

فی ظلال القرآن

پارہ ۲۰ تا ۲۶

جلد پنجم

سید قطب شہید

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

ادارہ منشورات اسلامی

بالمقابل منصوبہ ملتان روڈ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

فی ظلال القرآن	-----	تفسیر
سید قطب شہیدؒ	-----	مصنف
سید معروف شاہ شیرازی	-----	مترجم
سید عارف شیرازی	-----	ناشر
پارہ ۲۰ تا ۲۶	-----	جلد پنجم
۱۰۰۰	-----	تعداد
رضا پرنٹرز لاہور	-----	مطبع
۵۷ روپے	-----	ہدیہ
فروری ۱۹۹۷ء	-----	اشاعت اول
دسمبر ۱۹۹۷ء	-----	اشاعت دوم

---○○○---

عرض ناشر

”شہید اسلام سید قطب“۔ سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریخ اور میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سیرھا۔

سید قطب ۱۹۰۳ء میں مصر کے ایک صوبہ ”اسیوط“ کے ایک گاؤں ”موشاء“ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم ”تجیزہ دارالعلوم“ نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دارالعلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۲ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۳ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشر و اشاعت کے اخبار ”الاخوان المسلمون“ کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطب ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبدالسلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب اور تحریک اسلامی ان کا خاص موضوع رہا۔

تفسیر فی ظلال القرآن۔ مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی انگریزی جس نے عرب کی کاپیٹ دی تھی کی راہ میں حائل پردوں کو ہٹا کر دیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جاکھڑا ہوتا ہے جو ہبوط کدم علیہ السلام کے وقت سے رونے زمین پر برپا ہوئی اور انبیاء علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آ پہنچی۔ آپ ص ص کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ سید کا پیش حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جاسکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے الفاظ اور معنی کا دریا ہے۔ جس میں تحقیقی علمی وجدانی اور ادبی نکات جا بجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیان میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور امور انہلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور ہے اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص روح ایمان عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ

جس میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں لب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مترجم سید معروف شاہ شیرازی۔ سید معروف شاہ شیرازی ۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں سردھڑی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی، حصول علم کا شوق بچپن ہی سے انتہائی زیادہ تھا جس کی وجہ سے سرحد اور پنجاب کے مختلف دیہی مدارس اور معروف علماء کرام سے تعلیم حاصل کرتے رہے، پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں فنی قاضی اور ۱۹۵۳ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اگلے ہی سال مشہور دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے دورہ حدیث کر کے سند فراغت حاصل کی، جبکہ ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا، اور بعد میں ۱۹۶۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

درس نظامی پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۵ء گورنمنٹ ہائی سکول بٹل میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن بعد میں اس پیشہ کو ترک کر کے تصنیف و تالیف اور صحافت کے شعبہ سے منسلک ہو گئے۔ ایک سال تک ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کے ایڈیٹر رہنے کے بعد اپنا رسالہ ”اسوہ“ راولپنڈی سے نکالنا شروع کیا لیکن بعد میں کراچی منتقل ہونے کی وجہ سے کراچی سے ”اسوہ“ ”انجسٹ“ کے نام سے یہی رسالہ شائع کرتے رہے۔

اس دوران ادارہ معارف اسلامی کراچی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر کام کرتے ہوئے مختلف عربی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جو ”اسلامی تہذیب کے چند درخشان پہلو“، ”اسلام میں جرم و سزا“، (دو حصے) ”حسن الہناء شہید کی یادداشتیں“ اور ”نشانات راہ“ کے ناموں سے شائع ہوئیں۔

لیکن ۱۹۷۰ء میں ناسازی طبع کی بناء پر کراچی سے آبائی علاقہ میں منتقل ہو گئے اور وہاں ضلع مانسہرہ کی تحصیل منگرام میں وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۹۲ء تک اسی پیشہ سے منسلک رہے۔ پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس دوران ”سیرت القرآن“ حصہ اول دوم، ”اسلامی انقلاب کا منہاج“، ”اسلام اور جمہوریت ججوں اور جرنیلوں کے ذریعہ سایہ“، ”مدارس عربیہ اور اسلامی انقلاب“، ”سید مودودی کے فکری کام کا ایک جائزہ“، ”جماعت اسلامی انصاف کے دروازے پر“ اور انگریزی کی کتاب ”The Shape Of Basic Organs in Islamic State“ ادارہ منشورات اسلامی منصورہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔ گزشتہ ۲۹ سال میں دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ سید قطب شہید کی تفسیری ظلال القرآن کے اردو ترجمے کا کام بھی جاری رہا جو اکتوبر ۱۹۹۵ء میں مکمل ہوا۔

سید معروف شاہ شیرازی دوران تعلیم ہی سید مودودی ”سے متعارف ہوئے اور اکثر عصری مجالس میں حاضر رہتے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ مولانا مودودی ”کے ساتھ بھی رہے، جبکہ مولانا مودودی ”اکثر انھیں مسکین شاہ صاحب کے نام سے یاد فرماتے تھے ۱۹۶۲ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے اور ہمیشہ تحریکی سرگرمیوں میں مصروف رہے، قومی اتحاد کی تحریک کے دوران بری پور جیل میں بھی رہے۔ موصوف آج کل انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے شعبہ شریعہ اکیڈمی میں بطور کونسلینٹ خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ نائب امیر جماعت اسلامی ضلع مانسہرہ کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں اور جماعت اسلامی صوبہ سرحد کی شوری کے بھی منتخب رکن ہیں۔

فی ظلال القرآن کے ترجمہ کے بعد موصوف اپنی زیر تکمیل کتب ”حرمت سود“، ”تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل“، ”کتاب نکاح“، ”تحریکات اسلامیہ“، ”غیرت اسلام کی نظر میں“، ”مغلیہ دور حکومت میں سرحد کے صوفیاء کرام کا کردار“ کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

فی ظلال القرآن کی پانچویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلہ کی آخری جلد شائع کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین ثم آمین (سید عارف شیرازی)

جلد پنجم

سورة النمل - ۲۷	آیات ۶۰ تا - ۹۳
سورة القصص - ۲۸	آیات ۱ تا - ۸۸
سورة العنکبوت - ۲۹	آیات ۱ تا - ۶۹
سورة الروم - ۳۰	آیات ۱ تا - ۶۰
سورة لقمان - ۳۱	آیات ۱ تا - ۳۲
سورة السجده - ۳۲	آیات ۱ تا - ۳۰
سورة الاحزاب - ۳۳	آیات ۱ تا - ۷۳
سورة سبا - ۳۴	آیات ۱ تا - ۵۴
سورة فاطر - ۳۵	آیات ۱ تا - ۴۵
سورة یسین - ۳۶	آیات ۱ تا - ۸۳
سورة الصافات - ۳۷	آیات ۱ تا - ۱۸۲
سورة ص - ۳۸	آیات ۱ تا - ۸۸
سورة الزمر - ۳۹	آیات ۱ تا - ۷۵
سورة المؤمن - ۴۰	آیات ۱ تا - ۸۵
سورة حم سجده - ۴۱	آیات ۱ تا - ۵۴
سورة الشوری - ۴۲	آیات ۱ تا - ۵۴
سورة الزخرف - ۴۳	آیات ۱ تا - ۸۹

سورة الدخان - ۴۴	-----	آیات ۱- تا- ۵۹
سورة الجاثية - ۴۵	-----	آیات ۱- تا- ۳۷
سورة الاحقاف - ۴۶	-----	آیات ۱- تا- ۳۵
سورة محمد - ۴۷	-----	آیات ۱- تا- ۳۸
سورة الفتح - ۴۸	-----	آیات ۱- تا- ۲۹
سورة الحجرات - ۴۹	-----	آیات ۱- تا- ۱۸
سورة ق - ۵۰	-----	آیات ۱- تا- ۴۵
نوٹ الذریت - ۵۱ آیات ۱- تا- ۳۰ جلد ششم میں ملاحظہ فرمائیں -		

---○○○---

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فہرست جلد پنجم

پارہ نمبر۔ ۲۰----- سورہ النمل۔ ۲۷

۱۶	ایک نظریں	درس نمبر ۱۷۵
۱۸	تشریح آیات ۶۰-- تا۔ ۹۳	درس نمبر ۱۷۵

سورہ القصص۔ ۲۸

۴۹	ایک نظریں	سورہ القصص
۵۳	تشریح آیات ۱-- تا۔ ۴۳	درس نمبر ۱۷۶
۹۵	تشریح آیات ۴۴-- تا۔ ۷۵	درس نمبر ۱۷۷
۱۲۰	ایک نظریں	درس نمبر ۱۷۸
۱۲۱	تشریح آیات ۷۶-- تا۔ ۸۴	درس نمبر ۱۷۸
۱۳۰	تشریح آیات ۸۵-- تا۔ ۸۸	درس نمبر ۱۷۹

سورہ العنکبوت۔ ۲۹

۱۳۶	ایک نظریں	سورہ العنکبوت
۱۴۰	تشریح آیات ۱-- تا۔ ۱۳	درس نمبر ۱۸۰
۱۵۱	ایک نظریں	درس نمبر ۱۸۱
۱۵۳	تشریح آیات ۱۴-- تا۔ ۴۴	درس نمبر ۱۸۱

پارہ نمبر- ۲۱

۱۷۷	ایک نظریں	درس نمبر ۱۸۲
۱۷۹	تشریح آیات ۲۵-- تا-- ۶۹	درس نمبر ۱۸۲

سورہ الروم - ۳۰

۱۹۷	ایک نظریں	سورہ روم
۲۰۰	تشریح آیات ۱-- تا-- ۳۲	درس نمبر ۱۸۳
۲۲۵	ایک نظریں	درس نمبر ۱۸۴
۲۲۶	تشریح آیات ۲۳-- تا-- ۶۰	درس نمبر ۱۸۴

سورہ لقمان - ۳۱

۲۲۵	ایک نظریں	سورہ لقمان
۲۵۲	تشریح آیات ۱-- تا-- ۱۹	درس نمبر ۱۸۵
۲۶۹	تشریح آیات ۲۰-- تا-- ۳۲	درس نمبر ۱۸۶

سورہ السجدہ - ۳۲

۲۸۶	ایک نظریں	سورہ السجدہ
۲۹۰	تشریح آیات ۱-- تا-- ۳۰	درس نمبر ۱۸۷

سورہ الاحزاب - ۳۳

۳۱۳	ایک نظریں	سورہ الاحزاب
۳۲۲	تشریح آیات ۱-- تا-- ۸	درس نمبر ۱۸۸
۳۳۸	ایک نظریں	درس نمبر ۱۸۹
۳۴۶	تشریح آیات ۹-- تا-- ۲۷	درس نمبر ۱۸۹

پارہ نمبر- ۲۲

۳۷۰	تشریح آیات ۲۸-- تا-- ۳۵	درس نمبر ۱۹۰
-----	-------	-------------------------	--------------

۳۸۷	ایک نظرمیں	درس نمبر ۱۹۱
۳۸۸	تشریح آیات ۳۶ -- تا -- ۳۸	درس نمبر ۱۹۱
۴۰۳	ایک نظرمیں	درس نمبر ۱۹۲
۴۰۴	تشریح آیات ۲۹ -- تا -- ۴۲	درس نمبر ۱۹۲
۴۱۶	ایک نظرمیں	درس نمبر ۱۹۳
۴۱۷	تشریح آیات ۶۳ -- تا -- ۷۳	درس نمبر ۱۹۳

سورہ السنباء - ۳۴

۴۲۶	ایک نظرمیں	سورہ السنباء
۴۳۵	تشریح آیات ۱ -- تا -- ۹	درس نمبر ۱۹۴
۴۴۴	ایک نظرمیں	درس نمبر ۱۹۵
۴۴۵	تشریح آیات ۱۰ -- تا -- ۲۱	درس نمبر ۱۹۵
۴۵۶	ایک نظرمیں	درس نمبر ۱۹۶
۴۵۷	تشریح آیات ۲۲ -- تا -- ۲۷	درس نمبر ۱۹۶
۴۶۳	ایک نظرمیں	درس نمبر ۱۹۷
۴۶۴	تشریح آیات ۲۸ -- تا -- ۴۲	درس نمبر ۱۹۷
۴۷۳	ایک نظرمیں	درس نمبر ۱۹۸
۴۷۴	تشریح آیات ۴۳ -- تا -- ۵۴	درس نمبر ۱۹۸

سورہ فاطر - ۳۵

۴۸۳	ایک نظرمیں	سورہ فاطر
۴۸۷	تشریح آیات ۱ -- تا -- ۳	درس نمبر ۱۹۹
۴۹۷	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۰۰
۴۹۸	تشریح آیات ۴ -- تا -- ۸	درس نمبر ۲۰۰
۵۰۳	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۰۱
۵۰۴	تشریح آیات ۹ -- تا -- ۱۴	درس نمبر ۲۰۱

۵۱۶	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۰۲
۵۱۷	تشریح آیات ۱۵- تا- ۲۶	درس نمبر ۲۰۲
۵۲۲	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۰۳
۵۲۵	تشریح آیات ۲۷- تا- ۳۸	درس نمبر ۲۰۳
۵۲۲	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۰۴
۵۲۲	تشریح آیات ۳۹- تا- ۴۵	درس نمبر ۲۰۴

سورہ یسین - ۳۶

۵۲۲	ایک نظرمیں	سورہ یسین
۵۲۹	تشریح آیات ۱- تا- ۲۹	درس نمبر ۲۰۵
		پارہ نمبر- ۲۳	
۵۶۵	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۰۶
۵۶۶	تشریح آیات ۳۰- تا- ۶۸	درس نمبر ۲۰۶
۵۸۳	تشریح آیات ۶۹- تا- ۸۳	درس نمبر ۲۰۷

سورہ الصافات - ۳۷

۵۹۲	ایک نظرمیں	سورہ الصافات
۵۹۷	تشریح آیات ۱- تا- ۶۸	درس نمبر ۲۰۸
۶۱۱	تشریح آیات ۶۹- تا- ۱۲۸	درس نمبر ۲۰۹
۶۳۰	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۱۰
۶۳۱	تشریح آیات ۱۲۹- تا- ۱۸۲	درس نمبر ۲۱۰

سورہ ص - ۳۸

۶۳۹	ایک نظرمیں	سورہ ص
۶۴۲	تشریح آیات ۱- تا- ۱۶	درس نمبر ۲۱۱
۶۵۸	تشریح آیات ۱۷- تا- ۴۸	درس نمبر ۲۱۲

۶۷۴	تشریح آیات ۴۹-- تا-- ۶۴	درس نمبر ۲۱۳
۶۷۸	تشریح آیات ۶۵-- تا-- ۸۸	درس نمبر ۲۱۴

سورہ الزمر- ۳۹

۶۸۸	ایک نظرمیں	سورہ الزمر
۶۹۵	تشریح آیات ۱-- تا-- ۷	درس نمبر ۲۱۵
۷۰۵	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۱۶
۷۰۶	تشریح آیات ۸-- تا-- ۱۰	درس نمبر ۲۱۶
۷۱۱	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۱۷
۷۱۲	تشریح آیات ۱۱-- تا-- ۲۰	درس نمبر ۲۱۷
۷۱۶	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۱۸
۷۱۷	تشریح آیات ۲۱-- تا-- ۲۹	درس نمبر ۲۱۸

پارہ نمبر- ۲۴

۷۲۴	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۱۹
۷۲۵	تشریح آیات ۳۰-- تا-- ۳۵	درس نمبر ۲۱۹
۷۲۹	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۲۰
۷۳۰	تشریح آیات ۳۶-- تا-- ۵۲	درس نمبر ۲۲۰
۷۴۱	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۲۱
۷۴۲	تشریح آیات ۵۳-- تا-- ۶۱	درس نمبر ۲۲۱
۷۴۶	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۲۲
۷۴۷	تشریح آیات ۶۲-- تا-- ۷۵	درس نمبر ۲۲۲

سورہ المؤمن- ۴۰

۷۵۴	ایک نظرمیں	سورہ المؤمن
۷۶۱	تشریح آیات ۱-- تا-- ۲۰	درس نمبر ۲۲۳

۷۷۵	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۲۴
۷۷۶	تشریح آیات ۲۱ -- تا -- ۵۵	درس نمبر ۲۲۴
۸۰۰	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۲۵
۸۰۱	تشریح آیات ۵۶ -- تا -- ۷۷	درس نمبر ۲۲۵
۸۱۸	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۲۶
۸۱۹	تشریح آیات ۷۸ -- تا -- ۸۵	درس نمبر ۲۲۶

سورہ حم السجدہ - ۴۱

۸۲۷	ایک نظرمیں	سورہ حم السجدہ
۸۳۴	تشریح آیات ۱ -- تا -- ۳۶	درس نمبر ۲۲۷
		پارہ نمبر - ۲۵	

۸۶۲	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۲۸
۸۶۳	تشریح آیات ۳۷ -- تا -- ۵۲	درس نمبر ۲۲۸

سورہ الشوریٰ - ۴۲

۸۸۱	ایک نظرمیں	سورہ الشوریٰ
۸۸۸	تشریح آیات ۱ -- تا -- ۲۴	درس نمبر ۲۲۹
۹۱۸	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۳۰
۹۱۹	تشریح آیات ۲۵ -- تا -- ۵۳	درس نمبر ۲۳۰

سورہ الزخرف - ۴۳

۹۴۶	ایک نظرمیں	سورہ الزخرف
۹۵۲	تشریح آیات ۱ -- تا -- ۲۵	درس نمبر ۲۳۱
۹۶۶	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۳۲
۹۶۷	تشریح آیات ۲۶ -- تا -- ۵۶	درس نمبر ۲۳۲

۹۸۸	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۳۲
۹۸۹	تشریح آیات ۵۷ -- تا -- ۸۹	درس نمبر ۲۳۲
سورہ الدخان - ۴۴			
۱۰۰۶	ایک نظرمیں	سورہ الدخان
۱۰۰۹	تشریح آیات ۱ -- تا -- ۵۹	درس نمبر ۲۳۲
سورہ الجاثیہ - ۴۵			
۱۰۳۲	ایک نظرمیں	سورۃ الجاثیہ
۱۰۳۸	تشریح آیات ۱ -- تا -- ۲۳	درس نمبر ۲۳۵
۱۰۵۶	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۳۶
۱۰۵۸	تشریح آیات ۲۲ -- تا -- ۳۷	درس نمبر ۲۳۶
پارہ نمبر - ۲۶ ----- سورہ الاحقاف - ۴۶			
۱۰۶۴	ایک نظرمیں	سورہ الاحقاف
۱۰۷۰	تشریح آیات ۱ -- تا -- ۱۴	درس نمبر ۲۳۷
۱۰۸۵	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۳۸
۱۰۸۶	تشریح آیات ۱۵ -- تا -- ۲۰	درس نمبر ۲۳۸
۱۰۹۵	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۳۹
۱۰۹۶	تشریح آیات ۲۱ -- تا -- ۲۸	درس نمبر ۲۳۹
۱۱۰۳	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۴۰
۱۱۰۴	تشریح آیات ۲۹ -- تا -- ۳۵	درس نمبر ۲۴۰
سورہ محمد - ۴۷			
۱۱۱۸	ایک نظرمیں	سورۃ محمد
۱۱۲۵	تشریح آیات ۱ -- تا -- ۱۵	درس نمبر ۲۴۱
۱۱۴۸	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۴۲

۱۱۴۹	تشریح آیات ۱۶-- تا -- ۳۱	درس نمبر ۲۴۲
۱۱۶۱	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۴۳
۱۱۶۲	تشریح آیات ۲۲-- تا -- ۳۸	درس نمبر ۲۴۳

سورہ الفتح - ۴۸

۱۱۷۱	ایک نظرمیں	سورہ الفتح
۱۱۸۸	تشریح آیات ۱-- تا -- ۱۷	درس نمبر ۲۴۴
۱۲۰۶	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۴۵
۱۲۰۷	تشریح آیات ۱۸-- تا -- ۲۹	درس نمبر ۲۴۵

سورہ الحجرات - ۴۹

۱۲۲۵	ایک نظرمیں	سورہ الحجرات
۱۲۳۱	تشریح آیات ۱-- تا -- ۱۸	درس نمبر ۲۴۶

سورہ ق - ۵۰

۱۲۶۱	ایک نظرمیں	سورہ ق
۱۲۶۳	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۴۷
۱۲۶۴	تشریح آیات ۱-- تا -- ۱۵	درس نمبر ۲۴۷
۱۲۷۳	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۴۸
۱۲۷۴	تشریح آیات ۱۶-- تا -- ۳۵	درس نمبر ۲۴۸
۱۲۸۲	ایک نظرمیں	درس نمبر ۲۴۹
۱۲۸۳	تشریح آیات ۳۶-- تا -- ۴۵	درس نمبر ۲۴۹

سورہ الذریت - ۵۱

سورہ الذریت آیات ۱ تا ۳۰ جلد ششم میں ملاحظہ فرمائیں۔



فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۰

سورۃ النمل - ۲۷

آیات ۹۵ --- تا --- ۹۳

سورۃ القصص - ۲۸

آیات ۱ --- تا --- ۸۸

سورۃ العنکبوت - ۲۹

آیات ۱ --- تا --- ۲۲

درس نمبر ۷۷ ایک نظر میں

یہ سبق سوزہ نمل کا خاتمہ ہے۔ درمیان میں حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت صالح اور حضرت لوط علیہم السلام کے قصص سے مختصر کڑیاں لائی گئیں۔ یہ خاتمہ سورت کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اسی طرح سورت کے مضمون اور موضوع کے ساتھ بھی مربوط ہے۔ اس سورت میں قصص انبیاء میں سے جو کڑیاں لائی گئی ہیں وہ بھی سورت کے آغاز، اختتام اور موضوع و مضمون کے ساتھ مربوط ہیں۔ ہر قصہ اس مقصد کو ثابت کرتا ہے جو اس سورت کے پیش نظر ہے۔

یہ سبق اللہ کی حمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اور ان بندگان خدا پر سلامتی بھیجی جاتی ہے جو برگزیدہ ہیں۔ ان میں وہ انبیاء و رسل شامل ہیں جن کے قصے اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس حمد و سلام کے بعد پھر اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدے کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اس میں اس کائنات کے دلائل توحید نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے وجہ الٰہی دلائل، بعض نجیب امور اور علامات قیامت اور پھر مشاہد قیامت اور پھر حشر و نشر کے ہولناک لحاظ بیان کیے گئے ہیں۔ جن کے اندر زمین و آسمان کی تمام مخلوق خوفزدہ ہوگی لادہ شخص کہ جسے اللہ بچالے۔

--- ۰۰۰ ---

اس سبق میں انسان کو نفس انسانی اور اس کائنات کے کچھ مشاہدات کرائے جاتے ہیں۔ کوئی انسان ان مشاہدات اور ان دلائل کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور کوئی شخص بھی ان کی کوئی تشریح اس کے سوا نہیں کر سکتا کہ ایک واحد خالق ذات موجود ہے جو نہایت مدبر اور صاحب قدرت ہے۔

یہ مشاہدات مسلسل اور نہایت موثر ضربات کی شکل میں آتے ہیں اور انسان پر حجت تمام کرتے ہیں، اس کے شعور کو جگاتے ہیں، مسلسل سوالات ہیں جن کا جواب حقیقی یہی ہے کہ اللہ۔ کون ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا؟ کون ہے جس نے آسمانوں سے پانی اتارا جس کے ذریعہ ہم نے تروتازہ باغات پیدا کیے؟ کون ہے جس نے اس زمین کو ٹھہرا رکھا ہے؟ کون ہے جس نے زمین کے اندر دریا بہائے؟ کون ہے جس نے زمین میں اونچے اونچے پہاڑ کھڑے کیے؟ کون ہے جس نے دو دریاؤں اور سمندروں کے درمیان پردے کھڑے کیے۔ کون ہے جو ایک مضطرب شخص کی پکار سنتا ہے اور اس کی تکلیف دور کرتا ہے؟ کون ہے جو ہمیں زمین کے اندر اقتدار دے کر خلیفہ بناتا ہے؟ یہ مجرد کی ظلمات میں ہمیں راہ دکھانے والا کون ہے؟ پھر اپنی رحمت (بارش) سے قتل ٹھنڈی ہوا کون بھیجتا ہے؟ کون ہے جس نے یہ تخلیق کی اور پھر دوبارہ تخلیق کرے گا؟ کون ہے جو ہمیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سوالات مسلسل آتے ہیں اور ہر سوال کے بعد پھر ان کو جنم دیا جاتا ہے کہ آیا ہے کوئی الہ اللہ کے سوا؟ چنانچہ کوئی معقول شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ کوئی الہ اللہ کے ساتھ اور بھی ہے۔ کوئی ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن اس کے باوجود ان کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ اللہ کے

سوالور معبودوں کی بندگی کرتے ہیں۔

یہ ضرورت ہو براہ راست انسان کے دل پر پڑتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ اس کائنات کی کھلی کتاب ہے صفحات ہیں اور یہ ان کا شعوری وجدان ہے جسے وہ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ پھر بھی آخرت کی تکذیب کرتے ہیں اور آخرت کے معاملے میں یہ لوگ نہایت التباس کا شکار ہیں۔ چنانچہ ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ امم سابقہ نے بھی اسی طرح تکذیب کی تھی تو اللہ نے ان کو ہاک کر دیا تھا۔

یہاں سے بات پھر حشر و نشر کے ہولناک مناظر کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ دیکھئے ہر لمحے میں قارئین پھر دنیا کے اندر آ جاتے ہیں اور دوبارہ مشاہد قیامت نہایت ہی خوفناک انداز میں آتے ہیں۔ یوں انسانی دلوں کو ہلا مارا جاتا ہے اور ان کو خوب جھنجھوڑا جاتا ہے۔

اس سبق کے آخر میں ایک زبردست چوٹ لگائی جاتی ہے جس طرح کوئی آخری بات کرتا ہے اور خوفناک نتائج سے خبردار کر کے اور آخری وارننگ دے کر اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپؐ اب ان مزاح کرنے والوں اور آخرت کا انکار کرنے والوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ آپؐ نے ان کو دلائل تکوینی کی طرف بھی متوجہ کر دیا۔ قیامت کے ہولناک مناظر بھی پیش کر دیئے۔ پس اب چھوڑ دیئے جائیں یہ لوگ تاکہ وہ اپنے فطری انجام تک پہنچ جائیں۔ کیونکہ انہوں نے اس انجام کو اپنے لیے خود پسند کیا ہے اور ان کو بتا دیا جاتا ہے کہ رسولؐ کے ذمہ جو کام ہے وہ تو محمد و ولور متعین ہے۔ اور رسولؐ کے پاس جو ذرائع ہیں وہ محمد و ولور ہیں کیونکہ ذرائع کے بعد اختیار ان کا ہے کہ وہ راہ راست کو اختیار کریں یا نہ۔

اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اَعِذَّ رَبُّ هَذِهِ السَّاعَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَّ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۹۱) وَاَنْ اَتْلُو الْقُرْآنَ فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَاِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَاَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۹۱) (۲۷: ۹۱ - ۹۲) ”اے نبیؐ مجھے تو یہی

علم دیا گیا ہے کہ اس شر کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے۔ مجھے علم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھٹے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ میں تو بس خبردار کرنے والا ہوں۔“

اور یہ سبق اسی مضمون پر ختم ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کا آغاز ہوا تھا۔ یعنی صرف اللہ کی حمد جس کا وہ لٹل ہے۔ ان لوگوں کو اللہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو ان کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور جو ان کے اعمال سے بھی طرح باخبر ہے خواہ ظاہر ہوں یا باطن۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سِيرَتُكُمْ اَيْتِه فَتَعْرِفُوْنَهَا وَاَمَّا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

(۲۷: ۹۳) ”ان سے کہو تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ عنقریب تمہیں اپنی سیوں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لو گے اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو۔“

درس نمبر ۷۷ التشریح آیات

۶۰۔۔۔ تا۔۔۔ ۹۳

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ ۚ اَللّٰهُ خَيْرٌۭ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ

(۵۹:۲۷) ”(اے نبی!) کہو! حمد ہے اللہ کے لیے اور سلام اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے برگزیدہ کیا۔

(ان سے پوچھو) اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں؟“

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کلمات سکھاتا ہے جن کے ساتھ ہر مومن کو اپنے کلام کا آغاز کرنا چاہئے۔ ہر مومن کو اپنی تقریر اپنی تبلیغ اور اپنے مباحثے اور مکالمے کا آغاز ان کلمات سے کرنا چاہئے اور اپنے کلام کا خاتمہ بھی ایسے ہی کلمات پر ہونا چاہئے۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَبِّحْ بِحَمْدِ اللّٰهِ ۚ اَللّٰهُ خَيْرٌۭ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ تمہیں دکھائے گا۔۔۔“ اللہ نے اپنے بندوں پر جو انعامات کیے ہیں ان کی وجہ سے اللہ مستحق ہے کہ وہ اس کی تعریفیں کرتے رہیں اور اللہ کی نعمتوں میں سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو صحیح راہ دکھائی۔ وہ نادم بتلایا جس کے مطابق انسانوں نے زندگی گزارنی ہے۔ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ (۵۹:۲۷) ”اور سلام اس کے ان بندوں کے لیے جنہیں اس نے برگزیدہ کیا۔“ یعنی اپنی رسالت کے لیے دعوت کے لیے اور اسلامی نظام زندگی کی تبلیغ اور اقامت کے لیے۔

اس افتتاح کے بعد اب مشرکین پر حملے شروع ہوتے ہیں اور ان کو خوب ضربات لگائی جاتی ہیں۔ ان دلوں کو جھنجھوڑا جاتا ہے جو آیت الہیہ کا انکار کرتے ہیں۔ آغاز ایسے سوال سے کیا جاتا ہے جس کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ اس سوال کے ذریعے ان پر تنقید کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسرے اللہ ٹھہراتے ہیں۔ اَللّٰهُ خَيْرٌۭ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ

(۵۹:۲۷) ”اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک بناتے ہیں۔“

یہ جن لوگوں کو شریک بناتے ہیں وہ بت ہیں یا آسترنے ہیں یا ملائکہ ہیں اور یا جن ہیں اور یہ سب چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں یا ان کے علاوہ کسی اور مخلوق کو یہ شریک کرتے ہیں۔ بہر حال ان کے معبود ان باطل کسی حالت میں اللہ کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے، چہ جائیکہ وہ اللہ سے بہتر ہو جائیں۔ کوئی عقلمند آدمی ان معبودوں اور اللہ کے درمیان کوئی موازنہ نہیں کر سکتا۔ یہ سوال اپنے ان الفاظ میں گویا ان کے ساتھ ایک خوبصورت مزاح ہے اور ایک طرح کی تمذید اور توجیح بھی ہے کیونکہ کوئی شخص اس قسم کا سوال سنجیدگی سے نہیں کر سکتا۔ نہ اس سوال کا جواب طلب کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ جواب کے انتظار سے بھی پہلے دو سراسوال کر دیا جاتا ہے اور یہ سوال انسانوں کے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات کے بارے میں ہے جس کی یہ قلمونیوں کو وہ رات دن مشاہدہ کرتے ہیں۔

اَمِنْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَنْبَتْنَا

بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَّا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُثْبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ اِلٰهُ مَعَ اللّٰهِ

بَنْ هُمْ قَوْمٌ يَعِدُوْنَ ﴿۱۷﴾

”بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ وہ خوشناباغ اگائے جن کے درختوں کا اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ (نہیں) بلکہ یہی لوگ راہ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔“

زمین و آسمان ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو ہمارے ارد گرد قائم ہے۔ کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جن الملوں کو وہ پکارتا ہے ان میں سے کسی نے ان کو پیدا کیا ہے کیونکہ یہ لوگ تو انعام و اوجان اور ملائکہ و شیاطین اور شجر و حجر کے پوجنے والے تھے یا پھر شمس و قمر کے پجاری تھے۔ لہذا یہ بات بدیہی ہے کہ ان چیزوں نے اس کائنات کو پیدا نہیں کیا بلکہ مشرکین میں ایسے یہود و نصاریٰ بھی نہ تھے جو یہ دعویٰ کرتے ہوں کہ یہ کائنات خود اپنے وجود کی وجہ سے قائم ہے۔ بذات خود خالق و مخلوق ہے۔ اس قسم کے کم عقل صرف ہمارے ترقی یافتہ دور ہی میں پیدا ہوئے۔ لہذا صرف یہ بات ان کے لیے کافی تھی کہ ان کو اس کائنات کی طرف متوجہ کر دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ ذرا اس کے بارے میں غور و فکر کرو۔ محض یہ توجہ ہی کافی دلیل ہے کہ شرک کے لیے اور مشرکین کو لا جواب کرنے کے لیے۔ اور یہ سوال انسان ایک سوچنے والے انسان کے سامنے ہمیشہ قائم رہتا ہے کیونکہ اس کائنات کی تخلیق ایسی ہے کہ اسے کسی ذات نے ایک منصوبے اور ارادے سے پیدا کیا ہے۔ اس کے اندر کسی مدبر کی تدبیر صاف نظر آتی ہے۔ اس کے اصولوں کے اندر اس قدر ہم آہنگی ہے کہ یہ محض اتفاقی مخلوق معلوم نہیں ہوتی۔ صرف معمولی غور کرنے ہی سے انسان اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کی خالق کوئی عظیم قوت ہے۔ یہ واحد قوت ہے اور اس کی تخلیق کے آثار جاتے ہیں کہ وہ وحدہ لا شریک ہے اور اس نے اس کائنات کو ایک زبردست منصوبے کے ساتھ بنایا ہے۔ اس کائنات کے اصولوں اور اس کے قوانین میں وحدت اور تناسق پایا جاتا ہے۔ لہذا اس کا خالق بھی ایک ہے اور وہ ایسا خالق ہے کہ اس کا ارادہ اس کائنات کی ہر چھوٹی اور بڑی چیز میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔

درا سوالات پر دوبارہ غور کریں۔ ”بھلا وہ کون ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا؟“۔ ”وہ کون ہے جس نے تمہارے لیے پانی برسایا؟“۔ ”وہ کون ہے جس نے تمہارے لیے یہ رنگ برنگے درختے؟“۔ ”کیا تم ایسے درخت اگا سکتے ہو؟“۔

پانی آسمانوں سے بارش کے ذریعہ اترتا ہے۔ کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور کسی کے پاس اس کے حقیقی اسباب کے لیے اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ ایک خالق کائنات ہے جو اس کائنات کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہی ہے جس نے اس کائنات اور اس کے اس فطری نظام کو جاری کیا ہے۔ اور اس کے جاری کردہ اس قانون قدرت کے مطابق ایک خاص مقدار میں بارش نازل ہوتی ہے۔ پھر اس بارش کے ذریعہ اس کرۂ ارض پر اس انداز اور مقدار کے مطابق زندگی پائی جاتی ہے لہذا یہ سب کچھ محض اتفاق کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ یہ اتفاقات ایک خاص پیچیدہ ترتیب کے مطابق ہوتے ہیں۔ نہایت ہی طے شدہ اور مضبوط تسلسل کے ساتھ۔ جس میں زندہ مخلوق کی تمام ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ خصوصاً انسان کی تو تمام ضروریات کے مطابق اس کائنات کو بنایا گیا ہے۔ اس کی تخلیق میں انسانوں کی ضروریات کو مخصوص طور پر مد نظر رکھا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے :

وَأَنْزَلْ لَكُمْ (۲۷: ۶۰) ”اور اس نے تمہارے لیے نازل کیا ہے“۔ قرآن کریم اس طرف بار بار اشارہ کرتا ہے کہ نازل ہونے والے اس پانی کے اندر زندہ کرنے والے اثرات ہیں۔ اس کے اندر انسان کے وجود اس کی ضروریات اور اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ قرآن انسانوں کو ان زندہ آثار کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جو ان کے سامنے زندہ موجود ہیں لیکن یہ لوگ ان سے غافل ہیں۔

فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَدَائقَ ذَاتِ بَهْجَةٍ (۲۷: ۶۰) ”پھر اس کے ذریعہ ہم نے وہ خوشناباغ اگائے۔“ یعنی تردنازہ اور خوبصورت زندہ اور خوش منظر باغ اگائے۔ بہاوت کو دیکھ کر انسان کے دلوں میں زندگی، خوشی اور نشاط کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس حسن و جمال اور تردنازگی پر غور کرنے سے مردہ دل بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔ پانی سے پیدا ہونے والے اس حسن و جمال کے آثار پر غور کر کے ایک زندہ دل دماغ والا انسان صانع کائنات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور اس کی شجیع و تمجید کر سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک خوبصورت چیز کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کے تمام ماہرین فن بھی جمع ہو جائیں تو وہ ایک خوبصورت پھول بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ اس کے اندر رنگوں کی لہریں اور استزاج اس کے خطوط اس کی پتیوں کی ترتیب و تنظیم صرف ایک پھول کے اندر تخلیق و فن کا وہ کمال ہے جو معجز ہے۔ انسان کے قدیم اور جدید ترقی یافتہ فن کے اندر اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ رہی پورے درخت کے اندر قوت نامیہ تو یہ ایک عظیم راز ہے۔ پھر درخت کے اندر سے اس کی نسل کا تسلسل یہ وہ راز ہیں جو انسان کے لیے تو معجزہ ہیں۔

مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوا شَجَرَهَا (۲۷: ۶۰) ”جن کے درختوں کا اگانا تمہارے لیے ممکن نہ تھا۔“ اور زندگی تو ابھی تک علماء کے نزدیک ایک راز ہی ہے۔ خواہ نباتات کی ہو یا حیوانات کی۔ آج تک کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ زندگی کس طرح وجود میں آگئی یا زندہ انسان کے جسم حیوانات کے اجسام اور درختوں کے اجسام کے اندر پائے جانے والے میسرل کے ساتھ کس طرح وابستہ ہو گئی۔ لہذا زندگی کی اس تخلیق کا مقصد کہیں اور تلاش کرنا ہو گا۔

نباتات کی زندگی اور اس کے آثار اور باغ و ریلغ کو پیش کر کے اور انسانی عقل کو دعوت غور و فکر دے کر اور انسان

کے قولے بدرکہ کو تحریک دے کر اب قارئین کے سامنے ایک سوال رکھا جاتا ہے۔

ءَالِهَۃٌ مَّعَ اللّٰهِ (۲۷: ۶۰) ”کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الہ بھی ہے؟“۔ کون ہے جو اس سوال کے جواب میں ہاں کہہ سکتا ہے۔ اقرار اور یقین اور نئی شرک کے سوال اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے لیکن ایسے واضح حالات میں بھی لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ پھر بھی عجیب موقف اختیار کرتے ہیں اور وہ ایسے خالق کائنات کے ساتھ اپنے نام نہاد معبودوں کو الہ سمجھتے ہیں ’ان کی بندگی کرتے ہیں‘

بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعْدِلُونَ (۲۷: ۶۰) ”بلکہ یہ لوگ راہِ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔“
 عدلون کا معنی یا تو یہ ہے کہ یہ برابر کرتے ہیں یعنی یہ لوگ ایسے خدا کو جو خالق کائنات اور موجد حیات ہے۔ ان معبودوں کے برابر کرتے ہیں جن کو وہ الہ سمجھتے ہیں اور یا اس کے معنی ہیں عدل عن الحق یعنی یہ لوگ سچے راستے سے ایک طرف ہو کر چلتے ہیں حالانکہ حق کا راستہ بالکل واضح ہے۔ یعنی اللہ کے ساتھ دیگر الہوں کو شریک کر کے وہ سچائی کے راستے سے ہٹ گئے جبکہ اللہ وحدہ خالق ہے۔ دونوں مضموموں کے اعتبار سے ان کا موقف قابلِ تعجب ہے جو کسی عقلمند آدمی کے لائق نہیں ہے۔
 اب ان کو ایک دوسری کائناتی حقیقت کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔ جس طرح پہلے تخلیقِ حیات اور اس کے مظاہر کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔

أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا
 جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ
 لَا يَعْلَمُونَ ﴿۴۱﴾

”اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیئے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔“

اس کائنات کی پہلی حقیقت اور اس کے بارے میں پہلا سوال جو انسانی ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کیسے ہوئی۔ پھر جب ہم کرۂ ارض پر ہیں تو اس زمین کا اپنی موجودہ ہیئت پر وجود میں آنا ہمارے لیے ایک اہم سوال ہے۔ پھر یہ کہ اس زمین کو زندگی کا مستقر اور سکون کی جگہ بنایا گیا ہے۔ زمین کو ایسا بنایا گیا ہے کہ اس کے اندر زندگی وجود پا سکتی ہے، یہاں اسے سکون ملا ہے اور نشوونما کے اسباب ملتے ہیں۔ اگر اس زمین کی موجودہ شکل یہ نہ ہوتی اور شمس و قمر کے مقابلے میں اس کے موجودہ فاصلے نہ ہوتے یا اس کا حجم وہ نہ ہوتا جو ہے یا اس کے عناصر اور اس

کی فضا میں جو عناصر ہیں وہ نہ ہوتے، یا زمین کی حرکت اپنے محور کے ارد گرد دراتیز ہوتی یا سورج کے ارد گرد اس کی گردش موجودہ گردش سے زیادہ تیز ہوتی یا چاند کی گردش زمین کے گرد تیز ہوتی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے حالات جو محض اتفاق سے وجود میں نہیں آئے۔ بلکہ ایک مکمل ترتیب اور ہم آہنگی کے ساتھ وجود میں لائے گئے ہیں۔ اگر ان حالات میں سے کسی چیز میں کوئی ادنیٰ سا تغیر بھی آ جائے تو یہ زمین ”قرار“ نہ ہوتی اور نہ اس میں انسان یا کوئی اور چیز زندہ رہ سکتی۔

یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کے پسے مخاطب اللہ کے اس قول سے وہ باتیں نہ سمجھتے ہوں جو ہم سمجھتے ہیں: اَمَّنْ

جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا (۲۷: ۶۱) ”کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا۔“ لیکن اس قدر وہ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ یہ زمین زندگی کے لیے ایک جائے قرار ہے اور اس کے اوپر زندگی کو ممکن بنایا گیا ہے۔ وہ اس حقیقت کو ذرا اجمال کے ساتھ سمجھتے تھے اور ہم ذرا مزید تفصیلات کے ساتھ سمجھتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی مشرک بھی یہ دعویٰ نہ کر سکتا تھا کہ ان کے الہوں میں سے کوئی اللہ تخلیق زمین میں اللہ کے ساتھ شریک ہے۔ پس اس آیت سے ان کے لیے یہ بات کافی تھی اور اس آیت کے معنی کے اندر ہم کی وسعت کے ساتھ اب تفصیلات کی وسعت پیدا ہو گئی اور ہوتی رہے گی۔ یہ قرآن کریم کے انداز بیان اور طرز استدلال کا معجزہ ہے کہ اس سے سائنسی اعتبار سے ہمہ اندہ سوسائٹی بھی اسی قدر استفادہ کرتی تھی جس طرح زمانوں بعد آج کے ترقی یافتہ لوگ کرتے ہیں۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَ جَعَلَ خِلَالَهَا اَنْهَارًا (۲۷: ۶۱) ”کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے۔“ زمین کے اوپر اللہ نے جو دریا چلا رکھے ہیں وہ دراصل زندگی کے شریان ہیں۔ یہ اس کرۂ ارض کی بلندیوں سے مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کی سمتوں میں چلتے ہیں۔ اور اپنے ساتھ سرسبز شادابی اور نشوونما لاتے ہیں۔ ان کی تنگیں ان پانیوں سے ہوتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ زمین میں جمع فرماتا ہے، ہر علاقے کے طبعی حالات کے مطابق، جس ذات نے اس زمین کو پیدا کیا، اس نے اس کے منصوبے میں بادلوں کی تنگیں، بارش کا نظام اور دریاؤں کا بہاؤ رکھا۔ کوئی ہے جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس نظام کی تشکیل میں خالق کائنات کے سوا کوئی اور بھی شریک ہے۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ اس کرۂ ارض پر بڑے بڑے دریا بہہ رہے ہیں۔ یہ سوال ایک حقیقی سوال ہے کہ آخر کون ہے جس نے ان دریاؤں کو یوں چلایا اور بہایا۔ کیا ہے کوئی اللہ اللہ کے ساتھ؟

وَ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيًا (۲۷: ۶۱) ”اور اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں۔“ رواہی کے معنی اونچے پہاڑ کے ہیں۔ یہ اپنی جگہ بنے ہوئے اور زمین پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اور اکثر اوقات ان پہاڑوں ہی سے نمبریں نکلتی ہیں۔ جہاں سے بارشوں کے پانی نکل کر دریاؤں کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر ان دریاؤں کی وجہ سے پہاڑی علاقوں میں شکاف اور گھرائیاں پیدا ہو کر وادیاں بن جاتی ہیں اور اونچے مقامات سے یہ دریا قوت کے ساتھ نشیبی علاقوں کی طرف چلتے ہیں۔

یہاں انداز بیان میں اونچے اور جے ہوئے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ندیاں اور دریا دکھائے گئے ہیں۔

قرآن کی تصویر کشی کے اندر یہ طرز ادا امام ہے کہ وہ ایک ہی آیت میں باہم متضاد مناظر و معانی پیش کرتا ہے۔ یہاں بھی چلتے دریاؤں کے بعد کھڑے پہاڑ دکھائے گئے ہیں۔

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا (۶۱: ۲۷) ”اور پانی کے دو سمندروں کے درمیان پردے حائل کر دیئے۔“ ایک سمندر سخت نمکین کھار اور دوسرا میٹھا اور خوشگوار۔ دونوں کو بحرین کہ گیا۔ بطور تعلق کیونکہ دونوں کا مشترکہ مادہ پانی ہے اور دونوں کے درمیان پردہ ایک طبعی پردہ ہوتا ہے۔ اس طرح کہ سمندر کا پانی دریا کے پانی کے ساتھ ملا نہیں۔ اس طرح اسے کھار نہیں بنا دیتا۔ اس کی تفصیلات یوں ہیں کہ دریاؤں کی سطح سمندر کی سطح سے قدرے اونچی ہوتی ہے۔ جب دریاؤں کا پانی سمندر میں گرتا ہے تو اس پانی کی سطح سمندر کی سطح سے اونچی ہوتی ہے۔ یہ دریا پھر سمندر کی سطح کے اوپر دور تک چلتا رہتا ہے۔ سمندر اس کو خراب نہیں کرتا۔ اب اگر دریا کا یہ پانی سمندر کے پانی سے نیچے بھی ہو جائے تو وہ آپس میں ملتے نہیں۔ اس وجہ سے کہ سمندر کا پانی دریا کے پانی کی نسبت زیادہ کثیف ہوتا ہے۔ اس فرق کی وجہ سے دونوں پانی ایک دوسرے کے ساتھ ملتے نہیں جدا ہی جتے ہیں۔ یہ ہے اللہ کی سنت اپنی اس کائنات کے اندر اور اس معجزانہ انداز میں اللہ نے اپنی اس کائنات کو بنایا ہے۔ لہذا سوال یہ ہے کہ یہ معجزانہ کام کس نے کیا۔ اللہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ اَللّٰهُ مَعَ الْاٰلِہِ (۶۱: ۲۷) اگر کوئی اللہ کے سوا کسی اور کی بابت ایسا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ سامنے آئے۔ اگر نہیں تو اس کائنات کے یہ عجوب اور یہ منصوبے دلیل مطلق ہیں کہ اس کا ایک خالق ہے اور وہ ایک ہی ہے۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶۱: ۲۷) ”بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔“

یہاں بھی علم کا ذکر کیا کہ ”بے علم نتواں خدا را شناخت“۔ اور جس طرح اس سورت کے خلاصہ میں اور پارہ سابق میں ہم نے بتایا تھا کہ اس سورت کا محور ہی علم ہے۔ پوری سورت میں علم کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ اب روئے سخن مشاہد کائنات سے خود انسان کی نفسیاتی دنیا کی وادیوں کی طرف پھر جاتا ہے۔

اَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یُکْشِفُ السُّوءَ وَ یَجْعَلُ لَّکُمْ

خُلَفَاءَ الْاَرْضِ مَعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ

”کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟ اور (کون ہے جو) تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (یہ کام کرنے والا) ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔“

اب ان کے وجدان کو چھوا جاتا ہے۔ ان کے نفس کے اندر موجود خلجات کو چھڑا جاتا ہے اور ان کی زندگی کے عموماً حالات اور اہم واقعات کے دور ان ان کے نفس کی کیفیات ان کے سامنے رکھی جاتی ہیں۔ سمندر کے سفر میں جو لوگ نہایت ہی مشکل حالات میں گھر جاتے ہیں اور جہان ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں اور بظاہر مدد کو پہنچنے والا کوئی نہیں

رہتا۔ صرف اللہ کی مدد کی امید ہوتی ہے اور تمام سہارے ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان ہر طرف نظر دوڑاتا ہے اور کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ زمین کی کوئی قوت ان کی مدد کو نہیں پہنچ رہی ہوتی۔ انسان اپنے خیال میں جن قوتوں کے سہارے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ وہ سب قوتیں ایک ایک کر کے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ ہر وہ قوت جس سے کچھ بھی توقع تھی وہ جواب دے دیتی ہے۔ ایسے مایوس کن حالات میں پھر انسان کی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ انسان اس قوت کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو صحیح قوت ہوتی ہے۔ اب انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے حالانکہ اس سے قبل انسان اپنے نارمل حالات میں اللہ کو بھولا ہوا تھا۔ کیونکہ اب تو اللہ ہی ہے جو کسی مجبور شخص کو امداد دیتا ہے جب وہ بے سہارا ہو کر اسے پکارتا ہے اور یہ اللہ ہی ہے جو پھر اس کو مشکلات سے نکالتا ہے۔ امن و سلامتی عطا کرتا ہے اور اس مشکل سے نکالتا ہے۔

جب لوگ امن و عافیت اور خوشحالی میں ہوتے ہیں تو وہ غفلت میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ وہ ذات باری کو بھول جاتے ہیں۔ پھر وہ زمین کی قوتوں میں کسی قوت سے نصرت و امداد طلب کرتے ہیں۔ لیکن جب سختی آتی ہے اور انتہائی کرب کے حالات میں وہ گھر جاتے ہیں تو اس وقت غفلت کے پردے اتر جاتے ہیں اور اس وقت وہ کڑکڑا کر اپنے رب کی طرف لوٹتے ہیں۔ اگرچہ وہ غافل تھے اور ہٹ دھرمی کرنے والے تھے۔

قرآن کریم مکرین اور ہٹ دھرمی کرنے والوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جو خود ان کی فطرت میں ہے۔ یہ بات قرآن کریم ایسے ماحول میں ان کے سامنے پیش کرتا ہے جس میں زمین و آسمان کی تخلیق، آسمانوں سے پانی کا نزول، زمین کے اوپر ترستاؤں، باغ و رملغ کی پیدائش، اس کرۃ الارض کا قرار، اس کے اوپر پہاڑوں کا نصب کرنا اس کے اندر دریاؤں اور نالوں کا چلانا اور بہانا اور سمندر کے اندر دو قسم کے پانیوں کے پردے حائل کرنے کے مناظر پیش کیے گئے ہیں اور پھر سمندر میں ایک مضطرب اور کربناک صورت حال پیش کر کے سمجھایا گیا کہ ایسے حالات میں تو کوئی شخص بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں پکارتا اور یہ بھی مذکورہ بالا کائناتی خالق کی طرح ایک حقیقت ہے۔ وہ خالق کائنات تھے اور اس کا تعلق انسان کی نفسیاتی دنیا سے ہے۔

اب ان کی نفسیات کی دنیا سے بھی باہر لا کر، اللہ تعالیٰ ان کو ان کی زندگی کے ایک عملی حال کی طرف لاتا ہے۔

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ اَلْاَرْضِ (۲۷: ۶۲) ”اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے۔“ وہ کون ہے جس نے یہاں انسان کو پیدا کیا، پوری مخلوقات پر نصیبت بخشی۔ اس کے بعد پھر ایک کے بعد دوسرے کو اس زمین کا اقتدار دیتا رہا۔ کسی کو زوال ہوا اور دوسرے نے کمال حاصل کیا۔ یہ گرا اور وہ اٹھا۔

کیا یہ اللہ ہی نہیں ہے کہ جس نے قوانین قدرت کے مطابق تمہیں اس زمین پر زندگی بخشی اور پھر تمہیں ایسی قوتیں عطا کیں جن کی وجہ سے تم اس کرۃ الارض پر اللہ کی خلافت کے مستحق قرار پائے اور پھر تمہیں اس عظیم منصب کے لیے یہاں تیار کیا۔ زمین کو تمہارے لیے جائے قرار بنایا۔ اور اس کی ہر چیز کو تمہاری زندگی کے لیے مدد و معاون اور ہم آہنگ بنایا کہ زمین کی ہر چیز تمہارے لیے مدد حیات بن گئی اور اگر ایسا ہوتا کہ زمین کے اہم عناصر میں سے ایک عنصر غائب کر دیا جائے تو تمام انسان کیا تمام زندہ چیزیں ایک دم میں ختم ہو کر رہ جائیں۔ اور آئندہ کے لیے بھی یہاں کسی چیز کا وجود محال ہو جائے۔

سب سے آخر میں یہ بات ہے کہ اللہ ہے وہ ذات جس نے موت و حیات کو پیدا کیا اور ایک نسل کے بعد دوسرے لوگوں کو اٹھایا۔ اگر اللہ اگلی نسلوں کو اسی طرح قائم رکھتا اور آنے والی نسلیں پیدا ہوتی چلی جاتیں تو اس کرۂ ارض پر تل دھرنے کی جگہ ہی نہ ہوتی۔ زندگی کا یہ دھارا بہت ہی ست ہوتا۔ انسانی سوچ نہایت ست رفتار ہوتی۔ کیونکہ تازہ تازہ نسلیں وجود میں آنے کے ساتھ تازہ افکار اور تازہ خیالات بھی آتے ہیں۔ لوگ نئے نئے تجربے کرتے ہیں اور زندگی کی جدوجہد میں نئی نئی کوششیں کرتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے نئے نئے طریقے دریافت کرتے ہیں اور اب تو صورت یہ ہے کہ پرانے اور نئے لوگوں کی جنگ صرف فکر و شعور کے میدان میں ہوتی ہے۔ اور اگر سابقہ لوگ بھی سب کے سب زندہ ہوتے تو پرانے اور نئے لوگوں کے درمیان جسمانی تصادم بھی ہوتا۔ اور زندگی کی گاڑی آگے بڑھنے کے بجائے باہم تضادات اور تصادمات کا شکار ہو جاتی۔

یہ تمام نفسیاتی حقائق ہیں جس طرح اس سے قبل بیان کیے جانے والے آفاقی حقائق تھے۔ کون ہے جس نے یہ حقائق پیدا کیے، جنہیں خلیفہ بنایا۔ کوئی ہے اللہ کے سوا؟ ءَالِهَ مَعَ اللّٰہِ (۶۲:۲۷) ”کیا اللہ کے ساتھ ہے کوئی اور الہ“۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ حقائق کو بھول جاتے ہیں جب سمندر کی مشکلات سے ٹکلتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ان کی فطرت بھی سو جاتی ہے اور یہ غافل ہو جاتے ہیں حالانکہ خود ان کے نفس اور ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات میں حقائق موجود ہیں۔

قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ (۶۲:۲۷) ”تم لوگ کم ہی سوچتے ہو“۔ اگر انسان حقائق کو یاد رکھے اور ان پر مسلسل غور کرتا رہے، تو وہ ہمیشہ اللہ کے ساتھ جڑا رہے اور فطرت کی پکار کو سنتا رہے۔ وہ کبھی اپنے رب سے غافل نہ ہو اور کبھی اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔

اس کے بعد لوگوں کی زندگی سے بعض اور حقائق پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق اس کرۂ ارض پر لوگوں کی سرگرمیوں سے ہے اور ان کے ان مشاہدات سے ہے جو ہر وقت دہرائے جاتے ہیں۔

أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتٍ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُرْسِلُ الرِّيَّاسَ

بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ءَالِهَ مَعَ اللّٰہِ تَعَالٰی اللّٰہُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۶۲﴾

”اور وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوشخبری لے کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (یہ کام کرتا) ہے؟ بہت بالا و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔“

سب لوگ بحری سفر کرتے ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جو قرآن مجید کے مخاطب اول تھے۔ یہ لوگ بحری سفر کے راستوں میں سفر کرتے ہیں اور انہوں نے بحری سفر کی تاریکیوں میں اپنے تجربات اور علم کے مطابق سفر کیے اور کرتے ہیں۔ ان

سفروں میں وہ صحیح راستے معلوم کر لیتے ہیں 'وہ کون ہے جو ان سفروں میں انسان کو سیدھے راستے بتاتا ہے؟ کس نے انسانوں کو یہ عقل و خرد عطا کیا جس کے ذریعے وہ ان راستوں کا ادراک کرتے ہیں۔ ستاروں کے علوم اس نے دیے پھر آلات دریافت کرنے کی قوت کس نے دی۔ اور تجربات و نشانات کس نے بتائے؟ وہ کون ذات ہے جس نے انسانی فطرت اور فطرت کائنات کے اندر ہم آہنگی پیدا کی۔ اور انسان کے لیے فطرت کائنات تک پہنچنے کی راہ ہموار کی۔ کون ہے جس نے کانوں کے ذریعے انسانوں کو آوازیں معلوم کرنے کی طاقت دی۔ کون ہے جس نے آنکھ کے ذریعے انسان کو دور تک مشاہدے کی طاقت دی۔ اور کون ہے جس نے حواس خمسہ کے ذریعے انسان کو تمام محسوسات معلوم کرنے کی توفیق دی؟ پھر انسان کو عقل کی طاقت دی جس کے ذریعے انسان حواس سے بھی زیادہ لطیف مدركات معلوم کرتا ہے۔ پھر حواس کے تجربات سے نتائج اخذ کرنے اور وجدان اور الہام کے ذریعہ حقائق اخذ کرنے کی توفیق دی۔ ءِ اِلَہِ مَعَ اللّٰہِ (۶۳:۲۷) "کیا ہے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الہ"۔

وَمَنْ يُرْسِلِ الرِّیْحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ (۶۳:۲۷) "اور کون ہے جو اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوشخبری دے کر بھیجتا ہے"۔ یہ ہوائیں جن کے فکلی اسباب کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جائے گا لیکن یہ وہ ہیں جو روزِ اول سے اللہ نے اس کرۂ ارض کے ساتھ پیدا کی ہیں۔ اور جس طرح یہ چلتی ہیں روزِ اول سے ان کے لیے یہی منصوبہ ہے کہ یہ ایک جگہ سے بادلوں کو اپنی دوش پر لے کر چلتی ہیں اور انسانوں کو اس چیز کی خوشخبری دیتی ہیں جو مددِ حیات ہے یعنی پانی۔

سوال یہ ہے کہ یہ ہوائیں 'یہ بادل اور یہ بارش کا نظام اپنی موجودہ شکل میں کس نے تخلیق کیا؟ اور پھر ہوائیں 'ٹھنڈی ہوائیں' بادلوں اور بارش سے قبل کون بھیجتا ہے۔

ءِ اِلَہِ مَعَ اللّٰہِ (۶۳:۲۷) "کیا ہے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الہ"۔

تَعَالٰی اللّٰہُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۶۳:۲۷) "بہت بلند اور بالا ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

اَمَّنْ يَّبْدُوْا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُہٗا وَمَنْ یَّرْزُقْکُمْ مِّنَ السَّمَاءِ

وَالْاَرْضِ ؕ ءِ اِلَہُ مَعَ اللّٰہِ قُلْ هَآئِذَا بَرَّہَا نَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۱۷

"اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں حصہ دار) ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو"۔

اس کائنات و مخلوقات کا آغاز ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کوئی نہیں کر سکتا۔ نہ تخلیق کائنات کے مسئلے کو

اللہ وحدہ کے وجود کو تسلیم کیے بغیر حل کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس کائنات کا وجود ہی اس بات کو مستلزم ہے کہ اللہ موجود ہے۔ دنیا میں جن لوگوں نے اس کائنات کے وجود کے مسئلے کو وجود باری تسلیم کرنے کے بغیر حل کرنے کی سعی کی ہے، وہ آں حالیکہ اس کائنات کے وجود ہی میں ایک معمم ارادہ اور ایک قصد اور ایک منصوبہ نظر آتا ہے تو ایسے لوگ مسئلہ کائنات کے حل کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ اور اللہ کی وحدانیت اس لیے ثابت ہوتی ہے کہ اس کائنات کے تمام آثار کے اندر وحدت نظر آتی ہے اس کی حدیث ایک سبب تقدیر ایک ہے اور اس پوری کائنات کی اسیم میں ایک ایسا ربط اور ہم آہنگی ہے کہ اس کا ایک ہی خالق تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔

یہ تو تھا آغاز رہا یہ معاملہ کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کی تخلیق کا دوبارہ اعادہ کرے گا تو اس بارے میں تمام کفار اور مشرکین کو خلیان تھا۔ لیکن جو شخص اس کائنات کے آغاز کے بارے میں اس نتیجے تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ ایک صاحب ارادہ و تدبیر ذات کی تخلیق ہے اور وہ اس کائنات کے اندر پائی جانے والی وحدت اور ربط کی وجہ سے ایک ہے تو اس کے لیے یہ تسلیم کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہوتی کہ وہ ذات اسے دوبارہ پیدا کرے گی تاکہ اس دنیا میں آنے والے لوگ اپنے اعمال کی جزا پوری کی پوری وہاں پائیں گے کیونکہ اس دنیا میں اتنے بڑے عمل پر اسن کو اگرچہ جزاء و سزا ملتی ہے مگر وہ پوری جزاء و سزا نہیں ہوتی۔ لہذا مکمل مکافات عمل کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا جہاں ہو جس میں مکمل جزاء و سزا ہو۔ اس کے بغیر اس دنیا کی زندگی کی تکمیل ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا ایک آنے والی زندگی کی تصدیق ضروری ہے جس میں مکمل ہم آہنگی، مکمل کماں نصیب ہو۔ سوال یہ ہے کہ مکافات عمل کے اصول کے مطابق جزاء و سزا اس جہاں میں کیوں نہ ہوئی۔ تو یہ ان حکمتوں کی وجہ سے جن کو خالق کائنات ہی خوب جانتا ہے۔ کیونکہ اپنی مخلوق کے تمام راز خالق ہی کے پاس ہیں۔ اور یہ وہ عائبانہ راز ہیں جن کی اطلاع اللہ نے انسان کو نہیں دی۔

یہی اصول ہے جس کے مطابق اس آیت میں سوال کیا گیا ہے کہ کس نے ابتداء اس کائنات کو پیدا کیا اور کون ہے جو دوبارہ پیدا کرے گا؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی ہے کہ کوئی نہیں ہے۔

عَالِمٌ مَعَ اللَّهِ (۲۷: ۶۴) ”کیا ہے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا اللہ؟“

رزق دینے کا تعین، آغاز تخلیق سے بھی متعلق ہے اور امداد تخلیق سے بھی وابستہ ہے۔ اللہ کے بندوں کے رزق کا انتظام بالکل ظاہر و باہر ہے۔ نباتات کی شکل میں اور حیوانات کی شکل میں۔ پانی اور ہوا، کھانے پینے اور سانس لینے کے لیے ضروری ہیں۔ زمین کے معدنی ذخائر اور دھاتیں بھی انسانوں کے لیے مفید اور ضروری ہیں، جن میں مقناطیسی قوت اور بجلی کی قوت بہت ہی اہم ہے۔ اس کائنات کے اندر اللہ نے انسانی زندگی کے لیے اس کے علاوہ اور بھی بے حد و حساب ایسی قوتیں رکھی ہیں جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں لیکن انسان کو ابھی تک ان کے بارے میں علم نہیں ہے۔ وقفے وقفے سے اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے بارے میں بتاتا جاتا ہے۔

آسمانوں سے انسان کو کس طرح رزق فراہم ہوتا ہے؟ دنیا میں انسان کو آسمانوں سے روشنی فراہم ہوتی ہے، حرارت فراہم ہوتی ہے، بارش فراہم ہوتی اور تمام دوسری چیزیں جن کا مرکز آسمانوں میں ہے اور قیامت میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو جو درجات بلند اور جو انعامات دے گا وہ بھی معنوی اعتبار سے ایک آسمانی رزق ہے کیونکہ قرآن بھی آسمان ارتقاع اور

بلندی سے آتا ہے اور بلندی کے لیے آتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے تخلیق اور اعادۂ تخلیق کے بعد اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ اللہ اپنی مخلوق کو آسمانوں سے رزق فراہم کرتا ہے۔ اس لیے کہ آغاز تخلیق کے ساتھ زمین کے ارزاق کا واضح تعلق ہے۔ تمام مخلوق زمین کے ارزاق کی وجہ سے زندہ ہیں۔ اور آخرت کے ساتھ ان ارزاق کا تعلق یوں ہے کہ آخرت کی زندگی میں جزاء و سزا اسی دنیا کی زندگی پر موقوف ہے۔ اور آسمانوں کے رزق کا تعلق بھی آغاز تخلیق سے واضح ہے۔ دنیا میں حیات انسانی کے لیے آسمانوں کے ارزاق اور سامان زمیست کی ضرورت ہے اور آخرت میں یہ انعامات انسان کے جزاء و ثواباً ”پوری پوری جزا“ کی صورت میں ہوں گے۔ لہذا آغاز تخلیق اور زمین و آسمان کے ارزاق سے اس کا تعلق واضح ہے اور کلام الہی باہم حیرت انگیز انداز میں مربوط ہے۔

آغاز تخلیق اور اعادۂ تخلیق تو درحقیقت پیش پا افتادہ حقائق ہیں۔ اسی طرح زمین و آسمان سے انسانوں اور تمام مخلوقات کے لیے رزق کا سامان بھی دراصل معلوم حقائق ہیں لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ان حقائق پر غور نہیں کرتے۔ اس لیے قرآن نہایت زور دہر اور تحدی یعنی چیلنج کے انداز میں ان کو اس طرح متوجہ کرتا ہے۔

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲۷: ۶۴) ”کہو! لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔“
 بے شک اس دقت بھی مخالفین اس قسم کی کوئی دلیل لانے سے عاجز رہے اور آج تک کوئی اس قسم کی کوئی دلیل نہیں لاسکا۔ یہ ہے نظریاتی مباحث میں قرآن کا انداز کلام۔ قرآن کریم کائنات کے منظر و مشاہد پیش کرتا ہے۔ انسانی نفس کے اندر موجود حقائق کو پیش کرتا ہے۔ اس طرح قرآن جو منطق پیش کرتا ہے اس کا دائرہ اس پوری کائنات تک وسیع ہوتا ہے۔ انسانی فکر و نظر کو پوری کائنات میں گھماتا ہے۔ انسان کی فطرت کو مقلد کرتا ہے تاکہ انسانی دماغ اور انسانی فطرت خود کسی نتیجے تک پہنچ سکیں جو واضح اور سادہ ہو۔ اور انسانی شعور پر جوش ہو اور اس کی وجدانی قوت اچھی طرح کام کر رہی ہو کیونکہ دلائل تو خود انسانی نفس اور انسانی فطرت میں موجود ہیں لیکن غفلت اور نسیان کی وجہ سے انسان ان کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اور کفر اور انکار ان دلائل پر پردے ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ ان وجدانی اور کائناتی دلائل سے اور اپنی اس فطری منطق کے بل بوتے پر قرآن کریم انسان کو اس کائنات اور نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے عظیم حقائق تک پہنچاتا ہے۔ یہ حقائق اس طرح واضح ہو جاتے ہیں کہ ان میں وہ شکوک و شبہات نہیں رہتے جو کسی شک منطقی استدلال سے بذریعہ صغریٰ و کبریٰ ثابت کیے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ کتابی منطق ہم تک یونانی ثقافت کے ذریعے آئی ہے اور ہمارے علم الکلام کا حصہ بن گئی حالانکہ اس کا انداز قرآنی نہ تھا۔ اس نے ہمیں قرآنی منطق سے دور کر دیا۔

انفس و آفاق کی وادیوں میں سیر کرتے ہوئے اور عقیدۂ توحید اور نفسی شرک کو وجدانی طور پر ثابت کرنے کے بعد اب قرآن کریم ہمیں اس وادی میں لے جاتا ہے جو عالم غیب کے اندر مستور ہے اور جس کے حالات صرف وہ خالق اور مدبر ہی بتا سکتا ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے یعنی یہ کہ موت کے بعد کیا ہو گا۔ آخرت کس طرح ہو گی کیونکہ یہ اللہ کے غیب میں سے ایک غیب ہے۔ اور قرآنی منطق وجدانی ہدایت اور انسانی فطرت اس کے وقوع کی شہادت دیتی ہیں اور انسان علم و ادراک کے ذریعہ اس بات کے یقین سے قاصر ہیں کہ یہ گھڑی کب آئے گی؟

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ وَمَا يَشْعُرُونَ
 آيَاتَ يُبْعَثُونَ ﴿٤٥﴾ بَلْ أَذْرَكَ عَلَيْهِمْ فِي الْآخِرَةِ نَبْلَ هُمْ فِي شَكٍّ مِنْهَا بَلْ
 هُمْ مِنْهَا عَمُونَ ﴿٤٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِذَا كُنَّا تُرَابًا وَآبَاؤُنَا آيَاتًا
 لَمُخْرَجُونَ ﴿٤٧﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هَذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ إِنْ هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ
 الْأَوَّلِينَ ﴿٤٨﴾ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٩﴾
 وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ﴿٥٠﴾ وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا
 الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٥١﴾ قُلْ عَسَى أَنْ يَكُونَ رَدِفٌ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي
 تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٥٣﴾
 وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٥٤﴾ وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي
 السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ﴿٥٥﴾

”ان سے کہو‘ اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور وہ (تمہارے معبود تو یہ بھی) نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے۔ بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے‘ بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں‘ بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں۔ یہ منکرین کہتے ہیں ”کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائے گا؟ یہ خبریں ہم کو بھی بہت دی گئی ہیں اور پہلے ہمارے آباؤ اجداد کو بھی دی جاتی رہی ہیں‘ مگر یہ بس افسانے ہی افسانے ہیں جو اگلے دنوں سے سنتے چلے رہے ہیں۔“ کو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ بحرموں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔ لے نبی“ ان کے حال پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چالوں پر دل تنگ ہو۔۔۔۔۔ وہ کہتے ہیں کہ ”یہ دھمکی کب پوری ہوگی اگر تم سچے ہو؟“ کہو کیا عجب کہ جس عذاب کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو‘ اس کا ایک حصہ تمہارے قریب ہی آگیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ بلاشبہ میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ آسمان و زمین کی کوئی پوشیدہ چیز لہی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔“

غیب پر ایمان لانا‘ موت کے بعد اٹھایا جانا اور پوری زندگی کے اعمال کا حساب و کتاب دینا اسلامی عقائد کے اندر ایک بنیادی عنصر ہے۔ اسلامی زلویہ سے زندگی کا کوئی نظام ان عقائد کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ لہذا ہر مسلمان پر لازم

ہے کہ وہ آنے والے جہان پر ایمان لائے 'جہاں اعمال کی مکمل جزاء و سزا ہو اور عمل اور اس کی اجرت کے درمیان مکمل توازن ہو۔ یہ عقیدہ انسان کے دل میں جاگزیں ہو 'انسانی نفس اس کے بارے میں حساس ہو' اور اس دنیا میں انسان کی تمام سرگرمیاں اس عقیدے پر قائم ہوں کہ اس نے آخرت میں اپنی زندگی کا پورا حساب و کتاب دینا ہے۔

انسانیت نے اپنی طویل تاریخ میں عقیدہ آخرت کے بارے میں مختلف رسولوں کے مقابلے میں عجیب و غریب موقف اختیار کیے 'حالانکہ یہ عقیدہ بہت ہی سادہ ہے اور باوری النظر میں بہت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی رسول آیا اور اس نے لوگوں کو عقیدہ آخرت کی طرف متوجہ کیا تو لوگوں نے اس دعوت کو بہت ہی عجیب و غریب سمجھا۔ حالانکہ یہ کائنات موجود تھی 'اس کے اوپر یہ رنگا رنگ حیات موجود تھی 'وہ خود موجود تھے کیا ان ہجرات کو یہی مرتبہ صادر کرنا اور پیدا کرنا مشکل تھا یا دوسری مرتبہ ان کو دہرانا مشکل تھا؟ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ انسانوں نے آخرت کے بارے میں ڈرانے والوں کی دعوت سے منہ موڑا۔ وہ اس دعوت کے بارے میں بکواس کرتے رہے۔ اور کفر و انکار میں بڑھتے ہی چلے گئے۔

قیام قیامت ایک غیب ہے جسے صرف اللہ جانتا ہے 'اور اس کے بارے میں علم صرف اللہ کو ہے۔ کفار نے ہمیشہ انہوں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ قیامت کے وقوع کے وقت کا تعین کر دیں۔ جب یہ تعین نہ ہوا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا اور اسے محض پرانے وقتوں کی ایک کہانی سمجھا کہ یہ ایک بات ہے جو پرانے وقتوں سے کہی جا رہی ہے لیکن ابھی تک واقع نہیں ہوئی۔

یہاں پہلے یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارا علم آخرت کے بارے میں محدود ہے اور آخرت کا وقوع ان غیبی امور میں سے ایک ہے جن کا انسان کو علم نہیں ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۶۵) بَلِ ادْرِكْ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِنْهَا بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُونَ

(۶۶) (۶۵: ۲۷-۶۶) ”ان سے کہو 'اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور وہ (تمہارے معبود تو یہ بھی) نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے۔ بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے 'بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں 'بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں۔“

ابتداءً تخلیق سے انسان کو اس خفیہ غیب کا سامنا ہے۔ انسانی علم ایک حد سے آگے نہیں جاسکتا۔ غیب کے آگے جو پردے ٹک رہے ہیں ان سے وہ آگے نہیں جھانک سکتا۔ یہ منجبات میں سے صرف اسی قدر علم حاصل کر سکتا ہے جس قدر اللہ تعالیٰ اسے توفیق دیتا ہے اور انسان کے لیے بھائی اسی میں ہے کہ اللہ نے اسے مستقبل کے علوم غیبیہ سے محروم رکھا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس میں انسان کے لیے کوئی خیر دیکھتا تو وہ ضرور اسے عالم غیب کے بارے میں پورا علم عطا کر دیتا۔ اللہ نے انسان کو اس قدر قوت اور استعداد دی ہے جس کے ذریعے وہ اس دنیا میں اپنے فرائض بحیثیت خلیفہ اللہ فی الارض پورے کر سکے۔ یہ فرائض کوئی معمولی فرائض نہیں ہیں۔ اس سے آگے اللہ نے انسان کو مزید غیبی قوتیں نہیں

ہیں۔ اگر انسان کو ایسی قوت دے دی جاتی جس کے ذریعہ وہ مستقبل کے پردوں کو چاک کر کے معلومات حاصل کر سکتا تو اس کے ذریعہ اس کی ان قوتوں میں کوئی اضافہ ممکن نہ تھا۔ جن کے ذریعہ وہ یہاں بطور خلیفہ کام کر رہا ہے۔ بلکہ واقعات مستقبل کے سامنے پردوں کا نصب کرنا ہی دراصل اس شوق علم کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ یوں وہ اپنے طور پر غیوب مستقبل کے لیے نقب زنی کرنے اور کھوج لگانے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ زمین کے اندر پوشیدہ رازوں کو ڈھونڈتا ہے۔ وہ سمندر کے سینے کو چیرتا ہے۔ وہ آسمان کی فضاؤں میں دور تک دوڑتا ہے۔ وہ اس کائنات کے پوشیدہ رازوں کا انکشاف کرتا ہے۔ اور انسانوں کے لیے بھلائی کے جو راز ہیں ان کو وہ دریافت کرتا رہتا ہے۔ وہ زمین سے مواد اور عناصر کی تحلیل کرتا ہے۔ اس کی ترکیب اور شکل و صورت میں کیمیاوی عمل کرتا ہے اور زندگی کی انواع و اقسام اور طرز و طریقوں میں تبدیلیاں لاتا ہے۔ اور اس طرح اس زمین کی تعمیر و ترقی میں نہایت ہی اہم کردار ادا کر رہا ہے اور جن ذمہ داریوں کے ساتھ اللہ نے انسان کو منصب خلافت دیا تھا انہیں پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔

صرف انسان ہی کو علوم غیبیہ سے محروم نہیں کیا گیا۔ زمین و آسمان میں جس قدر مخلوق بھی ہے اسے محروم کیا گیا ہے خواہ ملائکہ ہیں یا جن ہیں یا دوسری کوئی مخلوق ہے۔ جو اللہ کے علم میں ہے۔ ان سب کو علم غیب نہیں دیا گیا اس لیے کہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لیے تمام غیبی علوم اور واقع ہونے والے حوادث کا علم صرف اللہ کو ہے۔

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ (۶۵: ۲۷) ”کہو آسمان اور زمین میں کوئی بھی غیب کا علم نہیں رکھتا“ اللہ کے سوا، یہ ایک قطعی نص ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی شخص علم غیب کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ اس سلسلے میں لوہام و خرافات پر یقین کرنے کی کوئی گنجائش رہتی ہے۔

غیب کی عمومی نفی کے بعد اب قیام قیامت کی خصوصی نفی کی جاتی ہے۔ کیونکہ عقیدہ توحید کے بعد اہل شرک کے ساتھ مسلمانوں کا بیزاری کا باعث تھا۔ و مایشعرون آیان یبعثون (۶۵: ۲۷) ”اور وہ تو نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے“۔ یعنی وہ لوگ جن کی پروا تم کرتے ہو ان کو تو قیامت کا شعور تک نہیں ہے۔ جب ان کو قیامت کا شعور ہی نہیں تو علم کیسے ہو گا تو قیام قیامت ان منہیات میں سے ہے جن کا علم زمین و آسمان میں کسی کو نہیں ہے بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم ہی بہت محدود ہے۔

بَلْ أَذْرَكَ عَلِمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ (۶۶: ۲۷) ”بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان سے گم ہو گیا ہے“۔ یہ اپنے حدود میں بہت دور چلا گیا ہے اور لوگوں کا اس تک پہنچنا دور رہ گیا ہے۔ اور اس کے اور ان کے درمیان پر دے حائل ہو گئے ہیں۔

بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِنْهَا (۶۶: ۲۷) ”بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں“۔ ان لوگوں کو اس قیامت کے آنے کا یقین نہیں ہے۔ یہ تو دور کی بات ہے کہ ان کو اس کے آنے کے وقت کا کوئی علم ہو یا اس کے وقوع کے بارے میں وہ انتظار کر رہے ہیں۔

بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْهَا (۲۷: ۶۶) ”بلکہ یہ اس کی طرف ہے شک میں ہیں۔“ ان لوگوں کو اس قیامت کے آنے کا یقین نہیں ہے۔ یہ تو دور کی بات ہے کہ ان کو اس کے آنے کے وقت کا کوئی علم ہو یا اس کے وقوع کے بارے میں وہ انتظار کر رہے ہیں۔

بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُونَ (۲۷: ۶۶) ”بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں۔“ یعنی وہ تو اس کے بارے میں اندھے ہیں۔ قیامت کے جوائے سے ان کو کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ نہ اس کی نوعیت کے بارے میں وہ کچھ یاد رکھ سکتے۔ ان کی یہ دوری پہلی اور دوسری دوری سے بھی زیادہ ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِذَا كُنَّا تُرَابًا وَآبَاءُنَا أَيْ اَنَا لَمُخْرَجُونَ (۲۷: ۶۷) ”یہ منکر کہتے ہیں کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائے گا۔“ کفار کے سامنے یہی عقیدہ تھا کہ جب ہم مرجائیں گے اور قبروں میں ہمارے جسم مٹی ہو جائیں گے اور بکھر جائیں گے۔ جیسا کہ یہ مشاہدہ ہے کہ تمام مردے دفنائے جانے کے کچھ عرصہ بعد اسی طرح ہوتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی جسم محفوظ رہتے ہیں۔ جب ہم بھی ایسے ہو جائیں گے اور ہمارے آباؤ اجداد بھی ایسے ہو جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ نکالا جائے گا؟ زندہ کیا جائے گا؟ جبکہ ہمارے اجسام کے ذرے مٹی میں مل چکے ہوں گے۔ یہ تو بڑی مسجد بات ہے۔ وہ یہ بات کرتے ہیں اور مادہ کے بارے میں ان کا جو تصور ہے وہ ان کے لیے حیات اخروی کے تصور کو مشکل بنا رہا ہے لیکن وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ان کو پہلے بھی پیدا کیا گیا اور اس پیدائش سے قبل وہ کچھ بھی نہ تھے۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ اس کے جسم میں جو غلے اور جو ذرات ہیں اور جن سے ان کی زندگی کا یہ ٹیکل بنا ہوا ہے۔ یہ کہاں کہاں سے جمع ہوئے؟ یہ زمین کے اطراف اور سمندر کی گہرائیوں میں بکھرے ہوئے تھے اور یا اس کائنات کی فضاؤں میں اڑ رہے تھے۔ زمین میں سے مٹی لی گئی، ہواؤں سے ذرات لیے گئے، پانی کے ذرات کہاں کہاں سے کس کس بادل نے اٹھا کر لائے، اور بعض ذرات تو سورج سے آئے۔ پھر جو بدستور بذریعہ تنفس، نباتات نیز حیوانات کے دودھ اور گوشت، پھر بخارات کے ذریعہ جسم میں داخل ہوتے ہیں، پینے کے ذریعے جو چیزیں جسم کا حصہ بنتی ہیں۔ پھر سورج کی گرمی سے جو جسم اثر لیتا ہے۔ یہ سب متفرق چیزیں جن کی تعداد تو صرف اللہ جانتا ہے۔ یہ سب چیزیں انسانی جسم میں جمع ہو جاتی ہیں اور یہ انسان اس چھوٹے سے خوردبینی انڈے سے یہاں تک پہنچتا ہے، اور یہ انڈا رحم مادر کی دیواروں کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اور بڑا ہو کر، مرکز کفن کے اندر یہ سب اجزاء جمع ہوتے ہیں۔ یہ تو ہے اس کی پہلی تخلیق۔ تو اس میں کیا تعجب ہے کہ اس مخلوق کو اللہ قبر سے دوبارہ اٹھالے۔ لیکن وہ لوگ یہ بات بھراں کرتے تھے اور اس قسم کے لوگوں میں سے بعض آج بھی موجود ہیں جو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ وہ یہ باتیں کرتے تھے اور اس کے بعد مزید مزاح اور ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے وہ یہ کہتے تھے۔

لَقَدْ وَعَدْنَا هَذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِن قَبْلُ إِنَّ هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۲۷: ۶۸)

”یہ خبریں ہم کو بھی دی گئی ہیں اور اس سے قبل ہمارے آباؤ اجداد کو بھی دی گئی ہیں لیکن یہ بس افسانے ہی افسانے ہیں جو اگلے وقتوں سے ہم سنتے چلے آ رہے ہیں۔“

--- ۰۰۰ ---

یہ لوگ جانتے تھے کہ ان سے پہلے بھی 'رسووں نے ان کے آبا کو اسی طرح قیامت سے ڈرایا ہے اور حساب و کتاب اور مشر و شرکی بات کی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے لیے عقیدہ آخرت بالکل ایک نیا عقیدہ نہ تھا۔ یہ نہ تھا کہ وہ بعث بعد الموت کے معنی ہی نہ سمجھتے ہوں بلکہ ان کا اعتراض یہ تھا کہ صدیوں سے یہ وعدے کیے جا رہے ہیں ان کا تحقق نہیں ہوا۔ چنانچہ اس بنا پر وہ اس عقیدے کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ یہ پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں اور حضرت محمدؐ ان کو نقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے غافل تھے کہ قیام قیامت کے لیے تو ایک وقت مقرر ہے۔ وہ نہ کسی کی جلد بازی کی وجہ سے جلدی آ سکتا ہے اور نہ کسی کی غفلت کی وجہ سے موخر ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک معلوم اور مقرر وقت پر ہو گا اور اس کا علم زمین و آسمان دونوں کی مخلوقات سے خفیہ رکھا گیا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے یہی کہا 'جب انہوں نے آپؐ سے قیامت کے بارے میں پوچھا

ما المستول عنہا باعلم من السائل "اس کے بارے میں پوچھے جانے والا پوچھنے والے سے زیادہ علم نہیں رکھتا۔"

یہاں ان لوگوں کو ان لوگوں کی قتل گاہوں کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے 'جو ان سے قبل ہلاک کیے گئے' جنہوں نے سچائی کا انکار کیا اور قرآن میں یہاں ان کو بھرمین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ (۶۹:۲۷) 'کہو' ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرمین کا کیا انجام ہو چکا ہے۔' یہاں 'اس ہدایت 'سیر فی الارض کے ذریعہ ان کی سوچ کے حدود کو وسیع کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انسانیت کی کوئی سوسائٹی بھی شجرۂ انسانیت سے محروم نہیں ہوتی۔ انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو سنن رکھے ہیں وہ سب کے لیے اٹل ہیں۔ اس سے قبل انسانی سوسائٹیوں کے مجرمین کو جو حالات درپیش ہوئے 'بعد میں آنے والے بھی لازماً ان ہیے حالات ہی سے دوچار ہوں گے۔ کیونکہ اللہ کے سنن اٹل ہوتے ہیں 'وہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ اور زمین میں چلنے پھرنے سے نفس انسانی کی اشداعت کا دائرہ بہت ہی وسیع ہو جاتا ہے۔ انسان کا دماغ روشن ہو جاتا ہے اور سیر فی الارض کے دوران انسان پر ایسے محات آتے ہیں کہ انسان کا ضمیر روشن ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم انسانوں کو اس کائنات کے اٹل اصولوں اور سنن کی طرف بار بار متوجہ کرتا ہے۔ اور انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ ان سنن یا بالفاظ دیگر سلسلہ علت و معلول پر ذرا غور کرو 'اس کی کڑیوں کو دیکھتے چلے جاؤ' تاکہ تمہاری زندگی انسانیت کی مجموعی زندگی سے وابستہ اور متصل رہے اور تمہاری سوچ کی حدود وسعت اختیار کریں۔ تمہاری سوچ محدود 'تنگ اور زندگی کے دھارے سے منقطع نہ ہو۔

ان توجہات کے بعد اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان لوگوں سے اپنے ہاتھ جھاڑ دیں۔ ان کو چھوڑ دیں کہ وہ جس انجام سے دوچار رہتے ہوں ہو جائیں۔ جس طرح تاریخ میں ان سے قبل بھی ایسے مجرمین ایسے ہی انجام سے دوچار ہوئے۔ اور یہ لوگ تحریک اسلامی کے خلاف جو مکاریاں کر رہے ہیں۔ 'کو کوئی نقصان نہ دے سکیں گی۔ نیز اذروئے ہمدردی ان کے لیے پریشان بھی نہ ہوں کیونکہ آپؐ نے تبلیغ نور و نہائی کا حق ادا کر دیا ہے اور ان

کو خوب سمجھا دیا ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ (۷۰:۲۷) ”اے نبی! ان کے حال پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چالوں پر دل ٹنگ ہو۔“ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر حساس تھے اور آپ کو اپنی قوم کے برے انجام کے بارے میں کس قدر فکر مند ہی تھی۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ جن اقوام نے تکذیب کی ان کا حشر کیا ہوا۔ اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے اس وقت ان لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مکاری کے جال بن رکھے تھے۔ اور وہ مسلمانوں، دعوت اسلامی کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکنا چاہتے تھے اور حضور اس کے بارے میں بہت ہی فکر مند تھے۔

بعثت بعد الموت کے بارے میں ان کے جو خیالات تھے ان کے مزید نمونے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ دنیا اور آخرت میں ان کو جس برے انجام سے ڈرایا جاتا تھا وہ اس کے ساتھ مزاج کرتے تھے اور کہتے تھے۔

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۷۱:۲۷) ”وہ کہتے ہیں یہ دھمکی کب پوری ہوگی اگر تم سچے ہو۔“ یہ وہ تب کہتے تھے جب کبھی ان کو ائمہ سابقہ کی طرح کے برے انجام سے ڈرایا جاتا تھا جن کی بستیوں پر سے وہ رات دن گزرتے تھے مثلاً حضرت لوط کی قوم کی ہستی سدوم اور حمیر میں ثمود کے آثار اور احقاف کے علاقے میں قوم عاد کے آثار اور قوم سبا کے کنڈرات جو ییل العرم کے بعد تباہ ہوئے۔ تو یہ لوگ کہتے تھے کہ جن باتوں سے ہمیں ڈراتے ہو متعین طور پر بتاؤ وہ عذاب کب آئے گا۔ اگر سچے ہو تو بتاؤ کہ وہ کیسا عذاب ہو گا اور کب ہو گا۔ یہاں پھر اس کا جواب بھی ویسے ہی حقارت آمیز انداز میں نہایت ہی اختصار کے ساتھ دے دیا جاتا ہے۔

قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِي تَسْتَعْجِلُونَ (۷۲:۲۷) ”کہو! کیا عجیب ہے کہ جس عذاب کی تم جلدی مچا رہے ہو اس کا ایک حصہ تمہارے قریب ہی آگیا ہو۔“ اس طرح اللہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دل میں عذاب اور ہلاکت کے تصور سے خوف پیدا کرتے ہیں۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ یہ عذاب تمہارے اسی طرح قریب ہو اور تمہارے ساتھ لگا ہوا ہو جس طرح اونٹ پر سوار شخص کے پیچھے بیٹھا ہوا دوسرا شخص اس کے ہانکل قریب ہوتا ہے۔ اور تمہیں اس کا شعور نہ ہو۔ اور اپنی غفلت اور نادانی کی وجہ سے جلدی کر رہے ہو۔ حالانکہ وہ تمہارے پیچھے بیٹھا ہوا ہے اور اچانک تمہیں پکڑ لے گا۔ ردیف کی طرف سے اس طرح اچانک پکڑے جانے سے انسان کا پورا جسم کانپ اٹھتا ہے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یہ عذاب تمہیں پکڑ لے۔ اس حاس میں کہ تم مزاج کر رہے ہو۔ کون جانتا ہے کہ مستقبل میں اور اگلے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ کیونکہ مستقبل کا غیب تو مستور ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیان پردہ حائل ہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ پردوں کے پیچھے کیا ہے۔ بعض اوقات چند قدموں کے فاصلے پر ایک خوفناک صورت حالت ہوتی ہے۔ عقلمند شخص تو ہر وقت چوکنا رہتا ہے، ڈرتا ہے اور ہر وقت اور ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار رہتا ہے کہ کوئی صورت بھی پیش آ سکتی ہے۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَشْكُرُونَ (۷۳:۲۷) ”حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔“ اور اللہ کا فضل تو ظاہر و

باہر ہے کہ اللہ لوگوں کو سلت دیئے جا رہا ہے اور ان سے عذاب کو موخر کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ قصور دار اور گناہ گار ہیں اور گناہوں پر اصرار کر رہے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان کی اصلاح کی امید ابھی باقی ہے اور عذاب کو موخر کرنا تو اللہ کا فضل ہے۔ اس کا شکر ادا کرنا چاہئے لیکن اکثر لوگ شکر ادا کرنے کے بجائے اٹا مزاج کرتے ہیں۔ اور اپنی گمراہی میں بغیر سوچے کچھ بڑے چلے جا رہے ہیں۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ (۲۷: ۷۴) ”بلاشبہ تیرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔“ اللہ ان پر عذاب نہیں لاتا اور اسے موخر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ خوب جانتا ہے کہ اپنے سینوں میں یہ لوگ کیا چھپائے ہوئے ہیں اور کیا وہ ظاہر کر رہے ہیں۔

اس سبق کا خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی شے اللہ سے غائب اور پوشیدہ نہیں ہے۔

وَ مَا مِنْ غَائِبَةٍ فِی السَّمَاۗءِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۲۷: ۷۵) ”آسمان اور زمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی نہ ہو۔“ فکر و خیال اب زمین و آسمان کے وسیع میدان میں چلا جاتا ہے۔ زمین و آسمان کے اندر چھپے ہوئے ہمید تو بے شمار ہیں۔ بے شمار راز، بے شمار قوتیں، بے شمار عجوبے، سب کے سب اللہ کے علم و ناموس کے پابند۔ کوئی چیز بھی علم الہی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اور نہ وہ نسبت علم الہی غائب ہے۔ یہ حاضر و غائب تو انسانی علم کی تقسیم ہے۔ اس سورت کی تذکیر تو علم پر ہے۔ پوری سورت میں علم کی طرف اشارات ہیں اور اس سبق کے اختتام پر یہ آخری اشارہ ہے۔

اللہ کے علم مطلق کے حواسے سے یہاں علم الہی نے کس طرح قرآن کریم میں فیصلہ کن اور دو ٹوک باتیں سامنے لا کر بنی اسرائیل کے وہ مسائل حل کر دیئے جس میں وہ صدیوں سے مختلف فیہ تھے۔ یہ قرآن اللہ کے علم کا ایک حصہ اور نمونہ ہے۔ اور اللہ کے فضل میں سے ایک فضل ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک گونہ تسلی ہے کہ آپ ان لوگوں کو اللہ کے اس آخری فیصلے کی طرف بلاتے رہیں۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقْضُ عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَکْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱﴾ وَ اِنَّہٗ لَهْدٰی وَ رَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۲﴾ اِنَّ رَبَّکَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ بِحُکْمِہٖ وَ ہُوَ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ ﴿۳﴾ فَتَوَكَّلْ عَلٰی اللّٰهِ اِنَّکَ عَلٰی الْحَقِّ الْمُبِیْنِ ﴿۴﴾ اِنَّکَ لَا تُسِیْعُ الْمَوْتٰی وَ لَا تُسِیْعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا دُلُّوْا مُدْرِیْنَ ﴿۵﴾ وَ مَا اَنْتَ بِہِدٰی الْعُمٰی عَنْ صَلٰتِہُمْ اِنَّ تُسِیْعُ اِلَّا مَوًۢیًۭیً یُّؤْمِنُ بِآٰیٰتِنَا فَہُمْ مُسْلِمُوْنَ ﴿۶﴾

”یہ واقعہ ہے کہ یہ قرآن بنی اسرائیل کو اکثر ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔ یقیناً (اسی طرح) تہاراب ان لوگوں کے درمیان بھی اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہ زیر دست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ پس اے نبی اللہ پر بھروسہ کرو‘ یقیناً تم صریح حق پر ہو۔ تم مردوں کو نہیں سنا سکتے‘ نہ ان بہروں تک اپنی یار پہنچا سکتے ہو‘ جو چٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں‘ اور نہ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔ تم تو اپنی بات اسی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں۔“

نصاری کے درمیان حضرت عیسیٰ اور آپ کی والدہ کے بارے میں شدید اختلاف رائے تھا۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰ محض ایک انسان تھے۔ بعض کہتے تھے اللہ نے ان کے بارے میں باپ‘ بیٹے اور روح القدس کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں دراصل وہ اللہ نے ذات باری کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں۔ تو اس گروہ کے نزدیک اللہ تین اقسام سے مرکب ہے۔ اب‘ ابن اور روح القدس۔ ابن چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے تو اللہ‘ جو صورت رب میں تھے‘ وہ روح القدس کی صورت میں اترے اور حضرت مریم میں ایک انسان کی شکل اختیار کر گئے۔ اور یہ اللہ پھر مریم سے بصورت انسان پیدا ہوئے۔ ایک جماعت نے کہا کہ ابن ازل نہیں ہے‘ جس طرح باپ ازل ہے۔ ہاں وہ عالم سے قبل پیدا کردہ ہے۔ لہذا وہ رب سے کم درجے کا ہے اور رب کے تابع فرمان ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ روح القدس اقنوم نہیں ہے اور نیقیلی مجلس منعقدہ ۲۲۵ نے یہ فیصلہ کیا اور قسطنطنیہ کی مجلس ۳۸۱ نے اس کی توثیق کی کہ ابن اور روح القدس باپ کے برابر ہیں اور یہ بھی لاہوت کی وحدت کا حصہ ہیں۔ یہ بیٹے بھی ازل ہی میں پیدا ہوئے تھے جبکہ روح القدس رب سے نکلے ہیں۔ اور طیبلہ کی مجلس منعقدہ ۵۸۹ نے یہ فیصلہ کیا کہ روح القدس ابن سے نکلا ہے۔ اس نکتے پر مشرق اور مغربی کلیسیہ کے درمیان افتراق پیدا ہو گیا جو آج تک نکتہ اختلاف ہے۔ قرآن کریم جب نازل ہوا تو اس نے ایک فیصلہ کن بات کر دی کہ وہ ایک کلمہ ہے جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور اللہ کی طرف سے روح ہے۔ اور وہ بشر ہیں۔

اِنَّهُ هُوَ الْاَعْبَدُ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مِثْلًا لِّبَنِي اِسْرَآءِیْلَ (۵۹: ۲۳) ”نہیں ہے وہ مگر ایک بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ایک مثال بنا دیا۔“ یہ بھی وہ فیصلہ کن بات جس میں ان کے درمیان اختلاف رائے تھا۔

اسی طرح بنی اسرائیل کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سولی پر چڑھائے جانے کے مسئلے میں بھی اختلاف ہوا۔ بعض کا عقیدہ یہ تھا کہ آپ کو سولی پر چڑھایا گیا۔ آپ فوت ہو گئے اور دفن کر دیئے گئے اور تین دنوں کے بعد آپ اپنی قبر سے نکلے اور آسمانوں کی طرف اٹھ لیے گئے۔ بعض کا عقیدہ یہ تھا کہ آپ کے حواریوں میں سے ایک شخص یہودا کو حضرت مسیح کے مشابہ بنا دیا گیا اور اس کو سولی دے دی گئی اس لیے کہ اس شخص نے حضرت مسیح کے ساتھ خیانت کی تھی اور حکومت کو آپ کی تشدد کی تھی اور آپ گرفتار ہو گئے تھے۔ بعض کا عقیدہ یہ تھا کہ آپ کے ایک حواری شمعون کو آپ کا مشابہ بنا دیا گیا اور وہ گرفتار ہوئے۔ قرآن کریم نے اصل بات بتا دی وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شَبَّه

لَهُمْ (۱۵۷: ۴) ”انہوں نے اسے قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر چڑھایا‘ لیکن ان کو شبہ میں ڈال دیا گیا۔“ اور دوسرے

جگہ قرآن مجید نے فرمایا:

يَا عِيسَى ابْنِي مُتَوَقِّفْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ (۵۵:۳) ”اے عیسیٰ میں تمہیں دلہن لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں پاک کرنے والا ہوں۔“ یہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں فیصلہ کن بات تھی۔

اس سے قبل یہودیوں نے بھی تورات کی شریعت کو بدل دیا تھا۔ کئی احکام میں تحریف کر دی گئی تھیں۔ قرآن مجید آیا تو اصل شریعت بتادی۔

وَكُتِبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنفَ بِالْاَنفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصًا ”تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔“

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کی تاریخ اور ان کے انبیاء کے بارے میں حقائق بتائے۔ اور ان حقائق میں سے ان قصے اور کہانیوں اور افسانوں کو علیحدہ کر کے صاف کر دیا جو ان حقائق کے ساتھ انہوں نے ناحق ملا دیئے تھے۔ یہ افسانے ایسے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی نبی بھی معصوم اور پاک ہو کر نہیں نکل سکتا تھا۔ ان کے افسانوں کے چند نمونے مشہور ہیں۔ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام پر الزام لگایا کہ انہوں نے ابومالک شاہ فلسطین اور فرعون شاہ مصر کے سامنے اپنی بیوی کو بہن کہہ کر پیش کیا۔ اور ان کے کہنے کے مطابق حضرت ابراہیم ان کی نظروں میں مقام بلند حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور حضرت یعقوبؑ جن کا نام اسرائیل تھا، انہوں نے خود اپنے باپ اسحاق سے حضرت ابراہیم کی برکات حیلہ سازی، جھوٹ اور چوری کے طور پر حاصل کیں۔ جبکہ یہ تبرکات ان کے بڑے بھائی عیصو کی ملکیت تھیں۔ اور حضرت لوط کے بارے میں ان کی روایات یہ ہیں کہ ان کی دو بیٹیوں نے ان کو شراب میں مدہوش کر کے ان کے ساتھ ہم بستری کی تاکہ اس طرح ان کے بطن سے نرینہ اولاد پیدا ہو اور ان کی میراث اور دلوں کے پاس نہ چلی جائے اور جس طرح ان لڑکیوں نے چاہا ایسا ہی ہوا۔ اور داؤد نے اپنے محل میں ایک خوبصورت عورت کو دیکھا اور معصوم ہوا کہ وہ ان کے فوجی کی بیوی ہے۔ پھر اس فوجی کو انہوں نے ایک ہلاکت آفرین مہم میں بھیجا تاکہ وہ بیوی کو حاصل کر سکیں۔ اور سلیمان بھل کی عبادت کی طرف مائل ہو گئے۔ محض اپنی عورتوں میں سے ایک عورت کو خوش کرنے کے لیے، کیونکہ ان کو اس کے ساتھ محبت تھی اور وہ اس کے مطالبے کو رد نہ کر سکتے تھے۔ یہ تھے ان کے الزامات اپنے پیغمبروں پر۔

اور جب قرآن کریم نازل ہوا تو اللہ نے تمام پیغمبروں کی صفائی بیان کی اور ان لوہم اور افسانوں کو پیغمبروں کی سیرتوں سے نکال دیا۔ کیونکہ یہ لوہم یہود و نصاریٰ نے خود اپنی کتابوں کے اندر داخل کر دیئے تھے۔ خصوصاً قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی ذات کے ساتھ منسوب تمام غلط باتوں کی نفی کی اور وہ صحیح تعلیمات بیان کر دیں جو اللہ کی طرف سے تھیں۔ اس مفہوم میں اس قرآن کو سابقہ کتب کے لیے ہمیں کما گیا ہے کہ وہ

سابقہ کتب کے اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے اور تمام اختلافی اور جدلیاتی مملوئی مسائل میں فیصلہ کن بت کرتا ہے۔

وَاِنَّهُ لَهْدٰى وَّ رَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۷۷:۲۷) ”اور یہ ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے“۔ یہ وہ ہدایت ہے جو اہل ایمان کو ضلالت اور اختلاف سے بچاتا ہے۔ ان کو ایک منہج حیات دیتا ہے۔ زندگی کی راہ میں ان کے ساتھ معاونت کرتا ہے اور ان کو ایسی تعلیمات اور نظریات دیتا ہے جو اس پوری کائنات میں موجود سنن الہیہ سے ہم آہنگ ہیں۔ اور یہ قرآن ہدایت کے ساتھ رحمت بھی ہے۔ انسانوں کو شک، بے چینی اور پریشانی اور بے یقینی سے نجات دیتا ہے۔ اور انسان کو ایسے کچے نظریات سے بچاتا ہے جو آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ پائے چوبیس رکھتے ہیں اور اپنے حال پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اس کی تعلیمات انسان کو مطمئن کر کے اللہ کے جوار رحمت اور بارگاہ سکون تک پہنچاتی ہیں۔ اس طرح انسان اپنے، حول، اپنی سوسائٹی اور خود اپنے انکار کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور آشتی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور آخرت میں اللہ کی رضامندی اور عظیم ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔

انسانی نفس کی تربیت اور از سر نو قوانین فطرت کے مطابق اس کی تشکیل و تھقیق کے معاملے میں قرآنی طریق کار ایک منفرد طریق کار ہے۔ اس طریق کار کے مطابق انسان اپنی زندگی ان قوانین فطرت کے مطابق گزارتا ہے جو خود اس کائنات میں بھی جاری و ساری ہیں اور اس طرح انسان کی زندگی نہایت سکون کے ساتھ انسانی انداز میں گزرتی ہے۔ اس میں کوئی تکلف اور بناوٹ نہیں ہوتی۔ اسلامی منہج تربیت کے نتیجے میں انسان اپنی زندگی کی گہرائیوں تک میں اطمینان محسوس کرتا ہے اور یہ بہت بڑی دولت ہوتی ہے۔ اور یہ اطمینان اس وجہ سے حاصل ہوتا ہے کہ اسلامی نظام تربیت کے مطابق انسان کی زندگی قوانین فطرت کے ساتھ متصادم نہیں ہوتی اور نہ انسان قوانین فطرت اور ان کے مطابق چلنے والی اس کائنات سے متصادم ہوتا ہے نہ انسانی اخلاقیات ان قوانین فطرت سے متصادم ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ انسان قوانین فطرت اور نوامیس کو اچھی طرح معلوم کر سکے اور وہ مقامات معلوم کر لے جہاں انسانی شخصیت اور اس کائنات کے درمیان باہم اتصال ہوتا ہے۔ اور انسان اس نتیجے تک پہنچ جائے کہ انسانی فطرت اور کائناتی فطرت اور اسلامی نظام زندگی کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ وہ باہم متناسب اور ہم آہنگ ہیں۔ یہ ہے وہ عظیم سلامتی جو انسانی شخصیت اور انسان کے ارد گرد پھیلی ہوئی اس عظیم کائنات کے درمیان قائم ہوتی ہے اور اس سلامتی کے نتیجے میں انسانی سوسائٹی نہایت ہی پرسکون زندگی بسر کرتی ہے۔ اور یہ ہے وہ رحمت جس کی طرف قرآن کریم اشارہ کرتا ہے۔ یہ رحمت الہیہ کا وسیع تر مفہوم ہے۔

ان اثرات کے بعد کہ قرآن کریم بنی اسرائیل کے بیشتر نظریاتی مسائل کو حل کرتا ہے، ان کے اختلافات کو دور کرتا ہے اور اہل ایمان کو ایک فطری نظام زندگی دے کر ان کو عظیم سکون اور سلامتی عطا کرتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دیتا ہے کہ آپ کی قوم آپ کے ساتھ ناحق مجادلہ کر رہی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی عنقریب اللہ کر دے گا۔ ایسا فیصلہ جسے کوئی رد نہ کر سکے گا۔ کیونکہ اللہ کے فیصلے حقائق اور صحیح علم پر مبنی ہوتے ہیں۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ (۷۹:۲۷) ”پس بے نی“ اللہ پر بھروسہ رکھو یقیناً تم صریح حق پر ہو“۔ اللہ تعالیٰ نے حق کی نصرت کرنا، حق کو غالب کرنا، اپنے لو پر اسی طرح لازم قرار دیا ہے جس

طرح اس کائنات میں اللہ کے دوسرے چلنے والے قوانین لازمی اور اٹل ہیں۔ یہ قوانین رکھتے نہیں، اسی طرح حق بھی غالب آتا ہے لیکن اللہ کی بعض پوشیدہ حکمتوں کی وجہ سے کبھی کبھار یہ غلبہ دیر سے آتا ہے اور ان حکمتوں کو اللہ ہی جانتا ہے۔ کچھ مقاصد ہوتے جن کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے لیکن یہ سنت پوری ہو کر رہتی ہیں اور آخر کار حق کو غلبہ نصیب ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ انسان کا ایمان اس وقت تک پورا اور مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس سنت کے اٹل ہونے پر ایمان نہ دے۔ مطلب یہ ہے کہ حق کی کامیابی کے لیے اللہ کے ہاں ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور اس سے قبل یہ کامیابی نہیں آ سکتی۔ انسان اگر جلدی کرتے ہیں تو یہ اس کی غلطی ہوگی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے بڑی مشکلات و پریشانی تھیں، بات بہت پر وہ جھگڑتے تھے، کٹ جاتی اور ہٹ دھرمی کرتے تھے۔ محض عناد کی وجہ سے بادی النظر چیزوں کو بھی نہ مانتے تھے۔ حضور کی جدوجہد اور نہایت حق واضح بیان و تبلیغ کے بعد بھی وہ کفر پر اصرار کر رہے تھے۔ قرآن کریم کے بار بار کے خطاب کو نظر انداز کر رہے تھے۔ ان سب باتوں پر آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ نے تو تبلیغ کا حق ادا کر دیا ہے، کوئی قصور نہیں کیا ہے، لیکن بات کو وہ لوگ سنتے ہیں جو زندہ ہوں اور ان کے کانوں کے پردے حساس ہوں۔ مردے تو کبھی سنا نہیں کرتے۔ مردوں کا دماغ مرچکا ہوتا ہے اور وہ غور و فکر سے عاری ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مردے نہ ایمان لاتے ہیں اور نہ سنتے ہیں۔ بس آپ کی قوم کے دل و دماغ مرچکے ہیں۔ لہذا ان کو سنا ناب نہ سنانے کے برابر ہو گیا ہے۔ ہدایت پر آنے کی ان کے سامنے کوئی سبیل باقی نہیں ہے۔ اب چھوڑ دس ان کو اپنی گمراہی اور سرکشی اور بے راہ روی پر۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَاَنْتَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۤءَ اِذَا وَاوَلٰٓؤُا۟ مُذٰبِرٰیۙنَ (۸۰) وَمَا اَنْتَ بِهٰدِیۡ الْعَمٰیۙ عَنْ ضَلٰلٰتِہِمۡۚ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنۡ یُّؤْمِنُ بِآٰیٰتِنَا فَہُمۡ مُّسْلِمُوۡنَ

(۸۱) (۸۰: ۲۷-۸۱) ”تم مردوں کو نہیں سنا سکتے، نہ ان بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو، جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں اور نہ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو۔ تم تو اپنی بات انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں۔“

قرآن کریم نے نہایت ہی عجیب انداز میں ان لوگوں کی نظریاتی اور نفسیاتی حالت کی تصویر کشی کی ہے۔ چنانچہ غیر محسوس معانی کو محسوس شکل دے دی ہے۔ قلبی جمود، روح کی مردنی، کند ذہنی اور شعور کی گراؤٹ کو یوں بیان کیا ہے کہ گویا یہ لوگ مردے ہیں اور بہرے ہیں اور رسول ان کو پکار رہا ہے۔ یہ نہیں سنتے، نہ جواب دیتے ہیں۔ کیونکہ مردے نہ سنتے ہیں، نہ ان کو شعور ہوتا ہے اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ ایک دوسری محسوس صورت یوں ہے کہ ایک شخص بہرا ہے۔ بالکل نہیں سنا اور پکار والے کی طرف اس کا رخ بھی نہیں ہے۔ بلکہ وہ مخالف سمت پر جا رہا ہے۔ ایسے شخص کو لاکھ پکار وہ نہ سنے گا۔ کبھی قرآن ان کو اس شکل میں لاتا ہے جس طرح اندھا ہوتا ہے۔ ایک اندھا شخص راہ راست پر کیسے جاسکتا ہے۔ جب اسے اگلے قدم پر کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ ان آیات میں ان تمام صورتوں کو نہایت ہی مجسم و مشخص صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔

اب ان مردوں، بہروں اور اندھوں کے مقابلے میں اہل ایمان ہیں۔ یہ زندہ ہیں، یہ سنتے ہیں، یہ دیکھتے ہیں۔

اِنْ تَسْمِعُ الْاَنَا مِنْ يَوْمٍ بَايْتَنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ (۸۱. ۲۷) ”آپ اپنی بات انہی کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں۔“۔ یعنی جن لوگوں کے اندر زندگی، قوت سامعہ اور قوت باصرہ ہے۔ آپ انہی کو سنا سکتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کو سنائیں۔ یہ علامات زندگی ہیں اور شعور زندہ لوگوں میں ہوتا ہے۔ سننے والے اور دیکھنے والے ہی، موت کو قبول کر سکتے ہیں اور یہ اہل ایمان ہی ہیں جن کے اندر حیات، سماعت اور بصارت پائی جاتی ہے۔ ان لوگوں پر رسول اللہؐ نے کام کیا۔ انہوں نے دعوت کو قبول کیا اور سر تسلیم خم کر دیا۔

اسلام بہت ہی سادہ اور قریب الہم دین ہے۔ فطرت سلیم کے بہت ہی قریب ہے۔ قلب سلیم اور فطرت سلیم دعوت اسلامی کو پاتے ہی قبول کرتے ہیں اور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ وہ پھر قیل و قال اور جدل و جدال میں نہیں پڑتے۔ یہی تصویر ہے اہل ایمان کی اور ایسے ہی لوگوں کو دعوت دینا چاہئے۔ ایسے لوگ دعوت کو سنتے ہی اس کی طرف لپکتے ہیں اور فوراً ایمان لاتے ہیں۔ مردوں کو اپنی جگہ پر چھوڑ کر داعی کو ایسے لوگوں تک پہنچنا چاہئے جو قبولیت کے لیے تیار ہوں۔

اب علامات قیامت کے موضوع پر اور قیامت کے بعض مناظر کی طرف بات نکلتی ہے۔ اور اس کے بعد اس سورت پر آخری تبصرہ ہو گا۔ ایک ایسا دایۃ الادمیٰ جو ان لوگوں کے ساتھ ہمکلام ہو گا، جو اللہ کی نکوئی آیات کو نہیں مانتے۔ اس کے بعد حشر و نشر کا منظر جہاں یہ تکذیب کرنے والے اور جدل و جدال کرنے والے نہایت ہی خاموشی کے ساتھ چپ چاپ کھڑے ہوں گے۔ پھر یہاں دنیوی آیات و نشانات مثلاً گردش لیل و نهار کے مناظر کی طرف بھی انسان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آیا ان سے بڑا معجزہ بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ لیکن لوگ ان سے غافل ہیں۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو یہ لوگ عظیم جزع و فزع میں مبتلا ہوں گے اور چیخ و پکار کس گے مگر بے فائدہ۔ جب پہاڑ چل پڑیں گے اور یہ فضائے کائنات میں بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اس جزع و فزع اور خوف و ہراس سے متاثر نہ ہوں گے اور بالکل مطمئن کھڑے ہوں گے اور کچھ دوسرے نہایت ہی دہشت زدہ سرنگوں ہوں گے۔ اور اسی حالت میں جہنم کے اندر گرادیئے جائیں گے۔

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ

ع ۱۶ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ ﴿۱۷﴾ وَيَوْمَ نَخْشِرُ مِنْ كُلِّ

۲ أُمَّةٍ قَوْجًا مِّمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿۱۸﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ

قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِآيَاتِي وَأَكْمُ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۹﴾ وَقَعَ

الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنْطِقُونَ ﴿۲۰﴾ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا آلَ الْاِلَ

لَيْسَكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۲۱﴾ وَيَوْمَ

يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ
 اللَّهُ وَكُلُّ أَتَوْكَ دُخْرَيْنَ ۖ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ
 السَّحَابِ صُنِعَ اللَّهُ الَّذِي آتَقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ ۝ مَنْ
 جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِمَّنْهَا وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ ۝ مَنْ
 جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وَجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تَجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

”اور جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت ان پر آپہنچے گا تو ہم ان کے لیے ایک جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے اور ذرا تصور کرو اس دن کا جب ہم ہر امت میں سے ایک فوج کی فوج ان لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے پھر ان کو (ان کی اقسام کے لحاظ سے درجہ بدرجہ) مرتب کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے تو (ان کا رب ان سے) پوچھے گا کہ ”تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا حالانکہ تم نے ان کا علی احاطہ نہ کیا تھا؟ اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے؟“ اور ان کے ظلم کی وجہ سے عذاب کا وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا تب وہ کچھ بھی نہ بول سکیں گے۔ کیا ان کو بھائی نہ دیتا تھا کہ ہم نے رات ان کے لیے سکون حاصل کرنے کو بنائی تھی اور دن کو روشن کیا تھا؟ اس میں بہت نشانیاں تھیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے تھے۔ اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہول کھا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔۔۔ سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ اس ہول سے بچانا چاہے گا۔۔۔ اور سب کان رہائے اس کے حضور حاضر ہو جائیں گے۔ آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جے ہوئے ہیں مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے یہ اللہ کی قدرت کا اثر ہے جو گرجس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو۔ جو شخص بھائی لے کر آئے گا اسے اس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے اور جو برائی لیے ہوئے آئے گا ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے۔ کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو دیا بھرو؟“

زمین سے جانور نکالنے کا ذکر بعض احادیث میں آتا ہے۔ لیکن ان صحیح روایات میں اس جانور کی تفصیلات و صفات نہیں ہیں۔ جن روایات میں اس جانور کی کچھ صفات بیان ہوئی ہیں۔ وہ حد صحت تک پہنچی ہوئی نہیں ہیں لہذا ہم یہاں ان صفات سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ کسی جانور کا طول اگر سات گز ہو یا اس کا روئیں والا ہونا یا داڑھی والا ہونا یا اس کا سر بتل جیسا ہونا یا اس کی آنکھیں خنزیر جیسی ہونا یا اس کے کان ہاتھی جیسے ہونا یا اس کے سینک بارہ ٹکے یا اس کی گردن آہو کی طرح ہونا اور اس کا سینہ شیر کی طرح ہونا اور اس کا رنگ چیتے کی طرح ہونا اور اس کے دونوں پہلو ہلی کی طرح ہونا اور اس کی دم دسبے کی طرح ہونا اس کے پاؤں لونٹ کی طرح ہونا اور پروں اور کھروں والا ہونا کوئی اہم بات نہیں ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جن میں مفسرین پریشان ہوئے۔

بس ہمیں چاہئے کہ قرآنی نص اور صحیح احادیث پر اکتفاء کریں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ عداوت قیامت میں ہے ایک یہ ہے کہ اس قسم کا جانور نکلے گا اور یہ اس وقت ہو گا جب توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اس وقت جو لوگ ہوں گے ان پر فیصلہ اٹل ہو جائے گا اور اب ان کے لیے توبہ کرنے کا کوئی موقع نہ ہو گا۔ بس اب جو لوگ جس حالت اور جس عقیدے پر ہوں گے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اس وقت یہ جانور نکلے گا۔ یہ ان کے ساتھ بات کرے گا جبکہ عموماً جانور بات نہیں کرتے یا ہم لوگ ان کی باتوں کو نہیں سمجھتے۔ لیکن آج سب لوگ اس جانور کی بات سمجھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ یہ وہ معجزہ ہے جسے قیامت سے قبل آنا تھا۔ اس سے قبل وہ آیات الہیہ پر ایمان نہ لاتے تھے۔ نہ ان کی تصدیق کرتے تھے اور نہ قیامت کی تصدیق کرتے تھے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ سورت نمل میں ایسے مشاہدات و عجائبات کا ذکر ہے مثلاً حشرات الارض کی آپس میں گفتگو، طیور کی گفتگو، جنوں کی گفتگو اور سلیمان علیہ السلام کا ان کی گفتگو سمجھنا۔ اسی ضمن میں ذابۃ المادض اور لوگوں کے ساتھ اس کی گفتگو، مضمون کلام کی ہم آہنگی کا اظہار ہے۔ اس طرح قرآن کریم ہر سورت میں مناظر، مثالیں اور مضامین و مفہیم و معانی بھی باہم متناسب اور ہم آہنگ لے کر آتا ہے۔ (دیکھئے میری کتاب تصویر الغنی)

اب علامت قیامت ذابۃ الارض کے بیان کے بعد بات خود منظر قیامت میں داخل ہوتی ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ (۲۷: ۸۳)

”اور ذرا تصور کرو اس دن کا جب ہم ہر امت میں سے ایک فوج کی فوج ان لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے پھر ان کو مرتب کیا جائے گا۔“ تمام لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ اللہ کی مرضی یوں اس لیے ہوئی کہ وہ کذبین کے موقف کو واضح کر دے۔ یوزعون کے معنی ہیں کہ ان سب کو ایک لکھ کے ساتھ چلایا جائے گا، ان کا اپنا کوئی اختیار و ارادہ نہ ہو گا اور نہ وہ اپنی مرضی سے کسی طرح جائیں گے۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءُ وَقَالَ أَكْذَبْتُمْ بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا أَمْ ذَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ

(۲۷: ۸۴) ”یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے تو وہ پوچھے گا: تم نے میری آیات کو جھٹلایا حالانکہ تم نے ان کا علی احاطہ نہ کیا تھا؟ اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے؟“ پہلا سوال تو ان کو شرمندہ کرنے اور ملامت کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ بات تو معلوم و معروف تھی کہ انہوں نے کذب و سب کی تھی۔ رہا دوسرا سوال تو وہ ان کی زندگی پر ایک بھرپور طنز ہے۔ اور اس انداز خطاب کے نظائر ہر زبان میں موجود ہوتے ہیں۔ کیا تم نے کذب و سب کی یا تم کیا کرتے تھے؟ کیونکہ بظاہر تمہاری زندگی کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا۔ یعنی کذب و سب کے عداوہ تمہاری زندگی کا اور تو کوئی عمل معلوم نہیں ہے جبکہ تمہیں کذب و سب نہ کرنا چاہئے تھی۔ ایسے سوالات کا جواب ظاہر ہوتا ہے اس لیے جواب نہیں دیا جاتا اور مخاطب خاموش رہتا ہے۔ گویا اس سوال ہی کی وجہ سے مخاطب گنگ ہو جاتا ہے اور اس سے کوئی جواب بن نہیں پاتا۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوا فَهُمْ لَا يَنْطِقُونَ (۲۷: ۸۵)

”اور ان کے ظلم کی وجہ سے عذاب کا وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا تب وہ کچھ بھی بول نہ سکیں گے۔“ یعنی دنیا میں ظلم اور شرک کرنے کی وجہ سے ان

پر فیصلہ برحق ہو گیا اور اب وہ بیکار، لاجواب اور خاموش کھڑے ہیں اور یہ اس وقت ہو گا جب دابة الارض بات کرے گا اور لوگ بات نہ کر سکیں گے۔ قرآن کے معجزاتی انداز کا یہ ایک پہلو ہے کہ وہ کلام کے اندر ایک حسین معنوی تقابل پیدا کرتا ہے کہ جانور بات کر رہا ہے، اس کے منہ میں زبان ہے اور یہ انسان ہو کر بھی لاکلام ہیں۔ پھر یہاں مشاہد دنیا اور مشاہد قیامت کے درمیان بھی ایک استخراج اور تقابل ہے۔ کبھی دنیا کا منظر سامنے آتا ہے اور کبھی آخرت کا کیونکہ خروج دابة دنیا کے آخری ایام میں ہو گا۔ اور یوں فضا میں گہرا تاثر قائم ہو جاتا ہے۔

یہاں پہلے قیامت کا منظر ہے کہ کذبین وہاں مبہوت اور لاجواب کھڑے ہیں۔ پھر بات دنیا کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ اور ان کے وجدان اور شعور کو بیدار کیا جاتا ہے اور دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ذرا اس نظام کائنات پر غور تو کریں کہ اللہ العالمین کس قدر عظیم قدرت والا ہے کہ تمہارے لیے وہ تمام اسباب حیات مہیا کرتا ہے۔ تمہارے لیے دنیا میں راحت اور آرام کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ اس نے پوری کائنات کو اس طرح سازگار بنایا ہے کہ اس کے اندر تمہاری زندگی نہایت خوش و خرم گزر رہی ہے۔ یہ کائنات اور اس کی قوتیں مدحیات ہیں، مضر حیات نہیں ہیں۔ وہ حیات انسانی کے لیے معاون ہیں۔ اس کے ساتھ برسر پیکار نہیں ہیں۔

الْمُيَسِّرُونَ أَنَا جَعَلْنَا اللَّيْلَ لَيْسَكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِن فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ

يُؤْمِنُونَ (۲۷: ۸۶) ”کیا ان کو بھائی نہ دیتا تھا کہ ہم نے رات ان کے لیے سکون حاصل کرنے کو بنائی تھی اور دن کو روشن کیا تھا؟ اس میں بہت نشانیاں تھیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے تھے۔“ رات کا منظر بالکل پرسکون اور خاموش ہے اور دن روشن اور گویا ہے۔ اور یہ منظر اس قابل ہیں کہ انسان کے اندر ایک ایسا شعور اور وجدان پیدا کریں جو اسے اللہ سے ملا دے۔ جو رات اور دن کو گردش میں لانے والا ہے۔ رات اور دن کا منظر تو دراصل دو کائناتی شواہد ہیں اور ان لوگوں کے لیے کافی ہیں جو ایمان لانا چاہیں لیکن وہ ایمان نہیں لاتے۔

اگر رات نہ ہوتی تو تمام زمانہ دن پر مشتمل ہوتا اور اس کرۂ ارض پر حیات ممکن نہ ہوتی اور اسی طرح اگر مسلسل رات ہوتی تو بھی زندگی ممکن نہ ہوتی بلکہ اگر رات اور دن اپنے موجودہ وقت سے دس گنا بھی طویل ہوتے تب بھی اس کرۂ ارض پر زندگی محال ہو جاتی۔ سورج تمام نباتات کو جلا ڈالتا۔ اور رات تمام چیزوں کو مجمد کر کے رکھ دیتی۔ لہذا گردش لیل و نہار بھی انسانوں کے لیے زریعہ حیات ہے لیکن لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لاتے۔

اب گردش لیل و نہار کے ان دونوں دماگل و معجزات کے منظر سے بات چشم زدن میں قیامت کے مناظر کی طرف چلی جاتی ہے۔ ایک لمحہ پہلے انسان اس کرۂ ارض پر خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے کہ صور پھونک دیا گیا۔ زمین و آسمانوں کے درمیان ایک بھونچال سا آگیا۔ تمام مخلوقات الا ماشاء اللہ خوفزدہ ہو گئی۔ پہاڑ اپنی جگہ سے چلے گئے، حالانکہ وہ سکون و قرار کی عادت تھے۔ پھر اس دن لوگوں کے انجام سامنے آگئے۔ کسی کا انجام امن و عافیت ہوا اور کسی کا جزع و فزع اور اوندھے منہ آگ میں گرائے جانے تک پہنچا۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ

وَكُلُّ أَوْتَاهُ دُخْرَيْنَ (۸۷) وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسِبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتَقَنَ كُلُّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ (۸۸) مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِمَّنْهَا وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ (۸۹) وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وَجُوهُهُمْ

فِي النَّارِ هَلْ تُحْزَنُونَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۹۰) (۸۷: ۲۷ - ۹۰) ”اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہول کھا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔۔۔ سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ اس ہول سے بچانا چاہے گا۔۔۔ اور سب کان دہائے اس کے حضور حاضر ہو جائیں گے۔ آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جھے ہوئے ہیں مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہو گا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو۔ جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اسے اس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے اور جو برائی لے ہوئے آئے گا ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے۔ کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور بڑا پائے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو؟“

صور وہ نر سنگھ ہے جس میں قیامت کے دن پھونکا جائے گا۔ اور یہ وہ آواز ہو گی جس سے زمین و آسمان کی تمام مخلوق خوفزدہ ہو جائے گی۔ الایہ کہ کسی کو اللہ اس سے مامون و محفوظ کر دے۔ کہا گیا ہے کہ شہداء اس سے محفوظ ہوں گے۔ تمام زندہ مخلوق بیوش ہو جائے گی یا مر جائے گی۔

اس کے بعد دوسری بار پھونکا جائے گا تو تمام لوگ یکدم جی اٹھیں گے۔ وَكُلُّ أَوْتَاهُ دُخْرَيْنَ

(۸۷: ۲۷) ”اور سب کان دہا کر اس کے حضور حاضر ہوں گے۔“ یعنی نہایت مطیع فرمان سرخم کیے ہوئے ہوں گے۔ اس خوف و ہراس کے ساتھ ہی افلاک کا موجودہ نظام خلل پذیر ہو جائے گا اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے۔ تمام مدار ختم ہوں گے۔ اور پہاڑ بادلوں کی طرح چل پڑیں گے اور بکھر جائیں گے۔ جس طرح لوگ مشوش ہوں گے اسی طرح پہاڑ بھی مشوش ہوں گے۔ ذی حیات اور جمادات سب میں انتشار ہو گا گویا پہاڑ بھی خوفزدہ ہو جائیں گے اور حیران و پریشان دوڑتے پھریں گے۔ اور پریشان و بے قرار ہوں گے۔ زندہ چیزوں کی طرح ان کی حرکت کی نہ سمت ہو گی نہ کوئی قرار ہو گا۔

صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتَقَنَ كُلُّ شَيْءٍ (۸۸: ۲۷) ”یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا۔“ سبحان اللہ اس کی کارگیری کی خوبصورتی اور کمال تو اس کی تمام مصنوعات سے عیاں ہے۔ اس کا ہر کام صحیح وقت پر ہوتا ہے اس میں کوئی نقص کوئی بخت و اتفاق کوئی بے عادت نہیں ہے نہ اس میں اللہ نے کوئی چیز بھلا دی ہے۔ اس نے جو چیز بھی بنائی ہے اس کے مالہ و ماعلیہ کو مکمل کیا۔ ہر چیز با مقصد بنائی۔ ہر چھوٹی اور بڑی چیز ایک انداز سے رکھی۔ منصوبے اور مقاصد کے مطابق اور اس کے اندر اس قدر گہری حکمت اور دقیق منصوبہ بندی ہے کہ

سرچکر جاتے ہیں۔ حرید تفصیلات دیکھئے سورۃ الفرقان کی آیت **خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ** کی تفسیر میں۔

اِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُوْنَ (۸۸:۲۷) ”وہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو“۔ اور یہ ہے یوم الحساب، ان کاموں کا جو تم دنیا میں کرتے رہے ہو۔ اور اس دن کو اس ذلت نے مقرر کیا ہے جس کی قدرت کا کرشمہ یہ پوری کائنات ہے۔ اللہ اسے اپنے وقت پر لایا ہے۔ اس میں ایک گھنٹے کی تقدیم و تاخیر ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور ہر چیز نے اس کی حکمت کے مطابق اپنا کردار ادا کرتا ہے تاکہ عمل اور مکافات عمل کی خدائی اسکیں اپنے انجام کو پہنچے۔ عمل پیل زندگی میں ہو اور اس کا اجر و ثواب دوسری زندگی میں۔

صَنَّعَ اللّٰهُ الَّذِیْ اَتَقَنَ کُلُّ شَیْءٍ اِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُوْنَ (۸۸:۲۷) ”یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہو گا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو“۔ اس خوفزدہ کرنے والے ہولناک دن میں وہ لوگ جنہوں نے دنیا کی زندگی میں مجھے کام کیے نہایت ہی امن و سکون میں ہوں گے۔ اور اس امن و سکون کے عداوہ ان کو جو اجر اور بدلہ ملے گا وہ بہت ہی بڑا ہو گا اور کافی دشانی ہو گا۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ یُّومَئِذٍ اٰمِنُوْنَ (۸۹:۲۷) ”جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اسے اس سے بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے“۔ قیامت کے دن کے ہول سے پر امن رہنا ہی ہمارے حقیر اعمال کی پوری جزاء ہے۔ اس کے بعد جو انعامات و اکرامات ملیں گے وہ گویا انعام اور بخشش ہے۔ اس لیے کہ اہل تقویٰ دنیا میں بھی اللہ سے ڈرتے رہتے تھے لیکن دنیا میں اللہ کے خوف اور تقویٰ کے ساتھ آخرت کے ہول کو جمع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ اللہ نے اہل تقویٰ کو اس سے مستثنیٰ کیا۔ اس دن جو مخلوق بھی زمین و آسمانوں میں ہے وہ اس ہول کا فکار ہوگی ماسوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ نے بچالیا اور یہ متعین ہوں گے۔

وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَکُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِی النَّارِ (۹۰:۲۷) ”اور جو پرائی لیے ہوئے آئے گا ایسے سب لوگ لونڈھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے“۔ یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہے کہ لوگوں کو لاٹا کر جہنم کے دھانے سے لونڈھے منہ اس کے اندر گرایا جا رہا ہو گا اور اس پر مزید ان کو زبردستی بھیج بھیجی جا رہی ہوگی۔

هَلْ تُجْزَوْنَ اَلَا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹۰:۲۷) ”کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو“۔ اس سے قبل دنیا میں انہوں نے ہدایت سے منہ موڑا اور انکار کیا۔ اس لیے یہاں ان کو بطور سزا منہ کے بل آگ میں گرایا جا رہا ہے کیونکہ ان کے سامنے سچائی نہایت ہی واضح ہو کر اور کھل کر آگئی تھی۔ اور اس طرح واضح تھی جس طرح رات اور دن واضح تھے مگر انہوں نے منہ موڑا۔

--- ۰۰۰ ---

اب سورت کے آخر میں آخری ضریات ہیں۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ آپ اپنی دعوت کا خلاصہ بیان کریں۔ اپنے منہاج کار کی وضاحت کریں۔ طریقہ دعوت بتا دیں اور تبلیغ کر دینے اور خدا کا پیغام پہنچا دینے کے بعد اب ان کو اس انجام کے حوالے کر دیں۔ جو اللہ نے ان لوگوں کے لیے پسند فرمایا ہے اس لیے کہ انہوں نے خود

لپنے لیے اسے چنا ہے۔ اور بات کا خاتمہ بھی اسی حمد و ثناء پر ہوتا ہے جس کے ساتھ آغاز ہوا تھا۔

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَذِهِ الْبَلَدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَإِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۹۲﴾ وَأَنْ أَتْلُوا الْقُرْآنَ فَسَبِّحْهُ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَتَذَكَّرْ لَهُ لَعَلَّكَ تُبْعَدُ عَنْ عَذَابِكُمْ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ﴿۹۳﴾

۷

۱۱ع

۳

” (اے نبی! ان سے کہو) ”مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر (مکہ) کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں۔“۔ اب جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ ”میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں۔“۔ ان سے کہو ”تقریب اللہ ہی کے لیے ہے“، غریب وہ نہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لو گے ”اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے“، ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو۔“۔

لل عرب مکہ مکرمہ کو بیت الحرام اور حرم کو قابل احترام سمجھتے تھے اور مکہ مکرمہ اور حرم شریف کے اس احترام پر ان کی قیادت و سیادت قائم تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس اللہ کو وحدہ لا شریک نہ سمجھتے تھے جس نے اس شہر اور کعبہ کو احترام دے کر ان کو عزت بخشی تھی۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ان کے نظریہ کو اس طرح دہست فرماتے ہیں جس طرح نظریہ کو درست کرنا چاہئے۔ وہ اعلان فرماتے ہیں کہ لوگو! مجھے سب سے پہلے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اس شہر کو محترم بنایا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ کی الوہیت کا پورا تصور یہاں یہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس شہر کا مالک ہے اور اس شہر کے علاوہ بھی ہر چیز اس کی ملکیت ہے۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ مجھے سب سے پہلے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں بھی سر تسلیم خم کر دینے والا بندہ، مسلم بن جاؤں۔ اس طرح کہ اس تسلیم و رضا میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو۔ ایسا ہی مسلم دہ گروہ ہے جس پر پوری انسانی تاریخ میں دعوت اسلامی کا مدار رہا ہے۔ جو پورے موجد اور پوری طرح سر تسلیم خم کرنے والے رہے ہیں۔

یہ تو حقے دعوت اسلامی کے بنیادی عناصر۔ رہا اس دعوت کا وسیلہ اور اس کا ذریعہ تو وہ جلالت قرآن ہے۔

وَأَنْ أَتْلُوا الْقُرْآنَ (۹۲: ۲۷) ”اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں۔“۔ قرآن دراصل دعوت اسلامی کی کتاب اور نئے۔ یہ ہمارا دستور ہے اور ہماری کامیابی اور فلاح کا وسیلہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اس قرآن کے ذریعے جہاد فرمائیں بمقابلہ کفار۔ انسانی عقل اور انسانی روح کی تربیت کے لیے اس کے اندر بہت کچھ ہے۔ یہ نفس انسانی کے ہر پہلو کو لیتا ہے۔ یہ انسانی شعور کے تمام طریقوں کو آزماتا ہے۔ اس کے اندر ایسی قوت ہے کہ وہ خشک دلوں کے اندر زلزلہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ انسان کے دل و دماغ کو اس قدر جھنجھوٹا ہے کہ انہیں بے قرار کر دیتا ہے۔

دعوتِ اسلامی کے لیے تو قرآن کافی و شافی ہے۔ اس کے ساتھ جماد و قتال کو تو محض اس لیے فرض کیا گیا ہے کہ للہ ایمان کو فتنوں اور دشمنوں کے شر سے بچایا جاسکے۔ اور پوری دنیا میں قرآن کی دعوت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اور جماد کا دوسرا مقصد ایسی قوت کا حصول ہے جس کے ذریعے تربیت کا قانون کو نافذ کیا جاسکے۔ رہی دعوتِ اسلامی تو اس کا دربیہ اور وسیلہ صرف کتابِ اللہ ہے۔ وَ اَنْ اَتْلُوْا نَسْرٰنَ (۹۲:۲۷) ”مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کریم کی تلاوت کروں۔“

فَمَنْ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَ مَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَا اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ

(۹۲:۲۷) ”اب جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ میں بس خبردار کر دینے والا ہوں۔“ اس آیت میں انفرادی ذمہ داری کا اصول بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ہدایت و ضلالت کی راہ اپنانے میں ہر شخص خود ذمہ دار ہے۔ اس انفرادی ذمہ داری کے اصول کے اندر یہ اصول کارفرما ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان بہت ہی محترم ہے۔ اور اسلام احترامِ آدمیت کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اسلام انسانوں کو حیوانوں کی طرح ہانک کر اسلام کے دائرے میں جبراً داخل نہیں کرتا۔ اسلام دعوتِ اسلامی کو قرآن کی شکل میں انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہ دعوت لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی ہے۔ یہ ہے اسام کا گہرا عمدہ اور عمیق طریق کار۔ یہ انسانی فطرت کو اس کی گہرائیوں سے لیتا ہے جس طرح قرآن نے انسانی نفوس کی تربیت کے لیے نہایت ہی فطری منہاج اپنایا ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ (۹۳:۲۷) ”اے کہو تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔“ اللہ کے کمالات اور کاری گریوں سے پہلے اللہ کی تعریف۔

سَيُرِيْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَہَا (۹۳:۲۷) ”عتریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لو گے۔“ اللہ نے بالکل سچ کہا ”اللہ کے بندے ہر دن انش و آفاق میں اللہ کی آیات و نشانات کو دیکھتے ہیں اور اللہ نے اس کائنات میں جو اسرار و رموز ودیعت کیے ہیں آئے دن ان کے بارے میں انکشافات ہوتے رہے ہیں۔“

وَمَا رَبُّکُمْ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۳:۲۷) ”اور تمہارا رب بے خبر نہیں ہے ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو۔“ یہ وہ آخری ضرب ہے جو انسانی عقل و خرد کی تاروں پر اس سورت کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔ نہایت ہی ٹھٹھے ’خوبصورت اشاراتی اور پھر نہایت ہی دو ٹوک اور خوفناک انداز بیان میں۔ اس کے بعد لوگوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اب وہ جو چاہیں کریں لیکن ان کو اس تنبیہ کے ساتھ آزاد چھوڑا جاتا ہے۔

وَمَا رَبُّکُمْ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۹۳:۲۷) ”اور تمہارا رب بے خبر نہیں ہے ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو۔“

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۰

سورۃ القصص - ۲۸

آیات ۱ --- تا --- ۸۸

سورۃ قصص ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے۔ یہ اس وقت نازل ہوئی جب مسلمان مکہ میں ایک کمزور اور قلیل جماعت کی شکل میں تھے جبکہ مشرکین مکہ شان و شوکت اور قوت و دبدبہ کے مالک تھے۔ ان کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار تھا۔ چنانچہ اس سورت کے پیش نظر یہ بتانا ہے کہ حقیقی قوت کیا ہے اور حقیقی اقتدار کیا ہیں۔ یہ بتاتی ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک ہی حقیقی قوت کام کر رہی ہے۔ یہ اللہ کی قوت ہے اور اس کائنات میں ایک ہی اعلیٰ قدر ہے اور وہ ایمانی قدر ہے۔ لہذا جس شخص کی پشت پر اللہ کی قوت ہو اسے کوئی ڈر نہیں ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ قوت کے سرچشموں سے محروم اور خالی نظر آتا ہو اور جس شخص کے مخالف محاذ میں اللہ کی قوت کام کر رہی ہو وہ کبھی بھی امن و سکون حاصل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ دنیا کی پوری قوتیں اس کی پشتیبان ہوں اور جس شخص نے ایمان کی دولت کو پالیا تو اس نے گویا تمام بھلائیوں کو پالیا اور جس شخص نے اس متاع کو گم کر دیا تو وہ گویا مفلس ہو گیا۔ اب کوئی چیز اسے فائدہ نہ دے سکے گی۔

یہی وجہ ہے کہ سورت کے آغاز میں فرعون و کلیم کی کشمکش کو مایا گیا ہے۔ قارون اور اس کی مفلس قوم کا تذکرہ آخر میں آتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش میں حکومت و اقتدار کی جابرانہ اور سرکش قوت کو بھور مثال پیش کیا گیا ہے جو عظیم قوت ہے اور پوری قوم پر اس کی نظر ہے اور سخت احتیاطی تدبیر اختیار کی گئی ہیں۔ اس عظیم قوت کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک چھوٹے شیرخوار بچے کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ جس کے پاس کوئی قوت اور طاقت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے زندہ بچنے کے لیے جائے پناہ بھی نہیں ہے۔ زمین پر فرعون کو مکمل برتری حاصل ہے۔ اس نے اپنی قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ Divide & Rule کے اصول کے مطابق ان گروہوں میں سے پھر بنی اسرائیل کو خوب دبا کر رکھا ہے۔ ان کے ٹکڑوں کو پیدا ہوتے ہی ذبح کر دیتا ہے۔ ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا ہے۔ یہ فرعون بنی اسرائیل سے اترتا ہے۔ ان کی گردنوں پر سوار ہے اور اس نے ان کو غلام بنا رکھا ہے۔ لیکن فرعون کی یہ عظیم قوت اس کی یہ جباری و قساری اور اس کی تمام انتہائی تدبیر اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔ وہ اپنی ان تمام قوتوں اور احتیاطوں کے باوجود موسیٰ علیہ السلام جیسے ایک نالواں بچے کو بھی نہیں ہکا سکتا۔ اس لیے کہ عالم بالا کی عظیم اور حقیقی قوت اس کی نگرانی ہے۔ اللہ کی عنایات اسے ہر قدم پر پہنائے چلی جا رہی ہیں۔ تمام حملے خود بخود پسپا ہو رہے ہیں۔ فرعون اور اس کی قوتوں کی آنکھیں اندھی ہو رہی ہیں۔ فرعون اور اس کی قوتیں اس سے مصروف اور غافل نظر آتی ہیں اور یہ ماچار بچہ خود فرعون کی کفالت میں جا پہنچتا ہے۔

بلکہ اس کی بیوی اس کی محبت میں جلا ہو جاتی ہے۔ فرعون کے ہاتھ بندھ جاتے ہیں۔ اس کے قتل سے ہاتھ روک لیتا ہے اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے وہ مصیبت فراہم کرتا ہے جس سے وہ رات دن خائف ہے۔

دوسرے قہرے قہرے میں دولت کی قدر و قیمت کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ علم کی قدر و قیمت کیا

ہے۔ یہ دولت انسانوں کو حقیر سمجھتی ہے۔ قارون زہیب و زینت کے ساتھ نکلا۔ لوگوں کو بھی معلوم تھا کہ وہ بہت مالدار ہے اس قدر کہ قوی لوگوں کی ایک جماعت اس کے خزانوں کی چابیاں بھی بمشکل اٹھاتی تھی۔ پھر قارون کو علم بھی دیا گیا تھا وہ اپنے علم پر فخر کرتا تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ وہ اس علم کے ذریعے مالدار بن گیا ہے لیکن قارون کی قوم میں سے جن لوگوں کو صحیح علم دیا گیا تھا، قارون کے خزانے اور قارون کی آرائش و زیبائش انہیں ہلکانہ کر سکی بلکہ وہ لوگ ایسے تھے جن کی نظریں رضائے الہی کے بلند مقاصد پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ رضائے الہی کا حصول بہت ہی بلند مقصد ہے لیکن اس قصے میں دست قدرت سامنے آتا ہے۔ اس کا محل اس کی دولت سمیت زمین میں دھنس جاتا ہے۔ اس کا علم اور اس کی دولت اسے بالکل کوئی فائدہ نہیں دیتے۔ دست قدرت کی یہ مداخلت براہ راست اور کھلی مداخلت ہے۔ دست قدرت نے اس سے قبل فرعون کے معاملے میں ایسی ہی مداخلت کی تھی۔ فرعون کو غرق کر دیا گیا تھا اور وہ اور اس کے لشکر غرق ہونے والوں میں سے ہو گئے تھے۔

فرعون نے بنی اسرائیل پر دست درازی کی۔ اور اپنی حکومتی قوت اور اقتدار اعلیٰ کے بل بوتے پر ان پر مظالم ڈھائے اور قارون نے بھی اپنی قوم پر ظلم کیا اور اپنے علم اور دولت کے بل بوتے پر لوگوں کا استحصال کیا۔ انجام فرعون و قارون دونوں کا ایک ہی ہوا۔ یہ اور اس کا محل زمین میں دھنس گئے اور وہ اور اس کی فوجیں سمندر کی نذر ہوئیں۔ اور زمین کی قوتوں میں سے کوئی قوت ان کی مدد کو نہ پہنچ سکی۔ دست قدرت نے علانیہ دونوں جگہ مداخلت کی۔ یوں اللہ نے ظلم اور فساد کے لیے حدود متعین کر دیئے لیکن دست قدرت نے یہ کام اس وقت کیا جب لوگ سرکشی اور فساد فی الارض کا دفعہ کرنے سے عاجز آ گئے۔

ان دونوں واقعات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب شر خالص ہو کر چھا جائے اور فساد ہر طرف ظاہر ہو جائے بھلائی کی راہیں مسدود ہو جائیں اور اصلاح اور نیکی کا پردہ گرام ناکام ہو جائے اور امن و امان ختم ہو جائے اور لوگ مال و دولت کے فتنے میں مبتلا ہوں تو پھر اللہ کی قدرت چیلنج کر کے سامنے آتی ہے۔ وہ پس پردہ نہیں ہوتی بلکہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ کیونکہ انسانی قوتیں اس وقت شر و فساد کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ جاتی ہیں۔^(۱)

(۱) سورت طہ میں بنی اسرائیل کے موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا تھا ”جب تک بنی اسرائیل ذلت کو قبول کرتے ہوئے فرعون کو غلامی کا خراج ادا کرتے رہے اس وقت تک دست قدرت ان کی امداد کے لیے متحرک نہیں ہوا اور ان کے حق میں کوئی آسمانی امداد نہیں آئی کہ تاکہ وہ ذلت، مسکنت اور خوف کی وجہ سے فرعون کی غلامی پر راضی ہو گئے تھے لیکن جب اہل ایمان نے حضرت موسیٰ پر ایمان لا کر بغیر جھجک کے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ اور اسی سلسلے میں وہ ہر قسم کی تکالیف اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ سر اٹھا کے چلیں گے۔ اور فرعون جیسے تمہارے جبار حکمران کے سامنے کلمہ حق کہیں گے“ بے باکی کے ساتھ اور سختی سے پہلو تھپ نہ کرتے ہوئے تو پھر اس وقت دست قدرت نے مداخلت کی اور ان کے لیے میدان نصرت تب آتی جب انہوں نے روحانی اور نظریاتی اعتبار سے برتری حاصل کر لی۔“۔ یہاں جو کچھ میں نے کہا ہے۔ یہاں کے سیاق کلام کے مطابق زیادہ صحیح ہے اگرچہ سورت طہ میں جو کچھ کہا گیا وہ بھی اپنی جگہ معمولی لفظی تفسیر کے ساتھ درست ہے۔ ابتدائی اسباب یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچنے کے تو دست قدرت نے تیار کیے لیکن میدان میں عملاً نصرت تب ہی نصیب ہوئی جب اہل ایمان نے فرعون کے سامنے جہاد اور اعلان کلمہ حق کر دیا باوجود اس کی تمہاری و جباری کے پس دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ (سید قطب)

قصص کے درمیان قرآن کریم پھیر پھیر کر مشرکین کو سمجھاتا ہے۔ کبھی تو کہا جاتا ہے کہ اس کائنات میں جو نشانیاں تم ظاہر و باہر دیکھتے ہو ان سے نصیحت حاصل کرو پھر اقوام سابقہ کی ہلاکتوں کے قصص اور واقعات بھی ان کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔ پھر قیامت کے مناظر میں سے پر تاثیر مناظر بھی سامنے لائے جاتے ہیں۔ غرض ان تمام طریقوں سے وہ نصیحت ان کے ذہن نشین کی جاتی ہے جو ان قصص سے نکلتی ہے۔ نہایت ہی مربوط انداز میں تاکید اُٹایا جاتا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں سنت الہیہ ایک ہی جیسی رہی ہے، اٹل رہی ہے اور تمام نتائج سنت الہیہ کے مطابق نمودار ہوتے ہیں۔ مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے۔

اِنْ تَتَّبِعِ الْهٰدٰی مَعَكَ تَتَّخِطُّفُ مِنْ اَرْضِنَا (۵۷:۲۸) ”اگر ہم تمہارے ساتھ ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے۔“ چنانچہ ہدایت نہ قبول کرنے کا عذر وہ یہ کرتے تھے کہ اگر ہم نے اسلام قبول کر لیا تو ہوگ ہمیں اپنے گھروں اور اراضی سے نکال دیں گے۔ اگر انہوں نے ان قدیم نظریات کو ترک کر دیا جن کی وجہ سے عربوں نے ان کی سیادت کو قبول کر لیا تھا اور جن کی وجہ سے لوگ ان کا اور بیت الحرام کا احترام کرتے تھے تو ان کا یہ مقام جاتا رہے گا۔

ان لوگوں کے ان خدشات کو ختم کرنے کے لیے اللہ نے اس سورت میں فرعون اور موسیٰ کا قصہ بیان کیا اور ان کو سمجھایا کہ امن و امان کا مرجع اور سرچشمہ کہاں ہے۔ اور ڈرنا کس سے چاہئے۔ چنانچہ بتایا گیا کہ امن تو اللہ کے ہاں نصیب ہو گا۔ اگرچہ کسی انسان کو ان اسباب امن و اطمینان میں سے کوئی سبب حاصل نہ ہو جو لوگوں کے ہاں متعارف ہیں اور خوف و ہراس اس میں ہے کہ انسان امن و اطمینان کے اس حقیقی سرچشمے سے کٹ جائے۔ اگرچہ لوگوں کے ہاں متعارف امن و سکون کے رسائل موجود ہوں۔ اس حقیقت کو دوسرے پیرائے میں بیان کرنے کے لیے قارون کا قصہ بھی بیان کر دیا کہ امن و سکون دولت سے بھی نصیب نہیں ہوتا۔ لہذا نہایت تاکید کے ساتھ ان قصص میں اس حقیقت کو ثابت کیا گیا۔

اور ان کے اس قول پر یہ تبصرہ کیا گیا۔

اَوَلَمْ نُمْكِنْ لَهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُحِبُّوْنَ اِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنْ

اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۵۷:۲۸) ”کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پر امن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھینچے چلے آتے ہیں ہماری طرف سے رزق کے طور پر مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں۔“ اللہ تعالیٰ اٹل کہہ کو یاد دہانی فرماتا ہے ہیں کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے ان کو خوف سے نجات دی اور امن و امان عطا کیا اور پورے حرم کو ان کے لیے پر امن بنا دیا۔ یہ اللہ ہی ہے جو ان کے لیے اس امن کو دوام بخشتا ہے یا امن ان سے سلب کر لیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ان کو سرکشی اور ناشکری کے انجام سے ڈراتا ہے۔

وَکَمْ اَهْلَکْنَا مِنْ قَرْیَةٍ بَطَرَتْ مَعِیْشَتَهَا فِتْلَکَ مَسْکُوْنٍ اَوْ تَسْکُنُ مِنْۢ بَعْدِہِمْ اِلَّا

قَلِیْلًا وَکُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِیْنَ (۵۸:۲۸) ”اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم جاہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی

معیشت پر اترتے تھے، سو دیکھ لو، وہ ان کے مسکن پر پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی رہا ہے، آخر کار ہم ہی وارث ہو کے رہے۔“

اللہ تعالیٰ ان کو ان کے انجام بد سے ڈراتا ہے کہ رسول کے بھیجے کے بعد اب ان کے عذرات ختم ہو گئے ہیں۔ اب اگر تم لوگ پھر بھی تکذیب کرو گے تو ذرا سنے والوں کے بعد اقوام سابقہ کا جو انجام ہوا وہ تمہارا بھی ہو گا۔

وَمَا كُنْ مَّهِلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمَمٍ رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَمَا

كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ لَوْلَا وَاهْلُهَا ظَالِمُونَ (۲۸: ۵۹) ”اور تمہارا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رب والے ظالم نہ ہو جاتے۔“

اس کے بعد ان کے سامنے قیامت کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ جب ان کے شرکاء کھلے بندوں ان سے اپنی برات کا انصار کر دیں گے۔ اس منظر میں اللہ تعالیٰ ان کے سامنے آخرت کے عذاب کی تصویر کشی کرتا ہے جبکہ اس سے قبل بتا دیا گیا کہ دنیا میں بدکاروں کا انجام کیا ہو کرتا ہے اور یہ کہ دنیا میں امن و سلامتی کے حصول کا طریقہ کیا ہے۔

اس سورت کا خاتمہ نبی وعدے پر ہوتا ہے۔ یہ وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ قرآن کے تقاضے پورے کرتے ہوئے آپ کو اس زمین سے نکالا جا رہا ہے۔ لیکن آخر کار اللہ آپ کو آپ کے اسی شرکی طرف لوٹائے گا اور شرک والوں پر آپ کو غلبہ نصیب ہو گا۔ لے بغیر آپ سوچتے نہیں کہ آپ کو اللہ نے رسالت سے نوازا حالانکہ آپ کو یہ امید بھی نہ تھی کہ آپ رسول بھی بن سکتے ہیں۔ یہی اللہ ہے جو آپ کو آپ کے اسی شرکی طرف لوٹا دے گا جس سے مشرکین نکال رہے ہیں۔ آپ جلد ہی امن اور کامرانی کے ساتھ اس شہر میں داخل ہوں گے۔ اس سورت کے اندر جو قصص لائے گئے ہیں وہ ان حقائق کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس شہر سے نکالا گیا تھا آپ پھر وہاں پر امن طور پر لوٹ گئے تھے۔ اس کے بعد آپ پوری قوم بنی اسرائیل کو فدا کیے بغیر نہ نکالے گئے تھے۔ فرعون اور اس کا لشکر عظیم غرق ہو گیا اور موسیٰ اور ان کی قوم موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں معجزانہ طور پر نجات پا گئی۔

یہ وعدہ ہوتا ہے اس پر سورت کے مضامین ختم ہوتے ہیں۔ اور دل و دماغ کی تاروں پر آخری ضرب یوں لگتی ہے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَ

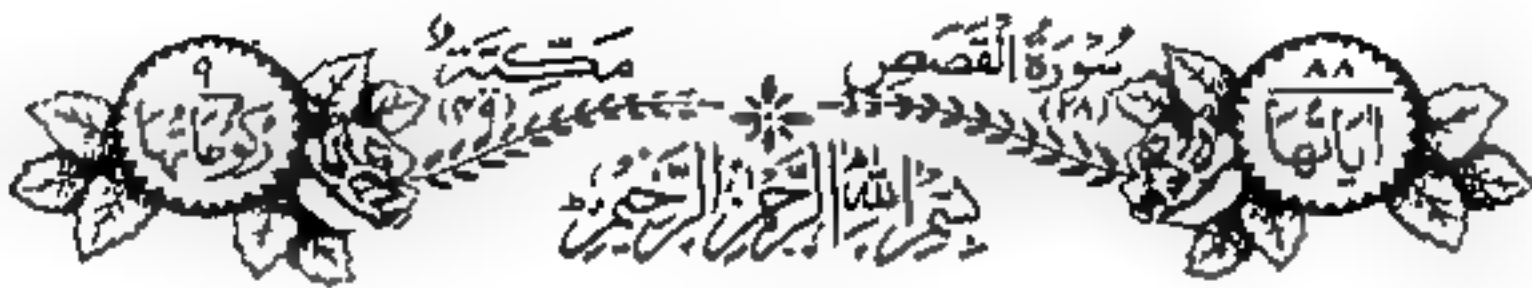
إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۲۸: ۸۸) ”اور اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو“ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر چیز

ہلاک ہونے والا ہے سوائے اس کی ذات کے۔ فرمانبرداری اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔“

یہ ہے اس سورت کا موضوع۔ اس کی فضا اور اس کا پرتو۔ ہمیں چاہیے کہ اس کے چار اسباق کو ایک ایک کر کے لیں۔ یعنی حضرت موسیٰ کا قصہ اور اس پر تیسرا قارون کا قصہ اور اس پر زبردست ڈراوا۔

درس نمبر ۷۷، التشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۲۳



طس ﴿تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ﴾

”ط۔س۔م“ یہ کتاب مبین کی آیات ہیں۔“ سورت کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ حروف حچی سے آغاز کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت ایسے ہی حروف سے مرکب ہے، لیکن عام حروف حچی سے مرکب یہ کتاب ایک بلند مرتبہ اور معجزانہ کتاب ہے۔ ان ہی حروف سے بننے والی دوسری کتابوں اور اس کتاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ کتاب عام لوگوں ہی کی زبان میں ہے، عام لوگ فانی ہیں لیکن یہ کتاب لازوال ہے۔ اور یہ

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ (۲۸: ۲) ”یہ کتاب مبین کی آیات ہیں۔“ لہذا یہ کتاب مبین کسی انسان کی بتائی ہوئی نہیں ہے کیونکہ اگر انسان کی بتائی ہوئی ہوتی تو دوسرے انسان بھی ایسی کتاب بنا کر لے آتے جبکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان ایسی کتاب نہیں لائے۔ لہذا ثابت ہوا کہ یہ وحی من جانب اللہ ہے اور اس سے اس کی فصاحت و بلاغت اور معجزانہ شان بالکل واضح ہے۔ پھر اس کے اندر جو مضامین ہیں وہ چھوٹے بڑے معاملے میں سچائی کی چھاپ لیے ہوئے ہیں۔

نَتْلُوَا عَلَيْكَ مِنْ نَبَأِ مُوسَىٰ وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۲۹﴾

”ہم موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک تمہیں سناتے ہیں، ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے جو ایمان لائیں۔“ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے آ رہی جو ایمان لانے والے ہوتے ہیں، یہ ان کی تربیت کرتی ہے، ان کو اٹھاتی ہے اور ان کے لیے منہاج حیات وضع کرتی ہے۔ راستہ بتاتی ہے۔ یہ قصص بھی ایسے ہی اہل ایمان کے لیے لائے جا رہے ہیں اور ایسے ہی

لوگ ان سے نفع اٹھاتے ہیں۔

اس کتاب کی یہ تلاوت براہ راست اللہ کی طرف سے ہے، یہ اللہ کی عنایات میں سے ایک عنایت ہے۔ اور اہل ایمان کے لیے اس کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب اہل ایمان کو بتاتی ہے کہ وہ نہایت ہی بلند مرتبہ اور قیمتی لوگ ہیں اور اللہ کے نزدیک وہ مرتبہ بلند رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر یہ کتاب ان کے لیے تلاوت کرتا ہے اور ان کے لیے یہ کتاب ان کی صفت ایمان کی وجہ سے تلاوت کی جا رہی ہے۔

لَقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۲۸: ۳) ”ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے جو ایمان لائیں۔“

اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے، یہاں قصے کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے آغاز یعنی آپ کی ولادت سے ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ کئی سورتوں میں آیا ہے لیکن آپ کی ولادت کے واقعات کا بیان صرف اس سورت میں اس انداز سے ہے کیونکہ آپ کی سیرت کا پہلا دور یعنی آپ کی ولادت اور وہ حالات جن میں ولادت ہوئی ہے، بی کا دور تھا ولادت ہوتے ہی آپ بے بس تھے۔ آپ کی قوم بھی بے بس تھی۔ فرعون کی غلامی میں یہ لوگ بندھے ہوئے تھے، بیل و خوار تھے اور یہی ذلت و مسکنت یہاں اس سورت کا حقیقی موضوع ہے۔ ایسے مشکل حالات میں صاف صاف نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچانے کے لیے دست قدرت واضح طور پر سرگرم ہے۔ جو تدبیر اختیار کی گئیں وہ بالکل ظاہر ہیں۔ ایسے حالات میں جبکہ ظلم زیادتی اور سرکشی کے خلاف تمام انسانی قوتیں عاجز آ گئی ہیں۔ دست قدرت اس عظیم قوت پر لپی ضرب لگاتی ہے جس کی کوئی آواز نہیں ہے۔ اس طرح مستضعفین کی نصرت کا آغاز ایسے حالات میں ہوتا ہے کہ ان کے پاس حالات کو بدلنے کا کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔ قوم بنی اسرائیل کو سخت ترین عذاب اور ظلم اور تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور ان کے پاس بچاؤ کی کوئی ظاہری سبیل نہیں ہے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال تھی جس سے مکہ میں مٹھی بھر ایمان والے دوچار تھے۔ مکہ کے اہل ایمان کو بھی اس طرح دست قدرت کی غیبی لہر کی ضرورت تھی اور مکہ میں تشدد کرنے والوں کو ضرورت تھی کہ ان کو متنبہ کیا جائے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے۔

دوسری سورتوں میں اکثر لوقات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا آغاز رسالت کے پردے کے جانے کے واقعات سے ہوتا ہے۔ کسی جگہ اس قصے کا آغاز ولادت موسیٰ کے واقعات سے نہیں ہوا۔ دوسرے مقامات پر جب ہم دیکھتے ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک قوی مومن کی طرح ایک سرکش مقتدر اعلیٰ کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہیں اور یہ قوت ایمانی غالب آتی ہے اور ظلم اور سرکشی سرنگوں ہوتی ہے لیکن یہاں یہ مفہوم بتانا مقصود نہیں ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ شرجب ننگا ہو کر اپنے عروج تک جا پہنچتا ہے تو اس کے اس عروج کے اندر سے اس کی خرابی کا سامان نمودار ہوتا ہے۔ شر اور ظلم جب کھل کر سامنے آ جاتے ہیں تو پھر ان کی شکست و ریخت کا سامان قدرتی طور پر فراہم ہوتا ہے۔ کسی بیرونی دفاع کی ضرورت نہیں رہتی۔ شر کے خاتمے کے قدرتی عوامل شروع ہو جاتے ہیں اور دست قدرت خود اس کا دفعیہ کرتا ہے اور مظلوم اور پسے ہوئے طبقات کو ظلم کی چکی سے نجات دے دی جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے، ٹیر پھلتا اور پھولتا ہے۔ اس کی تربیت ہوتی ہے اور اہل خیر وقت کے امام بن جاتے ہیں اور تمام امتداد ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے اور

وہ اس کے وارث ہو جاتے ہیں۔

یہی وہ حکمت ہے جس کے لیے سورۃ قصص میں قصہ موسیٰ کو لایا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں اس قصے کی وہ کڑی لی گئی ہے جو پوری طرح اس مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔ قرآن کریم میں قصص جہاں جہاں بھی لائے گئے ہیں، ہر جگہ ان سے ایک مخصوص غرض سامنے آتی ہے۔ لوگوں کی، ایک زاویہ سے، تربیت مقصود ہوتی ہے اور کچھ معانی، کچھ حکمتیں اور کچھ اصول ان کو بنانے مقصود ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس مقصد کے لیے قصہ لایا جاتا ہے، وہ نہایت ہی ہم آہنگی کے ساتھ اور مربوط طریقے سے رہنوں میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ حقائق پر ودیئے جاتے ہیں اور قلب و نظر کی تعمیر صحیح خطوط پر ہوتی ہے۔

یہاں اس قصے کی جو کڑیاں لائی گئی ہیں، مثلاً ولادت موسیٰ علیہ السلام، وہ سخت حالات جن میں آپ کی ولادت ہوئی، ان حالات میں جس معجزانہ انداز میں اللہ نے آپ کو بچانے کی تدبیریں کیں، پھر آپ کی پرورش کا معجزانہ انتظام اور آپ کو جو انی، علم اور حکمت کا عطا ہونا، قبلی کا قتل ہونا، فرعون اور اس کے سرداروں کا آپ کے خلاف مشورت کرنا، حضرت موسیٰ کا مصر سے مدین کی طرف بھاگنا، وہاں شادی کرنا، خدمت گزاری کی مدت پوری کرنا، پھر طور پر آپ کا ندائے ربی سننا اور منصب رسالت پانا، پھر آپ کا فرعون اور اس کے سرداروں کے سامنے فریضہ تبلیغ رسالت پورا کرنا۔ ان کی جانب سے تکذیب، حضرت ہارون کو بحیثیت معاون نبی متعین کرنا اور آخری انجام کہ فرعون کی غرقابی۔ یہ سب امور نہایت ہی تیزی کے ساتھ سین پر آتے ہیں۔

یہاں قصے کی دو کڑیوں کو قدرے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ان کو قرآن کریم میں پہلی بار لایا گیا ہے اور ان دونوں کے ذریعے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اللہ کس طرح کھل کر ظلم کے خلاف اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ فرعون کی تمام قوتیں اور مکاریاں فیل ہو جاتی ہیں۔ تمام احتیاطی تدابیر بے اثر ہو جاتی ہیں اور اللہ کے فیصلے نافذ ہو کر رہتے ہیں۔

وَنَرِيٰ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ (۶: ۲۸) ”اور ان سے فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کی وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انہیں ڈر تھا۔“

جس طرح پورے قرآن میں قرآن کریم کا انداز بیان قصص ہوتا ہے۔ قصہ فرعون و کلیم کو بھی یہاں منظر کی شکل میں لایا گیا ہے۔ ان مناظر کے درمیان ان کڑیوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جن کو انسان کی قوت متحیدہ خود بخود نظروں کے سامنے لے آتی ہے، لہذا وہ مناظر کے درمیان جو کڑیاں ترک کر دی جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں انسان نا علم نہیں رہتا، بلکہ انسان کی قوت متحیدہ پردہ خیال پر ان واقعات کو لے آتی ہے۔ یوں ظاہری اسکرین کے ساتھ ساتھ پردہ خیال پر بھی مناظر آتے اور جاتے رہتے ہیں۔

اس قصے کا پہلا حصہ پانچ منظر، دو سرانہ مناظر، تیسرا حصہ چار مناظر پر مشتمل ہے۔ اور ان مناظر اور ٹکڑوں کے درمیان ایک خلا ہے، کہیں یہ گیپ بڑا ہے اور کہیں چھوٹا ہے۔ جس طرح پردہ گرتا ہے اور منظر آنکھوں سے غائب ہو جاتا ہے اور خیال کی اسکرین پر منظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

قصہ کے آغاز سے بھی پہلے اس فضا کی تصویر کشی کی جاتی ہے جس کے اندر واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ وہ حالات

جن میں یہ قصہ واقع ہوا اور وہ مقاصد جن کے لیے دست قدرت نے یہ واقعات رونما کئے اور پھر وہ مقاصد جن کے لیے یہاں اس قصے کو دہرایا جا رہا ہے۔ یہ بھی قرآن کا ایک اسلوب ہے جو وہ قصہ پیش کرتے وقت اختیار کرتا ہے۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَ جَعَلَ أَهْلَهَا شِيْعًا
يَسْتَضِيعُ ظِلْفَةً مِّنْهُمْ يُدَبِّرُ أُنْتَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ
الْمُفْسِدِينَ ﴿٥٠﴾ وَ نُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتَضَعُوا فِي الْأَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ
آيَةً وَ نَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ﴿٥١﴾ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ
هَامَانَ وَ جُنُودَهُمْ مِّمَّا كَانُوا يَحَدِّرُونَ ﴿٥٢﴾

”واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے ہاشدوں کو گردہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔ اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مرہائی کہیں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنادیں اور انہی کو وارث بنائیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انہیں ڈر تھا۔“

یہ ہے وہ اسٹیج جس پر یہ واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ اس ماحول کو وہ ذات بیان کر رہی ہے جو ان واقعات کو رونما کر رہی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیتی ہے کہ ہم نے کیوں ایسا کیا اور یہ بھی صراحت کی کہ یہ ہم ہیں جو ایسا کر رہے ہیں۔ اور اس لیے کر رہے ہیں۔ ”واقعات۔“ قصہ کے آغاز ہی میں صاف صاف بتا دیا جاتا ہے ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ قصے کا ہدف واضح طور پر ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس عجیب انداز میں یہاں اس قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انداز اس کتاب کے عجائبات میں سے ہے۔

یہاں فراتہ مصر میں سے اس فرعون کا نام نہیں لیا جاتا جس کے عہد میں یہ واقعات رونما ہوئے کیونکہ واقعات کا خالص تاریخی پہلو متعین کرنا مقاصد قرآن میں سے نہیں ہے۔ نہ اس سے اس علم و حکمت میں کوئی اضافہ ہوتا ہے جو قرآن کریم اہل ایمان کو سکھانا چاہتا ہے۔ یہ کافی ہے کہ حضرت یوسف کے زمانہ مصر کے بعد یہ واقعات رونما ہوئے کیونکہ حضرت یوسف کے والدین اور بھائیوں کی مصر منتقلی کے ساتھ بنی اسرائیل کی مصر منتقلی شروع ہوئی اور یہاں وہ پھسے پھولے۔

حضرت یوسف کے دور کے بعد سرکشی فرعون نے مصر کا اقتدار اعلیٰ حاصل کیا۔ یہ بڑا جبار و قہار تھا۔ اس نے مصر میں طبقاتی نظام جاری کر دیا تھا۔ ہر طبقے کے فرائض متعین کر دیئے تھے اور بنی اسرائیل پر اس دور میں بے حد مظالم ہو رہے تھے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے عقائد و نظریات مصریوں کے عقائد و نظریات سے بالکل جدا تھے۔ بنی اسرائیل اپنے دادا

حضرت ابراہیم کے دین پر تھے۔ اگرچہ اس کے عقائد میں تغیر و انحراف واقع ہو گیا تھا لیکن دین کا بنیادی ڈھانچہ وہی تھا۔ وہ عقیدہ توحید کے قائل تھے۔ فرعون کی الوہیت کے منکر تھے۔ اس طرح فرعون جن باتوں کی پرستش کرتے تھے۔ بنی اسرائیل ان کے قائل نہ تھے۔

فرعون کو یہ خوف لاحق تھا کہ بنی اسرائیل مصر میں 'اپنے خیالات کی وجہ سے اس کے تاج و تخت کے لیے خطرہ ہیں۔ وہ مصر سے ان کو یکفخت نکال بھی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے نیز اس صورت میں فرعون کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر اس قدر عظیم آبادی کو یکبارگی مصر سے نکال دیا جائے تو وہ دشمن مجبور اقوام سے مل کر مصر پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ اس لیے اس نے اس قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے نہایت ہی وحشیانہ طریقہ نکالا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ یہ لوگ نہ فرعون کو مانتے ہیں اور نہ اس کی خدائی کے قائل ہیں 'اس لیے اس نے اس قوم کو سخت ترین مشقت کے پردہ کر دیا 'ان کو ہر طرح ذلیل کر کے رکھا' اور ان پر قسم قسم کے مصائب ڈھانے لگا۔ آخر کار اس نے یہ انتہائی فیصلہ کیا کہ ان کے تمام پیدا ہونے والے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے تاکہ ان کی آبادی میں اضافہ بالکل ختم ہو جائے۔ مرد زیادہ نہ ہوں اس طرح ان کی عورتوں کی کثرت اور مردوں کی کمی کی وجہ سے ان کی قوت ٹوٹ جائے گی اور یہ لوگ اس سخت عذاب اور ظلم کی وجہ سے دبا کر بھی رکھے جائیں گے۔

روایت میں آتا ہے کہ اس نے تمام حاملہ عورتوں کے لیے دائیاں مقرر کر رکھی تھیں جو ہریدہ ہونے والے بچے کے بارے میں فوراً رپورٹ کرتی تھیں اور بچے کو فوراً لٹکانے لگا دیا جاتا تھا۔ اور اس سنگدلانہ منصوبے پر عمل کرنے میں کوئی رو رعایت نہ برتی جاتی تھی۔ فرعون کا یہ اس قدر ظالمانہ منصوبہ تھا کہ بے گناہ بچوں کو یوں ذبح کرنے کے تصور ہی سے روکتے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ان حالات میں حضرت موسیٰ کا قصہ یوں ان کی ولادت سے شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے :

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيْعًا يَسْتَضَعِفُ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اِبْنَاءَهُمْ

وَيَسْتَحْيِ نِسَاءَهُمْ اِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸: ۴) ”واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا۔ اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو بھینا رہنے دیتا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔“

لیکن اللہ کا ارادہ اور منصوبہ فرعون کے منصوبے سے مختلف تھا۔ اللہ کا فیصلہ سرکش فرعون کے فیصلے سے جدا تھا۔ ہمیشہ یوں ہوتا ہے کہ ظالم اور سرکش اپنی قوت اور تندہی پر مست ہوتے ہیں 'وہ اللہ کے فیصلوں اور قدرتوں کو بھلا دیتے ہیں۔ وہ یوں سوچتے ہیں کہ یہ لوگ جو سوچیں گے نتائج دیے ہی ہوں گے۔ یہ لوگ اپنے دشمنوں کے لیے ان کا انجام خود حسین کرتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ حالات کے نتائج ان کے اندازوں کے مطابق ہی ہوں گے۔

اللہ یہاں اپنے ارادے کا اعلان کرتا ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں ہماری تقدیر یہ ہے۔ یہاں فرعون 'ہامان اور ان کے لشکروں کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ تم جو تندہی اختیار کر رہے ہو وہ تمہارے لیے مفید مطلب نہ ہوں گی۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ (۵) وَنَمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمَا مَا

كَانُوا يَحْذَرُونَ (۶) (۲۸: ۵-۶) ”اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مرہانی کس ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھا دیں جس کا انہیں ڈر تھا۔“ یہ کمزور لوگ جن کو اس سرکش نے پوری طرح غلام بنا رکھا تھا ان کے حالات میں اپنی مرضی سے تصرف کرتا تھا ان کو سخت سے سخت سزائیں دیتا تھا ان کے لڑکوں کو ذبح کرتا تھا۔ اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑتا تھا۔ اس تشدد اور ظلم و ستم کے باوجود وہ اپنی ذات اور اپنے اقتدار کے بارے میں ان عوام سے سخت خائف تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے خلاف خفیہ پولیس قائم کر رکھی تھی اور ان کے ہاں جو بچہ بھی پیدا ہوتا اسے رپورٹ مل جاتی اور وہ اسے مذبح خانے کو بھیج دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک قصاب تھا۔ یہ مظلوم الحال مستضعفین تھے جن پر اللہ بے پناہ فضل و کرم کرنے والا تھا۔ ان کو اللہ وقت کا امام بنانا چاہتا تھا۔ دنیا کی قیادت ان کے حوالے کرنے والا تھا۔ ان کو غلامی اور اطاعت کے درجے سے نکال کر قائدانہ رول دینا چاہتا تھا کہ وہ زمین پر اقتدار کے مالک بن جائیں۔ (بعد میں جب وہ اس کے مستحق بنے تو ایسا ہی ہوا لیکن یہ استحقاق ایمان و صلاح کی بنیاد پر تھا)۔ وہ ثابت قدم اور قوت و شوکت کے مالک بن جائیں اور ان کے ہاتھوں وہ خطرات و اتفاقات بن جائیں جو ان سے فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو لاحق تھے اور جن کے خلاف وہ ممکن حد تک احتیاطی تدبیر اختیار کیے ہوئے تھے لیکن ان کو یہ شعور نہ تھا کہ دست قدرت سے کیا ظاہر ہونے والا ہے۔

غرض واقعات قصہ کے بیان سے بھی پہلے یہاں مقاصد قصہ بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ موجودہ صورت حال کو بھی قارئین کے سامنے رکھا جاتا ہے اور جو ہونے والا ہے اس کی جھلکی بھی دکھائی جاتی ہے تاکہ دونوں قوتیں باہم بالمقابل ہوں۔ ایک طرف فرعون کا ظاہری کروفر ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے اور دوسری طرف اللہ کی وہ عظیم حقیقی قوت ہے جس کے مقابلے میں انسانی قوتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کی قوت کے سامنے سب قوتیں ضعیف لاغر اور نیست و نابود ہونے والی ہیں۔

اس قصے کے بارے میں یہ اعلان اس سے قبل ہو جاتا ہے کہ اس کے مناظر کا آغاز کیا جائے جبکہ لوگ واقعات قصہ کے خطر مینے ہیں۔ ان کو انتظار ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ اور جس طرح اعلان کیا گیا ہے یہ مستضعفین کس طرح اس عظیم قوت کو پاش پاش کر کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو جائیں گے؟

یوں یہ قصہ زندگی سے بھرپور ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ شاید اسے قرآن کریم میں سورۃ قصص میں پہلی بار لایا گیا اور یوں نظر آتا ہے کہ اس کے مناظر اب پیش ہو رہے ہیں۔ یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ گویا واقعات اب پیش ہو رہے ہیں۔ یہ قرآن کریم کا منفرد انداز بیان ہے کہ وہ تاریخی نہیں بلکہ تمثیلی انداز میں قصص کو بیان کرتا ہے۔

اس قصے کا آغاز ہوتا ہے 'اس چیلنج کے بعد دست قدرت کے تعارفات کھلے کھلے اسکرین پر نظر آتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی ولادت ہوتی ہے اور جن حالات میں ہوتی ہے وہ بیان کر دیئے گئے ہیں۔ ولادت کے ساتھ ہی یہ خطرہ لاحق ہے کہ ان کی ولادت کی رپورٹ ہو جائے اور وہ فوراً موت کے منہ میں چلے جائیں 'ان کی گردن پر چھری چل پڑے اور ان کا سر زمین پر جا کرے۔

ان کی والدہ سخت پریشان ہے۔ اسے ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ہر آن یہ خطرہ ہے کہ ان جلاوٹوں کو اطلاع ہو جائے۔ وہ جب سوچتی ہے کہ اس معصوم کی گردن پر چھری چل رہی ہے تو وہ کانپ اٹھتی ہے 'یہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس بچے کو اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے پاس اس کے بچانے کی کوئی قوت نہیں ہے۔ وہ اسے چھپ بھی نہیں سکتی۔ وہ اس کی فطری آواز 'رونے کی آواز کو بھی نہیں دبا سکتی۔ کوئی حیلہ اور وسیلہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ وہ اکیلی ہے 'عاجز ہے اور مسکین ہے۔

اس نازک موقع پر دست قدرت حرکت میں آتا ہے۔ اس حیران دہ پریشان ماں کا رابطہ عظیم قوت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اسے اس حالت خوف میں ہدایت مل جاتی ہے کہ وہ کیا کرے۔ اسے یوں حکم دیا جاتا ہے۔

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰی اِمْرَٔمُوسٰی اَنْ اَرْضِعِیْہٖؕ فَاِذَا خِفَتْ عَلَیْہِ فَلِیْقِیْہِ
فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ ؕ

”ہم نے موسیٰ کی ماں کو اشارہ کیا کہ ”اس کو دودھ پلا“ پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف اور غم نہ کر۔“

کیا شان کبریائی ہے 'اللہ کی عظیم قدرت قابل دید ہے! حکم ہوتا ہے 'موسیٰ کی ماں اسے دودھ پلاؤ' اسے پالتی رہو' اپنی حفاظت میں رکھو۔ اور جب بھی تم خطرہ محسوس کرو' اسے دریا میں ڈال دو' بے خطر ہو کر اسے موجوں کے سپرد کر دو' اگرچہ اس وقت وہ دودھ پی رہا ہو اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔

وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ (۲۸: ۷) ”کچھ خوف اور غم نہ کر۔“ وہاں دریا میں یہ اللہ کی نگرانی میں ہو گا۔ اسی قوت کی نگرانی میں کہ امن و سلامتی اسی کے جوار رحمت میں دستیاب ہے۔ اس کی قوت کی نگرانی میں کسی کے لیے کوئی ڈر رہتا ہی نہیں۔ یہ وہی ہاتھ ہے جو آگ کو گلزار بنا دیتا ہے۔ آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیتا ہے۔ جو سمندر کو جائے پناہ بنانے والا ہے جس کو یہ ہاتھ پناہ دے دے اس کو فرعون جیسا جا رہی ہاتھ نہیں لگا سکتا بلکہ زمین کا کوئی جبار و قہار بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

اِنَّا رَاٰدُوْکَ اِلَیْکَ وَجَاعِلُوْکَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ؕ

”ہم اسے تمہارے ہی پاس لے آئیں گے اور اس کو پیغمبروں میں شامل کریں گے۔“ میں رب ذو الجلال تمہارے

ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تمہارے ہاتھوں میں لوٹا دیا جائے گا۔ اس کی زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہ رہے گا اور مزید خوشخبری یہ ہے کہ وہ نبیوں میں سے ہو گا اور اللہ سے زیادہ سچا وعدہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

یہ اس قصے کا پہلا منظر ہے۔ ایک ماں ہے جو حیران و پریشان ہے۔ اسے خوف لاحق ہے کہ اس کے بچے کو قتل کر دیا جائے گا۔ اس قتل کے تصور ہی سے روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں اس لیے وہ اس تصور ہی سے بے تاب ہو جاتی ہے کہ اسے عالم بالا سے ہدایات ملتی ہیں، اسے خوشخبری دے دی جاتی ہے۔ وہ مطمئن ہو جاتی ہے اور اسے سکون ملتا ہے۔ ڈرے اور سسے ہوئے اس دل پر ایسا اثر ہوتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم کے لیے آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی تھی۔ سیاق کلام میں اس کی تفصیلات نہیں ہیں کہ ام موسیٰ کو یہ ہدایات کس طرح ملیں اور کس طرح انہوں نے ان پر عمل کیا۔ پس پردہ گر جاتا ہے اور جب پردہ اٹھتا ہے تو ہماری نظروں کے سامنے ایک دوسرا منظر ہے۔

فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ

”آخر کار فرعون کے گھر والوں نے اسے (دریا سے) نکال لیا۔“ کیا یہی امن تھا؟ کیا یہی وعدہ تھا؟ اور کیا یہی فرعون تک بشارت تھی؟ کیا آل فرعون کے علاوہ کسی اور سے اس بچاری کو کوئی ڈر تھا؟ ڈر تو یہی تھا کہ اس کے حامات سے ظالم فرعونی خیردار نہ ہو جائیں۔ ڈر تو صرف یہ تھا کہ یہ بچہ فرعون کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ دیکھئے قدرت خداوندی کا کرشمہ کہ یہ بچہ ان کے ہاتھ میں محفوظ ہے۔

ہاں، یہی کچھ تھا، یہ دست قدرت کا کھلا چیلنج ہے اور نہایت ہی کھلا چیلنج ہے۔ فرعون اور ہامان کی عظیم سیاسی اور مالی قوت کو چیلنج ہے۔ یہ عظیم قوت رات دن بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے لڑکوں کا چپھا کر رہی ہے۔ ان کو ڈر ہے کہ ان کا اقتدار، ان کا تخت، بلکہ خود ان کی دلت کو ان لوگوں سے خطرہ ہے۔ فرعونوں نے خفیہ سروس اور خفیہ ایجنسیوں کا جال پھیلارکھا تھا، وہ ایک ایک گھر پر نظر رکھتے تھے کہ کوئی بچہ بچ کر نہ نکل جائے۔ لیکن خالق حقیقی ان کی ان سرگرمیوں کا دفعیہ بغیر کسی قیل و قال، بغیر کسی خفیہ سروس کے خود ان کے ہاتھوں سے کر رہا ہے۔ خود ان سے اس بچہ کی پرورش کرا رہا ہے۔ یہ کون سا بچہ ہے؟ اس بچے کے ہاتھوں ان کی اس عظیم قوت کو پاش پاش ہوتا ہے۔ یہ بغیر سہارے، بغیر کسی طاہری مدد ہیر کے، عاجزی اور ناتوانی کی انتہائی شدید کمزوری کے حالات میں ان کے ہاتھوں میں ہے اور یہ بچاری ماں اسے ان کے حوالے کر رہی ہے۔ ایسے حالات میں کہ یہ بچہ اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ خود اس بچے کو فرعون کے مضبوط قلعوں تک پہنچا دیتی ہے۔ اس ظالم کو اس بچے کی تلاش بھی نہیں کرنا پڑتی۔ جس طرح وہ ہریدہ ہونے والے بچے کی تلاش رات دن جاری رکھتے تھے۔ جس کے ہاں بھی بچہ پیدا ہوتا، سرکار وہاں پہنچ جاتی۔ دست قدرت نہایت ہی چیلنج کے انداز میں اپنے منصوبے کا صاف صاف اعلان کر دیتا ہے۔

لَيَكُونَنَّ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا

”تاکہ وہ ان کا دشمن اور ان کے لیے سبب رنج بنے۔“ یہ بچہ ان کے لیے ایک ایسا، دشمن بن جائے جو ان کی قوت

کو پہنچ کرے اور ان کے لیے پریشانی کا باعث بن جائے۔

إِنِّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِبِينَ ﴿۸﴾

”واقعی فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر (اپنی تدبیر میں) بڑے غلط کار تھے۔“ وہ کس طرح ان کا دشمن بنے گا اور کس طرح باعث تشویش ہو گا حالانکہ وہ ان کے ہاتھ میں ہے اور بے بس ہے۔ اس کے پاس کوئی قوت نہیں ہے۔ اس کے پاس کوئی ظاہری ذریعہ اور تدبیر بھی نہیں ہے۔ سیاق کلام اس کا جواب خود دیتا ہے۔

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرْتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوهُ نَحْنَعْنٰی
أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۹﴾

”فرعون کی بیوی نے (اس سے) کہا ”یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے“ اسے قتل نہ کرو کیا عجب کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں۔ اور وہ (انجام سے) بے خبر تھے۔“

یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا کہ اس نے حضرت موسیٰ کو فرعون کے حصن حصین میں داخل کر دیا، پھر فرعون کی بیوی کے دل میں ان کی محبت ڈال دی اور یوں محبت کے مہین اور شفاف پردے میں حضرت موسیٰ کو محفوظ فرما دیا۔ حضرت موسیٰ کی حفاظت نہ اسلحہ سے کی گئی اور نہ مال و متاع کے ذریعے کی گئی۔ اللہ نے فرعون کی بیوی کے دل میں اس کی محبت ڈال دی۔ اس طرح فرعون کی سختی اس کی سنگدلی اور اس کی تمام احتیاطی تدابیر دھری کی دھری رہ گئیں۔ اور اللہ کے لیے یہ مشکل نہ تھا کہ وہ اس ضعیف بچے کو محبت کے ان مہین پر دوں کے سوا بھی بچالے لیکن یہ اس کی ایک شان ہے۔

قُرْتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوهُ (۹:۲۸) ”یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے“ اسے قتل نہ کرو۔ اس عورت کے سوا وہ سب کے لیے دشمن اور موجب پریشانی بننے والا ہے اور اسی کے ہاتھوں فرعون اور اس کا لشکر غرق ہونے والا ہے جبکہ ان کی سوچ یہ تھی:

عَسٰی اَنْ يَنْفَعَنَا اَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا (۹:۲۸) ”عجب ہے کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔“

حالانکہ اس بچے کے ساتھ ان کا وہ انجام بندھا ہوا ہے جس سے وہ ایک طویل عرصہ سے ڈر رہے تھے اور جس کے خلاف وہ احتیاطی تدابیر اختیار کر رہے تھے۔ لیکن انہیں کیا خبر تھی۔

وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۹:۲۸) ”وہ انہم سے بے خبر تھے۔“ قدرت ان کے ساتھ مذاق کر رہی تھی۔ یہاں آکر یہ دوسرا منظر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ پرزہ کرتا ہے۔

یہ تو تھے حالات حضرت موسیٰ کے۔ ان کی غم زدہ ماں کی حالت کیا تھی؟ اس کی بے تابیوں کا کیا عالم تھا؟

وَأَصْبَحَ قُودًا أَمْرًا مُوسَىٰ فِرْعَاوْنَ كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ لَوْلَا أَن
رَبَّنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا لِتَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ ۖ فَبَصُرَتْ
بِهِ سَنًا جُنُبٌ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۖ

”ادھر موسیٰ کی ماں کا دل اڑا جا رہا تھا، وہ اس کا راز فاش کر بیٹھتی، اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھا دیتے تاکہ وہ (ہمارے وعدے پر) ایمان لانے والوں میں سے ہو۔ اس نے بچے کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جائے۔ چنانچہ وہ الگ سے اس کو اس طرح دیکھتی رہی کہ (دشمنوں کو) اس کا پتہ نہ چلا۔“

اس نے عالم بالا کی طرف سے اشارہ پایا اور اپنے بچے کو دریا کی موجوں کے نذر کر دیا۔ لیکن اب وہ کہاں جا رہا ہے اس کا کیا انجام ہونے والا ہے؟ وہ دل میں سوچتی رہی۔ کس طرح اس کے لیے ممکن ہوا کہ وہ اپنے جگر گوشے کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دے۔ کس طرح اس سے یہ ہو سکا جبکہ اس سے قبل کوئی ماں ایسا نہ کر سکی تھی۔ اس حالت خوف میں کیا یہی سلامتی کا راستہ تھا؟ کیونکر یہ ممکن ہوا کہ اس نے آواز غیب پر اس طرح لبیک کہہ دیا؟

قرآن کریم اس بیچاری کی دلی کیفیات کی تصویر کشی عجیب انداز میں کرتا ہے۔ یہ دل خالی اور فارغ ہے۔ نہ اس میں عقل ہے نہ اسے کچھ سمجھ میں آ رہا ہے، نہ کوئی سوچ ہے اور نہ کوئی سدھیر ہے۔

إِنْ كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ (۲۸: ۱۰) ”قرب تھا کہ وہ راز فاش کر بیٹھتی“۔ اور وہ بخونہ کی طرح چیخ اٹھتی کہ میں نے اسے رکھا ہے، میں نے اسے رکھا ہے، تمام لوگوں کو خبر ہو جاتی اور قریب تھا کہ وہ پکار اٹھتی کہ میں نے اسے دریا پر دکھایا ہے اور ایک غیبی آواز پر میں نے ایسا کیا ہے۔

لَوْلَا أَن رَّبَّنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا (۲۸: ۱۰) ”اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھا دیتے“۔ اس کے دل کو سخت نہ کر دیتے، اس کے اندر قوت برداشت نہ پیدا کر دیتے۔ اور اسے چیخ و پکار اور آہ و نغاں سے روک نہ دیتے تو وہ اس راز کو فاش کر دیتی۔

لَتَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۸: ۱۰) ”تاکہ وہ ایمان لانے والوں میں سے ہو“۔ اسے اللہ کے وعدے کا پورا یقین ہو جائے اور اللہ کی راہ میں اتنا پر صبر کرنے اور اس پر جے رہنے کا مقام مل جائے اور وہ راہ ہدایت پر چلنے والی بن جائے۔

لیکن ام موسیٰ پھر بھی بھلائے فطرت انسانی تجسس سے نہ رکی۔ اپنی ہی کوشش اس نے کی۔

وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّیْهِ (۲۸: ۱۱) ”اس نے بچے کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جاؤ“۔ ذرا دیکھتی جاؤ کہ کیا ہوتا ہے۔ دیکھو کہ یہ زندہ رہتا ہے؟ اگر رہتا ہے تو کیونکر رہتا ہے۔ اسے پھلیاں کھا جاتی ہیں یا خشکی کے درد سے کھا جاتے ہیں۔ کہاں ڈوبتا ہے اور کہاں رکتا ہے؟

بہن نے نہایت ہی خفیہ انداز میں نہایت ہی احتیاط کے ساتھ اس کا پیچھا کیا۔ راستوں اور بازاروں میں اس کی خبریں تلاش کرتی رہی۔ آخر کار اس کو معلوم ہو گیا کہ دست قدرت نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس نے دور سے دیکھ لیا کہ فرعون کے نوکروں نے اسے دریا سے پکڑ لیا ہے۔ بچہ دودھ نہیں پی رہا ہے اور نوکر اس کے لیے دودھ پلانے والی کی تلاش میں ہیں۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ

بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نَصِیْحُونَ ﴿۱۲﴾

”اور ہم نے بچے پر پہلے ہی دودھ پلانے والیوں کی چھاتیاں حرام کر رکھی تھیں۔ (یہ حالت دیکھ کر) اس لڑکی نے ان سے کہا ”میں تمہیں ایسے گھر کا پتہ بتاؤں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ اسے رکھیں۔“

قدرت الہیہ کے اس عجوبے پر غور کیجئے، اسے پیدا کیا گیا ہے اور اس کو پالا گیا ہے اس لیے کہ فرعون اور اس کی قوم کے لیے باعث ہلاکت ہو، لیکن مدبریوں ہے کہ وہ خود اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں، اس کے لیے دودھ پلانے والی کو تلاش کرتے ہیں۔ دست قدرت اس پر تمام پلانے والیوں کا دودھ حرام کر دیتا ہے۔ دودھ پلانے والیوں دودھ پیش کرتی ہیں اور وہ پستان منہ میں نہیں لیتا۔ انہیں یہ خوف لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ مری نہ جائے۔ اس کی بہن دور سے یہ منظر دیکھتی ہے۔ قدرت اس کے لیے بات کرنے کے موقع پیدا کر دیتی ہے۔ وہ آگے بڑھ کر چٹکس کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی عورت کا پتہ دے دوں جو اس کی اچھی طرح تربیت کرے اور وہ اس کے لیے خیر خواہ بھی ہو؟ وہ خوشی خوشی اس چٹکس کو منظور کر لیتے ہیں۔ وہ امید کرتے ہیں کہ اگر یہ بچہ اس عورت کا دودھ لے لے اور اس طرح موت سے بچ جائے تو بہت ہی اچھا ہو کیونکہ یہ بہت ہی پیارا بچہ ہے۔

اب یہاں یہ چوتھا منظر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اب ہم اس کڑی کے پانچویں اور آخری منظر کے سامنے ہیں۔ یہ بچہ اب اپنی بے تاب ماں کی گود میں ہے۔ اس کو سکون مل گیا ہے۔ شاہی بچے کو دودھ پلانے کی وجہ سے ایک بلند مقام بھی مل گیا ہے۔ فرعون اور اس کی بیوی دونوں اس بچے کا خیال رکھتے ہیں، خوف کے سائے اس کے ارد گرد منڈلاتے ہیں لیکن وہ نہایت ہی پرسکون زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ ہیں دست قدرت کی صنعت کاریاں۔ قدرت کے اس عجوبے کی پہلی کڑی یہاں اختتام کو پہنچی ہے۔

فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ

حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿الرَّبِيعُ﴾

”اس طرح ہم موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس پٹالائے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو اور جاں لے کہ اللہ کا وعدہ سچا تھا مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے ان مناظر کے بعد اب سیاق کلام کے اندر کئی سالوں کا وقفہ ہے۔ قہر کا اگلا حصہ آپ کے شباب کے زمانے سے متعلق ہے۔ جب حضرت موسیٰ کو دودھ پلانے کے لیے ان کی ماں کے حوالے کر دیا گیا تو اس کے بعد کیا حالات پیش آئے اس کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ قہر فرعون کے اندر آپ کے شب و روز کیسے رہے اور یہ کہ زمانہ رضاعت کے اختتام کے بعد اپنی ماں کے ساتھ اس کا رابطہ کیسے تھا۔ یہ کہ بلوغ اور شباب کے بعد قہر شاہی میں آپ کا مقام و مرتبہ کیا تھا۔ آپ کا عقیدہ کیا تھا۔ بہر حال وہ فرعون اور اس کے کاہنوں کے درمیان باری تعالیٰ کی نگرانی میں تیار ہو رہے تھے تاکہ وہ اپنا فریضہ ادا کرس۔ اس طویل وقفے کے بعد پھر یہ حالات پیش آئے۔ بہر حال شباب اور بلوغ تک بچپن کے ساتھ ہی آپ کی علمی اور روحانی تربیت مکمل ہوئی۔ اللہ نے آپ کو علم و حکمت عطا کیا اور یہ بھی جزائیک لوگوں کی۔

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ ابْتَنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي

الْمُحْسِنِينَ ﴿الْمُحْسِنِينَ﴾

”جب موسیٰ اپنی پوری بولنی کو پہنچ گیا اور اس کی نشوونما مکمل ہو گئی تو ہم نے اسے حکم اور علم عطا کیا ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔“

”بلوغ اشد“ کے معنی ہیں جب آپ کی جسمانی قوتیں مکمل ہو گئیں اور استواء کا مفہوم ہے جسمانی اور عقلی اعتبار سے پختگی تک پہنچنا۔ یہ درجہ بالعموم تیس سال کی عمر میں حاصل ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس عرصے تک حضرت موسیٰ کیا فرعون کے قہر شاہی ہی میں رہے؟ اور فرعون اور اس کی بیوی کے لے پالک اور معینی رہے یا یہ ان سے علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے قہر شاہی کو چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ شاہی محلات کے گندے اور سڑے ہوئے ماحول میں کسی ایسے شخص کا رہنا ممکن ہی نہیں جس کی روح پاک و صاف ہو اور جس سے مستقبل میں نبوت کا کام لیا جانا ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کی ماں نے ان کو یہ بات بتا دی ہوگی کہ ان کی شناخت کیا ہے۔ ان کی قوم کیا ہے اور ان کا دین کیا ہے اور اس کے بعد جب وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ ان کی قوم پر کس قدر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں ان کو کس قدر ذلیل و خوار کر کے رکھا جا رہا ہے اور معاشرے کے اندر ایک ہمہ گیر فساد برپا ہے اور ہر طرف ظلم و تشدد کا دور دورہ ہے۔

لیکن ہمارے پاس ان کی اس زندگی کے بارے میں کوئی مستند ذریعہ علم نہیں ہے۔ البتہ بعد میں آنے والے آیتوں کی

بنیاد پر انسان ان کی اس زندگی کے بارے میں قیاس کر سکتا ہے۔ بعد میں ہم اس پر تبصرہ کریں گے۔ یہاں اس پر غور کرنا ہے کہ علم و حکمت عطا کرنے کے بعد اللہ نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے۔

وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۱۴۰۲۸) ”ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پاکیزگی اور احسان کی زندگی اپنائی تھی اور یہ علم و حکمت جزائے احسان تھا۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَى حِينٍ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا
فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِنْ شِيعَتِهِ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ
فَاسْتَفَاهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ فَوَكَزَهُ مُوسَى فَقَضَى
عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ فَقَالَ رَبِّ
إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ قَالَ رَبِّ
بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ

”(ایک روز) وہ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا جبکہ نکل شر غفلت میں تھے۔ وہاں اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم دالے کے خلاف اسے مدد کے لیے پکارا۔ موسیٰ نے اس کو ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ (یہ حرکت سرزد ہوتے ہی) موسیٰ نے کہا ”یہ شیطان کی کار فرمائی ہے“ وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کن ہے۔“ پھر وہ کہنے لگا ”اے میرے رب“ میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا“ میری مغفرت فرما دے۔“ چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی ”وہ غفور درحیم ہے۔“ موسیٰ نے عرض کیا کہ ”اے میرے رب“ یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے“ اس کے بعد اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔“

”وہ شہر میں داخل ہوا“ اور شر سے مراد دار الخلافہ ہے جس طرح کہ اس وقت وہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کہاں سے آئے اور شہر میں داخل ہوئے۔ کیا یہ عین اقصیٰ کے قصر شاہی سے نکل کر آئے یا یہ کہ انہوں نے شاہی محل اور دارالحکومت کو چھوڑ دیا تھا اور کسی اور جگہ رہائش اختیار کر لی تھی اور وہ شہر میں اس وقت داخل ہوئے جب لوگ غافل تھے یعنی دوپہر کا وقت تھا یا لوگوں کے آرام کا وقت تھا۔ جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں۔

فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِنْ شِيعَتِهِ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ فَاَسْتَفَاهُ الَّذِي مِنْ

شَيْعَتِهِ عَلَى الَّذِينَ مِنْ عَدُوِّهِ (۱۵:۲۸) ”وہاں اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف اسے مدد کے لیے پکارا۔“ ان میں سے ایک قبلی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فرعون کے مصاحبین میں سے تھا، بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ شاہی محل کا باورچی تھا اور دوسرا اسرائیل تھا۔ یہ دونوں آپس میں لڑ رہے تھے۔ تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے پکارا کیونکہ قبلی دونوں کا دشمن تھا۔ یہ کیسے ہوا؟ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ ایک عام اسرائیلی فرعون کے پروردہ شخص کو خود فرعون کے مازم یا اس کی قوم کے آدمی کے خلاف پکار رہا ہے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام کو بدستور شاہی محل میں فرض کر لیا جائے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ فرعون کے متنبی کو ایک دوسرے فرعون کے خلاف پکارا جائے۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ فرض کیا جائے کہ انہوں نے شاہی محل کو ترک کر دیا ہے اور فرعون سے ان کے رابطے ختم ہیں۔ بنی اسرائیل میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل سے ہیں اور یہ کہ وہ بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کے خلاف ہیں اور اب وہ اپنی پس مندی کی قوم کی حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام ایسا مقام و مرتبہ رکھنے والے شخص کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ قعر شاہی سے نکل گئے ہوں کیونکہ آپ کا پاک نفس شرفِ فساد کے اس گندے ٹالے میں کس طرح رہ سکتا تھا۔

فَوَكَّزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ (۱۵:۲۸) ”موسیٰ نے اس کو ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔“ دیکھو اس ضرب کو کہتے ہیں جو انسان پورے ہاتھ کے ساتھ دوسرے کو لگائے۔ اندازہ بیان سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی گھونسنے کے ساتھ قبلی زہر ہو گیا۔ اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کس قدر مضبوط اور قوی جوان تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ منفعَل الزاج تھے اور سخت غصے والے تھے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں فرعونوں اور فرعون کے خلاف سخت نفرت تھی۔

لیکن قرآن کریم کی عبرت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس قبلی کو قتل کرنا نہ چاہتے تھے۔ یہ نہ چاہتے تھے کہ اس کی جان لے لی جائے، جو نبی آپ نے دیکھا کہ وہ تو آپ کے سامنے ٹھنڈا پڑا ہے، آپ پشیمان ہو گئے کہ آپ نے یہ غلط کام کر ڈالا۔ آپ نے اسے شیطانی کام کہا کیونکہ یہ غصے کی وجہ سے کام ہوا اور غصہ شیطانی عمل ہوتا ہے یا یہ شیطان کی اکساہٹ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

قَالَ هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُضِلٌّ مُبِينٌ (۱۵:۲۸) ”موسیٰ نے کہا یہ شیطان کی کار فرمائی ہے وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کن ہے۔“ حضرت موسیٰ حریف کہتے ہیں کہ غصے کی وجہ سے انہوں نے اس فعل کا ارتکاب کیا۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے اس لغزش کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔ چنانچہ آپ رب تعالیٰ سے طلبِ مغفرت کرتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ

”پھر وہ کہنے لگا کہ میرے رب میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرمادے۔ چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرمادی، وہ غفور و رحیم ہے۔“ اللہ نے آپ کی عاجزانہ دعا کو قبول کر لیا۔ کیونکہ آپ کو غلطی کا احساس ہو گیا اور فوراً استغفار کر لیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اپنے کانپتے ہوئے دل اور اپنے تیز احساس اور اپنی توجہ الی اللہ سے محسوس کر لیا کہ ان کے رب نے ان کو بخش دیا ہے۔ قلب مومن کو جب اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے تو وہ محسوس کر لیتا ہے اور جب دعا قبول ہوتی ہے تو بھی اسے احساس ہو جاتا ہے کہ دعا قبول ہو گئی، انسان اپنے تقویٰ خدا غنی اور اپنے احساس کی وجہ سے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام اپنے تیز شعور، اپنی طہارت قلبی اور اتصال باللہ کے ذریعہ یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا ہے تو آپ فوراً اپنے اوپر لازم کرتے ہیں کہ رب، آپ نے مجھ پر جو انعامات کیے ہیں میں آئندہ ان کا شکر ادا کروں گا کہ مجرموں کے مددگار نہ بنوں گا۔

قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِلْمُجْرِمِينَ (۲۸: ۱۷) ”اے میرے رب یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے اس کے بعد میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔“

حضرت موسیٰ کی طرف سے یہ عام عہد ہے کہ وہ مجرموں کا معین و مددگار نہ بنیں گے جتنی آپ نے ہرم اور مجرمین سے اپنی برات کا اظہار کیا، ہر حال اور ہر صورت میں۔ اگرچہ بعض اوقات ان کا طبعی غصہ انہیں اس بات پر مجبور کر دے۔ بعض اوقات ظلم اور تشدد کے نتیجے میں لیک معدل مزاج میں بھی تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ یہ عہد اس لیے کر رہے ہیں کہ اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمائی۔ پھر اللہ کے ان انعامات کے بدلے بطور شکر انہوں نے یہ عہد کیا کہ اللہ نے ان کو جسمانی قوت اور علم و حکمت سے نوازا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر نیکی اور صراط مستقیم پر چلنے کا یہ ارتعاش اور اس سے قبل اپنی قوم کے حق میں مشتعل ہونے اور انتقام لینے کا ارتعاش یہ بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت میں کس قدر سیمائیت تھی۔ آپ کا وجدان تیز، انتقام سخت تھا اور دوسرے مقامات پر آپ کی شخصیت کا یہ پہلو بار بار ظہور پذیر ہوتا ہے۔ بلکہ لگے ہی منظر میں دیکھئے کہ آپ پھر اپنی قوم کے شخص پر غصہ ہوتے ہیں۔

فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ فَإِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهُ بِالْأَمْسِ يَسْتَصْرِحُهُ قَالَ لَهُ مُوسَى إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُبِينٌ فَلَمَّا أَنْ أَرَادَ أَنْ يَبْطِشَ بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالَ يٰمُوسَى أَتُرِيدُ أَنْ تَقْتُلَنِي كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْأَمْسِ إِنَّ تُرِيدُ إِلَّا أَنْ تَكُونَ جَبَّارًا فِي الْأَرْضِ وَمَا تُرِيدُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الصَّالِحِينَ (۲۹)

”دوسرے روز وہ صبح سویرے ڈرتا اور ہر طرف سے خطرہ بھانپتا ہوا شہر میں جا رہا تھا کہ یکایک کیا دیکھتا ہے کہ وہی

فخص جس نے کل اسے مدد کے لیے پکارا تھا، آج پھر اسے پکار رہا ہے۔ موسیٰ نے کہا ”تو تو بڑا ہی بھکا ہوا ہے۔“ پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے تو وہ پکار اٹھا ”اے موسیٰ! کیا آج تو مجھے اسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے؟ تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے، اصلاح کرنا نہیں چاہتا۔“

پہلے معرکے میں تو قبیلے کا کام تمام ہو گیا تھا، اس فصل پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت ندامت ہوئی۔ آپ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے اس غلطی پر استغفار کیا اور آپ کو معاف کر دیا گیا۔ اور آپ نے اب عہد کر لیا کہ آپ کبھی بھی بحرین کے معین و مددگار نہ ہوں گے۔

وہ دن تو گزر گیا لیکن آپ اس شہر میں ذرے سے پھر رہے تھے شاید یہ راز کھن نہ گیا ہو۔ آپ ہر وقت راز کے انکشاف اور شہر مندگی اور سزا سے خائف تھے۔ لفظ ”بِتَرَقُّبٍ“ میں یہ تمام مفہوم موجود ہیں۔ آپ کی بیست سے بھی ظاہر تھا کہ آپ کسی پریشان میں گھوم رہے ہیں۔ سب سے ہوئے، ہر لمحہ اور ہر لمحہ کسی خطرناک صورت حالات کی توقع کرتے ہوئے۔ ایک مضطرب مزاج شخص کی حالت ہمیشہ ایسی ہوتی ہے کہ ذرا سا کھٹکا بھی اس کی حرکات و سکنات کو ظاہر کر دیتا ہے۔ بترقب سے خوف اور پریشانی کا بھی طرح اظہار ہوتا ہے۔ بترقب کے بعد فی الدینہ سے اس میں مزید مبالغہ آجاتا ہے کیونکہ شہر تو ہمیشہ امن و امان کی جگہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس پر امن شہر میں بھی خائف ہیں اور سب سے بڑا خوف وہ ہوتا ہے جو انسان کو اپنے گھر اور جائے امن میں لاحق ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ پریشانی کن حالت قلبی طور پر بتاتی ہے کہ آپ اس وقت شاہی محل سے منسلک نہیں ہیں، کیونکہ شاہی محل کے لوگوں کو کسی ظلم و نساد کے نتیجے میں کوئی در لاحق نہیں ہوتا۔ اگر آپ شاہی محل ہی میں مقیم ہوتے تو قرآن کریم، آپ کے لیے۔

فِی الْمَدِیْنَةِ خَائِفًا یَّتَرَقَّبُ (۱۸:۲۸) کے الفاظ استعمال نہ کرتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے ہی حالات میں پھر رہے تھے کہ وہ ایک نیا منظر دیکھتے ہیں:

فَإِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهُ بِالْأَمْسِ یَسْتَصْرِحُهُ (۱۸:۲۸) ”یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ وہی شخص جس نے کل اسے مدد کے لیے پکارا تھا آج پھر اسے پکار رہا ہے۔“ یہ وہی شخص ہے جس کی کل انہوں نے قبیلے کے خلاف طرف داری کی تھی۔ یہی شخص اب کسی دوسرے قبیلے کے ساتھ الجھ رہا ہے۔ اور حضرت موسیٰ کو پکار رہا ہے کہ بچاؤ مجھے اس سے۔ شاید اس کا خیال یہ تھا کہ حضرت موسیٰ اس دوسرے مشترک دشمن پر ایک ضرب کلیم لگائیں اور یہ بھی اسی طرح ڈھیر ہو جائے۔

لیکن حضرت موسیٰ کے ذہن پر توکل کے مقتول کی سوچیں چھائی ہوئی تھیں اور اس پر انہوں نے اللہ سے معافی بھی مانگ لی تھی اور معافی ملنے کے بعد اللہ سے آپ نے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ آپ کسی مجرم کے طرفدار نہ ہوں گے اور سابقہ فعل کے راز کے افشا کا خوف بھی ابھی زندہ تھا۔ اب آپ کو اس شخص پر غصہ آگیا جو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ آپ نے غصے میں اس شخص سے کہا کہ تم تو بہت بڑے شہر مند ہو۔

قَالَ لَهُ مُوسَى إِنَّكَ لَغَوِي مُبِينٌ (۱۸: ۲۸) ”موسیٰ نے کہا تو بڑا ہی ہکا ہوا آدمی ہے“ یعنی تو ایسا آدمی ہے کہ ہر کسی کے ساتھ الجھتا ہے اور تمہارا یہ الجھاؤ ختم نہیں ہوتا، ہر کسی کے ساتھ حیرا جھگڑا ہے، جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس طرح تو بنی اسرائیل پر کوئی بڑی مصیبت لے آئے گا اور ان کی پوزیشن یہ ہے کہ نہ وہ انقلاب لا سکتے ہیں اور نہ مزید تشدد کے تحمل ہو سکتے ہیں۔ وہ اس وقت کوئی قمیری تحریک چلانے کی پوزیشن میں نہیں۔ لہذا اس قسم کی جزوی جھڑپوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

لیکن اس تنبیہ کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام کو اس قبیل پر غصہ آگیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس پر اسی طرح جھپٹے جس طرح انہوں نے گزشتہ روز کیا تھا اور اس کا کام بھی اسی طرح تمام کر دیں جس طرح کل انہوں نے کیا تھا۔ یہاں بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کی جلالی طبیعت قبیلوں کے مظالم کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ آپ مشتعل ہو گئے کیونکہ قبیلوں کے مظالم حد سے بڑھ گئے تھے۔ اس لیے ظلم و سرکشی کے خلاف ان کا یہ رد عمل فطری تھا جبکہ یہ مظالم ایک طویل عرصے سے ہو رہے تھے اور بنی اسرائیل کے دلوں میں ان لوگوں کے خلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور بہت گہری ہو چکی تھی۔

قَلَمًا اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالِ يَمُوسٰى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلِنِيْ
كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِى الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ

تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ (۱۹: ۲۸) ”پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے تو وہ پکار اٹھا“ اے موسیٰ! کیا آج تو مجھے اسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے؟ تو اس ملک میں جبارین کر رہنا چاہتا ہے، اصلاح کرنا نہیں چاہتا۔ ایسی باتیں اس وقت عام ہو جاتی ہیں جب معاشرہ فساد پذیر ہو، اس میں مظالم عام ہو جائیں، معاشرہ سے اعلیٰ قدریں ختم ہو جائیں، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہو۔ ظلم کی وجہ سے لوگوں کا دم مٹھنے لگے۔ حالات، قوانین اور رسم و رواج سب خراب ہو جائیں اور انسانوں کی فطرت اس طرح بدل جائے کہ لوگ ظلم کو دیکھیں اور ان کے اندر کوئی رد عمل پیدا نہ ہو۔ ان پر زیادتی ہو رہی ہو اور ان کے نفوس کے اندر کوئی جوش مدافعت پیدا نہ ہو۔ بلکہ لوگوں کی فطرت میں اس قدر بگاڑ پیدا ہو جائے کہ لوگ ان مظلوموں کو برا کہنے لگیں جو اپنی مظلومی کا دفاع کرتے ہوں اور جو شخص حق کا ساتھ دے اور ظلم کے خلاف آواز اٹھائے، اسے کہا جائے کہ یہ شریک اور دہشت گرد ہے۔ اور یہ زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ الفاظ کہ ”تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا ہے اور جبارین کر رہے والا ہے“ قبلی نے حضرت موسیٰ سے کہے۔ اس لیے کہ ان قبیلوں نے یہی دیکھا تھا کہ اسرائیلیوں پر ہر طرف سے مظالم ہو رہے تھے اور وہ سر نہ ہلاتے تھے۔ اس طرح ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ ایک اعلیٰ اخلاقی اصول ہے اور یہ نضائیں اخلاق میں سے ہے اور نہایت مذہب زندگی ہے اور اعلیٰ اخلاقی رویہ ہے اور اسی میں معاشرے کی اصلاح و فلاح ہے کہ کوئی نہ سراٹھا کے چلے۔ جب اس قسم کے لوگ دیکھتے کہ اور مظلوموں کے رویہ کے برعکس یہ شخص مدافعت کرتا ہے اور حکمرانوں نے جو غلامانہ اخلاقی نظام جاری کر رکھا تھا اور جس کے مطابق لوگ زندگی بسر کر رہے تھے اس کے خلاف

ایک شخص بے گناہ کر رہا ہے تو یہ بات ان کے لیے انوکھی ہوتی تھی۔ اور ان کو خوف لاحق ہو جاتا تھا۔ وہ الٹا مظلوم کو جبار و قہار کہتے تھے اور اس پر دہشت گردی اور بد اخلاقی کا الزام لگاتے تھے۔ الٹا مظلوم کو لعنت و ملامت کرتے تھے۔ ظالم تک ان کی لعنت و ملامت کا بہت ہی کم حصہ پہنچتا تھا۔ مظلوم کے لیے ان کے ذہنوں میں مدافعت کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگرچہ وہ بندگی تک پہنچ جانے کے بعد کوئی جسورانہ اقدام کرنے پر مجبور ہو گیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل پر ایک عرصے تک ظلم ہوتا رہا۔ موسیٰ علیہ السلام دیکھتے دیکھتے عاجز آ گئے۔ ان کا پیانا صبر لہریز ہو گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے وہ ایک اسرائیلی کی مدافعت کرتے ہیں اور غلام ہو جاتے ہیں لیکن حالات کا دباؤ اس قدر شدید ہے کہ وہ دوبارہ وہی فعل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور قریب ہے کہ وہاں یہ کام کر گزریں۔ آپ ارادہ کر لیتے ہیں کہ اس شخص کو پکڑ لیں جو ان کا 'لور' ان کی قوم کا دشمن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کے اس فعل پر 'حضرت موسیٰ کو چھوڑ نہ دیا بلکہ اللہ نے ان کی تربیت کی اور ان کی دعا کو قبول کیا۔ کیونکہ اللہ علیم و خبیر ہے۔ اس کو کبھی طرح معلوم ہے کہ انسان کس قدر قوت برداشت رکھتا ہے۔ جب ظلم شدید ہوتا ہے اور انصاف کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ تو مظلوم مجبور ہو کر حملہ کرتا ہے اور کسی بھی جسورانہ اقدام پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لہذا قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے ارتکابِ قتل کے فعل کو زیادہ خوفناک انداز میں بیان نہیں کیا جس طرح ایسے کام کو وہ سوسائٹیاں بہت ہی خوفناک سمجھتی ہیں جن کی فطرت اور جن کا ضمیر غلامی کے مظالم سے سستے بدل جاتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ حالات کے دباؤ اور تشدد کے جواب میں لوگ ایسے کام پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب ان کی قوت برداشت جواب دے دیتی ہے۔

قرآن کریم ان دونوں واقعات کا جس انداز میں ذکر کرتا ہے اس سے یہی تاثر ملتا ہے۔ قرآن نہ تو ان اقدامات کے لیے وجہ جواذ بیان کرتا ہے اور نہ ہی ان کی برائی میں مبالغہ آرائی کرتا ہے۔ البتہ قرآن نے اس کو نفس پر ظلم اس لیے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مقام پر قومیت کے جذبات کا اظہار کیا جب کہ وہ ہونے والے رسول تھے اور اللہ تعالیٰ خود اپنی نگرانی میں ان کی تربیت فرما رہا تھا۔ یا اس وجہ سے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے مظالم پر قبل از وقت کشمکش شروع کر دی تھی اور اللہ کا ارادہ اور اس کی اسکیم یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو پوری طرح اجتماعی نجات ملے۔ کیونکہ انفرادی جھڑپوں کے نتیجے میں کوئی اجتماعی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی جس طرح مکہ میں مسلمانوں کو یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ ہاتھ روکے رکھیں۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاید پہلے قتل کی بات پورے مصر میں پھیل گئی تھی۔ حضرت موسیٰ کے بارے میں حکومتی حلقوں میں شبہات پھیل گئے تھے کیونکہ اس سے قبل فرعون اور اس کی کارروائیوں پر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھی اسرائیل نے بھی بطور افتخار اور مسرت اس راز کو پھیلا دیا ہو گا۔ خصوصاً بنی اسرائیل کے اپنے حلقوں کے اندر تو یہ تیزی سے پھیل گیا ہو گا۔ اور باہر والوں کے کان میں بھی بھنک پڑ گئی ہو گی۔

ہم اس کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ ایسے حالات میں موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے فرعون کے حاشیہ نشینوں میں سے کسی کو قتل کرنا ہر اسرائیلی کے لیے خوشی اور مسرت کی بات تھی۔ اس طرح ان کے غیظ و غضب کی آگ ٹھنڈی ہو سکتی تھی۔ لہٰذا ہم بالعموم ایک سے دوسرے کی طرف بڑی تیزی سے پھیل جاتی ہیں۔ اور بعض اوقات ایک حلقے سے

نکل کر دوسرے صفتوں تک جا پہنچتی ہیں جبکہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مشہور بھی تھا کہ وہ اس فرعونی تشدد پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور مظلوموں کی حمایت کرتے رہتے ہیں۔

جب موسیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ دوسرے قبیلے کو پکڑ کر گوشالی کہیں تو اس نے پکار کر ان سے پہلے قبیلے کے قتل کا الزام لگا دیا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ موسیٰ اسے پکڑنے ہی والے ہیں۔ اور شاید ضرب کلیم اس کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہو تو وہ پکار اٹھا۔

اَتُرِيدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ (۱۹:۲۸) رہی باقی عبارت اِنْ تُرِيدُ اَلَا

اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَمَا تُرِيدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ (۱۹:۲۸) ”تم مجھے اسی طرح قتل کرنا چاہتے ہو جس طرح کل تم ایک شخص کو قتل کر چکے ہو تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے تو اصلاح کرنا نہیں چاہتا“ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت اصلاح کی کوئی تحریک شروع کر رکھی تھی اور وہ مصلح مشہور تھے اس لیے وہ شخص آپ پر الزام لگاتا ہے کہ تم اپنے منشور کے خلاف عمل کر رہے ہو۔ تم ایک جبار شخص کی طرح اس ملک میں رہنا چاہتے ہو۔ اصلاح احوال کے بجائے لوگوں کو قتل کرنا چاہتے ہو۔ جس طرح یہ شخص حضرت موسیٰ پر الزام لگا رہا ہے اور جس انداز میں حضرت موسیٰ کو مخاطب کر رہا ہے ان دونوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں حضرت موسیٰ فرعون کے مقرہیں اور لٹل خانہ میں سے نہ تھے۔ ورنہ کوئی مصری ان پر الزام لگانے کی اس قدر جسارت نہ کر سکتا تھا اور اس کا انداز خطاب بھی ایسا نہ ہو سکتا تھا۔

بعض مفسرین نے کہا کہ یہ فقرے اس اسرائیلی کے ہیں جس کی حمایت میں آپ قبیلے کو پکڑنا چاہتے تھے اس قبیلے کے نہیں ہیں۔ کیونکہ حضرت موسیٰ نے اسرائیلی کو ڈانٹا تھا۔

اِنَّكَ لَغَوٰی مُّبِیْنٌ (۱۸:۲۸) ”تو تو بڑا ہی بھکا ہوا آدمی ہے“۔ اس فقرے کے بعد جب موسیٰ قبیلے کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے تو اس اسرائیلی نے یہ گمان کیا کہ شاید ضرب کلیم مجھ پر پڑنے والی ہے تو وہ خوف کے مارے یہ الزام لگا گیا اور راز فاش کر دیا۔ ان مفسرین نے یہ رائے اس لیے اختیار کی ہے کہ یہ راز مصر میں راز ہی تھا کہ اس شخص کا قاتل کون ہے؟

لیکن زیادہ قرن قیاس یہ ہے کہ یہ بات قبیلے نے کہی ہو۔ ہم نے بتا دیا ہے کہ یہ راز چپے چپے پورے شہر میں پھیل گیا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصری نے اپنی فرست اور دانش مندی سے یہ الزام لگا دیا ہو کہ مقتول مجبور کے قاتل موسیٰ ہی ہو سکتے ہیں۔

بظاہر یہ معصوم ہوتا ہے کہ جب موسیٰ پر اس شخص نے قتل کا الزام لگایا تو موسیٰ علیہ السلام اس شخص کے پکڑنے سے رک گئے اور یہاں سے چھوٹ کر یہ شخص بھاگتے بھاگتے فرعون کے ہاں پہنچ گیا ہو گا اور کہہ دیا ہو گا کہ قاتل دراصل موسیٰ ہے۔ اب یہاں سابق منظر اور آنے والے منظر کے درمیان ایک وقفہ اور ”۔“ دکھا، منظر یہ ہے کہ ایک شخص بھاگتا ہوا مدینہ سے باہر یعنی شاہی دربار و رہائشی کے علاقے سے آتا ہے اور حضرت موسیٰ کو خبردار کرتا ہے کہ تمہارے

بارے میں اعلیٰ سطح پر مشورے شروع ہو گئے ہیں اور تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ جان بچا کر مصر سے نکل جاؤ۔

وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يٰمُوسَىٰ

إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ ﴿۲۸﴾

”اس کے بعد ایک آدمی شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا ”اے موسیٰ‘ سرداروں میں میرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں‘ یہاں سے نکل جا‘ میں تیرا خیر خواہ ہوں۔“

فرعون کے سرداروں‘ ایں کے حاشیہ نشینوں اور حکومتی افراد اور اس کے خاص انخاص لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ قتل میں موسیٰ کا ہاتھ ہے۔ اس لیے انہوں نے محسوس کر لیا کہ موسیٰ کی صورت میں خطرہ مجسم ہو کر آگیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا کام ہے جس کی نوعیت انقلابی اور خطرناک ہے۔ یہ بغاوت کا آغاز ہے۔ اور اس کے محرکات میں بنی اسرائیل کا جذبہ انتقام ہے۔ لہذا یہ ایک نہایت خطرناک رجحان ہے اور اس کے انسداد کے لیے سخت تدابیر کی ضرورت ہے۔ اگر یہ قتل کوئی معمولی واردات ہوتی تو اس پر انتہائی اعلیٰ سطح پر غور کی کیا ضرورت تھی۔ آئے دن انسانوں میں قتل ہوتے رہے ہیں لیکن اس قتل نے پورے نظام حکومت کو ہلکا کر رکھ دیا۔ انہوں نے بھی تدابیر کا آغاز کیا اور دست قدرت نے بھی اپنا کام شروع کر دیا۔ سرداروں میں سے ایک شخص جو موسیٰ کا ہمدرد تھا‘ دست قدرت نے اس سے کام لیا۔ یہ شاید وہی شخص ہے جو اپنے ایمان کو چھپ رہا تھا اور جس کا ذکر سورہ غافر کی آیت ۲۸ میں ہوا ہے۔ یہ شخص اٹھا اور اس نے حضرت موسیٰ کو اعلیٰ سطح پر ہونے والے مشوروں سے آگاہ کر دیا۔ یہ شخص نہایت سنجیدگی‘ اہتمام اور جلدی میں آیا اور اس نے شاہی کارندوں کو کسی کارروائی سے قبل حضرت موسیٰ کو اطلاع کر دی۔

إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ (۲۸: ۲۰)

”موسیٰ‘ سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں‘ یہاں سے نکل جا‘ میں تیرا خیر خواہ ہوں۔“

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۲۹﴾

”یہ خبر سنتے ہی موسیٰ ڈرنا اور سہتا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دعا کی کہ ”اے میرے رب‘ مجھے ظالموں سے بچا۔“

حضرت موسیٰ شہر سے ڈرے ہوئے اور سسے ہوئے نکل کھڑے ہوئے‘ یکہ و تما‘ ڈر رہے ہیں اور اللہ پر اعتماد کے سوا ان کے پاس کوئی ساز و سامان نہیں ہے۔ ان کی توجہ صرف اللہ کی طرف ہے۔ صرف اللہ کی مدد اور ہدایت کے وہ طلبگار ہیں۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَن يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿۳۰﴾

” (مصر سے نکل کر) جب موسیٰ نے مدین کا رخ کیا تو اس نے کہا ”امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا۔“

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یکہ و تھا مصر سے نکلنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں اور وہ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بغیر کسی زاد و عناد کے جانب مدین رواں ہیں ’مدین کا علاقہ شام کے جنوب اور حجاز کے شمال میں ہے۔ یہ ایک طویل سفر ہے‘ دور دراز کا سفر۔ جس کے لیے حضرت موسیٰ نے کوئی تیاری نہیں کی۔ وہ شہر سے نہایت ہی ڈر کی حالت میں سسے ہوئے نکلے اور فرعون کے سردار ناصح نے انہیں مزید خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس لیے آپ نے ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر وہاں سے نکل جانے میں عافیت سمجھی۔ اس ناصح کی نصیحت میں آپ نے کوئی شک نہ کیا اور نہ نکلنے میں کوئی تردد کیا۔ کسی کو راہنما بنانے کی تاخیر بھی نہ کی اور نہ کوئی رفتی سفر تلاش کیا۔ لیکن صاف نظر آتا ہے کہ ان کا رخ اللہ کی طرف ہے‘ اللہ کے آگے انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ صرف اللہ کی راہنمائی کے طالب ہیں۔

عَسَىٰ رَبِّي أَن يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ (۲۸: ۲۲) ”امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا۔“

ایک بار پھر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ خطرات میں گھر گئے ہیں۔ بچپن کے بعد وہ نہایت امن سے عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے اور شاہی محل میں نہایت ہی آرام سے رہ رہے تھے لیکن وہی شہزادہ اب اکیلا اور تنہا صحرا تو ردی کر رہا ہے اور اس کے پاس دنیا کا کوئی ساز و سامان نہیں ہے۔ فرعون اور اس کے جاسوس اس کے تعاقب میں ہیں۔ ہر جگہ اس کی تلاش ہو رہی ہے۔ آج وہ اس سے انتقام لینا چاہتے ہیں اور اس سے وہ متاع حیات چھین لینا چاہتے ہیں۔ جو بچپن میں وہ نہ چھین سکے۔ لیکن قدرت کی جن قوتوں نے اسے اس وقت بچایا وہ آج بھی اس کے ساتھ ہیں۔ قدرت اسے اس کے دشمنوں کے سپرد کرنا ہرگز گوارا نہیں کرتی۔ اس سے تو بہت سا کام لیا جاتا ہے ’چنانچہ وہ بے آب و گیاہ صحرا میں اکیلے جا رہے ہیں۔ اب وہ ایسے علاقے تک پہنچ گئے جہاں فرعون کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ نہ وہ انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ
وَوَجَدَ مِنْ دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ ۖ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا قَالَتَا لَا نَسْقِي
حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّبَاءُ يَكْتُمُوا آبُونَا شَيْئًا كَبِيرٌ ۖ فَسَقَىٰ لَهُمَا ثُمَّ تَوَلَّىٰ إِلَى
الْخِلِّ فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ۝

”اور جب وہ مدین کے کنوئیں پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں سے پوچھا ”تمہیں کیا

پریشانی ہے؟“۔ انہوں نے کہا ”ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں“ اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں۔“ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔ پھر ایک سائے کی جگہ جا بیٹھے اور بولے ”پروردگار! جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں۔“

یہ طویل صحرائی سفر ختم ہوا اور حضرت موسیٰ مدین کے ایک چٹھے پر پہنچے۔ آپ تھکے ماندے مسافر ہیں۔ اس چٹھے پر وہ ایک ایسا منظر دیکھتے ہیں جسے کوئی شریف اور بامروت آدمی برداشت نہیں کر سکتا اور پھر حضرت موسیٰ کیسے برداشت کرتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مرد چرواہے اپنے مویشیوں کو لالاکر پانی پلا رہے ہیں اور دو عورتیں ہیں جو اپنی بکریوں کو پانی سے دور رکھ رہی ہیں۔ حالانکہ فطرت سلیمہ اور مروت کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے عورتوں کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنی بھیڑوں کو پانی پلائیں اور چلی جائیں اور مرد ان کو موقع دیں اور ان کے ساتھ تعاون کریں۔ ”Ladies First“ ایک فطری اصول ہے۔

حضرت موسیٰ ایک فریب الدیار مسافر ہیں، اپنے علاقے سے نکلے ہوئے ہیں اور ان کا پیچھا بھی ہو رہا ہے۔ تھکے ہارے ہیں اور آرام کرنے کی خاطر اس چٹھے پر آئے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ یہ منظر معروف اخلاقی اصولوں کے خلاف ہے۔ وہ آگے بڑھتے ہیں اور ان دو عورتوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا معاملہ ہے؟

قَالَ مَا خَطْبُكُمَا (۲۸: ۲۳) ”تمہیں کیا پریشانی ہے۔“

قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصَدَّرَ الرِّعَاءُ وَابْنَا شَيْخٌ كَبِيرٌ (۲۸: ۲۳) ”انہوں نے کہا ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک چرواہے اپنے جانور نکال نہ لے جائیں اور ہمارے والد ایک سن رسیدہ بوڑھے ہیں۔“ چنانچہ انہوں نے بتا دیا کہ وہ کیوں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں اور کیوں دو مردوں کو پہلے موقعہ دیتی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ وہ عورتیں ہیں اور ضعیف ہیں اور دوسرے چرواہے مرد ہیں اور زور آور ہیں۔ اور باپ بوڑھے ہیں وہ نہ مویشی چرا سکتے ہیں اور نہ ان مضبوط چرواہوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے جذبہ ایمانی جوش میں آیا۔ آپ کی فطرت سلیمہ جاگ اٹھی۔ وہ آگے بڑھے اور اصول کے مطابق کام کیا تا کہ بچاری عورتیں پہلے پانی پلائیں جیسا کہ شریف اور مہذب لوگوں کا رواج ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ فریب الدیار تھے۔ ان کو کوئی نہ جانتا تھا، نہ یہاں ان کا کوئی حامی و مددگار تھا، تھکے ماندے تھے، ایک طویل سفر کاٹ کر یہاں تک پہنچے تھے اور ان کے پاس مزید سفر کے لیے کوئی ساز و سامان بھی نہ تھا۔ ان کا پیچھا بھی ہو رہا تھا، دشمن تعاقب میں تھے لیکن یہ تمام امور ان کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکے کہ وہ اس موقع پر مروت اور جوانمردی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اور امر بالمعروف پر عمل پیرا نہ ہوں اور لوگوں کو یہ بتانہ دیں کہ قدرتی انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ عورتوں کو پہلے موقعہ دیا جائے۔

فَسَقَىٰ لَهُمَا (۲۸: ۲۴) ”یہ سن کر موسیٰ نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔“ یہاں سیاق کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نہایت ہی تربیت یافتہ شریف النفس شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جسمانی لحاظ سے بھی ایک کڑیل جوان تھے، جسے دیکھ کر عام آدمی مرعوب ہو جاتا تھا۔ حالانکہ وہ طویل سفر سے تھکے ہوئے آئے تھے۔

چرواہوں پر ان کی جسمانی قوت سے زیادہ ان کی نفسیاتی برتری اور اخلاقی رویہ نے زیادہ اثر کیا۔ کیونکہ جسمانی قوت کے مقابلے میں لوگ اخلاقی رویوں سے زیادہ مرعوب ہوتے ہیں۔

ثُمَّ تَوَلَّى إِلَى الظِّلِّ (۲۸: ۲۴) ”پھر ایک سائے کی جگہ جا بیٹھا“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسم سخت گرمی اور لو کا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس قسم کی شدید گرمی میں یہ سفر کرنا پڑا تھا۔

فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لَمَّا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ (۲۸: ۲۴) ”اور بولا پروردگار جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں“۔ اس وقت انہوں نے جسمانی اعتبار سے درختوں کے گھنے سائے میں اپنے جسم کو آرام پہنچانے کے لیے پناہ لے رکھی ہے، لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت اور رحم و کرم کرنے والے بادشاہ کے سایہ رحمت میں بھی پناہ چاہتے ہیں۔ اپنی روح اور اپنے قلب کو اللہ کی طرف متوجہ کیے ہوئے ہیں۔ لے لے اللہ میں محتاج ہوں، شدید لو ہے، میں اکیلا ہوں۔ لے رب میں بے وسائل ہوں، لے رب میں تیرے فضل و کرم اور تیرے احسان کا بے حد محتاج ہوں۔

إِنِّي لَمَّا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ (۲۸: ۲۴) ”جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں“۔ ابھی ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مناجات کے اس منظر میں ہیں کہ سیاق کلام میں نہایت فرحت بخش بشارت آتی ہے۔ اس کا آغاز صرف (ماء) لعنہ سے ہوتا ہے، گویا عالم بالا نے حضرت موسیٰ کی دعاء کو اس سے قبل قبول کر لیا کہ وہ ہاتھ نیچے کہیں۔ کیونکہ وہ نہایت ہی خضوع سے یہ دعا کر رہے تھے۔

فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ ۖ قَالَتْ إِنَّ ابْنِي يَدْعُوكَ لِيجْزِيكَ أَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا

”(کچھ دیر نہ گزری تھی) ان دونوں عورتوں میں سے ایک شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی ”میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے لیے جانوروں کو پانی جو پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں“۔ اللہ کے فضل و کرم کے کیا کہنے، حضرت موسیٰ اللہ کے کس قدر قریب ہیں، ان کی پکار کس قدر تیزی سے سنی جاتی ہے۔ دو عورتوں کے والدین رسید شیخ عالم بالا کی ہدایت پر حضرت موسیٰ کو دعوت دیتے ہیں، یہ دعوت عزت و احترام پر مبنی پناہ عطا کرنے اور جزائے احسان دینے کے لیے ہے۔ یہ دعوت لے کر ان دو دوشیزاؤں میں سے ایک آئی ہے اور وہ

تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ (۲۸: ۲۵) ”شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی آئی ہے“۔ اس کی روش میں بکار ہے، نہایت نہیں ہے، وہ مقامات نہایت کا اظہار نہیں کرتی بلکہ ان کو چھپا رہی ہے۔ نہ نسوانی غرور ہے اور نہ

جاذبیت کا اظہار ہے۔ وہ آتی ہے اور والد کی طرف سے نہایت ہی مختصر جامع الفاظ میں یہ دعوت دیتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

اِنَّ اَبٰی یَدْعُوْكَ لِیَجْزِلَکَ اَجْرَ مَا سَقٰیْتَ لَنَا (۲۸: ۲۵) ”میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے جانوروں کو پانی جو پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دے دیں۔“۔ شرم و حیا کے دائرے میں نہایت وضاحت کے ساتھ جامع الفاظ میں یہ پیغام پہنچا دیا جس میں کوئی بناوٹ کوئی جھجک کوئی توقف نہ تھا اور کوئی پیچیدگی یا لکنت نہ تھی۔ یہ اس طرح کیوں ہے اس لیے کہ فطرت سلیمہ عقیقہ اور سیدھے سادھے کیریئٹروالی خواتین کی روش لئی ہی ہوتی ہے۔ سیدھی فطرت کی نوجوان عورت جب بھی مردوں سے ملتی ہے اسے حیا آتی ہے۔ وہ مردوں سے بات کرتے ہوئے شرماتی ہے لیکن یہ لڑکی چونکہ پر اعتماد اور عقیف اور سیم فطرت ہے۔ اس لیے اس کی باتوں میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ ورنہ مگری ہوئی فطرت اور کردار کی لڑکیاں ایسے موقع پر ناز و انداز اور کشش و ہیجان پیدا کرنے کا رویہ اختیار کرتی ہیں۔ لیکن اس لڑکی نے بس نہایت ہی مختصر الفاظ میں مطلوب پیغام پہنچا دیا۔ کوئی ایک لفظ بھی ضرورت سے زیادہ نہ سے نہیں نکالا۔

قرآن کریم بھی اس منہ کی یہی تھلک دکھاتا ہے اور اس پر کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ صرف شیخ کبیر کی طرف سے ایک لڑکی انہیں دعوت پیش کرتی ہے۔ موسیٰ قبول کر لیتے ہیں اور پردہ گرتا ہے۔ اگلا منظر دونوں کی ملاقات کا ہے۔ اس شیخ کبیر کا نام قرآن مجید نے نہیں لیا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ مشہور نبی حضرت شعیب علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور ان کا نام بیرون تھا۔ (۱)

فَلَمَّا جَاءَهُ وَ قَصَّ عَلَیْهِ الْقِصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ اِنَّمَا نَجَّوْتُ

مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِیْنَ ﴿۱۵﴾

”موسیٰ جب اس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصہ اسے سنایا تو اس نے کہا ”کچھ خوف نہ کرو اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو۔“

(۱) میں نے ان کے بارے میں بعض جگہ تو یہ کہا ہے کہ یہ حضرت شعیب ہیں، بعض جگہ یہ کہا ہے کہ یہ حضرت شعیب نبی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور ہوں۔ اب میرا میلان اس طرف ہے کہ شیخ کبیر حضرت شعیب نہیں ہیں۔ یہ مدین کے کوئی اور شخص تھے۔ اس رائے تک میں اس لیے پہنچا ہوں کہ یہ شخص تو شیخ کبیر ہیں، بوڑھے ہیں جبکہ حضرت شعیب کی قوم ان کی زندگی میں ہلاک ہوئی اور صرف لٹل ایمان ہی زندہ بچے تھے۔ اگر یہی صاحب حضرت شعیب ہوتے اور اپنی قوم کے اندر رہتے ہوتے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ لٹل ایمان ایک نبی کی لڑکیوں سے بھی اپنے جانوروں کو پانی پلا میں اور ان کا اس قدر احترام بھی نہ کریں اور نبی کی لڑکیوں کے ساتھ یہ سلوک کریں۔ نیز قرآن کریم نے بھی حضرت موسیٰ کے سر کے بارے میں کوئی صراحت نہیں کی۔ اگر یہ حضرت شعیب نبی ہوتے جن کے ہاں حضرت موسیٰ دس سال رہے تو قرآن ضرور ان کا ذکر کرتا۔ (سید قطب)

حضرت موسیٰ کو اس وقت سب سے پہلے جانے اس کی ضرورت تھی۔ نیز انہیں ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں ان کے کھانے پینے کا انتظام ہو جائے۔ لیکن ان کو کھانے پینے کی ضروریات سے زیادہ احتیاج ایک پر امن اور مامون و محفوظ ٹھکانے کا تھا۔ یہی وجہ ہے اس سنجیدہ اور سن رسیدہ بوڑھے نے سب سے پہلے انہیں کہا ”لَا تَخَفْ“ ”خوف نہ کرو“۔ اس شخص نے ان کو سب سے پہلے جو بات کہی کہ آپ اطمینان رکھیں، ”میں نہیں اور اس یقین دہانی کے بعد یہ فرمایا

نَحْنُ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (۲۸: ۲۵) ”اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو“۔ مدین پر ان کی حکومت نہیں ہے۔ مدین کے باشندے کو مصری کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔
لب مثلاً ایک نہایت ہی سلیم الفطرت اور عظیم عورت کی آواز آئی ہے۔

قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْكَ إِنَّا خَيْرٌ مِنَ الْقَوِيِّ الْأَمِينِ ﴿۲۹﴾

”ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا ”ابا جان“ اس شخص کو نوکر رکھ لیجئے، بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔“

ان دونوں بہنوں کو بھیڑ بکریاں چرانے پڑتی تھیں اور پانی پلاتے وقت ان کو مردوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کو مردوں سے واسطہ پڑتا تھا اور ان سے ٹکرانا پڑتا تھا، جس طرح ہر اس عورت کو ایسے حالات درپیش ہوتے رہتے ہیں جو مردوں والا کام کرتی ہے۔ ان دونوں بہنوں کو ہر وقت اس کام میں اذیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ امور خانہ داری تک محدود ہو جائیں اور ایک پاک دامن عفت مآب ”زن خانہ“ کی طرح زندگی بسر کرنے کا موقع ملے اور انہیں چہ اگاہوں اور گھاٹوں پر غیر مردوں کے ساتھ اختلاط پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ پاک دامن، پاک فطرت اور سلیم الفطرت عورتوں کی روش یہی ہوتی ہے کہ ان کو مردوں کے ساتھ مقابلہ اور مزاحمت کرنا پسند نہیں آتا اور اس قسم کے اختلاط اور مزاحمت کی وجہ سے عورتوں کے اندر جو ہلکا پن پیدا ہو جاتا ہے کوئی سلیم الفطرت عورت پسند نہیں کرتی۔

حضرت موسیٰ نوجوان مسافر اور غریب الوطن ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قوی اور امین بھی ہیں۔ اس عورت نے دیکھ لیا تھا کہ ان کی قوت اور شخصیت کو دیکھ کر تمام چرواہے سہم گئے تھے۔ انہوں نے موسیٰ کو فوراً راستہ دے دیا تھا اور ان دو مستورات کے جانوروں نے پانی پی لیا تھا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ غریب الوطن تھے اور غریب الوطن اگرچہ کوئی بڑا آدمی ہو۔ کمزور سمجھا جاتا ہے۔ اور جب یہ عورت موسیٰ کو دعوت دینے لگی تھی تو اس نے دیکھ لیا تھا کہ پاک نظر اور پاک زبان رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ عورت باپ کو مشورہ دیتی ہے کہ ابو آپ اس شخص سے اجارہ کر لیں تاکہ وہ اور اس کی بہن بکریاں چرانے کے عذاب سے نجات پالیں اور اس طرح ان کو وہ کام نہ کرنا پڑے جو مرد کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ مضبوط آدمی ہیں، امین ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص کسی دوشیزہ کی عفت کا لٹن ثابت ہو جائے، وہ تمام امور پر امین ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ اپنے اس مشورے میں بھی بالکل واضح سوچ رکھتی ہے اور صاف صاف بات کر رہی ہے اسے یہ خطرہ نہیں ہے کہ اس پر کوئی بدظنی کرے گا کیونکہ اس کی دل کی کتاب صاف ہے۔ اس کا احساس و شعور پاک ہے۔ اس لیے اسے کسی محاسسے سے ڈر نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس تجویز میں شغف شغف نہیں کرتی۔ اور نہایت ہی صاف الفاظ میں واضح

تجویز دیتی ہے۔

یہاں ان روایات کو دہرانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے جو مفسرین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت کے بارے میں نقل کی ہیں، مثلاً یہ کہ جس کنویں سے چرواہے پانی پلاتے تھے، اس پر ایک بڑا پتھر رکھا ہوا ہوتا تھا جسے ہیں، چالیس یا اس سے بھی کم دہش افراد اٹھا سکتے تھے۔ حالانکہ قرآن کریم کے سابق سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کنویں کے اوپر پتھر ہوتا تھا بلکہ دوسرے چرواہے پانی پلا چکے تو بعد میں یہ دو عورتیں پانی پلاتیں۔ حضرت موسیٰ نے ان چرواہوں کو ہٹایا اور ان عورتوں کے مویشیوں کو پانی پلا دیا یا دوسرے چرواہوں کے ساتھ ساتھ پانی پلا دیا۔

نیز یہاں ان روایات کے دہرانے کی بھی ضرورت نہیں ہے جن میں ان کی دیانت و امانت پر یہ دلیل دی گئی ہے۔ جس میں انہوں نے اس دوشیزہ سے کہا کہ تم میرے پیچھے چلو اور پیچھے سے مجھے راستہ بتاؤ، چلو، اس خوف سے کہ کہیں ان کی نظر اس عورت پر نہ پڑ جائے۔ یا یہ کہ حضرت موسیٰ نے اس لڑکی کو پیچھے چلنے کا اس وقت کہا جب وہ آگے چل رہی تھی تو ہوانے اس کے کپڑوں کو ٹخنوں سے اوپر کر دیا۔ یہ محض تکلفات ہیں اور ان کے ذریعہ سے ایسے ہلکوک کو دور کرنے کی سعی کی گئی ہے جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ بذات خود عقیق النظر تھے، پاک احساسات رکھتے تھے اور یہ عورت بھی پاک دامن تھی، عفت اور امانت جہاں ہو ان کے ثبوت کے لیے ایسے تکلفات کی ضرورت نہیں ہے خصوصاً مرد اور عورت کی ملاقات کے وقت کیونکہ عفت وہ پختہ ملک ہے جو بغیر کسی تکلف اور بناوٹ کے حصہ کر دار ہوتا ہے۔

اس بوڑھے نے اپنی بیٹی کی اس تجویز کو قبول کر لیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ لڑکی اور موسیٰ دونوں کے اندر خواہش اور اتحاد پایا جاتا ہے اور فطری میلان موجود ہے۔ اور یہ دونوں مل کر ایک صالح خاندان کی بنیاد ڈال سکتے ہیں۔ جب کسی نوجوان میں قوت اور عفت جمع ہو جائیں تو فطرتاً ہر سلیم الفطرت دوشیزہ ایسے شخص کو زندگی کا ساتھی بنانے پر راضی ہوتی ہے۔ جو خود پاک دامن اور صالح ہو۔ اس لیے اس بوڑھے نے حضرت موسیٰ کو پیش کش کر دی کہ وہ اپنی بیٹیوں میں سے ایک تمہارے نکاح میں دے سکتے ہیں۔ اگر تم آٹھ سال تک میری خدمت کرو اور میرے مویشی چراؤ اور اگر بطور احسان تم دس سال تک یہ خدمت کرو تو تمہاری طرف سے احسان ہو گا۔

قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَى أَنْ
تَأْجُرَنِي ثَمَنِي حَبِيبٌ فَإِنْ أَتَمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَإِن مَّا أُرِيدُ أَنْ
أَسْأَلَكَ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۱﴾

”اس کے باپ نے (موسیٰ سے) کہا ”میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو“ اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری مرضی ہے۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم ان شاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔“

یوں نہایت ہی سادگی اور بے تکلفی سے اس شخص نے اپنی دو بیٹیوں میں ایک حضرت موسیٰ کے عقد میں دینے کے لیے خود پیش کش کر دی۔ شاید یہ وہی لڑکی تھی جس نے تجویز دی تھی اور اس کے اور موسیٰ علیہ السلام کے قلوب کا میلان ایک دوسرے کی طرف تھا۔ اس شخص نے بے تکلفی سے اور براہ راست پیش کش صراحت کے ساتھ کر دی۔ کیونکہ یہ پیش کش عقد کے لیے تھی۔ لہذا اس میں حجاب محسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ پیش کش اس لیے تھی کہ ایک نیا خاندان وجود میں آجائے۔ اس شخص نے تکلف اور کنایہ و اشارہ میں بات کرنے کا تکلف نہیں کیا۔ ایسے تکلفات اور بناوٹیں ان معاشرہ میں ہوتی ہیں جن میں فطرت سے انحراف پیدا ہو جاتا ہے اور ایسے معاشرے نہایت ہی باطل، گندی رسومات اور تکلفات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان نکسعات کی وجہ سے والد یا سرپرست کسی بچی کو کسی کے عقد میں دینے کے لیے بھی صاف صاف پیش کش نہیں کرتا، حالانکہ دل سے وہ کئی لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ بھی طرح سمجھتا ہے کہ فلاں رشتہ اس کی بہن بیٹی اور رشتہ دار کے لیے بہت مفید ہے، لیکن لوگ انتظار کرتے ہیں کہ خاوند اس کے وکیل یا اس کے سرپرست کی طرف سے کوئی پیش کش ہو، بالعموم یہ تصور کیا جاتا ہے کہ عورت کی جانب سے پیش کش مناسب نہیں ہے۔

لیکن ایسی غیر فطری اور سڑی ہوئی سوسائٹیوں کے تضادات میں سے ایک تضاد یہ ہے کہ نوجوان لڑکے ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھتے ہیں۔ آزادانہ گپ شپ لگاتے ہیں، آزادانہ اختلاط اور باہم انکشاف کے روادار ہوتے ہیں لیکن نکاح اور عقد کی پیش کش کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جب نکاح کی پیش کش ہوتی ہے تو اس وقت بھی مصنوعی حجاب اور پردہ دہری شروع ہو جاتی ہے اور لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت چھوڑ دیتے ہیں بلکہ پردہ شروع ہو جاتا ہے۔ غرض نکاح کی پیش کش میں فطری بے تکلفی نہیں ہوتی حالانکہ اس میں سادگی اور کھلا پن ہونا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں باپ صاف صاف اپنی لڑکیوں کا رشتہ پیش کرتے تھے بلکہ عورتیں بھی اپنے آپ کو پیش کرتی تھیں۔ عورتیں اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے کی پیش کش کرتی تھیں یا ان لوگوں کو بے تکلف پیش کش کرتی تھیں جو ان کے ساتھ نکاح میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ معاملہ نہایت سادگی اور عطاویہ اور بے تکلفی اور کھلے پن سے طے ہو جاتا۔ اور اس کے لیے کوئی مخصوص آداب و تکلفات نہ تھے۔ نہ اس طرح پیش کش سے کسی کی عزت اور شرافت میں فرق آتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی حفصہ کی پیش کش حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کی تو وہ خاموش ہو گئے۔ پھر انہوں نے حضرت عثمانؓ کو کی تو انہوں نے معذرت کی۔ جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ انہوں نے ایسا کیا ہے تو حضورؐ بہت خوش ہوئے اور فرمایا ہو سکتا ہے کہ اسے ایسا رشتہ مل جائے جو ان دونوں سے بہتر ہو۔ اس کے بعد حضور اکرمؐ نے خود ان کے ساتھ نکاح کر لیا۔ ایک دوسری عورت نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیش کیا تو آپؐ نے معذرت کی۔ پھر اس عورت نے اپنے نکاح کا اختیار حضورؐ کو دے دیا۔ حضورؐ نے اس کا نکاح ایک ایسے شخص سے کر دیا جس کے پاس قرآن کی دو سورتیں تھیں۔ حضورؐ نے اس عورت کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا اور ان دو سورتوں کو اس کا مہر قرار دیا۔

--- ۰۰۰ ---

یہ تھی وہ سادگی جس کے ساتھ اسلامی معاشرے میں خاندان بن رہے تھے اور اس طرح ایک اسلامی سوسائٹی وجود میں آرہی تھی۔ اس معاملے میں ان کے ہاں کوئی اشارہ، کنایہ، تکلف اور تصنع اور ٹیڑھ نہ تھی۔ مدین کے اس بوڑھے نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے خود موسیٰ علیہ السلام کو یہ پیش کش کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اس عرصے میں وہ ان پر کوئی سختی نہ کرے گا۔ اور ان کی وسعت سے زیادہ کام نہ لے گا۔ اور وہ یہ امید کرتا ہے کہ تم ایک صالح نوجوان کا کردار ادا کرو گے۔ اور ہمارے معاملات صحت و صفائی کے ساتھ چلیں گے۔ یہ نہایت ہی خوبصورت اور سادہ آداب ہیں۔ وہ نہ اپنے آپ کو آسمانوں پر چڑھاتے ہیں اور پاکی داناں کی حکایات کرتے ہیں اور نہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تعریف اور مدح سرلی کرتے ہیں۔ پس صرف خیر کی امید رکھتے ہیں۔ اور تمام معاملات اللہ کی مشیت کے سپرد کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ نے بھی اسی سادگی، صداقت اور بے تکلفی سے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور اس پر اللہ ہی کو گواہ ٹھہرا کیونکہ وہاں اللہ کے سوا ان کا گواہ تھا کون؟

قَالَ ذَلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ

ع ۴ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿۲۸﴾

”موسیٰ نے جواب دیا ”یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو چکی۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی پوری کر دوں اس کے بعد پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو“ اور جو کچھ قول قرار ہم کر رہے ہیں، اللہ اس پر نگہبان ہے۔“

جب دو افراد باہم معاہدہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی بات پیچیدہ نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہی بات کو جمل چھوڑنا چاہئے۔ نہ اس موقع پر بات چھپانا چاہئے بلکہ بات کھل کر ہونی چاہئے۔ عقد کے موقع پر کسی بات کی وضاحت کرنے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ اس پیش کش کو مان لیتے ہیں اور نکاح کر لیتے ہیں۔ اس بوڑھے نے جو مشروط پیشکش کی اس کے متعلق حضرت موسیٰ یہ وضاحت کرتے ہیں ان دو میعادوں میں سے جو بھی وہ چاہیں پورا کریں۔

أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ (۲۸: ۲۸) ”دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کروں اس کے بعد کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہوگی۔“ چاہے میں آٹھ سال رہوں یا دس سال پورے کر دوں۔ لیکن کام کے فرائض میں زیادتی نہ ہوگی۔ یعنی آٹھ کے بعد دو سال کا جو اضافہ ہے وہ اختیاری ہے اور ہمارے اس معاہدے پر اللہ گواہ ہے کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے اور معاہدہ کرنے والے دونوں فریقوں پر اللہ گواہ ہوتا ہے اور وہ کافی گواہ ہے۔

حضرت موسیٰ نے یہ بیان اپنی فطرت کے عین مطابق دیا۔ وہ نہایت ہی سیدھی اور کھلی طبیعت کے مالک تھے۔ انہوں نے دس سال پورے کرنے کے بارے میں جو صاف صاف اختیاری ہونے کی شرط کی وضاحت کی وہ اس لیے کہ معاہدہ کرنے والے فریقوں کا فرض ہے کہ وہ صاف صاف بات کریں۔ حالانکہ ان کی نیت یہ تھی کہ وہ ان دو میعادوں میں سے لمبی معیار پر عمل کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لمبی اور

زیادہ طویل مدت پوری کی (بخاری)۔

یوں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے سر کے گھر میں نہایت عزت اور احترام سے رہے۔ وہ فرعون اور اس کی سازشوں سے مامون و محفوظ ہو گئے۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا اللہ کی عین حکمت کے مطابق ہو رہا تھا۔ اب یہ دس سال کیسے گزرے اسے چھوڑ دیجئے۔ ہمارے قصے میں ان کی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن نے ان کے مناظر کو کاٹ دیا ہے اور خاموش ہے۔ پردہ کرتا ہے۔

غرض یہ دس سال گزر گئے جن پر فریقین کے درمیان عقد ہوا تھا۔ اس سورت میں ان کے بارے میں کچھ مذکور نہیں ہے۔ اب اگلے منظر میں حضرت موسیٰ دس سال کی میعاد پوری کر کے جانب مصر واپس نظر آتے ہیں۔ یہ مدین کو چھوڑ کر اب مصر لوٹ رہے ہیں۔ یہ انہی راہوں پر واپس جا رہے ہیں جن پر وہ اکیلے آئے تھے 'ارے اور سے ہوئے۔ لیکن اب ان کی واپسی کی فضائی نہیں جس طرح ان کے فرار کی فضا تھی۔ وہ لوٹ رہے تھے لیکن اٹائے راہ وہ جن تجربات سے دوچار ہونے والے تھے ان کا خواب خیال بھی ان کے ذہن میں نہیں ہے 'یہ کہ رب تعالیٰ انہیں پکارے گا۔ اب وہ موسیٰ کلیم اللہ ہو جائیں گے اور رب وہ مشن ان کے سپرد ہو جائے گا جس کے لیے اللہ نے انہیں اپنی نظروں میں پیسے رکھا۔ تربیت اور پرورش کی۔ یہ مشن کیا تھا فرعون جیسے جبار اور اس کے سرداروں کے سامنے کلمہ حق کا بلند کرنا۔ اور کلمہ بھی یہ کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دو کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے رب کی بندگی کریں اور رب تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور وہ اس سرزمین کو آزاد کریں جس کے بارے میں اللہ نے ان کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے اور یہ کہ حضرت موسیٰ فرعون ہامان اور ان کے حواریوں کے لیے دشمن ہوں اور ان کے لیے باعث پریشانی ہوں۔ تاکہ ان دونوں کا انجام حضرت موسیٰ کے ہاتھوں سے ہو کیونکہ یہ اللہ کا سچا وعدہ تھا۔

فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ نَارًا ۚ قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا تَلْعَلْ أَتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ﴿١٠﴾ فَلَمَّا أَشْهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يُمُوسَى إِنِّي أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿١١﴾ وَأَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّى مُدْبِرًا وَلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يَمُوسَى أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِينَ ﴿١٢﴾ أَسْلَكَ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخَرُّجَ بَيْضَةٍ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ ۚ وَاضْمُمُ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ ۚ فَذَكَ بُرْهَانٍ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ ﴿١٣﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي قَتَلْتُ

مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَقْتُلُونِ ﴿۸۱﴾ وَاَخِي هَارُونُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّي لِسًا
فَاَرْسَلَهُ مَعِيَ رِدْآءً يُصَدِّقُنِي ۚ اِنِّي اَخَافُ اَنْ يُكَذِّبُونِ ﴿۸۲﴾ قَالَ سَنُنْصِرُ
عَصَدَكَ بِاَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكَمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ اِلَيْكُمَا ۚ بَايْتِنَا ۚ اِنَّمَا
وَمِنْ اَتْبَعَكُمَا الْغٰلِبُونَ ﴿۸۳﴾

”جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور وہ اپنے لعل و عیال کو لے کر چلا تو طور کی جانب اس کو ایک آگ نظر آئی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا ”نہرو“ میں نے ایک آگ دیکھی ہے شاید میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارہ ہی اٹھاؤں جس سے تم تپ سکو۔“ وہاں پہنچا تو وادی کے دہنے کنارے پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ ”اے موسیٰ میں ہی اللہ ہوں سارے جہاں والوں کا مالک۔“ اور (حکم دیا گیا کہ) پھینک دے اپنی لاشی۔ جوں ہی کہ موسیٰ نے دیکھا کہ وہ لاشی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو وہ بیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (ارشاد ہوا) ”موسیٰ پلٹ آؤ اور خوف نہ کرو“ تو بالکل محفوظ ہے۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال چکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے اور خوف سے بچنے کے لیے اپنا بازو بھیج لے۔ یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ بڑے نازبان لوگ ہیں۔“ موسیٰ نے عرض کیا ”میرے آقا میں تو ان کا ایک آدمی قل کر چکا ہوں ذرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے اتے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔“ فرمایا ”ہم تیرے بھائی کے ذریعہ سے تیرا ہاتھ مضبوط کرس گے اور تم دونوں کو ایسی سعادت بخشیں گے کہ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہماری نشانیاں کے زور سے قلبہ تمہارا اور تمہارے پیروؤں کا ہی ہو گا۔“

قبل اس کے کہ ہم اس حلقے کے ان دو مناظر پر تفصیلی گفتگو کریں ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ ان دس سالوں کے وقفے میں اللہ نے حضرت موسیٰ کے حوالے سے کیا تبدیلیاں اختیار کیں اور کیا اقدامات کیے۔ اس سفر اور آنے جانے میں کیا حکمت تھی۔

دست قدرت کو یوں منظور تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایک قدم آگے بڑھتے جائیں۔ یعنی اس وقت سے لے کر جب وہ شیرخوار بچہ تھے ان کی موجودہ پوزیشن تک ان کے ساتھ دست قدرت کا معاملہ کیا رہا۔ ان کو دریا میں پھینکا گیا تاکہ فرعون کے لوگ اسے پکڑ لیں۔ ان کو دیکھ کر فرعون کی بیوی ان پر فریفتہ ہو گئی یا کر دی گئی کہ وہ عین شاہی محل میں پرورش پائیں دشمن کے گھر میں ملیں۔ پھر وہ لوگوں کی غفلت کے وقت شرمیں داخل ہوئے اور ایک آدمی ان کے ہاتھوں مر گیا۔ پھر ان کے پاس فرعون کے حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص کو بھیجا گیا کہ نکلو تمہارے قتل کی تہ لہیر ہو رہی ہیں یہ تائیدی ایڑی مصر اور مدین تک کے صحرائی سفر میں اس کے ساتھ رہی جبکہ ان کے پاس کوئی زاد و غنا نہ تھا۔ اور پھر مدین کے کنوئیں پر ان کی ملاقات دختران شیخ سے کرادی گئی اور اس بہترین مرلی اور بوڑھے کے ساتھ ان کا دس سالہ معاہدہ ہو گیا اور جب وہاں سے واپس ہوئے تو طور پر ان کو عظیم مشن سپرد کیا گیا۔

مشن سپرد کرنے کی نداشت قبل ان پر خدا کا طویل فضل و کرم ہوتا رہا، ان کو تلقین ہوتی رہی اور تمام آسمانی قوتیں ان کی تائید میں بڑھتی رہیں۔ اور ان کو زندگی کے مختلف تجربات سے دوچار کیا جاتا رہا۔ مریانی، محبت اور راہنمائی کا تجربہ، حالات کے دباؤ میں آکر انتہائی اقدام کرنے کا تجربہ، نادم ہونے، احتیاط کرنے اور غلطی پر استغفار کرنے کا تجربہ۔ اور تعاقب اور پریشانی کا تجربہ، تنہائی، مسافری اور بھوک و افلاس کا تجربہ اور دوسروں کی خدمت کرنے اور بکریاں تک چرانے کا تجربہ اور ان بڑے بڑے تجربوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے روز مرہ کے تجربات، دلی احساسات، مختلف قسم کے تصورات و خیالات، نئی نئی دریافتیں اور معلومات۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ اللہ نے جو ان ہوتے ہی ان کو علم و حکمت سے نوازا لیا تھا۔ (ایک شاہزادے کی حیثیت سے نکال کر یہ تجربات کرائے گئے)

حقیقت یہ ہے کہ منصب رسالت ایک ایسا فریضہ اور ایک ایسی عظیم ذمہ داری ہوتی ہے جس کے متعدد پہلو ہوتے ہیں اور گونا گوں ذمہ داریاں نبی اور رسول پر آن پڑتی ہیں۔ لہذا نبی کو علم و فضل، حکمت و دانائی اور زندگی کے مختلف تجربات اور مختلف لوگوں کی عملی زندگی کا ادراک کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ عملی تجربہ اس لغوی علم و حکمت اور وحی الہی سے الگ ہوتا ہے جو ہر نبی کو کرایا جاتا ہے، تاکہ نبی کا ضمیر پاک و صاف ہو جائے اور ہدایت نبی کے قلب میں بٹھا دی جائے۔

رسولوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام انبیاء کو سپرد کئے جانے والے مشنوں میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذمہ داریاں بہت بھاری اور مشکل ذمہ داری تھی۔ ان کو فرعون جیسے سرکش اور جبار و قہار حکمران کے سامنے جانا تھا۔ یہ اپنے دور کے بادشاہوں میں سے بڑا اور مالدار بادشاہ تھا۔ قدیم شاہی سلسلے کا مالک تھا۔ حکومت نہایت مستحکم تھی اور تمدن کے لحاظ سے مصر اس وقت ترقی یافتہ تھا۔ اس نے تمام پسپائی ہوئی اقوام کو غلام بنا رکھا تھا اور زمین کے اوپر اس کو مقام بلند حاصل تھا۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ایسی قوم کی آزادی اور ہجرت کے لیے بھیجا گیا تھا جس کے دل و دماغ میں غلامی رچ بس گئی تھی۔ وہ غلامانہ زندگی کے عادی ہو گئے تھے اور ان کا ضمیر پوری طرح بدل گیا تھا۔ وہ عملاً ایک طویل زمانے تک غلام رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ غلامی انسانی فطرت کو بگاڑ دیتی ہے۔ اس کے اندر قہقن اور سڑاند پیدا ہو جاتی ہے اور اس قوم کے احساسات سے گندگی اور قہقن اور سڑاند کا احساس ہی جاتا رہتا ہے۔ بھائی، خیر اور جمال اور برتری اس کو اس ہی نہیں آتی۔ اس طرح کی مجبوری ہوئی قوم کو اٹھانا معنی دار ہے۔

آپ کو ایسی قوم کی طرف بھیجا گیا جو قدیم زمانہ سے اسلامی نظریہ کی حامل تھی لیکن اس کے اندر نظریاتی انحراف پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے دل و دماغ میں اس کی اصل حقیقی صورت وہ نہ رہی تھی۔ نہ یہ قوم پرانے اسلامی عقیدہ اور شریعت پر قائم تھی اور نہ جدید عقیدے کو صحیح طرح قبول کر رہی تھی۔ اس قسم کے لوگوں کی اصلاح کرنا بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے۔ ان کے اندر پائے جانے والی سچی کو درست کرنا، ان کے انحراف کو سپرد ہا کرنا اور ان کے اصل عقائد کے اوپر سے خرافات کی گہری تہوں کو پھٹانا اس ہمہ گیر مشکل ترین باتیں تھیں۔

مختصراً یہ کہ حضرت موسیٰ نے بالکل ایک نئی امت کی تعمیر کرنا تھی۔ بالکل نئے۔۔۔ پہلی مرتبہ نئی اسرائیل کو ایک خاص قوم، ایک خاص نظام کی حامل قوم اور ایک خاص رسالت کی حامل امت بنانا تھا اور ظاہر ہے کہ کسی قوم اور

امت کی تعمیر ایک نہایت ہی مشکل کام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کو بار بار دہرایا ہے۔ اس لیے کہ ایک نظریہ کی اساس پر کسی نئی امت کی تعمیر کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ایک مخصوص نمونہ تھی۔ ایسے عظیم کام کی راہ میں، اعلیٰ اور خارجی مشکلات ہوتی ہیں۔ ایسی ہمہ گیر دعوتوں میں کبھی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ وہ مخصوص شکل بھی اختیار کر لیتی ہے اور اسے بہت سے تجربات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اور راستے میں مشکلات بھی آتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین کی بددیانہ زندگی سے کیوں گزارا گیا تو یہ اس لیے تاکہ وہ عوام الناس کی پر مشقت زندگی کے نشیب و فراز بھی جان لیں اور براہ راست تجربہ بھی حاصل کر لیں۔

شاید محلات کی زندگی کی ایک مخصوص فضا ہوتی ہے، مخصوص آداب اور پروٹوکول ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اعلیٰ درجے کا سلیم الفطرت، پاک طینت اور صاحب علم و فضل کیوں نہ ہو، محلات کی زندگی کی پرچھائیں اس پر ضرور پڑتی ہے۔ اور اس کے کچھ نہ کچھ اثرات ضرور رہ جاتے ہیں جہاں تک رسالت کا تعلق ہے اس میں ایک رسول کا واسطہ غنی سے بھی پڑتا ہے اور فقیرت بھی۔ امت میں، لہذا، رہ بھی ہوتے ہیں اور فقراء بھی ہوتے ہیں۔ اس میں صاف ستھرے بھی ہوتے ہیں اور میل کچیل و اب بھی ہوتے ہیں، مہذب بھی ہوتے ہیں اور وحشی بھی ہوتے ہیں۔ پاک فطرت بھی ہوتے ہیں اور خبیث الفطرت بھی ہوتے ہیں۔ لچھے بھی اور برے بھی، قوی بھی اور ضعیف بھی۔ صابر بھی اور جزع و فزع کرنے والے بھی۔ غرض امت میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور نبی نے سب کی اصلاح کرنی ہوتی ہے۔ فقراء لوگوں کے کھانے پینے، چلنے پھرنے اور لباس کی الگ عادات ہوتی ہیں۔ وہ معاملات کو اپنے ذہن کے مطابق سمجھتے ہیں۔ ان کے سامنے زندگی کا ایک مخصوص تصور ہوتا ہے، ان کی بات چیت ان کی حرکات و سکنات، ان کا کلام اور ان کے شعور کا اپنا مخصوص انداز ہوتا ہے۔ یہ عوامی عادات ان لوگوں پر بہت بھاری ہوتی ہیں، جنہوں نے محلات میں تربیت پائی ہوئی ہوتی ہے۔ اونچے محلات کے لوگ، ان کے عوامی انداز کو دیکھنے کے روبرو بھی نہیں ہوتے، چہ جائیکہ وہ انہیں برداشت کرس اور ان کا علاج کرس۔ اگرچہ ان عامی لوگوں کے دل بھلائی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور وہ اصلاح پذیر ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ظاہری رنگ، صنگ، ان کی ظاہری عادات، اونچے محلات والے کو نہیں بچتے۔

ایک رسول کو بعض اوقات مشقتوں، تنہائیوں اور تنگ دستیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو بڑے بڑے محلات میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کے اندر قربانی دینے کا بے پناہ جذبہ کیوں نہ ہو، وہ بہت طویل عرصے تک تنگ دستی، محرومی اور عملی زندگی میں مشقتوں کو برداشت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ محلات کے اندر پر تعیش، فراوانی اور آرام طلبی کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کو محلات کے اس اعلیٰ معیار کی زندگی سے ذرا نیچے لا کر عوامی زندگی کی سطح تک اتارا جائے۔ انہیں چرواہوں کی سوسائٹی کے اندر ڈال دیا جائے اور خوف، تعاقب اور پکڑے جانے کے ذریعے فرار کے بعد ایک چرواہے کی زندگی گزارنے کا عادی بنایا جائے جہاں انہیں صرف کھانا اور ٹھکانا ملتا ہے تاکہ شہزادوں کے مزاج میں غربت اور غرباء سے جو کچھا ہوتا ہے وہ دور ہو جائے۔ چرواہوں کی عادات، ان کے اخلاق، ان کی درشتی اور ان کی سادگی کے بارے میں شہزادوں کے اندر جو ناگواری پائی جاتی ہے وہ دور ہو جائے۔ ان کی جہالت،

غربت 'بد حالی اور مجموعی طور طریقوں سے حضرت موسیٰ شنوارہ اپنے آپ کو بلند اور دور نہ سمجھیں ' اور اس لیے کہ ان کو عوامی زندگی کے گرم سمندروں کے اندر ڈال دیا جائے جبکہ پہلے وہ انسانی زندگی کے ایک محدود دھارے کے اندر تیرتے رہے تھے تاکہ آنے والی دہلیز زندگی کے لیے وہ اچھی طرح تیار ہو جائیں۔

جب موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت نے یہ تجربے مکمل کر لیے اور وہ عوامی زندگی کے نشیب و فراز خوب واقف ہو گئے اور یہ تجربات انہیں ایک غریب العید اجنبی کی حیثیت سے دوسرے علاقے میں رہ کر ہونے تو دست قدرت نے انہیں پھر اپنی جائے پیدائش کی طرف روانہ کیا۔ جہاں ان کے اہل و عیال اور ان کی قوم رہتی تھی۔ اور جہاں انہوں نے مشکل ترین فریضہ رسالت ادا کرنا تھا اب وہ اسی راہ پر چل رہے ہیں۔ اس سے وہ بھاگے تھے اور بالکل یکہ دستا بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ سوال یہ ہے کہ اس ایک ہی راستے پر وہ کیوں آئے اور واپس ہوئے؟ یہ دراصل ایک جنگی مشق تھی انہیں اس راستے کے خیب و فراز اور راہ و گھاٹ سے خبردار کرنا مطلوب تھا۔ کیونکہ قدرت نے طے کر رکھا تھا کہ عنقریب اسی راستے سے موسیٰ نے اپنی قوم کی قیادت کرتے ہوئے سینائی میں داخل ہونا ہے۔ یہ دراصل ہراوس دسے اور رہبر کی مشق تھی تاکہ حضرت موسیٰ کو خود اپنے سوا کسی اور راہنما کی ضرورت نہ پڑے ' راستہ بتلانے والے کی بھی۔ کیونکہ ان کی قوم ایسی حالت میں جاگ رہی تھی کہ انہیں چھوٹے بڑے سب کاموں میں راہنمائی کی ضرورت تھی اس لیے کہ 'دلت' غلامی اور ماتحتی نے انہیں پوری طرح بگاڑ رکھ دیا تھا۔ ان کے اندر کوئی تدبیر اور کوئی سوچ نہ رہی تھی۔

اب مظلوم ہو گیا کہ قدرت اب کس طرح اپنی نظروں کے نیچے حضرت موسیٰ کی تربیت کر رہی تھی اور ان کو فریضہ رسالت کی ادائیگی کے لیے کس طرح اچھی تربیت دی گئی۔ اب درادیکھئے کہ حضرت موسیٰ نے واپسی کا سفر کس طرح طے کیا؟

فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَىٰ الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ نَارًا قَالَ رَهْهُ
امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا أَلْعَلِّي آتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ

(۲۸: ۲۹) ”جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر چلا تو طور کی جانب اس کو ایک آگ نظر آئی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا ”نہرو“ میں نے ایک آگ دیکھی ہے ' شاید میں وہاں سے کوئی خبرے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارہ ہی اٹھا لاؤں جس سے تم تپ سکو۔“

یہاں یہ ایک اہم سوال ہے کہ وہ کیا سوچ تھی جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر و مٹے پر آمادہ کیا۔ مدین میں انہوں نے عرصہ کار پورا کر دیا۔ اب وہ مصر لوٹ رہے ہیں حالانکہ وہ مصر سے نہایت ہی خوف کی حالت میں نکلے تھے۔ ان کو تعاقب کا ڈر تھا۔ وہ یوں واپس ہو رہے تھے کہ شاید وہ اس خطرے کو بھول گئے ہیں جو مصر میں اب بھی ان کو درپیش ہے۔ وہاں انہوں نے ایک آدمی کو قتل کیا ہوا ہے ' فرعون ابھی زندہ ہے جو اپنے سرداروں کے ساتھ آپ کے قتل کا مشاورت کر رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ عالم ہاما کی اپنی سکیم کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس بار شاید اہل و عیال کو رقوم اور وطن

کے لیے فطری مسلمان انہیں واپسی پر مجبور کر رہا ہے اور ان کے دل سے وہ خطرات اب محو ہو گئے جن کی بنا پر اس نے یکہ و تھامیاں سے فرار اختیار کیا تھا۔ اور یہ دست قدرت اس لیے کر رہا ہے کہ وہ اس مہم اور منصب کے لیے تیار ہو جائیں جس کے لیے اللہ نے ان کو اول روز پیدا کیا ہے۔

بہر حال وجہ جو بھی ہو، حضرت موسیٰ واپس ہو رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے لیل و عیال بھی ہیں۔ رات کا وقت ہے، سخت اندھیرا ہے۔ یہ قافلہ راستے سے بھٹک گیا ہے۔ سردیوں کا موسم ہے۔ اس لیے کہ آگ دیکھ کر وہ وہاں سے آگ لانے کے لیے جا رہے ہیں۔ متصد یہ ہے کہ آگ کے پاس جو کوئی ہو گا یا تو راستہ بتا دے گا ورنہ وہ ایک انگارہ لے آئیں گے تاکہ تپ سکیں۔ یہ اس نیت کا پہلا منظر ہے۔
دوسرا منظر نہایت غیر متوقع ہے۔

فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ

(۳۰: ۲۸) ”وہاں پہنچا تو وادی کے دائیں کنارے پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا۔“ حضرت موسیٰ تو دیکھ رہے ہیں کہ آگ ہے اور یہ وادی طور میں ان کے دائیں جانب ہے۔ اور یہ جگہ نہایت ہی متبرک ہے، اور یہ وادی بھی آج ہی متبرک ہو رہی ہے، پوری کائنات لہ بھر کے لیے خاموش ہے اور اس کے اندر عالم بالا اور رب ذو الجلال کی یہ آواز گونج رہی ہے، بظاہر کانوں پر وہ ایک درخت مبارک سے آرہی ہے اور شاید یہ اس علاقے میں واحد درخت ہے۔

أَنْ يَمُوسَىٰ إِنَّي أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (۳۰: ۲۸) ”اے موسیٰ میں اللہ ہوں سارے جہانوں کا مالک۔“ حضرت موسیٰ نے اس آواز کو براہ راست سنا۔ اس گہری اور خاموش وادی میں وہ اکیلے کھڑے تھے۔ نہایت ہی تاریک اور خاموش رات میں۔ یہ آواز پوری کائنات بھی ہر طرف سے اس آواز کو سن رہی تھی، زمین اور آسمانوں کی دوریوں اور بلندیوں میں یہ آواز گونج رہی تھی۔ حضرت موسیٰ نے اس آواز کو پایا، کس ذریعہ سے پایا، کس طرح سے سنا، یہ ہمیں معلوم نہیں، البتہ حضرت موسیٰ کی ذات اور ان ماحول اور پوری کائنات اس سے گونج رہی تھی اور بھری ہوئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے رب کائنات کی آواز کو پایا اور اس کے متحمل ہو گئے، کیونکہ ان کو اس کے لیے تیار کر دیا گیا تھا۔

اس کائنات کے ضمیر نے اس آواز کو ریکارڈ کر لیا، جہاں اس آواز کو حضرت موسیٰ نے پایا، وہ جگہ بابرکت ہو گئی۔ یہ جگہ لب مکرم ہو گئی اور حضرت موسیٰ اب نہایت ہی بابرکت اور مکرم جگہ میں کھڑے تھے اور یہ آواز ابھی ختم نہیں ہوئی، مکالمہ جاری ہے۔

الْق عَصَاكَ (۳۱: ۲۸) ”پھینک دے اپنی لاٹھی۔“ حضرت موسیٰ نے باری تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے فوراً لاٹھی پھینک دی۔ دیکھتے کیا ہیں؟ وہ تو اب ان کی وہ لاٹھی نہیں ہے جو ان کے ساتھ ایک عرصہ تک رہی

اور جس کو وہ یقیناً جانتے تھے کہ یہ ایک عصا ہے۔ عصا نہیں اب تو وہ ایک سانپ ہے جو زمین پر ریگ رہا ہے۔ بڑی تیزی سے ادھر ادھر جا رہا ہے اور یہ اس طرح کر دیش بدل رہا ہے جس طرح چھوٹے چھوٹے سانپ بدلتے ہیں حالانکہ یہ ہمت ہی بڑا سانپ نظر آتا ہے

فَلَمَّا رَاَهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّى مُدْبِرًا وَلَمْ يُعَقِّبْ (۲۸: ۳۱) ”جو موسیٰ نے دیکھا کہ وہ لاشی سانپ کی طرح بل کھ رہی ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔“ اس لیے کہ یہ نہایت ہی غیر متوقع صورت حال تھی اس کے لیے وہ ذہناً تیار نہ تھے پھر آپ کا مزاج بھی انفعالی تھا۔ آپ پر ہر صورت حال کا جلد اثر ہو جاتا تھا۔ آپ اس طرح بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ یہ سانپ ان کی طرف بڑھ بھی رہا ہے یا نہیں تاکہ وہ معلوم کرتے کہ یہ عجیب معجزہ ہے اور اس پر کچھ غور کرتے۔ جو لوگ بھی جلد متاثر ہو جاتے ہیں ان کی روش اسی طرح ہوتی ہے۔ ندائے ربانی جاری ہے۔

يَمُوسَىٰ أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِينَ (۲۸: ۳۱) ”موسیٰ! پلٹ آ اور خوف نہ کر تو بالکل محفوظ ہے۔“ موسیٰ علیہ السلام کے لیے خوف اور امن کے یہ تجربے کوئی نئے نہ تھے۔ ان کی زندگی کے مختلف مراحل میں خوف اور امن کے چکروں پر مشتمل ہیں۔ خوف اور امن ان کی پوری زندگی کے موسم ہیں۔ آغاز سے انجام تک اور موسیٰ علیہ السلام کا یوں متاثر ہو جانا بھی حکمت خداوندی پر مبنی اور مطلوب و مقصود تھا۔ ان کی زندگی میں اسی طرح مقدر تھا کیونکہ حضرت موسیٰ کی زندگی میں یہ زیر و بم اور یہ اضطراب اور یہ غلاطم بنی اسرائیل کی جلد تقلیدی اور رکی ہوئی زندگی کے بالمقابل تصداید کیا گیا تھا۔ یہ قدرت کی تقدیر تھی اور قدرت کی گہری حکمت اور تدبیر پر مبنی تھی۔

أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِينَ (۲۸: ۳۱) ”واپس آ جاؤ اور ارد نہیں تم محفوظ ہو۔“ کس طرح وہ محفوظ نہ ہو گا جسے دست قدرت آگے بڑھا رہا ہو اور جس کی نگرانی اللہ تعالیٰ خود کر رہا ہو۔ ابھی مکالمہ جاری ہے۔

أَبْسَلْكَ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجُ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ (۲۸: ۳۲) ”اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال چکے ہو اٹکے گا بغیر کسی تکلیف کے۔“ حضرت موسیٰ نے حکم کی اطاعت فرمائی اور اپنے ہاتھ کو گریبان میں ڈالا اور نکال۔ یہ ان کے لیے اسی وقت درد سرا غیر متوقع منظر تھا کہ ہاتھ سفید اور چمکدار ہے اور بغیر کسی بیماری کے ایسا ہے حالانکہ پہلے وہ گندم گوں تھا۔ ہاتھ کے سفید ہونے میں اشارہ اس طرف تھا کہ حق اور سچائی واضح اور صاف اور روشن دن کی طرح ہے۔

اب موسیٰ علیہ السلام جذباتی اور متاثر ہونے والی شخصیت نے اپنا کام دکھایا۔ وہ ان مناظر غیر متوقع مناظر کو دیکھ کر ڈر گئے اور کانپنے لگے۔ ایک بار پھر ربانی ہدایت براہ راست آتی ہے۔ حکم ہوتا کہ اپنے ہاتھوں کو اپنے بازوؤں کو بھیج لو اس طرح تمہارے دل کی دھڑکن کم ہوگی اور تمہیں پورا اطمینان ہو جائے گا۔

وَ اضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ (۲۸: ۳۲) ”اور خوف سے بچنے کے لیے اپنا بازو بھیج لو۔“ گویا ان کا ہاتھ ان کا پر ہے جسے وہ سینے کے ساتھ دے رہے ہیں جس طرح پرندہ مطمئن ہو کر پروں کو جسم سے جوڑ لیتا ہے۔ جب پرندہ پروں کے ساتھ پھڑپھڑاتا ہے تو اس کی کیفیت اس طرح ہوتی ہے جس طرح انسانی دل دھڑکتا ہے۔ اور جب وہ پروں کو جوڑتا ہے تو وہ اطمینان اور سکون کی کیفیت کے ساتھ مشابہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم یہاں اس مفہوم کی لکھی ہی تصویر کشی کرتا ہے :

اب موسیٰ علیہ السلام باری تعالیٰ کی طرف سے ہدایات پا چکے ہیں اور جو مشاہدات ان کو کرائے گئے وہ مشاہدہ وہ کر چکے ہیں۔ یہ دو نشانیاں اور معجزات تو وہ خود دیکھ چکے ہیں۔ پہلے وہ خود بھی خائف ہو گئے اور ان کا دل دھڑکنے لگا۔ پھر ان کو اطمینان دیا گیا۔ اب ان کو وہ اصل مشن پر دیکھا جاتا ہے جس کے لیے ان کو ابتدا سے آغاز پیدائش سے تربیت دی جا رہی ہے۔

فَذَلِكَ بُرْهَانُنَا مِنْ رَبِّكَ إِلَيْنَا فِرْعَوْنُ وَ مَلَائِهِ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ

(۲۸: ۳۲) ”یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔“

یہ پیغام گویا فرعون اور اس کے سرداروں کے لیے تھا۔ اور یہ اس وعدے کا ایفا ہوا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے ساتھ کیا گیا تھا کہ ”ہم اسے تیری طرف لوٹانے والے ہیں اور اسے مرسلین میں سے بنانے والے ہیں۔“ اور یہ پختہ وعدہ تھا کہ یہ سال گزر گئے کہ یہ طے ہوا تھا۔ لیکن یہ اللہ کا وعدہ تھا اور اللہ وعدہ خلافی نہیں فرمایا کرتا۔ وہ تو سب سے سچی بات کرنے والا ہے۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یاد آتا ہے کہ انہوں نے تو ان کا ایک آدمی قتل کیا ہے اور یہ کہ وہ ان سے اس وقت چلے گئے جب گرفتاری کا خطرہ تھا۔ اور اس لیے بھاگ گئے تھے کہ انہوں نے انہیں قتل کرنے کے مشورے شروع کر دیئے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کا رب تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ شروع تھا اور یہ عظیم اعزاز تھا جو انہیں بخش گیا۔ پھر ان کو دو عظیم معجزات کا اعزاز بھی بخش گیا۔ اور پھر اپنی نگرانی میں ان کی تربیت فرمائی۔ لہذا انہوں نے اپنے مشن کے سلسلے میں ایک عملی دشواری کی طرف سے خدشے کا اظہار کیا۔ یہ نہ ہو کہ وہ لوگ جھوٹے ہی انہیں قتل کر دیں اور دعوت کا سلسلہ ہی کٹ جائے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّي قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَانْخَافُ اَنْ يَقْتُلُونِ (۲۸: ۳۳) ”موسیٰ نے عرض کیا

میرے آقا میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔“ موسیٰ علیہ السلام منصب نبوت قبول کرنے سے معذرت نہ کر رہے تھے۔ نہ ان کا مقصد یہ تھا کہ پیچھے ہٹ جائیں یا منہ موڑ لیں اور نافرمانی کس بلکہ وہ یقین دہانی چاہتے تھے اور یہ اطمینان چاہتے تھے کہ دعوت کو جاری رہنا چاہیے۔ اور اگر وہ قتل ہو گئے جس طرح خدشہ ہے تو سلسلہ شروع ہی سے ختم ہو جائے گا۔ یہ ان کی جانب سے ایک مناسب بات بھی ہے حالانکہ وہ قوی اور اطمینان

تھے۔ ڈرنے والے نہ تھے۔

وَأَنجِي هَارُونَ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَلِّقُنِي إِنِّي أَخَافُ أَنْ

يُكَذِّبُون (۳۴۰۲۸) ”اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔“ ہارون مجھ سے زیادہ فصیح و بلیغ مقرر ہے اور دعوت کو اچھی طرح پیش کر سکتا ہے اسے میرے لیے تائید کنندہ کے طور پر بھیج دے تاکہ وہ میرے دعوائے رسالت کی تائید کرے اور اگر وہ مجھے قتل ہی کر دیں تو میرا غلینہ ہو۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو یقین دہانی کرائی جاتی ہے اور درخواست قبول کر لی جاتی ہے۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا بِأَيِّنَا أَنْتُمَا

وَمَنْ أَتَّبِعُكُمَا الْغَلْبُونَ (۳۵۰۲۸) ”نرمایا“ ہم تیرے بھائی کے ذریعہ سے تیرا ہاتھ مضبوط کرس گے اور تم دونوں کو ایسی سعادت بخشیں گے کہ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہماری نشانوں کے زور سے غلبہ تمہارا اور تمہارے پیروؤں کا ہی ہو گا۔ جو واقعات بھی رونما ہو رہے ہیں ان میں قدرت الہیہ کی معجزانہ قوتیں زیادہ واضح طور پر حضرت موسیٰ کے ساتھ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی اور غلبہ کے پیچھے صرف متعارف اسباب ہی نظر نہ آئیں بلکہ اس پر عالم بالا کی مشیت کا رنگ غالب ہو تاکہ لوگوں کے نظریات کے اندر محض مادی اسباب کے علاوہ آسمانی قوتوں کی مشیت بھی واضح طور پر اہمیت اختیار کر لے۔ لوگوں کو اللہ پر ایمان حاصل ہو اور وہ اللہ پر توکل کرس اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔

یہ جو بصورت اور عظیم منظر ختم ہو جاتا ہے اور زمان و مکان کے قاصطے لپیٹ دیئے جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام اب دربار فرعون میں ہیں۔ اللہ کی واضح آیات لیے ہوئے ہیں۔ اب ہدایت و ضلالت آنے سامنے ہیں۔ اس کے درمیان سخت مکالمہ شروع ہے۔ اور اس دنیا میں حق و باطل کی کشمکش کا فیصلہ یوں ہوتا ہے کہ باطل اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق ہو جاتا ہے۔ اور آخرت میں لازماً وہ لعنت کا مستحق ہو گا۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسَى بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَذَا

إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۖ وَقَالَ مُوسَى رَبِّيَ أَعْلَمُ بِمَنْ جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِنْدِيهِ وَمَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۖ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي ۚ فَأَوْقِدْ لِي يَهَامُنُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِّي

صَرَخًا لَّحَلٍّ أَظْلَعُ إِلَى إِلَهِ مُوسَى وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۖ وَاسْتَكَبَرَ
هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُم إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ۝
فَاخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۝
وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يَدْعُونَ إِلَى التَّارِيعِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ لَا يُنصَرُونَ ۝
۱۴ اتَّبَعْنَاهُمْ فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۖ وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ هُمْ مِنَ الْمَقْبُوحِينَ ۝

”پھر جب موسیٰ..... ان لوگوں کے پاس ہماری کھلی کھلی نشانیاں لے کر پہنچا تو انہوں نے کہا کہ ”یہ کچھ نہیں ہے مگر بتاؤنی جادو۔ اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں بھی سنی ہی نہیں“۔ موسیٰ نے جواب دیا ”میرا رب اس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہوتا ہے‘ حق یہ ہے کہ ظالم بھی نجات نہیں پاتے۔“

اور فرعون نے کہا ”اے لل دربار میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ ہاں ذرا ایشیے پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنا‘ شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں‘ میں تو ات جھوٹ سمجھتا ہوں۔“
اس نے اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اپنی بڑائی کا ٹھنڈہ کیا اور سمجھے کہ انہیں بھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اب دیکھ لو کہ ان ظالموں کا کیا انجام ہوا۔ ہم نے انہیں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیش رو بنا دیا اور قیامت کے روز وہ کس سے کوئی مدد نہ پا سکیں گے۔ ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے روز وہ بڑی قیامت میں مبتلا ہوں گے۔

یہاں قرآن کریم نے نہایت ہی جلدی میں فرعون کا انجام بتا دیا اور ایک فیصلہ کن دار کے نتیجے میں اس کا کام تمام ہو گیا۔ یہاں جو دوسروں کے مقابلے کو حذف کر دیا گیا ہے جبکہ دوسری سورتوں میں بعض جگہ اجمال اور بعض جگہ تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر ہوا ہے۔ یہ کڑی یہاں اس لیے حذف کر دی گئی ہے کہ تکذیب کے بعد جلد ہی ہدایت کا منظر پیش کر دیا جائے۔ اور نہ صرف یہ کہ دنیاوی عذاب کا ذکر ہو بلکہ آخرت کے عذاب کی ایک جھلک بھی دکھا دی جائے۔ اختصار اور جلدی کے ساتھ بات کو انجام پہنچانا اس سورت میں مقصود بالذات ہے۔ کیونکہ پوری سورت کا انداز یوں ہی ہے۔ اس سورت میں دست قدرت نمایاں طور پر متحرک نظر آتا ہے اس لیے یہاں بھی موسیٰ اور فرعون کے آمنے سامنے کے بعد جلد ہی فرعون کا انجام بد دکھا دیا گیا اور دست قدرت نے چشم زدن میں اس عظیم قوت کو ختم کر دیا اور تفصیلات بیان کرنے کے بجائے جلدی سے آخری جھلک دکھا دی۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهَذَا

فَبَايَأْنَا آلَ وَلِيِّنَ (۲۸: ۳۶) ”پھر جب موسیٰ ... ان لوگوں کے پاس ہماری کھلی کھلی نشانیاں لے کر پہنچا تو انہوں نے کہا کہ ”یہ کچھ نہیں ہے مگر جادوئی جادو۔ اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں بھی سنی ہیں۔“ یہ ایک ایسی سچائی کا انکار ہے جس کا کوئی جواب ان سے بن نہ پڑتا تھا اور تمام زمانوں میں حالمین حق کے ساتھ مکذبین نے یہی سلوک کیا ہے۔ جب وہ لا جواب ہو گئے تو ایسی باتیں کرتے رہے۔ ان کا دعویٰ یہ رہا ہے کہ یہ جادو ہے۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں ہے کہ یہ تو نئی بات ہے۔ اس قسم کی بات ہم نے بھی اپنے آبا سے نہیں سنی۔ یہ لوگ حضرت موسیٰ کے معجزات کے مقابلے میں کوئی حجت اور دلیل نہیں پاتے اور نہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں کوئی برہان پیش کرتے ہیں۔ وہ بس ایک مجمل بات کرتے ہیں جس سے نہ حق ثابت ہوتا ہے اور نہ باطل۔ نہ کوئی دعویٰ رد ہوتا ہے اور نہ ثابت ہوتا ہے۔ کیا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم نے یہ بات بھی نہیں سنی۔ یہ محض شک کا اظہار ہے اور اہل باطل ہمیشہ جب سچائی کو تسلیم نہیں کرتے تو وہ اسے مشکوک بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ ہر دور میں باطل کا یہی رویہ رہا۔ لہذا موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہاں بات مختصر کرتے ہوئے معاملہ کو اللہ کے حوالے کر دیا۔

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِنْدِهِ وَمَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ

اِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (۲۸: ۳۷) ”موسیٰ نے جواب دیا ”میرا رب اس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی ہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہوتا ہے‘ حق یہ ہے کہ ظالم بھی فلاح نہیں پاتے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہ نہایت ہی مہذب اور بالادب جواب ہے۔ یہ جواب بہت ہی واضح اور نصیحت آموز ہے لیکن اس میں کوئی تلخ اور اشارہ اور لہجہ نہیں ہے۔ یہ جواب پر اعتمادی کے ساتھ دیا گیا ہے اور حضرت موسیٰ کو پورا اطمینان ہے کہ حق و باطل کے اس مقابلے میں حق فلاح پائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو خوب معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ سچے ہیں اس لئے کہ وہ اللہ کی براہ راست ہدایت اور ہکالے کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اور اچھا انجام ان لوگوں کے لیے ہے جو ہدایت پر ہیں اور ظالم بھی فلاح نہیں پاتے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ اگرچہ بعض معاملات بظاہر یوں نظر آتے ہیں کہ حق کو کامیابی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے اور اسی سنت کے ساتھ حضرت موسیٰ بھی فرعون کے مقابلے میں اترے ہیں اور تمام انبیاء سنن الہیہ کے مطابق ہی کام کرتے ہیں۔

اب اس پر اطمینان‘ مہذبانہ اور معقول جواب کا جواب الجواب فرعون کیا دیتا ہے؟ محض دعویٰ سرکشی‘ کھیل اور مزاح اور غرور لالہالی پن اور سستی۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَهِ غَيْرِي فَأَوْقِدْ لِي يَهَا مِنْ عَلِي الطِّينِ فَاجْعَلْ لِّي صَرْحًا لَّعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَى إِلَهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ الْكَاذِبِينَ

(۲۸: ۳۸) ”اور فرعون نے کہا ”لے اہل دربار‘ میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ ہا مان‘ ذرا ایتھیں

پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔“

اے سردار ان مصر میں نہیں سمجھتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی حاکم و الہ ہے۔ فسق و سرکشی کا یہ بلند ترین رویہ ہے اور سردار ظاہر ہے کہ وہ اقرار کریں گے۔ اب وہ یہاں اس نظریہ کا سارا لیتا ہے جو اس دور میں مصر میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا کہ بادشاہوں کا نسب نامہ انہوں سے ملتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس جبر کا سارا بھی لیتا ہے جس کے مقابلے میں کوئی دماغ سوچتا نہیں اور کوئی شخص سر اٹھا کر نہیں چلا۔ اور کوئی زبان یہ جرات نہیں کرتی کہ کوئی اختلافی بات کرے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بادشاہ انہی جیسا ایک بشر ہے جو پیدا ہوتا ہے اور مرتا ہے لیکن ان اساطیر اور پھر جبر کی بنا پر وہ ایسا کہتا تھا اور یہ تسلیم کرتے تھے بغیر اعتراض اور تنقید کے۔

اب وہ ایک ایسی حرکت کرتا ہے جس سے بظاہر تو وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ فی الواقعہ حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ موسیٰ کے اہل کو وہ آسمانوں میں تلاش کرنے نکلا ہے لیکن دراصل وہ حضرت موسیٰ کے ساتھ ایک سنجیدہ مزاح کرتا ہے۔

فَاَوْقَدْ لِيَ فِيهَا مِنْ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا لَّعَلِّي اطَّلِعُ اِلَىٰ اِلٰهِ مُوسٰى

(۳۸:۲۸) ”اے ہامان‘ ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں۔“

موسیٰ کہتا ہے کہ اس کا الہ آسمانوں میں ہے۔ بخور مزاح وہ کہتا ہے کہ مجھے تو اس میں شک ہے لیکن اس شک کے باوجود میں حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

وَ اِنِّى لَاطْنُهُ مِنَ الْكَذٰبِيْنَ (۳۸:۲۸) ”میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔“

جس طرح دوسرے مقامات پر ہوا‘ یہاں حضرت موسیٰ اور جو دوسروں کا مقابلہ بھی ہوا۔ جس کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے۔

وَ اسْتَكْبَرُ هُوَ وَ جُنُودُهُ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُّوْا اَنَّهُمۡ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ

(۳۹:۲۸) ”اس نے اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اس بڑائی کا گھمنڈ کیا اور سمجھے کہ انہیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے۔“ جب ان کو یہ داہرہ ہو گیا کہ انہوں نے اللہ کی طرف نہیں پلٹنا تو انہوں نے زمین میں ناحق گھمنڈ شروع کر دیا۔ اور معجزات اور پیغمبروں کو جھٹلایا۔ وہ معجزات جن کی تفصیلات اس سے قبل گزر گئی ہیں اور دوسری سورتوں میں ان کا مظاہرہ مفصل دکھایا گیا ہے۔

فَاَحْزَنَهُ وَ جُنُودُهُ فَنَبَذْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ (۴۰:۲۸) ”آخر کار ہم نے اے اور اس کے لشکروں کو

پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا۔“ یہ نہایت ہی اختصار کے ساتھ لیکن فیصلہ کن انداز میں سخت پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا جانے جس طرح انسان کسی کنکر اور کسی پتھر کو سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ جس طرح موسیٰ کی والدہ نے شیرخوار موسیٰ کو فرعون کے در سے دریا میں پھینک دیا تھا اس طرح اسے اور اس کے لشکروں کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔ لیکن اس بچے کو اللہ نے بچا تا تھا تو بچ گیا اور فرعون اور اس کے لشکروں کو غرق کر تا تھا تو غرق ہو گئے۔ سمندر ان کے لیے باعث ہلاکت ہو گیا۔ لہذا ان دامن بھی اللہ کے ہاں ہے اور ذرا تا ہے تو اللہ ہی سے ذرا ناچاہنے کہ وہ ذرے کا مستحق ہے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ (۲۸: ۴۰) ”دیکھو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا؟“۔ یہ انجام وہ منظر نظر آتا ہے۔ تمام دنیا کے سامنے ہے۔ اس میں مکذبین کے لیے بھی عبرت ہے اور نصیحت پانے والوں کے لیے بھی عبرت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکش جباروں کو اللہ ہلاک کر تا چاہے تو چشم زدن میں نیست و نابود کر دیتا ہے نصف سطر لکھنے سے بھی پہلے۔

اگلے لمحے فرعون اور اس کا لشکر اس دنیا سے اس جہاں میں ہیں اور فرعون اور اس کا لشکر وہاں بھی ایک عجیب منظر میں نظر آتے ہیں۔ ان کو حشر کے فیملے کے بعد جہنم کی طرف بلایا جاتا ہے۔ فرعون وہاں بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت جہنم کی طرف رواں دواں ہے جس طرح وہ تعاقب میں حضرت موسیٰ کے پیچھے رواں تھا۔

وَجَعَلْنَاهُمْ اٰثِمَةً يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (۲۸: ۴۱) ”ہم نے ان کو جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیش رو بنا دیا۔“ کیا ہی بری دعوت ہے جو یہ دُک دیتے ہیں۔ اور کیا ہی بری قیادت و امامت ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ لَا يَنْصُرُوْنَ (۲۸: ۴۱) ”اور قیامت کے روز کہیں سے کوئی مدد نہ پاسکیں گے۔“ دنیا میں بھی ان کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور آخرت میں بھی ان کو ناکامی کا سامنا کرنا ہو گا۔ سرکشی اور ظلم کا یہی بدلہ تو ہوتا ہے۔ وہاں صرف ناکامی ہی نہ ہوگی بلکہ ہر طرف سے لعنت و ملامت بھی ہوگی۔ اس زمین پر بھی اور آخرت میں حشر کے میدان میں بھی۔

وَاتَّبَعْنَاهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ هُمْ مِنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ (۲۸: ۴۲) ”ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے روز وہ بڑی قباحت میں مبتلا ہوں گے۔“ مقبوحین کا لفظ ہی ایسا ہے کہ اس کی آواز ہی اس کے منہم کو ظاہر کرتی ہے۔ ”تج“ شرمندگی، طعن، تشنیع، گندگی اور نفرت کے تمام مفہومات مقبوحین میں شامل ہیں۔ یہ اس لیے کہ زمین میں یہ کبر و غرور کا روپ اختیار کرتے تھے۔ عزت و جاہ اور قوت اور بندوں پر ظلم ان کا وطیرہ تھا۔

--- ۰۰۰ ---

یہاں سیاق کلام میں مصرعے بنی اسرائیل کے خروج کو نہایت ہی اختصار کے ساتھ اور فرعون کے انجام بد کی ایک جھلک سرعت کے ساتھ دکھانے کے بعد یہ دکھایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو کس قدر مقام بلند عطا ہوا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بَصَائِرَ
لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۱۲۸﴾

”پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی ’لوگوں کے لیے بصیرتوں کا سامان بنا کر‘ ہدایت اور رحمت بنا کر‘ تاکہ شاید لوگ سبق حاصل کریں۔“۔ یہ ہے حضرت موسیٰ کا انجام۔ یہ ایک بہترین انجام ہے جس قدر باعزت انجام و مقام ہے یہ۔ جہاں تک وہ پہنچے ’ان کو کتاب دی گئی جو لوگوں کے لئے اس طرح ذریعہ ہدایت تھی جس طرح انسانوں کے لیے آنکھیں ذریعہ ہدایت ہوتی ہیں۔ ہدایت ہے اور رحمت ہے۔ اور اس لیے ہے کہ بنی اسرائیل سبق سیکھیں۔ دیکھیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے نشیب و فراز میں دست قدرت نے کس طرح بار بار مداخلت کی۔ کس طرح اللہ نے کمزوروں کی حمایت کی اور جباروں کو ہلاک کیا۔ اور مظلومین کو بلا خبر برتری حاصل ہوئی۔

قصہ موسیٰ و فرعون اس سورت میں یوں بیان ہوا۔ اس سے یہاں یہ ہدایت دی گئی کہ امن و سکون اللہ کی جانب سے ہوا کرتا ہے۔ اور انسانوں سے ہرتے وہ لوگ ہیں جو اللہ سے نہیں ڈرتے۔ جو اللہ سے دور ہو جاتے ہیں اور یہ کہ جب ظلم اور سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ مظلوموں کے حق میں براہ راست مداخلت کرتا ہے اور ہمیشہ اللہ ظالم کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب جبار و قہار لوگ ظلم کرنا شروع کر دیں اور مخلوق خدا اپنے دفاع سے عاجز آجائے۔ یہ وہ ہدایات تھیں جو اس وقت مکہ میں برسر عمل ایک مختصر انقلابی جماعت کے لیے بے حد ضروری تھیں۔ نیز مکہ کے مشرکین جو ان بیچاروں کے لیے فرعون کی طرح جبار و قہار تھے ’ان کو بھی بار بار سنایا جاتا ہے کہ تم بھی غور کرو‘ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جہاں جہاں کوئی انقلابی عمل شروع کرے گا اسے ان ہدایات کی ضرورت ہو گی۔ جہاں بھی دعوت ہو اور اس پر تشدد ہو۔

قرآن کریم میں قصص صرف ایسی ہی انقلابی تعلیمات کے لیے آتے ہیں۔ داعیوں کی تربیت کے لیے۔ اللہ کے سنن کے مناظر دکھانے کے لیے کہ سنن البیہ کس طرح کام کرتی ہیں ’تاکہ لوگ فصاحت حاصل کریں اور اپنی جدوجہد میں ان سے بصیرت حاصل کریں۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۷۷: التشریح آیات

۴۴۔۔۔ تا۔۔۔ ۷۵

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ابھی گزرا اور سابقہ سبق میں اس کی مفصل تشریح کی گئی۔ اس سبق میں اس قصے پر تبصرے کیے گئے ہیں اور نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ ان نتائج کے بعد پھر سورت کا مضمون اپنے اصلی موضوع کی طرف پست جاتا ہے۔ اصل موضوع یہ ہے کہ امن و خوف کا مالک اللہ ہے۔ امن دینے والا بھی وہ ہے اور خوف میں مبتلا کرنے والا بھی وہ ہے۔ اس کے بعد روئے سخن مشرکین مکہ کی طرف پھر جاتا ہے جو شرک پر جے ہوئے تھے۔ اسلام کا انکار کرتے تھے اور اس کے خلاف طرح طرح کے عذرات پیش کرتے تھے۔ مشرکین کو اس پوری کائنات کے اندر موجود شواہد دکھائے جاتے ہیں۔ پھر ان کو ڈرانے کے لیے میدانِ حشر کے بھی بعض مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم لے کر آئے وہ سچی ہے۔ نفل کتاب میں سے سلیم الفطرت لوگ اسے قبول کرتے ہیں جبکہ مشرکین مکہ مدعی دینِ ابراہیمی ہونے کے باوجود انکار کرتے ہیں اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لیں تو یہ ان کے لیے رحمتِ مہیبت ہوگی۔

اس قصے سے جو پسا نتیجہ یہاں نکالا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کلام نازل ہو رہا ہے وہ سچا ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان قصص کو اس طرح بیان کر رہے ہیں جس طرح کوئی یحییٰ شاہد کسی واقعہ کو بیان کر رہا ہوتا ہے، حالانکہ حضور اکرمؐ ان وقعات کے پیش آنے کے وقت وہاں موجود نہ تھے بلکہ یہ علیم و خیر اللہ کی طرف سے وحی ہے جو آپ پر آرہی ہے اور یہ وحی رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو شرک میں جھلا ہیں۔ اور اس فعل کی وجہ سے دائمی عذاب کے مستحق ہو سکتے ہیں اور اس لیے کہ اگر یہ وحی نہ آتی تو ان لوگوں کو ایک بہانہ ہاتھ آ جاتا۔

رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَتُبْعَ ابْتِكَ وَ نَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۴۷:۲۸)
”پروردگار تو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی نبی بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور لیل ایمان میں سے ہوتے۔“

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْعَرَبِ إِذْ قَضَيْنَا إِلَى مُوسَى الْأَمْرَ
وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۖ وَلَكِنَّا أَنْشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ
عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُو
عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا ۖ وَلَكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۖ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا

وَلَكِنْ رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَتْهُمْ مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۱﴾ وَكَوَلَّا أَن تُصِيبَهُمُ مُّصِيبَةٌ إِيْمًا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَيَقُولُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ وَنَكُونُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَىٰ أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ قَالُوا سِحْرَانِ تَظَاهَرَا ﴿۳﴾ وَقَالُوا إِنَّا بِكُلِّ كِفْرٍ لَّهِ قُلْنَا فَاتَّبِعُوا يَكْتِبُ مِمَّنْ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعُهُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۴﴾ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّهُمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِخَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ إِنْ لَّمْ يَهْدِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۵﴾ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۶﴾

۵

ع۸

۸

” (اے نبی!) تم اس وقت مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو یہ فرمان شریعت عطا کیا اور نہ تم شاہدین میں شامل تھے بلکہ اس کے بعد (تمہارے زمانے تک) ہم بہت سی نسلیں اٹھا چکے ہیں اور ان پر بہت زمانہ گزر چکا ہے۔ تم اہل مدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ ان کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے مگر (اس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور تم طور کے دامن میں بھی اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ کو پہلی مرتبہ) پکارا تھا مگر یہ تمہارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات دی جا رہی ہیں) تاکہ تم ان لوگوں کو متنبہ کر دو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا شاید کہ وہ ہوش میں آئیں۔ (پھر یہ ہم نے اس لیے کیا کہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اپنے کیے کر تو توں کی بدولت کوئی مصیبت جب ان پر آئے تو وہ کہیں ”اے پروردگار! تو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی رسول بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے ہوتے۔“

مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آگیا تو وہ کہنے لگے ”کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟“ کیا یہ لوگ اس کا انکار کر چکے ہیں جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ انہوں نے کہا ”دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔“ اور کہا ”ہم کسی کو نہیں مانتے۔“ (اے نبی!) ان سے کہو ”اچھا تو ماد اللہ کی طرف سے کوئی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو اگر تم سچے ہو“ میں اس کی پیروی اختیار کروں گا۔“ اب اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔ اور (صحیح کی)

بات پے درپے ہم انہیں پہنچا چکے ہیں تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہوں۔“

غزلی سے یہاں طور کا جانب غزلی مراد ہے جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مکالمے اور چلہ کشی کے چالیس روز و شب کے لیے متعین فرمایا تھا۔ اصل معاد تیس راتیں تھیں پھر اس میں دس کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس کا تذکرہ سورت اعراف میں گزر چکا ہے۔ اس عرصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قورات کی وہ تختیاں دی گئیں جن میں احکام خداوندی لکھے ہوئے تھے تاکہ ان احکام پر بنی اسرائیل کا قانونی نظام قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ تھے کہ آپ از خود ان حالات و مشاہدات کی رپورٹ دے رہا ہے کیونکہ حضورؐ اور حضرت موسیٰ کے زمانوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔

وَلَكِنَّا أَنشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ (۲۸: ۴۵) ”ہم بہت سی نسلیں اٹھایے ہیں اور ان پر زمانہ گزر چکا ہے۔“ لہذا اس سے معلوم ہوا کہ حضور اکرمؐ کو یہ اطاعات اللہ علیم و خبیر دے رہا ہے اور یہ قرآن وحی من جانب اللہ ہے۔

قرآن کریم نے حضرت موسیٰ کے قیام مدین کے واقعات کے بارے میں بھی تحدی کی ہے اور چیلنج کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے وہاں قیام کیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ واقعات چارہے ہیں تو حضور ہدایت خود مدین میں بھی تو ۱۰، ۱۰، ۱۰ تھے کہ اس زمانے کی خبریں حضور اکرمؐ نے ان سے لی ہوں اور پھر تفصیلات بیان کر دیں۔ اس کی حقیقت یہی ہے کہ

لَكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ (۲۸: ۴۵) ”مگر یہ خبریں ہم بھیجے والے ہیں۔“ تو معلوم ہوا کہ قرآن مجید اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے جس کے پاس انبیائے سابقین کی خبریں محفوظ ہیں۔

پھر قرآن مجید نے حضرت موسیٰ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان مناجات اور مکالمے کو بھی اپنی جزئیات کے ساتھ نقل کیا ہے۔ نہایت گہرائی کے ساتھ۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا (۲۸: ۴۶) ”اور تم طور کے دامن میں اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے پہلی مرتبہ موسیٰ کو پکارا۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پکار تو نہ سنی تھی۔ نہ اس کی تفصیلات انہوں نے قلم بند فرمائی تھیں۔ یہ اللہ کی جانب سے اٹل کہ قوم رسول کے لیے ایک رحمت ہے کہ وہ خبریں تفصیلات کے ساتھ دی جارہی ہیں لہذا یہ خبریں بھی اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ آپ سچے ہیں اور جو دعویٰ کرتے ہیں اس پر پہلی دلیل خود یہ قرآن ہے تاکہ عرب جیسی قوم کو آپ ورائیں جن کے پاس اس سے قبل ڈرانے والا نہیں آیا۔ اس سے قبل کی رسالتیں بنی اسرائیل کے پاس آتی تھیں جو عربوں کے پڑوس میں بستے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد اٹل عرب میں کوئی رسول نہ آیا تھا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

یہ قرآن لوگوں کے لیے رحمت خداوندی بھی ہے اور ان پر حجت بھی ہے تاکہ وہ قیامت کے دن یہ نہ کہیں کہ ہمارے لیے تو کوئی رسول بھیجا ہی نہ گیا تھا اور یہ کہ ان کو تو اچانک ہی پکڑ لیا گیا اور یہ کہ اس پکڑ سے قبل ہمیں کوئی نوٹس نہیں دیا گیا۔ یہ لوگ جس جاہلیت اور شرک میں مبتلا تھے وہ تو موجب عذاب تھی تو اللہ نے ان کی حجت بازی اور ان کے

عذرت کو ختم کرنے کے لیے رسول بھیج دیا اور آخری رسول بھیج دیا تاکہ ان کے بعد کوئی عذر نہ کرے۔

وَلَوْ لَا أَن تَصِيَّبَهُمْ مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَيَقُولُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا

رَسُولًا فَتَتَّبِعَ آيَاتِكَ وَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۸: ۴۷) ”اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اپنے کرتوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب ان پر آئے تو وہ کہیں لے پروردگار تو نے کیوں ہماری طرف کوئی رسول نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے ہوتے۔“ اگر رسول نہ آتا تو وہ ایسی ہی بات کرتے۔ اگرچہ رسول کے پاس آیات نہ ہوتیں، لیکن جب رسول آگیا اور اس کے پاس آیات بھی ہیں تو یہ لوگ ماننے سے انکار کر رہے ہیں حالانکہ اس کے پاس ناقابل تردید و ناقابل شک دلائل ہیں۔

فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَىٰ أَوَلَمْ

يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ قَالُوا سِحْرُنَ تَظْهَرُ ۖ أَوَلَوْ أَنَّا بِكُلِّ كُفْرٍ وَنَ

(۲۸: ۴۸) ”مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آگیا تو وہ کہنے لگے ”کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟“ کیا یہ لوگ اس کا انکار کر چکے ہیں جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ انہوں نے کہا ”دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔“ اور کہا ”ہم کسی کو نہیں ماننے۔“ یہی غرض تھی ان کی بہانہ سازی اور ان کے غلط عذرات کی۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی تسلیم نہ کیا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ معجزات کیوں نہیں دیئے گئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے یعنی مادی معجزات یا قرآن کریم تختیوں پر لکھا ہوا کیوں نہیں آ رہا جس طرح تورات کو لکھا ہوا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے جو دلیل بیان کی ہے یہ اس میں بچے نہیں ہیں۔ نہ ان کا یہ اعتراض فلعائنہ ہے۔

أَوَلَمْ يَكْفُرُوا بِمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ (۲۸: ۴۸) ”کیا یہ لوگ اس کا انکار نہیں کر چکے

جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟“ جزیرۃ العرب میں یہودی رہتے تھے۔ ان کے پاس تورات بھی تھی تو عربوں نے تورات کو کیوں نہ مانا۔ انہوں نے تو تورات کی بھی تکذیب کی تھی۔ نیز ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ تورات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور صفات دونوں ہی لکھی ہیں اور انہوں نے قرآن کے بارے میں بعض اہل کتاب سے فتویٰ بھی پوچھا تھا اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ محمد جو تعلیم پیش کرتے ہیں وہ سچی ہے اور یہ تعلیم بھی کتب سابقہ کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ لیکن انہوں نے ان فتادی کو بھی تسلیم نہ کیا۔ انہوں نے تورات کو بھی جادو کہا۔ قرآن کو بھی جادو کہا اور چونکہ دونوں جادو ہیں اس لیے دونوں ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرتی

ہے۔

قَالُوا سِحْرَانِ تَظْهَرَا وَقَالُوا آتَانَا بِكُلِّ كُفْرٍ وَنَ (۲۸: ۴۸) ”انہوں نے کہا دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور کہا ”ہم کسی کو نہیں مانتے“ وہ حق طلب کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ورنہ دلائل کی کوئی کمی نہیں ہے اور نہ قرآن کی پشت پر موجود دلائل ضعیف ہیں۔

قرآن مجید ایک قدم آگے بڑھ کر ان کو اچھی طرح لایا جواب کر دیتا ہے ”ان سے کہا جاتا ہے اگر تم قرآن کو تسلیم نہیں کرتے، اور تورات کی تعلیمات بھی تمہارے دل کو نہیں لگتیں تو تم کوئی ایسی کتاب یادو جو تورات اور قرآن دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو، ہم اس کتاب کو مان لیں گے۔

یہ آخری بات ہے اور دلیں و برہان کی آخری حد ہے کہ تم ایسی کوئی کتاب یادو اس کے بعد بھی اگر کوئی حق کے سامنے نہیں جھکتا تو یہ مکابرہ ہو گا اور ہٹ دھرمی ہوگی۔ اور ہٹ دھرمی کے سامنے کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی۔

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ وَمِنْ أَضَلِّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ

بَغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (۲۸: ۵۰) ”اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں، اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدا کی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ لہٰذا ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔“

قرآن جن حقائق پر مشتمل ہے وہ نہایت واضح ہیں۔ دین اسلام کے جو دلائل ہیں وہ قطعی الثبوت ہیں۔ ان دلائل کا جو شخص انکار کرتا ہے وہ وہی شخص ہو گا جو اپنی خواہشات کی پیروی میں لگا ہوا ہو۔ کیونکہ معقول انسان کے لیے وہی راستہ ہیں۔ تیسرا راستہ ہی نہیں ہے یا تو وہ مخلص اور حق قبول کرنے والا ہو گا تو وہ۔ زماً دلائل ایمان کو دیکھ کر ایمان لائے گا اور یا وہ شک میں مبتلا ہو گا، اپنی خواہشات کا پیرو ہو گا وہ ہٹ دھرم اور کج بحثی کرنے والا ہو گا۔ انکار محض ہٹ دھرمی کی وجہ سے کرے گا، اس لیے نہیں کرے گا کہ اس کی عقائد میں کوئی پیچیدگی ہے یا حجت میں کوئی ضعف ہے یا دلیل میں کوئی کمی ہے جیسا کہ نفس پرست لوگ کہتے ہیں۔

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ (۲۸: ۵۰) ”اگر وہ آپ کی

بات نہیں مانتے تو جان لیں کہ وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ اور یہ فیصلہ حتمی ہے، آخری ہے، اللہ کا فیصلہ ہے۔ اس لیے اسے رد نہیں کیا جاسکتا۔ جو لوگ اس دین کو قبول نہیں کرتے وہ خدا پرست ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور عذر نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو زبردستی سمجھ بھار کھا ہے دراصل اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں۔ حق واضح ہے اور پھر بھی یہ لوگ منہ موڑتے ہیں۔

وَمِنْ أَضَلِّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ

(۲۸: ۵۰) ”اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدا کی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ لہٰذا ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔“ اور یہ اہل مکہ اس معاملے میں بڑے ظالم اور باغی ہیں۔

یہ آیت ان لوگوں کے تمام عذرت ختم کر دیتی ہے جن کا کہنا یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کو سمجھا نہیں ہے اور ان کو دین کا پورا پورا علم نہ تھا۔ اسلام کا موقف ہے کہ اسلام بالکل واضح ہے۔ صرف لوگوں تک پہنچنا چاہئے، ان پر حجت تمام ہونا چاہئے کہ اسلام پہنچا دیا گیا۔ بس پھر مجادلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف بتی دینے سے لوگوں کے عذرت ختم ہو جائیں گے۔ دین پہنچ جانے کے بعد محض نفس پرست یا مفاد پرست ہی اس سے منہ موڑ سکتا ہے اور نکلز سب وی شخص کر سکتا ہے جو زیر دستی اپنے آپ کو جاہل بنائے اور اپنے لو پر ظلم کرے۔ اس سچائی پر ظلم کرے۔ ایسا شخص مستحق ہدایت ہی نہیں ہوتا۔ ”ایسے ظالموں کو تو اللہ ہدایت ہی نہیں بخشتا۔“

حق پہنچتے ہی ان کا عذر ختم ہوا۔ ان پر دعوت پیش کرتے ہی رسوں اور امت کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ اب ایسے لوگوں کے پاس کوئی عذر نہ ہو گا۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۲۸: ۵۱) ”اور نصیحت کی بات پہ درپہ ہم انہیں پہنچا چکے ہیں تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہوں۔“

--- ۰ ۰ ۰ ---

گذشتہ آیت میں ثابت کیا گیا کہ یہ لوگ منہ موڑتے ہیں، شک کرتے ہیں اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں۔ اب یہاں بعض ایسے لوگوں اور ایسے کرداروں کا ذکر بھی کیا جاتا ہے جو حق کو غلو سے نیت سے قبول کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی مثال لیل کتاب میں متی ہے۔ ذرا دیکھو انہوں نے سچائی پر مشتمل اس کتاب کو کس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا۔

الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ مِنْ قَبْلِهِ فَهُوَ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۲﴾ وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا أَمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ﴿۵۳﴾ أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَذَرُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿۵۴﴾ إِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا تَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ ﴿۵۵﴾

”جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی، وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ”ہم اس پر ایمان لائے“ یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں“ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا اس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی۔ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب انہوں نے یہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ”ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے“ تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔“

سعید ابن جبیر فرماتے ہیں کہ یہ ان ۷۰ پادریوں کے بارے میں ہے جنہیں نجاشی نے بھیجا تھا۔ جب یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ نے ان پر سورت یسین پڑھی۔ جب سورت ختم ہو گئی تو یہ لوگ رونے لگے اور مسلمان ہو گئے ان کے بارے میں زیر بحث آیات بھی نازل ہوئیں۔

الَّذِينَ آمَنُوا مِنْ قَبْلِهِمْ وَكُنْتُمْ لَهُمْ آيَاتٍ (۵۲:۲۸) ”وہ لوگ جنہیں ہم نے اس سے قبل کتاب دی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔“

محمد ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے ”اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قریبا بیس آدمی آئے۔ آپ مکہ میں تھے۔ یہ لوگ عیسائی تھے اور انہوں نے آپ کے بارے میں سنا تھا۔ یہ لوگ حبشہ سے آئے تھے۔ انہوں نے حضور کو مسجد حرام میں پایا۔ یہ لوگ حضور کے پاس بیٹھے اور آپ سے بات کرتے رہے۔ قریش کے کچھ لوگ کعبہ کے ارد گرد محافل سبائے بیٹھے تھے۔ جب ان لوگوں کا سوال و جواب ختم ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو لہند کی طرف بلایا اور ان کے سامنے قرآن مجید پڑھا۔ جب انہوں نے قرآن مجید سنا تو ان کے آنسو جاری ہو گئے۔ انہوں نے دعوت الی اللہ قبول کر لی ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہوا پایا تھا وہ علامات آپ میں معلوم کر لیں۔ جب یہ لوگ حضور اکرم کے پاس سے اٹھ کر جانے لگے تو ابو جہل اور ہشام نے چند دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کی راہ روک لی اور انہوں نے ان لوگوں سے کہا تم کس قدر بد بخت مسافر ہو تمہیں تمہارے ملک کے ہم مذہب لوگوں نے بھیجا تھا کہ اس شخص کے بارے میں معلومت لے کر آؤ تم ابھی اس کے پاس ابھی طرح بیٹھے بھی نہ تھے کہ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس شخص کی تصدیق کر دی۔ ہم سمجھتے ہیں تم جیسا حق اور کوئی سوار نہ ہو گا۔ انہوں نے کہا تم پر سمانتی ہو ہم تمہارے ساتھ جہالت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا دین ہمارا ہے اور تمہارا دین تمہیں مبارک ہو۔ ہم اپنے آپ کو خیر سے دور نہیں رکھتے۔“

کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ وفد بخران کے نصاریٰ کا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ یہ وفد نجرانیوں کا تھا یا حبشیوں کا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی۔

الَّذِينَ آمَنُوا مِنْ قَبْلِهِمْ وَكُنْتُمْ لَهُمْ آيَاتٍ (۵۲:۲۸) کہتے ہیں میں نے زحری سے پوچھا کہ یہ آیات کس کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے علماء سے یہ سنتا رہا کہ یہ آیات نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور وہ آیات بھی جو سورت مائدہ میں ہیں۔

ذَلِكَ بَأْنٌ مِنْهُمْ فَسَيَسِينُ وَرُهْبَانًا فَاكْتَبْنَا مِنَ الشَّهِيدِينَ بَيْتًا

بہر حال یہ آیات جس کے بارے میں بھی نازل ہوئی ہوں قرآن ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس واقعہ کے بارے میں کفار جانتے تھے اور اس کا انکار نہ کرتے تھے تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ دنیا میں ایسے پاک نفس لوگ بھی ہیں جو قرآن کو سن کر اس کی تصدیق کرتے ہیں اور پھر اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہ اس سحابی کو ابھی طرح سمجھتے ہیں جو اس میں ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کے پاس جو سابق کتاب تھی۔ قرآن کی تعلیمات اس کے مطابق ہیں۔ ایسے

لوگوں کو کوئی روکنے والا ایمان لانے سے روک بھی نہیں سکتا۔ نہ ان کے اندر کا ان کا نفس امارہ اور نہ بڑائی کا تصور اور گھمڑ ہے اور ایسے لوگ پھر دوسرا جلاء کی طرف سے دی جانے والی ادیتوں اور طعنوں کو بھی برداشت کرتے ہیں۔ اور ان ایذاؤں اور اپنی خواہشات نفس کے علی الرغم حق پر جم جاتے ہیں۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ (۵۲: ۲۸) ”وہ لوگ جنہیں اس سے قبل کتاب دی گئی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں۔“

اور قرآن کی حقانیت کے دلائل میں سے یہ ایک دلیل ہے ’در نہ تمام کتابیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ ان کے مضامین باہم ملتے جلتے ہیں جس کو اس کا ابتدائی حصہ دیا گیا وہ اس کے آخری حصہ میں بھی حق پاتا ہے، مطمئن ہوتا ہے ’ایمان لاتا ہے‘ اور جان لیتا ہے کہ یہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

وَ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ

(۵۳: ۲۸) ”جب ان کو سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے۔ ہم تو پہلے ہی مسلم ہیں۔“ یعنی یہ کلام اس قدر واضح ہے کہ اسے صرف حلاوت کی ضرورت ہے، جن لوگوں کو پہلے کتاب حق دی گئی ہے وہ تو دیکھتے ہی معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ اسی سرچشمے سے ہے۔ اور اس کا سرچشمہ بھی وہی ہے جس سے سچائی نکلتی ہے۔ جھوٹ وہاں سے نہیں آ سکتا۔ ”یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے۔“ اور یہ کہ ”ہم تو اس سے پہلے ہی مسلم تھے۔“ اللہ کے مسلم ہونے کا مفہوم ہے کہ ہم پہلے سے اللہ کے مطیع فرمان تھے۔ یہ لوگ جو اللہ کے مطیع فرمان تھے اور پھر انہوں نے محض سنتے ہی قرآن کی بھی تصدیق کر دی۔

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا (۵۴: ۲۸) ”یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا اس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی۔“ یہ کہ انہوں نے خالص اسلام پر صبر کیا، انہوں نے اپنے دل و دماغ کو اسام کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے ذاتی خواہشات اور ہوائے نفس پر غلبہ پایا اور پہلے دین پر بھی تھے رہے اور دوسرے پر بھی تھے رہے۔ اس لیے ان کو دو مرتبہ اجر دیا جائے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے صبر کیا اور قبول حق کرنے کے بعد جم گئے۔ کسی عقیدے کو قبول کرنے کے بعد جم جانا بہت ہی مشکل کام ہے اور پھر خواہشات نفس، چہتوں، بے راہ روی اور سرکشی کے خلاف جم جانا تو بہت ہی مشکل کام ہے۔ اور ان لوگوں نے یہ سب کام کیے۔ ان لوگوں نے لوگوں کی مدد کی بھی پرواہ نہ کی۔ اور لوگوں کی طرف سے ایذا رسانی کی پرواہ نہ کی۔ جیسا کہ سابقہ روایات میں ذکر ہوا۔

وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۵۴: ۲۸) ”اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔“ یہ بھی ایک قسم کا صبر ہے۔ اور یہ صبر خالص صبر سے زیادہ پر مشقت ہوتا ہے۔ خالص صبر تو یہ ہے کہ ایذا رسانی اور مذاہق پر صبر کیا جائے۔ برائی پر صبر بہت مشکل ہے۔ نفسانی غرور کو صرف اسی طرح قابو میں لایا جاسکتا ہے کیونکہ نفس چاہتا ہے کہ

مزاج اور ایذا رسانی کا جواب دیا جائے 'غصہ کیا جائے اور انتقام لے کر دل کو ٹھنڈا کیا جائے اور پھر ایذا پر صبر کرنے کے بعد دوسرا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایذا کے بدلے میں احسان کیا جائے۔ مزاج کے بدلے میں نرمی اور ٹھنڈے پن کا مظاہرہ کیا جائے اور پھر بد روی کے مقابلے میں اچھا رویہ اختیار کرنا اور برائی کے بدلے احسان کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو بھلائی اور احسان کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں۔ یہ مقام صرف اچھے مومن ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ لوگوں سے ادیت پاتے ہیں اور پھر بھی راضی اور مطمئن رہتے ہیں۔

وَمِمَّا رَزَقْنَهُمْ يُنْفِقُونَ (۲۸: ۵۴) ”اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں یہاں ان لوگوں کی قبولیت حق میں کشادہ دلی کے ساتھ ساتھ اتفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں کشادہ دلی کا ذکر بھی کر دیا گیا۔ کیونکہ نیکی اور سخاوت ایک ہی سرچشمے سے نکلنے والی بھلائیاں ہیں اور یہ تب صادر ہوتی ہیں کہ جب انسان اپنی خواہشات نفس پر قابو پالے اور زحیٰ اقدار کے مقابلے میں اعلیٰ قدروں کو اہمیت دے۔ ان اقدار میں پہلی قدر کا تعلق نفسیات کی دنیا سے ہے اور دوسری کا معیشت سے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بسا اوقات ایمان اور اتفاق کا ذکر ایک جگہ آتا ہے۔

ایمان پر صبر کرنے والوں اور خالص عقیدہ اختیار کرنے والوں کی ایک دوسری صفت :

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلِّمٌ

عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ (۲۸: ۵۵) ”اور جب انہوں نے یہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے تم کو سلام ہے۔ ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ لغو کا مطلب فضول باتیں کرنا ہے جن میں کوئی فائدہ نہ ہو اور نہ ان کے پیچھے کوئی مقصد ہو۔ یعنی وہ لا حاصل گفتگو جس سے دل و دماغ کے اندر کسی مفید علم و حکمت کا اضافہ نہ ہو۔ یعنی وہ گری ہوئی باتیں جن سے احساس و شعور میں اور زبان و کلام میں گندگی اور برائی کا اضافہ ہو۔ چاہے وہ کسی کے ساتھ مکالمے کی صورت میں ہوں یا کسی غائب شخص کے واقعات نقل کرتے ہوئے ہوں۔

مومن دل بھی اس قسم کی لغو باتوں میں مشغول نہیں ہوتے۔ نہ وہ لغو باتیں سنتے ہیں کیونکہ ان کے پیش نظر بلند و بالا امور ہوتے ہیں پاکیزہ اور نورانی باتیں۔

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ (۲۸: ۵۵) ”انہوں نے جب یہودہ بات سنی تو کنارہ کش ہو گئے۔۔۔ لیکن وہ لکل لغو پر نہ غصہ ہوتے ہیں نہ ان سے الجھتے ہیں کہ زبردستی منع کر دیں اور نہ وہ ان کے ساتھ بحث شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ اہل لغو کے ساتھ الجھنا بھی ایک طرح کا لغو امر ہے۔ وہ بس ان کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلِّمٌ عَلَيْكُمْ (۲۸: ۵۵) ”اور کہا ہمارے اعمال

ہمارے لیے 'اور تمہارے اعمال تمہارے لیے تم کو سلام ہے'۔ نہایت ادب سے 'دعائے خیر کے ساتھ' اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی ہدایت یافتہ ہو جائیں۔ لیکن یہ خواہش رکھتے ہوئے بھی یہ ان کے لغو میں شریک نہیں ہوتے۔

لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ (۵۵:۲۸) "ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار نہیں کرتے"۔ اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ اپنا قیمتی وقت ان کے ساتھ ضائع کریں۔ نہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے لغو میں شریک ہوں اور خاموشی سے سنتے رہیں۔ لہٰذا رواداری کے بھی قائل نہیں۔

یہ ایک روشن نفس کی تصویر ہے جو نفس مومنہ ہے 'اپنے ایمان پر مطمئن ہے۔ لغو سے بالا و برتر ہے۔ لیکن کشادہ دل اور کشادہ دست ہے۔ یہ نفس مومنہ ان لوگوں کے لیے رسم و راہ مقرر کرتی ہے جو صحیح راستہ پر چلنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا جاہلوں کے ساتھ جاہلیت میں اشتراک بھی نہیں۔ ان کے ساتھ خاصیت بھی نہیں 'ان پر غصہ بھی نہیں' ان کے ساتھ ترش روئی بھی نہیں بلکہ سنجیدگی 'سر بلندی' کشادہ دلی 'اور برائی کرنے والے کے ساتھ بھی نیکی اور بھلائی'۔

یہ لیل کتاب 'جو ایمان لائے' ان کے ایمان لانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی بڑا مجاہدہ کرنا نہیں پڑا۔ آپ نے صرف قرآن کی تلاوت فرمائی 'بس چند سوالات کیے اور ایمان قبول کر لیا جبکہ وہ خود اپنی قوم کے ساتھ آپ رات دن سالوں تک مجاہدہ کرتے رہے۔ پھر اپنے محبوب رشتہ داروں کے ساتھ تو بہت ہی محنت کرتے رہے۔ لیکن ان لوگوں کو ایمان نصیب نہ ہوا۔ یہ بات حضورؐ خود جانتے تھے کہ آپؐ کے اختیار میں یہ بات نہیں ہے کہ آپ اپنے محبوبوں کو ہدایت دے دیں۔ اللہ تعالیٰ تو صرف ان لوگوں کو ہدایت عطا کرتا ہے جن کے نفس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ وہ مستحق ہیں اور ایمان کے لیے تیار ہیں۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَ لَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ
وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۵۵﴾

"اے نبی! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے مگر اللہ جسے چاہتا ہے 'ہدایت دیتا ہے اور وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں۔"

صحیحین میں وارد ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے حق میں نازل ہوئی۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حامی و مددگار تھے اور قریش کے مقابلے میں آپ کے دفاع کے لیے بنیان مرموص بنے ہوئے تھے۔ یہ آپ کے اس قدر حامی تھے کہ ان کی حمایت کی وجہ سے آپ آزادانہ دعوت دے سکتے تھے۔ اس حمایت کی وجہ سے قریش نے ان کا اور پورے بنی ہاشم کا مقاطعہ کیا تھا 'اور ان کو شعب ابو طالب میں محصور کر دیا۔ یہ سب کام وہ اپنے بھتیجے کی محبت میں کرتے تھے اور قومی حیت اور عزت و آبرو کو بچانے کے لیے کرتے تھے جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دعوت ایمان دی اور عرض کیا کہ آپ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ لیکن اللہ نے ان کے حق میں ایمان نہ لکھا تھا کیونکہ اس کا حقیقی علم اور اصلی سبب اللہ کو معلوم تھا۔

زہری اور سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے تو ابو جہل ابن ہشام ان کے پاس بیٹھا تھا۔ عبد اللہ ابن امیہ بھی تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے چچا! صرف لا الہ الا اللہ کہہ دس۔ میں اللہ کے ساتھ اس پر تمہارے لیے جھگڑاؤں گا۔ ابو جہل اور عبد اللہ ابن امیہ نے کہا ابو طالب تم عبد المطلب کی ملت کو چھوڑ رہے ہو! رسول اللہ بار بار ان پر یہ پیش فرماتے تھے اوز یہ دونوں بار بار اسے روکتے تھے۔ اور یہی بات دہراتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے آخری الفاظ یہ کہے ”عبد المطلب کے دین پر“۔ اور لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واللہ (خدا کی قسم) میں تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا جب تک مجھے منع نہ کر دیا جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ أَوْ ابْنِ
طالِب ہی کے حق میں نازل ہوئی:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (۲۸: ۵۶) (صحیحین)
مسلم اور ترمذی نے ’ابو حازم اور ابو ہریرہ کی روایت نقل کی کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت قریب آیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے اور کہا ”اے چچا کہہ دو ”لا الہ الا اللہ“۔ میں قیمت میں تمہارے حق میں شہادت دوں گا۔ انہوں نے کہا اگر یہ بات نہ ہوتی کہ قریش مجھے طعن دس کہ سکرانہ الموت کی تکلیف کی وجہ سے اس نے یہ کہہ دیا تو میں ضرور یہ کلمہ پڑھ دیتا“ تیری آنکھوں کی ٹھنڈک کی وجہ سے۔ میں یہ کلمہ صرف تیری آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پڑھتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ

(۲۸: ۵۶) ”تم ہدایت نہیں دے سکتے جتنے تم محبوب سمجھو“ یہ اللہ ہے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔“

--- ۰۰۰ ---

اور حضرت ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ سے روایت ہے اور مجاہدؒ شہبیؒ اور قتادہؒ کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ ابو طالب کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اور انہوں نے جو آخری لفظ کہے وہ تھے علی ملة عبد المطلب۔

انسان جب اس حدیث پر غور کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کس قدر پختہ اور سیدھا دین ہے۔ ابو طالب رسول اللہؐ کے حقیقی چچا، آپؐ کے کفیل، حامی اور آپؐ کا دفاع کرنے والے تھے۔ لیکن اللہ نے انہیں ایمان نصیب نہ کیا۔ باوجود اس کے کہ رسول اللہؐ کو ان سے بہت زیادہ محبت تھی اور آپؐ حد سے زیادہ خواہش مند تھے کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ابو طالب نے رشتے اور قومی حیثیت کو ایمان سے زیادہ اہمیت دی۔ اللہ کو اس بات کا علم تھا اور اللہ کو اس بات کا خوب علم تھا کہ حضور اکرمؐ ان سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں

کہ شاید وہ ایمان لے آئیں۔ اس لیے اللہ نے ہدایت نہ دینے کا اختیار حضورؐ کے اختیارات ہی — خارج کر دیا۔ ہدایت دینا یا نہ دینا صرف اللہ اللہ العالمین کے اختیار میں ہے اور رسول کی ذیولہ صرف تبلیغ تک محدود ہے۔ لہذا داعیوں کی ذیولہ یہ ہے کہ وہ دعوت دیں۔ دعوت کے بعد پھر لوگوں کے دلوں میں تصرف کرنا اللہ کا کام ہے۔ لوگوں کے دلوں کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ اللہ لوگوں کو ہدایت دیتا ہے یا گمراہ کرتا ہے۔ یہ فیصلے لوگوں کے دلوں کے حالات کے مطابق ہوتے ہیں اور ان کے شخص استعداد پر ہوتے ہیں اور اس بارے میں علم صرف اللہ کو ہے۔

اب قرآن مجید ان کے اس خدشے پر تبصرہ کرتا ہے جس کا اظہار وہ کرتے رہتے تھے کہ اگر ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا تو قبل عرب پر اہل قریش کو قیادت و سیادت کا جو منصب حاصل ہے 'وہ ہاتھ مارے گا۔ یہ لوگ خانہ کعبہ کی تعظیم کرتے ہیں۔ خانہ کعبہ کے مجاوروں یعنی اہل قریش کی اطاعت کرتے ہیں 'خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کی تعظیم کرتے ہیں اس لیے یہ قبل انہیں اپک لیں گے۔ یا جزیرۃ العرب سے باہر کا کوئی دشمن ان پر فتح پالے گا اور یہ قبائل ایسے دشمن کی حمایت کریں گے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ خوف و امن کا سرچشمہ اللہ باری ہے۔ فرعون بھی ہذا ہر بہت بڑی قوت کا حامل تھا۔ ہلاکت کا حقیقی سبب تو دنیا پرستی 'دولت پرستی' اللہ کی آیات اور اللہ کے رسولوں کی تکذیب ہے۔ اور حق سے منہ موڑنا ہے۔ حق کو قبول کرنا 'ہلاکت کا سبب بھی نہیں ہوا۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ہلاکت وہ اقوام ہوا کرتی ہیں جن کے پیش نظر صرف دنیا کے مفادات ہوتے ہیں 'حالانکہ متاع دنیا ایک حقیر چیز ہے 'انسان کا اصل فائدہ آخرت میں ہے اور وہ اللہ کے پاس ہے۔

وَقَالُوا إِنَّا نَسْتَعِيزُ الْهُدَىٰ مَعَكَ نَتَخَطَّفُ مِنْ أَرْضِنَا ۚ

اَوَلَمْ نَمَكِّنْ لَهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُجَنَّبُوْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ رُتْ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطَرَتْ مَعِيشَتَهَا
فِيْكَ مَسْكِنُهُمْ لَمْ يَنْتَكِنْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِيْنَ ۝
وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْ اُمَمٍ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۝ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝ وَمَا اَوْثَقْتُمْ
مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَّاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرِزْقُهَا ۝ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اِنَّا فَمَنۢ وَّعَدْنٰهُ وَوَعَدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَسَنٌ مَّتَّعْنٰهُ
مَتَّاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝

”وہ کہتے ہیں ”اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے۔“ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پر امن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھینچے چلے آتے ہیں، ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم جاہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو، وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے؛ آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔ اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیت سنانا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رب نے والے ظالم نہ ہو جاتے۔

تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی رہنت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟ بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو، کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے؟ ہم نے صرف حیات دنیا کا سر و سامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟“

یہ لال مکہ کا ایک سطحی اور دنیاوی نقطہ نظر تھا۔ قریش کو اسی دنیا پرستی کے نقطہ نظر نے ذر میں مبتلا کر دیا تھا کہ اگر ہم نے اس جدید تحریک کو قبول کیا تو نقصان ہو گا۔ دشمن حملہ آور ہو جائیں گے اور معاون و مددگار حمایت سے ہاتھ اٹھالیں گے اور ہم مالی لحاظ سے کمزور اور بد حال ہو جائیں گے۔

وَقَالُوا إِن تَتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَضَّعُ مِنْ أَرْضُنَا (۵۷:۲۸) ”وہ کہتے ہیں اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے۔“ یہ لوگ اس بات کے منکر نہیں تھے کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیمات پیش کرتے ہیں وہ حقیقی راہ ہدایت ہے۔ لیکن انہیں ذر یہ تھا کہ مکہ کے ارد گرد کے لوگ ان پر ٹوٹ پڑیں گے دراصل ان کی نظروں میں صرف دنیا کی قوت ہی تھی۔ ذلت باری اور اللہ وحدہ کی قوت کو انہوں نے بھلا دیا تھا۔ حالانکہ حقیقی نقطہ نظر تو اللہ ہے۔ حقیقی بچانے والا تو وہی ہے۔ اگر وہ اللہ کی حمایت میں آ جاتے ہیں تو پوری کائنات کی قوتیں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں۔ اور اگر اللہ ان کو ذلیل و خوار کرنا چاہے تو دنیا کی پوری قوتیں بھی ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتیں۔ ان کا یہ نقطہ نظر اس لیے تھا کہ ایمان ان کے دلوں کی تہ تک ابھی نہ اتر تھا۔ اگر اترتا تو حقیقی قوت کے بارے میں ان کا نقطہ نظریہ نہ ہوتا۔ وہ معاطات کا اندازہ یوں نہ کرتے۔ اور ان کو یہ یقین ہو جاتا کہ امن تو اللہ کے ہوا رحمت میں ہے اور خوف اور خطرات تو اللہ سے دوری کی راہ میں ہیں اور یہ کہ تحریک اسلامی میں شامل ہونا دراصل قوت اور عزت سے وابستہ ہونا ہے۔ اور یہ کہ اللہ کا حقیقی سرچشمہ قوت ہونا محض طفل قلی نہیں ہے، نہ کوئی دہم ہے۔ بلکہ ایک سائنٹیفک حقیقت ہے اس لیے کہ اللہ کا اتباع کرنا دراصل اس کائنات کے قانون قدرت کا اتباع ہے۔ اس طرح انسان اور کائنات کی قوتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یوں انسان کی پشت پر پوری تکوینی قوتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ اس کائنات کا خالق اور مدبر بھی اللہ ہے اور اسلامی دین کا بھیجے والا بھی وہی ہے اور جو شخص اللہ کی ہدایت پر چلتا ہے وہ اللہ کی تمام قوتوں کو کام میں لاتا ہے اور اس کائنات کی قوتیں لے کر وہ

ہیں۔ ایب شخص مگویا ایک عظیم سرچشمہ قوت سے مربوط ہو جاتا اور اس کا وارث بن جاتا ہے۔ اور یہ نہ یہ تاریخی حقیقت اور پوری زندگی کے تجربوں سے ثابت شدہ حقیقت۔

اللہ کی ہدایات ہی زندگی کا صحیح منہاج ہیں۔ ان کے مطابق زندگی گزارنا ہی اس کرۂ ارض کی حقیقی زندگی ہے اور جب دنیا میں اسلامی نظام اور اسلامی منہاج حیات رائج اور قائم ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں اخروی فلاح اور دنیا میں شوکت نصیب ہوتی ہے۔ اور اس نظام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دنیا اور آخرت کے درمیان کوئی دوئی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ فلاح اخروی تب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ اس دنیا کے نظام کو معطل کر دیا جائے یا اس پر وہ ڈال دیا جائے۔ اسلامی منہاج حیات میں دنیا آخرت دونوں باہم مربوط اور باندھے ہوئے ہیں۔ اسلام کیا ہے دل مومن کی اصلاح، انسانی سوسائٹی کی اصلاح اور اس کرۂ ارض پر اجتماعی نظام کی اصلاح۔ یہی وجہ ہے کہ اس سوچ کے مطابق دنیا آخرت کے جہاں میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ یہ دنیا آخرت کے لیے حرر ہے، کھلتا ہے۔ اس دنیا میں جنت کی تعمیر ہی دراصل وسیلہ ہے آخرت میں تعمیر جنت کا، اور اس میں ہمیشہ ہمیش کے لیے رہنے کا بشرطیکہ یہ کام اسلامی ہدایت اور اسلامی شریعت کے مطابق کیا جائے اور دنیا کی تمام تعمیر میں رضائے الہی مطلوب ہو۔

انسانی تاریخ کا تجزیہ شاہد ہے کہ جب بھی کسی جماعت نے اللہ کی ہدایت کا جھنڈا اٹھایا ہے، اللہ نے اسے قوت، شوکت اور دنیا کی قیادت دی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ جماعت اپنے آپ کو اس امانت کے اٹھانے کے لیے تیار کرے، اس کی اہل ہو جائے اور جان لو کہ یہ امانت، امانت خلافت ارضی ہے۔ جیسی اس دنیا میں تمام قوتوں پر کنٹرول اور زندگی کے نعیم و فراز پر کنٹرول۔

اکثر لوگ اتباع شریعت اور اللہ کی ہدایات پر چلنے سے بہت ڈرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے دشمنوں کی عداوت اور ان کی مکاریوں سے ڈرتے ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اللہ کے دشمن ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ لوگ اقتصادی تکالیف اور اقتصادی پابندیوں سے بھی ڈرتے ہیں۔ یہ اسی قسم کے اوہام میں جس طرح قریش کو یہ اوہام لاحق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا

ان تَتَّبِعِ الْهُدٰی مَعَكَ نَتَخَطَّفُ مِنْ اَرْضِنَا (۵۷:۲۸) ”اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت کی پیروی کریں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے۔“ لیکن جب انہوں نے اس ہدایت کو سمجھنے سے لگا لیا تو وہ مشرق و مغرب پر قابض ہو گئے اور یہ قبضہ صرف ۲۵ سال کے عرصے میں مکمل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس غدر رنگ کی اسی وقت تردید کر دی تھی کہ وہ کون ہے جس نے ان کو مکہ میں امن عطا کیا ہے۔ وہ کون ہے جس نے ان کے لیے مکہ کو بیت الحرام قرار دیا۔ وہ کون ہے جو تمام دنیا کے لوگوں کے دل مکہ کی طرف مائل کرتا ہے اور وہ دنیا کے تمام ثمرات لے کر وہاں حاضر ہوتے ہیں۔ تمام دنیا سے جمع ہو کر حرم میں آتے ہیں حالانکہ ان کے ملک مختلف ہیں اور ان کی عیدیں مختلف ہیں۔

اَوَلَمْ نُمْكِنْ لَهُمْ حَرَمًا اَمِنًا يُحْيِيْ اِلَيْهِ ثَمَرَتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا

”کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پرامن حرم کو ن کے لیے جائے قیام بنایا جس کی طرف ہر قسم کے ثمرات کچے چلے آتے ہیں ہماری طرف سے رزق کے طور پر“۔ پھر وہ کیوں ڈرتے ہیں کہ لوگ ان کو اچک لیں گے۔ اگر انہوں نے اللہ کی ہدایت کو قبول کر لیا۔ حالانکہ اس حرم کو جائے امن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے اللہ ہی نے تو بنایا تھا۔ سو اس سے کہ نافرمان ہونے کے باوجود ان لوگوں کو کس نے یہ پرامن ماحول دیا ہے؟ اور اگر وہ فرمان بردار ہو جائیں تو اللہ ان کو لوگوں کے حوالے کر دے گا کہ ان کی زمین سے وہ ان کو اچک کر مٹ جائیں۔ یہ کس طرح معقول ہو سکتا ہے؟

وَلٰكِنْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۵۷:۲۸) ”مگر ان میں سے اکثر سوک مانتے نہیں“۔ وہ نہیں جانتے کہ امن کہاں سے ملتا ہے اور خوف کہاں سے ملتا ہے۔ ان کو معلوم نہیں ہے کہ دراصل تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

اگر وہ ہدایتی اور خوف سے بچنا چاہتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ وہ ہلاکت اور بربادی سے دوچار ہوں تو بربادی کے اسباب یہ ہیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ ان سے بچیں۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَاَتٰكَ مَسْكِبُهُمْ لَمَّا تُوَسَّكُنْ مِنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا

قَلِيْلًا وَ كُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِيْنَ (۵۸:۲۸) ”اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم جاہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے“ آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔“ انعامات خداوندی پر اترا نا اور ان کا شکر ادا نہ کرنا دراصل بستیوں کی ہلاکت کا حقیقی سبب رہا ہے۔ اہل قریش کو بھی اللہ نے پرامن حرم بطور نعمت خداوندی دیا ہے۔ لہذا ان کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ اس پر اتراؤں نہیں بلکہ شکر ادا کریں ورنہ ان کی ہلاکت بھی یقینی ہوگی جیسا کہ ان بستیوں پر اللہ کی ہلاکت آئی جن کے بارے میں خوب جانتے ہیں۔ اور اہل قریش رات دن ان بستیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ برباد پڑی ہیں اور اس بربادی کے بعد کوئی بھی آ کر ان میں بسا تک نہیں۔ ان کے کھنڈرات موجود ہیں۔

لَمَّا تُوَسَّكُنْ مِنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۵۸:۲۸) ”جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے“۔ یہ بستیاں صاف صاف نظر آتی ہیں اور اپنے بانیوں کی کہانی سن رہی ہیں۔ اور یہ کہانی سن رہی ہیں کہ اللہ کے انعامات پر یعنی محض معاشی ترقی پر اترا نے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ان کے باشندے اس طرح فنا ہوئے کہ کوئی بھی پیچھے نہ رہا۔ کوئی ان کا وارث نہ ہوا۔

وَ كُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِيْنَ (۵۸:۲۸) ”آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے“۔ لیکن ان کے اس اترا نے اور سرکشی کے باوجود اللہ نے ان کو تب ہلاک کیا جب ان بستیوں کے مرکزی مقامات پر رسول بھیجے کیونکہ یہ اللہ کی سنت ہے اور اس سنت کو اللہ نے انسانوں پر سرپائی کرتے ہوئے اپنے اوپر لازم کر دیا ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمَمٍ رَسُولًا يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَمَا

كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَ أَهْلِهَا ظَلُمُونَ (۲۸: ۵۹) ”اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسو نہ بھیج دینا جو ان کو ہماری آیات نہ سنا تا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے ربے والے ظالم نہ ہو جاتے۔“ رسولوں کو بستیوں کے مرکزی مقامات میں اس لیے بھیجا گیا کہ یہ مرکزی مقامات مراکز تبلیغ ہوں اور ان سے پیغام الہی اطراف و اکناف میں نشر ہو تاکہ کوئی یہ کہ نہ سکے ان تک تو پیغام نہیں پہنچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں بھیجا گیا کیونکہ یہ عربوں کا ام اقربى تھا۔ اور آپ کا فریضہ تھا کہ آپ ارد گرد کے تمام لوگوں کو ان اقوام کے انجام سے خبردار کریں جن کے پاس رسول آئے اور انہوں نے نہ مانا اور ظلم کیا۔

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَ أَهْلِهَا ظَلُمُونَ (۲۸: ۵۹) ”ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے ربے والے ظالم نہ ہو جاتے تھے۔“ وہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے تھے حالانکہ وہ لہی طرح جانتے تھے کہ وہ حق ہیں۔

نیز یہ کہ زندگی کا پورا پورا سامان اور دنیا کی پوری دولت اور متاع اور وہ تمام خزانے جو زمین کے اندر ودیعت ہیں اور وہ پیداواریں تو انسانوں کو اس کرۃ ارض پر دی گئیں۔ اور وہ تمام چیزیں جو تمام انسانوں کے لیے اس جہاں میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ سب چیزیں اللہ کے ہاں جنتوں میں تیار کردہ سازو سامان کے مقابلے میں ایک حقیر چیز ہیں۔

وَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَّاعٌ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِينَتُهَا وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَ أَبْقٰی أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۲۸: ۶۰) ”تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور ہتی تر ہے۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔“ یہ آخری حساب ہے۔ صرف اس سازو سامان کا نہیں جس کے فوت ہونے کا انہیں ذر لائق تھا۔ یعنی سامان زیست امن اور زمین کا۔ یہ حساب صرف اقتدار ہر قسم کی پیداواروں اور امن و امان کا نہیں جس کا احسان اللہ نے ان کو جوایا صرف ان بستیوں کا حساب نہیں جنہیں اللہ نے ہلاک کیا محض اس لیے کہ وہ اپنی معیشت پر اترا رہی تھیں بلکہ یہ حساب ہے اس تمام سامان زندگی کا جس کا تعلق اس دنیا ہے۔ دنیا کا پورا سازو سامان مکس سازو سامان اور دائمی سازو سامان جس کے بعد کوئی ہلاکت اور بربادی بھی نہ ہو اور اس سے پوری طرح اور مکمل طور پر استفادہ بھی کیا گیا ہو یہ سب سازو سامان اللہ کے ہاں پائے جانے والے اور بیش باقی رہنے والے متاع کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے وہ خیر ہے یعنی اپنی حقیقت کے اعتبار سے اور باقی رہنے والا ہے یعنی مدت کے اعتبار سے۔

أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۲۸: ۶۰) ”کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔“ یعنی اس دنیاوی سازو سامان اور اخروی سازو سامان کے درمیان فرق و امتیاز کو سمجھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آخری تعقیب

نسبت ہی ایسے الفاظ میں آتی ہے جن میں عقل سے کام نہ لینے پر سرزنش کی گئی ہے کیونکہ عقل سے کام لینا ہر شخص کے اختیار میں ہے۔

آخر میں دنیا اور آخرت دونوں کا تقابل پیش کیا جاتا ہے اور لوگوں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ ان میں سے اپنے لیے جسے چاہیں پسند کر لیں۔

اَفَمَنْ وَعَدْنَاهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيهِ كَمَنْ مَتَعْنَاهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ

الْقِيَمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِّينَ (۲۸: ۶۱) ”بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو تبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیات دنیا کا سرو سامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟“۔

ایک طرف وہ شخص ہے جس کے ساتھ اچھا وعدہ ہے اور وہ اسے قیامت کے دن پانے والا ہے اور دوسرا شخص وہ ہے جسے دنیا کا ساز و سامان دیا گیا ہے اور وہ یہ مختصر زندگی میں اس حقیر سامان کو برت لیتا ہے۔ اور پھر اسے قیامت کے دن زبردستی حساب کے لیے لایا جاتا ہے۔ اس کے لیے ”محضین“ کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی گرفتار کر کے حاضر کیا جاتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کی وہاں خواہش یہ ہوگی کہ ان کو حساب کے لیے نہ لایا جائے کیونکہ حساب کے بعد تو ان کے لیے عذاب حاضر ہے۔

وہ کہتے تھے کہ اگر ہم تمہارے ساتھ ایمان لے آئیں تو ہمیں اپنی زمین سے اچک لیا جائے گا اور اب ان کو اس طرح جواب دیا جاتا ہے کہ اگر تمہیں اچک بھی لیا جائے اور تم دنیا کے تمام ساز و سامان سے محروم بھی کر دیے جاؤ تو بھی یہ گھانا نہ ہو گا کیونکہ یہ محرومیت اس مصیبت سے ہلکی ہے کہ تمہیں گرفتار کر کے لایا جائے لیکن ایسی صورت بھی نہ ہوگی کیونکہ حضور اکرمؐ کے متبعین تو دنیا میں بھی امن اور اقتدار اعلیٰ کے مالک رہیں گے اور آخرت میں تو ان کو بہت بڑی عطا اور بڑا امن و امان ہو گا۔ لہٰذا اللہ کی ہدایت سے منہ دہی لوگ موڑتے ہیں جو بہت ہی غافل اور احمق ہیں۔ اور وہ عقل کو کام میں لا کر اس کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کی سعی نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ خوف کا سبب کیا ہے اور امن کا سرچشمہ کیا ہے۔ اور یہی لوگ بڑے خسارے والے ہیں جو اپنی قوت اختیاری کو اچھی طرح استعمال نہیں کرتے اور اپنے آپ کو دائمی ہلاکت سے نہیں بچاتے۔

--- () ---

اب قیامت کے مناظر میں۔ ایک منظر جس میں ان لوگوں سے یوں سوال و جواب ہو گا اور اس سے اندازہ ہو گا کہ وہاں ان کی حالت زار کیسے ہوگی۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ اَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿۲۹﴾ قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ الَّذِينَ اَغْوَيْنَا كَمَا اَغْوَيْنَا تَبَرَّأْنَا

إِلَيْكَ نَمَّا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ﴿۵۷﴾ وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ
يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَرَأَوُا الْعَذَابَ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ ﴿۵۸﴾ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ
فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ ﴿۵۹﴾ فَعَمِيَّتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا
يَتَسَاءَلُونَ ﴿۶۰﴾ فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَحَسْبَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ
الْمُفْلِحِينَ ﴿۶۱﴾

”اور (بھول نہ جائیں یہ لوگ) اس دن کو جب کہ وہ ان کو پکارے گا اور پوچھے گا ”کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟“ یہ قول جن پر چسپاں ہو گا وہ کہیں گے ”اے ہمارے رب‘ بے شک یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔ انہیں ہم نے اسی طرح گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم آپ کے سامنے برات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہماری توبہ کی نہیں کرتے تھے۔“ پھر ان سے کہا جائے گا کہ پکارو اب اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو یہ انہیں پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے اور یہ لوگ عذاب دیکھ لیں گے۔ کاش یہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے۔

اور (فراموش نہ کہیں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ ”جو رسول بھیجے گئے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا؟“ اس وقت کوئی جواب ان کو نہ سوجھے گا اور نہ یہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ ہی سکیں گے۔ اللہ جس نے آج توبہ رزی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہو گا۔“

یہ سوال تو سرزنش کے لیے ہو گا اور اس سے محض ان کو شرمندہ کرنا مطلوب ہو گا۔

أَيْنَ شُرَكَاءِ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ (۲۸: ۶۲) ”کہاں ہیں وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے۔“ لہٰذا کو چھی طرح معلوم ہو گا کہ اس دن اس قسم کے کسی شریک کا وجود نہ ہو گا۔ اور اس دن ان کے معبین کو بھی کچھ پتہ نہ ہو گا کہ ان شرکاء کا کوئی وجود ہے یا نہیں۔ نہ یہ لوگ ان شرکاء تک پہنچ سکیں گے۔ یہ سوال دراصل ان لوگوں کو جمع عام میں شرمندہ کرنے اور سرزنش کرنے کے لیے کیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جن سے متعلق یہ سوال کیا گیا وہ یہاں جواب نہیں دیتے کیونکہ یہ سوال جواب طلب ہی نہیں ہے بلکہ وہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے جو معبین گمراہ ہوئے اور ان کی پیروی اختیار کی ان کے اس جرم سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیں۔ جیسا کہ کبراء قریش لوگوں کو گمراہی پر آمادہ کرتے تھے اور ان کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ اس لیے ان کا جواب یوں ہو گا۔

رَبَّنَا هَؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا كَمَا غَوَيْنَا تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ

(۶۳:۲۸) ”اے ہمارے رب‘ بے شک یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔ انہیں ہم نے اسی طرح گمراہ کیا جس طرح ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم آپ کے سامنے برات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہماری کوئی بندگی نہ کرتے تھے۔“

ہمارے رب ہم نے ان کو زبردستی گمراہ نہیں کیا۔ ان کے دل و دماغ پر ہمیں کوئی کنٹرول حاصل نہ تھا۔ یہ لوگ اپنی مرضی اور آزادانہ اختیار سے گمراہی میں پڑے جیسا کہ ہم خود بغیر کسی مجبوری کے گمراہی میں پڑے۔

تَرٰنَا الْبَیْثَ (۶۳:۲۸) ”ہم آپ کے سامنے برات کا اظہار کرتے ہیں“ کہ ہم نے ان کو گمراہ کیا ہے۔

مَا كَانُوا اٰیٰنًا یَّعْبُدُوْنَ (۶۳:۲۸) ”یہ ہماری بندگی تو نہ کرتے تھے۔“ بلکہ یہ بتوں‘ آستانوں اور دوسری مخلوقات کی بندگی کرتے تھے۔ ہم نے ان سے یہ نہ کہا تھا کہ ہم تمہارے الہ ہیں‘ اور نہ وہ وہاں ہماری عبادت کرتے تھے۔

اب ان کو اس مقام شرمندگی کی طرف لایا جا رہا ہے جس کی طرف وہ بات کا رخ کرنا نہیں چاہتے جس سے وہ بات کو پھیر کر دوسری طرف لے جانا چاہتے ہیں یعنی وہ شرکاء جو ان لوگوں کو اللہ کے سوا پکڑے ہوئے تھے۔

وَ قِیْلَ ادْعُوا شُرَکَآءَکُمْ (۶۴:۲۸) ”پھر کہا جائے گا کہ پکارو‘ ان ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو۔“

یعنی ان کو پکارو‘ اور ان کی سیرت سے نہ بھاگو‘ ان کو پکارو کہ وہ اب تمہیں تمہاری پکار کو پہنچیں۔ تمہیں اس مصیبت سے چھڑائیں‘ ان کو پکارو کہ آج دن ہے ان کے کام کرنے کا۔ یہی تو ان کا فائدہ تھا۔

یہ بد بخت لوگ لچھی طرح جانتے ہیں کہ ان شرکاء کو آج پکارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے‘ لیکن ہمارے مجبوری وہ احکام الہیہ کو بچالائیں گے۔

فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهُمْ (۶۴:۲۸) ”یہ انہیں پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے۔“ ان شرکاء سے یہی توقع تھی کہ وہ کوئی جواب نہ دیں گے۔ البتہ آواز اس لیے دہرائی جائے گی تاکہ یہ پکارنے والے لچھی طرح ذلیل ہوں۔

وَ رَاَوْا الْعَذَابَ (۶۴:۲۸) ”اور یہ لوگ عذاب دیکھ لیں گے“ یعنی اس بحث و مباحثے کے درمیان ہی عذاب دیکھ لیں گے۔ یہ اس عذاب ہی کی طرف بڑھ رہے ہوں گے اور عذاب ان کو نظر آجائے گا۔ اس ذلیل کرنے والے منظر کے بعد پھر اسی عذاب کا منظر ہو گا۔

یہ شرمسار کنندہ منظر جب اپنی انتہاؤں پر ہوتا ہے تو اچانک ان پر وہ ہدایت پیش کر دی جاتی ہے کہ کاس تم اسے قبول کر لیتے۔ اس برے حال میں یہ لوگ یہی آرزو کرتے ہوں گے کہ لے کاش کہ وہ ایسا کرتے‘ دنیا میں تو یہ ہدایت ان کے دسترس میں تھی اور اگر وہ لہیک کہہ کر اسے قبول کر لیتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔

لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَهْتَدُونَ (۲۸، ۶۴) ”کاش وہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے۔“
 لب سیاق کلام انہیں اس کرناک منہ کی طرف لے جاتا ہے۔

وَيَوْمَ يَنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَحْبَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ (۲۸، ۶۵) ”اور وہ دن جب وہ ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ جو رسول بھیجے گئے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا؟“ اور اللہ کو تو خوب معلوم ہے کہ انہوں نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا۔ لیکن یہ باز پرس محض ذلیل اور شرمسار کرنے کے لیے ہو گا۔ اس سوال کے جواب میں وہ خاموش ہوں گے بلکہ مدہوش کھڑے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ سخت کرب میں مبتلا ہوں گے اور ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو گا کہ وہ کیا جواب دیں۔

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ (۲۸، ۶۶) ”اس وقت کوئی جواب ان کو نہ سوجھے گا اور نہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ سکیں گے۔“ انداز نگاہ اس منظر میں لوگوں کی ایسی تصویر کھینچتا ہے کہ گویا وہ اندھے ہیں۔ گویا ”خبریں“ اندھی ہو گئی ہیں اور وہ ان تک پہنچ نہیں پاتیں۔ جس طرح اندھا آدمی کسی جگہ نہیں پہنچ جاتا۔ وہ کچھ نہیں جانتے۔ نہ پوچھ سکتے ہیں نہ جواب سکتے ہیں۔ مدہوشی کی سی حالت میں کھڑے ہیں۔

فَأَمَّا مَنْ تَابَ وَ آمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ

(۲۸، ۶۷) ”اہلہ جس نے آج توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہو گا۔“ یہ صلوٰۃ بالقابل ہے۔ جب غم اور تکلیف مشرکین کے لیے عروج پر ہوگی اس وقت توبہ کرنے والوں ایمان لانے والوں اور عمل کرے والوں کے لیے یہی فلاح ہوگی۔ اس لیے لے لوگو! یہ موقع ہے اس ت فائدہ اٹھاؤ! ابھی تمہارے سامنے کھلا وقت ہے بہتر ہے کہ اسے اختیار کرو۔

اب ہر امر اور ہر چیز کو نتیجہ ارادہ الہی قرار دیا جاتا ہے کیونکہ وہی رات ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور تمام معاملات اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ اول میں بھی آخر میں بھی۔ دنیا میں بھی وہی قابل تعریف ہے اور آخرت میں بھی وہی قابل تعریف ہے۔ دنیا میں بھی اس کا حکم چلتا ہے اور آخرت میں بھی اسی کی طرف لوٹتا ہے۔ لوگوں کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے خود کوئی فیصلہ کر سکیں نہ دوسروں کے بارے میں یہاں کوئی انسان کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے تخلیق کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اختیار کر لیتا ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحَانَ

اللَّهِ وَ تَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۶۸﴾ وَ رَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُونَ ﴿۶۹﴾

وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ

وَالَّذِينَ تَرْجِعُونَ ﴿۱﴾

”تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور (وہ خود ہی اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے) منتخب کر لیتا ہے“ یہ انتخاب ان لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ اللہ پاک ہے اور بہت بالا تر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ تیرا رب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہی ایک اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اسی کے لیے حمد ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ‘فرہں روئی’ اس کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔“

یہ تبصرہ ان لوگوں کے اس رویہ کس کے بعد آیا ہے کہ اگر ہم نے ہدایت کو قبول کر لیا تو ہم اپنی زمین سے اچک لے جائیں گے۔ اس قول کے بعد یوم الحساب کا ایک منظر پیش کیا گیا اور اس میں مشرکین کے موقف کو پیش کیا گیا۔ اب اس دوسرے تبصرے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کا اختیار تو خود ان کے نفوس کے بارے میں بھی نہیں ہے کہ وہ از خود اس اور خوف کا کوئی راستہ اپنے لیے اختیار کرس۔ اس لیے اللہ کی وحدانیت کے اختیارات کی وجہ سے آخر کار تمام امور میں اللہ ہی موثر ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (۲۸: ۶۸) ”اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور منتخب کر لیتا ہے اور یہ انتخاب ان لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔“ یہ وہ عظیم حقیقت ہے جسے ہر اوقات لوگ بھلا دیتے ہیں یا اس کے بعض پلوؤں کو لوگ بھلا دیتے ہیں کہ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اللہ کے کاموں کے سلسلے میں کچھ تجاوز دے یا اللہ کی تخلیق میں غلط اضافہ کرے یا اس کی تخلیق میں تغیر و تبدل کرے۔ وہ اپنی مخلوق میں سے مختلف چیزوں کو مختلف فرائض کے لیے اختیار کر لیتا ہے۔ مختلف مقامات میں مختلف چیزیں اپنا فریضہ ادا کرتی ہیں۔ اس لیے کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اللہ کے سامنے کسی شخص کو تجویز کرے کسی حادثہ کی تجویز کرے کسی حرکت کسی بات اور کسی فعل کی تجویز کرے۔ اور نہ ایسا کام اختیار کرنے کا اللہ نے کسی کو اختیار دیا ہے۔ نہ اپنے نفوس کے بارے میں اور نہ دوسروں کے بارے میں۔ غرض تمام امور کے فیصلے اللہ کرتا ہے، چھوٹے ہوں یا بڑے۔

اگر لوگوں کے دل و دماغ میں صرف یہ ایک حقیقت بیٹھ جائے تو لوگوں پر جو مصائب آتے ہیں وہ ان کی وجہ سے ہرگز پریشان نہ ہوں یا ان کی اپنی وجہ سے ان کو جو تکلیف پہنچتی ہے اس کی وجہ سے بھی وہ پریشان نہ ہوں نہ وہ اس چیز کی وجہ سے پریشان ہوں جو ان کے ہاتھوں سے نکل گئی یا وہ محروم ہو گئے کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ ہی ہے جو واقعات کا انتخاب کرتا ہے اور اس کو اختیار ملت ہیں۔

لیکن اس کا مفہوم یہ بھی نہیں ہے کہ لوگ اپنی عقل کو معطل کر دیں اور لوگوں کو موقوف کر دیں اور سرگرمیاں چھوڑ کر ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان غور و فکر کر کے اپنی سوچ کے بعد پوری جدوجہد کرے اور اپنی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے ایک کام کرے اور اس کے بعد جو نتائج ہوں ان کو اللہ پر چھوڑ دے۔ نتائج کو تسلیم

ورضے قبول کرے۔ کیونکہ اس کے دائرہ قوت میں جو کچھ تھا اس نے کر لیا۔ اس کے بعد کے امور اللہ کے لیے ہیں۔
 مشرکین اللہ کے ساتھ خود ساختہ الہوں کو بھی شریک کرتے تھے۔ اور ان کو بھی پکارتے تھے۔ حالانکہ اللہ وحدہ
 لا شریک ہے اور وہی اختیار و انتخاب کرتا ہے۔ اس تخلیق میں کوئی شریک نہیں اور نہ اس کے اختیارات میں کوئی شریک
 ہے۔

سُبْحَنَ اللّٰهِ وَتَعَالٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۲۸: ۶۸) ”اللہ پاک ہے اور بہت بالاتر ہے اس شرک
 سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔“

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ (۲۸: ۶۹) ”اور تیرا رب جانتا ہے جو کچھ
 یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔“ اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔“ اس لیے وہ ان کی جن باتوں کو جانتا ہے ان پر ان کو
 سزا دیتا ہے۔ ان کے لیے نتائج وہ منتخب کرتا ہے ان کے لیے ہدایت و ضلالت کا فیصلہ بھی وہی کرتا ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ (۲۸: ۷۰) ”وہ ایک اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔
 لہذا حق میں یا اختیارات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔“

لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ (۲۸: ۷۰) ”اس کے لیے حمد ہے دنیا میں بھی اور آخرت
 میں بھی۔“ اس بات پر کہ وہ کسی کے لیے کیا انجام اختیار کرتا ہے کسی کے لئے کیا انعامات تجویز کرتا ہے کسی کے لیے کیا
 حکمت و تدبیر اختیار کرتا ہے کسی کے ساتھ کیا انصاف کرتا ہے اور کسی پر کیا رحمت کرتا ہے۔ حمد و ثنا صرف اسی کے لیے
 ہے۔

وَلَهُ الْحُكْمُ (۲۸: ۷۰) ”حکم اس کا ہے۔“ اس لیے وہ اپنے بندوں کے درمیان جو فیصلے چاہتا ہے
 کرتا ہے اس کے کسی امر کو کوئی بدلے والا نہیں ہے۔ اور نہ اس کے فیصلوں کو کوئی بدل سکتا ہے۔

وَالِيَهُ تُرْجَعُونَ (۲۸: ۷۰) ”اور اس کی طرف تم سب پلٹ کر جانے والے ہو۔“ اور آخری فیصلہ
 بھی وہاں اللہ ہی اپنے پورے اختیارات کے ساتھ کرے گا۔

یوں اللہ تعالیٰ یہ شعور اہل ایمان کے گلے میں تعویذ کی طرح ہانکھ دیتا ہے کہ اس کائنات میں صرف اللہ کا ارادہ چلتا
 ہے۔ اور یہ بھی سمجھا دیتا ہے کہ اللہ راہوں کو بھی جانتا ہے اس سے کوئی چیز خفیہ نہیں ہے۔ سب نے اس کی طرف لوٹنا
 ہے۔ اس سے کوئی شخص بچ کر نہیں نکل سکتا۔ کس طرح یہ لوگ اللہ کے ساتھ شرک کی جرات کرتے ہیں حالانکہ یہ لوگ
 اس کے قبضے میں ہیں۔ اس سے نکل نہیں سکتے۔

--- ۰۰۰ ---

اس کے بعد ایک سفر اس پوری کائنات کا بھی کر لیا جاتا ہے جس میں یہ لوگ رہتے ہیں لیکن اس کے اندر اللہ کی جو
 مہمیری تدبیر و حکمت کام کر رہی ہے اس سے غافل ہیں۔ حالانکہ ان کی زندگی اور ان کی معیشت کے تمام فیصلے اللہ کے
 اختیار میں ہیں۔ اس طرح اللہ ان کے شعور کو اس کائنات کے دوہست اہم مظاہر کی طرف متوجہ کرتا ہے یعنی گردش لیل و

نہار کی طرف۔ اور اس امر کی طرف کہ گردش لیل و نہار کے اس نظام کے اندر اللہ وحدہ کی وحدانیت اور اس کے اختیار مطلق کے کیسے شواہد ہیں۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَنْ إِلَهُ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِضِيَاءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ۚ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَنْ إِلَهُ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِلَيْلٍ ۚ تَسْكُنُونَ فِيهِ ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۚ وَ مِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمْ لَيْلًا وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَلِعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

”اے نبیؐ! ان۔۔۔ کو بھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی مادے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ اں۔۔۔ پوچھو، کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں رات مادے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کر سکو؟ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کرو اور (دن کو) اپنے رب کا فضل تلاش کرو، شاید کہ تم شکر گزار بنو“۔

لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے رات اور دن کی گردش دیکھ دیکھ کر ان سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ اس گردش کے اندر ان کو کوئی بات نئی نہیں لگتی۔ وہ سورج کے طلوع اور غروب سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔ اسی طرح دن کا نمودار ہونا اور رات کا چھا جانا بھی ان کو کچھ زیادہ متاثر نہیں کرتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ گردش لیل و نہار کے اندر انسانوں کے لیے جو فائدے ہیں اور جو رحمتیں ہیں، جس طرح یہ گردش ان کو جان و بہکت سے بچاتی ہے، اکتانے اور تھکانے سے بچاتی ہے۔ یہ باتیں ان کے شعور میں مستحضر نہیں رہتیں۔

قرآن کریم ان کو غفلت کی غندہ سے جگاتا ہے ان کو ذرا اس عادی رویہ اور عادی منظر سے دور لے جاتا ہے۔ ان کو متوجہ کرتا ہے کہ تمہارے ارد گرد گردش لیل و نہار کی وجہ سے کس قدر عظیم واقعات رونما ہوتے ہیں تو تم توجہ نہیں کرتے۔ ذرا اتنا سوچو کہ رات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رک گئی یا دن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم ہو گیا۔ تو کس قدر خوفناک نتائج کا سامنا تمہیں کرنا ہو گا۔ انسانوں کو کسی چیز کی قدر و قیمت کا پتہ تب چلتا ہے جب وہ نہیں ہوتی۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَنْ إِلَهُ غَيْرُ اللَّهِ

يَأْتِيكُمْ بِضِيَاءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ (۲۸: ۷۱) ”اے نبیؐ! ان سے کو بھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے؟ میں روشنی لا دے۔ کیا تم سنتے نہیں ہو؟“۔ جب سردیوں میں رات قدرے طویل ہو جاتی ہے تو لوگ سپیدہ صبح کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں اور جب

سورج تھوڑی دیر کے لیے بادلوں میں چھپ جائے تو یہ آرزوئیں کرنے لگتے ہیں کہ سورج نکل آئے۔ اور اگر روشنی ہمیشہ کے لیے چلی جائے تو ان کی حالت کیا ہو جائے گی جب رات ہمیشہ کے لیے قیامت تک ان پر مسلط ہو جائے۔ یہ تو اس صورت میں ہے کہ یہ پھر زندہ بھی کسی صورت میں رہ سکیں۔ حالانکہ ایسی صورت میں تو خطرہ یہ ہو گا کہ دنیا سے زندگی کے آثار ہی مٹا دیئے جائیں اور کبھی بھی دن نمودار ہو یا زندگی برقرار ہو۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَنْ إِلَهٌ غَيْرُ اللَّهِ

يَأْتِيَكُمْ بَلِيلٌ تَسْكُنُونَ فِيهِ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۷۲: ۲۸) ”ان سے پوچھو کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں رات لاوے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کر سکو؟ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟“۔ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اگر دن ذرا طویل ہو جائے تو وہ سایوں کے تعاقب میں دوڑتے ہیں۔ اور گرمیوں میں دن طویل ہو تو رات کے مشتاق ہوتے ہیں اور رات کی تاریکی میں سکون و قرار تلاش کرتے ہیں۔ جبکہ زندگی رات کا سکون بھی چاہتی ہے جبکہ دوسرے دن دن کی سرگرمی دکھائی جائے۔ لیکن اگر دن قیامت تک کے لیے جاری کر دیا گیا تو لوگوں کی حالت کیا ہو جائے گی۔ پہلے تو وہ ختم ہی ہو جائیں گے اور اگر کسی طرح زندہ رہ گئے تو زندگی کس قدر مشکل ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ہر چیز ایک مقدار کے مطابق بنائی ہے۔ اور اس جہاں کی چھوٹی اور بڑی ہر چیز کے پیچھے ایک تدبیر ہے اور ہر چیز اللہ نے ایک اندازے کے مطابق بنائی ہے۔

وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ

تَشْكُرُونَ (۷۳: ۲۸) ”یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے یہ رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں سکون حاصل کرو اور دن کو اپنے رب کا فضل تلاش کرو شاید کہ تم شکر گزار بنو“۔

پس رات سکون و قرار کے لیے ہے۔ دن سرگرمیوں اور جدوجہد کے لیے ہے۔ اور دن کے اندر نکتہ توجہ یہ ہے کہ انسان کاروبار کرے اور رحمت الہی کی تلاش کرے۔ کیونکہ انسان کما کر ہی اللہ کے فضل سے کوئی چیز بطور شکر دوسروں کو دے سکتا ہے۔ اللہ نے ہمیں گردش لیل و نہار کی جو سہولت دی اس کی نعمت و رحمت ہے۔ پھر رات و دن کا ایک نظام کے ساتھ بدلتے رہنا بھی نعمت ہے اس کائنات کے دوسرے سنن اور قوانین طبعیہ اللہ نے پیدا کیے ہیں تم نے نہیں جاری کیے۔ اللہ نے ان قوانین کو اپنے علم و حکمت سے جاری کیا اور تم ان سے غافل ہو۔

یہ سبق قیامت سے ایک ایسے منظر پر ختم ہوتا ہے جو بڑی حیرت سے نظروں کے سامنے سے گزر جاتا ہے۔ اس منظر میں سرزنش کے طور پر مشرکین سے پوچھا گیا کہ کہاں ہیں وہ شریک جن کو تم شریک سمجھتے تھے۔ وہاں ان کو ان کے باطل موقف سے دوچار کیا جاتا ہے۔ سوال و جواب کے اس ترسار کنندہ موقف میں یہ لوگ کھل کر رہ جاتے ہیں اور ٹوٹ کر زمین پر گر جاتے ہیں۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿۲۸﴾ وَتَزْعُمَانَا
مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَ

۱۵ ع

ضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۲۹﴾

- ۱۰ ”(یاد رکھیں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ انہیں پکارے گا پھر پوچھے گا ”کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم کہاں رکھتے تھے؟“ اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکال لائیں گے پھر کہیں گے کہ ”لاؤ اب اپنی دلیل“۔ اس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ حق اللہ کی طرف ہے اور تم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے۔
- قیامت کے دن پکارنے کا منظر اور شرکاء کی ہمت پوچھنے کا واقعہ گزشتہ سبق میں بھی گزرا ہے لیکن یہاں اسے بطور تاکید دوبارہ ایک نئے منظر میں دیا جاتا ہے۔ اس منظر میں یہ سوال و جواب ایک گواہ کے سامنے ہو گا۔ یہ ہر امت کا نبی ہو گا اور یہ شہادت دے گا کہ کس نے دعوت اسلامی کے حوالے سے کیا موقف اختیار کیا۔ اس منظر میں اصل مقصد یہ ہے کہ نبی کو سامنے لایا جائے گا تاکہ اس کی امت بھی اسے سب کی سب دیکھے اور وہ بھی ان کو سب کے سب کو دیکھے۔ اور اس عظیم گواہ کے سامنے مشرکین کو مزید شرمسار کرنے کے لیے ان سے پوچھا جائے کہ وہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم ایسا سمجھتے تھے۔ اس وقت ان کا نہ کوئی شریک ہو گا اور نہ اس شرک پر کوئی دلیل ہوگی۔ اور نہ وہ دنیا کی طرح ہٹ دھرمی کر سکیں گے۔ اور نہ کوئی مکالمہ اور دلیل پیش کر سکیں گے۔

فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ (۷۵:۲۸) ”ان کو معلوم ہو گا کہ حق اللہ کی طرف ہے۔“ اور ایسا حق اور سچائی اللہ کی طرف ہوگی جس میں کوئی شبہ نہ ہو گا۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۷۵:۲۸) ”اور تم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے۔“ یعنی ہر کتاب شرک، شرکاء، نہ شرکاء ان کو دیکھیں گے اور نہ یہ شرکاء کو پا سکیں گے۔ حالانکہ اس مکالمے اور مناظرے کے وقت برہان کی ضرورت تھی۔

یہاں آکر موسیٰ علیہ السلام کے قصے پر تبصرہ ختم ہوتا ہے۔ اس تبصرے میں انسانوں کے دل و دماغ کو ایک وسیع بنیاد کی سیر کر لئی گئی۔ دنیا کی بھی، آخرت کی بھی، انسانی کے تشبہ و فراز میں بھی اسے پھرایا گیا اور اس کائنات کی وسعتوں میں بھی، سابقہ مکذبین کے کھنڈرات میں بھی اور اس کائنات کے سنن البیہ میں بھی۔ اور یہ تمام سورت کے اصل مقاصد اور اس کے قصوں کے مضمون کے ساتھ ہم آہنگ اور مربوط رہی۔ اب ہم سورت کے دوسرے قصے کی طرف آنے ہیں۔

درس نمبر ۸، ۱۷ ایک نظر میں

اس سورت کا ابتدائی حصہ قصہ فرعون و کلیم پر مشتمل تھا۔ اس قصے میں بتایا گیا تھا کہ قوت اور اقتدار کے نتیجے میں کس طرح نافرمانی اور سرکشی آتی ہے۔ اور حکمران کس طرح اللہ کی ناشکری کرتے ہیں۔ اللہ کی ہدایت سے دور ہوتے ہیں اور پھر ان سب باتوں کے نتیجے میں وہ زوال کا شکار ہوتے ہیں۔ لب یہاں قارون کا قصہ لایا جاتا ہے کہ مال اور علم و ہنر جب سرکشی اختیار کر لیں 'مالدار اترانے لگیں' عوام پر برتری جتلائیں 'اللہ کی نعمتوں کا انکار کریں تو ان پر کس طرح ہلاکت آتی ہے۔ اس کے بعد درست تصورات اور نظریات کے مطابق مال اور علم دنیا کی زیب و زینت ہیں اور ایمان اور نیک عمل کے مقابلے میں علم و ہنر اور مال و دولت کی کوئی قدر نہیں ہے۔ نیز درست طرز فکر و عمل یہ ہے کہ علم و ہنر اور مال و دولت کو اعتدال کے ساتھ ضروریات زندگی کے لیے استعمال کیا جائے۔ علوی الارض اور فساد فی الارض کے لیے نہیں۔

قرآن کریم نے اس قصے کا زمان و مکان بیان نہیں کیا۔ بس اس قدر معلومات کافی ہیں کہ یہ شخص قوم موسیٰ میں سے تھا اور یہ موسیٰ علیہ السلام سے باغی ہو گیا تھا۔ کیا یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل خروج سے قبل مصر ہی میں تھے؟ یا موسیٰ علیہ السلام کے خروج کے بعد؟ یا بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد تھا۔ اور خود موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہ واقعہ ہوا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ قارون نے حضرت موسیٰ کو اذیت بھی دی تھی اور اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف رشوت دے کر ان کو ایک عورت کے ساتھ سینڈل میں الجھانے کی کوشش کی تھی۔ اللہ نے حضرت موسیٰ کو لیا اور قارون زمین میں دھنسا دیا گیا۔

ہمیں ان روایات کی ضرورت نہیں ہے 'نہ اس قصے کے زمان و مکان کے تعین کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم میں جس طرح یہ قصہ آیا ہے اس سے اس کے لانے کے مقاصد اچھی طرح واضح ہوتے ہیں اور وہ اقتدار و اصول واضح طور پر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں جن کی وجہ سے یہ قصہ دیا گیا۔ اگر اس کے زمان و مکان اور اس کے ماحول کے دوسرے واقعات و حالات کی یہاں ضرورت ہوئی اور ان سے کسی مزید حقیقت 'قدر یا اصول کی وضاحت ہوتی تو اللہ ضرور وہ دوسری تفصیلات بھی دے دیتا۔ لہذا ہم اس کی تشریح صرف قرآنی اسلوب ہی میں کرتے ہیں۔ اور ان روایات سے ہٹ کر اس کی وضاحت کرتے ہیں کیونکہ ان تک اس کی تشریح کے سلسلے میں کوئی ضرورت باقی نہیں ہے۔

درس نمبر ۸۷ التشریح آیات

۷۶۔۔۔ تا۔۔۔ ۸۴

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَى فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَأَتَيْنَاهُ
مِنَ الْكُتُوبِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوزًا بِالْعُصْبَةِ أُولَى الْقُوَّةِ ۚ إِذْ قَالَ لَهُ
قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۗ وَابْتَغَ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ
الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا نَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِنَ كَمَا أَحْسَنَ
اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۗ
قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي ۖ

”یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ایک فتنہ خیز تھا، پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا ”پھول نہ جا، اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر، جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، اور زمین میں نساہر پانے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔“ تو اس نے کہا ”یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔“

یوں اس قحطی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے ہیرو کا نام قارون ہے۔ اس کی قوم، قوم موسیٰ ہے اور اس نے اپنی قوم کے عقائد سے بغاوت کر لی۔ یہ اپنی قوم کے خلاف ظلم کا لڑکھائی بھی کرتا اور یہ بغاوت اور ظلم وہ محض اپنی دولت مندی کی وجہ سے کرتا۔

وَأَتَيْنَاهُ مِنَ الْكُتُوبِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوزًا بِالْعُصْبَةِ أُولَى الْقُوَّةِ (۲۸: ۷۶) ”اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔“

اور اس کے بعد پھر واقعات 'اقوال اور وہ تاثرات بیان کیے جاتے ہیں جو اس قصے کے ساتھ ساتھ ذہن میں آتے ہیں۔۔۔ قارون موسیٰ علیہ السلام کا ہم قوم تھا۔ اللہ نے اسے بہت بڑی دولت دی۔ اس کی کثرت کی وجہ سے اسے خزانوں سے تعبیر کیا گیا۔ کنز (خزانہ) مال کو کہا جاتا ہے جو استعمال اور گردش سے زیادہ اور جسے محفوظ جگہ میں رکھا گیا ہو۔ نظروں سے اوجھل۔ اور یہ دوست اس قدر زیادہ تھی کہ اس کی تجویروں کی چلیاں بھی بہت زیادہ تھیں۔ اور ان کو طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت ہی اٹھا سکتی تھی۔ اس دوست کی وجہ سے قارون اپنی قوم سے بٹنی ہو گیا۔ یہاں اس کا ذکر نہیں ہے کہ اس نے کسی قسم کی بغاوت کی۔ یہاں بغاوت مجمل ہے اس لیے اس سے ہر قسم کی بغاوت اور نافرمانی مراد ہو سکتی ہے۔ یہ بغاوت بنی اسرائیل پر ظلم کے ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ ان کی لراہنی غصب کرنے کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ ان کی دوسری چیزیں چھین لینے سے بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ مال پر دست درازی کرنے والے اکثر لوگ کرتے ہیں۔ غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ بھی بغاوت ہے کہ قارون کے مال میں غریبوں کا حق تھا اور وہ ادا نہ کرتا تھا۔ کیونکہ اغنیاء کے اموال میں فقراء کا حق ہوتا ہے۔ تاکہ یہ مال اغنیاء کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے۔ محتاجوں تک بھی جائے۔ اس طرح طبقاتی نفرت پیدا ہوتی ہے اور سوسائٹی کا امن و امان تباہ ہوتا ہے۔ یہ بغاوتیں بھی ہو سکتی ہیں اور اس کے سوا اور بھی نافرمانیاں ہو سکتی ہیں۔

بہر حال قارون کی قوم میں ایسے لوگ تھے جو چاہتے تھے کہ یہ اس بغاوت سے باز آ جائے اور اسلام کے عادلانہ نظام معیشت کی طرف آ جائے 'جو اللہ نے دولت میں تصرف کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اور یہ ایسا نظام ہے کہ جس کے ذریعہ دولت مند اپنی دولت سے محروم نہیں ہوتا۔ اور وہ اعتدال کے ساتھ اپنی دولت سے استفادہ کر سکتا ہے 'جو اللہ نے امت بخشا ہے لیکن یہ نظام میانہ روی اور اعتدال کو اہل ثروت کے لیے لازم قرار دیتا ہے 'اور یہ کہ وہ اس ذلت کو ہر وقت دل میں رکھیں جس نے انہیں یہ مال دیا ہے اور دولت کو اس طرح کام میں لائیں کہ قیامت میں اپنے کیے کا حساب دے سکیں۔

اِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (۷۶) وَابْتَغِ فِيمَا اٰتٰكَ اللّٰهُ

الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ

الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (۷۷) (۲۸: ۷۶ - ۷۷) "ایک

دنہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا "پہوں نہ جا" اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر 'جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے 'اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر 'اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا'۔ اس آیت میں ان سب اقدار اور خصوصیات کو جمع کر دیا گیا ہے جو تمام دوسرے نظامائے زندگی کے مقابلے میں اسلامی نظام زندگی کی خصوصیات ہیں۔ اور وہ صرف اسلام میں پائی جاتی ہیں۔

لَا تَفْرَحْ (۲۸: ۷۶) ”پھول نہ جاؤ“۔ مال اور دولت پر مست ہو کر حد سے زیادہ خوشی محسوس نہ کرو۔ دولت کے ساتھ ضرورت سے زیادہ دلچسپی نہ لو، اور دل کو خزانوں کے ساتھ باندھ نہ دو۔ مملوکات اور مقبوضات کو دیکھ کر زیادہ مسرت کا اظہار نہ کرو، اور دولت پر اس طرح نہ پھول جاؤ کہ دولت عطا کرنے والے ہی کو بھول جاؤ۔ اللہ کی نعمتوں کو بھلا دو اور اس کا حمد و شکر چھوڑ دو۔ بعض لوگ مال و دولت ہی کی وجہ سے ہلکے ہو کر ہوا میں اڑنے لگتے ہیں، ان کا دماغ بھی اڑنے لگتا ہے اور محض دولت کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں اور لوگوں پر دست درازی کرتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ (۲۸ : ۷۶) ”اللہ پھول جانے والے لوگوں کو پسند نہیں کرتا“۔ اس طرح قارون کی قوم نے کوشش کی کہ قارون کو اللہ کی طرف لوٹا دے، کیونکہ اللہ مال اور دولت کی اسس پر غرور اور تکبر کو پسند نہیں کرتا اور نہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو دولت کی وجہ سے دوسرے کے ساتھ ظلم کرتے ہیں اور ان کا استحصال کرتے ہیں۔

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (۲۸ : ۷۷) ”جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسام کا نظام زندگی کس قدر معتدل اور سیدھا ہے جو ایسے دل کو جس کے پاس دولت ہے آخرت کے ساتھ بھی باندھ دیتا ہے اور اسے دنیا کے حصہ سے بھی محروم نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اسے حکم دیتا ہے کہ دنیا میں مال سے استفادہ کو بھول نہ جاؤ، اس طرح نہ ہو کہ تم تارک الدنیا ہو کر اس دنیا کی زندگی کو معطل کر دو۔

اللہ نے دنیا کے اندر یہ پاکیزہ چیزیں اسی لیے تو پیدا کی ہیں کہ لوگ ان سے استفادہ کریں اور زمین میں ان پاکیزہ چیزوں کی پیداوار میں اضافے کے لیے ہر وقت کوشش رہیں اور زندگی میں ترقی اور تنوع ہو تا رہے۔ اور اس طرح انسان اس کرۃ الارض پر منصب خلافت ادا کرتا رہے۔ لیکن یہ پیداوار اور یہ ترقی عالم آخرت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہو۔ آخرت کی راہ سے لوگ منحرف نہ ہوں اور آخرت کی تکالیف اور فرائض کو بھول نہ جائیں۔ اس انداز سے دنیا کے ساز و سامان سے لطف اندوز ہونا بھی ایک طرح کا شکر نعمت ہے اور اللہ کے دین کو قبول کرنا ہے اور ان سے لطف اندوز ہونا ہے اور یہ بھی اللہ کی عبادت میں سے، آپ عبادت اور اطاعت ہے۔

یوں اسلامی نظام زندگی، انسانی زندگی کے اندر اعتدال اور ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے اور اس معتدل زندگی ہی کے ذریعہ اس کو روحانی ترقی کے مدارج بھی طے کرتا ہے جس میں کسی قسم کی محرومیت نہیں ہوتی اور نہ اسی میں انسان کی فطری زندگی کے کسی بھی حصے کا قتل لازم آتا ہے۔

وَإِحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ إِلَيْكَ اللَّهُ (۲۸ : ۷۷) ”احسان کرو، جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا“۔ یہ مال اللہ کی طرف سے بخشش اور انعام ہے۔ اور اللہ کا احسان ہے۔ اللہ احسان کا بدلہ احسان ہونا چاہئے۔ اس احسان کو قبول کرو، احسان کے ساتھ اس میں تصرف کرو، اور لوگوں کے اوپر احسان کرو اور اپنے ذہن میں اللہ کے

اس احسان کا شعور تازہ رکھو اور شکر ادا کرتے رہو۔ گرے شعور کے ساتھ صرف زبان سے شکر گایا نہ کرو۔

وَلَا تَبْغِ الْفُسَادَ فِي الْأَرْضِ (۲۸: ۷۷) ”اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کرو۔“
یعنی سرکشی اور ظلم کی وجہ سے فساد نہ کرو، اور دنیا کا ساز و سامان اگر خدا خونی اور آخرت کے حساب سے مبرا ہو کر استعمال کیا جائے تو اس سے زمین میں فساد برپا ہوتا ہے، یوں کہ مالداروں کے خلاف لوگوں کے دل میں حسد، بغض اور کینہ کی آگ جہاں شروع ہو جاتی ہے اور اگر مال کو بے جا طریقے سے خرچ کیا جائے تو بھی ظلم اور فساد کا باعث۔ اگر جائز طریقوں میں خرچ سے روکا جائے تو بھی ظلم کا باعث ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (۲۸: ۷۷) ”اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔“ جس طرح اللہ تعالیٰ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح مفسدوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ تو قحی نصیحت قوم قارون کی، قارون کو اس پوری اصلاحی تقریر کے جواب میں وہ بس ایک ہی جملہ کہتا ہے لیکن یہ جملہ جامع شروع و فساد ہے۔

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي (۲۸: ۷۸) ”تو اس نے کہا، یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔“ یعنی میرے علم و ہنر نے اس مال کو جمع کیا ہے، لہذا یہ میرا حق ہے۔ تم کون ہوتے ہو مجھے اس کے تصرف کے لیے خاص ہدایات دینے والے؟ اور میری مخصوص ذاتی ملکیت کے بارے میں از خود فیصلے کرنے والے۔ یہ مال تو میں نے بڑی جدوجہد کے بعد بنایا ہے اور اپنی مہارت اور دانش مندی کی وجہ سے اس دن کا اہل ہوا ہوں۔ یہ اس مفرد اور پر خود غلط شخص کی بات ہے جو نعمت اور حکمت کے اصل مصدر کو فراموش کر دیتا ہے اور جسے مال فتنے میں ڈال دیتا ہے اور دولت اندھا کر دیتی ہے۔

اس قسم کے لوگ انسانوں میں ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ کئی ایسے لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جدوجہد ان کے مالدار ہونے کا حقیقی سبب ہے۔ اس لیے اپنے حاصل کیے ہوئے مال کے بارے میں انہیں مسئول نہ ہونا چاہئے۔ اس ماں کو وہ اصلاح کے کاموں میں لگائے یا فساد کے کاموں میں اس کے لوہے کوئی محاسبہ نہ ہونا چاہئے۔ اور اس کی خوشی اور غمی اور مرضی اور انکار کے لوہے کوئی نگرانی نہ ہونا چاہئے۔

اسلام انفرادی ملکیت کی اجازت دیتا ہے اور حلال طریقوں سے دولت جمع کرنے کی اسلام حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسلام انفرادی جدوجہد کو نظر انداز نہیں کرتا اور نہ اسے فضول سمجھتا ہے۔ لیکن اسلام اس آزادی کے ساتھ ساتھ انفرادی دولت اور مملوکیات کے استعمال کے لیے ضابطہ بھی متعین کرتا ہے جیسا کہ دولت کے کمانے اور ترقی دینے کے لیے اسلام ایک منہاج مقرر کرتا ہے۔ اسلام کا طریقہ کار اور اس کی معاشی پالیسی نہایت معتدل اور متوازن ہے۔ اس میں فرد اپنی جدوجہد کے ثمرات سے محروم نہیں ہوتا اور وہ اس جمع کردہ دولت کو اس طرح صرف بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اسراف اور تبذیر کی حدود میں داخل ہو جائے اور نہ اس کو یوں جمع اور خزانہ کرنے کی اجازت دیتا ہے کہ وہ کنجوسی اور کھسی چوسی کی حدود میں داخل ہو جائے۔ اسلام انفرادی ملکیت میں سوسائٹی کو بھی حصہ دار کرتا ہے اور انفرادی دولت کمانے کی بھی نگرانی کرتا ہے۔ دولت کو ترقی دینے کے طریقے بھی منصفانہ طور پر متعین کرتا ہے اور ان سے استفادہ کرنے اور خرچہ کرنے پر

بھی کنٹرول کرتا ہے۔ اسلام کی معاشی ہدایات واضح ہیں اور ممتاز خصوصیات کی مالک ہیں۔

بہر حال قارون نے اپنی قوم کی آواز پر لبیک نہ کہا۔ اس نے اللہ کے انعامات کا شعور قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اسلام کی معاشی پالیسی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور نہایت ہی گھٹیا انداز میں قوم کی اس نصیحت سے اس نے منہ موڑا۔ چنانچہ آیت کے خاتمہ سے بھی پہلے اسے تنبیہ کر دی گئی اور اس کے اس فقرے کو رد کر دیا گیا۔

أَوَلَمْ يَعْلَم أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ
هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَ أَكْثَرُ جَعْلًا وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ ﴿۷۸﴾

”کیا اس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمیعت رکھتے تھے؟ مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔“

اگر تم صاحب مال دوست ہو اور کچھ قوت رکھتے ہو تو تم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ایسی اقوام کو ہلاک کیا ہے جو تم سے مال میں بھی زیادہ تھیں اور قوت اور گرفت میں بھی۔ یہ تاریخی حقیقت ہمیں معلوم ہونا چاہئے کیونکہ اس علم سے ہمیں نجات ملے گی۔ اس سے نہیں جس کے بل بوتے پر تم نے دولت جمع کی ہے۔ تم جیسے نو دولتہ تو اس قابل ہی نہیں کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے اللہ اگر انہیں ہلاک کرے تو اس سے پوچھے یا نفوس دے۔ کیونکہ نہ تم فیصلہ کرنے والے ہو اور نہ گواہ ہو۔

وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ (۷۸: ۲۸) ”مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے۔“ اس قصے کے مناظر میں سے یہ پہلا منظر تھا اس منظر میں نظر آتا ہے کہ سرمایہ دار ہمیشہ سرکش اور ظلم کرتے ہیں۔ وہ نصیحت پر کان نہیں دھرتے، نصیحت سے اپنے آپ کو بلا سمجھتے ہیں کہ ان کا نفس کبھی ان کو شکر نعمت بجالانے پر بھی آمادہ نہیں کرتا۔

دوسرے منظر میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ قارون کسی موقع پر اپنی دوست کی نمائش کرتا ہے۔ اس کی اس نمائش کو دیکھ کر بعض اہل ایمان کے دس بھی اڑنے لگے۔ وہ احساس کتری میں مبتلا ہونے لگے اور وہ تمنائیں کرنے لگے کہ ہمیں بھی ایسا ہی دیا جائے جس طرح قارون کو دیا جاتا ہے اور وہ لوگ جن کو دولت سے محروم رکھا گیا تھا انہوں نے یہ تبصرہ کیا کہ قارون کو تو دولت کا حظ دافر دیا گیا ہے۔ اس موقع پر صحیح علماء اور مومنین سامنے آتے ہیں اور وہ دکھاتے ہیں کہ وہ قارون کی اس نمائش سے بلند ہیں اور جو لوگ اس مظاہرہ سے متاثر ہو گئے تھے ان کو وہ نہایت ہی اعتماد، یقین اور زور دار انداز سے منع کرتے ہیں۔“

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ ۖ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يَلِيَّتْ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿٧٩﴾
 قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيَلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنَ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا
 وَلَا يُلْقِهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ﴿٨٠﴾

”ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھانڈے میں نکلا۔ جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے ”کاش ہمیں بھی دینی تہمت ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے یہ تو بڑا نصیب والا ہے۔“ مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے ”افسوس تمہارے حال پر اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔“

دنیا کی اس زندگی کے اس نفع کے سامنے دوزخ میں دوزخ کے رد عمل سامنے آئے۔ ایک گروہ اس کی گرفت میں آگیا، مہسوت ہو گیا۔ اس منہر کے سامنے بچھ گیا اور اس پر ٹوٹ پڑا اور دوسرے گروہ کا رد عمل یہ تھا کہ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا، نظر بلند رکھی، امیدیں اس ثواب کے ساتھ وابستہ کر لیں جو اللہ کے ہاں محفوظ ہے، یہ اس کے نزدیک مال کی قوت کے مقابلے میں ایمان کا ترازو بھاری رہا۔

قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يَلِيَّتْ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ

عَظِيمٍ ﴿٧٩﴾ ”جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا۔ یہ تو بڑا نصیب والا ہے۔“ ہر دور میں دنیا کی زیب و زینت بعض لوگوں کا مقصد بن جاتی ہے اور جو لوگ دنیا کے طالب ہوتے ہیں ان کی آنکھیں اسے دیکھ کر چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ اور اس قسم کے لوگ اس چیز کی طرف بلند نظریں نہیں رکھتے جو اس دنیا سے اعلیٰ اور زیادہ قیمتی ہے۔ ایسے لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ اس زیب و زینت کو خریدنے والے نے کس قدر زیادہ قیمت ادا کر کے خریدا ہے۔ اور یہ دنیا کا ساز و سامان اس شخص نے کیا کیا ذرائع کام میں لا کر حاصل کیا ہے۔ اس کے لیے مال، منصب اور عزت کی کیا کیا قربانیاں دی گئی ہیں۔ چنانچہ سطحی نگاہ رکھنے والے ایسے مظاہر پر ٹوٹ پڑتے ہیں جس طرح کھیاں ہر مٹھی چیز پر جمع ہو جاتی ہیں۔ اور اس پر گرتی ہیں اور ایسے لوگ جب اہل ثروت کو دیکھتے ہیں تو ان کے منہ میں پانی آ جاتا ہے لیکن ان کی نظر اس بات پر نہیں ہوتی کہ یہ دولت اور زیب و زینت جمع کرنے والے نے بہت مہنگی قیمت ادا کی، کن کن گندگیوں سے ہو کر گزرا ہے اور کیا کیا خبیث ذرائع استعمال کیے ہیں۔

اور جن لوگوں کا رابطہ اللہ سے ہوتا ہے اور وہ اعلیٰ اقدار کو اہمیت دیتے ہیں اور دولت اور دنیا کی زیب و زینت سے بڑھ کر ان کی نظروں میں حریذ اعلیٰ قدریں بھی ہوتی ہیں۔ اپنی شخصیت کے اعتبار سے بند ہوتے ہیں اور ان کا دماغ اس قدر اونچا ہوتا ہے کہ وہ زمین کی قدروں کے سامنے کسی مالدار کے سامنے نہیں جھکتے۔ یہ لوگ ہیں جن کو حقیقی علم دیا گیا ہے۔ یہی وہ علم ہے جو انسانی زندگی کو سیدھا رکھتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيَلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنَ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا

يُنْقِضُهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ (۲۸: ۸۰) ”مگر جو لوگ ظلم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے افسوس تمہارے حال پر! اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔“

اللہ کے ہاں جو درجہ ہے وہ اس زمينت سے بہتر ہے! اللہ کے خزانے قارون کے خزانوں سے زیادہ ہیں اور یہ شعور اعلیٰ قدروں کی بابت صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو صبر کرنے والے ہوں! جو درد سروں کے اعلیٰ معیار حیات کو دیکھ کر متاثر نہیں ہوتے۔ اور زندگی کے تمام فتنوں اور رعنائیوں کے مقابلے میں اپنے مقام پر جے رہتے ہیں۔ جب ایسے لوگوں کا شعور یہ ہوتا ہے کہ آخرت کا اجر! اللہ کی رضامندی بہت قیمتی سامان ہے تو ان کا درجہ اور بلند ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا کے ساز و سامان سے بلند ہو جاتے ہیں اور ان کی نظریں ثواب آخرت کے اعلیٰ اقل پر ہوتی ہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

جب زیب و زینت کا یہ فتنہ امتحا کو پہنچ جاتا ہے! اور لوگ اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے بلکہ اس سے شکست کھا کر اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں تو اب دست قدرت کی طرف سے براہ راست مداخلت کا وقت آ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ضعیف لادراہ لوگوں کو اس کے جال میں شکار ہونے سے بچانے کے لیے اس فتنے کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ زیب و زینت کا یہ غور ختم کر دیا جاتا ہے۔ اور عبرتناک منظر میں ایک فیصلہ کن گرفت کی جھلک پیش کرتا ہے:

فَخَسَفْنَا بِهِ وَابِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ
يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِينَ

”آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر کوئی اس کے حامیوں کا گردہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا۔“
نہایت ہی مختصر جملے میں ایک مختصر جھلکی کی صورت میں یہ انجام دکھایا گیا۔

فَخَسَفْنَا بِهِ وَابِدَارِهِ الْأَرْضَ (۲۸: ۸۱) ”آخر ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔“ زمین اسے بھی ٹھل گئی اور اس کے محل کو بھی ٹھل گئی۔ جس زمین پر وہ اپنے آپ کو سر بلند سمجھتا تھا۔ جس کے اوپر وہ لوگوں پر ظلم کرتا تھا۔ اللہ نے اسے اسی کے اندر داخل کر دیا۔ اور وہ ضعیف و ناتواں ہو گیا۔ نہ اس کی مدد کوئی دد سرا کر سکا اور نہ وہ اپنی جاہ و مال کے ساتھ اپنی کوئی مدد کر سکا۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ فتنہ بھی دفن ہوا جس کے اوپر بعض لوگ فریفتہ ہو رہے تھے۔ غرض فیصلہ کن رونے ان کو اللہ کی قدرت کی طرف پھیر دیا اور غصب اور گمراہی کے پردے دور ہو گئے اور یہ آخری منظریں رہا۔

وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَتَّعُوا بِمَكَانِهِ بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيَكَانُ
اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَوْ لَا أَنْ مِّنَ اللَّهِ

عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۖ وَنِكَاتُهُ لَا يَنْفَعُ الْكَافِرُونَ ۝۸۱

”اب وہی لوگ ہو کل اس کی حرمت کی تمنا کر رہے تھے، کہنے لگے ”افسوس“ ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے، کشادہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے پناہ دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس ہم کو یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں پایا کرتے۔“

اب یہ لوگ اس بات پر اللہ کی حمد و ثنا کر رہے ہیں کہ اللہ نے ان کی دعا قبول نہ کی۔ اور ان کو وہ دولت نہ دی جس کی وہ تمنا کرتے تھے اور جو دولت قارون کو دی گئی وہ ان کو نہ دی گئی۔ ورنہ ان کی حالت بھی وہ ہو جاتی جو چوہیں گھٹنوں میں قارون کی ہو گئی۔ ان کو اب ہوش آیا کہ دولت اس بات کی علامت اور دلیل نہیں ہے کہ دولت مند پر اللہ کا فضل ہے اور اللہ اس سے راضی ہے بلکہ اللہ اپنے بندوں میں سے کسی کو کم رزق دیتا ہے اور کسی کو زیادہ دیتا ہے یہ اس لیے نہیں ہے کہ اللہ ان سے راضی ہے یا ناراض ہے۔ رزق کی فراہمی کے اسباب اور ہیں۔ اگر وافر رزق اللہ کی رضامندی کی دلیل ہوتا تو قارون اللہ کی اس شدید گرفت اور پکڑ میں نہ آتا۔ ایسے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو اب معصوم ہوا کہ کافر بھی فلاح نہیں پاتے۔ قارون کے بارے میں قرآن نے کلمہ کفر نقل نہیں کیا گیا۔ البتہ مال و دولت پر غور کرنا اور یہ سوچ رکھنا کہ یہ دولت اس نے خود اپنے علم و حکمت کے زور سے کمائی ہے، یہ بھی ایک قسم کا کفر ہے اور اس کا انجام ایسا ہوا جو کافروں کا ہوتا ہے یعنی مکمل جاہی اور ہلاکت۔

--- ۰ ۰ ۰ ---

اب اس منظر پر بھی پردہ گر جاتا ہے۔ دست قدرت کی مداخلت سے لیل ایمان کے دلوں کو قوت ملی۔ اور اللہ کے پیانوں میں ایمان کی قوت کو ترجیح ملی۔ اور اب ان مناظر پر بہترین تبصرہ:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ
وَلَا فَسَادًا ۖ وَالْحَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝۸۲

”وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے۔“

یہ دار آخرت جس کی بات لیل علم کرتے ہیں یعنی وہ لوگ جن کے پاس سچا علم ہے جو اشیاء کی صحیح قدر و قیمت متعین کرتا ہے یہ جہاں نہایت ہی بلند مرتبت ہے۔ سمت حق وسیع ہے یہ جہاں کس کے لیے ہے؟

نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا (۲۸: ۸۳) ”یہ ہم نے ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں۔“ ایسے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ وہ زمین میں برتری اپنی ذاتی سرمدی کے لیے حاصل کریں۔ وہ تو اپنی دلت اور اپنی شخصیت

پر بھی فخر نہیں کرتے۔ ان کی ذات بھی اللہ کے تصور اللہ کی یاد اور اللہ کے شعور میں گم ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے نظام حیات کے لیے ساعی ہوتے ہیں ان لوگوں کے چنانوں میں 'اس زمین' اس کی اشیاء' اس کے سامان' اور اس کی اقدار کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ وہ امتداد فساد فی الارض کے لیے نہیں حاصل کرتے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ نے دہر آخرت تیار کیا ہے جو عالی شان ہے۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (۸۳: ۲۸) ”اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے۔“ جو اللہ سے ڈرتے ہیں جو اس کے غضب سے خائف ہوتے ہیں اور اس کی رضامندی کے طلبکار ہوتے ہیں۔“
اس جہاں آخرت میں سب لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا ملے گی اور یہ بات اللہ نے اپنے اوپر لکھ دی ہے کہ نیکوں کا اجر بھی کماٹے گا اور برائیوں کی سزا ان کے برابر ہوگی۔ زیادہ نہ ہوگی۔ یہ ہے اللہ کی رحیمانہ شان۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ
فَلَا يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۸۴﴾

”جو کوئی بھلائی لے کر آئے گا اس کے لیے اس سے بہتر بھلائی ہے اور جو برائی لے کر آئے تو برائیاں کرنے والوں کو دیسا ہی بدلہ ملے گا جیسے عمل وہ کرتے تھے۔“

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۹۷ التشریح آیات

۸۵ --- تا --- ۸۸

اب قصص ختم ہیں۔ ان قصص پر جو تبصرے تھے وہ بھی ختم ہو گئے۔ اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ مکہ مکرمہ میں اس وقت مٹی بھر لیں ایمان آپ کے ساتھ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب ایسے حالات میں ہے کہ مکہ سے لوگ آپ کو نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آپ مدینہ کی طرف جانے والے ہیں اور اس میں بھی قوم آپ کا دھچکا کر رہی ہے۔ ابھی آپ مدینہ نہیں پہنچے۔ راستہ ہی میں ہیں۔ یہ آیات محمد میں اتریں جو مکہ کے قریب ہے۔ اس وقت ہجرت کرتے ہوئے آپ کی نظریں اور آپ کا دل اپنے محبوب شرمکہ کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ آپ پر مکہ چھوڑنا نہایت ہی دشوار گذر رہا ہے۔ اگر دعوت اسلامی کا عظیم مقصد آپ کے پیش نظر نہ ہوتا تو آپ اپنے بچپن کے اس شرمکو ہرگز نہ چھوڑتے جس کے ساتھ آپ کی یادیں وابستہ ہیں۔ جہاں آپ کے آباؤ اجداد خولیدہ ہیں اور جہاں آپ کے رشتہ دار رہتے ہیں۔ ایسے حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ

”اے نبی! یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین انجام کو پہنچانے والا ہے“ (یعنی مکہ تک)۔

اللہ آپ کو مشرکین کے حوالے کرنے والا نہیں ہے۔ جبکہ اللہ نے آپ پر قرآن کی تبلیغ اور دعوت فرض کر دی ہے۔ اللہ مشرکین مکہ کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کو مکہ سے نکال دیں۔ آپ پر اور آپ کی دعوت کے حاملین پر تشدد اور ظلم کرتے رہیں۔ اللہ نے جو آپ کو قرآن کی دعوت کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ وہ ایک مقرر وقت پر آپ کی نصرت بھی کرنے والا ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ ٹھیک ہے آج ان لوگوں نے آپ کو نکال دیا ہے لیکن بہت جلدی آپ پھر واپس آنے والے ہیں۔

جن حالات میں حضور اکرمؐ ہجرت پر مجبور ہوئے تھے وہ بہت زیادہ کرہناک تھے لیکن اللہ نے چاہا کہ ایسے حالات ہی میں آپؐ کے ساتھ یہ پختہ وعدہ کر دیا جائے کہ آپؐ ہنرمندی کے ساتھ پھر اس شرمکو لوٹیں گے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کی مشکلات کو امن اور یقین کے ساتھ برداشت کریں۔ مطمئن ہو جائیں کہ جلدی آپؐ فاتح کی حیثیت سے لوٹنے والے ہیں۔ اور آپؐ کو بھی طرح یقین ہو گیا کہ جلد ہی یہ تحریک مکہ میں فاتحانہ داخل ہوگی۔ اللہ کا یہ وعدہ ان

تمام لوگوں کے لیے قائم ہے جو بھی اس راہ پر چلنا چاہیں۔ جو شخص بھی اللہ کے لیے تشدد کا شکار ہو اور وہ اس پر مہر کرے اور یقین رکھے کہ اس ظلم اور تشدد کے بعد آخر کار اللہ کی مدد آئے گی تو اللہ نے آخر کار ایسے شخص کی مدد کی ہے۔ ایسا شخص آخر کار کامیاب ہوتا ہے اس معرکے سے سرخرو ہو کر نکلتا ہے۔ اس کے کاندھوں سے بوجھ اتر جاتا ہے اور وہ اپنے فرائض اچھی طرح ادا کر لیتا ہے۔

ان الذی فرّصَ علیک التّٰنِزَ انْ لَّا آدُکَ اِلٰی مَعَادٍ (۲۸: ۸۴) ”یقین کرو جس نے تم پر قرآن فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین جگہ (مکہ) واپس پہنچانے والا ہے۔“ اور اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکال دیئے گئے تھے اور ان کا تعاقب بھی ہوا تھا لیکن اللہ نے ان کو پھر مصر کی طرف لوٹا دیا۔ وہ واپس ہوئے اور انہوں نے اپنی قوم کے کمزور لوگوں کو فرعون کی غلامی سے نکالا اور فرعون اور اس کی فوج ہلاک ہوئی اور اچھا انجام ان لوگوں کا ہوا جنہوں نے ہدایت قبول کی تھی۔ لہذا آپ بھی جس راہ پر نکل پڑے ہیں چلتے رہیں اور آپ کی قوم اور آپ کے درمیان فیصلہ وہ کرے گا جس نے آپ کو اس ڈیوٹی پر مامور کیا ہے۔

قُلْ رَبِّیْٓ اَعْلَمُوْا مَنْ جَاءَ بِالْهُدٰی وَمَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۵﴾

”ان لوگوں سے کہہ دو کہ ”میرا رب خوب جانتا ہے کہ ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کھلی گمراہی میں کون مبتلا ہے“ یعنی ہدایت و ضلالت کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ وہ لکل ہدایت کو جزاء دے گا اور کل ضلالت کو سزا دے گا۔ آپ پر جو قرآن فرض کیا گیا ہے وہ آپ پر اللہ کی طرف سے ایک رحمت اور مہربانی ہے۔ آپ کے تو خوب و خیال میں یہ بات نہ تھی کہ یہ امانت آپ کے حوالے کی جائے گی۔ یہ ایک عظیم منصب ہے جو آپ کو دیا گیا اور اس منصب کے دیئے جانے سے قبل آپ کے تصور میں بھی ایسی کوئی بات نہ تھی۔

وَمَا کُنْتَ تَرْجُوْا اَنْ یُّلْقٰی اِلَیْکَ الْکِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّکَ

”تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتب نازل کی جائے گی“ یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی سے (تم پر نازل ہوئی ہے)۔“

یہ اس مسئلہ پر ایک فیصلہ کن بات ہے کہ رسالت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی امید نہ تھی کہ آپ رسول بھی ہو سکتے ہیں۔ پس یہ اللہ کا اچانک انتخاب تھا۔ اور اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے۔ یہ اس قدر بلند منصب ہے کہ اس کے لیے کوئی انسان قبل از وقت توقع بھی نہیں کر سکتا سوچ بھی نہیں سکتا کہ اللہ اسے اس منصب کے لیے جن لے گا یا اللہ اسے اس کے لیل بتا دے گا۔ یہ اللہ کا محض رحم و کرم ہوتا ہے۔ کسی شخص پر یا کسی قوم پر کہ ان میں سے کسی کو اللہ جن لیتا ہے اور یہ انتخاب ان کا ہوتا ہے جو اللہ کے اونچے بندے ہوں ان کا انتخاب نہیں ہوتا جو اس منصب کے امیدوار ہوتے ہیں۔ مکہ کے ماحول میں عربوں میں اور اسرائیل میں بہت سے لوگ تھے۔ اس انتظار

میں تھے کہ نبی آخر الزمان آنے والا ہے، لیکن وہ کون ہو گا؟ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ منصب رسالت کہاں لے جا کر رکھ دے۔ اللہ نے اس قوم اور اس شخص کو اس منصب کے لیے چن لیا جو اس کے لیے نہ امیدوار تھا اور نہ اس کو اس کا خیال تھا کیونکہ اللہ جہاں منصب نبوت دیتا ہے اس کے لیے پہلے اس کی قبولیت کے لیے فیض عظیم اور استعداد وافر عطا کرتا ہے۔

مکی وجہ ہے کہ حضور کو حکم دیا جاتا ہے چونکہ آپ کو یہ کتاب دی گئی جس کے مطابق آپ نے حق پر فیصلے کرنے ہیں، لہذا کافروں کے مددگار نہ بنیں، کیونکہ وہ تو آپ کو اللہ کی ان روشن نشانوں سے روک دیں گے۔ بلکہ آپ مشرکین کے مقابلے میں صاف صاف عقیدہ توحید پر مبنی دعوت لے کر اٹھیں۔

فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِلْكَافِرِينَ ﴿۸۷﴾ وَلَا يَصُدُّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ
بَعْدَ إِذْ أُنْزِلَتْ إِلَيْكَ وَادْعُ إِلَى رَبِّكَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۸۸﴾
وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَتَكُنْ شَىْءٌ هَالِكٌ إِلَّا
وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۸۹﴾

الثلاثه

”پس تم کافروں کے مددگار نہ بنو۔ اور ایسا بھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات جب تم پر نازل ہوں تو کفار تمہیں ان سے باز رکھیں۔ اپنے رب کی طرف دعوت دو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔ فرمانروائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب چلائے جانے والے ہو۔“

اس سورت کے آخر میں یہ انسانی عقل و خرد کے تاروں پر آخری ضرب ہے۔ اس فیصلہ کن ضرب میں بتا دیا جاتا ہے کہ آپ اور آپ کے راستے اور مشرکین اور مشرکین کے طریقے کے درمیان بڑے فاصلے ہیں۔ آپ کے متبعین قیامت تک آپ کی راہ اور اس کے نشانات پر رہیں۔ یہ فیصلہ کن بات آپ کی ہجرت کے موقعہ آئی ہے جس کے ذریعے حضور اور مشرکین مکہ کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے تھے اور آنے والے عہد میں مختلف تاریخیں تیار ہونے والی تھیں۔

فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِلْكَافِرِينَ (۸۷: ۲۸) ”پس آپ کافروں کے مددگار نہ بنیں۔“ کیونکہ مومن اور کافر کے درمیان کوئی تعاون اور باہم نصرت کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ دونوں کے راستے جدا ہیں، دونوں کے نظام زندگی متضاد ہیں۔ مومن حزب اللہ ہیں اور کافر حزب الشیطان ہیں۔ اس لیے دونوں کے باہم تعاون کے لیے کوئی مشترکہ اساس ہی نہیں ہے۔ دونوں کے تعاون کے لیے کوئی مشترکہ میدان نہیں ہے۔

وَلَا يَصُدُّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنْزِلَتْ إِلَيْكَ (۸۸: ۲۸) ”اور ایسا بھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات جب تم پر نازل ہوں تو کفار تمہیں ان سے باز رکھیں۔“ کفار کا ہمیشہ یہ مقصد رہا ہے کہ اہل دعوت

کو کسی نہ کسی طریقے سے دعوت سے باز رکھیں اور مسلمانوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت کے راستے پر چلتے رہیں۔ اگرچہ رکاوٹیں ڈالنے والے رکاوٹیں ڈالیں۔ اور اس طرح چلتے رہیں کہ کوئی ان کو راہ دعوت سے روک نہ سکے۔ وہ قرآن اور سنت کی آیات کو لے کر اور ان پر بھروسہ کر کے اپنی راہ پر چل نکلیں۔

وَ اِذْ عٰلِی رَبِّكَ (۲۸: ۸۵) ”اپنے رب کی طرف دعوت دو“۔ یہ دعوت خالص اسلامی دعوت ہو، بالکل واضح ہو اور اس کے اندر کوئی پیچیدگی اور کوئی التباس نہ ہو۔ یہ صرف اللہ کی طرف ہو، کسی قومیت اور کسی عصبیت کی طرف نہ ہو۔ کسی زمین اور کسی جھنڈے کے لیے نہ ہو، کسی مصلحت اور کسی مفاد کے لیے نہ ہو۔ کسی ذاتی خواہش اور کسی دنیاوی عیاشی کے لیے نہ ہو۔ اس دعوت کو کوئی قبول کرتا ہے یا نہیں کرتا، اس کی کوئی پرواہ نہ کی جائے۔ اور کوئی اس کو قبول نہیں کرتا تو وہ اپنے لیے کوئی اور راہ لے، ہمارا طریقہ اور راستہ تو یہی ہے۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (۲۸: ۸۵) وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۲۸: ۸۸)

”اور ہرگز مشرکین میں شامل نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ پکارو“۔ ایک ہی اصول کو تاکید دو مرتبہ بیان کیا گیا یعنی شرک نہ کرو، اور اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو، اس طریقہ سے اسلامی نظریہ حیات کھر کر سامنے آتا ہے۔ توحید اور شرک اسلامی عقیدہ کا بنیادی مسئلہ ہے۔ شرک کی نئی اور توحید کا اثبات بنیادی کلمہ ہے۔ اسی پر اسلامی نظریہ حیات قائم ہے۔ اسلام کے آداب، اس کے فرائض، اس کے اخلاقی ضابطے اور اس کے قانونی ضابطے سب اسی نظریہ پر قائم ہیں۔ ہر ہدایت اور ہر قانون نظریہ توحید پر قائم ہے۔ اس لیے ہر ہدایت اور ہر ضابطہ بندی سے قبل عقیدہ توحید کا ذکر ہوتا ہے۔ مزید تاکید ملاحظہ ہو۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ (۲۸: ۸۸) ”اس کے سوا کوئی معبود والا نہیں ہے ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے“۔ لہذا اسی کے آگے جھکنا ہے۔ اسی کی بندگی کرنا ہے، اس کے سوا کسی کے پاس کوئی قوت نہیں ہے۔ اس کے سوا کسی کے پاس جائے پناہ اور جائے تحفظ نہیں ہے۔

کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ (۲۸: ۸۸) ”ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے“۔ ہر شے زائل ہونے والی ہے، ہلاک ہونے والی ہے، مال ہو یا جاہ، اقتدار ہو یا قوت، زندگی ہو یا سامان زندگی، زمین ہو یا زمین کے باشندے۔ آسمان ہوں یا ان میں رہنے والی ہر چیز۔ اور یہ پوری کائنات جسے ہم جانتے ہوں یا جو ہمارے علم سے باہر ہو، ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے ماسوائے ذات باری تعالیٰ کے۔ صرف ذات باری تعالیٰ ایسی ہی باقی رہے گی۔

لَهُ الْحُکْمُ (۲۸: ۸۸) ”فرمانروائی اسی کی ہے“۔ وہ جو فیصلے چاہتا ہے، کرتا ہے، جو احکام چاہتا ہے، دیتا ہے۔ اس کے احکام اور بادشاہت میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے فیصلے کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ اس کے حکم کے ہاتھ کوئی حکم نہیں۔ اور وہ چاہے وہ ہوتا ہے اور اس کے سوا کوئی ایسی ذات

نہیں ہے جس کی حیثیت چلتی ہو۔

وَالَّذِينَ تَرَجُّعُونَا (۲۸: ۸۸) ”اور اسی کی طرف تم کو پلٹتا ہے۔“ لہذا اس کے حکم سے کوئی جائے خلاصی و جائے پناہ نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں فرار کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے سوا کوئی مجاہد ماویٰ نہیں ہے۔ یوں اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ قدرت البیہ اس میں برملا کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ذات باری دعوت اور داعیوں کی محافظ نظر آتی ہے۔ اور دعوت اسلامی کے مقابلے میں تمام قوتوں کو پاش پاش کرنے کے مناظر صاف نظر آتے ہیں۔ اور سورت کا اختتام دعوت اسلامی کی بنیاد یعنی عقیدہ توحید پر ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ و حاکم نہیں ہے۔ حکم اور فیصلہ اسی کا چلے گا اور اس دعوت کو لے کر اہل دعوت کو چاہئے کہ وہ یقیناً ’اعتماد اور یکسوئی کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ---- ۲۰

سورۃ العنکبوت - ۲۹

۱ --- تا --- ۴۴

سورۃ العنکبوت ایک نظر میں

سورۃ عنکبوت کی ہے 'بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ اس کی پہلی گیارہ آیات مدنی ہیں۔ محض اس لیے کہ ان میں جہاد اور منافقین کا ذکر ہے۔ لیکن ہم اس قول کو ترجیح دیتے ہیں یہ پوری سورت کی ہے اور اس کی آٹھویں آیت کے بارے میں یہ روایت آتی ہے کہ یہ سعد ابن ابی وقاص کے اسلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ عنقریب اس کا ذکر ہو گا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت سعد ابن ابی وقاص مکہ میں مسلمان ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جن آیات کو مدنی کہا گیا ہے یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ لہذا صحیح بات یہی ہے کہ ان سب آیات کو کی کہا جائے۔ رہی یہ بات کہ ان میں جہاد کا ذکر آیا ہے تو اس کی تاویل آسان ہے کیونکہ مضمون کلام سے یہاں آزمائشوں کے خلاف جہاد معلوم ہوتا ہے۔ نفس کے خلاف جہاد اور نفاق کا ذکر بھی اسی کا مفہوم ہے یعنی لکی منافقت کہ ایک آدمی بات کرتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا۔ ان آیات میں لوگوں کے ایک مخصوص نمونے کا ذکر ہے۔

یہ پوری سورت آغاز سے اختتام تک ایک ہی لائن اور ایک ہی موضوع پر جاری ہے۔ اس کا آغاز حروف مقطعات اور ایمان اور ایمان والوں کی آزمائش سے ہوتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب ایمان کسی شخص کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس شخص سے ایمان بھاری تقاضے کرتا ہے کیونکہ ایمان صرف چند کلمات کا نام نہیں ہے جو کہ دیئے جائیں بلکہ ایمان کے نتیجے میں جو مشکلات آتی ہے ان کو برداشت کرنا اس کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی ایمان کا حصہ ہوتا ہے۔ فرائض و مشکلات پر صبر کرنا بھی ایمان کا حصہ ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کا محور اور موضوع ہی "ایمان اور اس کے تقاضے" ہے کیونکہ ایمان اور مشکلات راہ کے ذکر کے بعد حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت شعیب علیہم السلام کے قصص آتے ہیں۔ پھر عاد، ثمود، قارون، فرعون اور ہامان کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر تمام زمانوں اور اقوام میں یہی صورت حال اہل ایمان کو پیش آتی رہی ہے یعنی ایمان کے ساتھ فتنے اور آزمائشیں لازم ہوتی ہیں۔

اس کے بعد یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس دنیا میں شرکی قوتیں ہمیشہ ایمان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتی ہیں اور مشکلات پیدا کرتی ہیں۔ شرکی قوتیں اہل ایمان کو معاشرے میں حقیر قوت ظاہر کرتی ہیں۔ ان کو نظر انداز کرتی ہیں لیکن اللہ ان کو خوب پکڑتا ہے۔

فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَ

مِنْهُمْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ أَغْرَقْنَا (۲۹ : ۴۰) (۲۹ : ۴۰) "آخر کار ہر ایک کو ہم

نے اس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پھرو کر ڈالنے والی ہوا بھیجی، اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا، اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور کسی کو غرق کر دیا۔ پھر ان تمام قوتوں کی ایک مجسم مثال دی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں یہ کس قدر کمزور ہیں اللہ کی قوتیں جب اٹھتی ہیں تو یہ بے بس ہوتی ہیں۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بِعَبَابٍ وَإِنْ أُوْهِنَ الْبُيُوتُ لَبَّيْتَ الْعَنْكَبُوتَ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۲۹: ۴۱) ”جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنالئے ہیں ان کی مثال ٹکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور ٹکڑی کا گھر بنی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔“

اس کے بعد یہ سورت اس سچائی کو جو تمام انبیاء کی دعوتوں میں پائی جاتی ہے، اس سچائی کے ساتھ جوڑ دیتی ہے، جو زمین اور آسمان کی تخلیق میں ہے اور اس کے بعد ان تمام دعوتوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ سب اللہ کی جانب سے ہیں۔ سب دعوتیں اللہ وحدہ کی طرف پکارتی ہیں۔ اس کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی کتاب قرآن کریم پر بات ہوتی ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ مشرکین کا رد عمل اس کتاب کے حوالے سے کیا تھا۔ وہ اس کتاب کے ہوتے ہوئے خارق عادت معجزات طلب کرتے ہیں حالانکہ اس کے اندر جو دعوت ہے وہ اللہ کی رحمت اور نصیحت ہی بہترین راہنمائی اور یاد دہانی پر مشتمل ہے۔ اور پھر تعجب انگیز انداز میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس بارے میں جلدی کرتے ہیں کہ عذاب جلد کیوں نازل نہیں ہوتا حالانکہ جہنم تو بہت جلد ان کو اپنے گھیرے میں لینے والی ہے۔ پھر خود ان کی سوچ اور اپنے عقائد میں تضاد ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ”اگر ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو، تو ان کا جواب یہی ہو گا کہ اللہ نے۔“

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَآخَرًا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ”اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں سے پانی کس نے نازل کیا، پھر زمین کے مردہ ہو جانے کے بعد اس کے ساتھ اسے زندہ کر دیا تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے۔“

فَاِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۲۹: ۵۶) ”جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو صرف اللہ کو پکارتے ہیں، پورا دین اس لیے خالص کرتے ہوئے۔“ لیکن یہ عقائد رکھنے کے باوجود یہ لوگ شرک کرتے ہیں اور لل ایمان کو آزمائشوں میں ڈالتے ہیں۔

اس بحث و مباحثہ کے درمیان مومنین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ان آزمائشوں سے بچنے کے لیے ہجرت کریں، موت سے نہ ڈریں کیونکہ

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ” ہر نفس موت کو چکھنے والا ہے، پھر وہ سب ہماری طرف لوٹ کر آئیں گے۔“ نیز ہجرت کرتے ہوئے اس بات کی بھی پروا نہ کرو کہ ہم کھائیں گے کیا کیونکہ

وَكَأَيِّن مِّن دَآئِبَةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ (۲۹، ۶۰) ”کتنے ہی زمین پر چلنے والے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے ہوئے نہیں ہوتے، اللہ انہیں رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی دیتا ہے۔“
سورت کے آخر میں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ان کی تعریف اور تہجد کی گئی ہے اور ان کو ہدایت پر مطمئن ہونے اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (۲۹، ۶۹) ”وہ لوگ جنہوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا، ہم ضرور ان کی راہنمائی اپنے راستوں کی طرف کریں گے“ بے شک اللہ محسن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔“ یوں سورت کا خاتمہ اس کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اس طرح پوری سورت کے پیش نظر ہو سکتا ہے، وہ واضح ہو جاتی ہے۔ اور اس کے تمام حلقے مربوط ہو جاتے ہیں اور سب اس سورت کے محور کے ارد گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔

چنانچہ اس سورت کی بات اپنے اس موضوع پر تین راؤنڈز میں چلتی ہے۔ پہلے راؤنڈ میں ایمان کی حقیقت اللہ کی یہ سنت کہ وہ کارکنوں کو آزماتا ہے اور مشکلات میں مبتلا کرتا ہے اور پھر یہ کہ ایمان لانے والوں کا انجام کیا ہو گا اور کافروں کا انجام کیا ہو گا۔ اور یہ کہ دوسرے راوی انفرادی ہے۔ لہذا قیامت کے دن کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

وَلَيَسْئَلَنَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۲۹: ۱۳) ”قیامت کے دن ضرور ان سے پوچھا جائے گا کہ وہ کیا افتراء پر دازیاں کرتے رہے تھے۔“

دوسرے راؤنڈ میں وہ قصص ہیں جن کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا۔ ان قصص میں بھی وہ مشکلات اور رکاوٹیں بیان کی گئی ہیں جو ہمیشہ دعوت اور داعی کی راہ میں آتی ہیں۔ لیکن آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی قوتوں کے سامنے ان مشکلات اور رکاوٹوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ بتایا جاتا ہے کہ رسولوں کی دعوت حق پر مبنی ہوتی ہے اور اس کائنات کی تخلیق بھی اس حق کے اصول پر ہے۔ جس حق پر کائنات استوار ہے اور جس پر دین و شریعت استوار ہے، دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔

تیسرے راؤنڈ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ نہ کرو مگر نہایت لچھے انداز میں۔ ہاں ان میں سے ایسے لوگوں کے خلاف سخت بات کی جاسکتی ہے جو ان میں سے ظالم ہوں۔ اہل کتاب سے یہ بات کی جاسکتی ہے کہ تمام ادیان ایک ہیں، اور کافر جس دین اسلام کا انکار کر رہے ہیں، یہ بھی تمام ادیان سماوی کا ہم مشرب دین ہے۔ سب کا سرچشمہ ایک ہے۔ اس راؤنڈ میں مشرکین کے ساتھ مباحثہ ہے۔ اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں کہ وہ مطمئن ہو جائیں، ان کے لیے خوشخبریاں ہیں اور ثابت قدمی سے اپنی راہ پر چلیں۔ کیونکہ۔

وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (۶۹:۲۹) ”بے شک اللہ محسنین کے ساتھ ہے۔“

آغاز سے اختتام تک دوران کلام جا بجا تبصرے آتے ہیں، جن میں ایمان کی حقیقت کو دلوں میں بٹھایا جاتا ہے۔ ان تبصروں کے ذریعے دلوں کو خوب سمجھوڑا جاتا ہے۔ اور داعیان حق کے دلوں کو راہ ایمان کی مشکلات کے سامنے کھڑا کیا جاتا ہے کہ یا تو ان مشکلات کو برداشت کرو یا اس راہ کو چھوڑ دو۔ اگر تم ایمان کے تقاضے پورے نہ کرو گے تو یہ نفاق ہو گا۔ غرض یہ ایسے اشارات اور ایسی ضربات ہیں جن پر ان نصوص کے ضمن ہی میں بحث کی جاسکتی ہے، جن میں یہ ضربات آتی ہیں۔ لہذا مفصل بات ہم نصوص کی تشریح تک موخر کرتے ہیں اور یہاں اسی اشارے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۱۸۰ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۱۳

الح۔م۔ ان حروف میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کتاب انہی حروف جمعی سے بنی ہے جو ہمیں معلوم ہیں اور تمہاری دسترس میں ہیں لیکن ان سے تم ایسی کتاب نہیں بنا سکتے جیسے قرآن ہے۔ اس لیے کہ یہ کتاب اللہ کا کلام ہے انسان کا کلام نہیں ہے۔ دوسرے مفسرین نے ان کے اور معانی بھی بیان کیے ہیں لیکن میں اس معنی کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس سے ظہور ہوتا ہے کہ جس سورت کے آغاز میں یہ حروف آئے ہیں اس کے بعد مستحکم یا سورت کے درمیان قرآن کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سورت میں بھی یہ آیات آتی ہیں۔

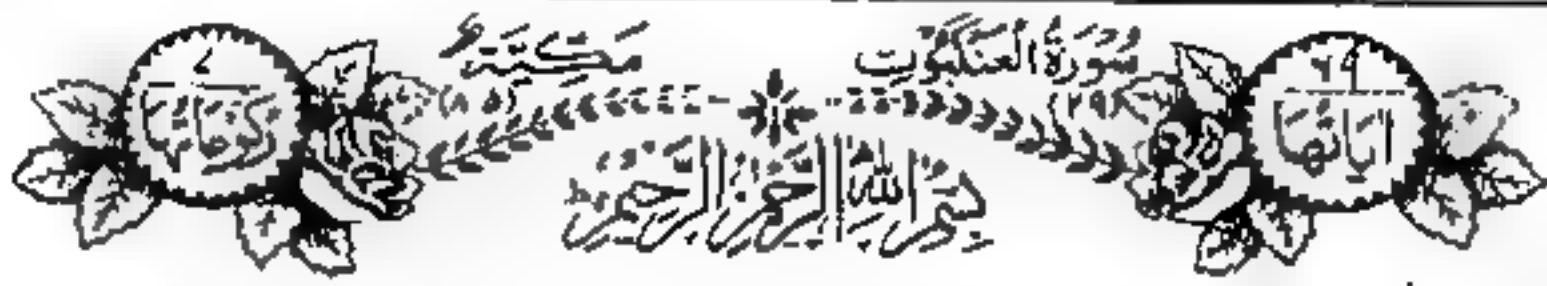
أَتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ (۲۹ : ۴۵) ”تمہاری طرف جو کتاب نازل کی جا رہی ہے اسے پڑھئے۔“

وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ (۲۹ : ۴۷) ”اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی کتاب نازل کی ہے۔“

وَمَا كُنْتُمْ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكُمْ (۲۹ : ۴۸) ”اس سے پہلے آپ کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔“

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ (۲۹ : ۵۱) ”کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے لو پر کتاب نازل کی ہے جو ان پر پڑھی جا رہی ہے۔“ یہ تذکرہ اسی قاعدے کے مطابق ہے اور اسی لیے ہم نے حروف مقطعات کی تفسیر میں یہ رائے اختیار کی ہے۔

ان کے بعد ایمان کی بات شروع ہوتی ہے اور ان آزمائشوں کی بات آتی ہے جو اس ایمان کی حقیقت سمجھنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں تاکہ معلوم ہو کہ مدعیان ایمان صادق ہیں یا کاذب اس لئے کہ سچے اور جھوٹے کی آزمائش ہی سے ہوتی ہے۔



الَّذِينَ أَحْسَبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۚ وَ
لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ
الْكَاذِبِينَ ۚ

”اہل۔م۔۔۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ”ہم ایمان لائے“ اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ لہذا کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟۔

اس سورت کے پہلے پروردگار قطعہ کا یہ دھماکہ خیز اعلان ہے، سرزنش آمیز سوالیہ کے ذریعے لوگوں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ تم ایمان کو کیا سمجھتے ہو؟ کیا ایمان صرف چند الفاظ کا نام ہے جو زبانی ادا کر دیئے جائیں؟

أَحْسَبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ (۲۹:۲) ”کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ وہ کہہ دیں کہ ”ہم ایمان لائے“ اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟۔ ایمان چند کلمات کا نام نہیں ہے جو زبان سے کہہ دیئے جائیں بلکہ وہ ایک حقیقت ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں۔ وہ ایک امانت ہے جس کی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ یہ دراصل ایک جہاد ہے جس میں بڑے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا یہ بات کافی ہے کہ کوئی زبان سے کہہ دے ”ہم ایمان لائے“۔ اگر وہ ایمان کا دعویٰ کرے تو خود ان کی آزمائش شروع ہو جائے گی اور ان آزمائشوں میں ان کو ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ ان آزمائشوں سے وہ صاف ہو کر نکلیں گے اور ان کے دلوں کو خالص ہونا ہو گا۔ فتنہ کے معنی ہیں سونے کو گرم کر کے اس سے کھوٹ جدا کرنا۔ اس لفظ کے یہ لغوی معنی بھی یہاں مراد ہیں کہ آزمائشوں کے نتیجے میں ہی خالص لوگ سامنے آتے ہیں۔ آزمائشوں سے نکل کر کارکنوں کے دل صاف و شفاف ہو جاتے ہیں لہذا ایمان کے اعلان کے بعد آزمائش کا آنا ایک اصولی بات ہے۔ ایک جاری سنت ہے اور اللہ کا معیار ہے۔ جس پر اہل ایمان پرکھے جاتے ہیں۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ

(۲۹:۳) ”حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ لہذا کو تو ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں؟۔“ اللہ کو تو ہر دل کی حقیقت معلوم ہے۔ ابتلا سے پہلے ہی معلوم ہے، لیکن مقصد یہ ہے کہ جو چیز اللہ کے علم میں ہے اور لوگوں سے پوشیدہ ہے وہ کھل کر سامنے آجائے تاکہ لوگوں کے ساتھ حساب و کتاب ان کے اعمال کے مطابق کیا جاسکے۔ اور صرف اسی بات پر ان کا محاسبہ نہ ہو کہ اللہ کو علم تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔ اور یہ ایک پہلو سے اللہ کا کرم ہے اور اللہ کا عدل ہے اور لوگوں کی تربیت ہے کہ کسی شخص کو صرف ان اعمال پر پکڑا جا

سکتا ہے جو کھلے ہوں، اور جو ایک عملی حقیقت ہوں۔ کسی کو اس کی نیت پر نہیں پکڑا جاسکتا۔ کیونکہ دنیا کا کوئی حاکم اللہ سے زیادہ نیات کا جاننے والا نہیں ہے۔

اب ہم اس مضمون کی طرف آتے ہیں کہ اللہ اہل ایمان کو اپنی سنت کے مطابق ہمیشہ آزماتا ہے اور انہیں بعض مشکلات سے دوچار کرتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور نظریہ اس کائنات میں اللہ کی امانت ہے۔ اس امانت کے حامل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اس کی اہمیت رکھتے ہوں اور جن کے اندر اس کے اٹھانے کی قدرت ہو اور وہ ایمان اور نظریہ کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتے ہوں جو اپنا آرام اور امن اور سکون و سلامتی ساز و سامان اور عیش و عشرت اس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ ایمان اور اسلامی نظریہ حیات اس زمین پر منصب خلافت الہیہ کا دو سرانام ہے۔ پس معنی کہ اس زمین پر مومن عوام الناس کا قائم ہو اور اللہ کے احکام کو اس دنیا کی زندگی میں حقیقت کا روپ دے۔ یہ ہے نہایت اہم اور قیمتی ذمہ داری اور یہ ایک ایسا کام ہے جو بہت ہی مشکل ہے اور اس کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو مشکلات کو انگیز کر سکتے ہوں۔

اہل ایمان کی آزمائشوں میں سے ایک آزمائش یہ ہوتی کہ وہ ان مشکلات اور اذیتوں پر صبر کس جو ان کو اہل باطل کی طرف سے پہنچیں۔ خصوصاً ایسے حالات میں کہ ان کے لیے کوئی مددگار اور سارا نہ ہو۔ مومن نہ اپنا دفاع کر سکتا ہو اور نہ اسے کسی طرف سے کوئی مدد ملتی ہو۔ نہ اس کے پاس کوئی ایسی قوت ہو جس کے ساتھ وہ زیادتی کرنے والوں کا مقابلہ کر سکے۔ یہ آزمائش کی سخت ترین صورت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں جب آزمائش کا ذکر ہوتا ہے تو ایسی ہی صورت حالات مراد ہوتی ہے۔ لیکن فتنے اور آزمائش کی اس سے بھی زیادہ سخت اور شدید صورتیں ہو سکتی ہیں۔

مثلاً بعض اوقات یہ خطرہ ہوتا ہے کہ ایک مومن کی وجہ سے اس کے دوستوں، احباب اور رشتہ داروں کو بھی اذیت دی جائے گی۔ اور یہ مومن ان کے بارے میں بے بس ہوتا ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ یہ احباب و ہائیں دیتے ہیں کہ مومن ان کی خاطر نرمی کرے یا باطل کے ساتھ مصالحت کرے تاکہ اقرباء اور رشتہ داروں پر تشدد نہ ہو اور دوسرے لوگ تباہ و برباد نہ ہوں۔ اس صورت میں اس قسم کی آزمائشوں کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ جہاں مومن کے ساتھ بچے بھی مارے جاتے ہیں۔

آزمائش کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ بعض اوقات باطل پرستوں پر دولت کی بارش ہوتی ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ اہل باطل خوشحال اور کامیاب ہیں۔ دنیا ان کے نعرے بلند کرتی ہے۔ عوام الناس تالیاں بجا کر ان کا استقبال کرتے ہیں۔ اس کے راستے سے رکاوٹیں دور ہوتی چلی جاتی ہیں اور لوگ ان پر قربان ہوتے ہیں اور ان کی زندگی نہایت ہی خوشگواہی سے گزرتی ہے اور یہ مومن پیچا رہ نظروں سے گرا ہوا، غیر اہم جس کا کوئی حامی نہ ہو، اور وہ جس عظیم سچائی کا حامل ہے اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے۔ ہاں چند اہل جیسے لوگ اور اس کے حامی ہوتے ہیں لیکن وہ خود معاشرے کے بے اثر لوگ ہوتے ہیں۔

بعض اوقات ایک مومن اپنے آپ کو بالکل غماغمسوس کرتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ وہ خود اپنی سوسائٹی میں غریب و بدیار ہے، اس کا پورا ماحول گمراہی میں مبتلا ہے۔ اور اس ماحول میں وہ انوکھا لگ رہا ہے۔

اور آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مومن کو ایک عجیب اذیت کے ساتھ آزمایا جاتا ہے۔ ایک مومن دیکھتا ہے کہ اس

کرۃ ارض پر بعض اقوام گمراہی اور رذالت میں کانوں تک ڈوبی ہوئی ہیں لیکن یہ اقوام نہایت ترقی یافتہ ہیں اور نہایت خوشحال اور مہذب ہیں اور ایسی اقوام میں ایک فرد 'جو بھی ہو' وہ ایک انسان کے لائق عزت اور دیکھ بھال پاتا ہے۔ یہ اقوام مالدار اور خوشحال ہیں حالانکہ یہ اللہ کی نافرمان اقوام ہیں۔

اور اس سے بھی نیک عظیم آزمائش ایک مومن کے لیے اور ہے۔ یہ بہت ہی شدید ہے۔ نفس 'نفسانیت اور شہوات کا فتنہ' دنیا کی کشش 'جسمانی لذت' دولت اور اقتدار کی پیاس 'خوشحالی اور سرفہ اعلیٰ کی دوز' اور صراط مستقیم اور راہ ایمان پر چلنے کی دشواری۔ پھر اخلاق و کردار اور نفس کے مخالف میلانات کی دشواری 'جدید دور کی زندگی کے حالات' جدید لوگوں کی سوچ 'اور نئی زمانہ کے تصورات کے حسے اور آزمائش۔

اور جب ایک مومن کی جدوجہد طویل تر ہو جائے 'اور اللہ کی طرف سے نصرت آنے میں تاخیر اور آزمائش شدید اور ناقابل برداشت ہو جائے اور ان کا مقابلہ وہی شخص کر سکتا ہو جسے اللہ ہی لغزشوں سے بچا رہا ہو 'تو ایسے مومن ہی دراصل وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس امانت کا حق ادا کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں پر اس عظیم امانت کے سپرد کیے جانے کا اعتماد کیا جاتا ہے۔ یعنی زمین کے بارے میں عالم باریکی امانت اور انسانی ضمیر میں ایمان باللہ کی امانت۔

خدا کی قسم 'یہ بات نہیں ہے کہ اللہ آزمائشوں کے ذریعہ اہل ایمان کو محض سزا دینا چاہتا ہو 'یا ان کو مصائب میں مبتلا کر کے ان کو اذیت دینا چاہتا ہو' بلکہ اللہ ان کو اس امانت کے اٹھانے کے لیے حقیقتاً تیار کرنا چاہتا ہے اور یہ تیاری اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اہل ایمان کو عملاً مشقتوں میں مبتلا نہ کیا جائے 'جب تک وہ صبر کر کے ہر قسم کی خواہشات اور شہوات پر برتری حاصل نہیں کر سکتے 'جب تک وہ اذیتوں پر صبر کرنا سیکھ نہیں لیتے 'اور جب تک انہیں اللہ کی نصرت پر حقیقی بھروسہ نہیں ہو جاتا۔ اگرچہ نصرت الہیہ بہت دیر کر دے 'اور اگرچہ ابتلاؤں کا دور طوں کھینچ لے اور بہت شدید ہو جائے۔

نفس انسانی کو جب مصیبتوں کی بھٹی میں گر مایا جاتا ہے تو اس کا کھوٹ دور ہو جاتا ہے۔ اس کی خفیہ قوتیں جوش میں آتی ہیں 'اس کی مدافعت قوتیں جمع ہوتی ہیں۔ مصائب کے یہ پہاڑ جب کسی پر ٹوٹتے ہیں تو اس کا باطن صقل ہو جاتا ہے 'اس کا جسم مضبوط ہوتا ہے اور یہ مومن ان مصائب و شدائد کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی جماعت پر یہ مشکلات آئیں تو وہ جماعت بھی اسی طرح صاف ہو جاتی ہے۔ اس کی صفوں سے کمزور لوگ نکل جاتے ہیں۔ مضبوط لوگ ہی رہ جاتے ہیں اور اولوالعزم اور قوی للارادہ اور اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق والے ہی جماعت میں رہتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں کسی ایک نہ ایک نتیجے نتیجے والے کی امید ہوتی ہے یا فتح کی یا اجر اخروی کی اور یہی لوگ ہوتے ہیں 'جن کو آخر میں جہنم سے تھمائے جاتے ہیں اور ابھی تیاری اور ٹریننگ کے بعد پھر ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

ایسے لوگ جب اس امانت کو اٹھاتے ہیں تو یہ پھر انہیں دس و جان سے عزیز ہوتی ہے اس لیے کہ انہوں نے اس کے لیے قربانیاں دی ہوتی ہیں اور اس کی بھاری قیمت ادا کی ہوتی ہے۔ اس کی خاطر انہوں نے صبر کیا ہوتا ہے اور مشقتیں جھیلی ہوتی ہیں اور جو کارکن اپنا خون اور اپنے اعصاب قربان کرتا ہے 'آرام اور اطمینان تیج دیتا ہے۔ لہذا مذکور مرغوبات کی قربانی دیتا ہے۔ اور پھر اذیتوں اور محرومیوں پر صبر کرتا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی کارکن کو اس امانت اور نظریہ کا شعور ہوتا ہے کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس لیے وہ اسے ارباب فروخت نہیں کرتا 'کیونکہ اس نے اس کی بھاری

قیمت ادا کی ہوئی ہوتی ہے۔

یہ بات کہ آخر کار یہ ایمان 'امانت اور اسلامی نظریہ حیات غالب ہو کر رہے گا تو یہ وہ وعدہ ہے جو اللہ نے کیا ہے اور اس کی ضمانت دی ہے۔ اور کوئی سچا مومن اللہ کے وعدے کے بارے میں شک نہیں کر سکتا، اگر یہ وعدہ دیر سے حقیقت بنتا ہے تو اس کی بھی کوئی حکمت ہوگی۔ اس میں اہل ایمان کے لیے بھلائی ہوگی۔ جان لو کہ اللہ جس قدر حق پر غیرت کرتا ہے 'جس قدر ان کی حمایت کرتا ہے' اس سے زیادہ حق کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ مومن کے لیے آزمائش اور مشقت ہی بہتر ہے تاکہ اس طرح وہ بدنگان عمار میں شامل ہو جائے۔ حق کا امین بن جائے 'اور اللہ اس پر گواہ ہو جائے کہ اس کا دین مضبوط ہے اور وہ حمل امانت کا نل ہے اس لیے اسے آزمائش کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے "اتلاؤں میں شدید اور مضبوط لوگ انبیاء ہوتے ہیں۔ پھر صالحین ہوتے ہیں" اور ان کے بعد درجہ بدرجہ 'ہر آدمی کی آزمائش اس کے دین کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر اس کا دین مضبوط ہو تو اسے زیادہ آزمایا جاتا ہے۔"

رہے وہ لوگ جو اہل ایمان پر ظلم کر کے ان کو آزماتے ہیں اور برے کام کرتے ہیں تو وہ تو عذاب الہی سے بچ ہی نہیں سکتے۔ اگرچہ ان کی باطل قوتیں بہت پھل پھولی ہوں۔ اگرچہ بظاہر وہ کامیاب و فاتح ہوں۔ اللہ کا وعدہ یہ ہے اور آخر کار اس کی سنت یہ ہے۔ سنو:

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا ۚ سَاءَ مَا

يَحْكُمُونَ ﴿۲۹﴾

"اور کیا وہ لوگ جو بری حرکتیں کر رہے ہیں 'یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ ہم سے بازی لے جائیں گے؟ بڑا غلط حکم ہے جو وہ لگا رہے ہیں۔"

کسی مفید کو یہ خیال نہیں رکھنا چاہئے کہ وہ بچ نکلے گا یا بھاگ جائے گا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ غلط ہے۔ اس نے غلط اندازہ کیا ہے 'اس کی سوچ پوچ ہے۔ کیونکہ اللہ نے اہل ایمان کی آزمائش کو ایک سنت بنایا ہے لیکن یہ اس لیے کہ سچے اور جھوٹے معلوم ہو جائیں 'اس کی سنت کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ وہ بدکاروں کو پکڑتا ہے اور اس کی سنت بھی بدلتی نہیں ہے۔

یہ اس سورت کے آغاز ہی میں ایک دوسری ضرب ہے کہ آنکھیں کھول لو 'اگر اہل ایمان کو آزمائش کی بجلی سے گزانا اور کھوٹے اور کھرے کے درمیان تمیز کرنا خدا کی سنت ہے تو بدکاروں اور مفیدوں کو پکڑنا بھی تو اللہ کی سنت ہے اس کے لیے بھی تیاریاں کر لو۔

اور تیسری ضرب 'اس سورت کے آغاز میں یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ سے ملنے کا یقین ہے وہ اطمینان رکھیں اور یقین کر لیں جس طرح ان کے دل یقین کے درجے تک پہنچ چکے ہیں کہ وقت آنے والا ہے۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنْ أَجَلَ اللَّهُ لَاتٍ ۖ وَهُوَ

السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۵﴾

”جو کوئی اللہ سے ملنے کی توقع رکھتا ہو (ات معلوم ہونا چاہئے کہ) اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے ہی والا ہے، اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔“

جو دل اللہ کی ملاقات کی امیدیں لیے ہوئے ہیں وہ مطمئن ہو جائیں اور انتظار کس ان چیزوں کا جن کا اللہ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے۔ یہ انتظار اس انداز کا ہونا چاہئے جس طرح کسی کو کسی چیز کے ملنے کا بختہ یقین ہو اور وہ اس کا منظر ہو۔ بس دن کے آنے کا انتظار ہو، اور شوق ملاقات بڑھتا ہی جائے۔ یہاں ایسے پاکیزہ قلب کی تصویر بڑی اشاراتی ہے۔ ایک ایسے شخص کی تصویر جو ملاقات کا امیدوار بھی ہے، مشتاق بھی ہے، مربوط بھی ہے اور ایسے شخص کے شوق کے جواب میں اسے نہایت ہی فرحت بخش اشارے ملتے ہیں کہ دیکھو ہم دیکھ رہے ہیں، سن رہے ہیں اور ہمیں پورا پورا علم ہے۔

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۵: ۲۹) ”اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔“

چوتھی ضرب کا رخ ان لوگوں کی طرف ہے جو ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں، جہاد فی سبیل اللہ کی تکالیف اٹھاتے ہیں کہ یہ جہاد اور مشقتیں وہ اپنے لیے برداشت کر رہے ہیں۔ اپنے جمال و کمال اور اپنی خیر اور بھلائی کے لیے، اللہ کو تو ان چیزوں کی چنداں ضرورت نہیں ہے وہ تو جہانوں اور کائنات سے غنی ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ

عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿۶﴾

”جو شخص بھی جہاد کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا۔ اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے۔“

جب اللہ مومنین کے لیے آزمائشیں مقرر کرتا ہے اور ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ یہ مشقتیں برداشت کریں تاکہ ان کے نفوس جنگاہ حیات میں مشکلات برداشت کرنے کے ثل بن جائیں، تو یہ احکام بھی خود اہل ایمان کی اصلاح کے لیے ہیں۔ یہ ان کو مکمل بناتے ہیں اور دنیا اور آخرت دونوں میں اہل ایمان کے لیے خیر کا باعث بنتے ہیں۔ جہاد کی وجہ سے خود ایک مومن کا نفس اور اس کا قلب پاک ہوتا ہے۔ ان کے تصورات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور اس کے پیش نظر دنیا کے آفاق وسیع ہوتے ہیں۔ یہ حب ہاں اور حب نفس سے بھی بلند ہو جاتا ہے، اب اس کی شخصیت کے اعلیٰ جو ہر کھلتے ہیں اور اس کی صلاحیت سامنے آتی ہے۔ اس کے بعد پھر وہ اپنی ذات سے آگے بڑھ کر ایک سوسائٹی کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ اس سوسائٹی کی اصلاح ہوتی ہے، اسے فائدہ ملتا ہے۔ اس میں حق کے جھنڈے بلند ہوتے ہیں، بھلائی پھیلتی ہے اور غائب ہوتی ہے اور شر مغلوب ہوتا ہے۔ اصلاح کو ترقی ملتی ہے اور فساد سکڑتا ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ (۶:۲۹) ”جو شخص بھی جہاد کرے گا تو وہ اپنے بھلے کے لیے کرے گا۔“

کوئی شخص جہاد شروع کر کے 'آدمی راہ میں کھڑا نہ ہو جائے کہ ماسیئے جی معاوضہ اب تک کے جہاد کا۔ یا اللہ پر احسان بتلائے یا تحریک اسلامی پر احسان بتلائے یا یہ کہے کہ جی اس قدر جدوجہد سے ہمیں کیا ملا کیونکہ اس کے جہاد سے اللہ کو کچھ بھی نہیں ملا۔ اللہ کو انسانوں کی طرف سے جہاد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کیا ہے اور اس کا جہاد کیا ہے؟ اللہ تو دو جہانوں سے بے نیاز ہے۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے اس ضعیف انسان کو اس عظیم کام کے لیے منتخب کیا۔ اسے زمین کا خیمہ بنایا اور وہ اس زمین میں کام تو اپنے لیے کرتا ہے پھر بھی اللہ اسے اجر و ثواب دیتا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ
وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹﴾

”اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے ان کی برائیاں ہم ان سے دور کر دیں گے اور انہیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔“

لہذا اللہ کی راہ میں کام کرنے والے مزدور اس بات پر مطمئن ہو جائیں کہ انہیں بہت کچھ ملے والا ہے، ان کی تعمیرات بھی معاف ہوں گی، ان کو بھی جزاء ملے گی، لہذا ان کو جہاد کی تکلیفوں پر صبر کرنا چاہئے۔ مشکلات اور مصائب کو برداشت کرنا چاہئے کیونکہ ان کی امید روشن ہے اور جزاء پاکیزہ ہے۔ اللہ کے ہاں ان کا انتظار ہو رہا ہے۔ یہ اس قدر عظیم اجر ہے کہ اگر انہیں اس دنیا کی پوری زندگی میں انصاف نہ ملے وہ بھی وہ کافی ہے۔

سورت کے آغاز میں ہم نے جن آزمائشوں کا ذکر کیا اس کا ایک رنگ اور پہلو اہل و عیال، محبوبوں اور دوستوں کا فتنہ ہے۔ ان آزمائشوں میں اللہ ایک مومن کو نہایت ہی معتدل موقف اختیار کرنے کا قہم دیتا ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ
بِإِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأُنَبِّتُكُم بِمَا
كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۰﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي
الصَّالِحِينَ ﴿۱۱﴾

”ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر زور لیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو میرے شریک کی حیثیت سے نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔ میری

ہی طرف تم سب کو پتہ آتا ہے پھر میں تم کو جادوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہوں گے ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے۔“

والدین، تمام اقرباء میں سے قریب تر اور زیادہ قابل احترام ہوتے ہیں ان کے حوالے سے اولاد کو بحکم شفقت بن جانا چاہئے اور اردئے شریعت ان پر رحم اور ان کا احترام فرض کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ محبت کا طریقہ یہ ہے کہ ان کا احترام کیا جائے اور ان کی جیھی طرح غفلت اور کچھ بھلائی جائے لیکن ان کو یہ حق سیں دیا گیا کہ اللہ کے حقوق مار کر ان کو دیئے جائیں اور ان کی اطاعت اس طرح کی جائے کہ اللہ کی مافرونی لازم آتی ہو یہ ہے صحیح راستہ۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ

فَلَا تُطِعْهُمَا (۸:۲۹) ”ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک نہمراے نہ تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔“

کیونکہ مومن کا پہلا تعلق اللہ سے ہے پھر یہی تعلق اور رابطہ ناقابل شکست ہے اگر والدین مشرک و کافروں تو ان کے ساتھ صرف حسن سلوب کیا جائے گا۔ احترام، رعایت ہوگی اتباع ان کا نہ ہوگا دنیا کی اس مختصر زندگی میں یہی ہو گا اصل مقام تو آخرت ہے جہاں دونوں اللہ کے سامنے ہوں گے۔

إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ وَأَنْتُمْ كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۸:۲۹) ”میری ہی طرف تم سب کو پتہ آتا ہے پھر تم کو جادوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔“ قیامت میں پھر تعلق والدین و اولاد کا نہ ہوگا۔ وہاں تو ہمیں باہم تعلق دار ہوں گے۔ نسب اور رشتے ہمیں رہ جائیں گے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ نُدْخِلُهُمْ فِي أَصْحَابِ الْإِيمَانِ (۲۵:۲۵) ”یہ وہ ایمان لائے ہوں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہوں گے ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے۔“ یوں اللہ دوسلے ایک جماعت ہوں گے جیسا کہ حقیقتاً وہ ایک جماعت ہیں۔ اور نسب خون اور رشتے و ماں ختم ہوں گے۔ یہ چیزیں یہاں دنیا ہی میں رہ جائیں گی۔ یہ اس دیا کے عارضی رشتے ہیں اور جو رشتے اس اصلی رشتے سے کٹ گئے یعنی رشتہ ایمان سے تو آخرت میں وہ نابود ہوں گے۔

امام ترمذی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور انکی ماں حمہ بنت ابی سفیان کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ اپنی ماں کے ساتھ بہت زیادہ حسن سوک کرتے تھے۔ اس نے ان سے کہا ”یہ کیا دین ہے جو تو نے اپنا دیا ہے؟ خدا کی قسم میں اس وقت تک کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی جب تک تم اس دین سے ہٹ نہیں جاتے یا یہاں تک کہ میں مر جاؤں۔ اسی طرح لوگ پوری زندگی تمہیں طعنہ دیتے رہیں گے اور لوگ نہیں گے“ ”مے ماں کے قاتل“ اس نے چوبیس گھنٹے تک یہ بھول ہڑتال کی تو حضرت سعد اس سے چوں آئے اور عرض کی ”اسے ماں اگر تمہاری سو جائیں ہوں اور تم ایک کے بعد ایک جاتا دیتا چلی جاؤ تو بھی میں اپنا دین چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ اگر

چاہو تو کھانا پی لو اگر نہ چاہو تو بھوک ہڑتال جاری رکھو۔“ جب وہ مایوس ہو گئی کہ یہ تو مانتے والا نہیں ہے تو اس نے کھانا پینا شروع کر دیا۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، لیکن شرک کرنے میں والدین کی اطاعت نہ کرو۔“

یوں اس واقعہ میں نسب کے قریب ترین رشتے پر ایمان غالب آگیا لیکن قرآن نے رشتہ داروں اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک جاری رکھا۔ لعل ایمان کو ہر دور میں ایسی مشکلات پیش آتی رہتی ہیں۔ لہذا یہ آیت اور حضرت سعد کی یہ حدیث ہمارے لیے نشانات راہ ہیں۔ یہی امن و نجات کی راہ ہے۔

اب 'مشکلات راہ ایمان ہی کے حوالے سے ایک دو سرا کردار' کہ جب مشکلات آتی ہیں تو چیخا چلاتا ہے، لیکن جب اللہ کی طرف سے کامیابی اور فتوحات آتی ہیں تو پھر لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے، اللہ تعالیٰ چند کلمات میں اس کردار کو بھی نمایاں فرماتا ہے، یوں کہ ایک واضح تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ وَلَٰكِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۖ أَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ۝
وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ ۝

”لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر۔ مگر جب وہ اللہ کے معاملہ میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا۔ اب اگر تمہارے رب کی طرف سے فتح و نصرت آگئی تو یہی شخص کہے گا کہ ”ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔“ کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون۔“

لوگوں میں ایسے کردار عام ہیں، ایسے لوگ لفظ ایمان کو ایک معمولی بات سمجھ کر اقرار کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ صرف زبان سے کلمہ پڑھنا ہے۔ اس کے کچھ تقاضے نہیں۔ لیکن جب اللہ کی راہ میں تکالیف آتی ہیں، اور یہ آزمائشیں اس کلمے کی وجہ سے آتی ہیں تو

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ (۱۰: ۲۹) ”اس آزمائش کو اللہ کا عذاب سمجھتا ہے۔“ اور جزع و فزع اور قیام میں شروع کر دیتا ہے۔ اب اس کی دینی قدس مختلف ہو جاتی ہیں۔ اس کا عقیدہ متزلزل ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہی تو جہنم کا عذاب ہے، جہنم میں ہیں ہم۔ سوچتا ہے کہ یہی تو عذاب الیم ہے۔ لہذا ایمان پر مبنی کیا ضرورت ہے۔ آخر جس مصیبت میں ہم ہیں جہنم اس سے کیا زیادہ ہوگی۔ یہ ہوتی ہے اس کی سوچ۔ وہ دنیا کی اس معمولی تکلیف کو عذاب الہی سمجھتا ہے۔ حالانکہ جہنم میں وہ عذاب ہو گا جس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے، نہ اس کی حدود ہوں گی۔ یہ تو تھا اس کا کردار آزمائش میں۔ لیکن اگر خوشیاں ہوں تو۔

وَلَكِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ (۲۹: ۱۰) ”اب اگر تمہارے رب کی طرف سے فتح و نصرت آگئی تو یہی شخص کہے گا کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔“ ہم تمہارے ساتھ تھے.... اور مشکلات میں وہ کس قدر ہلکا، ذلیل اور اس کی سوچ اور اس کے تخمینے کس قدر غلط تھے.... اب تو وہ لمبے چوڑے دعوے کر رہا ہے پھولا نہیں سکتا اب کتا ہے۔

إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ (۲۹: ۱۰) ”ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔“ اور جواب خوب آتا ہے۔

أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ (۲۹: ۱۰) ”کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں؟“ تمہارے دس کی قسم اللہ کے ہاں موجود ہے۔ اللہ کو تو معلوم ہے کہ کون صابر رہا اور کون جزع و فزع کرتا رہا۔ مومن کون ہے اور منافق کون ہے۔ کیا یہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔

وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ (۲۹: ۱۱) ”اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان ماننے والے کون ہیں اور منافق کون ہیں۔“ اللہ تو ان کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور یہ ضرور ظاہر ہوتے رہیں گے۔ یہ آزمائشیں تو آتی ہی اس لیے ہیں کہ کھرے اور کھوٹے جدا ہوں۔

اس منافق کردار کے بارے میں یہاں قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کیے وہ قائل غور ہیں۔ ان الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس کردار کو غلطی کہاں سے لگی ہے۔

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ (۲۹: ۱۰) ”تو لوگوں کی ذالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا۔“ ان کی غلطی یہ نہیں ہے کہ ان پر جو سختی آئی اس کے برداشت کرنے میں ان کا صبر تمام ہو گیا کیونکہ بعض اوقات ایک سچا مومن بھی برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ انسانی طاقت کے بہر حال حدود ہوتے ہیں۔ لیکن ایک سچا مومن انسانوں کی طرف سے آنے والی اذیتوں اور اللہ کے عذاب کے درمیان بہر حال تمیز کرتا ہے۔ وہ اس قدر غلطی نہیں کر سکتا کہ اس فانی دنیا کی کوئی چیز اور اللہ کے ہاں دائمی رہنے والے عالم آخرت کی کوئی چیز برابر ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کا ناقابل برداشت عذاب بھی آخرت کے عذاب الہی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ مومن کے احساس میں اللہ اور اس کے بے مثال کام میں کوئی چیز اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔ یہ ہے فرق مومن اور منافق کے درمیان۔

آخر میں لوگوں کو گمراہ اور بدراہ کرنے کی آزمائش کا نمونہ آتا ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ جزاء و سزا کے بارے میں لعل کفر کا تصور کس قدر پوچ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو گمراہ کر کے آخری ذمہ داری خود لیتا ہے حالانکہ اللہ کے ہاں یہ اصل الاصول ہے کہ ہر شخص اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کا انصاف ہے جو اس نے واضح طور پر قائم کیا۔ یہ عدل کا زرین اصول ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ

خَطِيئَتَكُمْ وَمَا هُمْ بِحَامِلِينَ مِنْ خَطِيئَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ إِنَّهُمْ لَكَاِبُونَ ﴿۱۲﴾

وَلِيَحْمِلَنَّ أَثْقَالَهُمْ وَاتَّقَالَا مَعَ أَثْقَالِهِمْ وَلَيَسْئَلَنَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ

عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۱۳﴾

۱۳ ”یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے۔ حالانکہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں، وہ قطعاً جھوٹ لیتے ہیں۔ ہاں ضرور وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے، اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی۔ اور قیامت کے روز یقیناً ان سے ان افترا پر دازیوں کی باز پرس ہوگی جو وہ کرتے رہے ہیں۔“

یہ بات یہ لوگ اس بددیوانہ اصول کے مطابق کہتے تھے جس میں جہاں کے سلسلہ میں وہ داری انتہائی ہو کر تھی۔ کسی جرم کا ذمہ دار پورا قبیلہ ہوتا تھا۔ اس نظر رواج کے تحت وہ یہ بھی زعم رکھتے تھے کہ آخرت میں شرک کی وہ داری بھی وہ اپنے سر لے سکتے ہیں اور اس طرح وہ ان کو جرم کی سزائیں پہنچالیں گے۔ یہ دراصل آخرت کی جزاء و سزا کے ساتھ مزاح کر رہے تھے۔

اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطِيئَتَكُمْ (۱۲: ۲۹) ”تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے۔“ یہی وجہ ہے کہ اس کا اٹل جواب آج ہے کہ ہر شخص اللہ کے سامنے ضرور حاضر ہوگا۔ ہر شخص سے اس کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ اور کوئی شخص کسی کے اعمال کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

وَمَا هُمْ بِحَامِلِينَ مِنْ خَطِيئَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ (۱۲: ۲۹) ”حالانکہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں۔“ اور بتایا جاتا ہے کہ یہ جو لاف زنی کرتے ہیں اس میں جھوٹ ہے۔ انہم لکذِبُونَ (۱۲: ۲۹) ”وہ قطعاً جھوٹ کہتے ہیں۔“

ہاں یہ لوگ اپنی گمراہی کا بوجھ بھی اٹھائیں گے، شرک کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اس افترا پر دازی کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کا بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ جب دوسرے گمراہ ہونے والے بھی معاف نہ ہوں گے۔

وَلِيَحْمِلَنَّ أَثْقَالَهُمْ وَاتَّقَالَا مَعَ أَثْقَالِهِمْ وَلَيَسْئَلَنَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ

(۱۳: ۲۹) ”ہاں وہ ضرور اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت بوجھ بھی اور قیامت کے روز یقیناً ان سے ان افترا پر دازیوں کی باز پرس ہوگی جو وہ کرتے رہے ہیں۔“ چنانچہ اس آزمائش اور فتنے کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جاتا ہے اور اعلان کر دیا جاتا ہے کہ لوگوں کا حساب و کتاب جماعتی صورت میں نہ ہوگا، فرداً فرداً ہوگا اور ہر شخص اپنے لیے کا ذمہ دار ہوگا۔

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ”ہر شخص اس کما فی کار بن ہو گا جو اس نے کمائی۔“

درس نمبر ۱۸۱ ایک نظر میں

سابقہ راؤنڈ میں یہ بتایا گیا تھا کہ جو لوگ کلمہ ایمان کا اقرار کرتے ہیں، اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق ان کو ضرور آزمایا جائے گا اور مشہدات سے دوچار کیا جائے گا تاکہ سچوں اور جھوٹوں کے درمیان امتیاز ہو جائے۔ آزمائشوں میں اذیت کی آزمائش، رشتہ داروں کی آزمائش اور سازشوں اور لالچوں کی آزمائش شامل ہے۔

اس سبق میں ان آزمائشوں کا ذکر ہے جو نوح علیہ السلام سے ادھر ہر اسلامی دعوت کے قائدین کو پیش آتی رہی چاہے وہ نبی ہوں یا ان کے متبعین اور ساتھی ہوں۔ دعوت و عزیمت کی اس تاریخ میں حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے حالات کو ذرا تفصیل سے لیا گیا ہے اور دوسرے انبیاء کے حالات مجمل بیان ہوئے ہیں۔

ان قصص میں بتایا گیا ہے کہ دعوت اسلامی کی راہ میں قسم قسم کی مشکلات اور رکاوٹیں آتی رہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے قہر میں یہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے طویل جدوجہد کی اور حاصل نہایت معمولی رہا۔ نو سو پچاس سال کی جدوجہد کے نتیجے میں بہت کم لوگ مسلمان ہوئے۔

فَاَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ (۲۹: ۱۴) ”آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آگیرا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں سرکش حکمران نے یہ صلہ دیا کہ وہ تشدد پر اتر آیا حالانکہ آپ نے حتی المقدور ان کی ہدایت کے لیے سعی کی۔ معقول دلائل سے بات کی تو اس قوم کا رد عمل بھی یہ تھا:

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ اِلَّا اَنْ قَالُوا اَقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ (۲۹: ۲۴) ”پھر ابراہیم کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا ”قتل کر دے یا جلا ڈالو اس کو۔“

حضرت لوط کے قہر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ردیل لوگ کس قدر خود سر ہو گئے ہیں اور کس قدر بے حیو اور طوطا چشم بن گئے تھے۔ نبی کا بھی کوئی لحاظ اور احترام نہیں کرتے تھے اور انہوں نے انسانیت کو حیوانیت کے درجے سے بھی گرا دیا تھا اور وہ گندگی اور رذائل میں مبتلا ہو گئے تھے اور وہ اپنے ذرائع ہمدرد کے مقابلے میں یہ جرات کرتے ہیں۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ اِلَّا اَنْ قَالُوا نَحْنُ بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ مِنَ

الصّٰدِقِيْنَ (۲۹: ۲۹) ”اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا عذاب ہم پر لے آؤ۔“

حضرت شعیب کے قصبے میں بھی لیل مدین کی طرف سے نسا و سرکشی سامنے آتی ہے 'اور وہ سچائی اور حق سے منہ موڑتے ہیں اور نکتہ عیب کرتے ہیں۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّحْفَةُ فَاصْبَحُوا فِيْ دَارِهِمْ جَثِمِيْنَ (۳۷:۲۹) ”آخر کار ایک سخت زلزلے نے انہیں آیا اور وہ اپنے گھروں میں پڑے گئے پڑے رہ گئے۔“

قوم عاد اور قوم ثمود کی طرف ہی غرور، قوت اور سرکشی کے مظاہرے کا اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح فرعون، قارون اور ہامان کی طرف یہ اشارہ کیا گیا کہ انہوں نے حق کے مقابلے میں مال و دولت، حکومت، سازش اور سرکشی کو سرچشمہ قوت سمجھا ان تمام تاریخی قوتوں پر قرآن یہ تبصرہ کرتا ہے کہ یہ قومیں 'چاہے وہ جس قدر زوردار کیوں نہ ہوں جب سچائی کے مقابلے میں آتی ہیں تو ان کی حیثیت مکڑی کے جالے کے برابر ہو جاتی ہے۔

كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ اتَّخَذَتْ يَتًا وَاِنْ اَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبِيتُ الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا

يَعْلَمُوْنَ (۴۱:۲۹) ”ان کی مثال مکڑی جیسی ہے 'جو اپنا گھر بناتی ہے 'اور سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔“

یہ راؤنڈ ایک ایسی بات پر ختم ہوتا ہے جس میں حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ آپ قرآن کی عظمت فرمائیں، نماز قائم کریں اور اس کے بعد دعوت کا انجام اللہ پر چھوڑ دیں۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ”اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔“

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۱۸ تشریح آیات

۱۲ --- تا --- ۲۴

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا
خَمْسِينَ عَامًا فَأَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ ﴿۱۲﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ
وَصَالِحِي السَّفِينَةِ وَجَعَلْنَاهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ﴿۱۳﴾

”ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ پچاس کم ایک ہزار برس ان کے درمیان رہا۔ آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آگھیرا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔ پھر نوح کو اور کشتی والوں کو ہم نے بچا لیا اور اسے دنیا والوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا کر رکھ دیا۔“

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک دعوت دی۔ نبوت مٹا ہونے سے پہلے بھی ان کی کچھ زندگی گزری ہوگی جس کا تعین یہاں نہیں ہے اور طوفان کے بعد بھی وہ زندہ رہے تھے وہ عرصہ بھی متعین نہیں ہے۔ اس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی عمر بظاہر موجودہ عمر طبعی سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن یہ عمر قرآن نے بتائی ہے جو اس کائنات میں سب سے سچا ذریعہ علم ہے اور اس کی صداقت کے لیے یہی کافی ہے کہ یہ قرآن کی تصریح ہے۔ اس کی توفیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس وقت دستِ قدرت نے طویل عمویں اس لیے رکھیں کہ زمین آباد ہو اور نسل پھیلے۔ جب لوگوں کی کثرت ہوئی تو پھر لمبی عمر کی ضرورت نہ رہی۔ کئی زندہ چیزوں میں یہ اصول مروج نظر آتا ہے، اگر کسی زندہ کی تعداد کم ہو تو عمر زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً شکاری پرندے شاہیں وغیرہ اور کچھوے جن کی عمویں اب بھی سینکڑوں سال ہوتی ہیں جبکہ کبھی زیادہ سے زیادہ دو ہفتے زندہ رہتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

بعات	الطیر	اکثرها	فراخا
وام	الصقر	مقلاة	نفور

”کنزِ در پرندوں کے بچے زیادہ ہوتے ہیں لیکن شاہین کی ماں بہت کم بچے دینے والی ہوتی ہے۔“

میں وجہ ہے کہ شاہین کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور چھوٹے اور زیادہ بچے دسینے والے پرندے کم عمر ہوتے ہیں۔ اللہ کے کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اور اس کے ہاں ہر چیز مقدار کے مطابق ہے۔ ہر حال حضرت نوحؑ کے ساڑھے نو سو سالہ تبلیغ کے نتیجے میں ایک قلیل مقدار ہی اسلام میں آئی اور اکثریت کو ان کے ظلم کی وجہ سے طوفان بہا کر لے گیا۔ چونکہ انہوں نے اس قدر طویل ہٹ دھرمی اور سرکشی کی اس لئے اللہ نے ان کو تباہ کیا اور عدو قلیل کو نجات دی جو موسیٰ تھے۔ یہ اصحاب سفینہ تھے۔ انہی سے بعد میں انسانی نسل چلی۔ اور طوفان تمام جہاں والوں کے لیے مغرور بن گیا اور ایک عرصہ تک ظلم، شرک اور کفر کا انجام قصہ نوح کے حوالے سے یاد ہوتا رہا۔

نوح علیہ السلام کے بعد صدیوں کی تاریخ کو لپیٹ کر قرآن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات کو دیتا ہے۔

وَإِذْ بَرَّاهِمُوهُ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ ۖ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۶﴾ إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا وَتَخْلُقُونَ إِفْكًا ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۱۷﴾ وَإِنْ تُكَذِّبُوا فَقَدْ كَذَّبَ أُمَمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ۚ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿۱۸﴾

”اور ابراہیم کو بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا: ”اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جنہیں پوج رہے ہو وہ تو محض بت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو۔ اور اس کا شکر ادا کرو“ اسی کی طرف تم پٹائے جانے والے ہو۔ اور اگر تم جھڑتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں“ اور رسول پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ دہری نہیں ہے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو نہایت واضح اور سادہ دعوت دی جس میں کوئی پیچیدگی اور اجمال نہ تھا۔ اس دعوت کو انہوں نے نہایت مرتب انداز میں پیش کیا۔ جو لوگ دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ دعوت کی اس ترتیب اور انداز پر غور کریں۔

پہلے تو انہوں نے اپنی دعوت کی حقیقت ان کے سامنے رکھی۔

اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ (۱۶: ۲۹) ”اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو“۔ اور اس کے بعد انہوں نے ان کے دلوں میں اس دعوت کے لیے دلچسپی پیدا کی کہ اس میں تمہارے لیے بہت خیر ہے بشرطیکہ وہ اچھائی اور برائی کو سمجھیں۔ خیر اور مقامات خیر کو جانیں۔

ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۱۶:۲۹) ”یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔“
 اس شرطیہ تنبیہ میں ان کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ جہالت کو ترک کر کے اور اپنی ذات کے حوالے سے
 جہالت کی نفی کر کے اپنے لیے بھدلی کی راہ اختیار کریں۔ یہ ایک حقیقت بھی ہے محض ایک خطابت اور جوش خطابت کی
 بہت دھرمی نہیں ہے اور نہ محض لفاظی ہے۔

تیسرے مرحلے میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ جو عقائد و نظریات رکھتے ہیں وہ متعدد پسوؤں سے غلط ہیں۔ وہ بتوں کی
 پوجا کرتے ہیں اور یہ بت پتھریا لکڑی سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ بندگی اور پوجا نہایت غلط اور کھوٹا عمل ہے۔ بلکہ یہ
 انہیں اللہ وحدہ کی بندگی سے بھی روک رہا ہے۔ پھر وہ جو پوجا کرتے ہیں اس پر کوئی معقول برہان و دلیل بھی نہیں ہے بلکہ
 کچھ جھوٹی باتیں ہیں جو انہوں نے از خود گھڑ رکھی ہیں۔ ان کا نہ کوئی سابقہ اور نہ کوئی لاحقہ ہے بلکہ جھوٹی خود ساختہ باتیں
 ہیں۔ اور کسی مسد اصول و قاعدے پر جہی نہیں ہیں۔ پھر یہ بت ان کو کوئی نفع یا نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے۔ نہ ان کو کچھ
 دے سکتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا (۱۷:۲۹) ”در حقیقت اللہ
 کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔“ اور چوتھے مرحلے میں قرآن پھر
 ان کو متوجہ کرتا ہے کہ اللہ سے رزق طلب کرو کہ وہ وعدہ رزاق ہے۔ یہ بات ان کے لیے بہت اہم ہے اور ان کی
 حاجات اور ضروریات اللہ کے دربار ہی سے پوری ہو سکتی ہیں۔

فَاِتَّقُوا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ (۱۷:۲۹) ”اللہ سے رزق مانگو۔“
 رزق دراصل مشغلہ نفوس ہے، خصوصاً نفوس مومنہ کا۔ اور رزق کو صرف اللہ کے ہاں طلب کرنا ایک حقیقت بھی
 ہے۔ یہ محض نفسیاتی ہیجان انگیزی نہیں ہے، نہ نفسیاتی میلان ہے جسے ابھارا جا رہا ہو، بلکہ ایک حقیقت ہے۔
 آخر میں ان کو یہ دعوت دی جاتی ہے کہ انعامات اور رزاق کے حقیقی مسبب اور حقیقی منعم کی بندگی کرو اور اس کا
 شکر ادا کرو۔

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَہٗ (۱۷:۲۹) ”اور اس کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔“
 آخر میں ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس سے بھاگ نہیں سکتے، نہ اس اللہ سے تم کہیں پناہ پا سکتے ہو۔ لہذا مناسب یہی
 ہے اور اسی میں تمہاری بھلائی ہے کہ تم اس کی طرف لوٹ آؤ اور ایمان لا کر اس کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔

اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۱۷:۲۹) ”اسی کی طرف تم لوٹ کر جانے والے ہو۔“
 اور اگر اس دعوت کے بعد وہ تمہاری تکذیب کرے تو اس تکذیب کی کیا حیثیت ہے! اس سے اللہ کی بادشاہت
 میں کوئی نقص یا کمی واقع نہیں ہوتی۔ نہ رسول اللہ کے مقام و مرتبے میں کچھ کمی واقع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کئی لوگوں
 نے تکذیب کی ہے اور رسول اللہ کی دیوثی تو صرف یہ ہے کہ آپؐ بس تبلیغ کر دیں۔

وَإِنْ تَكْذِبُوا فَقَدْ كَذَّبَ أُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ أَنَا إِلَّاءُ الْمُبِينُ

(۱۸:۲۹) ”اگر تم جھڑتے ہو تو تم۔۔۔ پہلے بہت سی قومیں جھڑا چلی ہیں اور رسول بہ صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی دھندلاری نہیں ہے۔“

یوں قرآن کریم قدم قدم ان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اور ان کے دلوں پر ہر طرف سے اثر انداز ہوتا ہے اور ان کے دس کے تاروں کو ہر طرف سے جھیرتا ہے۔ یہ مدد رچی اقدامات دعوت پیش کرنے کا ایک بہترین نمونہ ہیں اور دعوت اسلامی کے کارکنوں کو اس انداز پر اچھی طرح غور کرنا چاہئے۔ اور اس انداز سے انسانی نفوس پر اثر انداز ہونا چاہئے۔ اہل اس کے کہ اس کہانی کو اختتام تک پہنچایا جائے۔ ایک وقفہ کیا جاتا ہے اور یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ اس میں ہر اس شخص کو مخاطب کیا جاتا ہے جو دعوت ایمان کا منکر ہے۔ جو اللہ کی طرف رجوع سے انکار کرتا ہے اور بعث بعد الموت کا منکر ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿۱﴾
قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ
الْآخِرَةَ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲﴾ يُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَن
يَشَاءُ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ ﴿۳﴾ وَمَا أَنْتُمْ بِسُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ
﴿۴﴾ وَمَا لَكُم مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۵﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ
اللَّهِ وَلِقَائِهِ أُولَٰئِكَ يَئِسُوا مِن رَّحْمَتِي وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۶﴾

”کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتدا کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ یقیناً یہ (اعادہ تو) اللہ کے لیے آسان تر ہے۔ ان سے کہو کہ زمین میں چو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتداء کی ہے پھر اللہ بار دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جسے چاہے سزا دے اور جس پر چاہے رحم فرمائے اسی کی طرف تم پھرے جانے والے ہو۔ تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو نہ آسمان میں اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔“

یہ ہر اس شخص کو خطاب ہے جو اللہ کا منکر ہے اور اللہ کے سامنے جو لبدی کا انکار کرتا ہے۔ اس خطاب پر اس پوری کائنات کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ اس استدلال کا دائرہ زمین و آسمانوں تک وسیع ہے۔ یہ قرآن کریم کا معروف طرز استدلال ہے کہ وہ اس پوری کائنات کو دلائل و نشانات الہیہ کی نمائش گاہ بنا دیتا ہے اور انسانی قلب و نظر کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کھلی کتاب میں دلائل و آیات الہیہ تلاش کریں۔ اللہ کے وجود اس کی وحدانیت اور اس کے

وعدے اور وعید کی سچائی تلاش کریں۔ اس کائنات کے یہ مشاہد اور مظاہر تو بروقت ہماری نظروں کے لیے کھلے ہیں اور حاضر ہیں۔ پیش پا افتادہ ہیں لیکن انسان چونکہ انہیں ہر وقت دیکھتا رہتا ہے اس وجہ سے ان کا عادی ہو جاتا ہے اور ان کے اعجاز کا پہلو نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور یہ معجزات چونکہ بار بار دہرائے جاتے ہیں اس لیے انسانی قلب و نظر پر ان کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کا یہ کمال ہے کہ وہ ان پیش پا افتادہ مناظر اور دلائل اعجاز کو اس قدر زندہ کر کے اور حسین بنا کر پیش کرتا ہے اور یہ اس قدر خوبصورت حسین اور پر تاثیر بن جاتے ہیں کہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ گویا یہ مشاہد و مناظر اس کے سامنے پہلی بار پیش ہوئے ہیں۔ یہ مناظر زندہ شکل میں سامنے آتے ہیں اور انسانی قلب و نظر پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسان ان کے آثار و نتائج کو اخذ کرتا ہے اور یہی مناظر انسانی وجدان کے لیے دلائل اور براہین بن جاتے ہیں اور ان سے انسانی شعور بے حد متاثر ہوتا ہے۔ یہ طرز استدلال خشک منطقی استدلال کی طرح نہیں ہوتا جس میں محض ظاہری جدل و جدال ہوتا ہے اور ایک مردہ انداز گفتگو ہوتا ہے۔ یہ فلسفیانہ اور منطقی انداز استدلال اسلامی منطق اور شعور کے لیے ہمیشہ ناگوار رہا ہے۔ اس لیے اسلامی شعور اس سے کبھی گمراہ طور پر متاثر نہیں ہوا۔ اسلامی انداز استدلال یہ ہے :

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ

(۱۹:۲۹) ”کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتداء کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرتا ہے“ یقیناً یہ تو اللہ کے لیے آسان تر ہے۔“ بے شک یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ اللہ کس طرح تخلیق کرتا ہے ایک چھوٹے سے پودے میں بھی یہ تخلیق نظر آتی ہے ایک انڈے اور جنین میں بھی نظر آتی ہے۔ اور ہر اس چیز میں نظر آتی ہے جو نہ تھی اور پھر موجود ہو گئی اور ان میں سے ہر چیز ایسی ہے کہ انسان انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر بھی کوشش کریں تو اس جیسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتے اور نہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ اس کے خالق ہیں۔ اللہ کی تخلیقات تو بہت ہیں صرف معجزہ حیات ہی ایک سلسل معجزہ ہے۔ یہ حیات کس طرح وجود میں آئی؟ یہ بھی ایک معجزہ ہے کسی کی جانب سے ایجاد حیات کا دعویٰ کرنا تو ایک بڑی بات ہے۔ حیات کے بارے میں تو انسان صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ یہ اللہ کی پیدا کردہ ہے۔ اللہ ہر لمحہ میں اسے دہراتا ہے اور لوگ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہیں اور اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے۔

لوگ دیکھتے ہیں کہ اللہ لوگوں کو پیدا فرما رہا ہے تو ان اشیاء کا دوبارہ پیدا کرنا اللہ کے لیے نہایت ہی آسان ہے۔

إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ (۱۹:۲۹) ”اور یہ (اعادہ) اللہ کے لیے آسان تر ہے۔“ اللہ کی

مخلوقات میں سے تو کوئی چیز اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ انسانی معیار کے مطابق ان سے بات کرتا ہے۔ کیونکہ انسانوں کی مصنوعات میں پہلی صنعت کے مقابلے میں اس کا اعادہ آسان ہوتا ہے ورنہ اللہ کے لیے آغاز و اعادہ یکساں ہیں۔ اللہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہے تو ارادہ متوجہ کر کے کن کہتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ ذرا کھوکھلی آنکھوں کے ساتھ زمین میں پھرو اور اللہ کی آیات و نشانات کو دیکھو۔ زندہ اور مردہ چیزوں میں عجیب بات تخلیق الہی پر غور کرو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کی تخلیق بھی کسی مشقت کے بغیر خود کار طریقے سے ہو رہی ہے۔ اور اعادہ بھی اسی طرح ہو گا۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۹: ۲۰) ”ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتداء کی ہے پھر اللہ بار دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

زمین میں سیر و سیاحت سے انسان کی بصیرت اور بصارت دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ انسان ایسے مناظر دیکھتا ہے جو کبھی آنکھ نے نہیں دیکھے ہوتے اور قلب نے کبھی ان پر غور نہیں کیا ہوتا اس آیت میں اللہ نے ایک گہری حقیقت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ انسان کسی خطے میں بسا ہے اور اس کے مناظر اور عجائبات اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں لیکن جب وہ سیاحت کرتا ہے تو اس کے احساسات اور قوائے فکر کہ ہر نئے منظر کو غور سے دیکھتے ہیں۔ جدید دنیا اور علاقے میں اسے نئے مناظر و مشاہد متاثر کرتے ہیں۔ اگرچہ اس جیسے مناظر و مشاہد ان سے ایسے مناظر خود اس کے علاقے میں موجود ہوتے ہیں لیکن وہ کبھی ان کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہے۔ جب وہ اپنے علاقے کو واپس آتا ہے تو پھر وہ خود اپنے مسکن کو بھی ایک جدید احساس اور جدید غور و فکر کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اس سے قبل وہ جن چیزوں کو کوئی اہمیت نہ دیتا تھا اب وہ چند یوم غائب رہنے کے سبب ان کو جس نظر سے دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ اب یہ مناظر و عجائبات اس سے اس قدر نو ہمکلام ہوتے ہیں جبکہ اس سے قبل یہ عجائبات اس کے لیے نہ عجیب تھے اور نہ اس کے ساتھ ہمکلام ہوتے تھے۔ پس پاک ہے وہ اہل جس نے یہ قرآن نازل کیا۔ جو دلوں کی ان راہوں کو جانتا ہے جن کے ارپے دل کی دنیا پر اثر ڈالا جاسکتا ہے عالم نفس کی راہ و رسم سے بھی وہ واقف ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ (۲۹: ۲۰) ”ان سے کہو زمین میں چلو پھرو اور دیکھو اس نے کس طرح خلق کی ابتداء کی۔“
یہاں ماضی کے صغیے کے ذریعہ آغاز تخلیق کو بیان کیا گیا ہے۔

کَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ (۲۹: ۲۰) ”اس نے تخلیق کا آغاز کیسے کیا تھا؟“ اور اس بات کو تم زمین میں چل پھر کر سیر و سیاحت کر کے معلوم کرو اس سے ایک یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تم زمین میں چل پھر کر آغاز تخلیق الہی کو معلوم کرو ان چیزوں پر غور کرو جن سے ”حیات“ کی ابتدائی حالت کا پتہ چلے کہ اس دنیا پر آغاز حیات کیسے ہوا؟ آج کل آثار قدیرہ کے بعض علماء زمین کو کھود کر ابتدائی تخلیق کی کیفیت معلوم کرتے ہیں کہ حیات کا آغاز کیسے ہوا اور اس نے کس طرح ترقی کی۔ اور وہ کس طرح پھیلی۔ ان تخلیقات کے باوجود ابھی تک یہ علماء ”حیات“ کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے کہ یہ حیات ہے کیا؟ یہ کہاں سے آتی ہے؟ اور اس دنیا پر پیدا زندہ انسان یا مخلوق کیسے آیا۔ یہ سب تحقیقات اور یہ سب آثار دراصل دوبارہ تخلیق پر دلائل ہوں گے۔

اور اس خیال کے ساتھ ایک دوسرا خیال کہ آغاز حیات کے آثار و کیفیات معلوم کرنے کے تو وہ لوگ قابل ہی نہ تھے جن پر قرآن نازل ہوا تھا۔ جس طرح آج کل کے لوگ اس کے قابل ہو گئے ہیں کہ آغاز حیات کے آثار و کیفیات کا مشاہدہ کریں۔ لہذا اس آیت کا اگر مفہوم یہی ہے تو وہ لوگ تو اس قابل ہی نہ تھے لہذا قرآن کریم اپنے پہلے مخاطبین سے

کوئی اور چیز معصوم کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ معلوم کر سکتے تھے۔ اور جس کے معصوم کرنے سے وہ یہ نتیجہ نکال سکتے تھے کہ اس سے وہ نشاء ثانیہ کا امکان اخذ کریں۔ لہذا ان سے مطلب یہ ہو گا کہ وہ ہر جگہ نباتات، حیوانات اور انسان کے آغاز تخلیق کا مشاہدہ کریں اور زمین میں پھوس اور ان کی یہ سیر اور مشاہدہ ان کی قوت مشاہدہ کو تیز کرنے کا باعث بنے جیسا کہ ہم نے پہلے پیرے میں وضاحت کی کہ وہ آثار قدرت الہیہ کا مشاہدہ کریں اور رات اور دن اللہ کی قدرت جن معجزات و نشانات کو ظاہر کر رہی ہے اس پر غور کریں۔

ایک احتمال یہ بھی ہے جو قرآن کریم کے طریقہ کار کے مطابق ہے کہ قرآن بردور کے لوگوں کو ان کے حالات کے مطابق اور علم و ثقافت کے لحاظ سے ان کے مرتبہ و مقام کے مطابق اور ان کے حالات زندگی کے مطابق اور ان کے موجودہ وسائل اکتشاف کے مطابق متوجہ کرتا ہے۔ وہ اپنے ظروف و احوال کے مطابق اس کائنات میں پاسے جانے والے دلائل قدرت الہیہ پر غور کریں۔ اس طرح زندگی کے حالات کی ترقی کے مطابق قرآن کریم کے مفہوم کے فہم و ادراک میں بھی ترقی ہوگی اور دونوں خیالات میں کوئی تعارض بھی نہ ہو گا اور یہ مفہوم قرآن کے طریق کار کے زیادہ قریب ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۹: ۲۰) ”یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ اللہ اس زندگی کا آغاز بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی کرتا ہے۔ اور یہ اس کی قدرت قاہرہ کے درجہ ہو گا۔ اور اللہ کی قدرتیں انسان کی محدود سوچ کے دائرے کے اندر محدود نہیں ہیں۔ نہ اللہ کی قدرتوں کو ان کی سوچ کی محدود امکانات کے اندر محدود کیا جاسکتا ہے۔ نہ انسان کی سوچ انسان کے محدود تجربات تک محدود ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نہ نباتات کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ نہ حیوانات کہ وہ اپنے غائب و نامعلوم کے لیے اپنی رحمت کے دائرے کے اندر آئے۔ سب لوگوں سے آخر کار اس کی طرف لوٹنا ہے اور اللہ اس عمل کے کرنے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی نہ کوئی اس کی ممانعت کر سکتا ہے۔

يُعَذِّبُ مَنْ يُّشَاءُ وَ يَرْحَمُ مَنْ يُّشَاءُ وَ اِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ (۲۹: ۲۱) وَ مَا اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَاءِ وَ مَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَلِيٍّ وَ لَا نَصِيْرٍ

(۲۹: ۲۲) ”جسے چاہے سزا دے اور جس پر چاہے رحم فرمائے اسی کی طرف تم پھیرے جانے والے ہو۔ تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو نہ آسمان میں اور اللہ سے بچنے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔“ رحمت اور عذاب دونوں اللہ کی رحمت کے تابع ہیں اس طرح کہ اللہ نے ہدایت اور ضلالت کا راستہ بیان کر دیا۔ اور انسان کے اندر ایسی استعداد پیدا کر دی کہ وہ ہدایت و ضلالت کے راستے میں سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ اور اس نے دونوں راستے انسان کے لیے میسر کر دیئے۔ مطلب یہی انسان کی مرضی ہے کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ البتہ اگر وہ اللہ کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اللہ نے اپنے اوپر مارم کر دیا ہے کہ ایسے شخص کی معاونت کرے اور اگر وہ اللہ کی دلائل سے منہ موڑے اور اللہ کے راستے سے روک جائے تو وہ اللہ سے رابطہ منقطع کر دیتا ہے اور اسی اصول کے نتیجے میں

اللہ کی رحمت اور اللہ کا عذاب لوگوں کو ملتا ہے۔

وَالْيَهُ تَقْلِبُونَ (۲۹: ۲۱) ”اور اس کی طرف سے تم پھرتے جانے والے ہو“۔ یہ آخری انجام کی سخت تعبیر ہے اور بعد میں آنے والے مضمون کے ساتھ مناسب ہے۔

وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (۲۹: ۲۲) ”تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو نہ آسمان میں“۔ تمہارے پاس ایسی کوئی قوت نہیں ہے کہ تمام مخلوق کو اللہ کی طرف پھرنے سے روک سکو۔ نہ زمین میں نہ آسمانوں میں۔ جنات اور فرشتے بھی تمہاری قوت نہیں ہیں۔

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۲۹: ۲۳) ”اور اللہ ہی بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے“۔ اللہ کے سوا کوئی دلی اور مددگار ہے کون؟ اور کہاں ہے؟ کوئی ملائکہ ہے یا کوئی جن ہے؟ یہ تو سب خود اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کی مخلوق ہیں۔ یہ اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں، دوسروں کے لیے کیا کچھ کر سکیں گے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَلِقَائِهِ أُولَٰئِكَ يَئِسُوا مِنْ رَّحْمَتِي وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۲۹: ۲۴) ”جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک سزا ہے“۔ یہ اس لیے کہ انسان اللہ کی رحمت سے تب مایوس ہوتا ہے جب اس کا دل کافر ہو، اس حالات میں پھر اس کے اور رب کے درمیان رابطہ کٹ جاتا ہے۔ جو بھی کفر کی راہ اختیار کرتا ہے اس کے اور رب تعالیٰ کے درمیان رابطہ کٹ چکا ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت میں تردنازگی نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ کی رحمت میں داخل ہونے کے لیے وہ کوئی راہ نہیں پاتا۔ اور پھر انجام بھی متعین ہوتا ہے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۲۹: ۲۴) ”ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا ہوتی ہے“۔ اس لمحہ فکریہ کے بعد اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی طرف سے جواب آتا ہے۔ یہ ضمنی خطاب ہر اس شخص کے غور و فکر کے لیے تھا جو دعوت ایمان کا انکار کرتا ہے، یہ جواب نہایت ہی مایوس کن اور عجیب ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر اور سرکشی کے حاملین کس طرح پر خود غلط ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کے پاس اقتدار کی قوت ہوتی ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ

”پھر ابراہیم کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا ”قتل کر دو ات یا جلا زالو اس کو“۔ آخر کار اللہ

نے اسے آگ سے بچا لیا تھا، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں۔“
 ”اسے قتل کر دیا جد ذالو“ یہ اس سادہ اور قابل فہم دعوت کا جواب ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش فرمائی۔ جو انہوں نے ان کی معصومیت کے سامنے نہایت ہی قابل فہم انداز میں پیش کی ہے جس طرح کوئی پیش کرتا ہے وہ۔
 جب کفر اور سرکشی کھل کر سامنے آگئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوزیشن یہ تھی کہ آپ اس ظلم اور سرکشی کا دفعہ نہ کر سکتے تھے، وہ ایک فرد تھے اور ان کا کوئی ولی اور مددگار نہ تھا۔ ایک طرف عظیم قوت ہے، دوسری جانب وہ اکیلے کھڑے ہیں۔ اس لیے ایسے حالات میں دست قدرت بھی کھل کر ان کا ساتھ دیتا ہے۔ ایک خارق عادت معجزہ نمودار ہوتا ہے۔ ایک ایسا معجزہ جو انسانوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

فَإِنْجِهَ اللَّهُ مِنَ النَّارِ (۲۹: ۲۴) ”آخر کار اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا۔“ جس انداز میں خارق عادت کے طور پر اللہ نے ان کو بچا لیا تھا۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک معجزہ تھا جو ایمان لانے والے تھے مگر اس کے باوجود اس قوم نے ایمان قبول نہ کیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ طے کر دس کہ انہوں نے مان کر نہیں دیتا ہے تو معجزات بھی ان کے لیے مفید نہیں رہتے۔ ہدایت اسے نصیب ہوتی ہے جو ایمان لانے کے لیے تیار ہو، اسی لیے کہا جاتا ہے :

إِنْ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (۲۹: ۲۴) ”یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں۔“ پہلی نشانی تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم آگ سے نجات پا گئے۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ کفر اور سرکشی اور حکومتی قوت ایک فرد واحد کو اذیت نہ دے سکی۔ تیسرا معجزہ یہ ہے کہ اگر اللہ کسی کو ہدایت نہ دینا چاہے تو معجزات بھی مفید نہیں رہتے۔ اور یہ نشانیاں ان لوگوں کے لیے ہیں جو دعوت اسلامی کی تاریخ پر غور و فکر کرتے ہیں اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ دلوں کو پھرنے والا کون ہے اور ہدایت و ضلالت کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔
 حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نجات کے بعد بھی یہ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ حضرت ابراہیم اب اس قوم کی ہدایت سے مایوس ہو گئے ہیں جو اس قدر واضح اور جہن معجزے کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتی تو قبل اس کے کہ حضرت ان کو الوداع کہیں ان کو آخری حجت کے طور پر ایک حقیقت کے سامنے کھڑا کرتے ہیں :

وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا لَا مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَيلعن بعضكم بعضاً ذرأؤكم النار و ما لكم من نصيرين ﴿۲۵﴾

”اور اس نے کہا“ تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے اور آگ تمہارا ٹھکانا ہوگی اور وہی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔“

تم نے بتوں کی بندگی اس لیے اختیار نہیں کی کہ تم عقیدتا ان کو اللہ سمجھتے ہو اور تم ان کی بندگی پر مطمئن ہو بلکہ تم اس برائی پر ایک دوسرے کا لحاظ ملاحظہ کرتے ہوئے متفق ہو گئے ہو۔ محض ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے یہ بندگی کرتے ہو۔ تم میں سے ایک دوست یہ نہیں چاہتا کہ دوسروں کے اہوں کو چھوڑ دے۔ اگرچہ حق واضح ہو گیا ہو۔ اگر کوئی نئی سچائی کو قبول کر لے تو اس صورت میں دوستیاں ختم ہونے کا خطرہ ہے۔ یہ دوستیاں تم سچائی کی حق تلفی کر کے قائم رکھتے ہو۔ تم سچائی کو نظر انداز کرتے ہو اور اس کے مقابلے میں دوستیوں کو زیادہ قائم رکھتے ہو۔ تم سچائی کو نظر انداز کرتے ہو اور اس کے مقابلے میں دوستیوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہو، حالانکہ دعوت اسلامی ایک سنجیدہ امر ہے۔ یہ کوئی نرمی، کوئی ڈھیل اور کوئی دوستی قبول نہیں کرتی۔

اس کے بعد ان کے اخروی انجام کے صفحات کھولے جاتے ہیں۔ جن دوستوں کا لحاظ کرتے ہوئے وہ حق کو نظر انداز کر رہے ہیں اور بتوں کی بندگی پر قائم ہیں۔ قیامت کے دن یہ لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گے اور ایک دوسرے کو ملامت کریں گے اور یہ دوستیاں ٹوٹ جائیں گی۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ وَ يَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا (۲۹: ۲۵) ”مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے۔“ لیکن یہ لعن و طعن کوئی فائدہ نہ دے گا۔ اس سے تمہارے عذاب میں کوئی کمی نہ آئے گی۔

وَمَا وَكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّنْ نَّصِيرِينَ (۲۹: ۲۵) ”آج تمہارا ٹھکانا ہوگی اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔“۔۔۔ اسی آج میں یہ لوگ رہیں گے جس کے ساتھ وہ حضرت ابراہیم کو جہنم چاہتے تھے لیکن اللہ نے ان کی مدد کی اور ان کو نجات دے دی۔ رہے وہ تو ان کے لیے نہ نصرت ہے اور نہ نجات ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اب اپنی قوم کو دعوت دینا چھوڑ دیا۔ یہ معجزہ جو ناقابل شک تھا، وہ بھی ان کے سامنے آ گیا۔ اس دعوت اور اس ناقابل تردید معجزے کے نتیجے میں صرف ایک شخص مسلمان ہوئے، حضرت لوط، ان کی بیوی نے بھی اسلام قبول نہ کیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت لوط آپ کے بھتیجے تھے۔ یہی ایک مسلمان حضرت ابراہیم کے ساتھ کلدانیوں کے شہر اُور سے ہجرت کر کے اردن سے آگے کے علاقے میں جا کر آباد ہوئے۔

فَأَمِّنَ لَهُ لُوطٌ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۖ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ وَاتَيْنَاهُ أَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ۖ وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّكُم لَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ

الْعَالَمِينَ ﴿٢٨﴾ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ ۚ وَتَأْتُونَ فِي نَارِكُمْ

الْمُنْكَرَ ۚ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللَّهِ إِنْ كُنْتَ

مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٢٩﴾ قَالَ رَبِّ انصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ﴿٣٠﴾

۱۵ ”اس وقت لوط نے اس کو مانا اور ابراہیم نے کہا ”میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں“ وہ زبردست اور حکیم ہے۔“ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول قابل غور ہے وہ کہتے ہیں۔

اَنْتَ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (۲۹:۲۶) ”میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔“ انہوں نے کیوں ہجرت کی۔ انہوں نے نجات کے لیے ہجرت نہیں کی۔ نہ زمین کے حصول کے لیے نہ کسی تجارت اور کمائی کے لیے ہجرت کی تھی۔ انہوں نے رب کی طرف ہجرت کی ’اللہ کے قریب ہونے اور اس کی پناہ میں آنے کے لیے ہجرت کی۔ اپنا دل اور اپنا نظریہ لے کر ہجرت کی۔ ان کے جسم اور خون سے پہلے ان کے دل و دماغ نے ہجرت کی۔ انہوں نے اللہ کی طرف ہجرت کی تاکہ خالص اللہ کی عبادت اور بندگی کرس ‘ اپنا جسم اور اپنی سوج اس کے لیے خاص کر دیں اور کفر اور ملامت کے علاقے کو چھوڑ دیں اس لیے کہ اس علاقے کے لوگوں کی ہدایت کا اب کوئی امکان نہ رہا تھا۔

یہ علاقے چھوڑنے کا اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس دنیا میں بھی انعام دیا۔ اللہ نے ان کو ایسی صالح اولاد دی کہ رہتی دنیا تک ان کی وراثت اور نظریات کی وارث بنی۔ اس کے بعد نبوت ان کی اولاد ہی میں رہی۔ دنیا اور آخرت میں اس سے بڑا انعام نہیں ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ وَآتَيْنَاهُ أَجْرَهُ

فِي الدُّنْيَا وَآتَيْنَاهُ فِي الْآخِرَةِ لَمَنِ الصَّالِحِينَ (۲۹:۲۷) ”اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب (جیسی اولاد) عنایت فرمائی اور اس کی نس میں نبوت اور کتاب رکھ دی ‘ اور اسے دنیا میں اس کا اجر عطا کیا اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہو گا۔“

یہ اللہ کا ایسا انعام ہے جس میں سے لبوس و برکات کے سوت پھوٹ رہے ہیں ‘ جس میں اللہ کی رضامندی عیاں ہے۔ اس ذات بابرکات کی شخصیت میں یہ فیض عیاں ہے جس کے جلا ڈالنے پر تمام باغی اور سرکش قوتیں جمع ہو گئی تھیں لیکن اللہ نے عظیم معجزانہ انداز میں ان کے ماحول کو ٹھنڈا اور ملاحتی سے بھرا ہوا بنا دیا۔ یہ تھی اللہ کی مہربانی ‘ اس کا کرم اور اہل توحید کے لیے جزائے مناسب۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مختصر قہصے کے بعد اب حضرت لوط کا قصہ آتا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رب کی طرف مہاجر ہوئے۔ دونوں دادی اردن میں اترے۔ حضرت لوط بحر مردار کے کنارے کسی قوم کو دعوت دینے لگے۔ اس کے بعد اس بحیرے کا نام بحیرۃ لوط پڑ گیا۔ آپ شرمسردم بنے۔ حضرت لوط نے ان لوگوں میں رشتہ داری بھی کی اور معاشی سرگزی بھی ان لوگوں میں اختیار کی۔

اس قوم میں ایک عجیب اخلاقی بیماری پھیل گئی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ قبیح بیماری اس سے قبل کسی قوم میں نہ پھیلی تھی۔ یہ کہ ان لوگوں نے عورتوں کے مقابلے میں اور ان کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا شروع کر دیئے۔ حالانکہ اللہ نے اس مقصد کے لیے عورتوں کو پیدا کیا تھا تاکہ ایک مرد اور عورت سے ایک خاندان وجود میں آئے۔ اور اس طرح فطری طور پر انسانی زندگی کا تسلسل قائم رہے۔ جس طرح تمام دوسرے حیوانات میں یہ نظام قائم ہے کہ تمام حیوانات اور نباتات کو اللہ نے جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے۔ مرد اور عورتیں 'مذکر اور مؤنث'۔ غرض یہ بیماری قوم لوط سے قبل کسی اور قوم میں پیدا نہ ہوئی تھی۔

وَلَوْطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ لَأَتَاتُوكُمُ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ
(۲۸:۲۹) إِنَّكُمْ لَأَتَاتُوكُمُ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيَكُمُ الْمُنْكَرَ
فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا تَنَبَّأَ بِعَذَابِ اللَّهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ
الصَّادِقِينَ (۲۹:۲۹) قَالَ رَبِّ انصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ (۳۰:۲۹) "اور
ہم نے لوط کو بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا: "تم تو وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی
نے نہیں کیا ہے۔ کیا تمہارا حال یہ ہے کہ مردوں کے پاس جاتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام
کرتے ہو؟" پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ انہوں نے کہا "اے اللہ کا عذاب اگر تو سچا
ہے۔" لوط نے کہا "اے میرے رب! ان مفسدوں کے مقابلے میں میری مدد فرما۔"

حضرت لوط کی اس تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس برائی میں کانوں تک ادب گئے تھے۔ یہ لوگ ایک ایسی
برائی میں مبتلا ہو گئے تھے جس کا ارتکاب ان سے قبل کسی انسان نے نہیں کیا تھا۔ یہ مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم
کرتے تھے۔ یہ ایک انوکھا اور گندہ فعل تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی فطرت ہی بدل گئی تھی۔ جب بھی کوئی
قوم اعتدال کو چھوڑتی ہے اس کی فطرت بدل جاتی ہے کیونکہ پاکیزہ جنسی تعلق ایک عورت ہی کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ لہذا
اسے نہایت ہی گناہ و ناجرم قرار دیا گیا۔ عورت کے ساتھ جنسی تعلق بھی بعض اوقات حدود و قیود سے نکل جاتا ہے لیکن وہ
ہوتا بہر حال ایک فطری عمل ہے۔ رہی ہم جنس پرستی تو یہ حیوانات سے بھی گری ہوئی حرکت ہے۔ اس میں انسان کی فطری
عضویاتی ترکیب کے لحاظ سے بھی فساد ہے۔ اور نفسیاتی لحاظ سے بھی فساد ہے۔ زوجین کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے اس
میں جو لذت ہوتی ہے وہ امتداد حیات کے عظیم مقصد کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں انسانی حیات کا
تسلسل قائم ہوتا ہے اور فریقین جسمانی اور روحانی اعتبار سے اس تعلق سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کے تعلق اور
ملاپ کے اندر جسمانی اور عضویاتی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ رہا یہ تعلق جو قوم لوط قائم کرتی تھی۔ یہ غیر فطری، غیر فرحت بخش
اور بے مقصد تھا۔ اگر اس تعلق میں کسی کو مزہ آتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی فطرت بگڑ گئی ہے۔ اور مسخ ہو
گئی ہے اور وہ حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔

یہ لوگ اس برائی کے ساتھ ڈاکے بھی ڈالتے تھے 'لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے مالی مفادات وصول کرتے تھے۔ پھر وہ اس فعل کا ارتکاب بھی مردوں کو مجبور کر کے کرتے تھے۔ یہ پھر اس فعل بد کی ایک گھناؤنی شکل تھی کہ لوٹ مار کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ساتھ اس بد فعلی کا ارتکاب کرتے تھے۔

پھر یہ اس منکر فعل کا ارتکاب اپنی مجلسوں میں کرتے تھے۔ کھلے طور پر اور اجتماعی شکل میں۔ ایک دوسرے سے 'کتوں کی طرح' شرم بھی محسوس نہ کرتے تھے۔ فحاشی کا یہ بدترین درجہ ہے۔ فساد فطرت کی یہ انتہا ہے اور یہ رذائل پر اس قدر فخر ہے کہ اس کے بعد کسی اصلاح کی کوئی امید نہیں رہتی۔

یہاں اس قصے کو اختصار کے ساتھ لایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے پہل حضرت لوط نے ان کو نہایت ہی اچھے انداز میں اس سے منع کیا ہو گا۔ انہوں نے اصرار کیا ہو گا۔ حضرت لوط نے ان کو عذاب الہی سے ڈرایا ہو گا اور یہ بتایا ہو گا کہ یہ بہت ہی قبیح فعل ہے اور اس کا انجام بھی خوفناک اور عبرتناک ہو گا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا تَنَبَّأَ بِعَذَابِ اللَّهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ

الصَّادِقِينَ (۲۹: ۲۹) "پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوانہ تھا کہ لے آؤ اللہ کا عذاب اگر تم سچے ہو۔"

یہ ہے خود سری اور سرکشی ایک ڈرنے والے نبی کے مقابلے میں 'ایک چیلنج کے انداز میں نکدے میں اور یہ ایک ایسا بگاڑ ہے جس سے کسی خیر کی توقع نہیں رہتی اور نہ اصلاح کی امید رہتی ہے۔ رسول خدا نے ان پر حجت تمام کر دی اور اس کے سوا کوئی راہ نہ رہی کہ وہ اللہ سے نصرت طلب کریں جو آخری سارا ہے۔

قَالَ رَبِّ انصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ (۲۹: ۳۰) "لوط نے کہا اے میرے رب! ان مفسدوں کے مقابلے میں میری مدد فرما۔"

اب یہاں پردہ گرتا ہے۔ منظر پر صرف لوط علیہ السلام دعا کرتے نظر آتے ہیں۔ اب ہمارے سامنے اس دعا کی قبولیت کا منظر آتا ہے۔ جن کائنات کو حکم دیا گیا ہے کہ سدوم کو اوپر نیچے کر دو 'انہوں نے اس عمل سے پہلے حضرت ابراہیم کو خوشخبری بھی دی ہے۔ ایک ایسی ہیوی سے صالح بیٹے کی خوشخبری جو بانجھ تھی۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوا إِنَّا مُهْلِكُوا

أَهْلَ هَذِهِ الْقَرْيَةِ إِنْ أَهْلًا كَانُوا ظَالِمِينَ ﴿٣١﴾ قَالَ إِنْ فِيهَا لُوطٌ

قَالَوَا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَنْ فِيهَا فَتَنَّا لَنُنَجِّيَنَّهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ ۖ

كَانَتْ مِنَ الْغَابِيْنَ ﴿٣٢﴾

”اور جب ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر پہنچے تو انہوں نے اس سے کہا ”ہم اس بستی کے لوگوں کو ہدایت کرنے والے ہیں“ اس کے لوگ سخت ظالم ہو چکے ہیں۔“ ابراہیم نے کہا ”وہاں تو لوط موجود ہے۔“ انہوں نے کہا ”ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہے۔ ہم اسے اور اس کی بیوی کے سوا اس کے باقی سب گھردالوں کو بچالیں گے۔“ اس کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔“

یہ منظر ابراہیم علیہ السلام اور فرشتوں کا منظر۔ یہ منظر یہاں چونکہ مقصود بالذات نہ تھا اس لیے اسے نہایت اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں دوسری جگہ یہ بات آگئی ہے کہ انہیں حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کی بشارت دی گئی۔ اور حضرت اسحاق کی ولادت تو خوشخبری کا موضوع تھا۔ اس لیے ان باتوں کو ہاں مفصل نہیں دیا گیا کیونکہ مقصود اتمام قصہ بود تھا۔ یہاں صرف یہ کہہ دیا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرشتے اس لیے ہو کر آئے کہ انہیں خوشخبری دے دیں اور یہ بتا دیں کہ وہ کس مہم پر آئے ہیں۔

اَنَا مُهْلِكُوْا اَهْلَ هَذِهِ الْقَرْيَةِ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (۲۹: ۳۱) ”ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں“ اس کے لوگ سخت ظالم ہیں۔“

اب حضرت ابراہیم کا جذبہ رحم اور محبت امنڈ آیا۔ انہوں نے فوراً کہا کہ وہاں تو ان کے بچے حضرت لوط بھی رہتے ہیں اور وہ تو ظالم نہیں صالح ہیں۔ اللہ کے فرشتوں اور فرستادوں نے جواب دیا کہ ان کو اس مہم کے بارے میں پوری معلومات دی گئی ہیں اور وہ سب باتوں کو جانتے ہیں۔

قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا لَنُنَجِّيْنَّهٗ وَ اَهْلَهُ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَاٰتٍ مِنَ الْغٰیْبِيْنَ

(۲۹: ۳۲) ”انہوں نے کہا ”ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہیں۔ ہم اسے اور اس کی بیوی کے سوا اس کے باقی سب گھردالوں کو بچالیں گے۔“ اس کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔“

یہ بیوی قوم کے ساتھ تھی۔ یہ بھی ان کے جرائم اور بد اعمالیوں کی تصدیق کرتی تھی اور یہ عجیب بات تھی کہ عورت کے حقوق پر ایک عورت ڈاکہ ڈالے۔

اب یہ قصہ ایک تیسرے منظر میں داخل ہوتا ہے۔ یہ منظر بھی عجیب ہے۔ یہ فرشتے نہایت خوبصورت نوجوانوں کی شکل میں حضرت لوط کے پاس آتے ہیں۔ حضرت لوط بھی جانتے ہیں کہ یہ خطرناک مہمان ہیں، خوبصورت نوجوان اور قوم جس گندی حالت میں۔ مازم ہے کہ یہ لوگ ان مہمانوں کے ساتھ بد سلوکی کریں گے۔ اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنے مہمانوں کا دفاع کر سکیں اس لیے اس پریشانی سے ان کا دل بھر آیا اور ان پر پریشانی اور وحشت طاری ہو گئی۔

وَلَمَّا اَنَّ جَاۤءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیِّئَ رَیْہُمْ وَ ضَاۤقَ رِیْہُمْ ذَرْعًا

”پھر جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور تنگ دل ہوئے۔“ یہاں ان لوہاشوں

کی طرف سے مہمانوں پر ہجوم کے واقعہ کو بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اس موقع پر حضرت لوط کے ساتھ ان کا جو مکالمہ ہوا 'اسے بھی کلٹ دیا گیا ہے' جبکہ وہ اس وقت اس بیماری کے جوش میں تھے۔ یہاں بات کو انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے اور آخری انجام کا ذکر ہوتا ہے اس لیے کہ یہ خدائی فرستادے خود بات کو کھول دیتے ہیں اور حضرت لوط کو اپنا تعارف کرا دیتے ہیں کیونکہ وہ شدید اعصابی دباؤ میں تھے اور سخت دل تنگ تھے۔

وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ إِنَّا مُنْجُوكَ وَ أَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَكَ
كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿۱۳﴾ إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ
السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۱۴﴾

”انہوں نے کہا 'نہ ڈرو اور نہ رنج کرو۔ ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچالیں گے' سوائے تمہاری بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔ ہم اس بستی کے لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں اس فسق کی بدولت جو یہ کرتے رہے ہیں۔“

اس گاؤں کے لوگوں پر جو عذاب اُفی ہو 'اس کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے کہ حضرت لوط 'ان کے لٹل و عیال اور لٹل ایمان کے سوا تمام لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ ان پر خاک آلود پتھروں کی بارش کر دی گئی۔ معصوم ہوتا ہے کہ یہاں اللہ کے فرشتوں نے آتش نشانی کا عمل برپا کر دیا جس کے نتیجے میں خاک آلود پتھروں کی بارش ہو اُکرتی ہے۔۔۔ اور اس عذاب کے آثار کو باقی رکھا گیا تاکہ آنے والی اقوام کے لٹل عقل و دانش اس سے عبرت لیں اور صدیوں گزرنے کے بعد بھی یہ آثار باقی ہیں۔

وَلَقَدْ تَرَكْنَا مِنْهَا آيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۵﴾

”اور ہم نے اس بستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑ دی ہے 'ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“ اور یہ انجام اس قوم کا طبعی انجام تھا۔ کیونکہ اس کی مثال ایک غبیٹ درخت اور پودے کی تھی جسے زمین سے زمیندار ہمیشہ اکھاڑ پھینکتا ہے کیونکہ یہ درخت نہ پیداوار دیتا ہے اور نہ زندگی کے لیے مفید ہوتا ہے اس کے ساتھ یہی سلوک ہو سکتا ہے کہ اسے اکھاڑ کر بھوسہ بنا دیا جائے۔

اب قصہ حضرت شعیب علیہ السلام :

وَالِی مَدَیْنٍ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا لَّفَقَالَ یُقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا
الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْتَوُوا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۱۶﴾ فَكَذَّبُوهُ فَاَخَذَتْهُمُ

الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جُثَمِينَ ﴿۳۶﴾

”لور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور روز آخر کے امیدوار رہو اور زمین میں مغد بن کر زیادتیاں نہ کرتے پھرو۔“ مگر انہوں نے اسے جھٹلا دیا۔ آخر کار ایک سخت زلزلے نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے۔“

اس میں یہ اشارہ ہے کہ دعوت اسلامی تمام ادوار میں ایک رہی ہے اور دعوت اسلامی کا بنیادی عقیدہ بھی ایک رہا ہے۔

اعْبُدُوا اللَّهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْآخِرَ (۳۶:۲۹) ”اللہ کی بندگی کرو اور روز آخرت کے امیدوار رہو۔“ اللہ واحد کی بندگی کرنا اسلامی نظریہ حیات کی بنیاد ہے اور آخرت کی امید داری کے ذریعہ یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ اس دنیا میں جو حلال و حرام سمیٹے چلے جا رہے تھے اور ناپ اور تول کے پیمانوں میں خیانت کر رہے تھے، اس سے باز آجائیں۔ نیز وہ جو لوگوں کے حقوق مارتے تھے اور راہ زنی کرتے تھے۔ شاید خوف آخرت کی وجہ سے وہ ان جرائم سے باز آجائیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ لوگوں پر کئی قسم کی دست درازیاں کرتے تھے اور زمین میں فساد پھپکا کر رہے تھے خوف آخرت سے ان کی اصلاح ہو سکتی تھی۔

غرض آخر کار انہوں نے اپنے رسول کی نکتہ سبب کی اور ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا اور اللہ نے مکذبین کے بارے میں اپنی سنت جاریہ کے مطابق ان کو ہلاک کر دیا اور صلیٰ ہستی سے مٹا دیا۔

فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جُثَمِينَ (۳۷:۲۹) ”آخر کار ایک سخت زلزلے نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے۔“ اس سے قبل اس سخت زلزلے کی تفصیلات دے دی گئی ہیں، جس نے ان کی زمین کو ہلاک کر رکھا تھا اور یہ زلزلہ ایک سخت چیخ کے بعد آیا تھا۔ جس نے ان کو بے ہوش کر دیا تھا اور لوگ اسی جگہ پڑے کے پڑے رہ گئے جہاں تھے۔ اور یہ سزا ان کے ان جرائم کی وجہ سے دی گئی جن میں وہ چیخ چلا کر لوگوں پر ڈاکے ڈالتے اور ان کو لوٹے۔

اس کے بعد قوم عاد و ثمود کی ہلاکت کی طرف اشارہ :

وَعَادًا وَثَمُودًا وَقَدْ تَبَيَّنَ لَكُمْ مِنْ مَّسْكِنِهِمْ فَوَاحِشٌ
زَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا
مُصْتَبِرِينَ ﴿۳۸﴾

”لور عاد و ثمود کو ہم نے ہلاک کیا، تم وہ مقامات دیکھ چکے ہو جہاں وہ رہتے تھے۔ ان کے اعمال کو شیطان نے ان

کے لیے خوشنما بنا دیا اور انہیں راہ راست سے برگشتہ کر دیا حالانکہ وہ ہوش گوش رکھتے تھے۔

عاد کے لوگ جزیرۃ العرب کے جنوب میں علاقہ احناف میں رہتے تھے۔ یہ علاقہ حضرموت کے قریب ہے۔ اور ثمود علاقہ حجر شمالی جزیرۃ العرب میں رہتے تھے۔ اور یہ وادی القریٰ کے قریب علاقہ ہے 'قوم عاد کو تیز رفتار ہولنی طوفان کے ذریعہ ہلاک کیا گیا جو ناقابل کنٹرول تھا اور قوم ثمود کو ایک ہلاکت خیز چیخ کے ذریعہ جس کے بعد زلزلہ آیا۔ ان کے گھر عربوں کو معلوم تھے اور یہ لوگ اپنے گرمیوں اور سردیوں کے اسفار میں ان علاقوں سے گزرتے تھے اور ان کے آثار کو دیکھتے تھے کہ عزت اور اقتدار کے بعد یہ اقوام کس طرح لمبا میٹ ہوئیں۔

یہاں اس مختصر اشارے میں بتا دیا گیا ہے کہ ان کی گمراہی کا راز کیا تھا۔ یہی راز ہے دو سری تمام اقوام کی ضلالت کا۔

وَزَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ

(۳۸: ۹۸) ”ان کے اعمال کو شیطان نے ان کے لیے خوشنما بنا دیا اور انہیں راہ راست سے برگشتہ کر دیا اور وہ ہوش و گوش رکھتے تھے۔“

یہ عقیدہ تھے۔ ہدایت کے دلائل بھی ان کے سامنے تھے لیکن شیطان نے ان کو خواہشات نفسانیہ کے تابع کر کے ان کے ان اعمال کو ان کے لیے مزین بنا دیا تھا۔ اور ان پر وہ اس راستے سے حملہ آور ہوا جو کھلا تھا۔ یہ کہ وہ سخت مغرور تھے اور اپنے برے اعمال پر فخر کرتے تھے اور ان اعمال کے ذریعہ انہوں نے جو قوت اور مال و متاع جمع کر لیا تھا، اس کی وجہ سے وہ اعمال انہیں لٹھے لگتے تھے۔

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ (۳۸: ۹۸) ”انہیں راہ راست سے برگشتہ کر دیا تھا۔“ اور ایمان کا تو یہ واحد راستہ تھا۔ لہذا انہوں نے اس راہ پر چلنے کے مواقع گنوا دیئے۔

وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ (۳۸: ۹۸) ”اور بڑے دانش مند تھے۔“ صاحب فکر و نظر تھے اور عقل و اوراک کی قوتوں کے مالک تھے۔

اب قارون، فرعون اور ہامان کی طرف اشارہ۔

وَقَارُونُ وَفِرْعَوْنُ وَ هَامَانَ وَقَدْ جَاءَهُمْ مُوسَى

بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ ﴿۳۹﴾

”اور قارون و فرعون و ہامان کو ہم نے ہدایت کیا اور موسیٰ ان کے پاس بیعت لے کر آیا مگر انہوں نے زمین میں

اپنی بولی کا زعم کیا، حالانکہ وہ سبقت لے جانے والے نہ تھے۔“

قارون قوم موسیٰ کا فرد تھا مگر اس نے اپنی دولت مندی کی وجہ سے ان سے بغاوت کی۔ اور اس نے نصیحت کرنے والوں کی یہ نصیحت نہ سنی کہ اعتدال اور تواضع کا راستہ اختیار کرو، لوگوں پر احسان کرو اور سرکش اور بغاوت نہ کرو۔ اور فرعون ایک جبار اور سرکش حکمران تھا۔ اور قوم کے خلاف گناؤں کے جرائم کا ارتکاب کرتا تھا۔ اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور پوری طرح کنٹرول میں لے رکھا تھا۔ وہ بنی اسرائیل کے مردوں کو قتل کرتا تھا اور عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔ اور یہ محض ظلم کی وجہ سے۔ ہامان فرعون کا وزیر تھا اور اس کی ان قاہرانہ اور ظالمانہ ریاستی پالیسیوں کی تحفہ وہ کرتا تھا۔ فرعون کے تمام جرائم میں یہ اس کے لیے معین و مددگار تھا۔

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ (۲۹: ۳۹) ”اور موسیٰ ان کے پاس بیانات لے کر آیا مگر انہوں نے زمین میں بولی کا زعم کیا۔“ پس ان کی دوست، ان کی قوت، اور ان کا جبران کو نہ بچا سکا اور اللہ جس کو پکڑے، اسے تو کوئی بھی بچا نہیں سکتا۔ یہ لوگ اللہ کے عذاب سے نہ بچ سکے اور ان کو اللہ نے خوب پکڑا۔

یہ لوگ جو قوت، مال اور اسباب حیات کے مالک تھے اور زمین پر پوری طرح غالب تھے ان سب کو اللہ نے پکڑا، کیونکہ انہوں نے لوگوں کو فتنے میں ڈال دیا تھا اور ان کو اذیت دیتے تھے۔ اور وہ طویل عرصہ تک ایسا کرتے رہے تھے۔

فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنبِهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ أَغْرَقْنَا وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۴۱﴾

”آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھر اڑا کرنے والی ہوا بھیجی، اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا، اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور کسی کو غرق کر دیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے۔“

قوم عاد پر اللہ نے ایسی تیز ہوا بھیجی جو پتھراڑا کر پھینک رہی تھی۔ اسی طرح جو جہاں تھا، مارا گیا۔ قوم ثمود پر سخت دھماکہ دار چیخ آئی اور سب ڈھیر ہو گئے۔ اور قارون مع اپنی دولت اور کوئلوں کے زمین میں دھنس گیا۔ اور فرعون اور ہامان بحر میں غرق ہوئے۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے ظلم میں پکڑے گئے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۲۹: ۴۱) ”اللہ ان

پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔“

پہری انسانی تاریخ کے باغیوں 'سرکشوں اور ظالموں کی جہی اور بربادی کا عبرت آموز جائزہ لینے کے بعد اور آغاز سورت میں آزمائش اور گمراہی کے فتنوں کے ذکر کے بعد اب آخر میں 'اسلام اور کفر اور ایمان اور ضلالت کی قوتوں کی متکلف کو ایک تمثیل سے سمجھایا جاتا ہے کہ حقیقی قوت ایک ہی ہے اور وہ اللہ کی قوت ہے۔ اللہ کے سوا جس قدر قوتیں ہیں وہ نہایت ہی ناقص اور کچی ہیں۔ ان کی مثال تار عنکبوت کی طرح ہے جو شخص تار عنکبوت کا سارا لے گا وہ گویا ایک نہایت کچی چیز کا سارا لیتا ہے۔ اللہ کے سوا تمام قوتوں کی یہی مثال ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۴۱﴾ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۴۲﴾ وَالْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ﴿۴۳﴾

”جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔ یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو بھی پکارتے ہیں 'اللہ اسے خوب جانتا ہے اور وہی زبردست اور حکیم ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کی فمائش کے لیے دیتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔“

یہ ایک عجیب اور عجیب تصویر ہے 'ان تمام قوتوں کی جو اس کائنات میں موجود ہیں۔ اس میں ایک ایسی حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے جس سے لوگ بالعموم غافل رہتے ہیں اور اس غفلت کی وجہ سے پھر ان کے پیانے اور اقدار بدل جاتی ہیں۔ پھر وہ غلط رابطے قائم کر لیتے ہیں۔ ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ وہ غلط سمت میں جا رہے ہیں۔ وہ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کیا لیں اور کیا چھوڑیں۔

اس غلط سوچ کی وجہ سے وہ پھر ریاستی قوت سے بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں 'وہ سمجھتے ہیں کہ اس زمین پر ریاستی قوت ہی اصل قوت ہے اور سب کچھ ہے۔ اور ہر جگہ موثر ہے۔ اس لیے وہ اس قوت سے ڈرتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ وہ اس ریاستی قوت کی اذیتوں سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہیں اور اس کی حمایت کے حصول کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔

پھر ایسے لوگوں کو دولت کی قوت سے بھی دھوکہ ہوتا ہے 'وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی قوت ہے 'جس کے نتیجے میں زندگی کی قدریں حاصل ہوتی ہیں۔ اور تمام اقدار حیات دولت کے تابع ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگ حصول دولت کا شوق رکھتے ہیں اور زوال دولت کا انہیں ہر وقت خوف رہتا ہے۔ اور وہ حصول دولت کے لیے ہر وقت جدوجہد کرتے ہیں تاکہ اس

دولت کے ذریعہ وہ لوگوں کی گردنوں پر سوار ہوں اپنے زعم کے مطابق۔

یہ لوگ سائنس کی قوت کو بھی ایک بڑی قوت سمجھتے ہیں۔ اس کو بھی یہ مالی قوت اور تمام قوتوں کی بنیاد تصور کرتے ہیں، جن کے ذریعہ کوئی شخص گرفت کرتا ہے یا چلتا پھرتا ہے۔ سائنسی قوت کے سامنے بھی لوگ اس طرح جھکتے ہیں جس طرح سائنس کوئی معبود ہے اور لوگ اس کے بندے ہیں۔

غرض انسان کو یہ سب ظاہری قوتیں دھوکہ دیتی ہیں۔ جن افراد کے پاس یہ قوتیں ہیں جن سوسائٹیوں کے پاس یہ وسائل ہیں یا جن حکومتوں کے پاس یہ قوتیں ہیں ان سے دوسرے لوگ ڈرتے ہیں اور ان کا طواف کرتے ہیں اور ان پر لوگ اس طرح فدا ہوتے ہیں جس طرح پروانہ چراغ پر گرتا ہے۔ یا جس طرح وہ آگ میں گرتا ہے۔

ان ظاہری قوتوں سے دھوکہ کھا کر انسان اس اصلی قوت کو بھول جاتا ہے جو ان حقیر قوتوں کو پیدا کرنے والی عظیم قوت ہے۔ جو ان قوتوں کی پیدا کرنے والی ہے، جو ان سب قوتوں کی مالک ہے، جو کسی کو یہ قوتیں عطا کرتی ہے، جو ان قوتوں کی تسخیر کرتی ہے اور ان کا رخ جس طرف چاہتی ہے، پھیر دیتی ہے۔

لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ دنیا کی ان حقیر اور ظاہری قوتوں کے پاس پناہ لینا، خواہ یہ قوتیں افراد کے ہاتھ میں ہوں، چاہے کسی سوسائٹی میں ہوں، چاہے کسی حکومت کے پاس ہوں، اسی طرح ہے جس طرح کوئی تار عنکبوت کا سارا لے، یا بیت عنکبوت میں پناہ لے۔ یہ عنکبوت تو ایک کمزور، حقیر اور نہایت نرم پٹرا ہے اس کی ساخت ہی کمزور ہے۔ اور اس کا گھر بھی کمزور گھر ہے۔ وہ کسی کو کیا پناہ دے سکتا ہے۔

یاد رکھو! کہ حمایت صرف اللہ کی حمایت ہے، پناہ صرف اللہ کی پناہ ہے جو ایک قوی پناہ دینے والا ہے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جو قرآن کریم مومن لوگوں کے دلوں میں بٹھاتا ہے۔ اور ایک بار جب قرآن نے اہل ایمان کے دلوں میں یہ حقیقت بٹھادی تھی تو وہ گروہ دنیا کا ایک طاقت ور گروہ بن گیا تھا۔ اور اس نے ان تمام ظاہری قوتوں کو روند ڈالا تھا جو اس کی راہ میں کھڑی ہو گئی تھیں۔ زمین کے تمام جباروں اور قماروں کی گردنیں مرد ڈر جھکا دی تھیں اور بڑے بڑے قلعے مسمار کر کے رکھ دیئے تھے۔

یہ حقیقت قرآن نے اس گروہ میں کس طرح بٹھادی تھی؟ یہ حقیقت ہر نفس میں بیٹھ گئی تھی۔ اس سے ہر دل بھر گیا تھا۔ یہ حقیقت ان کے خون میں مل گئی تھی اور یہ ان کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ یہ حقیقت صرف الفاظ کی ادائیگی تک محدود نہ تھی۔ نہ یہ ایک موضوع بحث تھی جس پر سینار ہوتے تھے بلکہ یہ ان نفوس میں واضح طور پر نظر آتی تھی۔ اور ان کے حس و خیال میں اس کے سوا کوئی اور بات نہ تھی۔ یہ کہ اللہ کی قوت ہی واحد قوت ہے اور اللہ کی دوستی ہی واحد دوستی ہے اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ کمزور و ناتواں ہے۔ اگرچہ بظاہر دوسری قوتیں جس قدر بھی ظلم و استبداد کریں۔ اگرچہ انہوں نے ظلم و سرکشی کی حد کر دی ہو، اگرچہ ان کے پاس گرفت اور دست درازی کے تمام وسائل ہوں اور وہ پکڑ دھکڑ کر رہے ہوں۔

یہ سب کچھ بیت عنکبوت ہے۔ یہ تمام قوتیں اور وسائل تار عنکبوت ہیں۔

وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبُيْتُ الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۲۹: ۴۱) ”اور سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے، کاش کہ یہ لوگ جانتے۔“

وہ دایہ جو فتنوں اور آزمائشوں سے دوچار ہو جاتے ہیں، جنہیں قید و بند اور تشدد و اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ان کو چاہئے کہ اس حقیقت پر غور کہیں اور ایک لمحے بھر کے لیے بھی اسے نظروں سے گزر جائے نہ کہ ان کو تو اس میدان میں مختلف حرام قوتوں سے دوچار ہونا ہے۔ یہ قوتیں ان پر وارد کرتی ہیں اور ان کو نیست و نابود کرنا چاہتی ہیں۔ بعض ایسی قوتیں ہوتی ہیں جو انہیں خریدنا چاہتی ہیں۔ یہ سب قوتیں تاریک گتوں کی طرح ہوتی ہیں بشرطیکہ کسی کا ایمان و نظریہ مضبوط ہو، اور کوئی جانتا ہو کہ اصل اور حقیقی قوت ہے کیا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ (۲۹: ۴۲) ”یہ لوگ اللہ کو پھوڑ کر جس چیز کو پکارتے ہیں، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔“ یہ لوگ اللہ کے سوا بعض دوسری چیزوں کا سارا لیتے ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ یہ ہمارے کے قابل چیزیں نہیں ہیں۔ ان کی حقیقت وہی ہے جو تمثیل سابق میں بیان کی گئی تھی، یعنی مکڑی کا جالا۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲۹: ۴۲) ”وہی زبردست اور حکیم ہے۔“ وہی غالب ہے، وہی قاهر ہے، وہی حکیم ہے اور وہی اس پوری کائنات کا مدبر ہے۔

وَتِلْكَ اَلْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعُلَمَاءُ (۲۹: ۴۳) ”یہ مثالیں ہم لوگوں کی نمائش کے لیے دیتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔“ مشرکین کے بعض لوگ ایسے تھے جن کے دلوں پر تارے لگے ہوئے تھے اور ان کی عقل ماری گئی تھی، وہ لوگ اس تمثیل کے ساتھ یہ حرج کرتے تھے اور کہتے تھے کہ محمد کے رب کبھیوں اور پھروں کی بات بھی کرتے ہیں اور اس تمثیل میں جو حقیقت بیان کی گئی تھی، اس کو وہ سمجھ ہی نہ سکے تھے۔ نہ اس کا ان پر اثر ہوا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ

وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعُلَمَاءُ (۲۹: ۴۳) ”مگر ان چیزوں کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو عقلمند ہیں۔“ اب آخر میں ان تمام حقائق کو اس عقیم حقیقت کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے جو اس کائنات کے نقشے میں ردیعت کر دی گئی ہے، جس طرح قرآن کریم کا خاص اسلوب ہے۔

۴
خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾

”اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے، درحقیقت اس میں ایک نشانی ہے لعل ایمان کے لیے۔“ تمام انبیاء کے قصص کے بعد یہ آیت آتی ہے اور اس تمثیل کے بعد آتی ہے جس میں اللہ کی قوت کے مقابلے میں

دوسری قوتوں کو تار عنکبوت کی طرح نزار و نحیف بنایا گیا ہے۔ یہ آیت ان سب قصص و تمثیلات کے ساتھ مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ اور ان کے درمیان ایک گہرا رابطہ ہے کہ زمین و آسمان میں وہی حقیقت بکھری ہوئی ہے اور ہر سو نظر آتی ہے۔ یہ کائنات جس ٹھوس نظام پر قائم ہے اس کے اندر وہی حقیقت ہے وہی قوت ہے جو اس قرآن کے اندر پوشیدہ ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۲۹: ۴۴) ”در حقیقت اس میں نشانی ہے لل ایمان کے لیے“۔ کہ یہ ایک عظیم نظام ہے، ناپید اکفار کائنات ہے اور پھر بھی باہم متصادم نہیں ہے۔ اور لل ایمان ہی ہیں جن کے دل اس کائنات میں بکھری ہوئی نشانیوں کے لیے کھلے ہوتے ہیں، جن کا نظم و نسق یہ شہادت دیتا ہے، جس قدر بھی دور تک ہمارا مشاہدہ جائے کہ یہ کائنات ایک عظیم سچائی پر پیدا کی گئی ہے صرف لل ایمان ہی اس سے حقیقت کو پا سکتے ہیں اس لیے کہ ان کو مومنانہ بصیرت اور بصارت حاصل ہوتی ہے اور ان کا شعور اور قوت مدد کہ تیز ہوتی ہے۔

آخر میں اس کتاب کو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہے، ذکر و صلوٰۃ سے مربوط کر دیا جاتا ہے۔ اور اس حق کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے جو اس پوری کائنات میں پوشیدہ ہے اور اس ذکر و فکر سے مربوط کیا جاتا ہے جو نوح علیہ السلام سے اور تمام انبیاء کا مکتہ دعوت رہا ہے۔

اَتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَاَلَّذِكُرُ اللّٰهَ اَكْبَرُ وَاَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۲۹: ۴۵) ”جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے اسے پڑھئے اور نماز قائم کیجئے بے شک نماز فحاشی اور منکرات سے روکتی ہے۔ بے شک اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے جو کام تم کرتے ہو“۔

ان کے سامنے کتاب پڑھیں کہ یہی ذریعہ دعوت اسلامی ہے، اور ایک ربانی معجزہ ہے اور اس کتاب کے اندر بیان کردہ سچائی وہی ہے جو اس کائنات کے اندر پوشیدہ سچائی ہے۔

اور نماز قائم کرو، جب نماز قائم کی جاتی ہے تو یہ فحاشی اور منکرات سے روکتی ہے، یہ اللہ کے ساتھ ایسا رابطہ ہے کہ جب کوئی یہ رابطہ قائم کرتا ہے تو پھر وہ فحاشی اور منکرات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ ظاہری اور روحانی تطہیر کا ذریعہ ہے۔ لہذا اس کے ساتھ کوئی گندگی، ناپاکی اور میل کچیل لگا ہی نہیں کھاتی۔ حضورؐ نے فرمایا ”جو شخص ایسی نماز پڑھے جو اسے فحاشی اور منکرات سے نہ روکے تو وہ ایسی نماز سے ماسولے اس کے کہ اللہ سے دور ہو جائے۔ اور کوئی مفاد نہ پائے گا“۔ (ابن جریر)۔

اگر کوئی ایسی نماز پڑھتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے نماز ادا کر دی لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے نماز قائم کر دی۔ اور نماز ادا کرنے میں اور قائم کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگر نماز قائم کی جائے تو یہ ذکر اللہ ہوتی ہے اور

وَلَذِكُرُ اللّٰهَ اَكْبَرُ (۲۹: ۴۵) ”اللہ کا ذکر بہت بڑا ہوتا ہے“۔ مطلقاً وہ بڑی چیز ہوتی ہے۔ ہر

تصور اور ہر جذبہ سے بڑا ہوتا ہے۔ ہر عبادت اور ہر عاجزی سے ذکر اللہ بڑا ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ (۴۵:۲۹) ”اور اللہ جانتا ہے جو تم بناتے ہو“۔ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ اس پر کسی امر میں التباس نہیں ہوتا۔ تم نے آخر کار اس کی طرف لوٹنا ہے۔ اور وہ تمہاری تمام مصنوعات کا بدلہ تمہیں دینے والا ہے۔

صدق اللہ العظیم

---○ ○ ○---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۱

سورۃ العنکبوت - ۲۹

آیات ۴۵ --- تا --- ۶۹

درس نمبر ۱۸۲ ایک نظر میں

یہ سورہ عنکبوت کا آخری سبق ہے۔ پہلے دو سبق پارہ ۲۰ میں گزر چکے ہیں۔ سورہ ۲۹ نے پہلے کہا اس سورہ کا محور آزمائش و امتلاء ہے۔ جو لوگ بھی کلمہ حق بلند کرتے ہیں ان کی راہ میں رکاوٹیں آتی ہیں۔ فتنوں اور آزمائشوں کی بھیبت میں سے گزر کر اللہ تعالیٰ سے ملے اور جھوٹے لوگوں کے درمیان فرق واضح فرما دیتے ہیں۔ جو جس قدر گرم و سرد چشیدہ ہو گا اسی قدر وہ درجات بلند کا مالک ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں یہ بھی نشیں کر لیا گیا ہے کہ زمین پر موجود شیطانی قوتیں اہل ایمان کا راستہ روکنے کے لئے چاہے جس قدر زور لگائیں 'ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اہل ایمان اگر ذرا صبر کریں اور مصاہرت سے کام لیں تو اللہ آخر کار ہر کاروں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اہل ایمان کو کامیاب کرتا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے اور اسلامی دعوت کے ساتھ اللہ کی سنت کا ہمیشہ یہی معاملہ رہا ہے۔ نوح علیہ السلام سے لے کر آج تک یہ سنت اہل رہی ہے۔ اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ سنت اس بڑی سچائی کے ساتھ بھی مربوط ہے جو اس کائنات میں کام کر رہی ہے جس طرح اللہ کی دعوت ایک ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں اسی طرح اللہ کی سنت بھی ناقابل تغیر ہے۔

درس سابق کا خاتمہ اس بات پر ہوا تھا کہ اے رسول اور اے اہل ایمان تمہاری طرف جو آیات الہی نازل ہو رہی ہیں بس تم ان کی تلاوت کرتے جاؤ ان کو سمجھو اور مطالعہ کرو اور نذر قائم کر کے ان پر عمل کرو اور اس بات کو ذہن میں حاضر رکھو کہ اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ بھی تم کرتے ہو۔

اس سبق میں بھی کتاب اللہ کے بارے میں بات چلتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کتاب اور کتب معارفہ کے درمیان کیا تعلق اور نسبت ہے۔ مسلمانوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ ظالموں کو چھوڑ کر دوسرے عام اہل کتاب کے ساتھ رویہ اچھا رکھو، ان کے ساتھ اچھے انداز سے مکالمہ کرو۔ ظالم لوگ وہ ہیں جنہوں نے کتاب اللہ میں تحریف کر دی اور جنہوں نے عقیدہ توحید کو بدل کر شرک کا عقیدہ اپنایا اور شرک ہی بہت بڑا عظیم ہے۔ اہل ایمان کی راہ اور عقیدہ یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اس کی تمام رسالتیں ایک ہیں کتب ایک ہیں یہ کہ تمام کتابیں اللہ کے نزدیک عظیم سچائی پر مشتمل ہیں اور اہل ایمان ان کی تصدیق کرتے ہیں۔

اس کے بعد بعض ایسے اہل کتاب کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اس آخری کتاب پر ایمان لائے۔ حالانکہ مکہ کے مشرکین جن کے اندر سے نبی آخر الزمان کا انتخاب ہوا اس پر ایمان نہیں لائے۔ وہ اس عظیم اعزاز اور عظیم رحمت نبی قدر نہیں کرتے جو اللہ نے ان کو بخشا۔ وہ اس کتاب کے اعجاز اور اس کی تعلیمات کو 'بے وقوف' کے بیچے ہوئے رسوں کو اپنے لیے غنیمت نہیں سمجھتے کہ وہ اس سے ہمکلام بھی ہے اور اللہ کا کلام بھی ان کو سن رہا ہے جبکہ اس سے قبل مشرکین کے سامنے نہ انہوں نے کوئی کتاب پڑھی اور نہ وہ کوئی قلم کار تھے۔ اگر حضورؐ مطالعہ کتب کرتے رہتے اور کتابیں لکھتے رہتے

تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ انہوں نے یہ کتاب خود تصنیف کر ڈالی ہو۔

مشرکین مکہ بات بات پر یہ مطالبہ کر دیتے تھے کہ اگر تم سچے ہو تو لاؤ عذاب الہی جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عذاب بہت ہی قریب ہے اور یہ جہنم کی شکل میں تمہیں گھیرے گا۔ یہ قیامت کے دن لوہے سے بھی ہو گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی ہو گا۔ ہر طرف سے گھیر لے گا۔

اس کے بعد روئے سخن ان اہل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے جو مکہ میں اہل کفر کے تشدد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ اگر مکہ میں ان پر عرصہ حیات ٹنگ کر دیا گیا ہے تو وہ ہجرت کر جائیں تاکہ وہ رب واحد کی بندگی کر سکیں۔ یہ ہدایت ان کو ایک عجیب انداز میں دی جاتی ہے۔ ہجرت کے مشورہ سے ان کے دلوں میں جو پریشانیاں اور خدشات پیدا ہوتے ہیں انہیں دور کر دیا جاتا ہے۔ ان تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جاتا ہے جو ان کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں۔ چند چٹکیوں کے ساتھ ان کی قلبی حالت بدل دی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قرآن کو نازل کرنے والا وہی خالق ہے جو اس کائنات کو پیدا کرنے والا ہے کیوں کہ انسانی دلوں کی گہرائیوں تک اثر اور ان کے اندر اس قسم کے احساسات وہی ذات پیدا کر سکتی ہے جس نے ان دلوں کو پیدا کیا ہے کیونکہ وہی لطیف و خبیر ہے۔

اس کے بعد روئے سخن ان مشرکین کی طرف مڑ جاتا ہے جو نظریاتی انتشار میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ وحدہ ہی خالق کائنات، خالق ارض و سما، مسخر شمس و قمر ہے اور وہی ہے جو آسمانوں سے پانی اتارتا ہے جس سے یہ زمین مردہ ہونے کے بعد زندہ ہو جاتی ہے۔ جب وہ بحری سفر میں ہوتے ہیں تو وہ صرف اللہ وحدہ کو پکارتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد وہ پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔ اللہ کی کتاب کی حقانیت کا انکار کرتے ہیں، رسول اللہ کو ناجائز اذیتیں دیتے ہیں۔ اہل ایمان کو قتل اور مصیبتوں میں ڈالتے ہیں۔ اہل شرک کو یہ بھی یاد دلایا جاتا ہے کہ دیکھو تمہارے لیے اس حرم کو جائے امن بنایا گیا ہے جس میں تم چین سے رہتے ہو۔ تمہارے ارد گرد تمام قبائل ہر وقت خوف و ہراس میں رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ مشرکین اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اللہ کے ساتھ خود ساختہ اہوں کو شریک کرتے ہیں۔ اس لیے ان کو دھمکی دی جاتی ہے کہ تم جہنم رسید ہو گے اور وہاں تمہیں ہمیشہ رہنا ہو گا۔

سورہ کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ اہل ایمان کو کامیابی کی راہیں دکھائے گا لیکن ان اہل ایمان کو جو مومنین خالص ہوں، جنہوں نے رکاوٹوں کو پار کر لیا ہو، آزمائشوں سے گزر گئے ہوں اور مشکلات راہ پر قابو پالیا ہو۔ اگرچہ اس راہ کی رکاوٹیں بہت ہیں، لیکن انہوں نے یہ مشکل کام کر لیا ہو۔

درس نمبر ۱۸۲ تشریح آیات

۴۵ --- تا --- ۶۹

أَتْلُ مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ ۖ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ

عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۚ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ ۝
وَلَا تَجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ
وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَهُنَا وَإِلَهُكُمْ وَاحِدٌ
وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝

(اے نبیؐ) تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو، یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں اور ان سے کہو کہ ”ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی“ ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم (فرمانبردار) ہیں۔“

وہ دعوت جس کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے ہوا اور جس کا خاتمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا۔ یہ ایک ہی دعوت ہے، ایک ہی اللہ کی طرف سے ہے اور اس دعوت کا مقصد اور مطلوب بھی ایک ہی ہے۔ یہ کہ گمراہ انسانیت کو واپس لا کر رب العالمین کی راہ پر ڈال دیا جائے، اللہ کی ہدایت اور منہاج کے مطابق وہ زندگی بسر کرے۔ جو لوگ سابقہ رسولوں کی دعوت پر ایمان لاتے رہے ہیں وہ اہل ایمان کے بھائی ہیں۔ سب ایک ہی امت ہیں، ایک ہی اللہ کی بندگی کرتے ہیں۔ انسانیت اپنے ہر دور اور ہر زمان و مکان میں دو گروہوں میں بٹی رہی ہے۔ ایک گروہ مومنین کا ہے جسے حزب اللہ کہا جاتا ہے اور دوسرا گروہ اللہ کے دشمنوں کا ہے اور یہ حزب الشیاطین کے نام سے موسوم ہیں۔ اس سلسلے میں کسی زمان و مکان میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ لہذا وہ نہ قدیم سے لے کر آج تک مومنین ایک پارٹی ہیں اور اہل کفر ایک پارٹی ہیں۔

یہ وہ عظیم اور بلند حقیقت ہے جس کے اوپر اسلام قائم ہے اور جسے اس آیت میں منطبق کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان میں پائے جانے والے تعلقات اور روابط کو محض خون، نسب، قومیت، وطن، تجارت اور مفادات سے بلند کر کے انہیں اللہ واحد کی اساس پر قائم کرتی ہے۔ تمام انسانوں کا ایمان ایک ایسے نظریہ حیات

پر ہو جس میں تمام رنگوں اور تمام نسلوں کے لوگ پھل جائیں۔ تمام قومیں ختم ہوں خواہ نسل ہوں یا وطنی ہوں اور جس میں زمان و مکان کی دوریاں غائب ہوں اور تمام انسانوں نے ایک ہی مضبوط رسی کو پکڑ رکھا ہو۔ خالق کائنات اور شارع کائنات کی رسی کو۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کو اہل کتاب کے ساتھ مکالمے اور مجادلے سے منع کیا جاتا ہے ماسوائے اس کے کہ یہ مجادلہ نہایت ہی مستحسن طریقے سے ہو۔ مسلمانوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے اور سابقہ رسل کی تعلیم اور رسالت کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو اس تاریخی اسلامی دعوت کی آخری شکل یعنی دین اسلام پر اکتفاء کرنا چاہئے جو تمام سابقہ دعوتوں کے مطابق ہے۔ جو تمام سابقہ دعوتوں اور رسالتوں کی تکمیل ہے۔ یہ آخری صورت اس کو اللہ کے علم و حکمت نے دی ہے جو انسانوں کی مصلحت خود انسانوں سے زیادہ جاننے والے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ (۲۹: ۴۶) ”سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں۔“ جنہوں نے توحید سے انحراف کیا جو اسلامی نظریہ حیات کا سنگ اساس ہے جنہوں نے اللہ کے ساتھ شرک کی اور جنہوں نے اسلام کو بحیثیت منہاج حیات چھوڑ دیا کیونکہ ایسے لوگوں کے ساتھ نہ نرمی ہے اور نہ ایسے لوگوں کے ساتھ مکالمے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی ظالم لوگوں کے ساتھ اسلام نے اس وقت جنگ کی جب مدینہ میں اسلامی مملکت قائم ہو گئی۔ بعض لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا کہ مکہ میں جب اہل ترک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت برتاؤ کر رہے تھے تو آپ نے یہ باتیں کہیں کہ اہل کتاب کے ساتھ نرمی اور احسان کا طریقہ اختیار کیا جائے مگر جب مدینہ میں آپ کی حکومت قائم ہو گئی تو آپ نے اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ شروع کر دیا اور جنگیں لڑیں اور کئی اقوال کے خلاف طرز عمل اختیار کیا۔ یہ بہت بڑا بہتان ہے اور خود یہی کی آیت اس کا انکار کر رہی ہے۔ اسلام صرف ان اہل کتاب کے ساتھ نرم برتاؤ کرنے کی اجازت دیتا ہے جو ظالم اور مشرک نہ ہوں اپنے اصل دین پر ہوں اور سابقہ رسولوں کی ہدایات کے مطابق صحیح توحید پر قائم ہوں۔

وَقُولُوْا اٰمَنَّا بِالَّذِيْ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهِنَا وَاِلٰهَكُمْ وَاَحَدٌ وَّنَحْنُ لَهُ

مُسْلِمُوْنَ (۲۹: ۴۶) ”اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی اور ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم ہیں۔“ لہذا بحث و اختلاف کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اور جدل و جدال بے محل ہے۔ ہم سب اللہ واحد کو خدا مانتے ہیں۔ اہل ایمان تو قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور انبیائے سابقہ کی کتب پر بھی ایمان لاتے ہیں کیونکہ اسلام کی ایک ہی زنجیر ہے اور تمام نبوتیں اس کی کڑیاں ہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۙ فَالَّذِيْنَ اَتَيْنَهُمُ

الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۙ وَ مِنْ اَهْوَالِئِۦمَنْ يُؤْمِنُ بِهٖ ۙ وَمَا يَجْحَدُ بِآيٰتِنَا اِلَّا

الْكَافِرُونَ ﴿۱﴾

”(لے نبیؐ) ہم نے اسی طرح تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے، اس لیے وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور ان لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں، اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔“

”اسی طرح“ یعنی ایک ہی سلسل اور تاریخی منہاج کے مطابق، ایک ہی سنت الہیہ کے مطابق جو اہل ہے اور اسی طریقے کے مطابق جس کے ذریعے اللہ ہمیشہ رسولوں کو ہدایت دیتا رہا ہے۔

وَكَذَلِكَ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ (۴۷:۲۹) ”لے نبیؐ“ ہم نے اسی طرح تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے۔ اور جب کتاب نازل کی تو لوگ اس کے مقابلے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو اہل کتاب میں سے بھی تھے اور قریش میں سے بھی تھے وہ تو ایمان لے آئے اور دوسرا گروہ وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب کے ایمان اور شہادت کے بعد بھی اس کو تسلیم نہیں کرتے حالانکہ وہ اس کی سچائی کی تصدیق کر چکے ہیں۔

وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الْكَافِرُونَ (۴۷:۲۹) ”اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔“ یعنی یہ آیات اس قدر واضح ہیں، اس قدر سیدھی ہیں کہ ان کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جس کی عقل پر دسے پڑ گئے ہوں، جس کی روح مستور ہو، اور وہ اس قائل ہی نہ رہی ہو کہ سچائی کو دیکھ سکے۔ کفر کے حقیقی معنی ہی چھپانے اور پردوں میں ڈالنے کے ہیں۔ یہاں قرآن نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس میں کفر کے اصطلاحی معنوں کے ساتھ نفوی معنی بھی ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

وَمَا كُنْتُمْ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكُمْ

إِذَا لَزَمْتَ التَّبَاطُؤُونَ ﴿۲﴾

”(لے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔“

قرآن کریم کفار کے شبہات کا چچھا کرتا ہے، یہاں تک کہ ان کے بجگانہ اعتراضات اور شبہات کا بھی دفعہ کر دیا جاتا ہے۔ رسول اللہؐ نے زندگی کا طویل ترین حصہ کفار مکہ کے درمیان بسر کیا تھا۔ آپؐ نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔ اچانک انہوں نے ایسی عجیب کتاب پیش کی جس نے تمام پڑھے لکھے لوگوں اور لکھنے والوں کو عاجز کر دیا۔ اگر حضور اکرمؐ نزول قرآن سے قبل پڑھے لکھے ہوتے تو کفار مکہ جائز طور پر اعتراض کرتے کہ حضورؐ خود تصنیف کر رہے ہیں لہذا اب وہ جو اعتراضات کرتے ہیں وہ بے بنیاد ہے۔

میں کتابوں قرآن کریم ان کے لغو اور بے جگہ سوالات کا بھی جواب دیتا ہے۔۔۔ ورنہ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ حضور ارم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے لکھے تھے تو پھر بھی قرآن کریم پر ان کے لیے شبہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ کیونکہ اگر قرآن کریم پر بذات خود غور کیا جائے تو یہ ایک معجز کتاب ہے اور انسانوں کی تعریف کردہ کتاب نہیں ہے۔ یہ انسانی قوت اور معرفت کے حدود سے باہر ہے۔ انسانی ظلم و معرفت کی حدود سے اس کے مضامین وراء ہیں۔ قرآن کریم میں جو سچائی درج ہے وہ بے قید سچائی ہے جس طرح اس کائنات کے اندر موجود سچائی بے قید ہے۔ انسان جب بھی نصوص قرآنی پر غور کرتا ہے اب معصوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کی پشت پر سب بناہ قوت ہے۔ قرآن کریم کی عبرت میں بھی ایک عظیم شوکت ہے اور یہ قوت اور یہ شوکت کا نام انسانی طاقت سے وراء ہے۔

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ﴿٥٩﴾

”در اصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مکر وہ جو ظالم ہیں۔“

یہ قرآن اہل علم کے لیے واضح دلائل پر مشتمل ہے جن میں کوئی التباس اور پیچیدگی نہیں ہے نہ کوئی شبہ اور شک ہے۔ یہ ایسے دلائل ہیں جو لوگوں کے سینوں میں موجود ہیں، لوگوں کے دل ان دلائل پر مطمئن ہیں اس لیے اہل علم قرآنی آیات پر کوئی مزید دلیل طلب نہیں کرتے۔ وہ علم جس پر لفظ علم کا اطلاق کیا جاسکتا ہے وہ ان لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔ وہ بصورتِ ملکہ مستقر وہاں بیٹھا ہے۔ وہ دوسرے پھوٹا ہے، وہ دلوں کی راہنمائی کرتا ہے اور سیدھا منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔

وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ (۴۹: ۲۹) ”اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مکر وہ لوگ جو ظالم ہیں۔“ جو حقیقت اور معاملات کا صحیح اندازہ نہیں کرتے اور جو صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر نیڑھی راہوں پر چلتے ہیں۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾

”یہ لوگ کہتے ہیں کہ ”کیوں نہ ہماری عینیں اس شخص پر نشانیاں اس کے رب کی طرف سے؟“ کہو ”نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر۔“

ان معجزات اور نشانوں سے ان کی مراد وہ معجزات اور نشانیاں ہیں جو آغازِ انسانیت یعنی انسانیت کے دور طفولیت میں ان کے سامنے پیغمبروں نے پیش کیں، یعنی مادی معجزات۔ اور یہ معجزات صرف ان لوگوں کے لیے حجت ہوتے تھے جو

ان کو دیکھتے تھے۔ جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وہ آخری اور دائمی رسالت ہے جو ان تمام لوگوں کے لیے حجت ہے جن تک اس کی دعوت پہنچ جائے اور یہ رسالت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک انسانیت موجود ہے اور یہ دنیا قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس رسالت کو ایک ایسی معجز کتاب دی ہے جو ہمیشہ پڑھی جاتی ہے اور جس کا اعجاز ختم نہیں ہوتا۔ اور جس کے کمالات و عجائبات ختم نہیں ہوتے۔ اللہ کے لیے قرآن کے فرائض کا علیحدہ، خیرہ ظاہر ہوتا رہتا ہے اور اس کے یہ معجزات اور دلائل ہر دور کے اہل علم کے سینوں میں موجود رہتے ہیں۔ جب بھی اہل علم اس پر غور کرتے ہیں وہ اس کتاب کے اعجاز اور معجزات کو پاتے ہیں اور وہ انہی طرح محسوس کر لیتے ہیں کہ قرآن کریم کو یہ عظمت اور شوکت کس سرچشمے سے ملی ہے۔

قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ (۲۹: ۵۰) ”کہو، نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔“ اور اللہ اپنی نشانیاں اس وقت ظاہر کرتا ہے جب ان کی حاجت اور ضرورت ہو۔ اور یہ سب کام اللہ کے نظام تدبیر اور تقدیر کے مطابق ہوتا ہے اس لیے میں اس سلسلے میں نہ کوئی تجویز دے سکتا ہوں اور نہ مطالبہ کر سکتا ہوں۔ یہ میرے لائق نہیں ہے اور نہ ہی یہ میری عادت ہے۔

وَ إِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (۲۹: ۵۰) ”میں صرف خبردار کرنے والا ہوں، کھول کھول کر۔“ میں ڈراتا ہوں اور خبردار کرتا ہوں اور لوگوں کے سامنے حقائق کھول کھول کر بیان کرتا ہوں اور میں میرا فریضہ ہے جو میں ادا کرتا ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا وہ اللہ کی تقدیر و تدبیر کے مطابق ہو گا۔

اس طرح اللہ اسلامی نظریہ حیات کو ہر شک اور شبہ سے پاک کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور مقام کی حدود کا تعین کر دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ کی صفات اور الہ واحد و قہار کی صفات کے درمیان امتیاز کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح رسول اللہ کی شخصیت کے ارد گرد بے شمات کے وہ بادل بھٹ جاتے ہیں جو ان رسولوں کی شخصیات کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے جن کو مادی معجزات دیئے گئے کیونکہ ساتھ رسولوں کی صفات کو خدائی صفات کے ساتھ مل دیا گیا تھا اور لوگوں نے ان رسولوں کی شخصیات کو اوبام و خرافات سے گھیر لیا تھا جس کی وجہ سے ان کے عقائد کے اندر بہت بڑا انحراف واقع ہو گیا۔

یہ لوگ جو مادی معجزات طلب کر رہے ہیں اس بات کو انہی طرح سمجھ نہیں سکے اور نہ اس کی اہمیت کو سمجھ سکے ہیں کہ اللہ نے تو قرآن نازل کر کے ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَرَحْمَةً وَ ذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۱﴾

”اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی

ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔“

یہ ان کی جانب سے اللہ کی نعمتوں اور مہربانیوں کی ناشکری ہے، حالانکہ اللہ کے انعامات شکر اور قدر دانی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ یہ لوگ اس قرآن کے ساتھ آسمانوں میں پہنچ جائیں اور دیکھیں کہ یہ آسمانوں سے نازل ہو رہا ہے اور آسمانوں سے اُکروہ ان کے دلوں کے تاروں کو پھینک رہا ہے۔ ان کے دلوں کی بات کرتا ہے۔ ان کے ماحول کی باتیں کرتا ہے۔ ان کو یہ شعور دلاتا ہے کہ اللہ کی ان پر ہر وقت نظر ہے۔ اللہ کے ہاں تمہاری بہت اہمیت ہے کہ وہ تمہارے امور سے بحث کرتا ہے۔ تمہیں قصص سناتا ہے جبکہ اے انسان تو تو اللہ کی اس وسیع کائنات میں ایک چھترے بھی زیادہ کمزور اور چھوٹا ہے۔ بلکہ اے انسان تو تمہاری یہ زمین اور تمہارا یہ شمس و قمر تو اللہ کی اس کائنات میں اس طرح ہیں جس طرح پرکاش اس زمین کے مقابلے میں اور یہ پرکاش بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ نے تمہیں مکرم بنایا ہے اور وہ تم پر بلند یوں سے یہ قرآن نازل کرتا ہے لیکن تم پھر بھی اس کی قدر نہیں کرتے ہو؟

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرًا لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۲۹: ۵۱) ”بے شک اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔“ اس لیے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہی لوگ اس رحمت و شفقت کا احساس کر سکتے ہیں۔ اور وہی لوگ اس بات کا شعور حاصل کر سکتے ہیں کہ قرآن کو نازل کر کے اللہ نے اپنے بندوں پر کس قدر رحمت و شفقت فرمائی۔ یہی لوگ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ جو بہت ہی بلند مرتبہ ہے، جو بہت ہی عظیموں والا ہے وہ اس ناچیز انسان کو اپنے اس دسترخوان پر بلاتا ہے۔ ایسے ہی لوگ اس قرآن سے نفع حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ یہ تو مطالعہ کرنے والے کے لیے آپ حیات ہے اور اس کے ذریعہ مومن اور متدبر پر بے پناہ خزانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں، اور ان کی رگوں کے اندر یہ قرآن ایک روشن اور اشراق پیدا کر دیتا ہے۔

جن لوگوں کو ان امور کا شعور نہیں دیا گیا، وہ حقیر مادی معجزات طلب کرتے ہیں اور حقیر معجزات کے ذریعے وہ اس عظیم اور ابدی معجزے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی شخصیت مسخ ہو چکی ہے اس لیے ان کے دل اس نور کے لیے نہیں کھلتے لہذا ایسے لوگوں پر اپنا وقت نہ ضائع کرو۔ ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ ان کا فیصلہ وہی کرے گا۔

قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ بَيِّنًا وَبَيِّنٰتُكُمْ شَهِيدًا ۝۱۰ يَعْلَمُوْنَ مَا فِي

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۝۱۱ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۱﴾

”(اے نبی!) کہو کہ ”میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین میں سب کچھ جانتا ہے۔ جو لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔“

وہ ذات جو جہانوں کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے اس کی شہادت سے بڑی شہادت کس کی ہو سکتی ہے اور اللہ

اپنے علم سے شہادت دے رہا ہے کہ یہ لوگ باطل پر ہیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْحَسِرُونَ (۵۲:۲۹) ”جو لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔“ یہ مطلقاً خسارے میں ہیں۔ ہر چیز سے وہ محروم ہو گئے ہیں۔ دنیا و آخرت دونوں ہار چکے ہیں۔ اپنی ذات، شخصیت، ہدایت، استقامت، اطمینان، نچائی اور نور سب چیزوں سے محروم ہو چکے ہیں۔

اللہ کی ذات پر ایمان لانا بھی ایک عمل اور کمائی ہے۔ یہ بذات خود اچھی کمائی ہے۔ اس پر اللہ اپنے فضل و کرم سے اجر دیتا ہے۔ اجر یہ کہ ایمان سے قلبی اطمینان اور زندگی کی راہوں کا یقین ہو جاتا ہے۔ جو واقعات بھی اس زندگی میں پیش آئیں، بندہ مومن ان کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے، وہ اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے۔ اللہ کی حمایت کا طلبگار اور امیدوار ہوتا ہے اور اسے اچھے انجام کا یقین ہوتا ہے یہ بذات خود ایک کسب ہے، ایک کمائی ہے جس سے کافر محروم ہوتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْحَسِرُونَ (۵۲:۲۹) ”وہی لوگ خسارے میں ہوتے ہیں۔“

اب مشرکین کی بحث در آگے بڑھتی ہے کہ یہ لوگ عذاب کے آنے میں غفلت کرتے ہیں حالانکہ جہنم تو ان کے بہت ہی قریب ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَوْلَا أَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاءَهُمُ الْعَذَابُ وَلَيَأْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿۵۴﴾ يَوْمَ يَخْشَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ وَيَقُولُ ذُو قُوَّةٍ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۵۵﴾

”یہ لوگ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب آچکا ہوتا۔ اور یقیناً (اپنے وقت پر) وہ آکر رہے گا۔ اچانک اس حال میں کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی۔ یہ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ جہنم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے۔ (اور انہیں پتہ چلے گا) اس روز جب کہ عذاب انہیں اوپر سے بھی اڑھانک لے گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی اور کہے گا کہ اب چکھو مزا ان کر تو توں کا جو تم کرتے تھے۔“

مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ڈراوے اور تنزیف کی آیات سنتے تھے، لیکن ان کی سمجھ میں یہ حکمت نہ آتی تھی کہ پھر ان کے کفر کی وجہ سے ان پر یہ عذاب نازل کیوں نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اس سہلت کی وجہ سے بے باک ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور چیلنج عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ حالانکہ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرمین کو حد سے گزرنے کی سہلت دیتا ہے، تاکہ وہ سرکشی اور فساد کی آخری حدوں کو چھولیں۔ پھر عذاب آجاتا ہے یا یہ سہلت اس لیے طویں ہو جاتی ہے کہ اللہ کل ایمان کا امتحان لینا چاہتا ہے تاکہ وہ بہت زیادہ ثبات قدم اور پختہ مومن بن جائیں اور

ان کی صفوں سے وہ شخص نکل جائے جو صبر و ثبات نہیں رکھتا۔ یا یہ ملت اس نے بوقت بے ہوشی میں رہا ہے اور اسے معلوم ہے کہ اہل کفر کی صفوں میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو حق کی راہیں تلاش کر کے ہدایت پر آجائیں گے یا ان لوگوں کی لولاد میں سے ایسے لوگ پیدا ہونے والے ہوتے ہیں جو راہ ہدایت پالینے والے ہوں گے۔ وہ اللہ کی پارٹی میں شامل ہوں گے اگرچہ ان کے والدین مشرک ہوں۔ ان کے علاوہ بھی اللہ کی مصطفیتیں ہو سکتی ہیں جو وہ خود چاہتا ہے اور جو ہم سے مستور ہیں۔

ان مشرکین کو ایسا فہم و ادراک حاصل نہ تھا کہ وہ اللہ کی ان حکمتوں اور تدبیروں کو سمجھ سکیں۔ اس لیے وہ علی سبیل اللہ کی طور پر جہنم عذاب کا مطالبہ کرتے تھے لیکن

وَلَوْلَا أَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاءَهُمُ الْعَذَابُ (۵۳:۲۹) ”اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب آچکا ہوتا۔“ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس حکمت کے بیان کے درمیان میں بھی ان کو متنبہ کرتے ہیں کہ جس عذاب کے بارے میں تمہیں جلدی ہے وہ اچانک ہی تم پر آجائے گا لیکن اس وقت تمہیں اس کا انتظار اور توقع نہ ہوگی اور جب یہ اچانک آجائے گا تو یہ لوگ مہوت ہو کر رہ جائیں گے۔

وَلَيَأْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۵۳:۲۹) ”اور یقیناً وہ آکر رہے گا اچانک اس حال میں کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی۔“

پھر بعد میں بدر کے میدان میں ان پر یہ عذاب آیا۔ اللہ کا کمانچ ہو کر رہا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اللہ کا وعدہ کس قدر سچا ہوتا ہے۔ اللہ نے ان پر ایسا جامع اور ہمہ گیر عذاب نازل نہ کیا جس طرح پہلی اقوام پر آیا اور اللہ نے مادی معجزات کے اظہار کا مطالبہ بھی قبول نہ کیا جس طرح پہلی اقوام کو معجزات دکھائے گئے۔ انہوں نے انکار کیا اور ان پر ہمہ گیر عذاب آیا۔ وہ نیست و نابود ہوئے کیونکہ ان میں ایسے لوگ موجود تھے جو علم الہی کے مطابق زمانہ مابعد میں ایمان لانے والے تھے۔ جو اسدی لشکر کے بہترین لوگ بننے والے تھے اور ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا ہونے والے تھے جنہوں نے ازمنہ مابعد میں طویل عرصہ تک اسلام کے ہمنام اٹھائے رکھے۔ یہ سب کچھ اللہ کی تدبیر و تقدیر کے مطابق ہونا تھا اور ہوا۔

يَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ (۵۴:۲۹) ”یہ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ جہنم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے۔“ یہ قرآن کا مخصوص اور عجیب موثر اسلوب کلام ہے کہ وہ مستقبل موعود کو عالم شہود کی شکل دے دیتا ہے۔ ایسی تصور کشی یہاں کر دی گئی ہے کہ گویا جہنم کفار کو گھیرے میں لے چکی ہے جبکہ ابھی وہ مستقبل کے پردوں میں مستور ہے۔ لیکن ان کے کرتوتوں کے اعتبار سے وہ واقعہ ہے جو مشاہدہ میں آچکا ہے اور انسانی احساس کے پردوں پر نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کو ایسا خطرناک چیلنج دینے سے باز رہنا چاہئے۔ کیا وہ لوگ جلدی مچاتے ہیں جن کو جہنم گھیرے میں لے چکی ہے اور کسی بھی وقت گھیرا تلک کر کے وہ ان کو گرفت میں لے سکتی ہے۔

اب وہاں ان کی صورت حالات کیا ہوگی جس کے لیے یہ بہت سی شہابی کر رہے ہیں۔

يَوْمَ يَغْشَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ وَيَقُولُ ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ

تَعْمَلُونَ (۵۵:۲۹) ”اس روز جبکہ عذاب اسیں اوپر سے بھی ڈھانپ لے گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی۔

لورے کا کہ اب چکھو مراں کر توتوں کا جو تم کرتے تھے۔“ یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہو گا۔ نہایت ہی خوفناک حالت میں ان کو یوں طریقہ سرزنش کی جائے گی۔

ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۵۵:۲۹) ”اب چکھو مزا ان کر توتوں کا جو تم کرتے تھے۔“ یہ ہے

انجام اس جلد بازی اور ثبوت کا جو تم کرتے تھے اور ڈالنے والوں کو تم اہمیت نہ دیتے تھے۔

--- () ---

یہاں سیاق کلام مکرین 'لور مکذبین اور حد سے گزرنے والوں کو ایک دردناک عذاب کے منظر میں چھوڑ دیتا ہے۔ یہ عذاب انہیں اوپر نیچے سے گھیرے ہوئے ہے۔ اب روئے سخن نل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے جن پر یہ مکذبین محض عقائد و نظریات کی وجہ سے مظالم ڈھاتے ہیں اور ان کو ان کے رب کی عبادت سے روکتے ہیں 'ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی زمین وسیع ہے اپنے دین 'اپنے عقائد کو لے کر کہیں اور جاؤ۔ یہ نصیحت نہایت ہی پر محبت اور تردنازہ اور نہایت ہی موثر اسلوب میں کی جاتی ہے۔ اس طرح کا یہ نغمہ دل کی تمام تاروں کو پھیڑ دیتا ہے اور ان میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔

يُعْبَادِي الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةً فَإِيَّايَ

فَاعْبُدُونِ ﴿٢٠﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ﴿٢١﴾ وَالَّذِينَ

آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُبَوِّئَنَّهُم مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نِعَمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ

يَتَوَكَّلُونَ ﴿٢٣﴾ وَكَأَيِّن مِّن دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۗ اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ ۗ

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٢٤﴾

”اے میرے بند جو ایمان لائے ہو میری زمین وسیع ہے 'پس تم میری ہی ہندگی بجا لاؤ۔ ہر نفس کو موت کا حزا

چکھنا ہے 'پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹ کر مائے جاؤ گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی 'وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے 'کیا ہی عمدہ اجر

ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔۔۔ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے مہر کیا ہے اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، لہذا ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رزق بھی وہی ہے، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔“

دلوں کے خالق، دلوں کی خفیہ باتوں کے جاننے والے، دلوں میں آنے والے خیالات کے جاننے والے، اور دلوں میں پیدا ہونے والے وساوس، اور دلوں میں چھپے ہوئے خدشات کو جاننے والے اور ان دلوں کے پیدا کرنے والے خالق کائنات یوں پکارتے ہیں ”اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو“ ان الفاظ کے ساتھ پکار کر ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرو، اس خطاب کے ذریعے پہلے ہی مرحلہ پر بتا دیا جاتا ہے کہ اس ہجرت کی حقیقت کیا ہے یہ کہ اللہ اور رب کے لیے اور مولائے کریم کی راہ میں، میں اس کے بندوں کی یہ نقل مکانی ہے۔ یہ تو تھا پہلا لُحْ اور دوسرا احساس ان کو یہ دلایا جاتا ہے۔

اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ (۵۶:۲۹) ”میری زمین وسیع ہے۔“ تم میرے بندے ہو اور یہ میری زمین ہے اور بہت ہی وسیع ہے۔ اس قدر وسیع ہے کہ یہ تمہیں جگہ دے سکتی ہے اس لیے کیوں تم مکہ کی تنگیوں میں ڈٹے ہوئے ہو، جہاں تم پر محض تمہارے دین اور عقائد و نظریات کی وجہ سے مظالم ہو رہے ہیں۔ یہاں تمہیں اس کی اجازت بھی نہیں ہے کہ تم اپنے رب اور مولائے کریم کی بندگی کر سکو۔ ان تنگیوں کو خیر باد کہو اور اللہ کی وسیع دنیا کی طرف نکل جاؤ۔ اپنے دین کو لے کر اس ظلم سے نجات پاؤ تاکہ آزادی سے اپنے رب کی بندگی کر سکو۔ فَاِیَّای فاعْبُدُوْنَ (۵۶:۲۹) ”پس تم میری ہی بندگی بجالاؤ۔“

جب کسی کو ملک چھوڑنے پر آمادہ کیا جاتا ہے تو دل میں پہلا دکھ ملک چھوڑنے کا کر وٹیں لیتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہاں اس قدر میٹھا انداز اختیار کیا، میرے بندو جو ایمان لائے ہو، الایہ کہ میری زمین وسیع ہے۔ مکہ بھی میرا اور مدینہ بھی میرا ہے۔ تمام زمین میری ہے۔ لہذا محبت صرف اسی زمین سے رکھو جس میں تم میری عبادت کر سکو اور جس میں تمہارے لیے وسعت ہو۔ دوسرا خیال ایتہ مواقع پر ہجرت کے عمل کے خطرات اور خدشات کا آتا ہے یعنی یہ کہ اپنے گھروں سے نکلیں گے تو راستوں میں موت ہی نہ آجائے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ کفار نے مسلمانوں کو مکہ میں قید کر رکھا تھا۔ ان کو وہاں سے نکلنے کی اجازت ہی نہ دیتے تھے اس لیے مہاجرین کے لیے ہجرت کی راہ میں لکنا بھی پر خطر تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کے اس خدشے کو بھی دور فرماتے ہیں۔

کُلُّ نَفْسٍ ذَاۤئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَیۡنَا تُرْجَعُوْنَ (۵۷:۲۹) ”ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ پھر تم سب ہماری طرف پلٹ کر لائے جاؤ گے۔“ جہاں تک موت کا تعلق ہے تو وہ ہر جگہ آنے والی ہے، لہذا موت کی پرواہ مت کرو، جبکہ موت کا وقت اور سبب کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ تو ہجرت کرنے والے ہیں اور اگر نہ بھی کریں تو پھر بھی اللہ کی طرف سب کو پلٹایا جاتا ہے اور تم تو اللہ کے غلام ہو، تم کو تو دنیا و آخرت دونوں میں اللہ ہی کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ لہذا اس بارے میں ذرا کیا یا دلوں میں خوف و خطر کو لانے کا کیا مقام ہے۔

پھر اللہ کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ تمہیں دنیا میں زمین کی دستگیر - کا اور تم محفوظ ہو گئے بلکہ قیامت میں تمہارے لیے جو آرام گاہ تیار ہے وہ تو بہت ہی عظیم ہے۔ اب تم وطن چھوڑ رہے ہو تو دنیا میں بھی وسعت ملے گی اور گھر تم چھوڑ رہے ہو تو جنت میں تمہارے لیے محلات تیار ہیں اور وہ محلات تمہارے ان چھوٹے چھوٹے گھر وندوں سے بہت ہی بڑے اور عظیم ہیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

النَّهْرُ خَالِدِينَ فِيهَا (۵۸:۲۹) ”جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“ اور وہاں ان کو خوش آمدید ان الفاظ میں کہا جائے گا اور ان کی جدوجہد کا تذکرہ ہو گا۔

نَعْمَ أَجْرُ الْعَمَلِينَ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (۵۹:۲۹) ”کیا ہی عمدہ

اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے“ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔“ چنانچہ یوں اہل ایمان کو ہجرت پر آمادہ کیا جاتا ہے، ان کے ساتھ وعدے کیے جا رہے ہیں اور اس پریشانی، خدشات اور خوف کے ماحول سے ان کو ثابت قدمی اور جرات مندی اور حوصلہ سکھایا جا رہا ہے۔

تدریجی طور پر ہجرت کے وقت یہ فکر بھی لاحق ہو جاتی ہے کہ انسان کے ساتھ پیٹ تو لگا ہوا ہے۔ آخر صبح و شام کی ضروریات کا بندوبست کیا ہو گا۔ وطن چھوڑ دیں گے، مال چھوڑ دیں گے، روزگار ترک کر کے چلے جائیں گے۔ یہاں تو مکہ میں بہر حال ضروریات زندگی کی فراہمی کا بندوبست تو یقینی ہے۔ ہر شخص روزگار پر لگا ہے۔ چنانچہ ان خدشات کا جواب بھی دے دیا جاتا ہے۔

وَكَايْنٍ مِّنْ دَابَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ (۶۰:۲۹) ”اور کتنے ہی

جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رزق بھی وہی ہے۔“ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو انسان کی نگاہیں کھول دیتا ہے، اور یہ واقعی صورت حالات ہم رات اور دن اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ایسے جانور ہیں جو نہ رزق اٹھائے پھرتے ہیں، نہ جمع کرتے ہیں، نہ اس کا کوئی اہتمام کرتے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اس رزق کو پیدا کرنے کی کیا تدبیر کریں گے۔ نہ ذخیرہ کرنا انہیں آتا ہے۔ اس کے باوجود اللہ سب کو رزق دیتا ہے۔ کوئی جانور کبھی بھوک سے نہیں مرا۔ اسی طرح اللہ لوگوں کو بھی رزق دیتا ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کو یہ زعم لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ خود اپنے لیے رزق پیدا کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ وسائل رزق اللہ ہی فراہم کرتا ہے اور یہ وسائل ہی دراصل رزق ہیں۔ اگر اللہ کے یہ پیدا کردہ وسائل نہ ہوں تو انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ لہذا ہجرت کی وجہ سے تم بھوک سے نہ مرو گے۔ اس کی فکر نہ کرو، تم اللہ کے ہندے ہو اور اللہ اپنے بندوں کا بندوبست کرتا ہے جہاں بھی وہ ہوں جس طرح اللہ اپنی دوسری مخلوق کا بندوبست کرتا ہے اور کسی کو بھی بھوکا مرنے نہیں دیتا۔

یہ محبت آمیز نغمے اس شعور پر آکر ختم ہوتے ہیں کہ اللہ لیل ایمان کے ساتھ ہے۔ وہ ہر وقت ان پر نظر کرم رکھتا ہے۔ وہ ان کی سب باتیں سنتا ہے۔ ان کے حالات کو جانتا ہے اور کبھی بھی ان کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۲۹: ۶۰) ”وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔“ یہ دور یہاں آکر ختم ہوتا ہے۔ اس حال میں اللہ نے مہاجرین کے دلوں میں پائے جانے والے تمام خدشات دور کر دیئے اور اللہ کی راہ میں نکلنے وقت دل میں کھٹکنے والے تمام خدشات دور کر دیئے اور مل ایمان کے دلوں میں جو جو خدشات اور اندیشے پائے جاتے تھے لب ان کی جگہ اطمینان نے لے لی ہے۔ تلقین و پریشانیوں کی جگہ لب وہ مطمئن ہیں اور اب اہل ایمان کے دل اس قدر سکون اور ٹھنڈاؤ اور ثبات پا چکے ہیں کہ وہ اللہ کا قرب، اللہ کی نگرانی اور اللہ کی پناہ میں اپنے آپ کو اب محفوظ تصور کرتے ہیں۔ کون ہے جو انسان کے خدشات کو اس انداز میں محسوس کر سکتا ہے اور ان کو اس طرح دور کر سکتا ہے ماحول خالق کائنات کے۔ جو ان تمام باتوں سے واقف ہوتا ہے جو دلوں میں گزرتی ہیں۔

مومنین کے ساتھ اس مختصر مکالمہ کے بعد روئے سخن پھر مشرکین کے باہم متضاد افکار کی طرف پھر جاتا ہے۔ ان کے تصورات اس قدر غیر معقول ہیں کہ وہ ایک طرف تو یہ اقرار کرتے ہیں کہ صرف اللہ ہی ہے جو زمینوں اور آسمانوں کا خالق ہے۔ وہی ہے جس نے شمس و قمر کو مسخر کر رکھا ہے۔ وہی ہے جو آسمانوں سے بارشیں برساتا ہے اور زمین کو مردہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کرتا ہے اور یہ کہ وہی ہے جو رزق کو کھلا بھی کرتا ہے اور تنگ بھی کرتا ہے۔ جب یہ لوگ انتہائی خوف کی حالت میں ہوتے ہیں تو صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔ لیکن ان باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد یہ لوگ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ جو لوگ صرف اللہ وحدہ کو پکارتے ہیں اور اس کی بندگی کرتے ہیں، یہ ان کو اذیت دیتے ہیں حالانکہ اللہ کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں اور بلاوجہ یہ لوگ ایسے لوگوں پر مظالم ڈھاتے ہیں۔ اللہ نے ان پر جو احسانات کیے، ان کو یہ لوگ بھلاتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو بیت اللہ میں خوفزدہ کرتے ہیں۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَ سَخَّرَ

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّى يُؤْفَكُونَ ﴿۷۱﴾ اللَّهُ يَبْسُطُ

الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ

عَلِيمٌ ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ

بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۖ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۷۳﴾ وَمَا

هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهُوٌّ وَلَعِبٌ ۖ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانِ ۚ

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۷۴﴾ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ

فَلَمَّا نَجَّيْنَاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿۶۵﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ وَلِيَسْتَحْسِنَ
 فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۶۶﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا مِمَّا دِيْنَتُنَا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ
 حَوْلِهِمْ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ﴿۶۷﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن
 افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ﴿۶۸﴾

”اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ ہے۔ پھر یہ کہ حضرت دھوکا کھا رہے ہیں؟ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا جائز والا ہے اور اگر تم ان سے پوچھو کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے دریا بہہ رہے ہیں؟ زمین کو جلا اٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔ کو، الحمد للہ“ مگر ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔

اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک تھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا گھر تو دارِ آخرت ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔ جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں، پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں تاکہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کا کفران نعمت کریں۔ اور (حیات دنیا کے) مزے موٹیں۔ اچھا، مغرب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پر امن حرم بنا دیا ہے حالانکہ ان کے گرد و پیش لوگ ایک لیے جاتے ہیں؟ کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو ملتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا کفران کرتے ہیں؟ اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جب کہ وہ اس کے سامنے آ چکا ہو؟ کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنم ہی نہیں ہے؟“

ان آیات میں نزولِ اسام سے قبل عرب عقائد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے اصل عقائد توحید پر مبنی تھے۔ بعد کے ادوار میں ان کے عقائد اور نظریات کے اندر انحراف پیدا ہو گیا۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے کیونکہ یہ اولادِ اسماعیل تھے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم کے دین پر ہیں اس لیے وہ اپنے عقائد کو حضرت اسماعیل و ابراہیم علیہم السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ یہ لوگ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے دین کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ یہ دین جزیرۃ العرب کے آس پاس موجود تھے کیونکہ یہ لوگ دینِ ابراہیم کو برتر سمجھتے ہوئے اس پر فخر کرتے تھے۔ لیکن وہ اس بات کو سمجھ نہ سکتے تھے کہ ان کے عقائد کے اندر اصل دین کے مقابلے میں کس قدر انحراف آ گیا ہے اور عملاً وہ مشرک ہو گئے ہیں۔

جب ان سے پوچھا جاتا کہ آسمانوں اور زمینوں کا خالق کون ہے؟ اور شمس و قمر کو کس نے مسخر کیا ہے؟ آسمانوں سے پانی کون برساتا ہے؟ مردنی کے بعد زمین میں روئیدگی کون لاتا ہے؟ تو یہ لوگ صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ یہ سب کام اللہ ہی کرنے والا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بتوں کو بھی پوجتے ہیں۔ جنوں کی عبادت بھی کرتے ہیں، ملائکہ کی پرستش بھی کرتے ہیں اور ان سب کو عبادت میں اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ جبکہ تخلیق میں ان کو اللہ کے ساتھ

شریک نہیں کرتے۔ یہ عجیب تناقض تھا۔ اس تضاد کی وجہ سے ان آیات میں اللہ ان کے اس طرز فکر پر تعجب کا اظہار فرماتے ہیں :

فَإِنِّي يُوفِّكُون (۶۱:۲۹) ”پھر یہ کدھر سے دھوکہ کھا رہے ہو“۔ یعنی کس طرح تم حق سے پھر کر ان مغلوبہ عقائد میں پھنس گئے ہو۔

بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۶۳:۲۹) ”ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں“۔ کیونکہ جس کی عقل سلیم ہو وہ ایسے عقائد اختیار نہیں کرتا۔

خالق سموات و ارض کے بارے میں سوال، شمس و قمر کے سفر کرنے والے کے بارے میں دریافت اور آسمانوں سے پانی نازل کرنے والے کے بارے میں سوال اور مردہ زمین کو سرسبز کرنے والے کے بارے میں سوال کے درمیان یہ بھی قرار دیا جاتا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو کسی کار رزق تک کر دیتا ہے اور کسی کا کشادہ کر دیتا ہے۔ یوں تمام آثار قدرت کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ رازق بھی وہی ہے اور اللہ تمام مخلوقات کو جانتا ہے۔ اور سب کو رزق پہنچاتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۶۲:۲۹) ”یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے“۔ آسمانوں کی گردش کے ساتھ رزق واضح طور پر مربوط ہے۔ پانی، زندگی اور روئیدگی بھی گردش افلاک سے مربوط ہے۔ اسی طرح رزق کی کشادگی اور غل بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ تمام مظاہر ان آیات میں واضح طور پر دکھائے گئے ہیں۔ رزق پانی سے وجود میں آتا ہے۔ نہریں اور دریا بارش سے بہتے ہیں اور ان کی وجہ سے حیات و نبات قائم ہیں۔ یہ پانی زمین کے اندر بھی ذخیرہ ہوتا ہے اور اوپر بھی بہتا ہے اور اس کی وجہ سے خورد و کھار پیدا ہوتا ہے۔ غرض تمام ارضاق پانیوں سے وابستہ ہیں۔ اس کائنات کے نوامیس فطرت کے مطابق پانی پیدا ہوتے ہیں اور شمس و قمر کے سب مظاہر شمس و قمر کی تسخیر کے نتیجے میں، اور اگر یہ نوامیس فطرت ذرہ بھر بدل جائیں تو سطح زمین کا یہ منظر ہی یکفخت بدل جائے۔ پھر زمین کے اندر کے تمام ذخائر اور قدرتی وسائل بھی اللہ کے جاری کردہ نوامیس زمان و مکان کے مطابق ہیں۔ زمین کی یہ تمام بوقلمونیاں شمس و قمر کی گردش کے نتیجے میں ہیں (فی ظلال پارہ ۱۹ میں ہم نے تفصیلات دی ہیں)۔

قرآن کریم اس عظیم کائنات اور اس کے مشاہد و مناظر کو بطور محبت اور برہان پیش کرتا ہے۔ جو سچائی قرآن لے کر آیا ہے اس کا نکتہ سیر یہ عظیم کائنات ہے۔ ایک متفکر اور سوچ رکھنے والا دل اس عظیم کائنات پر ضرور غور کرتا ہے۔ وہ اس کائنات کے عجائبات کو دیکھ کر زندہ و بیدار رہتا ہے، دست قدرت کی صنعت کاریوں کو سمجھتا ہے۔ اس وسیع کائنات کے لیے جو نہایت ہی اہل ناموس قدرت وضع کیا گیا ہے وہ اس کا شعور رکھتا ہے۔ وہ نہایت ہی ٹھنڈے دل اور نہایت ہی سنجیدگی سے اور نہایت ہی سہولت سے اس شعور کو پالیتا ہے۔ اسے بہت گہرے غور و فکر کی ضرورت بھی نہیں پڑتی اور جب بھی یہ زندہ اور بیدار دل اس کائنات کی عظیم آیات میں سے کوئی نشانی پالیتا ہے تو وہ اللہ کی حمد و ثناء میں رطب الانسان ہو جاتا ہے۔

قُلْ الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۶۳:۲۹) ”کہو الحمد للہ مگر ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔“

زمین کے اوپر آثار حیات اور رزق کی شگلی اور کشادگی کے حوالے سے انسانوں کے سامنے اقدار حیات کا حساس ترازو رکھ دیا جاتا ہے کہ دیکھو دنیا کی یہ زندگی اپنی تمام بوقلمونیوں اور لہو لعب کے باوجود ایک تحصیل تماشا ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۶۴:۲۹) ”اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا مگر تو دار آخرت ہے کاش یہ لوگ جانتے۔ یہ زندگی عمومی لحاظ سے تو ایک کھیل تماشا ہی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب یہ اس طرح گزر رہی ہو کہ آخرت کی کوئی فکر نہ ہو اور یہی دنیا لوگوں کا مقصد اعلیٰ ہو اور اس دنیا کا ساز و سامان ہی غایت زندگی ہو۔ رہی آخرت کی زندگی تو وہ حقیقی زندگی ہے اور اس میں نہایت ہی اعلیٰ معیار ہو گا۔ وہی حقیقی زندگی ہے۔ وہ بھرپور ہے اور اس میں حقیقی حیات اور نشاط ہے۔“

یہ کہہ کر قرآن یہ تعلیم بھی نہیں دیتا کہ دنیا کو ترک کر دیا جائے یا اس کے متاع کو دور پھینک دیا جائے یا زندگی کی سرگرمیوں سے فرار اختیار کر کے رہبانیت اختیار کی جائے۔ یہ نہ اسلام کی روح ہے اور نہ اسلام زندگی کا یہ رخ اختیار کرتا ہے بلکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اصل ہدف آخرت ہو اور حدود اللہ کا لحاظ رکھا جائے۔ اس زندگی پر سربلندی حاصل کر کے اسے اپنے قبضہ قدرت میں رکھا جائے اور انسان اس دنیا کے متاع کا اسیر نہ بن جائے۔ انسان زندگی کے فرائض پورے کرے اور اس سے فرار اختیار نہ کرے۔ غرض حاصل مسئلہ صحیح سوچ اور صحیح قدر کا ہے۔ انسان کو اس دنیا کی بھی صحیح قدر و قیمت معلوم ہونا چاہئے اور آخرت کی بھی صحیح قدر و قیمت معلوم ہونی چاہئے۔ مومنین کو ان اقدار کا صحیح شعور ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جب ایک باشعور مومن دنیا سے معاملہ کرے گا تو اس کا نقطہ نظر معتدل ہو گا کہ دنیا تو کھیل تماشا ہے مختصر وقت کے لیے ہے اور آخرت اس طرح سنجیدگی کے لائق ہے جس طرح کھیل تماشے اور میلے ٹھیلے کے بعد انسان سنجیدگی سے اس دنیا کے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ فکر و فکر کی اس درنگی کے بعد اب جایا جاتا ہے کہ کفار کے فکر و نظر میں کیا تضادات ہیں۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلِكِ دَعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ

يُشْرِكُونَ (۶۶:۲۹) ”جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں۔ پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے جاتا ہے تو یہ ایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں۔“ یہ بھی ان کے عقائد کا بہت بڑا تضاد ہے۔ ان کے عقائد اس قدر ڈانواں ڈول ہوتے ہیں کہ جب کشتی پر وہ گہرے سمندر میں ہوتے ہیں اور یہ جہاز بحری امواج کے غلاطم میں ایک کھلونا بن جاتا ہے اور ان پر خوف طاری ہوتا ہے تو وہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں

پکارتے۔ اس وقت ان کو یہ اور اک ہوتا ہے کہ اصل قوت تو صرف اللہ ہی کی قوت ہے۔ پھر ان کی سوچ میں بھی اللہ وحدہ ہوتا ہے اور اس کی ربان پر بھی اللہ وحدہ کا نام ہوتا ہے۔ اب وہ اپنی اس فطرت کے تابع ہوتے ہیں جو وحدانیت کا شعور رکھتی ہے۔ لیکن جب اللہ ان کو بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو یہ لوگ اچانک پھر شرک کرنے لگتے ہیں اور وہ فطری شعور پھر دب جاتا ہے۔ اب اچانک وہ اس حالت کو بھوس جاتے ہیں جس میں وہ اللہ وحدہ کو پکارتے تھے اور اقرار اور تسلیم کے بعد دوبارہ یہ لوگ شرک کی راہ پر پڑ جاتے ہیں۔

اس بے راہ روی اور گمراہی کا انجام کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ یہ لوگ ان نعمات کی ناشکری اور کفر کرتے ہیں جو اللہ نے ان کو دیئے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس فطری راہ سے منحرف ہو جاتے ہیں جو اللہ نے ان کی شخصیت کے اندر ودیعت کر دی ہوئی ہے۔ ان فطری براہین کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن کو وہ محسوس کرتے ہیں اور وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ حیات دنیا تو ایک محدود وقت تک کے لیے ایک ساز و سامان ہے لیکن ان کو بہت جلد اپنے حقیقی انجام کا پتہ چل جائے گا۔ وہ بہت ہی برا انجام ہو گا۔

لَيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ وَلَيَمَتَعُوا فَسَوْفَ يَعلَمُونَ (۶۶:۲۹) ”تا کہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کا کفران نعمت کریں اور حیات دنیا کے مزے لوٹیں۔ اچھا عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔“ یہ نہایت ہی شدید ڈر اوا ہے یعنی نامعلوم مصیبت کا۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا؟

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو بتاتے ہیں کہ دیکھو اللہ نے تم کو یہ ”حرم امن“ دیا ہے جس کے اندر تم نہایت ہی امن و سکون سے زندگی بسر کرتے ہو۔ کیا اللہ کی اس عظیم نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے۔ یوں کہ صرف اللہ کی بندگی کریں اور اسی کو پکاریں بلکہ اس کے برعکس اس حرم امن میں اہل ایمان کو تم ڈر لاتے اور پریشان کرتے ہیں۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ

وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ (۶۷:۲۹) ”کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پر امن حرم بنایا ہے حالانکہ ان کے گرد و پیش لوگ ایک ایک لیے جاتے ہیں۔ پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کا کفران کرتے ہیں۔“

اہل مکہ کی حالت یہ تھی کہ وہ حرم مکی کی وجہ سے نہایت ہی امن و سکون سے زندگی بسر کرتے تھے۔ لوگ بیت اللہ کی وجہ سے ان کی تعظیم کرتے تھے۔ ان کے ارد گرد جو عرب قبائل تھے وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کا خوف ہوتا تھا۔ ان کو اگر امان نصیب ہوتا تھا تو بیت اللہ کے سائے میں ہوتا تھا۔ اور یہ امان اللہ نے دیا تھا لیکن یہ بہت بڑی ناشکری کی بات تھی کہ یہ لوگ بیت اللہ کو بتوں کا اڈہ بنا دیں اور بیت اللہ میں غیر اللہ کی بندگی ہوتی رہے۔

أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ (۶۷:۲۹) ”کیا پھر بھی یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔“

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ أَلَيْسَ فِي

جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ (۶۸:۲۹) ”اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جبکہ وہ اس کے سامنے آچکا ہو، کیا ایسے کافروں کا ٹھکانہ جہنم نہیں...؟“ اور اٹل مکہ اس جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ انہوں نے اللہ پر افتراء باندھا ہے کہ اللہ نے خود اپنے ساتھ شریک مقرر کئے ہیں اور ان کے پاس حق آگیا اور انہوں نے ٹکڑی بکری کر دی ہے۔ آخر جہنم کے ٹھکانے کے سوالیے لوگ اور کس مقام کے مستحق ہیں۔ اور ان کے پاس حق آگیا اور انہوں نے ٹکڑی بکری کر دی ہے۔ آخر جہنم کے ٹھکانے کے سوالیے لوگ اور کس مقام کے مستحق ہیں۔ یقیناً ایسے لوگ جہنم کے مستحق ہیں۔

سورہ کا خاتمہ کفار کے فریق مقابل کی تصویر کشی پر ہوتا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی راہوں میں جدوجہد کی تاکہ وہ اللہ تک پہنچ جائیں۔ ان کا رابطہ اللہ سے ہو جائے۔ جنہوں نے اللہ کی راہ میں ناقابل برداشت مصائب جھیلنے کے باوجود نہ اپنا عہد توڑا اور نہ مایوس ہوئے۔ جنہوں نے نفس کی خواہشات پر قابو پایا اور لوگوں کے تشدد کو بھی برداشت کیا۔ جنہوں نے اپنے بوجھ اپنائے اور ان بھارتی بوجھوں کے ساتھ اس طویل سفر پر چل پڑے، جو طویل بھی تھا اور پر مشقت بھی۔ ایسے لوگوں کو اللہ اس سفر میں تنہا نہیں چھوڑتا اور نہ ان کے ایمان کو ضائع کرتا ہے اور نہ ان کی اس جدوجہد کو بھولتا ہے۔ اللہ اپنے عرش برسی سے ان کو دیکھ رہا ہے اور ان سے بہت ہی راضی ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے اور قدم قدم پر ان کی راہنمائی کرتا ہے۔ وہ ان کی کوششوں کو دیکھے گا اور ان کے ہاتھ پکڑ کر ان کو صحیح راہ پر ڈال دے گا۔ ان کے صبر اور ان کی پاکیزگی کو دیکھا جا رہا ہے وہ بہت ہی اچھی جزاء دینے والا ہے۔

۷

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٦٩﴾

۳

”جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کیں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے“ اور یقیناً اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے۔“

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۱

سورۃ روم - ۳۰

آیات ۱ --- تا --- ۶۰

سورۃ روم ایک نظر میں

اس سورہ کی ابتدائی آیات ایک مخصوص تاریخی واقعہ کے حوالے سے نازل ہوئیں، جب اہل فارس نے اہل روم پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ کیونکہ فارس والے جزیرۃ العرب کو لپیٹے ماتحت رکھنا چاہتے تھے۔ یہ اس دور کا واقعہ ہے جب مکہ میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان نظریاتی جنگ جاری تھی۔ مسلمان مکہ میں تھے۔ ابھی ہجرت نہیں ہوئی تھی۔ اس دور میں رومی چونکہ اہل کتاب یعنی نصاریٰ تھے اور اہل فارس مجوسی یعنی مشرک تھے۔ اس لیے اس غلبے پر اہل مکہ خوش تھے کہ ایک مشرک ملت کے لوگ ایک کتابی ملت پر غلبہ آگئے۔ انہوں نے مکہ میں شرک اور توحید کی کشمکش میں اس واقعہ کو اپنے لیے نیک فال تصور کیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں پیش گوئی کی گئی کہ چند سالوں کے اندر اندر اہل کتاب رومی، مشرک فارسیوں پر غلبہ پالیں گے اور اس وقت اہل ایمان خوش ہوں گے کیونکہ اہل ایمان دوسری سطوں کے اہل توحید کے بھی حامی تھے۔ لیکن قرآن کریم نے بس صرف یہی جانے پر اکتفاء نہیں کیا کہ اس واقعہ میں مشرکین مکہ کی پسندیدہ قوت کو جلد ہی شکست ہوگی بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کو اس مخصوص واقعہ اور اس کے ماحول سے ذرا آگے ایک وسیع دنیا میں لے جاتا ہے کیونکہ یہ واقعہ تو ایک جزئی اور وقتی واقعہ تھا۔ قرآن کریم مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ وہ جس حق اور جس سچائی کے حامل ہیں وہ دراصل اس عظیم سچائی اور حق کا ایک حصہ ہے جس کے اوپر زمین و آسمان اور اس پوری کائنات کا نظام قائم ہے اور ان دونوں سچائیوں کے درمیان گہرا ربط ہے۔ اس طرح انسانوں کا ماضی، ان کا حال اور ان کا مستقبل باہم مربوط ہیں۔ پھر اسی طرح یہ بات اس کائنات سے بھی آگے بڑھ کر عالم آخرت میں داخل ہوتی ہے اور اس حیات دنیا کے بعد بات اخروی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس زمین کی محدود زندگی سے انسانوں کو آخرت کی وسعتوں میں لے جایا جاتا ہے۔ پھر اس پوری کائنات کی سیر کر لئی جاتی ہے، پھر انسانی نفس کی گہرائیوں میں، انسان کے شب و روز میں انسانی فطرت کے عجائبات بتائے جاتے ہیں۔ یوں انسان اس محدود واقعہ کے حوالے سے اس عظیم کائنات کی وسعتوں میں چلا جاتا ہے اور علم و معرفت کے بے قید اصول معلوم کر کے اس کی زندگی لا محدود ہو جاتی ہے۔ اس کا نصب العین بلند منزل بہت اعلیٰ و ارفع ہو جاتی ہے، اور وہ زمان و مکان کی شکلیں سے نکل کر اللہ کی اس کائنات کی وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کا ماضی، اس کا حال اور اس کا مستقبل سب کے سب اللہ کے وسیع اور لازوال قانون قدرت اور سنن فطرت میں گم ہو جاتے ہیں۔ لہذا ایک مومن انسان کے ہاں اس دنیا کے تعلقات و روابط، اس عظیم کائنات کے حوالے سے، بہت ہی وسیع اور ارفع ہو جاتے ہیں اس لیے کہ اس کے ذہن میں وہ قوانین بہت ہی عظیم ہوتے ہیں جو اس عظیم کائنات کو چلاتے ہیں، وہ اصول بہت ہی حکیمانہ ہوتے ہیں جو فطرت انسانی میں ودیعت کر دیئے گئے ہیں۔ انسانی زندگی اس کے مختلف حوادث اور اس میں فتح و شکست اور وہ پیانے جن کے مطابق انسانی اعمال کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے اور جن اصولوں کے

مطابق انسان اس زمین پر کام کرتا ہے اور جن کے مطابق اسے آخرت میں جزاء و سزا ملے گی، یہ سب بیانے اور اصول اعلیٰ اور بامقصد ہو جاتے ہیں۔ اس سے اس پوری زندگی کے بارے میں انسان کا تصور بلند ہو جاتا ہے۔

اس ہمہ گیر اور بلند تصور کے نقطہ نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے جو دعوت دی ہے وہ عالمی اور ابدی دعوت ہے اور اس کا تعلق اس جہاں اور اس کے پورے ماحول سے ہے۔ اگرچہ یہ دعوت مکہ کے بلند پہاڑوں کے درمیان سے اٹھ رہی ہے لیکن یہ وہاں تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اس کائنات کی فطرت سے مربوط ہے۔ اس کائنات کے قوانین سے ہم آہنگ ہے۔ نفس انسانی اور اس کے حالات کے صحن مطابق ہے۔ انسان کے ماضی، حال اور مستقبل کا اس میں عاظر رکھا گیا ہے۔ نہ صرف اس زمین پر بلکہ عالم آخرت کے ساتھ بھی اس دعوت کا گہرا تعلق ہے۔

یہ دعوت قلب مومن کو ان وسعتوں سے باندھ دیتی ہے۔ ایک مسلم کا تصور اور اس کا شعور اور اس کی اقدار حیات وسیع اور رفیع ہو جاتی ہیں۔ انسان کی نظریں عالم بالا پر، آسمان پر اور آخرت پر ہوتی ہیں۔ عالم بالا اور عالم مساوات کے اسرار و رموز پر وہ غور کرتا ہے۔ اس کی تخلیق، اس کے انقلابات پر اس کی نظر رہتی ہے اور یہ مخصوص واقعہ کو نہیں بلکہ اس کائنات کے تمام حادثات کو وہ اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس عظیم کائنات بلکہ کائناتوں کے ایک سمندر میں اس کا موقف ایک عظیم است کا موقف ہوتا ہے۔ وہ اپنی قدر و قیمت جانتا ہے، وہ اپنے اس عظیم تصور کی اہمیت سے واقف ہوتا ہے، اللہ کے حوالے سے بھی اور دوسرے انسانوں کے حوالے سے بھی، یوں ایک مومن عظیم انسان ہوتا ہے اور اس کا کردار بھی عظیم ہوتا ہے۔ وہ بھی وجہ البصیرت اپنے اس کردار کو ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے فرائض ادا کرتا ہے نہایت اطمینان، نہایت وثوق اور نہایت اہتمام کے ساتھ۔

ان روابط پر غور کرنے، اس کائنات میں ان کے مفہوم و مدلول کو سمجھنے اور پھر انسانی دلوں میں ان کا تصور بٹھانے کے لیے یہ سورہ دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

پہلے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ مومنین کی کامیابی اسی طرح برحق ہے جس طرح یہ کائنات ایک برحق نظام پر قائم ہے اور اہل ایمان کی اس کامیابی کے ساتھ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کا تعلق ہے۔ انسانی تاریخ میں اللہ کی جو سنت کارفرما رہی ہے وہ بھی اس پر شاہد عادل ہے۔ کائنات کا یہ نظام شاہد ہے کہ اللہ دوبارہ تمام انسانوں کو اٹھائے گا اور حساب و کتاب ہے گا۔ اس لیے پہلے حصے میں قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر بھی یہاں پیش کیا جاتا ہے اور اس میں مومنین اور کافرین کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا، وہ دکھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر اس کائنات پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے اندر اللہ کی کیا نشانیاں پوشیدہ ہیں اور انسان کے دل و دماغ پر وہ نشانیاں کیا اثرات چھوڑتی ہیں۔ پھر خود انسان اور اس کے مملوک غلاموں کی مثال دے کر دکھایا جاتا ہے کہ عقیدہ شرک کس قدر غیر معقول عقیدہ ہے اور یہ کہ یہ نظریہ محض خواہشات نفسانیہ پر مبنی ہے، کسی سچائی اور کسی دلیل کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ آخر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ اس سیدھے راستے پر ثابت قدمی کے ساتھ گامزن رہیں، یہ واضح راستہ ہے، فطری راستہ ہے جس کے اندر کوئی ٹیڑھ اور کوئی تغیر نہیں ہے اور یہ راستہ انسانوں کو متحد کرتا ہے، ان کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرتا جس طرح لیل شرک نے انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے طبقات میں تقسیم کر دیا ہے۔

دوسرے حصے میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کے اندر کس قدر تکون حراچی ہے۔ اس تکون حراچی کے اوپر زندگی کی

عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی۔ زندگی کا نظام تو ناقابلِ تغیر و تبدل اصولوں پر ہی قائم ہو سکتا ہے جن کو کچھ مخصوص لوگوں کی خواہشات کے مطابق بدلنا نہ جاسکے۔ ان کے سامنے خود انسانوں کے وہ حالات رکھے جاتے ہیں جن میں وہ امن و عافیت میں ہوں یا مصیبت اور مشکلات میں ہوں، خوشحال ہوں یا بد حال ہوں۔ اس مناسبت سے پھر اس رزق کو خرچ کرنے اور اس کو ترقی دینے کا مضمون اور پھر رزق الہی کے حوالے سے شرک اور شرکاء کا تذکرہ کہ یہ ٹھہرائے ہوئے خود ساختہ شرکاء نہ تو رزق دے سکتے ہیں نہ زندگی عطا کر سکتے ہیں، نہ مار سکتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر فساد لوگوں کے اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جنایا جاتا ہے کہ زمین میں سیر کرو، اور اس کے جنفرانی مطالعہ کے ساتھ تاریخی مطالعہ کرو اور دیکھو کہ بشرکین کا انجام ہمیشہ کیا ہوتا رہا ہے۔ حضور اکرم کو حکم دیا جاتا ہے کہ دین فطرت پر سیدھے جے رہو یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس میں ہر شخص کے سامنے اس کی کمائی رکھ دی جائے گی۔ اس دوسرے حصے میں بھی مشاہد کائنات پیش کیے جاتے ہیں جس طرح پہلے حصے میں اس کائنات سے نشانیاں پیش کی گئی تھیں۔ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کے طریقے پر چلو۔ رسول کا فریضہ تو صرف ابلاغ ہے۔ رسول تو نہ اندھوں کو ہدایت کر سکتا اور نہ بہروں کو سنا سکتا ہے۔ اس کے بعد خود انسان کے انفس کی سیر کر لئی جاتی ہے اور اس کی پیدائش سے انتہا تک اسے اس کے اطوار حیات دکھائے جاتے ہیں کہ کس طرح انسان کو پیدا کیا گیا اور طفویت کا دور کیسے گزرا۔ پھر موت آئے گی اور دوبارہ بعث بعد الموت ہوگی۔ یہ دوسرا حصہ بھی ختم ہوتا ہے اور رسول اللہ کو ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ دعوت دیں۔ ممبرکس اور لوگ جو تکالیف دیتے ہیں ان کو برداشت کریں۔ اللہ نے جو وعدہ کیا ہے وہ آنے والا ہے لہذا آپ ان لوگوں کے طرز عمل سے پریشان نہ ہوں جو ایمان نہیں لاتے۔

سورہ کی فضا اور اس کا انداز بیان سورہ کے مرکزی مضمون اور محور کی تصویر کشی میں باہم معاون ہیں۔ محور یہ ہے کہ لوگوں کے حالات، زندگی کے واقعات، ان کی تاریخ اور ماضی اور حال کے درمیان گہرا رابطہ ہوتا ہے۔ یہ سب امور پھر ان سنن الہیہ کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں جو اس کائنات میں جاری و ساری ہیں۔ لہذا انسان کی ہر حرکت اور اس کا سکون، انسان کو پیش آنے والا ہر حادثہ اور اس کا ہر حال، انسان کی ہر سرگرمی اور اس کا ہر انجام، اس دنیا میں اس کی فتوحات اور ناکامیاں سب کی سب انسان کے ان روابط اور تعلقات کی روشنی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور ان کا سنن کو نبیہ کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے اور اصل بات یہ ہوتی ہے کہ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ بَعْدُ (۴:۳۰) ”تمام امور اللہ کے لیے ہیں، پہلے بھی اور بعد میں بھی“۔ اور یہ وہ اساسی حقیقت جس کی توثیق و تاکید پورا قرآن کرتا ہے اور یہ بات اسلامی نظریہ حیات کی اساسی حقیقت ہے۔ اسی اسلامی تصور حیات سے، اقدار، شعور اور اقدار دیکھنے پھوٹتے ہیں اور اس کے سوا کوئی تھمریاتیات اور کوئی قدر درست نہیں ہو سکتی، نہ اسلام اس کو حلیم کرتا ہے۔

اس کے بعد وہ بھی تاریخی پیش گوئی آتی ہے جس میں یہ کہا گیا کہ رومی چند سالوں میں پھر غالب آجائیں گے۔ ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ ایرانی رومیوں پر غالب تھے اور مشرکین عرب چاہتے تھے کہ ایرانی رومیوں پر غالب رہیں اور مسلمانوں کی خواہش نہ تھی کہ ایرانی رومیوں پر غالب آجائیں۔ اس لیے کہ رومی لٹل کتاب تھے اور وہ مسلمانوں کے ذہن کے قریب تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی :

الْم (۳۰: ۱) غُلِبَتِ الرُّومُ (۳۰: ۲) فِيْ اَدْنٰى الْاَرْضِ وَهُمْ مِنْۢ بَعْدِ غَلِبِهِمْ

سَيَغْلِبُوْنَ (۳۰: ۳) فِيْ بَضْعِ سِنِيْنَ --- (۳۰: ۴) ”اہل۔م۔ رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔“ تو مشرکین مکہ نے کہ ابوبکر! تمہارے دوست کہتے ہیں کہ رومی چند سالوں میں غالب آجائیں گے۔ تو حضرت ابوبکر نے فرمایا ہاں وہ سچ کہتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا شرط لگاتے ہو تو انہوں نے سات سالوں کی میعاد پر چار اونٹنیوں کی شرط لگائی۔ یہ سات سال گزر گئے اور کچھ نہ ہوا۔ مشرکین اس پر بہت ہی خوش ہوئے۔ یہ بات مسلمانوں پر ناگوار گزری۔ انہوں نے حضورؐ کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا تمہاری زبان میں بضع سنین کا مفہوم کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا دس سے کم۔ تو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ جائیں اور میعاد میں دو سال کا اضافہ کر دیں۔ کہتے ہیں دو سال ابھی نہ گزرے تھے کہ سواروں نے آکر اطلاع دی کہ رومی فارس پر غالب آ گئے ہیں۔ اس پر مسلمانوں کو بہت خوشی ہوئی۔

اس بارے میں بہت سی روایات وارد ہیں۔ ان میں سے ہم نے امام ابن جریر کی روایت اختیار کی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس واقعہ سے آگے بڑھیں اس واقعہ میں جو ہدایات ہیں ان پر غور ضروری ہے۔

اس واقعہ میں ہمارے لیے پہلی نصیحت یہ ہے کہ شرک اور کفر ہر زمان و مکان میں ایک ملت ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ ایمان اور عقیدہ توحید کے خلاف رہے ہیں۔ اگرچہ اس دور میں دنیا کی حکومتوں کے باہم رد و لبھ ہمارے دور کی طرح گہرے نہ تھے اس کے باوجود مشرکین مکہ یہ سمجھتے تھے کہ پوری دنیا میں مشرکین کا غلبہ ان کا غلبہ ہے اور لٹل کتاب پر مشرکین کی فتح ان کی فتح ہے۔ مکہ کے مسلمان بھی یہ سمجھتے تھے کہ ان کے اور لٹل کتاب کے درمیان رابطے کی اساس موجود ہے اور وہ بھی اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ اٹل کتاب پر مشرکین کو کسی بھی جگہ غلبہ حاصل ہو۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ان کی دعوت اور تحریک اس جہان میں الگ تھلگ نہیں رہ سکتی۔ اور کفر و ایمان کی اس کشمکش پر بیرونی واقعات اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

یہ وہ کھلی حقیقت ہے جس سے ہمارے دور کے اکثر لوگ غافل ہیں اور وہ اس حقیقت کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے جس طرح اس کو رسول اللہؐ کے زمانے کے مسلمانوں نے سمجھا تھا۔ حالانکہ چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ آج کے مسلمان صرف جغرافیائی حدود یا قومیت کی اصطلاح میں سوچتے ہیں حالانکہ مسئلہ دراصل کفر و ایمان کا ہے اور اصل معرکہ حزب اللہ اور حزب الشیطان کے درمیان ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان اس کشمکش کی اصل حقیقت کو سمجھیں کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ اگر مسلمانوں نے اصل مسئلے کو سمجھ لیا تو پھر کفر و شرک کی صم بر دار جماعتوں نے جو مختلف رنگوں کے جمنڈے اٹھائے ہوئے ہیں وہ مسلمانوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف جنگ، محض اسلامی نظریہ حیات کی وجہ سے

کرتے ہیں۔ ذہنی طور پر معرکے کے اسباب و علل جو بھی ہوں، اصل جنگ نظریات کی ہے۔

دوسرا سبق اس واقعہ میں یہ ہے کہ اللہ کے وعدے پر بھروسہ کرو، جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فوراً کہا کہ حضور اکرمؐ نے سچ کہا، جبکہ مشرکین کے نزدیک حضورؐ کا یہ کلام تعجب انگیز تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے صاف صاف کہہ دیا ”انہوں نے سچ کہا“۔ انہوں نے شرط باندھی اور ابوبکرؓ نے قبول کر لی اور اللہ نے جو کہا تھا کہ چند سالوں میں یہ واقعہ ہو جائے گا تو ہو گیا۔ یہ پختہ اعتماد، یقین اور بھروسہ ہی تھا جس نے مسلمانوں کے دلوں کو یقین اور ثابت قدمی سے بھر دیا تھا اور وہ تمام مصائب اور مشکلات کو خوشی خوشی جھیل رہے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ کا کلمہ مکمل ہو گیا اور اللہ کا وعدہ سچا ہو گیا اور یہی بات جماد کے طویل راستے میں ایک نظریاتی کارکن کا بہترین ہتھیار ہو ا کرتا ہے۔

تیسرا سبق اس واقعہ کے بیان کے درمیان ایک نہایت ہی مختصر جملہ معترضہ کے ذریعہ دیا گیا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں لِلّٰہِ

الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ بَعْدُ (۳۰: ۴) ”اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی“۔ نہایت ہی شتابی سے بنا دیا گیا کہ معاملات سب کے سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس واقعہ میں بھی اور اس کے سوا دوسرے واقعات میں بھی۔ یہ ایک اہل کلیہ ہے، اسامی موقف کا یہ میزان ہے۔ فتح و ہزیمت، دنیا میں حکومتوں کا اٹھنا اور مٹنا، قوت پکڑنا اور ضعیف ہونا، اسی طرح ہے جس طرح اس کائنات میں دوسرے طبعی واقعات رونما ہوتے ہیں۔ سب کے لیے ایک سنت مقرر ہے۔ یہ سنت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح اللہ چاہتا ہے واقعات کا رخ پھیر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے ارادے اور اس کی حکمت پذیری سے واقع ہوتا ہے۔ تمام واقعات اور حادثات دراصل اللہ کے ارادہ مطلقہ کے آثار ہیں اور ان کا رخ متعین کرنے میں کسی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ نہ کسی کے پاس قوت ہے۔ ان واقعات کے پیچھے جو حکمت کار فرما ہے اس کا بھی اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں ہے۔ نہ کسی کو ان واقعات کے مصدر اور ابتداء کا پتہ ہے اور نہ انجام کا۔ لہذا ایک انسان کے لیے یہی محفوظ راستہ ہے کہ وہ تمام واقعات پر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور یہ کہہ دے کہ یہ اللہ کی مقرر کردہ تقدیر ہے۔

الْم (۳۰: ۱) غَلِبَتِ الرُّومُ (۳۰: ۲) فِي آدْنَى الْأَرْضِ وَ هُمْ مِنْ بَعْدِ غَلِبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ (۳۰: ۳) فِي بَضْعِ سِنِينَ لِلّٰہِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ بَعْدُ وَ يَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ (۳۰: ۴) يَنْصُرُ اللّٰہُ --- (۳۰: ۵) ”رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں“ اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہو گا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے۔ اور اللہ کا وعدہ سچا ہوا اور مؤمنین نے اللہ کی دی ہوئی نصرت پر خوشیاں منائیں۔

يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ وَ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۳۰: ۵) ”اللہ نصرت عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے“۔ فرض اختیارات سب اللہ کے ہیں، پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اللہ جسے چاہتا ہے نصرت عطا کرتا

ہے۔ اس کی مشیت پر کوئی قید نہیں ہے۔ اس کی مشیت جو نتیجہ چاہتی ہے ویسے ہی اسباب بھی میا کر دیتی ہے۔ وجود اسباب اور فتح و کامرانی کو اللہ کی مشیت کے ساتھ معلق کرنے کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس عالم اسباب کو جو قوانین قدرت کنٹرول کرتے ہیں وہ سب کے سب مشیت مطلقہ کے فراہم کردہ ہیں۔ مشیت الہیہ ہی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایسے اسباب اور ایسے سنن لیل جہاں میں جاری و ساری ہوں جو اہل ہوں اور اس کائنات کے اندر ایک نظم اور ایک قرار و ثبات ہو۔ لہذا فتح و ہزیمت بھی قدرتی اسباب اور موثرات کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں، اللہ کے جاری کردہ قوانین قدرت کے مطابق۔

اس موضوع پر اسلامی نظریہ حیات نہایت ہی واضح، معقول اور منطقی ہے۔ وہ تمام امور کو اللہ کے حوالے کرتا ہے لیکن اسلام عالم اسباب کی نفی بھی نہیں کرتا اور انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ عالم اسباب کے اندر اپنی جدوجہد جاری رکھے، تاکہ اللہ کے مقرر کردہ نتائج عالم ظہور میں آتے رہیں۔ انسانی جدوجہد کے مطابق عملات انجام نمودار ہوں یا نہ ہوں اس کا انسان ذمہ دار نہیں ہے۔ اس پر جدوجہد فرض ہے۔ انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ایک اعرابی نے اپنی اونٹنی کو مسجد نبویؐ کے دروازے پر کھلا چھوڑ دیا اور نماز پڑھنے کے لیے اندر آ گیا اور کہا

تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ "میں نے اللہ پر توکل کیا"۔ اسے رسول اللہؐ نے فرمایا اعقلها وتوکل "اسے پاندھ دو اور پھر توکل کرو"۔ اسلامی نظریہ حیات میں توکل عالم اسباب میں، مطابق اسباب جدوجہد کرنے کے بعد ہے۔ جدوجہد کرو اور پھر معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔

يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۵:۳۰) "اللہ نصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے"۔ یہ نصرت قدرت الہیہ کے سایوں میں ملفوف ہے اور یہ قدرت الہیہ ہی ہے جو اس تصرف کو عالم واقعہ میں لاتی ہے۔ اس نصرت پر رحمت الہیہ کے سائے بھی چھائے ہوئے ہیں جس کے ذریعہ لوگوں کے مفادات حقیقت کا روپ اختیار کرتے ہیں۔ مغلوب اور پیسے ہوئے طبقات کے لیے اس میں بہت سے فائدے ہوتے ہیں۔

وَلَوْ لَا دَفَعُ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ "اگر اللہ کی طرف سے بعض لوگوں کو بعض دوسرے لوگوں کے ذریعہ دفع کرنے کا کام نہ ہوتا رہتا تو پوری زمین میں فساد واقعہ ہو جاتا"۔ زمین میں اصلاح اسی طرح ہو سکتی ہے کہ مظلوموں اور پیسے ہوئے لوگوں کی حمایت کی جائے اور ان کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا جائے۔

وَعَدَ اللَّهُ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ وَلَكِنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۶:۳۰) يَعْلَمُونَ

ظاہراً مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَفْلُونَ (۷:۳۰) "یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے، اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں"۔ یہ لہذا اللہ کا وعدہ ہے لہذا وہ مازماً واقع ہو کر رہے گا۔

لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ (۶:۳۰) "اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا"۔ کیونکہ اللہ کا

وعدہ اس کے سبب قید ارادے کے تحت ہوتا ہے اور پھر اس کے اندر مگر حکمت مضمر ہوتی ہے اور وہ اپنے وعدہ کو حقیقت کا روپ دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ اس کی مشیت کو رد کرنے والی کوئی قوت نہیں ہے اور اس کے حکم سے کوئی سرتابی نہیں کر سکتا۔ اس پوری کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

اس وعدے کا پورا کرنا دراصل اللہ کے وسیع قانون قدرت کا ایک حصہ ہے اور اللہ کے ناموس اکبر اور اس کے قانون قدرت اور عظیم منصوبہ کائنات کے اندر کوئی تغیر تبدیل ممکن نہیں ہے۔

وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۳۰: ۶) ”مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔“ اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے بڑے جبہ و دستار رکھتے ہیں اور ان کے پاس علم کی ایک بڑی مقدار ہے۔ لیکن ان کا علم سطحی ہے اور زندگی کے ظاہری امور سے متعلق ہے۔ اللہ کے اہل قوانین قدرت اور اس کائنات کے حقیقی ضوابط اور اس کے عظیم ناموس اور اس کے نہایت ہی پختہ اور گہرے رولہد کا انہیں علم نہیں ہے۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۳۰: ۷) ”لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو ہی جانتے ہیں۔“ اس ظاہر کے پیچھے وہ جھانکنے کی سعی نہیں کرتے اور اپنی بصیرت سے اس کے پس منظر کو دیکھنے کی سعی نہیں کرتے۔ یہ ظاہری دنیا تو صغیر و حقیر ہے۔ اگرچہ لوگوں کو یہ بہت ہی وسیع نظر آتی ہے لیکن دراصل یہ بہت ہی حقیر ہے۔ انسان اس دنیا میں بہت جدوجہد کرتا ہے لیکن انسان کی محدود زندگی میں یہاں بہت ہی کم کچھ کیا جاسکتا ہے اور انسان کی یہ محدود زندگی اس عظیم کائنات کی وسعتوں کے مقابلے میں ان کا ایک مختصر حصہ ہے۔ اور اس زندگی پر بھی انہی قوانین کا کنٹرول ہے جن کا کنٹرول اس پوری کائنات پر ہے۔

وہ شخص جس کا ضمیر و قلب کائنات کے ساتھ مربوط نہیں ہے اور اسے یہ احساس نہیں ہے کہ اس کائنات کو کچھ اہل قوانین قدرت کنٹرول کر رہے ہیں، ایسا شخص اس کائنات کو بظاہر دیکھ تو رہا ہوتا ہے لیکن وہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح اندھا ہوتا ہے۔ وہ ظاہری اشکال کو دیکھ رہا ہوتا ہے، وہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ یہاں ہر چیز دائرے کی شکل میں سرگردان ہے لیکن وہ اس حرکت کی حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے وہ اس جہاں میں نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت ایسی ہی ہوتی ہے کیونکہ حقیقی مومن تو وہ ہوتا ہے جو اس کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والے زندگی کے اسرار و رموز سے واقف ہو۔ ایسا مومن ہی دراصل علم اور سائنس کو ایسی روح عطا کرتا ہے جو حقائق کا ادراک کرتی ہے۔ اس قسم کا ایمان رکھنے والے لوگ اس جہاں میں قلیل ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثریت حقیقی معرفت سے محجوب ہوتی ہے۔

وَهُمَّ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ (۳۰: ۷) ”اور آخرت سے وہ غافل ہوتے ہیں۔“ اس لیے کہ آخرت اس کائنات کے سلسلہ میں وجود ہی کی ایک کڑی ہے۔ آخرت کتاب کائنات کا ایک صفحہ ہے، جو لوگ تخلیق کی حقیقت کو نہیں سمجھتے جو لوگ اس کائنات میں پائے جانے والے قوانین فطرت کو نہیں سمجھتے، وہ آخرت کو بھی نہیں سمجھتے۔ اس لیے وہ آخرت کو اہمیت نہیں دیتے، اس کے لیے تیاری نہیں کرتے، اور وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ حرکت کائنات

کی لائن پر آخرت بھی ایک نکتہ ہے۔ دنیا اور اس کائنات نے اس نکتے پر پہنچنا ہے اور اس کے بعد پھر نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

لیکن آخرت سے غفلت کے نتیجے میں ایسے غافل لوگوں کی اقدار مضطرب ہوتی ہیں، ان کی اقدار حیات میں کوئی ثابت اور پختگی نہیں ہوتی۔ ان کا تصور حیات، تعبیر واقعات اور ان کی قدر و قیمت کے پیمانے نا پختہ ہوتے ہیں۔ ان کا علم سطحی، ناقص اور غلط ہری ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب ایک انسان اس پوری زندگی کے اختتام پر آخرت کے قیام کو تسلیم کرتا ہے تو اس جہان کے تمام واقعات کے بارے میں اس کا نقطہ نظر بدل جاتا ہے۔ اسے نظر آتا ہے کہ اس جہان میں اس کی زندگی ایک مختصر سا مرحلہ ہے اور اس جہاں میں اس کا جو حصہ ہے اور ہونا چاہئے وہ آخرت کے مقابلے میں بہت ہی معمولی اور حقیر ہے اور اس جہاں کی پوری زندگی دراصل طویل ترین ذرا سے کا ایک نہایت ہی مختصر شو یا جھلکی ہے۔ لہذا کسی شخص کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اس طویل ترین ذرا سے کی صرف مختصر ترین جھلکی کو دیکھ کر کوئی فیصلہ کر دے۔ اگر کوئی نہایت ہی حقیر جھلکی کو دیکھ کر پوری زندگی، پوری کائنات اور آخرت اور اس کی طویل زندگی کے بارے میں فیصلہ کرے گا تو یہ سطحی فیصلہ ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا انسان جو قیامت کا قائل ہے، اور جو قیامت کے لیے تیاری کر رہا ہے، اس انسان کے ساتھ اکٹھے ہو کر نہیں رہ سکتا جس کا منہج نظر صرف یہ دنیا ہے اور اس دنیا سے آگے اس کا کوئی ہدف نہیں ہے۔ اس قسم کے دو انسان نہ اس دنیا کے کسی پروگرام پر متفق ہو سکتے ہیں اور نہ ان کا یہاں کسی قدر پر اتفاق ہو سکتا ہے۔ دونوں کے پیمانے بالکل جدا ہوں گے۔ غرض ہر واقعہ، ہر حالت، اور زندگی کے حالات میں تہ ہر حالت کے بارے میں دونوں کا فیصلہ جدا ہو گا کیونکہ دونوں کے میزان الگ ہوں گے۔ ہر ایک کا رویہ نظر مختلف ہو گا۔ ہر ایک کی روشنی بھی مختلف ہوگی۔ لہذا ہر ایک کو ایک ہی چیز مختلف نظر آئے گی۔ واقعات، اقدار اور حالات کے بارے میں دونوں کا تصور جدا ہو گا۔ ایک دنیا کی ظاہری نظرت دیکھنے والا ہے اور دوسرا گہری نظرت سے واقعات کے پس منظر کو بھی دیکھ رہا ہے۔ وہ ظاہری اسباب اور واقعات کو بھی دیکھتا ہے اور باطن پر بھی اس کی نظر ہے۔ وہ ظاہر اور غائب دونوں کا علم رکھتا ہے۔ دنیا و آخرت دونوں کو جانتا ہے، حیات اور موت دونوں کی حقیقت کو جانتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل سب کا تصور رکھتا ہے۔ وہ انسانوں کے جہان سے بھی باخبر ہے اور اس کائنات کے دوسرے جہانوں اور زندوں اور مردوں سب سے واقف ہے۔ یہ ہے وہ وسیع افق جس پر اسام انسان کی نظریں فوکس کرتا ہے اور انسان کو ایک ایسا نقطہ نظر دیتا ہے جو انسان کے لائق ہے جو انسان کے لیے بحیثیت خلیفہ اللہ فی الارض ضروری ہے اور انسان کی شخصیت میں اللہ نے جو روحانیت و ربیت کی ہے، اس کا بھی یہی تقاضا ہے۔

--- ۰ ۰ ۰ ---

اس غرض کے لیے کہ اللہ کی نصرت کا وعدہ اسی طرح یہ حق ہے جس طرح یہ منظم کائنات ایک عظیم حق پر قائم ہے، اور یہ کہ آخرت کا قیام اس عظیم مہجائی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اب سیاق کلام ہمیں دوبارہ اس کائنات کے ضمیر کی سیر کرتا ہے۔ آسمانوں میں، زمین میں اور ان کے درمیان جو جہان موجود ہیں ان میں۔ اس کے بعد پھر انسان کو خود اس کے اپنے وجود کی سیر کرائی جاتی ہے تاکہ وہ مدبر کس، شاید کہ وہ اس حقیقت کبریٰ تک پہنچ جائیں جس سے وہ اس وقت غافل ہو

جاتے ہیں جب وہ آخرت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ کسی سطحی نقطہ نظر کی وجہ سے وہ دعوت اسلامی کی حقیقت کو بھی نہیں سمجھ سکتے کیونکہ یہ دعوت اس عظیم سچائی اور اس کے گہرے تدبیر پر مبنی ہے۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِمْ مَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ
وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ
بِلِقَائِي رَبِّهِمْ لَكٰفِرُونَ ۝

”کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں، برحق اور ایک مدت مقرر ہی کے لیے پیدا کیا ہے مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔“

کیا یہ لوگ سوچتے نہیں کہ خود ان کی ساخت اور ان کی تخلیق اور ان کے ارد گرد موجود یہ وسیع کائنات اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ وجود ایک سچائی پر قائم ہے۔ ایک ایسے اہل ناموس فطرت کے مطابق رواں دواں ہے جس کے اندر کوئی اضطراب نہیں ہے۔ یہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ کائنات کبھی ادھر ڈھلک گئی اور کبھی ادھر۔ نہ س کی گردش میں فرق آتا ہے نہ اجرام فلکی میں تصادم ہوتا ہے اور نہ اس کی حرکت کوئی غیر مرتب انداز کی حرکت ہے۔ نہ یہ حرکت بدلتی ہوئی خواہشات کے مطابق بدلتی ہے۔ بلکہ یہ حرکت نہایت ہی گہری، دقیق اور حکیمانہ نظام کے مطابق چل رہی ہے۔ یہ سچائی جس کے مطابق انسانی زندگی اور یہ وسیع کائنات چل رہی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس جہان کا کوئی انجام ہو، جہان جزاء و سزا پوری ہو سکے۔ جہاں خیر اور شر دونوں کو ان کا بدلہ مل سکے۔ یہ سچائی نظر آتی ہے کہ یہاں ہر چیز ایک مقررہ انجام تک پہنچتی ہے یہ حکمت مدبرہ کے مطابق ہے اور اس کائنات کا ہر واقعہ اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس میں کوئی تقدیم پائیا خیر نہیں ہوتی۔ اگر انسان یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ آخرت کب وقوع پذیر ہوگی تو اس کے معنی یہ نہیں کہ آخرت نہیں آئے گی۔ آخرت کا عدم علم یا اس کی تاخیر سے صرف وہ لوگ غلط نتائج اخذ کرتے ہیں جو معاملات کا صرف ظاہری پہلو دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح ان کو دھوکہ لگ جاتا ہے۔ اس وجہ سے

إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَائِي رَبِّهِمْ لَكٰفِرُونَ (۸:۳۰) ”بے شک بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔“

--- ۰۰۰ ---

حمیر کائنات اور زمین و آسمان کے درمیان پائے جانے والی مخلوقات کی سیر جو نہایت ہی وسیع سیر ہے جس کے آفاق بہت ہی طویل و عریض ہیں اور ناقابل تصور وسعتیں رکھتے ہیں اور ان آفاق کے اندر متنوع مخلوق ہے۔ جو زندہ اور غیر زندہ، قسم قسم کی اشیاء پر مشتمل ہے جس میں اجرام سماوی، الفلاک، نجوم و کواکب، بڑے اور چھوٹے تارے اور سیارے، ظاہر اور چھپے ہوئے، قریب و بعید اور معلوم و نامعلوم ہیں۔ اس وسیع سیر کے بعد اب قرآن کریم ہمیں خود اپنی

تاریخ کی سیر کی دعوت دیتا ہے کہ آثارِ انسانیت کے بعد ذرا خود انسانی تاریخ کا بھی مطالعہ کرو، خود اس تاریخ میں بھی یہ عظیم سچائی سنتِ جاریہ کی صورت میں اپنا کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور انسانی تاریخ کے واقعات بھی ایسے ہی اٹل اسباب کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں جس طرح اس کائنات کے حوادث۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۖ وَ أَثَارُوا الْأَرْضَ وَ عَمَرُوهَا أَكْثَرَ
مِمَّا عَمَرُوهَا وَ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ
لَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١٠﴾ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ اسَاءُوا
السُّوْءَ أَنْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَ كَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١١﴾

ع ۱۰

۴

”اور کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے، انہوں نے زمین کو خوب ادھیرا تھا اور اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انہوں نے نہیں کیا ہے۔ ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے۔ پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے۔ آخر کار جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں ان کا انجام بہت برا ہوا اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے۔“

ان آیات میں ہمیں دعوت دی جاتی ہے کہ گزرنے والوں کا جو انجام ہوا، ذرا اس پر بھی غور کرو، یہ بھی تو تمہاری ہی کی طرح کے انسان تھے۔ اسی طرح اللہ کی مخلوق تھے جس طرح تم ہو۔ ان کا انجام تمہارے لیے ایک نمونہ ہے۔ کیونکہ اللہ کی سنت تمام انسانوں کے لیے یکساں ہے۔ اللہ کی سنت انسانی تاریخ کے بارے میں بھی اسی طرح اٹل ہے جس طرح اس کائنات کے بارے میں اٹل ہے۔ اللہ کا انسانوں کی کسی نسل کے ساتھ کوئی مخصوص تعلق نہیں ہے کہ ان کے ساتھ کوئی ممتاز سلوک کرے۔ نہ اللہ کی کچھ خواہشات ہیں جو زمان و مکان کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ معاذ اللہ رب العالمین

یہ اس بات کی دعوت ہے کہ اس زندگی کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھا جائے اور اس پر غور کیا جائے کہ انسانی زندگی کے اس جہاں میں جو روابط و تعلقات ہیں ان کی حقیقت کیا ہے اور گزشتہ تاریخ میں اس انسانیت کی تخلیق اور اس کا انجام کیا رہا ہے تاکہ انسانوں کا کوئی گروہ اور نسل صرف اپنی زندگی، اپنے تصورات اور اپنی اقدار تک محدود نہ ہو جائے۔ تمام نسلوں کے درمیان جو مضبوط رشتہ ہے اس سے غافل نہ ہو جائے اور اس سنت کو بھی نہ بھول جائے جو تمام نسلوں پر حکمران ہے۔ اور ان انسانی قدروں کو بھی نہ بھول جائے جو ہر زمان و مکان میں ایک ہوتی ہیں۔ تاریخِ ماضی میں جو اقوام ہو گزری ہیں اور جو لٹل مکہ سے پہلے ہو گزری ہیں۔ وہ اٹل مکہ سے۔

كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۹۳۰) ”وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے۔“

وَأَنَارُوا الْآرَاضِ (۹۳۰) ”انہوں نے زمین کو خوب ادھیرا تھا۔“ انہوں نے اس میں کھیتی باڑی کا کام بھی کیا اور اس کے باطن کو پھاڑا اور اس کے ذخائر کو نکالا۔

وَعَمَرُوهَُا كَثْرًا مِّمَّا عَمَرُوهَُا (۹۳۰) ”اور انہوں نے اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انہوں نے نہیں کیا۔“ وہ لوگ عرب سے زیادہ متہذبن اور ترقی یافتہ تھے اور عربوں سے زیادہ زمین کے اندر تعمیرات کرنے والے تھے۔ یہ لوگ اس دنیا کی ظہری ترقی اور خوبصورتی پر ہی اکتفاء کر گئے اور آخرت کی طرف نگاہ نہ ڈالی۔

وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ (۹۳۰) ”ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے۔“ لیکن ان روشن نشانیوں کو دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں اور یہ لوگ اس نور پر ایمان نہ لائے جو ان کو صحیح راستہ دکھا رہا تھا۔ چنانچہ ان پر اللہ کی اس سنت کا اطلاق ہو گیا جو ہمیشہ مکذبین پر نافذ ہوتی ہے۔ عذاب الہی کے مقابلے میں ان کی قوت ان کے کچھ کام نہ آئی۔ ان کا علم اور ان کی ترقی ان کے کچھ کام نہ آئی۔ اور ان کو ان کی وہ سزا جزاء ملی جس کے وہ مستحق تھے۔

فَمَا كَا اللَّهُ لِيُظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۹۳۰) ”پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔“

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ آسَاءُ وَالسُّوَاءِ (۱۰۳۰) ”آخر کار جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں ان کا انجام بہت ہی برا ہوا۔“ یعنی وہ لوگ جو برائیاں کا ارتکاب کرتے تھے ان برائیوں کے مطابق پوری پوری سزا اور جزاء ان کو دے دی گئی اور ان کی برائی کیا تھی؟ یہ کہ

أَن كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِءُونَ (۱۰۳۰) ”اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے۔“

قرآن کریم مکذیب کرنے والوں اور مزاح اڑانے والوں کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ ذرا خدا کی اسی زمین پر چلیں پھریں اور گھونگھے کی طرح اپنے خول ہی میں بند نہ رہیں۔ انسانی تاریخ کو بھی ذرا پڑھیں کہ آپ جیسے مکذبین اور مزاح کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا انجام بھی ان جیسا ہو۔ اللہ کی سنت اٹل ہے اور وہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی۔ وہ ذرا اپنی سوچ اور فکر کو وسعت دے۔ پوری انسانیت کو ایک وحدت سمجھیں انبیاء کی دعوت کو ایک سمجھیں۔ اور یہ یقین کر لیں کہ اللہ کے قوانین قدرت کے مطابق تمام لوگوں کا انجام ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ تصور جس میں اسلام تمام مومنین کے فکر و نظر کو رنگنا چاہتا ہے اور اس پر بار بار زور دیتا ہے۔

اس پوری کائنات کی گہرائیوں کے مطابق اور انسانی تاریخ کے گہرے مطالعے کے بعد لب قرآن کریم انسان کو اس

میدان میں لے جاتا ہے جس سے انسان بیٹھ غافل رہتا ہے۔ یعنی بعث بعد الموت کے میدان میں۔ یہ اس عظیم سچائی کا ایک اہم عنصر ہے جس کے اوپر یہ کائنات قائم ہے۔

اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۱﴾

”اللہ ہی خلق کی ابتداء کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے۔“

یہ بہت ہی واضح اور سادہ حقیقت ہے اور اس کے دونوں اجزاء اور دونوں کڑیوں کے درمیان ربط بالکل واضح ہے کیونکہ کسی چیز کا پہلی بار بنانا اور اس کا دوبارہ بنانا قابل فہم بات ہے۔ اس میں الجھنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تخلیق میں یہی دو حلقے ہوتے ہیں ان کے درمیان یہی تعلق ہوتا ہے اور انسان کی تخلیق کے بعد اس کے خالق کے سامنے دوبارہ پیش ہونا ایک لازمی اور معقول امر ہے۔ وہی پہلی بار تخلیق کرنے والا ہے اور وہی دوسری بار تخلیق کرنے والا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ اچھا اور برا کام کرنے والوں کو وہ پوری پوری جزاء اور سزا دے۔

بعث بعد الموت پر یہ دلیل دینے کے بعد اب یہاں بعث بعد الموت کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں اہل ایمان اور اہل کفر کے انجام کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے جس کے اندر شریکوں اور عقیدہ شرک کے بودے پن کو اچھی طرح ظاہر کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ﴿۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ

مِّنْ شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاؤُاْ وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ ﴿۳﴾ وَيَوْمَ تَقُومُ

السَّاعَةُ يُؤْمِنُ يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ ﴿۴﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ ﴿۵﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ

الْآخِرَةِ فَأُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُخَضَّرُونَ ﴿۶﴾

”اور جب وہ ساعت برپا ہوگی اس دن مجرم ہر ایک دک رہ جائیں گے۔ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ان کا سفارشی نہ ہو گا اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے۔ جس روز وہ ساعت برپا ہوگی اس دن (سب انسان) لٹک کر دیووں میں بٹ جائیں گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ ایک باغ میں شادیاں و فرحان رکھے جائیں گے اور جنہوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ہے وہ عذاب میں حاضر رکھے جائیں گے۔“

یہ ہے وہ گھڑی جس سے لوگ غافل ہیں اور جھٹلانے والے جھٹلاتے ہیں۔ یہ دیکھو وہ آگئی اور ذرا دیکھو اس کا منظر

یہ ہے برپا ہوگئی وہ۔ ذرا مجرمین کو دیکھو کس طرح حیران و پریشان ہیں۔ کس قدر مایوس ہیں 'ان کو نجات کی کوئی امید نہیں ہے اور نہ ان کو رہائی کی کوئی امید ہے۔ وہ شرکاء اور سفارشی جو انہوں نے دنیا کی زندگی میں بنائے تھے اور جن سے وہ دھوکہ کھا کر گمراہ ہو گئے تھے 'ان کی جانب سے اب نہ اقتدار میں کوئی شرکت ہوگی اور نہ وہ سفارش کر سکیں گے 'بلکہ وہ تو ان لوگوں کی طرف سے شرک کرنے اور ان کی بندگی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیں گے کہ ہمیں تو معلوم ہی نہیں ہے کہ ان احمقوں نے ہمیں اللہ رب العالمین کے ساتھ شریک کیا ہے۔ چنانچہ لعل ایمان اور لعل کفر کے درمیان یوں تفریق کر دی جاتی ہے اور دونوں کے رستے جدا ہو جاتے ہیں۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ (۱۵۰:۳۰) ”جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے وہ ایک باغ میں شاداں و فرحان رکھے جائیں گے۔“ وہاں ان کو وہی صورت حال درپیش ہوگی جس سے وہ خوش ہوں گے۔ ان کے ضمیر میں فرحت پیدا ہوگی اور ان کے دل کو مسرت حاصل ہوگی۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ فَأُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ (۱۶:۳۰) ”اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا وہ عذاب میں حاضر ہیں گے۔“ یہ ہے آخری انجام نیکو کاروں اور بدکاروں کا۔

اب عالم آخرت کی سیر اور منظر سے ہم پھر واپس اس دنیا میں آ جاتے ہیں۔ اس کائنات اور اس کے اندر زندگی اور اس کے اسرار و رموز اور عجائبات و کرامات کی سیر شروع ہوتی ہے۔ فی الواقعہ یہ کائنات ایک دلچسپ تفریح گاہ ہے۔ آغاز سفر صبح و شام اللہ کی حمد سے ہوتا ہے کہ صبح و شام کے مناظر کو ذرا دیکھو کس قدر دفریب مناظر ہوتے ہیں۔

فَسُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ ﴿۱۸﴾ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُخْرِجُ النَّارَ مِنَ الطَّنَائِطِ وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ ﴿۱۹﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ ﴿۲۰﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاجْتِلَافُ السَّنَةِ وَالْوَاكِنُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِلْعَالَمِينَ ﴿۲۲﴾

مِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ
 لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿۱۱﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ يُرْسِلُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْزِلُ مِنَ
 السَّمَاءِ مَاءً فَيُخْرِجُ بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ
 يَعْقِلُونَ ﴿۱۲﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ
 دَعْوَةً مِّنَ الْأَرْضِ إِذَا أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ ﴿۱۳﴾ وَلَهُ مَن فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
 كُلُّ لَهٗ قُنُوتٌ ﴿۱۴﴾ وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴿۱۵﴾
 وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۶﴾

۴ ”پس تسبیح کرو اللہ کی جب کہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو۔ آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے حمد ہے اور (تسبیح کرو اس کی) تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے۔ وہ زندہ کو مردے میں سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ میں سے نکال لیتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ اسی طرح تم لوگ بھی (حالت موت سے) نکال لیے جاؤ گے۔

اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بشر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جوں ہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا پس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی، ”اس“ کے بندے ہیں۔ سب کے سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہی اللہ ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے

آسان تر ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔“

یہ اس کائنات کا نہایت ہی گہرا اور عظیم مطالعاتی سفر ہے۔ اس کائنات کی دوریوں اور گہرائیوں تک۔ انسانی توانائے مشاہدہ کو صبح و شام کے مناظر کی سیر کر لئی جاتی ہے۔ زمین کے مناظر اور آسمانوں کے مناظر، صبح و شام کے علاوہ پھر دوپہر کی دنیا۔ ان آفاق و مناظر میں حیات و ممات اور بہار و خزاں کی کارستانیوں دکھائی جاتی ہیں، ان خوشگوار فضاؤں میں انسان کو بتایا جاتا ہے کہ وہ ذرا اپنی تخلیق پر غور کرے، اپنی فطرت کے رجحانات اور میلانات کا مشاہدہ کرے۔ اپنی جسمانی اور روحانی قوتوں اور ان کی کشاکش کو ذرا دیکھے۔ اس دنیا میں ہر چیز جوڑے جوڑے ہے۔ ان جوڑوں کی باہمی محبت کو دیکھے، اور زوجین کے رجحانات و میلانات اور ان کے توانائے فطرت کو ذرا دیکھے اور اس کائنات کے زمین و آسمان، باغ و دریا، اور رنگ و رنگ اور پھر انسانوں کی شکلیں، ان کے رنگ اور ان کی ہزار ہا زبانیں اور پھر انسان کی بیداری، اس کی ہشیری اور اس کی نیند اور اس کی جدوجہد اور اس کا آرام۔ پھر اس طبعی کائنات میں طوفان باد باران اور برق و بادل اور پھر لوگوں کا ان کو چاہنا اور ان سے ڈرنا، اور پھر زمین کی مردنی اور روئیدگی اور پھر زندگی اور بہار اور پھر بحیثیت مجموعی اس کائنات کا قیام اور گردش اور نظام و انتظام، یہ سب کام اللہ کے سوا اور کون کر سکتا ہے۔ یہ اللہ ہی تو ہے جس کی یہ تجلیات ہیں۔ اس کے لیے یہ سب کام بہت ہی آسان ہیں۔ وہی ہے جس نے ان اشیاء کو پیدا کیا ہے اور وہی ہے جو ان کو دوبارہ پیدا کرے گا اور دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے بہت ہی آسان ہے۔ آسمانوں اور زمینوں میں ذات باری کے اعلیٰ مشاہد موجود ہیں جو بے مثال ہیں۔

فَسُبِّحْنَ اللَّهَ حِينَ تُمْسُونَ وَ حِينَ تُصْبِحُونَ (۱۷:۳۰) وَلَهُ الْحَمْدُ فِي

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ عَشِيًّا وَ حِينَ تُظْهِرُونَ (۱۸:۳۰) ”پس تسبیح کرو اللہ کی جب کہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو۔ آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے حمد ہے اور (تسبیح کر اس کی) تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے۔“ تسبیح کا یہ حکم اور حمد سابق فقرات و آیات میں بیان کردہ مشاہد قیامت کے بعد آتا ہے جس میں بتایا گیا کہ نفل ایمان جنت کے ایک مخصوص باغ میں خوش و خرم ہوں گے۔ اور کافر اور جھٹلانے والے عذاب اور سزا کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ تو یہ تسبیح دراصل بطور نتیجہ یہاں لائی گئی ہے اور سابقہ مناظر قیامت دراصل اس مطالعہ کائنات کے لیے تمہید تھے کہ یہ وسیع کائنات اور اس کے نقیب و فراز، نفس انسانی اور اس کی نفیست و عجائبات اور اللہ کی یہ تخلیق اور اس کے اسرار و رموز یہ سب کے سب لایعنی نہیں ہیں۔ ان پر قیامت کے نتائج مرتب ہوں گے۔ پس سابقہ مناظر قیامت اور موجودہ مطالعہ کائنات کے اندر مکمل ربط و مناسبت ہے۔

یہاں تسبیح اور حمد کے لیے کچھ اوقات بھی مقرر کیے گئے ہیں۔ شام کے اوقات میں اور صبح کے مناظر میں، پچھلے پہر اور پہلے پہر میں۔ پھر اس حمد و تسبیح کو آفاق مساوات کے ساتھ بھی جوڑا گیا تاکہ زمان و مکان کے فاصلے مٹا کر اس حمد و تسبیح کو ہمہ گیر بنا دیا جائے اور انسان کا دل ہر وقت اور ہر جگہ اللہ کے ساتھ جڑا رہے۔ وہ اس کائنات کے ڈھانچے، کرات و سادات کی گردش اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مظاہر صبح و مساء کے مظاہر کو دیکھ کر انسان ہر لمحہ اللہ کو یاد کرے۔ اس کا دل کھلا رہے، حساس رہے، اور اپنے ماحول کے حوالے سے بیدار رہے۔ اپنے بدلتے ہوئے حالات میں ماحول کا

مشاہدہ کرتا رہے اور اللہ کی حمد و تسبیح کے ساتھ یہ غور و فکر جاری رہے۔ اور ان تمام امور کو اللہ اور خالق کائنات کی آیات و معجزات سمجھے۔ یہ تمام حالات 'تمام مظاہر' اور تمام اوقات دراصل ایک معجزہ کردگار ہیں۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا

وَكَذَلِكَ تُخْرَجُونَ (۱۹:۳۰) ”وہ زندہ کو مردے میں سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ میں سے نکالتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے اور اسی طرح تم لوگ بھی نکالے جاؤ گے۔“

”ہاں وہ زندہ چیزوں سے مردوں کو نکالتا ہے اور مردہ چیزوں سے زندہ کو نکالتا ہے۔“ اور یہ ایک دائمی عمل ہے۔ نہ رکنے والا عمل ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس میں توقف نہیں ہوتا۔ رات اور دن ہر وقت یہ عمل جاری ہے 'ہر زمان و مکان میں جاری ہے۔ زمین کی سطح میں سے چپے چپے پر جاری ہے۔ فضا کے کائنات میں جاری ہے 'سمندر کی تہوں میں جاری ہے 'ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں 'یہ عمل کوئی غیر معمولی عمل نہیں ہے 'یہ تو ایک معجزہ ہے 'لیکن رات اور دن اسے دیکھتے دیکھتے ہم اس کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اس کا معجزانہ پہلو نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے حالانکہ ہر لمحہ نئی آن اور شان کے ساتھ مردے سے زندہ اور زندہ سے مردہ نکل رہا ہے۔ ایک مردہ اور خشک بیج زمین میں ڈالا جاتا ہے اور اس سے خوشنما پودے اور پھول پیدا ہوتے ہیں 'فصلیں اگتی ہیں اور جب یہی پھل پھول خوشے اور پودے خشک ہو کر بھوسہ بن جاتے ہیں تو اس خشک بھوسے کے اندر ہزار ہا مردہ بیج تیار ہو چکے ہوتے ہیں جن کے اندر پوری حیات موجود ہوتی ہے۔ یہ مردہ پھر فضا کے کائنات سے گرمی 'گیس' پانی اور تپش حاصل کر کے پھر زندہ ہوتا رہتا ہے۔ انسانوں اور حیوانوں کے جنین اور پرندوں کے جنین اور انڈے مختلف اشکال اور مختلف اندازوں سے زندگی کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ غرض انسان 'حیوانات' 'کیرڑے' اور 'کوڑے' اور حشرات اور بیج اور انڈے ہر وقت زندگی اختیار کرتے رہتے ہیں اور پھر مردہ بیج پیدا کرتے رہتے ہیں۔

یہ ایک مسلسل سرکل ہے اور زندہ مردہ اور مردہ زندہ ہوتا رہتا ہے۔ کیا کسی زندہ اور جاگنے والے دل کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اللہ دوبارہ تخلیق کر سکتا ہے۔ قرآن کی روشنی میں اس بات کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ قرآن کی روشنی اللہ کے نور سے نکلی ہوئی ہے۔

وَكَذَلِكَ تُخْرَجُونَ (۱۹:۳۰) ”بیینہ اسی طرح تم نکالے جاؤ گے۔“ یہ ایک تسلسل الفہم مسئلہ

ہے۔ ایک عام اور معمولی بات ہے 'یہ تو تمہارا مشاہدہ ہے۔ کائنات میں رات اور دن دیکھا جا رہا ہے۔ رات اور دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ (۲۰:۳۰) ”اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا 'پھر ایک تم بشر ہو کر پھلتے جا رہے ہو۔“ مٹی مردہ اور ساکن ہے۔ اس مٹی ہی سے انسان کو پیدا کیا گیا۔ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ آیا ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ”ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا۔“ (المومنون: ۱۲) مٹی دراصل انسان کا اصل الاصول ہے لیکن یہاں انسانی شخصیت کے اس اصل مادے کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ انسان مکمل شکل میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ تلاتا یہ مقصود ہے کہ ذرا تخلیق انسان کے اصل مادے کو دیکھو اور پھر تخلیق شدہ مکمل انسان کو دیکھو، دونوں کے اندر کس قدر فرق ہے۔ خصوصاً یہ اصول بیان کرنے کے بعد کہ

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (۱۹:۳۰) ”وہ زندہ سے مردہ چیزوں کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردے کو نکال لاتا ہے۔“ قرآن کریم کے انداز کے مطابق یہ معنوی ربط ہے۔

یہ معجزہ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی ہے۔ اور اس کی تشریح کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس زمین پر رہنے والے انسان اور اس زمین کا آپس میں رشتہ کیا ہے اور وہ کیا کتہ ہے جس میں وہ باہم ملتے ہیں یعنی اپنی اصل تخلیق اور ان قوانین قدرت کے ذریعہ سے جو خود انسان پر بھی نافذ ہیں اور اس کائنات پر بھی نافذ ہیں۔

اس مردہ مٹی کے اندر یہ عظیم انقلاب بذات خود ایک معجزہ ہے کہ وہ ایک مردہ اور پیش پا افتادہ شکل سے ایک انسانی ذی اقتدار اور ذی قدر کی شکل میں تبدیلی ہو گئی۔ یہ ایک ایسی تبدیلی اور صنعت کاری ہے جس سے اللہ جل شانہ کی عظیم صنعت کاری کا علم ہو جاتا ہے۔ انسان کا قلب و ضمیر بے ساختہ اللہ کی تسبیح و تہجد پر آمادہ ہو جاتا ہے اور انسان اللہ جل شانہ کی اس عظیم صنعت کاری پر رطب اللسان ہو جاتا ہے۔

پھر خود انسان کی زندگی کی تقسیم مرد اور عورت کی شکل میں اور ان اصناف کا باہم تعلق اور مشترکہ زندگی کا موضوع سامنے آتا ہے۔ کیا یہ کسی خارق العادت معجزے سے کم معجزہ ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً

وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۲۱:۳۰) ”اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔“ لوگوں کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کے جذبات جنس مخالف کے ساتھ کیا ہوتے ہیں۔ دونوں اجناس کے شعور اور اعصاب ایک دوسرے کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں اور اپنے جذبات اور میلانات کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے لیے بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔ یہ جذبات اور میلانات ان کو بے شمار کاموں اور مشقتوں پر آمادہ کرتے ہیں۔ لیکن جس ذات حکیم نے یہ سب کچھ کیا ہے اس کے دست قدرت کی طرف میاں بیوی کے رجحانات جاتے ہی نہیں۔ جس خالق نے ان نفوس کے اندر یہ کشش اور یہ میلان رکھا ہے اسے کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔ حالانکہ میاں بیوی کے اس تعلق کی وجہ سے انسان کے جسم، اس کی روح، اس کے اعصاب بلکہ اس کی پوری زندگی کے اندر ایک سکون اور ٹھہراؤ اور سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس تعلق سے انسان جسمانی اور روحانی لذت بھی حاصل کرتا ہے اور یہ لذت مرد اور عورت دونوں کے لیے برابر ہوتی ہے۔

یہاں قرآن نے نہایت ہی لطیف اور نازک انداز بیان اختیار کیا ہے اور نہایت ہی اشاراتی پیرایہ میں میاں بیوی کے

تعلق کو ظاہر کیا ہے۔ گویا قرآن دل کی گہرائیوں اور احساس و شعور کی تہوں میں تصویر کھینچ رہا ہے۔

لَتَسْكُنُوا إِلَيْهَا (۲۱:۳۰) ”تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔“

وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (۲۱:۳۰) ”تمہارے درمیان الفت اور باہم نرمی کے جذبات پیدا کر دیے۔“

ان فی ذلک لآیت لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُونَ (۲۱:۳۰) ”یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔“ اور جب وہ فکر کریں گے تو ان کو معلوم ہو گا کہ مرد اور عورت کی اصناف کی تخلیق کے اندر خالق نے کیا کیا مکتب رکھی ہوئی ہیں۔ طبعی لحاظ سے دونوں کو کس طرح ایک دوسرے کے موافق اور تکمیلی بنایا ہے۔ کس طرح دونوں ایک دوسرے کی فطری ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے نفسیاتی، عقلی اور جسمانی لحاظ سے تکمیل کا درجہ رکھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اطمینان، استقرار اور سکون کی جگہ ہیں۔ دونوں کے اجتماع سے تکمیل ہو جاتی ہے اور ایک خود مختار یونٹ وجود میں آ جاتا ہے۔ اس یونٹ کے اندر محبت اور رحمت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی جسمانی، نفسیاتی، اعصابی اور طبعی تشکیل ہی ایسی ہے کہ ایک دوسرے کے موالد ہو رہی ہے۔ مرد عورت کی خواہشات کی تسکین کا محل ہے اور عورت مرد کی خواہشات کی تسکین کی جگہ ہے۔ اس طرح دونوں کا اتحاد یکجہتی اور عذاب اس کرۃ ارض پر محدود حیات کا ذریعہ ہے۔ اس سے زندگی کی فصل کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ السِّتِکُمْ وَالْوَانِکُمْ اِنَّ فِیْ

ذلک لآیت لِّلْعٰلَمِیْنَ (۲۲:۳۰) ”اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمان و زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔“ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے۔“۔ زمین و آسمان کی تخلیق وہ نشانی ہے جس کی جانب قرآن کریم نے بار بار توجہ مبذول کر لائی ہے لیکن ہم رات اور دن اس زمین کے اوپر رہتے ہیں اور اس آسمان کے نیچے رہتے ہیں لیکن ہم اللہ کی اس تخلیق پر غور نہیں کرتے۔ حالانکہ زمین و آسمان اس قابل ہیں کہ ان پر طویل عرصہ تک غور کیا جائے اور بار بار غور و فکر کیا جائے۔

خلق السموات کا مفہوم کیا ہے کہ اللہ نے یہ عظیم، پیچیدہ اور نہایت ہی وسیع کائنات تخلیق کی ہے۔ اس عظیم اور وسیع کائنات کے ایک نہایت ہی معمولی حصے کا علم ہم ابھی تک حاصل کر سکے ہیں۔ افلاک اور فلکی کرات کا یہ عظیم اور لاتعداد اژدھام، ستارے، سیارے، ان کے مدار، کمکشاں اور پھر بلیک ہول۔ اس پوری کائنات کے اندر ہماری یہ زمین اس طرح ہے جس طرح ایک حقیر ارہ جو ہماری اس زمین کی فضا میں اڑ رہا ہے جس کا نہ کوئی وزن ہے اور نہ کوئی سایہ ہے۔ اس ہولناک کائنات کی ناقابل تصور وسعت کے ساتھ یہ کائنات نہایت دقیق اور ناقابل تغیر نظم کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ اس کی حرکات اور اس کے کرات کے مدارات میں بے انتہا نظم و ضبط ہے حالانکہ ان کے درمیان طویل فاصلے ہیں۔ ان حرکات میں کوئی اضطراب کوئی بے قاعدگی نہیں ہے اور ہر چیز حکم ربی کے مطابق چل رہی ہے۔

یہ مشاہدہ تو عموماً، جسم اور ان کرات کی حرکت کے نظم کے اعتبار سے ہے۔ رہے اس کائنات کے اسرار تو اس کے اندر پائی جانے والی متنوع مخلوقات، ان کے مزاج اور وہ حالات جن میں وہ مخلوق رہتی ہے اور وہ حالات جو اس پر طاری ہوتے ہیں تو ان کی انتہائیں ہیں۔ پھر وہ قوانین جو اس تمام مخلوق کو محفوظ رکھتے ہیں، اس مخلوق کو چلاتے ہیں، اور اس کے اندر تصرف کرتے ہیں تو ان کی انتہائیں پنہا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ان تمام امور اور موضوعات پر انسان کا علم بہت ہی محدود ہے۔ سمندر میں سے قطرے کے برابر بھی نہیں ہے۔

زمین و آسمان کی تخلیق پر یہ ایک سرسری نظر ہے، بہت ہی اختصار کے ساتھ۔ سائنس دان اور علمائے انسانیات نے اس سلسلے میں جو مختصر سا علم حاصل کر لیا ہے اس پر ہم طویل بحث کر سکتے ہیں۔ اب تک جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں ان کے مطابق یہ کائنات بہت ہی عظیم ہے اور اس کے مختلف اجزاء باہم مربوط ہیں۔ یہ تمام اجزاء بغیر اس کے کہ باہم متصادم ہوں، روزِ تخلیق سے حرکت میں ہیں، ایک سیکنڈ کے لیے بھی ان میں ٹھہراؤ نہیں ہے لیکن اس عجیب نظم میں جو بہت ہی پیچیدہ ہے، کبھی بھی یہ اجزاء اور اجرام باہم متصادم نہیں ہوتے۔ اس نظام کے ہرے میں موجودہ فراہم شدہ معلومات کے باوجود بعض ہلکے لوگ یہ کہنے کی جرات کرتے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے۔ اور پھر اس کا کوئی مدبر نہیں ہے جو اسے یوں چلا رہا ہے۔ ان نام نہاد سائنس دانوں کی یہ بکواس آج بھی سنی جاتی ہے۔

پھر ان آسمانوں اور زمین کے ساتھ ساتھ اس میں پائے جانے والوں یعنی مختلف انسانوں کے مختلف رنگ اور مختلف شکلیں اور مختلف رہائیں۔ یہ اختلاف بھی تخلیقِ سموات سے مربوط ہے۔ زمین پر مختلف قسم کے رنگوں اور زبانوں کا تعلق بھی تخلیقِ سموات سے ہے۔ مختلف علاقوں اور موسموں سے رنگ اور رہائیں بدل جاتی ہیں۔ انسان کے رنگ و زبان اور شکل و صورت کا موسمیات کے ساتھ گہرا ربط ہے۔

ہمارے دور کے علماء اور سائنس دان لوگوں کے رنگ اور زبانوں کے اختلاف کو دیکھتے ہیں اور کبھی انہوں نے اس پر غور نہیں کیا اور نہ وہ اس حقیقت کی طرف جاتے ہیں کہ اللہ کی تخلیقات کے یہ نمونے ہیں اور یہ کہ یہ باتیں بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ زبانوں کے اختلاف پر بہت ہی گہرا مطالعہ کرتے ہیں لیکن وہ اسے اللہ کی نشانی سمجھ کر اللہ تک پہنچنے کی سعی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ باوجود اس کے کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم سائنس دان ہیں مگر دراصل وہ سائنس دان نہیں ہیں۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۷:۳۰) ”یہ لوگ اس زندگی کے بھی بس ظاہری پہلو کو جانتے ہیں۔“ اور انسان اور علوم انسانی کا یہ پہلو کہ لوگوں کے رنگ مختلف ہیں اور زبانیں مختلف ہیں اسے صرف حقیقی علماء اور مومن سائنس دان ہی دیکھ سکتے ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۲:۳۰) ”بے شک اس میں نشانیاں ہیں صرف دانش مندوں کے لیے۔“

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَّنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

يَسْمَعُونَ (۳۰: ۲۳) ”اور اس کی نشانیں میں سے تمہارا دن کو سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور سے سنتے ہیں۔“ اس آیت میں بھی کائناتی مظاہر اور ان کے ساتھ انسانی احوال میں تبدیلی کی بات کی گئی ہے اور دونوں کے درمیان تعلق دکھایا گیا ہے۔ جس کے ذریعے اس عظیم الجثہ موجودات کے اندر ربط ظاہر ہوتا ہے اور ان کے درمیان ہم آہنگی بنائی جاتی ہے۔ شب و روز کے اختلاف کے ساتھ انسان کا سونا اور جاگن اور اس دنیا میں رزق حلال کے لیے جدوجہد کرنا مربوط ہے۔ رزق حلال کو یہاں فضل الہی سے تعبیر کیا گیا ہے بشرطیکہ وہ آرام کے بعد رزق حلال کے لیے جدوجہد کیں اللہ نے اس کائنات کو یوں بنایا ہے کہ وہ انسان کے لیے اس کی جدوجہد آسان کر دے اور وہ اس کرۂ ارض پر خوشگوار رہ سکے۔ اس جدوجہد کے لیے دن کی روشنی کو موزوں بنایا ہے۔ آرام اور راحت کے لیے رات کی تاریکی کو آسان بنایا ہے۔ یہ منظر اس کرۂ ارض پر رہنے والی بیشتر مخلوقات کے لیے ہے۔ ہر کسی کے لیے درجہ بدرجہ سہولت کا انتظام کیا گیا ہے۔ غرض نظام کائنات میں موجودات میں سے ہر موجود اپنے لیے سہولیات پاتا ہے اور یہ سہولیات اس کے لیے نہایت فطری ہیں۔ اس کی فطرت اور اس کی زندگی سے ہم آہنگ اور خوشگوار۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (۳۰: ۲۳) ”یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں۔“ نید سکون ہے اور سعی حرکت ہے۔ دونوں کا ادراک سننے سے ہوتا ہے۔ لہذا یسمعون کا لفظ قرآن کریم کے اسلوب بیان کے مطابق نہایت ہی موزوں ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يَرْيَكُمُ الْبَرْقُ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَآءً فَيُخْرِجُ بِهِ الْاَرْضَ

بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ (۳۰: ۲۴) ”اور اس کی نشانیں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے“ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“

بجلی کی چمک اس کائناتی نظام اور اس کی تخلیق کا ایک منظر ہے۔ بعض سائنس دانوں نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ بادلوں کے اندر بجلی موجود ہوتی ہے۔ جب ان کے دو ٹکڑے باہم ملتے ہیں تو اس ٹکراؤ سے بجلی کا ایک شرارہ بادلوں کے اندر پائے جانے والی بجلی کو مشتعل کر دیتا ہے یا یوں ہوتا ہے کہ یہ ہادل کسی پہاڑ کی چوٹی سے ٹکراتے ہیں اور ان سے یہ اشتعال پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے یہ بجلی چمک اٹھتی ہے۔ بالعموم اس چمک اور تصادم کے بعد بارش ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس کی حقیقت جو بھی ہو لیکن یہ اس کائنات میں دست قدرت کا ایک مظاہرہ ہے ایک خوفناک مظاہرہ۔ یہ اللہ کی ان قوتوں اور قدرتوں کا ظہور ہے جو اس نے اس کائنات میں ودیعت کی ہوئی ہیں۔

کا اسلوب بیشتر اوقات میں یہی ہے کہ وہ ان قدرتی مظاہر کی حقیقت اور ان کے سائنسی اسباب پر بات نہیں کرتا بلکہ ان مظاہروں سے صرف یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انسان کا دل و دماغ ان مظاہر کو دیکھ کر خالق تک رسائی حاصل کر لے۔ اس لیے قرآن مجید ان مظاہر سے یہی سبق عطا کرتا ہے کہ یہ قدرت الہیہ کی نشانیں ہیں سے ایک نشانی ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا (۲۴:۳۰) ”اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے۔ خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔“ یہ وہ احساسات ہیں جو بجلی کی چمک کے ساتھ انسان میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔ انسان ہر لمحہ بھی ہے کیونکہ یہ انسانوں اور فصلوں کو جلا دیتی ہے۔ اور پھر اس عظیم قوت اور چمک اور کڑک کہ نیم کر انسان کے اندر اس عظیم الیکٹرک کائنات کی قوتوں سے خوف پیدا ہو جاتا ہے اور طمع یوں پیدا ہوتا ہے کہ اکثر اوقات بجلی کے ساتھ بارش ہوتی ہے جو انسان کے لیے بہت ہی مفید ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے چمک اور کڑک کے ساتھ بارش کا ذکر کر دیا ہے۔ وَ يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْاَرْضَ

بَعْدَ مَوْتِهَا (۲۴:۳۰) ”اور آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ساتھ مردہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔“

زمین کی طرف مرنے کی نسبت اور پھر مرنے کے بعد اس کی طرف زندگی کی نسبت کر کے یہ تصور دیا جا رہا ہے کہ یہ زمین دراصل زندہ ہے۔ یہ بھی زندہ ہوتی ہے اور مرنے سے۔ اور حقیقت میں بھی یہ ایسی ہی ہے جس طرح قرآن کریم اس کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ یہ زمین بھی دراصل ایک زندہ مخلوق ہے۔ یہ اللہ کے حکم کا امتثال کرتی ہے۔ اپنے رب کی مطیع اور فرمانی بردار ہے۔ ہر وقت رب کے احکام پر لپک کھتی ہے۔ یہ اللہ کی بندگی میں ہے اور یہ انسان جو اس کرۂ ارض پر رنگ رہا ہے، یہ بھی اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ یہ بھی اس زمین کے ساتھ اللہ رب العالمین کے احکام کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔

مزید یہ کہ جب زمین پر بارش ہوتی ہے تو اس کے اندر سرسبزی اور شادابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے بڑھنے والی فصلیں اُگتی ہیں اور اس زمین کی سطح پر وہ لہلہاتی ہیں۔ یوں یہ زمین زندہ نظر آتی ہے۔ اس طرح جس طرح انسان اور حیوان زندہ ہوتے ہیں۔

اِنْ فِيْ ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ (۲۴:۳۰) ”یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔“ وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَاءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ

دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَا اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (۲۵:۳۰) وَلَهُ مَن فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

كُلُّ لَهٗ قَتْنُوْنَ (۲۶:۳۰) ”اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جوں ہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا، بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، اس کے بندے ہیں۔ سب کے سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔“

آسمانوں اور زمین کا انتظام و قیام نہایت ہی سلیم و متین انتظام ہے جس کی حرکات متعین ہیں اور ان میں ایک سیکنڈ کی تاخیر و تاخیر نہیں ہوتی۔ یہ اللہ جل شانہ کی مدبر سے ہے۔ کوئی مخلوق یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ یا اس کے سوا کوئی اور یہ انتظام کر رہا ہے اور کوئی عقلمند شخص اس بات کا قائل نہیں ہو سکتا کہ یہ سب کچھ بغیر کسی کرنے والے مدبر کے ہو رہا

ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ اللہ کے معجزات میں سے ایک معجزہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ زمین و آسمان اللہ کے کھڑے کرنے سے کھڑے ہیں۔ اللہ کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں اس کے مطیع فرمان ہیں۔ ان میں کوئی سرتابی، انحراف اور اضطراب نہیں ہے۔

ثُمَّ إِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْأَرْضِ إِذَا أَنْتُمْ تَعْرِجُونَ (۲۵:۳۰) ”پھر جو نبی کہ اس نے ہمیں زمین سے پکارا پس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔“ جو سائنس دان بھی اللہ کے اس نظام اور ان اندازوں اور ان قدرتوں پر غور کرے وہ اللہ کی اس دعوت کے جواب میں لبیک ہی کہہ سکتا ہے کہ جب اللہ پکارے گا تو لوگ خود کار طریقوں سے نکل آئیں گے۔

اب یہاں اس بیان اور مضمون کا خاتمہ آتا ہے اور اس میں بتایا جاتا ہے کہ انسان، حیوان، نباتات و جمادات سب کے سب اللہ کے مطیع فرمان ہیں۔

وَلَهُ مَن فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ لَه قَانِتُونَ (۲۶:۳۰) ”اور آسمان و زمین میں جو ہیں اس کے بندے ہیں۔ سب کے سب اس کے تابع فرمان ہیں۔“ مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان میں جو مخلوق بھی ہے وہ اللہ کے بندے ہیں، طوعاً و کرہاً مطیع فرمان ہیں اور یہ سب کچھ اللہ کی سنت کے مطابق چلتے ہیں اور ان میں نہ تخلف ہو سکتا ہے اور نہ انحراف ہو سکتا ہے۔ سب چیزیں اللہ کی سنت اور مشیت کی محکوم ہیں۔ دینی اعتبار سے وہ مومن ہوں یا کافر ہوں۔ اگرچہ ان کا دل اور دماغ کافر ہوتا ہے لیکن ان کا پورا جسم اور ان کے گرد پھیلی ہوئی یہ پوری کائنات اللہ کی مطیع ہے۔ جس طرح کائنات کی دوسری اشیاء سنت الہیہ کے لیے قانت اور مطیع ہیں اسی طرح انسان بھی ہے۔ رب کائنات کا یہ گمراہ، طویل اور عظیم سفر آخری اور اہم بات پر ختم ہوتا ہے کہ ایک دن تم نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے لیکن تم اس دن سے غافل ہو۔

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي

السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲۷:۳۰) ”وہی اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔“

اس سورہ میں آغاز تخلیق اور اعادہ تخلیق کا ذکر پہلے بھی ہوا ہے۔ اس طویل سفر اور کائنات کی میر کے بعد از سر نو اس کا ذکر اس حصے سے کیا جاتا ہے۔

وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ (۲۷:۳۰) ”اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے۔“ حالانکہ اللہ کے لیے کوئی چیز نہ آسان ہے اور نہ مشکل ہے اس کا معاملہ تو یہ ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ”اس کا معاملہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا

ارادہ کرتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا' پس وہ ہو جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس انداز میں سمجھاتے ہیں جس طرح 'اللہ جانتا ہے کہ وہ سمجھ سکتے ہیں۔ لوگوں کے ہاں پہلی تخلیق سے اعادہ آسان ہوتا ہے لیکن وہ خود اپنے تجربات کے خلاف جاتے ہیں کہ ابتدائی تخلیق سے اعادہ مشکل ہے۔ حالانکہ اعادہ آسان ہونا چاہئے۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (۲۷:۳۰) ”آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے۔“ وہ آسمانوں اور زمین میں منفرد ہے۔ اس کی ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ وہ اکیلا اور مید ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲۷:۳۰) ”وہ زبردست اور حکیم ہے۔“ زبردست ہے اور قاہر ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکیم ہے جو بھی کرتا ہے حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کا کیا نہایت ہی پختہ اور پورا پورا ہوتا ہے۔ کامل مکمل۔

اس عظیم مطالعاتی سفر کے اختتام پر 'جس میں ہم نے اس کائنات کے آفاق 'طول و عرض' اس کے ظاہری احوال اور اس کی گہرائیوں کا سفر کیا' جس میں ہم نے مناظر بھی دیکھے اور حقائق بھی اخذ کیے 'اب سیاق کلام میں عقل و خرد کی تہذیبوں پر آخری ضرب لگائی جاتی ہے۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِّنْ أَنفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ
مِّنْ شُرَكَاءَ فِي مَا رَزَقْتَكُمْ فَأَنْتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ تَخَافُونَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنفُسَكُمْ
كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۴۱﴾

”وہ ہمیں خود تمہاری اپنی ہی بات سے ایک مثال دیتا ہے۔ کیا تمہارے ان غلاموں میں سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں 'کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو ہمارے دیئے ہوئے مال و دولت میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہوں اور تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے ہمسروں سے ڈرتے ہو۔ اس طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“

یہ مثال ان لوگوں کے لیے دی گئی ہے جو اللہ کی مخلوق میں سے کسی مخلوق کو اللہ کا شریک بناتے ہیں۔ چاہے جن ہوں 'چاہے ملائکہ ہوں 'پھر ہوں یا درخت ہوں 'لیکن ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود اپنے مالوں میں 'اپنے نوکرہوں اور غلاموں کو شریک نہیں کرتے۔ اپنے غلام کو شریک کیا 'اپنے برابر انسان کا درجہ بھی نہیں دیتے۔ لہذا ان کا یہ رویہ بہت ہی عجیب ہے کہ وہ اللہ کا شریک ان لوگوں کو بناتے ہیں جو اللہ کی مخلوق ہیں جبکہ اپنے زیر دستوں کو اپنے مالوں میں شریک نہیں کرتے۔ یہ ان کا مال خود ان کا تخلیق کردہ بھی نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کا تخلیق کردہ ہے۔ لہذا ان کے موقف میں یہ واضح

تضاد ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اس تمثیل کو نہایت ہی سدرتِ جلال کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِّنْ أَنْفُسِكُمْ (۲۸:۳۰) ”وہ تمہیں خود تمہاری اپنی ہی ذات سے مثال دیتا ہے۔“ یہ مثال تمہاری عملی زندگی سے دور نہیں ہے کہ تم اسے سمجھ نہ سکو۔ اس کے ملاحظے کے لیے کسی دور دراز علاقے کا سفر ضروری نہیں ہے۔

هَلْ لَّكُمْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاءَ فِي مَآ رَزَقْنَكُمْ فَإِنَّكُمْ فِيهِ سَوَاءٌ

(۲۸:۳۰) ”کیا تمہارے ان غلاموں میں سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں، کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو تمہارے دیئے ہوئے مال و دولت میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہوں۔“ ظاہر ہے کہ مشرکین مکہ تو یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ ان کے غلام ان کی دولت میں شریک ہوں چہ جائیکہ ان کے حقوق ان کے ساتھ مساویانہ ہوں۔

تَخَافُوهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ (۲۸:۳۰) ”اور تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے آپ سے ڈرتے ہو۔“ یعنی ان کو وہی مرتبہ و مقام دیتے ہو جو تم آپس میں اپنے آزاد شرکاء کو دیتے ہو۔ اور تم ڈرتے ہو کہ وہ تم پر ظلم کس گے اور تم ان کے ساتھ ظلم کرنے سے احتیاط کرتے ہو کیونکہ ان کو تمہارے ساتھ برابر کا مقام و مرتبہ حاصل ہے کیا تمہارے ماحول میں اور خود تمہارے معاشرے میں ایسا ہوتا ہے؟ اگر خود تم اپنے غلاموں کے ساتھ مساویانہ سلوک نہیں کرتے ہو اور نہ اس پر راضی ہوتے ہو تو بتاؤ کہ ملاءِ اعلیٰ کے بارے میں کیونکر ایسی بات سوچتے ہو۔

یہ ایک واضح، سادہ اور فیصلہ کن مثال ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر کوئی جدل و جدال نہیں رہتا۔ یہ مثال ایک نہایت ہی سادہ استدلال اور عقل سلیم پر مبنی ہے۔

كَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ الْقِصَّةَ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۲۸:۳۰) ”اسی طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“

ان کے عقائد کے اس پوچ تضاد کو یہاں تک کھول کر بیان کر دینے کے بعد اب یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے عقائد کے اندر یہ تضاد پیدا کیوں ہوا۔ اس کا اصل سبب کیا ہے۔ صرف یہ کہ ان کا نفس یہی چاہتا ہے اور جب کوئی شخص خواہشاتِ نفسانیہ کا غلام ہو جائے تو پھر عقل و بصیرت سے محروم ہو جاتا ہے۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَمَنْ يَهْدِي

مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ وَمَا لَهُمْ مِّنْ مُّصْرِئِينَ ﴿۲۹﴾

”مگر یہ ظالم بے سمجھے ہوئے اپنے تعیلات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ اب کون اس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو“ ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔

ہوائے نفس کا پھر نہ کوئی معیار ہوتا ہے اور نہ کوئی ضابطہ ہوتا ہے۔ بس نفس انسانی کی بدلتی ہوئی خواہشات آگے آگے ہوتی ہیں اور انسان ان کے پیچھے ہوتا ہے۔ جس طرف میلان ہوا اسی طرف ڈھل گیا۔ جہاں کوئی ڈر ہوا رک گیا۔ جہاں ذرا بھی امید ہو اور لالچ پیدا ہوا وہ ذکر آگے بڑھ گیا۔ نہ ایسا شخص کسی حد پر رکتا ہے نہ حق و باطل کا غلط رکھتا ہے اور نہ حلال و حرام کی تمیز کرتا ہے اور نہ اپنے تصورات و اعمال کو کسی ترازو میں تولتا ہے۔ جب کوئی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کی ہدایت کی کوئی امید نہیں رہتی، ایسا شخص گمراہی کی راہوں پر اس قدر دور چلا جاتا ہے کہ واپسی کی کوئی امید نہیں رہتی۔

فَمَنْ يَهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ (۲۹:۳۰) ”اب کون اس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو“۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ شخص ہوائے نفس کا مطیع فرمان ہو گیا ہے۔

وَمَا لَهُمْ مِنْ نَّاصِرِيْنَ (۲۹:۳۰) ”ایسے لوگوں کا کوئی مددگار نہ ہو گا“۔ جو ان کو اس برے انجام سے بچا سکتا ہو۔

اب ان لوگوں کی بات ختم ہو جاتی ہے جو اس دنیا میں بدلتی ہوئی خواہشات کی بندگی کرتے ہیں اور جن میں ہر وقت اضطراب رہتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ اپنے دین حق پر قائم رہیں جو دین فطرت ہے۔ جو مضبوط دین ہے اور اس دین اور لوگوں کی فطرت کے درمیان مکمل موافقت ہے، کیونکہ فطرت کا خالق اور لوگوں کا خالق اور اس دین کا شارع ایک ہے۔ یہ وہ واحد عقیدہ اور نظریہ اور طرز عمل ہے جو صراط مستقیم پر لے جاتا ہے۔ اس سے ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ جس طرح کفار کی راہیں ہر وقت بدلتی رہتی ہیں۔ ہر روز کی خواہشات کے لیے ایک نیا دین ہوتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنْ اَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰﴾ مُنِيبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۱﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۱۲﴾

”پس (اے نبیؐ) اور نبیؐ کے پیرو (یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو) قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس

طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی، یہی بالکل راست اور درست دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے، اور ڈرو اس سے، اور نماز قائم کرو، اور نہ ہو جاؤ ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین لٹک بنا لیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ گمن ہے۔“

یہ ہدایت نہایت بروقت آتی ہے کہ اپنی توجہات اس دین کی طرف کر دو۔ یہ ہدایت اس وقت آتی ہے جب قرآن نے انسانی فکر کو اس کائنات کی ماہیت، اس کائنات کے مناظر، نفس انسانی کی گہرائیوں اور اس کی فطرت کے تشبہ و قیاس میں خوب سمھایا اور دوڑایا۔ اس سیر اور مطالعہ کے بعد سلیم الفطرت ذہن تسلیم کرنے اور استقبال حق کے لیے تیار ہوتا ہے۔ لہذا یہ ہدایت کہ تم لوگ اپنے چہرے کو دین ضیف کی طرف پھیر دو، بہت بروقت ہدایت ہے۔ اس کے مقابلے میں منحرفین اور مکذبین کی حالت یہ ہے کہ ان کے سامنے عقل و خرد اور دلیل و برہان کے تمام ہتھیار کند ہو گئے اور انہوں نے مان کر دینے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ باوجود اس کے کہ یہ ان کے پاس کوئی دلیل اور حجت نہیں ہے۔ یہ ہے وہ دلیل اور برہان ناسخ اور لا جواب انداز گفتگو جس کے ذریعہ قرآن کریم حق کو پیش کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی عقل نہر نہیں سکتی اور نہ فطرت سلیمہ انکار کر سکتی ہے۔

فَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا (۳۰: ۳۰) ”پس یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جم دو۔“ اور سیدھے سیدھے اس دین کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ کیونکہ یہی دین ایسا ہے جو انسان کو متفرق خواہشات سے بچا سکتا ہے ان خواہشات کی پشت پر حق بالعموم نہیں ہوتا۔ یہ علم اور تحقیق پر مبنی نہیں ہوتی۔ یہ محض طبعی شہوت اور مادی میلانات پر مبنی ہوتی ہیں اور ان کی پشت پر کوئی ضابطہ اور کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ لہذا اتمام سنتوں کو چھوڑ کر دین اسلام کی سمت اختیار کر لو۔ سیدھے سیدھے۔ اس کے سوا تمام سنتوں کو پس پشت ڈال دو۔

فَطَرَتِ اللَّهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ (۳۰: ۳۰) ”اس فطرت پر جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدل نہیں جاسکتی۔“ یوں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ فطرت انسانی اور اس دین کے اندر گہرا ربط ہے۔ یعنی دونوں اللہ کی مصنوعات و تخلیقات ہیں۔ دونوں اس ناموس کے مطابق ہیں جو اس کائنات کی روح بنے اور دونوں ایک دوسرے کے موافق اور ہم رخ اور ہم سمت ہیں۔ جس خدا نے انسان کو پیدا کیا اسی نے یہ دین نازل کیا کہ یہ انسانوں کی زندگیوں میں نافذ ہو اور انسانوں کی پوری زندگی اس کے مطابق چلے۔ یہ دین ہی فطرت انسانی کا علاج ہے، اسے روحانی بیماریوں سے بچاتا ہے اور صحیح راہ سے منحرف ہونے نہیں دیتا۔ کیونکہ اللہ اپنی مخلوق کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہے۔ وہ تو نہایت باریک بین اور بہت بڑا خبردار ہے۔ جس طرح فطرت ثابت ہے اسی طرح دین بھی ثابت اور مستحکم ہے۔

لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ (۳۰: ۳۰) ”اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدل نہیں سکتی۔“ جب نفس انسانی فطری راہ سے منحرف ہو جائے تو صرف یہی دین اسے فطرت کی راہ پر ڈال سکتا ہے کیونکہ فطرت کائنات، فطرت انسانی اور

نظرت دین لیک ہی ہیں۔

ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۳۰:۳۰) ”یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں“۔ چنانچہ وہ بغیر علم کے اپنی خواہشات کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ اور یوں راہ راست سے ہلک کر بہت دور چلے جاتے ہیں۔“

یہ حکم کہ اپنے چہرے کو دین قیم کی طرف کرنا اگرچہ لفظاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن اس کے اندر تمام نفل ایمان بھی آتے ہیں لہذا آگے کی تفصیلات میں ان کو بھی شامل کر دیا گیا۔

مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۳۱:۳۰)

مَنْ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۲:۳۰) ”اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے“ اور اردو اس سے ”اور نماز قائم کرو“ اور نہ ہو جاؤ ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے اور گردہوں میں بٹ گئے ہیں ”ہر ایک گردہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ ٹھن ہے۔“

اہمیت سے مراد اللہ کی طرف رجوع ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں۔ جب انسان کے اندر اللہ کا خوف پیدا ہوتا ہے اور وہ حساس ہو جاتا ہے تو وہ خفیہ اور کھلے بندوں ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ہر حرکت اور ہر سکون میں اسے خدا کا شعور ہوتا ہے۔ پھر وہ اس شعور اور حساسیت کے اعلیٰ مقام صلوٰۃ کی طرف دوڑتا ہے۔ اس شعور سے تمام ماسوا اللہ مٹ جاتا ہے لہذا وہ موحّد ہو جاتا ہے اور مشرکین سے جدا ہو جاتا ہے اور مشرکین کون ہوتے ہیں۔

الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا (۳۲:۳۰) ”جسوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا اور گردہوں میں بٹ گئے۔“ شرک کے بھی کئی رنگ اور اقسام ہیں۔ بعض لوگ جنوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض ملائکہ کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض آباء اجداد کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض ملوک و سلاطین کو، بعض کاہنوں اور مولویوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض پتھروں اور درختوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض سیاروں اور ستاروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض آگ کو شریک ٹھہراتے ہیں، بعض رات اور دن کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض جھوٹی اقدار کو شریک ٹھہراتے ہیں اور بعض خواہشات اور اغراض کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض ہیروں اور فقیروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ غرض شرک کی بے شمار قسمیں ہیں اور

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۲:۳۰) جبکہ دین قیم ایک ہے اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ دین حق کے پیروکار صرف ایک اللہ ایک قبلہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس اللہ کی طرف جس نے ان آسمانوں کو تمام رکھا ہے۔ وہ آسمانوں کا بھی بادشاہ ہے اور زمین کا بھی اور سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔

---○○○---

درس نمبر ۸۴ نظر میں

اس سورہ کا یہ سفر اور یہ باب اس کے حقیقی موضوع پر ہے۔ یعنی اس کائنات کے واقعات و حادثات اور انسانی زندگی کی اقدار و حادثات کے اندر گہرا ربط ہے۔ اس کائنات کے قوانین قدرت، اس زندگی کے قوانین فطرت اور اس دین کے قوانین شریعت باہم موافق، ہم آہنگ، مربوط اور بلا تضاد ہیں۔

اس سبق میں بتایا جاتا ہے کہ انسانی خواہشات تو بدلتی رہتی ہیں لیکن سنت الہیہ کے اندر کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ دین قیم کے اصولوں کے مقابلے میں شرکیہ عقائد پائے چوبیس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر اس سبق میں انسانی نفس کی کیفیات کی مختلف حالات میں تصویر کشی کی گئی ہے۔ حالت امن میں نفس انسانی کی حالت کیا ہوتی اور حالت خطرہ میں کیا ہوتی ہے۔ روح کی قبض کی حالت میں وہ کیا ہوتا ہے اور بسط کی حالت میں کیا کرتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب تک انسان اللہ کے پیانوں کے مطابق اپنی اقدار اور تصورات کا ناپ و تول نہ کرے اس وقت تک انسانی قدروں اور اس کی روح میں ٹھہراؤ اور سکون نہیں آسکا۔ ہاں جب انسان اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو کسی کا رزق کشادہ کرتا ہے اور کسی کا تنگ کرتا ہے۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں رزق اور مال کو بڑھانے کا بھی ایک مضبوط طریقہ ہے۔ کس طریقے سے مال بڑھتا ہے اور کس سے گھٹتا ہے۔ کس سے پاک ہوتا ہے اور کس سے ناپاک ہوتا ہے اور مالیت کا قانون بھی وہی درست اور قیم ہو گا جو دین قیم کے مطابق ہو اور اس سے ماخوذ ہو۔ اس کے بعد سامعین کو لوٹا کر اس ذات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو خالق اور رازق اور زندگی دینے والا اور مارنے والا ہے۔ اللہ کے سوا جن ہستیوں کو تم شریک ٹھہراتے ہو، وہ تو یہ کام نہیں کر سکتے۔ بتایا جاتا ہے کہ ہر زمان و مکان میں شرک موجب فساد ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو دوبارہ یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ اس راست اور درست دین پر جم جائیں۔ اور جو کچھ کمانا ہے اس دن کے آنے سے قبل ہی کمالیں جہاں کوئی عمل اور کوئی کمائی نہ ہوگی۔ وہاں تو اعمال کا حساب و کتاب ہو گا۔ اس کے بعد ان کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے ان کے لیے کیا کیا سہولیات دنیا میں پیدا کی ہیں۔ بعض چیزیں ان کی حیات مادی کے لیے ہیں، مثلاً پانی آسمانوں سے برستا ہے اور زمین زندہ اور تروتازہ ہو کر تمہارے لیے سب کچھ پیدا کرتی ہے۔ پھر سمندروں میں تمہارے لیے کشتی رانی کا سامان اور تمہاری روحانی زندگی کے لیے یہ آیات چمنات ہیں جو رسول اللہ پر اتر رہی ہیں۔ جن سے دل و دماغ زندہ اور سرسبز ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگ نہ ہدایت لیتے ہیں اور نہ سنتے ہیں۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنی دنیا میں زندہ رہ کر اللہ رب العالمین کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اس دن پھر کسی سے کوئی معذرت قبول نہ ہوگی اور نہ معافی کی درخواستیں طلب ہوں گی اور آخر میں رسول اللہ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ طاعت قدمی سے اپنا کام جاری رکھیں، صبر کریں یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ۔۔۔ سب بن کر سامنے آجائے۔ اللہ کا وعدہ حق یقین ہے اور اٹل ہے۔

درس نمبر ۸۴ تشریح آیات

۳۳ --- تا --- ۶۰

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا
 أَذَقَهُمْ مِنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا
 آتَيْنَاهُمْ فَتَمَتَّعُوا فَتَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿۳۴﴾ أَمَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا
 كَانُوا بِهِ يَشْرِكُونَ ﴿۳۵﴾ وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا وَإِنْ
 تُصِيبَهُمْ سَيِّئَةٌ يَبَاسًا قَدَّامَتْ أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ ﴿۳۶﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا
 أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ
 يُؤْمِنُونَ ﴿۳۷﴾

”لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتے ہیں پھر جب وہ کچھ اپنی رحمت کا ذائقہ انہیں چکھا دیتا ہے تو یکایک ان میں سے کچھ لوگ شرک کرنے لگتے ہیں تاکہ ہمارے کیے ہوئے احسان کی ناشکری کریں۔ اچھا، مزے کر لو، مغرب ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا ہم نے کوئی سند اور دلیل ان پر نازل کی ہے جو شہادت دیتی ہو اس شرک کی صداقت پر جو یہ کر رہے ہیں؟ جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں اور جب ان کے اپنے کیے کر تو توں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے جس کا چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے (جس کا چاہتا ہے) یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔“

یہ ایک ایسے انسان کی نفسیاتی تصویر ہے جس کو پختہ رنگوں سے نہیں بنایا گیا۔ جو مستقل اقدار حیات نہیں رکھتا اور

جس کے سامنے واضح منہاج حیات نہیں ہے۔ اس شخص کا نفس وقتی اغماط اور وقتی تاثرات کے درمیان ڈول رہا ہے جو تصور رہن میں آیا اس کی طرف لپکا۔ حادثات اور وقتی واقعات کی وجہ سے وہ بدلتا رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں 'رب کو یاد کرتے ہیں اور اس حقیقی قوت کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جس کے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہوتا۔ اور اس کے دربار میں گڑگڑانے کے سوا کوئی نجات نہیں ہوتی۔ اور جب مشکلات کے باد چھٹ جاتے ہیں اور سختی دور ہو جاتی ہے اور اللہ کی رحمت آ جاتی ہے۔

اِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ (۳۰:۳۳) "تو یکایک ان میں سے کچھ لوگ شرک کرنے لگتے ہیں۔" یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو صحیح عقیدے کا سہارا نہیں لیتے۔ جن کی قدریں مستقل نہیں ہوتیں۔ کیونکہ اللہ کی رحمتیں اور دنیا کی سہولیات ان کو ان مجبوریوں سے نکال دیتی ہیں جن کی وجہ سے ایسے لوگ اللہ کی طرف متوجہ تھے۔ وہ اچانک اپنے وہ مشکل کے دن بھول جاتے ہیں جن میں وہ خدا کو یاد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اللہ کی دی ہوئی ہدایت کی ناشکری کر کے اور اللہ کی رحمتوں کو چھوڑ کر کفر کی طرف چلے جاتے ہیں حالانکہ حالت رحمت میں خصوصاً مصیبت کے بعد رحمت میں ان کو تو شکر اور انابت الی اللہ پر جم جانا چاہئے تھا۔

ایسے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود تھے 'اللہ بھی نہایت مختصر الفاظ میں جلدی سے ان کو دھمکی دیتے ہیں اور ان کو یوں خطاب ہوتا ہے۔ حضور اکرمؐ کے دور کے متعین افراد پیش نظر ہیں۔ اس لیے خطاب کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ (۳۰:۳۴) "اچھا 'مزے کر لو' عتریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" یہ سخت خوفناک تحدید ہے۔ اگرچہ براہ راست نہیں ہے۔ انسان کی حالت تو یہ ہے کہ وہ ایک معمولی حاکم اور رئیس کی دھمکی سے بھی ڈرتا ہے۔ اللہ جل شانہ کی دھمکی تو بہت ہی خوفناک ہے کیونکہ اللہ کے سامنے کوئی بات مشکل نہیں ہے۔ ہر بات لفظ کن ہے وجود میں آ جاتی ہے۔

فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ (۳۰:۳۴) "اچھا 'مزے کر لو' عتریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

جلدی اور اختصار کے ساتھ یہ دھمکی دینے کے بعد اب ان کے اس موقف پر سخت برہمی کے ساتھ گرفت کی جاتی ہے کہ یہ اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں کے باوجود شرک کرتے ہیں اور کفر کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ آخر اس پر ان کے پاس کیا دلیل ہے؟

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهٖ يُشْرِكُونَ (۳۰:۳۵) "کیا ہم نے کوئی سند اور دلیل ان پر نازل کی ہے جو شہادت دیتی ہو 'اس شرک کی مبدلت پر جو یہ کر رہے ہیں۔" اس لیے کہ کسی شخص کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے عقائد و نظریات اللہ کے سوا کسی اور ماخذ سے لے۔ کیا ہم نے کوئی دلیل شرک پر نازل کی ہے؟ نہیں۔ یہ سخت سرزنش اور استکباری سوال ہے۔ نیز اس میں حرج اور حقارت کا رنگ بھی ہے۔ مقدمہ یہ ہے کہ ان کا یہ رویہ نہایت ہی احمقانہ ہے۔ اس پر کوئی حجت اور دلیل اور سلطان نہیں ہے۔ دوسرے

الفاظ میں یہ ایک تقریری سوال بھی ہے۔ معلوم یہ ہے کہ کوئی عقیدہ اللہ کی نازل کردہ وحی کے بغیر ثابت نہیں ہوتا۔ جب اللہ نے شرک پر کوئی دلیل نہیں تیار کی تو گویا عقیدہ شرک باطل ہے۔ بے اصل ہے، ضعیف ہے۔

اب انسان کی ایک دوسری نفسیاتی تصویر۔ جب وہ خوش حال اور خوش و خرم ہوتا ہے تو وہ ہلکا اور مغرور ہو جاتا ہے۔

وَ اِذَا آدَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا وَ اِنْ تُصِيبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيهِمْ اِذَا

هُمْ يَقْنَطُوْنَ (۳۰: ۳۶) ”جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر بھول جاتے ہیں اور جب ان کے اپنے کیے کر تو توں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں۔“

یہ بھی ایک ایسے شخص کی نفسیاتی تصویر ہے، جو اپنے معاملات کی ماہیت کو ایک مستقل پیمانے کے مطابق سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ ان کا رویہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہر حال میں ایک معیار اور پیمانہ ان کے سامنے رہے۔ ایسا مستقل پیمانہ کہ وہ کبھی بدلتا نہیں۔ یہاں مراد وہ لوگ ہیں جن کی قدریں اور پیمانے مستقل اور دائمی نہیں ہوتے۔ جب اچھے دن آتے ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور یہ اچھے دن عطا کرنے والے کو بھول جاتے ہیں اور ہوا میں ہوتے ہیں۔ عیش و عشرت میں غرق ہو جاتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے جو منعم حقیقی ہے اور وہ یہ بات پیش نظر نہیں رکھتے کہ اللہ کی رحمت اور خوشحالی بھی ایک امتحان ہوتا ہے لیکن جب اللہ کی مشیت ان کی اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے ان پر مصیبت لاتی ہے تو پھر وہ اندھے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ یقین نہیں کرتے کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے اور یہ بد حالی کی آزمائش ہے۔ لہذا اللہ کو یاد رکھیں اور صبر کریں کہ وہ مشکلات دور کر دے۔ اس کے بجائے وہ مایوس ہو جاتے ہیں اور وہی توانی کہتے ہیں۔ یہ تصویر ان دلوں کی ہے، جو اللہ سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو نہ سنن الہیہ کو جانتے ہیں نہ حکمت الہیہ ان کے سمجھ میں آتی ہے۔ یہ لوگ دراصل نہیں جانتے۔ بے علم ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کے ظاہری حالات کو دیکھ کر ہی فیصلے کرتے ہیں۔

اس نفسیاتی تصویر کشی کے بعد ایک سخت تہدید کی سوال کیا جاتا ہے جس میں ان کے معاملے پر سخت تعجب کا اظہار بھی ہے۔ ان کے اندھے پن اور بے بصیرتی پر ماتم بھی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ خوشحالی اور بد حالی دونوں اللہ کے ایک مستقل قانون قدرت کے مطابق آتی ہیں۔ ان کا تعلق سنن الہیہ اور اللہ کی مشیت سے ہے کیونکہ رحمت بھی وہی کرتا ہے اور مصیبت بھی وہی لاتا ہے۔ وہی رزق میں کشادگی کرتا ہے اور وہی تنگی کرتا ہے۔ سب کچھ اس کی حکمتوں کے تقاضے کے مطابق ہوتا ہے۔ اس جہان میں ہر وقت اس اصول کے مطابق واقعات ہوتے رہتے ہیں لیکن لوگ اندھے بن جاتے ہیں، دیکھتے ہی نہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يَقْدِرُ (۳۰: ۳۷) ”کیا یہ لوگ دیکھتے

نہیں ہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے، جس کا چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے۔“ لہذا جب رزق کشادہ ہو جائے تو تکبر اور غرور نہ کرنا چاہئے۔ پھولنا مناسب نہیں ہے اور جب رزق تنگ ہو جائے تو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تو عارضی حالات ہوتے ہیں، حکمت الہیہ کے مطابق آتے رہتے ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے قلب مومن تو یقین کر لیتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کا ہے۔ سنت الہیہ اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اللہ کا نظام مستقل ہے۔ اس کی حکمت کے مطابق روز و شب بدلتے رہتے

ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّٰمِنُوْنَ (۳۷۰۳۰) ”یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔“ چونکہ رزق کی کشمکش اور رزق کی تنگی صرف اللہ کے اختیار میں ہے، وہی ہے جو دیتا ہے اور وہی ہے جو روکتا ہے اپنی مشیت کے مطابق لہذا وہ تمہیں بتا دیتا ہے کہ تمہاری معیشت کی ترقی کی راہ کون سی ہے اور وہ کون سی معیشت ہے جو ترقی نہیں کرتی۔ حالانکہ لوگ اسے ترقی پذیر معیشت سمجھتے ہیں، ہدایت ہوتی ہے۔

قَاتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمَسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا اَتٰکُمْ مِّنْ رَّبٍّۢ لَّیْرٍۭۤ اَوْ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرٰیۤہُمْ عِنْدَ اللّٰہِ وَمَا اَتٰکُمْ مِّنْ زَکٰوٰۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُضْطَرِعُوْنَ ﴿۳۹﴾

”پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافروں کو (اس کا حق)۔ یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو اسی کے دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں۔“

جب تصور یہ ہے کہ تمام دولت اللہ کی ہے اور اللہ نے اپنے بندوں میں سے بعض کو زیادہ اور بعض کو کم دے رکھی ہے۔ اس تصور کے مطابق اللہ تعالیٰ تمام اموال کا مالک اول ہے۔ تو وہ حکم دیتا ہے کہ جو لوگ نادار ہیں ان کی طرف دولت کو منتقل کیا جانا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اسے ناداروں کا حق کہا ہے۔ یہاں ان ناداروں میں بعض لوگوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

وَالْمَسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ (۳۸۰۳۰) ”رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں“۔ جس دور میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اس میں زکوٰۃ کا تقین نہ ہوا تھا۔ نہ اس کے مستحقین کے مدد کا تقین ہوا تھا۔ اصولاً یہ بات متعین کر دی گئی تھی کہ تمام مال دراصل اللہ کی ملکیت میں ہے کیونکہ رازق اللہ ہے۔ محتاج لوگوں کا اس مال میں ایک حق متعین ہے اور یہ حق مال کے اصل مالک نے دیا ہے۔ یہ حق ان تک اس شخص کے واسطے سے پہنچتا ہے جس کے ہاتھ میں مال جمع ہے۔ مال کے بارے میں اسلام کا یہ بنیادی نظریہ ہے۔ اسلام کے اقتصادی اور معاشی نظریات کی اساس یہی تصور ہے کہ اصل مالک اللہ ہے۔ جب مال اللہ کا ہے تو اللہ کی جانب سے عائد شدہ واجبات سب سے پہلے ادا ہوں گے۔ مال کے بارے میں اللہ کے احکام ملکیت ہوں یا احکام اتفاق ہوں یہ سب لازمی احکام ہیں اور مال کا قابض آزاد نہیں ہے کہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔

اب یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جن کو اس نے بطور امانت یہ مال دیا ہے کہ تم لوگ کس طریق کار کے مطابق اس مال کو بڑھاؤ گے اور ترقی دو گے۔ بڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے رشتہ داروں، مسافروں اور مسکینوں پر

خرچ کیا جائے۔ یہ سب اللہ کے راستے میں خرچ ہو گا۔

ذَلِكَ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۳۸:۳۰) ”یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔“

بعض لوگ اپنا مال بطور ہدیہ مالدار لوگوں کو دیتے تھے تاکہ وہ ہدیہ کے جواب میں زیادہ لوٹا دیں۔ دو گنا ’تین گنا‘ تو اللہ نے جایا یہ مال بڑھانے کا طریقہ نہیں ہے۔

وَمَا آتَيْتُم مِّن رَّبًّا لِّيرَبُّوا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرَبُّوا عِنْدَ اللَّهِ (۳۹:۳۰) ”اور جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے تو اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا۔“ روایات میں اس آیت کا یہی مفہوم دیا گیا ہے لیکن قرآن کی نص عام ہے اور وہ تمام سودی معاملات اس کی زد میں آتے ہیں جن کے ذریعے سے لوگ مال بڑھاتے ہیں چاہے اس کی شکل و صورت جو بھی ہو۔ رہا کہ طریق کے مطابق مال بڑھانے کے بجائے یہ دیا گیا کہ حقیقی ترقی کی صورت کیا ہے۔

وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُضَعِفُونَ (۳۹:۳۰) ”اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی کے لیے دیتے ہو اس کے دینے والے درحقیقت اپنا مال بڑھاتے ہیں۔“ یہ ہے وہ ذریعہ اور طریقہ جو مال کے بڑھانے کا یقینی طریقہ ہے۔ یعنی مال مفت عطا کرو کسی جوہلی انعام کا انتظار نہ کرو کوئی محاذضہ نہ ہو۔ خالص فی سبیل اللہ اور لوجہ اللہ خرچ کر داس لیے کہ وہی اللہ ہے جو رزق میں کسادگی عطا کرتا ہے اور وہی رزق کو تنگ کرنے والا بھی ہے۔ دینے والا اور روکنے والا وہی ہے۔ جو لوگ اللہ کے لیے خرچ کرتے ہیں وہ ان کو کئی گنا زیادہ دیتا ہے اور جو لوگ لوگوں کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں ان کے اموال میں وہ کمی کرتا ہے۔ یہ سودی کاروبار دنیا کا انتظام ہے اور وہ حسب آخرت ہے اور اس میں کمی گنا مال ملتا ہے۔ یہی نفع بخش تجارت ہے یہاں بھی اور وہاں بھی۔

اب رزق اور کسب کے زادیہ سے شرک کے مسئلہ کو لیا جاتا ہے۔ موجودہ لوگوں میں شرک کے آثار اور امم سابقہ میں شرک کے آثار جمائے جاتے ہیں۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ هَلْ

۴ مِّنْ شُرَكَائِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِثْلَ ذَلِكَ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا

۵ يُشْرِكُونَ ﴿۱۰﴾ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

۶ لِّئَلَّا يَقَهُمُ بَعْضُ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۱﴾ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ

فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِينَ ﴿۱۲﴾

”اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تمہیں رزق دیا، پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے، پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو؟ پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ فحش اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے۔ لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ حرہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا شاید کہ وہ باز آئیں۔ (لے نبیؐ) ان سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو۔ پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے، ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔“

اللہ ان کی زندگی کی حقیقی صورت حال ان کے سامنے رکھتے ہیں اور ان کے ایسے حالات ان کے سامنے پیش فرماتے ہیں جن کے بارے میں انہیں شک نہیں ہے کہ ان حالات کا موجد اللہ ہے، یا ایسے حالات جن کے بارے میں وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے مزعومہ خدا اور اللہ ان حالات کے موجد ہیں، یا شریک ہیں، یہ کہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ وہی ہے جو تمہارا رازق ہے، وہی تمہیں مارتا ہے، وہی تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ جہاں تک تخلیق کا تعلق ہے، اس کا وہ اقرار کرتے تھے، جہاں تک رزق کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں بھی وہ یہ دعویٰ نہ کر سکتے تھے کہ ان کے مزعومہ اللہ ان کو رزق دیتے ہیں۔ رہا مارتا تو وہ اس بات کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ اللہ ہی مارتے والا ہے۔ رہا مسئلہ بعث بعد الموت کا تو اس میں وہ شک کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مسلمات کے ساتھ بعث بعد الموت کو بھی فرست مسلمات میں پیش فرماتے ہیں تاکہ ان کا شعور جاگ اٹھے۔ اور اس طرح وہ اس کے قائل ہو جائیں۔ یہ براہ راست ان کی فطرت اور وجدان سے ہمکلامی ہے۔ اگرچہ ان کی فطری سوچ کے اندر انحراف آگیا تھا لیکن اگر فطرت کو اصل حالات پر چھوڑا جائے اور انسان فطری انداز میں سوچے تو بعث بعد الموت کے عقیدے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان سے پوچھتے ہیں۔

هَلْ مِنْ شُرَكَاءِ كُمْ مَنْ يَفْعَلُ مِنْ ذَلِكَُمْ مَنْ شَيْءٍ (۳۰: ۴۰) ”کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو؟“ اس سوال کے جواب کا انتظار نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ ایک ایسا سوال ہے جو تردید کے لیے ہے اور ساتھ ساتھ سرزنش بھی جس کے جواب کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ بس اس کے بعد یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ اس قسم کے شریکوں سے پاک ہے۔

سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ (۳۰: ۴۰) ”اللہ پاک ہے، بہت بالا و برتر اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔“

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں انسانی زندگی کی اصلاح و فساد کا تعلق لوگوں کے اعمال سے ہے۔ جب لوگوں کے دل مجر جائیں، ان کے اعمال خراب ہوں اور ان کے عقائد خراب ہوں تو اس سے نظام ارضی میں خلل پڑ جاتا ہے اور فحش اور تری دونوں اس فساد کی لپیٹ میں آ جاتی ہیں۔ لوگوں کی اقدار حیات پر یہ فساد غالب آ جاتا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (۳۰: ۴۱) ”فحش اور تری میں فساد برپا ہو گیا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔“ دنیا کے نظام میں فساد کا ظہور اور اس کا پھیل جانا ہے مقصد نہیں ہوتا۔ اور نہ اچانک بطور اتفاق ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ کی تدبیر اور اس کے قوانین فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔

لِيَذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا (۴۱:۳۰) ”تاکہ مزہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا“۔
یعنی جب وہ ایسے اعمال کر رہے ہوں جو شر و فساد کا باعث ہوں اور جب اس عمومی فساد کی لپیٹ میں وہ آجاتے ہیں اور
اس کی جس اور تپش محسوس کرتے ہیں تو امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۴۱:۳۰) ”شاید کہ وہ باز آجائیں“۔ اور عزم کر لیں کہ ہم اس فساد کا مقابلہ
کریں گے اور اللہ کی طرف رجوع کر کے عمل صالح شروع کر دیں گے اور زندگی کے راست اور درست نظام کو اپنالیں
گے۔

اس سبق کے آخر میں ان کو اس انجام سے ڈرایا جاتا ہے جو زمانہ ماقبل کے مشرکین کو نصیب ہوا۔ لہٰذا مکہ ان میں
سے اکثر کے انجام سے واقف بھی تھے کیونکہ وہ اپنے سفروں میں ان کے آثار دیکھا کرتے تھے۔ یہ آثار امام مہین پر تھے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ كَانَ أَكْثَرُهُمْ

مُشْرِكِينَ (۴۲:۳۰) ”(اے نبی!) ان سے کہو کہ زمین میں چل کر پھر کر دیکھو۔ پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا
کیا انجام ہو چکا ہے ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔“ ان کا انجام وہ بار بار دیکھتے تھے جب وہ زمین میں پھرتے تھے۔ یہ
انجام ایسا تھا جو کسی کو اس رویے پر آمادہ نہ کرتا تھا جو ان لوگوں نے اختیار کیا ہوا تھا۔

یہاں آکر اب دو سر راستہ بھی بنا دیا جاتا ہے جس پر چلنے والے بھی گمراہ نہیں ہوتے۔ اور ایک دوسرے بلند افق کی
طرف ان کی نظریں مبذول کر لی جاتی ہیں جس کی طرف جانے والے بھی نامراد نہیں ہوتے۔

فَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ
مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّغُونَ ۚ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا
فَلَا نَفْسَ لَهُ يَمْهَدُونَ ۚ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ
إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝

”(اے نبی!) اپنا رخ مضبوطی کے ساتھ جماد’ اس دین راست کی سمت میں قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے
نہ جانے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن لوگ چھٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے جس
نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے وہ اپنے ہی لیے (فلاح کا راستہ) صاف
کر رہے ہیں تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے یقیناً وہ کافروں کو پسند نہیں
کرتا۔“

دین قیم کی طرف متوجہ ہونے والے کے لیے قرآن جو شکل تجویز کرتا ہے وہ نہایت ہی اثر انگیز ہے اور یہ جاتی
ہے کہ متوجہ ہونے والا شخص اپنی پوری توجہ سے اس طرف مڑ گیا ہے۔ وہ سنجیدہ اور سیدھا ہے۔

فَاقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ (۳۰: ۴۳) ”اپنا رخ مضبوطی کے ساتھ جما دو دین راست کی سمت میں۔“ نہایت اہتمام نہایت توجہ، صدرِ حکم کے انتظار کی طرح نہایت پختگی کے ساتھ اپنا رخ عالم بالا کی طرف کر دو جس طرح ایک فوجی (اٹلشن) کی حالت میں ہوتا ہے۔

دینِ قیَم کی طرف رخ جما دینے کا حکم پہلی مرتبہ اس سورہ میں اس وقت آیا تھا جب بات لوگوں کی خواہشات نفسانیہ کے پیچھے وڑنے کے موضوع پر ہو رہی تھی اور مختلف احزاب مختلف سمتوں میں دوڑ رہی تھیں۔ یہاں شرکاء کے مقابلے میں یہ حکم آیا ہے۔ رزق کے اضافے کے مضمون کے موقع پر ہے۔ شرک کی وجہ سے فساد پیدا ہونے اور لوگوں کی بد عملی کی وجہ سے پوری دنیا میں فساد پھیلنے کے مضمون کے موقع پر یہ حکم آیا ہے۔ اس کے بعد یہاں بتایا جاتا ہے کہ جس نے اچھے عمل کیے تو وہ اچھا پھل پائیں گے اور جس نے برے کام کیے تو اس کا برا انجام ہو گا۔ یہ دن ایسا ہو گا کہ جہاں لوگوں کے دو فریق ہوں گے، اہل ایمان اور اہل کفر اور ہر ایک کا اپنا انجام ہو گا اور یہ دن اٹل ہو گا۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا نَفْسَ لَهُ يَمْهَدُ لَهُ (۳۰: ۴۴) ”جس نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اس پر اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے، وہ اپنے ہی لیے (فلاح کا راستہ) صاف کر رہے ہیں۔“ یمہد کا مفہوم ہے تیار کرنا، کنٹرول میں لانا، منظم کرنا، تیار کرنا جس میں کچھ آرام سے رہتا ہے، رستہ تیار کرنا، ہسٹ تیار کرنا، جس پر آرام کیا جاتا ہے۔ تمام معاہدہ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے لیے کسی چیز کو ہموار کرتے ہیں۔ یمہد و ن سے عمل صالح کے حراج، نوعیت اور اس کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ جو لوگ عمل صالح کرتے ہیں وہ دراصل خود اپنے لیے آرام، خوشگوری اور مسرت کا ماحول تیار کرتے ہیں، یعنی حالتِ عمل میں بھی ان کو یہ نتائج مل جاتے ہیں، بعد کی بات تو اور ہے۔ قرآن کے اندازِ تعبیر یمہد و ن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ (۳۰: ۴۵) ”تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے۔“ فضل سے جزا دے دینے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان جنت کا مستحق صرف اپنے اعمال ہی پر نہیں ہو سکتا۔ انسان جس قدر اعمال بھی کرے ان سے وہ اللہ کے ایک معمولی فضل کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا۔ جنت صرف فضلِ ربی سے مل سکتی ہے۔ اللہ سبحانہ کافروں کو بہت ہی ناپسند کرتے ہیں۔

اِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (۳۰: ۴۵) اب یہاں اللہ کی بعض نشانیوں کی سیر کر لئی جاتی ہے۔ اللہ کی نشانیاں ہونے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے لیے وہ فضل و رحمت بھی ہیں۔ ان نشانیوں کی وجہ سے انسان کو رزق فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ ان کے لیے ہدایت ہے لیکن وہ اللہ کی ان نشانیوں میں سے بعض کو پہچانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّیَّاحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيَذِيقَكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَلِتَجْزِيَ الْفُلُكُ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۱﴾
وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَاَنْتَقَمْنَا

مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا ۖ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ
الرِّيْحَ فَتُثْبِتُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسْفًا
فَاتْرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ ۚ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا
هُم يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يُنْزَلَ عَلَيْهِمْ مِنَ قَبْلِهِ
لُمُبِلِسِينَ ۝ فَانْظُرْ إِلَىٰ أَشْرَ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ
إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَلَئِنْ أَرْسَلْنَا رِيحًا
فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوا مِنْ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ ۝

”اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے، بشارت دینے کے لیے اور تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرنے کے لیے اور اس غرض کے لیے کہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو۔ اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے، پھر جنہوں نے جرم کیا ان سے ہم نے انتقام لیا اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔

اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ لپٹے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے، برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و خرم ہو جاتے ہیں حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔ دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ وہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جلا اٹھاتا ہے، یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثر سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں تو وہ کفر کرتے رہ جاتے ہیں۔“

ان آیات میں بظاہر نہایت مختلف النوع موضوعات کو جمع کیا گیا۔ بشارت دینے والی ہوائیں، رسولوں کو معجزات اور نشانیوں کے ساتھ بھیجنا، مومنین کا رسولوں کے ذریعہ مدد کرنا، ایسی بارشوں کا نزول جو مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہیں اور بعث بعد الموت کا مسئلہ۔ یہ اجتماع با مقصد ہے۔ یہ سب چیزیں اللہ کی رحمت کی نشانیاں ہیں۔ یہ سب سنت الہیہ کے مظاہر ہیں، یہ سب اس کائنات کے نظام کے تحت ہیں، رسولوں کو ہدایت کے ساتھ بھیجنے اور مومنین کی نصرت کے درمیان گہرا تعلق ہے اور یہ سب آیات الہیہ کے مختلف نمونے ہیں۔ یہ سب امور اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں سے متعلق ہیں۔ لوگوں کی زندگی ان سب امور پر موقوف ہے اور یہ سب امور نظام کائنات کے ساتھ متعلق ہیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ يُرْسِلُ الرِّيَّاحَ مَبَشِّرَاتٍ (۴۶:۳۰) ”اور اس کی نشانوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے“۔ یہ ہوائیں ہارشیں برساتی اور پھیلاتی ہیں۔ یہ لوگ بارش پر سامنے دلی ہواؤں کو خوب جانتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کو مہارت اور تجربہ حاصل تھا۔ جب لکی ہوائیں چلتیں تو یہ لوگ خوش ہوتے۔

وَلِيُذِيقَكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ (۴۶:۳۰) ”تاکہ وہ انہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرے“۔ اس رحمت کے نتیجے میں سرسبزی اور شادابی اور روئیدگی ہوتی ہے۔

وَلِتَجْرِيَ الْفُلُكُ بِأَمْرِهِ (۴۶:۳۰) ”تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں“۔ یہ کشتیاں اس طرح بھی چلتی ہیں کہ یہ ہوائیں انہیں چلاتی ہیں اور یوں بھی کہ ہواؤں سے بارش برستی ہے، دریا بہتے ہیں اور ان میں کشتیاں چلتی ہیں۔ یہ ان ظاہری اسباب کے باوجود اسراہی سے چلتی ہیں۔ اس سنت الہیہ کے مطابق جس کے مطابق اللہ نے اس کائنات کو بنایا ہے۔ اللہ کے اس نظام تقدیر کے مطابق کہ اللہ نے ہر چیز کے اندر ایک خاصیت مقدر کر دی ہے۔ مثلاً یوں کہ پانی کی سطح پر کشتی کو ہلکا بنایا اور وہ چلنے لگی۔ اور یوں کہ یہ کشتی ہوا اور موجوں کے رخ پر لور ہو اور موجوں کے رخ کے تضاد میں چلے۔ اللہ نے ہر چیز کو ایک مقدار کے مطابق بنایا ہے۔

وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ (۴۶:۳۰) ”تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو“۔ یعنی تجارتی سفروں میں اور فصل کاٹنے میں، لیکن اور دین میں یہ سب امور اللہ کے فضل سے ہیں اور اللہ نے ہر چیز کو ایک مقدار کے مطابق پیدا کیا ہے۔۔۔ پورا پورا۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۴۶:۳۰) ”تاکہ تم شکر کرو“۔ یہ سب امور فضل الہی ہیں اور ان پر تم شکر کرو۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جن کے مقابلے میں بندگان خدا کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی ان نعمتوں کے مناسب رویہ اختیار کریں۔ ہواؤں کے بھیجنے کی طرح رسولوں کا بھیجنا بھی انسانوں پر اللہ کا فضل و کرم ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَى قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ (۴۷:۳۰) ”اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے“۔ لیکن لوگوں نے اللہ کی اس رحمت کا انتظار نہ کیا حالانکہ اللہ کی یہ رحمت ایسی تھی کہ ان کو اس کا استقبال تو ہواؤں سے زیادہ کرنا چاہئے تھا۔ ان لوگوں نے رسولوں سے کوئی استفادہ نہ کیا حالانکہ یہ نفع زیادہ اور دائمی نفع تھا بہ مقابلہ بارش اور پانی کے منافع کے اور رسولوں کے مقابلے میں یہ لوگ ہٹ گئے۔ ایک گروہ ان مجرمین کا تھا جو ایمان نہ لاتے تھے۔ اللہ کی آیات پر تہہ بر نہ کرتے تھے۔ رسولوں کو اذیت دینے سے بھی نہ چوکتے تھے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے باز رکھنے کے جرم سے بھی باز نہ آتے تھے۔ دوسرا گروہ ان مومنین کا تھا جو اللہ کی آیات کو سمجھ جاتے تھے۔ اللہ کا شکر ادا کرتے تھے، اللہ کے وعدوں پر اعتماد کرتے تھے اور وہ ان مجرمین کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کرتے۔ بہت زیادہ اذیتیں۔ چنانچہ انجام دیا ہوتا تھا جو اللہ کے عدل کے مطابق تھا اور اللہ کا وعدہ ہمیشہ پختہ ہوتا ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (۴۷:۳۰) ”پھر جنہوں نے جرم کیا ان سے ہم نے انتقام لیا اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔“

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے اوپر مومنین کی امداد فرض کر لی۔ اور اسے مومنین پر محض فضل و کرم کے بجائے ان کا حق قرار دیا۔ اسے اس انداز میں موکد قرار دیا اور لازمی قرار دیا کہ اس امداد میں کوئی شک و شبہ نہ رہا اور شک و شبہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب وعدہ کرنے والا اللہ ہو جو قوی، عزیز اور جبار ہے۔ وہ بلند اور اپنے بندوں پر کنٹرول کرنے والا اور حکیم و خیر ہے۔ یہ اللہ فرماتے ہیں جس کا ارادہ کبھی رد نہیں ہوتا اور اس کی سنت کبھی بھی ٹٹنے والی نہیں ہوتی کیونکہ اس کا ناموس فطرت اس پوری کائنات میں جاری ہے۔

بعض اوقات یہ نصرت بظاہر دیر میں آتی ہے لیکن یہ دیر انسانوں کے اپنے اندازوں کے مطابق ہوتی ہے کیونکہ لوگ معاملات کا حساب اپنے پیمانوں سے کرتے ہیں، اللہ کے پیمانوں سے نہیں کرتے۔ معاملات کا اندازہ اللہ کے اندازوں کے ساتھ نہیں کرتے اور اللہ حکیم اور خیر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ امداد کا صحیح وقت کون سا ہے۔ اس کا وعدہ اس وقت سچ ہوتا ہے جس وقت اللہ کی مشیت ہو۔ اس کی حکمت کا تقاضا ہو، اللہ جو وقت مقرر کرتا ہے اس کی حکمت بعض اوقات انسانوں کو معلوم ہوتی ہے اور بعض اوقات معلوم نہیں ہوتی لیکن اللہ جو چاہتا ہے وہی بہتر ہوتا ہے اور اللہ جو وقت مقرر کرتا ہے وہی صحیح ہوتا ہے۔ لیکن اللہ کا وعدہ قطعی ہے اور یقین ہے اور صبر کرنے والے اس پر بھروسہ کرنے والے بڑے اطمینان سے اس کا انتظار کرتے ہیں۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے جو بارشیں برساتی ہیں۔ جن سے زمین زندہ ہوتی ہے حالانکہ وہ مرچکی تھی۔ بس یہی انداز ہو گا حشر میں لوگوں کے اٹھائے جانے کا۔ یہی انداز ہو گا۔ فصل کی طرح لوگ زمین سے اُگ اُٹیں گے۔ یہ دونوں اس کائنات کے طبعی سنن ہیں۔

اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ (۴۸:۳۰) ”اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے۔“ یہ ہوائیں اس کے قانون قدرت کے مطابق چلتی ہیں اور یہ قانون اس کائنات میں اچھی طرح متصرف ہے۔

فَتَشِيرُ سَحَابًا (۴۸:۳۰) ”وہ بادل اٹھاتی ہیں۔“ اور یہ ہوائیں پانی کے بخارات اٹھاتی ہیں۔ ان بخارات کو وہ آسمانوں میں پھیلاتی ہیں۔

فَيَسُطُّهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ (۴۸:۳۰) ”پھر ان کو آسمانوں میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے۔“
وَيَجْعَلُهُ كِسْفًا (۴۸:۳۰) ”پھر انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے۔“ یعنی جمع کرتا ہے۔ وہ کثیف اور بوجھل بن جاتے ہیں۔ وہ پھر ایک دوسرے کے اوپر اور نیچے تھوں میں جم جاتے ہیں۔ بعض ٹکڑیوں کا بعض کے ساتھ تصادم ہوتا ہے۔ پھر بجلیاں چمکتی ہیں۔

فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ (۴۸:۳۰) ”پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے نچتے چلے آتے ہیں۔“ ودق کے معنی بارش کے ہیں جو بادلوں سے نکلتی ہے۔

فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مِنْ يَسَاءٍ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (۳۰: ۴۸) ”یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و خرم ہو جاتے ہیں۔“ اس خوشی کو اچھی طرح وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی زندگی بارش پر موقوف ہوتی ہے۔ عرب اس منظر سے اچھی طرح واقف تھے جن کی پوری معیشت آسمانوں کے پانیوں پر موقوف تھی اور ہے۔ اس کا تذکرہ وہ اپنے اشعار اور اپنی روایات و محاورات میں بڑی محبت سے کرتے ہیں اور بڑے فخر و مباہات کے ساتھ کرتے ہیں۔

وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ يَنْزَلَ عَلَيْهِمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمُبْلِسِينَ (۳۰: ۴۹) ”حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔“ یہ تو ہے ان کی حالت اس وقت جب بارش نہ برسی ہوئی تھی۔ وہ مایوس ہوتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ گویا وہ مرنے ہی والے ہیں۔ لیکن جب بارش آ جاتی ہے تو وہ خوش و خرم ہوتے ہیں۔

فَانْظُرْ إِلَى أَثَرِ رَحْمَتِ اللَّهِ (۳۰: ۵۰) ”دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کو۔“ ذرا ان خوش و خرم چروں کو دیکھو جو بالکل مایوس ہو گئے تھے اور اس زمین پر ان آثار کو دیکھو جو مبادہ شدہ تھی اور مردہ تھی۔ اور ذرا اس زندگی میں دیکھو جو زمین پر چلتی پھرتی ہے اور اسے ذرا لوگوں کے دلوں میں دیکھو کہ خوشی کی وجہ سے ان میں کیا کیا انگلیں پیدا ہوتی ہیں۔

يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۰: ۵۰) ”کہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو کس طرح جلا اٹھاتا ہے۔“ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ اس کے دیکھنے کے لیے کسی زیادہ عقل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی بات دلیل روشن ہے اس پر کہ حشر کے دن اس زمین سے انسان اسی طرح اُگ آئیں گے۔ یہ قرآن کریم کا وجدانی طرز استدلال ہے کہ وہ اس کائنات کے قابل مشاہدہ مناظر سے عقائد اور مستقبل کے واقعات اور امکانات ثابت کرتا ہے۔ قرآن انہی پیش پا افتاد مناظر سے اپنا مدعا ثابت کرتا ہے۔

إِنَّ ذَلِكَ لَمُحْيِي الْمَوْتَى وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۳۰: ۵۰) ”یہیٹا وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ اس زمین پر اللہ کی رحمت کے یہ آثار جاتے ہیں کہ اللہ کا یہ وعدہ سچا ہے کہ وہ لوگوں کو اٹھائے گا اور ان کا اچھا یا برا انجام ہو گا حسب وعدہ اللہ۔

اس حقیقت کی تصویر کشی کے بعد یہ جایا جاتا ہے کہ وہ لوگ پانی سے لدے ہوئے بادل لانے والی ہواؤں کی آمد پر خوش ہوتے ہیں اور جب وہ اللہ رحمت کے آثار بادلوں اور بارش کی صورت میں دیکھتے ہیں تو خوش و خرم ہوتے ہیں۔ یہی لوگ اگر دیکھیں کہ یہ ہوا اور یہ بادل زرد ہیں ان ہواؤں میں پانی کے بجائے گرم ریت اور مٹی بھری ہوئی ہے۔ پانی کا قطرہ بھی نہیں ہے اور یہ ہوا ایسی ہے کہ فصلوں کو زرد کر کے رکھ دیتی ہے اور دودھ پلانے والے جانوروں کو خشک کر دیتی ہے اور جس سے فصل زرد ہو کر قبل از وقت خشک ہو کر بھوسہ بن جاتی ہے تو ان کی حالت یہ ہوتی ہے :

وَلَكِنْ أَرْسَلْنَا رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا الظُّلُمَاتُ مِنْ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ (۳۰: ۵۱) ”اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثرات سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں تو وہ کفر کرتے رہ جائیں۔“ اس عذاب کو پاکر اور

ما یوس ہو کر بھی وہ کفر کریں۔ اور اللہ کی قدرت کا اقرار نہ کریں اور اللہ کے سامنے نہ گڑگڑائیں کہ وہ اس مصیبت کو دور کرے بلکہ کفر کے رویہ ہی پر جم جائیں ایمان نہ لائیں اور یہ ہرگز نہ سمجھ سکیں کہ اللہ کی حکمت اور تدبیر کیا کیا کرتی ہے۔ ان کو ان مصیبتوں کے پیچھے دست قدرت نظر نہ آئے۔ وہ ان واقعات اور حادثات کی تفسیر و تعبیر اس طرح نہ کریں کہ یہ سب کچھ اللہ کے قانون قدرت اور ناموس فطرت کے مطابق ہو رہا ہے..... بلکہ ابدی کافرانہ تاویلات ہیں۔

جب لوگ اس حد تک پہنچ جائیں کہ وہ اس دنیا کے واقعات اور حادثات کی تعبیر بھی اپنی خواہشات کے مطابق کرنے لگیں اور ان واقعات کے اندر جو اللہ کے نشانات و اشارات پنہاں تھے ان کو سمجھنے کی سعی ہی نہ کریں۔ اپنے ماحول کے اندر غور ہی نہ کریں۔ ان مشاہدات میں ان کو اللہ کی قدرت اور حکمت نظر ہی نہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ بس ایسے لوگوں کو ہدایت دینے سے آپ معذور ہیں۔ ایسے لوگوں کو ان کے مزاج کے حوالے کر دیں کیونکہ ان کی بصیرت اور بصارت دونوں ختم ہو چکی ہیں۔

فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا

مُدْبِرِينَ ۖ وَمَا أَنْتَ بِهَادٍ الْعُمَىٰ عَنْ صَلَاتِهِمْ ۖ إِنَّ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ

ع۱۳ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ ۝

۸

” (اے نبی!) تم مردوں کو نہیں سنا سکتے نہ ان بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہو جو پیٹھ پھیرے چلے جا رہے ہوں اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہ راست دکھا سکتے ہو۔ تم تو صرف انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔“

یہ لوگ مردے ہیں ان میں زندگی کی رمتی نہیں یہ ہرے ہیں کوئی آواز نہیں سن سکتے۔ یہ اندھے ہیں ان کو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ جو شخص اپنے احساس کے دروازے اس کائنات ٹوا بیس فطرت کے لیے بند کر دیتا ہے اور اسے فطرت کے یہ نشانات نظر نہیں آتے وہ مرچکا ہے۔ اس میں حیات نہیں ہے۔ اگر کوئی زندگی ہے تو پھر یہ حیوانی زندگی ہے بلکہ وہ حیوانوں سے بھی زیادہ گمراہ ہے۔ حیوانوں میں لیک فطری شعور ہوتا ہے اور وہ شعور کبھی بھی غلطی نہیں کرتا۔ جو شخص اللہ کی ان نشانیوں کی پکار نہیں سنتا وہ بالکل بہرے ہے۔ اگرچہ اس کے کان ہوں اور ان کے ساتھ آواز نکراتی ہو۔ جو شخص اس کائنات میں بکھری ہوئی اللہ کی نشانیوں کو نہیں دیکھتا وہ اندھا ہے اگرچہ حیوان کی طرح اس کے بوسے بوسے موٹے موٹے دیدے ہوں۔

إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ (۵۳:۳۰) ”تم صرف انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔“ ایسے ہی لوگ دعوت کو سنتے ہیں کیونکہ ان کے دل زندہ ہوتے ہیں اور زندہ دراصل دل کی زندگی ہوتی ہے۔ ان کی آنکھیں چھا ہوتی ہیں۔ ان کی قوائے مدرکہ صحیح و سقیمت ہوتی ہیں

لہذا وہ سنتے ہیں۔ سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ دعوت کی پکار ان کی فطرت سے گھبراتے ہی ان کے اندر اثبات پیدا کرتی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اب ذرا انسان کو خود اس کی ذات اور اس کے جسم کی دنیا میں گھمایا جاتا ہے۔ اپنے ماحول سے لاکر خود اپنے نفس کی دادیں میں پھر لیا جاتا ہے کہ تم پیدا کیسے ہوئے؟ اس زمین پر تمہاری پیدائش کیسی ہے؟ زندگی کیسی ہے اور تم مر کس طرح جاتے ہو؟ اور پھر قیامت کا منظر کیا ہو گا؟

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَ شَيْبَةً يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَ هُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ ۝ وَ يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ ۝ وَ قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَ الْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْبَعْثِ ۚ فَهَذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَ لَكِنَّمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُنْفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مُعْذِرَتُهُمْ وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ۝

”اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی۔ ابتدا کی 'پھر اس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی' پھر اس قوت کے بعد تمہیں ضعف اور بوڑھا کر دیں۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے 'پیدا کرتا ہے'۔ اور وہ سب کچھ جاننے والا' ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اور جب وہ ساعت برپا ہوگی تو مجرم تمہیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے ہیں' اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکا کھایا کرتے تھے 'مگر جو علم اور ایمان سے بہرہ مند کیے گئے تھے وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روزِ حشر تک پڑے رہے ہو' سو یہ وہی روزِ حشر ہے 'لیکن تم جاننے نہ تھے۔ پس وہ دن ہو گا جس میں ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا۔“

یہ ایک بہت ہی طویل مطالعاتی سفر ہے۔ اس کا آغاز تو انسانی زندگی کے آغاز سے ہوتا ہے اور یہ ہمارے سامنے ہے اور آئے دن کا مشاہدہ ہے۔ اس کا آخری حصہ نہایت ہی اگرچہ مشہور نہیں ہے لیکن قرآن کی تصویر کشی ایسے الفاظ میں کرتا ہے کہ گویا وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ یہ ایک ایسا مطالعاتی سفر ہے کہ چشمِ بینا رکھنے والوں کے لیے اور کھلے کان رکھنے والوں کے لیے اور کان لگا کر سننے والوں کے لیے اس میں سامانِ عبرت ہے۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ (۳۰: ۵) ”اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی۔“ یہ کہا کہ تمہیں ضعف سے پیدا کیا۔ یہ نہ کہا کہ تمہیں ضعیف پیدا کیا۔ گویا ان کی حیات کے آغاز کا عنصر ہی ضعیفی ہے اور یہاں جس ضعف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے کئی مضموم اور مظاہر ہیں اور یہ مظاہر انسان کے

اندر قابل مشاہدہ ہیں اور حریف مشاہدات ہوتے جاتے ہیں۔

وہ چھوٹا سا ظلیہ جس سے جنم بنتا ہے جو بہت ہی خوردبینی اور چھوٹا سا ہے اور ضعیف ہے۔ پھر جنم لور اس کے تمام مدارج حالت ضعف ہیں۔ پھر زمانہ طفولیت سب کا سب حالت ضعف ہے، اس وقت تک جب انسان مکمل نوجوان ہو جاتا ہے۔

پھر وہ مادہ جس سے انسان بنتا ہے 'ضعیف ہے مٹی۔ اگر اس میں تلخ ربانی نہ ہوتی تو یہ مٹی ہی ہوتی یا نباتات ہوتے یا حیوانات ہوتے۔ جو انسان کے مقابلے میں سب حادثات ضعف ہیں۔ پھر انسان اپنی خواہشات کے سامنے کمزور ہے۔ امتحانات و میلانات اسے مجبور کر دیتے ہیں، اگر اللہ کی جانب سے نفع و روح نہ ہوتا تو انسان اس احسن تقویم میں نہ ہوتا۔ اس کے اندر یہ صلہ جیتیں نہ ہوتیں اور یہ بھی دوسرے حیوانات کی طرح ایک ضعیف اور لاچار حیوان ہوتا۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً (۵۴:۳۰) ”پھر اس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی“۔ ایسی قوت اور ان معنوں میں قوت جن معنوں میں ضعف بیان ہوا۔ جسمانی قوت، انسانی ساخت میں قوت، انسان کی نفسیاتی اور روحانی قوت اور انسان کی فکری اور عقلی قوت۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ضَعْفًا وَ شَبِيهًا (۵۴:۳۰) ”پھر اس قوت کے بعد تمہیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا“۔ انسانی جسم ڈھیل پڑ گیا، بڑھاپا دراصل انسان کی تمام قوتوں کے اندر طفولیت کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے اندر نفسیاتی گراؤ بھی آ جاتی ہے اور انسان ضعیف الارادہ ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک بوڑھا اس طرح لایعنی باتیں کرتا ہے جس طرح ایک بچہ ہوتا ہے۔ اس کے ارادے کے اندر کوئی قوت نہیں ہوتی۔ بڑھاپے کے ساتھ بالوں کی سفیدی دراصل بڑھاپے کو مجسم کر دیتی ہے اور بالوں کی سفیدی کے ساتھ قوائے انسانی کا ضعف سامنے نظر آتا ہے۔ یہ ادوار جن سے کوئی فانی چیز نہیں بچ سکتی اور جس شخص کو طویل عمر نصیب ہو، ان کے اندر کبھی کوئی دور غائب نہیں ہوتا، کبھی یوں نہیں ہوتا کہ ان میں سے کوئی دور اپنے وقت پر نہ آئے۔ ان ادوار کا اسی ترتیب کے ساتھ ہر شخص پر آنا اس بات کا منظر ہے کہ یہ انسان کسی مدبر ہستی کے کنٹرول میں ہے۔ وہ ہستی جو چاہتی ہے تخلیق کرتی ہے، جو چاہتی ہے، مقدر بناتی ہے اور جس طرح چاہتی ہے، ہر مخلوق کے لیے اس کے حالات اور طور طریقوں کا منصوبہ بناتی ہے۔ یہ سب کام اللہ کے پختہ علم، اس کی تقدیر اور مگرری، ٹیکنالوجی کے مطابق انجام پاتے ہیں۔

يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَ هُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ (۵۴:۳۰) ”وہ جو کچھ چاہتا ہے، پیدا کرتا ہے، جو سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

لہذا اس محکم اور ٹیکنیکل اور نقشے کے مطابق بنی ہوئی اس مخلوق کا کچھ بامعنی انجام بھی ہے۔ ہاں اس کا ایک نہایت ہی بامعنی انجام اور فلسفہ ہے اور دیکھو اسے ایک منظر میں جو قیامت کے مناظر میں سے ایک پر تاثر منظر ہے اور حرکت اور مکالموں سے ہر منظر میں پیش کیا جاتا ہے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِثُوا غَيْرَ سَاعَةٍ (۵۵:۳۰) ”اور جب

وہ ساعت برپا ہوئی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے ہیں۔ ان کے احساس میں دنیا میں گزرا ہوا پورا زمانہ سکر جائے گا۔ اس لیے وہ اپنے احساس کے مطابق قسم کھائیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قبروں میں گزرے ہوئے زمانے کے بارے میں یہ کہہ رہے ہوں کہ یہ زمانہ اس قدر مختصر تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد پورا زمانہ ہو یعنی زمین کی زندگی کا اور پھر قبروں میں رہنے کا۔

كَذَلِكَ كَانُوا يُؤْفَكُونَ (۵۵:۳۰) ”اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکہ کھایا کرتے تھے۔“ اور حق سے منہ پھرتے تھے اور دنیا میں بھی انہوں نے واقعات کا صحیح اندازہ نہ لگایا تھا۔ چنانچہ اہل علم اور اہل ایمان ان کے اس خیال کی تصحیح کر دیں گے۔

وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَالْإِيمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْبَعْثِ

فَهَذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلَكِنَّكُمْ كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۵۶:۳۰) ”مگر جو اہل علم اور ایمان سے بہرہ مند کیے گئے تھے وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روز حشر تک پڑے رہے ہو سو یہ وہی روز حشر ہے لیکن تم جانتے نہ تھے۔“ یہ صاحبان علم و بصیرت وہی تھے جو اہل ایمان تھے۔ جنہوں نے حشر پہ یقین کیا ہوا تھا۔ اور انہوں نے وہ حقائق بھی جان لیے تھے جو اس ظاہری دنیا کے پیچھے تھے۔ یہ لوگ بھی معاملے کو اللہ کے علم کے سپرد کر دیتے ہیں۔

لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِلَى يَوْمِ الْبَعْثِ (۵۶:۳۰) ”در حقیقت اللہ کی کتاب میں تم یوم حشر تک رہے ہو۔“ یہ ہے وہ میعاد مقرر۔ اور اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ حشر تک پہنچتے پہنچتے تمہیں کتنی دیر لگی۔ یہ تھا مقررہ دن اور یہ آگیا دیکھ لو۔

اب یہ منظر ایک اجمالی کلیہ کی شکل میں ختم ہوتا ہے اور اس میں بتایا جاتا ہے کہ اب ظالموں کو کیا حادثات پیش آنے والے ہیں جو حشر اور قیامت کی تکذیب کرتے تھے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَعْذَرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ (۵۷:۳۰) ”پس یہ وہ دن ہو گا جس میں ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا۔“ نہ ان کی کوئی معذرت قبول ہوگی اور نہ کوئی ان پر عتاب کرے گا کہ تم نے ایسا ایسا کیوں کیا ہے۔ مانگو معافی تو بہ کرو کیونکہ آج تو سزا ہوگی یہاں کسی کو کوئی سرزنش نہ ہوگی یہ یوم عقاب ہو گا یوم عتاب نہ ہو گا۔

اب اس برے اور مایوس کن منظر سے دلپس لاکر انہیں ان کے اس حال میں لایا جاتا ہے جس میں وہ اپنے عناد اور تکذیب میں ڈرے ہوئے تھے۔ یہ تھا عناد کا انجام اور یہ تھا تکذیب کا خاتمہ۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ وَلَئِنْ

جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَيَقُولُنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ أَنْتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ ۚ كَذَلِكَ

يُطَبِّعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٨﴾

”ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا ہے۔ تم خواہ کوئی نشانی لے آؤ، جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے، وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو۔ اس طرح نصیہ لگا دیتا ہے اللہ ان لوگوں کے دلوں پر جو بے علم ہیں۔“

سیاق کلام میں اور مخاطب کے زمان و مکان میں یکایک تبدیلی آگئی۔ یہ بہت ہی دور رس تبدیلی ہے لیکن یہاں دوریوں کے فاصلے سمیٹ لیے جاتے ہیں اور جس مقام پر اب ہم کھڑے ہیں وہ بہت ہی قریب نظر آتا ہے۔ دوبارہ ہم قرآن کے سامنے ہیں اور اس کی اعلیٰ مثالیں سن رہے ہیں۔ قرآن کے مختلف اور متنوع اسالیب کلام ہمارے سامنے ہیں، جہاں ہر رنگ اور ہر سبب اور ہر طریقے سے دلوں میں بات لادنے کی سعی کی گئی ہے اور جس کے اندر بے شمار ایسے محلات آتے ہیں جو انسان پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ یہ قرآن ہر دل سے ہم کلام ہے، ہر درجے کی عقل سے مخاطب ہے۔ ہر معاشرے اور ہر تہذیب سے اس کے مکالمات بقدر عقول اناس ہیں۔ وہ نفس انسانی کو اس کے مختلف حالات میں خطاب کرتا ہے۔ انسان کے حالات و احوال میں سے ہر حال اور ہر طور کو زیر بحث لاتا ہے۔ لیکن ان ہمہ گیر اور ہمہ جہت مساعی کے بعد بھی لوگ بکھڑے ہیں۔ اور یہ اللہ کی نشانیوں اور آیات کی تکذیب پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ یہ لوگ صحیح علم رکھنے والوں پر دست درازیاں بھی کرتے ہیں اور انہیں ان پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ لوگ باطل پرست ہیں۔

لَئِنْ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَيَقُولُنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّكُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ (۵۸:۳۰) ”تم خواہ کوئی نشانی لے کر آ جاؤ، جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے، وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو۔“ پھر زبانوں پر یہ تمبر آتا ہے:

كَذَلِكَ يُطَبِّعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۵۸:۳۰) ”اس طرح نصیہ لگا دیتا ہے اللہ ان لوگوں کے دلوں پر جو بے علم ہیں۔“ یوں، یعنی اس طریقے کے مطابق اور ان وجوہات سے۔ یہ لوگ جو نہیں جانتے ان کے دلوں پر مہریں لگ گئی ہیں۔ ان کی چشم بصیرت اللہ کی آیات اور اس کے نشانات کو دیکھنے کے لیے کھلتی ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ لعل عم اور اہل ہدایت پر دست درازی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات کے مستحق بن گئے ہیں کہ اللہ ان کی بصیرت کو مسخ کر دے۔ ان کے دلوں پر نصیہ لگا دے کیونکہ اللہ سبحانہ ان دلوں کے بارے میں خوب جانتا ہے اور ان کی بصیرتوں کو بھی وہ چمکی طرح دیکھتا ہے۔

اس سورہ میں مشرکین کے ساتھ مکالمے، اس کائنات کی سیر، انسانی تاریخ کے مطالعے، اور انسانی شخصیت، انسانی زندگی اور اس کی نشوونما کی سیر کے بعد اور تمام شواہد اور نشانیوں کے دیکھ لینے کے بعد بھی ایسے لوگوں کے مشاہدے کے بعد جو بالکل نہیں مانتے، اب یہ آخری ضرب ہے عقل و خرد کے تاروں پر۔ اس کے ذریعہ نکل ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفُّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ ﴿٥٩﴾

”یہی (اے نبیؐ) صبر کرو‘ یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے‘ اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے۔“

اس طویل جدوجہد اور اسلامی انقلاب کے دشوار گزار سفر میں صبر ہی وسیلہ مومنین ہے۔ یہ سفر اس قدر طویل ہے‘ اس قدر مشکل ہے کہ بعض اوقات انسان کو لا انتہا نظر آتا ہے۔ لیکن اللہ کے وعدے پر یقین کرنا چاہئے۔ بغیر کسی بے چینی‘ کسی تزلزل‘ بغیر کسی حیرانی و پریشانی کے اپنے مقصد پر جم جانا ہی اس راہ کا توشہ ہے۔ اس وقت صبر اور ثابت قدمی کا مظاہرہ جبکہ دوسرے لوگ ڈگمگا جائیں‘ جبکہ بعض لوگ کھذیب کر دیں اور اللہ کے وعدے میں شک کرنے لگیں۔ اس لیے کہ شک کرنے والے اسباب یقین سے محروم ہوتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ تک پہنچنے کے لیے جنہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے‘ ان کا منہاج صبر و ثبات کا منہاج ہے۔ اگرچہ راہ طویل ہو جائے۔ اگرچہ اس کا انجام نظروں سے اوجھل ہو۔ اگرچہ وہ غبار اور بادلوں کے پیچھے محجوب ہو۔

--- ۰۰۰ ---

یہ سورہ یوں ختم ہوتی ہے جبکہ اس کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ شکست یافتہ رومیوں کو اللہ کے وعدے کے مطابق چند سالوں کے بعد فتح نصیب ہوگی اور اسی وقت مومنین کو بھی فتح نصیب ہوگی اور اس کا خاتمہ اس مضمون پر ہوتا ہے کہ اگر تم صبر و ثبات سے کام لو تو اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا کہ اللہ لکل ایمان کی مدد کرتا ہے۔ نیز جب لوگ اس تحریک کو بے وقار کرنے کی سعی کر رہے ہوں اور ان کی صفوف کے اندر دوسرے اندازی کر رہے ہوں اور یہ لوگ وہی ہوتے جو تحریک اسلامی کے دشمن ہوتے ہیں اور ان کا اس جدید دعوت پر ایمان نہیں ہوتا تو ایسے حالات میں صبر ہی لکل ایمان کا ہتھیار ہوتا ہے۔

یوں سورہ کا آغاز اور انجام ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ یوں یہ سورہ ختم ہوتی ہے اور ایک سچے قاری کے ذہن میں ایک قوی امید چھوڑ جاتی ہے کہ اگر صبر و ثبات سے کام لیا جائے تو اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے اور وہ لکل یقین سے بے وفائی نہیں کرتا۔

--- ۰۰۰ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۱

سورہ لقمان - ۳۱

آیات ۱ --- تا --- ۳۴

سورۃ لقمان ایک نظر میں

قرآن کریم نے انسانی فطرت سے فطری منطق کے ذریعہ خطاب کیا اس لیے کہ یہ کلام فطرت کا کام ہے۔ خالق جانتا ہے انسان کے لیے کیا مفید ہے اور کس چیز سے اس کی اصلاح ممکن ہے۔ اسے معلوم ہے کہ انسانی فطرت کے ساتھ کس انداز کا مکالمہ مناسب ہے۔ خالق اپنی مخلوق کی رسم راہ سے بہت ہی اچھی طرح واقف ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس فطرت انسانی کے سامنے وہی حقیقت پیش کی جو اس میں پہلے سے موجود تھی۔ فطرت انسانی اس حقیقت سے پہلے ہی خبردار تھی قرآن کے مکالمے سے بھی پہلے۔ کیونکہ انسانی فطرت اس اصول پر قائم ہے جو انسانی فطرت کے اندر تخلیق کے وقت سے ودیعت کر دیا گیا ہے۔ وہ حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور یہ کہ وہ خالق وحدہ لا شریک ہے۔ یہ پوری کائنات اس کی شاخوں پر ہے۔ موعود کرہا اس کے احکام کی مطیع فرمان ہے حمد و تسبیح کرنے والی ہے۔ لہذا انسان کو صرف اسی کی بندگی اور اسی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ یہ ہے اصل فطرت لیکن یہ فطرت اس دنیا کے گرد و غبار اور دھوئیں کی تھول کے نیچے دب جاتی ہے اور گوشت و پوست کی مٹلی خواہشات اس کو دبا بیٹھتی ہیں۔ خواہش نفس اور جسمانی تموات اسے جاوہ مستقیم سے منحرف کر دیتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم آتا ہے اور وہ اس فطرت کو اس کے اندر موجود سبق یاد دلاتا ہے اور فطری منطق کے مطابق اس کے ساتھ مکالمہ کرتا ہے۔ اس کو یاد دلاتا ہے کہ وہ خارجی وجوہات سے غافل ہو گئی ہے اور یہ یاد دہانی ایسے اسلوب میں کی جاتی ہے کہ جیسے فطرت جانتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم اس فطری منہاج پر یہاں ایک مکمل نظام وضع کرتا ہے۔ یہ منہاج درست عقیدہ کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ نہایت فطری ہے اور اسی راستے پر ہے جو انسان اور فطرت کے خالق کا پیدا کردہ ہے۔

یہ کی سورہ ہے اور یہ نمونہ اور مثال ہے قرآن مجید کے اندر مکالمات کا کہ قرآن کس طرح انسانی دل میں بات لاتا ہے۔ خصوصاً عقیدہ توحید کو مشرکین کے سامنے کس اسلوب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ توحید وہ بنیادی مسئلہ ہے جسے تمام کی سورتیں مختلف اسالیب میں پیش کرتی ہیں۔ مختلف زاویوں سے بات کرتی ہیں اور سبب انسانی کو مختلف پہلوؤں سے لیتی ہیں اور مختلف پہلوؤں سے فطرت کے ساتھ ہم کلام ہو کر اسے جگانے کی کوشش کرتی ہیں۔

اس سورہ میں نظریاتی بحث عقیدہ توحید 'اللہ وحدہ کی بندگی اور اللہ وحدہ کا شکر ادا کرنے کے موضوعات تک محدود ہے۔ آخرت پر یقین اور آخرت میں عادلانہ جزاء و سزا اور ان عقائد کے سوا تمام دوسرے اعتقادات کی نفی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت 'یہ ہیں اہم موضوعات اس سورہ کے۔

یہ سورہ عقیدے کے مسئلے کو قرآن کے بیان اور موضوع کے دائرے کے اندر پیش کرتا ہے۔ قرآن کریم کا دائرہ بحث اس پوری کائنات تک وسیع ہے۔ آسمان، زمین، شمس و قمر، شب و روز، فضا اور سمندر، لہریں اور پارش، نباتات اور درخت، یہ ہیں وہ موضوعات جن پر قرآن بحث کرتا ہے اور یہ بحث قرآن میں بار بار دہرائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس

پوری کائنات کو قرآن کریم ایک باطن موثر عامل کے طور پر پیش کرتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ اس کے اندر آیات الہیہ بکھری پڑی ہیں۔ اس میں دلائل ایمان بھی ہیں اور دلائل اخلاق بھی ہیں۔ یہ تمام نشانات و دلائل قلب انسانی پر اثر انداز ہوتے ہیں اس کے اندر جوش پیدا کرتے ہیں اور اس کا ایک رخ متعین کرتے ہیں اور اسے سمت عطا کرتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ مسئلہ ایک ہی ہے اور اس مسئلہ کا میدان بحث بھی ایک ہے لیکن اس ایک ہی سورت میں اسے چار مرتبہ پیش کیا گیا ہے اور چار بار عقیدہ توحید کو ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ہر بار انسانی دل و دماغ کو اس وسیع کائنات میں لے جایا گیا، پھرایا گیا، اور ہر بار ایک نیا تاثر چھوڑا گیا۔ ہر بار بیان اور زبان کا ایک نیا انداز اپنایا گیا۔ کائنات کی یہ سیر پے در پے آتی ہے۔ سفر کا آغاز ہوتا ہے اور ختم ہوتا ہے اور اس سیر میں قلب و نظر کو عجیب عجیب تفریحات ملتی ہیں اور قلب انسانی ایک نئے تاثر سے مالا مال ہو کر از سر نو آمادہ عمل ہوتا ہے۔

ان اسفار اربعہ کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ سورہ بھی انہی حروف سے مرکب ہے اور یہ کتاب حکیم کی آیات پر مشتمل ہے۔ اور محسنین کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔ یہ محسنین کون ہیں۔

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (۴:۳۱)
 ”جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔“ گویا محسن وہ ہے جو اللہ کی عبادت کرتا ہے اور آخرت کی جواب دہی پر یقین رکھتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے خوشخبری یہ ہے کہ

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۵:۳۱) ”یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔“ پھر کون ہے جو کامیاب نہ ہونا چاہتا ہو۔ ان کے مقابلے میں دوسرے لوگ وہ ہیں جو لود و لعب کی باتیں، تینتا خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے بدراہ کرس، یہ لوگ جاہل ہیں۔ یہ اللہ کی آیات کا مزاح اڑاتے ہیں اور ایسے لوگوں کا انجام بھی بتا دیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذہن کا آپریشن ہو جائے اور وہ جو آیات الہیہ کا مزاح اڑاتے ہیں اس کا نفیاتی جواب ہو جائے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (۶:۳۱) ”ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔“
 اس کے بعد اس فرق کی مزید حرکتیں بیان کی جاتی ہیں۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا (۷:۳۱) ”اے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے سمجھنے کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتا ہے کہ گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں۔“
 اس بیان کے ساتھ ایک ایسی بات بھی کہہ دی جاتی ہے جو نفسیاتی اعتبار سے قاری کو متاثر کرتی ہے اور اس قسم کے لوگوں کے لیے ایک قسم کی تحقیر بھی اس میں ہے۔

كَأَن فِي أُذُنِهِ وَقْرًا (۷:۳۱) ”گویا اس کے دونوں کانوں میں پردے ہیں۔“ اور ایک دوسری پرتائیر بات جس میں مزاح کا رنگ بہت نمایاں ہے۔

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۷:۳۱) ”اسے دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔“ بشارت کا لفظ بطور تحقیر اور مذاق اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے بعد روئے سخن لٹل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے، ان کی کامیابیوں کے بیان کے بعد جو سورہ کے آغاز ہی میں بیان کی گئی ہیں۔ آخرت میں ان کی جزاء کا تذکرہ ہے۔ دوسری جانب اسلام کے ساتھ مزاح کرنے والے بڑے لوگوں کی جزاء کا بھی ذکر ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ (۸:۳۱) خَلِدِينَ فِيهَا وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۹:۳۱) ”البتہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا بختہ وعدہ ہے۔ اور وہ زبردست و حکیم ہے۔“ یہاں آکر عظیم کتاب کائنات کا ایک صفحہ کھول جاتا ہے۔ جس میں فطرت کے براہین ہیں، یہ براہین فطرت انسانی کے مطالعہ کے لیے ہیں، یہ اس فطرت کو خطاب کرتے ہیں اور اس کے سامنے وہ عظیم سچائی پیش کرتے ہیں جسے لوگ نہیں دیکھتے اور نہایت ناپرواہی سے اس پر سے گزر جاتے ہیں۔

خَلَقَ السَّمُوتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَالْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ (۱۰:۳۱) ”اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستوں کے جو ہمیں نظر آئیں۔ اس نے زمین میں پہاڑ جمادیئے تاکہ وہ ہمیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیئے اور آسمانوں سے پانی برسا یا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگادیں۔“ ان کائناتی دلائل کے بعد جس سے احساس میں خوف پیدا ہوتا ہے اور شعور ششدر رہ جاتا ہے، اب بے راہ روش اختیار کرنے والے دلوں کو گریبان سے پکڑا جاتا ہے، جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی آنکھوں کے ساتھ اللہ کی اس عظیم اور ہولناک کائنات کو دیکھ رہے ہیں۔

هَذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ

(۱۱:۳۱) ”یہ تو ہے اللہ کی تخلیق اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔“ پہلا سبق یا پہلا مطالعاتی سفر اس کائناتی مطالعہ کے بعد یہاں ختم ہو جاتا ہے اور مسائل و نظریات کی یہ بحث اللہ کی وسیع کائنات کے میدان میں ہے۔

دوسرے سبق کے کردار انسانی نفوس ہیں۔ یہ سبق بھی مسئلہ توحید ہی کو موضوع بحث بناتا ہے۔ یہ بحث بھی کائناتی میدان میں ہے۔ البتہ اسلوب بحث جدید ہے اور اس میں بعض نئے دلائل دیئے گئے ہیں جو۔۔ کا اثر نیا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ (۱۲:۳۱) ”ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی۔“ یہ حکمت کیسی تھی

اور اس کا انگار کس شکل میں ہوا؟ خلاصہ صرف یہ تھا کہ اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کر دے

نَاشْكُرُ لِلّٰهِ (۳۱:۱۲) ”کہ اللہ کا شکر ادا کر دے۔“ یہ تھا اس حکمت کا خلاصہ اور یہ تھی اس کی سمت۔ اور اس کا دوسرا رخ یہ تھا کہ حضرت لقمان اپنی اولاد کو نصیحت کرتے ہیں۔ ایک دانشمند آدمی اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے۔ یہ نصیحت ہر قسم کی کمزوری سے پاک ہوگی اس لیے کہ نصیحت کرنے والا حکیم ہے، اور یہ نصیحت مشکوک بھی نہیں ہے کیونکہ کوئی والد اپنے بیٹے کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اس نصیحت میں یہ حکیم اپنے بیٹے کو عقیدہ توحید کی تلقین کرتے ہیں اور آخرت کے خوف اور جوابدہی کی طرف متوجہ کرتے ہیں نہایت ہی پر اثر انداز ہیں اور نئے موثر الفاظ اور دل میں اترنے والے دلائل کے ساتھ۔

وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ يٰبْنٰی لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ

عَظِيْمٌ (۳۱:۱۳) ”یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا ”بیٹا خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو“ حق یہ ہے کہ شریک بت بڑا ظلم ہے۔“ ایک دوسری دلیل اس موضوع پر یہ دی جاتی ہے اور اس سلسلے میں باپ اور اولاد، ماں اور اولاد کے رشتے کو پیش کیا جاتا ہے نہایت ہی موثر اور جذباتی انداز میں۔ جس کے نتیجے میں رحم و محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ جَمَلَتۡهُ اُمُّهُ وَهَنًا عَلٰی وَهْنٍ وَ فِصْلَةٌ فِیْ عَامِلِيْنَ

(۳۱:۱۴) ”اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف بہ ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹے میں لگے۔“ یوں اللہ کے شکر کا حکم والدین کے شکر کے ساتھ یکجا ہو جاتا ہے۔ اور اپنے شکر کو ان کے شکر پر مقدم رکھا جاتا ہے۔

اِنْ اَشْكُرْ لِيْ وَلَوْ اَلَدَيْكَ (۳۱:۱۴) ”میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا۔“ اس کے بعد اسلامی نظریہ حیات کا پہلا اصول سامنے لایا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں نظریاتی اخوت، گوشت و پوست کی اخوت اور قوم و نسب کے تعلق پر مقدم ہوگی۔ اگرچہ نسب اور خون کے رشتے بہت مضبوط ہوتے ہیں لیکن یہ اللہ کی رات اور عقیدہ توحید اور نظریہ حیات کے زلویہ سے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

وَ اِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰی اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبٰهُمَا

فِی الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَ اَتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ (۳۱:۱۵) ”لیکن اگر وہ یہ دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات برگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کہ جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔“ اس کے بعد آخرت کی جوابدہی کا احساس۔

ثُمَّ اِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَاَبْسِئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۱۵:۳۱) ”پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے اس وقت میں تمہیں جہادوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔“ اب ایک دوسری دلیل توحید سامنے آتی ہے۔ یہ ایک عظیم دلیل ہے۔ اس میں اللہ کے علم کے عموم و شمول اور جامعیت و مانیت کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ یہ علم محیط ہے۔ یہ تصویر کشی اس قدر موثر ہے کہ انسانی شعور میں ایک قسم کا ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ جب انسانی سوچ اس دلیل کا میدان کائنات میں پیچھا کرتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يٰۤاَتِهَا اِنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (۱۶:۳۱) ”یہاں کوئی چیز رملی کے دانہ کے برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو اللہ اسے نکال لائے گا وہ باریک بین اور باخبر ہے۔“ اس کے بعد لقمان اپنے بیٹے کو عقیدہ توحید کے تقاضوں کی نصیحت کرتے چھ جاتے ہیں کہ اس کے بالعموم رد و منکر سے روکو اور اسلامی نظریہ حیات اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے آپ کو جو تکالیف پیش آئیں ان پر صبر کرو کیونکہ داعی الی اللہ کو مشکلات آتی ہیں اور اس طریقہ پر صبر ہوتا ہے۔ لوگوں پر دست درازی نہ کرو اس لیے کہ رہاں سے جو اصلاح کی جائے گی برے عمل سے وہ مجز جائے گی۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۱۸:۳۱) وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنْ اَنْكَرَ الْاَصْوَابُ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (۱۹:۳۱) ”اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر نہ زمین میں اگر چلے اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز پست رکھ سب آوازوں میں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔“ یہاں کسی سے منہ پھرنے اور تکبر نہ کرنے کے لیے لاتصر اور لاتمش مرحا کے الفاظ استعمال کر کے ان حرکتوں کو حقیر جایا گیا ہے۔ یہاں آکر یہ سبق ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی اصل موضوع بحث عقیدہ توحید ہی ہے بالکل عملی انداز میں۔ اور نئے موثر دلائل اور نئے اسلوب کے ساتھ۔

تیسرے سبق میں بھی یہی عقیدہ توحید ہے لیکن اسے زمین و آسمان کے وسیع میدان میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ دلیل یہ دی گئی کہ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ نے انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کا شکر بجالائے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (۲۰:۳۱) ”کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین و آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی

ہیں اور اپنی کلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔ اس پر بھی حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو یا ہدایت یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔ اور اس کائنات اور اس کے اندر اللہ کی نعمتوں کو دیکھتے ہوئے نصرتِ انسانی کے بارے میں ایسے مباحثے سے نفرت کرتی ہے۔ اس کے بعد راہِ راست پر چلنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے کفر اور انکار پر سرزنش کی جاتی ہے۔

وَ إِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَ جَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا

(۲۱: ۳۱) ”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے۔ تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔“ یہ کس قدر بودا موقف ہے اس لیے اس کی پر زور دلائل سے تردید کر دی جاتی ہے۔

أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ (۲۱: ۳۱) ”کیا یہ انہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا ہو۔“ اب آخرت کی جزاء و سزا کو ایمان کے ساتھ مربوط کر کے پیش کر دیا جاتا ہے۔

وَمَنْ يُسْلِمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۲۲: ۳۱) وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزَنُكَ كُفْرُهُ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ

بِمَا عَمَلُوا۔۔۔ (۲۳: ۳۱) ”جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور ملاوہ نیک ہو اس نے فی الواقعہ ایک بھروسہ کے قابل سارا اتھام لیا اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اب جو کفر کرتا ہے اس کا کفر ہمیں فہم میں جلا نہ کرے۔ انہیں پلٹ کر آنا تو ہماری طرف ہے۔ پھر ہم جانیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔“ اب یہاں پھر اللہ کے وسیع علم کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے :

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۲۳: ۳۱) ”یقیناً اللہ سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔“ اور اب تہدید اور تنبیہ

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ غَلِيظٍ (۲۴: ۳۱) ”ہم تھوڑی مدت انہیں دنیا میں حرے کرنے کا موقعہ دے رہے ہیں پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف بھیج لے جائیں گے۔“ اس سبق کے خاتمے کے قریب ان کو نصرت کا آمنا سامنا کر لیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس پوری کائنات کا مشاہدہ کر لیا جاتا ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ اعتراف ہی کر لیں۔

وَلَعِنُ سَالَتَهُمْ مِمَّنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ

أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۲۵:۳۱) ”اگر ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو پھر یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، کو الحمد للہ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں۔“

اس سفر کا خاتمہ ایک کائناتی منظر پر ہوتا ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے علم کی امتحا نہیں ہے اور زمین و آسمان میں اللہ کی مشیت حاکم ہے۔ وہ خالق مطلق ہے۔ اس سے بعث بعد الموت پر استدلال کیا جاتا ہے اور دوبارہ تخلیق کا اسے ثبوت قرار دیا جاتا ہے۔

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفَدَتْ كَلِمَتُ اللَّهِ إِنَّ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۲۷:۳۱) مَا خَلَقَكُمْ وَلَا بَعَثَكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ

وَاحِدَةٍ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ (۲۸:۳۱) ”زمین و آسمان میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر دوات بن جائے جسے مزید سات سمندر روشنائی فراہم کریں تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی بے شک اللہ زبردست و حکیم ہے۔ تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ بلا اٹھانا بس ایسا ہے جیسے ایک تنفس کو پیدا کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔“

چوتھا سفر بھی ایک کائناتی منظر میں ہے۔ قلب بشری پر اس کے زبردست اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ منظر لیل و نہار ہے۔ رات لہی ہوتی ہے اور دن کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ لوریوں لہی ہوتی جاتی ہے اور دن لہا ہوتا ہے اور وہ رات کے جسم میں داخل ہوتا ہے اور آگے ہی بڑھتا ہے۔ شمس و قمر اپنے فلک میں مسخر ہیں اور یہ چلتے ہیں اور چلتے رہیں گے اس وقت تک جس میں ان کا خاتمہ ہو گا، خالق ہی جانتا ہے کہ یہ وقت کب آئے گا جو ان چیزوں کو بھی جانتا ہے اور لوگوں کو بھی جانتا ہے اور زمان و مکان سے بھی باخبر ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَأَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۲۹:۳۱) ”کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں پروتا ہوا آتا ہے۔ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ سب وقت مقررہ تک چلے جا رہے ہیں۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو باخبر ہے۔ اس منظر سے فطرت انسانی کی راہنمائی اس حقیقت کی طرف کی جاتی ہے جو زیر بحث ہے۔“

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (۳۰:۳۱) ”یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی برحق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو

یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں اور اللہ ہی بزرگ و برتر ہے۔“

اب اللہ کی ایک دوسری نعمت لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہ بھی کائنات کا ایک حصہ ہے۔ انسانوں کے دلوں کو چھو اجار رہا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرٰی فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ رَبِّهِ لَیُّرِیْکُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ (۳۱:۳۱) ”تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تاکہ وہ تمہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ اب ان کو اپنے فطری خوف کا مشاہدہ کر لیا جاتا ہے۔ یہ سمندر میں ہیں۔ ان کے پاس اب نہ علم ہے اور نہ قدرت۔ تمام قدرتیں اللہ کے پاس ہیں اور یہ بھی دلیل ہے عقیدہ توحید پر کہ سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

وَ اِذَا غَشِیْہُمْ مَّوْجٌ کَاطِفٌ دَعَوْا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُمُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجَّیْہُمْ اِلَی الْبَرِّ فَمِنْہُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّ مَا یَجْحَدُ بِآیٰتِنَا اِلَّا کُلُّ خَتَّارٍ کَفُوْرٍ (۳۱:۳۲) ”اور جب سمندر میں ان لوگوں پر ایک موج ساہاں کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں، اپنے دین کو بالکل اسی کے لیے خالص کر کے پھر جب وہ پی کر انہیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اقتصاد برتا ہے اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا، مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکر ہے۔“ امواج بحر کی ہولناکی قیامت کے ہول کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک عظیم خوف ہو گا، یہ یوم آخرت ہو گا۔ ایسا ہولناک منظر ہو گا کہ وہاں وہ تمام رشتے کٹ جائیں گے جو دنیا کی کسی ہولناکی میں نہیں کٹتے۔

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّکُمْ وَاخْشَوْا یَوْمًا لَا یَحْزَرِیْ وَاَلِدَّ عَنْ وَلَدِہٖ وَاُمُوْلُوْذُوْہُوْ جَاۤزٍ عَنْ وَّالِدِہٖ شَیْئًا اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَمَّا تَغَرَّبْتُکُمْ الْحَیْوۃَ الدُّنْیَا وَلَا یُغَرِّبُکُمْ بِاللّٰہِ الْفَرُوْرُ (۳۱:۳۳) ”لوگو! بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جبکہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بد نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف کچھ بدلہ لینے والا ہو گا۔ فی الواقعہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور نہ کوئی دھوکہ باز تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکہ دینے پائے۔ اس مقطع پر سورہ ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس حال میں ختم ہوتی ہے کہ مومنین کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ سورہ کے مسائل پر بحث ختم ہوتی ہے اور قاری اور سامع کے دل اور دماغ پر گہرے اثرات پڑ چکے ہوتے ہیں اور اب قلب و نظر کے تاروں پر آخری ضرب

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَ یُنْزِلُ الْغَیْثَ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْضِ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَکْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِآیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ

مخبّر (۳۱:۳۴) ”اس گھڑی کا علم اللہ کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ دس کے بیٹوں میں کیا پرورش پاتا ہے۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس

سرزمین میں اسی کی موت آتی ہے۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔“

یہ چار سفر اور سبق اپنے مخصوص انداز بیان، دلائل اور آیات و نشانات کے ساتھ ایک نمونہ ہیں کہ قرآن مجید کس انداز سے دلوں میں اپنی بات آتا رہتا ہے اور یہ انداز اللہ نے اختیار کیا ہے جو انسانی دلوں کا خالق ہے۔ وہ ان راہوں کو جانتا ہے جن کے ذریعے ان دلوں میں اتر جاسکتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان کے لیے کیا منید ہے اور کس طرح مفید ہے۔

اب مناسب ہے کہ اس ايمان اور سرسری نظر کے بعد آیات کی تفصیلات کی طرف آئیں۔ ہم ان اسفار اور جہ کو دو سبقتوں کی شکل میں پیش کریں گے کیونکہ مضمون و موضوع ہر حال ایک ہے۔

--- ۰ ۰ ۰ ---

درس نمبر ۸۵ التشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۱۹



الَّذِي تِلْكَ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ ۝ هُدًى وَرَحْمَةً لِلْمُحْسِنِينَ ۝ الَّذِينَ
يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝ أُولَٰئِكَ
عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

اللہ کے نام سے جو ہے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ ”اس۔ م۔ یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں“ ہدایت اور
رحمت نیکو کار لوگوں کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب
کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

حروف مقطعات ا۔ ل۔ م سے آغاز ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد یہ فقرہ آتا ہے۔

تِلْكَ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ (۳۱: ۲) ”یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں“۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ کتاب
الہی حروف سے مرکب ہے۔ جیسا کہ دوسری سورتوں میں بھی یہی اشارات موجود ہیں۔ کتاب کو کتاب حکمت کہا گیا ہے۔
کیونکہ اس کا اصل موضوع ہی قلبہ و حکمت ہے لہذا یہاں اس کتاب کی اس صفت کو لایا گیا کیونکہ اس سورہ کے مضامین
کے ساتھ اس کی مناسبت ہے اور یہی قرآن کا انداز ہے۔ کتاب کو کتاب حکیم کہہ کر یہ تاثر دیا گیا کہ یہ ایک زندہ کتاب
ہے۔ اور یہ ارادہ ایک ہدف کی بڑھ رہی ہے۔ گویا یہ ایک زندہ شخصیت ہے۔ بہت ہی دانشمند اور اس کی گفتگو میں ایک
مقصد ہے۔ اس کا ایک متعین ہدف ہے اور یہ اس ہدف کی طرف ہالارادہ بڑھ رہی ہے۔ اس میں روح ہے اس میں
زندگی ہے۔ اس میں حرکت ہے اور اس کتاب کی ایک ذات اور شخصیت ہے جو متعین ہے۔ یہ محبت کرنے والی ہے اور

یہ ہر اس شخص کے ساتھ مکالمہ کرتی ہے جو اس کی صحبت میں بیٹھے۔ جو اس کے سایوں میں زندگی بسر کرے اور وہ اس کی اس کشش کو محسوس کرے جس طرح ایک زندہ دوسرے زندہ کی طرف رکھتا رکھتا ہے اور جس طرح دوست دوست کی طرف کھینچتا ہے۔

یہ ہے کتاب حکیم۔ اور اس کی آیات ہدایت اور رحمت ہیں محسنین کے لیے۔ یہ اس کی اصل ماہیت ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے اور یہ محسنین کے لیے ہمیشہ ہدایت رہتی ہے۔ یہ ان کو ایک متعین منزل مقصود تک پہنچاتی ہے جس طرح ایک زندہ شخص کسی کو راہ دکھاتا ہے مگر حرکت طریقے سے نہیں بالکل الفت اور محبت کے ساتھ نہایت آرام اطمینان کے ساتھ اور اس کی ہدایت یہ ہے کہ پہلے نماز قائم کرو اور اپنے رب سے رابطہ قائم کرو اور پھر زکوٰۃ ادا کرو، اہل ایمان کے دس اس کے ذریعے باہم جو ذکر رکھ دو اور پھر تمام اہل ایمان اللہ کی اس کائنات کے لیے ہمکلام اور مربوط ہو جائیں جس میں وہ رہتے ہیں۔ یہ کتاب وہ اقدار اور وہ حالات پیدا کرتی ہے جس میں تمام انسانوں کا تمام متعین ہو اور وہ اپنی اصل پہچان جان سکیں۔ اس کتاب کے ہدایت یافتہ لوگ اس فطرت سے بھی متعارف ہوں جس فطرت پر انہیں پیدا کیا گیا ہے اور سیدھے ہوں اور ان کے اندر کوئی زلیخ اور ٹیڑھ نہ ہو۔

یہ کتاب جن محسنین کے لیے ہدایت ہے وہ کون ہیں؟

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (۳۱: ۴)

”جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔“ جب کوئی نماز قائم کرتا ہے۔ اس کے پورے ارکان کے ساتھ اسے ادا کرتا ہے، بروقت ادا کرتا ہے اور مکمل طور پر ادا کرتا ہے تو اس کی حکمت، اس کا اثر انسانی شعور اور انسانی طرز عمل میں واضح ہو کر سامنے آتا ہے، اور اس کے ذریعہ اللہ اور بندے کے درمیان وہ تعلق قائم ہو جاتا ہے جو مطلوب ہے۔ اللہ سے انس پیدا ہوتا ہے اور نماز کے اندر محاسن پیدا ہو جاتی ہے اور زکوٰۃ کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کے اندر جو فطری نخل ہے، اس پر انسان قابو پالیتا ہے۔ وہ امت مسلمہ کے لیے ایک اجتماعی نظام کی بنیاد ہوتی ہے اور امت کے اندر اجتماعی کفالت کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس سوسائٹی میں امیروں اور غریبوں دونوں کے اندر اعتماد ہوتا ہے۔ اطمینان ہوتا ہے اور باہم مودت اور محبت ہوتی ہے۔ اس کے اندر طبقاتی نفرت نہیں ہوتی اور آخرت پر ایمان تو تمام نیکیوں کی اساس ہے۔ اس سے قلب بشری ہر وقت بیدار رہتا ہے۔ اس کی نظریں عالم آخرت پر ہوتی ہیں اور زمین کی گندگیوں اور زبوں کے عارضی ساز و سامان کے مقابلے میں اس کی نظریں بلند ہوتی ہیں۔ خفیہ طور پر اور اعلانیہ طور پر انسان یہ دیکھتا ہے کہ اسے اللہ دیکھ رہا ہے اور انسان درجہ احسان تک پہنچ جاتا ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کر دو کہ اسے تم دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہ دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔“ (بخاری و مسلم کتاب الایمان)

یہ لوگ جو لکی نماز پڑھتے ہیں، جو اس نیت سے زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۳۱: ۵)

”یہی لوگ رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“ جس نے ہدایت پائی، اس نے فلاح پائی۔ وہ ایک

روتنی پر چل رہا ہوتا ہے۔ منہ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ گمراہیوں سے اور نساہ سے بچ جاتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس کو ارض پر اپنے اس سفر پر وہ مطمئن ہوتا ہے۔ پتہ رہتا ہے۔ وہ اس کائنات کے ساتھ ہم سفر ہوتا ہے اور اس کائنات کے ایک جزء کے طور پر اس کے ساتھ ہم آہنگی سے سفر طے کرتا جاتا ہے 'نہایت انس و محبت کے ساتھ۔ ایسے ہی لوگ اس کتاب کی آیات سے راہنہ پاتے ہیں۔ محسن 'عازی' زکوٰۃ دینے والے 'آخرت کا یقین رکھنے والے۔ یہ لوگ دنیا اور آخرت میں فلاح پانے والے ہیں۔ یہ لوگ ایک قرین ہیں۔ ان کے مقابلے میں ایک فرق اور بھی ہے۔ کیا ہیں اس کے خدو خال؟

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝ وَإِذَا نُفِثَ
عَلَيْهِ اِثْنًا وَٰلِي مُّسْتَكْبِرًا كَانَتْ لَمْ يَسْمَعْهَا كَانَتْ فِيْ اُذْنَيْهِ وَقُرْءًا فَبَشَّرَهُ
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

”اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام و غریب خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے۔ ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتا ہے گویا کہ اس نے انہیں سنا ہی نہیں گویا کہ اس کے کان بھرے ہیں۔ اچھا 'مژدہ' سنا دے اسے ایک دردناک عذاب کا۔“

لہو الحدیث سے مراد تفریحی اور دلچسپ کلام ہے جس سے محض وقت گزارنا مطلوب ہو۔ اس کلام سے کوئی اچھا اور مفید نتیجہ نہ نکلا ہو اور نہ اس میں کوئی ایسی تعمیری بات ہو جو انسان کے منصب خلافت سے متعلق ہو۔ جو انسان کی ذہنی اخلاقی اور معاشی اور دینی اور اخروی کسی غرض سے وابستہ نہ ہو۔ اسلام انسان کے لیے اس دنیا میں کچھ فرائض متعین کرتا ہے۔ ان فرائض کے حدود و مسائل اور طریقہ کار بھی متعین کرتا ہے۔ یہ آیت عام ہے۔ یہ انسانوں کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے جو ہر زمان و مکان میں بالعموم پایا جاتا ہے۔ بعض روایات یہ بتاتی ہیں کہ اسلام کی پہلی جماعت کے دور میں ایک متعین واقعہ بھی ہوا تھا اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ مکہ کا ایک ارباب نصر ابن اعراش ایران سے ایسی کتابیں خرید کر لاتا تھا جن میں ایرانیوں اور ان کے بڑے لوگوں کے افسانے اور تاریخی واقعات ہوتے تھے اور ان کی جنگوں کے دلچسپ واقعات ہوتے تھے۔ یہ شخص مکہ کی گلیوں میں بیٹھ کر ان لوگوں کو روکتا جو قرآن سننے کے لیے جاتے تھے اور ان کو یہ افسانے سناتا۔ یہ شخص قصص القرآن کے مقابلے میں قصص ایران سناتا تھا۔ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ آیت اس واقعہ میں وارد ہے تو بھی یہ آیت عام ہے۔ یہ لوگوں کی اس قسم کے خدو خال واضح طور پر بتاتی ہے۔ اس قسم کے لوگ ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی موجود تھے جس دور میں مکہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ (۶:۳۱) ”انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام و فریب خرید کر لاتا ہے۔“ یعنی اس کام میں اپنا مال اور اپنا وقت خرچ کرتا ہے اور اپنی زندگی اس میں کھپاتا ہے۔ اس قدر قیمتی چیزیں وہ اس قدر بے وقعت اور بے قیمت چیزوں میں خرچ کرتا ہے۔ اپنی محدود اور قیمتی عمر اس میں کھپاتا ہے۔ یہ عمر جو نہ واپس آتی ہے اور نہ واپس لائی جاسکتی ہے۔ وہ یہ کام کیوں کرتا ہے۔

لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بَغِيرَ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا (۶:۳۱) ”تا کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے۔“ ایسا شخص جاہل ہے اور اس کی نظروں سے حقیقت اوجھل ہے۔ وہ کوئی بات علم و یقین کی بنیاد پر نہیں کرتا۔ نہ وہ حکمت کی بنیاد پر کوئی کام کرتا ہے۔ اس کی نیت بھی خراب ہے اور اس کی غرض بھی فاسد ہے۔ وہ لوگوں کو ہدراہ کرنا چاہتا ہے۔ خود اپنے آپ کو بھی گمراہ کرتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے اور اپنی زندگی کو اس میں فضول ضائع کرتا ہے۔ پھر وہ اس قدر گستاخ ہے کہ دعوت اسلامی کے ساتھ مذاق کرتا ہے اور اس اسلامی نظام کے ساتھ مذاق کرتا ہے جو اللہ نے وضع کیا ہے تا کہ وہ لوگوں کی زندگی کا دستور و قانون ہو۔ چنانچہ قرآن مجید ایسے لوگوں کی تصویر کشی سے بھی قتل ان کو اہانت آمیز عذاب کی دھمکی دیتا ہے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (۶:۳۱) ”ایسے لوگوں کے لیے سخت و لیل کرنے والا عذاب ہے۔ ان کے لیے توہین آمیز عذاب ہو گا“ اس لیے کہ انہوں نے یہاں دعوت اسلامی کی توہین کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ لوگ اسلامی نظام زندگی کے ساتھ مزاح کرتے تھے۔ اب اس دھمکی کے بعد اس گروہ کے خدو خال قلم بند کیے جاتے ہیں۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا (۷:۳۱) ”اے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتا ہے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں۔“ یہ لیک ایسا منظر ہے جس کے اندر اس تکبر شخص کی ہیئت کذلی کو لکھی طرح قلم بند کر دیا گیا ہے۔ وہ نہایت غرور سے منہ موڑ کر گزر جاتا ہے سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ چنانچہ انکار تک اس تصویر میں نہایت حقارت آمیزی سے بھرا جاتا ہے۔

كَأَن فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا (۷:۳۱) ”گویا اس کے کان ہرے ہیں۔“ گویا اس کے کانوں کا یہ بھاری پن اللہ کی آیات کو اس کے کانوں تک پہنچنے ہی نہیں دیتا۔ ورنہ ان آیات کو کوئی انسان بھی اگر سنے تو وہ ان کے ساتھ یہ مذموم برتاؤ نہیں کر سکتا۔ یہ رنگ پھر حرید اہانت آمیز کر دیا جاتا ہے۔

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۷:۳۱) ”مژدہ بنا دو اسے دردناک عذاب کا۔“ یہ موقع کسی بشارت کا موقع نہیں ہے لیکن یہاں ان کی توہین مطلوب ہے اور ایسے تکبرین مسخروں کے لیے یہی انداز مناسب ہے۔

— ۰۰۰ —

اعراض کرنے والوں، تکبر کرنے والوں اور کفر کرنے والوں کی اس اہانت آمیز سزا کی مناسبت سے یہاں ضروری ہے

کہ اچھے عمل کرنے والے اہل ایمان کے انعام اور جزا کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ اس سورہ کے آغاز میں ان کا ذکر ہو چکا ہے اور ان کی کامیابی کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ وہاں اعلیٰ تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ﴿۱﴾
فِيهَا وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۲﴾

”اہلست جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں، ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا بختہ وعدہ ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔“

قرآن کریم میں جہاں جہاں اہل ایمان کی جزاء کا ذکر ہے وہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر ضرور کیا گیا ہے اس لیے کہ اسلامی نظریہ حیات کا مزاج یہ نہیں ہے کہ ایمان محض ’منجید‘ پوشیدہ، معطل اور مجرد تصور ہی ہو بلکہ ایمان کو ایک زندہ، فعال اور متحرک حقیقت ہونا چاہیے۔ جب وہ دل میں پیدا ہو، قرار پکڑے، پورا ہو، تو متحرک ہو کر عملی شکل اختیار کرے۔ وہ حرکت اور طرز عمل کی شکل اختیار کرے اور عالم واقعہ میں اس کے آثار اپنی ترجمانی کریں۔ اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس مومن کے دل میں کیا ہے۔

یہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو عملی شکل دی۔

لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ﴿۳۱﴾ (۸:۳۱) ”ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“ یہ باغات اور یہ دوام اللہ کے عہد کے مطابق ان کو دیا جا رہا ہے۔

وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ﴿۳۱﴾ (۹:۳۱) ”یہ اللہ کا بختہ وعدہ ہے۔“ اللہ کی مہربانی اس حد تک آگے بڑھ گئی کہ اس نے اپنے اوپر اپنے بندوں کے ساتھ احسان کرنا فرض کر لیا۔ یہ ان کے نیکی اور ان کے نیک اعمال کے بدلے میں حالانکہ اللہ تو غنی ہے۔ اسے کسی کے عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۳۱﴾ (۹:۳۱) ”وہ تو زبردست و حکیم ہے۔“ وہ اپنے عہد کو پورا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ مخلوقات کو اس نے بڑی حکمت سے بنایا ہے۔ وعدہ بھی حکمت سے کرتا ہے اور پورا بھی حکمت سے کرتا ہے۔

— ۰ ۰ ۰ —

اس بات کی دلیل کیا ہے کہ اللہ عزیر و حکیم ہے اور اس سے قبل جو کچھ کہا اس کا ثبوت کیا ہے؟ یہ عظیم کائنات جس کی تخلیق کا دعویٰ کوئی انسان اور کوئی قوت نہیں کر سکتی ماسوائے اللہ کے۔ یہ کائنات بہت ہی عظیم ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا نظام نہایت مستحکم اور دقیق ہے۔ اس کی ساخت نہایت ہی متوازن ہے۔ جوں جوں اس کائنات کے بارے میں زیادہ معومات ہوتی ہیں اور انسان غور کرتا جاتا ہے، عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسان کا تصور بھی رک جاتا ہے اور یہ عظیم کائنات ایک ایسی دلیل اور ایک ایسی شہادت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جس سے کوئی منہ نہیں موڑ

سکتا۔ جو بھی ذرا غور کرے 'ذات باری کے تسلیم کرنے کے سوا اس کے لیے چارہ کار ہی نہیں ہے اور جو لوگ پھر بھی اللہ وحدہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں وہ حق کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔

خَلَقَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَالْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ
وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ
زَوْجٍ كَرِيمٍ ۝ هَذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ ۚ بَلِ
الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝

۱۱ ع

”اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔ اس نے زمین میں پہاڑ جمادیے تاکہ وہ تمہیں لے کر دھلک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیئے اور آسمان سے پانی برسا یا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگا دیں۔ تو یہ ہے اللہ کی تخلیق اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔“

یہ آسمان 'بغیر اس کے کہ ان کے بارے میں ہم جدید پیچیدہ سائنسی معصومیت پیش کریں' اپنی ظاہری حالت میں جب ہمارے حواس کے سامنے آتے ہیں تو یہ بہت ہی عظیم لگتے ہیں۔ یہ آسمان ستارے اور سیارے ہوں یا کہکشاں اور سدم ہوں۔ جو بلندیوں میں تھر رہے ہیں اور ان کے حقیقی راز سے صرف اللہ ہی واقف ہے یا آسمان سے مراد یہ تہ ہو جسے ہم دیکھتے ہیں اور جس کی حقیقت سے اللہ ہی خبردار ہے۔ غرض آسمان سے مراد جو بھی ہو، بہر حال یہ عظیم کرات بغیر ہمارے اور ستونوں کے کھڑے ہیں۔ انسان رات اور دن ان مساوات کو دیکھتے ہیں اور جس چھوٹے سے ستارے پر انسان سوار ہیں اس تک ہم جس قدر دوریاں قریب کر دیں اس عالم کا محض تصویری سر کو چکرا دیتا ہے کہ یہ عالم کس قدر عظیم اور ہولناک ہے جس کے حدود و قیود انسان کے اور اک سے ابھی تک باہر ہیں۔ پھر جب ایک انسان سوچتا ہے کہ اس عظیم کائنات کو ایک منظم نظام میں باندھ دیا گیا ہے کہ اس کی حرکت میں ایک سینکڑ کا فرق بھی نہیں آتا۔ پھر اس عالم کو کس قدر خوبصورت بنایا گیا ہے کہ انسان دیکھتا ہی رہ جائے۔ دل سوچتا ہی رہے اور نہ تھکے۔ نظریں بھرتی ہی رہیں اور اس کے نظارے سے ملول نہ ہوں اور جب انسان یہ سوچے کہ اس گول آسمان میں جو چھوٹے چھوٹے تکتے نظر آتے ہیں ان میں سے ایک ایک ستارہ زمین سے ہزاروں گنا بڑا ہے (مثلاً مشتری ایک ہزار گنا) لاکھوں گنا بڑا ہے تو کسی بھی عقلمند انسان کے لیے یہی کافی دلیل ہے۔

فضائے کائنات کے اس ماحول سفر سے واپس آئیے یہ تو قرآن نے ایک سرسری اشارہ ہی کیا ہے۔

خَلَقَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۱۰: ۳۱) ”اس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے پیدا کیا جو تم کو نظر آئیں۔“ اب اسی زمین کی طرف اور ذرا جم کر دیر تک اس کے نظاروں کو غور سے دیکھئے۔ یہ چھوٹی سی زمین کائنات کا ایک ذرہ اس عظیم کائنات میں تو یہ ایک ذرہ ہی ہے جو فضا میں اڑ رہا ہے۔ ہم اس پر واپس آتے ہیں۔ ہم

سمجھتے ہیں کہ یہ زمین بہت وسیع اور طویل و عریض ہے۔ انسان اپنی مختصر زندگی میں اس کی سیر بھی نہیں کر سکتا۔ اگرچہ وہ پوری عمر اس چھوٹے سے ذرے کے سیر و سفر میں گزار دے۔ انسان کو کہا جاتا ہے کہ ذرا اسی کا مطالعہ کھلی آنکھوں سے کرو اور طویل الفت اور بار بار دیکھنے کی وجہ سے انسان سے اس کا انوکھا پن کم ہو گیا ہے۔ ذرا اس کے عجائبات کو دیکھو۔

وَالْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيًّۢا أَنْ تُصِيدَ بِكُمْ (۱۰: ۳۱) ”اور اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے کہ وہ تمہیں سے تر ڈھلک نہ جائے۔“۔ روای معنی پہاڑ۔ علمائے طبقات الارض یہ کہتے ہیں کہ پہاڑ دراصل زمین کے چٹکے کی شکلیں ہیں۔ جب زمین کا چھلکا سرد ہو گیا اور اس کے اندر کی گیسیں سکڑ گئیں تو زمین کا حجم کم ہوتا گیا جس کی وجہ سے زمین کے چٹکے کے اندر شکنیں پیدا ہو گئیں اور اس طرح زمین کے اوپر بلندیاں اور پستیاں اور تھیب و فراز پیدا ہو گئے۔ جس قدر جہاں زیادہ سیڑ کا عمل ہوا اسی قدر پہاڑ بلند ہو گئے۔ اب چاہے علمائے طبقات الارض کا یہ نظریہ درست ہو یا غلط ہو، لیکن اللہ کی کتاب یہ کہتی ہے۔ اللہ نے پہاڑ جما دیئے تاکہ زمین کی رفتار کے اندر توازن ہو اور انسان اس کی سطح پر رک سکے اور اس کے اندر ڈولنے کا عمل نہ ہو۔ علمائے طبقات الارض کا یہ نظریہ درست ہو سکتا ہے اور وہ اس بات کو تسلیم بھی کرتے ہیں کہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین کی رفتار محوری کے اندر وہ توازن نہ ہوتا جو ہے اور اللہ کا حکم ہر حالت میں بلند ہے اور رہے گا کیونکہ اللہ تمام حکمین میں سے سچا اور صادق ہے۔ صدق اللہ العظیم۔

وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ (۱۰: ۳۱) ”اور اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیئے۔“۔ اس عظیم کائنات کے عجائبات میں سے یہ ایک حیرت انگیز انجوبہ ہے کہ اس زمین کے اوپر اللہ نے رنگارنگ زندگی کو پھیلایا ہے۔ آج تک کوئی شخص راز حیات ہی کو نہیں پاسکا اس کی یہ بوقلمونی اور رنگارنگی تو بڑی چیز ہے۔ انسان اس حیات کی سادہ ترین صورت کو بھی نہیں پاسکا چہ جائیکہ وہ زندگی کی اعلیٰ اقسام اس کی رنگارنگی اور مختلف شخصائیں اور خوبصورت جانور پور پرندوں کو جان سکے جن کی تعداد کا بھی انسان کو علم نہیں ہے۔ بے حد افسوس ہے کہ بعض لوگ علم کے باوجود ان عجائبات پر آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں گویا وہ ایک بالکل معمولی چیز دیکھ رہے ہیں۔ یہی انسان جب انسان کی بنائی ہوئی ایک چھوٹی سی مشین کو دیکھتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے اور بار بار الٹ پلٹ کر اسے دیکھتا چلا جاتا ہے حالانکہ یہ مشین اللہ کے پیدا کردہ ایک سادہ غلے سے زیادہ پیچیدہ نہیں ہو سکتی اور ان غلیوں کے جو دقیق اور پیچیدہ تصرفات ہیں، وہ سب انجوبے ہیں۔ ہم صرف سادہ غلے کے عجائبات کی بات کرتے ہیں۔ رہے وہ پیچیدہ تخلیق دہانے والے بڑے انسان جن کے جسم میں سینکڑوں کیمیائی تجزیہ گاہیں اور لیبارٹریاں کام کر رہی ہیں جن کے اندر سینکڑوں سنسورز ہیں جہاں مواد جمع ہوتے ہیں اور تقسیم ہوتے ہیں اور جن کے اندر ایک عجیب مواصلاتی نظام ہے جو لاسکی کے طور پر پیغامات لیتا ہے اور ارسال کرتا ہے اور سینکڑوں دوسرے حوالہ ہزار ہا فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ (۱۰: ۳۱) ”اور آسمانوں سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگادیں۔“۔ آسمانوں سے پانی برساتا عجائبات تکوینی میں سے ایک انجوبہ ہے لیکن چونکہ یہ اکثر ہمارے سامنے دہرایا جاتا ہے اس لیے ہم اس پر سے غفلت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ یہ پانی جس

سے نہیں ہو کر بہتی ہیں جس سے بحیرے بھر جاتے ہیں جس کے ساتھ زمین میں چٹے پھوٹے ہیں۔ یہ پانی ایک نہایت ہی پیچیدہ نظام کے تحت آسمانوں سے برستا ہے۔ یہ آسمانوں کے نظام کے ساتھ مربوط ہے۔ اس کا مزاج اس کی تشکیل اور کرات کی دوریوں سے یہ مربوط ہے۔ پھر پانی کے نزول کے بعد زمین کے اندر مختلف انواع اور مختلف الشکس نباتات، زائعات مختلف، رنگ مختلف، حجم مختلف، خواص مختلف۔ ان کے اندر ایسے ایسے عجائبات کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے نباتات میں زندگی اور نمو ان کا تنوع ان کی دراشتی خصوصیات جو چھوٹے سے حج کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹا سا بیج اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ پودا پھول اور درخت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ ایک ہی پھول کے اندر رنگوں کی تقسیم کا مطالعہ ہی انسان کو خالق کائنات کی عظیم قوتوں کی طرف سمجھ پاتا ہے اور انسان کا ایمان گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

پھر قرآن تصریح کرتا ہے کہ اللہ نے نباتات میں بھی جوڑے پیدا کیے۔

مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ (۱۱:۳۱) ”عمدہ قسم کے جوڑے“۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے کہ سائنس کو بہت ہی قریب زمانے میں اس کا علم اور تجربہ ہو سکا ہے۔ ہر پودے میں نر اور مادہ خلیسے ہوتے ہیں۔ یہ خلیسے ایک ہی پھول میں یا ایک ہی شاخ کے دو پھولوں میں ہوتے ہیں یا یہ خلیسے دو درختوں میں علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور کوئی پودا اس وقت پھل نہیں دیتا جب تک نر اور مادی خلیسے باہم ملتے نہیں ہیں۔ جیسا کہ انسانوں اور حیوانوں کے تولید کا نظام واضح ہے۔

اور زوج کے ساتھ کریم کی صفت، یہاں اس لفظ کے استعمال کے ذریعے ایک خاص تاثر دینا مطلوب ہے کہ یہ اللہ کریم کی تخلیق ہے اور یہ بہت ہی اہم العجبہ ہے جسے دیدہ عبرت سے دیکھا جانا چاہیے اور اس کا احترام کرنا چاہیے۔ یہ اس لیے بھی لایا گیا ہے کہ اللہ نے تو یہ عمدہ کام کیے ہیں اور جن ہستیوں کو تم اللہ سمجھو ہوئے ذرا بتاؤ انہوں نے کیا کام کیے ہیں۔ یہ تو ہے

هَذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ (۱۱:۳۱) ”یہ تو ہے اللہ کی تخلیق اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے“۔ زوج کریم کے بعد یہ پہنچ اور اب یہ نتیجہ

بِالْظُّلُمُونَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (۱۱:۳۱) ”اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں“۔ اور شرک سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے جبکہ اس عظیم کائنات کا یہ معجزہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہاں پہلا سفر ختم ہوتا ہے اور نہایت ہی روداد الفاظ پر۔

--- ○ ○ ○ ---

اس کے بعد اب دو سرار اوٹھ شروع ہوتا ہے۔ یہ بالکل جدید ترتیب سے ہے۔ یہ بالواسطہ ہدایت اور حکایتی انداز تلقین ہے۔ موضوع بحث اللہ وحدہ کا شکر ادا کرنا ہے۔ اور اللہ کو ہر قسم کے شرک سے پاک قرار دینا ہے۔ اس حکایت کے درمیان آخرت اور اعمال اور ان کی جزا کی بات کی گئی ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنْ اشْكُرْ لِلَّهِ وَمَنْ يَشْكُرْ

فَانَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿۱۲﴾

”ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔ جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔“

حضرت لقمان حکیم کی زبانی یہاں عقیدہ توحید، عقیدہ آخرت اور دوسری اخلاقی تعلیمات یہاں دی گئی ہیں۔ ان کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ نبی تھے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ نبوت کے منصب کے بغیر ایک عبد صالح تھے۔ زیادہ تر مفسرین اس دوسری رائے کی طرف گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک حبشی غلام تھے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ نوبہ کے رہنے والے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے جوں میں سے ایک نج تھے۔ وہ جو بھی ہوں قرآن نے ہمیں یہ اطلاع دی ہے کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جس کو اللہ نے حکمت عطا کی تھی اور اس حکمت اور فلسفے کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ اَنْ اشْكُرْ لِلّٰهِ (۱۲:۳۱) ”ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کے شکر گزار بنو۔“ چنانچہ قرآن کریم ہمیں اس قصے کے ضمن میں یہ ہدایت دیتا ہے کہ تم لوگ اللہ کا شکر ادا کرو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت اور اطلاع کہ شکر تو شکر کرنے والے کے لیے ایک ذخیرہ ہے۔ اس کے نتیجے میں خود شاکر کو نفع ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تو غنی بادشاہ ہے کوئی شکر کرے یا نہ کرے اس کی بادشاہت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اللہ تو بذات خود محمود اور قابل ستائش ہے، چاہے کوئی اس کی حمد و ثناء کرے یا نہ کرے۔

وَمَنْ يَشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (۱۲:۳۱) ”جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز ہے۔“ لہذا بہت بڑا احق ہے وہ جو حکمت کے مخالف ہو اور وہ اپنے لیے یہ سرمایہ جمع نہ کرتا ہو۔

اب مسئلہ توحید ایک تقریر کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کے سامنے کی۔

وَإِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهِ ۖ وَهُوَ يَعِظُهُ يَبْنٰی لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾

”یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا ”بیٹا، خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا“ حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔“

یہ ایک ایسا وعظ ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے کیونکہ کوئی والد اپنے بیٹے کے لیے اچھائی کے سوا اور کوئی ارادہ ہی نہیں کر سکتا۔ ایک والد اپنے بیٹے کے لیے ناصح مشفق ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ہیں لقمان حکیم جو اپنے بیٹے کو شرک سے منع کرتے ہیں اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ شرک دراصل ایک عظیم ظلم ہے۔ وہ اس بات کو دو بار اپنی تقریر میں

دہراتے ہیں۔ ایک بار تو وہ شرک سے روک کر اس کی علت بتاتے ہیں اور دوسری تاکید لفظ ان اور لام تاکید کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ ہیں کہ ناحق مجادلہ کرتے ہیں اور اس عقیدے پر زور دینے کی وجہ سے حضرت پر الزامات عائد کرتے ہیں کہ شاید ان کی کوئی ذاتی غرض اس سے وابستہ ہے، مثلاً یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حکمران بننا چاہتے ہیں اور ان کے مقابلے میں بڑا آدمی بننا چاہتے ہیں۔ لہذا ان کی یہ بات درست نہیں ہے اس لیے کہ حضرت لقمان اپنے بیٹے کے سامنے یہی تقریر کرتے ہیں اور ان کو شرک سے روکنے کا امر کرتے ہیں ظاہر ہے کہ کوئی والد کم از کم اپنے بیٹے سے کوئی غلط بات نہیں کر سکتا۔ لہذا یہ فصاحت ہر قسم کے ظن اور گمان سے پاک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے بھی حکمت دی گئی وہ عقیدہ توحید کا قائل ہوتا ہے۔ عقیدہ توحید سے غرض خیر ہی خیر ہے اور کچھ بھی نہیں اور یہ ایک نفسیاتی استدلال ہے۔

--- ۰۰۰ ---

چونکہ یہ والد کی جانب سے اپنے بیٹے کو ایک مشفقانہ وعظ تھا اس لیے یہ بھی بتا دیا گیا کہ جب والد اپنی اولاد کے حق میں اس قدر مخلص اور مشفق ہوتا ہے تو تمام انسانوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ والدین کا تم پر حق ہے۔ یہ تقریر بھی نہایت ہی محبت بھرے الفاظ میں ہے۔ یہ باپ اور بیٹے، والدین اور اولاد کے تعلق کو نہایت ہی شفیقانہ اور اشاراتی انداز میں بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود نظریاتی تعلق اور نظریاتی روابط کو نسب اور خون کے تعلق سے مقدم رکھا جاتا ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَى وَهْنٍ وَفِضْلُهُ فِي عَمِيْنٍ
أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۚ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَى أَنْ تُشْرِكَ بِي
بِئْسَ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ
سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ۚ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

”اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اسی لیے ہم نے اس کو فصاحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے، اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔“

قرآن کریم میں بار بار اولاد کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے والدین کا خیال رکھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نصائح میں بھی اس کی بار بار تاکید آتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں والدین کو اپنی اولاد کے بارے میں بہت کم ہدایت دی گئی ہے۔ جو فصاحت کی گئی ہے وہ زندہ درگور کرنے کی بری رسم کے سلسلے میں ہے جبکہ یہ رسم بہت ہی محدود علاقوں

میں تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچوں پر رحم و شفقت ہر انسان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اللہ نے سلسلہ حیات کو جاری رکھنے کے لیے والدین کے اندر یہ داعیہ رکھ دیا ہے کہ وہ بچوں کی نگہداشت کریں۔ والدین 'اپنے جسم' اپنے اعصاب اور اپنی عمریں بچہ خدا کے لیے کھپا دیتے ہیں۔ وہ اپنی ہر قیمتی چیز اپنے بچوں پر قربان کر دیتے ہیں اور اس راہ میں جو بھی مشکلات آجائیں انہیں نہیں کرتے اور نہ شکوہ کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات والدین لاشعوری طور پر بچوں کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں بلکہ وہ بچوں پر نہایت ہی خوشی خوشی سے سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ اس طرح گویا یہ سب کچھ والدین اپنے لیے کرتے ہیں۔ لہذا بچوں کے لیے فطرت انسانی خود کفیل ہوتی ہے 'مزید کسی وصیت اور تاکید کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ رہا لڑکا اور اولاد تو ان کو بار بار یاد دہانی کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس نسل کا خیال رکھیں جس نے تم پر سب کچھ قربان کر دیا ہے، جس نے سب تدبیریں تمہارے لیے کیں اور جواب ٹھنڈاتے چراغ ہیں یا چراغ سحری ہیں جنہوں نے اپنی عمر 'اپنے جسم اور اپنی روح کو کشید کر کے تمہاری زندگی کا سماں تیار کیا ہے اور جہاں تک بچوں اور اولاد کا تعلق ہے وہ والدین کی قربانیوں کا پورا معاوضہ نہیں دے سکتے اگرچہ وہ اپنی پوری عمر ہی والدین کے لیے وقف کر دیں۔ ذرا اس پر تاثیر تصور کو دیکھیں۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفَصَّلَهُ فِي عَمَامِينَ (۱۴:۳۱) "اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔" اس قربانی اور اس نیکی کی تصویر اس سے لہجی نہیں بنائی جاسکتی۔ والد اپنے فریضہ طبعی کی رو سے زیادہ قربانی دیتی ہے اور بچوں کے لیے اس کی محبت 'شفقت اور نرمی باپ کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ حافظ ابو بکر بزار نے اپنی سند میں یہ روایت کی ہے بذریعہ مریدہ اور اس کے والد کہ ایک شخص طواف میں تھا اور اپنی ماں کو اٹھا کر طواف کر رہا تھا تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا میں نے اس کا حق ادا کر دیا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا نہیں، ایک سانس کے برابر بھی نہیں۔ یوں ایک سانس کے برابر بھی نہیں۔ حمل کے دور میں اور وضع حمل کے دور میں 'جب کہ وہ اسے ضعف پر ضعف جھیل کر اٹھا رہی تھی۔ اس خوشگوار شکرگزاری کے سلسلے میں متوجہ کیا جاتا ہے کہ منعم اول کا شکر ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ پہلا شکر اللہ کا ہے اور دوسرا والدین کا ہے۔

إِنْ أَشْكُرْ لَكُمْ وَلَوْ أَلَيْسَ لَكُمْ بِعَلَمٍ (۱۴:۳۱) "کہ میرا شکر کر لو اور اپنے والدین کا شکر بجالاؤ۔" اور ان حقائق کے ساتھ یہ ہم حقیقت بھی یاد رکھو۔

إِلَى الْمَصِيرِ (۱۴:۳۱) "میری ہی طرف تمہیں پلٹنا ہے۔" اور وہاں یہی ساز و سامان تمہیں فائدہ دے گا۔ لیکن والدین اور اولاد کے اس تعلق کی تعلق کے باوجود اور اولاد کی جانب سے اس حرمت اور ادب کے باوجود یہ تعلق ثانوی ہے۔ اس سے قبل نظر دینی تعلق ہے۔ لہذا اولاد کو یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ نظریات کے سلسلے میں والدین کے احکام اور خواہش کو بھی رکھنا چاہیے۔

وَإِنْ جَاهَدَكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (۱۵:۳۱)

”لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔“ کیونکہ والدین کی اطاعت کی سرحد یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے رب تعالیٰ کی اطاعت کا حکم ہے اور نظریاتی تعلق باپ بیٹے کے تعلق سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اس لیے والدین کسی کو مشرک بنانے کے جو احکام میں ’جدوجہد کہیں‘ دباؤ ڈالیں ’مطالبے کہیں‘ ناراض ہوں‘ تو ان کی یہ بات نہیں مانی جا سکتی کیونکہ اولاد جانتی نہیں ہے کہ اللہ کا کوئی شریک بھی ہے۔ لہذا حکم یہ ہے کہ یہاں سے آگے والدین کی اطاعت نہیں ہے۔ خالق کی اطاعت ہے۔

لیکن نظریاتی اختلاف اور نظریات کے بارے میں والدین کی عدم اطاعت کے حکم کے باوجود والدین کی عزت و احترام اور ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ ضروری ہے۔

وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (۱۵:۳۱) ”دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔“ یہ دنیا کی زندگی تو ایک مختصر سفر ہے۔ اصل سفر یہ ہے۔

وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ (۱۵:۳۱) ”مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔“ یعنی اہل ایمان کی پیروی کرو۔ اور اس مختصر سفر کے بعد پھر تم نے اللہ کے سامنے حاضری دی ہے۔

ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۱۵:۳۱) ”پھر تم سب کو پلٹنا میری طرف ہے۔ پھر میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کر کے آئے ہو۔“ اور ہر شخص کے لیے وہاں جزاء ہوگی اس کے اعمال کی چاہے اس نے شکر کیا یا کفر کیا۔ شرک کی راہ اختیار کی یا توحید کا راستہ اپنایا۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت اور سورہ عنکبوت کی آیت جو اس کے مشابہ ہے اور سورہ احقاف کی ایک آیت جس کا یہی مضمون ہے ’یہ آیات حضرت سعد ابن ابی وقاص اور اس کی ماں کے حق میں نازل ہوئیں۔ (میں نے بیسویں پارے میں سورہ عنکبوت کی آیت کے ضمن میں تفصیلات دی ہیں) بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت سعد ابن مالکؓ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ طبرانی نے اسے کتاب الاسمۃ میں نقل کیا ہے جو انہوں نے داؤد ابن بند سے روایت کی ہے۔ مسلم کی حدیث میں سعد ابن ابی وقاص کا قصہ آیا ہے اور رائج بات یہی ہے لیکن مفہوم اور حکم تمام ایسے حالات پر عام ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ تعلقات میں بھی درجات ہیں اور فرائض میں بھی درجات ہیں۔ ہر حکم اور ہر تعلق کی اپنی قدر و قیمت ہوتی ہے لہذا اسلام میں اللہ کا رابطہ سب سے پسلا رابطہ ہے اور اللہ کے حقوق سب سے اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن کریم مراتب کے اس ذوق کو بار بار بتاتا ہے کہ اگر فرق مراتب نہ کنی خونریزی۔ اور بار بار تاکید اس لیے کی جاتی ہے کہ اس معاملے میں کوئی لصال و اشکال نہ رہے۔

یہ تو تھا جملہ معترضہ حضرت لقمان کی تقریر میں۔ اس کے بعد ان کی تقریر اور نصیحت پھر شروع ہوتی ہے۔ اور یہ مسئلہ بعث بعد الموت اور حشر و نشر اور جزاء و سزا کے بارے میں ہے کہ وہاں سب کو جزاء و سزا ملے گی اور یہ بہت ہی عادلانہ ہوگی لیکن اس اصول کو محض اصول کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اسے ایک کائناتی تمثیل اور تصویر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس قدر موثر انداز میں جس سے انسانی شعور بے حد متاثر ہوتا ہے اور اس تصویر میں بتایا گیا ہے کہ اللہ اس

کائنات کے ذرے ذرے کو جانتا ہے اس لیے ہر کسی کے اجزائے جسم کے تمام ذرات کو وہ لا سکتا ہے۔

يُبْنَىٰ اِنَّهَا اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي
صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يٰٓاَيُّهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ﴿١٦﴾

” (اور لقمان نے کہا تھا کہ) ”بیٹا، کوئی چیز رملی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو، اللہ اسے نکل لائے گا۔ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔“

اگر کوئی اللہ کے علم کی جامعیت اور مہمیت کو محض اصولی الفاظ میں بیان کر دے اور اللہ کو بہت قدروقوں والا کہہ دے اور یہ کہ اسے ذرے ذرے کا حساب لینے والا کہہ دے تو وہ اس قدر موثر نہیں ہو سکتا جس طرح یہ مصور انداز تعبیر موثر اور دلنشین ہے۔ یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز تعبیر ہے کہ نہایت معنوی اور ذہنی امور کو مصور کر دیا جاتا ہے۔ (دیکھئے میری کتاب تصویر لفظی)۔ رملی کا دانہ بہت ہی چھوٹا، گرم گشتہ، بے حقیقت اور بے وزن ہوتا ہے۔ اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ پھر یہ دانہ کسی چٹان (صخرہ) میں ہو کہ وہاں تک پہنچنے کی کوئی راہ بھی نہ ہو یا وہ سداوت میں ہو، جن کی دوریوں کے تصور ہی سے سرچکرا جاتا ہے، جن کے اندر بڑے بڑے عظیم الجثہ کرات بے وزن تھر رہے ہیں یا اس زمین کے اندر وہ رملی کا دانہ کہیں غبار میں پڑا ہو تو اسے بھی اللہ ڈھونڈ لائے گا۔ پس ذرا تصور کر لو اس کے علم و قدرت کے بارے میں۔ وہ بہت ہی باریک بین ہے۔

يٰٓاَيُّهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ﴿٣١﴾ (۱۶:۳۱) اس مضمون کے ساتھ لطیف کا لفظ بہت ہی موزوں ہے۔

اور خیال اس ہونا کہ عظیم اور وسیع و عریض کائنات کی وادیوں میں اس رملی کے دانے کے پیچھے سرپٹ دوڑ رہا ہے اور یہ اللہ کے علم اور قدرت کے تصور پر احاطہ کرنے سے عاجز رہ جاتا ہے، اس لیے وہ اللہ کی طرف مڑ کر اپنی عاجزی کا اقرار کرتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ اللہ ہر خفیہ بات کا جاننے والا ہے اور وہ بات ذہن نشین ہو جاتی ہے جسے پورا قرآن انسان کے ذہن میں بٹھانے کے درپے ہے کہ ”وہ“ دیکھ رہا ہے۔ نہایت ہی بہترین انداز میں اور دلنشین اسلوب میں۔ حضرت لقمان اپنے بیٹے کو فصاحت جاری رکھے ہوتے ہیں۔ اللہ پر پختہ ایمان لانے اور دل سے ہر قسم کے شرک کا شاہدہ تک دور کرنے اور عقیدہ آخرت مثبت کرنے اور اسلامی نظریہ حیات دل میں بٹھانے کے بعد اب وہ اسلامی عقیدے کے تقاضے سامنے لاتے ہیں۔ وہ تقاضے یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کے لیے نماز پڑھیں، یہ معراج الہو منین ہے۔ لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کے لیے ان کو اسلام کی دعوت دیں۔ جو بھی دعوت دیتا ہے اسے مشکلات پیش آتی ہیں، اس لیے مشکلات پر مبرکرو۔

يُبْنَىٰ اَقِيْمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَصْبِرْ

عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿۱۷﴾

”پینا نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، ہدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔“

یہ اسلامی نظریہ حیات کا راستہ ہے کہ اللہ کو وعدہ یا شریک سمجھنا، یہ شعور پیدا کرنا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ اس بات کا معنی ہونا کہ اصل اجر اس کے پاس ہے۔ اس پر بھروسہ کرنا کہ وہ عدل کرے گا اور اس کے عذاب سے ہر وقت ڈرنا اور اس کے بعد لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دینا، ان کی اصلاح کرنا اور ان کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا اور ان تمام امور سے قفل اپنے آپ کو کفر کے ساتھ معرکہ آرائی کے لیے تیار کرنا اور اس راہ میں مادی تیاری سے زیادہ اہم تیاری اخلاقی تیاری ہے۔ اور وہ اقامت صلوٰۃ اور اس کے بعد پیش آنے والی مشکلات پر صبر کیونکہ لوگ دعوت کے مقابلے میں کج روی اختیار کرتے ہیں۔ دعوت کے ساتھ عناد رکھتے ہیں اور اعراض کرتے ہیں۔ اذیت میں لسانی اذیت اور دست درازی کی دونوں اذیتیں شامل ہیں۔ مال کی آزمائش اور جان کی آزمائش۔

إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (۱۷:۳۱) ”یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔“ عزم۔ لامور کا مضموم ہے راستے میں تردد ہونے کے بعد جب کوئی کسی طرف عزم کر لیتا ہے اور پھر راستہ طے کرتا ہے۔

اب حضرت لقمان اپنی فصاحت کو نظریات و عبارات کے بعد اخلاقیات کی حدود میں داخل کرتے ہیں۔ جو کسی بھی داعی کا بہترین زادراہ ہے کیونکہ دعوت الی اللہ دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان دوسروں کو حقیر سمجھے اور اپنے آپ کو برتر سمجھے اور پھر دعوت دیتے وقت اگر امیر بن جائے تو وہ لوگوں پر اپنی قیادت مسلط کرے اور اگر لیک آدمی دعوت الی الخیر کا کام بھی نہیں کرتا اور پھر بھی وہ بڑا بنتا ہے اور لوگوں سے اونچا رہتا ہے تو یہ بہت ہی زیادہ فحیح حرکت ہے۔

وَلَا تُصَغِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا

يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿۱۸﴾ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاعْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۚ إِنَّ

أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴿۱۹﴾

”اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں آکر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر، اور اپنی آواز ذرا پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔“

صر ایک بیماری ہے جب لونٹ کو لگ جاتی ہے تو وہ اپنی گردن نیڑے کر لیتا ہے۔ قرآن کریم مغرور شخص کے فعل کو صر کے ساتھ تشبیہ دے کر اس سے لوگوں کو متفرک کرنا چاہتا ہے۔ کبر اور سرتابی کے عمل کو صر کہا گیا یعنی اپنے رخساروں کو

لوگوں سے کبر و غرور کی وجہ سے پھیر دینا۔ زمین پر اڑ کر چلنے کے معنی ہیں غرور اور استکبار کے ساتھ چلنا۔ بھولا ہوا اور لوگوں کو کچھ نہ سمجھنے والا، یہ ایسی حرکت ہے جسے اللہ بھی مکروہ سمجھتا ہے اور لوگ بھی اسے برا سمجھتے ہیں۔ ایسا شخص اپنے بارے میں اونچا خیال رکھتا ہے اور اپنی رفتار میں اس کا اظہار کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۱۸:۳۱) ”اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے کو پسند نہیں کرتا۔“

اڑ کر چلنے کی ممانعت کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ اعتدال کے ساتھ چلو۔

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ (۱۹:۳۱) ”اور اپنی چال میں اعتدال اختیار کرو۔“ قصد سے مراد میانہ روی ہے۔ یعنی وہ اقتصادی پالیسی جس میں اسراف نہ ہو، کیونکہ جو شخص اڑ کر چلتا ہے، گردن مروڑ کر چلتا ہے اور اپنے آپ کو اونچا سمجھتا ہے وہ اپنی قوت کو ضائع کرتا ہے۔ گویا اسراف کرتا ہے۔ قصد سے مراد ارادہ بھی ہو سکتا ہے یعنی تمہارے چلنے کی حرکت بامقصد ہو اور تمہاری منزل متعین ہو۔ اور اڑ کر خود پسندی سے چلنے والا شخص ماسوائے دکھاوے کے اور اپنے ذہن میں بڑائی کے کوئی اور مقصد نہیں رکھتا اور یہ کوئی مقصد نہیں ہے، یعنی اگر چلتے ہو تو کسی مقصد سے مدد طریقے سے چلو۔ دھیمی آواز میں شائستگی ہوتی ہے۔ اس میں جو شخص بات کرتا ہے وہ اعتماد سے بات کرتا ہے اور اسے اپنی بات کی سچائی کا یقین ہوتا ہے۔ اونچی اور گرجدار آواز سے بات کرنے والا شخص عموماً بے ادب ہوتا ہے یا اسے اپنی بات پر یقین نہیں ہوتا۔ یا وہ اپنی شخصیت کی کمزوری کو شور و شغب میں چھپانا چاہتا ہے۔ جھوٹا شخص ہمیشہ جوش و خروش دکھاتا ہے۔ قرآن کریم کا اپنا اسلوب ہے، یہاں بے مقصد اونچی آواز کی قیاحت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک نہایت ہی مکروہ حقیر اور احمقانہ صورت پیش کی جاتی ہے۔

اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (۱۹:۳۱) ”سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔“ یوں ہر اونچی آواز کو گدھوں کی آواز سے تشبیہ دے کر اسے قابل نفرت بنا دیا گیا اور یوں ہر عقائد اور مذہب شخص اسے حقیر اور قابل نفرت سمجھنے لگتا ہے۔ یہ حقارت آمیز تصویر جس شخص کی نظروں میں ہو، وہ کبھی بھی گدھوں کی آواز کی طرح آواز نہیں نکالے گا۔

یوں یہ دو سراسر ختم ہوتا ہے جس کے اندر پہلے ہی مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث نہایت ہی متنوع اور جدید سے جدید اسلوب میں کی گئی ہے، قرآن کے اپنے انداز تصویر کشی میں۔

درس نمبر ۱۸۶ تشریح آیات

۲۰ --- تا --- ۳۲

یہ اس سورہ کا تیسرا آؤنڈ ہے۔ اس کا آغاز تکوینی دلیل کے بیان سے ہوتا ہے جس کا تعلق لوگوں سے اور ان کی زندگی کی سولیات و مفادات سے ہے کہ اللہ نے ان پر کیا کیا انعامات کیے جو ظاہر بھی ہیں اور باطن بھی ہیں جن سے وہ رات اور دن فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ان کے باوجود انہیں شرم نہیں آتی کہ وہ ایسے منعم، فضل و کرم کرنے والے، داتا کے بارے میں جھڑتے ہیں اور اس کے بعد وہی مسئلہ توحید بیان ہوتا ہے جو اس سے قبل دونوں اسفار میں بیان ہوا۔

الْمُتَرَوِّاۗنَ اِنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ
وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهُ ظَٰهِرَةً وَبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ
یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًی وَلَا كِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ۚ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا
مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلٰ نَنْبِیۡرُ مَا وَجَدْنَا عَلَیۡهِ اٰبَآءَنَاۤ اَوَلَوْ كَاٰنَ
الشَّیْطٰنُ یَدْعُوۡهُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیۡرِ ۝

”کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں؟ اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو ان کے بارے میں جھڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو، یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کس کے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ انہی کی پیروی کس کے خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو؟

یہ وہ نظارہ ہے جسے ہم سب دیکھتے ہیں۔ جسے قرآن کریم بار بار نقل کرتا ہے اور ہر بار منظر کائنات پڑھنے والے کو نیا نظر آتا ہے کیونکہ یہ عظیم کائنات اور اس کے کسی پہلو پر بھی اگر غور کیا جائے، جب بھی غور کیا جائے اور اس کے اسرار و رموز پر تدبر کیا جائے اور اس کے عجائبات دیکھے جائیں تو یہ نیا نظر آتا ہے۔ اور اس کے اسرار اور عجائبات ختم نہیں ہوتے۔ انسان اپنی محدود عمر میں وہ پوری معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔ جب بھی کوئی دریافت ہوتی ہے عقل دنگ رہ جاتی ہے

اور جب بھی ہم از سر نو غور کرتے ہیں اسے جدید پاتے ہیں۔

یسا قرآن کریم اس کائنات کے اس پہلو کو پیش کرتا ہے کہ اللہ نے یہ کائنات ہمارے لیے مسخر کر دی ہے اور یہ ہر طرف سے انسانی ضروریات کو پورا کر رہی ہے۔ پھر جب اس کائنات کے اندر پائے جانے والی تمام چیزوں کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی ترکیب بڑی عجیب ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی مدبر انجینئر نے بنایا ہے اور یہ یونہی اتفاقی طور پر پیدا نہیں ہو گئی۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ارادہ اس پوری کائنات کے پیچھے کام کر رہا ہے اور وہ اللہ مدبر ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کائنات کی تمام چیزوں کو انسان کی خدمت میں لگا دیا اور پھر اس کرۂ ارض کی تو ہر چیز کو خدمت انسان میں لگا دیا۔

جہاں تک اس ہولناک کائنات کا تعلق ہے 'یہ زمین اس کا ایک چھوٹا سا درہ ہے اور اس زمین پر پھر انسان ایک چھوٹی سی ضعیف مخلوق ہے بمقابلہ حجم زمین اور بمقابلہ ان قوتوں کے جو اس زمین کے اندر قدرت نے رکھی ہیں جو زندہ بھی ہیں اور مردہ بھی ہیں۔ ان قوتوں کے مقابلے میں انسان اپنے حجم طاقت اور وزن کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں۔ لیکن اللہ نے انسان کو فضیلت دی اور اس کے جسم میں اپنی روح پھونکی اور اسے اپنی مخلوقات کے ایک بڑے حصے پر فضیلت دے دی۔ اللہ کا یہ فضل و کرم ہی تھا جس کا تقاضا یہ ہوا کہ اس مخلوق کی اس کرۂ ارض پہ اہمیت ہو۔ اور اس کا سب مخلوق سے بلند مقام ہو۔ اس کے اندر یہ قوت اور صلاحیت ہو کہ وہ اس دنیا کے وسائل کو کام میں لائے اور اس کے اندر یہ قوت اور صلاحیت ہو کہ وہ اس دنیا کے وسائل کو کام میں لائے اور اس کے قدرتی ذخائر کی تلاش کرے۔ اس آیت میں جس تسخیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے 'وہ یہی ہے کیونکہ تسخیر کائنات ہی میں اللہ کی ظاہری اور پوشیدہ نعمتوں کا شمار ہوتا ہے۔ یہ تسخیر اس کے علاوہ ہے جو اللہ نے سموات کی قوتوں کو بھی انسان کے لیے مفید بنایا ہے۔ انسان کا وجود ہی اللہ کا فضل ہے اور پھر انسان کو اس قدر قوت و صلاحیت دی جاتی ہے کہ وہ اس کائنات کی سرکش قوتوں کو مسخر کرے۔ یہ اللہ کا دوسرا فضل ہے اور پھر اس کی ہدایت کے لیے رسولوں کو بھیجنا 'اللہ کا مزید فضل ہے۔ ہر وہ سائنس جو وہ لیتا ہے 'دل کی ہر دھڑکن جو اس کے جسم میں خون دوڑاتی ہے۔ اس دنیا کا ہر منظر جسے وہ دیکھتا ہے 'ہر وہ آواز جو اس کے کانوں سے گراتی ہے 'ہر وہ خیال جو اس کے ضمیر میں آتا ہے 'ہر نئی فکر جو وہ تخلیق کرتا ہے۔ یہ سب اللہ کے وہ انعامات ہیں جن میں ایک کا شکر بھی انسان اپنی پوری زندگی میں ادا نہیں کر سکتا۔ یہ سب اللہ کے فضل ہی فضل ہیں۔

اس انسانی مخلوق کے لیے اللہ نے ان تمام قوتوں کو مسخر کیا ہے جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں۔ سورج کی کرنوں کو اس کی خدمت میں لگا دیا۔ چاند کے نور کو اس کے لیے مفید کر دیا 'ستاروں سے اس کے لیے سمندروں میں راہنمائی فراہم کی۔ بارش 'ہوا' پرندے اور چرندے اس کے مفید مطلب بنادینے گئے۔ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کے لیے مفید اور مسخر ہو گئے۔ یہ تو ہم بڑی سہولت سے دیکھ سکتے ہیں۔ ان پر تو ہمیں رات اور دن تبدیل کرنا چاہئے۔ اس طویل و عریض کرۂ ارض پر اسے خلیفہ بنایا گیا اور زمین کے تمام خزانوں پر اس کا کنٹرول قائم کر دیا گیا۔ بعض خزانے ظاہر ہیں اور بعض باطن میں۔ بعض ایسے ہیں جن کے آثار و اثرات اس کے ادراک میں ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو ابھی اس کے ادراک سے باہر ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ان سے وہ استفادہ کرتا رہا لیکن اسے ان کا علم ہی نہ تھا۔ غرض انسان ہے کہ رات اور دن کے ہر لمحے میں اس پر اللہ کے فضل و کرم کی بارش ہو رہی ہے اور وہ اللہ کی رحمتوں میں غرق ہے لیکن اسے معلوم نہیں

کہ ان رحمتوں کی انتہا کیا ہے۔ اس کے انواع و اقسام کیا کیا ہیں لیکن ان سب امور کے باوجود لوگوں میں سے ایک فریق ایسا ہے جو اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا، ان پر غور نہیں کرتا، اپنے ماحول میں غور و فکر کر کے یقین نہیں رکھتا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي آلِهَةٍ بَغْيٍ عِلْمٍ وَلَٰهُدًى وَلَٰكُتُبٌ مُّتَبَّرَةٌ (۲۰:۳۱)
 ”اس کے باوجود حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو یا کوئی ہدایت یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب۔“

اللہ کے بارے میں یہ مجاہدہ عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے جبکہ یہ کائنات اور اس کی بقلمونیاں ہمارے سامنے ہیں اور ان وافر نعمتوں کی تعداد ہی ہمیں معلوم نہیں۔ ایسے حالات میں یہ انکار اور یہ تکذیب نہایت قبیح، نہایت مذموم، قابل نفرت اور فطرت کے خلاف ہے۔ اور انسان اگر غور کرے تو ہمارے خوف کے روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا یہ انکار کرنے والا شخص دراصل فطرتاً منحرف ہے۔ اس کے اندر فطری ہگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کی پکار کو نہیں سن رہا ہے اور وہ اس قدر جبری اور بے شرم ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ایسے منعم کے بارے میں گستاخی کرتا ہے۔ پھر اس شخص کا یہ مجاہدہ اور یہ انکار کسی علم سائنس پر بھی مبنی نہیں ہے۔ محض جہالت پر مبنی ہے۔ پھر ایسے شخص کے پاس نہ کوئی کتابی ثبوت ہے اور نہ دلیل منیر ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَحَدَنَا عَلَيْهِ آبَاؤُنَا

(۲۱:۳۱) ”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔“ یہ ہے ان کی واحد دلیل جو وہ اپنے رویے پر پیش کر سکتے ہیں۔ یہ بھی عجیب دلیل ہے۔ پھر جیسی جامد تقلید، جو نہ علم پر مبنی ہے، نہ کسی نظریہ پر مبنی ہے۔ یہی وہ تقلید ہے جس سے اسلام انسانیت کو چھڑانا چاہتا ہے۔ ان کی عقل کو آزادی دیتا ہے کہ وہ آزادانہ غور و فکر کریں اور انسان کے اندر بیداری، حرکت اور روشنی پھیلانا چاہتا ہے لیکن انسان ہیں کہ وہ اپنے، ماضی کے آثار سے منحرف ہو گئے ہیں اور انہوں نے زبردستی قنادے اپنی گردنوں میں ڈالے ہوئے ہیں اور موبیشیوں کی طرح اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھا ہوا ہے اور پیڑیاں از خود پھن رگی ہیں۔

اسلام تو دراصل ضمیر کی حریت اور شعور کی حریت کا نام ہے۔ وہ نور کی تلاش میں آگے بڑھتا ہے۔ وہ زندگی کا ایسا نظام ہے جس میں کوئی تقلید اور کوئی غلامی اور جمود نہیں ہے۔ لیکن انوس ہے کہ یہ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور اپنی روح سے اس آزادی کو پرے پھینکتے ہیں اور اللہ کے بارے میں بغیر علم، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی کتاب منیر کے مجاہدہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان کے سانچہ مذاق کیا جاتا ہے اور ان کے موقف کی ایک خفیہ خطرناکی بیان کر دی جاتی ہے۔

أَوَلَوْ كَانِ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ (۲۱:۳۱) ”کیا یہ انہی کی پیروی

کس کے خواہ شیطان انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف کیوں نہ بلاتا ہو۔ انہوں نے جو یہ موقف اختیار کر رکھا ہے تو وہ شیطان کی دعوت پر اختیار کر رکھا ہے تاکہ وہ انہیں جہنم کی آگ تک پہنچا دے۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر شیطان انہیں جہنم کی طرف لے جا رہا ہے تو پھر بھی یہ اس کی تقلید کس کے۔ یہ نہایت ہی احساس دلانے والی چٹکی ہے۔ نہایت ہی بیدار کرنے والی اور ڈرانے والی۔ خصوصاً اس عظیم کائناتی دلیل کے بعد۔

اس ہٹ دھرمی پر جی جدال اور یہ دلیل جھگڑے کے حوالے سے۔ اب ان کو بتایا جاتا ہے کہ ان کے لیے مناسب طرز عمل کیا ہے اور اس کائناتی دلیل اور اللہ کے وسیع انعامات کے بعد انہیں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔

وَمَنْ يُسَلِّمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ

بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ﴿۳۱﴾

”جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور عملاً وہ نیک ہو، اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سارا تمام لیا اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔“

یعنی پوری طرح اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور اس کے ساتھ حسن عمل اور حسن سلوک کو اپنانا، یعنی مکمل سپردگی اور اللہ کے فیصلوں پر پوری طرح راضی ہونا، اللہ کے احکام، ہدایات اور فرائض میں رنگ جانا، اس شعور اور یقین کے ساتھ کہ اللہ کی رحمت ہمارے شامل حال ہے اور اللہ ہر وقت نگہبان ہے۔ اس کا وجود ان اللہ کی رضامند کو پاتا ہو اور وہ اس سپردگی میں اپنے ساتھ پوری کائنات کو سر بسجود دیکھتا ہو۔ یہ سب اشارات اپنے چہرے کو اللہ کے حوالے کرنے کے لفظ کے اندر موجود ہیں۔ چہرہ دراصل نہایت ہی مکرم حصہ ہے وجود انسانی کا۔

وَمَنْ يُسَلِّمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ

(۳۱: ۲۲) ”جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور عملاً وہ نیک ہو، اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سارا تمام لیا۔“ یعنی وہ رسی جو نہیں کٹتی۔ جو کبھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔ جو کبھی اس شخص کو دھوکہ نہیں دیتی جو اسے پکڑتا ہے۔ مراد وہ سارا ہے جسے انسان تمام لیتا ہے یعنی جو شخص اللہ کے سپرد ہو جائے وہ سمجھے کہ وہ مشکل ترین حالات میں، تاریک راتوں میں، سخت مشکلات میں، سخت آندھیوں میں، کبھی بے سہارا نہ ہو گا۔

یہ مضبوط سہارا وہ یقین ہے اور وہ گہرا رابطہ ہے جو بندہ مومن اور اس کے رب کے درمیان ہو کرتا ہے۔ ایسا شخص ہر حال میں مطمئن ہوتا ہے اور اس پر جو مشکلات بھی آئیں وہ انہیں برداشت کرتا ہے۔ نہایت اطمینان اور نہایت وقار کے ساتھ۔ بڑے بڑے واقعات اور حادثات میں وہ ہاد قرار رہتا ہے اور مشکلات کو برداشت کرتا ہے۔ نیز وہ اگر خوشحال ہوتا ہے تو بھی وہ آپے سے باہر نہیں ہوتا اور اعتدال اور سنجیدگی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ اسی طرح اگر اس پر اچانک کوئی بحران آجائے تو وہ حواس باختہ نہیں ہوتا اور نہ خدا کے راستے میں آنے والی گونا گوں مشکلات میں پریشان ہوتا ہے۔ دعوت اسلامی کا سفر طویل اور خطرات سے پر ہے۔ اس میں محرومیاں اور مشکلات بھی خطرناک ہوتی ہیں لیکن

خوشحالی اور مالداری اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ مصیبت بھی آزمائش اور عافیت بھی آزمائش۔ لہذا ایسے سارے کی اس راہ میں ہر وقت ضرورت ہوتی ہے جو کبھی ڈھیلا نہ ہو۔ ایسی رسی کی ضرورت ہوتی ہے جو ٹوٹ نہ جائے اور یہ ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ یعنی مضبوط سارے کی اور یہ مضبوط سارا کیا ہے؟ اسم لانا اللہ پر یقین کرنا اس کے سپرد ہو جانا اور راہ احسان اختیار کرنا۔ پھر انجام اللہ کے ہاتھ میں دے دینا۔

وَاللّٰهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۲۲:۳۱) ”اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“ یعنی اسی کی طرف لوٹنا ہے اور آخری مرجع وہی ہے تو مناسب ہے کہ انسان پہلے سے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے اور اس کی طرف نہایت روشن اعتماد اور قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق راستے طے کرتا رہے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنكَ كُفْرُهُ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿۲۳﴾ نَسْتَعْتُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴿۲۴﴾

”اب جو کفر کرتا ہے اس کا کفر تمہیں غم میں مبتلا نہ کرے“ انہیں پتہ کر آتا تو ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم انہیں جہنم کے دس گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ یقیناً اللہ سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ ہم تمہاری مدت انہیں دنیا میں حیرے کرنے کا موقع دے رہے ہیں، پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف بھیج لے جائیں گے۔“ وہ تو تھا انجام ان لوگوں کا جو اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کے سپرد کر دیں اور یہ ہے انجام ان لوگوں کا جو کفر اختیار کرتے ہیں اور متاع دنیا ان کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ دنیا میں ان کا انجام یہ ہو گا کہ رسول اور اہل ایمان ان کو اہمیت ہی نہ دیں گے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنُّكَ كُفْرُهُ (۲۳:۳۱) ”اور جو کفر کرتا ہے، اس کا کفر تمہیں غم میں مبتلا نہ کرے۔“ ان کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپ جو سرور کونین ہیں ان کے لیے پریشان ہوں۔ یہ تو بہت ہی حقیر و صغیر ہیں اور آخرت میں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ حقارت آمیز ہونے والا ہے۔ یہ اللہ کے قبضے میں ہیں۔ یہ اللہ سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ اللہ ان کو ان کے اعمال کے بدلے پکڑے گا، وہ ہر شخص کے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے، خواہ ظاہر ہو یا خفیہ ہو، یا اس کے سینے میں ہو یا اس کی نیت میں ہو۔

إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۲۳:۳۱) ”انہیں پتہ کر آتا تو ہماری ہی طرف ہے۔ پھر ہم انہیں جہنم کے دس گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ یقیناً اللہ سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔“ زندگی کا ساز و سامان جو انسان کو فریب دیتا ہے ایک مختصر عرصے کے لیے ہے اور نہایت ہی کم قیمت

ہے۔

نُمَتَّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ (۳۱: ۲۴) ”ہم انہیں تھوڑی مدت اس دنیا میں مزے کرنے کا موقعہ دے رہے ہیں پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف بھیج لے جائیں گے۔“ تھوڑے دن تو مزے کریں گے پھر خوفناک عذاب سے دوچار ہوں گے اور انہیں اس عذاب کی طرف دھکیل کر لے جایا جائے گا۔ عذاب کی تعریف میں غلیظ کا غظ آیا ہے اور اس کے ذریعے عذاب کو مجسم کر دیا گیا ہے۔ اور اخطرار کے معنی میں کفار کی بے بسی کا اظہار کیا گیا یعنی وہ اس عذاب سے اپنے آپ کو بچانہ سکیں گی اور نہ لیت و لعل کر سکیں گے۔ یہ تو تھا کافروں کا حال لیکن جو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لے اور اپنے رخ کو اللہ کے سیرد کر دے اور سنجیدہ اور مطمئن ہو کر رب تعالیٰ کی طرف چل پڑے۔ وہ نہایت ہی اعلیٰ مقام پر ہو گا بمقابلہ کافر کے۔

--- ۰۰۰ ---

اب ان کو خود ان کی فطرت کی منطقی دلیل سے دوچار کر دیا جاتا ہے جب ان کے سامنے یہ عظیم کائنات رکھ دی جاتی ہے اور سوال یہ ہے کہ آیا اس کا کوئی خالق ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے سوالور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ہے کیونکہ ذات باری تو انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ اس کے سوا اس کائنات کی اور کوئی تعبیر ہی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ لوگ فطرت کی اس سادہ منطق سے بھی کجی اختیار کرتے ہیں اور اسے جی بھلا دیتے ہیں حالانکہ اس سے اور کوئی قوی اور درست دلیل نہیں ہے۔

وَلَیِّنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ
قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۵﴾ اللّٰهُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۳۶﴾

”اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو الحمد للہ۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ بے شک اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔“

کوئی معقول انسان جب خود اپنے دل سے پوچھے کہ آخر اس کائنات عظیم کا خالق کون ہے تو وہ یہی جواب پائے گا کہ اللہ۔ یہ جواب ہر شخص اپنی فطرت میں پاتا ہے۔ یہ زمین اور یہ افلاک ہماری نظروں کے سامنے قائم ہیں ان کے حالات ان کے حجم ان کی حرکات ان کی دوریاں ان کے خواص اور ان کی صفات سب کے سب اندازہ کیے ہوئے صحیح اور متعین اور باہم نظم اور نسق میں پروئے ہوئے۔ پھر یہ مخلوق ہیں اور کوئی مدعی بھی نہیں ہے کہ ان کا وہ خالق ہے۔ نہ یہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے ان کا اور یہ بھی عقلاً ممکن نہیں ہے کہ یہ عظیم کائنات خود بخود

یونہی پیدا ہوگئی ہے۔ پھر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کسی مدبر کے بغیر ہی یہ صدیوں سے اس قدر اہل تنظیم کی گرفت میں ہے۔
 اور اس کے نظام میں کوئی خلل نہیں ہے۔ لہذا مدبر کا ہونا لازم ہے۔ جو شخص اس کا قائل ہے کہ یہ خود بخود وجود میں آ
 گئی 'خود بخود قائم ہوگئی اور منظم ہوگئی محض اتفاقاً تو اس سے بڑا احق اور کوئی نہیں ہے۔ اس قسم کے قول کو فطرت اپنی
 گمراہیوں کے ذریعہ مسترد کر دیتی ہے۔

وہ لوگ جو اس دور میں عقیدہ توحید کا مقابلہ کر رہے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا راستہ روکے کھڑے
 تھے سخت مجادلہ کر رہے تھے۔ یہ لوگ خود اپنی فطرت کے شعور اور منطق کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے 'جب ان کے سامنے یہ
 کائنات اور اس کی موجودگی کو رکھا جاتا تھا 'جو ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی اور صرف دیکھنے کی ضرورت تھی۔

اس لیے وہ اس سوال کے جواب میں کوئی تردد نہ کرتے تھے۔ جب پوچھا جاتا کہ "زمین اور آسمانوں کو کس نے
 پیدا کیا؟" تو وہ فوراً کہہ دیتے "اللہ نے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ اس جواب کے
 جواب میں بس اللہ کی حمد کہیں "الحمد للہ"۔ الحمد للہ کہ ان پر حق واضح ہو گیا اور انہوں نے فطری منطق کو تسلیم کر لیا۔ خدا
 کا شکر ہے کہ وہ اس کائنات کی تخلیق کی حد تک موحد ہو گئے۔ اس کے سوا ہر حال میں حمد و ثنا کرتے رہو۔ اب جدال و
 مباحثہ کو چھوڑ کر ایک دو سرائبرہ۔

بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۲۵:۳۱) "مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں"۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ بحث
 اور مجادلہ کرتے ہیں۔ دلائل فطرت کو نہیں سمجھتے اور اس عظیم کائنات کے ہوتے ہوئے بھی عقیدہ توحید کے قائل نہیں۔
 انہوں نے چونکہ زمین اور آسمان کی تخلیق کی حد تک اللہ کی وحدانیت کو مان لیا ہے اس لیے اب بتایا جاتا ہے کہ اللہ
 خالق ہونے کے نامے اس کائنات کا مالک مطلق بھی ہے۔ اس حصے کا بھی جسے انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے اور اس
 حصے کا بھی جسے مسخر نہیں کیا گیا۔ لیکن وہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان سازی مخلوق سے غنی ہے اور وہ اپنی ذات میں
 خود محو ہے اگرچہ لوگ اس کی حمد و ثنا نہ کہیں۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۲۶:۳۱) "آسمانوں اور
 زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ بے شک اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محو ہے۔ یہ سفر اب اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ
 ختم ہونے والی نہیں۔ اللہ کا علم لامحدود اس کی قدرت ہے انتہا اور اس کی مشیت کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔
 تمام مخلوق پر وہ قادر ہے اور یہ بات ایک کائناتی منظر کی شکل میں عانی جاتی ہے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرٍ وَّ اَقْلَامٍ وَّ الْبَحْرِ يَمْدُ
 مِنْ بَعْدِ سَبْعَةِ اَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ
 خَلْقَكُمْ وَاَنْتُمْ اَعْمٰیءٌ اِلَّا كَفَّيْسٌ وَّاحِدٌ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيْرٌ

”زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے بہت مزید سمندر روشنائی مہیا کرے تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی۔ بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا تو (اس کے لیے) بس ایسا ہے جیسے ایک شخص کو (پیدا کرنا اور جلا اٹھانا)۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جو انسانوں کی معلومات اور ان کے محدود مشاہدات سے لیا گیا ہے تاکہ اللہ کی مشیت کے لامحدود کارناموں کو ان کے تصور کے قریب کر دیا جائے۔ اس تمثیل اور مجسم انداز کے بغیر انسانی تصور اس کا ادراک ہی نہیں کر سکتا تھا۔

انسان اپنے علم کو لکھتے ہیں اور اپنے اقوال کو ریکارڈ کرتے ہیں، اپنے احکام کو نافذ کرتے ہیں اور قلموں کے ذریعے وہ لکھتے ہیں۔ یہ قلمیں جنگلوں اور کلک سے بناتے ہیں اور پھر سیاہی بنا کر اس سے لکھتے ہیں۔ یہ سیاہی ایک شیش یا ایک دوات میں ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پوری زمین کے درختوں سے قلمیں بنا دی جائیں اور تمام سمندروں کے پانی کو سیاہی میں بدل دیا جائے اور ان جیسے سات اور سمندر بھی لے آئے جائیں اور لکھنے والے بیٹھ جائیں۔ اللہ کے نئے نئے کلمات جو اللہ کے علم پر دلالت کرتے ہوں تو یہ سب سمندروں کی روشنائی ختم ہو جائے اور اللہ کے کلمات علیہ ختم نہ ہوں اور اللہ کے علم کی انتہا نہ ہو۔ اس لیے کہ ایک محدود قوت لامحدود کو احاطہ میں ماننا چاہتی ہے۔ محدود قوت جس قدر بھی آگے جائے، بہر حال اس کی قوت ایک جگہ جا کر ختم ہو جاتی ہے اور لامحدود غیر محیط ہی رہتا ہے۔ غرض اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوتے کیونکہ اللہ کا علم، محدود ہے۔ اللہ کا ارادہ کسی سرحد پر نہیں رکھتا۔ اور اللہ کی مشیت کے حدود و قیود نہیں ہیں۔

درخت اور سمندر غائب ہو جاتے ہیں۔ تمام زندہ چیزیں اور تمام مردہ چیزیں غائب ہو کر ختم ہو جاتی ہیں۔ تمام حالات اور صورتیں پس پردہ چلی جاتی ہیں اور انسانی دل، اللہ کے جلال اور قدرت کے سامنے سہا ہوا رہ جاتا ہے۔ وہ قدرت جو نہ پھرتی ہے، نہ بدلتی ہے اور نہ غائب ہوتی ہے۔ اللہ خالق اور قوی اور مدبر اور حکیم کے سامنے انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ (۳۱: ۲۷) ”بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔“

اس سفر میں ہم ہولناک منظر کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور اب انسانی فکر و نظر کی تاروں پر آخری معرَب! بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے سامنے تمام لوگوں کا دوبارہ اٹھانا بہت ہی آسان ہے۔

مَا خَلَقْكُمْ وَلَا بَعَثْكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةً اِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيْرٌ (۳۱: ۲۸) ”تم

سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا تو بس ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنا اور اٹھانا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔“ وہ ارادہ جس کے متوجہ ہوتے ہی مخلوق پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے برابر ہے کہ وہ ارادہ ایک چیز کی طرف متوجہ ہو یا بے شمار چیزوں کی طرف متوجہ ہو۔ اللہ کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایک آدمی کو بناتا پھرے اور ایک ایک آدمی پر محنت کرے۔ اس کے لیے ایک آدمی کا پیدا کرنا اور بے شمار بلین لوگوں کا پیدا کرنا ایک ہی طرح کا ہے۔ ایک شخص کا زندہ کر کے اٹھانا اور بے شمار بلین لوگوں کو اٹھانا اللہ کے لیے ایک ہی جیسا ہے۔ اللہ نے تو

صرف ایک لفظ کن کما ہے۔

أَمَّا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ”اس کا حکم جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہے تو یہ ہوتا ہے کہ اسے کہہ دے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے۔“

اس قدرت اس علم اور اس نمارت کے ساتھ تحقیق اور بعث بعد الموت اور حساب و کتب کا عمل سرانجام دیا جائے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ (۲۸:۳۱) ”اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔“

--- ۰۰۰ ---

اب اس سورہ کا تیسرا سرفہ تیسرا ار اوٹہ ہے۔ اور اس میں بھی وہی مسئلہ توحید زیر بحث ہے جو پہلے دو اسفار میں تھا۔ فیعلہ ہوتا ہے کہ اللہ حق ہے۔ لوگ جن شرکاء کو پکارتے ہیں وہ باطل ہیں عبادت صرف اللہ وحدہ کی چاہئے۔ قیامت کے دن کے بعد جو حساب و کتاب ہو گا اس میں نہ والد اپنی اولاد کا فدیہ دے سکے گا اور یہ ہی بچہ اپنے والدین کی طرف سے کوئی بدلہ دے سکے گا۔ ان فیصلوں کے ساتھ کئی دوسرے اور جدید ایٹوز نہایت موثر انداز میں لیے گئے ہیں۔ یہ سب مسائل بھی اس کائنات کے فریم ورک میں زیر بحث آتے ہیں۔

الْمُتَرَّانَ اللّٰهُ يُؤَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي

الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَأَنَّ اللّٰهَ بِمَا

تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۱۵﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ

۳

۱۱ ع

الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴿۱۶﴾

۱۲

”کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پردتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں؟ اس نے سورج اور چاند کو سڑ کر رکھا ہے سب ایک وقت مقرر تک چلے جا رہے ہیں اور (کیا تم نہیں جانتے) کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے؟ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں اور (اس وجہ سے کہ) اللہ ہی بزرگ و برتر ہے۔“

رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا ان کا باہم متضاد ہونا اور مختلف موسموں میں ان کا لمبا اور چھوٹا ہونا ایک عجیب منظر ہے۔ لیکن ساموں سے اسے دیکھتے چلے جانا اور بار بار ایسا ہونا انہوں کو اس سے مانوس کر دیتا ہے اور اکثریت اس انجوبے کو دیکھتے ہوئے بھی اس کو محسوس نہیں کرتی۔ حالانکہ وہ نہایت ہی باریکی کے ساتھ اور کڑے نظم کے ساتھ واقعہ ہو رہا ہے اور اس میں سائنس کا فرق بھی نہیں آتا۔ اس میں کوئی خلل نہیں آتا۔ کبھی ایک بار بھی۔ یہ مسلسل دوران زمین اور دوران کرأت جس میں کوئی کرہ اپنے مدار سے نہ ادھر ادھر ہوتا ہے اور نہ رکتا ہے۔ ایک عظیم انجوبہ ہے۔ صرف اللہ وحدہ کی ذات ہی اس قسم کے نظام کو وجود میں لا سکتی ہے اور چھاستی ہے اور حفاظت سے رکھ سکتی

ہے۔ اس حقیقت کا اور ایک صرف افلاک سماوی اور کرات فلکی کے مدارات ہی کے مشاہدے سے ہو جاتا ہے۔ رات اور دن کے اس تغیر کا تعلق شمس و قمر کے دوران سے بھی واضح ہے۔ شمس و قمر کو میخ کر کے فضا میں رکھنا روز و شب کے ظہور سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ ان کے لمبے چھوٹے ہونے سے بھی زیادہ عجیب۔ اس عظیم نظام کو صرف اللہ ہی میخ کر سکتا ہے جو مدبر و خیر ہے، وہی ہے جو ان چیزوں کو وقت معلوم تک صحیح اندازے سے چلا سکتا ہے۔ رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا تو اس پوری کائنات کا ایک معمولی حصہ ہے۔ شمس و قمر کی تغیر بھی ایک واضح حقیقت ہے، شمس و قمر کی اہمیت ایک عام آدمی کے لیے یہ ہے کہ یہ دونوں اجرام فلکی انسان کے سامنے اور قریب ہیں ورنہ کائنات میں تو یہ بھی ذرے اور حقیر ذرے ہی ہیں۔ اس عظیم علم اور انتظام کے بعد پھر:

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۹:۳۱) ”جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“ یہ تو ایک معمولی سی بات ہے۔ ان کائناتی حقائق کے بعد یہ غیبی حقیقت بہت ہی چھوٹی ہے اور اللہ کے لیے اس کا کرنا مشکل نہیں۔ یہ دونوں حقائق باہم مربوط ہیں۔

گردش لیل و نمرز، تغیر و شمس و قمر اور اللہ کے علیم و خیر ہونا، ان تین حقائق کے بعد ایک عظیم حقیقت بیان کی جاتی ہے جس کے اوپر ان تینوں حقائق کا دار و مدار ہے اور اس عظیم حقیقت کو اس سفر میں بیان کیا گیا ہے اور اس کے لیے یہ دلیل دی گئی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ

الْكَبِيْرُ (۳۰:۳۱) ”یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے جھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ سب باطل ہیں اور (اس وجہ سے کہ) اللہ ہی بزرگ و برتر ہے۔“ ”یہ“ یعنی یہ نظام کائنات جو بہت ہی پیچیدہ، باریک، دائم، ثابت اور نہایت ہی ہم آہنگ ہے۔ یہ نظام اس لیے قائم ہے کہ اللہ حق ہے اور اللہ کے سوا تمام دوسرے معبود و الہ باطل ہیں۔ یہ نظام کائنات حقیقت کبریٰ کی وجہ سے قائم ہے اور حقیقت کبریٰ اللہ واجب الوجود ہے جس کی وجہ سے یہ پر اوہود قائم ہے۔ چونکہ یہ کائنات قائم ہے، لہذا اللہ حق ہے اور تبھی یہ کائنات قائم ہے۔ وہی اسے قائم کرتا ہے، چلاتا ہے، حفاظت کرتا ہے اور تبدیل کرتا ہے۔ وہی ہے جو اس کائنات کے قائم رہنے کی ضمانت ہے، وہی اس کے قرار ربیٰ اور نظم کا سبب ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (۳۰:۳۱) ”یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے۔“ اللہ کے

سوا ہر چیز تغیر اور متبدل ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز اپنا رخ بدلتی ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز میں زیادتی اور نقصان واقع ہوتا ہے۔ اس کے اوپر ضعف اور قوت، جوانی اور بڑھاپا، عروج و زوال، اقبال و ادبار آتا ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز نہ تھی نہ ہوئی نہ تھی اور نہ ہوگی۔ یہ صرف اللہ ہی ہے جو قائم و دائم ہے۔ اور اس پر کوئی تغیر، تبدل اور زوال نہیں آتا۔

نفس انسانی کے اندر ایک چیز رہتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ کا یہ قول۔

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ (۳۱: ۳۰) کی پوری مراد ہم الفاظ میں منتقل نہیں کر سکے۔ اس کا ایک مفہوم ہے اور اس کو محسوس کیا جاتا ہے لیکن میرے لیے اسے الفاظ میں لانا مشکل ہے۔ اسی طرح یہ تعبیر أَنَّ اللَّهَ هُوَ

الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (۳۱: ۳۰) اس کے سوا کوئی علی اور کبیر نہیں ہے۔ ان تعبیرات کے بارے میں میں نے ایک ایسی بات کہہ دی ہے جس کو میرا پورا دہود پاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ انسانی تعبیرات میں وہ الفاظ نہیں ہیں کہ ان کے ذریعے ان دو فقروں میں پائے جانے والے خالق کا اظہار کیا جاسکے۔ یہ بہت ہی بلند حقائق ہیں۔ اللہ حق ہے، علی ہے، کبیر ہے۔ انسانی تعبیرات ان مفہیم کو جو ان فقروں سے محسوس کیے جاسکتے ہیں اور محدود کر دیتی ہیں۔ اس لیے صرف قرآن کی تعبیری ان کے لیے کافی ہے۔

اس کائناتی منظر، عالم بالا کے منظر کے بعد اب ایک دوسرا منظر جو انسانوں کے تجربے اور مشاہدے میں آتا ہی رہتا رہے، روز و شب انسان ان کے تجربے سے گزرتے ہیں۔ یہ ایک کشتی ہے جو سمندر کی وسعتوں میں تیر رہی ہے۔ یہ بھی اللہ کے فضل و کرم سے تیر رہی ہے۔ اللہ لوگوں کو اس منظر میں ایک خطرناک حالت کے ساتھ کھڑا کر دیتے ہیں۔ ایسے مناظر سے اکثر مخاطبین خود گزر چکے ہیں۔ یہ ایک فطری سفر ہے۔ اس میں انسان قدرت اور قدرتی قوتوں کے اندر گمراہ ہوتا ہے۔ اس کے پاس کوئی قوت، کوئی مقابلہ، کوئی گرفت اور کوئی غور نہیں ہوتا۔ جب انسان اس کشتی میں سفر کر رہا ہوتا ہے اور سمندر کی گہرائیوں میں ہوتا ہے۔

الْمُرْتَدَّانَ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ نِعْمَتًا اللَّهُ لِيُرِيَكُمْ مِنْ
آيَاتِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿۵۷﴾ وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَوْجٌ
كَالظُّلُمِ دَعَوْا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ؕ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ
مُقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَسَّارٍ كَفُورٍ ﴿۵۸﴾

”کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تاکہ وہ تمہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے؟ درحقیقت اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔ اور جب (سمندر میں) ان لوگوں پر ایک موج سا تباہی کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دین کو بالکل اسی کے لیے خالص کر کے۔ پھر جب وہ بچا کر انہیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی انصاف برتا ہے اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکر ہے۔“

یہ کشتی ان قوانین قدرت کے مطابق چلتی ہے جو اللہ نے سمندر، کشتی، ہوا، زمین اور آسمانوں میں رکھتے ہیں۔ اللہ نے ان چیزوں کو ان خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا کہ کشتی سمندروں میں چلنے لگی ہے، نہ اڑتی ہے، اور نہ ایک جگہ ٹھہر رہی ہے۔ اگر ان خواص میں سے کوئی بھی خاصیت کسی ایک چیز کی ختم ہو جائے تو کشتی سمندر میں نہ چل سکے۔ اگر پانی کی کثافت

ختم ہو جائے یا کشتی کے مادے کی کثافت ختم ہو جائے یا اس کی مقدار میں کمی بیشی ہو جائے۔ ہوا کا دباؤ سمندر پر کم ہو جائے، ہوا کی موجیں یا سمندر کی موجوں میں خلل ہو جائے اور اگر وہ درجہ حرارت ختم ہو جائے جس کے مطابق پانی پانی رہتا ہے اور جس کی وجہ سے ہوا اور پانی کی موجیں مناسب حدود میں رہتی ہیں۔ اگر موجودہ حالت سے ایک فیصدی تبدیلی بھی ہو جائے تو کشتی سمندر کے پانیوں کے اوپر نہ تیر سکے۔ ان خواص کے علاوہ دوسرے عوامل کے مقابلے میں اللہ پر کشتی کا حامی و مددگار ہوتا ہے کہ امواج کی سرکشی کو روکتا ہے۔ طوفانوں اور موسمی اثرات سے بچاتا ہے۔ سمندر کی دوریوں میں اللہ کے سوا کوئی اور بچنے والا نہیں ہوتا لہذا یہ ہر حال میں اللہ کے رحم و کرم اور فضل و مہربانی کے ساتھ چلتی ہے۔ پھر اس کے اندر اللہ کے فضل کی چیزیں لدی ہوتی ہیں۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ فضل کے یہ دونوں منے ہو سکتے ہیں۔

لِيرِيَكُمْ مِّنْ آيَاتِهِ (۳۱:۳۱) ”تاکہ وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے جو تمہاری نظروں کے سامنے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی دیکھنا چاہے۔ ان میں کوئی اجمال اور اتھا نہیں ہے۔“

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۳۱:۳۱) ”اس میں نشانیاں ہیں ہر صابر اور شکور کے لیے“۔ یعنی مشکلات پر صبر کرنے والا اور سہولیات پر شکر کرنے والا۔ انسان ہر وقت ان دونوں حالات میں سے کسی ایک میں تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ نہ صبر کرتے ہیں اور نہ شکر کرتے ہیں۔ جب مصیبت آتی ہے تو چیختے گلتے ہیں اور اگر نجات دے دی جاتی ہے تو چند لوگوں کے سوا شکر نہیں کرتے۔

وَ اِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۳۱:۳۲) ”اور جب ان پر ایک موج سائبوں کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دین کو صرف اسی کے لیے خالص کر کے“۔ ایسے حالات میں کہ کشتی گمرے سمندر میں ایک پرگاہ کی طرح ہوتی ہے اور موجیں ایسی اٹھ رہی ہوتی ہیں جیسے سائباب‘ اور کشتی کے اوپر آ جاتی ہیں تو ایسے خطرناک حالات میں یہ لوگ جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔ امن و امان کے دنوں میں یہ جھوٹے اور موہوم معبود ان کی فطرت کو زحانپ لیتے ہیں اور فطرت اور خالق فصاحت کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں اور حالت خطر میں جب یہ پردے گر جاتے ہیں اور ان کی فطرت پر ہوں ورتوں کے نیچے کھلی ہو کر سامنے آتی ہے اور وہ اپنے رب کے سامنے سیدھی کھڑی ہوتی ہے۔ اپنے رب کی طرف رجوع کر لیتی ہے۔ دین اللہ کے لیے خالص کر دیتی ہے۔ اب وہ بر جھوٹے مدعی کا انکار کر دیتی ہے ہر اس معبود کو ترک کر دیتی ہے جو ابھی ہے اور دین اللہ کے لیے خالص کر کے صرف اسی کو پکارتی ہے۔

فَلَمَّا نَجَّاهُمْ اِلٰی الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ (۳۱:۳۲) ”پھر جب وہ بچا کر انہیں خشکی تک پہنچا دیا ہے تو ان میں سے کوئی اقتصاد برتتا ہے“۔ ات امن و سلامتی اور خوشحالی و سرکشی اور حد سے گزرنے کی طرف نہیں بھیج لاتی۔ اور یہ مسلسل اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہے۔ اگرچہ یہ ذکر و فکر میں اللہ کا پورا حق ادا نہیں کرتا، کیونکہ داکر و شاکر جن انتہاؤں تک پہنچ سکتا ہے وہ یہی ہو سکتی ہیں کہ وہ ادا میں مقتصد ہو اور باطل سیدھا ہو۔ (لہذا مقتصد کا مطلب مہمانہ

(روی کا ہے)

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ خطرہ ملتے ہی اور حالت امن آتے ہی وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔

وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ (۳۱: ۳۲) ”اور ہماری آیتوں کا انکار وہی شخص کرتا ہے جو خدا کو اور ناشکر ہو“۔ ختار، سخت خدا کو کہتے ہیں اور کفور شدید کفر کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ یہ مبالغہ ایسا ہے کہ جو کسی شخص کا وصف میں جاتا ہے اور یہ الفاظ اس شخص کے لیے بہت ہی مناسب ہیں جو کائنات کی ان لاجواب نشانیوں دیکھ کر بھی اور فطرت کی واضح منطق پا کر بھی اللہ کی آیات کا انکار کرتا ہے۔

--- ۰۰۰ ---

سمندر کی خوفناکیوں کی مناسبت سے، جہاں لوگوں کا غرور علم، غرور قوت اور غرور قدرت کا فور ہو جاتا ہے اور فطرت کے اوپر سے باطل کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور انسان فطری دلائل و ثبوت کو اپنے سامنے پاتا ہے۔ ان خوفناکیوں کی مناسبت سے یہاں بتا دیا جاتا ہے کہ اصل ہولناکیوں کا دن تو قیامت کا دن ہو گا۔ اس کے مقابلے میں سمندر کی ہولناکیاں کچھ بھی نہیں ہیں۔ وہ ایسا ہولناک دن ہو گا کہ باپ بیٹے کا تعلق، رحم کا تعلق اور خون کا تعلق بھی ختم ہو گا۔ والد اپنی اولاد کو چھوڑ دے گا اور بیٹا والدین سے بھاگ رہا ہو گا وہاں ہر شخص اکیلا کھڑا ہو گا۔ کوئی مددگار نہ ہو گا اور کوئی سہارا نہ ہو گا۔ تمام رشتہ داریاں اور تعلقات ختم ہوں گے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ وَاحْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَاوِزٌ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فَتَنْسُوا بِاللَّهِ الْغُرُورُ ﴿۳۳﴾

”لوگو! بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جب کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا ہو گا۔ فی الواقعہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے۔“

یہ نفسا نفسی کا عالم ہو گا۔ یہاں دنیا میں جو خوف ہوتا ہے دلوں میں اور شعور میں اس کی تو مثال ہوتی ہے۔ لیکن قیامت کا یہ خوف بے مثال ہو گا۔ اس میں تمام رشتہ داری اور خون کے تعلقات ختم ہوں گے۔ والد اولاد سے بھاگ رہا ہو گا۔ اور اولاد کو والدین کی پرداہ اور نگر نہ ہو گی۔ ہر شخص کو اپنی پڑی ہو گی، نفسا نفسی کا عالم ہو گا، کوئی کسی کی جگہ ضامن نہ ہو گا، کسی کو بھی خود اس کے اپنے اعمال کے سوا کسی کا عمل فائدہ نہ دے سکے گا۔ ایسے حالات ظاہر ہے کہ ایسے خوف میں ہوں گے جس کی کوئی نظیر اس دنیا میں نہ ہو گی۔ لہذا یہاں خدا سے ڈرنے کی دعوت دینا بہت ہی برکھل دعوت ہے اور آخرت کا مسئلہ نہایت ہی خوف کے عالم میں پیش ہوا ہے اس لیے دل و دماغ اس کی طرف متوجہ ہیں۔

اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (۳۱:۳۳) ”فی الواقعہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔“ نہ اللہ اس کے خلاف کرتا ہے اور نہ اللہ کا کماثل سکتا ہے۔ ہر شخص کو اس بے مثال خوف سے گزرنا ہے اور ہر شخص کو پوری باریکی سے حساب و کتاب دینا ہے۔ ایک عادلانہ فیصلہ سننا ہے جس کے نتیجے میں نہ باپ بیٹے کا بدل ہو گا اور نہ بیٹا باپ کا۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (۳۱:۳۳) ”ہنس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔“ اس دنیا میں ساز و سامان ہے، لو و حب ہے لیکن اس کی مصلحت بہت ہی محدود ہے۔ یہاں انسان آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُمُ بِاللّٰهِ الْغُرُورُ (۳۱:۳۳) ”اور نہ دھوکہ باز تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے۔“ کوئی ساز و سامان تمہیں دھوکا نہ دے، کوئی فتنل میلہ تمہیں بدراہ نہ کر دے، کوئی شیطان تمہیں دوسوے میں نہ ڈالے۔ دھوکہ باز بہت ہیں، شیطان بے شمار ہیں اور دنیا کی دلچسپیوں بھی ہر طرف سے رامن کش ہیں۔ مال کا غرور بھی شیطان ہے۔ علم کا غرور بھی شیطان ہے، قوت کا غرور بھی شیطان ہے۔ اور شیطان پرستی بھی شیطان ہے، خواہش نفس بھی شیطان ہے۔ شہوت جسمانی بھی شیطان ہے۔ ان تمام شیطانوں سے بچانے والی قوت خوف خدا کی قوت ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اس سورہ کے خاتمے اور اس چوتھے راؤنڈ کے خاتمے پر اور اس خوفناک منظر آخرت کی مناسبت سے فکر و خرد کے تاروں پر یہ آخری اور دراز شدید معرَب لگتا ہے۔ اس میں اللہ کے علم لامحدود اور انسان کے محدود علم کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ انسان کا علم جس کی دسترس سے ہر وہ چیز غائب ہے جو نظروں سے اوجھل ہو۔ اب اس مسئلے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے جو اس سورہ کا موضوع ہے اور یہ نتیجہ قرآن کی عجیب تصویر کشی سے لگتا ہے، اللہ کے علم ازلی اور ابدی کی تصویر۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَکَ عَلِمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِی

الْاَرْحَامِ ۚ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا ۚ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ یَّآئِیْ

اَرْضٍ تَمُوْتُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۝۱۳

۱۳

”اس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے، کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے، اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آئی ہے، اللہ ہی سب کچھ جانتے والا اور باخبر ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے قیام قیامت کی گھڑی کو ایک ایسا غیب رکھا ہے جس کا علم کسی کو نہیں ہے تاکہ لوگ ہر وقت چوکے رہیں۔ ہر وقت قیامت کی توقع کرتے رہیں۔ اور ہر وقت یہ کوشش کرتے رہیں کہ اس کے لیے کچھ کمائیں۔ ان کو معصوم نہیں ہے کہ کب قیامت ہوگی۔ بہر حال یہ اچانک آ جائے گی اور اس وقت پھر کسی تیاری کی کوئی مصلحت نہ دی جائے گی۔

نہ کوئی توشہ جمع کرنے کی اجازت ہوگی۔

اللہ اپنی حکمت کے مطابق جہاں چاہتا ہے 'بارش برساتا ہے' جس قدر چاہتا ہے 'برساتا ہے'۔ لوگ اپنے تجربوں اور آلات و علامات کے ذریعہ بارش کے قریب ہونے کا اندازہ لگاتے ہیں۔ لیکن وہ نہ بارش برسانے کے اسباب پیدا کر سکتے ہیں اور نہ وقت کا علم رکھتے ہیں۔ آیت میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ بارش اللہ برساتا ہے کیونکہ اللہ ہی ہے جو بارش کے لیے طبعی اسباب فراہم کرتا ہے اور ان کو منظم کرتا ہے۔ بارش میں اللہ کا اختصاص یہ ہے کہ اللہ ہی ان کے برسانے پر قادر ہے۔ جیسا کہ آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے بارش کے وقت کو اللہ کے مخصوص غیبی علوم میں داخل کیا ہے 'ان کا خیال درست نہیں ہے' حالانکہ علم دراصل اللہ ہی کا ہوتا ہے اور وہ ہر معاملے میں مختص ہوتا ہے کیونکہ اللہ کا علم ہی صحیح 'دائمی اور حاوی ہوتا ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْْحَامِ (۳۱: ۳۴) "وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیڑوں میں کیا پرورش پا رہا ہے۔" یہ اس طرح کا مخصوص علم ہے جس طرح قیام قیامت کا علم ہے اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ماں کے رحم میں کیا ہے۔ یعنی پیٹ کے اندر ہر لحظہ اور ہر لمحہ کیا پرورش ہو رہی ہے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ حمل کا کوئی وزن اور حجم نہیں ہوتا۔ پیٹ میں مذکر ہے یا مؤنث ہے 'ابتدائی وقت سے جب خلیہ انڈے میں داخل ہوتا ہے' اللہ کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خدوخال کیا ہیں۔ خواص کیا ہیں 'حالت کیا اور صلاحیت کیا ہے۔ یہ سب امور اللہ کے علم کے ساتھ مختص ہیں۔

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّا ذَاتُكَسِبُ غَدًا (۳۱: ۳۴) "کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرنے والا ہے۔" اچھائی کمائے گا یا برائی۔ اسے نفع ہو گا یا نقصان۔ آسانی ہوگی یا مشکلات سے دوچار ہو گا۔ صحت مند رہے گا یا بیمار ہو گا۔ اللہ کی اطاعت کرے گا یا معصیت کرے گا۔ اس لیے کہ کب محض منافع سے بہت عام ہے۔ کس کے اندر وہ تمام حالات داخل ہیں جو کسی شخص کو پیش آ سکتے ہیں۔ یہ ایک غیبی امر ہے جس کے دروازے بند ہیں۔ یہ پردوں کے پیچھے ہے اور انسان پردوں کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے۔ اور وہ نہیں جانتا کہ آگے کیا ہے؟

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ اَرْضٍ تَمُوتُ (۳۱: ۳۴) "کسی شخص کو خبر نہیں کہ کس زمین پر اسے موت آئے گی۔" کیونکہ یہ بھی ایک ایسا معاملہ ہے جو پردہ فردا کے پیچھے ہے اور مستقبل کا دہیز پردہ اس کے اور نفس انسانی کے درمیان حائل ہے۔

نفس انسانی ان پردوں سے ادھر کھڑا ہے۔ وہ بے بس ہے، اسے کچھ معلوم نہیں کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کا علم کس قدر محدود ہے۔ اس کی بے بسی واضح ہے۔ اس طرح سوچنے سے اس کے ذہن سے علم و معرفت کا غور ختم ہو جاتا ہے اور اس طرح ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کو بہت ہی قلیل علم دیا گیا ہے اور یہ کہ پس پردہ فردا بے شمار ایسے امور ہیں جنہیں انسان نہیں جانتا۔ اگر انسان ان پردوں سے ادھر کی تمام چیزوں کو جانتا تو وہ ان پردوں کے پس کھڑا ہو جاتا اور معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ کل کیا ہو گا۔ لیکن انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ کل کیا ہو گا بلکہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ یوں انسانی نفس اپنی کبرائی سے ذرا نیچے اتر آتا

ہے۔ وہ اللہ سے ڈرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اے اللہ اگلے لمحے میں خیر ہو۔

قرآن کریم اللہ کے ان مخصوص علوم کو نہایت وسیع دائرے میں پیش کرتا ہے۔ ایسے وسیع دائرے میں جس کا انسان پر بہت اثر ہوتا ہے۔ نہایت ہی گہرا اثر۔

یہ میدان زمان و مکان کی وسعت کو بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ حاضر بھی اس کی لپیٹ میں ہے اور آگے والا مستقبل بھی۔ قریب بھی اور بعید بھی۔ دلوں کے خیالات میں بھی اور دوسوسوں اور تفکرات میں بھی۔ قیام قیامت کی ساعت بھی اور بارش کے اوقات بھی۔ پھر رحم مادر تک یہ میدان پھیلا ہوا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ پھر وہ مستقبل قریب کے بچے کہ کل کیا ہو گا۔ زمانہ اگرچہ قریب ہے لیکن علم جمالت کی دور داریوں میں ہے۔ موت اور قبر تک یہ دائرہ پھیل جاتا ہے۔

غرض اللہ کے مخصوص علم کا ایک وسیع دائرہ ہے۔ لیکن اس وسیع چادر کے کونوں کو سمیٹ کر قرآن کے انداز بیان نے اسے ایک گٹھڑی کی شکل میں جمع کر دیا ہے۔ یہ علم غیب کی وسیع چادر ہے اور اس کے اندر مختلف النوع تمام امور کو رکھ کر سمیٹ لیا گیا ہے۔ اب یہ سب امور امور غیبیہ مخصوصہ ہیں اور یہ گٹھڑی مضبوطی سے بندھی ہوئی ہے۔ اور اس سے سوئی کے ٹکے کے برابر کوئی چیز باہر نہیں آ سکتی۔ انسان کے سامنے ان علوم کا دروازہ بند ہے کیونکہ یہ دائرہ قدرت انسان سے باہر ہیں۔ انسان کے علم سے وراء ہیں 'اللہ کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا' ہاں اللہ اپنے حکم سے کسی کو کچھ بتا دے تو لوگ بات ہے 'اللہ علیم وخبیر ہے اور اس کے سوا کوئی علیم وخبیر نہیں ہے۔

یہاں یہ سورہ ختم ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت ایک طویل اور دور دراز کا سفر تھا۔ اب ہم اس دور دراز کے مطالعاتی سفر سے تھک تھکا کر واپس ہوتے ہیں۔ ہم نے اس میں طویل راہوں کو طے کیا، بوجھ اٹھایا اور غور و فکر کیا۔ اس کائنات کا مشاہد قدرت دنیا اور اس کے بوقلموں پرندے اور چرندے دیکھے۔ یہ سورہ ۲۴ آیات پر مشتمل ہے لیکن معانی و افکار کی دنیا طویل و عریض ہے 'بڑی برکت والی ہے' وہ رات جس نے دل و دماغ کی تخلیق کی۔ جس نے اس قرآن کو تارا، جو دلوں کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے اور مومنین کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ---- ۲۱

سورۃ السجدۃ - ۳۲

آیات ۱ --- تا --- ۳۰

سورہ سجدہ ایک نظر میں

یہ ایک کی سورہ ہے اور یہ اس عظیم عقیدہ توحید اور نظریہ حیات کو قلب انسانی میں بٹھانے اور فطرت انسانی کے قریب تر کرنے کے لیے بہترین انداز خطاب کا ایک دو سرانموند ہے۔ یہ عظیم عقیدہ کیا ہے؟ یہ کہ اللہ ایک ہے اور بے نیاز ہے۔ نظام زندگی اسی کا ہو گا اور وہی اس کائنات کا خالق ہے۔ وہی آسمانوں اور زمینوں کا مدبر ہے۔ اور اس کائنات کے اندر پائے جانے والی تمام مخلوقات جس کا علم صرف اللہ وحدہ کو ہے وہ سب اس اللہ ہی کے کنٹرول میں ہے۔ یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ ان پر یہ کلام اللہ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور یہ پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے ہے۔ لوگوں کو ایک دن دوبارہ اٹھایا جاتا ہے اور وہ قیامت کا دن ہو گا اور جزاء و سزا ہو گی۔

یہ ہے وہ نظریہ حیات جسے یہ سورہ ذہن نشین کراتی ہے اور تمام کلی سورتیں اسی نظریہ اور عقیدہ کی دعوت دیتی ہیں۔ ہر سورہ کا اپنا اسلوب ہوتا ہے 'اپنے دلائل ہوتے ہیں اور یہ سورتیں قلب انسانی سے مکالمہ کرتی ہیں اور ان میں خطاب اللہ عظیم و بصیر کی طرف سے ہوتا ہے۔ اللہ انسانی دلوں کے پوشیدہ رازوں اور خفیہ باتوں سے بھی واقف ہے اور وہ انسانی شخصیت کے ثقیب و فراز کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ اس کی ساخت اور تخلیق سے بھی اچھی طرح واقف ہے 'اس کے اندر جو جذبات، خواہشات اور تقاضے ہیں 'ان سے بھی واقف ہے اور مختلف حالات اور مختلف مقامات پر اس کے جو تقاضے ہوتے ہیں ان سے بھی واقف ہے۔

سورہ سجدہ کا موضوع وہی ہے جو سورۃ فرقان کا تھا 'مگر اس کا انداز سورہ فرقان سے بالکل مختلف ہے۔ ابتدائی آیات ہی اس نظریہ کو بیان کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد یہ سورہ دل کو جگانے والے دلائل 'روح کو روشن کرنے والے براہین اور غور و فکر کو جگانے والے شواہد پیش کرتی ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم کہ آئے ہیں کہ اس موضوع پر اس کائنات اور اس کے صفحات اور مناظر میں دلائل و شواہد موجود ہیں۔ خود انسان کی پیدائش میں اور اس کے مختلف حالات اور اطوار میں اور قیامت کے مناظر میں سے بعض مناظر پیش کر کے بھی اس موضوع کے شواہد دیئے جاتے ہیں۔ یہ مناظر ہاؤ ہو اور دوڑ دھوپ سے بھرپور ہوتے ہیں۔ پھر یہ شواہد گزشتہ زمانوں کی ہلاک شدہ قوموں کے آثار میں بھی موجود ہیں۔ لیکن صرف ان لوگوں کے لیے جو سنتے اور جند بر کرتے ہیں۔

اس سورہ میں ایک سچے مومن کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے کہ وہ کس طرح اللہ سے ڈرتا ہے اور کس طرح اس کی نظریں ہر وقت اللہ کی طرف انھی رہتی ہیں۔ اس میں ان نفسوں کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے جو منکر ہیں اور انکار پر مصر ہیں۔ اس جزاء کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے جو ان دونوں فریقوں کو ملنے والی ہے۔ یہ منظر اس طرح بیان ہوا ہے کہ گویا وہ واقعہ ہو گیا اور نظر آرہا ہے اور ہر قاری قرآن اسے دیکھ رہا ہے۔

ان تمام مناظر اور مظاہر میں قلب مومن کو بیدار کرنے 'متحرک کرنے اور اسے غور و فکر پر آمادہ کرنے کی کوشش کی

گئی ہے۔ کبھی ذرا یاد رکھا گیا ہے کبھی امید دلائی گئی ہے اور حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ کبھی تہدید ہے تو کبھی امید ہے۔ کبھی وعظ ہے اور کبھی استدلال ہے اور اس کے بعد قلب بشری کو ذرا آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ان مظاہر مشاہد اور براہین کو پیش نظر رکھ کر جو چاہے 'رہیہ اختیار کرے۔ اپنے نفس کے لیے جو منہاج چاہے 'اختیار کرے اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور ہدایت اور ضمانت کو دیکھ کر اپنے لیے کوئی راستہ اختیار کرے۔

سورہ اس مسئلے کو چار یا پانچ حصوں میں بیان کرتی ہے۔ آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ الف 'لام 'میم۔ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ سورہ انہی حروف سے مرتب ہے اور اس کے من عند اللہ نزول میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

مَنْ رَبُّ الْعَالَمِينَ (۲: ۳۲) ”یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔“ اور اس کے بعد نہایت ناخوشگوار سی یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ ایسے الزامات لگاتے ہیں۔ یہ محض افتراء ہیں۔ یہ تو حق ہے ان کے رب کی طرف سے تاکہ حضرت محمد اپنی قوم کو ڈرائیں۔

لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ (۳: ۳۲) ”شاید کہ وہ ہدایت پائیں۔“ یہ مسئلہ اسلام کا پہلا لٹو ہے یہ کہ رسول اکرم ﷺ کے پیغمبر ہیں اور ان پر وحی آتی ہے اور وہ یہ تبلیغ بحیثیت مامور من جانب اللہ کر رہے ہیں۔

اس کے بعد اس کائنات میں اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کے مسئلے کو لیا جاتا ہے 'یوں کہ زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان پائے جانے والی تمام مخلوق کا خالق اللہ ہی ہے۔ اس پوری کائنات کو اللہ نے سنبھال رکھا ہے اور زمین و آسمان کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے۔ آخرت میں بھی تمام لوگ اس کے آگے پیش ہونے والے ہیں۔ انسان کا پیدا کرنا اس کے مختلف طور طریقوں میں اس کی سرگرمیاں 'اسے سننے 'دیکھنے اور ادراک کی قوت دینا وغیرہ لیکن افسوس ہے کہ لوگ ان شواہد کو دیکھ کر بھی شکر بجا نہیں لاتے۔

یہ دوسرا مسئلہ ہے یعنی الوہیت حاکمیت اور اس کے خدو خال۔ صفت تخلیق 'صفت تدبیر کائنات 'صفت احسان صفت انعام 'صفت علم 'صفت رحمت۔ یہ سب صفات تخلیق اور تکوین کی آیات کے ضمن میں آتی ہیں۔

اس کے بعد مسئلہ حشر و نشر پیش کیا جاتا ہے اور ان کے اس اشکال کا ذکر کیا جاتا ہے کہ جب ہم مرکز ذرات کی شکل اختیار کر لیں گے تو پھر کس طرح اٹھائے جائیں گے۔

وَقَالُوا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ (۱۰: ۳۲) ”اور وہ کہتے ہیں کہ جب ہم زمین میں رُل مل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے۔“

اس کے بعد تیسرا مسئلہ آتا ہے۔ خیر و شر اور آخری فیصلے کا مسئلہ۔ اس کے لیے قیامت کے منظر میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے۔

اذ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۳۲: ۱۲) ”جب مجرم سر جھکائے رب کے ہاں کھڑے ہوں گے۔“ یہ اس وقت اپنے یقین بالآخرت کا اظہار کر رہے ہوں گے اس وقت یہ اس قرآن کی بھی تصدیق کر رہے ہوں گے۔ وہ ایسی باتیں کہیں گے کہ اگر یہ باتیں وہ دنیا میں کرتے تو ان کے لیے اب جنت کے دروازے کھل جاتے۔ لیکن اے کاش کہ اب یہ یقین و اقرار ان کے لیے مفید نہ ہو گا۔ یہ منظر اس لیے پیش کیا گیا کہ در وقت جانے سے پہلے ہی ان کی آنکھیں کھول دی جائیں اور وہ اس کلمے کا اقرار کر لیں جس کا وہ اس مصیبت کے وقت اقرار کس گئے۔ اب یہ لوگ اقرار کر لیں گے لیکن اب وقت نہیں۔

اس منظر کے ساتھ ہی مومنین کا منظر بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان کو اللہ کی آیات یا دلائل جاتی ہیں تو

خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (۳۲: ۱۵) تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ

(۳۲: ۱۶) ”سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔ ان کی پسینیں بسترؤں سے الگ رہتی ہیں اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ بھی رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔“ یہ نہایت ہی صاف شفاف تصویر ہے اور اس کو دیکھ کر دل پھر پھڑکتا ہے۔ اس تصویر کے ساتھ ساتھ وہ اعمال و اکرامات بھی یاد دے جاتے ہیں جو ان کے لیے خیر ہیں۔ یہ اکرام ایسا ہے کہ انسان کے تصور سے بالا ہے اور یہ اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ لوگ جو اللہ سے ڈر کر خضوع و خشوع کرتے تھے، اس انجام کے امیدوار تھے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۳۲: ۱۷) ”پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی شخص کو خبر نہیں ہے۔“ اس کے بعد مومنین کے انجام کی ایک سرسری جھلک جنت میں اور فاسقین کی جزاء کی ایک سرسری جھلک جہنم میں دکھائی جاتی ہے۔ اور فاسقین کو یہ دھمکی بھی دے دی جاتی ہے کہ جہنم سے قبل اس جہنم میں بھی جہیں مزادی جاسکتی ہے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی طرف ایک مختصر اشارہ ہے۔ مطلب یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کے مقاصد ایک تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے بھی مومن تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے بھی مومن ہیں۔ انہوں نے بھی دعوت اسلامی کی راہ میں مشکلات اٹھائیں اور صبر کیا۔ اور ان کو جزاء یہ دی گئی کہ امت موسیٰ علیہ السلام نے دنیا کے لوگوں کی ہدایت کی۔ اشارہ اس طرح ہے کہ مسلمان بھی مشکلات پر صبر کریں اور ان کے خلاف جو سازشیں ہو رہی ہیں ان کو برداشت کریں کیونکہ انہوں نے بھی فرائض امامت ادا کرنے ہیں۔

اس کے بعد اقوام سابق کی ہلاکت کی طرف مختصر اشارات ہیں۔ لیل مکہ رات اور دن ان کھنڈرات سے گزرتے ہیں۔ پھر یہ بھی اشارہ کہ مردہ زمین کو اللہ کس طرح زندہ کرتا ہے اور کس طرح دنیا کی زندگی کی ترقی اور نشوونما ہوتی ہے۔ اور سورہ کا خاتمہ ان کی اس بات پر ہوتا ہے۔

مَتٰی هٰذَا الْفَتْحُ (۲۸:۳۲) ”وہ کہتے ہیں یہ فیصلہ کب ہو گا“۔ وہ تو یہ سوال اس لیے کرتے تھے کہ ان کو یقین نہ تھا۔ اس لیے جواب نہایت خوفناک دیا جاتا ہے ’نہایت تہدید آمیز۔ اور حضور سے کہا جاتا ہے کہ ان سے منہ پھیر لیں اور چھوڑ دیں انہیں کہ اپنے انجام ’طے شدہ انجام تک پہنچ جائیں۔ اب ہم تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۸۷ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۳۰



الَّذِي تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۚ أَمْ يَقُولُونَ
افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مِمَّا أَتَتْهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِمَّنْ قَبْلِكَ
لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۚ

”ا۔ل۔م۔ اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا“ شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں۔“

الف۔ لام۔میم۔۔۔۔۔ یہ وہ حروف ہیں جن سے عرب واقف تھے جن سے یہ کتاب سب سے پہلے مخاطب تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان حروف سے کلام کس طرح بنایا جاتا ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان حروف سے وہ جو کلام بناتے ہیں اس میں اور اس کلام میں کس قدر فرق ہے۔ ہر وہ شخص یہ فرق جانتا تھا جو اسلوب کلام سے واقف تھا۔ اور جو شخص بھی افکار و معانی کو الفاظ کا لباس پہنانے کا کام کرتا تھا۔ یہ لوگ یہ بھی جانتے تھے اور اسے مانتے تھے کہ نصوص قرآنی کے اندر کوئی خفیہ قوت ہے اور اس کے اندر کوئی گہرا عنصر ہے جو اسے ایک ایسی قوت کا ہرہ عطا کرتا ہے جو بات کو دل میں اتار دیتا ہے۔ ایسی تاثیر ان تمام باتوں اور اشعار میں نہیں ہے جو انسان خود بناتا ہے یا اس نے بنائے ہیں۔ یہ قرآن مجید کی ایسی خصوصیت تھی جس میں کسی کو کلام نہ تھا، موافق ہو یا مخالف۔ کیونکہ جو شخص بھی یہ کلام سنتا تھا وہ اسے محسوس کرتا تھا۔ وہ اس کلام کو دوسرے کلاموں سے ممتاز پاتا تھا اور اس پر جھوم جاتا تھا۔ اگرچہ وہ یہ نہ جانتا تھا کہ یہ کلام الہی ہے۔

قرآن کریم کو مکہ میں جن مخالف لوگوں نے بھی سنا، کلام کا یہ عنصر ان پر اثر انداز ہوا۔ مخالف لوگوں کے ساتھ مختلف واقعات پیش آئے۔

ادبائے عرب کے کلام اور شعر میں اور قرآن کریم کی سورتوں اور آیات میں وہی فرق ہے جو اللہ کی مصنوعات میں اور انسانوں کی مصنوعات میں ہے۔ اللہ کی مصنوعات واضح اور ممتاز اور جدا ہیں۔ کوئی انسانی مصنوعی چیز اللہ کی بنائی ہوئی چیز کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو لے لیں۔ ایک اصلی پھول کو لے لیں اور ایک مصنوعی پھول کو لے لیں۔ اگر دنیا کے تمام تصویر کشوں کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ مل کر ایسی تصویر بنائیں جس میں کسی ایک اصلی پھول میں رنگوں کی تقسیم کا مقابلہ ہو تو وہ ایسا نہ کر سکیں گے۔ ایک پھول کی کلر اسکیم ہی ایک معجزہ ہے۔ یہی حال ہے کلام الہی کا اور دوسرے انسانی کلاموں کا جو سب کے سب انہی حروفِ جمعی سے بنے ہوئے ہیں۔

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَآ رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۲: ۳۲) ”اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔“ یہ ایک فیصلہ کن بات ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے ہے۔ یہاں آیت کے درمیان لَآ رَيْبَ فِيهِ یعنی شک کی نفی کو لایا گیا ہے۔ یعنی مبتداء اور خبر کے درمیان کیونکہ یہ حقیقی ”ایٹو“ ہے اور اس آیت کا اصل مدعا یہ ہے کہ شک کی تردید کی جائے اور اس فقرے کا آغاز حروفِ مقطعات سے اس بات کا اظہار ہے کہ اگر کوئی شک کرتا ہے تو یہ رہے وہ حروف، وہ میٹرل جس سے یہ کلام بنا ہے، تم بھی بنا لو۔ لہذا شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ حروف تمہیں مہیا ہیں، تم لعل لسان ہو، اس کتاب کا انداز ایسا ہے جس کو تم بھی معجزانہ کلام تصور کرتے ہو۔ یہ تمہارا تجربہ ہے اور تمہارے تجربہ کار لوگوں کا یہی کہنا ہے۔

اس قرآن کی ہر سورہ اور ہر آیت اپنے اندر ایک معجزانہ عنصر رکھتی ہے۔ یہ عنصر اس کلام کے اندر بہت ہی گہرا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ اس کلام کے اندر کوئی خفیہ قوت ہے۔ جب اس کی تلاوت ہوتی ہے تو انسان پر کچھ جاری ہو جاتی ہے۔ وہ جھوم اٹھتا ہے، وہ متزلزل ہو جاتا ہے اور اسے اپنے اوپر کنٹرول نہیں رہتا۔ جب بھی کسی نے اس کے لیے دل کھولا، احساس نے کان دھرا، اور انسانی اور اک بلند ہوا اور اس کو سننے اور قبول کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ انسانی ثقافت اور علم و بصیرت جوں جوں وسیع ہوتی جاتی ہے، قرآن کریم کی یہ خصوصیت بہت ہی نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں انسان کا علم بڑھتا ہے، وہ اس کائنات کے اندر دور تک اپنا مشاہدہ بڑھاتا ہے اور وہ اس کائنات اور اس کے اندر کی مخلوق اور افراد تک اپنا علم بڑھاتا ہے۔

نہیں ہوتی۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہوتی ہے جب قرآن انسانی فطرت سے ہمکلام ہوتا ہے اور یہ تاثر ایک حقیقت بن کر سامنے آتی ہے جب قرآن ایک تجربہ کار دل و دماغ سے مخاطب ہو۔ جب یہ ایک تعلیم یافتہ عقل سے ہمکلام ہو، جو ایک بھرے ہوئے ذہن سے بات کر رہا ہو، جس کے اندر علم و معلومات ہوں۔ جوں جوں انسان کا درجہ علم، ثقافت اور معلومات بلند ہوتا ہے، اس قرآن کے معانی، مفہیم اور اثرات بڑھتے جاتے ہیں (بشرطیکہ انسانی فطرت سیدھی ہو، اس میں ٹیڑھ نہ ہو اور اس کے اوپر خواہشات نفسانیہ کے پردے نہ پڑ گئے ہوں) اور انسان علی وجہ یقین یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ (۳:۳۲) ”تو یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے۔“ یہ بات انہوں نے محض ضد اور عناد سے کہی تھی۔ لیکن سیاق کلام میں یہاں اس کو بصورت سوال استنکادی اور نہایت ہی ناپسندیدہ بات کے لانا ہے۔ کیا وہ ایسا کہتے ہیں؟ ایسی بات تو انہیں نہیں کہنا چاہئے اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار اور سیرت ان کے اندر موجود مثال ہے۔ انہوں نے تو کبھی کسی پر الزام نہیں لگایا۔ کیا وہ اللہ پر الزام لگاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب بذات خود اپنے اوپر شہادت ہے اس میں تو شک کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔

بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ (۳:۳۲) ”بلکہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔“ سچائی، یہ فطرت ازل کے عین مطابق ہے۔ یہ کائنات کے اندر موجود حق اور سچائی کے عین مطابق ہے۔ لہذا اس کے اندر گہری سچائی پائی جاتی ہے۔ اس کی ساخت، اس کے بیان، اور اس کے نظام کا ثبات و دوام اور اس کا جامع و مانع ہونا۔ اس کے اجزاء کا باہم ہم آہنگ ہونا اور متضاد نہ ہونا اور اس کے اجزاء کا باہم تعارف اور یگانگت یہ سب اس کے حق پر ہونے پر شاہد ہیں۔

یہ قرآن دراصل اس کائنات کے قوانین قدرت کا ترجمان ہے۔ اس کائنات کے اندر جو سچائی و دیعت شدہ ہے قرآن اس کا لفظی ایڈیشن ہے۔ کائنات کس ہے اور قرآن اس عمل کی ترجمانی ہے، اس لیے حق ہے۔ یہ اس لیے حق ہے کہ یہ انسان اور اس کائنات کے اندر پائے جانے والے قوانین فطرت کے درمیان رابطہ پیدا کرتا ہے۔ انسان اور اس کائنات کے قوانین کلیہ کے درمیان کس ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور قرآن انسان اور ان کائناتی قوتوں کے درمیان توافق اور سلامتی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ انسانی قوت اور کائناتی قوتیں باہم معاون، باہم ملاتی ہو جاتی ہیں اور ان کے درمیان پوری پوری مفاہمت ہوتی ہے۔ یوں انسان اپنے اس وسیع ماحول کا دوست بن جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے کہ جب انسانی فطرت است پاتی ہے تو اس پر ایک کمتی ہے۔ نہایت یر، نہایت خوشی اور نہایت شوق سے بغیر کسی تشقت اور دشمنی کے، کیونکہ دونوں کے اندر ازلی اور قدیم حق رکھ دیا گیا ہے۔

یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کے اندر کوئی تعارض، کوئی تضاد نہیں ہے اور وہ پوری انسانیت کے لیے ایک مکمل منہاج حیات ہے۔ یہ منہاج انسانوں کی شخصیت ان کی قوت، ان کے جذبات و میلانات، ان کی حالت صحت اور حالت مرض اور حالت قوت اور حالت ضعف حالت امن اور حالت فساد کو اچھی طرح مد نظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔

یہ ایک ایسی سچائی ہے جس میں مکمل عدل ہے۔ یہ نہ دنیا میں بے انصافی کرتا ہے نہ آخرت میں، انسانوں کے اندر جو قوتیں موجود ہیں ان کے ساتھ بھی یہ کوئی بے انصافی نہیں کرتا۔ یہ دینی اور فکری قوتوں کے ساتھ بھی بے انصافی نہیں کرتا۔ یہ انسان کی کسی حرکت کے ساتھ ظلم کر کے اسے کسی معقول سرگرمی سے نہیں روکتا۔ جب تک وہ سرگرمی اس عالم گیر سچائی کے دائرہ کے اندر ہو، جو اس پوری کائنات کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے۔

بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ (۳:۳۲) ”بلکہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔“ یہ تمہاری طرف سے نہیں ہے۔ یہ رب کی طرف سے ہے۔ یہ رب مسلمانوں کا ہی نہیں ہے، رب العالمین ہے۔ یہ ہے اس حق میں کرامت انسانی۔ اس میں رسول کی تکریم ہے کہ وہ اپنی طرف سے افتراء نہیں باندھ رہا۔ پھر یہ اللہ اور رسول کے درمیان

قرب کا ایک رنگ اور پرتو ہے۔ اور یہ درپردہ جواب ہے ان کے اس الزام کا کہ یہ اللہ پر افتراء ہے۔ ربک سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حضورؐ اور قرآن کریم کا مصدر اور سرچشمہ باری تعالیٰ کے درمیان پختہ تعلق ہے۔ ایک باعزت تعلق اور اس کی وجہ سے وہ نہایت ذمہ داری اور امانت داری کے ساتھ ٹھیک ٹھیک وحی نقل کرتے ہیں۔

لَتُنذِرَ قَوْمًا مِّنْهُمْ مِّنْ نَّذِيرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ (۳:۳۲) ”تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں“۔ عرب جن کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا تھا۔ آپؐ سے قبل ان کی طرف کوئی رسول نہ بھیجا گیا تھا۔ تاریخ میں بنی اسماعیل میں سے کسی رسول کے آنے کا ذکر نہیں ہے جو عربوں کے جد اول تھے۔ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب نازل کی جو سچائی پر مشتمل ہے تاکہ آپؐ ان کو ڈرائیں اور وہ ہدایت پالیں۔ ان کی ہدایت اسی کتاب کے ذریعے ممکن ہے کیونکہ اس میں سچائی ہے، وہ سچائی جو انسان کی فطرت میں بھی موجود ہے۔ انسانوں کے دلوں کے اندر بھی موجود ہے۔

یہ لوگ جن کے ڈرنے کے لیے یہ کتاب نازل کی گئی ہے کہ ان کو ڈر لیا جائے، یہ اللہ کے ساتھ دوسرے الہوں کو شریک کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں سے اللہ کی ان صفات کا بیان شروع ہوتا ہے جن کے ذریعہ وہ معلوم کریں کہ اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کی مخصوص صفات کیا ہیں اور اس طرح انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کے عقائد نہایت پوچ ہیں۔ ان عظیم صفات کا موصوف تو اللہ ہے جو رب العالمین ہے اور اس کے ہم پلہ دوسرے ہونے کا کوئی مستحق نہیں ہے۔ نہ ان کو چاہئے کہ وہ کسی اور کو اس کا ہم پلہ بنائیں۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ مَا لَكُمْ مِّنْ دُونِهِ مِّنْ قَوْلٍ وَلَا شَفِيعٌ إِلَّا مَنِ اتَّقَىٰ ۚ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۚ ذَٰلِكَ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۚ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ ۚ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ ۚ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۚ

”وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں، چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کے بعد عرش پر جلوہ فرما ہوا“ اس کے سوانہ تمہارا کوئی حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کے آگے سفارش کرنے

والا پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی مدبیر کرتا ہے اور اس مدبیر کی روداد لوہ اس کے حضور جاتی ہے۔ ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔ وہی ہے ہر پشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، زبردست اور رحیم۔ جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی، پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے، پھر اس کو تک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں اور دل دیئے تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔

یہ ہے اللہ۔ اور یہ ہیں اس کی الوہیت کے آثار و شواہد۔ یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے اور لا انتہا عالم میں اس کے شواہد ہیں جو انسان کے محدود ادراک سے وراء ہے۔ خود انسان کی پیدائش اور اس کی نشوونما کے مختلف مدارج ہیں جنہیں لوگ جانتے ہیں اور انسانی نشوونما کے ان مدارج میں جن سے انسان ابھی تک بے خبر ہے، اس کے شواہد موجود ہیں۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ (۳۲: ۴) ”وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھ دنوں میں پیدا کیا۔“ اور یہ چھ دن ہمارے ان دنوں سے یقیناً مختلف ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں کیونکہ زمین کے دن تو وہ ہیں جو سورج کے سامنے زمین کی گردش عوری سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دن ایک شب و روز پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ زمین اس کائنات کے اندر بہت ہی مختصر سا ٹکڑا ہے۔ ایک ذرہ ہے جس کی اس عظیم فضا میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ ہمارے روز و شب تو زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد پیدا ہوئے اور یہ روز و شب زمانہ کی وہ مقدار ہے جس کے مطابق ہم حساب و کتاب کرتے ہیں۔

ان چھ ایام کی حقیقت کیا ہے تو اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔ ہمارے پاس ان دنوں کے حساب و کتاب کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہ اللہ کے ایام ہیں جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا

فِي يَوْمٍ كَانَ مَقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (۳۲: ۵) ”اور تمہارے رب کے نزدیک ایک دن تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے۔“

یہ چھ دن وہ چھ حالات بھی ہو سکتے ہیں جن سے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی فضا گزری، یہاں تک کہ وہ اپنی موجودہ حالت تک پہنچی یا یہ تخلیق کے چھ مراحل تھے یا یہ چھ زمانے تھے جن کے درمیان کے وقت کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے۔ بہر حال جو بھی مراد ہو، ان سے وہ دن مراد نہیں ہیں جو ہمارے زمانے کے دن ہیں۔ بہر حال وہ ایک غیبی امر ہے اور اس کی مراد ہم متعین نہیں کر سکتے۔ مراد وہ زمانہ ہے جو تخلیق، تقدیر میں مطابق حکمت الہیہ صرف ہو اور اس زمانے میں اللہ نے ہر چیز کو اس کی موجودہ شکل تک پہنچایا مختلف مراحل، ادوار سے گزار کر۔

ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (۳۲: ۴) ”اور اس کے بعد عرش پر جلوہ فرما ہوا۔“ استواء علی العرش اشارہ ہے اس طرف کہ اللہ کے قبضہ قدرت میں تمام کائنات ہے۔ رہا یہ کہ عرش کیا ہے تو ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ انہی الفاظ پر بات کو ختم کرتے ہیں۔ بہر حال استواء علی العرش سے مراد ہے قدرت شاملہ ہے۔ پھر غلط فہم بھی ترتیب زمانی کے لیے نہیں ہے کیونکہ اللہ کے حالات بدلتے نہیں ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے اللہ کس حال میں تھا

پھر کسی دوسرے حال میں ہو گیا۔ یہ معنوی ترتیب ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا اور جب سے پیدا کیا وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے یعنی بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ پیدا پہلے کیا اور قبضہ قدرت میں بعد میں ہو اور نہ ایسا کوئی زمانہ نہ تھا کہ اللہ کے قبضہ قدرت میں نہ ہو۔ اس بے قید قبضہ قدرت کے بیان کے بعد اب لوگوں سے کہا جاتا ہے۔

مَا لَكُمْ مِّنْ دُونِهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ (۴:۳۲) ”اس کی مانند نہ تمہارا کوئی حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کے آگے سفارش کرنے والا ہے۔“ کہاں اور کون سفارشی ہو سکتا ہے جبکہ اللہ سبحانہ عرش پر متمکن ہوں اور زمین و آسمان سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہوں اور خالق ارض و سما بھی وہی ہو۔ تو اس کے سوا کوئی حامی ہو سکتا ہے اور اس کے سوا سفارش کرنے والا کون ہو سکتا ہے اور کون سفارشی اللہ کی سلطنت سے خارج ہو سکتا ہے۔

أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ (۴:۳۲) ”کیا تم ہوش میں نہیں آتے۔“ یہ حقیقت اس بات کی یاد دہانی کراتی ہے کہ اللہ کا اقرار کرو اور اپنا رخ اسی کی طرف کر دو۔ تخلیق اسی کی ہے وہی کمال اختیارات رکھتا ہے وہی تدبیر کرتا ہے اور امور طے کرتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ زمین و آسمان کے تمام امور اس کی طرف بلند ہوتے ہیں قیامت میں بھی تمام معاملات اس کے سامنے پیش ہوں گے اور دنیا میں بھی تمام رپورٹیں اس کی طرف پہنچتی ہیں اس طویل دن میں جس کی مقدار اس کو معلوم ہے۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (۵:۳۲) ”وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔“

قرآن کا انداز تعبیر اللہ کے تدبیر کائنات کے وسیع ترمیدان کی خوب تصویر کشی کرتا ہے۔

مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ (۵:۳۲) ”آسمانوں سے زمین تک۔“ اس سے انسانی ذہن کے اندر بات بٹھانا مقصود ہے یعنی ان الفاظ میں جن کا تصور ذہن انسانی کر سکتا ہے تاکہ دل میں خوف خدا پیدا ہو۔ ورنہ اللہ کی تدبیر کائنات کا دائرہ زمین اور آسمان سے بہت ہی وسیع ہے۔ لیکن انسانی احساس اور شعور کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اس کائنات کے سامنے کھڑا ہے اور اپنے شعور کو مشاہدے کی حد تک اللہ کی وسعت تدبیر کا تصور کر رہا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی وسعت تدبیر ہمارے تصور اور ہمارے ان شماریات مجھے بھی وسیع ہے جو ہمارے استعمال میں ہیں۔

پھر اللہ کی تمام تدابیر اور اللہ کی تمام تقدیرات کی رپورٹ میں ان کے نتائج اللہ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں اور یہ روئیداد اسے پورے عواقب و نتائج کے ساتھ تمام اعمال، احوال اور افعال کے ساتھ اشیاء اور زندوں اور تمام مواد کائنات کے بارے میں ایک دن اٹھائی جاتی۔ اس دن کی مقدار ایک ہزار سال ہمارے شماریات کے مطابق ہے۔ غرض اس کائنات کی کوئی چیز یونہی نہیں چھوڑ دی جاتی ہے نہ کسی چیز کو عبث پیدا یا گیا ہے بلکہ ایک مقررہ وقت تک تمام چیزوں کی تدبیر کی گئی ہے۔ ہر شے، ہر معاملہ، ہر نتیجہ اور ہر واقعہ اللہ کے تحت ہے اور اس کی روئیداد اللہ کے ہاں پہنچتی

ہے جس طرح وہ طلب کرتا ہے۔

ذٰلِكَ عِلْمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۶:۳۲) ”وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا“
زبردست اور رحیم۔ یعنی یہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور یہ استواء علیٰ عرش اور آسمانوں سے زمین تک تمام امور کا انتظام۔ یہ ہے اللہ عالم غیب اور عالم مشاہدہ کا جاننے والا وہی خالق ہے۔ وہ قادر مطلق ہے اور زبردست اور رحیم ہے۔ قدرت رکھنے والا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے برتاؤ میں مخلوقات کے ساتھ رحم کرنے والا ہے۔

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (۷:۳۲) ”جو چیز بھی اس نے بنائی خوب بنائی“۔ کیا شان ہے اللہ کی! بے شک یہ حق ہے، قدرت اسے دیکھ رہی ہے، آنکھیں دیکھ رہی ہیں، دل اسے دیکھ رہا ہے اور عقل اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ یہ حق جو اشیاء کی شکل میں بھی ہے۔ ان کے فرائض میں بھی ہے، ان کی طبیعت اور ان کی ہم آہنگی میں بھی ہے۔ ان کی حیات میں بھی ہے اور ان کی شکل میں بھی ہے۔ بہر حال جو چیز بھی حسن اور احسان سے متعلق ہے وہ اس مخلوقات میں موجود ہے۔

سبحان اللہ! یہ ہے اللہ کی کارگیری تمام اشیاء میں۔ اس کے دست قدرت کے کمالات تمام اشیاء میں موجود ہیں۔ جو چیز بھی اللہ نے بنائی ہے وہ حسین اور مکمل ہے۔ نہ حد سے آگے ہے اور نہ اس میں کوئی قصور ہے۔ حسن سے زیادہ نہ کم۔ نہ افراط ہے نہ تقریط۔ حجم کے اعتبار سے، شکل کے لحاظ سے اور مقاصد اور مفاد کے زاویہ سے۔ ہر چیز ایک متعین قدر کے ساتھ ہے۔ نہ حد حسن و جمال سے کم یا زیادہ ہے۔ اپنے وقت سے نہ پہلے آتی ہے، نہ بعد میں۔ نہ اپنی حد سے آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے رہتی ہے۔ درے سے لے کر بڑے سے بڑے اجسام تک میں حسن ملحوظ ہے۔ سادہ خلطے سے لے کر پیچیدہ ترین ذی حیات اشیاء تک ہر چیز حسین اور موزوں ہے۔ اسی طرح، احوال، اطوار، واقعات اور حرکات سب کے سب مقدر ہیں۔ سب اللہ کی تخلیق ہیں اور ہر واقعہ اور ہر حادثہ اپنے مقرر معیار کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے مقررہ اثرات مرتب ہوتے ہیں اور یہ اس منصوبے اور نقشے کے مطابق ہوتا ہے جو ازل میں اللہ نے تیار کیا ہے اور اب تک ایسا ہی تدبیر الہی کے مطابق ہوتا رہے گا۔

ہر چیز اور ہر مخلوق اس لیے بنائی گئی ہے کہ وہ اپنا مقرر اور متعین فریضہ ادا کرے اور اس فریضے کا تعین نہایت دقیق وزن کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ اس چیز کے تمام فرائض اس کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں اور ان خواص کی وجہ سے وہ اپنا فریضہ منہی پورا کرتی ہے اور اس کے لیے پوری طرح لگن ہے۔ یہ خلیہ جو متعدد مقاصد کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ کپڑا رنگ رہا ہے اور جس کے پاؤں اور بال و پر ہیں۔ یہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ اس زمین پر اپنے لیے راستہ نکالے۔ یہ اپنا کام احسن طریقے سے کرتا ہے۔ یہ پرندہ، یہ حیوان، اور یہ انسان، یہ کوکب، یہ ستارے، یہ سیارے، یہ افلاک اور جہاں اور یہ جہانوں کے جہاں، یہ کرابت اور ان کے دورے اور گردشیں، متعین اور مقرر، عجیب اور مضبوط اور نہایت ہی وقت کے ساتھ متعین وقت کے حامل۔ دائمی طور پر متحرک۔ غرض اس کائنات کی جس چیز کو دیکھو چھوٹی یا بڑی ہر چیز حسین و جمیل ہے۔ اس کے حسن و جمال میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہر کھلی آنکھ، ہر حس انسان، اور ہر صاحب بصیرت فخص اس حسن اور احسان کو دیکھ سکتا ہے جو اس کائنات کی

مجموعی شکل میں بھی ہے اور اس کی ایک ایک چیز میں بھی ہے۔ جب قلب و نظر اور ذہن و خیال متوجہ ہوں تو انسان اس جہان میں حسن و جمال اور صفت و کمال کے بڑے بڑے ذخائر دریافت کر سکتا ہے۔ اس حسن و جمال اور اس عجب و کمال کے نتیجے میں ہر طرف سے انسان کے لیے خیر اور برکات جمع ہوتے ہیں۔ مثلاً نہایت ہی خوشگوار پھل اور وہ روحانی ذوق و شوق جس سے کاسہ دل بھر جاتا ہے اور اس طرح انسان اس ربانی میلے میں اور اس خدائی جشن میں جدمہر دیکھے 'حسن و جمال ہی نظر آئے' جس چیز کا مطالعہ کرے وہ بدیع الجمال اور انتہائے کمال پر نظر آئے۔ اس طرح اس جہان فانی کے زائل ہونے والے اس حسن و جمال۔ آگے بڑھ کر عالم آخرت کے دائمی حسن و جمال اور لازوال کمال تک پہنچ سکتا ہے جو صفت الہی میں ہے اور جس کا تصور بھی کسی دل میں نہیں آیا۔

انسان ان انعامات اور حسن و جمال اور دقت و کمال کو اس دقت دیکھ سکتا ہے جب انسان ایک عادی اور معمولی اور روٹین کے مناظر کو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھے۔ یہ اس دقت ہی اسے پا سکتا ہے جب وہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کی کھینچوں کو سنے۔ فطرت کے اشارات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ جب وہ اس جہاں کو نور ربانی کے ساتھ دیکھے۔ جب وہ ان کو ربانی نور کے ساتھ دیکھے گا تو پھر اس کو معصوم ہو گا کہ ہر چیز کے اندر کیسا حسن و جمال ہے اور ہر چیز کی صفت میں انوکھا پن کیا ہے اور یہ حسن اسے اس دقت نظر آئے گا جب وہ ہر حسین چیز کو دیکھ کر اللہ کو یاد کرے اور سبحان اللہ کہے۔ یوں اس کا تعلق خالق کائنات سے پیدا ہو گا۔ یوں اس کا شعور جمال تک پہنچ جائے گا کیونکہ مخلوقات کے کمال و جمال سے انسان اللہ کے کمال و جمال تک پہنچ سکتا ہے۔

یہ کائنات جمیل ہے اور اس کا جمال ختم نہیں ہوتا اور انسان اس جمال کے ادراک میں روز بروز ترقی کرتا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کا یہ فائدہ غیر محدود ہے۔ وہ جس قدر چاہے اس فائدے کو آگے بڑھا سکتا ہے۔ جہاں تک بدیع السموات انسان کے لیے مقدر کرتا ہے اور موقع دیتا ہے۔

پھر اس مخلوق میں خوبصورتی کا عنصر مقصود بالذات ہے۔ اللہ نے ہر چیز کو خوبصورت بنایا ہے کیونکہ جب کسی بنائی ہوئی چیز کو خوبصورت اور اچھا بنایا جاتا ہے تو وہ اپنا فرض منصبی یا ذیوئی بہت اچھی طرح ادا کرتی ہے۔ یوں مصنوعات کی عمرگی کو بڑھا کر کمال تک پہنچایا جاتا ہے جبکہ اس کائنات کی خوبصورتی اس کے ہر جزء سے ظاہر ہے اور مخلوقات کی ہر قسم سے حیاں ہے۔ ذرا اس سمجھو کہ دیکھئے 'ذرا کسی ایک پھول کو دیکھئے' ذرا ایک پھول سے چھوٹے ستارے کو دیکھئے 'ذرا رات کو دیکھئے اور پھر دن کو دیکھئے' چھاؤں اور بادلوں کو دیکھئے 'اس پورے وجود کے اندر جاری و ساری نغمہ سرائی کو دیکھئے اور غایت درجہ کی ہم آہنگی 'ہواری اور حرکت کو دیکھئے۔ فَبَارِكْ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔

--- ○ ○ ○ ---

یہ ایک سیاحت ہے اور اس خوبصورت وجود اور نہایت ہی خوبصورت اور انوکھی کائنات میں ایک تفریح ہے اور مخلوقات کا مطالعہ سفر ہے۔ قرآن کریم ہماری توجہ اس طرف مبذول کرتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ اس سے لطف اٹھاؤ۔

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (۷: ۳۲) "جس نے ہر چیز کو خوبصورت تخلیق بخشی"۔ اس ہدایت سے انسان اس کائنات میں حسن و جمال کے نکات تلاش کرتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے۔

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ (۷: ۳۲) ”اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔“۔ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے انسان کی تخلیق گارے سے کی۔ انداز تعبیر سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ انسان کا آغاز گارے سے تھا۔ یعنی انسان کی ابتدائی شکل مٹی کے گارے کی سی تھی۔ اللہ نے یہ نہیں بتایا کہ گارے سے انسان تک کتنے مراحل سے انسان گزرا یا کتنا زمانہ اس میں لگا۔ اس معاملے میں قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ خصوصاً جب ہم اس آیت کو سورہ المؤمنون کی آیت سے ملا کر پڑھیں۔

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالَةٍ مِنْ سِتِّ سِتٍّ ”انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا گیا۔“۔ لہذا یہ کہنا ممکن ہے کہ انسان کی تخلیق ایسے مراحل سے گزری ہے جس کا اصل مٹی تک جا پہنچتا ہے۔

اس سے مراد وہ غلیہ بھی ہو سکتا ہے جو اس زمین میں پیدا کیا گیا اور یہ غلیہ مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔ اور نفع حیات اور نفع روح سے وہ خالص مٹی تھا اور یہی وہ راز ہے جس تک آج تک انسان نہیں پہنچ سکا۔ نہ انسان یہ معلوم کر سکا ہے کہ یہ زندگی کیا ہے اور نہ یہ معلوم کر سکا ہے کہ اس حلیے میں روح کیسے داخل ہوئی اور اس خلیے سے بھی انسان کیسے پیدا کیا گیا۔ قرآن کریم نے اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ یہ پورا عمل کیسے انجام تک پہنچا اور نہ یہ بتایا ہے کہ اس پر کس قدر وقت لگا۔ اس تحقیق کے لیے اللہ نے انسان کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح چاہے فیصلہ کرے اور اس قسم کی تحقیقات نص قرآنی کے خلاف نہیں ہیں۔ نص قرآنی میں صرف یہ ہے کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے یا مٹی کے ست سے ہوئی ہے۔ یہ ہے وہ موقف جس میں قرآن مجید جو قاطع ہے اپنی جگہ رہتا ہے۔ اور سائنسی تحقیقات بھی اپنے مقام پر رہتی ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ صراحت کر دی جائے کہ ڈارون کا نظریہ ارتقا کہ تمام حیوانات ایک ہی خلیے سے ارتقاء کر کے مختلف انواع کی شکل اختیار کر گئے ہیں اور خود انسان بھی بندر کی ترقی یافتہ شکل ہے اور یہ کہ انسان اور اعلیٰ قسم کے بندر کے درمیان ارتقائی مراحل کے انواع موجود رہے ہیں۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ نیز ڈارون کو وراثتی خصوصیات (جینز) کا علم ہی نہ تھا۔ لیکن جینز کی دریافت کے بعد تو یہ طے ہو گیا ہے کہ ایک نوع کا دوسرے نوع میں منتقل ہونا محال ہو گیا ہے۔ ہر خلیے یعنی نوع حیوان کے خلیے کے اندر ایسے جینز ہیں جو اسے اپنی نوع بدلنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ یہ جینز اپنی صورت نوعیہ کی پوری طرح حفاظت کرتے ہیں۔ لہذا ابلی جس خلیے سے پیدا کی گئی وہ ابلی ہی رہی ہے اور اس کی صورت نوعیہ میں کسی مرحلے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کتا کتا رہا ہے، تیل تیل رہا ہے، گھوڑا ہمیشہ گھوڑا رہا ہے، بندر ہمیشہ بندر رہا ہے اور انسان ہمیشہ انسان رہا ہے۔ جو چیز ممکن ہے وہ یہ ہے کہ ایک نوع اپنی حدود کے اندر ترقی کرے یا زوال پذیر ہو۔ ہر حال ممکن ہے کہ ایک نوع اپنی حدود کو کراس کر کے دوسری نوع میں داخل ہو جائے۔ یہ وہ بات ہے جو ڈارون کے نظریہ کی حقیقت ہی باطل کر رہی ہے۔ ہر حال یہ لوگ سائنس کے نام پر خود اپنے نظریات گھڑتے ہیں، ان پر یقین کرتے ہیں لیکن یہ نظریات کسی دن جا کر باطل ہو جاتے ہیں۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ (۸: ۳۲) ”پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے یعنی نطفے کے پانی سے جو جنین کے ارتقاء کی پہلی شکل ہے کہ وہ ایک نقطے سے ایک لوتھڑا بن جاتا ہے۔ پھر وہ گوشت کی بوٹی بن جاتا ہے۔ پھر اس کے اندر ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر وہ مکمل جنین بن جاتا ہے۔ یہ پانی کا ست

اور اس کا ارتقاء ہے۔ یہ نقطہ جو اس حقیر پانی میں ہوتا، جس طرح یہ ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور جس طرح آج کل اس کا مشاہدہ ہوا ہے یہ ایک عظیم ارتقاء ہے اور پھر یہ پورے انسان کی شکل میں آ جاتا ہے اور یہ انسان اپنی ذلت میں ایک عجیب جہان ہے اور اس حقیر پانی کے ست میں ایک دوسرے نقطے کو دیکھو اور پھر اس مکمل انسان کو دیکھو کہاں سے کہاں تک آگیا اور کیا سے کیا کچھ بن گیا۔ قرآن کریم اس عظیم تغیر و ارتقاء کو اس طرح ایک ہی آیت میں بیان کر رہا ہے۔

ثُمَّ سَوَّاهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهِ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ

(۹:۳۲) ”پھر اس نے اس کو تک سب سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیئے“ آکھیں دس اور دل دیئے۔ سبحان اللہ یہ کس قدر عظیم ارتقائی سفر ہے انسان کا۔ کن کن مشکل حالات سے یہ انسان گزرا ہے۔ کس قدر عظیم معجزہ ہے خود انسان کی تخلیق لیکن لوگ اس سے غافل ہیں۔ انسان کو دیکھو اور اس معتبر نقطے کے پانی کے اندر اس نکتے کو دیکھو۔ اگر دست قدرت اس معجزانہ عمل کو تکمیل تک نہ پہنچائے۔ یہ دست قدرت ہی ہے جو اس نہایت ہی چھوٹے نکتے کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ ان دشوار گزار مراحل اور راستوں سے گزر کر انسان کی شکل اختیار کر لے۔ اس چھوٹے سے نقطے اور اس خلیے کے اندر کس قدر تقسیم ہوتی ہے اور کس قدر کثرت ہوتی ہے۔ یہ بڑھتا بھی جاتا ہے اور تقسیم بھی ہوتا جاتا ہے۔ اس سے مزید مختلف قسم کے خلیے بنتے جاتے ہیں۔ یہ خلیے پھر باہم تضاد ہوتے ہیں۔ یہ بڑھتے جاتے ہیں۔ پھر اس انسان کے ہر ہر عضو کے اپنے خلیے ہوتے ہیں، ان کی مخصوص نوعیت ہوتی ہے اور ان کے پھر حریذ اجزاء ہوتے ہیں اور ہر جزء کا اپنا وظیفہ ہوتا ہے۔ ایک ہی عضو کے اندر کئی قسم کے خلیے بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ پہلا ظلیہ کس طرح اس قدر کثرت میں آ جاتا ہے، پھر اس کے اندر نوعیت کے اعتبار سے یہ تقسیم کس طرح ہو جاتی ہے، پھر اس ایک ہی ابتدائی نکتے اور خلیے سے خلیات کا عظیم مجموعہ کس طرح بن جاتا ہے۔ پھر ان خلیات کے اندر انسانی خصوصیات کہاں چھپی تھیں۔ پھر یہ جنین کے اندر مخصوص صلاحیتیں کہاں سے آ جاتی ہیں۔ ہر خلیے کے لیے متعین فریضہ کس طرح قائم ہو جاتا ہے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات دوسرے سے جدا کس طرح ہو جاتی ہیں۔ کون ہے جو ان قسم کے معجزے کے صادر ہونے کا یقین کرتا اگر ملا یہ معجزہ روز ہمارے سامنے وجود میں نہ آتا۔

یہ اللہ کا دست قدرت ہی ہے جس نے انسان کو ان طرح برابر کیا اور درست کیا اور پھر یہ اللہ کی جانب سے انسان کے اندر روح پھونکنے کا عمل ہے جو انسان کو انسان بنا دیتا ہے۔ یہی ایک معقول تشریح ہے اس معجزے کی جو ہر سیکنڈ میں واقع ہو رہا ہے۔ لیکن لوگ ہیں کہ اس سے غافل ہیں۔ یہ اللہ کا لطف روح ہے جس کی وجہ سے انسان انسان بن جاتا ہے۔ اس کے اندر سننے اور دیکھنے کی قوت آ جاتی ہے اور اس سمع و بصر ہی کی وجہ سے تمام عضویاتی حیوانات سے انسان مختلف اور ممتاز ہوتا ہے۔

وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ (۹:۳۲) ”تم کو کان دیئے“ آکھیں دس اور

دل دیئے۔ یہ وہ معجزہ ہے جو ہمارے سامنے ہر سیکنڈ میں رونما ہوتا ہے۔ اس کی تشریح اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی جانب سے لطف روح ہے ورنہ عقل انسانی اس اتھاہ سمندر میں غوطے کھاتی رہتی اور قیامت تک وہ اس کی تشریح نہ

کر سکتی۔ اس کے علاوہ یہ اللہ کے فضل و کرم کا فیضان ہے اور یہ اللہ کا فضل ہی ہے جو اس حقیر پانی کے ایک نکتے سے انسان بنا دیتا ہے۔ پھر وہ اللہ ہی ہے جو اس ایک حقیر خلیے کے اندر ارتقا اور نمو کی وہ خصوصیات رکھ دیتا ہے کہ وہ تہذیبوں سے ہوتے ہوئے اور اپنے اندر مزید خصوصیات لیے ہوئے انسان کی شکل میں پہنچ گیا۔ جس کے اندر لکی خصوصیات پیدا ہو گئیں کہ انسان تمام دوسرے حیوانات میں ممتاز ہو گیا۔ لوگ ہیں کہ اللہ کے اس فضل و کرم کا کوئی شکر ادا نہیں کرتے۔ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۹:۳۲)

--- ○ ○ ○ ---

انسان کی پیدائش اس کے مختلف مراحل اور ان سے اس کا عجیب انداز سے گزرتا اور ہر وقت اس عظیم معجزے کا صادر ہونا اور اس معجزے کا ہمارے سامنے بار بار دہرایا جانا ان امور کی روشنی میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ یہ انسان جب مرکز پھر مٹی بن گیا اور زمین کی دوسری مٹی میں مل گیا تو حشر و نشر کیسے ہو گا۔ اس بیان کے بعد یہ شک اور یہ اغراض بجائے خود عجیب اور احمقانہ نظر آتے ہیں۔

وَقَالُوا إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ بَلْ هُمْ بِلِقَائِ رَبِّهِمْ كَفِرُونَ ﴿۱۰﴾

”اور یہ لوگ کہتے ہیں: ”جب ہم مٹی میں رمل مل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟“ اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔“

یہ لوگ کہتے تھے کہ مرنے اور دفن کرنے کے بعد اور اجسام کے مٹی ہو کر مٹی میں رمل مل جانے کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمیں از سر نو پیدا کر دیا جائے جبکہ ہمارے ذرات دوسرے ذرات میں مل کر ناپید اور گم ہو جائیں گے۔ جب انسان کی تخلیق لوٹ پر غور کیا جائے تو اللہ کے لیے اس کا دوبارہ تحقق کرنا کوئی عجیب و غریب چیز نہیں ہے۔ آغاز میں اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا اور یہ مٹی اس زمین سے تھی جس میں وہ اپنی زلت کو گم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری پیدائش بھی تو پہلی پیدائش ہی کی طرح ہے۔ اس میں کوئی عجیب و غریب بات تو نظر نہیں آتی۔ اصل بات یہ ہے۔

بَلْ هُمْ بِلِقَائِ رَبِّهِمْ كَفِرُونَ ﴿۳۲:۱۰﴾ ”کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔“ اس وجہ سے وہ لکی باتیں کرتے ہیں۔ اللہ کے سامنے حاضری کا یہ انکار ہی ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ اس قسم کے واضح معاملے میں اپنے اوپر شک طاری کرتے ہیں یہ معاملہ ایسا ہے جو لیک بار ہو چکا ہے اور اس قسم کے واقعات و معجزات ہر لحظہ ہوتے رہتے ہیں۔ تاکید ان کی وفات اور اللہ کی طرف لوٹ آنے کی تاکید کی جاتی ہے اور دلیل وہی ہے جو اس سے پہلے دی گئی ہے۔

قُلْ يَتُوبُ إِلَيْكُمْ مَلِكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿۱۱﴾

۱

ع ۱۱

۱۴

”ان سے کہو ”موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے۔“

یہ ایک یقینی اطلاع کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ ملک الموت کون ہے اور وہ انسانوں کو پورا پورا اپنے قبضے میں کس طرح لے لیتا ہے یہ اللہ کے غیبی نوشتوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بارے میں اللہ نے ہمیں یہ اطلاع دے دی ہے کہ وہ لوگوں کو پورے کا پورا قبضے میں لے لیتا ہے اور پھر قیامت میں پیش کر دے گا۔ ہمیں اس پر یقین کرنا چاہئے اور زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہئے۔ یقین اس لیے کہ یہ اللہ کے سچے ذریعے سے اطلاع مل گئی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

موت کے بعد جی اٹھنے کے مسئلے کی مناسبت سے جس میں وہ ٹک کرتے تھے یا ٹک کرنا چاہتے تھے اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ ایک زندہ و تابندہ منظر ہے۔ حرکات اور مکالمات سے بھرپور۔ یوں کہ گویا ابھی یہ واقعہ ہو رہا ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ﴿۱۴﴾ وَلَوْ شِئْنَا
لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًىٰ وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ
الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿۱۵﴾ فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا إِنَّا نَسِينَاكُمْ
وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾

”کاش تم دیکھو وہ وقت جب یہ مجرم سر جھکائے اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے (اس وقت یہ کہہ رہے ہوں گے) ”اے ہمارے رب! ہم نے خوب دیکھ لیا اور سن لیا! اب ہمیں واپس بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل کرس، ہمیں اب یقین آگیا ہے۔“ (جواب میں ارشاد ہو گا) ”اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے مگر میری وہ بات پوری ہو گئی جو میں نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں ’سب سے بھر دوں گا۔ پس اب چکھو حرا اپنی اس حرکت کا کہ تم نے اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا! ہم نے بھی اب تمہیں فراموش کر دیا ہے۔ چکھو جہنم کے عذاب کا حرا اپنے کرتوتوں کی پاداش میں۔“

یہ ایک ایسا منظر ہے جس میں منکرین قیامت نہایت ہی شرمندگی کے ساتھ اعتراف کر رہے ہیں۔ اب وہ اس سچائی کو مان رہے ہیں جس کا وہ انکار کرتے تھے۔ وہ یہ درخواست کرس گے کہ ہمیں ایک بار پھر زمین پر لوٹا دیا جائے اور وہ اب کی بار اس کمی کو پورا کر دیں گے جو پہلی بار ہو گئی۔ یہاں شرمندگی کی وجہ سے وہ سرنگوں کھڑے ہوں گے۔ اب یہ لوگ اپنے اس رب کے پاس (عِنْدَ رَبِّهِمْ) ہوں گے جس کے پاس حاضر ہونے کا وہ انکار کرتے تھے۔ لیکن ان کی یہ سب

باتیں بعد از وقت ہوں گی اور لب اعتراق اور اعلان ان کو کوئی قاعدہ نہ دے گا۔

تیل اس کے کہ ان کی اس شرمندگی پر کوئی تبصرہ کیا جائے 'یہ بتا دیا جاتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں فیصلہ کن قوت کون سی ہے اور وہ کون سی قوت ہے جو لوگوں کے آخری انجام کا فیصلہ کرنے والی ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًى وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ

وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (۳۲: ۱۳) ”اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے مگر میری وہ بات پوری ہو گئی جو میں نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا۔“ اگر اللہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی راہ پر ڈال دیتا۔ اور یہ تھا طریقہ ہدایت جس طرح اس مخلوقات کا طریقہ ایک ہے جو اللہ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے اور وہ پوری زندگی ایک ہی طرح سے گزارتی ہے جیسے حشرات الارض پرندے اور زمین پر چلنے والے جانور یا وہ مخلوق جو اطاعت شعار ہے مثلاً فرشتے لیکن اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ انسانوں کا ایک خاص مزاج اور ماہیت ہو۔ اس کے اختیار میں ہو کہ وہ ہدایت اختیار کرے یا ضلالت اختیار کرے اور وہ اپنی اس مخصوص طبیعت کے ساتھ اس جہان میں ایک مخصوص کردار ادا کرے جس کے لیے اللہ نے اسے اس کردار میں پر بھیجا ہے اور ایک منصوبے کے مطابق بھیجا ہے۔ چنانچہ اس منصوبے کے تقاضے کے طور پر اللہ نے لکھ دیا کہ جنوں اور انسانوں سے وہ جہنم کو بھر دے گا ان لوگوں سے جو جنوں اور انسانوں میں سے ضلالت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ جس راہ کا انجام جہنم ہے۔ یہ لوگ جو اللہ کے سامنے قیامت کے دن پیش کیے گئے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اختیار اور خوشی سے جہنم کی راہ اختیار کی۔ اب وہ اللہ کے سامنے سر جھکائے شرمندہ کھڑے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے:

فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا (۳۲: ۱۴) ”اب چکھو مزا اپنی اس حرکت کا کہ تم اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا۔“

یہ ہے تمہارا دن جو حاضر ہے کیونکہ اس منظر میں ہم اسے حاضر دیکھ رہے ہیں۔ تم نے چونکہ اس دن کو بھلا دیا تھا۔ اب اس کا مزہ چکھو۔ تمہارے پاس کافی وقت تھا مگر تم نے اس کے لیے تیاری نہ کی۔

أَنَا نَسِيتُكُمْ (۳۲: ۱۴) ”ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا ہے۔“ اللہ تو کسی کو نہیں بھلاتا۔ لیکن ان کے ساتھ معاملہ اس طرح کرتا ہے کہ گویا وہ نیا دنیا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ اب سلوک ہے جس میں انہیں توہین آمیز انداز میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۳۲: ۱۴) ”چکھو اب بیگلی کے عذاب کا مزہ اپنے کرتوتوں کی پاداش میں۔“ اب اس منظر پر پردہ گر جاتا ہے۔ فیصلہ کن بات کر دی جاتی ہے اور مجرموں کو ان کے برے انجام میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ منظر قرآن کے پڑھنے والے کے پردہ فکر پر یوں نقش ہوتا ہے کہ گویا اب یہ لوگ وہاں اسی حال میں چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ تو وہ وہاں ہی کھڑے ہیں جہاں چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ ہے قرآن کی

اندر کی تصویر کشی۔

اب اس مشاہدہ و منظر پر وہ گرتا ہے اور ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے 'اس دوسرے منظر کا ماحول اور فضا مختلف ہے۔ یہ ایک دوسری ہی عطر آمیز اور فرحت بخش فضا ہے جس میں دل اڑا جا رہا ہے۔ یہ مومنین کا منظر ہے۔ وہ لوگ جو اللہ سے ڈرتے ہیں 'نہایت یکسوئی سے اس کی عبادت کرتے ہیں' وہ اللہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل کے اندر خدا کا خوف بیٹھا ہے۔ ان کے دل کانپ رہے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے فضل و کرم کی امیدیں لیے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے رب ذو الجلال نے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جس کا کوئی انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿١٥﴾ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿١٦﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مِّمَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾

”ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنہیں یہ آیات سنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔ ان کی منہیں بستروں سے الگ رہتی ہیں اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی تنفس کو خبر نہیں ہے۔“

یہ لیل ایمان کی نہایت ہی خوبصورت اور روشن تصویر ہے۔ یہ نہایت ہی لطیف اور شفاف اور حساس لوگ ہیں۔ ان کے دل خوف خدا سے کانپتے ہیں اور وہ نہایت ہی پر امید انداز سے اس کی اطاعت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی بندگی کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ نہ وہ اللہ کے مقابلے میں بڑائی اور تکبر کرتے ہیں۔ اُس قسم کے لوگ ہی دراصل اللہ کی آیات پر ایمان لانے والے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی آیات کو تیز احساس 'بیدار دل اور روشن ضمیر کے ساتھ لیتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو اللہ کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو یہ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا ﴿١٥﴾ (۱۵:۳۲) اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات سے بہت ہی متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ اللہ کی باتیں سن کر اللہ اور اس کی آیات کی تعظیم کرتے ہوئے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں یہ احساس کرتے ہوئے کہ اللہ اور اس کی آیات کی عظمت کا اظہار صرف سجدہ ریز ہو کر ہی کیا جاسکتا ہے اور اپنی پیشانی کو خاک آلود کرنے ہی سے اس کا اظہار ہو سکتا ہے۔

وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴿١٦﴾ (۱۵:۳۴) ”اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔“

یعنی جسمانی اعتبار سے وہ سجدہ کرتے ہیں اور زبان کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔

وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (۱۵:۳۲) ”اور وہ تکبر نہیں کرتے“۔ کیونکہ وہ مطیع فرمان ہو کر اللہ کی طرف رجوع کر کے اللہ کی کبریائی کا شعور رکھتے ہوئے سجدہ رہتے ہوئے ہیں۔
لب ذرا ان کی جسمانی شکل و صورت کی تصویر دیکھئے، انداز تعبیر اس طرح ہے کہ ان کی قلبی، روحانی اور ذہنی کیفیت مجسم ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (۱۶:۳۲) ”ان کی بعض بستروں سے الگ رہتی ہیں۔ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں“۔ یہ لوگ رات کو نماز کے لیے اٹھتے ہیں یعنی عشاء کی آخری نماز کے لیے۔ وتروں کے لیے، تہجد کے لیے اور رات کو دعاؤں کے لیے۔ لیکن قرآن نے ان امور کو اس انداز سے بیان کیا: ان کی بعض بستروں سے الگ رہتی ہیں۔ رات کے وقت بستروں کی تصویر کشی یوں کی جاتی ہے کہ انسان اس راحت، آرام، نیند اور دوسری لذتوں کو بڑی مشکل سے چھوڑتا ہے۔ لیکن ان کی بعض بستریں ’نرم بستر‘ آرام اور نیند اور عیش کے مقابلے میں دوسرا کام رکھتی ہیں۔ ان کا اپنے رب کے ساتھ کام ہوتا ہے۔ ان کو خیال ہوتا ہے کہ ان کو ایک دن رب کے ہاں حاضر ہونا ہے اور وہ خوف و رجاء کے درمیان اللہ کی طرف متوجہ ہیں۔ خوف ان کو اللہ کے عذاب کا ہوتا ہے اور امید اللہ کی رحمت کی ہوتی ہے۔ خوف اللہ کے غضب کا ہوتا ہے اور امید اللہ کی رضامندی کی ہوتی ہے۔ خوف اللہ کی معصیت کا ہوتا ہے اور امید اس کی توفیق اطاعت کی ہوتی ہے۔ ان تمام امور کو قرآن کریم نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ نہایت ہی مجسم انداز میں۔

يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (۱۶:۳۲) ”اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں“۔ اس حسیت اور لچکی، خضوع و خشوع کے ساتھ نماز اور گزرا کر دعا کرنے کے علاوہ اپنی سوسائٹی کی بھلائی کے لئے بھی فکرمند ہوتے ہیں اور اللہ کو راضی کرتے ہوئے وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (۱۶:۳۲) ”اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں“۔

ان بلند، روشن، حساس اور مشفق صورتوں کے ساتھ اللہ کا معاملہ بھی بہت شگفتانہ ہے اور نہایت ہی منفرد قسم کی جزاء ان کے لیے تیار ہے۔ وہ جزاء جس کے اندر ان کے لیے خاص مہربانی جھلکتی ہے۔ ان کے لیے ایک خاص اعزاز کا اعلان ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے ان پر کرم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے بلند نفوس کے لیے کیا خصوصی اور مخفی مہربانیاں اور تعلقات رکھتے ہیں۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۷:۳۲)

”بھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لیے پھپھار کھا گیا ہے اس کی کسی تنفس کو خبر نہیں ہے۔“

یہ لیک عجیب انداز تعبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ غیہ تعلق ہوتا ہے اور اللہ نے بذات خود اپنے دوستوں کے لیے تجھے تیار کر رکھے ہیں، ان کو غیہ رکھا ہے اور اللہ نے ان کے بارے میں کسی کو کوئی اطلاع بھی نہیں دی تاکہ ان کو قیامت کے دن اچانک ظاہر کیا جائے۔ اب یہ ہونے والی ملاقات کس قدر باعث احترام ہے، کس قدر اس کا انتظار ہے اور کس قدر شاندار ہے کہ اس میں اللہ اپنے دوستوں میں نادریدہ تجھے تقسیم کرس گے جو تیار ہو چکے ہیں اور اللہ اپنی موجودگی میں یہ تجھے تقسیم کرس گے۔

سبحان اللہ! اپنے بندوں پر اللہ کے کیا کرم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کس طرح ان کو اپنے فضل و کرم سے نوازتا ہے۔ ان کا عمل جو بھی ہو، ان کی عبادت جو بھی ہو، اور ان کی اطاعت جس قدر بھی ہو، بہر حال اللہ تعالیٰ نے خود ان کے لیے بعض تجھے تیار کر رکھے ہیں۔ نہایت اہتمام، رعایت، کرم اور شفقت کے ساتھ۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے اور وہ بہت ہی فضل و کرم کرنے والا ہے۔

پھر دوبارہ اس اجمال کی تفصیل دی جاتی ہے۔ ذلیل شدہ بحرین کے انجام کے مقابلے میں مومنین کا بہترین انجام ذرا مفصلاً بیان ہوتا ہے کہ اللہ مومنین کو کس قدر منصفانہ جزاء ان کے اعمال کی دے گا۔ وہ مومنین اور بحرین کے انجام میں دنیا اور آخرت دونوں میں فرق کرے گا جتنی غیہ تحفوں کے علاوہ ان کے اعمال کا بھی پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ ۚ اَمَّا الَّذِينَ
اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَاوٰی نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۱۹
الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوٰهُمُ النَّارُ كُلَّمَا اَرَادُوْۤا اَنْ يَخْرُجُوْۤا مِنْهَا اُعِيْدُوْۤا فِيْهَا و
قِيْلَ لَهُمْ دُوۡقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَكْذِبُوْنَ ۝۲۰ وَلَنَذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ
العَذَابِ الْاٰدٰی دُوۡنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ ۚ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۲۱ وَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآٰیٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرِضَ عَنْهَا ۚ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُتَقَبِّلُونَ ۝۲۲

”بھلا کیسے یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو، وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہو؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو

سکتے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے تو جہنم کی قیام گاہیں ہیں، ضیافت کے طور پر ان کے اعمال کے بدلے میں۔ اور جنہوں نے فسق اختیار کیا ہے، ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو لب اسی آب کے عذاب کا حرا جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا حرا انہیں چکھاتے رہیں گے، شاید

کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آجائیں۔ اور اس سے بڑا ظالم کون ہو گا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جائے اور پھر وہ ان سے منہ پھیر لے۔ ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے۔“

مومنین اور فاسقین، مزاج، شعور اور طرز عمل کسی چیز میں برابر نہیں ہوتے کہ وہ دنیا و آخرت کی جزاء میں برابر ہو جائیں۔ مومن کی فطرت سیدھی، سلیم ہوتی ہے اور وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے سیدھے راستے اور سیدھے نظام کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور فاسق منحرف، بے راہ رو، مفسد فی الارض، اور اللہ کے سیدھے راستے پر چلنے والے نہیں ہوتے اور نہ اسلامی نظام اور اسلامی قانون کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ مومن اور فاسق ایک جیسی زندگی بسر نہ کرس اور ان کی زندگی کا انجام ایک نہ ہو، دنیا اور آخرت میں۔ اور ان میں سے ہر ایک کو دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے کیے کے مطابق جزاء و سزا ملے گی۔

أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ حِجَّتُ الْمَأْوَى (۳۲: ۱۹) ”جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے تو جنتوں کی قیام گاہیں ہیں۔“ یہ ان قیام گاہوں میں فروکش ہوں گے اور یہ قیام گاہیں ان کو اپنے اندر لے لیں گی۔ یہ ان کے لیے اچھی منزلیں ہوں گی اور ان منازل میں وہ رہیں گے اور یہ بطور جزاء ہوں گی ان کے اعمال حسنة پر۔

وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ (۳۲: ۲۰) ”اور جنہوں نے فسق اختیار کیا ہے ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ وہ اس کی طرف لوٹیں گے اور وہ وہاں سرچھپائیں گے۔ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔“

كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا (۳۲: ۲۰) ”جب بھی نکلنا چاہیں گے اس میں دھکیل دیئے جائیں۔“ یہ ایک ایسا منظر ہے جس میں بھرپور دوزخ دھوپ ہے۔ لوگ بھاگ رہے ہیں اور انہیں پکڑ پکڑ کر دوبارہ دوزخ میں ڈالا جا رہا ہے۔

وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ (۳۲: ۲۰) ”اور ان سے کہ جائے گا کہ چکھو اب اسی آگ کے عذاب کا مزہ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔“ یہ ان کی سرزنش ہے۔ ان کو زیادہ ذلیل کرنے اور زیادہ سزا دینے کے لیے۔

یہ ہے آخرت میں انجام فاسق لوگوں کا۔ لیکن ان کو قیامت کے عذاب کے آنے تک مہلت نہیں دے دی گئی۔ ان کو قیامت سے پہلے اس جہاں میں بھی عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے۔

وَلَنَذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَى دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

(۳۲: ۲۱) ”اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا مزہ انہیں چکھاتے رہیں گے، شاید کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آجائیں۔“

لیکن ان چھوٹے موٹے عذابوں کی تمہ میں بھی دراصل اللہ کی رحمت پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں

فرماتے کہ اپنے بندوں کو بہر حال عذاب دےں۔ اگر وہ عذاب کے مستحق نہ ہوں۔ اگر وہ عذاب کے معصیت پر اصرار نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرا جھوٹا مونا عذاب جو بندوں پر آتا رہتا ہے وہ بھی انہیں متنبہ کرنے کے لیے آتا ہے کہ شاید وہ لوٹ آئیں۔ ان کی فطرت جاگ اٹھے اور یہ عذاب انہیں راہ راست پر لے آئے۔ اور اگر وہ باز آجائیں تو وہ اس عذاب کبر سے بچ جائیں جو ابھی ان کے سامنے گذشتہ منظر میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اگر ان کو رب تعالیٰ کی آیات کی یاد رہانی کی گئی اور انہوں نے ان سے اعراض کیا اور اس کی وجہ سے ان پر معمولی عذاب آگیا اور پھر انہوں نے عبرت حاصل نہ کی اور اپنی روش سے نہ لوٹے تو اب یہ ظالم ہیں۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا (۲۲:۳۲) ”اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جسے ہماری آیات سنائی گئیں اور پھر وہ اس دن ان سے منہ پھیر لے۔“ لہذا ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان سے انتقام لیا جائے۔

أَنَا مِنَ الْمُعْجَرَمِينَ مُنْتَقِمُونَ (۲۲:۳۲) ”ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے۔“ یہ ایک خوفناک تحدید ہے کہ اللہ جبار اور شکریہ دھمکی دے رہا ہے اور وہ اعلان کرتا ہے کہ ایسے مجرموں سے میں انتقام لوں گا۔ اللہ کے مقابلے میں یہ پیارے ضعیف کر بھی کیا سکیں گے۔ وادے اللہ کا انتقام!

یہ سبق اب مجرمن اور صالحین، مومنین اور فاسقین کے انجام پر ختم ہوتا ہے۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کا انجام مناظر قیامت کی شکل میں ہے۔ جس کے وقوع میں یہ لوگ شک کرتے تھے۔ اس کے بعد سیاق کلام میں ایک نظر حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کے حالات پر ڈال جائے۔ حضرت موسیٰ کو کتاب دی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کے لیے کتاب ہدایت ہو جیسا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن دیا گیا ہے کہ یہ مومنین کے لیے ہدایت ہو۔ صاحب قرآن اور صاحب تورات ایک ہی نظریہ حیات پر حلق ہیں اور جس طرح حضرت موسیٰ کے معین نے مبرد ثبات سے کام لیا اور ان کو ائمہ ہدایت بنایا گیا تھا اس طرح اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اگر مبرد ثبات سے کام لیں تو وہ بھی امامت کے مستحق ہوں گے امامت کی مستحق امت کی صفات کیا ہوتی ہیں۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهِ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى
لِّبَنِي إِسْرَآئِيلَ ۖ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ آيَةً يَّهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَشَوَّكَانُوا
بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُم يَوْمَ الْفَيْمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ
يَخْتَلِفُونَ ۚ

”اس سے پہلے ہم موسیٰ کو کتاب دے چکے ہیں، لہذا اسی چیز کے ملنے پر تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہئے۔ اس کتاب کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا اور جب انہوں نے مبرد ثبات سے کام لیا تو ان کے اندر

ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔ یقیناً تیرا رب ہی قیامت کے روز ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں (بنی اسرائیل) باہم اختلاف کرتے رہے ہیں۔

فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهِ (۲۳:۳۲) ”لہذا اس چیز کے ملنے پر تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہئے۔“
یہ جملہ معترضہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حق آپ کو دیا گیا ہے آپ اس پر ثابت قدم رہیں۔ یہی کافی ہے جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھی اور ان دو رسولوں کی دو کتابوں میں بھی سچائی تھی۔ یہ تفسیر اس تفسیر سے زیادہ اچھی ہے جو بعض مفسرین نے بیان کی ہے کہ اس آیت میں اشارہ اس طرف ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں حضرت موسیٰ سے ملے تھے۔ غرض حضرت موسیٰ سے ملنے کے مقابلے میں اس سچائی کا ملنا زیادہ احسن ہے جو حضرت موسیٰ کو بھی ملی تھی اور دونوں رسول ایک ہی حق اور ایک ہی سچائی پر باہم مل گئے اور اس بات کا ذکر بیان موزوں ہے۔ یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس میں ان مصائب و شدائد کی طرف اشارہ ہے جو رسول اللہ اور مسلمان مخالفین کے ہاتھوں میں رہے تھے۔ رسول اللہ کی تکذیب ہو رہی تھی اور کفار اعراض کر رہے تھے اس لیے یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ ثابت قدم رہو اور بعد کی آیات بھی اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اِثْمَةً يُّهْدُونَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَ كَانُوا بِاٰيَاتِنَا يُوْقِنُونَ

(۲۴:۳۲) ”اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر ایمان لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔“ یہاں مکہ میں چھوٹی سی مومن جماعت کو یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ تم اسی طرح صبر کرو جس طرح موسیٰ کے مختار مومنین نے صبر کیا اور جس طرح ان میں سے امام پیدا کیے گئے جو اللہ کی شریعت کے مطابق حکمرانی کرتے تھے، تم میں سے بھی ایسے امام پیدا ہوں گے جو اسلامی شریعت کے مطابق حکمرانی کریں گے بشرطیکہ صبر کیا اور یقین کیا۔ رہا یہ سوال کہ بنی اسرائیل نے بعد کے اورداد میں اختلاف کیا تو وہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی ان اختلافات کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۲۵:۳۲) ”یقیناً تیرا رب ہی قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ باہم اختلاف کرتے رہے۔“

--- ۰۰۰ ---

بہ سیاق کلام مکہ میں مکہ کو ذرا پیچھے انسانی تاریخ کے سامنے کھڑا کرتا ہے کہ ذرا دیدہ عبرت سے دیکھو۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمَا اٰمَلْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ

فِیْ مٰلِكِيْهِمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾

”اور کیا ان لوگوں کو (ان تاریخی واقعات میں) کوئی ہدایت نہیں ملی کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کے رہنے کی جگہوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟ اس میں بڑی نشانیاں ہیں کیا یہ سنتے نہیں ہیں؟“

تاریخ کی ہلاک شدہ اقوام کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تمام بعد کے جھلانے والوں کے لیے عبرت ہے۔ اللہ کی سنت تو اس جہان میں جاری و ساری ہے اور وہ کسی کی رو رعیت نہیں کرتی۔ یہ انسانیت ترقی اور زوال کے لیے الہی قوانین فطرت کے تابع ہے۔ اس کی کمزوری اور اس کی قوت کار از الہی قوانین کے اتباع و انکار میں ہے۔ قرآن کریم بار بار اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اقوام کے عروج و زوال کے لیے اللہ نے خصوصی قوانین جاری کر رکھے ہیں اور یہ قوانین مسلسل جاری ہیں اور ماضی کے واقعات اور اقوام ہلاک شدہ کے آثار میں بڑی عبرت ہے۔ اس موضوع پر آزادانہ مطالعہ ہونا چاہئے تاکہ باقی آثار سے لوگوں کے دل بیدار ہوں ان کے اندر احساس پیدا ہو اور لوگ اللہ کی پکڑ اور انتقام سے ڈریں کیونکہ اللہ نے بڑے بڑے جباروں کو پکڑا ہے۔ پھر تاریخی واقعات میں سنن الہیہ کے مناظر اور مظاہر ہیں۔ لوگوں کے اور اک اور ان کی اقدار اور انداز قیاس و استنباط کے لیے تاریخی مطالعہ ضروری ہے کیونکہ کوئی قوم زمان و مکان کے کسی گوشے میں گوشہ نشین نہیں ہو سکتی۔ نہ وہ اس نظام کو نظر انداز کر سکتی ہے جس کے مطابق انسانیت کی زندگی کا قافلہ آگے بڑھ رہا ہے اور صدیوں سے تسلسل کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ چونکہ اکثر اقوام نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا اس لیے وہ نیست و نابود ہوئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہلاک شدہ اقوام کے آثار میں بہت ہی مگر سبق ہوتا ہے اور یہ سبق بہت ہی خوفناک ہوتا ہے۔ بشرطیکہ دل شعور رکھتا ہو احساس و بصیرت موجود ہو۔ اگر کوئی اس سبق کو پڑھے تو پڑھنے والے پر کچلی طاری ہو جاتی ہے۔ ضمیر کانپ اٹھتا ہے اور دل دہل جاتا ہے۔ عرب جن کو ان آیات میں پہلی بار خطاب کیا گیا تھا وہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی اقوام عاد، ثمود، لوط کے آثار دیکھتے رہتے تھے۔ قرآن کریم ان لوگوں کو ملامت کرتا ہے کہ ان اقوام کے آثار تمہارے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ تم رات اور دن ان پر سے گزرتے ہو لیکن تمہارے دلوں میں پھر بھی خدا کا خوف پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا شعور بیدار نہیں ہوتا۔ تمہارے احساسات کے اندر روشنی کی چمک پیدا نہیں ہوتی۔ اور تم اس قسم کے انجام سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں کرتے ہو۔ تم ہدایت اخذ نہیں کرتے اور احتیاطی اور استدلالی تدبیر اختیار نہیں کرتے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ (۲۶:۳۲) ”اس میں بڑی نشانیاں ہیں کیلیہ سنتے نہیں۔“

ان کو چاہئے کہ ان لوگوں کے جو قصے قرآن کریم پیش کرتا ہے ان کو سنیں اور پھر ان کے انجام پر غور کریں جبکہ رات اور دن ان لوگوں کے مساکن اور کھنڈرات سے یہ گزرتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ڈرانے والے کی بات سنی ہو جائے اور یہ بھی ہلاک ہو جائیں انہیں ہوش میں آ جانا چاہیے۔

اس ہلاکت اور جاہلی کے منظر کے بعد فکر و احساس کی اس بیداری اور خوف خدا پر ابھارنے اور ڈرانے کے بعد اور ان کے دلوں پر کچلی طاری کرنے کے بعد ان کو ایک دوسری نشانی کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اس خوفناک فضا کے بعد بہت ہی خوشگوار منظر بنتی ہے۔ دیکھو ایک مردہ زمین تمہارے سامنے پڑی ہوتی ہے خشک سالی سے سوختہ اور ہم اس کی

طرف پانی چلاتے ہیں۔ اس کے اندر زندگی حرکت کرنے لگتی ہے۔ جبکہ اقوام سابقہ کے حالات میں ہم نے پڑھا کہ اس طرح کی سرسبز اور شاداب اراضی کو اللہ بخر بھی کر دیتا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ
بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ أَفَلَا يُبْصِرُونَ ﴿۳۵﴾

”اور کیا ان لوگوں نے یہ منظر بھی نہیں دیکھا کہ ہم ایک بے آب و گیاہ زمین کی طرف پانی بہا لاتے ہیں اور پھر اسی زمین سے وہ فصل اگاتے ہیں جس سے ان کے جانوروں کو بھی چارہ ملتا ہے اور یہ خود بھی کھاتے ہیں؟ تو کیا انہیں کچھ نہیں سوجھتا؟“

یہ مردہ زمین، جاہ حال زمین، یہ دیکھتے ہیں کہ قدرت خداوندی اس کی طرف پانی چلاتی ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہی مردہ زمین سرسبز و شاداب ہو کر زندگی سے بھرپور ہو گئی ہے اور لہلاتی ہے۔ فصلیں اگتی ہیں۔ لوگ بھی کھاتے ہیں اور ان کے مویشی بھی کھاتے ہیں۔ مردہ زمین کا منظر جس پر بارش برستی ہے اور وہ زندہ و تابندہ ہو جاتی ہے۔ یہ منظر دراصل دلوں کے بند دروازوں کو کھولنے کے لیے نہایت ہی موثر منظر ہے۔ دیکھو ہر طرف زندگی اور نباتات کا آگاہ اور لوگوں اور مویشیوں کی خوشیاں اور ان کا استقبال۔ زندگی کی محاسن اور تروتازگی کا شعور۔ پھر اس سرسبز زندگی اور خوبصورت اور تروتازہ ماحول کی خوبصورتی۔ قرب اور محبت کی لڑائیں زمزمے، جن میں اللہ کی قدرت کا جمال ہر طرف نظر آتا ہے اور اس کی صنعت کاریوں کے نمونے جا بجا نکھرے پڑے ہیں اور جن سے اس کائنات کے صفات پر ہر طرف زندگی اور خوبصورتی کے مناظر نظر آتے ہیں۔

یوں قرآن مجید دل انسان کو زندگی کے مختلف نشیب و فراز کی سیر کرتا ہے۔ جہاں زندگی بھی ہے اور نشوونما بھی ہے اور سرسبزی و شادابی بھی ہے اور اقوام سابقہ کی ہلاکتوں کے میدان اور آثار بھی ہیں۔ ہر جگہ قرآن کریم کی یہ کوشش ہے کہ کسی طرح قلب انسانی کے اندر حرکت پیدا ہو، وہ جاگے اور اسے اس جہان کے ساتھ الفت پیدا ہو۔ اس جہاں اور اس کی بوقلمونیوں پر سے محض غافل ہو کر نہ گزرے۔ آنکھوں پر سے پردے دور کر دے۔ ان مشاہد اور مناظر قدرت کے اسرار و رموز کو جاننے کی کوشش کریے۔ واقعات سے عبرت حاصل کرے اور تاریخ سے براہن اور دلائل حاصل کرے۔ آخر میں اس طویل سیاحت کے بعد سورہ کا منقطع آتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس عذاب کے آجانے میں جلدی کرتے ہیں، جس سے انہیں ڈرایا جاتا ہے۔ دراصل یہ لوگ اس ڈراوے اور احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کی ہیئت کو مشکوک بات سمجھتے ہیں۔ ان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ جس چیز سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے، وہ حق ہے اور حقیقت بننے والی ہے۔ اس دن ان کا ایمان ان کو کوئی نفع نہ دے گا۔ اور اس وقت ان سے جو غلطی ہو چکی ہوگی اس کی عطا فی ممکن نہ ہوگی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ ان کو چھوڑ دیا جائے وہ اپنے حتی انجام تک پہنچنے والے ہیں۔

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْفَتْحُ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۸﴾ قُلْ

یَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿۳۹﴾ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرِ إِنَّهُمْ مُنْتَظَرُونَ ﴿۴۰﴾

۳

ع ۸

۱۶

”یہ لوگ کہتے ہیں کہ ”یہ فیصلہ کب ہو گا اگر تم سچے ہو؟“ ان سے کہو ”فیصلے کے دن ایمان لانا ان لوگوں کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو گا جنہوں نے کفر کیا ہے اور پھر ان کو کوئی مہلت نہ ملے گی۔“ اچھا، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور انتظار کرو، یہ بھی ختم ہیں۔“

فتح دراصل فریقین کے درمیان اختلاف کے فیصلے کو کہا جاتا ہے۔ وہ عذاب جس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ڈرا رہے تھے اس کا آنا بھی فتح ہے۔ یہ لوگ غافل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر حال کسی حکمت کی وجہ سے اس کے آنے کی ميعاد موخر کی ہوتی ہے۔ وہ اگر سو بار بھی مطالبہ کریں اللہ کا کام اپنے وقت پر ہوتا ہے اور جب وہ آئے گا تو یہ لوگ اس کی بدانتہی نہ کر سکیں گے اور اس سے بچ کر نہ نکل سکیں گے۔

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿۳۹﴾ (۲۹:۳۲) ”ان سے کہو، فیصلے کے دن ایمان لانا ان لوگوں کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو گا جنہوں نے کفر کیا ہے اور پھر ان کی کوئی مہلت نہ ملے گی۔“ خواہ فیصلے کا دن اس دنیا میں ہو۔ اس وقت ان کو دھریا جائے گا جبکہ وہ کافر ہوں گے۔ پھر ان کو کوئی مہلت نہ دی جائے گی۔ نہ ان کا ایمان لانا اس وقت نافع ہو گا اور یہ فیصلے کا دن آخرت میں ہو گا۔ اس وقت یہ مہلت طلب کریں گے اور مہلت نہ دی جائے گی۔

یہ جواب اعصاب شکن ہے اور اس سے دل دہل جاتے ہیں اور آخری ضرب ان پر یہ لگائی جاتی ہے۔

فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرِ إِنَّهُمْ مُنْتَظَرُونَ ﴿۴۰﴾ (۳۰:۳۲) ”انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور انتظار کرو، یہ بھی ختم ہیں۔“ اس فقرے کی تہ میں دراصل بالواسطہ ایک دھمکی چھپی ہوئی ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دامن جھاڑ لیں اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیں تو انجام معلوم ہے۔

اس آخری ضرب پر یہ سورہ ختم ہوتی ہے۔ اس میں طویل مطالعاتی سفر ہے، اشارات و ہدایات ہیں اور قسم قسم کے مشاہدات اور دلائل دیئے گئے ہیں اور قلب انسانی کو ہر پہلو سے متاثر کرنے کی سعی کی گئی ہے اور ہر راستے سے اس کو سمجھ کر ہدایت کی طرف لانے کے لیے حملہ کیا گیا ہے۔

فی ظلال القرآن

جلد --- پنجم

پارہ ----- ۲۱

سورۃ الاحزاب - ۳۳

آیات ۱ --- تا --- ۲۷

سورۃ احزاب ایک نظر میں

یہ سورہ جماعت مسلمہ کی سیرت کا ایک حقیقی حصہ ہے۔ اس کا تعلق بدر الکبریٰ سے لے کر صلح حدیبیہ سے پہلے کے زمانے کے ساتھ ہے۔ یہ اس دور کے مسلمانوں کی حقیقی زندگی کی ایک خوبصورت تصویر کشی ہے۔ اس میں اس عرصہ کے بیشتر واقعات بیان ہوئے ہیں۔ نیز اس میں اس عہد کے اداروں اور انتظامی معاملات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس سورہ میں ان واقعات اور ان انتظامی اقدامات کے بارے میں ہدایت بہت کم ہیں۔ ہدایات و احکام سورہ کے ایک قلیل ہی حصے میں دیئے گئے ہیں۔ ان ہدایات کے ذریعہ واقعات اور انتظامی معاملات کو اسلام کی بنیادوں سے مربوط کیا گیا ہے یعنی اللہ پر ایمان لانا اور اللہ کے نظامِ قضا و قدر پر ایمان لانا مثلاً سورہ کا آغاز یوں ہے :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِيعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا
(۱) وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۲) وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (۳) مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمُ الْفِتَىٰ تُظْهِرُونَ مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِكُمْ وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ (۴: ۳۳) ”اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو۔ حقیقت میں علیم و خبیر تو اللہ ہی ہے۔ پیروی کرو اس چیز کی جس کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں کیا جا رہا ہے اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو اللہ پر توکل کرو“ اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے۔“

اسی طرح سورہ کے آغاز میں بعض انتظامی امور پر ایک تبصرہ آیا ہے :

كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا (۶: ۳۳) وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا (۷: ۳۳) لِيَسْأَلَ الصَّادِقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا أَلِيمًا

”یہ حکم کتاب الہی میں لکھا ہوا ہے اور اے نبی یاد رکھو اس عہد و بیان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا، تم بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی، سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں تاکہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے اور کافروں کے لیے تو اس نے دردناک عذاب مہیا کر ہی رکھا ہے۔“ اور پھر جنگ احزاب کے موقع پر مدینہ میں افواہیں پھیلانے والوں پر تبصرہ ہوا ہے ”یاد رہے کہ یہ سورہ اسی نام سے احزاب کہلائی ہے۔“

قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمْ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذَا لَأُتَمَتُّعُونَ اِلَّا قَلِيْلًا
(۱۶:۳۳) قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ

رَحْمَةً وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۱۷:۳۳) ”اے نبی! ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھانگن تمہارے لیے کچھ نفع بخش نہ ہو گا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقع تمہیں مل سکے گا۔ ان سے کہو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہو۔ اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر تم پر مہربانی کرنا چاہے۔ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پاسکتے۔“ مثلاً بعض ایسے انتظامی امور پر تبصرہ ”یہ انتظامی امور ان کے زمانہ جاہلیت میں جاری طریقے کے خلاف تھے اور ان کی جاہلی ذہنیت کے بھی خلاف تھے۔“

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضٰى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ
مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (۳۶:۳۳) ”کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے خود اپنے معاملے کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہو۔“ اور آخر میں وہ عظیم تبصرہ:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاٰمَانَ عَلٰى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَيِّنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۷۲:۳۳) ”ہم نے اس امانت کو آسمان اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھالیا، بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔“

تحریک اسلامی اور اسلامی سوسائٹی اس دور میں ایک خاص خصوصیت رکھتی تھی۔ اس دور میں اسلامی سوسائٹی اور اسلامی مملکت کے خدوخال ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن یہ خدوخال اگر اسلامی مملکت ابھی مستحکم نہ ہوئے تھے، جس طرح فتح مکہ کے بعد اسلامی سوسائٹی اور اسلامی مملکت مستحکم ہو گئی تھی اور لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور تمام اختیارات اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کو حاصل ہو گئے تھے۔

اس سورہ میں اسلامی سوسائٹی کو از سر نو منظم کرنے کی سعی کی گئی ہے اور جدید اقدامات کو اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت میں منظم کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ بتایا گیا کہ اسلامی نظام میں نظریہ حیات کیا ہے اور اسلامی مملکت کا دستوری نظام کیا ہو گا۔ بعض جاہلانہ رسومات اور رواجات اور قوانین کے اندر تبدیلیاں کی گئیں اور ان امور کو اسلامی تصور حیات اور اسلامی دستوری نظام کے مطابق ڈھالا گیا۔

ان معاشی، معاشرتی اور دستوری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ غزوۂ احزاب پر بھی تبصرہ کیا گیا۔ اور غزوۂ بنی قریظہ اور اس کے بارے میں کفار، منافقین اور یہودیوں کے موقف کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اسلامی صفوں کے اندر جس طرح سازشیں کر رہے تھے اس کا بھی تذکرہ ہے اور ان سازشوں کی وجہ سے اسلامی سوسائٹی میں جو بے چینی پیدا ہوئی تھی اس کا بھی تذکرہ ہے۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے اخلاق، آداب، ان کی بیویوں اور ان کے گھروں کے بارے میں جو سازشیں کرتے تھے اس پر بھی تبصرے ہیں۔

اس سورہ میں بیان کردہ اخلاقی، تنظیمی اور قانونی اور دستوری اصلاحات اور ان دو غزوات کے واقعات کے درمیان ماہہ الاشتراک کیا ہے کہ ان معاملات کے بارے میں کافر، یہودی اور منافقین ایک خاص موقف رکھتے تھے۔ یعنی اسلامی سوسائٹی کے خلاف مخالفین کی سازشوں کا جواب 'یہ لوگ اس جدید اسلامی سوسائٹی اور مملکت کے اندر بے چینی پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ اگر کسی جنگی حصے کا موقع ہوتا تو وہ بھی کرتے۔ اگر انہیں پھیلانی ہوتی تو بھی پھیلاتے۔ اگر لوگوں کو بدل کر کے شکست پر آمادہ کرنے کے مواقع ہوتے تو یہ بھی کرتے۔ اگر کوئی جدید اسلامی اخلاقیات میں سے کوئی بات جاری ہوتی تو یہ اس پر بھی معترض ہوتے۔ پھر غزوات کی وجہ سے جو اموال غنیمت آتے تھے اور اسلامی سوسائٹی کے جو حالات بدل رہے تھے تو اس کی وجہ سے بھی بعض معاشی روابط بدل رہے تھے۔ جدید اسلامی خطوط پر نئے اجتماعی روابط اور ادارے قائم ہو رہے تھے۔ لہذا ان پہلوؤں سے یہ تمام متفرق اصلاحات باہم مربوط ہو جاتی ہیں اور سورہ کا مضمون ایک وحدت بن جاتا ہے۔ اگرچہ موضوعات بظاہر متنوع ہیں لیکن جن متنوع اختلافات ماہہ الاشتراک میں واقعات پر تبصرہ ہے، وہ ایک ہی دور سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے سورہ کے مضامین باہم مربوط ہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

آغاز یوں ہوتا ہے کہ اے پیغمبر آپ اللہ سے ڈریں۔ کافرین، منافقین کی اطاعت نہ کریں۔ آیت پر جو وحی اللہ کی طرف سے آتی ہے اسی کا اتباع کریں اور اللہ پر توکل کریں۔ اس سورہ میں جو واقعات، جو انتظامی اصلاحات جو قانونی اور دستوری دفعات، جو اخلاقی اور معاشی آداب ہیں ان میں آپ صرف قرآن اور وحی کا اتباع کریں۔ سب سے بڑا اللہ ہے۔ اللہ کے ارادے اور ہدایت ہی کا اتباع کیا جائے۔ اللہ ہی کے نظام کو اختیار کیا جائے۔ اس پر توکل کیا جائے اور کفار اور منافقین سے اب مشورے نہ لیے جائیں اور اللہ کی نصرت پر بھروسہ کریں یہ لوگ آپ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔

اب اس کے بعد بعض اجتماعی رسم و رواج کے اندر اصلاحات کر کے اسلام کا کلمہ حق بتایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہا جاتا ہے کہ تمام اداروں کا اخذ اب خدا سے ہو گا۔ انسان بیک وقت اپنے اندر دو دل نہیں رکھ سکتا۔ اس کے دو قبلے نہیں ہو سکتے۔ نہ دو مختلف نظاموں کو بیک وقت چلایا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو وہ منافق ہو جائے گا۔ اس کے اقدامات میں اضطراب ہو گا۔

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ (۳۳: ۴) ”اللہ نے کسی کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے۔“ لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ ایک اللہ، ایک عقیدہ اور ایک نظام کی طرف متوجہ ہو اور اب مسلمانوں کو چاہئے کہ تمام جاہلی اطوار، عادات، رسم و رواج اور قوانین کو یکفخت چھوڑ دیں۔

پہلی اصلاح قانون ظہار میں کی گئی۔ مثلاً جاہلیت میں کوئی اپنی بیوی کو کہتا کہ وہ میرے لیے میری ماں کی بیٹہ (ظہار) کی طرح ہے تو یہ عورت اس پر ماں کی طرح، ابد حرام ہو جاتی تھی۔

وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمْ اَللّٰی تُظْهَرُوْنَ مِنْهُمْ اُمَّهَاتِكُمْ (۳۳: ۴) ”اللہ نے ان بیویوں کو تمہاری ماں نہیں بنایا۔“ جس سے تم ظہار کرتے ہو۔“ یہ ایک بات ہے جو تم اپنی زبان سے کہتے ہو اور یہ بیوی کو ماں نہیں بنا دیتی۔ ان الفاظ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بیوی، بیوی ہی رہتی ہے، اس کلام کی وجہ سے ماں نہیں بن جاتی۔ اسی طرح منہی بنانے اور اس پر جو آثار مرتب ہوتے تھے ان کو بھی لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ (۳۳: ۴) ”اور اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو حقیقی بیٹا نہیں بنایا۔“ لہذا آج کے بعد اس قسم کے تعلق کے ذریعے ان کے درمیان وراثت جاری نہ ہوگی۔ اور نہ دوسرے آثار حرمت ان کے درمیان پیدا ہوں گے۔ قصیدات کا انتظار کریں۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئندہ تمام اہل ایمان کے ولی ہوں گے اور یہ ولایت ان کی خود اپنے اختیارات ذاتی سے بھی برتر ہوگی اور نبی کی بیویاں آج کے بعد تمام اہل ایمان کی مائیں ہیں۔

اَلنَّبِیُّ اَوَّلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهُ اُمَّهَاتُهُمْ (۳۳: ۶) ”بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔“ اس کے بعد اسلام کے ابتدائی دنوں میں مہاجرین اور انصار کے درمیان جو مواخات قائم کی گئی تھی اور ان کے درمیان وراثت کے حقوق تھے، ان کو ختم کر دیا گیا اور اب وراثت اپنے نسبی قرہی رشتہ داروں کے درمیان محدود کر دی گئی۔

وَاُولَٔا الْاَرْحَامُ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُهَاجِرِیْنَ

(۳۳: ۶) ”کتاب اللہ کی رو سے عام مؤمنین اور مہاجرین کی یہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے سے زیادہ حقدار ہیں۔“ یوں اسلامی سوسائٹی کے قانون نظام کو معقول اور طبعی بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے اور جو جاہلی رسوم تھیں یا وقتی انتظامات تھے، ان کو ختم کر دیا گیا۔

یہ نیا انتظام جو اسلام اور اللہ کے احکام پر مبنی تھا، اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی قدیم کتاب میں درج شدہ ہے۔ اور یہ اس عہد کے مطابق ہے جو تمام انبیاء سے لیا گیا تھا۔ خصوصاً انبیاء میں سے اولوالعزم نبیوں سے لیا گیا تھا۔ یہ قرآن کا مخصوص انداز ہے کہ وہ قانون سازی کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کر کے ہدایت بھی دیتا ہے تاکہ وہ نیا قانون لوگوں کے ایمان اور ضمیر کا حصہ بن جائے۔ یہ تو تھا خلاصہ پہلے سبق کا۔

دوسرے سبق میں یہ بتایا گیا ہے کہ مومنین پر اللہ کا کس قدر رحم و کرم ہے کہ اس نے حملہ آور جماعتوں کی سازشوں کو رد فرمایا۔ اس کے بعد جنگ احزاب اور جنگ بنو قریظہ کے واقعات کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور یہ تصویر کشی بے درپے مناظر کی شکل میں ہے۔ ان کے اندرونی احساسات کو کاغذ پر نقش کر دیا جاتا ہے۔ ان کی ظاہری دوڑ و دوپ اور افراد و جماعتوں کے مکالمات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ ان معرکوں کے واقعات کے بیان کے درمیان جا بجا تبصرے بھی آتے ہیں اور واقعات سے قرآن کریم تھوڑی قدریں اخذ کر کے ان کو آئندہ زندگی کے لیے راہنما بناتا ہے۔ یعنی ان واقعات سے جو عمدہ ہوئے اور ان باتوں سے جو لوگوں کے دلوں اور ضمیروں میں پیدا ہوئیں۔

قرآن کریم کا انداز ہی ایسا ہے کہ وہ واقعات پر تبصرہ کر کے لعل ایمان کے نفوس کی تربیت کرتا ہے۔ اقدار اور پیمانے وضع کرتا ہے اور ان کے دس و دماغ میں ایسے تصورات وضع کرتا ہے جو ان کے لیے آئندہ فکری اساس ہوں۔ قرآن کا انداز بیان یوں ہے کہ وہ واقعہ بیان کرتا ہے جو عملاً ہوا۔ اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات 'اور اندرونی سوچ بیان کرتا ہے اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے بعد لعل ایمان کو اس واقعہ کی حکمت بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس پر نقد و تبصرہ کیا جاتا ہے کہ اس کا اچھا پہلو کیا تھا اور برا کیا تھا۔ کس نے راہ صواب اختیار کیا اور کون غلطی پر تھا۔ اس کے بعد غلطیوں کا ازالہ کیا جاتا ہے اور اس کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ جو ہو گیا سو ہو گیا اللہ کے ہاں مقرر یوں ہی تھا۔ یوں تمام معاملات کو اللہ کی مشیت اور قانون فطرت کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس معرکے کے بیان کا آغاز یوں ہوتا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ

رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (۳۳: ۹) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یاد کرو اللہ کے احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں“ اللہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اور ان واقعات کے درمیان یہ تبصرے

قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمْ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا

(۳۳: ۱۶) قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ

رَحْمَةً وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (۳۳: ۱۷) ”اے نبی! ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھانن تمہارے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہو گا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقعہ تمہیں مل سکے گا۔ ان سے کہو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہے۔ وہ اگر تمہیں نقصان پہنچانا چاہے اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر تم پر مہربانی کرنا چاہے۔ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں بنا سکتے۔“ اور دوسرا تبصرہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَ الْيَوْمَ الْآخِرَ

وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (۳۳: ۲۱) ”در حقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا۔ اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔“ اور خاتمہ اس پر ہوتا ہے :

لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِن شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِن

اللَّهُ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا (۳۳: ۲۴) ”تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزاء دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے اور چاہے توبہ قبول کر لے“ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔“

اس کے ساتھ ساتھ اس جنگ کے بارے میں مومنین صادقین کا موقف ’ان کے تصورات اور منافقین کا موقف ان کے تصورات اور احساسات بھی یہاں پیش کئے گئے تاکہ مسلمانوں پر مبنی قدس اور کھوئی قدس اچھی طرح واضح ہو جائیں۔

وَ إِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَ رَسُولُهُ

غُرُورًا (۳۳: ۱۲) ”یاد کرو جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا ’صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کیے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔“ اور دوسری طرف

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَ رَسُولُهُ وَ صَدَقَ اللَّهُ

وَ رَسُولُهُ وَ مَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَ تَسْلِيمًا (۳۳: ۲۲) ”جب مومنین نے احزاب کو دیکھا تو پکار اٹھے۔ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی ہر دلی کو اور بڑھا دیا۔“ اس کے بعد اس کا نیکو کن انجام یعنی الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

وَ رَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا وَ كَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ وَ كَانَ اللَّهُ

قَوِيًّا عَزِيزًا (۳۳: ۲۵) ”اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا۔ وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یونہی پٹ گئے اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی جنگ کرنے کے لیے کافی ہو گیا“ اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔“

اس کے بعد ازدواج مطہرات کو اختیار دینے کا مشہور واقعہ ہے کہ جب مسلمانوں پر ہر طرف سے اموال غنیمت آنے شروع ہو گئے تو انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر ماں و نفقہ کا مطالبہ شروع کر دیا۔ یہ اموال غزوہ بنی قریظہ کے ذریعے اور اس سے قبل کے اموال غنیمت کے ذریعہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ ازدواج مطہرات کو دو باتوں کے درمیان میں سے ایک کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا یا تو وہ دنیا کی زیب و زینت اور عیش و عشرت کی زندگی

اختیار کر لیں اور یا اللہ اور رسول اور آخرت کو اختیار کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے اللہ اور رسول اور آخرت کو اختیار کر لیا۔ تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کے مقام محرم کو چن لیا اور زندگی کے پیش اور عشرت کو ترک کر دیا۔ اس کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ جس طرح تم نے اللہ اور رسول اور آخرت کو اختیار کیا ہے تو تمہاری جزلے بھی عظیم ہوگی اور اگر تم نے گناہ اور فحاشی اور دنیا پرستی کو اختیار کیا تو تمہارے لیے سزا بھی دوسرے لوگوں سے زیادہ ہوگی۔ اور یہ اس لیے کہ تم نبی کریم کی عظیم ازواج ہو اور تمہارے گھروں میں قرآن نازل ہو رہا ہے اور اس کی تلاوت ہو رہی ہے۔ وہ رات اور دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکمت بھرے وعظ سن رہی ہیں۔ اس کے بعد تمام مومنین و مومنات کی جزلے اخروی کو بیان کر دیا جاتا ہے۔ یہ تیسرا سبق تھا۔

چوتھا سبق آپ کی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کے بارے میں ہے۔ یہ تہنشی اور ہاشمی النسب تھیں۔ ان کا نکاح آپ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ سے ہوا تھا۔ اس کے بارے میں یہ حکم ہوا تھا۔ مومنین اور مومنات کے معاملات کا اختیار اللہ کو ہے۔ اب ان کا اپنے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ نہ وہ اللہ اور رسول کے فیصلوں کے بعد کوئی اختیار رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا ارادہ ہے جو تمام معاملات کو چلاتا ہے اور مومنین کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے بارے میں سر تسلیم خم کر دیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ

مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلًّا مُبِينًا (۳۳: ۳۶) ”کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔“ یہ تو تھا زینب کے نکاح کا معاملہ۔

اب نکاح کے بعد ان کے درمیان طلاق ہو گئی۔ طلاق کے بعد متنبی بنانے کے قانون کو منسوخ کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں پہلے بات ہو چکی ہے اور یہ قانون پہلے ہی منسوخ ہو چکا تھا۔ یہ قانون عرب معاشرے میں چونکہ جنس پکڑ گیا تھا اس لیے اللہ نے اس کے اجراء کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو چنا۔ چنانچہ اس سلسلے میں خود رسول اللہ کو آزمائش میں ڈالا گیا تاکہ آپ خود اس بات کو اپنے اوپر نافذ نہ کریں اور یہ نیا اصول عربی معاشرے میں قائم ہو جائے اور ساتھ جاہل قانون کا قلع قمع کر دیا جائے۔

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ

اللَّهَ وَتَخْشَى فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ لَاحِقٌ أَنْ تَخْشَاهُ فَلَمَّا

قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَ لِلْكِ لَا يَكُونُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ

اَمْعِيَانِهِمْ اِذَا تَقَفُّوا مِنْهُمْ وَطَرَا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (۳۳: ۳۷) ”پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنین پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے، جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آتا ہی چاہئے۔“ اس مناسبت سے یہاں حضور اکرمؐ اور مومنین کے باہم تعلق کے بارے میں یہی بات ہو جاتی ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبًا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رُّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّنَ

(۳۳: ۴۰) ”محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔“ اس سبق کا خاتمہ رسول اللہؐ اور مومنین کے نام اس ہدایت کے اجراء سے ہوتا ہے:

وَلَا تُطِيعُ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ دَعَاْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلٰی اللّٰهِ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ

وَ كَيْلًا (۳۳: ۴۸) ”اور ہرگز اطاعت نہ کرو کفار اور منافقین کی، کوئی پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسائی کی اور بھروسہ کر لو اللہ پر۔ اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ اپنے معاملات اس کے سپرد کئے جائیں۔“

پانچویں سبق میں ان طلاق شدہ عورتوں کے مسئلہ میں جن کی رخصتی نہ ہوئی ہو۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عائلی زندگی کے بارے میں کچھ احکام ہیں، کہ کون سی عورتیں آپؐ پر حرام ہیں اور کون سی حلال ہیں۔ پھر مومنین کا تعلق ازواج مطہرات سے کیا ہے۔ زندگی میں اور آپؐ کی وفات کے بعد اور یہ کہ ان کا حجاب کن کن سے ہو گا۔ باپ، بیٹے، بھائیوں، بھتیجیوں یا غلاموں کے سوا تمام دوسرے لوگوں سے حجب ہو گا۔ پھر ان لوگوں کا حکم جو رسول اللہؐ کو آپؐ کی بیویوں اور خاندان کے بارے میں اذیت دیتے ہیں۔ ان پر دنیا و آخرت میں لعنت بھیجی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت منافقین اور کافریں اس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

اس کے بعد یہ حکم آتا ہے کہ ازواج مطہرات، آپؐ کی بیٹیاں مومنین کی ازواج اور تمام مومنہ عورتیں اپنی اوڑھنیاں سینوں پر ڈال لیا کریں۔

ذٰلِكَ اَدْنٰی اَنْ یُّعَرَفْنَ فَلَا یُوْزَوْنَ (۳۳: ۵۹) ”تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔“

اس کے بعد ان منافقین کو تہدید آمیز تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ اگر مدینہ میں شرذفہ اور اٹو اٹو پھیلانے سے باز نہ آئے تو ہم رسول اللہؐ کو آمادہ کریں گے کہ تم لوگوں کے خلاف وہ کارروائی کریں، تمہیں نکال دیں جس طرح بنی قینقاع کو نکال دیا۔ بنو نضیر کو نکال دیا۔ یہ تمہارا کام ہی تمام کر دیں۔ جس طرح بنی قریظہ کا کام تمام کر دیا۔ یہ سب امور یہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں منافقین رات اور دن مدینہ میں اسلام کے خلاف سرگرم تھے اور شرارتیں کرتے تھے۔

آخری سبق لوگوں کے اس سوال کا جواب ہے کہ قیامت کب آئے گی اور اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اس طرف اشارہ ہے کہ شاید یہ قریب ہی ہو۔ اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے دو منظر پیش کئے جاتے ہیں۔

يَوْمَ تَقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَلَيْتَنَّا اطَّعْنَا اللَّهَ وَ اطَّعْنَا الرَّسُولَ

(۳۳: ۶۶) ”جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کیے جائیں گے، اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش ہم نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی۔“ وہ اپنے اکابر پر لعنت اور ملامت کرس گئے جن کی انہوں نے اطاعت کی اور انہوں نے ان کو گمراہ کیا۔

وَقَالُوا رَبَّنَا اِنَّا اطَّعْنَا سَادَتَنَا وَ كَبَرَاءَنَا فَافْضَلْنَا السَّبِيلَا (۳۳: ۶۷) رَبَّنَا

اَتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنَّا كَثِيرًا (۳۳: ۶۸) ”اور کہیں گے اے ہمارے رب، ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہِ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب، ان کو دہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔“

سورہ کا خاتمہ نہایت ہی عظیم اور گہرے تبصرے پر ہوتا ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاٰمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يُحْمِلْنَهَا وَ

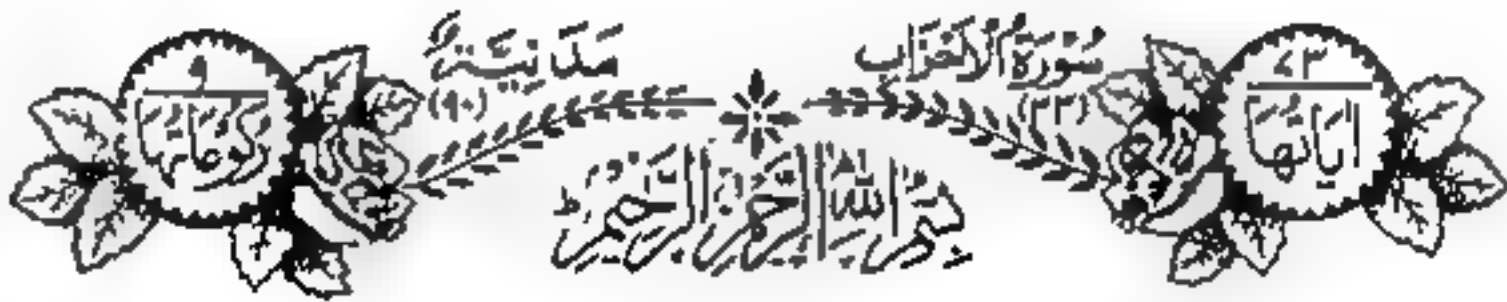
اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (۳۳: ۷۲) ”ہم نے امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑوں کے ساتھ پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا اور بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے تاکہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔“

یہ آخری تبصرہ یہ بتاتا ہے کہ انسانیت کے کاندھوں پر کس قدر بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہے خصوصاً جماعتِ مسلمہ کے کاندھوں پر۔ یہ عظیم امانت فی الوقت جماعتِ مسلمہ ہی اٹھاری ہے۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات کے پھیلانے کی ذمہ داری۔ اور اس دعوت کی راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر کرنا، شریعت کو قائم کرنا، اپنے اوپر اور زمین پر شریعت کو قائم کرنا وغیرہ یہ سب امور اسی سورہ کے موضوع کا اہم حصہ ہیں۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات سے اسلامی نظام، اسلامی دستور و قانون اور اسلامی معاشرے کا قیام اللہ کی امانت ہے جو مومنین کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے۔

اب سورہ ہذا کی آیات کی تشریح۔

درس نمبر ۱۸۸ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۸



يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّبِعِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا
حَكِيمًا ۖ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ
خَبِيرًا ۖ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو، حقیقت میں علیم اور حکیم تو اللہ ہی ہے۔ پیروی کرو اس بات کی جس کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں کیا جا رہا ہے، اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔ اللہ پر توکل کرو، اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے۔“

یہ اس سورہ کا آغاز ہے جس میں اس نئے اسلامی معاشرے کی اخلاقی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم نو کی گئی ہے۔ یہ آغاز ہی جاتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کا مزاج کیا ہے اور وہ قواعد اور اصول کیا ہیں جن پر اسلامی نظام عملاً قائم ہے۔ وہ تصورات کیا ہیں جن کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے ضمیر و اخلاق پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اسلام محض ہدایت اور وعظ نہیں ہے۔ نہ اسلام محض چند اخلاقی تعلیمات کا نام ہے، نہ اسلام صرف قوانین کا مجموعہ ہے۔ نہ وہ محض رسم و رواج کا نام ہے۔ اسلام دراصل مذکورہ بالا تمام چیزوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں بھی اسلام نہیں ہیں۔ اسلام دراصل سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے۔ اللہ کی مشیت اور اللہ کی خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا۔ اللہ کی تقدیر کے سامنے جھکنا۔ اور سب سے اوں بات یہ کہ اللہ کے احکام اور امر و نہی کے ماننے کے لیے تیار ہو

جائے۔ اللہ انسانوں کے لیے جو نظام تجویز کرتا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کر کے 'بغیر اداہر اداہر توجہ کرنے کے' اور اس کے سوا کسی اور طرف رخ کرنے کے۔ بغیر اس کے کہ اللہ کے سوا کسی اور قوت پر بھروسہ کیا جائے۔ اسلام کا بنیادی شعور یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ وہ ایک ایسے قانون قدرت کا تابع ہے جو خود انسان اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی پوری کائنات کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ نظام افلاک و کواکب کو بھی کنٹرول کرتا ہے اور تمام وجود کو بھی کنٹرول کرتا ہے خواہ خفیہ ہو یا ظاہر ہو۔ غائب ہو یا حاضر ہو۔ انسان اسے سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہو۔ اس یقین کے ساتھ کہ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے صرف اللہ کے احکام کا اتباع کرتا ہے اور ان کاموں سے روکنا ہے جن سے رکنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ان اسباب اور ذرائع کو استعمال کرتا ہے جو اللہ نے ان کے لیے فراہم کیے ہیں اور پھر ان نتائج کا انتظار کرتا ہے جو اللہ نے نکالنے ہیں۔ یہ وہ قاعدہ ہے جس کے اوپر تمام شریعتیں اور تمام قوانین قائم ہوتے ہیں 'رسم و رواج قائم ہوتے ہیں' آداب و اخلاق قائم ہوتے ہیں یعنی وہ عقیدہ جو خیر و شر میں ہوتا ہے وہ انسانی زندگی میں ملاحظہ پذیر ہو اور انسان کی زندگی میں اس کے عملی آثار موجود ہوں کہ انسان کا نفس اللہ کے سامنے جھک گیا ہے اور وہ اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے شریعت پھوٹی ہے۔ اس شریعت پر بھی ایک پورا نظام زندگی استوار ہوتا ہے اور یہ تینوں امور باہم مربوط اور ہم جسم ہوتے ہیں۔ یہ ہے اسلام۔

چنانچہ اس سورہ کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے لیے جدید قانون سازی کی جائے یعنی اللہ سے ڈرنا۔ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے کیونکہ حضور اکرمؐ ہی اس جدید معاشرے کے منتظم اعلیٰ تھے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ (۳۳: ۱) "اے نبی! اللہ سے ڈر"۔ اللہ سے ڈرنا اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ اللہ ہمارے اوپر نگران ہے اور وہ بہت جلیل القدر ہے۔ یہ اسلام کا بنیادی شعور اور بنیادی قاعدہ ہے۔ تقویٰ ہی انسان کے اندر ایک پاسبان ہوتا ہے جو انسان کو اللہ کے احکام کی پیروی پر مائل کرتا ہے۔ چنانچہ تقویٰ ہی کی وجہ سے اسلامی نظام زندگی عملاً قائم ہوتا ہے۔

دوسرا حکم آیا ہے کہ کافروں اور منافقوں کی خواہشات کی اطاعت نہ کرو۔ ان کی تجاوزات اور ان کی ہدایات کو نظر انداز کرو نہ ان سے رائے لو اور نہ ان کے اصرار کو تسلیم کرو۔

وَلَا تُطِيعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ (۳۳: ۱) "کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کرو"۔ اللہ کے احکام کی اطاعت کرنے کا حکم یہاں بعد میں آتا ہے۔ اس سے بھی پہلے کہا گیا کہ کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کرو، اس لیے کہ اس دور میں کفار اور منافقین کی طرف مسلمانوں اور حضور اکرمؐ پر بہت ہی دباؤ تھا۔ اس لیے یہاں حکم دیا گیا کہ آئندہ اسلامی معاشرے کی عملی تنظیم میں بھی ان کی کوئی بات نہ سناؤ اور ان کے دباؤ کے آگے نہ جھکو۔ حضورؐ کو تو اس وقت کے حالات کے مطابق حکم دیا گیا لیکن تحریک اسلامی کو ہر زمان و مکان میں یہی کرنا چاہئے کہ جہاں اپنی حکومت قائم ہو تو وہاں غیروں کی آراء و تجاوزات کو قبول نہ کرو تا کہ اسلامی نظام حیات خالص اپنی پالیسی پر آگے بڑھے اور وہ کسی غیر کی پالیسی کے دباؤ میں نہ ہو۔

کسی مسلمان کو یہ دھوکہ نہ کھانا چاہئے کہ ان کفار اور منافقین کے پاس مہارت ہے اور وہ علم و تجربہ رکھتے ہیں جس

طرح آج کل اپنے لیے اپنی کمزوری کے دور میں یہ وجہ جواز تلاش کرتے ہیں اس لیے کہ اللہ ہی علیم و حکیم ہے۔ اس نے مسلمانوں کو جو نظام زندگی دیا ہے وہ اس نے علم و حکمت کی اساس پر دیا ہے۔ اس میں کوئی فتور اور قصور نہیں ہے اور لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی علم و حکمت نہیں ہے۔ اور اس کے بعد متھو یہ حکم دیا جاتا ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (۲:۳۳) ”اور پیروی کرو اس بات کی جس کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں کیا جا رہا ہے“۔ کیونکہ مسلمانوں کے لیے ہدایات اللہ سے آیا کرتی ہیں۔ کفار اور منافقین کی طرف سے نہیں۔ مسلمان خدا کا اتباع کرتے ہیں کسی اور کا نہیں۔ اس آیت کی طرز تعبیر ہی میں بعض گہرے اشارات پائے جاتے ہیں یعنی اتباع کرو اس بات کی جو تمہارے طرف وحی (اشارہ) کی جارہی ہے، خصوصیت کے ساتھ۔ پھر یہ اشارہ رب کی طرف سے ہے۔ گویا یہاں یہ خاص اشارات کئے جا رہے ہیں، ان کو سمجھو۔ اور یہ اشارات اللہ مطاع کی طرف سے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۲:۳۳) ”اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اللہ جو ہدایات دیتا ہے وہ اعلیٰ درجے کے علم اور مہارت پر مبنی ہیں۔ وہ تمہارے اعمال کی حقیقت سے باخبر ہے، تمہارے رجحانات اور تمہاری خواہشات سے باخبر ہے۔ اور آخری ہدایت یہ ہے کہ

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (۳:۳۳) ”اللہ پر توکل کرو، اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے“۔ یہ بات اہم نہیں ہے کہ کفار و منافقین تمہارے ساتھ ہیں یا تمہارے خلاف ہیں۔ نہ ان کی مکاریوں اور سازشوں کی کوئی حیثیت ہے۔ نہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دو، اللہ تمہارے معاملات کے اندر اپنے علم، اپنی خبرداری اور مہارت سے تعریف کرے گا۔ معاملات کو اللہ پر چھوڑ دینا ہی وہ چیز ہے جس پر آخر کار انسان کا دل مطمئن ہو کر شرح صدر حاصل کر لیتا ہے اور وہ اپنے بندہ، و قیود سے باخبر ہو جاتا ہے۔ اپنے حدود سے باہر کے معاملات کو اللہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ اپنی حدود پر رک جاتا ہے اور آگے کی بات بات داسے پر چھوڑ دیتا ہے۔ نہایت اطمینان، پورے بھروسے اور پورے یقین کے ساتھ اپنے حصے کا کام کرتا ہے۔

یہ تین عناصر، خدا کا خوف، وحی الہی کا پورا اتباع اور اللہ وحدہ پر بھروسہ یہ کسی بھی داعی کے اصل زادراہ ہیں۔ بشرطیکہ کہ وہ کفار اور منافقین سے کٹ جائے۔ یہ عناصر دعوت اسلامی کو اپنے منہاج پر قائم رکھتے ہیں یعنی اللہ سے (خوف) اللہ کی طرف سے آنے والے حکم کا اتباع اور اللہ پر بھروسہ۔ یہ ہدایات ایک زبردست، گہرے تجربے پر رقم ہوتی ہیں اور یہ تجربہ ایک حسی مشاہدہ پر مبنی ہے۔

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِۦ

”اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے۔“ ہر انسان کے اند ایک ہی دل اور ایک ہی دماغ ہوتا ہے۔ لہذا اس کا تصور بھی ایک ہو گا اور اس کا نظام بھی ایک ہو گا۔ وہ ایک ہی صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے۔ اس کے سامنے ایک ہی پیانہ ہو گا جس سے وہ حسن و قبح کو ناپے گا۔ اور ایک ہی پیمانے سے وہ واقعات اور اقدار کو ناپے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی زندگی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ وہ منافع ہو گا۔ اس کی زندگی میں قشیم و فراز ہوں گے اور وہ صراطِ مستقیم پر نہ ہو گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک انسان اپنے اخلاق و آداب ایک سرچشمے سے لے اور اپنا دستور و قانون کسی دوسرے سرچشمے سے لے اور اپنا اجتماعی اور معاشی نظام کسی تیسرے سرچشمے سے لے اور اپنے فنون اور فلسفے کسی چوتھے سرچشمے سے لے۔ اس قسم کے مخلوط خیالات کسی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ایسا شخص اور اس کی شخصیت ٹکڑے ٹکڑے ہوگی اور اس کا وجود قائم نہ رہ سکے گا۔

ایک نظریاتی شخص جس کا فی الواقعہ کوئی نظریہ اور عقیدہ ہو، یہ نہیں کر سکتا کہ وہ زندگی کے چھوٹے یا بڑے معاملے میں کوئی نظریاتی موقف نہ رکھتا ہو۔ وہ ہر وقت اپنے نظریات کے تقاضوں کے مطابق قدریں اپناتا ہے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ کوئی بات کرے یا کوئی حرکت کرے، یا کوئی نیت و ارادہ کرے یا کوئی سوچ کرے اور وہ اس کے نظریات سے متاثر نہ ہو یا اس کے عقیدے سے مبرا ہو۔ کیونکہ اللہ نے کسی انسان کے سینے میں دو دل نہیں رکھے۔ ایک دل ہوتا ہے، ایک عقیدہ ہوتا ہے، ایک عمل ہوتا ہے، ایک سمت ہوتی ہے اور ایک ہی پیانہ اور قدر ہوتی ہے۔

کوئی نظریاتی شخص یہ نہیں کر سکتا کہ یہ کام میں نے اپنی ذاتی حیثیت میں کیا ہے اور یہ میں نے ایک مسلمان کی حیثیت میں کیا ہے۔ جیسا کہ آج کل کے سیاست دان ایسا کرتے ہیں، یا جیسا کہ اجتماعی، صنعتی کرتی ہیں یا علمی سوسائٹیاں کرتی ہیں۔ غرض انسان ایک ہوتا ہے، اس کا دل ایک ہوتا ہے، نظریہ ایک ہوتا ہے، قبلہ ایک ہوتا ہے، اس کا تصور ایک ہوتا ہے، اقدار اور حسن و قبح کے پیمانے ایک ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ اس کے عقائد میں ہوتا ہے۔

غرض اسی ایک دل کے ساتھ انسان تنہا بھی زندہ رہتا ہے، خاندان میں بھی رہتا ہے، جماعت میں بھی رہتا ہے، حکومت میں بھی رہتا ہے، دنیا میں بھی رہتا ہے، چھپے بھی رہتا ہے اور برملا بھی رہتا ہے۔ مزدور و آقا بھی رہتا ہے، حاکم و محکوم بھی رہتا ہے۔ مشکلات اور سہولیات میں بھی رہتا ہے۔ غرض یہ اس کا رنگ ہوتا ہے۔ یہ تبدیل نہیں ہوتا۔ نہ اس کا معیار بدلتا ہے اور نہ قیمت بدلتی ہے۔ نہ اس کی سوچ بدلتی ہے۔

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ (۳۳: ۴) لہذا کسی بھی نظریاتی اسلام کا منہاج ایک ہوتا ہے، راستہ ایک ہوتا ہے، رخ ایک ہوتا ہے۔ صرف اللہ کے حکم کے سامنے جھکتا ہے۔ دل ایک ہے تو اللہ بھی ایک ہے، آقا بھی ایک ہے، منہاج حیات بھی ایک ہے اور اگر کوئی ایسا نہ ہو گا تو اس کی زندگی منتشر ہوگی اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا۔

اس فیصلہ کن تبصرے کے بعد اور منہاج حیات کے تعین کے بعد اب سیاق کلام قانونی اصلاحات شروع کرتا ہے۔ پہلے قطار اور منہی بنانے کا قانون منسوخ کیا جاتا ہے تاکہ خاندان کو تہرونی عناصر سے پاک کر کے خالص رشتہ داری اور قدرتی بنیادوں پر تعمیر کیا جائے۔

وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمْ الَّتِي تَظْهَرُونَ مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِكُمْ وَمَا
 جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ
 يَهْدِي السَّبِيلَ ۖ اذْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوا
 آبَاءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ
 بِهِ وَلَكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

”نہ اس نے تم لوگوں کو ان بیویوں کو جن سے تم ظاہر کرتے ہو تمہاری ماں بنا دیا ہے اور نہ اس نے تمہارے
 منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنا دیا ہے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو لوگ تم اپنے منہ سے نکال دیتے ہو مگر اللہ وہ بات کہتا ہے
 جو جہنی بر حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو یہ
 اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔ اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور
 رفیق ہیں۔ نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم
 دل سے ارادہ کرو اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔“

جاہلیت میں رواج یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی سے کہتا تھا تم مجھ پر میری ماں کی بیٹہ کی طرح ہو۔ یعنی تم مجھ پر اس
 طرح حرام ہو جس طرح ماں حرام ہے۔ اسی وقت سے اس پر اس کے ساتھ مجامعت حرام ہو جاتی۔ اب یہ معلقہ ہو جاتی
 نہ یہ مطلقہ ہوتی کہ دوسرا کوئی اس سے نکاح کرتا نہ اس کی بیوی بن سکتی۔ اور یہ عورتوں پر ہونے والے مظالم میں سے
 سب سے بڑا ظلم تھا۔ اور جاہلیت کے دور کی بدسلوکیوں میں سے ایک بدسلوکی تھی۔

اسلام نے اصلاحات کا کام سب سے پہلے خاندانی نظام سے شروع کیا۔ خاندان کے اندر ہونے والے اس ظلم کو ختم
 کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خاندان انسانی اجتماعیت کا پہلا دائرہ ہے۔ اس لیے اسلام نے خاندانی نظام کی طرف بہت توجہ
 دی تاکہ جس تربیت گاہ میں بچے پرورش پاتے ہیں اس کی فضا خوشگوار ہو اور پر امن ہو۔ چنانچہ عورت کو اس عظیم بوجھ
 سے نکالا گیا اور اسے اس حالت قید سے رہائی دلا دی گئی۔ اور میاں بیوی کے تعلقات کو از سر نو عدل و انصاف پر استوار
 کیا۔ چنانچہ یہ قانون وضع کیا گیا۔

وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمْ الَّتِي تَظْهَرُونَ مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِكُمْ (۳۳: ۴) ”اس نے تم لوگوں کی
 ان بیویوں کو جن سے تم ظاہر کرتے ہو تمہاری ماں نہیں بنا دیا ہے۔“ کیونکہ صرف زبان سے ماں کہنے سے بیوی ماں
 نہیں بن جاتی۔ حقیقت واقعہ کے مطابق ماں ہے اور بیوی بیوی ہے۔ محض ایک لفظ کہنے سے تعلقات و روابط کی
 نوعیت نہیں بدل جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ظہار کی وجہ سے لہدی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ جس طرح ماں حرام ہوتی ہے
 جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں تھا۔

روایات میں آتا ہے کہ سورہ مجادلہ میں ظہار کے طمانہ قانون کو باطل کیا گیا اور واقعہ یوں ہوا کہ اوس ابن الصامت نے اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ کے ساتھ ظہار کر لیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے یہ دعویٰ کیا رسول خدا یہ میرا مال کھا گیا، اس نے میری جوانی کو ختم کر دیا، اور میرا پیٹ پھول گیا۔ اور میری عمر بڑھ گئی اور میری اولاد ختم ہو گئی تو اس نے میرے ساتھ ظہار کر لیا۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا ”میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم اس پر حرام ہو گئی ہو۔“

اس نے اپنی شکایت بار بار پیش کی۔ اس پر سورہ مجادلہ کی یہ آیات نازل ہوئیں :

قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُحَادِّثُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ (۵۸ : ۱) الَّذِينَ يُظْهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ مَا هُنَّ أُمَّهَاتُهُمْ إِنَّ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا اللَّائِي وَلَدْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنْكَرًا مِنَ الْقَوْلِ وَ زُورًا وَإِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌ غَفُورٌ (۵۸ : ۲) وَالَّذِينَ يُظْهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَا ذَلِكَ تَوْعَظُونَ بِهِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۵۸ : ۳) فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَا فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا ذَلِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَلِلْكَافِرِينَ

عَذَابٌ أَلِيمٌ (۵۸ : ۴) ”اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں ان کو جنا ہے۔ یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں اور حقیقت یہ کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرس پھر اپنی اس بات سے رجوع کرس جو انہوں نے کہی تھی تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ایک غلام آزاد کرنا ہو گا“ اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے درپے روزے رکھے، قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے دردناک سزا ہے۔“

اس قانون کی رو سے ظہار کی وجہ سے میاں بیوی کو وقتی طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا اور سابق قانون میں جو ابدی حرمت تھی اسے ختم کر یا گیا۔ اور اگر میاں بیوی باہم دوبارہ ازدواجی زندگی اختیار کرنا چاہیں تو اس سے قبل وہ ایک غلام آزاد کرس یا مسلسل دو ماہ روزے رکھیں یا ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائیں۔ یوں دوبارہ وہ بیوی خاوند کے لیے

حلال ہو جائے گی اور دونوں کی ازدواجی زندگی حسب سابق شروع ہو جائے گی۔ اور یہ نیا قانون ولایت پسندانہ ہے اور واقعی صورت حالات پر مبنی ہے۔

وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمْ الَّتِي تَظْهَرُونَ مِنْهُمْ أُمَّهَاتِكُمْ (۴: ۳۳) ”اللہ نے تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو، تمہاری مائیں نہیں بنایا۔“ اس جاہلی عادت کی وجہ سے خاندان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا تھا اور دوسری جانب عورت پر ایک دائمی ظلم تھا اور وہ زندہ درگور ہو جاتی تھی۔ یوں خاندانی روابط کے اندر اضطراب، طوائف الملوک اور بیچیدگیاں پیدا ہو جاتی تھیں اور یہ سب کچھ مرد کی ذاتی خواہشات اور جاہلی سوسائٹی میں ان کی برتری اور تشدد کی وجہ سے تھا۔

یہ تو تھا مسئلہ ظہار رہا قانون مصنیٰ اور لوگوں کو اپنے باپوں کے سوا دوسروں کے نام سے پکارنا، یہ بھی خاندانی نظام کے لیے باعث پریشانی تھا اور اس کی وجہ سے ایک خاندان کی ہم آہنگی میں خلل پڑتا تھا۔

اس کے باوجود کہ عربی معاشرے میں عفت اور نسب کا بہت بڑا خیال رکھا جاتا تھا اور نسب پر فخر کیا جاتا تھا لیکن اس فخر و مباہلات کے ساتھ ساتھ بعض کمزور پہلو بھی عرب معاشرے میں پائے جاتے تھے۔ معدودے چند خاندانوں کے سوا یہ کمزوریاں عموماً تھیں۔

بعض لوگوں کے ہاں ایسے بیٹے بھی تھے جن کے سرے سے باپ معلوم ہی نہ تھے۔ بعض لوگوں کو اس قسم کے نوجوان پسند آئے تو وہ انہیں اپنا بیٹا بنا لیتے اس کو اپنے نسب میں شمار کر لیتے اور دونوں ایک دوسرے کی میراث کے حقدار ہو جاتے۔ بعض بیٹے ایسے تھے کہ ان کے باپ معلوم تھے لیکن بعض اوقات ایک شخص کو کوئی ایسا لڑکا پسند آ جاتا، وہ اسے اپنا بیٹا بنا لیتا۔ اور اسے اپنے نسب میں شریک کر لیتا۔ لوگوں کے اندر وہ لہن نکلاں مشہور ہوتا۔ وہ اس کے خاندان کا فرد بن جاتا۔ یہ معاملہ خصوصاً جنگی قیدیوں اور اغوا شدہ لوگوں کے ساتھ ہوتا۔ جنگ اور ڈاکوؤں میں بچے اور نوجوان لڑکے قید ہو جاتے۔ بعض لوگ ایسے لوگوں کو اپنا بیٹا بنا لیتے۔ اسے اپنا نام دے دیتے اور وہ اس کے ساتھ مشہور ہو جاتا اور وہ بیٹے کے حقوق و فرائض ادا کرتا۔

انہی میں سے زید بن حارثہ نکلی بھی تھا۔ یہ ایک عربی قبیلہ ہے، ایام جاہلیت کے دور کی ذہنیوں میں سے کسی ذہنی میں یہ قید ہو کر آگیا۔ اسے حکیم ابن حزام نے اپنی پھوپھی خدیجہ کے لیے خرید لیا۔ جب حضورؐ نے خدیجہ کو اپنے نکاح میں لے لیا تو اس نے یہ حضورؐ کو بخش دیا۔ اس کے بعد اس کے باپ اور بیٹے نے اسے آزاد کرنے کا مطالبہ کیا تو حضورؐ اکر م نے اسے اختیار دے دیا تو زید نے حضورؐ کو اختیار کر لیا۔ حضورؐ اکر م نے اسے آزاد کر کے معنیٰ بنا دیا اور لوگ اسے زید بن محمد کہنے لگے۔ غلاموں میں سے حضورؐ پر وہ سب سے پہلے ایمان لائے۔

جب اسلام نے خاندانی تعلقات کو اپنی طبعی اور فطری بنیادوں پر استوار کرنا شروع کیا، خاندانی روابط کو مستحکم بنانے کی سعی کی اور خاندان کو خالص خاندانی حد تک محدود کیا تو جاہلی قانون مصنیٰ کو ختم کر دیا اور خاندانی روابط کو نسب کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ یعنی خونی رشتے باپ بیٹے کی اساس پر۔ اور یہ حکم دیا۔

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ (۴: ۳۳) ”اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا

نہیں بنایا۔“

ذَلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ (۳۳: ۴) ”یہ وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکالتے ہو۔“ صرف باتوں سے واقعات اور حقائق نہیں بدلتے۔ اور صرف باتوں سے خونی رشتے بھی قائم نہیں ہوتے اور وراثت کے حقوق بھی پیدا نہیں ہو جاتے۔ اور محض زبان سے یہ رشتے ایسے نہیں ہوتے جو اس وقت ہوتے ہیں جب ایک زندہ بچہ زندہ ماں سے پیدا ہوتا ہے یا حقیقی باپ سے پیدا ہو جاتا ہے۔

وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ (۳۳: ۴) ”مگر اللہ جو بات کہتا ہے وہی حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔“ وہ مطلق حق کہتا ہے جس کے اندر کوئی باطل نہیں ہوتا اور ان سچائیوں میں سے ایک سچائی یہ ہے کہ خاندانی قوانین اور رشتے حقیقت پر مبنی ہوں۔ یعنی خون اور نسب کے روابط ہوں نہ محض زبانی باتوں پر۔ وہ قانون سازی میں سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اور اسی کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ یہ فطری قانون ہوتا ہے اور انسان کے بنائے ہوئے قوانین ان فطری قوانین کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جبکہ وہ حقائق نہ ہوں محض خالی خونی باتیں ہوں۔ ایسے الفاظ ہوں جن کا کوئی مفہوم نہ ہو، لہذا ایسے قوانین و روابط پر حقیقی قوانین و روابط غالب ہو جاتے ہیں جو سیدھے رستے پر مبنی ہوں۔

أَدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ (۳۳: ۵) ”منہ بوے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔“ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔“ منصفانہ بات یہ ہے کہ بیٹے کو باپ کے نام سے پکارا جائے۔ یہی اس والد کے ساتھ انصاف ہے جس کے جسم سے یہ بچہ نکلا اور اس کا جسم بنا۔ بیٹے کے ساتھ بھی انصاف ہے اور انہی دونوں کے درمیان وراثت بھی انصاف ہے۔ باپ اور بیٹا ہی ایک دوسرے کے حقیقی معاون ہو سکتے ہیں۔ بیٹا باپ کی خفیہ خصوصیات کا بھی لہجہ ہو سکتا ہے اور آباؤ اجداد کے خصائص کا بھی لہجہ ہے۔ یہ اس طرح بھی عدل ہے کہ ہر حق کو اس کی جگہ رکھ دیا گیا اور روابط کو فطری اصولوں پر قائم کر دیا گیا۔ نہ والد کی حق تلفی ہو اور نہ بیٹے کی حق تلفی ہو۔ غیر حقیقی والد کو معنی ہونے کی ذمہ داریاں نہ اٹھانی پڑیں گی اور نہ اسے وہ مفادات ملیں گے جن کا وہ مستحق نہ تھا۔ نہ معنی غیر ضروری ذمہ داریاں اٹھائے گا اور نہ وہ مفادات ملے سکے گا جس کا وہ مستحق نہ تھا۔

یہ وہ عائلی نظام ہے جس کی وجہ سے خاندان کی ذمہ داریوں میں توازن پیدا ہوتا ہے اور خاندان نہایت ہی مستحکم اور گہری اور ولہیت پسندانہ بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ اس کی اساس میں سچائی، حق پسندی اور فطرت سے ہم آہنگی ہے۔ ہر وہ نظام جو خاندانی نظام کو نظر انداز کرتا ہے وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ ضعیف کمزور اور جعلی بنیادوں پر اٹھا ہوا ہوتا ہے اور کوئی ایسا نظام زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔^(۱)

(۱) اشتراکیت نے اپنے نظام کو خاندانی بنیاد پر استوار نہیں کیا۔ آج تک اشتراکی معاشرہ اندھیرے میں ٹانگ ٹوٹیاں مار رہا ہے۔ روسی نظام کی مذہبی اور فلسفیانہ بنیادوں کی مخالفت کے باوجود یہ ملک آہستہ آہستہ خاندانی نظام کی طرف منتقل ہوا اور خاندانی قوتیں منظم ہو رہی ہیں۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ دور جاہلیت میں خاندان کے روابط میں بہت انتشار تھا۔ اسی طرح جنسی تعلقات میں بھی انتشار تھا۔ اس کے نتیجے میں انساب کے اندر بہت ہی اختلاط پیدا ہو گیا تھا اور بعض اوقات لوگوں کے باپوں کا بھی پتہ نہ لگتا تھا۔ اسلام نے اس معاملے کے اندر سہولت پیدا کر دی کیونکہ اسلام کا منشا یہ تھا کہ خاندانی نظام کو از سر نو منظم کیا جائے۔ اور اسلام خاندان کی اساس پر اجتماعی نظام کی تشکیل کے درپے تھا۔ اس لیے جن لوگوں کے آباء و اجداد کا پتہ نہ تھا، ان کو اسلامی جماعت میں ایک مقام دے دیا۔ یہ اخوت اسلامی کا مقام تھا۔

فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ (۵:۳۳) ”اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور رفیق ہیں۔“ اخوت فی الدین کا تعلق ایک اخلاقی اور روحانی تعلق ہے اور اس پر کوئی قانونی حقوق و فرائض مرتب نہیں کیے گئے۔ مثلاً وراثت کی کفالت اور ادائیگی دے کر جبکہ معینی بتانے پر یہ قانونی حقوق و فرائض مرتب ہوتے تھے۔ یہ اس لیے کہ ان لوگوں کا بھی اسلامی جماعت میں کوئی نہ کوئی مقام اور رابطہ ہونا چاہئے۔

فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ (۵:۳۳) ”اگر تمہیں ان کے آباء و اجداد معلوم نہ ہوں۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دور جاہلیت کے معاشرے میں نسب کے اعتبار سے بہت بڑا انتشار تھا۔ اس کے نتیجے میں جنسی تعلقات کے معاملے میں بھی انتشار تھا۔ اس انتشار سے بچنے کے لیے اسلام نے خاندانی نظام کو از سر نو مرتب کیا۔ یوں خاندانی نظام منظم بنیادوں پر استوار ہو گیا۔

انساب کو اپنی حقیقت کی طرف واپس کر دینے کے بعد اب یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی کو اپنا نسب صحیح معلوم نہ ہو اور وہ نسب کے سلسلے میں کوئی غلط بات کہہ دے تو اس کا کوئی قصور نہ ہو گا۔

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ (۵:۳۳) ”نادانستہ بات تم کو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے کہ تم دل سے ارادہ کرو۔ یہ اللہ کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ اللہ کسی پر کوئی ایسا حکم عائد نہیں کرتا جس کے بجالانے کی ان میں طاقت نہ ہو۔“

وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (۵:۳۳) ”اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نسب کے سلسلے میں بہت ہی تاکید اور تشدید فرمائی ہے کیونکہ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ جدید معاشرے کو ایسے خطوط پر منظم کیا جائے جس میں کوئی انتشار نہ ہو جس طرح جاہلی معشروں میں کسی کے بارے میں کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ کون کس کی اولاد سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنا نسب چمپاتے ہیں ان کو سخت وعید کی گئی اور ان پر کفر کا اطلاق کیا گیا۔ ابن جریر نے ’یعقوب ابن ابراہیم سے‘ ابن علیہ سے ’عینہ ابن عبد الرحمن نے ان کے باپ سے‘ ابو بکرؓ سے فرماتے ہیں ’اللہ نے فرمایا۔‘

أَدْعُوهُمْ لِأَبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ (۵:۳۳) ”منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو‘ یہ اللہ کے نزدیک بہت

یہ مصفا نہ بات ہے۔ اگر ہمیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں۔“ میرے باپ نے کہا ”عینہ ابن عہد الرضی کہتے ہیں۔“ ”خدا کی قسم میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ اگر کسی کو یقین ہوتا کہ میرا باپ گدھا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرتا۔“ اور حدیث میں آیا ہے۔

من ادعی الی غیر ابیہ وھو یعلم الا کفر ”جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا اور کسی طرف منسوب کیا اور وہ جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔“ یہ تمہید اس پالیسی کے مطابق ہے جس کے ذریعے اسلام خاندان اور خاندانی روابط کو ہر شک و شبہ سے پاک رکھنا چاہتا ہے اور اسامی سلسلہ نسب کو صحیح ’سلامت‘ مسلم العقیدت رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس پر اسلامی معاشرے کی تعمیر کی جائے اور یہ معاشرہ صحیح اور پاک معاشرہ ہو۔

--- ○○○ ---

اس کے بعد ایک دوسرے عبوری قانون کے اندر ترمیم کر دی جاتی ہے۔ حضور اکرمؐ جب وارد مدینہ ہوئے تو وہاں آپؐ نے انصار اور مہاجرین کے درمیان مواخات قائم کی۔ اسلام سے قبل جاہلیت میں اس قسم کا کوئی نظام نہ تھا۔ یہ نظام ہجرت کے بعد اسلام نے ایسا دیکھا تھا کیونکہ مہاجرین اپنی دولت مکہ میں چھوڑ آئے تھے۔ یہاں قحی دست وارد ہوئے۔ اسی طرح مدینہ میں بھی ایسے لوگ تھے جن کو ان کے خاندان والوں نے گھروں سے نکال دیا تھا کیونکہ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ مواخات کو ختم کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ولایت عامہ دے دی گئی اور یہ ولایت تمام دوسری ولایتوں پر مقدم قرار دے دی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ولی عام بننے کے ساتھ ساتھ آپؐ کی ازواج کو بھی روحانی مائیں قرار دے دیا گیا۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ
وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَ
الْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أُولِيَ الْيَمِّ مَعْرُوفًا كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ
مَسْطُورًا ۝

”بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے، اور نبی کی بیویوں ان کی مائیں ہیں، مگر کتاب اللہ کی رو سے عام مؤمنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہیں۔ یہ حکم کتاب الہی میں لکھا ہوا ہے۔“

مہاجرین نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر مدینہ چلے آئے، اللہ کی طرف بھاگ نکلے۔ صرف دین لے کر بھاگ گئے۔ انہوں نے اپنے عقیدہ کو اپنی برادری کے تعلقات، اپنے مال کے ذخائر، اپنے اسباب حیات، بچپن کی یادوں، یاروں اور دوستوں کی محفلوں پر ترجیح دے دی۔ یہ لوگ صرف اپنا عقیدہ بچا کر نکل آئے اور

اس کے سوا سب کچھ چھوڑ چھاڑ دیا۔ اس انداز پر ہجرت کر کے انہوں نے وہ تمام چیزیں چھوڑ دیں جو ہر انسان کے لیے عزیز ہوتی ہیں۔ اہل و عیال، بیٹے بیٹیاں اور دوسرے رشتہ دار۔ یہ ایک زندہ مثال تھی اور یہ اس کرۃ الارض پر واقع ہوئی کہ لوگوں نے صرف عقائد کی خاطر سب کو چھوڑ دیا۔ ان کے دلوں پر عقیدہ چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ ان کے دل میں اس عقیدے اور نظریہ کے سوا کوئی چیز باقی ہی نہ رہی۔ ان کی شخصیت مجتمع ہو گئی۔

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ (۳۳: ۴) ”اللہ نے کسی انسان کے دھڑ میں دو دل نہیں بنائے۔“ اسی طرح مدینہ میں بھی ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ بعض خاندانوں کے افراد اسلام میں داخل ہو گئے اور دوسرے لوگ شرک کرتے رہے۔ دونوں کے درمیان تعلقات کٹ گئے۔ فرض خاندانی روابط کے اندر ایک بھونچال سا آگیا اور اجتماعی نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اسلامی معاشرہ نوزائیدہ تھا۔ اور اسلامی مملکت ابھی مستحکم نہ تھی۔ یہ دراصل ابھی تک ایک مجوزہ نظام ہی تھا جس کا زیادہ حصہ تصورات ہی میں تھا۔ ابھی تک اس کے مستحکم ادارے تشکیل نہ پائے تھے۔

فرض مدینہ میں ایک نظریاتی طوفان اٹھا۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کا طوفان تھا۔ اس نے تمام جذبات، تمام رسم و رواج اور تمام روابط اور تعلقات کو ختم کر دیا اور اس نئی سوسائٹی کے اندر صرف اسلامی رابطہ باقی رہ گیا۔ تمام دل عقیدہ اسلامی پر جمع تھے، خاندان، نسب، قبیلہ، دوستی اور قومی تعلقات نظریاتی لہروں کے نیچے دب گئے اور یہ نئی اکائیاں جو اسلامی سوسائٹی میں جمع ہو چکی تھیں باہم مل گئیں۔ ایک نئی سوسائٹی وجود میں آگئی اور اسلامی اخوت پر لوگ جمع ہو گئے۔ یہ لوگ اسلامی اخوت پر کسی قانون یا حکم کے ذریعہ جمع نہ ہو گئے تھے بلکہ اسلامی نظریہ حیات نے ان کے اندر ایک زبردست اتحادی شعور پیدا کر دیا تھا۔ یہ شعور اس قدر پختہ تھا کہ انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ فرض اس طرح ایک بہت بڑا خاندان وجود میں آگیا۔ ایک جماعت وجود میں آگئی۔ اس قسم کا خاندان نہ حکومت کی اسس پر قائم ہو سکتا تھا، نہ معاشرتی حالات اسے پیدا کر سکتے تھے۔ بہر حال یہ اخوت اسلامی تھی، ایک اندرونی شعور تھا۔

مہاجرین انصار بھائیوں کے ہاں آکر اترے۔ جنہوں نے ان کے لیے مدینہ کو خوب سنبھالا۔ استقبال کیا۔ ان کو اپنے دلوں اور گھروں میں آکر اور آنکھوں پر بٹھایا۔ انہوں نے ان کو اپنے مالوں میں شریک کیا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر ان کو پناہ دی۔ اس قدر مقابلہ ہوا کہ کوئی مہاجر کسی انصاری کے ہاں صرف قرعہ اندازی کے ذریعے جا سکتا تھا۔ کیونکہ مہاجرین کم تھے اور انصار زیادہ تھے جو پناہ دینا چاہتے تھے۔ یہ پناہ نہایت اعتماد اور شوق سے دی گئی۔ حقیقی خوشی اور دلی مسرت کے ساتھ دی گئی۔ یہ پناہ ہر قسم کے فطری بخل اور تکبر اور نمائش سے پاک تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کی۔ یہ نظام نظریاتی سوسائٹیوں کی تاریخ میں ایک بے مثال نظام تھا۔ یہ برادری باقاعدہ خون کی برادری کے قائم مقام ہو گئی۔ چنانچہ اس نظام کے تحت لوگ ایک دوسرے کے وارث بھی ہوئے اور اجتماعی تکافل کے دوسرے فرائض و واجبات بھی ادا کرتے رہے۔ مثلاً ویت وغیرہ۔

یہ شعوری اتحاد نہایت بند مقام تک جا پہنچا اور مسلمانوں نے بڑی سنجیدگی سے ان تعلقات کو مستحکم کیا۔ اسی طرح وہ بھائی بن گئے جس طرح اسلام کے دوسرے احکام انہوں نے قبول کیے۔ چنانچہ یہ سوسائٹی ایک مستحکم حکومت کی شکل اختیار

کر گئی ہے اور مواخات کے اصول باقاعدہ حکومتی ادارہ 'ایک قانونی نظام اور ایک مستقل صورت حال اختیار کر گئے۔ بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہو گئیں۔ اس نئی جماعت اور سوسائٹی کو کسی دھچکے سے بچانا بھی ضروری تھا۔ یہ نظام جو مستقل شکل اختیار کر رہا تھا اللہ کے منشاء کے مطابق ایک عارضی انتظام تھا۔

جس جماعت کو بھی ایسے حالات کا سامنا ہو جیسا کہ مدینہ کی اسلامی جماعت کو تھا، اس کے لیے اس قسم کا شعور پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ اس شعور کے تحت ایک مستقل سوسائٹی اور حکومت وجود میں آجائے۔ ایک قانونی نظام ہو اور مسلم ادارے ہوں تاکہ غیر معمولی حالات میں ایسی جماعت کو درپیش مسئلے حل کیے جاسکیں اور اس طرح جماعتی زندگی کو ترقی دی جاسکے۔ یہ کام اس وقت تک ہوتا رہے جب تک حالات معمول پر نہیں آجاتے۔

اسلام اگرچہ اس قسم کے شعور کو ہر وقت زندہ رکھنا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اس قسم کی اخوت اور ایثار کے فوارے اسلامی سوسائٹی کے اندر پھونٹے ہی رہیں۔ ان سے محبت اور قوت کے چشمے جاری رہیں لیکن اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ سوسائٹی کا ارتقاء طبعی حالات کے مطابق ہو اور اجتماعییت کا نظام محض وقتی جذبات اور وقتی طوفان پر نہ ہو جن سے غیر معمولی حالات میں کام لیا جاتا ہے بلکہ سوسائٹی کو طبعی اور نارمل حالات پر استوار کیا جاتا رہے۔ اور معمول کے مطابق نظام چلتا رہے۔ حتیٰ کہ غیر ضروری اور استثنائی حالات ختم ہوں۔

جب غزوہ بدر کے بعد مدینہ میں حالات قدرے معمول پر آگئے، اسلامی حکومت مستحکم ہو گئی، اجتماعی حالات معمول کے مطابق مستحکم ہو گئے اور لوگوں کے لیے روزگار کا انتظام ہو گیا۔ اسلامی لشکروں نے جو چھوٹی موٹی لشکر کشیاں شروع کر دی تھیں، بدر کی جنگ کے بعد ان کی وجہ سے لوگوں کے مالی حالات درست ہو گئے، خصوصاً بنی نضیر کی جلا وطنی کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس کافی اموال جمع ہو گئے۔ جو نئی سوسائٹی کے اندر دوسرے ذرائع سے سوشل سیکورٹی کا انتظام ہو گیا قرآن کریم نے مواخات کے اس غیر معمولی نظام کو از روئے قانون ختم کرنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں لگائی اور اجتماعی کفالت کا نظام خاندانی اور نسب کے نظام کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ البتہ اسلام نے اسلامی اخوت اور مواخات کے پیچھے جو شعوری جذبہ تھا، اسے بہر حال بحال رکھا کہ اگر پھر اس قسم کے غیر معمولی حالات پیدا ہو جائیں تو دوبارہ یہ نظام قائم ہو سکے۔ اس طرح جماعت مسلمہ کے اندر اجتماعی کفالت کا نظام اپنی حقیقی حالت کی طرف لوٹا دیا گیا، غرض وراثت دیات میں مکافل خون اور نسب کی طرف لوٹا دیا گیا۔ جیسا کہ اللہ کی کتاب میں پہلے ہی یہ درج تھا

وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ

إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَٰكُمْ مَّعْرُوفًا كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا (۶:۳۳) "مگر کتاب اللہ کی رو سے عام مؤمنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہیں۔ یہ حکم کتاب الہی میں لکھا ہوا ہے۔"

فیصلہ کر دیا گیا کہ رسول اللہ ولی عام ہیں اور یہ وہ ولایت ہے جو رشتہ داری بلکہ اپنے نفوس پر بھی مقدم ہے۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ (۶:۳۳) "نبی مؤمنین کے لیے ان کے نفسوں سے بھی

مقدم ہے۔ اور یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا کہ ازواج مطہرات روحانی مائیں ہیں۔

وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ (۳۳: ۶) ”آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت عام ولایت ہے، آپ کو اختیارات حاصل تھے کہ آپ امت مسلمہ کو زندگی کا پورا نظام دے دیں۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ رسول اللہ پر درود و سلام بھیجیں اور ان کے لیے کوئی راہ اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ان امور کو اپنائیں جو ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کر لیے۔

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هُوَ أَوْ لِمَا جِئْتُ بِهِ ”تم میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشات ان احکام کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لے کر آیا ہوں۔“

اس میں مسلمانوں کا شعور بھی شامل ہے، لہذا ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہونی چاہئے۔ اپنی جان سے بھی وہ بمقابلہ رسول زیادہ محبت نہیں کر سکتے۔ ان کے دلوں میں کوئی ذات یا کوئی چیز ذات رسول سے مقدم نہ ہونی چاہئے۔ حدیث صحیح میں ہے۔

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحْسَبَ إِلَيْهِ مِنْ نَفْسِهِ وَمَالِهِ

وولده والناس اجمعين ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اس کے نزدیک اس کے نفس اس کے مال اور اس کی اولاد بلکہ تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ صحیح حدیث میں ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ میں نے کہا حضور، آپ میرے نفس کے سوا مجھے دنیا کی تمام چیزوں سے عزیز ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں اے عمر، یہاں تک کہ میں آپ کے لیے تمہاری جان سے بھی محبوب نہ ہو جاؤں۔“ اس پر اس نے کہا رسول خدا، خدا کی قسم بے شک آپ مجھے تمام چیزوں سے محبوب ہیں یہاں تک میرے نفس سے بھی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا ”اب لے عمر۔“ یہ صرف باتیں ہی نہ تھیں۔ یہ ایک بلند معیار تھا جس تک اسلامی سوسائٹی پہنچی ہوئی تھی اور اس تک کوئی دس تب ہی پہنچ سکتا ہے جب تک کسی دل کو عالم بالا کی جانب سے مساس حاصل نہ ہو جائے اور وہ اپنی نظریں اتنی بلند تک اونچی نہ کر دے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ذات کی کشش اور اس کی گہری محبت بھی رسول اللہؐ کے لیے ہو جاتی ہے۔ انسان اپنی ذات اور اپنی ذات کے تعلقات سے ناقابل تصور محبت کرتا ہے۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے جذبات اور احساسات پر قابو پالیا ہے۔ اپنے نفس کو رام کر لیا ہے اور حب ذات کی بلندیوں سے وہ اتر آیا ہے لیکن جب اس کی ذات اور اس کے مفادات پر زبردستی ہے تو وہ یوں اچھل پڑتا ہے جیسا کہ اسے سانپ نے دس لیا ہے۔ وہ اس جھین کو اس طرح محسوس کرتا ہے کہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ اگر برداشت کر بھی لے تو یہ درد اس کے شعور میں بیٹھ جاتا ہے اور اس کی گہرائیوں میں گھر کر لیتا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنی پوری زندگی بھی قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن اپنی ذاتی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ نہ وہ کوئی ایسا عیب برداشت کر سکتا ہے جو اس کی ذات و صفات کی طرف منسوب کیا جائے اگرچہ کوئی بظاہر یہ ظاہر کرے کہ

وہ ان باتوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا، یا ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ غرض اپنی ذات پر قابو پانا اور اپنی ذات سے بھی حضور اکرمؐ اور اپنے نظریہ کو زیادہ اہمیت دینا، محض زبانی بات نہیں ہے کہ کوئی آسانی سے کہہ دے۔ یہ ایک ایسا مقام بلند ہے جس تک عالم بالا کے مساس کے بغیر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے طویل جدوجہد، طویل مشق اور دائمی بیداری اور عقلماندہ خواہش کی ضرورت ہے جس کے ساتھ اللہ کی خاص مدد شامل حال رہے۔ یہ ہے عظیم جہاد۔ جیسا کہ اسے رسول اللہؐ نے جہاد اکبر کہا اور یہ وہ مقام ہے کہ حضرت مرثیٰ جیسی شخصیت کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تنبیہ اور نصیحت کی ضرورت پڑ گئی۔ یہ ان کے قلب صافی کی ایک چٹکی تھی جس کے نتیجے میں حضرت مرثیٰ اس مقام بلند تک پہنچ گئے اور ایک سیکنڈ میں۔ ولایت عامہ میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے امت کے افراد پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ حدیث صحیح میں ہے ”جو بھی مومن ہیں میں ان کے لیے تمام لوگوں سے محبوب ہوں، دنیا اور آخرت دونوں میں، اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔“

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ (۶:۳۳) ”نبی مومنین کے لیے ان کے نفسوں سے بھی مقدم ہے۔“ اس لیے جس مومن نے مال چھوڑا تو یہ اس کے نصبت کو ملے گا جو بھی ہوں اور اگر اس پر قرض ہو یا کوئی نادران ہو تو وہ میرے پاس آئے، میں اس کا دالی ہوں۔“۔ معنی یہ ہے کہ اگر مومن مر جائے اور اس کی میراث میں مال نہ ہو جس سے اس کا قرضہ ادا کر دیا جائے تو میں اس کا قرض ادا کروں گا اور اگر اس کے عیال ہوں تو میں ان کی پرورش کروں گا، اگر چھوٹے ہوں۔ اس کے علاوہ عام حالات میں، عام لوگوں کی زندگی طبعی حالات کے مطابق اپنی جدوجہد کے مطابق گزرے گی، اس کے لیے اس قسم کے غیر معمولی جوش و خروش پیدا کرنے کی ضرورت نہیں جو غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے۔ اگرچہ نظام مواخات قانونی اعتبار سے تو قسٹ کر دیا گیا مگر اخلاقی دائرے میں موجود رہا۔ لہذا اگر کوئی دوست اپنے دوست کے لیے کوئی وصیت کرنا چاہے تو اسے ٹکٹ مال تک وصیت کی اجازت ہے۔

أَلَا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَيَّ أَوَّلِيَّتِكُمْ مَعْرُوفًا (۶:۳۳) ”الایہ کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ کوئی احسان کرنا چاہو۔“

ان تمام اقدامات کو مضبوطی سے اس کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا ارادہ اور مشیت ہے اور كَانَ ذَلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا (۶:۳۳) ”یہ قانون کتاب میں لکھا ہوا تھا۔“ لہذا دل مطمئن رہیں اور اس اصل کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں جس کی طرف تمام قوانین لوٹتے ہیں۔

یوں اب لوگوں کی معاشی زندگی اپنے قدرتی اصولوں پر استوار ہو جاتی ہے اور نہایت ہی سنجیدگی اور اطمینان سے چلتی ہے۔ اور اس کو ایسے معیار پر نہیں رکھا گیا جو غیر معمولی حالات میں قائم کیے جاسکتے ہیں۔ محدود جماعتوں اور محدود افراد کے اندر۔

لیکن اسلام اس فیاض سرچشمے کو بند بھی نہیں کرتا تا کہ اگر مستقبل میں اسلامی جماعت کو کسی استثنائی حالت میں ضرورت پڑے تو وہ اس جذبہ کو کام میں لائے یعنی ہنگامی حالات میں۔

اس بات کی مناسبت سے کہ یہ سب کچھ پہلے ہی کتاب میں لکھا ہوا تھا اور اللہ کی مشیت نے طے کر دیا تھا کہ وہ باقی

رہنے والا دائمی قانون بن جائے اور مسلسل طریقہ کار ہو۔ اس حوالے سے نبیوں کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ خصوصاً اولوالعزم نبیوں سے کہ وہ اسلامی نظام کے قیام کی ذمہ داری قبول کریں اور اس تحریک پر جیسے رہیں لوگوں کے اندر تبلیغ و تحریک کا کام جاری رکھیں اور ان اقوام میں اس دعوت کو جاری رکھیں جن کی طرف ان کو بھیجا گیا ہے تاکہ یہ بات لوگوں کے خلاف جھٹ ہو کہ ان تک پیغام پہنچا تھا اور وہ اپنی ضلالت و ہدایات کے ذمہ دار ہیں کفر اور ایمان کے ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ پیغمبروں کی تبلیغ کے بعد تو جنت تمام ہو جاتی ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَابْرَاهِيمَ

وَمُوسَى وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا لِّيَسْأَلَ

الصَّادِقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا أَلِيمًا

۱۷

اور (اے نبیؐ) یاد رکھو اس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے تم سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔ سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔ تاکہ سچے لوگوں سے (ان کا رب) ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے اور کافروں کے لیے تو اس نے دردناک عذاب مہیا کر ہی رکھا ہے۔
یہ وعدہ نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل لیا گیا۔ یہ واحد میثاق و لا نظام ہے اور یہ واحد امانت ہے۔ ہر نبی اپنے ماقبل سے لیتا رہا اور آنے والے کو دیتا رہا۔

ابتداء میں تمام نبیوں کے بارے میں کہا گیا کہ ہم نے ان سے میثاق لیا اور اس کے بعد قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی طور پر تھا (وَمِنْكَ) کیونکہ آپ خاتم النبیین ہیں اور آپ کی دعوت عالمی ہے۔ اس کے بعد اولوالعزم رسولوں کے نام گنوائے 'نوح' 'ابراہیم' 'موسیٰ' اور عیسیٰ علیہم السلام کا ذکر ہوا۔

اسحاب میثاق کے ذکر کے بعد اب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عہد تھا کیا اور کیا تھا تو وہ بہت پختہ عہد تھا بہت بھاری عہد تھا۔

مِيثَاقًا غَلِيظًا (۷:۳۳) پختہ عہد۔ اس میں غلط میثاق کے لغوی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ لغت میں میثاق معنی ہوئی رسی کو کہتے ہیں۔ استعارہ کے طور پر عہد کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس لفظ کے استعمال سے ایک معنوی مفہوم کو مجسم کر کے دکھانا مطلوب ہے تاکہ انسانی شعور بھی طرح سمجھ لے کہ یہ کوئی پختہ اور ہم عہد تھا جو اس قدر بڑے بڑے پیغمبروں سے لیا گیا کہ وہ وحی وصول کریں اس کی تبلیغ کریں اور اس کے مطابق اسلامی نظام قائم کریں اور نہایت امانت اور استقامت کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں برداشت کریں۔

لِّيَسْأَلَ الصَّادِقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ (۸:۳۳) تاکہ اللہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں

سوال کرے۔ اور صادق نکل ایمان ہیں کیونکہ انہوں نے سچ کہا اور سچے عقیدے کو قبول کیا۔ ان کے سوا تمام دوسرے لوگ جھوٹے ہیں کیونکہ ان کے عقائد باطل ہیں اور ان کی باتیں باطل ہیں۔ لہذا تعبیر کا خاص مفہوم ہے۔ بچوں سے سوال ایسا ہی ہو گا جس طرح ایک لائق شاگرد سے استاد لوگوں کے سامنے مجلس یا تقریب میں یہ پوچھتا ہے کہ تم نے کتنے نمبر لیے اور کیسے جوابات دیے اور یوں کامیابی حاصل کی۔ یہ سوال ان کی عزت افزائی کے لیے اعلانیہ تمام لوگوں کے سامنے ہو گا تاکہ تمام سننے والے بھی ان کی تعریف کریں۔ اسی طرح یوم المشرق میں اللہ صادقین سے سوال ان کی تکریم کے لیے کرے گا۔

اب دوسرے لوگ جنہوں نے باطل نظریات اپنائے اور جنہوں نے جھوٹے بول بولے حالانکہ ان کے سامنے اس کائنات کا بہت بڑا مسئلہ پیش کیا گیا تھا جس میں یا انہوں نے سچا کہہ کرنا تھا یا جھوٹا، ان سے سوال ہو گا اور ان کے لیے سزا بھی حاضر ہوگی اور وہ تیار کھڑی ہوگی۔

وَ اَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا اَلِيْمًا (۸:۳۳) ”اور کافروں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔“



درس نمبر ۱۸۹ ایک نظر میں

جنگہ حیات اور حادثات کے میدان کارزار میں اسلامی شخصیت کی تشکیل ہو رہی تھی۔ ہر نئے دن کے طلوع ہونے کے بعد اور ہر نئے حادثے کے بعد یہ شخصیت واضح ہوتی جاتی تھی۔ اس کے خدوخال کھر کر سامنے آتے تھے۔ جماعت مسلمہ ان شخصیات سے تشکیل پا رہی تھی جن کی خاص صلاحیتیں تھیں۔ ان کی خاص اقدار حیات تھیں اور تمام دوسری سوسائٹیوں سے اس کا رنگ و رنگ بالکل مختلف تھا۔

اس جماعت کے خلاف روز کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آتا اور یہ واقعات جماعت کے لیے یزاققہ بن جاتے اور یہ فتنہ اس طرح ہوتا تھا جس طرح سونے کا ”فتنہ“ ہوتا ہے۔ اس فتنے سے اصلی جو ہر اور کھوٹ علیحدہ ہو جاتے تھے، انسانوں کی حقیقت اور ان کا اصل جو ہر سامنے آ جاتا تھا۔ جھاگ دور ہو جاتی تھی اور خالص سونا جدا ہو جاتا تھا۔ یوں اسلامی سوسائٹی سے لہی قدریں ختم ہو جاتی تھیں جن میں ملاوٹ ہوتی تھی۔

ان ابتلاؤں میں قرآن کریم نازل ہوتا تھا یا واقعات و حادثات کے بعد ان پر تہرہ ہوتا تھا۔ اس تہرے میں واقعات بتائے جاتے، ان پر روشنی ڈالی جاتی اور ان کے خیب و فراز بتائے جاتے۔ یوں ہر ایک کا موقف سامنے آتا۔ ضمیر و شعور اور نیت و ارادے کی اصلاح ہوتی اور ان واقعات کی روشنی میں لوگوں کو ہدایات دی جاتیں اور وہ ہدایات اچھی طرح ان کی سمجھ میں آ جاتیں لوگ ان ہدایات سے اچھی طرح متاثر ہوتے اور اپنی اصلاح کرتے۔ یوں اسلامی جماعت کی تربیت ہر دن کے بعد ہوتی رہتی اور ہر حادثے کے بعد اسے ہدایات ملتی رہتیں۔ اسلامی نظام حیات کے اہداف کے مطابق اس جماعت مسلمہ کی شخصیت بنتی اور وہ ان تہروں سے تاثرات لیتے۔

یوں نہیں ہوا کہ تمام احکام اور ہدایات ایک ہی بار نازل کر کے مسلمانوں کے سامنے رکھ دیئے گئے ہوں اور پھر یہ کہا گیا ہو کہ جاؤ ان پر عمل کرو۔ بلکہ یہ ہدایات اور یہ قوانین واقعات کے بعد نازل ہوتے رہے، آزمائشیں آتیں، فتنے آتے اور واقعات پیش آتے، ادھر سے وحی آ جاتی کیونکہ اللہ خالق کریم کو یہ علم تھا کہ انسانی اخلاق کو صرف حد درجہ ہی کے ساتھ اچھی طرح نئے سانچے میں ڈھالا اور اچھی طرح پختہ کیا جاسکتا ہے۔ انسانی اخلاق کی نوک پلک صرف آزمائشوں اور واقعات و حادثات کی شکل میں درست کی جاسکتی ہے۔ یعنی واقعاتی تجربات کی صورت میں۔ کیونکہ عملی تجربات کے نتیجے میں بات دلوں کی نہ تک اتر جاتی ہے اور اعصاب بھی اس کے مطابق حرکت کرنے لگتے ہیں۔ یہ اعصاب پھر اس طرح جدید رد عمل بنا کر کرتے ہیں جس طرح معرکہ کارزار میں یا واقعات اور حادثات میں انسان کا فطری رد عمل ہوتا ہے۔ ایسے واقعات میں جب قرآن نازل ہوتا تو وہ تادینا کہ یہ واقعہ کیا ہے۔ اس کے پیچھے کیا عوامل ہیں اور اس میں ایک مسلمان کا اسلامی رد عمل کیا ہونا چاہئے۔ اس طرح اسلامی شخصیت آزمائشوں کی بھٹی سے صاف و ستھری ہو کر نکل آتی، کھر آتی، آزمائش کی تپش اس کے اخلاقی جسم سے ہر قسم کا کھوٹ نکال کر رکھ دیتی اور اب اسلام جس سانچے میں چاہتا، ان شخصیات کو ڈھال لیتا۔

یہ ایک عجیب دور تھا جو مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں گزاری۔ اس میں آسمانوں و زمین کے قلابے ملے ہوئے تھے۔ آسمان سے نکل زمین کا براہ راست رابطہ تھا۔ تمام واقعات اور تمام مکالمات میں آسمان سے ہدایت آ جاتی۔ ہر مسلمان رات اور دن یوں زندگی بسر کر رہا تھا کہ اللہ دیکھ رہا ہے سن رہا ہے۔ ابھی کوئی ہدایت یا تبصرہ نہ آ جائے۔ اس کا کوئی کلمہ، اس کی کوئی حرکت بلکہ اس کا کوئی ارادہ نزول وحی کا سبب نہ بن جائے۔ لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہو جائے، رسول اللہ کے پاس سے اس کے بارے میں کوئی تبصرہ نہ آجائے۔ گویا ہر مسلمان محسوس کرتا تھا کہ وہ رب تعالیٰ کے ساتھ براہ راست منسلک ہے۔ اگر اسے کوئی معاملہ درپیش ہوتا یا کوئی مشکل درپیش ہوتی تو وہ انتظار کرتا کہ اس کے بارے میں کوئی فتویٰ، کوئی ہدایت، کوئی فیصلہ آسمان سے آجائے اور اللہ بتا دے بذلت خود، اے فلاں تم نے یہ کیا، تم نے یوں کیا، تم نے یوں سوچا۔ یہ ظاہر کیا اور یہ چھپایا، یوں کرو، یوں نہ کرو، اور ایسا طرز عمل اختیار نہ کرو۔ یہ ایک عجیب دور تھا کہ اللہ کا ایک متعین حکم کسی متعین شخص کے بارے میں آ پہنچتا۔ اور یہ حکم پھر اس کے لیے بھی ہوتا اور تمام نکل زمین سے لیے بھی ہوتا۔ زمین کے ذرے ذرے کے لیے ہوتا۔ پوری زمین کے لیے ہی ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عجیب دور تھا۔ آج جب انسان اس کے بارے میں سوچتا ہے اس کے واقعات اور حادثات کو دہراتا ہے، پڑھتا ہے، پڑھاتا ہے تو وہ اچھی طرح ایک نقشہ ذہن میں لا سکتا ہے، ایک منظر دیکھ سکتا ہے کہ کس قدر عجیب دور تھا یہ۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تربیت صرف اس شعور کے ذریعہ ہی نہیں کی کہ ان کی شخصیت کو پختہ کر دیا جائے بلکہ ان کو عملی تجربوں سے گزارا گیا۔ ان کو آزمائشوں میں مبتلا کیا گیا جس میں ان کا نقصان بھی ہوا لیکن فائدے بہت ہوئے اور یہ سب امور اللہ کی مہر کی حکمتوں کے مطابق سرانجام پاتے، کیونکہ اللہ علیم وخبیر ہے اور وہ اپنی مخلوق کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔

یہ حکمت کیا تھی؟ ہمیں اس پر ذرا طویل غور و فکر کرنا چاہئے مگر ہم اسے معلوم کر لیں، پھر اس پر مدبر کس۔ اور پھر ہم زندگی کے واقعات، آزمائشوں پر اس کی روشنی میں غور کریں۔

--- ○ ○ ○ ---

اس سبق میں تحریک اسلامی کو پیش آنے والے ایک بڑے واقعہ کی تشریح کی گئی ہے۔ اور اسلامی تاریخ کے اس واقعہ میں جماعت مسلمہ کے لیے ایک بڑی آزمائش تھی اور یہ وقت امت مسلمہ پر بہت برا وقت تھا۔ بڑی مشکل دور سے تحریک گزر رہی تھی۔ یعنی غزوہ احزاب کا دور۔ یہ جنگ ہجرت کے پانچویں یا چوتھے سال میں پیش آئی۔ یہ اس نئی اٹھنے والی تحریک کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ تحریک اسلامی کی تمام اقدار اور تمام نظریات داؤ پر تھے۔ ان آیات پر غور کرنے سے، غزوہ احزاب کے واقعہ کے پیش کرنے سے، اس کے اسلوب بیان سے، بعض واقعات پر تبصرے سے، بعض لوگوں کی حرکتوں سے، بعض افراد کی سوچ سے، اور بعض لوگوں کے خدشات سے اور پھر اس جنگ میں سامنے آنے والی اقدار سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے ذریعہ امت مسلمہ کی تربیت کس خوش اسلوبی سے فرما رہے تھے۔

جنگ احزاب جیسے اہم واقعہ پر قرآن کریم کس انداز سے تبصرے کرتا ہے اور امت کو کس انداز سے ہدایات دیتا ہے۔ قرآنی نصوص کی تشریح سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ اس واقعہ کی پوری تفصیل ذرا اختصار سے کتب سیرۃ سے نقل کر دی

جائے۔ اس سے ہم تقابلی مطالعہ کر سکیں گے کہ انسان واقعات کو کس طرح بیان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے تبصرہ کیسے ہوتا ہے۔

محمد بن اسحاق نے اپنی سند کے ساتھ ایک جماعت سے نقل کیا ہے.... جنگ خندق کے واقعات میں یہ ہے کہ کچھ یہودی جن میں سے سلام بن ابوالحقین نضری، یحییٰ بن اخطب نضری، کنانہ بن ابوالحقین نضری، ہودہ بن قیس واکلی اور ابوعماد واکلی تھے اور ان کے ساتھ کچھ لوگ بنو نضیر، کچھ لوگ بنی دہل کے بھی تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ کے خلاف فکرمجمع کیے۔ یہ سب سے پہلے گھروں سے نکلے، قریش سے ملے اور ان کو دعوت دی کہ رسول خدا کے خلاف جنگ کریں اور انہوں نے کہا کہ ہم تمہارا ساتھ اس وقت تک دیں گے جب تک اس کو بنیاد سے نہ اکھاڑ دیں۔ قریش نے کہا، اے ملت یہود، تم لوگ پہلی کتاب کے حامین ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کیا اختلاف ہے، تم لوگ بتاؤ کہ اس کا دین اچھا ہے یا ہمارا۔ تو انہوں نے کہا اس کے دین سے تمہارا دین سچا ہے اور اس کے مقابلے میں تم زیادہ برحق ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ آیات اتیں:

الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيحًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْحَبِثِ وَالطَّاغُوتِ

وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا أَهْلًا ؕ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا (۵۱۰۴) ”کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جیت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان ماننے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔“۔ یہاں سے لے کر آیت

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَ

الْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا (۵۴) ”فَمِنْهُمْ مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ وَكَفَىٰ

بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا“ (۵۵) (۵۴: ۵۵-۵۵) ”پھر کیا یہ رد سرور سے اس لیے جدا کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا۔ مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان مانے اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا اور منہ موڑنے والوں کے لیے تو جہنم کی جھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔“۔

جب انہوں نے قریش کو یہ فتویٰ دیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور جوش میں آگئے اور رسول اللہ کے خلاف لڑنے کی حامی بھری۔ یہ لوگ اب قریش کو چھوڑ کر غطفان کے پاس گئے، جو قیس غیلان کی نسل سے ہیں۔ انہوں نے ان کو بھی دعوت دی کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑیں انہوں نے ان کو بتایا کہ یہ خود بھی ساتھ دیں گے اور قریش بھی ساتھ دیں گے۔ لہذا تم لوگ قریش کے ساتھ میٹنگ کرو۔

چنانچہ قریش کا یہ لشکر ابوسفیان بن حرب کی سربراہی میں، غطفان اپنے سردار عیصہ بن حسن بن نضیر کے ساتھ اور حارث بن عوف بن مردہ کے ساتھ اور مسر بن امیہ اپنے حشین بن الشجع کے ساتھ نکلے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شکر کشی کی اطلاعات ملیں تو آپؐ نے مدینہ کے ارد گرد خندق کھودنا شروع کر دی۔ خندق کھودنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کام کیا اور مسلمانوں نے بھی کام کیا۔ آپؐ نے بھی جانفشانی سے کام کیا اور مسلمانوں نے بھی سخت جانفشانی سے کام کیا۔ اس کام میں رسول اللہؐ اور مسلمانوں کے مقابلے میں بعض منافقین نے نہایت ست روی سے کام لیا۔ وہ بہت چھوٹے موٹے کاموں میں لگ جاتے اور بغیر اذن رسولؐ کے کھٹک جاتے۔ وہ گھروں کو چلے جاتے اور رسول اللہؐ کو علم بھی نہ ہوتا۔ اور مسلمانوں کی روش یہ ہوتی کہ اگر کسی کا کوئی ضروری کام پیش آتا تو وہ رسول اللہؐ سے اجازت لے کر چلا جاتا اور کام کر کے جلدی سے واپس آ جاتا۔ اور نہایت ہی ذوق و شوق سے کام کرتا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهُ عَلٰی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاۡئِهِمْ فَاَذْنِ لِمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

رحیم (۶۲: ۲۴) ”مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔ اے نبیؐ جو لوگ تجھ سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسولؐ کے ماننے والے ہیں۔ پس وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں تو جسے چاہو اجازت دے دیا کرو۔ اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔“ اس کے بعد اللہ نے ان لوگوں کے بارے میں کہا جو بغیر اجازت کے کھٹک جاتے تھے اور کام چوری کرتے تھے۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَاۡءَ الرُّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاۡءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لُوَاۡذَا فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖ اِنَّ تَصِيْبِهِمْ فِتْنَةٌ اَوْ يَصِيْبِهِمْ

عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۶۳: ۲۴) ”مسلمانوں! اپنے درمیان رسولؐ کے بلائے کو آپس میں ایک دوسرے کا سبب نہ سمجھ بیٹھو۔ اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لے کر چپکے سے کھٹک جاتے ہیں۔ رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے۔“

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق سے فارغ ہوئے تو قریش حبشیوں کننہ اور تمامہ کا ایک بڑا لشکر حرا پر لے کر پہنچ گئے۔ یہ مقام رومہ کے مجمع اسیل پر اترے اور عطفان اور ان کے تابع دو سرے کچھ قبائل احد کے پاس ذنب نقی پر اترے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان تین ہزار کی تعداد میں تھے۔ اس دن سری پشت کوہ سلح کی طرف

تھی۔ یہ لشکر یہاں اترا اور احزاب اور مسلمانوں کے لشکر کے درمیان خندق تھی۔ بچوں اور عورتوں کو حکم دیا کہ وہ قلعہ بند ہو جائیں۔

--- ○ ○ ○ ---

اللہ کا دشمن حبشی ابن اخطب لغزی کعب ابن اسد قرظی سے ملا۔ یہ صاحب تھے جنہوں نے بنی قریظہ کی طرف سے عہد کیا تھا اس نے اپنی قوم کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دہانی کر لئی تھی اور ان پر رسول اللہ سے عہد و پیمان کیا تھا۔ حبشی کعب ابن اسد سے چپکا رہا اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف آمادہ کرتا رہا۔ اسے دھوکہ دینے کے لیے بار بار چکر لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اس سے بھی وعدہ لے لیا کہ اگر قریش اور مہکن ولبس ہو گئے اور محمد پر حملہ آور نہ ہوئے تو میں تمہارے ساتھ تمہارے قلعہ میں رہوں گا تاکہ مجھے بھی وہ بات نہ پہنچ جائے جو تجھے پہنچے۔ ان یقین دہانیوں پر کعب ابن اسد نے حضور اکرمؐ سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دیا اور اس کے اور رسول اللہؐ کے درمیان جو عہد تھا اس سے براعت کا اظہار کر دیا۔

اس پر مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا اور خوف و ہراس پھیل گیا۔ اب اوپر سے بھی دشمن حملہ آور ہو گیا اور نیچے سے بھی۔ مسلمانوں نے ہر قسم کے خیالات دل میں دوڑانے شروع کر دیے۔ بعض منافقین کا نفاق بھی ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔ ایک شخص معتب ابن قیسر بنی عمر ابن عوف قبیلہ کے فرد سے یہ کہتے سنا گیا ”عہد تو ہم سے یہ وعدے کرتے تھے کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے کھائیں گے اور آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بے خوف ہو کر قضائے حاجت کے لیے نہیں جاسکتا“۔ اور قبیلہ بنی حارثہ کے ایک شخص اوس ابن قبیلی کہنے لگا ”حضور ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور یہ بات انہوں نے اپنی قوم کے سامنے کہی تو آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم لوگ اپنے گھروں کو چلے جائیں کیونکہ ہمارے گھر مدینہ سے باہر ہیں“۔

رسول اللہؐ بھی اٹے رہے اور مشرکین بھی تقریباً ایک ماہ تک پڑے رہے۔ جنگ صرف حمیروں اور محاصرے تک محدود رہی۔ جب لوگوں کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا تو حضورؐ نے ایک وفد عیسیٰ ابن صحن اور حارث ابن عوف کی طرف بھیجا۔ یہ دونوں غطفان کے لیڈر تھے۔ ان کو یہ پیش کش کی کہ ہم مدینہ کی کھجوروں کا ۲/۱ حصہ ادا کریں گے اس شرط پر کہ تم لوگ اپنے آدمیوں کو لے کر واپس ہو جاؤ۔ صلح کے مذاکرات ہوئے ایک معاہدے کا مسودہ بھی تیار ہو گیا۔ شہادت اور دستخط ابھی نہ ہوئے تھے جب حضورؐ نے دستخط کرنا چاہے تو آپ نے سعد ابن معاذ رئیس اوس اور سعد ابن عبادہ رئیس خزرج کو بلایا اور ان کے سامنے اس معاہدے کا تذکرہ کیا اور مشورہ طلب کیا۔ انہوں نے کہا حضور اکرمؐ اگر آپ اس معاہدے کو پسند کرتے ہیں تو آپ کی مرضی ہے، دستخط کر دیں۔ یا اگر اللہ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر۔ اور اگر یہ بات آپ ہمارے مفاد میں کرنا چاہتے ہیں تو ہائیں۔ حضورؐ نے فرمایا میں یہ صرف تمہاری خاطر کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو یہ اس لیے کر رہا ہوں کہ تمام عرب ایک ہی کمان سے تمہارے خلاف تیر اندازی کر رہے ہیں اور ہر طرف سے تمہارے لوہے ٹوٹ پڑے ہیں۔ تو میں نے سوچا کہ ان کی قوت میں کچھ کمی کر دوں۔ اس پر سعد ابن معاذ نے فرمایا ہم لوہے لوگ سب شرک پر تھے۔ اور بتوں کی بندگی کرتے تھے۔ نہ اللہ کی بندگی کرتے تھے اور نہ اللہ کو پہچانتے تھے۔ یہ لوگ ہم سے کھجور کا ایک دانہ بھی نہ لے سکتے تھے الا یہ کہ بیعہ خریدتے یا بطور مہمان نوازی کے ہم ان کو کھلاتے۔ اب جبکہ اللہ نے ہمیں

اسلام کے ذریعہ عزت بخشی ہے اور ہمیں ہدایت دی ہے اور آپ کے ذریعہ ہمیں اعزاز دیا ہے تو کیا اب ہم ان کو اپنا دس دے دیں۔ ہمیں اس رعایت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ تلوار کرے گی۔ تو حضورؐ نے فرمایا جو آپ کی مرضی ہو۔ سعد ابن معاذ نے وہ مسودہ لیا اور اس کے اندر جو کچھ لکھا تھا، مٹا دیا۔ اس نے کہا وہ ہمارے خلاف جو کچھ کرنا چاہیں کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان نہایت خوف اور شدت کی حالت میں رہے۔ کیونکہ دشمن نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا اور اس کی قوت زیادہ تھی۔ یہودیوں نے ان کے ساتھ معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ خیبر کی کھجوریں دیں گے۔ اگر وہ اس موقع پر ان کی لداؤں (تیزی)۔ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں حضورؐ کے ساتھ کئی شدت اور خوف کے مقامات پر رہی ہوں۔ غزوہ مریج، خیبر، حدیبیہ، فتح مکہ، حنین۔ ان میں سے کسی جگہ حضورؐ نے تھکاوٹ محسوس نہیں کی۔ نہ زیادہ خائف ہوئے، جس قدر تھکاوٹ اور خوف خندق میں تھا۔ بنی قریظہ عورتوں اور بچوں کے قریب تھے۔ مدینہ میں ساری رات پہرہ ہوتا تھا۔ ہم مسلمانوں کا نعرہ بکیر صبح تک سنتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے خود بخود ان کو دلپس کر دیا۔

--- ۰۰۰ ---

ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ ایک شخص نعیم ابن مسعودؓ عامر غطفانی رسول اللہؐ کے پاس آیا۔ اس نے کہا رسول خداؐ میں مسلمان ہو چکا ہوں لیکن میری قوم کو میرے اسلام کا پتہ نہیں۔ آپ جو خدمت میرے سپرد کریں، اس وقت کر سکتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا ”ہم میں آپ واحد آدمی ہیں تو جس طرح ہو سکے، لوگوں کو ہمارے خلاف جنگ کرنے سے روک لیں کیونکہ جنگ ایک قسم کی چال ہوتی ہے۔ اس نے ایک ایسی کارروائی کی جس کی وجہ سے ان احزاب اور بنو قریظہ کے درمیان اتحاد ختم ہو گیا۔ اس کی تفصیلات کتب سیرت میں مفصلاً موجود ہیں۔ اللہ نے احزاب کے اندر بھی بددلی پیدا کر دی اور ایک ایسا طوفان باد و باران بھیج دیا کہ سردیوں کی شدید ٹھنڈی رات میں ان کے خیمے اکھڑ گئے، ان کی ہانڈیاں الٹ گئیں اور چولہے بجھ گئے۔۔۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کے اختلافات پہنچے، اور ان کی اجتماعیت ختم ہو گئی تو اس آخری رات کے حالات معلوم کرنے کے لیے حضورؐ نے حضرت حذیفہؓ ابن الیمان کو بھیجا۔

محمد ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ میرے سامنے زید ابن زیادؓ ابن محمد ابن کعب قرظی نے روایت کی ہے ”ایک کوئی باشندے نے حضرت حذیفہؓ ابن الیمان سے کہا: ابو عبد اللہ! تم نے رسول اللہؐ کو کیا کہا ہے اور آپ کے ساتھ محبت کی ہے۔ تو اس نے کہا ہاں بھتیجے، میں نے دیکھا اور محبت کی۔ تو پھر تم کیا کرتے تھے؟ خدا کی قسم ہم بہت جدوجہد کرتے تھے تو اس شخص نے کہا، خدا کی قسم اگر بس رسول اللہؐ کو پاتے تو اسے ہرگز زمین پر چلنے نہ دیتے۔ اور اپنی گردنوں پر انہیں اٹھائے رکھتے۔ اس پر حضرت حذیفہؓ نے فرمایا: بھتیجے ہم نے حضورؐ کے ساتھ جنگ خندق میں حصہ لیا۔ یوں ہوا کہ حضورؐ نے رات کے ایک حصے میں نماز پڑھی اور پھر ہماری جانب متوجہ ہوئے۔ کون ہے، ہر اٹھنے اور جا کر معلوم کرے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ پھر وہ دلپس آجائے۔ اس کے لیے رسول اللہؐ نے واپسی کی شرط لگائی۔ میں اللہ سے سوال کروں گا کہ وہ جنت میں میرا ساتھی ہو۔“ اس قدر شدید خوف تھا کہ کوئی نہ اٹھا۔ اس قدر شدید بھوک تھی کہ کسی میں تاب نہ تھی اور سردی بھی شدید تھی۔ جب کوئی نہ اٹھا تو مجھے رسول اللہؐ نے پکارا۔ جب حضورؐ ”اٹھ لیا تو میرے لیے اب کوئی چارہ کار نہ تھا۔ فرمایا ”حذیفہ جاؤ، ان لوگوں میں داخل ہو جاؤ“ دیکھو وہ کیا کرتے ہیں اور کوئی بات نہ کرو جب تک

ہمارے پاس نہ آ جاؤ۔“ حذیفہ کہتے ہیں میں گیا۔ لشکر کے اندر داخل ہو گیا۔ طوفان اور لٹھ کے لشکر ان کے ساتھ وہ کچھ کر رہے تھے جو کر رہے تھے۔ ہانڈیاں اپنی جگہ ٹھہرنہ سکتی تھیں۔ آگ سلک نہ سکتی تھی۔ ابو سفیان کھڑا ہوا، حکم دیا کہ ہر شخص اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے بارے میں تسلی کرے۔ میں نے پہلے ہی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھ لیا کون ہو؟ تو اس نے بتایا فلاں ابن فلاں۔ اس کے بعد ابو سفیان نے کمال لیل قریش اب یہاں مزید نہیں رہ سکتے۔ گھوڑے اور اونٹ ہلاک ہو گئے۔ بنو قریظہ نے ہمارے ساتھ وعدہ خلائی کر دی اور ان کی جانب سے ہمیں وہ جواب ملا جسے ہم ناپسند کرتے ہیں، طوفان اس قدر ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔ ہانڈیاں اپنی جگہ قرار نہیں پکڑتی، آگ نہیں جلتی، خیمے ٹکڑ ٹکڑ ہو گئے۔ لہذا کوچ کرو میں تو یہ گیا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ اپنے اونٹ کو اٹھایا۔ وہ تین ٹانگوں پر کھرا ہو گیا اور اس کا عقاب اس نے کھڑے کھڑے کھول۔ اگر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم نہ دیا ہوتا کہ کوئی بات نہ کر دجب تک میرے پاس نہ آ جاؤ تو میں ایک ہی تیر مار کر ابو سفیان کا کام تمام کر دیتا۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ میں جب واپس پہنچا تو دیکھا کہ حضورؐ کھڑے ہیں اور ایک ایسی چادر میں نماز پڑھ رہے ہیں جو لمبی تھی اور منقش تھی۔ یہ آپؐ کی ازواج میں سے کسی کی تھی۔ جب آپؐ نے مجھے دیکھا تو مجھے اپنے پاؤں کے نیچے چادر میں داخل کر لیا اور چادر کا ایک حصہ مجھ پر ڈال دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے رکوع کیا اور سجدہ کیا اور میں چادر ہی میں لیٹا رہا۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو میں نے آپؐ کو پوری اطلاع دی۔ اب غطفان نے جب سنا کہ قریش نے یہ کام کیا ہے تو وہ بھی اپنے علاقوں کی طرف واپس ہو گئے۔

قرآن کے ان نصوص میں اشخاص کے نام نہیں لیے گئے۔ بلکہ لوگوں کے نمونے دیئے گئے ہیں اور واقعات کی تفصیلات اور جزئیات بھی قرآن نے چھوڑ دی ہیں۔ قرآن نے وہ اقدار، وہ کردار اور وہ طرز عمل یہاں ریکارڈ کیے ہیں جو نمونہ ہیں اور ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ وہ کردار جو کسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہیں، جو کسی شخص کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جو حالات کے منہ جانے سے مٹ جاتے ہیں۔ وہ کردار اور وہ قدس یہاں درج کر دی ہیں جو آئندہ کی نسوں کے لیے نمونہ عبرت ہیں اور ہر گروہ کے لیے معیار مطلوب ہیں۔ قرآن کریم تمام واقعات اور حادثات کو اللہ کی تدبیر اور تقدیر کے ساتھ منسلک کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ دست قدرت کس کس مرحلے پر مسلمانوں کا معاون رہا۔ اس معرکے کے ہر مرحلے میں تدبیر الہی نے اپنا کام کیا اور قرآن نے ہر مرحلے کا تبصرہ پیش کیا۔

قرآن کریم نے یہ قصہ ان لوگوں کے سامنے دہرایا۔ جو اس کے اندر موجود تھے جو اس کے کردار تھے۔ لیکن قرآن کریم وہ اسباب بھی ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے جن کا انہیں علم نہ تھا۔ ان واقعات و حادثات کے وہ پہلو جو نظروں سے اوجھل تھے حالانکہ وہ اس کمائی کے کردار تھے۔ قرآن کریم نفس انسانی کے نشیب و فراز کو بھی کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ لوگوں کے ضمیر کے میلانات بتاتا ہے اور بتاتا ہے کہ لوگوں کے دلوں کے اندر کیا کیا غلبات پیدا ہو گئے تھے۔

ان باتوں کے علاوہ انداز بیان کی خوبصورتی، اس کا رعب اور شوکت کلام، بات کی قوت اور حرارت اور منافقین کے بارے میں مزاحیہ انداز، اور ان کے نفاق کے بیچ و تاب اور مسلمانوں کی شجاعت اور ایمان، صبر اور اللہ پر پورا بھروسہ، غرض یہ سب باتیں قرآن نہایت خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کرتا ہے۔

یہ نصوص قرآنی دراصل ہر پڑھنے والے کو عمل پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ صرف ان لوگوں کو آمادہ نہیں کرتیں جن

لوگوں نے یہ معرکے لڑے اور ان میں ان کا بنیادی کردار رہا اور انہوں نے سب کچھ دیکھا بلکہ زمانہ مابعد کے تمام ادوار اور معاشروں میں بھی یہ نصوص ابھارنے والی ہیں 'جب بھی تحریک اسلامی کو ایسے ہی حالات سے واسطہ پڑتا ہے جیسا کہ ان لوگوں کو پڑا اگرچہ بہت زمانہ گزر چکا ہو۔ اگر جدید ترین متنوع معاشروں میں بھی ایسے حالات پیش ہوں تو بینہ اسی طرح یہ نصوص ایک مومن کو متحرک رکھتی ہیں جس طرح قرون اول میں انہوں نے مسلمانوں کو متحرک رکھا۔

ان نصوص کو صحیح طرح وہی شخص سمجھ سکتا جس کے لیے ویسے ہی حالات درپیش ہوں جس طرح جنگ احزاب میں اس وقت کے مسلمانوں کو درپیش تھے۔ جب ایسے حالات ہوں پھر ان آیات سے ہدایات کے چشمے پھوٹتے ہیں اور اسلام کے لیے کام کرنے والوں کے دل ان کے معافی کے لیے کھل جاتے ہیں۔ اب قرآن کے جملات اور سطریں قوت اور اسطہ بن جاتی ہیں اور کارکن ویسے ہی معرکوں میں کود جاتا ہے۔ پھر یہ آیات زندہ 'بیدار' آگے بڑھنے والے لوگ پیدا کرتی ہیں اور یہ لوگ ایک حقیقی تحریک لے کر اٹھتے ہیں۔ قرآن کریم کی یہ نصوص عالم واقعہ میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

یاد رہے کہ قرآن کریم کھن حلاوت اور علمی مباحث کی کتاب نہیں ہے۔ یہ کام تو بہت ہو چکا 'یہ تو ایک زندگی ہے' اچھلتی آگے بڑھتی زندگی۔ یہ تو نئے نئے واقعات کے لیے نئی نئی ہدایات ہیں۔ جب بھی کوئی دل ان نصوص کو سمجھے ان کے ہمدرد ہو کر چلے 'ان پر لبیک کہے تو ان نصوص کے اندر پوشیدہ قوت کے سرچشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ یہ ہے اس کتاب کا راز کہ اس کے اندر انجید و قوت کے ذخائر ہیں۔

ایک انسان ایک آیت کو ہزار بار پڑھتا ہے 'پھر وہ ایسے موقف اور ایسے حادثے کا شکار ہوتا ہے اور جب وہ اسی آیت کو پڑھتا ہے تو یہ وہ آیت نہیں ہوتی۔ یہ بالکل ایک نئی آیت ہوتی ہے۔ یہ اسے وہ کچھ بتاتی ہے جو پہلے نہ بتاتی تھی۔ یا اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ یہ حیران کن سوالات کا جواب دینے لگتی ہے۔ یہ پیچیدہ مشکلات حل کر دیتی ہے۔ صاف صاف راستہ بتلاتی ہے۔ ایک سمت متعین کر دیتی ہے اور وہ اس دل کو اس معاملے میں عزم بالجزم میں تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے اور پڑھنے والے کو پورا پورا اطمینان ہو جاتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۱۸۹ تشریح آیات

۹۔۔۔ تا۔۔۔ ۲۷

قرآن کریم اس سورۃ کا آغاز یوں کرتا ہے کہ اے اللہ ایمان اس بات کو ذرا یاد کرو کہ یہ فکرم تمہارے خلاف جمع ہوئے اور ان کا ارادہ یہ تھا کہ ہمیں یغ وین سے نکال کر ہمیںک میں اللہ نے محض اپنے کرم سے اور اپنی خاص فوجوں کی مدد سے ان کو نامراد واپس کر دیا۔ چنانچہ پہلی ہی آیت میں واقعہ کاحراج اس کا آغاز اور اس کا انجام بتا دیا گیا۔ تفصیلات سے بھی پہلے تاکہ جس نکتے کو اللہ ان کے ذہن میں نشاۃنہا چاہتے ہیں وہ اچھی طرح بینہ جائے۔ وہ اس کو یاد کرسں اور ان کے ذہن میں یہ بات بینہ جائے کہ اللہ کا مشاء یہ ہے کہ تم اللہ رسول اور وحی کی اتباع کرو اس پر توکل کرو اور کافریں اور منافقین کی اطاعت نہ کرو اور یہ کہ اللہ کی دعوت اور اس کے نظام پر جو لوگ عمل کرتے ہیں اللہ ان کا حامی و مددگار ہوتا ہے بمقابلہ کافریں اور منافقین کے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اس نے تم پر کیا ہے۔ جب فکرم تم پر جمع آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آئی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔“

یوں اس اجمالی آغاز ہی میں معرکہ کا آغاز اور انجام قلم بند کر دیا گیا۔ اور وہ عناصر بھی بتا دیئے گئے جو اس معرکہ میں فیصلہ کن رہے۔ یعنی احزاب کا جمع ہو کر ٹوٹ پڑنا اور طوفان بادیاں اور دوسری خدائی الزلج کا آنا جو نظر نہ آئی تھیں اور اللہ کی نصرت جو اللہ کے علم و تدبیر پر مبنی تھیں اور وہ مسلسل مگر لپٹی کر رہا تھا۔
اب اس کے بعد تفصیلات :

إِذْ جَاءُوكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونًا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ

الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ۝ وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ۝ وَإِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا ۝ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ ۚ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ۝

”جب دشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے، جب خوف کے مارے آنکھیں پھرا گئیں، کیجیے منہ کو آگئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے، اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔

یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا، صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کیے تھے، وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ ”لے بڑب کے لوگو! تمہارے لیے اب نصر نے کا کوئی موقع نہیں ہے، پلٹ چلو۔“

جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ ”ہمارے گھر خطرے میں ہیں، حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے، دراصل وہ (مجازجگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔

یہ وہ ہولناک صورت حال ہے جس نے مدینہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہر شخص خوف اور کرب میں مبتلا تھا۔ اس صورت حال سے کوئی ایک شخص بھی غیر متاثر نہ تھا۔ قریش اور اس کے حوالی و موالی، بنی غطفان اور ان کے زیر اثر قبائل اور یہودیوں بنی قریظہ ہر طرف سے اٹھ آئے تھے، اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی۔ ایسے حالات تھے کہ ان کا خوف ایک دل اور دوسرے دل میں جدا نہ تھا۔ اختلاف جو تھا وہ رد عمل میں تھا۔ اللہ کے بارے میں یقین میں اختلاف تھا۔ طرز عمل، اقدار، اسباب کے تصور اور نتائج کے تصور میں اختلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایک ہمہ گیر آزمائش تھی اور اس نے مومنین اور منافقین میں بالکل جدائی کر دی۔

آج ہم جب اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اسی موقف میں کھڑے ہیں۔ وہی حالات ہیں، وہی تاثرات ہیں، وہی ظلمات ہیں، وہی حرکات ہیں اور ان نصوص کے شیشے کے اندر ہمیں اپنے چہرے صاف صاف نظر آتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں اور یہ منظر ہمیں صاف صاف نظر آتا ہے۔

اذْجَاءَ وَكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ (۳۳: ۱۰) ”جب دشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے۔“ اور اس کے بعد لوگوں پر اس موقف کے اثرات

وَإِذْ زَاغَتِ الْبَصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ (۳۳: ۱۰) ”جب خوف کے مارے آنکھیں پھرا گئیں اور کیجیے منہ کو آئے لگے۔“ یہ ایک نہایت ہی مکمل تصویر ہے اس شخص کی جو انتہائی غلی، خوف اور

کرب میں مبتلا ہو۔ اس تصویر میں چہرے کی حالت اور دلوں کی حرکت دونوں کو دکھایا گیا ہے۔

وَتَظُنُّونَ بِاللّٰهِ الظُّنُونَا (۳۳: ۱۰) ”اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔“
ان گمانوں کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ ان کو مجمل چھوڑ کر تمام حالات اضطراب، تمام غلط فہمیاں اور تمام برے احساسات کو اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مختلف دلوں میں غمن کی تفصیل مختلف ہوگی۔
اب ذرا اس خوفناک صورت حالات کو مزید کھولا جاتا ہے۔ اور اس کے خدو خال اور اس کی حرکات کو سامنے لایا جاتا ہے۔

هٰذَا لِكَيْ تُبْتَلٰی الْمُؤْمِنُونَ وَ زَلْزَلُوْا زَلْزَلًا شَدِيْدًا (۳۳: ۱۱) ”اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہمارے گئے۔“ وہ خوف جو نکل ایمان کو ہمارا ہے، لازم ہے کہ وہ بہت ہی شدید اور ہولناک ہوگا۔

محمد ابن مسلمہ وغیرہ نے روایت کی کہ خندق میں ہماری رات بھی دن ہوتا تھا جبکہ مشرکین نے اپنے لیے باری مقرر کر رکھی تھی۔ ایک دن ابوسفیان ابن حرب اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کے لیے آئے، ایک دن خالد ابن ولید اپنے ساتھیوں سمیت آئے اور ایک دن عمرو ابن عاص آئے، ایک دن ہبیرہ ابن ابوجہب آئے اور ایک دن عکرمہ ابن ابوجہل آئے اور ایک دن ضرارہ ابن اللہباب۔ یہاں تک کہ یہ مصیبت بہت بڑھ گئی اور لوگوں کے اندر شدید خوف پھیل گیا۔
مقریزی نے اپنی کتاب استماع الاسماع میں مسلمانوں کے حال کی تصویر کشی یوں کی ہے: ”مشرکین نے صبح کے تڑکے اچانک حملہ کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو تیار کیا۔ اس دن رات کے ایک حصے تک لڑائی رہی اور رسول اللہؐ اور مومنین میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ حضورؐ ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نماز نہ پڑھ سکے۔ آپؐ کے ساتھی یہ کہنے لگے رسول خداؐ انہم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا: خدا کی قسم میں نے بھی نماز نہیں پڑھی۔ یہاں تک کہ اللہ نے مشرکین کو ہٹا دیا۔ دونوں فریق اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ اسید ابن حذیفہ خندق کے کنارے پر دو سو آدمیوں کو لے کر کھڑے ہوئے، خالد ابن ولید کی سرکردگی میں مشرکین نے حملہ کر دیا، یہ اچانک حملہ کرنا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر انہوں نے مقابلہ کیا۔ وحشی نے طفیل ابن نعمان، ابن حنہ انصاری سلمیٰ کو ایک نیزے کے ساتھ مارا۔ اسے اسی طرح قتل کر دیا جس طرح احد میں حضرت حمزہ کو قتل کیا تھا۔ اس دن حضور اکرمؐ نے فرمایا: ”مشرکوں نے ہمیں درمیانی نماز، نماز عصر سے مشغول رکھا اللہ ان کے دلوں اور پیروں کو آگ سے بھر دے۔“

یوں ہوا کہ مسلمانوں کے دو دستے رات کو نکلے۔ وہ آپس میں الجھ پڑے کسی کو علم نہ تھا کہ وہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ ہم دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ ان کے درمیان بھی قتل ہوئے اور بعض لوگ زخمی ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے اسلامی شعار سے پکارا۔ کوڑورڈ تھا۔

(حم لا ینصرون) چنانچہ وہ رک گئے۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا: ”تمہارا زخمی ہونا اللہ کے لیے ہے اور جو قتل ہو گیا وہ شہید ہے۔“

مسلمانوں پر شدید مشکلات اس وقت آئیں جب وہ خندق کے دہانے پر معروف جنگ تھے۔ اور بنو قریظہ کی طرف سے خبریں آ رہی تھیں کہ وہ وعدہ خدائی پر مائل ہو گئے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ کسی وقت بھی مشرکین کا لشکر خندق کی جانب سے حملہ آور ہو سکتا ہے اور پیچھے سے یودی حملہ کر سکتے ہیں اور وہ ان عظیم لشکروں کے درمیان ایک قلیل تعداد میں ہیں۔ یہ لشکر آتے اس لیے ہیں کہ مسلمانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں اور یہ معرکہ فیصلہ کن اور آخری معرکہ ہو۔

یہ حالات اس کے علاوہ تھے۔ مدینہ میں منافقین سازشیں کر رہے تھے اور انہیں پھیلا رہے تھے خود اسلامی صفوں میں بددلی پھیلائی جا رہی تھی۔

وَ اِذْ يَقُولُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اِلَّا

غُرُوْرًا (۱۲:۳۳) ”یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کیے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔“ ان شدید حالات میں ان لوگوں کو بھی موقع مل گیا کہ وہ اپنے خبث باطن کا اظہار کر دیں جبکہ مسلمان شدید کرب میں مبتلا تھے اور کلیجے منہ کو آرہے تھے۔ ایسے حالات میں کوئی نہ تھا جو ان کو ملامت کرتا۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کی توہین اور تذلیل اور شکوک پھیلانے کا موقع مل گیا۔ اور انہوں نے برملا کتنا شروع کر دیا کہ اللہ اور رسولؐ کے وعدے جھوٹے تھے حالانکہ اللہ اور رسولؐ کے وعدے تو پورے ہونے والے تھے۔ یہ منافقین یہ باتیں اس لیے کرتے تھے کہ ان حالات میں ان پر گرفت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ بظاہر حالات ایسے تھے کہ ان کی بات درست معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنے خیال میں درست موقف پر تھے۔ مسلمان جن ہولناک حالات سے دوچار تھے ان کی وجہ سے ان منافقین کے چہروں پر ایک جو مہین پردہ تھا جس کی وجہ سے وہ رکھ رکھاؤ کرتے تھے وہ بھی اتر گیا۔ اور ان کے نفوس نے ان کو اس پر آمادہ کر دیا کہ وہ اس ظاہری رواداری کو بھی ختم کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے حقیقی شعور کا اظہار کر دیا اور رکھ رکھاؤ کا پردہ چاک کر دیا۔

اس قسم کے منافقین اور انہیں پھیلانے والے ہر جماعت میں ہوتے ہیں اور مشکل حالات میں ان کا موقف بھی ایسا ہوتا ہے جیسا کہ ان کے بھائیوں کا موقف ہوتا ہے۔ لہذا اس قسم کے لوگ تمام نسلوں میں ایک مکرر نمونہ ہوتے ہیں۔ زمان و مکان کی قید کے بغیر اس قسم کے لوگ ہر جماعت میں ہوتے ہیں۔

وَ اِذْ قَالَتْ طٰٓئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا (۱۳:۳۳) ”جب ان

میں سے ایک گروہ نے کہا: اے اہل یثرب! تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے، ’پلٹ چلو‘۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ لوگ صف بندی کو ترک کر کے گھروں میں بیٹھ جائیں اور یہ کہہ دیں کہ خندق کے سامنے اس طرح صف بندی کر کے کھڑے رہنے کا کیا موقع و محل ہے۔ پیچھے سے گھروں کو خطرہ ہے۔ یہ ایک ایسی دعوت تھی جہاں سے لوگ متاثر ہو سکتے تھے کیونکہ عورتیں اور بچے خطرے میں تھے۔ خطرہ حقیقی تھا۔ خوف ہر طرف سے لاحق تھا اور حالات بہت ہی منہوش

تھے۔ کسی کا دل قرار نہ پکڑتا تھا۔

وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ (۱۳:۳۳) ”جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگے کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں۔“ یعنی ہمارے گھر دشمن کے سامنے کھلے ہیں اور ان کا کوئی دفاع نہیں ہے۔ لیکن قرآن یہاں اصل حقیقت بھی کھل دیتا ہے :

وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ (۱۳:۳۴) ”حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے۔“ چنانچہ یہاں صاف صاف کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ بزدل ہیں۔ بھاگنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے یہ معمولے چیلے گھڑتے ہیں۔

إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا (۱۳:۳۳) ”در اصل وہ بھاگنا چاہتے ہیں۔“ روایات میں آتا ہے کہ نبی حادث نے لوس ابن قیل کو رسول اللہ کے پاس بھیجا اور یہ کہا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور انصاریوں میں سے کسی کا گھر ہمارے گھروں کی طرح نہیں ہے۔ ہمارے اور غطفان کے درمیان کوئی نہیں ہے جو ان کو روک سکے۔ تو آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم گھروں کی طرف لوٹ جائیں تاکہ گھروں اور عورتوں کی حفاظت کر سکیں۔ حضورؐ نے ان کو اجازت دے دی۔ یہ بات سعد ابن معاذ تک پہنچی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ حضورؐ ان کو اجازت نہ دیں کیونکہ ہمیں اور ان کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی ہے انہوں نے ایسا ہی کیا ہے خدا کی قسم! چنانچہ حضورؐ نے ان کو دلہا کر دیا۔ غرض قرآن ان کو ملامت کرتا ہے کہ یہ محض فرار چاہتے ہیں وہ تھے ہی ایسے۔

--- ۰۰۰ ---

یہاں سیاق کلام قدرے رک جاتا ہے۔ ایک بہترین تصور پر غور کرنے کے لیے جس میں اس وقت کے خوفناک اور پریشان کن حالات اور باہم جیلہ بازی کے موقف کی تصویر کشی کی گئی ہے تاکہ ان بیمار دلوں والے منافقین کی نفسیاتی تصویر بھی دکھا دی جائے۔ یہ ان کی داخلی تصویر ہے اور یہ حالت ان کی اس لیے ہے کہ ان کا عقیدہ اور نظریہ کمزور ہے۔ یہ بزدل ہیں اور اسلامی صفوں سے یہ لوگ ایک معمولی بہانہ اور عذر کی وجہ سے بھی بھاگنے کے لیے تیار ہوئے ہیں۔ یہ کسی موقف پر مبنی دلائل نہیں ہیں اور نہ ہی یہ اس سلسلے میں کوئی رک رکھاؤ کرنے والے ہیں۔

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ أَقْطَارِهَا تَرْسُلُوا الْفِتْنَةَ لَا تَوْهَا

وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ﴿۱۵﴾

”اگر شر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اس وقت انہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں شریک فتنہ ہونے میں کوئی تامل ہوتا۔“

یہ ہے ان منافقین کی اندرونی تصویر۔ دشمن ابھی تو مدینہ سے باہر ہے۔ ابھی تو وہ شر کے اندر مچنے نہیں پایا۔ اگرچہ حالات بہت ہی خوفناک تھے لیکن ابھی تو حملہ آور باہر ہی پڑے تھے۔ کوئی خطرہ ابھی واقع نہ ہوا تھا۔ اگر لشکر مدینہ کے

اطراف سے حملہ آور ہو جاتا اور پھر

سُئِلُوا الْفِتْنَةَ (۳۳: ۱۴) ”پھر ان کو فتنے کی دعوت دی جاتی یعنی ان سے مطالبہ کیا جاتا کہ تم مسجد ہو جاؤ تو یہ لوگ فوراً مسجد ہو جاتے اور کچھ دیر نہ کرتے اور نہ ہی کوئی تردد کرتا۔

الْأَقْبَلُ یعنی اگر دیر کرتے تو تھوڑی ہی دیر کرتے یا ان میں سے قلیل لوگ تردد کرتے۔ یعنی مسجد ہونے سے قبل کچھ دیر کے لیے سوچتے۔ یہ ہے نقشہ دھیلے عقیدے اور نظریہ کا ہے۔ یہ گہری کمزوری ہے اس کے ساتھ یہ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یوں قرآن مجید ان کی حقیقت کا اظہار کرتا ہے اور ان کی اندرونی کیفیت سے پردہ اٹھا دیتا ہے اور اس کے بعد ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے عہد توڑ دیا اور وعدے کی خلاف ورزی کر دی۔ یہ عہد کس کے ساتھ تھا؟ یہ عہد انہوں نے اللہ کے ساتھ کیا تھا کہ بھائیں گے نہیں۔ ان کے ساتھ یہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔

وَلَقَدْ كَانُوا عَاهِدُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُؤَلُّونَ الْأَدْبَارَ
وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا ۝

”ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ یہ جینے نہ بھڑکیں گے اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی باز پرس تو ہونی ہی تھی۔“

ابن ہشام نے ابن اسحاق کی روایت اپنی سیرۃ میں نقل کی ہے کہ یہ لوگ بنو حارثہ تھے۔ یہی لوگ تھے جو عہد کے دن بھی بھاگنا چاہتے تھے اور بنو سلمہ اور ابن دونوں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اللہ کے ساتھ عہد کر لیا تھا کہ وہ ایسا ہرگز نہ کریں گے۔ یہاں یاد دہانی کر لینی جاتی ہے کہ تم نے خود یہ عہد اللہ کے ساتھ کیا تھا کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے۔

عہد کے دن تو اللہ کے فضل و کرم سے وہ بچ گئے تھے۔ اللہ نے ان کو ثابت قدمی دے دی تھی۔ اور ان کو فرار کے نتائج سے بچا لیا تھا۔ ابتدائی زمانے میں جہاد کے اسباق میں سے یہ ایک سبق تھا لیکن آج تو تحریک اسلامی پر طویل دور گزر گیا ہے۔ کافی تجربات ہو گئے ہیں۔ اس لیے قرآن کریم ان پر یہ سخت تہمید کرتا ہے۔

آج جب انہوں نے عہد توڑ دیا۔ آج وہ خطرے سے بچنے کے لیے اور خوف کی حالت سے بھاگنے کے لیے عہد توڑ چکے، تو قرآن کریم ان کو ہانا ہے اور ہر وقت ہانا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات میں اعلیٰ قدر کیا ہے اور اسلامی تصور حیات میں موت اور زیت کا تصور کیا ہے۔ کیا فرار اور نقص عہد زندگی کا ضامن ہے؟

قُلْ لَنْ يَنْفَعَكُمْ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ
وَإِذَا لَا تُسْمَعُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِيكُمْ مِنَ اللَّهِ ۝

آرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ آرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۖ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِّنْ دُونِ
اللّٰهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿۱۷﴾

”اے نبی! ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ نفع بخش نہ ہو گا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقعہ تمہیں مل سکے گا۔ ان سے کہو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہو۔ اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر تم پر مہربانی کرنا چاہے۔ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پاسکتے ہیں۔“

حقیقت یہ ہے کہ تمام واقعات اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ نظام قضا و قدر ان واقعات و نتائج کو آگے بڑھاتا جاتا ہے اور ہر معاملہ اس نظام کے مطابق انجام کو پہنچتا ہے۔ موت اور قتل ایک تقدیر ہے اس سے تو کوئی قرار ممکن نہیں ہے۔ یہ وقت پر آتی ہے۔ ایک لمحہ پہلے اور بعد میں نہیں آتی۔ فرار کی وجہ سے موت موخر نہیں ہوتی۔ اگر کوئی جنگ سے بھاگ گیا تو اپنی موت مرجائے گا جس کا وقت بہت قریب ہے۔ دنیا کا تو ہر عرصہ قریب ہی ہے۔ نیز دنیا کا ہر ساز و سامان بھی قلیل ہوتا ہے۔ بچانے والا کوئی نہیں ہے صرف یہ کہ اللہ کی مشیت کسی کی موت کی راہ میں حائل ہو جائے۔ یہ اللہ ہی ہے جو کسی کے بارے میں برائی کا فیصلہ کرتا ہے اور کسی کے بارے میں اچھائی کا فیصلہ کرتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی والی اور مددگار نہیں ہے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو کسی کو تقدیر الہی سے بچالے۔ لہذا ہر دگی، ہر دگی ہے، اطاعت، اطاعت ہے، وفا، وفا ہے، خواہ وہ سہولیات کے دور میں ہو یا مشکلات کے دور میں۔ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ پر توکل کرنا چاہئے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

لب بات کا رخ ان لوگوں کی طرف مڑ جاتا ہے جو جنگ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں جو جہاد سے لاپرواہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور جو دوسروں کو بھی جہاد سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں۔

لَا مَقَامَ لَكُمْ فَارِجُوعًا (۳۳: ۱۳) ”تمہارے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے، لوٹ جاؤ۔“ اور ان کی عجیب تصویر یہاں کھینچی جاتی ہے۔ یہ تصویر بھی تصویر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین کارٹون ہے اور اس قسم کے لوگ ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ بزدل، پیچھے ہٹنے والے، بہت چیخنے اور چلانے والے، شدید حالات میں جزع و فزع کرنے والے اور پراسن حالات میں تیز و طرار بات کرنے والے، ہر بھلائی کے معاملے میں کججوس، جدوجہد سے فراری۔ اگر ذرا بھی ڈر کا خطرہ ہو، اگرچہ دور ہو تو ایک دم مضطرب ہونے والے۔ قرآن کا انداز تعبیر ایسا دلکش ہے کہ اس تصویر کے کسی رنگ کو بدلا نہیں جاسکتا۔ ذرا غور قرآنی رنگ میں پڑھئے :

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِينَ مِّنْكُمْ وَالْقَائِلِينَ لِإِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ
إِلَيْنَا ۖ وَلَا يَأْتُونَ الْبَاسَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۱۸﴾ أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ

رَأَيْتَهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ
فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَّ بِكُمْ بِالْسِنَةِ حَدَادٍ أَشْحَةً عَلَى الْخَيْرِ أُولَئِكَ
لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۖ يَحْسَبُونَ
الْأَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا ۖ وَإِنْ يَأْتِ الْأَحْزَابُ يَوَدُّوا لَوْ أَنَّهُمْ بَادُونَ فِي
الْأَعْرَابِ يَسْأَلُونَ عَنْ أَنْبَاءِكُمْ وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قُتِلُوا إِلَّا قَلِيلًا ۚ

۱۸ ”اللہ تم میں سے ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو (جنگ کے کام میں) رکاوٹیں ڈالنے والے ہیں، جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ”آؤ ہماری طرف“۔ جو لڑائی میں حصہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو، جو تمہارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں۔ خطرے کا وقت آجائے تو اس طرح دیدے پھر پھر کر تمہاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غش طاری ہو رہی ہو، مگر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو یہی لوگ فائدوں کے حریص بن کر قبیلہ کی طرح چلتی ہوئی زبانیں لیے تمہارے استقبال کو آ جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے، اسی لیے اللہ نے ان کے سارے اعمال ضائع کر دیئے۔ اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ حملہ آور کروہ ابھی گئے نہیں ہیں۔ اور اگر وہ پھر حملہ آور ہو جائیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر کہیں صحرائیں بددوں کے درمیان جا بیٹھیں اور وہیں سے تمہارے حالات پوچھتے رہیں۔ تاہم اگر یہ تمہارے درمیان رہے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیں گے۔“

آغاز یوں ہوتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو لچکی طرح جانتا ہے جو لوگوں کو جنگ سے روکتے ہیں اور اس کی راہ میں روڑے اٹھاتے ہیں۔ جو اپنے بھائیوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ جنگ میں شرکت نہ کرس گھروں میں بیٹھے رہیں۔

وَلَا يَأْتُونَ الْبَاسَ إِلَّا قَلِيلًا (۱۸:۳۳) ”جو لڑائی میں حصہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو“۔ یہ جہاد میں محض دکھاوے اور نام داخل کرنے کے لیے شریک ہوتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ معصوم لوگ ہیں اور ان کی مکاریاں بھی معصوم ہیں۔

اب اللہ اپنے معجزانہ قلم ان کے اور ان جیسے لوگوں کے خدوخال سے بڑی خوبصورتی سے رقم فرماتے ہیں:

أَشْحَةً عَلَيْكُمْ (۱۹:۳۳) ”یہ تمہارا ساتھ دینے میں بہت بخیل ہیں“۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بغض اور دشمنی بھری ہوئی ہے۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں بھی بخیل ہیں، مگر اللہ ان میں بھی بخیلی اور لچکی نیت اور لچکی خواہشات میں بھی بخیل ہیں۔

فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ

لَمَوْت (۱۹:۳۳) ”خطرے کا وقت آجائے تو دیدے پھر ابھرا کر تمہاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو۔“ یہ لیک واضح تصویر ہے جس کے خدوخال واضح ہیں، جس کے اعضاء متحرک ہیں، لیکن ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ یہ تصویر مضحکہ انگیز ہے۔ اس سے ان کی بزدلی چھٹی پڑتی ہے۔ اس قدر بزدل کہ مارے خوف کے ان کے اعضاء کانپ رہے ہیں اور ان کے پورے جسم پر رعشہ طاری ہے۔ لیکن جب خوف چلا جاتا ہے تو ان کی تصویر زیادہ مضحکہ انگیز ہو جاتی ہے۔

فَإِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوا كُمْ بِالسِّنَةِ حَدَاد (۱۹:۳۳) ”مگر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو میں تمہارے استقبال میں قبیلہ کی طرح نیز زبانوں کے ساتھ آجائے ہیں۔“ یہ سوراخوں سے نکل آتے ہیں، ان کی آدیں بلند ہو جاتی ہیں حالانکہ پہلے ان پر رعشہ طاری تھا۔ ان کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں۔ پہلے تو سکر گئے تھے، اب پھول گئے اور بغیر شرم و حیاء کے لمبے لمبے دعوے کرنے لگے کہ ہم نے یہ یہ مشقتیں برداشت کیں۔ یہ یہ جنگیں کیں اور یہ یہ فضائل اعمال کیے اور اس قدر شجاعت اور بہادری دکھائی۔۔۔ اور پھر یہ لوگ۔

أَشِحَّةً عَلَى الْحَيَرِ (۱۹:۳۳) ”مال کے لیے بہت لالچی ہیں۔“ یہ کسی بھلائی کے کام میں کچھ خرچ نہیں کرتے۔ نہ اپنی قوت، نہ اپنا عمل، نہ اپنی دولت اور نہ اپنی جان۔۔۔ حالانکہ وہ بہت بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ ان کی زبان تیز ہے اور اپنے آپ کو بہت ہی بڑا سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے لوگ کسی ایک قوم قبیلے تک محدود نہیں ہیں۔ یہ ہمیشہ ہر معاشرے میں رہتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بڑے بہادر، فصیح اللسان اور چٹیل کرنے والے ہوتے ہیں بشرطیکہ وہاں امن ہو۔ اور اگر خوف اور شدید خطرہ ہو تو یہ بخیل، بزدل، خاموش اور پیچھے پیچھے رہنے والے۔ یہ لوگ ہر بھلائی اور ہر خیر کے معاملے میں بہت ہی بخیل ہوتے ہیں بس زبانی کلامی یہ ہر کام میں حصہ لیتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ لَمْ يُولِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ (۱۹:۳۳) ”یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لاتے اس لیے اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے۔“ ان کی منافقت کا پلاسب یہ ہے کہ ایمان ان کے دلوں ہی میں نہیں اترتا اور ایمان کی روشنی میں انہوں نے اپنا راستہ تلاش نہیں کیا۔ نہ یہ لوگ ایمان کے طریقوں پر چلنے والے ہیں۔ اس لیے اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے ہیں اور یہ کامیاب نہیں کیونکہ کامیابی کا اصلی مواد ہی ان کے پاس نہیں ہے۔

وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا (۱۹:۳۳) ”اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔“ اللہ کے لیے کوئی کام مشکل نہیں، بس سمجھ لو کہ ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔ رہا یہ کہ یوم الاحزاب میں ان کی حالت کیا تھی اور ان کی سوچ کیا تھی۔

يَحْسِبُوْنَ اَلْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا (۲۰:۳۳) ”سمجھ رہے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں

ہیں۔“ گویا یہ لوگ ابھی تک کانپ رہے ہیں، ابھی تک جنگ سے چھپ رہے ہیں، لوگوں کو ردک رہے ہیں، ان کو یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ احزاب تو بھاگ گئے ہیں اور خوف ختم ہو گیا ہے اور اس دلمان لوٹ آیا ہے۔

وَ اِنْ يَّاتِ الْاَحْزَابُ يَوْدُوْا وَاَلَوْ اَنْتُمْ بِاَدْوَانٍ فِی الْاَعْرَابِ یَسْأَلُوْنَ عَنْ اَنْبَآئِکُمْ

(۲۰: ۳۳) ”اور اگر وہ پھر حملہ آور ہو جائیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر کہیں صحرا میں بدوؤں کے درمیان جا بیٹھیں اور وہیں سے تمہارے حالات پوچھتے رہیں۔“ کیا سنجیدہ حراج ہے ان کے ساتھ اور کس قدر بھونڈی تصویر ہے ان لوگوں کی۔۔۔ یوں جس طرح کارٹون۔ اگر دوبارہ احزاب حملہ آور ہوں تو یہ لوگ چاہیں گے کہ یہ اہل مدینہ ہی نہ ہوں اور دور کہیں بدو باشندے ہو جائیں اور مدینہ والوں کی زندگی اور ذمہ داریوں میں شریک ہی نہ ہوں۔ ان کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں ان کو پتہ ہی نہ ہو اور دو مردوں سے اہل مدینہ کے حالات اس طرح پوچھیں جس طرح اجنبی، اجنبی کے بارے میں پوچھتا ہے اور ان کو اہل مدینہ سے کوئی ذاتی تعلق نہیں ہے اور یہ بزدل جان بچا کر نکل آتے ہیں۔

یہ لوگ ایسی معکھ خیز تمنائیں کرتے ہیں، یہ معرکے سے دور ہیں اور اس معرکے میں ذاتی طور پر شریک نہیں ہیں نہ براہ راست یہ لوگ اس معاملے کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ یہ دور سے بھی ڈرتے ہیں اور اس قدر بعید ہو کر بھی جزع و فزع کرتے ہیں۔

وَلَوْ کَانُوْا فِیْکُمْ مَا قَتَلُوْا اِلَّا قَلِیْلًا (۲۰: ۳۳) ”تاہم اگر یہ تمہارے درمیان رہے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیں گے۔“ یہ آخری لائن ہے جس کے کھینچنے سے یہ تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے تصویر ان منافقین کی جو مدینہ طیبہ میں اٹھنے والی اس نئی اسلامی جماعت کے اندر رہتے تھے۔ ایسے ہی لوگ قیامت تک اٹھنے والی ہر تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہی ہر دور کے منافقین کے خدو خال ہوتے ہیں۔ یہ تصویر یہاں ختم ہوتی ہے اور اہل ایمان کے دل میں ان کی حقیر، ان سے نفرت اور ان سے دوری لگھی طرح بٹھا دی جاتی ہے اور یہ لوگ اللہ کے ہاں بھی ہلکے ہو جاتے ہیں اور لوگوں کی نظروں میں بھی گر جاتے ہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

یہ تو تھا حال ان لوگوں کا جو منافق تھے، جن کے دلوں میں ردگ تھا، جو اسلامی صفوں میں بد دلی پھیلاتے تھے۔ یہ تھی ان کی مکروہ تصویر، لیکن جنگ احزاب کے شدید اور ہلا مارنے والے خوف اور بدتر حالات نے ترم لوگوں کو اس طرح مکروہ صورت نہ بنا دیا تھا۔ ان تاریک اور کرہناک حالات میں کچھ روشن چہرے بھی موجود تھے۔ ان ہلا مارنے والے حالات میں ایسے لوگ بھی تھے جو چٹان کی طرح مضبوط کھڑے تھے۔ جن کا اپنے اللہ پر پورا بھروسہ تھا۔ اللہ کے فیصلوں پر راضی تھے۔ ان کو یقین تھا کہ اللہ کی نصرت آئے گی باوجود اس کے کہ بقا ہر حالات بہت ہی مایوس کن تھے اور ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔

اب قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور نمونہ پیش کر کے ان روشن چہروں کے الہم کا آغاز کرتا ہے اور

دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ
يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ۝

”در حقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔“

اس خوفناک ذرہ اور جان لیوا حالات کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے لیے امن و اطمینان کا سرچشمہ تھے اور آپ کی ذات وثوق اطمینان اور امیدوں کا سرچشمہ تھی۔ اس مشکل وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کردار ادا کیا وہ دراصل تمام تحریکات اسلامی کے قائدین کے لیے مثال اور نمونہ ہے۔ ان تمام لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے جو صرف رضائے الہی اور یوم آخرت کے لیے کام کرتے ہیں اور جو اپنے آپ کو بہترین قائد ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہر وقت اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور کبھی بھی اللہ کو نہیں بھولتے۔

ہمیں چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنگ میں جو موقف اختیار فرمایا اس کی کچھ جھلکیاں یہاں دے دیں۔ پوری تفصیلات تو یہاں دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھڑ سے نکلے اور عام مسلمانوں کے ساتھ خندق کھودنے گئے۔ آپ کدال سے زمین کھودتے اور بیچتے سے مٹی جمع فرماتے اور پھر توبہ میں بھر کر کناروں پر ڈالتے۔ کام کرنے والے جو رجز پڑھتے آپ بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے۔ یہ لوگ لوہی آواز سے رجز پڑھتے رجز کے آخری لفظ کو دہراتے۔ وہ لوگ سادہ قسم کے ترانے گاتے تھے جن کا تعلق اس وقت کے واقعات سے ہوتا تھا۔ ایک شخص تھا جس کا نام جعیل تھا۔ حضور اکرم کو یہ نام اچھا نہ لگا تو آپ نے اس کا نام بدل کر عمرو رکھ دیا۔ اب مسلمانوں نے اس کے ساتھ رجز بنایا بہت ہی سادہ:

سَنَاهُ مِنْ بَعْدِ جَعِيلٍ عَمْرًا وَكَانَ لِلْبَائِسِ يَوْمًا ظَهْرًا

جب مسلمان یہ رجز پڑھتے اور ”عمرا“ کہتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی جواب میں ”عمرا“ فرماتے اور جب وہ دوسرے فقرے میں لفظ ”ظہرا“ پڑھتے تو آپ بھی ان کے جواب میں ظہرا دہراتے۔۔۔ اب دراصل فضا کے بارے میں سوچنے اور اس جوش و خروش کا تصور کیجئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رجز کے ساتھ قطع دہراتے ہیں۔ ”عمرا“ اور ”ظہرا“۔۔۔ اور ساتھ ساتھ کدال بھی مار رہے ہیں۔ بیچے سے مٹی بھی جمع کر رہے ہیں اور پھر توبہ میں مٹی اٹھ کر بھی لے جا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ رجز کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ یہ طرز عمل ان لوگوں کے جسم کے روٹنے روٹنے کو قوت نہ بھر رہا ہو گا۔ ان کی امداد کا پیمانہ کس قوت و شجاعت سے بہرہ ہو گا اور کس قدر جرأت و شجاعت اور اعتماد اور اعزاز ان کو حاصل ہو رہا ہو گا۔

○ زید ابن ثابت مٹی۔۔۔ جا رہے تھے تو حضورؐ نے فرمایا: یہ ایک بہترین نوجوان ہے۔ اسے نیند آگئی اور خندق ہی میں سو گیا۔ بہت دیر ہوئی۔۔۔ حضرت عمار دین جہ نے ان کا اسلحہ چیکے سے لے لیا اسے پتہ بھی نہ چلا۔ آنکھ کھلی

تو اسلحہ ندارد۔ یہ پریشان ہو گئے۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا ”اے ابواماد (زیادہ سونے والے کے باپ) تم اس قدر سو گئے کہ اسلحہ ہی چلا گیا۔“ پھر آپؐ نے فرمایا ”کس کو اس فوجیان کے اسلحہ کے بارے میں علم ہے؟“ عمارہ نے فرمایا ”رسول خداؐ وہ میرے پاس ہے۔“ آپؐ نے فرمایا اسے دے دو اور اس کے بعد حکم دیا کہ کسی مسلمان کی کوئی چیز بطور مزاح بھی نہ چھپاؤ۔۔۔ یہ واقعہ بھی بتاتا ہے کہ اسلامی صفوں میں جو لوگ تھے وہ بیدار مغز اور بیدار چشم تھے اور حضورؐ کی نظر ہر کسی پر تھی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سنجیدہ مزاح اور خوش مزاجی ان مشکل حالات میں بھی قائد انقلاب کے ساتھ تھے۔ ”اے سونے والے کے باپ“ تم سو گئے اور اسلحہ چلا گیا۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کن حالات میں تھے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کس قدر قریب تھے۔

○ آپؐ کی روح دور دور تک اسلامی انقلاب کے نقوش دیکھ رہی تھی۔ پتھروں کی چمک میں بھی اللہ آپؐ کو اسلامی انقلاب کی وسعتوں کو دکھاتے تھے۔ پہلے دن سے آپؐ نے خوشخبری سنائی تھی کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے ہاتھ آئیں گے۔ لیکن جنگ احزاب جیسے مایوس کن حالات میں بھی جب کدال کی ضرب سے پتھر سے چمک نکلتی تو اس سے بھی حضورؐ کو مستقبل کا نقشہ بنا دیا جاتا اور آپؐ فوراً مسلمانوں کو بتا دیتے اور اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں یقین اور امید کے جیسے پھوٹ نکلتے۔

ابن اسحاق لکھتے ہیں۔ سلمان فارسی کی یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ میں خندق کا ایک کونا کھود رہا تھا کہ ایک پتھر میرے لیے مشکل ہو گیا۔ رسول اللہؐ اس وقت میرے قریب تھے۔ آپؐ نے دیکھا کہ میں مسلسل دائرہ رہا ہوں اور جگہ میرے لئے مشکل ہو گئی ہے۔ حضورؐ اترے اور میرے ہاتھ سے کدال لیا اور پتھر پر وار کیا۔ کدال کے ٹپچے سے ایک چمک اٹھی۔ پھر آپؐ نے دوسری ضرب لگائی اور پھر پتھر سے ایک چمک اٹھی۔ پھر آپؐ نے تیسری ضرب لگائی اور پتھر سے پھر چمک اٹھی۔ کہتے ہیں میں نے پوچھا رسول خداؐ یہ چمک کیسی تھی جو میں دیکھ رہا ہوں کہ آپؐ جب مارتے ہیں تو کدال چمک اٹھتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا (سلمان تو نے یہ دیکھ لیا ہے) میں نے کہا ہاں۔ پہلی چمک میں یہ بات دکھائی گئی کہ میرے لیے یمن فتح ہو گیا ہے۔ دوسری چمک میں یہ دکھایا گیا کہ اللہ نے میرے لیے شام اور مغرب کا علاقہ فتح کر دیا اور تیسری چمک میں یہ بات تھی کہ اللہ نے میرے لیے مشرق کو فتح کر لیا ہے۔

مقریزی نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عمرؓ کو پیش آیا اور اس وقت سلمان فارسی بھی موجود تھے۔ ہمارے لیے سبق اس بات میں یہ ہے کہ اس قسم کے خوفناک ماحول میں بھی مسلمانوں کے دل و دماغ اعتماد سے بھر پور تھے۔

○ ذرا وہ وقت بھی یاد کیجئے کہ حذیفہؓ شدید سردی میں دشمن کے کیمپ سے نکل آئے ہیں۔ ان کے پاس اطلاعات ہیں۔ وہ سردی سے کانپ رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک کی لمبی شال میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضورؐ نماز میں ہیں۔ اپنے رب کے ساتھ مناجات میں ہیں۔ آپؐ حضرت حذیفہؓ کو چھوڑ نہیں دیتے کہ وہ اس وقت تک کاپتے رہیں جب تک حضورؐ نماز سے فارغ نہیں ہو جاتے بلکہ آپؐ حذیفہؓ کو اپنے پاؤں ٹانگوں کے اندر دبا لیتے ہیں اور اپنی شال کا ایک کونہ ان پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ گرم ہو جائیں اور آپؐ نماز جاری رکھتے ہیں۔ نماز ختم ہوتی ہے۔ حذیفہؓ آپؐ کو اطلاعات فراہم کرتے ہیں اور آپؐ کو خوشخبری سناتے ہیں کیونکہ ”مبارک“ کہہ رہا تھا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ حذیفہؓ اسے دیکھ کر آگئے۔

○ جہاں تک آپؐ کی شجاعت، عظمت قدمی اور اللہ پر بھروسے کا تعلق ہے تو وہ آپؐ کی سیرت سے عیاں ہیں اور اس پورے قصے سے بالکل عیاں ہیں۔ اور مشہور ہیں، لہذا ہم یہاں تفصیلات نہیں دے سکتے۔ اللہ نے سچ کہا ”در حقیقت تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک بہترین نمونہ تھا ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔“

--- ○ ○ ○ ---

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب ایک سچے مومن کی تصویر ملاحظہ ہو۔ جو اللہ پر پورا پورا بھروسہ رکھتا ہے اور پوری طرح مطمئن ہے۔ یہ تصویر روشن، چمکدار اور خوبصورت ہے۔ دیکھئے ہر قسم کے ہولناک حالات کے مقابلے میں یہ مومن ڈٹا ہوا ہے۔ خطرات میں کود پڑتا ہے۔ ایسے خطرناک حالات میں چٹان کی طرح ڈٹا ہے جن میں عام لوگوں پر کچلی طاری ہو جاتی ہے اور خطرہ جس قدر شدید ہوتا ہے اسے اسی قدر زیادہ اطمینان اللہ پر زیادہ بھروسہ اور خوشخبری کا یقین ہوتا ہے۔

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ
وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ نَوْمًا نَادَهُمُ الرَّسُولُ ائِمَّا نًا وَتَسْلِيمًا ۖ

”اور سچے مومنوں (کا حال اس وقت یہ تھا کہ) جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ ”یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا“ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔“

اس جنگ میں مسلمان جس خوف سے دوچار ہوئے وہ اس قدر عظیم تھا، اور اس غزوہ میں جو دکھ ان کو پہنچا، اس قدر شدید تھا، اور اس واقعہ میں وہ جس بے چینی کا شکار ہوئے، وہ اس قدر سخت تھی کہ وہ ہلا مارے گئے اور قرآن نے اس کے لیے زِلْزَالَآ شَدِيدًا (۱۱: ۳۳) کا لفظ استعمال کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

هٰذَا لِكَيْ يُبْتَلَى الْمُؤْمِنُونَ وَزَلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا (۱۱: ۳۳) ”یہاں مومنین کو آزمایا گیا اور وہ ہلا مارے گئے۔“

یہ لوگ بہر حال انسان تھے اور انسان کی قوت برداشت بہر حال محدود ہوتی ہے۔ اللہ بھی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتا۔ اگرچہ ان کو پورا پورا یقین تھا کہ آخری فتح ہماری ہی ہوگی۔ اور رسول اللہ نے ان کو بشارت بھی دے دی تھی اور یہ بشارت نہ صرف عرب بلکہ یمن، شام اور مشرق و مغرب کی فتح کی تھی۔ لیکن ان حقائق کے باوجود موجودہ ہولناک حالات نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا اور وہ مسلسل کرب اور خوف محسوس کرتے تھے۔

مسلمان کن حالات میں تھے اور کس قدر سہمے ہوئے تھے، اس کی تصویر حضرت حذیفہ ابن یمان کی روایت سے بہت وضاحت سے معلوم ہوتی ہے۔ اصحاب رسولؐ کی حالت کیا تھی اور ان کی اندرونی حالت کیا تھی۔ ”حضورؐ صحابہؓ سے کہتے ہیں کون ہے وہ شخص جو کھڑا ہو اور جائے دشمن کے لشکر کے اندر جا کر معلوم کرے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ اس کے

لیے شرط ہے کہ وہ دلپس آئے گا۔ میں اللہ سے دعا کروں گا کہ اللہ اسے میرے ساتھ جنت میں رکھے۔“۔ باوجود اس کے کہ اس شخص کی دلپس کی بھی ضمانت ہے اور اس کے لیے جنت کی دعاء کی بھی ضمانت ہے، لیکن کوئی بھی خود اٹھ کر نہیں آتا۔ اور حضور تین بار دہراتے ہیں۔ آخر میں حضور حضرت حذیفہؓ کا نام لے کر پکارتے ہیں اور حذیفہؓ بھی فرماتے ہیں کہ جب میرا نام لے لیا گیا تو اب میرے لیے جانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ رسولؐ یہ موقف انتہائی خوف کی حالت ہی میں اختیار کر سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات ان کی طاقت سے زیادہ تھی۔

لیکن اس زلزال شدید کے باوجود، اور آنکھیں پھرانے کے باوجود جان کی بے چینی کے باوجود، ان لوگوں کا اللہ کے ساتھ ایک غیر منقطع تعلق تھا۔ وہ سنن البیہ کو اس حد تک جانتے تھے کہ وہ کسی وقت بھی ان نظروں سے اوجھل نہ ہوتی تھیں اور ان کو سنن البیہ پر غیر متزلزل بھروسہ تھا کہ اللہ کے یہ سنن ناقابلِ تغیر ہیں اور جب ان کے مطابق اسباب فراہم ہوں تو نتائج ضرور ان کے مطابق نکلیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مومنین نے یہ سمجھ لیا کہ اس شدید خوف اور ہلا مارنے کے بعد اب نصرتِ قرب آگئی ہے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسْتَهْمُ
الْبَاسَاءِ وَالضَّرَآءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرُ اللَّهُ أَلَا

اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيبٌ (حوالہ) ”کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تم پر وہ حالات نہ آئیں گے جو تم سے پہلے لوگوں پر آئے۔ ان پر سختیاں آئیں، مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی لال ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔۔۔ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔“۔ اور اب چونکہ وہ ہلا مارے گئے ہیں لہذا نصرتِ الہی قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کہا: ”یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔“ (اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سہدگی کو اور زیادہ کر دیا)۔

هَذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ (۲۲:۳۳) ”یہ وہی چیز ہے جس کو اللہ اور رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔“۔ یہ خوف، یہ بے چینی، اور یہ کپکپی، یہ غلی وہ چیزیں ہیں جن پر ہم سے نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لہذا نصرت آنے ہی والی ہے۔

وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ (۲۲:۳۳) ”اور اللہ اور رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی۔“۔ یعنی اللہ اور رسولؐ نے نصرتِ الہی کی آمد کے لیے جو علامات رکھی تھیں، وہ سچ تھیں اور اب وہ علامات ظاہر ہو رہی ہیں تو بھی سچی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دل اللہ کی نصرت کے آنے پر مطمئن ہو گئے۔

وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا (۲۲:۳۳) ”اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سہدگی کو اور

زیادہ کر دیا۔“

بہر حال وہ انسان اور بشر تھے اور بشری جذبات سے وہ بھی پاک نہ ہو سکتے تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ ان سے شریعت کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ بشر سے زیادہ بوجھ اٹھائیں۔ دائرہ بشریت کے اندر ہی ان کو رہنا تھا۔ اور بشریت کی خصوصیات اور خدمات کا ان کے اندر پایا جانا حکمت خداوندی تھا۔ اس لیے ان کو پیدا کیا گیا تھا تاکہ وہ بشر ہوتے ہوئے کام کریں اور بشریت کے حدود کوئی اور جنس نہ ہوں۔ نہ مائیکہ ہوں اور نہ شیاطین ہوں۔ نہ جانور ہوں اور نہ پتھر ہوں۔ وہ بشر تھے۔ اس لیے ان پر خوف بھی طاری ہوتا تھا اور انہیں پریشانی بھی لاحق ہوتی تھی اور تنگی بھی محسوس کرتے تھے۔ اگر خطرہ حد برداشت سے زیادہ ہو جاتا تو ان پر کچکی بھی طاری ہوتی تھی۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود مضبوط رسی۔ ا۔ فاربہ تھا۔ وہ اللہ سے باندھے ہوئے تھے اور اللہ ان کو گرنے سے بچا رہا تھا۔ از سر نو امیدیں ان کے اندر پیدا فرمانا ہے اور ناامیدی سے ان کو بچانا تھا۔ اس لیے وہ انسانیت کی تاریخ میں ایک منفرد مثال تھے۔ ایسی مثال جس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

ہمیں چاہئے کہ اس حقیقت کا ادراک کریں کہ ہمیں معلوم ہو کہ پوری انسانی تاریخ کے انسانوں میں ایک ایسا نمونہ بھی تھا اور کبھی بشریت اس معیار تک بھی پہنچی تھی۔ یہ بشر تھے 'فرشتے نہیں تھے' ان میں کمزوریاں بھی تھیں اور قوت بھی تھی اور ان کا اعزاز اور معیار یہ ہے کہ انہوں نے بشریت کو اس قدر اونچے معیار تک پہنچا دیا یوں کہ دائرہ بشریت کے اندر رہتے ہوئے وہ اس قدر بلند معیار تک پہنچ گئے۔

جب ہم دیکھیں کہ ہمارے اندر کمزوری سمیٹی ہے یا ہمارے قدم متزلزل ہو گئے ہیں 'یا ہم ڈر گئے ہیں' یا ہم پر تنگی کا وقت آ گیا ہے۔ ہولناک اور خطرناک حالات سے دوچار ہو گئے ہیں تو ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے اور ہمیں چیخ و پکار نہ شروع کر دینا چاہئے کہ دسے مارے گئے۔ لیکن ہمیں یہ موقف بھی نہ اختیار کرنا چاہئے کہ یہ کمزوریاں تو خیر القرون میں بھی تھیں اور یہ ہماری فطرت کا حصہ ہیں اور ہم بلکہ تمام انسانوں سے اچھے لوگوں میں بھی تھیں 'اس لیے کہ ایک مضبوط رسی بھی ہے 'یہ مضبوط رسی آسمان سے تعلق کی رسی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اللہ پر بھروسہ کریں۔ اس کی رسی کو تھامیں اور اعتماد اور اطمینان کو دلہاں لوٹائیں اور ہمارے جب قدم متزلزل ہو جائیں تو ہم سمجھ لیں کہ اب اللہ کی نصرت آنے والی ہے تاکہ ہم ثابت قدم رہیں۔ ہمیں استعزاز حاصل ہو اور نہایت ہی قوت سے از سر نو راہ حق پر چل پڑیں۔

آغاز اسلام میں اللہ نے صحابہ کرام کی جو نیم تنکیں دی تھیں اسے یہی توازن عطا کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک منفرد نیم تھی۔ اس نیم کی تعریف خود قرآن بار بار کرتا ہے کہ اس نیم نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے۔ کس طرح ثابت قدم رہے۔ ان میں سے بعض تو اللہ کے ہاں پہنچ گئے اور بعض انتظار میں ہیں۔

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ

قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا

”ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا خطر ہے۔ انہوں نے اپنے روپے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔“
یہ نمونہ اس مکروہ نمونے کے بالقابل ہے۔ یہ مکروہ نمونہ وہ ہے جس میں لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ پیچہ نہ پھیریں گے مگر بعد میں انہوں نے اپنا عہد وفانہ کیا۔

وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْنُوءًا ”اور اللہ کے عہد کے بارے میں تو پوچھا جاتا ہے۔“

امام احمد نے حضرت ثابت سے نقل کیا ہے کہ ”میرے چچا انس بن نصرؓ رسول اللہؐ کے ساتھ بدر میں حاضر نہ ہو سکے تھے۔ ان پر یہ بات بہت شاق تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ پہلا معرکہ تھا جس میں رسول خداؐ شریک ہوئے اور میں غائب رہا۔ اگر اللہ نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی معرکہ میں شریک کیا تو اللہ تعالیٰ دیکھ لے گا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ ان کے سوا اور کوئی یہ بات نہ کہہ سکا۔ یہ رسول اللہؐ کے ساتھ احد کے دن حاضر ہوئے۔ یہ سعد ابن معاذؓ کے سامنے آگئے۔ انس نے ان سے کہا ابو عمر! دلہ! دلہ! جنت کی ہوا کیا خوب ہے۔ مجھے تو احد سے جنت کی ہوا آرہی ہے۔ کہتے ہیں اس نے ان کے ساتھ جنگ کی اور وہ قتل ہو گئے۔ ان کے جسم پر ۸۰ سے اوپر زخم تھے۔ تیروں، تلواروں اور نیزوں کے۔ ان کی بہن میری پھوپھی ربیع بنت نصرؓ نے کہا میں نے اپنے بھائی کو اس کی انگلیوں کے پوروں سے پہچانا۔ کہتی ہیں ان پر یہ آیت نازل ہوئی:

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا (۳۳: ۲۳) صحابہ کرامؓ کا خیال تھا کہ یہ آیت انسؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ بے مثال مؤمنین کی یہ نہایت ہی روشن تصویر ہے۔ یہاں ہم اس کا تذکرہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ ایمان کی حقیقت کیا ہوتی ہے۔ اور نفاق کیا ہوتا ہے۔ وفائے عہد کیا ہوتا ہے اور نقص عہد کیا ہوتا ہے۔ یہ میدان تربیت گاہ کے درمیان تقابلی مطالعہ تھا۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو ایسی آزمائشوں میں کیوں ڈالتا ہے اور جو لوگ وفائے عہد نہیں کرتے ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔

لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُفِيقِينَ إِن

شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

(یہ سب کچھ اس لیے ہوا) ”تاکہ اللہ چوں کہ ان کی سچائی کی جزا دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کر لے“ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔“

قرآن کریم میں واقعات و حادثات پر ایسا تبصرہ آتا رہتا ہے۔ مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ تمام معادلات اللہ کے اختیار میں ہیں۔ ان واقعات کی حکمت بھی بتا دی جاتی ہے کہ کوئی واقعہ عیب یا یونہی پیش نہیں آ جاتا۔ ہر واقعہ حکمت الہیہ کا حصہ ہوتا ہے اور مقررہ وقت پر آتا ہے۔ اس کے پیچھے با مقصد تدبیر ہوتی ہے اور اس کے مقررہ نتائج نکلتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کے

لئے رحمت اور فضل اس میں عیاں ہوتا ہے اور یہ جان لینا چاہئے کہ اللہ کی رحمت اور اس کا فضل ہمیشہ عیاں ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳: ۲۴) ”بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔“۔ اور یہ عظیم واقعہ اس پر ختم ہوتا ہے کہ مومنین کا اپنے رب کے بارے میں جو یقین تھا وہ درست ثابت ہوا اور منافقین اور انواریں پھیلانے والے غلط خیالات لیے ہوئے تھے۔ غرض ایمانی اقدار آخر کار کامیاب رہیں۔

وَرَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْطِهِمْ لَمَّا بَيَّنَّا لَآءِ خَيْرًا وَّكَفَى اللّٰهُ
الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَّكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝۱۵

”اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا، وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یونہی پٹ گئے اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا، اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔“۔
اس معرکے کا آغاز ہوا۔ یہ آگے بڑھا۔ اپنے انجام تک پہنچا لیکن پورے دور میں اس کی باگیں اللہ کے ہاتھ میں تھیں۔ جس طرح اللہ چاہتا تھا واقعات کا رخ موڑ دیتا تھا۔ قرآن کریم اپنے انداز تعبیر کے ذریعہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو بھی واقعات ہوئے، وہ اللہ نے کرائے اور یہ بات ابھی طرح اہل ایمان کے دلوں میں بٹھادی گئی۔ یوں اسلامی تصور حیات کو واضح کر دیا گیا۔

--- ۰۰۰ ---

اب اس لشکر کشی کا وہاں صرف مشرکین قریش اور غطفان پر ہی نہ پڑا بلکہ مشرکین کے حلفاء بنی فزیرہ بھی اس کی زد میں آ گئے۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيّٰصِيْمٍ
وَقَدْ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبُ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاسِيْرُوْنَ فَرِيْقًا ۝۱۶
اَرْضُهُمْ وَاٰبَادِيْنَهُمْ وَاَمْوَالُهُمْ وَاَسْرَآءُ لَمْ تَطْعُوْهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۷

۱۹

”پھر اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا، اللہ ان کی گڑھیوں سے انہیں اتار لایا اور ان کے دلوں میں اس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کر رہے ہو۔ اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“۔

بنی قریظہ کا کیا قصہ تھا؟ اس کا تعلق مسلمانوں اور یہودیوں کے باہم تعلقات سے ہے۔ مناسب ہے کہ یہاں اس کی وضاحت کر دی جائے۔ یہودیوں نے اسام کے ساتھ بہت ہی مختصر عرصہ کے لیے رواداری کا رویہ اپنایا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آتے ہی ان کے ساتھ باہمی امن کا معاہدہ کر لیا تھا اور ذمہ داری قبول فرمائی تھی کہ مسلمان ان کی نصرت اور حمایت کریں گے بشرطیکہ وہ غداری نہ کریں، قتل و غور نہ کریں، جاسوسی نہ کریں دشمن کی حمایت نہ کریں، اور کسی مسلمان کو اذیت نہ دیں۔

بہت ہی تھوڑے دن گزرے تھے کہ یہودیوں نے یہ محسوس کیا کہ دین جدید ان کے لیے بھی خطرہ بن گیا ہے اور ان کی موروثی امتیازی حیثیت کہ وہ لعل کتاب ہیں، اب ختم ہو رہی ہے۔ یہ لوگ لعل یثرب کے درمیان اپنی اس امتیازی حیثیت کی وجہ سے ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مسلمانوں کی جدید صف بندی سے بھی خطرات محسوس کر لیے۔ اس سے قبل وہ اوس اور خزرج کے درمیان پائے جانے والے طویل اختلافات اور جنگوں سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس طرح مدینہ میں انہی کی بات ہوتی تھی۔ جب نبی کریمؐ کی قیادت میں اسلام نے ان روایتی دشمنوں کو باہم شہرہ شکر کر دیا تو یہودیوں کے وہ مفادات ختم ہو گئے جو وہ ان دونوں فریقوں سے حاصل کرتے تھے۔

جس بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا وہ یہ تھی کہ ان کے عالم اور مذہبی راہنما عبد اللہ ابن سلام مسلمان ہو گئے۔ ان کا دل اسلام کے لیے کھل گیا۔ یہ مسلمان ہو گیا۔ اس نے اپنے خاندان سے بھی کہا تو وہ بھی مسلمان ہو گئے لیکن اس نے کہا کہ اگر وہ ایسے ہی اپنے اسلام کا اعلان کر دے تو یہودی الزام لگائیں گے تو انہوں نے رسول اللہؐ سے مطالبہ کیا کہ میرے بارے میں پہلے آپ ان سے پوچھ لیں۔ پہلے اس کے کہ میرے اسلام کا اعلان ہو، تو انہوں نے کہا یہ ہمارے سردار ہیں، سردار کے بیٹے ہیں۔ ہمارے حبر اور عالم ہیں۔ اس پر عبد اللہ ابن سلام نکلے اور ان سے کہا کہ ایمان لاؤ چنانچہ انہوں نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور تمام یہودی قبائل کو ان کے بارے میں آگاہ کر دیا۔ اب انہوں نے محسوس کر لیا کہ ہمارے دین کو حقیقی خطرہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ لہٰذا سازشیں جو کبھی رکتی نہ تھیں۔ اس دن سے یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو جنگ شروع ہوئی وہ آج تک جاری ہے اور یہ میدان کارزار آج تک ٹھنڈا نہیں ہوا۔

پہلے یہ سرد جنگ تھی اور جوں جوں ہمارے مسلمانوں کے حالات خراب ہوتے رہے، یہ جنگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور اسلام کے خلاف جاری رہی۔ اس جنگ نے مختلف رنگ اور اسلوب اختیار کیے۔ پہلے انہوں نے جدید رسالت کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلانے، پھر جدید عقیدے پر الزامات لگانے، پھر انہوں نے مسلمانوں کے درمیان عداوتیں ڈالنا شروع کر دیں۔ اوس اور خزرج کو بارہا لڑانا چاہا۔ انصار اور مہاجرین کے درمیان انہوں نے دشمنی ڈالی۔ یہ مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ کے لیے جاسوسی بھی کرتے رہے۔ یہ پھر منافقین کے دوست بن گئے۔ ان منافقین کے ذریعے اسلامی صفوں میں فتنے ڈالتے۔ آخر کار یہ کھل کر سامنے آ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف لشکر کشیاں کیں اور احزاب کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً غزوہ احزاب کی شکل میں۔

ان کے اہم قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

مسلمانوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ تھا۔ بنو قینقاع یہودیوں میں سے بہت ہی دلیر تھے۔ ان کے دل تو اس وقت جل گئے جب مسلمانوں کو بدر میں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے عہد کی خلاف ورزی شروع کر دی بلکہ عہد سے انکار ہی کر دیا اور ان کا خیال یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو کفار قریش کے ساتھ پہلے ہی سر کے میں کامیاب رہے ہیں لہذا اگر حالت یونہی رہی تو یہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ابن اسحاق کے ذریعہ سے ان کے یہ حالات درج کیے ہیں۔ بنی قینقاع کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ نے ان کو قینقاع کے بازار میں جمع کیا اور کہا: اے لیلِ یسود اللہ سے ڈرو جس طرح اللہ نے قریش پر وبال نازل کیا ہے ویسا ہی حال تمہارا نہ ہو جائے۔ اسلام قبول کر لو تمہیں تو معلوم ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ یہ بات تمہاری کتاب کے اندر موجود ہے۔ انہوں نے کہا اے محمد تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم قریش کی طرح ہیں۔ تم اس بات پر مغرور نہ ہو جاؤ کہ تم ایک ایسی قوم پر غلبہ آگئے جنہیں جنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور تم نے انہیں مار لیا۔ اگر ہم نے تمہارے ساتھ جنگ کی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیسے لوگ ہیں۔

ابن ہشام نے بواسطہ عبد اللہ ابن جعفر نقل کیا ہے۔۔۔ بنی قینقاع کا قصہ یوں ہوا کہ ایک عرب عورت دودھ لے کر آئی اور بنی قینقاع کے بازار میں اسے فروخت کیا اس کے بعد وہ ایک سار کے ہاں زیور بنانے کے لیے بیٹھ گئی۔ انہوں نے یہ کوشش کی کہ اس عورت کے چہرے کو کھول دیں۔ اس نے انکار کیا۔ سار نے جھٹ اس کے کپڑے کو اس کی پیٹھ کے ساتھ باندھ دیا۔ جب وہ انہی تو اس کی شرم گاہ نکل ہو گئی۔ اس پر وہ خوب غصے۔ اس نے چلا کر مدد کے لیے پکارا۔ ایک مسلمان سار پر ٹوٹ پڑا اور اسے قتل کر دیا۔ یہ یہودی تھا۔ تمام یہودی مسلمان پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ آوازیں ہوئیں۔ تمام مسلمان قینقاع کے خلاف جمع کیے اور یوں ان کے درمیان شر شروع ہوا۔

ابن اسحاق نے بات یوں کھل کی۔۔۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا۔ ان لوگوں نے حضور کے حکم پر ہتھیار ڈال دیے۔ اس پر عبد اللہ ابن ابی اسلول نے کہا: ”محمدؐ یہ لوگ میرے دوست ہیں ان کے ساتھ بھلائی کرو“ یہ خراج کے دوست تھے۔ حضور خاموش رہے۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ یہ مطالبہ کیا کہ یہ میرے دوست ہیں ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اس پر حضور نے پھر اعراض فرمایا۔ اب اس نے حضور کے زرہ کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ رسول اللہ نے اتنا کہا مجھے چھوڑ دو۔ آپ نے سخت غصہ میں فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس پر حضور نے فرمایا بد بخت چھوڑو مجھے۔ اس پر اس نے کہا۔ خدا کی قسم میں آپ کو اس وقت نہ چھوڑوں گا جب تک آپ میرے دوستوں کے ساتھ احسان نہ کریں۔ یہ چار سو شہ سوار اور تین سو زرہ پوش ہیں۔ انہوں نے سرخ و سیاہ اقوام کے خلاف میری مدد کی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ان کو صبح کے تڑکے فص کی طرح کاٹ دو۔ میں ایک ایسا آدمی ہوں جو مشکلات سے ڈرتا ہوں۔ اس پر رسول اللہ نے فرمایا تم جو چاہتے ہو وہی ہو گا۔

عبد اللہ ابن ابی اہنی تک اپنی قوم میں ذی حیثیت تھا۔ چنانچہ رسول اللہ نے اس کی سفارش قبول کر لی اور فیصلہ یہ ہوا کہ بنی قینقاع مدینہ سے نکل جائیں۔ وہ اپنے ساتھ اپنے مال لے جائیں ماسوائے اسلحہ کے۔ یوں مدینہ یہودیوں کی ایک ٹکڑی سے خالی ہوا۔ یہ رجسٹری بڑی قوت والی تھی۔

رہے بنی نضیر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر کے بعد من چار ہجری میں ان کے پاس گئے۔ آپ نے ان

سے دو مقتولین کی دیت میں شرکت کا مطالبہ کیا۔ حسب عہد انہوں نے یہ ادائیگی کرنی تھی۔ جب حضورؐ آئے تو انہوں نے کہا ہاں ابو القاسم ہم آپ کی لہذا حسب خواہش کریں گے۔ اس کے بعد یہ لوگ علیحدہ ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ تم اس شخص کو بھی ایسی حالت میں نہ پاؤ گے۔ اس وقت رسول ان کی ایک دیوار کے پیچھے بیٹھے تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ کون ہے جو جا کر ایک پتھر گرائے تاکہ اس شخص سے ہماری جان چھوٹے۔

چنانچہ یہ لوگ اس سازش کو عملی جامہ پہنانے میں لگ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع دے دی گئی۔ حضورؐ اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ کی طرف لوٹ آئے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کے ساتھ جنگ کی تیاری کرو! یہ لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ عبداللہ ابن ابی بنی السلول نے ان کو پیغام بھیجا کہ اٹ جاؤ۔ ہم تمہیں ان کے سپرد نہ کریں گے۔ اگر جنگ ہوئی تو ہم تمہارے ساتھ مل کر جنگ کریں گے۔ اگر تمہیں نکالا گیا ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے۔ لیکن منافقین نے اپنا یہ عہد پورا نہ کیا۔ بنی نضیر کو اللہ نے مرعوب کر دیا۔ بلا حرب و قتال انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ انہوں نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ ان کو جلا وطن کر دیں اور قتل نہ کریں۔ اونٹوں پر وہ اسلحہ کے سوا جو کچھ لے جاسکتے ہیں لے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ لوگ خیبر کو چلے گئے۔ بعض لوگ شام کو چلے گئے۔ حضورؐ نے یہ درخواست منظور کر لی۔ ان کے اشراف میں۔ جو لوگ خیبر کو گئے 'یہ لوگ تھے۔ سلام ابن ابوالحقیق، کنانہ ابن ابرہہ، حبیبہ ابن اخطب۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے غطفان، و قریش کو جمع کیا مسلمانوں کے خلاف اور غزوہ احزاب برپا کیا۔

اب رہائی قریظہ کا قصہ غزوہ احزاب میں انہوں نے جو کردار ادا کیا وہ معلوم ہو چکا ہے۔ یہ بھی مشرکین کے ساتھ جمع ہو گئے تھے۔ بنی نضیر کے زعماء کی تحریص اور آمادہ کرنے پر اور حبیبہ ابن اخطب اس کام کا ذمہ دار تھا۔ بنی قریظہ کی عہد شکنی دوسرے احزاب کے مقابلے میں مسلمانوں پر بہت ہی گراں گزری۔ ان لوگوں کا رویہ کس قدر خطرناک تھا۔ اس کا اندازہ تم اس سے کر سکتے ہو کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی عہد شکنی کی اطلاعات میں تو آپ نے سعد ابن معاذ رئیس اوس کو ان کے پاس بھیجا۔ اور سعد ابن عبادہ رئیس خزرج بھی ساتھ ہوئے۔ ان کے ساتھ عبداللہ ابن رواحہ اور خوات ابن جبیر بھی گئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ذرا جا کر دیکھو کہ ہم تک جو اطلاعات پہنچ رہی ہیں وہ درست ہیں یا نہیں؟ اگر یہ اطلاعات درست ہوں تو میرے سامنے ایسے الفاظ میں رپورٹ دو کہ میں ہی سمجھوں اور مسلمانوں پر اس کا برا اثر نہ ہو اور اگر وہ وفا پر قائم ہوں تو پھر اعلان یہ کہہ دینا۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کس طرح سمجھتے تھے کہ لوگوں پر اس خبر کا اثر کیا ہو گا)

یہ وفد گیا تو دیکھا کہ یہ لوگ اطلاع سے بھی زیادہ خراب پوزیشن میں تھے۔ انہوں نے رسول اللہؐ کو برا بھلا کہا۔ اور کہا کون رسولؐ کس کی بات کرتے ہو۔ ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی عہد و معاہدہ نہیں ہے 'دفنہ آیا۔ انہوں نے رسول اللہؐ کو اطلاع دی۔ اشاروں کے ساتھ۔ رسول اللہؐ نے فرمایا اللہ اکبر! مسلمانوں تمہیں خوشخبری دی ہے (حضورؐ نے یہ الفاظ مسلمانوں کو ثابت قدم بنانے کے لیے کہے)۔

ابن اسحاق کہتے ہیں اب مصیبت دگنی ہو گئی۔ خوف پھیل گیا۔ اوپر اور نیچے سے دشمن آگئے اور اب مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔ بعض منافقین کھل کر سامنے آ گئے۔

معرکہ احد سے پہلے تو یہ صورت حالات تھی۔ لیکن جب اللہ کے نبی کو جنگ احزاب میں اللہ کی نصرت ملی اور دشمنان

مسلمانانِ خائب و خاسر ہوئے، انہیں کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ اللہ نے خود ہی مومنین کی طرف سے جنگ کی۔ حضورؐ مدینہ کی طرف کامیاب لوٹے۔ لوگوں نے اسلحہ رکھنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل جنگی حالت کی وجہ سے غسل کرنے لگے، آپؐ اسلحہ کے گھر تھے تو جبریل علیہ السلام آگئے۔ ”حضورؐ آپ نے اسلحہ رکھ دیا ہے۔“ حضورؐ نے فرمایا ”ہاں۔“ ”لیکن ملائکہ نے تو اسلحہ نہیں رکھا اور میں ابھی اس قوم کا پیچھا کر کے آرہا ہوں۔“ اس کے بعد حضرت جبریل نے فرمایا ”اللہ کا حکم ہے بنی قریظہ کی طرف پہنچو۔“ بنی قریظہ مدینہ سے کئی میل دور تھے۔ یہ واقعہ نماز ظہر کے بعد کا ہے۔ حضورؐ نے حکم دیا ”کوئی شخص نماز نہ پڑھے مگر دیار بنی قریظہ میں“ لوگ نکل پڑے۔ راستے میں نماز عصر کا وقت آ گیا۔ بعض لوگوں نے راستہ ہی میں نماز پڑھ لی اور انہوں نے کہا کہ رسول اللہؐ کا ارادہ صرف یہ تھا کہ جلدی پہنچو لیکن دوسروں نے کہا کہ ہم بنی قریظہ کی بستیوں سے ادھر نماز نہ پڑھیں گے لیکن اس پر کسی نے ایک دوسرے کو ملامت نہ کی۔ حضورؐ ان کے بعد پہنچے۔ مدینہ میں ابن ام مکتوم صاحب۔

عَسَىٰ وَتَوَلَّىٰ اِنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی کو والی مقرر کر دیا۔ جعنا حضرت علیؑ ابن ابی طالب کو دیا گیا۔ حضورؐ نے ان کا پیچھا دنوں تک محاصرہ کیا اور ان کو کہا کہ ہتھیار ڈال دو۔ جب ان پر معاملہ طویل ہو گیا تو انہوں نے سعد ابن معاذ رئیس اوس کے حکم پر ہتھیار ڈال دیئے۔ جاہلیت میں یہ ان کے حلفاء میں سے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ان کے ساتھ احسان کریں گے۔ جس طرح عبد اللہ ابن ابی ابن السلول نے اپنے دوستوں کے ساتھ کیا تھا اور ان کو رسول اللہ سے چھڑا لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سعد ابن معاذ بھی وہی کرے گا جو عبد اللہ ابن ابی نے کیا۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ سعد کو ایک تیر بازو کی بڑی رگ میں لگا ہوا تھا۔ اور اگر یہ رگ کٹ جائے تو وہ زخمی ہرگز تندرست نہ ہوتا تھا۔ یہ خندق کے ابتدائی دنوں ہی میں لگ گیا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے داغ دھوئے تھے اور مسجد کے اندر ہی ایک خیمے میں انہیں رکھ ہوا تھا تاکہ حضورؐ سہولت کے ساتھ ان کی تیمارداری کر سکیں اور سعد یہ دعا کیا کرتے تھے اے اللہ! اگر آپ نے ہمارے اور قریش کے درمیان ابھی مزید جنگیں لکھی ہوئی ہیں تو مجھے زندہ رکھ اور اگر ہمارے ان کے درمیان جنگ ختم ہو چکی ہے تو پھر یہ زخم بہت رہے اور پھر میری صرف یہ تمنا ہے کہ میری آنکھیں بنی قریظہ کے معاملے میں ٹھنڈی ہو جائیں۔ اللہ نے اس کی دعا قبول کی اور یہ مقدر کر دیا کہ وہ انہی کے فیصلے پر ہتھیار ڈال دیں اور یہ درخواست خود انہوں نے اپنی خوشی سے کی۔

اب رسول اللہؐ نے حضرت سعد کو مدینہ سے بلایا کہ وہ ان لوگوں کے بارے میں فیصلہ کریں۔ جب وہ آیا اور وہ ایک گدھے پر سوار تھا جو انہوں نے اس کے لیے خوب تیار کیا تھا تو اوس اس کے پاؤں پر پڑنے لگے۔ کہتے اے سعد ہم تیرے دوست ہیں۔ ان کے ساتھ احسان کرو، وہ تو تمہیں کر رہے تھے کہ اس کے دل کو ان کے لیے نرم کر دیں۔ سعد ابن معاذ خاموش ہیں اور کچھ بھی نہیں کہہ رہے۔ جب انہوں نے اصرار کر لیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ سعد اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈرے۔ تو انہوں نے جان لیا ہے کہ سعد درست فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔

جب سعد اس خیمے کے پاس گئے جو رسول اللہؐ کا خیمہ تھا، تو حضورؐ نے فرمایا ”اٹھو اپنے سردار کے احترام و استقبال

میں۔ مسلمان لٹھے اور اسے اتار۔ بہت سی اعزاز و احترام اور اکرام کے ساتھ۔ تاکہ ان کا فیصلہ اچھی طرح نافذ ہو۔ جب سعد بیٹھے تو حضور اکرمؐ نے فرمایا ان لوگوں نے اشارہ بنی قریظہ کی طرف۔۔۔ تمہارے فیصلے پر ہتھیار ڈالے ہیں۔ لہذا آپ جو چاہیں ان کے بارے میں حکم دیں۔ تو اس پر اس نے کہا ”کیا میرا حکم ان پر نافذ ہو گا؟“ حضور اکرمؐ نے فرمایا ”ہاں“۔ ”اور ان تمام لوگوں پر نافذ ہو گا جو اس خیمے میں ہیں؟“ تو آپؐ نے فرمایا ”ہاں“۔ پھر انہوں نے کہا اور وہاں جو لوگ ہیں ان پر بھی (اس وقت سعد نے حضور اکرمؐ کی جگہ کی طرف اشارہ کیا جبکہ وہ خود اپنا منہ بوجہ حیاء اور احترام و اکرام پھیرے ہوئے تھے) تو رسول اللہؐ نے فرمایا ”ہاں“۔ اس پر سعد ابن معاذؓ نے فرمایا: ”میں فیصلہ کرتا ہوں کہ ان کے جنگی لوگوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے اموال اور اولاد کو مال غنیمت بنا دیا جائے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا ”تم نے بے شک اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے اور اللہ نے یہ فیصلہ سب سے سمجھ سولت کے اوپر کر دیا تھا۔“

پھر حضورؐ نے حکم دیا کہ زمین میں گڑھے کھودے جائیں اور یہ لوگ باندھے ہوئے لائے گئے۔ ان کی گردنیں اڑادی گئیں۔ یہ لوگ سات آٹھ سو کے قریب تھے اور جو مرد عورتیں بالغ نہ تھے ان کو غلام بنالیا گیا۔ مقتولین میں میں ابن اخطب بھی تھا۔ یہ حسب معاہدہ ان کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا تھا۔

اس وقت سے یہودی ذلیل ہوئے اور آج کے بعد مدینہ میں نفاق کی تحریک کمزور پڑ گئی۔ منافقین کے سر نیچے ہو گئے اور اس سے قبل وہ جو کچھ کرتے تھے اب اس سے ڈر گئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دن کے بعد کفار نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کی۔ بلکہ اب حملے مسلمانوں کی طرف سے ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ مکہ اور طائف فتح ہوئے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہودیوں، مشرکین مکہ اور منافقین کی تحریکات کا تانا بانا ملا ہوا تھا اور جب یہودی مدینہ سے جلا وطن ہوئے تو یہ ریشہ دوانیاں ختم ہو گئیں اور آج کے بعد اسلامی مملکت کی بنیاد مستحکم ہو گئی۔ یہ ہے پس منظر اس قول ربانی کا۔

وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُواهُمْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَن صَيَّاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا (۲۶) وَأَوْرَثَكُم أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطْلُوهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (۲۷:۳۳) ”پھر اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا ان کی گڑھیوں سے انہیں اتار لایا اور ان کے دلوں میں اس نے اب رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کر رہے ہو؟ اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ صیاصی سے مراد قلعے ہیں اور وہ زمین جو مسلمانوں نے پامال نہ کی تھی وہ ارض بنو قریظہ تھی جو ان کی مملوکہ تھی۔ ان کے محلے کے ارد گرد اور یہ زمین بھی ان کے اموال کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھ آگئی۔ اور یہ اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ بنی قریظہ نے بغیر قتال کے زمین دے دی اور پامال کرنے سے مراد جنگ ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

وَ كَانَ اللَّهُ عَنِ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (۲۷۰۳۳) ان تمام واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی تمام امور اللہ کے اختیارات میں ہیں۔ اس پورے قصبے میں تمام امور کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور تمام واقعات کو دست قدرت کا نتیجہ بتایا گیا ہے تاکہ باقی مسلمانوں کے دلوں میں اللہ واقعات کے ذریعے بٹھانا چاہتے ہیں اور واقعات کے بعد پھر قرآن کو نازل کر کے بٹھانا چاہتے ہیں کہ اسلامی تصور حیات صاف اور ستمرا دلوں میں بیٹھ جائے۔

یوں یہ عظیم حادثہ یہاں اختتام کو پہنچا۔ اس کے اندر بے شمار سنن الہیہ 'بے شمار اعلیٰ قدریں' بے شمار ہدایات اور بے شمار اصول بیان کیے گئے تاکہ یہ چیزیں صاف صاف ہو کر جماعت مسلمہ کی زندگی کا حصہ بن جائیں۔

یوں یہ واقعات تربیت کے لیے ایک اچھا مواد ہیں اور قرآن میں ان کو جگہ دے کر اسلامی نمونہ حیات کے لیے معیار اور راہنما بنا دیا گیا۔ ان آیات کو اسلامی جماعت کا رخ قرار دیا اور ان کے تصورات کو اچھی طرح ان کی زندگی کے اندر بٹھا دیا گیا۔ اسلامی جماعت کے لیے اعلیٰ قدریں واضح کر دی گئیں اور ان ابتلاؤں اور آزمائشوں میں اسلامی کردار نکھر کر سامنے آ گیا۔

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ---- ۲۲

سورۃ الاحزاب - ۳۳ آیات ۲۸ --- تا --- ۷۳

سورۃ سبا - ۳۴ آیات ۱ --- تا --- ۵۴

سورۃ فاطر - ۳۵ آیات ۱ --- تا --- ۴۵

سورۃ یسین - ۳۶ آیات ۱ --- تا --- ۲۱

درس نمبر ۱۹۰ تشریح آیات

۲۸ --- تا --- ۳۵

یہ سورہ احزاب کا تیسرا سبق ہے اور یہ ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص ہے۔ ماسوائے اس کے آخری فقرے کے جس میں تمام مسلمین اور مسلمات کے لیے اجر عظیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سورہ کے آغاز میں ازواج مطہرات کو امہات المؤمنین کا لقب دیا گیا تھا اور اس لقب کے فرائض بھی بتائے گئے تھے اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس صفت کی وجہ سے ان کو بہت ہی عظیم مقام نصیب ہوا ہے۔ اس لقب کے بھی فرائض ہیں اور رسول اللہ کی بیویوں ہونے کی وجہ سے بھی فرائض ہیں۔ اس سبق میں ان فرائض کا ایک حصہ بیان ہوا ہے اور وہ اقدار بتائی گئی ہیں جن کے اعتبار سے گھرانہ نبوت ایک مثال ہونا چاہئے اور یہ ایک ایسا مقام ہونا چاہئے جس سے لوگ روشنی حاصل کریں یعنی گھرانہ نبوت روشنی کا مینار ہو۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا
وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأَسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ﴿۳۵﴾ وَإِن كُنْتُنَّ تُرِدْنَ
اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالْدارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا
عَظِيمًا ﴿۳۶﴾

”اے نبی! اپنی بیویوں سے کہو! اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ! میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔“

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نفس اور اپنے لہل بیت کے لیے بقدر کفایت زندگی بسر کرنے کا راستہ اختیار کیا یہ اس وجہ سے نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وسائل نہ تھے۔ عربوں کے ایک بڑے علاقے کو آپ نے فتح کر لیا تھا، اموال غنیمت کی کثرت تھی اور صدقات بہت جمع ہو رہے تھے۔ وہ لوگ بھی غنی ہو گئے جن کے پاس اس سے قبل نہ مال تھا اور نہ اخراجات کے لیے کچھ تھا۔ ان جیسے حالات کے باوجود ایک ایک مہینہ گزر جاتا اور حضور کے ہاں چولہا نہ جلتا اور حضور کے پاس جو کچھ آتا آپ بطور ہبہ صدقہ اور ہدیہ لوگوں میں بانٹ دیتے۔ لیکن یہ زندگی حضور نے اس لیے اختیار کی کہ آپ اس دنیا اور متاع دنیا کو بھی فتح کرنا چاہتے تھے اور صرف اللہ کے لیے خالص

ہونا چاہتے تھے۔ حضور اکرمؐ اپنی یہ خواہشات پوری کرنے کی پوزیشن میں تھے لیکن آپؐ نے ان رغبات کو رضا کارانہ طور پر ترک فرما دیا اور بلند رویہ اختیار کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عقیدے یا اپنی شریعت کی رو سے اس بات کے پابند نہ تھے کہ وہ یہ رویہ اختیار کس اور اپنے لال و عیال اور گمراہوں کو بھی اسی طرح رکھیں کیونکہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی شریعت کی رو سے طیبات حرام نہ تھیں۔ جب آپؐ کے سامنے یہ طیبات پیش کی جاتیں تو آپؐ ان کے تناول کرنے سے کبھی انکار نہ فرماتے۔ بڑا تکلف آپؐ استعمال فرماتے بشرطیکہ یہ چیزیں روئین میں آپؐ کے سامنے آجائیں، آپؐ خواہش لے کر ان کے پیچھے کبھی نہ جاتے اور نہ ان طیبات میں ڈوب جاتے اور اپنے آپؐ کو ان میں مشغول کر لیتے۔ آپؐ نے اپنی امت کو بھی اس بات کا حکم نہیں دیا کہ عام لوگ بھی آپؐ کی طرح زہد اور ورع اختیار کریں۔ ہاں جو شخص رضا کارانہ طور پر چاہے تو اختیار کر لے یعنی اپنے آپؐ کو لذائذ اور دنیا کی بیش و عشرت سے بند کرتے ہوئے اور دنیا کی رغبات اور ساز و سامان کے بوجھ سے اپنے آپؐ کو سربلند کرتے ہوئے اور ان بکھیزوں سے اپنے آپؐ کو آزاد کرتے ہوئے۔

لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواج مطہرات بہر حال عورتیں تھیں، بشر تھیں۔ ان کے اندر بھی انسانی خواہشات تھیں۔ ان کی فضیلت، ان کی کرامت اور سرچشمہ نبوت سے ان کے قرب کے باوجود ان کے دلوں میں بھی قدرتی خواہشیں اور چاہتیں ان کے نفوس کے اندر بھی زندہ تھیں۔ جب اللہ نے نبیؐ پر اور مسلمانوں پر ہر طرف سے مال و دولت کے دروازے کھول دیئے تو انہوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسب نفقت کے سلسلے میں کچھ مطالبات کیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس مطالبے پر خوشی کا اظہار نہ کیا بلکہ آپؐ کو یہ مطالبہ ناگوار لگا اور آپؐ نے ناراضی کا اظہار کیا۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان حالات میں زندگی بسر کرنا چاہتے تھے جو اللہ ان کے لیے پسند فرماتے تھے یعنی آزادی، بلندی اور قناعت اور معیار زندگی کے بارے میں لاپرواہی اور اس کے بارے میں معمولی مصروفیت سے بھی اجتناب اور آپؐ کی خواہش یہ تھی کہ آپؐ کی زندگی اور آپؐ کے زیر سایہ رہنے والوں کی زندگی دنیا کے تمام شوائب سے پاک اور بلند افق پر ایک روشن مثال نظر آئے۔ اس نقطہ نظر سے نہیں کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے؟ کیونکہ حدل اور حرام تو قرآن نے بیان کر دیئے تھے بلکہ اس زاویہ سے کہ آپؐ اپنے آپؐ کو زندگی کی ضروریات اور اس دنیا کی خواہشات اور دنیا کے جمیلوں سے آزاد اور سربلند رکھنا چاہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ازدواج مطہرات کے ان مطالبات سے اس قدر دکھ پہنچا کہ آپؐ نے صحابہ کرام کے ساتھ مجلس عام بند کر دی اور آپؐ گھر ہی میں بیٹھ گئے۔ صحابہ کرامؓ تو ہر بات برداشت کر سکتے تھے لیکن حضورؐ کا ان میں نہ بیٹھنا یہ اس کے لیے قابل برداشت نہ تھا۔ لوگ آئے، حضورؐ نے ان کو ملاقات کی اجازت نہ دی۔ امام احمد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ حضرت ابوبکر تشریف لائے اور لوگ آپؐ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تو آپؐ نے اجازت نہ دی۔ پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے اور انہوں نے اجازت طلب کی تو ان کو بھی اجازت نہ دی گئی۔ حضورؐ اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کو اجازت دے دی۔ یہ دونوں اندر حضورؐ کے پاس گئے۔ حضورؐ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ کے ارد گرد ازدواج مطہرات بیٹھی ہوئی تھیں اور آپؐ خاموش تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں ایسی بات کروں گا کہ حضور اکرمؐ ہنس پڑیں گے۔ حضرت عمرؓ نے کہ رسول خداؐ ابھی آپؐ کے سامنے اگر زید کی بیٹی، مرن، بیوی، مجھ سے نفقہ طلب کرے تو میں اس کی گردن توڑ دوں۔ اس پر حضورؐ ہنس پڑے یہاں تک کہ آپؐ کے دانت مبارک نظر آ گئے۔ حضورؐ

نے فرمایا: یہ سب میرے گرد جمع ہو گئی ہیں اور یہ فقہ اہی مانگ رہی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ لٹھے کہ حضرت عائشہؓ کو ماریں اور حضرت عمرؓ لٹھے کہ صفہ کو ماریں۔ دونوں یہ کہہ رہے تھے کہ تم دونوں ہرگز نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کچھ نہ مانگو جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مارنے سے روک دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس مجلس کے بعد ہم رسول اللہؐ سے وہ کچھ نہ مانگیں گی جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ نے خیبر نازل کر دیا ہے۔ حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے شروع کیا۔ حضورؐ نے فرمایا میں تمہارے سامنے ایک بات رکھتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ اس کے بارے میں جلدی نہ کریں اور اپنے والدین سے مشورہ کریں۔ انہوں نے کہا کیا ہے وہ؟ حضورؐ نے فرمایا

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ (۲۸.۳۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ”کیا میں آپ کے بارے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں! میں تو اللہ اور رسول کو اختیار کرتی ہوں اور میری درخواست ہے کہ آپ دوسری عورتوں سے اس کا ذکر نہ کریں کہ میں نے آپ کو جن لیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ نے مجھے سختی کرنے والا نہیں بنا کر بھیجا بلکہ معلم اور آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ جو عورت بھی مجھ سے پوچھے کہ عائشہؓ نے کیا فیصلہ کیا ہے تو میں ضرور انہیں بتاؤں گا۔ (مسلم)

بخاری میں ابو سلمہؓ ابن عبد الرحمنؓ اور عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ نے اپنے رسول کو یہ حکم دیا کہ اپنی بیویوں کو اختیار دے دیں تو آپ سب سے پہلے میرے پاس آئے۔ اور یہ فرمایا میں ایک بات آپ کے سامنے رکھتا ہوں لیکن آپ پر لازم نہیں ہے کہ آپ جلدی فیصلہ کریں۔ مناسب ہے کہ والدین سے مشورہ کر لیں۔ حضورؐ کو معلوم تھا کہ میرے والدین مجھے یہ مشورہ نہ دیں گے کہ تم رسول اللہؐ کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے یہ پڑھا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ (۲۸.۳۳) ”میں نے کہا کہ میں کس معاملے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں! اللہ اور رسول کے بارے میں یا دارالآخرۃ کے بارے میں۔

قرآن کریم کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی تصور حیات کے لیے مستقل قدس وضع کر دے اور ان قدروں کا مجسم اور زندہ ترجمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرنے میں ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کی ترجمان ہو اور یہ ترجمانی بیت نبوت میں نہایت ہی وضاحت اور تفصیل سے ہو کیونکہ یہ گھرانہ پورے کرۃ ارض کے مسلمانوں کے لیے روشنی کا مینار تھا اور رہنے والا تھا۔ ازواج مطہرات کو اختیار دینے والی یہ دو آیات نازل ہوئیں اور ان آیات نے طریقہ کار متعین کر دیا۔ وہ طریقہ اور منہاج یہ ہے کہ یا تو تم لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت اختیار کر سکو یا اللہ اور رسول اللہؐ اور دار آخرت کو حاصل کر سکو۔ انسان کا دل ایک ہوتا ہے اور اس ایک دل میں دو تضاد باتیں یک وقت نہیں سہکتیں۔ اللہ نے کسی ایک جسم میں دو دل پیدا نہیں کیے۔

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلِيلَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ (۳۳: ۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج نے یہ تودعہ کر لیا تھا کہ آج کی مجلس کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف وہ کچھ طلب کریں گے جو آپ کے پاس ہے۔ وہ نہیں طلب کریں گی جو آپ کے پاس نہیں۔ اس کے بعد پھر قرآن کریم کی ہدایت آئی تاکہ اصل مسئلہ کا فیصلہ کر

دے۔ مسئلہ یہ نہ تھا کہ آپ کے پاس کچھ تھا یا نہ تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ اللہ اللہ کے رسول اور دار آخرت کو تمام چیزوں پر ترجیح دے دیں یا وہ دنیا کی نعمت کے اسباب اختیار کر لیں۔ چاہے پوری دنیا کا مال و اسباب ان کے ہاتھ میں ہو یا ان کے گھر خرچے سے بھی خالی ہوں۔ اس تخیر کے بعد سب نے اللہ اور رسول اللہ اور دار آخرت کو چن لیا اور وہ لکھی ہوئیں جس کا تقاضا وہ مقام کرتا تھا جس میں وہ تھیں۔ وہ رسول کرم کے گھر میں تھیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس اختیار کے نتیجے میں بہت خوش ہوئے۔

مناسب ہے کہ اس واقعہ پر ہم قدرے غور کریں اور اس کے بعض گوشوں کو واضح کریں۔ یہ واقعہ اسلام کی قدروں کو بہت ہی واضح شکل میں پیش کرتا ہے اور دنیا اور آخرت کا شعوری احساس انسان کے اندر پیدا کرتا ہے۔ یہ واقعہ انسانوں کے دل سے ہر قسم کی غیر یقینی صورت حال اور ہر قسم کا شفق ختم کر کے رکھ دیتا ہے کہ کبھی ایک مسلمان دنیا پرست ہو جائے اور کبھی آخرت پرست۔ کبھی وہ بندہ نفس ہو اور کبھی بندہ خدا ہو۔ اللہ کے ساتھ خلوص اور آخرت کی فکر کی راہ میں جو بات بھی رکاوٹ بنتی ہے 'یہ واقعہ اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔

یہ تو ایک پہلو ہے 'دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضور کی حقیقی زندگی اس واقعہ سے ہمارے سامنے آتی ہے اور پھر ان انسانوں کی حقیقی زندگی بھی ہمارے سامنے آتی ہے جو حضور کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس زندگی میں جو اعلیٰ درجے کی خوبصورتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ زندگی انسانوں کی ایک معیاری زندگی ہے۔ یہ لوگ بشر تھے۔ بشریت کے خواص اور نقصان ان سے سلب نہ کر لیے گئے تھے۔ ان کا شعور انسانی تھا اور ان کے خصائص انسانی تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ بہت ہی اعلیٰ درجے کے بشر تھے 'باوجود اس کے کہ وہ اللہ اور آخرت کے ساتھ اعلیٰ درجے کا خلوص رکھتے تھے 'انسانی خواہشات اور انسانی شعور ان نفوس قدسیہ کے اندر سے ختم نہ کر دیا گیا تھا البتہ یہ نفوس بہت ہی سر بلند ہو گئے تھے۔ وہ دنیا کی آلودگیوں سے پاک ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود ان کی انسانیت 'طبیعت اور ان کی مٹی کی زندگی موجود تھی۔ ان کے رستے میں کوئی ایسی رکاوٹ نہ آ سکتی تھی جو ان کو اس مقام بلند تک پہنچنے سے روکتی جو انسانوں کے لیے مقدر تھا۔

انسان بعض اوقات یہ غلطی کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے لیے غیر حقیقی زندگی کے تصورات اپناتے ہیں یا ہم ان کو انسان کامل نہیں سمجھتے بلکہ تمام انسانی جذبات اور خواہشات ہی سے ان کو پاک کر دیتے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کو بلند درجہ دیتے ہیں۔ ہم ان کو پاک تصور کرتے ہیں اور ان کو نقص اور ضعف سے پاک سمجھتے ہیں۔

یہ پوری غلطی ہے کہ اس طرح ہم ان نفوس قدسیہ کو غیر حقیقی شخصیات بنا دیتے ہیں۔ ہم ان کے گرد لوہام کا ایک ایسا ہالہ بنا دیتے جس کے اندر ان کی کامل درجے کی انسانی صفات غائب ہو جاتی ہیں اس لیے ہمارے اور ان کے درمیان بشری رشتہ ختم ہو جاتا ہے اور ہمارے احساس کے اندر اس ہالہ کے اندر دن ایسی شخصیات بن جاتی ہیں جو مومنہ شخصیات ہوتی ہیں۔ ہم نہ ان کو چھو سکتے ہیں اور نہ ان کو ہاتھ لگا سکتے ہیں اور ہمارے شعور کے اندر یہ بات آ جاتی ہے کہ شاید وہ ایک ایسی مخلوق تھے جو ہمارے جیسے نہ تھے۔ وہ ملائکہ تھے یا ایسے لوگ تھے جو انسانی خواص سے عاری تھے۔ باوجود اس تصور اور تصویر کی خوبصورتی کے 'ہم اس کے دائرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ نہ ہم ان کے ساتھ ہم محفل ہو سکتے ہیں اور ان سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہمارے اندر ایک مایوسی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم ان جیسے کیسے بن سکتے ہیں 'ہم

ان جیسے کام کیسے کر سکتے ہیں؟ اور اس طرح سیرت رسولؐ اور سیرت صحابہؓ کا ایک اہم عنصر اور اہم محرک ہم سے چلا جاتا ہے یعنی ہمارے شعور کے اندر ان حضرت کی تقلید سے مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے اندر ان کا رعب بیٹھ جاتا ہے اور ہم ان کو فوق الفطرت مخلوق سمجھنے لگتے ہیں۔ ہماری واقعی اور عملی زندگی پر ان کا اثر نہیں ہوتا۔ پھر ہمارے اور ان شخصیات کے درمیان ہم آہنگی نہیں رہتی کیونکہ ہم ان کے ساتھ ہم آہنگ تب ہی ہو سکتے ہیں اور ان کے ہر قدم تب ہی ہو سکتے ہیں۔ جب ہم یہ شعور رکھتے ہوں کہ یہ لوگ دراصل انسان تھے 'بشر تھے'۔ وہ انسانی جذبات 'میلانات' اور خواہشات رکھتے تھے اور اس اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے وہی میلانات 'جذبات' اور خواہشات ہم بھی رکھتے ہیں۔ لیکن ہم ان کی طرح سر بلند نہیں ہوتے اور وہ ہو گئے۔

اس سے وہ حکمت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے رسولوں کو انسان اور بشر بنایا۔ نہ ملائکہ بنایا اور نہ کوئی دوسری مخلوق بنایا تاکہ رسولوں اور ان کے متبعین کے درمیان حقیقی ربط قائم ہو۔ یہ متبعین محسوس کریں کہ رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ ویسے ہی جذبات 'ویسا ہی شعور اور ویسی ہی سوچ اور ویسی ہی خواہشات رکھتے تھے جیسی ہم رکھتے ہیں لیکن انہوں نے باطن کو صاف کیا۔ اپنے آپ کو دنیا کی آلودگیوں سے ہلکا کیا۔ اس طرح وہ جلدی سے اٹھ کر مقام بلند تک پہنچ گئے لہذا متبعین انسانوں کی طرح رسولوں سے محبت کرتے تھے جس طرح ایک چھوٹا انسان بڑے انسان کا احترام کرتا ہے۔

پھر اس واقعہ میں ازدواج مطہرات کی طبعی خواہشات بھی سامنے آتی ہیں کہ ان کے گھر میں بھی ساز و سامان ہو۔ پھر حضور اکرمؐ کے گھر کا ماحول سامنے آتا ہے اور اس میں ازدواج مطہرات ایک بشر کی طرح اپنے خاوند سے ایسے حالات کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ حضور اکرمؐ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان کی گردن توڑ دیں البتہ اللہ تعالیٰ نہایت ہی شائستگی کے ساتھ ان پر جسمانی ضرب سے زیادہ سخت ضرب لگاتے ہیں۔ مارتے اس لیے نہیں کہ مسئلہ انسان کی جائز خواہشات کا ہے 'اسے پورا کیا جانا چاہئے اور خواہشات کو دبانے نہیں چاہئے۔ یہ معاملہ یوں ہی رہ جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تخمیر نازل فرماتے ہیں۔ ایسا اختیار جس میں ضرب نہیں ہے۔ کوئی دباؤ نہیں ہے 'کمل آزادانہ اختیار ہے۔ اور جب وہ آزادانہ اختیار کو بھی اپنی آزادی کے لیے نہیں بلکہ رسول کی فلاحی کے لیے استعمال کرتی ہیں تو حضورؐ بہت خوش ہوتے ہیں۔

پھر اس واقعہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت عائشہ کے لیے جذبہ محبت ہے اور وہ ہر میلان سے محبت کرتے ہیں۔ آپؐ چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت عائشہ اس مقام عالی پر فائز ہونے کا اعلان کر دیں جو اللہ کو حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لل بیت کے لیے پسند ہے۔ اس لیے آپؐ یہ جو بڑے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کے سامنے رکھتے ہیں اور آپؐ کی خواہش یہ ہے کہ وہ آپؐ کے ساتھ اس مقام بلند میں تعاون کریں اور دنیاوی آلودگیوں سے پاک ہو جائیں اس لیے آپؐ ان کو مشورہ دیتے ہیں کہ پیش آنے والی بات کے معاملے میں جدی فیصلہ نہ کریں اور والدین سے مشورہ کے بعد فیصلہ کریں۔ حضورؐ کو یقین تھا کہ وہ بہر حال آپؐ کے حق میں مشورہ دیں گے اور یہ جذبہ محبت جو حضرت عائشہؓ کے ساتھ تھا اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ کی جانب سے بھی کسی غلطی کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ وہ بھی اسے پاتی ہیں۔ یہ جذبہ انہیں بھی خوش کرتا ہے اور وہ اسے ریکارڈ پر لاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ بھی ایک بشر ہیں اور وہ اپنی اس چھوٹی بیوی سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ لہذا آپؐ پسند فرماتے ہیں

”نبی کی بیوی تم میں سے جو کسی صریح فحش حرکت کا ارتکاب کرے گی اسے دو ہرا عذاب دیا جائے گا“ اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی اس کو ہم دو ہرا اجر دے گے اور ہم نے اس کے لیے رزق کریم مہیا کر رکھا ہے۔“

یہ اس بلند مقام کا تقاضا ہے جس پر وہ فائز ہیں۔ وہ سرور دو عالم کی بیویاں ہیں۔ ان کو اسماء المؤمنین کا مرتبہ دیا گیا ہے اور یہ دونوں اعزاز ان پر بہت ہی بھاری ذمہ داریاں عائد کرتے ہیں۔ ان کا پہلا تقاضا ہے کہ تم تمام فحاشیات سے مکمل اجتناب کرو اگر بغرض محل ان میں سے کسی نے بھی فحاشی کا ارتکاب کیا تو اسے دو ہرا عذاب دیا جائے گا اور اس فرضی دھمکی کے درپے دراصل بتانا یہ مقصود ہے کہ وہ کس قدر بلند مقام پر فائز ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔

وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا (۳۳: ۳۰) ”اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے۔“ رسول اللہ کی بیویاں ہونے کے باوجود بھی اللہ کو کوئی نہیں روک سکتا کہ تمہیں سزا نہ دے۔ ذہن میں یہ بات آ سکتی ہے کہ رسول مختار صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو سزا دینے میں شاید کوئی رکاوٹ ہو اس لیے تردید کر دی گئی۔

وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُمْ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا (۳۳: ۳۱) ”اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک کام کرے گی۔“ قنوت کے معنی طاعت اور خضوع و خشوع ہیں اور عمل صالح قنوت کا صحیح ترجمہ ہے۔

لَوْ تَهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ (۳۳: ۳۱) ”تو اس کو ہم دو ہرا اجر دے گے۔“ جس طرح ان میں سے اگر کوئی فحاشی کا ارتکاب کرے تو سزا دینی ہوگی۔

وَاعْتَدْنَا لَهُا رِزْقًا كَرِيمًا (۳۳: ۳۱) ”اور ہم نے اس کے لیے رزق کریم مہیا کر رکھا ہے۔“ وہ حاضر ہے، تیار ہے، دو گئے اجر کے بعد رزق کریم مزید ہے، یہ اللہ کا فضل و کرم ہو گا۔

--- ○ ○ ○ ---

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ نبی کی ازواج مطہرات عام عورتوں کی طرح نہیں ہیں لہذا لوگوں کے حوالے سے بھی ان کے کچھ فرائض ہیں اور اللہ کی بندگی کرنے میں بھی ان کے کچھ فرائض ہیں۔ گھروں میں بھی ان کے فرائض ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اس عظیم گھرانے کا نگہبان اللہ خود ہے۔ اللہ اس گھرانے کی زندگی کو پاک و صاف کرنا چاہتا ہے۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارے گھروں کے اندر جس حکمت اور آیات الہیہ کا نزول ہو رہا ہے اس کے حوالے سے تم پر خاص ذمہ داریاں ہیں اور یہ گھریلو ماحول تمہیں تمام جہان کی ازواج اور عورتوں سے ممتاز کرتا ہے۔

يُنِسَاءُ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ إِنَّ
اتَّقِيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا

مَعْرُوفًا ۝ وَتَرَنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ
 الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ
 عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۝ وَاذْكُرْنَ مَا يُكَلِّفُ فِي
 بُيُوتِكُنَّ مِنَ الْآيَةِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ۝

۱ ”دنی کی پیروی، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دلی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں جلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں تنگ کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سچ دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیتؑ نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔ یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں، بے شک اللہ لطیف اور باخبر ہے۔

جب اسلام آیا تو اس وقت عربی معاشرے میں، تمام دوسرے جاہلی معاشرہ کی طرح حالت یہ تھی کہ عورت کو سامان نقیش سمجھا جاتا تھا اور فقط شہوت دانی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی نقطہ نظر سے اسے ایک گری ہوئی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ نیز عربی معاشرے میں جنسی اعتبار سے بھی بڑی بے قاعدگی اور افراتفری پائی جاتی تھی اور نظام خاندانی میں ثبات نہ تھا جس طرح اس سورہ میں ہم نے تفصیلات دی ہیں۔

پھر جاہلیت کے زمانے میں عورت کی صنف کی طرف نہایت گری ہوئی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور ذوق جمال بھی نہایت گرا ہوا تھا۔ ننگے اجسام کی طرف زیادہ توجہ تھی اور اعلیٰ اور پاکیزہ ذوق جمال مفقود تھا۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار کے اندر یہ خصوصیات اُسی طرح نظر آتی ہیں جو عورت کے جسم خصوصاً عورتوں کے اندامائے نہانی کے بارے میں تھیں اور پھر نہایت ہی عریاں افعال اور معانی سے متعلق اشعار سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

جب اسلام آیا تو اس نے عورت کو معاشرے میں ایک باعزت مقام دیا اور مرد اور عورت کے درمیان تعلق کے معاملے میں انسانی پہلو کو زیادہ اہمیت دی۔ کیونکہ مرد اور عورت کا تعلق محض جسمانی بھوک کو فرو کرنے ہی کا تعلق نہیں ہوتا اور نہ خون اور گوشت کے جوش کو ٹھنڈا کرنا مطلوب ہوتا ہے بلکہ مرد اور عورت کا تعلق دراصل دو انسانی شخصیات کا اتصال ہے جن کو نفس واحد سے پیدا کیا گیا ہے اور ان کے درمیان محبت اور شفقت پیدا کی گئی ہے۔ ان کے ملاپ کی وجہ سے دونوں کو راحت اور سکون ملتا ہے اور دونوں کے ملاپ کا ایک ہدف مقرر ہے اور اس وقت سے مقرر ہے جب سے اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ پھر اس کا مقصد زمین کی آبادی ہے۔ اس میں انسان نے سننِ لہیہ کے مطابق جو فرائض ادا کرنے ہیں، ان کا ادا کرنا ہے۔

اسلام نے خاندانی تعلقات کو لیا اور خاندانی تعلقات کو اس طرح منظم کیا کہ اسلام کی اجتماعی تنظیم کے لیے اسے اساس بنایا اور پھر خاندان کو ایک ایسی نرسری قرار دیا جس کے اندر آئندہ نسلوں کے لیے پورے تیار ہوتے ہیں اور اس نرسری کی نشوونما اور ارتقا اور تربیت کے لیے تمام ضروریات فراہم کیں اور اسے بچائے، پاک و صاف رکھنے کے

انتظامات کیے، خصوصاً نئی نسل کے شعور اور خیالات کو پاک و صاف رکھنے کے لیے۔

اسلام کے نظام قانون میں خاندانی نظام کی حفاظت کے لیے سب سے زیادہ قانون سازی کی گئی ہے اور قرآن کریم کی کئی آیات اس کے لیے مخصوص ہیں۔ قانونی اقدامات کے علاوہ بھی اسلام کے نظام اجتماعی کے اس ابتدائی یونٹ کو محفوظ کرنے کے لیے اسلام نے مسلسل ہدایات دی ہیں، خصوصاً اس یونٹ کی روحانی تطہیر کے لیے اور اس میں دو اہناف کے جنس تعلق کے زاویہ سے، اس تعلق کو مریانی، بے راہ روی سے پاک کیا گیا اور محض جسمانی ملاپ کے لیے بھی سخت ہدایات دی گئیں۔

اس سورہ میں بھی اجتماعی تنظیم اور خاندانی نظام کی پختگی کے لیے آیات کا ایک بڑا حصہ وقف ہے۔ آیات زیر بحث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواج مطہرات کو خطاب ہے۔ ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق، ان کا لوگوں کے ساتھ تعلق، ان کا اللہ کے ساتھ تعلق، اور ان کے بارے میں اللہ کے ارادے کا ذکر کیا گیا ہے۔

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا

(۳۳: ۳۳) (اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم لہل بیت نبی سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے)۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے وسائل ہیں جن کے ذریعہ اللہ نبی کے لہل بیت کو پاک کرنا چاہتے ہیں اور لہل بیت کے لیے ان کو لازمی قرار دیتے ہیں جبکہ ازدواج مطہرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں اور وہ اس زمین کی تمام عورتوں سے زیادہ پاک ہیں۔ ظاہر ہے کہ تمام دوسری عورتیں ان وسائل اور ان اقدامات کی بہت زیادہ محتاج ہیں۔ کیونکہ اگر ازدواج مطہرات کو ان وسائل کی ضرورت تھی جو نبی کے گھر میں رہتی تھیں تو دوسری بیویوں کو ان کی بدرجہ اتم ضرورت ہے۔

پہلا وسیلہ یہ ہے کہ ازدواج مطہرات کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ تم نہایت ہی اوسنچے مرتبہ اور منصب اور مقام پر فائز ہو چکی ہو۔ تم تمام نساء عالم سے بلند مرتبہ ہو، لہذا سب سے پہلے تم اپنے اس مقام بلند کا خیال رکھو اور اس کے تقاضے پورے کرو۔

يُنْسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّكَآءِ إِنْ أَتَقَيْتُنَّ (۳۳: ۳۲) ”نبی کی بیوی، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو“۔ اگر تم خدا کا خوف کرو تو تم عام عورتوں کی طرح نہ رہو گی۔ تم تو ایسے مقام پر بیٹھی ہو جو قابل رشک ہے، اور اس میں تمہارے ساتھ عام عورتیں شریک نہیں ہیں، اور نہ تم اس میں کسی کو شریک کرتی ہو۔ لیکن یہ امتیاز تمہیں تقویٰ سے حاصل ہو گا کیونکہ محض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قربت داری کچھ چیز بھی نہیں ہے بلکہ تقویٰ کے ساتھ اس قربت داری کے تقاضے بھی پورے کرنے ہوں گے خود اپنے نفوس کے اندر۔

یہ وہ دو ٹوک سچائی ہے جس کے اوپر یہ دین قائم ہے۔ اس کا اعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں کے سامنے کر دیا کہ لوگو! ہمیں رسول اللہ کی رشتہ داری کہیں دھوکہ میں نہ ڈالے۔ کیونکہ رسول خدا تمہارے معاملے میں کچھ اختیارات نہیں رکھتے۔ ”اے فاطمہ بنت محمد! اے صفیہ بنت عبدالمطلب! اے لوناد عبدالمطلب! میں تمہارے حق

میں اللہ کے ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ جہاں تک میرے مال کا تعلق ہے 'اس کے بارے میں تم جو چاہتے ہو' مجھ سے مانگ لو۔ (مسلم) دوسری روایت میں ہے "اے لیل قریش! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ۔ اے اولاد بنی کعب! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ! اے قاطعہ بنت عمر! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ! خدا کی قسم میں اللہ کے ہاں تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ ہاں میرے ساتھ تمہاری قربت ہے اور اس کا حق میں ادا کرتا رہوں گا۔" (مسلم ترمذی)

جب ان کو ان کی منزلت اور مقام سے آگاہ کر دیا گیا کہ اس مقام تک وہ صرف تقویٰ سے پہنچ سکتے ہیں تو اب اللہ تعالیٰ وہ ذرائع بیان فرماتے ہیں جن کے ذریعہ اللہ لیل بیت نبی کو مکمل طور پر پاک و صاف کرنا چاہتے ہیں اور ان کی مکمل تعمیر پیش نظر ہے۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ (۳۳: ۳۲) "تو دہلی زبان سے بات نہ کر دو کہ دل کی خرابی میں جھکا کوئی شخص لالچ میں نہ پڑ جائے۔" اللہ ازواج مطہرات کو پہلا حکم یہ دیتے ہیں کہ جب ان کو غیر محرم لوگوں سے بات کرنا پڑے تو ان کی زبان میں وہ لچک نہیں ہونا چاہئے کہ جو نرم اور دہلی زبان میں بات کریں تو سننے والے کے لیے شہوت انگیزی کا باعث ہو۔ کیونکہ بالعموم نرم باتوں سے مردوں کو اشتہا پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے اندر تحریک ہوتی ہے اور بیمار دل اور کمزور اخلاق کے لوگ برے خیالات دلوں میں لاسکتے ہیں۔

ذرا یہاں غور کریں کہ وہ کون خواتین ہیں جن کو اللہ یہاں ڈرا رہا ہے۔ یہ ازواج مطہرات ہیں۔ امہات المؤمنین ہیں جن کے بارے میں کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا اور نہ کوئی طمع کر سکتا ہے اور نہ کسی بیمار کی بیماری کا اثر ان پر پڑ سکتا ہے۔ بظاہر انسان ہی سوچ سکتا ہے۔ پھر یہ تنبیہ کس دور میں ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں 'ان ممتاز اور برگزیدہ صحابہ کرام کے دور میں جن کے معیار کے لوگ نہ پہلے گزرے اور نہ بعد میں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جس خدا نے مردوں اور عورتوں کو پیدا کیا وہ تو جانتا تھا کہ عورت اگر دہلی اور نرم زبان میں ناز و انداز سے بات کرے تو لوگوں کے دلوں میں غلط خیالات پیدا کر سکتی ہے اور دلوں میں فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ خصوصاً وہ دل جو پہلے سے مریض ہوں وہ تو فوراً اشتعال میں آسکتے ہیں اور یہ مریض دل ہر دور اور عہد میں موجود ہوتے ہیں۔ ہر معاشرے میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں اور ایسے مریض ہر عورت کی طرف مائل ہو سکتے ہیں چاہے وہ نبی آخر الزمان کی زوجہ محترمہ ہو امہات المؤمنین میں سے ہو۔ کوئی ماحول اس وقت تک پاک اور صاف نہیں ہو سکتا جب تک گندگی کے اسباب کا سد باب نہ کیا جائے۔

اور ہم آج جس معاشرے میں رہتے ہیں 'اس کا حال کیا ہے؟ یہ معاشرہ پہلے سے مریض 'ناپاک اور گرا ہوا ہے جس میں قدم قدم پر فتنے ہیں۔ ہر طرف شہوت انگیزیاں ہیں 'خواہشات پھڑپھڑاتی پھرتی ہیں۔ اس ماحول میں ہمیں کیا کرنا چاہئے جس میں ہر طرف سے شہوت کو اٹھایا جاتا ہے 'جگایا جاتا ہے 'اور جنس کو گرم سے گرم تر کیا جاتا ہے۔ اس معاشرے اور اس زمانے میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ہمارا دور جس میں عورتوں کا لہجہ نہایت لوج دار 'جن کی آواز نہایت ہن مائع 'نسوانیت کے تمام فتنے مجتمع کیے ہوئے 'جنسی کشش کے تمام فتنے پیدا کیے ہوئے 'نہایت ہی خوش الحانی اور فتنہ سامانی کے ساتھ ہر جگہ حاضر۔ ایسی عورتیں کہاں پاک ہیں اور پاکی کی نقا کہاں ہے۔ یہ تو اپنی حرکات 'اپنی آواز اور اپنی مریانی کے ذریعہ ان تمام گندگیوں میں ملوث ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ازواج مطہرات کو پاک کرنا چاہتے ہیں اور جس سے اللہ

اپنے عکار بندوں کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حالات میں مریانی اور اختلاط کس قدر خطرناک ہے!

وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا (۳۳: ۳۲) ”بلکہ صاف سیدھی بات کر دو“۔ پہلے ان کو نرم اور لوجھلوجھ آواز سے منع کیا گیا اور اب یہاں کہا گیا کہ وہ سیدھی سادی بات کس معروف طریقے کے مطابق۔ جس طرح عام طور پر ایک اجنبی مرد اور اجنبی عورت ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں۔ ان باتوں میں کوئی منکر بات نہ ہو۔ بعض اوقات نرم لہجے سے زیادہ موضوع گفتگو بھی بے راہ ردی پر آمادہ کر سکتا ہے۔ لہذا کسی اجنبی مرد اور عورت کے درمیان لب و لہجے کا اشارہ بھی نہ ہو۔ نہ ان کے درمیان گپ شپ ہو، نہ مزاح اور غیر سنجیدہ گفتگو ہو، تاکہ اس کے نتیجے میں کچھ دوسرے امور کی طرف میلان نہ ہو، اور قریب یا بعید لوگ غلط راستوں پر نہ پڑ جائیں۔

اللہ تعالیٰ خالق ہے اور اپنی مخلوق کے مزاج اور طبیعت کے بارے میں بہت ہی اچھا جانتا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو ہمت المؤمنین کو یوں مخاطب کر رہا ہے تاکہ وہ اپنے دور کے اجنبی لوگوں کے ساتھ اس انداز میں گفتگو کریں جبکہ وہ غیر القرون تھا۔

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (۳۳: ۳۳) ”اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو“۔ قرن، وقار سے ہے معنی ہیں بھاری ہوا، اپنی جگہ پر ٹھہر گیا۔ اس کے لغوی معنی یہ نہیں کہ گھروں کے اندر بند رہیں اور گھروں سے باہر ہی نہ نکلیں۔ یہ ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ عورت کی اصل جگہ اس کا گھر ہے۔ یہ ان کا مقرر ہے اور اس کے سوا وہ اگر کہیں پائی جائیں تو وہ عارضی حالت ہوگی اور استثنائی صورت ہوگی۔ اس پر وہ قائم و دائم نہیں رہیں گی۔ باہر محض ضرورت سے نکلتا ہوگا۔

بیت اور گھر عورت کا وہ مستقر اور جائے آرام ہے جو اللہ نے اس کے لیے از روئے تخلیق و فطرت پسند فرمایا ہے۔ جس میں وہ اپنی فطرت سے منحرف نہیں رہتی، غلط کاریوں میں ملوث نہیں ہوتی اور جہاں وہ ان مشغلت آمیز فرائض میں نہیں جتی ہوتی از روئے فطرت اس کے لیے تیار نہیں کیے۔ جہاں وہ اس کام میں لگی ہوتی ہے جس کے لیے دراصل اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔ ”اس لیے کہ اسلام گھر کے لیے ایک مخصوص فضا مہیا کر دے اور تاکہ بچوں کی پرورش اس فضا میں خوب سے خوب تر ہو سکے۔ اللہ نے مرد پر بیوی کا نفقہ لازم کیا، اور اسے لازمی قرار دیا تاکہ ماں کو معاشی جدوجہد نہ کرنا پڑے اور اسے محنت و حردوری میں وقت نہ لگانا پڑے، وہ پوری طرح مطمئن ہو کر بچوں کی تربیت کر سکے اور گھر کے نظام اور سہاوت اور خوشی کو دوبالا کر سکے۔ وہ عورت جو محنت کر کے تنہی ہاری ہوئی ہوتی ہے، جسے اپنی ملازمت کے فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں اور جس کے اوقات اور مصروفیات بیرون خانہ ہوں اور اس کی قوتیں وہیں خرچ ہوتی ہوں، اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ گھر کو خوشیاں دے سکے۔ اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ ہاتھوں بچوں کی پوری تربیت کر سکے۔ جو عورتیں ملازمت کرتی ہیں، ان کے گھر، ہوٹل اور ٹیکریوں سے زیادہ کوئی مقام نہیں رکھتے۔ ان کے اندر وہ کشش نہیں ہوتی جو گھر میں ہوتی ہے۔ حقیقی گھر تو وہ ہوتا ہے جس کی تخلیق ایک گھریلو عورت کرتی ہے اور گھر کی کشش بھی وہی ہوتی ہے جس کا منبع ایک اچھی بیوی ہو۔ گھر کی محبت کا سرچشمہ ماں ہوتی ہے۔ وہ بیوی، وہ ماں یا وہ عورت جو اپنا وقت ملازمت میں گزارتی ہے وہ گھر کو غلی اور حزن و ملال کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتی۔“ (اسلام اور عالمی سلامتی)

”عورت کا گھر سے نکلتا کسی گھرانے کے لیے بہت ہی بڑا حادثہ ہوتا ہے اور کبھی کبھار اس کی حقیقی ضرورت بھی ہوتی

ہے لیکن اگر کسی کو ضرورت نہ ہو تو اس صورت میں یہ عقل و خرد کے لیے ایک لعنت ہے اور اس کا رواج ان زمانوں میں ہوا جن میں شر و فساد اور بے راہ روی اور گمراہی بڑھ گئی اور انسانیت نے ہزیمت اختیار کر لی“ (ایضاً)
 رہا عورت کا بغیر کسی ضرورت کے یا بغیر کسی ملازمت کے گھر سے نکلنا اور مرد و زن کا بازاروں اور گلیوں میں اختلاط اختیار کرنا تو یہ وہ ہزیمت ہے جس کے بعد انسانیت گندگی کے دلدل میں گر جاتی ہے اور انسان حیوان کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عورتیں نماز کے لیے نکلتی تھیں اور اب بھی شرعاً اس کی ممانعت نہیں ہے۔ لیکن وہ ایک ایسا دور تھا جس میں لوگ حفت اور پاکیزگی کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ لوگوں کے اندر خدا خونی قہی اور عورت نماز کے لیے پوری طرح لپٹ کر نکلتی تھی۔ یوں کہ لوگ اسے پہچان نہ سکیں اور اس وقت خواتین اپنے مقامات فقہ ہرگز نہ ظاہر کرتی تھیں۔ کے باوجود حضرت عائشہؓ نے اس دور میں ان کا نکلنا ناپسند فرمایا۔

صحیحین میں روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا مومنین کی بیویاں حضورؐ کے ساتھ نماز صبح میں شریک ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنی چادروں میں لپی ولپس ہوتی تھیں اور اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔ اور صحیحین ہی میں ان کی روایت ہے کہ اگر حضورؐ وہ دور پاتے جس میں عورتوں نے نئی نئی باتیں ایجاد کر لی ہیں تو ان کو اسی طرح منع فرماتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کے دور میں عورتوں نے کیا نیا فیشن اختیار کر لیا تھا؟ اور وہ کیا تبدیلیاں تھیں کہ اگر حضورؐ دیکھتے تو عورتوں کو نماز سے منع کر دیتے۔ ذرا قیاس کرو کہ یہ خیر القرون تھا اور آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔

وَلَا تَبْرَجْنَ تَبَرُّجُنَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى (۳۳: ۳۳) ”اور سابق دور جاہلیت کی سی جج دجج نہ دکھائی پھرو۔“ یعنی جب کوئی تم میں سے باہر نکلنے پر مجبور ہو۔ اس سے قبل گھروں میں تک کر رہنے کا حکم دیا جا چکا ہے۔ جاہلیت کے دور میں عورتیں زیب و زینت کی نمائش کرتی تھیں لیکن رولیات میں اس جج دجج کی جو صورتیں مردی ہیں وہ سب کی سب بہت سادہ اور سنجیدہ ہیں۔ آج کے دور میں عورتوں نے جو عریانی اختیار کر رکھی اس کا دور جاہلیت سے بھی کوئی موازنہ نہیں ہے۔

مجاہد کہتے ہیں ”جاہلیت میں عورتیں نکلتی تھیں اور مردوں کے اندر پھرتی تھیں یہ تھا تبرج جاہلیہ“۔ قتادہ کہتے ہیں ”یہ نماز و انداز سے چلتی تھیں اس سے منع کیا گیا“۔ مقاتل ابن حیان کہتے ہیں ”عورتیں سروں پر دوشہ ڈالتی تھیں اور اسے یوں نہ لپیٹتی تھیں کہ وہ گردن کے زیورات کو ڈھانپ لے یا کانوں کے زیورات چھپالے۔ اس وقت گردن کا زیور اور کان کا زیور ظاہر ہوتے تھے“۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں ”عورت مردوں میں اس طرح نکلتی کہ اس کا سینہ کھلا ہوتا اور اس کے اوپر کچھ نہ ہوتا“ بعض اوقات اس کی گردن اور بالوں کی میٹھیسیاں نکلی ہوتیں اور کان کے بندے بھی ظاہر ہوتے۔ اللہ نے مومنات کو حکم دیا کہ وہ ان چیزوں کو ظاہر نہ کرس۔

یہ تھی جاہلیت کی جج دجج اور قرآن اس وقت کے برے آثار سے اسلامی معاشرے کو پاک کرنا چاہتا تھا تاکہ فتنے کے

تمام عوام اسلامی معاشرے سے ناپید ہو جائیں اور اسلامی معاشرے کے آداب، تصورات اور اس کا اجتماعی شعور اور ذوق بلند اور پاکیزہ ہو۔

ہم نے اسلامی معاشرے کی تعمیر میں ”ذوق“ کی تعمیر کو بھی شامل کیا ہے کیونکہ جسم انسانی کو ننگا دیکھنا ایک ایسا ذوق ہے جو نہایت ہی غلیظ اور ہمسندہ ذوق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ذوق منجیدہ اور مستقل اور منظم ذوق جمال کے مقابلے میں بددیانہ ہے۔ اس بددیانہ ذوق میں روح، عفت اور شعور کا ذوق مفقود ہوتا ہے۔

یہ کہ اسلامی معیار انسانی سطح کو بلند کرتا ہے اور انسان کو ترقی یافتہ بناتا ہے۔ سچیدگی اور وقار اپنی جگہ ایک خوبصورتی ہے۔ یہ حقیقی حسن ہوتا ہے لیکن اس حقیقی حسن کے ادراک و شعور سے سطحی اور جاہلی ذوق محروم ہوتا ہے۔ کیونکہ گرے ہوئے جاہلی ذوق کے مطابق حسن صرف گوشت و پوست میں ہوتا ہے اور جاہلی ذوق کا دایمہ یہی ذوق ہوتا ہے۔

قرآن کریم کی یہ آیات یہاں جاہلی حج و حج کی طرف اشارہ کر کے یہ قائل ہیں کہ یہ گری ہوئی جاہلیت کی باقیات ہیں اور جو لوگ جاہلیت کے دور کو لے کر کے آگے بڑھ گئے ہیں وہ اس معیار سے بلند ہو جاتے ہیں اور ان کا شعور اور ان کا ذوق جمال بھی جاہلیت کی سطح سے بلند ہوتا ہے۔

جاہلیت کسی متعین زمانے کا نام نہیں ہے۔ زمانہ جاہل نہیں ہوتا، لوگ جاہل ہوتے ہیں۔ جاہلیت ایک حالت کا نام ہے۔ اس میں لوگوں کے خاص تصورات ہوتے ہیں اور یہ حالت، یہ تصورات اور یہ رسم و رواج ہر زمان و مکان میں ہو سکتے ہیں۔

اس معیار کے مطابق ہم آج دور جاہلیت میں ہیں۔ بالکل اندھی جاہلیت میں۔ جس کا احساس غلیظ ہے، شعور غلیظ ہے جس کے تصورات حیوانی ہیں اور مقام انسانی سے فروتر زندگی میں لت پت مقام کو یہ شعور پسند کرتا ہے۔ جس کے اندر کوئی طہارت، پاکیزگی اور برکت نہیں ہوتی۔ انسانیت اس میں ڈوبی ہوئی ہے اور وہ اس معیار کے مطابق تعمیر نہیں چاہتی جس کے مطابق اسلام انسانی معاشرے کو پاک کرنا چاہتا ہے۔ اسے جاہلیت اوٹی کے باقیات کو فرائض کرنا چاہتا ہے اور یہ کام قرآن اور اسلام نے اٹل بیت نبویؐ سے شروع کیا ہے تاکہ وہ عام مسلمانوں کے لیے طہارت، کھافت اور روشنی کا مینار ہو۔

قرآن کریم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ یہ اقدامت کس۔ ازواج مطہرات کے دلوں کو اللہ سے جوڑ دے اور ان کا نصب العین بلند افق پر متعین کر دے۔ نہایت روشن، نہایت پاکیزہ اور یوں وہ اس روشن مینار تک بتدریج بلند ہو جائیں۔

وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (۳۳:۳۳) ”نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو“۔ اللہ کی بندگی اجتماعی طرز اور اجتماعی اخلاق کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی وہ راستہ ہے جس کے ذریعہ انسان اعلیٰ اور بلند اخلاق اور اجتماعی سطح تک بلند ہو سکتا ہے۔ اللہ کی بندگی ہی سالک کے لیے زاوہ راہ ہے۔ سالک کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کی بندگی کے لیے مدد لے۔ لہذا اللہ سے تعلق کی ضرورت ہے جہاں سے انسان کو مدد ملے اور اللہ کے ساتھ ایسے تعلق کی ضرورت ہے جس سے دل صاف اور پاک ہوتا

رہے۔ اللہ کے ساتھ ایسے مضبوط رابطے کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے انسان لوگوں کے متعارف طرز عمل سے اور موجودہ معاشرے کے رسم و رواج سے بالا ہو جائے۔ اس کے اندر یہ سوچ اور یہ شعور ہو کہ اللہ سے رابطہ لوگوں اور پورے معاشرے اور اپنے خاندان سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے انسان میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی تعلق باللہ کی طرف دعوت دے۔ یہ نہ ہو کہ ایک شخص اسلام کی روشنی سے خبردار ہوتے ہوئے، بھی دوسرے لوگوں کا پیروکار بن جائے اور وہ اس کی قیادت غلط اور تاریکی کی طرف کرے جو عموماً اللہ سے تعلق کٹ جانے کی وجہ سے ہر طرف چھا جاتی ہے۔

اسلام ہی ہر قسم کے مراسم عبودیت، ہر قسم کے اخلاق و آداب، ہر قسم کے قوانین اور ہر قسم کے دستوری انتظامات کا حامل دین ہے۔ یہ تمام امور ایک نظریہ حیات کے فریم ورک کے اندر ہیں اور یہ تمام امور اس فریم ورک میں رہتے ہوئے اسلامی نظریہ حیات کے مقاصد پورے کرتے ہیں۔ یہ سب شعبے باہم توافقی کے ساتھ ایک ہدف کی طرف بڑھتے ہیں اور اسی ہم آہنگی اور توافقی سے دین اسلام کا مجموعی ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ ان تمام عناصر کی موجودگی اور توافقی کے بغیر یہ دین ہرگز قائم نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ حکم دیا گیا کہ تم نماز کو قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اللہ اور رسول کی اطاعت کے اندر تمام شعوری سمت، تمام اخلاقی ہدایات، ہر قسم کا طرز عمل، خاندان اور اجتماعی معاملات میں رویہ سب کے سب سمٹ آتے ہیں۔ کیونکہ اسلام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کوئی ان کو قائم نہ کرے اور یہ مجموعی اطاعت شعاری ایک خاص مقصد کے لیے ہے۔

اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يَطَهِّرَ كُمْ تَطْهِيرًا

(۳۳: ۳۳) ”اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم لہل بیت نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور جنہیں پوری طرح پاک کر دے۔“ اس تعبیر میں کئی اشارات، سب کے سب محبت، شفقت، دلربائی اور نرمی سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ ”تم لہل بیت نبیؐ“ ہو اہل بیت میں تصریح تو نہیں لیکن نبیؐ کے گھر کی طرف اشارہ ہے۔ گویا دنیا میں یہی ایک عظیم گھرانہ ہے اور یہ گھرانہ اس صفت کا مستحق ہے۔ جب ”اہل بیت“ کہہ دیا تو گویا مراد بیت النبیؐ ہے۔ یہی اشارات خانہ کعبہ کے بارے میں قرآن میں ہوتے ہیں۔ اسے بھی ”اہل بیت“، ”بیت الحرام“ کہا جاتا ہے اور اسی معنی میں بیت نبیؐ کو بھی اہل بیت کہا گیا۔ گویا یہ عظیم گھرانہ ہے، یہی گھرانہ ہے۔

اور پھر یہ تعبیر کہ لے اہل بیت تم سے اللہ گندگی کو پوری طرح دور کر کے صاف کرنا چاہتا ہے یعنی نبیؐ کے گھرانے کو پاک کرنے کا کام خود اللہ نے سنبھال لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور کسی گھر کی تعمیر کے کام کی ذمہ داری خود لینا! گویا یہ لہل بیت نبیؐ کا نہایت ہی بلند مرتبہ ہے۔ یہ وہ ذات کہہ رہی ہے جس نے پوری کائنات کو کن لیکر لے لیا۔ اور وہ عزیز و جبار اور علیٰ کل شئیٰ قدیر ہے اور وہ اس کام کو کرنا چاہتا ہے تو یہ لہل بیت کے لیے بڑا اعزاز بھی ہے۔

یہ بات اللہ اپنی اس کتاب میں کہہ رہے ہیں جو آسمانوں پر پڑھی جاتی ہے۔ زمین پر پڑھی جاتی ہے۔ ہر دور اور ہر جگہ پڑھی جاتی ہے اور جس کی پیروی ہر دور میں کئی ملین لوگ کرتے چلے آئے ہیں اور جس کی تلاوت ہر وقت کئی ملین

لوگ کرتے ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ یہ لوا سر اور یہ ہدایات یہاں تطہیر اور پاکی کا وسیلہ بنائے جا رہے ہیں اور ان کے ذریعہ اس گھرانے کو پاک کرنا مقصود ہے۔ تطہیر تطہیر سے ہے ہندگی تب دور ہوتی ہے جب کوئی ایسے وسائل اختیار کرے جس سے وہ دور ہو اور یہ کام لوگ خود کس اور اپنی عملی زندگی کی تطہیر کس۔ لوگوں کے اندر پاکیزگی کا شعور ہو اور وہ قتل ہوں ان کا طرز عمل پاکیزہ ہو۔ وہ پوری طرح اسلام میں داخل ہو کر اپنی زندگی کا رخ اسلام کی طرف کر دیں اور اس کے اہداف اسلامی ہوں۔

لور، بحث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو مزید ہدایات پر ختم ہوتی ہے کہ ازواج مطہرات کو پھر یاد دلایا جاتا ہے کہ تمہارا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ دوسری عورتوں سے تم ممتاز ہو۔ اس لیے کہ تم سرور کونین کے گھرانے کی فرد ہو۔ تمہارے گھروں کے اندر قرآن نازل ہو رہا ہے۔ جو حکمت و دانائی پر مشتمل ہے۔ گویا تمہارے گھر حکمت و دانائی کے مقامات نزول ہیں۔ نور ہدایت اور ایمان کی بارشیں وہاں ہو رہی ہیں۔

وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا

خَبِيرًا (۳۳: ۳۴) ”یاد رکھو“ اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں بے شک اللہ لطیف اور باخبر ہے۔“ یہ وہ بلند مرتبہ ہے جس کا ان کو یاد دلانا ہی کافی ہے۔ ہر کوئی اس مرتبہ بلند کو محسوس کرتا ہے۔ یہ اللہ کا دیا ہوا بہت بڑا مقام ہے اور وہ انعام ہے جس کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ نصیحت اس خطاب اور تقریر کے آخر میں دہرائی جاتی ہے جو ازواج مطہرات کے سامنے اس وقت کی گئی جب ان کو اختیار دیا جاتا تھا کہ تمہیں اختیار ہے کہ تم دنیا اور اس کی زوہل پذیر آرائشوں کو پسند کرتی ہو یا اللہ اور رسول اللہ اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہو۔ دکھایا جاتا ہے کہ غور کر لو، اللہ نے تمہیں بہت ہی بڑی نعمت دی ہے اور یہ پوری زندگی اس کے مقابلے میں کوئی چیز بھی نہیں ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

نبی کے گھرانے کے بعد اب اسلامی سوسائٹی کے اندر تطہیر کے اسباب بھی نہایت تفصیل اور باریکی کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔ اس میں مرد اور عورتیں دونوں برابر ہیں۔

إِنَّ السُّلَمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَنِينَ
وَالْقَنَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ
وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّالِينَ
وَالصَّالِيَاتِ وَالْحَفِظِينَ وَالْحَفِظَاتِ وَالذَّكِرِينَ اللَّهُ كَثِيرًا

وَالذِّكْرُ لَا أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿۳۵﴾

”بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزے رکھنے والے ہیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔“

یہ تمام صفات جو اس آیت میں جمع کر دی گئی ہیں یہ نفس انسان کی تربیت اور تشکیل میں بہت ہی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ صفات کیا ہیں، اسلام، ایمان، اطاعت امر، راست بازی، صبر، اللہ کے آگے جھکنا، صدقہ دینا، روزے رکھنا، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنا اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنا۔ یہ تمام صفات ایسی ہیں کہ انسان کی شخصیت کی تعمیر اور کردار کی تشکیل میں بہت اہم ہیں۔ اسلام سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے، ایمان کے معنی یقین اور تصدیق کے ہیں اور ان کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ ہر ایک دوسرے کے لیے ایک شکل ہے۔ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کا مطلب انتہائی اور گہری تصدیق ہے۔ اور جہاں جی تصدیق ہو وہاں سر تسلیم خم کرنا خود بخود پایا جاتا ہے۔

قنوت کے معنی اطاعت امر کے ہیں لیکن اس اطاعت کے پیچھے ایمان اور اسلام موجود ہو۔ یہ اطاعت اور اس کا داعیہ اندر سے ہو، محض جبریہ نہ ہو۔ خوشی سے ہو، اگر اہ سے نہ ہو۔

صدق ایک مسلمان کی عمومی صفت ہے اور ایک عمومی لباس ہے، اور جو سچا نہ ہو وہ امت مسلمہ سے خارج تصور ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

أَنَّمَا يُفْتَرَى الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ”جھوٹ وہی باندھتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے۔“۔ جھوٹا اسلامی مفہوں سے نکال دیا جاتا ہے کیونکہ امت کی صف سچوں کی صف ہے۔

ممبر وہ صفت ہے جس کے سوا ایک مسلم اور مومن اپنے فرائض سرانجام دے ہی نہیں سکتا۔ مومن ہر وقت ممبر کا محتاج ہے، قدم قدم پر۔ نفسانی خواہشات پر ممبر، دعوت اسلامی کی راہ میں مشکلات پیش آنے پر ممبر۔ لوگوں کے اذیت دینے پر ممبر۔ دلوں کی کمزوریوں، دلوں کے تلون اور کجی پر ممبر، ابتلاء، امتحان اور مشکلات پر ممبر، خوشی اور غم پر ممبر۔ فرض ہر صورت میں ممبر اور سنجیدگی ایک مشکل اور ضروری کام ہے۔

خشوع اور خشیت دلی اور ظاہری اعضا دونوں کی صفت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قلب اور اعضاء دونوں اللہ کی کبریائی، اللہ کی ہیبت اور عظمت کو محسوس کر رہے ہوں اور اللہ سے ڈرتے ہوں۔

روزہ کو بھی مومن کی صفت قرار دیا گیا ہے۔ اشارہ اس طرح ہے کہ روزہ رکھنا اور اس کا انتظام اور استقبال کرنا مومنین کی صفات میں سے ہے۔ روزہ کے ذریعہ خواہشات، ضروریات کی چاہت کو ایک محدود وقت کے لیے روکنا مطلوب ہوتا ہے اس میں صبر بھی شامل ہے۔ قوت ارادی کی پختگی بھی مطلوب ہے اور انسانی صفات کا حیوانی صفت پر غلبہ مطلوب ہے۔

حفظ فروج، شرم گاہوں کی حفاظت کرنا، اور اس طرح پاکیزگی اختیار کرنا، اور تہرے فطری میلانات پر قابو پانا۔ رکعت

جو انسانی ذلت کا حصہ ہوتے ہیں اور اس کے اندر گہرائی تک موجود ہوتے ہیں۔ یہ میلانات اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ ان پر قابو دہی لوگ پا سکتے ہیں جن کو اللہ کی نصرت اور معاونت حاصل ہو۔ پھر اس کے ذریعہ سوسائٹی میں مرد و زن کے باہم تعلق کی تنظیم بھی مطلوب ہے۔ اور انسان کو اعلیٰ اور ارفع مقاصد کی طرف متوجہ کرنا مطلوب ہے۔ مرد اور عورتوں کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے جنسی میلانات اور خواہشات کو شریعت کے تابع بنائیں۔ اس میں بہت بلند حکمت کار فرما ہے اور انسان اس ضابطہ کی پابندی سے اس زمین پر اپنے فرائض اچھی طرح ادا کر سکتا ہے۔

اللہ کا ذکر کثیر۔ یہ وہ صفت ہے جس سے انسان کی پوری زندگی مربوط ہو جاتی ہے۔ زندگی کے اعمال نظریہ حیات سے مربوط ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک انسان کا دل ہر وقت اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ اس نے اللہ کی رسی اور رابطہ مضبوطی سے پکڑا ہوتا ہے۔ اس کا کوئی خیال، کوئی تصور اور عمل اس رابطے سے باہر نہیں ہوتا۔ پھر اللہ کی یاد سے اس کا دل نور ربانی سے منور، پاک اور صاف ہوتا ہے۔ ایسے انسان کی پوری زندگی صاف ستھری اور روشن ہوتی ہے۔

جن لوگوں میں یہ صفات جمع ہو جائیں وہ مل کر ایک ایسی شخصیت بناتے ہیں جو ایک کامل شخصیت ہوتی ہے۔ اس دنیا میں بھی ممتاز اور آخرت میں۔

أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (۳۳: ۳۵) ”اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔“ یوں ان آیات نے ایک مسلم اور مسلمہ کی شخصیت کے بنیادی عناصر یہاں منولائے ہیں۔ یہ آیت ان ہدایات کے بعد آئی ہے جو اس سبق کے آغاز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئیں۔ یہاں مردوں کے ساتھ ساتھ خصوصاً عورتوں کا بھی ذکر کیا گیا تاکہ یہ بتایا جائے کہ بحیثیت مسلمان اور انسان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور معاشرے میں جو اسلامی حیثیت مرد کی ہے وہ عورت کی بھی ہے۔ اسلامی نظریہ حیات، ایمان، عبادت، اخلاق اور زندگی کے ہر طرز عمل میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے۔



درس نمبر ۱۹۱ ایک نظر میں

یہ سبق بھی اسلامی سوسائٹی اور اسلامی جماعت کے درمیان باہم روابط کو مضبوط کرنے کے لیے ہے۔ یہ سبق دراصل اسلامی سوسائٹی سے رسم تنہیت کو ختم کرنے اور نئے اسلامی معاشرے میں روابط کو اپنے حقیقی اصولوں پر قائم کرنے کے لیے ہے۔ اللہ نے اس رسم کو ختم کرنے کے لیے اس کا عملی آغاز خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کر لیا۔ اہل عرب کے اندر یہ رواج تھا کہ جس طرح بیٹے کی مطلقہ حرام ہوتی ہے اسی طرح معنی (منہ بولے بیٹے) کی مطلقہ بھی اس شخص پر حرام سمجھی جاتی تھی۔ اسلامی معاشرے میں معنی کی مطلقہ عورت کو حلال قرار دینے کے لیے کسی مثال اور نظیر کا پایا جانا ضروری تھا۔ کسی مثال کے بغیر محض قانون بنانے سے یہ تبدیلی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ اللہ نے اس فرض کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب کیا اور یہ اس قدر عظیم بوجھ تھا جس طرح رسالت کا بوجھ ہوتا ہے۔ اس واقعہ کا جو رد عمل ہوا اس نے ثابت کر دیا کہ رسول اللہ کے سوا کوئی اور شخص اس رسم کو نہیں توڑ سکتا تھا۔ یہ رسم معاشرے میں بہت ہی گہری جڑیں رکھتی تھی اور آپ کے سوا کسی کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ایسا انوکھا اور نامانوس کام کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد جو طویل تبصرہ آیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا تعلق خدا سے کیسا ہونا چاہئے۔ آپس میں کس طرح ہونا چاہئے اور ان کے درمیان نبی کے فرائض کے حوالے سے ان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ یہ سب اقدامات لوگوں کی آسانی کے لیے کیے گئے اور اس لیے کیے گئے کہ لوگ تسلیم و رضا سے اللہ کے احکام کو دل کی خوشی کے ساتھ قبول کریں۔ اس واقعہ کے بیان سے قبل یہ اصول بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اللہ اور رسول اللہ کا حکم ماننا لازمی ہے۔ اگر اللہ اور رسول اللہ کوئی فیصلہ کر دیں تو پھر مسلمانوں کو کسی بھی ایسے معاملے میں چوں چہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم عربوں کے اندر گہری جڑیں رکھتی تھی اور اسے آسانی سے ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ ایک سخت رسم تھی۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۱۹ تشریح آیات

۳۶ --- تا --- ۴۸

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا

”کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔“

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت زینب بنت عسلؓ کے بارے میں اتری ہے۔ حضورؐ نے چاہا جماعت مسلمہ کے اندر جو طبقاتی فرق پایا جاتا ہے اسے پاش پاش کر دیا جائے اور لوگ اسی طرح برابر ہو جائیں جس طرح ایک گنگھی کے دندانے ہوتے ہیں۔ تقویٰ کے سوا کسی کو دو سروں پر فضیلت حاصل نہ ہو۔ اس دور میں آزاد کردہ غلاموں کو ”موالی“ کہتے ہیں۔ اور یہ لوگ عام لوگوں سے ذرا کم تر سمجھے جاتے تھے۔ رسول اللہؐ کے آزاد کردہ غلام زید ابن حارثہ ان میں سے ایک تھے۔ ان کو رسول اللہؐ نے معینی بن دیا تھا۔ حضورؐ نے یہ مثال قائم کرنا چاہی کہ نبوہاشم کی ایک شریف زادی کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا جائے جو حضورؐ کی قرہی بھی تھی یعنی زینب بنت عسلؓ کا نکاح زید سے کر دیا جائے تاکہ یہ طبقاتی فرق ختم ہو جائے اور یہ کام وہ خود اپنے خاندان میں کر دیں۔ یہ بات یہاں نوٹ کرنا چاہئے کہ جس طرح معینی کی رسم بختہ اور شدید تھی اسی طرح معاشرے میں آزاد شدہ غلاموں کو بھی کم درجے کے لوگ سمجھا جاتا تھا۔ اس فرق کو بھی خود حضور اکرمؐ کے عملی قدم ہی سے ختم کیا جاسکتا تھا تاکہ جماعت اس کی تقلید کرے اور پوری انسانیت ایک ہی راہ پر گامزن ہو جائے۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے عوفی کی ایک روایت نقل کی ہے کہ ریر تفسیر آیت مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ کی شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید ابن حارثہ کے لیے ایک دوشیزہ کے لیے بیخود دینا چاہا تو آپ زینب بنت عسلؓ اسدیہ کے پاس گئے۔ آپ نے ان کو پیغام دیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں اس کے ساتھ نکاح نہیں کرنا چاہتی۔ حضورؐ نے فرمایا تم اس کے ساتھ نکاح کر لو۔ اس پر اس نے کہا کہ میں اس پر غور کروں گی۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا (۳۳:۳۶) تو اس پر زینب نے کہا رسول خداؐ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں کہ میرا نکاح اس کے ساتھ ہو؟ تو حضورؐ نے فرمایا ہاں میں نے تو یہ فعل کر دیا ہے۔ تو اس پر اس نے کہا اچھا مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ میں رسول خدا کی نافرمانی نہیں کروں گی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے نکاح میں دے دیا۔

ابن الحید نے ابو عمرہ سے 'مکرمہ' سے 'ابن عباس' سے 'فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے زینب بنت جحش کا رشتہ زید ابن حارثہ کے لیے طلب کیا۔ اس نے اسے پسند نہ کیا اور کہا میں اس سے حسب و نسب میں برتر ہوں 'یہ ایک سخت مزاج عورت تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ (۳۳:۳۶) میں تفسیر مجاہد 'قوادہ' مقاتل ابن حیان نے کی ہے کہ یہ آیت زینب بنت جحش کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس وقت نازل ہوئی جب حضورؐ نے ابن کا رشتہ زید ابن حارثہ کے لیے طلب فرمایا۔ پہلے اس نے انکار کیا اور پھر قبول کر لیا۔

ابن کثیر نے تفسیر میں ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے کہ عبد الرحمن ابن زید ابن اسلم کا کہنا یہ ہے کہ یہ آیت ام کلثوم بنت عقبہ ابن ابو معیط کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ صلح حدیبیہ کے بعد پہلی عورت تھی جو ہجرت کر کے آگئی تھی۔ اس نے اپنا نفس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بخش دیا تھا۔ تو حضورؐ نے فرمایا اچھا میں نے قبول کر لیا۔ حضورؐ نے اسے زید ابن حارثہ کے نکاح میں دے دیا [شاید زینب کے فریق کے بعد] اس پر یہ عورت اور اس کا بھائی ناراض ہو گئے۔ انہوں نے کہا ہم نے تو حضور اکرمؐ کو بخشا تھا 'انہوں نے اپنے غلام کو بخش دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا (۳۳:۳۶) وہ کہتے ہیں 'قرآن میں اس سے بھی زیادہ جامع حکم آیا ہے۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ (۳۳:۶) "نبی تمام مومنین کے لیے ان کی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں"۔ انہوں نے کہا کہ پہلی آیت خاص ہے اور یہ جامع ہے۔

امام احمد نے ایک تیسری روایت بھی نقل کی ہے۔ عبد الرزاق سے 'معمر سے 'ثابت نباتی سے 'حضرت انسؓ سے حضورؐ نے انصاریوں کی ایک عورت کے بارے میں جلیب کے لیے اس عورت کے والد کو پیغام بھیجا تو اس شخص نے کہا کہ میں اس کی ماں سے مشورہ کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا 'اچھا مشورہ کر لیں۔ یہ شخص بیوی کے پاس گیا اور اس نے اس کا تذکرہ کیا تو عورت نے کہا خدا کی قسم حضور اکرمؐ کو جلیب کے علاوہ کوئی نہیں ملا۔ اور ہم نے تو فلاں فلاں کا پیغام رد کیا ہے۔ یہ لڑکی پر دے میں سن رہی تھی۔ یہ شخص حضورؐ کی طرف نکلنے لگا کہ حضورؐ کے سامنے انکار کر دے۔ تو اس لڑکی نے کہا کیا تم لوگ رسول اللہؐ کے حکم کو رد کر رہے ہو۔ اگر حضورؐ تمہارے لیے اس بات کو پسند کرتے ہیں تو منظور کرو۔ گویا اس نے اپنے والدین سے برتر رویہ اختیار کیا۔ دونوں نے کہا یہ ٹھیک کہتی ہے تو یہ شخص حضورؐ کے پاس گیا کہ اگر آپ راضی ہیں تو ہم راضی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا میں تو راضی ہوں۔ کہتے ہیں اس نے لڑکی جلیب کو نکاح کر کے دے

یہ ایک آزاد کردہ غلام تھا۔

ہم نے یہاں تیسری روایت کو بھی نقل کر دیا ہے جس کا تعلق جلیب سے تھا۔ کیونکہ اس کا تعلق ایک لڑکی مہم سے ہے جس کے درمیان حضور اکرمؐ خاندانی روایات کی ذہنیت کو توڑنا چاہتے تھے کیونکہ اسلام معاشرتی مساوات قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی سوسائٹی کو جدید تصورات پر استوار کیا جائے۔ اس کرۂ ارض کی زندگی کے لیے اسلام نے جو قدس وضع کیں ان کے مطابق اسلام نے لوگوں کے فضول روایاتی بندھنوں سے آزاد کرنے کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس مہم کا تعلق اس روح سے تھا۔

یہاں آیت کی عبارت کسی مخصوص واقعہ سے عام ہے۔ اس کا تعلق رسم تنہی کے مٹانے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشن کی مظاہرہ کے ساتھ نکاح جائز ہے اور اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے زینب سے نکاح کر لیا جبکہ زید نے اسے طلاق دے دی۔ اس پر مدینہ میں ایک غلغلہ بلند ہو گیا اور آج بھی بعض دشمنان اسلام اس کو بنیاد بنا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تنقید کرتے ہیں۔ اسی واقعہ کے اوپر افسانوں کی حمیں چڑھاتے ہیں۔ چاہے سب خروں وہ ہو جو ان روایات میں آیا ہے یا زینب بنت محسن کے ساتھ آپ کا نکاح ہو۔ لیکن یہ اصول بہت عام ہے کہ اللہ و رسول جو فیصلہ کر دیں اس کے بعد مسلمانوں کو اس موضوع پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔

غرض اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی عناصر میں سے یہ عنصر ایسا تھا جو پہلی جماعت مسلمہ کے دلوں میں پوری طرح بیٹھ گیا تھا۔ ان کے دلوں میں اس کا یقین آگیا تھا اور ان کا شعور اس میں ڈوب گیا تھا۔ یہ عصر کیا تھا؟ یہ کہ ان کے اختیار میں 'اسلام لانے کے بعد' اب کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ بذات خود 'ان کی تمام مملوکات' اور ان کے جذبات سب کے سب اللہ کے اختیار میں ہیں 'وہ جس طرح چاہے' ان کو بھروسے اور یہ کہ ان کی حیثیت وہی ہے جس طرح اس کائنات کی ہے۔ وہ اس کا حصہ ہیں اور اللہ اسے جس طرح چاہتا ہے 'چلاتا ہے'۔ جس طرح اللہ اس کائنات کی دوسری چیزوں کو چلاتا ہے اور اس اس عظیم وجود کے چلانے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو فرائض مقرر کر دیئے ہیں وہ ان کے مطیع ہیں۔ ان کے لیے اس عظیم ایجنٹ پر جو کردار متعین کر دیا گیا ہے وہ اسے پورا پورا ادا کریں گے۔ ان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے خود کوئی کردار متعین کریں۔ کیونکہ جو قصہ انہوں نے پیش کرنا ہے وہ خود اس سے زیادہ خیر دار نہیں ہیں۔ نیز وہ اپنے لیے کوئی حرکت یا کردار خود پسند نہیں کرتے۔ اس طرح کسی بھی کھیل کا پورا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ وہ اس کھیل کے ڈائریکٹر نہیں ہیں۔ یہ تو کردار ہیں اور ڈائریکٹر کے مطیع فرمان ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے کردار کا معاوضہ طے شدہ ہے۔ یہ اپنا کردار ادا کریں اور معاوضہ باقی 'ان کو کوئی چوں و چرا کا اختیار نہیں ہے۔

انہوں نے اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ اسلامی نظام کے تمام اجزاء کو قبول کر لیا ہے۔ اس لیے معاہدے کے بعد اب ان کے پاس ان کے اختیار میں کوئی چیز باقی نہیں ہے اور جس طرح یہ کائنات حکم الہی سے چل رہی ہے یہ تربیت الہیہ کے مطابق چلیں۔ ہر تمام حرکات میں اپنا متعین کردار ادا کریں اور اپنے مدار میں اس طرح چلیں جس طرح کرات اپنے اپنے مدارات میں چلتے ہیں نہ ادھر نہ ادھر 'نہ آگے نہ پیچھے'۔ تمام دوسرے کرات کے توازن کے ساتھ۔

ان لوگوں نے سر تسلیم خم کر دیا 'ان سب حادثات کے لیے جو تقدیر الہی نے ان کے لیے مقدر کر دیئے ہیں۔ ان کا اندرونی شعور اس بات کو تسلیم کر چکا ہے کہ جو کچھ پیش آتا ہے اللہ کے حکم سے پیش آتا ہے۔ ایک شخص کے لئے ہر

حادثہ ہر حالت اللہ کی آوردہ ہے اور وہ مانتے ہوئے خوش خوشی سے نہایت اطمینان سے اللہ کی تقدیر کو قبول کرتا رہے۔ آہستہ آہستہ ان کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ اللہ کے فیصلوں کو نہ سمجھتے تھے۔ جب ان پر نازل ہو جاتے۔ نہ وہ ٹکا ہر داری کرتے ہوئے جزع و فزع سے اپنے آپ کو بچتے تھے یا وہ کوئی تکلیف محسوس کرتے تھے مگر صبر و مصابرت سے کام لے کر خاموش ہو جاتے تھے بلکہ ان کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ اللہ کے فیصلوں کا استقبال کرتے تھے جیسے وہ پہلے سے خبردار ہوں اور ان کے انتظار میں ہوں۔ جو فیصلہ آرہا ہے وہ ان کے حس و شعور میں ہے۔ ان کو معلوم ہے اور ان کے ضمیروں آواز ہے۔ کوئی اچھا کوئی اٹھکا پن اور کوئی بدک ان کے اندر نہ پیدا ہوتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ وہ یہ نہ چاہتے کہ آسمانوں کی رفتار ذرا تیز ہو جائے اور وہ کام صدی سے ہو جائیں جو وہ چاہتے تھے۔ اور وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ کچھ واقعات جلدی وقوع پذیر ہوں تاکہ ان کی بعض ضروریات پوری ہو جائیں۔ وہ اپنے طریقے کے مطابق تقدیر الہی کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اور یہ تقدیر الہی جہاں ان کو پہنچ رہی تھی وہ اس پر راضی ہو جاتے تھے 'خوش ہوتے تھے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ اس راہ میں خرچ کر رہے تھے۔ جان تک قربان کر دیتے تھے 'مال خرچ کر دیتے تھے 'نہ جلدی کرتے' نہ تنگی محسوس کرتے 'نہ غرور کرتے اور نہ حسرت کرتے۔ ان کو پوری طرح یقین تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے 'یہ اللہ کا فیصلہ ہے' جو اللہ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور ہر کام کے لیے ایک وقت متعین ہے اور ریکارڈ شدہ میعاد ہے۔

ان کے قدم پوری طرح اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اٹھتے تھے۔ ان کی حرکات اللہ کی ڈائریکشن کے مطابق تھیں۔ وہ امن 'بھروسے اور یقین کا پورا شعور رکھتے تھے۔ وہ نہایت سادگی 'نرمی اور آسانی سے تقدیر کے ساتھ چلتے تھے۔

اس تسلیم و رضا کا یہ اثر نہ تھا کہ وہ غم نہ کس یا ان کے پاس جو کچھ تھا 'اسے سب کا سب لکھ دیں' یا وقت اور جدوجہد میں عقیدہ تقدیر کوئی کمی کس۔ وہ اسباب سے قطع نظر نہ کرتے تھے۔ وہ ایسی باتیں اپنے اوپر نہ لیتے تھے جس کی ان کے اندر قدرت نہ ہو۔ مالا یطاق ہوں۔ وہ بشریت اور اس کے حدود و قیود سے بھی نہ نکلتے تھے۔ ضعیف بھی تھے 'قوی بھی تھے۔ وہ ان باتوں کا دعویٰ نہ کرتے تھے جو ان میں نہ تھیں 'وہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ ایک کام انہوں نے نہ کیا ہو اور اس پر ان کی تعریف کی جائے 'نہ وہ ایسی باتوں کا دعویٰ کرتے تھے جو انہوں نے کی نہ ہوں۔

اللہ کی تقدیر کے سامنے مطلقاً سر تسلیم خم کر دیتے اور پھر عملاً جدوجہد کرتے جہاں ان کی طاقت ہو۔ ہر کام کے درمیان انہوں نے ایک حسین توازن قائم کر دیا تھا اور جو بات ان کی استطاعت میں تھی وہ کرتے تھے۔ جماعت اول کے کردار میں یہ توازن نہایت مکمل تھا۔ اور یہ توازن ان کا خصوصی امتیاز تھا۔ یہی توازن تھا جس کی وجہ سے وہ اس عظیم لمانت کے اٹھانے کے لائل ہوئے 'جس کے اٹھانے سے پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا تھا۔

اسلام کی جماعت اول نے اپنی زندگی میں ان معجزات کو دکھایا اور حقیقت بنا دیا۔ یہ اس توازن کے بہرہ من منت تھے۔ اس وقت کے انسانی معاشرے میں یہ معجزات رونما ہوئے۔ یہ معجزات کہ اس جماعت کی حرکات و سکنات اور اعمال ان طرح متوازن تھے کہ یہ جماعت انلاک کی طرح منظم تھی اور مربوطی کے ساتھ حرکت پذیر تھی۔ ان کے اقدامات اور اعمال اسی طرح تھے جس طرح زمانے کی گردش مربوط ہے۔ یہ لوگ فطرت کے ساتھ متصادم نہ تھے اور نہ الجھتے تھے کہ

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاهَا لِيكُنْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ۝ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۖ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَقْدُورًا ۝ الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ ۚ وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝

۵

ع۶

۲

”اے نبی“ یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے احسان کیا تھا کہ ”اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو“۔ اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا۔ تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ پھر جب زید“ اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی غلی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہئے تھا۔ نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو۔ یہی اللہ کی سنت ان مسب انبیاء کے معاملہ میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔ (یہ اللہ کی سنت ہے ان لوگوں کے لیے) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور محاسبہ کے لیے بس اللہ ہی کافی ہے۔ (لوگو) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔“

اس سورہ کے آغاز ہی میں معنی بنانے کی رسم کو فہم کر دیا گیا تھا اور یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ ایسے لوگوں کو اب ان کے حقیقی آباء کی طرف منسوب کر دیا جائے اور عائلی تعلقات حقیقی نسب پر قائم ہوں گے، کہا گیا تھا۔

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيََاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَ

هُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ (۳۳: ۴) اَدْعُوهُمْ لَابَائِهِمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْا اَبَاءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَ مَوَالِيكُمْ وَ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا اَخْطَاْتُمْ بِهِ وَ لٰكِنْ مَا

تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳: ۵) ”نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو۔ مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو نبی پر حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔ اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رشتہ ہیں۔ نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا دل سے ارادہ کرو۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔“

عربی سوسائٹی میں منہ بولے بیٹوں کے پختہ رسم و رواج تھے اور گھرے آثار تھے۔ ان آثار کو مٹانا اس قدر آسان نہ تھا جس قدر نفس معنی کو مٹانا آسان تھا۔ اس لیے کہ اجتماعی رسم و رواج دلوں پر گھرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ اس لیے اس قسم کی رسومات کو مٹانے کے لیے ان کے بالمقابل سخت اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالعموم پہلے پہل جو اقدامات کیے جاتے ہیں ان کے خلاف شور و غل بھی ہوتا ہے اور ابتدا میں اس کے اثرات بھی نفوس پر پڑتے ہیں۔ اس سے قبل یہ بات آگئی ہے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کی شادی کرائی تھی۔ یہ آپ کے معنی تھے اور ان کو زید بن محمد کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد زید بن حارثہ کھلانے لگا۔ یہ شادی زینب بنت جحش سے کر لی گئی تھی جو آپ کی پھوپھی زاد تھیں، مقصد یہ تھا کہ غلاموں کو عرب سوسائٹی میں جو دوسرے درجے کا انسان سمجھا جاتا تھا اسے دور کر دیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے شرافت و کرامت کا جو اصول مقرر فرمایا ہے اسے بردے کا ر لایا جائے۔

اِنْ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ”تمہارے اندر زیادہ شریف وہی ہے جو زیادہ متقی ہے“۔ اور یہ مثال عملاً قائم کی جائے جو فی الواقعہ مثال ہو۔

اس کے بعد مشیت الہیہ کا تقاضا ہوا کہ رسالت کی ذمہ داریوں میں اس ذمہ داری کا اضافہ کر دیا جائے کہ معنی کی مطلقہ کے ساتھ نکاح کی مثال بھی حضور خود قائم کریں تاکہ معنی کی رسم کے جو گھرے آثار تھے وہ بھی مٹ جائیں اور حضور یہ نمونہ معاشرے کے سامنے پیش کریں۔ ان حالات میں کہ کسی اور کی ہمت اس کام کے لیے نہ ہو سکتی تھی اگرچہ رسم معنی قانوناً اور شرعاً اس سے قبل ختم ہو چکی تھی۔

اللہ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتا دیا کہ زید بن حارثہ کی بیوی کو طلاق دے دیں گے اور آپ کو یہ نکاح کرنا ہو گا۔ یہ تقاضائے حکمت الہیہ ہے۔ اس دوران زید اور زینب کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے اور آثار بتا رہے تھے کہ یہ نکاح قائم نہیں رہ سکا۔

حضرت زید بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شکایت کر رہے تھے کہ ان کی زندگی زینب کے ساتھ بہت مضطرب ہے اور یہ کہ وہ مزید ان کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی بے باکی سے اسلامی نظریہ حیات کی تبلیغ فرماتے تھے اور اس سلسلے میں کسی کی پردہ اندازہ نہ فرماتے تھے لیکن زینب کے ساتھ نکاح کرنے کے معاملے میں آپ بھی متاثر تھے۔ اس سلسلے میں آپ بھی عوام کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے اور آپ ہمیشہ زید سے کہتے 'جن پر اللہ کا انعام ہوا تھا کہ وہ مسلمان ہوئے اور پھر رسول اللہ کے قریب ہوئے اور رسول اللہ آپ سے محبت فرماتے تھے اور یہ محبت ایسی تھی کہ بلا استثناء سب سے زیادہ تھی۔ پھر رسول اللہ نے ان پر یہ مہربانی کی کہ انہیں آزاد کر دیا۔ ان کی تربیت کی اور ان سے بہت پیار کرتے۔ حضرت زید سے رسول اللہ کی کہتے۔

أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللَّهَ (۳۳: ۳۷) ”کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو“۔ اور دراصل حضور اکرمؐ اس طرح اس عظیم معاملے کو موخر کرنا چاہتے تھے جس کے وقوع کے بعد آپ کو عوام کا سامنا کرنے میں تردد تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی۔

و تَخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَ اللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ (۳۳: ۳۷)

”اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھونا چاہتا تھا۔ تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو“۔ اور حضورؐ اپنے دس میں یہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کا اللہ نے آپ کو یہ سبب بنا دیا تھا کہ اگر حضرت زید ان کو طلاق دیں گے تو آپ کو نکاح کرنا ہو گا۔ یہ معاملہ صریح حکم نہ تھا، ورنہ حضورؐ اس میں تردد نہ فرماتے نہ موخر کرتے اور نہ یہ کوشش کرتے کہ کسی طرح ٹل جائے اور حضورؐ اس وقت اس کا اعلان کر دیتے۔ نتائج جو بھی ہوتے، البتہ حضورؐ کے دل میں بطور اہتمام یہ بات ڈال دی گئی تھی اور حضورؐ اس وقت پریشان تھے کہ لوگ غوغا اُڑائی کس گے یہاں تک کہ خدا کے حکم سے زید نے طلاق دے دی اور یہ تصور نہ زید کا تھا اور نہ زینب کا کہ اس کے بعد حضورؐ سے نکاح ہو گا کیوں کہ عربوں میں یہ قانونی رواج تھا کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ کے ساتھ نکاح جائز نہ تھا۔ یہاں تک کہ مستثنیٰ بنانے کے قانون اور رواج کو ختم کر دینے کے بعد بھی لوگ مطلقہ مستثنیٰ کو حرام سمجھتے تھے اور ابھی ان کے حلال ہونے کا حکم بھی نہ آیا تھا۔ صرف اس واقعہ سے یہ رسم ختم ہوئی لیکن یہ واقعہ بہر حال اس سوسائٹی میں ایک دھماکہ اور ایک انوکھی اور نئی بات تھی۔

اس تفسیر سے وہ تمام روایات ختم ہو جاتی ہیں جن پر اعتماد کر کے دشمنان اسلام نے قدیم دور میں بھی اور جدید دور میں بھی افسانے تصنیف کیے ہیں اور حاشیہ آرائیاں کی ہیں۔ معاملہ بس اس قدر تھا۔

فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي

أَزْوَاجٍ أَذْعَبَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا (۳۳: ۳۷) ”پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اس کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی

رہے جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں۔ اور یہ واقعہ رسالت کی ان بھاری ذمہ داریوں میں سے ایک تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اٹھایا۔ یوں آپ نے ایک ایسے معاملے میں جاہلی معاشرے کی ایک رسم مٹانے میں نمونہ پیش کیا جسے ایام جاہلیت میں ایک مکروہ فعل سمجھا جاتا تھا۔ یہ فعل اس قدر مکروہ سمجھا جاتا تھا کہ حضور اکرمؐ نے اسلامی نظریہ حیات کے حوالے سے بڑی بڑی باتوں میں تامل نہ فرمایا تھا مگر اس میں متردد تھے۔ مثلاً عربوں کے خود ساختہ الہوں کی مذمت آپ نے بے دھڑک فرمائی اور یہ آپ نے برملا اعلان فرمایا کہ ہمارے آباء و اجداد غلطی پر تھے۔

وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا (۳۳: ۳۷) ”اور اللہ کا حکم تو عمل میں آتا ہی چاہئے تھا۔“ حضرت زینب سے حضور اکرمؐ کا نکاح عدت پوری ہونے کے بعد طے ہوا تھا۔ یعنی اسے رد نہ کیا جاسکتا تھا اور نہ اس سے کوئی مفر تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی اور اہل حقیقت تھی اور اس سے کوئی پہلو قحی نہ کر سکتا تھا۔

آپ کا نکاح زینب سے عدت گزر جانے کے بعد ہوا اور حضورؐ نے ان کو انہیں حضرت زید کے ذریعہ پیغام بھیجا تھا۔ یہ زید حضورؐ کو بہت ہی محبوب تھے۔ یہ گئے اور انہوں نے حضورؐ کا پیغام ان کو دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ’فرماتے ہیں کہ جب زینب کی عدت ختم ہو گئی تو حضورؐ نے زید بن حارثہ سے کہا ”آپ جائیں اور زینب کو میرے لیے پیغام دیں۔“ زید گئے اس وقت وہ آٹے میں خمیر ڈال رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب میں نے اسے دیکھا تو میرا ان کے ساتھ سامنا کرنا مشکل ہو گیا۔ میں ان کو دیکھ نہ سکا اور نہ کہہ سکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا تذکرہ کیا ہے۔ میں نے ان کی طرف اپنی پیٹھ پھیر لی اور وہاں جاتے ہوئے یہ کہا ”اے زینب تمہارے لیے خوشخبری ہے حضورؐ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں ان کا پیغام آپ تک پہنچا دوں۔“ اس نے کہا ”میں کوئی بات اس وقت تک کرنے والی نہیں ہوں جب تک میں اپنے رب کے ساتھ اس معاملے میں مشورہ نہ کر لوں۔ وہ انھی اور اپنی جائے نماز پر نماز پڑھنے لگی۔“ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور رسول اللہؐ اس کے بعد اس سے اجازت لینے کے بغیر اس کے پاس آگئے۔ (روایت احمد، مسلم اور نسائی بطریقہ سلیمان بن مغیرہ)۔

بخاری شریف میں حضرت انس کی روایت ہے کہ حضرت زینب دوسری ازواج مطہرات پر یہ فخر کرتی تھی کہ تمہارا نکاح تمہارے رشتہ داروں نے کیا ہے اور میرا نکاح اللہ نے سات آسمانوں کے لو پر کیا ہے۔

یہ معاملہ اسی طرح آسانی سے طے نہ پا گیا بلکہ اسلامی سوسائٹی میں اس کی وجہ سے ایک بھونچال آگیا اور منافقین کو ایک مسئلہ مل گیا کہ حضورؐ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے۔ چونکہ یہ معاملہ اسلامی معاشرے میں قانونی اصلاحات سے متعلق تھا اور اسلامی معاشرے کے لیے ایک نیا اصول طے کرنا تھا۔ اس لیے اللہ نے اس کی تاکید مزید کر دی اور پھر اس میں لوگوں کے نزدیک جو انوکھا پن تھا اسے یوں زائل کیا اور معاملات کو اپنی اصل حقیقت کی طرف لوٹا دی۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ (۳۳: ۳۸) ”نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو۔“ اللہ نے نبیؐ پر فرض کر دیا تھا کہ زینب کے ساتھ اس کا نکاح ہوتا کہ یہ جاہلی رسم ٹوٹے کہ کسی کا نکاح ان کے منہ بوسے بیٹے کی بیوی سے نہیں ہو سکتا جبکہ اس نے اسے طلاق دے دی ہو یا مر گیا ہو اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی پہلے رسول نہیں ہیں۔ اس سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (۳۳: ۳۸) ”یہی اللہ کی سنت ان سب انبیاء کے معاملے میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں“۔ تو یہ معاملہ سنت الہیہ کے مطابق جا رہا ہے اور اس میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان رسوم اور رواجات کو جو سے اکھاڑ کر پھینکتا رہا ہے جو معاشرے میں رائج رہی ہیں اور جن کی کوئی حقیقت و افادیت نہ تھی۔

وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَقْدُورًا (۳۳: ۳۸) ”اور اللہ کا حکم قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے“۔ اللہ کا حکم نافذ ہوتا ہے اور اسے نافذ کیا جانا ہی چاہئے۔ اس کے سامنے کوئی بھی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی اور نہ بننا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ تمام امور کو نہایت مہارت سے طے کرتا ہے، نہایت حکمت سے طے کرتا ہے اور اس کی تہ میں وہ مقاصد ہوتے ہیں جو اللہ کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اللہ ہی ان احکام کی ضرورت اور کسی زمان و مکان میں ان کی اہمیت کو جانتا ہے اور اللہ نے رسول اللہ کو حکم دے دیا ہے کہ وہ اس عادت کو جو کہ اس کے عملی آثار کا بھی قلع قوع کر دیں اور یہ کام وہ بنفس خود کریں۔ اللہ کے حکم کے نفاذ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جاسکتی اور اللہ کے رسولوں کی یہ سنت رہی ہے۔ تمام گزرے ہوئے رسولوں کی :

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ (۳۳: ۳۹) ”جو لوگ اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے“۔ ایسے لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے نظام کو عملاً قائم کرتے ہیں اور لوگوں کی باتوں سے نہیں ڈرتے۔ اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ وہ اللہ کے احکام پہنچاتے ہیں اور نافذ کرتے ہیں۔

وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيبًا (۳۳: ۳۹) ”اور محاسبہ کے لیے اللہ ہی کافی ہے“۔ حساب و کتاب نیک و بد کا اللہ ہی لے گا اور لوگوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے نبی کا محاسبہ کریں۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ (۳۳: ۴۰) ”محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں“۔ لہذا ازینب محمد کے کسی بیٹے کی مطلقہ سہیں ہے۔ زید ابن محمد دراصل زید ابن حارثہ ہیں۔ لہذا اس میں کوئی الجبسے کی بات نہیں ہے اگر حقیقت پسندانہ نظروں سے دیکھا جائے۔ حضرت محمدؐ اور تمام لوگوں کا آپس میں تعلق نبی اور قوم کا تعلق ہے وہ ان میں سے کسی کا باپ نہیں ہے۔

وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (۳۳: ۴۰) ”وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں“۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ قانون بناتے ہیں۔ اور یہ دائمی اور آخری شریعت ہے اور یہ قیامت تک رہتی ہے۔ اس کے بعد ان قوانین میں کوئی تغیر و تبدل ہونے والا نہیں ہے۔

وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (۳۳: ۴۰) ”اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے“۔ اللہ ہی جانتا ہے

کہ انسانیت کے لیے کون سا قانون مفید ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے نبی پر یہ کام کرنا فرض کیا اور اس کے لیے یہ آزمائش مقرر کی تاکہ لوگوں کے لیے منہ بولے بیٹوں کے معاملہ میں پابندی ختم ہو۔ جبکہ وہ کسی بیوی کو طلاق دے چکے ہوں اور ان سے اپنی ضرورت پوری کر چکے ہوں اور ان کو آزاد کر چکے ہوں۔ اللہ نے اپنے علم کے مطابق فیصلہ فرمایا ہے اور اللہ ہی ہے جو اپنی حکمت اور علم کے مطابق قانون بنانے والا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اب سیاق کلام میں اللہ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے کہ اللہ کو یاد کرو، صبح و شام اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے رہو۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مہربانی اور رحمت سے تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں داخل کیا۔ وہ مومنین پر کس قدر رحیم ہے۔ جب یہ مومنین قیامت میں حاضر ہوں گے تو ہر طرف سے مبارک سلامت ہوگی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا
وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۚ هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ
الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ۝۱۱۱ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ
وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا كَرِيمًا ۝۱۱۲

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو“ وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے“ وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے جس روز وہ اس سے ملیں گے ان کا استقبال سلام سے ہو گا اور ان کے لیے اللہ نے بڑا باعزت اجر مہیا کر رکھا ہے۔“

اللہ کا ذکر انسان کو اللہ کے ساتھ مربوط رکھتا ہے۔ اور انسان کا دس اللہ کی فکر اور سوچ میں رہتا ہے کہ اللہ کی ذات ہی سب کچھ کرنے والی ہے۔ صرف زبان ہی سے اللہ اللہ کرنا ذکر نہیں ہے۔ نماز قائم کرنا بھی ذکر الہی کی ایک شکل ہے بلکہ خصوصی قرآن و سنت میں ذکر کا مطلب قریب قریب نماز ہی ہے۔ امام ابو داؤد اور ابن ماجہ نے احمد کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اغر ابو سعید اور ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب کسی شخص نے اپنی بیوی کو رات کے وقت جگایا اور دونوں نے دو رکعت نماز پڑھی تو دونوں اس پوری رات میں ذکر میں اور ذاکرات میں شمار ہوں گے۔“

اگرچہ ذکر الہی نماز سے عام ہے لیکن ہر وہ صورت جس میں بندہ خدا کو یاد کرے وہ ذکر الہی ہے۔ جس میں بندے کا دل رب سے مربوط ہو چاہے زبان سے وہ ادا کرے یا نہ کرے۔ اصل بات یہ ہے کہ قلبی اور روحانی لحاظ سے انسان اللہ سے مربوط ہو جائے۔

جب انسان اللہ سے غافل ہو تو اس کا دل خالی ہوتا ہے وہ لاپرواہ ہوتا ہے اور وہ حیران و پریشان ہوتا ہے۔ جب وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ مانوس اور پرسکون ہو جاتا ہے۔ اب اس کا قلب بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ سنجیدہ

بن جانا ہے۔ اسے قرار و سکون مل جاتا ہے۔ اسے زندگی کی راہ معلوم ہو جاتی ہے، وہ اپنے منہاج سے باخبر ہوتا ہے۔ اسے پتہ ہوتا ہے کہ وہ کہاں ہے، اسے کہاں جانا ہے اور اس کی راہ کون سی ہے

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ذکر الہی پر بہت زور دیتا ہے۔ بہت ہی تائید نہ جاتی ہے کہ اللہ کو یاد کرو چنانچہ قرآن مجید ذکر الہی کو انسان کے معروف ترین اوقات اور حالات سے مربوط کرتا ہے تاکہ کسی بھی مصروفیت میں انسان ذکر الہی سے غافل نہ ہو جائے۔ اس کے وہ اوقات اور حالات بھی وسیلہ یاد الہی بن جائیں اور یوں انسان حالات اور اوقات کے حوالے سے بھی اللہ سے مربوط ہو جائے۔

وَسَبِّحْهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (۴۲:۳۳) ”صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو“۔ صبح و شام کے اوقات میں ایک خاصیت ہے۔ وہ یہ کہ ان اوقات میں انسانی قلب اللہ کی طرف مائل ہوتا ہے۔ کیونکہ ان اوقات میں انسان کے حالات اور دن اور رات کے اصول بدلتے ہیں جبکہ اللہ لازوال ہے اور اس کے سوا ہر چیز تغیر پذیر اور زوال پذیر ہے۔

اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ جس ذات کو تم یاد کرتے ہو، اور جس کی تسبیح کرتے ہو، وہ لازوال ہونے کے ساتھ تم پر بہت ہی رحیم و کریم ہے اور وہی ہے جو تمہاری تخلیق کرتا ہے، تمہاری بہتری چاہتا ہے، حالانکہ وہ غنی بادشاہ ہے اور تم محتاج ہو۔ اس کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو محض اس کا فضل و کرم ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيَخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ وَكَانَ

بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (۴۳:۳۳) ”وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے اور وہ مؤمنین پر بہت مہربان ہے“۔ اللہ بہت بند ہے، اس کی رحمتیں بہت زیادہ ہیں۔ اس کا فضل و کرم بہت ہی عظیم ہے۔ اللہ اپنے ان ضعیف اور محتاج بندوں پر رحمت فرماتا ہے جو کمزور اور بے قرار ہوتے ہیں، ان کو نصیحت کرتا ہے، ان پر رحم و کرم کرتا ہے۔ اس کے فرشتے انسانوں کے لیے دعا کرتے ہیں اور ان کو بھلائی سے یاد کرتے ہیں۔ یوں پھر پوری کائنات بھی بندوں کو یاد دہانی ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا ”اللہ فرماتے ہیں جس نے مجھے یاد کیا اپنے دل میں، میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں۔ جس نے مجھے لوگوں میں یاد کیا میں اسے ان سے مجھے لوگوں میں یاد کرتا ہوں۔“

یہ ایک عظیم قسمت ہے جس کا تصور انسان کے لیے ممکن نہیں کہ انسان اور یہ زمین اس کائنات کا ایک حقیر ذرہ ہیں اور یہ افلاک اور یہ پوری کائنات اللہ کی لائقہ اور مخلوقات و املاک کا حقیر حصہ ہیں جو کن فیکون سے پیدا ہوئے۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيَخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ

(۴۳:۳۳) ”وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئیں۔“

اللہ کا نور ایک ہے 'وہ ہر کسی کے شامل حال ہے اور عام ہے۔ اللہ کے نور کے سوا جس قدر افکار و خیالات بھی ہیں ' وہ ظلمات ہیں۔ جب بھی لوگ اللہ کے نور سے نکلیں وہ تاریکیوں میں ہوں گے۔ جزوی تاریکی ہوگی یا کلی تاریکی ہوگی۔ اور یہ تاریکی صرف ایک ہی ذریعہ سے دور ہو سکتی ہے کہ کسی کے دل میں نور آفتاب طلوع ہو جائے۔ اس کی روح بدل جائے ' وہ فطرت کی طرف لوٹ آئیں۔ یہی کائنات کی فطرت ہے اور یہی رحمت الہی ' دعائے ملائکہ اور یہی وہ راہ ہے جس کے ذریعے انسان ظلمات سے نکل آتا ہے لیکن جب اس کا دل کھل جائے۔

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (۳۳: ۴۳) "اللہ مومنوں پر بہت مہربان ہے۔"

یہ تو ہے دنیا میں نکل ایمان کا معاملہ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دنیا دہر الہل ہے۔ رہی آخرت جو دار الجزاء ہے تو وہاں بھی اللہ کا فضل و کرم ان کے شامل حال رہے گا اور اللہ کی رحمت وہاں بھی ان کو ڈھانپے ہوئے ہوگی۔ وہ ان کے لیے بہت ہی اعزاز ہوگا ' بہت ہی خصوصی کرم ہوگا اور اجر عظیم ان کے لیے وہاں تیار ہے۔

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ وَ أَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا كَرِيمًا (۳۳: ۴۴) "جس روز وہ اس سے ملیں گے ' ان کا استقبال سلام سے ہوگا اور ان کے لیے اللہ نے باعزت اجر تیار کر رکھا ہے۔" ان کے لیے ہر خوف و خطر سے سہمتمی ہوگی۔ ہر تھکاوٹ سے وہ دور ہوں گے۔ ان کے لیے کوئی مشکل نہ ہوگی۔ اللہ کی طرف سے مبارک و سلامت کے پیغامات فرشتوں نے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ یہ فرشتے ان کے پاس ہر طرف سے آتے ہوں گے اور اللہ کی جانب سے سلام پہنچا رہے ہوں گے۔ یہ سلام ان باعزت اجر و معاوضات کے علاوہ ہوگا جو ابھی سے تیار ہیں۔ یہ ہے وہ رب کریم جو لوگوں کے لیے قانون بناتا ہے جو ان کے لیے راہ پسند کرتا ہے۔ لہذا کون بد بخت ہوگا جو ایسے رب کے اختیار کردہ نظام سے منہ موڑے گا۔

--- ○ ○ ○ ---

رہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو ان لوگوں تک اللہ کے پسند کردہ قوانین اور ضوابط پہنچاتے ہیں اور خود اپنی سنت اور اپنے اسوہ اور نمونہ کے ذریعے وہ راستے متعین فرماتے ہیں تو یہاں ان کے بارے میں بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ان کے فرائض کیا ہیں۔ آپ کس مشن پر مامور ہیں اور ان کے ذریعے اس دنیا میں اللہ مومنین پر کس قدر فضل کر رہے ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۖ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۖ وَبَشِيرًا لِلْمُؤْمِنِينَ بِأَن لَّهُمْ مِنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ۖ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعَا أَذُنُوهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا ۚ

"اے نبی! ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر ' بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر ' اللہ کی اجازت سے اس کی

طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔ بشارت دے دو ان لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے اور ہرگز نہ دو کفار و منافقین سے کوئی پروا نہ کرو ان کی اذیت رسائی کی اور بھروسہ کر لو اللہ پر اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے۔“

نبی کا فریضہ منصبی یہ ہے کہ آپ لوگوں پر گواہ ہوں لہذا لوگوں کو ایسا عمل کرنا چاہئے کہ حضور اکرمؐ کی شہادت دینے کے قابل ہوں کیونکہ آپ نے تو سچی شہادت دینی ہے۔ اصل واقعہ سے کوئی تغیر و تبدیلی آپ نے نہیں کرنی ہے۔ رسول تو خوشخبری دینے والے ہیں ان لوگوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں۔ نیک لوگوں کے لیے اللہ کی رحمت انتظار میں ہے اور غافل اور بے راہ رو لوگوں کو ڈرانے والے ہیں کہ ان کے لیے سخت عذاب ہے تاکہ وہ بچارے غفلت میں نہ مارے جائیں اور اگر سزا دی جائے تو وارننگ کے بعد۔

وَدَاعِبًا إِلَى اللَّهِ (۴۶:۳۳) ”اور اللہ کی طرف بلائے والا بنا کر بھیجا ہے۔“ اس لیے نہیں بھیجا کہ صرف تمہاری دنیا لٹھی ہے۔ تم دنیا میں برتر ہو جاؤ اور قومی وقار تمہارا بلند ہو۔ نہ جاہلی مصیبت کے لیے اسے داعی بنایا ہے۔ نہ مال نعمت کے حصول کے لیے اٹھایا ہے۔ نہ نظام مملکت کا قیام مطلوب ہے۔ صرف دعوت الی اللہ ان کا منشور و مطلوب ہے اور یہ کام اللہ کے حکم سے انہوں نے شروع کیا ہے۔ نہ یہ اپنی طرف سے ہے اور نہ رضا کارانہ ہے۔ نہ آپ اپنی طرف سے یہ کام بطور رضا کار کرتے ہیں۔ یہ سب کام اللہ کے حکم سے ہے۔

وَسِرَاجًا مُنِيرًا (۴۶:۳۳) ”آپ روشن چراغ ہیں۔“ آپ غلمتوں کو دور کرنے والے ہیں۔ شہادت کو قائم کرتے ہیں۔ راستہ متعین کرتے ہیں اور لوگوں کے لیے ایسے راہنما ہیں جس طرح سراج منیر ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح روشنی لے کر آئے۔ یہ روشنی ایک واضح تصور تھا، ایک واضح نظریہ اور عقیدہ تھا جس نے پوری کائنات کو منور کر دیا۔ اس کائنات اور انسان کا ربط واضح کر دیا اور اس کائنات میں انسان کے مقام و مرتبہ کو متعین کیا۔ ان اقدار کی وضاحت کی جن پر یہ کائنات قائم ہے۔ انسان کا مقصد، اس کی غرض، اور اس کے حصول کا طریقہ متعین کیا۔ نہایت ہی واضح اسلوب میں اور نہایت ہی فطری انداز میں۔ اس طرح کہ بات انسان کے دل کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے۔ مشکل سے مشکل مسائل اور زندگی کے تشبیب و فراز میں پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو آسان ترین طریقوں سے حل کر دیا گیا ہے۔

مکرر اس بات کی تفصیل دی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریوں میں اس بات کا اضافہ کیا جاتا ہے کہ آپ مومنین کے لیے مبشر ہیں۔

وَبَشِيرٍ الْمُؤْمِنِينَ بَأَن لَّهُمْ مِنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا (۴۷:۳۳) ”بشارت دے دو ان لوگوں کو جو تم پر ایمان لائے کہ ان کے لیے اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔“ اس سے قبل آیت

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا (۴۵:۳۳) ”وہی ہم نے آپؐ

کو گواہ، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے) میں مجملًا آپ کو مبشر کہا گیا تھا اور یہ تفصیل اس لیے دی ہے کہ مومنین یقین کر لیں کہ ان پر اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم ہو گا اور یہ جو ان کے لیے قوانین اور ضوابط تیار ہو رہے ہیں اور نبی اپنے عمل سے ان کے لیے جو راہ و رسم وضع کر رہے ہیں یہ سب کار ان کے لیے خوشخبری اور عظیم فضل و کرم کی بشارت ہوں گے۔

اس خطاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ آپ کا فہم و فہم منفقوں کی کسی معاملے میں اطاعت کریں اور مومنین اور آپ کو یہ لوگ جو اذیت دیتے ہیں اس کی بھی کوئی پرواہ نہ کریں۔ صرف اللہ وحدہ پر توکل کریں۔ وہی تمہارے لیے کافی مددگار ہے۔

وَلَا تُطِيعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذْهَمَ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَىٰ بِسَلَةِ

وَکَيْلًا (۳۳: ۴۸) ”لو کہ ہرگز نہ دیو کافروں اور منافقین سے کوئی پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسائی کی۔ اور بھروسہ کر لو اللہ پر، اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ ”دی اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے“۔

یہ وہی خطاب ہے جو سورہ کے آغاز میں بھی تھا۔ اس سے قبل کہ وہاں قانون سازی کا آغاز کیا جاتا، اور جدید انتظامی ہدایت دی جاتی۔ یہاں اب یہ بات زیادہ ہے کہ ”نبیؐ آپ کافروں اور منافقوں کی اذیت رسائی کی کوئی پرواہ نہ کریں اور نہ ان کی پیروی کسی معاملے میں کریں اور نہ کسی معاملے میں ان پر اعتماد کریں۔ کیونکہ اللہ وحدہ قابل اعتماد ہے۔“

وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكَيْلًا (۳۳: ۴۸) ”اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے“۔

یوں رید اور زینبؓ کے واقعہ اور منہ بولے بیٹوں کی پیروی کے ساتھ نکاح کے جواز کے مسئلہ کی تمہید اور تبصرہ دونوں طویل ہیں اور یہ عملی مثال جسے پیش کرنے کے فریضے کو حضورؐ بھی بہت بھاری محسوس سمجھ رہے تھے۔ اس لیے اس میں اللہ کی طرف سے تشریح اور لوگوں کی دوسرا فزائی کی ضرورت تھی۔ ان معاملات میں تعلق باللہ کو مضبوط کرنے کی ضرورت تھی تاکہ بندہ اللہ کے احسان اور رحمت کا گہرا شعور حاصل کر لے اور ان احکام کو خوشدلی سے وصول کرے، قبول کرے اور تسلیم و رضا کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہو۔

درس نمبر ۱۹۲ ایک نظر میں

اس سبق کے ابتدائی حصہ میں عام خاندانی اور عائلی قانون ساری ہے۔ مطلقہ جسے رخصتی سے قبل طلاق ہو چکی ہو، اس کا حکم عدت وغیرہ۔ اس کے بعد حضورؐ کی خاندانی زندگی کے لیے ہدایات، ارواح کے ساتھ آپ کے تعلقات، اور رواج کے دو سرے لوگوں سے رابطے کی ضابطہ بندی اور مسلمانوں کا رسول کے گھرانے سے تعلق، اور پھر اس گھرانے پر درود و سلام۔ پھر پردے کا عام حکم جس میں رسول اللہؐ کی بیٹیاں، بیویاں اور مومنین کی تمام عورتیں شامل ہیں یہ کہ جب وہ قضاے حاجت کے لیے باہر نکلیں تو اپنی اوڑھنیاں سینوں پر ڈکالیا کس تاکہ وہ اس لباس کے ساتھ پہچانی جاسکیں اور ان کے ساتھ تعرض نہ کیا جاسکے۔ کیونکہ منافقین، فاسق و فجار اور مدینہ میں انہیں پھیلنے والے لوباش عورتوں سے چھیڑ خالی کرتے تھے۔ آخر میں ایسے لوگوں کو دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی ان کارروائیوں سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں گے۔

یہ تمام قانونی، معاشرتی اور امن و امان کے اقدامات اس لیے تھے کہ مدینہ کی سوسائٹی کو مکمل اسلامی خطوط پر منظم کیا جائے۔ جو ہدایات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے بارے میں ہیں، وہ اس لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس گھرانے کو قیامت تک کے لیے آنے والی نسلوں کے لیے کملی کتاب کے طور پر باقی رکھنا چاہتے تھے کیونکہ یہ کتاب تو قیامت تک پڑھی جانے والی تھی اور پھر یہ ہدایات اور کتاب الہی میں ان کا ثبت کیا جانا اس گھر کے لیے ایک اعزاز بھی تھا کہ خود اللہ اس کی تربیت کر رہے ہیں اور قیامت تک کے لیے نمونہ بنا رہے ہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۱۹۲ تشریح آیات

۴۹ --- تا --- ۶۲

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ
مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَةٍ تَعْتَدُوْنَ لَهَا فَمَتَّعُوهُنَّ
وَسَرَّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔ لہذا انہیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔“

سورہ بقرہ میں یہ احکام اس عورت کے بارے میں گزر چکے تھے جس کو قبل از رخصتی طلاق دے دی گئی ہو۔

لَا حُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَ
مَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتَرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى
الْمُعْسِينِ (۲۳۶:۲) وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ
فَرِيضَةً فَنَصَدْنَ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بِيَدِهِ عَقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ
تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

(۲۳۷:۲) (۲۳۶:۲-۲۳۷) ”تم پر کچھ گناہ نہیں اگر اپنی عورتوں کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مہر مقرر ہو۔ اس صورت میں انہیں کچھ نہ کچھ ضرور دینا چاہئے۔ خوشحال آدمی اپنی قدرت کے مطابق اور غریب اپنی قدرت کے مطابق معروف طریقہ سے دے۔ یہ حق ہے ایک آدمیوں پر۔ اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے

پہلے طلاق دی ہو مگر مقرر کیا جا چکا ہو تو اس صورت میں نصف مردیتا ہو گا۔ یہ اور بات ہے کہ عورت نرمی برتے۔ یا وہ مرد جس کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے نرمی سے کام لے اور تم نرمی سے کام لو، تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو، تمہارے ائمال کو اللہ دیکھ رہا ہے۔“

لہٰذا مطلقہ جس کی رخصتی نہ ہوئی ہو اگر مقرر ہو تو نصف مراد اکرنا ہو گا اور اگر مقرر نہ ہو تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ سامان دینا لازمی ہے۔ مالدار پر اس کی حیثیت کے مطابق اور غریب پر اس کی حالت کے مطابق۔ اس آیت میں عدت کے مسئلے کا اضافہ کر دیا گیا جو وہاں نہ تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ چونکہ رخصتی نہیں ہوئی ہے اس لیے عدت نہ ہوگی۔ کیونکہ ان لوگوں کے درمیان چونکہ ہم بستری نہیں ہوئی اس لیے عدت کے ذریعے رحم کو پاک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ سابقہ نکاح کے آثار ہی موجود نہیں تاکہ نسب کا اختلاط نہ ہو اور کسی آدمی کی طرف وہ بچہ منسوب نہ ہو جو دراصل اس کا نہ ہو۔ یا ایک شخص کا بچہ ہو اور وہ اس سے محروم ہو جائے لیکن رخصتی نہ ہونے کی صورت میں تو رحم پاک ہے۔ لہٰذا نہ عدت ہے اور نہ انتظار ہے۔

فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا (۳۳: ۴۹) ”تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کرو۔“ فَمَتَّعُوهُنَّ ”انہیں کچھ مال دو۔“ اگر مقرر ہو تو نصف مر ہے۔ اور اگر نہ ہو تو بھی کچھ دو، اپنی مالی حالت کے مطابق۔

وَسَرَّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (۳۳: ۴۹) ”اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔“ نہ روکے رکھو، نہ اذیت دو، نہ بغض رکھو اور نہ ان کو جدید ازدواجی زندگی گزارنے سے روکو۔ اس سورہ میں یہ عام حکم ہے اور پوری اسلامی سوسائٹی کے لیے ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ کے لیے کون سی عورتیں حلال کی گئی ہیں اور وہ خصوصیات جو آپ کی ذلت اور آپ کے قل بیت کے لیے ہیں۔ یہ احکام سورہ نساء کی آیت (ثنی و ثلاث و رباع) کے بعد آئے۔ وہاں مسلمانوں کے لیے چار عورتوں سے زیادہ کرنا حرام کر دیا گیا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں ۹ بیویاں تھیں۔ ہر ایک کے ساتھ نکاح ایک خاص ضرورت کے تحت ہوا تھا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بیٹیاں تھیں۔ یہ آپ کے قریبی ساتھی تھے۔ ام حبیبہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ ام سلمہؓ سودہ بنت زمعہ، زینب بنت خزیمہ ان لوگوں میں سے تھیں جو خاندانوں سے محروم ہو گئی تھیں اور حضورؐ نے ان کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی فرمائی۔ زینب بنت جحشؓ کا قصہ تو ابھی گزرا ہے۔ چونکہ آپؐ نے اصرار پر ان کو زید بن حارثہ غلام کے ساتھ بیاہ دیا تھا اور یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی تو اللہ نے حضورؐ سے ان کا نکاح کر دیا۔ ان کی دس جوئی کے لیے اور معینی بنانے کی رسم کے آثار کو ختم کرنے کے لیے تفصیلات گزر چکی ہیں۔ جو یہ بنت الحارث بنی المصطلق اور صفیہ بنت حبیبہ بنی المصطلق، دونوں غلام ہو کر آئیں اور حضورؐ نے ان کو آزاد کر کے نکاح میں لے لیا تاکہ ان قبائل سے تعلقات قائم ہوں اور ان دونوں دختران سرداران کی عزت ہو۔ یہ دونوں اسلام لایچکی تھیں اگرچہ ان کی اقوام کے ساتھ سخت سلوک ہوا۔

یہ سب عورتیں وہ تھیں جنہوں نے اہمات المؤمنین کا مقام پایا اور جب آیت تحییر مارل ہوئی تو ان سب نے اللہ اور رسول اللہ کو اختیار کیا اور دنیا پر آخرت کو اختیار کر لیا۔ نیز جب عورتوں کی تعداد کو چار کے اندر محدود کر دیا گیا تو ان ۱۰ اج نبیؐ نے حضورؐ کے لیے یہ ۱۰ ہونا شاق گزرا۔ اللہ نے ان پر نظر کرم فرمائی اور بقرہ کی آیت سے حضورؐ کو مستثنیٰ کر دیا۔ ان تمام عورتوں کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی۔ ان سب کو آپ کے لیے حلال کر دیا لیکن اس کے بعد یہ حکم بھی ۱۰۔ ۱۰ کہ آپ ان پر اضافہ نہیں کر سکتے۔ نہ ان میں سے کسی ایک کے بدلے دوسری لاسکتے ہیں۔ یہ اجازت صرف موجودہ ازدواج تک محدود ہے تاکہ وہ شرف زوجیت رسولؐ سے محروم نہ ہو جائیں جبکہ اس سے قبل وہ اللہ کے رسول اور دلوں پر آخرت کو ترجیح دے چکی تھیں۔ یہی موضوعات ہیں ان آیات کے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الَّتِي أَتَيْتَ أَجُورَهُنَّ
وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمَتِكَ
وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خُلَيْتِكَ الَّتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَأَةً مُؤْمِنَةً
إِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا
خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ
وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ٥١
تَرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤَيِّ إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ وَمِنْ ابْتِغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ذَلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ تَقَرَّ أَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَ وَيَرْضَيْنَ بِمَا
أَتَيْتَهُنَّ كُلَّهُنَّ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَلِيمًا ٥٢
يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ
ع ١٢ إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ رَقِيبًا ٥٣

”اے نبیؐ ہم نے تمہارے لیے حلال کر دیں تمہاری وہ بیویاں جن کے سر تم نے ادا کیے ہیں اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمہاری ملکیت میں آئیں اور تمہاری وہ بچا زاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ

زاد ہمیں جنوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی ہے اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبیؐ کے لیے چھپا دیا ہو اگر نبیؐ اسے نکاح میں لینا چاہے۔ یہ رعایت خالصتاً تمہارے لیے ہے۔ دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود و عائد کیے ہیں۔ تمہیں ان حدود سے ہم نے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے تاکہ تمہارے اوپر کوئی تنگی نہ رہے 'اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ تم کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو 'اپنے سے الگ رکھو' جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلا لو۔ اس معاملہ میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس طرح زیادہ متوقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی تم ان کو دو گے اس پر وہ سب راضی رہیں گی۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے 'اور اللہ علیم و حلیم ہے۔ اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں 'اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی پسند ہو 'البتہ لونڈیوں کی تمہیں اجازت ہے۔ اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس آیت میں مذکورہ عورتوں کو حلال قرار دیا گیا۔ اگرچہ وہ چار کی تعداد سے زیادہ ہوں جبکہ دوسرے مسلمانوں پر چار سے زیادہ تعداد حرام ہے۔ یہ اقسام یہ ہیں: وہ ازدواج جن کو مردے کر آپؐ نے نکاح فرمایا۔ وہ عورتیں جو غلام بن کر آجائیں۔ بچا زاد اور خالہ زاد عورتیں۔ پھوپھی زاد اور ماموں زاد عورتیں۔ ان میں سے صرف وہ جو آپؐ کے ساتھ ہجرت کر کے آئیں۔ یہ ان مہاجرات کی عزت افزائی کے لیے ہے۔ نیز وہ عورت بھی جو اپنے نفس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بخش دے 'بغیر مرد کے اگر نبیؐ اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہیں۔ (روایات میں اضطراب ہے کہ آیا اس قسم کی عورتوں میں سے کسی کے ساتھ حضورؐ نے نکاح فرمایا یا نہیں۔ رائج بات یہ ہے کہ جن عورتوں نے اپنے آپ کو حضورؐ کے لیے پیش کیا آپؐ نے ان کے ساتھ نکاح کیا)۔ یہ اقسام حضورؐ کے لیے بطور خصوصیت جائز کی گئیں کیونکہ حضورؐ مومنین اور مومنات کے دلی بھی تھے۔ رہے دوسرے لوگ تو وہ اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے معاملے میں اللہ کے جاری کردہ قوانین کے پابند تھے۔ یہ استثناء اس لیے کی گئی کہ حضورؐ اپنے شخص پر انتہائی حالات کی وجہ سے مشکلات میں مبتلا نہ ہوں۔

اس کے بعد یہ اختیار بھی حضور اکرمؐ کو دے دیا کہ اگر کوئی اپنی ذات کے بارے میں حضورؐ کو پیش کش کرے تو حضورؐ اسے اپنے حرم میں لے لیں یا موخر کر دیں۔ اور جن کے معاملے کو آپؐ نے موخر کر دیا تو بعد میں اسے حرم میں داخل کر دیں۔ یہ بھی اختیار دے دیا کہ جن عورتوں کو الگ کر دیں انہیں دوبارہ ساتھ بلا لیں۔

ذٰلِكَ اَدْنٰی اَنْ تَقْرَءَ عَيْنَهُمْ وَاَلَا يَحْزَنُ وَاَيُّ ضَمِيْنٍ بِمَا اٰتَيْتَهُنَّ كُلَّهُنَّ (۵۱:۳۳)

"اس طرح زیادہ متوقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں۔ اور جو کچھ بھی تم ان کو دو گے اس پر وہ سب راضی ہوں گی۔" گویا یہ حضور اکرمؐ کے خاص حالات کے تحت اجازت دی گئی۔ کیونکہ سب عورتیں آپؐ کی طرف راغب تھیں اور آپؐ کے ساتھ رابطہ چاہتی تھیں۔ اللہ کو ان حالات کا سب سے زیادہ علم تھا۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا (۵۱:۳۳)

"اللہ جانتا ہے: تم لوگوں کے دلوں میں ہے اور اللہ علیم و حلیم ہے۔"

اس کے بعد یہ حکم ہے کہ آپ کے حرم میں جو عورتیں ہیں، وہ ذاتی طور پر آپ کے لیے جائز ہیں، تعداد مطلوب نہیں ہے۔ اس لیے آپ ان میں سے کسی کے بدلے کسی دوسری عورت کو نہیں لاسکتے۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ آیا حضورؐ نے اس آیت کے نزول سے قبل کسی عورت کا اضافہ کیا تھا۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدِّلَ بَهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ

(۵۲:۳۳) ”اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ، خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔ اس میں کوئی استثناء نہیں۔“

أَلَا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ (۵۲:۳۳) ”البتہ لونڈیوں کی تمہیں اجازت ہے۔“۔ لونڈیاں جس قدر چاہیں رکھ سکتے ہیں۔

وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ رَقِيبًا (۵۲:۳۳) ”اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔“۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ یہ حرمت بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل اٹھالی گئی تھی لیکن اجازت کے باوجود حضور اکرمؐ نے ان کے سوا کسی عورت کے ساتھ نکاح نہ کیا اس لیے وہی امات المؤمنین رہیں۔

--- ۰۰۰ ---

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے اور عام مسلمانوں کے تعلقات و روابط کی ضابطہ بندی کی گئی ہے کہ آپ کی زندگی میں لوگوں کا ربط آپ کی ازواج کے ساتھ کیا ہو گا اور آپ کی وفات کے بعد کیا تعلق ہو گا۔ یہ احکام اس وقت کے واقعی حالات کے مطابق آئے۔ کیونکہ بعض منافقین اور بعض مریض اخلاق والے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی ازواج کے بارے میں اذیت دیتے تھے۔ اس لیے ان آیات میں ان کو سخت دھمکی دی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ان کی حرکات بہت ہی گنہاؤنی ہیں۔ یہ لوگوں سے تو چھپ سکتے ہیں مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ اللہ ان کی شرارتوں کو بھی جانتا ہے اور نیوٹوں کو بھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ

لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرٍ نَظِيرِينَ إِشْرَءُ وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا

طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذَى

النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ

خَبْرًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ وَمَا

كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِ
أَبْدَانِ إِنْ ذَلِكَ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا ۝ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نبی کے گھروں میں بلا اجازت نہ چپے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔ مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ۔ باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔ تمہاری یہ حرکتیں نبیؐ کو تکلیف دیتی ہیں، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے۔ اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ نبیؐ کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔ تمہارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دو، اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو، یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ کو ہر بات کا علم ہے۔“

امام بخاری نے حضرت انس ابن مالک کی روایت نقل فرمائی ہے کہ حضورؐ نے جب زینب بنت عجل سے شادی کی تو روٹی اور گوشت کی دعوت دی اور مجھے بلانے کے لیے بھیجا گیا۔ لوگ آتے اور کھانا کھا کر چلے جاتے۔ میں نے سب کو بلایا یہاں تک کہ کوئی نہ رہا۔ تو میں نے کہا حضور اکرمؐ کوئی رہ نہیں گیا۔ تو حضورؐ نے فرمایا اب دسترخوان اٹھا لو، کمرے میں تین آدمی بیٹھ گئے جو باتیں کر رہے تھے۔ حضور اکرمؐ نکلے اور حضرت عائشہؓ کے کمرے میں گئے۔ اور فرمایا السلام علیکم اکل البیت ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپؐ نے فرمایا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ اے رسول خداؐ! آپ کی نئی بیوی کیسی ہیں۔ اللہ آپ کے لیے اسے مبارک کرے۔ آپؐ اپنی ازواج کے ہاں گئے اور ایسا ہی مکالمہ کیا جس طرح عائشہؓ سے ہوا اور سب نے ایسا ہی جواب دیا۔ جب حضورؐ واپس ہوئے تو یہ تین افراد اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ حضورؐ نہایت ہی حیا دار تھے۔ تو حضورؐ حضرت عائشہؓ کے کمرے میں چلے گئے۔ معلوم نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کو اطلاع دی کہ لوگ چلے گئے یا کسی اور نے اطلاع دی۔ جب حضورؐ واپس ہوئے اور اپنا پاؤں دروازے کی چوکت سے اندر رکھا اور دو سرا ہا ہر تھا تو میرے اور اپنے درمیان پردہ گرادیا اور اس وقت حجب کی آیت نازل ہوئی۔

اس آیت میں وہ آداب مذکور ہیں جو درج جاہلیت میں ناپید تھے۔ یہاں تک کہ حضورؐ کے گھر میں بھی یہ ناپید تھے۔ لوگ گھروں میں بغیر اجازت کے داخل ہو جاتے تھے جیسا کہ سورہ نور کی آیت استیذان کی تشریح میں تفصیلات گزر گئیں اور حضور اکرمؐ کے گھر میں تو ان آداب کا بالکل خیال نہ رکھا جاتا تھا اس لیے کہ آپ کا گھر ایک مقام اجتماع تھا اور وہاں لوگ ہر وقت عجم و حکمت کے حصول کے لیے بیٹھے رہتے تھے۔ بعض لوگ آتے اور دیکھتے کہ کچھ پک رہا ہے تو وہ بیٹھ جاتے تا کہ بغیر دعوت کی کھالیں۔ بعض لوگ کھاپی لینے کے بعد بھی بیٹھے رہتے۔ چاہے دعوت دی گئی یا خود گھس آئے ہوں۔ پھر باتوں میں لگ جاتے اور نہ سمجھتے کہ اس سے حضور اکرمؐ کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے اور آپ کے اہل بیت کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ تین افراد جب باتیں کر رہے تھے تو اس وقت حضورؐ کی دامن اس کمرے میں منہ دیواری طرف کر کے بیٹھی تھی اور حضورؐ ہنس بات سے حیا کرتے تھے کہ وہ ان لوگوں کو بتا دیں کہ وہ آپ کے لیے کس قدر بوجھ ہیں۔ محض اس لیے کہ وہ شرمندہ نہ ہوں۔ چنانچہ اللہ نے رسول اللہؐ کی جانب سے یہ اعلان فرمایا۔

وَاللّٰهُ يَسْتَحْيٰ مِنَ الْحَقِّ (۵۳:۳۳) ”اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔“

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی غیرت کی بنیاد پر اور حساس ہونے کی وجہ سے حضورؐ کے سامنے یہ تجویز رکھ کرتے تھے کہ حجاب نافذ ہو جائے اور یہ تمنا بھی کرتے تھے یہاں تک کہ آیت حجاب نازل ہو گئی۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ”حضورؐ آپ کے پاس تو نیک و بد سب آتے ہیں۔ لے کاش کہ آپؐ اس۔۔۔ مومنین کو پردے کا حکم دیتے۔“

اس آیت میں یہ تعلیم دی گئی کہ لوگ نبی کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل نہ ہوں۔ جب کسی دعوت طعام کے لیے بلایا جائے تو داخل ہوں۔ اگر بلائے نہ گئے ہوں تو جلدی میں نہ آئیں ”در کھانے کے پکنے کا انتظار جائے دعوت میں جا کر نہ کرس۔ پھر جب ان کو کھانا کھل دیا جائے تو چلے جائیں اور کھانا کھانے کے بعد محض گپ شپ کے لیے بیٹھ نہ جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے مقابلے میں آج مسلمان آداب کے زیادہ محتاج ہیں کیونکہ اس ترقی کے دور میں بھی ہم ان آداب سے دور ہیں کیونکہ جن لوگوں کو دعوت پر بلایا جاتا ہے وہ کھانے کے بعد بھی جم جاتے ہیں بلکہ کھانا کھاتے وقت ہی وہ طویل باتیں کرتے ہیں۔ اگرچہ آداب جو اس رسم کے احکام حجاب سے بعض احکام ہی کی پیروی کرتے ہیں وہ قید ہوتے ہیں اور مہمان اپنی باتوں میں عرق نہ دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی آداب ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے مفید ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلامی اور خدائی آداب اختیار کرنے کے لیے تیار ہوں۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور عام لوگوں کے درمیان حجاب کی بات سامنے آتی ہے۔

وَ اِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَآءِ حِجَابٍ (۵۳:۳۳) ”نبی کی بیویوں سے اگر تم نے کچھ مانگا ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔“ اور یہ حجاب تمہارے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔

ذَلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ (۵۳:۳۳) ”یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے مناسب طریقہ ہے۔“ لہذا کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اس بات کے سوا کوئی اور بات کہے۔ اس لیے کسی کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ اختلاط ہے پردگی ہے پاک باتیں ہے قید مدقاتیں ہم نشینی اور جنسی کے درمیان اشتراک دلوں کو پاک کرتا ہے اور اس طریقے سے ضمیر زیادہ عقیف ہوتے ہیں۔ اس طرح میلانات اور خواہشات دب جاتی ہیں۔ انسانی سلوک اور شعور شفاف ہو جاتے ہیں۔ یہ ہیں بعض وہ خرافات جو اللہ کی مخلوق میں سے گرے ہوئے لوگ کہتے ہیں۔ میں مشورہ دوں گا کہ کسی کو یوں نہیں کہنا چاہئے جبکہ اللہ فرماتے ہیں۔

وَ اِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَآءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ (۵۳:۳۳)

”نبی کی بیویوں سے اگر تم نے کچھ مانگا ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگو یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے نہایت مناسب طریقہ ہے۔“ یہ حضور اکرمؐ کی بیویوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے جو امت مسلمہ میں ہیں اور ان لوگوں سے کہا جا رہا ہے جو زمین کا ٹک ہیں۔ رسول کے ساتھی ہیں جن کی ہمسری کا کوئی سوچ بھی

نہیں سکتا۔ جب اللہ بات کرتا ہے اور دوسری جانب سے اللہ کی مخلوق ایک بات کرتی ہے تو بات اللہ کی ہوتی ہے اور دوسروں کی باتیں خرافات ہوتی ہیں۔ اللہ کے مقابلے میں انسانوں کی باتوں کو اہمیت دہی شخص دے سکتا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ایک انسان اللہ سے زیادہ جانتا ہے۔

سالوں کے تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اللہ نے جو کچھ کہا، وہ زیادہ سچا تھا اور یہ چھوٹے اور بونے لوگ جو کچھ کہتے ہیں، ان کو سالوں اور صدیوں کے تجربات نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ آج مغرب میں جہاں عورت و مرد کا اختلاط اپنی امتدادوں کو چھو رہا ہے، کیا تمام لوگوں کے دل پاک و صاف ہو گئے ہیں۔ امریکہ اس میدان میں سب سے عروج پر ہے۔ ذرا اسی کے حالات کا مطالعہ کر لو۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ بد نے سے بھی پہلے آ جانا اور کھانے کے پکنے کا انتظار کرنا اور پھر کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دور دراز کی باتیں کرنا حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تکلیف دہ تھا اور آپ از روئے حیہ چشمی خاموش تھے۔ حالانکہ مسلمانوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لذیت دےں یا آپ کے بعد آپ کی ازدواج سے نکاح کرس۔ جبکہ وہ ان کی ماؤں جیسی ہیں۔ رسول اللہ کے مقام و مرتبے کا یہ تقاضا ہے کہ آپ کے بعد کوئی ان کے ساتھ نکاح نہ کرے، اس گھرانے کی حرمت اور عزت کو قائم کرنے کے لیے۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تُنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا

(۵۳:۳۳) ”تمہارے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو۔“ بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض منافقین یہ کہتے تھے کہ وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ حضور کی وفات ہو اور وہ عائشہ سے نکاح کرس۔

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا (۵۳:۳۳) ”یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔“ اور جو گناہ اللہ کے ہاں عظیم ہو وہ کس قدر بولناک ہو گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد مزید دھمکی دی جاتی ہے جو بہت ہی شدید ہے۔

اِنْ تَبَدُّواْ اَشْيَآءًاۙ اَوْ تَخَفُوْهُۥۙ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۵۴:۳۳) ”تم خواہ کوئی بات ظاہر کر دیا چھپاؤ، اللہ کو ہر بات کا علم ہے۔“ لہذا یہ سب معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ ہر ظاہر اور چھپے کا جاننے والا ہے۔ ہر تدبیر اور ہر سوچ کو جانتا ہے اور یہ معاملہ اس کے ہاں ہے بھی گناہ کبیرہ۔ اگر کوئی پھر بھی اس کے ساتھ الجھتا ہے تو وہ اللہ کے ساتھ جنگ کرتا ہے اور جس نے اللہ سے جنگ کی وہ مٹ گیا۔

اس عام حجاب کے بعد ازدواج مطہرات کے لیے بعض عمرات سے پردہ نہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ ان کے سامنے آسکتی ہیں۔

لَا جُنَاحَ عَلَیْہِمْ فِیْ اَبَآئِہِمْ وَلَا اَبْنَآئِہِمْ وَلَا اِخْوَانِہِمْ

وَلَا أَبْنَاءَ إِخْوَانِهِمْ وَلَا أَبْنَاءَ أَخَوَاتِهِمْ وَلَا نِسَائِهِمْ وَلَا مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُهُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ۝

”ازواج نبی کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے، ان کے بھانجے، ان کے میل جوں کی عورتیں اور ان کے مملوک گھروں میں آئیں۔ (اے عورتو) تمہیں اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرنا چاہئے اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔“

یہ وہی محرم ہیں جن کے سامنے تمام مسلمان عورتوں کو حجاب نہ کرنے کی اجازت ہے۔ یہ معصوم نہیں کہ ان دو آیات میں سے کون سی پہلے نازل ہوئی ہے۔ یعنی یہ آیت جو ازواج نبی کے ساتھ مخصوص ہے یا سورہ نور کی وہ عام آیت جو تمام مسلم عورتوں کے لیے ہے۔ رائج بات یہ ہے کہ پہلے حکم ازواج مطہرات کے لیے آیا اور پھر عام مسلم عورتوں کے لیے اور یہ اللہ کی طرف سے فرائض عائد کیے جانے کے مزاج کے مطابق ہے۔

اس اجازت کو بھی خدا کے خوف کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ اللہ سے ڈرو، اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔ تقویٰ اور اللہ کی نگرانی کو ذہن میں رکھنا ایسے مقامات پر بالعموم مذکور ہوتا ہے کیونکہ تقویٰ ہر برائی سے بچنے کی آخری ضمانت ہے۔ یہ وہ نگران ہے جو ہر وقت دل و دماغ کی نگرانی کرتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

سیاق کلام لوگوں کو اس بات سے ڈرانے میں ذرا مزید آگے بڑھتا ہے کہ وہ رسول اللہ کو اذیت نہ دیں۔ نہ آپ کی ذات کے معاملے میں اور نہ آپ کے خاندان کے معاملے میں۔ اس کام کے گھناؤنے پن کو مزید وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے اور یہ بات دو طریقوں سے بیان کی جاتی ہے۔ پہلے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ حضور اکرم اللہ کے ہاں کس قدر بلند مرتبہ ہیں اور دو سرائط طریقہ یہ کہ براہ راست یہ کہا گیا کہ حضور اکرم کو ایذا دینے والے دراصل اللہ کو ایذا دیتے ہیں اور اس کی سزا اللہ کے ہاں یہ ہے کہ ان کو اللہ کی رحمت سے دور کر دیا جاتا ہے اور وہ دنیا اور آخرت میں محروم ہوں گے اور ان کو یہ عذاب دیا جائے گا۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ
اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ۝

”اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔ جو لوگ

اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے رسواکن عذاب مہیا کر دیا ہے۔“

اللہ کی طرف سے رسول اللہؐ پر درود بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ عالم بالا میں نبی کی تعریف کی جاتی ہے اور فرشتوں کی طرف سے درود کے معنی یہ ہیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دعا کرتے ہیں۔ کیا ہی عظیم مرتبہ ہے حضورؐ کا اللہ کے ہاں کہ یہ پوری کائنات آپ کے لیے دعاگو ہے۔ اس کے ذریعہ پوری کائنات منور ہو جاتی ہے اور اللہ کی جانب سے یہ ثناء اور تعریف ہوتی ہے اور جو باقی ہے اور ازل اور ابدی ہے اور پوری کائنات اس کے ہمتہم ہے۔ اس نعمت اور تکریم سے بڑی اور نعمت کیا ہو سکتی ہے۔ ہم انسانوں کے درود و سلام کا اللہ اور پوری کائنات کے درود و سلام سے کیا مقابلہ۔ انسانوں سے صلوة و سلام کا مقابلہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کی یہ حقیر آواز بھی کائنات کی گونج سے مل کر اس عظیم ثناء میں شریک ہو جائے اور اس طرح انسان بھی اس بڑی تقریب میں شرکت کے مدعی بن جائیں جبکہ اللہ کی جانب سے صلوة و سلام تو ازل اور ابدی ہو گا۔

اس عظیم حمد و ثناء کو دیکھتے ہوئے جس میں رب تعالیٰ فرشتے کائنات اور انسان بھی شریک ہیں۔ اگر کوئی بد بخت نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ممدوح کائنات اور رب کائنات کو اذیت دیتا ہے تو اس کا یہ فعل کس قدر گناہنا، کس قدر قبیح اور قابل ملامت ہو جاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا

مُہینًا (۵۷:۳۳) ”جو لوگ اللہ اور رسول اللہؐ کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے رسواکن عذاب مہیا کر دیا ہے۔ یہ فعل اور بھی قبیح ہو جاتا ہے کہ ایک مخلوق اپنے خالق کو اذیت دیتی ہے۔ حالانکہ لوگ اللہ کو اذیت دے ہی نہیں سکتے۔ بلکہ انداز کلام یہ جاتا ہے کہ وہ رسول اللہؐ کو اس قدر سخت اذیت دیتے ہیں جس سے گویا اللہ جل و شانہ کو اذیت پہنچتی ہے۔ لہذا ان کی یہ حرکت بہت بری بہت قبیح اور نہایت گناہنا و فحش ہے۔“

اس کے بعد مومنین و مومنات کی ایذا کا ذکر آتا ہے کہ ان کو اذیت دینا ان پر بہتان باندھنا کہ ان میں کوئی عیب نہیں جیسے یہ منافقین ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا اُكْتُبُوْا

ع

ع۶

فَقَدْ اَحْتَمَلُوْا بِهٖتَانًا وَاِثْمًا مُّبِیْنًا

۴

”اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بے قصور اذیت دیتے ہیں انہوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مدینہ میں ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو اس طرح مومنین اور مومنات کو اذیت

رسانی کے مشغلے میں مصروف تھا۔ مومنین کے بارے میں بری باتیں رات اور دن منسوب کی جاتی تھیں۔ ان کے خلاف سازشیں کرتے، اتھتیں لگاتے، جس طرح ہر زمان و مکان میں اسلامی تحریکات کے خلاف ہوا کرتا ہے۔ بدکار اور اشرار کے ہر معاشرے میں مومنین اور مومنات کے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک ہوا ہے۔ مریض دل لوگ اور منافقین کا کسب ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اللہ نے مومنات کا دہن یہاں اپنے ذمہ لیا ہے اور الزام لگایا ہے کہ ان کے دشمن جھوٹے اور جنسی ہیں اور اللہ سے بچا اور کون ہو سکتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اس کے بعد حکم دیا جاتا ہے کہ لے نہی اپنی بیویوں، لڑکیوں اور مومنین کی عورتوں کو یہ ہدایت کر دو کہ وہ جب باہر نکلیں تو اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کس تاکہ وہ پہچان لی جائیں کہ وہ شریف زادیاں ہیں۔ اس طرح کہ ان کے سر، چہرے اور سینے پوشیدہ ہوں۔ جیوب، بٹ بٹ جیب ہے اور یہ قمیص کا کھٹکاف ہوتا ہے جو سینے پر ہوتا ہے۔ اس دور میں لوگ عورتوں سے چھیز چھا ڈرتے تھے۔ اس لیے اس طرح کے لباس سے اس قسم کے شریک ذرا سہم جائیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ یہ خواتین شرم و حیا والی ہیں لہذا وہ دست درازی کی جرئت نہ کر سکیں گے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ
يُذْنِبْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۚ وَ
كَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝

”اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور نسل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پونٹ لٹکالیا کیں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔“

سہی کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایسے فساق موجود تھے جو اس دور میں رات کو نکلتے تھے، اس وقت جب اندھیرا گرا ہوا جاتا تھا اور مدینہ کی تنگ گلیوں میں عورتوں سے چھیز چھا ڈرتے تھے۔ کیونکہ لوگوں کے گھر تنگ تھے اور قضاے حاجت کے لیے عورتوں کو باہر نکھٹا پڑنا تھا۔ یہ فساق ان عورتوں کے پیچھے پڑتے تھے۔ جب وہ دیکھتے کہ کسی عورت نے حجاب کیا ہوا ہے تو وہ یہ کہتے کہ یہ آزاد عورت ہے اس لیے یہ اس سے رک جاتے۔ اور جب وہ دیکھتے کہ پردہ نہیں ہے تو یہ اس پر ٹوٹ پڑتے۔

مجاہد کہتے ہیں کہ معنی یہ ہے کہ اپنے اوپر جلباب ڈال لیں تاکہ معلوم ہو کہ یہ آزاد عورتیں ہیں تاکہ کوئی فاسق ان کے ساتھ چھیز چھا نہ کرے یا تنگ نہ کرے اور یہ کہ۔

كَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا (۳۳: ۵۹) ”اور اللہ غفور و رحیم ہے۔“۔ یعنی بام جاہلیت میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ اس سے درگزر فرمائے گا کیونکہ اس وقت ان کو نہ حکم تھا اور نہ علم تھا۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ عرب کے گندے معاشرے کو اسلام آہستہ آہستہ پات کر رہا تھا اور فتنہ و فساد اور جنسی بے راہ روی کی ایک ایک راہ کو بند کرتا چلا جاتا، اور بدی کا دائرہ تنگ کیا جا رہا تھا تاکہ اسلام کی پاک رسم و راہ آہستہ آہستہ اسلامی معاشرے میں بڑ پکڑتی چلی جائے۔

آخر میں مدینہ کے ان ناپسندیدہ عنصر کو سخت دھمکی دی جاتی ہے کہ منافقین، بیمار اخلاق کے لوگ اور بیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے اگر باز نہ آئے اور جن کارروائیوں میں وہ مصروف ہیں ان کو ترک نہ کیا تو ان کے خلاف رسول اللہ کو سخت کارروائی کرنے کا حکم دے دیا جائے گا۔ نبی اور مومنین اور مومنات ان پر مسلط کر دیئے جائیں گے جس طرح یہودیوں پر نبی اور مسلمانوں نے مکمل اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ پھر ان کے لیے مدینہ میں رہنا مشکل ہو جائے گا اور ان کو بھی ملک بدر کر دیا جائے گا۔ ان کے خلاف کارروائی یہ ہوگی کہ مومنین و مومنات ۱۰ بیت دینے والے مباح اہم ہیں جہاں میں ان کا سر قلم کر دیا جائے جس طرح یہودیوں کا حشر انہوں نے کچھ بائبل اور جس طرح ازمنہ ماضیہ میں غیر یہودی فساد و فجار کا یہی حشر انبیاء کے ہاتھوں ہوتا رہا ہے۔

لَیِّنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنْفِقُونَ وَالَّذِیْنَ فِی قُلُوبِهِمْ
مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِی الْمَدِیْنَةِ لَنُخْرِجَنَّکَ بِہُمْ ثُمَّ لَا یُجَاوِزُوکَ فِیْہَا
إِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّنْ تَلْعَوْنَ نِیْنًا ۖ اَیْنَمَا تَقِفُوا أَخِذُوا وَقْتًا قَلِیْلًا ۖ سُنَّةَ اللّٰہِ فِی
الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَکِنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا ۚ الرَّحِیْمُ

”اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور وہ جو مدینہ میں بیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے نہیں اٹھا کر اکس گے پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے۔ ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بری طرح مارے جائیں گے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو ایسے لوگوں کے معاملے میں پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔“

اس تہدیدت معلوم ہوتا ہے کہ بنی قریظہ کے قلع قمع کے بعد مدینہ میں مسلمان چیلنج پاور بن گئے تھے اور اسلامی مملکت قوت سے اخلاقی تعلیمات نافذ کر رہی تھی اور منافقین کا رز ہو گئے تھے۔ صرف خفیہ سازشیں کرتے تھے، کھلے بندوں مسلمانوں کے خلاف ٹا ہرنہ ہو سکتے تھے بلکہ بظاہر وہ خائف اور سہمے ہوئے تھے۔

درس نمبر ۱۹۳ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا آخری سبق ہے 'اس میں لوگوں کے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے جو وہ قیامت کے بارے میں کرتے تھے اور قیام قیامت کے لیے مطالبے کرتے تھے بلکہ دراصل ان کو وقوع قیامت کے بارے میں شک تھا۔ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ قیام قیامت کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ البتہ اس کا وقت بہت دور بھی ہے اور ممکن ہے کہ وہ اچانک ہی تمہیں آلے اور تم غفلت میں ڈوبے رہو۔ اس کے بعد مناظر قیامت میں سے ایک ایسا منظر پیش کیا جاتا ہے جو وقوع قیامت کا مطالبہ کرنے والوں کے لیے ہرگز مسرت بخش نہیں ہے۔ جب ان کے چہرے جہنم میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے اور اس وقت وہ اللہ اور رسول اللہ کی معصیت پر سخت نادم ہوں گے 'جب وہ اپنے لیڈروں اور پیروؤں کے لیے دگنا عذاب طلب کریں گے۔ یہ اس قدر شرمسار کنندہ منظر ہے کہ کوئی شائبہ کرنے والا ہرگز اسے پسند نہ کرے گا۔

اب اس منظر سے ان کو واپس لا کر پھر اس دنیا میں قوم موسیٰ کی مثال ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے کہ اس قوم نے بھی موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دی تھی اور پھر اللہ نے حضرت موسیٰ کو ان کے لگائے ہوئے الزام سے بری کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عملی واقعہ تھا۔ اشارہ اس طرف ہے کہ مدینہ میں جو لوگ حضورؐ کے خلاف باتیں کرتے ہیں کہ حضورؐ نے زینب کے ساتھ نکاح کر کے عربوں کے رواج کے خلاف کیا ہے۔ ایسا ہی کوئی الزام حضرت موسیٰ پر بھی تھا اور مومنین سے کہا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی معاملے میں سیدھی بات کیا کریں اور اشارہ و کنایہ میں الزامات عائد نہ کیا کریں تاکہ اللہ تمہارے اعمال و اخلاق کو درست کر دے۔ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے اور جو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے گا 'اللہ ان کو بہت بڑی کامیابی عطا کرے گا۔

سورہ کا خاتمہ ایک عظیم تبصرے پر ہوتا ہے یہ کہ زمین و آسمان نے دعوت قرآنی کی امانت کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کر دیا لیکن انسان نے اس عظیم ذمہ داری کو قبول کر لیا تاکہ اللہ کی اس عظیم پایہ تکمیل تک پہنچے۔ لوگوں کے اعمال پر جزاء و سزا مرتب ہو اور انسان اپنے لیے جو راہ اختیار کرتا ہے اس پر اس کا محاسبہ اور جزاء و سزا ہو۔

لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى

الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (۷۳: ۳۳) ”تاکہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے اور اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔“

درس نمبر ۱۹۳ تشریح آیات

۶۳ --- تا --- ۷۳

يَسْأَلُ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللَّهِ
وَمَا يُدِيرُكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا ﴿٦٣﴾

”لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کی گھڑی کب آئے گی۔ کہو اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ تمہیں کیا خبر شاید کہ وہ قریب ہی آگئی ہو۔“

اہل مکہ مسلسل قیامت کے دن کے بارے میں رسول خداؐ سے پوچھتے رہتے تھے کیونکہ حضورؐ نے ان سے قیامت کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے تھے اور ان کو قیامت سے بہت زیادہ ڈرایا تھا۔ اور قرآن کریم نے قیامت کے مناظر اس قدر طوالت سے ذکر کیے کہ یوں نظر آنے لگا کہ شاید یہ مناظر آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اے پیغمبر! آپ سے یہ لوگ قیامت کے وقت وقوع کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ یہ جلدی واقع ہو جائے اور یہ لوگ جلدی اس لیے کر رہے تھے کہ ان کو دراصل اس کے وقوع میں شک تھا۔ یا جلدی کا مطالبہ کر کے دراصل وہ نکذ عیب کرنا چاہتے تھے یا قیامت کے ساتھ حراج کرنا چاہتے تھے۔ ہر سائل کا سوال اس کی نفسیات کے اعتبار سے تھا جس کے جو خیالات تھے اور جس کے جو اعتقادات تھے وہ اپنے اعتقاد کے مطابق سوال کرتا۔

قیام قیامت کا علم ایک ایسا غیب ہے جو خاصہ خدا ہے اور اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس کی اطلاع نہیں دی۔ نہ رسولوں کو نہ ملائکہ مقربین کو۔ عہد اللہ ابن مرے جو حدیث حقیقت ایمان اور حقیقت اسلام کے بارے میں وارد ہے اس میں ہے کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص نمودار ہوا بالکل سفید لباس میں۔ بالکل اس پر سفر کے آثار میں سے کوئی علامت نہ تھی ہم میں سے کوئی اسے نہ پہچانتا تھا۔ وہ رسول اللہ کے سامنے بیٹھ گیا اور اپنے زانو حضور کے زانوؤں کے ساتھ ملا دیئے۔ اپنے ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ دیئے اور کہا اے محمد! بتائیے اسلام کیا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی اسے نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نماز پڑھے، زکوٰۃ دے اور رمضان کے روزے رکھے اور حج کرے اگر راستے کی طاقت ہو تو اس نے کہا:

”آپ نے سچ کہا۔ ہم نے تعجب کیا کہ عجیب شخص ہے خود پوچھتا ہے اور خود ہی تصدیق کرتا ہے۔ پھر اس نے پوچھا ایمان کیا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا: یہ کہ تو اللہ پر ایمان لائے، اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، قیامت کے دن، اور ابھی اور بری تقدیر پر ایمان لے آئے۔“ تو اس نے کہا: آپ نے درست کیا۔ اس کے بعد اس نے پوچھا: پھر احسان کے معنی کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: یہ کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کرے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تو تجھے ہی دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے سؤل کیا مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے؟ تو آپ نے فرمایا: پوچھنے جانے والا پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ جبرائیل علیہ السلام تھے اور یہ تمہارے پاس آئے تمہیں تمہارا دین سکھارنے تھے۔

مسؤل عنہ رسول اللہؐ تھے اور سائل جبرائیل تھے۔ دونوں کا علم برابر تھا یعنی قیامت کے بارے میں دونوں نہ جانتے تھے۔

قُلْ اِنَّمَا عَلَّمَهَا عِنْدَ اللّٰهِ (۳۳: ۶۳) ”کہو، اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔“ اور یہ اللہ کی خصوصیت ہے اور اللہ اس کے بارے میں منفرد ہیں اور اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو اس کا علم نہیں۔

یہ اللہ کی حکمت ہے کہ اس نے اس کا علم کسی کو نہیں دیا۔ ہماری سمجھ میں اسی قدر حکمت آتی ہے کہ لوگ اس سے ہر وقت ڈرتے رہیں اور ہر وقت اس کی توقع کرتے رہیں اور اس کے اچانک آجانے کی تیاری میں لگے رہیں۔ یہ تو ان لوگوں کے لیے ہے جن کو اللہ نے اس کے ذریعے بھلائی کی راہ کی طرف پھیر دیا اور اس کے دل میں قیامت کا ڈر پیدا کر دیا۔ رہے وہ لوگ جو اس سے غافل ہیں اور ہر وقت اس کی تیاری میں لگے نہیں رہتے تو وہ لوگ اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو آگ سے نہیں بچاتے۔ ایسے لوگوں کے سامنے اللہ نے اس کے مناظر رکھے، اس سے ڈرایا اور اسے غیب قرار دیا جو رات اور دن کے کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔

وَمَا يُذَرِّكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا (۳۳: ۶۳) ”شاید کہ وہ قریب ہی آگئی ہو۔“

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝۶۴ خٰلِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا ۚ وَلَا نَصِيْرًا ۝۶۵ يَوْمَ تَقْلُبُ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَا اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلًا ۝۶۶ وَقَالُوْا رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكِبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَ ۝۶۷ رَبَّنَا اِنْتَهَمَزُفَعَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنَتُهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝۶۸

۵ ”بہر حال یہ اس یقینی ہے کہ اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکی ہوئی آگ مہیا کر دی ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، کوئی حامی و مددگار نہ پاسکیں گے۔ جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کیے جائیں گے اس وقت وہ کہیں گے کہ ”کاش ہم نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی۔“ اور کہیں گے ”اے رب ہمارے، ہم نے اپنے

سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہِ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب ان کو دو ہر اذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔“

یہ لوگ قیامت کے قیام کے بارے میں پرچختے ہیں 'ذرالن کو قیام قیامت کا ایک منظر ہی بتا دو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا (۳۳: ۶۴) ”بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر دی ہے۔“ اللہ نے کافروں کو اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کی ہے۔ وہ ان کے لیے تیار اور حاضر ہے۔

يُخَلَّدُوْنَ فِيْهَا (۳۳: ۶۵) ”اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“ اس قدر طویل عرصہ اس میں رہیں گے کہ اس کی طوالت کا علم اللہ ہی کو ہے۔ اس کی انتہا نہیں ہے لایہ کہ اللہ کے علم میں ہو جب وہ چاہے ختم کر دے۔ ان کے ساتھ کوئی بھی معاونت کرنے والا نہ ہو گا۔ کوئی مددگار نہ ہو گا۔ لہذا اس آگ سے نکلنے کی کوئی امید ان کو نہ ہو گی۔

لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۳۳: ۶۵) ”کوئی حامی و مددگار وہ نہ پاسکیں گے۔“ اس عذاب میں ان کا منظر نامہ کیا ہو گا؟ نہایت ہی بری حالت اور نہایت ہی الناک صورت حال :

يَوْمَ تَقْلُبُ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ (۳۳: ۶۶) ”جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کیے جائیں گے۔“ ہر طرف سے آگ ان کو ڈھانپ رہی ہو گی۔ یہاں ان کی حرکات کی تصویر یعنی قلم بنائی جا رہی ہے اور اسے جسم کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کہ ان کے چہروں کے ہر حصے کو آگ جھلسائے گی اور اس طرح انہیں سخت سے سخت عذاب دیا جائے گا۔

يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَا اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلًا (۳۳: ۶۶) ”اس وقت وہ کہیں گے اے کاش ہم نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی ہوتی۔“ یہ ان کی جانب سے بالکل بے کار تمنا ہو گی۔ کیونکہ تب اطاعت کا موقع و محل کہاں ہو گا۔ اس وقت تو کوئی موقع نہ ہو گا آزمائش کا۔ اب تو صرف حسرت ہی ہے۔ اب ان کو اپنے سرداروں اور کبراء پر سخت غصہ آئے گا جنہوں نے دراصل ان کو گمراہ کیا تھا 'لہذا وہ اب اللہ کے مطیع فرمان بننے کی سعی کریں گے مگر اب یہ اطاعت کا موقع ہی ختم ہو گیا۔

وَقَالُوْا رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلًا (۳۳: ۶۷) رَبَّنَا

اَتٰهُمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنَهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (۳۳: ۶۸) ”اور کہیں گے اے رب ہمارے ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہِ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب ان کو دو ہر اذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔“

یہ ہے قیامت کا نمونہ۔ پوچھتے کیا ہو؟ اس روز پہنچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ اس کے لیے تیاریاں کرو ورنہ یہ الناک انجام تمہارے سامنے ہو گا۔

حضرت زینب کے ساتھ حضورؐ کا نکاح چونکہ جاہلیت کی ایک نہایت ہی گہری رسم کے خلاف تھا اور اسلام نے اسی لیے اس پر حضور اکرمؐ کے فعل کے ذریعے ضرب کاری لگائی تھی، لیکن اس معاشرے نے درد محسوس کیے بغیر اپنے اندر سے اس رسم کا اکھاڑ پھینک قبول نہ کیا۔ منافقین اور مریض اخلاق کے لوگوں نے سخت غوغا آرائی شروع کر دی۔ ان کے ساتھ ہاں میں ہاں ملائے والے ایسے مسلمان بھی تھے جن کے ذہنوں میں اسلامی تصور حیات ابھی ابھی طرح نہ بیٹھا تھا۔ چنانچہ یہ عناصر طرد و تضحیح، اعتراض و تنقید کرتے تھے۔ پارے شہر میں انہوں نے کانا بھوسی شروع کر رکھی تھی اور حضور اکرمؐ کے بارے میں بری باتیں کرتے تھے۔

منافقین اور انواہیں پھیلانے والے کب خاموش رہ سکتے تھے۔ وہ کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے جس طرح غزوۂ احزاب میں انہوں نے ایک زبردست مہم شروع کر رکھی تھی۔ انک کے معاملے میں وہ اس سے قبل تجربہ کر چکے تھے۔ مال قیمت کی تقسیم میں وہ ایسی ہی مہم چلا چکے تھے۔ غرض ہر موقع دخل میں یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اذیت کا باعث تھے اور بالکل بے جواز۔

اس دور میں جبکہ بنی قریظہ اور سرے یہودیوں کو مدینہ سے نکالا گیا تھا، مدینہ میں کوئی کافر اور مشرک نہ تھا۔ اہل مدینہ یا تو سچے مسلمان تھے اور یا منافق تھے اور اس قسم کی مہم یہ منافق ہی چلاتے تھے۔ یہ جھوٹی انواہیں پھیلاتے۔ بعض سادہ لوح مسلمانوں پر بھی ان کا اثر تھا جو ان کے ساتھ فاضلی کی وجہ سے شریک ہو جاتے تھے۔ اس لیے قرآن کریم نے اہل ایمان کو یہاں متنبہ کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث اذیت نہ بنو، اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی مومنین نے بھی حضرت موسیٰ کو اذیت دی تھی۔ اس لیے ان منافقین کی باتوں پر بلا تحقیق و تحقیث کان نہ دھرو۔ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کرو، تمہارے لیے یہ بڑی کامیابی ہوگی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ أَذُوا مُوسَىٰ قَبْرًا

اللَّهُ مِمَّا قَالُوا وَكَانَ عِنْدَ اللَّهِ وَجِيهًا ۖ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ

وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۖ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ

يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنہوں نے موسیٰ کو اذیتیں دی تھیں، پھر اللہ نے ان کی بنائی ہوئی باتوں سے اس کی براءت فرمائی اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھا۔ اے ایمان لانے والو، اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ اللہ تمہارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

قرآن کریم نے اس ایذا کا تعین نہیں کیا جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھی۔ ابستہ روایت میں اس کا تعین کیا گیا ہے۔ لہذا ہم اس بات کو مجمل ہی چھوڑتے ہیں جسے قرآن کریم نے مجمل چھوڑ دیا۔ یہاں مقصد لٹل ایمان کو اس بات سے خبردار کرنا ہے کہ وہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت نہ دے۔ اللہ نے قرآن کریم میں بنی اسرائیل کی بدعمدیوں اور بدکرداریوں کی کئی مثالیں دی ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کر دیا کہ انہوں نے اپنے نبی کو اذیت دی تھی۔ لہذا مسلمانوں کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تاکہ مسلمانوں کا شعور ایسا بن جائے کہ وہ کسی معاملے میں بھی بنی اسرائیل کے مماثل نہ ہوں۔ ان کے دلوں میں ان کی نفرت بیٹھ جائے کیونکہ یہ لوگ مجسم بد عمل 'بے راہِ رد' نبی کو ہر وقت تنگ کرنے والے تھے۔ بنی اسرائیل نے اپنے نبی پر جو الزام لگایا تھا اللہ نے ان کو اس سے بری کر دیا تھا۔

وَكَانَ عِنْدَ اللَّهِ وَجِيهًا (۳۳: ۶۹) ”اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھا“۔ یعنی وہ اللہ کے نزدیک صاحب قدر و منزلت تھا۔ اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو ہر قسم کے بہتان اور الزام سے علی روس اللاشادہ بری کرتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں اس لیے اللہ ان کو بھی بری اور پاک کرتا ہے۔ قرآن کریم لٹل ایمان کو ہدایت کرتا ہے کہ کسی معاملے میں منافقین اور دشمنوں کے ساتھ اتفاق کرنے سے قبل اس کی تحقیق اور درستی کا پتہ کرنا فرض ہے۔ خصوصاً اپنے نبی 'مرشد اور ولی اور دوست کے بارے میں گمراہوں اور فساق و فجار کی باتوں پر کان دھرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ قرآن کریم ان کو ایک صالح بات کی ہدایت کرتا ہے جس کے نتیجے میں عمل صالح نمودار ہوتا ہے۔ جو لوگ سچے ہوتے ہیں اللہ ان کی تمکبانی کرتا ہے اور ان کی راہنمائی اعمال خیر کی طرف کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اچھی باتیں کرنے والوں اور اچھے اعمال کرنے والوں کی مغفرت فرماتا ہے اور ان کی تقصیرات کو معاف کرتا ہے کیونکہ تقصیرات سے کوئی آدمی محفوظ نہیں رہتا۔ ان تقصیرات سے آدمی صرف مغفرت الہی سے نکل سکتا ہے۔

مَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا (۳۳: ۷۱) ”جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ اطاعت الہی بذات خود فوز عظیم ہے“ کیونکہ اطاعت سے انسان اللہ کے نیج پر قائم ہوتا ہے۔ اور اللہ کے طریقے پر استقامت انسان کے لیے نفع بخش ہوتی ہے۔ اور جسے اللہ کے سیدھے طریقہ اور راستے کی طرف ہدایت ہو جائے یہ بذات خود دائمی سعادت اور نیک بختی ہے۔ اگرچہ اس کے سوا اس کے لیے کوئی اجر و جزاء نہ ہو۔ کیونکہ جو شخص ٹھیک ٹھیک اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہو اسے اپنا راستہ صاف نظر آرہا ہو اور اس کے ارد گرد مخلوق اسی کے ساتھ معاون ہو وہ اس شخص کی طرح نہیں ہو سکتا جسے اپنی راہ معلوم نہ ہو 'پریشاں ہو' اور اس کی راہ کے ارد گرد تمام کائنات اس سے متصادم ہو اور اس کے لیے اذیت ناک ہو۔ لہذا اللہ اور رسول کی اطاعت بذات خود احسن الجزاء ہے۔ یہی فوز عظیم ہے۔ یوم الحساب اور جنت نعیم سے بھی پہلے یہ کامیابی ہے۔ اخروی کامیابی تو فضل عظیم ہے اور یہ بونس ہے جو نعمت ملے گی اور یہ فضل اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل اس لیے ہے کہ حضرت انسان بہت ہی ضعیف ہیں۔ اور اللہ نے انسان کے کاندھوں پر جو ذمہ داری عائد کی ہے وہ بہت ہی بھاری ہے اور انسان نے اپنی نادانی کی وجہ سے اس قدر عظیم بوجھ اپنے اوپر لیا ہے جس کے احمق سے آسمان زمین اور پہاڑوں نے معذرت کی تھی۔ حالانکہ اسے اپنی کمزوریاں معلوم تھیں۔ شہوات و میلانات کا دباؤ 'علم و ہنر کا قصور' عمر کا

اختصار اور زمان و مکان کی مشکلات اور مستقبل کے واقعات کی پیش بینی میں انسان کی کمزوری وغیرہ۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ

فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا

جَهُولًا ﴿٣٣﴾

”ہم نے اس امانت کو آسمانوں، اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا“ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔“

زمین و آسمان اور زمین کے اندر بڑے بڑے پہاڑ، دراصل ایک عام انسان کے لیے عظیم مخلوق ہیں، جن کا یہاں قرآن نے ذکر کیا ہے اور جن کے اندر انسان رہتا ہے، ان کے مقابلے میں انسان بہت ہی ضعیف اور حقیر ہے۔ یہ مخلوقات اپنے خالق کو بھی طرح جانتی ہے اور اللہ کے حکمرانی نظام اور قانون کے مطابق چل رہی ہے۔ اللہ کے احکام کو براہ راست پاتی ہے اور ان پر عمل پیرا ہے۔ یہ اس ناموس فطرت کے مطابق چلتی ہے جو اللہ نے اس کے اندر جاری کیا ہے۔ آغاز تخلیق سے یہ کائنات یونہی، نظام قضا و قدر کے مطابق جاری و ساری ہے۔ نہ اللہ کی اطاعت سے نکلتی ہے اور نہ اللہ کے ناموس فطرت سے سرمو انحراف کرتی ہے اور نہ کر سکتی ہے۔ یہ سب مخلوق اپنا فریضہ منہی ادا کر رہی ہے، چاہے اسے شعور ہو یا نہ ہو۔ چاہے اس کا کوئی اختیار ہو یا نہ ہو۔

یہ سورج اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے اور اس کے دورے میں کوئی خلل نہیں آتا۔ یہ چمک رہا ہے اور جہاں تک اللہ کا حکم ہو گا، کائنات کو گرم اور روشن کرتا رہے گا۔ پھر اس سورج کا کنبہ بھی اس کے دائرے کے اندر ٹھیک ٹھیک اپنے اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہے اور اپنا فریضہ منہی ادا کر رہا ہے۔

یہ زمین اپنے مدار میں گردش کر رہی ہے۔ اس گردش کے نتیجے میں فصلیں اُگتی ہیں۔ انسانوں کے رزق کا انتظام ہو رہا ہے۔ یہ مردوں کو سمیٹتی ہے۔ اس کے اندر سے چشمے پھوٹتے ہیں اور یہ سب کام سنت الہیہ کے مطابق ہوتا ہے بغیر زمین کے ارادہ کے۔

یہ چاند اور یہ ستارے و سیارے، یہ ہوائیں اور یہ بادل یا یہ پانی اور یہ سمندر، یہ پہاڑ اور یہ میدان سب کے سب اپنے رب کے حکم سے اور اپنے خالق کی تقدیر سے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور یہ تمام اشیاء یہ فرائض بغیر جہد و مشقت کے ادا کرتی ہیں۔ یہ ارکان کائنات بار امانت نہ اٹھا سکے، ڈر گئے اور سہم گئے۔ یہ اس عظیم امانت کو نہ اٹھا سکے۔ یہ امانت کیا تھی، ذاتی ارادے اور اختیار سے اپنے فرائض کو سرانجام دینا اور اپنے اعمال اور انھماں کا ذمہ دار ہونا۔ لیکن!

وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ﴿٣٣﴾ (۷۲: ۳۳) ”مگر انسان نے اسے اٹھا لیا“۔ انسان جو اللہ کو اپنے شعور اور اپنے

ادراک سے جانتا ہے، اپنے تدبیر اور اپنی بصیرت سے ناموس قدرت کو معلوم کرتا ہے، اور اپنی سنی وجد و جہد سے اس ناموس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے، وہ اپنے ارادے سے اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور بالا ارادہ ذمہ داریاں اٹھاتا ہے۔ اور اپنے میلانات اور خواہشات پر قابو پاتا ہے۔ اپنی زندگی کے ہر قدم پر وہ متحرک بالا ارادہ ہے۔ اپنی راہ کا ادراک رکھتا

ہے۔ جان بوجھ کر اپنے لیے راہ اختیار کرتا ہے اور علی وجہ البصیرت کسی کی راہ پر چلتا ہے۔

یہ ہے وہ عظیم امانت جو اس انسان نے اٹھائی حالانکہ انسان بہت ہی ضعیف، کمزور اور چھوٹا اور بے طاقت تھا۔ جس طرح اس کی قوت محدود تھی اس طرح اس کی عمر بھی محدود تھی اور پھر اس ضعیف انسان پر ہر طرف سے میلانات، خواہشات اور طبعی شہوات کی افواج حملہ آور تھیں۔

اس زلویہ سے اس ضعیف انسان نے اپنے کاندھوں پر ایک عظیم ذمہ داری اٹھائی۔ بے شک وہ عالم اور جاہل تھا۔ اپنے نفس پر اس نے ظلم کیا کہ یہ بھاری بوجھ اس پر ڈالا اور اپنی قوت کی کمی سے وہ بے خبر تھا۔ لیکن جب انسان اس ذمہ داری کو پورا کرے جو اس نے اٹھائی اور جب وہ اپنی معرفت اور اپنے اور اک سے باری تعالیٰ تک پہنچ جائے تو وہ براہ راست ناموس الہی کی معرفت حاصل کر لیتا ہے اور پوری طرح اپنے رب کے ارادے کا مطیع ہو جاتا ہے۔ یہ معرفت، یہ ہدایت اور یہ اطاعت اپنی حقیقت کے اعتبار سے اور اپنے آثار کے اعتبار سے ایک بلند مقام تک پہنچ جاتی ہے اور اس قدر خود کار طریقے سے کام کرتی ہے جس طرح آسمان اور زمین اور پہاڑ بڑی کھولت سے 'براہ راست ہدایت' معرفت اور اطاعت پذیر ہوتے ہیں کیونکہ یہ قرام مخلوقات براہ راست اللہ کی معرفت حاصل کیے ہوئے ہوتی ہیں۔ براہ راست اللہ کی ہدایت کے تحت چلتے ہیں۔ براہ راست اطاعت کرتے ہیں اور ان کے اور باری تعالیٰ کے درمیان کوئی حائل اور کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اور کوئی چیز ان کو اللہ کی اطاعت سے روکنے والی نہیں ہوتی، تو جب انسان بھی اس پوری کائنات کی طرح اللہ کی معرفت، ہدایت اور اطاعت کا پابند ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ واصل باللہ ہو جاتا ہے اور تب اللہ کی مخلوقات میں اس کا مقام منفرد ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ارادہ، اور اک اور اختیار اور ذمہ داری اٹھانا ہی انسان کی امتیازی خصوصیات ہیں اور انہی کی وجہ سے انسان ان مخلوقات کے اندر ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ یہی وہ کرامت اور شرف ہے جس کا اعلان اللہ نے عالم بالا میں کیا تھا کہ فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اس انسان کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور قرآن کے اندر یہ اعلان قیامت تک ثبت کر دیا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ "حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی"۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی اس مکرم کی اصلی وجہ سمجھے اور اللہ نے اس کے حوالے جو امانت کی ہے اور اس نے جسے قبول کیا ہے اور جس کے اٹھانے سے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے انکار کیا، اور ڈر گئے اسے اچھی طرح ادا کرے۔ یہ امانت یا ذمہ داری اللہ نے انسان کے اوپر کیوں ڈالی؟

لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَ
يَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝۹

”اس بار امانت کو اٹھانے کا لازمی نتیجہ ہے تاکہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں، مشرک مردوں اور عورتوں، مزادے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔“

وہ خصوصیات کیا ہیں جو انسان نے اپنے کاندھوں پر اٹھائیں؟ یہ کہ اپنے آپ کو پہچانے، اپنی قوت عقلیہ سے معرفت کردار حاصل کرے۔ بذات خود عمل کرے اور خود خدا تک پہنچے۔ یوں وہ اپنے اختیار کو صحیح استعمال کرے اور اپنے اعمال کی سزا اور جزاء کا ذمہ دار ہو۔ اس طرح منافقین اور منافقات سزا کے مستحق ہوں، مشرکین اور مشرکات اپنے انجام تک پہنچیں اور اللہ مومنین و مومنات کی نداد کرے اور ان سے جو تفصیلات، کمزوریاں، ناتوانیاں صادر ہوں ان کو معاف کرے۔ کیونکہ انسان کی راہ میں ضعف، کمزوری، شہوات، جذبات، میلانات اور معاشرے کے تاثرات کی بے شمار رکاوٹیں ہیں اور اس کو اللہ کی رحمت اور مغفرت کی بے حد ضرورت ہے اور اللہ ہے بھی غفور و رحیم۔

اس عظیم تبرے اور عقل و خرد کی تاروں پر آخری اور شدید ضرب سے اس سورہ کا خاتمہ ہوتا ہے جس کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ اے نبی تم اللہ کی اطاعت کرو اور کفار اور منافقین کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ اللہ کی وحی اور اشاروں کے مطابق کام کرو، اللہ پر بھروسہ کرو، اور اللہ کے سوا کسی قوت پر تکیہ نہ کرو۔ اس کے بعد اسلامی نظام حیات کے لیے ضروری قانون سازی اور مملکت اسلامی کو عملی ہدایات دی گئی تھیں اور حکم تھا کہ اللہ کے قانون اور اللہ کی حکمت عملی پر چلو۔

اس آخری ضرب اور تبرے میں یہ بتایا گیا کہ جو ذمہ داری انسان پر عائد ہو، اس کا ذرا احساس کرے۔ یہ کس قدر عظیم ذمہ داری تھی؟ کہ پہاڑ بھی اس کے اٹھانے سے کانپ اٹھے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح یہ کائنات --- اللہ کے ناموس کی مطیع ہے انسان طوعاً اللہ کے ناموس تک رسائل حاصل کر کے مطیع ہو جائے اور اللہ کی مشیت کی اطاعت کرے۔

اس تبرے پر سورہ ختم ہوتی ہے۔ اس کا آغاز اور اختتام دونوں باہم متناسب پاس اور پوری سورہ اس آغاز اور اختتام کے رخ پر رواں دواں ہے۔ نہایت توافق کے ساتھ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی ذات کریم اس کتاب کو بھیجنے والی ہے جو اس کائنات کو چلا رہی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۲

سورہ سبا - ۴۴

آیات ۱ - تا - ۵۴

سورہ سبا ایک نظر میں

اس کی سورہ کے موضوعات عقائد متعلق ہیں۔ اللہ وحدہ لا شریک ہے، وحی پر ایمان، بعث بعد الموت کا عقیدہ اور اسلامی نظریہ حیات کے بارے میں بعض اہم اقدار کی توضیح۔ یہ کہ ایمان اور عمل صالح ذریعہ نجات ہے۔ مال اور اولاد ذریعہ نجات نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک جزاء و سزا کا مدار ایمان و عمل پر ہے۔ اللہ اگر چاہتا ہے تو اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اور اللہ کے ہاں کوئی سفارش نہیں ہو سکتی الا یہ وہ اجازت دے۔

اس سورہ میں بعث بعد الموت اور جزاء و سزا کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور یہ کہ اللہ کا علم محیط ہے، عام ہے اور بہت گہرا اور پیچیدہ اور نہایت دقیق ہے۔ اس سورہ میں مختلف اسالیب سے ان دونوں موضوعات کو بار بار لایا گیا ہے اور ابتداء سے انتہاء تک اس سورہ کی تفصیلی ہے۔

بعث بعد الموت کے بارے میں ہے

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَآتَيْنَا السَّاعَةَ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ عِلْمُ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمُوتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (۳۴:۳) ”منکرین حق کہتے ہیں کہ کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آتی؟ کو میرے پروردگار عالم الغیب کی قسم وہ تم پر آکر رہے گی اللہ سے لیک ذرے کے برابر چیز بھی پوشیدہ نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں بلکہ اس کے ہاں چھوٹی اور بڑی ہر چیز کھلی کتاب میں موجود ہے۔“

سزا و جزا کے بارے میں لکھا گیا۔

ثَوَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَهَلْ نَدَبَكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يَنْبِئُكُمْ إِذَا مُزِقْتُمْ كُلُّ مُمْزِقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ (۳۴:۷) ”اقتری علی اللہ کذباً“ ”آم بہ جنتہ بل الذین لا یؤمنون بالآخرۃ فی العذاب والضلل البعید“ (۳۴:۸) ”منکرین لوگوں سے کہتے ہیں ”ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارا جسم کا ورہ ذرہ منتشر ہو چکا ہو گا“ اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنوں لاحق ہے۔“ نہیں بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور بری طرح نکلے ہوئے ہیں۔“ اور دوسری جگہ ہے :

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ
(۴۰:۳۴) وَ الَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رَّحْمَتِي

الْبَئِيمِ (۴۰:۳۴) ”اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ جزا دے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے رہے ہیں ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم ہے اور جن لوگوں نے ہماری آیت کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے۔“

اس سورہ میں متعدد مناظر قیامت دکھائے گئے ہیں۔ ان میں قیامت کے منکرین کو سخت سرزنش کی گئی ہے اور عذاب کی ایسی صورتیں پیش کی گئی ہیں جن کی وہ محض سب کرتے تھے یا ان کے واقعہ ہونے میں شک کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنُؤْمِنَ بِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ
الظَّالِمُونَ مُوقِفُونَ عِندَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ يَقُولُ الَّذِينَ

اسْتَضَعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْ لَا أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ (۳۴:۳۱) قَالَ الَّذِينَ

اسْتَكَبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ

مُحْرِمِينَ (۳۴:۳۲) وَقَالَ الَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكَبَرُوا بَلْ مَكْرُ الْبَلِ وَ

النَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَنْدَادًا وَأَسْرُوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا

الْعَذَابَ وَ جَعَلْنَا الْآغْلَلَ فِي آعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ يُحْزَنُونَ إِلَّا مَا كَانُوا

بِعَمَلِهِمْ (۳۴:۳۳) ”کافروں نے کہا کہ ہم نہ تو قرآن کو مانیں نہ اس سے پہلے کی کتابوں کو کاش تم دیکھو ان کا

حال اس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھیں گے جو

گ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ وہ بڑے بننے

الے ان دے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: ”کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی؟

ہیں بلکہ تم خود مجرم تھے؟ وہ دے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے ”نہیں بلکہ شب و روز کی مکاری تھی

ب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمرغہ بنائیں۔“ آخر کار جب یہ لوگ عذاب

بہیں تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈالیں گے۔ کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی

دیا جاسکتا ہے۔ جیسے اعمال ان کے تھے ویسے ہی جزاء وہ پائیں گے؟“

یہ مناظر اس سورہ میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں اور بار بار آتے ہیں اور خاتمہ یوں ہوتا ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فَرَغُوا فَلَافُونَ وَأُخِذُوا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ (۵۱:۳۴) وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ وَأَنَّىٰ لَهُمُ التَّنَافُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ (۵۲:۳۴) وَقَدْ كَفَرُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ وَ يَقْدِفُونَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ (۵۳:۳۴) وَ حِيلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ مِنْ قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مُرِيبٍ (۵۴:۳۴) ”کاش تم دیکھو اس وقت جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جائیں گے، بلکہ قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے۔ اس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لائے حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کب ہاتھ آ سکتی ہے۔ اس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور بلا تحقیق دور دور کی کوڑیاں لایا کرتے تھے۔ اس وقت جس چیز کی یہ تمنا کر رہے ہوں گے اس سے محروم کر دیئے جائیں گے جس طرح ان کے ہم مشرب پیش رو محروم ہو چکے ہوں گے۔ یہ بڑے گمراہ کن شک میں پڑے ہوئے ہیں۔“

سورہ کے آغاز میں اللہ کے علم محیط اور شامل کے متعلق کہا گیا ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَ مَا يَخْرِجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيهَا وَ هُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ (۲۳:۴) ”جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے ہر چیز کو وہ جانتا ہے۔“

اور قیامت کے منکرین پر جگہ جگہ تہرے ہوتے ہیں کہ قیامت آئے گی۔

وَ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلَىٰ وَ رَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ عِلْمُ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمُوتِ وَ لَا فِي الْأَرْضِ وَ لَا أَصْغَرُ مِنْ ذَلِكَ وَ لَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (۳۳:۴) ”منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے قیامت ہم پر آگئیوں نہیں جاتی، کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر آ کر پہنچے گی۔ اس سے ذرا برابر کوئی چیز آسمانوں میں چھپی ہے، زمین میں، اذریے سے بڑی نداس سے چھوٹی سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہے۔“

اور سورہ کے خاتمہ کے قریب آتا ہے۔

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَ مَا يُبْدِي الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيدُ (۴۹:۳۴) ”منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے قیامت ہم آگئیوں نہیں جاتی۔ کو، میرا رب حق کا القاء کرتا ہے۔ وہ تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔“

توحید کے مضمون کا آغاز اللہ کی حمد و ثناء سے ہوتا ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْآخِرَةِ وَ هُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (۱:۳۴) ”حمد اس خدا کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے اور

آخرت میں بھی اس کے لیے حمد ہے۔ وہ دانا اور خیر ہے۔“ اور مشرکین کو ان کے بنائے ہوئے اہوں کے بارے میں بار بار چیلنج دیا جاتا ہے۔ جن کو وہ پکارتے ہیں۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمُوتِ وَلَا فِي

الْأَرْضِ وَمَالُهُمْ فِيهَا مِنْ شَرْكَ وَ مَا لَهُ مِنْهُمْ ظَهِيرٌ (۲۴ ۳۴) ”اں سے کہو کہ پکارو اپنے ان معبودوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنے معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں نہ زمین میں۔ وہ آسمان و زمین کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے۔“

قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں اشار ٹاکا جاتا ہے کہ یہ لوگ ملائکہ اور جنوں کی بندگی کرتے ہیں۔

و يَوْمَ يُحْشَرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَكَةِ أَهُولَاءِ يَأْكُمُ كَانُوا

يَعْبُدُونَ (۴۰: ۳۴) ”قَالُوا سُبْحَنكَ أَنْتَ وَلَيْسَ مِنْ دُونِهِمْ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ

أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ (۴۰ ۳۴) ”اور جس دن وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کرتے تھے؟ تو وہ جواب دیں گے، ’پاک ہے آپ کی ذات۔ ہمارے ولی تو آپ ہیں نہ یہ لوگ‘ دراصل یہ ہماری نہیں جنوں کی عبادت کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر انہی پر ایمان لائے ہوئے تھے۔“

اور اس بات کی تردید کر دی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ بعض مشرکین کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ ملائکہ اللہ کے ہاں ان کی کوئی سفارتیں کرس گئے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ إِذَا فُزِعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ

رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقُّ وَهُوَ الْعَبْدُ الْكَبِيرُ (۲۳: ۳۴) ”اور اللہ کے حضور کوئی شفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی۔ بجز اس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارتیں کی اجازت دی ہو۔ حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گمراہت دور ہوگی تو وہ پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا کہا۔ وہ کہیں گے ٹھیک جواب ما ہے اور وہ بزرگ و برتر ہے۔“

جنوں کی عبادت کی تردید کے لیے حضرت سیمان علیہ السلام کا قصہ لایا جاتا ہے کہ وہ پوری طرح ان کے زیر کنٹرول تھے اور ان کو پتہ ہی نہ چلا کہ حضرت فوت ہو گئے ہیں۔

فَلَمَّا قُضِيَ عَلَيْهِ الْمَوْتُ مَا دَلَّهُمْ عَلَى مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهُ فَلَمَّا

خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ أَنْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ

(۱۴ ۳۴) ”پھر جب سیمان پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس

گھن کے سوانہ تھی جو اس عصا کو کھڑا تھا۔ اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔“
اور اس رسالت کے بارے میں آتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالنَّاسُ ثُلُثٌ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُونًا عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتَضَعْفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا الْوَلَا أَلَا لَكُم مَّا مَنِينٌ (۳۴: ۳۶) ”اور کافر کہتے ہیں کہ ہم ہرگز اس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے کاش دیکھو ان کا حال اس وقت جب یہ عالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اس وقت کمزور متکبرین سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوئے تو ہم مومن ہوتے۔“ اور دوسری جگہ ہے۔

وَإِذَا تَلَّيٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا أَفْكٌ مَّفْتَرٍ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنَّ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (۳۴: ۴۳) ”اور ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ فحش توہیں یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان معبودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ اور یہ قرآن محض ایک جھوٹ گھڑ لایا ہے۔ ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو صریح جادو ہے۔“

اس کی تردید یوں کی جاتی ہے کہ یہ قرآن وحی من جانب اللہ ہے۔

وَيَرَىٰ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ الْحَقُّ وَيَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (۳۴: ۶) ”اے نبی علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے اور خدا نے عزیز و مہمید کا راستہ دکھاتا ہے۔“ اور دوسری جگہ ہے :
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۳۴: ۲۸) ”اور ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔“

اندر حیات کے سلسلے میں آتا ہے :

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ (۳۴: ۳۴) وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ

قُلْ إِنْ رَبِّي يَسْتَطِيعُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَكِنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ
(۳۶:۳۴) وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ آمَنَ وَ
عَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضَّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ
(۳۷:۳۴) وَالَّذِينَ يَسْمَعُونَ فِي اتِّبَانٍ مُّعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُونَ

(۳۸:۳۴) ”کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔“ لے نبی ان سے کہو ”تیرا رب جسے چاہتا ہے کثادہ رزق دیتا ہے یا نپاٹا عطا کرتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے۔“ یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرٹی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے عمل کی دہری جزاء ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے دوزخ و سوپ کرتے ہیں تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔“

اور اس مضمون پر بعض تاریخی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ لیل داؤد کا قصہ پیش کیا جاتا ہے جو اللہ کی نعمتوں پر شکر کرنے والے تھے اور اہل سبا کا قصہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو دولت کی وجہ سے سرش ہو گئے تھے اور دونوں کا جو انجام ہوا وہ بھی پیش کیا گیا ہے اور ان دو مثالوں میں مدعا کی پوری تصدیق ہے۔

--- ۰۰۰ ---

یہ مسائل جن پر اکثر کی سورتیں بحث کرتی ہیں ان کو مختلف سورتوں میں پیش کیا جاتا ہے اور ہر سورہ میں ایک مستقل تکنیکی پس منظر میں ان موضوعات کو پیش کیا جاتا ہے۔ ہر بار نئے دلائل کے ساتھ اور ہر بار دل پر ان کا ایک نیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ سورہ سبا میں بھی ان مسائل کو اسی طرح کائناتی پس منظر میں لایا گیا ہے۔ اس معلوم کائنات کے وسیع پس منظر میں اور اس سے بھی وسیع تر عالم غیب کے میدان میں جو ابھی تک نامعلوم ہے۔ پھر ان حقائق کو حشر کے میدان کے زبردست مناظر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور پھر خود انسان کی شخصیت کی گہرائیوں میں اور انسانی تاریخ کے صفحات میں اور جس پس منظر میں بھی ان حقائق کو قرآن پیش کرتا ہے ہر مرتبہ ایک نیا تاثر قائم کرتا ہے اور انسان کے لیے غفلت سے جاگنے کا سبب بنتا ہے۔

سورہ کے آغاز ہی سے اس کائنات کی عظیم نشانیوں کو وحدت کردگار کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کائنات کے صفحات کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے اندر جو نشانیاں ہیں انہیں پیش کیا جاتا ہے اور ان سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اللہ کا علم بہت ہی گہرا، دقیق اور محیط ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلْجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا

تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟“ تو وہ جواب میں گے پاک ہے آپ کی ذات ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ ان سے‘
در اصل یہ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے۔“

اور رسول اللہ کو جھٹلانے والے جو یہ کہتے ہیں کہ آپ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں‘ یا یہ کہ آپ جھوٹ ہیں‘ ان کو بھی
لا کر ان کی فطرت کی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے دل کی عدالت میں ان کو پیش کیا جاتا ہے جہاں کوئی جھوٹی اور
مصنویٰ شہادت پیش ہوتی۔

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مِثْلَ خِزْفٍ ۚ وَمَا يَنْفَعُكُمْ شَيْءٌ وَلَا يَضُرُّكُمْ شَيْءٌ ۚ وَأَنْتُمْ مُّعَذِّبُونَ

بصاحبکم من جنۃ ان هو الا نذیر لکم بین یدئ عذاب شدید (۴۶: ۳۴) ”اے
نبیؐ ان سے کہو کہ میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں‘ خدا کے لیے تم اکیسے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور
سوچو‘ تمہارے صاحب میں آخر کون سی بات ہے جو جنوں کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا
ہے۔“

یوں یہ سورہ انسانی عقل و خرد کو لے کر ان مختلف میدانوں کی سیر کراتی ہے‘ مختلف دلائل اور اشارات سے دو چار
کرتی ہے اور آخرت کے ہولناک مناظر کی سیر بھی کراتی ہے۔

اس سورہ کو اپنے ان مضامین‘ دلائل اور اشارات کے اعتبار سے ہم پانچ چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر سکتے
ہیں جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ پانچ حصوں میں بھی ہم اسے محض آسان تفسیر کے لیے تقسیم کرتے ہیں ورنہ
پورا سورہ ایک مسلسل مضمون ہے۔ یہی اس سورہ کی خصوصیت ہے۔

سورہ کا آغاز اللہ کی حمد سے ہوتا ہے جو زمین و آسمان کا مالک اور دنیا و آخرت میں محمود ہے۔ اور اس کا علم محیط
ہے۔ اوپر سے نیچے آنے والی چیزوں اور نیچے سے اوپر جانے والی ہر چیز پر محیط ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قیامت کس طرح
برپا ہوگی اور انسانوں کے ذرے ذرے کو اللہ کس طرح جمع کرے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا علم ذرے ذرے پر محیط ہے۔
اللہ سب کو جمع کرے گا اور جزاء و سزا دے گا۔ خصوصاً ان لوگوں کو سزا دے گا جو اللہ کی اس دعوت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ جو
لوگ لٹل علم ہیں اور فطرت سلیم رکھتے ہیں‘ وہ قیام قیامت کو حق سمجھتے ہیں اور جو لوگ ان پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں وہ
در اصل راہ حق سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ ایسے لوگوں کا علاج تو یہ ہے کہ ان پر آسمان کا کوئی حصہ گرا دیا جائے۔

دوسرے حصے میں آل داؤد کے احوال ہیں جنہوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا کیونکہ اللہ نے اکثر کائناتی قوتوں کو
ان کے لیے مسخر کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مغرور اور سرکش نہ بنے اور ان مسخر کردہ قوتوں میں سے جنوں کی قوت
بھی تھی جن کو بے وقوف عرب پوجتے ہیں اور ان سے غیبی باتیں معلوم کرتے ہیں۔ حالانکہ جنوں کو بھی غیب کا علم نہیں
ہوا۔ یہ تو خود سلیمان علیہ السلام کے لیے مشقت کرتے رہے۔ وہ مر بھی گئے ان کو علم نہ ہوا۔ یہ راز تو تب کھلا جب ان
کے عصا کو گھن نے کھیا اور سلیمان کے شکر الہی کے مقابلے میں قوم سبا کی ناشکری اور سرکشی کا قصہ۔ ان کو بھی اللہ نے
نعمتوں سے نوازا تھا۔ اس ناشکری کی وجہ سے۔

فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ ۖ وَمَزَقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (۱۹: ۳۴) ”ہم نے ان کو داستان سابقہ بنا دیا

اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔“ کیونکہ یہ شیطان کے پیرو ہو گئے تھے۔ حالانکہ شیطان کا ان پر کوئی جبر نہ تھا۔ یہ خوشی سے شیطان کے پیرو ہو گئے تھے۔

اور تیسرا سبق اس نتیجے سے شروع ہوتا ہے جو مشرکین کو دیا گیا ہے کہ وہ ذرا ان الملوں کو بلائیں جن کو وہ اللہ سمجھتے ہیں حالانکہ وہ قُلْ اَدْعُوا الدِّينَ مَنْ دُونِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهَا مِنْ شِرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ ظَهِيْرٌ (۲۲: ۳۴) ”کہو کہ پکار دیکھو اپنے ان معبودوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں ’وہ زمین و آسمان کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے۔“ ان کو اللہ کے ہاں سفارش کا بھی کوئی اختیار نہیں ہے اگرچہ وہ ملائکہ ہوں۔ کیونکہ ملائکہ تو نہایت عاجزی سے احکام لیتے ہیں اور وہ اس وقت تک بات نہیں کرتے جب تک ان پر غے خوف دور نہیں ہو جاتا۔ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آسمان و زمین میں سے ان کو کوئی رزق دیتا ہے جبکہ مالک ان کا اللہ ہے اور وہی ان کو رزق دیتا ہے۔ بہر حال معاملہ اللہ کے حوالے ہے ’وہی قیامت کے دن وہ فیصلہ کرے گا۔ سبق کا خاتمہ بھی اس تحدی پر ہوتا ہے جو شرک کرتے ہیں کہ وہ اس سے باز آجائیں۔ معبود تو صرف ایک ہے جو اللہ عز و جہم ہے۔

پھر تیسرے سبق کا موضوع وحی و رسالت ہے۔ اس کے متعلق مشرکین کے موقف پر بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح یہ بتایا گیا کہ مشرکین کے مالدار لوگ یہ کہتے تھے کہ منصب رسالت کے ہم مستحق ہیں ’جواب آتا ہے کہ مال اور اولاد اسلام میں معیار مطلوب نہیں ہے۔ جزاء و سزائیں امارت اور غربت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ایمان اور عمل پر دلور و مدار ہے۔ اولاد اور مال پر نہیں ہے۔ اس سبق میں مکذبین کا انجام انسانی تاریخ سے بھی پیش کیا گیا ہے اور مناظر قیامت میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ جہاں اطاعت کرنے والے غریب امراء لیڈروں سے براءت کا انکار کرس گے جیسا کہ ملائکہ گمراہوں اور مشرکین کی عبادت سے انکار کرس گے۔ اس کے بعد لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دس میں اور اپنی فطری منطق کے ذریعے غور و فکر کرس کہ آخر دعوت اسلامی میں کیا نقص ہے اور داعی اسلام میں کیا چیز ہے کہ تم مکذیب کرتے ہو۔ وہ تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ جھوٹا اور جہنمیں نہیں ہے۔ پھر قیامت کا ایک منظر اور آخر میں ایک زبردست تبصرہ۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَٰمُ الْغُيُوْبِ (۴۸: ۳۴) قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ مَا يُبْدِيُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيدُ (۴۹: ۳۴) قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَا اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ وَ اِنْ اهْتَدَيْتُ

فَبِمَا يُوحٰى اِلٰى رَبِّيْ اِنَّهُ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (۵۰: ۳۴) ”ان سے کہو میرا رب مجھ پر حق کا القاء کرتا ہے اور وہ تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔ کہو ”حق آگیا اور اب باطل کے لیے کچھ نہیں ہو سکتا۔“ کہو ”اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو میری گمراہی کا دیال مجھ پر ہے۔ اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اس وحی کی بنا پر ہوں جو میرا محبوب اور نازل کرتا ہے۔ وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب ہی ہے۔“

اور سورہ اور اس سبق کا خاتمہ قیامت کے ایک مختصر منظر پر ہوتا ہے جس کے اندر حرکات مختصر مگر بہت ہی قوی اور سخت ہیں۔ اب آیات کی تشریح۔

درس نمبر ۱۹۴ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۹



الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي
الْآخِرَةِ ۖ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ۝ يَعْلَمُ مَا يَلْبِغُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ
مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۖ وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ ۝

”حمد اس خدا کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد ہے۔ وہ
دانا اور باخبر ہے۔ جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں
چڑھتا ہے، ہر چیز کو وہ جانتا ہے، وہ رحیم اور غفور ہے۔“

یہ اس سورہ کا آغاز ہے جس میں مشرکین کے شرک، ان کی جانب سے رسول اللہ کی تکذیب، آخرت میں تکلیف، اور
ان کی طرف سے بعث بعد الموت کو مسجد سمجھنے کے موضوعات پر کلام کیا گیا ہے۔ آغاز ان کلمات کے ساتھ ہے کہ تمام
تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ جو بذات خود محمود ہے اگرچہ مخلوقات میں سے کوئی بھی اس کی تعریف نہ کرے۔ وہ اس پوری
کائنات میں محمود ہے اور اس کائنات کی پوری قوتیں اور مخلوقات اللہ کی حمد کرتی ہیں اگرچہ یہ انسان اس کی حمد نہ کرے۔

حمد کے ساتھ اللہ کی اس صفت کا ذکر ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ اللہ کے ساتھ کسی کا کوئی حق نہیں ہے۔
نہ زمین اور آسمانوں میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک ہے۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے اور یہ اسلامی نظریہ
حیات کا پہلا اور اساسی نکتہ ہے۔ اس طویل و عریض کائنات کا مالک اللہ ہے اور اس کے سوا کوئی شریک نہیں ہے۔

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْآخِرَةِ (۴: ۱) ”اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد ہے۔“ یعنی اللہ اپنی ذات

میں محمود ہے اور بندوں کی طرف سے کی جانے والی حمد بھی اسی کے لیے ہے۔ غرض وہ لوگ جو اللہ کا انکار کرتے ہیں یا اس کے ساتھ کسی کو شریک کرتے ہیں ان کی طرف سے بھی حمد اللہ ہی کے لیے ہے اور وہی اس کا سچا ہے اور ان پر یہ بات آخرت میں منکشف ہوگی۔

وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (۱: ۳۴) ”وہ دانالور باخبر ہے“۔ وہ ایسا حکیم ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔ وہ زمین اور آسمان کو بھی حکمت سے چلاتا ہے۔ اس کائنات کی تدبیر نہایت حکمت سے کرتا ہے۔ وہ ہر چیز سے خبردار ہے، ہر معاملے کا اسے علم ہے اور اس کا علم بہت گہرا، شامل اور محیط ہے۔ اللہ کے علم کو اگر دیکھنا ہے تو اس کی مثال کے لئے اس کی کتاب علم کا ایک صفحہ ملاحظہ ہو۔

يَعْلَمُ مَا بَلَّغَ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَرْجُحُ فِيهَا

(۲: ۳۴) ”جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے“ ہر چیز کو وہ جانتا ہے۔ یہ چند الفاظ ہیں ذرا ان پر غور کرو، کس قدر تعداد زمین کے اندر جاتی ہے، کس قدر اس سے نکلتی ہے، کس قدر تعداد کا آسمانوں سے نزول ہوتا ہے اور کس قدر اشیاء کا عروج ہوتا ہے۔ مختلف حرکات، مختلف شکلوں، مختلف صورتوں، مختلف تصورات اور مختلف ہنات میں۔ اس قدر کثیر کہ خیال ان کو اپنے دائرے میں نہیں لے سکتا۔

اگر تمام اہل زمین ایک سیکنڈ میں ہونے والے مذکورہ اہل کا احاطہ کرنا چاہیں تو شمار نہ کر سکیں۔ اگرچہ پوری زندگی اس کام میں لگا دیں۔ یقیناً وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لائقہ اشیاء اس ایک لمحہ میں زمین میں داخل ہوتی اور نکلتی ہیں اور آسمان سے مائعہ اشیاء کا نزول و عروج ہوتا ہے۔ کس قدر ج زمین میں گرتے ہیں اور کس قدر کو پھیلیں نکلتی ہیں، کتنے ہی حشرات داخل ہوتے اور نکلتے ہیں۔ کس قدر اجرام اور حیوانات، کس قدر پانی کے قطرے اور کس قدر گیس کے ذرات اور کس قدر کربائی ذرات زمین کے اطراف میں داخل ہوتے ہیں اور کس قدر دوسری اشیاء داخل و خارج ہوتی ہیں۔ اللہ کی آنکھ ان کو دیکھ رہی ہے اور شمار کر رہی ہے۔

ذرا نباتات ہی کو دیکھئے! ذرا چشموں کو دیکھئے، ذرا آتش لٹاں پہاڑوں کو دیکھئے، ذرا دوسری گیسوں کو دیکھئے اور یہ دیکھئے کہ کس قدر مستور خزانے ہیں اور ذرا حشرات الارض کو دیکھئے جو نظر آتے ہیں اور جو خوردبینوں سے بھی نظر نہیں آتے۔ بعض کے بارے میں انسان نے علم حاصل کر لیا ہے اور لائقہ اشیاء ابھی تک نامعلوم ہیں۔

آسمانوں سے نازل ہونے والے بارش کے قطروں کا شمار کر سکتے ہو! شهاب ثاقب تو قطرے نہیں ان کی تعداد معلوم ہے۔ سورج سے کسی بھی لمحے شعاعیں نکلتی ہیں۔ کس قدر جلانے والی، کس قدر روشنی کرنے والی، کس قدر فیصلے نازل ہو رہے ہیں اور کس قدر ابھی تک چھپے ہوئے ہیں۔ کس قدر رحمتیں ہیں جو عوام الناس پر ہیں اور کس قدر ہیں جو بعض بندوں پر نازل ہونے والی ہیں۔ کس قدر رزق ہے جو تقسیم ہوتا ہے اور کس قدر رزق ہے جو ردک لیا جاتا ہے اور کیا کچھ ہے جو صرف اللہ کے علم میں ہے۔

کتنے نفوس اور کتنے سانس ہیں جو آسمانوں کی طرف بلند ہوتے ہیں، نہایت کے، حیوانات کے جراثیم کے اور دوسری مخلوقات کے اور کتنی ہی دعوتیں ہیں جو اللہ کی طرف سے دی جا رہی ہیں، اعلانیہ ہیں یا چھپی ہوئی ہیں اور کوئی

سے چھوٹی۔ سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے۔“ اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ جزا دے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے رہے ہیں۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے۔

کافروں کی جانب سے آخرت کا انکار اس وجہ سے تھا کہ وہ تخلیق انسانیت میں پنہاں حکمت الہیہ اور تقدیر الہی کا ادراک نہ کر سکے۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو شتر بے مہار کی طرح نہ چھوڑ دیا جائے کہ جو اچھائی کرے اس کی بھی مرضی ہے اور جو برائی کرے اس کی بھی مرضی ہے۔ نہ محسن کو جزاء ملے اور نہ بدکار کو سزا ملے۔ اللہ نے اپنے رسولوں کی زبانی لوگوں کو متنبہ کر دیا تھا کہ جزاء کا لیک حصہ آخرت کے لیے باقی رہتا ہے اور سزا کا ایک حصہ بھی آخرت کے لیے چھوڑا جاتا ہے۔ لہذا جن لوگوں کو حکمت تخلیق کا ادراک ہو جائے وہ جان لیتے ہیں کہ اللہ کی اسکیم کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ آخرت برپا ہو تاکہ اللہ کا وعدہ پورا ہو اور اللہ کی اطلاع سچی ہو۔ کفار کی نظروں سے بس یہی حکمت لوجہل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے۔

لَا تَأْتِنَا السَّاعَةُ (۳:۳۴) ”قیامت ہم پر نہیں آئے گی“۔ اور اللہ ان کی اس بات کی پر زور تردید فرماتے ہیں۔

قُلْ بَلٰی وَ رَبِّیْ لَتَأْتِیَنَّکُمْ (۳:۳۴) ”کہہ دیجئے ہاں میرے رب کی قسم قیامت تم پر ضرور آئے گی۔“ اللہ بھی سچا ہے اور اس کے رسول بھی سچے ہیں۔ وہ غیب تو نہیں جانتے لیکن وہ اللہ پر اعتماد کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں۔ جس چیز کا خود انہیں علم نہیں ہوتا اس کے معاملے میں وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اللہ جو تاکید اکتا ہے کہ قیامت آئے گی وہ عالم الغیب ہے اس لیے اس کی بات سچ ہے کیونکہ وہ علم پر مبنی ہے۔

اب علم الہی کو ایک کائناتی حقیقت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس طرح سورہ کے آغاز ہی میں اس کی ایک جامع مثال دی گئی تھی۔ اس شہادت سے معلوم ہوا تھا کہ یہ قرآن انسانی کلام نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی جامع تمثیلات انسانی فکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں۔ اسی بات کو اب یہاں دوسرے الفاظ میں پڑھئے۔

لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا

اَکْبَرُ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۳:۳۴) ”اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمان میں چھپی ہے نہ زمین میں۔ نہ ذرے سے بڑی نہ اس سے چھوٹی! سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے۔“ میں اس بات کو یہاں دوبارہ دہراتا ہوں کہ یہ تصور ایک انسانی تصور نہیں ہے اور نہ انسان اس طرح کی جامع سوچ سوچتا ہے۔ آج تک انسانی کلام کے جو نمونے ہیں نظم کے ہیں یا نثر کے ان میں ایسی جامع بات نہیں ملتی۔ جب بھی انسان علم کی جامعیت اور اس کے احاطے کے بارے میں کوئی سوچ پیش کرتا ہے وہ اس قدر کائناتی رنگ میں نہیں ہوتی۔

لَا یَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَا اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا

اَکْبَرُ (۳:۳۴) ”اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمان میں چھپی ہے نہ زمین میں نہ ذرے سے بڑی نہ اس سے

چھوٹی۔ کم از کم انسانی نمونہ ہائے کلام میں علم کی شمولیت گہرائی اور جامعیت کے لیے ایسا انداز نہیں ملا جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو اس طرح اپنے علم کی جامعیت کو بیان کر سکتا ہے اپنے علم کی گہرائی کو بیان کر سکتا ہے۔ یہ باتیں انسانی تخیل کے احاطے میں ہی نہیں آسکتیں۔ اسی طرح مسلمانوں کا تصور اللہ اس طرح بلند ہو جاتا ہے جس کی مثال ان کے خیال میں نہیں آتی۔ وہ اپنے تصور اور خیال کو سمجھتے ہوئے اور اسے فوق التصور اور فوق الحیال سمجھتے ہوئے اس کی بندگی کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کتاب مبین کیا ہے؟ کتاب مبین اللہ کا علم ہی ہے جس نے ہر چیز کو اپنے احاطے میں لیا ہوا ہے۔ جس سے کائنات کے اندر تیرنے والا ذرہ بھی چھوٹ کر رہ نہیں گیا نہ ذرے سے کم اور نہ اس سے بڑی کوئی چیز۔

ذرا اس تعبیر پر کھڑے ہو کر غور کیجئے ”نہ ذرے سے کم“ نزول قرآن کے زمانہ تک معروف اور مشہور بات یہ تھی کہ ذرہ صغیر ترین جسم ہے۔ اس سے کم کا تصور موجود ہی نہ تھا۔ آج ذرے کے توڑنے سے انسان کو معلوم ہوا کہ ذرے سے زیادہ چھوٹی چیز بھی موجود ہے۔ اس وقت انسان کے تصور اور حساب میں اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ اللہ بہت ہی برکت والا ہے کہ اس کے بندے اس کی صفت کے وہ اسرار و رموز بھی جانتے ہیں۔ دوسرے لوگ صدیوں بعد مانتے ہیں اور یہ اللہ ہی ہے جو کسی بھی وقت ان اسرار و رموز سے پردہ اٹھا دیتا ہے، جب چاہتا ہے۔ یہ قیامت کیوں برپا ہوگی؟ جس کا حتمی اور جزی علم اللہ کو ہے جو صغیر و کبیر کا جاننے والا ہے؟

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ
(۴:۳۴) وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رَّحْمَتِي

الْأُولَٰئِكَ (۴:۳۴) ”اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ اللہ جزاء دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم ہے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے۔“

یہ ہے اللہ کی حکمت اس کا ارادہ اور اس کی تدبیر۔ اللہ نے اس بات کو مقدر بنا دیا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد نیک کام کیے ان کو پوری جزاء دے اور ان لوگوں کو بھی سزا دے جنہوں نے اللہ کی آیات کو نیچا دکھانے کے لیے مقدر بھر کوشش کی۔

وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کا ایمان اعمال صالحہ کے روپ میں نمودار ہوا۔ ان کے لیے مغفرت ہے، ان معاملات کے لیے جو ان سے غلط ہو گئے اور تقصیرات ہو گئیں اور پھر مغفرت کے بعد ان کے لیے رزق کریم ہے۔ اس سورہ میں رزق کا ذکر بہت آتا ہے، مراد جنتیں ہیں کیونکہ اللہ کی نعمتیں رزق کریم ہیں۔

رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی آیات کو نیچا دکھانے کی مساعی کیں اور تحریک اسلامی کے خلاف پوری قوت لگا دی ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ رجز نہایت ہی برے عذاب کو کہا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے تحریک اسلامی کے خلاف سرگرمیاں دکھائیں، تحریک کو ناکام کرنے کی سعی کی اور بری راہ پر جدوجہد کرتے رہے۔ یوں اللہ کی حکمت اور اس کا منصوبہ مکمل ہوتا ہے اور ان لوگوں نے جو نظریہ اپنا رکھا ہے کہ آخرت برپا نہ ہوگی اس کی وجہ ان کی لاعلمی ہے۔

حالانکہ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ ضرور آئے گی۔

--- ۰۰۰ ---

ان آدمیوں نے یقین کر لیا تھا کہ قیامت نہ آئے گی جبکہ وہ اللہ کے مخصوص غیوب میں سے ایک غیب ہے اور اللہ نے فیصلہ دے دیا کہ وہ ضرور آئے گی۔ اللہ ہی عالم الغیب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے دیا کہ آپ اس پیغام کو لشکر میں اور یہ کہ ان کا یہ عقیدہ جہالت پر مبنی ہے۔ اہل علم بھی اس نتیجے تک پہنچے ہیں جس تک اہل ایمان پہنچے ہیں۔ یہی راستہ ہے اللہ عزیز و حمید کا۔

وَيَهْدِي الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ
الْحَقُّ وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿٦٤﴾

”اے نبی“ علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے اور خدائے عزیز و حمید کا راستہ دکھاتا ہے۔“

بعض روایات میں آتا ہے کہ اہل العلم سے مراد اہل کتاب ہیں جن کو اپنی مذہبی کتابوں کی مبین گویوں کی وجہ سے معلوم تھا کہ قرآن کتاب برحق ہے اور وہ صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والا ہے، لیکن آیت کا دائرہ اطلاق اہل کتاب تک محدود نہیں ہے۔ اس سے مطلق اہل علم مراد ہیں۔ یہ آیت کسی زمان و مکان تک بھی محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے کے اہل علم اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ ہر زمانے، ہر نسل اور ہر قسم کے اہل علم مراد ہیں۔ بشرطیکہ ان کا علم صحیح علم ہو۔ اس لیے کہ قرآن کریم تو تمام زمانوں کے لیے کھلی کتاب ہے۔ اس کے اندر جو سچائی ہے وہ ہر زمانے اور علاقے کے اہل علم کے لیے سچائی ہے۔ یہ کتاب اسی سچائی پر مشتمل ہے جو اس کائنات کی تہ میں ہے۔ اس لیے قرآن کریم اس کائنات سچائی کا بہترین اور سچا ترجمہ ہے۔

وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ (۶: ۳۴) ”اور خدائے عزیز و حمید کا راستہ دکھاتا ہے۔“ اللہ عزیز و حمید کا راستہ وہی ہے جو اللہ نے اس کائنات کے لیے اختیار کیا ہے اور وہی راستہ اللہ نے انسان کے لیے بھی اختیار کیا ہے تاکہ انسانی رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہو جو اس کائنات کے لیے ہے جس میں انسان رہتا ہے۔ یہ راستہ قانون قدرت ہے اور ناموس فطرت کا راستہ ہے جس کے مطابق یہ کائنات چلتی اور جس کے مطابق خود یہ زندگی چلتی ہے کیونکہ خود انسانی زندگی اپنے نظام اور اپنی رفتار کے مطابق اس کائنات سے علیحدہ نہیں ہے۔ نہ ان تمام چیزوں سے علیحدہ ہے جو اس کائنات میں ہیں۔

وہ اللہ عزیز و حمید کی راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے، یوں کہ وہ مومنین کی قوت مدد کے اندر اس کائنات کا مناسب تصور پیدا کرتا ہے، اور پھر اس کائنات کے ساتھ مومنین کے تعلقات، روابط اور اقدار کا ایک تصور پیدا کرتا ہے کہ اس کائنات کے اندر انسان کا مقام کیا ہے۔ اس کے اندر انسان کا کردار کیا ہے، انسان اور اس کے گرد پھیلی ہوئی کائنات

مل کر کس طرح اللہ کی حکمت تخلیق کو بروئے کار لا سکتے ہیں اور انسان اور یہ کائنات باہم مل کر کس طرح اللہ جل شانہ کی سمت کی طرف سفر کر سکتے ہیں۔

یہ سچائی انسان کو عزیز و حمید کے راستے کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ یوں کہ وہ انسان کو ایک منہاج فکر دیتی ہے۔ اس فکر کو نہایت ہی مضبوط بنیادوں پر اٹھاتی ہے اور یہ کائناتی اثرات فطرت انسانی پر اثر انداز ہو کر اسے اس کائنات کا بہترین اور اک عطا کرتے ہیں۔ انسان اس کائنات کے خواص اور قوانین کو سمجھتا ہے اور ان سے استفادہ کرتا ہے۔ پھر وہ کائناتی حقائق کے ساتھ ٹکرانے کے بجائے ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

یہ سچائی انسان کو اللہ عزیز و حمید کی راہیوں دکھاتی ہے کہ ایک فرد کی تربیت کر کے اسے ایک سوسائٹی کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ چلانا سکھاتی ہے۔ پھر یہ ایک سوسائٹی کو دوسری سوسائٹیوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس پوری کائنات کی تعمیر اور ترقی کے لیے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اور تمام سوسائٹیوں کو اس کائنات کے ساتھ ہم قدم کرتی ہے تاکہ یہ کائنات اور اس کے اندر انسانی سوسائٹیاں بڑی سموت کے ساتھ چل سکیں۔

یہ سچائی اللہ عزیز و حمید کی راہ کی طرف یوں بھی ہدایت کرتی ہے کہ وہ انسان اور انسانی سوسائٹی کو ایسے قوانین عطا کرتی ہے جو فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہوں۔ انسانی زندگی کے حالات اور انسانی معیشت کے بارے میں ایسی ہدایات دیتی ہے کہ انسان تمام زندہ مخلوقات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر چلے۔ یہ نہ ہو کہ انسانی نظام اس کائنات اور اس کے اندر موجود دوسرے حیوانات کے نظام کے ساتھ متضاد ہو۔ حالانکہ انسان بھی اس کرۂ ارض کی دوسری مخلوقات اور اہم میں سے ایک امت ہے۔

غرض یہ کتاب اور یہ سچائی راہنما ہے 'سیدھی راہ کی طرف اور یہ راہنما بھی اللہ کا ارسال کردہ ہے اور یہ راہستہ بھی اسی کا پیدا کردہ ہے۔ اگر آپ نے کسی سڑک پر چلنا ہے اور آپ کو راہنمائی کے لیے وہی انجینئر مل جائے جس نے اس راستے کا نقشہ بنایا تھا تو آپ جیسا خوش قسمت اور کون ہے اور آپ کس خوش اسلوبی اور بے فکر سے یہ سفر طے کر سکیں گے۔ یقیناً بہت اطمینان کے ساتھ!

اس حساس تیسرے کے بعد اب دوبارہ بات شروع ہوتی ہے بعث بعد الموت کے موضوع پر 'تعجب کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ بعث بعد الموت پر کس قدر بے نگہ اعتراضات کرتے ہیں۔ وہ اپنی جانب سے حضور پر تعجب کرتے ہیں کہ آپ ایسی انسانی باتیں کرتے ہیں 'یا اللہ پر افتراء باندھتے ہیں حالانکہ خود ان کی تعجب انگیزی احمقانہ ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنْبِئُكُمُ إِذَا
مُزِقْتُمْ كُلَّ مَزْقٍ ۖ لَأَتَكُمْ بِجَدِيدٍ ۚ أَفَتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا
أَمْ بِهِ جِنَّةٌ ۚ بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلِيلِ
الْبَعِيدِ

”مکرمین لوگوں سے کہتے ہیں ”ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہو گا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے بنون لاقین ہے۔“ نہیں بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں ملتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بری طرح نکلے ہوئے ہیں۔“

یہ لوگ قیام قیامت کو اس قدر عجیب سمجھتے تھے۔ یہ لوگ قیامت کے قائل کو قاتل تعجب یا مجنون یا جھوٹا سمجھتے تھے۔ ذرا انداز گفتگو کو دیکھو ”بتائیں تمہیں ایسا شخص جو کہتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو جائے گا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے۔“ یہ ایک عجیب و غریب شخص پیدا ہو گیا ہے جو اس قسم کی انہونی باتیں کرتا ہے کہ مرنے کے بعد مٹی کے ذرات بن جانے کے بعد اور مٹی میں رمل مل جانے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا۔

یہ لوگ مزید تعجب کرتے ہیں اور نہایت ہی انوکھا سمجھتے ہوئے یہ پردہ پیگنڈا کرتے ہیں کہ یا تو یہ اللہ کے نام سے افتراء باندھتا ہے اور یا پھر یہ شخص مجنون ہے۔ کیونکہ ان کے ذمہ کے مطابق اس قسم کی باتیں یا تو جھوٹا شخص کر سکتا ہے یا مجنون کر سکتا ہے۔ اگر مجنون ہے تو یہ کلام ہذیان ہے اور اگر جھوٹا ہے تو یہ تعجب خیز ہے۔ وہ یہ باتیں کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہیں کہ تمہیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا لیکن خود ان کی بات تعجب خیز ہے۔ کیا یہ لوگ پہلی بار پیدا نہیں کیے گئے؟ انسان کی تخلیق کیا کوئی کم واقعہ ہے۔ پہلی بار ایسی تخلیق؟ اگر یہ اسے سمجھ رہا ہو تو غور سے دیکھیں تو کبھی تعجب نہ کریں۔ لیکن یہ گمراہ ہیں اور ہدایت کی راہ نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس تعجب پر ان کو سخت دھمکی دی جاتی ہے۔

بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِيدِ (۸: ۳۴) ”بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ خواب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بری طرح نکلے ہوئے ہیں۔“ اس عذاب سے مراد عذاب آخرت بھی ہو سکتا ہے گویا وہ عذاب ان پر واقع ہو گیا ہے۔ چونکہ وہ گمراہی میں بہت دور تک چلے گئے ہیں اس لیے اب ان کے ہدایت پر آنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ جس طرح عذاب الہی میں مبتلا ہیں اسی طرح گمراہ بھی ہیں۔ یہ بہت گہری حقیقت ہے اس لیے کہ جس شخص کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا وہ نفسیاتی لحاظ سے سخت عذاب اور کشمکش میں ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو دنیا کی بے انصافیوں میں نہ انصاف کی امید ہوتی ہے نہ عدل کی نہ جزائے آخرت کی اور نہ اخروی اجر کی۔ انسانی زندگی میں ایسے واقعات اور حوادث آتے ہیں کہ انسان انہیں صرف اجر اخروی کی خاطر ہی برداشت کر سکتا ہے اور یہ تسلی رکھتا ہے کہ نیکو کار کے لیے اجر حسن ہے اور بدکار کے لیے سزا ہے۔ کئی ایسی مشکلات ہوتی ہیں کہ انسان رضائے الہی اور جزائے اخروی کے لیے انہیں برداشت کرتا ہے کیونکہ آخرت میں چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ضائع نہیں ہوتا۔ اگر وہ برابر ہو اور کسی چٹان کے اندر ہو وہاں سے بھی اللہ اس مطلوب ذرے کو جو ریلی کے دانے کے برابر ہو لے کر آتا ہے اور جو شخص اس تروتازہ اور فرحت بخش اور روشن چراغ سے محروم ہے وہ گویا دائمی عذاب میں ہے۔ اس دنیا میں بھی مکر آخرت ایک مسلسل عذاب میں گرفتار ہوتا ہے اور آخرت میں تو وہ اپنے اعمال کی جزا بہر حال پائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا عقیدہ انسان کے لیے ایک رحمت ہے جس کے مستحق اللہ کے مخلص بندے ہوتے ہیں جو حق کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور جن کی خواہش ہر وقت یہ ہوتی ہے کہ وہ راہ راست پر

گمراہ ہوں۔ رات ہی ہے کہ اس آیت میں اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ گمراہی کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں بھی ایک مصیبت میں گرفتار ہیں۔

ان مکذبین کو اب ایک سخت دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان کی اس گمراہی کی وجہ سے حریہ عذاب دنیا ان پر نازل کر دے اور آسمان کا ایک ٹکڑا ان پر گرا دے یا ان کو اس خلالت کی وجہ سے زمین کے اندر دھنسا دے۔ یہ اس نظام کائنات پر غور نہیں کرتے کہ یہ نظام تو کسی بھی وقت بگڑ سکتا ہے۔

أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَى مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِنَ السَّمَاءِ

وَالْأَرْضِ إِنَّ تَشَاءُ نَحِيفَ يَوْمَ الْأَرْضِ أَوْ تُسْقِطَ عَلَيْهِمْ كِسْفًا مِنَ السَّمَاءِ

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ

۱
ع ۹

دیکھا انہوں نے بھی اس آسمان و زمین کو نہیں دیکھا جو انہیں آگے اور پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے؟ ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں یا آسمان سے کچھ ٹکڑے ان پر گرا دیں۔ درحقیقت اس میں ایک نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔

یہ ایک سخت ڈراؤنا کائناتی منظر ہے۔ یہ منظر ان کے مشاہدات سے ماخوذ ہے جن کو وہ رات اور دن دیکھتے رہتے ہیں۔ زمین کا دھنس جانا بھی انسانی مشاہدہ ہے اور نقص اور روایات میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح شباب ثاقب کے گرنے اور بجلیوں کے گرنے سے بھی آسمانی چیزیں گرتی رہی ہیں۔ یہ سب چیزیں ان کی دیکھی سنی ہیں۔ اس قدر خوفناک حالات کی طرف ان کو متوجہ کر کے ڈر لیا جاتا ہے جو قیام قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ اگر قیام قیامت سے پہلے ہی اللہ ان کو عذاب دینا چاہے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسی زمین اور اسی آسمان میں ان کو یہ عذاب دے دیا جائے جو ان کے آگے پیچھے ان کو گھیرے ہوئے ہے اور یہ ان سے دور بھی نہیں ہے جس طرح قیام قیامت ان کو بعید نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے عذاب سے تو غافل لوگ ہی بے فکر ہوتے ہیں۔

یہ آسمانوں کے اندر جو عملیات وہ دیکھتے ہیں، بجلیاں اور شباب ثاقب اور زمین کا دھنس جانا اور زلزلے۔ کسی وقت بھی ان میں سے کوئی عذاب اگر آجائے تو قیامت ہی ہوگی۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ (۹:۳۴) ”حقیقت یہ ہے کہ اس میں نشانی ہے ہر اس بندے

کے لیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔“ اور جو غلط راہ پر اس قدر دور نہ چلا گیا ہو۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۱۹۵ ایک نظر میں

اس سبق میں شکر اور سرکشی کی دو صورتیں پیش کی گئی ہیں اور یہ مثال بھی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے لیے ایسی قوتیں مسخر کر دیتے ہیں جو عموماً لوگوں کے لیے مسخر نہیں کی جاتیں۔ لیکن اللہ کی مشیت اور اللہ کی تقدیر کو لوگوں کی عادات کے تابع نہیں کیا جاسکتا۔ ان نقوش کے درمیان جنوں کی حقیقت بھی سامنے آتی ہے جن کی پوجا بعض عرب کیا کرتے تھے یا ان سے یہ عرب قبائل غیب کی خبریں طلب کرتے تھے جبکہ یہ جنات بذات خود غیب کی خبروں سے محروم ہوتے ہیں۔ اس سبق میں گمراہی کے وہ اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں جن کے ذریعے شیطان لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ لیکن یہ اسباب انسان کے دائرہ اختیار کے اندر ہیں۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ لوگوں کے جو اعمال پوشیدہ ہوتے ہیں اللہ ان کو ظاہر فرماتے ہیں اور اس سبق کا خاتمہ بھی سابقہ سبق کی طرح ذکر آخرت پر ہوتا ہے۔

---〇〇〇---

ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ اور جس طرح وہ رب تعالیٰ کی حمد گاتے تھے۔ اسی طرح پہاڑ بھی ان کے ساتھ گاتے تھے اور ان کی حمد کے جواب میں پہاڑ اور پرندے بھی حمد گاتے تھے۔ اس طرح کہ ان کے وجود اور کائنات کی حقیقت کے درمیان فاصلے مٹ گئے تھے۔ یہ کائنات بھی اللہ کی حدی خواں تھی اور حضرت داؤد بھی۔ یوں اللہ کی مخلوقات کی دو اقسام کے درمیان فاصلے مٹ گئے اور دونوں مخلوقات الہی حقیقت کے ساتھ مربوط ہو گئیں جس نے ان کے درمیان یہ پردے قائم کر رکھے تھے۔ دونوں اللہ کی تسبیح اور حمد گانے لگیں اور دونوں کا فہم ایک ہو گیا۔ یہ اشراقِ صفائی اور خلوص کا ایک درجہ ہے اور اس مقام اور درجے تک اللہ کے فضل و کرم کے سوا کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ جب حقیقت نوعیہ کے پردے اٹھ جائیں تو اللہ کی مخلوق ایک رہ جاتی ہے اور تمام حائل پردے اٹھ جاتے ہیں۔ کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔

جب حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کی حمد و ثنا گاتے تو پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ گاتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی شخصیت میں جو ترنم تھا، وہ پوری کائنات میں سرایت کر جاتا اور یوں پوری کائنات خالق کی طرف متوجہ ہو کر حمد گاتی۔ یہ وہ لحظات ہوتے ہیں جن کا ذوق انہی لوگوں کو ہوتا ہے جو ان تجربات سے گزرے ہوں اور جن لوگوں نے اپنی زندگی میں ایسے لحظات پائے ہوں۔

وَالنَّالَهُ الْحَدِيدَ (۳۴: ۱۰) ”ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا“۔ یہ اللہ کے فضل و کرم کا ایک دوسرا رنگ تھا جو حضرت داؤد علیہ السلام پر ہوا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر علامات کا جس طرح یہاں بیان ہو رہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی خارق العادت عمل تھا۔ معاملہ یہ نہ تھا جس طرح بھیڑوں میں لوہے کو گرم کر کے ان کو پگھلاتے ہیں اور پھر اعلیٰ کا کام کرتے ہیں۔ یہ دراصل ایک معجزانہ عمل تھا اور حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت پر ایک دلیل تھا اور سیاق کلام سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہاں مخصوص فضل و کرم کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ کوئی معمولی اور عادی ٹیکنالوجی نہ تھی۔

أَنْ أَعْمَلَ سَبْعًا وَقَدَّرَ فِي السَّرِّ (۳۴: ۱۱) ”اس ہدایت کے ساتھ کہ زرہیں بنا اور اس کے حلقے ٹھیک اندازے سے رکھ“۔ سابعات معنی زرہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے قبل تختیاں بنائی جاتی تھیں اور تختیوں کی زرہیں جسم کے لیے نہیں ہوتی تھیں اور جسم کو زخمی کر دیتی تھیں۔ اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ امر سکھایا کہ آپ گرم تاروں سے ان کو بنائیں تاکہ وہ نرم ہوں اور کپڑے کی طرح جسم ان کے اندر حرکت کر سکے۔ حکم دیا کہ اس زرہ کے حلقے ٹھیک کیے جائیں تاکہ اس کے اندر سے تیر نہ جائیں اور حلقے سب کے سب ایک اندازے سے بنائے جائیں اور یہ تمام کام اللہ کی جانب سے الہامی طور پر ہوا۔ ان کو مزید ہدایات یوں دی گئیں:

وَأَعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۳۴: ۱۱) ”اے آل داؤد نیک عمل کرو جو کچھ تم کرتے ہو میں دیکھ رہا ہوں“۔ اس زرہ سازی کے کام میں نہیں بلکہ ہر کام میں اعمالِ صالحہ کرو ہر معاملے میں اللہ کو حاضر سمجھو۔ اور یہ یقین رکھو کہ اللہ جزاء دینے والا ہے۔ اس سے کوئی چیز رہ نہ جائے گی۔ وہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔

یہ تو تھا حضرت دلوٰد علیہ السلام کا معاملہ۔ رہے حضرت سلیمان تو ان پر بھی بہت ہی بڑا فضل و کرم ہوا تھا۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عُدُوهُمَا شَهْرٌ وَرَوَّاحُهَا شَهْرٌ وَأَسَلْنَا لَهُ
عَيْنَ الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَن يَزِغُ
مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُنْذِرُكَ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿١٢﴾ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ
مَحَارِبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ ذَرِيبٍ ۚ اِعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ
شُكْرًا وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّاكِرِينَ ﴿١٣﴾

”اور سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا صبح کے وقت اس کا چنا ایک مینے کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چنا ایک مینے کی راہ تک۔ ہم نے اس کے لیے پچھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور ایسے جن اس کے تابع کر دیئے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے۔ ان میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے۔ وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا، اونچی عمارتیں، تصویریں، بڑے بڑے حوض جیسے نگوں اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیکیں۔ اے آل دلوٰد عمل کرو شکر کے طریقے پر، میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا گیا تھا اس کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہیں۔ ان روایات پر اسرار الہیات کا رنگ غالب ہے۔ اگرچہ یہودی کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔ ان روایات میں پڑنے سے بچتا ہی بہتر ہے۔ آیت میں جو کچھ آیا ہے بس اس پر اکتفا محفوظ راستہ ہے۔ آیات کا ظاہری مفہوم ہی مراد لیا جائے۔ آیات کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تھا اور یہ ہوا صبح کے وقت ایک علاقے کی طرف چلتی تھی۔ (سورہ انبیاء میں ہے کہ یہ ارض مقدس کی طرف چلتی تھی) اور ایک مینے کا فاصلہ طے کرتی تھی اور شام کے وقت وہ دوسرے علاقے کی طرف چلتی اور مسافت ایک ماہ کا فاصلہ ہوتا۔ دونوں سے حضرت سلیمان اپنے مفادات لیتے اور اللہ کے حکم سے استفادہ کرتے۔ اس کی تفصیلات کیا ہیں۔ وہ ہمیں معلوم نہیں۔ اور بلا تحقیق انسانوں کے پیچھے پڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ (۱۲: ۳۴) ”ہم نے اس کے لیے پچھلے ہوئے تانبے کا ایک چشمہ بہا دیا تھا۔“ قطر نحاس یعنی تانبے کو کہتے ہیں۔ سیاق کلام سے یہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوہے کو نرم کرنے کی طرح تانبے کا چشمہ بھی کوئی معجزانہ عمل تھا۔ یوں ہو سکتا ہے کہ اللہ نے آتش فشاں کے عمل کی طرح ان کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا ہو یا یوں کہ اللہ نے ان کو بطور الامام تانبا پچھلانا سکھا دیا ہو۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے فضل عظیم تھا۔

وَمِنَ الْجِنَّ مَنْ يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِأَذْنِ رَبِّهِ (۳۴: ۱۲) ”جن ان کے تابع کر دیئے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے۔“ اللہ نے معجزانہ طور پر جن ان کے تابع کر دیئے تھے اور وہ ان کی مملکت میں معجزانہ ڈیوٹیوں دیتے تھے۔ عربی میں ان تمام مخفی قوتوں کو جن کہا جاتا ہے جو نظر نہیں آتیں۔ یہ ایک مخلوق ہے جس پر اللہ نے جن کے لفظ کا اطلاق کیا ہے ہم اس مخلوق کے بارے میں وہی کچھ جانتے ہیں جو اللہ نے بتایا ہے اس سے زیادہ نہیں۔ یہاں اللہ نے صرف یہی کہہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ان کا ایک گروہ مسخر کر دیا گیا تھا جو آپ کے تحت کام کرتا تھا اور ان میں سے جو بھی بھاگ جاتا اسے اللہ سخت سزا دیتے تھے۔

وَمَنْ يَزْعُ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرٍ نَذِقُهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ (۳۴: ۱۲) ”ان میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ پکھاتے۔“ جنوں کی تسخیر کی بات ختم ہونے سے قبل ہی یہ تبصرہ کیا گیا کہ جن اللہ کے اس طرح قبضے میں ہیں کہ اگر نافرمانی کریں تو اللہ انہیں آگ میں ڈال دے۔ چونکہ بعض مشرکین جنوں کی پوجا کرتے تھے اس لیے یہاں ان کی اس بے بسی کو بیان کیا گیا کہ مشرکین کی طرح ان کے معبود بھی نار جہنم میں جائیں گے بوجہ نافرمانی کے۔۔۔ جن حضرت سلیمان کے لیے یوں مسخر تھے۔

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِبٍ وَ تَمَاثِيلٍ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ

رُسِيَّتٍ (۳۴: ۳۴) ”وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا تھا۔ اونچی عمارات، تصاویر، بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بڑی بڑی دنگیں۔“ محارب تو ان حکموں کو کہا جاتا ہے جہاں عبادت کی جاتی ہے۔ تماثیل تانبے اور لکڑی کی تصاویر کو کہتے ہیں۔ جوہلی جابہ کی جمع ہے وہ حوض جس میں پانی آئے۔ جن حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ایسے بڑے لگن بناتے تھے جو حوضوں کی طرح تھے اور وہ ان کے لیے ایسے بڑے دیگ بناتے تھے جو اپنی بڑائی کی وجہ سے جڑے رہتے تھے۔ یہ تمام خدمت وہ ہیں جن پر جنت مامور تھے۔ یہ تمام امور اس وقت خارق عادت تھے اس لیے ان کی یہی تفسیر درست ہے۔ اگر ان کو معمولی بنا دیا جائے تو یہ فضل نہیں رہتا۔

اب آل داؤد کو مخاطب کر کے ہدایت دی جاتی ہے۔

اعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا (۳۴: ۱۳) ”اے آل داؤد عمل کرو شکر کے طریقے پر۔“ ہم نے تمہارے لیے یہ فضل و کرم حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی شکل میں فراہم کر دیا ہے، لہذا اے آل داؤد تم شکر کا طریقہ اختیار کرو۔ فخر و مبہات کا طریقہ نہ اپناؤ اور عمل صالح کا طریقہ اپناؤ۔

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (۳۴: ۱۳) ”میرے بندوں میں سے کم ہی شکر گزار ہیں۔“ یہ ایک ایسا تبصرہ ہے جو حقیقت نفس الامری قارئین کے سامنے رکھتا ہے اور یہ قرآن کریم کے تمام قصوں پر آتا ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ کا فضل و کرم انسانوں پر اس قدر زیادہ ہے کہ کم انسان شکر ادا کر سکتے ہیں اور بشر ہمیشہ شکر الہی کی بجا آوری میں قاصر ہی رہتے ہیں۔ وہ جس قدر زیادہ شکر بھی ادا کریں پھر بھی قاصر رہتے ہیں لیکن اگر وہ بالکل شکر ہی نہ

کس تو ان کا تصور بہت زیادہ ہو گا اور اگر سرکشی کس تو.....

اللہ کے بندے نہایت ہی محدود قوت کے مالک ہیں اور ان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اللہ کی لامحدود نعمتوں پر شکر بجالائیں۔ اگر اللہ کی نعمتوں کو کوئی سمجھنے تو مکن ہی نہ سکے، یہ نعمتیں گو انسان کو لو پر سے ڈھانپ رہی ہے، پاؤں کے نیچے سے انسان ان میں غرق ہے، دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے انسان ان سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس کی ذات ان میں ڈوبی ہوئی ہے۔ خود انسان انعامات الہیہ کا لیک نمونہ ہے۔

ایک بار ہم بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ نہایت ہی دلچسپی کے ساتھ ہم کلام تھے۔ ہر قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اچانک چھوٹی بلی سو سو نمودار ہوئی۔ یہ ہمارے ارد گرد گھوم رہی تھی گویا کوئی چیز تلاش کر رہی ہے لیکن وہ بلی زبان سے کچھ کہنے پر قادر نہ تھی۔ اچانک اللہ نے ہمارے دل میں ڈال دیا کہ شاید یہ بیاسی ہے۔ جب ہم نے پانی فراہم کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بیاسی تھی، اسے شدید پیاس لگی ہوئی تھی لیکن وہ زبان سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ انسان پر اللہ کے فضل و کرم سے ایک بڑا فضل و کرم زبان بھی ہے جس کا شکر ادا کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

ایک طویل عرصے تک ہم نے سورج نہ دیکھا تھا۔ سورج کی شعاعیں صرف ایک پیسے کے برابر ہم پر چمکتی تھیں ہم اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور اپنے منہ ہاتھ اور چہرے اس سورج کے سامنے لاتے 'سر' پیٹھ اور پاؤں کو اس سورج کی شعاعوں کی نکیلا سے غسل دیتے۔ اور ہم سب یہ عمل باری باری کرتے۔ یہ ایک نعمت تھی جو ہمیں مل رہی تھی اور جب پہلے دن ہم سورج میں نکلے تو میں وہ خوشی بھول نہیں سکتا۔ اس وقت ہر ایک کے چہرے پر جو مسرت تھی اس کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ ہر ایک اللہ کا کمر اشکر ادا کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا 'الحمد للہ' یہ ہے سورج اور یہ تو ہمیشہ ہی چمکتا رہتا ہے۔

روزانہ یہ شعاعیں کس قدر پھیلتی ہیں اور ہم ان سے گرمی حاصل کرتے ہیں۔ اور ان شعاعوں میں غسل کرتے ہیں۔ یوں ہم اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اللہ کی نعمت میں غرق رہتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ ہم اس عظیم فیض الہی سے کس قدر فائدہ اٹھاتے ہیں جو مفت اور بلا حساب ہمیں فراہم کر دیا گیا ہے بغیر مشقت اور بغیر کسی تکلیف کے۔

اگر ہم اسی طرز پر اللہ کی نعمتوں کو پیش کرتے رہیں تو ہماری عمر ختم ہو جائے، ہماری پوری قوت صرف ہو جاے۔ نیکی پھر بھی ہم ان نعمتوں میں سے کسی معتد بہ جیسے کا شکر نہ کر سکیں۔ لہذا ہم بھی یہاں اسی مجمل اشارے پر اکتفاء کرتے جو قرآن نے کیا ہے تاکہ آگے نکل فکر و تدبیر خود ہی سوچ لیں اور وہ جس قدر اللہ چاہے اس سے تاثر لیں۔ یہ تو ہے اللہ کی نعمتوں کا ایک حصہ اور وہی شخص ان کو پا سکتا ہے جو نہایت ہی توجہ، خلوص اور یکسوئی کے ساتھ اس طرف متوجہ ہو۔

اب ہم قرآنی قیصے کی آخری آیات کی طرف آتے ہیں۔ یہ آخری منظر کا حصہ ہیں۔ حضرت سلیمان وفات پا جاتے ہیں اور جنات ان احکام کی تعمیل میں لگے ہوئے تھے جو انہوں نے اپنی زندگی کے دوران دیئے تھے۔ جنات کو معلوم نہیں ہے کہ حضرت سلیمان تو فوت ہو چکے ہیں۔ حضرت سلیمان جنات کے سامنے عصا پر ٹیک لگائے کھڑے ہی تھے کہ گھن نے ان کے عصا کو کھالیا اور آپ گر گئے۔ تب جنوں کو معلوم ہوا کہ وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس مشقت میں مبتلا رہے۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَى مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةٌ

الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَاتَهُۥ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ أَنْ لَوْ كَانَُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿۱۴﴾

”پھر جب سلیمان علیہ السلام پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس گھن کے سوانہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔“

روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا وقت آگیا تو وہ عصا پر تکیہ کیے ہوئے تھے۔ جن اپنی اپنی ڈیوٹیاں سرانجام دینے رہے تھے اور ان کے ذمہ بہت سے شدید فرائض تھے جو ان کو کرتے تھے۔ جنوں کو ایک عرصہ تک معلوم نہ ہوا کہ حضرت سلیمان فوت ہو گئے ہیں یہاں تک کہ گھن نے ان کے عصا کو چاٹ لیا۔ یہ کیزا جہاں ہوتا ہے چھت کے شہتیروں، درواریوں، ستونوں کو بری طرح کھا جاتا ہے۔ پورٹ سعید کے علاقے میں لوگ گھر بناتے ہیں اور اس گھن کے درست اس میں ایک لکڑی بھی نہیں لگاتے کہ یہ کیزا ہر قسم کی لکڑی کو چاٹ جاتا ہے۔ جب اس نے عصا کو چاٹ لیا تو وہ حضرت سلیمان کو نہ سار سکا اور آپ زمین پر گر پڑے۔ اس وقت جنوں کو معلوم ہوا کہ حضرت تو وفات پا چکے ہیں۔ یہاں آکر جنوں کو معلوم ہوا۔

تَبَيَّنَتِ الْجِنَّ أَنْ لَوْ كَانَُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ

(۱۴: ۳۴) ”یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔“ یہ ہیں وہ جن جن کو عرب پوجتے ہیں اور ان کو اللہ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کے تابع بنا دیا اور ان کو اپنے قریب کے غیب کا بھی علم نہ تھا۔ لیکن بعض لوگ اس قدر کم فہم ہیں کہ ان سے دور کی باتیں پوچھتے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے گمراہنے کا قصہ تو ان لل ایمان کا قصہ تھا جو اللہ کے فضل و کرم کا بے حد شکر ادا کرنے والے تھے۔ اس کے بالقابل قوم سبا کا قصہ ہے۔ سورہ نمل میں حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کے حالات گزر گئے ہیں۔ اب ان کا قصہ بعد کے ادوار سے متعلق ہے کیونکہ جن واقعات کا یہاں ذکر ہے وہ زمانہ مابعد سے متعلق ہیں۔

رائج بات یہ ہے کہ جب قوم سبا نے سرکشی اختیار کی تو اللہ نے ان سے اپنی نعمتیں چھین لیں اور اس کے بعد یہ لوگ اس علاقے سے منتشر ہو گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں یہ لوگ ایک بہت بڑی ترقی یافتہ مملکت کے مالک تھے اور ان کے علاقے میں ہر طرف خوشحالی اور رفاه عامہ کے کام تھے۔ کیونکہ ہر بد نے سلیمان علیہ السلام کے سامنے یہ رپورٹ پیش کی۔

إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ وَجَدْتُهَا

”مَهَا يَبْدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ“ میں نے دیکھا کہ ایک عورت ان کی ملکہ ہے اور اسے ہر چیز دی گئی ہے اور اس کا ایک عظیم تخت ہے۔ میں نے پایا کہ وہ اور اس کی قوم سورج کے پجاری ہیں 'اللہ کے سوا'۔ اس کے بعد پھر ملکہ سبا سلیمان علیہ السلام کے سامنے مسلمان ہو کر آ جاتی ہے۔ لہذا یسوں کے جو واقعات ہیں وہ ملکہ سبا کے زمانہ کے بعد سے متعلق ہیں۔ یہ مصائب ان پر اس وقت آئے جب انہوں نے سرکشی اختیار کر دی۔ اور اللہ کی ناشکری کی وجہ سے اللہ نے اپنے انعامات ان سے چھین لیے۔

تھے 'کا آغاز اس حالت کے بیان سے ہوتا ہے جس میں وہ تھے۔ اچھے دن 'فراوانی' ترقی اور اللہ کی نعمتیں اور ہر طرح کی پیداوار جس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان انعامات کے بدلے میں اللہ کا شکر ادا کرتے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكِنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتِ عَنْ يَمِينٍ وَ
مِشَالٍ هُكُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوا لَهُ بَلَدَهُ طَيِّبَهُ وَ رَبُّ
غَفُورٌ ۝

”سبا کے لیے ان کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی 'دو باغ دائیں اور بائیں۔ کھاؤ اپنے رب کا رزق اور شکر بجاؤ اس کا' ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا“۔ سبا اس قوم کا نام ہے جو جنوب یمن میں رہتی تھی۔ ان کی زمین تروتازہ تھی۔ اس کا ایک حصہ آج بھی اسی حالت میں موجود ہے۔ یہ اس قدر ترقی یافتہ تھے کہ مشرق اور جنوب سے آنے والی بارشوں کے پانی کا انہوں نے ذخیرہ بنالیا تھا۔ ایک ایسا ذیم بنایا تھا جس کے دونوں جانب قدرتی پہاڑ تھے۔ پہاڑوں کے درمیان تنگ جگہ پر انہوں نے ذیم بنالیا تھا جس میں سے چشمے اور نہریں نکلتی تھیں۔ ان کا پانی وہ حسب ضرورت بند کرتے تھے اور کھولتے تھے۔ انہوں نے پانی کی بہت ہی بڑی مقدار کو جمع کر لیا تھا اور اس ذخیرے پر انہیں کنٹرول حاصل تھا۔ چنانچہ یہ ان کے لیے ایک وسیع ذریعہ آپاشی تھا۔ اسے یہ لوگ سد مارب کہتے تھے۔

اس ذیم کے دائیں اور بائیں، جانب کی سرودوں کے تحت باغات تھے۔ یعنی پورا علاقہ سرسبز اور شاداب تھا 'حسین و جمیل' تھا اور یہ نشانی تھی 'رب کریم کی انعامات کی۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ رب غفور کا شکر ادا کریں ان نعمتوں پر۔

كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوا لَهُ (۱۵:۳۴) ”کھاؤ اپنے رب کا رزق اور شکر بجاؤ اس کا“۔ ان کو یہ نصیحت کی گئی کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرو جس نے تمہیں یہ خوبصورت علاقہ دیا۔ اور اس میں ہر قسم کی پیداوار دی اور پھر تم سے جو تقصیرات سرزد ہوئیں وہ بھی معاف کی گئیں۔

بَلَدَهُ طَيِّبَهُ وَ رَبُّ غَفُورٌ (۱۵:۳۴) ”ملک عمدہ اور پروردگار بخشش کرے والا“۔ زمین عمدہ

پیداوار والی، اور نعمتوں اور آسائیوں والی اور آسمانوں کی بادشاہت عطا کرنے والی۔ سوال یہ ہے کہ زمین ہر قسم کا پھل دینے والی ہے اور اللہ غفور الرحیم ہے تو پھر شکر ادا نہ کرنے اور اللہ کی حمد نہ کرنے کا جواز کیا ہے؟ لیکن اس کے باوجود انہوں نے شکر ادا نہ کیا۔

فَاعْرِضُوا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ
جَنَّتَيْنِ ذَوَاتِيْ اَكْلِ خُمُطٍ وَّاَثَلٍ وَ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿١٦﴾

”مگر وہ منہ موڑ گئے۔ آخر کار ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انہیں دیئے جن میں کڑوے کسبے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی ہیریاں۔“
انہوں نے اللہ کے شکر بجالانے سے منہ موڑ لیا۔ نیک کام کرنا چھوڑ دیا۔ اللہ کے انعامات میں غلط تصرفات کرنا شروع کر دیئے۔ لہذا اللہ نے ان سے وہ خوشحالی چھین لی جس میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان پر اس قدر شدید سیلاب بھیجا جو راستے میں آنے والے پتھروں کو بھی بہا کر لے جا رہا تھا۔ العرم کے معنی پتھر ہیں۔ یوں یہ ایم ٹوٹ گیا۔ پانی نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔ یہ گاؤں اور باغات تباہ ہو گئے۔ اور از سر نو پانیوں کے ذخیرہ کرنے کا انتظام ان سے نہ ہو سکا۔ اس لیے خوشحالی کی جگہ خشک سالی نے لی۔ زمین خشک ہو کر جل گئی اور سرسبز باغات ہیروں کی جھاڑیوں میں بدل گئے اور سرسبز زمین صحرائیں بدل گئی۔

وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتِيْ اَكْلِ خُمُطٍ وَّاَثَلٍ وَ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ

قَلِيْلٍ (۱۶: ۳۴) ”اور ان کے پچھلے دو باغوں کے بدلے دو اور باغ انہیں دیئے جن میں کڑوے کسبے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی ہیریاں۔“ خط اراک کے درخت کو کہتے ہیں۔ ہر خاردار درخت کو بھی خط کہتے ہیں۔ اور اثل ایک درخت ہے جو الطرقاء کے مماثل ہوتا ہے یعنی جھاؤ۔ اور سدر ہیری کو کہتے ہیں اور یہ ہیری جو اب ان کے لیے بہترین پھل رہ گئی تھی یہ بھی قلیل مقدار میں تھی۔

ذٰلِكَ جَزٰٓئُهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَاَھْلُ نٰجِيَّتِيْ اِلَّا الْكَافِرُوْنَ ﴿١٧﴾

”یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے۔“۔ یعنی کفر ان نعمت کی وجہ سے ان کو یہ سزا دی گئی۔

لیکن ابھی تک یہ لوگ اپنی بستیوں ہی میں رہ رہے تھے اگرچہ اس سیلاب کی وجہ سے ان کے رزق کے ذرائع محدود ہو گئے تھے۔ خوشحالی اور سولیات کے بدلے بد حالی اور مشکلات معیشت نے جگہ لے لی تھی۔ لیکن ابھی تک ان کو نکلے کھڑے کر کے زمین کے اندر بکھیر نہ دیا گیا تھا۔ اور ان کی بستیوں اور برکت والی بستیوں مکہ مکرمہ اور بیت المقدس کے

درمیان مواصلات کا سلسلہ باقی تھا۔ علاقہ سبا کے شمال میں یمن کا علاقہ بھی آباد تھا اور یمن مکہ اور مدینہ کے ذریعہ شام اور بیت المقدس سے جڑا ہوا تھا۔ یہ راہ مامون اور جاری تھی۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمُ الْبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً
وَقَدَرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سَيَرُوا فِيهَا لَيَالِيًا وَأَيَّامًا آمِنِينَ ﴿١٨﴾

”اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان، جن کو ہم نے برکت عطا کی تھی، نمایاں بستیاں بسا دی تھیں اور ان میں سفر کی مسافتیں ایک اندازے پر رکھ دی تھیں۔ چلو پھرو ان راستوں میں رات دن پورے امن کے ساتھ۔“
یہ راستہ ایسا تھا کہ مسافر اور قافلے صبح نکلنے اور اندھیرا ہونے سے پہلے دوسرے شہر تک پہنچ جاتے۔ لہذا ان شہروں کے درمیان محدود فاصلے کا سفر ہوتا اور یہ راستہ مسافروں کے لیے نہایت ہی امن و امان کا اور محفوظ ہوتا تھا۔ روز کے سفر کے بعد مسافر آرام کر سکتے تھے اور ان کو جگہ جگہ سروسز کی سہولیات مل جاتی تھیں۔

فَقَالُوا رَبَّنَا بَعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ
وَمَزَقْنَاهُمْ كُلَّ مَرْزِقٍ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿١٩﴾

مگر انہوں نے کہا ”اے ہمارے رب، ہمارے سفر کی مسافتیں لمبی کر دے۔“ انہوں نے خود مطالبہ کیا کہ اے اللہ ہمیں طویل المسافت سفر دے۔ ایسا سفر جو سالوں میں کیا جاسکے کیونکہ ان تھوڑے تھوڑے مختصر سفروں سے ہم تنگ آ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دماغ اور ان کے نفوس فساد پذیر ہو گئے تھے۔

وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ (۱۹:۳۴) ”انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔“ انہوں نے یہ دعا کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اللہ نے بھی ان کی دعا قبول کر لی۔ یہ دعا دراصل سرکشی کی دعا تھی اور اللہ نے اسے بطور سزا قبول کر لیا۔

فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَقْنَاهُمْ كُلَّ مَرْزِقٍ (۱۹:۳۴) ”آخر کار ہم نے انہیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انہیں بالکل تتر بتر کر ڈالا۔“ وہ خود اپنی خواہش کے مطابق اس ملک سے نکال دیئے گئے تتر بتر ہو گئے اور پورے جزیرہ العرب میں پھیل گئے۔ ان کی تاریخ افسانہ بن گئی۔ صرف قیس رہ گئے قوم ازدر ملک ناپید ہو گیا۔ حالانکہ وہ ملک اور امت کے مالک تھے اور بہترین زندگی بسر کرتے تھے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۱۹:۳۴) ”یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو بڑا صابر و شاکر ہو۔“ شکر کے ساتھ صبر کا ذکر بھی کیا گیا ہے کیونکہ مشکلات میں صبر بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ نعمتوں میں شکر انسان کے لیے بہت ہی مفید رویہ ہوتا ہے اور قصہ قوم سبا میں دونوں کے لیے سبق ہے۔

یہ تو تھا آیت کا ایک مفہوم لیکن ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے۔ اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمُ الْبَيْنَ الْفُرَى الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً (۱۸:۳۴) ”اور ہم نے ان بستیوں اور برکت والی بستیوں کے درمیان لسی بستیاں پیدا کر دیں جو قوت اور شوکت والی تھیں۔“ یعنی ان ہلکے شدہ بستیوں اور مبارک بستیوں کے درمیان غالب بستیاں وجود میں آئیں۔ جبکہ سہا کے لوگ فقراء بن گئے اور خشک صحراوی زندگی کی طرف لوٹ گئے۔ ان کو چہ اگا ہوں اور پانیوں کی طرف رات دن سفر کرنا پڑتا۔ انہوں نے ان آزمائشوں پر صبر نہ کیا۔ اور یہ دعا کی لیے رب سے دعا کی۔

بَيْنَ اسْفَادِنَا (۱۹:۳۴) ”ہمارے سفروں کو دور کر دے۔“ یعنی ہماری حالت پاداشی کو ختم کر دے۔ ہم تنگ آ گئے۔ یہ دعا انہوں نے اذیت اور اصلاح حال کے ساتھ نہ کی تھی اور وہ پوری طرح تائب نہ ہوئے تھے۔ اس لیے دعائیں نہ ہوئی۔ انہوں نے خوشحالی کی وجہ سے سرکشی اختیار کی تھی اور مشکلات پر صبر نہ کیا تو اللہ نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ یوں یہ لوگ انسان بن گئے جس کا کوئی مصداق روئے زمین پر نہ رہا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۹:۳۴) ”بے شک اس میں نشانیوں میں ہر اس شخص کے لیے جو صابر اور شاکر ہو۔“ چونکہ انہوں نے شکر نہ کیا تھا اور مشکلات میں صبر نہ کیا تھا۔ اس آیت کی یہ بھی ایک تفسیر ہے جو ذہن میں آتی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اب آخر میں بات قہر کے محدود احاطے سے نکل کر اللہ کی عمومی تدبیر کے دائرے میں آتی ہے۔ اللہ کا نظام تضاد قدر جو نہایت ہی حکم ہے جو عام اور جو بطور سخت لہجہ اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔ قہر کا سبق یوں نچوڑا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا

مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِيَعْلَمَ مَن يُّؤْمِنُ
بِالْآخِرَةِ ۚ مَن مِّنْهُمْ مُّوْمِنًا فِيْ شَيْءٍ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حٰفِظٌ

۲

ع ۱۲

۸

”ان کے معاملہ میں ابلیس نے اپنا گمان صحیح پایا اور انہوں نے اسی کی پیروی کی۔ بجز ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن تھے۔ ابلیس کو ان پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر جو کچھ ہوا وہ اس لیے ہوا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون آخرت کا ماننے والا ہے اور کون اس کی طرف سے شک میں پڑا ہوا ہے۔ تھوڑا سا ہر چیز پر نگرانی ہے۔“

یہ قوم اس راستے پر چل کر اس کا یہ انجام کیوں ہوا؟ اس لیے کہ ابلیس نے اپنی منصوبہ بندی کو درست پایا اور وہ ان کو گمراہ کرنے میں کامیاب رہا۔ ہاں اہل ایمان کو وہ گمراہ نہ کر سکا۔ مومنین کے گروہ کو وہ گمراہ نہ کر سکا۔ کیونکہ ہر گمراہ سو سائی میں لوگوں کی ایک قلیل تعداد ایسی رہ جاتی ہے جو گمراہ ہونے سے انکار کر دیتی ہے اور یہ قلیل گروہ مومنین اس

بات کا گواہ ہوتا ہے کہ سچائی اپنی جگہ قائم ہوتی ہے۔ صرف اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی سچائی کا طالب ہو۔ اگر کوئی طالب ہو تو سچائی مل جاتی ہے۔ بدترین حالات میں بھی سچائی قائم رہتی ہے۔ جہاں تک ابیس کا تعلق ہے لوگوں کے لوپر اس کو کوئی جابرانہ اقتدار حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کو مجبور کر کے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ شیطان ہر حال میں لوگوں پر مسلط ہوتا ہے۔ اب لوگوں میں سے بعض حق پر ثابت قدم ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ حق کے طالب ہی نہیں ہوتے، وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ پھر عالم واقعہ میں یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ مومن کون ہے اور مومن کو اس کا ایمان برے راستے سے بچاتا ہے۔

مَمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ (۲۱: ۳۴) ”اس سے جو آخرت سے شک میں ہوتا ہے۔“ جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ بچ جاتا ہے اور جو آخرت کے بارے میں شک کرتا ہے وہ شیطان کی گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اللہ کو تو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ کون سیدھی راہ لے گا اور کون غلط لے گا لیکن اللہ تعالیٰ فیصلوں کو تب صادر کرتا ہے جب وہ عملاً صادر ہو جاتے ہیں۔

اس وسیع میدان میں یعنی اللہ کی تدبیر اور تقدیر کے وسیع میدان میں شیطان کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ کسی کو مجبور کیے بغیر لوگوں پر مسلط ہو جائے اور ان نتائج کو ظاہر کر دے جو پہلے سے اللہ کے علم میں تھے۔ اس میدان میں قصہ سبا دراصل تمام اقوام عالم کا قصہ ہے۔ اقوام کے عروج و زوال کی داستان وہی ہے جو سبا کی ہے۔ اس لیے اس آیت کے دائرہ اطلاق کو وسیع کر دیا جاتا ہے۔ یہ اصول قوم سبا تک محدود نہیں رہتا۔ تمام انسانوں کے لئے اور برے حالات اسی اصول کے تحت آتے جاتے ہیں۔ لوگوں کا ہدایت پانا اور گمراہ ہونا اسباب ہدایت اور اسباب ضلالت اختیار کرنے کے نتیجے میں ہوتا ہے۔

وَرَبُّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِیْظٌ (۲۱: ۳۴) ”اور تیرا رب ہر چیز پر نگران ہے۔“ اس سے کوئی چیز غائب نہیں ہوتی، کوئی چیز نظام تخلیق میں مہمل نہیں ہوتی اور نہ بے کار ہوتی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۱۹۶ ایک نظر میں

یہ ایک مختصر سبق ہے جس کا موضوع توحید اور شرک ہے، لیکن اس سبق میں انسان کے عقل و خرد کو پوری کائنات کی سیر کر لی جاتی ہے۔ ظاہری کائنات ہو یا مخفی ہو، حاضر ہو یا غائب ہو، زمین سے ہو یا آسمان سے ہو، دنیا سے متعلق ہو یا آخرت سے۔ اس سفر میں انسان پر اس قدر خوف طاری کر دیا جاتا ہے کہ اس کا وجود کانپنے لگتا ہے اور اللہ کا جلال اس پر اس قدر طاری ہوتا ہے کہ انسان مدہوش ہو جاتا ہے۔ انسان کے سامنے اس کا نسب، اس کا رزق اور جزا و سزا کے مناظر رکھے جاتے ہیں۔ اس سبق میں نہایت ہی زور دار الفاظ میں لفظ قل قل قل کے ساتھ انسان کو مجبور ڈا جاتا ہے۔ ہر فقرے میں ایک لاجواب دلیل سامنے لائی جاتی ہے۔ نہایت ہی قوی دلیل۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۱۹۶ تشریح آیات

۲۲ --- تا --- ۲۷

قُلْ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمَا مِنْ شَرِكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيرٍ ﴿۲۲﴾

(”اے نبیؐ، ان مشرکین سے) کہو کہ ”پکار دیکھو اپنے ان معبودوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں نہ زمین میں۔ وہ آسمان و زمین کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے۔“
آسمانوں اور زمین کے وسیع میدان میں یہ چیلنج ہے۔

قُلْ ادْعُوا الَّذِينَ مِّنْ دُونِ اللَّهِ (۲۲: ۳۴) ”کہو کہ پکار دیکھو اپنے معبودوں کو جن کو تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔“ ان کو بلاؤ وہ آئیں۔ ذرا غلط تو ہوں میدان میں ’وہ خود دعویٰ کریں یا تم ان کی جانب سے دعویٰ کرو کہ زمین و آسمانوں کی بادشاہت میں ان کے اختیارات کیا ہیں؟ کچھ نہیں۔

لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ (۲۲: ۳۴) ”وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرے کے برابر چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں۔“ ظاہر ہے کہ وہ اور نہ ان کی جانب سے کوئی اور اس زعم کا دعویٰ کر سکتا ہے کیونکہ مالک تو وہ ہوتا ہے جو کسی چیز میں متصرف ہوتا ہے اور اس میں وہ متصرف نہیں ہیں۔ لہذا یہ معبود کسی چیز کے مالک نہیں ہیں کیونکہ اس وسیع کائنات میں ان کا کوئی تصرف نہیں ہے۔

وَمَا لَهُمَا مِنْ شَرِكٍ (۲۲: ۳۴) ”آسمان اور زمین کی ملکیت میں وہ شریک ہی نہیں۔“ یعنی نہ تو وہ واحد مالک ہیں اور نہ وہ شریک مالک ہیں۔

وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ (۲۲:۳۴) ”ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے۔“ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ رضا کارانہ طور پر اللہ کے مددگار ہوں، یہ بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اشارہ مخصوص قسم کے معبودوں اور مخصوص قسم کے شرک کی طرف ہے۔ یعنی اشارہ ملائکہ کی طرف ہے، جنہیں عرب اللہ کی دنیا سمجھتے تھے۔ سفارشی سمجھتے تھے اور انہی کے بارے میں ان کا کہنا تھا۔

مَا نَعُدُّهُمْ إِلَّا يَقْرَبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى ”ہم ان کی بندگی اس لیے کرتے ہیں کہ یہ تو ہمیں اللہ کے بہت قریب کرتے ہیں۔“ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں سفارش کی نفی کی جاتی ہے اور ایک ایسے منظر میں جو نہایت ہی خوفناک ہے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ

”اور اللہ کے حضور کوئی شفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی بجز اس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو۔“

اللہ کے ہاں شفاعت وہی لوگ کر سکیں گے جن کو اللہ کی جانب سے اجازت ہوگی۔ اللہ کسی ایسے شخص کے لیے اجازت نہیں دیا کرتا جو مومن نہ ہو اور سفارش کا مستحق نہ ہو۔ وہ لوگ جو شرک کرتے ہیں وہ اس کے مستحق نہیں رہتے۔ نہ ملائکہ کو اس کی اجازت ہے اور نہ ان کے علاوہ اور لوگوں کو جن کو شفاعت کی اجازت ہوگی۔ جن حالات میں شفاعت کرنے والے شفاعت کریں گے باوجود اجازت کے، وہ کس قدر خوفناک ہوں گے، کس قدر دہشت ناک ہوں گے؟

حَتَّىٰ إِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ فَقَالُوا الْحَقُّ ۖ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ

”حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوگی تو وہ (سفارش کرنے والوں سے) پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا جواب دیا، وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے اور وہ بزرگ و برتر ہے۔“

یہ اس دن کا منظر ہے جو نہایت ہی خوفناک ہو گا۔ لوگ قیامت کے دن کھڑے ہوں گے۔ سفارش کرنے والے اور جن کی سفارش ہو رہی ہوگی سب کے سب سے ہوئے ہوں گے۔ پہلے تو سفارش کرنے والے اجازت کے غم میں ہوں گے۔ یہ انتظار طویل ہو گا۔ لوگ توقعات میں کھڑے ہوں گے اور تھک جائیں گے۔ سب سے ہوئے ہوں گے، دل ڈرے ہوئے ہوں گے اور کان فیصلہ سنتے ہوں گے۔

جب اللہ کی بارگاہ عزت سے فیصلہ صادر ہو گا تو سفارش کرنے والے اور جن کی سفارش ہو رہی ہے اس قدر ڈرے ہوئے ہوں گے کہ وہ فیصلے کو سمجھ ہی نہ سکیں گے۔

حَتَّىٰ إِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ (۲۳:۳۴) ”حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوگی“

جب حالت خوف سے وہ نکلیں گے اور وہ اس ہیبت سے نکل آئیں جس کی وجہ سے وہ مدہوش ہو گئے تھے تو پھر کہیں گے۔

مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ (۲۳:۳۴) ”تمہارے رب نے کیا جواب دیا“۔ یعنی وہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ ان میں سے شاید بعض لوگوں نے حواس بحال رکھ کر بات کو سمجھ لیا ہو گا۔

قَالُوا الْحَقُّ (۲۳:۳۴) ”انہوں نے کہا حق کیا“۔ شاید یہ کہنے والے ملائکہ مقربین تھے جنہوں نے یہ مجمل اور جامع بات کہہ دی کیونکہ اللہ نے جو کچھ کتنا قہارہ حق ہی تھا۔ وہ حق ہے ’ازلی حق اور ابدی حق ہے۔ لہذا اس کی بات بھی حق ہے۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (۲۳:۳۴) ”اور وہ بزرگ و برتر ہے“۔ اللہ کی یہ صفت ایسے مقام پر آئی ہے جس میں اللہ کی علو شان نمایاں ہے اور اس مقام پر ہر شخص اللہ کی شان بلند کا ادراک کر سکتا ہے۔ یہ مجمل سورہ اس بات کا منظر ہے کہ فضا کے اندر گہری سنجیدگی اور خوف چھایا ہوا ہے کہ اس میں بھی مختصر بات کہی جاسکتی ہے۔ یہ سفارش کا خوفناک موقع ہے۔ اگر منظور نہ ہو تو؟ اور یہ حالت ملائکہ مقربین کی ہے۔ کیا اس خوفناک منظر کے بعد کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ شریک ہے یا کوئی عقلمند شخص یہ عقیدہ رکھ سکتا ہے؟ یہ تو حقیقی عقل و خرد کے تاروں پر پہلی ضرب اور دوسری ضرب کا تعلق ان ارضاق سے ہے جو انسان رات اور دن استعمال کرتے ہیں۔ یہ انسانی ضروریات کون فراہم کرتا ہے۔ انسانی حیات اور اس کے قائم رکھنے کے لیے خوراک ہی پر اگر غور کیا جائے تو یہ بھی اللہ وحدہ کی ذلت پر ایک سلطان اور برہان ہے۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللّٰهُ وَإِنَّا أَوْ

إِنَّا كُمْ لَعَلٰى هُدًى آوٰفٍ صٰلِحٍ مُّبِينٍ ﴿۱۲﴾

”(اے نبی!) ان سے پوچھو ”کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟“ کہو ”اللہ۔ اب لامحالہ ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہی ہدایت پر ہے یا کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔“

رزق ہر انسان کی زندگی کا واقعی اور زندہ مسدہ ہے۔ رزق نتیجہ ہے آسمانوں سے بارشوں ’سورج کی روشنی اور نور کا۔ یہ باتیں تو اس وقت قرآن کے مخاطب جانتے تھے۔ اس کے بعد رزق کے بارے میں بہت سے انکشافات ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ زمین کے رزق کیا ہیں۔ نباتات ’حیوانات ’چمٹے ’نمیں ’معدنیات اور خزانے۔ سابقہ ادوار کے لوگ بھی ان سے واقف تھے ’بعد کے لوگوں نے مزید انکشافات کیے۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللّٰهُ (۲۴:۳۴) ”کون ہے جو آسمانوں اور زمین میں سے تمہیں رزق دیتا ہے“ کہو ”اللہ“۔ اس لیے کہ وہ اس جواب میں شک نہ کر سکتے تھے اور نہ اس کے سوا کسی

اور جواب کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

کہو کہ رزق تو اللہ ہی دیتا ہے اور تمہارے امور اور ان کے امور اللہ کے سپرد ہیں۔ تم دونوں میں سے کوئی ایک خواہ مخواہ ضلالت پر ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ دونوں ہدایت پر ہوں یا دونوں ضلالت پر ہوں۔ لہذا ایک فریق ایک راستے پر ہے اور دوسرا دوسرے پر ہے۔

وَ اِنَّا اَوْ اَيَّاكُمْ لَعَلٰی هٰذٰی اَوْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۲۴: ۳۴) ”اب لامحالہ ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔“ بحث و مباحثہ میں یہ نہایت ہی معتدلانہ انداز گفتگو ہے کہ رسول اللہؐ مشرکین سے کہتے ہیں کہ ہم اور تم میں سے ایک فریق ہدایت پر ہے اور دوسرا ضلالت پر ہے۔ ہدایت یافتہ اور گمراہ فریق کا تعین نہیں کیا جاتا تا کہ سامع خود غور و فکر کے بعد متعین کرے۔ نہایت سنجیدگی کے ساتھ ’بغیر ہٹ دھرمی اور بغیر بحث و جدال اور حجت باری کے۔ کیونکہ حضور اکرمؐ تو ایک ہادی اور معلم تھے۔ آپ کا مقصد لوگوں کو راہ راست دکھانا تھا۔ ان کو لا جواب کر کے دلیل کرنا مطلوب نہ تھا۔

اس انداز گفتگو سے نہایت معاند ’حکمر سرکش اور دست درازی کرنے والے شخص کے دل پر بھی بات کا اثر ہوتا ہے اور کسی شخص کا مقام و مرتبہ راہ ہدایت لینے میں رکاوٹ نہیں۔ اور ایک بلند مقام رکھنے والا بھی سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور نہایت ہی ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہے۔ اسے اطمینان ہو جاتا ہے۔ یہ انداز گفتگو خصوصاً ان لوگوں کے گہرے غور کا مستحق ہے جو دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں۔

— ۰۰۰ —

اب عقل و خرد کے تاروں پر تیسری ضرب ’نہایت منصفانہ اور عادلانہ انداز گفتگو کے ساتھ لگائی جاتی ہے۔ ہر دل کو اس کے اعمال اور ان کے نتائج کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

قُلْ لَا تُسْأَلُونَ عَمَّا اجْرَمْنَا وَلَا نُسْأَلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۲۵﴾

”ان سے کہو جو تصور ہم نے کیا ہو اس کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔“

مشرکین رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر یہ الزام لگاتے تھے کہ یہ لوگ غلط کار ’صالی اور مجرم ہیں اور انہوں نے اپنا حقیقی دین چھوڑ دیا ہے جو ان کے آباء و اجداد کا دین تھا۔ لل باطل لل حق کو ہمیشہ گمراہ کہتے چلے آئے ہیں۔ یہ ان کی طوطا چشی اور غرور ہوتا ہے اور اس کا جواب یہی ہے۔

قُلْ لَا تُسْأَلُونَ عَمَّا اجْرَمْنَا وَلَا نُسْأَلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۲۵: ۳۴) ”کہو دو جو تصور ہم نے کیا ہو اس کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہ ہوگی۔“ ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہو گا۔ اور ہر شخص کو اپنے اعمال ہی کی جزاء ملے گی۔ لہذا یہ ہر شخص کا اپنا کام ہے کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھائے۔ فلاح کی طرف یا ہلاکت کی طرف۔

یوں قرآن ان کو جھنجھوڑتا ہے کہ وہ غور و فکر کریں۔ سچائی کی طرف چلنے کے لیے یہ پہلا مرحلہ ہے کہ انسان راہ حق پر غور کرے۔

اب چوتھی ضرب :

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۚ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴿۴۶﴾

”کہو! ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔ وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔“

پہلے سبق میں اللہ اہل حق اور اہل باطل کے درمیان مشترکہ فیصلہ دیا گیا کہ دونوں میں سے ایک ہی حق پر ہے اور ایک باطل پر ہے۔ اور حق اور باطل کا آمناسامنا ہوا تھا تاکہ اہل حق کی طرف آئیں، دائی اپنی دعوت پیش کریں اور حق و باطل باہم کشش کریں۔ دلائل کے سامنے شبہات لائے جائیں اور باطل حق کو بھاڑنے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ صورت ایک مختصر وقت کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے بعد فریقین کے درمیان فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ دو ٹوک ہے اور فیصلہ کرنے والا بہت بڑا حاکم ہے اور علیم بھی ہے۔ وہ علم اور معرفت پر فیصلہ کرتا ہے۔

اللہ کو فلاح علیم کہہ کر یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کے فیصلے پر اصرار کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ ایسا حاکم ہے جو حق و باطل کے درمیان علم کے مطابق فیصلہ کرنے والا ہے۔ وہ حق و باطل کو نکھار کر رکھ دیتا ہے اور ان کے درمیان التباس رہنے نہیں دیتا۔ حق پرستوں اور باطل پرستوں کو اکٹھا اور ملا جلا نہیں چھوڑا جاتا بشرطیکہ حق اپنی دعوت زوردار انداز سے پیش کرے، قوت اس راہ میں لگا دے۔ پورے تجربات سے کام لے اور پوری قوت لگا کر معاملے کو اللہ کے سپرد کر دے تاکہ اللہ فلاح علیم فیصلہ کرے۔

یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کس وقت کرتا ہے اس فیصلے کے لیے وقت کا تعین بھی اللہ کرتا ہے۔ نہ اس میں جلدی کا کوئی داعیہ ہے کیونکہ یہ اللہ ہی ہے جو حق و باطل کا آمناسامنا کرتا ہے، کشش کرتا ہے اور پھر فیصلہ کرتا ہے۔ وہی فلاح علیم ہے۔

--- ۰۰۰ ---

اب آخری ضرب 'یہ آخری ضرب پہلی ضرب کے مشابہ ہے۔ اس میں اللہ کے نام نہاد شرکاء کو پہنچ دیا جاتا ہے۔

قُلْ أَرُونِي الَّذِينَ أَلْحَقْتُمْ بِهِ شُرَكَاءَ كَلَّا بَلْ هُوَ اللَّهُ

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۴۷﴾

”ان سے کہو! ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی وہ کون ہستیاں ہیں جنہیں تم نے اس کے ساتھ شریک لگا رکھا ہے۔ ہرگز نہیں زبردست اور دانا تو میں وہ اللہ ہی ہے۔“

یہ نہایت ہی تمدید آمیز اور حقارت آمیز سوال ہے۔ ذرا دکھاؤ تو سہی وہ کون لوگ ہیں جن کو تم نے اللہ کے ساتھ

الوہیت میں ملحق کر دیا ہے۔ یہ لوگ کون ہیں؟ ان کی کیا حیثیت ہے۔ کس درجے کے لوگ ہیں یہ! اور پھر اس مقام کے لیے ان کا استحقاق کیا ہے؟

اس کے بعد لفظ کا۔ ان کی سرزنش کی جاتی ہے۔ کہاں سے یہ لائیں گے جبکہ اللہ کا کوئی شریک ہی نہیں ہے۔

بَلْ هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲۷:۳۴) ”زبردست اور داناتو بس اللہ ہی ہے۔“ جس ذلت کی صفات یہ ہوں اس کا کوئی شریک کیسے ہو سکتا ہے اور ضرورت بھی کیا ہے ’لہذا اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔‘
اس پر یہ سبق ختم ہوتا ہے۔ اس کے آخر میں نہایت ہی دو ٹوک اور سبق آموز تہمیدیں ہیں۔ اس عظیم کائنات کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ ایسے حالات میں جبکہ قیامت میں شفاعت کا مرحلہ ہو گا۔ حق و باطل کی کشمکش کے حوالے سے اور نفس انسانی کے اندر غور و فکر اور سوچ و بچار کے حوالے سے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۱۹ ایک نظر میں

اس سبق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اوپر نازل ہونے والی کتاب کے بارے میں منکرین کا موقف بیان کیا گیا ہے۔ یہ ہر رسول کے مقابلے میں اختیار کیا جانے والا کھاتے پیتے لوگوں کا موقف ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنے مال اور اولاد اور اپنے معاشرتی مقام کی وجہ سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر صرف اس دنیا کے مفادات ہوتے ہیں اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہ دنیا کے مفادات حاصل کرنے میں دوسروں سے آگے ہیں اس لیے یہ مختار اور افضل لوگ ہیں۔ اور یہ کہ اس دنیاوی دولت کی وجہ سے وہ دنیا و آخرت دونوں کے عذاب سے بچ جائیں گے۔ چنانچہ یہاں ان کے سامنے وہ منظر پیش کیا جاتا ہے جو آخرت میں ان کا ہو گا۔ یہ منظر ایسا ہے کہ گویا واقعہ ہو چکا ہے تاکہ وہ دیکھ لیں کہ جن چیزوں نے ان کو مغرور کر دیا ہے، وہ توقیامت میں کچھ فائدہ دینے والی نہیں ہیں۔ اس منظر میں یہ بات بھی دکھائی گئی ہے کہ دنیا میں وہ جن فرشتوں اور جنوں کی بندگی کرتے تھے وہ توقیامت کے دن ان کے لیے درہ بھر مفید نہیں ہیں۔ اس منظر کے مکالموں کے درمیان یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ کے ترازو میں کون سی چیز وزن رکھتی ہے۔ اسی طرح ان کھوٹی قدروں کی تردید خود بخود ہو جاتی ہے۔ جن کو وہ اس دنیا میں سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ ثابت یہ ہوتا ہے کہ رزق کا کشادہ ہونا یا محدود ہونا مشیت الہیہ پر موقوف ہے اور یہ اللہ کے غضب یا رضامندی کی دلیل نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کی آزمائش ہوتی ہے۔

— ۰ ۰ ۰ —

درس نمبر ۱۹ تشریح آیات

۲۸ --- تا --- ۴۲

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ

النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ ﴿۲۹﴾

قُلْ لَّكُمْ مِّيعَادُ يَوْمٍ لَا تَسْتَخِيرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ ﴿۳۰﴾

۹

”اور (اے نبیؐ) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ ”وہ (قیامت کا) وعدہ کب پورا ہو گا اگر تم سچے ہو؟“ کو تمہارے لیے ایک ایسے دن کی ميعاد مقرر ہے جس کے آنے میں نہ ایک گھڑی بھری تاخیر تم کر سکتے ہو اور نہ ایک گھڑی بھر پہلے اسے لا سکتے ہو؟“

گزشتہ سبق میں یہ بات طے کی گئی تھی کہ ہر شخص اپنے کئے کا ذمہ دار ہے اور نل حق اور نل باطل کے درمیان مکالمہ ضرور ہونا چاہئے۔ نل حق کو چاہئے کہ اپنی بات کھول کر رکھ دس نہایت حکمت کے ساتھ، پھر معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ وہاں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ نبی کا منصب و مقام اور فریضہ کیا ہے یہ لوگ منصب نبوت سے جا مل ہیں۔ آخرت کی جس جزاء و سزا کا نبی ذکر کرتے ہیں اپنی اس جہالت کی وجہ سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قیامت برپا کیوں نہیں ہو جاتی تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ قیامت کے برپا ہونے کے لیے ایک وقت مقرر ہے، اس سے وہ نہ پہلے آ سکتی ہے اور نہ بعد میں۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (۲۸:۳۴) ”اے نبیؐ ہم نے تم کو تمام

انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔“ یہ رسالت کے منصب کے عام فرائض ہیں کہ آپ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے اور تمام انسانوں کے لیے بھیجا گیا ہے۔ نبی کا فرض پورا ہو جاتا ہے جب وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لوگوں کو جنت کی خوشخبری دے دے اور دوزخ کے عذاب سے ڈر لوے۔

وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۲۸:۳۴) وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ

صدقیں (۲۹:۳۴) ”لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ وہ اربواکب آئے گا اگر تم سچے ہو۔“ ان کے اس سوال ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی رسول کے فرائض منجھی ہی سے واقف نہیں ہیں۔ آخر رسول کا یہ فرض نہیں ہوتا کہ وہ انجام برپا کر دے۔ رسول کا فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کر دے۔ رسول کی ذیوئی محدود ہوئی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں اور اپنے فرائض سے رسول اللہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے۔ اصل اختیار امت کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی بھیجے والا ہے، وہی کام کی حدود مقرر کرنے والا ہے۔ اللہ نے رسول کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ قیامت برپا کر دے یا اس کا وقت بتا دے۔ یہ رب تعالیٰ کا کام ہے۔ رسول اپنے حدود کار سے باخبر ہیں لہذا وہ اللہ سے کوئی ایسا سوال نہیں کرتے جو ان کی ذیوئی کی حدود سے باہر ہو۔ اور اس کے بارے میں کوئی ذمہ داری ان پر ڈالی نہ گئی ہو۔ حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو ایک اصولی بات بتا دی جائے۔

قُلْ لَكُمْ مِيعَادٌ يَوْمَ لَا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ (۳۴:۳۰) ”کہو تمہارے لیے ایک دن کی ميعاد مقرر ہے جس کے آنے میں نہ ایک گھڑی کی تاخیر تم کر سکتے ہو اور نہ گھڑی بھر پہلے اسے لا سکتے ہو۔“ ہر ميعاد اپنے مقررہ وقت پر آتی ہے جو اللہ نے مقرر کیا ہے اس میں تقدیم و تاخیر ممکن نہیں ہے۔ نہ کسی کی خواہش پر اللہ اس طرح کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی کام نہ مہٹ ہوتا ہے نہ اتفاقاً واقعہ ہو جاتا ہے۔ ہر واقعہ اللہ کا تخلیق کردہ اور تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر معاملے کا تعلق آخرت سے ہے۔ اللہ کی تقدیر ان واقعات کو اپنی حکمت کے مطابق رد و بدل لاتی ہے اور حکمت الہی سے انسان اسی قدر خبردار ہوتا ہے جس قدر اللہ انسان کو سمجھاتا ہے۔ ورنہ اللہ کی حکمت کا بیشتر حصہ مستور ہوتا ہے۔

اللہ کے وعدے اور اللہ کی سزا کے معاملے میں جلدی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا مطالبہ کرنے والا انسان اس اصول اور حکمت ربانی کے نظام سے واقف نہیں ہے اور علم نہیں رکھتا۔ اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں اور اپنی لاعلمی کی وجہ سے جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ

”یہ کافر جتنے ہیں کہ ہم ہرگز اس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے۔“ یہ ہے وہ عناد جس میں مخالفین اسلام اول روز سے جھکاتے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہدایت کو مان کر نہ دے گے اگرچہ اس کا منبع کتب سابقہ میں ہو۔ نہ قرآن کو مانیں گے اور نہ پہلی کسی کتاب کو۔ نہ اس کو نہ سابقہ کتب کو۔ یہی فیصلہ مخالفین اسلام کا کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کفر پر اصرار کرتے ہیں۔ پختہ فیصلہ انہوں نے کر لیا ہے کہ وہ کفر پر اصرار کریں گے اور دلائل ہدایت پر غور ہی نہ کریں گے۔ جب انہوں نے یہ فیصلہ کر ہی دیا ہے تو ان کا علاج یہی ہے کہ ان کے سامنے بس مناظر قیامت میں سے ایک منظر پیش کر دیا جائے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِندَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ

إِلَىٰ بَعْضِ الْقَوْلِ ۖ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنْتُمْ
 لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ﴿۳۱﴾ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا أَنْحُنُ صَدْدُكُمْ
 عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُمْ بِبَلٍّ كُنْتُمْ فِيهِ تَاجِرِينَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ
 الَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ الْبَلِّ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَنْ نَكْفُرَ
 بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَنْدَادًا ۖ وَأَسْرُوا ۖ النَّدَامَةُ لَنَا رَأَوُا الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا
 الْأَغْلَلَ فِي آعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾

”کاش تم دیکھو ان کا حال اس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بنے والوں سے کہیں گے کہ ”اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے“۔ وہ بڑے بننے والے ان دبا ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے۔ ”کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں بلکہ تم خود ہی مجرم تھے“۔ وہ دبا ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے ”نہیں بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسرہ ٹھہرائیں“۔ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ یہ لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جاسکتا ہے کہ جیسے اعمال ان کے تھے ویسے ہی جزا وہ پائیں؟“

یہ تو قحی ان کی دنیاوی بات ”ہم ہرگز قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے“۔ لیکن ان ظالموں کی حالت قیامت کے دن دیکھنے کے قابل ہوگی جب یہ لوگ۔۔۔۔۔ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور بطور حزم اللہ کی عدالت میں سزا کا انتظار کر رہے ہوں گے اور ان کو اس وقت یقین ہو گا کہ انہوں نے تو ہدایت کا انکار کیا تھا لہذا نتیجہ سامنے ہے۔ اب اور تو کچھ بس نہ چلے گا ایک دوسرے پر لعنت و ملامت کریں گے اور اس انجام کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالیں گے۔ یہ اس وقت کیا کہیں گے؟

يَقُولُ الَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ (۳۱: ۳۴)
 ”جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے ”اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے“۔ اس وقت وہ جس خوفناک صورت حالات سے دوچار ہیں یہ اس کی ذمہ داری اکابرین پر رکھیں گے۔ کیونکہ ان کو نظر آ رہا ہے کہ مصیبت سر پہ ہے۔ آج تو وہ ان کے منہ پر یہ حق بات کہہ رہے ہیں لیکن دنیا میں ان کو یہ حق بات کہنے کی توفیق نہ تھی۔ ان کو وقت کمزوری ’غلائی‘ حق بات کہنے نہ دیتی تھی۔ انہوں نے اللہ کی بخشی ہوئی آزادی کو فروخت کر دیا تھا۔ وہ

عزت جو اللہ نے ہر انسان کو دی تھی اس سے وہ دستبردار ہو گئے تھے۔ وہ قوت بدر کہ جو ہر انسان کو دی گئی، انہوں نے معطل کر دی تھی۔ آج تو سب جھوٹی اور کھوٹی قدریں ختم ہیں۔ ساجے دردناک عذاب ہے۔ اب وہ یہ حق بات کہتے ہیں جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

لَوْلَا اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ (۳۴: ۳۱) ”اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔“

اور یہ اکابرین بھی نہایت ہی جھٹی اور ترشی سے جواب دیتے ہیں۔ خطرہ تو اب دونوں کے لیے برابر ہے۔ یہ اپنی ذمہ داری خواہ مخواہ ان پر ڈالتے ہیں۔ وہ بھی خوب جواب دیتے ہیں۔

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا اَنَحْنُ صَدَدْنَكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ

اِذْ جَاءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُجْرِمِينَ (۳۴: ۳۲) ”اور ان بڑے بٹے والوں نے جواب دیا، کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں بلکہ تم خود مجرم تھے۔“ یوں وہ کسی ذمہ داری کے قبول کرنے کا صاف انکار کر دیتے ہیں۔ اور یہ اقرار کر لیتے ہیں کہ ہدایت آئی تھی۔ یہ مسکبرین دنیا میں تو ضغفاء کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ نہ ان سے رائے طلب کرتے تھے، بلکہ ان کا وجود ہی تسلیم نہ کرتے تھے اور یہ بات برداشت ہی نہ کرتے تھے کہ یہ ضغفاء ان کی مخالفت کریں یا مباحثہ کریں لیکن آج جبکہ عذاب کا سامنا ہے تو وہ صاف صاف انکار کرتے ہیں کہ۔

اَنَحْنُ صَدَدْنَكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَاءَكُمْ (۳۴: ۳۲) ”کیا ہم نے تمہیں روکا تھا، جب تمہارے پاس ہدایت آئی تھی۔“ بلکہ تم خود ہی مجرم تھے۔ تم نے مجرمانہ انداز اختیار کر لیا تھا۔

اگر دنیا ہوتی تو ان کمزور لوگوں کے ہونٹ ملے ہوئے ہوتے لیکن آخرت میں دنیا کے تمام جھوٹے پردے اٹھ جائیں گے۔ جھوٹی قدریں مٹ جائیں گی۔ آنکھیں کھل جائیں گی اور چھپے حقائق پردے سے باہر آ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں یہ کمزور لوگ بھی کھل کر بات کریں گے۔ بلکہ اب وہاں مسکبرین کے منہ میں منہ ڈال کر بات کریں گے اور کہیں گے کہ تم ہی اس سب صورت حالات کے ذمہ دار ہو۔ تم رات اور دن مکاری کرتے تھے اور ہمیں ہدایت سے روکتے تھے۔ تم نے باطل کو قیام رکھا تھا، ہم پر مسلط کر دیا تھا اور دعوتِ اسماء کو ہم پر مشتبہ بنا دیا تھا۔ تم اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے ہمیں گمراہ کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِينَ اسْتَضَعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا اَبَلْ مَكَرُ الْيَلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَأْمُرُوْنَنَا اَنْ

نُكْفِرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهُ اَنْدَادًا (۳۴: ۳۳) وہ بے ہوئے لوگ ان بڑے بٹے والوں سے کہیں گے، ”نہیں، بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمر ٹھہرائیں۔“

اب ان کو معصوم ہو جاتا ہے کہ یہ مکالمہ اور مجادلہ نہ ان کے لیے مفید ہے اور ان کے لیے۔ نہ بڑوں کی نجات ممکن ہے اور نہ چھوٹوں کی۔ ہر گروہ مجرم ہے، البتہ بڑوں پر اپنی گواہی کی بھی ذمہ داری ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی بھی ذمہ داری ہے۔ چھوٹوں پر یہ ذمہ داری ہے کہ انہوں نے کیوں ان بڑے لوگوں کی اطاعت کی۔ یہ بات وہاں معافی کی وجہ نہیں بن سکتی کہ یہ ضعیف تھے۔ اللہ نے ان کو عقل اور آزادی دی تھی۔ انہوں نے عقل سے کام نہ لیا اور اپنی آزادی رائے کو فروخت کر دیا۔ وہ طفیلی بن رہے پر راضی ہوئے اور ذلت کی زندگی قبول کی۔ اس لیے وہ عذاب کے مستحق بن گئے۔ اس گفتگو کے دوران ہی ان پر سخت ندامت طاری ہو گئی اور یہ اسے چھپانے لگے۔ جب انہوں نے عذاب دیکھ لیا۔

وَ اَسْرِتُمْ اَ النَّدَامَةَ لَمَّا رَاُوا الْعَذَابَ (۳۴: ۳۳) ”جب یہ عذاب دیکھیں گے تو پچھتائیں گے۔“ اور اپنی ندامت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ یہ ایسی حالت ہوتی ہے کہ دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ زبانیں بند ہو جاتی ہیں، ہونٹ سل جاتے ہیں اور سخت عذاب انہیں آ لیتا ہے۔

وَ جَعَلْنَا اَنَّا غُلْلًا فِيْ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳۴: ۳۳) ”ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔“ اب یہ لوگ طوقوں میں بندھے ہوئے ہیں لیکن بات کا رخ ان سے پھر جاتا ہے اور عام بدکاروں سے کہا جاتا ہے کہ جیسا کرد گے ویسا بھرو گے۔

هَلْ يُجْزَوْنَ اَلْاَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۳۴: ۳۳) ”کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال ان کے تھے ویسی ہی جزا وہ پائیں۔“

اب بڑے بننے والے اور چھوٹے بننے والے دونوں قسم کے ظالموں کے اس منظر پر پردہ گرتا ہے۔ دونوں ظالم ہیں۔ یہ اس لیے ظالم ہیں کہ سرکش تھے اور باغی تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے۔ وہ اس لیے ظالم تھے کہ انہوں نے انسانی شرافت اور آزادی کے مقام کو ترک کر دیا اور اپنے جیسے انسانوں کے ظلام بن گئے۔ ان کے سامنے ذلت اختیار کی۔ اب دونوں کے لیے دائمی عذاب ہے۔

پردہ گرتا ہے اور ظالم اپنا منظر اچھی طرح دیکھ چکے، زندہ شکل میں۔ انہوں نے اپنی ہر حالت دیکھ لی اور وہ اس زمین پر زندہ ہیں۔ دوسروں نے بھی اس منظر کو دیکھ لیا۔ سب کے سامنے ابھی سملت کی گھڑیاں ہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

کبراء قریش جو باتیں کرتے ہیں ایسی ہی باتیں اقوام رفتہ کے مسکبرین بھی کرتے چلے آئے ہیں۔

وَمَا اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتَرَفُّوْهُمَّا لَا

اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهِ كٰفِرُوْنَ ﴿۵﴾

”بھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بہتی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بہتی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ

کہا ہو کہ ”جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے۔“

یہ ایک عام رویہ ہے ’بار بار دہرایا جاتا ہے اس دنیا میں۔ زمانوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ خوشحالی دلوں کو سخت کر دیتی ہے۔ دلوں سے احساس ختم ہو جاتا ہے۔ فطرت بگڑ جاتی ہے۔ اور باطل کے نیچے دب جاتی ہے۔ اسے دلائل ہدایت نظر ہی نہیں آتے۔ اس لیے ہدایت کے مقابلے میں مسدین اپنے آپ کو اونچا سمجھتے ہیں اور ان کے سینے روشنی کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔

بیشہ یوں ہوتا ہے کہ لالہ ثروت اور کھاتے پیتے لوگوں کی جھوٹی تدبیریں ان کو دھوکہ دیتی ہیں۔ ان کے پاس جو دولت اور قوت ہوتی ہے وہ ان کو دھوکے میں ڈالتی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ اثر ان کو عذاب الہی سے بھی بچالے گا۔ اللہ نے جو ان کو دولت دی ہے یہی تو اللہ کی رضا کی علامت ہے اور یہ کہ وہ حساب و کتاب اور جواب دہی کے مقام سے بلند ہیں۔

وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَ أَكْثَرُ دَلَالًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ ۝۵

”انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ”ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔“

لیکن قرآن کریم جواب دہی کے لیے وہ معیار اور وہ تدبیر وضع کرتا ہے جو اللہ کے ہاں معمول بہا ہیں۔ اللہ کے ہاں رائج ہیں۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ رزق کی کشادگی اور تنگی پر مدد فیصلہ نہیں ہے۔ فیصلہ اللہ کی رضا و غضب پر ہو گا۔ رزق نہ کسی کو سزا دیتا ہے اور نہ بچاتا ہے۔ حساب و کتاب اور جزاء و سزا کا معاملہ دولت مندی اور تنگدستی سے جدا ہے۔ اللہ کی رضامندی اور ناراضگی کا تعلق رزق سے نہیں ہے اس کے لیے دو سرا معیار ہے۔

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ

النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝۶

”اے نبی ان سے کہو“ ”میرا رب جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگ دلا عطا کرتا ہے مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے۔“

یہ مسئلہ یعنی رزق کی فراوانی اور تنگی کا مسئلہ ہمیشہ و عشرت کے وسائل کی ملکیت اور ذمہ و ذمہت کے ذرائع اور ان سے محرومی کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے کئی لوگوں کے دلوں میں بے حد غلبان پیدا ہوتا ہے۔ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ لالہ شر لالہ فساد اور باطل پرستوں پر دنیا کے مال و دولت کے دروازے کھلے ہیں۔ لالہ حق لالہ خیر اور نیک لوگ ان سے محروم ہیں اس لیے بعض لوگ یوں سوچتے ہیں کہ اگر اللہ ان لوگوں سے ناراض ہوتا تو ان پر وسائل کی یوں بارش کیوں کرتا۔ بعض لوگ ان لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تنگی سچائی اور پاکبازی ہمیشہ محروم رہتی ہے۔

یہاں قرآن مجید دنیا کے مال و متاع اور ساز و سامان اور ان قدروں کے درمیان جدائی کر دیتا ہے جو اللہ کی نظروں میں بلند ہیں۔ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ رزق کی تنگی اور فراوانی اللہ کی مشیت کے تحت ہے۔ اس کا اللہ کی رضامندی اور

ناراضگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض اوقات اللہ ایک ایسے شخص کو بھی رزق فراوان دے دیتا ہے جس سے وہ ناراض ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کو بھی دیتا ہے جس سے راضی ہوتا ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ اہل شر اور اہل خیر دونوں غریب اور نادار ہوتے ہیں لیکن تمام حالات میں علل و اسباب ایک نہیں ہوتے۔

بعض اوقات اللہ اہل شر کو زیادہ نوازتا ہے تاکہ وہ سرکشی، فساد اور نافرمانی میں آگے بڑھ جائیں۔ یوں ان کو پکڑنا مقصود ہوتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ جرائم کا ارتکاب کر لیں تاکہ ان کو زیادہ سزائے۔ پھر اللہ ان کو دنیا میں بھی سزا دیتا ہے اور آخرت میں بھی دے گا۔ اپنی حکمت اور تدبیر کے مطابق بھی بعض اوقات اللہ اہل شر کا رزق تنگ کرتا ہے تو وہ مزید جرائم کرتے ہیں۔ اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں اور اپنی ناداری کی وجہ سے شر و فساد اور ظلم و مظلالت کی حدوں کو پار کر جاتے ہیں۔

بعض اوقات اللہ اہل خیر پر بارش کر دیتا ہے تاکہ وہ مزید نیکی کے کام کریں۔ اگر ان کے پاس دولت نہ ہوتی تو وہ یہ کام نہ کر سکتے اور اس لیے بھی کہ وہ اللہ کا شکر ادا کریں۔ دل کے ساتھ، زبان کے ساتھ اور عمل کے ساتھ۔ وہ اپنے مال کے ذریعے ایسی نیکیاں کمائیں جو اللہ کے ہاں ان کے لیے ذخیرہ ہوں اور کبھی اہل خیر محروم کیے جاتے ہیں تاکہ محرومیت پر ان کے صبر اور شکر کو آزمایا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ وہ اللہ پر کس قدر بھروسہ کرتے ہیں۔ کس قدر رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں اور اللہ کی تقدیر پر ان کو کس قدر یقین ہوتا ہے۔ کس قدر راضی برضا ہوتے ہیں اور رب تعالیٰ اچھا اور باقی رہنے والا ہے۔ اس طرح ان کا ذخیرہ آخرت بڑھ جاتا ہے اور اللہ ان سے بہت راضی ہوتا ہے۔

بہر حال رزق کی فراوانی اور تنگی کے جو اسباب بھی ہوں، اور لوگوں کے اعمال اور حکمت الہیہ کے حوالے سے جو بھی سبب ہو، حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ اللہ کے ہاں مقبولیت سے بالکل علیحدہ مسئلہ ہے۔ اس کی بنا پر اللہ کے ہاں کوئی مقدم و موخر نہیں ہوتا۔ اللہ کے ہاں مقدم اور موخر ہونے کا دار و مدار اس پر ہے کہ جس شخص کے مال اور اولاد میں فراوانی دی گئی ہے وہ اپنے مال اور اولاد میں تصرف کیسے کرتا ہے۔ اسی طرح جسے رزق کی تنگی دی گئی ہے وہ کس قدر صبر و شکر کرتا ہے۔ لہذا مال و اولاد وال شخص اگر اپنے مال اور اولاد میں اچھا تصرف کرتا ہے تو اللہ اس کے اجر میں اضافہ کرے گا۔

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفَىٰ
إِلَّا مَنِ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جِزَاءٌ الْوَسْطَىٰ بِمَا عَمِلُوا وَ
هُوَ فِي الْغُرُفِ الْأَمْنِ ۝ وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُعْجِزِينَ أُولَٰئِكَ فِي
الْعَذَابِ مُخَصَّرُونَ ۝

”یہ تمہاری دوست اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے عمل کی دہری جزا ہے۔ اور وہ بلند ہلالا شمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے۔“

نمایت صراحت کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ رزق کی فرلوانی کے ذریعہ کوئی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہو جاتا۔ ہاں اگر کوئی اپنی دولت میں سے فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے تو وہ اللہ کے ہاں مفید ہے۔

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ
وَمَا تَفْقَهُوا مِن شَيْءٍ فَهُوَ يَخْلُقُهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿۲۹﴾

”اے نبی! ان سے کہو ”میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، کھارزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے، نپاٹتا ہے۔ جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو اس کی جگہ وہی تم کو اور دیتا ہے، وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے۔“
یہ سبق اب ایک ایسے منظر پر ختم ہوتا ہے جس میں وہ تمام لوگ فرشتوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں جو فرشتوں کی بندگی کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا تھا کہ قیامت کے عذاب سے ڈرو تو وہ کہتے تھے کہاں ہے قیامت؟ لاؤ۔ ان سے کہا جائے گا اب چکھو اس عذاب کو جس کے متعلق تمہیں جلدی تھی۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَكَةِ آمُورًا
إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿۳۰﴾ قَالُوا سُبْحَنَكَ أَنْتَ وَلَيْسَ مِنَّا مِنْ دُونِهِمْ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ
الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ ﴿۳۱﴾ فَالْيَوْمَ لَا يَتْلِكَ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَفَعًا وَلَا ضَرًّا
وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ﴿۳۲﴾

”اور جس دن وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا ”کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟“ تو وہ جواب دیں گے کہ ”پاک ہے آپ کی ذات، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ ان لوگوں سے۔ دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے، ان میں سے اکثر انہی پر ایمان لائے تھے۔ (اس وقت ہم کہیں گے کہ) آج تم میں سے کوئی نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، اور ظالموں سے ہم کہہ دیں گے کہ اب چکھو اس عذاب جہنم کا مزہ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔“

ان فرشتوں کی وہ اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے یا ان کو وہ اللہ کے ہاں سفارشی بناتے تھے۔ اب ان کو ان کے سامنی پیش کیا جاتا ہے۔ فرشتے اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ یہ لوگ ان کی عبادت کرتے تھے۔ گویا یہ بندگی اور عبادت ان کی جانب سے لغو اور کالعدم حرکت تھی۔ گویا یہ ہوئی ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بندگی دراصل شیطان کی بندگی ہے۔ یا تو یہ لوگ شیطان کی پوجا کرتے تھے یا شیطان کا حکم سن کر اس کی اطاعت کرتے تھے۔ جب وہ فرشتوں کی بندگی کرتے تھے تو گویا شیطان کی بندگی کرتے تھے۔ جنوں کی بندگی تو عربوں میں، ہمارے ہاں تھا۔ بعض لوگ ایسے تھے جو جنوں کی بندگی بھی کرتے تھے اور ان سے استعانت بھی کرتے تھے۔

بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ (۴۱: ۳۴) ”در اصل یہ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے اور ان میں سے اکثر انہی پر ایمان لائے تھے۔“

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ سلیمان علیہ السلام کا ان مسائل کے ساتھ تعلق ہے۔ یہ قرآن کریم کا خاص انداز ہے کہ قصص سورہ کے موضوع سے مربوط ہوتے ہیں۔

یہ منظر اسکرین پر چل رہا تھا کہ اچانک کلام کا اسلوب بدل جاتا ہے اور براہ راست خطاب شروع ہو جاتا ہے اور یہ شرمسار کنندہ باتیں ان سے کہی جاتی ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُم لِبَعْضٍ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا (۴۲: ۳۴) ”آج تم میں سے کوئی نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔“ نہ فرشتے کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ نہ یہ کفار ایک دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ وہ آگ جس کی ظالم حکمذیب کرتے تھے اور جس کے بارے میں وہ مطالبہ کرتے تھے کہ لاؤ وہ آگ، اسے اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے۔

وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ (۴۲: ۳۴) ”اور ظالموں سے ہم کہہ دیں گے کہ اب چکھو اس عذاب جنم کا مزہ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔“
یہاں یہ سبق ختم ہو جاتا ہے جس کا مرکزی مضمون حساب و کتاب، سزا و جزاء اور قیام قیامت ہے، جس طرح دوسرے اسباق کا بھی یہی مضمون رہا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۱۹۸ ایک نظر میں

اس سورہ کے اس آخری سبق کا آغاز مشرکین اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کے بارے میں ان کے اقوال سے ہوتا ہے۔ ان کو یہ بات یاد دلائی جاتی ہے کہ ان جیسے لوگوں کا انہم کیا ہوا کرتا ہے۔ انسانی تاریخ کی ایسی اقوام کی داستانوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو ان سے زیادہ قوی، زیادہ علم والی اور زیادہ مالدار تھیں، جن کو اس دنیا ہی میں پکڑ لیا گیا۔

اس کے بعد عقل و خرد کے تاروں پر مسلسل شدید ترین ضربات لگائی جاتی ہیں۔ پہلی ضرب میں ان کو یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ ذرا تخیل میں 'تمام رکاوٹوں اور پردوں کو ہٹا کر جو انہیں صحیح فکر و نظر سے روکتے ہیں اللہ کے بارے میں سوچیں۔ دوسری ضرب میں 'ان کو اس حقیقت پر غور کرنے کے لیے دعوت دی گئی ہے کہ وہ دیکھیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو مسلسل جو دعوت دے رہے ہیں اس دعوت میں ان کا کوئی مفاد بھی نہیں ہے اور آپ ان سے اجر بھی طلب نہیں کرتے تو آخر یہ لوگ حضورؐ کی دعوت میں شک کیوں کرتے ہیں اور منہ کیوں موڑتے ہیں۔ اس کے بعد قل قل سے یہ ضربات مسلسل لگائی جاتی ہیں اور یہ اس قدر زور دلا رہی ہیں کہ اگر کسی دہلیز میں ذرہ برابر بھی شعور ہو تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اور یہ سبق قیامت کے ایک نہایت ہی متحرک منظر پر ختم ہوتا ہے جو نہایت ہی متحرک ہے اور سابقہ ضربات کے ساتھ مناسب بھی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۱۹۸ تشریح آیات

۴۳ --- تا --- ۵۴

وَإِذَا تَنَادَىٰ عَلَيْهِمُ الْيَتِيمَانِ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَنْ
يُصَدِّكُمَا عَنْمَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ قَالُوا مَا هَذَا إِلَّا إِنْكَ مَفْتَرٍ وَقَالَ
الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۴۳﴾ وَمَا اتَّيْنَهُمُ
مِّنْ كِتَابٍ يَتَدْرُسُونَهَا وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ مُّبِينًا ﴿۴۴﴾ وَكَذَّبَ الَّذِينَ
مِن قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِثْرًا مَّا اتَّيْنَهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿۴۵﴾

۵
ع
۱۱

”ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان
معبودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔“ اور کہتے ہیں کہ ”یہ (قرآن) محض
ایک جھوٹ ہے گھڑا ہوا۔“ ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ ”یہ تو صریح جادو ہے۔“ حالانکہ
نہ ہم نے ان لوگوں کو پسے کوئی کتاب دی تھی کہ یہ اسے پڑھتے ہوں اور نہ تم سے پہلے ان کی طرف کوئی متنبہ کرنے والا
بھیجا تھا۔ ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں۔ جو کچھ ہم نے انہیں دیا تھا اس کے عشر مشیر کو بھی یہ نہیں پہنچے
ہیں۔ مگر جب انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔“

ان لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت واضح سچائی پیش فرماتے تھے لیکن وہ اس کا مقابلہ ماضی کے
افسانوں سے کرتے تھے۔ یہ چند پارینہ رسم رواج تھے اور لوہام و خرافات تھے جو انہوں نے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔
ان کے اندر کوئی جاسیت اور ریبہ بھی نہ تھا۔ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ قرآن مجید سیدھی سادی سچائی پیش کر رہا ہے
اور قرآن کی تعلیمات ایک مکمل اور مربوط نظام زندگی ہیں اور معقول اور دل کو لگتی ہیں تو انہوں نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ
ان کے آباؤ اجداد سے منقول خرافات، غیر معقول رسم و رواج اس معقول نظام زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے
انہوں نے یہ اعلان کیا کہ یہ نئی تعلیم ان کے تمام سرمایہ رسوم کے لیے خطرہ ہے۔

مَا هَذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَنْ يَصُدِّكُمَا عَنْمَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ (۴۳: ۴۴) ”کہ یہ

فخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان معبودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ لیکن صرف یہ الزام لگا دینا تو کافی نہ تھا کیونکہ صرف یہ بات کہ آباء و اجداد کے معبودوں سے روکتا ہے سب لوگوں کے لیے مسلم نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک دوسرا الزام بھی لگایا کہ جو تعلیمات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔

وَقَالُوا مَا هَذَا إِلَّا أَفْكَ مُفْتَرًى (۴۳:۳۴) ”اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو محض ایک جھوٹ گھڑا ہوا ہے۔“ افک کے معنی جھوٹ اور افتراء کے ہیں۔ لیکن مفتزی کا لفظ بطور تاکید مزید لائے ہیں تاکہ ابتداء ہی سے قرآن کی قدر و قیمت میں کمی نہ ہو کیونکہ جب قرآن کریم کے حقیقی مصدر ہی کو مشکوک بنا دیا گیا تو اس کی قدر و قیمت ظاہر ہے کہ کم ہو جاتی ہے۔

اور مزید یہ الزام۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (۴۳:۳۴) ”ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو صریح جادو ہے۔“ اور یہ الزام انہوں نے اس لیے لگایا کہ قرآن ایک نہایت موثر کلام تھا۔ جو اس کو سنتا اس کی دینی دنیا میں بھونچال آ جاتا۔ اس لیے صرف یہ بات بھی کافی نہ تھی کہ یہ جھوٹ اور گھڑا ہوا ہے۔ اس لیے اس کے اثر کی تاویں یہ کی کہ یہ کھاجادو ہے۔

یہ مسلسل الزامات تھے۔ ایک کے بعد دوسرا الزام اور یہ الزامات بھی وہ اللہ کے قرآن پر لگا رہے تھے تاکہ لوگوں کے دلوں پر اس کا اثر نہ ہو لیکن یہ لوگ جو الزام لگاتے تھے ان میں سے کسی پر خود ان کے ساتھ کوئی ثبوت نہ تھا۔ یہ سب جھوٹے الزامات تھے اور عوام الناس کو گمراہ کرنے کے لیے تھے۔ جو لوگ یہ الزامات لگاتے تھے وہ کبراء اور سردار تھے۔ یہ کبراء اور سردار خود پوری طرح یقین رکھتے تھے کہ قرآن کریم خدا کی بھی کتاب ہے۔ یہ کتاب انسانی طاقت سے باہر ہے۔ بڑے سے بڑے حکمیں بھی اس قسم کا کلام لانے سے عاجز آ گئے تھے۔ ہم نے ظلال القرآن میں ایسے لوگوں کی کئی روایات دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں ان کی اصل رائے کیا تھی۔ اور یہ روایات بھی ہم نے بتائیں کہ وہ قرآن کریم کے بارے میں اور اس کے خلاف کیا کیا اندیشہ کرتے تھے۔

قرآن کریم نے ان کی اس کمزوری کو کھول دیا۔ اور یہ کہا کہ یہ عرب تو امی تھے یہ لال کتاب نہ تھے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کی تعلیمات کے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات کر سکیں۔ یہ لوگ وحی کے بارے میں بھی نہ جانتے تھے۔ اس لیے یہ لوگ وحی کے بارے میں بھی کوئی ماہر لوگ نہ تھے۔ نیز ان کے پاس حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی رسول بھی نہیں آیا تھا کہ یہ اس بارے میں کوئی ماہر رائے دے سکیں۔ لہذا وہ رسول اللہ قرآن اور وحی کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ ایسی باتیں ہیں جس موضوع پر ان کو کوئی علم نہیں۔

وَمَا آتَيْنَهُمْ مِنْ كُتُبٍ يُدْرِسُونَهَا وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَذِيرٍ (۴۴:۳۴) ”حالانکہ ہم نے ان لوگوں کو پہلے کوئی کتاب نہ بھیجی تھی کہ یہ اسے پڑھتے ہوں اور نہ تم سے پہلے ان کی طرف کوئی متنبہ

کرنے والا بھیجا تھا۔ ان کے دلوں کو احساس دلایا جاتا ہے کہ ذرا ان سے پہلے کے ان لوگوں کے انجام پر غور کرو جنہوں نے تکذیب کی۔ تم لوگ ان لوگوں کے مقابلے میں بہت کم قوت والے ہو۔ وہ علم والے تھے، مال والے تھے، قوت والے تھے اور ترقی یافتہ تھے لیکن جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو ان کو عذاب الہی نے گھیر لیا اور وہ بہت ہی سخت پکڑ میں آ گئے۔

وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَّغُوا مِيعَاتِمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي فَكَيْفَ

كَانَ نَكِيرٍ (۴۵:۳۴) ”ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھلا چکے ہیں جو کچھ ہم نے انہیں دیا تھا اس کا عشر عشر بھی ان کے پاس نہیں ہے مگر جب انہوں نے میرے رسولوں کو بھٹایا تو دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔“ لہذا ان کی یہ سزا نہایت ہی بجاہ کن تھی۔ ان منکرین میں سے بعض لوگ ایسے تھے جن کے بارے میں قریش جانتے بھی تھے لہذا ان کو یہ یاد دہانی کافی تھی۔ لیکن یہاں طنز یہ انداز میں سوال کیا گیا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرٍ (۴۵:۳۴) ”میری سزا کیسی تھی۔“ چونکہ مخاطبین کو معلوم تھا کہ یہ سزا کیسی تھی اس لیے یہ سوالیہ انداز نہایت موثر ہے۔

— ۰۰۰ —

اب لوگوں کو نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ یہ دعوت دی جاتی ہے کہ سچائی کے ساتھ تم حق کو تلاش کرو اور سچائی کے بارے میں جو جھوٹا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کرو اور جو دعوت تمہارے سامنے پیش کی جا رہی ہے اس کے بارے میں خارجی موثرات سے آزاد ہو کر سوچو اور اس کی قدر و قیمت معلوم کرو۔

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مَنِئِي وَفِرَادَى
ثُمَّ تَتَفَكَّرُونَ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ
عَذَابٍ شَدِيدٍ

”اے نبیؐ ان سے کہو کہ ”میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو، تمہارے صاحب میں آخر کون سی بات ہے جو جنون کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے۔“

یعنی اللہ کے معاملے میں غور کرو، اور یہ غور اپنی ذاتی خواہشات کو ایک طرف رکھ کر دو۔ اپنی مصالحتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے غور کرو۔ دنیا کے حالات اور میلانات سے ہٹ کر کرو، اور ان دوسو سو اور ظلمات سے ہٹ کر گرد جو دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، یہ سب چیزیں انسان کو اللہ سے دور کرتی ہیں، غرض تمہاری سوسائٹی اور تمہارے معاشرے کے

اندراخ تصورات سے ہٹ کر تم اللہ کے معاملے پر غور کرو۔

یعنی دعوت اسلامی کے مضمون کو سادہ انداز میں لو اپنے رائج تصورات کے حوالے سے نہ لو۔ نہ خالص منطقی اور فلسفیانہ انداز میں لو جس میں لغائی توہمت ہوتی ہے لیکن سیدھی سادہ حقیقت کو جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی۔
ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ منطقیانہ سوچ کے بجائے فطرت کی سنجیدہ سوچ کا راستہ اختیار کرو۔ جس میں شور و شغب کم ہوتا ہے اور غلط بحث نہیں ہوتا نہ سوچ میں ٹیڑھ ہوتی ہے اور نہ فکر میں گدلاپن ہوتا ہے بلکہ صاف و شفاف سوچ ہوتی ہے۔

لیکن فطری انداز میں تلاش حقیقت بھی دراصل حقیقت کی تلاش ہی ہوتی ہے۔ جبکہ یہ سوچنے کا سیدھا سادہ طریقہ ہوتا ہے۔ جس پر معاشرے کے رائج افکار اثر انداز نہیں ہوتے نہ معاشرے کے اندر رائج غلط رسم و رواج اثر ڈالتے ہیں صرف خدا کا خوف اور اللہ کی نگرانی ہی بڑی موثر ہوتی ہے۔

اس سوچ کا راستہ صرف ایک ہی ہے خدا کا راستہ خدا کے سامنے جھکنے کا راستہ خدا کی رضا کا راستہ۔ اور بے لوث راستہ جس میں کوئی ذاتی خواہش، کوئی مصلحت، کوئی مفاد موثر نہ ہو، خالص انداز میں فطری سوچ جس پر کوئی خارجی عوامل اثر انداز نہ ہوں۔ یہی صرف اللہ کے لیے سوچ۔

أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مِثْلَ خِزْفٍ (۴۶:۳۴) ”خدا کے لیے تم اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ۔“ دو دو اس طرح کہ دعوت اسلامی کے مسئلے پر ایک دوسرے کے ساتھ مذاکرہ کرو، یعنی محدود تعداد میں شور و شغب سے علیحدہ ہو کر مذاکرہ کرو، عوام الناس کی بھیڑ سے الگ ہو کر۔ حالات اور عوام سے متاثر ہوئے بغیر کیونکہ عوام الناس وقتی حالات سے متاثر ہوتے جاتے ہیں اور اکیلے غور کرو، جو غور و فکر کا سب سے موثر طریقہ ہے۔

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جَنَّةٍ (۴۶:۳۴) ”سوچو کہ تمہارے صاحب میں آخر کون سی بات ہے جو جنوں کی ہو۔“ آپ کے سامنے تو وہ عقل سمجھ پر اور نہایت ہی دانائی کی بات کرتا ہے۔ اور آخر وہ کون سی بات لہی کرتا ہے جس سے معلوم ہو کہ اس کی عقل میں فرق ہے۔ وہ تو نہایت ہی مضبوط قوی اور واضح بات کرتا ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ (۴۶:۳۴) ”وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے۔“ شدید ترین عذاب کے واقع ہونے کا امکان انسان کو غور و فکر پر آمادہ کرتا ہے اور ڈرانے والے نے متنبہ بھی کر دیا تاکہ جو بچنا چاہتا ہے بچ جائے۔ مگر ایک شخص چلاتا ہے کہ آگ لگ گئی ہے بھاگو۔ اگر کوئی نہیں بھاگتا تو اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتا ہے جبکہ آواز دینے والا ہے بھی سچا شخص اور نہایت ہی بہترین کردار کا مالک ہے۔

امام احمد نے ابونعیم شریعت عبد اللہ ابن بریدہ سے اس نے اپنے باپ سے کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ہم پر نکلے تو تین بار آواز دی لوگو تمہیں معلوم ہے کہ میری اور تمہاری مثال کیا ہے؟ لوگوں نے کہا اللہ اور رسول اللہ خوب جانتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ”میری اور آپ لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک قوم کو کسی دشمن کے حملے کا خطرہ ہو۔ انہوں نے ایک آدمی بھیجا کہ وہ حالات معلوم کر کے بتائے۔ یہ شخص دیکھ رہا تھا کہ دشمن آگیا۔ وہ چلانے لگا اور استہزاء کرتا کہ لوگوں کو اس

کی آواز پہنچنے سے پہلے ہی اسے دشمن پکڑ نہ لے۔ تو اس نے دور ہی سے کپڑا ہلایا 'لوگو' دشمن آگیا' دشمن آگیا' لوگو تم پر حملہ ہو گیا۔ اور ایک دوسری روایت میں حضورؐ سے مروی ہے کہ میں اور قیامت ایک ہی ساتھ بھیجے گئے ہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ قیامت مجھ سے بھی پسے آجائے۔

حیثو تھیں پہلی ضرب 'اب دوسری ضرب طالعہ ہو۔

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنَّ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ
وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

”ان سے کہو“ اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تم ہی کو مبارک رہے۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔“

پہلے تو آپ نے ان کو دعوت دی کہ تم لوگ اکیلے یا دو دو مل کر تحریک اسلامی پر غور کرو کہ تمہارے ساتھی کی دعوت میں آخر جنوں کی کیا بات ہے۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ حضور اکرمؐ لوگوں کے ڈرنے میں اس قدر گمن ہیں اور لوگوں کو شدید عذاب سے ڈرا رہے ہیں۔ آخر اس میں ان کا مفاد کیا ہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں۔ حضورؐ کو کیا فائدہ ہے۔ اس حقیقت کی طرف ان لوگوں کی سوچ اور قوت استدلال کو نہایت ہی موثر انداز میں متوجہ کیا جاتا ہے۔

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (۴۷:۳۴) ”کہو“ میں اگر تم سے کوئی اجر مانگتا ہوں تو وہ تم ہی سے ہے۔ یہ اجر تمہیں ہی مبارک ہو۔ یہ نہایت ہی طرہ انداز ہے اور اس میں ان کے لیے سرزنش بھی ہے۔

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ (۴۷:۳۴) ”میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔“ اسی نے مجھے اس کام پر لگایا ہے۔ وہی معاوضہ دے گا۔ میں اسی سے امید رکھتا ہوں اور جو شخص اللہ کے عطیہ کا امیدوار ہو اس کے نزدیک پھر لل دنیا کا ہر عطیہ حقیر اور بے قیمت ہو جاتا ہے۔ اس کے بارے میں ایسا شخص سوچتا ہی نہیں ہے۔

وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۴۷:۳۴) ”وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔“ وہ جانتا ہے دیکھتا ہے اور اس سے کوئی چیز خفیہ نہیں ہوتی۔ وہ میرے اوپر گواہ ہے۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں جو کچھ کہتا ہوں اور جو کچھ کرتا ہوں۔ اب تیرا معرب :

قُلْ إِنْ رَبِّي يَقْذِرُ بِالْحَقِّ عَلامُ الْغُيُوبِ

”ان سے کہو“ میرا رب (مجھ پر) حق کا القا کرتا ہے اور وہ تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔“

یعنی میں جو چیز لے کر آیا ہوں وہ حق ہے۔ یہ وہ مضبوط حق ہے جسے اللہ قوت سے پھینکتا ہے۔ اس سچائی کے مقابلے میں کون کھڑا ہو سکتا ہے جسے اللہ زور دار انداز سے نازل کر رہا ہو۔ یہ ایک نہایت ہی مجسم اور مصور انداز تعبیر ہے۔ گویا

حق کے گولے برس رہے ہیں، بمباری ہو رہی ہے اور کسی کو ہمت نہیں ہے کہ اس کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ اللہ سچائی کے گولے پھینک رہا ہے جو علم الغیوب ہے۔ وہ علم سے یہ گولے پھینک رہا ہے۔ ہم کے ساتھ ان کا رخ کسی کی طرف کرتا ہے۔ اس کا نشانہ خطا میں ہوتا۔ کوئی حیر اس سے غائب نہیں ہے اور کوئی چیز اس سچائی کی زد سے بچ نہیں سکتی اس لیے کہ رکاوٹ بننے والی کوئی چیز سامنے نہیں ہے۔ اللہ کے سامنے نشانہ کھلا ہے۔

اب آخری ضرب :

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَ مَا يُبْدِيُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيدُ ۝

”کہو، حق آگیا اور اب باطل کے لیے کچھ نہیں ہو سکتا۔“ سچائی آگئی ہے، رسول آگیا، قرآن آگیا، اسلامی نظام زندگی سیدھا سیدھا آگیا۔ اعلان کر دو، اور کھلا اعلان کر دو کہ اب حق آگیا ہے۔ یہ گولہ قوت کے ساتھ پھینکا گیا ہے۔ قوت اور سر بلندی کے ساتھ آگیا ہے۔

وَ مَا يُبْدِيُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيدُ (۴۹:۳۴) ”باطل کے لیے اب نہ آغاز ہے اور نہ انجام۔“ اس کا معاملہ اب ختم ہے۔ اس کی زندگی ختم ہے۔ اب اس کے لیے کوئی میدانِ عمل نہیں ہے۔ اس کا جانا ٹھہر گیا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی ہلا مارنے والی ضرب ہے۔ جو کوئی بھی اس اعلان کو سنتا ہے، وہ یقین کر لیتا ہے کہ اب کوئی گنجائش نہیں ہے، باطل کے قائم رہنے کی۔ لہذا حق کے سوا اب کسی اور کی حکمرانی نہ ہوگی۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب سے قرآن آیا ہے۔ سچائی کا منہاج دنیا میں قائم ہو گیا ہے اور باطل اب اس سچائی کے سامنے دفاعی پوزیشن میں ہے، کیونکہ سچ نے غالب ہونے کا عزم بالہزم کیا ہوا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات باطل کو مادی قوت حاصل ہوتی ہے لیکن وہ کبھی حق پر نظریاتی برتری حاصل نہیں کر سکا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات لٹل باطل لٹل حق پر غالب آجاتے ہیں لیکن یہ لٹل حق کی غلطی کی وجہ سے وقتی تزلزل ہوتا ہے۔ جہاں تک حق کا تعلق ہے، وہ اپنی جگہ جما ہوا ہوتا ہے۔ واضح ہوتا ہے، صریح ہوتا ہے۔

اور آخری ضرب :-

قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِي

إِلَيَّ رَبِّي إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ۝

”کہو، اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہے، اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اس وحی کی بناء پر ہوں جو میرا رب میرے اوپر نازل کرتا ہے، وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب ہی ہے۔“

اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو اس کا وبال تم پر نہ ہو گا۔ میں خود ذمہ دار ہوں گا اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اللہ نے بذریعہ وحی مجھے یہ ہدایات دی ہیں۔ میں خود از خود کوئی کام کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ میں تو خود بھی اسیر اشارہ ابرو ہوں۔

اِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ (۵۰:۳۴) ”وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب ہی ہے۔“ یہ لوگ اللہ کو قریب پاتے تھے۔ ان کے تصور میں اللہ کی یہ صفات بٹھی ہوئی تھیں اور ان کی حقیقی زندگی میں یہ صفات موڑ تھیں۔ ان کو یقین تھا کہ اللہ سمیع ہے اور قریب ہے۔ اور وہ ان کے امور کو براہ راست دیکھ رہا ہے۔ ان کی شکایت اور ان کے مشورے سب اللہ کے سامنے ہیں۔ اللہ نے اپنے بندوں کو چھوڑ نہیں رکھا اور نہ کسی کے حوالے کر رکھا ہے۔ چنانچہ ان کی زندگی اللہ کے انس و محبت میں گزرتی تھی۔ اللہ کے زیر سایہ تھی۔ اس کے پڑوس میں تھی۔ اس کی مریانیوں میں تھی۔ اس کی نگرانی میں تھی اور یہ عقیدہ وہ اپنے قوس کے اندر زندہ پاتے تھے ’زندہ اور سادہ شکل میں۔ یہ صفات محض تصور ہی نہ تھیں بلکہ زندہ اور عملی تھیں اِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ (۵۰:۳۴)

لب خاتمہ اس سورہ کا قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ منظر حرکت اور دوڑ و دوڑ سے ہے۔ اس میں دنیا اور آخرت کے ڈانڈے لے ہوئے ہیں۔ گویا دنیا اور آخرت ایک ہی اسٹیج پر ہیں۔ اس منظر کی جھلکیاں بڑی تیزی سے اسکرین پر گزرتی ہیں۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فِرْعَوْنًا فَلَا فُوتَ وَآخِذُوا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿۵۰﴾
قَالُوا امْنَا بِهِ وَآتَىٰ لَهُمُ التَّنَادُ ﴿۵۱﴾ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۵۲﴾ قَدْ كَفَرُوا بِهِ مِنْ
قَبْلُ وَيَقْدِرُونَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۵۳﴾ وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ
﴿۵۴﴾ كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مَُّرِيبٍ ﴿۵۵﴾

”کاش تم دیکھو انہیں اس وقت جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جائیں گے بلکہ قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے۔ اس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لے آئے۔ حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کہاں ہاتھ آ سکتی ہے۔ اس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور بلا تحقیق دور دور کی کوڑیاں لایا کرتے تھے۔ اس وقت جس چیز کی یہ تمنا کر رہے ہوں گے اس سے محروم کر دیئے جائیں گے جس طرح ان کے پیش رو ہم مشرب محروم ہو چکے ہوں گے۔ یہ بڑے گمراہ کن شک میں پڑتے ہوئے تھے۔“

کاش تم دیکھو ’منظر تو سب کے سامنے کھلا ہے اور دیکھا جاسکتا ہے۔ دیکھو یہ کس طرح گھبرائے پھر رہے ہیں۔

فَزِعُوا (۵۱:۳۴) اچانک ان پر خوف طاری ہو گیا ہے۔ یہ بھاگنا چاہتے تو تھے لیکن دیکھو پکڑے جا رہے ہیں کوئی ایک بھی بھاگ نہیں سکتا۔ بلکہ یہ دور تک نہیں بھاگ سکتے قریب قریب ہی سے پکڑے جا رہے ہیں۔

وَآخِذُوا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ (۵۱:۳۴) اچانک انہوں نے تھوڑی بہت حرکت تو کی بھاگنے کے لیے مگر نہ بھاگ سکے۔

اب سب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے بعد از وقت۔ اب تو ایمان ان سے بہت دور نکل گیا ہے۔ بہت دور جا چکا

ہے۔ یہ اب اسے پکڑ نہیں سکتے۔

التَّنَافُوسُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ (۵۲:۳۴) اب ان کی سہی اس طرح ہے جس طرح کوئی کسی چیز کو دور سے پکڑنا چاہے مگر نہ پکڑ سکے۔ ایمان تو دور دنیا میں رہ گیا ہے۔ انہوں نے موقع ضائع کر دیا۔

وَقَدْ كَفَرُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ (۵۳:۳۴) ”اس سے پہلے انہوں نے ایمان سے انکار کر لیا۔“ اب یہاں تو معاملہ ختم ہے، مصلحت ختم اب سہی لا حاصل ہے۔

وَيَقْدِفُونَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ (۵۳:۳۴) ”یہ دور سے غائب نشانے پر پھینکتے تھے۔“ اس وقت انہوں نے انکار ہی کر دیا تھا کہ قیامت نہیں ہے حالانکہ وہ مستقبل کے پردوں میں اسے کس طرح دیکھ سکتے تھے کہ نہیں ہے۔ اس طرح وہ دور نامعلوم نشانے پر بمباری کر رہے تھے۔ اور اب ایمان لانے کی سہی کر رہے ہیں جبکہ وہ دور نکل گیا ہے۔

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ (۵۴:۳۴) ”اس وقت جس چیز کی یہ تمنا کر رہے ہوں گے۔ اس سے وہ محروم کر دیئے جائیں گے۔“ اب یہ ایمان سے محروم ہوں گے کیونکہ وہ بعد از وقت ہو گا۔ اب عذاب سے بچنا ممکن نہ ہو گا کہ وہ سر پر ہو گا۔

كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِمْ مِنْ قَبْلُ (۵۴:۳۴) ”جس طرح ان کے پیش رو ہم مشرب محروم کر دیئے جائیں گے۔“ یعنی جب ان پر پکڑ آئی تو انہوں نے نجات کی دعا کی لیکن اب نہ دعا کا وقت تھا نہ بھاگنے کی جگہ تھی۔

أَنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مُرِيبٍ (۵۴:۳۴) ”یہ بڑے گمراہ کن شک میں پڑے ہوئے تھے۔“ اور اب یقین کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس سورہ کا خاتمہ اس شدید ضرب پر ہوتا ہے۔ اور یہ منظر قیامت، قیام قیامت کو عملاً ثابت کر دیتا ہے کہ وہ دیکھو قیامت برپا ہو گئی! یہی مضمون تھا اس سورہ کا۔ آغاز بھی قیامت کے قیام ہے اور اختتام بھی احوال قیامت پر۔

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۲

سورۃ فاطر - ۳۵

آیات ۱ --- تا --- ۴۵

سورہ فاطر ایک نظر میں

یہ مکی سورہ ہے اور سیاق کلام اور موضوع کے اعتبار سے اس کا ایک مخصوص انداز ہے۔ اس کا انداز سورہ رعد کے مطابق ہے۔ آغاز سے لے کر انتہا تک قلب انسانی کے لیے نہایت ہی موثر ضربات لگائی گئی ہیں۔ یہ ضربات نہایت ہی موثر اور اشاراتی اور انسان کو خوب جھنجھوڑنے والی ہیں۔ انسان کو غفلت سے جگاتی ہیں تاکہ وہ غور کرے اور اس کائنات کی عظمت کا ادراک کرے۔ اس کائنات کی حیران کن خوبصورتی سے لطف اندوز ہو سکے اور اس کے اندر خالق کائنات کے وجود پر جو دلائل اور نشانیاں جا بجا بکھری پڑی ہیں ان پر انسان غور اور تدبر کرے۔ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرے اور اللہ کی رحمت اور اللہ کی نگرانی اور مربانی کو یاد کرے۔ گزرے ہوئے لوگوں کی مقل گاہوں کو دیکھے اور قیامت کے مناظر بھی دیکھے۔ اس کائنات میں اللہ کی صنعت کاریوں، دست قدرت کے معجزات، انسانی نفس کے اندر تخلیق کردہ عجوبے، انسانی زندگی کے عجیب نشیب و فراز اور انسانی تاریخ کے عبرت آموز واقعات کو دیکھ کر اللہ کا خوف اپنے دل کے اندر پیدا کرے۔ پھر وہ دیکھے کہ اس کائنات اور ان تمام آثار کے اندر ایک ہی سچائی اور ایک ہی قانون جاری و ساری ہے اور ایک ہی صانع، مبدع اور قوی دست قدرت کام کر رہا ہے۔ یہ تمام امور ایسے موثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ کوئی زندہ دل ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ سورہ اس طرح ہے جس طرح زنجیر کی کڑیاں باہم پیوست ہوتی ہیں، اس کو اسبق اور دروس کے اندر تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ پوری سورہ کا ایک ہی موضوع ہے۔ انسان کے قلب و خرد کی تاروں پر ضربات ہیں اور یہ ضربات اس کائنات، نفس انسانی، حیات انسانی، تاریخ انسانی، بعث بعد الموت کے واقعات سے مملو ہیں۔ یوں یہ زحرے نفس کو ہر پسو سے متاثر کرتے ہیں اور دل کو ہر طرف سے گھیرتے ہیں اور انسان کی روحانی دنیا کو ایمان، خضوع و خشوع اور یقین سے بھر دیتے ہیں۔

ان تمام تبصروں اور نصیحتوں میں متنازع بات یہ ہے کہ تمام ذوریوں کے سر۔ دست قدرت میں پکڑے گئے ہیں اور یہ دکھایا گیا ہے کہ دست قدرت کی کار فرمائیاں ہیں کہ وہ ان ذوریوں کو ہلاتا ہے اور اس کائنات میں عجوبے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ دست قدرت ہی ہے جو کسی رسی کو کھینچ لیتا ہے اور کسی کو دراز چھوڑتا ہے، کسی کو سخت کرتا ہے اور کسی کو نرم کرتا ہے۔ اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی مددگار اور شریک ہے۔

سورہ کے آغاز میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ دست قدرت کی یہ کار فرمائیاں نمایاں ہیں۔ اور یہ سورہ کے خاتمے تک یونہی جاری ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ یہ عظیم کائنات دست قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو اسے وجود میں لایا ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولَىٰ أَجْنَحَةٍ مَّتَنِي
وَتَلْتِ وَرُبْعَ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۳۵: ۱) ”تعریف
اللہ ہی کے لیے جو آسمان اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے جن کے دو دو تین اور
چار چار بازو ہیں۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے ایسا کرتا ہے‘ یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“
اور اللہ کا یہ بے قعد قدرت بے قید ہے۔ اگر اللہ رحمت کا یغمان عام کرتا ہے تو اسے کوئی بند نہیں کر سکتا اور اگر اللہ
اپنی رحمت کے سرچشمے خشک کر دے تو کوئی نہیں ہے کہ انہیں جاری کر سکے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ بَعْدِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ
(۳۵: ۲) ”اللہ جس رحمت کا لوگوں کے لیے دروازہ کھول دے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جسے بند کر
دے‘ اسے کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں ہے۔ وہ زبردست اور حکیم ہے۔“
ہدایت اور ضلالت بھی ایک قسم کی رحمت ہے یا زحمت۔

فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (۳۵: ۸) ”اللہ ہی ہے جسے چاہے گمراہ کر دے
اور جسے چاہے ہدایت دے۔“

إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ (۳۵: ۲۲) ”اِنَّ
اَللّٰهُ نَذِيرٌ (۳۵: ۲۳) ”اللہ جسے چاہتا ہے سنوارتا ہے مگر تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون
ہیں۔ تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔“
یہی دست قدرت ہے جس نے پہلے زندگی پیدا کی اور وہ دوبارہ بھی زندگی عطا کرے گا اور قیامت میں مردوں کو
اٹھائے گا۔

وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَثِيرٌ سَحَابًا فَسَقْنَهُ إِلَىٰ بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ
بَعْدَ مَوْتِهَا كَذَلِكَ النُّشُورُ (۳۵: ۹) ”وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے‘ پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں پھر ہم
اسے ایک اجاز زمین کی طرف لے جاتے ہیں جو مری پڑی تھی۔ مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اس طرح ہو گا۔“ اور
عزت اور برتری سب اللہ کے لیے ہیں۔ اور ہر قسم کی عزت اور برتری کا سرچشمہ اللہ ہی ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا (۳۵: ۱۰) ”جو عزت چاہتا ہے تو اسے معلوم ہونا
چاہئے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے۔“

تخلیق وجود میں لانا، نسل چلانا اور پھر مارتا سب کے سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِّنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ وَمَا يُعَمِّرُ مِنْ مَّعْمَرٍ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ

عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ (۳۵: ۱۱) ”اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے۔ پھر تمہارے جوڑے بنا دیے۔ کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا ہوتا ہے، اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہوتا ہے۔“
اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں آسمان و زمین کی بنیادیں، افلاک و کواکب کی حرکات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ذَلِكَُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا

يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ (۳۵: ۱۳) ”وہ دن کے اندر رات اور رات کے اندر دن کو پروتا ہے ہوالے آتا ہے، چاند اور سورج کو اس نے مسخر کر رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ایک وقت مقررہ تک چلے جا رہا ہے۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو، وہ ایک پرکاش کے مالک بھی نہیں ہیں۔“ اللہ کا دست قدرت اس کائنات میں متصرف ہے۔ وہ جمادات، نباتات اور حیوانات اور انسانوں میں تصرف کر رہا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٍ (۳۵: ۲۷) وَمِنَ

النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ

الْعُلَمَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ (۳۵: ۲۸) ”کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمانوں سے پانی برسا رہا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں۔ جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں۔“

یہ دست قدرت انسان کو قدم بقدم آگے لے آتا ہے اور ایک نسل کو دوسری نسل کا وارث بناتا ہے۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۳۵: ۳۲) ”پھر ہم نے اس کتاب کا

وارث بنا دیا ان لوگوں کو، جنہیں ہم نے اپنے بندوں کے لیے منتخب کیا۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ (۳۵: ۳۹) ”وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو خلیفہ بنایا۔“ اور یہی اللہ ہے جس نے اس پوری کائنات کو تمام رکھا ہے اور اسے زوال سے محفوظ کر دیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُمَسِّكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ (۳۵: ۴۱) حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو زمین و آسمان کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے سوا کوئی دوسرا انہیں تھامنے والا نہیں ہے۔

تمام امور اللہ کے دست قدرت کے قبضہ میں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو کوئی قوت کسی کام سے عاجز نہیں کر سکتی۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ (۳۵: ۴۴) ”اللہ تعالیٰ کو زمین و آسمان کی کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی۔“

إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا (۳۵: ۴۴) ”وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۳۵: ۴۴) ”وہ عزیز و حکیم ہے۔“

وَالِلَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ (۳۵: ۴۴) ”تمام امور اللہ کی طرف لوٹتے ہیں۔“

عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ (۳۵: ۸) ”وہ ان باتوں کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔“

لَهُ الْمُلْكُ ”بادشاہت اسی کی ہے۔“

الْغَنِيُّ ”وہ غنی اور اپنی ذات میں محمود ہے۔“

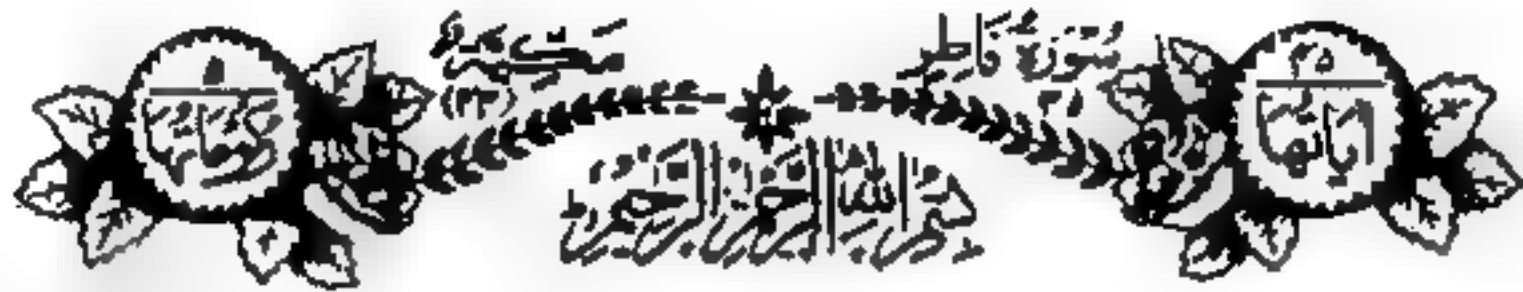
إِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ (۳۵: ۱۸) ”اور اللہ ہی کی طرف لوٹتا ہے۔“ وہ ”عزیز و غفور“ ہے۔ وہ ”غفور و شکور“ ہے۔ وہ ”خبیر و بصیر“ ہے۔ وہ ”زمین و آسمانوں“ کے غیب کا جاننے والا ہے۔ وہ عظیم بذات الصدور ہے۔ وہ عظیم و غفور ہے۔ وہ عظیم و قدیر ہے۔ وہ تمام بندوں پر بصیر ہے۔ ان آیات اور آیات کے تراجم سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ کی فضا کیا ہے اور اس پوری سورہ کا یہ رنگ ہے۔

ہاں سورہ کی تشریح کی خاطر ہم نے اسے چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ اس کے معانی اور تشریحات سہولت سے کی جائیں ورنہ یوں یہ سورہ دراصل ایک ہی حلقہ اور ایک ہی سبق ہے اور اول سے آخر تک مضمون و موضوع بھی ایک ہی رنگ کا ہے۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۱۹۹ تشریح آیات

۱۔۔ تا۔۔ ۳



الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلِكَةِ رُسُلًا أُولَىٰ أَجْنَحَةٍ
مَّثْنًى وَثَلَاثَ وَرُبْعٍ يُزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرٌ ۝

اللہ کے نام سے جو ہے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ ”تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمان اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے جن کے دو دو، تین تین اور چار چار بازو ہیں۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے، بھیغادہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

سورہ کا آغاز حمد باری سے ہو رہا ہے۔ اس پوری سورہ کا مضمون یہ ہے کہ انسانی دل کو اللہ کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اللہ کی نعمتوں کو دیکھا جائے، اللہ کی رحمتوں کا شعور زندہ کیا جائے اور انسان کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ اپنی مخلوقات میں اللہ نے کیا عجائبات پیدا کیے ہیں۔ انسانی احساس کو ان عجائبات کے شعور سے بھر دیا جائے اور نتیجتاً انسان اللہ کی حمد و ثنائیں رطب اللسان ہو۔
سب حمد اللہ کے لیے ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ (۱: ۳۵) ”سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔“ اور اس کے بعد اللہ کی وہ صفت بیان ہو رہی ہے جو خلق اور ایجاد پر دلالت کرتی ہے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱:۳۵) ”جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے“۔ وہ ان عظیم اور ہولناک مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے جنہیں ہم اپنے اوپر نیچے دیکھ رہے ہیں۔ جس بھی ہم ہوں اور ان میں سے نہایت ہی چھوٹے اجسام اور ہم سے قریب ترین اجسام کے بارے میں ہم کچھ معلومات رکھتے ہیں۔ ان تمام اجسام کو ایک ہی قانون قدرت کنٹرول کرتا ہے نہایت ہی تناسب اور توافق کے ساتھ۔ یہ سب چیزیں چلتی ہیں اور ان کا تصور بھی ہم اپنے ذہن پر بہت بڑا بوجھ ڈال کر کر سکتے ہیں۔ یہ تمام اجسام اپنی عظمت اور خوفناکی کے ساتھ ساتھ ایک ایسے دقیق اور پیچیدہ تناسب کے ساتھ اپنے مدارات میں ایک ہی رخ پر چلتے ہیں کہ اگر اس تناسب میں بالفضل ایک معمولی فرق آجائے تو یہ تمام عظیم اجسام ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں اور قیامت برپا ہو جائے اور سب کے سب روئی کے گالوں کی طرح بکھر جائیں۔

قرآن کریم اسی عظیم تحقیق سہولت کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے اور ہم اس پر — یہ بھی گزر جاتے ہیں — بغیر اس کے کہ ہم اس کے سامنے رک کر قدرے تامل اور تدبر کریں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ کہ ”اس جود اختیار کر گیا ہے۔ ہماری عقل و خرد کے تاریک آلود ہو گئے ہیں اور ان پر قرآن کریم کے مضارب کی قدرت سخت ضربات بھی کارگر نہیں ہیں اور ان ضربات کے باوجود ان سے کوئی نفع نہیں نکلتا۔ وہ سرود جو کبھی اللہ کے لیے — ہوئے دلوں سے نکلتا تھا — جو اللہ کو یاد کرتے تھے اور اللہ کی قدرت کی ان نشانیوں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے اور یہ بڑی وجہ ہے کہ اس عظیم کائنات کو ہم دیکھتے دیکھتے اس کے اس قدر عادی بن گئے ہیں کہ اس کے عجائبات ہمیں عجائبات ہی نہیں لگتے۔ ان کا بے مثال حسن ہمیں متاثر ہی نہیں کرتا اور ان کی نہایت ہی پیچیدہ ٹیکنالوجی ہمیں ششدر نہیں کرتی۔ اگر ہم ان پر ایسی نظر ڈالیں جس طرح کوئی انہیں پہلی مرتبہ دیکھتا ہے اور بہت ہی حیران ہو جاتا ہے۔

یاد رہے کہ کھلے دل ’اللہ کے ساتھ جڑے ہوئے دل کے لیے آسمان میں ’ستاروں کے مواقع و مدارات پر غور اور تدبر کرنے کے لیے‘ ان کے حجم اور عظمت کو دیکھنے کے لیے‘ اور ان کے ماحول کے مطالعے کے لیے‘ بعض کا دوسرے کے ساتھ تعلق اور کشش کے معلوم کرنے کے لیے۔ اور ہر ایک کے حجم‘ ہر ایک کی حرکت اور ہر ایک کے حالات معلوم کرنے کے لیے کسی بڑے علم کی ضرورت نہیں ہے‘ جو دل اللہ سے جڑا ہوا ہو‘ اس کے لیے کسی بڑے اور گہرے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ معمولی توجہ سے اس کائنات کے حسن و جمال کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ مناظر ایک خدا رسیدہ شخص کے دماغ کے تاروں کے اندر نغمہ پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ رات کے وقت ذرا صاف ستھری فضا اور صاف موسم میں ان گنت تاروں ہی کو چمکتا ہوا دیکھ لیجئے! تاریک رات ہو اور موسم صاف ہو اور ہر ستارہ زمین پر وضو پاشی کر رہا ہو۔ پھر صبح کے وقت ذرا سپید صبح کی نموداری اور سورج کے طلوع ہونے کے منظر کو دیکھئے۔ اسی طرح پہاڑوں کی اوٹ میں ڈوبنے والے سورج اور سرخ شفق ہی کو دیکھئے۔ پھر اس چھوٹی سی زمین اور اس کے مختلف مواقع اور مناظر کو دیکھئے۔ ان مناظر کو کوئی سیاح ختم نہیں کر سکتا اور نہ ان کی سیر سے سیر ہو سکتا ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ صرف ایک پھول ہی کو دیکھئے۔ اس کا رنگ اور اس کی پتیاں اور اس کی تشکیل اور رنگوں کی تنظیم سُبْحَانَ اللَّهِ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔

قرآن کریم ان امور کی طرف جا بجا اشارات کرتا ہے۔ بڑے بڑے مناظر کی طرف بھی اور چھوٹے چھوٹے پیش پا افتادہ مناظر کی طرف بھی۔ اگر کوئی زندہ دل ان میں سے ایک کی طرف بھی اشارہ کر دے تو زندہ و بیدار مغز انسان کی

ہدایت کے لیے صرف ایک ہی چیز یا ایک ہی پھول کا مطالعہ کافی ہے اور کسی ایک چیز کے اندر موجود عجائبات پر بھی انسان اللہ کی حمد و ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولٰٓئِیْ اٰجْنِحَۃٌ مِّثْنٰی

وَتُلُتْ وَرُبْعَ (۱: ۳۵) ”تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے جن کے دو دو، تین تین اور چار چار بازو ہیں۔“ اس سورہ میں موضوع سخن رسولوں و وحی الہی اور نزول وحی ہے۔ فرشتوں کا اس کے اندر بہت اہم کردار ہے کیونکہ یہ فرشتے ہی آسمانوں سے وحی لے کر مقرر رسولوں کے پاس آیا کرتے ہیں اور یہ پیغام رسائی جو اللہ سے رسولوں کے پاس آتی ہے نہایت ہی اہم اور نہایت ہی بھاری کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کائنات کی عظیم تخلیقات کے بعد فرشتوں کی تخلیق کا خصوصی ذکر ہوا کیونکہ یہ فرشتے ہی زمین اور آسمان کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہیں۔ وہی رابطہ ہوتے ہیں خالق سادات و ارض اور اللہ کے مقرر بندوں یعنی رسولوں کے درمیان اور یہ پیغام رسائی اور ذریعہ ربط اس کائنات کا اہم کام فریضہ رسالت کے بارے میں ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں آغاز سے یہاں تک فرشتوں کا ذکر تو ہوتا رہا ہے لیکن فرشتوں کی شکل و صورت کے بارے میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے۔ اس سے قبل فرشتوں کی طبیعت اور ان کے فریضہ منصبی کی بات ہوتی رہی ہے مثلاً

وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ (۱۹: ۲۱) يُسَبِّحُونَ

الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ (۲۰: ۲۱) (انبیاء: ۱۹-۲۰) ”اور جو اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو برا سمجھ کر اس کی بندگی سے سہمائی کرتے ہیں۔ نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ دم نہیں لیتے۔“ دو سری جگہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُوْنَهُ وَلَهُ یَسْجُدُونَ

(۲۰: ۶) ”جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے۔ اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں۔“ (۲۰: ۶) یہاں ایک نئی بات یہ کہی گئی ہے کہ ان کی تخلیقی صورت کیا ہے کہ ”جن کے دو دو، تین تین اور چار چار بازو ہیں۔“ یہ ایک ایسی صفت ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہے نہ اس کا ہم کوئی تصور کر سکتے ہیں کہ ان کے بازو اور پر کیسے ہیں۔ ہمیں بس چاہئے اور ہم ہی کر سکتے ہیں کہ بس ایمان لائیں کہ ان کے پر ایسے ہوں گے۔ اس بارے میں کوئی متعین تصور ہم نہیں کر سکتے کیونکہ ہم جو اندازہ بھی کریں گے اس میں غلطی ہوگی جبکہ ان کی شکل کے بارے میں تفصیلات ہمیں احادیثِ معجمہ سے بھی نہیں ملتیں۔ قرآن کریم میں دو سری جگہ ان کی ایک اور صفت آئی ہے اور وہ یہ ہے۔

عَلَيْهَا مَلَكَةٌ غُلَاطٌ شِدَادًا لَا يَعْصُونَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (۶: ۶۶)

”جن پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے ہوں گے جو بھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔“ اس میں بھی فرشتوں کی شکل کو متعین نہیں کیا گیا۔ احادیث میں جو کچھ آتا ہے وہ یہ ہی کہ رسول اللہ نے جبرئیل علیہ السلام کو دو مرتبہ اپنی اصل شکل میں دیکھا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اس کے چہرہ سو پرستے اس سے بھی ان کی شکل و اہیت کا تعین نہیں ہوتا۔ لہذا یہ معاملہ بھی علوم غیبیہ میں سے ایک ہے۔
ان کے دو دو یا تین تین یا چار چار پر ہیں اور انسانوں نے صرف پرندوں کے پر دیکھے ہیں۔ اس لیے اللہ فرماتے ہیں۔

يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (۱: ۳۵) ”وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے۔“
یوں اللہ کی مشیت بے قید ہے اور وہ خود اپنی بنائی ہوئی اشکال کا پابند نہیں ہے۔ اس کی مخلوقات میں ہم دیکھتے ہیں کہ لاتعداد شکلیں ہیں اور لاتعداد شکلیں ایسی ہیں جو ابھی تک ہمارے علم ہی سے باہر ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱: ۳۵) ”اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ یہ تیسرہ نہایت وسیع ہے اور زیادہ جامع ہے۔ لہذا کسی صورت کے تعین کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی تمام شکلیں اللہ کی قدرت کے دائرے کے اندر آتی ہیں۔ ہر قسم کا تغیر و تبدل اللہ کی قدرت کے تحت ہوتا ہے۔

مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

”اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جسے وہ بند کر دے اسے اللہ کے بعد پھر کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں۔ وہ زبردست اور حکیم ہے۔“
اس سورہ کی اس دوسری آیت میں اللہ کی قدرتوں کا ایک رنگ دکھایا گیا ہے جبکہ پہلی آیت میں اللہ کی قدرت کا ذکر تھا۔ جب یہ رنگ کسی انسان کے تصور اور عمل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کے تصورات ’اس کا شعور‘ اس کا رخ‘ اس کے حسن و قبح کے پیمانے بھی اس رنگ میں رنگے جاتے ہیں اور اس کی پوری زندگی اس رنگ میں رنگی جاتی ہے۔
یوں کہ یہ رنگ انسان کو اس کائنات کی پوری قوتوں سے کاٹ کر اللہ کی قوت سے جوڑ دیتا ہے۔ اسے زمین و آسمان کی تمام مشکوک رحمتوں سے مایوس کر دیتا ہے۔ صرف اللہ کی رحمت سے جوڑتا ہے اور اس کا امیدوار بنا دیتا ہے۔ زمین و آسمان کے تمام دروازے بند کر کے صرف اللہ کا دروازہ کھلا چھوڑتا ہے اور اس کے سامنے زمین و آسمان کے تمام راستے بند کر کے صرف اللہ کا دروازہ کھلا چھوڑتا ہے۔ اس کے سامنے زمین و آسمانوں کے تمام راستے بند کر کے صرف اللہ کا راستہ کھلا چھوڑتا ہے۔

اللہ کی رحمت کے مظاہر متعدد ہوتے ہیں ’لاتعداد ہوتے ہیں۔ اللہ نے انسانوں کی جس انداز سے تخلیق کی‘ اس کے

نفس کے اندر جو ممتاز قوتیں ودیعت کیں اور اپنی مخلوق میں سے جس طرح اسے مکرم بنایا صرف ان رحمتوں کو اگر انسان قلم بند کرنا چاہے تو وہ انتہاؤں تک نہیں پہنچ سکتا۔ جس طرح اللہ نے انسان کے لیے اس کے ماحول کو سازگار بنایا ہے۔ اس کے ارد گرد اس کے اوپر نیچے ہر چیز کو اس کے لیے مسخر کیا ہے اور اس کے اوپر جو انعامات کیے ہیں جنہیں وہ جانتا ہے اور وہ انعامات جنہیں وہ نہیں چاہتا یہ انعامات بے شمار ہیں ان گنت ہیں۔

اللہ کی رحمت ان چیزوں میں بھی موجود ہے جو ممنوع ہیں۔ ان میں بھی موجود ہے جن کی اجازت ہے اور جس شخص پر اللہ کی رحمتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے اسے یہ رحمت ہر چیز میں نظر آتی ہے۔ ہر حال، ہر ماحول، اور ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اس کے شعور میں اس کے ماحول میں جہاں بھی وہ ہو جیسا بھی ہو اگرچہ انسان ان تمام نعمتوں سے محروم ہو جائے جنہیں لوگ محرومیت سمجھتے ہیں۔ اس رحمت سے اپنے آپ کو وہ ہر شخص محروم پاتا ہے جس پر اللہ اس کا دروازہ ہر چیز میں بند کر دیتا ہے۔ ایب شخص پھر ہر حال میں ہر صورت میں اور ہر جگہ محروم ہی ہوتا ہے اگرچہ اس کے پاس بظاہر وہ ساز و سامان موجود ہوں جس کو لوگ خوشحالی تصور کرتے ہیں۔

دنیا کے بے شمار ساز و سامان ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ اللہ کی رحمت شامل نہیں ہوتی وہ عذاب الہی بن جاتے ہیں اور کئی لکی مشکلات ہوتی ہیں جن کے ساتھ اللہ کی رحمت شامل ہوتی ہے۔ یہ مشکلات بذات خود رحمت بن جاتی ہیں۔ بعض اوقات انسان کانٹوں پر سوتا ہے مگر اس پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ یہ کانٹے اس کے لیے نرم بچھونا ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات نرم و نازک بستر انسان کے لیے کانٹے بن جاتے ہیں اور رحمت ہی اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔ انسان مشکل ترین کام کر رہا ہوتا ہے اور وہ اس کے لیے اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ وہ نساعت ہی پر قیام زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے لیکن وہ اس کے لیے مصیبت ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ ایک خوفناک صورت حالات میں گھس جاتا ہے اور وہ اس کے لیے امن ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ مشکلات کے بغیر مراحل عبور کر لیتا ہے اور وہ اس کے لیے ہلاکت کا باعث بن جاتے ہیں۔

اللہ کی رحمت کے ساتھ کوئی تنگی، تنگی نہیں رہتی۔ اگرچہ کوئی جیل کی تاریکیوں میں ہو یا ہلاکت کی دیواروں میں یا سخت مصائب میں ہو بلکہ اللہ کی رحمت کے سوا تمام کشادگیاں تنگی ہوتی ہیں۔ اگرچہ کوئی نعمتوں اور سہولتوں میں زندگی بسر کر رہا ہو خوشحال ہو اسے زندگی کی تمام سہولیات حاصل ہوں۔ جب انسان اللہ کی رحمت کی وجہ سے قلبی طمانیت کا مقام حاصل کر لیتا ہے تو اس کے اندر سے نیک نیتی، رضامندی اور اطمینان کے سرچشمے پھوٹنے لگتے ہیں اور یوں نفس کے اندر تلقی، تھکاوٹ، واماندگی اور محنت و مشقت کی تکلیف دہ نیش زبیاں ختم ہونا شروع ہو جاتی ہیں اگرچہ وہ نفس کے اندر جمی ہوئی ہوں۔

اللہ کی رحمت کی کنجی تمام دروازوں کے لیے مٹھ جاتی ہے۔ اس سے تمام دروازے کھل جاتے ہیں اس سے تمام چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں اور تمام غلط راہیں مسدود ہو جاتی ہیں انسان بے فکر ہو جاتا ہے اللہ کی رحمت کا دروازہ کھل جانے سے پھر وسعتیں، کشادگیاں اور آرام و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا دروازہ ہے کہ اس کے کھل جانے سے تمام نفع بخش دروازے اور راستے کھل جاتے ہیں اور تمام غیر نفع بخش دروازے بند ہو جاتے ہیں اور جب یہ دروازہ بند ہو جائے تو تمام ایسے دروازے، کھڑکیاں اور راستے کھل جاتے ہیں جو نفع بخش نہیں ہوتے اور انسان تنگی، کرب، سختی، بے چینی اور واماندگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات اللہ کا یہ فیض انسان کو ڈھانپ لیتا ہے پھر اگر زندگی تنگ ہو یا مالی حالت اچھی نہ ہو رہنے اور سننے کے

حالات خراب ہوں تو کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ فیضِ رحمت ہی دوایم 'راحت' 'سعادت' ہے۔ اور جب اس رحمت کا دروازہ بند ہوتا ہے اور دوسری جانب سے رزق کشادہ ہوتا ہے اور ہر سامان کی آمد آمد ہوتی ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے غلی 'خرج اور شقاوت و بد بختی حاصل ہوتی ہے۔

مال و دولت، صحت و قوت، شان و شوکت بھی ہواوقات رنجِ الم اور تھکاوٹ اور مشقت کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر دستِ قدرت اپنا فضل و رحمت کھینچ لے۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور متاعِ حسن اور دنیا کے ساز و سامان کو جمع کر دیا۔ پھر کیا ہوتا ہے، ہر طرف آرام اور سکون ہوتا ہے۔ دنیا میں بیش و عشرت اور آخرت کے لیے پوری تیاری ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے خلاف پھر دنیا پرستوں کے دس میں حسد اور کینہ برپا ہوتا ہے لیکن مال و دولت کے ساتھ ایک شخص کو اگر بخل دے دیا جائے تو وہ محروم ہو جاتا ہے یا مال و دولت کے ساتھ بیماری بھی دے دی جائے تو بھی وہ دنیا کے انعامات سے محروم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات مالدار سرکش ہو جاتا ہے اور اس کا مال تلف بھی ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات اللہ کسی کو لولاد دیتا ہے اور اس اولاد کے ساتھ رحمتِ خداوندی بھی شامل ہوتی ہے۔ پھر یہ اولاد نہنتِ حیات بن جاتی ہے۔ خوشی اور سعادت کا باعث بن جاتی ہے اور آخرت میں 'مزید اجر کا باعث بنتی ہے۔ وہ اس شخص کے لیے نیک اور اچھے جانشین بن جاتے ہیں اور اسی اولاد کے ساتھ اگر رحمتِ خداوندی نہ ہو تو یہی میٹھی اولاد زحمت بن جاتی ہے 'بلائے جان ہوتی ہے' باعثِ بد بختی اور پریشانی ہوتی ہے۔ راتوں کی نیند حرام کر دیتی ہے اور دن کا آرام غارت کر دیتی ہے۔ اللہ انسان کو صحت اور قوت دیتا ہے۔ اب اگر اس صحت اور قوت کے ساتھ رحمتِ خداوندی بھی ہو تو یہ نعمت ہوتی ہے۔ زندگی اچھی طرح بسر ہوتی ہے۔ زندگی کی لذتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس صحت و قوت کے ساتھ رحمتِ خداوندی شامل نہ ہو تو یہ صحت اور یہ قوت بلائے جان بن جاتی ہیں۔ اور نیک صحیح اور قوی شخص مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی صحت اور اپنی قوت کو ان کاموں میں کھپا دیتا ہے جو خود اس کی صحت اور قوت کے لیے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی روح اور اس کے اخلاق کی تباہی کے ساتھ ساتھ اس کی آخرت بھی تباہ ہو جاتی ہے۔

بعض لوگوں کو اللہ مرتبہ اور مقام دیتا ہے اور اس کی رحمت ایسے لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے۔ یہ مرتبہ و مقام اصلاح کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ملک میں امن قائم ہو جاتا ہے اور یہ مرتبہ و جاہ اس بات کا ذریعہ بن جاتے ہیں کہ انسان اپنے پیچھے اچھے اعمال اور اچھے آثار چھوڑے جو آخرت کا بہترین ذخیرہ ہوں۔ اگر اللہ کی رحمت اقتدار اور جاہ کے ساتھ شامل نہ ہو تو وہ شخص بے چین رہتا ہے۔ لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔ حد سے تجاوز کرتا اور سرکشی اختیار کرتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ نہایت بغض اور کینہ رکھتا ہے۔ یہ جاہ و اقتدار ہی ایسے لوگوں کے لیے عدالت کا ذریعہ بن جاتا ہے اور ایسا شخص پھر ایسے کام کرتا ہے کہ اپنے لیے آخرت میں آگ کا لیک بہت بڑا سرمایہ جمع کر لیتا ہے۔

گمراہ علم اور طویل عمر اور جاہ و مرتبہ بدلتے رہتے ہیں۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ علم و معرفت کسی کے لیے مفید ہوتے ہیں اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ طویل عمر باعثِ برکت ہو۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ قلیل عمر ہی برکت کا باعث ہوتی ہے اور نہایت ہی قلیل مال و دولت بڑی سعادت مندی کا ذریعہ ہو جاتا ہے۔

جماعت بھی ایک فرد کی طرح ہوتی ہے اور ملت بھی ایک فرد ہے۔ ہر حال اور ہر صورت میں اور مثالوں پر غور

کرنے سے کوئی سچ نکالنا مشکل کام نہیں ہے۔

اللہ کی رحمت کی علامت یہ ہے کہ انسان اللہ کی رحمت کو محسوس کرے۔ اس طرح اللہ کی رحمت پھر انسان کو سینے سے لگا لیتی ہے اور رحمت الہی کی بارش ہو جاتی ہے۔ فیوض و برکات نازل ہوتے ہیں۔ لیکن کسی کا یہ شعور کہ اس پر اللہ کی رحمت ہے 'سب سے بڑی رحمت یہی ہے۔ کسی انسان کا صرف اللہ سے امیدوار ہونا' اسی پر بھروسہ کرنا رحمت ہے۔ ہر معاملے میں اللہ سے امیدیں وابستہ کرنا اور اللہ پر اعتماد کرنا ہی رحمت ہے۔ اور حقیقی عذاب یہ ہے کہ انسان اس سے چھپ جائے۔ اس سے مایوس ہو جائے اور اس میں شک کرے۔ یہ ایک ایسا عذاب ہے جو کسی مومن کے کبھی قریب ہی نہیں جاتا۔

اِنَّهُ لَا يَيْتَسُّ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ "اس میں شک نہیں ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس صرف کافر ہوا کرتے ہیں۔"

اللہ کی رحمت کا اگر کوئی طالب ہو تو وہ ہر کسی کو ہر جگہ مل جاتی ہے۔ کسی کے لیے ناپید نہیں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اسے آگ میں پایا۔ یونس علیہ السلام نے اسے مچھلی کے پیٹ کے اندھیروں میں پایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسے سمندر کی لہروں میں پایا جبکہ وہ طفل ناتواں تھے۔ پھر انہوں نے اسے فرعون کے محل میں پایا جبکہ وہ ان کا دشمن ہو گیا اور اس کی تلاش میں نکل گیا۔ اصحاب کف نے اسے غار میں پایا جبکہ محلات اور شہروں میں وہ اس سے محروم رہے جب انہوں نے یہ فیصلہ کیا۔

فَاَوْآاَ اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ (۱۸: ۱۶) "غار میں پناہ لے لو تمہارا رب تمہارے لیے اپنی رحمت کی چادر بچھا دے گا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق نے اسے غار میں پایا جبکہ کفار ان لوگوں کا تعاقب کر رہے تھے۔ اور ان کے قدموں کے نشانات کو تلاش کر کے دھانے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ رحمت ہر اس شخص کو ملتی ہے جو تمام دوسرے ذرائع سے مایوس ہو جائے اور اسے بالکل یہ امید نہ رہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور قوت بھی پچانے والی ہے اور وہ پوری طرح یقین کرتا ہو کہ اب اللہ کی رحمت ہی پچانے والی ہے اور تمام دروازوں کو چھوڑ کر وہ اللہ کے در پر سولی ہو گیا ہو۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر اللہ اپنی رحمت کا دروازہ کسی پر کھول دے تو اس کا بند کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور جب اللہ اپنی رحمت کے دروازے کسی پر بند کر دے تو کوئی کھولنے والا نہیں ہوتا۔ لہذا ایک سچے مومن کے دل میں کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ کسی سے کچھ امید نہیں رہتی۔ کسی چیز کے چلے جانے کا خوف نہیں رہتا اور کسی چیز کی امید نہیں رہتی۔ کسی ذریعے کے فوت ہونے کا ڈر نہیں ہوتا اور کسی وسیلے کی موجودگی کی بھی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی۔ اللہ کی مطلق مشیت ہی اصل یقین ہے۔ لہذا اللہ اپنی رحمت کے دروازے کھول دے تو کوئی بند کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ بند کر دے تو کوئی کھولنے والا نہیں ہے۔ معاملہ براہ راست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ عزیز و حکیم ہے۔ وہ ایسے اندازے اور تقدیر مقرر کرتا ہے کہ کسی کو روکنے یا عطا کرنے کا کوئی اختیار ہی نہیں رہتا۔ اللہ کی عطا اور اللہ کا روکنا اس کی اپنی رحمت کے مطابق ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی اپنی حکمتوں کے مطابق ہوتا ہے اور اللہ کے ہر کام کے پیچھے ایک حکمت کام کر رہی ہوتی ہے۔

مَا يَفْتَحُ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ”اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے اسے کوئی روکنے والا ہی نہیں ہے۔“ اللہ کی رحمت اور لوگوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔ لوگ براہ راست اللہ سے براہ راست طلب کر سکتے ہیں۔ وہ بلا واسطہ اور بلا وسیلہ طلب کر سکتے ہیں۔ صرف بندے کی طرف سے توجہ، اطاعت، امید، بھروسہ اور سرطاعت فہم کر دینے کی ضرورت ہے۔

وَمَا يُمْسِكُ فَنَّا مُرْسِلٌ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ ”اور جسے وہ بند کر دے اسے پھر اللہ کے سوا کوئی کھولنے والا نہیں ہے۔“ یہ آیت انسانی ضمیر کو انتہائی قرار و سکون اور انسانی شعور اور تصور کو نہایت ہی نمایاں کرتی اور انسانی اقدار اور پیمانوں کو اونچا معیار عطا کرتی ہے۔ انسانی شخصیت کو وقار اور اطمینان دیتا ہے۔

یہ ایک مختصر آیت ہے لیکن زندگی کے لیے بالکل ایک نیا نقشہ تیار کرتی ہے۔ انسانی تصور اور شعور کو نہایت مستحکم قدس عطا کرتی ہے۔ ایسی قدریں جن میں نہ تزلزل ہے نہ جھکاؤ اور نہ وہ دقتی باتوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ اثر انداز ہونے والے لیکن آئیں یا جائیں، بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں، عظیم ہوں یا چھوٹے ہوں، ان کا مہد لوگ ہوں یا واقعات ہوں، یا اشیاء ہوں، ان سے یہ قدریں متاثر نہیں ہوتیں۔

یہ زندگی کی ایک صورت ہے اگر یہ عقیدہ انسانی زندگی میں بیٹھ جائے تو وہ واقعات، اشیاء، افراد، بڑی بڑی قوتوں، اقدار اور حالات کے سامنے پہاڑ کی طرح سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو جائے۔ اگرچہ اس پر جن دافس باہم مل کر سب کے سب ٹوٹ پڑیں۔ یہ تمام جن دافس نہ اللہ کی رحمت کے دروازے کو بند کر سکتے اور نہ اگر بند ہوں تو کھول سکتے ہیں۔ صرف اللہ ہی العزیز اور الحکیم ہے۔

اسلام کے آغاز میں اسلام اور قرآن نے انسانوں کا ایک ایسا ہی گروہ پیدا کر دیا تھا۔ یہ ایسا گروہ تھا کہ اللہ نے خود اپنی نگرانی میں اس قرآن کے ذریعہ پیدا کر دیا تھا، تاکہ یہ گروہ قدرتِ الہیہ کے لیے دستِ قدرت ہو۔ یہ گروہ اس زمین کے اندر وہ عقائد و تصورات تخلیق کرے جنہیں اللہ چاہتا تھا۔ وہ قدریں عطا کرے جن کو اللہ کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ وہ حالات اور صورتِ حیات پیدا کر دے جو اللہ چاہتا تھا اور دنیا کے اندر ایک ایسی زندگی، عملی زندگی قائم کر کے چلا جائے جس کے بارے میں آج جب ہم پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں انسانہ اور قہے نظر آتے ہیں۔ وہ گروہ جو اللہ کی تقدیر تھا، اسے اللہ جس پر چاہتا تھا، مسلط کر دیتا تھا۔ اس کے ذریعہ اللہ نے کچھ کو اقوام کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور کچھ کو قائم کر دیا۔ جنہیں اللہ مٹانا چاہتا تھا یا جنہیں اللہ کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس لیے کہ یہ یہ گروہ اس قرآن کے الفاظ ہی کے ساتھ معاملہ نہ کرتا تھا، نہ خوبصورت نظریات و تصورات ہی سے بحث کرتا تھا بلکہ اس نے قرآن کو اپنی زندگیوں کے اندر عملاً قائم کر دیا تھا اور وہ گروہ قرآن کی دنیا میں زندہ رہتا تھا۔

وہی قرآن لوگوں کے پاس موجود ہے۔ یہ قرآن اب بھی ایسے گروہ پیدا کر سکتا ہے جو دنیا سے اقوام کو مٹا دیں اور دوسری اقوام کو اٹھا دیں۔ لیکن یہ تب ہو گا کہ قرآنی تصورات کسی گروہ کی زندگی میں ٹھوس شکل میں، عملی شکل میں بیٹھ جائیں، رائج ہو جائیں اور قرآن کسی گروہ کی زندگی میں چلا پھرتا نظر آئے۔ اسے لوگ آنکھوں سے دیکھ سکیں اور ہاتھوں سے چھو سکیں۔

اب میں اس طرف آتا ہوں کہ اس مختصر آیت کے ذریعے میں نے معلوم کر لیا ہے کہ اللہ کی مجھ پر خاص رحمت

ہے۔ میں نے جب اس آیت کا سامنا کیا تو میں روحانی لحاظ سے نہایت ہی خشک، فکری لحاظ سے بہت تنگ، نفسیاتی لحاظ سے بہت ہی پریشان، جسمانی اور ساز و سامان کے لحاظ سے مشکل حالات میں تھا۔ ایسے سخت اور شدید حالات میں میں نے اس آیت کا مطالعہ کیا۔ اللہ نے مجھے اس آیت کی حقیقت تک پہنچا دیا۔ یہ حقیقت میری روح میں انڈیل دی گئی۔ گویا وہ ایک شراب طور ہے جو میرے جسم کی رگ رگ میں سرایت کر رہی ہے اور میں اسے محسوس کر رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے جس کا میں ادراک کر رہا ہوں۔ محض تصور نہیں ہے۔ یہ حقیقت بذات خود میرے لیے رحمت ہے اور یہ آیت میرے سامنے خود اپنی تفسیر بیان کر رہی ہے۔ یہ ایک واقعی اور عملی تفسیر تھی۔ جس طرح اس آیت کے اسرار و رموز میرے سامنے کھلے اسی طرح اللہ کی رحمت کے دروازے بھی میرے سامنے کھلے۔ اس سے قبل میں اس آیت کو پڑھتا رہا اور اس آیت کے پاس سے اس سے قبل میں بار بار گزرا ہوں لیکن آج یہ آیت مجھ پر رحمت کا فیضان کر رہی ہے۔ میں اس کے معانی اور مفہومات سے سیراب ہو رہا ہوں۔ میں اس آیت کی حقیقت کو صاف صاف دیکھ رہا ہوں۔ یہ آیت مجھے پکار رہی ہے کہ آئیے میں ادھر ہوں۔ میں اللہ کی رحمت ہوں، جس کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے۔ ذرا دیکھیے اللہ کی رحمت کے کرشمے۔

غور کیجئے میرے ماحول کی کوئی چیز نہیں بدلی لیکن میرے احساس نے اب ہر چیز کو ایک نیا رنگ دے دیا ہے۔ یہ ایک نہایت عظیم رحمت ہے جو کسی پر ہو جاتی ہے۔ اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ جس طرح اس آیت کے خزانے مجھ پر کھل گئے۔ یہ ایک نعمت خداوندی ہے اور جب یہ کسی پر آتی ہے تو انسان اتے چمکتا ہے۔ اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے لیکن اس کے لیے اس کو بیان کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح اس احساس کو اور اس ذوق کو قلم بند کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ میں ایک عرصہ رحمت خداوندی کے اس فیضان میں زندہ رہا ہوں، اسے محسوس کرتا رہا ہوں اور اسے پہچانتا رہا ہوں۔ اپنی زندگی کے مشکل ترین حالات میں مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوئی ہے۔ اب میری حالت یہ ہے کہ میں کشادگی، خوشی، سیرابی، آزادی اور بے قیدی محسوس کرتا ہوں۔ ہر چیز سے آزادی، ہر کرب اور ہر رنج سے آزادی محسوس کرتا ہوں اور میں اسی جگہ ہوں، جہاں تھا۔ یہ اللہ کی رحمت ہی ہے جس کے دروازے مجھ پر کھل گئے ہیں۔ یہ اللہ کا فیض ہی ہے جس کی مجھ پر اس آیت کے ذریعہ بارش ہو رہی ہے۔ یہ آیت ہے، قرآن کی بس ایک ہی آیت لیکن اس نے تاریک کوٹھڑی میں روشنی کا ایک طاق کھول دیا ہے۔ اس نے میری سیرابی کے لیے خشک جگہ پر ایک چشمہ آبِ صافی بہا دیا ہے اور میں اب نہایت ہی کھلی شاہراہ پر رضائے الہی کی سمت نہایت ہی اطمینان کے ساتھ بڑھ رہا ہوں۔ اور چشم زون میں۔ اذیت کے بجائے میری زندگی راحت میں بدل گئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، حَمْدًا کَثِیْرًا ”لے پروردگار“ جس نے اس قرآن کو اللہ کی رحمت بنا کر بھیجا مومنین کے لیے رحمت اور شفاء اور ہدایت۔“

مطالعہ کلام الہی کے دوران یہ ایک چمکتی تھی جسے میں نے قلم بند کر دیا۔ اب دوبارہ ہم سورہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پہلی دو آیات کے اندر جو اشارات تھے وہی تیسری آیت میں بھی ہیں۔ لوگوں پر ان کے حوالے سے اللہ کے انعامات اور رحمتوں کا ذکر ہے۔ اللہ جس کے سوا کوئی اللہ مالک اور حاکم اور رازق نہیں ہے۔ تعجب انگیز اسلوب سے کہا جاتا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ لوگ یہ اختیارات اللہ کے سوا کسی اور معبود کو دیتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا اللّٰهَ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ

غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ قَالُوا تَوْفَكُونُ ۝

”لوگو! تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں انہیں یاد رکھو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟۔۔۔ کوئی معبود اس کے سوا نہیں، آخر تم کہاں سے دھوکا کھا رہے ہو؟“

اللہ کی نعمتوں کی تو یاد دہانی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ نعمتیں بہت ہی واضح اور کھلی ہیں، جو ان کو دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور چھوتے ہیں۔ لیکن وہ بھوس جاتے ہیں۔ ان کو یہ نعمتیں یاد نہیں رہتیں۔

ذرا اس زمین و آسمان اور انسان کو گھیرے ہوئے اس کائنات پر نگاہ دو ڈاؤ! ہر وقت اللہ کے انعامات انسان پر برسا رہی ہے۔ رزق کے دروازے ان پر کھل گئے ہیں۔ ہر قدم پر ایک نعمت ہے۔ ہر لحظہ میں ایک نیا فیض ہے۔ آسمانوں اور زمین سے انسان کے لیے سہویات چلی آرہی ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے آرہی ہیں جو وحدہ خالق و رازق ہے۔ اللہ کا فیض عام ہے اور یہ کس کی طرف سے ہے؟ سخت سے سخت مشرک بھی یہ نہیں کہہ سکتے۔

کیا ان فیوض و برکات اور رحمتوں کا نزول خالق کائنات اللہ کے سوا کوئی اور کر رہا ہے۔ جب اللہ کے سوا کوئی خالق اور رازق نہیں ہے تو پھر کیوں وہ صیحت حاصل کر کے شکر الہی بجا نہیں لاتے؟ پھر کیوں وہ اللہ کی حمد و ثنا نہیں کرتے اور صرف اسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور بندگی سے منہ موڑتے ہیں؟ اس کے سوا تو کوئی حاکم نہیں ہے۔ آخر وہ ایسے خدا پر ایمان لانے سے کیوں منہ موڑتے ہیں جس میں کوئی شک نہیں ہے۔

فَإِنِّي تُوفِّكُونُ (۳:۳۵) يَا أَيُّهَا النَّاسُ ”آخر تم کہاں دھوکہ کھا رہے ہو؟“ تعجب انگیز بات ہے کہ ایک ایسے واضح حق اور بین سچائی سے عقل مند ہوگ منہ موٹیں جو رات اور دن انہیں رزق بھی دے رہا ہے اور پھر اس سے بڑا تعجب خیز امر اور کیا ہو گا کہ ہوگ رب زد الجلال کا انکار بھی نہیں کر پاتے اور اس کا اعتراف بھی نہیں کرتے؟

یہ تین ضربت تھیں، نہایت ہی قوی اور تیز جو عقل و خرد کی تاروں پر لگائی گئیں اور سورہ کا آغاز ہوا تا کہ پوری سورہ کے زمرے کو لوگ توجہ سے سنیں۔ ہر آیت میں انسان کو جو تعلیم دی گئی ہے وہ انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے اور اس کے شعور میں ایک گہری حقیقت کے طور پر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ تینوں ضربات باہم مربوط اور متناسب ہیں اور مختلف سمتوں سے ایک ہی اثر ڈالتی ہیں۔

— ○ ○ ○ —

درس نمبر ۲۰۰ ایک نظر میں

پہلا سبق اس کائنات کے نہایت ہی بنیادی تین حقائق پر تھا۔ یعنی یہ کہ اس کائنات کا خالق اور موجد اللہ وحدہ ہے۔ رحمت کا خزانہ اسی کے پاس ہے اور رازق بھی وہی وحدہ ہے۔ اس دوسرے سبق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ ان لوگوں کی تکذیب اور انکار سے پریشان نہ ہوں۔ ان کا اور ان کے رد عمل کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں اور لوگوں سے زور دار اور بلند آواز کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ قیامت برحق ہے اور شیطان سے خبردار رہیں کیونکہ اس کا مشن ہی یہ ہے کہ تمہیں ان عظیم حقائق سے بدراہ کرے۔ تمام لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ جو ایمان لائیں گے ان کا صلہ کیا ہو گا اور جو شیطان کے دھوکے میں آجائیں گے ان کا انجام کیا ہو گا۔ آخر میں دوبارہ حضور اکرمؐ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو پریشان کر کے اپنی جان نہ گھمائیں۔ ہدایت و ضلالت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگوں کی صنعت کاریوں کے بدلے ان کو ملتی ہے اور اللہ ان کے کارناموں سے واقف ہے۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۰۰ تشریح آیات

۴ --- تا --- ۸

وَإِنْ يَكْذِبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝

”اب اگر (اے نبیؐ) یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) تم سے پہلے بھی بہت سے رسولؐ جھٹلائے جا چکے ہیں اور سارے معاملات آخر کار اللہ ہی کی طرف رجوع ہونے والے ہیں۔“
یہ عظیم حقائق بالکل واضح ہیں۔ اگر پھر بھی یہ لوگ تکذیب کرتے ہیں تو آپؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کیا آپؐ سے پہلے رسولؐ نہیں آئے رہے۔

فَقَدْ كَذَّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ (۳۵: ۴) ”تم سے پہلے بہت سے رسولؐ جھٹلائے جا چکے ہیں۔“ تمام امور اللہ کے لیے ہیں اور تمام معاملات کے فیصلے اللہ کی طرف جاتے ہیں۔ تبلیغ و تکذیب تو ایک ردِ مین کام ہے۔ یہ اللہ نے اسباب مقرر کیے ہیں۔ انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انجام کی تدبیر وہ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ لوگوں کو دوسری آواز یہ دی جاتی ہے کہ خبردار!

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ
الدُّنْيَا ۖ وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغُرُورُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ
عَدُوًّا ۚ إِنَّمَا يَدْعُوا حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِن أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝

”لوگو! اللہ کا وعدہ یقیناً برحق ہے، لہذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ وہ بڑا دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے پائے، درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے پیروں کو اپنی راہ پر اس لیے بلاتا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں۔“

اللہ کا وعدہ برحق ہے اور وہ واقع ہونے والا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ جب یہ حق ہے تو حق ہوتا ہی وہ ہے جو واقع ہونے والا ہو۔ حق نہ ضائع ہوتا ہے نہ باطل ہوتا ہے اور نہ کالعدم ہوتا ہے نہ اپنا دھار اور راستہ بدلتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان کو صرف یہ دنیاوی زندگی دھوکہ دیتی ہے۔

فَلَا تُغْنِیْکُمُ الْحَیْوَةُ الدُّنْیَا (۵:۳۵) ”لہذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکہ نہ دے۔“ لیکن شیطان تو رات اور دن لگا ہوا ہے دھوکہ دینے میں اس لیے تم کو چاہئے کہ اس سے چوکنے رہو۔

وَلَا یَغْنِیْکُمْ بِاللّٰهِ الْغُرُورُ (۵:۳۵) ”اور نہ کوئی بزدل دھوکہ باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے پائے۔“ شیطان نے اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ تمہارا دشمن ہے اور اسے تمہاری دشمنی پر اصرار بھی ہے۔

فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا (۶:۳۵) ”لہذا تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔“ اس کی طرف نہ جھکو اسے اپنا ناصح نہ سمجھو۔ اس کے نقش قدم پر نہ چلو کیونکہ دشمن دشمن کے قدم پر نہیں چلا کرتا۔ اگر وہ غلط ہے کیونکہ دشمن انسان کو بھی بھی بھلائی کی طرف نہیں بلاتا اور نہ دشمن دشمن کی فلاح و نجات چاہتا ہے۔

اِنَّمَا یَدْعُوْا حَرِبْهُ لَیْکُمْ اَمِنْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (۶:۳۵) ”وہ تو اپنے پیروں کو اپنی راہ پر اس لیے چلا رہا ہوتا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں۔“ کیا کوئی عاقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ چہیزوں میں سے ہو جائے۔

یہ ایک وجدانی احساس ہے۔ جب انسان اس بات کو ذہن میں رکھ لے کہ اس کے اور شیطان کے درمیان معرکہ جاری ہے تو وہ اپنی پوری قوت مجتمع کر لیتا ہے۔ وہ ہر وقت بیدار رہتا ہے اور اپنی ذات اور اپنے خیالات کا دفاع کرتا ہے۔ وہ دشمن کے دھوکے اور گمراہ کن اندامات سے اپنے آپ کو بچاتا ہے اور وہ ہر دوسرے اندازی سے بیدار رہتا ہے۔ ہر نئی بات کو اللہ اور رسول کے بیانیوں سے پیمائش کرتا ہے تاکہ وہ معلوم کر سکے کہ یہ حقیقت ہے یا دھوکہ ہے۔

یہ ایک وجدانی حالت ہے جسے قرآن ہر ضمیر میں پیدا کرنا چاہتا ہے یعنی ہر وقت شیطانی دسائوس سے بچاؤ کے لیے تیار رہنا اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنا۔ جیسا کہ کوئی شخص یا ملک اپنے دشمن سے ہر وقت چوکنار رہتا ہے۔ اور اس کے شرفساد کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ دشمن کے ذہنی اور جسمانی شرے سے بچاؤ کے لیے۔ اور ہر وقت کسی بھی معرکہ میں کودنے کے لیے تیاری کی حالت کا برقرار رکھنا اسی احتیاطی تدابیر تیاری اور احتیاطی تدابیر کو مزید مستحکم کرنے کے لیے بتایا جاتا ہے کہ کافرن کا انجام کیا ہو گا اور اہل اسلام کا کیا ہو گا۔

الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

الصَّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ کَبِیْرٌ

ع

۱۳

”جو لوگ کفر کریں گے ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔“ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ شیطان کس طرح انسان کو گمراہ کرتا ہے اور شیطان کا عمل اور اس کی گمراہ کن چالیں کیسی ہوتی ہیں۔ وہ کون سا دروازہ کھول دیتا ہے جس سے ہر قسم کا شرور آتا ہے۔ کس طرح وہ انسان کو راہ

ظلمات پر دور تک لے جاتا ہے تاکہ وہاں سے کوئی دلہن نہ آ سکے۔

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ قَرَآءَ حَسَنًا فَإِنَّ اللَّهَ
يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَتًا
إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ۝

(بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس شخص کی گمراہی کا) جس کے لیے اس کا برا عمل خوش بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے اچھا سمجھ رہا ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے 'راہ راست دکھا دیتا ہے۔ پس (اے نبیؐ) خواہ خواہ تمہاری جان ان لوگوں کی خاطر غم و افسوس میں نہ گھلے۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں 'اللہ اس کو خوب جانتا ہے'۔

شر کا دروازہ اور اس کی کنجی یہ ہے کہ انسان کے لیے اس کے برے اعمال کو اچھا بنا دیا جائے۔ شیطان یہی کام کرتا ہے کہ انسان کے لیے اس کے برے اعمال اچھے بنا دیے جاتے ہیں اور وہ برے کاموں کو اچھے کام سمجھتا ہے۔ وہ جس قدر برے افعال کرتا ہے 'وہ سمجھتا ہے کہ وہ اچھا کر رہا ہے اور وہ کام اسے لگتے بھی اچھے ہیں۔ ایسا شخص کبھی اپنے اعمال کا جائزہ بھی نہیں لیتا کہ ان میں کیا کیا غلطی کے مقامات ہیں کیونکہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ غلطی نہیں کرتا۔ اسے بخت یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ کتا اور کرتا ہے 'وہ درست ہے۔ وہ اپنے قول و عمل پر اترتا ہے اور اپنے کاموں سے اسے عشق ہو جاتا ہے۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آتا ہے کہ وہ اپنے کسی کام پر نظر ثانی کرے یا اپنا محاسبہ خود کرے۔ لہذا وہ اپنے کسی خیال اور کسی عمل سے رجوع نہیں کرتا۔ کیونکہ جب کوئی سمجھے کہ وہ اچھا کر رہا ہے تو وہ کس طرح اسے چھوڑ سکتا ہے کیونکہ اچھے کام کبھی نقصان دہ نہیں ہوتے۔

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ قَرَآءَ حَسَنًا (۸:۳۵) ”بھلا ہے کچھ ٹھکانا اس شخص کی گمراہی کا جس کے لیے اس کا برا عمل خوش بنا دیا گیا ہو۔“

یہ ہے وہ عظیم مصیبت جو انسان پر شیطان لا دیتا ہے اور یہ ہے وہ مقام جہاں تک شیطان انسان کی راہنمائی کر کے اسے لے جاتا ہے۔ پہلے اسے گمراہ کرتا ہے 'پھر اسے ہدایت کے گڑھے میں گراتا ہے۔

جس شخص کے لیے اللہ ہدایت اور بھلائی لکھ دیتا ہے اس کے دل میں احساس 'شعور' احتیاط اور غور و فکر کی عادت ڈال دیتا ہے۔ وہ اللہ کی تدبیروں سے غافل نہیں رہتا۔ اور نہ اس بات سے غافل ہوتا ہے کہ اللہ انسان کے دل کو کسی بھی وقت بدل سکتا ہے۔ نہ وہ انسان کی فطری کمزوری 'تزلزل اور خطا کاری سے غافل رہتا ہے۔ نہ وہ انسان کے فطری نقص اور عاجزی کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ ایسا شخص ہر وقت اپنے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔ ہر وقت اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ اپنے بارے میں بہت حساس رہتا ہے۔ وہ شیطان سے ہر وقت ڈرتا ہے اور ہر وقت اللہ کی مدد اور نصرت کا امیدوار ہوتا ہے۔

یہ ہے مقام امتیاز اور جدائی ہدایت و ضلالت اور فلاح اور بربادی کے درمیان۔۔۔۔۔ یہ ایک گہری نفسیاتی حقیقت ہے

جس کی تصویر کشی قرآن کریم ان الفاظ میں کرتا ہے۔

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَاهُ حَسَنًا (۸: ۳۵) ”بھلا کچھ نکماتا ہے اس شخص کی گمراہی کا جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے اچھا سمجھ رہا ہو۔“

یہ ہے نمونہ اس گمراہ شخص کا جو تباہ و برباد ہو گیا اور آخر کار وہ ہلاکت کے برے انجام تک پہنچ گیا اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اس کے لیے اس کے برے اعمال کو مزین بنا دیا گیا۔ اس خوشنمائی کی وجہ سے وہ مغرور ہو گیا۔ یوں اس شخص کے دل پر اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ صحیح راہ کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ ایسا شخص کوئی اچھا کام بھی نہیں کر سکتا اس لیے کہ وہ خود اپنے کام کو اچھا سمجھتا ہے۔ ایسا شخص اپنی غلطی کی اصلاح بھی نہیں کر سکتا اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس سے غلطی سرزد ہی نہیں ہو سکتی۔ وہ کسی فاسد کام کی اصلاح بھی نہیں کر سکتا کیونکہ زعم خود اس سے فاسد کام کا صدور ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص ایک حد پر جا کر رکتا بھی نہیں کیونکہ وہ اپنے ہر قدم کو اصلاح سمجھتا ہے۔ فرض شیطان کا صرف یہی کام تمام فسادوں کا دروازہ ہے اور آخری گمراہی کی چابی ہے۔

یہاں اللہ سوال فرماتے ہیں کہ اس شخص کی گمراہی کی کیا حد ہوگی جس کے لیے اس کے برے اعمال خوبصورت بنا دیئے گئے ہیں اور وہ انہیں اچھا سمجھتا ہے؟ اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ اس کا کوئی جو جواب بھی دے وہی جواب ہو گا۔ کیا ایسے شخص کی اصلاح کی امید کی جا سکتی ہے؟ کیا یہ شخص اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو ہر وقت اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا رہتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے۔ کیا یہ شخص اللہ سے ڈرنے والوں جیسا ہو سکتا ہے۔ غرض اس سوال کا اب جو جواب بھی دس وہی جواب ہو گا۔ یہ وہ اسلوب ہے جو قرآن کریم میں بہت آتا ہے۔ لیکن اس میں ان جوابات میں سے ایک جواب کی طرف بالواسطہ اشارہ کر دیا گیا ہے۔

فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ

حَسَرَات (۸: ۳۵) ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھاتا ہے۔“ مگر یہ جو اب دیا گیا کہ جس شخص کے لیے شیطان اس کے اعمال کو خوشنما بنا دے ایسے شخص پر ضلالت لکھ دی جاتی ہے۔ اس کے لیے اللہ نے ضلالت کا راستہ کھول دیا ہے۔ وہ اس کے اندر چلا گیا ہے اس کی دلیلی کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ اللہ کا اختیار ہے کہ وہ جسے چاہے ہدایت دے دے اور جسے چاہے ضلالت دے دے۔ یوں کہ جو شخص طالب ضلالت ہوتا ہے اسے ضلالت ملتی ہے اور جو طالب ہدایت ہوتا ہے اسے ہدایت مل جاتی ہے۔ ضلالت کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ برے اعمال کو اچھا دکھاتی ہے اور ہدایت کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ ہدایت پانے والے ہر معاملے میں محتاط ہوتا ہے، ڈرتا ہے، محاسبہ کرتا ہے اور یہی فرق ہے ہدایت اور ضلالت کا۔

اور جب فیصلہ یہی ہے۔

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَات (۸: ۳۵) ”آپ اپنی جان کو ان لوگوں کے غم میں نہ

مکملائیں۔“ یہ معاملہ ہدایت و ضلالت کا معاملہ ہے جو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ یہ بشر خود رسول اللہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ دل اللہ کی انگلیوں کے درمیان رہیں اور اللہ مقلب القلوب ہے۔ اس طرح اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قلب دیتے ہیں۔ تاکہ آپ کا رحیم و شفیق دل قرار پکڑے کیونکہ آپ سے ان لوگوں کی گمراہی دیکھی نہ جاتی تھی۔ جبکہ آپ دیکھ رہے تھے کہ ان بیچاروں کا کس قدر برا انجام ہونے والا ہے اس لیے آپ کا دل خوش مارتا تھا کہ آپ ان کے سامنے جو حق پیش کر رہے ہیں وہ اتنا تسلیم کر لیں۔ یہ انسانی حرص ہے ہر شخص جانتا ہے کہ انسان جس چیز کو پسند کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ اسے قبول کر لیں اور اللہ کو رسول اللہ سے ہمدردی ہے کہ انکے احساسات پر یہ ناحق بوجھ ہے کیونکہ یہ حضور کے اختیار اور استطاعت میں نہیں ہے کہ وہ سب کو ہدایت میں لے آئیں یہ کام اللہ کا ہے۔

تمام مخلص دانیوں کو اس کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کی اہمیت 'خوبصورتی اور افادیت کو دیکھتے ہیں۔ دو سری جانب عوام کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس سے رد گردانی کرتے ہیں۔ وہ اس خوبصورتی 'افادیت اور حسن کو محسوس نہیں کر سکتے جو داعی محسوس کرتا ہے۔ اس عدم احساس کی وجہ سے یہ اس دعوت سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ لہذا ایسے مخلص داعیوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کی اس ہدایت کو پہلے باندھ لیں۔ اپنی پوری قوت دعوت میں جھونک دیں اور پھر لوگوں کو اللہ کے سپرد کر دیں۔ اگر کسی قوم کے لیے اللہ نے سچائی کو مقدر نہ کیا ہو تو اسے اپنے حال پر چھوڑ دیں اور مایوس نہ ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَاۤ يَصْنَعُوْنَ (۸:۳۵) ”جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔“ وہی ہدایت کی تقسیم کرتا ہے اور کسی کے لیے ضلالت مقدر کرتا ہے۔ یہ سب کام اس کے علم اور اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ ان باتوں کو اس وقت سے جانتا ہے جب ان کا صدور بھی نہیں ہوا ہوتا۔ اسے پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہو گا۔ یہ تقسیم اس نے علم ازلی سے کر لی ہوئی ہے۔ لیکن اللہ اپنے علم ازلی کی بنیاد پر سزا نہیں دیتا۔ سزا اس وقت دیتا ہے جب ان سے اس معصیت کا صدور ہوتا ہے۔ یہاں دو سراسمیت ختم ہوتا ہے۔ اس سبق اور پہلے سبق کے درمیان گہرا ربط ہے اسی طرح آنے والے سبق سے بھی ربط ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۰ ایک نظر میں

یہ تیسرا سبق دراصل پہلے درجے کے اسفار پر مشتمل ہے۔ یہ سفر انسانی خیال کو 'اس کائنات کی وسعتوں میں کرائے گئے ہیں اور قرآن نے ان اسفار میں انسان کو دلائل ایمان سے آگاہ کیا ہے۔ ان اسفار کے درمیان انسان کو جو مظاہر دکھائے گئے ہیں ان سے قرآن دعوت اسلامی پر دلائل و براہین فراہم کرتا ہے۔

یہ اسفار اس مضمون کے بعد آئے ہیں کہ ہدایت و ضلالت کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ آپ منہ موڑنے والوں کے رویہ کی کوئی پرواہ نہ کریں اور ان کا معاملہ اس اللہ کے سپرد کر دیں جو ان کی تمام کارستانیوں سے باخبر ہے۔ اس سبق کا مضمون یہ ہے کہ اگر کوئی ایمان لانا چاہتا ہے تو یہ دیکھو دلائل ایمان اس کائنات میں جہاں بکھرے پڑے ہیں۔ جس کے اندر کوئی پیچیدگی نہیں ہے لیکن بہر حال اگر کوئی گمراہ ہوتا ہے تو وہ اس حال میں گمراہ ہو گا کہ دلائل ایمان ہر طرف سے اس کا گھیرا ڈالے ہوئے ہوں گے۔

صرف ایک منظر پر غور کرو 'یہ زمین بالکل مردہ ہونے کے بعد سرسبز ہو جاتی اور زندہ و تابندہ ہو جاتی ہے۔ کیا اس میں اس بات کے لیے دلیل نہیں ہے کہ موت کے بعد اسی طرح لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ پھر انسان کو نمٹی سے پیدا کیا گیا اور اسے اس کی موجودہ شکل میں ایک نہایت ہی برتر مخلوق بنایا گیا۔ یہ بھی ایک برہان ہے۔ پھر انسانی تخلیق کے مراحل میں سے ہر مرحلہ ایک حجت ہے اور انسان اپنے تخلیقی مراحل میں نہایت ہی طے شدہ نقشے کے مطابق آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے اور یہ نقشہ بھی کتاب مبین میں درج ہے اور ایک برہان ہے۔

پھر دو قسم کے پانی ایک ہی سمندر میں علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔ ایک میٹھا ہے دو سڑا کھارا ہے۔ یہ بھی ایک حجت ہے۔ اور سمندروں کے اندر مزید اللہ کی نعمتیں ہیں اور ہر ایک چیز میں اللہ کی کبریائی ہے۔

پھر رات اور دن کا منظر جو ایک دوسرے کے اندر داخل ہوتے ہیں 'بڑھتے گھٹتے ہیں۔ یہ بھی ایک حجت ہے اور اس نظام کو جاری کرنے میں بھی ایک حجت ہے۔ شمس و قمر کو ایک نظام کے اندر مسخر کر دیا جاتا ہے ایک حجت اور دلیل ہے۔

یہ سب دلائل و براہین اس کائنات کے اندر بکھرے ہوئے ہیں اور یہ اللہ ہے جو خالق و مالک ہے اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسرے معبود سمجھے جاتے ہیں۔ وہ تو ایک گھٹلی کے برابر بھی تخلیق نہیں کر سکتے۔ جو نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دیتے ہیں۔ وہ قیامت کے دن ان کی عبادت سے براءت کا اظہار کریں گے اور یہ فیصلہ دیں گے کہ یہ لوگ گمراہ تھے اور سچائی کے علاوہ جو کچھ بھی ہے 'گمراہی ہے۔

درس نمبر ۲۰ تشریح آیات

۹۔۔۔ تا۔۔۔ ۱۴

وَاللّٰهُ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیْحَ فَتُثَوِّرُ سَحَابًا ۖ فَنُقْتَلُ اِلٰی بَلَدٍ
مَّيِّتٍ ۖ فَاحْيِنَا ۚ بِهٖ الْاَرْضُ ۚ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ﴿۹﴾

”وہ اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں پھر ہم اسے ایک اجاڑ علاقے کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے اسی زمین کو جلا اٹھاتے ہیں جو مری پڑی تھی۔ مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہو گا۔“
یہ منظر قرآن میں دلائل تکوینی کے بیان کے دوران بار بار آتا ہے۔ ہواؤں کا منظر، بادلوں کا منظر، سمندروں کا منظر۔ بادلوں کو ہواؤں کا چلانا، سمندروں سے بخارات کا اٹھنا۔ گرم ہوائیں بخارات اٹھاتی ہیں۔ سرد ہوائیں ان کو کثیف کر کے بادل کی شکل دیتی ہیں۔ سمندروں سے یہ بخارات اور بادل پھر ہوا کی موجوں کی سمت میں شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی طرف چلتے ہیں جس طرف بھی اللہ کو ان کا چلانا منظور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ کر برستے ہیں اور جہاں مردہ زمینوں پر بارش ہوتی ہے۔ وہاں زمین زندہ ہو جاتی ہے۔

فَاحْيِنَا ۚ بِهٖ الْاَرْضُ ۚ بَعْدَ مَوْتِهَا (۹:۳۵) ”اور اس کے ذریعے سے اس زمین کو جلا اٹھاتے ہیں جو مری پڑی تھی۔“ یوں یہ معجزہ برپا ہوتا ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ہر لحظہ اس قسم کے معجزات دیکھتے ہوئے بھی انہیں قیامت میں لوگوں کا اٹھایا جانا مسجد نظر آتا ہے حالانکہ مشر و شر تو ان کے ہاتھوں میں اس دنیا میں موجود ہے۔

كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (۹:۳۵) ”مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہو گا۔“ یہی سادہ طریق استدلال ہے قرآن کا۔ اسی طرح آسانی سے یہ عمل ہو گا اللہ کے لیے اس میں کوئی دقت نہیں ہے۔

یہ منظر قرآن میں کائناتی دلائل کے بیان کے دوران بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ منظر ایسا ہے جسے ہر شخص دیکھتا ہے اور اس کے انکار کا کوئی جواز انسان کے سامنے نہیں ہے۔ پھر یہ منظر انسان کو بے حد مجبور کرتا ہے بشرطیکہ انسان اسے دیکھیں۔ اسے سمجھیں اس حال میں کہ ان کے دل زندہ ہوں اور جب بھی انسان اس منظر پر غور کرے تو یہ انسانی شعور پر چھا جاتا ہے۔ پھر یہ منظر ایک خوبصورت اور پسندیدہ منظر ہے۔ خصوصاً صحرائی علاقوں میں جہاں انسان ریگستانوں میں

جتا رہتا ہے۔ اچانک جب سرسبز اور شاداب علاقہ آ جاتا ہے تو انسان کی نگاہ گردیدہ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ کل جب بارش نہ ہوئی تھی تو یہی علاقہ پھیل میدان اور خشک صحرا تھا۔ قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ اپنے دلائل ایسے مناظر سے اخذ کرتا ہے جو انسان نے دیکھے ہوئے ہوں۔ جبکہ ان مناظر سے انسان روز گزرتے ہیں لیکن نہایت غفلت سے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ان مناظر پر انسان غور کرتا ہے تو اسے یہ منظر معجزات نظر آتے ہیں۔

اب روئے سخن مردہ زمین کے احیاء کے موضوع سے بحث کر نفیاتی شعور کے میدان میں آتے ہیں۔ موضوع کی یہ تہدیلی بظاہر عجیب لگتی ہے یہ کہ عزت، سرمدی، قوت اور شوکت کا سرچشمہ کیا ہے؟ اور عزت اور سرمدی کو مربوط کیا جاتا ہے۔ قول طیب اور قوس صالح کے ساتھ، کیونکہ قول صالح بھی اللہ کی طرف اٹھتا ہے اور عمل صالح بھی عزت اور رفعت پاتا ہے اور اس کے مقابلے میں قوس خبیث اور عمل خبیث سرنگوں ہو کر ہلاکت اور تباہی کی طرف آتے ہیں۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يُبَوِّرُهُ

”جو کوئی عزت چاہتا ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔ اس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے، اور عمل صالح اس کو اوپر چڑھاتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو بے ہودہ چال بازیاں کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کا مکر خود ہی عارت ہونے والا ہے۔“

شاید مردہ زمین میں اٹھنے والی نباتاتی زندگی اور کلمہ طیبہ اور عمل صالح کے درمیان ربط یہ ہے کہ دونوں میں پاکیزہ زندگی اور تدر مشرک ہے۔ نباتات کی بھی طیبہ زندگی ہے اور عمل صالح اور کلمہ طیبہ بھی پاک زندگی ہے۔ اور ان کے درمیان ربط اور تعلق وہی ہے جس کی طرف سورہ ابراہیم کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی کائنات کے مزاج اور اسلامی زندگی کے مزاج کی یکسانی سورہ ابراہیم میں فرمایا:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ صَرَّبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۲۴) تُؤْتِي أُكْلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۲۵) وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ فَوْقَ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ

قَرَار (۲۶) (ابراہیم ۲۴ تا ۲۶) ”کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے۔ اس کی مثال اُسی ہے جیسے ایک اچھی ذلت کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی

ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب۔۔۔ ختم۔ اپنے پھل و بار بار ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ اس سے سبق لیں اور کلمہ خیشہ کی مثال ایک بہت درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے۔ یہ ایک حقیقی ستبہت ہے جو ایک پاک کلمہ اور پاک درخت کے درمیان پائی جاتی ہے۔ دونوں کے اندر حیات اور برہنہ موجود ہے۔ ایک کلمہ اور نظریہ بھی نشوونما پاتا ہے اور بار آور ہوتا ہے اور ایک درخت بھی نشوونما پاتا ہے اور پھل دیتا ہے۔ دونوں کی ایک ہی مثال ہے۔

مشرکین اس لیے ترک کرتے تھے کہ مکہ کے اندر ان کا جو دیں تمام تھا وہ برقرار رہے۔ محض عقیدے اور نظریہ کی وجہ سے وہ دوسرے قبائل سے برتر تسلیم کیے جاتے تھے۔ پھر ان کو مان مفادات بھی حاصل تھے۔ مثلاً ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس وجہ سے وہ پر شوکت اور پر قوت تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے۔

اِنْ تَتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نَتَّخِطْ مِنْ رَّضٰنًا ۝ اَگر تمہارے ساتھ ہدایت کے تابع ہو جائیں تو ہمیں ہماری زمین سے اچک لیا جائے گا۔۔۔ لہذا اللہ فرماتا ہے :

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا (۳۵: ۱۰) ”جو کوئی عزت چاہتا ہو اسے معصوم ہونا چاہئے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔“ یہ حقیقت جب کسی کے دل میں بیٹھ جائے تو اس انسان کی قدس اور حسن و قبح کے اصول بدل جاتے ہیں۔ ان قدروں کے حصول کے درائع اور منصوبے ہی بدل جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عزت سب کی سب اللہ کے لیے ہے اور عزت کا کوئی حصہ بھی اللہ کے سوا کسی کا نہیں ہے۔ اگر کوئی عزت چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ عزت اپنے مصدر حقیقی سے صلب کرے اور اللہ کے سوا عزت کا کوئی سرچشمہ نہیں ہے۔ اگر کوئی اللہ کے ہاں عزت طلب کرے گا تو وہاں لازماً جائے گا اور اسے عزت ضرور ملے گی اور اگر کسی اور دروازہ پر عزت تلاش کرے گا تو خوار ہو گا اس لیے کہ۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا ”عزت تو سب کی سب اللہ کے ہاں ہے۔“

قریش اپنے بت پرستانہ عقیدے کی وجہ سے لوگوں سے عزت چاہتے تھے۔ وہ لوگوں کے علی الرغم ہدایت قبول کرنے سے ڈرتے تھے حالانکہ وہ سمجھتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو دعوت دیتے ہیں وہ ہدایت ہے۔ وہ اس لیے ڈرتے تھے کہ ان کے مقام و مرتبہ میں فرق نہ آجائے۔ جن عوام اور قبائل سے وہ ڈرتے تھے ان کے پاس عزت کا کوئی سرچشمہ ہی نہ تھا۔ وہ عزت کے مالک ہی نہ تھے۔ عزت کا مالک تو اللہ ہے۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا ”بے شک عزت اللہ کی ہے۔“ اگر قریش قوی تھے تو قوت کا مصدر بھی اللہ ہی ہے۔ لہذا ان کا فرض ہے کہ وہ عزت اور قوت اور شوکت اپنے اصلی مصدر سے لیں لوگوں سے نہ لیں۔ یہ لوگ تو خود عزت کے طالب و محتاج اور کمزور ہیں۔

اسلامی نظریہ حیات کے حقائق میں سے یہ اولین حقیقت ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ اگر کسی کے ذہن میں بیٹھ جائے تو اس کی قدس بدل کر رکھ دیتی ہے۔ حسن و قبح کے پیمانے بدل دیتی ہے۔ اقوام کے فیصلے اور ان کی تقدیریں بدل دیتی ہے۔ ان کا منہاج زندگی اور طرز عمل بدل جاتا ہے۔ وہ اپنے اسباب و وسائل بدل دیتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم صرف

اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیں اور پھر پوری دنیا کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں۔ پھر ہم دنیا میں نہایت معزز و پر وقار اور مستقل مقام و مرتبہ پائیں گے۔ اقوام عالم میں ہمارا وزن ہو گا۔ یہی ہے عزت و وقار کا طریقہ۔ ایک مسلمان کے لیے اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔

جب کسی دل میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو وہ دل پھر کسی جبار و قہار کے سامنے نہیں جھکتا۔ وہ کسی تند و تیز طوفان سے بھی نہیں ڈرتا۔ کوئی عظیم حادثہ بھی اس کے عزائم کو ختم نہیں کر سکتا۔ کوئی صورت حال اور کوئی حکومت اسے متاثر نہیں کر سکتی۔ کوئی مملکت اور کوئی مصلحت اسے متاثر نہیں کر سکتی۔ اس کرۂ ارض کی قوتوں میں سے کوئی قوت اسے نہیں جھکا سکتی اور کیوں ایسا ہو سکے؟ جب کہ ہر قسم کی قوت کا سرچشمہ اللہ کے پاس ہے اور اس کے سوا کسی کے پاس کوئی قوت نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں کلمہ طیبہ اور عمل صالح کا ذکر ہوتا ہے۔

اللّٰہُ یَصْعَدُ الْکَلِمَ الطَّیِّبَ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهُ (۳۵: ۱۰) ”اس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ پاکیزہ قول ہے اور عمل صالح اس کو اوپر اٹھاتا ہے۔“

اس عظیم حقیقت کے ذکر کے بعد اس تہمید کا ایک خاص مفہوم اور اشارہ ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کوئی عزت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے ذرائع کیا ہیں؟ وہ ہیں قول طیب اور عمل صالح۔ توں طیب سیدھا اللہ کی طرف بلند ہوتا ہے اور عمل صالح اللہ کی طرف اٹھایا جاتا ہے۔ یوں اللہ عمل صالح کو مکرم بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قول طیب اور عمل صالح کے مالک ہمیشہ سر بلند اور معزز اور مکرم ہوتے ہیں اور ان کو عزت عطا ہوتی ہے۔

صحیح عزت وہ ہوتی ہے جو قبل اس کے کہ اس دنیا میں وہ نمودار ہو یا اس کے آثار نمودار ہوں ایک شخص کے قلب میں بیٹھتی ہے۔ جب یہ حقیقت کسی دل میں بیٹھ جائے تو ایسا شخص ذات اور سرگونی کے تمام اسباب کے دائرے سے ہر نکل آتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جب کسی کے دل میں بیٹھ جائے تو سب سے پہلے تو وہ خود اپنے نفس امارہ پر قابو پا لیتا ہے۔ یہ سب سے پہلے اپنی سفلی خواہشات کو کنٹرول کر لیتا ہے۔ جب کوئی انسان ان انسانی کمزوریوں پر قابو پالے تو پھر اس کو دلیل کرنے اور تابع کرنے کا کوئی سبب ہی نہیں رہتا۔ لوگوں کو جو چیز دلیل کر کے رکھ دیتی ہے وہ ان کی خواہشات اور رغبات ہوتی ہیں۔ ڈر اور لالچ ہوتا ہے اور جو شخص ان کمزوریوں پر غالب آجاتے وہ گویا تمام انسانوں پر غالب آگیا۔ اور وہ یہ حقیقی عزت ہے جس کے ذریعے انسان سر بلند، قوی اور نڈر ہو جاتا ہے۔

عزت یہ نہیں ہے کہ انسان حق کے ساتھ معاند ہو، خود سر ہو اور باغی ہو اور باطل کو بلند کرنے کی سعی کرتا ہو نہ قوت اس بات کا نام ہے کہ کوئی فاسق و فاجر ہو جائے، اللہ کا باغی اور نافرمان ہو جائے اور نہایت ہی جبر اور اصرار کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کرے اور نہ قوت اس بات کا نام ہے کہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے کوئی آزادانہ شہوت رانی اور بے حیائی کا رویہ اختیار کرے۔ نہ قوت یہ ہے کہ کوئی بغیر کسی اصول اور ضابطے کے طاقت کا استعمال کرے اور انصاف اور اصلاح کے مقاصد کے بغیر پکڑ دھکڑ تر دوغ کر دے۔ ہرگز نہیں بلکہ قوت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پالے۔ انسان ذلت اور غلامی کا مقابلہ کرے، اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے نہ جھکے اور صرف اللہ کے سامنے عاجزی اور خشوع کرے، اللہ کا خوف کرے، اس سے ڈرے، خوشی اور غم دونوں حالتوں میں اللہ سے ڈرے۔ جب کوئی ایسی قوت حاصل کر لے تو پھر اس کی پیشانی بلند ہوگی اور ایسا انسان ہر اس بات کا مقابلہ کر سکے گا جسے اس کا ضمیر پسند نہ کرتا ہو۔ اور ایسا انسان اللہ

کی رضا کے سوا کسی اور چیز کو خاطر میں نہ لاتے گا۔ یہ بے کلمہ طیبہ اور عمل صالح کا مقام۔ عزت کے حوالے سے اور سیاق کلام میں بات کی مناسبت اور ربط کے ۔ ۔ ۔ اس کے بعد صفحہ بالقابل کی تکمیل یوں کی جاتی ہے۔

وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ سَيِّئَاتٍ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَ مَكْرٌ أُولَٰئِكَ هُوَ يُنَوِّرُ

(۳۵: ۱۰) ”رت وہ لوگ جو بیہودہ چال بازیاں کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کا کر خود ہی عارت ہونے والا ہے۔“ یزیدون کے اندر سمجیر کے معنی بھی شامل ہیں لیکن یہاں مکر بمعنی سازش اور چال اس لیے استعمال ہوا ہے کہ اس کا اکثر استعمال برے معنوں ہی میں ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے عذاب شدید ہے اور یہ عذاب تو ان کے لیے مقدر ہے کہ ان کی یہ چال بازیاں عارت جائیں گی نہ قائم رہیں گی اور نہ ان کا کوئی نتیجہ نکلے گا۔ یہ ”بور“ ہے اور ”بور“ اور ”بوران“ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ آیت سب سے پہلے اشارہ زمین کی آبادی اور پھل دینے کے معنی کی طرف تھا یہاں اس کے بالقابل بوران کا لفظ لایا گیا ہے جس میں پھل ضائع ہو جانے کے معنی ہیں۔

جو لوگ یہ چال بازیاں کرتے ہیں وہ جھوٹی عزت حاصل کرنے کے لیے یہ کام کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ سوسائٹی میں عام لوگوں کی نظروں میں وہ معزز ہوں۔ بظاہر وہ بڑے لوگ اور صاحب عزت ہوں اور قوت والے نظر آئیں۔ یہاں عزت ذرا وسیع مفہوم میں ہے لیکن ہر بری تدبیر جس میں قول طیب نہ ہو اور عمل صالح نہ ہو اس کا مدبر بھی معزز پر وقار اور صاحب قوت نہیں ہوتا۔ اگرچہ بعض اوقات وہ ایک مختصر وقت کے لیے اپنا رعب جھالیتا ہے لیکن آخر کار وہ ہلکتی طرف جاتا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اور اللہ اپنے وعدوں سے کبھی الٹ نہیں کرتا۔ ہاں وہ ہر مکار کو قدرے سہلت ضرور دیتا ہے لیکن جب وقت آتا ہے تو یہ تمام مکاریاں عارت چلی جاتی ہیں۔

--- ۰۰۰ ---

اب انسان کی پس زندگی اور پہلی پیدائش کا ایک منظر اس سے قبل کے منظر میں بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک خشک زمین کو پانی کے ذریعہ کس طرح زندہ اور سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے۔ انسان کی پیدائش میں اس کے زمانہ حمل مادر اور پھر اس کی طویل عمر یا قصیر عمل۔ یہ سب چیزیں اللہ کے علم اور منصوبے کے مطابق ہوتی ہیں۔

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا
وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ وَمَا يُعْتَرُ مِنْ مُّعْتَرٍ
وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿۱۱﴾

”اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے (یعنی مرد اور عورت) کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنم ہی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے۔ کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا۔ اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے۔ مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔ اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے۔“

انسان کی پہلی تخلیق کی طرف قرآن کریم میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا گیا۔ اسی طرح قرآن میں حمل کے ابتدائی مراحل کی طرف بھی مفصل اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی نطفہ کی طرف۔ تراب وہ عنصر ہے جس میں زندگی نہیں ہوتی اور نطفہ وہ عنصر ہے جس میں زندگی ہوتی ہے۔ اس کائنات کے عظیم معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ اس بے جان عنصر میں کس طرح جان ڈال دی گئی اور حیات کس طرح پہلے عنصر کے ساتھ گھل مل گئی۔ آج تک یہ راز معجزہ ہے اور انسان ابھی تک اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ یہ ایک قائم اور دیکھی جانے والی حقیقت ہے۔ اس کے اعتراف کے سوا چارہ کار بھی نہیں ہے۔ یہ معجزہ خالق زندہ کرنے والے اور عظیم قدرت والے اللہ کی طرف انسان کو دیکھیل کر لے جاتا ہے اور انسان کسی شکل میں بھی اسے رد نہیں کر سکتا اور نہ اس میں ہن میں کوئی چوں چا کر سکتا ہے۔

بے جان سے جان دار کی طرف کسی عنصر کو منتقل کرنا نہایت ہی بڑا انقلاب ہے اور یہ زمانہ و مکان کی دوریوں سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس انقلاب پر ایک زندہ دل شخص جس قدر بھی غور کرے وہ طول نہ ہو گا۔ اس طرح اس کائنات کے اسرار بھی ختم نہ ہوں گے اور اس راہ میں علم کے آگے بڑھنے سے جو اسرار و رموز بھی کھلیں گے ہر اگلا راز پیچھے سے زیادہ عجیب ہو گا۔

اب اس نطفے سے ذرا آگے بڑھئے۔ ایک خلیہ کامل ہوتا ہے، جنین بنتا ہے اور پھر ایک مرحلے میں اس جنین کی جنس کا تعین ہوتا ہے۔ مرد اور عورت الگ الگ۔ پھر وہ صورت بنتی ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے۔

ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا (۳۵: ۱۱) ”پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے۔“ چاہے اس سے مراد یہ ہو کہ جنین کی حالت میں مذکر اور مؤنث کا امتیاز کر دیا یا اس سے مراد یہ ہو کہ ولادت کے بعد اور بالغ ہونے کے بعد شادیاں کر کے جوڑے بنا دیا۔ یہ انقلاب بھی کیا فکر و نظر کے لیے کم ہے کہ نہایت چھوٹے نطفے سے یوں مذکر و مؤنث بنا دیا گیا تو یہ بھی ایک عظیم انقلاب ہے۔ یا تو ایک چھوٹا سا نکتہ جو نطفے کی شکل میں ہے اور یا پھر ایک مکمل انسان جو ایک قوی پیکل مخلوق ہے اور جس کے جسم کے اندر کثیر التعداد مشینیں ہیں جو مختلف کام کر رہی ہیں۔ جس کی تفصیلات میڈیکل سائنس میں موجود ہیں اور باہم بالکل جدا ہیں۔

اب ہمارے زیر مطالعہ یہ سادہ خلیہ ہے۔ یہ اب تقسیم ورت تقسیم ہوتا ہے اور اس سے اور خلیے نکلتے ہیں۔ اب اس ایک خلیے سے خیمات کے مجموعے بنتے چلے جاتے ہیں اور اعضاء بنتے چلے جاتے ہیں اور ہر عضو کا ایک فریضہ مقرر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان تمام اعضا سے ترکیب پا کر ایک انسان وجود میں آتا ہے اور اس کے تمام اعضاء باہم مربوط اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہ انسان ایک بالکل ممتاز مخلوق ہوتا ہے۔ یہ اپنے ہم جنس بنی نوع انسان سے بھی الگ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ بلکہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی جدا ہوتا ہے۔ ممکن ہی نہیں ہے کہ دو انسان بالکل ایک ہی جیسے ہوں حالانکہ یہ ایک ہی نطفے سے پیدا ہوئے اور اس کے اندر کسی فرق کا اور اک انسان کو نہ تھا۔ پھر یہ خلیے مرد و عورت کی شکل اختیار کر کے جوڑے بن جاتے ہیں اور ان جوڑوں کے ذریعے پھر اس تخلیق کا تسلسل قائم ہوتا ہے اور یہ تسلسل انہی مراحل میں چلتا ہے۔ وہی مراحل دوبارہ دہرائے جاتے ہیں۔ یہ اس قدر عجیب سلسلہ ہے کہ جس کے عجوبات ختم نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے قرآن میں اس انجوبے کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک راز نہیں ہے بلکہ جسم انسانی میں رازوں کا مجموعہ ہے۔ لوگ اگر اس پر تدبر کرس تو ایک انسان کے جسم میں بے شمار عجوبات ہیں اور انسان کی روح ان پر تدبر کر کے جاگ سکتی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اس زلویہ سے آسان کو بار بار جھوڑتا ہے اور جگاتا ہے۔

اس باریک مطالعہ کو پیش کرنے کے بعد اللہ کے علم کی وسعت کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سورہ سبا میں اس کی تفصیلات آئی ہیں کہ اللہ کا علم بہت ہی وسیع ہے۔ یہاں مذکر و مونث کی تخلیق اور حمل و وضع حمل بھی اس کے علم میں رہتا ہے۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ (۳۵: ۱۱) ”کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ کوئی بچہ جنمی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے“۔ اب یہاں مذکر و مونث کا دائرہ عام کر دیا جاتا ہے۔ انسان، حیوان، طیور، مچھلیاں اور تمام حشرات الارض اس کے دائرے میں آ جاتے ہیں۔ چاہے ہم ان کو جاننے ہوں یا نہ جاننے ہوں کہ جن کا وضع حمل ہوتا ہے یا جو انڈے دیتے ہیں کیونکہ انڈا بھی ایک قسم کا حمل ہوتا ہے۔ انڈے کے اندر جو جنین ہوتا ہے وہ ماں کے پیٹ میں نہیں بڑھتا بلکہ انڈے کے اندر بڑھتا ہے۔ صرف انڈا ماں کے پیٹ سے باہر آ جاتا ہے اور یہ بھی اللہ کی صنعت کاری کا ایک کرشمہ ہے کہ ایک عمل جو پیٹ کے اندر ہوتا ہے، یہاں یہ پوری ٹیکنالوجی انڈے کے اندر پیٹ کے باہر کر دی جاتی ہے اور پھر وہ بڑھتی ہے اور ان سب عملوں کو اللہ جانتا ہے اور اس پر اس کا علم محیط ہے۔ اس پوری کائنات کے مختلف اطراف ہیں۔

اللہ کے علم کی یہ جامعیت ایسی ہے کہ ذہن انسانی اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ نہ تصور کے اعتبار سے اور نہ انداز تعبیر کے اعتبار سے جیسا کہ ہم نے سورہ سبا میں یہ نکتہ بیان کیا۔ یہ تو بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ہی قرآن کا نازل کرنے والا ہے اور قرآن کا مصدر وسیع ذات باری ہے اور یہ ایک مفرد انداز استدلال ہے۔ پھر مختلف افراد و اشیاء کی عمر بھی اللہ کے علم میں ہے اور کتاب میں درج ہے۔

وَمَا يُعْمَرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَلَا يَنْقُصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ

(۳۵: ۱۱) ”کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔ اللہ کے لیے یہ سب کچھ بہت آسان کام ہے۔ جب خیال اس طرف جاتا ہے کہ اس کائنات میں نباتات، پرندے، حیوانات اور انسان اور دوسری چیزیں جن کے سائز اور حجم مختلف ہیں اور مختلف انواع و اقسام کی ہیں۔ مختلف علاقوں اور زمانوں میں ہیں، پھر انسان جب یہ تصور کرتا ہے کہ یہ عظیم تعداد جس کا صحیح علم صرف خالق ہی کو ہے، اس کے ہر فرد کو ایک عمر دی جاتی ہے۔ یہ عمر طویل ہو یا قصیر ہو، اس میں زیادتی ہو یا کمی ہو، سب کی سب ایک کتاب میں درج ہے اور اللہ سب کے بارے میں جانتا ہے۔

بلکہ ہر ایک فرد کے جزء کے بارے میں بھی اللہ جانتا ہے کہ اس کی عمر کیا ہوگی۔ زیادہ ہوگی یا کم ہوگی مثلاً کسی درخت کے پتے کی عمر کیا ہوگی۔ کب نکلے گا اور کب گرے گا اور کب مٹی ہو گا۔ ہر پرندے کے ہر پر کے بارے میں بھی اللہ کو معلوم ہے کہ وہ کب جسم سے الگ ہو گا۔ ہر حیوان کا ہر سینگ کس قدر عمر پائے گا یا حیوانیت کی باہم فکر میں کوئی سینگ ٹوٹ جائے گا۔ پھر انسان کے اعضاء آنکھ اور کان وغیرہ یہ کب تک رہیں گے اور کب کام چھوڑ دیں گے۔

یہ سب باتیں اللہ کی کتاب تقدیر میں درج ہیں۔ اور اللہ کے علم میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اس سلسلے میں کوئی جہد

کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

”إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ“ (۳۵: ۱۱) ”اللہ کے لیے یہ بہت آسان ہے۔“

جب انسانی خیال ان باتوں پر غور و فکر کرتا ہے اور ان لائنوں پر آگے بڑھتا ہے تو یہ بہت ہی عجیب نظر آتا ہے۔ اس آیت کے ضمن میں ہم اس طرف متوجہ ہوتے ہیں جس طرف انسانی خیال باعوم متوجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح کی باتیں سوچنا انسان کی عادت ہی نہیں ہے۔ یہ صرف خداوند قدوس کی ہدایت ہے کہ تم ذرا اس انداز سے غور کرو۔

اور عمر کی زیادتی سال و ماہ کی تعداد کے ذریعے بھی ہوتی ہے اور عمر میں برکت کے ذریعے بھی ہوتی ہے۔ عمر میں برکت یوں ہوتی ہے کہ انسان کی عمر اچھے کاموں میں صرف ہو اور اس میں دد و دھوپ، مفید کام اور اعمال و آثار زیادہ ہوں۔ اور عمر کا نقص بھی اسی طرح ہے یا تو ماہ و سال کم ہو جائیں یا عمر کی افادیت کم ہو جائے اور اس سے برکت نکل آئے بجائے اس کے کہ انسان اچھے کام کرے اس کی زندگی خالی ہو۔

بعض اوقات زندگی کا ایک لمحہ بھی پوری عمر کے برابر ہوتا ہے۔ وہ افکار اور شعور اور احساسات سے بھرپور ہوتا ہے۔ اور اس کے اندر اونچے درجے کے اعمال عمل میں آجاتے ہیں اور اچھے نتائج نکلتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات انسان کا پورا سال خالی خالی گزر جاتا ہے اور اس کا کوئی حساب و کتاب نہیں ہوتا۔ اللہ کے نزدیک اس سال کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ یہ سب امور اللہ کے حساب و کتاب میں ہیں اور ہر موجود مخلوق کے بارے میں یہ سب امور صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

جماعتیں افراد کی طرح ہیں۔ اسی طرح اقوام بھی ایک فرد کی طرح ہیں۔ ان کی عمر کا بھی یہی قانون ہے۔ کسی کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور کسی امت کا پتہ جلد ہی کاٹ لیا جاتا ہے اور یہ سب معانی اس آیت میں داخل ہیں۔ ام کی بھی تقدیر ہوتی ہے اور وہ طاؤس و رباب پر ختم ہوتی ہے۔ تمام اشیاء کی بھی عمر ہوتی ہے جس طرح زندہ چیزوں کی عمر ہوتی ہے۔ ایک چٹان کی بھی عمر ہوتی ہے۔ ایک پہاڑ کی بھی عمر ہوتی ہے۔ ایک نہر کی بھی عمر ہوتی ہے، دریا کی پتھر کی بھی عمر ہوتی ہے۔ پھر وہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ایک غار کی بھی عمر ہوتی ہے اور پھر وہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ایک نہر کی عمر ہوتی ہے اور جب عمر ختم ہو تو نہر خشک ہو کر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔

بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں جن کو انسان بناتا ہے۔ ان کی بھی عمر ہوتی ہے۔ مشینیں، کپڑے اور تمام دوسری مصنوعات کی بھی عمر ہوتی ہے اور اپنی مقررہ عمر پوری کر کے وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں اور یہ سب کام اللہ کی تقدیر میں ہیں اور معلوم و مقدر ہیں۔

اس زلویہ سے اگر امور پر مدبر کیا جائے تو اس کائنات کا مطالعہ ایک نئے افق سے ہوتا ہے۔ یہ کائنات کے مطالعہ کا یہ ایک نیا اسلوب ہے اور انسانی فہم و ادراک کی قوتوں کو ایک نیا شعور ملتا ہے۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اللہ کی قدرت اور علم وسیع اور شامل اور کامل ہے۔ لہذا انسان اس شعور کے ہوتے ہوئے کبھی غافل اور گمراہ نہیں ہو سکتا۔ وہ جہاں دیکھتا ہے، دست قدرت کی کاری گری نظر آتی ہے۔ اللہ کی نگرانی نظر آتی ہے اور ہر چیز میں اللہ کی مہربانی اور قدرت نظر آتی ہے۔

--- ۰۰۰ ---

اب سیاق کلام کا رخ کائناتی مناظر کے ایک منظر کی طرف ہوتا ہے۔ سمندر کے پانیوں کے مناظر میں سے ایک منظر، پانیوں کی اقسام۔ یہ ہے مٹھا پانی اور وہ ہے سخت کھرا۔ دونوں قسم کے پانیوں کے پھل سمندر کے اندر ساتھ ساتھ چلتے

ہیں۔ دونوں انسانوں کی خدمت کرتے ہیں، 'باہم ملتے نہیں ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَذَا
مِلْحٌ أُجَاجٌ وَمِنْ كُلِّ تَاكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا
وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَآخِرَ لِيَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۲﴾

”اور پانی کے دونوں ذخیرے یکساں نہیں ہیں۔ ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا ہے، پینے میں خوشگوار اور دو سراسخت کھاری کہ طق جھیل دے۔ مگر دونوں سے تم تردنازہ گوشت حاصل کرتے ہو، پینے کے لیے زینت کا سامان نکالتے ہو، اور اسی پانی میں تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس کا سینہ چیرتی چلی جا رہی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو۔“

پانی کی تخلیق میں انواع و اقسام واضح ہیں۔ اور اس تقسیم کے پیچھے جو خدمت ہے وہ بھی واضح ہے۔ پیٹھے پانی کا استعمال تو واضح ہے۔ رات اور دن ہم ات استعمال کرتے ہیں۔ ہر قسم کی زندگی تو پانی پر موقوف ہے اور پانی زندگی کا اہم عنصر ہے۔ رہا کڑوا پانی مثلاً سمندر اور بڑے سمندر تو اس کے بارے میں بعض سائنس دانوں نے عجیب معلومات دی ہیں اور بتایا ہے کہ اس کی تخلیق میں کس قدر گہری انجینئرنگ کارفرما ہے۔

”لاکھوں سالوں سے زمین مختلف قسم کے گیس چھوڑتی ہے اور ان میں سے اکثر گیسیں زہریلی ہوتی ہیں۔ لیکن قدرت الہیہ کی منصوبہ بندی دیکھئے کہ زمین کے اوپر جو ہوا ہے، اس کے اندر پائے جانے والی نسبت متاثر نہیں ہوتی۔ جو انسان کے وجود کے لیے ضروری ہے۔ اس عظیم توازن کی گاڑی پانی کی وہ عظیم مقدار ہے یعنی گہرا سمندر جس سے زندگی، غذا، بارش، معتدل موسم اور نہات اور پھر خود انسانی زندگی حاصل کرتے ہیں۔“

پانی کی تخلیق کے بارے میں آج تک جو راز معلوم ہوئے ہیں، ان میں بالارادہ رکھی ہوئی حکمت بالکل واضح ہے۔ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس تخلیق میں خالق نے بالارادہ توازن اور ہم آہنگی رکھی ہے۔ اور ان ہم آہنگیوں اور توازنوں پر اس کائنات کی مختلف چیزوں کی زندگی قائم ہے اور حیات کا پورا نظام ابستادہ ہے۔ اور یہ پیچیدہ نظام اللہ جل شانہ نے بالارادہ وضع کیا ہے۔ یہ توازن اس قدر پیچیدہ ہے اور اس قدر باریک انجینئرنگ پر مبنی ہے کہ کوئی عقلمند انسان یہ نہیں سوچ سکتا کہ یہ اتفاقاً ایسا ہو گیا ہے۔ یہاں دو قسم کے سمندری پانی کی طرف اشارے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پانی ایک دوسرے کے ساتھ کس نہیں ہوتے۔ ان کے درمیان واضح فرق ہے۔ اس قسم کا امتیازی افتراق انسانی جذبات، انسانی شعور، انسانی رجحانات اور انسانی قدروں میں بھی ہوتا ہے۔ پھر دونوں قسم کے پانی انسانوں کے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔

وَمِنْ كُلِّ تَاكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ

مَوَآخِرَ (۱۲: ۳۵) > ”مگر دونوں سے تم تردنازہ گوشت حاصل کرتے ہو، پینے کے لیے زینت کا سامان نکالتے ہو اور اسی پانی میں تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس کا سینہ چیرتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور اس کے

شکر گزار ہو۔“ تروتازہ گوشت سے مراد مچھلیاں اور سمندر کے دوسرے جانور ہیں جو مختلف قسم کے ہیں اور زیب و زینت کے لیے سیپ اور مرجان اور دوسرے موتی جو سمندر سے نکالے جاتے ہیں۔ یہ موتی سمندر کی سیپوں میں پائے جاتے ہیں۔ سیپوں کے اندر جب پانی اور ریت کے ذرات داخل ہوتے ہیں تو اس کے اندر کیمیائی عمل سے یہ موتی تیار ہوتے ہیں۔ مرجان ایک حیوانی پودا ہے جو سمندر میں میلوں تک پھیل جاتا ہے اور یہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ بعض اوقات سمندری سفر کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کی شاخوں میں زندہ مخلوق بھی پھنس جاتی ہے۔ یہ مرجان بھی ایک خاص طریقے سے کاٹ کر اس سے زیورات بنائے جاتے تھے۔

کشتی سمندروں اور دریاؤں کو چیرتی چلی جاتی ہے اس لیے کہ اللہ نے پانی اور کشتی دونوں میں بعض خواص رکھ دیئے ہیں۔ جن چیزوں سے کشتی بنائی جاتی ہے ان کی کثافت اور ساخت اور سمندر کے پانی کی اپنی کثافت ہے۔ یوں سمندر کی سطح پر کشتی حیرتی ہے۔ ہواؤں کے اندر بھی یہی خصوصیات رکھ دی گئی ہیں۔ پھر اللہ نے ان توتوں کو انسان کے لیے مسخر کر دیا اور انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

لَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ (۱۲:۳۵) ”تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو۔“ سفر اور تجارت کے ذریعہ سے تم اللہ کا فضل تلاش کرو۔ سمندر سے مفاد کی چیزیں نکالو اور پانی اور کشتیوں کو نقل و حمل کے مقاصد کے لیے استعمال کرو۔

وَلَكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۲:۳۵) ”تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو۔“ اللہ نے تمہارے لیے شکر کے اسباب فراہم کر دیئے ہیں۔ یہ اسباب تمہارے ہاتھ میں ہیں اور یوں اللہ تمہاری جانب سے ارائے شکر میں بھی تمہارا مددگار ہے۔

--- ۰ ۰ ۰ ---

اور اب رات اور دن کے منظر پر یہ کائناتی سفر ختم ہوتا ہے۔ شمس و قمر کی تسخیر جو اللہ کے وسیع کائناتی نظام کا ایک حصہ ہے۔

يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى

”وہ دن کے اندر رات اور رات کے اندر دن کو پر دتا ہوا لے آتا ہے۔ چاند اور سورج کو اس نے مسخر کر رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے۔“

راستہ کو دن میں داخل کرنا اور دن کو رات میں۔ یہ نہایت ہی خوبصورت مناظر ہیں۔ جب رات دن میں داخل ہوتی ہے تو روشنی آہستہ آہستہ مدہم پڑتی ہے اور تاریکی دھیرے دھیرے چھاتی ہے۔ غروب کے بعد پھر تاریکی گہری ہوتی جاتی ہے اور رات کے اندر دن کے داخل ہونے کا منظر بھی بہت ہی دلچسپ ہے۔ سفید صبح آہستہ آہستہ نمودار ہوتا ہے، روشنی پھیلتی جاتی ہے اور اندھیرا آہستہ آہستہ غائب ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ روشنی نمودار ہوتی ہے اور خوب پھیل

جاتی ہے۔ یعنی رات دن کو پوری طرح کھا جاتی اور دن رات کو کھا جاتا ہے۔ دونوں اوقات میں دل کو خوشی اور سکون حاصل ہوتا ہے اور دونوں اوقات میں انسان کے غور و فکر کی قوت تیز ہوتی ہے۔ وہ خدا سے ڈرتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ خدا بہت ہی عظیم ہے جو یہ عظیم تصورات لاتا ہے۔ یوں خطوط کھینچتا ہے۔ ایک رسی کو کھینچتا ہے اور دوسری کو ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔ اور گردش لیل و نهار کا یہ نظام نہایت ہی پیچیدہ اور حساس ہے اس کے اندر اس قدر استحکام ہے کہ کبھی اس میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی اضطراب پیدا نہیں ہوتا اور نہ کبھی اس میں خلل پڑتا ہے۔

شمس و قمر کی تسخیر اور اجل مقرر تک ان کا یونہی چلتے رہنا۔ اس وقت تک جس کے بارے میں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ وہ منظر ہے ہر انسان دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔ چاہے اسے شمس و قمر کا صحیح علم ہو یا نہ ہو، چاہے اسے ستاروں اور سیاروں کے جسم، حرکت اور حجم کے بارے میں معلومات ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن یہ دونوں اجرام فلکی ہمارے سامنے طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ ہر آنکھ کے سامنے چڑھتے اور گرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ حرکت ایک مسلسل حرکت ہے اور اس کے اندر ایک لمحے کے لیے بھی خلل، اضطراب اور وقفہ نہیں ہوتا۔ اس منظر کو اس حد تک دیکھنے کے لیے کسی گمراہ علم و حساب کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لہذا گردش لیل و نهار اور شمس و قمر کا طلوع و غروب وہ منظر ہے جو ہماری نظروں کے سامنے بچھا ہوا ہے۔ آج ہم ان کے بارے میں ذرا زیادہ جانتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جن کے سامنے یہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔

لیکن علم کی مقدار اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم ان سے کس قدر متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے دل اس سے کس قدر اثر لیتے ہیں۔ ہمارے اندر غور و فکر کی کس قدر قوت پیدا ہوتی ہے اور ہم اس منظر سے اللہ کی قدرت کا کس قدر گہرا ادراک کرتے ہیں۔ اس سے ہمارے دس کس قدر زندہ ہوتے ہیں کیونکہ اصل زندگی تو دلوں کی زندگی ہوتی ہے۔ مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے۔ کہ زندگی تو عبارت ہے تیرے پینے سے

--- ○ ○ ○ ---

نہایت ہی گہرائی تک متاثر کر دینے والے ان مناظر کی چھاؤں میں اور حیران کن حد تک متاثر کر دینے والے دلائل ربوبیت کے ان مناظر میں بتایا جاتا ہے کہ رب تعالیٰ وعدہ لاشریک ہے۔ یہ اسی کے کارنامے ہیں اور جو لوگ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں وہ نہایت ہی بڑے خسارے میں ہوں گے۔

ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ ۚ اِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْعَوْا دُعَاؤَكُمْ ۚ وَكُلُوْا سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ ۚ وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ يَكْفُرُونَ بَشُرِكُمْ ۚ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ۝۱۳

ع ۱۳ مِثْلُ خَبِيرٍ ۝۱۳

”وہی اللہ (جس کے یہ سارے کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ استہجو ذکر جن دوسروں کو تم

پکارتے ہو، وہ ایک پرکاش کے مالک بھی نہیں ہیں۔ انہیں پکارو، تو وہ تمہاری دعائیں سن نہیں سکتے۔ اور سن لیں تو ان کا تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔ حقیقت حال کی ایسی صحیح خبر تمہیں ایک خبردار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔

یہ ہے وہ رب جس نے ہوائوں کے ذریعہ بادل بھیجے، جس نے بادلوں کے ذریعہ بارشیں بھیجیں، جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، جس نے تمہیں جوڑے جوڑے بنایا، جو جانتا ہے کہ ہر مادہ کیا حاصل لیتی ہے، وہ جو جانتا ہے کہ کس کی عمر کیا ہے اور ڈیوریشن کیا ہے، جس نے دو سمندر پیدا کیے۔ بیٹھا اور کھارا، جس نے رات اور دن پیدا کیے، جس نے شمس و قمر کی گردش مقرر کی۔ یہ ہے تمہارا رب۔
سب کچھ اسی کا ہے۔

لَهُ الْمُلْكُ (۱۳:۳۵) اور وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ

(۱۳:۳۵) ”اور اس کے سوا جن دو سردوں کو تم پکارتے ہو، وہ پرکاش کے مالک بھی نہیں ہیں۔“ ظہیر عظمیٰ کے خلاف اور مہین پر دے کو کہتے ہیں۔ یہ مہین اور حقیر پر وہ بھی ان کی ملکیت میں نہیں ہے جن کو تم خواہ مخواہ پکارتے ہو۔ ذرا مزید تشریح۔

اِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ (۱۴:۳۵) ”انہیں پکارو تو وہ تمہاری دعائیں سن ہی نہیں سکتے۔“ یہ توبت اور مورتیاں ہیں، درخت ہیں، ملائکہ اور جن ہیں۔ یہ سب کے سب بھی ظہیر کے مالک نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی تمہاری دعائیں نہیں سنتا۔ اگر سنتا بھی ہے تو وہ سمجھتا نہیں۔ اگر سمجھتا بھی ہے تو مدد نہیں دے سکتا۔

وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا (۱۴:۳۵) ”اگر سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے۔“ ملائکہ تو سنتے ہیں تو جن جواب ہی نہیں دے سکتے۔ اور ملائکہ بھی از خود کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ یہ تو ہے ان کی حالت دنیا میں اور قیامت میں تو وہ تم سے براءت کا اعلان کر دیں گے۔

وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ يَكْفُرُونَ بَشِرْكُمْ (۱۴:۳۵) ”اور قیامت کے روز تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے۔“ ذرا ہوش کرو، یہ اہل دعائیں کون دے رہا ہے۔

وَلَا يَنْبُتُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ (۱۴:۳۵) ”ایسی صحیح خبریں تمہیں خبردار کرنے والے کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔“ یہاں یہ سبق ختم ہوتا ہے اور اس کائنات کی سیر ختم ہوتی ہے۔ اس سیر سے قلب مومن نے بہت کچھ سیکھا اور دیکھا۔ وہ کیفیات مغفرت میں ڈوبا اور حیرا۔ اگر کوئی ہدایت لینا چاہے تو قرآن کی ایک سورہ کا ایک ہی سبق اس کے لیے کافی ہے بشرطیکہ کوئی برہان و سلطان کا محتاشی ہو کسی نشانی اور معجزات کا طالب ہو۔

درس نمبر ۲۰۲ ایک نظر میں

ایک بار پھر پکارا جاتا ہے کہ ہوگو! ذرا اپنی حقیقت پر غور کرو 'اور اپنے تعلق باللہ کا جائزہ لو۔ ایک بار پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں۔ یہ جو لوگ روگردانی کرتے ہیں 'یہ خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔ اس سورہ کے دوسرے سبق میں بھی حضور کو ایسی ہی تسلی دی گئی تھی۔ البتہ یہاں در اس بات کی وضاحت کر دی جاتی ہے کہ ہدایت اور ضلالت کی حقیقت اور ماہیت ایک نہیں ہے 'دونوں کے درمیان اس طرح کا فرق و امتیاز ہے جس طرح اندھے اور بینا میں ہوتا ہے۔ جس طرح نور و تاریکی میں ہے 'جس طرح سائے اور کڑکتی دھوپ میں ہے۔ جس طرح موت و حیات میں ہے۔ پھر ہدایت 'بصیرت' نور 'سائے اور زندگی اپنے اندر بذات خود ایک گہرا ربط اور مشابہت رکھتے ہیں اور اسی طرح اندھا پن 'تاریکی' گرمی اور موت باہم مربوط اور مماثل ہیں۔ یہ سبق مکنذین کے انجام پر ختم ہوتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۰۲ تشریح آیات

۱۵۔۔۔۔۔ تا۔۔۔۔۔ ۲۶

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿١٥﴾

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٦﴾ وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿١٧﴾

”لوگو! تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو غنی و حمید ہے۔ وہ چاہے تو تمہیں بٹا کر کوئی نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے، ایسا کہ اللہ کے لیے کچھ بھی دشوار نہیں۔“

لوگوں کو جب یہ دعوت دی جائے کہ وہ اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آنے کی جدوجہد کریں اور ضلالت کے بدلے ہدایت اختیار کریں تو اس وقت ان کو یہ حقیقت یاد دلانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ فقراء ہیں اور اللہ کی طرف محتاج ہیں جب کہ اللہ ان کے مقابلے میں پوری طرح غنی ہے اور جب ان کو ایمان، اللہ کی عبادت اور اللہ کی حمد و ثنا کی دعوت دی جاتی ہے تو اللہ ان کی عبادت اور حمد سے پوری طرح بے نیاز ہے۔ وہ تو بذات خود محمود ہے۔ اپنی رامت میں ستودہ صفات ہے۔ یہ اللہ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اگر اللہ چاہے تو ان کو ختم کر کے ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے اور ان کو اپنا خلیفہ بنالے تو یہ اللہ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں اور یہ کام اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو یہ حقیقت یاد دلائی جائے تاکہ ان کے ذہنوں سے یہ غرور نکل جائے کہ اللہ ان کی ہدایت کے لیے رسول بھیجتا ہے اور ان کی ہدایت کا ساز و سامان کرتا ہے تو شاید اللہ کو ہماری ہدایت کی کوئی ضرورت ہے۔ اللہ رسول بھیجتا ہے اور وہ پوری انسانی تاریخ میں لوگوں کی ہدایت کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتے رہے ہیں۔

اللہ اپنے بندوں کے ساتھ مہربانی کرتا ہے، ان پر رحمت کرتا اور ان پر فضل و کرم کرتا ہے یوں کہ ان کے پاس اپنے رسول بھیجتا ہے۔ یہ رسول لوگوں کی نافرمانی اور لوگوں کی ایذا رسانی کی وجہ سے مہمبتیں برداشت کرتے ہیں اور ان روگردانیوں اور ایذا رسانیوں کے باوجود وہ دعوت حق پر جے رہتے ہیں تو یہ اہتمام کر کے اللہ اپنے بندوں پر محض رحم و کرم کرتے ہیں کیونکہ وہ رحیم و کریم ہے۔ یہ اس کی ذاتی صفات ہیں، اس لیے اللہ کو اللہ کی حکومت میں پرکاش کے برابر کوئی اضافہ کر سکتے ہیں یا اللہ کی حکومت میں اُسے کے برابر کسی چیز کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ نیز اللہ کے مقابلے میں

انسان کوئی بڑی طاقتور یا غالب مخلوق نہیں ہے کہ اللہ ان کو بدل نہیں سکتا۔ اس لیے اللہ ان کی غلطیوں کو برداشت کرتا ہے۔ کیا یہ انسان ایک ایسی مخلوق ہیں جن کو بدلا نہیں جاسکتا۔ ایسی صورت نہیں ہے۔

انسان جب اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو دیکھتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ ایک طرف یہ انسان کمزور، حقیر اور ناتواں ہے اور اس کے مقابلے میں دلت باری ہے، جو بہت طاقتور ہے اور اس کی جانب سے انسانوں پر یہ مہربانیاں ہیں۔

انسان تو اس کائنات کے کینوں میں سے ایک نہایت ہی چھوٹی سی مخلوق ہے اور یہ انسان سورج کے گرد چکر لگانے والے ذرات و کرات میں سے ایک نہایت ہی چھوٹے سے کرے پر رہتا ہے۔ سورج بھی ان ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے اور سورج جیسے ستاروں کی تعداد کا بھی ابھی تک انسان کو علم نہیں ہے۔ یہ دوسرے ستارے تو چھوٹے چھوٹے نکلتے ہیں حالانکہ اپنی جگہ نہایت دوریوں میں وہ بہت ہی عظیم الجثہ ہیں اور یہ عظیم الجثہ ستارے اس فضا میں حقیر ذروں کی طرح چمکتے پھرتے ہیں۔ یہ اللہ کی مخلوقات کا نہایت ہی مختصر حصہ ہیں۔

اس کے باوجود انسان اللہ کی جانب سے اس قدر عظیم فضل و کرم اور اس کے بے شمار فیوض کا وصول کنندہ ہے۔ اس پر اس قدر مہربانیاں ہیں جو اس کے لیے اسی زمین میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس کے جسم کے اندر ودیعت کر دیئے گئے ہیں اور اس کے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیر مخلوق گمراہ ہو کر اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتی ہے اور اللہ کو اس کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے رسول بھیجنے پڑے۔ ایک کے بعد دوسرا رسول آیا۔ رسولوں پر کتابیں بھیجی گئیں۔ رسولوں کو خوارق عادت معجزات دیئے گئے۔ اور اللہ کا یہ فضل و کرم اس مقام تک پہنچ گیا کہ اللہ نے اپنی آخری کتاب بھیج دی۔ اس میں تمام انبیاء کے قصص بھی ثبت کر دیئے۔ اسلاف کی تاریخ اس میں ثبت کر دی۔ پھر انسان کو جو صلاحیتیں دی گئیں اور اس کے اندر جو کمزوریاں رکھ دی گئی تھیں وہ سب اس میں بیان کر دی گئیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک ایک انسان کی مشکلات کا حل بنا دیا اور اس کی مشکلات کو دور کر دیا۔

یہ عظیم کرم ایک طرف اور دوسری جانب یہ حقیقت کہ یہ انسان مکان زمین میں سے ایک حقیر اور کمزور مخلوق ہے۔ یہ زمین جس پر وہ رہتا ہے۔ یہ مٹی ککشاں کا ایک حقیر تابع ستارہ ہے جو اس عظیم اور ہولناک عظیم الجثہ کائنات کے اندر یوں ہے جس طرح زمین کی فضا میں تھرتھاتا ہوا ایٹم اور اللہ سبحانہ اس پوری کائنات و سموات کا پیدا کنندہ ہے۔ اس نے اس پوری کائنات اور مافیہا کو صرف ایک کلمہ سے پیدا کیا۔ صرف ارادہ متوجہ ہوا اور کن کیون سے سب کچھ وجود میں آگیا اور وہ ایسا کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

لوگوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں اور غور کریں کہ اللہ کا فضل و کرم کس قدر ہے اور وہ معصوم کر لیں کہ اگر وہ زندہ رہ رہے ہیں تو محض اللہ کے فضل و کرم کی وجہ سے زندہ رہ رہے ہیں اور اللہ کی عظیم رحمت کی وجہ سے زندہ رہ رہے ہیں اور یہ رحمت انسان کے انکار، اعراض، نافرمانیوں کے باوجود ہے۔

اس لحاظ سے یہ ایک نہایت ہی وجدانی رُج ہے جبکہ یہ ایک حقیقت بھی ہے۔ قرآن کریم ایسے ہی حقائق انسانی قلوب پر القاء کرتا ہے۔ کیونکہ جب حقیقت انسان کے دل پر روشن ہوتی ہے تو وہ انسان کے دل کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ قرآن حق ہے اور سچائی کے ساتھ یہ نازل ہو رہا ہے۔ لہذا قرآن کی تمام باتیں حق ہیں۔ وہ سچائی کے ساتھ لوگوں کو مطمئن کرتا ہے، سچائی پیش کرتا ہے۔ اس کے اشارات تمام کے تمام حق ہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

اب ایک دوسرے سے۔ یہ کہ دنیا و آخرت میں ذمہ داری انفرادی ہے۔ ذمہ داری انفرادی ہوگی، کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ نہ کوئی کسی کو فائدہ دے سکے گا۔ لہذا لوگ اگر ہدایت یافتہ ہو جائیں تو اس سے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ان کے اعمال اور فرائض کے بارے میں پوچھا جائے گا جب کہ دوسرے تمام افراد سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ہر شخص اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو گا۔ کوئی اس سے پوچھنے والا نہ ہو گا۔ اگر کوئی پاکیزہ زندگی اختیار کرتا ہے تو اپنے لیے کرتا ہے وہ اپنے لیے کرتا ہے۔ کسی اور کے لیے نہیں اور قیامت میں معاملات کا اختیار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہو گا۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ وَإِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ حِمْلٍ
لَّا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ
رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ
وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ

”کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا“ اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے پکارے گا تو اس کے بار کا ایک اونٹ حصہ بھی بٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ (اے نبی) تم صرف انہی لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ جو شخص بھی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لیے کرتا ہے اور پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔“

انفرادی ذمہ داری کے اصول کا انسانی اخلاقیات پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے اور اسی طرح انسانی طرز عمل پر بھی اس کا فیصلہ کن اثر ہوتا ہے۔ کسی انسان میں یہ شعور پیدا ہونا ضروری ہے کہ اسے سزا و جزاء صرف اس کے اعمال پر ہوگی اور اس سے مواخذہ صرف اس کے اعمال پر ہو گا۔ کسی دوسرے کی بد عملی پر اسے سزا نہ ہوگی اور اپنے اعمال بد سے بھی وہ کسی طرح بچ کر نہ نکل سکے گا۔ یہ ایک ایسا فیکٹر ہے جو انسان کو ہر وقت بیدار رکھتا ہے اور اس کا یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ انسان جھوٹی امیدوں پر ٹکیہ نہیں کرتا کہ کوئی اسے فائدہ دے گا یا اس کی جگہ کوئی ذمہ داری برداشت کر لے گا۔ یہ اصول انسانوں کے لیے باعث اطمینان بھی ہے۔ اس میں ایک فرد اس بات سے مطمئن ہو جاتا ہے کہ پوری جماعت کی بد عملیوں کا مواخذہ اس سے نہ ہو گا۔ یوں وہ خود اپنے اچھے اعمال سے ناپوس نہ ہو گا بشرطیکہ اس نے جماعت اور سوسائٹی میں تبلیغ و نصیحت اور معروف کو جاری کرنے اور منکر کو روکنے کی سعی کی ہو اور اپنی طاقت اس کام کے لیے استعمال کی ہو۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کا محاسبہ بحیثیت جماعت نہیں کرے گا۔ بلکہ ہر ایک مردہ محاسبہ ہو گا۔ اور یہ محاسبہ اس کے پورے اعمال کا ہو گا۔ ان حدود کے اندر ہو گا جو اس پر فرض کیے گئے ہیں اور ہر فرد پر یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ دوسروں کو نصیحت

کرے اور اپنی طاقت کی حد تک ان کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دے۔ اگر اس نے اپنی یہ اجتماعی ذمہ داری ادا کر دی تو پھر سوسائٹی جو کچھ بھی کرتی ہے وہ اس کا ذمہ دار نہ ہو گا۔ وہ صرف اپنے اچھے اعمال کی جزاء پائے گا۔ نیز اگر جماعت اور سوسائٹی اچھی ہو اور یہ شخص اس کے اندر گمراہ اور بدکار ہو تو بھی سوسائٹی کی اچھائی اسے کچھ فائدہ نہ دے گی۔ کیونکہ اللہ لوگوں کا محاسبہ فرشتوں کے مطابق نہ کرے گا۔

قرآن کریم نے اس اصول کو قرآن کے مخصوص اندازِ تعبیر کے مطابق بیان کیا ہے۔ اس انداز کا نہایت ہی گہرا اثر ہوتا ہے۔ یوں بتایا جاتا ہے کہ بے شمار لوگ ہیں اور انہوں نے اپنا اپنا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ کوئی شخص جس کا بوجھ ہلکا ہو وہ دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا رہا۔ اگر کسی کا بار گناہ زیادہ ہے اور وہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو بلاتا ہے تو کوئی شخص اس کی اس دعوت پر لبیک نہیں کہتا اور کوئی اس کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

یہ ایک ایسے قافلے کا منظر ہے جس میں ہر شخص اپنا اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ اپنے رستے پر جا رہا ہے یہاں تک کہ لوگ ترازو کے سامنے پہنچ جاتے ہیں اور وزن کرنے والا وزن کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر نظر آتا ہے کہ ہر شخص بوجھ کے نیچے ہے۔ کوئی تھکا ماندہ ہے اور کوئی ہلکا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے نتیجے کا منظر ہے اور اپنے آپ میں مشغول ہے۔

اس منظر کو دیکھتے ہوئے جس میں لٹل قافلہ تھکے ماندے ہیں روئے سخن حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔

اَنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ (۳۵: ۱۸) ”تم صرف انہی لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔“ ایسے ہی لوگوں کے لیے ڈرنا مفید ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں حالانکہ انہوں نے اپنے رب کو دیکھا نہیں ہے اور وہ نماز قائم کر کے اپنے رب کے ساتھ رابطہ قائم کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ذاتِ پیغمبر سے استفادہ کر سکتے تھے۔ تمہاری بات سن سکتے تھے۔ لہذا آپ پر ان لوگوں کی ذمہ داری نہیں ہے جو اللہ سے سب سے ڈرتے اور جو نماز قائم نہیں کرتے۔

وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ (۳۵: ۱۸) ”اور جو شخص پاکیزگی کی راہ اختیار کرتا ہے وہ اپنے ہی کے لیے کرتا ہے۔“ نہ آپ کسی کے ذمہ دار ہیں اور نہ کوئی اور کسی کا ٹھیکہ دار ہے۔ جو شخص نیکی اختیار کرتا ہے اور پاکیزگی کرتا ہے وہ خود اس سے نفع اندوز ہوتا ہے۔ (تزکّی) کے اندر نہایت ہی لطیف اور گہرا مفہوم ہے۔ جس کے اندر ظاہری صفائی بھی شامل ہے۔ جس کے اندر قلب و شعور کی صفائی بھی شامل ہے۔ جس کے اندر طرزِ عمل اور رویہ کی صفائی بھی شامل ہے۔ (تزکّی) کے اندر گہرا اشاراتی مفہوم پایا جاتا ہے۔

وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ (۳۵: ۱۸) ”اور پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے۔“ اللہ ہی محاسب ہے۔ وہی جزاء و سزا دینے والا ہے۔ اس کے ہاں نہ اچھا عمل ضائع ہوتا ہے نہ برا عمل شمار سے رہ سکتا ہے اور نہ جزاء و سزا کے احکام ایسے لوگوں کے حوالے کیے جاتے ہیں جو فیصلے میں رعایت کرتے ہیں یا بھولتے ہیں یا دیت ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

--- () ---

اللہ کے نزدیک ایمان و کفر برابر نہیں ہیں۔ خیر و شر کی برابر قیمت نہیں۔ ہدایت و ضلالت اللہ کے ہاں برابر نہیں ہوتے۔ اندھا اور آنکھوں والا بھی اس کے ہاں ایک نہیں ہوتے۔ روشنی اور تاریکی کی قدر وہاں ایک نہیں ہے۔ چھوٹے اور گرمی کی افادیت بھی برابر نہیں ہے اور نہ اللہ کے ہاں زندہ اور مردہ برابر ہوتے ہیں۔ یہ سب چیزیں واضح طور پر قدر و قیمت کے اعتبار سے جدا ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۖ وَلَا الظُّلُمُ وَلَا النُّورُ ۖ وَلَا الظُّلُمُ وَلَا الْحَرُورُ ۚ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۗ

”اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہیں۔ نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔ نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے اور نہ زندے اور مردے مساوی ہیں۔“

یہاں ایک طرف کفر، اندھے پن، تاریکی، گرمی اور موت سب کے سب ایک حراج رکھتے ہیں اور ان کے مفہومات کے درمیان ربط ہے۔ دوسری جانب ایمان، نور، بصارت، چھاؤں اور زندگی کے مفہومات کا ایک ہی حراج ہے اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

ایمان نور ہے۔ دل میں نور، اعضاء میں نور، حواس میں نور، ایسا نور جس سے اشیاء کی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اقدار اور واقعات روشن ہوتے ہیں اور ان کی حدود اور روابط واضح ہوتے ہیں۔ مومن اس نور سے تمام اشیاء کو دیکھتا ہے اور وہ روشنی کے اندر واقعات کو دیکھتا ہے۔ اس لیے اس کے معاملات اچھے ہوتے ہیں۔ اس کے اقدامات درست سمت میں ہوتے ہیں اور اس کے قدم ڈمگاتے نہیں۔

ایمان ایک آنکھ ہے جو دیکھتی ہے۔ یہ آنکھ چیزوں کو ان کی حقیقت کے مطابق دیکھتی ہے۔ نہ اس میں تزلزل ہوتا ہے اور نہ اس میں انتشار ہوتا ہے اور صاحب ایمان اپنی راہ پر روشنی میں اعتماد کے ساتھ اور اطمینان کے ساتھ چلتا ہے۔ پھر ایمان ایک سایہ ہے جس کے نیچے انسان راحت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا نفس اس میں آرام کرتا ہے اور روح خوش ہوتی ہے۔ شک، بے چینی، حیرت اور اندھیروں کے سڑکی گرمی سے انسان پناہ میں ہوتا ہے۔

پھر ایمان ایک زندگی ہے۔ دلوں اور شعور کی زندگی۔ ارادہ کی زندگی، رخ اور سمت کی زندگی۔ ایمان ایک حرکت اور جدوجہد کا نام ہے۔ یہ تعمیری جدوجہد ہے، مفید اور با مقصد زندگی ہے، جس کے اندر یہ مردگی اور مردنی نہیں ہے اور زندگی بھی بھٹی نہیں ہوتی ہے۔ نہ اس میں کوئی چیز مٹ ہے اور نہ بیہودگی ہے۔

کفر تاریکی ہے یا تاریکیاں ہیں۔ جب لوگ نور ایمان کے دائرہ سے نکل آئیں تو پھر وہ مختلف قسم کے اندھیروں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایسے اندھیرے جن کے اندر کسی چیز کی صحیح حقیقت نظر نہیں آتی۔ کفر ایک قسم کی سخت دھوپ ہے۔ اس کے اندر دل جیرانی، پریشانی، قلق، بے چینی، تزلزل اور عدم اطمینان کی گرم آندھیوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور آخرت میں جہنم کی گرمی کا شکار ہوتا ہے۔ کفر ایک طرح کی موت ہے۔ صمیر کی موت، منع حیات سے کٹ جانا صحیح راستے

سے کٹ جانا، حقیقی سرچشمے سے کٹ جانا اور حقیقی آب حیات سے محروم ہونا جس سے انسانی سیرت متاثر ہوتی ہے۔ فرض ان صفات میں سے ہر ایک صفت کی ایک حقیقت ہے اور دونوں کے درمیان مکمل تضاد ہے اور اللہ کے ہاں دونوں برابر نہیں ہیں۔

--- ۰۰۰ ---

اب روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کو بتایا جاتا ہے کہ دعوت اسلامی کے حوالے سے آپ کے فرائض اور عمل کی حدود کیا ہیں۔ اپنے فرائض و حدود سے آگے جو معاملات ہیں وہ اللہ کے سپرد کر دیں کیونکہ اللہ ہی ان کا واکدار ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي
الْقُبُورِ إِنْ أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ ۖ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَإِنْ
مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۚ وَإِنْ يَكْذِبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ ۖ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالْزُبُرِ ۖ وَإِلَيْكَ الْمُنِيرُ ۚ ثُمَّ
أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِي ۚ

۳

ع ۱۲۰

۱۵

”اللہ جسے چاہتا ہے سناتا ہے، مگر (اے نبی!) تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔ تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔ اب اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی جھٹ چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن ہدایات دینے والی کتاب لے کر آئے تھے۔ پھر جن لوگوں نے نہ مانا ان کو میں نے پکڑ لیا اور دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔“

اس کائنات کی حقیقت اور نفس انسانی کی ماہیت میں امتیازات حقیقی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ لوگوں کا مزاج مختلف ہوتا ہے اور دعوت اسلامی کے حوالے سے ان کا رد عمل بھی جدا ہوتا ہے اس طرح جس طرح بشارت اور اندھے پن کا سائے اور دھوپ کا اندھیروں اور روشنی کا اور حیات اور موت کا اور ان تمام معاملات کی پشت پر اللہ کی حکمت اور قدرت کام کر رہی ہوتی ہے۔

لہذا رسول صرف نذیر ہوتا ہے۔ اس کی انسانی طاقت محدود ہوتی ہے۔ وہ قبروں کے اندر پڑے مردوں تک دعوت نہیں پہنچا سکتا۔ نہ ایسے چلتے پھرتے مردوں کو وہ دعوت دے سکتا ہے یا سنا سکتا ہے۔ وہ اصل میں حقیقی مردوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اللہ ہی ہے جو ہر اس شخص کو سنا دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ جب چاہے جس طرح چاہے۔ لہذا رسول اللہ کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی گمراہ ہوتا ہے تو کیوں ہوتا ہے۔ اگر کوئی منہ پھیرتا ہے تو پھرے بشرطیکہ رسول نے دعوت

وے دی ہو اور رسالت کی ذیوٹی ادا کر دی ہو۔ لہذا جو سنا ہے 'سنے' اور جو اعراض کرتا ہے 'اعراض کرے'۔
اس سے قبل رسول اللہؐ سے کہا گیا تھا۔

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَتٌ (۸:۳۵) ”پس آپؐ ان پر حسرت کر کے اپنے آپ کو گملا نہ دیں۔“ اللہ نے رسول اللہؐ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا تھا۔ آپؐ کا منصب ایسا ہی ہے جیسا کہ آپؐ کے دوسرے بھائی رسولوں کا تھا۔ وہ تعداد میں تو بہت زیادہ تھے کیونکہ ہر امت اور ہر قوم کے لیے رسول بھیجا جاتا رہا ہے۔

وَ اِنْ مِنْ اُمَّةٍ اَلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۲۴:۳۵) ”اور کوئی امت نہیں گزری جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔“ اگر آپؐ کی قوم تکذیب کر رہی ہے تو بے شمار رسولوں کی اقوام نے اسی طرح تکذیب کی ہے اور اس تکذیب کی وجہ رسولوں کی تبلیغ کا تصور نہ تھا۔ اور نہ دلائل کی کمی تھی۔

وَ اِنْ يُكْذِبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتَابِ الْمُنِيْرِ (۲۵:۳۵) ”اب اگر یہ لوگ جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن ہدایات دینے والی کتاب لے کر آئے تھے۔“ دینات سے مراد مختلف قسم کے دلائل ہیں۔ معجزات بھی دلائل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ رسول اللہؐ سے معجزات طلب کرتے تھے اور تہدی دیتے تھے۔ الزبر سے مراد متفرق صحیفے، رسائل اور پمفلٹ ہیں، جن میں نصیحتیں، ہدایات اور تکالیف و فرائض ہوتے تھے۔ کتاب منیر سے مراد مطابق قول رابع حضرت موسیٰؑ کی کتاب تورات ہے۔ لیکن ان کی امت نے کتب الہیہ کی تکذیب کی۔
ہمیشہ اکثر اقوام نے رسولوں اور ان کی ہدایات اور کتابوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ لہذا معاملہ جدید نہیں ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے والا سلوک کوئی منفرد سلوک نہیں ہے۔ یہ تو ایک معمول بہ طرز عمل ہے۔ لیکن ایسا رویہ اختیار کرنے والوں کا انجام بھی ایک ہی رہا ہے۔

ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۲۶:۳۵) ”پھر جن لوگوں نے ظلم کیا میں نے ان کو پکڑا۔“ اور ذرا دیکھو یہ پکڑ کیسی تھی۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرٌ (۲۶:۳۵) ”دیکھو لو، میری سزا کیسی سخت تھی۔“ اللہ کی پکڑ بہت سخت تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ نے ان کو ہلاک کر کے رکھ دیا۔ لہذا جو لوگ اس راہ پر گامزن ہیں، انہیں ذرا ڈرنا چاہئے کہ ان کا انجام ایسا ہی نہ ہو جائے۔

یہ ہے قرآنی نوح جس کے ساتھ یہ سبق کھل ہوتا ہے۔ اب ہم ایک دوسری وادی کے لیے رخت سفر باندھتے ہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۰۳ ایک نظر میں

یہ سبق اس کائنات کی کتاب اور اللہ کی کتاب کے ایک اقتباس پر مشتمل ہے۔ کتاب کائنات کا مطالعہ اور اس کے خوبصورت اور عجیب صحیفہ پر ایک نظر ہے جو مختلف اقسام اور مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ جن کے پھل قسمیں ہیں، جس کے پھاڑ رنگ ہیں۔ جن کے انسان، حیوان اور زمین پر چلنے والے جانور مختلف النوع اور مختلف الاشکال ہیں۔ اس خوبصورت کائنات کا یہ عجیب مطالعہ بہت ہی دلچسپ ہے اور پوری کائنات اس کا موضوع ہے۔ پھر اللہ کی کتاب منزل کا مطالعہ اور اس کے اندر جو تعلیمات ہیں اور جو سچائیاں ہیں اور جو اس سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتی ہے پھر امت مسلمہ کا سابقہ امتوں کا وارث بنایا جاتا اور وارثوں کے درجے اور اہل ایمان کے لیے جو عفو و مغفرت اور انعامات تیار کیے گئے ہیں۔ جنتوں کے مناظر اور جہنم کے مناظر اور کافروں کے حالات اور آخر میں یہ قرار داد کہ یہ سب کچھ اللہ کے علم کے مطابق ہوتا ہے۔

--- () ---

درس نمبر ۲۰۳ تشریح آیات

۲۷ --- تا --- ۳۸

الْمَرْتَرَانِ أَنَّهُ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ
مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا
وَغَرَابِيبُ سُودٌ ۚ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَأَلْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ
كَذَلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ۝

”کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعہ سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی ’سفید‘ سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ زیر دست اور درگزر فرمانے والا ہے۔“

یہ اس کائنات کی ایک جھلک ہے۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ کتاب اللہ کا سرچشمہ اور کتاب کائنات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اس جھلکی میں پوری زمین کو دکھا دیا گیا ہے اور پوری زمین کے رنگ و رنگ ظاہر کیے گئے ہیں۔ پہلوں کے رنگ و اقسام ’پہاڑوں کے رنگ اور ان کی انواع‘ لوگوں کے رنگ اور شکلیں ’حیوانات اور مویشیوں کی اقسام و انواع‘ چند الفاظ کے اندر پوری زمین کے خدوخال ضبط کر دیئے گئے ہیں جس میں زندہ اور غیر زندہ سب چیزوں کو لپیٹ لیا گیا ہے۔ چند الفاظ کے اندر خداوند قدوس کی اس نمائش کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے جو بہت ہی دلکش ہے اور یہ دلکشی پوری زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔

آغاز میں ہم دیکھتے ہیں کہ بارشیں ہو رہی ہیں۔ اور ان بارشوں کے نتیجے میں اس زمین پر رنگارنگ پھل پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں چونکہ مختلف رنگوں کی نمائش مقصود ہے اس لیے پہلوں کے ذکر کے بجائے ان کے رنگ دکھائے جاتے ہیں۔

فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا (۲۷:۳۵) ”اور پھر اس کے ذریعہ ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں۔“ پہلوں کے رنگ بھی درحقیقت ایک عظیم نمائش گاہ ہے اور اس میں رنگوں کی جو اسطیم ہے اس کا کوئی حصہ دنیا کے تمام غماش مل کر بھی تیار نہیں کر سکتے۔ ایک قسم کے پہلوں کا رنگ دوسری اقسام سے مختلف ہے۔ بلکہ ایک قسم کے پہلوں میں بھی مختلف رنگ ہیں اور ایک قسم کا رنگ دوسروں سے مختلف ہے۔ اور ہر دانے کا رنگ بھی

دوسروں سے مختلف ہے۔

اور پھلوں کے رنگ کے بعد پھر پہاڑوں کے رنگ، اور پھلوں کے رنگوں اور پہاڑوں کے رنگوں کے درمیان بظاہر کوئی ربط نظر نہیں آتا لیکن اگر حقیقی مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو ایک قدرتی ربط موجود ہے۔ پہاڑوں کے رنگوں اور پھلوں کے رنگوں کے درمیان ایک قسم کا ربط موجود ہے۔ بلکہ پتھروں اور پہاڑوں کے رنگ بھی بعض اوقات پھلوں کے رنگوں جیسے ہوتے ہیں۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيبُ سُودٌ

(۲۷:۳۵) ”پہاڑوں میں سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔“
جدد کے معنی راستے اور شاخیں ہیں یعنی دھاریاں۔ آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ ”جدد بیض“ کا رنگ بھی مختلف ہے اسی طرح ”جدد حمر“ کا رنگ بھی مختلف ہے۔ یعنی ہر قسم یعنی سفید و سرخ کا رنگ بھی مختلف ہے اور بعض دھاریاں شدید درجے کی سیاہ ہیں۔

یہاں اس بات کی طرف توجہ دی جاتی ہے کہ ایک رنگ کے پتھر مثلاً سرخ و سفید پتھر آپس میں مختلف ہیں۔ پہاڑوں اور پتھروں کے یہ مختلف رنگ، پھلوں کے مختلف رنگوں کے بعد ذکر ہوئے۔ اس سے انسان کے دل میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور ذوق جمال تیز ہو جاتا ہے۔ یوں یہاں جمال اور خوبصورتی کو بھی تجریدی آرٹ کی شکل میں پیش کیا گیا جو بیک وقت پتھروں میں بھی ذوق نظر کے لیے دامن کش ہے اور پھلوں میں بھی ذوق نظر کو کھینچتا ہے جبکہ پھلوں میں اور پتھروں میں بظاہر کوئی نسبت نہیں ہے۔ لیکن تجریدی ذوق جمال ہر جگہ خوبصورتی کو دیکھ لیتا ہے اور قرآن کی یہ خصوصیت قابل الثبات ہے۔

پھر لوگوں کے رنگ؟ یہ انسانوں کے عام رنگوں تک محدود نہیں، بلکہ ایک رنگ کے مختلف لوگوں کے رنگ اور ہر ایک کی بناوٹ کے درمیان فرق ہے بلکہ دو لوگ بھی رنگ میں مختلف ہوتے ہیں۔

انسانوں سے آگے پھر پرندوں، چاندوں اور درندوں کے رنگ، دابہ ہر حیوان کو کہا جاتا ہے جو زمین پر چلتا ہے۔ انعام اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکریوں کے لیے آتا ہے۔ دولاب کے غنم کے بعد انعام کا خصوصی ذکر اس لیے کیا کہ انسان ان سے زیادہ مانوس ہے۔ ان کے رنگوں کی اسکیم بھی پھلوں اور پتھروں کی طرح حیران کن ہے۔

اس کائنات کے رنگوں کا یہ الہم عجیب و غریب ہے۔ قرآن کریم اس کی درق گردانی کرتا ہے اور انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ چشم بینا کے ساتھ رنگوں کی اس کائناتی اسکیم پر غور کرے۔ صرف اہل علم اور اہل ذوق ہی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ صرف اہل علم ہی حکمت اور قدرت خداوندی کو پا کر اللہ کی عظمت کا خیال کر کے اس سے ڈر سکتے ہیں۔

انَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۲۸:۳۵) ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف قلم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔“ کتاب کائنات کے جو اوراق قرآن مجید نے لئے ہیں وہ اس کے بہت کم اوراق ہیں اور علماء دراصل اس کائنات پر غور کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے علماء ہی دراصل اللہ کی حقیقی معرفت رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کی صنعتوں کے آثار سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور اللہ کی معرفت کا ادراک اس کی قدرت کے آثار

سے ملاحظہ کرتے ہیں۔ اللہ کی تخلیق کے عجائبات کو دیکھ کر اس کی عظمت کا شعور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ سے صحیح معنوں میں ڈرتے ہیں۔ وہ اس کی حقیقی بندگی اس کے خوف کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اللہ کے بارے میں ان علمائے کائنات کا شعور مہمل اور پیچیدہ شعور نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے بارے میں ان کو گہری معرفت حاصل ہوتی ہے۔

قرآن کے یہ صفحات اللہ کی کتاب کا نمونہ ہیں جبکہ رنگ اور دوسرے کائناتی عجائبات اس کائنات کا نمونہ ہیں اور ان کی حقیقت دراصل علمائے کائنات ہی مانتے ہیں۔ وہ لوگ جو حقیقی علم کتاب رکھتے ہیں اور جو حقیقی تکوینی علم بھی رکھتے ہیں۔ جو اللہ کی معرفت براہ راست رکھتے ہیں۔ ایسا علم جو ان کے دل کا شعور ہو اور جس کے ذریعہ ان کا دل متحرک ہو۔ جس کے ذریعہ وہ اس کائنات کے خوبصورت رنگوں کو کبھی طرح دیکھ سکتے ہیں اور ان سے خوشی حاصل کر سکتے ہیں اور اللہ کی قدرت کاملہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

اس کائنات کی تفکیک و تخیل میں حسن و جمال کا عنصر اصل مقصود ہے اور اس حسن کا کمال یہ ہے کہ ہر چیز اپنے فرائض منصبی اپنے طبعی جمال اور حسن کے واسطے سے ادا کرتی ہے۔ یہ پھول اپنے حسن و جمال اور اپنی نریت ہی کی وجہ سے خوشبو کی وجہ سے شہد کی مکھڑوں اور پروانوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مکھڑوں اور پروانوں کی ڈیوٹی پھولوں کے حوالے سے یہ ہے کہ یہ مادہ اور نر پھولوں کے درمیان ملاپ کر آئیں تاکہ پودوں کے ساتھ پھل لگیں۔ یوں یہ پھول اپنی خوبصورتی اور حسن و جمال کے ذریعے یہ کام کرواتے ہیں۔ مادہ اور نر کے درمیان حسن و جمال ایک دوسرے کے لیے باعث کشش ہوتا ہے اور اس طرح دو منفی اپنا اپنا فریضہ منصبی اور طبعی ادا کرتے ہیں۔ یوں تمام اشیاء فریضہ طبعی حسن و جمال کے ذریعے سرانجام دیتی ہیں۔ پس جمال اس کائنات کی اسکیم میں مقصود بالذات ہے اور یہی وجہ ہے کہ کتاب کائنات کے حسن و جمال کے اظہار کے لیے کتاب الہی جا بجا انسانی نظر کے لیے دامن کش ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ غَفُوْرٌ (۲۸:۳۵) ”بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے۔“ وہ زبردست ہے جس نے یہ اشیاء پیدا کیں اور وہ جزاء و سزا بھی دے سکتا ہے۔ وہ غفور ہے اور جو لوگ اس کی اطاعت اور خوف و خشیت میں تقصیر کرتے ہیں وہ ان کو معاف کرتا ہے۔ نیز جو لوگ اللہ کی صنعت کے عجائبات میں غور نہیں کرتے وہ ان کو بھی معاف کرتا ہے۔

اب صفحات کائنات سے روئے سخن صفحات کتاب الہی کی طرف پھر جاتا ہے کہ جو لوگ اس کی تلاوت کرتے ہیں ان کے پیش نظر کیا ہے اور ان کے لیے کیا کیا انعامات تیار ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتٰبَ اللّٰهِ وَآَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَآَنَفَقُوْا

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَ عَلٰنِیَۃً یَّرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ ۙ لَّیُوْفِیْہُمْ اُجُوْرُہُمْ

وَزَیْدٌ مِّنْ فَضْلِہٖ ۙ اِنَّہٗ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ ۙ

”جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے متوقع ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہو گا۔ (اس تجارت میں انہوں نے اپنا سب کچھ اس لیے کھپایا ہے) تاکہ اللہ ان کے اجر پورے کے پورے ان کو دے اور مزید اپنے فضل سے ان کو عطا فرمائے۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور قدر دان ہے۔“

تلاوت کتاب سے مراد صرف جہاں یا خاموشی کے ساتھ کلمات کتاب دہرانے کے بجائے کوئی اور چیز ہے اور وہ ہے قرآن کو تئیر کے ساتھ پڑھنا۔ جس کے بعد پڑھنے والا کسی حقیقت کا ادراک کرے اور اس سے متاثر ہو۔ اس کے بعد وہ اس پر عمل کرے اور اپنی زندگی کو اس پر ڈھالے۔ یہی وجہ ہے کہ تلاوت قرآن کے بعد اقامت صلوٰۃ اور انفاق کا ذکر ہوا خواہ پوشیدہ ہو یا عدنیہ ہو۔ اور اس کے بعد پھر ایسے لوگوں کو یہ امید ہو کہ اس سود میں انہیں کوئی گھٹا نہ ہو گا۔ ایسے لوگوں کو یہ معرفت حاصل ہو کہ اللہ کے ہاں جو اجر ہے وہ ان امور سے بہتر ہے جو ان کے ہاں ہیں۔ ان کو یہ یقین بھی ہو کہ وہ ایک ایسی تجارت کر رہے ہیں جس کا فائدہ محفوظ ہے اور ضمانت شدہ ہے۔ وہ اللہ وعدہ سے معاملہ کیے ہوئے ہیں اور اللہ کے ساتھ کیا ہوا یو پار بہت ہی نفع بخش ہوتا ہے۔ یہ تجارت اخروی تجارت ہے جس میں منافع کی شرح بہت زیادہ ہے۔ یہ ایک ایسی تجارت ہے جس میں لین دین باطل پورا پورا ہوتا ہے اور اس پر فضل اللہ بھی ہوتا ہے۔ وہ (غفور و شکور ہے) تقصیرات کو معاف کرتا ہے اور بہت ہی شکر کرنے والا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے شکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ بہترین جزاء دیتا ہے لیکن لفظ شکر انسان کے لیے حوصلہ افزائی کے لیے استعمال ہوا ہے اور یہ بات انسان کو شرم دلانے کے لیے اور حیا کرنے کے لیے کہی گئی ہے کہ جب اللہ منعم حقیقی اپنے بندوں کا شکر کرتا ہے تو پھر بندوں کا تو فرض ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کے شکر میں رطب اللسان رہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

اس کے بعد اس کتاب کے مزاج کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے اندر حق ہی حق ہے اور اس کے وارث جنتوں کے وارث ہوں گے۔ آگے اس حق کے وارثوں کی بات آرہی ہے۔

وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا

بَيْنَ يَدَيْهِ إِنَّ اللَّهَ بِعِبَادِهِ لَخَبِيرٌ بَصِيرٌ ﴿۳۵﴾

”(اے نبی!) جو کتاب ہم نے تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی ہے وہی حق ہے تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے آئی تھی۔ بیشک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔“

سچائی کے دلائل اس کتاب کے مضامین میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہیں۔ یہ کتاب اس کائنات کے حقائق کی ترجمان ہے۔ بلکہ یہ کتاب اس کائنات کا وہ صفحہ ہے جو پڑھا جاتا ہے اور پوری کائنات وہ صفحہ ہے جو خاموش ہے اور اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو اللہ نے پہلے بھی بھیجی ہیں کیونکہ دونوں کا صدر اور سرچشمہ ایک ہے۔ اور سچائی ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ اس میں تعدد نہیں ہوتا۔ اس کتاب کے نازل کرنے والے نے اسے لوگوں کے

لیے بھیجا ہے اور وہ لوگوں کا خالق ہے اور وہ اچھی طرح لوگوں کو جانتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس چیز میں ان کی مصلحت ہے اور کس چیز کے ذریعہ ان کی اصلاح ممکن ہے۔

”اِنَّ اللّٰهَ بَعْبَادَهٗ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ“ (۳۵: ۳۱) ”بے شک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔“

یہ تو ہے حقیقت اس کتاب کی۔ یہ کتاب اللہ نے امت مسلمہ کو دی ہے اور اللہ نے اس کام کے لیے اس کا انتخاب کیا ہے جیسا کہ اللہ فرماتے ہیں :

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا

”پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنا دیا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے (اس وراثت کے لیے) اپنے بندوں میں سے چن لیا۔“ ان الفاظ پر امت مسلمہ کو غور کرنا چاہئے۔ اللہ نے اسے بہت ہی بڑا اعزاز دیا ہے اور اللہ نے اس کے کاندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے۔ اس انتخاب کے ذریعہ سے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کتاب کے کچھ تقاضے ہیں۔ کیا یہ برگزیدہ امت سن رہی ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ اور اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہے۔ اللہ نے تو اس امت کو اس انتخاب کی وجہ سے بہت بڑی عزت دی ہے اور اس کے بعد اللہ نے اس پر جزاء اور انعام مقرر کر کے اسے حرید فضیلت عطا کر دی ہے۔

فِيْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖۭ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌۢ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ يٰۤاٰذِنُ اللّٰهِ

”اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی بیچ کی راہ ہے، اور کوئی اللہ کے لذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے۔“ پہلا فریق تعداد میں زیادہ ہو گا اس لیے اس کا ذکر پہلے کیا گیا۔ یہ لوگ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہوں گی اور ان لوگوں کے اعمال میں سے سب سے زیادہ ہوں گے اور نیکیوں کم ہوں گی۔ اور دوسرا فریق مقتصد ہو گا۔ یعنی میانہ روی والا۔ اس کی نیکیوں اور بدیاں برابر ہوں گی۔ اور تیسرا فریق سابق بالخیرات ہو گا یعنی نیکیوں میں سبقت لے جانے والا۔ اس کی نیکیاں برائیوں سے بہت زیادہ ہوں گی لیکن ان تینوں کے ساتھ اللہ کا فضل شامل رہے گا۔ یہ سب لوگ آنے والی آیتوں میں مذکور نعمتوں میں داخل ہوں گے۔ اگرچہ درجات میں مختلف ہوں گے۔

قرآن کریم نے امت کی کرامت کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے ہم اس میں کوئی اضافہ کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اللہ نے اس امت کو برگزیدہ کر لیا ہے اور اس کے لیے جزائے خیر کا اعلان کر دیا ہے۔ آیات یہی بتاتی ہیں کہ آخر کار امت کا انجام یہی ہو گا۔ امت سب کی سب اس اچھے انجام تک پہنچ جائے گی اور اس کی تفصیلات ہم اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس جزاء کو ہم یہاں لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں جو اللہ نے اس امت کے ان تینوں قسم کے لوگوں کے لیے مقدر کر رکھی ہے اور وہ

جیسی ہی جزا ہوگی۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿۳۳﴾ جَنَّتٌ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا يُحَلَوْنَ
فِيهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ﴿۳۴﴾ وَقَالُوا
الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۵﴾
الَّذِيْ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهِ ؕ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ
لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۶﴾

”یہی بہت بڑا فضل ہے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے‘ وہاں انہیں سونے کے کنگوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا‘ وہاں ان کا لباس ریشم ہو گا‘ اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا‘ یقیناً ہمارا رب معاف کرنے والا اور قدر فرمانے والا ہے‘ جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ نصیرا دیا‘ اب یہاں نہ ہمیں کوئی مشقت پیش آتی ہے اور نہ ٹکان لاحق ہوتی ہے۔“

اس منظر میں نہایت ٹھوس اور مادی نعمتوں کا ذکر ہے اور ایسی نفسیاتی سہولتوں کا ذکر ہے جنہیں محسوس کیا جاتا ہے۔ وہاں ان کی ٹکاہری حالت یہ ہوگی۔

يُحَلَوْنَ فِيهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيْرٌ (۳۵:۳۳)
”وہاں انہیں سونے کے کنگوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا‘ وہاں ان کا لباس ریشم ہو گا۔“ یہ ساز و سامان مادی اور ٹھوس ہے اور نظر آنے والا ہے۔ انسان کا نفس ان چیزوں کو پسند کرتا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی رضامندی‘ دلی اطمینان اور امن و سکون ہو گا۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (۳۵:۳۴) ”شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کیا۔“ اور یہ دنیا جہاں ہر شخص قلق و بے چینی اور مصائب و مشکلات سے دوچار ہوتا ہے آخرت کے مقابلے میں حزن ہے جہاں نعیم مقيم ہو گا۔ حشر کے دن کی پریشانی دنیا کی پریشانیوں سے بھی بڑی ہوگی جس سے ان کو نجات مل چکی ہوگی۔

اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۳۵:۳۴) ”بے شک ہمارا رب معاف کر دینے والا اور قدر فرمانے والا ہے۔“ اس نے ہمیں بخش دیا‘ ہمارے معتبر اعمال کی قدر کی اور اس پر بہت بڑا معاوضہ دیا۔

الَّذِيْ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ (۳۵:۳۵) ”جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ نصیرا دیا۔“ ہمیشہ کے لیے رہائش پذیر کر دیا اور مستعلاً ہم آباد ہو گئے۔ یہ کام اس نے اپنے فضل و کرم سے کیا کیونکہ ہم اپنے اعمال

کے بل بوتے پر توسع نہ تھے۔ یہ تو فضل تھا ہمیں کوئی مشقت پیش آتی ہے اور نہ نکان لاحق ہوتی ہے۔ بلکہ یہاں راحت، اطمینان اور ہر قسم کی نعمتیں جمع ہیں۔

پوری فضا آرام، راحت اور نعمتوں سے مالا مال ہے۔ اور اس نرم و نازک اور پر لطف ماحول کے لیے اللہ نے الفاظ بھی نہایت ہی نرم و نازک چنے ہیں۔ یہاں تک کہ غظ، حزن کو بھی یہاں حزن کہہ کر نرم و نازک کر دیا گیا ہے اور جنت کے لیے دار القامہ کا غظ استعمال ہوا ہے۔ نکان اور مشقت کے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ چھو کر بھی نہ جاسکے گی۔ اور الفاظ اور نعروں کا ترنم اپنی جگہ نہایت ہی فرحت بخش ہے۔ نہایت ہی دھیمی موسیقی کی طرح۔ اب ذرا دوسری جانب آئیے! قل، اضطراب اور پریشانی اور افراتفری۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا

”اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ نہ ان کا قصہ پاک کر دیا جائے گا کہ مرجائیں اور نہ ان کے لیے جہنم کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی۔“ نہ یہ ہے اور نہ وہ۔ ان کے لیے موت بھی نہ ہوگی۔

كَذَٰلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ

”اس طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اس شخص کو جو کفر کرنے والا ہو۔“ اور اب ہمارے کان ایک کرخت اور سخت آواز سنتے ہیں۔ یہ ایک غوغا ہے جو مختلف آوازوں سے مل کر اٹھ رہا ہے۔ یہ مختلف اطراف سے آنے والی چیخ و پکار ہے۔ ان کی طرف سے جو جہنم میں پھینک دیئے گئے ہیں۔

وَهُمْ يَصْطَرِحُونَ فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۖ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ

”وہ وہاں چیخ کر کہیں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کرس ان اعمال سے مختلف ہو پہلے کرتے رہے تھے۔“ (انہیں جواب دیا جائے گا) ”کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟ اور تمہارے پاس متنبہ کرنے والا بھی آچکا تھا۔ اب مزا چکمو۔ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے۔“

وَهُمْ يَصْطَرِّخُونَ فِيهَا (۳۵:۳۷) ”وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے“۔ لفظ (یصطرخون) کے تلفظ کے اندر ہی اس کے تمام مفہوم ثبت ہیں۔ اس کرخت آواز ہی سے اس کا مفہوم ظاہر ہو جاتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں:

رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ (۳۵:۳۷) ”اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال دے تاکہ ہم نیک عمل کریں ان اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے“۔ اب یہ اللہ کی طرف جھک رہے ہیں۔ اعتراف گناہ کر رہے ہیں اور تادم ہیں لیکن جب چڑیاں چک گئیں کھیت۔ دیکھئے کس قدر سخت اور دو ٹوک جواب سنتے ہیں ہم جس کے اندر سرزنش بھی ہے۔

أَوَلَمْ نَعْمَرْكُمْ مَا يُتَذَكَّرُ فِيهِ مِنْ تَذَكُّرٍ وَجَاءَكُمْ النَّذِيرُ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ (۳۵:۳۷) ”(انہیں جواب دیا جائے گا) ”کیا ہم نے تم کو اتنی مرنہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟ اور تمہارے پاس تنبیہ کرنے والا بھی آچکا تھا۔ اب حرا چکو۔ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے۔“

تمہیں ہم نے ’مردی‘ تم نے اس سے استفادہ نہ کیا، حالانکہ یہ عمران لوگوں کے لیے کافی تھی جو نصیحت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پھر تمہاری مزید سولت کے لیے انبیاء بھی بھیجے گئے۔ انہوں نے تمہیں ڈرایا مگر تم نہ ڈرے۔ ان آیات میں دو باہم متقابل صورتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک جانب امن و راحت ہے اور دوسری جانب قلق و اضطراب ہے۔ ایک طرف شکر نعمت کا بیٹھا نغمہ ہے اور دوسری طرف چیخ و پکار ہے۔ ایک طرف اعزاز و اکرام و استقبال ہے اور دوسری جانب نظرائم از کرنا اور سرزنش کرنا ہے۔ ایک طرف نرم و نازک اور فرحت بخش الفاظ اور دوسری جانب کرخت اور سخت جھڑکی ہے۔ یوں کلام کے دونوں اطراف میں مکمل تقابل ہے، ہر جزو میں۔

اور سب سے آخر میں تمام مناظر پر ایک تھخری تبرہ آتا ہے، خصوصاً اہل دین اور امت مصطفویٰ کو جن لینے اور اسے اعزاز و اکرام دینے پر۔

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمُ غَيْبِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ

الصُّدُورِ ﴿۳۶﴾

”بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز سے واقف ہے۔ وہ تو سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔“

اللہ کا کامل و شامل اور وسیع و عریض علم تو ان موضوعات کے بعد بیان کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے کتاب نازل کی اور اس کتاب کے جو لوگ وارث بن گئے ہیں، وہ جہاں والوں سے برگزیدہ کہے گئے ہیں۔ ان میں سے اگر بعض لوگوں سے کوئی ظلم و تعصیر صادر ہو جائے تو اللہ ان کو معاف کر دے گا۔ یہ اللہ کی جانب سے ان پر فضل و کرم ہو گا اور پھر اہل کفر کا جو انجام بتایا گیا۔ ان سب حقائق پر یہ آخری تبرہ کہ وہ عالم الغیب ہے اور آسمانوں اور زمینوں میں پائی جانے والی ہر چیز کو جانتا ہے۔ وہ دلوں کی باتوں کو بھی جانتا ہے لہذا وہ تمام فیصلے اپنے اس عظیم اور کامل و شامل علم کے ذریعے کرے گا۔ اللہ کے فیصلوں میں کوئی ناانصافی نہ ہوگی۔

درس نمبر ۲۰۴ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا آخری سبق ہے اور یہ وسیع مطالعاتی اسفار پر مشتمل ہے۔ اس میں جابجا دل و دماغ کو تیز احساس دلایا گیا ہے اور اشارات و ہدایات دی گئی ہیں۔ انسانوں کی تاریخ کی طویل وادی میں دور تک یہ سفر ہے جس میں بے شمار نشیب و فراز آتے ہیں۔ بعض اقوام و ملل کیا اور بعض کچھ ہیں۔ پھر زمین و آسمان کا ایک سفر بھی اس میں ہے جس میں سعی بسیار کے باوجود اللہ کا کوئی شریک اور ہمسرنہ ملا۔ پوری کائنات کو چھان مارا۔ پھر ایک سفر اس مطالعہ کے لیے ہے کہ زمین و آسمان کو اللہ نے کس طرح تمام رکھا ہے۔ وہ ہمیں توازن کیا ہے جس کی وجہ سے کائنات کے یہ دیو ویکل کرے باہم نہیں کھرتے۔ پھر ایک سفر اس قوم کی وادیوں میں ہے جس نے ہدایت کو ٹھکرا دیا ہے حالانکہ اس سے قبل یہ قوم دعائیں کرتی تھی کہ اگر اس کے امیر کوئی رسول آگیا تو وہ دوستوں میں سے کسی ایک کے مقابلے میں کم از کم زیادہ ہدایت پر ہوں گے۔ لیکن جب ان کے ہاں رسول بشیر و نذیر بھیجا گیا تو وہ اپنے وعدے کو بھلا بیٹھے اور بے حد نفرت کرنے لگے اپنے مطلوب رسول سے۔ اور پھر انسانی تاریخ کی طویل وادیوں میں ہلاک کردہ اقوام کی سیرجن پر عذاب آئے اور ہلاک ہوئیں لیکن آج کے لوگ ان مصائب سے کوئی عبرت نہیں لیتے اور پھر اس سبق کا خوفناک خاتمہ۔

وَلَوْ يَأْخُذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرٍ هَآ مِنْ دَآبَّةٍ (۴۵:۳۵)۔
 ”اگر کہیں اللہ لوگوں کو ان کے کرتوتوں پر پکڑتا تو زمین پر کسی شخص کو جینا نہ چھوڑتا۔“ لیکن یہ اللہ کا عظیم فضل ہے کہ وہ لوگوں کو مہلت دیئے جا رہا ہے اور ان پر تباہ کن عذاب نازل نہیں فرماتا حالانکہ وہ اس کے مستحق ہیں۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۰۲ تشریح آیات

۳۹ --- تا --- ۴۵

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ
وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا مَقْتًا وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ
كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾

”وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ اب جو کوئی کفر کرتا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے اور کافروں کو ان کا کفر اس کے سوا کوئی ترقی نہیں دیتا کہ ان کے رب کا غضب ان پر زیادہ سے زیادہ بھڑکتا چلا جاتا ہے۔ کافروں کے لیے خسارے میں اضافے کے سوا کوئی ترقی نہیں۔“

زمین کے اوپر نسلوں کا آنا اور جانا اور اس کا تسلسل اور ایک نسل کا مٹنا اور دوسری کا اس کی جانشینی کے مقام کو پانا، ایک مملکت کا ختم ہونا اور دوسری کا قیام عمل میں آنا، ایک شعلہ ہوائ کا بجھنا اور دوسرے کا اشتعال پذیر ہونا، ایک قوم کا مٹنا اور دوسری کا ظاہر و غالب ہونا اور صدیوں سے ایسا ہوتے چلے جانا۔ تاریخ کی اس رفتار پر غور و فکر کرنے سے انسان کو بہت سادہ و سبقت اور عبرت حاصل ہوتی ہے اور حاضر اقوام یہ سوچتی ہیں کہ انہیں بھی اسی طرح نیست و نابود ہونا ہے۔ ان کے آثار پر بھی آنے والے اسی طرح غور کس گئے جس طرح ہم جانے والوں کے آثار پر غور کرتے ہیں۔ یوں غافل سے غافل شخص بھی ہوش کے ناخن لے سکتا ہے۔ یوں ایک غور کرنے والا یہ غور کر سکتا ہے کہ وہ دست قدرت کیا ہے جس کی یہ سب کرشمہ سازیاں ہیں کہ کسی کی عمر کم ہے اور کسی کی زیادہ۔ آج ایک حکومت ہے اور کل دوسری۔ آج ایک ملک پر قابض ہے اور کل دوسرا قابض ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کی جانشین ہے۔ ہر چیز جاری ہے۔ اس کی اختتام ہو رہی ہے اور باقی ہے صرف نام اللہ کا۔ جو نہ زائل ہوتا ہے اور نہ اس کے لیے اختتام ہے۔

جو چیز جانے والی ہے اور اس کا وجود ختم ہوتا ہے وہ دائمی نہیں ہوتی۔ اس کی مثال اس طرح ہے جس طرح ایک مسافر کسی منزل پر رکتا ہے۔ کل اسے آگے جانا ہوتا ہے۔ اور بعد میں دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اس نے کیا کیا اور کیا چھوڑا۔ اور اس کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ اس کا حساب کیا جائے کہ اس نے کیا کیا اور کیا نہ کیا۔ لہذا ہر شخص کا یہ

فرض ہے کہ وہ اپنی قلیل زندگی میں اچھے کام کرے اور اپنے پیچھے ذکر جمیل چھوڑے۔ کچھ ایسے کام کرے جو اس کے جائے آرام میں اسے کام آئیں۔

یہ ہیں بعض وہ خیالات جو دل و دماغ کی دیواریں پھلانگ کر آتے ہیں لیکن اس وقت جب کوئی اقوام کے عروج و زوال کو دیکھتا ہے۔ طلوع و غروب پر غور کرتا ہے۔ عروج پانے والی قوتوں اور مٹ جانے والی قوتوں کے امور پر غور کرتا ہے اور ایک قوم کو دیکھتا ہے کہ وہ دوسری قوم کی وارث ہو جاتی ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ (۳۵: ۳۹) ”وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔“ اس موثر مسلسل اور دیکھے جانے والے منظر کے سائے میں انسانوں کو یہ یاد دہانی کرنی جاتی ہے کہ ذمہ داری انفرادی ہے۔ لہذا قیامت میں کوئی کسی کی جگہ کوئی ذمہ داری نہ اٹھا سکے گا اور کوئی کسی کے مقابلے میں مدافعت نہ کر سکے گا۔ یہاں اشارہ کیا جاتا ہے کہ تم جس طرح نہ پھرتے ہو، جس طرح کفر کرتے ہو، جس طرح گمراہی میں مبتلا ہوتے ہو، آخر کار اس کا انجام نہایت ہی گھناؤنا ہو گا۔

فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتًا وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا (۳۵: ۳۹) ”اب جو کوئی کفر کرتا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے اور کافروں کو ان کا کفر اس کے سوا کوئی ترقی نہیں دیتا کہ ان کے رب کا غضب ان پر زیادہ سے زیادہ بھڑکتا چلا جاتا ہے۔ کافروں کے لیے خسارے میں اضافے کے سوا کوئی ترقی نہیں۔“ حق کا مغموم شدید غضب ہے اور جس پر اللہ کا شدید غضب ہو جائے تو اسے جان لینا چاہئے کہ کس قدر برا انجام اس کے انتظار میں ہے۔ اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

دو سراسر آسمانوں کی وسعتوں میں ہے تاکہ معلوم کیا جاسکے کہ جن لوگوں کو یہ اللہ کا شریک بناتے ہیں آیا ان کے کسی کارنامے کے کوئی آثار زمین و آسمان میں ہیں۔ زمین و آسمان میں تو ان کا کوئی اثر پتہ نہیں ہے اور نہ کچھ آثار ہیں۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَوَاتِ أَمْ أُنِذِرُكُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْهُ بَلْ إِنَّ يَعْدُو الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ﴿۴۰﴾

”(اے نبی!) ان سے کہو ”بھی تم نے دیکھا بھی ہے اپنے ان شریکوں کو جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہو؟ مجھے بتاؤ انہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں میں ان کی کیا شرکت ہے (اگر یہ نہیں جانتے تو ان سے پوچھو) کیا ہم

نے انہیں کوئی تحریر لکھ کر دی ہے جس کی بنا پر یہ (اپنے اس شرک کے لیے) کوئی صاف دلیل رکھتے ہوں؟ نہیں بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسنے دیئے جارہے ہیں۔“

یہ حجت بالکل واضح ہے اور یہ دلیل محتاج تشریح نہیں ہے۔ یہ زمین اور اس کے اندر جو بھی ہے اس کے ساتھ وہ اللہ کی مخلوق ہے اور یہ آسمان اپنی وسعتوں تک اللہ کا ہے۔ اس زمین کے اندر نظر آنے والی اشیاء میں سے کون سی چیز ایسی ہے جس کے بارے میں اللہ کے سوا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہو یا کسی اور کے بارے میں دعویٰ کیا جاسکتا ہو کہ اس نے اسے پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے تو ہر چیز اس کے دعویٰ کے خلاف پکار اٹھے گی کہ یہ غلط ہے اور ہر چیز پکار کر کہے گی کہ اسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ ہر چیز اپنے اندر ایسے آثار اٹھائے ہوئے ہے کہ وہ کسی مدعی کے دعویٰ کو رد کرنے کے لیے کافی ہیں کیونکہ یہ آثار کسی انسانی صنعت سے مشابہت ہی نہیں رکھتے۔ یعنی انسانوں نے جس قدر چیزیں بنائی ہیں ان میں نظام قدرت کی مصنوعات کی صفات نہیں ہیں۔

اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ (۳۵: ۴۰) ”یا آسمانوں میں ان کی کیا شریکت ہے۔“ یہ تو بطریق اولیٰ مسترد ہے۔ جب زمین کی کسی چیز میں وہ شریک نہیں تو آسمان کی کسی چیز میں شریک کیسے ہیں۔ کیونکہ جب زمین کی کسی چیز کے بارے میں کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ان نام نہاد والیوں کی مخلوق ہے تو آسمان کی کسی چیز کے بارے میں کوئی کیسے دعویٰ کر سکتا ہے۔ غرض نہ یہ اللہ آسمانوں کی کس چیز کی تخلیق میں شریک ہیں اور نہ ملکیت میں شریک ہیں۔ جو چیز بھی آپ کہیں۔ یہاں تک کہ جن اور ملائکہ کو بھی ایسی کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ ان کے بارے میں تو ان کا زعم یہ تھا کہ جن آسمانوں کی خبریں چرا کر لاتے ہیں اور یہ ان سے یہ خبریں معلوم کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ عقیدہ کبھی نہیں رہا ہے کہ جن یا ملائکہ آسمانوں میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔

اَمْ اَتَيْنَهُمُ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰی بَيِّنٰتٍ مِّنْهُ (۳۵: ۴۰) ”کیا ہم نے ان کو کوئی تحریر لکھ کر دی ہے جس کی بنا پر کوئی صاف سند رکھتے ہیں۔“ یہ کہ اللہ نے ان خود ساختہ خداؤں کو کوئی تحریر دی ہو اور انہیں یقین ہو کہ وہ بھی خدا کے ساتھ شریک ہیں یہ مفروضہ بھی غلط ہے۔ یہاں یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہ استغمام انکاری شرکاء کے بجائے مشرکین سے ہو، یعنی ان خود ساختہ الوہوں پر ان لوگوں کا جو اندھا عقیدہ ہے کیا یہ عقیدہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کسی تحریر پر جہی ہے۔ جو ان مشرکین پر اتری ہو۔ اس سے یہ اپنا عقیدہ لیتے ہوں اور استدلال کرتے ہوں جبکہ یہ صحیح نہیں ہے اور نہ وہ کوئی ایسی تحریر پیش کر سکتے ہیں۔ یہاں اس تفسیر کے مطابق یہ اشارہ بھی نکلے گا کہ عقائد صرف اللہ کی جانب سے کسی کتاب اور صریح نص ہی سے ثابت ہوتے ہیں اور کتاب اللہ ہی نظریات کے لیے ماخذ ہو سکتی ہے کیونکہ یہی یقینی سرچشمہ ہدایت ہوتی ہے۔ ان کے پاس کوئی منصوص دلیل چونکہ نہیں ہے اس لیے ان کا دعویٰ غلط ہے۔ ان کے مقابلے میں رسول اللہؐ کا ہر قول اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا ہے اور مستند ہے۔ پس کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ منہ پھیرتے ہیں حالانکہ عقائد لینے کا صحیح راستہ یہی ہے کہ یہ لوگ رسولؐ کی بات مانیں۔

بَلْ اِنَّ يَظْلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا (۳۵: ۴۰) ”بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو

محض فریب کے جھانسنے دیئے جا رہے ہیں۔ یہ ظالم ایک دوسرے سے لمبے چوڑے وعدے کرتے ہیں کہ ان کا راستہ یہی راستہ ہے جو آباء و اجداد کا ہے اور یہ کہ وہ آخر کار کامیاب ہوں گے۔ حالانکہ یہ لوگ فریب خوردہ اور مطرور ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ بعض کو دھوکہ دیتے ہیں۔ وہ اس غرور میں زندہ رہتے ہیں اور یہ ان کے لیے کوئی نفع بخش صورت حال نہیں ہے۔

اس کے بعد کہ اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے نہ آسمانوں میں نہ زمین میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ دست قدرت کا کارنامہ ہے کہ جس نے زمین و آسمان کو تھم رکھا ہے اور وہ بلا شرکت غیرے اس کائنات کا مدبر اور چلانے والا ہے۔ کائنات میں کوئی اور الہ تلاش کرنے کے بجائے خود اس کو دیکھو۔

إِنَّ اللَّهَ يُمِصُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا
إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ۝

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو نل جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ نل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا انہیں تھامنے والا نہیں ہے۔ بے شک اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے۔“

ذرا اس آسمان پر نگاہ ڈالو اور زمین کو دیکھو اور ان لاتعداد اربوں اجرام فلکی کو دیکھو جو اس لا انتافہا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ تمام کے تمام اپنی جگہ پر رکے ہوئے ہیں جو اپنے افلاک میں پھر رہے ہیں۔ اپنے مدارات میں مقرر، پھر ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ نہ ان کی رفتار میں کوئی غلط آتا ہے نہ مدار سے نکل سکتے ہیں نہ ان کی رفتار سست ہو سکتی ہے، اور نہ تیز ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کو اس طرح اپنے مقام پر ٹھہرانے کے لیے کوئی ستون نہیں لگا ہوا اور نہ یہ مضبوط رسیوں سے باندھے ہوئے ہیں۔ کسی چیز کا بظاہر ان پر کوئی سہارا نہیں ہے۔ اس عظیم مخلوق کو دیکھتے ہو جو اربوں کھربوں کی تعداد سے زیادہ ہے اور جو نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ ایک عقلمند انسان کی آنکھیں ضرور کھل جانی چاہئیں کہ اس کے پیچھے ایک نہایت طاقتور الہ العالین کا دست قدرت کام کر رہا ہے جس نے اس عظیم کارخانے کو تھام رکھا ہے۔

اگر آسمانوں کے یہ سیارے اور ستارے اور زمین اپنی جگہ سے نل جائیں اور بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھر جائیں تو ان کو کوئی پھر سے مرتب نہیں کر سکتا۔ یہ ہے وہ وقت جب قیامت برپا ہو جائے گی اور اس جہان کے خاتمہ کے لیے قرآن نے اسی نظام کے اختلال کو علامت قرار دیا ہے جہاں پہاڑ اور ستارے روٹی کے گالوں کی طرح اڑ جائیں گے اور اس نظام کائنات کی ہر شے دوسری سے ٹکرا جائے گی۔

یہ وہ مقرر وقت ہے جس میں تمام لوگوں کا حساب و کتاب ہو گا اور دنیا میں جس نے جو عمل کیا اس کا محاسبہ ہو گا۔ دنیا کا انجام عالم آخرت پر ہو گا اور یہ دو سرا جہان اپنے مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے اس دنیا سے بالکل مختلف ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ زمین و آسمان کو تھامے رکھنے پر یہ تمبر ہوتا ہے۔

إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا (۳۵: ۴۱) ”اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے۔“ وہ حلیم ہے۔

لوگوں کو سہلت دیتا ہے، وہ ان کی بد عملی کی وجہ سے اس جہان کو ختم نہیں کرتا اور اجل مقرر سے قبل ہی ان سے حساب و کتاب لینا نہیں شروع کر دیتا۔ لوگوں کو توبہ کا بھی موقع دیتا ہے، قیامت کی تیاری کی سہلت بھی دیتا ہے اور غفور اس طرح ہے کہ لوگوں نے جو جو جرائم کیے سب پر مواخذہ نہیں کرتا بلکہ اللہ لوگوں کی برائیوں کے ایک بڑے حصے سے درگزر فرماتا ہے۔ جب بھی اللہ ان میں کوئی بھلائی دیکھے تو ان کی مغفرت کر دیتا ہے۔ یہ ایک ہدایت ہے جو لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ وہ اس موقع اور ضرورت کو غنیمت سمجھیں اور اگر یہ فرصت گنوا دی تو یہ دلہن نہ آئے گی۔

--- ○ ○ ○ ---

چوتھا سفر نفل مکہ اور اس کے ارد گرد کے مشرکین کے احوال کا ہے۔ ان لوگوں کی وہ ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ اگر اللہ ان میں رسول بھیج دے اور اسے کتاب دے دے تو وہ ایمان لائیں گے۔ پھر انہوں نے نقص عمد کیا اور فساد کی الارض کا ارتکاب کیا۔ ان کو ڈرایا جاتا ہے کہ اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

وَأَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ أَهْدَىٰ مِنْ
إِحْدَى الْأُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا ۚ اسْتَكْبَارًا فِي
الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَمْلِهِ ۚ فَهَلْ يَنْظُرُونَ
إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ
اللّٰهِ تَحْوِيلًا ۚ

”یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کھا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راست رو ہوتے۔ مگر جب خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا تو اس کی آمد نے ان کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔ یہ زمین میں اور زیادہ سرکشی کرنے لگے اور بری بری چالیں چلنے لگے، حالانکہ بری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو سب سے بھینتی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا ہے وہی ان کے ساتھ بھی برتا جائے؟ یہی بات ہے تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے۔“

فل عرب دیکھتے تھے کہ یہودی جزیرۃ العرب میں ان کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کو لیک کتاب دی گئی ہے اور وہ دیکھتے تھے کہ یہ یہودی اپنے دین سے منحرف ہو گئے ہیں اور بے عمل ہیں۔ عرب ان کی تاریخ بھی پڑھتے تھے کہ انہوں نے اپنے بے شمار رسولوں کو قتل بھی کیا اور جب بھی ان کے پاس سپائی آئی انہوں نے اس سے منہ پھیرا۔ اس وقت یہ یہودیوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے قسمیں کھا یا کرتے تھے کہ اگر اللہ نے ہمیں کوئی پیغمبر دیا، اور وہ عربوں میں مبعوث ہوا تو وہ دنیا کی تمام امتوں سے بڑھ کر نیک ہوں گے۔ مراد ان کی یہ تھی کہ یہودیوں سے وہ زیادہ ہدایت پر

رہیں گے۔ یہ لوگ اشارہ یودیوں کی طرف کرتے تھے۔

لَئِنْ جَاءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ أَهْدَىٰ مِّنْ إِحْدَى الْأُمَمِ (۳۵: ۴۲) ”اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہو، تو وہ دنیا کی ہر قوم سے زیادہ راست روہوتے۔“

یہ تھا ان کا حال قبل بعثت اور یہ تھا ان کا عقیدہ۔ یہ عقیدہ قرآن مجید ان پر اس طرح پیش کرتا ہے کہ ذرا تم اس صورت حالت کو یاد کرو کہ تم کیا کہا کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کے سامنے وہ حالات پیش کیے جاتے ہیں جو عملاً رسول کے آنے کے بعد پیش آئے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُم إِلَّا نُفُورًا (۳۵: ۴۲) اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَ

مَكْرَ السَّيِّئِ (۳۵: ۴۳) ”مگر جب خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا تو اس کی آمد نے ان کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔ زمین میں اور زیادہ سرکشی کرنے کی خاطر اور بری چالیں چلنے کی وجہ سے۔“ یہ کس قدر بری بات ہے کہ ایک شخص قسمیں کھائے کہ اس کا رویہ یہ ہو گا اور پھر وہ اس کے الٹ رویہ اختیار کرے۔ مگر عجب و غرور کی وجہ سے اور اپنی بری سازشوں کی وجہ سے۔ قرآن مجید ان کے انکار کا اصلی سبب ریکارڈ کرتا ہے اور اس کے بعد قرآن مجید پھر ان کی ان مکادیوں کے بارے میں یہ فیصلہ اور جواب یوں دیتا ہے کہ جو شخص اس قدر قبیح حرکت کرتا ہے اس کا ایمان کیا ہو گا۔ اور انجام کیا ہو گا۔

وَلَا يَحْقِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (۳۵: ۴۳) ”حالانکہ بری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔“ یعنی ان کی بری چالیں ان ہی کے خلاف پڑیں گی اور یہ بری چالیں ان کو نخبوط الھو اس کر دیں گی اور ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ اگر صورت یہ ہے تو پھر یہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں۔ صرف اس کا کہ ان پر بھی وہی مصائب آجائیں جو ان سے پہلی اقوام پر آئے۔ سابقہ اقوام کے قصے تو انہیں معلوم ہیں۔ وہ بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ کی مستحکم سنت انہیں پکڑ لے۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا (۳۵: ۴۳) ”یہی بات ہے تو تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقررہ راستے کوئی حالت پھیر سکتی ہے۔“

--- ○ ○ ○ ---

لوگوں کے معاملات اللہ کا نہیں چل رہے اور اس زمین پر یہ زندگی اور مخلوقات عبث طور پر نہیں پیدا کیے گئے۔ اس دنیا کے کچھ قوانین ہیں جو ہرگز تبدیل نہیں ہوتے۔ قرآن کریم اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے اور لوگوں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ اس دنیا کے واقعات کو ایک انفرادی واقعہ ہی نہ سمجھیں اور اپنی زندگی ان سنن الہیہ سے غافل ہو کر نہ گزراں بلکہ اپنی زندگی کو زمان و مکان کے مختصر ترین محلت و مقامات تک بھی محدود نہ کر دیں۔ قرآن ان کے تصور کو ذرا

بلند کر کے ان کی زندگی کے طریقوں کو اس کائنات کے طریقوں کے ساتھ مربوط کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید بار بار اس طرف توجہ کرتا ہے کہ اس کائنات میں اللہ نے کچھ اٹل اصول جاری کر رکھے ہیں۔ وہ ان کو ان واقعات کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے جو اس دنیا میں ان سنن الہیہ کے مطابق ظاہر ہوئے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کا ماضی بتاتا ہے کہ یہ سنن اس کائنات میں جاری ہیں۔

یہ پانچویں سفر اسی کی ایک مثال ہے۔ یہاں بھی یہ کہنے کے بعد کہ اللہ کے سنن نہیں بدلتے، اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

أَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي
السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ۝

”یہ لوگ زمین میں بھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان سے بہت زیادہ طاقتور تھے؟ اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

اس زمین میں سیر کھلی آنکھوں اور بیدار دل و دماغ کے ساتھ ہونا چاہئے اور اس میں گزشتہ اقوام کے واقعات بھی پیش نظر رہنے چاہئیں کہ وہ کیا کرتے تھے اور ان کا انجام کیا ہوا۔ زمین کے واقعات و حادثات سے انسانی شعور اور دل میں خدا کا خوف اور عبرت آموز اشارات کا میٹھنا ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار یہ ہدایت کی گئی ہے کہ زمین میں پھرو اور اقوام کے عروج و زوال کی داستانوں کا مطالعہ کرو، ہلاک شدہ اقوام کے شب و روز دیکھو، جن کا نام و نشان اس زمین سے مٹا دیا گیا۔ ان سے عبرت حاصل کرو اور ان دلوں کو جگاؤ جن کو علم نہیں ہے۔ اگر علم ہے تو ان کے اندر احساس نہیں ہے اور اگر احساس ہے تو وہ عبرت نہیں لیتے۔ ان مردہ دلوں میں سنن الہیہ کا کوئی شعور نہیں ہے اور وہ تاریخی واقعات کی تعبیر سنن الہیہ کی روشنی میں نہیں کرتے۔ حالانکہ انسان اور حیوان کے اندر فرق ہی صرف یہ ہے کہ انسان واقعات کی تعبیر و تشریح اصولوں کی روشنی میں کرتا ہے جبکہ حیوان حالات، واقعات، اصولوں اور قواعد اور سنن الہیہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچتا، نہ وہ کسی واقعہ سے احکام و نتائج اخذ کرتا ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ تمام بنی نوع انسان سنن الہیہ اور نواہیس فطرت کے سامنے یکساں ہوتے ہیں۔

اس تاریخی سفر میں قرآن کریم ناظرین کو تاریخ کی ہلاک شدہ اقوام کے کھنڈرات کے دہانے کھڑا کر کے ان کو یاد دہانی کراتا ہے کہ یہ لوگ نہایت قوت اور شوکت والے تھے اور ان کو ان کی یہ قوت اور شوکت پہچان نہ سکی، لہذا تمام قوتوں سے برتر قوت موجود ہے۔ وہ قوت جس کے مقابل کی کوئی قوت نہیں ہے اور نہ اس کو کوئی قوت عاجز کر سکتی ہے۔ یہ قوت

ان لوگوں کو اسی طرح پکڑ سکتی ہے جس طرح سابقہ اقوام کو اس نے پکڑا۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمُوتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ (۳۵: ۴۴) ”اور اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں“ اور اس پر یہ تبصرہ آتا ہے جو اس کی تفسیر کرتا ہے اور دلیل پیش کرتا ہے۔

اِنَّهُ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا (۳۵: ۴۴) ”وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے“۔ سب سے آخر میں سورہ کا خاتمہ آتا ہے جس میں اللہ کی مہربانیاں اور معافیاں اور درگزر کا انصر بھی کیا جاتا ہے اور اللہ کی قدرت اور قوت کا احساس بھی دلایا جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ لوگوں کو جو سہلت دیئے جا رہا ہے وہ اس لیے دے رہا ہے کہ وہ رحیم و کریم ہے اور اللہ حساب و کتاب میں نرم رویہ اختیار کرتا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِمَا

مِنْ دَابَّةٍ وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ

اللَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيْرًا ۝

۱۴

”اگر کہیں وہ لوگوں کو ان کے کیے کرتوتوں پر پکڑتا تو زمین پر کسی منسل کو جیتا نہ چھوڑتا۔ مگر وہ انہیں ایک مقررہ وقت تک کے لیے سہلت دے رہا ہے۔ پھر جب ان کا وقت آن پورا ہو گا تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھ لے گا۔“
لوگ جو اللہ کے انعامات کا کفر کرتے ہیں زمین میں شر و فساد کا ارتکاب کرتے ہیں اور علم و زیادتی اور سرکشی کرتے ہیں یہ ان کی جانب سے بہت ہی بری حرکت ہے۔ اگر اللہ لوگوں کو ان کی اس بری حرکت پر پکڑتا تو اللہ کی پکڑ کا دائرہ پورے کرۂ ارض تک پھیل جاتا اور یہ پورا کرۂ ارض زندگی کے قابل ہی نہ رہتا۔ صرف انسانوں کے لیے نہیں بلکہ کوئی زندہ چیز بھی یہاں نہ رہتی۔

اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ بہت برا اور گھناؤنا کام ہے اور اگر اللہ اس پر فوری ہی پکڑ لیتا تو لوگوں کے اعمال کے طبعی اور اخلاقی نتائج ان کی فوری بربادی پر منتج ہوئے۔ لیکن اللہ حلیم ہے اور وہ لوگوں کی پکڑ میں شتابی نہیں فرماتا۔

وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى (۳۵: ۴۵) لیکن وہ انہیں ایک مقررہ وقت تک کے لیے سہلت دیتا ہے۔ یعنی ہر فرد کو اس کی عمر طبعی تک سہلت دیتا ہے اور دنیا میں وہ اپنی عمر پوری کرتا ہے۔ اور وہ سوسائٹیوں اور ملتوں کو بھی اپنے وقت مقررہ تک سہلت دیتا ہے یہاں تک کہ وہ نیست و نابود ہو کر دوسری نسل کے لیے جگہ خالی کرتی ہیں اور پوری نئی نوع انسان کو وہ سہلت دیتا ہے۔ جب وقت مقرر آئے گا تو قیامت برپا کر کے حساب و

کتاب لے گا اور وہ اس طرح لوگوں کو موقع دیتا ہے کہ وہ شاید نیک کام کر سکیں۔

فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ (۴۵:۳۵) ”پھر جب ان کا وقت پورا ہو گا“۔ جب کسب و عمل کا وقت پورا ہو گا اور حساب و کتاب کا وقت آئے گا تو اللہ ان پر کوئی ظلم نہ کرے گا۔

فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيرًا (۴۵:۳۵) ”تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھ لے گا“۔ اللہ کا اپنے بندوں کو دیکھ لینا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ پورا پورا حساب و کتاب ان کے اعمال کے مطابق کر لے۔ ان کے اعمال میں سے صغیرہ اور کبیرہ کوئی چیز رہ نہ جائے گی۔

--- ○ ○ ○ ---

یہ اس سورہ کا آخری زمزمہ ہے۔ اس کا آغاز حمد الہی سے ہوا تھا جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ

جَاعِلِ الْمَلَكِ أُولَىٰ أَجْنَحَةٍ (۱:۳۵) ”جو فرشتوں کو رسول بناتا ہے جو پروں والے ہیں“۔ اور جو آسمانوں سے اس کا پیغام زمین پر لاتے ہیں جس کے اندر خوشخبری اور ڈر لوا ہے۔ خوشخبری جنت کی ہے اور ڈر لوا جہنم کا ہے۔ اس آغاز اور اختتام کے درمیان اس سورہ نے قارئین کو اس پوری کائنات کے مطالعہ کے لیے بے شمار سفر کرائے۔ یہ ہے اختتام ان اسفار کا۔ یہ ہے انجام زندگی کا اور یہ ہے انجام حضرت انسان کا۔

مآئید - ۵ نومبر ۱۹۹۲ء

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ----- ۲۲

سورۃ یسین - ۳۶

آیات ۱ --- تا --- ۲۱

سورہ یسین ایک نظر میں

یہ نکی سورت ہے اور اس کے فقرے مختصر ہیں۔ یوں لگتا ہے اس میں عقل و خرد کی تاروں پر جلدی جلدی ضربات لگائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کی آیات ۸۲ ہونے کے باوجود یہ اس سے پہلے آنے والی سورت 'سورہ فاطر' سے بہت چھوٹی ہے جبکہ اس کی آیات ۳۵ ہیں۔

مختصر فقرات اور آیات کے آخر میں خواہل اور پے درپے ضربات کی وجہ سے اس سورت کا ایک خاص مزاج اور ایک خاص طبیعت واضح نظر آتی ہے۔ عقل و خرد کی تاروں پر مسلسل ضربات 'انسانی احساس کو بیدار کرتی چلی جاتی ہیں اور کلام کی اس تیز رفتاری کی وجہ سے اس سورت کے اثرات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور وہ سائے اور تصویر کشیل اور مناظر جو اس سورت کے آغاز سے انجام تک مسلسل اور پے درپے آرہے ہیں 'وہ انسان پر مختلف النوع اور گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔

اس سورت کا مرکزی موضوع اور مضمون وہ ہے جو تمام کی سورتوں کا ہوا کرتا ہے۔ سورت کا مقصد اس کے آغاز ہی سے یہ نظر آتا ہے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی نکات کو مستحکم کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ آغاز ہی سے وحی و رسالت کی سچائی پر زور دیا جاتا ہے۔

بَلِّسَ (۱:۳۶) وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ (۲:۳۶) إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (۳:۳۶)

عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۴:۳۶) تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ (۵:۳۶) (۵:۲۱) "لیس۔ قسم ہے قرآن حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو اور یہ قرآن غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے۔" اس کے بعد اصحاب القریہ کا قصہ آتا ہے۔ اس گاؤں والوں کے پاس رسول آتے ہیں۔ یہ رسول لوگوں کو وحی و رسالت کی تکذیب سے ڈراتے ہیں اور قصہ کا انجام دکھا کر سورت کے محور اور موضوع کو ثابت کیا جاتا ہے اور سورت کے اختتام کے قریب بھی دوبارہ اسی موضوع کو لیا جاتا ہے۔

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُبِينٌ (۶۹:۳۶)

لَيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقُّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ (۷۰:۳۶) "اور ہم نے اس نبی کو شعر نہیں سکھایا اور نہ شاعری اس کو زیب ہتی ہے۔ یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف صاف پڑھی جانے والی کتاب تاکہ ہر اس شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت تمام ہو جائے۔"

اس سورت میں اللہ کی حاکمیت اور وحدانیت کے مسئلے کو بھی لیا گیا ہے۔ ایک رجل مومن کی زبانی شرک کی کراہت اور نہایت گھناؤنے پن کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ شخص اس قریہ کے دور دراز علاقوں سے آیا اور رسولوں کے حوالے سے اپنی قوم کے رویے پر اس نے سخت مواخذہ کیا۔ اس نے اپنی قوم پر اس طرح تنقید کی۔

وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۳۶:۲۲) ءَأَتَّخِذُ مِنْ دُونِ
الهِ ان يُرِذَنَ الرَّحْمَنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِي عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَلَا يُنْقِذُونِ (۳۶:۲۳)

اِنِّیْ اِذَا الْفَسَى ضَلَلْتُ مُبِیْن (۳۶:۲۴) ”آخر کیوں نہ میں اس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور جس کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔ کیا میں اس کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنالوں حالانکہ اگر خدائے رمن مجھے کوئی نقصان پہنچاتا ہے تو نہ ان کی شفاعت کچھ کام آسکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔ اگر میں ایسا کروں تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔“ اور سورت کے خاتمے کے قریب اس موضوع کو دوبارہ دہرایا جاتا ہے۔ وَأَتَّخِذُ مِنْ دُونِ

دُونِ اللَّهِ إِلَهًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ (۳۶:۷۴) لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ

مُحَضَّرُونَ (۳۶:۷۵) اور انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنالے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ اٹکے ان کے لیے حاضر ہیں۔“

جس مسئلے پر اس سورت میں بہت زور دیا گیا ہے وہ مسئلہ بعث بعد الموت ہے۔ اس سورت میں یہ مسئلہ بہت سے مقامات پر دہرایا گیا ہے۔ اس کے آغاز میں اس پر یوں بحث کی گئی ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ وَكُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي

إِمَامٍ مُّبِينٍ (۳۶:۱۲) ”ہم یقیناً ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ ہر کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ ہم سب لکھتے جا رہے ہیں اور جو آثار انہوں نے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں۔ ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے۔“ اور گاؤں وانوں کے قصہ میں بھی بعث بعد الموت کا ذکر آتا ہے۔ رجل مومن کے واقعہ کے ضمن میں اور سیاق کلام میں اس کی جزاء کا فوری تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے۔

قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يَلَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ (۳۶:۲۶) بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَ

جَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ (۳۶:۲۷) ”اس شخص سے کہہ دیا کہ ”داخل ہو جانت میں“ اس نے کہا کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرمادی اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل کر دیا۔“ اس کے بعد سورت کے وسط میں بھی اس کا تذکرہ ہوتا ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۶: ۴۸) مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً
وَّاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ (۳۶: ۴۹) فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ
أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ (۳۶: ۵۰) ”یہ لوگ کہتے کہ یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ تاؤ اگر تم سچے
ہو“ دراصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں عین اسی حالت میں دھرلے گا جب یہ
اپنے دنیوی معاملات میں جھگڑ رہے ہوں گے اور اس وقت یہ وصیت نہ کر سکیں گے نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے۔“
اس کے بعد پھر مناظر قیامت میں سے ایک مکمل منظر دیا جاتا ہے اور سورت کے آخر میں اس موضوع کو ایک مکالمے
کی صورت میں لیا جاتا ہے۔

وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَ نَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيمٌ (۳۶: ۷۸)
قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ (۳۶: ۷۹) ”اب وہ ہم پر
مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے ”کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی
ہوں“ اس سے کہو انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔“
یہ مسائل تو وہ تھے جو اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ مسائل بار بار زیر بحث لائے
جاتے ہیں اور کئی سورتوں میں تو ان پر کلام بار بار کیا جاتا ہے۔ لیکن ہر بار ان مسائل کو مختلف زاویوں سے لیا جاتا ہے اور
ہر بار قصہ نیا نظر آتا ہے۔ موضوع پر ہر بار نئی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اور ہر بار اس کے اثرات نئے ہوتے ہیں اور ہر بار
سورت کی مجموعی نفاذ اس کے ماحول اور اس کی تصاویر کے مطابق ہوتا ہے۔
یہ سب اثرات مناظر قیامت کے ذریعہ اور پھر قصے کے مناظر اور اس کے کرداروں کے موقف اور ان کے مکالمات
کے ذریعہ نفس انسانی پر نقش کیے جاتے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ میں گزری ہوئی اقوام پر آنے والے عذاب اور اس
کائنات کے مختلف النوع اور حیرت انگیز مظاہر کے ذریعہ انسان کو مسحور کر لیا جاتا ہے۔ ایک بے آب و گیاہ مردہ زمین ہے
اور چشم زدن میں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ اندھیری رات ہے اور اس سے سپید صبح نمودار ہوتا ہے اور پھر شام کے
بعد اندھیرا۔ پھر سورج اپنے جائے قرار کے لیے چل رہا ہے۔ چاند اپنی منازل میں سرگرداں ہے اور سوکتے سوکتے کجور کی
خشب شاخ کی طرح بن جاتا ہے۔ پھر ذرا سمندر کے سینے پر کشتی کو دیکھو کہ وہ انسانوں سے بھری جا رہی ہے۔ اور پھر ذرا
حیوانات کو دیکھو کہ وہ انسانوں کے لیے مسخر ہیں اور پھر انسان کو دیکھو کہ لطفے کے اندر وہ خوردبین کے ذریعے بمشکل نظر
آتا ہے اور پھر مختلف مراحل سے ہو کر جب وہ مکمل انسان بنا دیا جاتا ہے تو وہ باتیں بتاتا ہے۔ اور سرسبز و شاداب درخت
کو تو دیکھو کہ اس کے اندر تھمارے لئے آگ کو مسخر کر دیا گیا ہے اور تم اسے جلاتے ہو۔

ان مشاہد کے علاوہ اس سورت میں کچھ اور بھی سحر انگیز چیزیں ہیں جو انسانی وجدان پر اثر ڈالتی ہیں اور اسے جنگاں
ہیں۔ مثلاً ان مکذبین کی تصویر کشی جن کے خلاف خود ان کے کفر کی وجہ سے اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا اور ان کی حالت یہ ہو

گئی نہ ذرا و ان پر اثر انداز ہوا اور نہ آیات الہیہ ان کے لیے نفع بخش ثابت ہوئیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلَالًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُونَ (۸:۳۶) وَ جَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيهِمْ سَدًّا وَ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (۹:۳۶) ”ہم نے ان کی گردنوں میں حلق ڈال دیئے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں۔ اس لیے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے۔ انہیں اب کچھ نظر نہیں آتا۔“

انہی چیزوں میں سے یہ امر بھی ہے کہ لوگوں کے نفسیاتی حالات سے اللہ تعالیٰ باخبر ہے، چاہے وہ چپے ہوئے ہوں یا ظاہر ہوں۔ اور یہ کہ عمل تخلیق صرف ایک لفظ کن سے مکمل ہوتا ہے۔

اِنَّمَا اَمْرُهُ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَقُوْلَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ (۸۲:۳۶) ”وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔“
یہ تمام امور انسان کے دل و دماغ کو چھوتے ہیں اور انسان ان چیزوں کے مفہوم کو عالم واقعہ میں موجود پاتا ہے۔

--- ۰۰۰ ---

یہ سورت اپنے مضامین کے بیان کے اعتبار سے تین اسباق میں منقسم ہوتی ہے۔

۱۔ پہلا سبق دو حروف کے ساتھ قسم کھا کر شروع کیا جاتا ہے۔ یاسین اور ان حروف کی قسم کے بعد پھر قرآن مجید کے ساتھ قسم کھائی جاتی ہے۔ یہ قسم اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسوں ہیں اور بالکل سیدھے راستے پر چل رہے ہیں اور جو لوگ غفلت کی وجہ سے آپ کی تکذیب کر رہے ہیں ان کا انجام نہایت ہی برا ہونے والا ہے۔ اللہ نے ان لوگوں کے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ لوگ راہ راست کی طرف نہ پلٹ سکیں گے۔ کیونکہ ان کے اپنے عمل کی وجہ سے ان کے اور راہ راست کے درمیان مشیت الہیہ حائل ہو چکی ہے اور اس حقیقت کی تفصیل یہ ہے کہ ہدایت صرف اس شخص کے لیے مفید ہو ا کرتی ہے جو اللہ سے غائبانہ طور پر ڈرتا رہے اور جو نصیحت قبول کرنے کا دایمہ رکھتا ہو۔ اور اس کا قلب دلائل ہدایت کی طرف مائل ہو اور اس کائنات میں جو شواہد انسان کو ایمان لانے پر مجبور کرتے ہیں وہ ان کو دیکھنے کے لئے تیار ہو۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان کے سامنے صحاب قریب کا قصہ اور مثال بیان کریں۔ اور ذرا ان کو بتائیں کہ جھٹلانے کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ اور ایمان لانے والا دل کیا ہوتا ہے اور جو شخص ایمان لے آتا ہے اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

دوسرا سبق ایسے مکذبین کی حالت پر سخت انسوس کے اظہار پر مشتمل ہے، جو تکذیب پر تل جاتے ہیں۔ ہر رسول کی تکذیب ایسے ہی لوگ کرتے چلے آئے ہیں بلکہ وہ اس پر مزید استزاء اور مذاق بھی کرتے چلے آتے ہیں اور انسانوں نے کبھی بھی اپنی تاریخ میں اس تکذیب کی وجہ سے ہلک کی جانے والی اقوام کے انجام پر غور نہیں کیا۔ اور یہ لوگ ہمیشہ غافل رہتے ہیں اور اس کائنات میں پائی جانے والی روشن نشانیوں پر غور نہیں کرتے۔ اور اس کے بعد دوسرے سبق میں

ان نشانیوں کو تفصیل سے لایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ آئے ہیں۔ اس سبق میں بڑی تفصیل سے قیامت کے مظاہر بھی دیئے جاتے ہیں۔

تیسرے سبق میں دوبارہ پوری سورت کے مضامین کو دہرایا گیا ہے۔ پہلے یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لے کر آئے ہیں وہ شعر و شاعری نہیں ہے۔ اس کے بعد بعض وجدانی اشارات دیئے جاتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور وحدہ لا شریک ہے۔ اس بات پر افسوس کیا جاتا ہے کہ لوگ اللہ کے سوا دوسری ہستیوں کو الہ پکارتے ہیں۔ یہ لوگ ان الہوں سے نصرت طلب کرتے ہیں اور خود ان الہوں کے فوجدار بنے ہوئے ہیں اس کے بعد مسئلہ بعث بعد الموت کو لیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دیکھو ہمیں اللہ نے نطفے سے پیدا کیا، کیا اس کے لیے بوسیدہ ہڈیوں سے ایک انسان کو کھڑا کرنا مشکل ہے۔ اس میں آخر انوکھے پن کی کیا بات ہے۔ اللہ تو وہ ہے جو بالکل سرسبز درخت سے آگ پیدا کر دیتا ہے۔ یہ بات کیا عجیب تر نہیں ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین پر مشتمل یہ عظیم کائنات تخلیق کی ہے۔ اللہ ایسا ایک دوسرا جہان بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اور آخرت میں انسانوں کو بھی دوبارہ بنا سکتا ہے۔ اب سورت کے آخر میں فکر و نظر کی تاروں پر ضرب لگائی جاتی ہے۔

اِنَّمَا اَمْرُهُ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَقُوْلَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ (۸۲:۳۶) فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ

بِیْدِهِ مَلٰكُوتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۸۳:۳۶) ”وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جاوے اور وہ ہو جاتی ہے۔ پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔“

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۰۵ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۲۹



يٰسَ ۙ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ۚ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۚ عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۚ
تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۚ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُونَ ۚ
لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَى أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۚ إِنَّا جَعَلْنَا فِيْ أَعْنَاقِهِمْ
أَغْلَآلًا فَهِىَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُونَ ۚ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ
سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۚ وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ
ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۚ إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ
وَخَشِيَ الرَّحْمٰنََ الْغَيْبَ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ ۚ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِ
الْمَوْتَى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِيْ إِمَامٍ

ع ۱۲

مُبِينٍ ۚ

۱۸

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرماتے والا ہے۔

یس۔ قسم ہے قرآن حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو اسیدھے راستے پر۔ (یہ قرآن) غالب اور رحیم
ہستی کا نازل کردہ ہے تاکہ تم خبردار کرو ایک ایسی قوم کو جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ

غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر لوگ فیصلہ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں ' اسی لئے وہ ایمان نہیں لاتے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں ' اس لیے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے۔ ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے ' انہیں لب کچھ نہیں سوجھتا۔ ان کے لیے یکساں ہے ' تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو ' یہ نہ مانیں گے۔ تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمان سے ڈرے۔ اتنے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دے دو۔ ہم یقیناً ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں ' اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں ' وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں۔ ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ دو حروف "یا" اور "سین" کی قسم اٹھاتا ہے اور اسی طرح قرآن کریم کی بھی قسم اٹھاتا ہے۔ اللہ نے یہاں قسم میں ان حروف اور قرآن کریم کو یکجا فرمایا ہے ' اس سے حروف مقطعات کی اس تفسیر کو ترجیح حاصل ہو جاتی ہے جو ہم نے ان حروف کے حوالے سے اختیار کی ہے۔ ان حروف کے تذکرے اور قرآن کے تذکرے کے درمیان یہ ربط ہے کہ یہ قرآن انہی حروف سے بنا ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہے اور جس پر یہ لوگ سوار نہیں کرتے ' اس کے ذریعہ قرآن کریم ان لوگوں کو متوجہ کرتا ہے کہ تم اس نکتے پر غور کرو کہ یہ قرآن انہی حروف سے بنایا گیا ہے جو تمہاری دسترس میں ہیں۔ لیکن قرآن کا انداز تعبیر ' اس کا انداز بیان اور اس کی منطقی قدر انہی ہے کہ تم اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز آگئے ہو۔

قسم کھائے ہوئے قرآن کی جو صفت یہاں لائی جاتی ہے۔ وہ صفت حکمت ہے۔ حکمت ایک دی عقل کی صفت ہوتی ہے جو زندہ اور فکندہ ہو۔ قرآن کریم کی یہ صفت چاکر یہ تاثر دینا مطلوب ہے کہ یہ زندہ اور قصد و ارادے کی مالک کتاب ہے۔ اسی وجہ سے یہ حکیم ہے۔ اگرچہ قرآن کریم کے لیے یہ صفت بطور مجاز استعمال کی گئی ہے لیکن یہ ایک عظیم حقیقت کی منظر ہے۔ ایک اہم حقیقت کو اذہان کے قریب لایا جا رہا ہے۔ وہ یہ کہ اس کتاب کی ایک روح اور ایک زندگی ہے۔ اور جب قاری کا دل صاف ہو جائے اور وہ محبت کے ساتھ اس سے ہم کلام ہو جائے تو یہ کتاب نہایت لغت اور محبت کے ساتھ اس شخص کے ساتھ ہم کلام ہوتی ہے اور وہ ایسے شخص پر پھر اپنے اسرار و رموز کھولتی ہے بشرطیکہ قاری خود اس کے لئے اپنا دل کھول دے اور اپنے دل و جان کے ساتھ اس کا ہو جائے۔ پھر اس کے قاری کو اس کے وہ خد و خال نظر آئیں گے جس طرح کسی دوست کے چہرے میں انسان کو نظر آتے ہیں۔ اور وہ اس کتاب کی طرف اسی شوق کے ساتھ مائل ہو گا جس طرح کوئی اپنے دوست کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور پھر قرآن میں اسے وہی سکون ملتا ہے جس طرح ایک دوست کی محفل میں ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں سے قرآن کو سننا پسند فرماتے تھے۔ آپ ایسے دروازوں پر کھڑے ہو جاتے اور سنتے جس میں قرآن حکیم کی عظمت ہو رہی ہوتی تھی۔ جس طرح کوئی عاشق اپنے محبوب کی باتیں غور سے سنتا ہے۔

اور قرآن تو حکیم ہے۔ وہ ہر اس شخص سے ہم کلام ہوتا ہے جو اس کا گردیدہ ہو جائے۔ وہ ایک مومن کے دل کی حساس تاروں کو چھیڑتا ہے۔ اس کے ساتھ اسی مقدار میں ہم کلام ہوتا ہے جس قدر اس کو ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ مکالمہ نہایت حکمت سے ہوتا ہے۔ اس انداز میں کہ مخاطب کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کو ایک ست ملتی ہے۔

قرآن حکیم ہے، بڑی حکمت کے ساتھ تربیت کرتا ہے۔ نہایت ہی معقول انداز میں۔ درست نفسیاتی سمت میں۔ ایسے انداز میں کہ جس میں تمام انسانی صلاحیتوں کو تعمیری انداز میں نکالا چھوڑ دیا جاتا ہے اور انسانی صلاحیتوں کو صحت مند ترقی کے لئے ایک سمت دی جاتی ہے۔ یہ انسانوں کو زندگی گزارنے کا نہایت ہی حکیمانہ نظام دیتا ہے جس کے کھلے اور وسیع حدود کے اندر انسان زندگی کی سرگرمیاں جاری رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ یا اور سین اور پھر قرآن مجید کی قسم کھا کر یقین دہانی فرماتا ہے کہ اے رسول آپ رسولوں میں سے ہیں اور آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ آپ رسول کریم ہیں اور یہ قرآن حکیم ہے۔

اِنَّكَ لَمِّنَ الْمُرْسَلِينَ (۳:۳۶) عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴:۳۶) ”تم یقیناً رسولوں میں سے ہو“ سیدھے راستے پر چلو۔ اللہ تعالیٰ کو قسم اٹھانے کی ضرورت کیا ہے؟ لیکن قرآن اور حروف قرآن کی یہ قسم، ان چیزوں کو جلالت شان عطا کرتی ہے جن کی قسم اٹھانی گئی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ کسی عظیم الشان اور اہم چیز کی قسم اٹھاتا ہے یہاں تک کہ اس چیز کی اہمیت ایک شاہد اور حلیت کنندہ کی ہو جاتی ہے۔

اِنَّكَ لَمِّنَ الْمُرْسَلِينَ (۳:۳۶) ”تم یقیناً رسولوں میں سے ہو“۔ جس انداز سے یہ آیت آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں رسولوں کا بھیجنا اور انتخاب پہلے سے طے شدہ ہے۔ یہاں حضور الہی صلی اللہ علیہ وسلم کو حلیہ بیان کی صورت میں بتایا جاتا ہے کہ آپ کا نام رسولوں کی فہرست میں ہے اور یہاں مکذبین اور منکرین کو خطاب کرنے کی بجائے رسول اللہ کو خطاب فرمایا جاتا ہے۔ اس میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ رسول اور منصب رسالت اس قدر بلند و بالا ہیں کہ جن پر کوئی کلام اور مباحثہ اور مجادلہ نہیں ہو سکتا۔ بس اللہ کی جانب سے رسول کو اطلاع دے دینا ہی مکمل ثبوت تصور ہوتا ہے۔

اِنَّكَ لَمِّنَ الْمُرْسَلِينَ (۳:۳۶) عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴:۳۶) ”تم یقیناً رسولوں میں سے ہو“ سیدھے راستے پر چلو۔ رسولوں کے یقین اور تقرر کے بعد بتایا جاتا ہے کہ رسالت کی نوعیت کیا ہے؟ یہ کہ وہ ایک سیدھا راستہ ہے۔ یہ رسالت تلوار کی دھار کی طرح سیدھی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی ٹیڑھ پن اور کوئی انحراف نہیں ہوتا۔ نہ اس میں کوئی پیچیدگی ہوتی ہے اور نہ کوئی پکھ ہوتی ہے۔ یہ ایسی سچائی پر مشتمل ہوتی ہے جو بالکل واضح ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی التباس نہیں ہوتا۔ نہ وہ خواہشات نفسانیہ کی تابع ہے۔ اور نہ وہ مصلحتوں کی سمت میں قبلہ بدلتی ہے۔ جو شخص بھی اس سچائی کی تلاش کرے اور مخلص ہو، یہ اسے مل جاتی ہے۔

یہ رسالت چونکہ سیدھا راستہ بتاتی ہے اس لیے اس میں نہ کوئی اشکال ہے نہ پیچیدگی ہے اور نہ کوئی چکر ہے۔ یہ مسائل کو مشکل نہیں بناتی۔ نہ لوگوں کو مشکلات میں ڈالتی ہے اس کے اندر جدلیاتی مسائل پر مکالمہ نہیں ہوتا۔ اور نہ فلسفیانہ تصورات میں الجھایا جاتا ہے۔ یہ سچائی کو نہایت ہی سادہ شکل میں پیش کرتی ہے۔ اور اس قدر سادہ شکل میں جس میں کوئی شبہ اور کوئی غلط بحث نہیں ہوتا۔ اس قدر سادہ کہ اسے مزید تشریح کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ الفاظ کا جو ڈھونڈ اور باتوں سے بات نکالنا اس میں پیش ہوتا ہے اور نہ پیچیدہ اور ڈولیدہ افکار کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ اسی رسالت کے ساتھ موجودہ ہدایات اور ظاہری احکام پر عمل

کرتے ہوئے زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ یہ امی اور عالم دونوں کے لیے ہدایت ہے۔ یہ دیہاتی اور شہری دونوں کے لیے ہدایت ہے۔ ہر شخص اور ہر طبقہ اس کے اندر اپنی ضرورت کی ہدایت پاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کی زندگی کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اس کا نظام زندگی درست ہو جاتا ہے۔ زندگی کے طور طریقے درست ہو جاتے ہیں اور انسانوں کے باہم تعلقات نہایت ہی آسانی کے ساتھ سرانجام پاتے ہیں۔

پھر یہ رسالت اس کائنات کی فطرت اور اس کائنات کے اندر جاری و ساری قانون الہی کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔ انسان اور انسان کے ماحول میں پائے جانے والی نذر و اشیاء کے ساتھ بھی یہ رسالت ہم آہنگ ہے۔ یہ نہ دنیا کی اشیاء کے ساتھ متصادم ہے نہ انسان کو یہ رسالت غم دیتی ہے کہ وہ فطرت کے ساتھ متصادم ہو۔ یہ اپنے منہاج پر درست استوار ہے۔ اور اس کائنات کے ساتھ متوازی ہے۔ یہ معاون ہے یہ ایک ایسا نظام دیتی ہے جو مکمل کائنات ہے۔

یہ رسالت اللہ تک پہنچنے کا صحیح راستہ بتاتی ہے اور اللہ تک پہنچاتی ہے۔ اس رسالت کے متبعین کو کبھی یہ خطرہ درپیش نہیں ہوتا کہ وہ راستہ بھلا دیں۔ نہ ان کی راہ میں کوئی ٹیڑھ آتی ہے جو اس راہ میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اس کے خائب و فرازت ہوتا ہو اسید حار ضائع الہی اور اپنے خالق عظیم تک جا پہنچتا ہے۔

اس رسالت نے یہ قرآن دیا ہے۔ جو اس سیدھی راہ کا پورا نقشہ بناتا ہے اور ایک گائیڈ ہے۔ جب انسان اس کتاب کی راہنمائی میں چلے تو وہ سچائی کی سیدھی فکر پالیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور پھر اس کی قدروں کے بارے میں یہ کتاب فیصلہ کن ہدایت دیتی ہے اور ہر چیز کو اس کی صحیح جگہ پر رکھ دیتی ہے۔

تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ (۵: ۳۶) ”یہ غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے“۔ ایسے مقامات پر اللہ اپنے بندوں سے اپنے آپ کو متعارف فرماتا ہے تاکہ وہ اللہ کے کلام کی حقیقت کو سمجھیں کہ اللہ غالب ہے اور رحیم ہے۔ وہ غالب ہے لہذا جو چاہے کر سکتا ہے۔ اور رحیم ہے اس لیے اپنے بندوں کے ساتھ رحیمانہ برتاؤ کرتا ہے۔ اس لیے اللہ کے احکام میں رحمت کا پہلو ضرور ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ اس قرآن کے نزول کے مقصد کیا ہیں اور اس کی حکمت کیا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو انجام بدست ڈر لیا جائے اور ان تک سچائی کا پیغام پہنچایا جائے خصوصاً

لَتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاءَهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ (۶: ۳۶) ”تاکہ تم خبردار کرو ایسی قوم کو جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں“۔ غفلت وہ بڑی بیماری ہے جس کی وجہ سے دلوں میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک غافل دل دراصل اپنے فریضہ منصبی کو چھوڑ دیتا ہے اس لیے وہ ایک غفلو محفل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہدایت اخذ کرنا اور است قبول کرنا یہ دل کا کام ہے۔ جب انسانوں کے سامنے دلائل ہدایت پیش کیے جاتے ہیں تو انسانی دل یا تو ان پر غافل ہو کر گزر جاتا ہے اور یا ان دلائل کو اخذ کر لیتا ہے۔ لہذا ان غافل لوگوں کو ڈرانا مفید تھا۔ کیونکہ فطرت گزر گئی تھیں اور اس قوم کے پاس کوئی ڈرانے والا نہ آیا تھا۔ نہ کوئی ایسا شخص آیا تھا جو ان کو متنبہ کرتا۔ یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امت اور اولاد میں سے تھے۔ اور ان کے بعد صدیاں گزر گئی تھیں۔ اور ان کے پاس کوئی نبی اور نذیر نہ آیا تھا۔ لہذا ایسا ڈرانے والا ان کی ضرورت تھا جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کر دے

کیونکہ آباؤ اجداد کے وقت سے یہ لوگ خواب غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ان عاقلوں کا انجام کیا ہوئے ولایت۔ اللہ کے نظام قضا و قدر نے ان کے بارے میں کیا فیصلہ کر دیا ہے کیونکہ اللہ کو ان کے قلوب کے بارے میں خوب علم تھا۔ وہ ان سے سرزد ہونے والے امور کو پہلے سے جانتا تھا۔ انہوں نے جو کیا وہ بھی اللہ کے علم میں تھا اور جو ہونے والا تھا وہ بھی اس کے علم میں تھا۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلَىٰ أَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۷:۳۶) ”اں میں سے اکثر لوگ فیصلہ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اسی لیے وہ ایمان نہیں لاتے۔“ ان کے معاملے میں اللہ نے فیصلہ صادر کر دیا ہے اور اللہ کا فیصلہ ان کے حق میں درست ہے۔ یہ فیصلہ سچائی پر ہوا ہے۔ حق کے مطابق ہے۔ کیونکہ اللہ ان کی حقیقت سے خوب واقف تھا۔ اللہ ان کے شعور اور میلان سے بھی واقف تھا۔ یہ لوگ ایمان لانے والے ہی نہ تھے۔ اکثریت کا یہی انجام ہے۔ ان کے نفوس اور ہدایت کے درمیان پر دے حاصل ہو چکے ہیں۔ وہ نہ سچائی کے دلائل کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان کو ان کا شعور حاصل ہے۔

جن لوگوں پر اللہ کا فیصلہ حق ہو چکا ان کی نفسیاتی حالت کی تصویر یہ ہے۔ ان کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں۔ ان طوقوں کے اندر وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ دیکھ بھی نہیں سکتے۔ ان کے لور ہدایت کے درمیان پر دے اور رکاوٹیں حاصل ہو چکی ہیں۔ ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں اس لیے وہ دیکھنے کے اہل ہی نہیں رہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَىٰ آلِهِمْ دِقَاقٍ فَهُمْ لَا مُمْتَحِنُونَ (۸:۳۶) و
جَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (۹:۳۶)
”ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑ گئے ہیں اس لیے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے۔ ہم نے انہیں اچانک دیا ہے انہیں اب کچھ نہیں سوچتا۔“

ان کے ہاتھ طوقوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ پھر یہ ان کی گردنوں کے ساتھ بندھے ہیں اور ان کی ٹھوڑیوں کے نیچے جکڑ دئے گئے ہیں۔ اس طرح ان کے سر مجبوراً اوپر کی طرف اٹھ گئے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے سامنے کی طرف بے راستے کو دیکھنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ چونکہ وہ اس بری حالت میں ہیں۔ اس لیے نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ پھر ان کے آگے بھی ایک دیوار ہے اور پیچھے بھی ایک دیوار ہے۔ اس طرح وہ کسی طرح بھی حق تک پہنچنے کے اہل ہی نہیں رہے۔ یہ کسے ہوئے ہیں لہذا دیکھ سکتے۔ آگے پیچھے دیواریں ہیں جن سے ان کی نظریں پار نہیں ہو سکتیں۔ خود اپنی اپنی ملائقی اور بد ملی دنیا سے وہ اس نفسیاتی حالت تک پہنچے ہیں۔

یہ منظر کسی ہے اور بڑا شدید منظر ہے لیکن روزِ مرہ کی زندگی میں ہمیں بے شمار لوگ ملتے ہیں جن کے بارے میں انسان اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ یہ لوگ واضح سچائی کو نہیں دیکھ پا رہے۔ لہذا ان کے سامنے ایسے پردے اور ایسی دیواریں حاصل ہیں کہ وہ ان سے اس پار نہیں دیکھ سکتے۔ اگر ہاتھ پاؤں یوں بندھے ہوئے نہ بھی ہوں اور ان کے سر اوپر

کی طرف کس نہ بھی دیئے گئے ہوں کہ وہ اوپر ہی کو دیکھ سکتے ہوں، بلکہ وہ بظاہر صحیح سالم اور آزاد ہوں لیکن ان کی نفسیاتی حالت ایسی ہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی بصیرت کے ذریعے ہدایت کو نہیں دیکھ پاتے اور دلائل ہدایت اور ان کی سوچ کے درمیان غیر مرئی دیواریں حائل نظر آتی ہیں۔ یہی حالت مکہ کے ان لوگوں کی تھی جنہوں نے قرآن کا استقبال ایسی ہی نفسیاتی حالت کے ساتھ کیا۔ قرآن ان کے سامنے صاف صاف دلائل و نشانیاں پیش کرتا اور وہ انکار پر مصر رہتے۔ پیش کردہ دلائل کے علاوہ قرآن تو بذاتِ خود معجزانہ دلیل اور نشانی تھ جس کے مقابلے میں کوئی صاحب بصیرت انسان نہیں ٹھہر سکتا تھا مگر یہ لوگ انکار پر مصر رہے۔

وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۳۶: ۱۰) ”ان کے لیے یکساں ہے تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو یہ نہ مانیں گے۔“ اس لیے کہ ان کے معاملے میں اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کیونکہ اللہ کو علم تھا کہ ان کے دلوں میں ایمان کے راہ پانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اور ایسے دلوں پر خبردار کرنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جو ایمان کے لیے تیار ہی نہ ہوں۔ وہ دس جو بندھے ہوئے ہیں جن کے اور سچائی کے درمیان دیواریں حائل ہوں۔ انذار اور تبلیغ کی وجہ سے مردہ دلوں کو زندہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ غافل اور سوئے ہوؤں کو جگایا جاسکتا ہے۔ خصوصاً ایسے سوئے ہوئے دلوں کو جو ہدایت لینا چاہیں اور اس کے لیے تیار ہوں۔

إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمَنَ الْغَيْبَ فَسَّرَهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ

(۳۶: ۱۱) ”تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور جو بے دیکھے رحمن سے ڈرے“ اسے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دے دو۔“ الذکر سے یہاں قرآن کریم مراد ہے۔ رائج قول یہی ہے۔ وہ شخص جو قرآن کی تابعداری کرے اور رحمن سے بن دیکھے ڈرے یہی شخص ذرا لے سے استفادہ کر سکتا ہے۔ گویا یہی شخص ہے جس کے لیے ڈراوا آیا ہے۔ گویا ایسے ہی شخص کے لیے رسول اللہ کو بھیجا گیا ہے۔ اگرچہ رسالت عمومی ہے لیکن دوسرے لوگوں اور ہدایت کے درمیان پردے حائل ہو چکے ہیں۔ لہذا ہدایت اس شخص تک محدود ہو گئی جو قرآن کو مان لے اور بن دیکھے رحمن سے ڈرے۔ ایسے ہی لوگ جب وہ ذرا لے سے استفادہ کرتے ہیں تو وہ خوشخبری کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ (۳۶: ۱۱) ”اسے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دے دو۔“ مغفرت ان غلطیوں پر جو واقع ہو گئیں اور ان پر اصرار نہ کیا گیا۔ اور اجر کریم اس لیے کہ یہ شخص غائبانہ طور پر اللہ سے ڈرتا رہا۔ اور اللہ کی جانب سے جو یاد دہانی آتی رہی اس کا اتباع کرتا رہا۔ یہ دونوں چیزیں قلب مومن میں باہم دگر لازم و ملزوم ہیں۔ جب بھی کسی دل میں خدا کا خوف پیدا ہو تو انسان خدا کی ہدایات پر عمل شروع کر دیتا ہے اور جس نظام زندگی کا اس نے ارادہ کیا اس پر استقامت حاصل ہو جاتی ہے۔

چنانچہ یہاں یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ ایک دن تم نے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے، تمہارا حساب نہایت وقت کے ساتھ تیار ہو گا اور اس میں سے کوئی بات چھوٹی ہوئی نہ ہوگی۔

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ وَكُلِّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي

امام مہینس (۳۶: ۱۲) ”یقیناً ہم ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں۔ ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے۔“

مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا وہ مسئلہ ہے جس پر ہمیشہ مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ اس سورت میں بھی اس کے امکان پر کئی مثالیں دی جائیں گی۔ یہاں ان کو زندہ کیا جاتا ہے کہ وہ جو اعمال بھی کر رہے ہیں اور اپنے پیچھے جو بھی اچھے یا برے آثار چھوڑ رہے ہیں وہ سب اللہ کے ہاں ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ ان اعمال میں سے نہ کوئی چیز چھوٹ سکتی ہے اور نہ بھول سکتی ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ وہی ہے جو ان کے اعمال و آثار کو قلم بند کر رہا ہے۔ وہی ہے جو ہر چیز کو لکھ رہا ہے۔ لہذا یہ تمام امور اسی طرح ظہور پذیر ہوں گے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے دست قدرت سے انہیں ظاہر کرے گا اور جس طرح اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے کہ وہ ان امور کو اسی طرح ظاہر کرے گا۔

امام مہینس سے مراد لوح محفوظ ہے یا وہ دفتر جس میں اللہ کے نظام کے مطابق اعمال ریکارڈ ہوتے ہیں، لوح محفوظ سے اللہ کا ازل اور قدیم علم مراد ہے۔ اور اللہ کا علم ہر چیز کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔

--- ۰۰۰ ---

دینی و رسالت کے مسئلے کے اس تائیدی بیان اور تفسیر حساب و کتاب کے اس اہل اعدان کے بعد اب اسی مضمون کو قصے کی صورت میں لایا جاتا ہے۔ اس قصے میں ایمان اور کفر کے جو دو باہم متقابل موقف سامنے آتے ہیں وہ نفس انسانی پر نہایت گہرے اثرات چھوڑتے ہیں اور دونوں موقف کا انجام بھی آنکھوں کے سامنے منقش نظر آتا ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿١٥﴾
 أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَهُكُمُ
 مُّرْسَلُونَ ﴿١٦﴾ قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَمَا أَنْزَلَ الرَّحْمَنُ مِنْ شَيْءٍ
 إِن أَنْتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ﴿١٧﴾ قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَهُكُمْ لَمُُرْسَلُونَ ﴿١٨﴾ وَ
 مَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿١٩﴾ قَالُوا إِنَّا تَطَئِنَا بِكُمْ لَعَنَّا تَذْهَبُوا
 لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَسَّيَنَّكُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٠﴾ قَالُوا طَائِرُكُمْ مَعَكُمْ أَإِنْ ذُكِّرْتُمْ
 بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ﴿٢١﴾

”انہیں مثال کے طور پر اس ہستی واہوں کا قصہ سناؤ جب کہ اس میں رسول آئے تھے۔ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے اور انہوں نے دونوں کو جھٹل دیا۔ پھر ہم نے تیسرا مدد کے لیے بھیجا اور ان سب نے کہا ”ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں۔“ ہستی واہوں نے کہا ”تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان اور خدائے رحمن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے تم محض جھوٹ بڑے ہو۔“

رسولوں نے کہا ”ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔“ ہستی والے کہنے لگے ”ہم تو تمہیں اپنے لیے فال بد سمجھتے ہیں۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے۔“ رسولوں نے جواب دیا ”تمہاری فال بد تو تمہارے اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کیا یہ باتیں تم اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی گئی؟ اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرتے ہوئے لوگ ہو۔“

قرآن کریم نے اصحاب قریہ کا نام نہیں لیا نہ اس گاؤں کا نام ہے نہ اس کے بارے میں مفسرین نے بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ ان روایات کے پیچھے پڑنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ نہ ان پر بحث کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم کا اس شہر کا نام نہ لینا اس بات کی دلیل ہے کہ قصہ کے جو مقاصد ہیں ان میں اس گاؤں کا نام لینے سے کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس شہر اور اس کے محل وقوع کا نام نہیں لیا۔ اور قصے اور اس سے حاصل ہونے والے سبق ہی پر اکتفاء کیا۔ بہر حال یہ ایک گاؤں تھا جس کی طرف دو رسول بھیجے گئے تھے۔ جس طرح حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہما السلام دونوں کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا گیا تھا۔ اس گاؤں والوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی۔ اللہ نے ان دونوں رسولوں کی تائید میں ایک تیسرا رسول بھی بھیج دیا اور اس تیسرے نے لوگوں کو بتایا کہ یہ دونوں برحق رسول ہیں چنانچہ ان تینوں نے از سر نو اپنی دعوت کا آغاز کیا۔

فَقَالُوا اِنَّا اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُونَ (۳۶: ۱۴) ”ان سب نے کہا ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں۔“ اب اس گاؤں والوں نے ان پر دہش گھسے پٹے اعتراضات کیے جو ہمیشہ رسولوں پر ہوتے ہیں۔

قَالُوا مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَا اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذٰبُونَ

(۳۶: ۱۵) ”ہستی واہوں نے کہا ”تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان اور خدائے رحمن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے تم محض جھوٹ بولتے ہو۔“ یہ اعتراضات جو تمام رسولوں پر ہوتے رہے ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت ہی سادہ لوح تھے اور ان کی سوچ ناچختہ تھی۔ یہ لوگ رسول اور رسالت کے بارے میں عجیب تصورات رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں رسول کی شخصیت ایک پراسرار شخصیت ہونا چاہئے اور اس کی شخصیت کے ساتھ بہت سے اوبہام اور قصے منسوب ہونے چاہئیں۔ اس لیے کہ رسول آسمان کی طرف سے زمین واہوں کی طرف آتا ہے لہذا اس کی شخصیت کے ساتھ اوبہام و اساطیر وابستہ ہونا ضروری ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہو کہ ایک رسول کھلا اور سادہ انسان ہو۔ ہماری طرح اس کی زندگی میں کوئی راز نہ ہو اور نہ کوئی عجوبہ ہو۔ ہم جیسا ایک عام اور معمولی انسان رسول کس طرح ہو

سکتا ہے جو بازاروں میں پھرتا ہو اور ہمارے جیسے گھروں میں رہتا ہو۔

یہ تھی ان کے فکر اور ان کی سوچ کی سادگی۔ اس لیے کہ نبوت کے ساتھ پر اسراریت لازم نہیں ہے، لیکن مقام نبوت اس قدر سادہ بھی نہیں ہے جس طرح یہ لوگ سمجھے ہیں۔ منصب رسالت اور منصب نبوت میں ایک عظیم اور گہرا راز بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک عام اور سادہ انسان کے اندر ایسی استعداد پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ایک عام انسان ہونے کے باوجود باری تعالیٰ سے وحی وصول کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات اس سے زیادہ تعجب خیز ہے کہ ایک رسول فرشتہ ہو جیسا کہ ان لوگوں کی تجویز تھی کہ رسول کو تو فرشتہ ہونا چاہئے۔

اصل بات یہ ہے کہ رسالت کا مقصد لوگوں کو اسلامی نظام زندگی سے روشناس کرنا ہوتا ہے اور رسول کی زندگی اس نظام کا عملی نمونہ ہو ا کرتی ہے اور رسول کی دعوت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو اس عملی نظام کے اتباع کی طرف بلاتا ہے۔ لوگ چونکہ انسان ہیں اس لیے ان کا مقصد بھی انسان ہونا چاہئے تاکہ وہ ان لوگوں کے لیے عملی نمونہ پیش کر سکے۔ اور وہ اس کی تقلید کر سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر رسول کی زندگی لوگوں کے لیے ایک کھلی کتاب ہو ا کرتی ہے۔ قرآن جو اللہ کی محکم کتاب ہے اس نے اس تفصیلی زندگی کے ایک معمولی اور اصولی حصے کو قلم بند کیا، تفصیلات کے بجائے اصول لکھ دیے۔ باقی تفصیلی نظام زندگی رسول وقت کی عملی زندگی سے امت اخذ کرتی ہے اور وہ عملی زندگی ایک کھلی کتاب کے طور پر تمام امت کے سامنے ہوتی ہے اور کئی سالوں پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ ان تفصیلات میں رسول کی خاندانی اور گھریلو زندگی کے خدوخال اور اجتماعی زندگی کے نمونے سب موجود ہوتے ہیں۔ بعض اوقات قرآن نے تو رسول کی نفسیاتی کیفیات کو بھی قلم بند کیا ہے تاکہ آنے والی امتیں بھی دیکھیں کہ نبی اللہ کی قلبی کیفیت کیا تھی۔

یہ تھی وہ واضح اور قریب الفہم حقیقت جس پر ہمیشہ انسانوں کی طرف سے اعتراض ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس گاؤں کے باشندوں نے تینوں رسولوں سے یہ کہا

مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۱۵:۳۶) ”تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم جیسے انسان ہو۔“ یہ تم محض دعوئی کر رہے ہو کہ تم رسول ہو۔

اب ذرا رسولوں کا جواب دیکھیں۔ وہ حقیقت حال سے واقف ایک مطمئن اور پرامن شخص کی طرح جواب دیتے ہیں۔

قَالُوا رَبَّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ (۱۶:۳۶) وَمَا عَلَيْنَا الْبَلَّغُ الْمُبِينُ

(۱۷:۳۶) ”رسولوں نے کہا ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔“ اللہ جانتا ہے کہ ہم رسول ہیں، بس یہی ہمارے لیے کافی ہے۔ ہمارا فریضہ صرف یہ ہے کہ رب کا پیغام پہنچا دیں۔ اور یہ تو ہم نے ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد لوگ آزاد ہیں اپنی زندگی میں جو تصرف چاہیں کریں۔ اور وہ جو رویہ بھی اختیار کریں گے اس کی ذمہ داری وہ اٹھائیں گے۔ رسولوں اور

امتوں کے درمیان تعلق صرف فریضہ رسالت کی ادائیگی کا ہے۔ جب یہ فریضہ ادا کر دیا گیا تو اس کے نتائج اللہ کے اختیار میں ہیں اور اللہ ہی کے حوالے ہیں۔

لیکن جاہلی گروہ اور جھٹلانے والے اس معاملے کو اس طرح سادگی سے اور آسانی سے نہیں لیتے۔ وہ دایمان حق کو برداشت کرنے کے روادار بھی نہیں ہوتے۔ ان کو ان کا غرور نفس مجبور کرتا ہے کہ وہ کوئی سخت قدم اٹھائیں۔ وہ محبت اور دلیل کے مقابلے میں تشدد اور بد مزاجی اور سخت کلامی کا سہارا لیتے ہیں کیونکہ باطل ہمیشہ تمزدلا ہوتا ہے۔

قَالُوا اِنَّا نَطْهَرُ نَا بِكُمْ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَ لَيَمَسَّنَّكُم مِّنَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ

(۱۸:۳۶) بستی والے کہنے لگے ہم تو تمہیں اپنے لیے قال بد سمجھتے ہیں۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک مزا پاؤ گے۔ تم منحوس لوگ ہو تمہاری وجہ سے ہم پر مصیبت آگئی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تمہاری دعوت کی وجہ سے ہماری بستی میں شر و فساد پھیل جائے گا۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم خاموش نہ رہ سکیں گے۔ اور ہمارے لیے یہ ممکن نہ ہو گا کہ تم اس طرح دعوت دیتے چلے جاؤ۔

لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَ لَيَمَسَّنَّكُم مِّنَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۸:۳۶) ”اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک مزا پاؤ گے۔“ یوں باطل نے اپنی برہمی کا اظہار کر دیا اور ہدایت دینے والوں کو دھمکی دے دی اور پر امن کلمہ حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کی اور فکر و خیال اور انداز گفتگو میں بد مستی کا اظہار کیا۔ لیکن رسولوں کا فریضہ تو یہ ہے کہ جیسے بھی حالات ہوں وہ اپنی راہ پر چلتے رہیں۔ اس لیے ان کا رویہ بالکل مختلف ہے۔

قَالُوا طَآئُرُكُمْ مَّعَكُمْ (۱۹:۳۶) ”رسولوں نے کہا تمہاری قال بد تمہارے اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے۔“ اس لیے کہ نیک ذلی یا بد ذلی دونوں جاہلیت کے خرافات میں ہیں۔ اور رسولوں کے مشن میں یہ بھی داخل ہے کہ اس دہم کو بھی دور کیا جائے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کو خیر و شر باہر سے نہیں ملتا بلکہ خیر اور شر دراصل خود اس کے نفس کے اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ خیر اور شر تو تمہارے ساتھ لگا ہوا ہے۔ تمہاری نیوٹوں اور تمہارے اعمال سے آنے والے خیر و شر کا مگر رابطہ ہے اور خیر و شر کا مدار تمہارے اعمال پر ہے۔ یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم آنے والے واقعات کو اپنے لیے بہتر بناؤ اور نیک انجام پاؤ یا اسے خود اپنے لیے شر بنا دو کیونکہ اللہ لوگوں کے بارے میں وہی فیصلے کرتا ہے جن کے لیے ان کے نفوس میں میلان ہو اور اپنے عمل کی وجہ سے اس طرف انہوں کا رجحان ہو۔ لہذا تمہارا شگون اور بد شگون تمہارے ساتھ اور تمہارے نفوس کے اندر ہے۔ یہ ہے ایک قائم اور دائم حقیقت۔ رہی یہ بات کہ کسی کا منہ دیکھ کر قال بد لینا یا کسی جگہ سے بد شگون یا الفاظ سے بد شگون لینا یہ خرافات جاہلیت میں سے ایک موهوم بات ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اس لیے رسولوں نے کہا اِنَّ ذٰلِكُمْ اَنْتُمْ (۱۹:۳۶) ”کیا یہ باتیں تم اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی محی؟“ یعنی تم ہمیں رجم کرنے کی دھمکی اس لیے دیتے ہو یا ہمیں سخت سزا اس لیے دیتے ہو کہ ہم تمہیں نصیحت کر رہے

ہیں اور رہے بے بجا رہے ہیں۔

بل انتم قوم مسرفون (۱۹:۳۶) ”اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو۔“
یعنی اپنی سوچ اور واقعات کو وزن کرنے میں تم حدود سے نکل چکے ہو، تم نصیحت کا بدلہ دھمکی سے دیتے ہو، اور تشدد پر اتر آئے ہو۔ اور دعوت اسلامی کے جواب میں تشدد اور قتل کی بات کرتے ہو۔

--- ۰۰۰ ---

جن لوگوں کے دلوں پر پردے پڑ گئے تھے۔ ان کی جانب سے رسولوں کی دعوت کا جواب یہ دیا گیا اور یہ ہے مثال
ان سرکش لوگوں کی جو ہمیشہ دعوت اسلامی کی راہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور تشدد پر اتر آتے ہیں۔ جب بھی دعوت
اسلامی کا آغاز ہو گا اس قسم کے لوگ متحرک ہو جائیں گے۔ یہ ہے راہ و رسم دعوت اللہ کے کام کی۔
اس کے بالمقابل انسانوں میں سے ایک دوسرا نمونہ بھی ہوتا ہے جو نصیحت قبول کر کے اس کی اطاعت کرتا ہے۔
رحمن سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔ اس لیے اس دوسرے نمونے کا رویہ بالکل پہلے رویے سے مختلف ہوتا ہے۔ اور اس کا
رد عمل پہلے والے لوگوں کے رد عمل سے بالکل جدا ہوتا ہے۔

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ بَعْثٌ يَسْعَىٰ قَالِ يَقُومِ

اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ۖ اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْئَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُّهْتَدُونَ ﴿۲۱﴾

”لتنے میں شہر کے دور دراز گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا ”اے میری قوم کے لوگو! رسولوں کی پیروی
اختیار کر لو۔ پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں۔“
یہ ہے نمونہ فطرت سلیمہ کا۔ جب فطرت سلیمہ ایک سیدھے سارے حق کو سنتی ہے تو وہ فوراً تصدیق کرتی ہے۔
نہایت سادگی اور نہایت ہی گرم جوشی کے ساتھ اور فطرت سلیمہ کی فکر مستقیم ہوتی ہے۔ اور وہ پر شوکت سچائی کے مقابلے
میں جوش و خروش سے لبیک کہتی ہے۔

یہ ایک شخص بھی اسی معاشرے اور گاؤں کا فرد ہے، دعوت اسلامی کو سنتے، وہ لبیک کہتا ہے۔ وہ سچائی کے دلائل و
نشانات کو ابھی طرح پاتا ہے۔ رسولوں اور ان کی قوم کے درمیان جو مکالمہ ہوا ہے اس کے اندر پائے جانے والی گہری
منطق کو وہ پالیتا ہے۔ جب یہ سچائی اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گئی تو وہ فوراً حرکت میں آ جاتا ہے۔ اب وہ
خاموش نہیں رہ سکتا۔ یہ اپنا دروازہ بند کر کے اپنے گھر میں بیٹھا بھی نہیں رہتا جبکہ اس کے ارد گرد گمراہی کا دور دورہ ہو،
فسق و فجور عام ہو اور لوگ کفر کر رہے ہوں، اس کے ضمیر کے اندر جو سچائی اتر چکی ہے اور جس کو اس کا شعور حق تسلیم
کر چکا ہے وہ اسے لے کر دوڑتا ہوا آتا ہے، وہ اپنی قوم کے پاس آتا ہے، یہ قوم جو انکار کر رہی ہے، دھمکیاں دے رہی
ہے، تشدد پر اتر آئی ہے۔ یہ شخص شہر کے مضافاتی علاقے میں رہتا ہے۔ یہ اپنا فریضہ ادا کرنے کے لیے بھاگ نکلتا ہے۔
اور اپنی اس منکر حق قوم کو دعوت حق دیتا ہے ان کو بغاوت، سرکشی اور تشدد سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے جس کا وہ
لپے رسولوں کے بارے میں ارادہ کر چکے ہیں۔

معلوم یوں ہوتا ہے کہ یہ شخص اس سوسائٹی کا کوئی بااثر فرد نہ تھا۔ نہ اس کے پاس کوئی خاندانی وجاہت اور قوت تھی کہ اس کو ان سرکشوں کے تشدد سے بچائے۔ ہاں اس کے قلب میں ایک زندہ اور پرجوش ایمان تھا۔ یہ ولولہ انگیز ایمان تھا جو اسے بستی کے مفاقات سے اٹھا لایا۔

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَا الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ قَالَ يَتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ (۲۰: ۳۶)

اَتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْئَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ (۲۱: ۳۶) ”اتنے میں شر کے دور دراز گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا ”اے میری قوم کے مگو رسولوں کی پیروی اختیار کر لو۔ پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں۔“

جو شخص اس قسم کی تحریک اٹھاتا ہے اور اس پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا، نہ کوئی مفاد اس کا اس تحریک سے وابستہ ہوتا ہے۔ بے شک وہ سچا ہے۔ اگر یہ فریضہ اس کی جانب سے عائد نہیں ہے اور اللہ کے لیے نہیں ہے تو پھر وہ کیوں یہ سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ لہذا لازمی نتیجہ ہے کہ یہ سچا ہے۔ اگر سچا ہیں تو پھر وہ کیوں خواہ مخواہ یہ مشکلات برداشت کرتا ہے۔ لوگوں کو ایسے خیانات و نظریات دیتا ہے جن کے وہ عادی نہیں ہیں، لوگ اسے ازیت دیتے ہیں، اس کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں، اس کے ساتھ مذاق کرتے ہیں، اس سے انتقام لیتے ہیں، وہ یہ سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی مفاد اس کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ نہ وہ کوئی اجر طلب کرتا ہے۔ لہذا معقول راہ یہی ہے کہ

اَتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْئَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ (۲۱: ۳۶) ”پیروی اختیار کرو ان لوگوں کی جو

تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں۔“

ان کی ہدایت تو ان کی دعوت اور ان کے کردار سے واضح ہے۔ وہ فقط ایک اللہ کی دعوت دیتے ہیں اور یہ نہایت ہی معقول بات ہے۔ وہ ایک واضح منہاج زندگی کی طرف دعوت دیتے ہیں جو واضح طور پر معقول ہے۔ وہ ایسے عقائد و نظریات کی طرف دعوت دیتے ہیں جن میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اور نہ کوئی وہم و گمان ہے۔ یہ لوگ دراصل ایک نہایت ہی درست اور سیدھے راستے کی طرف راہ پا چکے ہیں اور ہدایت یافتہ ہیں۔

اس پورے معاشرے اور بستی سے پھر یہ اکیلا شخص کیوں ایمان لایا۔ اس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ دیکھو میرے ایمان کے اسباب یہ ہیں۔ میری فطرت جاگ اٹھی ہے۔ اور اپنی فطری سلامتی کی وجہ سے بات میری سمجھ میں آگئی ہے اور کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اس دعوت سے کوئی سلیم الفطرت شخص منہ موڑے۔

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ---- ۲۳

سورۃ یسین - ۳۶

آیات ۲۲ --- تا --- ۸۳

سورۃ الصفات - ۳۷

آیات ۱ --- تا --- ۱۸۲

سورۃ ص - ۳۸

آیات ۱ --- تا --- ۸۸

سورۃ الزمر - ۳۹

آیات ۱ --- تا --- ۳۱

میرے ہی کام آ سکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں۔

اس سے بڑا گمراہ اور کون ہو سکتا ہے جو اس فطری سوچ کو ترک کر دے کہ جو ہر مخلوق کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے اور ایسے معبودوں کی بندگی نہ کرے جو خالق نہیں ہیں۔ جن کا کوئی جواز نہیں اور جن میں کوئی معقولیت نہیں۔ اور یہ معبود ہوں بھی ضعیف و ناتواں نہ کسی کی حمایت کر سکتے ہیں اور نہ کسی سے مدافعت کر سکتے ہیں، خصوصاً جبکہ حقیقی خالق کسی کو اس کی گمراہی کی وجہ سے سزا دینا چاہے۔

اِنِّیْ اِذَا الْغَیْیُ ضَلُّ مُبِیِّنٌ (۳۶: ۲۴) ”اگر میں ایسا کروں تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔“ اس رجل مومن نے لوگوں کے سامنے فطری سوچ تو پیش کر دی، نہایت ہی سچے اور عارفانہ اور واضح انداز میں۔ اب وہ خود اپنا فیصلہ ان کو سناتا ہے۔ وہ جو تکذیب پر تلے ہوئے وہ جو تشدد پر آمادہ ہیں۔ یہ فیصلہ وہ اس لیے سناتا ہے کہ یہ فطری آواز اس کے دل کو ایمان سے بھر چکی ہے۔ اس کا دل اب کسی دھمکی اور کسی نامعقول تہدید و تکذیب کو خاطر ہی میں نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے۔

اِنِّیْ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْا (۳۶: ۲۵) ”میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہوں سن لو میری بات۔“ یوں اس نے نہایت اطمینان، نہایت اعتماد کے ساتھ اپنے ایمان کا آخری اعلان کیا اور اس پر اس نے خود ان کو گواہ ٹھہرایا۔ اشارہ یہ دیا کہ جس طرح میں ایمان لایا ہوں تم بھی ایمان لاؤ کیونکہ میں جس رب پر ایمان لایا ہوں وہ تمہارا ہی رب ہے یا یہ کہ سن لو میں ایمان لایا ہوں جو چاہو کرو جو چاہو کہو۔

--- ۰۰۰ ---

اس کے بعد اس رجل مومن کی تقریر پر جو تبصرہ آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اس شخص کو تو وہیں شہید کر دیا۔ اگرچہ قرآن کریم نے اس کی صراحت نہیں کی۔ لیکن اس قصے کا وہ منظر جو اس دنیا سے تعلق رکھتا ہے، وہ ختم ہو جاتا ہے۔ پردہ گر جاتا ہے۔ دنیا اور اس کے اندر اس کی قوم کے ساتھ یہ مکالمہ ختم ہوتا ہے۔ اب یہ شہید آخرت میں نظر آتا ہے۔ جس نے کلمہ حق بلند کیا جس نے اپنی فطرت کی پکار پر لبیک کہا، اور جس نے اپنے ایمان کا اعلان ان لوگوں کے سامنے جہرا کیا جو نبیوں کو بھی قتل اور تشدد کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ اب یہ شخص عالم آخرت میں ہے۔ وہاں اللہ کے ہاں اس کا عظیم استقبال ہو رہا ہے۔ جیسا کہ مومنین صادقین اور شہداء کا وہاں ہوتا ہے۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۖ قَالَ يَلِيَّتْ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا عَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمَكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾

” (آخر کار ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا اور) اس شخص سے کہہ دیا گیا کہ ”داخل ہو جنت میں۔“ اس نے کہا ”کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بددست میری معفرت فرما دی اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل فرمایا۔“

درس ۲۰۶ ایک نظر میں

پسے سبق میں بت ان لوگوں کے بارے میں قلمی جنموں نے دعوت اسلامی کا استقبال انکار اور مکذیب کے ساتھ کیا۔ اور اس کا انجام ان کے گاؤں کا قصہ بیان کر کے بتایا گیا کہ ان جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ ان کا انجام یہ ہوا کہ

فَاِذَا هُمْ خُمِدُوْنَ (۲۹:۳۶) ”اچانک وہ بجھ کر رہ گئے۔“ لیکن اس سبق میں تمام ملتوں اور تمام کتب سماوی کے مکذبین کا انجام بتایا گیا ہے۔ اور پوری انسانی تاریخ سے گمراہ انسانوں کے خدوخال اور نقوش یہاں بتائے گئے ہیں اور یہاں نہایت ہی دلہوز آواز و انداز میں پکارا جاتا ہے کہ تعجب ہے کہ لوگ ان اقوام کی تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے۔ جس کو سچائی کو جھٹلانے کی وجہ سے ہلاک کیا گیا۔ یہ مکذبین وہ ہیں جو گمراہی کے راستے پر آگے ہی بڑھ رہے ہیں اور یوم الدین کا انہیں کوئی خیال نہیں ہے۔

وَ اِنْ كُلُّ لَمَمٍ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (۳۶:۳۲) ”ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جاتا ہے۔“

اس کے بعد تکوینی دلائل اور معجزات اور نشانیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ وہ نشانیاں ہیں جن کو یہ لوگ رات اور دن دیکھتے ہیں اور نہایت ہی لاپرواہی سے ان پر سے گزر جاتے ہیں۔ یہ خود ان کے نفوس کے اندر بھی موجود ہیں۔ ان کے ماحول میں بھی موجود ہیں۔ ان کی قدیم تاریخ میں بھی موجود ہیں لیکن ان کو اس کا شعور نہیں ہے اور جب ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو وہ یاد نہیں کرتے۔ سبق نہیں حاصل کرے۔

وَ مَا تَاتِيهِمْ مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ (۳۶:۴۶) ”ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے، یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔“ اس کے برعکس یہ لوگ اللہ کے عذاب کے بارے میں جلد آنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ مطالبہ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کو عذاب کے آنے کا کوئی یقین نہیں۔

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۶:۴۸) ”کہتے ہیں کہ یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ ہاؤ اگر تم سچے ہو۔“

چونکہ یہ لوگ عذاب میں شہابی کا مطالبہ کرتے ہیں، قیامت کے آنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور دل میں یہ ہے کہ ان کو ان امور کے واقع ہونے کا یقین نہیں ہے۔ اس لیے یہاں منظر قیامت میں سے ایک حویل منظر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ منظر صاف صاف جاتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہو گا جس کے واقع ہونے کی ان کو بہت جلدی ہے۔ یہ منظر اس انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ گویا ان کا انجام واقع ہو گیا اور یہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔

درس نمبر ۲۰۶ تشریح آیات

۳۰ --- تا --- ۶۸

يَحْصِرُهُ عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ
يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۳۰﴾ أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا
يَرْجِعُونَ ﴿۳۱﴾ وَإِنْ كُلُّ لُحْمًا جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿۳۲﴾

”افسوس بندوں کے حاس پر جو رسول بھی ان کے پاس آیا اس کا وہ مذاق ہی اڑتے رہے۔ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں اور اس کے بعد وہ پھر بھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آئے؟ ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جاتا ہے۔“

حسرت ایک ایسی نفسیاتی حالت ہے جس میں انسان کو بے حد افسوس ہوتا ہے لیکن وہ اس حالت کو بدلنے کی طاقت میں رکھتا۔ پس وہ دیکھ دیکھ کر کڑھتا ہے اور اسے اذیت ہوتی ہے۔ اللہ کو تو بندوں کے ایمان نہ لانے پر کوئی حسرت نہیں ہوتی۔ مفہوم یہ ہے کہ انسانی نقطہ نظر سے یہ لوگ قابل حسرت ہیں۔ وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی حالت پر افسوس کیا جائے۔ کیونکہ ان کا یہ حال نہایت ہی قابل تأسف پریشان کن اور قابل رحم ہے کہ یہ لوگ اپنی اس ضلالت کی وجہ سے دائمی شر اور دائمی مصیبت میں مبتلا ہونے والے ہیں۔

یقیناً وہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی حالت پر افسوس کیا جائے جن کو نجات کا موقع ملا ہے اور وہ اس سے استفادہ نہیں کرتے۔ ان کے سامنے انسانی تاریخ موجود ہے اور وہ اس تاریخ سے عبرت نہیں لے سکتے اور نہ ہی تاریخی واقعات پر غور کرتے ہیں۔ اس لوگوں کے پاس وقتاً فوقتاً اللہ ال کی ہدایت کے لیے رسولوں کو بھیجتا ہے لیکن یہ لوگ اللہ کی رحمت کے دروازوں سے دور ہو جاتے ہیں اور پھر اللہ کی شان میں گستاخی بھی کرتے ہیں۔

يَحْصِرُهُ عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ

(۳۶: ۳۰) ”جو رسول بھی ان کے پاس آیا اس کا وہ مذاق ہی اڑتے رہے۔“

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ (۳۶: ۳۱) دیکھا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں اور اس کے بعد وہ پھر بھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آتے۔ وہ اقوام ہر ہلاک کی گئیں اور اس دنیا سے مٹا دی گئیں ان کے مٹ جانے میں لوگوں کے لیے سامان عبرت و نصیحت ہے۔ اور طویل انسانی تاریخ انسانوں کے لیے موضوع غور و فکر و تدبر ہے۔ لیکن یہ بد بخت لوگ انسانی تاریخ پر غور نہیں کرتے۔ حالانکہ اپنی اس لاپرواہی کی وجہ سے وہ ہلاکت اور بربادی کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ تو ان کی اس افسوسناک حالت پر حسرت کے سوالور کیا کیا جاسکتا ہے۔

ایک حیوان بھی جب دوسرے حیوان کی موت اور ہلاکت اپنے سامنے دیکھتا ہے تو وہ کانٹا اٹھاتا ہے اور مقدر بھر کوشش کرتا ہے کہ وہ اس انجام سے بچ جائے۔ لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ اپنے بھائیوں کو اپنی بے راہ روی کی وجہ سے ہلاک ہوتے دیکھتا ہے اور پھر وہ اسی راہ پر چلتا ہے۔ محض اپنے غرور اور کبر اور پرواہی کی وجہ سے وہ دھوکہ کھاتا ہے اور دیکھنے کے باوجود اسی راہ پر چلتا ہے۔ انسان کی ایک طویل تاریخ اس کے سامنے اور وہ جانتا بھی ہے کہ انسانوں کی ہلاکت فلاں فلاں اسباب کی وجہ سے ہوئی لیکن وہ پھر بھی اندھوں کی طرح لاپرواہی سے اپنی راہوں پر چلتا ہے۔ اور نہیں دیکھتا۔

جب ہلاک ہونے والے اور نابود کر دیئے جانے والے اب اپنے جانشینوں کے پاس دلوں میں آسکتے تو یہ جانشین بھی اسی راستے پر جائیں گے۔ یہ ہم سے بچ کر نہ نکل سکیں گے۔ ان سے بھی حرب لیا جائے گا۔

وَ اِنْ كُلُّ لَمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ (۳۶: ۳۲) ”ب شک اس سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جاتا ہے۔“

وَ اٰیۃُ لَهُمُ الْاَرْضُ الْمِیْتَةُ ۝۱۱۱ اَحْیَیْنَهَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ یَاْكُلُوْنَ ۝۱۱۲ وَ جَعَلْنَا فِیْهَا جَدَّتٍ مِّنْ نَّخِیْلِ وَ اَعْنَابٍ وَ فَجَّرْنَا فِیْهَا مِنَ الْعُیُونِ ۝۱۱۳ لِیَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖ ۝۱۱۴ وَ مَا عَمِلَتْہُمْ اَیْدِیْہُمْ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ۝۱۱۵ سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَنْوَاجَ كُلَّہَا مِمَّا تُثْبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِہُمْ وَ مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۱۱۶

”ان لوگوں کے لیے بنے جان زمین ایک نشانی ہے۔ ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے نکلے گیات یہ اُٹھاتے ہیں۔ ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے بان پھل دیئے اور اس کے اندر سے چٹے پھوڑ نکالے، تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ پھر کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے؟ پاک ہے وہ ذات جس نے ہر اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نہات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوع انسانی) میں یا ان

اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں۔“

یہ لوگ رسولوں کی کھنڈ میب کرتے ہیں اور انسانی تاریخ کے اندر کھنڈ میب کرنے والوں کی قتل گاہوں اور پر بادریوں پر غور نہیں کرتے۔ اور یہ لوگ مخلوق کی اس حالت سے کوئی سبق نہیں لیتے کہ لوگ چلے جا رہے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں ہو رہا ہے۔ اور رسول کی دعوت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کی طرف ہدایت ہیں۔ وہ اللہ جس کے وجود پر ان کے اور گرد پھیلی ہوئی یہ کائنات بھی طرح دلاتی کرتی ہے۔ اللہ کی شاکرتی ہے اور اس کے وجود پر شاہد ہے۔ یہ زمین جو ان کے پاؤں کے نیچے ہے یہ دیکھتے ہیں کہ ایک وقت میں یہ مرجاتی ہے۔ اس میں کوئی روئیدگی نہیں ہوتی۔ پھر یہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اس میں حیوانات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اندر باغات پیدا ہوتے ہیں۔ کجوبس، انگور اور پھر ان باغات کے اندر چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور یوں انسانی اور دوسری زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔

اور پھر یہ زندگی بذلت خود ایک معجزہ ہے اور کوئی انسان یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ زندگی کا اجرا کر سکے، اس کی تخلیق کر سکے اور اس کے بعد اس کا سلسلہ قائل کو جاری کر سکے۔ زندگی کے اس عظیم معجزے کا اجراء دست قدرت کا عجیب کارنامہ ہے۔ مردہ جسم کے اندر زندگی کی روح پھونک دی جاتی ہے دم بدم بڑھنے والی فصل کو دیکھ کر، کھنی چھاؤں والے باغات کو دیکھ کر، اور اس سے بھرے ہوئے پختہ پھلوں کو دیکھ کر انسانی دل و دماغ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ انسان دیکھتا ہے کہ یہ پوری زمین کو پھاڑ کر روشنی اور آزادی کے لیے سر نکالتے ہیں۔ اور یہ سر نکالتے والی لکڑی سورج کی روشنی میں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ پودا پتوں اور پھولوں سے مزین ہو جاتا ہے۔ پھول کھل جاتے ہیں، پھل پک جاتے ہیں اور توڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

لَيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهِ وَاَمَّا عَمَلَتُهُ اَيَّدِيْهِمْ (۳۶: ۳۵) ”تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں اور یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔“ یہ اللہ ہی کا ہاتھ ہے جس نے ان کو اس کام پر قدرت دی۔ جس طرح اس نے فصلوں اور پھلوں کو بڑھنے کی صلاحیت دی۔

اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ (۳۶: ۳۵) ”پھر کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے۔“

اس کے بعد قرآن کریم میں ایک لطیف اشارہ اس طرح آتا ہے کہ جس ذات نے انسان کی راہنمائی ان نباتات اور باغات کی طرف فرمائی۔ وہ وہی ہے جس نے فصلوں کے اندر بھی جوڑے پیدا کیے یعنی نر اور مادہ جس طرح انسانوں اور حیوانوں کے اندر جوڑے ہیں اور تمام دوسری مخلوق میں بھی جوڑے ہیں جن کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

مُسَبِّحِيْنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَاَمِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا

يَعْلَمُوْنَ (۳۶: ۳۶) ”پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں۔“

اللہ کی یہ تسبیح نہایت ہی موزوں وقت پر آتی ہے اور تسبیح کے ساتھ ساتھ یہ اس کائنات کی عظیم حقیقت کا اظہار بھی کر رہی ہے۔ یہ کہ تمام مخلوق ایک جیسی ہے۔ اللہ کی تخلیق کا ایک اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے تمام مخلوقات کو

جوڑے جوڑے پیدا کیے ہیں۔ نباتات بھی انسانوں کی طرح جوڑے ہیں۔ اور انسانوں اور نباتات کے علاوہ دوسری مخلوق بھی جوڑے ہیں۔

وَمَا لَّا يَعْلَمُونَ (۳۶:۳۶) ”اور ان اشیاء میں بھی جوڑے ہیں جنہیں یہ جانتے تک نہیں۔“ اصول تخلیق اور حکوین کی یہ یگانگت بتلاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق بھی ایک ہے۔ تمام شکلوں، تمام مجموعوں، تمام انواع، تمام اجناس، تمام خصائص اور تمام علامات کے اندر یہ قاعدہ پوری طرح کارفرما ہے۔ یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ انہم اس کائنات کا وہ چھوٹا سا حصہ ہے جو آج معلوم ہو چکا ہے اور یہ انہم بھی دو جوڑوں سے مرکب ہے۔ یعنی مثبت اور منفی الیکٹرک شعاعیں۔ یہ باہم جدا بھی ہوتی ہیں اور متحد بھی۔ اسی طرح ہزاروں ستارے ایسے معلوم ہو چکے ہیں جو مزدوج تخلیق کے مالک ہیں۔ جو دو ستاروں سے بنے ہوئے ہیں اور باہم مرتب و ہم آہنگ ہیں اور ایک ہی مدار میں پھرتے ہیں۔ گویا وہ ایک مرتبہ نمونہ کی شکل میں ہیں۔

--- () () ---

یہ تو تھی مردہ زمین جس سے زندگی پھوٹ رہی ہے۔ اب زمین سے آگے بڑھ کر قرآن آسمان کی طرف متوجہ ہوتا ہے، ”آسمانی نظارے ہمارے سامنے پیش ہوتے ہیں اور یہ تمام نظارے دست قدرت کے عجوبے ہیں۔“

وَآيَةٌ لَهُمُ اللَّيْلُ مَسَّ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَإِذَا هُمُ مُظْلِمُونَ ﴿۳۷﴾
وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۳۸﴾ وَالْقَمَرَ
قَدَرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي
لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ﴿۴۰﴾ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ
يَسْبَحُونَ ﴿۴۱﴾

”ان کے لیے ایک اور نشانی رات ہے، ہم اس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔ اور چاند، اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔“

رات کے آنے کا منظر، روشنی ختم ہو جاتی ہے اور اندھیرا آہستہ آہستہ چھا جاتا ہے۔ یہ وہ منظر ہے جسے تمام انسان ۲۴ گھنٹوں میں دہرایا ہوا دیکھتے ہیں، ”ماسوائے ان خطوں کے جہاں رات اور دن کا عمل چھ ماہ کے بعد دہرایا جاتا ہے۔ یعنی ان علاقوں میں جو قطبین کے بہت قریب ہیں۔ یہ عمل اگرچہ رات اور دن میں بار بار دہرایا جاتا ہے لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ اللہ کی قدرت کا ایک عجوبہ ہے اور اس قائل ہے کہ انسان اس پر غور و فکر کریں۔“

یہاں اس مقام پر اس مجاہد کا انداز تعبیر بھی مفرد ہے۔ یہاں رات کو دن میں ملبوس تصور کیا گیا ہے اور جب دن کا لباس اتر جائے تو رات آجاتی ہے۔ اور لوگ اچانک اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں۔ اسی انداز تعبیر کا ادراک یوں ہو سکتا ہے اور یہ اس وقت پھر نواز کے بجائے حقیقت نظر آتی ہے 'جب ہم زمین کی گردش محوری پر غور کریں۔ سورج کے سامنے اس کی اس گردش کے بدولت زمین کا ایک نقطہ سورج کے سامنے رہتا ہے اور وہاں دن ہوتا ہے اور جب زمین کا وہ حصہ غائب ہوتا ہے تو اچانک دن کا لباس اتار دیا جاتا ہے اور ماحول پر پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور یہ منظر نہایت ہی عظیم کے ساتھ یونہی چلتا رہتا ہے۔ ہر وقت دن کے لباس کو رات کے جسم سے کھینچا جاتا ہے اور رات ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ غرض یہ قرآنی تعبیر حقیقی بھی ہے اور نہایت ہی فصیح اور ادبیانہ بھی۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (۳۶:۳۸) ”اور سورج“ وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔“ سورج بھی گردش محوری رکھتا ہے۔ بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اپنی جگہ ابستادہ ہے لیکن تازہ ترین سائنسی معلومات یہ ہیں کہ یہ سورج اپنی جگہ رکھا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ بھی چل رہا ہے 'عملاً رواں ہے۔ یہ ایک ہی سمت میں جا رہا ہے۔ اس عظیم کائنات اور اس فضا اور خلا میں یہ ایک طرف جا رہا ہے۔ اور یہ ۱۲ میل فی سیکنڈ کے حساب سے ایک ہی سمت میں جا رہا ہے۔ نیل میں اس کی حرکت اور رفتار کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو خیر و بصیر ہے اور اللہ صریح طور پر فرماتا ہے کہ اس کی ایک جگہ ٹھہر ہے اور اس کے لیے وہ بے تابی سے چل رہا ہے۔ کس طرح اور کب وہاں پہنچتا ہے یہ قیامت ہے اور اس کا ہم اللہ ہی کو ہے۔

جب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ اس سورج کا حجم زمین سے ایک ملین گنا زیادہ ہے اور یہ سورج اپنی اس کمکتاں کے ساتھ (اور کمکتاں کس قدر عظیم ہے 'ذرا سوچ لیں) ایک فضائے لامتناہی میں اپنے مستقر کے لیے رواں ہے 'تو اس سے اللہ کے علم اور قدرت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہے مضمون اس آیت کا۔

ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۳۶:۳۸) ”یہ زبردست، عظیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔“

وَالْقَمَرَ قَدَرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ (۳۶:۳۹) ”چاند“ اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے۔“ لوگ چاند کو تو اپنی ان منزلوں میں، کچھ سکتے ہیں۔ وہ ہلال کی طرح نمودار ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ گول ہو کر بدر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد گھٹنا شروع ہوتا ہے اور پھر وہ ہلال کی طرح ہو جاتا ہے اور یوں نظر آتا ہے جس طرح کھجور کی پرانی تنگ شاخ۔ العُرْجُونِ اس شاخ کو کہتے ہیں جس میں کھجور کی قسم ”بیج“ ہوتی ہے۔ جو لوگ چاند کو ہر رات دیکھتے ہیں وہ قرآن کریم کی اس انداز تعبیر کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ (۳۶:۳۹) ”یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔“ خصوصاً اس تعبیر میں غفہ قدیم معنی خیز ہے۔ چاند پہلی راتوں میں ہلال ہوتا ہے اور آخری راتوں میں بھی ہلال ہوتا ہے لیکن پہلی راتوں میں وہ غفہ اور نشوونما وال نظر آتا ہے۔ اور آخری راتوں میں پڑ مرہہ ردال پڑے

اور خشکی اور سکڑنے کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہ سکڑ کر اس قدر خشک ہو جاتا ہے جس طرح خشک شاخ۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ قرآن نے یہ انداز تعبیر اختیار کیا ہے بلکہ یہ بامقصد اور اصل صورت کا حقیقی اظہار ہے اور عجیب ہے۔

چاندنی راتوں میں مسلسل غور و فکر کرنے سے انسانی احساس کے پردوں پر شعور اور تخیلات کی عجیب و غریب اور تروتازہ کیفیات آتی ہیں اور انسان پر اس سوچ کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور وہ انسان جو اس چاند کا پورے ایک ماہ تک مشاہدہ کرتا ہے اور غور کرتا ہے وہ تاثرات لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بدیع السموات اور خالق جلال و جلال کی قدرت کی شان کیا ہے جس نے اس قدر عظیم اجرام سماوی کو یہ خوبصورتی اور یہ تنظیم عطا کی ہے۔ ہر شخص اس منظر سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ چاہے وہ اس عظیم کائنات کے ان رازوں کو جانتا ہے یا نہیں۔ میں کہتا ہوں صرف رات کے وقت چاند کا مشاہدہ ہی انسانی دل کو ہلکا دینے کے لیے کافی ہے۔ اس سے شعور بیدار ہوتا ہے اور انسان کے اندر غور و فکر کی عادت پڑتی ہے۔

اب اللہ ذرا اس عظیم کائنات اور ان عظیم اجرام فلکی کی لطیف تنظیم کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور اس تنظیم اور ترتیب کی وجہ سے کیا کیا مظاہر پیدا ہوتے ہیں؟ غور کیجئے!

لَا الشَّمْسُ يَسْبِعِي لَهَا أَنْ تَذُرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ

يَسْبَحُونَ (۳۶: ۴۰) ”نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔“ ہر ستارے اور سیارے کے لیے ایک فلک ہے یا اس کا اہتمام ہے۔ اپنی رفتار اور گردش میں وہ اپنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ ستاروں اور سیاروں کے درمیان عظیم فاصلے ہیں۔ زمین سورج کے درمیان ۹۳ ملین میل کا فاصلہ ہے اور چاند زمین سے ۲۴۰ ملین میل دور ہے۔ لیکن یہ فاصلے بھی اپنی اس دوری کے باوجود حسی کمکتاں اور اس کے قریب ترین دو سری کمکتاں کے قریب تارے۔ چار نوری سال دور تے۔ اور نوری سال میں ٹائم کا تعین یوں کیا گیا ہے کہ جس میں روشنی کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ ہو گویا سورج کی کمکتاں سے قریب ترین ستارہ ایک سو چار ملین میل دور ہے۔

اللہ جو اس کائنات کا خالق ہے اس نے ستاروں اور سیاروں کے درمیان اس قدر عظیم فاصلے پیدا کیے ہیں اور جس نے اس عظیم کائنات کا یہ عجیب نقشہ تیار فرمایا ہے تاکہ ان باہم تصادم اور ٹکراؤ سے بچایا جائے اور یہ نظام یونہی جاری رہے لایہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت برپا کر دے اس لیے سورج کے اندر یہ قوت نہیں ہے کہ وہ چاند کو جالے۔ اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے نہ اس کے مقابلے میں کھڑی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جس گردش کی وجہ سے روز و شب پیدا ہوتے ہیں وہ جاری ہے۔ لہذا ان دونوں میں سے کوئی دوسرے سے آگے نہیں ہو سکتا اور نہ دوسرے کی راہ روک سکتا ہے۔

وَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۳۶: ۴۰) ”اور سب ایک ایک فلک میں تیرتے ہیں۔“ فضائے کائنات

میں ان سیاروں اور اجرام فلکی کی حرکت یوں ہے جس طرح سفینہ سمندر میں تیر رہا ہوتا ہے۔ یہ بحری جہاز اپنی عظمت کے باوجود اس عظیم سمندر میں ایک سیاہ مکہ ہی ہوتا ہے۔

انسان حیران اور ششدر رہ جاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں سیارے اور جرم فلکی اس وسیع فضا کے کائنات میں بکھرے پڑے ہیں اور تھر رہے ہیں۔ ہر سیارے اور اجرام فلکی کے ارد گرد ایک وسیع فضا ہے اور وہ دوسرے سے بہت دور ہے اور ان سیاروں اور اجرام کا حجم بہت بڑا ہونے کے باوجود اس وسیع فضا میں وہ ایک نکتہ ہیں۔ بہت ہی معمولی نکتہ!!

--- () ---

وَ آيَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلِّ الْمَشْحُونِ ﴿٣٧﴾
خَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ ﴿٣٨﴾ وَإِنْ نَشَأْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيخَ
لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُونَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا رَحْمَةً مِنَّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿٤٠﴾

”ان کے لیے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیا اور پھر ان کے لیے ویسی ہی کشتیوں اور پیدائشیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔ ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں، کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو اور کسی طرح یہ نہ بچائے جاسکیں۔ بس ہماری رحمت ہی ہے جو انہیں پار لگاتی اور ایک وقت خاص تک زندگی سے متمتع ہونے کا موقعہ دیتی ہے۔“ یہاں سیاق کلام میں ایک نہایت ہی لطیف مناسبت ہے۔ ستارے اور سیارے بلند فضا کے کائنات میں تھر رہے ہیں اور کشتی اولاد آدم سے بھری ہے اور وہ پانیوں میں تھر رہی ہے۔ ان دونوں مناظر کے اندر ظاہری نسبت بھی ہے، رفتار کی مناسبت بھی ہے اور یہ رہہ بھی ہے کہ ان دونوں کو اللہ نے مسخر کر لیا ہے۔ اور اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کے اندر اپنی قدرت سے ان کو تمام رکھا ہے۔

یہ دونوں مناظر انسانوں کی نظروں کے سامنے ہیں لیکن انسان ان پر غور نہیں کرتے۔ اگر انسان اپنے قلب کو کھول دے اور اپنے دماغ کو وسعت دے تو ان امور پر غور و تدبر کر کے وہ بڑی سہولت سے اللہ کی نشانیوں کو پا سکتا ہے۔
بھری ہوئی کشتی سے مراد شاید کشتی نوح ہو جس نے اولاد آدم کو اٹھایا اور اس کے بعد اللہ نے ان کے لیے ایسی ہی دوسری کشتیاں پیدائیں جو انسانوں کو اٹھا کر چلتی ہیں اور ان دونوں کو اللہ کے ان قوانین قدرت نے چلایا جو اس نے اس کائنات میں ودیعت کیے کہ کشتی پانیوں کی سطح پر تھر رہی ہے۔ سیارے آسمانوں کی فضاؤں میں تھر رہے ہیں اور لکڑی پانی اور ہوا، بخارات یا ایسی قوت پیدا کی جس کی وجہ سے یہ بڑے بڑے جہاز چلتے ہیں۔ یہ سب امور تقدیر الہی کے مطابق ہیں۔

وَإِنْ نَشَأْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُونَ (۴۳:۳۶) إِلَّا رَحْمَةً مِنَّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ

حِينَ (۴۴:۳۶) ”ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں، کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو اور کسی طرح یہ نہ بچائے جاسکیں۔ بس ہماری رحمت ہی ہے جو انہیں پار لگاتی اور ایک وقت خاص تک زندگی سے متمتع ہونے کا موقعہ دیتی ہے۔“
گمرے سمندروں میں کشتی کی حیثیت وہی ہوتی ہے جس طرح طوفان میں ایک پرکی ہوتی ہے۔ جس قدر بھی کشتی بھاری اور بڑی ہو اور چاہے وہ بہت ہی اعلیٰ سائنسی اصولوں کے مطابق بنی ہو۔ اگر ان کشتیوں کے ساتھ اللہ کی رحمت اور شفقت نہ

ہو تو وہ رات یاد ان کے کسی بھی لمحے میں بیاہ ہو جائیں۔ وہ لوگ جسوں نے سمندروں کا سفر کیا ہے، چاہے یہ سفر چھوٹے بحرے میں ہوا ہو یا بڑے، بحری جہاز میں..... وہ سمندر کی ہولناکی کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سمندر کی طاقتور لہروں کے مقابلے میں انسانی بچاؤ کی تدبیر کس قدر معمولی ہوتی ہیں۔ اس لیے ایسے لوگ اللہ کی رحمت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم کائنات میں عالم طبیعت کے طوفانوں اور انقلابات کے مقابلے میں صرف اللہ کی رحمت ہے جس نے سرکش طبیعی قوتوں کی ناکام تھم رکھی ہے۔ زمین و آسمان میں اللہ کے دست قدرت کے سوا اور کوئی خمیس ہے جس نے سب چیزوں کو تھم رکھا ہے۔ یہیں تک کہ قیام قیامت کا وقت آپہنچے جس طرح اللہ حکیم و خیر نے اس کے لیے وقت مقرر کیا ہے۔

وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ (۳۶: ۴۴) ”پھر وقت خاص تک متمتع ہونے کا موقعہ دیتی ہے۔“

--- (۱) (۱) (۱) ---

لیکن ان واضح ترین نشانیوں کے باوجود لوگ غفلت کی نیند میں سوئے ہوئے ہیں۔ ان کی نظر ان نشانیوں پر نہیں پڑتی۔ اور ان کے دل بیدار نہیں ہوتے اور وہ انکار اور تمسخرانہ انداز کو نہیں چھوڑتے۔ اور بس انہوں نے یہی رٹ لگا رکھی ہے کہ جسی مذہب سے تم ہمیں ڈراتے ہو بس اسے لے ہی آؤ۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۵۷﴾ وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿۵۸﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمْ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ نَطْعَمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿۵۹﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۶۰﴾

”ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ بچو اس انجام سے جو تمہارے آگے آرہا ہے اور تمہارے پیچھے گزر چکا ہے، شاید کہ تم پر رحم کیا جائے (تو یہ سنی ان سنی کر جاتے ہیں)۔ ان کے سامنے ان کے رب کی آیت میں سے جو آیت بھی آتی ہے، یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہیں عطا کیا ہے، اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کر دو تو یہ لوگ جسوں نے کفر کیا ہے ایمان لائے والوں کو جواب دیتے ہیں ”کیا ہم ان کو کلامیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟ تم تو بالکل ہی بسک گئے ہو“۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ”یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟“

یہ نشانیاں بھی ان کے دل و دماغ میں تجسس، اندہر اور احساسِ خدا خونی پیدا نہیں کرتیں۔ حالانکہ اگر کسی انسان کا دل کھلا ہو تو یہ نشانیاں اس کے اندر حرکت پیدا کرتی ہیں، اسے الجھوڑتی ہیں اور اسے پر جوش رویہ اختیار کرنے پر آمادہ

رتی ہیں۔ اور یہ نشانیاں اس قابل ہیں کہ انسان کو اس کائنات کے ساتھ ملا دیں۔ وہ کائنات جو ایک کھلی کتاب ہے اور اس کا ہر آیت صفحہ خالق کی عظمت کا کھلا ثبوت ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تدبیر بہت گہری اور اس کے انداز بہت ہی درست ہوتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ جن کی فطرت اور بصیرت مسخ ہو چکی ہے۔ وہ ان نشانیوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ اور اگر وہ ان کو دیکھ بھی لیں 'ان پر رحم'۔ پس کرتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی عظیم رمتوں کی وجہ سے پھر بھی ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ نہیں دیتا۔ اللہ پھر بھی اس کے پاس رسول بھیجتا ہے 'جو ان کو ڈراتا ہے۔ اور ان کو اس ۵۔ ت کے خالق کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ اب وہ خود میں لانے والا ایک قادر مطلق ہے۔ یہ رسول ان کو ڈراتا ہے 'ان سے۔ میں خوف اور تقویٰ پیدا کرتا ہے۔ اور ان کو اللہ کے غضب اور ان کو عذاب الہی کے اسباب فراہم کرنے سے ڈراتا ہے۔ کیونکہ اللہ کے عذاب نے تو ان کو احاطہ میں لیا ہوا ہے۔ ان کے آگے اور پیچھے عذاب الہی موجود ہے۔ اُپر یہ لوگ غماظ نہ رہے تو کسی بھی وقت اللہ کے عذاب میں پڑ سکتے ہیں اور ان کے قدم پھسل سکتے ہیں۔ پھر ان تکوینی نشانیوں کے علاوہ دوسری نشانیاں اور معجزات بھی اللہ پہ درپے ان کے لیے بھیجتا ہے لیکن وہ توجہ نہیں کرتے اور اپنی روش پر آگے ہی بڑھ رہے ہیں لاپرواہ ہو کر۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّقُوا مَا بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۴۵:۳۶)

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ (۴۶:۳۶) ”ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ بچو اس انجام سے جو تمہارے آگے آرہا ہے اور تمہارے پیچھے گزر چکا ہے شاید کہ تم پر رحم کیا جائے (تو یہ سنی ان سنی کر جاتے ہیں)۔ ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔“

اور اگر ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنی دولت میں سے کچھ فقراء پر بھی خرچ کرو تو وہ مزاح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

أَطِيعُوا مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطِيعُوهُ إِنَّ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (۴۷:۳۶) ”کیا ہم ان کو کھلائیں جسیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلاتا؟ تم تو بالکل ہی بسک گئے ہو۔“ مزاح کے علاوہ یہ لوگ ان لوگوں پر گمراہی کا الزام لگاتے جو ان کو دعوت انفاق دیتے ہیں۔

ان لوگوں کے اس انداز گفتگو سے یہی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ انسانوں کی زندگی میں جاری دساری سنسنی الہیہ سے بالکل سہمے ہوئے ہیں۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ ہی سب کو کھلاتا ہے۔ اللہ ہی سب کا رازق ہے۔ زمین میں بندوں کے پاس ۱۰ دست اور جو رزق ہے وہ اللہ ہی کا تخلیق کردہ ہے۔ انسانوں نے خود تو اپنے لیے کچھ پیدا کیا ہی نہیں اور نہ وہ کسی آیت کی تخلیق پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن اللہ کی مشیت یہ ہے کہ اس زمین کو انسان آباد کریں۔ اس لیے اللہ نے لوگوں کو ضروریات کا محتاج کیا۔ یہ ضروریات لوگوں کو صرف ان کی جہد اور سعی سے مل سکتی ہیں۔ زمین کے اندر زراعت کا انتظام صنعتوں کا انتظام پھر زمین کے خزانوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کا انتظام۔ پھر ان اشیاء کی

سیلابی اور خرید و فروخت مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے۔ یہ سب انتظامات اللہ نے کیے۔ پھر لوگ اپنی قابلیت اور صلاحیت کے اعتبار سے مختلف اور متفاوت ہیں اور اللہ اپنی مشیت کے مطابق مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں دیں اور یہ اس لیے تاکہ انسان مل کر خلافت ارضی کے فرائض سرانجام دیں۔ انسان کی صلاحیتوں کے اندر تفاوت صرف مال اور دولت جمع کرنے ہی میں نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات انسان دو سری ضروریات میں مصروف ہوتے ہیں اور یہ دوسرے میدان بھی خلاف ارضی کا تقاضا ہوتے ہیں۔ اس لیے بعض انسان مال دولت جمع کرنے کے کام کے لیے فانی نہیں ہوتے اور مایہ ناز سے محتاج ہوتے ہیں۔

ایک طرف انسان کے منصب خلافت ارضی کے وسیع تقاضے ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اور ان صلاحیتوں کے مطابق پھر انسانوں کے درمیان ضروریات اور منافع کا لین دین ہوتا ہے۔ لوگوں کے درمیان مقابلہ اور حصہ رسانی کا تعین ہوتا ہے۔ یہ ایک وسیع معاشی نظام ہے جس کی بے تدریجیوں ہیں اور ہر کڑی دوسری سے ملی ہوئی ہے بلکہ اس کا تعلق نسلوں سے بھی ہے۔ یعنی نسلاً بعد نسل ایسے اسباب ہوتے ہیں جو لوگوں کی معاشی جدوجہد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ غرض معاشیات کے میدان میں مختلف اور متنوع اسباب کی مدد سے۔ لوگوں کے درمیان دولت اور ان کے رزق میں تفاوت رکھی۔ یہ تفاوت اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو اس لیے رحمتی ہے کہ انسان خلافت ارضی کے منصب کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس زمین کی تعمیر و ترقی میں کوشاں رہے لیکن اس تفاوت کو حد اعتدال میں رکھنے کے لیے اسلام نے بعض انفرادی محرومیوں کا سد او ابھی کیا ہے۔ وہ یہ کہ اہل ثروت پر لازم ہے کہ وہ اپنی دولت کا ایک حصہ فقراء اور محرومین کے لیے نکالیں۔ اور معاشرے کے اندر کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ رہے جو بنیادی معاشی ضروریات سے محروم ہو۔ ان انتظامات کی وجہ سے اغنیاء اور فقراء کی اخلاقی اور نفسیاتی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اس اتفاق کے لیے اسلام زکوٰۃ لیتا ہے اور زکوٰۃ کے لغوی مفہوم میں صہارت کے معنی شامل ہیں۔ گویا یہ اتفاق طہارت مال بھی ہے اور عبادت بھی۔ اور اس کے ذریعے اللہ نے فقراء اور اغنیاء کے درمیان محبت اور دوستی کا رشتہ بھی استوار کر دیا ہے

لہذا ان لوگوں کا جو حکمت خداوندی کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے: یکہنا۔

اَنْطَعُمْ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ اَطَعَمَهُ (۴۷:۳۶) ”کیا ہم ان کو کھلائیں جسیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟“ اور اس پر مزید پھر ان کی جانب سے اتفاق کی دعوت دینے والوں پر یہ الزام

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۴۷:۳۶) ”تم تو بالکل ہی بک گئے ہو“۔ دراصل حقیقی گمراہی ہے۔ اور یہ لوگ اس کائنات میں جاری سنسنی جہیہ سے بے خبر ہیں۔ اور یہ لوگ اس جہاں میں زندگی کی حقیقی چمن اور اس کے متنوع معاشی اسباب سے بھی بے خبر ہیں۔ پھر اس جہاں میں اللہ نے جن متضاد کی خاطر لوگوں کو متنوع صلاحیتیں دی ہیں اور جن کے نتیجے میں لوگ مختلف کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے پھر سامان زیست کا تبادلہ ہوتا ہے اور دنیا کا معاشی نظام چل رہا ہے۔ یہ لوگ اس سے بھی واقف نہیں ہیں۔

اسلام ایک ایسا نظام معیشت وضع کرتا ہے جس کے اندر تمام لوگوں کو کام کرنے کے آزادانہ مواقع حاصل ہوتے

ہیں۔ اس کے بعد اسلامی نظام تمام لوگوں کے مختلف قسم کے کام کرنے کے آزادانہ مواقع فراہم بھی کرتا ہے۔ اور لوگ اس طرح پاک اور صاف زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کے بعد اپنے عملی اقدامات سے معاشی و مالی اربوں کے حل کے لیے خصوصی اقدامات بھی کرتے ہیں۔

سب — آخر میں بات اس ہے کہ اس طباق پر ہوتی ہے۔ جو انہیں بعث بعد الموت کے سلسلے میں تھا۔ اور جس کی وجہ سے وہ اس قسم کا عقیدہ و رشتہ دہانوں کا مذاق اڑاتے تھے۔

وَيَقُولُونَ مَسَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ ۖ إِنَّ كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۶: ۸۹) ”یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ مگر تم سچے ہو۔“

اللہ نے قیامت کے واقع ہونے کے لیے جو وقت مقرر کر رکھا ہے وہ انہوں کی جلد بازی یا مطالبے کی وجہ سے وقت سے پہلے نہیں آسکتا۔ اور اگر لوگ یہ امید کریں کہ وہ اپنے مقررہ وقت سے ذرا دیر کر کے واقع ہو گا تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک ہر شے ایک مقدار کے مطابق ہے۔ اور ہر واقعہ اپنے مقررہ وقت پر ہوتا ہے۔ تمام واقعات اپنے وقت پر ہوتے ہیں جس طرح اللہ نے ان کے بارے میں فیصلہ ازل میں کر رکھا ہے اور اپنی حکمت کے مطابق کر رکھا ہے۔ اس دنیا کا ہر واقعہ اپنے وقت پر نظام قضا و قدر کے مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے۔

ان لوگوں کے ان سوالات اور شبہات کا جواب کیا ہے تو وہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی صورت میں دیا گیا ہے۔ اس منظر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جب قیامت ہوگی تو اس کی کیفیت یہ ہوگی۔ رہیں یہ بات کہ یہ کب ہوگی تو اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

۳ مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ ﴿۸۸﴾
 ۱۸ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ﴿۸۹﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ
 ۲ فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ ﴿۹۰﴾ قَالُوا يَوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدٍ نَاهٍ هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ﴿۹۱﴾ إِنَّ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿۹۲﴾

”در اصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں اس حالت میں دھرلے گا جب یہ (اپنے دنیوی معاملات میں) جھگڑ رہے ہوں گے اور اس وقت یہ وصیت تک نہ کر سکیں گے نہ اپنے گھروں کو لوٹ سکیں گے۔ پھر ایک صور پھونکا جائے گا اور یکایک یہ اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنی اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے۔ گھبرا کر کہیں گے، ”اے یہ کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اٹھا کھڑا کیا؟“۔۔۔ ”یہ وہی چیز ہے جس کا خدا نے رحمن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچی تھی“۔ ایک ہی زور کی آواز ہوگی اور سب کے سب ہمارے سامنے

حاضر کر دیئے جائیں گے۔“

جھٹلانے والوں کا سوال یہ تھا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۶: ۴۸) ”یہ قیامت کی دھمکی کب پوری ہوگی؟ تاؤ اگر تم سچے ہو۔“ لہذا ان کا جواب اس منظر کی شکل میں دیا گیا۔

مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ (۳۶: ۴۹) فَلَا

يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ (۳۶: ۵۰) ”در اصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں عین اس حالت میں دمر لے گا جب یہ جھگڑ رہے ہوں گے اور اس وقت یہ وصیت تک نہ کر سکیں گے اور نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے۔“ قیامت اچانک لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لے گی۔ اس وقت وہ اپنے دنیاوی جھگڑوں یا مذہبی مباحثوں میں مصروف ہوں گے اور ان کو وقوع قیامت کی امید ہی نہ ہوگی۔ اور نہ وہ اسے کچھ اہمیت دیں گے۔ لیکن وہ اچانک واقع ہو جائے گی۔ ہر شخص اسی حال میں گرفتار ہو گا۔ جس پر وہ اس وقت ہو گا۔ کسی کو آنے والوں کے بارے میں نہ وصیت کے مواقع ہوں گے۔ اور نہ ان کو اس قدر سہولت ہوگی کہ وہ گھر تک چلا جائے اور گھر والوں سے کچھ کہہ دے۔ اور وہ ہوں گے کہاں؟ کیونکہ گھر والے بھی جہاں ہوں گے اسی قیامت کی گرفت میں ہوں گے۔

اور اس کے بعد صور پھونکا جائے گا۔ ہر شخص اپنی قبر سے اٹھے گا اور جلدی سے دوڑ پڑے گا۔ یہ انتہائی درجے میں اہمیت زدہ اور دہشت زدہ ہو گا۔ ہر شخص دوسرے سے پوچھے گا۔

مَنْ بَعَثْنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (۳۶: ۵۲) ”ارے یہ کس نے ہماری خوابگاہ سے ہمیں اٹھا کر کھڑا کیا؟“ قدرے وقفے کے بعد اب دہشت ختم ہوگی تو اصل حقیقت ان کو معلوم ہو جائے گی۔

هَذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ (۳۶: ۵۲) ”یہ وہی چیز ہے جس کا خدا نے رحمن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچی تھی۔“

پوراب آخری آواز ہوگی۔ ایک پکار اور یہ تمام ٹکڑے ہوئے پریشان اور حیران لوگ اللہ کے حضور حاضر ہوں گے۔

فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ (۳۶: ۵۳) ”اور اچانک سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے۔“ اور سب کے سب صفوں کی صورت میں منظم کر دیئے جائیں گے اور یہ پیش چشمِ زدن میں ہوگی اور عدل کے بازگشت کی طرح ہوگی اور اس موقعہ محل پر اللہ کا یہ فیصلہ سنایا جائے گا اور سلطان ہو گا کہ جزام و سزائیں کسی کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

”آج کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا اور نہیں دیسائی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے رہے تھے۔“
یوں نہایت تیزی کے ساتھ تین مناظر کی جھلک دکھائی جاتی ہے اور ان لوگوں کے شکوک اور غیبات کا رد کر دیا جاتا ہے جو خواہ مخواہ وقوع قیامت میں شک کرتے ہیں اور نہایت ہی ترتیب کے ساتھ۔
اب یہاں اہل ایمان کے ساتھ حساب و کتاب کا حال بھی چند لمحوں میں لیٹ لیا جاتا ہے اور ان کا انجام بھی تیزی کے ساتھ دکھا دیا جاتا ہے۔

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغْلٍ فَاكِهِونَ ﴿٥٦﴾ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ
فِي ظِلٍّ عَلَى الْأَرَايِكِ مُتَكِئُونَ ﴿٥٧﴾ لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَلَهُمْ مَّا يَدْعُونَ ﴿٥٨﴾
سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِيمٍ ﴿٥٩﴾

”آج جنتی لوگ مزے کرنے میں مشغول ہیں۔ وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں ہیں۔ مسندوں پر نیکیے لگائے ہوئے، ہر قسم کی لذیذ چیزیں کھانے پینے کو ان کے لیے وہاں موجود ہیں، جو کچھ وہ طلب کریں ان کے لیے حاضر ہے، رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے۔“
یہ عیش و عشرت میں مشغول ہوں گے، ان پر اللہ کے انعامات کی بارش ہوگی اور نہایت ہی خوشگوار چھاؤں میں بیٹھے ہوں گے۔ آمنے سامنے تختوں پر نیکیے لگائے ہوئے ہوں گے اور وہ جنت کے مالک ہوں گے اور ان کا یہ حق ہو گا کہ جو چاہیں گے، میا ہو گا۔ اور ان لذائذ کے اوپر مزید ان کے لعل خانہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اور ان کی تکریم ہوگی کہ خود اللہ تعالیٰ ان کے نام سلام بھیجے گا۔ یہ رب کریم کی طرف سے ان کا اعزاز ہو گا۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِيمٍ (۵۸:۳۶) ”رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے۔“۔ رہے کفار تو ان کے ساتھ حساب و کتاب یہاں نہیں دکھایا گیا بلکہ یہاں محض سرزنش اور تہزکی اور ملامت کر دی جاتی ہے۔

وَأَمَّا أَزْوَاجُ الْمُنَافِقِينَ فَيُؤْتَوْنَ مَا ظَنُّوا أَنَّهُم مُّسْتَقِيمُونَ ﴿٦٠﴾ وَالْمُتَكَبِّرُونَ وَلَئِنَّكَ فَتَكُونُ زَجْرًا ﴿٦١﴾ وَلَئِنَّكَ فَتَكُونُ زَجْرًا ﴿٦٢﴾ وَلَئِنَّكَ فَتَكُونُ زَجْرًا ﴿٦٣﴾ وَلَئِنَّكَ فَتَكُونُ زَجْرًا ﴿٦٤﴾

”اور اے مجرمو! آج تم بھٹ کر الگ ہو جاؤ۔ آدم کے بچہ کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور میری ہی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے؟ مگر اس کے باوجود اس نے تم میں سے ایک گروہ

کثیر کو گمراہ کر دیا۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے؟ یہ وہی جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا تھا جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو اس کی پاداش میں اب اس کا ایہد من ہو۔

ان لوگوں کی تواضع حقارت اور توہین سے کی جائے گی۔

وَ امْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (۵۹:۳۶) ”اور اے مجرمو! آج تم چٹ کر الگ ہو جاؤ۔“ تم کل ایمان سے دور ہو کر الگ ہو جاؤ۔

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يٰبْنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ

(۶۰:۳۶) ”آدم کے بچو! کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“ ”آدم کے بچو!“ کے الفاظ سے پکار کر ان کو شرمندہ کیا گیا ہے اس لیے کہ شیطان نے ان کے باپ کو جنت سے نکالا تھا اس کے باوجود تم اس کی بندگی کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

وَأَنْ اَعْبُدُونِي هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ (۶۱:۳۶) ”میری بندگی کرو! یہ سیدھا راستہ ہے۔“ یہ راستہ مجھ تک پہنچانے والا ہے اور اس پر چلنے سے میری رضامندی حاصل ہوتی ہے تم اس دشمن سے نہ ڈرے جس نے تمہاری نسلوں اور گروہوں کو گمراہ کر دیا۔

أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ (۶۲:۳۶) ”کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے۔“

اور اس موقع پر ان کو دی جانے والی سزائیں سنائی جاتی ہیں جو نہایت ہی دردناک ہے۔ اور یہ فیصلہ بھی سختی اور سرزنش کے انداز میں سنایا جاتا ہے۔

هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ (۶۳:۳۶) اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ

(۶۴:۳۶) ”یہ وہی جہنم ہے جس نے تم کو ڈرایا جاتا رہا تھا، جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو اس کی پاداش میں اب اس کا ایہد من ہو۔“

یہ پیشی یہاں ختم نہیں ہو جاتی اور اس کی بساط کو لپیٹ نہیں لیا جاتا بلکہ اس موضوع پر بات چیت جاری ہے اور ایک نیا منظر ہمارے سامنے آتا ہے۔

الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ

أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۷۵﴾

”آج ہم ان کے منہ بند کیے دیتے ہیں ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دنیا

میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں۔“

یوں وہ ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہیں۔ ان پر خود ان کے اعضاء شہادت دے رہے ہیں خود ان کی اپنی شخصیت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے اور ان کی ذات کے حصے ایک دوسرے کے خلاف گواہ ہوں گے اور انسان کا ہر عضو اپنے رب کے سامنے انفرادی طور پر ذمہ دار ہو گا۔ اور اللہ کے سامنے ہر عضو اقرار گناہ کرے گا اور سر تسلیم خم کرے گا۔ یہ نہایت ہیبت ناک اور خوفناک منظر ہے۔ انسان اس منظر کے بارے میں سوچتے ہی کانپ اٹھتا ہے۔

--- ۵۵۵ ---

یہ منظر یوں اختتام پذیر ہوتا ہے کہ ان کی زبانیں بند ہیں اور ان کے ہاتھ بات چیت کر رہے ہیں۔ ان کے پاؤں شہادت دے رہے ہیں، حالانکہ انہیں اپنے ہاتھ پاؤں سے یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ ان کے ساتھ اس کے سوا کوئی اور سلوک کرتا اور انہیں جو سزا چاہتا، دیتا اور ان پر جو مصیبت چاہتا، آتا۔ یہاں اللہ دو سری سزاؤں کے دو نمونے بھی دیتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو یوں ہوتا۔

وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلَىٰ أَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَأَنَّى

يُبْصِرُونَ ﴿٣٦﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَمَسَخْنَاهُمْ عَلَىٰ مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوا مُضِيًّا

ع ۱۷ وَلَا يَرْجِعُونَ ﴿٣٧﴾

۳

”ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں موند دس، پھر یہ راستے کی طرف لپک کر دیکھیں، کہاں سے انہیں راستہ بھٹائی دے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں ان کی جگہ ہی پر اس طرح مسخ کر کے رکھ دس کہ یہ نہ آگے چل سکیں نہ پیچھے پلٹ سکیں۔“
یہ دو مناظر ہیں ان میں عذاب اور سزا بھی ہے اور تحقیر اور مزاح بھی ہے۔ تحقیر ان لوگوں کی ہے جو دعوت اسلامی کی تکذیب کرتے ہیں اور مزاح ان لوگوں کا ہے جو دین اسلام کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں۔ جو یہ کہتے تھے۔

مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۶: ۴۸) ”یہ وعدہ کب پورا ہو گا اگر تم سچے ہو۔“

چنانچہ پہلے منظر میں ان کو ان کی شکل بگاڑ کر ان کو اندھا کر دیا گیا ہے۔ اندھوں کے درمیان ایک دوسرے کے درمیان آگے بڑھنے کا مقابلہ ہے۔ وہ راستے کو عبور کر کے ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ لیکن ان کو اندھوں کی طرح براہ نہیں سو جھتی۔ اور وہ گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ سیدھی راہ دیکھ سکیں۔

فَاَنۢى يُبۡصِرُوۡنَ (۳۶: ۶۶) ”کہاں سے انہیں راستہ بھٹائی دے گا۔“

اور دوسرے منظر میں انہیں یوں دکھایا گیا ہے کہ چلتے چلتے وہ اپنی جگہ جم گئے۔ بت بن گئے جو نہ آگے جاسکتے ہیں اور نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ حالانکہ ابھی یہ لوگ اندھے تھے اور ادھر ادھر ٹانگ ٹوٹیاں مار رہے تھے۔

ان دو مناظر میں وہ کھلونے نظر آتے ہیں، ایسے کھلونے جنہیں دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ یہ وہی لوگ تھے جو

قیامت کے وقوع کے بارے میں حراج کرتے تھے اور اسے اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔

--- ۵۵۵ ---

یہ حالت تو ان کی اس وقت ہوگی جب قیامت واقع ہو جائے گی جس کے بارے میں انہیں بہت جلدی ہے لیکن اگر انہیں زمین پر صلت دے دی گئی اور انہوں نے اس میں خوب ترقی کی اور ات ترقی دی اور قیام قیامت تک اللہ کے منصوبے کے مطابق یہاں زندہ رہے تو بھی یہ لوگ ایک ایسی ناپسندیدہ حالت تک پہنچ جائیں گے جس کے اندر زندگی گزارنے کے بجائے وہ جلدی مرنا زیادہ پسند کرس گے۔ یہ لوگ ایسے ناتواں اور بوڑھے ہو جائیں گے اور ان کی دسمانی اور دماغی قوتیں اس قدر مضحل ہو جائیں گی کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آئے گی۔

وَمَنْ تُحِبُّهُ نُفْسُهُ فِي الْخَلْقِ أَفْلا يَعْقِلُونَ ﴿۱۸﴾

”جس شخص کو ہم پسند دیتے ہیں اس کی ساخت کو ہم الٹ ہی دیتے ہیں کیا (یہ حالات دیکھ کر) انہیں عقل نہیں آتی؟“۔ جب انسان بہت بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ دوبارہ الٹ کر طفل ناتواں بن جاتا ہے۔ لیکن اس میں بچوں جیسی محبوبیت اور کشش نہیں ہوتی۔ یوں بوڑھے لوگ پیچھے کی طرف چلنے رہتے ہیں۔ ان کے پاس جو علم تھا، اسے بھولتے جاتے ہیں۔ ان کے اعصاب کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی فکر مضحل ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا ان کی قوت برداشت ختم ہوتی جاتی ہے۔ ایک دلت ایسا آتا ہے کہ ایسا انسان خالص بچہ ہو جاتا ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ بچہ اگر توہلی زبان بھی بولتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں۔ وہ اگر کوئی حماقت کرتا ہے تو بھی دیکھنے والے خوش ہوتے ہیں۔ لیکن بوڑھا تو کبیدہ خاطر ہوتا ہے۔ اس کی حماقتوں کو محض رحم اور احترام ہی سے برداشت کیا جاسکتا ہے۔ اور انہوں نے ان کی قوتیں مضحل ہوتی ہیں اور اس سے حماقتیں سرزد ہوتی ہیں۔ لوگ اس کے ساتھ حراج کرتے ہیں۔ جو وہ ناتواں ہو، ہے۔ اس کی کمرٹیز می ہوتی ہے وہ پیچھے ہٹتا ہے اور ہٹتا چلا جاتا ہے۔

دونوں صورتوں میں یہ برا انجام ہے جو دعوت اسلامی کو جھٹلانے والوں کے انتظار میں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ان کے اعمال کی مدد سے اللہ نے رشد و ہدایت سے محروم کر دیا ہے اور ایمان کی وجہ سے ان کو جو اعزاز ملنے والا تھا، اس سے وہ بے بہرہ رہ گئے۔

--- ۵۵۵ ---

درس نمبر ۲۰ تشریح آیات

۶۹ --- تا --- ۸۳

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے اور اس میں ان تمام مسائل کو لیا گیا ہے جو اس سورت کا محور ہیں۔ وحی کا مسئلہ، وحی کی ماہیت، مسئلہ الوہیت اور وحدانیت الہی۔ بعث بعد الموت اور حشر و نشر۔ اس سبق میں یہ تمام مسائل علیحدہ علیحدہ کیے بعد دیگرے بیان کیے گئے ہیں، نہایت ہی موثر اور زور دار انداز میں۔ تمام موضوعات میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہر چیز کی صنعت میں دست قدرت کار فرما ہے اور اس کائنات کی کھجیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ مضمون اس سبق اور اس سورت کی آخری آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

فَسُبِّحْنَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۸۳:۳۶) ”پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا عمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔“ یہ دست قدرت اور اس کی صنعت کاریاں ہیں کہ اس نے جانوروں کو بشر کے لیے پیدا کیا اور ان کے تابع فرمان کر دیا۔ جس نے انسان کو ایک حقیر نطفے سے پیدا کیا اور جس طرح ایک نہایت ہی چھوٹے نطفے سے اسے پیدا کیا۔ اسی طرح بوسیدہ ہڈیوں سے اسے دوبارہ پیدا کر دے گا۔ جس نے سرسبز درخت سے آگ پیدا کی۔ جس نے زمین و آسمان جیسی عظیم کائنات پیدا کی۔ اور جو اس جہاں کی ہر چیز کا مالک اور مقتدر اعلیٰ ہے۔ یہ ہے اس سورت کا خلاصہ۔

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ

مُبِينٌ ۚ لِّيُنْذِرَ مَنِ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝

”ہم نے اس (نبیؐ) کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے۔ یہ تو ایک فصیحیت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب، تاکہ وہ ہر اس شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت قائم ہو جائے۔ وحی کے موضوع پر سورت کے آغاز ہی میں بحث ہوئی تھی۔

یٰس (۱:۳۶) وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ (۲:۳۶) إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (۳:۳۶) عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۴:۳۶) تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ (۵:۳۶) لِيُنْذِرَ قَوْمًا مَّا أُنْذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُونَ (۶:۳۶) ”یس، قسم

ہے قرآن حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو اور یہ قرآن غالب اور حکیم ہستی کا نازل کردہ ہے تاکہ تم خبردار کرو ایک ہی قوم کو جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔ یہاں وحی کا ذکر اس مضمون اور مناسبت سے آتا ہے کہ یہ وحی الہی ہے، شاعری نہیں ہے۔ کیونکہ بعض لوگ آپ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ شاعر ہیں اور قرآن کریم ایک مخصوص قسم کا شعری کلام ہے۔ دراصل کبرئے قریش جانتے تھے کہ معاملہ یہ نہیں ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام لائے ہیں وہ عربوں کے اسایب شعر کے مطابق نہ شعر ہے اور نہ ان کی ترکی طرح نثر ہے۔ یہ الزام دراصل اسلام کے خلاف ان کی جانب سے پروپیگنڈے کی جنگ تھی۔ اور عوام الناس کو گمراہ کرنے کے لیے قرآن اور حضور پر یہ الزام تھا۔ ہاں یہ لوگ قرآن کریم کے حسن و جمال اور انوکھے اور موثر اسلوب کلام سے یہ استدلال کرتے تھے۔ اس طرح عوام الناس اشعار اور قرآن میں فرق نہ کر سکتے تھے اور اس لیے وہ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوتے تھے۔

یہاں اللہ اس بات کی تردید فرماتا ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعری سکھائی ہے جب اللہ نے آپ کو شعر کا علم نہیں سکھایا تو آپ کو شعر کا علم ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان وحی جانتا ہے جو اللہ اسے سکھاتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس حقیقت سے بھی نقاب کشائی کرتا ہے کہ شعر کہنا آپ کے شایان شان ہی نہیں ہے۔ (وَمَا يَنْبَغِي لَهُ) کیونکہ شاعری کا منہاج نبوت کے منہاج سے ہمت ہی مختلف ہوتا ہے۔ شعر ایک تاثر ہوتا ہے اور تاثرات کا بیان ہوتا ہے۔ اور انسانی تاثرات مختلف حالات میں بدلتے رہتے ہیں جبکہ نبوت کا منہاج وحی پر مبنی ہوتا ہے اور مستقل ہوتا ہے۔ اور نبی ایک سیدھے راستے پر ہوتا ہے۔ اور اس ناموس الہی کے تابع ہوتا ہے جس کے مطابق یہ پوری کائنات رواں دواں ہوتی ہے۔ اور یہ ناموس بدلتی ہوئی خواہشات اور بدلتے ہوئے تاثرات کے مطابق نہیں بدلتا۔ جس طرح شعر بدلتے رہتے ہیں اور ہر حال میں شعر میں ایک نظریہ نہیں پایا جاتا۔

نبوت میں تو نبی براہ راست ہر وقت اللہ سے مربوط ہوتا ہے اور وہ براہ راست اللہ کی وحی سے ہدایت لیتا ہے اور اس کی جدوجہد دائمی انداز لے ہوئے ہوتی ہے کہ زندگی کا نظام اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق چلے۔ جبکہ شعر اپنے اعلیٰ معیار کے ساتھ محض انسانی خواہشات اور جمال و کمال کے تاثرات پر مشتمل ہوتا ہے۔ انسان میں انسانی سوچ کی تقصیرات اور کمزوریاں موجود ہوتی ہیں۔ اور وہ انسان کے محدود تصورات کا عکس ہوتا ہے اور انسان کی محدود صلاحیت اور علم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ شعر جب اپنے اعلیٰ مقام سے گر جاتا ہے تو یہ محض جسمانی لذت اور طبعی خواہشات اور جنسی لذت تک گر کر محدود ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر وہ جسمانی بخار کا نام ہوتا ہے۔ لہذا نبوت اور شاعری اپنی نوعیت اور ماہیت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ شعر اگر اعلیٰ درجے کا بھی ہو وہ ان خواہشات پر مشتمل ہوتا ہے جو زمین سے اٹھتی ہیں اور نبوت آسمانوں سے ایک ہدایت کی شکل میں نازل ہوتی ہے۔

انْ هُوَ اَلَا ذِكْرٌ وَّ قُرْآنٌ مُّبِينٌ (۳۶: ۶۹) ”یہ تو ایک فصیحیت ہے اور صاف پڑھے جانے والی کتاب ہے۔“ ذکر اور قرآن دونوں ایک ہی چیز کی صفات ہیں۔ ذکر اس معنی میں ہے کہ اس کتاب کا اصل مقصد ہی فصیحیت ہے اور قرآن اس حساب سے ہے کہ اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہ گویا اللہ کی یاد ہے اور دل اس میں مشغول

ہوتا ہے اور قرآن ہے جس کی تلاوت زبان سے ہوتی ہے اور اسے نازل اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ اپنا متعین مقصد پورا کرے۔

لَيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقُّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ (۷۰: ۳۶) ”تاکہ وہ ہر اس شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت تمام ہو جائے۔“ قرآن نے کفر اور حیات کو بالقابل رکھا ہے۔ گویا کفر موت کے ہم معنی ہے۔ اور جس شخص کے دل میں ایمان کی استعداد ہو وہ زندہ ہے اور قرآن کا مقصد یہ ہے کہ وہ رسول اللہؐ پر اس لیے نازل ہوا ہے تاکہ آپ اس کے ذریعے ان لوگوں کو آرائیں جو زندہ ہوں جن لوگوں کے اندر زندگی کی رمت ہو وہ مرنے گئے ہوں تاکہ ڈرانے کا انہیں فائدہ ہو۔ رہے کفار تو وہ مردے ہوتے ہیں۔ ان کو ڈرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ نیز ڈرانے کا فریضہ اس لیے عائد کیا گیا ہے تاکہ وہ عذاب کے مستحق ہو جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی کو سزا نہیں دیتا جب تک اس تک اللہ کا پیغام پہنچ نہ جائے اور پھر وہ کفر نہ کر دے۔ اور پھر اگر اللہ انہیں ہلاک کر دے تو وہ بلا حجت اور بغیر سبب کے ہلاک نہ کیا جائے۔

یوں لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کے حوالے سے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک فرق وہ ہے جو اسے قبول کرتا ہے تو وہ زندہ ہے اور ایک وہ ہے جو قبول نہیں کرتا تو وہ مردہ ہے۔ اور اس فرق کو معلوم ہو جائے کہ اس کے خلاف فیصلہ برحق ہو اور وہ سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔

--- ۰۰۰ ---

اس سبق کے دوسرے ٹکڑے میں الوہیت اور وحدانیت کا مضمون بیان ہوا ہے۔ الوہیت اور وحدانیت کا یہ بیان لوگوں کے مشاہدات کے فریم ورک میں ہے کہ ذرا دیکھو کہ اللہ کے ان پر کس قدر انعامات ہیں جنہیں وہ استعمال کر رہے ہیں لیکن اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِنَّا عَمِلَتْ أَيْدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِكُونَ ﴿۱﴾ وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ ﴿۲﴾ وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿۳﴾ وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لَّهُمْ يَبْصُرُونَ ﴿۴﴾ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَلَا هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُونَ ﴿۵﴾ فَلَا يَحْزَنكَ قَوْلُهُمْ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۶﴾

”کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے ہیں اور اب یہ ان کے مالک ہیں۔ ہم نے انہیں اس طرح ان کے بس میں کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی پر یہ سوار ہوتے ہیں کسی کا یہ گوشت کھاتے ہیں اور ان کے اندر ان کے لیے طرح طرح کے فوائد اور مشروبات ہیں۔ پھر کیا یہ شکر گزار نہیں

ہوتے؟ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنا لیے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ لائے ان کے لیے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں۔ اچھا، جو باتیں یہ بنا رہے ہیں، وہ تمہیں رنجیدہ نہ کریں، ان کی چھٹی اور کھلی سب باتوں کو ہم جانتے ہیں۔“

کیا یہ دیکھتے نہیں؟ اللہ کی نشانیاں تو ان کے سامنے موجود ہیں اور سب کو نظر آتی ہیں۔ نہ ان سے اوجھل ہیں اور نہ دور ہیں۔ اور نہ یہ نشانیاں اس قدر پیچیدہ ہیں کہ انہیں سمجھنے کے لیے کسی بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ یہ انعامات جو اللہ نے انسانوں کے لیے پیدا کیے اور انسانوں کو ان کا مالک بنایا، ان میں سے جانور ہیں جن کو انسانوں کے تابع بنایا جن پر انسان سوار ہوتے ہیں، ان میں سے بعض نعمتوں کو کھاتے اور پیتے ہیں۔ اور بعض سے بعض دوسرے فائدے اٹھاتے ہیں اور یہ سب امور اللہ کی تدبیر اور تقادیر کے مطابق ہے۔ اور پھر اللہ نے انسانوں کے اندر مختلف صلاحیتیں اور خصوصیات ودیعت فرمائیں۔ پھر جانوروں کو مختلف خصائص اور صلاحیتیں دیں۔ انسانوں کو یہ قدرت دی کہ وہ ان کو اپنا تابع فرمان بنائیں اور ان سے فائدے اٹھائیں۔ چنانچہ وہ سدھائے گئے تابع فرمان بنائے گئے اور ان سے انسانوں کی مختلف حاجات و ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ انسانوں کے اندر یہ قدرت نہ تھی کہ وہ از خود ان نعمتوں کو پیدا کر سکتے۔ سب نعمتیں تو بڑی بات ہے اگر تمام انسان جمع ہو جائیں اور وہ ایک مکھی کی تخلیق کرنا چاہیں تو وہ بھی نہ کر سکیں گے۔ نیز اللہ نے چونکہ مکھی کے اندر یہ خاصیت نہیں رکھی کہ وہ انسانوں کے تابع ہو جائے اس لیے آج تک انسان مکھی کو تابع نہ کر سکے۔

اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ (۷۳:۳۶) ”پھر کیا یہ شکر گزار نہیں ہوتے؟“ جب انسان ان معاملات کے بارے میں اس انداز سے سوچتا ہے اور قرآن کریم کی روشنی میں ان امور پر غور کرتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ تو اللہ کے انعامات کے اندر زدیا ہوا ہے اور اس پر اللہ کے کرم کی ہر وقت بارش ہو رہی ہے۔ اس کے ماحول کی ہر چیز اس کے لیے رحمت ہے۔ جب بھی وہ کسی حیوان پر سوار ہوتا ہے، یا گوشت کا کوئی ٹکڑا کھاتا ہے، یا دودھ کا ایک گھونٹ پیتا ہے یا سوت، اون اور ریشم کا کوئی کپڑا پہنتا ہے، یا گھی اور پیر استعمال کرتا ہے یا اپنے انعامات کو کام میں لاتا ہے تو اسے گہرا شعور حاصل ہوتا ہے کہ خالق کائنات کی رحمت کس قدر وسیع ہے اور اس کے انعامات کا دائرہ کس قدر بڑا ہے۔ غرض یہ شعور اور بھی بڑھتا ہو جاتا ہے جب انسان اس جہاں کی تازہ اور باسی فصلوں اور پھلوں کو استعمال کرتا ہے اور اسی شعور کے نتیجے میں انسانی زندگی پوری کی پوری حمد و ثنا ہو جاتی ہے۔ قدم قدم پر اس شعور کی وجہ سے انسان عبادت اور بندگی کرتا ہے اور رات دن اللہ کا شواہد ہوتا ہے۔

لیکن لوگوں کے اندر یہ شعور نہیں ہے اس لیے وہ شکر نہیں بجا لیتے بلکہ انہوں نے اللہ کی مخلوق میں دہری چیزوں کو اللہ کے سوا اللہ اور مددگار بنا رکھا ہے۔

وَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اِلٰهَةً لَّعَلَّهُمْ يَنْصُرُوْنَ (۷۴:۳۶) لَا يَسْتَطِيعُوْنَ نَصْرَهُمْ

وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ (۷۵:۳۶) ”انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنا لیے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ لائے ان کے لیے حاضر باش لشکر بنے

ہوئے ہیں۔“ ماضی میں یوں ہوتا تھا کہ بت اور آستانے پہنچے جاتے تھے یا درختوں اور ستاروں کی پوجا کی جاتی تھی۔ فرشتوں اور جنوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ ماضی کی بت پرستی آج بھی بعض علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ اس مظاہر پرستی میں مبتلا نہیں ہیں وہ بھی خالص توحید کے قائل نہیں ہیں۔ آج اکثر لوگ اللہ کے سوا دوسری کھوٹی اور جھوٹی قوتوں سے خائف ہیں اور اللہ کے سوا دوسرے سہاروں پر اعتماد کرتے ہیں۔ شرک کے بہر حال بہت سے رنگ ہوتے ہیں۔ زمان و مکان کے اختلاف سے اس کے رنگ ڈھنگ بھی بدلتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ ان الہوں کی بندگی اس لیے کرتے تھے کہ ان کے ذریعے یہ لوگ کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ حالانکہ عملاً صورت حالات یہ ہوتی تھی کہ ان کے الہوں کے خلاف اگر کوئی کچھ اقدام کرتا تھا تو یہ لوگ اپنے الہوں کی لدا کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنے الہوں کی حمایت کرتے تھے۔ اصل میں تو یہ لوگ اپنے کھوئے خداؤں کے مددگار ہوتے تھے۔

وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحَضَّرُونَ (۷۵:۳۶) ”وہ اپنے الہوں کے لیے حاضر باش فوجدار تھے۔“ یہ ان کی سوچ اور فکر کی انتہائی کمزوری تھی۔ آج بھی لوگوں کی اکثریت اسی سوچ میں مبتلا ہے۔ اور صرف شکل و صورت کے اعتبار سے ہی اختلاف ہے۔ اصل سوچ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آج جو لوگ بڑے بڑے سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کو اللہ بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ازمنہ سابقہ کے بتوں کے پیجاریوں سے کہیں دور نہیں ہیں۔ دراصل یہ لوگ ان بتوں کے فوجدار ہیں۔ یہ لوگ ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کو پوجتے بھی ہیں۔ اور ان کی حمایت و مدافعت بھی کرتے ہیں۔

بت پرستی بہر حال بت پرستی ہے۔ اس کی شکل و صورت مختلف ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ہر دور میں موجود ہوتی ہے۔ اور جب بھی عقیدہ توحید میں اضطراب پیدا ہوتا ہے بت پرستی کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ شرک اور جاہلیت لے لیتی ہے۔ انسانوں کی فلاح اور نجات صرف توحید خالص میں ہے جس کے اندر صرف اللہ ہی کو اللہ سمجھا جائے۔ صرف اس کی بندگی کی جائے۔ اور صرف اسی پر بھروسہ کیا جائے اور اطاعت اور تعظیم بھی اسی کی کی جائے۔

فَلَا يَحْزَنُكَ قَوْلُهُمْ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَ مَا يُعْلِنُونَ (۷۶:۳۶) ”اچھا جو باتیں یہ بنا رہے ہیں وہ تمہیں رنجیدہ نہ کریں۔ ان کی چھپی اور کھلی سب باتوں کو ہم جانتے ہیں۔“ اس میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ آپ کے مخاطب وہی لوگ تھے جنہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو اللہ بنا رکھا تھا۔ اور یہ لوگ اللہ کا شکر ادا نہ کرتے تھے۔ لہذا یہ لوگ نصیحت بھی نہ لیتے تھے۔ حضور سے کہا گیا کہ آپ ان کی فکر نہ کریں۔ اللہ ان کے بارے میں خوب جانتا ہے۔ وہ تحریک اسلامی کے خلاف اور بت پرستی کے حق میں جو تدبیر اختیار کر رہے ہیں وہ ہماری نظروں میں ہیں۔ لہذا اے رسول آپ پر ان باتوں کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ان کے معاملات قدرتِ ہبہ کے سامنے کھلے ہیں اور اللہ کی قدرت ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تحریک اسلامی کے کارکن جب یہ عقیدہ رکھیں تو ان کا معاملہ بہت ہی سہل ہو جاتا ہے۔ وہ چونکہ صرف اللہ پر بھروسہ کرنے والے ہوتے ہیں اس لیے ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ کیونکہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ اللہ ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ یہ کہ وہ اللہ کے قبضے میں ہیں اللہ کی نظروں میں ہیں اگرچہ بظاہر یہ بات نظر نہ آتی ہو۔

اس آخری سبق کا یہ تیسرا حصہ ہے۔ اس میں حشر و نشر کے مسئلہ کو لیا گیا ہے۔

أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ ۖ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَتَسَىٰ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَنْ يُحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۚ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَنَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۚ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِّنْهُ تُوقِدُونَ ۚ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَىٰ ۚ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَن يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۚ

”کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑا لو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے ”کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟“ اس سے کہو ”انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا“ اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے، وہی جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چولے روشن کرتے ہو۔ کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں؟ جب کہ وہ ہر خلاق ہے۔ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔“

اس حصے میں بات کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ انسان کو خود اپنے وجود اور اپنی ذات کی طرف دیکھنا چاہئے۔ اس کی تخلیق کا آغاز کس طرح ہوا؟ وہ کس طرح بڑا ہوا اور سن بلوغ کو پہنچا۔ یہ سب مراحل جو اس کی زندگی میں طے ہوئے وہ اس کی نظروں میں ہیں۔ وہ دیکھتا رہا ہے۔ کیا اس سے وہ کوئی سبق اور نصیحت نہیں لے رہا ہے۔ کیا خود انسانی زندگی تخلیق و تکمیل سے وہ یہ سبق نہیں اخذ کر سکتا کہ اللہ کے لیے دوبارہ اٹھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگرچہ وہ مٹ جائے اور اس کی ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں۔

أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ (۷۷:۳۶) ”کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑا لو بن کر کھڑا ہو گیا۔“

سوال یہ ہے کہ وہ نطفہ کیا چیز ہے جس کے بارے میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ انسان کا اصل قریب ہے۔ یہ ایک حقیر پانی سے مرکب ہے، یہ کوئی ٹھوس چیز ہے اور نہ اس کی کوئی قیمت ہے۔ یہ ایک پانی ہے جس میں ہزار ہا غصے ہوتے ہیں۔ ان ہزار ہا غلیوں میں سے صرف ایک جنین بنتا ہے۔ اور یہ ایک جنین پھر انسان بنتا ہے۔ یہ پھر اپنے رب اور خالق کے ساتھ گستاخانہ باتیں کرتا ہے۔ رب کی مخالفت کرتا ہے اور اپنے خالق سے برہان و دلیل کا مطالبہ کرتا ہے۔

حالانکہ وہ خالق تدبیر ہی ہے جس نے اس قدر حقیر چیز سے انسان کو بنایا اور وہ ”خصیم“ میں اور صریح جھگڑا لو بن گیا۔

ذرا غور تو کیا جائے کہ یہ انسان کیا سے کیا بن گیا۔ دراصل کے آثار اور انجام پر غور کیا جائے۔ کیا اس قدرت ”قادرہ“ کے سامنے یہ کوئی مشکل کام۔ کہ وہ جزائے جسم کو دوبارہ یکجا کر دے۔ اگرچہ وہ مرٹے کے بعد زمین میں بکھر گئے ہیں۔

وَضَرَبَ مِثْلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ (۷۸:۳۶)

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ (۷۹:۳۶) ”وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے ”کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں۔“ اس سے کہو ”انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے“ کس قدر سادہ منطق ہے یہ؟ نہایت فطری استدلال۔ ایسا استدلال جو مشاہدہ کے مطابق نظر آتا ہے۔

یہ نطفہ جو کچھ کہہ رہا ہے کہ وہ بوسیدہ ہڈیوں سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ کیا انسان اسی نطفے سے نہیں بنا اور کیا انسان کی پیدائش ثانی کا عمل پیدائش اول کا عمل نہیں ہے اور جس ذات نے اس حقیر نطفے کو ایک انسان بنایا اور اسے وہ شخصیت دی کہ وہ صریح جھگڑالو بن گیا تو وہ ذات ان بوسیدہ ہڈیوں سے انسان کو تیار نہیں کر سکتی اور انہی ہڈیوں اور اجزاء سے ایک خلق جدید تیار نہیں کر سکتی؟

یہ معاملہ تو بہت ہی آسان اور ظاہر ہے۔ اور اس قدر ظاہر ہے کہ اس پر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ کوئی اس پر سہاڑ کرے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ (۷۹:۳۶) ”اس سے کہو“ انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔“

اس کے بعد اللہ کی قدرت خالقہ کی مایت کا ایک نمونہ انہیں بتایا جاتا ہے تاکہ یہ بات ان کے ذہن میں بیٹھ جائے۔ اللہ کی یہ صنعت کاری ان کے مشاہدہ اور ان کے روزمرہ کے معمولات میں سے ہے اور یہ اسے آزماتے رہتے ہیں۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ (۸۰:۳۶)

”وہ جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چولے روشن کرتے ہو۔“ یعنی یہ سادہ ابتدائی مشاہدہ ہی اللہ کی قدرت مذکورہ کی تصدیق کر دے گا۔ یہ مشاہدہ تم لوگ روز کرتے ہو لیکن اس کی حقیقت نہیں پاتے ہو۔ یہ سرسبز درخت جو پانی کے رس سے بھرا ہوا ہے جب اس کا ایک حصہ دوسرے سے رگڑا جاتا ہے تو اس سے آگ پیدا ہوتی ہے اور یہ درخت بھی پھر اس آگ کا ایندھن بن جاتا ہے۔ باوجود اپنی سرسبزی اور تروتازگی کے۔ اور وہ گہری تحقیق کہ درخت کے اندر جو طبعی حرارت کا خزانہ ہوتا ہے جو وہ سورج کی تاب کاری سے جذب کرتا ہے اور وہ اسے اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتا ہے حالانکہ وہ پانی کے رس سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اور ان درختوں کے رگڑتے پھر وہ آگ پیدا ہوتی ہے جس طرح جلنے کے عمل سے آگ پیدا ہوتی ہے تو اس تحقیقی علم و معرفت سے یہ حقیقت اور کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہرے بھرے درخت سے آگ کس طرح نمودار ہوتی ہے۔ خالق کائنات ہی نے درختوں کے اندر یہ

کمالات و دیت فرمائے جس نے ہر چیز کو اس کی تخلیق دی اور پھر اسے حکم دیا کہ وہ ان مقاصد کو پورا کرے جن کے لیے پیدا کیا گیا۔ ہاں یہ ہماری بے راہ روی ہے کہ ہم اس مخلوق کو اپنی راویہ نظر سے نہیں دیکھتے اور نہ کھلی آنکھوں سے کائنات کے ان عجبات پر غور کرتے ہیں۔ اس لیے ہم پر یہ اسرار و رموز نہیں کھلتے اور نہ وہ ہماری راہنمائی اس خالق اور صانع کی طرف کرتے ہیں۔ اگر ہم کھلے دلوں اور گہری نظروں کے ساتھ دیکھیں تو یہ اسرار و رموز ہماری دسترس میں ہیں اور ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم انہیں سمجھیں اللہ کی بزرگی کہیں اور ہر وقت اللہ کی حمد و ثنا کرتے رہیں۔

اس کے بعد دلائل قدرت الہیہ بیان کیے جاتے ہیں اور یہ بتایا جاتا ہے کہ تخلیق کا یہ عمل کس قدر سادہ ہے اور اسی طرح اللہ کے لوگوں کا دوبارہ پیدا کرنا کس قدر آسان ہے۔

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَدِيرٍ عَلٰی أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰی وَهُوَ

الْخَلْقُ الْعَلِيمُ (۳۶: ۸۱) ”کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کر دیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے کیوں نہیں! جبکہ وہ ہر خلاق ہے۔“ آسمان اور زمین اور یہ وسیع کائنات تو ایک عجیب مخلوق ہے۔ یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں اور اس میں لاکھوں ملین اجناس و اصناف مخلوقات موجود ہیں، بعض اس قدر باریک کہ ہم ان کے حجم ہی کو نہیں پکڑ سکتے۔ نہ ہم ان کی حقیقت کو پا سکتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں آج تک ہم بہت کم جانتے ہیں۔ یہ زمین اس سورج کے کنکشاں میں سے ایک چھوٹا سا تابع سیارہ ہے جس پر ہم رہتے ہیں۔ اس میں ہم سورج کی روشنی اور حرارت سے رہتے ہیں اور ہمارا یہ سورج جس کنکشاں کے تابع ہے اس کے اندر ایک کروڑ ستاروں میں سے سورج ایک ہے جس سے ہماری قریب کی یہ دنیا بنتی ہے۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس جہاں میں کئی اور کنکشاں ہیں۔ اور کئی ایسی دنیاں ہیں جس طرح ہماری قریب کی دنیا ہے۔ ماہرین فلکیات ابھی تک ایک کروڑ کنکشاؤں تک شمار کر سکے ہیں اور یہ شمار انہوں نے اپنی محدود طاقت والی دوربینوں سے کیا ہے۔ اور وہ اس انتظار میں ہیں کہ کئی اور کنکشاں دریافت ہوں گے جب طاقتور رصد گاہیں اور بہت ہی دور تک دکھانے والی دوربینیں بنا دی جائیں گی۔ ہماری اس کنکشاں اور اس سے قریب ترین کنکشاں کے درمیان فاصلہ کتنا ہے؟ سات لاکھ پچاس ہزار نوری سال کا فاصلہ ہے۔ اور ایک نوری سال کا فاصلہ کیا ہوتا ہے یعنی ۲۶ ملین میل۔ کہتے ہیں کہ طبعی مواد کا ایک عظیم ذخیرہ یا گور تھا اور اس کے بکھرنے سے یہ سورج بنے ہیں۔ یہ ہے اللہ کی وسیع کائنات اور اس کی وسیع کرسی اور اس کے بارے میں ہمارے حقیر اور محدود معلومات۔

یہ سورج جن کو گنا نہیں جاسکتا ان میں سے ہر ایک کا ایک مدار یا آسمان اور فلک ہے جس کے اندر یہ سورج چلتا ہے اور ان سورجوں میں سے ہر سورج کے اپنے تابع اجرام ہیں جن کے اپنے اپنے مدار ہیں۔ وہ ان مداروں میں اپنے اپنے سورجوں کے گرد گھومتے ہیں۔ جس طرح ہماری زمین ہمارے سورج کے گرد گھومتی ہے۔ یہ تمام گھومنے والے اربوں سورج اور چاند اور ستارے نہایت ہی دقیق اور متعین رفتار کے ساتھ چلتے ہیں اور کبھی اپنی رفتار اور مدار کو نہیں بدلتے۔ ایک لمحہ کے لیے نہیں رکتے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کائنات کے تمام مجموعے جو اس وقت ان فضاؤں میں تیر رہے ہیں سب باہم متصادم ہو جائیں اور یہ تمام نظام درہم برہم ہو جائے۔

یہ فضا جس میں اربوں اجرام فلکی چکر لگا رہے ہیں اور جن کی تعداد بھی ابھی تک معلوم نہیں، یوں ہیں جس طرح

چھوٹے چھوٹے ذرے ہیں۔ نہ ان کی تصویر کشی ہو سکتی ہے اور نہ یہ دائرہ تصور میں آ سکتے ہیں۔ یہ اس قدر وسیع و عریض کائنات کے حصے ہیں جس کے تصور ہی سے سرچکرا جاتا ہے۔

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ

(۸۱:۳۶) ”وہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے۔“۔ لوگوں کی تخلیق تو ایک معمولی بات ہے جبکہ یہ کائنات بہت ہی وسیع اور عظیم ہے۔

بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ (۸۱:۳۶) ”ہاں وہ مہر خلاق ہے۔“۔ اللہ نے یہ سب چیزیں پیدا کیں وہ ان کے مددہ اور چیزوں کو بھی پیدا کر سکتا ہے اور بغیر کسی تکلیف اور محنت کے۔ اللہ کے لیے چھوٹی یا بڑی چیز کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں ہے۔

أَمَّا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۸۲:۳۶) ”وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جاوے وہ ہو جاتی ہے۔“۔ یہ چیز زمین ہو یا آسمان ہوں پھر ہو یا پھر ہو یا چوٹی یہ سب چیزیں اللہ کے حکم کے سامنے یکساں ہوتی ہیں۔ کن فیکون

اللہ کے سامنے مشکل و آسان کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ کے لیے قریب و بعید یکساں ہیں۔ صرف ارادے کا متوجہ ہونا ہوتا ہے۔ ادھر ارادہ ہوا ادھر وہ چیز ہو گئی۔ وہ جو بھی ہو۔ اللہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ لوگ اللہ کے اعمال و افعال کو سمجھ جائیں۔ ورنہ انسان کی محدود قوت مدد کے لیے چیزوں کا سمجھنا ہی مشکل ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اب اس سورت میں انسان کے قلب و نظر کی تاروں پر ایک آخری ضرب لگائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی ضرب ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کیا ہے۔

فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۸۶﴾

”پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلائے جانے والے ہو۔“

لفظ ملکوت سے خالق و مخلوق کے تعلق کی اہمیت اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس کائنات کی ہر چیز مطلقاً اللہ کی ملکیت ہے اور اس کائنات کی تمام محسوسات پر اللہ کا مکمل قبضہ اور کنٹرول ہے۔

دوسری بات یہ کہ تمام چیزوں کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ آخری ضرب ہے اور اس سورت کی نہایت عظیم اور ہولناک فضا کے لیے یہ نہایت ہی مناسب تنبیہ ہے۔ اس سورت کا موضوع بھی نہایت ہی عظیم اور اہم ہے۔ اور اس کے اندر جو حقائق اور دلائل بھی دئے گئے ہیں وہ بھی بہت ہی عظیم اور ہولناک ہیں اور اس عظیم حقیقت سے مربوط و متعلق ہیں جن کی تفصیلات اور موضوع اس سورت میں دی گئی ہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ---- ۲۳

سورۃ الصفّت - ۳۷

آیات ۱ --- تا --- ۱۸۲

سورۃ الصفّت ایک نظر میں

ملاحظہ سورت کی طرح یہ سورت بھی مکی ہے۔ اس کی آیات اور فواصل مختصر اور زود اثر ہیں اور ان کے اندر مختلف مناظر اور مختلف مواقف ہیں۔ مختلف تصاویر اور مختلف سائے ہیں۔ اس کے اندر تمام واقعات ایسے ہیں جن کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن بعض واقعات خصوصی طور پر نہایت ہی شدید 'سخت' اور گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ تمام دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورت کا ہدف بھی یہی ہے کہ انسانوں کے نظریات اور عقائد کو درست کیا جائے۔ انسانی سوچ کو ہر قسم اور ہر شکل و صورت کی شرک سے پاک کیا جائے۔ لیکن خصوصاً یہاں شرک کی اس صورت کو لیا گیا ہے جو اس وقت عربی معاشرے میں رائج تھی۔ یہ سورت شرک کی اس قسم پر طویل تبصرہ کرتی ہے اور مختلف وسائل اور ذرائع سے اس کے کھوٹ اور باطل ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ جاہلیت عربیہ نے اس شرک کی شکل و صورت یوں گھڑ رکھی تھی کہ وہ اللہ اور جنوں کے درمیان رشتہ داریاں ثابت کرتے تھے۔ اس سوچ میں وہ اس قدر آگے بڑھے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ نے نعوذ باللہ جنوں کے ساتھ شادی کی اور اس کے نتیجے میں ملائکہ پیدا ہوئے۔ پھر یہ بھی ان کا عقیدہ تھا کہ فرشتے عورتیں ہیں اور یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

اس سورت میں ان خرافاتی کمانیوں پر تنقید کی گئی ہے۔ اس تصور کے پوچ اور اس سوچ کے کھوٹ اٹھانے سے بحث کی گئی ہے۔ چونکہ اس سورت کا یہ اہم موضوع تھا اس لیے سورت کے آغاز ہی میں فرشتوں کے بعض گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ اللہ کے حوالے سے ان کی حیثیت کا تعین ہو۔

وَ الصَّفّتِ صَفًّا (۱:۳۷) فَالزَّجْرَتِ زَجْرًا (۲:۳۷) فَالْتَلِیْتُ ذِکْرًا

(۳:۳۷) ”قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم‘ پھر ان کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں۔ پھر ان کی قسم جو کلام فصیح سناتے والے ہیں۔“ اس کے بعد سرکش شیاطین کا ذکر آتا ہے جن کو شاب ثاقب کے ذریعہ مارا جاتا ہے تاکہ وہ طاع اعلیٰ کے قریب نہ جاسکیں۔ اور عالم بالا میں اللہ کے حکویتی امور کے بارے میں جو فیصلے ہوتے ہیں ان کے سننے کے لیے یہ کان نہ لگائیں۔ اگرچہ عربوں میں مروج وہم پرستانہ کمانیوں کے مطابق عالم بالا سے ان شیاطین کو یوں نہ بھگایا جاسکتا تھا۔ اس سورت میں زقوم کے پودے کے پھلوں کو رؤس الشیاطین سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی اس درخت کو مزید گھناؤنا اور قبیح ثابت کرنے کے لیے سورت کے آخر میں اس پوچ تصور پر براہ راست حملہ کیا گیا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمُ الرِّبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ (۳۷:۱۴۹) اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ

هُمْ شٰہِدُونَ (۳۷:۱۵۰) اَلَا اَنْهُمْ مِّنْ اَفْکِهِمْ لَیْقُوْلُوْنَ (۳۷:۱۵۱) وَلَدَ اللّٰہِ

وَأَنَّهُمْ لَكَذِبُونَ (۱۵۲:۳۷) أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ (۱۵۳:۳۷) مَا لَكُمْ
كَيْفَ تَحْكُمُونَ (۱۵۴:۳۷) أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (۱۵۵:۳۷) أَمْ لَكُمْ سُلْطَنٌ مُّبِينٌ
(۱۵۶:۳۷) فَاتُوا بِكِتَابِكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۱۵۷:۳۷) وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ
الْجَنَّةِ نَسْبًا وَلَقَدْ عَلِمْتِ الْجِنَّةُ أَنََّّهُمْ لَمُحْضَرُونَ (۱۵۸:۳۷) سُبْحَنَ اللَّهِ عَمَّا

يَصِفُونَ (۱۵۹:۳۷) (۱۵۹-۱۴۹:۳۷) ”پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو کیا (ان کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے؟ کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سن رکھو، دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ ”اللہ اولاد رکھتا ہے۔“ اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کریں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسے حکم لگا رہے ہو؟ کیا تمہیں ہوش نہیں آتا؟ یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے، تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو۔ انہوں نے اللہ اور ملائکہ کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ ملائکہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ مجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ اللہ پاک ان باتوں سے جو یہ لوگ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔“

اس مخصوص صورت شرکیہ کی تردید کے ساتھ ساتھ اس سورت میں ان تمام دوسرے غلط عقائد کی بھی تردید کی گئی ہے جو ان سورتوں کا خاص موضوع ہے۔ چنانچہ خالص توحید پر اس ظاہر و باہر کائنات سے استدلال کیا جاتا ہے۔

إِنَّ إِلَهُكُمْ لَوَاحِدٌ (۳۷:۴) رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ

الْمَشَارِقِ (۵۰:۳۷) ”تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہے، وہ جو زمین اور آسمانوں اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں اور سارے مشرقوں کا مالک ہے۔“ یہ سورت تصریح کرتی ہے کہ شرک جنم رسید ہونے اور عذاب پانے کا سبب اول ہے۔ یہ تصریح مناظر قیامت کے ایک منظر میں کی جاتی ہے۔

فَاتَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ (۳۳:۳۷) إِنَّا كَذَلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ
(۳۴:۳۷) إِنَّهُمْ كَانُوا إِدَاقِيلَ لَهُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ (۳۵:۳۷) وَ يَقُولُونَ إِنَّا
لَنَارِكُوا إِلَهَيْنَا لِشَاعِرٍ مُّحْنُونَ (۳۶:۳۷) بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ (۳۷:۳۷)
إِنَّكُمْ لَدَاقِقُوا الْعَذَابِ الْآلِيمِ (۳۸:۳۷) وَمَا تُحْزَنُونَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۳۹:۳۷)

(۳۷:۳۳ تا ۳۹) ”اس طرح وہ سب اس روز عذاب میں مشترک ہوں گے۔ ہم مجرموں کے ساتھ ہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے تو یہ گھمنڈ میں آ جاتے تھے۔“

اور کہتے تھے کہ ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ حالانکہ وہ حق لے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی۔ اب ان سے کہا جائے گا کہ تم لازماً دردناک سزا کا مزہ چکھنے والے ہو اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جا رہا ہے وہ انہی اعمال کا دیا جا رہا ہے۔ جو تم کرتے رہے ہو۔

اس سورت میں بعث بعد الموت اور جزاء و سزا کے مسئلے کو بھی لیا گیا ہے۔

وَقَالُوا إِن هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (۱۵:۳۷) ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا
لَمُبْعُوثُونَ (۱۶:۳۷) اَوَاٰبَاؤُنَا الْاَوَّلُونَ (۱۷:۳۷) قُلْ نَعْم وَاَنْتُمْ دَاخِرُونَ

(۱۸:۳۷) ”اور وہ کہتے ہیں یہ تو صریح جادو ہے۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا بنجر رہ جائیں اس وقت ہم پھر زندہ کر کے اٹھ کھڑے کیے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباؤ اجداد بھی اٹھائے جائیں گے۔ ان سے کہو ہاں اور تم خدا کے مقابلے میں بے بس ہو۔“ اور اس کے بعد پھر مناظر قیامت میں سے ایک طویل اور منفرد منظر پیش کیا جاتا ہے جس کے اندر بے شمار مناظر، حرکات، تاثرات اور اچانک آنے والے حالات پیش کیے گئے ہیں۔

اس سورت میں وحی الہی اور منصب رسالت سے بھی بحث کی گئی ہے۔ وہ کہتے تھے۔

وَيَقُولُونَ اِنَّمَا نَتْلُو آٰیٰتًا لِّشَاعِرٍ مُّجَنُّوْنَ (۳۶:۳۷) ”کیا ہم اپنے الوں کو ایک شاعر اور مجنون کی وجہ سے چھوڑ دیں۔“ اس کا جواب یوں آتا ہے :

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷:۳۷) ”بلکہ وہ سچ لے کر آیا ہے اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی ہے۔“

نیل مکہ کی گواہی اور مکہ کی مناسبت سے رسولوں کے قصے بھی اس سورت میں لائے گئے ہیں۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کے قصے لائے گئے ہیں۔ حضرت حمز، حضرت ہارون، حضرت الیاس، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کے قصے بھی لائے گئے ہیں۔ ان قصص سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے رسولوں پر ہمیشہ رحمت فرماتا رہا ہے اور ان کی نصرت کرتا رہا ہے۔ اور ان کے مخالفین اور مکذبین پر اللہ کا عذاب آتا رہا ہے۔ اور ان کو سزا دی جاتی رہی ہے۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ (۷۱:۳۷) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ

(۷۲:۳۷) فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُّنْذَرِيْنَ (۷۳:۳۷) اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ

الْمُخْلِصِيْنَ (۷۴:۳۷) ”حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے تھے اور ان میں ہم نے تنبیہ

کرنے والے رسول بھیجے تھے۔ اب دیکھو کہ ان تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بدگمانی سے بس اللہ کے دین بند۔ بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا تھا۔

ان قصص میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بہت ہی ممتاز ہے۔ حضرت اپنے بیٹے کو خواب میں اشارے کی بنا پر دغ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعت اور سر تسلیم خم کرنے کا اعلیٰ ترین معیار کیا ہوتا ہے۔ یہ اطاعت امر رب کی اعلیٰ ترین مثال ہے اور اس اعلیٰ اور بلند ترین چوٹی پر دین ہوگ بھیج سکتے ہیں جنہوں نے اپنے نفوس کی تربیت اعلیٰ مقاصد کے لیے کی ہو اور ان کی نظریں افق اعلیٰ پر ہوں جو نہایت ہی روشن ہے۔

اس سورت میں موضوع سخن دور مسائل و ریخت کے نتیجے میں جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا خلاصہ واضح طور پر یوں ہے :

۱۔ آسمانوں کے مناظر، کوکب اور شہاب ثاقب کے حیران کن مناظر:

اِنَّا رَیْنَا سَمَاءَ الدُّنْیَا بِزُیْنَةٍ اُنْکُورًا کَب (۶ ۳۷) وَ حَنَظًا مِّنْ کُلِّ سَیْطَرٍ

مَّارِدٍ (۷ ۳۷) لَّا یَسْمَعُونَ اِیَّیْ لَمَدًا اِلَّا عَلٰی وَ یُقَذَّفُونَ مِّنْ کُلِّ حَاسِبٍ (۸ ۳۷)

دُحُورٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّ اَصْب (۹ ۳۷) اِنَّا مِّنْ حَطَفِ الْخَطَفَةِ وَ اَتَعَهُ شِهَابٌ

ثَّاقِبٌ (۱۰ ۳۷) ”ہم نے آسمان دنیا کو تاروں کی ریت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ شیاطین طلاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے۔ ہر طرف سے مارے اور پائے جاتے ہیں اور ان کے لیے جہنم عذاب ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔“

۲۔ قیامت کے مناظر اور اس کے نہایت ہی اچانک، غیر متوقع اور دہشت ناک مناظر اور نہایت ہی قوی اثرات اس سورت میں بیان کیے گئے۔ اس سورت میں یہ ماحرر یف خصوصی شان لیے ہوئے ہیں۔ ان کی تفصیلات ہم تشریح آیات کے وقت دیں گے۔ انشاء اللہ!

۳۔ پھر اس سورت میں لائے ہوئے قصص میں خاص اشارات اور اسباق پوشیدہ ہیں۔ خصوصاً قصہ ابراہیم اور آپ کے دغ بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے واقعات میں یہ اثرات اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ باپ جب بیٹے کو حکم الہی کے تحت دغ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں تو تسلیم و رضا کی یہ ایک اعلیٰ ترین مثال قرار پاتی ہے اور بہت ہی مشکل تعمیل۔

۴۔ پھر اس سورت میں ترنم انگیز فواصل آیات ہیں۔ مختصر آیات اور آیات کا ہم درس حاتمہ۔ اس سورہ کے مناظر اس کے پر توؤں اور اس کے موافق اور اشارات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

یہ سورت ان موضوعات کو تین اسباق کی شکل میں لیتی ہے۔

۱۔ پہلے سبق کا آغاز ان ملائکہ کی قسم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جو صف بہت تعمیل حکم۔ ہیں اور جو اٹھتے اور پھنکارتے ہیں اور وہ جو کام نصیحت سناتے اور پھیلاتے ہیں۔ یہ قسم اس بات پر اٹھائی جاتی ہے کہ تمام مشرقوں کا رب

اللہ وحدہ ہے جس نے آسمانوں کو کواکب کے ذریعے مزین کیا ہے۔ پھر شیاطین ان کی جانب سے عالم ہلا کے راز چلنے اور شباب ثاقب سے مارے جانے کا ذکر ہے اور اس کے بعد سوا حل کیا جاتا ہے۔

اَھمُّ اَشَدُّ خَلْقًا (۳۷: ۱۱) ”کیا یہ لوگ زیادہ طاقتور ہیں“ یا یہ بندگان خدا ملائکہ کواکب شیاطین اور شباب ثاقب؟ اس سے اس بات پر استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ بعث بعد الموت کو بعید سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے لیے یہ بہت ہی آسان کام ہے۔ یہ لوگ اپنی کج فہمی کی وجہ سے اسے مسجد سمجھتے ہیں اور مزاح کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کا ایک طویل منظر پیش کیا جاتا ہے یہ ایک منفرد منظر ہے۔

۲۔ دوسرے سبق کا آغاز اس مضمون سے کیا جاتا ہے۔ کہ مکہ کے گمراہوں کی مثالیں اہم سابقہ میں بھی موجود رہی ہیں۔ ان کے پاس بھی ڈرانے والے آئے تھے لیکن ان میں سے اکثر لوگ گمراہ ہی رہے۔ ان ڈرانے والوں میں قوم نوح، قوم ابراہیم، موسیٰ، ہارون، الیاس، لوط اور یونس علیہم السلام کے قصص لائے گئے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان ڈرانے والوں کی اقوام کا انجام کیا ہوا۔

۳۔ تیسرے سبق میں وہ خرافاتی تصور پیش کر کے اسے رد کیا گیا ہے۔ جس کا تذکرہ ہم کر آئے ہیں۔ یعنی جنات اور ملائکہ کا قصہ۔ اس آخری سبق میں اللہ کے اس عہد کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس نے تمام رسولوں کے ساتھ کیا ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ (۳۷: ۱۷۱) اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ (۳۷: ۱۷۲) ”وَ اِنْ جُنَدْنَا لَهُمُ الْغَلْبُونَ“ (۳۷: ۱۷۳) ”اپنے پیچھے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا الفکر ہی غالب ہو کر رہے گا“۔ سورت کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ تمام شرکوں سے پاک ہیں۔ اس کے رسولوں پر دنیا و آخرت میں سلامتی ہے۔ اور ہر قسم کی حمد و ثنا اور حاکمیت و ربوبیت اللہ کے لیے ہے۔

سُبْحَنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ (۳۷: ۱۸۰) وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ

(۳۷: ۱۸۱) وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۳۷: ۱۸۲) ”پاک ہے ہمارے رب عزت کا مالک“ ان تمام باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں اور سلام ہے رسولوں پر اور ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے جتنی بھی وہ اصل مسائل ہیں جو اس سورت کا موضوع تھیں۔ اور سورت کے مضمین انہی کے گرد گھومتے ہیں۔ اب تفصیلات اور تشریحات۔

درس نمبر ۲۰۸ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۶۸



وَالصَّفَّاتِ صَفًّا ۚ فَالْزُجْرَاتِ زُجْرًا ۚ فَالتَّلِیَّتِ ذِکْرًا ۚ إِنَّ إِلَٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۚ
رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۚ

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”قطار در قطار باندھنے والوں کی قسم، پھر ان کی قسم جو ڈانٹنے پھٹارنے والے ہیں، پھر ان کی قسم جو کلام نصیحت سنائے والے ہیں، تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے۔۔۔ وہ جو زمین اور آسمانوں کا اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں، اور سارے مشرقوں کا مالک۔“

قطاروں میں صف آرا ہونے والے، زجر کرنے والے اور تلاوت کرنے والے دراصل وہ فرشتے ہیں جو ان اعمال کے حامل ہیں۔ صفیں باندھنے والے یعنی نمازوں میں یا اللہ سے احکام لینے کے انتظار میں صف بستہ مراد ہوں اور زجر و توبیخ سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ جن نافرمانوں کی روح قبض کرنا مقصود ہو تو وہ ڈانٹتے ہوئے پلتے ہیں، یا وہ جو حشر میں ان کو ڈانٹ ڈپٹ سے جہنم کی طرف چلائیں گے۔ یا کسی بھی حال میں اللہ کی مرضی کے مطابق زجر کرنے والے۔ اور تلاوت و ذکر کرنے والوں سے مراد کتاب الہی پڑھنے والے اور اللہ کی تسبیحات کرنے والے ہو سکتے ہیں۔
غرض ملائکہ کی ان خاص اقسام و انواع کی قسم کھانے کی غرض و غایت یہ ہے کہ لوگو! جان لو کہ۔

اِنَّ الْاِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (۳۷: ۴) ”تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے۔“۔ اور ان فرشتوں کی اس حالت کی پھر قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ فرشتوں کے بارے میں عربوں کا مقصود بہت غلط تھا جیسا کہ ہم نے کہا کہ عرب فرشتوں کو اللہ کی اولاد سمجھتے تھے اور بعض عرب فرشتوں کو اللہ بھی اس لیے بناتے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں لہذا ہماری دیویاں ہیں۔

ضروری ہوا کہ فرشتوں کی حیثیت بتانے کے بعد اللہ خود اپنی تعریف بھی فرمادے :

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِ (۵:۳۷) ”وہ جو زمینوں اور آسمانوں کا اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان ہیں اور سارے مشرقوں کا مالک ہے۔“ یہ زمین اور آسمان جو انسانوں کے ارد گرد قائم ہیں وہ انسانوں کو بتاتے ہیں کہ اس عظیم کائنات کا ایک خالق مدبر ہے۔ اس جہاں میں کوئی ذات اس کے سوا نہیں ہے جس کا یہ دعویٰ ہو کہ اس کی تخلیق اور تدبیر میں اس کا بھی حصہ ہے۔ کوئی عقلمند انسان اس اعتراف سے سب سے بھاگ سکتا کہ اس جہاں کا خالق ہے قید قدرتوں کا مالک ہے۔ اور وہ رب ہے اور وہی مالک ہے زمین و آسمان اور ان کے درمیان ہر چیز کا۔ خواہ ہوائیں ہیں، بارشیں، روشنی ہے، مخلوقات ہیں، دیکھی جانے والی مخلوقات ہیں یا ایسی مخلوقات ہیں جو نظر نہیں آ سکتیں اور آئے دن ان کے بارے میں انسانوں کے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ان کی اکثریت اب بھی نظروں سے اوجھل ہے۔

آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی مسافتیں اسی قدر وسیع ہیں کہ اس قدر عظیم ہیں اور ان کے درمیان پائی جانے والی مخلوقات اس قدر متنوع، خوبصورت اور باہم ہم آہنگ ہیں کہ ایک زندہ دل انسان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس کائنات سے گہرے تاثر اور عبرت پکڑنے اور اس پر غور و فکر کے بغیر وہی شخص گزر سکتا ہے جس کا دل مر چکا ہو، اس لیے ایسے شخص پر پھر یہ خوشگوار تاثرات کوئی اثر نہیں کرتے اور اس کا دل و دماغ ان عجائبات کو دیکھ کر بھی جوش میں نہیں آتا۔

رَبُّ الْمَشَارِقِ (۵:۳۷) ”مشرقوں کا مالک“۔ ہر شے کے لیے ایک مشرق ہے اور ہر شے کے لیے ایک مشرق ہے۔ لہذا اس کائنات میں بے شمار مشرق ہیں۔ ان وسیع اجرام فلکی میں ان گنت مشرق ہیں۔ اس تعبیر میں اس زمین کی طرف بھی گہرا اشارہ ہے جس پر ہم رہتے ہیں۔ زمین جب سورج کے سامنے حرکت محوری کا عمل کرتی ہے، تو کسی نہ کسی وقت اس کا ایک حصہ مشرق ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی نہ کسی وقت اس کا ایک حصہ مغرب ہوتا رہتا ہے۔ اور یہ عمل بے درپے چلا رہتا ہے۔ جو نہی کوئی حصہ سورج کے سامنے آتا ہے وہ مشرق ہوتا ہے۔ اور اس کے بالقابل حصہ مغرب ہوتا ہے۔ جوں جوں حرکت اور گردش ہوتی رہتی ہے، مشرق بھی بدلتا رہتا ہے اور مغرب بھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے نزول قرآن کے وقت لوگ بے خبر تھے۔ لیکن اللہ نے ان کو اس قدر قدیم زمانے میں خبر دے دی۔

یہ نہایت ہی گہرا نظام ہے جس کے مطابق اس زمین پر مشرق و رواں دواں ہیں، اور یہ خوبصورتی جو طلوع آفتاب کے وقت اس زمین پر بکھر جاتی ہے، یہ اس قابل ہے کہ انسانی دل کو خوشگوار، تاثر اور گہرے غور و فکر کے تاثرات نہ بھر دے۔ اور انسان چلا لٹھے کہ صانع کائنات کی کیا شان ہے اور انسان چلا لٹھے کہ بے شک اللہ وحدہ خالق کائنات ہے کہ اس عظیم صفت کے آثار اور اس کی مسافت اور طبیعت یہ بتاتی ہے کہ اس کا بنانے والا ایک ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں اللہ کی صفت رب المشرق کو لایا گیا ہے۔ مغرب ہم کو اکب، شباب، ثاقب، شیطین اور ان کے بھگائے جانے پر بحث کریں گے، اس موقع پر رب المشرق کے کچھ اور مفہوم اور مرستیں بھی بیان کریں گے۔

إِنَّا زَيْنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ ﴿٦٧﴾ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ﴿٦٨﴾ لَا يَتَمَعُّونَ إِلَى الْمَلَاءِ الْأَعْلَىٰ وَ يُقَدِّفُونَ مِّنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿٦٩﴾ دُخُورًا وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ ﴿٧٠﴾ إِلَّا مَن خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاتَّبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿٧١﴾

”ہم نے آسمان دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے۔ ہر طرف سے بارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے ہییم عذاب ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

سورت کے آغاز میں ملک کے بارے میں عربوں کے غلط خیالات پر بحث کی گئی تھی، یہاں شیاطین کے بارے میں ان کے غلط خیالات کو لیا جاتا ہے۔ عربوں کے یہ خیالات تھے کہ اللہ اور جنوں کے درمیان رشتہ داری ہے۔ بعض عرب محض اس خیال سے شیاطین کی پوجا کرتے تھے کہ شیاطین کو ملکوت السموات کی بعض غیوب کا علم ہوتا ہے۔ وہ ملاء اعلیٰ سے وابستہ ہوتے ہیں اور یوں نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

زمین، آسمان اور مشرقوں کے ذکر کے بعد، چاہے ان سے مراد ستاروں کے مشرق ہوں، زمین کے اوپر جاری مشرق ہوں، یا دونوں مشرق ہوں یا ان سے مراد نور اور روشنی ہو، ہر حال اب یہاں کوکب کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

إِنَّا زَيْنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ (۶:۳۷) ”ہم نے آسمان دنیا کو تاروں سے آراستہ کیا ہے۔“ جہرے ایک نظر ہی سے یہ زینت دکھائی دیتی ہے۔ چاندنی رات میں تارے اور کوکب کی نظارہ پیش کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کائنات میں جس ایک اہم عنصر ہے۔ جس طرح اللہ کی تخلیق غور و فکر کے بعد انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح خوبصورت بھی معلوم ہوتی ہے۔ جمال اس کائنات کے نقشے میں کوئی عارضی رنگ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک حقیقی عنصر ہے۔ تخلیق کائنات میں دو چیزیں بنیادی مواد ہیں۔ ایک کمال درجے کا منصوبہ اور دو سرانمایتی خوبصورت نقوش فطرت۔ یہ دونوں عنصر برابر اور مقصود بالذات ہیں۔ اور اس کائنات میں کمال و جمال دونوں اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔

چاندنی رات میں جب انسان تاروں بھرے آسمان کو دیکھتا ہے تو وہ اس دنیا کے خوبصورت ترین منظر کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ یہ منظر اس قدر خوبصورت ہوتا ہے کہ انسان دیکھتا چلا جائے، نظریں تھکتی نہیں اور دل ملول نہیں ہوتا۔ ہر ستارہ ضو بار ہوتا ہے اور چمکتا ہے۔ ہر ستارہ اپنا نور بکھیر رہا ہوتا ہے۔ انسان محسوس کر رہا ہے کہ یہ کائنات کی محبت بھری آنکھیں ہیں جو نظر چراگے دیکھ رہی ہیں اور جب انسان ان پر نظر ڈالتا ہے تو یہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، چھپ جاتی ہیں اور جب آپ ان سے نظر ہٹاتے ہیں تو یہ آنکھیں پھر چمک اٹھتی ہیں اور اپنے منظور نظر کی تلاش میں رہتی ہیں۔ ہر رات ان آنکھوں کا موقف مختلف ہوتا ہے اور منزل جہاں ہوتی ہے۔ یہ بھی انسان کے لیے ایک ذہنی اور نفسیاتی خوراک ہے اور اسے جس قدر بھی کوئی کھائے سیر نہیں ہوتا اور نہ مل رہا ہوتا ہے۔

انہی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ ان کو کب کا ایک دوسرا فریضہ بھی ہے۔ ان میں سے بعض شباب ثاقب ہوتے ہیں اور یہ ان شیاطین پر بمباری کرتے ہیں جو طلاء اعلیٰ کے قریب جانے کی سعی کرتے ہیں۔

وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ (۷:۳۷) لَا يَسْمَعُونَ إِلَى الْمَدِ الْأَعْلَىٰ وَ يُقْذَفُونَ مِّنْ كُلِّ جَانِبٍ (۸:۳۷) دُحُورًا وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ (۹:۳۷) اَلَا

مَنْ خَطَفَ الْخَطْفَةَ فَاتَّبَعَهُ شَهَابٌ ثَاقِبٌ (۱۰:۳۷) اور ہر سرکش شیطان سے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ شیاطین طلاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے۔ ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے عظیم عذاب ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

بعض سیارے ایسے ہوتے ہیں جو عالم بالا کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی دیوٹی یہ ہوتی ہے کہ یہ عالم بالا میں جو فیصلے اس عالم کے بارے میں ہوتے ہیں 'شیاطین کو ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے روکتے رہیں۔ جب بھی کوئی شیطان عالم بالا سے کوئی راز چرانے کی سعی کرتا ہے تو شباب ثاقب اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اور ان کو مار کر ہانک دیتے ہیں۔ ایسے شیاطین متمردين کے لیے آخرت میں ایسا عذاب ہو گا جو کبھی ختم ہونے والا نہ ہو گا۔ بعض اوقات شیاطین 'بعض معلومات لے اڑتے ہیں ایسے شیاطین کا پیچھا یہ شباب ثاقب کرتے ہیں۔ یہ شباب ایسے شیاطین پر لگتے ہیں اور انہیں جلا کر رکھ دیتے ہیں۔

ہم ان کیفیات کو بھی طرح سمجھ نہیں سکتے کہ یہ شیاطین جاسوسی کا یہ عمل کس طرح کرتے ہیں اور کس طرح وہ کچھ معلومات لے اڑتے ہیں اور کس طرح انہیں شباب ثاقب کے ذریعے بھسم کر دیا جاتا ہے۔ یہ عالم غیب کی باتیں ہیں اور انسانی فہم و ادراک کی جو طبیعت ہے وہ ان کے معلوم کرنے سے عاجز ہے۔ اور نہ ان کی کیفیات کا تصور کر سکتی ہے۔ ہمارا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی طرف سے جو کچھ آجائے ہم اس کی تصدیق کر دیں 'اس جہاں کے اندر ہم طبیعیات کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں وہ سطحی علم ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ شیاطین جن کو عالم بالا تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔ اور وہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کی طرف کان لگانے سے بھی ان کو روکا جاتا ہے۔ وہی شیاطین ہیں جن کے بارے میں عرب کے لوگوں کا دعویٰ تھا کہ ان کا اور اللہ تعالیٰ کا آپس میں رشتہ ہے (نعوذ باللہ)۔ اگر ان لوگوں کا یہ دعویٰ درست ہوتا تو معاملہ مختلف ہوتا۔ اور یہ نہ ہوتا کہ اللہ کے رشتہ داروں کو اس طرح دھتکارا جاتا 'ہانکا جاتا اور اگر کچھ بات وہ لے اڑیں تو انہیں رجم کر دیا جاتا۔ یہ رشتہ دار تو عالم بالا میں آزادانہ آتے جاتے۔

ملائکہ کے ذکر اور آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان اشیاء کے ذکر کے بعد اور ان ستاروں کے ذکر کے بعد جن سے آسمانوں کو حرین کیا گیا اور ان شیطانوں کے ذکر کے بعد جو سرکش ہیں اور جن پر شباب ثاقب چھوڑے جاتے ہیں 'اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ذرا ان لوگوں سے پوچھیں کہ وہ زیادہ طاقتور ہیں یا مذکورہ بالا ۱۰ طاقتور سے اور زیادہ قوی ہے تو پھر وہ دوبارہ اٹھائے جانے کے

تصور سے کیوں دہشت زدہ ہو جاتے ہیں اور مزاح کرتے ہیں۔ اور اس کے وقوع کو مستبعد سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قیامت میں لوگوں کو دوبارہ اٹھانا اس عظیم اور ہولناک مخلوقات کی پیدائش سے زیادہ مشکل امر نہیں ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمْ مَنْ خَلَقْنَا إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ
مِنْ طِينٍ لَّازِبٍ ۝ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ۝ وَإِذَا ذُكِّرُوا لَا
يَذْكُرُونَ ۝ وَإِذَا سَأُوا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ ۝ وَقَالُوا إِن هَذَا إِلَّا
سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا إِنَّا لَمَبْحُوثُونَ ۝ أَوْ
أَبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ۝

”اب ان سے پوچھو ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا ان چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟ ان کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔ تم (اللہ کی قدرت کے کرشموں پر) حیران ہو اور یہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے غصوں میں اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں ”یہ تو صریح جادو ہے“ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم سرچھے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پتھر رہ جائیں اس وقت ہم پھر زندہ کر کے اٹھ کھڑے کیے جائیں؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباؤ اجداد بھی اٹھائے جائیں گے۔“

ذرا ان سے پوچھو کہ تم مانتے ہو کہ ملائکہ، سموات، زمین، ان کے درمیان فضا میں، شیاطین، ستارے اور شباب ثاقب سب اللہ کی مخلوق ہیں۔ تو کیا تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا اللہ کے ان جہانوں کی تخلیق؟ اس سوال کے بعد ان کے جواب کا انتظار ہی نہیں کیا جاتا کیونکہ جواب تو ظاہر ہے۔ یہ سوال تو محض سرزنش کے لیے کیا گیا ہے اور ان کی غبارت پر تعجب کے اظہار کے لئے کیا گیا ہے۔ اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ لوگ حد درجہ غافل اور حیران کن حد تک فہم نہیں۔ چنانچہ ان کے سامنے یہ حقیقت رکھی جاتی ہے کہ آغاز میں ہمیں ایک لیس دار گارے سے بنایا گیا ہے۔ اور یہ گارہ اسی زمین سے لیا گیا ہے۔ جو خلایق میں سے ایک ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِنْ طِينٍ لَّازِبٍ (۱۱: ۳۷) ”ہم نے انہیں لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔“
لہذا یہ لوگ پیدائش کے اعتبار سے کوئی زیادہ دشوار نہیں ہیں اور نہ ان کی تخلیق مشکل ہے۔ لہذا ان کا موقف عجیب ہے کہ اپنی حماقتوں کو نہیں سمجھتے۔ ان اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ ان کو بعث بعد الموت کی جواب دہی سے ڈر لیا جاتا ہے اور یہ مذاق سمجھتے ہیں۔ ان کی یہ حماقت ہے جس پر حضور اکرم کو تعجب ہوتا ہے اور یہ لوگ ہیں کہ اپنی روش پر چل رہے ہیں۔

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ (۱۲: ۳۷) وَإِذَا ذُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ (۱۳: ۳۷) وَإِذَا

رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ (۳۷: ۱۴) ”تم حیران ہو اور یہ مذاق ازار ہے ہیں۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اتنے غصہ میں اڑا دیتے ہیں۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حق ہے کہ آپ ان کے معاملات پر تعجب کریں۔ کیونکہ آپ تو اللہ کو اپنے قلب میں پاتے ہیں۔ جس طرح ہر مومن پاتا ہے اور اللہ کی آیات کو واضح طور پر دیکھتا ہے۔ جو اس کائنات میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ آپ کو اس پر تعجب ہے کہ ان آیات اور نشانیوں کو دیکھتے ہوئے کس طرح ایک شخص اندھا ہو سکتا ہے اور کس طرح اس قسم کا جاہلانہ موقف اختیار کر سکتا ہے۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے رویہ کی وجہ سے انگشت بدنداں ہیں ’ادھر ان کی حالت یہ ہے کہ مسئلہ کی اس قدر وضاحت کے باوجود ’عقیدہ توحید اور بعث بعد الموت کے مسائل کے واضح ہونے کے باوجود ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں ان کی فطرت مسخ ہو چکی ہے۔ اور وہ مذاق کرتے ہیں۔ بلکہ وہ مذاق طلب کرتے ہیں۔ دوسروں کو بھی مذاق کی دعوت دیتے ہیں۔ لفظ (یَسْتَسْخِرُونَ) سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔

ان کے مذاق اور ناظمی کا ایک نمونہ یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید کو جادو کہتے ہیں اور اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ قرآن کریم موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے نظریہ کی دعوت دیتا ہے۔

وَقَالُوا إِن هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (۳۷: ۱۵) ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا

لَمُبْعُوثُونَ (۳۷: ۱۶) اَوْ اٰبَاؤُنَا اَلْاَوَّلُونَ (۳۷: ۱۷) ”اور وہ کہتے ہیں یہ تو صریح جادو ہے۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا ہجرہ جائیں تو ہم پھر زندہ کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباد اجداد بھی اٹھائے جائیں گے۔“

اپنے ماحول میں اللہ کی قدرت کے آثار کے دیکھنے سے یہ لوگ غافل ہیں ’خود اپنی ذات کے اندر اللہ کی قدرت کے آثار یہ دیکھ نہیں پاتے۔ زمین اور آسمانوں کی تخلیق کے اندر جو آثار پائے جاتے ہیں ان سے بھی یہ غافل ہیں۔ ستاروں ’سیاروں اور شہاب ثاقب پر بھی غور نہیں کرتے۔ ملائکہ ’شیاطین کی تخلیق پر غور نہیں کرتے۔ خود اپنی تخلیق پر غور نہیں کرتے کہ کسی طرح ایک لیس دار گارے سے ان کو بنایا گیا۔ یہ سب آثار قدرت ان کی نظروں سے اوجھل ہیں اور تعجب کرتے ہیں اس بات پر کہ جب وہ مر سٹ جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو انہیں دوبارہ کس طرح اٹھایا جائے گا اور پھر اگلے دور کے آباء کو کس طرح اٹھایا جائے گا۔ جن کی ہڈیاں بھی نہیں۔ حالانکہ اس طرح دوبارہ اٹھائے جانے میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ بعید الامکان ہے۔ صرف معمولی غور و فکر کی ضرورت ہے اور انفس و آفاق کے مذکورہ مشاہدات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

--- () () ---

اگر یہ لوگ اس جہاں میں ان مشاہدات پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر نہیں کرتے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے سامنے یہ ہولناک منظر پیش فرماتا ہے کہ اب یہ لوگ گویا موت کے بعد اٹھ دیے گئے ہیں۔ قیامت کے اس منظر کی تصویر کشی اس قدر خوفناک انداز میں کی گئی ہے کہ اس میں وہ ماہذب آب کی طرح مضطرب نظر آتے ہیں۔

قُلْ تَعْمَرُوا أَنْتُمْ دَاخِرُونَ ۝۱۱

”ان سے کہو ہاں اور تم (خدا کے مقابلے میں) بے بس ہو۔“ ہاں تم اور تمہارے آباء و اجداد ازمنہ قدیم والے بھی اٹھائے جائیں گے۔ اور نہایت ہی بے بسی کی حالت میں ذلیل اور گرفتار کر کے یوں کہ سرپاں کی بجاں نہ ہوگی۔ اور یہ کس طرح ہو گا۔ ذرا دیکھو اس منظر کو اب قیامت کا ایک طویل منظر پیش کیا جاتا ہے۔ اس منظر کے پیش کرنے کا اسلوب منفرد ہے۔ زندہ اور متحرک ہے۔ مکالمے اور حرکات سے بھرپور ہے۔ کبھی بیانیہ انداز کلام ہے اور کبھی مکالمے کی شکل میں ہے اور کبھی واقعات پر بیچ میں تبصرہ آ جاتا ہے۔ چنانچہ کلام کے اعلیٰ ترین خصوصیات پر یہ منظر مشتمل ہے۔

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَإِذَا هُمْ يَنْظُرُونَ ۝۱۲

”بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں گے۔“ یعنی پلک جھپکتے ہی وہ یہ منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ بس ایک تنبیہ آمیز چی ہوگی۔ (زجرۃ) کا لفظ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ اس میں سختی کلام ہوگی۔ ایک برتر اتھارٹی کی طرف سے حاکمانہ چی۔ اس چی کے ساتھ ہی وہ اپنی نظروں کے سامنے سب کچھ دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ منظر ان کے سامنے اچانک بغیر کسی تمہید کے ہو گا۔ یہ لوگ حواس باختہ ہو کر بیٹھنے چلائے لگیں گے۔

وَقَالُوا يُوَيْلَنَا هَذَا يَوْمُ الدِّينِ ۝۱۳

”اس وقت یہ کہیں گے ہائے ہماری کم سختی یہ تو یوم الجزا ہے۔“ یہ لوگ اسی حالت میں ہوں گے اہل کے حواس ابھی تک درست نہ ہوں گے کہ اچانک ان کے کانوں سے ایک دوسری سخت سواز گونجے گی، بالکل خلاف توقع!

هَذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝۱۴

”یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔“ اب یہاں انداز کلام ”بیانی“ اور ”خبری“ سے بدیں کر خطاب کی شکل اختیار کر رہا ہے اور خطاب ان لوگوں سے ہے جو مرنے کے بعد اٹھائے جائے کی تکذیب کرتے تھے۔ ایک سخت حکم ہے جو ان کے کانوں سے بڑی سختی سے گونجتا ہے۔ فیصلہ کن انداز میں۔ اور اس کے بعد روئے سخن اللہ کے کارندوں کی طرف۔

أَحْشَرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ۝۱۵

يُنْ دُونِ اللَّهِ قَاهِدًا وَسُورًا إِلَى صِرَاطِ الْحَيٰثِيَّةِ ۝۱۶ وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مِنَ الْمُنْجَرِّ

مَسْئُولُونَ ﴿۷۳﴾

(حکم ہو گا) ”گھیر لاؤ سب غلاموں اور ان کے ساتھیوں اور ان معبودوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر بندگی کیا کرتے تھے ‘پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ اور ذرا انہیں گھیراؤ‘ ان سے کچھ پوچھنا ہے۔“

گھیر لاؤ اور اٹھا لاؤ گرفتار کر کے ان لوگوں جنہوں نے ظلم کیا اور جو غلاموں کی صف میں تھے۔ یہ ایک جیسے ہیں۔ اس لیے ان کو جوڑ۔ نہٹیا اور ان کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔ انداز کلام کس قدر سخت فیصلہ کن اور توہین آمیز ہے۔

فَاهْذُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَجِیمِ (۲۳:۳۷) ”ان کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔“ جنت کا راستہ تو ان کو دکھایا جا رہا تھا لیکن انہوں نے اسے رد کر دیا۔ اب جہنم کا راستہ ہی ان کے لیے رہ جاتا ہے جو ان کے لائق ہے۔

چشم زدن میں ان کو جہنم رسید کر دیا گیا۔ جہنم تک پہنچا دیا گیا لیکن ایک ضمنی حکم میں کہا گیا کہ ذرا گھیراؤ ان کو ‘ ان سے کچھ پوچھتی لیا جائے اور اچانک ان کو ملامت سے بھرپور انداز میں خطاب کیا جاتا ہے۔ سوالیہ انداز میں مکالمہ ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُونَ ﴿۷۴﴾

”دیکھا ہو گیا تمہیں ‘ اب کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔“ اب کیا وجہ ہے کہ تم یہاں کوئی اجتماعی بچاؤ کی تدبیر نہیں کرتے۔ یہاں تو تم سب کھڑے ہو اور اب تمہیں ایک دوسرے کی لہذا کی بہت ضرورت بھی ہے۔ اور وہ دیکھو تمہارے وہ معبود بھی کھڑے ہیں جن کی دنیا میں تم بندگی کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ان کے پاس نہ کوئی جواب ہے اور نہ وہ بات کر سکتے ہیں۔ یہ سواں تو کیا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس پر ایک تبصرہ ہو۔

بَلْ هُمُ الْیَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ ﴿۷۵﴾

”اے ‘ آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کیے دے رہے ہیں۔“ یعنی ہر ایک اپنے آپ کو بے بسی میں دوسرے کے حوالے کر رہا ہے ‘ بندگی کرنے والے ہوں کہ معبود ہوں۔

اب یہاں خطابي انداز کلام کو بدل کر پھر مطالبتي اور بیانیہ انداز سامنے آتا ہے۔ اس منظر میں یہ ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں۔

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿۷۶﴾ قَالُوا إِنَّا كُنَّا نَسْتَشِيرُ

تَأْتُونَنَا عَنِ الْیَمَنِ ﴿۷۷﴾

”اس کے بعد یہ ایک دوسرے کی طرف مڑیں گے اور باہم پھر پھر شروع کر دیں گے۔ (بیرونی کرنے والے اپنے

پیشواؤں سے) کہیں گے ”تم ہمارے پاس سیدھے رخ سے آتے تھے۔“
یعنی تم سیدھے رخ سے آکر ہمارے دلوں میں دسو سے ڈالتے تھے، بالعموم جب کسی کے کان میں کوئی بات ڈالتا ہے تو وہ دائیں جانب سے آتا ہے۔ لہذا تم ہماری اس حالت کے دمہ دار ہو۔
اور ان کا جواب یہ آتا ہے کہ تمہارا یہ الزام امتقانه ہے۔ تم خود اپنے کیے کے دمہ دار ہو، جو فیصد کیا تم نے کیا۔

قَالُوا بَلْ لَّمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿۳۸﴾

”وہ جواب دیں گے ”نہیں بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہ تھے۔“ یہ ہمارا دوسرا ہی نہ تھا جس نے تمہیں گمراہ کیا بلکہ تم تو ایمان ہی نہ لائے تھے اور تم نے تو ہدایت کو قبول ہی نہ کیا تھا۔

وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ﴿۳۹﴾

”ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا۔“ کہ ہم نے تمہیں اس رائے کے اختیار کرنے پر مجبور کیا جو ہماری تھی۔ ایسا نہ تھا کہ تم ایک رائے کو اختیار کرتا تو نہ چاہتے تھے اور ہم سے تم سے زبردستی کر کے اس رائے کے اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۴۰﴾

”تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔“ تم خود ہی حد سے گزرنے والے تھے۔ کسی حد پر رکنے والے نہ تھے۔

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا اِنَّآ لَذٰٰۤیْقُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمۡ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾

”آخر کار ہم اپنے رب کے اس فرمان کے مستحق ہو گئے کہ ہم عذاب کا مزہ چکھنے والے ہیں۔ سو ہم نے تم کو بہکایا، ہم خود بیکے ہوئے تھے۔“

لہذا ہم لوگ اور تم لوگ دونوں عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔ وہ ڈراوا اب ہم پر حق بن کر آگیا ہے۔ اب ہمارے لیے عذاب کا مزہ چکھنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ تم لوگ ہمارے ساتھ اس لیے آگئے تھے کہ تم ہمارے راستے پر چلنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ تم ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔

فَاَغْوَيْنٰكُمۡ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ (۳۷:۳۲) ”سو ہم نے تم کو بہکایا، ہم خود بیکے ہوئے تھے۔“ اب یہاں اس صورت حال پر ایک دوسرا تبصرہ آتا ہے۔ یہ گویا عدالت، کھلی عدالت کا ایک فیصلہ ہے۔ جس کے اندر دلائل بھی موجود ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں یہ لوگ ایسے کام کرتے رہے۔ اس لیے آخرت میں ان کے ساتھ یہ سلوک ردوار کھا گیا:

فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍۭ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ

بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْۤا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

وَيَقُولُونَ إِنَّا لَنَارِكُوا إِلَهَئِنَّا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ﴿۳۱﴾

”اس طرح وہ سب اس روز عذاب میں مشترک ہوں گے۔ ہم مجرموں کے ساتھ ہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا ”اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔“ تو یہ تمہذ میں آجاتے تھے اور کہتے تھے ”کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟“ اور یہ تبصرہ اور یہ فیصلہ ان لوگوں کی سررہش پر ختم ہوتا ہے جنہوں نے دنیا میں یہ رائے اختیار کی تھی جبکہ یہ رائے نہایت ہی گھٹیا رائے تھی۔

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۳۲﴾ إِنَّكُمْ لَنَآيِقُوا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۳۳﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۴﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلِصِينَ ﴿۳۵﴾

”حالانکہ وہ حق سے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی۔ (اب ان سے کہا جائے گا کہ) تم لازماً دردناک سزا کا سزا بخشنے والے ہو۔ اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جا رہا ہے انہی اعمال کا دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو..... مگر اللہ کے پیچیدہ بندے (اس انجام بد سے) محفوظ ہوں گے۔ مجرموں کے خلاف فیصلہ سناتے ہوئے اوپر اللہ کے مخلص بندوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا کہ وہ عذاب الیم سے بچ گئے تھے۔ اس مناسبت سے قیامت میں ان کے انجام کی ایک جھلک بھی دکھا دی جاتی ہے۔ ان مجرموں کے عذاب الیم کے بالقابل وہ انعامات بھی رکھ دیئے جاتے ہیں۔ جن میں وہ مزے لے رہے ہوں گے۔ اندازیوں ہے کہ ایک منظر کے بالقابل دوسرا منظر۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿۳۶﴾ فَوَاكِهُ وَهُمْ مُكْرَمُونَ ﴿۳۷﴾ فِي جَنَّاتٍ النَّعِيمِ ﴿۳۸﴾ عَلَى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿۳۹﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ ﴿۴۰﴾ بَيضَاءَ لَذَّةٍ لِلشَّرِيبِينَ ﴿۴۱﴾ لَا فِيهَا غَوْلٌ ﴿۴۲﴾ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ﴿۴۳﴾ وَعِنْدَهُمْ قُصْرَاتُ الظُّرْفِ عِوًى ﴿۴۴﴾ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ﴿۴۵﴾

”ان کے لیے جانا بوجھا رزق ہے، ہر طرح کی لذیذ چیزیں اور نعمت بھری جنتیں جن میں وہ عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے۔ چٹوں پر آنے والے سائے بیٹھیں گے۔ شراب کے چشموں سے ساغر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے۔

چمکتی ہوئی شراب جو پینے والوں کے لیے لذت ہوگی۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہو گا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی، خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی، ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی تھلی۔

جنت کی نعمتیں کیسی ہوں گی؟ اس میں نعمتوں کا ہر رنگ ہو گا جس میں نفس انسانی کی غذا بھی ہوگی اور انسانی احساسات اور انسانی جسم سب کے لیے متاع ہو گا۔ مزید یہ کہ وہاں جو نفس جو کچھ چاہے گا وہ اسے ملے گا۔ قسما قسم انعامات اس لیے کہ یہ لوگ سب سے پہلے تو اللہ کے کرم بندے ہیں، اللہ کی بندگی انسان کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ پھر عالم بالا میں وہ محرز ترین مہمان ہوں گے۔ یہ ان کے آرام کی جگہ ہوگی اور وہاں ان کو کوئی مشقت اور زیوٹی نہ کرنا ہوگی۔ پھر مزید یہ کہ آرام کے ساتھ اللہ کی رضامندی بھی انہیں حاصل ہوگی۔ جو سب سے بڑی نعمت ہوگی۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ (۴۵:۳۷) بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ (۴۶:۳۷)

لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ (۴۷:۳۷) ”شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان بھرائے جائیں گے چمکتی ہوئی شراب جو پینے والوں کے لیے لذت ہوگی۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہو گا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی۔“ یہ جنت کی شراب کی نہایت ہی خوبصورت تعریف ہے کہ اس سے شراب کی لذت تو ہوگی لیکن شراب کے معذرات اس میں نہ ہوں گے۔ اس میں نشہ نہ ہو گا جس سے سرچکر آجائیں گے۔ اور نہ اس میں کی ہوگی کہ بھی ملے اور بھی نہ ملے اور مزہ جاتا رہے۔

وَعِنْدَهُمْ قَصْرٌ مِّنَ الطَّرَفِ عِينٍ (۴۸:۳۷) ”اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی۔“ نہایت حیا دار، نظریں اپنے خاوندوں کے سوا کسی پر نہ اٹھیں گی بوجہ حیا و عفت۔ اور ان کی آنکھیں بہت ہی خوبصورت ہوں گی۔ وہ نہایت محفوظ، نرم و نازک اور پتلے ہوں گی۔

كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ (۴۹:۳۷) ”جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی تھلی“ یہ جملی ایسی ہوتی ہے کہ نہ اس کو کسی کا ہاتھ لگ سکتا ہے اور نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے اور ہوتی بھی نرم و نازک ہے۔

یہ تصویر کشی ابھی جاری ہے۔ اللہ کے یہ قلعے اور نیک بندے جو جنت کے متاع اور عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں، نہایت ہی خوشگوار موزا میں باہم گفتگو بھی کرتے ہیں۔ اس گفتگو میں اپنے ماضی اور حال پر بحث کرتے ہیں جبکہ اس سے قبل ہم پڑھ آئے ہیں کہ بحرین بھی باہم سخن طعن کرتے تھے۔ چنانچہ جنتیوں میں ایک شخص دوسروں کے سامنے اپنے حالات رکھتا ہے۔

فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۖ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۖ يَقُولُ أَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ ۖ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا

كُرَابًا وَّ عِظَامًا ۖ اِنَّا لَمَدِيُونُونَ ﴿۵۳﴾

”پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر حامات پوچھیں گے۔ ان میں سے ایک کے گا، ”دنیا میں میرا ایک ہم نشین تھا جو مجھ سے کہا کرتا تھا، کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟ کیا واقعی جب ہم مر چکے ہوں گے اور مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پتھر بن کر رہ جائیں گے تو ہمیں جزا و سزا دی جائے گی؟“

اس جنتی کا یہ دوست وقوع قیامت اور حساب و کتاب کا منکر تھا اور وہ اس جنتی کو ملامت کرتا تھا کیا تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ لوگ قیامت میں دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور ان کا حساب و کتاب ہو گا۔ اس کے بعد کہ وہ مٹی ہو جائیں اور محض ہڈیاں رہ جائیں گی۔

یہ جنتی اپنے ساتھیوں کے ساتھ محو گفتگو ہے کہ اچانک اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ ذرا تلاش تو کرے کہ اس کے دوست کا انجام کیا ہوا ہے۔ اسے یقین ہے کہ جنت میں تو وہ ہو نہیں سکتا لہذا جہنم میں ہو گا۔ وہ خود بھی تلاش کرتا ہے اور دوستوں سے بھی پتا ہے کہ اسے تلاش کیا جائے۔

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّظْلَعُونَ ﴿۵۴﴾ ۖ فَاُظْلَعُ فَرَآكَ فِي سَوَاءٍ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾

”اب کیا آپ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ صاحب لب کہاں ہیں؟“ یہ کہہ کر جو نئی وہ بھکا تو جہنم کی گمرانی میں اس کو دیکھ لیا۔

اب یہ جنتی اپنے دوزخی دوست سے ہم کام ہوتا ہے۔ اس نے جہنم میں دیکھ لیا۔ یہ اس سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔ اے فلاں، قریب تھا کہ اپنی وسوسہ اندازیوں کی وجہ سے تو مجھے ہلاک کر دیتا۔ یہ تو مجھ پر اللہ کا انعام تھا کہ اس نے مجھے بچا لیا اور میں نے تیری باتوں پر توجہ نہ دی۔

قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتُ لَتُرْدِيْنَ ﴿۵۶﴾ ۖ وَلَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ

مِنَ الْمُحْضَرِّيْنَ ﴿۵۷﴾

”اور اس سے خطاب کر کے کہے گا، ”خدا کی قسم، تو تو مجھے جاہلی کر دینے والا تھا۔ میرے رب کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو آج میں بھی ان لوگوں میں سے ہوتا جو پکڑے ہوئے آئے ہوں۔“

یعنی میں بھی ان لوگوں میں سے ہوتا جنہیں پکڑ کر پھری میں لایا جاتا ہے اور وہ دراصل پیشی نہیں چاہتے۔ اس دوست کو دیکھو وہ اپنی خوشحالی اور نیک انجامی کو بیان کر کے اپنی خوشی میں اضافہ کرتا ہے۔ جب کہ اس کا دوست جہنم کے بیچ میں پڑا ہے اور یہ اور اس کے دوست انعامات الہیہ میں زدبے ہوئے ہیں۔ یہ تحدیثِ نعمت ہے، دوامِ نعمت پر خوشی کا اظہار ہے اور یوں لذت میں نفسیاتی اضافہ۔

اَفَمَا نَحْنُ بِمَبْتَئِيْنَ ﴿۵۸﴾ ۖ اِلَّا مَوْتَنَا الْاُولٰٓئِ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾

”اچھا تو کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں؟ موت جو ہمیں آنی تھی وہ بس پہلے آ چکی؟ اب ہمیں کوئی عذاب نہیں

ہوتا؟“ لب یہاں قرآن ایک تہرہ لاتا ہے جس کے ذریعے قارئین کو اچھے کاموں میں باہم مسابقت اور اچھے انجام کے لیے جد مسلسل پر ابھارا جاتا ہے۔

إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۶۰﴾ لِيُثِلَ هَذَا فَلَْيَعْمَلِ الْعَمَلُونَ ﴿۶۱﴾

”یقیناً یہ عظیم الشان کامیابی ہے۔ لیکن ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے۔“

اس قسم کے اچھے انجام کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے جو دائمی ہے۔ جس کے ختم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جس کے بعد کوئی موت نہیں ہے۔ جس کے بعد کسی عذاب اور سزا کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ انجام ہے جس کی فکر ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی اس زمین پر ہے اور جس کے لیے اہل زمین عموماً کھا دیتے ہیں وہ بیچ ہے۔ اس اخروی انجام کے مقابلے میں جو دائمی ہے۔

یہاں فریق مخالف کے انجام کا منظر بھی دے دیا جاتا ہے جو قیامت اور حشر و نشر کا منظر تھا تاکہ اہل جنت کے اچھے دائمی پرائس اور ہمہ گیر پیش اور اچھے انجام کی اہمیت اور اجاگر ہو جائے اہل جہنم کا انجام یہ ہو گا۔

أَذَلَّكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ﴿۶۲﴾ إِنْ كَا

جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِلظَّالِمِينَ ﴿۶۳﴾ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا

كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ﴿۶۵﴾ فَإِنَّهُمْ لَا يَكُلُونَ مِنْهَا فَمَا لَهُمْ مِنْهَا الْبُطُونِ ﴿۶۶﴾

ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَا إِلَى الْجَحِيمِ ﴿۶۸﴾

”بولو! یہ ضیافت اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟ ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے قند بنا دیا ہے۔ وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔ اس کے ٹکڑے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔ جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھرئیں گے، پھر اس پر پینے کے لیے ان کو کھولا ہوا غیر خالص پانی ملے گا اور اس کے بعد ان کی ویسی اسی آتش دوزخ کی طرف ہوگی۔“

یہ قائم اور دائم نعمتیں بہتر ہیں اور جنت بہتر ہے قائم ہے۔ یا زقوم کا درخت بطور خوراک اور جہنم جائے قیام بہتر ہے اور زقوم ہے کیا؟

إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ (۶۴: ۳۷) طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ

الشَّيَاطِينِ (۶۵: ۳۷) ”وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔ اس کے ٹکڑے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔“ اور لوگ شیطانوں کے سروں کو نہیں جانتے۔ لہذا ان کی سمجھ میں کیا ہے ۱۰ یہ دراصل ایک خوفناک صورت حال ہے۔ اس کا محض تصور ہی خوفناک ہے۔ چہ جائیکہ وہ اسے کھائیں گے اور اس سے اپنے پیٹ بھرئیں

گے۔

اللہ نے اس درخت کو خالوں کے لیے ایک آزمائش بنا دیا ہے جب وہ زقوم کا نام سنتے تھے تو اس کے بارے میں مذاق کرتے تھے کہ کس طرح یہ درخت جہنم میں آگ سکے گا۔ کیا جلے گا نہیں؟ بعض لوگوں نے کہا 'مثلاً ابو جہل بن ہشام نے نہایت ہی حراہ انداز میں "لے اٹھ کر پیش تمہیں معلوم ہے کہ زقوم کا درخت کیا ہے؟ محمد تمہیں اس سے ڈراتا ہے تو انہوں نے کہا: ہمیں تو معلوم نہیں۔ اس نے کہا یہ عثب کے عمدہ کھجور اور کھن ہو گا اور اگر یہ ہمیں دستیاب ہو تو ہم اسے ضرور نکل جائیں گے"۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ یہ زقوم کا درخت ایک دوسری چیز ہے جسے انسانوں نے نہیں چکھا۔ اور نہ جانتے ہیں۔

فَاتَّهُمْ لَاكُلُونِ مِنْهَا فَمَا لَتَوْنَ مِنْهَا الْبَطُونَ (۳۷: ۶۶) "جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے"۔ اور اس کے کھانے میں اور نکلنے میں ان کو تکلیف ہوگی کیونکہ یہ تو شیاطین کے سروں جیسا ہو گا۔ اور اس سے ان کے پیٹ جل اٹھیں گے۔ اس لئے کہ یہ تو پیدا ہی جہنم میں ہو گا۔ اور یہ خود نہیں جلے گا یہ ہو گا ہی آگ کی نوعیت کا۔ اب یہ پانی کی طرف متوجہ ہوں گے تاکہ پیاس بجھاسکیں۔ چنانچہ پینے کے لیے ان کو غیر خالص پانی ملے گا۔

ثُمَّ اِنْ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ (۳۷: ۶۷) "پھر پینے کے لیے ان کو کھوٹا ہوا غیر خالص پانی ملے گا"۔ اور اس کے بعد یہ لوگ اس دسترخواں سے اٹھیں گے اور اپنے اصل مقر جہنم کی طرف جائیں گے۔ کیا ہی برا مقام اور جائے فرار ہے۔ اللہ کی پناہ۔

ثُمَّ اِنْ مَرَجَعَهُمْ لَا اِلٰى الْجَحِيمِ (۳۷: ۶۸) "اس کے بعد ان کی واپسی اسی آتش دوزخ کی طرف ہوگی"۔ یوں اس منفرد منظر کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اور اس سورت کا پہلا سبق ختم ہوتا ہے۔ گویا یہ منظر لیک دیکھا ہوا منظر ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۰۹ تشریح آیات

۶۹ --- تا --- ۱۴۸

اس سبق میں سیاق کلام عالم آخرت 'اللہ کی نعمتوں اور قیامت میں اللہ کی سزاؤں سے نکل کر لب انسانی تاریخ اور ام ماضیہ کے حالات میں داخل ہوتا ہے۔ انسانیت کے آغاز سے قصہ ہدایت و ضلالت کو لیا جاتا ہے۔ یہ قصہ تمام اقوام کے ہاں ایک ہی ہے اور نظر آتا ہے کہ مکہ کے مکرین جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تکذیب کرتے ہیں۔ وہ سابقہ مکذبین کے بقایا اور نمونہ ہیں۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ تم سے پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے۔ یوں ان کے دلوں کے سامنے انسانی تاریخ کے قدیم ترین صفحات رکھے جاتے ہیں۔ ان قصص میں نل ایمان کے لیے بھی اطمینان کا سامان ہے کہ پوری انسانی تاریخ شاہد ہے کہ اللہ نے ہمیشہ نل ایمان کا خیال رکھا ہے۔

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے قصے کا ایک رخ حضرت ابراہیم 'اسماعیل 'اسحاق 'موسیٰ 'ہارون 'الیاس 'لوط اور یونس علیہم السلام کے قصص کے بعض حصے قارئین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کے حالات وراطوات کے ساتھ لیے گئے ہیں جن میں عظمت ایمان 'قربانی 'اطاعت اور ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کے رہنوں میں اسلام کا جو تصور تھا وہ یہاں بیان کیا جاتا ہے اور اس میں ان کے قصے کا ایک ایسا حلقہ دیا جاتا ہے جو اس سورت کے سوا کسی دوسری سورت میں نہیں دیا گیا۔ اس سبق کا بنیادی مواد انہی قصص پر مشتمل ہے۔

إِنَّهُمْ أَكْثَرُ الْأَوَّلِينَ ۝ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُنْذِرِينَ ۝ فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذِرِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۝

ع ۵۳

”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا اور انہی کے نقش قدم پر درڑ چلے حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے تھے۔ اور ان میں ہم نے تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے۔ اب دیکھ لو کہ ان تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بد انجامی سے بس اللہ کے دئیے بندے بچے ہیں جنہیں اس آیت ۱۵۰ کے لیے خالص کر لیا ہے۔“

یہ لوگ ضلالت اور گمراہی میں غرق ہو چکے ہیں۔ یوں کہ وہ ہر بات میں آبا و اجداد کی تقلید کرتے ہیں۔ کسی پیش آمدہ

معا ملے پر غور و فکر نہیں کرتے۔ بلکہ یہ جلد بازوں کی طرح اڑتے اور دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ آباء و اجداد کے قدموں پر قدم رکھتے چلے جا رہے ہیں، بغیر سوچے اور بغیر عقل سے کام لیتے ہوئے اور وہ چونکہ گمراہ تھے لہذا یہ بھی گمراہ ہیں۔

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَاءَهُمْ ضَالِّينَ (۳۷: ۶۹) فَهُمْ عَلٰی اٰثَرِهِمْ يَهْرَعُوْنَ (۳۷: ۷۰)
 ”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے باپ، دادا کو گمراہ پایا اور انہی کے نقش قدم پر دوڑتے چلے گئے۔“ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اور ان کے آباء و اجداد اسی گمراہی پر تھے جس میں اکثر مکذبین مبتلا تھے۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلٰیْنَ (۳۷: ۷۱) ”حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے ہیں۔“ اور یہ گمراہی اس کے باوجود تھی کہ ہم نے ان کی خاطر ارانے والے بھیجے تھے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (۳۷: ۷۲) ”اور ان میں ہم تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے۔“

لیکن ان لوگوں کا کیا انجام ہوا اور اللہ کے مخلص بندوں کا انجام کیا ہوا؟ یہ سب آپ کو انبیاء کے قصص سے معلوم ہو جائے گا۔ یہ بات یہاں محض متوجہ کرنے کے لیے کہی جا رہی ہے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ (۳۷: ۷۳) اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ
 (۳۷: ۷۴) ”اب دیکھ لو، ان تنبیہ کیے جانے والوں کا انجام کیا ہوا، اس بد انجامی سے بس اللہ کے وہی بند بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا۔“

اب قصہ نوح کا آغاز کیا جاتا ہے اور اس میں اللہ کے نیک بندوں کا انجام نہایت ہی تیزی سے بتا دیا جاتا ہے اور یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ اللہ اپنے مخلص بندوں کے انجام کا لحاظ رکھتا ہے۔

وَلَقَدْ نَادَيْنَا نُوْحًا فَلْيَنْعَمِ الْمُجِيبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجِّنْهُ وَاَهْلَهُ
 مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي
 الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلَامٌ عَلٰی نُوْحٍ فِي الْعَالَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي
 الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۲﴾

”ہم کو (اس سے پہلے) نوح نے پکارا تھا، تو دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے۔ ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو کرب عظیم سے بچا دیا۔ اور اسی کی نسل کو باقی رکھا، اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی۔ سلام ہے نوح پر تمام دنیا والوں میں۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہمارے مومن

بندوں میں سے تھا۔ پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا۔“

اس میں حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے رب تعالیٰ سے کی تھی۔ اور اللہ نے ان کی دعا کو پوری طرح قبول فرمایا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دعا کا جواب دینے والا ہے۔

فَلَنَعْمَ الْمُجِيبُونَ (۷۵:۳۷) ”ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے۔“ اور اللہ نے ان کو اور ان کے اہل و عیال کو کرب عظیم سے نجات دی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ طوفان تھا جس سے صرف وہی لوگ بچے جن کے بچانے کا اللہ نے ارادہ کر لیا تھا۔ اور جن کی زندگی ابھی باقی تھی اور اللہ کی تقدیر میں جن لوگوں کے بارے میں لکھا تھا کہ اللہ نوح کی اولاد سے ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جنہوں نے اس زمین پر بطور خبیثہ اللہ کام کرنا تھا اور اس زمین کو آباد رکھنا تھا کہ حضرت نوح کا ذکر آنے والی نسلوں میں باقی رہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۷۸:۳۷) ”اور بعد کی نسلوں میں ان کی تعریف و توصیف چھوڑ دی۔“ اعلان کیا جاتا ہے کہ دونوں جہانوں میں نوح پر سلامتی ہوگی اس لیے کہ انہوں نے نیک راہ اختیار کی۔

سَلَّمَ عَلَى نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ (۷۹:۳۷) اِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ

(۸۰:۳۷) ”سلام ہے نوح پر تمام دنیا والوں میں۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزاء دیا کرتے ہیں۔“ اللہ کے سلام کے بعد اور کیا جزاء درکار ہے کسی بندے کو۔ اور تمام جہاں میں قیامت تک کسی کے نام کو باقی رکھنے کے بعد اور کیا انعام ہے کسی بندے کے لیے۔ احسان اور اس کے بعد انعام کا حقیقی سبب بہر حال ایمان ہے۔ اس لیے کہا گیا۔

اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ (۸۱:۳۷) ”در حقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔“ اور یہی جزاء ہے اہل ایمان کی۔ رہے وہ لوگ جو قوم نوح سے غیر مومن تھے تو ان پر اللہ نے ہلاکت اور فساد ہی دی تھی۔

ثُمَّ اغْرَقْنَا الْآخِرِينَ (۸۲:۳۷) ”پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا۔“ لہذا انسانیت کے آغاز ہی سے سنت ایسی ہی رہی ہے جس طرح ان قصص کے آغاز میں کہا گیا۔

وَلَقَدْ ارْسَلْنَا فِيهِمْ مُنْذِرِينَ (۷۲:۳۷) فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِينَ

(۷۳:۳۷) اَلْاَعْبَادَ اللّٰهُ الْمُخْلِصِينَ (۷۴:۳۷) ”اور ان میں ہم نے تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے۔ اب دیکھ لو کہ ان تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بد انجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے۔“

--- ○ ○ ○ ---

اس کے بعد حضرت ابراہیم کا قصہ آتا ہے۔ اس قصے کی دو کڑیاں یہاں لائی گئی ہیں۔ پہلی کڑی میں آپ اپنی قوم کو

دعوت دیتے ہیں۔ بتوں کو توڑتے ہیں 'لوگ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور اللہ کے حکم سے ان کے لیے آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور قہر کا یہ حصہ کئی دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے۔ اور دوسری کڑی وہ ہے جو صرف اسی سورت میں آئی ہے 'یعنی خواب 'ذبح اور فدیہ۔ یہ کڑی نہایت ہی تفصیل کے ساتھ آئی ہے جس کے واقعات اور مراحل کو نہایت ہی تفصیلات کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اسلوب کلام نہایت موثر 'دکھل اور پرشکوہ ہے۔ اس کڑی کے اندر حلیم و رضا 'سمیع و طاعت کا اعلیٰ معیار اور اعلیٰ مثال پائی جاتی ہے۔ انسانی نظریات کی تاریخ میں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ہے۔

وَإِن مِّن شَيْعَةٍ لِّابْرَاهِيمَ ؑ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ؑ
إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ ؑ أَفِيكَ إِلَٰهَةٌ دُونَ اللَّهِ تُرِيدُونَ ؑ
فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ؑ

”اور نوح ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیم تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا۔ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا ”یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو؟ آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟“

یہ اس قہر کا آغاز ہے اور قہر کے اندر پہلا منظر ہے۔ نوح سے اب ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام تک آگئے۔ ان دونوں انبیاء کی دعوت 'نظریہ اور منہاج دعوت ایک ہے۔ اگرچہ دونوں کے درمیان زمان و مکان کے فاصلے ہیں لیکن دونوں ایک ہی گروہ کے لوگ ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کا دیا ہوا نظام زندگی ایک ہے۔ اور اس زاویہ سے یہ دونوں باہم مربوط ہیں اور ان کا تعلق ایک ہی سلسلہ سے ہے جس میں وہ باہم شریک ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کی صفات میں قلب کی سلامتی 'عقیدے کی راستی اور خلوص ممتاز صفات ہیں۔

إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (۳۷: ۸۴) ”جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا۔“
قلب سلیم کیا چیز ہے؟ پوری طرح اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا۔ اللہ کے ساتھ پوری محبت رکھنا۔ صاف ستھری 'سیدھی روش سلامت قلبی ہے۔ قلب سلیم کی تعبیر نہایت معنی خیز اور اپنے مفہوم کی واضح تصویر لیے ہوئے ہے۔ تعبیر سادہ اور قریب الغم بھی ہے اور واضح بھی۔ قلب سلیم کے اندر صفائی 'اخلاص 'سیدھاپن اور پاکیزگی کے مفہیم شامل ہیں۔ یہ لفظ بہت ہی سادہ ہے۔ پیچیدہ نہیں۔ اور مذکورہ تمام معانی پر حاوی ہے جبکہ مذکورہ الفاظ کے اندر اس قدر جامعیت نہیں ہے۔ یہ قرآن مجید کا انوکھا انداز تعبیر ہے۔

یہ قلب سلیم ہی تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی قوم کے عقائد کو ناپسند کیا۔ انسان جب صحت مند سوچ رکھتا ہے اور سلیم الفطرت ہوتا ہے تو وہ از روئے طہارت قلب ناپسندیدہ چیز کو ناپسند کرتا ہے۔ تصور میں بھی اور عمل میں بھی۔

اِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَ قَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ (۸۴:۳۷) اِنَّكُمْ اِلٰهَةٌ

دُونِ اللّٰهِ تُرِيدُونَ (۸۶:۳۷) فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۷:۳۷) ”جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم — کہا۔ یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو۔ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو۔ آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے۔“ حضرت دیکھ رہے تھے کہ وہ بتوں اور آستخانوں کو پوجتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی فطرت سلیمہ کی رو سے ان پر شدید گرفت کرتے ہیں کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟

مَاذَا تَعْبُدُونَ (۸۴:۳۷) ”یہ کیا ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔“ یعنی یہ کیا چیزیں ہیں؟ یہ تو اس قابل ہرگز نہیں کہ ان کی بندگی کی جائے یا کوئی ان کا بندہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان ان کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو محض گھڑے ہوئے ہیں، افتراء ہیں اور ان کے من گھڑت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ کیونکہ ان جھوٹے خداؤں کی بندگی کر کے تم عہد افتراء باندھتے ہو۔

اِنَّكُمْ اِلٰهَةٌ دُونِ اللّٰهِ تُرِيدُونَ (۸۶:۳۷) ”جھوٹ گھڑے ہوئے معبود تم چاہتے ہو۔“ یہ تمہارا اللہ کے بارے میں کیا تصور ہے۔ تمہارا تصور اللہ اس قدر گرا ہوا ہے کہ انسانی فطرت سلیمہ پہلی نظر ہی میں اس کا انکار کر دیتی ہے۔

فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۸۷:۳۷) ”آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟“ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت سلیمہ ایسے امر کا پہلی ہی نظر میں انکار کر دیتی ہے جو عقل و ضمیر کے خلاف ہو اور انسانی عقل اور شعور اس کا انکار کرتے ہوں۔

اب سیاق کلام میں ان کی جانب سے کسی جواب کا تذکرہ نہیں ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام از روئے فطرت سلیمہ اور قلب سلیم جس نتیجے تک پہنچے اگلی کڑی میں وہ بتا دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی قوم کھوکھلے من گھڑت عقائد پر تھی۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِی السُّجُومِ فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْطٌ ۝
فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِیْنَ ۝ فَرَاغَ اِلَی الْاِلٰهِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ مَا لَكُمْ لَا
تَنْطِقُوْنَ ۝ فَرَاغَ عَلَیْهِمْ ضَرْبًا بِالْیَمِیْنِ ۝

”پھر اس نے تاروں پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا میری طبیعت خراب ہے۔ چنانچہ وہ لوگ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے پیچھے وہ چپکے سے ان کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا ”آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں؟ کیا ہو گیا؟“ آپ لوگ بولتے بھی نہیں؟“ اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں۔“

روایات میں آتا ہے کہ اس وقت عید یا میلے کا دن تھا۔ شاید نوروز ہو۔ اس دن لوگ شہر سے باہر چلے جاتے تھے۔ رواج کے مطابق وہ اپنے اہل خانہ کے سامنے برائے تبرک پھل رکھتے تھے۔ اور سیر اور تفریح کے بعد وہ یہ مبارک کھانے لیتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے جب معقول باتوں کے مقابلے میں مایوس کن رویہ پایا اور اس نتیجے تک پہنچے کہ ان کے عقائد اور نظریات کے اندر اس قدر بگاڑ پیدا ہو گیا ہے کہ اب ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تو انہوں نے دل میں ایک فیصلہ کر لیا کہ ان کو ذرا تلخ سبق دیا جائے۔ آپ نے اپنے منصوبے کے لیے اس دن کا انتظار فرمایا۔ کیونکہ اس دن یہ لوگ عبادت گاہوں کو خالی چھوڑ کر باہر چلے جاتے تھے۔ اور حضرت کے لیے اپنے منصوبے پر عمل کرنا ممکن ہو سکتا تھا۔ ان لوگوں کی تنگ نظری اور کج فہمی حضرت ابراہیم کے لیے اب قابل برداشت نہ رہی تھی۔ جب دوسرے لوگوں نے ان سے کہا کہ تم عبادت گاہ کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلو تو آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ میں سیر و تفریح کے لیے نہیں جاسکتا۔ کیونکہ سیر و تفریح اور میلوں میں تو وہ لوگ جاتے ہیں جو عیش و عشرت کرنا چاہیں، جن کے دل خالی ہوں اور ان کے لیے کوئی دلچسپی یا اہم کام پیش نظر نہ ہو۔ حضرت ابراہیم تو ہر وقت پریشان تھے۔ اپنی قوم کی اس بیماری کی وجہ سے۔ اس لیے ان کے قلب سلیم کو سیر و تفریح میں خوشی کب نصیب ہوئی تھی۔

بہر حال لوگ جلدی میں تھے تاکہ جائیں اور اپنے رسم و رواج کے مطابق اپنی عید منائیں۔ اس لیے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی زیادہ فکر نہ کی بلکہ ان کو چھوڑ کر چلے گئے اور اپنی خوشیاں منانے لگے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ موقع مل گیا جس کی تلاش میں تھے۔

حضرت ابراہیم فوراً ان کے نام نہاد اہل خانہ کے پاس پہنچے۔ ان کے سامنے قسم قسم کے کھانے اور تازہ پھل رکھے ہوئے تھے۔ بطور مزاح حضرت نے فرمایا تم کھاتے نہیں ہو؟ ظاہر ہے کہ بتوں نے اس مزاح کا کیا جواب دینا تھا۔ اب آپ نے ذرا غصے اور کھلے مزاح کے ساتھ کہا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم بات کیوں نہیں کرتے۔ بعض اوقات انسان ایسی چیز سے بطور مزاح ہمکلام ہوتا ہے جس کے بارے میں اس کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ نہیں سنی اور نہ جواب دے سکتی ہے۔ حقیقت کا علم ہوتے ہوئے بھی انسان ایسی باتیں کرتا ہے۔ یہ بات دراصل حضرت ان لوگوں کے پوچھ اور غلط عقائد سے تنگ آ کر کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ بتوں نے جواب تو نہ دینا تھا اور نہ دیا۔ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان کے بجائے آپ کے ہاتھ حرکت میں آ گئے۔

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ (۹۳:۳۷) ”اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں“۔ اب آپ کی بیماری دل گرفتگی اور پریشانی دور ہوئی۔ بالفاظ دیگر آپ کا دل ٹھنڈا ہوا۔

اب یہ منظر ختم ہوتا ہے اور دوسرا منظر سامنے آتا ہے۔ لوگ دلیں ہوئے انہیں علم ہوا کہ ان کے بتوں کے سر پاؤں اور ہاتھ کٹے ہوئے ہیں۔ دوسری سورتوں میں تفصیلات آتی ہیں کہ انہوں نے حقیت کی کس نے یہ کام کیا ہے۔ آخر وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ ابراہیم نام کا ایک شخص ان کے بارے میں بدگویی کرتا ہے۔ بہر حال یہاں اختصار کر کے فریقین کا آمنہ سامنا دکھایا جاتا ہے۔

فَاقْبَلُوا إِلَيْهِ يَزْقُونَ ﴿٩٤﴾

(دلہن آکر) ”وہ لوگ بھاگے بھاگے اس کے پاس آئے۔“ انہوں نے ایک دوسرے سے یہ خبر سن لی تھی۔ یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ کام کرنے والا کون ہے۔ لہذا سب لوگ دو ذکر ابراہیم کے پاس پہنچے۔ سب ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ لوگوں کی بڑی تعداد بلکہ پورا میلہ اکٹھا ہو گیا۔ سب لوگ ایک طرف اور ایک مومن ایک طرف۔ ایک ایسا فرد جو کام کرنا چاہتا ہے۔ ایسا فرد جس کا تصور اللہ واضح ہے جس کا عقیدہ ٹھوس اور متعین ہے۔ وہ اپنے نفس کے اندر اس حقیقت کے طور پر پاتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات میں اسے پاتا ہے۔ یہ ایک فرد ہے لیکن افراد کی اس بھڑلور جم غفیر سے وہ اپنے آپ کو قوی پاتا ہے۔ جن کا عقیدہ درست نہیں۔ جن کا تصور حیات ٹھوس نہیں۔ چنانچہ وہ فطری سچائی کے ساتھ جرات مندانہ طریقے سے ان کو یوں خطاب کرتا ہے۔ اور ان کے کسی رد عمل کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ لوگ اس وقت اشتعال کی حالت میں ہیں اور بڑی تعداد میں ہیں۔

قَالَ اتَّعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ ۖ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

”اس نے کہا ”کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو۔“

یہ ایک فطری استدلال تھا، حضرت ابراہیم نے بائگ دہل ان کے سامنے رکھ دیا کہ تم اپنی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو۔ معبود حق تو وہ ہو سکتا ہے جو سب چیزوں کا بنانے والا ہو نہ کہ اسے کسی سنگ تراش نے تراشا ہو۔

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ (۹۶: ۳۷) ”اللہ تو وہ ہے جس نے تمہیں بھی بنایا اور تمہاری مصنوعات کو بھی بنایا۔“ یہ صانع مطلق اس قابل ہے کہ اس کی پوجا کی جائے۔

اس استدلال کی سادگی اور واضح ہونے کے باوجود لوگوں نے اپنی غفلت اور غلط روش کی وجہ سے اس پر کان نہ دھرا۔ باطل کی روش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ سچائی کے نہایت ہی سادہ اور منطقی استدلال پر کان نہیں دھرتا۔ اور اللہ کی جانب سے جن لوگوں کے ذمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذیوٹی لگائی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ لیل باطل کی طرف سے تشدد سہہ رہے ہیں۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْبَحْرِ حَيًّا ﴿۹۷﴾

”انہوں نے کہا اس کے لیے ایک لٹاؤ تیار کرو اور اسے دھکی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔“ یہ ہے قوت اور طاقت کا استدلال۔ اور آگ اور تشدد جس کے سوا سرکشوں کے پاس اور کوئی استدلال نہیں ہوتا۔ جب بھی دلیل ختم ہوتی ہے اور کوئی سرکش حجت پیش نہیں کر سکتا، وہ تشدد کرتا ہے۔ خصوصاً جبکہ سرکشوں کے سامنے کہ حق پیش کیا جائے اور وہ اسے لاجواب کر دے۔

ان کی اس دھمکی کے بعد کیا ہوا، یہاں قرآن مجید اس کی کوئی صراحت نہیں کرتا۔ اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ لیل حق کو

کامیابی نصیب ہوئی اور مکذبین گھائے میں رہے۔

فَارَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ﴿۵۸﴾

”انہوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا۔“ جب اللہ نہ چاہے تو ضعیف بندوں کی مدد اہر کیا کر سکتی ہیں اور اللہ کے معاملے میں ضعیف اور حقیر بندے کر بھی کیا سکتے ہیں۔ دنیا کے سرکش، جبار، حکمران، ڈکٹر اور ان کے اموال و انصار اللہ کے مقابلے میں بچتے ہوئے ہیں۔ جب اللہ کا فضل اللہ کے بندوں کے شامل حال ہو۔

--- (۱۱۵۰) ---

اب قصہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری کڑی شروع ہوتی ہے۔ اپنے باپ اور اپنی قوم کے ساتھ آپ کا تعلق ختم ہو گیا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ ایک خود ساختہ مجسم (آگ) میں آپ کو جلا دیں۔ اور اللہ نے ارادہ کیا کہ وہ گھائے میں رہیں۔ اور حضرت ابراہیم ان کی سازش سے بچ گئے۔ یہاں آکر حضرت ابراہیم نے اپنی سابقہ زندگی کو خیر باد کہا اور زندگی کے نئے مرحلے کا آغاز کیا۔ سابقہ زندگی کا دفتر لپیٹ لیا گیا اور زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿۵۹﴾

”ابراہیم نے کہا ”میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں“ وہی میری راہنمائی کرے گا۔“ میں رب کی طرف ہجرت کر کے جا رہا ہوں۔ یعنی مسافاتی ہجرت سے قبل یہ نفسیاتی اور نظریاتی ہجرت ہے۔ ایک ایسی ہجرت جس میں وہ اپنی تمام ماضی اور آبائی مقام کو خیر آباد کہہ رہے ہیں۔ اپنے باپ اور قوم کو چھوڑ رہے ہیں۔ اپنے گھر اور وطن کو چھوڑ رہے ہیں۔ ان تمام روابط کو کاٹ رہے ہیں جو انسان کو اس زمین سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں سے وابستہ کر دیتے ہیں تمام رکاوٹوں کو عبور کر کے آگے بڑھ رہے ہیں۔ تمام مصروفیتوں کو ختم کر رہے ہیں۔ تمام بوجھ ہٹکے کر کے اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ تمام چیزوں کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ اپنی پوری ذات کو رب کے سپرد کر رہے ہیں۔ اور اپنی ذات کا کوئی حصہ اپنے لیے نہیں رکھ رہے ہیں انہیں یقین ہے کہ ان کا رب ضرور انہیں ہدایت دے گا۔ ان کی مدد کرے گا اور سیدھی راہ بھجائے گا۔

یہ ایک مکمل ہجرت ہے بلکہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف مکمل انتقال ہے۔ تمام روابط کو کاٹ کر صرف ایک رب سے جڑنا، یہ گویا نہایت ہی یکسوئی، تجرد، خلوص اور سر تسلیم خم کر دینے کا اقدام ہے۔ پورے اطمینان اور پورے یقین کے ساتھ۔

حضرت ابراہیم اس وقت تک اکیلے تھے۔ ان کی کوئی لولاد نہ تھی۔ پیچھے وہ جو کچھ چھوڑ رہے تھے وہ اقرباء اور رشتہ داری کے تعلقات تھے۔ ہر قسم کی دوستی اور آشنائی کو ترک کر رہے تھے۔ ماضی کے تمام موقوفات اور عادات کو ترک کر رہے تھے۔ ان تمام روابط کو کاٹ رہے تھے جو جنم بھوی سے قائم ہو جایا کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم اور ان کے نسل کے درمیان پائے جانے والے تمام روابط کاٹ گئے جنہوں نے ان کو آگ میں ڈالنے کا اقدام کیا۔ اس لیے آپ نے اس عزم

کا ارادہ کر لیا کہ اب میں اللہ کی طرف جا رہا ہوں اور چونکہ لٹل و اہالی رہ گئے اس لیے رشتہ داروں کی جگہ اولاد اور جائیش کے طلبکار ہوئے۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۰﴾

”اے پروردگار! مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔“ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مخلص بندے کی دعا قبول کر لی۔ جس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور قلب مسیم لے کر اللہ کے دربار میں آگیا تھا۔

فَبَشِّرْهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ﴿۱۱﴾

”(اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردار) لڑکے کی بشارت دی۔“ یہ حضرت اسماعیل ہیں جس طرح اس سورت اور سیرت کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اللہ نے ان کے حلیم اور صبر اور بردباری کی تعریف کی۔ جبکہ وہ ابھی لڑکے تھے۔ ہمیں چاہئے کہ اس مقام پر حضرت ابراہیم کی تنہائی، وطن سے جدائی اور اہل قربت سے دوری کے بارے میں سوچیں اور پھر اس بچے کی خوشخبری پر خوشی کا تصور کریں جس کی تعریف رب تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ یہ بچہ غلام حلیم ہو گا۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی، ان کا وہ طرز عمل سامنے آتا ہے جو پوری انسانی تاریخ میں ایک منفرد طرز عمل ہے اور ان کی زندگی میں تو وہ ہر حال تک یا دگار طرز عمل ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو قیامت تک امت مسلمہ کے لیے ایک اعلیٰ و ارفع مثال ہے۔ یہ عمل حضرت ابراہیم نے خود پیش فرمایا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَبْنَىٰٓ أِىٰٓ اَرَىٰ فِى الْمَنَامِ أِىٰٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ
مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَآبَتِ اَفْعَلُ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲﴾

”وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے اس سے کہا ”بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں“ اب تو جاننا کیا خیال ہے؟“ اس نے کہا ”اب جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے“ آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔“

یا اللہ! کیا عظیم ایمان ہے اور تسلیم و رضا کا کیا اعلیٰ مقام ہے۔

یہ ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک بوڑھے، اپنے اقرباء اور رشتہ داروں سے دور، اپنے ملک اور وطن سے دور۔ ان کو بڑھاپے اور کبر سن میں ایک بیٹا عطا ہوتا ہے۔ ایک طویل عرصہ تک انہوں نے اس بچے کا انتظار فرمایا۔ جب اللہ ان کو یہ ممتاز اور ذی صلاحیت بیٹا دیا اور ان کے مرتبہ و مقام کی شہادت دی۔ وہ ابھی ان کے ساتھ اچھی طرح مانوس بھی نہیں ہوا، ابھی بچہ ہے۔ آپ کے ساتھ چلنے پھرنے لگا ہے اور قریب ہے کہ اب وہ زندگی کا ساتھی بن جائے۔ غرض ابراہیم علیہ السلام کی اس بچے سے امیدیں وابستہ ہی ہوئی تھیں کہ وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ وہ اس بچے کو ذبح کر رہے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے اشارہ ہے کہ اس بچے کی قربانی دے دو۔ اب کیا ہوتا ہے؟ آپ بالکل تردد نہیں کرتے۔ آپ کو کوئی شک اور غلجان نہیں ہوتا۔ بس جذبہ اطاعت ہی سامنے آتا ہے۔ آپ تسلیم امر ربی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض اشارہ تھا۔ یہ امر صریح نہ تھا نہ براہ رہبت وحی آئی تھی۔ لیکن آپ نے رب کی طرف سے اشارہ ہی کو کافی سمجھا۔ آپ کے لیے تو اشارہ ہی کافی تھا۔ آپ نے لبیک کہہ دیا۔ اور قبیل پر آمادہ ہو گئے بغیر کسی اعتراض کے 'بغیر کسی سوال کے کہ لے اللہ میں اپنے واحد بیٹے کو کیوں ذبح کر دوں۔

حضرت ابراہیم جزع و فزع کی حالت میں لبیک نہیں کہتے۔ نہ ان پر کوئی اضطرابی کیفیت طاری ہوتی ہے بلکہ وہ تسلیم و رضا کے پیکر ہیں، مطمئن اور پروقار ہیں اور ان کا یہ اطمینان 'نہرواؤ اور تسلیم و رضا ان کے ان کلمات سے ظاہر ہوتی ہے جن میں وہ یہ تجویز اپنے بیٹے کے سامنے رکھتے ہیں۔ یہ تو نصرت ہی عظیم اقدام ہے لیکن ان کے الفاظ نہایت سنجیدہ اور ان کی روش پروقار ہے۔

قَالَ يٰٓإِبْرٰهٖمُ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ فَاَنْظُرْ مَا ذَا تَرٰی (۳۷: ۱۰)

”ابراہیم نے اس سے کہا ”بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں اب تو بتا میرا کیا خیال ہے؟“ یہ الفاظ اس شخص کے ہیں جن کو اپنے اعصاب پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔ وہ درپیش اہم معاملے کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہے۔ اسے یقین ہے اور وہ اس پر حلا ہوا ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے گا۔ یہ ایک مومن کے الفاظ ہیں ایسے مومن کے جسے یہ عقیم امر خوفزدہ نہیں کر رہا ہے تاکہ وہ جلدی جلدی اسے گزرے۔ آنکھیں بند کر کے تاکہ وہ اس سے بچ جائے اور یہ معاملہ ختم ہو جائے اور اس کے اعصاب پر جو ناقابل برداشت بوجھ آ پڑا ہے وہ اتر جائے۔ ایسا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فعل ناقابل برداشت ضرور ہے۔ مطالبہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کسی معرکہ کارزار میں بھیج دیں۔ نہ حکم یہ ہے کہ اسے ایک ایسے کام میں لگا دیں جس سے اس کی زندگی ختم ہو جائے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کر دیں۔ اور یہ حکم انہیں اس طرح خواب میں ملتا ہے۔ اور آپ اسے اپنے اکلوتے بیٹے کے سامنے رکھتے ہیں۔ اور اس سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے پر فوراً کرے اور اپنی رائے دے۔

نیز حضرت ابراہیم اپنے بیٹے کو اچانک پکڑ کر لسی حالت میں ذبح نہیں کر دیتے کہ انہیں پتہ ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے اور معاملہ ختم کر دیا جائے۔ بلکہ معاملہ تجویز کی صورت میں ان کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام محسوس کرتے ہیں کہ ان کے رب کی مرضی ہی لسی ہے۔ لہذا اس معاملے کو اس طرح سرانجام دینا چاہئے جس طرح رب کی مرضی ہے۔ رب کا حکم سر آنکھوں پر۔ لہذا بچے کو بھی معلوم ہونا چاہئے کہ معاملہ کیا درپیش ہے اور وہ بھی اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ کوئی جبر اور کوئی اضطراب نہ ہو تاکہ اس کو بھی اطاعت امر کا اجر ملے۔ وہ بھی تسلیم و رضا کے اعلیٰ مقام پر قافز ہو اور اطاعت امر کے مٹاس کو پالے۔ ذرا ان کے اکلوتے بیٹے کی زندگی کی لذت چکھ لیں اور وہ بھی وہ بھلائی دیکھ لیں جو زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و ارفع ہے۔

اب بیٹے کا فیصلہ کیا ہے؟ کہ اس کے باپ نے خواب دیکھا ہے اور باپ خواب بیٹے کے سامنے رکھتے ہیں اور تجویز یہ ہے کہ بیٹے کو ذبح کر دیا جائے 'فیصلہ کیا ہے؟ جتنا بھی آخر حضرت ابراہیم کا بیٹا ہے۔ وہ بھی اس مقام بلند پر پہنچ چکے ہیں جس پر حضرت ابراہیم ہیں۔

قَالَ يَا بَنِي آدَمَ أَفَعَلْ مَا تُمُرُّ سَتَجِدُنِي إِِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ (۱۰۲:۳۷)
 ”اس نے کہا: ایا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے۔ آپ انشاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔“
 حضرت اسماعیل بھی اس حکم کے سامنے صرف سر تسلیم خم نہیں کر دیتے بلکہ وہ نہایت اعتماد اور رضائے الہی سے سرشار ہو کر تسلیم کرتے ہیں۔ بابت ایا جان! نہایت ہی محبت اور نہایت ہی اپنائیت کے ساتھ۔ وہ ذبح ہونے جا رہے ہیں لیکن ان پر کوئی خوف طاری نہیں ہے، کوئی جزع و فزع نہیں ہے۔ ان کے حواس بھل ہیں بلکہ ادب اور محبت میں بھی کوئی کمی نہیں آتی ہے۔

افْعَلْ مَا تُمُرُّ (۱۰۲:۳۷) ”آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل فرمائیں“۔ حضرت اسماعیل کا احساس بھی وہی ہے۔ جو اس سے قبل آپ کے باپ کا تھا۔ بیٹا بھی یہ سمجھا ہے کہ باپ کو ذبح عظیم کا اشارہ مل گیا ہے۔ اور خدا کی طرف سے اشارہ بھی امر ربی ہے اور ایک جلیل القدر پیغمبر کے لیے یہ اشارہ ہی کافی ہے کہ وہ بغیر کسی تردد، بغیر کسی شک اور بغیر کسی بہانہ سازی کے عمل کریں۔

بارگاہ رب العزت میں نہایت ادب کے ساتھ بات ہو رہی ہے۔ بات کرنے والے کو اپنی قوت کے حدود کا بھی طرح علم ہے اور اپنی قوت برداشت کا بھی علم ہے۔ اسے اپنی کمزوریوں کا علم ہے۔ اس لیے اللہ کی معاونت طلب کی جاتی ہے۔ اس لیے اس قربانی اور اطاعت شعاری کی نسبت بھی اللہ کی مشیت کی طرف کی جاتی ہے۔

سَتَجِدُنِي إِِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ (۱۰۲:۳۷) ”آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔“

یہ بیٹے اپنی بہادری کا اظہار بھی نہیں کرتے۔ نہ جسورانہ اور تمہورانہ بات کرتے ہیں۔ نہ لاپرواہی سے دوڑ کر خطرے میں کودتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کا کوئی رنگ یہاں نہیں دکھاتے۔ نہ اپنا جھم اور نہ اپنا وزن جتاتے ہیں۔ تمام معاملے کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں۔ کہ اللہ نے جو قربانی طلب کی ہے اگر اللہ کی معاونت شامل حال رہی اور اس نے مہر عطا کر دیا تو یہ کام ہو جائے گا۔

سَتَجِدُنِي إِِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ (۱۰۲:۳۷) ”اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔“ ورنہ نہیں۔

کیا شان ہے اللہ کے جناب میں عاجزی کی۔ اور کس قدر روشن ایمان ہے کس قدر عالی شان اطاعت اور بے مثال تسلیم و رضا ہے یہ!

باتوں سے آگے اب اس منظر میں واقعات ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ اب صرف مکالمہ نہیں ہے۔ عمل شروع ہو رہا ہے۔

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّ لِلْجَبِينِ ﴿۵۱﴾

”آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرادیا۔ ایک بار پھر یہاں اطاعت سر بلند ہوتی ہے اور عظمت ایمان کا اظہار ہوتا ہے اور تسلیم و رضا کی وہ مثال سامنے آتی ہے جو پوری انسانی تاریخ کا ایک جلی عنوان ہے۔ ایک انسان اپنے اکلوتے بیٹے کو منہ کے بل گرتا ہے تاکہ اسے دغ کے لیے تیار کرے۔ اور یہ لڑکا بھی سر تسلیم خم کرتا ہے اور بے حس و حرکت گر جاتا ہے۔ بات اب عمل تک آ پہنچی ہے اور قریب ہے کہ چھری چل جائے۔

باپ بیٹے دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ یہی ہے اسلام۔ اسلام میں تسلیم و رضا ہی اصل حقیقت ہے۔ اعتماد طاعت، اطمینان اور تسلیم و رضا دونوں کے جذبات نظریات اور عمل یکساں ہیں۔ نفاذ امر کے لیے تیار ہیں۔ اس قسم کی تیاری کہ تنفیذ کے لیے بس ایک کس کی ضرورت ہے اور یہ کام ایک عظیم ایمان ہی کر سکتا ہے۔

یہ جرات اور جسارت کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ جوش اور بہادری کا معاملہ نہیں ہے۔ بعض اوقات میدان کارزار میں ایک مجاہد پر جوش انداز میں آگے بڑھتا ہے، قتل کرتا ہے اور قتل ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک فدا لئی اقدام کرتا ہے اور اسے علم بھی ہوتا ہے کہ وہ زندہ نہ بچے گا لیکن وہ جذبہ فداکاری سے سرشار ہوتا ہے اور یہ ایک انداز ہوتا ہے لیکن حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل جو کچھ کر رہے ہیں اس کی ادا بالکل نرالی ہے۔ یہاں کوئی خونی جوش نہیں ہے۔ نہ جذبہ حمایت کا فرما ہے۔ نہ غلت پسندانہ جوش ہے جس کی تہ میں خوف و ہراس کو چھپایا جاتا ہے۔ کمزوری اور بزدلی کو نفروں میں پیٹ لیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایسی تسلیم و رضا ہے جو معاملے کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر چکی جا رہی ہے۔ عقلمندی کے ساتھ ایک کام ہو رہا ہے۔ قصد و ارادے اور سوچ و فکر کے بعد ہو رہا ہے۔ پورے مشورے اور بحث و مباحثے کے بعد۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اطمینان کے ساتھ کہ نتائج کیا ہوں گے۔ فحشی رضامندی، خوشی خوشی سے اللہ کا جذبہ اطاعت کام کر رہا ہے۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے حق ادا کر دیا۔ تسلیم و رضا کا اظہار ہو گیا۔ امر الہی کو وہ رد و بعل لے ہی آئے۔ فرض پورا کر دیا۔ بس چھری کی ایک کس ہی باقی رہ گئی تھی۔ خون کی ایک دھار ہی باقی تھی۔ اکلوتے بیٹے کی روح کی پرداز ہو چکنی باقی تھی۔ اللہ کے ہاں اس روح کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ اللہ کے پیانے میں وزن کسی اور چیز کا تھا جو ہونچکا۔ دونوں نے عزم و ارادہ اس میزان میں رکھ دیا تھا۔ رب جانتا تھا کہ ان کے شعور کی حالت کیا ہے، ان کا جذبہ کیا ہے۔

یہ ایک امتحان تھا جو ہو چکا۔ اس میں وہ فتح یاب ہو گئے۔ نتائج سامنے آ گئے۔ مقصد امتحان پورا ہو گیا جو بہت رہ گئی وہ صرف یہ تھی کہ کوئی تڑپ جائے۔ خون بہہ جائے۔ دغ کا جسم ٹھنڈا ہو جائے۔ لیکن اللہ بندگی و اطاعت چاہتا ہے۔ عبادت کے معنی اسلام میں ابتلا اور تعذب نہیں۔ اللہ خون اور جسموں کو گرانا نہیں چاہتا۔ جب خلوص کا اظہار ہو گیا۔ بندہ اس مشکل حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہو گیا۔ اپنے دل و جان سے تیار ہو گیا تو فرض ادا ہو گیا اور امتحان میں وہ کامیاب ہو گیا۔

اللہ جانتا تھا کہ ابراہیم اور اسماعیل دونوں سچے ہیں۔ اس لیے اللہ نے ان کی تیاری ہی کو عمل سمجھا۔

وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ ۖ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كُنَّا

نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۰۵﴾ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ السَّبِيحُ وَقَدْ يَنْجِعُ عَظِيمُ ﴿۱۰۶﴾

”اور ہم نے ندا دی کہ ”اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔“ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیہ میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا۔“

تمہارا خواب بھی سچا تھا، تم نے اسے سچ کر دکھایا۔ عملاً سچا کر دیا۔ اللہ تو تسلیم و رضا کا خواہش مند ہے۔ یوں کہ نفس کے اندر کوئی ایسی بات نہ رہے جو اللہ سے چھپائے، جو اللہ کے حکم سے زیادہ عزیز ہو، یا حکم الہی کے مقابلے میں کوئی تحفظ ہو۔ اگرچہ وہ اکلوتا بیٹا اور جگر گوشہ ہو۔ اگرچہ وہ جان اور روح ہو۔ اے ابراہیم! تو نے تو یہ گویا کر دکھایا۔ تم تو ذبح عظیم کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اگر اللہ ہاتھ کو نہ پکڑتا۔ تم نے تو عزیز ترین متاع قربان کر دی تھی۔ اور تم نہایت ہی سنجیدگی، دھیمے انداز اور پروقار طریقے سے، اطمینان اور اعتماد کے ساتھ، مشورے اور سوچ کے ساتھ قربانی کر دی۔ اب تو صرف خون اور گوشت رہ گیا تھا۔ اس مقام پر انسان کے خون اور گوشت کے بدلے قربانی کا خون اور گوشت پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس کا بدلہ دے دیا جاتا ہے اور اسے ذبح عظیم کا نام بھی دے دیا جاتا ہے۔ ایک مینڈھا حکم ربی سے ابراہیم علیہ السلام کی چھری کے نیچے آ جاتا ہے۔ اور وہ اسے اسماعیل علیہ السلام کے بدلے ذبح کر دیتے ہیں اور کہا جاتا ہے :

إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۳۷: ۱۰۵) ”ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔“ ہم ان کو اس قسم کی آزمائش کے لیے جن کر ان پر کرم کرتے ہیں اور ان کے دلوں کو تسلیم و رضا اور اطاعت و وفا کے لیے تیار کر کے اور ان کو اس عظیم کام پر آمادہ کر کے ان پر انعام کرتے ہیں اور اس قسم کی عظیم قربانی پر ان کو قدرت دے کر اور صبر دے کر ان کو جزاء دیتے ہیں۔ اور حقیقی جزاء کے مستحق قرار دے کر ان پر احسان کرتے ہیں۔

اس تعذیب و ابتلا کو ایک سنت جاریہ بنایا گیا ہے۔ ہر بقرعید پر قربانی جاری ہو گئی۔ یہ اس عظیم واقعہ کی دائمی یادگار ہے۔ جس کے اندر ایمان اپنے عروج پر نظر آتا ہے جس میں اطاعت کا حسن اور تسلیم و رضا کی بلندی اور عظمت نظر آتی ہے۔ اور امت مسلمہ اس قربانی کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے تاکہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم کی عظمت کی معرفت تازہ ہوتی رہے۔ جن کی ملت پر یہ امت ہے جن کی نسبت اور جن کی نظریاتی میراث کی وہ وارث ہے تاکہ وہ اس نظریہ حیات اور ان عقاید و ایمانیات کا اچھی طرح ادراک کر سکے جو ملت ابراہیمی کی میراث ہیں۔ اور جسے معلوم ہو کہ مسلم وہ ہوتا ہے۔ جو بے چون و چرا رب تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرے، خوشی خوشی۔ اور اللہ کا حکم پاتے ہی بلکہ اشارہ پاتے ہی وہ اسے رو بہ عمل لائے۔ اپنے لیے کچھ نہ رکھے۔ کوئی تحفظ نہ ہو۔ وہ اللہ کی اطاعت میں کوئی اپنا طریقہ، اپنا اسلوب اختیار نہ کرے بلکہ اللہ کی مرضی اور اس کے طریقے کے مطابق عمل پیرا ہو، جس طرح حکم ہو اور جس طرح حکم ملا ہو۔

پھر امت کو یہ بھی سبق دیا گیا کہ اللہ کے احکام کی تعمیل میں امت پر سختی اور تشدد مطلوب نہیں ہے کہ اسے ایسے احکام دیئے جائیں جو اس کی وسعت اور طاقت میں نہ ہوں۔ اللہ ایسے احکام دیتا ہے جن پر امت لبیک کہہ کر تعمیل کر سکے۔ اور پوری طرح ان احکام کو ادا کر سکے۔ اور جو حکم بھی آئے اس پر سنبھلا سکے۔ اور اپنی طرف سے کوئی تجویز نہ دے۔ نہ اس میں سستی دکھائے اور نہ احسان جتلائے۔ جب اللہ آمادگی اور تسلیم کو جان لیتا ہے تو پھر وہ اپنے بندوں کو

عذاب دے کر اور ان پر تشدد کر کے خوش نہیں ہوتا۔ آمادگی اور سر تسلیم خم کرنا ہی دراصل عمل شمار ہوا اور اصل عمل کا فدیہ دے دیا گیا۔ یہ سلوک اللہ کا اس امت کے ساتھ ہے جس طرح اس کے جد امجد ابراہیم کے ساتھ ہوا۔

وَتَرْكُنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝

”اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی“۔ صدیوں سے اس واقعہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام امر قرار پائے۔ انبیاء کے باپ قرار پائے۔ اس امت کے باپ قرار جائے۔ یہ امت ان کی ملت کی وارث ہوئی۔ اور اللہ نے اسی لیے ان کے دمہ پوری بشریت کی راہنمائی اور قیادت کا فریضہ عائد کیا۔ چنانچہ اس امت کو ابراہیم کا جانشین قرار دیا گیا، قیامت تک کے لیے۔

سَلِّمْ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝

”سلام ہے ابراہیم پر“۔ رب تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم پر سلام آتا ہے۔ اس کو قرآن کریم جیسی دائمی اور باقی رہنے والی کتاب میں رجسٹر کر دیا جاتا ہے۔ اور یوں اسے اس کائنات کے وجود میں ثبت کر دیا جاتا ہے۔

كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝

”ہم نیکی کرنے والوں کو نسی بن جزا دیتے ہیں“۔ آزمائش میں ڈال کر ان سے وفا کا اظہار کرا کے ان کے ذکر کو دوام بخش کر ان پر سلام بھیج کر اور ان کو اعزاز دے کر ہم جزاء دیتے ہیں۔

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝

”یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا“۔ یہ ہے جزاء ان کے ایمان کی اور اس کی حقیقت وہ ہے جو اس آزمائش میں کامرانی سے ظہور میں آئی۔ اس کے بعد اللہ ان پر ایک بار پھر تجلیات فرماتا ہے۔ اور اللہ کا ایک بار پھر کرم ہوتا ہے۔ اور وہ یوں کہ بڑھاپے میں ان کو ایک دو سرائے کا اسحاق دیا جاتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو بھی برکت دی جاتی ہے۔ اور ان کے بیٹے اسحاق کو بھی برکت دی جاتی ہے اور حضرت اسحاق کو بھی صالح نبی بنایا جاتا ہے۔

وَبَشِّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَبُرْكْنَا عَلَيْهِ ۝

وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ ۝

”اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے اور اسے اور اسحاق کو برکت دی۔ اب ان دونوں کی ذریت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر مرتع علم کرنے والا ہے۔“

اسماعیل اور اسحاق کے بعد ان کی اولاد کا سلسلہ چلتا ہے لیکن ان کی اولاد کی وراثت 'وراثت گوشت و پوست' نہیں ہے۔ یہ نظریاتی اور ملی وراثت ہے لہذا انہوں نے ملت پر رہا وہ محسن رہا اور جس نے ملت اور نظریات سے انحراف کیا وہ ظالم قرار پایا اور قربت اور نسب اس کے لیے مفید نہ ہوا۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ (۱۱۳:۳۷) ”لب ان دونوں کی ریت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے۔“ اور انہی کی اولاد سے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام تھے۔

وَلَقَدْ مَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ۖ وَنَجَّيْنَاهُمَا وَ قَوْمَهُمَا
مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۚ وَ نَصَرْنَاهُمْ فَاكُنُوا هُمُ الْخَالِيَيْنِ ۖ وَ اتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ
الْمُسْتَبِينَ ۖ وَ هَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۚ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِينَ ۖ
مَلَكًا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَ هَارُونَ ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۚ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا
الْمُؤْمِنِينَ ۚ

”اور ہم نے موسیٰ و ہارون پر احسان کیا، ان کو اور ان کی قوم کو کرب عظیم سے نجات دی، انہیں نصرت بخشی جس کی وجہ سے وہی غالب رہے، ان کو نصرت واضح کتاب عطا کی، انہیں رہا راست دکھائی اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھا۔ سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔“

قصہ موسیٰ کی اس جھلک میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اللہ نے ان پر احسان کیا کہ ان کو منصب نبوت کے لیے منتخب کیا اور ان کے ذریعہ ان کو اور ان کی قوم کو نجات دی اور یہ نجات ان کو اس عظیم اذیت سے دلائی جس میں وہ اور ان کی قوم مبتلا تھے۔ دوسری سورتوں میں ان کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ یہاں صرف یہ کہا کہ ظالموں اور جلا دوں پر ان کو نصرت اور غلبہ دیا گیا اور ان کو واضح احکام پر مشتمل کتاب دی گئی اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت دی گئی۔ وہ راستہ جو اللہ تمام نفل ایمان کو عطا کرتا ہے یعنی اسلامی نظام زندگی اور ان پر یہ احسان کہ موسیٰ و ہارون کے ذکر کو دوام بخشا گیا۔ اس حصے کا خاتمہ بھی موسیٰ اور ہارون پر اللہ کی طرف سے سلامتی کے اظہار سے ہوتا ہے۔ یہ مختصر اور پر تاثیر فقرے بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ یہ جتانے کے لیے کہ اللہ اپنے محسن بندوں پر احسان بھی کرتا ہے اور ان کے ذکر کو دوام بھی بخشتا ہے۔ اور یہ جاننے کے لیے کہ نفل ایمان کی قدر و قیمت ان کے ایمان اور اسلام کی وجہ سے ہوتی ہے یعنی احسان کی وجہ سے۔

--- ۰ ۰ ۰ ---

اس کے بعد ایک جھلک حضرت الیاس علیہ السلام کی۔ یہ کون تھے؟ رائج بات یہ ہے کہ عہد نامہ قدیم میں جو پیغمبر

اہلہ کے نام سے مذکور ہیں 'وہی الیاس ہیں۔ یہ شام کے لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ یہ لوگ ایک بغل نامی بت کے پرستار تھے۔ پہلی آج تک اسی بت کے آثار میں سے ہے۔ بھل کے پرستار یہاں رہتے ہوں گے۔

وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۳۶﴾ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿۱۳۷﴾
 اتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ﴿۱۳۸﴾ اللَّهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ آبَائِكُمُ
 الْأَوَّلِينَ ﴿۱۳۹﴾ فَكَذَّبُوا فَاتَّهُمُ الْمَحْضَرُونَ ﴿۱۴۰﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿۱۴۱﴾ وَتَرَكْنَا
 عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿۱۴۲﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿۱۴۳﴾ إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۴۴﴾
 إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۴۵﴾

”اور الیاس بھی یقیناً مرسلین میں سے تھا۔ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”تم لوگ اُرتے نہیں ہو؟ کیا تم بھل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو؟ اس لفظ کو جو تمہارا اور تمہارے اگلے پچھلے آباد اجداد کا رب ہے؟“ مگر انہوں نے اسے بھند دیا، سو اب یقیناً وہ سزا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں، بجز ان بندگان خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا اور الیاس کا ذکر خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا۔ سلام ہے الیاس پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ واقعی وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔“

حضرت الیاس نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور اس بات پر تنقید کی کہ تم بھل کی عبادت کرتے ہو اور اس ذات کو چھوڑتے ہو جو احسن الخالقین ہے۔ تمہارا بھی رب ہے، اور تمہارے آباد اجداد کا بھی رب ہے، یعنی اسی طرح جس طرح حضرت ابراہیم نے اپنی قوم اور باپ کی بت پرستی پر تنقید کی تھی۔ جس طرح ہر رسول اپنی اپنی قوم کی بت پرستی پر اہصاب کرنا آیا تھا۔

نتیجہ یہ تھا کہ قوم نے ٹکڑے ٹکڑے کیے۔ اللہ تعالیٰ مافیہ فرماتا ہے کہ ان کو گرفتار کر کے حاضر کیا جائے گا۔ اور ان کو وہی سزا ملے گی جو ہمیشہ مکذبین کو ملتی ہے۔ ہاں ان میں سے کچھ ایمان اور اللہ کے خالص بند۔ متشی ہوں گے۔ حضرت الیاس علیہ السلام کے ساتھ یہ محفل بھی اس بات پر ختم ہوتی ہے کہ اللہ کی طرف سے ان پر سلام آتا ہے۔ ان کی بھی تکریم ہوتی ہے۔ اور اہل ایمان اور اہل احسان کو اللہ ایسی ہی جزاء دیتے ہیں۔

حضرت الیاس علیہ السلام کی سیرت یہاں پہلی مرتبہ آتی ہے مگر نہایت اختصار کے ساتھ۔ ہم بھی اختصار کے ساتھ اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔ البتہ یہاں ایک فنی نکتہ بیان کرنا ضروری ہے۔

سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ (۳۷: ۱۳۰) ”سلام ہے الیاس پر“۔ یہاں الیاس علیہ السلام کے نام کے ساتھ ”ین“ کا فاصلہ لگا دیا گیا، کہ عبادت کا صوتی حسن دوبالا ہو جائے۔ اور یہ قرآن کا مخصوص انداز بیان ہے کہ

سورت کی آیات کا خاتمہ تقریباً صوتی ہم آہنگی کے ساتھ ہوتا ہے اور اس انداز تعبیر کا سامع پر بہت اثر ہوتا ہے۔

--- () () ---

اب قصہ لوط کی ایک جھلک - (دوسرے مقامات پر یہ قصہ حضرت ابراہیم کے قصے کے ساتھ آتا ہے۔

وَإِنَّ لُوطًا لِّمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٢٤﴾ إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَآهْلَهُ أَجْمَعِينَ ﴿١٢٥﴾ إِلَّا

عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ﴿١٢٦﴾ ثُمَّ دَمَرْنَا الْأَخْرِيسَ ﴿١٢٧﴾ وَانْكُورَ لُتَمُورٍ ﴿١٢٨﴾ عَلَيْهِمُ

مُصِيبَاتٌ ﴿١٢٩﴾ وَيَالَيْلٍ أَفْلا تَعْقِلُونَ ﴿١٣٠﴾

ع ۲۵

۸

”اور لوط بھی انہی لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یاد کرو جب ہم نے اس کو اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی 'سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔ پھر باقی سب کو تیس تیس کر دیا۔ آج تم شب و روز ان کے ایڑے دیار پرست گزرتے ہو۔ کیا تم کو عقل نہیں آتی؟“

یہ جھلک نوح علیہ السلام کے قصے کی جھلک کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ اس میں اس بات کا ذکر ہے کہ لوط علیہ السلام رسول تھے۔ ان کو اپنے اہل و عیال کے ساتھ نجات دی گئی۔ ماسوائے ان کی بیوی کے۔ اور گمراہ جھٹلانے والوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ عربوں کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم تو روز و شب علاقہ لوط پرست گزرتے ہو۔ کیا تمہارے دل بیدار نہیں ہوتے اور تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ کیا یہ کھنڈرات ہو کافی سناتے ہیں 'تم اس کی طرف کان نہیں لگاتے اور کیا تمہارے دل میں ایسے انجام کا ڈر پیدا نہیں ہوتا۔

قصص انبیاء کی یہ جھلکیاں قصہ یونس پر ختم ہوتی ہیں۔

وَإِنَّ يُونُسَ لِمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٣١﴾ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ﴿١٣٢﴾

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ ﴿١٣٣﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ ﴿١٣٤﴾ فَلَوْلَا

أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسْتَجِيبِينَ ﴿١٣٥﴾ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٣٦﴾ فَنَبَذْنَاهُ

بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِيمٌ ﴿١٣٧﴾ وَأَبْنَيْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَقْطِينٍ ﴿١٣٨﴾ وَارْسَلْنَاهُ

إِلَى مِائَةِ آلَافٍ أَوْ يُزِيدُونَ ﴿١٣٩﴾ فَآمَنُوا فَمَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ﴿١٤٠﴾

”اور یونس بھی رسولوں میں سے تھا۔ یاد کرو جب وہ ایک بھری کشتی میں سب بھاگ بھاگ پھر قزم اندازی میں شریک ہوا اور اس میں ملت کھائی۔ آخر کار مچھلی نے اسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا۔ اب اگر وہ توبہ کرنے والوں میں

سے نہ ہوتا تو روز قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا۔ آخر کار ہم نے اسے بڑی ستیم حالت میں ایک چھیل زمین پر پھینک دیا۔ اور اس پر ایک بیلدار درخت اگا دیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے ایک لاکھ 'یا اس سے زائد لوگوں کی طرف بھیجا۔ وہ ایمان لائے 'اور ہم نے ایک وقت خاص تک انہیں باقی رکھا۔"

قرآن کریم اس بات کا تذکرہ نہیں کرتا کہ قوم یونس کہاں تھی۔ یہ بات قرآن سے صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ کسی ساحل بہتی میں آباد تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت یونس کی قوم کی جانب سے مسلسل تکدیب کی وجہ سے ان کا دل بھر آیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی قوم کو یہ وارننگ دے دی کہ جلد ہی تم پر عذاب آنے والا ہے۔ آپ نے اپنی قوم سے سخت غصہ ہو کر نکل کھڑے ہوئے۔ چنانچہ آپ سمندر کے ساحل پر چلے گئے۔ اور وہاں ایک لکی کشتی میں سوار ہو گئے جو سواریوں سے بھری ہوئی تھی۔ سمندر کے درمیان میں کشتی کو طوفان نے آلیا اور وہ موجوں کی لپیٹ میں آگئی۔ لوگوں کی طرف سے اعلان ہوا کشتی کے سواروں میں کوئی شخص ایسا ہے جس نے غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور وہ مغضوب علیہ ہے اور یہ بات لازمی ہے کہ ایسے شخص کو سمندر میں پھینک دیا جائے، تاکہ کشتی نجات پا جائے۔ اس لیے ان لوگوں نے قرعہ اندازی کی کہ جس کا قرعہ نکلا اسے سمندر میں پھینک دیا جائے۔ یونس علیہ السلام کا قرعہ نکل آیا۔ ان لوگوں کے اندر یونس علیہ السلام نیکی اور تقویٰ میں معروف تھے۔ لیکن جب ان کے نام بار بار قرعہ نکلا تو انہوں نے انہیں سمندر میں پھینک دیا یا خود وہ سمندر میں کود گئے۔ چنانچہ ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ اس وقت سب لوگ ان کو ملامت کر رہے تھے یعنی وہ ملامت کے بظاہر مستحق تھے کیونکہ انہوں نے اس مہم کو چھوڑ دیا تھا جس کے لیے ان کو بھیجا گیا تھا اور اپنی قوم سے ناراض ہو کر ان کو چھوڑ دیا حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نہ آئی تھی۔ جب مچھلی کے پیٹ میں انہوں نے احساس کر لیا تو اس ظلم سے استغفار کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ اعتراف کر لیا کہ میں نے ظلم کیا ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ "نہیں ہے کوئی حاکم مگر تو، تو پاک ہے، بے شک میں ظالموں میں سے تھا۔" اللہ نے ان کی دعا کو سنا اور قبول کر لیا۔ چنانچہ مچھلی نے ان کو ساحل پر اگل دیا۔

فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ (۱۴۳:۳۷) لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ

(۱۴۴:۳۷) "اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو روز قیامت تک اس مچھلی کے پیٹ میں رہتا۔" جب آپ مچھلی کے پیٹ سے نکلے تو بہت ہی کمزور ہو چکے تھے اور آپ کے پاس لوڑھنے کے لیے بھی کچھ نہ تھا اور آپ ساحل کی گری میں پڑے تھے۔

وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَقْطِينٍ (۱۴۶:۳۷) "اور ہم نے اس پر ایک بیلدار درخت اگا دیا۔" اور یہ کدو کی پل تھی۔ یہ اپنے پھلے ہوئے بتوں کے ذریعہ انہیں دھوپ سے بچاتی اور یہ ان سے کھیلوں کو بھی دور رکھتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کھیاں اس درخت کے قریب نہیں جاتیں۔ یہ اللہ کا لطف و کرم تھا اور معجزانہ تدبیر تھیں۔ جب ان کی صحت لوٹ آئی تو اللہ نے ان کو اپنی اس قوم کے پاس واپس بھیجا جن سے ناراض ہو کر وہ آگئے تھے۔ حضرت یونس

کے بعد یہ لوگ ڈر گئے تھے، ایمان لے آئے تھے۔ اللہ سے استغفار کیا اور اجتماعی طور پر معافی مانگی اور اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی اور ان پر وہ عذاب سنت الہیہ کے مطابق نہ آیا جو مکذبین پر آتا رہتا ہے۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حَیْثُ (۱۴۸:۳۷) ”وہ ایمان لے آئے اور ہم نے ایک مقررہ وقت تک ان کو متاع حیات دیا۔“ ان کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے زیادہ تھی۔ اور یہ سب کے سب ایمان لے آئے تھے۔ یہ تعد یہاں یہ بتاتا ہے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوتا ہے جو ایمان لاتے ہیں جبکہ سابقہ قصص کا مدعا یہ بتانا تھا کہ جو ایمان نہیں لاتے ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ لہذا اے قوم محمد، تم ان دو انجاموں میں سے اپنے لیے جو انجام چاہتے ہو، اختیار کر لو۔۔۔ یہاں اگر اس سورت کا یہ سبق فہم ہوتا ہے اور اس پر وہ تاریخی جائزہ بھی فہم ہوتا ہے جو نوح علیہ السلام کے بعد تمام ڈرانے والوں کی اقوام کے انجام کے بارے میں تھا، خواہ وہ مومنین تھے یا مکذبین تھے۔

---○ ○ ○---

درس نمبر ۲۱۰ ایک نظر میں

اس سورت کے سبق ۲ میں لائے جانے والے قصص نے جن امور پر روشنی ڈالی اور اللہ اور اس کے بندوں کے تعلق کی جو وضاحت کی اور اللہ کی جانب سے اپنے رسولوں کے مکہ میں کوجس طرح پڑا گیا جو غیر اللہ کی بندگی کرتے تھے اور اللہ کے ساتھ خود اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق کو شریک کرتے تھے اور اس حقیقت کی روشنی میں جو درس اول کا موضوع تھی، اب اس آخری سبق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جاتی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ اس موضوع پر مکالمہ کس کس کے ان تمام حقائق کے مقابلے میں ان کے اس انسانی عقیدے کی کیا حقیقت ہے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں نیز ان کے اس انسانی عقیدے کی کیا حیثیت ہے جس کے مطابق وہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ اور جنوں کے درمیان کوئی رشتہ دہری ہے اور ان کو یاد دلائیں کہ تم تو تمنا نہیں کرتے تھے کہ ہم میں بھی کوئی رسول آجائے اور تم یہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی رسول آجائے تو ہم اس کی ہدایات کو بسر و چشم قبول کس گے لیکن اب تمہارا حال یہ ہے کہ جب رسول آگیا تو تم نے کفر کا رویہ اختیار کر لیا۔ سورت کا خاتمہ اس ریکارڈ پر ہوتا ہے کہ اللہ نے رسولوں کے ساتھ وعدہ کر لیا ہے کہ وہی غالب رہیں گے اور یہ کہ یہ مشرکین اللہ کی طرف جو نسبتیں کرتے ہیں وہ ان سے پاک ہے اور تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔ چنانچہ آغاز ہوتا ہے۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۱۰ تشریح آیات

۱۲۹ --- تا --- ۱۸۲

فَاسْتَفْتِهِمُ الرَّبُّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ﴿۱۲۹﴾ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ
شَاهِدُونَ ﴿۱۳۰﴾ أَلَا إِنَّهُمْ مِّنْ أَفْكِهُمُ لَيَقُولُونَ ﴿۱۳۱﴾ وَلَدَ اللَّهِ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۱۳۲﴾
أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ ﴿۱۳۳﴾ مَا لَكُمْ تَكْتِفُ تَحْكُمُونَ ﴿۱۳۴﴾ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۳۵﴾ أَمْ
لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِينٌ ﴿۱۳۶﴾ فَأَتُوا بِكُشْيِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۳۷﴾

”پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو کیا (ان کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے؟ کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سن رکھو“
در اصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ ”اللہ اولاد رکھتا ہے“ اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کر لیں، تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسے حکم لگا رہے ہو؟ کیا تمہیں ہوش نہیں آتا؟ یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے، تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو۔“

ان کے اس غلط عقیدے کا ہر طرف سے گہراؤ کیا جاتا ہے۔ ان کے خلاف ان کی زبان میں بات کی جاتی ہے اور ان کے سماج میں جو سوچ تھی اسی کو ان کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ عربوں کے سماج میں لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اور وہ بچیوں کی پیدائش کو مصیبت سمجھتے تھے۔ لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں کم تر مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ فرشتے دیویاں ہیں اور یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ چنانچہ اس عقیدے کو ان کی منطق اور سوچ کے مطابق رد کر دیا گیا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ حقیقت تو دور کی بات ہے خود ان کے تسلیم شدہ معیار کے مطابق بھی ان کا عقیدہ غلط ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمُ الرَّبُّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ (۱۲۹: ۳۷) ”پھر ذرا ان سے پوچھو کہ تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے“۔ کیا تمہارے دل کو یہ بات لگتی ہے۔ جبکہ تمہارے سماج میں لڑکیاں لڑکوں سے کم تر رتبہ رکھتی ہیں۔ کیا خوب تقسیم ہے تمہاری کہ تمہارے لیے ہوں بیٹے اور خالق کے لیے ہوں

بیٹیاں یا یہ کہ خود اللہ نے اپنے لیے بیٹیاں جن لیں اور بیٹے تمہارے لیے چھوڑ دیئے۔ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ تمہارے یہ مزاحمت کس قدر پوچ ہیں۔

آج تمہارے اندر یہ انسانوی سوچ کیسے پیدا ہو گئی۔ کہاں سے یہ عقیدہ پھیل گیا کہ فرشتے مونث ہیں۔ کیا انہوں نے ان کی پیدائش کو دیکھا ہے اس وقت یہ موجود تھے اور انہوں نے ان کی جنس کو معلوم کر لیا؟

أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ (۳۷: ۱۵۰) ”کیا ہم نے ملائکہ کی تخلیق مونث کے طور پر ہی اور یہ اس وقت دیکھ رہے تھے۔“

یہاں اللہ تعالیٰ ان کے اس مقولے اور عقیدے کو ان کے منصوص الفاظ میں نقل کر کے رد کرتا ہے۔

أَلَا إِنَّهُمْ مِّنْ أَفْكِهَمُ لَيَقُولُونَ (۳۷: ۱۵۱) وَلَدَالِلُهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ

(۳۷: ۱۵۲) ”در اصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ ”اللہ اولاد رکھتا ہے“ اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔“ یہ اپنے سماج کے مسلمہ رواج اور اپنی ثابت شدہ روایات کے خلاف یہ بات کرتے ہیں۔ یہ خود تو بیٹے چاہتے ہیں اور اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے ہیں۔

أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ (۳۷: ۱۵۳) ”کیا اللہ نے بیٹیوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کیں۔“ تمہاری یہ منطق خود تمہارے فلفل یا صحیح مسلمات کی رو سے ہی غلط ہے۔

مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ (۳۷: ۱۵۴) أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (۳۷: ۱۵۵) ”تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسے حکم لگا رہے ہو، کیا تمہیں ہوش نہیں آتا۔“ یہ استدلال تم کہاں سے نکال لائے ہو، عجیب ہے یہ؟

أَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِينٌ (۳۷: ۱۵۶) فَاتُوا بِكِتَابِكُمْ إِن كُنْتُمْ صٰدِقِينَ

(۳۷: ۱۵۷) ”پھر کیا تمہارے پاس اپنی باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو۔“ ان کا دوسرا انسانہ یہ تھا کہ اللہ اور جنوں کے درمیان رشتہ داری ہے۔

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَ بَيْنَ الْجَنَّةِ نَسْبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ

إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ﴿۱۵۸﴾

”انہوں نے اللہ اور جنوں کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے“ حالانکہ جن خوب جانتے ہیں کہ یہ محرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔“

ان کا زعم یہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں تھیں اور ان سے جن پیدا ہوئے یوں جنوں اور اللہ کے درمیان قربت ہو گئی۔ جنوں کو تو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ کی دوسری مخلوق کی طرح ایک مخلوق ہیں۔ اور وہ قیامت کے دن اللہ کے حکم سے حاضر کیے جائیں گے اور رشتہ داروں کے ساتھ یہ سوک تو نہیں کیا جاتا کہ وہ بطور مجرم پکڑے جا کر پیش کیے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مراحت کے ساتھ اس عقیدے کی تردید بھی کر دی جاتی ہے۔

سُبْحَنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

”اللہ پاک ہے اس باتوں سے جو یہ لوگ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔“
یہاں جنوں سے اللہ کے نیک بندوں کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے جو جنوں سے ہیں اور جو ایمان لانے والے ہیں۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلِصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

”ماسوائے اللہ کے ان بندوں کے جو مخلص ہیں۔“
اس کے بعد فرشتوں کی طرف سے خطاب ہے ’ان مشرکین کو اور ان کے ان معبودوں کو‘ جن کی وہ بندگی کرتے تھے۔ یہ خطاب ان کے خود ساختہ عقائد پر ہے جو وہ رکھتے ہیں۔ بظاہر انداز کلام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب فرشتوں کا ہے۔

فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفِتْنَيْنِ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ

هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَ اِنَّا لَنَحْنُ

الصّٰفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

”پس تم اور تمہارے یہ معبود اللہ سے کسی کو پھر نہیں سکتے مگر صرف اس کو جو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھلسنے والا ہو۔ اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے اور ہم صف بستہ خدمت گار ہیں اور تسبیح کرنے والے ہیں۔“

معلوم یہ ہے کہ تم اور تمہارے معبود اللہ کے مقابلے میں اس کے بندوں میں سے کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے ماسوائے ان لوگوں کے جو جہنم کے حساب میں لکھے جا چکے ہیں اور تقدیر الہی نے فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔ تم لوگ اس مومن کو گمراہ نہیں کر سکتے جس کا نیک انجام لکھا ہوا ہے کہ اس نے راہ اطاعت لی ہے۔ کیونکہ جہنم کے ایندھن کا انتظام بھی اللہ نے کرنا ہے۔ اور سب کو معلوم ہے کہ یہ ایندھن وہ لوگ اور ان کے معبود ہیں جو اس فتنے کی راہ خود اختیار کرتے ہیں اور جو فتنہ پر دازیوں کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں۔

یہ فرشتے اس افسانوی عقیدے پر صرف یہ تسمیہ کرتے ہیں کہ اللہ نے ہر کسی کے لیے مقام و انجام مقرر کر دیا ہے۔

ہر کسی نے اس تک لا محالہ پہنچا ہے۔ ہم فرشتے تو سب اللہ کے بندے ہیں، مخلوق ہیں، ہمارے لیے اللہ نے اپنی اطاعت کے فرائض مقرر کر رکھے ہیں۔ ہم نماز کے لیے صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے مقام پر کھڑا ڈیوٹی دے رہا ہے اور اللہ تو اللہ ہے (فرشتوں کی بات یہاں ختم ہو گئی)۔

اب روئے سخن پھر مشرکین کی طرف پھر جاتا ہے جو ان افسانوی عقیدے کے قائل تھے۔ ان کو ان کے وہ وعدے اور وہ آرزوئیں یاد دلائی جاتی ہیں کہ جب وہ اہل کتاب کے ساتھ حسد کرتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے پاس بھی کوئی ایسی کتاب آجائے جس میں پہلے لوگوں کا ذکر ہو یعنی حضرت ابراہیم اور آپ کے بعد آنے والوں کا تو ہم اللہ کے مخلص اور اعلیٰ بندے بن جائیں اور اللہ کے ہاں ہمارا بلند مقام ہو۔

وَإِنْ كَانُوا لَيَقُولُنَّ ۖ لَوْ أَنَّا عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْأَوَّلِينَ ۖ

لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ۖ فَكَفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۖ

”یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے پاس وہ ”ذکر“ ہوتا جو پہلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے چیدہ بندے ہوتے۔ مگر (جب وہ آگیا) تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اب عنقریب انہیں (اس روش کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا۔“ یہ ہے وہ ذکر جو ان کے پاس آگیا اور یہ اس کرہ ارض پر عظیم ترین نصیحت ہے لیکن ان لوگوں نے اسے نہ پہچانا۔

فَكَفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۳۷: ۱۷۰) ”مگر جب آگیا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اب عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔“

(عنقریب) کے لفظ میں درپردہ دھمکی بھی ہے اور یہ دھمکی ان کے مناسب حال ہے کیونکہ وہ خود تمنائیں کرتے تھے اور اب انکار کرتے ہیں۔ اس تمہید خفی کے بعد اب بتایا جاتا ہے کہ اللہ اپنے رسولوں کو غالب کرے گا اور ان کی نصرت کرے گا۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۖ إِنَّهُمْ لَهُمُ

الْمَنْصُورُونَ ۖ وَإِنْ جُنَدُنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ۖ

”اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔“ یہ وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے اور اللہ کی بات اپنی جگہ قائم ہے۔ زمین کے اوپر توحیدی نظریہ حیات قائم ہے۔ ایمان کی عمارت مکمل ہو چکی ہے۔ تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے علی الرغم توحید کا کلمہ بلند ہے۔ اگرچہ جھٹلانے والے جھٹلاتے ہیں۔ اگرچہ دنیا میں اسد م کی دعوت اور اسلام کے قیام کا علم بلند کرنے والوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ آج بھی کفار کے عقائد، ان کا رعب و نیا ت ختم ہے۔ کفار، مشرکین کا تمام نظریاتی زور ختم ہے۔ آج دنیا

میں وہی عقائد و نظریات زندہ ہیں جو رسولوں نے پیش کیے۔ آج بھی رسولوں کا پیش کردہ عقیدہ توحید لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ لوگوں کے تصورات اور نظریات کو ایک خاص کیف دے رہا ہے اور تمام رکاوٹوں کے باوجود اس کو ارض پر انسانوں کے دل و دماغ پر واضح طور پر چھایا ہوا ہے۔ اور وہ تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں جو رسولوں کے پیش کردہ نظریہ توحید کے مخالف تھے۔ یہ نظریات ان علاقوں میں بھی ختم ہو چکے ہیں جہاں سے وہ اٹھے تھے۔ (سوشلزم روس میں) اور اللہ کے رسولوں کا کلمہ آج بھی بلند ہے اور وہ اللہ کا شکر نظریاتی اعتبار سے آج بھی غالب ہے۔

یہ تو ہم ایک عمومی بات کرتے ہیں لیکن ایک بات تمام روئے زمین پر بطور حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ ہمیشہ ہر زمانے میں پائی گئی ہے اور ہر تحریک اور دعوت پر وہ اصول صادق آیا ہے کہ جب دایہ مخلص ہوں 'سچے ہوں اور دعوت کے لیے یکسو ہوں تو وہ ہر حال میں غالب رہتے ہیں۔ اس کے راستے میں مشکلات اور رکاوٹوں کے پہاڑ کیوں نہ کھڑے کر دیئے جائیں۔ اللہ کا لشکر ہر حال میں غالب رہتا ہے اور اسے اللہ کی نصرت حاصل رہتی ہے۔ مخلصین کی راہ میں مشکلات کے پہاڑ کیوں نہ کھڑے کر دیئے جائیں اور دشمن کی قوتیں اور شیطانی قوتیں ان کے خلاف حرب و ضرب کا بازار کیوں نہ گرم کر دیں۔ وہ غالب رہتے ہیں۔ مخلصین کو بے شک مختلف جنگیں لڑنی پڑتی ہیں جو کبھی لڑائی سے سابقہ پیش آتا ہے لیکن آخری نتیجہ وہی ہوتا ہے کہ اللہ کا لشکر غالب ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اگر پوری دنیا کی قوتیں اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں 'یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ مخلصین مومنین کو نصرت ملے گی 'وہ غالب ہوں گے اور زمین پر ان کا اللہ ار قائم ہو گا۔

اللہ کا یہ وعدہ کوئی جزوی واقعہ نہیں ہو گا بلکہ یہ اس کائنات کی سنتوں میں سے ایک سنت الہیہ ہے۔ اور اللہ کی سنت اس طرح حرکت میں رہتی ہے جس طرح یہ ستارے اور سیارے اپنے مدار میں متحرک ہوتے ہیں۔ ان کے مدار پر ان کی رفتار میں ایک لمحے کا فرق نہیں آتا۔ جس طرح رات اور دن کے ظہور میں کوئی غلغل نہیں پڑتا۔ صدیوں سے یہ ظہور جاری ہے۔ جس طرح بہار و خزاں کے مظاہر آتے جاتے ہیں اور مردہ زمین کو زندہ کرتے رہتے ہیں اسی طرح سنت الہیہ بھی جاری و ساری ہے۔ لیکن وہ اللہ کی تقدیر کی پابند ہے اور اللہ کے ارادے کے مطابق چلتی ہے۔ اور جس طرح اللہ چاہتا ہے 'اس کا ظہور ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ظہور میں دیر نظر آتی ہے اور یہ دیر غلغل پسند انسان کی تہاؤں کی وجہ سے آتی ہے۔ لیکن اس سنت میں تغیر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات یہ سنت اس طرح اپنا کام کرتی ہے کہ انسان اسے سمجھ ہی نہیں سکتا۔ وہ ایسی شکل و صورت میں آتی ہے جو انسان کے تصور میں نہیں ہوتی۔ اور جب سنت الہیہ اپنا کام کر کے چلی جاتی ہے تو ایک عرصے کے بعد اہل ایمان کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں گوشے سے نصرت الہیہ نے کام کیا تھا۔

اللہ کے رسولوں کا اتباع کرنے والے لشکر خداوندی کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی لہ ادا اس متعین صورت میں ہو جو اس کے ذہن میں ہے۔ لیکن اللہ کی مشیت یہ ہوتی ہے کہ یہ نصرت نہایت ہی اعلیٰ اور مکمل شکل میں ہو۔ چنانچہ ہوتا وہی کچھ ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اگرچہ یہ لشکر اپنے خیال میں بہت زیادہ مشقت اٹھا رہا ہو اور اس کے خیال میں جدوجہد پر بہت عرصہ گزر چکا ہو اور انتظار ان کے تصور سے زیادہ ہو گیا ہو۔ مثلاً مسلمانوں کا ارادہ یہ تھا کہ جنگ بدر کے موقع پر قافلہ ان کے ہاتھ آجائے لیکن اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ دنیاوی نفع ان کے ہاتھ سے جاتا رہے اور ان کی ہڈ بھین فوج اور لشکر جرار سے ہو جائے اور وہ ایک ایسے گروہ سے کرا جائیں جو زاد و عتاد رکھتا ہو۔ اور اللہ نے جو چاہا وہ بہتر تھا۔ اسلام اور مسلمانوں دونوں کے لیے بہتر تھا۔ یہ تمہی اللہ کی نصرت لشکر الہی کے حق میں۔ اللہ پوری انسانی تاریخ میں اپنے لشکروں کے

ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔

بعض اوقات اللہ کے لشکر کسی نہ کسی جنگ میں شکست بھی کھا جاتے ہیں اور جنگ کا رخ ان کے خلاف چلا جاتا ہے۔ ان پر ابتلائیں اور مشکلات بھی آ جاتی ہیں۔ یہ تو اللہ کی مشا یہ ہوتی ہے کہ کسی دوسرے کے معرکے میں نصرت اور غلبہ دے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ اس موقع پر اس کے لشکر کے لیے فتح مفید نہیں ہے اور اگلے موقع پر وہ فتح بہت وسیع بہت ہمہ گیر اور دور رس اثرات کی حامل ہوگی۔

اللہ نے اپنی بات کر دی ہے اس کا وعدہ اور لہذا وہ کام کر چکا ہے اور اللہ کی منت بار ہا ثابت ہو چکی ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ (۱۷۱:۳۷) اِنَّهُمْ لَهُمُ

الْمَنْصُورُونَ (۱۷۲:۳۷) وَ اِنْ جُنْدًا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (۱۷۳:۳۷) ”اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔“

--- ○ ○ ○ ---

اس فیصلہ کن وعدے کے بعد اور نہایت ہی دیرینہ و ستادیز ہونے کے بعد اور اللہ کی طرف سے ہونے کے بعد اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اب آپ مشرکین مکہ کو چھوڑ دیں۔ اب دیکھیں کہ اللہ کا یہ وعدہ کس طرح سچا ہوتا ہے اور منت البیہ کس طرح کام کرتی ہے۔ آپ بھی انتظار کریں اور وہ بھی انتظار کریں اور اللہ کے کاموں اور شانوں کا نظارہ کریں۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۱۷۳﴾ وَ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصَرُونَ ﴿۱۷۴﴾

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿۱۷۵﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ ﴿۱۷۶﴾

تَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۱۷۷﴾ وَ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصَرُونَ ﴿۱۷۸﴾

”پس لے نہی“ ذرا کچھ مدت تک انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، غفریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے۔ کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی بجا رہے ہیں؟ جب وہ ان کے محن میں اترے گا تو وہ دن ان لوگوں کے لیے بہت برا ہوگا، جنہیں متنبہ کیا جا چکا ہے۔ پس ذرا انہیں کچھ مدت کے لیے چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، غفریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے۔“

ان سے منہ پھیر لیں۔ ان کو پوری طرح نظر انداز کر دیں۔ ان کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ ان کو اس دن تک اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ جب آپ ان کو دیکھیں گے اور وہ آپ کو دیکھ رہے ہوں گے اور اللہ کا وعدہ سچا ہو رہا ہوگا۔ ہاں اگرچہ یہ ہمارے عذاب کے آنے کے لیے بہت جلدی کر رہے ہیں لیکن لے کاش کہ وہ سوچ سکتے کہ اس دن کیا تباہی مچے گی۔ جب یہ عذاب ان کے محن میں ہو گا جب ہمارے رسول ڈر رہے ہیں اور لوگ مان کر نہیں دیتے تو اس وقت سخت عذاب

نازل ہوتا ہے۔

دوبارہ حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان سے روگردانی کر لیں اور ان کو نظر انداز کر دیں۔ یہ دراصل ان کو درپیش آنے والے خوفناک انجام کی طرف اشارہ ہے۔

فَقَوْلٌ عَنْهُمْ فِي حِينِ (۱۷۴:۳۷) ”ذرا انہیں کچھ مدت کے لیے جھوڑ دیں“۔ اور عذاب کی ہولناکی کی طرف بھی دوبارہ اشارہ کر دیا جاتا ہے۔

وَأَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ (۱۷۵:۳۷) ”اور دیکھتے رہو عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے۔“

سورت کا خاتمہ اللہ کی پاکی کے بیان پر ہوتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ عزت اور غلبہ اسی کا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہے جس طرح تمام رسولوں پر ہے۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو بلا شرکت غیر رب العالمین ہے۔

سُبْحَنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿۱۸۱﴾ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۸۲﴾ وَ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۸۳﴾

ع ۴۴

۹

پاک ہے تبار رب، عزت کا مالک، ان تمام باتوں سے جو یہ لوگ بتا رہے ہیں، اور سلام ہے رسولوں پر، اور ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔“

یہ ایسا خاتمہ ہے جو اس سورت کے تمام موضوعات پر حاوی ہے اور مضامین سورت اور مسائل زیر بحث کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ---- ۲۳

سورہ ص - ۳۸

آیات ۱- تا - ۸۸

سورہ ص ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے۔ مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی مسئلہ توحید، مسئلہ وحی الہی اور مسئلہ بعث بعد الموت پر بحث کی گئی ہے۔ یہ تینوں مسائل اس سورت کے آغاز میں پہلے ہی سبق میں لیے گئے ہیں۔ جن آیات میں ان مسائل کو لیا گیا ہے۔ وہ نصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان میں اس تعجب و دہشت اور اچھبے کو ظاہر کیا گیا جو مشرکین کے سرداروں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے طاری ہو گیا تھا۔ ان کو یہ بات بہت ہی انوکھی لگی کہ یہ شخص ایک خدا کا قائل ہے اور باقی تمام الہوں کو اس نے ختم کر دیا ہے۔ پھر وہ اس بات پر بھی متعجب تھے کہ اس پر وحی آتی ہے اور وہ اللہ کا فرستادہ بن گیا ہے۔

وَعَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ وَ قَالِ الْكُفْرُ وَ هَذَا سِحْرٌ كَذَّابٌ
(۳۸: ۴) أَجْعَلِ الْآلِهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (۳۸: ۵) وَ انْطَلَقِ
الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنْ امْشُوا وَ اصْبِرُوا عَلَى الْهَيْكُمِ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ (۳۸: ۶) مَا
سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸: ۷) ء أَنْزَلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ
بَيْنِنَا (۳۸: ۸) ”ان لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آگیا۔ مکرین کہنے لگے کہ یہ سحر ہے سخت جھوٹا ہے کیا اس نے سرے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے اور سردار ان قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض کے لیے کہی جا رہی ہے۔ یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔ کیا ہمارے درمیان بس ایک ہی شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا۔“

نیز جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس بات سے ڈرایا کہ تمہاری کنڈی ب کی وجہ سے تم پر عذاب نازل ہو جائے گا تو انہوں نے مذاق کرتے ہوئے دعا کی۔

وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْعَنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸: ۱۶) ”یہ کہتے ہیں اے ہمارے رب، یوم الحساب سے پہلے ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے۔“ ان لوگوں نے اس بات کو ناقابل تصور سمجھا کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے ایک شخص پر ذکر نازل کر دے اور پھر یہ شخص محمد بن عبد اللہ ہو جو کوئی رئیس نہ تھا اور نہ اس کی سابقہ ریاست تھی۔ نہ وہ علاقے کا حکمران تھا۔ چنانچہ ان کے اس تعجب کے جب ہی سے ان کا یہ قول نقل کیا کہ کیا ہم میں سے

اسی پر یہ ذکر نازل ہوتا تھا۔ اس پر اللہ نے ان سے پوچھا کہ کیا اللہ عزیز اور وہاب کے خزانوں کی چابیاں ان کے پاس ہیں یا زمین آسمانوں اور ان کے درمیان کی حکومت ان کے پاس ہے۔

أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيزِ الْوَهَّابِ (۳۸: ۹) أَمْ لَهُمْ مُلْكُ فِي

السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَلْيَرْتَقُوا فِي الْأَسْبَابِ (۳۸: ۱۰) ”کیا تیرے دانا اور غالب پروردگار کی رحمت کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں؟ کیا یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک ہیں۔ اچھا یہ عالم اسباب کی بلندیوں پر چڑھ دیکھیں۔“

اللہ یہ کتنا چاہتا ہے کہ اس کی رحمت کو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اپنی رحمت کے دروازے وہ جس پر چاہتا ہے کھول دیتا ہے۔ زمین اور آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک وہ نہیں ہیں۔ لہذا یہ خزانے اللہ جسے چاہے دے دے۔ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے مختار بنا دے۔ کیونکہ وہی جانتا ہے کہ کسی منصب کا مستحق کون ہے وہ اپنے بندوں پر بے قید اور بے حساب انعامات کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نکتے کو ثابت کرنے کے لیے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے قصے لائے گئے کہ اللہ نے انہیں نبوت، حکومت، پہاڑوں کی تسخیر، پرندوں کی تسخیر جنوں اور ہواؤں کی تسخیر کی قوت دی اور زمین کے خزانوں کا تو شمار ہی نہ تھا۔ اور دنیا کا ساز و سامان اور زیر و زمت تو بے انتہا تھی۔

کیا داؤد و سلیمان ان سب انعامات کے باوجود انسان نہ تھے۔ کیا ان کے اندر بشری کمزوریاں نہ تھیں۔ کیا وہ ہر رحمت خداوندی کے محتاج نہ تھے۔ کیا ان جیسے طاقتور نبیوں اور بادشاہوں کی لہذا اللہ نے قدم قدم پر نہ کی تھی۔ کیا ان کی غلطی پر توبہ قبول نہ کی تھی اور راہ صواب کی طرف ان کی راہنمائی نہ کی تھی۔

ان قصص کے ساتھ بغیر اسلام کو ہدایت کی گئی کہ آپ ان مکہ بین کی ایذا رسانیوں پر صبر کریں اور اللہ کے فضل کے امیدوار رہیں۔ اللہ آپ کا نگہبان ہے۔

اصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ (۳۸: ۱۷)

”اے نبی صبر کر ان باتوں پر جو یہ لوگ بتاتے ہیں اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کرو جو بڑی قوتوں کا مالک تھا۔ اور ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔“

حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ اس مقصد کے لیے لایا گیا کہ اللہ اپنے مخلص ترین بندوں کو ابتلاؤں میں آزماتا ہے۔ لہذا دعوت اسلامی کے کارکنوں کو اس طرح صبر کرنا چاہئے جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام نے صبر کیا۔ یہ قصہ نیک لوگوں کے حسن انجام کی تصویر ہے۔ نیکوں پر بالآخر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ وہ رحمت میں ڈوب جاتے ہیں۔ قدرت اپنے رحیمانہ ہاتھوں سے ان پر شفقت کا ہاتھ پھیرتی ہے۔ اس دور میں رسول اللہ اور اہل ایمان مکہ میں بے حد مصائب برداشت کر رہے تھے۔ ان کو یہ اشارہ دیا جا رہا ہے کہ ان مشکلات کے بعد رحمتوں کا فیضان ہو گا۔ اور اللہ کے خزانوں کے منہ کھل جائیں گے۔

یہ قصص سورت کے ایک پڑے جسے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اور سورت کا سبق نمبر ۲ انہی پر مشتمل ہے۔

یہ لوگ عذاب کے نازل ہونے میں بہت جلدی کرتے تھے وہ کہتے تھے :

وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْعًا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸:۱۶) ”اے ہمارے رب‘ یوم الحساب سے پہلے ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے۔“ چنانچہ ان قصص کے بعد قیامت کے منظر میں سے ایک منظر یہاں لایا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مستحقین کا انتظار کیا انعامات کر رہے ہیں اور یہ کہ جہنم کس شان سے مکذبین کا انتظار کر رہی ہے۔ قیامت کے اس منظر میں بتایا جاتا ہے کہ وہ حقیقی قدریں کیا ہیں جن کی وہاں اہمیت ہے۔ یہ سردار وہاں اپنا انجام دیکھ لیں گے۔ اور دنیا میں جن فقراء اور مساکین کے ساتھ وہ مذاق کرتے تھے اور ان کو اس بات کا لٹل نہ سمجھتے تھے کہ یہ بھی اللہ کی رحمتوں اور خزانوں کے حق دار ہو جائیں۔ یہاں معلوم ہو گا کہ یہ سردار ابراء نہیں اور یہ فقراء‘ فقراء نہیں۔ یہاں ان فقراء کا انجام یہ ہو گا۔

جَنَّاتٍ عِدْنٍ مِّن مَّوْجِدٍ لَّهُمُ الْبَابُ (۳۸:۵۰) مُتَّكِئِينَ فِيهَا يَدْعُونَ فِيهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَشَرَابٍ (۳۸:۵۱) وَعِنْدَهُمْ قُصِرَتُ الطَّرْفُ اَنْرَابُ

(۳۸:۵۲) ”میدے رہنے والی جنتیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے ان میں وہ ٹکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ خوب خوب خوراک اور مشروب طلب کر رہے ہوں گے اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہوں گی۔“ اور جو سرکش ہیں ان کا انجام بہت ہی برا ہو گا۔

جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمِهَادُ (۳۸:۵۶) هَذَا فَلْيَذُوقُوهُ حَمِيمٌ وَغَسَّاقٌ (۳۸:۵۷) وَآخِرُ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ (۳۸:۵۸) ”جہنم جس میں وہ جھلے جائیں گے۔ بہت ہی بری قیام گاہ یہ ہے ان کے لیے۔ پس وہ مزہ چکھیں کھولتے ہوئے پانی اور پیپ‘ لہو اور اس قسم کی دوسری تلخیوں کا۔“ یہ لوگ جہنم میں ایک دوسرے کو لعنت و ملامت کریں گے۔ باہم جھگڑیں گے اور یہ بات یاد کریں گے کہ وہ تو مومنین کو حقیر سمجھ کر ان سے مذاق کرتے تھے۔

وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرَى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِنَ الْأَشْرَارِ (۳۸:۶۲) اَتُخَذَتْهُمْ

سُخْرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمْ الْأَبْصَارُ (۳۸:۶۳) ”وہ آپس میں کہیں گے کیا بات ہے ہم ان لوگوں کو کہیں نہیں دیکھتے جن کو ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے۔ ہم نے یونہی ان کا مذاق بنالیا تھا یا کہیں وہ نظروں سے لوجھل ہیں۔“ یہ لوگ ان مومنین کو جہنم میں نہ پائیں گے اور یہ بات تو معلوم ہے کہ وہ جہنم میں نہ پائیں گے۔ لہذا یہ ہے جواب ان کے اس مطالبے کا اور مذاق کا۔ یہ منظر اس سورت کا تیسرا سبق ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کفار کو علوم وحی سناتے وہ مکذیب کرتے ہوئے ان باتوں کو انہونی سمجھتے۔ حضرت

آدم علیہ السلام کا قصہ سنا کر ان کو بتایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ قصہ بذریعہ وحی آرہے ہیں ورنہ وہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو موجود نہ تھے۔ یہ خبریں ان کو لکھ جاتا ہے۔ وہاں آدم علیہ السلام کے سوا کوئی اور تو موجود ہی نہ تھا۔ دور ان قصہ بتایا جاتا ہے کہ ابلیس کو جس امر نے ہلاکت میں ڈالا وہ صرف یہ تھا کہ اسے حضرت آدم کے ساتھ ضد ہو گئی تھی۔ اور اس نے اس بات کو ناپسند کیا کہ اللہ نے اس کے مقابلے میں آدم علیہ السلام کو کیوں ترجیح دی۔ جس طرح لیل مکہ یہ کہتے تھے کہ بس یہی رہ گیا ہمارے میں سے نبی بننے کے لیے۔ اشارہ یہ مطلوب ہے کہ ان کے موقف اور ابلیس کے موقف میں پوری پوری یگانگت ہے۔ لہذا جس طرح وہ راندہ درگاہ ہوا یہ بھی ہوں گے۔

اس سورت کا خاتمہ سبق چارم پر ہوتا ہے۔ اس میں حضور ان لوگوں سے خطاب کر رہے ہیں کہ آپ جو دعوت دے رہے ہیں وہ خود اپنی جانب سے نہیں دے رہے ہیں۔ اور نہ آپ اس پر ان سے کوئی اجرت طلب کرتے ہیں اور یہ کہ اس دعوت کے بہت ہی عظیم نتائج لکھنے والے ہیں۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ (۳۸: ۸۶) اِنْ هُوَ اِلَّا

ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ (۳۸: ۸۷) وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ (۳۸: ۸۸) ”اے نبی ان سے کہہ دو کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹی لوگوں میں سے ہوں۔ یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے اور تھوڑی مدت ہی گزرے گی کہ تمہیں اس کا حال خود معلوم ہو جائے گا۔“

یہ چاروں سبق اس سورت کے موضوعات کو اس طرح آگے بڑھاتے ہیں کہ انسان کے دل و دماغ کو تاریخ کے ان اقوام کی سیر کراتے ہیں جنہوں نے زمین پر بڑی حاصل کی، جباری و تماری کا رویہ اختیار کیا اور رسولوں اور مومنین پر دست درازیاں کیں۔ لیکن ان کا انجام جہاں و بربادی اور کھلم ہلاکت کی صورت میں سامنے آیا۔

جَعَدْنَاكَ مَهْزُومًا مِنَ الْأَحْزَابِ (۳۸: ۱۱) كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَ

عَادٌ وَفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ (۳۸: ۱۲) وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ لَيْكَةِ

أُولَئِكَ الْأَحْزَابُ (۳۸: ۱۳) اِنْ كُلُّ اِلَّا كَذِبَ الرُّسُلِ فَحَقَّ عِقَابُ (۳۸: ۱۴)

”یہ قوموں میں سے ایک بھونٹا جتہ ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے۔ ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور بنو فرعون اور ثمود اور قوم لوط اور ایک جھٹلا چکے ہیں۔ جتھے وہ تھے ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور میری حقیت کا فیصلہ ان پر چسپاں ہوا۔“

چنانچہ انسانی فکر کے سامنے اقوام کی تاریخی ہلاکتیں، بربادیاں اور تمام سرکشوں کی بربادیاں پیش کر کے اس کے مقابلے میں اللہ کے سچے بندوں اور اللہ کے لشکروں کی کامیلیاں بھی بیان کی جاتی ہیں۔ عزت، اقتدار اعلیٰ اور اللہ کی رحمت اور شفقت ان کے شامل حال رہتی ہے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے قصص کی صورت میں رسولوں اور اللہ کے بندوں کی کامیلیاں بھی بیان کی جاتی ہیں۔

یہ کامیابیاں تو زمین پر ہیں۔ اس کے بعد کچھ مناظر قیامت کی کامرانیوں کے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ نعمتیں اور اللہ کی رضامندیاں۔ دوسری جانب جہنم اور اللہ کا غضب کھڑیوں کے لیے۔ اس دافقواء کے بعد دار بقا میں دونوں فریقوں کے حال و احوال بھی ان اسباق میں پیش کیے گئے ہیں۔

آخری سبق قصہ انسانیت ہے۔ کس طرح شیطان نے حسد اور بغض کی وجہ سے انسانیت کے خلاف سازش کی۔ آج بھی یہی شیطان در حقیقت کھڑیوں کی تکیل قحاصے ہوئے ہے مگر وہ غافل ہیں۔ ان اسباق کے دوران انسانی احساس کو چکا کر جایا جاتا ہے کہ زمین و آسمان کے اندر در اصل ایک حقیقی سچائی کام کر رہی ہے۔ یہ ایک سچے نظام پر قائم ہیں۔ بعینہ اس طرح رسول بھی ایک سچائی لے کر آئے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں سچائیاں ایک ہیں۔ نہ انسان ہے مقصد ہے اور نہ یہ کائنات ہے مقصد ہے۔

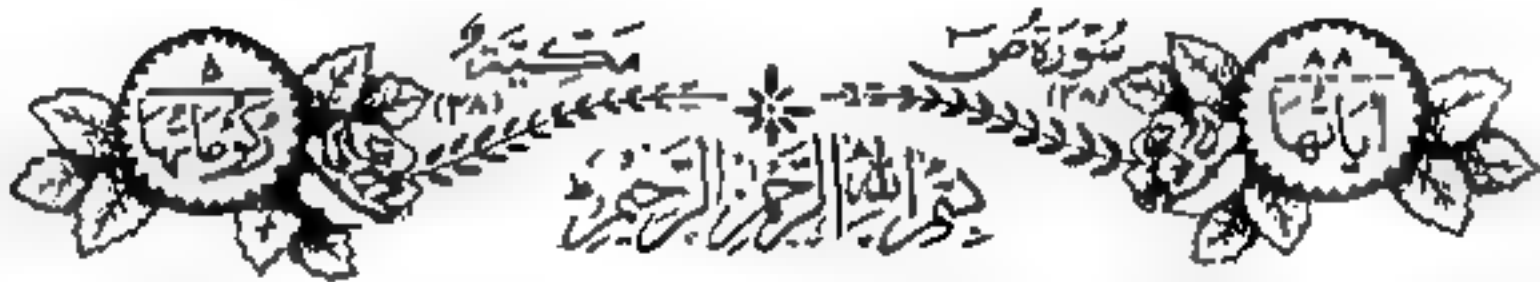
وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا (۲۷:۳۸) ”ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان پائی جانے والی چیزوں کو فضول پیدا نہیں کر دیا۔“ قرآن کریم میں ایسے بے شمار اشارات موجود ہیں اور یہ وہ اصل نظریہ ہے جس پر یہ کائنات اور یہ شریعت قائم ہے اور تمام کی قرآن میں اس حقیقت کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔

اب تفصیلات اور تشریحات۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۱۱ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۱۶



ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ ۚ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ ۚ كَذَّبْنَا
مِنْ قَبْلِهِمْ مَنْ قَرَّبْنَا نَادُوا وَكَانَتْ حِجْنٌ مِّنَاصٍ ۚ

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ص“ قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی، بلکہ یہی لوگ جنہوں نے ماننے سے انکار کیا ہے، سخت تکبر اور ضد میں مبتلا ہیں۔ ان سے پہلے ہم ایسی کتنی ہی قوموں کو ہاک کر چکے ہیں (اور جب ان کی شامت آئی ہے) تو وہ چیخ اٹھے ہیں، مگر وہ وقت بچنے کا نہیں ہوتا۔“

اللہ تعالیٰ حرف ص اور قرآن کریم کی قسم کھاتا ہے۔ اس قرآن کی قسم جو نصیحت سے مالا مال ہے۔ یہ حرف ص بھی اللہ کا بنایا ہوا ہے اور یہ قرآن بھی اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ اللہ ہی ہے جو انسان کے گلے میں حرف صاد پیدا کرتا ہے اور پھر یہ حرف اور اللہ کے پیدا کردہ دوسرے حروف جنہی مل کر قرآن کے اسالیب کلام پیدا کرتے ہیں۔ لیکن تمام انسان ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ کیونکہ قرآن کلام الہی ہے اور اس کے اندر وہ ادبی صنعت کاری ہے جو انسان کے دائرہ قدرت سے باہر ہے اور اللہ کا یہ اعجاز کلام الہی قرآن میں بھی ہے اور دوسری پیدا کردہ چیزوں میں بھی ہے۔ یہ آواز ص جو انسان کے گلے سے نکلتی ہے، یہ اس اللہ کی تخلیق سے نکلتی ہے۔ جس نے انسان کا گلا بنایا، جس سے اس کے سوا دوسری آوازیں بھی نکلتی ہیں۔ انسانوں کی قدرت میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ آواز نکالنے کا کوئی ایسا چلتا پھرتا زندہ آلہ بنالیں اور یہ بھی لیک خارق العادت معجزہ ہے اور اس قسم کے ہزار ہا معجزات خود ان کے جسم میں ہیں۔ اگر یہ لوگ صرف اپنے اللہ کے اندر پائے جانے والے معجزات ہی پر غور کرتے تو انہیں اس بات پر کوئی اچھٹا نہ ہوتا کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے

ایک بندہ پر وحی نازل کی ہے اور ایک بندے کو مختار بنایا ہے کیونکہ وحی کے اندر ایسی بات نہیں ہے جس طرح اللہ کے پیدا کردہ انسان اور دوسری چیزوں کے اندر ایک ایک بات مخبرہ ہے۔

ص وَالْقُرْآنَ ذِي الذِّكْرِ (۳۸: ۱) ”ص“ قسم ہے نصیحت بھر قرآن کی۔ قرآن کریم میں جس طرح قوانین، دستور، قصص، فلسفہ اور تہذیب کی باتیں ہیں اسی طرح نصیحت اور یاد دہانی بھی ہے۔ لیکن نصیحت اور اللہ کی طرف راہنمائی سب دوسرے مضامین کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ قرآن کی اصل غرض نصیحت و ہدایت ہے بلکہ نصیحت کے سوا دوسرے مضامین بھی دراصل اللہ تک پہنچانے والے ہیں۔ یوں کہ سب اللہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ واللہ ذکر کا مفہوم مذکور اور مشہور بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی قرآن کی صفت ہے کہ وہ بہت مشہور ہے۔

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا هِيَ عِزَّةٌ وَشِقَاقٌ (۳۸: ۲) ”بلکہ یہی لوگ جنہوں نے ماننے سے انکار کیا ہے سخت تکبر اور صدمہ میں مبتلا ہیں۔“ یہاں کلام میں اضطراب اور اچانک موضوع سخن کی تبدیلی نظر آتی ہے۔ پہلے قرآن کا موضوع تھا اب مشرکین پر تبصرہ شروع ہو گیا کہ وہ کبر و غرور میں ڈوبے ہوئے ہیں اور سخت ضد اور دشمنی میں مبتلا ہیں۔ لیکن یہ موضوع سخن کی تبدیلی فقط ظاہری ہے اور اس ظاہری تبدیلی سے غرض یہ ہے کہ قاری مسئلے پر درراستہ گیری سے غور کرے۔ یہاں ص اور قرآن دی ذکر کی قسم اٹھائی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس بات کا ذکر ہو رہا ہے وہ بہت بڑی بات ہے۔ اسی لیے اللہ نے اس پر قسم اٹھائی ہے۔ اس کے بعد مشرکین کے غرور اور ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا۔ مسئلہ ”بل“ حرف اضطراب سے قبل اور بعد ایک ہی ہے۔ ان کی توجہ اس طرف مبذول کر لئی جاتی ہے کہ اللہ قرآن کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اور مشرکین ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کس طرح قرآن کو نظر انداز کرتے ہیں۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ اس سے قبل انسانی تاریخ میں جن جن اقوام نے غرور و تکبر کیا اور اس کی وجہ سے ضد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہوئے وہ صفحہ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ کیونکہ انہوں نے بہت بڑا تکبر کیا اور دعوت اسلامی سے شدید دشمنی اختیار کی۔ دراتاریخ میں ان کا منظر دیکھو کہ چیخ و پکار کر رہے ہیں اور کوئی سنتا ہی نہیں۔ اب تو ان کے دماغ سے وہ سب کچھ نکل گیا ہے۔ اب تو وہ بچے جارہے ہیں۔ دشمنی انہوں نے ترک کر دی اور اب تو وہ بہت ہی بر خور دار بنے جا رہے ہیں۔ لیکن اس وقت جب چڑیاں چک گئیں کھیت!

كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قُلُوبٍ مِّن قَبْلِهِمْ مَّنْ قَرْنَ فَنَاءً دَوًّا وَلَآتَ حِينٌ مِّنَّا ص (۳۸: ۳) ”ان سے پہلے ہم ایسی کتنی ہی قوتوں کو ہلاک کر چکے ہیں اور جب ان کی شامت آئی تو وہ چیخ لگھے ہیں مگر وہ وقت بچنے کا نہیں۔“ شاید تاریخ کے ان صفحات کے مطالعے کا ان پر اثر ہوا اور وہ اپنے کبر و غرور سے وحکس ہو جائیں اور اپنی بے جا دشمنی کو ترک کر دیں۔ اور اپنے آپ کو اس موقف پر کھڑا نہ کریں جو ان ہلاک شدہ اقوام کا تھا کہ وہ جیتنے پکارتے رہے لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی۔ اب تو ان کے سامنے وسیع وقت ہے۔ وہ اس بے بسی کی پکار سے بچ سکتے ہیں۔ جب کوئی سننے والا نہ ہو۔ اور نہ بچنے کی کوئی راہ ہو۔

یہ تو تھی ان کو جھوڑنے کے لیے ایک سخت ضرب۔ اب تفصیلاً بتایا جا رہا ہے کہ ان کے تکبر اور ان کی دشمنی کی تفصیلات کیا تھیں۔ نئے تفصیلات :

وَعَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا سِحْرٌ كَذَّابٌ أَجَعَلَ الْإِلَهَ الْهَآ وَاحِدًا إِن هَذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۚ
وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَى آلِهَتِكُمْ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ ۚ مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ ۚ إِن هَذَا إِلَّا خِتِلَاقٌ ۚ

”ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آگیا۔ منکرین کہنے لگے کہ ”یہ ساحر ہے“ سخت جھوٹا ہے ”کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔“ اور سردار ان قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ ”چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے۔ یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔“ تکبر یہ تھا۔

ء أَنزَلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا (۳۸: ۸) ”کیا ہمارے درمیان بس یہی شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا۔“ اور دشمنی یہ تھی کہ

أَجَعَلَ الْإِلَهَ الْهَآ وَاحِدًا (۳۸: ۵) ”کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا۔“ اور یہ بھی دشمنی کی وجہ ہے۔

مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ (۳۸: ۷) ”یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔“ اور یہ کہ ہذا سِحْرٌ كَذَّابٌ (۳۸: ۴) ”یہ جادوگر ہے بڑا جھوٹا۔“ اور ان ہذا إِلَّا خِتِلَاقٌ (۳۸: ۷) ”یہ کچھ نہیں مگر ایک من گھڑت بات۔“ یہ سب دشمنی کی وجوہات تھیں۔

رسول کا انسان ہونا زمانہ قدیم سے قابل تعجب رہا ہے۔ ہر زمانے میں اس کا اعادہ ہوا ہے۔ جب سے رسالتوں کا آغاز ہوا ہے یہ اعتراض ہوتا رہا ہے۔ رسول بھی آتے رہے اور اس قسم کے اعتراضات بھی ہوتے رہے۔

وَعَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ (۳۸: ۴) ”اور ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آگیا۔“ حالانکہ مناسب ترین اور معقول ترین بات تو یہی ہے کہ ڈرانے والا انہی میں سے ہو، وہ بشر ہو اور یہ بات جانتا ہو کہ انسان کیا سوچتے ہیں اور ان کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ ان کے غلط فہمیاں کیا ہوتے ہیں اور ان کے وجود میں کیا کشمکش ہے۔ اور ان کے اندر کیا کیا کمزوریاں ہوتی ہیں اور کیا کیا کوتاہیاں ان کے وجود

میں ہوتی ہیں۔ ایک انسان ہی یہ جان سکتا ہے کہ انسان میں کہاں کہاں کیا کمزوری ہے۔ کہاں کہاں وہ جذبات اور میلانات کا دباؤ محسوس کرتا ہے۔ اس کی وسعت اور قدرت کی حدود کیا ہیں۔ وہ کس قدر مشقت برداشت کر سکتے ہیں۔ کن کن رکاوٹوں اور مشکلات کے سامنے وہ بے بس ہو جاتے ہیں اور کیا کیا چیزیں ان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

رسول ایک انسان ہوتا ہے 'انسانوں سے ہوتا ہے' انسانوں میں رہتا ہے تو اس کی زندگی ان کے لیے نمونہ ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے اسوہ کو اپناتے ہیں 'وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارا ہی بھائی ہے اور ہم ہی میں سے ہے۔ اور یہ کہ قوم اور رسول کے درمیان انسانی اور سماجی رولبط پسے سے موجود ہوتے ہیں۔ لہذا وہ اس منہاج کو اپنا سکتے ہیں جس پر وہ ہوتا ہے۔ اور لوگوں سے بھی یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ اسے اپناؤ۔ کیونکہ رسول جیسے طرز عمل کو وہ بھی اپنا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس نظام پر ایک شخص نے عمل کر کے دکھا دیا ہے۔ جو خود ان میں سے ہے اور ان جیسا انسان ہے۔

لیکن یہ بات تعجب انگیز ہے کہ یہ معقول ترین اور لازمی امر بھی ہمیشہ لوگوں کے لیے باعث تعجب بنا رہا ہے۔ وہ اسے انوکھا سمجھتے رہے ہیں اور محذوب کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ انسانوں میں سے رسول جیسے کی حکمت کو نہ سمجھتے تھے۔ وہ رسالت کے منصب کی حقیقت کو بھی نہ سمجھتے تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ رسول کو ایک بشر قائد اور راہنما سمجھتے جو ان کو اللہ کی راہ دکھاتا ہے 'وہ رسول کو ایک عجب ناقابل فہم اور خیالی شخصیت سمجھتے تھے۔ وہ یوں سیدھے سادے انسانوں کو رسول نہ مانتے تھے۔ وہ رسول کو بھی ایسی شخصیت سمجھتے تھے جو خیالی ہو 'جسے چھو نہ جاسکتا ہو۔ جسے دیکھنا نہ جاسکتا ہو۔ وہ ظاہر و باہر نہ ہو 'جو اس کرۂ ارض پر ایک عملی زندگی نہ رکھتا ہو۔ فرض وہ رسولوں کو ایک انسانی شخصیت کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور جس طرح ان کے عقائد تھے وہ رسولوں کو بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔

لیکن اللہ کی مرضی یہ تھی کہ انسانوں کے لیے اس کی یہ آخری رسالت نہایت عملی اور واقعت پندارہ ہو۔ اس میں لوگوں کے لیے پاکیزہ 'طیب اور اعلیٰ درجے کی زندگی کا انتظام ہو۔ اور یہ آخری رسالت زمین کے اوپر ایک حقیقت ہو۔ اوہام و خیالات اور محض ہوائی مثالوں اور افسانوں پر مبنی نہ ہو۔ حقائق پر مبنی ہو 'محض اوہام و اساطیر نہ ہو۔

وَقَالَ الْكُفَرُؤْنَ هَذَا سِحْرٌ كَذَّابٌ (۳۸: ۴) "مشرکین کہنے لگے یہ تو ساحر ہے 'سخت جھوٹا ہے۔" اور کافروں نے یہ بات محض اس لیے کہی کہ وہ اپنے جیسے ایک شخص کی رسالت کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے۔ اور پھر انہوں نے یہ بات اس لیے بھی کہی کہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پیغمبر ہو جائیں اور وہ سچائی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے جو واضح تھی اور پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ صدق و صفا میں مشہور تھے 'وہ اس کو لوگوں کی نظروں میں مشتبہ بنانے کے لیے ایسا کرتے تھے۔

اصل حقیقت یہ ہے اور اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مشرکین مکہ نے کسی بھی مرحلے میں خود اپنی اس بات کو کبھی بھی سچا نہیں سمجھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جاوید گر ہیں یا بہت بڑے جھوٹے ہیں کیونکہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈے اور گمراہ کن نشر و اشاعت کی جو مہم چلا رہے تھے۔ یہ اس کے ہتھیاروں میں سے ایک اوجھا ہتھیار تھا۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو 'اپنے مقام و مرتبہ کو اور اپنے غلط عقائد کو بچانا چاہتے تھے۔ کیونکہ تحریک اسلامی کی صورت میں ان کو جو خطرہ درپیش تھا 'اس کی

وجہ سے ان کی کھوئی اور جھوٹی اقدار کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور ان کے بتاؤنی طور طریقوں کے وجود تک کو خطرہ لاحق تھا اور کبرائے قریش اسے اچھی طرح سمجھتے تھے۔

ہم نے یہ بات اس سے پہلے بھی نقل کی ہے اور یہاں بھی نقل کر رہے ہیں کہ کبرائے قریش نے پروپیگنڈے کی یہ جھوٹی ہم نہایت ہی سنجیدگی اور سوچ سمجھ کر شروع کی تھی۔ اس طرح وہ اپنے وجود اپنے طور طریقوں اور اپنے نظریات کو بچانا چاہتے تھے۔ نیز اس طرح موسم حج میں عرب قبائل میں تحریک اسدی کے اثرات کے پھیلنے کا جو خطرہ درپیش تھا اس کا وہ سدباب چاہتے تھے۔

محمد بن اسحاق نے نقل کیا ہے کہ ولید ابن مغیرہ کے پاس قریش کے کچھ معمر لوگ جمع ہوئے 'موسم حج آنے والا تھا۔ ولید نے ان سے کہا کہ اکابرین قریش آپ کو معلوم ہے کہ موسم حج آرہا ہے اور عرب کے وفود آنے شروع ہوں گے۔ نیز انہوں نے اس شخص کے بارے میں بھی سن رکھا ہو گا۔ لہذا اس موضوع پر اپنی بات کو ایک کرلو۔ یوں نہ ہو کہ ہر شخص ایک علیحدہ بات کرے اور تم خود ایک دوسرے کی ٹکڑی بکرتے پھرو۔ تو انہوں نے کہا عبد شمس تم ہی کچھ کو لو اور ہمیں ایک مضبوط موقف دے دو تاکہ ہم سب ایک ہی بات کہیں تو ولید نے کہا تم کو میں سن کر قیاس کروں گا۔ کسی نے کہا اسے کاہن کو 'ولید نے کہا یہ تو بات نہیں ہے۔ خدا کی قسم یہ کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کو خوب دیکھا ہوا ہے۔ نہ قرآن کاہنوں کا زمرہ ہے اور نہ ان کا سب کچھ کام ہے تو کسی نے کہا اتنا پاگل کو۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ مجنون بھی نہیں ہے۔ لوگ مجنوںوں اور پاگلوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ نہ وہ مجنوںوں کی طرح گلوگیر ہے۔ نہ دہنی خلیجان میں جتلا ہے اور نہ اسے کوئی دوسرہ ہے۔ تو پھر اسے شاعر کہنا چاہئے۔ تو اس نے کہا کہ اس کا کلام شعر بھی نہیں ہے۔ ہم اشعار کو جانتے ہیں۔ نہ رجز ہے 'نہ ہزج ہے 'نہ قریض ہے 'نہ مقبوض ہے 'نہ مبسوط ہے۔ لہذا یہ کلام شعر نہیں ہے تو انہوں نے کہا پھر اتنا جادوگر ہی کہا جاسکتا ہے۔ تو ولید نے کہا وہ تو جادوگر بھی نہیں ہے۔ ہم نے جادوگر بھی دیکھے ہوئے ہیں۔ ان کے جادو کے کرشمے بھی دیکھے ہوئے ہیں۔ نہ یہ ان کی بھونک ہے اور نہ ان کی بندش ہے تو ان اکابرین نے کہا عبد شمس پھر تم ہی بتاؤ کہ کیا کہیں اسے۔ تو اس نے کہا خدا کی قسم اس کی بات میں مٹھاس ہے۔ اس کی جنس بہت ہی گہری ہے۔ اور اس کی شاخوں پر پھل ہیں اور تم ان باتوں میں سے جس کا بھی پروپیگنڈہ کرو معلوم ہو گا کہ تمہاری بات غلط ہے۔ ہاں ممکن حد تک جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ تم اسے ساحر کو کہو کہ وہ جو کلام لایا ہے وہ جادو کی طرح ایک شخص اور اس کے بھائی 'ایک شخص اور اس کی بیوی ایک شخص اور اس کے خاندان کے درمیان تفریق کرتا ہے۔ لہذا سب ہی ایک بات کرو 'چنانچہ موسم حج میں یہ لوگ راستوں پر بیٹھ گئے۔ اور جو بھی گزرتا اسے وہ کہتے تھے کہ لوگو ڈرو اس شر میں ایک جادوگر پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ از خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تفصیلات بتاتے۔ یہ تھی حقیقت اس بات کی جو وہ کہتے تھے۔

سُحْرٌ كَذَّابٌ (۳۸: ۴) جبکہ وہ خود جانتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچ کہتے تھے 'نہ ساحر تھے اور نہ کذاب تھے۔

نیز وہ اس بات پر بھی تعجب کرتے تھے کہ وہ نرم الوں کی جگہ ایک ذات کو اللہ ماننے کی دعوت دے رہا ہے۔

حالانکہ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ اس کائنات کا اللہ ایک ہی ہے۔

أَجْعَلِ الْإِلَهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجَابٌ (۵:۳۸) وَ انْطَلِقِ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنْ امْشُوا وَ اصْبِرُوا عَلَى الْهَيْكُمِ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ (۶:۳۸) مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمَلَّةِ الْآخِرَةِ إِنَّ هَذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (۷:۳۸) کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے اور سردار ان قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض کے لیے کہی جا رہی ہے۔ یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی مت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔

قرآن کریم اسلامی نظریہ حیات سے ان کی دہشت اور بوکلاہٹ کی خوب تصویر کشی کرتا ہے۔

أَجْعَلِ الْإِلَهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا (۵:۳۸) ”کیا اس نے تمام الہوں کو ایک الہ بنا دیا“۔ گویا اسلام کا فطری عقیدہ ایک انہونی اور ناقابل تصور بات ہے۔

إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجَابٌ (۵:۳۸) ”یہ تو ایک عجیب نظریہ ہے“۔ لفظ ”عجاب“ یہ بتاتا ہے کہ ان کی دہشت زدگی اور بوکلاہٹ بہت ہی عظیم تھی۔

جمہور کے ذہنوں سے اسلامی عقائد کے اثرات مٹانے کے لیے وہ جس قسم کی جدوجہد کر رہے تھے۔ قرآن کریم اس کی بھی زبردست تصویر کشی کر رہا ہے۔ وہ بے حد جدوجہد کر رہے تھے کہ لوگ اپنے موروثی عقائد پر جے رہیں۔ اگرچہ وہ عقائد و نظریات باطل اور پوچھ ہوں۔ وہ عوام کو یہ باور کراتے تھے کہ دراصل اس تحریک کے پیچھے کوئی خفیہ ہاتھ ہے۔ اور یہ کہ وہ سردار ہیں اور خفیہ سازشوں سے باخبر ہیں۔ اور یہ گہری سازش کی جا رہی ہے۔

وَ انْطَلِقِ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنْ امْشُوا وَ اصْبِرُوا عَلَى الْهَيْكُمِ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ

(۶:۳۸) ”اور سردار ان قریش یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ چلو اور اپنے معبودوں کی عبادت پر اٹے رہو۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے۔“ یہ کوئی دین اور نظریہ کی بات نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہی گہری سازش ہے اور جمہور عوام کا یہ فرض ہے کہ یہ معاملہ اکابر پر چھوڑ دیں۔ جو خفیہ باتوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے موروثی طرز عمل پر جے رہیں اور اپنے آباؤ اجداد کے عقائد کو سختی سے پکڑ رکھیں۔ اور اس جدید تحریک کے پیچھے جو سازش ہے اس میں نہ پڑیں۔ یہ لیڈروں کا کام ہے کہ وہ ان سازشوں کا دفاع کریں۔ عوام کو مطمئن رہنا چاہئے۔ قیادت اپنے مفادات ’عوام کے مفادات اور اپنے الہوں کے مفادات کو اچھی طرح جانتی ہے۔

یہ ہے ایک عام اور ہر سوسائٹی میں دہرائے جانے والا طریقہ کار جس کے مطابق لوگ عوام الناس کو ملک و ملت کے

مسائل سے ہٹانے کے لیے جسے ہر سوسائٹی کے سرکش، باغی اور ڈکٹیز اور طاغوتی قوتیں استعمال کرتی ہیں۔ اس لیے کہ اگر عوام الناس قوی مسائل پر سوچنا شروع کر دس تو یہ طاغوتی قوتوں کے لیے ایک خطرناک علامت ہوتی ہے۔ طاغوت کے اقتدار کے لیے یہ خطرہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ان اندھیروں کے چھٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے جن میں عوام الناس غرق ہوتے ہیں۔ کیونکہ طاغوت کا اقتدار قائم بن تب ہوتا ہے جب جمہور جمالت میں غرق ہوں۔

اس کے بعد وہ اہل کتاب کے ظاہری عقیدے سے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں یعنی اہل کتاب کے حوالے سے جبکہ اہل کتاب کے عقائد میں بھی انسانے داخل ہو گئے تھے اور انہوں نے توحید کے خالص عقیدے میں تحریف کر کے اسے شرکیہ عقائد بنا دیا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (۷: ۳۸) ”یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات۔“

نزول قرآن کے زمانے میں عیسائیوں کے درمیان عقیدہ تثلیث عام ہو گیا تھا اور حضرت عزیر کی الوہیت کا عقیدہ بھی یودیوں کے درمیان پھیل گیا تھا۔ اکابرین قریش اس طرف اشارہ کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ ”یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں نہیں سنی۔ حیر خالص توحید تو نہ یہودیت میں ہے اور نہ عیسائیت میں۔ لہذا حضرت محمدؐ جو کچھ پیش کر رہے ہیں، یہ ان کا من گھڑت دین ہے۔“

اسلام نے خالص توحید کے قیام کے لیے بہت ہی جدوجہد کی۔ اور عقیدہ توحید سے ہر قسم کے انسانوں، شرک خفی اور شرک جلی اور تمام دوسری بے راہ رویوں اور کج فکریوں کو دور کر دیا۔ یہ اس لیے کہ عقیدہ توحید وہ حقیقت ہے جس پر یہ پوری کائنات قائم ہے۔ اور اس پر یہ پوری کائنات شہادت دے رہی ہے۔ نہایت ہی واضح انداز میں۔ پھر انسان کی شخصیت کی اصلاح اس کی ذات میں ان کے اصول حیات میں اور زندگی کے فروغی مسائل میں اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ عقیدہ توحید پر قائم نہ ہو۔

یہاں مناسب ہے کہ اس بات کی تفصیل دے دی جائے کہ قریش عقیدہ توحید کی کس قدر شدید مزاحمت کر رہے تھے۔ اس عقیدے کی وجہ سے وہ کس قدر زیادہ دہشت زدہ ہو گئے تھے اور وہ بے شمار لوگوں کی جگہ اللہ واحد کے عقیدے کو کس قدر عجیب اور انوکھا سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی بیان کر دس کہ قریش سے قبل انسانی تاریخ میں تمام مشرکین نے کس طرح ہمیشہ اس عقیدے کی مخالفت کی اور آدم علیہ السلام سے ادھر تمام انبیائے کرام نے کس طرح ہمیشہ اس عقیدے پر اصرار کیا۔ اور اس بات کے لیے ان تھک مٹائی کہیں کہ لوگ اس عقیدے کو تسلیم کر لیں اور یہ کہ حقیقتاً ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ بیٹھ جائے۔ سب سے پہلے یہ مناسب ہے کہ قارئین عقیدہ توحید کی اہمیت کو سمجھ لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ توحید وہ بنیادی سچائی ہے جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے اور یہ پوری کائنات نہایت وضاحت کے ساتھ وحدت الوہیت پر شہادت دیتی ہے۔

وہ قوانین قدرت جو اس پوری زمین پر لاگو ہیں اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے بالکل ایک اکائی ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ جس ارادے کے تحت یہ قوانین وجود میں آئے ہیں، وہ ایک ہی ارادہ ہے۔ اس کائنات پر مجموعی نظر ڈالنے

سے یا اس کائنات کے ایک ہی جزء کے مطالعے۔ ابھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر وحدت پائی جاتی ہے۔ اور یہ وحدت جاتی ہے کہ اس کو وجود میں لانے والا ارادہ ایک ہی ہے۔

اس کائنات میں جس قدر اشیاء ہیں 'ان میں سے ہر شے متحرک ہے۔ یہ پوری کائنات چھوٹے چھوٹے درات سے مرکب ہے۔ خواہ زندہ کائنات ہو یا مردہ۔ یہ تمام ذرات الیکٹرون سے مرکب ہیں اور یہ الیکٹران ایک محضی کے ارد گرد حرکت کرتے ہیں جو پروٹونز سے مرکب ہے۔ یہ حرکت اسی طرح ہے جس طرح کوکب سورج کے ارد گرد حرکت کرتے ہیں۔ اور جس طرح بے شمار سورجوں کا مجموعہ ککشاں اپنے ارد گرد حرکت کرتا ہے۔ یہ تمام حرکات غرب سے شرق کی طرف حرکت کرتے ہیں۔ یہ وقت کی حرکت سے متضاد حرکت ہے۔

وہ عناصر جن سے زمین اور دوسرے ستارے اور سیارے مرکب ہوتے ہیں یہ ایک ہی ہیں۔ تمام ستارے بھی انہی عناصر سے مرکب ہیں جن سے زمین مرکب ہے۔ یہ تمام عناصر ذرات سے مرکب ہیں اور ذرات الیکٹرون 'پروٹون اور نیوٹرون سے مرکب ہیں۔ تمام ذرات بلا استثناء ان تین اجزاء سے مرکب ہیں۔

”جس طرح پورا مادہ ان تین اجزاء سے مرکب ہے 'اسی طرح قوت بھی ایک ہی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ روشنی اور حرارت 'بغشی شعاعیں 'لاسلکی شعاعیں 'مادرائے بغشی شعاعیں اور تمام دوسری شعاعیں دراصل مقناطیسی کیمیائی قوت کی مختلف اقسام ہیں۔ ان کی رفتار ایک ہے 'اختلاف صرف ان کی موجوں میں ہے۔“

”مادہ تین اجزاء سے مرکب ہے اور قوت موجوں سے مرکب ہے۔“

”آئن سٹائن کا مخصوص نظریہ اضافت یہ ثابت کرتا ہے کہ مادہ اور قوت ایک ہی چیز ہے۔ تجربات نے اس دعویٰ کی تصدیق کر دی ہے۔ ایک آخری تجربہ بھی سامنے آگیا ہے۔ جس نے ہمارا یہ اعلان کر دیا ہے اور تمام دنیا نے اسے سن لیا ہے کہ ایک جدید ہم میں ایٹم نے قوت کی شکل اختیار کر لی۔“

”یوں ثابت ہوتا ہے کہ مادہ اور قوت ایک چیز ہے۔“ (۱)

یہ ہے اس کائنات کی طبعی تشکیں میں وحدت اور حال ہی میں انسان اس کی حقیقت کو معلوم کر سکا ہے۔ اس کائنات کی مسلسل حرکت میں بھی ایک طرح کی یگانگت اور وحدت ہے جیسا کہ ہم نے بار بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر اس کائنات کی تمام حرکات منظم اور مسلسل ہیں۔ اس قدر باقاعدہ کہ ان میں سے ایک سیکنڈ کا خلل بھی نہیں پڑتا۔ نہ اس میں کوئی اضطراب ہے۔ پھر پورے نظام میں اس قدر توازن ہے کہ نہ کسی جرم فلکی کی حرکت میں قفل آتا ہے اور نہ ہی اجرام فلکی کے درمیان کوئی تصادم آتا ہے اور وہ ستارے اور سیارے جو ان ککشانوں میں جو ہمارے قریب ہیں اور جو اس فضا کے کائنات میں تیر رہے ہیں 'ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مدار 'ان کی حرکت اور ان کے فاصلے متعین ہیں۔ ان کے اندر کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوتا۔ ان کی ہر چیز مقدر ہے۔ ایک منصوبے کے مطابق 'یعنی یہ ایک ناقابل تغیر و تبدل منصوبے اور نقشے کے مطابق چل رہے ہیں۔

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھیے ”اللہ کے ساتھ آسمانوں میں“ مصنفہ ڈاکٹر احمد ذکی 'سابق وائس چانسلر جامعہ ازہر۔

میں سمجھتا ہوں کہ نظام کائنات کے اندر پائی جانے والی وحدت اور عقیدہ توحید پر کائناتی شہادت کے مطالعہ کے لیے یہ سرسری وقفہ کافی ہے۔ عقیدہ توحید وہ اہم حقیقت ہے کہ انسان کی اصلاح اور ترقی اس کے سوا کسی اور عقیدے پر ممکن نہیں ہے۔ لہذا عقیدہ توحید کی وضاحت کے بغیر انسان کا تصور کائنات مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کائنات میں انسان کی قدر و قیمت متعین ہو سکتی ہے۔ اور نہ انسان اور اس کائنات کا باہم تعلق صحیح سمت لے سکتا ہے۔ نہ انسانوں کے ذہنوں میں اس کائنات کو وجود میں لانے والی ہستی کا تصور درست ہو سکتا ہے اور نہ انسان اور خدا کا تعلق درست ہو سکتا ہے۔ لہذا انسان کے شعور کو صحیح سمت دینے کے لیے اور انسان کے طرز عمل کو درست حالت میں رکھنے کے لئے عقیدہ توحید کی تشریح ضروری ہے۔

اب دیکھئے کہ جو شخص اللہ وحدہ پر ایمان لاتا ہے 'جو اس عقیدہ توحید کے معنی کو سمجھتا ہے۔ اس کا تعلق اپنے رب کے ساتھ بھی درست ہوتا ہے۔ اور اس کا تعلق اللہ کے سوا پوری کائنات کے ساتھ بھی درست ہو جاتا ہے۔ اور یہ تعلقات نہایت حقیقت پسندانہ ہوتے ہیں اور ان میں انحراف و تغریط نہیں ہوتی۔ یوں اس کے شعور میں انتشار نہیں ہوتا۔ اور اس کی سوچ مختلف اہل میں نہیں بٹی۔ اور نہ اس پر اللہ کے سوا کوئی اور مسلط ہوتا ہے۔

اور جو شخص اللہ پر ایمان لے آتا ہے اور جو اللہ کو اس کائنات کا مصدر و منبع سمجھتا ہے وہ اس کائنات کے ساتھ 'اس کے اندر موجود اشیاء کے ساتھ باہم تعارف، محبت اور الفت کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور اس کی زندگی پر امید ہوتی ہے اور اس کی زندگی کی ایک ایسی صورت گری ہوتی ہے جو اس شخص سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا۔ اور وہ اپنے آپ کو اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں پاتا۔

وہ شخص جو اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اللہ کی جانب سے مخصوص ہدایات پاتا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کو اس کائنات کے اندر پائے جانے والے ناموس اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ شریعت کے مطابق تشکیل دے۔ کائنات پر بھی اللہ کا قانون جاری و ساری ہے اور انسانی زندگی پر اللہ کی مقرر کردہ شریعت جاری ہوتی ہے اور یوں انسان کی عملی زندگی اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

غرض اس حقیقت کا ادراک اس لیے ضروری ہے کہ انسان کا شعور درست ہو۔ وہ روشن ہو 'وہ صحیح سمت رکھتا ہو۔ اور وہ اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات کے ساتھ ہم آہنگ متناسق اور متوازن ہو۔ اور انسان کے باہمی تعلقات 'اس کائنات کے ساتھ تعلقات اور اپنے معاشرے کے ساتھ تعلقات واضح اور متعین ہوں۔ یہ تعلقات اخلاقی ہوں یا طرز عمل سے متعلق ہوں 'اجتماعی معاملات سے متعلق ہوں 'شخصی ہوں یا انسانی ہوں۔ (۱) (۲)

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم عقیدہ توحید کو اس قدر اہمیت دیتا ہے اور عقیدہ توحید کے لیے یہ جدوجہد آدم علیہ السلام سے ادھر آنے والے تمام انبیاء نے کی ہے۔ اور تمام رسولوں نے عقیدہ توحید پر سنت اصرار کیا ہے۔ کلمہ توحید کے الفاظ بھی ایک رہے ہیں اور مفہوم بھی ایک رہا ہے۔

(۱) میں ارادہ رکھتا ہوں کہ ان نکات کی تفصیل ایک مجوزہ کتاب "سنن انسانی زندگی اور اس کائنات کے بارے میں اسلامی تصور" میں مرتب کروں۔ (سید قطب)

قرآن میں تو عقیدہ توحید پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ اسے بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس پر اصرار کیا گیا ہے۔ مسئلہ توحید اور اس کے تقاضوں کی بار بار مختلف اسالیب سے تشریح کی گئی ہے۔ خصوصاً انکی سورتوں میں تو اس پر بہت زور دیا گیا ہے جبکہ مدنی سورتوں میں بھی عقیدہ توحید پر مدنی موضوعات کے اعتبار سے زور دیا گیا ہے۔ جہاں حاکمیت اور قانون سازی کے حق کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔

یہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے مشرکین مکہ تعجب کر رہے تھے کہ حضور اکرمؐ تمام الہوں کو رد کر کے صرف ایک ہی اللہ کے قائل ہیں۔ چنانچہ اس پر وہ حضور اکرمؐ سے الجھتے تھے۔ تعجب کرتے تھے 'لوگوں کو اس نظریہ سے پھرتے تھے اور اس نظریہ حیات کے خلاف اپنے تمام وسائل انہوں نے مجتمع کر لیے تھے۔

اب اس کے تعجب کا دوسرا پہلو یہ کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دولت اور شخصی وجاہت کے زاویہ سے منصب نبوت کے قائل نہ سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قائد کوئی خان اور نواب ہونا چاہئے۔

عَٰزُّوْا عَلَیْہِ الذِّکْرُ مِنْ بَیِّنٰتٍ

”کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کیا گیا؟“ یہ کوئی قابل تعجب بات تو نہ تھی مگر اکابرین قریش حسد میں مبتلا تھے۔ اس حسد کی وجہ سے وہ غرور، دشمنی اور کینہ پر اتر آتے تھے۔

ابن اسحاق نے محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری سے نقل کیا ہے کہ ایک بار ابوسفیان ابن حرب، ابو جہل ابن ہشام اور ابھی ابن شریق ابن عمرو ابن وہب ثقفی حلیف بنی زہرہ رات کے وقت نکلے کہ قرآن سنیں۔ حضورؐ رات کے وقت نماز میں قرآن کریم پڑھا کرتے تھے۔ ان تینوں میں سے ہر شخص دوسرے سے بے خبر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ رات دیر تک یہ سنتے رہے۔ جب سپید صبح نمودار ہوئی تو یہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ راستے میں وہ اتفاقاً مل گئے اور انہوں نے ایک دوسرے کو خوب ملامت کی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا آئندہ یہ حرکت مت کرو، اگر بعض نادانوں نے ہمیں دیکھ لیا تو ان کے دلوں میں بات بیٹھ جائے گی۔ یہ لوگ چلے گئے جب دوسری رات ہوئی تو دوبارہ ہر شخص پھر آکر اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھ گیا۔ رات گئے تک سنتے رہے۔ جب فجر نمودار ہوئی تو یہ لوگ نکلے اور راستے میں پھر اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے گزشتہ رات کی طرح ایک دوسرے کو ملامت کی۔ اور چپے گئے۔ تیسری رات کو پھر ہر شخص آکر بیٹھ گیا۔ رات کو سنتے رہے۔ جب فجر ہوئی تو جانے گئے اور راستے میں پھر ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ اب انہوں نے کہا کہ جب تک ہم کوئی معاہدہ نہ کریں، نہ جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے باقاعدہ معاہدہ کیا اور پھر چلے گئے۔ صبح ہوئی تو انس ابن شریق نے اپنی عصائی۔ یہ پہلے ابوسفیان کے پاس گیا۔ اس نے کہا ابو صفیلہ تم نے محمدؐ سے جو کچھ سنا، جاؤ۔ اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ اس نے کہا میں نے بعض باتیں سنی جو میرے علم میں ہیں اور میں ان کا مطلب بھی سمجھتا ہوں اور بعض باتیں میں نے نہیں سنی اور نہ میں ان کا مطلب سمجھتا ہوں۔ تو اس نے کہا خدا کی قسم میرا بھی یہی حال ہے۔ اس کے بعد یہ شخص ابو جہل کے پاس آیا۔ اس کے گھر میں اس سے ملا۔ اس سے کہا ابوالحکمؐ محمدؐ سے تم نے جو کچھ سنا، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے کہا میں نے کیا سنا؟ اٹا اور بنو عبد مناف کے درمیان ہمیشہ مقابہ رہا۔ انہوں نے کھانا کھلایا، ہم نے بھی کھلایا۔ انہوں نے لوگوں کو سولہا دس، ہم نے بھی سولہا دس۔ انہوں نے عٹے دیئے ہم نے بھی عٹے دیئے۔ جنگ

میں بھی ہم نے مقابلہ کیا یہاں تک کہ ہم مقابلے کے گھوڑوں کی طرح ساتھ ساتھ رہے۔ اب وہ کہتے ہیں ہم میں نبی پیدا ہو گیا ہے۔ اس پر آسمانوں سے وحی آتی ہے اب ہم ان کے مقابلے میں نبی کہاں سے لائیں؟ کبھی بھی ہم اس پر ایمان نہ لائیں گے، خدا کی قسم اور کبھی بھی اس کی تصدیق نہ کریں گے۔ اسٹھ کھڑا ہوا اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

دیکھئے یہ کھلا کینہ ہے جس کی وجہ سے ابوجہل حق کا اعتراف نہیں کر رہا ہے۔ حالانکہ جب مسلسل تین راتوں کو وہ کلام الہی سن رہا تھا تو وہ جانتا تھا کہ یہ برحق ہے۔ یہ حسد اور کینہ تھا جو اس کے ایمان کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا کی ہے راز اس بات میں ہے۔

ءَاَنْزَلَ عَلَیْهِ الذِّکْرُ مِنْ بَیْنِنَا (۸:۳۸) ”کیا ہمارے درمیان میں اس شخص پر کلام الہی نازل ہوا“ اور کوئی نہ تھا۔

یہی لوگ تھے جو یہ کہتے تھے۔

لَوْ لَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقُرَیَّتَیْنِ عَظِیْمٍ (۳۱:۴۳) ”یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ ہوا“۔ ان دو بستیوں سے ان کی مراد مکہ اور طائف تھی۔ جہاں قریش کے اکابر حکمران تھے۔ جہاں ان لوگوں کی مذہبی سیادت و قیادت قائم تھی۔ نیز انہوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ لیک تیا نبی آنے ہی والا ہے اور جب اللہ نے یہ منصب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دیا تو یہ لوگ جل بھن گئے۔ اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ اللہ کی اس عظیم رحمت اور اس اونچے منصب کے مستحق وہ نہیں ہیں۔ کیا سارے جہاں سے محمد ہی اس کے مستحق ٹھہرے؟

اللہ تعالیٰ بھی ان کو اسی انداز میں جواب دیتا ہے عذرت کے ساتھ، جس کے اندر تمہید اور ذراوے کے اشارات موجود ہیں۔

بَلْ مَوَفِّیْ شَکِّ مِّنْ ذِکْرِیْۤ اَبَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِیْ ۝۱۵

”اصل بات یہ ہے کہ یہ میرے ”ذکر“ پر شک کر رہے ہیں“ اور یہ ساری باتیں اس لیے کر رہے ہیں کہ انہوں نے میرے عذاب کا حرا چکھا نہیں ہے۔“

ان کا سوال یہ تھا کہ ”کیا ہمارے درمیان سے نزول قرآن کے لیے صرف اس شخص کا انتخاب کیا جانا تھا؟“ جبکہ وہ خود قرآن کی سچائی ہی کے بارے میں مشکوک ہیں۔ ان کے دلوں کے اندر یہ یقین ہی نہیں ہے کہ یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہے۔ وہ تو حقیقت وحی کے بارے میں سخت خلیان میں تھے لیکن اس کے باوجود یہ بھی وہ تسلیم کرتے تھے کہ یہ قرآن ایک عام کلام کے مقابلے میں ایک بلند پایہ کلام ہے۔

اب قرآن کریم کے بارے میں ان کی بات سے روئے سخن پھر جاتا ہے۔ اور ان کے خلیان کو بھی ایک طرف چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور ان کو سخت عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے۔

بَلْ لَّمَّا يَذُوقُوا عَذَابِ (۸:۳۸) ”یہ ساری باتیں اس لیے کر رہے ہیں کہ انہوں نے میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا۔ یعنی اللہ نے اپنی مرانی سے نجات دی ہوئی ہے لیکن جب ان کو عذاب نے آلیا تو پھر وہ ایسی باتیں نہ کریں گے۔ اس وقت ان کو حقیقت حال کا صحیحی طرح علم ہو جائے گا۔

اب آخری تمبر یہ آتا ہے کہ یہ لوگ حضرت محمد ﷺ پر ہونے والے فضل و کرم کو ان کے استحقاق سے زیادہ سمجھتے ہیں تو سوال یہ کیا جاتا ہے کہ کیا رحمت ربی کی تقسیم کے انچارج یہ ہیں اور ان کا اختیار ہے کہ کسی پر رحمت کہیں کس پر نہ کہیں۔

أَمْرٌ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيزِ الْوَهَّابِ ۝۹

”کیا تیرے دانا اور غالب پروردگار کی رحمت کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں۔“

یہ ان کو سخت تنبیہ ہے کہ ان کی یہ باتیں بارگاہ عزت میں صریح گستاخی ہیں۔ یہ ان معاملات میں ٹانگ اڑا رہے ہیں جن میں مداخلت کرنے کا ان کو کوئی حق نہیں ہے۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ کسی پر فضل کرتا ہے یا کسی سے اپنے فضل کو روکتا ہے۔ وہ غالب ہے ’قدرتوں والا ہے‘ کوئی شخص اس کے ارادے کے سامنے بطور رکاوٹ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ وہ دانا ہے ’حی ہے اور اس کی وارد و ہٹ کی کوئی حد نہیں ہے۔

یہ لوگ اس بات پر بھی ہیں کہ حضرت محمد رسول بنا دیئے گئے ہیں۔ کیا اللہ کی کرم نوازیوں کی تقسیم ان کے ہاتھ میں ہے؟ کیا اللہ کے خزانے ان کے چارج میں ہیں؟

أَمْرٌ لَهُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۝۱۰

”کیا یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک ہیں۔“ اس کا وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے کیونکہ یہ دعویٰ وہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ خود ان کا یہ عقیدہ تھا کہ زمین اور آسمانوں کا مالک اللہ ہے اور وہ دیتا ہے اور وہی روکتا ہے۔ وہ کرم نوازیوں کرتا ہے اور وہی مناسب عطا کرتا ہے۔ اور چونکہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کا اقتدار انہیں حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اللہ مقتدر اعلیٰ کے معاملات میں ان کو دخل بھی نہ دینا چاہئے وہ تو بلائید متصرف ہے۔

اب بطور مزاح اور لاجواب کرنے کی خاطر انہیں کہا جاتا ہے کہ اگر ان کا جواب اثبات میں ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مقتدر اعلیٰ ہیں تو وہ اپنی قوت مقتدرہ کو کام میں لائیں۔

فَلْيَرْتَقُوا فِي ٱلْأَسْبَابِ ۝۱۱

”اچھا تو یہ عالم اسباب کی بلندیوں پر چڑھ کر دیکھیں؟“ تاکہ زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان جو مدارج ہیں ان پر ان کا کنٹرول ظاہر ہو۔ اور وہ اللہ کے کام خود سرانجام دیں۔ اللہ کے خزانوں کی تقسیم کہیں۔ جسے چاہیں ’دیں اور جس سے چاہیں روک لیں۔ جب کہ ان کے رویے کا تقاضا ہے کہ وہ منصب نبوت کی تقسیم پر اعتراضات کرتے ہیں۔ یہ تو تھا مزاح‘ اب حقیقت کیا ہے اور کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں یہ لوگ؟

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ ۝

”یہ تو جنتوں میں سے ایک چھوٹا سا جنتہ ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے۔“ ان کا انجام اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ دور جا کر پھینک دیئے جائیں اور ان کے اس لشکر کو شکست ہو جائے۔ وہ مقام جس کا اپنے لئے یہ دعویٰ کرتے ہیں اس سے بہت دور اور بہت فروتر کسی جگہ ان کا لشکر شکست کھانے والا ہے۔ یہ لشکر اللہ کی مملکت میں دخیل نہیں ہے۔ یہ اللہ کے ارادوں کو نہیں بدل سکتا۔ اور اللہ کی مشیت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ ایک مجہول نسب لشکر ہے 'مجہول الشان' ہے اور شکست خوردہ ہے۔ گویا شکست اس کی لازمی صفت ہے۔ اس کی شخصیت کا حصہ ہے اور یہ لشکر مختلف احزاب سے بنا ہوا ہے۔ جن کے رجحانات مختلف ہیں اور جن کی خواہشات مختلف ہیں۔

اللہ اور رسول اللہ کے دشمن صرف اسی قدر ترقی کر سکتے ہیں جس کی تصویر کشی قرآن کریم کمزوری 'عجز اور ضعف کے رنگوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اور یہ تاثر دیتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے تصرف اور تدبیر کے دائرے سے بہت ہی دور ہیں۔ اگرچہ دنیا کی نظروں میں وہ جبار و قہار ہوں اور ان کی پکڑ سخت ہو اور کچھ عرصہ کے لیے دنیا میں ان کی بات چیتی ہو۔ پوری تاریخ انسانی میں ایسے جباروں کے بارے قرآن مجید یہ تصویر کشی کرتا ہے۔

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ (۱۱:۳۸) ”یہ تو جنتوں میں سے ایک چھوٹا سا جنتہ ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے۔“

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَ عَادُ وَ فِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَارِ ۝

وَ ثَمُودُ وَ قَوْمُ لُوطٍ وَ أَصْحَابُ لَيْكَةِ ۝ أُولَٰئِكَ الْأَحْزَابُ ۝

ع ۱۳ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابُ ۝

۱۰

”ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد اور ثمود اور قوم لوط اور ایک والے جھٹلا چکے ہیں۔ جتنے وہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور میری عقوبت کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو کر رہا۔“

یہ مثالیں تو ان لوگوں کی ہیں جو قریش سے قبل تاریخ میں گزرے ہیں۔ قوم نوح، قوم عاد، فرعون جو بڑے بڑے اہراموں والا تھا۔ یہ اہرام زمین پر ایسے ہیں جیسے میخیں 'قوم ثمود' قوم لوط، قوم شعیب جنہیں اصحاب الایکہ بھی کہا جاتا ہے یعنی گھنے جنگلوں والے 'یہ ہیں وہ جتنے جسوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ تو انجام کیا ہوا ان کا۔ حالانکہ وہ بڑے جبار اور پکڑ والے تھے۔ یہ ہوا کہ فَحَقَّ عِقَابُ (۱۴:۳۸) ”میرے عذاب کا فیصلہ ان پر چسپاں ہوا۔“ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ وہ اس طرح نیست و نابود کر دیئے گئے کہ ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے۔

یہ تو تھی پوزیشن ان لوگوں کی جو زمانہ ماضی میں گزرے۔ رہے یہ لوگ تو ان کے لیے بھی ایک عذاب آنے والا

ہے۔ یہ دن یوم الحساب سے قبل آئے گا اور ایک چغ ہوگی اور پوری دنیا میں کچھ نہ رہے گا۔

وَمَا يَنْظُرُ هَؤُلَاءِ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً مِّمَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾

”یہ لوگ بھی بس ایک دھماکے کے منتظر ہیں جس کے بعد کوئی دوسرا دھماکہ نہ ہو گا۔“

یعنی جب یہ وقت آئے گا تو اس میں اس قدر تاخیر بھی نہ ہوگی جس قدر اونٹنی کا دودھ دوہنے کے دو اوقات میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ دودھ دینے والے جانوروں کا دودھ دقت مقررہ پر نکالا جاتا ہے جس میں تقدیم و تاخیر نہیں کی جاتی۔ یہ امت آخری امت ہے اور اللہ نے اس امت تک کا دقت اور صلت دے دی ہے۔ کیونکہ اس امت کو اللہ ام سابقہ کی طرح نیست و نابود نہیں کرتا۔

یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اس امت کو اللہ نے طویل صلت دے دی ہے لیکن افسوس کہ اہل قریش نے اس کو غنیمت نہ جانا اور اس پر خدا کا شکر ادا نہ کیا۔ انہیں اپنے مقررہ انجام کے جلدی آنے کا مطالبہ کرتے رہے، دعا کرتے رہے کہ لے اللہ تم میں سے جس کا انجام برا ہے جلدی وہ اس تک پہنچ جائے۔ اور یوم الحساب سے بھی پہلے اسی دنیا میں یہ عذاب آجائے۔

وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾

”اور یہ کہتے ہیں کہ لے ہمارے رب، یوم الحساب سے پہلے ہی ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے۔“ بس یہاں اگر قرآن مجید ان کے بارے میں بات ختم کر دیتا ہے اور روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ ان کی حماقتوں کی پرواہ نہ کریں۔ یہ عذاب کا مطالبہ کر کے اللہ کے جناب میں سوء ادب کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ دراصل یہ قیامت کے قیام پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ اللہ کی رحمت پر ناشکری کرتے ہیں۔ آپ کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ انبیائے سابقہ کے حالات پڑھیں کہ ان پر کیا کیا آزمائشیں آئیں۔ اور اس کے بعد اللہ کی رحمتیں ان پر نازل ہوئیں۔

--- ○ ○ ○ ---

رس نمبر ۲۱۲ تشریح آیات

۱۷۔۔۔ تا۔۔۔ ۲۸

یہ پورا سبق قصص اور رسولوں کی زندگیوں کی اعلیٰ مثالوں پر مشتمل ہے۔ یہ مثالیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس لیے پیش کی جا رہی ہیں کہ آپ ذرا رسل سابقین کی زندگیوں پر غور کریں اور قریش جو بکھڑا کر رہے تھے۔ الزام تراشیں کرتے تھے 'الزام لگاتے تھے اور آپ کی رسالت کو انوکھا سمجھتے تھے 'اس پر صبر کریں اور ان مشکلات کو برداشت کریں جن کی وجہ سے انسان کا جی بھر آتا ہے۔

یہ تمام قصص 'حضور اکرم ﷺ کو تسلیم دینے کے لیے رسولوں پر اللہ کی رحمتوں اور مہربانیوں کے واقعات پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کہ ان رسولوں پر اللہ نے کیا کیا کرم نوازیں کیں 'بعض رسولوں کو اللہ نے حکومتیں اور بڑی بڑی سلطنتیں عطا کیں۔ اور ان پر بڑے بڑے انعامات کیے۔ یہ واقعات اس لیے بیان کیے کہ لیں قریش کو اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب رسالت کیوں عطا کر دیا گیا۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کوئی پہلے رسول نہ تھے۔ رسولوں کو تو بڑی بڑی مملکتیں عطا ہوئی ہیں۔ بعض کے لیے تو پہاڑ بھی مسخر کر دیئے گئے اور پرندے ان کے ساتھ مل کر صبح پڑھتے تھے۔ بعض کے لیے ہوائیں مسخر تھیں اور جن اور شیطان بھی ان کے تابع تھے مثلاً داؤد و سلیمان علیہما السلام۔ آخر یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ محمد ابن عبد اللہ کو نبی آخر الزمان کے منصب کے لیے منتخب کر دیا گیا۔

ان قصص میں یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ اپنے رسولوں کی نگرانی ہر وقت کرتا رہتا ہے۔ ان کی زندگی کے ہر موڑ پر ہر وقت ہدایات دی جاتی ہیں 'ان کو تجربات کرائے جاتے ہیں۔ وہ بھی بشر تھے جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔ ان رسولوں میں بشری کمزوریاں بھی تھیں۔ چنانچہ اللہ ہر وقت نگرانی کر کے ان کو بشری کمزوریوں سے بچاتا تھا۔ اللہ ہر وقت ان کو صحیح موقف بتاتا ہے 'ان کی راہنمائی کرتا ہے اور ان کو آزماتا ہے تاکہ ان کی لفظوں پر مغفرت کر دے۔ یہ باتیں جانے سے حضور اکرم ﷺ کے دل کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ اپنے رب کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ آپ کی نگرانی اور حمایت کر رہا ہے۔

إَصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَادْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ ۚ إِنَّهُ

أَوَّابٌ ۚ إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ ۚ وَالطُّيْرَ مَحْشُورَةً

كُلٌّ لَّهُ آوَابٌ ۚ وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَأَتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ الْخِطَابِ ۚ

”اے نبی صبر کرو ان باتوں پر جو یہ لوگ بتاتے ہیں اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کر دو جو بڑی قوتوں کا مالک تھا۔ ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کر رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ پرندے سمٹ آتے، سب کے سب اس کی تسبیح کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی تھی اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی۔“

اصبر صبر کرو یہ تمام رسولوں کی زندگی کا اہم خاصہ ہے۔ وہ خاصہ جس کی بناء پر یہ سب لوگ ایک ہی گروہ قرار پاتے ہیں۔ سب اسی راہ پر چلے، سب نے تکالیف برداشت کیں۔ سب پر آزمائشیں آئیں اور سب نے ان پر صبر کیا۔ صبر سب کا زاد راہ تھا۔ انبیائی سلسلہ کے اندر سب نے درجہ بدرجہ مشکلات برداشت کیں۔ ان کی زندگی تجربہ تھی اور یہ تجربہ مشقتوں اور ابتلاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ مصائب پر وہ صبر کرتے تھے اور یہ ان کے لیے آزمائش تھی اور پھر اللہ کے فضل و کرم پر بھی وہ صبر کرتے تھے اور یہ بھی ابتلا تھی۔ دونوں حالات میں صبر ضروری ہوتا ہے اور انہوں نے صبر کیا۔ جس طرح قرآن نے رسولوں کی زندگی کی حکایات بیان کی ہیں اگر ہم ان سب کو پیش نظر رکھیں تو ان کی زندگی کی بنیاد اور ان کی زندگی کا اہم لچرہ صبر ہے۔ ان کی پوری زندگی عبارت ہے آزمائشوں، مشقتوں اور جدوجہد اور صبر و مصابرت سے۔

انبیاء کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزمائشوں پر مشتمل ایک برگزیدہ زندگی ہے۔ فی الواقع یہ ایک پر مشقت زندگی ہے۔ یہ ایک کھلی کتاب ہے جس کے اندر صرف ابتلاؤں اور صبر کے نئے نئے کلمے ہوئے ہیں۔ اور انسانیت کے لیے بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں تاکہ تاریخ کے اندر اس بات کو ریکارڈ کر دیا جائے کہ روح انسان کس طرح مصائب اور زندگی کی ضروریات اور سہولیات کی خواہش پر غالب ہو جاتی ہے۔ اور انسانی روح کس طرح ان تمام اقدار سے برتر ہو جاتی ہیں جن پر دنیا فخر کرتی ہے اور کس طرح انسانی روح دنیا کی دھوکہ دینے والی چیزوں اور نفس کو مرغوب چیزوں سے ماتعلق ہو جاتی ہے۔ صرف اللہ کے لیے ہو جاتی ہے اور یوں آزمائشوں میں فلاح پالیتی ہے۔ وہ اللہ کو تمام ماسوا اللہ پر ترجیح دے دیتی ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ہی پھر وہ انسانیت کو چیلنج کر کے کہہ سکتی ہے کہ یہ ہے طریق زندگی۔ یہ ہے سر بلندی کی راہ۔ اور یہ ہے وہ راہ جو نہایت ہی بلند یوں پر اللہ کی طرف جاتی ہے۔

اصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ (۳۸: ۱۷) ”یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو۔“ اور وہ کیا باتیں کرتے تھے؟

هَذَا سِحْرٌ كَذَّابٌ (۳۸: ۴) ”یہ جادوگر ہے بہت بڑا جھوٹا۔“ اور وہ یہ کہتے تھے۔

أَجْعَلِ الْإِلَهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا (۳۸: ۵) ”کیا اس نے تمام الہوں کی جگہ ایک خدا ٹھہرایا ہے؟“ اور وہ یہ کہتے تھے۔

ءَأَنْزَلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ (۳۸: ۸) ”کیا خدا کے کلام کے لیے ہمارے درمیان میں سے صرف اسی کا

انتخاب ہونا تھا“ وغیرہ۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو متوجہ فرماتا ہے کہ بس آپ صبر کرتے چلے جائیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ ان کفار کے ماڈلوں کے مقابلے میں کچھ دوسرے ماڈلوں میں زندہ رہیں۔ پر خلوص اور شریف النفس ماڈلوں کے ساتھ۔ یہ ماڈل آپ کے بھائی انبیائے سابقہ کے ماڈل ہیں۔ آپ کے سامنے ان کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ آپ ان کے ساتھ قریبی تعلق کا احساس کریں کہ یہ ہیں آپ کے بھائی، آپ کے نبی اور رشتہ دار۔ چنانچہ حضور فرماتے ہیں۔ اللہ میرے فلاں بھائی پر رحم کرے.... اور میں اس نبی کا زیادہ قریبی ہوں۔

اصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَادْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ (۱۷:۳۸)
 ”اے نبی صبر کرو، ان باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کرو، جو بڑی قوتوں کا مالک تھا اور ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا“۔ داؤد علیہ السلام کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نہایت قوتوں والے تھے لیکن ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اس سے قبل قوم نوح، قوم عاد اور فرعون، قوم ثمود، قوم لوط اور اصحاب ایکہ کا ذکر ہوا تھا۔ یہ سب اقوام نہایت ہی سرکش تھیں۔ وہ اپنی قوت کا اظہار یوں کیا کرتی تھیں کہ وہ لوگوں پر ظلم زیادتی کرتی تھیں اور حق کی ٹکڑی بکرتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں داؤد علیہ السلام بھی بڑی قوتوں والے تھے۔ لیکن وہ اواب تھے۔ ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اللہ کے مطیع، عبادت گزار اور اسے یاد کرنے والے۔ حالانکہ وہ قوتوں والے اور مقتدر اعلیٰ تھے۔

حضرت داؤد کے قصے کا ابتدائی حصہ اور طاہوت کے لشکر میں ان کی نمایاں کارکردگی بیان ہو چکی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کا یہ لشکر طاہوت کی قیادت میں اٹھا تھا۔ اس دور میں بنی اسرائیل زوال پذیر تھے اور انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ہمارے لیے اللہ کی طرف سے بادشاہ اور قائد ریاست مقرر ہو۔ یہ لشکر بنی اسرائیل کے جبار دشمن جالوت سے ٹکرایا۔ داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اس دور میں حضرت داؤد نوجوان تھے۔ یوں ان کا ستارہ چکا اور بالآخر وہ بادشاہ بن گئے۔ لیکن ان کا رویہ یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اطاعت شعار اور عبادت گزار تھے اور ہر وقت ذکر و استغفار میں لگے رہتے تھے۔

اس اقتدار و سلطنت کے ساتھ اللہ نے ان کو نبوت بھی عطا کی اور نہایت ہی خوبصورت آواز ان کو دی گئی تھی۔ یہ نہایت ہی خوش الحانی کے ساتھ اللہ کی شاکرتے تھے۔ یہ ذکر میں اس قدر مستغرق تھے اور حمد و ثنا کو اس قدر تزیل سے پڑھتے تھے کہ ان کے لور اس کائنات کے درمیان کے تمام پردے اٹھ گئے تھے۔ یوں ان کے ساتھ پرندے، اور پہاڑ بھی ثنا پڑھتے تھے اور اللہ کی تعریف و تجید کرتے تھے۔ پہاڑ ان کے ساتھ گنگناتے تھے اور پرندے ان کے لرد گرد پھنچڑاتے تھے۔ اور سب کے سب مولائے کریم کے شاخوں تھے۔

إِنَّا سَحَرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعُشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ (۱۸:۳۸) وَالطُّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَهُ

أَوَّابٌ (۱۹:۳۸) ”ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ متحرک رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ پرندے سٹ آتے سب کے سب اس کی تسبیح کی طرف متوجہ ہو جاتے۔“

عام لوگ اگر اس آیت کو پڑھیں تو حیران رہ جائیں گے کہ جلد پہاڑ کس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور یہ تسبیح وہ صبح و شام کرتے تھے، خصوصاً جب وہ اپنے رب کی یاد کے لیے تخیل میں جاتے تھے۔ وہاں وہ اللہ کی حمد گاتے تھے۔ نہایت ہی خوش اخالی کے ساتھ۔ اور اللہ کی تعریف و تہجد کرتے تھے۔ پرندے ان کے نعمات کو سن کر جمع ہوتے تھے۔ اور وہ بھی ان کو دہراتے تھے۔ فی الواقع لوگوں کے لیے یہ بات حیران کن ہوگی۔ کیونکہ عادی امور اور عادی روئے اس کے خلاف ہے۔ لوگ جب گوشہ نشین ہوتے ہیں تو وہ ایسی باتیں محسوس نہیں کرتے۔ انسانوں اور پرندوں کے اجناس میں اور جلد پہاڑوں کے درمیان یہ یگانگت کیسے وجود میں آگئی۔

لیکن اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ کوئی تعجب خیز دعویٰ نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تمام مخلوقات کی حقیقت اور ماہیت ایک ہے۔ اگرچہ شکل و صورت اور جنس و نوع میں وہ باہم مختلف ہیں۔ یہ سب چیزیں اپنے خالق کے حوالے سے ایک ہیں۔ اور ایک کلی وجود کا حصہ ہیں۔ زندہ وجود ہو یا غیر زندہ چیزیں ہوں۔ جب ایک انسان اپنے رب کے لیے خالص ہو جاتا ہے اور اسے صفائے باطن اور اشراق کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے تو جنس و نوع کے یہ تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور یہ تمام چیزیں اپنی اصل حقیقت کے ساتھ سامنے آ جاتی ہیں۔ یہ سب مخلوق ان ظاہری پردوں کی پشت سے ایک ہو جاتی ہیں۔ مختلف اجناس، اصناف، شکلیں اور صورتیں، ظاہری رنگ اور خصوصیات تو دراصل پردے ہیں۔ حقیقت ان کے پیچھے ہے۔

وَشَدَدًا مُّلْكُهُ وَآتَيْنَهُ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ الْخُطَابَ (۳۸: ۲۰) ”ہم نے اس کی حکومت مضبوط کر دی تھی اور اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی“۔ چنانچہ آپ کی حکومت بہت ہی مضبوط تھی۔ آپ کی حکومت کی پالیسی حکمت و دانش مندی اور ٹھوس فکر پر مبنی تھی۔ اور اس کے فیصلے دو ٹوک ہوتے تھے۔ آپ کے اندر بے پناہ قوت فیصلہ تھی۔ کسی حکومت میں جب قوت اور حکمت جمع ہو جائے تو وہ کمال کی انتہاؤں کو چھو لیتی ہے۔

لیکن ان کمالات کے باوجود حضرت داؤد پر بھی اللہ کی طرف سے امتحان آئے۔ ان کو بھی آزمایا گیا۔ ان آزمائشوں میں بھی وہ اللہ کی نگرانی میں رہے، کیونکہ وہ پیغمبر تھے اور اللہ اپنے پیغمبروں کو غلطی سے بچاتا ہے۔ ان کی کمزوریوں کے مقامات پر دست گیری کرتا ہے۔ اور اس راہ کی مشکلات سے انہیں بچاتا ہے۔ احتیاط کے طریقے سکھاتا ہے۔

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَوُّ الْخَضِيمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْبَيْتَ ۚ إِذْ دَخَلُوا

عَلَىٰ دَاوُدَ فَفَزَعَهُ مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَخَفْ خَصَمِينَ بَغْيَ بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ

فَاحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ ۖ إِنَّ هَذَا

أَخِي فَلَهُ تَسْمُوتُ وَتَسْعُونَ نَجَّةً وَإِلَىٰ نَجَّةً ۖ وَاقَالَ أَكْفَلْنِيهَا وَعَزَّنِي

فِي الْخِطَابِ ۖ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعَجِكَ إِلَىٰ نَعَاجِهِ ۖ وَإِنَّ كَثِيرًا

مِنَ الْخُلَطَاءِ لِيَبْغِيَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ وَظَنَّ دَاوُدُ أَنَّمَا فَتَتْهُ فَاِستَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ
رَاكِعًا وَ انَابَ ۖ

”پھر ہمیں کچھ خبر پہنچی ہے ان مقدمے والوں کی جو دیوار چڑھ کر اس کے بالا خانے میں گھر آئے تھے؟ جب وہ داؤد کے پاس پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ انہوں نے کہا ”ڈریے نہیں“ ہم دو فریق مقدمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے“ بے انصافی نہ کیجئے اور ہمیں راہِ راست بتائیے۔ یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس سناوے دنیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دنی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک دنی بھی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا لیا۔“ داؤد نے جواب دیا: ”اس شخص نے اپنی دنیاؤں کے ساتھ تیری دنی ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تجھ پر ظلم کیا“ اور واقعہ یہ ہے کہ مل جل کر ساتھ رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے اور عملِ صالح کرتے ہیں اور ایسے لوگ کم ہی ہیں۔“ داؤد سمجھ گیا کہ یہ تو ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رجوع کر لیا۔“

اس واقعہ کی تشریح یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے وقت کا ایک حصہ امور مملکت کو دیتے تھے لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے۔ کچھ وقت وہ خلوتِ تنہائی عبادت اور حمد و ثنا اور حمدِ الہی کے ترانے پڑھنے کے لیے دیتے تھے۔ جب آپ محراب میں خلوت گزریں ہوتے تھے تو کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ جب تک کہ آپ خود باہر نہ آجائیں۔

ایک دن یوں ہوا کہ دو افراد دیوار پھلانگ کر اس خلوت گاہ میں گھر آئے۔ آپ ان کے اس طرح گھر آنے سے گھبرا گئے۔ کیونکہ کوئی لہلہ ایمان یا کوئی زہر و لہر شخص یوں ان کی خلوت گاہ میں نہ آسکتا تھا۔ چنانچہ ان دو افراد نے بھی آپ کے خوف کو محسوس کیا اور جلدی سے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

قَالُوا لَا تَخَفْ خَصْمَانِ بَغَىٰ بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ (۳۸: ۲۲) ”انہوں نے کہا ڈریے نہیں“ ہم دو فریق مقدمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔“ چنانچہ ہم فیصلے کے لیے آئے ہیں۔

فَاحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَ اهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ (۳۸: ۲۲) ”آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے“ بے انصافی نہ کیجئے اور ہمیں راہِ راست بتائیے۔“ اس کے بعد ایک نے بیانِ دعویٰ شروع کر دیا۔

اِنَّ هٰذَا اَخِي لَهُ تِسْعٌ وَ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةً وَّاحِدَةً فَقَالَ اَكْفُلْنِيهَا وَ عَرَفَنِي فِي الْخِطَابِ (۳۸: ۲۲) ”یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ۹۹ دنیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ یہ ایک

دنی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا دیا۔“ اگلی کے معنی ہیں مجھے دے دے، میری ملکیت میں دے دے اور میری کفالت میں دے دے اور عزتی کے معنی ہیں مجھ پر بات میں سختی کی اور غالب ہو گیا۔

جہاں تک مقدمے کا تعلق ہے خود بیان و دعویٰ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا ظالمانہ فعل ہے جس کی کوئی تائید نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ حضرت داؤد نے بھی جواب دعویٰ سننے سے پہلے ہی فیصلہ کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ بادی النظر میں اس بھائی کا فعل ظالمانہ تھا۔ اس لیے حضرت داؤد نے دوسرے فریق سے بات ہی نہ کی۔ نہ جواب دعویٰ سنانہ اس سے کوئی عذر طلب کیا۔ بس دعویٰ من کر ہی فیصلہ کر دیا۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نِعْمَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي

بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ (۳۸: ۲۴)

”داؤد نے جواب دیا اس شخص نے اپنی دنیوں کے ساتھ تمہری دنی ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تجھ پر ظلم کیا اور واقعہ یہ ہے کہ مل جل کر رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں۔ بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے ہوں اور عمل صالح کرتے ہیں اور ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔“ طعنا سے مراد اقربا جو اکٹھے ہوتے رہتے ہیں۔ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اشخاص اس مرحلے پر غائب ہو گئے کیونکہ یہ فرشتے تھے اور امتحان لینے آئے تھے یعنی اس نبی کا امتحان مطلوب تھا جسے اللہ نے عوام الناس کا حاکم اور سربراہ اور جج بنایا تھا۔ اور حکم دیا تھا کہ لوگوں کے درمیان عدل کے مطابق فیصلہ کریں۔ اور فیصلہ سنانے سے قبل مقدمات کی بھی طرح تفتیش کریں۔ امتحان اس طرح زیادہ شدید ہو جاتا ہے جب ان کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش کیا جاتا ہے تو بادی النظر میں صریح ظلم نظر آتا ہے لیکن لیک جج کا یہ رویہ ہوتا ہے کہ وہ کسی فریق کی بات سے متاثر نہ ہو۔ وہ جلدی میں فیصلہ نہ کرے۔ محض ظاہری باتوں یا حالات پر فیصلہ نہ کرے۔ بیان دعویٰ کے مقابلے میں جواب دعویٰ طلب کرے۔ کیونکہ بعض اوقات جواب دعویٰ سننے سے دعویٰ کی حیثیت ہی بدل جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بیان دعویٰ اگر ظاہراً درست ہے مگر درحقیقت مسئلہ کی نوعیت دوسری ہے۔ یا یہ کہ مدعی بعض باتیں چھپا رہا ہے اور دھوکہ دے رہا ہے۔

اس مقام پر داؤد علیہ السلام کو یہ خیال آیا کہ یہ معاملہ کوئی حقیقی مقدمہ نہ تھا بلکہ پرچہ امتحان تھا۔

وَظَنَّ دَاوُدُ أَنَّمَا فَتْنَهُ (۳۸: ۲۴) ”اب داؤد کو یقین ہو گیا کہ ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے۔“ یہاں اب ان کا اصل مزاج سامنے آتا ہے۔ وہ تو ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ (۳۸: ۲۴) ”السجدة“ ”چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رجوع کر لیا۔“

فَغَفَرْنَا لَهُ ذَلِكَ وَإِنَّ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ وَحَسَنَ مَّآبٍ ﴿۳۹﴾

”تب ہم نے اس کا وہ تصور معاف کیا اور یقیناً ہمارے ہاں اس کے لیے تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے۔“
 بعض تفاسیر نے اس آیت کے تحت اسرائیلیت سے ربط دیا جس میں جمع کیا ہے اور حضرت داؤد کی آزمائش کے معاملے میں بہت دور تک چلے گئے ہیں۔ انہوں نے ایسی باتیں بھی نقل کی ہیں جو نبوت کے شایان شان ہی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ مطلقاً منصب نبوت کے ساتھ یکجا نہیں ہو سکتیں۔ بعض روایات نے اگرچہ بعض انسانوں کی تاویل کر کے ان کی قباحت کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن انہوں نے بھی بعض انسانوں کو پہلو اپنے اندر سمیٹ لیے ہیں۔ لہذا یہ روایات اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کو نقل کیا جائے اور ان پر نظر ڈالی جائے۔ کیونکہ یہ روایات قرآن کریم کے اس تہرے کے بالکل خلاف ہیں۔

وَ اِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَزُلْفٰی وَ حُسْنَ مَّآبٍ (۲۵:۳۸) ”یقیناً ہمارے ہاں اس کے لیے تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے۔“

اس قصے پر جو تبصرہ آیا ہے، وہ صاف صاف جاتا ہے کہ حضرت داؤد کی آزمائش کی نوعیت کیا تھی۔ اللہ نے حضرت داؤد کو حکومت دی تھی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلے کرے، اس لیے متعین ہو گیا کہ اس آزمائش و امتحان کا تعلق جوڈیشل پروسیڈنگز سے تھا۔ چنانچہ کہا گیا:

يٰۤاٰدُوۡدُ اِنَّا جَعَلٰنِكَ خَلِيۡفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ

بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ

الَّذِيۡنَ يَظْلُمُوۡنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيۡدٌۢ بِمَا نَسُوۡا يَوْمَ

۱۲ ع الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾

(ہم نے اس سے کہا) ”اے داؤد! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً ان کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ کہا گیا کہ آپ کو زمین کا اللہ تعالیٰ دیا گیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان حق پر مبنی فیصلے کریں اور ان فیصلوں میں اپنی ذاتی چاہت کا خیال نہ رکھیں۔ جہاں تک نبی کا تعلق ہے وہ تو خواہشات نفس کی پیروی سے محفوظ ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ابتدائی میلان پر ہی فیصلہ نہ کر دیا کریں۔ یہ نہ ہو کہ بغیر سوچے سمجھے اور بغیر تحقیقات کیے ہی فیصلہ نہ کر دیا کریں۔ کیونکہ اس طرح جلدی میں بغیر تحقیق کے فیصلے اکثر غلط ہوتے ہیں۔ آیت کے آخر میں حکم عام ہے۔ ان تمام لوگوں کے لیے جو اللہ کے راستے سے گمراہ ہوتے ہیں۔ جو اللہ کو بھول جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے دن شدید عذاب سے دوچار ہوں گے۔

اللہ کی حضرت داؤد پر کرم نوازی دیکھئے کہ پہلی فرصت میں ان کو متنبہ کر دیا گیا اور اپنے ذاتی میلان سے روک دیا گیا اور آپ کو دور رس انجام سے ڈرایا گیا حالانکہ حضرت داؤد علیہ السلام نے عملاً اس غلط اقدام کی طرف ایک قدم بھی نہ اٹھایا تھا۔ اللہ کے تمام عقاربندوں پر یہ اللہ کا فضل ہوتا ہے کہ انہیں قبل از وقت متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ متقاضی بشریت ذرا سی لغزش کھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہمت قدم کر دیتا ہے۔ ان کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے، ان کو تعمیم دیتا ہے اور ان کو اپنی طرف موڑ دیتا ہے۔ ان کی لغزش صاف کر دیتا ہے۔ اور اس آزمائش کے بعد ان پر رحمتوں کی بارش کر دیتا ہے۔

خلافت ارضی میں سچائی پر چلنے کے اصول کے طے ہونے کے بعد اور لوگوں کے درمیان سچائی اور حق پر مبنی فیصلے کے احکام کے بعد اور قصہ داؤد علیہ السلام کے ختم ہونے سے پہلے اس سچائی کو اس عالم گیر سچائی کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے جس کے اوپر زمین و آسمان قائم ہیں اور آسمان اور زمینوں کے درمیان پوری کائنات قائم ہے۔ یہ سچائی اس کائنات کے اندر بہت گہری ہے اور صرف خلافت فی الارض کی سچائی اور لوگوں کے درمیان عدل کی سچائی سے بہت عام ہے۔ یہ سچائی اس زمین سے بھی وسیع تر ہے جبکہ یہ صرف اس دنیا کی زندگی سے بھی آگے عالم آخرت تک پہنچی ہوئی ہے۔ جس طرح یہ کائنات اس کی لپیٹ میں ہے اسی طرح عالم آخرت بھی اس کی لپیٹ میں ہے۔ اس عالم گیر سچائی پر یہ آخری رسالت مبنی ہے اور اللہ کی یہ آخری کتاب اسی ہمہ گیر اور عالم گیر سچائی کی منظر اور مفسر ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذَٰلِكَ

ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ قَوْلُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ ۖ أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ
كَالْفُجَّارِ ۚ كَذَّبُ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَذَّبَرُوا إِلَيْهِ وَلِيَذْكُرُوا
أُولَٰئِكَ الْأَلْبَابِ ۚ

”ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا۔ یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا ہے، اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور ان کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں، یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں؟ یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبی!) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔“

یہ ہے اصل بات، ان تین آیات میں وہ عظیم حقیقت بیان کر دی گئی ہے جس کی قرآن میں بہت اہمیت ہے۔ یہ نہایت ہی گہری، عمومی اور عظیم الشان حقیقت ہے۔ اس کی جنس اور شاخص اس پوری کائنات کے اندر گہری ہیں اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی مخلوق کوئی کھیل تماشا نہیں ہے۔ یہ باطل نہ تھی، نہ ہے اور نہ ہوگی۔ بلکہ یہ حق ہے۔ یہ کائنات حقائق پر قائم ہے۔ اس ہمہ گیر سچائی سے تمام سچائیاں پھولتی ہیں

اور یہ سچائی دراصل اس کائنات اور پھر اس زمین کی حقیقت و ماہیت ہے۔ اس دنیا پر انسان کی حکمرانی میں سچائی 'لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کے قیام میں سچائی' 'لوگوں کے شعور و خیال میں سچائی اور ان کے اعمال میں سچائی کا قیام اس عظیم حق اور سچائی کی شاخیں ہیں۔ لہذا جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور شعور کی سچائی رکھتے ہیں اور جو لوگ نیک عمل کرتے ہیں اور ان کا طرز عمل درست ہے وہ منفدین کی طرح نہیں ہو سکتے۔ لہذا اس کرۂ ارض پر متقین کا وزن اور فساق و فجار کا وزن برابر نہیں ہو سکتا۔ جس عظیم سچائی کو یہ کتاب لے کر آئی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کرس اور ان میں سے جو عقلمند ہیں وہ اس سے نصیحت حاصل کرس۔ وہ عظیم سچائی ہے۔ اور لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس عظیم حقیقت کا دافر حصہ پالیں اور اس پر تدبر کرس۔ کافر درحقیقت اس عظیم سچائی کا تصور اور شعور بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان کی فطرت 'ان کا شعور اس عظیم سچائی سے محروم ہے جس کے اوپر یہ کائنات قائم ہے۔ اور جس کا حامل قرآن ہے۔ کافر تو رب تعالیٰ کے بارے میں سوئے ظن رکھتے ہیں۔ اور وہ اس عظیم سچائی کے ادراک سے محروم ہوتے ہیں۔

ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸: ۲۷) "یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے 'جہنم کی آگ سے'۔"

اسلامی شریعت دراصل اللہ کے اس عظیم حق کی تشریح کر رہی ہے۔ جس پر یہ پوری کائنات قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں حکام اور خلفاء سے جس سچائی اور عدل کا مطالبہ فرماتا ہے وہ اس کلی حق اور سچائی کا ایک حصہ ہے۔ اس حق کا تقاضا یہ ہے کہ جس طرح وہ کائنات میں قائم ہے اسی طرح انسانوں کے نظام اور معاشرے میں بھی قائم ہو تاکہ یہ عظیم سچائی ادھوری نہ ہو۔ اس کے تمام اطراف قائم ہو جائیں۔ اس لیے جو لوگ شریعت سے انحراف کرتے ہیں 'عدالت سے انحراف کرتے ہیں۔ وہ دراصل اس سچائی سے انحراف کرتے ہیں جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے۔ اس طرح وہ اس کائنات میں ایک عظیم شرف و فساد پیدا کر دیتے ہیں۔ یوں کائناتی قوتوں کے درمیان تصادم پیدا ہو جاتا ہے۔ لہذا اس صورت میں ان کائناتی قوتوں کے درمیان بھی تصادم کا خطرہ ہوتا ہے اور انسانی قوتوں کے درمیان بھی۔ یوں کائنات اور انسانی معاشرے دونوں میں ٹوٹ پھوٹ کا خطرہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک 'ظالم' باغی اور ناموس افی اور شریعت لہیہ سے تصادم ہونے والا شخص صحیح سالم اور صراط مستقیم پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور یہ ضعیف اور ناتواں انسان اگر بغاوت بھی کرے تو اللہ کی عظیم قوتوں کا وہ کیا بگاڑ سکتا ہے۔ وہ اگر کوئی فساد برپا کرے گا اور نقصان کرے گا تو اپنا کرے گا۔ اللہ کی جبار و قہار قوتوں کے مقابلے میں تو وہ بس ہو جائے گا۔

یہ وہ عظیم حقیقت ہے جس کے اوپر تمام اہل دانش کو غور و فکر کرنا چاہئے اور اصحاب دانش اور عقل کو چاہئے کہ وہ اس سے نصیحت حاصل کرس۔ اس قصے کے درمیان یہ سبق آموز واقعہ بیان ہوا اور اس پر تبصرہ ہوا تاکہ اس اہم بات کی وضاحت کر دی جائے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ کے مزید انعامات گنائے جاتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ان کی اولاد میں حضرت سلیمان جیسے بالکمال شخص پیدا کیے جن پر اللہ کا بہت بڑا کرم ہوا۔ بلکہ کئی قسم کی کرم نوازیاں ہوئیں۔ حضرت سلیمان کی آزمائش 'ان پر اللہ کے کرم کے واقعات اور آزمائش کے بعد اللہ کی رحمتوں کی بارش کے واقعات کا ذکر ہوتا ہے۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَنَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿۵﴾
 إِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصُّفُوفُ الْجِيَادُ ﴿۶﴾ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ
 حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۷﴾ رُدُّوهَا
 عَلَيَّ ۖ فَفُتِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ ﴿۸﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَنَ وَآلَقَيْنَا
 عَلَى كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ ﴿۹﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي
 لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۱۰﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ
 رُجَاءَ حَيْثُ شَاءَ وَصَابَ ﴿۱۱﴾ وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ ﴿۱۲﴾ وَأَخْرَيْنَا مُقَرَّنِينَ
 فِي الْأَصْفَادِ ﴿۱۳﴾ هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۴﴾ وَإِنَّ لَهُ عِندَنَا
 لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَّآبٍ ﴿۱۵﴾

ع ۱۴

۱۲

”لور داؤد کو ہم نے سلیمان (صیبا بیٹا) عطا کیا، بہترین بندہ کثرت سے اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا۔ قابل ذکر ہے وہ موقع جب شام کے وقت اس کے سامنے خوب سدھے ہوئے گھوڑے پیش کیے گئے تو اس نے کہا ”میں نے اس مال کی محبت اپنے رب کی یاد کی وجہ سے اختیار کی ہے۔“ یہاں تک کہ جب وہ گھوڑے نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو (اس نے حکم دیا کہ) انہیں میرے پاس واپس لاؤ پھر لگا ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھرنے۔ اور (دیکھو کہ) سلیمان کو بھی ہم نے آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لاکر ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کیا اور کہا کہ ”اے میرے رب، مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوارتہ ہو، بے شک تو ہی اصل داتا ہے۔“ تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو سحر کر دیا جو اس کے حکم سے زمی کے ساتھ چلتی تھی۔ جدھر وہ چاہتا تھا اور شیاطین کو سحر کر دیا، ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابند سلاسل تھے (ہم نے اس سے کہا) ”یہ ہماری بخشش ہے، تجھے اختیار ہے جسے چاہے دے اور جس سے چاہے روک لے کوئی حساب نہیں۔“ یقیناً اس کے لیے ہمارے ہاں تقرب کا مقام لور بہتر انجام ہے۔“

یہاں دو اشارات ہیں۔ ایک الصافات الجیاد ہے یعنی اچھے سدھے ہوئے قیمتی گھوڑے۔ اور دوسرا اشارہ یہ کہ حضرت سلیمان کی کرسی پر ایک جسد ڈال دیا۔ ہمارے تفسیری ذخیرے میں جس قدر روایات یا تاویلات وارد ہیں۔ ان میں سے ان اشارات کی تفسیر میں کسی ایک تفسیر اور روایت پر میرا دل مطمئن نہیں ہے۔ جہاں تک روایات کا تعلق ہے، ان میں سے بہت تو اسرائیلیات سے متعلق ہیں اور تفاسیر جو بھی کی گئی ہیں وہ ایسی تاویلات ہیں جن کے اوپر کوئی صحیح سند نہیں

ہے۔ یہ دو واقعات اصل میں کیا ہیں؟ ان کے بارے میں کوئی اطمینان بخش چیز سامنے نہیں آئی تاکہ اس پر غور کر کے میں یہاں نقل کر دوں۔ ماسوائے ایک حدیث کے اور کوئی صحیح حدیث بھی منقول نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔ ایک صحیح حدیث ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا تعلق ان واقعات کے ساتھ ہے۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے۔ امام بخاری نے یہ حدیث مرفوعاً نقل کی ہے۔ ”حضرت سلیمان نے کہا میں آج رات اپنی مریبوں کے پاس جاؤں گا۔ ہر ایک سے ایک جو ان پیدا ہو گا۔ جو جہاد فی سبیل اللہ کرے گا۔ لیکن انہوں نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ وہ ان بیویوں کے پاس گئے۔ ان میں سے صرف ایک کا حمل ٹھہرا اور جب بچہ پیدا ہوا تو ناقص تھا۔ خدا کی قسم اگر حضرت سلیمان ان شاء اللہ کہتے تو یقیناً یہ سب اللہ کی راہ میں جہاد کرتے۔“ یہ ہو سکتا ہے کہ ان آیات میں جس فتنے کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہی ہو اور ان کی کرسی پر یہی جسد ناقص بیٹھا گیا ہو۔ لیکن یہ بھی احتمال درجے میں ہے۔ گھوڑوں کا قلعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ شام کے وقت ان کے سامنے گھوڑے پیش کیے گئے اور غروب سے قبل وہ جو عبادت کرتے تھے وہ قضا ہو گئی تو حضرت نے کہا ان سب گھوڑوں کو دلہن کر دو چنانچہ انہوں نے ان کی گردنوں اور پنڈلیوں کو تلوار سے کاٹنا شروع کیا۔ کیونکہ ان کی وجہ سے ان کی نماز قضا ہوئی اور وہ ذکر رب سے غافل ہو گئے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ان کے پاؤں اور گردنوں پر ہاتھ پھیر کر ان کو تپکی دیتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ کہ یہ اللہ کی راہ میں لڑنے والے گھوڑے ہیں۔ دونوں روایتوں پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اس کے بارے میں کوئی فرضی بات نہیں کر سکتے۔ لہذا کوئی محقق ان دونوں واقعات کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کر سکتا۔

جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی آزمایا گیا۔ اور یہ آزمائش امور مملکت کے بارے میں تھی اور اسی نوعیت کی تھی جس طرح تمام انبیاء کو راہ حق دکھانے کے لیے آزمایا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس راہ میں ان سے کوئی لغزش سرزد نہ ہو جائے۔ اس آزمائش کے بعد حضرت سلیمان نے اپنے رب کی طرف ثابت طور پر رجوع کر لیا اور مغفرت طلب کی۔ اور اللہ کی طرف مڑ کر دست بدعا ہوئے :

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي إِنَّكَ أَنْتَ

الْوَهَّابُ (۳۸: ۳۵) ”کہا“ اے میرے رب مجھے معاف کر اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو“ بے شک تو ہی اصل دانا ہے۔“

حضرت سلیمان کی مذکورہ بالا دعا کا مطلب جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسی خصوصیت چاہتے تھے جو معجزانہ ہو۔ یعنی ان کو حکومتی اقتدار چلانے کے لیے معجزانہ قوتیں دی جائیں اور تمام دوسرے ذی اقتدار لوگوں سے یہ اعجاز مختلف ہو۔ اس کی ایک متعین شکل ہو جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہ ہو۔ یعنی عوام الناس کے ہاں جس طرح کی حکومتیں متعارف ہیں۔

رب تعالیٰ نے بھی ان کی دعا قبول کرنے میں دیر نہیں فرمائی۔ چنانچہ جیسی حکومت انہوں نے چاہی تھی وہ ان کو دے دی۔ ایسی حکومت جو آئندہ کسی کو نہ دی جائے گی۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَحْرِيًى بِأَمْرِهِ رُحَاءَ حَيْثُ أَصَابَ (۳۸:۳۶) وَ الشَّيْطَانِ

كُلُّ بَنَاءٍ وَ غَوَاصٍ (۳۸:۳۷) وَ آخَرِينَ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ (۳۸:۳۸) ”تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی‘ جہرودہ چاہتا تھا اور شیاطین کو مسخر کر دیا۔ ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابند سلاسل تھے۔“

ہوا کو اللہ کے حکم سے اس کے بندوں میں سے کسی کے لیے مسخر کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہوا اللہ کے ارادے سے باہر آگئی۔ انسانوں کی تسخیر کے باوجود ہوا بدستور ارادہ الہی کے تحت چلتی ہے۔ اللہ کے حکم سے اس کے نواہیں قدرت کے مطابق ہی چلتی ہے۔ جب اللہ اپنے کسی بندے کے لیے یہ بات سل بنا دے کہ اس کا فعل ارادہ الہی کی تعبیر ہو اور بندے کا حکم الہی کے موافق ہو جائے تو ایسے حالات میں کائناتی قوتیں اللہ کے امر کے ساتھ ساتھ بندے کے امر کے ساتھ جتنی نظر آتی ہیں۔ پھر یہ ہو آئیں نہایت ہی نرمی کے ساتھ جہاں وہ بندہ چاہتا ہے ادھر چلتی ہیں۔ یہ ایک ایسا فعل ہے جس کا صدور اللہ سے مسجد نہیں ہوتا ہے۔ یہ فعل کی صورتوں میں سرزد ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرماتا ہے۔

لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَ الْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ

لَتُغَرِّبَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُحَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا (۳۳:۶۰) ”اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے اور وہ مدینہ میں بیجان انگیز افواہیں پھیلاتے ہیں ایسی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمہیں اٹھا کر آکرے گے۔ پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے۔“ اس کا مفہوم کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ باز نہ آئے تو اللہ اپنا ارادہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کی صورت میں حرکت میں لائے گا اور آپ کو ان کے خلاف اٹھا کر یوں ان کو مدینہ سے نکال دے گا۔ اللہ کے ارادے کے نتیجے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خلاف قتل شروع کر دیں گے۔ یوں اللہ کے ارادے اور نبی کے ارادے میں توافق پیدا ہو جائے گا۔ دونوں کے ارادے باہم مل جائیں گے اور اللہ کا ارادہ رسول اللہ ﷺ کے اقدامات کی شکل میں نظر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو اسی معنی میں مسخر کر دیا تھا جس طرح حضرت سلیمان چاہتے۔ اسی طرح اللہ ہواؤں کو مسخر فرما دیتا۔ یا جس طرح اللہ چاہتا اسی طرف حضرت سلیمان کا ارادہ ہو جاتا۔

اسی طرح آپ کے لیے شیاطین کو بھی مسخر کر دیا گیا اور آپ ان سے تعمیرات کا کام لیتے تھے۔ سمندر میں اور خشکی میں یہ لوگ آپ کے لیے غوطے لگاتے تھے اور جو اشیاء حضرت سلیمان چاہتے تھے وہ نکال لاتے تھے اور مخالفین اور مفسدین کو سزا دینے کی پوری پوری قدرت اللہ نے آپ کے لیے ودیعت کر دی تھی۔ مجرموں کو گرفتار کرنے‘ قید کرنے اور پکڑنے کی پوری قدرت آپ کو دے دی تھی۔ آپ کی حکومت میں امن و امان کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یعنی مجرم اکیلے اور اجتماعی شکل میں گرفتار ہو کر پابہ زنجیر کر دیے جاتے۔

زمین میں دولت کی تقسیم کے پورے اختیارات آپ کو دے دیے تھے۔ جسے چاہتے عطا کرتے‘ جسے چاہتے نہ

دیتے۔ یا جسے جس قدر چاہتے 'دے دیجئے۔

هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۸: ۳۹) ”یہ ہماری بخشش ہے تجھے اختیار ہے 'جسے چاہے۔ اور جس سے چاہے روک لے کوئی حساب نہیں ہے۔“ یہ اس لیے کہ آپ کو اللہ بہت بڑا اعزاز دینا چاہتا تھا کہ آپ کی حکومت پر کوئی مالی قدغن عائد نہیں ہے۔ مزید اس پر یہ اضافہ فرمایا کہ حضرت سلیمان ہمارے نزدیک بہت ہی مغرب اور برگزیدہ بندے تھے۔ اور ان کا انجام بہتر ہو گا۔

وَنَزَّلْنَاهُ عِنْدَنَا نِزْلًا مُّغْفِرًا وَحُسْنِ مَّآبٍ (۳۸: ۴۰) ”یقیناً اس کے لیے ہمارے ہاں تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے۔“ یہ ایک نہایت ہی عظیم مقام و مرتبہ ہے جو حضرت سلیمان کو دیا گیا۔ نہایت ہی فضل و کرم اور رضامندی اور بخشش اور مہربانیاں۔

--- ۰۰۰ ---

حضرت سلیمان کے بعد اب حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ ایتلا آتا ہے اور اس کے بعد ان پر اللہ کا فضل و کرم۔ حضورؐ اور مسلمانوں کے لیے امید پیدا کی جاتی ہے۔

وَإِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ
بُئْسَ وَعْدَآبٍ ۖ أُرْكُضُ بِرَجْلِكَ هَذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ ﴿۴۱﴾ وَهَبْنَا لَهُ
أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِنَّا وَذُكْرَىٰ لِأُولَى الْأَلْبَابِ ﴿۴۲﴾ وَخُذْ بِيَدِكَ
ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنَثْ ۚ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ۖ نِعْمَ الْعَبْدُ ۚ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿۴۳﴾

”اور ہمارے بندے ایوب کا ذکر کرو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔ (ہم نے اسے حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مارا یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے۔ ہم نے اسے اس کے اہل و عیال واپس دیئے اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور 'اپنی طرف سے رحمت کے طور پر' اور عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر۔ (اور ہم نے اس سے کہا) ٹکوں کا ایک مطالعے اور اس سے مار دے 'اپنی قسم نہ توڑ۔ ہم نے اسے صابر پایا' بہترین بندہ 'اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا۔“

حضرت ایوب کے صبر کا قصہ تو ایک مثال بن گیا ہے۔ اور بہت ہی معروف و مشہور ہے۔ صبر ایوبی ایک محاورہ ہے۔ لیکن اس قصے کے اوپر اسرائیلی روایات کی تہہ جم گئی ہے۔ اور حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے۔ اصل حقیقت وہ ہے جس طرح قرآن کریم تصریح کرتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام بندہ صالح اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اللہ کی آزمائش ان پر آئی اور اس میں انہوں نے خوب صبر فرمایا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آزمائش اس طرح تھی کہ مال چلا گیا، صحت چلی گئی اور بیوی بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ لیکن ان تمام جان لیوا تکالیف میں انہوں نے رب تعالیٰ کا دامن تھامے

رکھا۔ اللہ پر ان کا بھروسہ رہا اور وہ راضی برضائے اسی رہے۔

شیطان ان لوگوں کے دل میں وسوسے ڈالتا رہا جو تہ ادم میں تھوڑے تھے مگر ان کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان میں سے ان کی بیوی بھی تھی۔ شیطان ان کے دلوں میں یہ وسوسے ڈالتا کہ اگر ایوب اللہ کا برگزیدہ بندہ ہوتا تو اللہ ہرگز ان کو اس آزمائش میں نہ ڈالتا۔ جب یہ لوگ حضرت ایوب کو یہ باتیں مانتے تو ملی جسمانی مصیبت سے بھی زیادہ اذیت ان کو ان شیطانی وسوسہ اندازیوں سے ہوتی۔ جب ان کی بیوی نے ان کے سامنے ایسی باتیں کیں تو آپ نے حلف اٹھایا کہ اگر اللہ نے اس مصیبت سے نجات دی اور وہ تندرست ہو گئے تو بیوی کو کوڑے مارں گے۔ بعض نے سو کوڑے کہا ہے۔

اسی آزمائشوں پر جب شیطان کی جانب سے ایذا رسانی بھی شروع ہو گئی اور اس کا اثر ان کے مخلصین پر بھی ہوتا شروع ہو گیا اور خود ان کے دل پر اثر ہو گیا تو وہ دست ہدعا ہوئے۔

اَنِّیْ مَسْنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ (۳۸: ۴۱) ”کہ شیطان نے مجھے تکالیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔“

جب یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ سچے اور صابر ہیں اور وہ شیطانی وسوسہ اندازیوں سے بھی نفرت کرتے ہیں اور اس سے ان کی اذیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تو اب اللہ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ آزمائش کے دن بیت جاتے ہیں۔ ان کی صحت لوٹ آتی ہے۔ رب تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اپنے قدموں کو زمین پر ماریں۔ ٹھنڈا پانی نکل آئے گا۔ اس سے وہ نہیں اور غسل کریں۔ صحت لوٹ آئے گی۔

اُرْکُضْ بِرِجْلِكَ هَذَا مُغْتَسِلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ (۳۸: ۴۲) ”اپنا پاؤں زمین پر مار‘ یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے اور پینے کے لیے۔“ حرید رحمتیں یوں آتی ہیں:

وَوَهَبْنَا لَهُ اَهْلًا وَّمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرًا لِّاُولٰٓئِی الْاَلْبَابِ

(۳۸: ۴۳) ”اور ہم نے اسے نکل و عیال دلپس کر دیئے اور اپنی طرف سے رحمت کے طور پر ان کے ساتھ اتنے ہی اور دیئے اور عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر۔“

بعض روایات میں آتا ہے کہ اللہ نے ان کے وہ بچے زندہ کر دیئے جو فوت ہو گئے تھے اور اسی تہ ادم میں اور اولاد بھی دے دی۔ قرآن کریم اس بات کی صراحت نہیں کرتا کہ مردوں کو زندہ کیا گیا۔ مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو لوگ ان کو چھوڑ کر غائب ہو گئے تھے وہ اور ان کے نکل خانہ دلپس کر دیئے گئے اور پھر حرید اولاد دی گئی۔ حرید انعام اور رحمت و رعایت کے طور پر۔ اور یہ انعامات اس لیے کیے گئے کہ نکل عقل و دانش اس سے عبرت لیں۔

ان تمام قصے سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کے جو بندے مشکلات اور آزمائشوں میں صبر کریں اللہ ان پر کرم نوازی کرتا ہے اور آخر کار ان پر کرم ہوتا ہے۔

یہ کہ ان کی قسم کا نتیجہ کیا ہوا تو اللہ کی رحمت نے ان کو اور ان کی بیوی کو ڈھانپ لیا۔ کیونکہ ان کی بیوی نے اس

طویل آزمائش میں حضرت ایوب کی بہت خدمت کی تھی۔ اور اس نے بھی بہت ہی مصابرت سے کام لیا تھا۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ انہوں نے جتنے کوڑے مارنے کی قسم اٹھائی ہے اتنی ہی شاخیں لیں اور ان تمام شاخوں سے ایک ہی وار اس پر کر لیں۔ اس طرح ان کی قسم پوری ہو جائے گی اور وہ حادثہ نہ ہوں گے۔

وَ خُذْ يَدَكَ ضَعْفًا فَاضْرِبْ بِهِ وَلَا تَحْنُثْ (۳۸: ۴۴) ”نکلوں کا ایک مٹھے اور اس سے مار دے، اپنی قسم نہ توڑ“۔ یہ سہولت ان کو اس لیے دی گئی کہ اس عظیم امتحان میں انہوں نے اللہ کی منشاء کے مطابق صبر کیا اور اطاعت شعار بندے کے طور پر رہے اور آخر میں اللہ ہی سے التجا کی۔

اَنَا وَ جَدُّهُ صَابِرٌ اَنْعَمَ الْعَبْدُ اِنَّهُ اَوْ اَبٌ (۳۸: ۴۴) ”ہم نے اسے صابر پایا۔ بہترین بندہ اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا“۔

یہ تین قصے تو قدرے تفصیل سے ذکر ہوئے۔ مقدمہ یہ تھا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی موجودہ مشکلات پر صبر کریں۔ اب رسولوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ ان کے قصے میں بھی آزمائشیں اور صبر کے واقعات ہیں اور ان پر بھی اللہ کے انعامات اور فضل و کرم ہوتے رہے ہیں جس طرح حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور ایوب علیہم السلام کے قصے میں آزمائشیں اور فضل و کرم ہیں۔ ان میں سے بعض انبیاء تو ان سے پہلے گزرے ہیں اور معروف ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کے زمانے کا تعین نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن اور ہمارے ہاں حقیقی تاریخی مصادر کے اندر ان کے زمانے کا تعین نہیں کیا گیا۔

وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولٰٓئِیْنِ وَ الْاَبْصَارِہٖۤ اِنَّا اَخْلَصْنٰہُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرٰی الدَّارِہٖۤ وَ اِنَّہُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفٰیْنَ الْاَخْيَارِہٖۤ وَ اذْكُرْ اِسْمٰعِیْلَ وَ الْیَسَعَ وَ ذَا الْكُفْلِ وَ كُلُّ مِّنَ الْاَخْيَارِہٖۤ

”اور ہمارے بندوں‘ ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا ذکر کرو۔ بڑی قوت عمل رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ تھے۔ ہم نے ان کو ایک خالص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا‘ اور وہ دارِ آخرت کی یار تھی۔ یقیناً ہمارے ہاں ان کا شمار چنے ہوئے نیک اشخاص میں ہے۔ اور اسماعیل، یسح اور ذوالکفل علیہم السلام کا ذکر کرو‘ یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔“

حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہم السلام تو یقیناً حضرت داؤد اور حضرت سلیمان سے قبل تھے لیکن حضرت ایوب کے دور کے بارے میں ہمیں چینی معلومات نہیں ہیں۔ اسحٰق و ذوالکفل کے بارے میں بھی صحیح معلومات نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن کریم میں صرف اشارات ہی پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے ایک نبی کا نام عبرانی میں یسح آتا ہے۔ یہی عربی میں یسح ہیں۔ اسی لیے ہم بھی ترجیح دیتے ہیں۔ رہے ذوالکفل تو ان کے بارے

میں زیادہ تاریخی معلومات نہیں ہیں۔

اللہ نے حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے بارے میں صرف یہ کہا ہے کہ وہ

أُولَی الْأَیْدِیْ وَ الْأَبْصَارِ (۴۵:۳۸) ”بڑی قوت رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ تھے۔“
مطلب یہ ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں سے عمل صالح کرنے والے اور نظریاتی اعتبار سے فکر مستقیم کے مالک تھے۔ گویا جو عمل صالح نہیں کرتا وہ کمزور ہوتا ہے اور جو شخص فکر سیم نہیں رکھتا وہ آنکھوں کے باوجود اندھا ہوتا ہے۔
قرآن کریم میں ان پیغمبروں کے اعزاز کی صفت کے بیان میں کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے خالص بندے تھے۔ اور ان کی دوسری خاص صفت یہ تھی وہ دار آخرت کو ہر وقت یاد کرنے والے اور اس کا لحاظ کرنے والے تھے۔ وہ صرف رضائے الہی اور فلاح اخروی کے لیے کام کرتے تھے۔

أَنَا اخْتَصَنَهُم بِخَالَصَةِ ذِكْرِي الذَّارِ (۴۶:۳۸) ”ان کو ایک خاص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا اور وہ دار آخرت کی یاد تھی۔“ یہ ان کا مرتبہ اور ان کی بلندی تھی اور اس مرتبے اور بلندی نے ان کو برگزیدہ بنا دیا تھا۔

وَ أَنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْآخِيَارِ (۴۷:۳۸) ”اور یقیناً ہمارے ہاں ان کا شمار چنے ہوئے نیک اشخاص میں سے ہے۔“

نیز اللہ تعالیٰ تصریح فرماتا ہے کہ حضرت اسماعیل، حضرت زوالکفل اور حضرت اسمعیم علیہم السلام اس کے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرماتا ہے کہ تم لوگ ان کی روحانی صحبت میں رہو۔ ان کے صبر و مصابرت کو یاد کرو اور آخر کار ان پر جو فضل و کرم ہوا اس کی امید رکھو۔ اور تمہاری قوم کی طرف سے جو تکذیب ہو رہی ہے اور اس پر تمہیں جو اذیت ہو رہی ہے اس کو برداشت کرو۔ کیونکہ تمام رسولان کرام کا طریقہ صبر اور مصابرت کا ہے۔ اور رسولوں کے بعد بھی تمام دعوتوں کا طریقہ بھی صبر کا ہے اور ہمیشہ یوں ہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے صبر کرنے والے بندوں پر رحم و کرم کرتا ہے۔ ان کو قوت اور اقتدار عطا کرتا ہے اور ان پر رحمتیں نازل کرتا ہے۔ اللہ کے ہاں اپنے بندوں کے لیے جو اجر اور انجام ہوتا ہے وہ بہر حال بہتر ہوتا ہے۔ اور اللہ کی رحمتوں اللہ کی برکتوں کے مقابلے میں سازشیوں کی سازشوں اور مکاروں کی مکاریوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اللہ اپنے بندوں کا ہر وقت نگہبان ہوتا ہے۔

— ○ ○ ○ —

درس نمبر ۲۱۳ تشریح آیات

۲۹ --- تا --- ۶۲

هَذَا ذِكْرٌ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ ﴿۵۱﴾ جَنَّاتٍ عَدْنٍ
مُفْتَحَةٌ لَهُمْ أَبْوَابُهَا ﴿۵۲﴾ مُكِينٌ فِيهَا يُدْعَوْنَ فِيهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَ
شَرَابٍ ﴿۵۳﴾ وَعِنْدَهُمْ قُصِرَتُ الطَّرِيقُ أَتْرَابٍ ﴿۵۴﴾ هَذَا مَا تُوْعَدُونَ لِيَوْمِ
الْحِسَابِ ﴿۵۵﴾ إِنَّ هَذَا لِرِزْقِنَا مَا لَهُ مِنْ تَفَافٍ ﴿۵۶﴾ هَذَا وَإِنَّ لِلطَّغْيَانِ لَشَرَّ
مَآبٍ ﴿۵۷﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْيِهَادُ ﴿۵۸﴾ هَذَا فَلْيَذُوقُوهُ حَمِيمٌ وَ
غَسَاقٌ ﴿۵۹﴾ وَآخَرُ مِنْ شَكَاةٍ أَزْوَاجٍ ﴿۶۰﴾ هَذَا فَوَجٌّ مُفْتَحٌ مَعَكُمْ لَا
مَرْحَبًا بِهِمْ إِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۶۱﴾ قَالُوا بَلْ أَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ أَنْتُمْ قَدْ مُمِئْتُمْ
لَنَا فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۲﴾ قَالُوا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ أَمْرًا هَذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي
النَّارِ ﴿۶۳﴾ قَالُوا مَا لَنَا لَا نَرَى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِنَ الْأَشْرَارِ ﴿۶۴﴾ أَتُخَذُ لَهُمْ
سُخْرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمْ الْبَصَارُ ﴿۶۵﴾ إِنَّ ذَلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ ﴿۶۶﴾

۱۳

”یہ ایک ذکر تھا (اب سنو کہ) متقی لوگوں کے لیے یقیناً بہترین ٹھکانا ہے، بیشہ رہنے والی جنتیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے۔ ان میں وہ یکے لگائے بیٹھے ہوں گے، خوب خوب فواکہ اور مشروبات طلب کر رہے ہوں گے، اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہوں گی۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں حساب کے دن عطا کرنے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ یہ تو ہے متقیوں کا انجم۔ اور سرکشوں کے لیے بدترین ٹھکانا ہے“

جنم جس میں وہ جھلے جائیں گے بہت ہی بری قیام گاہ۔ یہ ہے ان کے لیے 'پس وہ مزا چکیں کھولتے ہوئے پانی اور پیپ' لہو اور اسی قسم کی دوسری تلیوں کا۔ (وہ جنم کی طرف اپنے پیروں کو آتے دیکھ کر آپس میں کہیں گے) "یہ ایک لشکر تمہارے پاس گھسا چلا آرہا ہے" کوئی خوش آمدید ان کے لیے نہیں ہے، یہ آگ میں جھسنے والے ہیں۔ وہ ان کو جواب دے گے "نہیں بلکہ تم ہی جھلے جا رہے ہو" کوئی خیر مقدم تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم ہی تو یہ انجام ہمارے آگے لائے ہو، کیسی بری ہے یہ جائے قرار۔" پھر وہ کہیں گے "اے ہمارے رب، جس نے ہمیں اس انجام کو پہنچانے کا بندوبست کیا، اس کو دوزخ کا دو ہر عذاب دے۔" اور وہ آپس میں کہیں گے "کیا بات ہے، ہم ان لوگوں کو کہیں نہیں دیکھتے جنہیں ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے؟ ہم نے یونہی ان کا مذاق بنالیا تھا، یا وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہیں؟" بے شک یہ بات سچی ہے، اہل دوزخ میں یہی کچھ جھڑے ہونے والے ہیں۔

درس ماضی میں ہم اللہ کے مختار بندوں کے ہم محفل تھے۔ ان لوگوں کی زندگی کی آزمائش اور پھر ان کی جانب سے مشکلات پر صبر کا پہلو نمایاں طور پر موضوع غن تھا۔ آزمائش کے بعد ان سب بندوں کو اللہ کی رحمت اور اس کے فضل و کرم نے ڈھانپ لیا۔ اس محفل ذکر میں ہمیں یہ بتانا مقصود تھا کہ اس کرۂ ارض پر یہ اعلیٰ ترین زندگی ہے اور اس عارضی زندگی کو اس طرح گزارنا چاہئے۔ اب یہاں اس سبق میں یہ بتایا جاتا ہے عالم آخرت میں اللہ کے متقی بندوں کا کیا حال ہو گا اور سرکشوں اور جھٹلانے والوں کے شب و روز کیا ہوں گے۔ گویا سابقہ سبق میں حیات فانی موضوع غن تھا اور اس میں حیات باقیہ کے شب و روز زیر بحث ہیں۔ یہ زندگی یہاں منظر کی شکل میں دکھائی گئی، جس کہ قرآن کریم کا انداز ہے۔ یہاں مناسب ہے کہ میں اپنی کتاب "مشاہد قیامت" کے کچھ اقتباسات دے دوں۔

ان مناظر کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ دو منظر ہیں اور دو انجام ہیں اور ایک دوسرے کے بالکل بالمقابل ہیں۔ مجموعی طور پر بھی ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں اور اجزاء کے اعتبار سے بھی یہ دونوں مناظر باہم متقابل ہیں۔ ہیئت و شکل اور مضمون اور خواص کے اعتبار بھی دونوں مناظر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ متعین ایک اچھے انجام تک پہنچ چکے ہیں (حسن مآب)۔ جبکہ مفسدین برے انجام تک پہنچ چکے (شر مآب)۔ اگر متعین کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے دروازے ان کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔

جَنَّتٍ عَدْنٍ مَّفْتَحَاتٍ لَّهُمْ الْبَابُ (۳۸: ۵۰) اور وہ اس میں بالمقابل کیے لگائے بیٹھے ہیں اور اچھا کھانا اور اچھا پینا ان کو میسر ہے۔ اور ان کو نوجوان حوریں میسر ہیں اور جوانی کے باوجود وہ شرمیلی بھی ہیں۔ نہ وہ کسی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی ہیں اور نہ سر اٹھا کر چلتی ہیں اور جوانی کے ساتھ ہم عمر بھی ہیں۔ پھر وہ تمام سہولیات دائی ہیں لہذا اللہ کی طرف سے ہیں اور مآلہ من نفاذ "ختم ہونے والی نہیں ہیں۔"

تو مکذہبن بھی ایک جائے قرار میں نظر آتے ہیں۔ یہ بہت ہی بری جائے قرار ہے۔

فَبَشِّرَ الْمُهَادِّ (۳۸: ۵۶) وہاں ان کے پینے کے لیے گرم پانی ہے اور قابل نفرت اور تے لانے والا کھانا وہ کھا رہے ہوں گے۔ یعنی ان کے زخموں کا دھون اور پیپ۔ اس قسم کے کئی دوسرے عذاب ان کے لیے ہوں گے۔ اور ان عذابوں کو ازواج سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان مذکورہ تلیوں کے علاوہ دوسری بھی تلیاں ہوں گی۔

ان دو مناظر کے بعد اب تیسرا منظر دیکھئے جس کے کردار ایک دوسرے سے ہمکلام بھی ہیں۔ اہل جہنم سرکشوں کا ایک گروہ دنیا میں ایک دوسرے کا جگری دوست تھا۔ اب یہ لوگ یہاں ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور نفرت کرنے والے ہیں۔ دنیا میں یہ گمراہی کے ہم سفر تھے۔ یہ مومنین سے اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔ مومنین کی دعوت اور ان کے منشور کے ساتھ یہ لوگ مذاق کرتے تھے۔ خصوصاً ان کے اس عقیدے کے ساتھ کہ وہ جہنم میں ہوں گے جیسا کہ قریش کہتے تھے۔

ءَاَنْزَلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا ۚ كَیَاہِم مِّنْ ذِكْرِ اٰیٍۭیْہِیْۤا

درا ان کے منظر کو دیکھئے کہ یہ فوج در فوج جہنم میں گھسے جارہے ہیں 'یاد رکھیے جارہے ہیں اور ایک دوسرے سے وہ یوں ہمکلام ہیں۔

ہٰذَا فَوْجٌ مُّفْتَحٌ مَّعَكُمْ (۵۹:۳۸) ”یہ لشکر تمہارے پاس گھسا چلا آرہا ہے“۔ جواب کیا ہے؟ نہایت ہی سنگ حراکی سے جواب آتا ہے۔

لَا مَرَحِبًا بِہِمۡ اِنَّہُمْ صَالُوۡا النَّارَ (۵۹:۳۸) ”کوئی خوش آمدید ان کے لیے نہیں ہے۔ یہ تو آگ میں جھسنے والے ہیں“۔ جس فوج پر یہ تبصرہ کیا جارہا ہے 'وہ بھی سن کر جل بھن جاتی ہے اور ان کا جواب یہ ہے '

قَالُوۡا بَلۡ اَنْتُمْ لَا مَرَحِبًا بِکُمْ اَنْتُمْ قَدْ مَتَمُوۡہُ لَنَا فَبُئِسَ الْقَرَارُ (۶۰:۳۸) ”وہ کہیں گے بلکہ تمہارے لیے کوئی خوش آمدید نہیں ہے 'تم ہی تو یہ انجام ہمارے آگے لائے ہو۔ کیسی بری ہے یہ جئے قرار“۔ تم ہی تو اس مصیبت کا باعث بنے ہو۔ اب یہ لوگ نہایت دل شکنی 'کھن اور انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر یہ درخواست کرتے ہیں۔

قَالُوۡا رَبَّنَا مَنۡ قَدَّمَ لَنَا ہٰذَا فَرَّزَہُ عَذَابًا ضِعْفًا فِی النَّارِ (۶۱:۳۸) ”پھر وہ کہیں گے اے ہمارے رب 'جس نے ہمیں اس انجام کو پہنچایا اس کو دوزخ کا دو ہر عذاب دے“۔

اب یہ لوگ جہنم میں مومنین کو تلاش کس گے۔ ان کا کوئی لہ پھ جہنم میں نہ ہو گا۔ حالانکہ یہ لوگ اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں اونچے لوگ سمجھتے تھے 'اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ تو چند شریر لوگ ہیں۔ اور ان کے دستور اور منشور کے ساتھ بھی مذاق کرتے تھے۔ اور جن اعلیٰ مقام اور رضائے اعلیٰ کے لیے وہ کام کرتے تھے 'اس کو حقت سمجھتے تھے۔ یہ لوگ ان جہنم میں گھسنے والوں میں نہیں ہیں۔ یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں چلے گئے وہ لوگ۔ یہاں وہ موجود نہیں یا ہمیں نظر نہیں آتے۔

وَقَالُوۡا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا کُنَّا نَعُدُّہُم مِّنَ الْاَشْرَارِ (۶۲:۳۸) اَتَّخَذْنٰہُمْ

سِخْرِیًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْہُمُ الْاَبْصَارُ (۶۳:۳۸) ”وہ آپس میں کہیں گے 'کیا بات ہے 'ہم ان لوگوں

کو کہیں نہیں دیکھتے جنہیں ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے اور ہم نے یونہی ان کا مذاق بنالیا تھا، یا وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہیں؟“
یہ لوگ ان کے بارے میں جہنم میں اتنے پتہ دریافت کر رہے ہیں حالانکہ وہ لوگ جنتوں کے حروں میں ہیں۔
یہ منظر اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ لٹل دوزخ میں یہ جھگڑے یونہی چلتے رہیں گے۔

إِنَّ ذَلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ (۳۸: ۶۷) ”بے شک یہ بات سچی ہے کہ لٹل دوزخ میں یہی کچھ جھگڑے ہونے والے ہیں۔“

درا دیکھئے کہ ان کا انجام لٹل ایمان کے انجام سے کس قدر مختلف اور اپنے طور پر کس قدر بھیانک ہے۔ دنیا میں تو لٹل جہنم متعین کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ اللہ نے ان پر جو کلام الہی نازل کیا ہے۔ یہ اس کے لٹل ہی نہیں۔ اور یہی وہ نقشہ عذاب ہے جس کے بے وہ بچوں کی شبابی مچا رہے تھے۔ اور کہتے تھے۔

وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطْعَنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸: ۱۶) ”اے ہمارے رب ہمارا حصہ ہمیں یوم الحساب سے بھی پہلے ہمیں دے دے۔“

--- ○ ○ ○ ---

وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۸: ۶۵) ”کوئی معبود نہیں مگر اللہ جو یکناں ہے غالب“۔ اور ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ اختیارات میرے پاس نہیں ہیں۔ میرے ذمے جو کام ہے وہ صرف یہ ہے کہ میں لوگوں کو ڈراؤں اور اس کے بعد اللہ واحد اور قادر پر ان کا انجام چھوڑ دوں جو

رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (۳۸: ۶۶) ”جو زمین و آسمان اور ان ساری چیزوں کا رب ہے جو ان کے درمیان ہیں“۔ لہذا اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اور زمین و آسمان میں کسی کے لیے اس کے دربار کے سوا جائے پناہ نہیں ہے۔ وہ عزیز ہے، قوی ہے، اور وہ گناہوں کا بخشنے والا ہے، وہ درگزر فرمانے والا ہے۔ جو لوگ توبہ کر کے اس کی پناہ گاہ میں آتے ہیں وہ محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ جو کلام عظیم میں لایا ہوں، اس کی ہر قدر وقعت تم متعین کرتے ہو، وہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اور اس کے توہمت عظیم نتائج، انقلابی نتائج نکلنے والے ہیں مگر تم غافل ہو۔

قُلْ هُوَ نَبِيُّ عَزِيزٍ أَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ

ان سے کہو ”یہ ایک بڑی خبر ہے جس کو سن کر تم منہ پھرتے ہو“۔

کہہ دو، قرآن کریم اپنے موجودہ زمانے اور مستقبل قریب کی بہ نسبت آگے چل کر بہت ہی عظیم نتائج پیدا کرنے والا ہے۔ اس کائنات میں یہ امر الٰہی ہے۔ اور اس کا تعلق اس پوری کائنات کے عظیم معاملات میں سے ہے۔ یہ اس کائنات میں جاری و ساری نظام تضاد قدرت متعلق ہے۔ یہ قرآن اور اس کا نزول زمین و آسمانوں کے معاملات سے کوئی علیحدہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس سے ماضی بعید کے امور بھی متعلق ہیں اور مستقبل کی تہدیلیاں بھی اس کے نتیجے میں ہوں گی۔

یہ تو ایک عظیم شہ سرخی ہے۔ یہ عظیم خبر قریش سے بھی آگے بڑھنے والی، یہ مدین اور جزیرۃ العرب سے بھی آگے پھیلنے والی ہے۔ یہ اس وقت کی موجود نسل سے بھی آگے آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک شہ سرخی ہے۔ یہ خبر زمان و مکان میں محدود رہنے والی نہیں ہے۔ یہ انسانیت کے مستقبل کے زمانوں میں اور تمام اقطار عالم میں انقلاب برپا کرنے والی خبر ہے۔ اور یہ انسانیت کے حالات اور مسائل کو اس وقت تک متاثر کرتی رہے گی جب تک قیامت برپا نہیں ہو جاتی۔ نظام کائنات میں اس خبر کے لیے جو وقت مقرر تھا۔ یہ خبر بسینہ اپنے وقت پر نشر ہوئی ہے تاکہ اس کے ذریعے دنیا کے اندر وہ تغیرات پیدا ہوں جو اللہ چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دست قدرت نے اس بناء عظیم کے ذریعے انسانیت کے سفر کے لیے جو راہ متعین کی ہے اور جس طرح انسانیت کو صراطِ مستقیم پر ڈالا ہے اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو وہ انقلابی تغیرات ثابت ہوں گے۔ ان لوگوں پر تو یہ اثرات ہوئے جو ماننے والے تھے لیکن اس سے وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جو نہ ماننے والے تھے بلکہ جو مخالف تھے۔ نزول قرآن کے دور میں جانی جانے والی نسلیں بھی اس سے متاثر ہوئیں اور بعد میں آنے والے بھی اس سے متاثر ہوئے۔ پوری انسانی تاریخ پر کسی بات کسی خبر نے اس قدر گہرے اثرات مرتب نہیں کیے۔ قرآن نے کیے۔

قرآن نے دنیا کو اعلیٰ اقدار اور برتر تصورات عطا کیے۔ اس دنیا کو ضابطہ اخلاق، ضابطہ قانون اور بین الاقوامی

قانون دیا۔ اور یہ قوانین اور انتظامات پوری انسانیت کے لیے تھے۔ ان اقدار اور ضابطہ عمل کے بارے میں عربوں نے تو سوچا ہی نہ تھا۔

عربوں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا اور نہ سوچ سکتے تھے کہ اس عظیم خبر کے نتیجے میں روئے زمین پر اس قدر تغیرات واقع ہوں گے۔ تاریخ کا دھارا بدل جائے گا۔ اس زندگی کا نقشہ اللہ کی تقدیر کے مطابق بدل جائے گا۔ انسان کے ضمیر و شعور اور اس کے حالات میں انقلاب برپا ہو جائے گا۔ اور یہ تغیرات اس لائن پر ہوں گے جس پر یہ پوری کائنات چل رہی ہے اور یہ کہ یہ خبر دراصل اس سچائی کی خبر ہے جس کے اوپر یہ کائنات چل رہی ہے اور قیامت تک زندگی نے اب اس طرح چلنا ہے اور اس طرح اس بناء عظیم نے انسانوں کی قسمت کو بدلنا ہے۔

آج مسلمانوں کا رد عمل اس خبر پر وہی ہے جس طرح ابتداء میں عربوں کا تھا۔ وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ اس خبر کا تعلق روح کائنات کے ساتھ ہے۔ آج مسلمان بھی یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بناء عظیم اسی سچائی کی حامل ہے جس پر یہ کائنات قائم ہے۔ مسلمان اس کائنات پر اس کے اثرات کو اس طرح پیش نہیں کرتے۔ جس طرح فی الواقع وہ اثرات مرتب ہوئے۔ انسانی تاریخ پر وہ قرآنی نظریہ اور قرآنی زاویہ سے نگاہ نہیں ڈالتے بلکہ وہ انسانی اور خود اپنی تاریخ اور اس عظیم خبر کو ان لوگوں کی عینک لگا کر پڑھتے ہیں جو اسے سرے سے درست ہی نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس کربۂ ارض پر نہ اپنے ماضی کے کردار کو سمجھتے ہیں نہ اپنے حالیہ کردار کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور نہ مستقبل میں جو کردار انہوں نے ادا کرنا ہے اس کو سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قیامت تک یہ کردار ادا کرنا ان کا فریضہ ہے۔

ابتدائی دور کے عرب یہ سمجھتے تھے کہ یہ معتمد عربوں کا ہے، قریش کا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اور صرف یہ ہے کہ عربوں سے محمد نامی شخص کو نبی جن لیا گیا حالانکہ ان کے خیال میں وہ کوئی بڑا آدمی نہ تھا۔ ان کے ارادے اور ان کی سوچ اس قدر محدود شکل میں تھی۔ قرآن کریم ان سے کہتا ہے کہ یہ کوئی میوہل مسئلہ نہیں ہے، یہ تو بہت ہی عظیم امر ہے۔ یہ محمد ابن عبد اللہ کا ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ تو صرف اس عظیم خبر کو نشر کرنے والے ہیں۔ یہ خود اس کے موجد بھی نہیں ہیں۔ وہ صرف وہ بات کہہ رہے ہیں جس کے بارے میں ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس عظیم خبر کا اعلان کر دو۔ محمد کو کیا پتہ کہ آغاز کائنات میں اللہ نے تخلیق انسانیت کے بارے میں کیا مکالمہ کیا۔

مَا كَانَ رَبِّيَ عَلَىٰ عِلِّيِّهِ بِالْمَلِكِ الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٢٨﴾ يُوحَىٰ إِلَيْنَا أَنَّمَا

أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٢٩﴾

”(ان سے کہو) ”مجھے اس وقت کی کوئی خبر نہ تھی جب طاء اعلیٰ میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ مجھ کو تو وحی کے ذریعہ سے یہ باتیں صرف اس لیے بتائی جاتی ہیں کہ میں کھلا کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔“

یہاں پھر قصہ انسانیت شروع ہوتا ہے کہ اس بناء عظیم میں انسان کا کیا مقام ہے۔ اس وقت عالم بالامیں وہ مکالمہ ہوا جس سے انسانی تاریخ کی لائن متعین ہوتی ہے۔ اور انسانی قدریں متعین ہوتی ہیں اور اسی نظریہ اور فلسفہ کی تبلیغ کے لیے حضرت محمد ﷺ بھیجے گئے ہیں۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ؕ فَاِذَا

سَوَّیْتُهُ وَنَفَخْتُ فِیْهِ رُوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدٰتٍ ؕ

”جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا ”میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں“ پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔“

ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ یہ مادہ کس انداز میں ہوا۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی فرشتوں کے ساتھ مکالمے کی کیفیت کیا ہے اور یہ بھی ہمیں معلوم نہیں ہے کہ فرشتے اللہ سے ہدایات کس طرح اخذ کرتے ہیں۔ نہ ہم فرشتوں کی حقیقت سے باخبر ہوں۔ نہ ہمیں ان مسائل میں الجھنے کی ضرورت لاحق ہے اور نہ کوئی فائدہ متوقع ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس قصے کا جو مطلب ہے اور اس کے اندر جو فلسفہ ہے اس پر بات کریں۔

اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ جس طرح زمین کی تمام ذی روح چیزوں کو مٹی سے بنایا۔ تمام زندہ مخلوقات کے عناصر ترکیبی مٹی میں موجود ہیں۔ صرف ایک چیز ابھی تک راز ہے کہ روح اور حیات اس کے اندر کہاں سے آئی اور کس طرح آئی۔ اس راز کے سوا انسان کی ذات کے تمام عناصر مٹی سے ہیں۔ اور انسان دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں انسان قرار پایا۔ وہ اسی روح کی وجہ سے جو اللہ نے اس کی ذات کے اندر پھونکا۔ انسان کی ماں یہ زمین ہے۔ زمین کے عناصر سے اس کی تخلیق ہوئی ہے اور بس اس سے روح جدا ہوتی ہے تو وہ پھر مٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب اس کے جسد خاکی سے روح نکلتی ہے تو اس سے اس کے آگے علوی نکل جاتے ہیں۔

روح کی پھونک کی یا حقیقت ہے اس کی ماہیت سے ہم بے خبر ہیں البتہ روح کے آثار ہمارے علم میں ہیں۔ یہ روحانی آثار ہیں جن کی بنا پر یہ حضرت مرثیہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور اس روح ہی کی وجہ سے وہ روحانی اور عقلی ارتقاء کرتا ہے۔ یہ روح ہی ہے جس کی وجہ سے انسان ماضی سے تجربات حاصل کرتا ہے۔ اور مستقبل کے لیے راہ عمل متعین کرتا ہے۔ اس طرح انسانی عقل جو اس کے مددگار اور عقل کے مددگار سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور اسے وہ روحانی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو جو اس اور عقل کے دائرے سے ورہا ہیں۔

عقل اور روحانی ارتقاء انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس زمین پر زندہ ہونے والے تمام دوسرے ذی حیات انسان کے ساتھ اس خاصہ میں تریب نہیں ہیں۔ جب سے انسان پیدا ہوا ہے اس کے ساتھ دوسرے حیوانات بھی پیدا ہوئے۔ لیکن انسان اور زمین کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حیوانات میں سے کوئی حیوان عقل اور روح کے اعتبار سے انسان جیسی ترقی کر گیا ہو۔ اگر ہم عضویاتی ارتقاء کو تسلیم بھی کر لیں لیکن عقلی ارتقاء کی کوئی مثال نہیں ہے۔

اللہ نے اس بشری مخلوق میں اپنی روح پھونکی ہے۔ کیونکہ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ حضرت انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہو اور اس خلافت اور نیابت کی رو سے زمین کے اختیارات اپنے حدود قدرت کی حد تک سنبھال لے۔ یعنی اس کی تعمیر کرے۔ اس کے اندر پوشیدہ قوتوں کو اپنے کام میں لائے اور یہاں خدا کی فضاء کو پورا کرے۔

اللہ نے انسان کو ترقی اور حصول علم کی قوت دی اور اپنے روز آفرینش سے وہ ترقی کر رہا ہے بشرطیکہ وہ اس روح

کے منبع سے جزا رہے یعنی ذات باری سے۔ اور ذات باری سے وہ صراطِ مستقیم کی طرف گامزن ہونے کی ہدایت لین رہے لیکن اگر وہ عالم بالا کی ہدایات سے منحرف ہو جائے تو پھر انسان کی ذات میں ترقی اور آگاہی کا جو تہوج ہے وہ متوازن نہیں رہتا۔ اور اس کی سمت بھی درست نہیں رہتی۔ اور بعض اوقات انسان آگے بڑھنے کے بجائے ترقی معکوس کرتا ہے اور یہ تہوج پھر اس کی ذاتی اور انسانی سلامتی کے لیے خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر وہ انسانی خصوصیات میں رجعت تعمیری اختیار کرے تو حقیقی ارتقاء کے بجائے وہ زوال کی راہ پر پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ بقا ہر اس کے علوم و فنون زیادہ ہو گئے ہوں۔ وہ تجربات میں بہت آگے جا چکا ہو اور زندگی کے بعض پہلوؤں کے اعتبار سے ترقی کر گیا ہو۔

یہ انسان! نہایت ہی چھوٹا انسان کائنات کے ان عظیم اور ہولناک اجسام و کرات کی بہ نسبت! یہ انسان! جس کی قوتیں نہایت محدود ہیں جس کا عمل بہت قصیر ہے۔ جس کا علم بہت ہی محدود ہے۔ یہ انسان اس قدر عظمت و کرامت حاصل ہی نہ کر سکتا تھا۔ اگر اللہ نے اس میں اپنی روح نہ پھونکی ہوتی اور اس پر اللہ کا یہ مخصوص کرم نہ ہوا ہوتا۔

ذرا سوچو! اس انسان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ یہ تو اس کائنات کے اندر ایک نہایت ہی چھوٹا سا کیڑا ہے اور یہ لَمَّا تَعْدُ وَلَا تُحْصِي دوسرے زندہ کیڑوں، مکوڑوں اور پرندوں اور چرندوں کے ساتھ یہاں رہتا ہے اور یہ زمین کیا ہے، یہ کسی ایک نظامِ شمس میں چھوٹی سی کیند ہے اور اس قسم کی کئی بلین گیندیں اس کائنات میں تہرتی پھرتی ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کا آغاز کہاں سے ہے اور انتہا کہاں پر ہے، یہ انسان! اس انسان کو فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ کے فرشتے، یہ محض اس نفعِ روح کی وجہ سے ہے جو نہایت ہی گہرا راز ہے اور عظیم راز ہے۔ اس راز ہی کی وجہ سے یہ انسان زمانِ قدیم سے محض حیوانِ رذیل نہیں ہے۔ اگر اس سے یہ روح اور روحانیت کو متقی کر دیا جائے تو یہ ایک حقیر مٹی کا ٹکڑا ہے۔ ملائکہ نے ہر حال امرانی کی تعمیل کی۔

فَسَجَدَ لِلْبَلَدِ كُلُّهُمْ أَجْعُونَ ﴿۵۱﴾

”حکم کے مطابق فرشتے سب کے سب سجدے میں گر گئے۔“ کس طرح سجدہ کیا۔ کہاں کیا کب کیا؟ یہ سب اللہ کے علوم غیبیہ سے ہیں۔ اگر یہ معصومات اللہ فراہم ہی کر دیتا تو اس سے اس قصے کے مفہوم اور مطلب میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہوتا۔ قصے کا مقصد یہ ہے کہ مٹی سے بنایا ہوا یہ حضرت انسان جو دوسرے حیوانات کی طرح ہے کس طرح کرم و در مسجود ملائکہ بن گیا۔ یوں کہ اسے نفعِ ربانی کی وجہ سے یہ برتری حاصل ہوئی۔ اس کی روح اور روحانیت کی وجہ سے نہ جسم اور جسمانیات کی وجہ سے۔

ملائکہ نے ازراہِ اسفل امرانی سجدہ کر لیا۔ وہ اس کی حکمت کو پا گئے تھے۔ کیونکہ اللہ ان کو سکھا گیا تھا۔

إِلَّا ابْلِيسَ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿۵۲﴾

”مگر ابلیس نے اپنی بڑائی کا ٹھنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔“ کیا ابلیس فرشتوں میں سے تھا؟ ظاہر یہ ہے کہ نہ تھا۔ کیونکہ اگر یہ فرشتوں میں سے ہوتا تو معصیت کیسے کرتا اس لئے کہ فرشتے تو اللہ کے اوامر سے معصیت نہیں کرتے اور ان کو جو بھی حکم دیا جاتا ہے۔ اسے وہ کر گزرتے ہیں۔ آئندہ یہ بات آئے گی کہ یہ سگ سے پیدا شدہ مخلوق ہے۔ اور

یہ بات مقول ہے کہ فرشتے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن وہ فرشتوں میں رہتا تھا۔ اور اسے بھی حکم دیا گیا تھا کہ سجدہ کرو۔ اور حکم دیتے وقت صرف فرشتوں کا تذکرہ ہوا۔ اور اس کا تذکرہ نہ ہوا یعنی ”یہ نہیں کہا کہ اے فرشتو اور شیطان سجدہ کرو“۔ اس لیے کہ اللہ کے علم میں تھا کہ یہ نافرمانی کرے گا لہذا اسے نظر انداز کرے کے لیے ایسا کیا گیا۔ ہمیں تب معلوم ہوا کہ شیطان کو بھی سجدے کا حکم دیا گیا تھا جب اس پر عتاب نازل ہوا۔

قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِإِيدِي

أَسْكَبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ ﴿۵۵﴾

”رب نے فرمایا ”اے ابلیس“ تجھے کیا چیز اس کو سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟ تو بڑا بہن ربا ہے یا تو ہے ہی کچھ اونچے درجے کی ہستیوں میں سے۔“

میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا؟ اللہ تو سب مخلوقات کا خالق ہے۔ لہذا انسان کی تخلیق میں کوئی امتیازی بات ہے اس لیے یہاں اللہ نے اپنے دست قدرت کا ذکر کیا۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اس مخلوق پر مخصوص عنایات کی ہیں اس میں اپنی مخصوص روح پھونکی ہے اور اس پر بہت کچھ عنایات کی ہیں۔

تو نے میرے حکم کے مقابلے میں سرکشی کی ہے یا تو کچھ اونچے درجے کی ہستیوں میں سے ہے۔ (اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ ۷۵:۳۸) یعنی ان لوگوں میں سے ہے جو میری بغاوت پر تلے ہوئے ہوتے ہیں۔

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ﴿۵۶﴾

”اس نے جواب دیا ”میں اس سے بہتر ہوں“ آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے۔“

اس جواب سے حسد پکا پڑتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جسد آدم میں مٹی کے عنصر سے جو زائد عنصر ہے شیطان اس سے غافل تھا۔ یہ وہی زائد عنصر تھا یعنی روح ربانی جو اس عزت افزائی کا مستحق تھا۔ بہر حال یہ اس ذات کی جانب سے ایک کورا جواب ہے جو اس منظر میں ہر قسم کی خیر اور بھلائی سے محروم ہوتی ہے۔

چنانچہ بارگاہ رب العزت سے حکم نامہ جاری ہوا اور اس نتیجے ذات کو دربار عالیہ سے نکال دیا گیا۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿۵۷﴾ وَإِنْ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَى يَوْمِ الدِّينِ ﴿۵۸﴾

”فرمایا“ اچھا تو یہاں سے نکل جا“ تو مردود ہے اور تیرے اوپر یوم الجزاء تک میری لعنت ہے۔“

یہ واضح نہیں ہے کہ منہا کی ضمیر کس طرف عائد ہوتی ہے۔ کیا یہ جنت کی طرف راجع ہے اور یہ خبیث جنت میں تھا۔ یا اس کا مرجع رحمت الہیہ ہے۔ دونوں کی طرف یہ ضمیر راجع ہو سکتی ہے۔ اس پر کسی مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔

غرض شیطان رائد درگاہ ہو گیا اس پر اللہ کی لعنت ہوئی اور غضب ہو اکیوں؟ اس لیے کہ اس نے امر الہی کے مقابلے

میں سرکشی اختیار کی اور اللہ کے احکام کے مقابلے میں جرات اور جسارت کا مظاہرہ کیا۔
لب یہ حسد دشمنی میں بدل جاتا ہے اور شیطان انتقام کا منصوبہ بناتا ہے۔

قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٥٩﴾

وہ بولا ”اے میرے رب‘ یہ بات ہے تو پھر اس وقت تک کے لیے مجھے مہلت دے دے جب یہ لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔“ اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں تھا کہ اس کی درخواست منظور کر لی جائے اور اسے قیامت تک فرصت و مہلت دے دی جائے۔

قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ﴿٦٠﴾ إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٦١﴾

فرمایا ”اچھا‘ تجھے اس روز تک کی مہلت ہے جس کا وقت مجھے معلوم ہے۔“
شیطان نے اپنے مقاصد صاف صاف بتا دیئے کہ اپنی کینہ پروری وہ ان مقاصد کے لیے استعمال کرے گا۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَا أُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٦٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٦٣﴾

اس نے کہا ”تیری عزت کی قسم‘ میں سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا‘ بجز تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے خالص کر لیا ہے۔“

اس نے اپنا منہاج کار بھی متعین کر دیا‘ وہ اللہ کی عزت کی قسم اٹھا کر اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ میں ان تمام انسانوں کو گمراہ کر کے چھوڑ دوں گا۔ ہاں وہ صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ کرتا ہے جن پر اس کا بس نہیں پڑتا۔ اس لیے نہیں کہ اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ وہ کچھ مہربانی کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ اس کے دام میں آنے والے نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شیطان کی دست درازیوں سے محفوظ ہیں۔ ان کے اور شیطان کے درمیان کیا پردہ ہوتا ہے؟ وہ یہ کہ بندہ اللہ کی بندگی اخلاص کے ساتھ کرے تو وہ شیطان کی دسترس سے دور ہو جاتا ہے۔ یہی طریق نجات ہے اور یہی زندگی کی مضبوط رسی ہے۔ اور یہ بھی اللہ کے ارادے اور تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ کی مشیت کے دائرہ کے اندر ہلاکت یا نجات ملتی ہے۔ اس موقع پر اللہ نے بھی اپنے ارادے کا برملا اظہار کر دیا اور اللہ نے بھی اپنے منہاج کا اعلان کر دیا۔

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقُّ أَقُولُ ﴿٦٤﴾ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ

تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٦٥﴾

فرمایا ”تو حق یہ ہے‘ اور میں حق ہی کہتا ہوں‘ کہ میں جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا جو ان انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے۔“

اللہ حق بات کہتا ہے اور ہمیشہ حق بات کہتا ہے۔ اس بات کی طرف اس سورت میں مختلف اسالیب میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ دو فریق مقدمہ جو دیوار پھانگ کر داؤد علیہ السلام کے پاس برائے فیصلہ پہنچ گئے تھے وہ کہتے ہیں۔

فَاحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ (۲۸:۲۲) ”ہمارے درمیان حق پر جی فیصلہ کرو اور بے انصافی نہ کرو۔“

اللہ اپنے بندے داؤد کو کہتا ہے۔

فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ (۲۸:۲۶) ”لوگوں کے درمیان حق پر جی فیصلہ کرو اور اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو۔“ اس کے بعد زمین اور آسمانوں کی تخلیق کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ تخلیق حق پر ہوئی ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَ الْأَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذَلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا

(۲۸:۲۷) ”اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو باطل طور پر پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا۔“ اس کے بعد حق کا تذکرہ اللہ تعالیٰ اور عزیر کی زبان پر ہوتا ہے۔

فَالْحَقُّ وَالْحَقُّ أَقُولُ (۳۸:۸۴) ”تو حق یہ ہے اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں۔“

لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ مِمَّنْ تَبَعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ (۳۸:۸۵) ”کہ میں جہنم کو تجھ سے اور ان لوگوں سے بھر دوں گا جو ان انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے۔“ یہ ہے معرکہ انسانوں یعنی بنی آدم اور شیطان کے درمیان۔ یہ معرکہ باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہے۔ اور اللہ نے بھی ان کو ان کا انجام نہایت ہی واضح الفاظ میں بتا دیا۔ اور اس وضاحت کے بعد اب لوگ جو راہ اختیار کریں وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ اللہ کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ لوگوں کو بے خبری میں نہ پکڑا جائے۔ نہ جمالت میں رکھ کر پکڑ لیا جائے۔ اس لیے اللہ نے انبیائے منذرین ان کے پاس بھیجے۔

سبق کے آخر اور سورت کے اختتام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو آخری بات صاف طور پر کہہ دی جائے۔

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَ مَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ۝

ع۲۴ اِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝ وَ لَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ۝

۱۴

”(اے نبی!) ان سے کہہ دو کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹی لوگوں میں سے ہوں۔“

یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے اور تھوڑی مدت ہی گزرے گی کہ تمہیں اس کا حال خود معلوم ہو جائے گا۔ یہ تو خاص نجات کی دعوت ہے۔ انجام بنا دیا گیا اور اس سے خوب ڈرا بھی دیا گیا۔ یہ ایسی مخلصانہ دعوت ہے کہ داعی کسی جردانہم کا طلبگار نہیں ہے۔ یہ داعی سلیم الفطرت ہے۔ وہ عام لوگوں کی زبان میں بات کرتا ہے۔ کوئی تکلیف اور کوئی ہناوٹ اس کی بات میں نہیں ہے۔ وہ دعویٰ باتیں کرتا ہے جو اسے فطرت کی منطق سکھاتی ہے اور جو قریب الفہم ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے یاد دہانی ہے، جو اپنی غفلت کی وجہ سے اس وعظ و نصیحت کو بھول چکے ہیں اور یہ تو وہ عظیم خبر اور شہ سرخی ہے جس کے نتائج عنقریب وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ لیکن بہت ہی تھوڑی دیر کے بعد۔ یہ پورے کرۂ ارض کی عالمی خبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کے چند سال بعد ہی ان لوگوں نے اس کے نتائج دیکھ لیے۔ اور قیامت میں بھی اس کے نتائج دیکھ لیں گے کہ ان نور اور جنوں سے جہنم کو پھر دیا جائے گا۔

لَا مَلْئَنٌ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبَعَتْ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ (۳۸: ۸۵) ”میں ضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا جو ان انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے۔“

یہ اس سورت کا خاتمہ ہے اور یہ اس سورت کے اختتامی کلام اور اس کے موضوعات و مسائل سے ہم آہنگ ہے جن کے بارے میں اس سورت میں بحث کی گئی ہے۔ یہ ایک آخری اور گہری ضرب ہے۔ اور اس کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ اسلامی انقلاب کی اس تحریک کی خبریں مستقبل میں کیا ہوں گی۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ (۳۸: ۸۸) ”تھوڑے ہی وقت کے بعد تم اس کی خبر پا لو گے۔“

صدق اللہ العظیم

ماہنامہ جمعہ ۲۲ جولائی ۱۹۹۲ء

---○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پاره ----- ۲۳

سورة الزمر - ۳۹

آیات ۱ --- تا --- ۳۱

سورۃ الزمر ایک نظر میں

اس پوری سورت میں مسئلہ توحید کو لیا گیا ہے۔ انسان کے دل و دماغ کو پے درپے سوچ کی وادیوں کی سیر کر لی گئی ہے۔ اور انسانی سوچ کی تاروں کو بار بار مضارب سے چھیڑا گیا ہے اور بار بار ان پر شدید ضربات لگائی گئی ہیں تاکہ انسانی فکر میں مسئلہ توحید کو چھٹی طرح بٹھا دیا جائے اور انسانی عقائد کو شرک اور شرک کے شائبہ تک سے پاک کر دیا جائے اور انسانی فکر انظر شرک کا حقیقہ، ماسایہ بھی باقی نہ رہے۔ اس لیے یہ سورت آغاز سے انجام تک ایک ہی موضوع رکھتی ہے۔ البتہ اس موضوع پر مندرجہ اسالیب سے بات کی گئی ہے جس طرح قرآن کا طریقہ ہے۔

سورت کے آغاز ہی سے مسئلہ توحید نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور پوری سورت میں یہی نظر آتا ہے کہ اس سورت میں عقیدہ توحید ہی سے بحث ہوگی۔

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (۱:۳۹) اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ (۲:۳۹) اَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ (۳:۳۹) ”اے نبی! یہ کتاب ہم نے تو تجھے حق نازل کی ہے۔ لہذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو، دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ خبردار دین خالص اللہ کا حق ہے۔“ اس سورت میں آیات کے مقاطع پر بار بار منصوص طور پر یا اشارۃ یا معنی عقیدہ توحید ہی کو لایا گیا ہے۔

منصوص طور پر یوں مثلاً

قُلْ اِنِّي اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ (۱۱:۳۹) وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ (۱۲:۳۹) قُلْ اِنِّي اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۱۳:۳۹) قُلْ اَللّٰهُ اَعْبُدْ مُخْلِصًا لَهُ دِيْنِيْ (۱۴:۳۹) فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِنْ دُوْنِهٖ

(۱۵:۳۹) ”اے نبی! ان سے کہو مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں، کو اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ کہہ دو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں گا۔ تم اس کے سوا جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔“

اور دوسری جگہ ہے:-

قُلْ أَغْفِرَ اللَّهُ تَأْمُرُونَنِي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ (۳۹: ۶۴) وَلَقَدْ أَوْحَىٰ إِلَيْكَ وَ
إِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ
(۳۹: ۶۵) بَلِ اللَّهُ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ (۳۹: ۶۶) ”اے نبی! ان سے کہو پھر کیا
اے جاہلو! تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو؟ تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے
تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو
گے۔ لہذا تم بھی اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں ہو جاؤ۔“

اور مفہوم کے اعتبار سے بھی مثلاً

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَكِّسُونَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِينَ
مَثَلًا الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۳۹: ۲۹) ”اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ ایک شخص تو وہ ہے
جس کے مالک ہونے میں بہت سے کج خلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی
آقا کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں کا حق یکساں ہو سکتا ہے؟ الحمد للہ۔ مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔“ یا یہ قول۔
أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ
هَادٍ (۳۹: ۳۶) وَ مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَزِيزٍ ذِي
إِنْتِقَامٍ (۳۹: ۳۷) ”اے نبی! کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم
کو ڈراتے ہیں حالانکہ اللہ جس کو گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے اور جتنا وہ ہدایت دے اسے
بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے۔“

حقیقت تو حید جو اس سورت کلام موضوع ہے۔ اور اسے یہ سورت مومن کے دل و دماغ میں لکھی طرح بٹھانا
چاہتی ہے لیکن اس کے علاوہ دل مومن کو جگانے کے لیے اور اس کے اندر شدید احساس پیدا کرنے کے لیے اور اسے اخذ
ہدایت کے لیے تیار پا کر ہو کر دعوت حق پر لبیک کہنے کا جوش لانے کے لیے اس سورت میں خصوصی ہدایات و اشارات
بھی ہیں۔ مثلاً یہ فرمان۔

وَالَّذِينَ احْتَبُوا الطَّاغُوتَ أَنْ يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فَمَنْ عِبَادِ (۳۹: ۱۷) الَّذِينَ
يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُوا الْقَلَابِ (۳۹: ۱۸) ”جن

لوگوں نے طاغوت کی بندگی سے اہتمام کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا۔ ان کے لیے خوشخبری ہے۔ پس اے نبی بشارت دو میرے ان بندوں کو جو بت کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور یہی دانشمند ہیں۔

اللَّهُ تَرَىٰ أَحْسَنَ لِحَدِيثِ كِتَابٍ مُّتَشَابِهًا مَّثَانِي تَنَشَعْرُ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَحْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ذَلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (۲۳: ۳۹) ”اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے‘ ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں‘ اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں‘ اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ راہِ راست پر لے آتا ہے‘ جسے چاہتا ہے اور جسے اللہ ہی ہدایت نہ دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں۔“

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَنْدَادًا لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ (۸: ۳۹) ”انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے۔ پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نوازتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پیسے پکارتا رہا تھا اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھہراتا ہے تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کرے۔ اے نبی اس سے کہو تو ڈال اپنے کفر سے لطف اٹھالے یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے۔“

اس سورت کے اندر ایک خاص بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس سورت کے آغاز سے آخر تک اس پر قیامت کا سایہ چھایا ہوا ہے۔ اور اس کے تمام مختصر اور طویل سیاق کلام انسان کو عالمِ آخرت کی سیر کرتا ہے۔ اور انسان کا بڑا وقت عالمِ آخرت کی سیر میں گزرتا ہے۔ یہ ہے اس سورت کا پسلا دائرہ کلام اور اس پر اس میں بار بار نہایت ہی موثر دلائل دیئے گئے ہیں بار بار۔ چنانچہ اس سورت میں بار بار قیامت کے مناظر آتے ہیں یا ہر آیت کے مقطع میں قیامت کی طرف صراحت کے ساتھ یا رمز کے ساتھ اشارہ موجود ہے۔ مثلاً درج ذیل اشارات امن ہو قانت انا ء الیل

سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةً رَبِّهِ (۹: ۳۹) ”وہ جو مطیع فرمان ہے‘ رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا ہے اور سجدے کرتا ہے‘ آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے۔“

قُلْ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۱۳: ۳۹) ”کہو‘ اگر میں اپنے

رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔“

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ اَفَانتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ (۳۹: ۱۹) ”اے نبیؐ اس شخص کو کون بچا سکتا ہے جس پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہو؟ کیا تم اسے بچا سکتے ہو جو آگ میں گر چکا ہو۔“

اَفَمَنْ يَتَّقِ بُرْجَهُ سُوءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ (۳۹: ۲۴) ”اب اس شخص کی بدحواسی کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو جو قیامت کے روز عذاب کی سخت مار اپنے منہ پر لے گا۔“

وَالْعَذَابُ الْآخِرَةُ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۳۹: ۲۶) ”اور آخرت کا عذاب تو اس سے شدید تر ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔“

الْاِنْسُ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِيْنَ (۳۹: ۳۲) ”کیا کافروں کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔“
وَلَوْ اَنَّ لِلدِّينِ طَمَعًا مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا وَمِنْهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ سُوءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَبَدَّالْهِمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوْا يَحْتَسِبُوْنَ (۳۹: ۴۷)

”اگر ان ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو، اور اتنی ہی اور بھی تو یہ روز قیامت کے میرے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار نہ رہ جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے۔“

وَاَنْبِئُوْا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلَمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِيَكُمْ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُوْنَ (۳۹: ۵۴) ”اُتبعو اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِيَكُمْ الْعَذَابُ بِغَتَّةٍ وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۳۹: ۵۵) اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يَّحْسِرْتِيْ عَلٰى مَا فَرَطْتُ فِيْ جَنبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السَّخِرِيْنَ (۳۹: ۵۶) اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰى لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۳۹: ۵۷) اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرٰى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۳۹: ۵۸)“

”پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ، قبل اس کے کہ تم پر عذاب آجائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے۔ اور پیروی اختیار کر لو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی شخص کے ”افسوس میری اس تفصیر

جو میں اللہ کی جناب میں کرتا رہا، بلکہ میں تو ان مذاہق والوں میں سے تھا۔“ یا کہ ”کاش اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہوتی تو میں متقیوں میں سے ہوتا یا عذاب دیکھ کر کے کاش مجھے ایک موقع اور مل جائے اور میں بھی نیک عمل کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں۔“ یہ مقام اور آیات کے آخری حصے ان مکمل مناظر اور مشاہد قیامت سے عیسیدہ ہیں جو اس سورت کا بڑا حصہ ہیں اور جن کی پوری فضا قیامت کے مضامین پر مشتمل ہے۔

رہے وہ کائناتی مناظر جو تمام کی سورتوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں، خصوصاً اسلامی نظریہ حیات پر بطور دماثل و نشانات تو وہ بھی اس سورت میں ہیں مگر بہت ہی کم۔
ایک کائناتی منظر سورت کے آغاز ہی میں ہے۔

خَلَقَ السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى أَلَا هُوَ الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ

(۵: ۳۹) ”اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اس نے سورج اور چاند کو اس طرح منظر کر رکھا ہے کہ ہر ایک ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے۔“ اور لیکن دوسرا منظر سورت کے وسط میں ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيَجُ فِتْرَهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا

لأُولَى الْأَلْبَابِ (۲۱: ۳۹) ”کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسا یا پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا پھر اس پانی کے دریغ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں۔ پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں پھر آخر کار ان کو بھس بنا دیتا ہے۔ درحقیقت اس میں ایک سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے۔“

ان دونوں مکمل مشاہد اور مناظر میں زمین و آسمان کی تخلیق کی طرف مختصر اشارات کیے گئے ہیں۔ اس سورت میں انسانی زندگی کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔ انسانی نفسیات میں گہرائیوں تک جا کر بعض موتی نکال لائے گئے ہیں۔ اور یہ اس سورت میں جگہ جگہ نکھیر دیئے گئے ہیں۔
آغاز ہی میں تخلیق انسانیت کی کہانی ہے۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ أَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَنِهٖ
أَزْوَاجًا يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ حَلَقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثِ ذَلِكُمْ اللَّهُ

رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَانْتَصِرُوا (۳۹:۶) ”اس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا اور اس نے تمہارے لیے موشیوں سے کٹھن زدہ پیدا کیے۔ وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں میں تھیں ایک کے بعد ایک شل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے، بادشاہی اس کی ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں۔ پھر تم کدھر پھرائے جا رہے ہو۔ اور مشکلات اور آسانوں میں نفس انسانی کا مختلف رد عمل۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِن قَبْلُ (۳۹:۸) ”انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے۔ پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس معیت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا۔“

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ (۳۹:۴۹) ”انسان کو جب معیت چھو جاتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے اور جب ہم اسے اپنی طرف سے نعمت دے کر اٹھا دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا۔“

نیز یہ کہ انسانی جانیں اور نفوس دراصل ہر حال میں اللہ کے قبضے میں ہیں۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۹:۴۲) ”یہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روہیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے۔ پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے، اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روہیں وقت مقررہ تک کے لیے واپس بھیج دیتا ہے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔“

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ پوری سورت میں آخرت کی نفا ہے۔ اور سورۃ کا خاتمہ بھی ایک ایسے منظر پر ہوتا ہے جس میں آخرت کے حالات عیاں ہیں۔

وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۳۹:۷۵) ”اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہوں گے اور لوگوں کے درمیان ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ ہو گا اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے اللہ رب العالمین کے لیے۔“

آخرت کی یہ فضا۔ اس پوری سورت کے مضامین اور اس کی فضا کے ساتھ نہایت موزوں ہے۔ اور رنگ اور ان

احساسات کے مطابق ہے جو اس سورت میں انسانی دل کے اندر پیدا کیے گئے ہیں۔ پوری سورت میں انسان کے اندر خضوع، خشوع، آخرت کا خوف اور اس کے قلب کے اندر کچلی پیدا کی گئی ہے۔ چنانچہ پوری سورت میں ہم وہ حالات پاتے ہیں جو انسانی دل میں خشیت، خوف اور ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ایسا کر دہر اس سورت میں ہے 'جو اللہ کے سامنے رات کو کھڑا ہے' بخود اور رکوع میں اور آخرت سے ڈر رہا ہے اور رحمت ربی کا امیدوار ہے۔ پھر ایسے کر دار بھی نظر آتے ہیں جو اللہ سے ڈرے۔ سب سے ہیں اور جن کے جسم پر روٹنے کھڑے ہیں اور جب وہ تلاوت قرآن کرتے ہیں تو ان کے دل تسبیح کرتے جاتے ہیں اور وہ اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس سورت میں ہدایات دی جاتی ہیں کہ اللہ سے اردو تقویٰ اختیار کرو اور اللہ کے عذاب سے بچنے کی فکر کرو۔

قُلْ يٰۤعِبَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا رَبَّكُمۡ (۳۹: ۱۰) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے رب سے ڈرو۔"

قُلْ اِنِّیْۤ اَحَافُۡ اَنْ عَصِیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَّوْمٍ عَظِیْمٍ (۳۹: ۱۲) "کہہ دیجئے میں اگر اپنے رب کی معصیت کروں تو یوم عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔"

لَهُمْ مِّنۡ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِّنۡ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌۢ ذٰلِكَ یُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهُ

یَعِبَادَ فَاَتَّقُوْا (۳۹: ۱۶) "ان پر آگ کی چھتریاں ہیں۔ اوپر سے بھی چھائی ہوئی ہوں گی اور نیچے سے بھی۔ یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے کہ اے میرے بندو! میرے غضب سے بچو۔" پھر قیامت کے مناظر اور وہاں کے جزع و فزع میں اور اللہ کی طرف یکسوئی اور اس کے خوف میں یہی خدا خوفی کی نفا نظر آتی ہے۔

یہ پوری سورت عقیدہ توحید اور فکر آخرت کے موضوع پر مشتمل ہے۔ اس سورت کو بڑے بڑے دروس میں تقسیم کرنا مشکل ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے اسفار پر مشتمل ہے جو توحید و قیامت کے مطالعاتی سفر ہیں اور ان میں یا تو قیامت کا کوئی منظر پیش کیا گیا ہے یا قیامت کی کوئی جھلکی دکھائی گئی ہے۔ مناسب ہے کہ اس سورت کو اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں لیا جائے۔

درس نمبر ۲۱۵ تشریح آیات

ا۔۔۔ تا۔۔۔ ۷



تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ
فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۝ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الدِّينُ الْخَالِصُ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا
مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ
بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ ۝

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانائی طرف سے ہے۔“ (لے نبیؐ) یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق
نازل کی ہے، لہذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو، دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ خبردار، دین خالص اللہ کا حق ہے۔
رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسرے سرپرست بن رکھے ہیں (اور اپنے اس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو
ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں، اللہ یقیناً ان کے درمیان ان تمام باتوں کا فیصلہ کر
دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو جھوٹا اور منکر حق ہو۔“

سورت کا آغاز اس فیصلہ کن قرارداد سے ہوتا ہے۔

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (۱: ۳۹) ”اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانائی طرف
سے ہے۔“ وہ زبردست ہے اور وہ اس قسم کی کتاب کے نزول پر قدرت رکھتا ہے۔ اور وہ حکیم و دانائے ہے اور وہ جانتا ہے کہ
نزول قرآن کس بارے میں ہے اور یہ حکیم کیوں ہے۔ یہ تمام کام اللہ نہایت حکمت اور تدبیر اور تقدیر سے کرتا ہے۔

اس قرارداد پر بات طویل نہیں ہوتی کیونکہ یہ تو تمہید تھی، اصل بات کے لیے اور اصل موضوع کے لیے یہ پوری

سورت وقف ہے۔ سورت کا نزول ہی اس موضوع کا ثبوت اور تاکید ہے۔ یعنی مسئلہ توحید، اللہ کی بندگی میں توحید اور اسلامی نظام زندگی میں توحید۔ اور عقیدے، زندگی اور نظام زندگی کو ہر پہلو سے شرک سے پاک کرنا۔ اور پھر اللہ تک رسائی کے لیے واسطوں کو ختم کر کے براہ راست اس کو پکارنا بغیر کسی سفارش کے۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ (۳۹: ۲) ”اے نبیؐ یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے۔“ اور جس سچائی پر یہ کتاب نازل کی گئی ہے۔ وہ ہمہ جہت وحدانیت ہے، جس کے اوپر یہ کائنات قائم ہے۔ اس سورت کی پانچویں آیت میں ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۳۹: ۵) ”آسمانوں اور زمین کو اس نے برحق پیدا کیا ہے۔“ لہذا جس حق اور سچائی پر وحدت کا قیام ہے، وہی سچائی اس کتب کا موضوع ہے۔ اس کتاب کا تصور توحید اور اس کائنات کی تخلیق کی وحدت ایک ہی ہیں۔ جس طرح یہ کائنات اللہ واحد کی تخلیق اور مصنوع ہے اور جس طرح یہ انسان اللہ کی تخلیق اور اس کے امر پر قائم ہے، اسی طرح یہ کتاب بھی اللہ کے اوامر پر قائم ہے۔ لہذا منطقی نتیجہ یہ ہے:

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ (۳۹: ۲) ”لہذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو“ دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔“

خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے جن کی طرف یہ کتاب برحق نازل کی گئی۔ اور یہ کتاب رسول کا پیش کردہ منہاج حیات ہے جس کی طرف آپ تمام انسانوں کو دعوت دیتے ہیں۔ جو اس عقیدے پر قائم ہے کہ اللہ ایک ہے، اسی کی بندگی کرنی ہے۔ نظام زندگی صرف اسی سے اخذ کرنا ہے اور پوری زندگی کو اس عقیدہ توحید پر قائم کرنا ہے۔ اللہ کو ایک الہ سمجھنا اور دین اس کے لیے خالص کرنا محض چند کلمات کا نام نہیں ہے جو زبان سے ادا کر دیئے جائیں۔ یہ دراصل زندگی کا پورا نظام ہے جو انسان کے دل و دماغ سے عقیدہ توحید کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور ایک اسلامی سوسائٹی میں مکمل نظام زندگی کے قیام پر ختم ہوتا ہے۔

وہ دس جو اللہ وحدہ کو الہ سمجھتا ہے، جو صرف اللہ کی بندگی کرتا ہے، وہ اپنا سر کسی کے آگے نہیں جھکاتا۔ وہ نہ تو غیر اللہ سے کوئی چیز طلب کرتا ہے، نہ غیر اللہ پر اعتماد کرتا ہے۔ ایسے شخص کے نزدیک صرف اللہ ہی قوی ہے اور صرف اللہ اس پوری کائنات پر غالب ہے۔ سب کے سب ضعیف اور کمزور ہیں اور وہ کسی کے لیے کوئی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے۔ لہذا کسی انسان کو کسی انسان کے سامنے سر نہیں جھکانا چاہیے۔ کیونکہ یہ انسان سب کے سب اسی کی طرح ہیں اور خود اپنے نفع و نقصان کے مختار بھی نہیں۔ اللہ وحدہ ہی دینے والا اور روکنے والا ہے۔ لہذا اللہ کو اس سلسلے میں کسی دسلے اور واسطے کی ضرورت نہیں۔ تمام مخلوق اس کی محتاج ہے اور وہ فنی ہے۔

پھر جو دل عقیدہ توحید سے لبریز ہے وہ اس بات پر بھی ایمان لاتا ہے کہ اس کائنات کے ایک ہی قانون قدرت اور ناموس فطرت کنٹرول کرتا ہے۔ لہذا اس کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ جو نظام زندگی اللہ نے انسانوں کے لیے تجویز کیا ہے، یہ بھی انہی قوانین قدرت کا حصہ ہے۔ جو اس کائنات کے لیے وضع ہوئے ہیں۔ لہذا یہ انسان اس دنیا کے ساتھ ہم آہنگی کی

زندگی نہیں بسر کر سکتا الا یہ کہ وہ اسلامی نظام زندگی کو اپنالے۔ لہذا وہ وہی احکام و انتظام اختیار کرتا ہے جو اللہ چاہتا ہے یعنی وہ اللہ ہی کی شریعت کی اطاعت کرتا ہے جو اس نظام کائنات اور انسان کے وجود کے نظام کے ساتھ موافق ہے۔

پھر جو دل اللہ کو وحدہ لا شریک سمجھتا ہے، وہ اپنے اور اس اللہ کی پیدا کردہ تمام کائنات کے درمیان ایک قربت اور تعلق محسوس کرتا ہے۔ اس کائنات کی زندہ چیزیں ہوں یا مردہ۔ لہذا اس کی زندگی ایک ایسے ماحول کے اندر بسر ہوتی ہے جو اس کا دوست، محمد و معادن اور اس کے ساتھ ہمقدم اور محبت کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماحول میں اللہ کے دست قدرت کی کارستانی محسوس کرتا ہے۔ لہذا وہ اس ماحول میں اللہ اور اس کی مخلوقات کے ساتھ مانوس ہو کر رہتا ہے۔ اس کے ساتھ اللہ کی مخلوق ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں اللہ کی پیدا کردہ عجائبات پر ہوتی ہیں۔ وہ یہاں اس کائنات کی کئی چیز کو ایذا نہیں دیتا۔ وہ اس کائنات کی کسی چیز کو تکلف نہیں کرتا مگر امر الہی سے۔ کیونکہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ وہی زندگی دینے والا ہے۔ وہ سب کا رب ہے اور ہر چیز کا رب ہے۔

اسی طرح انسانی تصورات اور میلانات میں بھی توحید ظاہر ہوتی ہے۔ انسانی طرز عمل اور اس کی چال ڈھال میں بھی توحید کا اثر ہوتا ہے۔ اور انسانی زندگی اور سوسائٹی کے لیے منہاج اور طریق زندگی میں بھی توحید کا اثر ہوتا ہے۔ اور عقیدہ توحید محض ایک کلمہ نہیں رہتا جسے زبان سے کہہ دیا جائے۔ وہ ایک مکمل نظام بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن میں عقیدہ توحید کو بہت ہی بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ہر جگہ اس پر اصرار و تکرار کیا گیا ہے۔ لہذا توحید پر ان زلویوں سے غور کیا جانا چاہئے۔ اس زاویہ سے توحید ایک فکر، ایک نظام عمل، ایک نظام اجتماعی اور نظام حکومت بن جاتی ہے۔ اور اس پر ہر وقت تدبر کی ضرورت ہے۔ ہر زمانے میں، ہر خاندان اور سوسائٹی میں اور اسی مفہوم میں اس پر تدبر کی ضرورت ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ (۳۹:۳) ”خبردار دین خالص اللہ کا حق ہے۔“ نہایت ہی اونچی نہایت ہی طویل اور نہایت ہی رعب دار آواز میں۔ گویا اعلان شاہی ہے اور لفظ ”ال“ خبردار! سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور نہایت ہی قصر اور حصر کے الفاظ میں کہ اللہ ہی کا حق ہے نظام زندگی اور خالص اللہ کا حق ہے۔ جس طرح مفہوم موکد ہے اس طرح الفاظ بھی پر شوکت ہیں۔ یہ اصول حیات ہے۔ پوری زندگی اس پر قائم ہے بلکہ پوری کائنات اس اعلان پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قدر مختصر زور دار اور قصر و حصر کے الفاظ میں یہ قانون نافذ ہوتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں اس دور کی جاہلیت کا کلمہ اور نظریہ کیا تھا، جسے رد کیا گیا۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَزَآيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقْرِبُوْهُمْ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِىْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ

(۳۹:۴) ”رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسرے سرپرست بنائے ہیں (کہتے ہیں) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرادیں۔ اللہ یقیناً ان کے درمیان ان تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو۔“ وہ اعلان کرتے تھے کہ اللہ ان کا

خالق ہے۔ وہ سموات اور زمین کا خالق ہے۔ لیکن پھر وہ فطری استدلال کی راہ پر نہ چلتے تھے کہ اگر وہی خالق ہے تو وہی بندگی کے لائق ہے۔ اور پھر دین اور دستور اور قانون اسی کا چلنا چاہئے۔ یہاں آکر وہ یہ افسانہ گھڑتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ پھر وہ فرشتوں کے بت بناتے اور ان کو پوجتے۔ پھر یہ کہتے کہ وہ ملائکہ کے بتوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں، جن کو وہ اللہ کہتے تھے۔ لات، منات اور عزیٰ، یہ دراصل ان کی عبادت نہیں ہے بلکہ یہ محض اللہ کے قریب ہونے کے لیے ہم ان کے آگے جھکتے ہیں، تاکہ یہ فرشتے اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں۔ اور یوں ہم اللہ کے نزدیک ہو جائیں۔

یہ عقیدہ سیدھے فطری انداز فکر سے انحراف ہے اور یہ عقیدہ غلط ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ اور ناقابل فہم بھی ہے۔ نہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور نہ یہ بت فرشتوں کے بت ہیں۔ نہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے۔ نہ اللہ کسی کی سفارش سنتا ہے اور نہ اللہ اپنے بندوں کو اس طریقے پر اپنے قریب لاتا ہے۔

جب بھی انسانیت نے عقیدہ توحید کو ترک کیا ہے۔ وہ فطرت کے سیدھے انداز فکر اور سیدھے سادے انداز استدلال سے محروم ہو گئی ہے، جو اسلام اول روز سے لے کر آیا ہے اور آدم علیہ السلام سے لے کر ادھر تمام رسولان محترم نے یہی عقیدہ توحید پیش کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دقت ہر جگہ نیک لوگوں اور اولیاء کی عبادت اسی طرح کی جاتی ہے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عرب فرشتوں اور فرشتوں کے بتوں کی عبادت بطور تقرب الہی اپنے زعم کے مطابق کیا کرتے تھے۔ مقصد ان کی سفارش کا حصول ہوتا تھا، لیکن اللہ عقیدہ توحید اور سیدھے راستے کی نشاندہی فرماتا ہے ایسی توحید جس کے ساتھ کوئی التباس، کوئی سفارشی اور کوئی افسانوی مقررین خدا نہ ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ (۳۹:۳) ”اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو“۔ کیونکہ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔ ایک تو یہ جھوٹ ہے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، دوسرا یہ جھوٹ ہے کہ یہ اللہ کے ہاں سفارش کرتے ہیں جبکہ فرشتے ان کی اس بندگی کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل اللہ کے صریح احکام کا کفر کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو اس پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں۔ ہدایت تو ان کو ملتی ہے جو مخلص ہوں، متوجہ ہوں، برائی سے بچنا چاہتے ہوں اور ان کو نیکی کے کاموں میں دلچسپی بھی ہو اور وہ غور و فکر کر کے اپنے لیے صحیح راستے کا انتخاب کرتے ہوں۔ جو لوگ جھوٹ باندھتے ہیں، اللہ کی آیت کا انکار کرتے ہیں تو وہ اللہ کی ہدایت اور مریادوں کے مستحق نہیں ہوتے اس لیے کہ ایسے لوگ جان بوجھ کر صحیح راستے سے دوری اختیار کرتے ہیں۔

اس کے بعد اس شرکیہ تصور خدا کی کمزوری اور پوچھ ہونے کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاَصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۝

سُبْحٰنَہٗ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝

”اگر اللہ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا، برگزیدہ کر لیتا، پاک ہے وہ اس سے (کہ کوئی اس کا

بیٹا ہو) 'وہ اللہ ہے اکیلا اور سب پر غالب'۔

یہ ایک استدلالی مفروضہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ کسی کو اپنا شریک بناتا تو اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی شریک کر کے اس کا اعلان کر دیتا۔ اس کا ارادہ تو بے قید ہے 'لیکن اللہ کی ذلت ان سے پاک ہے۔ اس لیے اللہ کی طرف نہ بیٹے کی نسبت ہو سکتی ہے نہ اللہ کسی کا بیٹا ہے۔ یہ اللہ کی حیثیت و ارادہ اور اس کی تقدیر ہے۔ ان چیزوں سے اللہ پاک ہے۔

سُبْحَنَهُ هُوَ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۴: ۳۹) "پاک ہے وہ اس سے 'وہ اللہ ہے اکیلا اور سب پر غالب'۔
اللہ اپنے لیے کسی کو بیٹا کب بناتا ہے۔ وہ تو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہر چیز کا خالق ہے۔ ہر چیز کا مدبر ہے۔ ہر چیز اور ہر انسان اس کی ملکیت میں ہے اور وہ جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔

خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ يَكُوِّرُ اللَّيْلُ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ
النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ أَلَا هُوَ الْعَزِيزُ
الْمُعْتَكِرُ

"اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک ایک وقت مقررہ تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو 'وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے'۔

آسمان و زمین کی بادشاہت پر یہ ایک سرسری نظر، لیل و نہار کے نظام اور شمس و قمر کے نظام اور اسے زبردست طریقے سے مسخر کرنے کے نظام پر ایک نگاہ 'اس بات کو ثابت کر دیتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور اللہ نہیں ہے۔ یہ نظام فطرت دل کے اندر یہ بات اتار دیتا ہے کہ نہ اللہ کا کوئی شریک ہے اور نہ اس کا کوئی بیٹا ہے۔

زمین و آسمان کی تخلیق میں اللہ کی وحدانیت کے دلائل بالکل ظاہر ہیں اور ان قوانین میں بھی وحدت الہی کے نشانات ظاہر ہیں جو ان کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ اس پوری کائنات پر ایک سرسری نظر ہی اس بات کو ظاہر کر دیتی ہے کہ اس کو چلانے والا ارادہ ایک ہے۔ آج تک انسانوں نے جو سائنسی انکشافات کیے ہیں 'ان میں وحدت الوہیت کے لیے بے شمار دلائل موجود ہیں۔ یہ بات انسانوں پر ثابت ہو گئی ہے کہ یہ کائنات جس تک انسان نے رسائی حاصل کر لی ہے 'یہ ایسے ذرات سے بنی ہوئی ہے جن کی حقیقت اور ماہیت ایک ہے اور ان ذرات میں سے ہر ایک درہ ایسی شعاعوں سے مرکب ہے 'جن کی حقیقت ایک ہے۔ اور یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ ان ذرات سے جو اجرام فلکی بنے ہیں خواہ وہ ایسے ہوں جس میں ہم رہتے ہیں یا دوسرے سیارے اور ستارے ہوں۔ یہ سب کے سب ایک مکمل حرکت میں ہیں اور اس حرکت کا ایک مخصوص جاری قانون ہے جس سے کوئی ستارہ بھی ہٹ نہیں سکتا۔ چھوٹے ذرات اور ستاروں میں بھی وہی حرکت ہے اور اس دنیا کے عظیم ترین ذرات میں بھی وہی حرکت ہے۔ پھر مطالعہ کائنات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

اس حرکت کا ایک نظام ہے۔ یہ نظام وہ حقیقت ہے جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اس پوری کائنات کا خالق و مدبر ایک ہے۔ سائنس دان ہر روز جس نئی حقیقت کی دریافت کرتے ہیں اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کائنات کے منصوبے میں جو کچھ رکھا ہوا ہے وہ اللہ وحدہ کی ذات پر شاہد عادل ہے اور یہ ایک سچائی ہے اور یہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق نہیں بدلتی۔ اور نہ کسی شخص کے میلانات کے مطابق کسی طرف مائل ہوتی ہے۔ نہ اپنی راہ ایک سیکنڈ کے لیے چھوڑتی ہے اور نہ بے راہ روی اختیار کرتی ہے۔

خَلَقَ السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ (۵: ۳۹) ”اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا۔“ اور کتاب بھی اس نے برحق نازل فرمائی۔ لہذا اس کائنات میں بھی حق ہے اور اس کتاب میں بھی حق ہے اور یہ ایک ہی حق اور سچائی ہے جو اس کائنات میں بھی ہے اور اس کتاب میں بھی ہے اور دونوں کا منبع و مصدر ایک ہی ہے۔ اور دونوں اس بات کی نشانی ہیں کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے۔

يُكْوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكْوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ (۵: ۳۹) ”وہی ہے جو دن پر رات کو اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔“ یہ انداز تعبیر ایسا ہے کہ انسان کا دامن کھینچ کر ان جدید انکشافات کی طرف اس کی توجہ مبذول کرتا ہے جن کے مطابق زمین کا گول ہونا ثابت ہوا ہے۔ باوجود اس خواہش کے کہ میں قرآن مجید کی تفسیر میں جدید سائنسی انکشافات سے دامن بچاؤں۔ کیونکہ انسانی نظریات کبھی درست ہوتے ہیں کبھی غلط۔ آج ثابت ہوتے اور کل باطل ہو جاتے ہیں جبکہ قرآن حق ہے اور اپنی سچائی پر وہ خود دلیل ہے۔ ”آفتاب آمد دلیل آفتاب“ قرآن اپنی سچائی کا ثبوت اپنے موافق یا مخالف سے مانگتا ہی نہیں۔ نہ ان انکشافات سے جو یہ ضعیف انسان فراہم کرتا ہے۔ لیکن اپنے اس رویے کے باوجود یہ انداز تعبیر مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں زمین کی گردش محوری اور اس کی کروی سہست پر غور کروں اس لیے کہ ایک ظاہری منظر اس تعبیر سے صاف صاف نظر آتا ہے اور اس کا انکار ممکن نہیں۔ زمین گول ہے اور گردش محوری کے ساتھ سورج کے سامنے ہے۔ اس لیے اس کا جو حصہ سورج کے سامنے ہے وہ روشن ہے اور دن ہے لیکن یہ حصہ ایک جگہ کھڑا نہیں رہتا۔ جو نہی یہ حصہ حرکت کر کے آگے بڑھتا ہے۔ اندھیرا زمین کے اس حصے کو ڈھانپتا جاتا ہے۔ اور اسے لپیٹتا جاتا ہے۔ لہذا یہ دن والا حصہ لپیٹتا جا رہا ہے اور رات اسے لپیٹتی جاتی ہے۔ دوسری جانب سے جہاں رات لپٹی ہوئی ہے وہ بھی آگے بڑھتی اور روشنی رات والے حصے کو لپیٹتی ہے اور اس میں دن آتا جاتا ہے۔ یوں ایک طرف سے دن کو رات کو (Cover) کرتی ہے اور دوسری طرف سے رات دن کو کور کرتی جاتی ہے اور یہ حرکت جاری ہے۔

يُكْوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكْوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ (۵: ۳۹) یہ الفاظ صورت حال کا خوب نقشہ کھینچتے ہیں اور صورت حال کا صحیح نقشہ ذہن میں آ جاتا ہے۔ اس طرح زمین کی حرکت کی نوعیت کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔ زمین کا گول ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس کا دورہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس انداز بیان کی یہ بہترین تفسیر ہے اس کے سوا کوئی دوسری تفسیر اس سے زیادہ گہری نہیں ہو سکتی۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى (۵: ۳۹) ”اس نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے۔“ سورج اپنے مدار پر چل رہا ہے اور چاند اپنے مدار پر چل رہا ہے۔ اور دونوں حکم الہی سے مسخر ہیں۔ اور کسی کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ ان کو چلا رہا ہے اور فطری استدلال اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ بغیر کسی محرک کے یہ حرکت ہو رہی ہے اور از خود یہ نہایت ہی پیچیدہ نظام اس باقاعدگی سے چل رہا ہے کہ کئی ملین سال گزرنے کے بعد ہمیں اس حرکت میں بال برابر کی بیشی نظر نہیں آتی۔ اور یہ شمس و قمر اسی طرح جاری رہیں گے اور ایک وقت تک جاری رہیں گے۔ یعنی قیامت تک اور اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ جب حکم ہو گا یہ رک جائیں گے۔

الَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ (۵: ۳۹) ”جان رکھو وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے۔“ لہذا قوت قدرت اور غلبے کی وجہ سے وہ کائنات کو سنبھالتا ہے اور اس قوت کے ساتھ ساتھ وہ غفار بھی ہے۔ جو لوگ اس کی طرف مڑ جاتے ہیں ان کی کوتاہیوں کو بخش دیتا ہے حالانکہ انہوں نے مکذیب اور شرک جیسے بڑے جرائم کیے تھے۔ اور وہ اللہ کے ساتھ الہ بناتے تھے۔ اور پھر اللہ کے لیے اولاد مقرر کرتے ہیں اور دوسرے جرائم کرتے ہیں لیکن توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور اس سے داخل ہونے کے لیے راہ و آزار ہے اور اللہ عزیز و غفار ہے۔

--- ۰۰۰ ---

اس عظیم کائنات کے مطالعے کے لیے اس سرسری نظر کے بعد اب روئے سخن ذرا بچر جاتا ہے۔ انسان کے نہایت ہی چھوٹے نفس کی طرف جو اپنے اندر ایک عظیم جہان رکھتا ہے۔ صرف اس پہلو کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا ”زندگی“ اور ”حیات“ پر غور کرو۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَآَنَزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَلَاثَةَ زَوَاجٍ ۖ يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ ۖ فِی ظُلُمٍ ثَلَاثٍ ۚ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَآَنَّى تُصَرِّفُونَ ﴿۶﴾

”اسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور اسی نے تمہارے لیے موبیشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے، بادشاہی اسی کی ہے کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو؟“

انسان جب اپنے نفس پر غور کرتا ہے اس نفس پر جسے اس نے خود پیدا نہیں کیا اور وہ اس کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں بھی خود نہیں جانتا۔ صرف وہی معلومات اس کے پاس ہیں جو اللہ خالق نے دیے ہیں۔ انسان کا نفس ایک

ہے، اس کی ذات ایک ہے۔ اس کی اس دلت اور نفس کے خصائص ایک ہیں اور اس نفس انسانی کے بعض خصائص دوسری مخلوقات سے بالکل جدا ہیں۔ جس طرح نفس انسانی کے تمام افراد ایک مخصوص دائرے کے اندر محدود و محدود متمیز ہیں۔ اسی طرح ”نفس انسانی“ ان اربوں افراد کے درمیان ایک ہے جو اس زمین میں منتشر ہیں یا رہتے ہیں۔ اسی نفس واحد سے پھر اس کا جوڑا یا بیوی بھی پیدا ہوئی۔ تمام انسانی خصوصیات کے اندر عورت مرد کے ساتھ شریک ہے۔ اگرچہ تفصیلی خصوصیات مختلف ہیں لیکن بنیادی خصوصیات ایک ہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد و عورت کی ساخت ایک ہی نقشے کے مطابق ہے۔ اسی نقشے کے اندر بعض ترمیمات کی وجہ سے مرد اور عورت الگ الگ ہو گئے۔ ایک ہی ارادہ ہے جو مرد اور عورت کو الگ کرتا ہے۔

نفس انسانی کے اندر مرد و عورت کے اختلافات کے حوالے اور مناسبت سے یہاں دوسرے حیوانات کی اہم اجناس کے زرمادہ کے نظام کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ اس پوری کائنات میں اور انسانوں کے علاوہ دوسرے حیوانات میں بھی حق جاری ہے۔

وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَنِيَّةً زَوْاجٍ (۶:۳۹) ”اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ زرمادہ پیدا کیے“۔ یہ آٹھ جانور زرمادہ جس طرح دوسری آیات میں آئے ہیں ’بھیر‘ بکریاں‘ ڈمگر اور لونٹ ہیں۔ یعنی زرمادہ کے شمار سے آٹھ بنتے ہیں۔ اور جب زرمادہ کو جمع کیا جائے تو ان پر از دلج یعنی جوڑوں کا غلط بولا جاتا ہے۔ یوں مجموعہ آٹھ بن جاتا ہے۔

انداز بیان یہ بتاتا ہے کہ اللہ نے ان کو ناز کیا ہے یعنی پیدا کر کے تمہارے لیے مسخر کیا ہے۔ یہ تغیر اللہ کی طرف سے منزل ہے۔ یعنی اللہ کے علوشان کا یہ کارنامہ ہے اور اس اللہ نے اس کی اجازت دی ہے کہ انسان ان آٹھ قسم کے جانوروں کا گوشت استعمال کرے۔

جانوروں میں زرمادہ کی خصوصیات کے تذکرے کے بعد پھر ماؤں کے پیٹ میں پائے جانے والے جنین کے مختلف مراحل کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ (۶:۳۹) ”پھر وہ ماؤں کے پیٹوں میں تخلیق کے بعد تخلیق کرتا چلا جاتا ہے“۔ پہلے لطفہ‘ پھر لوتھرا‘ پھر گوشت کا قلعہ‘ پھر ہڈیاں‘ پھر واضح شکل اور آخر میں اس کے اندر انسانی حواس کا پیدا کرنا اور انسانی خصوصیات کا پیدا کرنا۔

فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ (۶:۳۹) ”تین تین تاریکیوں کے اندر“۔ پہلے اس پردے کی تاریکی جس کے اندر جنین ہوتا ہے‘ پھر رحم مادر کی ظلمت جس کے اندر وہ ملفوف ہوتا ہے اور پھر ماں کا پیٹ جس کے اندر رحم ہوتا ہے اور اللہ کا دست قدرت اس ذرے کو روز بروز ہلاتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ دست قدرت روز اسے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس کی شکل و صورت بدلتی چلی جاتی ہے۔ یہ ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ اللہ اس مخلوق کی نگرانی کرتا ہے اور اسے بڑھنے کی طاقت دیتا ہے۔ اور یوں شکل بدلنا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے۔ یہ قدم بقدم آگے جاتا ہے۔ اللہ کی تقدیر اور اندازے کے مطابق۔

انسان کے اس مختصر سفر اور اس کے اندر اس کی ساخت کی ان دور رس تبدیلیوں پر ایک نظر ڈالنے اور ان تغیرات کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر پائی جانے والی عجیب و غریب خصوصیات کی کار فرمائی اور راہنمائی میں اس کمزور ترین اور خوردبینی علم نے جس انداز سے ترقی کی 'ان اندھیروں میں اور اس عجیب انداز میں' تو انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب باتیں انسان کے علم و بصیرت اور اس کی قدرت سے وراء ہیں۔

یہ تمام حقائق اس بات کے لیے کافی ہیں کہ انسان کو خالق کائنات کی معرفت پر مجبور کس۔ اور انسان خالق کائنات کو اس کے ان زندہ آثار کے ذریعے پہچانے اور اس تخلیق کے اندر جو وحدانیت ہے۔ اس کے آثار بالکل ظاہر و باہر ہیں اور کوئی سوچنے والا انسان کس طرح ان سے صرف نظر کر سکتا ہے۔ ذَلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا

اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَانْتَصِرُوْا (۶: ۳۹) ”یہی تمہارا رب ہے“ بادشاہی اسی کی ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے، پھر تم کدھر پھرے جا رہے ہو؟“

اللہ وحدہ کی ان نشانیوں کو دیکھتے ہوئے 'اللہ کی بے قید قدرت کے ان نشانات کو ملاحظہ کرتے ہوئے یہاں لوگوں کو خود اپنے طرز عمل پر خود کرنے کے لیے ذرا کھڑا کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اب تمہارے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ شکر کی راہ اور کفر کی راہ اور جو راہ بھی تم اختیار کرو گے اس کے سارے نتیجے کی ذمہ داری انفرادی ہے۔ اور اشارہ دے دیا جاتا ہے کہ وقت قریب ہے۔ دنیا کا یہ مرحلہ ختم ہونے والا ہے۔ پھر حساب و کتاب ہو گا اور یہ حساب و کتاب وہ ذات لے گی جس نے تمہیں تین تاریک ترین پردوں کے اندر سے نکال کر ذمہ دار بنایا ہے۔ اور وہ اب تمہارے دلوں کی خفیہ ترین باتوں کو بھی جانتا ہے۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَۃَۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا
يَرْضٰهُ لَكُمْۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰىۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذٰتِ الصُّدُوْرِۙ

”اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے، لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا، اور اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ آخر کار تم سب کو اپنے رب کی طرف بلتنا ہے، پھر وہ تمہیں جادے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو، وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔“

تمہاری ماؤں کے پیٹ کا عرصہ تو تمہارے طویل سفر زندگی کا ایک مختصر حصہ ہے۔ ابتدائی مرحلہ ہے۔ پھر پیٹ سے باہر آکر تم قدرے طویل مرحلے میں داخل ہو گے۔ اس کے بعد تیسرا طویل اور ابدی مرحلہ ہو گا۔ حساب و کتاب ہو گا اور یہ مرحلہ اللہ عظیم و خمیر کی مدد پر طے ہو گا۔

جہاں تک اللہ کی ذات کا تعلق ہے وہ انسان جیسی کمزور مخلوق کا محتاج نہیں ہے۔ انسان بہت ہی ضعیف مخلوق ہے۔

یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ وہ انسانوں کی طرف متوجہ ہے اور ان کی نگرانی اور ان پر مریانی کرتا ہے۔ اور وہ کس قدر ضعیف ہیں اور کس قدر کمزور ہیں۔

اِنْ تَكْفُرُوا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ (۷:۳۹) ”اگر تم کفر کرو تو اللہ بے نیاز ہے۔“ کیونکہ تمہارا ایمان اللہ کی مملکت میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کر سکتا۔ اور تمہارا کفر اس میں کسی چیز کی کمی نہیں کر سکتا۔ لیکن اللہ اپنے بندوں کی جانب سے کفر کو پسند نہیں کرتا اور کفر کو محبوب نہیں رکھتا۔

وَلَا يَرْضٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (۷:۳۹) ”لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا۔“ اور اگر تم شکر کرو۔

وَ اِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ (۷:۳۹) ”اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔“ وہ شکر کو محبوب رکھتا ہے اور اس پر جزائے خیر دیتا ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰى (۷:۳۹) ”کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔“ آخر کار ہم نے اللہ کے ہاں لوٹنا ہے۔ صرف اس کے آگے پیش ہونا ہے اور اس کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷:۳۹) ”آخر کار تم سب کو اللہ کی طرف بلٹا ہے۔ پھر وہ تمہیں قاتلے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔“ اس پر کوئی امر غنی نہیں ہے۔

اِنَّهُ عَلِيْمٌ بِذٰاتِ الصُّدُوْرِ (۷:۳۹) ”وہ دلوں کا حال جانتا ہے۔“ یہ ہے انجام حیات۔ یہ ہیں دلائل ہدایت اور یہ ہے دور راہد جس سے دونوں راستے الگ ہوتے ہیں۔ ایک ہدایت کا راستہ اور ایک ضلالت کا راستہ۔ اب ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جو شخص جس راستے کو اختیار کرے خوب سمجھ کر اختیار رہے۔ غور و تدبیر کے بعد کرے۔ علم اور فکر کے ساتھ کرے۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۱۶ ایک نظر میں

پہلے سبق میں یہ بات کہی گئی کہ تخلیق انسان کی کہانی کیا ہے۔ یہ کہ تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا گیا ہے اور پھر اسی نفس سے ایک جوڑا بھی بنایا گیا ہے۔ پھر موسیٰ کو بھی بے شمار جوڑوں کی صورت میں بنایا گیا ہے۔ اور پھر تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تخلیق کے بعد تخلیق تمہیں دی اور تین عظمتوں کے اندر تمہیں پیدا کیا۔ پھر اللہ نے تمہیں انسانی خصوصیات عطا کیں اور پھر ان خصائص کا نظام تسلسل قائم کیا اور اس کو ترقی دی۔

اب یہاں انسانوں کی نفسیاتی دنیا کے حالات بتائے جاتے ہیں کہ خوشی اور غم اور اس و خوف کے وقت اس کی حالت کیا ہوتی ہے۔ وہ کس قدر کمزور ہیں اور کس قدر قہر مند ہیں اور کس قدر کمزور و ناتواں ہیں الا یہ کہ وہ رب تعالیٰ کے ساتھ رابطہ قائم کر لیں۔ اور اسی کی طرف امید لگائے رہیں اس کے مطیع فرمان ہو جائیں اور صحیح راستہ پہچان لیں۔ اور اصل حقیقت کو پالیں اور اللہ نے انسان کو جو انسانی خصائص دیئے ہیں اپنے آپ کو اس کی راہ پر ڈالیں۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۱۶ تشریح آیات

۸ --- تا --- ۱۰

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ
نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوًّا إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَنْدَادًا
لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ ۝

”انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے۔ پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس معیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا اور دوسروں کو اللہ کا ہمسرہ ٹھہراتا ہے تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کرے۔ (اے نبی!) اس سے کہو کہ تھوڑے دن اپنے کفر سے لطف اٹھ لے، یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے۔“

یہ انسان کی فطرت کا مزاج ہے کہ جب خطرات لاحق ہوں تو انسانی فطرت کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور وہ تمام پردے اور حجابات دور ہو جاتے ہیں جو اس فطرت کے اوپر چھائے ہوئے ہوں اور تمام اوہام و خرافات بھی دور ہو جاتے ہیں۔ خطرے کے وقت انسان صرف رب ذوالجلال کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ فطرت انسانی اس وقت اس بات کا ادراک کریتی ہے کہ یہ خطرہ صرف اللہ ہی کے ٹالنے سے ٹل سکتا ہے۔ اللہ کے سوا تمام دوسری قوتیں جھوٹی ثابت ہوتی ہیں۔

لیکن جب مشکلات دور ہوتی ہیں اور امن و امان اور خوشحالی کا دور آتا ہے اور اللہ مشکلات کو نعمتوں سے بدل دیتا ہے اور یوں مشکلات دور ہو جاتی ہیں تو یہی انسان جس کی فطرت کھل کر سامنے آگئی تھی پھر اوہام و خرافات میں پھنس کر اپنی سابقہ حالت کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ اور مشکلات میں اپنے گمراہانے ’اللہ کی طرف متوجہ ہونے اور توبہ کرنے کو بھول جاتا ہے۔

اس وقت پھر اس کی وہ حالت نہیں ہوتی کہ وہ اللہ ہی کو پکارے ’اس سے ڈرے اور یہ سمجھے کہ اب اللہ کے سوا کوئی بھی مشکلات کو دور نہیں کر سکتا۔ یہ تمام حالات بھلا کر اب دوبارہ اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک کرتا ہے۔ یا تو وہ ان

الہوں کو پوجتا ہے جو جاہلیت کے دور میں پوجے جاتے تھے یا بعض اشخاص کو پوجتا ہے۔ یہ ایسے حالات کی بندگی کرتا ہے جو اللہ کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ جس طرح ہر جاہلیت کا ایک الہ ہوتا ہے۔ کبھی وہ اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کو پوجتا ہے یا وہ مستقبل کی امیدوں اور ان جانے خوف سے ڈرتا ہے یا اپنی اولاد و اولاد کو پوجتا ہے یا اپنے سرداروں اور لیڈروں کو پوجتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ سردار بھی پوجے جاتے ہیں جس طرح خدا کو پوجا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ خدا۔ بھی زیادہ پوجے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ شرک کی بھی کئی اقسام ہیں۔ بعض شرک نہایت ہی خفی ہوتے ہیں۔ انک نہ اسے دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان کو اس کا احساس ہوتا ہے۔ قرآن کریم صرف معروف و مشہور شرک ہی کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ ہر اس بات کو لیتا ہے جو اپنے غشے کے اعتبار شرک پر۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا انسان اللہ کے راستے سے گمراہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ کی راہ تو لیک ہوتی ہے۔ اس میں تعدد ممکن نہیں ہے۔ وہ یہ کہ بندگی صرف اللہ ہی کی ہوگی۔ محبت صرف اللہ کے ساتھ ہوگی۔ اور کسی شخص کے تصور میں بھی اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو۔ نہ مال کا خدا شریک ہو، نہ اولاد کا خدا شریک ہو، نہ وطن کا خدا شریک ہو، نہ زمین کا خدا شریک ہو، نہ رشتہ داری کا خدا شریک ہو، شرک کی ان صورتوں میں سے جو بھی کسی کے دل میں جاگزیں ہوگئی تو یہ انداز اللہ میں شامل ہوگی۔ اللہ کے راستے سے گمراہی ہوگی۔ اور اللہ کے راستے سے گمراہی کا انجام آگ ہے اور یہ بات بہت جلد اس دنیا کی قلیل زندگی کے بعد سامنے آنے والی ہے۔

قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ (۸:۳۹) ”کہہ دیجئے کہ تم لوگ تو تھوڑے ہی دن اپنے کفر سے لطف اٹھالے یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے۔“ اس دنیا کے دن جس قدر بھی حویل ہوں، تھوڑے ہی ہیں۔ انسان کے دن زمین پر بہر حال گنے چنے ہیں اگرچہ عمر طویل کوئی پڑے۔ بلکہ خود پوری جس انسانی کی زندگی بھی اس کرۂ ارض پر قلیل ہے۔ جب ہم اس عمر کا مقابلہ لیا م اللہ سے کریں۔

--- ۰۰۰ ---

اس پری تصویر کے مقابلے میں ایک بھی تصویر اور بھی نئیاتی کیفیت بھی ہے۔ اللہ سے ڈرنے والا دل، ہر حالت میں، ہر آفت میں اللہ کو یاد کرنے والا دل، دنیا میں آخرت کو نظر میں رکھ کر زندگی گزارنے والا دل، اللہ کی رحمت کا طلبگار، اللہ کے ساتھ ایسا رابطہ کرنے والا دل جس سے علم صحیح پیدا ہو، اور اس کائنات کی حقیقت کو پا لینے والا دل، اس کی تصویر یہ ہے:

أَمَّنْ هُوَ قَانِثٌ إِنَّا إِلِيلٌ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ

وَيَرْجُوا رَحْمَةً رَبِّهِمْ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ط

إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ؕ

”کیا اس شخص کی رشد بہتر ہے یا اس شخص کی) جو مطیع فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے؟ ان سے پوچھو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں بھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں؟“

یہ نہایت ہی روشن اور حساس تصویر ہے۔ مطیع فرمان، اطاعت شعار، سجدے کی حالت میں اور رکوع کی حالت میں ہونا دراصل حساس اطاعت شعاری ہے۔ ایسا شخص آخرت سے ڈرتا ہے اور اللہ کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔ یہ صفائی اور باطن کی یہ شفافیت انسانی بصیرت کو کھول دیتی اور انسانی دل و دماغ کو دیکھنے، اخذ کرنے اور فکر کرنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ ان تمام امور کے ذریعہ مومنین کی بہت ہی اچھی تصویر کھینچ جاتی ہے۔ جبکہ آیت سابقہ میں مشرکین کی نہایت ہی بھونڈی تصویر تھی۔ اس کے بعد ان کے درمیان موازنہ دیکھئے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْمَلُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْمَلُونَ (۹:۳۹) ”ان سے پوچھو کیا عم رکھنے والے اور نہ رکھنے والے دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟“

سچا علم دراصل معرفت الہی کا نام ہے۔ سچائی تک پہنچنے کا نام ہے۔ اور ایسا علم انسانی بصیرت کو کھول دیتا ہے۔ اور یوں ایک عالم ان حقائق تک رسائی حاصل کر لیتا ہے جو اس وجود میں ہوتی ہے۔ علم ان معلومات کا نام نہیں ہے جو ذہن میں جمع ہو جائیں اور جن سے کوئی سچا اصول اور کوئی سچی حقیقت ذہن نشین نہ ہو۔ اور نہ محسوسات کے علاوہ کوئی حقیقت ذہن میں بیٹھی ہو۔

یہ ہے صحیح راستہ علم حقیقی اور اس حقیقت کا جو دل و دماغ کو منور کر دیتی ہے۔ یہی ہے اللہ کا مطیع فرمان ہونا۔ دل کا حساس ہونا اور آخرت کا خوف اور اللہ کے فضل و کرم کی امید داری اور یہ ہے اللہ کا خوف اور اللہ کے سامنے ڈرے اور سے رہنا۔ علم اور حقیقی علم یہی ہے اور اس طرح جو عقلیت پیدا ہوتی ہے وہ دیکھنے والی اور سننے والی اور جس چیز کو وہ پاتی ہے اس سے فائدہ اٹھانے والی ہوتی ہے اور یوں اس قسم کا علم ان مشاہدات کے پیچھے حقیقت عظمیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ انفرادی تجربات کو علم کہتے ہیں اور صرف ان چیزوں کو معلومات کہتے ہیں جو نظر آتی ہیں۔ ایسے لوگ معلومات جمع کرنے والے تو ہیں لیکن علماء نہیں۔

انَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولَٰئِكَ الْآلِبَابِ (۹:۳۹) ”نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں۔“ یعنی کھلے دلوں والے جن کی بصیرت کے دروازے وا ہوں اور جو عواہر و مشاہد کے پیچھے جھانک سکتے ہوں۔ وہ لوگ عقلمند ہیں اور وہی لوگ ہر چیز میں اللہ کے نشانات دیکھ کر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور وہ اللہ کے سامنے جو ابدی کے یقین کو بھوس نہیں جاتے۔

ان دو تصویروں کے بعد اہل ایمان کو مخاطب کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور اچھے کام کریں اور اس مختصر زندگی میں طویل زندگی کے لیے کچھ کما کر اور سجا کر چھوڑیں۔

قُلْ يٰۤاَعْبَادِ اللّٰهِ اٰمَنُوْا اَتَقُوْا رَبَّكُمْۙ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِیْۤ هٰذِہٖ

الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾

” (اے نبی) کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو اپنے رب سے ڈرو۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھائی ہے اور خدا کی زمین وسیع ہے، صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔“
کہو اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، قُلْ يَعْبَادِ اللَّهِ الَّذِينَ آمَنُوا (۱۰: ۳۹) اہل ایمان کی طرف نہایت ہی نظر کرم ہے۔ اصل میں عربی عبارت یوں ہے:

قُلْ يَعْبَادِ اللَّهِ الَّذِينَ آمَنُوا (۱۰: ۳۹) یعنی ان سے میرا یہ پیغام کہہ دو کہ متقی بن جاؤ۔ اپنے رب سے ڈرو۔ لیکن اللہ نے اسے براہ راست پکار کے صبحے میں تہدیں کر دیا۔ یہ ایک قسم کا اعلان اور تنبیہ ہے۔ رسول اللہ تو مسلمانوں کو (باعبادی) کہہ کر نہیں پکارتے تھے آپ تو یا عباد اللہ کہہ کر انہیں پکارتے تھے لیکن یہ اللہ کی نظر کرم ہے کہ وہ حضورؐ سے فرماتا ہے کہ (باعباد) کہہ کر پکارو۔ یوں یہ پکار اللہ کی جانب سے ہو اور حضور اکرمؐ اللہ کے ذریعہ خطاب کی حکایت فرمائیں۔

قُلْ يَعْبَادِ اللَّهِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ (۱۰: ۳۹) ”اے نبی کہو“ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو اپنے رب سے ڈرو۔“ تقویٰ کیا ہے؟ وہی دل کی حساسیت۔ اللہ کی طرف ڈر اور خشیت کے ساتھ دیکھنا۔ امید اور طمع کے ساتھ دیکھنا۔ اس کے غضب، ناراضگی سے ڈرتے رہنا۔ یہ ہے بہترین تصویر اہل ایمان کی۔ اس آیت میں جو تصویر کشی کی گئی ہے اور اس میں جو رنگ بھرے گئے ہیں وہ وہی ہیں جو آیت سابقہ میں ہیں، البتہ یہ عملی رنگ ہیں۔

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (۱۰: ۳۹) ”جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا، ان کے لیے بھلائی ہے۔“ کیا خوب جزاء ہے کہ اس دنیا میں اچھا سلوک کرو۔ تو یہاں اس حقیر دنیا میں بھی اچھائی پاؤ اور آخرت میں بھی اچھائی پاؤ۔ جو دار بقا اور دایرہ دوام ہے۔ لیکن یہ انسان پر فضل و کرم ہے اور اللہ کو معلوم ہے کہ یہ انسان کس قدر ضعیف اور ناتواں ہے۔ اس لیے اللہ نے اس پر بے پناہ کرم کیا۔

وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ (۱۰: ۳۹) ”خدا کی زمین وسیع ہے۔“ لہذا زمین کی محبت اور کسی ایک جگہ کے ساتھ الفت ہمیں بہا کر نہ رکھ دے۔ نسب، رشتہ داری اور دوستی کے روابط ہمیں بڑے کاموں سے روک نہ دیں۔ ہجرت ایک عظیم مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ اگر کوئی جگہ تمہارے دین کے لیے ٹھک ہو اور جہاں تم اسلام کا محسانہ نظام جاری نہیں کر سکتے تو پھر زمین سے چمٹے رہنا شیطان کی حرکت ہے۔ اور یہ انسان کے دل پر کا ایک رنگ ہے۔
یہ قرآن کا نہایت ہی لطیف اشارہ ہے، اس طرف کہ انسان کے دل و دماغ میں شرک خفی اس طرح سرایت کرتی

ہے کہ بات اللہ کی وحدانیت اور اللہ سے ڈرنے کی ہو رہی ہے۔ اور اس میں یہ لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا سرچشمہ وہی ذات باری ہے جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ کیونکہ انسان کے دل و دماغ کا یہ علاج وہی ذات کر سکتی ہے جو انسان کی خالق ہے اور جو انسان کے بارے میں پوری معلومات رکھتی ہے۔ اور انسان کی شخصیت کے خفیہ گوشوں کو جانتی ہے۔

اللہ جانتا ہے کہ یہ ہجرت انسانوں کے لیے کس قدر مشکل کام ہے۔ دنیا کے ان راہبوں کو یقیناً ترک کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایک چالو زندگی کو ترک کرنا رزق کے ایسے وسائل جن کا انسان عادی ہو جائے۔ ان کو ترک کرنا چلتے ہوئے کاروبار کو چھوڑنا اور بالکل ایک نئی سرزمین پر از سر نو زندگی شروع کرنا ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ اس کے لئے انسان مشکل سے تیار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اس معاملے کو بڑا صبر کہا گیا ہے اور اس پر بڑے اور پورے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا يُوفِى الصَّابِرُونَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۹: ۱۰) ”صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا“۔ یہاں اللہ تعالیٰ انسانی دلوں کو نہایت ہی بر محل یہ احساس دلاتا ہے اور ان کو اس کام کے لیے آمادہ فرماتے ہیں جو بالعموم انسانوں کے لیے بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔ اور ہجرت جیسے شدید حالات میں اللہ ان پر اپنی رحمت اور شفقت اور اپنے قرب کی شہنم کرتا ہے۔ اور وطن کے روابط، اہل و عیال اور رشتہ داریوں اور دوستیوں کو قربان کرنے پر بعض بے حساب اجر کا وعدہ فرماتا ہے ہیں۔ پاک ہے وہ ذات جو انسان کے بارے میں علیم و خبیر ہے۔ اور انسانی قلوب کے ساتھ یہ شفقانہ معاملہ کرتی ہے۔ اور انسانی نفسیات کے خیب و فراز کے اندر گہرائیوں تک پائے جانے والے نہایت ہی خفیہ احساسات کو جانتی ہے اور ان کا مدد اوکرتی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۱ ایک نظر میں

اس سبق پر آخرت کی فغا چھائی ہوئی ہے۔ اور آخرت کے عذاب کے مختلف رنگ اور سائے ہیں۔ نیز آخرت کے ثواب کی امیدیں بھی ہیں۔ حضور اکرمؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ خالص توحید کے عقیدے کا اعلان کر دیں۔ اور یہ بھی اعلان کر دیں کہ اگر میں اس سے انحراف کروں تو مجھے عذاب الہی کا ڈر ہے اور یہ کہ میں اپنے منصوبے اور منہاج پر قائم ہوں اور تم جانو اور تمہارا منہاج و طریقہ۔ البتہ اسلامی منہاج کا انجام یہ ہو گا اور کفریہ منہاج کا انجام یہ ہو گا۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۱ تشریح آیات

۱۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۲۰

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ﴿١١﴾
أُمِرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٢﴾ قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيَ عَذَابَ يَوْمٍ
عَظِيمٍ ﴿١٣﴾

(اے نبی!) ان سے کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں۔ کہو، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان ہے کہ آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اللہ وحدہ کی بندگی کریں اور دین اس کے لیے خالص کر دیں۔ اور اس طرح آپ پہلے مسلمان بن جائیں اور یہ بھی اعلان کر دیں کہ اگر میں اپنے رب کی معصیت کا ارتکاب کر لوں تو میرے لیے بھی عذاب الہی کا خطرہ ہے۔ اسلام نے جو عقیدہ توحید پیش کیا ہے اس کو خالص کرنے کے لیے اس اعلان کی بڑی اہمیت ہے۔ اس عقیدے کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے ایک بندے ہی ہیں اور آپ مقام بندگی سے آگے نہیں جاسکتے۔ اور تمام انسان بھی بندگی کے مقام پر مساوی طور پر کھڑے ہیں اور صرف ذات باری ہی ہے جو ان بندوں کے اوپر نگہبان ہے۔ یہ ہے مراد اس آیت سے۔

اس طرح مقام الوہیت اور مقام بندگی اپنی اپنی جگہ پر لگ ہو جاتے ہیں اور بالکل متمیز ہو جاتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی اختلاط ہوتا ہے اور نہ کوئی اشتباہ ہوتا ہے اور وحدانیت کی صفت اللہ وحدہ کے لیے مختص ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا۔ اور جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت بندہ دوسرے بندوں کے ساتھ ہم صف کھڑے ہیں اور آپ بھی اللہ کی معصیت کے ارتکاب سے ڈرتے ہیں لہذا بتوں اور فرشتوں کی سفارش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ اللہ کے ساتھ ساتھ یا مستلک ان کی عبادت کا سوال پیدا ہوتا ہے، حضور اکرم ایک بار پھر اللہ کی بندگی کا اعلان فرماتے ہیں اور اصرار کے ساتھ بندگی کا اعلان فرماتے ہیں اور مشرکین سے کہہ دیا جاتا ہے کہ تم جانو اور تمہارا درد ناک انجام۔

قُلْ اللَّهُ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَهُ دِينِي ﴿١٤﴾ فَاعْبُدُوا مَا شِئْتُمْ مِنْ دُونِهِ ﴿١٥﴾ قُلْ

إِنَّ الْخُسْرَيْنَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَ أَهْلِيَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ أَلَا ذَلِكَ هُوَ
الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴿۱۵﴾

”کہہ دو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں گا، تم اس کے سوا جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔ کہو اہل دیوالیہ تو وہی ہیں جنہوں نے قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو گھائے میں ڈال دیا۔ خوب سن رکھو یہی کھلا دیوالیہ ہے۔“

اور دوبارہ اعلان کیا جاتا ہے کہ دیکھو میں تو اپنی راہ پر چل رہا ہوں، میں بندگی صرف اللہ کی کرتا ہوں، نظام زندگی صرف اللہ کا اپناتا ہوں، تم بھی جس راہ کو پسند کرو اور جس کی بندگی چاہو اختیار کرو لیکن تم اس عظیم دیوالیہ پن سے دوچار ہو گے۔ اتنا بڑا خسارہ ہو گا تمہیں جس سے بڑا اور کوئی خسارہ نہ ہو گا۔ تم اپنی جان کو جہنم تک پہنچا دو گے۔ تمہیں اہل و عیال کا خسران ہو گا چاہے مومن ہوں یا کافر۔ اگر اہل مومن ہوں تو وہ جنتوں کو چلے جائیں گے اور یہ جہنم میں ان سے بہر حال کم ہوں گے۔ اگر کافر ہوں تو جس طرح خود کو گنوا یا اسی طرح ان کو بھی گنوا یا۔ دونوں جہنم میں ہوں گے۔

ذَلِكَ هُمُ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ (۳۹: ۱۵) ”یہی کھلا دیوالیہ ہے۔“ اور اس خسارے کا ایک منظر یہ ہے :

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۚ ذَٰلِكَ
يُخَوِّفُ اللَّهُ بِهِ عِبَادَكُمْ ۖ يُعْبَادُ فَاتَّقُوا ۚ ﴿۱۶﴾

”ان پر آگ کی چھتیاں اوپر سے بھی چھائی ہوں گی اور نیچے سے بھی۔ یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، پس اے میرے بندو، میرے غضب سے بچو۔“

فی الواقع یہ ایک خوفناک منظر ہے۔ یہ آگ کا منظر ہے۔ ان کے اوپر بھی آگ کی چھتیاں ہوں گی اور نیچے بھی اور وہ ان چھتروں میں لپٹے ہوں گے اور آگ کے یہ شعلے جنہیں چھتیاں کھا گیا ہے ان پر حاوی ہوں گے۔ یہ خوفناک منظر اللہ اپنے بندوں کے سامنے اس وقت پیش کرتا ہے جبکہ ابھی وہ دنیا میں ہیں اور اگر وہ اس سے بچنا چاہیں تو بچ سکتے ہیں۔

ذَٰلِكَ يُخَوِّفُ اللَّهُ بِهِ عِبَادَهُ (۳۹: ۱۶) ”یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔“ ان کو زور زور سے پکارتا ہے کہ بچو بچو! آگے بہت بڑا خطرہ ہے۔

يُعْبَادُ فَاتَّقُوا (۳۹: ۱۶) ”اے میرے بندو، میرے غضب سے بچو۔“ اور دوسری جانب، بالقابل پیٹ فارم پر کھڑے ہیں وہ لوگ جو نجات پا چکے ہیں، جو دنیا میں اس برے انجام سے ڈر گئے تھے :

وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَنْ يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ

الْبَشَرِۦ فَبَشِّرْ عِبَادِۙ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُۥ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُوا۟ الْأَلْبَابِۙ

”بمخلاف اس کے جن لوگوں نے طاغوت کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا ان کے لیے خوشخبری ہے۔ پس (اے نبیؐ) بشارت دے دو میرے ان بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی دانش مند ہیں۔“

طاغوت کا صیغہ ظنیان سے ہے۔ جس طرح ملکوت، عظمت اور رحمت کے صنف بنے ہیں اس کے مفہوم میں ضخامت اور مبالغہ پایا جاتا ہے۔ اس کا مروج مفہوم یہ ہے کہ جو بھی سرکشی کرے اور حدت تجاوز کر جائے، وہ طاغوت ہے۔ اور جو لوگ طاغوت کی بندگی اور طاعت سے اجتناب کرتے ہیں وہ لوگ کون ہیں؟ وہ جو کسی شکل میں بھی طاغوت کی بندگی نہ کریں۔ اور یہ وہی لوگ ہوں گے جو ہر چھوٹے بڑے کام میں اللہ کی بندگی کرنے والے ہوں، اس کی طرف لوٹنے والے ہوں اس کی طرف رجوع کرنے والے ہوں اور بندگی کے صحیح مقام پر کھڑے ہوں۔

ایسے ہی لوگوں کے لیے بشارت ہے اور یہ بشارت عالم بالا سے ہے اور رسول اللہؐ ان کو اس کی خوشخبری دے رہے ہیں۔

لَهُمُ الْبَشَرِۦ فَبَشِّرْ عِبَادِ (۱۷:۳۹) ”ان کے لیے خوشخبری ہے۔“ (پس اے نبیؐ) بشارت دے دو میرے ان بندوں کو۔“ ان کے لیے عالم بالا سے بشارت آئی اور رسول اللہؐ نے سنادی تو اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے؟

اللہ کے ایسے بندوں کی صفت یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ اللہ کی جو بات سنتے ہیں اسے غور سے سنتے ہیں۔ پھر اس بات کی وہ اطاعت کرتے ہیں کیونکہ وہ بہت ہی احسن ہوتی ہے اور دوسری باتوں کو وہ ترک کر دیتے ہیں۔ لہذا وہ صرف اچھی بات ہی لیتے ہیں۔ اس کے ذریعہ اپنے اذہان و قلوب کو صاف کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ یوں ہوتا ہے کہ پاک اور طیب نفوس پاک اور احسن باتوں کے لیے ہمیشہ کھلے ہوتے ہیں۔ وہ فوراً قبول کرتے ہیں اور ناپاک اور خبیث دل طیب چیزوں کے لیے بند ہوتے ہیں۔ اور گندی باتیں ہی قبول کرتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ (۱۸:۳۹) ”یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے۔“ کیونکہ اللہ نے دیکھ لیا کہ ان کے دلوں میں خیر موجود ہے۔ لہذا اللہ نے ان کو خیر کی طرف ہدایت دی اور انہوں نے اچھی باتوں کو سنا اور قبول کر لیا۔ اور ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے۔

وَأُولَٰئِكَ هُمُ أُولُوا۟ الْأَلْبَابِ (۱۸:۳۹) ”اور یہی لوگ دانشمند ہیں۔“ عقل سلیم ہی انسانوں کو پاکیزگی کی طرف مائل کرتی ہے۔ نجات کی طرف مائل کرتی ہے۔ لہذا جو شخص پاکیزگی اور نجات کی طرف میلان نہیں رکھتا

وہ گویا مسلوب العقل ہے اور اس نے اللہ کی دی ہوئی نعمت سے انکار کر دیا ہے۔ قبل اس کے پاکیزہ لوگوں کے انعام و انجام کو پیش کیا جائے۔ یہ کہ جاتا ہے کہ عافیت کے یہ بندے دراصل عملاً آگ تک پہنچ گئے ہیں اور ان میں سے ایک بھی آگ سے نجات نہیں پاسکتا۔

أَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ أَفَأَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۝

”(اے نبیؐ) اس شخص کو کون بچا سکتا ہے جس پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہو؟ کیا تم اسے بچا سکتے ہو جو آگ میں گر چکا ہو۔“

خطاب رسول خداؐ سے ہے۔ اور اگر رسول اللہؐ ان کو آگ سے نہیں بچا سکتے تو آپ کے سوا اور پھر کون ہے جو ان لوگوں کو آگ سے بچا سکے۔“

ان جہنمیوں کے منظر کے بالقابل ان لوگوں کا منظر ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور ان باتوں سے ڈرتے ہیں جن سے اللہ نے ان کو ڈرایا ہے۔ گویا یہ جہنمی عملاً جہنم میں ہیں اور جنتی عملاً جنت میں ہیں۔

لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۝ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَعَدَّ اللَّهُ لَا يَخْلِفُ اللَّهُ الْوَعْدَ ۝

”البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈر کر رہے ان کے لیے بلند عمارتیں ہیں منزل پر منزل بنی ہوئی، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔“

اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے منزل پر منزل بنی ہوئی بلند عمارتوں یعنی بالا خانوں کا یہ منظر لیل جہنم کے اس منظر کے بالقابل ہے جن کے اوپر بھی چھتیاں ہوں گی آگ کی اور نیچے بھی ہوں گی۔ یہ قابل قرآن کے انداز کلام کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ ان تمام مناظر میں پایا جاتا ہے جو قرآن مجید میں تقابلی مناظر کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔

یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ ہمیشہ واقع ہو کر رہتا ہے۔ جن مسلمانوں نے سب سے پہلے اس قرآن کو سنا۔ انہوں نے ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے لیے کوئی وعدہ یا وعید دور نہ تھا۔ ان کے قلوب اور ان کے احساسات تو ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ وعدے اور وعید تو ان کے لیے مشاہدہ تھے۔ یہ وعدے اور وعید سن کر وہ کانپ اٹھتے تھے اور ان کے نفوس اس طرح اپنا رخ قرآن کے ساتھ بدل دیتے تھے۔ جس طرح بادِ نما ہوا کے ساتھ رخ کو بدل دیتا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کو اخروی مناظر کے مطابق بدل دیئے تھے اور وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی مناظر قیامت میں زندہ رہ رہے تھے۔ یہی رویہ ہونا چاہئے ایک مسلمان کا قرآن کے حوالے سے کہ وہ قرآن کو سمجھے اور اپنی عملی زندگی کے رخ کو قرآن کے رخ پر ڈالتا رہے۔

درس نمبر ۲۱۸ ایک نظر میں

یہ سبق عالم نباتات کی ایک جھلک دکھاتا ہے کہ کس طرح اللہ پانی آسمانوں سے اتارتا ہے اور پھر زمین سرسبز ہو کر فصلیں اگتی ہیں اور یہ فصلیں اپنے انجام تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ مثال قرآن میں زمین کی بے ثباتی اور حیات دنیا کے اختصار کے لیے دی جاتی ہے۔ اور اہل فکر و نظر کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس پر غور و فکر کریں۔ پھر آسمانوں سے پانی کے نزول کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ کتاب بھی ایک قسم کا بارانِ رحمت ہے جو آسمانوں سے نازل ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ سے خشک دل سرسبز ہو جاتے ہیں اور مکمل جاتے ہیں۔ اس موقع پر ایک نہایت ہی اشاراتی تصویر بھی پیش کی جاتی ہے کہ کھلے دل اس کتاب سے کس طرح استفادہ کرتے ہیں۔ وہ اس سے ڈرتے ہیں 'ان پر کچی طاری ہو جاتی ہے' رو تھکنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور نرم ہو کر ان کے اندر قبولیت پیدا ہوتی ہے اور پھر ہدایت قبول کر کے وہ خوب مطمئن ہو جاتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کی تصویر جو ذکر الہی کی طرف لبیک کہتے ہیں اور ان کی تصویر جن کے دل پتھر ہو گئے ہیں۔ آخر میں توحید کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور ایک مثال دی جاتی ہے کہ اللہ واحد کی بندگی کرنے والوں اور متعدد الہوں کی بندگی کرنے والوں کی حالت کیا ہوتی ہے۔ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ دونوں کا ایک حال نہیں ہو سکتا، مثلاً ایک غلام جس کے مختلف اور باہم لڑنے جھگڑنے والے مالک ہوں اور دو سرا غلام جو صرف ایک ہی سنجیدہ مالک کا غلام ہو۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۱۸ تشریح آیات

۲۱ --- تا --- ۲۹

الَّذِينَ آمَنُوا أَنزَلَ اللَّهُ مِنْ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ
ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيَجُ فَتَوَدُّهُ مَضْضًا ثُمَّ
يَجْعَلُهُ حُطَامًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۲۱﴾

۱۹ دیکھا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ روڑ پڑ گئیں پھر آخر کار اللہ ان کو بھس بنا دیتا ہے۔ درحقیقت اس میں ایک سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے۔

یہ منظر جس کی طرف یہاں قرآن کریم ہماری توجہ مبذول کرتا ہے ایک ایسا منظر ہے جو اس کرۂ ارض پر ہر جگہ دہرایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس منظر میں جو عبارات ہیں ان کی تعجب خیزی بوجہ بار بار دہرائے جانے کے ختم ہو جاتی ہے اور انسان ان سے مانوس ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم انہی مناظر کو دوبارہ گہرے غور و فکر کے لیے پیش کرتا ہے کہ انسان اس منظر کی ترقی پر مرحلہ وار غور کرے۔

دیکھو آسمانوں سے پانی نازل ہو رہا ہے۔ یہ پانی کیا ہے اور کس طرح یہ آ رہا ہے۔ یہ چونکہ اکثر نازل ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے ہم اس پر سے یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ یہ پانی اور اس کی تخلیق بذات خود ایک معجزہ ہے۔ اگرچہ ہمیں اس قدر معلوم ہو گیا ہے کہ یہ ایک متعین انداز میں ہائیڈروجن کے دو ذروں کا آکسیجن کے ایک ذرے کے ملاپ کا نام ہے۔ لیکن ہمارا یہی علم ہے کہ لہندہ نے کائنات کے اندر ہائیڈروجن اور آکسیجن کو پیدا کیا اور پھر ایسے حالات پیدا کیے۔ کہ یہ ذرے آپس میں مل گئے اور اس اتحاد کے نتیجے میں پانی وجود میں آگیا۔ اور اس کے بعد اس زمین پر حیات کا پیدا کیا جانا ممکن بنا دیا گیا اور اللہ کا دست قدرت ان تمام امور کے پیچھے ہے۔ اور یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی صنعت کاریاں ہیں۔ پھر آسمانوں سے اس پانی کا نازل کرنا اس مخصوص انداز میں ایک دوسرا معجزہ ہے کہ اس زمین اور اس کائنات کو اس انداز

میں بنایا کہ پانیوں کا بر سنا ممکن ہو گیا۔

پھر اس کے بعد جو مرحلہ آتا ہے وہ یہ کہ

فَسَلَّكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْاَرْضِ (۳۹: ۲۱) ”پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا۔“ اس میں وہ دریا بھی شامل ہیں جو زمین پر بہتے ہیں۔ اس میں وہ ذخیرے بھی شامل ہیں جو سطح زمین کے نیچے ادھر ادھر چلتے ہیں۔ اور سوتوں اور چشموں کی شکل میں نکلتے ہیں۔ یا اس سطح زمین کے اندر کنویں نکال کر جاری کیے جاتے ہیں اس طرح کہ اللہ اس پانی کو سطح کے قریب رکھتا ہے اور یہ پانی دور تک نہیں جاتے کہ کبھی دلوں ہی نہ ہو سکیں۔

ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلَفًا لِّوَانِهِ (۳۹: ۲۱) ”پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جس کی قسمیں مختلف ہیں۔“ نباتاتی زندگی جو بارش کے نتیجے میں نمودار ہوتی ہے اور بارش سے پیدا ہوتی ہے ایک ایسا معجزہ ہے جس کا مقابلہ انسانی جدوجہد نہیں کر سکتی۔ ایک پھوٹی سی کوئیل جو زمین سے سر نکالتی ہے زمین کے بھاری بوجھ کو پھاڑ کر اور سر نکال کر کھلی فضا میں سانس لیتی ہے اور روشنی اور ہوا سے لطف اندوز ہوتی ہے اور آزاد فضا میں آزادی سے لہلاتی ہے اور پھر یہ فضا میں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی ہے۔ صرف اس کو نہیں کا ملاحظہ ہی انسان کے دل و دماغ کو ذکر الہی سے بھر دیتا ہے۔ اور اللہ خالق کائنات کے احساس کی ایک لہر انسان کے ذہن میں اٹھا دیتا ہے وہ اللہ جس نے ہر چیز کو اس کا وجود بخشا اور پھر اسے ہدایت دی پھر ایک ہی قطعہ زمین میں مختلف قسم کے پھل مختلف پھل نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا پودا بلکہ ایک ہی قطعہ زمین میں مختلف قسم کے پھل مختلف پھل نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا پودا بلکہ ایک چھوٹا سا پھول بھی قدرت باری تعالیٰ کی ایک عظیم نمائش گاہ ہے۔ انسان صرف ایک پھول کا تجزیہ کر کے ہی اپنے عجز کا اظہار کر دیتا ہے۔ اور پھر یہ سرسبز فصل اپنی سرسبزی ختم کر کے پک جاتی ہے اور اپنے دن پورے کر کے۔

ثُمَّ يَهْبِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا (۳۹: ۲۱) ”پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں۔“ اور اس کائنات کے ناموس فطرت میں اس کے لیے جو انجام مقرر ہے اس تک وہ پہنچ جاتی ہے اور مراحل حیات طے کر کے پک جاتی ہے۔

ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا (۳۹: ۲۱) ”پھر آخر کار اللہ ان کو بھس بنا دیتا ہے۔“ اس کا وقت مقررہ آ پہنچا ہے۔ وہ اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ اور اس کا دور ختم ہوتا ہے جو زندگی بخشنے والے اللہ نے اس کے لیے مقرر فرمایا تھا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرًا لِّاُولٰٓئِی الْاَلْبَابِ (۳۹: ۲۱) ”در حقیقت اس میں سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے۔“ وہ عقل رکھنے والے جو غور کرتے ہیں سبق لیتے ہیں اور اللہ نے ان کو جو صلاحیتیں دی ہیں اور جو عقل و خرد دی ہے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

اَفَمِنْ شَرِّهِ اللّٰهُ صَدْرَكَ لِلّٰی سَلَامٍ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّیِّہٖ نُوْرٌ

لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۹﴾ اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ
الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
ثُمَّ تَكَلِّينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ذٰلِكَ هُدًى لِّلَّذِينَ يَهْدِي إِلَيْهِ
مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿۴۰﴾

”اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟)۔ جیسا ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل اللہ کی نصیحت سے اور زیادہ سخت ہو گئے۔ وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ اپنے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اسے سن کر ان لوگوں کے روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں، اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ راہِ راست پر لے آتا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے اللہ ہی ہدایت نہ دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں ہے۔“

جس طرح آسمانوں سے پانی نازل ہوتا ہے، زمین سے نباتات لگتے ہیں اور ان کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح آسمان سے ذکر اور نصیحت نازل ہوتی ہے۔ اس ذکر سے بھی زندہ دل فائدہ اٹھاتے ہیں، ان دنوں کے دردناکے کھلے ہوتے ہیں۔ وہ ہدایات لیتے ہیں اور اچھے کاموں کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ اور جس طرح آسمانوں کی بارش پھروں پر نفل نہیں اگاتی۔ اسی طرح سگدل لوگوں پر ذکر آسمانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ ان میں کار خیر کی روئیدگی ہوتی ہے اور نہ فکر خیر کی روئیدگی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے ایسے دلوں کے اندر شرح صدر پیدا کر دیتا ہے جن کے بارے میں اللہ کے علم میں ہوتا ہے کہ ان کے اندر خیر ہے۔ ان تک نور الہی پہنچتا ہے تو وہ چمک اٹھتے ہیں اور ان سے روشنی پھوٹتی ہے۔ اور شرح صدر والے قلوب اور سگدل قلوب میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ (۳۹: ۲۲) ”جیسا ان لوگوں کے لیے جن کے دل نصیحت سے اور سخت ہو جاتے ہیں۔“

أُولَٰئِكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۹: ۲۲) ”وہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔“ یہ آیت کریمہ ان دلوں کی حقیقت بیان کرتی ہے جو اسلام کے لیے کھل جاتے ہیں، جو اسلام سے ہدایات لیتے ہیں اور اسلام سے تروتازگی حاصل کرتے ہیں اور اپنے دلوں کا تعلق اللہ سے جوڑتے ہیں۔ ان کی شرح صدر کی حالت سے ان کی تروتازگی، ان کے اندر پائی جانے والی بشارت اور مسرت اور نورانیت اور اشراق کی کیفیات وجود میں آتی ہیں اس کے مقابلے میں یہ آیت

ان دلوں کا حال بھی بتاتی ہے جو سخت اور پتھر ہیں۔ جو اپنی خشکی کی وجہ سے مر چکے ہیں۔ بانجھ اور تاریک ہو چکے ہیں۔ غرض اللہ جس کو اسلام کے لیے پسند کرتا ہے اس کا دل اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور اسلام کا نور ان کے دلوں میں داخل ہو جاتا ہے اور جسے محروم کرنا چاہتا ہے اس کا دل سخت کر دیتا ہے اور ان دونوں کے اندر بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں یہ بتایا گیا کہ اللہ ایمان قرآن کریم کو کس انداز میں لیتے ہیں۔ قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جس کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس کی طبیعت اور مزاج میں 'اس کی سمت میں' 'اس کی روح میں' 'اس کے خصائص میں' یہ ان تمام زاویوں سے مشابہ اور مثالی ہے (دہرائی ہوئی)۔ اس کی آیات کے آخری حصے یعنی مقصدیہ 'اس کے قصص اور اس کی ہدایات اور اس کے مناظر بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں تضاد نہیں ہوتا۔ ہر جگہ ایک نئے زاویہ سے دہرائے جاتے ہیں اور ہر جگہ نئے لگتے ہیں اور ہر جگہ نیا ذمہ ہوتا ہے۔ نہایت ہم آہنگی 'نہایت سنجیدگی اور مضبوط اصولوں کے مطابق' جن میں نہ تضاد ہے اور نہ تضاد ہے۔

وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس کے احکام کے مطابق پرہیز کرتے ہیں اور ہر وقت احتیاط میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر وقت اللہ کے فضل کے امیدوار ہوتے ہیں۔ وہ قرآن کریم کے بارانِ رحمت کو نہایت خوف اور کچکی سے لیتے ہیں۔ اور وہ اس سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ کانپ اٹھتے ہیں۔ ان کے جسم پر رد گھٹتے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کے نفوس کے اوپر سکون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ان کے دل اس ذکر سے مانوس ہو جاتے ہیں 'پھر ان کے دل نرم ہو کر اس نصیحت کو قبول کر لیتے ہیں۔

یہ ایک زندہ اور حساس صورتِ حالات ہے۔ یہ صورتِ حالات الفاظ کے رنگ سے منقش ہے اور یہ تصاویر یوں نظر آتی ہیں کہ گویا زندہ و متحرک ہیں۔

ذٰلِكَ هُدًى اِلٰلّٰه يَهْدِيْٓ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۳۹: ۲۳) ”یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ جس کو چاہتا ہے 'راہِ راست پر لے آتا ہے'۔ یہ دل از خود اس طرح کانپ نہیں جاتے بلکہ یہ رخص کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتے ہیں اور رخص کے فضل و کرم سے وہ لبیک کہتے ہیں اور ان کے اندر نور پیدا ہو جاتا ہے 'اللہ کو تمام قلوب کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ لہذا وہ کسی کو ہدایت دیتا ہے اور کسی کو گمراہی لیکن یہ ان قلوب کی پسند کے مطابق ہوتا ہے۔

وَمَنْ يُّضِلِّ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (۳۹: ۲۳) ”اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں ہے۔“ اللہ اس کو اس لیے گمراہ کرتا ہے کہ وہ شخص گمراہی اختیار کرتا ہے اور اللہ کو علم ہوتا ہے کہ اس نے ایسا کر لیا ہے یا کرے گا اور وہ بھی بھی ہدایت کو قبول نہ کرے گا۔ اور نہ ہدایت کے سامنے سر جھکائے گا۔

اَفَمَنْ يَّتَّقِۦ يَوْجِہٖۤ سُوْءَ الْعَذَابِ یَوْمَ الْقِیْمَةِ طَوِیْلٌ

لِلظَّالِمِیْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

”اب اس شخص کی بد حالی کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو جو قیامت کے روز عذاب کی سخت دہرائے اپنے منہ پر لے گا؟ ایسے ظالموں سے تو کہہ دیا جائے گا کہ اب چکھو حرہ اس کمائی کا جو تم کرتے رہے تھے۔“

انسان کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں اور اپنے جسم کے ذریعے بھی اپنے چہرے کو بچاتا ہے۔ یہاں دوزخ کے اندر تو وہ اپنے آپ کو کسی صورت میں بھی آگ سے نہیں بچا سکتا۔ نہ ہاتھوں سے نہ پاؤں سے۔ لہذا وہ یہاں چہرے سے آگ کو دفع کرے گا۔ اور چہرے کے ذریعہ سخت عذاب سے بچنے کی سعی کرے گا۔ یہاں مراد ہے شدید آگ، شدید خوف اور شدید اضطراب۔ اس قسم کی صورت حال میں اب کفار کو سرزنش کی جاتی ہے اور اس کے سامنے اس کی پوری زندگی کی کمائی پیش کی جاتی ہے۔

وَقِيلَ لِلظَّالِمِينَ ذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ (۳۹: ۲۴) ”اور ظالموں سے کہہ دیا جائے گا‘ اب چکھو حرہ‘ اس کمائی کا جو تم کرتے تھے۔“ اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے والے لوگوں سے پھر کہ ان اقوام کی طرف چلا جاتا ہے جنہوں نے انسانی تاریخ میں دوسرے نبیوں کی تکذیب کی تاکہ ذرا وہ تاریخ سے بھی سبق لیں اور اپنا بندوبست بھی کر لیں۔

كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَآتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۳۵﴾ فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۳۶﴾

”ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ اسی طرح جھٹلا چکے ہیں۔ آخر ان پر عذاب ایسے رخ سے آیا کہ ان کا خیال بھی نہ جاسکتا تھا۔ پھر اللہ نے ان کو دنیا ہی کی زندگی میں رسولی کا مزہ چکھایا اور آخرت کا عذاب تو اس سے شدید تر ہے‘ کاش یہ لوگ جانتے۔“

یہ ہے حال تکذبین کا دنیا اور آخرت دونوں میں۔ دنیا میں بھی اللہ نے ان کو شرمندہ اور ذلیل کیا۔ آخرت میں بھی ان کے لیے ایک عظیم عذاب انتظار میں ہے۔ اللہ کی سنت اپنا کام کرتی ہے۔ وہ اٹل ہے۔ اقوام رفتہ کا انجام پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ شاہد عادل ہے۔ اللہ کی دھمکی قائم ہے کہ وہ آخرت میں ان کو سزا دے گا۔ ان کے سامنے اب بھی فرصت کے لمحات موجود ہیں۔ ان کو غنیمت سمجھیں اور قرآن کی نصیحت سے ہدایت لیں‘

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۳۹: ۲۶) ”کاش یہ لوگ جانتے۔“

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۳۷﴾

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۳۸﴾ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلًا
فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَكِّسُونَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۖ هَلْ يَسْتَوِينَ مَثَلًا
الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾

”ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرزِ طرح کی مثالیں دی ہیں کہ یہ ہوش میں آئیں۔ ایسا قرآن جو عربی زبان ہے، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، تاکہ یہ برے انجام سے بچیں۔ اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ ایک شخص تو وہ ہے جس۔ مالک ہونے میں بہت سے رکّہ خلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دو سرائی شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟۔۔۔ الحمد للہ مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں۔“

اللہ تعالیٰ کسی ایسے بندے کی جو موحّد ہے اور کسی ایسے بندے کی جو مشرک ہے، یہ مثال دیتا ہے کہ ان کی مثال لہٰذا ہے جیسے ایک غلام ایک قصّہ کی خالص ملکیت ہو اور دو سرائی غلام کئی مختلف الجہال مالکان کے درمیان مشترک ہو۔ اس مشترک غلام میں مختلف مالکان کے علیحدہ علیحدہ مطالبے ہیں۔ اور یہ بیچارہ ان کے درمیان حیران و پریشان ہے۔ کوئی ادھر کھینچتا ہے، کوئی ادھر۔ وہ اسے کوئی ایک پروگرام نہیں دیتے اور اس بیچارے کی یہ طاقت ہی نہیں ہے کہ وہ ان کی متضاد فرمائشیں شروع کر سکے۔ کیونکہ وہ اس کے رخ کو بھی تبدیل کر رہی ہیں۔ اور اس کی خواہشات کو بھی تبدیل کر رہی ہیں۔ اور ایک مالک کا غلام کیسے ہے۔ اس کو مالک نے ایک پروگرام دیا ہوا ہے اور اسے معلوم ہے کہ اس نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک آقا کا غلام مطمئن، خوش اور یکسو ہو گا۔

هَلْ يَسْتَوِينَ مَثَلًا (۳۹: ۲۹) ”کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟۔“ یقیناً دونوں برابر نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کا ایک آقا ہے وہ آرام، استراحت، استقامت اور یقینی پروگرام رکھتا ہے۔ اس کی قوتیں مجتمع ہیں۔ اس کا رخ متعین ہے۔ اس کی راہ متعین ہے اور جس غلام کے مختلف الجہال آقا ہیں۔ وہ ایک دائمی عذاب میں ہے۔ ایک دائمی کشاکش میں ہے۔ اور ہر وقت قلق و بے چینی میں مبتلا ہے۔ کسی ایک حال پر برقرار نہیں ہے۔ اور اس سے ایک مالک بھی راضی نہ ہو گا، سب کا راضی ہونا تو محال ہے۔

یہ مثال حقیقت توحید اور حقیقت شرک پر تمام حالات میں منطبق ہے۔ ایک موحّد و مومن اس زمین پر اپنا سفر نہایت ہی سیدھے راہ پر ہی وجہ البصیرت طے کرتا ہے۔ کیونکہ ان کی نظریں ہمیشہ ایک نصب العین پر مرکوز ہیں۔ پوری زندگی، پوری قوت اور تمام ضروریات اور تمام نفع و نقصان وہ ایک جہت سے طلب کرتا ہے۔ ایک ذات ہے جو اسے روکتی ہے اور ایک ہی ذات ہے جو اسے اجازت دیتی ہے۔ لہٰذا اس کے قدم سیدھے اس ایک سرچشمے کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ اسی سرچشمے سے اخذ کرتا ہے اور اس کے ہاتھوں میں ایک ہی مضبوط ری ہے جسے اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے، ایک ہی ہدف ہے جس پر وہ نظریں جمائے ہوئے ہے۔ ایک ہی آقا کی وہ خدمت کرتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میرا

آقا کس بات پر راضی ہوتا ہے اور کس پر عراض ہوتا ہے۔ یوں اس کی قوتیں مجتمع ہوتی ہیں اور یوں وہ پوری قوت کے ساتھ زمین پر کام کرتا ہے۔ اور آسمان پر نظریں جمائے ہوتا ہے۔

اور اس مثال پر تبصرہ الحمد للہ سے کیا جاتا ہے کہ اس نے عقیدہ توحید کے ذریعے اپنے بندوں کو آرام و اطمینان اور راحت بخشی ہے۔ اور ان کی زندگی کو ثبات و قرار عطا کیا۔ اب اگر وہ اس سے انحراف کرتے ہیں تو وہ لاعلم ہیں۔

یہ ان مثالوں میں سے ایک ہے جو قرآن نے لوگوں کی راہنمائی کے لیے دی ہیں تاکہ لوگ حقیقت کو جان سکیں۔ یہ قرآن عربی ہے 'سیدھا' واضح اور بین ہے۔ اس کے معانی میں کوئی التباس نہیں۔ نہ پیچیدگی اور انحراف ہے اور یہ عوام الناس کو ایک فطری استدلال سے خطاب کرتا ہے 'جو ان کی سمجھ میں آتا ہے۔

— ○ ○ ○ —

درس نمبر ۱۹ ایک نظر میں

یہ سبق اس سے ماقبل کے تمام اسباق پر ایک تبصرہ ہے۔ آسمانوں سے پانی کے نزول کی نشانی بیان کرنے کے بعد، مردہ زمین پر روئیدگی پیدا ہو کر فصل کاٹنے تک کی نشانی کے بعد، اور اللہ کی جانب سے نازل ہونے والی اس کتاب کی نشانیوں کے بعد اور قرآنی امثال کے بیان کے بعد اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین دہانی کرانے کے بعد کہ اکثر لوگ نہیں جانتے، یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ لوگوں کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اب بعثت بعد الموت کے بعد ہی اللہ تمام حقائق کا فیصلہ کر دے گا۔ لہذا تکذیب کرنے والوں کو ان کی تکذیب کا بدلہ مل جائے گا اور وہ اس کے مستحق ہوں گے۔ اور بچوں کو سچائی کا وہ صلہ مل جائے گا جس کے وہ مستحق ہوں گے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۱۹ تشریح آیات

۳۰ --- تا --- ۳۵

إِنَّكَ مِثُّكَ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ ۚ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ عِنْدَ
رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ ۝

۱۷

” (اے نبیؐ) تمہیں بھی مرنا ہے اور ان لوگوں کو بھی مرنا ہے، آخر کار قیامت کے روز تم سب اپنے رب کے حضور اپنا اپنا مقدمہ پیش کرو گے۔“

ہر زندہ مخلوق نے اس جام کو ہونٹوں سے لگایا ہے، باقی رہے گا صرف نام اللہ کا۔ اور موت کے معاملے میں تمام انسان برابر ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جان دینی ہے اور یہاں اس کا ذکر بھی توحید کے ثبوت کے لیے ہے۔ اور توحید اس سورت کا بڑا موضوع ہے۔ اس کے بعد بعثت بعد الموت کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ کیونکہ موت ہی پر معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ تو ایک مرحلہ ہے۔ اس کے بعد کے مراحل آنے والے ہیں۔ اس لئے کہ مخلوقات میں سے کوئی چیز بعثت نہیں ہے کہ یونہی چلی جائے کہ بس پیدا ہوئے اور مر گئے۔ آج دنیا میں جن موضوعات پر لوگ باہم دست و گریباں ہیں ان پر رب کے ہاں بھی جھڑت ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے ہاں کھڑے ہوں گے اور وہاں پھر پوچھا جائے گا کہ اب تاؤ تم رسول اللہ کے مقابلے میں کیا کیا کرتے رہے ہو۔ اور اللہ کی ہدایت اور قرآن کا کیا کیا مقابلہ کرتے رہے ہو۔

--- () () ---

فی ظلال القرآن

پارہ - ۲۲

جلد پنجم

سورہ الزمر - ۳۹

۳۲ --- تا --- ۷۵

سورہ المؤمن - ۴۰

۱ --- تا --- ۸۵

سورہ حم السجدہ - ۴۱

۱ --- تا --- ۴۶

میسر

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ وَكَذَبَ بِالصِّدْقِ إِذْ جَاءَهُ ۖ

الَّذِينَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ۚ

”پھر اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور جب سچائی اس کے سامنے آئی تو اسے منہ دیا۔ کیا ایسے لوگوں کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟“

یہ سوال استفہام کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ سوال تقریری ہے۔ اس لیے کہ ایسے شخص سے بڑا ظالم اور کوئی نہیں ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے، کسی کو اللہ کا بیٹا اور کسی کو بیٹی کہتا ہے۔ سچائی کی تکذیب کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے آئے ہیں۔ وہ کلمہ توحید کی تصدیق نہیں کرتا۔ چونکہ یہ ایک کفریہ عمل ہے، اور کافروں کا ٹھکانہ یقیناً جہنم ہے اس لیے اس کے فیصلہ کن اظہار کی خاطر سوالیہ انداز اور اسلوب اختیار کیا گیا ہے تاکہ بات زیادہ واضح ہو جائے اور اس کی زیادہ تاکید ہو جائے۔

یہ تو نبیؐ اور جنس کا ایک فریق تھا۔ اور فریق مقابل کون ہے؟ تو وہ شخص ہے جو اللہ کی طرف سے وہ سچائی لے کر آیا۔ اور اس نے اس کی تصدیق کی اور اس سچائی کو لوگوں تک پہنچایا، نہایت عقیدت مندی اور تسلی کے ساتھ۔ اور اس شخص یعنی رسول اللہ کے ساتھ تمام رسول اور انبیائے کرام شامل ہیں۔ اور اسی طرح رسول اللہ کے ساتھ اس میں وہ تمام لوگ بھی شامل ہیں جو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں درآنحالیکہ وہ اسلام پر پوری طرح ایمان لاتے ہیں اور کبھی طرح مطمئن ہیں اور اس دعوت میں ان کا قلب اور ان کی زبان دونوں شریک ہیں ایسے تمام لوگ متقی ہیں۔

وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۚ

”اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنہوں نے اس کو سچ مانا، وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔“

یہاں متقین اور ان کے لیے تیار شدہ جزاء کی تفصیلات دی جاتی ہیں:

لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ ۚ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ۚ

”انہیں اپنے رب کے ہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ خواہش کریں گے۔ یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا۔“

یہ ایک جامع انداز تعبیر ہے جو بھی چیزیں مومن کو مرغوب ہو اور جس کی چاہت اس کے دل میں پیدا ہو وہ اس کے لیے اس کے رب کے ہاں تیار ہوگی۔ یہ اس کا حق ہو گا جس میں کوئی خسارہ نہ ہو گا اور نہ کوئی حصہ اس کا ضائع ہو گا۔ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ (۳۹: ۳۴) ”یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا۔“

اور یہ اس لیے کہ اللہ نے ان کے لیے جس بھلائی اور جس عزت افزائی کا ارادہ فرمایا تھا وہ حقیقت بن جائے اور عدل سے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ فضل و کرم کا معاملہ کرے۔

لِيُكَفِّرَ اللَّهُ عَنْهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا وَيَجْزِيَهُمْ أَجْرَهُمْ

يَا حَسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٣٥﴾

”تاکہ جو بدترین اعمال انہوں نے کیے تھے انہیں اللہ ان کے حساب سے ساقط کر دے اور جو بہترین اعمال وہ کرتے رہے ان کے لحاظ سے ان کو اجر عطا فرمائے۔“

اس لیے کہ عدل تو یہ ہو گا کہ نیکوں کا بھی حساب کیا جائے اور برائیوں کا بھی حساب کیا جائے اور پھر دونوں پر سزا و جزاء دی جائے۔۔۔ لیکن اللہ یہاں فضل و کرم کرے گا۔ اللہ اپنے متقی بندوں پر اپنے کرم کی بجلی کرے گا۔ یوں کہ ان کے بہت برے اعمال کو قلم زد کر دے گا۔ لہذا میرا میں ان کا کوئی حساب نہ ہو گا اور ان کو اجر بھی احسن طریقے سے دے گا، یعنی ان کے استحقاق سے زیادہ۔ چنانچہ ان کے ترازو میں ان کی نیکیوں کو زیادہ وزن دے دیا جائے گا۔ یہ اللہ کا فضل ہو گا اور یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ جسے چاہے، یہ فضل دے۔ ہاں اللہ نے اپنے ڈرنے والے بندوں کے لیے یہ وعدہ کر دیا ہے لہذا ایسا ہی ہو گا اور اہل تقویٰ اس پر مطمئن ہیں۔

--- () () ---

درس نمبر ۲۲۰ ایک نظر میں

اس سورت کا یہ سفر تمام اسفار سے زیادہ طویل اور وسیع ہے۔ اس میں عقیدہ توحید کو مختلف زلو یوں سے لیا گیا ہے اور اس کے بارے میں نہایت ہی حساس دلائل دیئے گئے ہیں۔ اور یہ نہایت ہی متنوع دلائل ہیں۔ اس سبق کا آغاز ایک سچے مومن کی قلبی کیفیات سے کیا گیا ہے، جو صرف اللہ پر اعتماد رکھتا ہے۔ اللہ ہی کو بڑی قوت سمجھتا ہے اور اللہ کے سوا تمام حقیر اور کمزور قوتوں کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ اس لیے وہ ان تمام قوتوں سے قطع تعلق کر کے اپنے امور اور ان کے امور کا فیصلہ قیامت کے دن پر چھوڑ دیتا ہے اور وہ اپنے راستے پر ثابت قدمی، اعتماد اور یقین کے ساتھ گامزن رہتا ہے۔

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضے کا تعین کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کے ذمہ دار اور ٹھیکہ دار نہیں ہیں کہ ضرور ان کو راہ ہدایت پر لانا ہے۔ وہ تو اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ ان کی چوٹی اللہ کے ہاتھ میں، ہر حال اور ہر صورت میں۔ لوگوں کے لیے اللہ کے سوا اور کوئی سفارش بھی نہیں ہے۔ سفارش کے اختیارات تو اللہ کے پاس ہیں۔ زمین و آسمانوں کا مالک ہی وہ ہے۔ اور سب نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

پھر مشرکین کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کی نفسیاتی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کلمہ توحید کا ذکر ہو تو ان کی طبیعت متعجب ہو جاتی ہے اور اگر شرکیہ کلمہ سنیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ کلمہ توحید کا اعلان کر دیں۔ اور مشرکین کو اللہ پر چھوڑ دیں۔ اور ان کی ایک تصویر آپ کے سامنے کر دی جاتی ہے کہ قیامت کے دن تو یہ چاہیں گے کہ پوری روئے زمین کی دولت اور اس جیسی مزید دولت بھی نہ بے میں دے کر جان چھڑالیں۔ اس لیے کہ وہاں وہ اللہ کی وہ بادشاہت دیکھ لیں گے جس سے وہ حواس باختہ ہو جائیں گے۔

اور ان کی حالت یہ ہے کہ جب وہ کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو وہ اللہ وحدہ کو پکارتے ہیں اور اگر وہ خوشحالی پا لیں تو پھر اکر لے بے چوڑے دعوے کرنے لگتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ دولت ہمیں اپنے علم و ٹیکنالوجی کی وجہ سے دے دی گئی ہے اور یہ وہی بات ہے جو ان سے پہلے لوگوں نے بھی کہی تھی اور ان کو اللہ نے بکرا اور وہ اللہ کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ بن سکے اور نہ اللہ کو عاجز کر سکے۔ رہی رزق کی فراخی اور اس کی تنگی تو یہ اللہ کے سنن اور قوانین پر موقوف رکھی گئی ہے اور اللہ کے یہ قوانین قدرت اس کی حکمت کے مطابق چلتے ہیں۔ وہی ہے جو رزق میں کشادگی دیتا ہے۔ اور وہی ہے جو کسی کار رزق تنگ کر دیتا ہے۔

ان فی ذلک لآیت لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُونَ (۵۲:۳۹) ”بے شک اس میں آیات اور نشانیاں ہیں، ہر اس قوم کے لیے جو مومن ہو۔“

درس نمبر ۲۲۰ تشریح آیات

۳۶ --- تا --- ۵۲

أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهِ
وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۖ وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ
أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَزِيزٍ ذِي انْتِقَامٍ ۚ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ
لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۚ قُلْ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرَادَنِيَ
اللَّهُ بِضَرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضَرِّهِ أَوْ أَرَادَنِيَ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ
رَحْمَتِهِ ۚ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ ۚ قُلْ لِقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَى
مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَ
يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُثْقِلٌ ۚ

” (اے نبیؐ) کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں۔
حالاںکہ اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے۔ اور جسے وہ ہدایت دے اسے بھٹکانے والا بھی
کوئی نہیں۔ کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے؟ ان لوگوں سے اگر تم پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا
کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ ان سے پوچھو جب حقیقت یہ ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان
پہنچانا چاہے تو کیا تمہاری یہ دیویاں حنیس تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو مجھے اس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بچالیں
گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گی؟ بس ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ ہی کافی
ہے، بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان سے صاف کہو کہ ”اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ اپنا کام کیے
جاؤ میں اپنا کام کرتا رہوں گا“ عتریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے

جو بھی لٹے والی نہیں۔“

یہ چار آیات بتاتی ہیں کہ اہل ایمان کا سیدھا سادا استدلال کیا ہوتا ہے، یہ استدلال کس قدر قدرتی اور پر زور ہوتا ہے۔ کس قدر واضح اور گہرا ہوتا ہے۔ جس طرح یہ استدلال اور یہ سوچ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں ہے اور جس طرح اسے ہر مومن کے قلب میں ہونا چاہئے۔ جس کا ایمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر پختہ ہو۔ اور وہ اسی دعوت پر قائم ہو اور اسی کی تبلیغ کر رہا ہو اور جسے وہ اپنا دستور و منشور سمجھتا ہو اور وہ اس کے لیے کافی و شافی ہو۔ اور وہ اس کو ایک مکمل راستہ بتاتی ہو، جو سیدھا منزل مقصود تک پہنچتا ہو اور مستقل راستہ ہو۔

اس آیت کے نزول میں ایسی روایات آئی ہیں کہ مشرکین مکہ رسول اللہ کو اپنے بتوں اور ان کے غضب سے ڈراتے تھے۔ جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ صفات ان کے سامنے رکھتے تھے اور ان کی بے بسی و بے کسی بیان فرماتے تھے۔ مشرکین مکہ حضور اکرم کو ڈراتے تھے کہ اگر آپ نے ان کے بارے میں خاموشی اختیار نہ کی تو میں بت آپ کو اذیت دیں گے۔

لیکن اس آیت کا مفہوم اس مخصوص شان نزول سے زیادہ وسیع ہے۔ مراد ہر وہ دعوت حق ہے جو اس کرۂ ارض پر قیام نظام اسلامی کے لیے اٹھی ہے اور ہر وہ قوت ہے جو اس نظام اور اس دعوت کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ یہاں دعوت حق انھوں نے اہل ایمان کے عمل بھروسے، اطمینان اور یقین کا ذکر کیا گیا ہے اور ان مخالف قوتوں کو بھی صحیح طرح تو لا گیا ہے کہ ان کا وزن کیا ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (۳۹:۳۶) ”کیا اللہ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں ہے؟“۔ ہاں اللہ کافی ہے، لہذا وہ لوگ کون ہیں جن سے حضور کو ڈرایا جا رہا ہے۔ اللہ جب اپنے بندے کے ساتھ ہے تو ان دوسری مخلوقات کی حیثیت کیا ہے۔ خصوصاً جبکہ حضور نے بندگی کا منصب لے لیا ہو اور وہ بندگی کا حق بھی ادا کر رہے ہوں۔ اللہ نہایت قوی اور اپنے تمام بندوں پر کنٹرول کرنے والا ہے۔

وَيُخَوِّفُوكَ بِالَّذِينَ مِنْ دُونِهٖ (۳۹:۳۶) ”یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں۔“ آپ جس طرح ڈر سکتے ہیں۔ اللہ کے سوا دوسری تمام قوتیں کس طرح ڈرا سکتی ہیں۔ اس شخص کو جس کی حفاظت اللہ کر رہا ہو۔ اور تمام روئے زمین پر جو قوتیں ہیں وہ اللہ سے فروتر قوتیں ہیں۔

یہ ایک بالکل سادہ اور واضح مسئلہ ہے۔ یہ کسی بڑی بحث اور مباحثے اور کسی زیادہ سوچ کا محتاج نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر داعی کا حامی تو اللہ ہے اور دوسری تمام قوتیں فروتر ہیں۔ اور جب کوئی شخص یہ موقف اختیار کرے تو پھر کوئی شک اور اشتباہ نہیں رہتا کہ اللہ کا ارادہ ہی نافذ ہو کر رہتا ہے اور اللہ کی مشیت ہی غالب رہتی ہے۔ وہ اپنے بندوں کے درمیان فیصلے فرماتا ہے۔ ان کی ذات کے بارے میں، ان کے دلوں کے بارے میں اور ان کی سوچ اور شعور کے بارے میں بھی۔

وَمَنْ يُسَلِّلْ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ حُدٍّ (۳۹:۳۶) وَمَنْ يُهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُّضِلٍّ (۳۹:۳۷)

”اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اس کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے۔ اور جسے وہ ہدایت دے دے اس کو بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔“ اللہ جانتا ہے کہ ضلالت کا مستحق کون ہے لہذا وہ اسے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہدایت کا مستحق کون ہے لہذا وہ اسے ہدایت دے دیتا ہے۔ اور وہ جس کے بارے میں جو فیصلہ بھی کر دے اس کے فیصلے کو بدلنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔

الَيْسَ اللَّهُ بِعَزِيزٍ ذِي انْتِقَامٍ (۳۹: ۳۷) ”کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے؟“ ہاں وہ انتقام لینے والا ہے۔ اور وہ عزیز و قوی ہے۔ اور وہ ان تمام لوگوں کو ان کے استحقاق کے مطابق جزاء دیتا ہے۔ اور جس سے وہ انتقام لیتا ہے۔ وہ مستحق ہوتا ہے کہ اس سے انتقام لیا جائے لہذا اس کی بندگی کرنے والے کو کسی چیز کا ڈر نہیں رہتا وہ کافی اور کفیل ہے۔

اس کے بعد خود ان کی منطق اور ان کے زلویہ نگاہ کے مطابق استدلال کر کے یہی نتائج نکالے جاتے ہیں اور اس منطق اور اس طرز فکر کا وہ اقرار کرتے تھے اور اللہ کے بارے میں وہ اس قسم کا تصور رکھتے تھے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ قُلْ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّهِ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَتُ رَحْمَتِهِ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ (۳۹: ۳۸) ”ان لوگوں سے اگر تم پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ ان سے پوچھو جب حقیقت یہ ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا تمہاری یہ دیویوں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو مجھے اس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بچالیں گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گی؟ بس ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔“

جب ان لوگوں سے پوچھا جاتا تھا کہ خالق ارض و سما کون ہے؟ تو وہ اقرار کرتے تھے کہ خالق ارض و سماء اللہ وحدہ ہے۔ کوئی صحیح الفطرت انسان اس کے سوا جواب دے ہی نہیں سکتا۔ اور کوئی عقلمند زمین و آسمان کی تخلیق کا سبب ایک ذات بلند اور عالی مقام کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا۔ لہذا قرآن ان کو اور تمام عقلاء کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ تمہاری فطرت کے اندر یہ بات بیٹھی ہوئی ہے اور بہت واضح ہے۔ اگر صورت یہی ہے تو پھر کوئی ہے جو اس مصیبت کو روک سکے والا ہو جو وہ ذات عالی اپنے بندوں پر لانا چاہے یا زمین و آسمان میں کون ہے کہ اگر وہ کسی بندے پر رحمت کرنا چاہے تو اس کی رحمت کو روک سکے۔

تو ان سوالات کا قطعی جواب یہ ہے کہ ”نہیں“۔ اگر یہ بات طے ہو جاتی ہے تو داعی الی اللہ کس سے ڈر سکتا ہے۔ وہ کس سے خائف ہو سکتا ہے اور کس سے امیدیں وابستہ کر سکتا ہے۔ کون ہے جو اس کی مصیبتوں کو دور کر سکتا ہے۔ کون ہے جو اللہ کی رحمت کو اس سے دور کر سکتا ہے۔ کون ہے جو اسے بے چین کر سکتا اسے ڈرا دھکا سکتا ہے اور اپنے

راستے سے ہٹا سکتا ہے؟

جب قلب مومن میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو اس کی نسبت سے معاملہ ختم ہو جاتا ہے 'تلازمہ ختم ہے' غیر اللہ سے تمام امیدیں ختم۔ صرف اللہ سے امید باقی رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے بندوں کے لیے کافی ہے اور ہمیں اسی پر توکل کرنا چاہئے۔

قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ (۳۸:۳۹) "ہیں کہہ دو اللہ میرے لیے کافی ہے اور بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔"

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ آپ انسان کر دیں کہ مجھے رب تعالیٰ پر پورا اعتماد 'بھروسہ اور یقین ہے۔ اس قدر بھروسہ جس میں کوئی شک نہیں۔ ایسا یقین جس میں کوئی تزلزل نہیں۔ اور اس قدر اطمینان جس میں بے چینی کا شائبہ نہیں۔ اور اس زاور راہ کے ساتھ آپ چل پڑیں اور منزل تک پہنچنے سے پہلے دم نہ لیں۔

قُلْ يَقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ (۳۹:۳۹) مَنْ

يَاْتِيهِ عَذَابٌ يُحْزِنُهُ وَ يَحْلُ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ (۴۰:۳۹) ان سے صاف کہو کہ "میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ اپنا کام کئے جاؤ" میں اپنا کام کرتا رہوں گا 'تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسول اکرم عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو کبھی ملنے والی نہیں" اے قوم تم اپنے منہاج کے مطابق کام کرو اور میں اپنی راہ پر چل پڑا ہوں 'نہ ڈرتا ہوں اور نہ شک ہے مجھے۔ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ اسی دنیا میں تم پر کس قدر شرمسار کنندہ عذاب آتا ہے اور پھر آخرت میں تو یہ عذاب دائمی ہو گا۔

اس معاملے کا فیصلہ ہو چکا اور اس فطری استدلال کے ذریعہ ہوا جس پر ہر سلیم الفطرت انسان گواہی دیتا ہے اور جس پر یہ کائنات گواہ ہے کہ اللہ خالق سموات ہے اور خالق ارض ہے۔ اور تمام رسولوں نے آج تک جو دعوت پیش کی ہے یہ دعوت اللہ کی ہے۔ لہذا اللہ کے رسولوں اور داعیان حق کے لیے زمین اور آسمان میں کون ہے جو کوئی اختیار رکھتا ہے۔ کوئی ہے جو ان سے مصائب دور کر سکتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو لوگ غیر اللہ اور ان دنیاوی قوتوں سے ڈرتے کیوں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ معاملہ واضح ہے اور راستہ صاف ہے اور اب بحث و مباحثے کی مزید کچھ ضرورت نہیں ہے۔

--- ۰۰۰ ---

یہ تو ہے تعلق رسولوں اور داعیان حق کا اور ان قوتوں کا جو ان کی راہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں اب سوال یہ ہے کہ دعوت حق کے حوالے سے رسولوں اور داعیان کا فریضہ کیا ہے اور جھٹلانے والوں کے ساتھ وہ کیا رویہ اختیار کریں گے۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنْ

اِهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلٰیهَا وَمَا اَنْتَ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰﴾

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْاَنفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَمِمْسِكَ

الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۳۹﴾ أَمَّا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ قُلُوبًا أَوْ كَوْنُ
كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ﴿۴۰﴾ قُلْ لِلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا لَهُ مُلْكُ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۴۱﴾

” (بے نی) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کر دی ہے۔ اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا اپنے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہو گا تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روہیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روہیں ایک وقت مقرر کے لیے ولہس بھیج دیتا ہے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔ کیا اس خدا کو چھو ذکر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ ہو نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہو شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے۔ پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔“

اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ عَلٰیكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ (۳۹: ۴۱) ”ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کی ہے۔“ اس کتاب کی ماہیت سچائی ہے۔ یہ جو طرز زندگی اور منہاج حیات انسان کو عطا کرتی ہے وہ برحق ہے۔ اس کا قانون برحق ہے اور یہی وہ سچائی ہے جس پر زمین و آسمان قائم ہیں اور وہ نظام جو اس کتاب نے انسانوں کے لیے وضع کیا ہے اور وہ ضابطہ جو اللہ نے اس کائنات کے چلانے کے لیے وضع کیا دونوں حق ہیں اور باہم ہم آہنگ اور متوافق ہیں۔ یہ سچائی لوگوں کے لیے نازل کی ہے کہ لوگ اس سے ہدایت لے کر اس کے مطابق زندگی بسر کریں اور آپ اس حق کے مبلغ ہیں۔ اور یہ فیصلہ انہوں نے کرنا ہے کہ وہ اپنے لیے راہ ہدایت کا انتخاب کرتے ہیں یا راہ ضلالت کا۔ جنت کی نعمتیں حاصل کرتے ہیں یا جہنم کی آگ اختیار کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے نفس کو جدھر چاہے لے جائے۔ نہ آپ ان کے ذمہ دار ہیں اور نہ حوالدار۔

فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَ مَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ

بِوَكِيلٍ (۳۹: ۴۱) ”اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا تو اپنے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہو گا۔ تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو۔“ ان کا ذمہ دار اللہ ہے۔ وہ بیداری میں بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور سوتے میں بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اپنے تمام حالات میں وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ جس طرح چاہتا ہے ان کے اندر تصرف فرماتا ہے۔“

لَهُ يَتَوَقَّى الْإِنْسَانُ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ

عَلَيْهَا أَمُوتَ وَيُرْسِلُ الْآخِرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى (۴۲:۳۹) ”وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں ایک وقت مقرر کے لیے واپس بھیج دیتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ تمام مردوں کی روحیں ان کے وقت مقرر کے مطابق قبض کرتا ہے۔ اس سے قبل اللہ ہر شخص کی روح کو سونے کی حالت میں بھی قبض کرتا ہے۔ اگرچہ وہ شخص مردہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کی روح اس وقت بھی قبض ہوتی ہے ایک وقت مقررہ تک کے لیے۔ اگر سوتے ہی میں اس کا وقت مقرر آجائے تو پھر وہ شخص جاگ نہیں اٹھتا۔ اور اگر وقت مقرر نہ آیا تو روح واپس بھیجی جاتی ہے۔ اور یہ شخص جاگ اٹھتا ہے۔ لہذا تمام نفوس اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں سوتے میں بھی اور جاگتے میں بھی۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْتَكِرُونَ (۴۲:۳۹) ”اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو فکر کرتے ہیں۔“ غرض یہ لوگ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ ہی ان کا ذمہ دار ہے اور آپ ان کے انجام کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اگر وہ ہدایت پاتے ہیں تو اپنے لیے پاتے ہیں اور اگر وہ گمراہی کی راہ اختیار کرتے ہیں تو اپنے لیے کرتے ہیں۔ محاسبہ سب کے لیے ہے۔ کوئی بھی مہمل چھوڑ دیا جانے والا نہیں ہے۔ لہذا ان کو اپنے آپ کو چمڑانے کی فکر کرنی چاہیے۔

أَمْ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ (۴۳:۳۹) قُلْ لِلَّهِ الشُّفَاعَةُ جَمِيعًا لَهُ مُلْكُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ

(۴۳:۳۹) ”کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو کیا وہ شفاعت کرس گئے خواہ ان کے اختیار میں کچھ ہو نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟“ کہو شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے۔ پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔“ یہ ان کے ساتھ ایک مذاق ہے۔ وہ لوگ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ملائکہ کی زندگی اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ملائکہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے۔

أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ (۴۳:۳۹) ”خواہ ان کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی کچھ نہ ہوں۔“ اور اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ سفارش تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ یہ اللہ ہی ہے کہ جس کو سفارش کی چاہے اجازت دے دے۔ لیکن اگر اللہ کسی کو سفارش کی اجازت دے تو ہمارے لیے یہ جائز نہ ہو گا کہ ہم اسے اللہ کا شریک بنالیں۔

لَهُ مُلْكُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ (۴۴:۳۹) ”زمین و آسمان کی بادشاہی کا وہی مالک ہے۔“ اس

بادشاہی میں کوئی اس کی ملکیت اور ارادہ کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ سب نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے اور سب نے آخر کار اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

--- (۱۱۱) ---

یہ نظریہ اور موقف کہ اللہ وحدہ بادشاہ ہے۔ وہ تمام اختیارات کا مالک ہے اور تبار ہے اور جس کا خلاصہ کلمہ توحید ہے 'اس سے وہ کس قدر بدکتے ہیں اور کلمہ شرک کے لیے یہ کس قدر خوش ہوتے ہیں' حالانکہ کلمہ شرک کا انکار ان کی فطرت بھی کرتی ہے۔ اور ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات بھی کرتی ہے۔

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ
بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿١١١﴾

”جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں 'اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔“

یہ ایک حقیقی صورت حال کی نقشہ کشی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود تھی۔ اس وقت صورت یہ تھی کہ جب مشرکین کے خداؤں کا ذکر احترام سے کیا جاتا تو یہ مشرکین کھل اٹھتے اور بہت خوش ہوتے۔ اور جب کلمہ توحید کا بیان ہوتا تو یہ لوگ مرجھا جاتے اور ان کی طبیعت میں انقباض پیدا ہو جاتا۔۔۔ لیکن یہ ایک نفسیاتی حالت ہے جو ہر زمان و مکان میں پائی جاتی ہے۔ ہر دور میں ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ وحدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے اور صرف اللہ کی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے اور صرف اسلامی نظام اور اسلامی دستور و منشور کی بات کی جائے تو ان کو سخت انقباض ہوتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں جب انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہائے زندگی کی بات کی جائے 'انسانی قوانین کی بات کی جائے تو وہ بہت ہی خوش ہوتے ہیں 'کھل اٹھتے ہیں اور ایسی باتوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تصویر کشی اس آیت میں کی گئی ہے۔ یہ لوگ ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی فطرت مسخ ہو چکی ہے۔ ان کے مزاج میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ لوگ ضال اور مضل ہیں۔ اگرچہ کوئی معاشرہ حضور اکرم کے معاشرے سے مختلف ہو۔ اگرچہ ان کی جنس اور قوم عربوں سے جدا ہو۔

ایسے منحرفین مگر اہوں اور بگڑے ہوئے لوگوں کا جواب وہی ہے جو اللہ نے حضور کو بتایا تھا جب آپ کو ایسے حالات سے مقابلہ درپیش تھا۔

قُلِ اللَّهُمَّ فَاطِرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ عَلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِي مَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٢﴾

”کہو 'خدا یا' آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے 'حاضر و غائب کے جاننے والے' تو ہی اپنے بندوں کے درمیان

اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔“

یہ اس فطرت کی پکار ہے جو زمین و آسمان کو دیکھ رہی ہو۔ اور اس کے لیے یہ بات مشکل ہو کہ وہ اللہ کی ذات کے سوا کسی کو اللہ مان سکے جو خالق ارض و سما ہے۔ لہذا یہ فطرت اس کی طرف اعتراف اور اقرار کے ساتھ متوجہ ہوتی ہے اور اللہ کی تعریف و تمجید ان صفات کے ساتھ کرتی ہے جو اس کے لائق ہیں یعنی ”اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے“

عِلْمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (۴۶:۳۹) ”اے حاضر و غائب کو جاننے والے“۔ اے ظاہر و باطن کو جاننے والے۔

أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِي مَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۴۶:۳۹) ”تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہتے ہیں“۔ کیونکہ قیامت کے دن تو ہی حاکم ہو گا۔ اور سب نے قیامت میں اسی کے سامنے آنا ہو گا۔ اور کوئی قیامت کی حاضری سے بچ کر نکلنے والا نہیں ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اور جب اللہ کے بندے قیامت کے روز کے نپیلے کے لیے حاضر کیے جائیں گے تو ان کی حالت پھر کیا ہوگی ذرا اسکرین پر یہ منظر دیکھیں :

وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ
لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ سُوءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۖ وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ
يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ ۝ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا
بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝

”اگر ان ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو اور اتنی ہی اور بھی تو یہ روز قیامت کے برے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے۔ وہاں اپنی کمائی کے سارے برے نتائج ان پر کھل جائیں گے اور وہی چیز ان پر مسلط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں۔“

ایک ہولناک صورت حال کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ یہ قرآن ہی کر سکتا ہے یہ ظلم جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور شرک ظلم عظیم ہے۔ اگر قیامت کے دن ان کے قبضے میں یہ پوری زمین ہو اور اس جیسی ایک اور زمین بھی اور وہ اس کے اور مافیہا کے واحد مالک ہوں تو وہ قیامت کے دن کے عذاب سے بچنے کے لیے وہ سب کچھ دینے کے لیے تیار ہوں گے۔ اور اس عذاب سے یہ لوگ رہائی نہ پا سکیں گے۔

ان جامع الفاظ کے اندر ایک دوسری دھمکی بھی چھپی ہوئی ہے۔

وَبَدَّالَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (۳۹: ۷۴) ”اور اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے۔“۔ یہاں اس بات کا تذکرہ نہیں کیا گیا کہ وہاں ان کے سامنے اللہ کی طرف سے کیا غیر متوقع انکشافات ہوں گے؟ لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ جو کچھ ظاہر ہو گا وہ بہت ہی خوفناک ہو گا اور وہ ان کو مدہوش کر دے گا۔ اور وہ حواس باختہ پھریں گے۔ ایک طرف اللہ ہے اور دوسری طرف یہ ضعفاء ہیں اور اللہ کی طرف سے ان کے سامنے خوفناک انکشافات ہوں گے یہاں ان کو متعین نہیں کیا گیا۔

وَبَدَّالَهُمْ مَسَاقِطَ مَا كَسَبُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۳۹: ۷۸) ”وہاں اپنی کمائی کے سارے نتائج ان پر کھل جائیں گے اور وہی چیز ان پر مسلط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں۔“ اس سے بھی ان کی حالت مزید بگڑ جائے گی۔ جب ان کے سامنے اپنے کرتوتوں کے نتائج بھی تک شکل میں آئیں گے۔ اور جس عذاب کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ انہیں گھیر لے گا۔ اور وہ نہایت ہی کرہناک حالت میں ہوں گے۔ اَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهَا۔

--- ۰۰۰ ---

اب اس موقف کے بعد جب وہ اپنے رب کے سامنے حاضر کئے جائیں گے اس رب کے سامنے جس کے ساتھ یہ لوگ شرک کرتے تھے اور جب اللہ وحدہ کا ذکر کیا جاتا تو ان کے دل سکڑ جاتے تھے اور جب ان کے شرکاء کا ذکر ہوتا تو وہ کھل جاتے تھے۔ ان مضامین کے بعد ان کی ایک عجیب حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ یہ اللہ کی وحدانیت کا تو انکار کرتے ہیں لیکن جب یہ کسی بڑی مصیبت میں پھنستے ہیں تو صرف اللہ وحدہ کو نہایت عاجزی سے پکارتے ہیں۔ لیکن جب ان سے یہ مصیبت نکل جائے تو پھر تکبر کرتے ہوئے انکار کرتے ہیں۔

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةٌ
مِمَّا لَا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا
يَعْلَمُونَ ﴿۷۹﴾

”یہی انسان جب ارہی مصیبت اسے چھو جاتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، اور جب ہم اسے اپنی طرف سے نعت دے کر اچھا دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ہے، نہیں بلکہ یہ آزمائش ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔“

یہ آیت انسانوں کے ایک ایسے نمونے کا ذکر کرتی ہے جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایسا نمونہ ہے جس کی فطرت نے سچائی تک رسائی حاصل نہیں کی۔ رب واحد کے عقیدے تک نہیں پہنچ سکی کہ اسے صحیح رویہ معلوم ہو اور خوشی اور غم کی حالت میں بھی وہ اپنا صحیح راستہ نہ بھولے۔

مصیبت، انسانی فطرت کے اوپر سے خواہشات نفسانیہ کی جی ہوئی ویزتوں کو دور کر دیتی ہے اور مصنوعی عوامل کو

ہٹا کر انسانی ضمیر کے اندر موجود شجائی نکھارتی ہے۔ جب انسان مشکلات سے دوچار ہوتا ہے تو اسے اللہ نظر آتا ہے ”جب کیا تنگ جتوں نے تو خدا یاد آیا“ اب خدا کی تعریف ہونے لگتی ہے اور لوگ صرف اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور جب یہ شدت اور مصیبت ختم ہو جاتی ہے اور خوش حالی اور امن لوٹ آتا ہے تو انسان ان باتوں کو بھول جاتا ہے جو اس نے شدت و مصیبت کے وقت میں کی تھیں اور اس کی فطرت پھر خواہشات نفسانیہ اور وقتی عوامل کے دباؤ میں آ جاتی ہے اور پھر اللہ کی نعمتوں اور فضل و کرم کے بارے میں وہ کہتا ہے۔

اِنَّمَا اُوْتِيْتُهُ عَلٰی عِلْمٍ (۳۹: ۴۹) ”یہ تو مجھے علم کی بناء پر دیا گیا ہے“۔ یہ بات قارون نے بھی کہی تھی۔ ہر وہ شخص اور قوم جسے یہ دھوکہ ہو جائے کہ اس کے لئے دن علم و حکمت اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہیں۔ یہ اس کی مہارت ہے کہ اس کو ماں اور اقتدار ملا ہے۔ ایسے لوگ فضل و کرم کے اصل مصدر سے غافل ہوتے ہیں اور صدمہ دینے والے کو نہیں پہچانتے جو مسبب الاسباب ہے اور جو رزق مقرر کرتا ہے۔

یہ ہے امتحان اور آزمائش۔ اس کے ذریعے اللہ معصوم کرتا ہے کہ جس پر فضل و کرم ہو رہا ہے وہ شکر کرے گا یا کفر کرے گا۔ آیا اس فضل و کرم کی وجہ سے اس کی اصلاح ہوتی ہے یا وہ مزید بگڑتا ہے۔ وہ راہِ راست لیتا ہے یا گمراہی کی راہ پر آگے پڑھتا ہے۔

قرآن کریم نے بندوں پر مہربانی کرتے ہوئے یہ راز ان پر کھول دیا ہے اور اس خطرے سے انہیں پیشگی آگاہ کر دیا ہے کہ یہ مال اور دولت اور اقتدار و جاہ بھی تمہارے لیے آزمائش ہے۔ قرآن کریم اقوام گزشتہ کے حالات ان پر پیش کر کے ان کو متنبہ کرتا ہے کہ پہلے بھی اس قسم کے لوگوں نے کہا تھا کہ۔

اُوْتِيْتُهُ عَلٰی عِلْمٍ (۳۹: ۴۹) ”یہ تو مجھے علم کی بناء پر دیا گیا ہے“۔

قَدْ قَالُوا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَا اَغْنٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ۝۵۰ فَاَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوْا وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَاءِ
سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوْا وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۵۱

”یہی بات ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی کہ چکے ہیں مگر جو کچھ وہ کہاتے تھے وہ ان کے کسی کام نہ آیا۔ پھر اپنی کمائی کے برے نتائج انہوں نے بھگتے اور ان لوگوں میں سے بھی وہ جو ظالم ہیں وہ معتریب اپنی کمائی کے برے نتائج بھگتیں گے یہ ہمیں عاجز کر دینے والے نہیں ہیں۔“

یہ وہی الفاظ ہیں جو اس سے قبل کے بد فطرت لوگوں نے کہے تھے۔ اور اس کا رد ۵۱ آیت آیا۔ نہ ان کا علم ان کے کام آیا نہ ان کا اقتدار انہیں بچا سکا۔ اور نہ ان کی ٹیکنالوجی اور اللہ کے عذاب نے انہیں آلیا۔ یہ اللہ کی آزمائش تھی

اس میں تہدیلی نہیں ہوتی۔ اور اللہ کو عاجز کرنے والا کوئی نہیں۔ انسان جیسی ضعیف مخلوق اللہ کو کیسے عاجز کر سکتی ہے۔
 رہی یہ بات کہ اللہ نے ان کو مال و اقتدار دیا تو یہ اللہ کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور یہ حکمت اللہ خود ہی جانتا ہے کہ وہ کسی کو مال و اقتدار کی فراوانی کیوں دیتا ہے۔ اصل بات ہوتی ہے اس کی مشیت اور اس کی آزمائش۔

أَوَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّ

ع ۱۱ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝۵۴

۲ ”اور کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے؟ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔“
 یہ تو اللہ کی نشانیاں ہیں کہ وہ کسی کو زیادہ اور کسی کو کم دیتا ہے اور ان نشانات سے راہ ہدایت لینا چاہیے نہ یہ کہ ان نشانات الہیہ کو کفر و ضلالت کا ذریعہ بنایا جائے۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۲۱ ایک نظر میں

اس سے پہلے سبق میں بتایا گیا تھا کہ قیامت کے دن ظالموں کے حالات کیا ہوں گے۔

وَلَوْ أَنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۖ وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ مِنْ سُوءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ وَبَدَّ اللَّهُ مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (۴۷:۳۹)

وَبَدَّ اللَّهُ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا ۖ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۴۸:۳۹) ”اگر ان ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو، اور اتنی ہی اور بھی، تو یہ روز قیامت کے برے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے۔ وہاں اپنی کمائی کے سارے برے نتائج ان پر کھل جائیں گے اور وہی چیز ان پر مسلط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں۔“

اس لیے اس سبق میں توبہ کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور کوئی کس قدر گناہوں کا مرتکب کیوں نہ ہو گیا ہو، اسے دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، چاہے وہ میری راہوں پر بہت آگے بھٹ گئے ہوں۔ دعوت دی جاتی ہے کہ لوٹ آؤ، میرے در پر کوئی مایوسی نہیں ہے، لیکن اگر اس عام معافی اور عام دعوت سے تم نے فائدہ نہ اٹھایا اور توبہ نہ کی تو پھر تمہارے لیے وہ عذاب ہے جس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہ ہوگی۔ اس فرصت سے فائدہ اٹھاؤ، قبل اس کے کہ وقت چلا جائے۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۲ تشریح آیات

۵۳ --- تا --- ۶۱

قُلْ يُعِيَاذِي الَّذِينَ اسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا
مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۵۳﴾

” (اے نبی!) کہہ دو کہ لے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا،
یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور و رحیم ہے۔“

اللہ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ وہ بڑی سے بڑی معصیت کو اپنی پیٹ میں لے سکتی ہے، چاہے وہ جو بھی ہو۔ یہ
توبہ اور واپس آ جانے کی دعوت عام ہے۔ ان لوگوں کو دعوت ہے جو گمراہی، فسق و فجور اور بدکاری کی راہوں میں بہت
دور چلے گئے ہیں اور مایوس ہو گئے ہیں۔ ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اللہ پر بھروسہ
کریں اور اللہ کی رحمت کا دروازہ وسیع ہے اور غم و درگزر کی چادر بہت کھلی ہے۔ وہ اپنے بندوں پر رحیم و کریم ہے۔ وہ
جانتا ہے کہ میرے بندے کس قدر کمزور اور ضعیف ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ان کے طرز عمل پر داخلی اور خارجی عوامل
اثر انداز ہوتے ہیں۔ اللہ کو یہ بھی معلوم ہے کہ شیطان لعین گھات میں بیٹھ ہوا ہے اور دائیں بائیں ہر طرف سے وہ ان
کے راستوں پر بیٹھ ہوا ہے اور ان کو گمراہ کرتا ہے۔ اور اپنی تمام سوار افواج اور پیدل افواج اس نے انسانوں پر حملہ آور کر
دی ہیں۔ اور وہ اپنے اس خبیث منصوبے میں بہت ہی سنجیدہ ہے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ انسان کی ساخت بہت ہی کمزور
سے اور اس غریب کے ہاتھ سے جو نہی جبل متین چھوٹتی ہے یہ اپنے ذاتی میلانات، نفسیاتی رجحانات سے برائی کی طرف
مائل ہو جاتا ہے۔ اس کا توازن ختم ہو جاتا ہے اور وہ انحراف کی راہوں پر چل نکلتا ہے اور اس کا توازن ختم ہو کر وہ
معصیت کی راہوں پر نکل پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق کی ان سب کمزوریوں سے واقف ہے۔ اس لیے اللہ اس کی معاونت فرماتا ہے اس کے لیے
دامن رحمت وسیع فرماتا ہے اور سزا صرف اس وقت دیتا ہے جب اس کی اصلاح کے لیے تمام وسائل کام میں لائے کہ وہ
راہ راست پر آ جائے اور جب وہ معصیت کی راہوں پر دور نکل جائے، گمراہوں میں حد سے گزر جائے، اور اتنے یقین ہو
جائے کہ وہ تو اب ہر مردود و مسترد ہو گیا ہے اور اس کے لیے نہ اب ویسی ممکن ہے اور نہ معافی، اس قسم کی مایوسی اور
قنوطیت کی حالت میں اللہ کی یہ پکار سنتا ہے۔

قُلْ يُعْبَادِي الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ

الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۵۳:۳۹) ”(ب-بی) کہ دو کہ لت میرے بندوں جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ تو غفور و رحیم ہے۔“

یہ شخص معصیت میں حد سے گزر گیا ہے گناہوں میں ڈوب گیا محفوظ جگہ سے بھاگ گیا ہے اور راستے سے بے راہ ہو گیا ہے اب اس کے اور سایہ رحمت، تروتازہ کرنے والی رحمت، زندہ کرنے والی رحمت، نرم و نازک رحمت کے درمیان صرف ایک ہی دروازہ رہ گیا ہے۔ یہ ہے توبہ کا دروازہ یہ دروازہ ہر وقت کھلا ہے اس پر کوئی دربان نہیں ہے۔ اس دروازے سے رحمت خداوندی کے سایوں تک پہنچنے کے لیے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہے بس توبہ کرو اور لوٹ آؤ! صد بار اگر توبہ کھلتی باز آ۔

وَأَنِيبُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿۵۴﴾ وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَ أَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿۵۵﴾

”پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ اس کے قبل اس کے کہ تم پر عذاب آجائے اور پھر کہیں تمہیں مدد نہ مل سکے۔ اور پیروی اختیار کر لو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی۔ قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔“

انابت، اسام اور سر تسلیم خم کر دینے کے دائرے میں لوٹ آنا ایک ہی مفہوم رکھتا ہے اور ایک ہی حقیقت ہے۔ اللہ کی اطاعت کے حظیرہ میں داخل ہونا ایک ایسا عمل ہے جس میں کوئی مراسم نہیں، کوئی رکاوٹ نہیں، کوئی واسطہ اور سفارش نہیں، جو چاہے جس وقت چاہے اسلام کے سادہ سے نظام میں داخل ہو جائے۔

اسلام بندے اور رب کے درمیان بلا واسطہ دین ہے۔ یہ خالق اور مخلوق کے درمیان بلا واسطہ تعلق ہے۔ گناہ گاروں میں سے جو بھی دلچسپ ہونا چاہے مگر انہوں میں سے جو چاہے بوٹ آئے جو لوگ بھی جس قدر تاخیر فرماتی کرتے رہے ہیں وہ سر تسلیم خم کر دیں اور واپس آجائیں دروازہ کھلا ہے۔ سایہ دار پناہ گاہ موجود ہے۔ تروتازہ اور نرم و نازک نفا موجود ہے۔ اور یہ سب چیزیں ایک ایسے دروازے کے اندر ہیں جس کے لیے کوئی دربان نہیں ہے اور اس دروازے سے داخل ہونے کے لیے کوئی حساب و کتاب نہیں ہے۔

لوٹ آؤ! لوٹ آؤ! قبل اس کے کہ آواز آجائے کہ فلاں نماز!

مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ (۵۴:۳۹) ”قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ

جائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے۔ وہاں تو کوئی مددگار نہ ہو گا۔ اس لیے لوٹ آؤ وقت کے ختم ہونے میں دیر نہیں ہے۔ کسی بھی وقت آخری گھڑی کا فیصلہ ہو سکتا ہے اور دروازہ بند ہو سکتا ہے۔ رات اور دن کے کسی وقت میں مصلحت کی گھڑیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ (۵۵:۳۹) ”اور پیروی اختیار کرو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی۔“ اس سے مراد قرآن کریم ہے جو تمہارے ہاتھوں میں ہے۔

مَنْ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمْ الْعَذَابُ بُغْتَةً وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (۵۵:۳۹) ”قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔“

لہذا باز آ جاؤ قبل اس کے کہ فرصت ختم ہو جائے، مصلحت جاتی رہے اور تم نے اللہ کے حق میں کوتاہی کی ہو اور پھر تم بچتاؤ کہ کیوں ہم اللہ کے وعدے کا مذاق اڑاتے تھے۔

أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ يَحْصِرُنِي عَلَى مَا قَرَرْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ

وَإِنْ كُنْتُ لَيْنَ الشَّيْءِ ۝۵۶

”کیس ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی شخص کے ”افسوس میری اس تعمیر پر جو میں اللہ کی جناب میں کرتا رہا“ بلکہ میں تو اللہ مذاق اڑانے والوں میں شامل تھا۔“

یا کوئی یہ بات کہے کہ اللہ نے میرے لیے تو گمراہی لکھ دی تھی۔ اگر اللہ میرے لیے ہدایت مقدر کر دیتا تو میں ہدایت پر آ جاتا۔

أَوْ تَقُولَ لَوْ أَنَّ اللَّهَ هَدَانِي لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ۝۵۷

”یا کہے ”کاش اللہ نے مجھے ہدایت بخش ہوتی تو میں بھی متقیوں میں سے ہوتا۔“ یہ استدلال باری النظر میں غلط ہے۔ فرصت کی گھڑی موجود ہے، ہدایت کے ذرائع موجود ہیں، توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور تمہیں آزادی دی گئی ہے۔

أَوْ تَقُولَ حِينَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ أَنَّ لِي كَرَّةً فَأَكُونَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ۝۵۸

”یا عذاب دیکھ کر کہے ”کاش مجھے ایک موقع اور مل جائے اور میں بھی نیک عمل کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں۔“

اور یہ تو ایک ایسی آرزو ہے جسے کوئی نہیں پاسکتا۔ جب یہ زندگی ختم ہوگی تو دوبارہ اس جہاں میں کسی کے بھیجے جانے کی کوئی امید نہیں ہے۔ کیا تم دارالعرس میں موجود نہیں ہو۔ یہ ایک فرصت ہے اور جب یہ ختم ہو جائے تو پھر وقت لوٹ کر نہیں آتا۔ اور اس وقت کے برسے میں تم سے نہایت ہی سرزنش کے انداز میں باز پرس ہوگی!

بَلَىٰ قَدْ جَاءَكَ آيَاتِي فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٥١﴾

” (اور اس وقت اتے یہ جواب ملے کہ) ”کیوں نہیں“ میری آیات میرے پاس آچکی تھیں پھر تو نے انہیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور تو کافروں میں سے تھا۔“

--- ○ ○ ○ ---

سياق کلام اب قیامت میں متقین اور منکرین کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔ عین اس وقت جب قارئین کو قیامت کے برپا ہونے کے آخری لمحات تک پہنچا دیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ وُجُوهُهُم مُّسْوَدَّةٌ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٥٢﴾ وَيُنَجِّي اللَّهُ الَّذِينَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٥٣﴾

”آج جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ باندھے ہیں قیامت کے روز تم دیکھو گے کہ ان کے منہ کالے ہوں گے۔ کیا جہنم میں منکروں کے لیے کافی جگہ نہیں ہے؟ اس کے برعکس جن لوگوں نے یہاں تقویٰ کیا ہے ان کے اسباب کامیابی کی وجہ سے اللہ ان کو نجات دے گا ان کو نہ کوئی گزند پہنچے گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

یہ ہے آخری انجام ایک گروہ ہے کہ شرمندگی کی وجہ سے اس کا چہرہ سیاہ ہے۔ نیز غم کی وجہ سے اور جہنم کی شعلوں کی وجہ سے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں اپنے آپ کو بہت ہی بڑا سمجھتے تھے۔ ان کو رات اور دن اللہ کی دعوت دی جاتی تھی۔ یہ دعوت اس وقت بھی برقرار تھی جب یہ گناہوں میں گردن تک ڈوبے ہوئے تھے لیکن انہوں نے داعی کی پکار پر کان نہ دھرا۔ آج یہ گروہ بہت ہی شرمندہ ہے۔ شرمندگی اور کبیدگی کی وجہ سے اس کا چہرہ سیاہ ہے اور دوسرا فریق نجات پا چکا ہے کامیاب ہو گیا ہے۔ اب اسی کوئی گزند پہنچنے کا امکان ہی باقی نہیں رہا۔ نہ اسے کوئی پریشانی لاحق ہوگی۔ یہ متقین کافرین ہے جو دنیا میں اس طرح زندہ رہے کہ آخرت سے ڈرتے رہے اور اللہ کی رحمت کے امیدوار رہے۔ آج وہ نجات کامیابی امن اور سلامتی میں ہیں۔

لَا يَمَسُّهُمْ السُّوءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۶۱: ۳۹) ”ان کو اب کوئی گزند نہ پہنچے گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ اس صورت حال کے بعد اب جو چاہے داعی حق کی پکار پر لبیک کہے اور اللہ کی تر و تازہ رحمت اور جنت میں داخل ہو جائے۔ یہ رحمتیں اور یہ جنتیں توبہ کے دروازے کے ساتھ موجود ہیں۔ دروازہ کھلا ہے۔ چھوڑ دو اپنا اسراف چھوڑ دو بے راہہ روی اور ترک کرد فسق و فجور قبل اس کے کہ تمہیں عذاب الہی آ لے اور تمہیں اس کا شعور ہی نہ ہو۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۲۲ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے 'اس میں تخلیق کائنات کے حوالے سے حقیقت توحید کے مضمون کو لیا گیا ہے۔ یہ کہ اللہ نے تمام چیزوں کی تخلیق کی ہے۔ وہ تمام چیزوں میں مالکانہ تصرف رکھتا ہے۔ لہذا مشرکین کی یہ تجویز کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے الہوں کی بندگی کریں اور ہم اس کے مقابلے میں اللہ رب العالمین کی بندگی کریں۔ یوں ایک مشترکہ دین وجود میں آجائے' یہ تجویز اور مطالبہ نہایت احمقانہ ہے اور عجیب و غریب ہے۔ اللہ تو خالق کائنات ہے۔ آسمانوں اور زمین کے تمام اختیارات اور بادشاہت اسی کی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور چیز کی بندگی بھی کی جائے۔ جبکہ زمین و آسمان کی کنجیوں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ”اور ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔“ یہ لوگ اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ وحدہ معبود، قدرت والا اور تمام کائنات کا کنٹرول کرنے والا ہے۔

وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَالسَّمَوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ (۳۹: ۶۷)
”قیامت کے روز پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دست راست میں لپیٹے ہوں گے۔“ اور اس حقیقت کو اس انداز میں ریکارڈ کرنے کے لیے قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے اور یہ منظر اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ فرشتے عرش الہی کے ارد گرد ننگے پاؤں پھر رہے ہوں گے۔ یہ اللہ کی تسبیح کے ساتھ اس کی حمد بیان کر رہے ہوں گے۔ پوری کائنات حمد و ثناء میں رطب اللسان ہوگی۔ اور کہا جائے گا ہر طرف اور ہر جہت تَبَّحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ”سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔“ اور اس کائنات کی حقیقت میں یہ ایک فیصلہ کن بات ہوگی۔

درس نمبر ۲۲۲ تشریح آیات

۶۲ --- تا --- ۷۵

اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿۶۲﴾
مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ وَٱلَّذِينَ كَفَرُوا بِآيٰتِ ٱللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ
ٱلْخٰسِرُونَ ﴿۶۳﴾

۱۱ع

۳

”اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اور جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہیں۔ وہی گھائے میں رہنے والے ہیں۔“
یہ وہ حقیقت ہے جس پر ہر چیز گواہ ہے۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے کوئی چیز بنائی ہے اور کوئی معقول انسان یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ یہ کائنات بغیر کسی پیدا کرنے والے کے خود وجود میں آگئی۔ حالانکہ اس کائنات کے اندر جو موجودات بھی ہیں ان کی ذات اور ان کی اسکیم بتاتی ہے کہ اس کو بالارادہ بنایا گیا ہے۔ کوئی چیز اتفاقی نظر نہیں آتی، چاہے چھوٹی ہو یا بڑی۔

وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴿۶۲﴾ (۶۲:۳۹) ”اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔“ زمین و آسمان کو وہی چلانے والا ہے اور اپنے ارادے اور مشاکے مطابق اللہ زمین و آسمان کو چلاتا ہے۔ یہ پوری کائنات اللہ کے نظام تضاد و قدر کے مطابق چلتی ہے۔ اللہ کے ارادے کے سوا کسی اور کا ارادہ ان تصرفات میں دخل نہیں ہے۔ اس بات کی شہادت فطرت دہتی ہے۔ حقیقت و واقعہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے اور انسانی عقل و ضمیر بھی اس کی تائید میں ہے۔

وَٱلَّذِينَ كَفَرُوا بِآيٰتِ ٱللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ ٱلْخٰسِرُونَ ﴿۶۳﴾ (۶۳:۳۹) ”اور جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہیں وہی گھائے میں رہنے والے ہیں۔“ ان کو اس علم اور آگاہی سے محرومی ہے جس کے ذریعے ان کی زندگی اس پوری کائنات کی حرکت سے ہم آہنگ رہتی ہے۔ یہ ان کے لیے بڑا خسارہ ہے۔ وہ ہدایت کی راحت اور ایمان کے حسن سے محروم رہے اور اعتقاد اور نظریہ کے اطمینان اور یقین کی مناسبت سے بھی محروم رہے اور آخرت

میں وہ خود بھی کھائے میں رہے اور ان کی وجہ سے ان کے خاندان بھی کھائے میں رہے۔ وہ تو اس قدر نقصان اٹھا رہے ہیں کہ ان پر افا سرون کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اس حقیقت کی روشنی میں جس پر آسمان اور زمین گواہ ہیں اور جس پر اس کائنات کی ہر چیز گواہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ان سے کہو: کیا تجویز کرتے ہو کہ میں تمہارے اہل کی بندگی کروں اور اس بدلے میں تم اہل العالمین کی بندگی کرو۔ کس قدر جاہلانہ تجویز ہے یہ؟ کیا سچائی کوئی بکنے والی جنس ہے جس کا بازاروں میں سودا ہوتا ہو۔

قُلْ أَفْخَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونَنِي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ ﴿۴۳﴾

”(اے نبی!) ان سے کہو ”پھر کیا اے جاہلوں! تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو۔“ یہ ایک فطری سرزنش ہے اور ان لوگوں کی پوچھ تجویز کا مناسب جواب ہے ان کی اس تجویز ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر گہری جہالت میں ڈوبے ہوئے تھے اور خالص اندھے تھے۔

چنانچہ اس کے بعد مشرک لوگوں کو ڈرایا جاتا ہے اور اس ڈراوے کے مخاطب اول حضور اکرمؐ اور تمام انبیاء علیہم السلام ہیں۔ حضرات انبیاء کے بارے میں تو شرک کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل یہ ڈراوا ان کی امتوں کو ہے کہ وہ اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں۔ اور بندگی صرف اللہ کی کریں اور تمام انسان جن میں انبیاء علیہم السلام بھی ہیں اللہ کو وحدہ لا شریک سمجھیں۔

وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ ۖ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَخْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۴۴﴾

”(یہ بات تمہیں ان سے صاف کہہ دی جا رہی ہے کہ) تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے۔“

شرک سے ڈراوے کا خاتمہ توحید پر کاربند ہونے کے حکم پر کیا جاتا ہے۔ یعنی صرف اللہ کی بندگی کرو اور ایمان اور ہدایت پر اللہ کا شکر ادا کرو اور اللہ کی ان نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرو جو اللہ کے بندوں کو دھانپ لیتی ہیں اور جن کو وہ گن بھی نہیں سکتے جبکہ وہ ان میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں:

بَلِ اللّٰهُ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِنَ الشّٰكِرِينَ ﴿۴۵﴾

”لہذا (اے نبی!) تم بس اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں سے ہو جاؤ۔“

--- () () () ---

اب اللہ جل شانہ کی قدرت اور اللہ کے مقام کے بارے میں جایا جاتا ہے جس کے ساتھ شریک کرنے کی تجاویز وہ دیتے تھے۔

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِۦ

”ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔“ حقیقت یہ کہ انہوں نے اللہ کی ذات کی قدر نہیں کی۔ ورنہ وہ اللہ کے ساتھ اس کی مخلوقات کو شریک نہ کرتے۔ نہ انہوں نے اللہ کی بندگی کا حق ادا کیا ہے کیونکہ وہ عقیدۂ توحید اور اللہ کی عظمت کو سمجھ ہی نہیں سکے۔ ان کو اللہ کی جلالت قدر کا شعور ہی نہیں ہے۔

اللہ کی جلالت قدر اور عظمت کا شعور ان کو یوں دیا جاتا ہے، قرآن کے مخصوص انداز بیان کے مطابق کہ قرآن اعلیٰ عقلی افکار کو بھی نہایت ہی مشغی انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ کلی اور عقلی مفہیم محدود انسانی ادراک کے قریب آجائیں۔

وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَالسَّمَوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ

بِيَمِينِهِۦ سُبْحَنَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۷۴﴾

”اس کی قدرت کاملہ کا حال تو یہ ہے کہ قیامت کے روز پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دست راست میں لیے ہوئے ہوں گے۔ پاک اور بال تر ہے وہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔“

قرآن دست میں جہاں جہاں اس قسم کی تصاویر اور مناظر آتے ہیں وہ دراصل تمثیلات ہیں اور حقائق کو انسانی ادراک کے قریب تر کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ معانی کو ایسے الفاظ میں بیان کیا جائے جن کا تصور ان کے لیے ممکن ہو، یہاں بھی اللہ کی قدرت مطلقہ کو مٹھی کی شکل میں لایا گیا ہے، ورنہ اللہ نہ کسی شکل، نہ کسی جگہ اور نہ کسی حد کا پابند ہے۔ یہاں عقلی حقائق کو حسی انداز دیا گیا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اس کے بعد قیامت کا ایک طویل منظر آتا ہے۔ اس کا آغاز نذرِ اولیٰ سے دوتا ہے اور خاتمہ اس وقت ہوتا ہے جب قیامت کے تمام معاملات چکا دیئے جا چکے ہیں۔ اور لیلِ جنم کو جنم کی طرف چلا دیا جاتا ہے۔ اور اہل جنت کو جنت کی طرف رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اور صرف ذاتِ باری رہ جاتی ہے اور تمام کائنات ذاتِ باری کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہوتی ہے۔

یہ ایک زبردست منظر ہے۔ جوش و خروش اور حرکت پر ہے اور اس کی حرکات نہایت ترتیب سے آہستگی کے ساتھ شروع ہوتی ہیں اور آگے بڑھتی ہیں۔ یہاں تک کہ تمام حرکات ختم ہو جاتی ہیں، تمام آوازیں بیٹھ جاتی ہیں اور منظر پر ایک خوفناک خاموشی چھا جاتی ہے۔ تمام مخلوقات اللہ واحد اور قہار کے سامنے سہم جاتی ہیں۔

دیکھئے! ایک سخت آواز بلند ہو جاتی ہے اور سب لوگ مرکزِ گر جاتے ہیں۔ اس وقت زمین میں موجود پوری آبادی چشمِ زدن میں بے جان ہو جاتی ہے۔ آسمانوں کی پوری مخلوق بھی ختم ہو جاتی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اب ہمیں یہ معلوم نہیں

ہے کہ کتے وقفے کے بعد دوسری چٹچ بلند ہوتی ہے۔ لیکن دوسری چٹچ بلند ہو جاتی ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي
الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اٰخَرٰى فَاِذَا هُمْ قِيٰاَمُ
يَنْظُرُوْنَ ﴿۶۸﴾

”اور اس روز صور پھونکا جائے گا اور وہ سب مرکز گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں‘ سوائے ان کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے۔ پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکایک سب کے سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔
یہاں تیسری آواز کا تذکرہ نہیں ہے۔ جس میں جمع ہونے اور اللہ کے ہاں حاضر کا حکم ہو گا۔ اور حشر و نشر کی چٹچ و پکار اور اژدہام کے شور کی تصویر کشی نہیں کی گئی کیونکہ اس منظر کو نہایت ہی پرسکون انداز میں پیش کرنا مطلوب ہے۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (۶۹:۳۹) ”زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی۔“۔ یعنی
وہ میدان جس میں قیامت برپا ہوگی۔ یہ میدان جہاں نور ربی ہو گا دو سرا کوئی نور نہ ہو گا۔

وَوَضِعَ الْكِتٰبُ (۶۹:۳۹) ”کتاب اعمال لاکر رکھ دی جائے گی۔“۔ وہ کتاب جس میں لوگوں کا
اعمال نامہ درج ہو گا۔

وَجَآئِیْ بِالنَّبِیِّیْنَ وَالشُّهَدَآءِ (۶۹:۳۹) ”انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیئے جائیں گے۔“۔ تاکہ
وہ حق بات کہہ دیں جو وہ جانتے تھے اور ہر تنازعہ وہاں طے کر دیا گیا۔ نہایت خاموشی کے ساتھ کیونکہ اس منظر میں تمام
معاملات خسوع اور خضوع سے طے ہوتے ہیں۔ کوئی تنازعہ نہیں رہتا۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوَضِعَ الْكِتٰبُ وَجَآئِیْ
بِالنَّبِیِّیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِیَ بَیْنَهُمُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَوُفِیَتْ
كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ﴿۷۰﴾

”لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا‘ ان پر کوئی ظلم نہ ہو گا اور ہر تنفس کو جو کچھ بھی
اس نے عمل کیا تھا‘ اس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں‘ اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔“۔

یہاں کسی کو کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے 'نہ کوئی آواز اٹھانے کی یہاں کوئی ضرورت ہے۔ چنانچہ پوری انسانیت کا حساب و کتاب بڑی خاموشی کے ساتھ لپیٹ لیا جاتا ہے اور اجمال کے ساتھ جبکہ دوسرے مناظر میں تفصیلات دی گئی ہیں، کیونکہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس دن اللہ کا رعب اور خوف چھایا ہوا ہو گا۔ اور اللہ کے جلال کے سامنے کسی کو دم مارنے کی سکت نہ ہوگی۔

وَسَيَقُ الَذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا
فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ
عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَلَكِنْ حَقَّتْ
كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٢١﴾

”(اس فیصلہ کے بعد) وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا، جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانگے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے، تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے ”کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جنہوں نے تم کو تمہارے رب کی آیات سنائی ہوں اور تمہیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمہیں یہ دن بھی دیکھنا ہو گا؟“ وہ جواب دیں گے۔ ”ہاں، آئے تھے، مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا۔“

یہاں فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور کہیں گے ہاں تم اس جہنم کے مستحق ہو اور یہ ہیں اس کے اسباب۔ کافروں کے خلاف اللہ کا فیصلہ برحق صادر ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اس لیے کافر یہاں بغیر کسی خاصیت کے اسے تسلیم کرتے ہیں، اقرار کرتے ہیں کہ ہم مجرم تھے اور سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

قِيلَ ادْخُلُوا ابْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيْهَا ۚ فَيُسْ مَثْوًى الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٢٢﴾

”کہا جائے گا، داخل ہو جاؤ، جہنم کے دروازوں میں، یہاں اب تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، بڑا ہی برا ٹھکانا ہے یہ تکبروں کے لیے۔“ یہ جہنمیوں کا قافلہ ہے۔ تکبرین کا قافلہ ہے۔ وہ گیا، اس کے لیے دروازے کھلے۔۔۔ لیکن دیکھئے دوسری طرف مستقین کا قافلہ بھی آرہا ہے۔ یہ اہل جنت کا قافلہ ہے!

وَسَيَقُ الَذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَىٰ الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا
وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا
خَالِدِينَ ﴿٢٣﴾

”اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے، اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے، تو اس کے نخطمین ان سے کہیں گے کہ ”سلام ہو تم پر بہت اچھے رہے“ داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لیے۔“

یہ ایک بہترین استقبال ہے۔ تعریف ہے۔ اور اس کے اندر اس کا سبب بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ ”طہتم“ تم تمہارے رہے، یعنی تم پاکیزہ رہے۔ تم پاک تھے۔ پاک ہو کر آئے کیونکہ جنت میں تو پاک لوگ ہوں گے۔ پاک لوگ ہی وہاں داخل ہو سکتے ہیں کیونکہ وہاں تو ظلود اور نعمتیں ہیں۔

اب یہاں اللہ جنت کی آوازیں نہایت خشوع سے بلند ہوتی ہیں اور وہ دھیمی آواز کے ساتھ اللہ کی تسبیح و تہجد کرتے ہیں۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدًا وَأَوْثَقَنَا
الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَمِلِينَ ﴿۸۵﴾

”اور وہ کہیں گے ”شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا“ اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔“

یہ جنت کی سرزمین کے وارث ہو گئے۔ جہاں چاہتے ہیں اس کے اندر جا رہے ہیں اور بس رہے ہیں۔ جو چاہتے ہیں کھا رہے ہیں، سب کچھ موجود ہے۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔

اب اس منظر کا خاتمہ نہایت ہی خوفناک انداز میں ہوتا ہے، لیکن یہ جلال بھی نہایت دھیمی انداز کا ہے۔ اس منظر کی نفا سے ہم رنگ۔ پوری کائنات رب کی شانیں رطب اللسان ہے۔ نہایت ہی دھیمے انداز میں، خشوع اور سرا گندگی کے ساتھ اور ہر زندہ مخلوق جس کلمے کو دہراتی وہ نہایت عجز کے ساتھ دہراتی ہے۔

وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ
رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۸۶﴾

”اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہوں گے اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ چکا دیا جائے گا“ اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے ”اللہ رب العالمین کے لیے۔“

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ---- ۲۴

سورۃ المؤمن - ۴۰

آیات ۱ تا --- ۸۵

سورۃ المؤمن ایک نظر میں

اس سورت میں حق و باطل کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ایمان اور کفر کے مسئلے پر بحث ہے۔ دعوت اسلامی کے مقاصد اور زمین پر جابرانہ نظام اور بغیر استحقاق کے اقتدار کے حصول کے مسائل پر بحث آئے ہیں۔ اور یہ بتایا گیا کہ اس طرح جبر اور قہار لوگوں کے ساتھ اللہ کا پھر سلوک کیا ہوتا ہے۔ اس موضوع کے درمیان مومنین اور اللہ کے مطیع فرمان لوگوں کو تسلی دی جاتی ہے کہ اللہ کی نصرت تمہارے شامل حال رہے گی۔ فرشتے تمہارے لیے دعاگو ہیں اور اللہ تمہارے بارے میں فرشتوں کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور آخرت میں تو بہت بڑے انعام و اکرام تمہارے انتظار میں ہیں۔

اس سورت کی مجموعی فضا اس کے موضوع کے اعتبار سے یوں لگتی ہے کہ گویا جنگ ہو رہی ہے اور کشمکش برپا ہے۔ حق و باطل کا باہم ٹکراؤ ہے۔ ایمان اور کفر میدانِ معرکہ میں ہیں۔ زمین کی سرکش قوتوں کے مقابلے میں عذاب الہی ہے کہ انہیں تباہ و برباد کر رہا ہے اور اس فضائے کشمکش کے درمیان جب مومنین کا ذکر آتا ہے تو گویا رحمت خداوندی کی بارِ نسیم چل پڑتی ہے۔

معرکہ کی یہ فضا اس سورت میں جا بجا بکھری ہوئی ہے۔ جہاں اقوام ماضی کی جاہی کے مناظر آتے ہیں ان میں بھی اور جہاں قیامت کے مناظر آتے ہیں ان میں بھی ہے اور انداز بیان نہایت ہی سخت اور خوفناک ہے۔ جس طرح پوری سورت کی فضا ہے۔ رعب، شدت اور سختی اس کے انداز بیان کا خاص رنگ ہے۔

غالباً اس سورت کی عمومی فضا کی مناسبت ہی سے شاید سورت کا آغاز شاندار اور زوردار فقروں سے کیا گیا ہے جن کے ذریعہ غور و فکر کی تاروں پر زوردار ضربات لگا کر ایک خاص زمرہ پیدا کیا گیا ہے :

غَافِرِ الذُّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطُّوْلِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِلَيْهِ

الْمَصِيرُ (۳: ۴۰) ”گناہ معاف کرنی والا“ توبہ قبول کرنے والا سخت سزا دینے والا“ بڑا صاحب فضل ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں، اس کی طرف پلٹنا ہے۔“ یہ منظم ضربات ہیں جن کی آواز منظم ہے، جن کی تاخیر مستقل ہے، آیات کے مقاطع جس طرح زوردار ہیں، اسی طرح معانی بھی ذی جلال ہیں اور موسیقی بھی پر تاثیر ہے۔

اسی طرح اس سورت میں الساس، باس اللہ، باسنا کے الفاظ بار بار دہرائے جاتے ہیں اور سورت میں مختلف مقامات پر آتے ہیں۔ اس کے سوا بعض دوسرے الفاظ بھی ہیں جن کے مفہوم و مراد میں سختی پائی جاتی ہے۔

باسم یوں نظر آتا ہے کہ پوری سورت میں دل و دماغ کو کھٹکھٹایا جاتا ہے اور بہت ہی زوردار انداز میں تاکہ انسان کا دل و دماغ بیدار ہو، یہ سختی گزشتہ ملتوں کی ہلاک شدہ اقوام کے واقعات کے بیان میں بھی ہے اور قیامت کے مظاہر کے

بیان کے دور ان بھی ہے۔ لیکن بعض اوقات انداز بیان نرم بھی ہو جاتا ہے۔ دل و دماغ کے تاروں کو نرمیت ہی لطف اور محبت سے چھیڑا جاتا ہے، خصوصاً جبکہ ان فرشتوں کا بیان آتا ہے جو حاملین عرش ہیں، جو اپنے رب کو پکارتے ہیں کہ اے اللہ اپنے مومن بندوں پر فضل و کرم فرما اور خصوصاً اس وقت جب انسان کے سامنے اس کائنات کی نشانیاں پیش کی جا رہی ہوں یا خود نفس بشری کے اندر موجود آیات دکھائی جا رہی ہوں۔

بعض مشاہدوں کا یہاں ذکر ضروری ہے جن سے معلوم ہو کہ سورۃ میں پایا جانے والا سخت انداز کیا ہے اور نرم انداز کیا ہے۔۔۔ ہلک شدہ اقوام کے بارے میں :

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَدَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتَهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابُ

(۴۰: ۵) ”ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم بھی جھٹلا چکی ہے اور اس کے بعد بہت سے جہنموں نے بھی یہ کام کیا۔ ہر قوم اپنے رسوں پر جھنپی تاکہ اسے گرفتار کرے، ان سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو بچا دکھانے کی کوشش کی مگر آخر کار میں نے ان کو پکڑ لیا، پھر دیکھ لو میری سزا کیسی سخت تھی۔“

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ (۴۰: ۲۱) ذَلِكَ بَأْنَهُمْ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا

فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ أَنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۴۰: ۲۲) ”کیا یہ لوگ بھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا۔ جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین پر چھوڑ گئے تھے۔ مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا، اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول بجا بے لے کر آئے اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا“ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا۔ یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔

اور قیامت کے مناظر میں یہ دو منظر:

وَأَنْذَرَهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كُظُمِينَ مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ

وَلَا شَفِيعٌ يُطَاعُ (۴۰: ۱۸) ”اور ان لوگوں کو اس دن سے جو قریب آگیا ہے، ڈراؤ، جب کیجے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ پی رہے ہوں گے، ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہو گا اور نہ کوئی شفیع

جس کی بات مانی جائے۔“

الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۷۰:۴۰)
 إِذِ الْأَغْلُلُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلْسِلُ يُسْحَبُونَ (۷۱:۴۰) فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ
 يُسْجَرُونَ (۷۲:۴۰) ”یہ لوگ اس کتاب کو اور ان ساری کتابوں کو بھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں
 کے ساتھ بھیجی تھیں، فقریب انہیں معلوم ہو جائے گا جب طوق ان کی گردن میں ہوں گے اور زنجیروں جن سے پکڑ کر وہ
 کھولتے ہوئے پانی کی طرف کھینچے جائیں گے اور پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔“
 اور وہ دیکھئے کہ حالمین عرش نہایت ہی خشوع کے ساتھ مومنین کے لیے دعا کر رہے ہیں! کس قدر خوشگوار اور
 تروتازہ منظر ہے۔

الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَ
 يَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَ
 اتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْحَجِيمِ (۷:۴۰) رَبَّنَا وَادْخُلْهُمْ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي
 وَعَدْتَهُمْ وَمِنْ صَلَاحٍ مِنْ أَبَائِهِمْ وَازْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
 الْحَكِيمُ (۸:۴۰) وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ وَذَلِكَ
 هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۹:۴۰) ”عرش الہی کے حامل فرشتے اور وہ جو عرش کے گرد پیش حاضر رہتے ہیں، سب
 اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے
 مغفرت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: ”اے ہمارے رب تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ بس
 معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچا لے ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیسرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے
 ہمارے رب اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں، جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے والدین اور
 بیویوں اور اولاد سے جو صالح ہوں۔ تو بلاشبہ قادر مطلق اور حکیم ہے۔ اور بچا دے ان کو برائیوں سے اور جن کو تو نے
 قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا، اس پر تو نے بڑا رحم کیا۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔“

اس سورت میں ان نشانات کو بھی بیان کیا گیا ہے جو انفس و آفاق میں ہیں، نہایت ہی دلکش اور نرم انداز میں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشَدَّكُمْ

ثُمَّ لَتَكُونُوا شُيُوعًا وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۶۷:۴۰) هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ فَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ

فَيَكُونُ (۶۸:۴۰) ”وہی تو ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے ٹوٹے سے، پھر تمہیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمہیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو، وہی ہے زندگی دینے والا اور وہی ہے موت دینے والا۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے، بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے، وہ ہو جاتی ہے۔“

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ (۶۱:۴۰) ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَّا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَإِنِّي تُؤَفِّكُونَ (۶۲:۴۰) ”وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو، اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے، ہر چیز کا خالق، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر تم کہہ رہے ہو۔“

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ قَرَارًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُورَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُم فَتَبَرَّكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ

(۶۴:۴۰) ”اللہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اوپر آسمان کا گنبد بنایا جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی، جس نے تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔ وہی تمہارا رب ہے، بے حساب برکتوں والا ہے، وہ کائنات کا رب ہے۔“

یہ دونوں قسم کے انداز اور مناظر سورت کی نفاذ جاتے ہیں۔ اور یہ اس کے موضوع اور مضمون کے مطابق مناسب انداز بیان بھی ہیں۔ سورت کا سیاق ہم نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ چار ممتاز اسباق پر مشتمل ہے۔ پہلا سبق حروف مقطعات سے سورت کا آغاز کرتا ہے۔

حَمْدٌ (۱۰۴۰) تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۲:۴۰) ”ہا، میم“ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے، جو زبردست ہے، سب کچھ جاننے والا ہے۔ اور اس کے بعد عقل و خرد کے تاروں پر وہ مضبوط اور مستقل ضربات ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطُّوْلِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۴۰: ۳) ”گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحبِ فضل ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں، اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔“ اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات مسلم ہے۔ اور اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والی ہے۔ اور اللہ کی نشانیوں کے بارے میں وہی لوگ مجاہدہ کرتے ہیں جو کفر پر اصرار کرتے ہیں لہذا وہ اس پوری کائنات سے مختلف رویہ اختیار کرتے ہیں۔ لہذا وہ اس قاتلِ حق نہیں ہیں کہ ان کو رسول اللہ کوئی اہمیت دے۔ اگرچہ وہ مالدار ہوں اور ان کی بات چلتی ہو۔ کیونکہ یہ اسی انجام تک پہنچنے والے ہیں جس سے اس سے قبل انسانی تاریخ کے دوسرے مہذبین پہنچے۔ اللہ نے ان کو خوب پکڑا۔ اور ان کو ایسا عذاب دیا جو حیران کن تھا۔ اس دنیا میں بھی ان کو عبرتناک سزا دی گئی اور آخرت کا عذاب تو مستلماً ان کے لیے تیار ہے اور ان کے انتظار میں ہے۔ یہ تو کفر کرتے ہیں لیکن جن فرشتوں نے اللہ کے عرش کو اٹھا رکھا ہے، وہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنے رب پر ایمان مائے ہیں۔ اس کی بندگی کرتے ہیں پھر زمین میں جو لوگ ایمان لاتے ہیں۔ یہ حاملینِ عرش ان کے لیے دعا کرتے ہیں، ان کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور ان کے لیے دائمی نعمتوں اور فلاح کی دعا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قیامت میں کافروں کے منظر کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے کہ ان پر یہ پوری کائنات ہر طرف سے آوازے کسے گی، وہ کائنات جو مومن اور سر تسلیم خم کرنے والی ہے:

لَمَقَّتْ اللَّهُ أَكْثَرُ مِنْ مُفْتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ إِذْ تُدْعَوْنَ إِلَى الْإِيمَانِ فَتَكْفُرُونَ

(۴۰: ۱۰) ”آج تمہیں جتنا شدید غصہ اپنے اوپر آ رہا ہے۔ اللہ تم پر اس سے زیادہ غضبناک ہے اس وقت ہوتا تھا جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم کفر کرتے تھے۔“ اب یہ لوگ انکسار کے بجائے نہایت ہی ذلت کے مقام پر کھڑے ہیں، اپنے گناہوں کا اقرار کر رہے ہیں، رب کا اعتراف کر رہے ہیں لیکن یہ اقرار و اعتراف مفید ہی نہیں ہے۔ بس وہی گناہ یاد کیے جا رہے ہیں جو یہ شرک اور تکبر کی صورت میں کرتے تھے اور اب روئے سخن قیامت کے اس منظر سے پھر کر دنیا میں آ جاتا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا (۴۰: ۱۳) ”وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور آسمانوں سے تمہارے لیے رزق نازل کرتا ہے۔“ یہ اس لیے یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ رب کی طرف لوٹ کر اسے وحدہ لا شریک سمجھیں۔

فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (۴۰: ۱۴) ”اللہ ہی کو پکارو، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، خواہ تمہارا یہ فعل کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔“ پھر وحی کی طرف اشارہ آتا ہے اور قیامت کے ہولناک دن سے ڈرایا جاتا ہے۔ اور پھر قیامت کا ایک منظر

يَوْمَ هُمْ بَرْزُورُونَ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ (۴۰: ۱۶) ”وہ دن جب کہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہوگی۔“ اس دن جبار، تکبر اور جھگڑنے والوں کا نام و نشان نہ ہوگا۔

لَمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۰: ۱۶) ”آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ واحد قہار کی۔“ آج کے دن کا بیان چلتا ہے۔ جہاں فیصلے اور احکام صرف اللہ کے چلتے ہیں اور اللہ کے سوا جو دوسرے معبود تھے وہ چھپ گئے ہیں۔ منہمک ہو گئے ہیں۔ جس طرح اس دن سرکشوں اور فاسق فاجر لوگوں کا کوئی نام و مقام نہیں ہے۔ دوسرے سبق میں سابق اقوام کی ہلاکتوں سے بات چلتی ہے۔ اس کا آغاز حضرت موسیٰ اور فرعونؑ ہامان اور قارون کے قصے سے ہوتا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ ہمیشہ سرکش لوگ دعوتِ اسلامی کے مقابلے میں کیا رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں قصہ موسیٰ کا ایک ایسا حصہ بیان کیا جاتا ہے جو اس سے پہلے بیان نہیں ہوا۔ اور یہ کڑی صرف اسی سورت میں ہے۔ ایک مومن شخص حضرت موسیٰ کی حمایت کرتا ہے اور ان کے قتل کے منصوبے کی مخالفت کرتا ہے۔ اور نہایت ہی احتیاط کے ساتھ حق بات کہتا ہے۔ نرمی اور حکمت کے ساتھ بات شروع کرتا ہے اور جب سمجھتا ہے کہ بات میں اثر ہے تو وہ نہایت وضاحت اور صراحت سے اپنی بات کرتا ہے اور اپنی تقریر میں وہ حق کے دلائل دیتا ہے۔ یہ دلائل نہایت قوی اور واضح ہیں وہ ان کو قیامت کے دن سے ڈراتا ہے اور قیامت کے بعض مناظر بھی ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نہایت موثر انداز میں یہ شخص تقریر کرتا ہے۔ یہ شخص ان کو خود ان کا موقف بھی یاد دلاتا ہے اور اس سے قبل انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی یاد دلاتا ہے۔ اور قصے کے آخر میں وہ ان کو قیامت کے مناظر تک لے جاتا ہے کہ وہاں وہ آگ میں ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں۔ اور ضعیف اور متکبرین ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہیں اور پھر یہ سب جہنم کے دلدرد غلوں کے ساتھ مکالمہ کرتے ہیں کہ کیا کوئی صورت ہے رہائی کی۔ لیکن اے کاش کہ وقت گزر گیا ہے۔ اس تقریر اور اس منظر کی روشنی میں حضورؐ کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں اور حمد و تسبیح کے ساتھ استغفار کریں۔

نیسرے سبق کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ جو لوگ سچ بات کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کو اس بات پر وہ کبر آمادہ کرتا ہے جو ان کے نفس میں ہوتا ہے حالانکہ وہ اپنے آپ کو جس قدر بڑا سمجھتے درحقیقت اس کے مقابلے میں ان کے قد اتنے ہی بونے ہوتے ہیں۔ یہاں سیاق کلام لوگوں کو اس عظیم کائنات کی طرف متوجہ کرتا ہے جسے اللہ نے پیدا کیا اور وہ اللہ ہے جو اکبر اور کبیر اور متکبر ہے۔ یہ اس لیے کہ شاید وہ اللہ کی عظمت اور کائنات کی عظمت کو دیکھ کر اپنے حدود میں آجائیں۔ اور ان کی آنکھیں کھل جائیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ

قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ (۴۰: ۵۸) ”اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائیں اور ایماندار اور صالح اور بدکار برابر ٹھہریں۔ مگر تم لوگ کم ہی سمجھتے ہو۔“ پھر ان کو قیام قیامت کی یاد دہانی کی جاتی ہے اور ان کو اس دعا کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو مستجاب ہوتی ہے جو لوگ اللہ کو پکارنے سے لپٹے آپ کو برتر سمجھتے ہیں وہ جہنم میں لٹے منہ پھینکے جائیں گے ذلیل و خوار ہوں گے۔ یہاں بعض ایسی نشانیوں کو ان کے سامنے رکھا جاتا ہے جن پر سے وہ رات اور دن گزرتے ہیں لیکن ان سے غافل ہو کر گردشِ لیل و نهار زمین کا اپنی جگہ رکے رہے۔ انہوں کی دوریاں اور چھت کی طرح رہنا۔ پھر خود حضرت انسان کی رات و شخصیت اور اس کی خوبصورتی۔ ان سب دلائل کے پیش نظر کہا جاتا ہے کہ

صرف اللہ کو پکارو اس کے دین کو خالص کرتے ہوئے 'حضور' سے فرمایا جاتا ہے کہ آپ ان کے معبودوں کی عبادت سے برات کا اعلان کر دیں کہ اللہ نے مجھے اس سے روکا ہے اور یہ حکم دیا کہ میں صرف خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں۔ اس لیے کہ صرف اللہ ہے جس نے انسان کو مٹی سے اور نطفے سے پیدا کیا، وہی پیدا کرنے والا اور مارنے والا ہے۔ حضور سے نہایت تعجب کے انداز میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور عذاب قیامت کا ایک خوفناک منظر پیش کر کے ان کو ڈرایا جاتا ہے۔

اِذِ الْاَغْلُلُ فِيْ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلْسِلُ يُسْحَبُوْنَ (۷۱ : ۴۰) فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي

النَّارِ يُسْحَرُوْنَ (۷۲ : ۴۰) ”جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں جن سے پکڑ کر وہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف کھینچے جائیں گے اور پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔“ اس وقت ان کے معبود اس بات کا انکار کر دیں گے کہ وہ انہیں پوجتے تھے اور آخر کار یہ جہنم رسید ہوں گے۔

اَدْخُلُوْا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوًى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۷۶ : ۴۰) ”اب

جاؤ، جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے۔ بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا۔“ اس منظر کی روشنی میں اللہ حضور اکرم کو قتل دیتا ہے کہ آپ صبر کرس اور یقین کرس کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے چاہے آپ موجود ہوں اور ان کا انجام دیکھیں یا آپ کی وفات کے بعد یہ لوگ اس انجام سے دو چار ہوں اور اللہ کا وعدہ پورا ہو۔

آخری سبق کا مضمون تیسرے سبق سے ملتا جلتا ہے۔ حضور کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ صبر کرس، انتظار کرس، آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے گئے اور ان کے ساتھ یہی ہوا۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ اَنْ يَّاتِيَ بِآيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۷۸ : ۴۰) ”کسی رسول کی یہ طاقت نہ

تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی لے آئے۔“ اور یہ دیکھتے نہیں کہ یہ کائنات ایک پوری نشانی ہے۔ ان کے سامنے معجزات موجود ہیں۔ لیکن یہ ان پر غور نہیں کرتے۔ کیا یہ جانوروں پر غور نہیں کرتے، جو ان کے لیے مسخر کر دیئے

ہیں، کیا یہ سمندروں میں کشتیوں کی پلٹ کو نہیں دیکھتے، کیا یہ انسانی تاریخ پر غور نہیں کرتے کہ کس طرح اللہ نے بڑی بڑی قوموں کو نیست و نابود کر دیا اور سورت کا خاتمہ ایک ایسی قوی ضرب سے ہوتا ہے جس سے دل و دماغ کی تمام یاہیں

زحرمہ بکھیرتی ہیں کہ جب جھٹلانے والوں پر ہاکت آئی اور انہوں نے عذاب دیکھا تو فوراً پر خود ارباب بن گئے اور ایمان لانے لگے لیکن فَلَمْ يَكُنْ يَنْتَعِمُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُبَّتَ اللّٰهُ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهِ وَخَسِرَ هُنَالِكَ

الْكُفْرُوْنَ (۸۵ : ۴۰) ”مگر ہمارا عذاب دیکھنے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے نافع نہ ہو سکا تھا کیونکہ یہی اللہ کا مقرر

ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں پر جاری رہا ہے، اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے۔“ یہ ہے سورت کا خاتمہ جس میں متکبرین کا انجام بتایا گیا ہے اور یہ خاتمہ اس سورت کے موضوعات و مضامین اور اس کی فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

اب ہم اس سورت کے اسباق و آیات کی تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔

درس نمبر ۲۲۳ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۲۰



حَمْدٌ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۹﴾ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ
التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿۱۰﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ح‘م۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے‘ سب کچھ جاننے والا ہے‘ گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے‘ سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحب فضل ہے‘ کوئی معبود اس کے سوا نہیں‘ اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔“

یہ سورت ان سات سورتوں میں سے پہلی سورت ہے جن کا آغاز حالور میم کے حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک سورت لکی ہے جس میں حا۔ میم کے بعد عین‘ سین اور قاف بھی آیا ہے۔ حروف مقطعات کے بارے میں ہم تمام سورتوں میں کہہ آئے ہیں کہ ان میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ کلام انہی حروف جچی سے بنا ہے اور یہ ایک معجز کلام ہے حالانکہ یہ حروف جچی تمہاری دسترس میں ہیں۔ یہ تمہاری زبان کے حروف ہیں اور اس زبان کو تم بولتے بھی ہو‘ لکھتے بھی ہو۔

ان حروف کے بعد پھر نزول کتاب کی طرف اشارہ ہے۔ یہ وہ بات ہے جو اکثر کی سورتوں کے آغاز میں کہی جاتی ہے جن کا مضمون اکثر اسلامی نظریہ حیات اور کلمہ توحید سے ہوتا ہے۔

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۲: ۴۰) ”اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔“

اس اشارے کے بعد اب بات اس ذات کی بعض صفات کی طرف منتقل ہوتی ہے جس نے یہ کلام نازل کیا ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جن کا اس سورت کے موضوع کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ اس سورت میں جو موضوعات اور جو مسائل لیے گئے ہیں ان کے ساتھ ان صفات الہی کا ربط ہے۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطُّوْلِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِلَهٌ

الْمَصِيرُ (۳: ۴۰) ”زیر دست ہے‘ سب کچھ جاننے والا ہے‘ گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے‘ سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحب فضل ہے‘ کوئی معبود اس کے سوا نہیں‘ اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔“

اس آیت میں عزت‘ علم‘ گناہوں کی مغفرت‘ توبہ کی قبولیت‘ سخت سزا‘ فضل و کرم‘ الوہیت اور حاکمیت کی وحدت اور سب لوگوں کا اس کی طرف لوٹنے کی صفات بیان کی گئی ہیں۔

اور اس سورت کے تمام موضوعات انہی معانی کے ارد گرد گھومتے ہیں جن کو اس آیت میں قلم بند کیا گیا ہے۔ اس آیت میں نہایت زور دار انداز‘ زور دار آواز میں اور قوی ترکیب اور جملوں میں نہایت پختگی اور استقلال سے لایا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ صفات یہاں متعارف کرائی ہیں جن کا انسانی وجود اور انسانی زندگی پر گہرا اثر ہے۔ یوں اللہ نے انسانوں کے دلوں اور ان کے شعور کے احساسات کو تیز کیا۔ ان کے اندر رجائیت پیدا کی اور امید کو جگایا۔ ان کے اندر خوف اور تقویٰ پیدا کیا اور ان کو یہ یقین دلایا گیا کہ وہ اللہ کے قبضے میں ہیں۔ وہ اللہ کے تصرفات سے کیسی بھاگ نہیں سکتے۔ ذرا ان صفات کا تفصیلی جائزہ لیں۔

الْعَزِيزُ (۲: ۴۰) ”وہ قوی اور قادر مطلق جو ہر کسی پر غالب ہے‘ اور اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ وہ تمام امور میں تصرف کرتا ہے اور اس پر کوئی قدرت نہیں رکھتا اور نہ اس کے اوپر کوئی مگر ان ہے۔“

الْعَلِيمُ (۲: ۴۰) وہ ذات ہے جو اس کائنات کو علم اور مہارت سے چلاتی ہے‘ اس پر اس کائنات کا کوئی راز مخفی نہیں ہے۔ اور کوئی چیز اس کے علم سے غائب نہیں ہے۔

غَافِرِ الذَّنْبِ (۳: ۴۰) وہ جو بندوں کے گناہوں کو بخشا ہے‘ ان بندوں کے گناہوں کو جن کے بارے میں اپنے شامل علم کے ذریعے اللہ جانتا ہے کہ وہ بخشش کے مستحق ہیں۔

وَقَابِلِ التَّوْبِ (۳: ۴۰) وہ جو نافرمانوں پر مہربانی کرتا ہے اور ان کو لوٹا کر اپنے خیرہ امن میں لاتا ہے اور ان کے لیے اپنی رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے اور بلا روک ٹوک ان کو اندر آنے دیتا ہے۔

شَدِيدِ الْعِقَابِ (۳: ۴۰) جو مستکبرین کو نیست و نابود کرتا ہے‘ اور اسلام کے دشمنوں کو سزا دیتا ہے‘

جو نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ استغفار کرتے ہیں۔

ذی الطُول (۳: ۴۰) وہ جو لوگوں کو انعامات دیتا ہے 'جو ٹیکوں میں اضافہ کرتا ہے اور لوگوں کو اس قدر دیتا ہے کہ ان انعامات کا کوئی حساب نہیں کیا جاسکتا۔

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ (۳: ۴۰) الوہیت 'حاکمیت اسی کی ہے' اور وہ وحدہ لا شریک ہے 'اپنی ذات و صفات ہیں۔

إِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۳: ۴۰) حساب و کتاب کے لیے ہر کسی نے اس کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور اس سے ملاقات ہوگی۔ تمام مخلوق نے اسی کی طرف لوٹنا ہے اور وہی لوٹنے کی جگہ ہے۔ یوں بندوں کا تعلق اللہ سے اور اللہ کا تعلق بندوں سے واضح کیا جاتا ہے۔ بندوں کے شعور ان کے تصورات 'ان کے ادراک' اور ان کے علم میں اللہ سے رابطہ بنھ جاتا ہے۔ اس طرح انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ کس قدر چوکنا ہو کر اور احتیاط سے معاملہ کرنا ہے اور یہ جانتے ہوئے معاملہ کرنا ہے کہ کس چیز سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور کس چیز سے راضی ہوتا ہے۔

جن لوگوں کے ادیان اور عقائد انسانی ہیں 'وہ اپنے الہوں کے بارے میں جو تصور رکھتے ہیں' وہ اس کے بارے میں حیرت میں رہتے ہیں 'انہیں ان الہوں کے بارے میں کوئی ٹھوس معلومات نہیں ہوتیں' ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ کیا چیز انہیں ناراض کرتی ہے اور کس سے وہ راضی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے الہوں کی جو تصویر کھینچتے ہیں۔ اس کے مطابق ان الہوں کی خواہشات بدلتی رہتی ہیں 'ان کا رجحان صاف نہیں ہوتا۔ وہ الہ جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان الہوں کے ساتھ ہمیشہ بے چینی کی زندگی گزارتے ہیں اور ہر وقت اس بات کی تلاش میں رہتے ہیں کہ ان کی رضا کس میں ہے اور کس میں نہیں ہے۔ آیا وہ تعویذوں سے راضی ہوتے ہیں 'قرآنوں سے راضی ہوتے ہیں۔ ذبیحوں سے راضی ہوتے ہیں یا اور اگر وہ یہ کام کر بھی گزرے تو بھی ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ راضی ہو گئے یا نہیں ہوئے۔

ان حالات میں اسلام آیا 'اس نے واضح اور متحرک تصورات و عقائد دیئے 'لوگوں کو اپنے سچے خدا سے ملا دیا۔ ان کو اللہ کی صحیح صفات سے آگاہ کر دیا۔ ان کو اللہ کی مشیت کے بارے میں بتا دیا 'یہ بھی صاف صاف بتا دیا کہ وہ اللہ کے قریب کس طرح ہو سکتے ہیں 'اس کی رحمت کی امید وہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ اس کے عذاب سے کس طرح ڈر سکتے ہیں اور اللہ کا سیدھا اور درست راستہ کون سا ہے۔

--- ۰ ۰ ۰ ---

مَا يُجَادِلُ فِي آيَاتِ اللَّهِ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَا يَغْرُرُكَ تَقْلُبُهُمْ
فِي الْبِلَادِ كَذَبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ
كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَدَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ

الْحَقُّ فَآخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۗ وَكَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ

”اللہ کی آیات میں جھگڑ نہیں کرتے مگر صرف وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے۔ اس کے بعد دنیا کے ملکوں میں ان کی چلت پھرت تھیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ ان سے پہلے نوح کی قوم بھی جھگڑ چکی ہے اور اس کے بعد بہت سے دوسرے جنہوں نے بھی یہ کام کیا ہے۔ ہر قوم اپنے رسول پر جھپٹی تاکہ اسے گرفتار کرے۔ ان سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو بچا دکھانے کی کوشش کی، مگر آخر کار میں نے ان کو پکڑ لیا، پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ اسی طرح تیرے رب کا یہ فیصلہ بھی ان سب لوگوں پر چسپاں ہو چکا ہے۔ جو کفر کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واصل جہنم ہونے والے ہیں۔“

اس فیصلے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند صفات رکھتا ہے اور وہ وحدہ ماشریک ہے، اب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حقائق، اس کائنات کی ہر چیز کی طرف سے مسلم ہیں کیونکہ اس کائنات کی فطرت ان حقائق کے ساتھ مربوط ہے اور یہ تعلق براہ راست ہے جس میں کوئی تنازعہ اور کوئی مجادلہ نہیں ہے۔ یہ پوری کائنات بڑے اطمینان سے آیات الہیہ کو تسلیم کرتی ہے، اللہ کی وحدانیت پر شاہد دل ہے۔ اور اس میں مجادلہ و حق لوگ کرتے ہیں جو کفر پر تلے ہوئے ہیں اور یہ لوگ اس کائنات سے منحرف ہیں۔

مَا يُجَادِلُ فِي آيَاتِ اللَّهِ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا (۴۰: ۴) ”اللہ کی آیات میں جھگڑے نہیں کرتے مگر وہی لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے۔“ ”یہی لوگ“ یعنی اس کائنات میں سے صرف وہی لوگ اکیلے ان آیات کا انکار کرتے ہیں جو کفر پر تلے ہوئے ہیں۔ اس عظیم مخلوقات میں سے صرف یہی لوگ منحرف ہیں۔ اور ان کی اس عظیم الشان وجود میں چوٹی سے بھی کم حیثیت ہے۔ جس طرح اس کرۂ ارض کی نسبت سے ایک چوٹی حقیر شے ہے۔ اس طرح اس کائنات کے حوالے سے انسان ایک چوٹی سے بھی کم ہے۔ لیکن جھگڑتا ہے یہ حضرت انسان اللہ کی نشانیوں کے بارے میں، جبکہ یہ عظیم کائنات اہل کفر کے مقابلے میں کھڑی ہے۔ اور حق تعالیٰ کا اعتراف کر رہی ہے۔ اور عزیز و جبار کی قوتوں کی معترف ہے۔ یہ لوگ اس موقف میں اپنے انجام کے خلاف کھڑے ہیں۔ یہ لوگ چاہے دنیا میں قوت رکھتے ہوں اور جاہ و مال کے مالک ہوں اور مقتدر اعلیٰ ہوں، لیکن جس جگہ انہوں نے جانا ہے اس کی انہیں کوئی قار نہیں ہے۔

فَلَا يَخْرُوكْ تَغْلِبُهُمْ فِي الْبِلَادِ (۴۰: ۴) ”اس کے بعد دنیا کے ملکوں میں ان کی چلت پھرت تھیں دھوکے میں نہ ڈالے۔“ وہ جس قدر دوزد دھوپ کریں، جس قدر اقتدار اور مال و جاہ کے وہ مالک ہوں، جس قدر وہ عیش و عشرت میں ہوں، آخر کار یہ لوگ جاہ و برباد اور ہلاک ہونے والے ہیں۔ ان کی اس جنگ کا انجام معروف ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس عظیم خالق کائنات کے درمیان اور اس کائنات کی ایک حقیر چوٹی کے درمیان کوئی معرکہ برپا ہو سکتا ہے۔

ان سے پہلے ان جیسی کئی اقوام اس زمین پر ہو گزری ہیں، ان کا جو انجام ہوا اس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسی اقوام کا انجام کیا ہوا کرتا ہے، جو اللہ کی قوت کے مقابلے میں آجائیں۔ اللہ کی قوت ان کو پس کر رکھ دیا کرتی ہے

اور ہر اس قوت کو نہیں ڈالتی ہے جو اللہ کے ساتھ جنگ کے لیے اٹھتی ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ

لِيَاخُذُوهُ وَجَدُّوهُ بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ

(۵: ۴۰) ”ان سے پہلے قوم نوح کی قوم بھی تھلا چکی ہے اور ان کے بعد بہت سے دوسرے جنہوں نے بھی یہ کام کیا۔ ہر قوم اپنے رسول پر جھپٹی تاکہ اسے گرفتار کرے۔ ان سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کی مگر آخر کار میں نے ان کو پکڑ لیا۔ پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔“ یہ سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور یہ ایک ایسا معرکہ ہے جو ہر زمان و مکان میں برپا ہے، اور یہ آیت اس قصے کا خلاصہ بتاتی ہے۔ رسولوں اور ان کی ٹکڑیوں کا قصہ۔ اور ان کے اور اللہ کے مقابلے میں سرکشی کا رویہ ہر زمان و مکان میں یونہی ہوتا رہا ہے اور انجام بھی ایک رہا ہے۔

رسول آیا ہے، اس کی قوم کے سرکشوں نے اس کی ٹکڑیوں کی ہے۔ انہوں نے دلیل کا جواب دلیل سے نہیں دیا، بلکہ دلیل کے مقابلے میں تشدد کے ہتھیار سے کرے اور انہوں نے رسول کو پکڑ کر گرفتار کرنے کی کوشش کی اور ہمسور عوام کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کی کوشش کی تاکہ حق کا مقابلہ کس، حق کو نیچا دکھائیں مگر اللہ کی قوت جبارہ نے مداخلت کی ہے۔ اور ایسے سرکشوں کو اس طرح چوٹی سے پڑا کر وہ آنے والوں کے لیے عبرت بن گئے۔

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ (۵: ۴۰) ”میری سزا کیسی سخت تھی۔“

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی سزا جاہ کن تھی، بہت سخت تھی۔ ان اقوام کے جو آثار بھی آج باقی ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ یہ سزا بہت سخت تھی۔ اور احادیث و روایات بھی یہ بتاتی ہیں کہ وہ سزا بہت سخت تھی۔ اور یہ معرکہ یہاں ختم نہیں ہو گیا بلکہ یہ قیامت تک چلا گیا:

وَكَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ

النَّارِ (۶: ۴۰) ”اسی طرح تیرے رب کا یہ فیصلہ بھی ان سب لوگوں پر چسپاں ہو چکا ہے جو کفر کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واصل جہنم ہونے والے ہیں۔“ جب یہ اللہ کا فیصلہ حق ہوا، چسپاں ہوا، گویا نافذ ہو گیا، اور ہر قسم کا مباحثہ ہی ختم ہو گیا۔

یوں قرآن کریم ایک حقیقی صورت حال کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ایمان اور کفر کے طویل معرکہ کی تصویر کشی۔ حق اور باطل کے درمیان معرکہ آرائی، ان لوگوں کے درمیان جو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور ان لوگوں کے درمیان معرکہ آرائی جو زمین میں سرکشی اختیار کرتے ہیں، بغیر دلیل کے بات کرتے ہیں۔ یوں قرآن یہ بتاتا ہے کہ یہ معرکہ حق و باطل آغاز انسانیت سے شروع ہے اور اس کا میدان زمین سے بھی آگے ہے۔ اس پوری کائنات میں بھی یہ جاری ہے

کہ یہ پوری کائنات اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے لیکن ایک کافر نہ صرف اہل ایمان سے بلکہ پوری کائنات کے ساتھ بھی برسرِ پیکار ہوتا ہے۔ یہ اس کائنات کے اندر موجود اللہ کی نشانیوں سے بھی لڑتا ہے اور اس معرکہ آرائی کا انجام بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق کی قوتیں بہت بڑی بہت طاقتور ہیں۔ اللہ ہے 'پوری کائنات ہے' اہل ایمان ہیں اور اس کے مقابلے میں کفار کی قلیل و حقیر قوت ہے۔ اگرچہ عارضی طور پر اس کا پلہ بھاری ہو اور بقا ہر یہ قوت بہت ہی خوفناک نظر آئی ہو مگر آخر کار یہ جاہ ہونے والی ہے۔

یہ حقیقت کہ حق و باطل کا معرکہ اور اس میں لڑنے والی قوتیں اور اس کا میدان جنگ یعنی طویل انسانی تاریخ اس کی تصویر کشی قرآن اس لیے کرتا ہے کہ اہل ایمان کے دلوں میں یہ بات چھی طرح بیٹھ جائے 'خصوصاً ان اہل ایمان کے دلوں میں جو پیغمبروں کے اصول و منہاج پر دعوت حق لے کر آئے ہیں اور ہر زمان و مکان میں دعوت ایمان دیتے ہیں وہ اچھی طرح جان لیں اور یقین کر لیں کہ باطل کی قوت کچھ بھی نہیں ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر پھولی ہوئی نظر آئے 'ایک محدود وقت کے لیے کسی محدود سرزمین میں' یہ قوت حقیقت نہیں ہے۔ اصل حقیقت وہ ہے 'جس کی نشاندہی اللہ کی کتاب کر رہی ہے' جسے وہ کلمۃ الحق کہتی ہے 'اور حق غالب ہو اکر تا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور اس کی بات سچی ہے۔

--- ۰۰۰ ---

اس حقیقت کے ساتھ ساتھ کہ دعوت حق ہے اور اس کے حامل مومنین ہیں۔ ان کے ساتھ وہ مومنین بھی شامل ہیں جو اللہ کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرد گرد متعین وہ بھی اہل ایمان کے ساتھ تائید میں کھڑے ہیں۔ وہ ہر وقت انسان مومنین کی رپورٹ اللہ کے ہاں پیش کرتے ہیں 'ان کے لیے مغفرت طلب کرتے رہتے ہیں اور ان کے لیے جو اللہ کا وعدہ ہے 'اللہ سے اس کے پورا کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ انسان بھی مومن ہیں اور وہ بھی مومن ہیں۔

الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ
يُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَ
عِلْمًا فَاعْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ رَبَّنَا
وَأَدْخِلْهُمْ جَنَّاتٍ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدْتَهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ
وَضُرِّيَّتِهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ
يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

ع ۹

۶

”عرش الہی کے حامل فرشتے اور وہ جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی

تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ”اے ہمارے رب‘ تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے‘ پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچالے‘ ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور حیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے ہمارے رب‘ اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے‘ اور ان کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ ہی پہنچا دے)۔ تو بلاشبہ قادر مطلق اور حکیم ہے۔ اور بچا دے ان کو برائیوں سے‘ جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے بڑا رحم کیا‘ یہی بڑی کامیابی ہے۔“

ہم نہیں جانتے کہ عرش کی حقیقت کیا ہے‘ نہ اس کی صورت متعین کر سکتے ہیں اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اس کے اٹھانے والے اسے کس طرح اٹھاتے ہیں۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ اس کا ماحول کیا ہے اور اس کے ارد گرد فرشتے کیسے ہیں‘ لہذا ہمیں ان چیزوں کی ہیئت اور ماہیت معلوم کرنے کی فضول جدوجہد نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ اشیاء انسانی اور اک کے دائرہ سے ماوراء ہیں۔ نہ ہمیں ان غیبی امور کے پیچھے پڑنا چاہئے‘ جن کے بارے میں مباحثہ کرنے والوں کو کوئی علم نہیں رہا گیا۔ جو بات آیات سے سمجھ میں آئی ہے‘ وہ صرف یہ ہے کہ اللہ کے بعض مقرب بندے‘ رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں‘ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور قرآن کریم ان کے ایمان کی تصریح اس لیے کر رہا ہے کہ ان کا ربط مومن انسانوں کے ساتھ واضح ہو جائے اور اللہ کے یہ مقرب بندے ان مومن انسانوں کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں جو یہاں اس دنیا میں معرکہ خیز و شر میں کودے ہوئے ہیں۔ یہ بندے جس انداز سے دعا کرتے ہیں اس میں ہمارے لیے تعلیم ہے کہ ہر انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ کو یوں مخاطب کرے۔ وہ کہتے ہیں:

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا (۷: ۷۰) ”اے ہمارے رب‘ تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔“ وہ اللہ کے سامنے طلب رحمت کے لیے یوں درخواست کرتے کہ (اے اللہ) ہم انسانوں کے لیے وہ رحمت طلب کرتے ہیں جو دراصل ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور وہ اللہ کے علم کو ذریعہ بناتے ہیں جو ہر چیز کو شامل ہے۔ وہ اللہ کے سامنے کوئی نئی چیز پیش نہیں کرتے جو اللہ کے پیش نظر نہ ہو۔ اللہ کی رحمت اور علم جو ہر چیز کو محیط ہیں انہی کے واسطے وہ التجا کرتے ہیں۔

فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ (۷: ۷۰) ”پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچالے‘ ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔“ اس دعا میں ایک اشارہ مغفرت اور توبہ کا ہے جو آغاز سورت میں غافر الذنب اور قابل التوب کے ساتھ موافق ہے اور دوسرا اشارہ عذاب جہنم سے بچانے کی طرف ہے جو آغاز سورت میں شدید العقاب کے ساتھ موافق ہے۔

اس کے بعد یہ بندے دعائیں ذرا آگے بڑھتے ہیں‘ اب وہ مغفرت اور عذاب جہنم سے بچانے سے بھی آگے جنت عطا کرنے کا سوال کرتے ہیں اور ان وعدوں کے پورے کیے جانے کا سوال کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے نیک بندوں سے کر رکھے ہیں۔

رَبَّنَا وَادْخُلْهُمْ جَنَّاتٍ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدْتَهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۸: ۴۰)

ان کو ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ ہی پہنچا دے)۔ تو بلاشبہ قادر مطلق اور حکیم ہے۔

جنت میں داخلہ 'بے شک بہت بڑی نعمت اور بہت بڑی کامیابی ہے' اور اس پر مزید کہ آباء 'ازواج اور اولاد بھی ساتھ ہوں۔ یہ مزید نعمت ہے۔ اس سے اس بات کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ مومنین جنت میں بھی اکٹھے خاندانی نظام کی شکل میں ہوں گے۔ یہ ایمان ہے جو آباء 'ازواج اور اولاد کے درمیان اکٹھے پیدا کرتا ہے' اگر ایمان نہ ہوتا تو یہ رشتے کٹ جاتے۔ اور اس فقرے پر جو آخری نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۸: ۴۰) "تو قادر مطلق اور حکیم ہے"۔ اس میں ایک طرف قوت ہے اور دوسری طرف حکمت۔ بندوں کے معاملے میں کوئی فیصلہ قوت اور حکمت کے سوا نہیں ہو سکتا۔

وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

(۹: ۴۰) "اور بچا دے ان کو برائیوں سے جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے بڑا رحم کیا" یہی بڑی کامیابی ہے۔ جنت میں داخل ہونے کی دعا کے بعد یہ دعا کہ ان کو برائیوں سے بچا دے یہ توجہ دلاتی ہے کہ ذرا غور کرو کہ یہ سیئات اور برائیاں ہی ہیں جو ان کا ارتکاب کرنے والوں کو برباد کرتی ہیں۔ اور یہ بربادی آخرت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی جہنم رسید کرتی ہیں۔ جب اللہ نے مومنین کو برائیوں سے بچا لیا تو وہ جہنم سے ہی بچ گئے اور برے نتائج سے بھی۔ یہی رحمت خداوندی کا عروج ہو گا اس مشکل وقت میں۔ اور

وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۹: ۴۰) "یہی بڑی کامیابی ہے"۔ کہ کوئی برائیوں سے بچ جائے۔

--- ○○○ ---

ایک طرف عرش کے حاملین اپنے مومنین بھائیوں کے لیے دعاگو ہیں 'دوسری جانب کفار کی حالت یہ ہے کہ وہ سخت مصیبت میں پھنس گئے ہیں' کسی مددگار کی تلاش میں ہیں اور کوئی مددگار نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اور پوری کائنات کے درمیان کوئی ربط نہیں رہا ہے۔ ہر طرف سے ان پر پھنکار اور لعنت و ملامت ہے۔ دنیا کے اعتبار کے بعد اب یہاں وہ سخت ذلت میں ہیں۔ اور بے یار و مددگار ہیں 'لیکن پھر بھی مومنون امیدوں کے سرب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں' لیکن کہاں ہے منزل مراد!

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنَادُونَ لِمَقْتُ اللَّهِ أَكْبَرُ مِنْ مَقْتِكُمْ

أَنْفُسَكُمْ إِذْ تُدْعَوْنَ إِلَى الْإِيمَانِ فَتَكْفُرُونَ ﴿١٠﴾ قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا اِثْنَتَيْنِ وَ

أَحْيَيْنَا اثْنَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَى خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ ﴿٤٠﴾ ذَلِكُمْ
بِآيَاتِهِ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ ۚ وَإِنْ يُشْرَكْ بِهِ تُؤْمِنُوا ۚ فَالْحُكْمُ لِلَّهِ
الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ ﴿٤١﴾

”جن لوگوں نے کفر کیا ہے، قیامت کے روز ان کو پکار کر کہا جائے گا“ ”آج تمہیں جتنا شدید غصہ اپنے اوپر آ رہا ہے، اللہ تم پر اس سے زیادہ غضبناک اس وقت ہوتا تھا جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم کفر کرتے تھے۔“ وہ کہیں گے ”اے ہمارے رب، تو نے واقعی ہمیں دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی دے دی، اب ہم اپنے قصوروں کا اعتراف کرتے ہیں، کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟“ (جواب ملے گا) ”یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو، اس وجہ سے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور جب اس کے ساتھ دو سروں کو ملایا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے۔ اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر کے ہاتھ ہے۔“

موت کا مفہوم ہے بہت شدید ناپسندیدگی۔ ان کو سب مخلوق خدا ہر طرف سے یہ پکارے گی کہ بد بختو تمہیں رسول اللہ ایمان کی پکار رہا ہے تھے اور تم ناحق انکار کرتے تھے۔ اور اللہ تم پر بہت ناراض ہوتا تھا۔ اور تمہارے رویے کو بہت ناپسند فرماتا تھا جس طرح آج تمہیں حقیقت معلوم ہوئی ہے تو تم اپنے اس رویے کو ناپسند کرتے ہو لیکن تم سے تو وقت چلا گیا ہے۔ تم نے کفر کیا، ایمان سے منہ موڑا اور تم سے ایک عظیم دولت چلی گئی۔ پوری کائنات کی جانب سے یہ ملامت آ رہی ہو گی اور یہ ان کے لیے سخت سواہن روح ہوگی۔ اس برے دن میں کسی تسلی کے بجائے ہر طرف سے مزید ملامت۔ اب تو دھوکے اور گمراہی کے پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ نجات کی جگہ اب صرف ذات باری ہے۔ لہذا گڑا گڑاتے ہیں:

قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا اِثْنَيْنِ وَاَحْيَيْنَا اِثْنَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَى خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ

(۱۱: ۴۰) ”وہ کہیں گے“ ”اے ہمارے رب، تو نے واقعی ہمیں دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی دے دی، اب ہم اپنے قصوروں کا اعتراف کرتے ہیں، کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟“ یہ ایک نہایت ہی بد حال مایوس اور بد بخت شخص کی درخواست ہے، اب تو وہ کہتے ہیں ”اے ہمارے رب“ اور اس وقت وہ رب کا انکار کرتے تھے، تو نے پہلی مرتبہ ہمیں زندگی دی۔ مردے میں روح ڈالی، وہ زندہ ہو گیا۔ پھر مرنے کے بعد دوبارہ زندگی دی اور اب ہم میدانِ حشر میں ہیں۔ اس لئے تو اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ہمیں موجودہ مصیبت سے نکال دے۔ اب تو ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے۔

فَهَلْ إِلَى خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ (۱۱: ۴۰) ”کیا نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟“ یہ ہے سرزنش جس سے

ان کی بے مائی، مایوسی اور تلخی ظاہر ہوتی ہے۔

اس کڑے وقت میں ان کو یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ تمہارے اس برے انجام کا اصل سبب کیا ہے:

ذَلِكُمْ بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ وَإِنْ يُشْرَكَ بِهِ تُؤْمِنُوا فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ

الْكَبِيرِ (۴: ۱۲) ”یہ حالت جس میں تم جلا ہو اس وجہ سے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو ملایا جاتا تو تم مان لیتے تھے۔ اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر کے ہاتھ ہے۔“ میں ذیل کرنے والے انجوم تک تمہیں یہ بات مانی ہے کہ تم عقیدہ توحید کا انکار کرتے تھے۔ اور عقیدہ شرک کو مان لیتے تھے۔ لہذا اب فیصلہ اللہ وحدہ کے ہاتھ میں ہے جو علی اور کبیر ہے۔ فیصلے کے حوالے سے یہ دونوں مناسب صفات ہیں۔ کوئی فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جو بزرگ ہو اور برتر مقام رکھتا ہو اور اللہ تو ہر چیز پر برتر ہے اور ہر چیز سے بڑا ہے، خصوصاً قیامت کے دن۔

--- ○ ○ ○ ---

یہاں اللہ کی صفات علی و کبیر کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے اور مومنین کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس علی و کبیر کی بارگاہ میں دعا کرو اور توحید کا عقیدہ اپنا کر نظام زندگی بھی اسی کا اپنالو، یہاں قیامت کے فیصلے کی گھڑی سے بھی ڈرایا جاتا ہے جہاں اللہ واحد و قہار کے پاس سب اختیارات ہوں گے اور وہ بہت ہی بلند و برتر ہے۔

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَنْ يُنِيبُ ۝ فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۝ يَوْمَ هُمْ بَرْزُؤْنَهُ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۝ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ الْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝

”وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور آسمان سے تمہارے لیے رزق نازل کرتا ہے، مگر (ان نشانوں کے مشاہدے سے) سبقت صرف وہی شخص لیتا ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ (پس اے رجوع کرنے والو) اللہ ہی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، خواہ تمہارا یہ فعل کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ بلند درجوں والا مالک عرش ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، اپنے حکم سے روح نازل کر دیتا ہے تاکہ وہ ملاقات کے دن سے خبردار کر دے۔ وہ دن جب کہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ (اس روز پکار کر پوچھا جائے گا) آج بادشاہی کس کی ہے؟ (سارا عالم پکار لٹھے گا) اللہ واحد قہار کی۔ (کہا جائے گا) آج ہر شخص کو اس کمائی بدلہ دیا جائے گا۔ جو اس نے کی تھی، آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا اور اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔“

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ (۱۳: ۴۰) ”وہی تو ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے“۔ اور اللہ کی نشانیاں تو اس کائنات کی ہر چیز میں نظر آتی ہیں۔ شمس و قمر کی گردش میں، رات اور دن کے نظام میں۔ رعد و برق اور باد و باران میں، ذرے، غلے، پتے اور پتوں میں غرض ہر چیز میں ایک معجزانہ نشانی ہے اور اس نشانی کی عظمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اس کی نقل کرنے کے لیے بیٹھے۔ یا اس جیسی کوئی چیز بنائے لیکن اسے کاش کہ وہ اس قسم کی کسی چیز کی نقل کر سکتا یا اس جیسی ہی بنا سکتا اور اللہ کی بنائی ہوئی ایک نہایت ہی چھوٹی چیز ہی بنا سکتا۔

وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا (۱۳: ۴۰) ”اور آسمانوں سے تمہارے لیے رزق نازل کرتا ہے“۔ لوگوں کو صرف بارش کے بارے میں علم ہے جس کی وجہ سے اس زمین پر زندگی قائم ہے، اور یہ کھانے و پینے کے تمام اسباب فراہم کرتی ہے اور آسمانوں سے نازل ہونے والی دوسری اشیاء بھی بے شمار ہیں جن کے انکشافات روز ہوتے رہتے ہیں، ان میں وہ شعاعیں ہیں جو زندگی بخشی ہیں کہ اگر وہ نہ ہوں تو زمین کے اس ستارے پر زندگی نہ ہوتی اور یہ بھی انسان کے لیے ایک ذہنی اور روحانی غذا ہے جو آدم علیہ السلام سے انبیاء پر نازل ہوتی چلی آرہی ہے اور جس کے ذریعے انسان بچپن سے آگے بڑھ کر بالغ ہو گیا ہے۔ اور اب نبوت محمدیؐ کی وجہ سے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو گیا ہے۔ اور اس رزاق نے اسے منہاجِ حیات دیا، اور اس کائنات کا مستقل قانون عطا کیا۔

وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مِنْ يُنِيبُ (۱۳: ۴۰) ”سبق صرف وہی شخص لیتا ہے جو اللہ سے رجوع کرنے والا ہو“۔ جو شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اللہ کا فضل و کرم کس قدر عظیم ہے اور وہ اس کائنات میں اللہ کی نشانیوں کو پاتا ہے جبکہ غافل اور سخت دل ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔۔۔ انہی کی وجہ سے لٹل ایمان کے دل میں جو یاد الہی پیدا ہوتی ہے، اور وہ ان نشانیوں پر غور و فکر کرتے ہیں، اس کے حوالے سے مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ وحدہ کو پکارتیں، اسی کا طے کردہ نظام زندگی جاری کریں اور کافروں کی ناپسندیدگی کی کوئی پروا نہ کریں۔ اگر مومنین اپنا دین اللہ کے لیے خالص کر دیں اور صرف اسلامی نظام زندگی نافذ کر دیں تو اس صورت میں کافران سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح وہ اگر اللہ وحدہ کو پکارتیں تو بھی کافر راضی نہیں ہو سکتے۔ مومنین کافروں کے ساتھ جس قدر نرمی بھی کریں، جس قدر مصالحت بھی کریں اور ان کی رضا جوئی کے لیے جس قدر جتن بھی کریں وہ ان سے راضی نہیں ہو سکتے۔ لہذا مومنین کو بے خطر اپنے راستے پر گامزن ہو جانا چاہئے۔ رب واحد کو پکارنا چاہئے، اس کے لیے حقیقہ خالص اختیار کرنا چاہئے۔ دلوں کو اللہ کی طرف متوجہ کرنا چاہئے، چاہے کافر خوش ہوں یا غمناک ہوں وہ تو کبھی راضی نہ ہوں گے۔

اب بتایا جاتا ہے کہ اس اللہ کی صفات کیا ہیں جس کی عبادت کی طرف لٹل ایمان متوجہ ہوں گے اور اس پر کافر ناپسندیدگی کا اظہار کریں گے۔ وہ صفات یہ ہیں :

رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ حَيْثُ رِءُوسِهِ (۱۵: ۴۰) ”وہ بلند درجوں والا ہے، مالکِ عرش ہے، اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنے حکم سے روح نازل کر دیتا ہے“۔ اللہ

ہی رفعتوں والا اور عالی مقام ہے۔ اور وہ ایک ایسے عرش کا مالک ہے جو قابض ہے پوری کائنات پر اور بہت ہی بلند ہے اور یہ وہی ہے جو اپنے کسی بندے پر روحانی تعلیمات نازل کر دیتا ہے۔ اور ان کی وجہ سے یہ زمین دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اس میں بننے والے انسانوں کی روح اور دس زندہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے مراد وحی اور رسالت ہے۔ لیکن انداز تعبیر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وحی اور رسالت کی غرض و غایت کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وحی لوگوں کے لیے روح اور زندگی ہے۔ اور پھر یہ بندوں سے اللہ کے چنے ہوئے بندوں پر آتی ہے۔ یہ سب صفات اور سائے اور رنگ اللہ کی اس صفت کے ساتھ متناسب ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ وہ العلیٰ الکبیر ہے۔

اب جن لوگوں کو چنا جاتا ہے اور ان پر روح نازل کی جاتی ہے۔ ان کا فریضہ منجی کیا ہے؟ صرف لوگوں کو متنبہ کرنا۔

لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ (۱۵: ۴۰) ”تاکہ وہ ملاقات کے دن سے خبردار کر دے۔“ اس دن تمام لوگ باہم ملیں گے، لوگ اپنے اعمال کے ساتھ دوچار ہوں گے۔ لوگ ملائکہ، جنوں اور تمام مخلوقات سے ملیں گے اور تمام لوگوں کو پھر باری تعالیٰ سے ملنا ہو گا اور حساب دینا ہو گا۔ گویا یہ دن اپنے ان تمام مفاہیم کے ساتھ یوم التلاق ہے۔ پھر یہ ایسا دن ہو گا جو کھلا ڈھسا ہو گا، کوئی پردہ، کوئی طمع کاری اور کوئی دھوکہ بازی اس میں نہ چلے گی:

يَوْمَ هُمْ بَرْزُؤُنَا لَّا يَخْفِي عَلَيَّ اللَّهُ مِنْهُمْ شَيْءٌ (۱۶: ۴۰) ”وہ دن جبکہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہوگی۔“ اور اللہ سے تو کسی بھی وقت، کسی بھی دن اور کسی بھی حال میں کوئی شئی مخفی نہیں ہوتی، لیکن دوسرے دنوں میں، اس دنیا کے دنوں میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مخفی ہیں اور ان کے اعمال اور حرکات پوشیدہ ہیں، آج لوگ خود بھی یہ سمجھیں گے کہ اب تو سب کچھ کھل گیا ہے، ان کا سیاہ و سپید سامنے ہے۔ اور سب پر دے غائب ہیں اور وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہیں۔

آج تو کمند بین اور مستکبرین بر خور دار ہوں گے، سکڑے اور سنے ہوئے ہوں گے۔ تمام کائنات سہی ہوئی ہوگی، لوگ ڈرے ہوئے ہوں گے۔ بادشاہت صرف اللہ واحد و قادر کی ہوگی۔ اللہ تو ہر وقت وحدہ بادشاہ ہے لیکن پہلے لوگوں کو اللہ کی بادشاہت نظر نہ آتی تھی۔ آج ان کا دل و دماغ تسلیم کرتا ہے کہ بادشاہت اللہ کی ہے۔ ہر منکر اور ہر متکبر بھی جان جائے گا کہ بادشاہ صرف اللہ ہے۔ ہر قسم کی شور و غوغا اس دن ختم ہوگی اور ایک عظیم القدر اور صاحب جلالت آواز آئے گی۔ خود ہی سوال کرے گی اور خود ہی جواب دے گی کیونکہ پوری کائنات میں تو آج جواب دینے والا ہی کوئی نہیں ہے۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۱۶: ۴۰) ”آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ واحد و قادر کی۔“

الْيَوْمَ تُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ

الْحِسَابِ (۱۷: ۴۰) ”آج ہر نفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے گا، جو اس نے کی تھی، آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ اور اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔“ آج کا دن جزائے حق کا دن ہے۔ آج عدل کا دن ہے، آج فیصلے اور حکم سنائے کا دن ہے۔ کوئی مہلت کسی کے لیے نہیں اور نہ سست روی ہے۔

فضا پر رعب اور خاموشی چھا جاتی ہے۔ لوگوں پر خشوع اور خوف جاری ہو جاتا ہے، تمام مخلوق بت سنتی ہے اور سہم جاتی ہے۔ تمام معاملات طے کر دیئے جاتے ہیں اور تمام دفاتر لپیٹ لیے جاتے ہیں، بڑی تیزی میں۔
سورت کے آغاز میں کہہ گیا تھا کہ جو لوگ اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں۔

فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ (۴۰ : ۴) ”شہروں میں ان کی چلت پھرت تمہیں دھوکہ نہ دے۔
یہاں بتا دیا کہ زمین میں ان کی اس چلت پھرت کا، ان کی سر بلندی اور ناحق بڑائی کا، ان کی جباری و قدری کا، اور ان کی دولت و ساز و سامان کا یہ انجام ہے کہ مارے خوف کے سہمے ہوئے ہیں، بات تک نہیں کر سکتے۔

--- ○ ○ ○ ---

اب روئے سخن حضور اکرمؐ کی طرف مڑ جاتا ہے کہ اپنی قوم کو اس سخت دن سے ڈرائیں۔ ایک منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں فیصلے کے اختیارات صرف اللہ کے ہیں، جبکہ اس سے قبل ان کے اس دن کے حالات حکایتی انداز میں بیان کیے گئے تھے اور اس میں ان کو بات کرنے کی کوئی اجازت نہ تھی۔

وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْأَزْفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كُذِّبَتْ ۚ مَا لِلظَّالِمِينَ
مِنْ حَیْمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُونَ ۖ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۖ
وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ ۗ
إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۖ

۱۱ع

۷

”اے نبیؐ! ڈراؤ ان لوگوں کو اس دن سے جو قریب آگاہ ہے، جب کھجے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ پیئے کھڑے ہوں گے۔ ظالموں کا نہ کوئی شفیع درست ہو گا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔ اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں اور اللہ ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلہ کرے گا۔ رہے وہ جن کو (یہ مشرکین) اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔ بلاشبہ اللہ ہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔“

آزفہ کے معنی ہوتے ہیں قریب، جلدی آنے والی، معنی ہے قیامت۔ یہ لفظ قیامت کی تصویر اس طرح کھینچ رہا ہے کہ گویا وہ پہنچنے ہی والی ہے۔ انسانی سانس تیز ہو گا، لوگ ہانپ رہے ہوں گے۔ اور کھجے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگوں پر بہت بڑا دباؤ ہو گا لیکن یہ پریشان دل لوگ دباؤ کا مقابلہ کرنے کی سعی کس گے۔ سانس کی چیزی کو روک رہے ہوں گے۔ درد پر قابو پانے کی سعی کس گے، خوف کو چھپائیں گے۔ اور اس برداشت کی وجہ سے ان پر مزید دباؤ ہو گا، ان کے سینے پھٹ رہے ہوں گے۔ کوئی دوست نہ ہو گا جس کے سامنے سینہ کھول کر رکھ دیں اور وہ ہمدردی کرے، کوئی سفارشی نہ ہو گا جو ان کے حق میں کوئی بات کرے۔ اس قدر خوفناک اور کرہناک مقام پر کوئی کیا بات کر سکتا ہے۔

ان کے راز اس دن کھلیں گے، ان کی کوئی بات اللہ سے مخفی نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ آنکھوں کے خائن کی کوئی بات بھی مخفی نہ ہوگی اور دلوں کے راز بھی مخفی نہ ہوں گے۔

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۱۹:۴۰) ”اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے، اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں میں چھپا رکھے ہیں۔“ خائن آنکھیں ہمیشہ اپنی خیانت کو چھپائے رکھتی ہیں۔ لیکن اللہ پر تو کوئی بات مخفی نہیں ہوتی، نہ دلوں کا راز مخفی ہوتا ہے، اللہ تو سب کچھ جانتا ہے۔
اس دن صرف اللہ ہی فیصلے کرے گا۔ یہ سچے فیصلے ہوں گے۔ لوگوں نے جن کو اسے بنا رکھا ہے، ان کا کوئی اختیار نہ ہوگا اور نہ وہ فیصلہ کر سکیں گے۔

وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ (۲۰:۴۰) ”اور اللہ ٹھیک بے لاگ فیصلے کرے گا۔ رہے وہ جن کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔“ اللہ حق کے فیصلے عم اور مہارت سے کرتا ہے۔ وہ دیکھ سکتا ہے کہ فیصلے کرتا ہے۔ نہ کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ کوئی چیز بھولتا ہے۔
إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (۲۰:۴۰) ”بلاشبہ اللہ ہی سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔“

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۲۴ ایک نظر میں

اس سے قبل ہم اس سبق پر لحدی تبصرہ کر آئے ہیں۔ تفصیلی تشریح سے قبل یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ یہاں یہ قصہ سورت کے موضوع کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔ اور اس سورت کے انداز بیان کے ساتھ ہم آہنگ کر کے دیا گیا ہے بلکہ بعض اوقات اسی سورت کے فقرہوں ہی کو استعمال کیا گیا ہے۔ اور ایک ہی انداز بیان اختیار کیا ہے۔ مثلاً رجل مؤمن فرعون کے سامنے جو تقریر کرتا ہے 'اس کے بعض فقرے اس سے قبل اسی سورت میں موجود ہیں۔ وہ فرعون، ہامان اور قارون کو نصیحت کرتا ہے کہ تم لوگ زمین میں چلت پھرت رکھتے ہو، نیز ان کو وہ ایک ایسے دن سے ڈراتا ہے جو دوسری اقوام کو پیش آیا۔ اور وہ ان کو قیامت کے دن سے بھی اسی طرح ڈراتا ہے۔ جس طرح اس سے قبل سورت میں قیامت کے مشاہد ذکر ہوئے۔ یہ اس بات کو دہراتا ہے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہو گا جو اللہ کی آیات میں ہنکرتے ہیں۔ اللہ کی ناراضگی کا ذکر، نل ایمان کی ناراضی جس طرح پہلے سبق میں ذکر ہوئی۔ اس کے بعد جہنم میں ان کا منظر، جہاں سے وہ نکالے جانے کی درخواست کریں گے لیکن منظور نہ ہوگی جیسا کہ ایسا ہی منظر اس سے پہلے ذکر ہوا۔

رجل مؤمن کی پوری تقریر اس سورت کے مضامین کو دہراتی ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان سب کے سب ایک طرح سوچا کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریر سے سورت کی نفاذ ایک رنگ ہو جاتی ہے۔ اس سورت کی ایک شخصیت سامنے آتی ہے جس کے خدوخال واضح ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو پورے قرآن میں پیش نظر رکھی گئی ہے۔



درس نمبر ۲۲۲ تشریح آیات

۲۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۵۵

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا
فِي الْأَرْضِ فَاخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ﴿۲۱﴾
ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَاخَذَهُمُ اللَّهُ إِنَّهُ
قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾

دیکھو یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین میں چھوڑ گئے ہیں مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول بیانات لے کر آئے اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔“

یہ آیات قصہ موسیٰ اور سورت کے سابقہ مضامین کے درمیان پل کا کام دے رہی ہیں۔ مشرکین مکہ کو یاد دلاتی ہیں کہ تم زرا ان تاریخی واقعات پر غور کرو اور ان سے عبرت حاصل کرو جو تمہارے گرد و پیش ہی میں واقع ہوئے۔ زمین کے اندر پھر دو اور گزشتہ اقوام کی ہلاکت کے واقعات پر غور کرو جنہوں نے سچائی کے مقابلے میں وہی رویہ اختیار کیا تھا جو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ وہ قوت کے اعتبار سے اور زمین کے اوپر آثار چھوڑنے کے اعتبار سے تمہارے مقابلے میں زیادہ قوی تھے لیکن اپنی اس زبردست تمذیب و تمدن کے باوجود اللہ کے عذاب کے مقابلے میں بے بس تھے۔ اپنے گناہوں کی وجہ سے وہ قوت کے اسی مرکز سے دور ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کے گناہوں نے لکل ایمان کو دعوت دی کہ وہ ان کی ہلاکت کے لیے انہیں جن کے ساتھ اللہ عزیز و قہار کی قوتیں معاون و مددگار تھیں۔

فَاخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ﴿۲۱﴾ (۲۱: ۴۰) ”مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔“ کیونکہ بچانے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہوتی ہے۔ اور اس سے وہ محروم تھے۔ پھر بچانے والی چیز یہ ہوتی ہے کہ انسان ایمان، عمل صالح اور سچائی کے محاذ کے ساتھ ہو لیکن وہ تو

بکھڑ سیب کرنے والے اور اللہ کی نشانیوں کو جھٹلنے والے تھے اور ان چیزوں کا انجام بربادی اور ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَاتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَاٰخَذَهُمُ اللّٰهُ اِنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيْدٌ

العقَاب (۲۲: ۴۰) ”یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول بینات لے کر آئے اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا۔ یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔“

--- ۰۰۰ ---

اس اصولی اور کلی اشارے کے بعد اب اللہ تعالیٰ ایسی اقوام میں سے ایک نمونہ پیش فرماتا ہے۔ یہ لوگ مشرکین مکہ سے بہت قوی تھے اور انہوں نے زمین پر بہت سے آثار چھوڑے تھے۔ ان کے گناہوں کی وجہ سے اللہ نے انہیں پکڑ لیا۔ یہ تھے فرعون، قارون اور ہامان۔ اور ان کے ساتھ بڑے بگنے والوں کے ٹولے بھی تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ کئی حصوں اور مناظر پر مشتمل ہے۔ آغاز اس مقام سے ہوتا ہے جہاں حضرت موسیٰ فرعون کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور اس کا انجام اس پر ہوتا ہے کہ آخرت میں جہنم رسید ہو کر وہ آگ میں باہم لڑتے ہیں۔ یہ بہت ہی طویل سفر ہے لیکن یہاں اس طویل سفر کی جھلکیوں پر اکتفاء کیا گیا ہے اور یہ جھلکیاں اس قصے کے وہ تمام حصے دکھا دیتی ہیں جو یہاں مطلوب ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوسٰی بِآیٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝۱۳۱ اِلٰی فِرْعَوْنَ

وَهَامِّنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سِحْرٌ كَذٰبٌ ۝۱۳۲

”ہم نے موسیٰ کو فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف اپنی نشانیوں اور نمایاں سند ماموریت کے ساتھ بھیجا مگر انہوں نے کہا ”ساحر ہے کذاب ہے۔“

یہ ہے فرعون کے ساتھ پہلا ملاپ۔ حضرت موسیٰ بعد معجزات کھڑے ہیں اور ان کے ساتھ وہ بہت بھی ہے جو ہر سچائی کے ساتھ ہوتی ہے اور سچائی ان کے ہاتھ میں ہے۔ فرعون، ہامان اور قارون بھی موجود ہیں۔ ان کے ساتھ ان کا کھوٹا اور باطل موقف ہے اور ان کے ساتھ ان کی ظاہری قوت ہے اور وہ مقام و مرتبہ ہے جس کے چلے جانے کا ان کو بہت ڈر ہے، یہ لوگ سچائی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ اب باطل بحث و مباحثے میں پڑ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں سِحْرٌ كَذٰبٌ (۲۴: ۴۰) ”جادوگر ہے جھوٹا ہے“

--- ۰۰۰ ---

یہاں اب قصے میں سے وہ تمام حصے کاٹ دیئے جاتے ہیں جو اس مباحثے کے بعد پیش آئے۔ جادوگروں کے ساتھ مقابلے کا حصہ بھی کٹ جاتا ہے جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے سب باطل جادو ٹوٹوں کو عصائے موسیٰ چٹ گیا تو وہ ایمان

لاستے ہیں تو یہ سب جیسے کٹ کر فرعونوں کے وہ اقدامت لائے جاتے ہیں جو انہوں نے میدان میں ہارنے کے بعد کیے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ

آمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ وَمَا كَيْدُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝

”پھر جب وہ ہماری طرف سے حق ان کے سامنے لے آیا تو انہوں نے کہا ”جو لوگ ایمان لا کر اس کے ساتھ شامل ہوئے ہیں ان سب کے لڑکوں کو قتل کر دو اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دو“۔ مگر کافروں کی چال اکارت ہی گئی۔ یہی انداز ہمیشہ سب سرکشوں کا ہوتا ہے جب ان سے دلیل و حجت کے ہتھیار ختم ہوتے ہیں تو وہ تشدد کے ہتھیار تھام لیتے ہیں جب بھی دلائل کے اعتبار سے وہ ذلیل ہوتے ہیں اور ان کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ حق تو غالب آنے والا ہے کیونکہ اس کی بات صاف زوردار ہے۔ واضح اور قابل فہم ہے اور دل لگتی اور فطرت کو اپیل کرتی ہے جس طرح جادوگروں کی فطرت نے قبول کر لیا وہ ایمان نے آئے حالانکہ وہ مقابلے کے لیے لائے گئے تھے۔ انہوں نے حق کو قبول کر کے فرعون کا مقابلہ شروع کر دیا حالانکہ وہ بہت بڑا جبار تھا۔ اس پر یہ تبصرہ نہایت برکھل ہے ”کافروں کی چال اکارت گئی“۔

اب فرعون اور ہامان اور قارون کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا:

اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ (۴۰: ۲۵) ”جو لوگ ایمان لا کر

اس کے ساتھ شامل ہوئے ہیں ان کے لڑکوں کو قتل کر دو اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دو“۔

فرعون نے اس قسم کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے زمانے میں جاری کیا تھا۔ ہو سکتا کہ اس سے پہلے فرمان کے صدور کے بعد یہ ہوا کہ جس فرعون نے یہ حکم جاری کیا تھا وہ مر گیا ہو اور اس کا بیٹا اور ولی عہد فرعون مقرر ہو گیا ہو اور جدید عہد میں یہ ظالمانہ فرمان مردہ قانون ہو گیا ہو اور حضرت موسیٰ جب آئے اور انہوں نے فرعون کو دعوت دی تو وہ آپ کو جانتا تھا کیونکہ آپ کی تربیت تو شاہی محل میں ہوئی تھی۔ اور یہ جدید فرعون یہ بھی جانتا تھا کہ سابقہ حکومت نے ایک فرمان بنی اسرائیلی کے خلاف جاری کیا تھا کہ ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دو اور مردوں کو قتل کر دو یوں اس کے حاشیہ نشینوں اور مشیروں نے یہ مسورت دیا ہو کہ موسیٰ پر جو لوگ ایمان لائے ہیں ان پر وہی فرمان دوبارہ نافذ کیا جائے چاہے وہ جادوگر مصری ہوں یا بنی اسرائیل ہوں یا اور لوگ ہوں جنہوں نے موسیٰ کی دعوت کو قبول کر لیا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرعون وہی ہو جس نے موسیٰ علیہ السلام کو پالا تھا لیکن اس کے سابقہ فرمان میں قدرے نرمی کر دی گئی ہو اور اس قانون کے نفاذ میں شدت نہ رہی ہو اور اب یہاں اس کے مشیروں نے از سر نو مسورت دینا ہو کہ اس قانون کو صرف ان لوگوں پر نافذ کیا جائے جو حضرت موسیٰ پر ایمان لائے ہوں تاکہ ان کو ڈرایا جاسکے۔

رہا فرعون تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رائے اور تھی۔ وہ یہ کہتا تھا کہ موسیٰ تمہارا دین بدل دے گا اور ملک کا امن و امان تباہ ہو جائے گا لہذا مجھے اجازت دو کہ میں موسیٰ سے تمہاری جان ہی چھڑا دوں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَى وَلْيَدْعُ رَبَّهُ إِنِّي أَخَافُ أَنْ

يُبَدِّلْ دِينَكُمْ أَوْ أَنْ يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ ﴿٤٠﴾

”ایک روز فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا ”چھوڑو مجھے میں اس موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل دالے گا یا ملک میں فساد برپا کرے گا۔“

اس کے اس قول سے ذُرْوَسِیْ اَفْتَلُ مُوسٰی (۲۶:۴۰) ”چھوڑو مجھے میں اس موسیٰ کو قتل کروں“ سے معلوم ہوتا ہے اس کے حاشیہ نشینوں کی جانب سے حضرت موسیٰ کے قتل کے خلاف دلائل دیئے جا رہے تھے کہ اگر آپ موسیٰ کو قتل کر بھی دیں تو مسئلہ ختم نہ ہو گا، جمہور عوام انہیں شہید سمجھ کر اسے ایک مقدس شخصیت قرار دیں گے۔ اس طرح لوگ شعوری طور پر ان کے دین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں، خصوصاً جبکہ ایک قوی میلے کے دن جادوگر اس پر ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کی وجہ بھی لوگوں کو بتا دی ہے۔ حالانکہ جادوگروں کو جمع اس لیے کیا گیا تھا کہ اس کے دین کو باطل ثابت کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بادشاہ کے بعض مشیر دل ہی دل میں زر گئے ہوں کہ حضرت موسیٰ کا خدا ان سے انتقام لے گا۔ اور وہ خدا کی پکڑ میں آجائیں گے، یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کیونکہ بت پرست تو متحد والہوں کے قائل دتے تھے۔ اور وہ قدرتی طور پر سوچ سکتے تھے کہ موسیٰ کا خدا ان سے انتقام لے۔ اور فرعون کا یہ قول کہ وَلَيَذَّعُ رَبُّہُ (۲۶:۴۰) ”اور یہ اپنے رب کو بھی پکار دیکھے“۔ اگرچہ بظاہر فرعون کی ایک متکبرانہ بات ہے۔ لیکن شاید یہ ان مشیروں کے رد میں ہو اور اسی متکبرانہ بات کی وجہ سے بعد میں اسے اللہ نے پکڑ اور ہلاک کر دیا۔ جیسا کہ بعد میں آئے گا۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے جو فرعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کے جواز کے بارے میں کہی۔

اَنِّیْ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ (۲۶:۴۰) ”مجھے ڈر ہے کہ یہ تمہارا دین بدل دالے گا یا زمین میں فساد برپا کر دے گا“۔ فرعون کی اس دلیل پر غور ضروری ہے۔ کیا ایک بت پرست بادشاہ کی یہ بات کوئی نئی بات ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ تمہارا دین بدل دے گا یا کم از کم ملک میں فساد ضرور برپا کر دے گا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر سرکش اور مفسد ہمیشہ یہی کہتا ہے، جب بھی کسی نے اسلام کی اصلاحی دعوت شروع کی ہے۔ مفسدین نے یہی بات کہی کہ انہوں نے اصلاح کو فساد کہا، ہمیشہ اہل ایمان داعیوں اور مصلحین کے بارے میں مطلب پرست سرکشوں اور مفسدوں نے عوام کے سامنے یہی عذر پیش کیا۔

جب بھی حق و باطل کے درمیان کشمکش شروع ہوئی، باطل کی منطق اور استدلال یہی رہا۔ ایمان اور کفر کی جنگ میں یہی منطق چلتی رہی۔ ہر زمان و مکان میں اور تاریخ کے ہر دور میں اصلاح کو فساد اور فساد کو اصلاح کہا گیا۔ غرض یہ قدیم کہانی ہے اور اسے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے تھے۔ ان کا بھروسہ نہایت مضبوط قوت پر تھا۔ وہ حصن حصین میں محفوظ تھے اور انہوں نے اس ذات کے ہاں پناہ لے رکھی تھی جہاں ہر سرکش متکبر سے بھاگ کر لوگ پناہ لیتے ہیں۔

وَ قَالَ مُوسٰی اِنِّیْ عُدْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا

ع ۴ یَوْمِ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۴۰﴾

”موسیٰ نے کہا ”میں نے تو ہر اس منکبر کے مقابلے میں جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا“ اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے۔“

حضرت موسیٰ نے یہ بات کہہ دی اور مطمئن ہو گئے اور اپنی حفاظت کا معاملہ اس ذات کے سپرد کر دیا جو ہر منکبر سے بلند ہے۔ ہر جبار کے اوپر ہے اور تمام دوسرے جباروں سے بھاگ کر اس کی پناہ میں آنے والوں کی حفاظت کرتا ہے۔ حضرت نے یہ کہا کہ وہ اس رب کی پناہ میں ہیں جو خود ان کافروں کا بھی رب ہے اور ہمارا بھی رب ہے اللہ نے ہمیں بھلا نہیں دیا اور نہ فرعون کی دھمکیوں کے مقابلے میں بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔ یہ لوگ تو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس لیے یہ زمین میں اپنی کبریائی قائم کرتے ہیں۔ کوئی شخص جو قیامت کی جو ابدی پر ایمان رکھتا ہو وہ منکبر نہیں بن سکتا۔ کیونکہ وہ تصور کر سکتا ہے کہ قیامت کے دن لوگ کس قدر ذلیل ہوں گے اور ذرے ہوئے ہوں گے۔ کوئی قوت اور طاقت اور کوئی سہارا نہ ہو گا نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ کوئی سفارشی ہو گا اور نہ کوئی نذیر دیا جائے گا۔

اب یہاں منظر خود فرعون کے حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص آتا ہے۔ اس کے دس پر سچائی اثر انداز ہو گئی۔ لیکن اس نے اپنا ایمان ابھی چھپا رکھا ہے۔ یہ شخص حضرت موسیٰ کی مدافعت میں آواز بلند کرتا ہے ’کوشش کرتا ہے کہ لوگ حضرت موسیٰ کے قتل سے باز آجائیں۔ یہ اپنی تقریر میں مختلف پہلوؤں سے بات کرتا ہے۔ یہ اپنی ماصحانہ باتیں ان کے دلوں میں اترنے کی کوشش کرتا ہے‘ ان کے لئے جذبات کو ابھارتا ہے‘ ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انہیں بد سے بھی ڈراتا ہے۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ

رَجُلًا أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا

فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِنْ يَكُ صَادِقًا يُصِيبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا

يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۴۱﴾ يَقَوْمِ لَكُمْ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَهَرْنَا فِي

الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنَ بَنِي إِسْرَءِيلَ قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا

مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ ﴿۴۲﴾ قَالَ الَّذِي أَمَرَ يَقَوْمِ إِنِّي

أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ ﴿۴۳﴾ مِثْلَ دَاوُدَ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادَ وَشُعُوبَ

وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعِبَادِ ﴿۴۴﴾ وَيَقَوْمِ إِنِّي أَخَافُ

عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿٢٦﴾ يَوْمَ تُنَادُونَ مُذِيرِينَ ۖ مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ
وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿٢٧﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ
بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ
يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا ۚ كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُرْتَابٍ ﴿٢٨﴾
الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَتْهُمْ كِبَرٌ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَ
عِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبٍ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿٢٩﴾

”اس موقع پر اس فرعون میں سے ایک مومن شخص، جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا، بول اٹھا: ”کیا تم ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟ حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بیلت لے آیا۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پلٹ پڑے گا۔ لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آجائیں گے۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو۔ اے میری قوم کے لوگو! آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین میں تم غالب ہو، لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آگیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا؟“۔ فرعون نے کہا ”میں تو تم لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے اور میں اسی راستے کی طرف تمہاری رہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے۔“

وہ شخص جو ایمان لایا تھا اس نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو! مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آجائے جو اس سے پہلے بہت سے جنموں پر آچکا ہے، جیسا دن قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اے قوم! مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پر فریاد و فغاں کا دن نہ آجائے۔ جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے، مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔ سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس بیلت لے کر آئے تھے مگر تم ان کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے۔ پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا اب ان کے بعد اللہ کوئی رسول ہرگز نہ بھیجے گا۔“۔ اسی طرح اللہ ان سب لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شکی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔ یہ ردیہ لہند اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ ہر حکیم و جبر کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے۔“

یہ وہ عظیم گفتگو ہے جو راجل مومن نے فرعون کے سازشی حاشیہ نشینوں کے ساتھ کی۔ اس شخص نے نہایت فطری انداز میں نہایت احتیاط کے ساتھ نہایت صراحت اور زور و دہرا انداز میں یہ بات کی۔ پہلے تو اس نے یہ کہا کہ تم جو تجویز پیش کر رہے ہو اور وہ نہایت گھناؤنی تجویز ہے۔

اتَّقَتُلُونِ رَجُلًا اَنْ يَقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ (۲۸:۴۰) ”کیا تم ایک شخص کو صرف اس بیٹاء پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔“

کیا یہ کوئی جرم ہے کہ کوئی ایک خدا ہونے کا عقیدہ رکھے۔ یہ ہر کسی کا حق ہے کہ وہ وہی عقیدہ رکھے جس پر اس کا قلب اور اس کا نفس مطمئن ہو۔ کسی عقیدے پر کوئی اس بات کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس کی جان لے لی جائے۔ یہ تو نہایت مکروہ اور ظالمانہ بات ہے اور اس کی کراہت اور برائی اور گناہ ناپن بالکل ظاہر ہے۔

اس کے بعد یہ شخص ایک قدم آگے بڑھتا ہے کہ یہ شخص جو کہتا ہے کہ ”میرا رب صرف اللہ ہے۔“ تو وہ بے دلیل بات بھی نہیں کرتا، وہ دلیل و برہان اور معجزات دکھا کر بات کرتا ہے۔

وَ قَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ (۲۸:۴۰) ”حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلائل لے کر آیا ہے۔“ اشارہ ان معجزات کی طرف ہے جو حضرت موسیٰ نے پیش فرمائے۔ اور انہوں نے چشم سر دیکھے اور جمہور عوام سے دور اپنی اس ادنیٰ محفل میں تو وہ ان معجزات کا انکار بھی نہیں کر سکتے اور نہ شک کر سکتے ہیں۔

اب یہ شخص بطور فرض ان کے سامنے اس اقدام کے برے نتائج پیش کرتا ہے اور اس مسئلہ کا ایک منصفانہ حل پیش کرتا ہے کہ تم اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو فرض کر سکتے ہو وہ یہ ہے۔

وَ اِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ (۲۸:۴۰) ”اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اسی پر پلٹ پڑے گا۔“ اپنے جھوٹ کا وہ خود ذمہ دار ہو گا۔ اور اپنے انجام تک پہنچ جائے گا اور اپنے جرم کی سزایا لے گا۔ محض جھوٹ بولنے پر تم کسی شخص کو کیسے قتل کر سکتے ہو۔

لیکن ایک دوسرا احتمال بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ شخص سچا ہو، لہذا تم اس کو بھی بطور احتیاط پیش نظر رکھو اور اپنے آپ کو برے نتائج کا مستحق نہ ٹھہراؤ۔

وَ اِنْ يَكُ صَادِقًا يُصِيبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ (۲۸:۴۰) ”لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آجائیں گے۔“ وہ جن چیزوں سے تمہیں ڈراتا ہے ان میں بعض کا تو احتمال پیش نظر رکھو، یہ شخص ان کو تمام امور سے نہیں ڈراتا بلکہ مبالغے کو کم کرنے کے لیے بعض کے احتمال کا ذکر کرتا ہے یعنی اپنی بات کو منصفانہ بناتا ہے۔

اب وہ حرید اصولی بات کرتا ہے جو دونوں فریقوں پر منطبق ہو سکتی ہے اگرچہ خفیہ اشارہ ان کے لیے ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (۲۸:۴۰) ”اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو۔“ اگر موسیٰ جھوٹا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت بھی نہ دے گا اور توفیق بھی نہ دے گا۔ پھر چھوڑ دو اسے کہ اپنے انجام کو پہنچے۔ اور اگر تم جھوٹے ہو اور موسیٰ کے خلاف جھوٹ بک رہے ہو اور اس

کے بارے میں حدت گزر رہے ہو تو تم پر اللہ کا عذاب آ سکتا ہے۔

جب اس نے ان کو اس بات سے ڈرایا کہ اللہ حد سے گزرنے والوں اور جھوٹوں کو ہدایت نہیں دیتا تو اب مزید کہتا ہے اگر اللہ کا عذاب ہم پر آگیا تو ہمیں کون بچا سکتا ہے اللہ کے عذاب سے کیونکہ موجودہ قوت اور سلطنت اور اقتدار کا ہم شکر ادا نہیں کر رہے ہیں، کفرانِ نعمت کر رہے ہیں اور قوت کے بل بوتے پر ایک شخص کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔

يَقَوْمِ لَكُمْ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَهَرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنَ بَاسِ اللَّهِ إِنَّ جَاءَنَا

(۲۹:۴۰) ”اے میری قوم کے لوگو! آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین میں تم غالب ہو، لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آگیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا۔“ اس شخص کو وہ مکمل شعور حاصل ہے جو ایک صحیح مومن کو حاصل ہوتا ہے کہ اللہ کا عذاب بادشاہوں، برسرِ اقتدار طبقات اور زمین پر با اختیار لوگوں پر سب سے پہلے آتا ہے اور ان کو چاہئے کہ وہ اللہ کے عذاب سے زیادہ ڈریں۔ یہ عذاب تو رات اور دن کے ہر لمحے میں تمہارے انتظار میں ہے۔ اس لیے یہ شخص ان کو یاد دلاتا ہے کہ تم زمین کے مقتدر اعلیٰ ہو، بادشاہ ہو، لہذا تمہیں اللہ سے ان کے مقابلے میں زیادہ ڈرنا چاہئے۔ یہ بات اس رجل مومن کے احساسات کا حصہ ہے، اور جب اللہ کے عذاب کی بات وہ کرتا ہے تو اپنے آپ کو ان میں شامل کرتا ہے۔

فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنَ بَاسِ اللَّهِ إِنَّ جَاءَنَا (۲۹:۴۰) ”اگر خدا کا عذاب ہم پر آگیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا۔“

جب تقریر یہاں تک پہنچتی ہے تو فرعون کے اندرونی رد عمل پیدا ہوتا ہے جو ہر سرکش پر طاری ہوتا ہے۔ جھوٹا وقار ہر شخص کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ اور اب شخص خالص صیحت کو بھی اپنی سلطنت اور اختیارات پر حملہ تصور کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ صیحت کرنے والا کہیں اقتدار میں شرکت چاہتا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ (۲۹:۴۰)

”فرعون نے کہا میں تو لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے۔ اور میں اس راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے۔“ میں تمہیں وہی کچھ کہتا ہوں جسے میں درست سمجھتا ہوں۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ وہ مفید ہے اور بغیر شک کے وہی صحیح راستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ سرکش ڈکٹیٹر جو سوچتا ہے وہی درست ہوتا ہے۔ کسی کو یہ کیسے اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ سوچے کہ بادشاہ غلط بھی سوچ سکتے ہیں یا کر سکتے ہیں یا کسی کو یہ اختیار کب ہے کہ وہ شاہ یا ڈکٹیٹر کی رائے ہوتے ہوئے کوئی دوسری رائے رکھے۔ اگر یہ بات ہو سکتی ہے تو پھر وہ کس چیز کے بادشاہ اور ڈکٹیٹر ہیں!

لیکن رجل مومن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ شاہ کے مقابلے میں مستقل سوچ رکھے۔ پھر ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ ان کو ڈرائے اور متنبہ کرے اور نصیحت کرے اور ایمانداری سے اس کی جو رائے ہے اس کا اظہار کرے۔ اور اس بات کو اپنا فریضہ سمجھے کہ جس رائے کو وہ حق سمجھتا ہے اس کی حمایت کرے، سرکشوں، ڈکٹیٹروں اور بادشاہوں کی جو رائے ہو

سو ہو۔ اس لیے یہ رجل مؤمن اس دوسرے۔ ”یہ سے ان کے دل و دماغ پر دستک دیتا ہے کہ شاید وہ احساس کر لیں، جاگ اٹھیں اور ان کے اندر ابرقائش پیدا ہو اور وہ نرم ہو جائیں“ اس لیے وہ ان کو تاریخ میں گزری ہوئی سرکش اقوام کے برے انجام کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ تاریخ کے اندر بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ سرکشوں اور حد سے گزرنے والوں کو اللہ نے پکڑا ہے۔

وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَوْمَ يَقُومُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ (۴۰: ۳۰) مِثْلَ دَابِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظَلْمًا لِلْعِبَادِ (۴۰: ۳۱) ”وہ شخص جو ایمان لایا تھا اس نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو! مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آجائے جو اس سے پہلے بہت سے قوموں پر آچکا ہے“ جیسا دن قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔“ ہر جتنے کا ایک دن عیدہ تھا۔ لیکن رجل مؤمن نے تمام علیحدہ علیحدہ دنوں کی تعبیر ایک ہی دن سے کر دی۔

مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ (۴۰: ۳۰) وہ گویا ایک ہی دن تھا جس کی نوعیت ایک طرح تھی۔ اگرچہ احزاب بہت تھے۔

وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظَلْمًا لِلْعِبَادِ (۴۰: ۳۱) ”اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔“ اللہ ان کے گناہوں پر انہیں پکڑتا ہے۔ اور ان لوگوں کے انجام کو دیکھ کر دوسرے لوگ جو ان کے ارد گرد رہتے ہیں ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور جو لوگ ان ہلاک شدہ اقوام کے بعد آتے ہیں ان کو عبرت ہوتی ہے۔

لب یہ رجل مؤمن ان کے دلوں پر ایک اور دستک دیتا ہے اور یہ اللہ کے دلوں میں سے برے دن یوم آخرت کو یاد دلاتا ہے۔ اتنے یہاں فریاد و فغاں کا دن کہا گیا ہے۔

وَيَقُومُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ (۴۰: ۳۲) يَوْمَ تَوَلَّوْنَ مَذْبِرِينَ مَا لَكُمْ مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (۴۰: ۳۳) ”اے قوم! مجھے ڈر ہے کہ کہیں فریاد و فغاں کا دن نہ آجائے جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔ سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔“

تنادی کے معنی ہیں باہم پکارنا اس دن ملائکہ جو لوگوں کو پکڑ کر حساب و کتاب کے لیے لائیں گے اور ایک دوسرے کو احکامات دیتے ہوئے پکاریں گے۔ پھر اصحاب اعراف جنت والوں کو پکاریں گے اور دوزخ والوں کو بھی پکاریں گے اور دوزخی جنت والوں کو پکاریں گے۔ لہذا مختلف صورتوں میں لوگ ایک دوسرے کو پکاریں گے اس لیے قیامت کے دن کو

یوم التصاد کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں باہم چیخ و پکار اور فریاد و فغاں شامل ہے۔ ہر طرف سے دوڑ و دوپ اور شور ہو گا۔ یہ مفہوم رجل مومن کے اس قول کے مطابق ہے۔

يَوْمَ تُولُوكُمْ مُدْبِرِينَ مَا لَكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ (۴۰: ۳۳) ”جس دن تم پیٹھ پھیر رہا ہو گے مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا“۔ یہ جہنم کے خوف سے بھاگنے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں بھاگ نہ سکیں گے۔ یہاں فریاد و فغاں اور فرار اور پکڑے جانے کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ اس مستکبرین کے لیے نہایت ہی مناسب ہے جو یہاں جاہ و مرتبہ رکھتے ہیں کہ وہاں یہ حالت ہوگی تمہاری۔

وَمَنْ يَضِلَّ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ (۴۰: ۳۳) ”سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں“۔ اس میں ایک خفیہ اشارہ فرعون کے اس قول کی طرف ہے۔

وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ (۴۰: ۲۹) ”اور میں تو صرف صحیح راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتا ہوں“۔ اشارہ یہ ہے کہ ہدایت والا راستہ تو وہ ہے جو اللہ بتائے اور فرعون کا بتایا ہوا راستہ وہ نہیں ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ کیونکہ اللہ لوگوں کی حقیقت اور ان کے حالات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے لیے ہدایت کا راستہ کیا ہے اور ضلالت کیا ہے۔ آخر میں یہ رجل مومن ان کو یاد دلاتا ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں کیا موقف اختیار کیا تھا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام انہی کی لولادت تھے۔ یہ مصری حضرت یوسف علیہ السلام کی رسالت میں بھی شک کرتے تھے حالانکہ آپ آیات اور نشانیوں سے آگے تھے۔ لہذا وہی سلوک حضرت موسیٰ سے نہ دہراؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کی بھی تصدیق فرما رہے ہیں۔ تم نے حضرت یوسف کی تعلیمات میں بھی شک کیا اور یہ نقطہ تصور قائم کر دیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا۔ حضرت موسیٰ حضرت یوسف کے ایک عرصہ بعد آگئے ہیں اور انہوں نے تمہارے اس اعتقاد کی تکذیب کر دی ہے کہ اب رسالت ختم ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنَ يَّعْتَلَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُرْتَابٌ (۴۰: ۳۴) ”الذین یجادلون فی آیت اللہ بغیر سلطان اتہم کبر مقتا عند

اللہ و عند الذین امنوا کذلک یطبع اللہ علی کل قلب متکبر جبار (۴۰: ۳۵) ”اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس بیانات لے کر آئے تھے مگر تم ان کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے۔ پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا اب ان کے بعد اللہ کوئی رسول ہرگز نہ بھیجے گا“۔ اسی طرح اللہ ان سب لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شکلی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں بغیر

اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔ یہ روپیہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مہغوض ہے۔ اسی طرح اللہ ہر منکر و جبار کے دل پر نصیب لگا دیتا ہے۔“

یہ واحد جگہ ہے جس میں قرآن نے حضرت یوسف کی رسالت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کو مصر والوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ رت یوسف سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کو مصر کے خزانے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ آپ ان میں خود مختاری تھے ساتھ تصرف کر رہے تھے اور آپ ”عزیر مصر“ کے مرتبے تک پہنچ گئے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ اس وقت مصری وزیر اعظم کا لقب تھا۔ سورت یوسف میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ مصر کے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ بات یقینی نہیں کہ آپ بادشاہ مصر بن گئے تھے۔

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا وَقَالَ يَأْتِي هَذَا تَابِيلٌ رُءُيَايَ مِنْ

قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا (یوسف : ۱۰۰) ”اور انہوں نے اپنے والدین کو تخت پر اٹھایا۔ وہ اس کے سامنے سجدے میں گر گئے اور اس نے کہا اے باپ! یہ ہے تاویل میرے خواب کی جو میں نے پہلے دیکھی تھی جسے اللہ نے حق بنا دیا۔“

یہ ہو سکتا ہے کہ جس تخت پر آپ نے اپنے والدین کو اٹھا کر بٹھایا وہ کوئی اور ممتاز جگہ ہو اور مملکت مصر کا تخت نہ ہو جس پر فرعون بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن ان آیات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف اقتدار اعلیٰ تک پہنچ گئے تھے۔ اس لیے ہم رجل مومن کے اس قول کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو حضرت یوسف کی تعلیمات کے بارے میں شک تھا۔ البتہ حضرت یوسف چونکہ اقتدار کے بہت ہی اعلیٰ مقام پر تھے اس لیے لوگ آپ کی مخالفت میں آواز نہ اٹھاتے تھے۔

حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنَ يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا (۴۰ : ۳۴) ”یہاں تک کہ جب آپ فوت ہو گئے تو تم نے کہا اس کے بعد اللہ ہرگز کوئی رسول نہ بھیجے گا۔“ گویا آپ کی موت سے ان کو بے حد حوشی ہوئی اور حوشی کا اظہار انہوں نے اس شکل میں کیا کہ رسالت کا خاتمہ کر دیا کیونکہ شاید وہ آپ کی تعلیمات کو پسند نہ کرتے تھے کیونکہ آپ تو توحید خالص کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ تعلیم جیسے آپ کی تقریریں زنداں سے واضح ہے۔

أَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۹ : ۱۴) ”کیا کئی رب بہتر ہیں یا ایک اللہ واحد اور زبردست“۔ انہوں نے یہ عقیدہ اس لیے اختیار کیا کہ حضرت یوسف کے بعد کوئی رسول نہ آئے اس لیے وہ اس طرح چاہتے تھے۔ بعض اوقات ایک شخص ایک چیز کو بہت پسند کرتا ہے۔ پھر وہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ یہ بات واقع ہو گئی ہے کیونکہ اس طرح اس کی خواہش پوری ہوتی ہے۔

رجل مومن کا انداز یہاں قدرے سخت ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے تم شک کرتے ہو اور حد سے گزر کر تکذیب کرتے ہو۔

كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ (۴۰ : ۳۴) ”اللہ ان لوگوں کو اسی طرح گمراہ کرتا

ہے جو حد سے گزرنے والے اور شک کرنے والے ہوتے ہیں۔“ یہ رجل مؤمن ان کو ڈراتا ہے کہ اللہ نے جو دعوت نشانیوں کے ساتھ بھیجی ہے اس کے بارے میں جو حد سے گزرے گا اور اس میں شک کرے گا تو اللہ اسے گمراہ کر دے گا وہ تو دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد بڑی سختی سے ان کو بتلاتا ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کے بارے میں بلا حجت و دلیل جھگڑتے ہیں ان کو مومنین اور اللہ دونوں ناپسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا رویہ بہت ہی برا ہے۔ اور ان کے تکبر اور جبر کے رویہ پر بھی یہ شخص تنقید کرتا ہے اور ان کو اللہ کی پکڑ سے ڈراتا ہے اور اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ جباروں اور قہاروں کو بالآخر پکڑتا ہے!

الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ

آمَنُوا كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٌ (۴۰: ۳۵) ”اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔ یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر و جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے۔“ رجل مؤمن کی زبانی جو بات کی گئی وہی بات سورت کے آغاز میں براہ راست بھی کہی گئی کہ جو لوگ اللہ کی آیات میں بغیر دلیل و حجت کے مجادہ کرتے ہیں ان کے دلوں میں ہدایت کی کوئی جگہ نہیں ہوتی اور نہ ان کا دماغ حقیقت کے ادراک تک پہنچ سکتا ہے۔

--- ۰۰۰ ---

رجل مؤمن کی اس طویل ترین تقریر کے باوجود جس میں ان کو تاریخ کے بہت سے نشیب و فراز دکھائے گئے اور ان کو متاثر کرنے کی سعی کی گئی، فرعون اپنی گمراہی میں آگے ہی بڑھتا رہا اور اس نے حق کو پہچاننے کی کوئی سعی نہ کی لیکن بظاہر اس نے یہ احمقانہ رویہ اختیار کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے دعاوی کی تحقیقات کر رہا ہے۔ بہر حال رجل مؤمن کی تقریر کا یہ اثر ضرور ہوا کہ فرعون کسی نہ کسی انداز میں اس تحریک کے بارے میں تحقیق پر آمادہ ہوا یوں فرعون نے مجلس شیوخ کی رائے کو براہ راست رد نہ کیا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَهْمُنُ ابْنُ بَنِي صَرَخًا لَعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ ۝

أَسْبَابَ السَّمَوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلَى إِلَهِ مُوسَى وَإِنِّي لَأَكْظُمُهُ كَاذِبًا ۖ وَكَذَلِكَ زُيِّنَ

لِفِرْعَوْنَ سُوءُ عَمَلِهِ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا كَيْدُ الْفِرْعَوْنَ إِلَّا فِي

تَبَابٍ ۝

۱۰ع

۹ ”فرعون نے کہا ”اے ہامان“ میرے لیے ایک بلند عمارت بنانا کہ میں راستوں تک پہنچ سکوں، آسمانوں کے راستوں تک اور موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں۔ مجھے تو یہ موسیٰ جھوٹا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ اسی طرح فرعون کے لیے اس کی بد عملی خوشنما بنا دی گئی اور وہ براہ راست سے روک دیا گیا۔ فرعون کی ساری چال بازی (اس کی اپنی) چابی کے راستہ

ہی میں صرف ہوئی۔“

فرعون نے ہامان سے کہا میرے لیے ایک بلند عمارت بنانا کہ میں آسمان کے راستوں تک پہنچ سکوں اور موسیٰ کے خدا کے بارے میں جان سکوں۔

وَ اَنْتٰی لَاطْنٰهُ كَادِبًا (۳۷: ۴۰) ”مجھے تو یہ موسیٰ جھوٹا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ یہ سرکش فرعون کی چالاکی اور اٹکل بازی ہے، وہ سچائی کے مقابلے میں علانیہ آتا نہیں چاہتا اور عقیدہ توحید کا اعتراف بھی نہیں کرتا کیونکہ اس صورت میں اس کی حکومت جاتی ہے، جن انسانوں پر اس کی مملکت قائم تھی وہ عقیدہ توحید کے بعد باطل قرار پاتے تھے۔ یہ بات بعید از امکان ہے کہ فرعون اس قدر کم عقل تھا اور وہ اس علمی سطح کا آدمی تھا۔ اور وہ اللہ موسیٰ کو اس سادہ انداز سے دھوکہ دے رہا تھا کیونکہ فرعون مصر علی لحاظ سے بہت ہی ترقی یافتہ تھے۔ یہ دراصل اس کی طرف سے حضرت موسیٰ اور اللہ العالمین کے ساتھ مذاق تھا۔ البتہ اس مذاق کے ساتھ وہ اپنے رویہ کو بظاہر منصفانہ بنانا چاہتا تھا۔ اور رجل مومن نے جو ذہر دست منطقی تقریر کی تھی اس سے جان چھڑانے کا یہ بھونڈا طریقہ اور تدبیر تھی لیکن یہ سب باتیں یہ ضرور ظاہر کر دیتی ہیں کہ فرعون مصر کو اپنی گمراہی پر اصرار تھا اور وہ کبر میں مبتلا تھا۔ اور حضرت موسیٰ کی دعوت کو رد کرنے پر تلا ہوا تھا۔

وَ كَذٰلِكَ زَيْنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْءَ عَمَلِهٖ وَ صَدَّ عَنْ السَّبِيْلِ (۳۷: ۴۰) ”اس طرح فرعون کے لیے اس کی بد عملی خوشامیاد دی گئی اور وہ راہ راست سے روک دیا گیا۔“ اور اب وہ اس بات کا مستحق قرار پایا کہ اسے راستے سے روک دیا جائے کیونکہ وہ جس رویے کا اظہار کر رہا تھا وہ صراط مستقیم سے دور اور انحراف کا رویہ تھا۔ نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ وہ بربادی اور ناکامی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

وَ مَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ (۳۷: ۴۰) ”اور فرعون کی ساری چال بازی تباہی کے راستہ ہی میں صرف ہوئی۔“

--- ۰۰۰ ---

اسی مذاق اور فریب اور گمراہی پر یہ اصرار کو دیکھ کر رجل مومن نے بھی مناسب سمجھا کہ ایک آخری بات ان سے کہہ دے۔ یہ بہت ہی بلند واضح بات ہے۔ اس سے پہلے تو لوگوں کو یہ دعوت دی کہ میرا اتباع کرو میں تمہیں سیدھی راہ کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ پھر اس نے لوگوں کو بتایا کہ یہ زندگی تو بہت ہی مختصر اور فانی زندگی ہے۔ اس لیے تم اس زندگی کا انتظام کرو جو باقی رہنے والی ہے اور آخرت کے دائمی عذاب سے بچو اور اس نے واضح طور پر بتایا کہ شرک کے عقیدے میں کیا کیا کمزوریاں ہیں :

وَ قَالَ الَّذِیْ اٰمَنَ یُّقُوْمُ الشَّعُوْنُ اَهْدِکُمْ سَبِيْلَ
الرَّشَادِ یُّقُوْمُ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیْوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ

هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْشِىْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَيَقُومُ مَا لِيْ أَدْعُوْكُمْ إِلَى النَّجْوَى وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾ تَدْعُونَنِي لِأَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَأُشْرِكَ بِهِ مَا لَيْسَ لِيْ بِهِ عِلْمٌ وَأَنَا أَدْعُوكُمُ إِلَى الْعَزِيزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا جَبْرَ أَنَا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ وَأَنْ مَّرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَتَذَكَّرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأَفِيضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾

”وہ شخص جو ایمان لایا تھا“ بولا ”اے میری قوم کے لوگو! میری بات مانو! میں تمہیں صحیح راستہ بتاؤں۔ اے قوم! یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے، ہمیشہ کے لیے قیام کی جگہ آخرت ہی ہے، جو برائی کرے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اس نے برائی کی ہوگی۔ اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ جہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا، اے قوم! آخر یہ کیا ماجرا ہے کہ میں تو تم لوگوں کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم لوگ مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو! تم مجھے اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اس کے ساتھ ان بستیوں کو شریک ٹھیراؤں جنہیں میں نہیں جانتا، حالانکہ کہ میں تمہیں اس زبردست مغفرت کرنے والے خدا کی طرف بلا رہا ہوں۔ نہیں، حق یہ ہے اور اس کے خلاف نہیں ہو سکتا کہ جن کی طرف تم مجھے جا رہے ہو، ان کے لیے نہ دنیا میں کوئی دعوت ہے، نہ آخرت میں، اور ہم سب کو پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے، اور حد سے گزرنے والے آگ میں جانے والے ہیں۔ آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، عنقریب وہ وقت آئے گا، جب تم اسے یاد کرو گے۔ اور اپنا معاملہ میں اللہ کے سپرد کرتے ہو، وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔“

یہ وہ حقائق ہیں جن کے بارے میں اس سورت کے آغاز میں دو لوگ الفاظ میں بتا دیا گیا تھا۔ یہاں رجل مومن اپنی تقریر میں فرعون کے سامنے ان کو دہراتا ہے۔ یہ فرعون کے سامنے کہتا ہے۔

يَقُومُ اَتَسْعُوْنَ اِهْدِيْكُمْ سَبِيْلَ الرُّشَادِ (۳۸: ۴۰) ”اے قوم! میری بات مانو! میں تمہیں صحیح راستہ بتاتا ہوں۔“ اس سے چند لمحے پہلے فرعون نے یہ کہا تھا:

وَمَا اِهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرُّشَادِ (۲۹: ۴۰) ”اور میں تو تمہیں سیدھے راستے کے سوا کوئی

شریک ٹھہراؤں جنہیں میں نہیں جانتا حالانکہ میں تمہیں زبردست مغفرت کرے والے خدا کی طرف بلاتا ہوں۔“ اور ان دونوں دعوتوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ میری دعوت تو بہت واضح اور صاف ہے۔ عزیز و غفار کی طرف سے یہ دعوت۔ ایک ایسے اللہ وحدہ کی طرف دعوت ہے جس کی وحدانیت پر اس کائنات کے تمام آثار شہد ہیں اور اس کی قدرت اور حکمت پر اس کائنات کی ہر چیز شہد عادل ہے۔ وہ ان کو اس کی طرف بلاتا ہے جو مغفرت کرنے والا ہے تاکہ بخش دے۔ جو بہت بڑا بخشنے والا ہے۔ اور یہ لوگ اس رجل مومن کس طرف بلاتے ہیں؟ کفر کرنے کے لیے، شرک کرنے کے لیے، جس کا اسے کوئی علم نہیں ہے۔ محض دعوتی ہے، لوہام ہیں اور انسانے ہیں جن پر ان کا عقیدہ ہے۔ وہ ان کو دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہے کہ جن ہستیوں کو تم نے خدا کا شریک بنا رکھا ہے۔ ان کی تو نہ دنیا میں کوئی پوزیشن ہے اور نہ آخرت میں کوئی پوزیشن ہے۔ آخر کار تمام انسانوں کو تو صرف اللہ کے ہاں لوٹنا ہے۔ اور یہ تم لوگ جو اسراف کرتے ہو اور حدود کو یاد کرتے ہو تمہارے لیے تو جہنم کے سوا کچھ نہیں ہے۔

لَا جَرَمَ أَنَّمَا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ وَأَنْ مَّرَدُّنَا

إِلَى اللَّهِ وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ (۴۰: ۴۳) ”حق یہ ہے اور اس کے خلاف نہیں ہو سکتا کہ جن کی طرف تم مجھے بلارہے ہو، ان کے لیے نہ دنیا میں کوئی دعوت ہے نہ آخرت میں اور ہم سب کو پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے اور حد سے گزرنے والے آگ میں جانے والے ہیں۔“ عقائد کے حوالے سے یہ بنیادی باتیں دو ٹوک انداز میں بیان کر دینے کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ یہ سب باتیں اس رجل مومن نے فرعون، اس کے درباریوں اور وزراء سامنے کر دیں، ہیر کسی جھجک اور شف شف کے۔ پہلے تو وہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا لیکن تقریر کے آخر میں اس نے اس کا اظہار کر دیا۔ اب صرف یہ بات رہتی ہے کہ حق تبلیغ ادا کرنے کے بعد وہ تمام امور کو اللہ پر چھوڑ دے۔ اس نے بات کہہ دی، اس کا ضمیر مطمئن ہو گیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اے کاش! عنقریب تم میری باتوں کو یاد کر دو گے لیکن اس وقت اس فصاحت کا تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ حقیقت میں معاملات کی باگ زور اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَافْوَضْ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ

بِالْعِبَادِ (۴۰: ۴۴) ”آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں عنقریب وہ وقت آئے گا جب تم اسے یاد کر دو گے اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔“ اب اس پر یہ تقریر اور مکالمہ ختم ہوتا ہے۔ رجل مومن نے کلمہ حق اس کائنات کے ضمیر میں ریکارڈ کر دیا اور قرآن نے اسے لازوال دوام بخشا۔

--- ○ ○ ○ ---

یہاں سیاق کلام حضرت موسیٰ اور فرعون کی حویل کشش کی بعض کڑیوں کو مجمل کر دیتا ہے۔ اب یہاں بنی اسرائیل کے فرار اور نجات اور فرعون کی غرقابی کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس پر تہرے کیے جاتے ہیں۔ برزخی زندگی میں اس کا حال یہ ہو گا۔

فَوَقَّعَهُ اللَّهُ سَيِّئَاتٍ مَّا مَكْرُوهًا وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ
سُوءُ الْعَذَابِ ۖ إِنَّكَ تَارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۖ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۖ
أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ۖ وَإِذْ يَتَحَاجُّونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعَفَاءُ
لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا ۖ فَمَا كُنْتُمْ تُخَنُّونَنَا نَصِيبًا مِّنَ النَّارِ ۖ
قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُلٌّ فِيهَا ۖ إِنَّ اللَّهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ۖ وَقَالَ
الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَتِهِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۖ
قَالُوا أَوَلَمْ تَأْتِكُمْ رُسُلُكُم بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا بَلَىٰ قَالُوا فَادْعُوا وَمَا دُعَاؤُا
عَالَمِ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۖ

۱۰

”آخر کار ان لوگوں نے جو بری سے بری چالیں اس مومن کے خلاف چیں، اللہ نے ان سب سے اس کو بچالیا اور فرعون کے ساتھ خود بدترین عذاب کے پھر میں آگئے۔ دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح و شام وہ پیش کیے جاتے ہیں اور جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو علم ہو گا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔ پھر ذرا خیال کرو اس وقت کا جب یہ لوگ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے۔ دنیا میں جو لوگ کمزور تھے وہ بڑے بنے والوں سے کہیں گے کہ ”ہم تمہارے تابع تھے اب کیا یہاں تم ہمارے جہنم کی تکلیف کے کچھ حصے سے ہم کو بچالو گے؟“ وہ بڑے بننے والے جواب دیں گے ”ہم سب یہاں ایک حال میں ہیں اور اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے۔“ پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے لعل کاروں سے کہیں گے ”اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن کی تخفیف کر دے۔“ وہ پوچھیں گے ”کیا تمہارے پاس رسول چنات لے کر نہیں آتے رہے تھے؟“ وہ کہیں گے ”ہاں۔“ جہنم کے لعل کار بولیں گے ”پھر تو تم ہی دعا کرو اور کافروں کی دعا انکار ت ہی جانے والی ہے۔“

یہاں اس دنیا کے صفحات کو لپیٹ دیا جاتا ہے اور کتاب دنیا کا آخری صفحہ جو ہم نے پڑھا یہ ہے کہ رجل مومن جس نے کلمہ حق نہایت بے باکی کے ساتھ کہا اور چلا گیا تو اس کو اللہ نے فرعون کی بری اور گہری مکاریوں سے بچالیا۔ فرعون اور اس کے حاشیہ نشین نہ اتنے اس دنیا میں گزند پہنچائے اور نہ آخرت میں جبکہ فرعون اور اس کے تمام ساتھی ایک نہایت ہی برے عذاب میں گھر گئے۔

النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۰: ۴۶) ”دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے یہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں اور جب

قیامت کی گھڑی آئے گی تو حکم ہو گا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔“ آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ صبح و شام ان کو آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کے زمانے میں یہ ہو گا عذاب قبر۔ کیونکہ اس کے بعد یہ فقرہ آتا ہے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۰: ۴۶) ”اور جب قیامت کی گھڑی آئے گی تو حکم ہو گا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔“ لہذا آگ پر پیش کرنے کا عذاب قیامت سے پہلے کا عذاب ہو گا اور یہ بہت ہی سخت سزا ہے کہ صبح و شام ان کو آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ است دیکھتے اور سوچتے ہیں کہ یہ آگ ہے جو انہیں جلائے گی۔ اس کی حرارت تو ان کو بہر حال پہنچے گی۔ یہ بھی شدید عذاب ہے کیونکہ لفظ عرض قرآن میں چھونے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ عملاً انہیں صبح و شام آگ میں جلایا جاتا ہے اور قیامت کے دن پھر مستحق شدید ترین عذاب میں داخل ہوں گے۔

لیکن اگلی آیت میں اب جو منظر ہے اس میں قیامت عملاً برپا ہے۔ ایک جھلک جہنم کی دکھائی جاتی ہے۔ جہاں وہ یوں جھگڑتے ہیں :

فَيَقُولُ الضَّعِيفُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُّعْتَدُونَ عَنَا نَصِيبًا

مَنْ النَّارِ (۴۰: ۴۷) ”دنیا میں جو لوگ کمزور تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے ہم تمہارے تابع تھے اب کیا یہاں تم نار جہنم کی تکلیف کے کچھ حصے سے ہم کو بچا لو گے۔“ اس وقت ضعیف بھی مستکبرین کے ساتھ جہنم میں ہوں گے۔ یہ بات ان کے لیے مفید نہ ہوگی کہ وہ دوسروں کے تابع مصل تھے اور ماتحت تھے۔ ان کے لیے یہ بات مفید نہ ہوگی کہ انہیں تو دنیا میں بھیڑ بکریوں کی طرح چلایا جا رہا تھا۔ اور ان کی کوئی رائے اور کوئی ارادہ نہ تھا اور نہ اختیارات تھے۔

اللہ نے تو ان کو بہت بڑا مرتبہ دیا تھا، انسانی کرامت اور شرافت دی تھی اور یہ شرافت دی تھی کہ ہر ایک فرد اپنے کیے کا ذمہ دار ہے۔ اور ہر فرد کو آزادی اور حریت دی تھی لیکن انہوں نے از خود ان سب باتوں کو ترک کر دیا اور از خود انہوں نے ان بڑے اور سرکشوں کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ اس لیے اب یہ لوگ ان کبراء سے کیوں شکایت کرتے ہیں بلکہ وہ اس شکایت کے بارے میں سوچتے کیوں ہیں بلکہ یہ جو شکایت کرتے ہیں اس کے بارے میں انہوں نے سوچا ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا (۴۰: ۴۷) ”ہم تمہارے تابع تھے۔“ لیکن یہ اس لیے تو تابع نہ ہوئے تھے اور اپنی آزادی سے اس لیے تو دستکش نہ ہوئے تھے کہ اللہ کے ہاں یہ کبراء کوئی شفاعت کس گے۔ وہ تو اس وقت آگ میں جل رہے ہیں اور یہاں تک کبراء ہی نے ان کو پہنچایا ہے جس طرح وہ دنیا میں ان کو چلاتے تھے اس طرح جیسے بھیڑ بکریوں کو چلایا جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ ان کبراء سے پوچھتے ہیں۔

فَهَلْ أَنْتُمْ مُّعْتَدُونَ عَنَا نَصِيبًا مِنَ النَّارِ (۴۰: ۴۷) ”اب کیا یہاں تم نار جہنم کی تکلیف کے کچھ

جسے سے ہم کو بچا لو گے۔“ جس طرح زمین میں تمہارا دعویٰ تھا کہ ہم عوام کو سیدھے راستے کی طرف لے جاتے ہیں اور فساد سے بچاتے ہیں اور شر اور تکلیفوں اور دکھوں سے اور دشمنوں کی سازشوں سے بچاتے ہیں۔

رہے وہ لوگ جو دنیا میں بڑے بنے ہوئے تھے۔ وہ اس سوال کا جواب بڑی ترشی سے دیتے ہیں، کیونکہ وہ جہنم کے عذاب میں جل رہے ہیں، نہایت ہی تنگدلی کے ساتھ، وہ دو ٹوک الفاظ میں، 'جواب دیتے ہیں اور استکبار کے بعد اب اجرام کا اقرار کرتے ہیں۔

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا اَنَا كُلُّ فِئْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ (۴۸:۴۰) ”بڑے بننے والے جواب دیں گے، ہم سب یہاں ایک حاکم میں ہیں اور اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے۔“ ہم سب اس میں ہیں

اَنَا كُلُّ فِئْهَآ (۴۸:۴۰) ”ہم سب اس میں ہیں“ اب ہم سب ضعفاء ہیں۔ کوئی معاون اور کوئی مددگار نہیں ہے۔ سب رنج و الم میں مبتلا ہیں، سب کے سب درد و کرب میں ہیں۔ اس لیے تمہارا سوال احمقانہ ہے۔ یہاں تو کبراء و ضعفاء سب ہی مر رہے ہیں۔ اللہ نے فیصلہ سب کا کر دیا ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں ہو سکتی، اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ یہ فاعل فیصلہ ہے۔ بندوں میں سے تو کوئی اللہ کے کسی فیصلے کی سزا میں کمی نہیں کر سکتا۔ جب دونوں نے معلوم کر لیا کہ اللہ کے سوا کوئی شنوائی نہیں کر سکتا تو یہ لوگ اب جہنم کے داروغہ کی طرف جاتے ہیں، نہایت ہی دلت کی حالت میں، نہایت ہی عاجزی اور بے کسی میں، اور یہ حالت کبراء و ضعفاء، دونوں پر طاری ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَازِنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ (۴۹:۴۰)

”پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے اہل کاروں سے کہیں گے، ”اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے عذاب میں پس ایک دن کی تخفیف کر دے۔“ اب یہ جہنم کے اہل کاروں کی سفارش لانے کی سعی کریں گے کہ وہ ان کی درخواست پیش کریں، ان اہل کاروں سے امیدیں وابستہ کریں گے کیونکہ عذاب سخت ہے۔ اور تم لوگ رب تعالیٰ سے صرف ایک دن کی معافی دلو اور۔ صرف ایک دن۔ کہ ایک دن کے لیے تو ہم سانس لے سکیں اور ایک دن ہی تو آرام سے گزر جائے۔ جہنم میں ایک دن بھی اس قدر اہم ہو گا کہ اس کے لیے یہ عاجزانہ التماس کر رہے ہیں۔ لیکن جہنم کے اہل کار اس عاجزانہ درخواست پر بحث ہی نہیں کرتے۔ جو نہایت ہی رست اور مصیبت میں دی گئی ہے کیونکہ ان کو اللہ کے قواعد معلوم ہیں۔ ان کو سنت الہیہ کا علم ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ ان لوگوں نے وقت گنوا دیا ہے۔ لہذا وہ ان کو ملامت کر کے مزید دکھ دیتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اب تو سوچو کہ اس حالت زار تک کس طرح پہنچے۔

قَالُوا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيكُمُ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا بَلٰى (۵۰:۴۰) ”وہ پوچھیں گے کیا

تمہارے پاس تمہارے رسول نشانیاں لے کر نہیں آتے رہے تھے۔ وہ کہیں گے ہاں۔“ جہنم کے اہل کار ان کا یہ سوال جواب ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ بات یہاں ختم ہو جائے۔ اب جہنم کے اہل کار ان بات دامن جھاڑ لیتے ہیں اور نہایت ہی حقارت اور استہزاء کے ساتھ ان کو اس مایوسی میں ڈوبا ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔

قَالُوا فَاذْعُوبُوا (۵۰: ۴۰) ”پھر تو تم دعا کر دو۔“ اگر یہ دعا تمہاری اس حالت کے اندر کوئی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔۔۔ اور آخر میں یہ تبصرہ آتا ہے :

وَمَا دُعُوا الْكُفْرَيْنَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ (۵۰: ۴۰) ”اور کافروں کی دعا اکارت ہی جانے والی ہے۔“ وہ مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ نہ جگہ تک پہنچتی ہے اور نہ اس کا جواب آتا ہے۔ یوں ضعفاء اور کبراء دونوں کو ناقابل التفات حالت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

--- ۰۰۰ ---

جہنم کے اس فیصلہ کن موقف کے بعد پھر آخری تبصرہ یہ ہے۔ یہ تمام مخلوق کے لیے سبق ہے۔ اس سے قبل اس طرف اشارہ آیا تھا کہ جو گروہ اور پارٹیاں اللہ کے عذاب کو دعوت دیتی ہیں اور رسول کی تکذیب کرتی ہیں اور زمین میں انگبار کا رویہ اختیار کرتی ہیں قیامت میں تو ان کا یہ حال ہو گا جتنی دنیا میں بھی بے غم نہ رہیں گے۔

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ﴿۱﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعَذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ
وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴿۲﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَىٰ وَأَوْثَقْنَا بِنِيِّ إِسْرَءِيلَ
الْكِتَابَ ﴿۳﴾ هُدًى وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَ
اسْتَغْفِرْ لِنَفْسِكَ وَنَفْسِ بْنِ إِسْرَءِيلَ وَنَفْسِ الْإِبْرَاهِيمَ ﴿۵﴾

”یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے“ جب خالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان پر لعنت پڑے گی اور بدترین ٹھکانا ان کے حصے میں آئے گا۔ آخر دیکھ لو کہ موسیٰ کی۔ نے رہنمائی کی اور بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنا دیا جو عقل و دانش رکھنے والوں کے لیے ہدایت و نصیحت تھی۔ پس اسے نبی مبرک کرد اللہ کا وعدہ برحق ہے اپنے تصور کی معافی چاہو اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔“

اس دو ٹوک موقف پر یہ فیصلہ کن تبصرہ بہت ہی مناسب ہے۔ انسانیت کو معلوم ہو گیا کہ حق و باطل کی کشمکش کا آخری انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ اس دنیا میں دونوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور آخرت میں دونوں کا انجام کیا ہو گا۔ انسانوں نے دیکھ لیا کہ فرعون اور اس کے سرداروں کا انجام اس دنیا میں کیا ہوا جس طرح انہوں نے قیامت کے منظر میں دیکھ لیا کہ وہ آگ میں بھی لیک دو سرے کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ اور ان کو نہایت حقارت کے ساتھ ناقابل التفات چھوڑ دیا گیا۔ ہر کشمکش کا فیصلہ یہی ہوتا ہے جس طرح قرآن کا مرتب فیصلہ ہے۔

اَنَا لَنَنْصُرَنَّ رُسُلَنَا وَ الَّذِينَ اٰمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُومُ
الْاَشْهَادُ (۵۱:۴۰) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوءُ

الذَّارِ (۵۲:۴۰) ”یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں اور اس روز بھی کس گے جب گواہ کھڑے ہوں گے جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان پر لعنت پڑے گی اور بدترین ٹھکانا ان کے حصے میں آئے گا۔“۔ رہی آخرت تو کسی مومن کی جانب سے تو اس کے بارے میں کسی بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر بحث ہو سکے۔ رہی دنیا میں نصرت تو اس کی تشریح کی ضرورت ہے۔

بہر حال اللہ کا فیصلہ اور وعدہ تو یقینی ہے۔ قطعی الفاظ میں ہے۔

اَنَا لَنَنْصُرَنَّ رُسُلَنَا وَ الَّذِينَ اٰمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۵۱:۴۰) ”بے شک ہم اپنے رسولوں اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں مدد کرتے ہیں۔“ لیکن لوگوں کا مشاہدہ یہ ہے کہ رسولوں میں سے بعض تو قتل بھی کیے گئے، بعض کو اپنی زمین سے بھی نکالا گیا۔ ان کو اپنا گھر اور قوم چھوڑنا پڑی اور علاقہ بدر کر دیئے گئے۔ مومنین میں سے بعض بعض کو سخت عذاب دیا جاتا ہے۔ بعض کو گڑھوں میں جلایا جاتا ہے، بعض شہید ہوتے ہیں، بعض نہایت دکھ درد اور مصیبتیں جھیٹتے ہیں تو پھر یہ قطعی وعدہ کس طرح ہے کہ ہم حیات دنیا میں اپنے رسولوں اور مومنین کی مدد کرتے ہیں۔ اس سوال کے ذریعہ شیطان اللہ کے بندوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور ان کے ساتھ کیا کچھ کرتا ہے؟ تو حقیقت کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ تمام امور کے ظاہری پہلو ہی کو جانتے ہیں۔ ان کے سامنے وہ بیشتر قدریں اور حقائق نہیں ہوتے۔ جن کا تعلق اللہ کے نظام قضا و قدر سے ہوتا ہے۔۔۔ پھر لوگوں کی سوچ، اعمال و نتائج کے بارے میں ایک محدود زمانے تک محدود ہوتی ہے اور انسان کے قیاس اور سوچ کا دائرہ محدود ہوتا ہے، رہے اللہ کے فیصلے تو زمان و مکان کے اعتبار سے ان کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک زمانے اور دوسرے زمانے میں جدلی نہیں کرتا۔ ایک علاقے اور دوسرے علاقے میں فرق نہیں کرتا۔ اگر ہم زمان و مکان کے حدود سے آگے بڑھ کر ایمان کے مسئلہ پر سوچیں تو حقیقت یہ سامنے آئے گی کہ ایمان کامیاب رہتا ہے۔ ایمان اور عقیدے کی کامیابی دراصل ان لوگوں کی کامیابی ہوتی ہے جو ایمان اور عقیدے کو اپناتے ہیں۔ اہل ایمان کا ایمان سے باہر کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ اور ایمان کا پہلا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ ایمان لانے والے اس میں فنا ہو جائیں۔ وہ خود مٹ جائیں اور ایمان کو نمایاں کر دیں۔

پھر نصرت کا مفہوم بھی لوگوں کے ہاں محدود ہے۔ وہ قریبی نصرت دیکھتے ہیں جت وہ خود دیکھ سکیں۔ لیکن نصرت کی اشکال تو بے شمار ہیں۔ بعض اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ انسان کو نصرت بظاہر شکست نظر آتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا جاتا ہے لیکن وہ اپنے عقیدے اور دعوت سے نہیں پھرتے۔ سوال یہ ہے کہ ان کو نصرت ہوئی یا وہ شکست کھا گئے۔ ایمان کے پیانوں سے دیکھا جائے تو ان کو فتح ہوئی۔ اس وقت بھی وہ فاتح تھے، جب ان کو آگ میں پھینکا

جا رہا تھا اور اس وقت بھی وہ فاتح تھے جب ان کو نجات دی گئی۔ یہ بھی فتح کی ایک صورت ہے اور آگ کا ٹکڑا ہونا بھی اس کی ایک صورت ہے۔ جبکہ بظاہر دونوں کی صورتیں مختلف ہیں۔ لیکن اپنی اصلیت میں دونوں ایک ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کربلا میں شہادت پاتے ہیں 'یہ ایک دلدوز واقعہ ہے۔ یہ فتح تھی یا شکست۔ اگر بظاہر محدود پیمانوں سے دیکھا جائے تو شکست تھی۔ اور اگر حقیقت کے پیمانوں سے دیکھا جائے تو یہ عظیم فتح ہے۔

قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حسین کو آج تک محبت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ آج تک لوگوں کے دل حسین کے ساتھ ہیں۔ آج تک لوگ ان پر فدا سوتے ہیں جبکہ فاتحِ یزید کا نام و نشان غائب ہے۔ حسین پر شیعہ سنی سب فدا ہیں اور یزید کے بارے میں کوئی نہیں کہتا کہ وہ لولہ یزید ہے یا یزید ہی ہے۔

کئی ایسے شہداء ہیں کہ اگر وہ ہزار سال زندہ رہتے تو اپنے نظریات کو پھیلا نہ سکتے۔ لیکن ایک شہادت سے ان کے نظریات اقطارِ عالم تک پھیل گئے۔ کوئی بھی شہید اپنے بیان اور تقریروں سے عوام کو بلند مقاصد عطا نہیں کر سکتا۔ نہ عوام کو بلند مقاصد کے لیے ابھار سکتا ہے۔ لیکن اپنے خون کے ذریعہ وہ جو خطبہ دیتا ہے اور وہ اس کا آخری خطاب ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے محرک ہوتا اور نسوں تک نشانِ حزن رہتا ہے۔ اور بعض اوقات تو ایک شہید جو راہ متعین کرتا ہے صدیوں تک تاریخ اس پر چلتی رہتی ہے اور قافلے اسی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

تو پھر فتح کیا ہے اور ہزیمت کیا ہے؟ ہمیں چاہئے کہ فتح و شکست کے جو پیمانے ہم نے اپنے ذہنوں میں قائم کر رکھے ہیں ان پر در نظر ثانی کریں۔ اور اس کے بعد پھر پوچھیں کہ اللہ کی وہ مدد کہاں ہے جس کا وعدہ اللہ نے مومنین سے کیا ہے 'دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی'۔

ہاں بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ جب ظاہری صورت حال 'اللہ کے اعلیٰ اور دور رس پیمانوں کے ساتھ موافق ہو جاتی ہے تو فوری فتح بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے اپنی زندگی ہی میں نصرت اور کامرانی عطا فرمائی تھی کیونکہ دنیا میں اسماعیلی نظریہ حیات کی حقیقت اور یہ نصرت ساتھ ساتھ قائم ہو گئی تھیں۔ عقیدے کو نصرت تب ملتی ہے جب عقیدہ انسانی سوسائٹی پر غالب آجائے اور وہ سوسائٹی اس 'نک میں رنگ کر اس کے اندر ڈوب جائے۔ ایک فرد، ایک جماعت اور ایک قوت حاکمہ سب کی سب اس میں ڈوب جائے تو پھر اللہ ایسے دایوں اور ایسی دعوت کی مدد کرتا ہے اور یہ نظریہ اور یہ نظام اپنی حقیقی صورت میں پھر قائم ہو جاتا ہے اور یہ نظام غالب ہو کر تاریخ پر اپنے نقوش چھوڑتا ہے۔ اور تاریخ پر اس کے یہ نقوش نمایاں نظر آتے ہیں۔ یوں قریبی نصرت کی صورت اور دور رس مقاصد کی صورت باہم متصل ہو جاتی ہیں۔ اب بظاہر نصرت عاجلہ ظہور میں آتی ہے جو دور رس سنتِ الہیہ کا حصہ ہوتی ہے۔ یوں سنتِ الہیہ اور تقدیرِ الہی کے اندر ایک فوری فتح کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ اللہ کا وعدہ اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کے ساتھ قائم ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ وعدے کے مستحق ہونے والے مومنین کے دلوں کے اندر حقیقتِ ایمان صحیح طرح قائم اور جاگزیں ہو جائے تاکہ اس پر اللہ کا وعدہ مرتب ہو۔ حقیقتِ ایمان کے سلسلے میں بسا اوقات لوگ سہل

انکاری سے کام لیتے ہیں۔ ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ قلب مومن میں شرک کا شائبہ تک نہ رہے۔ کسی قسم کی شرک بھی دل کے قریب نہ ہو۔ شرک کی بعض صورتیں نہایت خفیہ ہوتی ہیں۔ ان سے دل پاک و صاف اس وقت ہوتا ہے جب انسان صرف اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہو۔ اور صرف اللہ وحدہ پر توکل کرے۔ اور اللہ انسان کے بارے میں جو فیصلہ کرے اس پر وہ مطمئن ہو جائے۔ اور انسان اپنے آپ کو تقدیر الہی کے سپرد کر دے۔ انسان کے اندر یہ احساس ہو کہ اس کے معاملات میں صرف اللہ ہی متصرف ہے۔ لہذا اس کے لیے اللہ جو اختیار کرتا ہے اس پر وہ کسی حال میں حیران نہ ہو اور اس کو جو پیش آئے اسے نہایت اطمینان، اعتماد اور سر تسلیم خم کر کے قبول کرے۔ جب انسان تسلیم و رضا کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ بھی اللہ کے آگے نہیں بڑھتا اور جد بازی نہیں کرتا۔ اور اللہ کے سامنے فتح و نصرت اپنی پسندیدہ صورت میں پیش نہیں کرتا۔ اپنے معاملات اللہ کے حوالے کر دیتا ہے اور اپنی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ اسے اسی راہ میں جو بھی پیش آتا ہے 'وہ اسے خیر سمجھتا ہے۔ یہ ہے حقیقی نصرت..... یہ ہے نصرت اور فتح اپنی ذلت، اپنی خواہشات پر۔ یہ ہے اندرونی فتح اور خالص فتح تب ہی حاصل ہوتی ہے جب اندرونی فتح مکمل ہو۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوَةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ یَقُوْمُ
الْاَشْهَادُ (۵۱:۴۰) یَوْمَ لَا یَنْفَعُ الظَّالِمِیْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوءُ

الدَّارِ (۵۲:۴۰) ”یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں“ اور اس روز بھی کس گے جب گواہ کھڑے ہوں گے جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی قائدہ نہ دے گی اور ان پر لعنت پڑے گی اور بدترین ٹھکانا ان کے حصے میں آئے گا۔“

سابقہ منظر میں ہم نے دیکھا کہ ظالموں کے لیے کوئی معذرت مفید نہیں ہے۔ اور ان کا انجام یہ ہوا کہ ان پر لعنت پڑی اور جہنم رسید ہوئے۔ رہی یہ بات کہ اللہ رسولوں کی مدد کس طرح کرتا ہے تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ نے مدد فرمائی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسٰی الْهُدٰی وَ اَوْرَثْنٰۤہٗۤا بَنِیْۤاِسْرَآءِیْلَ الْکِتٰبَ (۵۳:۴۰) هُدٰی

وَ ذٰکِرٰی لِاَوَّلِی الْاَلْبَابِ (۵۴:۴۰) ”آخر کار دیکھ لو کہ موسیٰ کی ہم نے رہنمائی کی اور بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنا دیا جو عقل و دانش رکھنے والوں کے لیے ہدایت و نصیحت تھی۔“ یہ اللہ کی نصرت کا ایک نمونہ تھا کہ حضرت موسیٰ کو کتاب دی، ہدایت دی اور پھر نجات دی۔ یہاں بطور مثال قصہ موسیٰ کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ قصہ بہت ہی طویل ہے اور اس میں نصرت اور تائید خداوندی کے کئی نمونے ہیں۔

اس مثال کے بعد ایک آخری تسلی کیونکہ مکہ میں مسلمان اور رسول اللہ بہت ہی مشکل حالات میں زندگی بسر فرما رہے تھے، ان کو تسلی دی جا رہی ہے کہ نصرت ضرور آئے گی اور رسول اللہ کے بعد جو لوگ دعوت اسلامی کا کام کر رہے ہیں اور ایسے ہی حالات میں ہیں، ان کے لیے بھی تسلی ہی تسلی ہے۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ (۵۵:۴۰)

”اے نبی صبر کرو اللہ کا وعدہ برحق ہے اپنے قصوروں کی معافی چاہو اور صبح و شام اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔“ عقل و خرد کی تاروں پر یہ آخری ضرب ہے۔ صبر کی دعوت، لوگوں کی جانب سے تکذیب پر صبر کرو اس پر صبر کرو کہ باطل کو اقتدار اور قوت حاصل ہے اور اس کی وجہ سے وہ پھیل رہا ہے لیکن یہ ایک عرصے کے لیے ہے، لوگوں کے مزاج۔ ان کے اخلاق اور ان کے معاملات کی غلطیوں پر صبر کرو انسان کے نفس، اس کی خواہشات اور چاہتوں پر صبر کرو خصوصاً جب نفس یہ چاہے کہ اللہ کی نصرت بہت جلد آنی چاہئے اور نصرت کے نتیجے میں ہونے والی کامیابیوں اور تحریک اسلامی کی طویل جدوجہد میں دشمنوں سے بھی پہلے دوستوں کی طرف سے پیدا کی جانے والی مشکلات پر صبر کرو۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ (۵۵:۴۰) ”اے نبی صبر کرو اللہ کا وعدہ حق ہے۔“ دیر آید درست آید۔ اگر آپ کے معاملات پیچیدہ ہوں۔ اگر بظاہر اسباب نصرت نہ نظر آتے ہوں کیونکہ نصرت کا وعدہ وہ ذلت باری کر رہی ہے جو اپنے وعدے کو حقیقت کا جامہ پہنا سکتی ہے اور اللہ نے وعدہ کیا ہے تو اللہ نے ارادہ کر لیا ہے۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ (۵۵:۴۰) ”اور اپنے قصور کی معافی چاہو اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔“ یہ ہے اصلی زاد سفر۔ نہ راہ بہت طویل ہے اور دشوار گزار ہے۔ اس میں وہی شخص آگے قدم بڑھا سکتا ہے جو اپنے قصوروں کی معافی چاہتا رہے، جو حمد باری تعالیٰ کرتا رہے اور حمد کے ساتھ اللہ کی تسبیح اور پاکی بیان کرتا رہے۔ اس میں نصرت بھی مل سکتی ہے اور نفس انسانی کی تربیت بھی۔ اور اس راستے پر چلنے کی تیاری بھی اور قلب و نظر کی تطہیر بھی۔ یہ وہ نصرت ہے جو قلت تعداد کے اندر بھی اپنا کام کرتی ہے اور اس کے بعد نصرت کی وہ صورت سامنے آتی ہے جو زندگی کی عملی صورت میں ہوتی ہے۔

صبح و شام کا ذکر یا تو اس لیے ہے کہ اس سے مراد پورا وقت ہے کیونکہ صبح و شام اوقات کے اطراف ہیں۔ یا ان اوقات میں انسانی قلب صاف اور متوجہ ہوتا ہے اور ان اوقات میں غور و فکر اور اللہ کی حمد و تسبیح کے اثرات گہرے ہوتے ہیں۔

یہ ہے وہ منہاج جس کے مطابق اللہ کی نصرت حاصل ہو سکتی ہے اور اسے اللہ نے اپنی نصرت دینے کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اسی کے مطابق اس راستے پر چلنے کی تیاری ہوگی، زاد سفر تیار ہوگا۔ اور تب نصرت ملے گی اور کسی بھی سفر کے لیے تیاری اور ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی جنگ بغیر تربیت اور سامان کے نہیں ہو سکتی۔

درس نمبر ۲۲۵ ایک نظر میں

یہ سبق اپنے موضوع اور مضمون کے اعتبار سے پوری طرح سابق سبق سے بالکل مربوط اور یکساں ہے۔ اس سبق میں وہی مضمون آگے چلا ہے جو پہلے سبق کے آخر میں چھوڑا گیا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ لوگ دعوت اسلامی کی جو ناقص تکذیب کرتے ہیں۔ آپ اس پر صبر کس۔ وہ آپ کو ایذا دیتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف آنے سے روکتے ہیں یہ سب کچھ وہ اپنے جھوٹے فخر و غور کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگ بغیر دلیل و برہان کے اللہ کی آیات میں کیوں جھگڑتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ہیں تو بہت جھوٹے اور بونے مگر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں اور یہ کہ ان کے دلوں میں بیٹھا ہے اور حق کو تسلیم کرنے سے مانع ہو رہا ہے۔

چنانچہ ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم بڑے ہو یا اللہ کی بتائی ہوئی یہ کائنات بڑی ہے۔ ذرا آسمانوں کی دوریوں پر غور کرو اور اس زمین پر غور کرو، تمہیں نظر آجائے گا کہ تم کتنے بڑے ہو۔ یہ سبق آگے بڑھتا اور اس کائنات کی بعض نشانیوں کو بیان کرتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ دیکھو ان عظیم نشانیوں کو اس چھوٹے اور کمزور انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ خود انسانی ذات پر اللہ نے جو فضل و کرم کیے ہیں۔ ذرا ان پر تو غور کرو کیا یہ سب چیزیں اللہ وعدہ کے وجود اور اس کی بادشاہت اور وحدانیت پر مکمل دلیل نہیں ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ آپ کلمہ توحید بلند کریں اور ان الہوں سے منہ پھیر لیں جن کی پرستش یہ لوگ کرتے ہیں۔ اس سبق کا خاتمہ ایک ایسے خوفناک منظر کے ساتھ ہوتا ہے جو قیامت کے مناظر میں سے ہے۔ ان کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے وہاں ان سے پوچھا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ تمہارے اللہ۔ اور اس کا خاتمہ بھی درس سابق کے خاتمہ کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تلقین پر ہوتا ہے کہ آپ صبر فرمائیں۔ چاہے اللہ آپ کو اسلامی انقلاب کا کچھ حصہ دکھادے یا آپ کو اٹھالے۔ بلبل اس کے کہ نصرت مائے۔ یہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۲۵ تشریح آیات

۵۶۔۔۔ تا۔۔۔ ۷۷

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ
 إِنَّ فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيهِ فَاستَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ
 السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝ لَخَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ
 لَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرَةُ وَالَّذِينَ
 آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ إِنَّ السَّاعَةَ
 لَأَتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَقَالَ رَبُّكُمْ
 ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ
 جَهَنَّمَ دُخْرِينَ ۝

۱۰ع

”حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی سند و حجت کے بغیر جو ان کے پاس آئی ہو اللہ کی آیات میں جھگڑ رہے ہیں ان کے دلوں میں کبر بھرا ہوا ہے مگر وہ اس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جس کا وہ ٹھنڈ رکھتے ہیں۔ بس اللہ کی پناہ مانگ لو! وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسان کو پیدا کرنے کی بہ نسبت یقیناً زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائیں اور ایماندار و صالح اور بدکار برابر ٹھہریں مگر تم لوگ کم ہی کچھ سمجھتے ہو۔ یقیناً قیامت کی گھڑی آنے والی ہے اس کے آنے میں کوئی شک نہیں مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔ تمہارا رب کہتا ہے ”مجھے پکارو میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا“ جو لوگ ٹھنڈ میں اگر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“

یہ انسان بسا اوقات اپنے آپ کو بھول جاتا ہے یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اس کائنات کی ایک چھوٹی اور ضعیف مخلوق ہے۔ یہ بذات خود قوت کا سرچشمہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنی قوت دراصل قوت کے اصلی سرچشمے سے اخذ کرتا ہے یعنی اللہ

ہے۔ جب اللہ سے اس کا رابطہ کٹ جاتا ہے تو پھر وہ پھونسا سو جتا شروع ہو جاتا ہے 'اونچا ہونا اور سرکش ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس کے دل میں یہ بات بیٹھنا شروع ہو جاتی ہے کہ وہ کوئی بہت بڑی چیز ہے اور اس کی یہ سوچ شیطان سے افذ ہوتی ہے جو اس کبر ہی کی وجہ سے رائدہ درگاہ ہوا اور پھر اللہ نے اس انسان پر مسلط کر دیا جس پر وہ ہر طرف سے حملہ آور ہوتا ہے۔

یہ انسان پھر اللہ کی نشانیوں کے بارے میں جھگڑتا رہتا ہے اور ہٹ دھرمی کرتا ہے۔ یہ ہٹ دھرمی ایک ایسی صفت ہے جس سے انسان کی فطرت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس قسم کا انسان خود اپنے آپ کو اور لوگوں کو یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ حق کے لیے تحقیق و تفتیش کر رہا ہے اور بحث اس لیے کر رہا ہے کہ اسے تسلیم نہیں ہوئی۔ اور اسے پورا پورا یقین نہیں ہے لیکن اللہ تو اپنے بندوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ سمجھ و بصیرت اور دل کے رازوں کا جاننے والا ہے 'یہ اللہ فیصلہ فرماتا ہے کہ یہ کبر کی وجہ سے ہے صرف اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ یہ کبر دل میں جاگزیں ہوتا ہے اور یہ کسی شخص کو ایسے مسئلے میں جھگڑے پر آمادہ کر دیتا ہے جو جھگڑے کا ہوتا نہیں ہے۔ یہ کبر ہی ہے جو انسان کو ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالنے پر آمادہ کرتا ہے جو انسان کی حقیقت سے زیادہ اونچے ہوتے ہیں 'انسان ایسے مقام تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے جو اس سے بلند ہوتا ہے اور انسانی حقیقت سے بالا ہوتا ہے۔ انسان کے پاس اس کے لیے نہ دلیل ہوتی ہے اور نہ وجہ جواز۔ صرف اس کبر کی وجہ سے وہ اس طرح کی اونچی پرواز شروع کر دیتا ہے 'ایسے ہی لوگ ہیں

اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰہُمْ اِنْ فِیْ صُدُوْرِہِمۡ اِلَّا کِبْرٌ مَّا

ہُمْ بِبَالِغِہٖ (۵۶:۴۰) "حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی سند اور حجت کے بغیر جو ان کے پاس آئی ہو اللہ کی آیات میں جھگڑ رہے ہیں 'ان کے دلوں میں کبر بھرا ہوا ہے 'مگر وہ اس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جن کا وہ جھگڑا رکھتے ہیں۔" اگر انسان اس کائنات کو اچھی طرح سمجھ لے اور اپنی ذات کی معرفت حاصل کرے اور اس کائنات میں اپنی حیثیت کا ادراک کرے تو وہ مطمئن ہو جائے اور اپنی حیثیت اور منصب سے آگے نہ بڑھے۔ اگر وہ یہ معلوم کرے کہ وہ ان لاتعداد موجودات میں سے ایک ہے اور جس طرح یہ پوری کائنات امر ربی کی پابند ہے 'اس طرح وہ بھی ہے اور وہ بھی اللہ کے نظام تضاد و قدر کے مطابق چل رہا ہے جسے صرف اللہ جانتا ہے اور یہ کہ اس کائنات میں اس کا کردار ایک متعین کردار ہے 'اگر انسان ان حقائق کا ادراک کرے تو وہ مطمئن اور آرام سے بیٹھ جائے اور اس کا سر قدرے جھک جائے اور اس کے اندر تواضع پیدا ہو جائے اور وہ اپنے آپ کے ساتھ 'اس کائنات کے ساتھ اور اپنے ماحول کے ساتھ نہایت امن و سلامتی کے ساتھ رہے۔

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّہٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۵۶:۴۰) "پس اللہ کی پناہ مانگ لودہ سب کچھ دیکھتا

اور سنتا ہے۔" کبر کے مقابلے میں اللہ کی پناہ مانگنے کا مشورہ دینا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ بہت ہی قبیح اور قابل نفرت خصلت ہے۔ کیونکہ اللہ کی پناہ نہایت ہی قبیح اور ناپسندیدہ چیز ہے مانگی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں شر و فساد اور لذیت ملتی ہے۔ اور کبر میں یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ کبر خود صاحب کبر کے لیے مصیبت ہے اور اس کے ماحول کے لیے بھی

معیبیت ہے۔ جس دس میں کبر ہو اس کے لیے بھی اذیت ہے اور دوسروں کے دلوں کو بھی دکھانے والی عادت ہے۔ لہذا کبر ایک ایسا شر اور فساد ہے جس سے اللہ کی پناہ مانگنا ضروری ہے۔

اِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (۵۶: ۴۰) ”وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے“۔ کبر انسان کو ایسی حرکات پر آمادہ کرتا ہے جو دیکھی جاسکتی ہیں اور انسان سے ایسی باتیں کرواتا ہے جو سنی جاسکتی ہیں اس سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو سننے اور دیکھنے والے کی ولایت میں دے دو۔

اس کے بعد انسان کو بتایا جاتا ہے کہ اس عظیم کائنات میں اس کا حقیقی مقام کیا ہے۔ اور اللہ کی بعض مخلوقات جسے انسان دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ کس قدر چھوٹا اور کمزور ہے۔ اور یہ چیزیں جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ دیکھتے ہی انسان ان کی ضخامت کا قائل ہو جاتا ہے۔ اور جب ان کی پوری حقیقت ان کی سمجھ میں آجائے تو ان کا شعور اور ہمت ہل جاتا ہے۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لَكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا

يَعْلَمُوْنَ (۵۷: ۴۰) ”آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے مقابلے میں یقیناً زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔“۔ آسمان اور زمین انسان کے سامنے بچھے ہوئے ہیں اور انسان ان کو دیکھتا ہے۔ اور انسان کی حالت میں ہے یہ بات کہ وہ ان کے حوالے سے اپنی قدر و قیمت معلوم کرے۔ جب انسان کو اس زمین و آسمان کے حوالے سے اپنی نسبت ’آسمانوں کی دوریاں اور اٹلاک سماوی کے حجم کا غم ہوتا ہے تو اس کا سر جھک سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنی کم مائیگی کے شعور کی وجہ سے وہ پگھل کر رہ جائے لایہ کہ وہ انسان کے اس شرف کو یاد کرے جو اللہ نے اس کے اندر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے انسان کو مکرم بنایا گیا ہے۔ وہ واحد صفت ہے جس کی وجہ سے انسان اس کائنات کی عظمت کے سامنے کھڑا ہو سکتا ہے کیونکہ کائنات ہی عظیم اور ہولناک ہے اور وہ ہمت ہی چھوٹا ہے۔

اس عظیم کائنات کے اور اوپر ایک لمحہ غور کرنا انسان کو یہ سب کچھ معلوم کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ زمین جس کے اوپر ہم رہتے ہیں۔ یہ سورج کے تابع ستاروں میں سے ایک چھوٹا سا ستارہ ہے۔ اس سورج کے تابع ستاروں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور یہ زمین سورج سے دس لاکھ گنا چھوٹی ہے۔ پھر یہ سورج اس قسم کے سو ملین سورجوں میں سے ایک ہے جو ہمارے قریب ترین ککشاں میں ہیں۔ اور ہم بھی اسی ککشاں میں ہیں اور انسانوں نے آج تک سو ملین ککشاں دریافت کر لیے ہیں جو اس عظیم فضا میں تیر رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ اس فضا کا نہایت ہی چھوٹا حصہ ہوں۔

جہاں تک انسانی معلومات کا تعلق ہے تو انسان نے ابھی تک اس کائنات کے ایک مختصر اور قابل ذکر حصے کی دریافت کی ہے اور یہ چھوٹا سا حصہ بھی اس قدر بڑا ہے کہ صرف اس کے تصور ہی سے انسان کا سر چمکاتا ہے۔ ہم اپنے سورج سے تقریباً ۹۳ ملین میل دور ہیں اور یہ سورج ہماری اس چھوٹی سی زمین کے کتبے کا سرخیل ہے۔ اور یہ زمین بھی اپنی اس ماں کی چھوٹی سے یعنی سورج سے ۹۳ ملین میل دور ہے۔ یہ زمین سورج ہی سے جدا ہوئی ہے۔

وہ ککشاں جس کے تابع یہ سورج ہے اس کا قطر تقریباً ایک لاکھ ملین نوری سال ہے۔ اور نوری سال چھ سو ملین

میل ہوتا ہے کیونکہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ ہوتی ہے۔

اور ہماری کمکشاں سے قریب ترین کمکشاں ایک لاکھ سات سو پچاس ہزار نوری سال دور ہے۔ ہمیں یہاں یہ بات پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہ دریاں اور غم وہ ہیں جو اس حقیر انسان نے دریافت کر لیے ہیں اور اس کے ساتھ انسان نے یہ بھی دریافت کر لیا ہے وہ حقیقت کائنات ہی چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

لَخَلْقُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا

يَعْلَمُونَ (۵۷: ۴۰) ”آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسان کو پیدا کرنے کی یہ نسبت یقیناً زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔“

اللہ کی قدرت کے سامنے کوئی بات نہ بڑی ہے اور نہ چھوٹی نہ مشکل ہے اور نہ آسان۔ وہ تو ہر چیز کی تخلیق ایک کلمہ سے کرتا ہے۔ یہ صفات تو اشیاء کی ہیں۔ لوگ انہیں کم دیکھتے ہیں یا زیادہ آسان دیکھتے یا مشکل۔ پھر انسان اور اس ہولناک سرچکرا دینے والی کائنات کی باہم کیا نسبت ہے؟ اس کم مانگی کے باوجود پھر انسان کا یہ کبرا!

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ

(۵۸: ۴۰) ”لوہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائیں اور ایماندار اور صالح اور بدکار برابر ٹھہریں۔“

صاحب بصارت تو دیکھتا ہے اور استعم ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی قدر و قیمت بھی جانتا ہے۔ حد سے نہیں گزرتا، پھول نہیں اور نہ تکبر کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے، اندھا نہ دیکھتا ہے اور نہ خود اپنی قدر و قیمت جانتا ہے، نہ اپنی پوزیشن جانتا ہے اور نہ اپنے ماحول کے ساتھ اپنی نسبت کو جانتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے وہ اپنے بارے میں غلط اندازہ کرتا ہے۔ پھر اپنے ماحول کے بارے میں غلط فیصلہ کرتا ہے۔ اور ان غلط اندازوں کی وجہ سے پھر وہ راہ بھول جاتا ہے۔ اس طرح مومن و صالح اور بدکار برابر نہیں ہو سکتے۔ مومن دیکھنے والے اور جاننے والے ہوتے ہیں۔ لہذا وہ اپنا اور اپنے ماحول کا صحیح اندازہ کرتے ہیں، جبکہ کافر اور بدکار جاہل ہوتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو برباد کر دیتے ہیں۔ اپنے آپ کو اپنے ماحول کو، لوگوں کو اور سب سے پہلے وہ اپنے عمل اور فہم کو برباد کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ اندھے ہوتے ہیں، دلوں کے اندھے۔

قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ (۵۸: ۴۰) ”مگر تم لوگ کم ہی سمجھتے ہو۔“ اگر ہم سمجھتے تو ہمیں حقیقت معلوم

ہوتی۔ بات واضح ہے۔ صرف یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ اگر ہم آخرت پر ہلکتے یقین رکھتے اور اسے یاد کرتے اور مقامات قیامت کو ذہن میں رکھتے اور وہاں کی حاضری ہمارے ذہن میں ہوتی تو ہم بختہ مومن ہوتے۔

إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ (۵۹: ۴۰) ”یقیناً

قیامت آنے والی ہے۔ اس کے آنے میں کوئی شک نہیں مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔“ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ کی آیات میں

مبادلہ کرتے ہیں اور کبر کرتے ہیں۔ ورنہ اگر مانتے اور یقین کرتے تو وہ حق کو پہچانتے۔ وہ جانتے کہ حق کے حوالے سے اوستکافیا مقام ہے۔ اس لیے تجاوز نہ کرتے۔

صرف اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور بندگی کرنا اور نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ کو پکارنا انسان کو اس کبر سے بچاتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان پھول جاتا ہے اور بغیر حجت کے اللہ کی آیات میں جھگڑا کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اپنے دردناکے کھوتا ہے تاکہ ہم اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کو پکاریں اور اعلان فرماتا ہے کہ میں نے ہر پکارنے والے کی پکار کو قبول کرنا اپنے اوپر لکھ دیا ہے۔ اور ان لوگوں کو ڈراتا ہے جو اللہ کی پکار کے مقابلے میں تکبر کرتے ہیں کہ وہ آگ میں ذلیل و خوار ہوں گے۔

وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ

سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ ذٰلِحِرِيْنَ (۶۰ : ۴۰) ”تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ جو لوگ جہنم میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“ یہ یاد رہے کہ دعا کے بھی آداب ہیں اور ان کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ قلب کو اللہ کے لیے خالص ہونا چاہئے کوئی صورت متعین کیے بغیر مانگنا چاہئے اور اس یقین کے ساتھ مانگنا چاہئے کہ اللہ ضرور قبول فرماتا ہے۔ قبولیت کے ظروف و احوال اور زمان و مکان متعین نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ آداب دعا کے سراسر خلاف ہے۔ اور یہ یقین کرنا چاہئے کہ دعا کی توفیق صرف اللہ ہی دیتا ہے۔ یہ بھی ایک انعام ہے قبول ہونا دو سرا انعام ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں ”میں استجاب دعا کی پریشانی اٹھا کر نہیں پھرتا میری ذمہ داری تو یہ ہے کہ دعا کروں۔ جو مجھے یہ توفیق دے دی گئی اور یہ الہام کر دیا گیا کہ دعا کرو تو قبولیت ساتھ ہوتی ہے۔“ دعا تو عارف کے دل کی بات ہوتی ہے عارف اس بات کو جانتا ہے کہ جس خدا نے دعا کو مقدر کیا وہی قبولیت کا فیصلہ بھی کرتا ہے۔ جب اللہ توفیق دے تو دعا اور قبولیت دونوں باہم موافق اور مطابق طور ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔

جو لوگ اللہ کی طرف متوجہ ہونے سے کبر کرتے ہیں تو ان کی سزا یہ ہے کہ جہنم میں خوار اور ذلیل کر کے پھینکے جائیں اور کبر کی سزا اللہ کے ہاں یہی ہے جس کی وجہ سے انسان پھولتا ہے۔ ایک جھوٹا سا انسان اس چھوٹی سی زمین پر اور اس چھوٹی سی زندگی میں۔ اور یہ شخص اللہ کی عظیم تخلیق کو بھول جاتا ہے اللہ کی عظمت کو بھول جاتا ہے اور آخرت کو بھول جاتا ہے جبکہ یہ آنے والی ہے اور وہاں پھر اسے ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں کرنا ہو گا۔

--- ○ ○ ○ ---

جب ان لوگوں کا ذکر ہوا تو اللہ کی بندگی کرنے اور اسے پکارنے سے کبر کر کے ہیں تو اس حوالے سے اللہ کی بعض نعمتوں کا ذکر کر دیا گیا۔ وہ نعمتیں جو اللہ کی عظمت کی گواہ ہیں اور اس قسم کے حکمران پر اللہ کا شکر نہیں بجالاتے بلکہ اللہ کی عبادت کرنے اسے پکارنے اور اس کی طرف متوجہ ہونے سے کبر کرتے ہیں :

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۱۱﴾
 ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۖ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَآفَىٰ تُؤَفَّكُونَ ﴿۱۲﴾
 كَذَٰلِكَ يُؤَفِّكُ الَّذِينَ كَانُوا بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿۱۳﴾ اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ
 لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا وَ السَّمَاءَ بِنَاءً ۚ وَصَوَّرَكُمُ فَأَحْسَنَ صُورَكُمْ ۖ وَرَزَقَكُمُ
 مِنَ الطَّيِّبَاتِ ۚ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمُ فَتَبَرَّكِ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۴﴾

”وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو“ اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر براہِ فضل فرمانے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ وہی اللہ (جس نے تمہارے لیے یہ کچھ کیا ہے) تمہارا رب ہے۔ ہر چیز کا خالق۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کدھر سے بکائے جا رہے ہو؟ اسی طرح وہ سب لوگ بکائے جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے دھمے۔ وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اوپر آسمان کا گنبد بنا دیا۔ جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی ہی عمدہ بنائی۔ جس نے تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔ وہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بے حساب برکتوں والا ہے۔ وہ کائنات کا رب ہے۔ وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کو تم پکارو اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے۔ ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔“

گردشِ لیل و نہار تو دو کائناتی مظاہر ہیں جبکہ زمین و آسمان دو کائناتی تخلیقات ہیں۔ ان دونوں کو یہاں ذکر کر کے پھر بتایا جاتا ہے کہ اس لیل و نہار اور ارض و سماء کے اندر اللہ نے تمہاری خوبصورت شکلیں پیدا کیں اور پھر تمہارے لیے اس جہان میں قسم قسم کے رزق پیدا کیے۔ یہ ہے تمہارا رب اور یہ ہیں اس کے کارنامے۔ بڑی ہی برکتوں والا ہے رب العالمین! وہی زندہ ہے اور اس کے سوا کوئی زندہ نہیں ہے اور یہ سب کچھ اس کا فضل ہے۔ لہذا اللہ کو وحدہ لا شریک سمجھتے ہوئے صرف اسی کی بندگی کرو۔ اس سے معصوم ہوتا ہے کہ ان کائناتی مظاہر اور ان نکویتی معانی اور اللہ کی ان تخلیقات کو اللہ کی توحید اور اللہ کے نظامِ زندگی کے حوالے سے وسیع دائرہ میں پڑھنا، ان پر تدبر کرنا اور توحید اور شریعت کے ساتھ ان کا ربط پانا ضروری ہے۔ اور یہ دیکھنا کہ اس نکویتی نظام، شرعی نظام کے درمیان ہم آہنگی کیا ہے۔

یہ کائنات اللہ نے جس اصول پر بنائی ہے، پھر اللہ نے اسے جس ناموس فطرت کے مطابق چلایا ہے، وہی اللہ ہے جس نے اس کرۂ ارض پر زندگی کو چلایا، اس کی ترقی اور نشوونما کا انتظام فرمایا۔ پھر یہ وہی ذات باری ہے جس نے انسان کو اس کی موجودہ شکل عطا فرمائی جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اور انسان کی تخلیق اور اس کی حیات کے لیے ضروری امور کو اس کائنات کے اندر ملحوظ رکھا۔ وہی تو ہے جس نے رات کو سکون، آرام اور راحت کے لیے بنایا۔ اور دن روشن، دیکھنے کے لیے معاون اور دوڑ و دوپ کے لیے بنایا۔ اور زمین کو زندگی کے قابل اور چلنے پھرنے کے لیل بنایا اور آسمان کو ایک چھت کی طرح بنایا کہ وہ بلند یوں پر سیاروں اور ستاروں کو لیے ہوئے ہے، جو گرتے نہیں۔ اور جن کی دوریاں بھی باہم لپک

دوسرے کے ساتھ کرا کر خل نہیں ڈالتیں۔ اگر ان دوریوں میں دراپھر فرق پڑ جائے تو اس چھوٹے سے کرۂ ارض پر انسان کے وجود کے اندر خل واقع ہو جائے۔ یہ لہند ہی ہے جس نے اس زمین پر پاک خوراک پیدا کی۔ یہ رزق اسی زمین سے پیدا کیا۔ یہ رزق آسمانوں سے بارش کی شکل میں نازل ہوتا ہے اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔ اور انسانی صورتیں کس قدر خوبصورت اور رنگارنگ ہیں۔ اور پھر وہی ہے جس نے انسان کے اندر وہ صلاحیتیں پیدا کیں جو اس کائنات کے ساتھ متفق ہیں۔ اور یہ صلاحیتیں اس زمین پر رہنے کے لیے کافی ہیں۔ پھر یہ صد صیتیں اس پوری کائنات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہیں۔ تو یہ تمام امور باہم مربوط اور موافق ہیں جیسا کہ ہر شخص ملاحظہ کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام امور کو قرآن ایک ہی جگہ لیتا ہے۔ اسی ترتیب اور ربط سے لیتا ہے اور ان امور سے وحدانیت پر برہان قاطع پیش کرتا ہے۔ اور ان امور ہی کی روشنی میں قلب انسانی کو دعوت دیتا ہے کہ اللہ وحدہ کو پکارو۔ اور دین اور نظام زندگی صرف اسی کارائج کرو۔ اور آخر میں کہا جاتا ہے 'الحمد للہ رب العالمین! اور یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ رب العالمین وہی ذات ہو سکتی ہے جس نے ان تمام چیزوں کو اس طرح پیدا کیا۔ یہی ہے اللہ رب العالمین 'لہذا تعجب ہے کہ لوگ اس عظیم سچائی سے کس طرح منہ موڑتے ہیں۔

یہاں ہم سرسری طور پر وہ جھلکیاں دیتے ہیں جو خود جانیں گی کہ اس کائنات کی ساخت میں 'اور انسان کی زندگی کے ساتھ اس کے تعلق میں یہ امور ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ اللہ نے یہاں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے 'اس سمت میں چند لمحات۔

”یہ زمین سورج کے سامنے گردش محوری کر رہی ہے جس کے نتیجے میں لیل و نهار کا نظام وجود میں آیا ہے 'اگر اپنی گردش کی موجودہ رفتار سے اس کی رفتار قدرے تیز ہو جائے تو تمام مکانات گر جائیں 'اس زمین کے اجزاء ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور فضائے آسمانی میں بکھر جائیں۔“

”اور اگر یہ زمین موجودہ گردش محوری کی رفتار سے اپنی رفتار ذرا کم کر دے تو لوگ گرمی یا سردی سے ہلاک ہو جائیں۔ زمین کی موجودہ گردش محوری ایسی بنائی گئی ہے کہ یہ اس زمین کے اوپر حیوانی اور نباتاتی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ اور ان کے لیے اپنے وسیع معنوں میں مفید ہے۔“

”اور اگر زمین کی گردش محوری صرف رک جائے تو بخارات ختم ہو جائیں اور سمندر پانیوں سے خالی ہو جائیں۔“

”اگر زمین گردش محوری ختم کر دے اور سورج کے ارد گرد اپنی گردش سالانہ جاری رکھے تو کیا ہو گا۔ تمام فصلیں ختم ہو جائیں 'لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ گرمیاں کہاں ہیں اور سردیاں کب ہوں گی اور ریح و خریف ختم ہو جائے۔“

”اگر زمین کا چھلکا چند قدم اور دبیز ہوتا تو بعض گیہوں کے جذب کر لینے کی وجہ سے نباتات ختم ہو جائے۔“

”زمین کے اوپر کرۂ ہوائی جس قدر بلندی پر ہے اگر اس سے مزید بلند ہو جائے تو آج کل لاکھوں کے حساب سے ہوا میں جو شباب ثاقب جل جاتے ہیں 'وہ سب کے سب کرۂ ارض پر گرنے لگتے 'ان کی رفتار ۲۶ میل فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ اس طرح وہ زمین کے اوپر ان تمام چیزوں کو جلا کر رکھ دس گے جو جلنے کے قابل ہیں۔ اور اگر یہ شباب بندوق کی گولی کی رفتار سے بھی چلیں تب بھی سب کے سب زمین سے گرا جائیں۔ اور اس کے نتائج نہایت ہی خوفناک ہوں۔ انسان بچارے کی حالت تو یہ ہے کہ اگر ایک چھوٹا سا شباب جس کی رفتار بندوق کی گولی سے ستر مرتبہ زیادہ ہو 'اس زمین سے

بھی ٹکرا جائے تو اس شباب کے گزرنے سے جو حرارت پیدا ہوگی 'صرف اس حرارت ہی سے اس کے اجزائے جسم بکھر کر رہ جائیں'۔^(۱)

”اس وقت ہوائیں آکسیجن کی نسبت ۲۱ فیصد ہے اگر یہ ۵۰ فیصد ہو جائے تو جل جانے کی قابل تمام چیزیں آگ پکڑ لیں اور جل جائیں۔ بس آگ کی ایک چنگاری لگتے ہی تمام جنگلات جل جائیں بلکہ بھک سے اڑ جائیں۔ اگر ہوائی آکسیجن کم ہو کر ۱۰ فیصد ہو جائے یا اس سے کم ہو جائے تو کرۂ ارض کی زندگی شاید ایک طویل عرصہ بعد اپنے آپ کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کر ہی لے لیکن وہ تمام سنولیات ختم ہو جائیں جن کی وجہ سے انسان معدن قرار پایا ہے مثلاً آگ وغیرہ“۔^(۲)

غرض اس کائنات کی تخلیق و تکمیل میں ہزاروں لکڑی ممد اور معاون چیزیں 'باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ رکھی ہوئی نظر آتی ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک چیز میں معمولی خلل آجائے تو ہماری زندگی اپنی موجودہ شکل میں نہ رہے۔ اسی طرح دوسرے حیوانات کی زندگی کی موجودہ شکل بھی نہ رہے۔

رہا انسان تو اس کی تو یہ پیاری پیاری صورت ہی ایسی ہے 'جو نہایت ہی منفرد انداز میں ہے اور تمام زندہ اشیاء میں ممتاز ہے۔ یہ ایک اس قدر کامل اور مکمل تخلیق ہے کہ وہ اپنے تمام فرائض نہایت ہی سہولت اور ہارکی سے ادا کرتی ہے۔ اس کی یہ تخلیق اس کی زمین کے اوپر حرکت اور وہ حالات جن میں اس کے لیے زندہ رہنا اور کام کرنا آسان بنایا گیا ہے 'پھر اس کی وہ اعلیٰ و ارفع خصوصیت جس کے ذریعہ اسے تمام روئے زمین کی مخلوقات کا سردار بنایا گیا ہے اور اسے منصب خلافت ارضی دی گئی ہے اور اس منصب کے فرائض کی ادائیگی کے لیے اسے عقل و خرد سے نوازا گیا ہے۔ اور پھر رب تعالیٰ کے ساتھ اسے رابطے کا اعزاز دیا ہے۔ یہ تو انسان کی ممتاز ترین خصوصیات ہیں۔

اب ذرا ذات انسان کی طرف توجہ 'اگر انسانی ذات اس کے اعضاء 'اور ان کے فرائض کی ہارکی پر بحث کریں 'جو اس آیت کا مضمون بھی ہے۔

وَصَوِّرْكُمْ فَاَحْسَنَ صُوْرَكُمْ (۴۰: ۶۴) ”جس نے تمہاری صورت بنائی اور بہت ہی عمدہ بنائی“۔ تو ہمیں انسان کے چھوٹے چھوٹے اعضاء میں سے ہر ایک کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ بلکہ انسان کے خلیات میں سے ہر ایک خلیے پر بحث کرنی ہوگی۔

ایک ہی مثال سے تخلیق انسانی اور جسم انسان کی گہری ٹیکنالوجی کا پتہ چل سکتا ہے۔ انسان کے جڑے کو لیجئے اور اس کے اندر دانتوں کی تنصیب کو اگر آلہ خوراک کے زلیوہ سے دیکھا جائے تو یہ اس قدر حساس ہیں کہ اگر زبان یا لعاب میں ۱۰/۱ ملی میٹر کی حد تک لہار آجائے تو یہ جڑے زبان اور لعاب کی مزاحمت کرتے ہیں۔ اور اگر کسی دانت میں اسی قدر لہار آجائے تو وہ اپنے مقابل جسم کے ساتھ ٹکرائے شروع کر دے اور اگر دو جڑوں کے درمیان سگریٹ کے کاغذ جتنا موٹا کاغذ آجائے تو وہ دونوں جڑوں کا دباؤ محسوس کرے گا۔ اور اس پر بھی دونوں جڑوں کا دباؤ ہو گا کیونکہ دونوں جڑوں

(۱) ”اللہ کے ساتھ جو آسمانوں میں ہے“ ڈاکٹر احمد زکی۔

(۲) ”سائنس ایمان کا تقاضا کرتی ہے“ ترجمہ ڈاکٹر صالح علی

کی ساخت لہی ہوتی ہے کہ جب یہ دونوں ملتے ہیں تو دونوں طرف کے دانت پوری طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ یوں یہ پیٹنے اور چبانے کا عمل کرتے ہیں اور لہی چیزوں کو بھی چبا لیتے ہیں جن کا موٹاپا سگریٹ کے ابری کاغذ جیسا باریک ہو۔

پھر اسی انسان کو اپنی اس ساخت کے ساتھ اس زمین پر رہنے کے لیے سہولیات فراہم کی گئی ہیں کہ یہ یہاں زندہ رہے۔ اس کی آنکھوں کو روشنی کی لہروں پر بنایا گیا ہے تاکہ یہ دیکھنے کا کام کرے۔ اور اس کے کانوں کو ہوا اور آواز کی لہروں پر بنایا گیا ہے تاکہ یہ سننے کا کام کرے۔ غرض اس کے تمام اعضاء اور حواس کو اس فضا کے مطابق بنایا گیا ہے جس کے اندر اس نے زندگی بسر کرتا ہے اور اسے یہ طاقت بھی دی گئی ہے کہ وہ ایک حد تک اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال سکے۔

غرض اسے اس زمین کے لیے بنایا گیا ہے تاکہ یہ یہاں زندہ رہے۔ اس سے متاثر ہو اس کو متاثر کرے۔ غرض یہ ماحول جس میں انسان رہتا ہے اس کے اور انسان کی تخلیق کے درمیان گہری منصوبہ بندی موجود ہے۔ پھر انسان کی موجودہ شکل و صورت کا بھی اس کے موجودہ ماحول کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس کی ساخت کو اس ماحول کے مطابق بنایا گیا ہے، جہاں وہ رہتا ہے یعنی اس زمین و آسمان کے مطابق۔ اس لیے یہاں اللہ نے انسان کی اسی شکل کا ذکر اس آیت کے درمیان کیا ہے جس میں زمین و آسمان کی تخلیق کا ذکر ہے۔

اب قرآنی آیات کی قدرے تشریح۔

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (۴۰: ۶۱) ”وہ اللہ ہی ہے جس نے ہمارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن کیا۔“ رات کو سکون حاصل کرنا ہر زندہ چیز کے لیے ضروری ہے۔ نیز ایک تاریکی کا عرصہ ضروری ہے تاکہ اس میں زندہ غلے آرام کر سکیں اور اس وقت کے بعد پھر روشنی میں کام شروع کر سکیں۔ صرف نیند ہی کافی نہیں ہے تاریکی بھی ضروری ہے۔ بلکہ رات ضروری ہے۔ کیونکہ زندہ خلیہ روشنی کو برداشت کرتے کرتے اس قدر تھک جاتا ہے کہ اس کے اعصاب تلف ہونا شروع ہو جاتے ہیں چونکہ روشنی میں اسے آرام نہیں مل سکتا۔ لہذا رات کی تاریکی ضروری ہے۔

وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (۴۰: ۶۱) ”دن کو روشن کیا۔“ انداز تعبیر بالکل مشتمل ہے گویا دن ایک شخص ہے جو دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ لوگ دن میں دیکھتے ہیں۔ یہ تو ہے دن کی غالب افادیت اور صفت۔۔۔ لیکن گردش لیل و نهار کا یہ نظام ایک نعمت ہے جو اپنے اندر مزید نعمتیں پوشیدہ رکھتی ہے۔ اگر رات اور دن میں سے کوئی ایک دائمی ہو جائے، بلکہ اپنے موجودہ وقت سے وہ دراطویل ہی ہو جائے تو زندگی ناپید ہو جائے یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اللہ کے اس فضل کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جس کا لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ (۴۰: ۶۱) ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔“ اور ان دو نظری مظاہر یعنی

گردش لیل و نهار کے بعد یہ تصریح کر دی جاتی ہے کہ ان کو اللہ نے پیدا کیا ہے لہذا وہی اللہ ہونے کا مستحق ہے اور یہ نام ”اللہ“ ایک عظیم نام ہے۔

ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَّا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَانْتَبِهُوا (۶۲:۴۰) ”یہ ہے اللہ تمہارا رب جو ہر چیز کا خالق ہے اس کے سوا کوئی اللہ نہیں ہے“ پھر تم کدھر بکائے جا رہے ہو۔“ یہ ایک نہایت ہی تعجب انگیز اور حیرت افزا بات ہے کہ لوگ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز میں اللہ کا ہاتھ ہے اور تمام اشیاء کا موجود ہونا ہی از روئے عقل اس بات کو فرض کر دے کہ اس کا اللہ خالق ہے اور اللہ کے سوا کوئی اور قوت بھی نہ ہو کہ وہ خالق ہونے کی مدعی ہو اور یہ بات بھی ذہن میں نہ آتی ہو کہ یہ چیزیں خود بخود وجود میں آگئی ہوں یہ نی الواقع ایسی عجیب بات جو ہر معقول انسان کے لیے تعجب انگیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اور دیکھتے ہوئے بھی لوگ ایمان لانے سے منہ موڑیں۔

فَانْتَبِهُوا (۶۲:۴۰) ”کدھر بکائے جا رہے ہو۔“

لیکن ’ہوئی رہا ہے کہ لوگ بدستور اس واضح سچائی سے منہ موڑ رہے ہیں جیسا کہ قرآن کے پہلے مخاطب منہ موڑ رہے تھے اور اس کے بعد بھی ہر زمان و مکان میں منہ موڑ رہے ہیں۔ بغیر سبب بغیر حجت اور بغیر دلیل کے۔

كَذَلِكَ يُوفِّكَ الَّذِينَ كَانُوا بَايَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (۶۳:۴۰) ”اسی طرح وہ سب لوگ بکائے جا رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔“

اب سیاق کلام اس طرف آتا ہے کہ زمین کو اپنی جگہ ٹھہرایا گیا اور آسمان کو چھت کی طرح اوپر ٹھہرایا گیا۔

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً (۶۴:۴۰) ”وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اوپر آسمان کا گنبد بنادیا۔“ زمین تو ہر قرار ہے اور انسانوں کی رہائش کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور اس میں ایسی بے شمار سہولیات رکھ دی گئی جو انسان کے لیے ضروری ہیں اور جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور آسمان ایک ایسی چھت ہے جس کی نسبتیں متعین اور مقرر ہیں۔ جس کی ددریاں ’حرکتیں اور چکر مقرر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وجہ سے زمین پر انسان کی زندگی کو قرار حاصل ہے اور یہ قرار اور یہ سہولیات اس کائنات کے نقشے کے اندر باقاعدہ حساب سے رکھ دی گئی ہیں اور اس کی تعمیر میں انہیں ایک خاص لبت سے رکھا گیا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق کے ساتھ ہی انسان کی پیاری صورت اور انسان کے لیے رزق کو بھی مربوط کر دیا گیا جیسا کہ ہم نے ان باتوں کی طرف اجمالی اشارہ کر دیا ہے۔

وَصَوَّرَكُمُ فَاَحْسَنَ صُورَكُمْ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبِ (۶۴:۴۰)

”جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی جس نے تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔“۔۔۔ اور پھر ان نشانیوں اور صرائحوں پر یہ تبصرہ:

ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَتَبَرَّكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (۶۰: ۴۰) ”یہ ہے اللہ تمہارا رب“ ہے حساب برکتوں والا ہے۔ وہ کائنات کا رب ہے۔ یہ اللہ جو تخلیق کرتا ہے، جو انداز سے تخلیق کرتا ہے اور پھر اپنی مخلوقات کا مدبر بھی ہے۔ وہ تمہاری نمکبانی کرتا ہے اور تمہیں اس نے اپنی اس مخلوق میں بسایا ہے۔ یہ ہے تمہارا رب، برکتوں والا، اور بہت بہت برکتوں والا اور تمام جہانوں والا، جن کے تصور ہی سے سرچکرا جاتا ہے۔

هُوَ الْحَيُّ (۶۰: ۴۰) ”وہی زندہ ہے“۔ ہاں، وہی اکیلا زندہ ہے۔ اس کی ذاتی زندگی ہے، کسی سے لی نہیں گئی، کسی کی تخلیق کردہ نہیں ہے۔ نہ اس کی ابتداء اور نہ انتہا ہے نہ اس کے درمیان کوئی حائل ہے اور نہ وہ زائل ہونے والی ہے۔ نہ اس میں کوئی انقلاب آتا ہے اور نہ تغیر۔ اللہ کے سوا کسی کو یہ صفات حاصل نہیں ہیں۔ اللہ پاک ہی منفرد ہے ان صفات میں۔ لہذا وہی منفرد ہے الوہیت میں۔ اس لیے کہ زندہ وہی ہے۔ لہذا حق یہی ہے کہ وہی واحد و قہار ہو۔

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ (۶۰: ۴۰) ”نہیں کوئی اللہ مگر وہ“، تو پھر صرف : فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (۶۰: ۴۰) ”اسی کو تم پکارو، اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے“۔ اس کی حمد کرو، اس سے دعا کرو،

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۶۰: ۴۰) ”ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے“۔

--- ۰۰۰ ---

ان نشانیوں اور مہربانیوں کے تذکرے اور ان پر تبصرے کے بعد اور حقیقت الوہیت اور عقیدہ توحید اور مظاہر ربوبیت کی تشریح کے بعد اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ ان نشانیوں اور دلائل کی بنا پر میں روک دیا گیا ہوں کہ میں تمہارے معبودوں کی بندگی کروں، مجھے تو حکم دے دیا گیا کہ صرف رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں۔

هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ
الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ قُلْ إِنِّي نُهَيْتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ
تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنَا جَاءَنِيَ الْبَيْتُ مِنْ رَبِّي وَأُمِرْتُ أَنْ
أَسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

”اے نبی“ ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے تو ان ہستیوں کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے۔ جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔ (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جب کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے بیانات آچکی ہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کے آگے سر تسلیم خم کر دوں۔“

یہ اعلان ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کی آیات سے منہ موڑتے ہیں اور اللہ کے عطیات کی ناشکری کرتے ہیں کہ میں تو ان معبودوں کی بندگی سے منع کر دیا گیا ہوں جن کو تم پکارتے ہو۔ لہذا میں منع ہو گیا ہوں۔ اس لیے کہ میرے پاس نشانات آگئے ہیں اور آئے بھی میرے رب کی طرف سے ہیں۔ میرے پاس دلائل پہنچ چکے ہیں اور میں ان پر ایمان لا چکا ہوں۔ اور اللہ نے میرے پاس جو دلائل بھیجے ہیں ان کا حق ہے کہ میں ان پر مطمئن ہو جاؤں اور تصدیق کر دوں اور اس سچائی کا اعلان کر دوں جو میرے پاس آگئی ہے۔ اور غیر اللہ کی بندگی سے رک جانا ہی کافی نہیں بلکہ رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور ایک مثبت پروگرام شروع کرنا بھی بڑا مشن ہے۔ اس میں ”لا“ بھی ہے اور ”الا“ بھی ہے۔

اور آفاقی دلائل الہیہ کے بیان کے بعد لب اس کی طرف روئے سخن مڑتا ہے۔ اس کے دلائل میں سے بڑی دلیل ظہور حیات انسانی ہے اور پھر اس کے ظہور کے عجیب اطوار و درجات ہیں۔ انسانی حیات کا مطالعہ ایک مقدمہ ہے۔ اس بات کے لیے کہ اس کائنات میں ہر قسم کی حیات در حقیقت اللہ کے دست قدرت کا کرشمہ ہے اور اس کی مٹھی میں ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ
ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشْدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا وَمِنْكُمْ مَنْ
يَمُوتُ مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ هُوَ الَّذِي يُحْيِي

وَيُمِيتُ ۚ فَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝

”وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر وہ تمہیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے پھر تمہیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ پھر پور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔ وہی ہے زندگی دینے والا اور وہی موت دینے والا ہے۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے اس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ ہو جاتی ہے۔“

اس کرۂ ارض پر انسانی پیدائش کا اندازہ انسانی علم نہیں کر سکتا کیونکہ انسان اس وقت نہ تھا جب اسے پیدا کیا گیا تھا، انسانی پیدائش کے تسلسل میں بعض امور ایسے ہیں جن کا مشاہدہ انسان کرتا ہے لیکن یہ انسانی مشاہدہ اپنی موجودہ ترقی یافتہ شکل میں زمانہ حال میں سامنے آیا ہے نزول قرآن کے صدیوں بعد۔

پہلی بات یہ ہے کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور یہ واقعہ اس وقت ہوا جب انسان نہ تھا۔ لیکن معلوم ہو گیا کہ اس کرۂ ارض پر مٹی ہی حیات کی بنیاد ہے۔ اسی سے انسان کو بنایا گیا ہے اور اسے زندگی دی گئی ہے۔ یہ بات اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا کہ یہ معجزہ کس طرح ظہور میں آیا زندگی اور زمین کی تاریخ میں یہ عظیم واقعہ کب اور کس طرح وجود میں آیا۔ رہائشوں کا چلنا تو اس کا نظام یوں بنایا گیا کہ مرد کا ظلیہ یعنی نطفہ جب عورت کے اندر سے ملتا ہے اور یہ دونوں آپس میں متحد ہو جاتے ہیں اور رحم میں خون کے ایک لوتھڑے کی شکل میں ٹپک جاتے ہیں تو جنین لینے مرسل طے کرتا ہے اور

اپنے آخری مرحلے میں بچہ نمودار ہوتا ہے۔ پیدا ہونے سے قبل بچے میں بہت بڑے بڑے انقلابات ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ابتدائی غلے کو غور سے دیکھا جائے تو اس کی زندگی بچے کی زندگی سے زیادہ طویل ہے یعنی ولادت سے لے کر موت تک کے عرصہ سے 'سیاق کلام میں قرآن مجید نے یہاں صرف اس کی بعض ممتاز صفات و مراحل کا ذکر کیا ہے۔ یعنی بچپن کا مرحلہ 'پھر سن رشد تک پہنچنا یعنی تیس سال کی عمر تک پھر بڑھاپا۔ یہ وہ مراحل ہیں جنہیں طے کر کے انسان اپنے کمزور آغاز و انجام کے درمیان اپنی پوری قوت تک پہنچتا ہے۔

وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّىٰ مِنْ قَبْلُ (۶۷: ۴۰) ”تم میں سے کوئی پہلے ہی دہلیس بلا لیا جاتا ہے۔“۔ اور وہ یہ پورے مراحل طے نہیں کرتا یا بعض مراحل اس سے چھوٹ جاتے ہیں اور وہ فوت ہو جاتا ہے۔

وَلَتَبْلُغُوا أَجَلَ مُّسَمًّى (۶۷: ۴۰) ”یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ۔“۔ یہ وقت مقرر طے شدہ اور معلوم ہے۔ اس میں کوئی تقدیم اور تاخیر نہیں ہوتی۔

وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۶۷: ۴۰) ”اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔“۔ جنین کا سفر طے کرنا 'پھر بچے کا سفر طے کرنا 'پھر ان کی شکل و صورت کا حسن اور ان کی طبیعی نشوونما کے صحیح صحیح اندازے اور اطوار میں سوچنے کا بہت بڑا سامان ہے۔

جنین کا سفر تو نہایت ہی حیرت انگیز سفر ہے۔ علوم طبیہ کی ترقی کے بعد تو اس کے بارے میں ہم نے حیرت انگیز معلومات حاصل کر لی ہیں۔ علوم جنین ایک مستقل شعبہ ہے لیکن قرآن نے جس انداز سے آج سے چودہ سو سال قبل اس کے بعض مراحل کی طرف جس ٹھیک ٹھیک انداز سے اشارہ کیا ہے 'یہ فکر و نظر کے لیے دامن گیر ہے۔ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان مراحل سے غافل ہو کر گزر جائے اور ان پر مگر اغور و فکر نہ کرے۔ جنین کا سفر اور بچے کا سفر انسانی احساس پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں اور انسانی دل کو خوب جھنجھوڑتے ہیں۔ چاہے عقل و رشد کے جس مرحلے میں بھی وہ ہو۔ ہر نسل انسانی اپنی معلومات کے حوالے سے اس سے متاثر ہوتی ہے 'اس لیے قرآن نے انسانی نسلوں کو اس طرف متوجہ کیا ہے اس لیے کہ اس سے انسان متاثر ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ آزاد ہے 'بلکہ کے پائے کے۔

اس بحث کے بعد زندہ کرنے اور مارنے اور تخلیق اور نشوونما کے بارے میں ایک سبق آموز تیسرہ:

هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ فَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۶۸: ۴۰)

”وہی ہے زندگی اور موت دینے والا۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے اس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ ہو جاتی ہے۔“۔ قرآن میں آیات موت و حیات کا بہت ذکر ہوا ہے۔ کیونکہ موت و حیات کا مضمون انسانی شخصیت کو گہرے طور پر متاثر کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی ممتاز اور بار بار دہرائے جانے والے واقعات ہیں اور انسانی حس ان کو بہت ہی قریب سے دیکھتی ہے۔ باری النظر میں زندہ کرنے اور مارنے سے جو بات انسان کی سمجھ میں آتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو حیات و ممات کا مضمون اس سے کہیں گہرا ہے۔ حیات کی بھی کئی اقسام ہیں 'موت کی بھی کئی اقسام ہیں۔ زمین کو ہم مردہ

دیکھتے ہیں۔ پھر زمین ہی کو ہم زندہ اور سرسبز دیکھتے ہیں۔ جب مردہ ہو تو درختوں کے پتے نہیں ہوتے، شاخیں خشک نظر آتی ہیں، ایک تو یہ موسم ہوتا ہے، اور جب یہ زندہ ہوتے ہیں تو یہی مردہ شاخیں اور ٹہنیاں سرسبز اور شاداب ہو کر لہلہاتی ہیں۔ ان شاخوں کا انگ انگ پھوٹ جاتا ہے اور پھول اور پتے نکل آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ زندگی ان شاخوں سے الٹی پڑتی ہے۔ ایک اندازے کو دیکھو، پھر بچے کو دیکھو، بچ کو دیکھو اور لگنے والے پودے کو دیکھو، اور پھر اٹے سفر کو دیکھو کہ یہی زندگی موت میں بدل جاتی ہے اور بجھے ہوئے کھیت سامنے آتے ہیں۔ یہ سب حالات دل اور دماغ کو متاثر کرتے ہیں اور بموجب ”فکر ہر کس بقدر ہمت اوست“ ہر شخص کا تاثر مختلف ہوتا ہے۔

آخر میں موت و حیات سے آگے، اہم سوال کہ کائنات کس طرح وجود میں آئی؟ بس اللہ کا ارادہ ہوا، کن کا حکم ہوا اور سب کچھ ہو گیا یا جو چاہا ہو گیا۔ یہ کائنات ہوتی چلی گئی اور تسلسل قائم ہوتا چلا گیا۔ فَبَارَكْ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ

--- ○ ○ ○ ---

حیات و ممات کے اس منظر کے بعد نور انشاء و تخلیق کے کن فیکون کے بعد اللہ کی نشانیوں اور مہربانیوں میں جدل و جدال اور بحث و تکرار لاحق ہے اور رسولوں کے پیغام اور دعوت کی تکذیب اس سے بھی عجیب تر ہے۔ اب ہو جاؤ خبردار! ایک خوفناک منظر تمہارے سامنے آنے والا ہے۔ خبردار! یہ قیامت ہے اور تم نے اس منظر کو دیکھا ہے، اور دیکھنے سے پہلے ہی دیکھ لو!

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ
 أَنِّي يُصَرِّفُونَ^(۱۹) الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أُرْسِلْنَا بِهِ رُسُلَنَا شَفَوَقَ^(۲۰) يَعْلَمُونَ^(۲۱)
 إِذِ الْأَغْلُلُ فِيْ أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلِيلُ يُسْحَبُونَ^(۲۲) فِي الْحَبِيدِ^(۲۳) ثُمَّ فِي النَّارِ
 يُسْجَرُونَ^(۲۴) ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ آيِنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُونَ^(۲۵) مِنْ دُونِ اللَّهِ^(۲۶) قَالُوا
 ضَلُّوا عَنَّا بَلْ لَمْ نَكُنْ نَدْعُوا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا كَذَلِكَ يَضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ^(۲۷)
 ذَلِكَ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُونَ^(۲۸)
 أَدْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَلِيدِينَ فِيهَا^(۲۹) فَبِئْسَ مَثْوًى الْمُتَكَبِّرِينَ^(۳۰)

”تم نے دیکھا ان لوگوں کو جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں، کہاں سے وہ پھرائے جا رہے ہیں؟ یہ لوگ جو اس کتاب کو اور ان ساری کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجی تھیں، عفریب انہیں معلوم ہو جائے گا جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیروں پہنی جائیں گی، کھولتے ہوئے پانی میں اور دوزخ کی آگ میں

بھونک دیئے جائیں گے۔ پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ ”اب کہاں ہیں اللہ کے سوا وہ دوسرے خدا جن کو تم شریک کرتے تھے؟“ وہ جواب دیں گے ”کھوئے گئے وہ ہم سے“ بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہ پکارتے تھے۔“ اس طرح اللہ کافروں کو گمراہ ہونا مققن کر دے گا۔ ان سے کہا جائے گا ”یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم زمین میں فیر حق پر مکن تھے۔ اور پھر اس پر اتراتے تھے۔ اب جاؤ“ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ“ ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے، بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا۔“

یعنی گزشتہ آیات میں اللہ کی جو نشانیاں بیان ہوئیں ان کے ہوتے ہوئے ان لوگوں کا رویہ قابل تعجب ہے جو اللہ کی ان نشانوں کے بارے میں پھر بھی جت و جدال کرتے ہیں، لیکن ان کا انجام کیا ہونے والا ہے، نہایت عبرت آموز!

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُحَادِّثُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ أَنِّي بَصُرْتُ نَ (۶۹: ۴۰) الَّذِينَ

كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَمَا أُرْسِلْنَا بِهِ رَسُولَنَا (۷۰: ۴۰) ”تم نے دیکھا ان لوگوں کو جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں کہاں سے وہ پھرائے جا رہے ہیں؟ یہ لوگ جو اس کتاب کو اور ان ساری کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجی تھیں۔“

انہوں نے تو صرف ایک کتاب قرآن اور ایک رسول حضرت محمد ﷺ کو جھٹلایا تھا مگر اس طرح کر کے انہوں نے تمام کتابوں اور تمام رسولوں کو جھٹلایا کیونکہ تمام رسولوں کا عہدہ اللہ کے ہی تھا اور یہی عقیدہ اپنی مکمل صورت میں خاتم النبیین ﷺ کو دیا گیا۔ لہذا انہوں نے گویا تمام رسالتوں اور تمام رسولوں کی تکذیب کر دی۔ ہر مکذیب نے یہی کیا خواہ قدیم زمانے میں تھا یا جدید زمانے میں اس نے عقیدہ توحید ہی کی تکذیب کی۔

فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۷۰: ۴۰) ”مقرر یہ انہیں معلوم ہو جائے گا۔“ کہ ان کا انجام کیا ہو گا۔ آگے تفصیلات دے دیں کہ ایسے لوگوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ یہی کہ نہایت توہین آمیز اور حقارت آمیز انداز میں ان کو سزا دی جائے گی صرف سزا نہ ہوگی بلکہ اہانت اس کے ساتھ شامل ہوگی۔

إِذَا الْغُلُوفُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلْسِلُ يُسْحَبُونَ (۷۱: ۴۰) ”جب طوق اور زنجیریں ان کی گردنوں میں ہوں گی اور کھینچے جائیں گے۔“ اس طرح جس طرح موٹی کھینچے جاتے ہیں، اہانت کے ساتھ۔ عزت ان کی کیوں ہو، انہوں نے خود ہی عزت کا لباس اتار پھینکا تھا۔ یوں توہین کے ساتھ کھینچ کر اور چلا کر آخر کار انہیں گرم پانیوں اور آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ (۷۲: ۴۰) ”گرم پانی میں، پھر آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔“ یعنی ان کو باندھا جائے گا۔ پھر کتوں کی طرح گلے میں زنجیریں ڈال کر ہانکا جائے گا اور ان کو ایسے مکان میں گرا دیا جائے گا جو گرم پانی اور آگ سے بھرا ہو گا۔

یہ لوگ ایسی ہی حالت میں ہوں گے کہ ان پر سرزنش، ملامت دھتکار آئے گی:

ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ اٰتَيْنَا مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۷۴:۴۰) ”پھر ان سے پوچھا جائے گا اب کس میں اللہ کے سوا وہ خدا جن کو تم شریک کرتے تھے۔“

اب وہ ایسا جواب دیتے ہیں جس طرح وہ شخص دیتا ہے جس کے ساتھ دھوکہ ہوا اور پھر یہ دھوکہ ظاہر ہو گیا اور وہ نہایت مایوس اور ضرر رسیدہ ہوتا ہے :

قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا (۷۴:۴۰) ”وہ جواب دیں گے کھوئے گئے وہ ہم سے، بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہ پکارتے تھے۔“ وہ تو ہم سے اس طرح غائب ہو گئے کہ اب ہمیں ان کے ڈھونڈنے کا راستہ تک معلوم نہیں۔ اور نہ اب وہ ہم کو راستہ بتاتے ہیں۔ بلکہ اس سے پہلے ہم جن کو پکارتے تھے وہ تو کوئی چیز ہی نہ تھے محض اویہام اور افسانے تھے۔۔۔ اس مایوس کن جواب پر یہ تبصرہ اور عبرت۔

كَذٰلِكَ يُصَلُّ اللّٰهُ الْكَافِرِيْنَ (۷۴:۴۰) ”اس طرح اللہ کافروں کا گمراہ ہونا متحقق کر دے گا“ اور اس کے بعد پھر سرزنش اور ان کے گمراہی کا سبب۔

ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ (۷۵:۴۰) اَدْخُلُوْا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ حٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوٰى الْمُتَكَبِّرِيْنَ

(۷۶:۴۰) ”ان سے کہا جائے گا“ یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم زمین میں غیر حق پر مگن تھے۔ اور پھر اس پر اترتے تھے۔ اب جاؤ، جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے، بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا۔“

اے فریاد رس خداوند! یہ طوق اور زنجیروں گھلے میں باندھ کر گرم پانیوں اور آگ میں کہاں لے جائے گئے؟ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے دائمی عذاب سے پہلے گرم پانی اور آگ کا عذاب دیا گیا۔

فَبِئْسَ مَثْوٰى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۷۶:۴۰) ”بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا۔“ یہ توہین آمیز سزا ان کو جو دی جا رہی ہے اس کا حقیقی سبب تو کبر ہی ہے اور اس کبر ہی کی وجہ سے اس سخت سزا کے ساتھ حقیر اور تذلیل کو شامل کیا گیا ہے۔

— ۰۰۰ —

اس خوفناک عذاب کے منظر اور ذلت آمیز سلوک کے بعد، جو آیات الہی میں ناروا جدل و جدال کے نتیجے میں ان پر نازل ہوا اور جس کا سبب حقیقی کبر تھا، جو انسان کو پھلا دیتا ہے، اس منظر کے بعد اور اس برے انجام کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں کیونکہ ان لوگوں کے کبر و جدالی کی وجہ سے آپ کو بے حد تکلیف ہوتی ہے، آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ چاہے اسلامی انقلاب کا وعدہ آپ کی حیات میں پورا ہو یا بعد

میں 'یہ اللہ کی رضا ہے کہ وہ جس طرح چاہے' کرے رسول کا کام یہ ہے کہ وہ تبلیغ کر کے اللہ کے پاس چلا جائے۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ
أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿۵﴾

”پس لے نبی“ صبر کرو 'اللہ کا وعدہ برحق ہے' اب خواہ ہم تمہارے سامنے ہی ان کو ان برسے نتائج کا کوئی حصہ دکھا دیں جن سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں 'یا' (اس سے پہلے) تمہیں دنیا سے اٹھالیں 'پلٹ کر آنا تو انہیں ہماری ہی طرف ہے۔“
یہ ایک جھٹک ہے 'ہمیں چاہئے کہ ذرا اس پر غور کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دور میں مخالفین کی جانب سے کبر 'اذیت' تکذیب اور نافرمانی کی اذیت جھیل رہے تھے۔ آپ کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ کے فرائض یہ ہیں 'بس آپ ان تک اپنے آپ کو محدود کر دیں' رہے نتائج تو ان کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے یہاں تک کہ وہ مکذبین اور منکبرین کو اس دنیا میں سزا پاتے دیکھنے کی خواہش بھی نہ رکھیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ حکم بجالائیں 'اپنا فریضہ ادا کر دیں' کیونکہ انجام تک کسی بات کو پہنچانا یہ داعی کا کام نہیں ہے۔ یہ اللہ کے اختیار میں ہے 'اور وہ وہی کچھ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

اللہ العالمین! کس قدر بلند مقام ہے یہ۔ کس قدر کامل آداب کی تلقین ان لوگوں کو جو دعوت اسلامی کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور یہ کون ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء!

نفس انسانی کے لیے یہ حکم بہت بھاری ہے۔ یہ ایک ایسا حکم ہے جو ضعیف انسان کی چاہتوں کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں یہ حکم دینے سے بھی پہلے صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ لہذا یہاں دوبارہ صبر کی تلقین کا حکم دینا عکس اثر نہیں ہے۔ یہ ایک نئے انداز کا صبر ہے۔ یہ صبر ایذا 'تکذیب اور استہزاء سے بھی زیادہ مشکل صبر ہے۔ تمام داعیوں کو 'انسان اور بشر داعیوں کو' یہ کہہ دینا کہ تمہارے دشمنوں کو ضرور سزا ہوگی 'اللہ ان کو ضرور پکڑے گا لیکن شاید تم نہ دیکھ سکو' یہ انسان کی اس خواہش کے خلاف ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو سزا پاتے دیکھے۔ یہ شدید خواہش ہوتی ہے 'جبکہ داعیوں پر مظالم ہو رہے ہوں لیکن یہ آداب الہیہ ہیں اور یہ اللہ کی جانب سے اپنے عکار بندوں کی تربیت ہے اور نفس انسانی کو ہر اس بات سے پاک کرنا مطلوب ہے جس میں کوئی ادنیٰ سی خواہش بھی ہو۔ اگرچہ یہ خواہش صرف یہ ہو کہ دشمنان دین کو سزا ہو جائے۔

اس نکتے پر تمام داعیان دین کو غور کر لینا چاہئے 'چاہے وہ جس زمان و مکان میں بھی ہوں' خواہشات کے طوفانوں میں یہ کامیابی کا نگر ہے۔ یہ خواہشات تو ابتداء میں بڑی پاکیزہ نظر آتی ہیں لیکن آخر میں شیطان ان میں گھس آتا ہے۔

درس نمبر ۲۲۶ ایک نظر میں

یہ پورا سبق اس سے پہلے سبق کے آخر میں آنے والے درس عبرت کی تکمیل و تشریح ہے۔ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی مومنین کو ہدایت کی گئی تھی کہ آپ لوگ مشکلات راہ پر صبر کریں۔ اس وقت تک کہ اللہ کا حکم آجائے اور اللہ نے فتح اسلام کا جو وعدہ کیا ہے وہ پورا ہو جائے۔ چاہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہو یا آپ کی وفات کے بعد ہو۔ کیونکہ اختیار آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بلکہ معاملہ اسلام اور اسلام کو ماننے والوں اور ان کے مخالفین اور مجادلین کا ہے۔ دونوں برسرِ جنگ ہیں اور فیصلہ ان کے درمیان اللہ کو کرنا ہے۔ اور یہ اللہ ہی ہے جو اسلامی انقلاب کی تحریک کو چلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے۔

یہ سبق جس پر اس سورت کا خاتمہ ہو رہا ہے اس حقیقت کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کر رہا ہے یہ کہ کفر و اسلام کی جنگ کوئی نئی بات نہیں ہے اور نہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور اسلام سے شروع ہوئی ہے۔ آپ سے قبل بھی رسول بھیجے گئے ہیں بعض کے قہر آپ کے سامنے بیان کیے گئے ہیں اور بعض کے بیان نہیں کیے گئے۔ ان سب کا استقبال مکہ میں اور انکار سے کیا گیا۔ سب سے مطابہ کیا گیا کہ معجزات پیش کرو اور سب نے یہ تمنائیں کیں کہ کاش اللہ کوئی معجزہ صادر کر دے جس کو دیکھ کر مکہ میں رہنے والے مان لیں لیکن معجزات کا صدور اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اور اس وقت ہوتا ہے جب اللہ چاہتا ہے۔ یہ دعوت اللہ کی دعوت ہے وہ جس طرح چاہتا ہے اسے چلاتا ہے۔

البتہ اللہ کے بعض معجزات اس کائنات میں بکھرے پڑے ہیں ہر زمان و مکان کے لوگوں کی نظروں کے سامنے ہیں۔ مثلاً موسیٰ کشتیاں اور دوسری چیزیں جن کا انکار کوئی نہیں کر سکتا۔

اور اس سبق کا خاتمہ ایک نہایت شدید جھکے سے ہوتا ہے جس میں ان اقوام کی ہلاکت دکھائی گئی ہے جنہوں نے اس سے قبل مکہ میں رہ کر اپنے مال دولت اور ترقی پر نازاں رہے۔ اللہ نے پھر ان کو اپنی سنت کے مطابق پکڑا۔

فَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْاْ بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهِ وَ

خَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُوْنَ (۸۵: ۴۰) ”مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکا تھا کیونکہ یہی اللہ کا مقرر شدہ ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا ہے اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑے۔“

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۲۶ تشریح آیات

۸۸ --- تا --- ۸۵

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ
مِنْهُمْ مَنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ
اللَّهِ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ فُصِّى بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ

۱۳

”اے نبی“ تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے۔ کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کو کوئی نشانی لے آتا۔ پھر جب اللہ کا حکم آگیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا اور اس وقت غلط کار لوگ خسارے میں پڑ گئے، علم

اتامت دین کی جدوجہد کی مثالیں اور پیغمبر بھیجنے کی مثالیں سابقہ تاریخ میں موجود ہیں۔ بعض کے واقعات قرآن میں بیان کیے گئے ہیں اور بعض کا تذکرہ نہیں کیا گیا اور جن کے واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں تحریک اسلامی کی طویل جدوجہد کے نشانات راہ موجود ہیں۔ یہ راستہ واضح ہے اور طویل ہے اور اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ اور ان پیغمبروں کے واقعات صاف صاف بتاتے ہیں کہ اللہ کی سنت کیا ہے اور رسولوں کا فریضہ کیا ہے۔

اور جس بات کی تاکید مطلوب ہے اس کی وضاحت بھی کر دی گئی جس پر ہر دائی کو اعتماد کرنا چاہئے وہ یہ کہ۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (۷۸:۴۰) ”کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کو کوئی نشانی لے آئے۔“

نفس انسانی کی یہ شدید خواہش ہوتی ہے، اگرچہ رسول ہی کیوں نہ ہو کہ دعوت اسلامی کے مخالفین دعوت اسلامی کو قبول کر لیں اور اس کے مقابلے میں سرکشی اور ضد کرنے والے لوگ اس پر یقین کر لیں۔ اس لیے قدرتی و طر پر انسانی نفس معجزات کے صدور کی خواہش رکھتے ہیں تاکہ مخالفین کی زبانیں بند ہو جائیں اور وہ یقین کر لیں لیکن اللہ کی خواہش یہ ہے کہ اس کے مختار بندے صبر کا سہارا لیں اور اپنے آپ کو دعوت پر قائم رکھیں۔ یہ بات یوں کہی جاتی ہے کہ فتح و شکست کا معاملہ تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم دعوت پہنچا دو۔ رہا معجزہ دکھانا تو یہ اللہ کا کام ہے۔

جس وقت اللہ چاہے گا معجزہ آجائے گا۔ تم اطمینان رکھو، ثابت قدم رہو اور دہمئی ستہ کام کرو اور جو نتائج تمہارے ہاتھوں سے برآمد ہوتے ہیں ان پر صبر کرو، دعوت کا انجام اللہ کے سپرد کر دو۔

یہاں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ لوگ حقیقت الوہیت کو بھی جان لیں اور منصب رسالت کو بھی سمجھ لیں۔ اور یہ جان لیں کہ رسول بھی بشر ہوتے ہیں۔ ان کو اللہ نے منصب نبوت کے لیے چن لیا ہوتا ہے۔ ان کے لیے فریضہ مقرر کر دیا جاتا ہے، نہ وہ طاقت رکھتے ہیں اور نہ ان کو اجازت ہے کہ اپنے فرائض کے حدود سے آگے بڑھیں۔ پھر یہ کہ معجزات کے آنے میں تاخیر ان کے لیے ایک نعمت ہے کیونکہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب معجزات آتے ہیں اور لوگ انکار کرتے ہیں تو اللہ پھر ایسی اقوام کو ہاک کر دیتا ہے اس لیے معجزہ نہ آنا دراصل ایک مہلت ہے اور یہ مہلت اللہ کی طرف سے ہے۔

فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ (۷۸: ۴۰) ”پھر جب اللہ کا حکم آگیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا۔ اور اس وقت نط کار لوگ خسار میں پڑ گئے۔“ اب پھر عمل اور توبہ یا واپسی کی کوئی مہلت باقی نہیں رہتی اور آخری فیصلہ ہو جاتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اب ان لوگوں کو جو معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں ان آیات و معجزات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اس کائنات میں بکھرے پڑے ہیں اور جن کو رات دن دیکھتے دیکھتے انسان ان کے ساتھ اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ اب وہ اس کے لیے معجزہ نہیں رہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر ان پر غور و فکر کیا جاتا تو ہرگز مزید کسی معجزے کا مطالبہ نہ ہوتا۔ یہ تمام چیزیں اللہ کی الوہیت کی بھی نشانیاں ہیں، کیونکہ اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جو دعویٰ کر سکتا ہو کہ اس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے اور اسی طرح یہ دعویٰ بھی بادی النظر میں مسترد ہے کہ یہ تمام کائنات از خود وجود میں آگئی ہے۔

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْإِنْعَامَ لِتَرْْكَبُوهَا مِنَّمَا وَ مِنَّمَا تَأْكُلُونَ ﴿١﴾
وَلَكُم فِيهَا مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوا عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى
الْفُلْكِ تَحْمِلُونَهَا وَ يُرِيكُمُ آيَاتِهِ فَأَيُّ آلِهَةٍ تُشْكِرُونَ ﴿٢﴾

”اللہ ہی نے تمہارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔ ان کے اندر تمہارے لیے اور بھی بہت سے منافع ہیں۔ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمہارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو وہاں تم ان پر پہنچ سکو۔ ان پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو۔ اللہ اپنی یہ نشانیاں تمہیں دکھا رہا ہے، آخر تم اس کی کن کن نشانیوں کا انکار کر دے گے۔“

ان مویشیوں کی ابتدائی تخلیق اسی طرح نشانی ہے جس طرح انسان کی تخلیق نشانی اور معجزہ ہے، ان حیوانات کے اندر

روح ڈالنا، ان کو اس شکل و صورت میں بنانا اور ان کو رنگارنگ پیدا کرنا سب معجزات ہیں۔ پھرچہ تمام جانور اور مویشی انسان کے لیے مسخر کیے گئے ہیں حالانکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو جسم کے اعتبار سے بھی اور قوت کے اعتبار سے بھی انسان سے زیادہ قوی ہیں لیکن۔

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْإِنْعَامَ لَتَرْكَبُوا مِنْهَا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ (۷۹: ۴۰) ”اللہ ہی نے تمہارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔“ اب اگر کوئی کہے کہ یہ جانور اسی طرح دنیا میں پائے گئے ہیں اور یہ کہ انسان کے لیے یہ کوئی معجزہ نہیں ہیں، یا یہ کہ یہ جانور کسی خالق پر دلالت نہیں کرتے جس نے انہیں پیدا کیا ہو اور انسان کے لیے مسخر کیا اور ان جانوروں کے اندر یہ خصائص موجود ہیں اور انسانوں کے اندر بھی یہ خصائص موجود ہیں تو اسی قسم کی باتیں قائل قبول نہیں ہیں اور انسانی کی فطری سوچ اس کے خلاف ہے۔ لہذا جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ بہت ہی سطحی لوگ ہیں اور ان کی یہ باتیں بالکل سطحی اور محض جدال ہیں۔

ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ ان آیات میں کیا کیا خوارق عادت معجزات ہیں اور کیا نعمتیں ہیں۔

لَتَرْكَبُوا مِنْهَا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ (۷۹: ۴۰) وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوا عَلَيْهَا

حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ وَعَلَيْهَا الْفُلُكُ تُحْمَلُونَ (۸۰: ۴۰) ”تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔ ان کے اندر تمہارے لیے اور بھی بہت سے منافع ہیں۔ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمہارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو وہاں تم ان پر پہنچ سکو۔ ان پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو۔“ اور وہ خواہشات جو ان کے دلوں میں ہوتی تھیں اور ان جانوروں پر سوار ہو کر وہ ان تک پہنچتے تھے۔ وہ بہت بڑی حاجات و ضروریات تھیں، خصوصاً اس دور میں۔ اس دور میں نقل و حمل کے موجودہ ذرائع تو تھے نہیں۔ لیکن آج تک یہ جانور بعض ضروریات پورا کرتے ہیں۔ آج بھی بعض پہاڑ ایسے دشوار گزار ہیں کہ وہاں تک کوئی جہاز کوئی ریل کوئی موٹر وغیرہ نہیں جاتے۔ وہاں ہی جانور کام آتے ہیں۔ ان پہاڑوں میں راستے اس قدر تنگ ہوتے ہیں کہ وہاں ہی جانور کام کرتے ہیں۔

وَعَلَيْهَا الْفُلُكُ تُحْمَلُونَ (۸۰: ۴۰) ”ان پر بھی اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو۔“ یہ دونوں اللہ کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں۔ اور اللہ کی ان مہربانیوں میں سے ہیں جو اس نے انسان پر کیں۔ کشتی کو پانی پر چلایا۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو پانی اور کشتی کے اندر تخلیق کے وقت رکھی گئیں۔ زمین میں بھی اور آسمان میں بھی۔ خشکی میں بھی اور تری میں بھی۔ چاہے یہ کشتی بادبانوں سے چلے، بخارات سے چلے یا اینٹی قوت سے چلے یا ان کے بھی علاوہ کسی اور قوت سے چلے جو اللہ نے اس کائنات میں رکھ دی ہیں اور انسان کو یہ توفیق بخشی ہے کہ وہ ان قوتوں کو کام میں لائے۔ اس لیے ان سب چیزوں کو اللہ کے معجزات اور اللہ کے دیئے ہوئے انعامات کے مضمون میں لایا گیا ہے۔

اور اس قسم کی کئی آیات و معجزات اس کائنات میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کسی معجزے اور انعام کا انکار کر سکے بشرطیکہ وہ سنجیدہ ہو۔

وَيُزَيِّنُ لَكُمْ آيَاتِهِ فَآيَ آيَاتِ اللَّهِ تُنْكِرُونَّ (۴۰: ۸۱) ”اللہ اپنی یہ نشانیاں تمہیں دکھا رہا ہے“ آخر تم اللہ کی کن کن نشانیوں سے انکار کرو گے؟“۔ ہاں بعض لوگ ہیں جو انکار کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں، بعض ایسے ہیں جو باطل دلائل لے کر آتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے حق کو بچا دکھائیں۔ لیکن ان سب میں سے کوئی بھی نیک نیت نہیں ہے یا اس کے اندر فیڑہ ہے یا کوئی مفاد ہے، یا کبر ہے یا اسے کوئی مغالطہ ہے یا کسی اور غرض کے لیے یہ کر رہا ہے۔

بعض لوگ اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ فرعون اور دوسرے لوگوں کی طرح ذی جاہ اور سرکش اور ظالم ہیں، ان کو اپنی حکومت اور اقتدار کا خطرہ ہے، ان کو تخت و تاج کا خطرہ ہے، یہ تخت و تاج جن خاکوں پر قائم ہیں ان کو دعوت حق اڑا دیتی ہے، کیونکہ دعوت اسلامی کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ اور حاکم الیک ہوتا ہے۔

بعض لوگ اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ مذہبی راہنما ہیں، بعض اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ ایک خاص طرز کا نظام حکومت و معیشت چاہتے ہیں مثلاً اشتراکیت کے علم بردار، جب آسمانی عقائد و نظریات ملت ہو جائیں تو ان کا نظریہ اڑ جاتا ہے۔ اسلام تو لوگوں کو زمین کے ساتھ نہیں چماتا، پیٹ اور جسم کی خواہشات کا بندہ نہیں بناتا اور اللہ کی بندگی سے چمڑا کر کسی دوسرے نظریہ یا کسی دوسرے یلدر کی بندگی میں داخل نہیں کرتا۔

بعض لوگ اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ پاپائیت سے جان چھڑانا چاہتے ہیں جیسا کہ قرون وسطیٰ میں اہل کینہہ اور عوام کے درمیان ہوا۔ چونکہ عوام پاپائیت سے جان چھڑانا چاہتے ہیں، اس لیے انہوں نے اہل کینہہ کو ان کا اللہ بھی ولیس کر دیا۔ کیونکہ اللہ کے نام سے انہوں نے لوگوں کو غلام بنا رکھا تھا۔

ان اسباب کے سوا اور بھی کئی اسباب ہیں، لیکن انسان کی فطری سوچ ان تمام اسباب کو مسترد کر دیتی ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے جو اس کائنات کے وجود میں مستقل موجود ہے اور جس کی موجودگی کی نشاندہی کائنات کی یہ نشانیاں کرتی ہیں۔ اور آخر میں یہ زور دہر تبصرہ:

أَفَلَوْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ أَسَدَّ قُوَّةً وَ أَثَارًا فِي
الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَى عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۴۱﴾ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ
بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ
يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۴۲﴾ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا امْكُتُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ

مُشْرِكِينَ ۖ فَلَكَ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بِاَسْنَانُتِ اللّٰهِ اَلَّتِي ۙ

۴۰ قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۚ وَخَيْرَ هٰذَا لَكَ الْكَافِرُونَ ۝

۱۴

”پھر کیا یہ زمین میں چے پھرے نہیں ہیں کہ ان کو ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے تعداد میں زیادہ تھے، ان سے بڑھ کر طاقتور تھے، اور زمین میں ان سے زیادہ شاندار آثار چھوڑ گئے ہیں۔ جو کچھ کمالی انہوں نے کی تھی، آخر وہ ان کے کس کام آئی؟ جب ان کے رسول ان کے پاس بیٹاتے آئے تو وہ اسی علم میں مگن رہے جو ان کے اپنے پاس تھا، اور پھر اسی چیز کے پھیر میں آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو پکار اٹھے کہ ہم نے مان لیا اللہ وحدہ لا شریک کو اور ہم انکار کرتے ہیں ان سب معبودوں کا جنہیں ہم اس کا شریک ٹھہراتے تھے مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے کچھ بھی نفع نہ ہو سکتا تھا کیوں کہ یہی اللہ کا مقرر ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا ہے اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے۔“

انسانی تاریخ میں گزشتہ اقوام کی جاتی کے ایام بہت ہیں اور بعض تو ایسے ہیں جس کے آثار آج بھی موجود ہیں اور ان کے مرثیہ خواں ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ زبانی روایات کے ذریعے ان کی کہانیاں محفوظ ہیں۔ بعض کی کہانیاں کتابوں کے اور اہل میں محفوظ ہیں۔ قرآن کریم بار بار ان ایام اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس لیے کہ انسانیت جس لائن پر بڑھتی چلی آئی ہے اس میں جا بجا حقائق موجود ہیں۔ پھر ان ایام اللہ کا اثر بھی انسان پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اور قرآن چونکہ خالق فطرت کی طرف سے نازل ہو رہا ہے اس لیے وہ فطرت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرتا ہے۔ قرآن فطرت کی راہ و رسم سے خوب واقف ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ اس کی یہ مخلوق کس بات سے متاثر ہوتی ہے اور کس انداز سے اس کے دل میں بات اتاری جاسکتی ہے، اللہ کو پتہ ہے کہ انسانی دل کا کون سا دروازہ صرف ایک ہی دھک دینے سے کھل جاتا ہے اور کون سا دروازہ چند زوردار دھک دینے سے کھلتا ہے اور کون سا ہے جو زنگ آلود ہو گیا اور توڑے بغیر نہیں کھلتا۔

اللہ انسانوں سے پوچھتا ہے، ”انہیں انسانی تاریخ کی سیر کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے کہ دراکھلی آنکھوں سے انسانی تاریخ کے نشیب و فراز کو دیکھو۔ وادی وادی میں گھومو اور احساس کو تیز رکھو، اور قلب و نظر کو کھول کر چہو، دیکھو اور غور کرو، تم سے پہلے اس زمین پر کیا کیا ہوتا رہا ہے اور انسان پر کیا کیا مصائب ٹوٹے ہیں۔“

اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

(۸۲: ۴۰) ”پھر کیا زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کو ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔“ قبل اس کے کہ ان کے انجام کو بتایا جائے، ان کے کچھ خدو دخل جائے جاتے ہیں اور ان کے حالات زندگی سے موازنہ کیا جاتا ہے تاکہ یہ عبرت آموزی مکمل ہو۔

كَانُوا اَكْثَرُ مِنْهُمْ وَاَشَدُّ قُوَّةً وَّاَتَارَافِي الْاَرْضِ (۸۲: ۴۰) ”وہ ان سے تعداد میں

زیادہ تھے 'ان سے پڑھ کر طاقتور تھے اور زمین میں ان سے زیادہ شاندار آثار چھوڑ گئے ہیں'۔ کثرت تعداد 'سیاسی قوت اور ترقی سب میں موجودہ لوگوں سے زیادہ تھے۔ ان میں سے کئی نسلیں تھیں جو عربوں سے پہلے گزری تھیں۔ بعضوں کے قصے تو رسول کو سنائے گئے اور بعض کو تاریخ کے قبرستان میں مدفون ہی چھوڑ دیا گیا اور بعض قصے عربوں کو معلوم تھے اور بعض کے آثار کو وہ شب و روز دیکھتے تھے۔

فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۸۲:۴۰) ”جو کچھ کئی انہوں نے کی تھی آخر وہ ان کے کس کام آئی“۔ نہ ان کی کثرت نہ قوت اور نہ ترقی ان کو بچا سکی۔ حالانکہ وہ انہی چیزوں پر بھروسہ کیے ہوئے تھے اور مغرور تھے۔ بلکہ ان کی ہلاکت کا سبب یہی باتیں ہوئیں۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرَحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (۸۳:۴۰) ”جب ان کے رسول ان کے پاس بیانات لے کر آئے تو وہ اس علم میں مگن رہے جو ان کے پاس تھا“۔ علم بغیر ایمان کے ایک عظیم فتنہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور سرکش بنا دیتا ہے۔ اس قسم کے ظاہری اور سائنسی علوم لوگوں کو مغرور بنا دیتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنے اس علم کی وجہ سے وہ اقتدار میں ہیں 'بڑی بڑی قوتوں کو چلاتے ہیں اور بڑے بڑے خزانوں کے مالک ہیں۔ یوں وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور وہ ان وسعتوں کو بھول جاتے ہیں جن تک ابھی ان کے علم کو رسائی نہیں ہوئی ہے حالانکہ وہ وسعتیں اس کائنات میں موجود ہیں۔ ان قوتوں پر ابھی انہوں نے قابو نہیں پایا ہوتا ہے بلکہ ان کا تصور بھی وہ نہیں کر پاتے 'ان کو تو وسعتوں کے صرف ایک معمولی کنارے تک رسائی ہوئی ہوتی ہے۔ یوں یہ بے ایمان صاحب علم پھول جاتا ہے اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس کا علم اسے پھلا دیتا ہے اور اس کا جمل اسے اپنی حقیقت بھلا دیتا ہے۔ اگر وہ یہ قیاس کر لیتا کہ اس کا علم تو بہت ہی تھوڑا ہے اور اس کے جمل کا دائرہ بہت وسیع ہے اور جس کا وہ اندازہ کرتا ہے وہ اس سے بہت تھوڑا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تو وہ سر جھکا لیتا اور اپنی کبریائی کو تھوک دیتا اور یہ جو پھول رہا ہے اس میں ذرا کی کر دیتا۔

بہر حال یہ لوگ جو اپنے موجودہ علم میں مگن ہو گئے تھے وہ یاد دہانی کرانے والوں کا مذاق اڑاتے رہے۔

وَ حَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۸۳:۴۰) ”پھر اس چیز کے پھیرے میں آ گئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے“۔

جب انہوں نے اللہ کے عذاب کو دیکھا تو پردہ گر گیا اور ان کو معلوم ہو گیا کہ جس چیز پر ان کو غرور تھا وہ تو کچھ نہ تھی۔ اب انہوں نے اس بات کا اعتراف کر لیا جس کا وہ انکار کرتے تھے۔ اللہ کی وحدانیت کے قائل ہو گئے۔ اپنے شرکاء کا انکار کر دیا لیکن اب تو وقت چلا گیا تھا۔

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحَدُّهُ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ

(۸۴:۴۰) فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا (۸۵:۴۰) ”جب انہوں نے ہمارا

عذاب دیکھ لیا تو پکار اٹھے کہ ہم نے مان لیا اللہ وحدہ لا شریک کو اور ہم انکار کرتے ہیں ان سب معبودوں کا جنہیں ہم اس کا شریک ٹھہراتے تھے مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ اللہ کی سنت ہے کہ عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان قبول نہیں ہوتا اس لئے کہ اس وقت خوف کی توبہ ہوتی ہے۔ ایمان کی توبہ نہیں ہوتی۔

سُنَّتَ اللّٰہِ الَّتِیْ قَدْ خَلَّتْ فِیْ عِبَادَہٗ (۸۵: ۴۰) ”کیونکہ یہی اللہ کا مقرر ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا ہے۔“ اور اللہ کی سنت میں کوئی تغیر اور ترمیم نہیں ہو سکتی۔ یہ اپنی مقرر راہ پر چلتی ہے۔

وَ خَسِرَہُنَّ اَلْکُفْرُ وَ اَن (۸۵: ۴۰) ”اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے۔“

--- ۰۰۰ ---

اس سخت منظر، یعنی منظر عذاب الہی پر یہ سورت ختم ہوتی ہے، جس میں یہ چیخ و پکار کرتے ہیں، جزع فزع کرتے ہیں اور معافیاں مانگتے ہیں، ایمان و یقین کا اعلان کرتے ہیں، سورت کا یہ خاتمہ سورت کی نفا اور موضوعات اور مضامین کے ساتھ مناسب ہے۔

اس سورت کے دوران ہم نے ایسے مسائل پر بھی بحث کی ہے جو خالص مکی سورتوں کے اہم مسائل ہیں، مثلاً مسئلہ توحید، مسئلہ معاد، مسئلہ وحی، لیکن یہ مسائل اس سورت کا اصل موضوع نہ تھے۔ اس کا اصل موضوع معرکہ حق و باطل تھا۔ ایمان و کفر تھا۔ اصلاح و سرکشی تھی۔ یہ اس سورت کے نمایاں موضوعات و مضامین تھے۔ اور اس سورت کے اہم خدوخال، اور تمام سورتوں کے مقابلے میں نہایت ہی نمایاں مقاصد.....

--- ۰۰۰ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پاره ----- ۲۴

سورة حم السجدة - ۴۱

آیات ۱ تا --- ۴۶

سورۃ حم السجدۃ ایک نظر میں

اسلامی نظریہ حیات اور اس کے اساسی عناصر اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ یعنی مسئلہ الوہیت، قیام قیامت اور وحی و رسالت۔ ان مضامین کے ساتھ ایک مضمون یہ بھی اس سورت میں آتا ہے کہ دعوت اسلامی کا طریقہ کار کیا ہو گا اور داعی کے اخلاق کیسے ہونے چاہئیں۔ اس سورت میں جو مضامین و مباحث بھی آئے وہ انہی مسائل کی تشریح و تفصیل ہیں۔ ان موضوعات پر استدلال ہے اور آفاق اور اٹس سے ان موضوعات پر دلائل جمع کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ جھٹلانے کے برے نتائج اور سابقہ جھٹلانے والوں کے برے انجام اور قیامت کے دن جھٹلانے والوں کے حالات اور یہ بیان کہ جن دافس میں تہکذین ان واضح حقائق کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور اللہ وحدہ کے سامنے نہیں جھکتے جبکہ زمین و آسمان اور شمس و قمر اور فرشتے سب کے سب اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔ سجدہ کرتے ہیں، خضوع و خشوع کرتے ہیں اور سر تسلیم خم کرتے ہیں اور مطیع فرمان رہتے ہیں۔

سورت کے آغاز میں اللہ کی الوہیت کے بارے میں آتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰى اِلٰى اَنَّمَا الْهُكْمُ لِلّٰهِ وَاحِدٌ فَاسْتَقِمْوْا اِلَيْهِ

وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (۶: ۱۴۱) ”اے نبی، ان سے کہو میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا مجھے وحی کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا اس ایک ہی خدا ہے۔ لہذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ اور تباہی ہے مشرکین کے لیے۔“

قُلْ اِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَّوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗ اَنْدَادًا ذٰلِکَ

رُبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۹: ۱۴۱) ”اے نبی، ان سے کہو کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسرہ ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنایا۔ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے۔“
عاد و ثمود کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ ان کے رسولوں نے بیحد کی بات ان سے کہی تھی۔

اَلَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ (۱۴: ۱۴۱) ”کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔“ اس قصے کے وسط میں آتا ہے۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ (۳۷: ۱۴۱)

”سورج و چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا۔“ اور سورت کے آخر میں ہے۔

وَيَوْمَ يَنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَاءِى قَالُوا أَدْخِلْكَ مَا مَنَّا مِنْ شَهِيدٍ (۴۱: ۴۷) ”پھر جس روز وہ ان لوگوں کو پکارے گا کہ کس ہیں میرے وہ شریک؟ یہ کہیں گے ”ہم عرض کر چکے ہیں آج ہم میں سے کوئی اس کی گواہی دینے والا نہیں ہے۔“

مسئلہ آخرت کے بارے میں تو منکرین آخرت کو سب سے پہلے دھکی ملتی ہے۔

وَوَيْلٌ لِلْمُشْرِكِينَ (۴۱: ۶) الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزُّكُوَّةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَفَرُونَ (۴۱: ۷) ”بتا ہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں۔“ اور سورت کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے۔

إِنَّمَا أَنْتُمْ فِي مَرِئَةٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ إِنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ (۴۱: ۵۴) ”آگاہ رہو یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں‘ سن رکھو وہ ہر چیز پر محیط ہے۔“ جبکہ قیامت کے مناظر میں بھی اس کے وقوع کو بطور حقیقت واقعہ پیش کیا گیا ہے بلکہ قیامت کے لیے نبوت اور دلیل پیش کرنے کی نسبت اس کا منظر پیش کرنا زیادہ موثر طریقہ ہے۔

اور وحی و رسالت پر اس سورت میں کافی مواد موجود ہے‘ یوں لگتا ہے کہ یہ سورت کا اصل موضوع ہے‘ افتتاح یوں ہوتا ہے۔

حُم (۴۱: ۱) تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ (۴۱: ۲) كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۴۱: ۳) بَشِيرًا وَنَذِيرًا فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ (۴۱: ۴) وَقَالُوا أَقُلُوبُنَا فِيْ أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِيْ آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّا نَعْمَلُونَ (۴۱: ۵) قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۴۱: ۶) ”یہ خدا کے رحمن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے‘ ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں‘ عربی زبان کا قرآن‘ ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں‘ بشارت دینے والا اور ڈرادینے والا۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہیں۔ ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے۔ تو اپنا کام کر‘ ہم اپنا کام کیے جا رہے ہیں‘ کہہ دو میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا....“ اور اس سورت کے درمیان آتا ہے کہ مشرکین نے قرآن کا استقبال یوں کیا۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَبُونَ

(۴۱: ۲۶) ”یہ منکرین حق کہتے ہیں اس قرآن کو ہرگز نہ سناؤ اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو شاید کہ

اسی طرح تم غالب آ جاؤ۔ اس کے بعد بھی اس رد عمل کی تفصیلات آتی ہیں اور ان کے اقوال کا رد بھی کیا جاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ وَاِنَّهُمْ لَكٰتِبٌ عَزِیْزٌ (۱۰۴: ۱) لَا یَاْتِیْهِ
الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ (۱: ۴۲) مَا یُقَالُ لَكَ
اِلَّا مَا قَدْ قَبِلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ اِنْ رَبُّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ دُوْعِقَابٍ اَلِیْمٍ (۱: ۴۳)
وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَجَمِیًّا لَقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُهُۥ اَعَجَمِیٌّ وَّ عَرَبِیٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا هُدًی وَّ شِفَآءٌ وَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ فِیْ اٰذَانِهِمْ وَقُرْ وَّ هُوَ عَلَیْهِمْ عَمًی اُولٰٓئِكَ

یُنَادُوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِیْدٍ (۱: ۴۴) ”یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے کلام نصیحت آیا تو انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے، بطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے۔ لہٰذا نبیؐ تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی لپی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں سے نہ کہی جا چکی ہو۔ بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا بھی دینے والا ہے۔ اگر ہم اس کو بھی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں۔ کیا ہی عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور غییب عربی۔ ان سے کہو کہ یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت و شفا ہے مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے تو اس کے لیے یہ کانوں کی ذلت اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو۔“
طریقہ دعوت اور داعی کے اخلاق کے بارے میں کہا گیا ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰهِ وَعَمِلَ صٰلِحًا وَّقَالَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ
(۱: ۳۳) وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ
بَیْنَكَ وَبَیْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (۱: ۳۴) وَمَا یُلْقِیْهَا اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا
یُلْقِیْهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ (۱: ۳۵) وَاِمَّا یَنْزَغْنٰكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ

اِنَّهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۱: ۳۶) ”اور اس شخص کی بات سے اچھی بات کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور لے نبیؐ کی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیب والے ہیں

اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔“
یہ مسائل گہرے شعوری دلائل اور اثر کرنے والے انداز کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اس کائنات میں جو بے شمار دلائل و نشانات پائے جاتے ہیں، ان کے دائرے کے اندر، پھر عالم نفس کے اندر جو نشانات ہیں، ان کے رنگ میں، پھر انسانی تاریخ کے سفر کے ساتھ جس میں گزرے ہوئے مفکرین حق کے عبرتناک نشانات ہیں اور پھر ان مسائل کو مشاہد قیامت کی آہ و فغاں کی کے رنگ میں بھی لایا جاتا ہے جس کا انسان پر گہرا اثر ہوتا ہے اور اس سورت کے بعض منظر تو منفرد قسم کے ہیں اور نہایت ہی خوفناک ہیں۔

اس کائنات کے مشاہد میں زمین و آسمان کی ابتدائی تخلیق کی کہانی جسے نہایت ہی تفصیل سے لیا گیا ہے۔

قُلْ اِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهُ اَسَادًا ذٰلِكَ رُبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۹:۴۱) وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيْ مِنْ فَوْقِهَا وَ بَرَكَ فِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَامًا فِيْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءٍ لِّلنَّسَبِ اَثَلَيْنِ (۱۰:۴۱) ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ فَتَالَهَا وَ لِلْاَرْضِ اَثْبًا طَوْعًا وَ اَوْ كَرَهَا قَالَتَا اَنِيْمَا طَآئِعِيْنَ (۱۱:۴۱) فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ اَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ حَفِظْنَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۱۲:۴۱) ”اے نبی! ان سے کہو کہ تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دو سرور کو اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو، جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا۔ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے، اس نے اوپر سے اس میں پہاڑ جمادیسے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔ پھر وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ جو اس وقت محض دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا، وجود میں آ جاؤ، خواہ تم چاہو، یا نہ چاہو۔“ دونوں نے کہا، ”ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح۔“ تب اس نے دو دن کے اندر آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست عظیم ہستی کا منصوبہ ہے۔“

ان نشانیوں ہی میں سے رات اور دن کی نشانی ہے، شمس و قمر کی نشانی ہے، ملائکہ کی عبادت و اطاعت کی نشانی ہے۔ زمین کی قانون قدرت کے سامنے اطاعت کی نشانی اور اس پر ردیدگی کی نشانی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ الْاَيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۳۷:۴۱) فَاِنْ اسْتَكْبَرُوْا

فَالَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونََهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْتَمُونَ (۳۸:۴۱) وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَرَى الْآرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتِ إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۳۹:۴۱) ”اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند سورج اور چاند کو سجدہ نہ کر دے بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔ لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آکر اپنی ہر بات پر اڑ رہے ہیں تو پرواہ نہیں جو فرشتے تمہارے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے اور اللہ کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سولی پڑی ہوئی ہے۔ پھر جو نمی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا، یکایک وہ پھک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مرنے والی زمین کو جلا اٹھاتا ہے وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“ رہائش انسانی تو اس کی حقیقت کو بھی اس سورت میں کھول گیا ہے اور انسانوں کے سامنے اس صاف صاف کھلا اور واضح کر کے رکھ دیا ہے۔

لَا يَسْتَمُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوسٌ قَنُوطٌ (۴۱:۴۹) وَلَئِنْ أَدْرَأْتَهُ رَحْمَةً مِنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرْأٍ مَسْتَه لَيَقُولَنَّ هَذَا إِلَى وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُجِعْتُ إِلَى رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَهُ لِلْحُسْنَى فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَهُمْ مِنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ (۴۱:۵۰) وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأْبِحَانِيهِ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ (۴۱:۵۱) ”انسان کبھی بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا اور جب کوئی آفت اس پر آتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہوتا ہے مگر جو نمی سخت و تیز گزر جانے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں یہ کہتا ہے کہ ”میں اس کا مستحق ہوں“ اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی اگر میں واقعی اپنے رب کی طرف پلنگہ گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا“ حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم جہنم بھیجیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں اور انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ انسان کو جب ہم نعمت دیتے تو وہ منہ پھیرتا ہے اور اڑ جاتا ہے اور اسے جب کوئی سخت چھو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔ گزشتہ اقوام کی ہلاکتوں میں قوم عاد اور قوم ثمود کے عذاب کو چٹا گیا ہے۔

فَإِنَّمَا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَحْحَدُونَ (۴۱:۱۵)

فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَحِسَاتٍ لِنُذِيقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ وَهُمْ لَا يُنصَرُونَ (۱۶۰:۴۱) وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ فَآخَذْتَهُمْ صَاعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا

يَكْسِبُونَ (۱۷:۴۱) وَنَحْنُ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ (۱۸:۴۱) ”عار کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے ”میں سے زیادہ زور آور“ ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے ”وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے۔ آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت اور رسولی کا مزہ چکھا دیں اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہے۔ وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو گا۔ رہے ثمود تو ان کے سامنے ہم نے راہ راست پیش کی مگر انہوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا رہنا پسند کیا۔ آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا اور ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی اور بد عملی سے پرہیز کرتے تھے۔

اس سورت کے نہایت ہی موثر مشاہد قیامت میں سے بعض یہ ہیں :

وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ (۱۹:۴۱) حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهُ شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲۰:۴۱) وَ قَالُوا لِحُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقْنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَ إِلَيْهِ تَرْجَعُونَ (۲۱:۴۱) ”اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ ان کے انگوں کو پچھوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا۔ پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے ”تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟“ وہ جواب دیں گے ہمیں اس خدا نے گواہی دی جس نے ہر چیز کو گواہ کر دیا ہے۔ اس نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اب اس کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو۔“ اور ایک وہ آیت جس میں دھوکہ دینے والوں پر ان لوگوں کا طیش جنہوں نے دھوکہ کھایا۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا أَرِنَا الَّذِينَ أَضَلَّانَا مِنَ الْجِنَّ وَالنَّاسِ نَجْعَلُهُمَا تَحْتَ أَقْدَامِنَا لِيَكُونَا مِنَ الْأَسْفَلِينَ (۲۹:۴۱) ”وہاں یہ کافر کہیں گے ”اے ہمارے رب“ ذرا ہمیں دکھا دے ان جنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں۔“

۱۔ ان سورت میں اسوہ کے بنیادی عقائد گہرے موثر دلائل کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ ان موثر دلائل و مناظر ہی سے اس سورت کی فضا مزاج اور رنگ ڈھنگ کا پتہ بھی چلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سورت کے آغاز سے لے کر اختتام تک یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم زمین، آسمان اور دنیا و آخرت اور نفس انسانی کی گہرائیوں کی سیر کر رہے ہیں اور نہایت موثر مناظر و دلائل دیکھ رہے ہیں۔ اس سفر سے قلب و فکر کی تاروں سے تازہ تازہ رحمت اخٹا ہے۔

سورت میں دو ہی سبق ہیں اور یہ اپنے موضوعات اور ان پر دلالت و منظرے کر آگے بڑھتی ہے اور کڑیوں سے کڑیاں ملتی چلی جاتی ہیں۔ پہلا سبق ان آیات سے شروع ہوتا ہے جو نزول کتاب سے متعلق ہیں۔ کتاب کی نوعیت اور اس کے بارے میں مشرکین کا موقف بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد زمین و آسمانوں کی تخلیق اور عار و ثمود کے واقعات اور آخرت میں ان کے خلاف خود ان کے اعضا اور ان کی کھالوں کی شہادت کا منظر ہے 'اس کے بعد یہ کہ دنیا میں وہ کس طرح گمراہ ہوئے' یوں کہ جن و انس کے کچھ ساتھی ان پر مسلط ہو گئے 'انہوں نے ان کے اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا' کفار کا یہ مشورہ کہ قرآن کو نہ سنو اور قیامت میں کافروں کی یہ خواہش کہ اللہ جن دو افراد نے ہمیں گمراہ کیا ذرا ان کو سامنے لائیے کہ ان کو روند ڈالیں۔ دو سری جانب لٹل ایمان ہیں جن پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور جو اپنی دعوت پر استقامت سے گامزن ہیں۔ یہ فرشتے ان کو دنیا و آخرت میں خوشخبری دیتے ہیں۔ یہ اچھے ساتھی ہیں اور پھر دعوت اور داعی کے لیے ہدایات۔

دوسرے سبق کا آغاز گردش لیل و نهار اور گردش شمس و قمر سے ہوتا ہے 'پھر ملائکہ عبادت گزار اور زمین اور اس کی سرسبزیاں۔ پھر کتاب الہی کا موضوع اور اس میں الحاد کرنے والے کتاب موسیٰ اور اس میں اس کی قوم کا اختلاف اور آخرت میں اختلاف قوم موسیٰ کا فیصلہ وغیرہ مضامین آتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کہ قیامت کا علم اللہ کو ہے۔ اور پھر اللہ کے علم کی وسعت کا عجیب بیان کہ تمام پھوٹنے والے پودوں، کلیوں، رحموں کی حالت اور ان میں پیدا ہونے والوں پر اللہ کا علم محیط ہے۔ قیامت کا منظر جہاں کافر اپنے شریک کیے ہوئے معبودوں کو تلاش کریں گے۔ نفس انسانی کی حالت اور انسان کی بے احتیاطیاں اور تکذیب کفر اور اس کے نتیجے میں ہلاکت اور آخر میں یہ وعدہ کہ اللہ انس و آفاق میں اپنی نشانوں کو عنقریب ظاہر کر دے گا!

سَنَرِيهِمْ اٰتِنَا فِيْ اِنْفَاقٍ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَسِيْۢۤتٌۢ يَّتَبَيَّنْ لَّهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَّلَمۡ يَكْفِۢۤرُ
بِرَبِّكَ اِنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۵۳: ۴۱) اَلَا اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ اَلَا اِنَّهُ

بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ (۵۴: ۴۱) ”عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھا دیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ فرمان واقعی برحق ہے کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔ آگاہ رہو! یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں۔ سن رکھو وہ ہر چیز پر محیط ہے۔ اس آخری تہرے پر یہ سورت ختم ہوتی ہے۔

درس نمبر ۲۲ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۳۶



حَمْدٌ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ كَتَبَ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا
 لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۝ فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۝ وَ
 قَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكْثَةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَ
 بَيْنِكَ حِجَابٌ فَأَعْمَلْ إِنَّا خَائِفُونَ ۝ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ
 أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوا ۝ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ۝
 الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا
 وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝

۱۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرماتے والا ہے۔

”ح م“ یہ خدا کے رحمن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا ہے۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں ”جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک

اہل ہو گیا ہے تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کیے جائیں گے۔“ لے نبیؐ ان سے کہو، میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ مجھے ان کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے، لہذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ جہاں ہے ان مشرکوں کے لیے جو رکوع نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں، رہے وہ لوگ جنہوں نے مان لیا اور نیک اعمال کیے، ان کے لیے جینا ایسا اجز ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔“

حروف مقطعات کے بارے میں بات کئی سورتوں میں ہو چکی ہے اور اس افتتاح کمر ”حم“ میں بھی وہی اشارہ ہے جس طرح قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ بار بار ان حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انسانی دل و دماغ پر اثر ڈالتے ہیں اور منکر اس لیے کہ انسان کو بار بار کی یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ مگر گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی نظرت نصب العین کو جھل ہو جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی بھی شعوری حقیقت بھٹانے کے لیے، اسے بار بار تنبیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور قرآن کا نازل کرنے والا اپنے تخلیق کردہ فطرت انسانی سے خوب واقف ہے۔ اور اس کے خصائص اور صلاحیتیں اسی نے عطا کی ہیں اس لیے وہ بار بار یاد دلاتا ہے، وہ خالق قلب اور مصرف القلوب ہے۔

حم (۱: ۴۱) تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ (۲: ۴۱) ”یہ خدائے رحمن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے۔“ حم گویا سورت کا نام ہے یا جس قرآن جو انہی حروف سے بنایا گیا ہے۔ حم مبتداء ہے اور تنزیل خبر ہے یعنی یہ ہیں حم (جن سے قرآن بنا ہے جو رحمن و رحیم کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔

نزول کتاب کے وقت رحمن و رحیم کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ اس تنزیل کی صفات عالیہ رحمت الہیہ ہے۔ اور یہ کتاب اور حاصل کتاب دونوں بطور رحمت اللعالمین آئے۔ یہ صرف ان لوگوں پر رحمت نہیں ہے جو ایمان لائیں اور اس کی اطاعت کریں۔ بلکہ غیروں کے لیے بھی رحمت ہے صرف انسانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام زندہ لوگوں کے لیے رحمت ہے کیونکہ اس کتاب نے ایک ایسا منہاج حیات دنیا کو دیا جس کی وجہ سے پوری دنیا متاثر ہوئی۔ انسانیت کو نئی زندگی ملی۔ اس کو تصورات دیئے، اس کو علم دیا اور غرض اس قرآن نے انسانیت کے آگے بڑھنے کی سمت ہی بدل کر رکھ دی۔ قرآن کے رحمانہ اثرات صرف لل ایمان تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے اثرات عالمی تھے اور اس وقت سے آج تک یہ اثرات جاری ہیں۔ جو لوگ انسانی تاریخ کا مطالعہ انصاف سے کرتے ہیں اور اس کا عام انسانی زاویہ سے مطالعہ کرتے ہیں اور اس مطالعہ میں انسانی سرگرمیوں کا پوری طرح احاطہ کرتے ہیں وہ اس حقیقت کو پاتے ہیں اور وہ اس نکتے پر مطمئن بھی ہوتے ہیں کہ قرآن رحمت العالمین ہے، بعض منصف مزاج لوگوں نے اس بات کا اعتراف کر کے اس کو ریکارڈ بھی کرا دیا ہے۔

کُتِبَ فَصِّلْتُ آيَتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۳: ۴۱) ”ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔“ یعنی اغراض و مقاصد کے لحاظ سے، لوگوں کی طبیعت اور سمجھ کے مطابق، معاشروں اور زمانوں کے مطابق، لوگوں کی ذہنیت اور ان کی ضروریات کے مطابق اس کی آیات کو نہایت بہتہ انداز میں مصلح بنایا گیا ہے۔ اور یہ اس کتاب کی اتنی زری خصوصیت ہے اس زاویہ سے یہ کتاب مفصل اور محکم ہے۔ ان تمام پہلوؤں سے یہ کتاب مفصل ہے۔ پھر عربی زبان میں ہے۔

لَقَوْمٌ يَعْلَمُونَ (۳: ۴۱) ”ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔“ یعنی جن کے پاس علمی استعداد ہے وہ سمجھ سکتے ہیں اور کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتے ہیں۔
اس قرآن کے نزول کا بڑا مقصد بشارت اور ڈراوا ہے۔

بَشِيرًا وَنَذِيرًا (۴: ۴۱) ”بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔“ یہ قرآن مومنین کو بشارت دیتا ہے اور مکذبین اور بدکاروں کو ڈراتا ہے اور پھر خوشخبری اور ڈراوے کے اسباب بھی بتاتا ہے۔ یہ اسباب وہ عربی زمین میں بتاتا ہے اور ان لوگوں کے سامنے پیش ہو رہا ہے جو عرب ہیں لیکن ان کی اکثریت اسے قبول نہیں کر رہی ہے۔

فَاعْرِضْ أَكْثَرَهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ (۴: ۴۱) ”مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔“

اور یہ لوگ روگردانی اس لیے کرتے تھے اور نہ سنتے تھے اور اپنے دلوں کو روگردانی کر کے قرآن سننے سے بچاتے تھے۔ کیونکہ قرآن غضب کی تاثیر رکھتا ہے اس لیے جو جسور عوام کو بھی اس بات پر ابھارتے تھے کہ نہ سناؤ جس طرح عنقریب اس کی تفصیلات آئیں گی۔

وَقَالُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَبُونَ (۲۶: ۴۱) ”مکرمین حق کہتے ہیں اس قرآن کو نہ سناؤ اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل (الو) شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ۔“ بعض اوقات وہ سنتے تھے لیکن اس طرح جیسے کہ نہ سنتے ہوں اس لیے قرآن کے ان پر جو اثرات پڑتے تھے ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کا مقابلہ کرتے تھے گویا وہ بہرے ہیں سنتے ہی نہیں۔

وَقَالُوا أَقُلُّونَا فِي أَكْثَرِ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنَكَ

حِجَابٌ فَأَعْمَلْ إِنَّا عَمِلُونَا (۵: ۴۱) ”کہتے ہیں: جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں میں غلاف چڑھے ہوئے ہیں، ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ایک حجب حائل ہو گیا ہے، تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کیے جا رہے ہیں“ یہ بات وہ گہری ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے کہتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مایوس کرنے کے لیے کہتے تھے تاکہ آپ دعوت دینا بند کر دیں کیونکہ وہ آپ کی دعوت کا اثر خود اپنے دلوں میں پاتے تھے اور وہ بالارادہ اس موقف پر جمے ہوئے تھے کہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔

چنانچہ انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں ڈھپے ہوئے ہیں، تمہاری بات تو ہمارے دلوں تک پہنچتی ہی نہیں۔ ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہیں، لہذا تمہاری بات ہم تک پہنچتی ہی نہیں۔ تمہارے اور ہمارے درمیان دیوار پردے حائل ہیں، اس لیے رابطے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں ہے۔ لہذا ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں، ہمیں کوئی پردہ نہیں ہے کہ تم کیا کرتے ہو، کیا کہتے ہو، کس سے ڈراتے ہو، کس کا وعدہ کرتے ہو، ہم اپنی راہ پر چلنے والے ہیں۔ تم چاہو تو اپنی راہ پر چلو، تمہاری جو مرضی ہے کرو۔ ہم نے سن کر نہیں دینا۔ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ لے ہی آؤ۔

ہمیں کوئی پردہ نہیں ہے۔

یہ تھے وہ حالات و مشکلات جن سے داعی اول صلی اللہ علیہ وسلم دوچار تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ دعوت دیتے چلے جاتے تھے۔ کبھی رکے نہیں تھے۔ ان مایوس کن حالات سے کبھی آپ متاثر نہیں ہوئے، کبھی آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اتنا عرصہ ہو گیا، اللہ کا وعدہ سچا نہیں ہوا اور نہ دشمنوں پر عذاب آیا۔ آپ یہی کہتے کہ اللہ کے وعدے کا پورا ہونا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں تو ایک بشر ہوں۔ اللہ کا پیغام میرے پاس آتا ہے اور میں تبلیغ کرتا ہوں، لوگوں کو اللہ واحد کی طرف بلاتا ہوں اور جو مان لیں، ان سے کہتا ہوں کہ اسی راستے پر جم جاؤ، اور مشرکین کو انجام بد سے ڈراتا ہوں اس کے بعد کے مراحل میرے اختیار میں نہیں۔ میں تو ایک بشر اور مامور ہوں۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ

وَاسْتَغْفِرُوهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ (۶: ۴۱) ”اے نبی“ ان سے کہو، میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ مجھے وحی کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے، لہذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ جہاں ہے ان مشرکوں کے لیے۔“ کس قدر عظیم صبر ہے! کس قدر برداشت ہے! کیا عظیم ایمان ہے اور تسیم و رضا ہے! لیکن ایسی صورت حال کو صرف وہی داعی سمجھ سکتا ہے، ایسے حالات پر دعویٰ صبر کر سکتا ہے، اس قسم کے حالات میں صرف وہی اپنے ماحول سے لاپرواہ ہو کر دعوت دیتے آگے بڑھ سکتا ہے اور اعراض، تکذیب، تکبر اور توہین آمیز سلوک کو برداشت کر سکتا ہے جو ایسے حالات سے دوچار ہو گیا ہو، جس نے تجربہ کر لیا ہو کہ جلد بازی نہیں کرنی، جس نے روگردانی کرنے والوں، منکبرین اور سرکشوں کی مدالعت کی ہو، جس نے دعوت کی راہ میں مشقت برداشت کی ہو، اور جس نے دعوت کی راہ میں مشقت برداشت کرنے کا حوصلہ پایا ہو اور پھر ان مشکلات کے باوجود وہ اٹ گیا ہو۔

ایسے ہی مقامات کی وجہ سے انبیاء و رسل کو بار بار ہدایت کی محنت ہے کہ صبر کریں، کیونکہ دعوت کی راہ صبر کی راہ ہے۔ طویل صبر، اور صبر کی آزمائش سب سے پہلے اس خواہش میں ہوتی ہے، جو بہت شدید ہوتی ہے کہ دعوت جلدی کامیاب ہو جائے۔ نصرت جلدی جائے، نصرت کے نشانات بھی نہ ہوں لیکن داعی صبر، استقامت اور تسلیم و رضا سے کام لے کر جا رہا ہو۔

اور ان مشکلات، روگردانیوں اور کبر و لاپرواہی کے جواب میں رسول اللہ صرف یہ کہتے ہیں۔

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ (۶: ۴۱) الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ

كُفَرُونَ (۷: ۴۱) ”جہاں ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں۔“ اس مقام پر زکوٰۃ کے ذکر کی کوئی وقتی مناسبت ہوگی، کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں آیا، کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور زکوٰۃ سن دو ہجری میں مدینہ میں فرض ہوئی۔ اگرچہ اسوۃ کرمہ میں بھی معروف تھی۔ مدینہ میں فرضیت کے ساتھ نصاب بھی مقرر ہو گیا۔ اور اسے بطور معین فرض وصول کیا جائے گا، مکہ میں یہ ایک عام رسم تھی۔ لوگ رضا کارانہ طور پر زکوٰۃ دیتے تھے۔

اس کی کوئی حد نہ تھی اور ادائیگی دینے والے کے ضمیر پر چھوڑ دی گئی تھی۔ کفر بالآخرۃ تو وہی کفر ہے جس کے نتیجے میں انسان دائمی تباہی کا مستحق ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس آیت کی تفسیر میں زکوٰۃ سے مراد ایمان لانا اور شرک سے پاک ہونا لیا ہے۔ یہ مضموم بھی رد نہیں کیا جاسکتا ایسے حالات میں اس کا احتمال ضرور ہے۔

--- ۰۰۰ ---

اب داعی حق ان کو یہ بتانے کے لیے کہ کفر و شرک کا ارتکاب کر کے وہ کس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو اس کائنات کی سیر کراتے ہیں کہ ذرا تم زمین و آسمانوں پر مشتمل اس عظیم کائنات پر غور و فکر کرو کہ تم اس کے مقابلے میں کس قدر چھوٹے ہو اس قدر کزور ہو یہ سراسر اس لیے کر لئی جاتی ہے کہ ذرا وہ اللہ کی بادشاہت کو بھی دیکھ لیں جس کا وہ انکار کرتے ہیں کیونکہ انسان بھی فطرت کائنات کا ایک نہایت ہی حقیر جزء ہے اور تاکہ وہ ان کو بتائیں کہ اس دعوت کی طرف تم نہایت ہی تنگ زاویہ نظر سے دیکھ رہے ہو تم صرف یہ دیکھ سکتے ہو کہ ہجوماد مگرے نیست۔ تم تو صرف اپنے آپ کو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو دیکھتے ہو اور تم یہ سوچتے ہو کہ محمد ابن عبد اللہ کو اگر مان لیا تو وہ بلند مقام پر فائز ہو جائے گا۔ تمیں تو یہ تنگ نظری اس عظیم حقیقت کے دیکھنے سے روکے ہوئے ہے جو حضرت محمد ﷺ لے کر آئے ہیں جس کی تفصیلات قرآن کریم میں درج ہیں۔ یہ حقیقت جس کا تعلق آسمانوں، زمین، انسان، پوری انسانی تاریخ اور اس عظیم سچائی کے ساتھ ہے جو زمان و مکان سے وراء ہے۔ اور جسے اس کائنات کے نقشے میں رکھا گیا ہے :

قُلْ اَيْنَكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْاَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَ
تَجْعَلُونَ لَهٗ اَنْدَادًا ۚ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰ وَجَعَلَ
فَوْقَهَا وَبْرَكًا فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَا اَمْوَاتَهَا فِيْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۚ سَوَّآءٌ
لِّلْسَآءِلِيْنَ ۝۱۱ ثُمَّ اَسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ
اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۚ قَالَتَا اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۝۱۲ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ
يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاءٍ اَمْرًا ۚ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ۚ وَ
حِفْظًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۱۳

”اے نبی! ان سے کہو کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دو سروں کو اس کا ہسر ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنادیا؟ دینی تو سرے جہان والوں کا رب ہے۔ اس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جم دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت کھن دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا ”وجود میں آ جاؤ“ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔“ دونوں نے کہا

”ہم آگے فرمانبرداروں کی طرح“۔ تب اس نے دو دن کے اندر آسمان بنا دیا اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمان دنیا کو ہم نے چرانگوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست عظیم ہستی کا منصوبہ ہے۔“

اے پیغمبران سے کہو کہ تم جب کفر کرتے ہو اور لاپرواہی میں یہ عظیم بات کہہ جاتے ہو، یہ تو تم ایک بہت ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرتے ہو، یہ نہایت ہی قبیح اور ناپسندیدہ فعل ہے، تم ایک ایسی ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو پیدا کیا، اس کے اندر پہاڑ پیدا کیے، ان کے اندر برکات پیدا کیں، اس زمین کے اندر رزق کی تمام ضروریات پوری پوری رکھ دیں، جس نے آسمانوں کو پیدا کیا اور یہ سب کام اس نے چار دنوں میں سرانجام دیئے اور تمام ماتلئے والوں کے لیے ان کی ضروریات مہیا کر دیں جس نے آسمانوں کو پیدا کیا، منظم کیا، خصوصاً دنیا سے قریب والے آسمان کو خوب مزین کیا، زمین اور آسمان نے اس کے قوانین قدرت اور احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، لیکن اے لیل زمین تم ہو کہ تم انکار کرتے ہو اور تکبر کرتے ہو۔

لیکن قرآن کی عبارت نے، قرآن کے انداز بیان کے مطابق ان مضامین کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ بات فوراً دل میں اتر جاتی ہے اور دل کو ہلکا کر رکھ دیتی ہے۔ ذرا نص قرآن کے الفاظ دوبارہ پڑھئے اور غور کیجئے۔

قُلْ اِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِي خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهُ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رُبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۹:۴۱) وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيْ مِنْ فَوْقِهَا عِشْرَةَ فَفِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَا اَقْوَامًا فِيْ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلنَّبَا ثَلٰثِيْنَ (۱۰:۴۱) ”اے نبی“ ان سے کہو، کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دو سروں کو اس کا ہسر ٹھہراتے ہو، جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا۔ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے، اس نے اوپر سے اس میں پہاڑ جما دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب ماتلئے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔“

یہاں زمین کی تخلیق کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے دو دنوں میں پیدا کیا گیا۔ زمین کی پیدائش کی مزید بات سے پہلے اس پر تبصرہ کر کے شرک کی نفی کی گئی اور بتایا گیا کہ

ذٰلِكَ رُبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۹:۴۱) ”یہی جہاں والوں کا رب ہے۔“ تم اس رب کا انکار کر رہے ہو، اور اس کے ساتھ لوگوں کو شریک کر رہے ہو، جس زمین پر تم چل پھر رہے ہو، وہ تو اس نے بنائی ہے لہذا تکبر اور لاپرواہی تمہیں زیب نہیں دیتی۔ یہ تو بہت ہی قبیح فعل ہے۔ اس کے بعد پھر باقی بات۔

سوال یہ ہے کہ یہ دو دن کون سے دن ہیں، جس کے اندر زمین پیدا کی گئی اور جن دو دنوں میں پہاڑ پیدا کیے اور زمین کے اندر ضروریات زندگی پیدا کی گئیں اور یوں یہ چار دن ہو گئے؟

یہ ایام دراصل ایام اللہ ہیں اور ان کی طوالت کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ ایام اس زمین کے ایام بہر حال

نہیں ہیں۔ کیونکہ زمین کے ایام تو وہ زمینی معیار ہے جو زمین کے پیدا ہونے اور اس کی گردش متعین ہوئے کے بعد، جو وہ میں آیا ہے۔ جس طرح اس زمین کے ایام ہیں۔ اور یہ گردش محوری اور سورج کے گردش سالانہ گردش کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اسی طرح کوکب میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے ایام ہیں۔ ستاروں کے اپنے ایام ہیں یہ زمین کے ایام سے مختلف ہیں۔ بعض زمین کے ایام سے چھوٹے اور بعض طویل ہیں۔

وہ ایام جن میں ابتداء زمین پیدا ہوئی، پھر اس میں پہاڑ پیدا ہوئے، پھر اس کے اندر حسب ضرورت رزق اور ضروریات رکھی گئیں، یہ کوئی اور ہی ایام تھے اور ان کا معیار بھی اور تھا۔ ہمیں اس کا علم نہیں ہے، لیکن اس قدر ضرور معلوم ہے کہ یہ ایام ان دنوں کے مقابلے میں بہت ہی طویل تھے۔

آج تک انسانی علم جہاں تک پہنچ سکا ہے، اس کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مراد وہ زمانے ہیں جن سے یہ زمین گزرتی رہی، یہاں تک کہ وہ اپنے موجودہ مدار میں ٹھہری، اس کا چھلکا سخت ہو گیا اور یہ زندگی کے قیام کے لیے قابل ہو گیا، جس زندگی کو ہم جانتے ہیں اور آج تک جو نظریات پیش ہوئے ہیں ان کے مطابق اس پر ہمارے زمین کے معیار ایام کے مطابق نو ہزار ملین سالوں کا وقت لگا۔

یہ بھی محض علمی نظریات ہیں اور ان نظریات کو تبصروں اور چٹانوں کے مطالعہ کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔ قرآن کے مطالعہ میں ہم ان علمی نظریات کو آخری بات نہیں کہتے کیونکہ یہ فاضل تو ہیں نہیں۔ یہ نظریات ہیں اور ان میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ہم قرآن کو ان کا تابع تو نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر ان نظریات اور نص قرآنی کے درمیان قرب اور موافقت ہو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظریہ درست ہو سکتا ہے۔ اور ایسا نظریہ تشریح قرآن کا معاون بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ذریعہ ہم قرآن کے مفہوم کے قریب جاسکتے ہیں۔

آج کل کے نظریات کے مطابق رائج قول یہی سمجھا جاتا ہے کہ زمین بھی کسی وقت ایک آگ کا گونا گونا تھا جس طرح اس وقت سورج ہے اور مریخ کی شکل میں تھی۔ اور یہ زمین بھی سورج ہی کا حصہ تھی، اس سے جدا ہو گئی، اس کے بارے میں سائنس دانوں کا اتفاق نہیں ہے کہ کیوں ہوئی اور کس طرح ہوئی البتہ اسے ٹھنڈا ہونے کے لیے طویل وقت لگا جبکہ اس کا پیٹ ابھی تک اسی حالت میں ہے۔ جہاں بڑے بڑے پہاڑ پکھل جاتے ہیں۔ اور کھولنے لگتے ہیں۔

”جب زمین کا چھلکا ٹھنڈا ہوا تو یہ سخت ہو گیا۔ پہلے پہل یہ سخت پتھر تھا اور پتھر کے پھر جڑتے تھے۔ اوپر اور نیچے کے پتھر۔ اور نہایت ہی ابتدائی دور میں بخارات پیدا ہوئے جن کا $\frac{2}{3}$ حصہ ہائیڈروجن اور $\frac{1}{3}$ حصہ آکسیجن تھا۔ ان کے اتحاد کی وجہ سے زمین پر پانی پیدا ہو گیا۔

”ہوا اور پانی نے باہم تعاون کر کے چٹانوں کو توڑا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کو لیک جگہ سے اٹھایا اور دوسری جگہ ڈھیر لگا دیا اور اس کی وجہ سے مٹی پیدا ہوئی جس میں فصل اگانا ممکن ہوا، اس طرح ہوا اور پانی نے پہاڑوں کو توڑا اور اونچی جگہوں کو پست کیا اور گڑھوں اور نیچی جگہوں کی بھرائی کا کام کیا۔ لہذا زمین کے اندر جو بھی چیز ہے یا ہونے والی ہے۔ اس میں ہمیں تغیر و تحریک ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں۔“

”زمین کا لوہا کا حصہ جسے چھلکا کہہ سکتے ہیں، دائمی طور پر حرکت اور تغیر میں رہتا ہے۔ سمندر میں جب موجیں اٹھتی ہیں تو یہ چھلکا متاثر ہوتا ہے۔ سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بخارات بن جاتا ہے، آسمانوں کی طرف اٹھتا ہے، بادلوں کی

شکل اختیار کرتا ہے 'زمین پر بیٹھاپانی برساتا ہے۔ موسلا دھار بارشیں ہوتی ہیں 'سیلاب آتے ہیں 'دریا بہتے ہیں 'اور یہ اس زمین کے 'چھلکے کے اوپر چلتے ہیں اور اس میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ ایک پتھر اور چٹان پر یوں اثر انداز ہوتے ہیں کہ اسے ایک، چٹان سے دوسری قسم کی چٹان میں بدل دیتے ہیں۔ اور پھر یہ سیلاب اور دریا اسے اٹھا کر دوسری جگہ بھی لے جاتے ہیں اور صدیوں کے بعد پھر زمین کا چہرہ بدل جاتا ہے۔ اور ہزاروں اور لاکھوں سالوں کے بعد وسیع تغیرات پیدا ہوتے ہیں 'پھر پہاڑوں پر برف جمتی ہے 'یہ دبی کام کرتی ہے جو ہوا اور پانی کرتے ہیں اور سورج بھی زمین کی چھلکے پر ویسے ہی اثرات ڈالتا ہے جس طرح ہوا اور پانی ڈالتے ہیں۔ یہ اسے گرم کرتا ہے۔ پھر زمین کے اوپر زندہ جانور بھی زمین کے اس چہرے کو بدلتے رہتے ہیں اور آتش فشانی کا عمل بھی زمین پر تغیرات پیدا کرتا ہے۔

”اس زمین کے چٹانوں کے بارے میں آپ کسی بھی جیالوجسٹ سے پوچھ سکتے ہیں 'وہ چٹانوں کے بارے میں آپ کو بہت سی معلومات دے گا اور وہ اس کی تین بڑی اقسام جائے گا۔۔۔ مثلاً ”ناری چٹانیں“ (Igneous Rocks) جو زمین کے پیٹ کے پچھلے ہوئے مادے کی شکل میں باہر آئیں۔ یہ مادہ پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ آپ کو لاوا کی چٹان (Granites) بطور مثال پیش کرے گا اور پتھر دکھا کر آپ کو بتائے گا کہ اس کے اندر سفید 'سرخ اور سیاہ چمکدار مادے ہیں۔ یہ کیمیائی مرکبات ہیں اور ان کا اپنا وجود ہے کیونکہ یہ مخلوط دھاتوں کے پتھر ہیں۔ وہ یہ بتائے گا کہ تمام روئے زمین کا چمکدار انہی پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ جب یہ زمین تیار ہوئی بہت زمانہ پہلے 'بارشیں شروع ہوئیں 'زمین پر دریا بجے 'یا برف پگھلی 'طوفان چلے 'سورج نے اثر دکھایا۔ ان موثرات نے ان ناری چٹانوں کے اندر توڑ پوڑ کا عمل کیا۔ ان کے بلے اور ان کے اندر کی کیمیائی مواد سے یہ جدید چٹانیں تیار ہو گئیں اور لاوے کی ان چٹانوں سے کئی اور رنگ اور قسم کی چٹانیں تیار ہو گئیں۔

”اب چٹانوں کی ایک دوسری اہم قسم ہے جس کو جیالوجی کی زبان میں گارے (Sedimentary Rocks) کی چٹانیں کہتے ہیں یہ وہ چٹانیں ہیں جو پانی 'ہوا' سورج یا زندہ چیزوں کے عمل سے زمین کی اصلی سخت چٹانوں سے ٹوٹ پھوٹ کر بنیں اور ان کو Sedimentary اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنی اصلی جگہ میں نہیں ہوتی ہیں۔ یہ اپنی اصلی چٹانوں سے ٹوٹ پھوٹ کر اور پانی 'ہوا اور طوفان کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں اور وہاں گارے کی شکل میں جمع ہو کر جم جاتی ہیں“

”ان گارے کی چٹانوں کی مثال جیری پتھر ہیں جن سے پورا ”مقلم“ پہاڑ بنا ہوا ہے اس پہاڑ سے لے لیل تاہرہ پتھر توڑ کر اپنے مکانات بناتے ہیں۔ ماہرین بتائیں گے کہ یہ کیشیم کاربونیٹ (Calcium Carbonate) ہے اور یہ زمین سے زندہ چیزوں یا کیمیائی عمل سے جدا ہوا 'پھر ریت بھی اسی قسم کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے نیز میلٹیم لیسٹ بھی اس قسم سے بنا ہے۔ یہ بھی دوسری چٹانوں سے نکلا ہے۔ مثلاً خشک گارے کے پتھر اور خشک بچنے والی مٹی کے پتھر۔ یہ تمام سابقہ اصول کے مطابق بنتے ہیں“

یہ سابقہ اصلی چٹانیں ہیں جن سے گارے کی (Sedimentary) چٹانیں بنیں جن کی اقسام مختلف ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اصلی چٹانیں لاوے کی چٹانیں ہیں 'جب زمین کی سطح جم گئی اور اس کی سطح حالت جاتی رہی اور یہ عمل بہت ہی پہلے ہوا 'اس وقت سطح زمین پر لاوے کی چٹان کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر بخارات اور پانی پیدا ہوا اور اس نے لاوے کی چٹان پر توڑ پھوڑ کا عمل شروع کیا۔ اس میں ہوا اور مختلف قسم کی گیسوں نے بھی کام کیا۔ سخت طوفانوں اور سورج کی گرمی نے بھی

لہا ددی۔ یہ سب مراحل جمع ہوئے اور اپنے اپنے طبعی اور مزاج کے مطابق کام کیا اور یہ لاوے کے پتھر مفید پتھروں کی شکل میں بدلے۔ اب ان پتھروں سے عمارت بنتی ہیں۔ معدنیات نکالی جاتی ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سخت لاوے کے پتھری سے مٹی نکالی گئی جو سطح زمین پر مختلف مقامات پر جمع ہوئی اور یہی مٹی نباتات و حیوانات کے لیے تھی۔ مٹی۔
 ”لاوے کی چٹائیں کھیتی، فصل اور آبیائی کے لیے مفید نہیں ہے۔ لیکن اس سے، نرم و ملائم مٹی نکلتی ہے“^(۱)
 جیسی دوسری چٹانوں سے یہ مٹی جمع ہوتی ہے اور اس مٹی سے پھر نباتات و حیوانات پیدا ہوئے۔ اور یوں اس زمین کے رکھیں المخلوقات انسان کی پیدائش کے لیے راہ ہموار ہوئی۔^(۲)

یہ طویل سفر جس کا انکشاف علم جدید نے کیا ہے، اس کی عدد سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ زمین و آسمان کی تخلیق میں جو ایام لگے، زمین کی تخلیق، اس کے اوپر پہاڑوں کی تنصیب، اس کے اندر برکات و ضروریات کی تشکیل پر جو چار دن لگے، یہ ایام اللہ کے چار دن تھے جن کی طوالت کا ہمیں علم نہیں کہ ان کی طوالت کا کیا معیار و مقیاس ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ یقیناً ہماری اس زمین کے ایام نہ تھے۔

اب ہم نص قرآنی کے ایک ایک فقرے پر غور کریں گے، قبل اس کے کہ ہم زمین کے موضوع کو چھوڑ کر آسمان کی طرف چلیں:

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا (۱۰: ۶۱) ”اور اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیے۔“ بعض اوقات ان پہاڑوں کے لیے روای کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ روای کے معنی نگر انداز ہونے والی کشتی اور پہاڑ ہیں اور بعض جگہ پہاڑوں کو روای کہہ کر

أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ ”کہ تم ڈھلک نہ جاؤ۔“ یعنی زمین نگر انداز ہے، یہ پہاڑ اسے ایک جگہ نکالتے ہیں تاکہ انسان ڈھلک نہ جائے۔ ایک وقت ایسا تھا کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ زمین ایک جگہ جمی ہوئی ہے اور مستحکم بنیادوں پر ٹھہری ہوئی ہے۔ اب ایسا وقت آگیا ہے کہ یہ زمین تو ایک کرہ ہے، چھوٹی سی گیند جو فضا میں تھر رہی ہے اور کسی چیز کا سہارا نہیں لے رہی ہے۔ جب انسانوں کو سب سے پہلے یہ بات بتائی گئی ہوگی تو وہ پریشان ہو کر دائیں بائیں دیکھ رہے ہوں گے کہ واقعی کہیں ہم گر نہ جائیں۔ ڈھلک نہ جائیں۔ یا ہم فضا کی گہرائیوں میں نہ اڑ جائیں۔ اطمینان رکھو، اللہ نے اس کو فضا ہی میں رکھا ہے اور زمین و آسمان دونوں اپنی جگہ سے ہٹ یا پھسل نہیں سکتے۔ اگر ان کا توازن کبھی بگڑ گیا تو پھر اللہ کے سوا کوئی اسے قائم بھی نہیں کر سکتا۔ اطمینان کیجئے! اللہ نے جو قوانین فطرت کائنات میں جاری کیے ہیں وہ بہت ہی پختہ ہیں اور اللہ قوی و عزیز ہے۔

ذرا پہاڑوں کا مزید مطالعہ درکار ہے۔ ان کو اللہ نے ”روای“ کہا ہے۔ یہ زمین کو باندھتے ہیں کہ وہ ڈھلک نہ جائے، جیسا کہ ظلال القرآن میں ہم نے دوسری جگہ یہ نکتہ بیان کیا کہ سمندروں کے اندر جو گہرائیاں ہیں اور زمین کے اوپر جو بلندیاں ہیں یہ دونوں حصوں کا توازن برابر کرتی ہیں۔ یوں زمین کے دونوں حصے سمندری اور خشکی متوازن ہو

جاتے ہیں۔۔۔ ایک سائنس دان کی سنئے!

”زمین کے اندر جو حادثہ ہوتا ہے اس کی سطح پر یا اندر اس کی وجہ سے زمین کا مادہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کو منتقل ہوتا ہے‘ یہ اس کی گردش کو متاثر کرتا ہے۔ اس میں صرف مد و جزر ہی واحد عامل نہیں ہے۔ یعنی زمین کی رفتار میں کمی کے بارے میں‘ یہاں تک کہ دریا ایک جگہ سے جو پانی دوسری جگہ کو منتقل کرتے ہیں اس کا بھی زمین کی رفتار پر اثر ہوتا ہے۔ ہوائیں جو ادھر سے ادھر جاتی ہیں‘ یہ بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ سمندروں کے اندر کی سطح کا جگہ جگہ گرنا اور خشکی کی سطح کا جگہ جگہ سے اٹھنا بھی گردش زمین کی رفتار کو متاثر کرتا ہے اور یہ چیز بھی زمین کی گردش کی رفتار کو متاثر کرتی ہے کہ کسی جگہ سے زمین پھیلے یا سکڑے۔ اگرچہ یہ سکڑنا اور پھیلنا چند اقدام تک محدود کیوں نہ ہو۔“

غرض یہ حساس زمین جس کی حساسیت کے بارے میں ہم نے یہ مطالعہ کیا‘ کیا بعید کہ اس کی رفتار کی تیزی میں یہ اونچے اونچے پھاڑ توازن قائم کرتے ہوں اور وہ اس کو غیر متوازن ہونے سے روکتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے آج سے چودہ سو سال قبل یہ بات کہہ دی اَنْ تَعْبِدَہُمْ ”کہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔“

وَبَرَکَ فِیْہَا وَقَدَّرَ فِیْہَا اَقْوَاتَہَا (۱۰: ۱۰) ”اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس میں ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔“ یہ فقرہ ہمارے اسلاف کے دہنوں میں یہ مفہوم منتقل کرتا ہو گا کہ فصیح اکابر اس زمین کے اندر بعض مفید جمادات اور دھاتیں رکھ دیں مثلاً سونا چاندی اور لوہا وغیرہ۔ لیکن آج اللہ تعالیٰ نے انسان پر زمین کی جو برکات کھول دی ہیں اور جو صدیوں پہلے اس زمین میں رکھ دی گئی تھیں اور ہم ان سے استفادہ کرتے ہیں تو اس فقرے کا مفہوم بہت ہی وسیع ہو گیا ہے۔

اب ہم نے دیکھ لیا کہ کس طرح ہوا کے عناصر نے تعاون کیا اور پانی تشکیل ہوا اور کس طرح پانی اور ہوا نے تعاون کیا اور سورج اور طوفانوں نے تعاون کیا اور مٹی کی تشکیل ہوئی جو قابل زراعت بن گئی۔ اور پانی‘ سورج‘ ہواؤں کے باہم تعاون سے بارشیں برسیں‘ یہ بارش ہی ہے جس کے ذریعہ سے تمام پانی فراہم ہوتے ہیں۔ مٹی‘ شروں کے ذریعے‘ دریاؤں اور ندیوں کے ذریعے اور زمین کے اندر کے ذخیروں اور چشموں کے ذریعہ‘ یہ سب برکات و ارزاق ہی تو ہیں۔ اور پھر ہوا اور ہمارا اور تمام حیوانات کا نظام تنفس اور ہمارے جسم۔

”زمین ایک کرہ اور گیند ہے۔ اس کے اوپر چٹان کی ایک تہہ ملفوف ہے اور اس چٹان کی تہہ کے اکثر حصے کے اوپر پانی کی تہہ ہے جس سے یہ چٹان ملفوف ہے۔ پھر اس پانی اور چٹان کی تہہ کے اوپر ایک ہوائی کرہ ہے جو دیزجیس کی شکل میں دنیا کو ملفوف کیے ہوئے ہے۔ یہ ہوائی کرہ سمندر کی طرح ہے۔ اس کی سمندر کی طرح گہرائی ہے۔ ہم انسان اور حیوان اور نباتات ہوا کے اس سمندر کی تہہ میں زندہ رہ رہے ہیں اور بڑے بڑے ترے سے رہ رہے ہیں۔“

”ہو امیں ہم سانس لیتے ہیں‘ آکسیجن لیتے ہیں‘ ہوا ہی سے نباتات اپنا جسم بناتے ہیں‘ ہوا ہی سے کاربن لیتے ہیں بلکہ آکسائیڈ سے کاربن لیتے ہیں جسے اہل کیمیا کاربن ڈی آکسائیڈ کہتے ہیں۔ نباتات اپنا جسم کوئلے کے آکسائیڈ سے بناتے ہیں۔ ہم نباتات کھاتے ہیں اور ہم حیوانات کو بھی کھاتے ہیں۔ اور حیوانات نباتات کو کھاتے ہیں۔ دونوں سے ہمارا جسم تیار ہوتا ہے۔ ہو امیں مائٹروجن ہے‘ یہ آکسیجن کو خفیف بناتی ہے۔ ورنہ ہم سانس لیتے ہی جل جائیں۔ پانی کے بخارات ہوا کے

اندر رطوبت پیدا کرتے ہیں۔ کچھ دوسری گیسیں ہیں جو قلیل مقدار میں پائی جاتی ہیں اور غیر مرتب ہیں۔ ان میں ہیسیم، نیون وغیرہ اور ہائیڈروجن گیس، یہ ہوا میں ابتدائی تخلیق کے وقت سے موجود ہیں۔^(۱)

وہ مواد جو ہم کھاتے ہیں اور اپنی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جبکہ رزق اس مواد سے وسیع مفہوم رکھتا ہے جو صرف پیٹ میں جاتا ہے، یہ سب چیزیں اس اصلی مواد اور عناصر پر مشتمل ہیں جو یہ زمین اپنے پیٹ میں رکھتی ہے یا فضا میں رکھتی ہے۔ مثلاً چینی کیا چیز ہے۔ یہ کاربن ہائیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ہے اور پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مرکب ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے کھانے اور پینے کی چیزوں کے بڑے مرکبات ہیں۔ نیز لباس اور آلات بھی انہیں عناصر سے بنتے ہیں جو اس زمین کے اندر اللہ نے ودیعت کیے ہیں۔

یہ ہیں وہ امور جو اس زمین کی برکات اور اس کے اندر موجود ذرائع رزق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کو چار دنوں یا چار طویل ادوار، یعنی ایام اللہ میں بنایا گیا جن کی مقدار ہمیں معلوم نہیں ہے۔

--- ۰۰۰ ---

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلٰی السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِينَ (۱۱: ۴۱) فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَّوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَزَیِّنَا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَحِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ

(۱۱: ۴۱) ”پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا“ جو اس وقت محض دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا ”وجود میں آ جاؤ“ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو“۔ دونوں نے کہا ”ہم آگئے“ فرمانبرداروں کی طرح“۔ تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زیر دست علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔“

استواء کا معلوم یہاں ارادہ کرنا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے قصد کرنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف اپنے ارادے کو متوجہ کر دے۔ ثم بعض اوقات ترتیب زمانی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ معنوی ارتقاء کے لیے بھی آتا ہے۔ آسمان چونکہ انسانوں کو ارفع اور بلند نظر آتے ہیں اس لیے اس کے لیے ثم کا لفظ آیا۔

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلٰی السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (۱۱: ۴۱) ”پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اس وقت محض دھواں تھا“۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ستاروں کی تخلیق سے قبل ایک حالت تھی جیسے ”سدم“ کی حالت ہوتی ہے اور یہ ایک قسم کا گیس تھا، جیسے دھواں ہوتا ہے۔

”سدم (Black Whole) میں جو گیس اور غبار ہوتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جو ستاروں کی تخلیق سے بچ گیا ہوتا

ہے۔ نظریہ تخلیق کائنات یہ ہے کہ ککشاں گیس اور غبار سے مرکب ہوتی ہے۔ جب یہ گیس اور غبار زیادہ کثیف ہو گئے تو اس کے نتیجے میں ستارے پیدا ہوئے۔ کچھ لمبہ رہ گیا۔ یہ بقیہ لمبہ سدھم کی شکل اختیار کر گیا۔ اس وسیع ککشاں میں اس کا جو حصہ باقی ہے وہ منتشر ہے۔ گیس اور غبار کی شکل میں۔ اس کی مقدار اتنی ہے جتنے ستارے بن گئے۔ یہ ستارے اس بقیہ گیس اور غبار کو اپنی طرف اپنی جاذبیت کے ذریعے کھینچتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس عمل سے آسمانوں کی صفائی ہو رہی ہے۔ لہذا اس غبار کو جذب کرنے والے ستارے اس ہولناک فضا میں بہت تھوڑے ہیں۔ اور جن علاقوں کو اس سے صاف نہیں ہے وہ بہت ہی وسیع ہیں۔“

یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ یہ اس مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔ جو اس آیت میں ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلٰی السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (۱۱: ۴۱) ”پھر وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اس وقت دھواں تھا۔“ یہاں تک کہ اس سے آسمان بنائے اور ان میں درلیم اللہ صرف ہوئے یعنی طویل عرصہ۔ اس کے بعد اب ہم اس حقیقت پر غور کریں گے۔

فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ اُنْسِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَآئِعَتَيْنِ (۱۱: ۴۱) ”اس نے آسمان اور زمین سے کہا: وجود میں آ جاؤ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔“ دونوں نے کہا ”ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح۔“ اس آیت میں عجب اشارہ ہے اس قانون قدرت اور ناموس فطرت کی طرف جو اس کائنات میں چلایا گیا ہے اور اس کائنات کا تعلق اپنے خالق کے ساتھ اطاعت اور سر تسلیم خم کر دینے کا تعلق ہے۔ پوری کائنات اللہ کی مشیت اور حکم کے مطابق چل رہی ہے۔ یہاں صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اللہ کے ناموس کے سامنے مجبور ہو کر سرطاعت خم کرتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے۔ یہ انسان بھی یقینی طور پر اس ناموس فطرت کا مطیع فرمان ہے اس سے نکل نہیں سکتا۔ یہ اس عظیم کائنات کا نہایت ہی معمولی پرزہ ہے۔ اور اس کائنات کے کلی قوانین اس پر بھی نافذ ہیں خواہ وہ راضی ہو یا نہ ہو لیکن اس کائنات میں یہ انسان واحد ذات شریف ہے جو اللہ کی اطاعت اس طرح نہیں کرتا جس طرح ارض و سما کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اطاعت سے آزاد کرنا چاہتا ہے یا راہ حق سے انحراف چاہتا ہے جو مستقیم اور آسان ہے لہذا وہ قوانین فطرت سے ٹکراتا ہے اور یہ بات لازمی ہے کہ یہ قوانین اس پر غالب آکر اسے پاش پاش کر دیتے ہیں۔ اس وقت یہ پھر کر مطیع فرمان ہوتا ہے۔ ہاں اللہ کے وہ بندے جن کے دل جن کا وجود جن کی حرکات جن کے تصورات جن کا ارادہ جن کی خواہشات اور جن کا رخ قوانین فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو ایسے بندے پھر خوشی خوشی سے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اس کائنات کے ساتھ ہمہ دم ہو کر نہایت تعاون سے چلتے ہیں اور جس طرح یہ پوری کائنات اللہ کی سمت چلتی ہے۔ وہ بھی اسی سمت رواں دواں ہوتے ہیں۔ وہ کائناتی قوتوں کے ساتھ لڑتے ہیں جب مومن اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کے ہاتھوں معجزات کا صدور ہوتا ہے کیونکہ اس نے ناموس قدرت کے ساتھ اتحاد کر لیا ہے۔ اس کائنات کی عظیم قوتیں اس کی پشت پر آ جاتی ہیں۔ اور یہ عظیم قوت جب اللہ کی راہ میں چلتی ہے تو مطیع فرمان ہو کر چلتی ہے۔

ہم اگر اللہ کی اطاعت کرتے ہیں تو مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ کاش کہ ہم خوشی سے مطیع فرمان ہوتے۔ کاش ہم بھی زمین و آسمان کی طرح خوشی سے اطاعت کرتے، رضا اور خوشی سے۔ اس حال میں کہ ہم روح کائنات کے ساتھ ہم

آہنگ ہو چکے ہوں اور نہایت خوشی اور خضوع و خشوع کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے اور سر تسلیم خم کرتے ہوئے اللہ رب العالمین کی طرف چلیں۔

بعض اوقات ہم سے بڑی مشکلہ خیز حرکات سرزد ہوتی ہیں 'تقدیر کی گاڑی اپنی شاہراہ پر چلتی ہے' تیزی سے چلتی ہے۔ اپنی سمت پر چلتی ہے 'یہ پوری کائنات اس کے ساتھ چلتی ہے۔ مستقل قوانین فطرت کے مطابق چلتی ہے۔ ہم آتے ہیں اور ہمارا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ ہم تقدیر سے بھی آگے ہو جائیں یا تقدیر سے ست روی اختیار کر لیں حالانکہ ہم اس عظیم کائنات کا حصہ ہیں۔ ہم اپنی نفسیاتی کمزوریوں کی وجہ سے جب قافلہ کائنات سے الگ ہو جاتے ہیں تو ہمارے سفر کی سمت ہی بدل جاتی ہے اور یہ سمت اس لیے بدلتی ہے کہ ہم بے چین 'جلد باز' 'لا لچی' مطلب پرست اور ڈر پوک ہو جاتے ہیں۔ اور قافلہ ایمان اور قافلہ کائنات سے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں 'ہم کبھی اس طرف گمراہتے ہیں' کبھی ادھر ٹھکتے ہیں اور درہم دپاتے ہیں 'ادھر گرتے ہیں' ادھر حادثہ کرتے ہیں 'اور پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ جبکہ کائنات کی گاڑی اپنے راستے پر 'اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف جارہی ہے۔ اور اسی طرح ہماری تمام قوتیں 'تمام جدوجہد بے کار ہو جاتی ہیں لیکن جب ہمارے دل ایمان سے لبریز ہوں 'ہم اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں 'روح کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں 'اس وقت ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمارا کردار کس قدر حقیقی ہے۔ پھر ہم اپنے قدموں اور تقدیر کی رفتار کے درمیان توازن پیدا کر دیں گے۔ اور ہم مناسب وقت میں مناسب رفتار سے مناسب سمت کی طرف حرکت کریں گے۔ ہمارے ساتھ اس پوری کائنات کی قوت شامل ہوگی۔ اور ہم عملاً بہت عظیم کام کر سکیں گے 'سوائے اس کے کہ ہم پر کبر و غور کا اثر ہو 'کیونکہ ہمیں تو اصل حقیقت معلوم ہوگی کہ جس قوت کے ذریعے ہم یہ کارہائے نمایاں کر رہے ہیں 'اس کا سرچشمہ تو دراصل کوئی اور ہے۔ یہ ہماری ذاتی قوت نہیں ہے۔ ہماری قوت میں یہ برکت اس لیے پیدا ہو گئی کہ یہ اس کائنات کے اندر ودیعت کردہ اللہ کی قوت کے ساتھ یکجا ہو گئی ہے۔

کیا ہی سعادت مندی ہوگی 'کیا رضامندی ہوگی' کس قدر راحت ہوگی اور کس قدر اطمینان ہو گا کہ ہم اس کرۂ ارض پر جو اللہ کو بنیک کہنے والا ہے 'اپنا یہ مختصر سفر اس خوشی میں 'اس کرۂ ارض کی سعادت میں طے کریں اور آخر کار رب تعالیٰ کے ہاں ایک بڑے سفر کے آغاز کے لیے پہنچ جائیں۔

وہ کیا عظیم امن و سلامتی ہوگی جب ہم ایک ایسی کائنات میں زندہ رہ رہے ہوں جو ہماری دوست ہو 'سب کی سب اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والی ہو اور ہم بھی اللہ کے مطیع فرمان ہوں۔ ہم دونوں ہمدرد ہوں 'دشمنی پر نہ ہوں' دوست ہوں 'کیونکہ ہم اس کائنات کا حصہ ہیں اور اسی کے ہمہ رخ ہیں۔

قَالَتْ اَتَيْنَا طَآئِعِينَ (۱۱: ۴۱) "ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح۔"

فَقَضَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ (۱۲: ۴۱) "تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیئے۔"

وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۱۲: ۴۱) "اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا۔" یہ

دو دن وہی ہو سکتیں جن میں سدم سے ستارے تیار ہوئے یا جن میں ان کی تشکیل مکمل ہوئی۔ حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ ہر آسمان کی طہ اس کے امور کی وحی کے معنی یہ ہیں کہ اس پر قوانین قدرت نافذ کر دیئے۔ اور ہدایت کر دی کہ یوں چلو، پھر آسمان کے حدود کیا ہیں تو اس کا تعین فی الحال ہم نہیں کر سکتے۔ دوری کا ایک درجہ ایک آسمان ہو سکتا ہے۔ ایک کھنک ایک آسمان ہو سکتی ہے 'یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دوری تک جس قدر کھکشاں ہیں وہ ایک آسمان ہوں یا اس کا اور سوم بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بلندیاں سات ہیں۔

وَزِينَا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا (۱۲: ۴۱) ”اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے محفوظ کر دیا۔“ سماء دنیا کا بھی کوئی متعین موصوم نہیں ہے 'اس سے مراد قریب تر کھکشاں بھی ہو سکتی ہے جو ہمارے ہاں مٹی کھکشاں کے نام سے مشہور ہے اور جس کا قطر ایک لاکھ ملین نوری سال ہے۔ یا کوئی اور معیار ہو اللہ کے نزدیک جس پر لفظ سما کا اطلاق ہوا ہو۔ اس میں ستارے اور سیارے ہیں جو ہمارے لیے چراغ ہیں اور بہت خوبصورت ہیں۔

حفاظت کس چیز سے؟ شیطانوں سے۔ قرآن میں دوسری جگہ اس کی تصریح ہے۔ پھر شیطان کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کریم میں جو افعال ان کی طرف منسوب ہیں اور جو اشارے ہیں 'ان کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی حقیقت اور ماہیت کا علم اللہ کو ہے۔

ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۱۲: ۴۱) ”یہ سب کچھ ایک زبردست اور علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔“ کون ہے اللہ کے سوا جو اس عظیم اور ہولناک کائنات کو چلا سکتا ہے؟ صرف اللہ زبردست اور علیم و حکیم 'اس کام کو کر سکتا ہے 'جو ہر چیز سے باخبر ہے۔

--- ۰۰۰ ---

ایک عظیم کائناتی سفر کے بعد اللہ کا انکار کرنے والوں کے موقف کی کیا وقعت رہ جاتی ہے اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں ان کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے 'جبکہ آسمان و زمین دونوں بیک زبان کہتے ہیں کہ ہم ہیں مطیع فرمان۔ لیکن انسان ہے اور کیا انسان؟ اس کائنات کے اعتبار سے ایک نہایت چھوٹی سی چوٹی بلکہ جرثومہ 'بے وقعت 'جو زمین پر رہتا ہے۔ یہ نہایت ہی ناپردہسی 'غور کے ساتھ کہتا ہے کہ میں نہ مانوں!۔ کیا سزا ہونی چاہئے ایسے لوگوں کی 'ایسے ناپردہ مکبرین کی!

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صِيعَةً مِّثْلَ صِيعَةِ عَادٍ وَنُوحٍ ؑ إِذْ جَاءَتْهُمْ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبَّنَا لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ؑ فَاَمَّا عَادُ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا

مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۚ أُولَٰئِكَ يَرَوْنَ أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً
وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿١٥﴾ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَحْسَاتٍ
لِّنَنْزِقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَى
وَهُمْ لَا يُنْصَرُونَ ﴿١٦﴾ وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ
فَأَخَذَتْهُمُ صَاعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿١٧﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا
وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿١٨﴾

۱۶

”اب اگر یہ لوگ نہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں، جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا۔ جب خدا کے رسول ان کے پاس آگے اور پیچھے ہر طرف سے آئے اور انہیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، تو انہوں نے کہا ”ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہذا ہم اس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔“ عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے ”کون ہے ہم سے زیادہ زور آور؟“ ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے؟ وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے، آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا حذر چکھا دیں، اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہے، وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو گا۔ رہے ثمود، تو ان کے سامنے ہم نے راہِ راست پیش کی مگر انہوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا بنا رہنا ہی پسند کیا، آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا اور ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی و بد عملی سے پرہیز کرتے تھے۔“

یہ فی الحقیقت ایک خوفناک ڈرانا ہے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ (۴۱: ۱۳) ”اب اگر یہ لوگ نہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا۔“ یہ ڈرانا مشرکین کے جرائم اور فحاشی کی مکروہ بد کاریوں کے لیے نہایت مناسب تھا جس طرح کے غرور میں مشرکین مکہ جلا تھے، جس کا ذکر سورت کے آغاز میں ہوا، نیز وہ اس پوری کائنات کی روشِ اطاعت سے بھی پھرے ہوئے تھے، جس کا ذکر اس ڈرانا سے متعلق پہلے ہوا۔

اس ڈرانا کے قصے کے بارے میں ابن اسحاق نے روایت کی ہے، یزید ابن زیادہ سے انہوں نے محمد ابن کعب قرظی سے، انہوں نے کہا مجھے یہ بتایا گیا کہ عقبہ ابن ربیعہ نے، جو قریش کا ایک سردار تھا، ایک دن جبکہ وہ قریش کی محفل

میں بیٹھا ہوا تھا اور رسول اللہ ﷺ مسجد الحرام میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگا سردار ان قریش 'کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ میں محمد سے بات کروں اور ان کے سامنے کچھ تجاویز پیش کروں' شاید وہ ان میں سے بعض کو قبول کر لے۔ وہ جو چاہے ہم اس کو دے دیں اور وہ ہمیں معاف کر دے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت حمزہ اسلام لے آئے تھے۔ اور سردار ان قریش نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں تو اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ تو زیادہ ہو رہے ہیں بلکہ لوگ کثرت سے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اہل مجلس نے کہا ابو الولید یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ انہیں اور اس سے بات کریں۔ عتبہ اٹھا اور حضورؐ کے پاس گیا 'یہ رسول اللہؐ کے پاس بیٹھا اور کہا' بھتیجے! تو ہم میں خاندانی مقام و مرتبہ کے اعتبار اور جاہ و نسب کے لحاظ سے ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ تو نے اپنی قوم کو ایک بہت بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ قوم کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ تو نے ان کے نظریات اور عقائد کی تضحیک بھی کی۔ ان کے دین اور انہوں پر نکتہ چینی کی۔ پھر تو نے ان آہا و بھدا کی تکفیر کی جو چلے گئے ہیں۔ لہذا اب میری کچھ تجاویز سنو' ان پر غور کرو۔ اگر تم ان میں سے بعض تجاویز کو قبول کرو تو آپؐ نے فرمایا ابو الولید آپ کہیں میں سنتا ہوں۔ تو اس نے کہا: "بھتیجے تم نے جو تحریک چلا رکھی ہے اگر اس سے تمہاری غرض مال و دولت جمع کرنا ہے تو ہم تمہارے لیے مال و دولت کی بڑی مقدار جمع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ تم سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے' اگر تم مقدار چاہتے ہو تو ہم تمہیں ایسے اختیارات کے ساتھ سردار بناتے ہیں کہ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ اور اگر سرداری سے بھی آگے تم بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تمہیں بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ اور اگر یہ صورت ہے کہ جو تم پر آتا ہے وہ کوئی بیماری ہے جس سے تم اپنے آپ سے دور نہیں کر سکتے ہو تو ہم تمہارے بڑے بڑے طبیب لاتے ہیں اور اس میں بہت کچھ خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں یہاں تک کہ تم تندرست ہو جاؤ' کیونکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے پیچھے لگنے والا اس پر غالب ہو جاتا ہے اور اسے اس کا علاج کرانا پڑتا ہے۔ یہ تھی عتبہ کی تقریر جو اس نے کی۔ جب عتبہ فارغ ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی باتیں غور سے سن رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا: آپ کی بات ختم ہو گئی تو اس نے کہا "ہاں"۔ حضورؐ نے فرمایا سنئے میری بات' تو اس نے بھی کہا بات کیجئے' حضورؐ نے فرمایا

حَم (۴۱: ۱) تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ (۴۱: ۲) كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۴۱: ۳) بَشِيرًا وَنَذِيرًا فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ

(۴۱: ۴) "ح م" یہ خدائے رحمن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے' ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں' عربی زبان کا قرآن' ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں' بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا ہے۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے رد گردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سورت اس کے سامنے پڑھتے رہے۔ عتبہ نے سنا تو وہ خاموش رہا اور اپنے ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے لگا کر ان پر ٹیک لی اور سنتا رہا یہاں تک کہ رسول اللہؐ سجدے کے مقام تک آئے' تو حضورؐ نے سجدہ فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا ابو الولید تم نے سن لیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ عتبہ اٹھا اور اپنے ساتھیوں کی طرف گیا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا 'ہم خدا کی

قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ابو الولید کا چہرہ وہ نہیں ہے جس کے ساتھ وہ گیا تھا۔ جب وہ ان کے پاس بیٹھا تو انہوں نے پوچھا ابو الولید کیا خبر لائے ہو۔ تو اس نے کہا خبر یہ ہے کہ خدا کی قسم میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے 'اپنی زندگی میں' میں نے ایسا کلام ہرگز نہیں سنا۔ خدا کی قسم یہ جادو نہیں ہے 'یہ شعر نہیں ہے' یہ کمانت نہیں ہے۔ اے برادران قریش میری بات مانو اور یہ معاملہ میرے حوالے کر دو 'اس شخص کو چھوڑ دو وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے' اسے کرنے دو 'اسے اپنے حال پر چھوڑ دو' خدا کی قسم وہ جو کچھ کہتا ہے 'آئندہ اس کی بڑی اہمیت ہوگی۔ اگر دوسری عرب اقوام نے اسے کچل دیا تو وہ تمہاری مصیبت کو ختم کر دیں گے تمہارے بغیر ہی۔ اور اگر یہ شخص عربوں پر غالب آگیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی ہوگی۔ اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور تم اس کے ذریعہ خوشحال ترین لوگ ہو جاؤ گے تو انہوں نے کہا "خدا کی قسم" ابو الولید تم پر اس نے اپنی باتوں سے جادو کر دیا۔ اس پر اس نے کہا کہ میری رائے تو یہی ہے 'تم جو چاہو کرو'۔

علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی ہے (محمد بن فضل سے 'انہوں نے ابوعب سے) یہ ابوجہل بن عبد اللہ الکندی الکوفی ہیں۔ (اس آدمی کے بارے میں ابن کثیر نے کہا کہ یہ کسی قدر ضعیف ہے) اس نے زیلال ابن حزمہ سے انہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے کہ جب حضورؐ اس آیت تک آئے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادَ وَثُمُودَ (۱۳: ۴۱) تو عتبہ نے آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور صلہ رحمی کا واسطہ دیا۔ اور یہ عتبہ اپنے گھر چلا گیا اور پھر قریش کی محفل میں نہ آیا اور اپنے آپ کو ان سے دور رہنے کے لیے گھر میں بند کر لیا۔

اس ڈراوے کے اثرات کی ایک صورت آپؐ نے دیکھی کہ حضورؐ کی زبان سے ایک غیر مسلم نے اسے سنا اور وہ کانپ اٹھا۔ اس حدیث پر غور بھی قسم نہیں ہوا ذرا رکے 'رسول اللہ کی تصویر دیکھئے' اس عظیم انسان کے آداب گفتگو دیکھئے۔ آپؐ کے اطمینان قلبی کو دیکھئے 'آپؐ نے بڑے اطمینان سے عتبہ کے منہ سے نہایت گری ہوئی باتیں سنیں جن کی آپؐ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں ہے۔ لیکن آپؐ کا دل اپنے عظیم مقصد کو چھوڑ کر نیچے نہیں آتا۔ یہ چھوٹی چھوٹی پیش کشیں آپؐ کو گندی تجاویز محسوس ہوتی ہیں جن سے آپؐ کا نفس نفرت کرتا ہے لیکن حضورؐ نہایت ہی صبر کے ساتھ ان کو سنتے ہیں۔ شریفانہ انداز میں سنتے ہیں۔ آپؐ مطمئن 'نہرے ہوئے' سنجیدہ اور محبت کرنے والے کی طرح سنتے ہیں۔ آپؐ صبر سے عتبہ کو یہ گری ہوئی تجاویز پیش کرنے دیتے ہیں۔ جب وہ بات ختم کرتا ہے تو پھر بھی آپؐ جلدی نہیں کرتے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ پوچھتے ہیں اور کے ساتھ۔ "ابو الولید تم فارغ ہو گئے؟" وہ کہتا ہے ہاں۔ تو آپؐ فرماتے ہیں اچھا اب میری بات سنو۔ اور آپؐ اس وقت تک نہیں شروع کرتے جب تک وہ کہہ نہیں دیتا کہ سنائیے۔ اب حضورؐ نہایت اطمینان 'اعتماد اور بھرپور انداز میں شروع کرتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایسی تصویر ہے جسے دیکھتے ہی دل میں محبت و احترام کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اعتماد و محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور اطمینان ہو جاتا ہے کہ آپؐ ایک عظیم شخصیت ہیں 'یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے سامعین پر آپؐ چھا جاتے تھے' جو بھی آپؐ کی طرف آتا وہ مسور ہو کر لوٹتا یا مبسوت ہو جاتا۔ اللہ نے سچ کہا کہ اللہ جانتا ہے کہ وہ منصب رسالت کس کے سپرد کرتا ہے۔۔۔ اب ہم اس واقعہ کو چھوڑ کر نص قرآنی کی طرف آتے ہیں۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثُمُودَ (۱۳:۴۱) ”اگر یہ منہ موڑیں تو ان سے کہہ دس کہ میں تم کو اسی طوفان کے آگے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا کہ عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا۔“ یہ ایک سفر بے گزری ہوئی اقوام کے کھنڈرات کی سیر کے لیے۔ جبکہ اس سے قبل قرآن نے ہمیں آسمانوں کی دستوں کی سیر کرائی۔ یہ ایک ایسی سیر ہے جو خوف کے مارے دلوں کو ہل کر رکھ دیتی ہے کہ کیسی کیسی اقوام کو اللہ نے تباہ کیا جو اس جہاں میں اپنے خیال کے مطابق بڑے بنے ہوئے تھے۔

إِذْ جَاءَهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ (۱۴:۴۱)

”جب خدا کے رسول ان کے پاس آگے اور پیچھے ہر طرف سے آئے اور انہیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔“ یہ وہی ایک کلمہ ہے جسے تمام انبیاء و رسل نے پیش کیا اور جس پر تمام ادیان حقہ کی عمارت تعمیر ہوئی۔

قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً فَأَنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كُفْرًا (۱۴:۴۱) ”تو انہوں نے کہا ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا لہذا ہم اس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔“ یہ بھی وہی اعتراض ہے جس کا سامنا تمام انبیاء و رسل نے کیا۔ حالانکہ انسانوں سے خطاب کرنے والے رسول کو انسان ہی تو ہونا چاہئے جو ان کو جانتا ہو اور جسے وہ جانتے ہوں جس کے اندر لیڈر شپ کے حقیقی لوصاف وہ پائے جاتے ہوں۔ وہ انہی مشکلات میں رہتا ہو جس میں وہ رہتے ہوں لیکن عاد اور ثمود نے اپنے رسولوں کی دعوت کا انکار کر دیا۔ اور اس لیے کر دیا کہ وہ بشر کیوں ہیں۔ ان کی تجویز کے مطابق ملائکہ کیوں نہیں۔

یہاں تک تو عاد و ثمود دونوں کی بات ایک تھی کہ دونوں پر عذاب ایک سخت کڑک دار آواز یا دھماکے سے آیا تھا۔ اب یہاں سے آگے ان کی ہلاکت کی تفصیلات الگ تھیں۔ اس لیے الگ بیان کیا گیا۔

فَإِنَّمَا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مِنْ أَشَدُّ مَنَا قُوَّةً

(۱۵:۴۱) ”عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے: ”کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔“ حق تو یہ ہے کہ انسان اللہ کے سامنے جھکے اور زمین میں استکبار نہ کرے۔ پھر انسان ذرا اللہ کی عظیم خلقت کے مقابلے میں اپنے آپ کو دیکھے لہذا اس کرۂ ارض پر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنا کسی استحقاق کے بغیر ہی ہوتا ہے۔ پھر استکبار کے بعد انکار غرور بہت بڑا جرم ہے کہ ہجوم دیگرے نسبت۔

مَنْ أَشَدُّ مَنَا قُوَّةً (۱۵:۴۱) ہر سرکش ڈکیتی پر کچھ سمجھتا ہے۔ یہ اس شعور کے تحت ایسا کرتا ہے کہ اب ہماری قوت کے برابر کوئی دوسری بڑی قوت نہیں ہے لیکن یہ ڈکیتی بھول جاتے ہیں۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۱۵:۴۱) ”ان کو یہ نہ سوجھا کہ

جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے، وہ ان سے زیادہ زور آور ہے؟“ غرض بادی النظر میں ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کو پیدا کرنے والی ذات ہر حال ان سے زیادہ قوت والی ہے، کیونکہ یہ خالق ہی ہے جس نے ان کو یہ محدود قوت فراہم کی ہے لیکن کوئی سرکش اس بات کو نہیں سمجھتا۔

وَكَانُوا بآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ (۱۵:۴۱) ”وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے۔“ یہ لوگ اس منظر میں تھے، لپٹے زور بازو کا مظاہرہ کر رہے تھے، اپنی قوت پر اتر رہے تھے کہ اچانک پردہ گرتا ہے اور ایک دوسرا منظر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس منظر میں یہ پوری طرح پٹے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کو ان کے قابل نفرت کبر و غرور کی مناسب سزا دے دی جاتی ہے۔

فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَحِيسَاتٍ لِّنَذِيقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۱۶:۴۱) ”آخر ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں۔“ یہ نہایت ہی تیز رفتار مسلسل چلنے والی ہوائی تھی جس نے ان لوگوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، سخت سرد دنوں میں سخت سردی کے ساتھ آئی، یہ تباہی تو ان کے لیے دنیا کی زندگی میں شرمندگی تھی۔ ان لوگوں کے لائق سزا تھی یہ جو دنیا میں بڑے بنتے ہیں۔ تکبر کرتے اور لوگوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو اونچا سمجھتے ہیں۔ یہ تو تھی دنیا میں، لیکن آخرت میں بھی یہ لوگ بچ نہ سکیں گے۔

وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ وَهُمْ لَا يُنصَرُونَ (۱۶:۴۱) ”اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی رسوا کن ہے، وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو گا۔“

وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ (۱۷:۴۱) ”رہے ثمود تو ان کو ہم نے سیدھا راستہ دکھایا مگر انہوں نے اس راستے پر چلنے کی بجائے اندھا بنارہنا ہی پسند کیا۔“ اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ ناقہ کی نشانی کے بعد انہوں نے ہدایت قبول کر لی تھی۔ پھر مرتد ہو گئے اور کفر کی راہ اپنالی اور ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دے دی۔ اور ہدایت پالینے کے بعد گمراہ ہونا اندھے پن کے مشابہ ہے۔

فَاخَذَتْهُمْ صَعَقَةٌ الْعَذَابِ أَلْهُونَ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۱۷:۴۱) ”آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا۔“ اور ذلت آمیز عذاب ان کے لیے مناسب تھا، یعنی صرف ہلاک ہی نہ کیے گئے بلکہ ان کی ابرمدا کی وجہ سے اور ہدایت کے بعد ضلالت کی وجہ سے ان کو ذلیل بھی کیا گیا۔

وَنَجَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ (۱۸:۴۱) ”اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور بد عملی سے پرہیز کرتے تھے۔“ یہ سفر عادی ثمود کی بربادی پر ختم ہوتا ہے اور یہ نہایت ہی ڈراؤنا سفر ہے۔ اس

میں قارئین کو بتایا گیا کہ اللہ کی قوت کا کیا عالم ہے۔ اور اس کی بادشاہت کیسی ہے۔ ان کی قوت کا اللہ کی قوتوں سے کوئی مقابلہ نہیں اور اللہ کی بادشاہت سے کوئی قلعہ نہیں بچا سکتا۔ اور کوئی خود سرختہ پڑا اس بادشاہت میں نہیں رہ سکتا۔

--- ۰۰۰ ---

اب جبکہ فطرت کائنات کے اندر اللہ کی قوتوں کا مطالعہ کر لیا گیا۔ انسانی تاریخ میں اللہ کے فیصلوں کو ہم نے دیکھ لیا کہ کتنی کتنی طاقتور تہذیبوں کو نیست و نابود کیا گیا۔ اب اللہ ان کو بتاتا ہے کہ خود نفس انسانی پر اللہ کی بادشاہت کس طرح قائم ہے کہ خود اپنی ذات کی کسی چیز کے بھی وہ مالک نہیں ہیں۔ اور اللہ کے اقتدار سے وہ اپنی ذات کی کوئی چیز بھی بچا کر نہیں رکھ سکتے۔ یہاں تک کہ ان کے کان 'ان کی آنکھیں' ان کا گوشت و پوست بھی اللہ کے مطیع فرمان ہیں اور جب قیامت کا دن آئے گا تو یہ سب خود انسان پر گواہ ہوں گے۔ اس وقت انسان کی حیرانگی کا عالم کیا ہو گا! ملاحظہ کیجئے:

وَيَوْمَ يُخْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿١٤﴾

إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وُجُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾ وَقَالُوا لِمَ لَجُّوا لِمَعْرِضٍ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنْطَقْنَا اللَّهَ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿١٦﴾ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَرُونَ ۚ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَعُوكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾ وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدَكُمْ فَأَصْبَحْتُم مِّنَ الْخَاسِرِينَ ﴿١٨﴾ فَإِنْ يَصْبِرُوا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۖ وَإِنْ يَسْتَعْتِبُوا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِينَ ﴿١٩﴾

”اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ ان کے انگوٹوں کو پھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا، پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے ”تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟“ وہ جواب دیں گی ”ہمیں اسی خدا نے گواہی دی ہے جس نے ہر چیز کو گواہ کر دیا ہے۔ اسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو۔ تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمہیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمہارے اپنے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی۔ بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمہارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے۔ تمہاری یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے۔“ اس حالت میں وہ صبر کس (یا نہ کس)

آگ ہی ان کا ٹھکانا ہوگی، اور اگر رجوع کا موقع چاہیں گے تو کوئی موقع نہیں نہ دیا جائے گا۔

یہاں اچانک قرین کے سامنے ایک منظر آتا ہے، انتہائی مصیبت کا منظر ہے۔ اللہ کا اقتدار عروج پر ہے۔ انسان کے اعضا اللہ کے حکم پر کلہ حق کہتے ہیں۔ یہ کس کے اعضا ہیں؟ اللہ کے دشمنوں کے اعضاء، کیا ہے انجام اعدائے الہی کا۔ یہ حشر کے میدان میں جمع ہیں، آدم علیہ السلام سے لے کر اس جہں پر آخری پیدا ہونے والا انسان تک حاضر ہیں۔ ایک ریوڑ کی طرح جمع ہوں گے۔ ان میں سے دشمنانِ خدا کو چلایا جائے گا کس طرف؟ آگ کی طرف، جب حساب و کتاب شروع ہو گا۔ ان کے خلاف ایسے گواہ آتے ہیں جن کے بارے میں ان کو توقع ہی نہ تھی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی حالانکہ یہ ان کے حق میں جھوٹ بولتی تھی، افتراء باندھتی تھی اور مذاق اڑاتی تھی۔ ان کے کان ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے ان کے خلاف عدالت میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور تسلیم و رضا کے ساتھ اللہ کے ہاں گواہی دے رہے ہیں، جو کچھ انہوں نے کہا، پورا پورا لیان کر رہے ہیں۔ یہ لوگ تو یہ سب باتیں اللہ سے چھپاتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اللہ انہیں دیکھ نہیں رہا ہے۔ وہ اپنی نیٹوں اور جرائم کو ہلکا سمجھتے ہیں اور چھپاتے ہیں لیکن اپنے اعضاء سے تو نہ چھپا سکتے تھے۔ اعضاء تو ان کے ساتھ تھے۔ یہ تو ان کا حصہ تھے۔ یہ اعضاء ان باتوں کو کھول دیتے ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ خفیہ راز میں اور تمام لوگوں سے چھپے ہوئے ہیں۔ رب العالمین سے بھی چھپے ہیں۔ اللہ کی سلطنت اور اقتدار اعلیٰ کا یہ منظر اچانک ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور اقتدار الہی ہم سے ہمارے اعضاء بھی چھین لیتا ہے۔

وَقَالُوا الْحُلُوفُ دِهِمْ لَمْ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا (۲۱: ۴۱) ”وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟“ تو وہ ان کو وہ حقیقت بتاتے ہیں جو ان سے پوشیدہ تھی۔ اور یہ بات وہ بغیر کسی جھجک اور رکھ رکھاؤ کے بتاتے ہیں۔

قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (۲۱: ۴۱) ”وہ جواب دیں گے ہمیں اس خدا نے گویائی دی ہے، جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔“ کیا وہی نہیں ہے جس نے زبانوں کو گویائی دی۔ کیا وہ دوسرے اعضاء کو گویائی نہیں دے سکتا۔ آج تو اس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے، ہر چیز اب بولتی ہے۔

وَهُوَ مَخْلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَ إِلَيْهِ تَرْجَعُونَ (۲۱: ۴۱) ”اسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو۔“ تخلیق بھی اسی کی ہے اور آخر کار رجوع بھی اس کی طرف ہو گا۔ اس کے بعض قدرت سے کوئی باہر نہیں ہے۔ اور نہ بھاگ سکتا ہے۔ نہ اس دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

ان باتوں کا تو انہوں نے انکار کیا تھا۔ اب خود ان کے اعضاء ان کا اقرار کر رہے ہیں۔ اب اگلی آیت اعضاء کے کلام کی حکایت بھی ہو سکتی ہے اور اس پورے واقعہ پر تبصرہ بھی ہو سکتا ہے۔

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ

(۲۲: ۴۱) ”تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمہیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمہارے اپنے کان،

تمہاری آنکھیں اور تمہارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی۔“ تمہارے تو تصور میں بھی نہ تھا کہ یہ اعضاء تمہارے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ اور تمہاری طاقت میں بھی یہ بات نہ تھی کہ تم کسی بھی طرح اللہ سے چھپا سکو اگر چاہو بھی۔

وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (۴۱: ۲۲) ”بلکہ تم نے تو یہ سمجھ لیا کہ تمہارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے۔“ تاہم جس نے تمہیں دھوکہ دے دیا۔ یہ نہایت ہی جاہلانہ اور بدکارانہ روش تھی جس نے تمہیں جہنم کے دھانے پر پہنچا دیا۔

وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرَدَكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۴۱: ۲۳) ”تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے۔“

اور اب اس پورے منظر پر تبصرہ اور اس سے حاصل ہونے والا سبق :

فَاِنْ يُّصْرُوْا فَاَلْاَنَارُ مَثْوٰى لَّهُمْ (۴۱: ۲۴) ”اس حالت میں اگر وہ مبرکریں تو آگ ہی ان کا ٹھکانا ہے۔“ کیا سنجیدہ مزاح ہے۔ مبرا اب آگ جہنم پر ہے۔ یہ وہ مبرا نہیں ہے جس کے نتیجے میں انسان کو خوشی اور حسن جزاء نصیب ہوتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس پر جزاء نار جہنم ہے کیونکہ اب تو قرار دیا جا چکا ہے کہ یہی ان کا ٹھکانا ہے۔

وَ اِنْ يَّسْتَعْثِبُوْا فَمَا هُمْ مِنَ الْمُعْتَبٰى (۴۱: ۲۴) ”اگر رجوع کا موقعہ چاہیں گے تو کوئی موقعہ انہیں نہ دیا جائے گا۔“ نہ وہاں رضامندی ہے اور نہ وہاں توبہ کی گنجائش ہے۔ کیونکہ جو شخص معافی مانگتا ہے تو معافی تب ہوتی ہے جب ظلم و زیادتی کو زائل کر کے معافی طلب کی جائے۔ آج تو معافی اور ازالے کا دروازہ ہی بند ہو چکا ہے۔ اور اس لیے ان کے پاس کوئی موقعہ نہیں ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اب اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا اقتدار تو تمہارے دلوں پر بھی قائم ہے۔ جب تم زمین میں تھے اس وقت بھی تمہارے دل اللہ کے قبضہ قدرت میں تھے۔ جب تم اللہ کی نافرمانی کرتے تھے۔ جب اللہ کو تمہارے دلوں کا میلان فساد معلوم ہوا تو اللہ نے تمہارے دلوں پر ایسے ساتھی مسلط کر دیئے جو جنوں میں سے بھی تھے اور انسانوں میں سے بھی۔ یہ برائی کو تمہارے دل و دماغ کے لیے مزین کرتے تھے۔ یہ ساتھی ان کو اس قافلے میں ملا دیتے تھے جس کا انجام گھائے کا لکھا گیا تھا۔ یوں ان پر کلمہ عذاب اور فیصلہ عذاب صادق ہوا:

وَ قَيَّضْنَا لَهُمْ قُرٰنًا فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَاَمَّا

خَلْفَهُمْ وَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِىْ اُمِّهِمْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنَّ

۲

ع وَالْإِنْسِ، إِنَّهُمْ كَانُوا خَسِرِينَ ﴿۴۱﴾

۱۴

”ہم نے ان پر ایسے ساتھی مسلط کر دیئے تھے جو انہیں آگے اور پیچھے ہر چیز خوشنما بنا کر دکھاتے تھے، آخر کار ان پر بھی وہی فیصلہ عذاب چسپاں ہو کر رہا جو ان سے پہلے گزرے ہوئے جنوں اور انسانوں کے گرد ہوں پر چسپاں ہو چکا تھا، یقیناً وہ خسارے میں رہ جائے والے تھے۔“

ذرا دیکھیں تو سہی کہ وہ کس حد تک اللہ کے قبضے میں ہیں، جس کی بندگی کرنے سے وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں۔ اور ان کے دل جو ان کے پہلوؤں میں ہیں، وہ ان کو عذاب اور برے انجام کی طرف لے جا رہے ہیں۔ جس کو اللہ گمراہ کرنا چاہے اس پر وہ ایسے ساتھی مسلط کر دیتا ہے جو اس کے دل میں دوسرے اندازی کا کام کرتے ہیں اور اس کے ماحول میں جو بری چیز ہوتی ہے اس کو اس کے لیے حیرن کرتے ہیں اور اس کے جو اعمال ہوتے ہیں اس کی نظروں میں اچھے بناتے ہیں، ان کو ان میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی اور انسان کے لیے سب سے بڑی بیماری یہ ہوتی ہے کہ اس کے برے افعال اور اس کی گمراہی کے بارے میں اس کا احساس ختم ہو جائے۔ اپنی ذات کے ہر پہلو کے بارے میں وہ یہ دیکھنے لگے کہ وہ اچھا ہے۔ اس مقام پر جب انسان پہنچ جائے تو پھر وہ ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ لوگ اس گمے میں شامل ہو گئے جس نے ہلاکت کی طرف جانا تھا۔ یعنی ان گرد ہوں میں جن پر اللہ کا فیصلہ طے ہو چکا تھا، جنوں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی کہ

اِنَّهُمْ كَانُوا خَسِرٰۤیْنَ (۲۵: ۴۱) ”کہ یقیناً وہ خسارہ میں رہ جائیں گے۔“

ان لوگوں کے جو ساتھی تھے ان کو گمراہ کرنے کے لیے، انہوں نے ان کو آمادہ کیا کہ قرآن کا مقابلہ اس طرح کرو کہ اسے نہ سنو، نہ سننے دو کیونکہ انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ اس کے اندر غضب کی تاثیر ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوَاۤیِیۡهِ لَعَلَّكُمْ تَخْلَبُوْنَ ﴿۴۲﴾

”یہ منکرین حق کہتے ہیں“ اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں غلط ڈالو، شاید کہ اسی طرح تم غالب آ جاؤ۔“

یہ وہ بات ہے جو قریش کے کبراء اپنے آپ کو اور جمہور عوام کو کہتے تھے۔ یہ لوگ قرآن کریم کی حیرت انگیز اثر آفرینی سے عاجز آ گئے تھے۔ یہ اثر ان پر بھی تھا اور عوام پر بھی تھا۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ (۲۶: ۴۱) ”اس قرآن کو ہرگز نہ سنو۔“ کیونکہ جس طرح وہ کہتے تھے یہ ان پر جادو کرتا ہے۔ ان کی سوچ پر غالب آ جاتا ہے اور ان کی زندگی کو خراب کر رہا ہے۔ باپ اور بیٹے کے درمیان تفرقہ کر دیتا ہے، خوند اور بیوی کے درمیان جدائی کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن ایسی جدائیاں کر دیتا تھا لیکن اس لیے کہ خود اللہ نے ایمان اور کفر کے درمیان جدائی کر دی ہے، ہدایت اور ضلالت کے درمیان جدائی کر دی ہے، جو اسے ماننا تھا وہ غلو صحت ماننا تھا۔ اس لیے اس کے بعد وہ کسی اور تعلق کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ چنانچہ اس طرح جدائیاں ہو جاتی تھیں۔

وَالْغَوَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ (۲۶: ۴۱) ”اور اسی میں خلل ڈالنے کی کوشش کی۔ ان نعرہ صا یہ کام کرتا تھا۔ اس طرح شور و شغب اور بیٹیاں بجانے کے ذریعے بھی وہ یہ کام کرتے تھے اور اپنے بیچ اور رجز کے اشعار کے ذریعے بھی کرتے تھے لیکن یہ سب تدبیریں ہوا ہو گئیں اور قرآن غالب رہا۔ کیونکہ اس کے اندر غلبے کا راز تھا۔ وہ حق پر مشتمل تھا۔ اور سچائی ہمیشہ غالب ہو ا کرتی ہے۔ اگرچہ لعل باطل لاکھ جتن کرس ان کی اس مکروہ بات کی تردید میں ان کو سخت ڈر لواریا جاتا ہے۔

چنانچہ انہوں نے رستم و اسفندیار کے قصوں کے دربیہ قرآن میں خلل ڈالنے کی کوشش کی۔ ان نعرہ صا یہ کام کرتا تھا۔ اس طرح شور و شغب اور بیٹیاں بجانے کے ذریعے بھی وہ یہ کام کرتے تھے اور اپنے بیچ اور رجز کے اشعار کے ذریعے بھی کرتے تھے لیکن یہ سب تدبیریں ہوا ہو گئیں اور قرآن غالب رہا۔ کیونکہ اس کے اندر غلبے کا راز تھا۔ وہ حق پر مشتمل تھا۔ اور سچائی ہمیشہ غالب ہو ا کرتی ہے۔ اگرچہ لعل باطل لاکھ جتن کرس ان کی اس مکروہ بات کی تردید میں ان کو سخت ڈر لواریا جاتا ہے۔

فَلَنذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ
الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ جَزَاءُ اَعْدَاءِ اللّٰهِ النَّارُ فِيْهَا دَارُ
الْخُلْدِ ۖ جَزَاءُ اِیْمًا كَانُوا بِآيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۲۸﴾

”ان کافروں کو ہم سخت عذاب کا مزہ چکھا کر رہیں گے اور جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں، ان کا پورا پورا بدلہ انہیں دے دیں گے۔ وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا گھر ہو گا۔ یہ ہے سزا اس جرم کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔“

آگے اب بہت جلد ہم انہیں آگ میں دیکھتے ہیں اور اب ان دو ساتھیوں پر ان لوگوں کی نفرت کی بوچھاڑ ہوتی ہے جنہوں نے ان کو دھوکہ دیا تھا اور ان کے لیے ان کے ماحول کو حریں کر دیا تھا اور دھوکہ دے کر اس مقام تک انہیں لے آئے تھے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا اَرِنَا الَّذِيْنَ اَضَلَّنَا مِنَ الْجِنَّۃِ وَ
الْاِنْسِ نَجْعَلْهُمْ تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۲۹﴾

”وہاں یہ کافر کہیں گے کہ ”اے ہمارے رب! ذرا ہمیں دکھا دے ان جنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا! ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں۔“

یہ بہت سخت غصہ ہے۔ یہ لوگ اب انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں اور ان کے دلوں میں یہ خواہش ہے کہ۔

نَجْعَلُهُمَا تَحْتَ أَقْدَامِنَا (۴۱: ۲۹) ”ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں۔“

لِيَكُونَا مِنَ الْأَسْفَلِينَ (۴۱: ۲۹) ”ناکہ وہ خوب ذیل و خوار ہوں۔“ لیکن پہلے تو تم دوست تھے، گھرے پار تھے، ان کے دوسووں اور ان کی تزئین پر تم یقین کرتے تھے۔

--- ۰۰۰ ---

یہ تو انجام تھا دوسووں کا اور عوام کو گمراہ کرنے کا۔ لیکن لوگوں کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرنے والوں کا بھی ایک انجام اور اجر ہے۔ یہ مومن ہیں، جنہوں نے اخلاص کے ساتھ کہہ دیا کہ بس اللہ ہمارا رب ہے، پھر اپنی راہ پر استقامت اختیار کی یعنی ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔ ایسے لوگوں پر اللہ پھر برے ساتھی مسلط نہیں کرتا۔ ان کے ساتھ ملائکہ ہوتے ہیں جو ہر وقت ان کے دلوں پر امن و اطمینان وحی کرتے رہتے ہیں اور ان کو جنت کی خوشخبری دیتے رہتے ہیں اور یہ فرشتے ان کے ساتھ دنیا اور آخرت دونوں میں محبت کرتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ
الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَابْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ
تُوعَدُونَ ﴿۱۸﴾ نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا
مَا تَشْتَهُي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴿۱۹﴾ نُزِّلَا مِنْ غُفُورٍ رَحِيمٍ ﴿۲۰﴾

۱۸ ”جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ”نہ ڈرو، نہ غم کرو“ اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی، یہ ہے سامان فیاضیت اس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔“

یعنی اللہ کو اپنا رب کہہ کر استقامت کے یہ معنی ہیں کہ اس اقرار کے تقاضے پورے کیے جائیں جس طرح ان کا حق ہے۔ ضمیر میں شعوری طور پر یہ عقیدہ بیٹھا ہوا ہو، زندگی اور عمل میں اس پر گامزن ہو، اس راہ میں اگر تکالیف آئیں تو ان کو برداشت کرے۔ اس معنی میں یہ دراصل بہت بڑا حکم ہے اور بھاری ذمہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے ہاں پھر اس کا بہت بڑا اجر ہے کہ ملائکہ ان پر نازل ہوں گے اور ان کے اہم ہوں گے۔ ان کے دسترس ہوں گے اور وہ جو باتیں کریں گے اللہ نے ان فرشتوں کی زبانی ان کو نقل کیا ہے۔

أَلَّا تَحْزَنُوا (۴۱: ۳۰) ”نہ ڈرو“ وَلَا تَحْزَنُوا (۴۱: ۳۰) ”نہ غم کرو“۔ اور اس جنت کے لیے خوش ہو جاؤ۔ بشارت ہے تم کو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ اس کے بعد یہ فرشتے پھر ان کے سامنے اس جنت کی تصویر کھینچتے ہیں جو انہیں ملنے والی ہے کہ ”وہاں جو

کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہرچیز جس کی تم تناکر دو گے تمہاری ہوگی۔۔۔ پھر وہ مزید حسن و جمال اور عزت و استقبال کا ذکر کرتے ہیں: ”یہ ہے سامان ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور و رحیم ہے۔“ یعنی یہ اللہ نے تمہاری ضیافت اور مہمانی کے لیے تیار کیا ہے۔ اب ان نعمتوں کے بعد اور کیا رہ جاتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اس سبق کا خاتمہ ایک داعی کے خدوخال اور حوصلہ افزائی پر ہوتا ہے۔ اس کی روح 'اس کے الفاظ' اس کے آداب اور اس کی میٹھی میٹھی باتوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ ان باتوں کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے تمام داعیوں کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ سورت کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ پیغمبروں اور داعیوں کے ساتھ عوام الناس کا رویہ کس قدر ظالمانہ ہوتا ہے۔ اور وہ کس قدر گستاخی اور تکبر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس لیے یہاں داعی کو بتایا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کا منہاج دعوت یہ ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ
صَالِحًا وَقَالَ إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٢٢﴾ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٢٣﴾ وَمَا
يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۚ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا ذُو حِظٍّ عَظِيمٍ ﴿٢٤﴾ وَإِنَّمَا يَنزَغَنَّكَ
مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ ۖ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٢٥﴾

”اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور لے نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عدوت پڑی ہوئی تھی وہ بگڑی دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبیے والے ہیں اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو وہ سب کچھ مٹا اور جانتا ہے۔“

دعوت اسلامی کا کام ایک بہت بڑا اور کٹھن کام ہے، داعی کو مخاطب کی پیچیدہ نفسیات کا، اس کی جمالت کا، اس کی عزت نفس، اس کے استکبار کا، اس کی خواہشات کا، اس کے مفادات کا اور اس کے مرتبہ و مقام کا سامنا ہوتا ہے۔ صرف اللہ وحدہ کی حاکمیت کی طرف دعوت دینا، ان میں سے بیشتر چیزوں کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ پھر یہ دعوت دینا اور ایک طبقاتی معاشرے میں دینا کہ سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ برابر ہیں، ایسے حالات میں دعوت کی ذمہ داری اٹھانا حقیقت ہے کہ ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ لیکن مشکل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک عظیم کام بھی تو ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ

(۳۳) ”اور اس شخص کی بات سے اور اچھی بات کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا میں مسلمان ہوں۔“ جو لوگ دعوتِ اسلامی کا کام لے کر لٹھے ہیں ان کی دعوت اس عالم میں سب سے برگزیدہ دعوت ہے ان کے کلمے آسمانوں کی طرف پاکیزہ کلمات کی صورت میں بلند ہوتے ہیں، لیکن داعی کی دعوت کے ساتھ اس کا عمل بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ وہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہو۔ اس کی رات اس دعوت میں گم ہو جائے اور اس کے سب کام دعوت ہو جائیں اور اس کی تمام سرگرمیوں میں اس کا اپنا کچھ نہ ہو۔

اس کے بعد پھر داعی کو کوئی پردہ نہیں ہوتی ہے کہ اس کی دعوت کا رد عمل کیا ہوتا ہے۔ کوئی انکار کرتا ہے، کوئی گستاخی کرتا ہے، کوئی تکبر کرتا ہے، بہر حال داعی ایک اچھا انداز لے کر ہی چلتا ہے۔ وہ تو بلند مقام پر ہوتا ہے۔ اس کا مخالف برائی لے کر آتا ہے۔ اس کا مخالف تو نہایت ہی گرے ہوئے مقام پر ہوتا ہے۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ (۴۱: ۳۴) ”لے نی، نیکی اور بدی یکساں نہیں۔“ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ برائی کا جواب برائی سے دے۔ نیکی اور بدی کا اثر یکساں نہیں ہوتا۔ نہ دونوں کی قدر و قیمت یکساں ہے۔ داعی کو چاہئے کہ شر کا مقابلہ شر سے کرنے کی دلی رغبت کو ترک کر دے اور برائی کو صبر، معافی اور سنجیدگی کے ساتھ رد کرے۔ کرخت نفس کو اعتماد اور نرمی پر آمادہ کرے۔ چنانچہ دشمن دوستی سے بدل جائے اور سختی نرمی میں بدل جائے۔

ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ

(۴۱: ۳۴) ”تم بدی کو نیکی سے دفع کر دو جو بہترین ہو، تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔“ اسلام کا یہ اصول بسا اوقات نہایت ہی اچھے نتائج دیتا ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ سخت دشمنی دوستی میں بدل جاتی ہے اور غضب اور کینہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ تکبر، شرم و حیاء میں بدل جاتا ہے، بشرطیکہ کوئی اچھی بات کرنا جانتا ہو اور سنجیدگی سے بات کر سکتا ہو اور ایک نہایت ہی پہچانی کیفیت کے سامنے مسکراہٹ سے بات کر سکتا ہو۔ ایک ایسے شخص کے سامنے نہایت ہی ٹھنڈے مزاج کا مظاہرہ کر سکتا ہو جو آپے سے باہر ہو گیا ہو۔

اگر کسی ایسے شخص کا مقابلہ ایسے ہی انداز میں کیا گیا جس طرح اس کا ہے تو پھر کیا ہو گا۔ وہ مزید آپے سے باہر ہو گا، تکبر کرے گا اور سرکشی پر آمادہ ہو گا، حیا و شرم کا جامہ اتار پھینکے گا اور آپے سے باہر ہو کر آمادہ جنگ ہو گا۔

لیکن اس میں ایک شرط ہے، وہ یہ کہ اس طرح کی شرافت کا مظاہرہ کرنے والا ایک بڑے دل اور بڑے مقام کا مالک ہو، وہ اس پوزیشن میں ہو کہ اگر لینٹ کا جواب پھر سے دینا چاہے تو دے سکے۔ برائی کا جواب دینے کی اگر قدرت ہو تو پھر شرافت کا اثر ہو گا۔ ورنہ ”گد اگر تواضع گند حوئے لوست“۔ یہ نہ ہو کہ اچھا رویہ اختیار کرنے کو کمزوری سمجھا جائے۔ اگر مخالف نے یہ سمجھ لیا کہ یہ کمزور ہے تو پھر وہ ہرگز احترام نہ کرے گا اور پھر اچھائی کا کوئی اثر نہ ہو گا۔

پھر یہ بات بھی نوٹ کر لینا چاہئے کہ اس شرافت کا مظاہرہ محض دست درازی کے مواقع پر ہونا چاہئے۔ اگر کوئی اسلام اور اللہ کے اصولوں پر دست درازی کرتا ہے، یا کوئی لٹل ایمان پر مظالم ڈھاتا ہے۔ لوگوں کو دین سے روکتا ہے، تو اس صورت میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے مقابلہ ضروری ہے یا پھر اگر مقابلے کی صورت نہ ہو تو صبر کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہ

ہو کہ ایک تو اسلام کی پیروی کر رہا ہو اور دوسرا برائی کا بدلہ نیکی سے دے رہا ہو۔

یہ مقام کہ برائی کو نیکی کے ساتھ دفع کرنا، اور غیض و غضب کے مقام پر رواداری اور برداشت کرنا اور یہ فیصلہ کر سنانا کہ کہاں رواداری اور برداشت کرنا ہے اور کہاں برائی کو نیکی کے ساتھ دفع کرنا ہے۔ یہ ایک عظیم مرتبہ ہے۔ یہ مرتبہ و مقام ہر انسان کو نہیں مل سکتا۔ اس مقام پر وہی شخص فائز ہو سکتا ہے جسے صبر کی بڑی مقدار دی گئی ہو۔ یہ وہ مقام ہے جس پر اللہ کے خاص بندے اور صبر کرنے والے ہی فائز ہو سکتے ہیں۔

وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا ذُو حُظٍّ عَظِيمٍ (۴۱: ۳۵) ”اور یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہوتے ہیں۔“ یہ اس حد تک بلند درجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو ذاتی معاملات میں بھی کبھی غصے میں نہیں آتے تھے اور اگر غصے میں آتے تھے تو ان کے مقابلے میں کوئی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، آپ گو اور آپ کے ذریعہ ہر داعی کو یہ کہا جاتا ہے :

وَأَمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۴۱: ۳۶) ”اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔“ غصے میں کبھی اکساہٹ ہوتی ہے انتقام کی، برائی کی وجہ سے بعض اوقات انسان صبر کی کمی محسوس کرتا ہے یا شرافت میں تنگ دلی محسوس کرتا ہے۔ ایسے حالات میں اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھنا چاہئے۔ اس سے وہ سوراخ بند ہو جائے گا جو شیطان کرنا چاہتا تھا۔

اللہ انسانی دل کا خالق ہے، وہ اس کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ اس کی طاقت اور حد برداشت کو بھی جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ شیطان کس سوراخ سے حملہ آور ہوتا ہے۔ یہ داعی کے قلب کو گھیرتا ہے اور اکساتا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو بچانے والا ہے۔ کیونکہ یہ راستہ کنھن ہے۔ یہ راہ بڑی دشوار گزار ہے، نفس انسانی کے نشیب و فراز میں اور نفس انسانی کی پیچیدہ وادیوں میں داعی کو سفر کرنا ہوتا ہے تاکہ داعی گہرے نفسیاتی میلانات میں ہدایت اور قیادت کا حق ادا کر سکے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۲۸ ایک نظر میں

اس سبق کا تعلق بھی اسلامی دعوت کے ساتھ ہے۔ یہ کائناتی نشانیوں سے شروع ہوتا ہے۔ اور گردش لیل و نهار کو ہمارے غور کے لیے پیش کرتا ہے اور شمس و قمر کو اس لیے پیش کرتا ہے کہ مشرکین میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو شمس و قمر کے پجاری تھے۔ حالانکہ یہ دونوں خدا کی مخلوقات میں سے ہیں۔ ان آیات کے باوجود یہ لوگ اللہ کی آیات سے انکار کرتے ہیں اور اس کی بندگی نہیں کرتے لیکن اللہ کے ہاں ایسی مخلوق ہے جو ہر وقت اس کی بندگی میں لگی ہوئی ہے۔ پھر یہ پوری زمین بھی اللہ کی بندگی میں لگی ہوئی ہے 'یہ مردہ ہو جاتی اور پھر اللہ سے فیض حیات لیتی ہے جیسا کہ انسان کو بھی زندگی اللہ نے دی ہے' لیکن انسان ہے کہ نافرمانی کرتا ہے۔ اللہ کی آیات کو لٹے معنی پہناتا ہے۔ قرآن کی آیات کے معنی بگاڑتا ہے 'حالانکہ قرآن مجید صاف عربی میں ہے۔ اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر سامنے آتا ہے۔ پھر خود اس کی زندگی کو پیش کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان ایک ضعیف مخلوق ہے۔ مال کا لالچی ہے اور جب کوئی مشکل پڑتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے۔ اور سورت کے آخر میں انفس و آفاق کے دلائل و نشانات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں پر حق واضح ہو جائے اور ان کے دلوں کے شہادت دور ہو جائیں۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۲۸ تشریح آیات

۳۷ --- تا --- ۵۴

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا
تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ
إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۳۷﴾

”اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔“

یہ نشانیاں جن کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے، آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہیں، عالم بھی انہیں دیکھ سکتا ہے اور جاہل بھی، انسانی دل پر ان کے براہ راست گہرے اثرات بھی ہیں۔ اگرچہ انسان ان کی سائنسی حقیقت بالکل نہ جانتا ہو، کیونکہ انسان اور اس کائنات کے درمیان، سائنسی علم سے بھی زیادہ گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ دونوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ فطرت دونوں کی ایک ہے، ساخت ایک ہے، انسان اس کائنات کا حصہ ہے اور یہ کائنات انسان ہی کا حصہ ہے۔ دونوں کا مادہ وجود ایک ہے، فطرت ایک ہے اور جس قانون قدرت کے مطابق انسان چلتا ہے، اس کے مطابق یہ کائنات بھی چلتی ہے۔ دونوں کا اللہ ایک ہے۔ اس لیے انسان اس زمین و آسمان کے بارے میں ایک گہرا احساس اور گہرا فطری ادراک رکھتا ہے۔ اور یہ ادراک اسے گہری فطری منطق کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم صرف اس پر اکتفاء کرتا ہے کہ انسان کو اس کی طرف متوجہ کر دے اور اسے غفلت سے جگا دے اور یہ غفلت انسانوں پر اس لیے طاری ہو جاتی ہے کہ انہوں نے گردش لیل و نہار اور شمس و قمر کو دیکھتے دیکھتے لب ان کی کوئی اہمیت ان کے ہاں نہیں رہی ہے۔ ان کے دل و دماغ پر پردے آگئے ہیں، اس لیے قرآن انسان کو جگاتا ہے، ان کی سوچ کو صیقل کرتا ہے کہ دران معجزات پر غور کرو، یہ تمہاری دوست کائنات کا حصہ ہیں، تم لیل و نہار اور شمس و قمر کے ساتھ رہتے ہو۔

شمس و قمر کے حوالے سے ایک گہرا ہی اور فکری انحراف کی طرف بھی متوجہ کر دیا۔ بعض لوگ شمس و قمر کی پوجا کرتے

تھے تاکہ اس طرح وہ اللہ کا تقرب حاصل کر لیں، کیونکہ اللہ کی بہترین مخلوق جسے سامنے سجدہ کرنا اللہ کے سامنے سجدہ کرنا ہے۔ قرآن نے یہاں حتی طور پر اس انحراف کی تصحیح بھی کر دی اور عقائد کی آلودگی کو صاف بھی کر دیا۔ اگر تم فی الحقیقت اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو تو پھر شمس و قمر کی عبادت نہ کرو

وَ اسْجُدْ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَھُنَّ (۳۷: ۶۱) ”بلکہ اس خدا کی بندگی کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔“۔ مخلوق کو صرف خالق کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اور شمس و قمر بھی تمہاری طرح اللہ ہی کے پیروکار ہیں۔ اللہ نے ان دو شمس و قمر کو پیدا کیا ہے اور ان دو کے لیے یہاں جمع مونث کی ضمیر استعمال کی ہے۔ کیونکہ یہاں جنس ستاروں اور سیاروں کی طرف اشارہ ہے۔ صرف یہ دو مراد نہیں اور پھر جمع مونث عاقل کی خبر ان کی طرف اس لیے راجع کی گئی ہے کہ یہ بھی تمہاری طرح اشخاص ہیں اور اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

ان آیات و نشانات اور اس تبلیغ و بیان کے بعد بھی اگر وہ تکبر کرتے ہیں تو اس سے اللہ کی بادشاہت میں کوئی کمی بیشی اور کوئی تقدیم و تاخیر واقع نہیں ہوتی، اللہ کے ہاں بے شمار مخلوقات اس کی عبادت میں لگی ہوئی ہیں۔

فَإِنْ اسْتَكْبَرُوا فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ یَسْتَحْیُونَ لَہٗ بِالنَّیْلِ وَ النَّہَارِ

وَ هُمْ لَا یَسْتَمُوعُونَ السَّمْعَ

”لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آکر اپنی ہی بات پر اڑے رہیں تو پروا نہیں جو فرشتے تیرے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں ٹھکتے۔“

اس کا قریب الفہم مفہوم تو یہی ہے کہ اللہ کے پاس کی مخلوق سے مراد ملائکہ ہیں۔ لیکن اللہ کے مقرب بندوں پر مشتمل کوئی اور مخلوق بھی اس سے مراد ہو سکتی ہے۔ اللہ کی مخلوقات کے بارے میں تو ہم بہت کم جانتے ہیں۔

وہ لوگ جو رب کے ہاں ہیں وہ ارفع و اعلیٰ مخلوق ہیں، وہ زیادہ مکرم اور مثالی لوگ ہیں۔ یہ اللہ کے مقابلے میں اس طرح کبر نہیں کرتے جس طرح زمین کی یہ کمزور مخلوق انسان کرتا ہے، نہ وہ اس طرے میں جلا ہوتے ہیں کہ ہم اللہ کے مقربین ہیں اور نہ وہ رات اور دن کے کسی بھی وقت اللہ کی تسبیح کرنے سے رککتے یا ٹھکتے ہیں۔

وَ هُمْ لَا یَسْتَمُوعُونَ (۳۸: ۶۱) ”کبھی نہیں ٹھکتے۔“۔ لہذا اگر لعل زمین سب کے سب ہی اللہ کی بندگی چھوڑ دے تو اللہ کی پرستش میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ذرا اس زمین کو تو دیکھیں جس میں وہ رہتے ہیں، جس سے وہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور جس کی طرف ہونا کر دفنائے جائیں گے۔ یہ زمین جس کے اوپر یہ حیوانیوں جیسے پھرتے ہیں ان کے کھانے پینے کا کوئی سامان بھی اس زمین کے سوا کہیں نہیں ہے۔ یہ زمین بھی نہایت خشوع میں اللہ کے سامنے سہمی ہوتی ہے۔ مردہ ہو جاتی ہے تو اللہ ہی اسے زندہ اور سرسبز و شاداب کر دیتا ہے۔

وَ مِنْ آیٰتِہٖ اَنَّکَ تَرٰی الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَا اَنْزَلْنَا عَلَیْہَا

الْمَاءِ اهْتَزَتْ وَرَبَّتْ ۚ إِنَّ

شَيْءٌ قَدِيرٌ ﴿۳۹﴾

”اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سونی پڑی ہوئی ہے، پھر جو نمی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا، یکایک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھتا ہے وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

ہر مقام پر قرآن کا انداز تعبیر قابل ملاحظہ ہے۔ زمین کا ”خشوع“ کی حالت میں ہونا سے مراد یہ ہے کہ بارش سے پہلے وہ سونی ہوئی اور مردہ حالت میں تھی۔ جب بارش برسی تو وہ پھبک اٹھی، سرسبز و شاداب ہو گئی، گویا اس نے شکر ادا کیا اور سجدے میں گر گئی کہ اسے زندگی مل گئی۔ جس سیاق میں یہ مثال آرہی ہے وہاں عبادت خشوع و خضوع اور حمد و ثنا اور تسبیح کا مضمون چل رہا ہے۔ چنانچہ زمین کی بھی یہی کیفیت دکھائی گئی، گویا وہ بھی زندہ ہے اور اللہ کے حوالے سے وہ بھی شعور رکھتی ہے۔ مناسب ہے کہ میں اپنی ہی کتاب تصویر الفنی فی القرآن سے ایک صفحہ یہاں نقل کر دوں :

”قرآن نے بارش ہونے سے قبل زمین کی حالت کو بعض جگہ خاشعہ (سونی ہوئی، مردہ، دُرّ سہی ہوئی) اور بعض جگہ حامدہ (سوکھی، بھیجی ہوئی، مردہ) کہا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض طرز تعبیر کا تنوع ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دونوں لفظ کس سیاق میں کس طرح استعمال ہوئے ہیں، یہ الفاظ قرآن نے دو مختلف سیاق و سباق میں استعمال کیے ہیں :

لفظ حامدہ سورۃ حج میں آیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّن تُّرَابٍ ثُمَّ مِّن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِّنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِّنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقْرِضَ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشَدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّن يَتَّقِي وَمِنْكُمْ مَّن يَرُدُّ إِلَىٰ أَرْدَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَتَرَى الْآرِضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ

اهْتَزَتْ وَرَبَّتْ وَانْبَتَتْ مِّن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ (۲۲ ۵) ”لوگو! اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، ہو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں تاکہ تم اپنی جہولی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کو پھیر دیا جاتا۔“ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جاننے اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر

قسم کی خوش منظر نباتات اگلی شروع کر دی۔

اور لفظ خاشعہ اس سیاق و سباق میں آیا ہے :

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ آيَاةً تَعْبُدُونَ (۳۷: ۴۱) فَإِنِ اسْتَكْبَرُوا فَالَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ (۳۸: ۴۱) وَمِنْ آيَاتِهِ أَنَّكَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتِ إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۳۹: ۴۱) ”اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے“ اگر فی الواقعہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو، لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آکر اپنی ہی بات پر اڑے رہیں تو پر د انہیں جو فرشتے ترے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ دیکھتے ہو زمین سونی پڑی ہوئی ہے! پھر جوں جوں کہ ہم نے اس پر پانی برسایا، یکایک وہ پھک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔“

ان دونوں سیاق و سباق پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے حامدہ اور خاشعہ کا ربط ظاہر ہو جاتا ہے۔ پہلے سیاق و سباق میں نضا اٹھانے، زندہ کرنے اور نکالنے کی ہے۔ تو اس کے ساتھ زمین کی حالت مردہ (حامدہ) زیادہ مناسب ہے۔ مردنی کے بعد وہ حرکت میں آتی ہے، پھولتی ہے اور ہر قسم کے خوش منظر نباتات کے جوڑے پیدا کرتی ہے (میں کہوں گا کہ لفظ زوج بھی یہاں نہایت معنی خیز ہے) دوسرے سیاق و سباق میں مضمون عبادت، خضوع و خشوع کا ہے، لہذا اس کے ساتھ زمین کی تصویر خاشعہ اور سہمی ہوئی زیادہ مناسب ہے۔ اور جب بارش ہوتی ہے تو وہ پھول اٹھتی ہے۔

یہاں اس دوسرے سیاق میں زمین کے پھیک اٹھنے اور پھول جانے کے بعد نباتات کے اگنے کا ذکر نہیں جبکہ پہلے سیاق میں ذکر ہے، کیونکہ یہاں عبادت کا موضوع ہے اور عبادت کے ساتھ نباتات کے اگنے کی کوئی مناسبت نہیں ہے کیونکہ اهتزت و ربّت (۳۹: ۴۱) کے لفظ کے بھی دونوں جگہ دو الگ مقاصد ہیں، یہاں دوسرے سیاق میں مطلب یہ ہے کہ زمین حرکت میں آئی جس طرح اس منظر میں تمام متحرک چیزیں عبادت کے لیے حرکت میں آتی ہیں۔ لہذا زمین کو بھی خشوع اور مردنی کی حالت میں نہ چھوڑا جائے۔ اس لیے یہاں وہ حرکت میں آئی کہ وہ دوسرے عبادت گزاروں کے ساتھ عبادت میں شریک ہو، اور منظر کے تمام اجزاء اس میں شریک ہو جائیں۔ یوں انداز بیان کی نہایت ہی باریک جزئیات کے غاسق کو بھی پیش نظر رکھتا ہے جبکہ پہلے سیاق میں اهتزت و ربّت (۳۹: ۴۱) پیدا انشی عمل کی حرکت کے لیے ہے۔“

اب ہم پھر سیاق کلام کی طرف آتے ہیں، اسی زمین کے احیاء کے استدلال سے یہ نتیجہ کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت

کے دن مردوں کو نکال لائے گا۔

اِنَّ الَّذِیْ اَحْیَاہَا لَمُحْیِ الْمَوْتِی اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۳۹: ۴۱) ”یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھاتا ہے وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“ اس قسم کے مناظر سے قرآن میں بار بار یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ اسی طرح مردوں کو اٹھائے گا اور اس سے اللہ کی بے پناہ قدرت پر بھی استدلال قرآن کریم میں بار بار کیا جاتا ہے۔ زمین کے اندر بناتی اور دوسری زندگیوں کے مناظر کو انسان بڑے قریب سے مشاہدہ کرتا ہے۔ عقل سے بھی پہلے یہ بوقلمونیاں دل کو متاثر کرتی ہیں۔ جب موت سے زندگی نمودار ہوتی ہے تو انسان اس قدرت کے کرشمے کو بڑی حیرت سے دیکھتا ہے اور انسان کے شعور میں اس کے اثرات بیٹھتے ہیں اور قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ عقل کی بجائے فطری شعور سے مخاطب ہوتا ہے۔

--- ۰۰۰ ---

اب اس قدر تفصیلات کے بعد اور کائناتی شواہد و دلائل کے بعد اگر لوگ ان نشانیوں کو الٹے معنی پہناتا ہے یا قرآن کی آیات میں الحاد کرتے ہیں تو وہ تیار ہو جائیں اپنے انجام کے لیے۔ یہ لوگ اللہ کی واضح آیات کا انکار کرتے ہیں اور ان میں مغالطہ ڈالتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَاۙ اَفَمَنْ یُّکَلِّفِ فِی النَّارِ خَيْرًاۙ اَمْرًاۙ مِّنْ یَّا۲تِیْۤاۙ اِمِنَّاۙ یَوْمَ الْقِیَمَةِۙ اَعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْۚ اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌۭ ﴿۴۱﴾

”جو لوگ ہماری آیات کو الٹے معنی پہناتے ہیں وہ ہم سے کچھ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھوٹا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہو گا؟ کرتے رہو جو کچھ تم چاہو“ تمہاری ساری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے۔“

یہ تہدید اگرچہ بالواسطہ اور مجمل ہے لیکن نہایت ہی خطرناک ہے۔

لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا (۴۱: ۴۰) ”وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔“ اللہ کے علم میں وہ بالکل سامنے ہیں۔ لہذا وہ جو اعاذ کرتے ہیں قرآن کے معنوں کو الٹے معنی پہناتے ہیں۔ اس پر ان کو سزا ہوگی۔ اگرچہ وہ مغالطے اور تاویلات کریں۔ اگرچہ وہ سمجھیں کہ ہم اللہ کے ہاتھوں چھوٹ جائیں گے۔ جس طرح وہ قرآن کے معانی میں مغالطہ ڈال کر اپنے آپ کو ذمہ داریوں سے آزاد کرتے ہیں۔ یا لوگوں کے سامنے بہانہ بنا لیتے ہیں۔

اس لجمالی ڈرلوے کے بعد قدرے تشریح

اَفَمَنْ يُلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَنْ يَّاتِيْ اٰمِنًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۴۱ : ۴۰) ”خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھوٹکا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کی حالت میں حاضر ہو گا۔“ یہ دھمکی کی تصریح ہے کہ آگ میں پھینکا جانا اور جزع فزع تمہارے انتظار میں ہے جبکہ مومن نہایت امن و اطمینان کے ساتھ آئیں گے۔

اس آیت میں ایک دوسری دھمکی بھی ہے۔

اعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۴۱ : ۴۰) ”فکرتے رہو جو تم چاہو‘ تمہاری ساری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے۔“ کس قدر بد بخت ہے وہ شخص جسے ہر کچھ کرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ وہ جس طرح چاہے اللہ کی آیت میں مقابلے ڈالے اور اللہ اس کے تمام کرتوتوں کو نوٹ کر رہا ہو۔

--- ۰۰۰ ---

اب سیاق کلام انہی لوگوں کے بارے میں آگے بڑھتا ہے جو قرآن مجید کا انکار کرتے ہیں، جبکہ وہ ایک طاقتور اور غالب ہونے والی کتاب ہے، نہایت ہی محفوظ ہے۔ اس کے قریب بھی باطل نہیں پھٹ سکتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۭ

لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ ۚ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۚ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ

حَمِيْدٍ ۭ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۚ اِنْ رَّبُّكَ

لَنُؤَمِّرَكَ مَغْفِرَةً وَّ ذُرِّيَّةً اٰلِيْنَ ۭ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَبِيَّا لَقَالُوْا لَوْلَا

فُضِّلَتْ اٰتِيَّتُهُ ۚ اَعْجَبِيٍّ وَّ عَرَبِيٍّ ۭ قُلْ هُوَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدٰى وَّ شَفَآءٌ

وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْ اٰدَانِهِمْ وُقُوْرٌ ۭ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمٰى ۭ اُولٰٓئِكَ

ع ۱۲ يِّنَادُوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ۭ

۱۹

”وہ لوگ جن کے سامنے کلام نصیحت آیا تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے‘ یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے۔ اے نبی“ تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے‘ اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو۔ بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے‘ اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔ اگر ہم اس کو عجی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے: ”کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟ کیا ایسی عجیب بات ہے کہ کلام عجی ہے اور مخاطب عربی۔“ ان سے کہو‘ یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے توہدایت اور شفا ہے‘ مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان

کے لیے یہ کانوں کی ذات اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو۔“
آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ذکر ربی کا انکار کرتے ہیں جبکہ وہ ان کے پاس آگیا ہے۔ لیکن یہ لوگ کون ہیں اور ان کا انجام کیا ہو گا؟ اس کا ذکر نہیں ہے۔ مبتداء ہے اور خبر نہیں ہے۔ گویا ان کا فعل اس قدر گھناؤنا ہے کہ اس پر منطبق کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ست ہی بری حرکت یہ کر رہے ہیں۔۔۔ ان لوگوں کے بارے میں کوئی خبر دینے کی بجائے یہ تفصیلات دے دی جاتی ہیں کہ وہ ذکر و فصیحت کیسی ہے جس کا وہ انکار کر رہے ہیں تاکہ ان کے اس فعل کی کراہت اور زیادہ سمجھی جائے۔

إِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ (۴۱: ۴۱) لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ

حَكِيمٍ حَمِيدٌ (۴۱: ۴۲) ”مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے“ یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے۔“ باطل اس کتاب میں کس طرح داخل ہو سکتا ہے۔ یہ تو اللہ برحق کی طرف سے نازل شدہ ہے جو حق بیان کرتا ہے اور یہ کتاب اس سچائی سے مربوط ہے جس کے اوپر آسمان و زمین مبنی ہیں۔ یہ کتاب کتاب عزیر ہے اور یہ محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے لی ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۹: ۱۵) ”بے شک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

جو شخص بھی قرآن پر سیدہ برکتا ہے وہ اس سچائی کو پالیتا ہے جس کو لے کر یہ نازل ہوئی ہے۔ اور جو نازل ہی اس لیے ہوئی ہے کہ اسے پڑھا جائے اور جو شخص بھی اسے پڑھے گا وہ یہ سچائی ایک طرف اپنی روح میں پائے گا اور دوسری طرف اس کے نصوص میں پائے گا۔ بڑی سادگی اور آسانی کے ساتھ قرآن سے ہر شخص سچائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سچائی نہایت فطری اطمینان بخش اور انسانی فطرت کے اندر موجود ہے۔ ہر قاری پر اس کتاب کا نہایت ہی گہرا اور عجیب اثر ہوتا ہے۔

اور پھر یہ کتاب۔

تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ (۴۱: ۴۲) ”یہ حکیم و حمید کی نازل کردہ ہے۔“ اس کی تعمیر ہی میں حکمت پنہاں ہے۔ اس کے طریق نزول اور اس کی ہدایات سے حکمت عین ہے۔ لہذا جس رب تعالیٰ نے اسے نازل کیا ہے وہ حمد کثیر کا مستحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار حمد و ثناء کے لیے ابھارا گیا ہے۔

اب قرآن کو کتب سابقہ کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ اور تمام انبیائے سابقہ کے درمیان ایسا تعلق قائم کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ہی محفل ہے، ایک ہی خاندان ہے، ان کی بات بھی ایک ہے، ان کی روح اور قلب بھی ایک ہیں۔ طریقہ دعوت بھی ایک ہے۔ یوں ہر ایک مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے درخت کا پتہ ہے جس کے اندر بے شمار پتے ہیں اور جس کی جڑیں گہری ہیں اور یہ کہ وہ ایک ایسی محفل کا ممبر ہے جو آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے :

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ

الیم (۴۱: ۴۳) ”اے نبی“ تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو۔ بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔ ایک ہی وحی، ایک ہی رسالت، ایک ہی عقیدہ اور پوری تاریخ میں انسانوں کا اس کے مقابلے میں ایک ہی رد عمل رہا ہے۔ سب لوگوں نے کھڑی سبکی، سب نے ایک جیسا اعتراض کیا۔ لہذا تمام انبیاء کے درمیان ایک ہی پختہ رشتہ ہے، ایک ہی شجرۂ نسب ہے، ایک ہی خاندان ہے، دکھ اور درد بھی ایک ہے۔ تجربات بھی ایک ہی طرح کے ہیں اور مقاصد بھی ایک ہی جیسے اور راستہ بھی ایک اور طریقہ کار بھی ایک۔

انس و محبت کا کیا گہرا شعور ہے یہ! قوت، صبر اور گہری پختگی کا شعور۔ داعی کو یہ اشارہ دیا جا رہا ہے کہ آپ ایک ایسے راستے پر رواں ہیں جس پر آپ سے قبل نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رواں دواں رہے ہیں۔ کس قدر اعزاز اور بلندی کا شعور دیا جا رہا ہے کہ اس راہ کے مصائب، اس کی ٹھوکریں، اس کے کانٹے اور مشکلات کو برداشت کرو کہ یہ راہ تو بہت بڑے لوگوں کی ہے۔ یہ تو انبیاء و صالحین کی راہ ہے اور اس شعور کے ساتھ داعی کی قوت برداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور یہ حقیقت ہے۔

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ (۴۱: ۴۳) ”تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو“۔ کہنے کو تو یہ ایک معمولی بات ہے لیکن اس حقیقت کو مومنین کے دل و دماغ میں بٹھانے کے کس قدر عظیم اثرات ہیں۔ اس سے اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کام قرآن ہی کر سکتا ہے۔ وہ اس عظیم حقیقت کے بیچ دلوں میں کاشت کرتا ہے اور رسولوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے یہ بھی کہا گیا:

إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ (۴۱: ۴۳) ”بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی“۔ مغفرت کے ساتھ سزا بھی ہے تاکہ توازن قائم ہو جائے۔ انسان اگر کسی مغفرت کا امیدوار بھی ہو گا اور اس کے عقاب الیم سے ڈرنے والا بھی۔ نہ مایوس ہو اور نہ بے باک ہو حقیقت یہ ہے کہ توازن اسلامی تعلیمات کا بنیادی اصول ہے۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ اللہ کی یہ مہربانی ہے کہ اس نے عربی مبین میں تمہاری زبان میں قرآن اتارا لیکن تمہاری ہٹ دھرمی، تمہارے مغیضے، تمہارے مجاہدے اور پھر اس کتاب میں تحریفات قابلِ تعجب ہیں۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَقَالُوا لَوْ لَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ أَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ

عربی (۴۱: ۴۴) ”اگر ہم اس کو عربی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے، کیوں نہ اس کی آیات کھل کر بیان کی

گئیں۔ کیا ہی عجیب بات ہے کہ کلامِ عجمی ہے اور مخاطب عربی۔ یہ لوگ ایک عربی قرآن کی طرف کان نہیں لگاتے کیونکہ یہ اس کی بے پناہ تاثیر سے ڈرتے ہیں۔ یہ عربی کلام ہے اور عربوں کی فطرت سے مخاطب ہوتا ہے، ان کی اپنی زبان میں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں خلل ڈالو۔ جب پڑھا جائے تو شور کرو، اسی طرح تم غائب ہو گے۔ تو اگر یہ عجمی ہوتا تو پھر بھی یہ اس پر اعتراض کرتے کہ کیوں نہ قرآن عربی میں نازل ہوا کیوں نہ مفصل اور فصیح زبان میں آیا اور اگر اس کا بعض حصہ عربی ہوتا اور بعض عجمی ہوتا تو پھر کہتے کہ عربی و عجمی، فرض ان کا مقصد ہر صورت میں اعتراض کرنا ہے۔

اور اس بحث و جدال سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جھگڑا صرف الفاظ اور زبان کے بارے میں ہے۔ اور قرآن کی تعلیمات کے بارے میں نہیں ہے۔ تعلیمات کے لحاظ سے یہ مومنین کے لیے ہدایت اور شفا ہے۔ مومنین کے دل ہی اس کی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ اس سے رہنمائی اور شفا پاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان ہی نہیں لاتے ان کے دل اندھے ہیں، ان تک قرآن کی روشنی ہی نہیں پہنچتی۔ ان کے کانوں میں ڈٹ لگی ہوئی ہے۔ وہ دلوں کے اندھے ہیں، لہذا ان کو اس کتاب میں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔ کیوں؟ یہ لوگ اس کتاب کے مزاج ہی سے بہت دور ہیں، اس کی آواز ہی کو نہیں سمجھتے۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَ شِفَاءً ۚ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ

عَلَيْهِمْ عَمًى ۚ أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ (۴۱: ۴۴) ”ان سے کہو“ یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے لیے یہ کانوں کی ڈٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو۔ اس آیت کا اطلاق جن لوگوں پر ہوتا ہے وہ ہر زمان و مکان اور ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ یہ قرآن ان کے نفوس میں اثر کرتا ہے اور ان کو کیا سے کیا بتا دیتا ہے۔ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ وہ اپنی ذات اور اپنے، حول میں عظیم لوگ بن جاتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے دل و دماغ پر یہ قرآن بہت بھاری لگتا ہے۔ اور اگر ان کو سنایا جائے تو یہ ان کو اور اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔ قرآن تو دعویٰ ہے، دلوں کا فرق ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

قرآن کے حوالے سے حضرت موسیٰ اور ان کی کتاب اور اس کے بارے میں ان کی قوم کے اختلافات کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے۔ یہاں بطور نمونہ حضرت موسیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے تمام رسولوں کا ذکر مجموعی طور پر ہوا۔ یہاں کتابِ موسیٰ کے اختلافات کو بھی مجمل چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس سے قبل کہہ دیا گیا ہے کہ ان کا فیصلہ یومِ عظیم یعنی قیامت کے دن ہو گا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ

سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لَكَاغِبٌ

”اس سے پہلے ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کے معاملے میں بھی یہی اختلاف ہوا تھا۔ اگر تیرے رب نے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر دی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے سخت اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔“

اور یہی فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں کیا گیا۔ قیامت میں اس کے بارے میں بھی فیصلہ ہو جائے گا، لوگ جس طرح چاہیں عمل کریں، قیامت میں جزاء و سزا ہوگی ان کے اعمال پر۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ

بِظُلَامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿۴۱﴾

”جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے اچھا کرے گا، جو بدی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہو گا“ اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے۔“

رسالت محمدیؐ نے اعلان کر دیا کہ انسانیت اب بالغ ہو چکی ہے اور اس کے کاندھوں پر آزادی کا بوجھ اٹال دیا گیا ہے۔ اور ہر شخص کو اپنے کیے کا ذاتی طور پر ذمہ دار قرار دے دیا گیا ہے۔ اب جو شخص جو راستہ چاہے اختیار کرے۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (۴۱: ۴۶) ”اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے۔“

--- ○ ○ ○ ---

آیات گزشتہ میں قیامت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اس میں اللہ کی جانب سے سب کے ساتھ انصاف کرنے کی طرف بھی اشارہ تھا کہ کوئی ظلم نہ ہو گا۔ اس لیے یہاں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ قیامت کی گھڑی کا علم صرف اللہ وحدہ کو ہے۔ اس ضمن میں اللہ کے علم کی تصویر کشی بھی کر دی جاتی ہے کہ وہ ہر معاملے میں کتنی گہرائیاں اور تفصیلات رکھتا ہے۔ بعض مثالیں بھی دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد قیامت کا ایک منظر بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں مشرکوں سے سوال و جواب ہوتے ہیں :

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد پنجم

پارہ ۲۵

سورہ حم السجدہ - ۴۱	۴۷ - تا - ۵۴
سورہ الشوریٰ - ۴۲	۱ - تا - ۵۳
سورہ الزخرف - ۴۳	۱ - تا - ۸۹
سورہ الدخان - ۴۴	۱ - تا - ۵۹
سورہ الجاثیہ - ۴۵	۱ - تا - ۳۷

إِلَيْهِ يَرْدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرَاتٍ مِنْ أَكْمَامِنَا وَمَا

تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَى وَلَا تَضُرُ إِلَّا بِعِلْمِهِ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي
قَالُوا أَذْنُكَ مَا مِثْلُ شَهِيدٍ ۖ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِنْ
قَبْلُ وَظَنُّوا مَا لَهُمْ مِنَ مَحِصٍ ۖ

”اس ساعت کا علم اللہ ہی کی طرف راجع ہوتا ہے‘ وہی ان سارے پھلوں کو جانتا ہے جو اپنے شگوفوں میں سے نکلتے ہیں‘ اسی کو معوم ہے کہ کون سی مادہ حاملہ ہوئی ہے اور کس نے بچہ جتا ہے۔ پھر جس روز وہ ان لوگوں کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟ یہ کہیں گے ”ہم عرض کر چکے ہیں“ آج ہم میں سے کوئی اس کی گواہی دینے والا نہیں ہے۔“ اس وقت وہ سارے معبودان سے گم ہو جائیں گے جنہیں یہ اس سے پہلے پکارتے تھے‘ اور یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔“

قیام قیامت ایک ایسا غیب ہے جو مجہول اور مستقبل کے خمیر میں گمراہ پوشیدہ ہے۔ اسی طرح شگوفوں میں سے جو پھل مستقبل میں برآمد ہوتے ہیں ان کو بھی صرف اللہ جانتا ہے۔ اسی طرح رحم میں صل بھی غیب ہے‘ جو چھپا ہوا ہے۔ یہ سب اللہ کے علم میں ہیں۔ انسانی سوچ ان پھلوں کے پیچھے دوڑ رہی ہے جو پھولوں اور کلیوں سے نکلتے ہیں‘ ان بچوں کے پیچھے جو ماؤں کے رحم میں ہیں‘ ہماری سوچ اس وسیع زمین کے قریب و فراز میں دوڑ رہی ہے اور لاتعداد پھولوں اور شگوفوں کے بارے میں سوچتی ہے۔ پھر ہر مادہ کے رحم میں موجود بچے جن کی تعداد متعین کرنا انسان کے دائرہ قدرت میں نہیں ہے‘ تمام انسانوں‘ حیوانوں کی مادیات‘ چرندوں پرندوں اور حشرات کی مادیات۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا راہوار خیال تھک کر گر پڑتا ہے۔ اللہ کے علم کے حدود کا تصور بھی ممکن نہیں کہ وہ لامحدود ہے۔

انسانوں میں سے گمراہوں کا ایک چھوٹا سا ریوڑ‘ ایک دن اس علم کا سامنا کرے گا اور اس علم کے دائرے سے تو کوئی چیز باہر نہ ہوگی۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي (۴۷: ۴۱) ”پھر جس روز وہ ان کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک؟“ اس وقت بھی کوئی جھوٹا‘ مجادلہ اور مغالطہ کام نہ دے گا‘ نہ زبان کی تحریف و تاویں چل سکے گی تو وہ پھر کیا کہہ سکیں گے اس کے سوا:

قَالُوا أَذْنُكَ مَا مِثْلُ شَهِيدٍ (۴۷: ۴۱) ”یہ کہیں گے ہم عرض کر چکے ہیں‘ آج ہم میں سے کوئی اس کی گواہی دینے والا نہیں ہے۔“ لے اللہ ہم نے تو تجھے اطلاع کر دی ہے کہ آج تو ہم میں سے کوئی بھی

اس بات کا گواہ نہیں ہے۔

وَضَلُّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُوا مَا لَهُمْ مِنْ

مُحِيطٍ (۴۸: ۴۱) ”اس وقت وہ سارے معبودان سے گم ہو جائیں گے جنہیں یہ اس سے پہلے پکارتے تھے اور یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔“

کیونکہ اب ان کو اپنے سابقہ دعویٰ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو گا کہ اس کی تصدیق کر سکیں۔ ان کے نفوس میں یہ بات گہرے طور پر بیٹھ گئی ہوگی کہ اب تو کوئی جائے فرار نہیں ہے۔ یہ ہوگی ان کی کرہناک اور مدہوش کر دینے والی حالت اس دن۔ جب ایسی حالت آتی ہے تو انسان اپنا تمام ماضی بھول جاتا ہے، پھر اسے وہی حالات یاد ہوتے ہیں جو درپیش ہوئے ہیں۔

--- ○ ○ ○ ---

یہ کس قدر خوفناک دن ہے لیکن انسان اس کے بارے میں بالکل غماض نہیں ہے۔ انسان ہر قسم کی بھلائی کے لیے بہت ہی حریص ہے۔ لیکن قیامت کی بھلائی کی وہ ذرا بھی فکر نہیں کرتا۔ انسان معمولی مصیبت پر جزع فزع کرنے لگتا ہے۔ لیکن قیامت کے ہولناک جزع فزع کا اسے خیال نہیں ہے۔ یہاں انسان کے نفس کی اندرونی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ تمام لباس اور پردے اتار دیئے جاتے ہیں اور ہر قسم کی طمع کاری کو ہٹا کر نقش انسانی کا اصل رنگ دکھایا جاتا ہے۔

لَا يَسْعَى الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيُوسِسْ

قَوِّطٌ ۖ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرَاءٍ مَسَّهُ لَيَقُولَنَّ هَذَا

لِي ۖ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَهُ

لِلْحُسْنَىٰ فَلَنُنِيبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنْ عَذَابٍ

غَلِيظٍ ۖ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَا بَجَانِبِهِ ۖ وَإِذَا مَسَّهُ

الشَّرُّ فَنَدُو دُعَاءِ عَرِيضٍ ۖ

”انسان کبھی بھلائی کی دعا مانگتے نہیں نکلتا اور جب کوئی آفت اس پر آ جاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے مگر جو نہی کہ سخت وقت گزر جانے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں یہ کہتا ہے کہ ”میں اسی کا مستحق ہوں اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کب آئے گی“ لیکن اگر واقعی میں اپنے رب کی طرف پلٹا گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا۔ حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم جہنم میں رکھیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں اور انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزہ

چکھائیں گے۔ انسان کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ منہ پھیرتا ہے اور اڑ جاتا ہے اور جب اسے کوئی آفت چھو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔“

فہم انسانی کی یہ نہایت ہی سچی تصویر ہے۔ نہایت ہی باریک خدو خال کو بھی اس میں نمایاں کیا گیا ہے۔ وہ لوگ جو اللہ کی ہدایات پر ایمان نہیں رکھتے، جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، وہ تو بالکل سیدھی راہ پر گامزن ہوتے ہیں، ان کا ایک ہی رنگ دھنگ ہوتا ہے۔ لیکن گمراہ لوگوں کی نفسیات کیا ہیں، یکدم بدلنے والے، ضعیف الارادہ، دکھاوے کے شیدائی، مال کے لالچی، ناشکرے، خوشحالی میں مغرور اور بد حالی میں آہ و فغاں کرنے والے، غرض یہ نہایت ہی تفصیلی تصویر ہے ان لوگوں کی اور عجیب تصویر ہے۔

انسان بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا۔ وہ بڑے اصرار اور گڑگڑا کر دعائے خیر کرتا ہے۔ اور دعا کرتے ہوئے نہیں تھکتا۔ لیکن شر اگر محض اس کو چھو کر بھی گزر جائے تو وہ تمام امیدیں کھو دیتا ہے، مکمل طور پر مایوس ہو جاتا ہے۔ یہ خیال کرتا ہے کہ اس شر سے تو اب نکلنے اور بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ یوں وہ سمجھ لیتا ہے کہ سب اسباب و وسائل ختم ہو گئے۔ اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے، منہموم و متفکر ہو جاتا ہے۔ اللہ کی رحمتوں اور مہربانیوں سے مایوس ہو جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس کا اپنے رب پر بھروسہ نہیں ہوتا اور رب سے اس کا تعلق کمزور ہوتا ہے۔

لیکن یہی انسان، جب اللہ اس پر اپنی رحمتیں اور مہربانیاں کرتا ہے، یہ مصیبت جاتی رہتی ہے، تو اللہ کی نعمتیں اسے ہلاک اور منکسر کر دیتی ہیں۔ یہ شکر نہیں بجا مانتا۔ اب خوشحالی اسے آسمانوں پر چڑھا دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے یہ تو میرا حق ہے۔ میں اپنی صلاحیت پر اس کا مستحق ہوا ہوں اور یہ حق دائمی ہے۔ یہ شخص آخرت کو بھول جاتا ہے اور اسے بعید از امکان سمجھتا ہے۔ کہتا ہے۔

وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً (۵۰: ۴۱) ”میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی۔“ اب یہ اپنے آپ میں مست ہے۔ اللہ پر احسان جتلاتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ کے ہاں بھی میرا یہی مقام ہو گا حالانکہ اس کا کوئی مقام نہ ہو گا۔ یہ تو آخرت کا منکر اور کافر ہے۔ اس کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ اگر اللہ کے ہاں چلا گیا تو وہاں بھی باعزت لوگوں میں شمار ہو گا۔

وَلَكِنْ رَجَعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي عِنْدَهُ لَلْحُسْنَىٰ (۵۰: ۴۱) ”لیکن اگر واقعی میں اپنے رب کی طرف پلٹا یا گیا تو وہاں بھی حرے کر دوں گا۔“ یہ بے جا غرور، اب نہایت ہی بر محل تنبیہ آتی ہے۔

فَلَنَنْبِئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ (۵۰: ۴۱) ”حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم پکار رہے ہیں کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں اور انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔“ یہ ہے انسان کہ جب اللہ اسے خوشحال بناتا ہے۔ تو یہ سرکشی اختیار کرتا ہے۔ منہ موڑتا ہے اور غرور کرتا ہے۔ لیکن اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو پھر گر جاتا ہے۔ اپنے آپ کو ذلیل و خوار سمجھتا ہے۔ حقیر و لاچار ہوتا ہے۔ اور گڑگڑانے اور بلبلانے لگتا ہے، لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے۔

ذرا دیکھئے تو سہی 'قرآن کریم نے انسانی نفسیات کے چھوٹے بڑے عمل اور رد عمل کو کس باریکی سے ریکارڈ کیا ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے جو خالق انسان ہے اور خود خالق بنا رہا ہے کہ یہ ہے حضرت انسان۔ کیونکہ خالق اپنی مخلوق کے کل پرزوں کو اچھی طرح جانتا ہے 'اللہ جانتا ہے کہ یہ ان نشیب و فراز میں پھرتا رہتا ہے 'انا یہ کہ اسے صراطِ مستقیم کی طرف پکڑ کر لے جایا جائے۔ تب وہ راہِ راست پر چلتا ہے۔

نفس انسانی کی اس نہایت ہی نفلی تصویر کے بعد اللہ ان سے پوچھتا ہے کہ تم اس وقت کیا کرو گے کہ جس کتاب کی تم تکذیب کرتے ہو۔ اگر یہ اللہ کی جانب ہی سے ہو اور تم اس عذاب کے مستحق ہو جو جس سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے اور اس وقت تم تکذیب اور دشمنی کے عواقب و نتائج کا اپنے آپ کو مستحق کر لو۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ثَمَرٌ كَفَرْتُمْ بِهِ مِنْ

أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿۵۱﴾

”اے نبی! ان سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر واقعی یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا اور تم اس کا انکار کرتے رہے تو اس شخص سے بڑھ کر بھٹکا ہوا اور کون ہو گا جو اس کی مخالفت میں دور تک نکل گیا ہو؟“

قرآن ان کے سامنے ایک احتمال پیش کرتا ہے کہ اس قدر احتیاط تو کرو 'لیکن انہوں نے کوئی احتیاط بھی نہ کی۔

--- ۰۰۰ ---

اس کے بعد اب قرآن کریم ان کو اپنے حاس پر چھوڑ دیتا ہے کہ سوچیں۔ اور پھر اس وسیع کائنات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ دیکھو اللہ نے اس میں کچھ نشانات اور قدیرات طے کر رکھی ہیں 'جن کا ظہور مستقبل میں ہو گا۔

سَرُّيْهِمُ الْيَتَامَى الْاَفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتٰى يَتَّبِعْنَ لَھُمْ اَنْۡہُ

الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّہٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ ﴿۵۲﴾ اَلَا اِنَّہُمْ فِیْ مِرَیۡۃٍ مِّنْ

لِقَآءِ رَبِّہُمْ اَلَا اِنَّہٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ﴿۵۳﴾

”عقرب ہم ان کو اپنی نشانیوں آفاق میں بھی دکھائیں گے 'اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شہید ہے؟ آگاہ رہو! یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں۔ سن رکھو! وہ ہر چیز پر محیط ہے۔“

یہ آخری ضرب ہے اور آخری جبرہ ہے اللہ اپنے بندوں کے ساتھ وعدہ فرماتا ہے کہ عقرب ہمیں اس کائنات کے کچھ رازوں سے آگاہ کیا جائے گا 'اسی طرح خود تمہارے نفس اور ذات کے اندر جو راز ہیں ان کے بارے میں تم پر انکشافات ہوں گے یعنی نفس و آفاق کے نشانات تمہیں دکھائے جائیں گے۔ اور یہ راز ہائے ہفتہ جب کھلیں گے

تو معلوم ہو گا کہ یہ کتاب کتاب برحق ہے۔ یہ کتاب اور یہ مہراج اور نظام زندگی، اور یہ قول جو تمہیں بتایا جا رہا ہے، یہ سب سچے ہیں۔

فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا تھا۔ گزشتہ چودہ سو سال سے اللہ نے انفس و آفاق کے کئی نشانات انسانوں پر ظاہر فرمائے ہیں۔ اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ انسان کی ذات کے بارے میں بھی عجیب و غریب انکشافات ہوئے ہیں۔ اور کائنات کے بارے میں بھی۔

پھر انسان بھی لگا ہوا ہے، اس نے نزول قرآن کے وقت سے آج تک بہت سارے انکشافات کیے ہیں۔ اس کائنات کی وسعتیں بھی دور تک انسان نے دیکھ لیں اور اس کے لیے کھل گئیں اور نفس انسانی کے وسائل بھی اس پر واضح ہو گئے اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔

انسان نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے، اور دیکھ لیا ہے، اگر انسان یہ بات معلوم کرے کہ کس طرح اس نے ان چیزوں کا ادراک کیا اور اللہ کا شکر ادا کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہو گا۔

مثلاً انسان نے معلوم کر لیا کہ وہ جس زمین کو کائنات کا مرکز سمجھتا تھا۔ یہ تو ایک حقیر سا ذرہ ہے جو سورج کے تابع ہے۔ اور انہوں نے معلوم کر لیا کہ یہ سورج اس کائنات کا ایک چھوٹا سا کرہ ہے۔ اور اس جیسے کئی سو ملین سورج ہیں۔ انہوں نے شمس و قمر اور ارض و سما کی حقیقت معلوم کر لی اور انہوں نے اپنے وجود کی اور نفس کی حقیقت بھی معلوم کر لی ہے۔

پھر انسان نے اس کائنات کے مادے میں سے بھی اکثر چیزوں کو معلوم کر لیا ہے کہ اس مادے کے اندر کیا عناصر ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہو کہ کوئی مادہ ہے۔ پھر انسان نے یہ دیکھ لیا کہ اس کائنات کا اصل مادہ ذرہ ہے۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ یہ ذرہ شعاع کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ دیکھ لیا کہ دراصل تو یہ پوری کائنات روشنی ہے۔ مختلف انداز کی روشنی جس سے مختلف شکل و صورت کی چیزیں بنتی ہیں۔

افسانوں نے اس چھوٹے سے کرے اور زمین کے بارے میں تو بہت کچھ جان لیا ہے کہ یہ گیند ہے اور گیند کی طرح ہے۔ یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ یہ اپنے گرد بھی گھومتا ہے اور سورج کے گرد بھی گھومتا ہے۔ انہوں نے اس کے براعظموں، اس کے سمندروں اور اس کے دریاؤں کو معلوم کر لیا۔ اس کے اندرون تک گھس گئے اور اس کے پیٹ میں جو کچھ چھپا تھا اس کو بھی انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ کیا کیا قوتیں اس کے اندر ودیعت کر دی ہیں۔ پھر ان قوتوں میں سے نفا میں کون کون سی ہیں۔

انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ ان کی اس زمین کو اس پوری کائنات کے ساتھ جس قانون قدرت نے مربوط کر دیا ہے وہ ایک ہی قانون ہے۔ اس کائنات میں تصرفات ہوتے ہیں، ان میں سے بیشتر کو انسان نے دریافت کر لیا ہے۔ اب انسانوں میں سے کچھ لال علم ایسے ہیں کہ انہوں نے ان قوانین سے معصوم کر لیا ہے کہ کوئی مقفن اور خالق ہے اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے لیے ان کا یہ علم ہی وبال بن گیا۔ یہ ان ظاہری انکشافات کے اندر ہی گم ہو گئے۔ آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن آیات الہیہ کے اس عظیم انکشاف کے بعد انسانیت نے اب اللہ کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا ہے اور تسیم کرنا شروع کر دیا ہے کہ یہ حق ہے۔

انسان کی ذات اور اس کے نفس کے اندر علم کی فتوحات اس کائنات سے کم نہیں ہیں انسانوں نے انسانی جسم، اس کی

ترکیب ' اس کے خصائص اور اس کے اسرار و رموز کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔ اس کی بناوٹ ' اس کے اعضاء ' ان کے فرائض ' اس کے امراض ' اس کی غذا کے بارے میں وافر علوم جمع کر لیے ہیں ' انسانی اعمال اور حرکات کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔ یہ تمام انکشافات دراصل آیات الہیہ کے بارے میں ہیں۔ ان چیزوں کا خالق اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔

انسانی نفسیات کے بارے میں بھی انسان نے بہت کچھ جان لیا ہے۔ یہ اگرچہ اس حد تک نہیں ہے جو نشانات جسم کے بارے میں انسان نے دریافت کر لیے ہیں۔ کیونکہ انسان کی جدوجہد زیادہ تر انسانی جسم اور اس کی آلاتی حیثیت پر مرکوز ہے۔ انسان کی عقل ' اس کی روح کی طرف ابھی زیادہ توجہ نہیں ہوئی۔ لیکن نفس انسانی کے میدان میں بعض چیزوں کا انکشاف ہوا ' وہ جانتا ہے کہ اس میدان میں بھی مستقبل میں بڑی فتوحات ہوں گی اور انسان مزید نشانات دیکھیں گے۔ ابھی تو انسان راستے ہی میں ہے۔

اللہ کا وعدہ قائم ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۵۳: ۴۱)

”عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔“ اور اس وعدے کا آخری حصہ کہ قرآن کتاب برحق ہے ' بیسویں صدی میں اس کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ ایمان کے قائلے مختلف راستوں سے جمع ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ خالص مادی علوم کے راستے سے بھی لوگ اسلام کی حقانیت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہر طرف سے اسلامی افواج کا اجتماع ہو رہا ہے۔ اگرچہ ماضی میں اس کرۂ ارضی پر مادیت و الحاد کی جو لہریں اٹھیں وہ بڑی سرکش تھیں۔ لیکن اب یہ طوفان ختم ہو رہا ہے۔ اگرچہ باد مخالف بڑی تند تھی۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ صدی جس سے ہم گزر رہے ہیں ' ابھی ختم نہ ہو گی کہ مادیت و الحاد کے یہ طوفان ختم ہوں گے اور اللہ کا کلمہ حق ہو کر رہے گا۔ (سید قطب ! آپ کی روح کو اللہ اطلاع کرے کہ اشتراکی روس ختم ہو گیا ہے ' جس کے ایک کتے نے آپ کو شہادت کے منصب پر فائز کیا۔ اور یہ تو تھی مادیت اور امریکی الحاد کے خلاف بھی خدائی فوجیں لڑ رہی ہیں ' امید ہے کہ بہت جلد وہ بھی ختم ہو گا۔ مترجم)

أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۵۳: ۴۱) ”کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔“ اللہ نے یہ وعدہ علم و یقین کے ساتھ کیا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے اور شاید عادل ہے ' اس لیے یہ سچا ہے۔

أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ (۵۴: ۴۱) ”آگاہ رہو یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں۔“ یہی وجہ ہے کہ یہ غلطیاں کرتے ہیں کیونکہ ان کو اللہ کی ملاقات پر پورا یقین نہیں ہے۔ یہ نہایت ہی تاکید امر ہے۔

أَلَا أَنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ (۵۴: ۴۱) ”سن رکھو وہ ہر چیز پر محیط ہے۔“ لہذا تم اس کی ملاقات سے کیسے بچ سکتے ہو۔ تم مکمل طور پر اس کے گھیرے میں ہو۔

۱۷ ستمبر ۱۹۹۴ء کراچی ڈینس کالونی

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۵

سورۃ الشوریٰ - ۲۲

آیات ۱ --- تا --- ۵۳

سورۃ الشوریٰ ایک نظر میں

یہ سورت بھی تمام دوسری سورتوں کی طرح نظریاتی مسئلے پر بحث کر رہی ہے لیکن اس کے زیادہ تر مضامین وحی و رسالت کے مضمون کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس سورت کا مرکزی مضمون نور و حق و راست ہے تو درست ہو گا۔ اس سورت کا تانا بانا اسی موضوع سے ہے اور دوسرے موضوعات اسی مرکزی مضمون کے تابع ہیں۔

اللہ کی وحدانیت کے مضمون کو یہ سورت مختلف پہلوؤں سے لیتی ہے اور اس موضوع پر بات کو بہت پھیلا دیا گیا ہے۔ قیامت اور قیامت پر ایمان کا موضوع بھی ہے اور قیامت کے بعض مناظر بھی اس کے اندر بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس سورت میں مومنین کی امتیازی صفات اور خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں اور یہ بھی ہے کہ کسی کو دافتر مقدر میں رزق دینا اور کسی کے رزق میں تنگی کرنا اللہ کا کام ہے اور یہ کہ انسان کو خوشحالی اور مشکلات میں کس طرح کا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔

اگرچہ مذکور متوجع مضامین بھی اس سورت میں ہیں لیکن وحی و رسالت اور ان سے متعلقہ مضامین اس سورت میں ممتاز ہیں اور سورت کا بڑا حصہ انہی پر مشتمل ہے اور دوسرے مضامین پر بھی انہی کا سایہ ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ دوسرے مضامین بھی وحی و رسالت کے ثبوت کے لیے لائے گئے ہیں۔

یہ مضامین اور ان کے ذیلی مضامین اس سورت میں اس طرح لائے گئے ہیں جو قابل غور اور قابل تدبر ہیں اور اس انداز پر ”بر“ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کئی پہلوؤں سے موضوعات کو دہرایا گیا ہے، اگرچہ بعض آیات ایسی ہیں جن میں خالق کی وحدانیت، رازق کی وحدانیت، دلوں میں تصرف کی وحدانیت، اور اچھے یا برے انجام عطا کرنے میں وحدانیت کے مضامین ہیں لیکن یہ اس وقت ہے جب وحی و رسالت جیسے واسطے کی وحدانیت کی بات آتی ہے، جس میں وحدت وحی، وحدت عقیدہ، توحید، وحدت تربیت اور منہاج حیات اور سب سے اڑیں یہ اس نظریہ حیات کی روشنی میں انسانوں کی قیادت کی وحدت کے مضامین۔

چنانچہ قاری کے ذہن میں تائید کے خطوط ابھرنا شروع ہوتے ہیں اور وہ واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مختلف پہلوؤں اور مختلف معانی کے لحاظ سے توحید کے اشارات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ سورت کے تمام مضامین سے اور مختلف قسم کے موضوعات سے۔ مناسب ہے کہ بعض اہم اشارات یہاں دے دیئے جائیں، تفصیلات بعد میں آئیں گی۔

سورت کا آغاز حاء، ییم، سین اور قاف کے حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ اور اس کے متصلا یہ آیت ہے :

كَذَٰلِكَ يُوحِي إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲: ۳) ”اسی

طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی“ ”تو بتا رہا ہے“۔ گویا وحی کا سرچشمہ اولین اور آخرین کے لیے ایک ہی رہا ہے۔

إِلَيْكَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ (۳: ۴۲) ”تمہاری طرف اور تم۔ پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف۔“
اس کے بعد اللہ عزیز و حکیم کی صفات بیان کی گئی ہیں۔

لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (۴: ۴۲) ”آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ وہ برتر اور عظیم ہے۔“ اس میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ آسمانوں اور زمین کا مالک اللہ وحدہ ہے اور برتری اور عظمت کا مستحق وہی ہے اور صرف وہی ہے۔

صفت عزیز و حکیم کے بعد اب سیاق کلام اللہ وحدہ پر ایمان کے سلسلے میں اس کائنات کے رد عمل کو بھی پیش کرتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے جو لوگ شرک کرتے ہیں یہ پوری کائنات بھی ان کے اس فعل کو مسترد کرتی ہے۔

تَكَادُ السَّمُوتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا أَنْ اللَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۵: ۴۲) وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ اللَّهُ حَفِیْظٌ عَلَيْهِمْ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ (۶: ۴۲)
”قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں۔ فرشتے اپنی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے جاتے ہیں آگاہ رہو حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہی ہے۔ جن لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنارکھے ہیں اللہ ہی ان پر نگران ہے تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو۔“ گویا پوری کائنات ایمان اور شرک کے مسئلے میں لگی ہوئی ہے۔ شرک اس قدر بڑا گناہ و ناقص ہے کہ اس سے قریب ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑیں اور جو لوگ اس برے فعل کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے لیے فرشتے بھی استغفار کرتے ہیں کہ خدایا ان کو اس فعل بد سے موڑ دے۔

اس کے بعد روئے سخن پہلی حقیقت کی طرف آتا ہے۔

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرَى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ

الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيهِ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (۷: ۴۲) ”ہاں اسی طرح اے نبی“ یہ قرآن عربی ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے تاکہ تم بستیوں کے مرکز (شہر) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کرو اور جمع ہونے کے دن سے ڈرلو جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ کو جنت میں اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں جاتا ہے۔“

اس کے بعد فریق جنت اور فریق جہنم کی بات آگے بڑھتی کہا جاتا ہے کہ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو تمام انسانوں کو ایک ہی فریق بنا دیتا لیکن اللہ کی مشیت کا یوں تقاضا ہوا کہ اس نے جنت چاہا اپنی رحمت میں داخل کر دیا اور یہ فیصلہ اللہ نے اپنے علم اور معرفت کی بنا پر کیا۔

وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۴۲: ۸) ”اور ظالموں کا کوئی ولی و مددگار نہیں ہے۔“ اور ولی و مددگار تو اللہ ہی ہے۔

فَاِنَّ لِلّٰهِ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۲: ۹) ”ولی تو اللہ ہی ہے وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔“

اس کے بعد روئے سخن پھر پہلی حقیقت کی طرف پھر جاتا ہے یعنی وحی و رسالت کی طرف آتا ہے کہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہیں تو انہی کے لیے اللہ نے یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کو معیار بنا کر اپنے مسائل حل کریں۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ اِلَى اللّٰهِ ذٰلِكُمْ اللّٰهُ رَبِّىْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (۴۲: ۱۰) ”تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے وہی اللہ میرا رب ہے اس پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔“

وحدانیت خالق کے ثبوت کے لیے بات اب اللہ کی ربوبیت کے نظام میں داخل ہوتی ہے کہ وہ وحدہ خالق ہے رب ہے اور متصرف فی الامور ہے۔ آسمانوں اور زمینوں کا نظام اس نے مقرر کیا ہے رزق کی فراوانی اور تنگی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

فَاَطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَءُكُمْ فِيْهِ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۴۲: ۱۱) ”لہ مقالید السموات والارض یسطط الرزق لمن یشاء ویقدر انه بکل شیء علیم (۴۲: ۲۱)“ ”آسمانوں اور زمین کا بنانے والا جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے اور اس طرح جانوروں میں بھی جوڑے بنائے اور اس طریقہ سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ آسمان اور زمین کی کتبیاں اس کے پاس ہیں جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے اسے ہر چیز کا علم ہے۔“

اس کے بعد پھر پہلی حقیقت وحی الہی کی طرف :

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصٰى بِهِ نُوْحًا وَّالَّذِیْنَ اَوْحٰیْنَا اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهِ اِبْرٰهیمَ وَمُوسٰى وَعِیْسٰى اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ کَبُرَ عَلٰی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ اللّٰهُ یَجْتَبِیْ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ یَّیْنِبُ (۴۲: ۱۳)

وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَقَّتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَى أَحَلِّ مُسَمًّى لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكُتُبَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ (۱۴: ۴۲) فَلِذَلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ

اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ (۱۵: ۴۲) ”اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو۔ لہٰذا جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اس کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آچکا تھا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تیرا رب پہلے ہی نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقررہ تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا ہوتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے اے محمد تو اب اس دین کی طرف دعوت دے اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو اور ان سے کہو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے اس پر میں ایمان لایا۔“

غرض حقائق کے بیان کرنے میں یہ سورت اس نہج پر چلتی ہے اور یہ اس کے موضوعات ہیں۔ یہ فضا ہے اور یہ تمام امور وحی و رسالت کے ساتھ متعلق ہیں۔ جو اس سورت کا مرکزی موضوع ہے۔ اس سورت کے پسے سبق کے اندر ترتیب اور ربط مضامین بالکل واضح ہے۔ مضمون ہوں جو آگے بڑھتا ہے وحی و رسالت کے ساتھ اس کا تعلق واضح ہوتا جاتا ہے۔ مضمون کا کوئی نہ کوئی حصہ وحی و رسالت سے وابستہ نظر آتا ہے۔ دوسرا سبق بقیہ سورت پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز رزق کی فراوانی اور تنگی کے مضمون سے ہے۔ پھر باران رحمت زمین و آسمان کی تحقیق اور زمین کے اندر قسم قسم کے حیوانات کا پھیلنا پھاڑوں جیسے بحر جہاز۔ پھر صفات مومنین اور ان کی جماعت پھر وہ منظر جب ظالم قیامت کے دن عذاب دیکھیں گے۔

وَتَرَى الظَّالِمِينَ لَمَّا رَأَوْا الْعَذَابَ يَقُولُونَ هَلْ إِلَىٰ مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيلٍ (۱۴: ۴۲) وَنَرَهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا حَشِيعِينَ مِنَ الدَّلِّ يَنْظُرُونَ مِنْ طَرَفٍ حَقِيقٍ

(۱۵: ۴۲) ”تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں تو کہیں گے اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے اور تم دیکھو گے کہ یہ ہم کے سامنے جب مائے جاں گئے تو دلت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے اور اس کو نظر بچا کر کن اکھیں

تہ دیکھیں گے۔“

اس دن مومنین سر بلند ہوں گے اور وہ ظالموں کے حالات پر یہ تبصرہ کریں گے۔

وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ الْخٰسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَ هَلِيَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ

اَلَا اِنَّ الظَّالِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقْتَرِنٍ (۴۲: ۴۵) ”اس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے کہیں گے کہ واقعی اصل زیان کار وہی ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈالا۔ خیردار رہو ظالم لوگ مستقل عذاب میں رہیں گے۔“

اس لیے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اپنے آپ کو اس قسم کے انجام بد سے بچاؤ۔ قبل اس کے وقت باتھوں سے چلا جائے۔

اِسْتَجِبُوا لِلرَّبِّ كُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِيْ يَوْمَ لَا مَرَدُّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَا لَكُمْ مِنْ مُّلْحَا يَوْمَئِذٍ وَّ

مَا لَكُمْ مِنْ نَّكِيْرٍ (۴۲: ۴۷) ”مان لو اپنے رب کی بات قبل اس کے کہ وہ من آئے جس کے ٹٹنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا۔“

اب یہاں آکر مضمون پھر پہلی حقیقت کی طرف مڑ جاتا ہے یعنی حقیقت وحی و رسالت کی طرف رسالت کا ایک پہلو یہاں لیا جاتا ہے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَا اَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اِلَّا اَلْبَلٰغُ (۴۲: ۴۸) ”اب اگر یہ لوگ نہ موڑتے ہیں تو کون ہی ہم نے تم کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔ تم پر تو صرف بات پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔“

اس کے بعد اب سیاق کلام اسی مضمون کے گرد گھومتا ہے ’براہ راست یا بالواسطہ‘ دوران بیان وحی و رسالت کی طرف کسی نہ کسی شکل میں اشارہ آتا ہے۔ یہاں تک کہ سورت کے آخر میں وحی و رسالت کے بارے میں یہ بیان آتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوحِيْ بِاٰذَنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلٰى حَكِيْمٍ (۴۲: ۵۱) وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نُّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاَنْتَ لَنْهْدٰى لِيْ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲: ۵۲) صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ

لَا تُكَافِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ إِلَّا إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ (۵۳:۴۲) ”کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو برو بات کرے“ اس کی بات یا تو وحی کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغام بر بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ چاہتا ہے وحی کرتا ہے وہ برتر اور حکیم ہے اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دی جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمان کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار ہو سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

--- ۰۰۰ ---

اس پوری سورت میں اگرچہ مرکزی مضمون وحی و رسالت ہے لیکن اس مضمون کو اس انداز میں پیش کرنے کا ایک خاص مقصد ہے وہ یہ کہ مبشرین اور مبغیثین کی ایک جدید قیادت متعین کی جائے جو اس آخری پیغام اس آخری نبی اور اس آخری امت کے مشن کو آگے بڑھائے یہ امت جو اسلام کے نہایت ہی مستحکم منہاج پر چل رہی ہے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے پہلا اشارہ سورت کے آغاز ہی میں ہے۔

كَذَٰلِكَ يُوحِي إِلَيْكَ وَإِلَى الدِّينِ مَنْ قَبْلَكَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۵۳:۴۲) ”اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف وحی کرتا رہا ہے۔ تاکہ یہ بتا دیا جائے کہ تمام رسولوں کی طرف رسالت اللہ ہی وحی کرتا رہا ہے اور یہ آخری رسالت سابقہ رسالتوں کا تسلسل ہے اور اس کا مضمون پہلے سے طے شدہ ہے۔ اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یہی اشارہ آتا ہے۔

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا (۷:۴۲) ”اور اسی طرح ہم نے اے نبی“ یہ قرآن عربی تمہاری طرف وحی کیا ہے تاکہ تم بتیوں کے مرکز (مکہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو۔“ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قیادت کا مرکز مکہ ہے اور اس کی طرف بعد میں بھی اشارہ آئے گا۔ اور تیسرے اشارے میں ہے کہ رسالت بھی ایک ہے جس طرح پہلے اشارے میں ہے کہ رسالت اللہ کی طرف سے بھیجی گئی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی ایک ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِينَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (۱۳:۴۲) ”اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا۔ اور جسے تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس

دین کو اور متفرق نہ ہو جاؤ۔ اس بیان کو جاری رکھتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ تفرق فی الدین اس وصیت کی مخالفت میں واقع ہوا، ان رسولان کرام کے متبعین نے یہ تفرق جہل کی وجہ سے اختیار نہ کیا بلکہ ملنے ہوئے حسد، ظلم اور دست درازی کی خاطر انہوں نے تفرق کیا۔

وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۱۴:۴۲) ”اور ان لوگوں میں جو تفرق رہنا ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آچکا تھا۔ اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔“ اور یہی مضمون چلتا ہے کہ ان اختلاف کرنے والوں کے بعد جو لوگ آئے ان کا حال کیا تھا۔

وَأَنَّ الَّذِينَ أَوْرَثُوا الْكُتُبَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ (۱۴:۴۲) ”حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے، وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔“ یعنی سابقہ کتب کے بارے میں۔

یہاں اگر یہ بات متعین ہوگئی کہ تمام انسانیت ذہنی اختصار اور شک میں مبتلا ہے اور بے رہبر ہے، اور کسی مستحکم دین پر نہیں ہے۔ آسمانی ہدایات اور کتب سابقہ میں سخت اختلاف ہو گئے اور بعض میں آنے والے تو اپنی کتابوں کے بارے میں سخت غلبان میں مبتلا ہو گئے اور ان کی کوئی قیادت بھی نہ رہی۔ لہذا ان حالات میں یہ آخری رسالت بھیجی جا رہی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قائد ہیں اور ان کی ڈیوٹی یہ ہے۔

فَلِذَلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ (۱۵:۴۲) ”اس لیے اے محمد، اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو، جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے، اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو، اور ان سے کہہ دو، ”اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہی ہمارا رب بھی اور تمہارا رب بھی“ یہی وجہ ہے کہ درس و تہ میں جماعت مسلمہ کی صفات کو لایا گیا ہے کہ اس جماعت نے اس کام کو لے کر اٹھنا ہے، تاکہ وہ انسانیت کی قیادت ایک مستحکم منہاج پر کرے۔

جب ہم ان باتوں کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے، اس سورت کا سیاق اس کا مرکزی موضوع اور دوسرے متعلقہ موضوعات ایک خاص سمت کی طرف واضح ہدف لے کر جا رہے ہیں۔ آیات کی تشریح کے دوران ہم ان اشارت کی تفصیلات دیں گے۔

درس نمبر ۲۲۹ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۲۲



حَمْدٌ ۝ عَسَىٰ ۚ كَذٰلِكَ يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ الْعَزِيْزَ الْحَكِيْمَ ۝
 لَهُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ
 يَتَفَطَّرُوْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِنَّ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ
 فِى الْاَرْضِ ۗ اَلَا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهَا
 اَوْلِيَآءَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝

اللہ کے نام سے جو سبے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ح م ع س ق“۔ اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے (رسولوں) کی طرف
 وحی کرتا رہا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اسی کا ہے ’وہ برتر اور عظیم ہے۔ قریب ہے کہ آسمان اوپر سے
 پھٹ پڑیں۔ فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے
 جاتے ہیں۔ آگاہ رہو ’حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہی ہے۔ جن لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنا
 رکھے ہیں ’اللہ ہی ان پر نگران ہے ’تم ان کے حوالہ داور نہیں ہو۔“

حروف مقطعات کے بارے میں کئی سورتوں کے آغاز میں بات ہو چکی ہے جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ حروف بتاتے ہیں کہ سورت کا آغاز ہو رہا ہے۔ ان حروف کے بعد پہلا فقرہ یہ ہے۔

كَذَٰلِكَ يُوحِيٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الدِّیْنِ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۳: ۴۲) ”اسی طرح اللہ غالب و حکیم ہماری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف وحی کرتا رہا ہے۔“ یعنی جس طرح تمہاری طرف وحی ہو رہی ہے اسی طرح اور اسی انداز میں ہم نے پہلے رسولوں کی طرف بھی وحی بھیجی ہے۔ یہ وحی الفاظ، کلمات اور حروف جمعی پر مشتمل رہی ہے۔ وحی کا کلام الہی حروف سے بنایا گیا ہے۔ ان حروف سے لوگ ابھی طرح واقف ہیں۔ ان کلمات کے معنی وہ سمجھتے ہیں لیکن اس وحی کی طرح وہ کلام پیش نہیں کر سکتے۔ حالانکہ جس مواد سے یہ کلام بنا ہے، وہ ان کے سامنے ہے اور دسترس میں ہے۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ وحی ایک ہے، وحی کا مصدر و ماخذ ایک اللہ ہے جو عزیز و حکیم ہے۔ اور جن کی طرف وحی آتی ہے وہ ہر زمان و مکان کے رسول ہیں۔ رسول مختلف ہیں، زمان و مکان کا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن وحی اور ہدایت ایک ہی ہے۔

اَلَيْتَ وَاِلَى الدِّیْنِ مِنْ قَبْلِكَ (۳: ۴۲) ”تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف۔“

یہ بہت لمبی کہانی ہے، زمانے کے خلیفہ و فرماں روا تاریخ کی بے شمار کڑیوں پر مشتمل اس کے مختلف سلسلے ہیں البتہ وحی کا یہ ایک مستحکم و مستقبل اصول و منہاج ہے اور اس کی کئی شاخیں ہیں۔

یہ بات اس انداز سے جب اہل ایمان کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے تو وہ اپنے اندر یہ شعور پاتے ہیں کہ وہ جس منہاج اور طریقے پر ہیں، یہ ایک مستقل، واحد طریقہ ہے اور اس کا سرچشمہ بھی واحد اللہ وحدہ ہے۔ اور یہ کہ ان کا سررشتہ بھی اللہ العزیز الحکیم ہے۔ اس طرح ان کے اندر یہ شعور بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک تاریخی قافلہ حق کے ممبر ہیں جس کا آخری سرایا پہلا سرارمان و مکان کے اندر دور تک چلا گیا ہے، یہ گویا اہل ایمان کا ایک خاندان ہے جس کا روحانی شجرہ نسب انسانی تاریخ کے آغاز ہی سے شروع ہوتا ہے۔ آخر میں اس شجرے کی کڑیاں ملتی ہیں اور سب جاکر اللہ العزیز پر ملتے ہیں، جو قوی اور قادر مطلق ہے، جو حکیم ہے، جو اپنی حکمت و تدبیر کے ساتھ جس کی طرف چاہتا ہے، وحی کرتا ہے۔ لہذا تم اس واحد ثابت اور مستقل ربانی منہاج سے مستحضر ہو کر ادھر ادھر گھڑنڈیوں پر کیوں جا رہے ہو، کیونکہ یہ گھڑنڈیاں تو اللہ تک نہیں پہنچاتیں، ان کے جائے آغاز کا نہ پتہ اور نہ ان کے مقام انجام کا پتہ ہے اور نہ ان کا راستہ مستقیم ہے۔

اللہ جس نے تمام رسولوں کی طرف وحی فرمائی۔ اس کی مزید صفات بھی دی جاتی ہیں کہ وہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا واحد مالک ہے۔ اور وہی بلند اور عظیم ہے۔

لَهُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (۴: ۴۲) ”آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے، وہ برتر اور عظیم ہے۔“

بسا اوقات لوگوں کو یہ دھوکہ ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی مالک ہیں، محض اس لیے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں ان کے ہاتھوں میں ہیں۔ ان کے قبضہ قدرت اور کنٹرول میں ہیں۔ وہ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں ان سے خدمت لیتے ہیں لیکن یہ دراصل حقیقی ملکیت نہیں ہے۔ حقیقی ملکیت اللہ کی ہے۔ وہ اللہ ہے جو موجود

اور معدوم کرتا ہے، زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ یہ وہی ہے جو کسی بشر کو جو چاہتا ہے، دیتا ہے۔ اور جس چیز سے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔ جس وقت چاہتا ہے ان کے ہاتھ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ یکدم چلا جاتا ہے۔ اور اگر وہ چاہے تو جو چلا گیا ہے، اس کا متبادل دے دے۔ مالک حقیقی تمام اشیاء میں اللہ ہے۔ وہ ان چیزوں کو اپنے قانون قدرت کے مطابق چلاتا ہے۔ اور یہ تمام اشیاء اس کے حکم پر لبیک کہتی ہیں۔ اس لحاظ سے زمین و آسمان میں جو چیز ہے، وہ اللہ کی ہے اور اس لحاظ سے اللہ کے ساتھ اس ملکیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (۴۲: ۴) ”وہ برتر اور عظیم ہے“۔ وہ صرف مالک ہی نہیں ہے۔ وہ مالک اعلیٰ بھی ہے۔ اور وہ بڑی عظمتوں والا ہے، اور اس عظمت میں وہ منفرد ہے۔ وہ اس طرح برتر ہے کہ اس کے مقابلے میں ہر چیز کمتر ہے اور وہ اس معنی میں عظیم ہے کہ اس کے مقابلے میں ہر چیز بہت ہی چھوٹی ہے۔ جب یہ حقیقت انسانوں کے خیر میں اچھی طرح بینہ گئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے نفوس کے لیے جو مال، جو رزق اور جو روزگار طلب کرتے ہیں، یہ انہوں نے کہاں سے طلب کرنا ہے یعنی یہ کہ زمین و آسمان میں جو چیزیں موجود ہیں، ان کا مالک اللہ ہے۔ اور وہ مالک ہی کسی کو کوئی چیز دے سکتا ہے۔ پھر وہ برتر اور عظیم بھی ہے۔ اس سے اگر کوئی کچھ مانگتا ہے تو وہ اس کے سوال کو رد نہیں کرتا۔ جس طرح قلوقات کے سامنے ہم ہاتھ پھیلاتے ہیں وہ نہ برتر ہیں اور نہ عظیم ہیں، اس لیے ان کا سوالی محروم بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد اس کائنات میں سے ایک ایسا منظر دکھایا جاتا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کائنات کا مالک صرف اللہ ہے اور برتری اور عظمت اللہ ہی کے لیے ہے کہ قریب ہے کہ یہ آسمان اللہ کی عظمت کے رعب کی وجہ سے اور بعض لوگوں کی کج روی اور بری باتوں کی وجہ سے پھٹ پڑیں پھر اللہ کی عظمت کا ایک منظر یہ بھی یہاں مایا گیا ہے کہ ملائکہ ہر وقت اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اہل زمین کے لیے مغفرت مانگتے رہتے ہیں، کیونکہ اہل زمین کے انحراف اور بے راہ روی کو دیکھ کر وہ بھی سہم جاتے ہیں۔

تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ

يَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۴۲: ۵) ”قریب ہے کہ آسمان لوپر سے پھٹ پڑیں۔ فرشتے اپنی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے جا رہے ہیں۔ آگاہ رہو، حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہی ہے۔“

سموات وہ عظیم کائنات ہے جو ہمارے اوپر نظر آتی ہے۔ اس کرۂ ارض کی پشت پر ہم جہاں کہیں بھی ہوں اور ہمارے پاس اس کے بارے میں ابھی تک جو معلومات جمع ہوئی ہیں وہ اس سے ایک بالکل معمولی حصے کے بارے میں ہیں۔ آج تک جو معلومات دستیاب ہیں ان سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہمارے سورج جیسے ایک لاکھ ملین سورج مدد اپنے لاتعداد توابع کے موجود ہیں۔ اور ایسے مجموعے یا گروپ کتنے ہیں؟ تقریباً ایک لاکھ ملین گروپ معلوم ہو چکے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ سورج ہماری زمین سے ایک ملین گنا بڑا ہے۔ اور یہ لاکھوں اربوں سورج تو وہ ہیں جن کو ہم اپنی چھوٹی چھوٹی رصد

گاہوں کے دریچے دیکھتے ہیں، یہ اس لامحدود فضائے کائنات (جسے ہم آسمان کہتے ہیں) کے اندر بکھرے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان طویل مسافتیں ہیں جو ہزار ہا مین فوری سالوں کی دوری پر ہیں، جن کا حساب روشنی کی رفتار کے حساب سے کیا جاتا ہے مبنی ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کے حساب سے۔

یہ آسمان جن کے بارے میں ہمارا علم بہت ہی محدود ہے، قریب ہے کہ پھٹ پڑیں، ہمارے اوپر اس فضا میں سے کیوں؟ اللہ کے خوف سے، اللہ کی عظمت سے، اور اللہ کے جلال سے اور زمین کے ان لوگوں کی بدکاریوں کی وجہ سے ان کی غفلت اور نسیان کی وجہ سے جو انہوں نے اس رب ذوالجلال اور اس کائنات کے بارے میں روارکھی ہوئی ہیں۔ قریب ہے کہ آسمانوں پر ریشہ طاری ہو جائے اور یہ ٹوٹ پڑیں اور اس مقام سے گر جائیں جہاں یہ نگے ہوئے ہیں۔

وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ (۵: ۴۲) ”فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے جاتے ہیں۔“ ملائکہ وہ مخلوق ہے جو مکمل طور پر اطاعت شعار ہے۔ یہ تمام مخلوقات میں سے بہتر مخلوق ہے، لیکن یہ مسلسل اپنے رب کی تسبیح کر رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا رب کتنا برتر ہے۔ اور کتنا عظیم ہے۔ وہ باوجود اپنی مکمل اطاعت شعاری کے پھر بھی اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں حمد و ثناء میں ان سے کوئی تقصیر نہ ہو جائے۔ جبکہ اہل زمین تصور وار بھی ہیں، ضعیف بھی ہیں۔ راہ راست سے منحرف بھی ہیں، پھر بھی احساس نہیں رکھتے چنانچہ ملائکہ اللہ کے غضب سے ڈرتے ہیں اور زمین میں جو معصیت ہوتی ہے، جو تقصیرات ہوتی ہیں، اس پر وہ اللہ کے غضب کے ڈر سے استغفار کرتے ہیں۔ یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں ملائکہ کے استغفار سے مراد اہل ایمان کے لیے استغفار ہو، جس طرح سورۃ غافر میں آیا ہے۔

الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَوْمَئِذٍ

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا (غافر: ۷) ”عرش الہی کے حامل فرشتے، اور وہ جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں، سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔“ اس حالت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فرشتے زمین پر معصیت کے ارتکاب سے بہت ڈرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اہل ایمان بھی اگر معصیت کریں تو فرشتے ڈرتے ہیں اور اس خوف کی وجہ سے وہ اللہ سے اہل زمین کے لیے معافی طلب کرتے ہیں اور وہ اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں تاکہ ان معصیوں کی وجہ سے اللہ کا عذاب نہ آجائے اور اس لیے کہ اللہ کی رحمت لوگوں پر آتی رہے۔ وہ امید کرتے ہیں کہ لوگوں کو معاف کیا جائے گا اور ان پر رحمت ہوگی۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۵: ۴۲) ”آگاہ رہو حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہے۔“ اللہ کی صفات عزت اور حکمت کے ساتھ اور صفات علو اور عظمت کے ساتھ صفات مغفرت اور رحمت کو بھی یہاں جمع کیا گیا ہے تاکہ لوگ رب کی تمام صفات کو پیش نظر رکھیں۔

اس پیر کے آخر میں 'ان عفات البیہ کے بیان اور اس کائنات میں ان کے اثرات کے بیان کے بعد 'روئے سخن ان لوگوں کی طرف مڑ جاتا ہے۔ جسوں نے اللہ کے سوا کچھ اور سرپرست بھی بنا رکھے ہیں 'حالانکہ یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی سرپرست نہیں ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معاملات سے اب دستکش ہو جائیں 'کیونکہ آپ کو ان کا حوالہ دار نہیں مقرر کیا گیا۔ اللہ ہی دراصل ان پر نگران ہے اور مختار ہے۔

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ اللَّهُ حَفِیْظٌ عَلَيْهِمْ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ

ہو کیل (۶: ۴۲) ”جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں 'اللہ ہی ان پر نگران ہے 'تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو“۔ انسانی تصور میں ان کج خلق اور بد بختوں کی یہ تصویر آتی ہے کہ انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے سرپرستوں کے سامنے ہاتھ دلا رکھے ہوئے ہیں اور ان سے کچھ مانگتے ہیں اور ان کے ہاتھ خالی ہیں 'یہاں تو ہوا کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی تصویر اور ان کے سرپرستوں کی تصویر نہایت ہی مکروہ 'حقیر اور بونی تصویر ہے۔ اللہ کے قبضے میں ہیں یہ لوگ اور نہایت ہی چھوٹے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہہ دیا گیا ہے کہ آپ ان کے معاملے سے 'ی الذمہ ہیں۔ آپ ان کی پرواہ نہ کریں 'اللہ تعالیٰ ان کا بندوبست کرے گا۔

اہل ایمان کے دلوں میں یہ بات ایسی طرح بیٹھ جانی چاہئے اور اس معاملے میں ان کو مطمئن ہونا چاہئے 'ہر حال میں مطمئن ہونا چاہئے۔ وہ لوگ جن کو سرپرست بنایا گیا ہے 'وہ اس کرۃ ارض پر برسر اقتدار اور اصحاب جاہ و مرتبہ ہوں یا دوسرے لوگ ہوں۔ اصحاب اقتدار کے بارے میں تو اہل ایمان کو یوں مطمئن ہونا چاہئے کہ وہ جس قدر جبر و قہار بھی ہوں 'اگر ان کا اقتدار قرآن و سنت سے ماخوذ نہیں ہے تو پھر وہ اللہ کی گرفت میں ہیں 'اللہ نے انہیں احاطے میں لے رکھا ہے۔ ان کے ارد گرد پوری کائنات اللہ پر ایمان لانے والی ہے 'صرف وہی منحرف ہیں۔ وہ ایک نہایت ہی موزوں زمرے میں ایک کرخت آواز کی طرح ہیں۔ اور اگر یہ سرپرست اہل اقتدار کے علاوہ اور پیر فقیر ہوں تو اہل ایمان پر ان کی ذمہ داری نہیں ہے کیونکہ اللہ کی مخلوق میں سے اگر کوئی غلط راہ اختیار کرتا ہے۔ تو یہ ذمہ دار نہیں۔ دین و عقائد میں زبردستی نہیں ہے 'ان پر صرف تبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ بندوں کے دلوں پر نگران اللہ ہی ہے۔

چنانچہ مومنین کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی سیدھی راہ پر وحی الہی کی روشنی میں چلیں اور اگر دوسرے لوگ غلط عقائد اختیار کرتے ہیں تو ان پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ غلط عقائد جو بھی ہوں 'وہ خود ذمہ دار ہیں۔ اب ہم اس سورت کے پہلے موضوع یعنی وحی و رسالت کی طرف آتے ہیں :

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّنُنْذِرَ أُمَّ الْقُرَى وَمَنْ

حَوْلَهَا وَنُنْذِرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ فَرِیقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِیقٌ فِي

السَّعِيرِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ

فِي رَحْمَتِهِ وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ قَرِينٍ وَلَا نَصِيرٍ ۝ أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۚ قَالَ اللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ع ۹

۲ ”ہاں اسی طرح اے نبیؐ یہ قرآن عربی ہم نے تمہاری طرف وحی کیا ہے تاکہ تم بستیوں کے مرکز (شرکہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو اور جمع ہونے کے دن سے ڈرا دو جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ کو جنت میں جانا ہے اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی دلی ہے نہ مددگار۔ کیا یہ (ایسے نادان ہیں کہ) انہوں نے امت چھوڑ کر دوسرے ولی بنا رکھے ہیں؟ ولی تو اللہ ہی ہے، وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (۷: ۴۲) ”ہاں اسی طرح اے نبیؐ یہ قرآن عربی ہم نے تمہاری طرف وحی کیا ہے۔“ تاکہ تم بستیوں کے مرکزی شرکہ کے لوگوں کو ڈراؤ۔ یہ فقرہ معطوف ہے اس فقرے پر جس سے سورت کا آغاز ہوا۔ یعنی كَذَلِكَ يُوحَىٰ پر۔ سورت کے آغاز میں آنے والے اس كَذَلِكَ سے مراد حروف مقطعات تھے۔ یہاں معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مناسبت حروف مقطعات اور قرآن عربی کی ہے۔ یہ مناسبت ظاہر ہے۔ یعنی یہ حروف عربی ہیں اور یہ قرآن عربی ہے۔ وحی نے ان حروف سے یہ قرآن بنایا ہے تاکہ وہ اپنا مقصد پورا کرے اور غرض و غایت کیا ہے۔

لَتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا (۷: ۴۲) ”تاکہ تم بستیوں کے مرکز (شرکہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو۔“ ام القریٰ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس میں بیت اللہ کا پرانا گھر تھا۔ اللہ نے یہ پسند فرمایا کہ خانہ کعبہ اس آخری رسالت کا مرکز ہو اور اللہ نے اپنی آخری کتاب کے لیے عربی زبان کو منتخب کیا۔ یہ اس کی مصلحت تھی اور وہی اس کو جانتا ہے کہ کیوں۔

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ”اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں رکھے۔“

آج جب ہم تاریخی واقعات کا جائزہ لیتے ہیں اور پوری تاریخ کو چھانٹتے ہیں اس وقت کے حالات اور تقاضوں کو دیکھتے ہیں۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دعوت کس طرح پھیلی اور کن خطوط پر آگے بڑھی اور اس نے کیا کیا نتائج پیدا کیے اور دنیا پر کیا کیا اثرات چھوڑے۔ آج جب ہم یہ جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ نے اس سرزمین کو اس مقصد کے لیے کیوں منتخب کیا تھا۔ اور تاریخ کے ایک خاص موڑ پر اس آخری رسالت کے لیے کیوں مکہ مکرمہ کو مرکز ٹھہرایا۔ جبکہ یہ آخری رسالت تھی بھی عالمی رسالت تمام انسانوں کے لیے تھی۔ اور جس کے عالمی خدوخال اس کے ابتدائی دنوں ہی سے عیاں تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے دور میں پورے کرۂ ارض کے آباد علاقوں کو چار شہنشاہوں نے باہم تقسیم کر رکھا تھا۔ رومی سلطنت جو پورے ایشیا کے ایک حصے اور افریقہ پر حکمران تھی۔ کسراے فارس کی مملکت جس کا اقتدار ایشیا کے

ایک بڑے حصے 'افریقہ کے ایک حصے پر قائم تھا' مملکت ہند اور مملکت چین۔ یہ آخر اندک دونوں شہنشاہیں اپنے خول میں بند تھیں 'ان کے اپنے عقائد تھے اور صرف چین و ہند کے باہم سیاسی روابط تھے' چونکہ چین و ہند کی ملکتیں اپنے ہی خول میں بند تھیں۔ اس لیے دنیا کے معاشرہ پر حقیقی اثر قیصر روم اور کسرائے فارس ہی کی حکومتوں کو حاصل تھا۔

اس دور میں دنیا میں دو مشہور سماوی دین تھے۔ یہودیت اور نصرانیت۔ یہ دونوں مذاہب اس پوزیشن تک پہنچ گئے تھے کہ یہ کسی نہ کسی حکومت اور مملکت کے زیر اثر ہو گئے تھے۔ ان ادیان پر حکومت کا اثر قائم ہو گیا تھا۔ کسی مملکت پر دین کا اثر نہ تھا بلکہ مملکت دین پر غالب تھی۔ یہ اس لیے کہ ان ادیان کے اندر تحریف و تغیر واقع ہو گیا تھا اور اہل دین بد عمل ہو گئے تھے۔

یہودیوں پر تو کبھی رومی ظلم کرتے اور کبھی اہل فارس ان پر مظالم ڈھاتے۔ ان کی تو اس علاقے میں کوئی قابل ذکر پوزیشن نہ تھی۔ حالات نے یہودیت کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ صرف یہودیوں 'یعنی بنی اسرائیل کا دین بن جائے اور خود اپنے اندر سکڑ جائے۔ ان کو نہ اس بات کی ضرورت تھی اور نہ خواہش تھی کہ وہ دوسری اقوام کو دین یہودیت میں لائیں۔

جہاں تک موجودہ عیسائیت کا تعلق ہے 'تو یہ مملکت روما کی پیدا کردہ ہے۔ جس وقت عیسائیت وجود میں آئی تو مملکت روما، فلسطین، مصر، شام اور ان باقی حصوں پر برسر اقتدار تھی جن میں مسیحیت خفیہ طور پر پھیل گئی تھی اور مملکت روما اس پر تشدد کر رہی تھی۔ اس دین کو ماننے والوں کا پیچھا کیا جاتا تھا۔ اور ان پر سختیاں کی جاتی تھیں۔ یہ تشدد اس قدر سخت تھا کہ ہزار ہا لوگوں کو ظلمانہ طریقے پر ذبح کیا گیا۔ جب اس تشدد کا دور ختم ہوا اور قیصر روم خود دین مسیحیت میں داخل ہو گیا تو وہ اپنے ساتھ بت پرستانہ انسانے بھی لایا۔ چنانچہ یونان کے مذہبی دیو مالائی فلسفے عیسائیت میں داخل ہو گئے اور عیسائیت کی سادہ شکل ہی کو بدل کر رکھ دیا گیا۔ لہذا اب سرکار کے سائے میں جو عیسائیت وجود میں آئی 'وہ اس دین سے بالکل مختلف تھی جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتارا تھا بلکہ یہ ایک نئی چیز وجود میں آگئی۔ ہوا یوں کہ مملکت روم نے کل تو پڑھ لیا مگر وہ مسیحیت سے متاثر نہ ہوئی۔ اور مسیحیت تشدد سے تو کنٹرول میں نہ آئی تھی 'اب مکمل طور پر کنٹرول میں آگئی۔ اس سرکاری کنٹرول کی وجہ سے یہ دین مزید ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اس طرح تشدد کا ایک دوسرا دور شروع ہوا 'سرکاری مسیحیت نے دوسرے فرقوں کو کچلا شروع کر دیا۔ کینہہ تقسیم ہو گیا اور یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ اس کے نتیجے میں مملکت روما منقسم ہو جائے۔ یوں ایک سرکاری فرقے نے دوسرے فرقوں کو کچلا اور دونوں کی حالت یہ ہو گئی کہ کوئی بھی حضرت عیسیٰ کے دین پر نہ رہا۔

یہ وقت تھا جب اسلام نمودار ہوا۔ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت جس 'انحراف' 'فساد' ظلم اور جاہلیت میں گرفتار ہے 'اسے ان تاریکیوں سے نکالا جائے۔ اسلام نے چاہا کہ پوری انسانی زندگی کو اپنے کنٹرول میں لے 'اور نہایت ہی روشنی اور صحیح راستے پر اس کی راہنمائی کرے۔ یہ ضروری تھا کہ اسلام پوری انسانیت کے اوپر اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کرے تاکہ انسانی زندگی میں وہ عظیم انقلاب لایا جاسکے۔ جو اسلام کے پیش نظر تھا۔ لہذا یہ ضروری تھا کہ اسلام کا آغاز کسی ایسے مقام سے کیا جائے جو آزاد ہو اور وہاں دنیا کی بڑی شہنشاہتوں میں سے کوئی بھی برسر اقتدار نہ ہو۔ اور اسلام کی ترقی اور نشوونما ایسے حالات میں ہو کہ اس پر کوئی ایسی مملکت مسلط نہ ہو 'جو اس کے مزاج کے متضاد ہو۔ بلکہ اس علاقے پر اسلام خود ہی برسر اقتدار ہو۔ ان مقاصد کو پیش نظر دیکھتے ہوئے اگر سوچا جائے تو مکہ مکرمہ 'اس وقت کے حالات کے مطابق

آغازِ اسلام کے لیے ایک بہترین مقام تھا، جہاں سے اسلام نے اپنا عالمی سفر شروع کیا کیونکہ ایک عالمی انقلابِ اولِ روز سے اسلام کے پیشِ نظر تھا۔

جزیرۃ العرب میں ان دنوں کوئی منظم حکومت نہ تھی جس کے اپنے قوانین ہوں، جس کی فوجیں ہوں، جس کی پولیس ہو، اور وہ پورے جزیرۃ العرب پر اقتدار رکھتی ہو۔ اور جو اپنے منظم ڈھانچے کے بل بوتے پر جدید نظریہ حیات کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ اور جمہورِ عوام پوری طرح اس کے کنٹرول میں ہوں جیسا کہ اس وقت دنیا کی چار شہنشاہیتوں میں ایسا انتظام تھا۔

پھر جزیرۃ العرب میں ایسا واضح دین بھی نہ تھا، جس طرح یہودیت، عیسائیت تھی یا بکھری ہوئی بت پرستی تھی۔ تمام قبائل کے معتقدات اور ان کے طریقہ ہائے حیات مختلف تھے۔ پھر ان کے الہ بھی مختلف تھے۔ ملائکہ سے، جنوں سے، سیاروں اور ستاروں سے، اور بتوں سے، لیکن ان حالات کے باوجود خانہ کعبہ اور قریش کی دینی قیادت و سیادت، پورے جزیرۃ العرب میں مسلم تھی۔ اگرچہ یہ قیادت باقاعدہ اقتدارِ اعلیٰ کی نہ تھی، نہ مکہ پر اور نہ حیردن مکہ پر۔ اس وجہ سے دینِ جدید کی مزاحمت حکومتی سطح پر نہ تھی۔ قریش نے دینِ جدید کا ایک حد تک مقابلہ ضرور کیا لیکن اگر اقتصادی وجوہات نہ ہوتیں، اور قریش کے سرداروں کے خاص مفادات کا مسئلہ نہ ہوتا تو اسلام کی جو مخالفت امِ القریش میں ہوئی وہ بھی نہ ہوتی۔ جہاں تک عقائد و نظریات کا تعلق ہے، وہ جانتے تھے کہ ان کے عقائد پوچھ ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

جزیرۃ العرب میں کسی سیاسی نظام کا نہ ہونا، یا کسی منظم دینی نظام کا نہ ہونا، اسلام کے مفاد میں تھا، ابتدائی اودار میں اسلام کے اوپر کوئی خاص دباؤ نہ تھا۔ اگر کوئی ایسا نظام ہوتا تو وہ لازماً اسلام کے مزاج کے خلاف ہوتا اور وہ اسلام کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا۔

بلکہ کسی اجتماعی حکومتی اور دینی نظام کی عدم موجودگی میں، ایک طرح اسلام کی حمایت کا پہلو نکل آیا۔ اجتماعی نظام حکومت کی جگہ جزیرۃ العرب میں قبائلی نظام تھا اور اس قبائلی نظام میں خاندان کو اہمیت حاصل ہوتی۔ جب حضورؐ دعوتِ اسلامی لے کر اٹھے تو بنی ہاشم کی تلواریں آپ کے ساتھ تھیں اور جو قبائلی توازن قائم تھا وہ آپ کے حق میں تھا۔ کیونکہ بنو ہاشم باوجود اس کے کہ آپ کے دین کو قبول نہ کرتے تھے لیکن آپ کے حامی ضرور تھے۔ بلکہ آغازِ اسلام میں جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا اور ان کا تعلق اہم قبائل سے تھا، ان پر لوگ کسی قسم کے شدید سے ڈرتے تھے۔ ان کی اصلاح اور تادیبی کارروائی کا کام قبائل کے سپرد تھا۔ اسی طرح جن غلاموں پر تشدد ہوا ان پر بھی ان کے مالکان نے تشدد کیا، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر ایسے غلاموں کو خریدتے اور آزاد کر دیتے۔ اس طرح ان پر سختی ختم ہو جاتی اور وہ حضرت ابوبکر کے مولیٰ ہو جاتے۔ اب لوگ ان کے دین کے بارے میں زیادہ نہ جھجھرتے۔ اس صورت حال نے دینِ جدید کو ایک امتیازی شان دے دی۔ تمام غریاء اور غلام اس کی طرف لپکے۔

پھر عربوں کے اندر بہادری، ذاتی وقار، جوانمردی اور بھلائی پر خوشی سے آمادہ ہو جانے کی صفات بھی تھیں۔ یہ وہ صفات ہیں جو جدید دین کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے ضروری تھیں۔

ان باتوں کے علاوہ جزیرۃ العرب میں اس وقت وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو کسی تہذیب و ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہیں اور ساکنانِ جزیرہ ان پر فخر کرتے تھے۔ جزیرۃ العرب میں قوت، قابلیت، شخصیات کے کافی ذخائر موجود تھے جو بے تاب تھے کہ ان کو کام میں لایا جائے۔ غیب کے قلب میں یہ سب کچھ موجود تھا۔ پھر اہل قریش پوری دنیا میں

گردیدہ اور گرم و سرد چشیدہ تھے۔ وہ ایک طرف قیصر روم کی مملکت میں سفر کرتے تھے دوسری جانب وہ کسری فارس کے علاقوں میں سفر کرتے تھے اور انہوں نے اس وقت کی تہذیب و تمدن کے تمام تجربات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے تھے۔ نل قریش کے سفر موسم گرما اور سفر موسم سرما کو قرآن کریم نے ہمیشہ کے لیے ریکارڈ بھی کر دیا ہے۔

لَا يَلْفُ قُرَيْشٍ (۱۰۶: ۱) فِيهِمْ رِحْلَةُ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶: ۲)
فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ (۱۰۶: ۳) الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَآمَنَهُمْ مِنْ

خَوْفٍ (۱۰۶: ۴) ”چونکہ قریش مانوس ہوتے ہیں، جاڑے اور گرمی کے سفروں سے لہذا ان کو چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کرس جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا۔“ پھر تجربات کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے ہاں مختلف اسباب کے تحت جمع ہو گیا تاکہ جزیرہ العرب اسلامی انقلاب کی مہم کے لیے تیار ہو جائے۔ جب اسلام آیا تو اس نے ان تمام ذخائر اور صلاحیتوں کو اسلام کے حق میں استعمال کیا۔ عربوں کی حالت اور جنگی صلاحیت جو صدیوں سے جمع ہو چکی تھی، وہ صلاحیت کھل گئی۔ اسلام کی کئی — یہ خزانے روبہیں ہو گئے۔ یہ تمام صلاحیتیں اسلام کا سرمایہ بن گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز اسلام ہی سے اسلام کو ایسی عظیم شخصیات مل گئیں جن کا ملنا کسی تحریک کے لیے بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام اس زاویہ نظر سے بہت بڑا مقام رکھتے ہیں، مثلاً حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت خالدؓ، حضرت معاذؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ وغیرہم۔ ساتھیوں کا یہ باصلاحیت گروپ جنہوں نے ابتداء ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا، ان کے دل اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیئے، انہوں نے اس دعوت کو اٹھایا۔ اس دعوت کے ذریعہ یہ باصلاحیت لوگ مزید بڑے لوگ بن گئے اور ان کی صلاحیتیں اور نکھر گئیں۔ لیکن ان کے اندر بنیادی قابلیت اسلام سے پہلے بھی موجود تھی۔

یہاں ہم تفصیلی اسباب نہیں لکھ سکتے کہ جزیرہ العرب کو کیوں دعوت اسلامی کے لیے منتخب کیا گیا۔ کیوں اس دعوت کو آغاز میں بچا کر جزیرہ العرب ہی میں اس کی نشوونما کی گئی، اور کیوں ام القریٰ اور ماحول کو برتری دی گئی کہ بڑی ملکیتیں اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوئیں، تو یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جزیرہ العرب کو جدید رسالت کے لیے ایک پرورش گاہ بنانا چاہتا تھا۔ جس نے پوری انسانیت کو روشنی دیٹی تھی۔ اور پھر ام القریٰ کو منتخب کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے انھیں۔ بہر حال یہ بہت ہی طویل بحث ہوگی اور اس کے لیے ایک مستقل کتاب کے صفحات درکار ہیں۔ یہاں یہی اشارات کافی ہیں اور جن سے آگے بڑھ کر مزید اسباب بھی معلوم کیے جاسکتے ہیں، یہ تو ان اسباب کا ایک حصہ ہیں۔ جس طرح ہم کائنات میں سنن الہیہ کے سلسلے میں نئے اسباب معلوم کر رہے ہیں۔ اسی طرح ام القریٰ کے بارے میں مزید وجوہات غور و فکر کے بعد سامنے لائی جاسکتی ہیں۔

غرض یوں یہ قرآن ام القریٰ میں نازل ہوا، اس نے اس کے ارد گرد کام شروع کیا اور جب پورا جزیرہ العرب جاہلیت سے نکل کر اسلام میں داخل ہو گیا۔ اور عرب پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو گئے تو انہوں نے اسلام کے

جہنمے بلند کر دیئے اور وہ اسلام کو لے کر شرق و غرب میں داخل ہو گئے اور انہوں نے جدید رسالت اور اس کے ذریعہ آیا ہوا نظام اسلام اور نظام شریعت تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا۔ جس طرح اسلام کا مزاج تھا۔ جن لوگوں نے یہ جہنمے بلند کیے وہ اس مقصد کے لیے صالح ترین لوگ تھے۔ جنہوں نے اسے اٹھایا اور پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ جب وہ اسے لے کر اٹھے تو اسلام کی تولید و تکمیل ایک بہترین ماحول میں ہو چکی تھی۔

یہ بات کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے جزیرۃ العرب میں اسلام کے مکمل غلبے تک زندہ رکھا اور پورے جزیرۃ العرب کو مشرکین اور شرک کے آثار سے بھی پاک کر دیا گیا۔ پھر اس دعوت کے لیے عربی زبان کو بھی محض اتفاق سے نہ چنا تھا بلکہ دنیا کی زبانوں میں یہ اس دعوت کے پھیلانے کے لیے نہایت ہی موزوں زبان تھی۔ یہ ایک مکمل اور بختہ زبان تھی۔ اس کے اندر وسعت کی بے پناہ صلاحیت تھی اور اس دعوت کے مقاصد کے لیے اس وقت اس سے زیادہ بہتر اور کوئی زبان نہ تھی۔ اگر یہ کوئی اور زبان ہوتی یا اس زبان کی تکمیل اور ساخت میں کوئی جھول ہوتی تو اس کے لیے ممکن نہ ہوتا ہے کہ یہ زبان دعوت اسلامی کے مقاصد کو پورا کر سکتی اور نہ یہ زبان اس دعوت کو جزیرۃ العرب کے باہر پھیلا سکتی۔ غرض جس طرح رجل عرب اس دعوت کا بوجھ اٹھانے کے لیے موزوں تھے اسی طرح ان کی زبان بھی موزوں تھی (یہ زبان پھر قرب و جوار کے ملکوں کی زبان بن گئی)۔

غرض یہ وہ قدرتی سازگاریاں تھیں جو اس رسالت کے جزیرۃ العرب سے آغاز میں مضر تھیں۔ لیکن تمام وجوہات کے مقابلے میں اصل وجہ یہی ہے جو خود قرآن نے بتائی ہے۔

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ”اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں رکھتا ہے“۔ بہر حال غورو تدبر سے حکمت الہیہ کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔

لَتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيهِ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (۷: ۴۲) ”تاکہ تم بستیوں کے مرکز اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو اور جمع ہونے کے دن سے ڈراؤ جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ کو جنت میں جاتا ہے اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں“۔ قرآن کریم میں ذرلوے کا ذکر بہت آتا ہے۔ بار بار مختلف طریقوں سے لفظ انذار آتا ہے۔ اس سے مراد یوم قیامت سے ڈرانا ہے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں جس زمان و مکان میں انسان پیدا ہوئے اور فوت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو جمع کرے گا اور پھر ان کی گروہ بندی ہوگی

فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (۷: ۴۲) ”ایک گروہ جنت میں جائے گا اور ایک جہنم میں“۔ جس طرح انہوں نے اس دنیا میں عمل کیا، جو دارالعمل ہے اور جو رویہ انہوں نے اپنی اس مختصر زندگی میں اختیار کیا۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ وَالظَّالِمُونَ

مَا لَهُمْ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۸: ۴۲) ”اگر اللہ چاہتا ہے تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے اور نہ مددگار۔“ اگر اللہ چاہتا تو انسانوں کی تخلیق ہی دوسرے انداز سے کرتا جس میں ان کا رویہ ایک جیسا ہوتا۔ ان کا انجام بھی ایک ہی ہوتا، یا سب جنتی ہوتے یا سب جہنمی ہوتے لیکن اللہ نے اس انسان کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ اور اس خلافت کا تقاضا یہ تھا کہ انسان ایسا ہو جیسا کہ وہ ہے۔ انسان کو خصوصی استعداد دی جائے اس استعداد کے ذریعہ وہ فرشتوں سے بھی ممتاز ہو اور شیطین سے بھی ممتاز ہو۔ اور اللہ کی دوسری مخلوقات سے بھی ممتاز ہو۔ جن کی تخلیق کسی محدود مقصد کے لیے ہے اور ان کا ایک ہی رویہ ہے۔ اس استعداد کے ذریعہ بعض انسان ہدایت اور نور کی طرف آ جائیں، عمل صالح کریں اور بعض لوگ گمراہی اور تاریکی کی طرف چلیں اور برے کام کریں۔ ہر انسان ان احتمالات میں سے ایک طرف جھک جائے جو اس کی طبیعت میں رکھے ہوئے ہیں اور پھر اس احتمال کے لیے جو انجام مقرر ہے اس سے دوچار ہو، یعنی ایک فریق جنت میں جائے اور دوسرا دوزخ میں۔ اور اس طرح یہ بات حق بن جائے کہ۔

يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۸: ۴۲)
 ”اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے اور نہ مددگار۔“ اور اللہ کی مشیت نے اپنا کام اپنے سابق علم کی وجہ سے کیا۔ انسان اس کی ہدایت کی وجہ سے اس کی رحمت کا مستحق ہو اور ضلالت کی وجہ سے وہ گمراہی و عذاب کا مستحق ہو گیا۔
 اس سے قبل یہ بات گزر گئی کہ بعض لوگوں نے اللہ کے سوال اور سرپرست بنا رکھے تھے۔ یہاں یہ فیصلہ دے دیا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا تو کوئی ولی و مددگار نہ ہو گا۔ لہذا جن کو وہ ولی و مددگار پکارتے ہیں تو یہ ایک فضول حرکت ہے ان کی جانب سے کیونکہ ان کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ پھر پوچھا جاتا ہے:

أَمْ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (۹: ۴۲) ”کہا انہوں نے اللہ کے سوال اور ولی و مددگار پکڑ رکھے ہیں؟“ یہ سوال استکباری اس لیے ہے کہ ان کو متوجہ کر کے یہ فیصلہ دے دیا جائے کہ اللہ وحدہ ولی و مددگار ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور اس سے اس کی قدرت واضح ہوتی ہے۔ مردے کو حیات دینا یہ بہت بڑی قدرت ہے۔

فَاللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَى (۹: ۴۲) ”اللہ ہی ولی و مددگار ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے۔“ اس کے بعد اس خصوصی قدرت کے منظر یعنی احیائے موتی کے بعد عام قدرت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۹: ۴۲) ”اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ اس کی قدرت صرف احیائے موتی تک محدود نہیں۔

--- ۰۰۰ ---

پھر روئے سخن اس سورت کے موضوع اول کی طرف مڑتا ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں اپنے تمام اختلافات کس معیار

پر رفع کیے جائیں گے۔ یہ وحی واحد معیار حق ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہے، یہ صراطِ مستقیم ہے اور مکمل اسلامی نظام زندگی آنے کے بعد تم نے تمام اختلافات اس کے مطابق ختم کرنے ہیں۔ اب یہ نہ ہو گا کہ ہر شخص ہوائے نفس کے مطابق چلے :

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿۱﴾ فَاطِرُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَنْوَاجًا وَ مِنَ الْأَنْعَامِ أَنْوَاجًا يَذَرُكُمْ فِيهِ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿۲﴾ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۳﴾

”تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے وہی اللہ میرا رب ہے“ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے اور اسی طرح جانوروں میں بھی (انہی کے ہم جنس) جوڑے بنائے اور اس طریقہ سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے آسمان اور زمین کے خزانوں کی سبکیاں اسی کے پاس ہیں جسے چاہتا ہے کھارزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تپا تلا دیتا ہے اسے ہر چیز کا علم ہے۔ ان حقائق کو اس ایک پیراگراف میں پیش کرنے کا طریقہ بڑا عجیب ہے۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان حقائق کے درمیان ایک باریک اور خفیہ ربط موجود ہے۔ یہ کہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہیں ان کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲ : ۱۰) ”تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے“۔ اور اللہ نے اپنا فیصلہ اس قرآن میں نازل کر دیا ہے اور اس قرآن نے دنیا و آخرت دونوں کے بارے میں فیصلے کر دیئے ہیں اور لوگوں کی زندگی کے لیے انفرادی اور اجتماعی منہاج اس کے اندر ضبط کر دیا ہے۔ ان کے نظام زندگی، ان کے نظام معیشت، ان کے نظام قانون، ان کے نظام سیاست اور ان کے نظام اخلاق و سلوک کے تمام امور قرآن کریم نے طے دیئے ہیں اور ان موضوعات پر کافی دشانی بیان دے دیا ہے۔ اس قرآن کو انسانی زندگی کا دستور العمل بنا دیا ہے۔ یہ تمام دنیا کے دستبر سے زیادہ جامع و مانع ہے۔ اگر ان کے درمیان کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اس کا حکم اس قرآن میں تیار ہے اور حاضر۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے۔ اور آپ نے اس قرآن کی اساس پر نظام زندگی قائم کر کے بنا دیا ہے۔

اس ہدایت کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر شروع ہوتی ہے کہ آپ نے اعلان کر دیا کہ آپ اپنے امور تمام کے تمام اللہ کے حوالے کرتے ہیں اور اس طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ یہ ہے رب تعالیٰ جس نے مجھے یہ کلیہ دیا ہے۔

ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (۴۲: ۱۰) ”یہی اللہ میرا رب ہے“ اس پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔“ یہ ثابت اور یہ توکل اور یہ اقرار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہاں ریکارڈ کیا جاتا ہے تاکہ اس کا لوگوں پر ایک نفسیاتی اثر ہو کہ دیکھو یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ کے نبی ہیں، وہ بھی شدت دیتے ہیں کہ اللہ ہی ان کا رب اور حاکم ہے اور یہ کہ آپ اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں، اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ لہذا دوسرے انسان اور مسلمان اپنے اختلافات میں کس طرح کسی اور کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اور نبی جو ہدایت پر ہیں اپنے فیصلے اللہ ہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ لہذا تمام لوگوں کو بطریق ادنیٰ اپنے فیصلے قرآن کی طرف لے جانے چاہئیں۔ اور اس سے کسی جگہ بھی ایک لمحے کے لیے بھی ادھر ادھر نہیں ہونا چاہئے۔ اور کس طرح وہ اپنے امور میں کسی دوسری جانب جاسکتے ہیں جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود بھی کسی دوسری طرف نہیں جاتے۔ اللہ ہی کی طرف رجوع فرماتے ہیں کیونکہ رب بھی اللہ، دالی بھی اللہ، کفیل بھی اللہ اور یہ اللہ ہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جدھر موڑنا چاہتا ہے، موڑتا ہے۔

جب کسی مومن کے دل میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو اس کا راستہ روشن ہو جاتا ہے، اس کے سفر زندگی کے نشانات واضح ہو جاتے ہیں اس لیے وہ اپنے سفر میں ادھر ادھر دیکھتا ہی نہیں۔ طمانیت کا ایک لہریں پیانہ اس کے دس پر انڈیں دیا جاتا ہے اور اس کے مقامات قدم پر اعتماد بچھا دیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ نہ شک کرتا ہے، نہ تردد کرتا ہے، اور نہ حیرت زدہ ہوتا ہے۔ اس کو یہ شعور مل جاتا ہے کہ اللہ اس کا حامی، نگہبان، محافظ اور اس کے قدموں کو درست رکھنے والا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس راستے کے راہی رہے ہیں۔

جب مومن کے ضمیر میں اور شعور میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے تو اس کے نظام زندگی اور طرز زندگی کے بارے میں اس کا شعور اور اس کی سوچ بلند ہو جاتی ہے، اس لیے وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ اسلامی نظام زندگی کے سوا اور بھی کوئی قابل التفات منہاج ہو سکتا ہے۔ نہ وہ یہ تصور کر سکتا ہے کہ اللہ کے حکم اور فیصلے کے سوا اور بھی کوئی حکم اور فیصلہ ہو سکتا ہے، جس کی طرف اختلاف کی صورت میں کوئی نگاہ بلند کر سکے۔ جبکہ ہادی اور نبی بھی اپنے فیصلوں میں اللہ کی شریعت اور حکم کی طرف ہی دیکھتے ہیں۔

اب ایک بار پھر اس حقیقت کو ذہن نشین کیا جاتا ہے تاکہ وہ جیسی طرح مومن کے شعور کی گہرائی تک اتر جائے۔

فَاطِرُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْإِنْعَامِ أَزْوَاجًا

يَذَرُكُمْ فِيهِ لَآئِسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (۴۲: ۱۱) ”آسمانوں اور زمین کا بنانے والا جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے اور اس طرح جانوروں میں بھی جوڑے بنائے“ اور اس طریقے سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا

ہے۔“ اللہ قرآن کو نازل کرنے والا ہے کہ اس کا حکم تمہارے اختلافات کے اندر فیصلہ ہو۔ وہی اللہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین کا مدبر ہے۔ زمین اور آسمان میں جو قانون قدرت چلتا ہے، وہ زمین اور آسمان کے امور میں فیصلہ کن ہے۔ لوگوں کی زندگیوں کے معاملات بھی دراصل اس کائنات ہی کا ایک حصہ ہیں، لہذا لوگوں کی زندگیوں میں قانون خداوندی کا اجراء دراصل لوگوں کی زندگیوں کو اس پوری کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر دے گا۔ اس طرح تمام انسان اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ اور ہم قدم ہو کر چلیں گے۔ جبکہ کائنات میں حکمرانی میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ لہذا انسان کی زندگی میں حکمرانی اس کی ہوگی۔

وہ اللہ جس کے حکم کی طرف لوگوں نے اپنے اختلافات میں رجوع کرنا ہے، وہ اللہ وہی ذات ہے جو تمہارا خالق ہے۔ تمہارے نفوس کو اسی نے بنایا ہے اور یہ اپنی مخلوق کو بھی طرح جانتا ہے۔ پھر۔

جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا (۴۲: ۱۱) ”پھر تمہاری جنس ہی سے تمہارے لیے جوڑے بنائے۔“ اس طرح تمہاری زندگی کی بنیادی تشکیل ایک خاندان کی صورت میں ہوئی، لہذا وہی جانتا ہے کہ کس طرح یہ زندگی درست ہو سکتی ہے، اور انسان کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے، اللہ وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق اس طرح کی جس طرح تمام دوسری زندہ مخلوق کو اس نے بنایا اور ان کے بھی جوڑے بنائے۔

وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا (۴۲: ۱۱) ”اور اسی طرح جانوروں میں بھی جوڑے بنائے۔“ تخلیق میں وحدت نظام اور تسلسل نوع، یہ ظاہر کرتا ہے کہ خالق ایک ہی ہے۔ تم اور مویشی اسی نظام کے مطابق حکاثر و غاسل کے عمل سے گزرتے ہو۔ جبکہ اللہ کی مثال اپنی مخلوقات میں سے نہیں ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (۴۲: ۱۱) ”کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں۔“ انسانی فطرت اس اصول کو تسلیم کرتی ہے کیونکہ کوئی چیزیں اگر کسی نے بنائی ہیں تو خالق کسی طرح بھی ان کے مماثل نہیں ہو سکتا۔ لہذا انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اس بے مثال خالق کے احکام و نواہی کو صرف لوٹیں۔ خصوصاً اس دنیا میں اپنے اختلافات کے معاملے میں۔ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رجوع نہ کریں۔ کیونکہ وہ بے مثال خالق و حاکم ہے۔ لہذا ایک مرجع کے سوا کوئی اور مرجع اور جائے فیصلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ جیسا کوئی نہیں ہے۔

باوجود اس کے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے مشابہ کوئی شئی اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اللہ اور اس کی مخلوقات کے درمیان رابطہ باقی اور قائم ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور پھر دیکھنے اور سننے والے کی طرح فیصلے کرتا ہے۔ اور اللہ جس اختلافی معاملے میں فیصلہ کرتا ہے وہ پھر آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ اس معنی میں کہ کنبیاں سب کائنات کی اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اس وقت سے ہیں جب سے اس نے اس کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے اور اس کے لیے ایک ناموس فطرت بنا کر اس میں اسے رائج کر دیا ہے۔

لَهُ مَقَالِيدُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ (۴۲: ۲۱) ”آسمان اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے ہاتھ

میں ہیں۔“ لہذا انسانوں کے اختیارات بھی اسی کے ہیں کیونکہ انسان بھی اس کائنات کا حصہ ہیں۔ لہذا انسانوں کی کنجیاں بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

پھر وہ اللہ ہی ہے جو انسانوں کے رزق کی کشادگی اور تنگی کے اختیارات رکھتا ہے۔ اور یہ رزق ان کو زمین و آسمان کے خزانوں سے دیتا ہے۔

يَسْطُرُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ (۲۱: ۴۲) ”جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے پناہ دیتا ہے۔“ وہ ان کا رازق ہے، وہ ان کا کفیل ہے، وہ ان کو کھانا دینے والا ہے، ان کو پلانے والا ہے لہذا وہ غیر اللہ کے متوجہ کیوں ہوتے ہیں کہ وہ ان کے درمیان فیصلے کرے۔ حق تو یہ ہے کہ لوگ فیصلوں کے لیے رازق اور کفیل کی طرف رخ کس جس جو رزق اور دوسرے معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔

اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۱: ۴۲) ”اسے ہر چیز کا علم ہے۔“ فیصلہ وہی ذات کر سکتی ہے جو علم رکھتی ہے اور اسی کا فیصلہ عادلانہ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ یوں اس پوری تقریر کے معانی نہایت ہی دقیق و لطیف انداز میں باہم مربوط اور مناسب ہیں تاکہ وہ انسانی قلب و عقل پر اثر انداز ہوں اور عقل و خرد کی تاروں پر ایسی چوٹ لگائیں کہ ان سے نہایت ہی گہرا موزوں اور خوش آواز زحرمہ پیدا ہو۔

--- ۰۰۰ ---

اب پھر وحی الہی کی طرف :

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَضَىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي
أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا
الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ
اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ۚ وَمَا تَفَرَّقُوا
إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَلَوْ لَا كَلِمَةُ سَبَقَتْ مِنْ
رَبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكُتُبَ
مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ ۚ فَلِذَاكَ فَادَعُ ۖ وَاسْتَقِمْ
كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ

وَأَمَرْتُ لِعَدَالٍ بَيْنَكُمْ اللَّهُ رَبَّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَسْمَانَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ
لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ وَالَّذِينَ
يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِيبَ لَهُ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ

”اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف (اے محمدؐ) تم انہیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آچکا تھا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تیرا رب پہلے ہی نہ فرما چکا ہو کہ ایک وقت مقررہ تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا رہا گیا ہوتا اور حقیقت یہ ہے کہ انگوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ (چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے) اس لیے اے محمدؐ اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو اور ان سے کہہ دو کہ: ”اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا“ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔ اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ (لبیک کہنے والوں سے) اللہ کے معاملہ میں جھگڑے کرتے ہیں ان کی حجت بازی ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر اس کا غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے۔“

اس سورت کے آغاز میں آیا تھا۔

كَذَلِكَ يُوحِي إِلَيْكَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲: ۳) ”اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف وحی کرتا رہا ہے۔“ یہ ایک اجمالی اشارہ تھا کہ وحی الہی کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور اس وحی نے جو نظام پیش کیا ہے یہ وہی ہے جو سابقہ رسولوں نے پیش کیا تھا اور اس وحی کا رخ بھی اسی طرف ہے جس طرف سابقہ انبیاء کا تھا۔ اب اس اشارے کی تفصیلات دی جا رہی ہیں کہ اللہ نے مسلمانوں کے لیے جو نظام زندگی اور جو شریعت وضع کی ہے وہ عمومی اصولوں میں وہی ہے جو حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو دی گئی تھی۔ سب کو حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کے واحد دین کو قائم

کرد اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو اور تمہارا فرض ہے کہ اللہ کے اس قدیم نظام زندگی پر جم جاؤ اور جو لوگ اس سے ادھر ادھر دیکھتے ہیں، محض خواہشات نفسانیہ پوری کرنے کے لیے تو ان کی طرف کوئی توجہ نہ کرو اس دین کو غالب کرو اور جو لوگ اس دین کے خلاف حجت بازیاں کرتے ہیں ان کی حجت کو رد کر کے باطل کر دو اور ان کو اللہ کے غضب اور شدید عذاب سے ڈراؤ۔

اس پیراگراف کے فقرہوں کے اندر بھی نہایت ہی لطیف ربط ہے جس طرح سابقہ پیراگراف کے فقرہوں میں ہم نے بیان کیا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِينَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ

ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ اَنِ اقِمْوْا الدِّينَ وَاَلَّا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۱۳: ۴۲) ”اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔“ اس کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کر دیا جاتا ہے جس کی تفصیلات ہم نے سورت کے آغاز میں دیں کہ ادیان کی جڑ ایک ہے۔ زمان و مکان کے لحاظ سے مختلف زمانوں میں اس کی نشوونما ہوئی۔ اس سے جس مومن میں ایسے تصورات و نجات آتے ہیں کہ وہ سوچتا ہے کہ اس کا ماضی بہت طویل ہے اور اس کے سلف بہت ہی عظیم لوگ ہیں اور وہ ایسے عظیم لوگوں کا تابع اور پیرو کار ہے۔ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اجمعین۔ یہ شعور بنتے ہوئے کہ یہ دین ادیان سابقہ ہی کا تسلسل ہے اور یہ کہ وہ انبیاء و رسل کے راستے ہی پر رواں دواں ہے۔ اور اس راستے پر وہ نہایت خوشی سے چل رہا ہے۔ اگرچہ اس میں تھکاوٹ ہو مشکلات ہوں اور اسے اپنے بے شمار مفادات قربان کرنے پڑیں۔ مومن کو یہ پختہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ وہ عظیم لوگوں کے قافلے کا فرد ہے اور یہ قافلہ پوری انسانی تاریخ میں عظیم لوگوں کا قافلہ ہے۔

یہ کہ جو لوگ اللہ کے اس دین پر چلنے والے ہیں ان کے درمیان دائمی امن و آشتی ہے۔ یہ ایک مستقل شریعت اور شاہراہ پر قائم ہیں۔ ان کے درمیان کوئی اختلاف اور دشمنی نہیں ہے بلکہ ان کے درمیان تو گہرے تعلقات و روابط ہیں۔ یہ تعلقات و روابط باہمی مزید تعلق اور مفاہمت کا تقاضا کرتے ہیں۔ یوں مومنین کا حال ان کے ماضی سے مربوط ہو جاتا ہے اور ان کا ماضی ان کے حال سے جڑ جاتا ہے اور وہ سب وہ ایک ہی راستے پر چل پڑتے ہیں۔

اگر اسلامی نظام اور شریعت جو اللہ نے مومنین اور مسلمین کے لیے مقرر کی ہے دعویٰ ہے جس کی وصیت اور تاکید حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ علیہما السلام کو بھی اس سے قبل کی گئی تھی تو پھر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ علیہما السلام کے متبعین باہم کیوں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے متبعین میں سے مختلف فرقے کیوں باہم دست و گریباں ہیں۔ پھر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ علیہما السلام کے متبعین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کے ساتھ کیوں عناد رکھتے ہیں۔ پھر وہ لوگ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ دین ابراہیمؑ پر ہیں حتیٰ مشرکین عرب تو ان کے لیے کیا جواز ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور وہ کیوں نبی آخر

الزمان کے جھنڈے تلے جمع نہیں ہوتے جن کی دعوت یہ ہے کہ تمام پیروکاران دین کو یہ وصیت کی گئی تھی کہ۔

اَنْ اَقِمْوْا الدِّیْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (۱۳: ۴۲) ”دین کو قائم کرو اور اس میں فرقے نہ بنو“۔
 اور کیوں اپنے فرائض ادا نہیں کرتے کیوں ایسا نہیں کرتے کہ وہ انحراف کو چھوڑ دیں۔ کج ردی سے توبہ کریں اور کیوں پھر یہ لوگ، آخری نبی کے جھنڈے تلے صف واحد کی صورت میں کھڑے نہیں ہوتے۔ کیونکہ حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے بعد اب حضرت محمد کی باری ہے اور یہ لمانت اب ان تک پہنچی ہے۔
 مشرکین جو ام القرئی میں بستے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ دین ابراہیمی پر ہیں وہ دعوت اسلامی کے مقابلے میں ایک معاند اور مخالف کے طور کھڑے ہیں۔ یہ کیوں؟

كَبُرَ عَلٰی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ (۱۳: ۴۲) ”یہ بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو“۔ ان کو یہ بات ناگوار ہے کہ ان میں سے محمد ابن عبد اللہ پر وحی کیوں آئی۔ حالانکہ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ وحی دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر نازل ہوگی۔

عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمَیْنِ یعنی ان دو گاؤں کے کبراء اور اہل اقتدار میں سے کسی پر نازل ہوئی۔
 لیکن خود ان کی یہ بات بھی حقیقت واقعہ کے طور پر درست نہ تھی، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے قول کے مطابق صادق و امین تھے۔ اور آپ قریش کے ایک ممتاز قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ توبہ بنک عظیم آدمی تھے۔
 ان پر یہ نئی دعوت شاق گزرتی تھی کیونکہ اگر یہ کامیاب ہوتی ہے تو بت پرستی کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ بت اور بتوں کے انسانی ختم ہو جاتے ہیں اور اسی پر تو ان کی سیادت و قیادت قائم تھی۔ ان کے ذالی اور اقتصادی مفادات انہی تصورات سے وابستہ تھے، لہذا انہوں نے شرک کو سینے سے لگا لیا اور خالص توحید پر مبنی دعوت ان پر بھاری تھی، جس کی طرف رسول بلا تے تھے۔

پھر ان پر یہ بات بھی گراں گزر رہی تھی کہ ان کے جو آباء و اجداد جاہلیت پر مر گئے ہیں وہ گمراہی پر گئے اور وہ کافر اور جہنمی تھے۔ لہذا انہوں نے کہا اگر آباء جہنمی ہیں تو ہم بھی ہیں۔ یوں وہ ضد میں آ گئے اور غلط راہ عناد کی وجہ سے پکڑ لی۔ اور عدا اپنے آپ کو جہنم میں گرانے کے لیے تیار ہو گئے۔ محض اس لیے کہ وہ اپنے آباء کو گمراہ قرار دینے کے لیے تیار نہ تھے۔

قرآن کریم ان کے اس موقف کی تردید یوں کرتا ہے کہ یہ اللہ کا اختیار ہے کہ جسے چاہے جہنم لے۔ اس طرح اللہ اپنی جانب صرف اسی کو متوجہ کرتا ہے جو اللہ کی پناہ میں آنا چاہے اور دھتکارے ہوئے لوگوں کو بذریعہ توبہ واپس کرتا ہے:

اَللّٰهُ یَهْدِیْ اِلَیْهِ مَن یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْ اِلَیْهِ مَن یَّخِیْبُ (۱۳: ۴۲) ”اللہ جسے چاہتا ہے اپنا لیتا ہے اور جو اپنی طرف اسی کو راستہ دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے“۔ تو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جن لیا۔
 اور جو بھی اب اللہ کے بتائے ہوئے راستے کی طرف متوجہ ہو گا اللہ اسے ہدایت دے دے گا۔

اب روئے سخن مذکور بالا بڑے انبیاء کے معجزوں کے موقف کی طرف پھرتا ہے 'جن کو اللہ نے ایک ہی دین دے کر بھیجا تھا اور انہوں نے قوم کے سامنے ایک ہی دین پیش کیا تھا مگر معجزوں نے اس میں تفرقہ اختیار کر لیا:

وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَيْنَهُمْ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى لَفُضِّى بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ

مریّب (۴۲: ۱۴) ”لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا‘ وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آچکا تھا‘ اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تہا رب پہلے ہی نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقررہ تک فیصلہ ملوئی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے‘ وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔“ ایک تو یہ کہ یہ اختلافات جمالت کی وجہ سے نہ تھے۔ یہ وجہ نہ تھی کہ ان کو اس اصل حقیقت کا پتہ نہ تھا اور یہ پتہ نہ تھا کہ رسولوں کی تعلیم کا ماخذ کیا ہے بلکہ انہوں نے اچھی طرح جانتے بوجھتے شک کیا۔ آپس کی دشمنی کی وجہ سے تفرقہ کیا۔ بغض اور حسد کی وجہ سے یہ اختلافات ہوئے۔ ظالمانہ خواہشات نے مجبور کیا کہ وہ تفرقہ کرس۔ اور ناقابل کنٹرول خواہشات نفس نے ان کو مجبور کیا۔ یہ تفرقہ اس لیے نہیں ہوا کہ ان کے پاس درست عقائد کے لیے کوئی دلیل نہ تھی یا جو نظام زندگی انہیں دیا گیا تھا‘ اس میں سے ان کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ اگر وہ اپنے حقیقی عقیدے اور شریعت پر مخلصانہ طور پر قائم رہتے تو تفرقہ نہ کرتے۔

یہ لوگ اس بات کے مستحق تھے کہ اللہ ان کو پکڑ لیتا اور ان پر جلدی اللہ کا عذاب آجاتا‘ ان کی سرکشی اور ان کے ظلم کی وجہ سے جو انہوں نے یہ تفریق کر کے دین حق کے ساتھ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے تدبیر کائنات کے سلسلے میں پہلے سے ایک فیصلہ کر دیا تھا اور ان کو ایک مقررہ وقت تک مہلت دے دی گئی تھی۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى لَفُضِّى بَيْنَهُمْ (۴۲: ۱۴) ”اگر میرا رب پہلے یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقررہ تک فیصلہ ملوئی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا۔“ اور اس طرح ان اختلافات میں حق ہو چکا ہوتا اور باطل باطل ہو چکا ہوتا اور معاملہ اس دنیا ہی کی زندگی میں ہی ختم ہو چکا ہوتا لیکن ان کو وقت معلوم تک مہلت دے دی گئی ہے۔

وہ نہیں جو ان ابنائے سابقین کے پہلے معجزوں کی وارث نہیں جنہوں نے تفرقہ کیا تھا۔ اور یہ کتاب ان کو ملی تو ان کو یہ کتاب اور یہ نظریہ یعنی انداز میں نہ ملا۔ کیونکہ اختلافات کا ریکارڈ ان کے سامنے تھا اور اس سے کوئی جزی اور قطعی بات سامنے نہ آتی تھی۔ تمام فرقہ وارانہ اختلافات عمل‘ غیر واضح اور پریشان کن تھے۔

وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُّزِبٍ (۴۲: ۱۴) ”اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے تھے۔“ یوں ہوتا ہے عقیدہ تو اس مضبوط چٹان کی طرح ہوتا ہے جس کے ارد گرد سے زمین حرکت میں ہوتی ہے لیکن

وہ مضبوط ہوتا ہے۔ اور ایک مومن اس راسخ چٹان پر مضبوطی سے جم جاتا ہے اور اسے کوئی زلزلہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور عقیدہ وہ ستارہ ہوتا ہے جو اپنی جگہ جما ہوا ہوتا ہے اور لہروں اور طوفانوں کے باوجود مومن کی نظر بلند افق پر اپنے ستارے پر ہوتی ہے جو سمت کا تعین کرتا ہے۔ اس طرح ایک مومن راستہ نہیں بھولتا اگرچہ تاریک سمندروں میں ہو۔ لیکن جب عقیدہ اور نظریہ ہی مشکوک ہو جائے تو پھر کسی کی کوئی بات مستقل نہیں ہو سکتی۔ نہ کسی بے عقیدہ شخص کی کوئی بات مستقل ہو سکتی ہے۔ نہ ایسا شخص کسی بھی سمت پر مستقل رہ سکتا ہے۔ نہ کسی راستے پر مطمئن ہو سکتا ہے۔

عقیدہ اور نظریہ ہوتا ہی اس لیے ہے کہ لوگوں کا نصب العین اور ان کی سمت متعین کرے اور پھر وہ دوسرے لوگوں کی اس راہ پر چلتے ہوئے قیادت کریں۔ اگر وہ خود اضطراب اور شک میں پڑے ہوں تو وہ کسی کی قیادت نہیں کر سکتے۔ ختمہ راختمہ کے کندہ بیدار۔۔۔ جب اس دنیا میں دین اسلام آیا تو اہم سابقہ کے متعین کی یہی حالت تھی۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی اپنی ”کتاب عالم اسلام میں مشریت و مغربیت کی کشمکش“ میں لکھتے ہیں :

”حقیقت یہ ہے کہ دوسرے بڑے ادیان کے لیڈر کھیلنے والوں اور کھلاڑیوں کے ہاتھ میں شکار ہیں اور ان پر تحریف کرنے والوں اور منافقوں کا اثر ہے۔ یہ ادیان اپنی روح اور شکل گنوا بیٹھے ہیں۔ اگر ان ادیان کے پہلے ماننے والوں کو اللہ اب زندہ کر دے تو وہ خود اپنے نام سے منسوب ان ادیان کو نہ پہچان سکیں۔ چنانچہ کبھی تو یہ ادیان تمدن و تمدن اور حکومت و سیاست عطا کرنے والے تھے۔ اب وہاں سے بد نظمی، خلل اور اختلافات اور طوائف الملوک ہوتی ہے، حکام بد عمل ہیں، اپنی ذات میں گم ہیں۔ ان کے پاس اتواہم اور دنیا کے لیے کوئی پیغام نہیں ہے۔ مقاصد عالیہ کے اعتبار سے وہ مفلس ہیں۔ ان کی زندگی کے سوتے خشک ہو چکے ہیں، ہدایات سماوی کی روشنی میں ان کے پاس کوئی راہ نہیں ہے، نہ کوئی مستقل اور محکم نظام زندگی ہے۔“

مشہور امریکی مصنف جارج ایچ۔ وینسن اپنی کتاب جذبات بحیثیت اساس تمدن (Emotion as the basis of civilisation) میں لکھتے ہیں :

”پانچویں صدی اور چھٹی صدی عیسوی میں نکل دین کی دنیا جہاں کے ایک گھرے گڑھے کے وہاں پر تھی۔ کیونکہ جو نظریات تمدن کو جنم دینے میں مدد و معاون تھے، وہ ختم ہو چکے تھے اور اس وقت کے موجودہ ادیان کی جگہ لینے کے لیے کوئی نظریہ موجود نہ تھا۔ اور یہ واضح طور پر نظر آنے لگا تھا کہ جس انسانی تمدن و ترقی پر چار ہزار سال گزرے تھے وہ ختم اور برباد ہونے والی ہے اور انسانیت دوبارہ جہالت، قبائلی نظام کے جنگل میں پھنسنے والی ہے، جس میں کوئی قانون و نظام نہیں ہوتا کیونکہ مسیحیت نے جو اجتماعی نظم و نسق قائم کیا تھا، اس کی عمارت گرنے ہی والی تھی۔ اس لئے کہ مسیحیت فرستے فرستے ہو گئی تھی۔ اس کے اندر کوئی اتحاد اور نظم نہ تھا۔ اس دور میں تمدن کی مثال اس طرح تھی کہ وہ ایک عظیم درخت کی طرح تھی جس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اور اس کا سایہ تمام دنیا پر چھایا ہوا تھا، یہ درخت سخت طوفانوں کی زد میں نہایت کمزوری کی حالت میں کھڑا تھا اور ہلاکت اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی، کہ اس انشاء میں ایک شخص (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہو گیا۔“

یہ صورت حال اس لیے تھی کہ ادیان سماوی کے حاملین نے باہم سخت اختلافات شروع کر دیئے تھے، بعد اس کے کہ ان کے پاس علم آچکا تھا۔ اور ادیان کے اصحاب اولین کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنے تھے ان کو ان کتابوں کی

صداقت کے بارے ہی میں شک تھا۔ ان وجوہات سے اور پوری دنیا میں انسانیت کی قیادت کے لیے کسی مرکز کے ناپید ہو جانے کی وجہ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا اور آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ میدانے راستے پر چل پڑیں۔ لوگوں کو دعوت دیں اور آپ کی واضح اور بین نظریات اور آپ کی مستحکم دعوت کے بارے میں لوگ جو چاہیں، کہیں۔ آپ کسی کی طرف متوجہ نہ ہوں اور یہ اعلان کر دیں کہ یہ دعوت اور یہ نظام وہی ہے جسے اللہ نے تمام انبیاء کو دیا تھا اور اس کے بارے میں وصیت کی تھی۔

فَلِذَلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا

حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَالْيَهُ الْمَصِيرُ (۱۵: ۴۲) ”(چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے) اس لیے اے محمد! اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو، اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ، اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو، اور ان سے کہہ دو کہ: ”اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔“

اب دعوت اسلامی گویا پوری انسانیت کے لیے نئی قیادت تھی۔ یہ ایک دانشمند، صحیح فکر قیادت تھی جس کا نظام زندگی واضح تھا، جس کو یقین محکم حاصل تھا۔ یہ اللہ کی طرف بلائی تھی اور اپنے مقصد کے لیے علی وجہ البصیرت کام کر رہی تھی اور ہنیر کسی کج روی کے امراہی پر گامزن تھی۔ اور وہ اپنے فیصلوں میں بدلتے ہوئے مقاصد اور بدلتی ہوئی خواہشات کے پیچھے نہ جاتی تھی۔ ایسی قیادت جس کا پیغام ایک تھا، جس کی کتاب ایک تھی، نظام و شریعت ایک تھا، جس کا ایمان ماخذ ایمان کی طرف راجع تھا۔ اور جس نے تمام انسانیت کو ایک اہم اصول کی طرف لوٹا دیا تھا۔

وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ (۱۵: ۴۲) ”اور ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں۔“ اس کے بعد یہ دعوت یہ تحریک دعوت حق کو لے کر دنیا میں سر بلند ہوتی ہے اور اقتدار اعلیٰ حاصل کرتی ہے تاکہ وہ لوگوں کے درمیان عدل کرے۔

وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (۱۵: ۴۲) ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔“ یہ ایسی قیادت ہے جس کے پاس اقتدار بھی ہے اور یہ زمین میں عدل گستری کا اعلان کرتی ہے۔ (یہ بات حضورؐ اس وقت کر رہے ہیں جب دعوت اسلامی مکہ میں ہے اور داعی اور تحریک سب ابھی طالب میں محصور ہیں، ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں لیکن وہاں بھی دعوت اسلامی کا مزاج، چھا جانے والا مزاج بالکل واضح ہے) (مترجم)۔ یہ دعوت اعلان کرتی ہے کہ رب واحد ہے

اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ (۱۵:۴۲) ”اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی“۔ اور یہ اعلان بھی کیا جاتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور جواب دہی انفرادی ہے۔

لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ (۱۵:۴۲) ”ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے تمہارے لیے ہیں“۔ اس لیے اب فضول بحث و مباحثہ ختم ہونا چاہئے۔

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۱۵:۴۲) ”ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں“۔

اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَآلِيهِ الْمَصِيرُ (۱۵:۴۲) ”اللہ ہم سب کو ایک روز جمع کرے گا۔ اور اسی کی طرف لوٹتا ہے“۔

یہ ایک آیت ہے لیکن یہ دعوت اسلامی کے مزاج کی وضاحت پوری طرح کر دیتی ہے۔ اس آیت کے فقرے بھی چھوٹے چھوٹے ہیں، لیکن وہ نہایت ہی دو ٹوک اور فیصلہ کن بات کرتے ہیں۔ یہ ایک دعوت ہے جس نے اپنی راہ پر گامزن رہنا ہے اور انسانوں کی خواہشات کا کوئی لحاظ نہیں رکھتا۔ اس نے اس کرۂ ارض پر تقدیر اعلیٰ پر خالص ہونا ہے تاکہ وہ عدل کر سکے۔ اس نے تمام انسانوں کو ایک میدان میں راہ دکھائی ہے جو صراطِ مستقیم ہے اور یہی راہ تمام رسولوں کی راہ رہی ہے۔

چنانچہ دعوت اسلامی کی اس رنگ میں وضاحت کرنے کے بعد اور اہل ایمان کے ایک گروہ کی جانب سے اس دعوت پر لبیک کہنے کے بعد، الجھنے والوں اور بے فائدہ مباحثے کرنے والوں کی باتوں کی طرف التفات کرنے کا کوئی موقعہ نہیں رہا ہے۔ ان کی تمام دلیلیں باطل ہو چکی ہیں، ان کا کوئی وزن نہیں ہے، نہ اہمیت ہے۔ لہذا ان کے بارے میں اب فیصلہ کن بات کر دی جاتی ہے اور ان کو اللہ کی شدید دھمکی کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

وَالَّذِينَ يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتَجِيبَ لَهُ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ

وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ (۱۶:۴۲) ”اللہ کی دعوت پر لبیک کے جانے کے بعد جو لوگ اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں، ان کی حجت بازی ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر اس کا غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے“۔ جو لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور ان کی حجت اللہ کے نزدیک ہی باطل ہے تو پھر ان کا جھگڑا باطل ہے اور ان کی دلیل کی کوئی حیثیت نہیں۔ زمین پر بھی ان کی دلیل مسترد ہے اور آخرت میں ان کو اللہ کے شدید غضب اور عذاب کا سامنا کرنا ہو گا۔ اور یہ فضول جھگڑے اور حجت بازی ان کے لیے سوزوں سزا ہے جبکہ وہ دیکھتے بھی ہیں کہ نہایت ہی قلمس اور دانشمند لوگوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ لہذا ان کی یہ بحث اور مناظرہ حق کی وضاحت کے بعد ہے اور کچھ دوسرے مقاصد کے لیے ہے۔

اب سیاق کلام کا رخ پھر پہلے موضوع کی طرف۔

اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ وَمَا يُدْرِيكُ

لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ﴿۱۶﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا
وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ إِلَّا الَّذِينَ يُمارُونَ
فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿۱۷﴾ اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْقَوِيُّ

۱۰۷ العَزِيزُ ﴿۱۸﴾

۳ ”وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب اور میزان نازل کی ہے اور ہمیں کیا خبر شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آگئی ہو۔ جو لوگ اس کے آنے پر ایمان میں رکھتے ’وہ تو اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں‘ مگر جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یقیناً وہ آنے والی ہے۔ خوب سن لو جو لوگ اس گھڑی کے آنے میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے جسے جو کچھ چاہتا ہے‘ دیتا ہے اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔ جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے‘ اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں‘ اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے‘ اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔“

اللہ نے ایک تو کتاب برحق نازل کی اور اس میں عدل نازل کیا۔ اس میزان عدل کے مطابق لوگوں کے اختلافات کے بارے میں حکم دینے اور فیصلہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ فیصلہ لوگوں کی خواہشات و دعاوی کے بارے میں ہویا ان کی آراء کے بارے میں ہو یا عقائد و نظریات کے بارے میں۔ اور اللہ نے ایک نظام شریعت بھی نازل کیا جس کی اساس عادلانہ فیصلوں پر رکھی۔ قرآن نے عدل کے لیے میزان کا لفظ استعمال کیا۔ یعنی ایسا عدل کہ جس کے مطابق حقوق کا وزن کیا جا سکے۔ اعمال اور تصرفات کو تولایا جاسکے۔

اب روئے سخن کتاب و میزان سے قیامت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور مناسبت مضمون واضح ہے کہ کتاب اور شریعت نے بھی لوگوں کے درمیان اس دنیا میں میزان لگا کر عدل کرنا ہے اور آخرت میں بھی میزان لگا کر عدل و انصاف ہو گا۔ قیامت قیامت چونکہ ایک غیب ہے اور اس کے قیام کی گھڑی کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ بہت ہی قریب ہو۔

وَمَا يُذَرِّبُكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ (۱۷: ۴۲) ”اور ہمیں کیا معلوم کہ فیصلے کی گھڑی قریب آگئی ہو۔“ اور لوگ اس سے غافل ہوں اور وہ ان کے قریب ہو۔ اور یہ آخری عدل و انصاف کا ترازو بھی نصب ہو جائے جہاں کسی عمل کو مہمل نہ چھوڑا جائے گا اور نہ کوئی گم ہو گا۔ یہاں قیامت کے بارے میں مومنین اور منکرین دونوں کی سوچ کو نمایاں کیا ہے۔

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ (۱۸: ۴۲) ”جو لوگ اس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے‘ وہ اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں‘ مگر جو اس پر

ایمان رکھتے ہیں وہ اس ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ یقیناً آنے والی ہے۔“ ظاہر کہ جو اس پر ایمان نہیں لاتے ان کے دلوں پر اس کا خوف ہی نہیں ہے اور ان کو اندازہ نہیں ہے کہ وہاں انہیں کیا پیش آنے والا ہے۔ اس لیے وہ بطور حرج اس کے آنے کا مطالبہ کرتے ہیں، یا اس کے لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اندھے ہیں اور ان کو نظر ہی نہیں آتا۔ رہے وہ لوگ جو ایماندار ہیں تو انہیں قیامت پر بھی یقین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں اور نہایت خوف اور ڈر سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جب وہ آئے گی تو کیا ہو گا، وہ حق ہے۔ اس کا آنا حق ہے اور مومن اسے جانتا ہے کیونکہ مومن اور حق کے درمیان رابطہ ہے۔

اَلَا اِنَّ الَّذِیْنَ یُمارَوْنَ فِی السَّاعَةِ لَفِی ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ (۱۸: ۴۲) ”خوب سن لو جو لوگ اس گمراہی میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں، وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔“ انہوں نے گمراہی میں غلو کر لیا ہے۔ اور اس راہ پر بہت دور نکل گئے ہیں، اب ان کے لیے اس قدر دور نکلنے کے بعد واپسی ممکن نہیں ہے۔ اب آخرت، اس کے انکار اور اس کے بارے میں لاپرواہی اور اس سے ڈرنے کے مضمون سے روئے سخن اس دنیا میں لوگوں کے رزق کی بحث کی طرف مڑتا ہے جو اللہ کسی کو کم کسی کو زیادہ دیتا ہے۔

اَللّٰهُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِهِ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ (۱۹: ۴۲) ”اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے، جسے جو کچھ چاہتا ہے، دیتا ہے اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔“ بظاہر آخرت اور بندوں کے رزق کے مضامین کے درمیان کوئی خاص مناسبت اور ربط نظر نہیں آتا۔ لیکن بعد کی آیت پڑھنے کے بعد ربط ظاہر ہو جاتا ہے۔

مَنْ كَانَ یُرِیدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِی حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ یُرِیدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُوفِیْهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ (۲۰: ۴۲) ”جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے، اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔“ بس اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے، جسے جو کچھ چاہتا ہے، دیتا ہے۔ صالح کو بھی دیتا ہے، برے کو بھی دیتا ہے، مومن کو بھی دیتا ہے، کافر کو بھی دیتا ہے، کیونکہ انسان خود اپنے رزق کا بندوبست نہیں کئے، جب اللہ نے ان کو زندگی دی ہے تو زندگی کے بنیادی اسباب بھی دیئے ہیں، اگر اللہ کافر، فاسق اور بدکار کو رزق نہ دیتا تو وہ اپنے رزق کا بندوبست تو خود نہ کر سکتے اور بھوک لوہیاس سے مر جاتے۔ جب وہ زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ رکھ کر مہلت دینے کا جو قانون مقرر فرمایا تھا، وہ پورا نہ ہوتا۔ اور یہ نہ ہو سکتا تھا کہ لوگ دنیا میں آزادانہ عمل کرس اور ان کے اعمال کا حساب آخرت میں ہو۔ اس لیے اللہ نے رزق کا معاملہ نیکی اور برائی کے دائرے سے باہر رکھا۔ ایمان و کفر کے ساتھ رزق کا تعلق نہیں ہے اور رزق کے معاملے کو انسانوں کی اجتماعی زندگی کے حالات پر رکھ دیا، پھر ان اجتماعی حالات میں بندوں کے طرز عمل پر رکھ دیا اور مال کو بھی لوگوں کے لیے فتنہ اور آزمائش بنا دیا جس پر جزاء و سزا کا دایرہ مدار ٹھہرا۔ پھر آخرت اور دنیا کے لیے علیحدہ علیحدہ کھیت قرار دیا۔ ہر آدمی کو اختیار دے دیا کہ وہ دنیا کے کھیت میں منت کرتا

ہے یا آخرت کے کھیت میں۔ جو شخص آخرت کے لیے کھیتی باڑی کرتا ہے اسے آخرت کی فصل ملے گی اور اللہ بطور انعام اس کے کھیت میں اضافہ کر دے گا اور اس کی نیت کی وجہ سے اس کام میں اس کے لیے اسباب فراہم کر دے گا۔ اس میں برکت دے گا۔ اس آخرت کی کھیتی میں اس کے لیے ضروریات دنیا کا بھی انتظام ہو گا۔ دنیا کے لیے بھی رزق اسے ملے گا۔ اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ بلکہ یہی دنیا کا رزق ہی فلاح آخرت قرار پائے گا۔ جب وہ اس دنیا کے رزق کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور اس میں 'اللہ کے حکم کے مطابق تصرف۔ اتفاق فی سبیل اللہ کرے گا۔ اور جو شخص صرف دنیا کا کھیت چاہے تو اللہ اسے دنیا کا ساز و سامان دے گا اور جو اس کے لیے لکھ دیا گیا ہو وہ اسے ملے گا۔ لیکن آخرت میں اس کا حصہ نہ ہو گا اس لیے کہ اس نے آخرت کی کھیت میں کام ہی نہیں کیا کہ وہاں اس کے لیے کوئی چیز مختصر ہو۔

اب در اطلبکار ان کشت زار دنیا اور طلب گار ان کشت زار آخرت پر ایک نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ صرف دنیا کے کھیت میں کام کرنے والے بہت ہی احمق ہیں۔ جہاں تک دنیا کے رزق کا تعلق ہے تو اللہ دونوں فریقوں کو دیتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے رزق تو ہر کسی کو ملتا ہے جس قدر اس کے مقدر میں لکھا ہوا ہے۔ ہاں آخرت کے کھیت میں کام کرنے والے کے لیے آخرت کا حصہ صرف اس کا ہوتا ہے۔

صرف دنیا کے کھیت کا انتخاب کرنے والوں میں فقراء بھی ہوتے ہیں اور امراء بھی۔ یعنی جس کے پاس جس قدر دولت ہے 'اس معاشرے کے عام حالات کے مطابق جس میں وہ رہتا ہے' اور اس کی ذاتی صلاحیت اور محنت کے مطابق۔ یہی حال ہے آخرت کے کھیت میں کام کرنے والوں کا کہ ان میں امراء بھی ہوں گے اور فقراء بھی۔ کیونکہ رزق کے معاملے میں مومن اور کافر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اختلاف تو یہاں ہو گا کہ کون کس کھیت کا انتخاب کرتا ہے 'فقط دنیا کا' یا آخرت کا۔ احمق وہ ہے جو آخرت کے کھیت کو ترک کرتا ہے جس میں دنیا کا رزق بھی ہے اور آخرت کا بھی۔ اور جب وہ آخرت کے کھیت کو ترک کرتا ہے تو دنیا میں بھی اسے اسی قدر ملتا ہے جو مقدر ہے۔

غرض معاملہ اس سچائی کے مطابق اپنے انجام کو پہنچے گا جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کی ہے۔ حق اور انصاف یہ ہے کہ تمام زندہ چیزوں کو رزق دیا جائے اور آخرت کا حصہ صرف ان لوگوں کے لیے ہو جنہوں نے آخرت کے لیے کام کیا اور جو آخرت کے لیے کام نہ کریں وہ آخرت میں محروم ہوں۔

--- ○ ○ ○ ---

اب پھر ایک سطر پہلے موضوع پر یعنی توحید و رسالت پر۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ۖ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ۖ وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ تَصْيِبٍ ۚ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَى الظَّالِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا

كَسَبُوا وَهُوَ وَاَقْرَبُ بِهِمْ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رَوْضَتِ الْجَنَّةِ
لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿۲۷﴾ ذَلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ
اللَّهُ عِبَادَهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا
الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ وَمَن يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
شَكُورٌ ﴿۲۸﴾

”کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا؟ اگر نپٹے کی بات سنے ہو گئی ہو تو ان کا تفسیر پکا دیا گیا ہوتا۔ یقیناً ان ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم اس وقت اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہوں گے۔ اور وہ ان پر آکر رہے گا۔ بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ جنت کے گلستانوں میں ہوں گے جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے یہی بڑا فضل ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جنہوں نے مان لیا اور نیک عمل کیے۔ لے نبیؐ ان لوگوں سے کہہ دو کہ ”میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں“ البتہ قربت کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔ جو کوئی بھلائی کماے گا ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے۔ بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے۔“

پچھلے پیرا گراف میں یہ کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے لیے جو نظام زندگی اور شریعت تجویز کی تھی وہ وہی ہے جس کے بارے میں نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ علیہم السلام کو تاکید کی گئی تھی۔ وہی بات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی وحی کی گئی۔ اب اس پیرے میں ان سے گرفت کے انداز میں پوچھا جاتا ہے کہ تم بتاؤ تمہاری شریعت اور قانون اور نظام اور نظریہ کا ماخذ کیا ہے؟ تمہاری شریعت کس نے بنائی ہے۔ یہ تم جس نظام کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہو یہ تو تمام شریعتوں کے خلاف ہے۔

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنَ بِهِ اللَّهُ (۲۱: ۴۲) ”کیا کچھ لوگ ایسے شریک خدا ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا۔“ اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اللہ کی شریعت اور قانون کے متضاد کوئی قانون بنانا چاہے وہ کوئی شخص بھی ہو۔ قانون ساری کا اختیار صرف اللہ وحدہ کو ہے کیونکہ اللہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے اس پوری کائنات کے لیے ایک نظام تجویز کر رکھا ہے اور انسان بھی اس کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس لیے انسان کی زندگی کو ضابطے میں لانے کے لیے ایسا ہی قانون چاہئے جو قانونِ فطرت ہو۔ اللہ کے قوانین فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اور یہ صرف اس وقت ہوتا ہے کہ جب قانون وہ ذات بنائے جو نظام فطرت کی موجد ہے۔ اللہ کے سوا

کوئی اور ذات یہ کام نہیں کر سکتی۔ اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ لہذا کوئی شخص انسانوں کی قانون سازی پر وہ اعتماد نہیں کر سکتا جو اللہ کے قانون پر کرتا ہے۔

اگرچہ یہ وہ حقیقت ہے جو ہدایت کی حد تک واضح ہے لیکن پھر بھی زیادہ لوگ اس کے بارے میں جھگڑتے ہیں یا ان کو اس پر یقین نہیں آتا۔ اور پھر بھی وہ جرات کرتے ہیں کہ اللہ کے قانون کے سوا کسی اور اصول کے مطابق قانون سازی کس۔ ان کا زعم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے لیے بھلائی کر رہے ہیں، پھر وہ اپنے حالات کو ان قوانین کے مطابق ڈھالتے ہیں جو انہوں نے خود بنائے ہیں۔ گویا وہ اللہ سے زیادہ جانتے ہیں، زیادہ بہتر فیصلے کرنے والے ہیں، یا اللہ کے سوا ان کے کوئی اور الہ ہیں جو ان کے لیے ایسے قانون بناتے ہیں جس کا اللہ نے اذن نہ دیا ہو۔ اس قسم کے لوگ اللہ کے نزدیک گھنا اٹھانے والے ہیں اور اللہ کی ذات کے خلاف جرات کرتے ہیں۔

اللہ نے انسانوں کے لیے ایسا قانون بنایا ہے جو انسان کی فطرت اور اس کائنات کے ناموس فطرت اور انسان کے حراج کے مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قانون کے مطابق انسانوں کا باہم تعاون اپنے اعلیٰ درجات تک پہنچ جاتا ہے اور اس کائنات کی دوسری قوتوں کے ساتھ بھی انسان کو تعاون حاصل ہو جاتا ہے۔ اللہ نے انسان کی پوری زندگی کے بارے میں قانون بنا دیا ہے۔ صرف جزئیات کا دائرہ چھوڑ دیا گیا جن کے بارے میں انسان نئے حالات کے مطابق خود قانون سازی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ قانون سازی بھی اللہ کے جاری کردہ اصولی قوانین کے دائرے کے اندر کر سکتا ہے۔ اور اگر کسی معاملے میں انسانوں کے درمیان اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اللہ اور رسولؐ کے قانون کے مطابق طے کرنا ہو گا۔ کیونکہ اصول اسلامی شریعت میں طے کر دیئے گئے ہیں اور یہ اصول وہ ترازو ہیں جن کے مطابق تمام انسانوں نے اپنی آراء کو تولنا ہے۔

یوں قانون سازی کا ماخذ طے ہو جاتا ہے اور حکم اللہ کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے جو احکم الحاکمین ہے۔ اس کے سوا کوئی اگر اصول و دستور طے کرے گا وہ اسدی شریعت سے بغاوت کرے گا۔ اللہ کے دین سے بغاوت کرے گا۔ اور اس وصیت اور تاکید کے خلاف چلے گا جو حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ علیہم السلام کو کی گئی۔ اور اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وہی شریعت نافذ کر دی گئی۔

وَلَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ (۲۱: ۴۲) ”اگر فیصلے کی بات طے نہ ہو گئی ہوتی تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا۔“ اللہ نے فیصلہ کی بات یوں کر دی ہے کہ لوگوں کو فیصلے کے دن تک سہلت دے جائے گی۔ اگر یہ بات طے نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں ان کا فیصلہ کر دیتا۔ اور اللہ کی شریعت کے مخالفین کو یہاں ہی پکڑ لیا جاتا۔ ان کا قضیہ جلدی ہی چکا دیا جاتا۔ لیکن اللہ نے سہلت دے دی ہے۔

وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۲۱: ۴۲) ”اور ان ظالموں کے لیے یقیناً دردناک عذاب ہے۔“ یہ عذاب ان کے ظلم کی وجہ سے ان کا منظر ہے اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو شخص اللہ کی شریعت کی مخالفت کرے۔ اور اللہ کے سوا دوسروں کی شریعت کی حمایت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ظالموں کو اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ وہاں ڈرے ہوئے ہیں، سسے ہوئے ہیں۔ عذاب جہنم ان کے سامنے ہے۔

اس سے قبل تو وہ اس سے نہ اڑتے تھے اور نہ خوف کھاتے تھے بلکہ مذاق اڑاتے تھے۔

تَرَى الظَّالِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا كَسَبُوا وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ (۲۲: ۴۲) ”تم دیکھو گے کہ یہ ظالم اس وقت اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ ان پر نگر رہے گا۔“ قرآن کا انداز تعبیر بڑا عجیب ہے کہ یہ لوگ وہاں ”اپنی کمائی“ سے ڈر رہے ہوں گے۔ ان کی کمائی گویا ایک بلا ہوگی جس سے وہ ڈر رہے ہوں گے اور یہ بلا انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے کمائی اور دنیا سے وہ اپنے اس کارنامے (غیر اسلامی قانون سازی) پر بہت خوش تھے لیکن آج وہ اس سے خوفزدہ ہیں لیکن وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ (۲۲: ۴۲) ”اور وہ ان پر واقع ہونے والا ہے۔“

اور اس منظر کی دوسری جھلک مومنین کے بارے میں ہے، جو اس دن سے اڑتے تھے لیکن آج وہ امن و عافیت سے ہیں اور بہت ہی خوشحال ہیں:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رَوْضَاتِ الْجَنَّاتِ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ (۲۲: ۴۲) ذَلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللَّهُ عِبَادَهُ الَّذِينَ آمَنُوا

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (۲۳: ۴۲) ”بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں، وہ جنت کے گلستانوں میں ہوں گے، جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے، یہی بڑا فضل ہے۔“ یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جنہوں نے مان لیا اور نیک عمل کیے۔“

قرآن کی تعبیر بھی نہایت ہی خوش کن، نرم اور دھیمے انداز کی ہے۔ روضات الجنۃ جنتوں کے گلستان، کئی جنتیں اور کئی گلستان۔ ”جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے۔“ بلا حدود و قیود۔ ”یہی بڑا فضل ہے۔“ ”یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے بندوں کو دیتا ہے۔“ یہ حاضر خوشخبری ہے اور یہ سابقہ خوشخبری کے لیے مصداق ہے۔ خوشخبری کی فضا سب سے زیادہ فرحت بخش ہوتی ہے۔ جب کسی کو نعمت حاصل ہو تو خوشخبری دینے سے اس کا احساس اور تیز ہو جاتا ہے۔

نعمتوں کے اس نرم و نازک اور لطف و کرم کے اس بحر پر منظر کے دکھانے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ جو ہدایت میں پیش کر رہا ہوں اور جس سے تمہیں یہ نعمتیں ملیں گی اور جہنم سے دور ہو جاؤ گے یہ میں اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ تم میرے رشتہ دار ہو اور مجھے تم سے محبت ہے میرے لیے یہی اجر کافی ہے۔

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ وَمَن يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا

حُسْنًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ (۲۳: ۴۲) ”اے نبی ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم لوگوں سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ البتہ قربت محبت کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ تم جہنم سے بچ جاؤ۔ جو کوئی بھلائی کرائے گا ہم اس کے لیے بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے۔ بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قادر دالں ہے۔“

جس مضمون کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا بلکہ قربت داری کی محبت مجھے

اس کام پر مجبور کر رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت داری قریش کی ہر شاخ سے تھی اور آپ یہ کوشش فرماتے تھے کہ آپ کے رشتہ دار ہدایت پر آجائیں۔ آپ اس قربت داری کی وجہ سے چاہتے تھے کہ یہ بھلائی ان کو مل جائے اور یہی وافر اجر ہے آپ کے لیے۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ انداز تعبیر آیا ہے اسے پڑھنے کے بعد میرے خیال میں یہی معنی واضح ہے۔ حضرت ابن عباس سے ایک تفسیر بھی مروی ہے۔ یہاں میں اس لیے نقل کرتا ہوں کہ وہ صحیح بخاری میں وارد ہے۔ بخاری نے روایت کی ہے۔ محمد بن بشار سے انہوں نے محمد بن جعفر سے انہوں نے شعبہ بن عبد الملک ابن میسر سے انہوں نے طاؤس سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ انہوں نے آیت الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰی (۲۳: ۴۲) کے بارے میں پوچھا تو سعید ابن جبیر نے کہا ”آل محمد کے رشتہ دار مراد ہیں“۔ حضرت ابن عباس نے کہا تم نے جلدی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قریش کی کوئی شاخ نہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں رشتہ داری نہ ہو۔ اس کے بعد انہوں نے کہا معنی یہ ہے ”الا یہ کہ میرے اور تمہارے درمیان جو قربت داری ہے اس کا تعلق رکھو“۔

اس حدیث کے مطابق معنی یہ ہو گا کہ تم میری قربت داری کا لحاظ رکھتے ہوئے مجھے اذیت دینے سے باز آ جاؤ۔ اور میں جو کچھ کہتا ہوں سنو اور نرم رویہ اختیار کرو۔ یہی کافی اجر ہو گا۔ بس یہی اجر میں تم سے چاہتا ہوں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔

حضرت ابن عباس کی تائید سعید ابن جبیر کی تائید سے زیادہ قریب القسم ہے۔ لیکن میں نے جو مفہوم اوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ قریب اور زیادہ خوبصورت ہے۔ واللہ اعلم۔

بہر حال مفہوم جو بھی ہو مذکورہ باغات اور خوشخبروں کے منظر کے بعد اللہ فرماتا ہے کہ غنیمت اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے اور یہ بات تو بہت ہی بعید ہے کہ جن کو ہدایت کی جا رہی ہے وہ اس پر ان سے اجر طلب کریں لیکن یہ تو اللہ کے فضل و کرم ہیں کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ تجارتی حساب و کتاب نہیں کرتا نہ منصفانہ حساب کرتا ہے۔ اللہ کا حساب مہربانی اور فضل والا ہے۔

وَمَنْ يُّقْتِرْ حَسَنَةً نَّزَّلْنَا فِيهَا حُسْنًا (۲۳: ۴۲) ”جو بھلائی کمائے گا ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے“۔ صرف یہ نہیں کہ ہدایت پر کوئی اجر نہیں لیا جاتا بلکہ مزید انعامات بھی دیئے جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد مغفرت کی جاتی ہے اگر کوئی غلطی ہو اور مزید یہ کہ اللہ کی طرف سے قدر کی جاتی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۲۳: ۴۲) ”بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے“۔ اللہ معاف بھی کرتا ہے پھر خود شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ کس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اپنے بندوں کا کہ وہ راہ راست پر آئے حالانکہ راہ راست پر آنے کی توفیق بھی اسی نے دی۔ پھر مزید یہ کہ ان کی صفات میں اضافہ کرتا ہے برائی کو صاف کرتا ہے اور اس کے بعد قدر دانی بھی کرتا ہے کیا ہی مہربانیاں ہیں! انسان کے لیے تو ایسا سلوک کرنا ممکن نہیں۔ صرف اللہ کا شکر ادا کیا جاسکتا ہے اور توفیق قلب کی جاسکتی ہے۔

لب ردئے غن پھر دجی الہی کی طرف!

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ فَإِنْ يَشِإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۚ
وَيَمَحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ ۚ وَيُحِقُّ الْحَقُّ بِكَلِمَاتِهِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٤٢﴾

”کیا یہ سوگ کتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹا بتان گھڑ لیا ہے؟ اگر اللہ چاہے تو تمہارے دل پر مر کر دے۔ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے، وہ سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔“
اب یہاں مشرکین کے آخری اعتراض کو لیا جاتا ہے۔ وحی کے بارے میں ان کا جو رویہ تھا اس پر یہ ان کی آخری دلیل تھی، اس سے قبل وحی کے مصدر اور سرچشمہ، وحی کے مزاج و ماہیت اور وحی کے اغراض و مقاصد کے مفصل بیان کے بعد اب یہ ان کا آخری سوال ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا (۲۴: ۴۲) ”کیا یہ سوگ کتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹا بتان گھڑ لیا ہے۔“ اور اصل وجہ یہ ہے کہ وہ قرآن کی تصدیق نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کا زعم یہ ہے کہ یہ وحی نہیں ہے، اللہ کی طرف سے کوئی بات نہیں آرہی۔

یہ سوال اس لیے پروردگار نے کہ اللہ کس طرح ایسے شخص کو اجازت دے سکتا ہے کہ وہ اللہ کی مملکت میں اللہ کے نام پر یہ فریب کرتا پھرے۔ اور یہ کہ اس پر وحی آرہی ہے حالانکہ اس پر وحی نہ آرہی ہو۔ اللہ تو اس بات پر قادر ہے کہ ایسے کسی شخص کے دل پر مر لگا دے اور وہ سرے سے کوئی بات ہی نہ کر سکے اور کسی اور دربیہ سے اس باطل کا پوس کھوں دے۔ اور اس طرح اسے مٹا دے اور اصل بات کو واضح کر کے رکھ دے۔

فَإِنْ يَشِإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۚ وَيَمَحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ ۚ وَيُحِقُّ الْحَقُّ بِكَلِمَاتِهِ

(۲۴: ۴۲) ”اگر اللہ چاہے تو تمہارے دل پر مر کر دے۔ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے۔“ اللہ پر تو کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دس میں آتی ہے۔ اگر اللہ کی جانب سے یہ باتیں نہ ہوتیں تو اللہ مٹا دیتا۔

إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۲۴: ۴۲) ”بے شک وہ سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔“
لہذا یہ ایک ایسا شبہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو اللہ کے علم کے خلاف ہے۔ اللہ کی قدرت کو یہ چیلنج ہے اور یہ اللہ کی سنت جاریہ کے خلاف ہے کیونکہ اللہ زمین میں حق کو ٹھیراتا ہے اور باطل کو مٹاتا ہے۔ لہذا یہ وحی برحق ہے۔ حضرت محمد صادق دالین ہیں اور جو اعتراضات و الزامات لگائے جاتے ہیں وہ غلط اور باطل ہیں۔ یوں وحی پر یہاں وقتی طور پر بات ختم ہوتی ہے۔ اور ایک دوسرا سبق شروع ہوتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۳۰ ایک نظر میں

سورت کا یہ دو سرا حصہ انفس و آفاق میں موجود دلائل ایمان کے بیان پر مشتمل ہے اور اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت کے آثار کس طرح قدم قدم پر موجود ہیں۔ اور لوگوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ان آثار کا تعلق ان کی زندگی اور ان کی معیشت کے ساتھ ہے۔ اور پھر اس میں اہل ایمان کی صفات بیان کی گئیں کہ وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کیا کیا امتیازی خصوصیات رکھتے ہیں جبکہ پہلے حصے میں موضوع سخن زیادہ تر وحی و رسالت تھا۔ اس سبق کے آخر میں وحی الہی کی شکلیں بیان کی گئی ہیں۔ اس سورت کے دونوں حصوں میں ربط ظاہر ہے اللہ کے دلائل ایمان کا مقصد بھی یہی ہے کہ لوگ وحی و رسالت کے ساتھ منسلک ہو جائیں۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۳۰ تشریح آیات

۲۵ --- تا --- ۵۳

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ﴿۲۵﴾ وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ ﴿۲۶﴾ وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿۲۷﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلَكِنْ يُنْزِلُ بِقَدَرٍ مَا يَشَاءُ ﴿۲۸﴾ إِنَّهُ يَعْبَادُهُ خَيْرٌ بِصِيرٍ ﴿۲۹﴾

”وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر فرماتا ہے، حالانکہ تم لوگوں کے سب افعال کا اسے علم ہے۔ وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اور زیادہ دیتا ہے۔ رہے انکار کرنے والے، تو ان کے لیے سخت سزا ہے۔ اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے، نازل کرتا ہے۔ یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے۔“

یہ بیان اس منظر کے بعد آتا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ قیامت کے دن ظالم ڈرے ہوئے ہوں گے، یہ خوف انہیں اپنے کرتوتوں کی بلائے ناگہانی سے ہو گا جو یقیناً آنے ہی والی تھی اور پھر اس منظر کے بعد کہ اہل ایمان جنات کے گلستاں میں ہوں گے اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا، آپ جو پہنچا رہے ہیں، اللہ کی طرف سے پہنچاتے ہیں اور یہ کہ اللہ تو دلوں کے راز تک جانتا ہے۔“

ان حالات میں کہا جاتا ہے کہ مایوس نہ ہو جاؤ، تم جس گمراہی میں پڑے ہو، کسی بھی وقت تم اس سے باہر نکل کر سکتے ہو۔ قبل اس کے کہ آخری فیصلہ ہو جائے۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہے، اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے اور سینات کو دوا معاف کرتا ہے۔ لہذا ناامیدی اور معصیت ہی میں آگے بڑھنے پر تم مجبور نہیں ہو۔ سابقہ گناہوں کے بارے میں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ جانتا ہے وہ سچی توبہ کو بھی جانتا ہے۔ سابقہ گنہوں کو بھی جانتا ہے اور معاف کرتا ہے۔ اس

جو بصورت طرز بیان کے درمیان بھی مومنوں اور کافروں کا انجام ذکر کیا جاتا ہے، جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں وہ اپنے رب کی دعوت قبول کرتے ہیں اور رب پھر ان پر مزید فضل فرماتے ہیں۔

وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ (۲۶: ۴۲) ”اور انکار کرنے والوں کے لیے شدید سزا ہے۔“
جبکہ توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور ہر شخص اس عذاب شدید سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ اور جو توبہ کرے گا اسے توبہ کی فضل الہی بطور انعام ملے گا۔

آخرت میں اللہ کا فضل بڑا حساب ہو گا اس پر کوئی حد اور قید نہیں ہے۔ رہا اس جہاں میں بندوں کے لیے رزق کا انتظام تو اس پر اللہ نے حدود و قیود رکھے ہوئے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کو جانتا ہے کہ ان کا طرف کتنا ہے۔ ماحدود فضل الہی کے وہ متحمل نہیں ہیں۔

وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلَكِنْ يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ

بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ بَصِيرٌ (۲۷: ۴۲) ”اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے، نازل کرتا ہے۔ یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا رزق چاہے وہ جتنا بھی ہو، آخرت کے فیض اور آخرت کے ارزاق کے مقابلے میں کفاف ہی ہے۔ اللہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے۔ اللہ ان چیزوں پر اس کو خوب جانتا ہے کہ ان کو ایک حد تک ہی مالدار ہونا چاہئے۔ اور اگر ان کے لیے رزق اسی طرح وسیع کر دیا جاتا جس طرح آخرت میں ہے تو یہ زمین پہ طوفان بد تمیزی مچا دیتے۔ ان کا ظرف کم ہے۔ یہ اپنے حدود میں نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک حد تک ہی مالدار ہونا برداشت کر سکتے ہیں۔ اور اللہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے۔ لہذا اس جہاں میں ان کے لیے رزق کو محدود کر دیا ہے۔ ایک مقدار کے مطابق، جو ان کے لیے برداشت کرنے کے قابل ہو اور جو اس زمین کی آزمائشوں میں کامیاب ہوں گے اور امتحان پاس کر لیں گے اور سلامتی کے ساتھ دار بقاء تک پہنچ جائیں گے ان کو اللہ کا فیض اور فضل کبیر وہاں بلاحدود و قیود ملے گا۔

--- ۰۰۰ ---

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ ۖ
وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ﴿۲۸﴾

”وہی ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے“ اور وہی قابل تعریف ولی ہے۔“

یہ ایک دوسرا مدار ہے جو ان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اس دنیا میں بندوں پر اللہ کے فضل و کرم کے کئی رنگ ہیں۔

بعض اوقات سخت خشک سالی ہو جاتی ہے ' بارشیں بند ہو جاتی ہیں اور وہ زندگی کی پہلی ضرورت کی فراہمی سے بھی عاجز آ جاتے ہیں ' زندگی کی پہلی ضرورت پانی ہے - حالت یہاں تک آ پہنچتی ہے کہ یہ مایوس ہونے لگتے ہیں ' اس کے بعد اللہ بارشیں برسا دیتا ہے - ان کی حاجت پوری ہوتی ہے - اللہ کی رحمت پھیل جاتی ہے - ' زمین زندہ اور سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے - بیج پھوٹنے لگتے ہیں ' نباتات اٹھنے لگتے ہیں - نضا لطیف ہو جاتی ہے - اور ہر طرف زندگی حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے - چہرے کھل جاتے ہیں ' دل کھل جاتے ہیں ' امیدیں بڑھ جاتی ہیں اور انگلیں پوری ہوتی ہیں - یاد رہے کہ مایوسی اور امید و رحمت کے درمیان پس چند لمحے ہوتے ہیں - چند لمحوں میں اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں - آسمانوں کے دروازے پانی کھول دیتے ہیں -

وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ (۲۸: ۴۲) "اور وہی قابل تعریف ولی ہے" - وہ مددگار ' کفیل ہے اور اپنی دلت و صفات میں محمود ہے -

یہاں قرآن مجید نے بارش کے لیے غیث کا لفظ استعمال کیا ہے - جس میں امداد اور دادرسی کا مفہوم شامل ہے - اس وقت امداد دینا جب لوگوں پر فحش اور معیبت ہو ' فحش ہے - اسی طرح اس مدد کے نتائج کو رحمت کا نام دیا -

وَيُنْشِرُ رَحْمَتَهُ (۲۸: ۴۲) "اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے" اس سے تروتازگی ' سرسبزی ' امید اور خوشی کے معانی نکلتے ہیں - جو نباتات کے پھوٹنے سے ' اور پھلوں کے ٹکنے سے ظاہری طور پر رحمت کے پھیلاؤ کی شکل میں نظر آتے ہیں جب بھی طویل خشک سالی کے بعد باران رحمت کا نزول ہوتا ہے تو لوگوں کی خوشی ' جسم اور اعصاب کی تروتازگی اور قلب و شعور کا سرور قابل دید ہوتا ہے - ایسی خشک سالی کے بعد جب زمین نباتات سے سرسبز ہو جاتی ہے تو انسانی دلوں سے تمام پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں - زمین مردنی کے بعد زندہ ہو جاتی ہے -

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا مِنْ دَابَّةٍ
وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ ﴿۴۳﴾ وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ
أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ ﴿۴۴﴾ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ﴿۴۵﴾ وَمَا لَكُمْ
مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِن قَوْلٍ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۴۶﴾

"اس کی نشانیوں میں سے ہے - یہ زمین اور آسمانوں کی پیداوار ' اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں - وہ جب چاہے انہیں اکٹھا کر سکتا ہے - تم لوگوں پر جو معیبت بھی آئی ہے ' تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے - اور رحمت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کرتا ہے - تم زمین میں ' اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو ' اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے" -

یہ نشانی ہر وقت انسانی نظروں کے سامنے ہے اور جب وحی آئی تو اس نے اس کی شہادت دی - وحی میں تو انہوں

نے شک کیا اور جھگڑتے رہے لیکن آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی جو نشانی ہے اس میں تو کوئی شک نہیں وہ تو قطعی الدلائل ہے۔ یہ فطرت انسانی کو فطری زبان میں خطاب کرتی ہے۔ کوئی سنجیدہ گفتگو کرنے والا اس کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں رکھ سکتا۔ یہ نشانی یہ بتاتی ہے کہ جس ذات نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی ہے وہ انسان نہیں ہے۔ نہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی اس نشانی کا خالق نظر آتا ہے۔ لہذا کسی خالق و مدبر کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اس کائنات کی ہولناک ضخامت، اس کی رفتار کی باریک اور دقیق یکسانی، اس کے نظام کا حیران کن تسلسل اور اس پوری کائنات کے اندر ایک ہی قانون طبیعت اور ناموس فطرت کا اجراء، ان سب امور کی کوئی عقلی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جاسکتی کہ ایک ذات ہے جو انہ العالمین ہے، جو اس کی تدبیر کر رہا ہے۔ رہی انسانی فطرت تو وہ براہ راست اس استدلال کو اور ان نشانیوں کو دیکھ پاتی ہے اور ان کا ادراک کر کے مطمئن ہو جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ ایک بھی لفظ کسی خارجی ذریعہ سے سنے۔

آسمانوں اور زمین کی یہ بڑی نشانی اپنے اندر کئی نشانیاں رکھتی ہے۔

وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَآئِبَةٍ (۲۹: ۴۲) ”اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھے ہیں۔“ اس کو چھوڑ دیجئے کہ آسمانوں میں زندگی ہے یا نہیں، ابھی تک ہمیں اس کا علم نہیں، البتہ اس زمین کے اندر زندگی کی جو رنگارنگی ہے یہ ایک نہایت ہی عظیم نشانی ہے۔ یہ ایک ایسا راز ہے کہ ابھی تک اس کی ماہیت تک کوئی نہیں پہنچا ہے۔ یہ تو دور کی بات ہے کہ کوئی اسے پیدا کر سکے۔ یہ ایک پوشیدہ راز ہے کہ زندگی کہاں سے آتی ہے۔ کس طرح آتی ہے۔ اجسام کے اندر کس طرح مل جاتی ہے۔ آج تک حیات کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے جس قدر مساعی کی گئی ہیں اس راز کے دریافت کے تمام دروازے بند پائے گئے ہیں جو کچھ دریافت ہوا، وہ حیات کے بعد زندگی کی ترقی اور نشوونما کے بارے میں ہے۔ زندگی کی رنگارنگی اور اس کے مقصد اور حکمتوں کے بارے میں ہے۔ اور اس محدود دائرے میں بھی آراء اور نظریات کا بے حد اختلاف ہے۔ ظاہری زندگی کے پیچھے کیا ہے، وہ پردہ راز کے پیچھے ہے۔ کوئی آنکھ وہاں تک نہیں دیکھ سکتی۔ کوئی قوت مدد کہ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ یہ امر الہی ہے، اللہ کے سوا اس کو کوئی نہیں جانتا۔

یہ رنگارنگ زندہ مخلوق جو سطح زمین کے اوپر ہے، سطح کے اندر ہے اور سمندروں کے اندر ہے اور لاناختنا نضاؤں میں ہے۔ ان میں سے انسان نہایت ہی معمولی حصے کے بارے میں جانتا ہے۔ رہی یہ کہ اس نہایت ہی وسیع اور ناقابل تصور وسعتوں والی کائنات میں اور کوئی زندہ مخلوق ہے یا نہیں اس کے متعلق ہمیں کوئی معلومات نہیں ہیں ہم تو زمین کے اوپر موجود اور مشہود حیات میں سے بھی نہایت ہی تھوڑے حصے کو معلوم کر سکے ہیں، یہ زندہ مخلوقات جو آسمانوں اور زمین میں ہے اسے اللہ جس دن چاہے گا جمع کرے گا۔ کوئی ایک فرد بھی جو یہاں وجود کائنات کے بعد پیدا ہوا ہے، رہ نہ جائے گا یا غائب نہ ہو سکے گا۔

انسانوں کی حالت تو یہ ہے کہ اگر ان کے بنجرود سے پرندوں کی ایک ڈار اڑ جائے یا کھیلوں کے ایک چھتے سے ایک ڈار اڑ جائے تو وہ اسے جمع نہیں کر سکتے۔ رہے پرندوں کے ڈار، وہ کہتے ہیں، یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ پھر کھیلوں، چوہنیوں اور اسی طرح کے دوسرے حیوانات کے چھتے تو ان کے بارے میں بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ ہی ان کو گن سکتا ہے۔ حشرات ارض، کیر، کر، اور جراثیم تو ان کی تعداد اور ان کی جگہ کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ پھلیوں اور

دوسرے حیوانات۔ مگر تو ان کی تعداد اور اقسام کے بارے میں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ پالتو اور جنگلی جانوروں کی اقسام و تعداد کہ کہاں کہاں بکھرے ہیں اس کا علم بھی صرف اللہ کو ہے اور پھر انسانوں کی آبادیاں اور گروہ اور اقوام و انواع سے اللہ ہی باخبر ہے کہ وہ کہاں کہاں رہتے رہتے ہیں، رہتے ہیں اور رہیں گے۔ ان اقسام کے علاوہ بے شمار مخلوق ہیں جو تعداد میں ان سے زیادہ اور جو زمین و آسمانوں میں مخفی ہیں، ان کو بھی اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ اللہ ہی کی مخلوق ہے۔ اللہ جب جمع کرے گا تو وہ ایک ہی لفظ کے ساتھ چشمِ زدن میں جمع کر دے گا۔ ایک ہی آیت میں ان سب زندہ چیزوں کے بکھیرنے اور پھر جمع کرنے کے دونوں مناظر دکھا دیئے گئے، قبل اس کے کہ فقرہ پوری طرح زبان سے ادا ہو جائے۔ منظر پہلے ہی ذہن کے پردے پر آکر چلا جاتا ہے۔ یہ قرآن کا مخصوص انداز ہے۔

ان مناظر کے درمیان ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارے اعمال کی وجہ سے اس جہاں میں تم پر وبال بھی آتے رہے ہیں۔ یہ وبال پورے نہیں بلکہ ان کا ایک حصہ تم پر آتا ہے، اکثر تو اللہ معاف کر دیتا ہے کیونکہ اللہ انسانوں کو ان کے اعمال کی پوری پوری سزا نہیں دیتا۔ اکثر اعمال بد سے اللہ درگزر کر دیتا ہے۔ اللہ ان کو یاد دلاتا ہے کہ تم تو بہت ہی عاجز و لاچار ہو۔ تم اللہ کے کسی منصوبے کو تو نہیں روک سکتے۔ تم تو اس کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہو۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ (۴۲: ۳۰) وَمَا

أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (۴۲: ۳۱)

”تم لوگوں پر جو مصیبت بھی آئی ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے۔ اور بہت سے قصوروں سے وہ پیسہ ہی درگزر کر جاتا ہے۔ تم زمین میں اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو، اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے۔“ پہلی آیت میں اللہ کے عدل کی عکاسی ہے، اور انسانوں پر اللہ کی رحمت کی تجلیات ہیں۔ اس پر جو مصائب آتے ہیں اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے آتے ہیں۔ لیکن اللہ تو تمام بد کاریوں پر خود انہیں پکڑ پکڑ کر معاف کر دیتا ہے کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ انسان بہت ضعیف ہے۔ اس کی فطرت کے رجحانات اور اس کا ماحول اسے بد کاری پر مجبور کرتا ہے۔ اس لیے بہت سے گناہوں کو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ اس کی رحمتیں اور مہربانیاں ہوتی ہیں۔

دوسری آیت میں انسان کی کمزوری کا اظہار ہے کہ وہ زمین پر اللہ کے کسی منصوبے کو نہیں روک سکتا۔ (اسی طرح وہ دعوتِ اسلامی کو نہیں روک سکتا) اس کا کوئی ولی و مددگار اللہ کے سوا نہیں ہے۔ لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے حقیقی ولی کی طرف لوٹ آئے۔

وَمِنَ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ إِنَّ يَتَشَأُ يُسْكِنَ

الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلَى ظَهْرِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّخَلٍ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿۳۳﴾

أَوْ يُوقِفَهُنَّ بِمَا كَسَبْنَ وَيَعْفُ عَنْ كَثِيرٍ ﴿۳۴﴾ وَ يَعْلَمُ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ

فِي آيَاتِنَا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيصٍ ﴿۳۵﴾

”اس کی نشانوں میں سے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اللہ جب چاہے ہوا کو ساکن کر دے اور یہ سمندر کی پیٹھ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو کمال درجہ مبر و شکر کرنے والا ہو۔۔۔ یا (ان پر سوار ہونے والوں کے) بہت سے گناہوں سے درگزر کرتے ہوئے ان کے چند ہی کرتوتوں کی پاداش میں انہیں ڈبو دے اور اس وقت ہماری آیات میں جھگڑے کرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔“

پہاڑوں کی طرح دریاؤں میں چلنے پھرنے والے بحری جہاز اللہ کی نشانوں میں سے مزید نشانیاں ہیں۔ یہ نشانی بھی حاضر و مشہود ہے۔ یہ نشانی ایسی ہے جو اللہ کی بنائی ہوئی نشانوں میں سے کئی نشانوں پر قائم ہے اور اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ یہ سمندر اللہ کے سوا کون ہے جس نے اسے بنایا؟ انسانوں نے اسے بنایا اور نام نہاد الہوں نے۔ کون ہے جس نے اسے یہ گہرائی، یہ کثافت اور یہ وسعت دی کہ وہ بڑی بڑی کشتیوں اور جہازوں کے اٹھانے کے قابل ہو گیا۔ پھر جس مواد سے کشتیاں بنتی ہیں اس مواد میں ایسی خصوصیت کس نے رکھی کہ وہ سطح سمندر پر تیرتا پھرے اور پھر یہ ہوا جو اس وقت ان بحری جہازوں کو چلاتی تھی اور اس وقت کے مخاطب جانتے تھے اور ہمارے دور میں وہ تمام قوتیں جن کو اللہ نے انسانوں کے لیے مسخر کیا ہے اور وہ انہیں عظیم الجثہ جہازوں کے چلانے کے لیے کام میں لاتے ہیں۔ یہ قوتیں کس نے پیدا کیں جو جدید سے جدید پہاڑوں جیسے جہازوں کو چلاتی ہیں۔

انْ يَشَأْ يُسْكِنَ الرِّيحَ فَيَظْلِلْنَ رَوَاكِدَ عَلَى ظَهْرِهِ (۳۳: ۴۲) ”اللہ جب چاہے ہوا کو ساکن کر دے اور یہ سمندر کی پیٹھ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔“ اور بعض اوقات یہ جہاز اس طرح کھڑے رہ جاتے تھے جسے ان کے اندر کوئی زندگی نہیں ہے۔

انْ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٌ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۳۳: ۴۲) ”اس میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو کمال درجے مبر و شکر کرنے والا ہو۔“ یعنی ان جہازوں کے چلانے میں اور ان کے کھڑے کرنے میں نشانیاں ہیں۔ قرآن کریم میں بسا اوقات مبر اور شکر ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ مبرا بظاہر ہوتا ہے اور شکر نعمتوں پر ہوتا ہے خوشی اور غم اور مبر اور شکر دونوں انسانی نفسیات میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

اَوْ يُوقِنُھُمْ بِمَا كَسَبُوْا (۳۴: ۴۲) ”یا ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں ڈبو دے۔“ ان کشتیوں کو پاش پاش کر دے یا ان کو غرق کر دے اس وجہ سے کہ لوگوں نے گناہوں اور معاصی کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے ایمان کی مخالفت کی حالانکہ اللہ کی تمام مخلوقات مومن ہے انسانوں میں سے بعض لوگ انکار کرتے ہیں۔

وَبَعْفٌ عَنْ کَثِيْرٍ (۳۴: ۴۲) ”اور اللہ بہت سے گناہوں سے درگزر کرتا ہے۔“ اس لیے وہ لوگوں کو قدم قدم پر ان کے ہر گناہ پر نہیں پکڑتا بلکہ درگزر فرماتا ہے اور معاف کر دیتا ہے۔

وَيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُعَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰتِنَا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ (۳۵: ۴۲) ”اور اس وقت

ہماری آیات میں جھگڑا کرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔“ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو اپنے عذاب کے سامنے لاکھڑا کرتا، ان کی کشتیاں غرق کر دیتا اور وہ نجات نہ پا سکتے۔۔۔۔۔ یوں ان کو یہ ہت سبھائی جاتی ہے کہ وہ اس دنیا کے جس ساز و سامان اور کاروبار کے مالک ہیں، وہ بھی اللہ کی ہدایت کی زد میں ہیں۔ لہذا دنیا میں کسی چیز کے لیے قرار و ثبات نہیں، ماسوائے تعلق باللہ کے۔

--- ۰۰۰ ---

اس کے بعد ان کو ذرا اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس دنیا میں ان کو جو ساز و سامان دیا گیا ہے، ذرا اس پر نگاہ ڈالیں کہ یہ کس قدر مختصر وقت کے لیے ہے۔ اور اصل باقی رہنے والی چیز اور دولت وہی ہے جو اللہ کے ہاں ذخیرہ کی گئی ہے۔ اور یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں اور رب تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں۔ یہ بیان آگے جاتا ہے اور اہل ایمان کی صفات گناتا ہے جو ان کو ایک امت بنا دیتی ہیں، جس کے لگ خدو خال ہوتے ہیں اور وہ امت تمام امتوں سے ممتاز ہے۔

فَمَا أُوتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَّاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ
خَيْرٌ وَّاَبْقٰی لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۱۰ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ
كَبِيْرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشِ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝۱۱ وَالَّذِيْنَ
اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۝۱۲ وَاٰمُرُهُمْ شُوْرٰی بَيْنَهُمْ وَمِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۱۳ وَالَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝۱۴ وَجَزَاؤُ
سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۝۱۵ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ
الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۶ وَلَمَنْ اٰتٰتَصَّرَبَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝۱۷ اِنَّمَا
السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ ۝۱۸ فِی الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۝۱۹
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۲۰ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ ۝۲۱ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ
الْاُمُوْرِ ۝۲۲

”جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سر و سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ ستر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں جو بڑے

بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کرتے ہیں، جو اپنے رب کا حکم ملتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں، ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔۔۔ برائی کا بدلہ دینی ہی برائی ہے، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے دہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ میں ان کو مدد مت نہیں کی جاسکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق ریادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے، ابستہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔“

اس سورت میں اس سے قبل قرآن مجید نے انسانیت کی حالت کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اہل کتاب نے علم آ جانے کے باوجود باہم اختلافات کیے اور یہ اختلافات غلط فہمی اور جہالت پر مبنی نہ تھے۔ حالانکہ ان کے پاس کتاب الہی صاف صاف آگئی تھی۔ بلکہ انہوں نے باہم یہ تفرقہ حسد اور دشمنی کی وجہ سے کیا۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ عہد نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے لوگوں کے لیے وہ آسمانی دین اور ایک منہج اور نظام زندگی مقرر کر دیا گیا تھا۔ اور یہ وصیت بھی کی گئی تھی کہ اسے قائم کرو۔ اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جن لوگوں نے حسد اور دشمنی کی وجہ سے منہج الہی میں اختلاف کیا ان کے بعد جب کوئی کتب ان کی اگلی نسلوں کو ملی تو ان اختلافات کی وجہ سے وہ سرے سے کتابوں کے بارے میں شک میں پڑ گئے۔ جب اہل کتاب اور اہل دین سامدی کا یہ حال ہو گیا تھا تو جن اقوام کے پاس کوئی کتب یا کوئی دین ہی نہ تھا، ظاہر ہے کہ ان کی حالت تو ان سے بھی بدتر ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ انسانیت کو ایک صالح قیادت کی ضرورت تھی تاکہ وہ انسانوں کو ان اندھی جاہلیتوں سے نکالے اور ان کی رہنمائی کر کے ان کو ایک مضبوط رسی میں باندھ دے۔ اور ان کی رہنمائی ایک ایسے راستے کی طرف کرے جو اللہ تک پہنچاتا ہو جو اس وجود کا رب ہے۔

اس لیے اللہ نے یہ آخری کتب عربی زبان میں اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری تاکہ ام القری، مکہ مکرمہ اور اس کے ماحول میں رہنے والوں سے دعوت کا آغاز کرے اور ان کے اندر وہی دین قائم کرے جس کی سخت تاکید حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو کی گئی تھی تاکہ تمام ادیان حقہ کی کڑیاں باہم مل جائیں اور آغاز تاریخ سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی منہج، ایک ہی دین اور ایک ہی شریعت ہو اور ایک ایسی جماعت یہاں قائم کی جائے جو اس تاریخی دعوت کی محافظ ہو، اس کی قیادت کرے اور اس کرۃ ارض پر اس دعوت کو اللہ کی فضا کے مطابق برپا کر کے یہاں اس منہج کو قائم کرے۔ اور یہ کام اس شکل و صورت میں ہو جو اللہ کو پسند ہو۔ لہذا زیر بحث آیات میں اس جماعت کے خدوخال بیان ہو رہے ہیں۔ جس نے یہ عظیم فریضہ سرانجام دینا ہے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ آیات مکی ہیں اور مدینہ میں اسلامی نظام حکومت کے قیام سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ لیکن ہم مکہ میں بھی تحریک اسلامی کی امتیازی خصوصیت میں سے ایک خصوصیت دیکھتے ہیں۔

و امرہم شورى بیہم (۳۸: ۴۲) ”اور اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاورت کا قیام اسلامی سوسائٹی اور مسلمانوں کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ اسلامی جماعت کی بنیادی خصوصیت ہے۔ جماعتی نظام شوریٰ پر قائم ہوتا ہے۔ یہی نظام جماعت سے آگے بڑھ کر پھر مملکت کا حصہ بن جاتا ہے۔ یعنی اسلامی معاشرے کی جان شوریٰ ہے اور یہ اس کے اندر پھیلتی جاتی ہے۔ اس طرح اس جماعت کی دوسری خصوصیت یہ بنائی گئی ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ (۳۹: ۴۲) ”جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ اس کا مقابلہ کرتے ہیں“۔ باوجود اس کے کہ مکہ میں حکم بھی تھا کہ صبر کرو اور زیادتی کا بدلہ زیادتی سے نہ دو اور یہ حکم اس وقت تک کے لئے تھا جب ہجرت کے بعد قتال کی اجازت دے دی گئی اور یہ کہا گیا۔

أُذِّنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بَانِهِمْ ظَلَمُوا وَأَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ (۳۹: ۲۲) ”اجازت دے دیجیئے ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً شہنشاہی مدد پر قادر ہے“۔ تو اس صفت کا ان کی آیات میں ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ تحریک اسلامی کا مزاج یہی ہے کہ وہ زیادتی کے خلاف سینہ سپر ہو جاتی ہے اور اس سے پہلے اور بعد کے جو احکام ہیں وہ صبر کرنے اور دیکھنے کے لیے ہیں۔ اور استثنائی احکام ہیں اور ایک متعین وقت تک کے لیے ہیں۔ یہاں اس کی سورت میں چونکہ جماعت مسلمہ کی بنیادی صفات قلم بند کی جارہی تھیں اس لیے یہاں ذکر کر دیا کہ اگرچہ فی الوقت انتصار کی ممانعت تھی لیکن یہ صفت اہل ایمان کی بنیادی صفات میں سے ہے۔

بہر حال جماعت مسلمہ کی صفات کے ضمن میں ایسے امور کا ذکر جن پر عمل نہ ہو رہا تھا اور نہ جماعت کے ہاتھ میں کسی ملک کی عملی قیادت تھی اور جماعت بھی مکہ میں مصائب برداشت کر رہی تھی یہ اس لیے ہوا کہ اس جماعت نے پوری انسانیت کی قیادت کرنی تھی اور اس لیے برپا کیا گیا تھا کہ وہ پوری انسانیت کو اندھیروں سے نکال کر نور اسلام میں لائے گی۔ لہذا جماعت مسلمہ کے اندر ان صفات کا پیدا ہونا اور جماعت کے لیے ان مقاصد کے لیے تیاری کرنا ضروری تھا۔ یہاں ان باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ جب اس کے ہاتھ میں اللہ آئے تو وہ اس کی اہل ہو۔ لہذا ان صفات پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے کہ یہ کیا ہیں؟ ان کی حقیقت کیا ہے؟ اور انسانی معاشرے میں ان کی اہمیت کیا ہے۔

یہ ہیں ایک اسلامی جماعت کی صفات۔ ایمان، توکل، اجتناب کبار اور فواحش، غصے کے وقت معافی، اللہ کی پکار پر بیک کھنا، اقامت صلوٰۃ، ہر معاملے میں مشاورت، اتفاق فی سبیل اللہ، ظلم و زیادتی کا مقابلہ، غفو، اصلاح اور صبر۔ یہ کیا ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ اور ان کی اہمیت کیا ہے۔ مناسب ہے کہ ان صفات کو قرآنی ترتیب کے مطابق بیان کرس۔

قرآن کریم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طے کردہ ہتھک لور داہی میزان کے سامنے کھڑ کر دیتا ہے تاکہ وہ داہی اور مستقل قدروں اور عارضی اور بدلنے والے حالات کے درمیان فرق و امتیاز کر سکیں۔ اور ان کی سوچ میں فرق نہ ہو ورنہ ان کی نگاہ میں ہر چیز کی حقیقی قدر و قیمت صحیح نہ رہے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مومنین کی صفات کے بیان سے پہلے ایک مستقبل میزان اور بیان بیان کر دیا کہ ایک مسلم جماعت کی صفات کے لیے یہ بیانہ ہے۔

فَمَا أُوتِيتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَّاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَابْقٰی (۳۶: ۴۲)

”جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ کھس دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔“ اس زمین کا ساز و سامان بہت ہی پرکشش اور ذرق و برق ہے۔ کھانے پینے کے سامان، ولاد، شہوات، لذائذ، مرتبہ اور اقتدار وغیرہ اور بعض نعمتیں وہ ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں کو زمین میں بطور مہربانی دی ہیں اور یہ اللہ کی جانب سے خالص بخشش ہیں۔ ان کو اللہ نے اس دنیا میں معصیت اور طاعت پر موقوف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ اطاعت شعار کی ان قلیل بخشش میں برکت ہوتی ہے اور بدکار کے ہاتھ میں اگر بہت کچھ ہو تب بھی اس سے برکت چھن جاتی ہے۔

لیکن یہ سب امور باقی اقدار نہیں ہیں۔ یہ متاع اور اس زندگی کا سروسامان ہے۔ یہ سروسامان محدود وقت کے لیے ہے۔ یہ نہ کسی کا مرتبہ بلند کرتا ہے نہ گرتا ہے۔ یہ اللہ کے نزدیک نہ شرافت و عزت کی دلیل ہے اور نہ کراہت اور ناپسندیدگی کی دلیل ہے۔ نہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسے شخص سے اللہ راضی ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اللہ ناراض ہے۔ بس یہ اس زندگی، فانی زندگی کا سامان ہے اور اس کے مقابلے میں۔

وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ (۳۶: ۴۲) ”جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔“ بہتر ہے اپنی قیمت کے اعتبار سے اور پائیداریوں کہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ لہذا اس فانی دنیا کا ساز و سامان بمقابلہ آخرت کچھ بھی نہیں ہے۔ بہت ہی محدود اور کم قیمت ہے اور چند روزہ ہے۔ ایک فرد کے لیے صرف اسی کی زندگی میں کار آمد ہے اور پھر ہر شخص سوچ لے کہ وہ کتنی عمر لے کر آیا ہے اور کتنی رہ گئی ہے۔ اور بمقابلہ ایام اللہ یہ تو بہت کم بلکہ لمحات ہیں جس طرح چشم زدن۔

اس تمہیدی بیان اور اصل معیار نیک و بد کے بیان کے بعد اب اللہ ان مومنین کی صفات بیان فرماتا ہے جن کے لیے اللہ نے بہتر اور پائیدار انجام اپنے ہاں تیار کر رکھا ہے۔

وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ لِلَّذِينَ آمَنُوا (۳۶: ۴۲) ”اور اللہ کے ہاں جو ہے وہ بہتر اور پائیدار ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں۔“ ایمان وہ حقیقت ہے کہ جب یہ ذہن میں بیٹھ جائے تب ہی جا کر اس کے ذریعہ انسانوں کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس کائنات کی ہر چیز کی اصل ”قدر“ معلوم کر سکیں۔ صرف ایمان کے ذریعہ ہم اس کائنات کی حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں کہ اس کائنات کو اللہ العالمین نے بنایا ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے بعد ہی کوئی شخص اس کائنات کے ساتھ کوئی معاملہ کر سکتا ہے۔ اس طرح انسان اس کی حقیقت کو معلوم کر لیتا ہے۔ اس کے اندر پائے جانے والے قوانین قدرت کا حقیقی ادراک کر سکتا ہے اور اس طرح یہ انسان اپنی حرکت کو اس کائنات کی حرکت کے ساتھ ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ پھر انسان اس کائنات کے کلی قوانین قدرت سے انحراف نہ کرے گا کیونکہ اس طرح یہ ہم آہنگی ختم ہو جائے گی اور یہ ہم آہنگی اس قدر اہم ہے کہ اس کے ساتھ انسان اس دنیا میں بھی جیسی زندگی بسر کر سکے گا۔ اور اس عظیم وجود کے ساتھ مل کر اپنے باری تعالیٰ اور خالق کی اطاعت اور تابعداری میں زندگی بسر کر سکے گا۔ یہ صفت ہر انسان کے لیے لازمی صفت ہے کہ وہ مومن ہو، لیکن جس جماعت نے پوری انسانیت کے اس سفر کی قیادت کرنی ہے اور جس نے پوری انسانیت کو خالق کائنات تک پہنچانا ہے اس کے اندر اس صفت کا بدرجہ اتم موجود ہونا ضروری ہے۔

اس ایمان کے نتائج کیا نکلتے ہیں؟ مومن کو نفسیاتی اطمینان اور نصب العین کا تعین حاصل ہو جاتا ہے۔ تردد، حیرت، خوف اور مایوسی اس کے قریب نہیں لگتی اور اس کو ارض پر عام زندگی گزارنے کے لیے بھی یہ صفات اشد ضروری ہیں۔ لیکن یہ صفات اس جماعت کے لیے تو لابدی ہیں جس نے اس کٹھن راہ میں دوسرے انسانوں کی رہنمائی کرنی ہے۔

ایمان کو اہم قدروں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مومن خواہشات نفسانیہ، ذاتی اغراض، ذاتی مصحتوں، مفادات کے حصول سے پاک ہو۔ تب جا کر وہ کسی اونچے مقاصد کے لیے کام کر سکے گا۔ اور یہ سوچے گا کہ اس کام میں اس کی ذات کی کوئی حصہ داری نہیں ہے۔ یہ تو صرف دعوت الی اللہ کی ذیوٹی ہے۔ یہ عند اللہ اجر پا چکا ہے۔ اللہ کے ساتھ سودا ہو چکا ہے اور یہ شعور اس شخص کے لیے تو بہت ہی لازمی ہے جو قائم تحریک ہو، تاکہ وہ اس وقت مایوس نہ ہو جب ایک خود سر گروہ اس سے لگ ہو جائے یا اسے دعوت کی وجہ سے ایذا دی گئی ہو، اور اگر تمام عوام اس کے گرویدہ ہو جائیں اس کے مطیع ہو جائیں تو وہ مغرور نہ ہو جائے کیونکہ وہ تو ایک مزدور ہے، اس نے اجرت اللہ سے پہلے ہی لے لی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا پہلا گروہ، جماعت صحابہ کے اندر اس قسم کا ایمان پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے ایمان نے ان کے نفوس، ان کے اخلاق، ان کے طرز عمل میں ایک عجیب انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ان کے دور میں پوری انسانیت کے اندر ایمان کی شکل ہی بگڑ گئی تھی۔ ایمان دب گیا تھا، بلکہ ایمان کا لوگوں کے اخلاق، ان کے طرز عمل اور ان کی نفسیات پر کوئی اثر ہی نہ رہا تھا۔ جب اسلام آیا تو اس نے ایمان کی ایک زندہ، موثر، فعال صورت دی۔ اور اس نے صحابہ کرام کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جنہوں نے اسلامی انقلاب کا بیڑا اٹھایا۔

— ○ ○ ○ —

سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب ”مسلمانوں کے زوال کے عالمی اثرات“ میں فرماتے ہیں :

”یہ ہے وہ ایمان جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور اس میں ایمان کو اس جماعت کی صفت اول بتایا گیا ہے جو پوری انسانیت کی قیادت کے لیے اٹھائی گئی ہے جو اپنے ایمان کی وجہ سے انسانیت کی قیادت کرتی ہے۔ اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مومن صرف اللہ پر توکل کرے۔“ لیکن قرآن مجید توکل علی اللہ کو بطور ایک مستقل عنوان ذکر کرتا ہے۔

وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (۳۶: ۴۲) ”اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔“ یہاں سیدھے سادے فقرے یَتَوَكَّلُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ کی بجائے وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (۳۶: ۴۲) کہا۔ یعنی بعد کے الفاظ کو مقدم یعنی جار مجرور کو مقدم کرنے سے حصر کے معنی پیدا ہوئے یعنی صرف اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں اور کسی پر نہیں کرتے۔ یہ بھی عقیدہ توحید ہے اور عقیدہ توحید کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ان کا اللہ پر بھروسہ ہو۔ مومن کا اللہ کی ذات اور صفات پر ایمان ہوتا ہے۔ اس کا یقین ہوتا ہے کہ اس کائنات میں کوئی شخص اپنی مشیت سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ کوئی کام یہاں اللہ کے اذن کے بغیر واقع ہی نہیں ہو سکتا۔ لہذا مومن صرف اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔ کسی کام کے کرنے یا کسی کام کے نہ کرنے میں مومن صرف اللہ پر توکل کرتا ہے۔

ہر شخص کے لیے یہ شعور اس کی عملی زندگی میں لابدی ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ ہر کسی کے سامنے سرائٹھا کے چلے گا۔ اور اس کا سر کسی کے سامنے نہ جھکے گا۔ وہ بہت مطمئن ہو گا، نہ کسی سے کوئی امید رکھے گا نہ اسے کسی کا خوف ہو گا

اگر مشکلات آجائیں تو پر جوش اور ثابت قدم ہو گا اور اچھے دن ہوں تو سنجیدہ رہے گا۔ نہ خوشحالی اور نہ ہی بدحالی اسے اپنی جگہ سے ہلا سکے گی۔ لیکن یہ شعور اسلامی انقلاب کے قائد کے لیے بہت ہی ضروری ہے کہ وہ اس راہ کے نشیب و فراز میں جم جائے اور اسلامی انقلاب لانے والی جماعت کے ہر فرد میں بھی یہ صفت ضروری ہے۔

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الذَّنْبِ وَالْفَوَاحِشَ (۳۷: ۴۲) ”جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں۔“ قلب کی طہارت، طرز عمل کا شفاف ہونا، خصوصاً بڑے گناہوں اور فحاشی کے کاموں سے، اسلامی معاشرے کی اساسی خصوصیت ہے اور یہ ایمان کے نمایاں آثار میں سے ہے۔ اور کسی صحیح قائد اور خصوصاً اسلامی دعوت کے لیے اچھے دل والی جماعت کے لیے تو یہ بہت ہی ضروری صفت ہے۔ کوئی دس صاف اور شفاف نہیں رہ سکتا، اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کر رہا ہو اور فحاشی کے کاموں میں حصہ دار ہو اور ان چیزوں سے اجتناب کرنے والا نہ ہو، اور کوئی فرد اور کوئی جماعت قیادت کے قابل نہیں، اگر اس کا دل صاف نہ ہو، اور معصیت اور فحاشی نے اس کے ایمان کو خود ختم کر دیا ہو اور اس کی شکل ہی بگڑی ہوئی ہو۔

یہی جماعت مسدہ کے دل میں ایمان اس قدر تیز احساس کے ساتھ، اس درجے تک بلند ہو گیا تھا جس کی طرف محولہ بالا ص ۲۲ میں اشارہ کیا گیا اور اس طرح اس جماعت کو اس کے ایمان نے انسانی قیادت کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔ اور انہوں نے ایسی قیادت کی کہ اس کی مثال نہ سابقہ قدیم تاریخ میں ملتی ہے اور نہ نئی تاریخ میں۔ اس قیادت کی مثال ایسی ہے جس طرح ایک حیر ہو اور جو ستارے کی طرف اشارہ کرتا ہو، اس جہان میں جہاں خواہشات کی جنگ برپا ہو اور نفسا نفسی کا عالم ہو۔

اللہ اس انسانی مخلوق کی کمزوریوں سے خوب واقف ہے، لہذا اللہ تعالیٰ نے قیادت کے لیے شرائط بھی معقول حد کے اندر رکھی ہیں۔ جن پر کوئی قیادت عمل کر سکے اور اس پر وہ اللہ کے ہاں مقبول ہو سکے۔ اللہ نے جو معیار تجویز فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی جماعت اور اس کی لیڈر شپ کبڑے گناہوں اور فحاشی سے بچتے ہوئے رہے چھوٹے گناہوں کا ارتکاب تو وہ اللہ معاف کر دے گا۔ کیونکہ اللہ انسان کی طاقتوں، حدود و قیودات خوب واقف ہے۔ یہ اللہ کا فضل، اس کی مہربانی اور رحمت ہے، جو اس نے اس انسان پر یہ مناسب ہے کہ ہم اللہ سے شرم کیں کیونکہ مہربانی سے انسان کے اندر حیا کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور غفور و درگزر کی وجہ سے عزت و احترام پیدا ہوتا ہے۔

وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ (۳۷: ۴۲) ”اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کرتے ہیں۔“ یہ صفت اس کے بعد متصلاً آئی جب اس نے قلم اشارہ کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے چھوٹے گناہ معاف کر کے درگزر فرماتا ہے۔ لہذا بندوں کو بھی چاہئے کہ وہ آپس میں مہربانی اور درگزر کا سلوک روادار رکھیں۔ چنانچہ مومنین کی صفات میں اس بات کو شامل کیا گیا کہ جب ان کو غصہ آئے تو وہ ایک دوسرے کو معاف کریں۔

اس معاملے میں بھی اسلام نفس انسانی کے ساتھ نہایت ہی احسان کرتا ہے۔ اسلام انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اللہ کو تو معلوم تھا کہ غصہ ایک ایسا انسانی رد عمل ہے جو انسان کی فطرت سے اٹھتا ہے۔ اور یہ غصہ سراسر تربیتی سبب ہے۔ اللہ کے لیے، اللہ کے دین کی خاطر، سچائی کے لیے اور انصاف کی خاطر تو غصہ مطلوب ہے۔ اور

اس میں خیر ہے۔ لہذا اسلام نفس غصے کو جرم قرار نہیں دیتا۔ نہ اسے غلطی قرار دیتا ہے بلکہ اسلام انسانی مزاج اور فطرت میں غصے کو قبول کرتا ہے۔ اس لیے اسلام انسان اور اس کی فطرت کے درمیان کسی دینی حکم کی وجہ سے جدائی اور تفریق نہیں کرتا۔ ہاں اسلام یہ ہدایت ضرور دیتا ہے کہ انسان کو اپنے غصے پر قابو پانا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ حتی الوسع غلو و درگزر سے کام لے اور یہ اس کی ایمانی صفات میں سے ایک مثالی صفت ہوگی۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ آپ کبھی بھی ذاتی معاملات میں غصہ نہیں ہوئے۔ آپ کا غصہ اللہ کے لیے ہوتا تھا اور پھر آپ کے غصے کے سامنے کوئی طاقت ٹھہر نہ سکتی تھی۔ خیر یہ تو مقام محمدیؐ کے درجات و کمالات ہیں۔ عام مسلمانوں کو اللہ ان کی طاقت کے مطابق ہی حکم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس میں ان کو آزماتا ہے اور صرف یہ حکم دیتا ہے کہ اگر غصہ آجائے تو معاف کر دیں، اور اگر ممکن ہو سکے تو معاف کر دیں اور انتقام کے جذبات پر قابو پالیں بشرطیکہ معاملہ ذاتی حدود کے اندر ہو۔ اور دو افراد کے درمیان ہو۔

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ (۳۸:۴۲) ”جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں“۔ وہ اپنے اور رب کے درمیان حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں اور نفس انسانی سے وہ باتیں محو کرتے ہیں جو توجہ الی اللہ سے مانع ہوں، یہ رکاوٹیں نفسانی خواہشات، جذبات و میلانات اور وہ رکاوٹیں جو انسان کے وجود اور اس کی ذات سے لگی ہوئی ہیں، جب انسان ذاتی خواہشات پر قابو پالے اور شخصی رکاوٹوں کو دور کرے تو پھر اس کے اور اس کے رب کے درمیان راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ رب کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے ہر وقت تیار ہوتا ہے اور اللہ کے حکم کے سامنے ذاتی خواہشات کی کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اللہ کے احکام پر عمل کرنے کی یہ عمومی صفت ہے لیکن احکام الہی میں سے بعض کا یہاں خصوصی ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ (۳۸:۴۲) ”نماز قائم کرتے ہیں“۔ اسلام میں نماز کو ایک بہت بڑا مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ کلمہ طیبہ کے اقرار کے بعد پہلا حکم نماز کا آتا ہے۔ گویا نماز اللہ کے احکام کی پیروی کا آغاز ہوتا ہے۔ بندے اور اس کے رب کے درمیان تعلق کا نام نماز ہے۔ پھر یہ اس بات کا اظہار ہے کہ اسلام میں محمود و لیار ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔ کسی کا سرد و سرے کے مقابلے میں بلند نہ ہو گا، کوئی کسی سے آگے نہ ہو گا۔ اور یہی پہلو ہے یعنی مساوات کا پہلو کہ نماز کے بعد بالعموم زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے لیکن یہاں زکوٰۃ سے پہلے وَ أَمَرُهُمْ شُورٰی (۳۸:۴۲) کا ذکر کیا تاکہ معلوم ہو کہ رائے ہر شخص کی برابر شمار ہوگی۔

وَأَمْرُهُمْ شُورٰی بَيْنَهُمْ (۳۸:۴۲) ”اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں“۔ انداز بیان ایسا ہے کہ ان کے تمام امور مشورے کے نتیجے میں ہوتے ہیں گویا ان کی پوری زندگی مشورے کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا یہ ایک ہی آیت ہے اور یہ حکم اسلامی حکومت کے قیام سے بھی پہلے کا ہے۔ یہ رنگ گویا صرف حکومتی امور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک اسلامی سوسائٹی کا عمومی طرز عمل ہے۔ اگرچہ حکومت اس وقت قائم ہی نہ ہوئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں حکومت کی تنظیم دراصل اسلامی سوسائٹی کے خدوخال کا ایک منظم ظہور ہی ہے اور اسلامی سوسائٹی میں اسلامی حکومت بھی آتی ہے۔ لہذا اسلامی سوسائٹی 'اسلامی حکومت کو بھی اسی نہج پر چلاتی ہے۔ جس طرح اس کے عمومی امور چلتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں آغاز ہی سے مشورہ کا عمل جاری تھا۔ اور اس مشورے کا دائرہ حکومت اور حکومتی احکام سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ یہ دراصل اسلامی سوسائٹی کی صفت ہے اور اس جماعت کی تو ممتاز صفات میں سے ہے جسے اللہ نے پوری انسانیت کی قیادت کے لیے برپا کیا ہے۔ اور قیادت کے لیے تو یہ بہت ہی اہم ہے۔

شوریٰ کی شکل و صورت کیا ہونی چاہئے تو اسلام نے اس کے لیے کوئی فولادی قالب نہیں تیار کیا۔ ہر زمان و مکان کے حالات میں اس کی مختلف شکل و صورت تیار ہو سکتی ہے تاکہ یہ صفت یعنی شوریٰ اسلامی سوسائٹی میں بھی رائج ہو۔ اسلامی اداروں میں بھی مروج ہو، لیکن اس کی کوئی جامد شکل نہ ہو بلکہ شوریٰ کی روح ہر جگہ موجود ہو۔ یعنی یہ شوریٰ اسلامی دراصل الفاظ اور اشکال کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک صفت ہے جو ایمان کے نتیجے میں اسلامی سوسائٹی میں شوریٰ شعور اور طرز عمل پیدا کرتی ہے۔ بعض لوگ ایسے اسلامی اداروں کی بات کرتے ہیں جن کی تہ میں ایمان نہ ہو یا ایمان کا ہونا ضروری نہ ہو تو وہ ایک فضول کام کر رہے ہیں۔ اور یہ کوئی سطحی بات نہیں ہے جس طرح پہلی نظر میں نظر آئے گی اور خصوصاً ان لوگوں کو نظر آئے گی جنہوں نے اسلامی نظریہ حیات میں ایمان کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ کیونکہ اسلامی نظریہ حیات اداروں اور تشکیلات میں منتقل ہونے سے قبل اس کے اندر ایسی عقل اور نفسیاتی حقیقتیں ہوتی ہیں جو انسانی سوچ اور انسان کی دلت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور اس کے بعد اسلام کے اجتماعی اداروں میں وہ اصول بن کر ایک متعین شکل اختیار کر کے سامنے آتی ہیں اور اس کے بعد پھر نصوص آتے ہیں اور وہ ان اشکال اور حالات کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ نصوص ان اصولوں کو منظم کر دیتے ہیں 'ان کی تخلیق نہیں کرتے' ان کی تخلیق تو ایمان کی وجہ سے ہو چکی ہوتی ہے۔ لہذا اسلامی نظریہ حیات کی کسی شکل و صورت کے ظہور کے لیے کسی ملک میں اسلامی سوسائٹی اور مسلمانوں کا وجود ضروری ہے۔ اور ان مسلمانوں کا ایمان فعال اور بااثر ہو۔ اگر مسلمانوں کا وجود ہی نہ ہو تو محض اداروں کے قیام سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ محض ادارہ ضرورت پوری نہ کر سکیں گے اور اس صورت میں کوئی ایسا نظام وجود میں نہ آسکے گا جسے اسلامی کہا جاسکے۔

جب مسلمان صحیح معنوں میں پائے جائیں گے اور ایمان اپنی حقیقت کے اعتبار سے وجود میں آجائے گا تو اسلامی نظام بذات خود وجود میں آجائے گا اور اس کی ایک اداراتی شکل خود بخود وجود میں آجائے گی جو ان مسلمانوں کی ضرورت ہوگی اور ان کی سوسائٹی کی ضرورت ہوگی اور صرف اس طرح اسلامی اصولوں کے جواب کی سچی تعبیر وجود میں آسکے گی۔

وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (۳۸: ۲۷) "اور ہم نے ان کو جو رزق دیا اس سے خرچ کرتے ہیں۔" یہ آیت بھی حکم فرضیت زکوٰۃ سے پہلے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ زکوٰۃ دہجری میں فرض ہوئی لیکن انفاق فی سبیل اللہ عام حکم اسلامی جماعت کے لیے پہلے سے تھا۔ بلکہ اسلامی سوسائٹی کی تشکیل کے ساتھ ہی یہ حکم وجود میں آگیا تھا۔

دعوتِ اسلامی کے عمل کے لیے مال کی ضرورت ہے اور یہ مال بذریعہ انفاق حاصل ہو گا۔ انفاق کے ذریعہ انسان سے دس بخوسی کی بری خصلت سے پاک ہوتے ہیں جب انسانی جذبہ مال پر قابو پالیتا ہے اور اپنی مملوکات کی بجائے اللہ پر بھروسہ

کرنا سیکھتا ہے، ایمان کے مفہوم کے نکھار کے لیے یہ سب امور ضروری ہیں۔ اور یہ بات تو اپنی جگہ ہے کہ اتفاق کے بغیر کوئی اجتماعی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ چونکہ دعوت تو ایک جدوجہد ہے اور جدوجہد میں کارکنوں کی کفالت ضروری ہے تاکہ اجتماعی ضروریات پوری ہوں اور نتائج برآمد ہوں۔ بعض اوقات یہ تکافل ہمہ گیر ہو جاتا ہے کہ کسی کے لیے انفرادی دولت رکھنے کی اجازت ہی نہیں ہوتی۔ جب مہاجرین مکہ سے نکلے اور مدینہ میں انصار کے ساتھ مل کر جو نظام قائم ہوا یہ سب اسی اصول کے تحت تھا لیکن جب حالات معموں پر آگئے تو پھر زکوٰۃ کو رائج کر کے موافقات کے نظام کو منسوخ کر دیا گیا جو کلی تکافل تھا۔ بہر حال اتفاق فی سبیل اللہ اس جماعت کی ممتاز خصوصیت ہے جسے اس مقصد کے لیے چنا گیا ہو یا است اس مقصد کے لیے قائم کیا گیا ہو کہ وہ کسی خطے میں اسلامی انقلاب برپا کرے۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ (۳۹: ۴۲) ”اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں“۔ یہی سورتوں میں اس صفت کا ذکر اپنے اندر خاص معنی رکھتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلامی جماعت مسلمہ کے اندر یہ طبعی صفت ہوتی ہے کہ وہ زیادتی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ برائی کا مقابلہ کرنا ایک اہم فریضہ ہے کیونکہ اگر کوئی ظالم کے سامنے ہتھیار ڈال دے تو ظالم اور جری ہو جاتا ہے۔ لہذا ظالم کا مقابلہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اور ایک ایسی ملت جسے اٹھایا ہی اس لیے گیا ہو کہ لوگوں کے حقوق کی پاسبانی کرے، امر بالمعروف اس کا مشن ہو اور نہی عن المنکر اس کا فریضہ ہو، اس کے لیے تو برائی کا مقابلہ کرنا بہت ہی اہم ہے کیونکہ امت مسلمہ اور جماعت مسلمہ کا نصب العین یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی پر چھ جانے لور اس کے اندر سچائی کے ساتھ عدل و انصاف قائم کرے۔

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ ”اور عزت اللہ، رسول اللہ اور مومنین کے لیے ہے“۔ لہذا اسلامی جماعت کا مزاج اس کے فرائض کی نوعیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ زیادتی کا مقابلہ کرے اور اس پر جو دست درازیاں کی جا رہی ہیں ان کی مدافعت کرے۔ مکہ میں حکم یہ تھا کہ رک جاؤ اور ہاتھ روک لو اور صبر کرو۔ نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو، وہاں یہ احکام مکہ کے مخصوص حالات کی وجہ سے تھے اور ابتدائی عرب مسلمانوں کی قدرت تربیت بھی مطلوب تھی کیونکہ عرب مزاجاً منتقم المزاج تھے، یہ اسلامی جماعت اور اسلامی سوسائٹی کے لیے مستقل احکام نہ تھے۔ مکہ میں بعض خصوصی اسباب کی وجہ سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہر قیمت پر بھائے یاہمی کے لیے اس اور سہمائی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

۱۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے خلاف سختی اور زیادتی کسی منظم حکومتی ادارے کی طرف سے نہ تھی جو اس وقت کی جماعت پر حکمران ہو، کیونکہ جزیرۃ العرب کی سیاسی صورت حال غیر منظم قبائلی انداز کی تھی۔ وہاں مسلمانوں پر جو تشدد کیا جاتا تھا اگر کوئی مسلمان کسی قبیلے کا زرتھ تھا تو اچھے تشدد قبیلہ کرتا تھا اور قبیلے میں بھی اس کے قریبی رشتہ دار کے مدد کوئی جرات نہ کر سکتا تھا۔ مسلمانوں پر ہمیشہ جماعت کوئی تشدد نہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات آقا اپنے مسلمان غلاموں پر تشدد کرتے تھے اور مسلمان انہیں خرید کر آزاد کر دیتے تھے۔ اس لیے کوئی بھی اپنے غلاموں پر زیادہ تشدد کی جرات نہ کرتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ چاہتے تھے کہ مکہ میں گھر گھر کے اندر لڑائی شروع ہو جائے۔ ایک ہی گھر کے جو لوگ مسلمان ہو گئے ہیں وہ غیر مسلموں سے لڑنا شروع کر دیں۔ پھر مکہ میں نرمی دو سرے لوگوں کے دلوں کو زیادہ نرم کر دیتی تھی، نسبت سختی کے۔

پھر عرب معاشرہ ایک خوددار اور جوانمرد معاشرہ تھا۔ اس میں مظلوم کی حمایت میں لوگ اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مسلمان جب اذیت برداشت کرتے تھے اور اپنے عقیدے پر جم جاتے تھے تو عربوں کی جوانمردی کے جذبات ان کے حق میں اٹھتے تھے۔ شعب ابی طالب میں محصوری کے دوران بالعموم اسی جذبے نے مسلمانوں کی مدد کی جس میں بنی ہاشم سب محصور کر دیئے گئے تھے۔ اس محاصرے کے خلاف لوگوں کی ہمدردیاں مسلمانوں کے حق میں ہو گئیں اور لوگوں نے اس معاہدے کے پرزے پرزے کر دیئے جو صحیفے میں تھا اور یوں یہ ظالمانہ معاہدہ ختم ہوا۔

پھر عربوں کے اندر یہ رواج تھا کہ وہ بات بات پر تلو اور سونت لیتے تھے۔ وہ بڑے جذباتی تھے اور کسی نظم و نسق کے پابند نہ تھے۔ اسلامی جماعت میں جو تنظیم مطلوب تھی اس کا تقاضا تھا کہ اس جذباتیت کو ذرا دبایا جائے اور اسے کسی ہدف کا پابند کیا جائے۔ اور لوگوں کو اعصابی ضبط اور صبر کا عادی بنایا جائے۔ اور لوگوں کے اندر یہ شعور پیدا کیا جائے کہ نظریہ اور نصب العین ہر جذبے اور ہر مفاد پر مقدم ہیں۔ لہذا مکہ میں مہر اور مسلسل صبر کی تلقین کرنا اسلام کے منہاج تربیت کے لیے بہت ضروری تھا۔ اس طرح ایک مسلم کی شخصیت میں مطلوبہ توازن پیدا ہو گیا اور وہ صبر و ثبات کے ساتھ اپنے مقصد کے لیے آگے بڑھتے رہے۔۔۔ غرض یہ اور اس طرح کے دوسرے اسباب تھے جن کو اللہ اور رسول جانتے ہیں۔ ان کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں صبر کی تلقین ہوتی رہی لیکن اصلی ہدف تحریک اسلامی کا بھی تھا۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ (۴۲: ۳۹) ”وہ لوگ جب ان پر زیادتی ہو تو وہ مقابلہ کرتے ہیں۔“

اس اصول کو زندگی کا ایک دوسرا اصول عملدار لایا کرتا ہے ”وہ ہے :

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲: ۴۰) ”برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔“ سزا کا یہ اصول ہے کہ جیسا جرم ہو ویسی ہی سزا دی جائے تاکہ سرکشی اختیار نہ کرے۔ اگر کسی سرکش انسان کو کوئی روکنے والا نہ ہو تو وہ سرکشی اور ظلم میں بڑے اطمینان سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔

یہ تو ہے مظلوم کا حق اور اصول عام۔ لیکن اگر کوئی اپنے اصلاح نفس یا جزائے خیر اور اخروی اجر کے لیے کسی کو معاف کرتا ہے یا جماعت مسلمہ کے خلاف اٹھنے والے جذبات کی وجہ سے معاف کرتا ہے تو اس قاعدے میں استثناء موجود ہے۔ لیکن معافی کو اس وقت معافی تصور کیا جائے گا جب کوئی شخص برائی کا جواب برائی کے ساتھ دینے پر قدرت رکھتا ہو۔ اس وقت غصہ کا وزن بھی ہو گا اور دست درازی کرنے والے کی اصلاح بھی ہوگی کیونکہ دست درازی کرے والا جب یہ سوچے گا کہ غصہ اور درگزر محض احسان کی وجہ سے ہوئی ہے اور اس میں معاف کرنے والے کی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ تو اس صورت میں وہ شرمندگی محسوس کرے گا، نادم ہو گا اور آئندہ حیا کرے گا۔ اور یہ سوچے گا کہ میرے مخالف نے میرے ساتھ شریفانہ سلوک کیا ہے۔ وہ لونچا آدمی ہے اور جو شخص انتقام لینے پر قادر ہو اور معاف کر دے تو اس کا دل بھی صاف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایسے حالات میں غصہ و درگزر دونوں کے لیے معیہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایک شخص انتقام لینے سے عاجز ہو اور معاف کر دے تو پھر صورت یہ ہوگی ”گد اگر تو واضح کند خوئے دوست۔“ لہذا ایسے غصہ کو غصہ کہنا ہی نہیں چاہئے کیونکہ وہاں غصہ نہیں ہے، مجبوری ہے۔ اور یہ صورت حال ایک شراغیز صورت حال ہے۔ اس کے نتیجے میں

ظلم کرنے والا اور جری ہوتا ہے۔ اور فساد اور پھیلتا ہے، یہ ہے مفہوم آیت۔

فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (۴۲: ۴۰) ”پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے۔“

اِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (۴۲: ۴۰) ”اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔“ یہ پہلے قاعدے کی تاکید ہے کہ ”برائی کا بدلہ دیکسی ہی برائی ہے۔۔۔“ مطلب یہ ہے کہ یا تو معاف کر دو یا اگر بدلہ لینا ہے تو برابر بدلہ لو اس میں حدت نہ پڑے۔ ایک دوسری تاکید اسی قاعدے کی:

وَلِمَنْ اَنْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ (۴۲: ۴۲) اِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيمٌ (۴۲: ۴۲) ”اور جو لوگ ظلم کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جاسکتی۔ ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ لہذا جو شخص ظلم کے بعد مدافعت کرتا ہے، اور برائی کا بدلہ اس کے مساوی لیتا ہے، تعدی نہیں کرتا تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ وہ تو اپنا قانونی حق استعمال کرتا ہے۔ لہذا اس کے خلاف کسی کے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔ نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ اس کی راہ روکے۔ راہ تو ان لوگوں کی روکنی چاہئے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں بغیر استحقاق کے زیادتیاں کرتے ہیں۔ کیونکہ کسی ایسے ملک کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب اس میں ایک ظالم لوگوں پر ظلم کر رہا ہو اور اس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ ہو۔ اس میں بغی ہو جو لوگوں پر مظالم ڈھا رہا ہو اور کوئی قوت ایسی نہ ہو جو اس کا ہاتھ روکے یا اس سے تعاصد ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ ہر حال اس قسم کے ظالموں کو عذاب الیم کی دھمکی دیتا ہے۔ لیکن یہ لوگوں کا بھی فریضہ ہے کہ وہ ظالم کا ہاتھ پکڑیں۔

آخر میں پھر انفرادی حالات اور طاقت انتقام کے باوجود ’توازن‘ ’اعتدال‘ ’ضبط نفس‘ صبر اور احسان کا رد یہ اپنانے پر متوجہ کیا جاتا ہے۔ جب صبر اور احسان فی الواقعہ ایک درگزر ہو، ذلت نہ ہو، کوئی احسان ہو، مجبور نہ کر دیا گیا ہو۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۴۲: ۴۳) ”البتہ جو صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی لو لو العزمی کے کاموں میں سے ہے۔“

اس پیراگراف کی تمام ہدایات و احکام نہایت ہی اعتدال اور میانہ روی پر جہی ہیں۔ نفس انسانی کو ایک طرف کینہ اور غصے سے بچانے کی سعی کی گئی ہے، اور دوسری جانب کمزوری، ذلت اور ظلم و زیادتی سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ہر حال میں اللہ کی رضامندی کو پیش نظر رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ صبر ہر حال ز اور راہ ہے۔

اور مومنین کی جو صفات یہاں دی گئی ہیں وہ اس اختلائی جماعت کی خصوصیات ہیں جس نے پوری انسانیت کی

قیادت کرنی ہے اور جس کے پیش نظر اندام اخروی اور رضائے اسی ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائیں اور رب پر توکل کریں۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہ صفات مومنین یہ ہیں اور ان کے لیے جو اخروی اجر ہے 'وہ بہت بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ اب بطور تقابل تصویر کا دوسرا رخ بعض ظالموں کا انجام بھی یہاں دے دیا جاتا ہے۔ اور ان کے لیے ذلت اور خسران کا اعلان کیا گیا ہے۔

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَرَیِّ مِّنْ
بَعْدِهِۦ وَتَرَى الظَّالِمِينَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ يَقُولُونَ هَلْ إِلَىٰ مَرَدٍّ مِّنْ
سَبِيلٍ ۚ وَتَرَاهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا خَشِيعَاتٍ مِّنَ النَّارِ يَنْظُرُونَ مِنْ كُلِّ
حَافِيٍّ وَقَالَ الَّذِينَ أَسْمَوْا إِنَّ الْخَيْرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَآهْلِيَهُمْ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ ۚ أَلَا إِنَّ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ مُّقِيمٍ ۚ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ أَوْلِيَاءَ
يَنْصُرُونَهُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ سَبِيلٍ ۚ

”جس کو اللہ ہی گمراہی میں پھینک دے اس کا کوئی سنبھالنے والا اللہ کے بعد نہیں ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ اور تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے تو دست کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے اور اس کو نظر بچا بچا کر کن اکیوں سے دیکھیں گے۔ اس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈال دیا۔ خبردار رہو، ظالم لوگ مستقل عذاب میں ہوں گے اور ان کے کوئی حامی و سرپرست نہ ہوں گے۔ جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کو آئیں جسے اللہ گمراہی میں پھینک دے اس کے لیے بچاؤ کی کوئی سبیل نہیں۔“

اللہ کے فیصلے کو رد نہیں کیا جاسکتا اور اللہ مشیت کی راہ کوئی روک نہیں سکتا۔

وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَرَیِّ مِّنْ بَعْدِهِۦ (۴۲: ۴۴) ”جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے“ اس کا کوئی سنبھالنے والا اللہ کے بعد نہیں۔“ جب اللہ کے علم میں یہ بات آ جاتی ہے کہ یہ بندہ گمراہی کا مستحق ہے تو اللہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے کہ یہ گمراہ ہو گا۔ اس کے بعد پھر کوئی دلی اسے ہدایت دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ نہ اس کی مدد یوم الحساب میں عذاب سے بچانے میں کر سکتا ہے۔ باقی آیت میں ایک منظر

وَتَرَى الظَّالِمِينَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ يَقُولُونَ هَلْ إِلَىٰ مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيلٍ (۴۲: ۴۴)

وَتَرَهُمْ يَعْزُضُونَ عَلَيْهَا حَشَشَيْنَ مِنَ الذَّلِيلِ يَنْظُرُونَ مِنْ طَرَفٍ خَفِيٍّ (۴۲: ۴۴) ”تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے اب پلٹنے کی کوئی سہیل ہے؟ اور تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے زلت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے۔ اور اس کو نظریں پچا کر کن اکیوں سے دیکھیں گے۔“ ظالم چونکہ سرکش اور باغی تھے تو اللہ تعالیٰ نے یوم الجزاء میں انہیں بظاہر زلت کی حالت میں رکھا۔ یہ عذاب دیکھتے ہیں تو ان کی بڑائی دھڑام سے گرتی ہے اور نہایت ہی زلت اور اٹھارے باہم بات کرتے ہیں کہ کوئی راستہ ہے پلٹنے کا ہے۔ اس بے تابانہ مایوسی کے مکالمے اور اس زلت و خواری کی حالت میں جب آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تو حالت خشوع میں ہیں۔ تقویٰ اور احترام کی وجہ سے نہیں بلکہ زلت اور خواری کی وجہ سے ”وہ خود بھی سسے ہوئے“ جھکے ہوئے ہیں اور نظریں بھی نیچی ہیں۔ زلت اور شرمندگی کی وجہ سے نظریں اٹھا کر نہ دیکھ سکیں گے۔

يَنْظُرُونَ مِنْ طَرَفٍ خَفِيٍّ (۴۲: ۴۴) ”اور نظریں پچا کر کن اکیوں سے دیکھیں گے۔“ یہ اس وقت نہایت ہی توہین آمیز حالت میں ہوں گے۔

اور اس وقت یہ معصوم ہو گا کہ یہ دن اللہ ایمان کا ہے۔ وہ بات کرتے ہیں اور تبصرے کرتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ الْخُسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَآهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ

(۴۲: ۴۵) ”اس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے کہیں گے کہ واقعی اصل زیان کار وہی ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈال دیا۔“ اور یہ کفار واقعی سب کچھ ہار گئے۔ اور یہ لوگ زلت سے جھکے کھڑے ہیں وہ بھی باہم تبصرہ کرتے ہیں مگر یوں کہ کیا ایسی کی کوئی راہ ہے؟۔۔۔ اب لیک عام تبصرہ آتا ہے اس پورے منظر پر کہ یہ لوگ جن کو آگ پر پیش کیا گیا ہے ان کا انجام کیا ہو گا۔

إِنَّا إِنَّ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ مُقِيمٍ (۴۲: ۴۵) وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ أَوْلِيَاءَ

يَنْصُرُونَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ سَبِيلٍ (۴۲: ۴۶) ”خبردار رہو“ ظالم لوگ مستقل عذاب میں ہوں گے اور ان کے کوئی حامی و سرپرست نہ ہوں گے جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کو آئیں اور جیسے اللہ گمراہی میں پھینک دے اس کے لیے بچاؤ کی کوئی سہیل نہیں۔“ نہ کوئی مددگار ہے اور نہ نکلنے کا کوئی راستہ ہے۔ لہذا اب ان کے لیے عذاب مقیم ہی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اس منظر کی روشنی میں حضورؐ کے معاندین اور مغرور مخالفین کو اب نہایت ہی ہمدردی سے خطاب کیا جاتا ہے کہ اللہ کی بات کو قبول کر لو، قبل اس کے کہ اچانک تم پر یہ دن آجائے، جس سے پھر کوئی پناہ تمہیں نہ ملے، کوئی مددگار نہ ملے جو اس برے انجام پر احتجاج کر سکے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اگر یہ اس مخلصانہ تنبیہ کو نہیں ملتے اور منہ موڑتے ہیں تو آپ کا فرض پورا ہو گیا۔ آپ کا فریضہ صرف یہ ہے کہ بات پہنچا دیں، آپ ان کی

ہدایت کے مکلف اور ذمہ دار نہیں نہ ان کے ٹھیکہ دار ہیں۔

اَسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّآئِیَ یَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ
مِّنْ اِلٰہٍ ۚ مَا لَکُمْ مِّنْ تَلْجَا یَوْمَیْنِ ۚ وَ مَا لَکُمْ مِّنْ تَکْوِیْنٍ ۚ فَاِنْ اَعْرَضُوْا قَمَآ
اَرْسَلْنَاکَ عَلَیْہُمْ حَفِیْظًا ۚ اِنْ عَلَیْکَ اِلَّا الْبَلٰغُ

”مان مولیٰ نے رب کی بات قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے نکلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔
اس دن تمہارے لیے کوئی پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا۔ اب اگر یہ
لوگ منہ موڑتے ہیں تو اب نبیؐ نے تم کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔ تم پر تو صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ
داری ہے۔“

اس کے بعد انسان کے عمومی حرائج کو ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ انسان جو دعوتِ اسلامی اور سچائی کا مقابلہ کرتا ہے اور
رسول برحق سے عناد رکھتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو اذیت و عذاب کا مستحق گردانتا ہے تو اس کی حالت یہ ہے کہ
جب کسی اذیت میں یہ مبتلا ہو جاتا ہے تو اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی قوت برداشت جواب دے دیتی ہے۔ جزع
فزع اور آہ و فقاں شروع کر دیتا ہے اور اگر اللہ کی کوئی نعمت مل جائے تو ہواؤں پر اڑنے لگتا ہے۔ اور حدود پار کر لیتا ہے
جبکہ سختی میں مایوس اور کافر ہو جاتا ہے۔

وَ اِنَّا اِذَا اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِثْلَ رَحْمَةٍۢ مِّنَّا رَحْمَةًۭ فَرِحَ بِہَا ۚ وَ اِنْ تُصِیْبْہُمْ سَیْئَةٌ
مِّنَّا قَدَّ مَتَّ اَیْدِیْہُمْ ۚ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ کَفُوْرٌ ۝۸

”انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو اس پر پھول جاتا ہے اور اگر اس کے اپنے
ہاتھوں کا کیہ دھرا کسی معیبت کی شکل میں اس پر الٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے۔“ اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ
دنیا میں انسانوں کے حصے میں خوشی آتی ہے یا غم آتا ہے، سبھی آتی ہے یا کشادگی نصیب ہوتی ہے، یہ سب امور اللہ کے ہاتھ
میں ہیں۔ پس یہ بد بخت انسان جو بھلائی کا شیدائی ہے اور برائی اور سختی سے نفور ہے، اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس مالک
سے دور رہا ہے جس کے ہاتھ میں اس کے سب امور ہیں اور ہر حال میں وہ خالق و مالک ہے۔

یٰۤاِنَّہٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ یَهَبُ لِمَنْ
یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّکُوْرَ ۝۹ اَوْ یُزَوِّجْہُمْ ذُکْرًا وَّ اِنَاثًا ۚ

وَيَجْعَلُ مَنْ يَشَاءُ عَقِيمًا إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ

”اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے۔“

اولاد کسی شخص پر فضل و کرم ہونے یا اس سے محروم ہونے کی بڑی نشانی ہے۔ پھر اولاد انسانی نفس کے بہت ہی قریب پسندیدہ چیز ہے۔ اولاد سے انسان کو بہت محبت ہوتی ہے۔ اس لیے کسی پر اللہ کے فضل ہونے یا اس سے محروم ہونے کے حوالے سے یہ بہت ہی حس اور قوی لاثری چیز ہے۔ اس سورت میں رزق کے اعتبار سے خوشحالی اور بد حالی کی بات گزر چکی ہے۔ یہاں اولاد کے حوالے سے بھی انسان کے نصیب کی بات کر دی تاکہ اس و اولاد دونوں کی بات ہو جائے کیونکہ اولاد بھی اللہ کی طرف سے ایک بہترین رزق ہے۔ مال کی طرح بلکہ اس سے پیارا۔

جہاں بھی اللہ کے ملک کی بات ہوتی ہے وہ ملک سموات اور پوری زمین سے شروع ہوتی ہے ’مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ عام مالک ہے۔ اسی طرح یَخْلُقُ مَا يَشَاءُ (۴۲: ۴۹) ”جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے“۔ تخلیق کا ذکر بھی یہاں نہایت مناسب اور معنی خیز ہے۔ یہاں اولاد کو زندہ کرنے اور عطا کرنے کا مضمون ہے۔ اس کے ساتھ صفت تخلیق کا ذکر مناسب ہے۔ انسان کو بتایا گیا کہ تم جو پسند کرتے ہو ان کو بھی اللہ پیدا کرتا ہے اور جن کو تم ناپسند کرتے ہو ان کو بھی اللہ پیدا کرتا ہے۔ وہی دینے والا اور وہی محروم کرنے والا ہے۔

اب حالات داود دہش اور حالات محمدیت کی تفصیلات۔ اللہ جسے چاہتا ہے عورتیں دیتا ہے اور یہ لوگ عورتوں کو پسند نہ کرتے تھے (جس طرح آج بھی نہیں کیا جاتا) یہ تو اللہ ہے کہ کسی کو لڑکے، کسی کو لڑکیاں اور کسی کو دونوں دیتا ہے۔ اور کسی کو اس بیٹھے بھل سے صاف صاف محروم کر دیتا ہے۔ یہ سب حالات اللہ کی مشیت پر موقوف ہیں۔ اس میں اللہ کے سوا کسی کا دخل نہیں ہے۔ وہ اپنے علم و قدرت کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔

إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ (۴۲: ۵۰) ”وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

--- ○ ○ ○ ---

سورت کے خاتمہ پر موضوع اوس سامنے آتا ہے جس پر اس پوری سورت میں بات ہوتی رہی ہے۔ یعنی رسالت اور وحی کی حقیقت یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس عمل میں بندے اور خدا کے درمیان رابطہ کس طرح ہوتا ہے اور اس کی صورتیں کیا ہیں؟ اور یہ رابطہ رسوں کریم کے ساتھ ہو چکا ہے اور اس کے نہایت ہی بلند مقاصد ہیں یہ کہ جو صراطِ مستقیم کی طرف آنا چاہے اسے لایا جائے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ مُّهِينٍ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ

رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مِمَّا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ
نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۵۲﴾

۱۰۔ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اِلَّا اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْر ﴿۵۲﴾

”کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو برد بات کرے۔ اس کی بات یا توحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے، یا پردے کے پیچھے سے، یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے، وہ برتر اور حکیم ہے اور اسی طرح (اے نبی!) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو، اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو، سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔“

اس آیت میں یہ بات قطعی انداز میں کہہ دی گئی ہے کہ کوئی انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ آنے سے سانسے ہو کر بات نہیں کر سکتا۔ حضرت عائشہؓ سے یہ مروی ہے: ”جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو اس نے بہت برا افترا باندھا“ (متفق علیہ) خدا کا مکالمہ بندوں کے ساتھ تین طریقوں سے سرانجام پاتا ہے۔ بذریعہ وحی، یہ وحی قلب نبی پر براہ راست ہوتی ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ یہ وحی ہے، یا پردے کے پیچھے سے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مکالمہ ہوا۔ لیکن جب آپ نے اللہ کو دیکھنے کی درخواست کی تو اس درخواست کو قبول نہ کیا گیا۔ اور پہاڑ نے بھی تجلیت لہیہ کو برداشت نہ کیا۔

وَخَرَّ مُوسٰی صَبَقًا فَلَمَّا آفَقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبٰرِكُ اِلٰيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ

(۷: ۱۴۳) ”اور موسیٰ غش کھ کر گر پڑا جب ہوش آیا تو بولا: پاک ہے تیری ذات میں تیرے حضور تو پہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔“ یا پھر یہ طریقہ ہے کہ ایک پیغام لانے والا بھیج دے اور یہ فرشتہ ہوتا ہے جو اللہ کے حکم سے جو چاہے وحی کر دے۔ اور اس کی تفصیلات حضور اکرمؐ نے خود بتا دی ہیں۔ پہلا طریقہ یہ کہ فرشتہ آپ کے دل میں بات ڈال دے ماسوائے اس کے کہ آپ فرشتے کو دیکھیں۔ حضورؐ نے فرمایا ”روح القدس نے میرے دل میں یہ بات پھونک دی کہ ہرگز کوئی نفس نہ مرے گا قبل اس کے کہ وہ اپنا رزق مکمل نہ کر دے، لہذا اللہ سے ڈرو اور نہایت ہی خوبصورت طریقے سے رزق کی تلاش کرو۔“ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فرشتہ ایک انسان کی شکل میں آپ سے بات کرتا اور آپ اس کی بات کو سمجھ لیتے۔ تیسری صورت یہ کہ وحی آپ پر تھنی کی آواز کی طرح آتی اور یہ طریقہ آپ کے لیے بہت سخت ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ سخت سردی کے دنوں میں بھی آپ کے ماتھے سے پینہ ٹپکتا اور ایسی حالت میں اگر آپ سواری پر ہوتے تو اس پر اس قدر بوجھ ہوتا کہ سواری بیٹھ جاتی۔ آپ پر ایک بار ایسی حالت میں وحی آئی اور آپ کا سر مبارک زید لہن ثابت کی ران پر تھا۔ اس پر یہ اس قدر بھاری ہو گیا کہ قریب تھا کہ اس سے ان کی ران چورہ چورہ ہو جاتی۔ چوتھی صورت یہ تھی کہ آپ فرشتے کو ایسی شکل میں دیکھتے جس میں اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔

اس وقت وہ جو چاہتا 'وحی کر دیتا۔ اور اس شکل میں فرشتہ صرف دو بار آیا ہے۔ جیسا کہ سورت نجم میں ذکر ہوا (زاد العاد' لن قیم الجوزیہ)

یہ ہیں وحی کی صورتیں 'اور ان کے مطابق اللہ کے ساتھ حضور اکرمؐ کا رابطہ ہوتا رہا ہے۔

اِنَّهُ عَلٰی حَكِيْمٍ (۴۲ : ۵۱) "اللہ برتر اور حکیم ہے۔" وہ اپنی بلندیوں سے وحی کرتا ہے اور وہ اپنی حکمت سے جسے چاہتا ہے 'چن لیتا ہے۔

میں یہاں ضرور کہوں گا کہ جب بھی میں نے کسی ایسی آیت یا حدیث پر غور کیا ہے جس میں بندے اور رب کے درمیان رابطے کا ذکر ہو 'تو میرا دل رواں رواں کانپ اٹھا ہے کہ ایک ازلی لیدی ذات جو لازمان اور لامکان ہے 'جس کو کسی جگہ میں محدود نہیں کیا جاسکتا 'جس کی مثل کائنات میں کوئی چیز نہیں ہے اور فانی بندے کے درمیان اتصال کس طرح واقع ہو سکتا ہے جبکہ انسان ایک جگہ میں محدود ہے 'ایک زمان تک محدود ہے۔ اور مخلوقات کی دوسری حدود کا پابند ہے۔ پھر یہ رابطہ معانی اور کلمات کی شکل کس طرح اختیار کرتا ہے اور ایک فانی محدود ذات کے اندر یہ قوت کس طرح ودیعت کر دی جاتی ہے کہ وہ ازلی و لیدی اور لامکان ذات کا کلام پاسکے۔ جس کی کوئی مثال نہیں ہے 'یہ کس طرح ممکن ہوا۔ کیونکر ہوا؟

لیکن میں نے پھر لوٹ کر اپنے آپ سے یہاں تک کہ یہ سوال کرتے ہو؟ لیکن خود تمہارا یہ کیف بھی محدود 'فانی' قاصر اور ایک حدود کے اندر ہے۔ لیکن یہ حقیقت تو واقع ہو چکی ہے۔ اور اس نے ایک شکل بھی اختیار کر لی۔ اس کا ایک وجود ہرے سامنے آگیا ہے اور تم اسے پارہے ہو۔

لیکن اس کے باوجود یہ اپنے بھائی 'یہ گھبراہٹ اور یہ خوف موجود ہے۔ یہ نبوت تو بہت ہی عظیم امر ہے۔ اور اس پیغام کے وصول کرنے کا وقت تو بہت ہی عظیم ہے۔ ایک انسانی ذات ایک ذلت عالی مقام کا پیغام وصول کرتی ہے۔ بھائی! تم یہ کلمات پڑھتے ہو کیا تم میرے اس تصور میں میرے ساتھ شریک ہو؟ کیا تم میرے ساتھ اس امر عظیم کو سوچ رہے ہو؟ کہ یہ وحی وہاں سے آرہی ہے۔ نہیں میں کہتا ہوں کیا میں کہہ سکتا ہوں کہ "وہاں" سے اس دربار عالی میں تو "یہاں" اور "وہاں" نہیں ہے۔ یہ نزول تو غیر مکان اور لازمان سے واقع ہے۔ یہ تو جگہ مکان اور حدود سے پاک ہے۔ جہت اور طرف تو اس بارگاہ میں نہیں۔ انتہائی مطلق 'ازلی لیدی ذات ہے 'اللہ ذوالجلال ہے۔ دوسری طرف ایک انسان ہے 'نبی' ہے 'رسول' ہے لیکن انسان ہے۔ وہ حدود و قیود رکھتا ہے۔ یہ وحی! یہ ایک عجیب رابطہ ہے۔ معجزانہ رابطہ ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو اسے ایک حقیقت واقعہ بنا سکتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ یہ واقعہ کیسے محقق ہوا۔ بھائی! تم یہ کلمات پڑھ رہے ہو کیا تم ان خیالات کو پارہے ہو جو میرے دل میں آتے ہیں اور میں انہیں کلمات کی شکل دے رہا ہوں۔ میرا پورا وجود جس قدر رعب 'کچکی محسوس کرتا ہے اور میں اسے کلمات میں منتقل کر رہا ہوں 'میں نہیں جانتا کہ اس کے لیے میں کیسے کلمات لا سکتا ہوں۔ یہ واقعہ تو اپنی ماہیت کے اعتبار سے بہت ہی عظیم عجیب اور خارق عادت ہے۔ جن صورتوں میں بار بار واقعہ ہوا۔ لوگوں نے اسے محسوس کیا اور بار بار اس کے مناظر بھی دیکھے 'رسول اللہؐ کے عہد میں آپ کے ساتھیوں نے۔ حضرت عائشہؓ انسانی تاریخ کے اس عظیم واقعہ کو دیکھ رہی ہیں۔ اور روایت کر رہی ہیں۔ آپؐ فرماتے عائشہ! یہ ہیں جبرئیل 'تم پر سلام کہتے ہیں۔ آپؐ فرماتی ہیں وعلیہ السلام۔ آپؐ فرماتی ہیں وہ دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتیں۔ یہ ہیں زید

لین ثابت۔ اس وقت حضور کا سر مبارک ان کی ران پر ہے۔ وحی آتی ہے، قریب ہے کہ ان کی ران کو پس ڈالے۔
 اور یہ دوسرے صحابہ کرام بارہا اس واقعہ کو دیکھتے ہیں اور پہچان جاتے ہیں آپ کے چہرہ مبارک پر آثار وحی۔ آپ کو تنہا
 چھوڑ دیتے ہیں کہ وحی کی تلقین کا عمل پورا ہو جائے۔ آپ بھی واپس آتے ہیں اور وہ بھی واپس آتے ہیں۔

یہ کیا شخصیت ہے رسول خدا کی جو ذات علوی کے ساتھ یہ رابطہ رکھتے ہیں؟ آپ کا جو ہر کیا ہے؟ آپ کی روح کیسی
 ہے کہ ایک ابدی کے ساتھ ازل کے ساتھ آپ رابطہ ہو جاتا ہے۔ یہ اختلاط کیسے ہوتا ہے۔ یہ مسائل ہیں لیکن یہ حقیقت ہو
 چکے ہیں۔ لیکن یہ واقعات ہمارے ادراک کے آفاق سے بہت دور ہیں بہت بلند ہیں۔

ہمارے نبی کی روح ایک انسانی روح ہے۔ یہ انسانی اور فانی روح کس طرح وحی اخذ کرتی ہے۔ تلقین اور ادراک کے
 دروازے کس طرح کھل جاتے تھے؟ کس طرح ان پر یہ فیضان ہوتا تھا۔ ان عجیب لوحات میں وجود رسول اور وجود کائنات
 کس طرح محسوس کرتا تھا۔ جس میں اللہ کی تجلیات آتی تھیں۔ اور یہ تجلیات کلمات کی شکل اختیار کرتی تھیں۔

پھر اللہ کی تمکینات، اللہ کی مہربانیاں اور اللہ کی عزت افزائیاں تو دیکھو! اللہ بہت ہی بلند، بہت ہی بڑا اور وہ اس
 نہایت ہی چھوٹی، کمزور اور بے بس مخلوق پر رحمتیں نازل کرتا ہے۔ یہ وحی اس کی اصلاح کے لیے ہے۔ اس کی راہ روشن
 کرنے کے لیے ہے۔ ان میں سے جو بے راہ ہو گئے۔ حیران ہیں ان کی راہنمائی کے لیے۔ انسان جو اللہ کے لیے اس سے
 بھی کم قیمت ہے جس طرح انسانوں کے لیے ایک مجسم۔ وہ اللہ کی مملکت میں اسی طرح ہے جس طرح پوری زمین کے
 مقابلے میں ایک مجسم۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے لیکن یہ انسان کی قوت مددگار کے تصور سے بہت ہی بلند و بالا ہے۔ ہم
 صرف اس افق عالی کی طرف دیکھ سکتے ہیں۔

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَنْ نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ
 (۵۲: ۴۲) صِرَاطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ إِلَّا إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ

الْأُمُورُ (۵۳: ۴۲) ”اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا
 کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے
 بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین
 اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔“

وَكَذَلِكَ (اسی طرح) اس عجیب رابطے کے ذریعہ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ (۵۲: ۴۲) ”ہم نے تمہاری طرف وحی
 کی۔“ گویا وحی مذکور طریقے سے ہوئی۔ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اور رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (۵۲: ۴۲) ”اپنے حکم سے
 ایک روح“۔ ہم نے تمہاری طرف وحی کی۔ یہ ایک روح ہے اس میں زندگی ہے۔ یہ انسانوں کو زندگی عطا کرتی ہے۔ یہ
 انسانوں کو آگے بڑھاتی ہے، حرکت دیتی ہے اور نشوونما عطا کرتی ہے، دلوں کو زندہ کرتی ہے اور عملی زاویہ سے لوگوں کو

زندہ کرتی ہے۔

مَا كُنْتُ تَذَرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (۵۲:۴۲) ”ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔“ یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذہنی کیفیت کی تصویر اللہ کھینچتا ہے۔ اور اللہ آپ کے بارے میں زیادہ علم رکھتا ہے۔ یہ اس وحی کے نزول و وصول سے پہلے کی بات ہے۔ اس نزول وحی سے قبل حضورؐ نے کتابوں کے بارے میں بھی سنا ہوا تھا۔ اور ایمان کے بارے میں بھی سنا ہوا تھا۔ اور جزیرۃ العرب میں یہ بات مشہور تھی کہ وہاں اہل کتاب ہیں اور ان کے پاس کتاب الہی ہے، اور ان کا یہ عقیدہ ہے۔ لہذا مراد یہ نہیں ہے کہ آپ نہ کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو جانتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ضمیر کے اندر وحی کتاب اور ایمان کا وہ شعور نہ پاتے تھے۔ وحی الہی سے قبل آپ کے شعور میں یہ باتیں نہ تھیں جو وحی کے ذریعہ اب آپ لوگوں کو جاتے ہیں۔

وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ (۵۲:۴۲) ”مگر اس کو ہم نے روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں۔“ یہ ہے اس وحی کی مابیت اور اس کی ذاتی خصوصیت۔ یہ روح، یہ وحی، یہ کتاب دراصل ایک نور ہے۔ یہ نور جب قلب کا حصہ بن جاتا ہے تو پھر یہ رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن یہ نور اسی شخص کے دل میں داخل ہوتا ہے جس کے بارے میں اللہ کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے دل میں راہ پا سکتا ہے۔ اور یہ شخص اس کی طرف مائل ہے۔

وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۵۲:۴۲) ”یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہو۔“ یہاں تاکید کے ساتھ وحی کی رہنمائی کی حیثیت کو واضح کیا جاتا ہے کہ یہ ایک عملی رہنمائی کا پروگرام ہے۔ اور ہدایت بھی اسی کو ملتی ہے۔ جس شخص کے بارے میں اللہ کی مشیت ہو۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ جس کے مقدر میں چاہے لکھ دے۔ اور اللہ ہر مقدر اپنے پیشگی علم کی وجہ سے تحریر کرتا ہے۔ یہ علم صرف اللہ ہی کو ہوتا ہے۔ رسول کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا۔ رسول تو حکم الہی سے تبلیغ پر مامور ہے۔ وہ کسی کے دل میں ہدایت نہیں ڈال سکتا۔ آپ اپنا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ کی مشیت کام کرتی ہے۔

وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۵۲:۴۲) صِرَاطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي

السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (۵۳:۴۲) ”یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو، اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین و آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔“ یہ وحی ہدایت ہے اللہ کے راستے کی طرف۔ جہاں تمام راستے آکر ملتے ہیں اور یہ مالک کا راستہ ہے جو زمین و آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے جو اس راستے پر آگیا۔ اسے اس کائنات کے قوانین فطرت کی راہ بھی معلوم ہو گئی۔ اسے زمین و آسمان کی قوتوں کا پتہ بھی چل گیا، اسے آسمانوں اور زمینوں کی لہر اوق کا بھی پتہ چل گیا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زمین و آسمان سب اللہ کی راہ پر چل رہے ہیں۔ اللہ ہی ان کا مالک ہے، یہ سب اس کی طرف متوجہ ہیں اور تمام امور اسی کی طرف مڑتے ہیں۔

اَلَا اِلٰی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ (۵۳:۴۲) ”خبردار رہو“ سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔“ سب چیزیں اللہ پر جا کر فتمی ہوتی ہیں، وہاں سب امور جمع ہوں گے اور ان کے فیصلے ہوں گے۔ اور یہ نور اس راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو اللہ نے بندوں کے لیے پسند کیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ جڑنے کے لیے اس کی طرف آئیں اور اس کے نشانات پر مطیع فرمان ہو کر چلیں۔

یوں اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس کا آغاز وحی پر بات سے ہوا، اس کا آخری مضمون اور محور وحی تھا۔ ابتدائی نبوتوں سے لے کر اس نے تمام نبوتوں کو لیا اور بتایا کہ یہ لیکن ہی سلسلہ ہے۔ ایک ہی نظام اور منہاج کی طرف دعوت ہے، راستہ بھی ایک ہے، طریقہ بھی ایک ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت نے تمام انسانیت کی رہنمائی کرنی ہے اور اس کی قیادت جماعت مومنہ نے کرنی ہے۔ اس نے لوگوں کو راہ راست پر لانا ہے۔ یہ اس ذات کا راستہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ پھر اس سورت نے اس ابتدائی جماعت کی خصوصیات بھی بتائیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی اور جس نے بھی یہ کام کرنا ہو، اس کے اندر یہ خصوصیات لازمی ہیں۔ ان خصوصیات کے بغیر نہ قیادت ممکن ہے اور نہ اس امانت کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔ یہ امانت جو اس منہاج کے مطابق آسمانوں سے زمین پر تقاری گئی۔

— ○ ○ ○ —

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پاره ----- ۲۵

سورة الزخرف - ۴۳

آیات ۱ --- تا --- ۸۹

سورۃ الزخرف ایک نظر میں

اس سورت میں ان مشکلات اور مصائب کا ایک حصہ پیش کیا گیا ہے جن سے اس کے زمانہ نزول میں تحریک اسلامی دوچار تھی۔ اور وہ رکاوٹیں اور اعتراضات بھی اس میں نقل کیے گئے ہیں جن سے دعوت اسلامی کو سابقہ درپیش تھا۔ ان موضوعات کے ساتھ ساتھ یہ بھی اس سورت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کو قرآن مجید کس طرح حل کر رہا تھا۔ چاہے ان کا تعلق خیالات سے ہو یا عمل سے ہو۔ اور یہ کہ قرآن مجید بت پرستانہ عقائد اور افسانوں کی جگہ کس خوبصورتی کے ساتھ اپنے حقائق اور قرآنی اقدار کو لوگوں کے ذہن میں بٹھا رہا تھا۔ اور جاہلی اقدار کو ایک ایک کر کے راہوں سے محو کر رہا تھا۔ یہ جاہلی اقدار اس وقت تو ہر انسان کے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھیں، مگر آج بھی ان کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ ہر زمان و مکان میں موجود رہی ہیں۔

جاہلیت کی بت پرستی اس بات کی قائل تھی کہ ان جانوروں میں جن کو اللہ نے بندوں کے لیے مسخر کیا ہے، ایک حصہ اللہ کا ہے اور ایک حصہ ان کے اہل کے ہے۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَذَا لِشُرَكَائِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَى

شُرَكَائِهِمْ (۶ : ۱۳۶) ”انہوں نے اللہ کے لیے خود اس کے پیدا کیے ہوئے کھیتوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہے، بزعم خود اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے۔ پھر وہ جو ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے، وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔“ اور انہی جانوروں کے بارے میں انہوں نے اور بے شمار خرافات اور افسانے بھی گھڑ رکھے تھے، سب کے سب نظریاتی انحراف سے پیدا ہوئے تھے۔ بعض جانور ایسے تھے جن پر سواری ممنوع تھی۔ بعض کے گوشت کو حرام کر دیا گیا تھا۔

وَقَالُوا هَذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ

حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا (۶ : ۱۳۸) ”اور کہتے ہیں یہ جانور اور کھیت محفوظ ہیں، انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھانا چاہیں، حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔ پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن کے اوپر یہ اللہ کا نام نہیں لیتے۔“

اس سورت میں اس قسم کے نظریاتی اور عقائد کی بے راہ روی کی اصلاح کی گئی ہے۔ انسانی دہن کو اصلی فطرت اور پہلی حقیقت کی طرف لوٹایا گیا ہے کہ تمام جانور اللہ کی مخلوق ہیں۔ یہ حیات روئے زمین پر اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ یہ جانور بھی اس کا حصہ ہیں۔ اور ان کی تخلیق بھی زمین و آسمان کی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہے۔ اللہ نے ان کو انسان کے لیے پیدا کیا ہے تاکہ انہیں استعمال کریں اور اپنے رب کی ان نعمتوں پر رب کا شکر ادا کریں۔ یہ نہ کریں کہ اللہ کے لیے بعض لوگوں کو شریک بنائیں اور پھر اللہ کی چیزوں میں سے اپنے لیے اور اپنے شرکاء کے لیے حصے مقرر کریں۔ حالانکہ وہ عقیدتا اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا خالق صرف اللہ ہے۔ لیکن اس عقیدے کے لازمی تقاضے سے پھر جاتے ہیں اور اس اقرار کا کوئی اثر ان کی زندگی میں نظر نہیں آتا۔ اور وہ خرافات اور انسانوں کے قائل ہیں۔

وَلَعِنَ سَالَتِهِمْ مِّنْ خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ لَيَقُولُنَّ خَلَقْنَاهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ (۹)
 الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۱۰)
 وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مِّثْلًا كَذَلِكَ تُخْرَجُونَ (۱۱)
 وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ (۱۲)
 لَتَسْتَوُوا عَلَى ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَنَ
 الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ (۱۳) وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ (۱۴)

(۴۳ : ۹ تا ۱۴) ”اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ خود کہیں گے کہ ”انہیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے۔“ وہی ناجس نے تمہارے لیے اس زمین کو گوارہ بنایا۔ اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنادیے تاکہ تم اپنی منزل مقصود کی راہ پا سکو۔ جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو اٹھایا۔ اس طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے۔ وہی جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا۔ تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو ان یاد کرو اور کہو کہ ”پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا۔ ورنہ ہم انہیں قابو میں نہ نہ رکھتے تھے۔ اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔“

یہ جاہلیت کی بت پرستی کے یہ عقائد بھی تھے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ اپنے لیے وہ بیٹیوں کو پسند نہ کرتے تھے لیکن اللہ کے لیے بیٹیاں بناتے تھے۔ اور اللہ کے سوا ان کی پوجا بھی کرتے تھے۔ اور پھر یہ کہتے تھے کہ ہم جو ان کی عبادت کرتے ہیں تو اللہ کی مرضی اور مشیت سے کرتے ہیں۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے اور یہ افسانہ محض ان کی نظریاتی بگاڑ سے پیدا ہوا تھا۔

اس سورت میں اللہ ان کے سامنے خود ان کے اقوال رکھتا ہے اور فطری منطق سے استدلال کرتا ہے کہ یہ خرافات

۔ یہ لوہام اور انسانے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

وَجَعَلُوْا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۵) اَمْ اَتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَّاَصْفُكُمْ بِالْبَنِيْنَ (۱۶) وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۱۷) اَوْ مِنْ يَنْشُرُوْا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (۱۸) وَجَعَلُوْا الْمَلَائِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشْهَدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ (۱۹) وَقَالُوْا لَوْ شَاءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنَهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۲۰) اَمْ اَتَيْنَهُمْ كِتٰبًا مِنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُّسْتَمْسِكُوْنَ (۲۱) بَلْ قَالُوْا اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰى اُمَّةٍ وَّاَنَا عَلٰى اَثَرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ

(۲۲) (۴۳: ۱۵ تا ۲۲) ”ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزء بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے۔ کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو دیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا اچھی طرح واضح بھی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمن کے خاص بندے ہیں، عورتیں قرار دے لیا۔ کیا ان کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھ لی ہے؟ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ یہ کہتے ہیں، اگر خدائے رحمن چاہتا تو ہم ان کو کبھی نہ پوچھتے۔ یہ اس معاملہ کی حقیقت کو قطعی نہیں جاننے محض تیرے لڑتے ہیں۔ کیا ہم نے اس سے پہلے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند یہ اپنے پاس رکھتے ہوں۔ نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔“

جب ان سے کہا جاتا کہ تم تو مورتیوں اور پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے ہو اور تم جن چیزوں کی پوجا کرتے ہو وہ تو جنم کا ایندھن ہیں کہ جن معبودوں کی تم پوجا کرتے ہو تم اور وہ دونوں جنم میں ہو گے تو وہ اس واضح کلام کی تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پھر عیسیٰؑ کا کیا حال ہو گا؟ ان کی قوم نے تو ان کی بندگی کی ہے۔ کیا وہ آگ میں اُلے جائیں گے؟ پھر وہ کہتے ہیں مورتیاں تو فرشتوں کی نقل ہیں اور ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں کیا ان کو بھی جنم میں ڈالا جائے گا۔ لہذا ہم ان کی عبارت کرتے ہوئے بہر حال نصاریٰ کی حالت سے بہتر ہیں جو عیسیٰؑ کی بندگی کرتے تھے۔ کیونکہ عیسیٰؑ بہر حال بشر تھے۔ اور ہمارے معبود فرشتے ہیں۔

اس سورت میں ان کے اس خط بحث کا بھی جواب دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معین نے ان کے بعد جو ان کی بندگی شروع کی ہے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بری الذمہ ہیں۔

وَلَمَّا ضَرَبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ (۵۷) وَقَالُوا آءِ إِلَهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ (۵۸) إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا

عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ (۵۹) (۴۳: ۵۷ تا ۵۹) ”اور جو بنی اسرائیل کی مثال دی گئی، تمہاری قوم کے لوگوں نے اس پر غل مچا دیا اور لگے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمہارے سامنے کج بحثی کے لیے لاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔ بنی مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اپنی قدرت کا نمونہ بنا دیا۔

ان کا زعم یہ تھا کہ وہ ملت ابراہیمی کے پیروکار ہیں۔ لہذا وہ دوسرے لٹل کتاب سے زیادہ ہدایت پر ہیں اور عقائد کے اعتبار سے افضل ہیں۔ حالانکہ وہ اس بت پرستانہ جاہلیت میں گم کردہ راہ تھے۔

چنانچہ اس سورت میں حضرت ابراہیم کی حقیقت بتائی گئی اور بتایا کہ ابراہیم کی ملت تو خالص توحید کی ملت تھی۔ کلمہ توحید تو ابراہیم علیہ السلام کا کلمہ ہے، انہی کی وراثت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اسی کلمے کو لے کر آئے ہیں لیکن انہوں نے اس کلمے کا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال اس طرح نہیں کیا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ملت کو کرنا چاہئے تھا۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبْنَيْهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ (۲۶) إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ (۲۷) وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۲۸) بَلْ مَتَّعْتُ هَؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُولٌ مُّبِينٌ (۲۹) وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ

قَالُوا هَذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ (۳۰) (۴۳: ۲۶ تا ۳۰) ”یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے اپنے باپ اور قوم سے کہا تھا کہ تم جن کی بندگی کرتے ہو، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا تعلق صرف اس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا، وہی میری رہنمائی کرے گا۔“ اور ابراہیم یہی کلمہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ بلکہ میں انہیں اور ان کے باپ دادا کو متاع حیات دیتا رہا یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آگیا مگر جب وہ حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔“

وہ اس حکمت کو نہ سمجھ سکے کہ اللہ نے کیوں رسول کو منتخب کر کے بھیجا۔ ان کی نظروں میں زمین ہی کی معمولی کھوٹی

اور بے قیمت قدروں میں بیٹھ گئیں اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دنیا پرستوں میں سے ایک آدمی ہی سمجھا۔ اس سلسلے میں ایک رسول کے بارے میں ان کے اقوال، ان کے تصورات اور ان کی سوچ کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں اور ان کو بتایا گیا کہ رسالت کے بارے میں حقیقی سوچ کیا ہے اور یہ کہ رسول کے متعلق وہ جو سوچتے ہیں وہ محض دنیا داری کی سوچ ہے۔ بہت ہی گھٹیا قسم کی دنیا داری۔ اس کی اقدار پر مبنی سوچ کی ایک جھلک ان کو دکھائی جاتی ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (۳۱) أَهْمُ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۳۲) وَلَوْلَا أَن يُكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَن يَكْفُرُ بِالرَّحْمَنِ لِبُيُوتِهِمْ سُقْفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ (۳۳) وَلِبُيُوتِهِمْ أَبْوَابًا وَسُرُورًا عَلَيْهَا يُتَكَبَّرُونَ (۳۴) وَزُخْرَفًا وَإِنْ كُلُّ ذَلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ

عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ (۳۵) (۴۳: ۳۱ تا ۳۵) ”کہتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں بڑے شہروں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کی رحمت یہ تقسیم کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے۔ اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو سمیٹ رہے ہیں۔ یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدا کے رحم سے کفر کرنے والوں کے گمروں کی چھتیں اور ان کی میڑھیاں جن سے وہ اپنے بالا خانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تحت جن پر وہ ٹکیے لگائے بیٹھے ہیں سب چاندی اور سوئے کے بنا دیتے۔ یہ تو محض حیات دنیا کی متاع ہے اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے۔“

اس کے بعد حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصے کی ایک کڑی آتی ہے، فرعون بھی اسی طرح کی قدروں پرست ہے۔ اللہ کے مقابلے میں کبر کرتا ہے۔ جن جھوٹی قدروں پر فرعون نے فخر کیا، ایسے فخر کرنے والوں کا انتظار بہت برا انجام کرتا ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۴۶) فَلَمَّا حَاسَتْهُمْ بَايِنَاتُنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ (۴۷) وَمَا نُرِيهِمْ مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا وَاعْتَذَرُوا بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۴۸) وَقَالُوا يَا أَيُّهَ السَّحِرِ

اِذْ عَلَّمْنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اِنَّا لَمُهْتَدُونَ (۴۹) فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ (۵۰) وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَاقَوْمِ اَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَذِهِ النَّهْرُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي ۚ اَفَلَا تُبْصِرُونَ (۵۱) اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِنْ هٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَاَلَا يَكَادُ بَيْنُهَا (۵۲) فَلَوْلَا اَلْقَىٰ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِنْ ذَهَبٍ اَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِينَ (۵۳) فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَطَاعُوهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (۵۴) فَلَمَّا اَسْفَوْنَا اَنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۵۵) فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلَاخِرِيْنَ (۵۶)

(۴۳: ۴۶ تا ۵۶) ”ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانوں کے ساتھ فرعون اور اس کے ایمان سلطنت کے پاس بھیجا اور اس نے جا کر کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ پھر جب اس نے ہماری نشانیاں ان کے سامنے پیش کیں تو وہ ٹھنڈے مارنے لگے۔ ہم ایک پر ایک ایسی نشانیاں ان کو دکھاتے چلے گئے جو پہلے سے بڑھ چڑھ کر تھی اور ہم نے ان کو عذاب میں دھر لیا کہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔ ہر عذاب کے موقع پر دو کہتے: اے ساحر اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے، اس کی بنا پر ہمارے لیے اس سے دعا کر، ہم ضرور راہ راست پر آجائیں گے، مگر جو نہی کہ ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے۔ ایک دن فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا ”لوگو کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے اور یہ نہروں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن لٹارے گئے یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا۔ اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی۔ درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔ آخر کار جب انہوں نے ہمیں خطبہ تک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونہ عبرت بنا کر رکھ دیا۔“ غرض اس پوری سورت میں بت پرستی، نظریاتی بگاڑ، دنیا کی جھوٹی قدروں پر بات کی گئی ہے اور بھرپور تنقید۔ اس سورت کے تین اسباق ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا جن کا اکثر مواد ہم نے یہاں دے دیا ہے۔

درس نمبر ۲۳ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۲۵



حَقُّهُ ۱ وَ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ۲ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۳ وَ اِنَّهُ
فِي اَمْرِ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلٌّ حَكِيمٌ ۴ اَفَتَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ
قَوْمًا مُّسْرِفِينَ ۵ وَ كَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَبِيٍّ فِي الْاَوَّلِينَ ۶ وَ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ
نَبِيٍّ اِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۷ فَاَمْلِكْنَا اِشْدَادًا مِنْهُمْ بَطْشًا وَ مَضَىٰ مَثَلُ
الْاَوَّلِينَ ۸

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ح۔م۔تم ہے اس واضح کتاب کی کہ ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم لوگ اسے سمجھو۔ اور درحقیقت یہ ام الکتاب میں ثبت ہے ہمارے ہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے برتر کتاب۔ اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درس فصاحت تمہارے ہاں بھیجنا چھوڑ دیں صرف اس لیے کہ تم حد سے گزرے ہوئے ہو؟ پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی بارہا ہم نے نبی بھیجے ہیں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی نبی ان کے ہاں آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ پھر جو لوگ ان سے درجہ زیادہ طاقتور تھے، انہوں نے ہاک کر دیا، پچھلی قوموں کی مثالیں گزر چکی ہیں۔“

سورت کا آغاز دو حروف حاور میم سے ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد۔

وَ الْكِتَابِ الْمُبِينِ (۲: ۴۳) کا عطف ہے۔ اللہ حاور میم کی بھی قسم اٹھاتا ہے اور کتاب مبین کی بھی۔

حضور میں بھی اسی کتاب کے حروف ہیں۔ یا کتاب میں ان دو حروف کے جن سے ہے۔ غرض یہ کتاب میں حروف تہجی کے اعتبار سے ایسے ہی حروف تہجی سے مرکب ہے۔ یہ دو حروف اسی طرح کے حروف ہیں جس طرح کے حروف انسانی زبانوں میں ہوتے ہیں۔ یہ خالق کائنات کی نشانیاں ہیں جس نے انسان کو اس انداز سے پیدا کیا اور اس کو اس قسم کی آوازیں دیں۔ قرآن کے ساتھ ان حروف کا جب ذکر آتا ہے کہ تو اس کے بے شمار معانی اور بے شمار دلالت و اشارات ہوتے ہیں۔ قسم اس بات پر اٹھائی جاتی ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو اس انداز پر بنایا عربی زبان میں۔

اَنَا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۳: ۴۳) ”ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم لوگ اسے سمجھو“۔ جب قرآن ان کی زبان میں ہے اور وہ اس کے معنی جانتے بھی ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن تو وحی الہی ہے لیکن اللہ نے اسے عربی زبان میں نازل کیا کیونکہ قرآن کی دعوت کے لیے اللہ نے آغاز میں عربی معاشرے کو چنا اور سب سے پہلے اس دعوت کے حاملین عرب ہی رہے۔ اس حکمت کی بنا پر جس کی طرف ہم نے سورہ شوریٰ میں اشارت کیے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس امانت اور اس زبان کی صلاحیتوں کو بھی طرح جانتا تھا کہ امت عربیہ اور لسان عربی اس دعوت کو دو سری اقوام تک بھی طرح نازل کر سکتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ اپنی رسالت کی امانت کو کہاں رکھے اور کہاں نہ رکھے۔

اس کے بعد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس قرآن کا مقام و مرتبہ اللہ ازیلی اور ابدی ذات کے ہاں کیا ہے؟

وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلَىٰ حَكِيمٌ (۴: ۴۳) ”اور در حقیقت یہ ام الکتاب میں ثبت ہے اور ہمارے ہاں بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب ہے“۔ ام الکتاب کیا ہے؟ اس کے فنی معنوں میں ہم نہیں پڑتے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہے یا اللہ کا علم ازیلی ہے کیونکہ ہمارے اور اک میں نہ تو لوح محفوظ کا۔ اور نہ اللہ کے علم ازیلی کا پورا تصور ہے البتہ اس آیت سے ہمارے علم میں ایک اصولی حقیقت آتی ہے۔ جب ہم یہ آیت پڑھتے ہیں۔

وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلَىٰ حَكِيمٌ (۴: ۴۳) ”یہ در حقیقت ام الکتاب میں ثبت ہے اور ہمارے ہاں بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب ہے“۔ تو اس سے ہمارے ذہن میں یہ بات واضح طور پر آ جاتی ہے کہ اللہ کے علم میں اس کتاب کی بڑی وقعت ہے اور اسے امت ہی اہم دستاویز سمجھا جاتا ہے۔ بس یہ اصولی اور کلی بات ہمارے لیے کافی ہے کہ قرآن ایک بلند مرتبہ کتاب ہے اور حکیم ہے یعنی حکمت والی کتاب ہے۔ یہ دونوں صفات اس کتاب کو ایک ایسی شخصیت دیتی ہیں جس طرح زندہ انسان ہوتا ہے یعنی بلند اور حکیم کا۔ اور بالکل یہ بات اسی طرح ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے گویا اس میں زندگی ہے اور اس میں زندہ شخصیت کی صفات ہیں یہ کہ جو ارواح اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں یہ ان کے ہم قدم چلتی ہے۔ اور یہ اپنی بلندی اور حکمت کے بدولت انسانیت پر نگران ہے اس کو ہدایت دیتی ہے اس کی قیادت کرتی ہے اپنی طبیعت اور اپنے خصائص کے مطابق اور یہ انسانی فہم و ادراک میں وہ انداز اور وہ تصورات بناتی ہے جن پر ان دو صفات علی اور حکیم کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس حقیقت کو فیصلہ کن انداز میں طے کرنے کے بعد اب اس قوم کو یہ بات بھی طرح سمجھ لینا چاہئے جن کی زبان

میں یہ علی و حکیم کتاب اتری ہے کہ اللہ نے ان کو کتنا بڑا اعزاز بخشا ہے اور یہ لوگ پھر بھی اللہ کے اس فضل و کرم کو نہیں سمجھتے۔ اور پھر بھی اس خزانہ حکمت سے منہ موڑتے ہیں اور اس کی توہین کرتے ہیں۔ ان حالات میں یہ تو اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے پاس آنے والی اس حکمت و ہدایت پر مشتمل کتاب کا نزول ہی بند کر دیں، چنانچہ یہاں ان کی اس زیادتی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور سوالیہ انداز میں پوچھا جاتا ہے کہ کیا تمہاری اس زیادتی اور حد سے گزر کر زیادتی کی وجہ سے اس سرچشمہ ہدایت دائمی کو بند کر دیں۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمْ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِينَ (۵: ۴۳) ”اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درس نصیحت تمہارے ہاں بھیجا بند کر دیں۔ صرف اس لیے کہ تم حد سے گزرے ہوئے ہو۔ یہ بات نہایت ہی عجیب لگتی ہے اور آئندہ بھی عجیب رہے گی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی قوم کو اس قدر اہمیت دی کہ اس کے لیے اس نے کتاب بھیجی۔ ان کی زبان میں بھیجی۔ اس کتاب نے ان کی فطرت کے عین مطابق وہ باتیں کہیں جو ان کے دل میں تھیں، ان کی زندگی کی گہرائیوں تک چلی گئی، اور ان کے لیے ہدایت کا راستہ بیان کیا، پہلی اقوام کے عبرت آموز قصے بیان کیے، گزشتہ اقوام کے ساتھ سنت الہیہ نے جو سلوک کیا وہ بیان کیا گیا، لیکن اس نے اس کتاب کو نظر انداز کر دیا اور امراض کر لیا! پھر بھی اللہ ان لوگوں کی فکر کرتا ہے حالانکہ وہ نہایت بلند، نہایت عظیم اور غنی بادشاہ ہے۔

اس آیت میں درحقیقت ایک خوفناک تہدید ہے کہ اگر اللہ چاہے تو اس سرچشمہ فیض و حکمت کو ختم کر دے اور تم پر ہونے والی اس مہربانی کو بند کر دے۔ کیونکہ تم اس عظیم حکیمانہ اور بلند مرتبہ کتاب کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کر رہے ہو، اور تم سے ان اقوام جیسا سلوک کرے جو تم سے پہلے گزری ہیں۔

وَکَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِیٍّ فِی الْاَوَّلِیْنَ (۶: ۴۳) وَمَا یَاتِیْهِمْ مِنْ نَّبِیٍّ اِلَّا کَانُوْا بِهِ یَسْتَهْزِئُوْنَ (۷: ۴۳) فَاهْلَکْنَا اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰی مَثَلُ الْاَوَّلِیْنَ (۸: ۴۳) ”پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی بارہا ہم نے نبی بھیجے ہیں، بھیجی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی نبی ان کے ہاں آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ پھر جو لوگ ان سے بدرجہا زیادہ طاقتور تھے، انہیں ہم نے ہلاک کر دیا، پچھلی قوموں کی مثالیں گزر چکی ہیں۔“ وہ اب اور کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں، اللہ نے ایسے رویہ پر تو ان سے زیادہ قوت گرفت رکھنے والی اقوام کو ہلاک کیا ہے جو انہی کی طرح رسولوں اور کتابوں کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔ کئی مثالیں موجود ہیں۔

بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے وجود کا اعتراف کرتے تھے۔ یہ بھی اعتراف کرتے تھے کہ اللہ ہی ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا، لیکن ان اعترافات کے بعد پھر ان کے قدرتی نتائج کو قبول نہ کرتے تھے اور اپنی زندگی کے امور میں صرف اللہ کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو شریک کرتے تھے اور اللہ کے پیدا کردہ بعض جانوروں کو ان الہوں کے لیے مخصوص کرتے تھے اور یہ عقیدہ انہوں نے گھڑ لیا تھا کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور ملائکہ کے بت بنا کر یہ ان کو پوجتے تھے۔

قرآن مجید یہاں ان کے اعترافات کو پیش کر کے پھر اس کے فطری نتائج مرتب کرتا ہے اور پھر ان کو فطری استدلال

کے سامنے کھڑا کرتا ہے جس سے وہ بھاگتے تھے۔ قرآن کریم ان کے سامنے اللہ کی مخلوقات میں سے حیوانات اور کشتی کو بطور مثال پیش فرماتا ہے کہ ان میں تمہارے لیے کتنے فائدے ہیں اور اس کے مقابلے میں تمہارا رویہ کیا ہونا چاہئے مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کے بعد دوسرے پیرا گراف میں یہ بتایا گیا کہ کیا جواز ہے کہ تم نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔

وَلَیِّنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیْقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ ۝ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَانْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّیْمًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝ وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمُ فِیْنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۝ لَیْسَتُوْا عَلٰی ظُهُوْرِهِۦ ثُمَّ تَذْكُرُوْنَ نِعْمَةً رَّبِّكُمْ اِذَا اسْتَوِیْتُمْ عَلَیْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝

”اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا تو یہ خود کہیں گے کہ ”انہیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے“۔ وہی نا جس نے تمہارے لیے اس زمین کو گوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنا دیئے تاکہ تم اپنی منزل مقصود کی راہ پا سکو۔ جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو جلا اٹھایا، اسی طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے۔ وہی جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے، اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا تاکہ ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ ”پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے“ اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔“

عربوں کے اندر خدا پر یقین تھا، وہ ملت ابراہیمی پر تھے۔ لیکن عربوں کے اندر ملت ابراہیمی کی بگڑی ہوئی شکل رہ گئی تھی۔ اس میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ توحید کی جگہ شرک اور دوسرے افسانے اس میں داخل ہو گئے تھے۔ بہر حال وجود باری کے وہ قائل تھے کیونکہ فطرت انسانی بہر حال اس کا انکار نہیں کر سکتی کہ ایک خالق ہے، جو اللہ ہے۔ کیونکہ کسی خالق کا انکار کوئی سلیم الفطرت انسان نہیں کر سکتا۔ اور کوئی معقول انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ عظیم اور ہولناک کائنات خالق کے بغیر پیدا ہو گئی۔ اس کائنات کو اللہ کے سوا کوئی اور پیدا بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس عظیم کائنات کا خالق تو اس سے بھی عظیم اور طاقتور ہونا چاہئے لیکن وہ یہاں آکر رک جاتے تھے اور خود اپنے عقیدے کے لازمی تقاضوں کو تسلیم نہ کرتے تھے۔

وَلَیِّنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیْقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ (۹:۴۳) ”اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ تو یہ خود کہیں گے کہ انہیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے۔“ یہ

بات واضح ہے کہ یہ دو صفات عزیز و ذبردست اور علیم یہ کفار کا قول نہ تھا۔ وہ تو صرف اسی قدر مانتے تھے کہ وہ اللہ ہے۔ وہ اللہ کی وہ صفات نہ مانتے تھے جو اسلام اور قرآن نے پیش کیں۔ ایسی صفات جو ان کی زندگی پر مثبت اثر ڈالیں۔ جو ان کی زندگی اور اس کائنات کو یک وقت عملاً چلائیں۔ وہ اللہ کو بس اس کائنات کا خالق مانتے تھے۔ خود اپنا خالق بھی اللہ کو مانتے تھے لیکن زندگی کو عملاً چلانے کے لیے پھر انہوں نے کچھ دوسری ہستیاں بنا رکھی تھیں۔ کیونکہ اللہ کی ایسی صفات سے متعارف نہ تھے جن کے بعد پھر انہیں شرک کی ضرورت نہ پڑے۔ اور عقیدہ شرک انہیں پوچ اور ہے وقت نظر آئے۔

قرآن مجید یہاں ان کو یہی تعلیم دیتا ہے کہ جس خدا کو تم خالق السموات والارض سمجھتے ہو۔ وہ عزیز بھی ہے اور العلیم بھی ہے۔ وہ قادر بھی ہے، وہ علیم و عارف بھی ہے۔ چنانچہ اللہ ان کے اس اعتراف کو بنیاد بنا کر ان کو درج ذیل اعترافات پر مجبور کرتا ہے۔ غرض ان کو ایک قدم آگے بڑھا کر ان کو یہ بتاتا ہے کہ تخلیق کے بعد اللہ نے تم پر یہ فضل کیا:

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ

(۱۰: ۴۳) ”وہی نا جس نے تمہارے لیے زمین کو گوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنا دیئے تاکہ تم اپنی منزل کی راہ پاسکو۔“ یہ حقیقت کہ اللہ نے انسان کے لیے اس زمین کو گوارہ بنایا ات ہر دور کے انسان نے اپنے حدود علم کے مطابق سمجھا ہے اور اس کی تصویر بنائی ہے۔ جن لوگوں نے پہلی مرتبہ اس کو سنا ہو گا، انہوں نے بھی یہ سمجھا ہو گا کہ اللہ نے زمین کو اس قابل بنایا کہ وہ ان کے قدموں کے نیچے چلنے کے لیے موزوں ہے۔ پھر وہ ذرا امت کے لیے موزوں ہے۔ پھر وہ زندگی اور نباتات کے لیے موزوں ہے لیکن آج ہم اس بات کو کہ زمین تمہارے لیے گوارہ بنا دی گئی درازیاہ وسعت اور گہرائی کے ساتھ سمجھ رہے ہیں۔ جس حد تک ہم نے اس زمین کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اس کی بعید و قریب تاریخ کے بارے میں معلومات فراہم کر لی ہیں بشرطیکہ ہمارے اپنے علوم کے بارے میں جو نظریات قائم ہوتے ہیں وہ ہوں بھی درست اور ہم جو اندازے اور تخمینے لگاتے ہیں وہ صحیح ثابت ہو جائیں۔ ہم سے بعد میں آنے والی نسلیں ان کے بارے میں ہم سے بھی زیادہ سمجھیں گی۔ یوں اس آیت کا مضمون وسعت اختیار کرتا جائے گا۔ جس قدر ہم علم میں آگے بڑھیں گے، علم و معرفت کی فتوحات کی وسعت کے ساتھ ساتھ اس آیت کے معانی بھی وسیع ہوتے جائیں گے اور یوں انسانی جمالت کا پردہ دور تر جاتا رہے گا۔

ہم آج جانتے ہیں کہ یہ زمین انسان کے لیے کس قدر اچھا گوارہ بنائی گئی ہے اور اس کے اندر انسان اپنے لیے زندگی کی کس قدر مختلف راہیں تلاش کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کرۂ ارض مختلف مراحل سے گزر کر یہاں تک یعنی اپنی موجودہ حالت تک پہنچی ہے اور انسان کے لیے گوارہ بنائی گئی ہے۔ ان مراحل میں سے ایک مرحلہ یہ تھا کہ اس پوری زمین کی سطح ایک سخت چٹان کی طرح تھی۔ اس کے بعد اس پر جگہ جگہ مٹی جمع ہوئی اور اس میں نباتات اگنا شروع ہوئے اور اس کی سطح پر جو ہائیزروجن گیس اور آکسیجن گیس موجود تھی، ان کے ملاپ سے پانی وجود میں آگیا۔ پھر اپنی گردش محوری کے نتیجے میں اس کے دن کے اندر اس قدر معتدل حرارت پیدا ہوئی کہ وہ حیوانات کی زندگی کے لیے مناسب ہو گئی۔ اور اس کی رفتار گردش محوری کو یوں رکھا گیا کہ اس کی سطح پر چیزوں کا کھڑا رہنا ممکن ہوا۔ انسان مکانات اور دوسری چیزیں بکھر کر ہوا میں نہیں اڑ سکتی۔

پھر اللہ نے اس زمین کے اندر کشش ثقل پیدا کی۔ یوں ہوا کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا جس کے اندر زندگی ممکن ہوئی۔ اگر اس زمین کے ارد گرد پائی جانے والی ہوا زمین کی جاذبیت سے چھوٹ جائے تو زمین پر کسی چیز کا زندہ رہنا ممکن نہ ہو، دوسرے اجرام فلکی کی سطح پر چونکہ جاذبیت نہیں ہے یا اس سے کمزور ہے تو وہاں حیات ممکن نہیں ہو سکتی۔ ان کرات سے ہوا چلی گئی۔ مثلاً چاند کے اوپر کوئی ہوا نہیں ہے۔ یہ جاذبیت اس قدر متوازن ہے کہ حرکت زمین کی وجہ سے اشیاء کو دور بھیجنے کا جو عمل پیدا ہوتا ہے اس کے اندر یہ توازن پیدا کر دیتی ہے۔ یوں تمام اشیاء اور زندہ چیزیں بکھرنے اور اڑ جانے کے عمل سے محفوظ ہیں۔ اور یہاں زمین کی سطح پر ان کا ٹھہرنا اور چلنا بالکل ممکن ہے۔ اگر یہ جاذبیت موجودہ مقدار سے بڑھ جائے تو تمام زندہ اور مردہ چیزیں زمین کے ساتھ لیٹ جائیں۔ انسانوں کے لیے قدم اٹھانا ممکن نہ ہو، یا بہت مشکل ہو اور اس کے لیے بہت ہی قوت صرف کرنی پڑے اور دوسری جانب سے انسان پر ہوا کا دباؤ بڑھ جائے تو انسان کو زمین کے ساتھ چپکا دے۔ جس طرح ہم پتھروں اور کھیلوں کو پریشر کے ارتکاز سے ہاتھ لگائے بغیر ہلاک کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ دباؤ اس سے کم ہو جائے جو ہے تو ہمارا سینہ اور ہماری شریانیں خون کے دباؤ کی وجہ سے پھٹ جائیں۔

اور زمین کو گوارہ بنانے اور اس کے اوپر راستوں کو ہموار کرنے کے سلسلے میں ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق ارض و سما نے اس زمین کے اندر ایسی موافق توہین و دیت فرمائی ہیں جو سب کی سب مل کر اس زمین پر زندگی کو سل بناتی ہیں۔ اگر ان موافق حیات یا عمد حیات قوتوں میں سے ایک قوت بھی ناپید ہو جائے یا اس میں خلل واقع ہو جائے تو اس کرۂ ارض پر زندگی محال ہو جائے۔ بعض تو وہ ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ اور بعض اور ہیں۔ مثلاً اللہ نے اس کرۂ ارض پر پانیوں کی مقدار کو اس قدر رکھا ہے جو سمندروں، دریاؤں کی شکل میں زمین کی سطح کے اوپر ہونے والے تمام مسموم گیسوں کو چوس لیتے ہیں اور زمین کی فضا کو آلودگی سے اس قدر صاف رکھا جاتا ہے کہ یہاں زندگی کا وجود ممکن ہوتا ہے۔ پھر اللہ نے نباتات کو آکسیجن کے درمیان توازن کے قیام کا ذریعہ بنایا۔ وہ آکسیجن جس کو انسان سانس کے ذریعہ لیتا ہے اور اس آکسیجن کے درمیان جس کو نباتات چھوڑتے ہیں۔ اگر یہ توازن نہ ہوتا تو ایک عرصہ کے بعد انسان دم گھٹ کر مر جاتا۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے مفہوم و معانی اس آیت میں شامل ہیں۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا (۴۳: ۱۰) ”جس نے

تمہارے لیے زمین کو گوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنائے۔“ ہر دم اور ہر روز اس کے نئے نئے معانی منکشف ہو رہے ہیں اور مدلولات ان معانی پر اضافہ ہوتے جاتے ہیں جو اس آیت سے اس کے اول مخاطبین کرام سمجھتے تھے۔ اور یہ سب اللہ حاکم سموات والارض کے علم کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور اس کی قدرت کے بھی مظاہر ہیں۔ جو زبردست ہے اور نہایت حکمت والا ہے۔ یہ سب معانی ایک شعور رکھنے والے دل کو یہ دکھاتے ہیں کہ ایک خالق اور مدبر قوت موجود ہے جس قدر انسان کی نظر آگے بڑھتی ہے اور اس کی سوچ گہرائی تک جاتی ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ کوئی ایسی مخلوق نہیں جو آوارہ چھوڑ دی گئی ہو اور یہ کہ اس نے کسی کے آگے جواب نہیں دینا ہے بلکہ انسان یہ یقین کر بیٹا ہے کہ ایک زبردست قوت و مدبر نے ان کو پکڑ رکھا ہے اور وہ اس کے تمام امور کا دال ہے، زندگی میں بھی زندگی سے پہلے بھی اور زندگی کے بعد بھی۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۴۳: ۱۰) ”تاکہ تم اپنی منزل مقصود پاسکو۔“ اس کائنات پر اس طرح گہرائی کے ساتھ غور کرنا اور اس کے اندر پائے جانے والے نوائس فطرت کا گہرا مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ انسان کا دل و دماغ خالق کائنات کی طرف راہ لے۔ جس نے اس کائنات کے اندر اس قدر گہری تنظیم اور توازن رکھا ہے۔ زندگی کی نشوونما اور اس میں زندوں کے لیے سہولیات اور زمین کو ان کے لیے گوارہ بنانے اور اس میں انسانوں کے لیے راستے بنانے کے بعد اب ایک قدم اور آگے :

وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذَلِكَ تُخْرَجُونَ

(۴۳: ۱۱) ”جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو جہاں اٹھایا اسی طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے۔“ وہ پانی جو آسمانوں سے نازل کیا جاتا ہے اسے تو ہر انسان دیکھتا ہے اور جانتا ہے لیکن اس منظر کو اکثر لوگ یونہی دیکھ کر گزر جاتے ہیں اور اس پر انہیں کوئی تعجب نہیں ہوتا اور اس کے احساس و شعور میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ وہ ہر وقت اور ہر اوقات نزول باران رحمت دیکھتے رہے ہیں لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بارش کے قطروں کو نہایت ہی محبت و دلچسپی اور نہایت مسرت سے دیکھتے تھے اس لئے کہ آپ کو یہ پختہ شعور حاصل تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے آرہے ہیں اس لیے کہ آپ کا زندہ و بیدار قلب ابھی طرح دیکھ رہا تھا کہ یہ قطرے اللہ کی صفات اعلیٰ نمونے ہیں۔ آپ ان میں دست قدرت کی کاریگری دیکھ رہے تھے۔ ان قطروں پر اس دل کو اسی طرح دیکھنا چاہئے جو اللہ تک پہنچا ہوا ہو اور اس کائنات کے اندر اللہ کے جاری کردہ نوائس فطرت کو جانتا ہو۔ کیونکہ بارش کے یہ قطرے انہی قوانین قدرت کے نتائج ہیں۔ یہ نوائس فطرت اس کائنات میں اللہ کی نظروں کے تحت اور اللہ کے دست قدرت کے ذریعہ ایک ایک قطرہ ہو کر گرتے ہیں۔ اس حقیقت کی ضرورت اور اس کے اثرات میں یہ سوچ کی نہیں لا سکتی کہ یہ پانی دراصل بخارات تھیں جو زمین سے اوپر فضا میں جا کر اٹھنے لگے ہو گئے اور فضاؤں میں ان کے اندر اس قدر کثافت پیدا ہو گئی کہ بارش ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ آخر زمین کو کس نے پیدا کیا۔ یہاں پانی کس نے بنایا۔ پھر ان پر حرارت کس نے مسلط کی اور پانی کی ساخت کس نے اس طرح بنائی کہ وہ حرارت سے بخار بن جائے۔ پھر بخارات کے اندر یہ خاصیت کس نے رکھی کہ وہ اوپر جائیں؟ اور اوپر پھر کثیف ہو جائیں۔ پھر یہ خصائص کس نے رکھے۔ یہ بخارات بجلیوں سے بھی بھر جائیں جو آپس میں ملیں تو پانی نیچے گر جائے اور پھر بجلی کیا چیز ہے؟ غرض وہ تمام خصائص طبعیت کیا ہیں جن سے مل کر بارش بنتی ہے۔

سائنس پڑھ کر دراصل ہم اپنے احساس کے پردوں کو اس قدر کثیف بنا دیتے ہیں کہ اس کائنات کے عجبات کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا حالانکہ ہمیں چاہئے تو یہ ہے کہ سائنس کے ذریعہ ہم اپنے احساسات کو مزید تیز کر دیں اس قدر تیز کہ دل خوف خدا سے کانپ اٹھیں۔

وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ (۴۳: ۱۱) ”جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا۔“ یہ پانی ایک اندازے کے اندر مقدار اور سوزوں ہے نہ زیادہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو غرق کر دے نہ اس قدر

کم ہوتا ہے کہ زمین خشک ہو کر زندگی کے قابل ہی نہ رہے۔ ہم یہ عجیب توازن اور مقدار دیکھ رہے ہیں۔ اور آج اسے ابھی طرح جانتے ہیں کہ یہ توازن زندگی کی ضروریات کے لیے ضروری ہے اور یہ ارادہ الہیہ سے قائم ہوا۔

فَأَنْشَرْنَاهُ بِلَدَّةٍ مِّثَّتَا (۴۳: ۱۱) ”اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو جلا اٹھایا“۔ انشا سے مراد احیاء ہے اور ہر قسم کی زندگی پانی کے بعد آتی ہے کیونکہ اللہ نے ہر چیز کو پانی سے زندہ کیا۔

كَذَلِكَ تُخْرَجُونَ (۴۳: ۱۱) ”اس طرح تم ایک روز زمین سے برآمد کیے جاؤ گے“۔ جس نے پہلی مرتبہ زندہ کیا وہ دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے۔ جس نے زندہ چیزوں کو پہلی مرتبہ مردہ زمین سے نکالا، اس طرح وہی قیامت کے دن میدان حشر میں سب زندہ انسانوں کو اگا کر نکال لائے گا۔ جب ابتداء ہوگئی تو اعادہ اور تکرار مشکل نہیں رہتا۔ اس میں اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔

پھر یہ جانور جن کو یہ لوگ تقسیم کر کے کچھ اللہ کو دیتے ہیں اور کچھ اللہ کے سوا دوسرے شریکوں کو، وہ تو اللہ نے اس لیے نہیں پیدا کیے کہ تم اس طرح کی تقسیم کرو، یہ تو اس لیے تخلیق کیے گئے ہیں کہ یہ لوگوں کے لیے نعمت خداوندی کا کام کریں۔ لوگ ان پر اس طرح سوار ہوں جس طرح کشتیوں پر سوار ہوتے ہیں اور ان کی اس تسخیر پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ اور اللہ کے انعامات کے مقابلے میں شکر یہ ادا کریں۔

وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ (۴۳: ۱۲) لَتَسْتَوُوا عَلَى ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ

تَقُولُوا سُبْحَنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ (۴۳: ۱۳) وَ إِنَّا إِلَى رَبِّنَا

لَمُنْقَلِبُونَ (۴۳: ۱۴) ”وہی جس نے یہ تمام جہاز پیدا کیے اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا۔ تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو“ اور کہو کہ ”پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا۔ ورنہ جس قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔“

اللہ نے زندگی کے تسلسل کو زوجیت کے اصول پر رکھا ہے۔ تمام زندہ اشیاء جوڑے جوڑے ہیں۔ یہاں تک کہ پہلا خلیہ بھی اپنے ساتھ مذکور زمانیت کے خصائص لیے ہوئے ہوتا ہے، بلکہ سائنسی تحقیقات نے یہ بتا دیا ہے کہ پوری کائنات کا دہرہ دار ازدواج پر ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ کائنات کی پہلی اکائی ذرہ ہے۔ جو منفی الیکٹرون اور مثبت پروٹون سے مرکب ہے تو یہ بھی جوڑا ہے اور طبیعی تحقیقات اسی منہج پر آگے جاری ہیں۔

بہر حال زندگی میں زوجیت کا نظام بالکل ظاہر ہے اور یہ اللہ ہی ہے جس نے تمام جوڑے پیدا کیے خواہ انسانوں کے ہوں یا حیوانوں کے :

وَجَعَلْ لَّكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ (۴۳: ۱۲) ”اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا۔“ یہاں اشارہ اسی طرف ہے کہ تمہیں خلیفۃ اللہ فی الارض بتایا اور اس زمین کی تمام قوتیں اور طاقتیں تمہارے لیے مسخر کیں۔ اس کے بعد ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ ان نعمتوں کا شکر لازم ہے۔ اس مرتبے کے آداب بجا لانا لازم ہے۔ اور جب بھی نعمت سامنے آئے، منعم کو یاد کرو، تاکہ دل خالق سے جڑے رہیں۔ زندگی کی ہر حرکت اور ہر سکون میں۔

لَتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ (۴۳: ۱۳) ”اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو، اور کہو کہ ”پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا۔ ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔“ ہم تو اللہ کی نعمتوں میں سے کسی ایک نعمت کے مقابلے میں نعمت کا بدلہ نعمت سے نہیں دے سکتے۔ ہم تو نعمتوں کے مقابلے میں صرف شکر کر سکتے ہیں۔ پھر وہ یاد کریں کہ زمین پر سے اپنی خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد انہوں نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ اور وہ ان کو ان کے تمام اعمال پر جزا دے گا جو انہوں نے فریضہ خلافت سرانجام دینے کے سلسلے میں کئے اور یہاں ان پر انعامات کیے اور پوری دنیا کو ان کے لیے مسخر کیا۔

وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ (۴۳: ۱۴) ”اور ایک روز ہم نے اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔“ یہ ہے منعم حقیقی کے حوالے سے ایک مسلمان کا رویہ اور طرز عمل۔ اللہ اس کے بارے میں ہمیں یاد دہانی فرماتا ہے کہ جب بھی کسی نعمت سے لطف اندوز ہو جاؤ تو رب کا شکر ادا کرو۔ کیونکہ تم ہر وقت اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہو لیکن نعمت اور شکر نعمت بھول جاتے ہو۔

یہ اسلامی آداب جو اللہ کی نعمتوں کے استعمال کے وقت سکھائے گئے ہیں، یہ محض رسومات نہیں کہ دسما یہ دعا پڑھ لی جائے جب بھی کوئی کسی سواری پر سوار ہو یا کشتی پر سوار ہو، یا محض منتر کی طرح عبارات نہیں کہ ان کو پڑھ لیا جائے بلکہ ان عبارات کے معانی کو سمجھ کر ان کا شعور اپنے دل میں پیدا کرنا چاہیے۔ اللہ کی ذات کا تصور، بندے اور خدا کے تعلق کا تصور اور اللہ کی ان تمام نعمتوں کا تصور جو ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی ہیں اور جن قوتوں کو اللہ نے ہمارے لیے مسخر کیا ہے ان کے بارے میں یہ زندہ تصور کہ یہ تو اللہ کے بہت بڑے انعامات ہیں جو انسان پر ہوئے ہیں۔ جن کا کوئی بدلہ انسان اللہ کو نہیں دے سکتا وہ اللہ کے فضل و کرم کا بدلہ دینے پر تو قادری نہیں۔ اس لیے وہ نعمتوں کا شکر ادا کریں اور اللہ کے ہاں حاضر ہونے سے ہر وقت ڈرتے رہیں کہ حساب و کتاب میں مارے نہ جائیں۔ یہ سب احساسات اس بات کے ضامن ہیں کہ انسان کا دل ہر وقت بیدار رہے، حساس رہے اور اللہ کی نگرانی کا ہر وقت خیال کرے۔ اور کسی بھی وقت اس پر غفلت اور نسیان کی حالت طاری نہ ہو۔

--- ○ ○ ○ ---

اور اس کے بعد یہ بات کہ فرشتوں کو انہوں نے اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔ یہ ان کا زعم تھا اور حقیقت کے مطابق ان کا

افسانوی عقیدہ تھا۔

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ۚ إِنَّ الْإِنْسَانَ

لَكَفُورٌ مُّبِينٌ ﴿۱۵﴾ أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَكُمْ بِالْبَنِينَ ﴿۱۶﴾ وَإِذَا بُشِّرَ ۱۵

أَحَدُهُمَا بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿۱۷﴾ أَوْ

مَنْ يَنْشَأُ فِي الْجِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴿۱۸﴾ وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ

هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ إِنَاثًا أَشْهَادًا خَلَقَهُمْ سَكَّتَبُ شَهَادَتِهِمْ وَيَسْأَلُونَ ﴿۱۹﴾

وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ ۗ مَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا

يَخْرُصُونَ ﴿۲۰﴾ أَمِ اتَّيَّنَهُمْ كِتَابًا مِّنْ قَبْلِهِ فَهُمْ بِهِ مُسْتَسْكُونَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوا إِنَّا

وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ ﴿۲۲﴾ وَكَذَلِكَ مَا أَرْسَلْنَا

مِّن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ

أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ ﴿۲۳﴾ قُلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ بَآئِدٍ مِّمَّا وَجَدْتُمْ

عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَنْظَرُوا

۲

ع

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿۲۵﴾

۸

”(یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے بھی) ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جز بنا ڈالا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسن فراموش ہے۔ کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور ہمیں بیٹوں سے نوازا؟ اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مرثوہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و محبت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کر سکتی؟ انہوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمن کے خاص بندے ہیں، عورتیں قرار دے لیا۔ کیا ان کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھی ہے؟ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہ کہتے ہیں ”اگر خدائے رحمن چاہتا (کہ ہم ان کی

عبادت نہ کریں) تو ہم بھی ان کو نہ پوجتے۔“ یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے، محض حیرت کے لڑاتے ہیں۔ کیا ہم نے اس سے پہلے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند (اپنی اس مانگ پرستی کے لیے) یہ اپنے پاس رکھتے ہوں؟ نہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اسی طرح تم سے پہلے جس بہستی میں بھی ہم نے کوئی نذر بھیجا، اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے ان سے پوچھا، کیا تم اسی ذکر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمہیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو، ہم اس کے کافر ہیں۔ آخر کار ہم نے ان کی خبر لے ڈالی اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔“

قرآن مجید اس افسانوی عقیدے پر اس طرح حملہ آور ہوتا ہے کہ اس کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا جاتا ہے اور ان کی اپنی دنیا میں ہر طرف سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے یہاں تک ان کے ذہنوں تک اس کے پہنچنے کی ہر راہ بند کر دی جاتی ہے۔ اور پھر قرآنی استدلال خود ان کی منطق اور ان کے مسلمات کی اساس پر ہے اور یہ دلائل ان کی زندگی کے واقعات پر ہیں۔ نیز قرآن مجید ان کے سامنے اقوام سابقہ کی مثال بھی پیش کرتا ہے کہ جس نے بھی یہ عقیدہ اختیار کیا ہے ہم نے اس سے عبرت آموز انتقام لیا ہے۔

آغاز اس عقیدے کی کمزوری سے کیا جاتا ہے اور یہ کہ خدا کے نزدیک یہ ایک عظیم گناہ ہے اور صریح کفر ہے۔

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۵: ۴۳) ”ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزء بنا ڈالا حقیقت یہ ہے کہ انسان کھانا احسان فراموش ہے۔“ فرشتے تو اللہ کے بندے ہیں اور ان کو اللہ کی بنیاں کسے کا مطلب یہ ہوا کہ ان کو اللہ کی صفت عبودیت سے محروم کر دیا گیا۔ اور ان کو اللہ کی قریبی رشتہ داری کا مقام دے دیا گیا۔ حالانکہ وہ ساری مخلوقات کی طرح مخلوق ہیں۔ اور اللہ کے بندے ہیں۔ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ ہم ان کو اللہ کی بندگی کے بجائے کوئی اور صفت دیں۔ اور ان کا اور ان کے رب کا کوئی اور تعلق جائیں۔ جبکہ اللہ کی تمام مخلوقات اس کے بندے بندیاں ہیں۔ لہذا جو لوگ اس قسم کے دعوے کرتے ہیں وہ بلاشبہ کفر کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۵: ۴۳) ”بے شک انسان کھانا احسان فراموش ہے۔“ اس کے بعد ان کے خلاف ان کے عرف اور ان کی ذہیت سے دلیل دی جاتی ہے اور اس طرح یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ان کا دعویٰ کس قدر غلط اور اللہ کے حق میں کس قدر توہین آمیز ہے کہ تم فرشتوں کو اللہ کی بنیاں کہتے ہو۔

اَمْ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَّ اَصْفَحَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ (۱۶: ۴۳) ”کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا؟“ اگر اللہ نے اولاد پیدا ہی کرنی تھی تو یہ کیسے ہوا کہ خود تو بیٹیاں پیدا کیں اور تم کو بیٹوں سے نوازا۔ اور کیا ان کے لیے ایسی بات کہنا مناسب ہے کہ خود وہ بیٹی پیدا ہونے سے بہت سخت کبیدہ

خاطر ہوتے ہیں۔

وَ إِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَ هُوَ كَظِيمٌ

(۱۷: ۴۳) ”اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدا کے رحم کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔“ کیا ادب، احترام اور انسانیت کا تقاضا یہ نہ تھا کہ جس اولاد کی پیدائش سے وہ خود کبیدہ خاطر ہوتے ہیں اس کی نسبت رحم کی طرف نہ کریں۔ خود تو یہ لوگ لڑکیاں ہونے پر اس قدر خفا ہوتے ہیں کہ چرے سیاہ ہو جاتے ہیں اور کسی کو منہ نہیں دکھاتے اور ولادت کو چھپاتے پھرتے ہیں اور قریب ہوتا ہے کہ اس غم کی وجہ سے مر ہی جائیں۔ کیا وہ کمزور مخلوق جو زیورات میں ملتی ہے اور نہایت ہی ناز اور نخرے میں زندہ رہتی ہے اور اپنا فی الضمیر بھی پیش نہیں کر سکتی اور نہ جنگ و قتال میں حصہ لیتی ہے اس کی نسبت خدا کی طرف کرتے ہیں، جبکہ خود اپنے لیے ایسی اولاد چاہتے ہیں جو تیز و طرار ہو اور جنگ کے موقع پر گھوڑا سوار ہو۔

غرض قرآن یہاں ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر بحث کرتا ہے اور ان کو شرمندہ کرتا ہے کہ جس اولاد کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے ہو وہ اللہ کے لیے پسند کرتے ہو۔ اگر تم نے یہ حماقت کرنی ہی تھی تو تم اللہ کے لیے ایسی نسبت کرتے جسے تم خود بھی اپنے لیے پسند کرتے ہو اگر یہ کفر تم نے کرنا ہی تھا۔ اب ان کے اس افسانوی عقیدے کو اس دوسرے زاویہ سے گھبرا جاتا ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ فرشتے لڑکیاں ہیں۔ آخر کس بنیاد پر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

وَ جَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ إِنَاثًا أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ

شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ (۱۹: ۴۳) ”انہوں نے فرشتوں کو جو خدا کے رحم کے خاص بندے ہیں، عورتیں قرار دیا کیا ان کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھی ہے۔ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جوابدہی کرنی ہو گی۔“ کیا جب فرشتے پیدا کیے جا رہے تھے تو یہ لوگ وہاں موجود تھے کہ وہ بیٹیاں ہیں کیونکہ جو شخص ایک دعویٰ کرتا ہے اس کے پاس چشم دید شہادت ہونی چاہئے جو اس کے دعوے کو ثابت کرے۔ وہ یہ دعویٰ تو نہ کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے کہ انہوں نے فرشتوں کے جسم کی ساخت دیکھی ہے۔ لیکن باوجود اس کے کہ انہوں نے یہ ساخت نہیں دیکھی پھر بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں لہذا اب اس جھوٹی شہادت کے نتائج برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ (۱۹: ۴۳) ”ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہو گی۔“

اس کے بعد ان کی اس افترا پر دازی پر مزید بحث کی جاتی ہے اور اس کے لیے وہ جو جھوٹے دلائل لاتے تھے ان کا رد کیا جاتا ہے۔

وَ قَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ مَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ

”وہ کہتے ہیں کہ اگر خداے رخص چاہتا تو ہم بھی ان کو نہ پوجتے، یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے۔ محض تیرے لئے لڑتے ہیں۔“ جب ان کو قوی دلائل کے ذریعہ سے ہر طرف سے گھیرا جاتا ہے۔ اور ان کا یہ افسانوی عقیدہ ان کے سامنے ٹھس ٹھس ہو جاتا ہے تو پھر وہ نظریہ مشیت الہی کا سہارا لیتے ہیں یہ کہ اللہ دراصل فرشتوں کی عبادت پر خوش ہے۔ اگر اللہ راضی نہ ہوتا تو ان کے لیے یہ عبادت کرنا ممکن ہی نہ ہوتا۔ اللہ سختی سے ہمیں منع کر دیتا۔

یہ دراصل ایک دھوکہ ہے، یہ درست ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی مشیت سے واقع ہوتی ہے لیکن اللہ کی مشیت کے دائرے میں تو یہ بات بھی ہے کہ انسان ہدایت بھی لے سکتا ہے اور گمراہی کا راستہ بھی لے سکتا ہے اور اللہ نے انسان پر یہ فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ہدایت اختیار کرے اور اس پر اللہ راضی ہوتا ہے۔ اور اگر انسان گمراہ اور کافر ہو تو اللہ ناراض ہوتا ہے۔ اگرچہ اللہ کی مشیت نے اسے ہدایت و گمراہی دونوں کے قابل بنایا ہے۔

وہ مشیت الہیہ کے نظریہ سے دھوکہ دیتے ہیں۔ خود ان کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہے کہ اللہ نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ لوگ فرشتوں کی پوجا کریں۔ یہ یقین وہ تو نہیں رکھتے۔

مَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (۴۳: ۲۰) ”یہ اس معاملے کی حقیقت کو نہیں جانتے محض تیرے لئے لڑتے ہیں۔“ اور لوہام و خرافات پر یقین کرتے ہیں۔

أَمْ أُتِينَهُمْ كِتَابًا مِنْ قَبْلِهِ فَهُمْ بِهِ مُسْتَمْسِكُونَ (۴۳: ۲۱) ”کیا ہم نے ان سے پہلے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند یہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔“ اور ان کا دعویٰ اس کتاب کے نصوص پر مبنی ہے۔ اور اپنی یہ عبادت انہوں نے اس کتاب سے اخذ کی ہے۔ اور اس کے دلائل ان کے پاس موجود ہیں؟ یوں ان لوگوں کے لیے نقلی دلیل کی راہ بھی بند کر دی جاتی ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ عقائد و نظریات ’وہی تباہی باتوں اور اندھیرے میں تیرے چلانے سے ثابت نہیں ہوتے‘ محض ظن و تخمین سے عقائد ثابت نہیں ہوتے۔ عقائد تو اللہ کی کتابوں سے صریح طور پر ثابت ہوتے ہیں۔

اب آخر میں بتایا جاتا ہے کہ ان کے پاس اپنے اس افسانوی عقیدے پر واحد دلیل جو یعنی شہادت پر مبنی نہیں ہے اور کسی کتاب سے بھی ماخوذ نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ:

بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُهْتَدُونَ (۴۳: ۲۲) ”نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔“ یہ ایک نہایت مضحکہ خیز استدلال ہے۔ پھر دلیل کے اعتبار سے بھی یہ ایک گری ہوئی بات ہے۔ یہ محض نقالی اور تقلید ہے اور اس پر کوئی غور و فکر انہوں نے نہیں کیا ہے۔ اور صحیح استدلال اور منطقی انداز میں اس پر غور نہیں کیا۔ ان کی مثال ایک ریوڑ کی طرح ہے جسے ہانکنے والا جس طرف چاہتا ہے لے جاتا ہے۔ کوئی پوچھتا نہیں کہ اس طرف ہمیں کیوں چلایا جا رہا ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں؟

اسلام فکری آزادی کا بھی ایک پیغام ہے اور شعور و نظریہ کی کی آزادی کی ایک تحریک ہے۔ اسلام اس قسم کی جلد تقلید کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ گندہ اور گمراہی کو محض اس لیے برداشت نہیں کرتا کہ ہمارے آباد و اجداد ایسا کرتے تھے۔ ہر

کام، ہر سند اور ہر بات پر دلیل چاہئے۔ ہر اقدام سے پہلے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد اسے علم و یقین پر جی خود مختاری دی گئی ہے۔

آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اس قسم کے افسانوی عقائد جنہوں نے اختیار کیے اور محض نقالی اور جامد تقلید کی راہ اختیار کی ایسے لوگوں کا انجام تاریخ میں کیا ہوا، جن کے سامنے حقیقت بیان کر دی گئی اور ان کا یہ بہانہ بھی ختم کر دیا گیا کہ ہم تک تو صحیح بات ہی نہیں پہنچی اور پھر بھی انہوں نے حقیقت کو تسلیم کرنے سے منہ موڑا۔

وَكَذَلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ (۲۳:۴۳) قَالَ أَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِأَهْدَىٰ مِمَّا وَجَدْتُمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ (۲۴:۴۳) فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ

فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (۲۵:۴۳) ”اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا، اس کے کھاتے پیچے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے ان سے پوچھا، کیا تم اسی ذکر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمہیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو، ہم اس کے کافر ہیں۔ آخر کار ہم نے ان کی خبر لے ڈالی اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔“

یوں معلوم ہوتا ہے کہ تمام رد گردانی کرنے والوں کی دلیل و حجاج ایک ہوتے ہیں۔ یہ کہ ”ہم نے اپنے باپ دادا کو اس طریقے پر پایا اور ہم ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔“ بس نقالی آنکھیں بند کر کے، عقل اندھی ہو جاتی ہے جو لوگ غور و فکر کے بغیر تقلید کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے سامنے جو بات پیش کی جاتی ہے وہ تقلیدی نظریات و اعمال سے زیادہ معقول کیوں نہ ہو۔ اس کی پشت پر دلائل و شواہد کا انبار کیوں نہ ہو۔ ایسی فطرت کے لوگوں کو ہلاک کرنا ہی بہتر ہے جو آنکھ نہیں کھولتے کہ دیکھیں، دل نہیں کھولتے کہ سمجھیں دماغ نہیں کھولتے کہ دلائل کا وزن کریں۔

اس قسم کے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے اور ان کے سامنے اسے پیش کیا جاتا ہے کہ سمجھ کر اس سے بچیں اور اس راہ کے انجام سے خبردار ہوں۔

درس نمبر ۲۳۲ ایک نظر میں

قریش کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اور یہ دعویٰ برحق تھا۔ پھر ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں اور ان کی یہ بات غلط تھی۔ حضرت ابراہیم نے تو عقیدہ توحید کا اعلان نہایت کھل کر کیا تھا۔ جس کے اندر کوئی التباس اور پیچیدگی نہ تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے باپ کو چھوڑا اپنی قوم کو چھوڑا اس سے پہلے ان کو قتل کرنے اور جلانے کی سعی کی گئی۔ اور ان کی شریعت بھی عقیدہ توحید پر قائم تھی اور اسی کی انہوں نے اپنی اولاد کو تاکید کی تھی۔ اس لیے ابراہیم علیہ السلام کی دعوت اور شریعت میں شرک کا شائبہ تک نہ تھا۔

اس سبق میں قرآن اپنے مخالفین کو خود ان کی تاریخ کی بھر کر رہا ہے تاکہ ان کے دعوے کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اس کے بعد رسالت محمدی پر ان کے اعتراضات کو پرکھا جا رہا ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْفَرِيقَتَيْنِ عَظِيمٍ (۳۱:۴۳) ”کہتے ہیں یہ قرآن دو شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نازل نہیں ہوا؟“۔ ان کے اس قول کی تردید یوں کی جاتی ہے کہ ان کی سوچ میں بہت بڑی کجی ہے۔ کیونکہ اسلام جن قدروں پر مبنی ہے ان کے اعتبار سے یہ سوچ ہی غلط ہے کہ دعوت اسلامی کی زہم کسی بڑے آدمی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ جھوٹی قدریں ہیں اور یہی اسلام کی طرف آنے میں ان کے لیے رکاوٹ بن رہی ہیں۔ انہی باطل سوچوں نے ان کو حق و ہدایت سے دور رکھا ہوا ہے۔ اس فیصلے کے بعد ان کو یہ اطلاع بھی کر دی جاتی ہے کہ اس گمراہی کی اصل علت اور وجہ یہ ہے کہ شیطان ان کے دلوں میں دوسرے انداز کی کرتا ہے۔ اس درس کے آخر میں رسول اللہ کی طرف توجہ کر کے آپ کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ ان سے منہ موڑ لیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں آپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ کسی اندھے کو بینا کر دیں کسی بہرے کو شنوائی دے دیں۔ یہ اندھے اور بہرے ہو گئے ہیں۔ اور ان کو ضرور سزا ملے گی خواہ آپ کی زندگی میں اللہ ان سے انتقام لے یا آپ کے بعد وہ اس سے دوچار ہوں۔ آپ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ کو جو پیغام دیا گیا ہے آپ اس کو مضبوطی سے پکڑیں۔ یہی پیغام تمام انبیاء کو دیا گیا تھا۔ سب کلمہ توحید لے کر آئے تھے۔

وَسُئِلَ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مَنْ رُسُلُنَا أَجَعَلْنَا مِنَ الرَّحْمَنِ إِلَهًا يُعْبَدُونَ (۴۳:۴۵) ”تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے ان سب سے پوچھ دیکھو کیا ہم نے خدائے رحمن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے؟“۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا ایک حلقہ پیش کیا جاتا ہے۔ فرعون کلیم کے قصے کا وہ حصہ جس میں وہی جھوٹی قدریں سامنے آتی ہیں جو نفل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیش کیں گویا یہ ایک تیار استدلال ہے بنایا اور تاریخ کے ہر مرحلے میں اسے دہرایا جاتا ہے۔

درس نمبر ۲۳۲ تشریح آیات

۲۶ --- تا --- ۵۶

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ ﴿۲۶﴾
إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ ﴿۲۷﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۲۸﴾

”یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”تم جن کی بندگی کرتے ہو، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا تعلق صرف اس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا، وہی میری رہنمائی کرے گا۔“ اور ابراہیم یہی کلمہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔“

دعوت توحید جسے یہ لوگ انوکھا سمجھتے ہیں، یہ دراصل ان کے باپ کی دعوت ہے، یہ وہ دعوت ہے جو انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور ان کے باطل عقائد کی تردید کی۔ اور اس میں انہوں نے اپنے آباء و اجداد کے موروثی عقائد کو ترک کیا اور موروثی راہ و رسم پر نہ چلے۔ محض اس لیے کہ آباء و اجداد یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے، اس معاملے میں ان کے مقابلے میں برات کے اظہار میں کوئی لگی لپٹی بات نہیں کی بلکہ نہایت ہی صاف الفاظ اور شفاف عمل میں ان کی تردید کی، جس طرح قرآن نقل کرتا ہے:

إِنِّى بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُونَ (۲۶: ۲۷) إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ

(۲۷: ۲۸) ”بے شک میں ان سے بری الذمہ ہوں جن کی تم بندگی کرتے ہو، میرا تعلق صرف اس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا وہی میری رہنمائی کرے گا۔“ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اظہار برات اور پھر اس اعلان سے کہ میں صرف اس خدا کی بندگی کروں گا جو میرا خالق ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرودی معاشرہ بھی بالکل خدا کا منکر نہ تھا بلکہ وہ اللہ کے سوا اور انہوں کو اللہ کے ساتھ شریک قرار دیتے تھے۔ اور ان کی بندگی کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ان سے برات کا اظہار کیا۔ اس لا تعلقی کے اظہار سے آپ نے خالق کائنات کو مستغنی کیا۔ اور اللہ کی یہاں آپ نے وہ صفت بیان کی جو صرف اللہ کے لیے عبادت کا استحقاق ملتی کرتی ہے۔ یہ کہ وہ پیدا کرنے والا ہے۔ لہذا بندگی اور حکم بھی اسی کا چلنا

چاہئے اور آپ نے اس یقین کا اظہار کیا کہ اللہ انہیں ہدایت دے گا کہ وہ کیا کریں کیونکہ خالق اپنی مخلوق کی راہنمائی کا انتظام بھی کرتا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کس طرح ہدایت دے۔ یہ کلمہ جس کے اوپر زندگی قائم ہے جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے اور جس پر شہادت دے رہی ہے یہ حضرت ابراہیم نے کہا۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۲۸: ۴۳) ”اور ابراہیم یہی کلمہ پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں“۔ اس کلمہ ارض پر کلمہ توحید کے اقرار اور رواج میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا بڑا حصہ ہے۔ آپ ہی کے بعد یہ کلمہ تمام نسلوں میں رائج ہوا۔ اور یہ رواج آپ کی اولاد کے ذریعے ہوا۔ آپ کا اولاد ست بے شمار رسول بھیجے گئے۔ تین رسوں تو اولوالعزم رسول تھے۔ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ آج دنیا میں ایک ارب سے زیادہ لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو مختلف بڑے ادیان کے پیروکار ہیں جو اپنے باپ کے کلمہ توحید پر کاربند ہیں۔ اس نے اس کلمے کو اپنی اولاد میں باقی رکھا۔ اگرچہ ان میں سے بھی گمراہ ہونے والے گمراہ ہوئے لیکن یہ کلمہ باقی رہا۔ کبھی یہ بالکل ناپید نہیں ہوا اور اس کے قدم مضبوط رہے کبھی کسی نے اسے جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینکا اور نہ اس کے ساتھ باطل کا استخراج ہوا ہے تاکہ لوگ اللہ کی طرف لوٹیں کیونکہ اللہ ہی نے ان کو پیدا کیا ہے لہذا ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو تو پہچانیں۔ اور اس سچائی کی طرف لوٹیں اور اسے سینے سے لگائیں۔

ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی کلمہ توحید سے انسانیت واقف تھی لیکن زمین کے اوپر کلمہ توحید کو قرار و ثبات حضرت ابراہیم کے بعد نصیب ہوا۔ آپ سے پہلے حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور شاید حضرت ادریس علیہم السلام نے کلمہ توحید پیش کیا لیکن ان رسولوں کو ایسے جانشین نہ ملے جو ان کے بعد کلمہ توحید کو باقی رکھتے اور اس کے مطابق زندگی گزارتے اور جو اس کے لیے زندہ رہتے۔ لیکن جب یہ کلمہ حضرت ابراہیم نے پیش فرمایا تو آپ کے بعد اس کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اور رسولوں کا بھی ایک غیر منقطع سلسلہ چل نکلا۔ چنانچہ آپ کی اولاد میں سے آخری بیٹے نور آپ کے ساتھ زیادہ مشابہ (۱) حضرت محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور انہوں نے کلمہ توحید کو اس کی کامل اور شامل صورت میں پیش کیا جس نے پوری زندگی کو اس کلمے کے ارد گرد گھما دیا۔ اور انسان کی ہر سرگرمی میں اس کو اثر انداز کر دیا۔

یہ تھی توحید کی کہانی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ادھر جن کے بارے میں اہل قریش یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں اور اس کلمے کو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں وراثت میں باقی رکھا اور حضرت ابراہیم سے ادھر یہ کلمہ سلا بعد نسل نقل ہوتا رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت کرنے والے اس کلمے کے مقابلے میں کیا رد عمل اختیار کرتے ہیں۔

زمانے گزر گئے۔ اللہ نے سلا بعد نسل ان کو زندگی کے خوب سارو سامان دیئے بہت زیادہ دور چلے جانے کے بعد

(۱) حضورؐ نے فرمایا مجھ پر سب انبیاء پیش کیے گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اہل شہادہ کے مردوں جیسے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ ترین افراد جو میں نے دیکھے ان میں سے عروہ ابن مسعود ہیں۔ اور میں نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو وہ تمہارے ساتھی کے زیادہ مشابہ تھے۔

انہوں نے ملت ابراہیمی کو بھلا دیا۔ اور ان عربوں کے اندر کلمہ توحید انوکھا ہو گیا۔ اب جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں تو انہوں نے اس کامیابی پر استقبال کیا اور اسے بھی لیل زمین اور دنیا پرستوں کی قدروں کے پیمانوں سے ٹاپنا شروع کر دیا اور خود ان کے پیمانے بھی بدل گئے۔

بَلْ مَتَّعْتُ هَؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْحَقُّ
وَرَسُولٌ مُّبِينٌ ﴿۲۹﴾ وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ
وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ ﴿۳۰﴾ وَقَالُوا كَلَّا تُزِيلُ هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ
الْقُرَيْتَيْنِ عَظِيمٍ ﴿۳۱﴾ أَهَمُّ يَفْسِمُونَ رَحِمَتِ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمُ
مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ
بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرِيًّا وَرَحِمَتِ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۳۲﴾ وَلَوْ لَا أَن
يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَن يَكْفُرُ بِالرَّحْمَنِ لِبُيُوتِهِمْ سُقْفًا مِّنْ
فِضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ ﴿۳۳﴾ وَلِبُيُوتِهِمْ أَبْوَابًا وَسُرَرًا عَلَيْهَا يَتَكُونَ ﴿۳۴﴾
أَوْ زُخْرَفًا وَإِنْ كُلُّ ذَلِك لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِندَ رَبِّكَ
لِلْمُتَّقِينَ ﴿۳۵﴾

۳

ع ۱۰

۹ ”(اس کے باوجود جب یہ لوگ دوسروں کی بندگی کرنے لگے تو میں نے ان کو سنا نہیں دیا) بلکہ میں انہیں اور ان کے باپ دادا کو متاع حیات دیتا رہا‘ یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آگیا۔ مگر جب وہ حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں‘ یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے درائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں‘ اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) اس دوست سے زیادہ قیمتی ہے جو (ان کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تاکہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں‘ اور ان کی میڑھیاں جن سے وہ اپنے بالاخانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں‘ سب چاندی اور سونے

کے بنا دیتے۔ یہ تو محض دنیا کی متاع ہے اور آخرت حیرے رب کے ہاں صرف متعین کے لیے ہے۔“
اب سیاق کلام میں روئے سخن اچانک لٹل مکہ کی طرف پھر جاتا ہے، اسے اضطراب کہتے ہیں اور یہ انداز عربوں میں رائج تھا۔

بَلْ مَتَّعْتُ هُولَاءِ وَاَبَاءَهُمْ حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُولٌ مُّبِينٌ (۲۹:۴۳)
”بلکہ میں انہیں اور ان کے باپ دادا کو متاعِ حیات دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آگیا۔“ گویا یوں کہا گیا کہ چھوڑو حضرت ابراہیم کی بات کو، ان لوگوں کے ساتھ مناسبت اور نسبت ہی کیا رہ گئی ہے۔ ہمیں ان کے شب و روز کو دیکھنا چاہئے۔ ان کے حالات، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات سے تو ملتے نہیں۔ ان لوگوں کے حالات یہ ہیں کہ ان کو اور ان کے آہد اجداد کو خوب سامانِ زندگی دیا گیا، ان کو طویں صلت دی گئی، یہاں تک کہ وہ سچائی اس قرآن کی شکل میں آئی اور اس کے ساتھ ایک نہایت ہی کھول کر بات سمجھانے والا رسول بھی آ گیا جو ان پر یہ سچائی پیش کرتا ہے اور نہایت ہی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ وَاَنَا بِهِ كَافِرُونَ (۳۰:۴۳) ”مگر جب وہ حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔“ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جادو میں سچائی کا شائبہ تک نہیں ہوتا، یہ بات بالکل واضح ہے۔ یہ تو ان کا محض ایک دعویٰ اور الزام تھا اور اس کے بارے میں سب سے پہلے خود ان کو یقین تھا کہ یہ الزام غلط ہے۔ کیونکہ کبراء قریش اس حد تک جہانمیدہ تھے کہ ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی کہ قرآن کریم کلام حق ہے، یہ جو الزامات وہ لگاتے تھے۔ وہ جمہور عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے وہ ایسا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے اور اس کے بعد یہ جو اعلان کرتے تھے کہ ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔ یہ بات کو پکی کرنے کے لیے اعلان کرتے تھے۔

اَنَا بِهِ كَافِرُونَ (۳۰:۴۳) ”اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔“ جمہور عوام کو وہ اس سے یہ تاثر دیتے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا انہیں پورا پورا یقین ہے۔ اس طرح وہ ان کو یہ اشارہ دیتے تھے کہ ہمارے پیچھے چلتے رہو اور ہمارے مطیع فرمان رہو اور ہر قوم سے سردار جمہور عوام کو اس طرح دھوکہ دیتے ہیں، یہ نہ ہو کہ وہ ان کے دائرہ اختیار سے نکل جائیں اور کلمہ توحید کو قبول کر لیں۔ کیونکہ جب کلمہ توحید کا اقتدار قائم ہوتا ہے، تمام گردن کش مگر جاتے ہیں۔ پھر تو صرف اللہ کی بندگی ہوتی ہے اور لوگ اللہ ہی سے ڈرتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے کھری اور کھوٹی قدردوں کے درمیان کس طرح ملاوٹ کر دی ہے۔ وہ یہ اعتراض کرتے ہیں اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی منتخب کیا ہے کہ وہ یہ پیغام پہنچائیں۔

وَقَالُوا لَوْلَا نَزَلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (۳۱:۴۳) ”اور وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟“ دو گاؤں سے ان کی مراد کہ

اور طائف ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی ایک شاخ سے تھے۔ پھر بنی ہاشم کی ایک شاخ کے فرد تھے۔ اور یہ لوگ عربوں میں سے برتر لوگ تھے جبکہ آپ کی ذات بھی اخلاق عالیہ کے لحاظ سے ممتاز تھی۔ بہشت سے پہلے آپ صادق ولین اور اعلیٰ اخلاق کے مالک انسان کے طور پر مشہور تھے۔ لیکن آپ اپنے قبیلے کے سربراہ نہ تھے۔ نہ کسی خاندان کے رئیس تھے اور اس دور میں لوگ انہی چیزوں پر فخر کرتے تھے کہ کوئی قبیلے یا کسی شاخ کا سربراہ ہو۔ معترضین کا اعتراض یہی تھا۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (۴۳: ۳۱) ”کہتے ہیں یہ قرآن ان دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر نازل کیوں نہ کیا گیا۔“ حالانکہ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کی رسالت اور دعوت کے لیے کون موزوں ہے اور یہ منصب کس کو دیا جائے۔ لہذا اللہ نے اہل ترین شخص کا انتخاب کر لیا۔ اللہ کا منشا یہ نہ تھا کہ اس رسالت کو خارجی اسباب میں سے کوئی سہارا ملے، اس کی قوت اس کے خارج سے نہ ہو بلکہ اس کے اندر سے ہو۔ لہذا اس نے اس کے لیے ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جس کی بڑی خصوصیت اس کے اخلاق تھے۔ اس دعوت کا مزاج ہی یہ ہے اور یہ اس کی بالکل ممتاز خصوصیت ہے۔ اس لیے کسی قبیلے کے سردار کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ نہ کسی خاندان کے سربراہ کو اس کے لیے منتخب کیا گیا۔ نہ کسی صاحب جاہ و مرتبہ کا انتخاب ہوا۔ نہ ایک بہت بڑے مالدار کا یوں انتخاب ہوا تاکہ آسمانوں پر سے نازل ہونے والی اس دعوت کی اصل اقدار کسی ایسی قدر سے ٹھس نہ ہو جائیں جس کا تعلق اس دنیا پرستی سے ہو اور اس دعوت کے اندر دنیا پرستی کے غیلات میں سے کوئی غلبہ داخل نہ ہو جائے جو اس دعوت کی حقیقت کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں رکھتا۔ اور دعوت اسلامی کی ذاتی قوت کے سوا کوئی اور خارجی سبب اس پر اثر انداز نہ ہو۔ نہ کوئی طالع آزما اس کے قریب آئے اور نہ کوئی پاکباز اس سے دور ہو۔ لیکن اس قوم پر دنیا پرستی کا غلبہ تھا، اس لیے جو لوگ آسمانی دعوت کی نوعیت کو سمجھتے نہ تھے۔ وہ اس قسم کے اعتراضات کیا کرتے تھے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (۴۳: ۳۱) ”یہ قرآن ان دو شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل نہیں کیا گیا۔“ لہذا قرآن نے اللہ کی اس عظیم رحمت پر ان کے اس سطحی اعتراض کو رد فرما دیا، یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ اپنی رحمت کے لیے جو چاہے، اختیار کر لے، جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے انہوں نے دنیا پرستی اور جاہلیت کی اقدار اور اللہ کی آسمانی قدروں کو ملا دیا ہے۔ اور وہ اپنی دنیا پرستی کی آنکھوں سے اس دعوت اسلامی کو دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دعوت خدا پرستی اور آخرت کے حساب سے دی جا رہی ہے۔

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سَخِرِيًّا وَرَحْمَتُ رَبِّكَ

خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۳۲: ۴۳) ”کیا میرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ارباب تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔ اور میرے رب کی رحمت اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو یہ سمیٹ رہے ہیں۔“ یعنی تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ لب نبوت بھی خود تقسیم کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کو اللہ کی رحمت اور نبوت سے واسطہ کیا ہے؟ اصل پوزیشن ان کی یہ ہے کہ یہ کسی چیز کے مالک نہیں ہیں، خود اپنے رزق کے بھی یہ مالک نہیں ہیں، یعنی اس دنیا کی مختصر زندگی کے لیے بھی ان کا رزق ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ بھی ہم ان پر تقسیم کرتے ہیں۔ یہ ہم اپنی حکمت اور تدبیر سے تقسیم کرتے ہیں اور یہ ہماری تقسیم اس زمین کی تعمیر و ترقی کے لیے ہے۔

اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے رزق لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق دیا جاتا ہے۔ زندگی کے حالات کے مطابق دیا جاتا ہے اور معاشرے کے افراد کے باہم تعلقات کے مطابق دیا جاتا ہے۔ مختلف عوامل کے مطابق افراد معاشرہ کے درمیان اس کی تقسیم ہوتی ہے۔ ہر معاشرے میں نظام تقسیم رزق مختلف ہوتا ہے۔ ہر زمانے میں اس کے اندر تبدیلیاں آتی ہیں۔ ہر سوسائٹی دوسری سے مختلف ہوتی ہے۔ اور اس میں عمومی حالات اور افراد معاشرہ کے باہم تعلقات پر دارومدار ہوتا ہے۔ لیکن ہر دور اور ہر معاشرے میں تقسیم رزق میں جو بات موجود رہی ہے، وہ یہ رہی ہے کہ رزق کی تقسیم میں فرق رہا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مصنوعی معاشروں میں بھی تقسیم رزق میں فرق ہے، جن کا مقصد ہی پیداوار بڑھانا اور مساویانہ تقسیم کرنا ہے۔

تفاوت رزق کے اسباب مختلف معاشروں میں مختلف رہے ہیں۔ لیکن مقدار رزق کے اختلاف میں اختلاف ناپید بھی نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ جن مصنوعی معاشروں کے اندر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مکمل مساوات ہے وہاں بھی رزق مختلف ہوتا ہے اور وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ (۳۲: ۴۳) ”اور کچھ لوگ کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے۔“

اور تمام معاشروں میں فرق مراتب رزق کے اسباب تو مختلف رہے ہیں لیکن حکمت یہی رہی ہے۔

ذَرَجَتْ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (۳۲: ۴۳) ”یا کہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔“ یعنی بعض لوگ دوسروں کو اپنا ماتحت کر کے ان سے خدمات لیں، اس دنیا میں جب معیشت کی گاڑی چلتی ہے تو بعض لوگ خدمات فروخت کرتے ہیں اور بعض خریدتے ہیں۔ یوں بعض بعض کے لیے مسخر ہو جاتے ہیں، یہاں تسخیر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک طبقہ برتر ہو اور دوسرا کم تر ہو یا ایک فرد دوسرے کا غلام ہو۔ اگر یہ لیا جائے تو یہ اس لفظ کا بہت ہی سادہ مفہوم ہو گا۔ یہ اللہ کے دائمی اور بلند کلام کی سطح تک نہیں پہنچتا۔ اللہ کے فرمان کا مفہوم کسی تفسیر سے بالا ہے، اگرچہ انسانی سوسائٹی کے حالات میں جس قدر تبدیلی واقع ہو جائے، یہ ایسا مفہوم نہیں ہے کہ جانے والے حالات میں اور ہو اور آنے والے حالات میں اور ہو۔ حقیقی مفہوم یہ ہے کہ تمام انسان ایک دوسرے کے لیے مسخر ہیں اور زندگی اور معیشت کا چکر سب کو گھومتا ہے۔ اور ہر حال اور ہر صورت میں لوگ ایک دوسرے کے محتاج و مجبور ہیں۔ ہر ایک کے وسائل رزق متعین ہیں، کسی کے درائع کشادہ ہیں اور کسی کے محدود ہیں۔ کوئی اس کام میں لگا ہوا کہ دوست

جمع کرے ' اس سے خود بھی کھائے اور وہ دوسروں کو بھی دے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے مسخر ہیں۔ اور دونوں کے وسائل رزق میں جو فرق ہے اس نے دونوں کو ایک دوسرے کے لیے محتاج اور مسخر بنا دیا ہے۔ اور زندگی خصوصاً معاشی زندگی کے چکر میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں ' مزدور انجینئر کا محتاج ہے اور انجینئر مالک کا محتاج ہے۔ انجینئر اور مزدور دونوں مالک کے محتاج ہیں ' مالک انجینئر اور مزدور دونوں کا محتاج ہے۔ اور ہر ایک اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت الہیہ کے پورا کرنے میں لگا ہوا ہے اور مسخر ہے۔ اور یہ سب نظام رزق میں تعاون کی وجہ سے قائم ہوا ہے۔ کسی کو خدمات و رکار ہیں اور کسی نے بیچنی ہیں۔

بعض ایسے لوگ جو خود ساختہ نظریات کے داعی ہیں وہ اس آیت کو پیش نظر رکھ کر اسلام اور اسلام کے اقتصادی نظام پر بہت سے اعتراضات کرتے ہیں اور پھر بعض مسلمان اس آیت کے سامنے شف شف کرتے ہیں اور ان کا انداز یوں ہوتا ہے کہ وہ گویا اسلام پر یہ ایک الزام ہے اور وہ اس کا رد کرتے ہیں کہ اسلام رزق کے معاملے میں فرق مراتب کا قائل نہیں ہے اور یہ کہ رزق میں فرق مراتب اسلام پر تمت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ اہل اسلام ' اسلام کے بارے بالکل کھل کر اور صاف صاف بات کریں۔ وہ ان خود ساختہ نظریات سے متاثر ہوئے بغیر اور وہی انداز اختیار کیے بغیر صاف صاف کہہ دیں کہ رزق میں فرق مراتب ایک حقیقت ہے جسے اسلام روار کھتا ہے اور لوگ ہمیشہ وسائل رزق کے معاملے میں مختلف ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی حالت طبعی : رہائش نفسی اسی تفاوت پر قائم ہے۔ لوگوں کو خالق کائنات کی طرف سے مختلف درجوں کی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق کام کر سکتا ہے اور یہ تفاوت اور فرق مراتب اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہر شخص نے اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت الہیہ کی ادائیگی میں بالکل ایک جہاں دار ادا کرنا ہے۔ اگر سب لوگ اس طرح پیدا کیے گئے ہوتے جس طرح پرہیز سے ایک اشتہار چھپتا ہے یا کتاب کا ایک نسخہ تیار ہوتا ہے تو اس دنیا میں زندگی کی یہ اجتماعی صورت نہ ہوتی اور کئی ضروری کام یونہی رہ جاتے جن کے سرانجام دینے کے لیے کوئی قابل آدمی نہ ہوتا کیونکہ ان کے لیے کوئی قابل آدمی ہی نہ ملتا۔ جس اللہ نے زندگی پیدا کی ہے اور اس کے لیے بقا کا انتظام فرمایا ہے اس نے ہر شخص کے لیے ایک کردار رکھا ہے اور ہر عمل کے لیے ایک شخص ' ہر کسے رہبر کارے ساختہ ' پھر ہر شخص کی کارکردگی کی وجہ سے اس کے رزق میں بھی فرق ہوتا ہے ' اگر فرق مراتب نہ کنی زندگی ' یہ ہے اصل قاعدہ۔ رہا یہ کہ مختلف الہیت کے لوگوں کے رزق کے اندر کس قدر فرق ہو تو یہ ہر نظام ' ہر معاشرے اور ہر ملک کے اپنے حالات پر موقوف ہوتا ہے۔ لیکن یہ فطری اصول کسی جگہ رد نہیں کیا جاسکتا کہ فرق مراتب ہو اور اس طرح زندگی نشوونما پائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے مصنوعی نظامائے معیشت کے پیروکاروں نے جنہوں نے مساوات کے بلند بانگ دعوے کیے ' مزدور ' انجینئر اور مینجر کی محو اہوں کے اندر مساوات قائم نہ کی اور نہ کر سکے۔ حالانکہ انہوں نے اپنے نظام کو بروئے کار لانے کے لیے بڑے سے بڑا تشدد کیا لیکن آخر کار یہ لوگ اللہ کے ابدی اصول کے سامنے شکست کھا گئے۔ کیونکہ اللہ کا قانون اس کائنات کے اندر موجود نہایت ہی مستحکم ناموس زندگی پر مبنی ہے (سید قطب ' لے کاش آپ زندہ ہوتے اور ان مصنوعی مذاہب کو روس میں دھڑام سے گرتے دیکھتے!) اور جس نظام کی نشاندہی اللہ نے اس دنیا کی زندگی کے لیے کی ہے اسی میں اللہ کی رحمت ہے۔

وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۳۲:۴۳) ”تیرے رب کی رحمت اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو یہ جمع کرتے ہیں۔“ اور یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ اپنی اس رحمت کے لیے جس کو چاہے، جن لے کیونکہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کس منصب کے لیے کون اہل ہے۔ پھر اللہ کی رحمت کا تعلق اس دنیا میں پائے جانے والے نظام معیشت کی اہلیت پر نہیں ہے۔ یہ تو دنیاوی اقدار ہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ کوئی بہت بڑا کمال نہیں ہے کہ کوئی بہت بڑی دولت جمع کر دے کیونکہ دولت کے جمع کرنے میں نیکو کاروں اور بدکاروں کے لیے برابر کے مواقع ہیں اور اچھوں اور بدوں کے لیے اس میں برابر مواقع ہیں لیکن اللہ کی رحمت (حیوت) کے لیے تو بہت ہی ممتاز ترین لوگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے اور اس کام کو اللہ ہی جانتا ہے۔

اللہ کے نزدیک یہ دنیا اور اس کی دولت اس قدر حقیر اور اس قدر بے وقعت ہے کہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تا کہ سب لوگ کافر ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ یہاں کافروں پر دولت کی بارش کر دیتا۔ لیکن اندیشہ یہ تھا کہ یہ دولت لوگوں کے لیے فتنہ بن جائے گی اور انہیں ایمان کی راہ سے روک دے گی۔

وَلَوْلَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَكْفُرُ بِالرَّحْمَنِ لَبُيُوتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فُضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ (۳۳:۴۳) وَلِبُيُوتِهِمْ أَبْوَابًا وَسُرُورًا عَلَيْهَا يُتَكَبَّرُونَ (۳۴:۴۳) وَزُخْرُفًا وَإِنْ كُلُّ ذَلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ (۳۵:۴۳) ”اگر یہ اندیشہ نہ ہو تا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں، اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالا خانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ نیکے لٹا کر بیٹھتے ہیں، سب چاندی اور سونے کے بنا دیتے۔ یہ تو محض حیات دنیا کی متاع ہے اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے۔“

اللہ جانتا ہے کہ اس کی مخلوق ضعیف ہے اور وہ دنیا کے مال و دولت سے کس قدر متاثر ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ اپنی اس عظیم رحمت کا انکار کرنے والوں کو اس حقیر و ذلیل دنیا سے مالا مال کر دیتا، ان کے مکانات، ان کی چھتیں اور ان کے دروازے اور ان کا فرنیچر سب سونے چاندی کے ہو جاتے۔ ان کے گھروں کے بڑے بڑے گیٹ ہوتے۔ جن تختوں پر وہ بیٹھے ان کے بڑے بڑے نیکے ہوتے اور یہ سونے چاندی اور دوسری قیمتی دھاتوں کے ہوتے۔ یہ دنیائے دنی سب کی سب ان کفار کے حوالے کر دی جاتی۔

وَإِنْ كُلُّ ذَلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۳۵:۴۳) ”یہ تو سب حیات دنیا کی متاع ہے۔“ یعنی زائل ہونے والا ساز و سامان، جو اس دنیا کی حدود سے آگے جاتا ہی نہیں۔ یہ دنیا بھی کم قیمت اور مختصر اور اس پر انسان کی زندگی بھی مختصر۔

وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ (۳۵: ۴۳) ”اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے۔“ اور یہ لوگ اللہ کے نزدیک اپنے تقویٰ کی وجہ سے مکرم ہیں۔ لہذا اس نے ان کے لیے وہ انعامات تیار کر رکھے جو بہت ہی باعزت اور قیمتی ہیں۔ اور وہ اس دنیا کے فانی متاع کے مقابلے میں زیادہ باقی رہنے والے بیش قیمت ہیں۔ اور اللہ ان کو قیامت میں رحمن کے کافروں کے مقابلے میں بہت ہی امتیازی شان دے گا اور رہے یہ کافروں کو اللہ متاع حیات اس حساب سے دیتا ہے جس طرح حیوانات کو چارہ دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حیات دنیا کا یہ ساز و سامان جس کی مثال اللہ نے یہاں دی، اس دنیا کے بہت سے لوگوں کی نظروں کو چکاچوند کر دیتا ہے۔ اور جب نفل ایمان فساد و فجار کے ہاتھ میں یہ مال و دولت دیکھتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ اللہ کے نیک بندوں کے ہاتھ ان سے خالی ہیں یا وہ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ حسرت، سختی اور تنگی ترشی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ فساق و فجار اپنی دولت کے بل بوتے پر، قوت و سطوت اور اقتدار پر ہیں تو وہ فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ یہ فتنہ لوگوں پر بہت اثر کرتا ہے لیکن اللہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ یہ چیزیں نہایت ہی حقیر، عارضی اور کم قیمت ہیں۔ اور اللہ نے اپنے ہاں متقین کے لیے جو کچھ تیار کر رکھا، وہ ناقابل تصور ہے۔ یہ نیک لوگوں کے لیے ہے۔ اس طرح قلب مومن اس حالت پر مطمئن ہو جاتا ہے جو اللہ نے ابرار کے لیے اختیار کیا ہے یا فجار کے لیے اختیار کیا ہے۔

ان لوگوں کا اعتراض یہ تھا کہ اللہ نے نبوت کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جس کے پاس دولت دنیا نہیں ہے۔ وہ لوگوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ان کے اقتدار، ان کے مال، اور ان کے مرتبے سے لگاتے ہیں۔ ان کو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں تو یہ چیزیں حقیر اور فانی ہیں۔ یہ تو اللہ کی شریر ترین مخلوق کے پاس بہت زیادہ ہوتی ہیں اور اللہ کے مبغوض ترین لوگوں کے پاس زیادہ ہوتی ہیں۔ لہذا مال و دولت اللہ کے ہاں قرب، مرجہ اور رضائے الہی کی دلیل نہیں ہے۔

یوں قرآن کریم ہر چیز کو اپنی جگہ اور صحیح مقام پر رکھتا ہے۔ اور اللہ کے قوانین بہت تقسیم رزق بیان کرتا ہے کہ اس دنیا میں دولت کی تقسیم کا یہ نظام ہے۔ اور یہ وضاحت کرتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس سلسلے میں کیا قدریں ہیں اور یہ تمام باتیں اس حوالے سے کی گئیں کہ ان لوگوں کو رسالت محمدی پر اس زلویہ سے اعتراض تھا کہ اللہ نے مکہ اور طائف کے رؤسا کو چھوڑ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا دیا جو دولت کے اعتبار سے ایک عام آدمی تھے۔

یوں اس مناسبت سے امارت اور غربت کے بارے میں، اسلامی نظام معیشت کے لیے بنیادی اور کلی قواعد وضع کر دیئے گئے، جن کے اندر کوئی تبدیلی نہ ہوگی اور کوئی تغیر ممکن نہ ہو گا۔ زندگی کی بوجھنیاں، نظام کا اختلاف، نظریات کا اختلاف، محاشروں اور سوسائٹیوں کا اختلاف کوئی چیز بھی ان قواعد کو متاثر نہ کرے گی۔ کیونکہ زندگی کی بعض مستقل قدریں ہیں اور یہ زندگی ان کے دائرے کے اندر ہی حرکت کرتی ہے۔ وہ اس کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں کو بدلتے ہوئے حالات اس طرف سے اندھا کر دیتے ہیں کہ وہ زندگی کی ان مستقل قدروں کو دیکھ سکیں، وہ اللہ کے اس مستقل معاشی اصول اور معاشی کلیہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ (انہدام روس کے بعد سمجھ لیا ہے) اسلامی نظام دراصل ثبات اور تغیر کے درمیان ایک حسین امتزاج ہے۔ اس کے معاشی نظام میں بدلنے والے اصول بھی ہیں اور ناقابل تغیر بھی ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو اس حقیقت کو نہیں سمجھتے، وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ زندگی کی ترقی میں تغیر و تبدل ہی اصل چیز ہے۔ یہ تغیر اور انقلاب اشیاء کی حقیقت میں بھی آتا ہے اور شکل میں بھی آتا ہے اور ان لوگوں کا زعم یہ ہے کہ اس تغیر اور تبدیلی کے

ساتھ مستقل اور ثابت اصول نہیں چل سکتے۔ یہ لوگ اس بات کے منکر ہیں کہ تبدل و تغیر کے سوا اور کوئی مستقل قانون معیشت بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ثابت ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ یہ لوگ صرف تغیر کے قانون کو تسلیم کرتے ہیں۔ رہے ہم مسلمان تو ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اس پوری کائنات میں ثابت اور تغیر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اور ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور اس دنیا کی بعض چیزوں میں ثابت بطور ایک مستقل قدر موجود ہے اور اس کی بڑی مثال تو یہی مسئلہ موضوع بحث ہے۔ لوگوں کے درمیان تقسیم رزق میں تفاوت ایک مستقل اصول ہے اور نسبت تفاوت میں فرق و امتیاز بہر حال ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ نسبت ہر ملک اور ہر معاشرے اور ہر زمانے میں بدل سکتی ہے۔ خود موضوع زیر بحث میں دونوں مثالیں موجود ہیں کہ ثابت و تغیر تقسیم معیشت میں موجود ہے۔ اور تفاوت مستقل ہے اور نسبت تفاوت متغیر ہے۔

--- ۰۰۰ ---

جب یہ بیان کر دیا گیا کہ اللہ کے نزدیک اس دنیا کا مال و متاع کوئی چیز نہیں ہے اور یہ ایک حقیر سامان چند روزہ ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ فساد و فجار کو جو دولت دی جاتی ہے یہ ان کی کراست اور شرافت کی دلیل نہیں ہے۔ اور آخرت کے تمام مزے متعین کے لیے ہیں۔ تو یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں دولت دی گئی اور وہ اللہ کو یاد نہیں کرتے اور وہ ان عبادت سے منہ پھیرے ہیں جن کے نتیجے میں آخرت میں نعمتیں ملیں گی تو ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو گا۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نَقِيضٌ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ
قَرِينٌ ﴿۳۷﴾ وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ﴿۳۸﴾
حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ يَلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِينُ ﴿۳۹﴾
وَلَنْ يَنْفَعَكَ الْيَوْمَ إِذْ ظَلَمْتُمْ أَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿۴۰﴾

”اور جو شخص رحمن کے ذکر سے تعافل برتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیطان ایسے لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔ آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا ”کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بعد ہوتا تو بدترین ساتھی ہے“ اس وقت ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ جب تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تمہارے لیے کچھ بھی نفع نہیں ہے کہ تم اور تمہارے شیاطین عذاب میں مشترک ہیں۔“

المنی کے معنی ہوتے ہیں نظر کا دیکھ نہ سکا، بالعموم یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب تیز روشنی سے آنکھیں دوچار ہوں، جس میں آنکھوں کو کھولنا ممکن نہ ہو۔ نیز منی کی وجہ سے شام کے اندھیرے میں کمزور نظر کے لوگ صحیح طرح معلوم نہیں کر سکتے۔ اور ایک خاص بیماری کی وجہ سے بھی یہ ہوتا ہے۔ یہاں مقصد غفلت اور اللہ کی یاد سے منہ موڑنا اور دل سے یہ شعور محو کر دینا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقِيضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ (۴۳: ۳۶) ”جو شخص رحمن کے ذکر سے غافل برتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے۔“ اللہ کی مشیت نے فطرت انسان میں یہ بات رکھ دی ہے کہ جب بھی اس کا دل ذکر الہی سے غافل ہوا اس کی طرف ایک شیطان راہ پالیتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ لگ جاتا ہے، ہر وقت اس کے دل میں دوسرے ڈالتا ہے۔ اور اس کے لیے برائی کو خوبصورت بناتا رہتا ہے۔ یہ شرط اور اس کا جواب دونوں مل کر اللہ کے نظام حیات کی خوبصورت تعبیر کرتے ہیں۔ اللہ کی حکمت کے مطابق سب آتے ہی نتیجہ سامنے آ جاتا ہے۔ یہی فیصلہ پہلے سے اللہ کے علم کے مطابق طے ہوتا ہے اور اسے قضا۔ قدر کہتے ہیں۔ اور شیطانی برے دوستوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے انسانی برے دوستوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ یوں یہ انسان خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔

وَأَنَّهُمْ لَيَصْدُوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳: ۳۷) ”اور یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں اور وہ اپنی جگہ یہ سوچتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔“ ایک دوست کی طرف سے ایک دوست کے ساتھ یہ نہایت ہی برا سلوک ہے کہ وہ دوست کو سیدھے راستے سے روک کر غلط راہ پر ڈال دے اور پھر اسے مسلسل غافل رکھے کہ وہ انسانی دوست کبھی یہ سوچ بھی نہ سکے کہ وہ غلطی پر ہے بلکہ اسے یہ تسلی دیتا رہے کہ وہ سیدھی راہ پر جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ برے انجام کے ساتھ تصادم ہو جاتا ہے۔ یہاں انداز تعبیر کے لیے فعل مضارع استعمال ہوا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہر عمل جاری ہے۔ لَيَصْدُوْنَهُمْ ”وہ روکتے ہیں۔“ يَحْسَبُوْنَ ”وہ گمان کرتے ہیں۔“ اور دیکھا جاسکتا ہے بلکہ دوسرے لوگ دیکھ رہے ہیں اس تماشے کو، جبکہ وہ خود اسے تمہیں دیکھ رہے جو جہنم کی طرف رواں ہیں لیکن انجام سے بے خبر اور جس راہ پر وہ جا رہے ہیں، اچانک ہی وہ انجام بد تک پہنچ جائیں گے۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ يَلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِينٌ

(۴۳: ۳۸) ”آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا، ”کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بعد ہوتا تو، تو بدترین ساتھی نکلا۔“

چشمِ زدن میں ہم دنیا سے آخرت میں چلے جاتے ہیں، ہماری اس زندگی کا دفتر لپیٹ لیا جاتا ہے اور یہ اندھا پن اس کو شیطان کی رفاقت میں آخری انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ یہاں اب ہوش آ جائے گا، جس طرح شرابی کا نشہ اترتا ہے اور اندھے پن اور مدہوشی کے بعد یہ نظریں اٹھا کر دیکھیں گے۔ اب یہ شخص اپنے ساتھی کو غور سے دیکھے گا جو اسے یہ یقین دہانیاں کر رہا تھا کہ میں تو آپ کو صحیح راہ پر لے جا رہا ہوں، لیکن تھوڑے بربادی و ہلاکت کا راہبر۔ اس لیے وہ جل بھن کر اسے کہے گا۔

يَلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ (۴۳: ۳۸) ”کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و

مغرب کا بعد ہوتا۔“ کاش کہ ہم ملتے ہی نہ اور ہمارے درمیان یہ دوریاں ہوتیں اور پھر قرآن مجید کہتا ہے۔

فَبَيْسَ الْقَرْيَيْنِ (۳۸:۴۳) ”یہ تو بہت ہی براساٹھی ہے۔“ اب دونوں کی حالت پر مایوس کر دینے والا تبصرہ۔ اور پھر اس منظر پر وہ گرتا ہے۔

وَلَنْ يَنْفَعَكُمْ الْيَوْمَ اِذْ ظَلَمْتُمْ اَنْكُمُ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ (۳۹:۴۳) ”اور اس وقت ان لوگوں سے کہ جائے گا کہ جب تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تمہارے لیے کچھ نافع نہیں ہے کہ تم اور تمہارے شیطان عذاب میں مشترک ہیں۔“ عذاب سب کے لیے برابر ہے اور اس کو باہم تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔

--- ۰۰۰ ---

اب روئے سخن ان لوگوں سے بھر جاتا ہے۔ ان لوگوں کو اس بری حالت میں چھوڑ کر کہ لیک دوسرے کو ملامت کرس، اللہ کی بوجھاؤ کرس، برا بھلا کہیں، خطاب رسول اللہ سے شروع ہو جاتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے اس انجام بد سے پریشان نہ ہوں اور ان کے اعراض اور کفر کی پردہ بھی نہ کرس جو حق آپ کی طرف آ رہا ہے اس پر جم جائیں اور سچائی قدیم زمانے سے مسلسل آ رہی ہے اور ہر رسول نے اسی کو پیش کیا ہے۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۚ فَاِمَا نَذٰرٌ مِّنْكَ ۙ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنتَقِمُوْنَ ۝۱۰ اَوْ تُرِيۡكَ الَّذِیۡ وَعَدْنٰهُمۡ فَاِنَّا عَلَیْهِمۡ مُّقْتَدِرُوْنَ ۝۱۱ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیۡ اُوۡحِیَ اِلَیۡكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیۡمٍ ۝۱۲ وَاِنَّهٗ لَذِکْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِکَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ۝۱۳ وَنَسْـَٔلُ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رُّسُلِنَا ۙ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوۡنِ الرَّحْمٰنِ اِلٰهَةً یُّعْبَدُوْنَ ۝۱۴

”اب کیا ہے نبی“ تم بہروں کو سناؤ گے؟ یا اندھوں اور صرغ گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ دکھاؤ گے؟ اب تو ہمیں ان کو سزا دینی ہے خواہ ہم تمہیں دنیا سے اٹھالیں، یا تم کو آنکھوں سے ان کا وہ انجام دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے، ہمیں ان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ تم بہر حال اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو، جو وحی کے ذریعہ تمہارے پاس بھیجی گئی ہے، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا شرف ہے اور مغرب تم لوگوں کو اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے ان سب سے پوچھ دیکھو، کیا ہم نے خدائے رحمن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے؟“

قرآن کریم میں یہ مثال بار بار دہرائی جاتی ہے۔ یہ رسول اللہؐ کو تسلی دینے کے لیے آئی ہے۔ اور اس کے ذریعہ ہدایت و ضلالت کی حقیقت بھی بتائی جاتی ہے اور اس سلسلے میں اللہ کی مشیت اور قضا و قدر کا جو نظام ہے اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی بھی رسول کے فرائض میں یہ شامل نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت پر لے آئے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ انسانوں میں سے ایک اعلیٰ ترین جدوجہد کرنے والے انسان یعنی رسول کے کام کی حدود کہاں ختم ہوتی ہیں اور قدرت الہیہ اور نظام معیشت کہاں تک ہے۔ اور اس سے عقیدہ توحید کی طرف اشارہ بہت ہی لطیف اشارہ کہ وہی کچھ ہوتا جو منظور خدا ہوتا ہے۔

أَفَأَنْتَ تَسْمَعُ الصَّهْمَ أَوْ تَهْدِي الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۴۳: ۴۰)
 ”اے نبیؐ کیا تم بہروں کو سناؤ گے، یا اندھوں اور صریح گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ راست دکھاؤ گے؟“ وہ تو نہ بہرے تھے اور اندھے تھے لیکن بہروں اور اندھوں کی طرح تھے اور گمراہی میں دوڑ چلے گئے تھے اور ان پر دعوت اور پکار کا کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔ نہ وہ دلائل ہدایت کو سمجھتے تھے حالانکہ رسول اللہؐ کی ذیوئی تو یہ تھی کہ جو سنتا ہے اسے سمجھائیں اور جو دیکھتا چاہے اسے راہ راست دکھائیں۔ جب انہوں نے اپنے یہ اعضا ہی معطل کر دیئے ہیں اور انہوں نے اپنے دل و دماغ کی آنکھیں ہی بند کر دی ہیں تو رسول اللہؐ ان کو ہدایت کس طرح دے سکتے ہیں۔ پھر اگر یہ گمراہ ہوتے ہیں تو رسول اللہؐ پر کیا ذمہ داری ہے۔ آپؐ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔۔۔ اب اللہ کا کام ہے کہ ادائیگی فرض کے بعد ان کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُونَ (۴۳: ۴۱) أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُونَ (۴۳: ۴۲)
 ”اب تو ہمیں ان کو سزا دینی ہے“ خواہ تمہیں دنیا سے اٹھالیں، یا تم کو آکھوں سے ان کا وہ انجام دکھا دں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے، ہمیں ان پر پوری قدرت حاصل ہے۔“
 بہر حال ان دونوں صورتوں میں سے ایک ضرور پیش آئے گی۔ اگر اللہ نے نبیؐ کو اٹھالیا تو اللہ اس کے مکذبین سے انتقام لے گا اور اگر آپؐ کے ہوتے ہوئے وہ بات وجود میں آگئی جس سے ان کو ڈر لیا جا رہا ہے تو اللہ اس پر قادر ہے کہ جس بات سے وہ ڈر رہا ہے اس کو وجود میں لائے۔ وہ تو اللہ کو کسی صورت میں شکست نہیں دے سکتے۔ دونوں حالات میں معاملہ اللہ کی قدرت اور مشیت کے اختیار میں ہے، اللہ ہی اس دعوت کا مالک ہے۔ رسول تو پیغام پہنچانے والا ہے۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ أَنْتَ عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۴۳: ۴۳)
 ”تم بہر حال اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو جو وحی کے ذریعہ سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔“ آپؐ جس کام میں لگے ہوئے ہیں اس پر جم جائیں اور اپنے راستے پر چلیں ان لوگوں نے جو رویہ اختیار کیا یا ناسندہ کس کے اس کی کوئی پروا نہ کرس۔ اپنے راستے پر پوری طرح مطمئن ہو کر چلیں۔ آپؐ تو یقیناً سیدھے راستے پر ہیں۔ یہ راستہ آپؐ کو نہ ادھر ادھر لے جائے گا نہ اس میں ٹیڑھ ہے اور نہ وہ اپنی منزل سے دور لے جاتا ہے۔

پھر جس عقیدے اور نظریہ کی آپ تبلیغ کرتے ہیں وہ اس پوری کائنات کی حقیقت کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور اللہ کے اس عام قانون کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس پر یہ پوری کائنات قائم ہے۔ یہ نظریہ اس کائنات کے ناموس اکبر کی لائن پر ہے۔ اس سے جدا نہیں ہوتا اور نہ اس سے منقطع ہوتا ہے۔ اور یہ راستہ اپنے راہ رو کو ٹھیک اپنے خالق تک پہنچاتا ہے اور یہ اس قدر سیدھا ہے کہ سفر بھی نہایت ہی خوشگوار رہتا ہے۔

آپ کو تاکید کی جاتی ہے کہ آپ اس حقیقت پر جسے رچیں اور آپ کے بعد آپ کی امت کے جو داعی ہوں گے آپ کا عمل ان کے لیے مشعل راہ ہو گا اگرچہ اس راہ کے منحرفین کے ہاتھوں ان کو اذیتیں کیوں نہ مل رہی ہوں۔

وَ اِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْئَلُونَ (۴۳: ۴۴) ”اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا شرف ہے اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جوابدہی کرنی ہو گی۔“ یہاں اس آیت کے دو مفہوم ہیں کہ یہ قرآن تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے نصیحت ہے اور تم سے جلد ہی قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ لہذا اس نصیحت اور یاد دہانی کے بعد تمہارے پاس کوئی جھٹ نہ رہے گی۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے ایک شرف اور شہرت ہے اور یہ وہ مفہوم ہے جو واقع ہو گیا۔ جہاں تک رسول اللہ کا تعلق ہے تو اربوں ہونٹ آپ پر درود و سلام بھیجتے ہیں اور رات دن اور صبح و شام آپ کو عاشقانہ انداز میں یاد کرتے ہیں اور اس طرح حضور کی بشت سے بے کر قیامت تک اربوں لوگ آپ پر درود و سلام پڑھتے رہیں گے۔

رہی حضور کی قوم تو جب قرآن آیا تو دنیا میں ان کا نام و نشان نہ تھا۔ اور اگر کچھ تھا تو زندگی کی کتاب پر ایک حلیے کی شکل میں ایک کونے میں۔ یہ یہی قرآن ہے جس کے ذریعے انسانی تاریخ میں عربوں کا ایک عظیم کردار متعین ہوا۔ یہ قرآن ہی تھا جس کی وجہ سے ربیع مسکوں ان کے زیر نگین رہا۔ جب تک انہوں نے قرآن کو سینے سے لگا رکھا تھا اور جب انہوں نے قرآن کو چھوڑا تو دنیا نے ان کو چھوڑ دیا وہ دوبارہ حقیر ہو گئے اور پھر ان کو قافلہ انسانیت کی لائن میں سب سے پیچھے پھینک دیا۔ لیکن جب قرآن انہوں نے سینے سے لگایا ہوا تھا تو وہ قافلہ سالار تھے۔۔۔ اور یہ ایک عظیم ذمہ داری تھی۔ انسانیت کی ذمہ داری اور اس کے بارے میں اللہ عنقریب تم سے جواب دہی کرے گا کہ کیوں تم نے اس منصب کو چھوڑا۔ وَسَوْفَ تُسْئَلُونَ (۴۳: ۴۴) ”اور جلد ہی تم سے پوچھا جائے گا۔“ یہ آخری مفہوم زیادہ جامع و مانع ہے۔ میں اسی کی طرف مائل ہوں۔

وَسْئَلُ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ آلِهَةً يُعْبَدُونَ

(۴۳: ۴۵) ”تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے ان سب سے پوچھ دیکھو کیا ہم نے خدائے رحمن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے کہ ان کی بندگی کی جائے؟“ اس حقیقت کو قرآن یہاں نہایت ہی منفرد انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس صورت میں کہ رسول اللہ سابقہ رسولوں سے پوچھ لیں۔

أَجْعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ إِلَهًا يُعْبَدُونَ (۴۳: ۴۵) ”کیا ہم نے خدائے رحمن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے“۔ اور پھر اس سوال کا جواب ہر رسول کی طرف سے قطعی انکار ہے۔ استفہام انکاری کی یہ صورت نہایت ہی عجیب اور موثر ہے۔ اور یہ اسلوب نہایت ہی پر تاثیر ہے، یعنی تاریخ سے پوچھو۔

رسول اللہؐ اور انبیائے سابقین کے درمیان تو زمان و مکان کے طویل فاصلے ہیں۔ پھر موت و حیات کے فاصلے بھی بہت طویل ہیں، ’آب زندہ ہیں اور انبیائے سابقہ فوت ہو گئے ہیں لیکن یہ تمام فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ پوری انسانی تاریخ میں رسالت تو ایک ہے، پیغام ایک ہے اور کلمہ توحید بھی ایک ہے۔ اگرچہ زمان و مکان بعید ہیں۔ حیات اور موت کے درمیان دبیز پردے ہیں لیکن وحدت نبوت ان تمام دوریوں اور پردوں کو مٹا دیتی ہے۔ مردے اور زندہ ایک ہو جاتے ہیں۔ ماضی و حال ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کریم کا انداز تعبیر جو لطیف اور عجیب ہے۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے برادر دیگر انبیائے کرام اور اللہ کے ساتھ ان کے ربط کو دیکھا جائے تو یہاں قریب و بعید کے فاصلے ختم ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے ہاں یہ پردے چشمِ زدن میں دور ہو جاتے ہیں اور تمام رکاوٹیں اور فاصلے دور ہو کر حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔ حضورؐ پھر سوال کرتے ہیں اور انبیاءؑ جواب دیتے ہیں جیسا کہ لیلۃ المصباح میں ہوا۔

ایسے مقامات پر چاہئے کہ ہم اپنی زندگی کے معمولات اور عادات کو اہمیت نہ دیں کیونکہ یہ مآلوفات جو ہم دیکھتے ہیں کہ سبب کے بعد مسبب آتا ہے۔ یہ اللہ کے حوالے سے کوئی کلی قواعد نہیں ہیں۔ ہم تو اس کائنات کے بعض آثار ہی کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کائنات کے طبعی حالات کے بھی ایک نہایت ہی معمولی حصے تک پہنچ سکے ہیں۔ کئی ایسے حقائق ہیں جو ہماری ساخت، ہمارے حواس اور ہمارے مرتب کردہ نتائج سے وراء ہیں۔ جب نفس انسانی ان مآلوفات اور طبیعیات کے دائرے سے نکل جاتا ہے اور اسے تجرّد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر ایک مجرد حقیقت تک انسان کا پہنچنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ یہ ادراک پھر اس سے آسان تر ہو جاتا ہے جس طرح کوئی اپنے ہی جسم سے کسی دوسرے جسم کو چھو کر ادراک کرے۔

--- ○ ○ ○ ---

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے حوالے سے کہ کبرائے قریش نے آپؐ کی نبوت پر اعتراض کیا۔ آپؐ کو کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ اور پھر آپؐ کے انتخاب پر ان کا اعتراض صرف دنیا کی کھوٹی اور جھوٹی قدروں کی بنا پر کیا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حصے کی ایک کڑی لائی جاتی ہے جس میں یہ بتایا گیا کہ آپؐ کی قوم نے جس طرح اپنے آپ کو بوجھا، اسی طرح فرعون نے بھی موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اپنے آپ کو بوجھا تھا۔ جس طرح انہوں نے کہا۔

لَوْ لَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (۴۳: ۳۱) ”یہ قرآن ان دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہیں اتارا گیا“۔ اسی طرح فرعون نے بھی اپنی قوت، حکومت اور مال و دولت پر گھمنڈ کیا تھا اور نہایت فخریہ انداز میں پوچھا تھا:

أَلَيْسَ لِي مَلِكُ مِصْرَ وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي أَفَلَا تَبْصُرُونَ (۴۳: ۵۱) ”لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے نیچے بہہ رہی ہیں کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا“۔ اور وہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جو اپنے آپ کو بوجھتا تھا وہ محض اپنے دنیاوی مرتبہ و مقام کی بنا پر اور مال و دولت

کی بنا پر تھا حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ بندے اور نبی تھے۔ لیکن وہ دنیاوی اعتبار سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا:

”أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ“ (۵۲:۴۳) ”میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا۔“ اور فرعون کی تجویز اور اہل قریش کی تجویز کس قدر مسائل ہیں۔

فَلَوْلَا أُلْقِيَ عَلَيْهِ أَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلَأُكَةُ مُقْتَرِنِينَ (۵۳:۴۳)
 ”کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن نہ نازے گئے یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا۔“ یہ ایک نسخہ ہے جو بار بار پیغمبروں کے خلاف آزمایا جا رہا ہے۔ بنی بنائی دلیل ہے جو ہر نبی کے خلاف استعمال ہو رہی ہے۔

اس کے بعد یہ بیاں کیا جاتا ہے کہ عوام جن کو فرعون نے ذلیل کر کے رکھا ہوا تھا اور پوری طرح دھوکے میں رکھا ہوا تھا اس طرح فرعون کی بات پر بیک کہتے ہیں۔ حالانکہ عوام اور فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حیران کن معجزات پیش کیے تھے۔ پھر ان لوگوں پر اور آزمائشیں بھی آئی تھیں اور یہ لوگ دوڑ کر آتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام سے دعا کرتے تھے اور اللہ ان مصیبتوں سے ان کو نجات دیتا تھا۔

جب معجزات اور تبلیغ کے ذریعہ ان پر حجت تمام ہو گئی تو ان کا انجام یہ ہوا۔

فَلَمَّا اسَفُوْنَا اَنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاغْرَقْنَهُمْ اَجْمَعِينَ (۵۵:۴۳) فَجَعَلْنَهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا

لِّلْآخَرِينَ (۵۶:۴۳) ”آخر کار جب انہوں نے ہمیں غضبناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونہ عبرت بنا کر رکھ دیا۔“

اور دیکھئے یہ ہیں بعد میں آنے والے نہ عبرت پکڑتے اور نہ فہمیت لیتے ہیں۔ اس پیراگراف کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسالت اور دعوت الیک رہی ہے۔ تمام رسولوں کا منہاج کار الیک رہا ہے راستہ الیک رہا ہے۔ اس طرح سرکشوں اور کبراء زمانہ کا رویہ بھی سچائی کے رد عمل میں الیک ہی رہا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ دنیا کی کھوٹی اور جھوٹی قدردن کے زاویہ سے پیغمبروں کو دیکھا اور ہمیشہ جمہور عوام کا رویہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے جن کو کبرا ذلیل کر کے رکھتے ہیں اور پوری انسانی تاریخ اس کی داستان ہے۔

وَلَقَدْ ارْسَلْنَا مُوسٰى بِآيٰتِنَا اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلٰٓئِكِهٖ فَقَالَ

اِنِّى رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٥٦﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيٰتِنَا اِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُوْنَ ﴿٥٧﴾

”ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے پاس بھیجا اور اس نے جاکر کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ پھر جب اس نے ہماری نشانیاں ان کے سامنے پیش کیں تو وہ خنصے مارنے لگے۔“

حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان یہ پہلی ملاقات ہے اور اس کا ذکر بطور تمہید ہوا۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اس

تھے 'کا متعلقہ حصہ پیش کیا جائے' متعلقہ حصہ یہ ہے کہ جس طرح قریش نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کیے 'ویسے ہی فرعون نے بھی کیے تھے' جس طرح یہ اعتراضات دنیا سے دنی کے جھوٹے معیار کے حوالے سے تھے اسی طرح فرعون نے بھی اپنی برتری کے لیے دنیاوی معیار پیش کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں اور تمام رسولوں نے کہا کہ ہم رسول ہیں 'یہاں حضرت موسیٰ کے معجزات کی طرف ۱۰ ان کے مقابلے میں فرعونوں کے رد عمل کی طرف بھی صریح اشارہ۔

اِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ (۴۳: ۴۷) ”وہ ہنسنے مارنے لگے“۔ اور ہمیشہ جاہلوں کا یہی انداز ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان آزمائشوں کی طرف اشارہ آتا ہے 'جن کی تفصیلات دوسری سورتوں میں دے دی گئی ہیں۔ یہ آزمائشیں بچے در بچے ان پر آئیں اور یہ حضرت موسیٰ کے ہاں فریادی ہوئے اور آپ کی دعاؤں سے وہ آزمائشیں دور ہوئیں۔

وَمَا نُرِيهِمْ مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتَيْهَا
وَآخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۴۴﴾ وَقَالُوا يَا أَيُّهَ السَّحَرُ ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ إِنَّا لَمُهْتَدُونَ ﴿۴۵﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ إِذَا
هُمْ يَنْكُشُونَ ﴿۴۶﴾

”ہم ایک پر ایک ایسی نشانی ان کو دکھاتے چلے گئے جو پہلے سے بڑھ چڑھ کر تھی 'اور ہم نے ان کو عذاب میں دھریا کہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔ ہر عذاب کے موقع پر وہ کہتے 'اے ساحر 'اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے 'اس کی بنا پر ہمارے لیے اس سے دعا کر 'ہم ضرور راہ راست پر آجائیں گے مگر جوں ہی کہ ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے“۔

یوں یہ مسلسل معجزات جو حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے جا رہے تھے ذریعہ ایمان نہ بنے۔ حالانکہ ایک سے ایک بڑا معجزہ ظاہر ہو رہا تھا۔ یہ بات قرآن کریم کے اس اصول کی تصدیق کرتی ہے جو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ جو دل ہدایت کے قابل ہی نہ ہو اس کو معجزات کے ذریعہ کبھی ہدایت نہیں ملتی اور یہ کہ کوئی رسول ہرے کو سنا نہیں سکتا اور اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا۔

یہاں قرآن کریم فرعون اور اس کے درباریوں سے جو بات نقل کرتا ہے اس میں بھیب بات یہ ہے جو وہ کہتے ہیں۔

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا السَّحَرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ إِنَّا لَمُهْتَدُونَ

(۴۳: ۴۹) ”اے ساحر 'اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے 'اس کی بنا پر ہمارے لیے اس سے دعا کر 'ہم ضرور راہ راست پر آجائیں گے“۔ یہ ایک مصیبت میں گرفتار ہیں۔ رب موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ دعا کرتے ہیں کہ یہ مصیبت ٹل جائے لیکن اس کے ساتھ حضرت موسیٰ کو ”اے جادوگر“ سے خطاب کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں۔

اِذْ عٰلَمْنَا رَبَّكَ بِمَا عٰهَدَ عِنْدَكَ (۴۳: ۴۹) ”اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے“ اس کی بنا پر ہمارے لئے اس سے دعا کر۔ حالانکہ حضرت موسیٰ تو ان کو کہتے تھے کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ یہ نہ کہتے تھے کہ میں صرف اپنے رب کی طرف سے رسول ہوں۔ لیکن اصل بات یہ تھی نہ ان معجزات نے ان کے دل پر اثر کیا تھا اور نہ رسول کے کلام نے ان پر اثر کیا تھا۔ وہ یہ غلط کہتے تھے کہ اِنَّا لَمُهْتَدُوْنَ (۴۳: ۴۹) ”ہم ضلالت میں ہیں۔“ راست پر آجائیں گے۔“

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۴۳: ۵۱) ”مگر جو نبی کہ ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے۔“ لیکن بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ معجزات کے نتیجے میں جمہور عوام کے دلوں پر اثر ہو جاتا ہے اور ان کے دھوکہ کھائے ہوئے دماغوں میں بعض اوقات بات آ جاتی ہے۔ اب فرعون و بدبہ شاہی اور اقتدار کے رنگ میں آتا ہے۔ زبیب و زینت اور اقتدار کے کردار میں۔ اور جمہور کے سامنے اپنی سطحی منطق پیش کرتا ہے۔ اور عوام کو متاثر کرنے کی سعی کرتا ہے۔ غلامی کی زنجیت رکھنے والے عوام کے سامنے جن کا خیر ظلم اور جبر کے دور میں بالعموم بدل جاتا ہے وہ چینی چڑی باتیں کرتا ہے اور ان کے سامنے کردار کے ذریعے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔

وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖۙ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْۤ اٰمْلٰكُۙ
مِصْرَ وَهٰذِهٖ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىۢ مِنْ تَحْتِىْۙ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَۙ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ
هٰذَا الَّذِىۤ هُوَ مَوْمِنٌۙ ؕ وَلَا يَكٰدُ يُبَيِّنُۙ فَلَوْلَا اَلْقِىَ عَلَيْهِۙ اَسْوَرَةٌۭ مِّنْ
ذَهَبٍۙ اَوْ جَآءَ مَعَهُۥ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنٰتٍۙ ؕ

”ایک روز فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا، ”لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے، اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا؟“ مصر کی بادشاہت، مصر کی نہریں فرعون کے زیر انتظام تھیں اور جمہور عوام کو نظر آتی تھیں۔ یہ ان کی آنکھوں کو چکاچوند کر دیتی تھیں۔ اس لیے لوگ دھوکہ کھا جاتے تھے۔ رہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہت جس میں مصر ایک ذرہ ہے، تو اس کو سمجھنے کے لیے مومن دلوں کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس بات کو سمجھ سکیں اور اللہ کی بادشاہت اور مصر کی بادشاہت کے درمیان موازنہ کر سکیں۔

رہے غلامی کے خور و عوام جن کا ہر دور میں استحصال کیا جاتا ہے تو ان کو قریب کی دنیاوی چمک دمک متاثر کر دیتی ہے اس لیے ان کی نظریں ان کے دل اور ان کے دماغ اللہ کی بلند حکومت اور بادشاہت کو سمجھنے کے لیے سر بلند ہی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون نے ان عوام کے غافل اور سطحی دلوں کے سامنے ترقیات کا زرق برق نقشہ پیش کیا اور کہا۔

اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ وَّلَا یَکَادُ یَیْنُ (۵۳:۴۳) ”میں بہتر ہوں یا یہ جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا۔“ یہاں زلت سے اس کی مراد یہ تھی کہ یہ نہ امیر ہے نہ صاحب اقتدار اور نہ اس کے پاس نظر آنے والی مالی پوزیشن ہے۔ لفظ ام سے وہ اشارہ بنی اسرائیل کی غلام قوم کی طرف کرتا ہے اور اپنی بات کھول کر بیان نہیں کر سکتا اس طرف کہ مصر سے جانے سے پہلے آپ کی زبان میں کنت تھی۔ یہ پہلے کی بات تھی ورنہ اب کنت نہ تھی۔ حضرت موسیٰ نے دعا فرمائی تھی۔

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْطِلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوا قَوْلِیْ ”اے میرے رب میرے سینہ کو کھول دے، میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے، اور میری زبان میں کنت ہے، اسے کھول دے تاکہ وہ میری بات کو سمجھیں۔“ اس وقت آپ کی زبان کا عقدہ کھل گیا تھا اور آپ لب بات بیان کر سکتے تھے۔ اور جمہور عوام کا ظاہر ہے کہ فیصلہ یہی ہو گا کہ فرعون جو مصر کا بادشاہ ہے، مصر میں نہیں اس نے جاری کر رکھی ہیں۔ وہ موسیٰ علیہ السلام سے بہتر ہو گا۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس تو حق بات، نبوت کا پیغام، نجات کی دعوت اور دردناک عذاب سے بچنے کی راہ تھی۔

فَلَوْلَا اُلْقِیَ عَلَیْہِ اَسْوَرۃٌ مِّنْ ذَہَبٍ (۵۳:۴۳) ”کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے۔“ یہ ہے ذہنیت و ذیروں کی۔ اس دنیا کا حقیر ساز و سامان، نبوت کی حقانیت کے لیے بطور علامت تجویز ہو رہا ہے۔ سونے کے کنگن، ان معجزات سے بھاری ہو گئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئے۔ مطلب یہ تھا کہ اسے مصر کا اقتدار کیوں نہیں دیا گیا۔ کیونکہ مصر کے بادشاہ کی تاج پوشی کے موقع پر سونے کے کنگن اتارے جاتے تھے۔ یہ ان کی رسم تھی۔ یوں وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ رسول کو مقتدر اعلیٰ ہونا چاہئے اور یہ میں ہوں۔

اَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِکَةُ مُقْتَرِنٰتٍ (۵۳:۴۳) ”یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا۔“ یہ بھی ایک اعتراض تھا جس کا تعلق اس دنیا کی چمک دمک سے تھا۔ اور عوام پر اثر انداز ہوتا تھا۔ یہ بھی ایک بنا بنایا اعتراض ہے جو ہر رسول پر کیا گیا۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمُہٗ فَاطَاعُوْهُ اِنَّہُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۵۴﴾

”اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی، اور حقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔“ جمہور عوام کو ذکیئروں کی طرف سے خیف و حقیر سمجھنا کوئی انجی نہیں ہے وہ پہلے تو عوام سے ہر بات کو چہا کر رکھتے ہیں۔ ان سے حقائق کو چھپاتے ہیں تاکہ وہ بھول جائیں۔ اور ان کے بارے میں وہ دوبارہ کھوج ہی نہ لگائیں۔ ان کے دل و دماغ کو اس قدر متاثر کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت عوام کے ذہنوں پر چھا جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر ان کے لیے عوام کو ہلکا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ مطیع ہو جاتے اور جدھر چاہتے ہیں اُدھر جاتے ہیں۔

لیکن کوئی ذکیئر عوام کو اس قدر ہلکا نہیں بنا سکتا جب تک وہ خود فاسق و فاجر نہ ہوں اور بے راہ مروی نہ کرتے

ہوں۔ انہوں نے اللہ کی رسی نہ پکڑی ہو۔ معاملات کو ایمان کے ترازو سے نہ تولتے ہوں، رہے مومن تو نہ ان کو کوئی ہلکا سمجھ سکتا ہے، نہ ان کو دھوکہ دے سکتا ہے، اور نہ ان کو کھلونا بنایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ عوام الناس نے فسق و فجور کی وجہ سے فرعون کا ساتھ دیا۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ (۴۳: ۵۴) ”اس نے اپنی قوم کو ہلکا بنا دیا، پس انہوں نے اس کی اطاعت کر لی اور یہ لوگ ایک فاسق قوم کے فرد تھے۔“

اب اس کی آزمائش، ان کو ڈرانے اور سمجھانے کا مرحلہ ختم ہوتا ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ یہ قوم ایمان لانے والی نہیں ہے۔ فتنہ عام ہو گیا ہے، ہسور عام فرعون کے پیچھے لگ گئے ہیں اور فرعون بہت ہی سرکش، حکیم، مقرر رہے اور عوام اللہ کے بین معجزات کے مقابلے میں بالکل اندھے ہو گئے ہیں، ان کو یہ روشنی نظر ہی نہیں آتی۔ اب اللہ کے عذاب کا فیصلہ ان پر آ جاتا ہے۔

فَلَمَّا اسَفُّوْنَا اَنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ

سَلَفًا وَمَثَلًا لِّلْآخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

۵

۱۱ ع

۱۱

”آخر کار جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونہ عبرت بنا کر رکھ دیا۔“

یہاں اللہ کا قرآن ذات باری کے غضب اور انتقام اور جہاں بچانے والے اقدام کو پیش کرتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے غضب کے نتیجے میں اس کی قوت جو کام کرتی ہے وہ تاریخ میں مثال ہوتی ہے۔

فَلَمَّا اسَفُّوْنَا (۴۳: ۵۵) ”جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا۔“ یعنی بہت زیادہ ناراض کر دیا۔

اَنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۴۳: ۵۵) ”ہم نے ان سے انتقام لیا اور سب کو اکٹھا غرق کر دیا۔“ فرعون، اس کے سرداروں اور لشکر کو۔

یہی لوگ تھے جو حضرت موسیٰ کے تعاقب میں ہلاک ہوئے، ان کو پیشوا بنا دیا کہ ہر ظالم یہی کام کرے اور اسی انجام تک پہنچے۔

وَمَثَلًا لِّلْآخِرِيْنَ (۴۳: ۵۶) ”اور نمونہ عبرت، پچھوں کے لیے۔“ یعنی ان لوگوں کے لیے جو فرعون کے بعد ایسے کام کرنے والے تھے اور جو ان کے قصے کو معلوم کر کے اس سے عبرت حاصل کرنے والے تھے۔

--- ۰۰۰ ---

حضرت موسیٰ کے قصے کی یہ کڑی یہاں ختم ہوتی ہے۔ یہ کڑی ان حالات کے مشابہ تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو

بمقابلہ قریش درپیش تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ مومنین نے سخت بے جگری سے ان کا مقابلہ کیا۔ اس قصے کے ذریعہ عرب کے مشرکین کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ تم جس طرح کے اعتراضات کرتے ہو، یہی اعتراضات فرعون اور اس کی قوم نے کیے تھے اور ان کا یہ انجام ہوا تھا۔

اس طرح اس قصے میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں، وہ قصہ فرعون و موسیٰ اور حالات موجودہ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل قریش کے حالات پر پوری طرح منطبق ہوتے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس حورث میں بیان کردہ حالات میں قصے کی اس کڑی کو کیوں لایا گیا ہے، پھر اس طرح یہ قصہ الہی منہاج تربیت کے مطابق مسلمانوں کے لیے بہترین ذریعہ تربیت بھی ہے۔

--- ۰۰۰ ---

اب قصہ موسیٰ علیہ السلام کی اس کڑی سے بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ایک کڑی کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ اور یہ کڑی اس نکتے پر لائی گئی ہے کہ مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر ان کی عبادت کرتے تھے اور یہود کا ان مسیح ان کو خدا کا بیٹا سمجھ کر ان کی بندگی کرتے ہیں اور یہ اس سورت کا آخری سبق ہے۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۳۳ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے اور اس کا موضوع بھی عربوں کے افسانوی عقائد ہیں 'یہ کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں' اس لیے ہم ان کی بندگی کرتے ہیں 'یہاں ایک استدلال نقل کیا جاتا ہے جو مشرکین مکہ اپنے واپسی تباہی عقائد کی مدافعت میں پیش کیا کرتے تھے۔ یہ استدلال وہ اس نیت سے نہ کرتے تھے کہ وہ سچائی کے متلاشی تھے 'یہ محض دکھاوا اور دھوکہ تھا۔ جب ان سے کہا گیا کہ تم اور جن بتوں کی تم بندگی کرتے ہو 'وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ مراد تو یہ تھی کہ جن بتوں کی پوجا کرتے ہو 'خواہ وہ فرشتوں کے نام سے ہیں یا کسی اور کے نام کے۔ مراد یہ نہ تھی کہ جن کے نام سے تم بتوں کو منسوب کرتے ہو 'وہ بھی جہنم میں ہوں گے۔ غرض ان سے جب یہ کہا گیا کہ عابد و معبود دونوں جہنم میں ہوں گے۔ جب ان سے یہ کہا گیا تو بعض لوگوں نے عیسیٰ ابن مریم کی مثال دی کہ بعض گمراہ عیسائی ان کی بندگی کرتے تھے۔ یہ ان کی طرف سے محض ایک کج بحثی تھی۔ پھر وہ کہتے تھے کہ جب لیل کتاب حضرت عیسیٰ کی بندگی کرتے ہیں تو ان سے ہم بہتر ہیں کہ ہم فرشتوں کی بندگی کرتے ہیں۔ یہ استدلال بناء الباطل علی الباطل کی بہترین مثال تھا۔ اس بنا پر یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ایک کڑی لائی جاتی ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی حقیقت کیا ہے۔ آپ کی دعوت کیا تھی۔ اور ان سے پہلے بنی اسرائیل میں کیا اختلافات تھے اور ان کے بعد کیا اختلافات پیدا ہوئے۔

اس کے بعد تمام بد عقیدہ اور مشرکانہ خیالات رکھنے والوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ اچانک قیامت آجائے گی اور پھر حالت کیا ہوگی؟ اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک طویل منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں ایک جھلک ان نعمتوں کی ہے جو متقین کے لیے تیار کی گئی ہیں اور ایک جھلک اس دردناک عذاب کی ہے جو مجرمین کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس سبق میں فرشتوں کے بارے میں عربوں کے اس افسانے کو بھی رد کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ پاک ان باتوں سے بری ہے جو یہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس مناسب سے اللہ کی بعض صفات کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ زمین و آسمان اور دنیا و آخرت کا مطلق مالک ہے اور سب لوگوں نے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور آخر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ ان کو نظر انداز کر دیں 'ان سے منہ پھیر لیں اور ان کو کرتے ہیں جو کرتے ہیں۔ عنقریب ان کو اپنا انجام معلوم ہو جائے گا اور یہ ایک ایسی بالواسطہ دھمکی ہے جو ان لوگوں کے لیے مناسبت ہے جو محض دکھاوے کے لیے کٹ جیتی کرنے میں 'احقاق حق کے لیے بات نہیں کرتے۔

درس نمبر ۲۳۳ تشریح آیات

۵۷ --- تا --- ۸۹

وَلَمَّا ضَرَبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ﴿٥٧﴾
وَقَالُوا لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ
خَصِمُونَ ﴿٥٨﴾ اِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ۖ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ ﴿٥٩﴾
وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ﴿٦٠﴾ وَإِنَّهُ
لَعِلْمٌ لِّلْسَاعَةِ ۚ فَلَا تَمْتَرْنَ بِهَا ۚ وَاتَّبِعُونِ ۖ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وَلَا
يُضِلُّكُمُ الشَّيْطَانُ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٢﴾ وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ
قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلَفُونَ فِيهِ ۚ
فَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَأَطِيعُوا أَمْرِي ۚ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ ۖ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ
مُسْتَقِيمٌ ﴿٦٣﴾ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ
يَوْمِ إِلْيَاسَ ﴿٦٤﴾

”اور جو نہی کہ ابن مریم کی مثال دی گئی، تمہاری قوم کے لوگوں نے اس پر غل مچا دیا اور لگے کہنے کہ ہمارے معبود
بچے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔
ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اسے اپنی قدرت کا ایک
نمونہ بنا دیا۔ ہم چاہیں تو تم کو فرشتے بنا دیں جو زمین میں تمہارے جانشین ہوں اور وہ (یعنی ابن مریم) دراصل قیامت کی
ایک نشانی ہے، پس تم اس میں شک نہ کرو اور میری بات مان لو، یہی سیدھا راستہ ہے، ایسا نہ ہو شیطان تم کو اس سے

روک دے کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور جب یہی صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا اس نے کہا تھا کہ ”میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو“ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ اسی کی تم عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔“ مگر (اس کی اس صاف تعلیم کے باوجود) گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا، پس جاہی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب سے۔“

ابن اسحاق نے سیرۃ میں لکھا ہے کہ جس طرح مجھ تک یہ بات پہنچی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں ولید بن مغیرہ کے پاس بیٹھے تھے، نصر ابن الحارث بھی آیا اور وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گیا۔ مجلس میں قریش کے کئی اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ بات کی۔ نصر ابن حارث نے کچھ اعتراض کیا، تو حضورؐ نے اس کو خاموش کر دیا۔ اس کے بعد ان پر یہ آیت پڑھی۔

اَنْتُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصْبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَرِدُوْنَ (۹۸:۲۱)
 ”تم اور جن بتوں کی تم پوجا کرتے ہو، جنم کا ایندھن ہیں۔ تم اس جنم میں پہنچنے والے ہو۔۔۔۔۔“۔ رسول اللہ اس مجلس سے اٹھ گئے اور عبد اللہ ابن الزبیری جیسی آیا اور مجلس میں بیٹھ گیا تو ولید ابن مغیرہ نے کہا: ”خدا کی قسم نصر ابن الحارث کا کھڑا ہونا تھا کہ عبدالمطلب کے بیٹے اٹھ کر چلے گئے۔ محمد کا خیال یہ ہے کہ ہم اور ہمارے سب معبود جنم کا ایندھن ہیں۔ اس پر عبد اللہ ابن الزبیری نے کہا، خدا کی قسم اگر مجھے ملے تو میں اس کے ساتھ جھگڑا کروں گا۔ تم محمد سے پوچھو کیا وہ تمام معبود جن کی عبادت کی جاتی ہے، لپچے عبادت کرنے والوں کے ساتھ جنم میں ہوں گے۔ ہم تو ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں۔ یہودی عزیر کی عبادت کرتے ہیں اور نصاریٰ مسیح ابن مریم کی عبادت کرتے ہیں تو ولید اور اہل مجلس، عبد اللہ ابن زبیری کی بات سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے سمجھا کہ اس نے خوب دلیل پیش کی اور مباحثہ کیا۔ یہ بات رسول اللہ کے سامنے ذکر ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا: ”جس نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ اللہ کے سوا پوجا جائے تو بے شک وہ ان لوگوں کے ساتھ جنم میں ہو گا جنہوں نے اسے پوجا۔ یہ لوگ دراصل شیطان کی عبادت کرتے ہیں جس نے ان کو ان بزرگوں کی بندگی کا حکم دیا ہے۔“ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَ الْحُسْنٰی اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ (۱۰۱:۲۱) ”رہے وہ لوگ جن کے بارے میں ہماری طرف سے بھلائی کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہو گا تو وہ یقیناً اس سے دور رکھے جائیں گے۔“ یعنی حضرت عیسیٰ، حضرت عزیر اور ان کے ساتھ پوجے جانے والے دوسرے اہبار اور رہبان۔ جو اللہ کی عبادت پر قائم رہے اور ان کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کی عبادت شروع کر دی اور ان کو ارباب من دون اللہ بنا دیا۔ اور یہ جو عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں بات کی گئی کہ ان کی بھی من دون اللہ عبادت کی جاتی ہے اور ولید اور دوسرے اہل مجلس اس سے متاثر ہوئے تو اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَمَّا ضَرَبَ ابْنُ مَرْیَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ یَصِدُوْنَ (۵۷:۴۳) ”جب ابن مریم کی

بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ (۵۸:۴۳) ”حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ“۔ یہ جھگڑتے ہیں اور تنقید کرنے میں بہت ماہر ہیں، مناظرہ باز ہیں۔ ان کو پہلے سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور رسول اللہ کی مراد کیا اس کے بعد وہ منہم کو توڑ مرد ڈکر اپنی مراد پر لاتے ہیں اور پھر اعتراض کرتے ہیں اور الفاظ کے عموم کو لے کر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ ان کے اندر وہ پورے قرآن کی تعلیمات سے خود اختصاص پیدا کر سکتے تھے اور اس قسم کے عمومی اعتراضات وہی عائد کرتا ہے جو غلط نہ ہو اور پوری طرح چالاک ہو جس کی سوچ درست نہ ہو، مکاریہ کرنے والا ہو اور ہر وقت شبہات، الفاظ کے ہیر پھیر اور کسی جگہ پر نقب زنی کرنے کا حلاشی ہو۔ اس لیے حضور اکرمؐ نے بیش لسی گفتگو سے منع فرمایا ہے جس میں محض دکھاوا ہو، حقیقت نہ ہو اور جس میں صاحب کلام ہر صورت میں اپنی بات کو غالب کرنا چاہتا ہو۔

ابن جریر نے ابو کریب سے انہوں نے احمد ابن عبدالرحمن سے انہوں نے عبادہ ابن عبادہ سے انہوں نے جعفر سے انہوں نے قاسم سے اور انہوں نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے اور لوگ قرآن کریم میں مباحثہ اور مناظرہ کر رہے تھے۔ آپ کو بہت شدید غصہ آیا۔ گویا آپ کے چہرہ مبارک پر سرکہ ڈال دیا گیا ہو۔ (ترشہ روئی کا اظہار کیا) اس کے بعد آپ نے فرمایا ”قرآن کے بعض حصوں کو بعض دوسرے حصوں سے نہ ٹکراؤ، کیونکہ لوگ گمراہ تب ہوئے جب ان کے اندر مذہبی جھگڑے اور اختلافات شروع ہو گئے“۔ اس کے بعد آپ نے پڑھا۔

مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ (۵۸:۴۳) ”یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت ہی جھگڑالو لوگ ہیں“۔
اس آیت کی تفسیر میں ایک دو سرائیمال بھی ہے۔

وَقَالُوا آءِ الْهَيْثَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ (۵۸:۴۳) ”اور وہ کہنے لگے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟“ میں یہ اشارہ ہے کہ ان کے افسانوی عقائد کے مطابق وہ ملائکہ کی پوجا کرتے تھے ان کا خیال یہ تھا کہ ان کی یہ پوجا نصاریٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا سے بہتر ہے۔ کیونکہ ملائکہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اور ان کے افسانوی خیال کی رو سے خدا کے زیادہ قریب ہیں۔ اس پر یہ تبصرہ۔

مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ (۵۸:۴۳) ”یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت ہی جھگڑالو لوگ ہیں“۔ اور جس طرح پہلے گزرا یہ ابن الزبیری پر رو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نصاریٰ کی عبادت مسیح کی مثال لانا یہاں باطل ہے۔ نصاریٰ کا عمل حجت نہیں ہے کیونکہ وہ تو توحید سے پھر گئے ہیں جس طرح مشرکین توحید سے پھر گئے ہیں۔ لہذا دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ سب کے سب گمراہ ہیں۔ بعض مشرکین نے اس طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بھی ایک قریب القسم تفسیر ہو سکتی ہے۔ اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ کے بارے میں جامع تبصرہ۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي اِسْرَآئِیْلَ (۴۳: ۵۹) ”ہیں مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اسے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا دیا۔“ اور وہ اللہ نہیں جس کی عبادت کی جائے، جس طرح نصاریٰ کا ایک گروہ گمراہ ہوا اور اس نے ان کی بندگی شروع کر دی۔ وہ ایک بندہ خدا ہیں ان پر اللہ کا انعام ہو گیا اور اگر بعض لوگوں نے ان کی بندگی کی ہے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے ان کو رسالت اور معجزات دے کر بنی اسرائیل کے لئے نمونہ قدرت الہیہ بنایا گیا تھا اور بنی اسرائیل کو چوستے تھا کہ وہ ان کی پیروی کرتے اور ہدایت حاصل کرتے مگر وہ گمراہ ہو گئے۔

اب بات ان کے عقائد بابت ملائکہ کے موضوع کی طرف آئی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ فرشتے تو تمہاری طرح اللہ کی مخلوق ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اس زمین میں تمہارا جانشین فرشتوں کو بنا دیں یا بعض لوگوں کو فرشتے بنا دیں جو زمین میں جانشین ہو جائیں۔

وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُقُوْنَ (۴۳: ۶۰) ”اگر اللہ چاہتا تو ملائکہ کو تمہارا خلیفہ بنا دیتا۔“ یہ سارے معاملات اللہ کی مشیت پر موقوف ہیں۔ اپنی مخلوق کے بارے میں جو چاہے کر دے لیکن مخلوق میں سے کوئی اللہ سے نسب نہیں جوڑ سکتا۔ اور نہ اللہ سے مل سکتا ہے سوائے خالق و مخلوق کے تعلق سے یا عہد و معہود کے تعلق سے یا غلام اور مالک کے تعلق سے۔

اس کے بعد کچھ فیصلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق کہ وہ ایک تو قیامت کی نشانی ہیں۔ اس قیامت کی جس کی یہ نکتہ میب کرتے ہیں یا ان کو اس کے آنے میں شک ہے۔

وَ اِنَّهُ لَعَلَّمَ لِّلْاِسْعَآءِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنَ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (۴۳: ۶۱) وَ لَا یُضِلُّکُمْ الشَّیْطٰنُ اِنَّهٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (۴۳: ۶۲) ”اور ابن مریم دراصل قیامت کا علم ہے بس تم اس میں شک نہ کرو اور میری بات مانو۔ یہی سیدھا راستہ ہے ایسا نہ ہو کہ شیطان تم کو اس سے روک دے“ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ قیامت سے قبل نزول عیسیٰ علیہ السلام کے موضوع پر کئی احادیث آئی ہیں۔ یہ قیامت سے قدرے پہلے زمین پر اتریں گے۔ اور اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

وَ اِنَّهُ لَعَلَّمَ لِّلْاِسْعَآءِ (۴۳: ۶۱) ”اور وہ قیامت کا علم ہے۔“ یعنی ان کے آنے سے قرب قیامت کا علم ہو جائے گا اور دوسری قرات یہ ہے۔

وَ اِنَّهُ لَعَلَّمَ لِّلْاِسْعَآءِ (۴۳: ۶۱) ”اور وہ قیامت کی نشانی ہے۔“ دونوں معنی صحیح ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ قریب ہے کہ تمہارے اندر ابن مریم بطور ایک منصف حاکم نازل ہوں، وہ صیب کو توڑیں گے، خزہ کو قتل کریں گے، لوگوں پر جزیہ عائد کریں گے اور مال تقسیم کریں گے یہاں تک کہ کوئی لینے والا نہ ہو گا، حالت یہ ہوگی کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا

سے بہتر ہو گا (متفق علیہ 'ابوداؤد' مالک)۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا 'میری امت میں سے ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے گا اور قیامت تک غالب رہے گا یہاں تک کہ عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے' مسلمانوں کے امیران سے کہیں گے 'آپ! ہمیں نماز پڑھائیں' وہ کہیں گے 'نہیں۔ تم میں سے بعض بعض کے امراء ہوں گے' اللہ نے اس امت کو یہ اعزاز بخشا ہے۔'۔ (مسلم)

یہ ایک غیب ہے 'اور اس کی اطلاع ہمیں صادق دلائل صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور اس طرف قرآن کریم نے بھی اشارہ کیا ہے 'لہذا اس بارے میں کوئی انسان کوئی اور بات نہیں کر سکتا صرف وہی بات حق ہے جو ان دو سچے ذرائع سے آئی ہے اور ہمارے لیے سچے مصادر قیامت تک یہی ہیں۔

فَلَا تَعْتَرِزْ بِهَا وَاتَّبِعُونْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ (۴۳: ۶۱) "پس تم اس میں شک نہ کرو اور میری بات مانو! یہی سیدھا راستہ ہے۔" یہ لوگ قیامت میں شک کرتے تھے۔ قرآن کریم انہیں دعوت دیتا ہے کہ اس پر یقین کرو 'حضور اکرمؐ کی زبانی ان کو دعوت یقین دی جاتی ہے کہ تم میری اطاعت کرو اور میں تمہیں سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ جو بالکل سیدھا اور منزل مقصود تک پہنچنے والا ہے۔ اور اس پر چلنے والے کبھی گمراہ نہیں ہوتے۔

یہ بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ صراط مستقیم سے اوجھڑا رہے ہوتے ہیں اور رائدہ درگاہ ہوتے ہیں 'وہ شیطان کے اثر سے ہوتے ہیں' لہذا شیطان کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ اس بات کے مستحق ہیں کہ آپ کی اطاعت کی جائے۔

وَلَا يَصُدُّكُمْ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (۴۳: ۶۲) "ایسا نہ ہو کہ شیطان تم کو اس سے روک دے" وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔" قرآن کریم اس مسلسل معرکہ کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے جو اولادِ آدم اور شیطان کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے جاری ہے۔ یہ معرکہ جنت سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ اور اس فتنے سے بڑا احق اور غافل اور کون ہو سکتا ہے جسے بار بار متنبہ کیا جائے کہ گھات میں دشمن بیٹھا ہے اور اس نے تمہارا ارادہ کر رکھا ہے اور یہ فتنے اس کے برعکس دشمن کا مطیع فرمان بن جائے۔

اسلام نے تو انسان کو حکم دیا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں شیطان کے خلاف اس دواوی جنگ میں برسرِ پیکار رہے اور اس کے ساتھ اس قدر عظیم مالِ غنیمت کا وعدہ کیا ہے جو کسی بشر کے تصور سے باہر ہے۔ اسلام نے انسانی جنگ کا رخ اس معرکہ خیز و شرکی طرف پھیر دیا جس کی وجہ سے انسان صحیح انسان بنتا ہے اور جس کی وجہ سے تمام مخلوقات میں سے انسان کو ایک ممتاز مخلوق بنایا گیا ہے اور ایک خاص مزاج دیا گیا ہے اور یہاں انسان کا سب سے بڑا نصب العین یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے کھلے دشمن شیطان پر غالب آجائے 'یوں وہ شر' خباثت اور ہر قسم کی گندگی پر غالب آجائے اور زمین میں شیر کی بنیادیں رکھ دے جن میں لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں گے اور پاکیزہ زندگی گزاریں گے۔

اس نصیحت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مزید معلومات کہ وہ کیا پیغام لے کر آئے تھے اور ان سے پہلے بنی اسرائیل کے باہم اختلافات کیا تھے اور بعد میں کیا ہوتا رہا۔

وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلَفُونَ فِيهِ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا (۶۳: ۴۳) إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ (۶۴: ۴۳) فَاسْتَخْلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ قَوِيلٌ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا

مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْيَمِّ (۶۵: ۴۳) ”اور جب عیسیٰ صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں اختلاف کر رہے ہو لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا بھی۔ اس کی تم عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے مگر گردہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ پس بتاہی ہے ان لوگوں لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب کی۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کے سامنے واضح نشانیاں لے کر آئے تھے۔ یہ نشانیاں وہ معجزات بھی تھے۔ صدر آپ کے ہاتھوں پر ہوا۔ اور وہ کلمات اور تقاریر بھی تھیں جو آپ نے لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے کہیں۔ آپ نے اپنی قوم سے کہا:

قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ (۶۳: ۴۳) ”میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں“ اور جسے حکمت دی گئی وہ گویا خیر کثیر کا مالک بن گیا۔ وہ لغزش اور بے راہ روی سے امن میں ہو گیا۔ تفریط اور تقصیر سے محفوظ ہو گیا۔ اور صحیح راستے پر اس کے قدم نہایت ہی توازن اور روشنی میں اٹھنے لگے اور آپ ان کے پاس اس لیے بھی خصوصی طور پر آئے تھے کہ اس وقت مذہبی گردہوں میں جو بہت بڑا فرقہ پیدا ہو گیا تھا آپ اسے دور کریں۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں ان کے فتناء نے بے حد اختلاف شروع کر دیا تھا۔ وہ فرتے فرتے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ آپ نے قوم کو اس طرف بلایا کہ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور آپ نے عقیدہ توحید تو بڑی وضاحت ’بلا ربیب اور بغیر کسی التباس اور پیچیدگی کے بیان کیا۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ (۶۴: ۴۳) ”بے شک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے لہذا اسی کی بندگی کرو۔“ نہ آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ آپ الہ ہیں اور نہ یہ دعویٰ کیا کہ آپ ابن اللہ ہیں اور آپ نے اپنے کلام میں کسی جگہ ماسوائے تعلق رب اور بندہ اور خالق و مخلوق اللہ کے ساتھ کسی اور تعلق کا اشارہ تک نہیں کیا۔ صرف یہی کہا کہ میں رسول ہوں صراط مستقیم دے کر بھیجا گیا ہوں جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے نہ کوئی پھسلن ہے اور نہ کج روی۔ لیکن جو لوگ حضرت عیسیٰ کے بعد آئے وہ بھی اسی طرح ٹکڑے اور پار پٹیاں بن گئے جس طرح آپ سے پہلے کے لوگ ٹکڑے اور پار پٹیاں تھے۔ یہ اختلافات انہوں نے محض ظلم کرتے ہوئے کیے اختلافات کے لیے نہ کوئی جواز تھا اور نہ شبہ تھا۔

فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ (۴۳: ۶۵) ”پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب کی۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ اس دور میں بنی اسرائیل رومیوں سے تباہی کے لیے انتظار تھا کہ نجات دہندہ آئے گا اور ہمیں چھڑائے گا لیکن جب وہ آیا تو انہوں نے اسے بچونے سے انکار کر دیا اور اس کی دشمنی پر اتر آئے اور انہوں نے اسے سولی پر چڑھانے کی سعی کی۔

جب آپ تشریف لائے تو اس وقت بنی اسرائیل ٹکڑے ٹکڑے تھے، اہم فرقے چار تھے :

(۱) صدوقی فرقہ : یہ صدوق کی طرف منسوب تھے، وہ اور اس کے خاندان کے لوگ یسکلی سیمانی کے کاہن تھے۔ حضرت داؤد اور سیمان علیہما السلام کے زمانے سے وہ اس منصب پر تھے۔ شریعت کے مطابق ضروری تھا کہ ان کا نسب ہارون علیہ السلام تک پہنچے جو حضرت موسیٰ کے بھائی پیغمبر تھے کیونکہ ہارون علیہ السلام کی اومادہتی یسکل کی متولی تھی۔ یہ لوگ اپنے فرائض کے مطابق عبادت کی ظاہری صورت پر بہت زور دیتے تھے۔ اور کسی قسم کی بدعت کے سخت مخالف تھے جبکہ اپنی شخصی زندگی میں بہت عیش تھے اور زندگی کے مزے لیتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ قیامت نہیں ہے۔

(۲) فریسیوں کا فرقہ : یہ صدوقیوں کے سخت خلاف تھے۔ ان کو اعتراض یہ تھا کہ یہ لوگ مذہبی رسومات اور عبادت کی ظاہری شکل پر بہت زور دیتے ہیں اور قیامت اور حساب و کتاب کے منکر ہیں۔ یہ نہایت ہی متقی اور صوفی قسم کے لوگ تھے۔ اگرچہ بعض کے اوپر علمی غرور چھایا ہوا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کا علمی غرور پسند نہ تھا۔ نیز آپ کو ان کی لغاطی بھی پسند نہ تھی۔

(۳) تیسرافرقہ سامریوں کا تھا، یہ فرقہ یہودیوں اور اشوریوں پر مشتمل تھا۔ اور یہ عہد قدیم کی صرف پانچ کتابوں کو مانتا تھا۔ باقی کتب کو بعد کے اضافے سمجھتا تھا۔ یہ پانچ کتابیں موسوی کتب کے نام سے مشہور ہیں جبکہ دوسرے فرقے ساری کتب کو ملتے تھے۔

(۴) ان کو آسین یا اسہیین کہتے تھے۔ یہ لوگ بعض فلسفیانہ انکار سے متاثر تھے۔ اور یہ لوگ دوسرے فرقوں سے عیسوہ رہتے تھے۔ اور اپنے آپ کو نہایت سختی اور تعسف میں رکھتے تھے اور ان کی جماعت بھی تنظیم میں بہت سخت تھی۔ ان چار مشہور فرقوں کے علاوہ بھی بہت سے انفرادی فرقے تھے۔ غرض بنی اسرائیل کے اندر نظریات اور طرز عمل کا سخت اختلاف و انتشار تھا۔ جن پر رومی شہنشاہیت کا سخت دباؤ تھا۔ اور پوری قوم سخت ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ یہ منظر تھا جس میں ایک نجات دہندہ کی مہین گولی کتابوں میں کی گئی تھی کہ وہ آئے گا اور ہمیں نجات دلائے گا۔ جب حضرت مسیح عقیدہ توحید کے ساتھ بھیجے گئے اور انہوں نے اعلان کر دیا۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ (۴۳: ۶۴) ”کہ اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، لہذا اس کی عبادت کرو۔“ اور اس کے ساتھ انہوں نے ایسی شریعت پیش کی جس میں رد واداری اور روحانی اصلاح پر اور عبادت کی ظاہری صورت کی بجائے عبادت کے روحانی پہلو پر زور دیا گیا تھا تو ان فقہاء اور فریسیوں نے آپ کا مقابلہ کیا کیونکہ یہ لوگ عبادت کی ظاہری شکلوں ہی پر زور دیتے تھے۔

ان لوگوں کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کہا، ان میں سے آپ کے بعض اقوال نہایت ہی موثر ہیں مثلاً یہ لوگ بڑے بڑے بھاری بوجھ باندھتے ہیں اور لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کو اپنے کاندھوں پر اٹھائیں اور خود اپنی انگلی بھی آگے نہیں بڑھاتے کہ اس بوجھ کو جگہ سے ہٹا دیں۔ وہ جو کام بھی کرتے ہیں، اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ اسے دیکھیں۔ اور اپنے کپڑوں کے دامن لیے کرتے ہیں۔ دعوتوں میں اول مقام پر بیٹھتے ہیں اور جلسوں میں پہلی جگہ پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں اور باروں میں پھر کر سلام وصول کرتے ہیں اور یہ پسند کرتے ہیں کہ انہیں پکارا جائے۔ ”سیدی سیدی“ کہ کر جہاں بھی وہ جائیں۔“

اور فریسیوں اور فقیہوں سے کہتے ہیں ”اے اندھے قائدین! تم مجھ پر چھانتے ہو اور اونٹ نکل جاتے ہو، تم پیالے اور تھالی کے ظاہری حصے کو خوب صاف کرتے ہو لیکن ان کے اندر گندگی اور بدکاری ہوتی ہے، اے لکھنے والے مفتیان کرام اور دکھاوا کرنے والے فقہاء، تمہاری مٹاں یوں ہے جس طرح ایک چونا گچ کی سفید قبر، جس کا ظاہری حصہ خوبصورت اور طبع شدہ ہے اور اندر بوسیدہ ہڈیاں ہیں۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان کلمات کو پڑھو اور خود اپنے دور کے علماء اور مفتیان کرام کو دیکھو، کیا یہی الفاظ ان پر صادق نہیں آتے، دین کی تحریف کرے والے، رسومات کے پجاری، ظاہر پرست اور دکھاوا کرنے والے۔ اس کے بعد حضرت مسیح اپنے رب کے پاس چلے گئے۔ اس طرح آپ کے پیروکاروں کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے۔ یہ اس طرح فرتے فرتے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ بعض نے خود ان کو اللہ بنا دیا۔ بعض نے اللہ کا بیٹا بنا لیا۔ بعض نے حالتِ خلافت کہا اور وہ کلمہ توحید ان سے گم ہو گیا جس کی دعوت لے کر آپ اس لئے تشریف لائے تھے کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف لوٹ آئیں اور دین اللہ کے لیے خالص کر دیں۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابٍ يَوْمَ الْقِيَامِ

(۶۵: ۴۳) ”مگر مگر وہوں نے آپس میں اختلاف کیا پس بتایا ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک عذاب کے دن کی، مشرکین عرب آئے اور انہوں نے حضور اکرمؐ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو دہ شروع کر دیا۔ اس وجہ سے کہ پیروکار ان مسیح نے آپ کے بعد گل کھلائے تھے اور آپ کے بارے میں بے شمار انسانے گمراہ لیے تھے۔“

— ۰ ۰ ۰ —

جب ظالموں اور مشرکوں کے لیے ہلاکت کی خوشخبری دے دی گئی تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے ظالم احزاب کو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان احزاب کے فسط نظریات کی اساس پر مباحثہ اور مناظرہ کرنے والے ظالمین کو قیامت کے ایک منظر میں دکھایا جاتا ہے اور اس منظر میں ایک جھلک مومنین متقین کو بھی دکھائی جاتی ہے جو جنت کے گلستانوں میں نہایت ہی عزت سے ہوں گے۔

مَنْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ، أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا

ع ۱۲ یَشْعُرُونَ ﴿۶۶﴾ إِلَّا خِلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ ﴿۶۷﴾ يُعْبَادُ
لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿۶۸﴾ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا
مُسْلِمِينَ ﴿۶۹﴾ أَدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَآزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ ﴿۷۰﴾ يُكَفِّرُ عَنْهُمْ
سَيِّئَاتِهِمْ وَيُصْحَفُ مِنْ ذَهَبٍ وَآكَوَابٍ ﴿۷۱﴾ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ﴿۷۲﴾
وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۷۳﴾ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۷۴﴾
لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۷۵﴾ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي عَذَابٍ جَهَنَّمَ
خَالِدُونَ ﴿۷۶﴾ لَا يُفْتَرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴿۷۷﴾ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ
كَانُوا هُمُ الظَّالِمِينَ ﴿۷۸﴾ وَنَادَوْا لِیَسْلِكَ لَیْقُضْ عَلَيْنَا رَبُّكَ قَالَ إِنَّكُمْ مُكْثَرُونَ ﴿۷۹﴾

”کیا یہ لوگ اب بس اسی چیز کے منتظر ہیں کہ اچانک ان پر قیامت آجائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو؟ وہ دن جب آئے گا تو متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس روز ان لوگوں سے جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور مطیع فرمان بن کر رہے تھے کہا جائے گا کہ ”اے میرے بندو! آج تمہارے لیے کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم لاحق ہو گا۔ داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں، جنہیں خوش کر دیا جائے گا۔“ ان کے آگے سونے کے تھاں اور ساغر، دھن کرائے جائیں گے اور ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز وہاں موجود ہو گی۔ ان سے کہا جائے گا ”تم اب یہاں ہمیشہ رہو گے۔ تم اس جنت کے وارث اپنے ان اعمال کی وجہ سے ہوئے ہو جو تم دنیا میں کرتے رہے۔ تمہارے لیے یہاں بکثرت فواکہ موجود ہیں جنہیں تم کھاؤ گے۔“ رہے مجرمین، تو وہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے، کبھی ان کے عذاب میں کمی نہ ہوگی، اور وہ اس میں مایوس پڑے ہوں گے۔ ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ وہ پکاریں گے ”اے مالک! تمہارا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے تو اچھا ہے۔“ وہ جواب دے گا ”تم یوں ہی پڑے رہو گے۔“

یہ منظریں شروع ہوتا ہے کہ قیامت اچانک برپا ہو جاتی ہے۔ جب وہ اس سے غافل اور لاپرواہ تھے۔ ان کو توقع نہ تھی کہ اچانک قیامت آجائے گی۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۴۳: ۶۶) ”کیا یہ لوگ بس اسی چیز کے منتظر ہیں کہ اچانک ان پر قیامت آجائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔“

اور جب یہ آ جاتی ہے تو دنیا کے تمام حالات کو بدل کر رکھ دیتی ہے، دنیا کی تمام باتیں بدل جائیں گی اور یہ بہت بڑا

حادثہ ہو گا۔

الْأَخِلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ (۶۷: ۴۳) ”متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔“ ان کی دوستی کے سرچشمے ہی سے ان کی دشمنی پھوٹے گی۔ اس دنیا میں وہ شریر مجتمع تھے اور وہ گمراہی میں ایک دوسرے کے مشیر تھے۔ آج وہ ایک دوسرے پر ملامت کرنے والے ہوں گے اور اس شر اور گمراہی کی ذمہ داری وہ ایک دوسرے پر ڈال رہے ہوں گے۔ کبھی تو وہ بارہا ہدم تھے اور آج وہ ایک دوسرے سے الجھنے والے مخالف۔ إِلَّا الْمُتَّقِينَ (۶۷: ۴۳) ”ماسوائے متقین کے۔“ ان کی دوستی باقی ہوگی کیونکہ وہ دوستی بدعت پر تھی، باہم خیر خواہی پر تھی، اور انجام کار ان کو نجات ملی۔

جہاں دوست باہم جھگڑیں گے اور الجھیں گے پوری کائنات سے آواز ہوگی اور یہ اللہ کریم کی جانب سے ہوگی اور متقین کے لیے ہوگی:

يُعْبَادُونَكَ خَوْفٌ عَلَيْكَ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ (۶۸: ۴۳) الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ (۶۹: ۴۳) أَدْخِلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَآزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ

(۶۸: ۴۳) ”اس روز ان لوگوں سے جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور مطیع فرمان بن کر رہے تھے، کہا جائے گا کہ ”اے میرے بندو! آج تمہارے لیے کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم لاحق ہو گا۔ داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں، تمہیں خوش کر دیا جائے گا۔“ یعنی تم اس قدر خوش ہو گے کہ سرور اور خوشی تمہارے پہلوؤں اور چہروں کو ڈھانپ لے گی یوں نظر آئے گا کہ تم پر ایک خوبصورت چادر بھی ہوئی ہے۔

اب ہمارا تخیل کچھ اور عجیب چیز دیکھتا ہے۔ سونے اور چاندی کے تھال اور پیالے ان پر پھرائے جا رہے ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جنت میں ان کے لیے وہ کچھ ہے جنہیں ان کا نفس چاہتا ہے اور نفوس جو کچھ چاہتے ہیں ان کے علاوہ آنکھیں جو کچھ چاہتی ہیں، وہ بھی ہے اور یہ سب ضیائیں ان کی کمال درجے کی عزت اور مکریم کے لیے ہوں گی۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ (۷۱: ۴۳) ”ان کے آگے سونے کے تھال اور ساغر گردش کرائے جائیں گے اور ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز وہاں موجود ہوگی۔“

اور ان نعمتوں کے علاوہ وہ چیز ہوگی جو ان سے بھی بڑی اور افضل ہے۔ یہ کہ اللہ خود مخاطب ہو کر ان کی عزت افزائی کرے گا اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہو گا۔

وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۷۱: ۴۳) وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۷۲: ۴۳) لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِّنْهَا تَأْكُلُونَ (۷۳: ۴۳) ”تم اب یہاں ہمیشہ

رہو گے، تم اس جنت کے وارث اپنے ان اعمال کی وجہ سے ہوئے ہو، جو تم دنیا میں کرتے رہے۔ تمہارے لیے یہاں بکفرت نواکھ موجود ہیں جنہیں تم کھاؤ گے۔“

اور ان بحرین یا ان دنیا کا کیا حال ہے جسیں ہم بھی لڑتے جھگڑتے چھوڑ آئے ہیں :

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ (۷۴: ۴۳) ”رہے بحرین تو وہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں جلا رہے ہیں گے۔“ جہنم کا عذاب ایک دائمی عذاب ہے اور یہ نہایت ہی شدید اور اعصاب شکن عذاب ہوتا ہے، مسلسل ہوتا ہے اور ایک منٹ کے لیے بھی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ اور اس میں ان کے لیے امید کی کوئی چنگاری نہ ہوگی اور نہ دور دور رہائی کا کوئی نشان ہوگا۔ اور یہ بد بخت اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

لَا يُفْتَرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ (۷۵: ۴۳) ”بھی ان کے عذاب میں کمی نہ ہوگی اور وہ اس میں مایوس پڑے ہوں گے۔“ یہ کام انہوں نے خود اپنے خلاف کیا اور اپنے آپ کو اس ہلاکت خیز گھاٹ پر اتارا۔ یہ خود ظالم ہیں اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے، مظلوم نہیں ہیں۔

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ (۷۶: ۴۳) ”ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے رہے۔“ اب اس منظر میں دور سے ایک چیخ اٹھتی ہے۔ ایک ایسی دردناک پکار جس میں مایوسی، تنگ دلی اور کربناکی کی تمام علامات موجود ہیں۔

وَنَادَوْا اٰمِلْمٰكَ لِيَقْضَ عَلَيْنَا رَبُّكَ (۷۷: ۴۳) ”اور پکاریں گے اے مالک، تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے تو اچھا ہے۔“ یہ چیخ نہایت دور سے جہنم کی تہوں سے اٹھتی ہے۔ جس کے دروازے بھی اب بند ہو چکے ہیں۔ یہ انہی بحرین اور ظالمین کی آواز ہے۔ اب ان کی یہ پکار نجات کے لیے نہیں، نہ کسی لہذا کے لیے ہے، یہ تو اب جہنم میں مایوس پڑے ہوئے ہیں، اب ان کی تجویز یہ ہے کہ اللہ ہمیں نیست و نابود کر دے، فوراً ختم کر دے تاکہ ہم آرام کر لیں۔ اور بہت سی آرزوئیں آرزوئیں ہی رہتی ہیں۔ لیکن اس پکار میں غضب کی تنگی اور بے تابی اور کربناکی ہے۔ اس فریاد و فغان کے پیچھے ہمیں ایسے لوگ نظر آتے ہیں جن کی حالت عذاب نے خراب کر دی ہے۔ ہوش ٹھکانے نہیں رہے، درد کی حد ہو گئی اور یہ ان کی طاقت برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ اس لیے آخر میں مجبور ہو کر یہ چیخ بے ساختہ نکل گئی۔

يٰمَلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ (۷۷: ۴۳) ”اے مالک، تیرا رب ہمارا کام تمام ہی کر دے تو اچھا ہے۔“ لیکن اس پکار کا جواب نہایت ہی مایوس کن اور توہین آمیز ہے اور بغیر کسی لحاظ کے اور بغیر اس کے کہ ان کی کربناک پکار کو کوئی اہمیت دی گئی ہو۔

قَالَ اَنْتُمْ مَّكْنُوْنَ (۷۷: ۴۳) ”وہ جواب دے گا، تم یونہی پڑے رہو گے۔“ اب رہائی کی کوئی امید نہیں ب۔ نہ موت ہے اور نہ تم نیست و نابود کیے جاؤ گے۔ تم نے اب یہاں ہی ٹھہرنا ہے۔

اب سچائی کو ناپسند کرنے والوں اور منہ موڑنے والوں اور اس انجام تک پہنچنے والوں کو اس کرہناک منظر کے متحمل بعد خطاب کیا جاتا ہے اور نہایت ہی سنجیدہ اور تعجب خیز انداز میں کہا جاتا ہے اور اس حیرت انگیز نفا میں ان کو ڈر لیا جاتا ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمْ بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كُرْهُونَ ﴿۷۹﴾ أَمْ أَمْرُؤًا آمُرًا فَإِنَّا مُبْرِمُونَ ﴿۸۰﴾ أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ بَلَىٰ وَرُسُلْنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ﴿۸۱﴾

”ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے تھے مگر تم نہ۔۔۔ اکثر کو حق ہی ناگوار تھا۔ کیا ان لوگوں نے کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اچھا تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کیے لیتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔“

یہ ہے وہ اصل بات۔۔۔ اصل حق کی کراہیت اور ناگواری اس بات سے مانع تھی کہ وہ اسے قبول کرس۔ یہ بات مانع نہیں تھی کہ وہ سچائی کا ادراک نہ کر سکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کو کوئی شک ہی نہ تھا۔ انہوں نے کبھی آپ کی طرف جھوٹ منسوب ہوتے نہ دیکھا تھا۔ جب ایک شخص لوگوں کے ساتھ جھوٹ کا معاملہ نہیں کرتا تو وہ اپنے اللہ پر جھوٹ کس طرح باندھ سکتا ہے۔ اور جھوٹا دعوائے نبوت کیسے کر سکتا ہے۔

دنیا میں جو لوگ بھی حق کے خلاف جنگ کرتے ہیں، وہ حق سے لاسم نہیں ہوتے، اصل بات یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کو پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ حق ان کی خواہشات نفسانیہ کے خلاف ہوتا ہے، ان کی شہوات سے متصادم ہوتا ہے اور ایسے لوگ اخلاقی لحاظ سے اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ اپنی خواہشات اور اپنی حاجتوں کو دبا نہیں سکتے۔ اس کے مقابلے میں وہ سچائی پر ولولہ کرنے میں بڑے جری ہوتے ہیں اور سچائی کے داعیوں کے ایسے لوگ جنی دشمن ہوتے ہیں، اپنی خواہشات اور چاہتوں کے مقابلے میں ان کی یہ کمزور سچائی اور سچائی کے حاملین کے خلاف قوت کے استعمال کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ تو پھر حقیقی قوت کا مالک اور جبار و قادر بھی ان کو دھمکی دیتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ میں ان کی تمام خفیہ اور ظاہری سازشوں سے باخبر ہوں۔

أَمْ أَمْرُؤًا آمُرًا فَإِنَّا مُبْرِمُونَ ﴿۷۹﴾ أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ

نَجْوَاهُمْ بَلَىٰ وَرُسُلْنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ﴿۸۰﴾ ”کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔“

حق کے مقابلے میں باطل پر ان کا اصرار ہے تو اللہ کو بھی اصرار ہے کہ ان کے باطل کے مقابلے میں حق کا بول بالا کر کے رہے گا۔ ان کی تدابیر اور ان کی سازشوں کے مقابلے میں اللہ کا علم کام کر رہا ہے جو راز کو بھی جانتا ہے اور

مرگوشیوں سے بھی باخبر ہے۔ اللہ خالق اور عزیز و عظیم ہے اور اس کے مقابلے میں آنے والے ضعیف انسان ہیں اس لیے یہ کچھ نہ کر سکیں گے۔

— ۰ ۰ ۰ —

اس خوفناک ذر لوے کو چھوڑ کر رسول کریم کو ایک ایسی بات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو آخری بات ہے کہ یہ ان سے کہہ دیں اور پھر ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں تاکہ اس انجام تک پہنچ جائیں جس کی تصویر تم نے ابھی دیکھی ہے۔

قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَبْدِينَ ﴿٨١﴾
سُبْحَنَ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿٨٢﴾ فَذَرَهُمْ
يَخَوْضُونَ وَيَلْعَبُونَ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوْعَدُونَ ﴿٨٣﴾

”ان سے کہو اگر واقعی رحمن کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے عبادت کرنے والا میں ہوتا۔“ پاک ہے آسمانوں اور زمین کا فرماں روا، عرش کا مالک، ان ساری باتوں سے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اچھا، انہیں اپنے باطل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل میں منہمک رہنے دو، یہاں تک کہ یہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ فرشتوں کی عبادت اس تصور پر کرتے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اگر اللہ کی اولاد ہوتی تو اس کے ساتھ جان پہچان اور اس کی بندگی کا حق وارسب سے پہلے ہی ہوتا۔ کیونکہ انسانوں میں سے خدا کے قریب نبی اور رسول ہی ہوتے ہیں۔ اور پھر اللہ کی بندگی اور اطاعت میں بھی وہ سب سے آگے ہوتے ہیں اور اگر کوئی اولاد ہوتی تو اس کی عزت بھی سب سے پہلے ہی کرتے۔ لہذا ان لوگوں کا یہ تصور اور زعم ہی محض افسانہ ہے۔ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اس قسم کی صفات کی اللہ کی طرف نسبت کرنا اس کے شایان شان نہیں ہے، وہ پاک ہے۔

سُبْحَنَ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ (۸۲: ۸۳) ”پاک ہے آسمان اور زمین کا فرماں روا، عرش عظیم کا مالک ان ساری باتوں سے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔“ جب انسان ان آسمانوں اور زمین پر غور کرتا ہے، ان کے نظام پر غور کرتا ہے، ان کی رفتار اور آثار کے اندر غایت درجہ ہم آہنگی دیکھتا ہے، اور اس نظام کے پیچھے جب بلند اور عظیم قوت کی عظمت کو دیکھتا ہے اور پھر اس پورے نظام پر اس کے قبضے اور کنٹرول کو دیکھتا ہے، جس کی طرف رب العرش کا لفظ اشارہ کرتا ہے تو انسان کے ذہن سے اس قسم کے افسانوی خیالات و خرافات خود بخود محو ہو جاتے ہیں۔ اور یہ غور کرنے والا انسان خود اپنی فطرت کے ذریعہ یہ معلوم کر لیتا ہے کہ ایسی ذات بے مثال ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں ہو سکتی جس طرح مخلوق کی اولاد ہوتی ہے اور نسلیں چلتی ہیں۔ یہ اللہ کے لائق نہیں ہے۔ وہ اس سے پاک ہے۔ اس قسم کے عقائد اس سوچ کے بعد خود بخود لغو نظر آتے ہیں۔ یہ فضول کلام اور ناجائز جہرت ہے۔ اس لیے کلام کرنا ہی فضول ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنے حال

پر چھوڑ دیا جائے۔

فَذَرَهُمْ يَخْوَضُونَ وَيُلْعَبُونَ حَتَّى يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوْعَدُونَ (۴۳: ۸۳)
 ”انہیں اپنے باطل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل میں منہمک رہنے دو یہاں تک کہ یہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جن کا انہیں
 خوف دلایا جا رہا ہے۔“ اور وہ دن کیا ہو گا اس کی ایک تصویر تو ابھی انہوں نے دیکھ لی ہے۔

--- ۰۰۰ ---

ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کے بعد اللہ کی تعریف اور حمد میں کچھ باتیں کی جاتی ہیں، یہ جانے کے لیے کہ
 اس عظیم کائنات کا رب ایسا ہوتا ہے۔ یہ ہیں اس کی صفات:

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهٌُ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌُ وَهُوَ
 الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۝ وَتَبَارَكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا
 بَيْنَهُمَا ۝ وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ۝ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ
 يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝

”وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا“ اور وہی حکیم و علیم ہے۔ سمت بالا دیر تر ہے جس کے قبضے
 میں زمین اور آسمانوں اور ہر اس چیز کی بادشاہی ہے جو زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے، اور وہی قیامت کی گھڑی
 کا علم رکھتا ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔ اس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ کسی شفاعت
 کا اختیار نہیں رکھتے، الا یہ کہ کوئی علم کی بناء پر حق کی شہادت دے۔“

یہ ہے زمین و آسمان میں صرف ایک ہی الوہیت کا اعلان، جو وحدہ لا شریک ہے، وہ جو کام بھی کرتا ہے حکمت کی بنا پر
 کرتا ہے اور اپنے بے قید علم کے مطابق کرتا ہے۔ پھر یہاں لفظ جبارک کا استعمال ہوا ہے یعنی برکتوں والا ہے اور اس کے
 بارے میں یہ لوگ جو تصورات رکھتے ہیں، ان سے بہت بلند ہے، وہ زمین و آسمانوں اور ان کے اندر تمام مخلوقات کا رب
 اور مالک ہے۔ وہی قیامت کے دن کا جاننے والا ہے اور اس کی طرف لوٹنا ہے۔ اس دن ان الہوں میں سے کوئی بھی نہ
 ہو گا۔ سب غائب ہوں گے جن کو نہ پکارتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ کہتے تھے ہمارے یہ رب دراصل ہمارے سفارشی ہیں
 اور وہیں تو سفارش اس کی چلے گی جس کو پیشگی اجازت دے دی جائے گی، اور ظاہر ہے جن کو پیشگی اجازت ملے گی وہ
 معاندین حق اور دشمنان اسلام کی سفارش کرنے سے رہے۔

اب یہاں ان کے سامنے وہ بات رکھی جاتی ہے جس میں وہ نہ شک کرتے تھے اور نہ جھڑتے تھے۔ یہ کہ اللہ ہی
 ہمارا خالق ہے۔ سوال یہ کیا جاتا ہے جب اللہ خالق ہے تو پھر کیوں دو سرور کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہو۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّى يُؤْفَكُونَ ۝

”اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر کہاں سے یہ دھوکا کھا رہے ہیں۔“ یعنی جس سچائی کو ان کی فطرت تسلیم کرتی ہے اس سے وہ کیوں نہ موڑتے ہیں اور ایک طرف ہو کر نکل جاتے ہیں۔

سورت کے آخر میں حضور اکرمؐ کی فریاد کو لایا جاتا ہے جو آپؐ کرتے تھے کہ میری قوم کفر، عناد اور ایمان نہ لانے پر تلی ہوئی ہے۔ یہاں اس فریاد کو لا کر اس کی قسم اٹھائی جاتی ہے۔

وَقِيلَ لَهُ يٰرَبِّ اِنَّ هٰؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٤٢﴾

وَقُلْ سَلٰمٌ فَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٣﴾

۱۳

”قسم ہے رسولؐ کے اس قول کی کہ اے رب! یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے، اچھا، اے نبیؐ ان سے درگزر کرو اور کہہ دو کہ سلام ہے تمہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔“

اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریاد دور رس ہے، اس کے گہرے نتائج نکلنے والے ہیں، اسے سن لیا گیا، اور عالم بالا اس کے نتیجے میں کچھ عظیم اقدامات کر رہا ہے۔ لہذا اے نبیؐ آپ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں اور ان کی کارروائیوں اور ریشہ دوانیوں کی کوئی پروا نہ کریں، مطمئن رہیں، نہایت امن سلامتی اور شرافت کے ساتھ اپنی راہ پر چلتے رہیں۔ اس میں بھی درپردہ ایمان نہ لانے والوں کو سخت دھمکی دی جا رہی ہے۔ اس دن کے سلسلے میں جب سب چپے غا ہر ہوں گے۔ ”اے نبیؐ ان سے درگزر کرو اور کہہ دو سلام ہے تمہیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔“

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پاره ----- ۲۵

سورة الدخان - ۴۴

آیات ۱ تا ۵۹

سورۃ الدخان ایک نظر میں

اس سورت کی آیات چھوٹی چھوٹی ہیں اور آیات کے ماضی اور مسجع ردیف اور فواصل ایک دوسرے کے قریب ہیں، ان میں زوردار قسم کی تصویر کشی ہے جس کے تمام رنگ نہایت اشاراتی ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہم گمشدہ راہ انسانیت کے دل و دماغ کی تاروں پر زوردار چوٹیں لگائی جا رہی ہیں۔

پوری سورت میں سیاق کلام متحد اور مربوط ہے۔ جس کا محور اور عمود ایک ہے۔ تمام تاریں اسی ایک عمود سے ملتی ہیں، خواہ قصص ہوں، قیامت کے مناظر ہوں یا تاریخ کی ہلک کردہ اقوام کی بربادیوں کے مناظر ہوں یا اس وسیع و عریض کائنات کے مناظر ہوں۔ توحید، رسالت اور قیامت پر براہ راست بات چیت ہے، یہ سب چیزیں انسان کے مردہ دلوں کو زندہ کرنے والی ہیں اور اس کے اندر زندہ اور متحرک ایمان پیدا کرنے والی ہیں اور پورے قرآن کا مقصد یہ ہے کہ مردہ دلوں کے اندر زندہ اور متحرک ایمان پیدا کیا جائے۔

آغاز یوں ہوتا ہے کہ یہ قرآن ایک مبارک رات میں نازل ہوا جس کے اندر اللہ بڑے بڑے فیصلے فرماتا ہے اور اللہ کا بندوں پر بڑا کرم تھا کہ اس نے یہ کتاب نازل فرمائی۔ اور ان کو قتل از وقت خبردار کر دیا۔ اور یہ نازل کرنے اور کرم کرنے والا کون ہے؟ آسمانوں کا رب اور زمین کا رب۔ اور ان کے درمیان کا بھی رب۔ جو اولین اور آخرین کا رب ہے۔ اور جو زندہ کرنے والا اور مارنے والا رب ہے۔

روئے سخن یکت پھر جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی دل لگتا انداز ہے۔

بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ (۹: ۴۴) ”بلکہ یہ لپچے شک میں پڑے کھیل رہے ہیں۔“ اور اس شک پر بھی ان کو خوفناک دھمکی دی جاتی ہے۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُحَانٍ مُّبِينٍ (۱۰: ۴۴) ”یُغْشَى النَّاسَ هَذَا عَذَابٌ“

الْیَمِّ (۱۱: ۴۴) ”اچھا انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ ہے دردناک سزا۔“ اب یہ لوگ اس عذاب کے دور کرنے کی دعائیں کرتے ہیں لیکن یہ تو ایسا دن ہے کہ جب آتا ہے تو پھر تلتا نہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ تصویر تو تم نے دیکھ لی ہے یہ عذاب گو آیا نہیں ہے تو کیا تم اس فرصت کو قیمت نہیں سمجھتے۔ بجائے اس کے کہ یہ رب کے سامنے پہنچ جائیں۔ کیوں نہ ابھی سے تیاری شروع کر دیتے۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطِشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ (۱۶: ۴۴) ”جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں

کے وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔“

یہ ایک شدید ضرب ہے سوئے ہوئے دلوں پر کہ آرہا ہے وہ دن جس کی پکڑ سخت ہوگی، شدید عذاب ہو گا اور اللہ کا انتقام ہو گا۔ اس کے بعد فرعون اور اس کے سرداروں کی ہلاکت کا منظر جب ان کے پاس ایک رسول کریم آیا اور اس نے ان کو پکارا۔

أَنْ أَدُوعًا إِلَىٰ عِبَادِ اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ (۱۸:۴۴) وَأَنْ لَا تَعْلُوا عَلَىٰ

اللَّهُ (۱۹:۴۴) ”اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو۔ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔“ انہوں نے سننے سے انکار کر دیا اور یہ شریف رسول ان سے مایوس ہو گیا۔ اس تکبر، غرور کے بعد پھر ان کی ہلاکت نہایت ہی توہین آمیز انداز سے ہوئی۔

كَمْ تَرَكَوْا مِنْ جَنَّتٍ وَ عَيْوُنٍ (۲۵:۴۴) وَ زُرُوعٍ وَ مَقَامٍ كَرِيمٍ (۲۶:۴۴) وَ نَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فُكِهِيْنَ (۲۷:۴۴) كَذٰلِكَ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ

(۲۸:۴۴) فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوا مُنْظَرِيْنَ (۲۹:۴۴) ”کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے، کتنے ہی عیش کے سرور سامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے، ان کے پیچھے دھڑے رہ گئے، یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر دیا، نہ زمین اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔“

جب یہ منظر عروج پر تھا تو انہیں متوجہ کیا گیا کہ پھر بھی تم لوگ آخرت کی تکذیب کرتے ہو، اور تم ایسی باتیں کرتے ہو۔

اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُولٰٓئِ وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ (۳۵:۴۴) فَاتُوا بِاٰبَائِنَا اِنْ كُنْتُمْ

صٰدِقِيْنَ (۳۶:۴۴) ”ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں۔ اگر تم سچے ہو تو اٹھاؤ ہمارے باپ دادا کو۔“ تاکہ قوم شیخ کا انجام انہیں بتایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ تم ان سے کچھ اچھے لوگ نہیں ہو کہ اس برے انجام سے بچ کر نکل جاؤ۔
بعث بعد الموت کا ربط زمین و آسمان کی تخلیق کی اسکیم سے ہے۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لِعٰبِيْنَ (۳۸:۴۴) مَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹:۴۴) ”یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم

نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنادیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ مانتے نہیں ہیں۔
اس کے بعد ان کو یوم الفصل کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ میقاتِ اجماع (۴۴: ۴۰) ”یہ سب کے لیے طے شدہ ہے“۔ اور پھر اس کے بعد شجرہ رقوم کی بابت اور بدکاروں کے رگیدنے کی بابت اور پھر ان کو رگید کر جہنم میں پھینکنے اور اوپر سے گرم پانی اُنڈیلنے کی بابت ایک خوفناک منظر ہے اور اس میں کفار کو خوب دلیل و خوار کیا جاتا ہے۔

ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ (۴۴: ۴۶) اِنْ هَذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ (۴۴: ۵۰) ”کچھ اس کا حرا‘ بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو‘ یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے“۔
پھر اس منظر کے ساتھ ہی ایک منظر آتا ہے جس کے اندر اللہ کی نعمتیں اسی طرح گہری ہیں جس طرح پچھلے منظر کا عذاب گہرا تھا اور یہ اس پوری سورت کی فضا کو جاری رکھتے ہوئے جس میں نہایت ہی موثر مناظر دیئے گئے ہیں۔
جس طرح سورت کا آغاز قرآن مجید کے موضوع سے ہوا۔ اس طرح انجام میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔

فَأَنمَّا يَسِرُّنَّ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۴۴: ۵۸) ”اے نبی‘ ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں سہل بنا دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں“۔

غرض یہ ایک ایسی سورت ہے جو انسانی دل و دماغ پر آغاز سے اختتام تک حملہ آور ہے۔ اس کا اثر تیز اور مسلسل ہے جس طرح یہ تدبیر کی تاروں کو چھیڑتی ہے۔ نغمہ اور زحرمہ دیتی ہے۔ اسی طرح اس کے مناظر‘ تصاویر اور ان کے مختلف رنگ‘ تیز رنگ اور مسلسل نظارے انسان کو اس جہاں کی سیر کراتے ہیں اور اسے اللہ کے نشانات ارض و سما میں دکھاتے ہیں۔ یعنی جنت اور جہنم کے مناظر‘ ماضی اور حال کے مناظر‘ عطاوہ اندس موت و حیات کے مناظر اور اس کائنات میں موثر قوانین فطرت کبھی سب کے سب موجود ہیں اس لئے اپنے اختصار کے ساتھ یہ سورت بھی اس جہاں کا ایک مطالعاتی سفر ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۲۳۲ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۵۹



حَمْرُ ۱۰ وَ الْكِتَابِ الْمُبِينِ ۱۱ اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ ۱۲
 فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٍ ۱۳ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۱۴ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۱۵ رَحْمَةً
 مِّنْ رَبِّكَ ۱۶ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۱۷ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۱۸
 اِنْ كُنْتُمْ مُّوقِنِينَ ۱۹ لَا اِلَهَ اِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ الْاَبَآئِكُمْ
 الْاَوَّلِينَ ۲۰

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ح۔م۔“ قسم ہے اس کتاب مبین کی کہ ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔ ہم ایک رسول بھیجے والے تھے ’تیرے رب کی رحمت کے طور پر‘ یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے ’آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اس چیز کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہے‘ اگر تم لوگ واقعی یقین رکھنے والے ہو۔ کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے ’وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ تمہارا رب اور تمہارے ان اسلاف کا رب جو پہلے گزر چکے ہیں۔“

آغاز دو حروف سے ہوتا ہے ح۔م۔ اور دونوں کی قسم اٹھائی جاتی ہے اور ۲۳۲۔ مبین کی بھی قسم اٹھائی جاتی ہے جو ایسے ہی حروف تہجی سے مرکب ہے۔ ان کے بارے میں سورتوں کے آغاز میں ہم بارہا بات کر چکے ہیں۔ پھر ان حروف

کی بھی اسی طرح قسم اٹھائی گئی جس طرح کتاب مبین کی قسم اٹھائی گئی۔ کتاب مبین کی اہمیت مسلم مگر ان حروف کی اہمیت کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر حرف بھی ایک معجزہ اور نشانی ہے اور ہر حرف انسان کی زبان کی ساخت کی نشانی ہے اور پھر کس انداز سے زبان اپنے مخرج سے اس حرف و صوت کو نکالتی ہے، پھر ان حروف کے مخرج کی ترتیب پھر ہر حرف کے نام اور اس کی آواز کے درمیان ایک رمز و اشارہ اور ان حروف اور کلمات کے ذریعہ انسان عظیم حقائق تک پہنچتا ہے۔ اور علوم کو مرتب کرتا ہے۔ یہ اس قدر عظیم کام ہے کہ اگر ہم اس پر سمجیدگی سے غور کریں اور اپنی عادت اور مانوسیت کو ایک طرف پھینک دیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ ایک حرف کس قدر عظیم چیز ہے اس لیے ان کی قسم اٹھائی گئی۔ وہ چیز کیا ہے جس کے لئے یہ قسم اٹھائی گئی ہے، وہ ہے وہ عظیم حادثہ جو ایک مبارک رات میں واقع ہوا یعنی نزول قرآن

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ (۴۴:۳) فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ
(۴۴:۴) أَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ (۴۴:۵) رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ إِنَّهُ هُوَ

السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۴۴:۶) ”ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے، کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔ ہم ایک رسول بھیجے والے تھے، تیرے رب کی رحمت کے طور پر، یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔“

اور مبارک رات جس میں قرآن نازل ہوا، وہ رات ہے جس میں قرآن کریم کا نزول شروع ہوا اور یہ رمضان المبارک کی راتوں میں سے ایک رات ہے، جس کے بارے میں تصریح ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ ”رمضان المبارک کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔“ قرآن مجید سب کا سب تو نہ اس رات کو نازل ہوا ہے اور نہ سب کا سب رمضان المبارک میں نازل ہوا ہے لیکن اس زمین پر اس کے آنے کا آغاز رمضان المبارک میں ہوا اور پھر اس مبارک رات میں ہوا۔ یلۃ القدر یا لیلہ مبارکہ کے بارے میں یہی کافی ہے۔ واللہ اعلم!

یہ رات فی الواقع مبارک ہے جس میں انسانیت کے لیے رحمت خداوندی کا یہ عظیم دروازہ کھلا اور جہاں اسلامی نظام زندگی انسانوں کی زندگی میں جاگزیں ہونا شروع ہوا جس کے اندر انسان روح فطرت سے شناسا ہوا، جس کی نہایت ہی خوبصورت ترجمانی قرآن مجید میں کی گئی ہے۔ فطرت انسانی اس نظام کے لیے لیکھ کہتی ہے اور خوشی خوشی اسے قبول کرتی ہے اور یوں، دوائی فطرت انسانی کے مطابق ایک ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے جو فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق اور اس کائنات کے بھی عین مطابق ہوتا ہے جس میں انسان رہ رہا ہے۔ یہ نظام اس قدر پاک و صاف اور بلا تکلف اور بغیر کسی تکلیف کے قائم ہوتا ہے اور اس نظام کے زیر سایہ انسان رہتا تو زمین پر ہے لیکن وہ ہوتا آسمانوں پر ہے۔

صحابہ کرامؓ اور پہلے انسان جن پر یہ قرآن نازل ہوا، وہ اسی آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ایک عرصہ تک اللہ کے ساتھ مربوط اور موصول زندگی گزارتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو فی انور جاتا تھا کہ تمہارے دلوں میں یہ یہ یہ تصورات آتے

(مولانا مودودی کا جو ترجمہ میں نے دیا ہے اس سے اس مذکورہ تفسیر کا فرق واضح ہے۔ کیونکہ سید قطب ”یفرق“ کو فرق کے معنوں میں لے رہے ہیں جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ (حزب))
اور یہ فیصلے اللہ کے ارادے سے ہوئے کیونکہ اللہ کی مشیت یہ تھی اور یہ رہی ہے کہ رسولوں کو بھیجا جائے تاکہ وہ کلام الہی کو بیان کریں اور اس کے مطابق فیصلے کریں۔

اَنَا كُنَّا مَرْسَلِينَ (۴۴: ۵) ”ہم ایک رسول بھیجے واسلے تھے“۔ اور رسول کا بھیجنا اللہ کی رحمتوں کے تقاضے سے تھا۔ قیامت میں اللہ لوگوں پر رحمت کرنا چاہتا تھا۔

رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۴۴: ۶) ”تیرے رب کی رحمت کے طور پر یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے“۔ قرآن کے نزول سے جس طرح اللہ کی رحمت کا ظہور ہوا اس طرح کسی اور رحمت کا ظہور نہیں ہوا۔ یہ قرآن نہایت آسانی کے ساتھ اور سرعت کے ساتھ دلوں میں بیٹھ جاتا ہے اور انسان اس کے رد عمل کے طور پر اس طرح خود کار طریقے سے عمل کرتا ہے جس طرح انسان کے جسم میں خون دوڑتا ہے اس طرح یہ بشر ایک نہایت ہی سنجیدہ اور شریف انسان بن جاتا ہے اور انسانی معاشرہ ایک خوبصورت خواب کی طرح نظر آتا ہے۔ اور یہ خواب ایک عملی خواب ہوتا ہے جو آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔

یہ نظریہ حیات جو قرآن مجید نے پیش کیا اپنی جامعیت اور ہم آہنگی کے زاویہ سے ایک ایسا خوبصورت عقیدہ ہے کہ انسان بے ساختہ اس کے ساتھ محبت کرنے لگتا ہے۔ دل اس کے ساتھ اٹک جاتے ہیں۔ یہ نظریہ نہ صرف یہ کہ خیر و صلاح پر مبنی ہے۔ اس کے اندر کمال اور جامعیت بھی موجود ہے بلکہ یہ چیزیں اس میں اس قدر ترقی کرتی ہیں کہ پرکشش خوبصورتی کے مقام تک چلی جاتی ہیں۔ یہ خوبصورتی اس قدر کمال اور جامع ہے کہ اس عقیدے اور نظام کا ایک ایک جزء نہایت ہی خوبصورت ہے۔ پھر اس کا جزئی اور کلی حسن و کمال اس کائنات کے جزئی اور کلی حسن و کمال کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

یہ قرآن مجید رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ (۴۴: ۶) ”تیرے رب کی طرف سے بطور رحمت کے نازل ہوا“۔ اور اس مبارک رات میں نازل ہوا۔

اِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۴۴: ۶) ”یقیناً وہی سننے اور جاننے والا ہے“۔ وہ سنتا اور جانتا ہے۔ اللہ جو کلام اور جو احکام نازل کرتا ہے وہ علم و معرفت کی بنا پر نازل کرتا ہے۔ وہ لوگوں کے اقوال و افعال کو جانتا ہے اور ایسے اصول و قوانین نازل کرتا ہے جو ان کے لیے مفید ہیں اور جن کے ذریعے ان کی اصلاح ہوتی ہے۔
اللہ ہی وہ ذات ہے جو اس کائنات کا نگہبان ہے اور اس کا اور اس کے اندر تمام چیزوں کا محافظ ہے۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوقِنِينَ (۴۴: ۷) ”آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اس چیز کا رب جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے اگر تم واقعی یقین رکھتے ہو“۔ اس لیے وہ لوگوں

کے لیے جو کلام و نظام نازل کرتا ہے وہ ان کی تربیت کے لیے کرتا ہے جس طرح اس کائنات میں اس کی ربوبیت چلتی ہے، انسان بھی اسی کا حصہ ہے اور انسان بھی اللہ کے قوانین فطرت کا ایک حصہ ہے اور یہاں ایمان اور ایقان کی طرف جو اشارہ کیا ہے تو وہ اس لیے کہ ان کے عقائد نہایت مضرب اور ذاتواں ڈول تھے کیونکہ ایک طرف تو وہ آسمانوں اور زمین کو اللہ کی مخلوق سمجھتے تھے۔ دوسری جانب انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے ارباب بھی بنا رکھے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اللہ کا تصور نہایت مجمل، غیر واضح، سطحی اور پختگی سے بہت دور تھا۔ حالانکہ اللہ واحد الہ ہے جو موت و حیات کا مالک ہے اور اولین اور آخرین سب کا رب ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ (۸: ۴۴) ”کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے وہی زندگی عطا کرتا ہے، وہی موت دیتا ہے، تمہارا رب اور تمہارے اسلاف کا رب جو گزر چکے ہیں۔“ زندہ کرنا اور مارنا تو دونوں ایسی باتیں ہیں جن کو تمام انسان دیکھتے ہیں اور یہ بھی ان کو معلوم ہے کہ یہ کام اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے تو معمولی فکر و تدبیر کی ضرورت ہے۔ موت کا منظر اور حیات کی کمانی دونوں انسانی قلب پر بہت ہی قریب سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان سے انسان کا دل متاثر اور متغیر ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا تذکرہ قرآن میں بہت ہوتا ہے۔ اور انسانی قلب اور دماغ کو اس طرف بار بار متوجہ کیا جاتا ہے اور مومنین کے دلوں کو بار بار اس کا غسل دیا جاتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اس حد تک قرآن کے مخاطبین کو متاثر کرنے اور جوش دلانے اور حق کو قبول کرنے پر آمادہ کرنے کے بعد اب روئے سخن اچانک پھرتا ہے۔ اور تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا جاتا کہ اس عظیم کتاب کی اس سعی کے بعد ان لوگوں کی حالت کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اسے ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن یہ لوگ اس قدر سنگ دل ہیں کہ اس قدر سنجیدہ کوششوں کے باوجود وہ ابھی تک اس تحریک کو مذاق ہی سمجھتے ہیں۔

بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ ﴿۹﴾ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ﴿۱۰﴾ يَغْشَى النَّاسَ هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۱﴾ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ﴿۱۲﴾ أَتَى لَهُمُ الذِّكْرَى وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ﴿۱۳﴾ ثَوَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلِّمٌ مِّثْنُونٌ ﴿۱۴﴾ إِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابَ قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ ﴿۱۶﴾

”مگر فی الواقع ان لوگوں کو یقین نہیں ہے بلکہ یہ اپنے شک میں پڑے کھیل رہے ہیں۔ اچھا، انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ ہے دردناک سزا۔ (اب کہتے ہیں کہ)

”پروردگار! ہم پر سے یہ عذاب ہٹا دے! ہم ایمان لاتے ہیں۔“ ان کی غفلت کہاں دور ہوئی ہے؟ ان کا حال تو یہ تھا کہ ان کے پاس رسول مبین آگیا۔ پھر بھی یہ اس کی طرف تفت نہ ہوئے اور کہا کہ ”یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے۔“ ہم ذرا عذاب ہٹانے والے ہیں (اگر ہٹا دیں تو) تم لوگ پھر وہی کچھ کر دے گے جو پہلے کر رہے تھے۔ جس روز ہم بڑی پکڑ دھکڑ کریں گے وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔“

فرماتے ہیں کہ یہ تو اس قدر سیکھنا اور عظیم الشان نظریہ اور نظام کے مقابلے میں غیر سنجیدہ ردیہ اختیار کرتے ہیں اور ان نشانیوں میں شک کرتے ہیں جو ثابت شدہ ہیں لہذا ان کا صحیح علاج یہی ہے کہ ان کو اس دن کے لیے چھوڑ دیا جائے جو بہت ہی سخت اور اصراب شکن ہو گا۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُحَانٍ مُّبِينٍ (۴۴: ۱۰) يَغْشَى النَّاسَ هَذَا عَذَابٌ

الْأَلِيمُ (۴۴: ۱۱) رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ (۴۴: ۲۱) ”اچھا انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ ہے دردناک سزا“ ”پروردگار! ہم پر سے عذاب ہٹا دے! ہم ایمان لاتے ہیں۔“

سلف صالحین کے درمیان آیت دھان کی تفسیر میں اختلاف رہا ہے۔ بعض نے یہ کہا کہ یہ قیامت کے دن کا دھواں ہے، یہ دھمکی جو دی گئی کہ اس کا انتظار کرو، یہ ویسی ہی ہے جس طرح قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر عذاب قیامت کے انتظار کے لئے کہا جاتا ہے اور یہ تو آنے ہی والا ہے۔ لوگ بھی انتظار کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انتظار فرمایا لیکن بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یہ واقعہ عمل گزر گیا ہے۔ جس طرح قرآن نے دھمکی دی ہے اور پھر جب آیا تو مشرکین حضورؐ کے پاس آئے۔ آپ نے دعا فرمائی اور یہ عذاب دور ہو گیا۔ یہاں ہم دونوں اقوال اور ان کی سند نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد اپنا تبصرہ کریں گے۔

سلیمان ابن مہران الاعمش نے روایت کی ہے۔ ابوہنئی مسلم ابن صبیح سے انہوں نے مسروق سے یہ کہتے ہیں کہ میں ابوب کندہ کے پاس کوفہ کی ایک مسجد میں داخل ہوا، ایک شخص اپنے ساتھیوں کے سامنے یہ بیان کر رہا تھا۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُحَانٍ مُّبِينٍ (۴۴: ۱۰) ”اچھا انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا۔“ کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ دھواں کیا ہے؟ یہ ایک دھواں ہے جو قیامت کے دن آئے گا۔ اس سے منافقین اور کفار اندھے اور بہرے ہو جائیں گے۔ اور مومنین پر صرف اس قدر اثر ہو گا جس طرح زکام ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم ابن مسعودؓ کے پاس آئے۔ یہ بات ہم نے ان سے ذکر کی۔ اس وقت یہ تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پریشان ہو کر اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے نبی سے کہا:

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، اور نہ ہی مجھے تمہاری ہدایت کا مکلف بنایا گیا ہے۔“ یہ بھی بہت بڑے علم کی دلیل ہے کہ اگر کسی کو کوئی بات معلوم نہ ہو تو کہے

واللہ اعلم! اس کے بارے میں ہمیں اصل بات بتانا ہوں۔ جب قریش نے کسی صورت میں اسلام قبول نہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اے اللہ ان پر ایسے سال لے آیا جو یوسف علیہ السلام کے دور میں مصر میں آئے تھے۔ چنانچہ ان پر جمد و مشقت اور بھوک اور پیاس کے دن آگئے یہاں تک کہ انہوں نے ہڈیاں کھانا شروع کر دیں۔ اور مردار بھی کھانے لگے۔ ایسے حالات ہو گئے کہ وہ آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے اور انہیں دھواں ہی دھواں نظر آتا اور بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں کہ ایک شخص آسمان کی طرف نظریں اٹھاتا اور اسے فضا یوں نظر آتی جس طرح دھواں ہو اور یہ بد حالی کی وجہ سے۔ اس کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (۴۴: ۱۰) يَغْشَى النَّاسَ هَذَا

عَذَابُ الْيَوْمِ (۴۴: ۱۱) ”انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ ہے دردناک سزا۔“ لوگ رسول اللہ کے پاس آئے اور آپ سے کہ گیا رسول خدا آپ اللہ سے مہر عربوں کے لیے دعا مانگیں کیونکہ یہ ہلاک ہونے والے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے بارانِ رحمت کی دعا مانگی اور بارش ہوئی۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

أَنَا كَاشِفُ الْعَذَابِ قَلِيلًا أُنْكُمْ عَائِدُونَ (۴۴: ۱۵) ”ہم ذرا عذاب ہٹا دیتے ہیں تم لوگ پھر وہی کچھ کر دگے جو پہلے کر رہے تھے۔“ حضرت ابن مسعودؓ نے مزید کہا کیا یہ ہو سکتا ہے کہ قیامت کے دن ان پر سے عذاب اٹھایا جائے۔ غرض جب ان کو پھر خوشحالی ملی تو وہ اسی پرانی روش کی طرف لوٹ آئے۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ (۴۴: ۱۶) ”جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں گے وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔“ اس سے مراد یومِ بدر ہے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ پانچ چیزیں گزریں: دھواں، روم، شق، قمر، بدشہ الکرئی اور لزام۔ یہ حدیث صحیحین میں مروی ہے۔ امام احمد نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ترمذی اور نسائی نے بھی کتاب التفسیر میں دی ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس سے متعدد طرق سے نقل کی ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن مسعودؓ سے ایک جماعت نے اتفاق کیا ہے کہ دخان کا واقعہ چلا گیا ہے۔ مثلاً مجاہد، ابو العالیہ، ابراہیم بنی، ضحاک اور عبیدہ عوفی اور یحییٰ تفسیر ابن جریر نے اختیار کی ہے۔

لیکن دوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ دخان کا واقعہ گزرا نہیں ہے بلکہ یہ قیامت کی علامات میں سے ہے جس طرح ابو سریج حذیفہ ابن اسید الغفاریؓ کی حدیث میں آتا ہے۔ انہوں نے کہا ہم پر رسول اللہ آئے، عرفہ سے ہو کر آئے اور ہم قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے تو رسول اللہؐ نے فرمایا ”قیامت اس وقت تک برپا نہ ہوگی جب تک دس نشانیوں نہ ظاہر ہو جائیں: (۱) سورج کا مغرب سے طلوع، (۲) دخان، (۳) دلبہ، (۴) یاجوج و ماجوج کا خروج، (۵) عیسیٰ ابن مریم کا خروج، (۶) دجال، (۷) تین چاند گرہن، (۸) مشرق میں زمین کا دھنسا، (۹) مغرب میں زمین کا دھنسا، (۱۰)

جزیرۃ العرب میں زمین کا دھنسا۔ ایک آگ مدین کی گھرائیوں سے نکلے گی۔ یہ لوگوں کو چلائے گی یا لوگوں کو اٹھائے گی جہاں یہ رات کو ہوں گے وہیں یہ بھی ہوگی جہاں یہ دن کو آرام کرس گے یہ بھی آرام کرے گی۔ (مسلم)

علامہ ابن جریر نے روایت کی ہے۔ محمد ابن عوف سے انہوں نے محمد ابن اسماعیل ابن عیاش سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے ضیفم ابن زرعہ سے انہوں نے سرج ابن عبیدہ سے اور انہوں نے حضرت مالک اشعریؒ سے کہ وہ فرماتے ہیں 'فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شک تمہارے رب نے تمہیں تین باتوں سے ڈرایا ہے۔ دھواں جو مسلمان کو زکام کی طرح متاثر کرے گا اور کافر پر اثر یہ ہو گا کہ وہ اس سے پھول جائے گا اور وہ اس کی ہر سننے کی جگہ سے نکلے گا۔ دوسری داہنہ الارض اور تیسرا دجال۔ اس حدیث کو جبرانی نے ہاشم ابن یزید سے نقل کیا ہے۔ اور اس نے محمد ابن اسماعیل ابن عیاش سے اسی متن کے ساتھ (ابن کثیر نے کہا یہ سند جید ہے)

ابن جریر نے روایت کی ہے 'یعقوب سے 'انہوں نے ابن علیہ سے انہوں نے ابن جریج سے انہوں نے عبد اللہ ابن ابولیکہ سے 'انہوں نے نے کہا کہ میں ایک دن سورے حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا 'تو انہوں نے فرمایا کہ میں آج رات صبح تک بالکل نہیں سویا۔ میں نے پوچھا یہ کیوں! آج ایک دہرہ ستارہ طلوع ہوا تو مجھے یہ خوف لاحق ہو گیا کہ شاید دھواں کا وقت آگیا 'اس وقت سے میں صبح تک نہیں سویا۔ ابن ابوحاتم نے اپنے باپ سے 'انہوں نے ابن عمر سے انہوں نے سفیان سے انہوں نے عبد اللہ ابن ابویزید سے 'عبد اللہ ابن ابولیکہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے 'اسی طرح روایت کی ہے۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ یہ سند حضرت ابن عباسؓ تک صحیح ہے 'جو اس امت سے بڑے عالم ہیں اور ترجمان القرآن ہیں۔ اور یہی قول اپنایا ہے 'صحابہ و تابعین میں سے ان لوگوں نے جنہوں نے ان سے اتفاق کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں کئی مرفوع اور حسن احادیث بھی انہوں نے پیش کی ہیں جن سے پوری تسلی ہو جاتی ہے کہ یہ دھواں جس کا یہاں ذکر ہے یہ ان نشانیوں میں سے ہے جن کا انتظار ہے اور قرآن کریم کا ظاہری مضمون بھی یہی ہے۔ اللہ نے فرمایا:

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (۴۴: ۱۰) "انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا"۔ یعنی دھواں بالکل واضح ہو گا اور اسے ہر شخص دیکھ سکے گا اور حضرت ابن مسعود نے جو روایت کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسانی تخیل تھا اور لوگ بھوک اور مشقت کی وجہ سے دھواں دیکھ رہے تھے۔ پھر يُغْشَى النَّاسَ (۴۴: ۱۱) "وہ لوگوں پر چھا جائے گا"۔ یعنی ان کو ڈھانپ کر اندھا کر دے گا۔ اگر یہ ایک خیالی معاملہ تھا اور صرف لٹل مکہ نے اسے محسوس کیا تھا تو پھر یغشی الناس کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔ پھر آگے ہے۔

هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ (۴۴: ۱۱) "یہ ہے دردناک عذاب"۔ یعنی ان سے یہ کہا جائے گا 'بطور سرزنش و ملامت کے جس طرح دوسری جگہ ہے۔

يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَى نَارِ جَهَنَّمَ دَعَاً (۵۲: ۱۳) هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ (۵۲: ۱۴) "جس دن انہیں دھکے مار مار کر نار جہنم کی طرف چلایا جائے گا اس وقت ان سے کہا جائے گا 'یہ وہی

آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔“

ہو سکتا ہے کہ وہ خود ایک دوسرے سے یہ بات کہیں گے کہ یہ عذاب الیم ہے اور اس کے بعد آیت۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اَنَا مُؤْمِنُونَ (۴۴: ۱۲) ”پروردگار! ہم پر سے یہ عذاب ہٹال دے! ہم ایمان لاتے ہیں۔“ یعنی کافر یہ کہیں گے جب انہوں نے دیکھ لیا کہ عذاب الہی آگیا اور یہ تو سزا ہے۔ تو وہ سوال کس گے کہ لے رب اس عذاب کو ہٹال دے! جس طرح دوسری جگہ اللہ نے فرمایا:

وَلَوْ تَرَى اِذْ وَقَفُوا عَلٰی النَّارِ فَقَالُوا اَيَلَيْتَنَا نُرْدُ وَلَا نُنْكَدِبُ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنُ

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۷: ۶) ”کاش تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے! اس وقت وہ کہیں گے کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔“ اور اسی طرح اس آیت میں بھی یہی مضمون ہے۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ نَّحْبِ دَعَوَتِكَ وَنَتَّبِعِ الرَّسُوْلَ اَوْ لَمْ تَكُوْنُوْا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُم مِّنْ زَوَالٍ

”لے نبی! اس دن سے تم انہیں درادو جبکہ عذاب انہیں آئے گا۔ اس وقت یہ ظالم کہیں گے کہ لے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی سی مدت اور دے دے! ہم تیری دعوت کو لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے۔“ کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جو ابھی سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آنا ہی نہیں ہے۔“ زیر بحث آیت نے اگلی آیت میں اللہ فرماتا ہے۔

اِنِّیْ لَہُمْ الذِّکْرٰی وَقَدْ جَاۤءَتْہُمْ رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ (۴۴: ۱۳) ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْہُ وَقَالُوْا

مَعْلَمٌ مُّجْنُوْنٌ (۴۴: ۱۴) ”ان کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے ان کا حال تو یہ تھا کہ ان کے پاس رسول الہی آیا تھا۔ یہ اس کی طرف ملفت نہ ہوئے اور کہا ”یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے۔“ مطلب یہ ہے کہ وہ کس طرح یاد دہانی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں! ہم نے ان کی طرف رسول بھیجا جس نے واضح طور پر ان کے سامنے دعوت پیش کی۔ ان کو ڈرایا! اس کے باوجود انہوں نے منہ پھیر لیا۔ اور انہوں نے اس کی کوئی بات نہ مانی بلکہ تکذیب کی اور کہا کہ یہ تو سکھایا ہوا مجنون ہے۔“

اس کی مثال بھی قرآن کریم میں ہے۔

یَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاِنِّیْ لَہُ الذِّکْرٰی (۲۳: ۸۹) ”اس دن انسان کو سمجھ آئے گی اور اس وقت اس کے سمجھنے کا کیا حاصل۔“ اور اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فُزِعُوا فَلَا فَوْتَ وَأُخِذُوا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ (۵۱: ۳۴) وَقَالُوا آمَنَّا بِهِ وَأَنَّىٰ لَهُمُ التَّنَاقُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ (۵۳: ۳۴) ”کاش تم دیکھ سکو‘ انہیں اس وقت جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جائیں گے بلکہ قریب ہی سے پکڑے جائیں گے۔ اس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لے آئے حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کہاں ہاتھ آسکتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت نمبر ۱۲ کے بعد یہ آیت آتی ہے :

أَنَا كَاشِفُ الْعَذَابِ قَلِيلًا أُنْكُمْ عَاثِدُونَ (۱۵: ۴۴) ”ہم عذاب ذرا ہٹا دینے والے ہیں مگر تم پھر وہی کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔“ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اگر ہم عذاب کو ہٹا دیں اور تمہیں پھر دنیا میں لوٹا دیں تو تم نے پھر وہی کچھ کرنا ہے جو پہلے کیا‘ یعنی کفر و تکذیب اور اس کی مثال دو سری آیات میں بھی ہے۔

وَلَوْ رَحِمْنَاهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِنْ ضُرٍّ لَلَجُّوا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ

(۷۵: ۲۳)

”اگر ہم ان پر رحم کرس اور وہ تکلیف جس میں آج یہ مبتلا ہیں‘ دور کر دیں تو یہ اپنی سرکشی میں بالکل ہی بہک جائیں گے۔“ اور جس طرح دو سری آیت میں ہے :

وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا أَلَمَانَهُوَ اعْتَهُ وَانَّهُمْ لَكَذِبُونَ (۲۸: ۶) ”اگر انہیں سابق زندگی کی طرف بھیجا جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں جس سے انہیں منع کیا گیا اور وہ تو ہیں ہی جھوٹے۔“ اور دو سرا مضموم یہ ہو سکتا ہے‘ ہم تم سے عذاب کو عملاً روکے رکھتے ہیں یا روکے رکھنے والے ہیں حالانکہ تم سرکشی اور گمراہی میں پڑھتے چلے جاتے ہو۔ کیونکہ کشف عذاب کے لیے لازمی نہیں ہے کہ عملاً ان پر عذاب آ بھی گیا ہو۔ دو سری جگہ اللہ نے فرمایا :

إِنَّا قَوْمٌ يُونُسَ لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ

مَتَّعْنَاهُمْ إِلَىٰ حِينٍ (۹۸: ۱۰) ”مساوائے قوم یونس کے کہ وہ جب ایمان لائے تو ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں رسولی کا عذاب ہٹال دیا تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقعہ دے دیا تھا۔“ حالانکہ ابھی عذاب نے ان کو چھوا نہیں تھا بلکہ عذاب کے اسباب فراہم ہو گئے تھے۔ قادیانے تو یہ معنی لیے ہیں کہ تم عذاب الہی کی طرف لوٹنے والے ہو‘ آگے آیت ہے۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ (۱۶: ۴۴) ”جس روز ہم پکڑ دھکڑ کریں گے وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔“ حضرت ابن مسعودؓ نے اس کی تفسیر بدرکبریٰ سے کی ہے اور یہ قول کچھ دوسرے لوگوں نے بھی اختیار کیا ہے جنہوں نے ابن مسعود کے ساتھ اتفاق رائے کیا ہے۔ اور یہی تفسیر حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے۔ ان سے یہ روایت عوفی نے نقل کی ہے اور یہی رائے حضرت ابی ابن کعب کی ہے اور اس کا احتمال

بھی ہے لیکن ظاہرات یہی ہے کہ اس سے بھی مراد یوم القیامہ ہے۔ اگرچہ یوم بدر کفار کے لیے بھی بڑی ہکڑ کا دن تھا۔ لیکن جریر نے روایت کی ہے 'یعقوب سے انہوں نے ابن علیہ سے انہوں نے خالد حذاء سے انہوں نے عکرمہ سے کہ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "لن مسود فرماتے ہیں بطلشۃ الکبریٰ سے بدر کا دن مراد ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ یہ قیامت کا دن ہے۔" اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ حسن بصری اور عکرمہ بمطابق صحیح روایت اسی کے قائل ہیں۔"۔ یہاں لن کثیر کا کلام ختم ہوا۔

ہم یہاں حضرت ابن عباسؓ کا قول اختیار کرتے ہیں کہ دخان قیامت کے دن ہو گا۔ اور اس کی تفسیر علامہ لن کثیر نے بہت اچھی کی ہے۔ یہ کفار کے لیے تمہید اور ڈر اوا ہے اور اس کے نظائر قرآن کریم میں بہت ہیں۔ جن کے مطابق یہی مضمون دوسرے مقامات پر بھی دہرایا گیا ہے۔ اس طرح مضمون یہ ہو گا یہ لوگ شک کرتے ہیں اور کھیل کود میں مصروف ہیں 'ان کو چھوڑ دیں اور اس دن کا خوفناک دن کا انتظار کریں' جب آسمان سے دھواں آئے گا 'تمام لوگوں کو ڈھانپ لے گا اور یہ کہا جائے گا کہ یہ ہے عذاب الیم۔ اور پھر ان کی فریاد کی تصویر کشی کی گئی کہ لبے ہمارے رب 'اس عذاب کو ہم سے دور کر دے ہم ایمان لاتے ہیں اور ان کی اس درخواست کو رد کر دیا جاتا ہے کہ اس کی منظوری محال ہے کیونکہ وقت چلا گیا ہے۔ اب یہ نصیحت بھی پا سکتے ہیں 'لن کے پاس تو رسول مبین آگیا تھا اور یہ اس وقت یہ کہتے ہوئے منہ موڑ گئے تھے کہ یہ سکھایا ہوا جادوگر ہے۔ اسے یہ سب کچھ ایک عجیب غلام سکھا رہا ہے۔ اور یہ باطل ہے۔

اس منظر میں جہاں یہ لوگ عذاب کے نکلنے کی درخواست کرتے ہیں 'لن سے بطور جملہ معترضہ یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھو ابھی تو تم دنیا میں ہو۔ فرصت کے قلیل لمحات موجود ہیں اور ابھی تو عذاب سے بچے ہوئے ہو 'ایمان لے آؤ' تمہیں ڈرایا جا رہا ہے کہ تم ہی ہو گے جو آخرت میں ایمان لانے پر آمادہ ہو گے مگر وہاں ایمان قبول نہ ہو گا۔ ابھی تو تم امن و عافیت میں ہو اور یہ امن و عافیت دائمی نہیں ہے۔ تم ہمارے سامنے آنے والے (عائدون) ہو۔

یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ (۱۶:۴۴) "جس دن یہ دھواں ہو گا جس کی تصویر کشی قرآن کر رہا ہے اور ہکڑ دھکڑ ہوگی تو اَنَا مُتَّقِمُونَ (۱۶:۴۴) "تو ہم انتقام لیں گے۔" تمہاری اس لاپرواہی کا 'تمہاری اس بہتان طرازی کا' جو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے ہو اور کہتے ہو 'مَعَكُمْ مَجْنُونٌ (۱۴:۴۴) "سکھایا پڑھایا مجنون ہے۔" حالانکہ وہ صادق و امین ہے۔

اس طرح تمام آیات کی تفسیر درست ہو جاتی ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق۔ واللہ اعلم!

--- ○ ○ ○ ---

اس کے بعد قرآن مجید ان کو تاریخ کی ایک داوی میں لے جاتا ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا ایک مختصر حصہ ہے اور اس کا خاتمہ اس زمین پر ایک عظیم ہکڑ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ (۱۶:۴۴) کا نمونہ ہے۔ اس سے قبل جس کا نمونہ لن کو دخان کی نقشہ کشی میں بنا دیا گیا تھا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ

كَرِيْمٌۭ اَنْ اَذُوًّا اِلَىٰ عِبَادِ اللّٰهِ اِنِّیْ لَكُوْرَسُوْلٌۭ اٰمِيْنُۭ ۝ وَاَنْ
 لَا تَعْلُوْا عَلٰی اللّٰهِ اِنِّیْ اَتٰیْتُكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَاِنِّیْ عٰذَتُ
 بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاَعْتَزْلُوْنِ ۝ فَدَعَا رَبُّهُ
 اَنْ هٰؤُلَاءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ۝ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنْكُمْ مُّتَّبِعُوْنَ ۝ وَاشْرٰكُ
 الْبَحْرِ رَهْوًا اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ حَبْتٍ وَّ عِیُوْنٍ ۝ وَزُرُوْعٍ
 وَ مَقَایِرَ كَرِيْمٍ ۝ وَ نَعَمَیْۤهٖ كَانُوْا فِیْهَا فٰكِهِیْنَ ۝ كَذٰلِكَ ۝ وَاذْرٰثُهَا قَوْمًا اٰخِرِيْنَ ۝
 ۱۲۰ ۝ فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝ وَ لَقَدْ نَجَّیْنَا بَنٰی
 ۱۳ اِسْرَآءِیْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْبَیْهِيْنَ ۝ مِّنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ كَانَ عَلٰیآ مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝
 وَ لَقَدْ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلٰی الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ اَتٰیْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰیٰتِ مَا فِیْهِ بَلَآءٌ مُّبِيْنٌ ۝

”ہم ان سے پہلے فرعون کی قوم کو اسی آزمائش میں ڈال چکے ہیں ان کے پاس ایک نہایت شریف رسول آیا اور
 اس نے کہا کہ ”اللہ کے بندو! سب کچھ میرے حوالے کر دو“ یا ”اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو“ میں تمہارے لیے
 ایک امانت دار رسول ہوں۔ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کر دو۔ میں تمہارے سامنے (اپنی ماموریت کی) صریح سند پیش
 کرتا ہوں اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔ اگر تم میری بات
 نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو۔“ آخر کار اس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔ (جواب دیا گیا)
 ”اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑا۔ تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔ سمندر کو اس کے جاں پر کھلا چھوڑ
 دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے۔“ لکتنے ہی باغ اور بیٹھے اور شائد ار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی
 عیش کے سرور سامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے ان کے پیچھے دھڑے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے
 دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین اور زراعت بھی ان کو نہ دی گئی۔ اس طرح
 بنی اسرائیل کو ہم نے سخت زلزلت کے عذاب فرعون سے نجات دی جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اونچے
 درجے کا آدمی تھا اور ان کی حالت جانتے ہوئے ان کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی اور انہیں ایسی نشانیاں دکھائیں
 جن میں صریح آزمائش تھی۔“

اس وادی کے دردناکے ہی پر یہ خوفناک اعلان لکھا ہوا ہے کہ یاد رکھو کسی قوم کی طرف رسول کا بھیجا جانا اس کی
 آزمائش ہوتی ہے۔ مکذہبن کو یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ وقت بہت تھوڑا ہے اس میں تم مکذہب بھی کر سکتے ہو، تکبر اور

غور بھی کر سکتے ہو۔ رسول کو لیزا بھی دے سکتے ہو، مومنین پر ظلم و ستم بھی ڈھا سکتے ہو لیکن آخر میں غور کا سرنچا ہوتا ہے اور تم جو رسول اللہ کو طیش دلاتے ہو، ان کا پیانا مہر لہز کرتے ہو، لیکن آپ بدستور مہر کا پیکر بنے ہوئے ہیں اور تمہاری ہدایت ہی کے امیدوار ہیں اس کا انجام برا بھی ہو سکتا ہے اور تم فرعون کی طرح سخت پکڑ میں بھی آ سکتے ہو۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ (۱۷:۴۴) ”ہم اس سے قبل فرعون کی قوم کو اس آزمائش میں ڈال چکے ہیں۔“ ان کو نعمتیں دے کر اور بادشاہت دے کر اور زمین میں نہایت ہی تمکنت دے کر آزما چکے ہیں۔ اور پھر خورشالی، دولت کے اسباب اور سر بلندی میں ان کو طویل مصلحت بھی دی گئی :

وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ (۱۷:۴۴) ”اور ان کے پاس ایک نہایت ہی شریف رسول آیا۔“ اور یہ بھی آزمائش کا ایک پہلو تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم نے ان سے کیا بات حلیم کرنے کے لیے کہا تھا۔ آپ نے ان سے کوئی بات یا کوئی چیز اپنے لیے طلب نہ کی تھی۔ آپ ان کو اللہ کی طرف بلاتے تھے اور آپ کا مطالبہ یہ تھا کہ ہر بات اللہ کے لیے ادا کرو اور کوئی چیز بخل کر کے اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے نہ رکھو۔

أَنْ أَدُوعًا إِلَى عِبَادَةِ اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ (۱۸:۴۴) وَأَنْ لَا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ إِنِّي آتِيكُمْ بِسُلْطَنِ مُبِينٍ (۱۹:۴۴) وَإِنِّي عَذْتُ رَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ

(۲۰:۴۴) وَأَنْ لَّمْ تُؤْمِنُوا إِلَيَّ فَاعْتَرِلُونِ (۲۱:۴۴) کہ ”اللہ کے بندو! سب کچھ میرے حوالے کر دو،“ یا ”اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو“ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے (اپنی ماموریت کی) صریح سند پیش کرتا ہوں اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو۔“ یہ ہے وہ مختصر دعوت جسے رسول کریم یعنی حضرت موسیٰ نے لے کر آئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تم کلی طور پر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دو، پوری ادائیگی کرو، اور سب کچھ اللہ کے لیے دے دو، جس کے تم بندے ہو، بندوں کو یہ ذریعہ نہیں دیتا کہ وہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی کریں۔ یہ اللہ کی دعوت ہے اور ایک شریف رسول لے کر تمہارے پاس آیا ہے اور اس کے پاس رسول ہونے کی سند بھی ہے۔ ایک مضبوط اور قوی دلیل ہے۔ اگر کھلے دل سے غور کیا جائے تو ایسے براہین پر یقین آنا چاہئے۔ آپ ان کے تشدد کے مقابلے میں اللہ کی پناہ لیتے ہیں کہ وہ آپ کو پکڑ کر رجم کر دیں۔ اگر وہ ایمان کا انکار کرتے ہیں اور رسول سے الگ ہوتے ہیں تو آپ ان کو یہ چیلنج کرتے ہیں کہ میں بھی تم سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔ اور یہ ایک نہایت ہی منعفانہ بات ہے کہ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو میری راہ نہ روکو۔

اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے۔

أَنْ أَدُوعًا إِلَى عِبَادَةِ اللَّهِ (۱۸:۴۴) ”کہ اللہ کے بندوں (بنی اسرائیل) کو میرے حوالے کر دو۔“

اور ان کو تشدد اور ظلم کا نشانہ نہ بناؤ۔ دوسری جگہ تصریح آئی ہے۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيَّ اسْرَآئِیْلَ ”یہ کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو“۔ لیکن سرکشوں نے کبھی بھی کسی کے معقول اور منصفانہ مطالبات نہیں مانے۔ سرکش سچائی کو آزاد دیکھنا پسند نہیں کرتے کہ وہ سہولت کے ساتھ عوام تک پہنچ جائے، چنانچہ ہر سرکش سچائی کو اپنی گرفت میں لینا پسند کرتا ہے اور کبھی اس کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا۔ کیونکہ سرکشوں اور سچائی کے درمیان اگر صلح ہو جائے تو پھر سچائی تو چھانے لگتی ہے۔ اور عوام کے دل و دماغ کو فتح کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باطل اہل حق پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ اہل حق کو رجم کرتا ہے۔ وہ حق کو الگ بھی رہنے نہیں دیتا کہ وہ صحیح سلامت اور آرام سے رہے۔

یہاں سیاق کلام میں قصے کی کئی کڑیوں کو مختصر کر کے پیش کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو جلد انجام تک پہنچایا جائے، جبکہ آزمائش انتہا کو پہنچ جائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام محسوس کر دیں کہ یہ لوگ دعوت کو ہرگز قبول کرنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ اس کے لیے تیار ہیں کہ ہمیں گوارا کر کے اپنا کام کرنے دیں۔ اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ ان کی ہجرانہ اہمیت بہت ہی گہری اور ٹھوس ہے اور ان کی اصلاح کی کوئی امید نہیں ہے۔ اور وہ اس ذہنیت کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ یہاں آکر پھر آپ اپنے رب کے ہاں آخری پکار کرتے ہیں اور مکمل طور پر اس کی پناہ میں آجاتے ہیں۔

فَدَعَا رَبَّهُ اَنْ هُوَّلَاۤءَ قَوْمٌ مَّجْرُمُوْنَ (۲۲: ۴۴) ”آخر کار انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں“۔ آخر ایک رسول اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کی پوری کمائی لے کر اپنے رب کے دربار میں پیش کر دے اور اسے اللہ کے سامنے رکھ دے اور اگلا اقدام اللہ پر چھوڑ دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے بارے میں جو تبصرہ اور رپورٹ کی تھی، اللہ نے اسے قبول کر لیا کہ یہ درست ہے کہ یہ لوگ فی الواقع مجرم ہیں۔

فَاَسْرِ بِعِبَادِيَ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبِعُوْنَ (۲۳: ۴۴) وَ اَتْرُكِ الْبَحْرَ رَهَوًّا اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ (۲۴: ۴۴) ”اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑو تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔ سمندر کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے“۔ اسری اس سفر کو کہتے ہیں جو رات کے وقت ہو، اس کے بعد ”لیلا“ کا لفظ منظر کو دوبارہ ذہن میں لاتا ہے کہ اللہ کے کچھ بندے بنی اسرائیل رات کے وقت سفر میں ہیں۔ یہ لفظ اس وقت رازداری کی فضا کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ کیونکہ ان کا یہ شبینہ سفر دراصل تھاہی فرعون سے خفیہ اور حکومت کی لاعلمی سے تھا۔ ”الربو“ کے معنی ہوتے ہیں سکون کے۔ یہاں اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اور آپ کی قوم گزر جائیں اور اپنے پیچھے سمندر کو سکون کی حالت میں چھوڑ دیں۔ ایسی ہی حالت پر جس میں آپ اس سے گزرے تاکہ فرعون اور اس کی فوج دھوکہ کھا کر تمہارا پیچھا کرے اور اس طرح اللہ کا حکم پورا ہو جائے۔

اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ (۲۴: ۴۴) ”یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے“۔ یوں اللہ کی تقدیر کا فیصلہ اسباب ظاہریہ کے مطابق ہوا اور یہ اسباب بھی درحقیقت اللہ کے فیصلے ہی کا حصہ ہوتے ہیں۔

یہاں سیاق کلام میں فرعون کی غرقابی کے واقعات کو مجمل چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ بطور فیصلہ یہ کہہ دیا گیا کہ یہ غرق ہونے والا لشکر ہے۔ اب اس منظر کو چھوڑ کر اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے اور یہ تبصرہ بھی ایک زبردست منظر ہے جو سرکش اور تکبر فرعون اور اس کے سرداروں کی زبوں حالی کی داستان ہے۔ یہی لوگ تھے جو اسے ظلم اور سرکشی پر آمادہ رکھتے تھے۔ ان کا ہلاک و برباد کرنا اللہ کے لئے کس قدر سہل رہا۔ اپنی اس حیثیت کے ساتھ وہ غرور کرتا تھا۔ اور اس کے یہ پیروکار اس پر غار ہوتے تھے۔ حالانکہ یہ سب لوگ اس قدر چھوٹے اور اس قدر معمولی تھے کہ اس کائنات نے ان کی غرقابی کا کوئی احساس ہی نہ کیا۔ فرعون سے سب کچھ چھین لیا گیا اور کوئی رونے والا نہ تھا۔ کسی نے بھی اس کی اس بربادی پر مرثیہ نہ لکھا نہ زمین نے نہ آسمان نے۔

کَمْ تَرَکُوا مِنْ جَنَّتٍ وَ عِیُونٍ (۲۵:۴۴) وَ زُرُوعٍ وَ مَقَامٍ کَرِیْمٍ
(۲۶:۴۴) وَ نَعْمَةٍ کَانُوا فِیْهَا فِکْهِیْنَ (۲۷:۴۴) کَذَلِکَ وَ اَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ

(۲۸:۴۴) فَمَا بَکَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَاءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا کَانُوا مُنْظَرِیْنَ (۲۹:۴۴)
”کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سرو سامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔“ اس منظر میں وہ انعامات بھی دکھائے گئے ہیں جن میں وہ داد عیش دیتے تھے۔ باغات، چشمے، قسم قسم کی زراعت، بڑے بڑے محل جہاں ان کو بڑا اعزاز ملا ہوا تھا۔ ان نعمتوں میں کھاتے پیتے اور داد عیش دیتے تھے اور سرور اور مست تھے۔

اس کے بعد ان سے یہ سب کچھ چھین لیا جاتا ہے اور دوسری اقوام کو ان کا وارث بنا دیا جاتا ہے اور دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے۔

کَذَلِکَ وَ اَوْرَثْنَاهَا بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ ”یوشی“ اور وارث بنا دیا ہم نے ان چیزوں کا بنی اسرائیل کو۔“ بنی اسرائیل تو فرعون کی بادشاہت کے وارث نہ بنائے گئے تھے لیکن فلسطین میں ان کو زبردست عروج نصیب ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اسی قسم کی نعمتوں کا ان کو وارث بنایا گیا جیسی فرعونوں سے چھینی گئی تھیں۔

پھر کیا ہوا فرعون اور اس کے سردار نیست و نابود ہو گئے۔ ایک وقت تھا کہ اس زمین پر وہ لوگوں کی آنکھ کا تار تھا اور لوگوں کے دلوں میں ان کا بے حد رعب تھا یا یہ وقت ہے کہ ان کے نیست و نابود ہونے پر کوئی آنکھ نہیں روئی۔ نہ آسمان کو اس کا احساس ہوا اور نہ زمین کو نہ ان کو مہلت ملی اور ان کے معاملے کو اٹھا کر رکھا گیا۔

فَمَا بَکَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَاءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا کَانُوا مُنْظَرِیْنَ (۲۹:۴۴) ”نہ آسمان ان پر رویا اور نہ زمین اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔“ یہ ایک ایسا انداز تعبیر ہے جو ان کی کسمپرسی اور دنیا کی بے وفائی اور آنکھیں پھیر لینے کو غا ہر کرتا ہے۔ یہ سرکش اور مغرور لوگ اس دنیا سے چلے گئے اور ان کے لیے رونے والی آنکھ نہ

زمین و آسمان میں کوئی نہ تھا، جو ان پر تاسف کا اظہار کرتا، وہ اس طرح چلے گئے جس طرح کوئی چیونٹوں کو روند ڈالے۔ جبکہ وہ اس قدر جبار و قہار تھے کہ انسانوں کو چیونٹوں کی طرح روندتے چلے جاتے تھے۔ یہ کیوں ہوا اس لیے کہ یہ اس کائنات سے منقطع تھے۔ یہ پوری کائنات مسلم تھی اور یہ کافر تھے، یہ غیث، دھنکارے ہوئے اور شرع لوگ تھے اور یہ پوری کائنات ان سے نفرت کرتی تھی۔ اس دنیا کے ڈکٹریٹر اگر ان باتوں کو سمجھتے اور ان ہدایات کو اپناتے جو ان آیات میں ہیں تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ وہ اس کائنات میں کتنے ہلکے ہیں اور اللہ کے ہاں وہ کس قدر ہلکے ہیں۔ اور ان کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ اس زمین پر نہایت ہی تھا، دھنکارے ہوئے اور پوری کائنات اور خالق کائنات سے کٹے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں، یہ کیوں اس لیے کہ وہ ایمانی رابطوں سے کٹے ہوئے اور مجرم ہیں۔

اور ان کے ان برے دنوں کے مقابلے میں لیل ایمان کی عزت اور کریم:

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِي إِسْرَآءَ يَلَّ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ (۴۴: ۳۰) مِنْ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ

كَانَ عَلِيًّا مِّنَ الْمُسْرِفِينَ (۴۴: ۳۱) وَلَقَدْ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمِ عَلِيِّ الْعَلَمِينَ

(۴۴: ۳۲) وَآتَيْنَاهُمْ مِّنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَوٌ مُّبِينٌ (۴۴: ۳۳) ”اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت ذلت کے عذاب، فرعون سے نجات دی جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا، اور ان کی حالت جانے ہوئے ان کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی، اور انہیں ایسی نشانیاں دکھائیں جن میں صریح آزمائش تھی۔“

یہاں توہین آمیز عذاب سے بنی اسرائیل کی نجات کا ذکر ہے۔ جبکہ یہ عذاب دینے والے جباروں کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ جو کبر و غرور کرنے والے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والے تھے۔

مِنْ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ كَانَ عَلِيًّا مِّنَ الْمُسْرِفِينَ (۴۴: ۳۱) ”فرعون سے جو حد سے گزرنے والوں میں فی الواقع اونچے درجے کا آدمی تھا۔“

اس کے بعد اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دوسری قوموں پر ترجیح دی اور ان کی حقیقت کو جاننے ہوئے دی۔ ان کی اچھائی بھی ہماری نظروں میں تھی اور ان کا شر بھی ہماری نظروں میں تھا۔ اس لیے ان کو اپنے دور میں تمام اقوام پر سر بلند کر دیا، کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ اپنے زمانے کی اقوام میں یہ اعلیٰ و افضل اور برتر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنی نصرت، اور امداد سے اس قوم کو بھی نوازتا ہے جو اپنے لیل زمانہ سے افضل ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ لوگ ایمان و یقین میں اعلیٰ معیار تک نہ پہنچے ہوئے ہیں۔ بشرطیکہ ان کی قیادت اچھی ہو اور ان کو ہدایت، علم اور بصیرت کے ساتھ اور ثابت قدمی کے ساتھ بلندی کی طرف لے جا رہی ہو۔

وَآتَيْنَاهُمْ مِّنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَوٌ مُّبِينٌ (۴۴: ۳۳) ”اور انہیں ایسی نشانیاں دیں جن میں صریح آزمائش تھی۔“ اس طرح ان نشانیوں کے ذریعہ ان کو آزمایا گیا۔ جب ان کا امتحان اور ان کی آزمائش پوری ہو گئی اور ان کی

خلافت اور اقوام عالم پر ترجیح کا زمانہ ختم ہو گیا تو ان کے انحراف اور گمراہی کی وجہ سے ان کو پکڑا گیا اور ان پر دوسری اقوام کو مسلط کر دیا گیا، پھر ان کو بار بار ملک بدری کا سامنا کرنا پڑا اور ان پر دلت اور خواری لکھ دی گئی اور ان کو کہہ دیا گیا کہ جب بھی تم حد سے بڑھے اور سرکشی اختیار کی تو تمہیں ذلیل و خوار کیا جائے گا۔ یہ حالت تمہاری قیامت تک ہوگی۔

--- ۰۰۰ ---

فرعون اور اس کے سرداروں کی ہلاکت خیر سفر کے مشاہدات کے بعد جس میں حضرت موسیٰ اور آپ کی قوم کو امت دی گئی اور اس کے بعد ان کو آزمایا گیا۔ اب دوبارہ مشرکین کے عقیدہ بعث بعد الموت کی طرف بات کا رخ ہوتا ہے۔ یہ لوگ مرنے کے بعد اٹھائے جانے میں شک کرتے تھے بلکہ انکار کرتے تھے۔ اس موضوع کو دوبارہ اس زلویہ سے لیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد اٹھایا جائے اس کائنات کے اصل نقشے کا حصہ ہے کیونکہ یہ حق ہے اور اس کائنات کا وجود ہی حق پر ہے اور حق کا تقاضا ہے کہ موت کے بعد لوگوں کو اٹھایا جائے۔

إِنَّ هَؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ۖ إِنَّمَا مَوْتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِينَ ۚ
فَاتُوا بِآيَاتِنَا إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۚ أَمْ خَيْرٌ أَمْرٌ قَوْمٌ تُبْعِ ۖ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
أَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ۚ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا
لِعَيْنٍ ۚ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۚ إِنَّ يَوْمَ
الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ۚ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلَىٰ عَنْ مَوْلَىٰ شَيْئًا وَلَا هُمْ
يُنصَرُونَ ۚ إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۚ

ع ۱۳

۱۵ ”یہ لوگ کہتے ہیں ”ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں“ اس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ اگر تم سچے ہو تو اٹھالو ہمارے باپ دادا کو۔“ یہ بہتر ہیں یا حج کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے ان کو اسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے۔ یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنادی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے، مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ان سب لوگوں کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت پہلے کا دن ہے، وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی، سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے، وہ زبردست اور رحیم ہے۔“

مشرکین عرب یہ کہتے تھے ”بس ہماری یہی موت ہے“ جس سے ہم دوچار ہوں گے۔ اس کے بعد نہ زندگی ہے اور نہ حشر و نشر ہے اور اس کو وہ ”پہلی“ اس معنی میں کہتے تھے کہ حشر و نشر کا جو ذرہ لواء میں سنایا جا رہا ہے اس سے یہ پہلی ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ یہی موت ہے اور اس پر سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ یونہی ان کے آباء و اجداد بس ایک ہی بار مر گئے۔ اور ان میں سے کوئی بھی اس جہاں میں دلپس نہیں آیا۔ نہ بھی کوئی اٹھایا گیا اور ان کا مطالبہ ہی یہ ہوتا تھا کہ اگر

نشر حق ہے تو لاہ تارے آباء کو۔

لیکن اس سسے پر وہ حشر و نشر کی حکمت پر غور نہ کرتے تھے اور یہ بھی محسوس نہ کرتے تھے کہ حشر اور نشر انسانی نشوونما کا ایک مرحلہ ہے۔ اس کی ایک خاص حکمت ہے اور ایک متعین مقصد ہے۔ وہ یہ کہ زندگی کے پہلے مرحلے میں کس نے کیا کیا۔ جو اچھے لوگ ہیں اور جنہوں نے دنیا کی زندگی کے اس مرحلے میں اچھا رویہ اختیار کیا ان کو اچھا بدلہ دیا جائے اور جن لوگوں نے یہاں برا رویہ اختیار کیا ان کو اس کا بدلہ دیا جائے اور نہایت ہی ناپاک اور غلیظ زندگی دی جائے اگر انہوں کو جزائے خیر نہ دی جائے اور بدوں کو مناسب سزا نہ دی جائے تو یہ حق بات نہ ہوگی۔ اس حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس پوری زمین پر موجودہ مرحلہ حیات ختم ہونے کے بعد حشر و نشر ہو اور حساب و کتاب ہو۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ کائنات کی اس پوری سکیم کو ختم کر کے، محض چند لوگوں کے مطالبے پر چند افراد یا ایک گروہ کے حشر و نشر کا ڈر لیا گیا جائے اور ان کے مطالبے کو پورا کیا جائے جبکہ ان کو موت کے بعد اٹھائے جانے پر یقین بھی نہیں ہے جس کی اطلاع ان کو تمام رسولوں نے بالاتفاق دی ہے۔ اور اس زندگی پر ابھی طرح غور و فکر کرنے سے بھی عقل اس کا تقاضا کرتی ہے اس طرح اللہ کے نظام تخلیق میں بھی اگر غور کیا جائے تو انسان قیامت پر یقین کر سکتا ہے۔

قبل اس کے کہ ان کو اس پوری کائنات کے اسای نقشے پر غور و فکر کی دعوت دی جائے۔ ان کے دل و دماغ کو ایک ایسے تاریخی واقعہ کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جس کے وقوع سے وہ ابھی طرح باخبر تھے، یعنی قوم تبع اور ملوک حیر کے واقعات۔ یہ تاریخ اس وقت کے لوگوں کو ابھی طرح معلوم تھی اس لیے اس کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ در ان کے دلوں کے اندر خدا کی پکڑ کا ڈر تازہ ہو جائے۔

أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ أَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ

(۳۷: ۴۴) ”یہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے ان کو اسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے۔“ اس یاد دہانی کی فضا میں اور کانپتے ہوئے دلوں اور اللہ کی پکڑ کے تصور کی اس فضا میں ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس پوری کائنات کی تخلیق کا نقشہ کیا ہے۔ اس کائنات کے اندر بالارادہ نہایت ہی گہری سچائی رکھی گئی ہے اس کا تقاضا بھی یہ ہے کہ حشر و نشر لا بدی ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعَيْنٍ (۳۸: ۴۴) مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا

بِالْحَقِّ وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۳۹: ۴۴) إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ

(۴۰: ۴۴) يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلَى عَنْ مَوْلَى شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۴۱: ۴۴) إِلَّا مَنْ

رَحِمَ اللَّهُ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۴۲: ۴۴) ”یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنادی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ان

سب کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے 'وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی' سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے 'وہ زبردست اور رحیم ہے'۔ یہ ایک نہایت ہی لطیف اشارہ ہے کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو مخلوقات پیدا کی گئی ہیں 'اس کے اور مسئلہ حشر و نشر کے درمیان ایک لطیف ربط ہے اور انسانی فطرت اس کا ادراک اس وقت کر سکتی ہے جب وہ اس کائنات کی تخلیق پر گہرا غور و فکر کرے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا جو نقشہ اور اسکیم ہے۔ وہ نہایت پیچیدہ اور گہری ٹیکنالوجی پر مبنی ہے۔ اس کے اندر تمام باریکیاں ایک مقصد اور ارادے کے ساتھ رکھی گئی ہیں۔ یہ تخلیق بڑی مربوط ہے۔ اور اس کے اندر ہر چیز ایک مقدار مطلوب کے مطابق ہے 'نہ اس میں کمی ہوتی ہے اور نہ اضافہ ہوتا ہے۔ ہر چیز اپنے ماحول کے اندر پوری طرح فٹ ہے۔ جس چیز کو جس شکل و صورت میں پیدا کیا گیا ہے 'اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طرح ضروری ہے اور یہ بات بعید از امکان ہے کہ اس قدر پیچیدہ ٹیکنالوجی محض بخت و اتفاق سے پیدا ہو گئی ہو اور اس پوری کائنات میں جو ہولناک حد تک عظیم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام باتوں پر اچھی طرح غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا بھی کوئی بڑا مقصد ہے اور وہ صرف اس صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ حشر و نشر کو تسیم کیا جائے۔ یہ کائنات حق پر قائم ہے 'اس میں کوئی چیز باطل نہیں ہے' اس کا ایک انجام ہے جو ابھی واقع نہیں ہوا۔ یہ انجام اور مقصد صرف موت سے پورا نہیں ہوتا کیونکہ موت تو اس دنیا کا انجام ہے۔ اس دنیا کے مختصر سفر کا اختتام ہے۔ اور حشر و نشر تو محض منطقی حوالے سے بھی ضروری ہے کیونکہ جب تخلیق سچائی پر ہے تو نیکی اور بدی کا فیصلہ بھی سچائی پر ہونا چاہئے۔ انسان کے اندر آغاز حیات سے صلاح و فساد کی صلاحیت رکھی گئی ہے۔ اور وہ یہاں یا صلاح اختیار کرتا ہے یا فساد لہذا اس صلاح کا انجام اور فساد کی سزا ملنی چاہئے۔ یہ کہ انسان کو نیکی اور بدی کی صلاحیت دی گئی ہے اور یہ کہ اللہ نے اس کو اس طرح عبث نہیں پیدا کیا ہے 'لہذا ایک اور بد کا متعین انجام ضروری ہے اور یہ انجام اس دنیا کی مختصر زندگی کے بعد ہونا چاہئے۔ لہذا حشر و نشر اس کائنات کی تخلیق کے نقشے کے اندر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہنے کے بعد کہ کائنات کو عبث نہیں پیدا کیا گیا 'قیامت کا ذکر آتا ہے۔

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ (۴۴ : ۴۰) يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلَى عَنْ مَوْلَى شَيْئًا

وَلَا هُمْ يَنْصُرُونَ (۴۴ : ۴۱) إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۴۴ : ۴۲)

”ان سب لوگوں کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے 'وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی' سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے 'وہ زبردست اور رحیم ہے'۔

قیامت کی یہ بات اپنی ماقبل کی باتوں اور آیات سے نہایت مربوط طور پر یہاں لائی گئی ہے۔ حکمت اور حق کا تقاضا یہ ہے کہ ایک یوم الفصل ہو جس میں لوگوں کے باہم فیصلے بھی چکائے جائیں اور ضلالت و ہدایت کے فیصلے بھی کئے جائیں 'نیکی کو عزت بخشی جائے اور برائی اور شر کو سزا دی جائے' اور لوگ تمام ارضی مسادوں سے بے نیاز ہوں 'عزیز و

اقارب کا وہاں کوئی آسرا نہ ہو۔ وہ اکیلے اکیلے وہاں جائیں جس طرح خالق نے انہیں پیدا کیا ہے۔ خالق وہاں ان کو اس کی جزاء دے جو انہوں نے کمایا۔ کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو، کوئی ان پر رحم کرنے والا نہ ہو، بس صرف اللہ 'قادر مطلق' عزیز و رحیم ہی کا بھروسہ اور فضل ہو۔ کیونکہ اسی نے ان کو اس زمین پر لا کر کام میں لگایا اور وہی ہے جو ان کو سزا دے گا۔ اور یہاں ان کے بسائے جانے اور اٹھائے جانے کے درمیان جو مختصر زندگی ہے، یہ امتلا اور آزمائش کی زندگی ہے۔

یوں اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کے اصلی نقشے میں اور زمین و آسمان کی ساخت کے انداز میں سچائی ودیعت کردہ ہے اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا ایک مقصد ہے۔

--- ۰۰۰ ---

ان باتوں کے بعد اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر 'سرکشوں کی سزا اور اطاعت کیوں کے لیے انعام' یہ ایک نہایت ہی خوفناک اور شدید منظر ہے اور اس پوری سورت کی قصا کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقْوِمِ طَعَامُ الْأَثِيمِ ۖ كَالْهَلِیْ یَغْلِیْ فِی الْبُطُونِ ۖ
 كَغَلِی الْحَمِیْمِ ۖ خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَى سَوَاءِ الْجَحِیْمِ ۖ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ
 مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ ۖ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ۖ إِنَّ هَذَا مَا كُنْتُمْ
 بِهِ تَمْتَرُونَ ۖ إِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِی مَقَامٍ أَمِیْنٍ ۖ فِی جَنَّتٍ وَعُیُونٍ ۖ
 یَلْبَسُونَ مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَقَبِّلِیْنَ ۖ كَذَٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُمْ
 بِحُورٍ عِیْنٍ ۖ یَدْعُونَ فِیْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ ۖ آمِنِیْنَ ۖ لَا یَذُوقُونَ فِیْهَا
 الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۖ وَوَقَّعْنَا لَهُمُ الْبَاقِیَةَ ۖ فَضْلًا مِّنْ
 رَبِّكَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۖ

”زقوم کا درخت گناہ گار کا کھا جا ہو گا، تل کی تلھٹ جیسا، پیٹ میں وہ اس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔“ پکڑو اسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اور اس کو جہنم کے پھوں بچ اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔ کچھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ ٹک رکھتے تھے۔ خدا ترس لوگ اس کی جگہ میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں، حریر و دیا کے لباس پہنے، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ ہوگی ان کی شان۔ اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں ان سے بیاہ دیں گے۔ وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں گے۔ وہاں موت کا مزہ وہ کبھی نہ چکھیں گے۔ بس دنیا میں جو موت آچکی، سو آچکی۔ اور اللہ اپنے فضل سے ان کو جہنم کے عذاب سے بچا دے گا، یہی بڑی کامیابی ہے۔“

یہ منظر قوم کے درخت کے پیش کرنے سے شروع ہوتا ہے اور یہ بدکاروں کی خوراک ہو گا۔ اور یہ اس قدر کڑوا ہو گا جس طرح تیل کی تلھٹ کڑوی ہوتی ہے۔ یہ جہنموں کی خوراک کی خوفناک تصویر کشی ہے اور یہ تلھٹ پیٹ میں یوں جوش مارے گا جس طرح تیلے میں پانی کھولتا ہے۔ ان بدکاروں کے پیٹ میں 'جو برتری دکھاتے تھے رب پر اور اس کے رسولؐ ائین پر۔ فرمان الہی یوں ان "شرقاء" کے لیے صادر ہوتا ہے۔

خُذُوهُ فَاعْتَلُوهُ اِنِّیْ سَوَّآءٌ الْجَحِیْمِ (۴۴: ۴۷) ثُمَّ صَبُّواْ فَوْقَ رَاسِهٖ مِنْ

عَذَابِ الْحَمِیْمِ (۴۴: ۴۸) "پکڑو اسے اور رگیدنے ہوئے لے جاؤ اس کو جہنم کے پھوں بیچ اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔" یعنی پکڑو اسے سخت ہے دردی کے ساتھ۔ کس کر باندھو اسے اور پھر رگیدتے ہوئے جہنم کی طرف لے جاؤ کوئی نرمی اور کوئی باعزت گرفتاری نہ ہو۔ اور ان کے سروں پر اس قدر سخت گرم پانی انڈیل دو کہ ان کو بھون کر رکھ دے، اس سختی، کھینچنے، دھکیلنے، رگیدنے گرم پانی سے جلنے اور دلغ دسینے کے ساتھ جہنم کے اندر گراؤ اور پھر یہ بھی کہہ دو:

ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ (۴۴: ۴۹) "کچھ اس کا حرا" بوازد بردست عزت دار آدمی ہے

تو۔ جو لوگ عزت اور شرافت کے بغیر عزیز و کریم بننے ہیں ان کی سزا ایسی ہی ہے۔ تم اللہ اور رسول اللہ کے مقابلے میں یہی کچھ کرتے تھے۔ تم اس دن میں شک کرتے تھے اور مذاق اڑاتے تھے اور ٹھنسنے کرتے تھے۔

اس منظر میں ایک طرف تو پکڑ دھکڑ، باندھنا اور داغنا ہے اور گرم پانی گراتا ہے اور دوسری طرف وہ حقیقی شریف و کریم لوگ ہیں جو مستحق تھے، جو ہر وقت اس دن سے ڈرتے تھے۔ یہ لوگ نہایت ہی امن کے مقام میں کھڑے ہیں نہ ڈر ہے اور زیادہ دغاؤں سے نہ کھینچا تائی ہے اور نہ دھکم پیل ہے، اور نہ ان پر سختی اور گرم پانی گراتا ہے۔ بلکہ وہ نہایت ہی بہتر پوزیشن میں ہیں۔ باغات میں جہاں ہر طرف جیشے بہہ رہے ہیں۔ یہ نرم و بریک ریٹم اور موٹے ریٹم کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں وہ ایک دوسرے کے بالفاظیل ٹکیوں پر بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ شریک محفل ہیں۔ پھر ان کو وہاں ایسی بیویاں دی جائیں گی جو نہایت ہی خوبصورت آنکھوں والی ہوں گی۔ یوں یہ نعمت اور فرحت تمام ہوگی اور وہ جنت میں ہمیشہ کے لیے معیم ہوں گے جو بھی وہاں چاہیں گے ملے گا۔

یَدْعُوْنَ فِیْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِیْنَ (۴۴: ۵۵) "وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں

طلب کریں گے۔" یعنی ان کو ان نعمتوں کے ختم ہونے کا کوئی اندیشہ نہ ہو گا، نہ موت ہوگی جبکہ ایک بار وہ سرچکے۔ اور اس کے سوا کوئی اور موت ہوگی ہی نہیں۔ مشرکین تو یہ کہتے تھے کہ یہی پہلی موت ہے اور حشر و نشر نہ ہو گا، اس کے جواب میں ہے کہ ٹھیک ہے یہی پہلی موت ہے لیکن حشر و نشر ہو گیا، اب کوئی موت نہیں ہے، اگرچہ تم موت چاہتے ہو۔ اور اللہ نے اہل ایمان کو جہنم سے بچالیا، محض اپنے فضل و کرم سے کیونکہ نجات تو اللہ کے فضل و کرم پر موقوف ہے۔

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۴۴: ۵۷) "اور اللہ اپنے فضل سے ان کو موت

سے بچائے گا' یہی بڑی کامیابی ہے۔" اور نہایت ہی عظیم کامیابی!

اس شدید منظر کے بعد اب سورت کا خاتمہ اسی بات پر ہوتا ہے جس سے اس کا آغاز ہوا تھا کہ یہ قرآن اور یہ رسالت اللہ کی طرف سے نعمت عظمیٰ ہے اور اس نعمت کا انکار اور رسول کی تکذیب کے نتائج سے متنبہ کیا جاتا ہے۔

۳

۱۷۷ **فَإِنَّمَا يَسْتَرْزِقُهُ بِلسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۱۷۷﴾ فَارْتَقِبْ إِنَّهُمْ مُرْتَقِبُونَ ﴿۱۷۸﴾**

۱۶ ”اے نبی! ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں نازل فرمایا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اب تم بھی انتظار کرو' یہ بھی منتظر ہیں۔“

یہ اس سورت کا خاتمہ ہے' اس میں اس پوری سورت کی نفاذ اور اس کے موضوع بحث کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ خاتمہ اس کے آغاز اور اس میں بحث کی جو لائن اختیار کی گئی ہے اس کے مطابق ہے۔ آغاز ذکر کتاب' نزول کتاب اور غرض نزول یعنی ذرا نے اور نصیحت کرنے سے ہوا تھا۔ اور اس کے سیاق میں اس عذاب کی تشریح کی گئی تھی۔ جو ان مکذبین کے انتظار میں ہے۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ (۱۷۷: ۱۷۸) ”جس دن یہ بڑی ضرب لگائیں گے' وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔“ اب یہ خاتمہ یوں ہے کہ ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ رسول کریم کی زبانی قرآن مجید تمہارے لیے آسان کر دیا گیا ہے جو عربی زبان میں ایک عربی بوسنے والے رسول پر نازل کیا گیا ہے۔ تم اس کو سمجھ سکتے ہو' وہ آپ کو سمجھا سکتے ہیں' اگر تم نے اسے تسلیم نہ کیا تو ایک نہایت ہی خوفناک انجام تمہارے انتظار میں ہے۔

فَارْتَقِبْ إِنَّهُمْ مُرْتَقِبُونَ (۱۷۷: ۱۷۸) ”تم بھی انتظار کرو' یہ بھی منتظر ہیں۔“

--- ۰۰۰ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ---- ۲۵

سورة الجاثية - ۴۵

آیات ۱ --- تا --- ۳۷

سورۃ الجاثیہ ایک نظر میں

یہ بھی سورت ہے۔ یہ جاتی ہے کہ مکہ میں مشرکین نے دعوت اسلامی کا استقبال کس طرح کیا اور دعوت اسلامی کی آیات و دلائل کا مقابلہ کس انداز سے کیا۔ دعوت اسلامی کے حقائق اور مسائل اور نظریات کے مقابلے میں ان کا رد عمل کیا رہا۔ غرض انہوں نے بغیر کسی شرم و حیا کے اور واضح سچائی کو دیکھتے ہوئے اور بین دلائل کو سنتے ہوئے بھی پوری طرح اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ پھر یہ سورت تصویر بھی دکھاتی ہے کہ قرآن مجید نے ان سنگدل اور ہوا و ہوس کے پیچھے سرپٹ دوڑنے والے لوگوں کی اصلاح کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے۔ ایسے لوگوں کی اصلاح کی خاطر جن کے دل پردوں اور غلافوں میں لپٹے ہوئے تھے اور ہدایت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایسے لوگوں کے سامنے قرآن کریم نے نہایت ہی گہرے اثر و اسلے دلائل اور نہایت ہی فیصلہ کن براہین پیش کیے۔ ان کو عذاب الہی سے ڈرایا، ان کے سامنے جنت کی تصویر پیش کی۔ اللہ کے سنن گنوائے اور اس کائنات میں چلنے والے قوانین فطرت بتائے۔

اس سورت کی آیات اور اس کے مناظر کے درمیان ہمیں اس قسم کے کردار بھی نظر آتے ہیں جن کو گمراہی پر اصرار ہے، جو حق کے مقابلے میں باحق ڈٹے ہوئے ہیں، دعوت اسلامی کے ساتھ سخت عناد رکھتے ہیں، اللہ کے حق میں اور اللہ کے کلام کے حق میں نازیبا باتیں کرتے ہیں۔ یہ آیات ایسے لوگوں کی تصویر حقیقی رنگ میں پیش کرتی ہیں اور ان کو مناسب سرزنش کرتی ہیں۔ اللہ کے عذاب الیم و عظیم سے ڈراتی ہیں اور نہایت ہی توہین آمیز انجام کے بارے میں بتاتی ہیں۔

وَيَلْ لَّكَ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (۷) يُسْمِعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِيرُهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۸) وَإِذَا عَلِمَ مِنَّا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (۹) مِّنْ وَرَائِهِمْ جَهَنَّمُ وَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ مَا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا

اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۰) (۴۵ : ۷ تا ۱۰) ”جی ہاں ہے ہر اس جھوٹے بد اعمال شخص کے لیے جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور وہ ان کو سنتا ہے، پھر پورے غرور کے ساتھ اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کا ٹرہہ سنا دو اور ہماری آیات میں سے کوئی بات جب اس کے علم میں آتی ہے تو وہ اس کا مذاق بنا لیتا ہے۔ ایسے سب لوگوں کے لیے دہشت کا عذاب ہے۔ ان کے آگے جہنم ہے جو کچھ بھی انہوں نے دنیا میں کمایا ہے اس میں سے کوئی چیز ان کے کام نہ آئے گی۔ نہ ان کے وہ سرپرست ہی ان کے کچھ کام آئیں گے جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے اپنا ولی بنا رکھا تھا ان

کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس سورت میں ہم ایک ایسے گروہ سے بھی ملتے ہیں جن کا تصور اور جن کے اندازے بالکل غلط ہیں۔ غالباً یہ اہل کتاب ہیں۔ یہ لوگ خالص ایمان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے، نہایت بدکار لوگ ہیں یہ اور ان کے مقابلے میں اہل ایمان نہایت ہی اچھے لوگ ہیں لیکن وہ اس فرق کو نہیں سمجھتے۔ قرآن کریم انہیں سمجھاتا ہے کہ ایسے دونوں گروہوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے پیانوں کے مطابق بہت بڑا فرق ہے اور ان کو بتایا جاتا ہے کہ ان کا نظریہ اور ان کے یہ فیصلے کس قدر غلط ہیں، اللہ کے پیانوں کے مطابق تمام معاملے اس میزانِ عدل کے مطابق ہوتے ہیں جس کو اس پوری کائنات کے لیے ریڑھ کی ہڈی بنایا گیا ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (۲۱) وَ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُونَ

(۲۲) (۴۵: ۲۱ تا ۲۲) ”کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے، یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے گا؟ بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔ اللہ نے تو آسمان اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر نفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے، لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔“

ایک کردار ایسا بھی ہمارے سامنے آتا ہے جو صرف نفس کے قاضی کے فیصلے مانتا ہے۔ گویا اس کا اللہ اس کے اندر ہے اور یہ اسی کا مطیع فرمان ہے۔ ایسے کرداروں کی ایک انوکھی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ شخص اپنی اس روش پر خوب اترتا ہے۔

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَ خَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَ جَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غَشَاةً فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَدْرُونَ (۴۵: ۲۳) ”پھر بھی تو نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے۔“

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ قیامت کے منکر ہیں اور وہ حشر و نشر کے بارے میں پوری طرح شک میں مبتلا ہیں۔ اور نہایت ہی ہٹ دھرمی کے ساتھ اس قسم کی دلیل طلب کرتے جس کا مظاہرہ اس دنیا میں زمین پر نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم ایسے لوگوں کے سامنے بھی ایسے دلائل پیش کرتا ہے جو موجود ہیں۔ یہ نہایت ہی دل پذیر دلائل ہیں لیکن یہ لوگ ان سے منہ موڑتے ہیں۔

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُم بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (۲۴) وَ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا اسْتَوَا بَابِائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲۵) قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَمَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

(۲۶) (۴۵: ۲۴ تا ۲۶) ”یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ ہمیں ہمارا مرنا اور جینا ہے۔ اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔ درحقیقت اس معاملہ میں ان کے پاس کوئی علم نہیں۔ یہ محض گمان کی بنا پر باتیں کرتے ہیں اور جب ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھالاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔ لہٰذا نبیؐ نے کہو اللہ ہی تمہیں زندگی بخشتا ہے۔ پھر وہی موت دیتا ہے پھر وہی تم کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔“

ہو سکتا ہے کہ یہ سب لوگ ایک ہی گروہ ہوں اور یہی گروہ یہ سب باتیں کرتا ہو اور قرآن کریم جگہ جگہ ’ان کی بات کرتا ہو‘ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مختلف گروہ ہوں اور مکہ میں اپنی اپنی جگہ میں کام کرتے ہوں اور ان میں بعض اہل کتاب بھی ہوں۔ اگرچہ اہل کتاب مکہ میں بہت ہی قلیل تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اشارہ انہی اہل کتاب کی طرف ہو اور اہل مکہ کو نصیحت کے لیے یہ بات کہی جا رہی ہو۔ اگرچہ وہ مکہ میں موجود نہ ہوں۔

بہر حال قرآن کریم نے ان لوگوں کی یہ صفات دے کر یہاں ان کی تردید کی۔ اور اس سورت میں ان کے بارے میں مفصل بات کی۔ قرآن کریم نے ان کے سامنے آفاق اور افق کے دلائل بھی پیش کیے اور ان کو قیامت کے دن سے ڈرایا اور یہ بھی بتایا کہ دراتاریخ انہی کے جہردکوں میں سے دیکھو کہ مکذبین کس انجام سے دوچار ہوتے رہے۔ ان کے سامنے قرآن مجید نے نہایت ہی سادہ اور پرتاثر اسلوب میں بات پیش کی :

إِنَّ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ (۳) وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبْتُغُونَ مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۴) وَ اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِيفِ الرِّيحِ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۵) تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللَّهِ وَ آيَتِهِ يُؤْمِنُونَ (۶) (۴۵: ۳ تا ۶)

(۶) ”حقیقت یہ ہے کہ آسمان اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لیے۔ اور تمہاری اپنی پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو اللہ پھیلا رہا ہے بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں اور شب و

روز کے فرق و اختلاف میں اور اس رزق میں جسے اللہ آسمانوں سے نازل فرماتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے اور ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جو ہم تمہارے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔ آخر اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔“

اور یہ دلائل و نشانیاں اللہ ان کے سامنے اپنے انعامات میں سے کسی نہ کسی شکل میں پیش فرماتا ہے جن کو انہوں نے بھلا دیا ہے تاکہ وہ اسیں یاد کریں اور ان پر غور کریں۔

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ سَخَّرَ لَكُمْ اسْحَرَ لَتَجْرِي الْفُلُكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَ لَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۲) وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمُوتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۳) (۱۲: ۴۵ تا ۱۳) ”وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار ہو۔ اس نے زمین و آسمان کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ سب کچھ اپنے پاس سے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔“

پھر اللہ نے ان کے سامنے ان حالات کا خوبصورت نقشہ بھی رکھ دیا ہے اس دن کا جس کا یہ انکار کرتے ہیں اور جس میں ان کو گمراہی ہے۔

وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَ يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُونَ (۲۷) وَ تَرَى كُلُّ أُمَّةٍ جَآئِيَةً كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَى إِلَى كِتَابِهَا الْيَوْمَ تُحْزَرُونَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ

(۲۸) هٰذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنسِخُ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ

(۲۹) فَاَمَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ ذٰلِكَ هُوَ

الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (۳۰) وَ اَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمْ يَكُنْ اٰتِي تَتْلٰى عَلَيْهِمْ فَاَسْتَكْبَرْتُمْ وَ

كُنتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ (۳۱) وَ اِذَا قِيلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَ السَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ

مَا نَذَرٰى مَا السَّاعَةُ اِنْ نُّظُنُّ الْاٰظِنًا وَ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ (۳۲) وَ بَدَّلْهُمْ سَيِّئَاتُ

مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوْا بِهِ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۳) وَ قِيلَ الْيَوْمَ نَنسِفُكُمْ كَمَا

نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا وَ مَأْوَكُمْ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّصِيرِينَ (۳۴) ذَلِكُمْ بِاَنكُمْ
اتَّخَذْتُمْ آيَةَ اللّٰهِ هُزُوًا وَ غَرَّتْكُمْ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَ لَا هُمْ

يَسْتَعْتَبُونَ (۳۵) (۴۵: ۲۷ تا ۳۵) ”اور جس روز قیامت کی گھڑی آگھڑی ہوگی اس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے۔ اس دن ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامہ اعمال دیکھے۔ ان سے کہا جائے گا ’آج تم لوگوں کو تمہارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کر رہے تھے۔ یہ ہمارا تیار کیا ہوا اعمال نامہ ہے‘ جو تمہارے اوپر ٹھک ٹھیک شہادت دے رہا ہے ’جو کچھ بھی تم کرتے تھے‘ اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے۔ پھر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تھے۔ انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہی صریح کامیابی ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا۔ کیا میری آیات تم کو نہیں سنائی جاتی تھیں مگر تم نے تکبر کیا اور مجرم بنے رہے اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے۔ ہم تو بس ایک گمان سار کھتے ہیں۔ یقین ہم کو نہیں ہے۔“ اس وقت ان پر ان کے اعمال کی برائیاں کھل جائیں گی اور وہ اس چیز کے پھیر میں آجائیں گے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ ”آج ہم بھی اس طرح تمہیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم اس دن کی عاقبات کو بھول گئے تھے تمہارا ٹھکانا اب دوزخ ہے۔ اور کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق بنالیا تھا اور تمہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا۔ لہذا آج نہ یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے کہا جائے گا کہ معافی مانگ کر اپنے رب کو راضی کرو۔“

اس طرح اللہ نے منصفانہ جزاء و سزا اور ہر شخص کی انفرادی ذمہ داری کے اصول میں کوئی شک نہیں رہنے دیا اس لیے یہ بتایا گیا کہ یہ اصول اس کائنات کے وجود میں بہت ہی گہرا ہے۔ اس اصول پر یہ کائنات قائم ہے۔ اس آیت میں کہا گیا:

مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَ مَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ (۱۵۰: ۴۵)
”جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو برائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ پھر جانا تو سب کو رب ہی کی طرف ہے۔“

اور جو لوگ بدکاریاں کرتے ہیں اور پھر یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے ہاں مومنین ہی کی طرح ہوں گے جو نیک کام کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِيُخْزِيَ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا

يُظْلَمُونَ (۲۲: ۴۵) ”اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے اور لوگوں پر ظلم نہ کیا جائے۔“

یہ پوری سورت ایک ہی ٹکڑا ہے لیکن ہم نے تشریح کی سہولت کے لیے اسے دو شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس کا

آغاز حروف مقطعات حاء میم سے ہوتا ہے۔ پھر قرآن کریم کے نزول کی طرف اشارہ ہے۔

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (۲: ۴۵) ”کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔“ اور اس کا خاتمہ بھی حمد الہی اور اللہ کی عام ربوبیت سے بیان ہوتا ہے۔ نیز اللہ کی پاکی اور عظمت کے بیان پر ہوتا ہے اور یہ حمد و ثنا اور عظمت اور تعجید ان لوگوں کے خیالات کے مقابلے میں بیان کی گئی جو اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں اور ٹھنڈے مارتے ہیں۔

فَلِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمُوتِ وَ رَبِّ الْأَرْضِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۳۶: ۴۵) وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۳۷: ۴۵) ”پس تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو زمین اور آسمانوں کا مالک ہے اور سارے جہاں والوں کا پروردگار ہے۔ زمین و آسمانوں میں بڑائی اسی کے لیے ہے اور وہی زبردست اور دانائے۔“

اس سورت کا انداز بیان سورت دخان کے مقابلے میں سہل، دھیمہ، واضح اور گہرا اور سنجیدہ ہے جبکہ سورۃ دخان نہایت پر شوکت اور شدید اور رعب دار انداز میں تھی۔ جس میں قلب و ضمیر اور دل و دماغ پر شدید ضربات لگائی گئی تھیں۔ اللہ تمام دلوں کا خالق ہے۔ قرآن کا نازل کرنے والا ہے، بعض اوقات اصلاح کے لیے سخت انداز اختیار کرتا ہے اور بعض اوقات نہایت ہی نرم و نازک، درشتی و نرمی، بہم درجہ است۔ موقع و محل اور حالات کے مطابق۔ اللہ لطیف و خبیر ہے اور عزیز و حکیم ہے۔ اب تفصیلات تشریح۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۳ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۲۳



حَوْثٍ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ إِنَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
لَآيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَابَّاءٍ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝
وَإِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ
الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ح م۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ایمان ماننے والوں کے لیے۔ اور تمہاری اپنی پیدائش میں ’اور ان حیوانات میں جن کو اللہ (زمین میں) پھیلا رہا ہے‘ بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں اور شب و روز کے فرق و اختلاف میں ’اور اس رزق میں جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے‘ پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے ’اور ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“

ح۔ ایم کے بعد ’یہ آتا ہے کہ یہ کتاب اللہ عزیز اور حکیم کی طرف سے ہے اور اس کتاب کا مصدر اور منبع اللہ کی ذات ہے اور دوسرا اشارہ اس میں یہ ہے کہ یہ معجز کتاب انہی حروف سے بنائی گئی ہے۔ جیسا کہ حروف مقطعات کے بارے میں ہماری رائے ہے اور یہ کہ یہ چیلنج ہے ان کو کہ تم ان حروف سے ایسی کتاب نہیں بنا سکتے۔ لہذا احاطہ دہلی ہے تنزیل الکتب پر کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ زبردست قدرت والا ہے اور اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا اور حکیم ہے جس نے اس پوری کائنات کو حکمت سے بنایا اور تمام معاملات اس ذات کے حکم سے طے ہوتے ہیں۔ یہ ایک

ایسا تبصرہ ہے جو سورت کی فضا کے ساتھ مناسب ہے جس میں طرح طرح کے نفوس اور ان کی ذہنیت دکھائی گئی ہے۔ قبل اس کے کہ لوگوں کے سامنے 'اس کتاب کے حوالے سے ارباب کا موقف رکھا جائے' ان کو ان آیات و نشانات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اس کائنات میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ آیات اور یہ نشانیوں اس بات کے لیے کافی تھیں کہ یہ لوگ ایمان لاتے اور یہ لوگ اپنے دلوں کو اگر ان کی طرف متوجہ کرتے تو ان کے دل کھل جاتے اور اس کتاب کے نازل کرنے والے عظیم اللہ کی طرف ان کا احساس تیز ہو جاتا جو اس کائنات کا ایک عظیم خالق ہے۔

ان فی السموات و الارض لآیات للْمُؤْمِنِينَ (۳: ۴۵) 'حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں'۔ اور وہ نشانیاں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ کسی چیز تک محدود نہیں ہیں کسی حال تک محدود نہیں ہیں 'اس کائنات کی جس چیز کو بھی انسان دیکھے اور مطالعہ کرے تو دل گولہی دیتا ہے کہ یہی پہلو ایک معجزہ ہے گویا "جا انجاست"۔ سوال یہ نہیں ہے کہ نشانی کہاں ہے؟ سوال یہ ہے کہ کون سی چیز نشانی نہیں ہے؟

ذرا دیکھو ان آسمانوں اور ان کے اندر تھرنے والے عظیم الجثہ اجرام فلکی کو 'پھر اس کی طویل و عریض دھنوں کو' یہ اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جس طرح ذرات اور رائی کے دانے 'بمقابلہ اس فضا اور خوفناک حد تک عریض و طویل فضا کے نیز یہ نہایت ہی خوبصورت ہیں۔

پھر ذرا اس بات کو دیکھو کہ ان اجرام کی گردش اپنے اپنے مدار میں کس قدر تسلسل کے ساتھ قائم ہے۔ نہایت ہی خوبصورت ہم آہنگی کے ساتھ 'انسان یہ چاہتا ہے کہ دیکھتا ہی رہ جائے اور اس کے مدح سے جی بھرتا ہی نہیں۔ بعض گردشیں کروڑوں سالوں میں مکمل ہوتی ہیں اور ایک سیکنڈ کا فرق میں پڑتا۔

اور یہ زمین جسے انسان بہت ہی طویل و عریض سمجھتا ہے 'یہ ایک نہایت ہی چھوٹا سا ذرہ ہے 'بمقابلہ ان بڑے ستاروں کے (صرف مشتری اس سے ایک ہزار گنا زیادہ بڑا ستارہ ہے) پھر یہ ذرہ یعنی زمین 'اس وسیع فضائے کائنات کے اندر تھرتی ہے۔ اگر اللہ کی قدرت نہ ہوتی جس نے اسے تمام رکھا ہے اور اپنے مدار میں بند کر رکھا ہے تو یہ اس فضائے بیست میں اپنی راہ گم کر دیتی لیکن اللہ کی قدرت کا یہ کمال ہے کہ اس کائنات کا ذرہ بھی یہاں گم نہیں ہو سکتا۔

پھر وہ ساز و سامان جو اللہ نے اس زمین میں 'اس کے ایک خاص مقام اور نظام کی وجہ سے ودیعت کیا اور جس کی وجہ سے اس کے اوپر زندگی ممکن ہوئی 'اس کا تو ہر پہلو ایک نشانی ہے۔ اس ساز و سامان کی ہر چیز کے اپنے اپنے خواص 'نہایت باریک بینی کے ساتھ 'بڑی کثرت اور ہم آہنگی کے ساتھ یہاں جمع کیے گئے ہیں۔ اگر کسی ایک چیز کی خاصیت و ماہیت شہ برابر بدل جائے تو زندگی کا پورا نظام خلل پذیر ہو جائے یا سرے سے ختم ہو جائے۔ غرض اس زمین کی ہر زندہ شے ایک علیحدہ نشانی ہے۔ ہر چیز کا ایک ایک جزء اور ایک ایک عضو ایک الگ نشانی ہے۔ اس معاملے میں عظیم الجثہ اشیاء اور ذرہ برابر کی اشیاء نشانی ہیں۔ ایک عظیم درخت سے ایک چھوٹا سا پتہ اٹھا لو 'اس کائنات کی پہنائیوں میں ایک چھوٹا سا نباتاتی پودا لے لو اور تجربہ کرو 'اپنے حجم اور اپنی شکل کے اعتبار سے یہ ایک نشانی ہے۔ رنگ میں بھی اور چھوٹے پن میں بھی۔ اپنے مقاصد کے لیے بھی لفظانی اور اپنے جسم میں بھی نشانی۔ انسان یا حیوان کے جسم کا ایک بال ہی لے لو 'یہ

بھی ایک نشانی ہے 'اس کی ترکیب' اس کا رنگ نشانی ہے 'ہر پردے کا ہر ایک نشانی ہے' اس کا مادہ ترکیب 'اس کے مقاصد' اور اس کی ہم آہنگی۔ اگر انسان اس زمین و آسمان میں چشم بصیرت کے ساتھ دیکھے تو اسے نشانات الہیہ کا اژدہام نظر آئے اور انسان اعلان کر دے کہ اس کی فکر و نظر سے یہ تمام نشانات دراء ہیں۔

لیکن یہ نشانیاں کس کے لیے ہیں؟ خود یہ آیات بتا دیتی ہیں 'یہ نشانیاں کس کے سامنے پردہ اگندہ ہوتی ہیں۔ ان کا احساس کس کو ہو سکتا ہے لِقَوْمٍ یُّوقِنُونَ (۴: ۴۵) "ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں"۔ جو مومن ہیں اور مومن ہی نور ربی سے دیکھتا ہے۔

پس ایمان ہی وہ قوت ہے جو دلوں کے دروازے کھلتا ہے 'پھر انسان پکار سنتا ہے 'کوئی روشنی دلوں کو اندر آکر منور کر سکتی ہے' کوئی تازہ باد نسیم کے جھونکے دنیا کے دل پر تروتازگی بکھیر سکتے ہیں اور ایمان ہی کی وجہ سے انسان 'اس کائنات میں ہر طرف بھری ہوئی نشانیاں دیکھ سکتا ہے' یہ ایمان ہی ہے جو دلوں کو ایسی فرحت بخش تازگی عطا کرتا ہے اور ان کے اندر رقت اور لطافت پیدا کرتا ہے 'جس کے نتیجے میں یہ دل وہ اشارات وصول کرتے ہیں جو اس کائنات میں سے ہر طرف سے آرہے ہیں' جو یہ بتاتے ہیں کہ یہ اشارے دست قدرت کی طرف سے ہیں اور دست قدرت جن جن چیزوں کو بناتی ہے ان کے اندر یہ اشارات موجود ہوتے ہیں۔ اللہ کی پیدا کردہ ہر چیز معجزہ ہے اور مخلوق اس کی نقل بھی نہیں کر سکتی۔ اب اس کائنات کی طویل اور دور دراز دایوں سے دلپس لا کر انسان کو اس کی اپنی ذات کی طرف لایا جاتا ہے 'جو اس کے قریب ہے۔ اور وہ جانور جو انسان کے قریب ہیں ان پر غور و فکر کی دعوت!

وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَ مَا یُبَیِّنُ مِنْ دَآئِبَةٍ اَیُّ لِقَومٍ یُّوقِنُونَ (۴: ۴۵) "اور تمہاری اپنی پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو اللہ زمین میں پھیلا رہا ہے بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں"۔ انسان کو یہ عجیب ساخت عطا کرنا 'پھر اسے ایسی عجیب خصوصیات عطا کرنا' اور نہایت ہی گہرے 'لطیف اور پیچیدہ فرائض اس کے حوالے کرنا جن میں سے ہر ایک معجزانہ ہے۔ جسم انسانی کے ایسے اندرونی معجزات ہیں کہ رات اور دن دیکھتے دیکھتے وہ ہمارے لئے عجوبے ہی نہیں رہے۔ اس لیے کہ ہمارے اندر اور ہمارے قریب ہیں لیکن صرف ایک عضو کا تجربہ کیا جائے تو انسان کا سرچرکا جاتا ہے اور انسان اس پیچیدہ ترکیب کی ہونٹائیوں سے مبہوت رہ جاتا ہے۔

زندگی 'چاہے وہ اپنی سادہ ترین صورت میں کیوں نہ ہو وہ تو ایک معجزہ ہے۔ ایسا جس کا ایک ہی غلیہ ہوتا ہے اور ایسا سے بھی چھوٹی زندگی بھی معجزہ ہے۔ رہا انسان تو اس کی زندگی تو بہت ہی پیچیدہ اور سخت اور عجیب و غریب ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے بھی وہ نہایت ہی پیچیدہ اور معجزاتی ہے۔ عضوی ترکیب سے اس کی نفسیات زیادہ پیچیدہ ہیں۔

اور وہ مخلوقات جو اس زمین پر ہر طرف رہتی ہیں 'اور جس کی لاتعداد انواع و اقسام ہیں' بے شمار جسم اور اشکال ہیں جن کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اس زندگی میں سے چھوٹی سے چھوٹی چیز اور بڑی سے بڑی چیز سب اپنی اپنی جگہ معجزاتی ہیں 'یہ اپنی عمر اور جنس کے اعتبار سے بھی معجزاتی شان رکھتی ہیں۔ اور یہ قدرتی طور پر اپنی نوع کی حفاظت کرتی ہیں اور کوئی نوع دوسری انواع کو فنا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اور دست قدرت نے ان انواع و اقسام کی تعداد اپنے پاس رکھی ہوئی ہے کسی میں کمی کرتا ہے اور کسی میں اضافہ۔ اور ہر ایک کو اس کے خصائص دیتا ہے اور قوت و صلاحیت دیتا ہے۔ اس

طرح حیوانات کے تمام انواع و اقسام کی آبادی کے اندر ایک توازن قائم رہتا ہے۔

گدھ اور باز چارچ اور معز پرندے ہیں اور ان کی عمر بھی لمبی ہے لیکن ان کی آبادی بہت کم ہے اور بہت کم انڈے دیتے ہیں۔ اگر گدھ اور باز چڑیوں کی طرح ہوتے تو ذرا سوچ لیں کہ اس دنیا میں شاید چھوٹے بڑے کسی پرندے کی نسل نہ ہوتی۔

حیوانات میں سے شیر و درندہ جانور ہیں، اگر ان کی نسل ہرنوں اور بھیڑ بکریوں کی طرح زیادہ ہوتی تو وہ جنگلات میں کوئی حیوانی مواد نہ چھوڑتا۔ لیکن یہ قدرت ہے جس نے ان کی نسل کو محدود رکھا ہے اور وہ مطلوبہ تعداد ہی میں ہوتے ہیں جبکہ ہرن اور بھیڑ اور بکریاں زیادہ ہوتی ہیں کیونکہ قدرت کو معلوم ہے کہ ان کی زیادہ ضرورت ہے۔

ایک کھسی ایک ہی زندگی میں لاکھوں انڈے دیتی ہے لیکن اس کی زندگی زیادہ سے زیادہ دو ہفتے ہوتی ہے۔ اگر ایک کھسی کی عمر طبعی کئی ماہ یا سال ہوتی تو تمام انسانی جسموں کو ڈھانپ دیتیں، آنکھوں کو کھا جاتیں لیکن دست قدرت نے ان پر ایک قدرتی بند بھی رکھا ہے اور اس کی عمر کو محدود کر دیا ہے۔

یونہی ہر چیز اور ہر نوع کی یہ حالت ہے۔ اللہ کی تدبیر اور تقدیر انسانوں اور حیوانات میں اپنا کام کرتی ہے اور ہر چیز کے اندر ایک قسم کی نشانی ہے۔ اور یہ نشانی پکار پکار کہتی ہے کہ اللہ کی آیت میں غور و تدبر کرو اور یہ آیات لِقَوْمٍ یُّؤْفِقُونَ (۴۰: ۴) ”ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں“۔

یقین ایسی حالت ہے جو دلوں کو تیر اور مائل اور متاثر کرنے والی حالت ہے، تاکہ وہ احساس کریں، متاثر ہوں اور اللہ کی طرف مائل ہوں۔ ایمان و یقین دلوں کو ثابت، برقرار اور مطمئن کر دیتا ہے۔ ایسے دل بڑے فہراؤ سے اس کائنات پر غور کرتے ہیں اور اس سے حقائق اخذ کرتے ہیں۔ ان میں سے بے چینی، پریشانی، بے ثباتی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے دلوں کو اگر اس دنیا میں کم کچھ ملے تب بھی وہ اس سے بڑے نتائج اور آثار حاصل کرتے ہیں۔

اس کے بعد اپنی ذات اور اپنے ارد گرد کے حیوانات سے انہیں اس پوری کائنات کے مظاہر کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ اس کائنات سے ان کے لیے اور دوسرے زندوں کے لیے جو اسباب حیات پیدا کیے جاتے ہیں اور فراہم کیے گئے ہیں ذرا ان پر بھی غور کرو۔

وَ اِخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ قَاحِیَا بِهِنَّ الْاَرْضَ

بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِیْفِ الرِّیْحِ اَیْتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۴۰: ۵) ”اور شب و روز کے فرق و اختلاف میں اور اس رزق میں جسے اللہ آسمانوں سے نازل فرماتا ہے۔ پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“ گردش لیل و نہار وہ منظر ہے جس کے بار بار کی تکرار کی وجہ سے اس کی جدت انسانوں کے ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی پہلی مرتبہ ان کو دیکھے یا پہلی مرتبہ رات کو دیکھے تو یہ ایک عجیب منظر ہے جو دل شاعرانہ احساس رکھتے ہیں وہ اس جدت کو سمجھتے ہیں اور گردش لیل و نہار کو اس کائنات کا ایک حیران کن نظام سمجھتے ہیں۔

انسانوں کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کائنات کے بعض مظاہر کے بارے میں تو لب انسانوں نے وسیع

معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اب انسان جانتے ہیں کہ گردش لیل و نهار دراصل زمین کی گردش محوری سے پیدا ہوتی ہے جو یہ سورج کے سامنے کرتی ہے اور یہ گردش چوبیس گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے لیکن اس علم کے مطابق بھی یہ انوکھا منظر اور عجوبہ ابھی ختم نہیں ہے کیونکہ یہ کرۂ زمین ہوا کے اندر معلق ہے اور ایک خاص رفتار کے ساتھ چل رہا ہے اور وہ کسی چیز کا سارا نہیں لے رہا ہے۔ اللہ نے اسے تمام رکھا ہے اور وہ ایک سیکنڈ بھی اپنی رفتار کم نہیں کرتا۔ اور یہ رفتار ایسی ہے کہ تمام زندہ مخلوقات اس کے اوپر بڑے آرام سے رہ رہی ہے اور یہ مخلوق اس فضا میں معلق گولے کے اوپر چلی ہوئی ہے جو فضا میں گردش پر ہے۔

اب انسان کا علم قدرے اور وسعت اختیار کرتا ہے کہ اس گردش محوری کے اثرات اس زمین کے اوپر اور تمام زندہ مخلوقات پر کیا ہیں۔ انسان نے معلوم کیا کہ ان اوقات کو اس طرح رات اور دن میں تقسیم کرنے ہی سے اس کرۂ ارض پر زندگی ممکن بنائی گئی ہے۔ اگر گردش لیل و نهار نہ ہوتے یا اس انداز سے اور اس نظام اور رفتار سے نہ ہوتے تو اس زمین کی سطح پر موجود ہر چیز بدل جاتی اور خصوصاً انسانی زندگی ختم ہو جاتی۔ چنانچہ یوں اس علم کے بعد معلوم ہوا کہ گردش لیل و نهار اللہ کی نشانیوں میں سے بہت اہم نشانی ہے۔

وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۵: ۴۵) ”اور

اس رزق میں جسے اللہ آسمانوں سے نازل فرماتا ہے۔ پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمینوں کو جلا اٹھاتا ہے۔“ رزق سے بھی تو پانی مراد ہوتا ہے جو آسمانوں سے آتا ہے جس طرح قدیم مفسرین نے اس سے یہی سمجھا ہے لیکن آسمانوں سے آنے والا صرف پانی بہت وسیع ہے۔ آسمانوں سے جو شعاعیں نکلتی ہیں وہ زمین کو زندہ کرنے میں پانی سے کوئی کم موثر نہیں ہیں بلکہ ان شعاعوں ہی کے اثر سے حکم اُتی سے پانی پیدا ہوتا ہے۔ سورج کی حرارت ہی پانی کو بخارات میں بدلتی ہے۔ اور یہ بخارات کثیف ہو کر بارش کی شکل اختیار کرتے ہیں اور نہریں اور چشمے بہتے ہیں۔ اور اس سے زمین مردہ ہونے کے بعد زندہ ہو جاتی ہے پانی سے بھی اور حرارت سے بھی۔

وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ (۵: ۴۵) ”اور ہواؤں کی گردش میں۔“ یہ ہوائیں شمالاً و جنوباً چلتی ہیں شرقا اور

غرباً چلتی ہیں، میدھی اور ٹیزھی چلتی ہیں گرم اور سرد چلتی ہیں۔ اس نہایت ہی پیچیدہ نظام کے مطابق جو دست قدرت نے اس کائنات کی تخلیق کے اندر رکھ دیا ہے اور اس کی ہر چیز کو حساب و مقدار سے رکھا ہے اور اس میں کوئی چیز اتفاق اور مصادفت پر نہیں چھوڑا پھر ہواؤں کے چلنے کا زمین کی گردش محوری سے گہرا تعلق ہے۔ اور ان کا تعلق گردش لیل و نهار سے بھی ہے اور اس رزق سے بھی ہے جو آسمانوں سے نازل ہوتا ہے۔ غرض حرارت، ہوا اور رات اور دن کا نظام سب مل کر یہاں کام کرتے ہیں اور ان میں آیات و نشانات ہیں۔ لَقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۵: ۴۵) ”ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔“ کیونکہ اس میدان میں عقل ہی کام کر سکتی ہے۔

--- ۰۰۰ ---

یہ تو ہیں اس کائنات کی بعض نشانیاں جن کی طرف اشارہ کیا گیا، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے لیے جو یقین کرتے ہیں اور پھر ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ یہ آیات ان کی طرف اشارہ کرتی

ہیں۔ یہ اشارات دلوں کو چھوتے ہیں، ان کو جگاتے ہیں اور یہ آیات الہیہ انسانی فطرت سے براہ راست مخاطب ہوتی ہیں کیونکہ فطرت انسانی اور اس کائنات کے درمیان براہ راست فطری رابطہ ہے۔ اور اس رابطے کو قرآن کا طرز استدلال ہی زندہ اور تازہ کر سکتا ہے۔ جو لوگ ان آیات فطرت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان سے کوئی توقع نہیں ہے کہ وہ کسی اور چیز کو تسلیم کرس گے جن لوگوں کو قرآن کریم کے یہ اشارات اور آیات نہیں جگا سکتیں، ان کو کوئی اور آواز نہیں جگا سکتی خواہ وہ جس قدر تیز آواز ہو۔ ذرا سنئے :

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُومَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعَدَ اللَّهُ
وَأَيُّهُ يُؤْمِنُونَ ﴿۱﴾

”یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جنہیں ہم تمہارے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔ اب آخر اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔“
کوئی کلام، کلام الہی کی طرح فصیح نہیں اور کوئی تخلیق مخلوقات الہیہ کی طرح بدیع نہیں ہے۔ کوئی حقیقت بھی وجود باری کی طرح عظمت نہیں ہے۔ پس ان دلائل و قہیہ کے بعد وجود باری واضح اور یقینی ہے۔ لہذا ان دلائل کے بعد بھی اگر کوئی ایمان نہیں لاتا تو اسے دھمکی دینے اور خبردار کرنے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ﴿۲﴾ يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُشْلَىٰ عَلَيْهِ ثَمَرٌ
يُصِِّرُ مُسْتَكْبِرًا كَانَ لَوْ يَسْمَعُهَا فَبَشِيرُهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۳﴾ وَإِذَا عَلِمَ مِنْ
أَتَيْنَا شَيْئًا اتَّخَذَ مَا مُرُؤًا ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۴﴾ مِنْ وَرَائِهِمْ
جَهَنَّمُ وَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ مَا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ
أَوْلِيَاءَ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۵﴾

”بہا ہی ہے ہر اس جھوٹے بد اعمال شخص کے لیے جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور وہ ان کو سنتا ہے، پھر پورے غور کے ساتھ اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو۔ ہماری آیات میں سے کوئی بات جب اس کے علم میں آتی ہے تو وہ ان کا مذاق بنا لیتا ہے۔ ایسے سب لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ ان کے پیچھے جہنم ہے جو کچھ بھی انہوں نے دنیا میں کمایا ہے اس میں سے کوئی چیز ان کے کسی کام نہ آئے گی نہ ان کے وہ سرپرست ہی ان کے لیے کچھ کر سکیں گے جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے اپنا دلی بتا رکھا ہے ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔“

جیسا کہ ہم نے اس سورت کے مقدمے میں بھی وضاحت کی کہ مکہ میں مشرکین نے جس طرح دعوت اسلامی کا استقبال کیا، اس کی تصویر کشی ان آیات میں کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنے باطل موقف پر اصرار کیا۔ ایسی ہی دعوت کا ایک لفظ بھی سننے سے انکار کیا جو حق پر مبنی تھی اور جو اپنی اہمیت میں واضح تھی۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب تھی۔ انہوں نے اس حقیقت کے ماننے میں اس قدر ہٹ دھرمی سے کام لیا کہ یوں نظر آتا تھا کہ گویا یہ دعوت ان کے ہاں اذہان تک پہنچی ہی نہیں ہے بلکہ انشاؤہ اللہ کے معاملے میں گستاخ ہو گئے۔ اور قرآن کی جو آیات ان تک پہنچی ان سے منہ موڑنے لگے قرآن کریم نے ان کے اس رویے کی نہایت شدید مذمت کی ہے۔ اور سخت دھمکی دی ہے ان کے لیے سخت بربادی ہے اور ان کو شدید توہین آمیز اور دردناک عذاب سے دوچار ہونا ہو گا۔

وَبَلِّ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَنۡثِمَ (۷: ۴۵) ”تاہی ہے ہر اس جھوٹے بد اعمال شخص کے لیے“۔ دلیل ’یعنی ہلاک ہے۔ افاک ’بست بڑا جھوٹا جو جھوٹ باندھنے میں مہارت رکھتا ہو۔ بست زیادہ گناہ کاریاں اور بد کاریاں سمیٹنے والا۔ یہ دھمکی ہر اس شخص کے لیے ہے جس میں یہ صفات موجود ہیں۔ یہ اللہ قہار و جبار کی دھمکی ہے جو ہلاک کرنے اور برباد کرنے پر قدرت رکھتا ہے جس کی دھمکی اور ڈر لو اور تہدید بالکل سچی ہوتی ہے۔ اس لیے اس فقرے میں جو دھمکی دی گئی ’وہ بست ہی خوفناک ہے۔

ایسے افاک جھوٹے اور بد اعمال اور بد کار کی صفت و علامت کیا ہے؟ یہ کہ وہ باطل پر اصرار کرتا ہے ’سچائی کے مقابلے میں جھکنے کی بجائے اور اڑتا ہے‘ اللہ کی نشانیوں کو تسلیم کرنے کی بجائے منہ موڑتا ہے اور شریفانہ رویہ اختیار نہیں کرتا بلکہ گستاخی کرتا ہے۔

يَسْمَعُ اٰیۡتَ اللّٰهِ تُتْلٰی عَلَیْہِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا کَاَنۡ لَّمْ یَسْمَعْہَا (۸: ۴۵) ”جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور وہ ان کو سنتا ہے پھر پورے غور کے ساتھ اپنے کفر پر اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں“۔ یہ نہایت ہی قابل نفرت تصویر ہے۔ اگرچہ یہ مشرکین مکہ کے ایک گروہ کی تصویر ہے جو اس وقت ایسا تھا، مگر ہر نظام جاہلیت میں یہ تصویر اسی طرح دہرائی جاتی ہے۔ آج بھی ہے اور کل بھی ہوگی۔ اس زمین پر کتنے ہی ایسے لوگ ہیں اور نام نہاد مسلمانوں میں سے کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور وہ ان کو سنتے ہیں مگر اپنے موقف پر اڑ جاتے ہیں اور غور میں منہ موڑ لیتے ہیں کیونکہ وہ ان کی خواہشات کے موافق اور ان کے مآلوفات سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں اور یہ آیات باطل پر تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں اور یہ اس شرکی تائید نہیں کرتیں جس پر وہ مصرحتے ہیں اور یہ آیات اس سمت پر نہ خود چلتی ہیں اور نہ لوگوں کو چلاتی ہیں جس سمت پر وہ جارہے ہیں۔

فَنَشَرُّہٗۤ بِعَذَابِ اَلِیۡمٍ (۸: ۴۵) ”ایسے شخص کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو“۔ خوشخبری تو کسی اچھے کام پر ہوتی ہے۔ یہاں ان کے لیے بطور استہزاء خوشخبری کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اگر کوئی ڈر لے دالے اور متنبہ کرنے والے کی بات نہیں مانتا تو پھر اگر ہلاکت آتی ہے تو آنے دو ’وہ خود ہلاکت طلب کرتا ہے۔

وَإِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا (۹: ۴۵) ”ہماری آیات میں سے جب کوئی چیز اس کے علم میں آتی ہے تو وہ ان کا مذاق بنا لیتا ہے۔“ یہ جلتے ہوئے کہ یہ اللہ کی آیات اور ان کا سرچشمہ ذات باری ہے۔ یہ رد یہ اس کی جانب سے شدید جسارت ہے۔ یہ تصویر بھی جس طرح جاہلیت لوٹی میں تھی اسی طرح آج بھی موجود ہے۔ اور بے شمار لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ان میں سے بھی ایسے لوگ ہیں جو آیات الہیہ کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور وہ ان آیات اور ان پر ایمان لانے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو بھی جو عوام الناس کی زندگیوں کو ان آیات کے مطابق ڈھالتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (۹: ۴۵) ”ان سب لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔“ اہانت ان کے لیے موزوں سزا ہے کیونکہ یہ بھی تو اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ آیات الہیہ ہیں۔ یہ قیامت کا توہین آمیز عذاب حاضر ہے اگرچہ قیامت کا برپا ہونا تدریجاً بعد میں ہے۔

مِنْ وَرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ (۱۰: ۴۵) ”ان کے پیچھے جہنم ہے۔“ لفظ ”ان کے پیچھے جہنم ہے“ کا ایک خاص مقصد ہے یعنی یہ اسے دیکھ نہیں سکتے کہ انہوں نے قیامت کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس سے ڈرتے اور بچتے اس لیے نہیں کہ یہ غافل ہیں اور اس لیے وہ اس کے اندر گرنے والے ہیں۔

وَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ مَا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ

(۱۰: ۴۵) ”جو کچھ انہوں نے دنیا میں کمایا ہے اس میں سے کوئی چیز ان کے کسی کام نہ آئے گی نہ ان کے وہ سرپرست ہی ان کے لیے کچھ کر سکیں گے جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے اپنا دلی بٹا رکھا ہے۔“ یعنی دنیا میں انہوں نے جو کام کیے یا جو ان کی ملکیت تھی وہ انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔ ان کے اعمال اگرچہ اچھے ہوں وہ تو اکارت جائیں گے۔ کیونکہ ایمان کے بغیر عمل مقبول ہی نہیں۔ اور قیامت میں ان کی ملکیت زائل ہو جائے گی کوئی نہ ان کے پاس ہوگی اور نہ فائدہ دے گی۔ اور ان کے دوست اور یار یا معبود جو اللہ کے سوا انہوں نے بنا رکھے تھے وہ وہاں ان کے لیے نہ نقصان پہنچا سکیں گے اور نہ نفع۔ نہ کسی کو سفارش کی اجازت ہوگی۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۰: ۴۵) ”ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔“ یہ عذاب توہین آمیز بھی ہو گا جیسا کہ پہلے کہا گیا اور عظیم بھی ہو گا۔ توہین آمیز اس لیے کہ یہ آیات کا مذاق اڑاتے تھے اور عظیم اس لیے کہ جرم بڑا ہے۔ یہ عذاب اگر فہم ہوا ہے جس میں آیات الہیہ کے ساتھ مذاق کرنے کی مذمت وارد ہے۔ ان کے مقابلے میں اٹھارہ کرنے کا ذکر ان آیات سے لوگوں کو روکنے کا ذکر ہے۔ خاتمہ پر ان آیات کی حقیقت بیان کی جاتی ہے اور ان کے منکرین کی سزا کا دوبارہ ذکر کر دیا جاتا ہے۔

هَٰذَا هُدًى وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رَّجْزٍ أَلِيمٌ ۝۱۱

”یہ قرآن سراسر ہدایت ہے اور ان لوگوں کے لیے بلا کا دردناک عذاب ہے جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا۔“

اس قرآن کی حقیقت بس یہ ہے کہ یہ ایک رہنمائی ہے۔ خالص ہدایت، صاف صاف ہدایت۔ ایسی ہدایت جس میں ضلالت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اس لیے اس قسم کی آیات کا جو لوگ انکار کرتے ہیں، وہ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ ان کو دردناک عذاب سے دوچار کر دیا جائے۔ الیم کے معنی میں شدت الم اور ایذا رسانی کے معنی ظاہر ہیں۔ رجز کے معنی ہیں عذاب شدید۔ اور جس عذاب کی انہیں دھمکی دی جا رہی ہے، وہ الیم بھی ہے اور شدید بھی۔ یعنی اس کی شدت اور اس کا الم دونوں مکرر و مشدّد ہیں۔ تاکید بعد تاکید ہے اور جو لوگ واضح خالص اور صریح ہدایت کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے ایسا عذاب ہی ہونا چاہئے۔

--- ۰۰۰ ---

اس شدید دھمکی اور سخت ڈراوے کے بعد اب پھر ان کے دلوں کو بادلِ نصیم کی طرح نرم بات سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ انعامات دوبارہ یاد دلائے جاتے ہیں جو اس کائنات میں ان کے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔

اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلُكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ
وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا
فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

”وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار ہو۔ اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا، سب کچھ اپنے پاس سے۔“ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔“

اللہ کی یہ چھوٹی سی مخلوق انسان پر اللہ کے بڑے کرم ہیں کہ اس نے اس کے لیے اس کائنات کی عظیم مخلوقات کو مسخر کر دیا ہے۔ اور ان مخلوقات سے یہ مختلف طریقوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ سمجھایا ہے کہ اس کائنات کا قانون فطرت کیا ہے؟ جس کے مطابق یہ کائنات چلتی ہے اور اس کے خلاف نہیں جاسکتی۔ اگر اللہ کی جانب سے انسان کو اس قدر عظیم صلاحیت نہ دی گئی ہوتی تو اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ان کائناتی قوتوں کو اس طرح مسخر کر کے ان سے اس طرح استفادہ کرتا بلکہ اس کے لیے ان قوتوں کے اندر زندہ رہنا بھی مشکل ہو جاتا کیونکہ انسان ایک چھوٹا سا کیزا ہے اور فطرت کی قوتیں نہایت ہی عظیم القوت، عظیم الجثہ اور بڑے بڑے ہلاک ہیں۔

سمندر ان بڑی قوتوں میں سے ایک ہے جسے انسان نے مسخر کر لیا ہے۔ انسان کو اللہ نے اس کی ساخت اور خصوصیات کا علم دیا اور انسان نے معلوم کیا کہ کشتی اس عظیم اور سرکش سمندر کے اوپر چل سکتی ہے اور اس کی بھری ہوئی جہاز موجوں کے ساتھ کرا سکتی ہے اور اسے ان سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

لَتَجْرِيَ الْفَلَکُ فِيْهِ بِأَمْرِہ (۱۲: ۴۵) ”تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں۔“ اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو یہ خصوصیات دیں اور کشتی کے مواد کو تھرنے کی خصوصیات دیں۔ فضا کے دباؤ، ہواؤں کی تیزی اور زمین کی کشش کی خصوصیات پیدا کیں اور وہ دوسرے خصائص اس میں رکھے جن کی وجہ سے بحری سفر آسان ہوا اور انسان کو اس کام کا علم دیا کہ وہ سمندری مخلوق سے نفع اٹھائے اور دوسرے فوائد بھی حاصل کرے۔

وَلَتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہ (۱۲: ۴۵) ”در تم اس کا فضل تلاش کرو۔“ مثلاً سمندر میں شکار، زیب و زینت کا سامان، تجارت، معلوماتی سفر، تجربات، مشقیں، ورزش اور تفریح وغیرہ۔ غرض وہ سارے فوائد جو یہ چھوٹا سا انسان سمندروں سے حاصل کرتا ہے۔

غرض اللہ نے انسان کے لیے کشتی اور سمندر دونوں کو مسخر کیا کہ وہ اللہ کے فضل کی تلاش کرے۔ پھر اللہ کا شکر کرے کہ اللہ نے یہ فضل و کرم، یہ انعامات اور یہ تسخیر اور یہ علم اسے دیا۔

وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۱۲: ۴۵) ”اور تم شکر گزار بنو۔“ اللہ تعالیٰ پھر اس قرآن کے ذریعہ انسان کو ہدایت کرتا ہے کہ اس دلت باری کی وقاداری کرو، اس سے تعلق قائم کرو، اور یہ بات معلوم کرو کہ تمہارے اور اس کائنات کے درمیان ایک تعلق ہے اور وہ یہ کہ تم اس کا حصہ ہو اور ایک ناموس فطرت کے تحت چل رہے ہو اور تم دونوں کا رخ اللہ ہی کی طرف ہے۔

سمندروں کی تسخیر کے خصوصی دکر کے ساتھ یہ پوری کائنات بھی بالعموم تمہارے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ زمین اور آسمانوں کے درمیان پائے جانے والی تمام قوتیں، نعمتیں اور معید چیزیں جو اس کے لیے فرائض منصب خلافت کی ادائیگی میں مفید و معاون ہیں۔

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہ (۱۳: ۴۵) ”اس نے زمین اور آسمان کی ساری ہی چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دیں، سب کچھ اپنے پاس سے۔“ اس کائنات میں جتنی چیزیں بھی ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں اور اسی کی ہیں۔ وہی ان کا پیدا کرنے والا اور مدبر ہے۔ اس نے ان کو مسخر کر رکھا ہے۔ اور ان پر اس چھوٹی سی مخلوق کو مسلط کر دیا ہے۔ انسان جسے اللہ نے اس کائنات کے مزاج اور اس کے قوانین کو سمجھنے کی قوت دی اور وہ اپنی قوت اور طاقت سے کہیں بڑی قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔ یہ سب کام اللہ کا فضل و کرم ہے۔ اس انسان پر اور جو لوگ فکر اور تدبر سے کام لیتے ہیں ان کے لیے اس میں آیات و نشانات ہیں بشرطیکہ وہ اپنی اس عقل سے یہ فائدہ بھی اٹھائیں کہ اس کائنات اور اس انسان کا ایک پیدا کرنے والا بھی ہے جس نے اسے یہ سب کچھ دیا ہے اپنے کرم خاص سے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۳: ۴۵) ”اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔“ یہ فکر اور یہ تدبر اس وقت تک صحیح جامع اور گہرا نہ ہو سکے گا جب تک وہ ان قوتوں، مسخر شدہ قوتوں کے پیچھے اس بڑی قوت کی طرف جھانکنے کی کوشش نہ کرے گا، جس نے ان تمام قوتوں کو پیدا کیا

اور جس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر انسان کو ان رازوں سے آگاہ کیا کہ ان کا راز یہ ہے اور ان کا قانون قدرت یہ ہے۔ اور فطرت کائنات اور فطرت انسان ایک ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان یہ تعلق ہے۔ اس تعلق کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان کو علم حاصل ہوا اسے قوت اور کنٹرول حاصل ہوا اس نے ان قوتوں کو مسخر کر کے اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔ اگر یہ تعلق نہ ہوتا تو انسان کو ان چیزوں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔

--- ۰۰۰ ---

جب بات یہاں تک پہنچی ہے اور ایک مومن اس کائنات کے قلب تک جا پہنچتا ہے۔ اسے شعور حاصل ہو جاتا ہے کہ قوت کا حقیقی سرچشمہ کیا ہے، یہ کہ اس کائنات کے اسرار و رموز کی آگاہی دراصل قوت کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ اب مومنین کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ شرافت، اخلاق عالیہ، وسعت قلبی اور رواداری اختیار کریں اور جو ضعیف، ناتواں اور جاہل لوگ اس خزانے اور اس بھرپور خزانہ علم و معرفت سے محروم ہیں، ان پر رحم کریں، ان کے ساتھ ہمدردی کریں کہ یہ لوگ ان عظیم خالق سے محروم ہیں۔ جو اللہ کے نواہیں فطرت کو نہیں دیکھتے، جو تاریخ میں سنن الہیہ کو تلاش نہیں کرتے جو اس کائنات کے اسرار و رموز سے واقف نہیں اور اس لیے وہ ان خالق کی عظمت سے بھی بے خبر ہیں۔

۱۔ قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿۱۵﴾

”اے نبی! ایمان ماننے والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے برے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے، ان کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔ جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو برائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ پھر جانا تو سب کو اپنے رب ہی کی طرف ہے۔“

اہل ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ جو لوگ اللہ کے عذاب سے نہیں ڈرے، ان سے درگزر کرو اور ان کے ساتھ دشمنی کی بجائے ہمدردی کا رویہ اختیار کرو۔ اور شریفانہ اور اخلاق عالیہ کا رویہ اختیار کرو۔ درگزر کرو اور ان پر رحم کرو کہ وہ مساکین ہیں۔ وہ علم و ہدایت اور قوت اور رحمت کے اصل سرچشمے سے محروم ہیں۔ یہ ایمان ہی کا سرچشمہ ہے جو انسان کو غنی، قوی اور رحیم و کریم بنا دیتا ہے۔ انسان اسی پر بھروسہ کرتا ہے، مطمئن ہوتا ہے اور مشکل اوقات میں اس کے سامنے سرسبز ہوتا ہے اور اس کے سہارے آہ و فغاں کرتا ہے۔ پھر یہ لوگ ان قوانین فطرت اور سنن الہیہ سے بہن ناواقف ہیں جن کے نتیجے میں انسان کو ہر قسم کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اہل ایمان چونکہ ایمان کے خزانے تک رسائی حاصل کر چکے ہیں اور اس کے ذریعہ ان کو مادی اور روحانی اطمینان حاصل ہے اور وہ ایک برتر پوزیشن میں ہیں اس لیے ان کے شایان شان یہ ہے کہ وہ عفو و درگزر سے کام لیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس درگزر کے نتیجے میں اہل ایمان کا رویہ یہ ہو گا کہ وہ تمام معاملات اللہ کے حوالے کر

دیں گے جو محسن کو اس کے احسان کی جزاء دے گا اور بدکار کو اس کی بدکاریوں پر سزا دے گا۔ غنودہ درگزر کی بجائے اگر نکل ایمان ان پیاروں کے ساتھ سختی کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو وہ اس نیکی سے محروم ہو جائیں گے بشرطیکہ اس غنودہ درگزر کی پالیسی کے نتیجے میں امن و امان کو خطرہ لاحق نہیں ہوتا اور لوگ حدود اللہ پر دست درازی میں جری نہیں ہو جاتے ہوں۔

لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۴۵: ۱۴) ”تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔“ اور اس کے بعد یہ بھی تصریح کر دی جاتی ہے کہ جزاء و سزائیں ہر شخص اپنے کئے کا ذمہ دار ہے۔ لہذا ہر شخص کو اللہ کے سامنے حاضری دینے کے وقت کی فکر کرنی چاہئے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ

(۴۵: ۱۵) ”جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو برائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا غمناک بنے گا۔ پھر جانا تو سب کو اپنے رب ہی کی طرف ہے۔“ یوں ایک مومن کا سینہ فراخ ہوتا ہے۔ اس کی سوچ بلند ہوتی ہے۔ وہ انفرادی مشکلات بھی برداشت کرتا ہے اور امتوں کی حماقتیں بھی برداشت کرتا ہے اور اندھے اور محروم لوگوں کے طرز عمل کو بھی برداشت کرتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کمزور ہوتا ہے اور لٹنٹ کا بھوکا پتھر سے نہیں دے سکتا۔ یہ برداشت وہ تنگ دلی سے نہیں بلکہ وسعت قلبی سے کرتا ہے۔ کیونکہ وہ مضبوط کردار اور کھلے دل کا مالک ہوتا ہے۔ اور اس نے ان محروم لوگوں کے لیے بھی ہدایت کی مشعل اٹھا رکھی ہوتی ہے۔ اس نے پیاروں کے لیے شفا یابی کا تریاق اٹھا رکھا ہوتا ہے۔ اور وہ اس پر اجر کا طالب صرف اللہ سے ہوتا ہے اور آخر کار تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور ہدایت اور رہنمائی کا سرچشمہ بھی اللہ ہی ہے۔ اور اس کی طرف لوٹنا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اب انسانیت کے لیے مومن قیادت کے کردار کے موضوع پر بات ہوتی ہے۔ یہ قیادت اب اسلامی جماعت کی شکل میں وجود میں لانی چاہیے۔ اس سے پہلے یہ بنی اسرائیل کے ہاتھ میں تھی۔ ان کو کتاب دی گئی۔ حکومت دی گئی۔ نبوت دی گئی مگر انہوں نے اختلافات شروع کر دیئے۔ اور ان سے یہ قیادت اور منصب لے کر لے محمدؐ آپ کو دے دیا گیا ہے۔ اس وقت آپ مکہ میں تھے۔ اور دعوت اسلامی نہایت ہی مشکل دور سے گزر رہی تھی لیکن آدم علیہ السلام سے ادھر اس کا مزاج اس کی نوعیت اور مقاصد اور ہم ایک ہی رہی ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنَاهُمْ

مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۱۶﴾ وَآتَيْنَاهُمْ بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَمَا

اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي

بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ

شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعُهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٦٥﴾ إِنَّهُمْ
لَن يَخْشَوْنَكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ
وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ ﴿١٦٦﴾ هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ
يُوقِنُونَ ﴿١٦٧﴾

”اس سے پہلے بنی اسرائیل کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی۔ ان کو ہم نے عمدہ سامان زیست سے نوازا، دنیا بھر کے لوگوں پر انہیں فضیلت عطا کی اور دین کے معاملہ میں انہیں واضح ہدایات دے دیں۔ پھر جو اختلاف ان کے درمیان رونما ہوا وہ (ناواقفیت کی وجہ سے نہیں بلکہ) علم آجانے کے بعد ہوا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اللہ قیامت کے روز ان معاملات کا فیصلہ فرمادے گا جن میں وہ اختلافات کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد اب اے نبی، ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آ سکتے۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں، سب لوگوں کے لیے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو یقین لائیں۔“

اسلام سے قبل تحریک اسلامی کی قیادت بنی اسرائیل کے پاس تھی۔ آسمانی ہدایت اور عقیدہ کے حامل یہی تھے۔ اور اللہ نے اس دور کے لیے یہ مشن ان کے سپرد کر دیا تھا۔ کیونکہ انسانیت کے لیے ہر دور میں آسمانی رہنمائی کی ضرورت رہی ہے۔ اس لئے کہ زمین کے اندر جو بھی قائدین رہے ہیں وہ خواہشات نفسانیہ کے پیروکار، جاہل اور تفصیرات سے پر رہے ہیں اس لیے وہ انسانوں کے لیے جو قانون اور شریعت بناتے رہے ہیں۔ وہ ایسی ہی پر تفصیر رہی۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اس لیے اللہ کی شریعت ہی ایسی ہو سکتی ہے جو جہل، ہوائی خواہشات اور تفصیرات سے پاک ہو سکتی ہے۔ اس لیے سب لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ کسی کا حامی اور کسی کا مخالف نہیں ہے۔ اور اللہ جہل، تصور اور خواہشات سے پاک ہے۔ وہ زیادہ جانتا ہے اور لطیف و خبیر ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَآءَ يِلَّ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (۱۶: ۴۵) ”اس سے پہلے بنی اسرائیل کو ہم نے کتاب، حکم اور نبوت عطا کی تھی۔“ تورات ان کو دی گئی جس میں اللہ کی شریعت تھی۔ اور اس میں یہ احکام تھے کہ شریعت کو قائم کرو اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی نبوت اور حکومت ان میں جاری رہی کہ شریعت کو قائم کرو اور ان کے اندر دوسری اقوام کے مقابلے میں بے شمار نبی بھیجے گئے۔

وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ (۱۶: ۴۵) ”ان کو ہم نے عمدہ سامان زیست سے نوازا۔“ ان کی حکومتیں اور ان کی نبوتیں ارض مقدس تک محدود رہیں۔ یہ سرزمین فرات اور نیل کے درمیان ایک پاک سرزمین تھی۔

وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعُلَمِينَ (۱۶:۴۵) ”اور دنیا بھر کے لوگوں پر ان کو ہم نے فضیلت عطا کی۔“
اس مرکزی مقام پر ربانی ہدایت کے حامل ہونے کے ناطے اس وقت یہ تمام عالم پر برتر قوم تھے اور ان کی افضلیت کی بڑی دلیل یہ تھی کہ وہ حاملین شریعت تھے اور ان کو حکومت اور نبوت دی گئی تھی۔

وَآتَيْنَاهُم بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْأَمْرِ (۱۷:۴۵) ”اور دین کے معاملے میں انہیں واضح ہدایات دے دیں۔“
جو شریعت انہیں دی گئی وہ دو ٹوک اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی تھی۔ اس میں کوئی بات ناقابل فہم، پیچیدہ، ٹیز مٹی اور صحیح راہ سے منحرف نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے اس شریعت کے اندر جو اختلافات کیے اور فرقے بنے اس کا کوئی جواز نہ تھا۔ انہوں نے جو تفرقہ کیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ شریعت اور دین سمجھے نہ تھے یا یہ کہ وہ جاہل تھے اور انہیں صحیح بات اور حق معلوم نہ تھا۔

فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدَ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ (۱۷:۴۵) ”پھر جو اختلافات ان کے درمیان واقع ہوئے وہ جانتے ہوئے کیے گئے۔ ان کے درمیان حد درجہ حسد اور بغض پیدا ہو گیا تھا۔ اور باہم نزاع اور ایک دوسرے پر مظالم اٹھاتے ہوئے یہ اختلافات کیے گئے، باوجود اس بات کے کہ وہ صحیح بات جانتے تھے۔“

بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۱۷:۴۵) ”اس بنا پر ہوا کہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔“ یوں زمین پر ان کی قیادت ختم ہو گئی اور اللہ نے ان کو جو خلافت ارضی عطا کی تھی ان سے چھین لی گئی اور اختلافات کا آخری فیصلہ تو اللہ کرے گا۔

إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۱۷:۴۵) ”اللہ قیامت کے روز ان معاملات کا فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ اختلافات کرتے رہے ہیں۔“
اس کے بعد اللہ نے رسالت جدیدہ کو خلافت ارضی کا مقام عطا فرمایا، جو قوم کو اللہ کی شریعت کی طرف لوٹائے گی اور تمام معاملات میں اللہ کی قیادت اور برتری قائم کرے گی۔ اور دنیا میں اللہ کی شریعت کے مطابق نظام قائم کرے گی، بندوں کی خواہشات کے مطابق نہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

(۱۸:۴۵) ”اس کے بعد اب اے نبی، ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ پر قائم کیا لہذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو، جو علم نہیں رکھتے۔“ یوں یہ معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے یا تو اللہ کی شریعت ہوگی یا ان لوگوں کی خواہشات ہوں گی جو نہیں جانتے۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہے۔ یا تو سیدھی اور مستقیم شریعت اور شاہراہ ہے اور یہ پھر لوگوں کی ہدایتی ہوئی خواہشات ہیں۔ اور ان کے درمیان تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جو قوم شریعت کو چھوڑتی ہے، وہ اپنی خواہشات کی پوجا کرتی ہے کیونکہ شریعت کے سوا جو بھی ہے وہ ان لوگوں کی ہوا و ہوس ہے

جو نہیں مانتے۔

اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے ڈرتا ہے کہ آپ ان لوگوں کی خواہشات کی اطاعت نہ کریں جو نہیں جانتے۔ اگر آپ نے یہ کام کیا تو یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں آپ کو کوئی فائدہ نہ دے سکیں گے۔ یہ لوگ تو ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کرتے ہیں۔ اگر اللہ کے دین اور شریعت کو نہ ماننے والے یہ لوگ ایک دوسرے کے جگری دوست بھی بن جائیں اور ایک دوسرے کو بھی یہ آپ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ اے پیغمبر آپ کے مولیٰ تو اللہ ہے۔

اِنَّهُمْ لَنُغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَّاللّٰهُ وَلِیُّ

الْمُتَّقِیْنَ (۱۹: ۴۵) ”اس کے بعد اے نبی ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہذا تم اس پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتے۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے۔“

یعنی ایک طرف شریعت ہے جو ظلم و حکمت پر مبنی ہے اور دوسری جانب خواہشات نفسانیہ ہیں جو جہالت پر مبنی ہیں اور جاہلیت ہیں۔ ایک داعی کو چاہئے کہ وہ شریعت کا اتباع کرے اور ساری راقی خواہشات کو چھوڑ دے۔ داعی کا فرض ہے کہ وہ شریعت سے ادھر ادھر نہ ہو کیونکہ ذاتی خواہشات رکھنے والے لوگ اللہ کے مقابلے میں کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ وہ تو داعی کے مخالف ہوتے ہیں اور سب مل کر مخالفت کرتے ہیں اور وہ شریعت کی مخالفت میں ایک دوسرے کے مدد و معاون ہوتے ہیں، لہذا داعی کو ظالموں اور جاہلوں سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ پھر یہ کہ یہ ظالم کسی داعی کی مدد بھی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ تو ان کی خواہشات کے خلاف ہے لیکن وہ اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ وہ سچے داعی کو نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ داعی کا ولولہ وارث اللہ ہوتا ہے اور جس کا والی وارث اللہ ہو، اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ لو انسان ضعیف کمزور ہوتے ہیں، جن کی کوئی قوت نہیں ہوتی جبکہ اللہ کے دوست مسلمان ہوتے ہیں اور وہ قوی ہوتے ہیں۔ اس فیصلہ کن بیان پر مزید تبصرہ یہ ہے کہ قرآن دو ٹوک اور فیصلہ کن باتیں کرتا ہے اور قرآن کی ان دو ٹوک باتوں سے یقین نصیب ہوتا ہے جو انسان کو بصیرت اور ہدایت دیتا ہے۔

هٰذَا بَصٰٓئِرٌ لِلنَّاسِ وَهُدًی وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّوقِنُوْنَ (۲۰: ۴۵) ”یہ بصیرت کی

روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لئے جو یقین لائیں۔“ قرآن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ لوگوں کے لئے بصیرت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کے اندر گہری بصیرت ہے اور روشنی ہے۔ قرآن بذات خود بصیرت اور روشنی ہے جس طرح بصیرت اور روشنی انسانوں کے لیے دیکھنے اور سمجھنے کا ذریعہ ہوتے ہیں تو قرآن بذات خود بصیرت و ہدایت ہے اور یہ بذات خود رحمت ہے، لیکن قرآن کے اندر یہ صفات تب نظر آئیں گی اور اس سے یہ فوائد جب حاصل ہوں گے جب کسی کے اندر ذوق یقین پیدا ہو۔ انسان کے اندر اس قدر یقین ہو جائے جس کے اندر شک کا شبہ ہی نہ ہو۔ اس کے اندر کوئی بے چینی نہ ہو، اور دل میں کوئی غش نہ ہو۔ جب قلب کو یقین حاصل ہو جائے اور اسے پورا وثوق حاصل ہو جائے تو اس کے اندر پھر کوئی تزلزل نہیں ہوتا۔ وہ پھر شرف شرف نہیں کرتا۔ ادھر ادھر نہیں ڈالتا، اس

کی راہ پھر واضح ہو جاتی ہے۔ اسے اپنی منزل دور افق پر بلند نظر آتی ہے۔ اس کا مقصد متعین ہو جاتا ہے۔ طریق کار متعین اور استوار ہو جاتا ہے۔ اب پھر قرآن اس کے لیے نور بصیرت بن جاتا ہے، ہدایت بن جاتا ہے اور رحمت بن جاتا ہے بشرطیکہ یقین محکم ہو۔

اس بیان کے بعد کہ ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ متعین کے دلی ہیں۔ اور یہ کہ قرآن مجید متعین کے لیے نور بصیرت ہے اور یقین کرنے والوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور جو لوگ نیک کام کرتے ہیں، یعنی مومن ان کے درمیان بنیادی فرق ہے اور اللہ کے ہاں دونوں کا ایک مقام نہیں ہو سکتا۔ نہ دونوں کا ایک جیسا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کے ترازو میں دونوں کے درمیان فرق ہے۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کے اس نظام کو حق اور عدل پر قائم کر رکھا ہے۔ اور اس کائنات کے نقشے میں سچائی بنیادی اور اساسی عنصر ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ ابْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ

كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿۱۰﴾

وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ

لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۱﴾

”کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے؟ بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔ اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے، لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔“

ہو سکتا ہے کہ یہاں بدکاروں سے مراد اہل کتاب ہوں جنہوں نے اپنی کتاب سے روگردانی کی اور برائیوں کا ارتکاب کیا۔ اور سمجھتے ہی رہے کہ وہ حقیقی مومن ہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو اہل ایمان کے برابر سمجھتے ہیں جبکہ وہ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور مومنین نیکوں کے کام کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں گروہ اللہ کے ہاں برابر ہو سکتے ہیں؟ خواہ اس دنیا کا معاملہ ہو یا آخرت کا موازنہ ہو؟ اور اس سے مراد عام اصول بیان کرنا بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کے پیاروں کے مطابق نیک کام کرنے والے برے کام کرنے والے آپس میں برابر نہیں ہو سکتے، نہ اس دنیا میں نہ آخرت کے حساب و کتاب میں۔ مومنین کا پلڑا ایسا ہی ہو گا اور آخرت میں بھی بھاری ہو گا۔ اور یہ اصول اللہ کی اس کائنات کے نقشے میں ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتا ہے۔ اس پوری کائنات کی تخلیق حق پر ہوتی ہے۔ شریعت کی تشکیل بھی حق پر ہوتی ہے۔ جس چیز کے ساتھ یہ کائنات قائم ہے، وہ توازن اور اعتدال ہے اور اسی اصول پر انسانی زندگی بھی قائم ہے یعنی عدل و انصاف جس کا اہتمام اچھے کام کرنے والوں اور برے کام کرنے والوں کے درمیان فرق کر کے کیا گیا۔ اور ہر شخص کو اس کے کئے کی جزا و سزا دی گئی اگر وہ نیک ہو یا اگر وہ برا۔ تاکہ تمام لوگوں کے ساتھ انصاف کیا جاسکے۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۴۵: ۲۲) ”اور لوگوں پر ہرگز ظلم نہ کیا جائے گا۔“ یہ مفہوم کہ اس کائنات کی تخلیق کے اصل نقشے میں حق بنیادی چیز ہے۔ اور یہ کہ جس طرح کائنات کے اندر حق ہے اسی طرح شریعت کے اندر حق ہے اور یہ کہ یوم الحساب میں اسی حق پر حساب و کتاب ہو گا۔ یہ مفہوم اور مضمون قرآن میں بار بار آتا ہے کیونکہ یہ اسلامی تصور حیات کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ تمام شاخیں اس اصول پر مبنی ہیں۔ انسانی نفس، آفاق کائنات اور اسلامی شریعت سب اس سچائی پر مبنی ہیں۔ یہی ہے ”کائنات، حیات اور انسان اور انسان اسلام کی نظریں“ میری فکر کتاب کا موضوع۔ یہ ان شاء اللہ جلد پیش ہوگی۔

--- ○ ○ ○ ---

اب اس عظیم اصول کے بالمقابل اور شریعت کے بالمقابل لوگوں کی خواہشات ہوتی ہیں جو بدلتی رہتی ہیں۔ ان خواہشات کو لوگ اپنا اللہ بنا لیتے ہیں، ایسے لوگ گمراہی میں اس قدر دور چلے جاتے ہیں کہ ان کی ہدایت کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ
عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاةً فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ
أَقَلَّا تَذَكَّرُونَ ﴿۲۳﴾

”پھر کیا تم نے بھی اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مرگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے؟“

انسان جب اسلام کا عظیم اصول اتباع شریعت ترک کر دیتا ہے تو پھر اس کی جو حالت ہوتی ہے قرآن کریم اس کی خوب تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ شخص اپنی بدلتی ہوئی خواہشات کے تابع ہے۔ یہ اپنی خواہشات کے سامنے سجدہ ریز ہے اور ان کا مطیع فرمان ہے۔ اس کے تصورات، اس کے احکام، اس کی سوچ اور اس کی حرکات، اس کی خواہشات کے زوایہ سے ہوتی ہیں۔ یہ ان کو اس طرح پوچھتا ہے جس طرح کوئی کسی بت کو پوچھتا ہے۔ یہ خواہشات کے اشارات کے پیچھے دوڑتا ہے۔ قرآن ایسے لوگوں کی یہ تصویر کشی بڑی ناہنیدگی سے کرتا ہے۔

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ (۴۵: ۲۳) ”پھر کیا تم نے بھی اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا؟“ کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے؟ یہ شخص ایک لکی عجیب مخلوق ہے جو تماشا کے قائل ہے کہ اس کا تماشا دیکھا جائے۔ یہ شخص اللہ کے سامنے اپنے آپ کو ضلالت کا مستحق ثابت کر دیتا ہے۔ اب اللہ ایسے شخص پر ہدایت کی رحمت نازل ہی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کے دل میں ہدایت کی جگہ ہی باقی نہیں رہی ہے اس لئے کہ وہ

اپنی خواہش کو بردت پختا رہتا ہے۔

وَ أَضَلُّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ (۲۳:۴۵) ”اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا ہے۔“
اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ اللہ نے علم کے مطابق جانتے ہوئے اسے ضلالت میں پھینک دیا۔ اس لیے کہ یہ ضلالت کا مستحق ہو گیا تھا۔ یا یہ کہ وہ اپنے طور پر عالم ہونے کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا گیا۔ اور اس کے علم و معرفت نے اس کو اس بات سے نہ روکا کہ وہ اپنی خواہشات کو الٹے بنائے۔ یوں پھر اللہ نے اسے بھی ڈھیل دے دی اور گمراہی میں پھینک دیا۔

وَ خَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَ قَلْبِهِ وَ جَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشْوَةً (۲۳:۴۵) ”اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔“
مذاوہ تمام روشن دان بند ہو گئے جن سے روشنی اندر آتی تھی اور وہ درکات بے کار ہو گئے جن کے ذریعہ سے ہدایت کسی شخص کے دل و دماغ میں داخل ہو سکتی تھی۔ اور انسان نے خواہشات نفسانیہ کو اس طرح قبول کرنا شروع کر دیا کہ حصول ہدایت کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔

فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنَ بَعْدِ اللَّهِ (۲۳:۴۵) ”اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے؟“۔ ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ اللہ کے سوا اور تو کوئی کسی کی ہدایت اور ضلالت کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ یہ تو اللہ کا خصوصی اختیار ہے اس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے مختار رسولوں کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی کو ہدایت دے دیں۔

أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (۲۳:۴۵) ”کیا تم لوگ سبق نہیں لیتے؟“۔ جس نے سبق لیا وہ ہوشمند رہا اور متنبہ ہو گیا۔ اور وہ ہوائے نفس کے پھندے سے آزاد ہو گیا اور ایک واضح اور مستقل منہاج پر گامزن ہو گیا جس پر چلنے والے کبھی گمراہ نہیں ہوتے۔

---○○○---

درس نمبر ۶۳۶ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری پیراگراف ہے۔ اس میں آخرت کے حساب و کتاب اور حشر و نشر کے بارے میں مشرکین کے عقائد و خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس پر تردید کے لیے خود ان کے وجود کو پیش کیا گیا ہے کہ آخر تم موجود ہو اور کوئی تمہیں اٹھائے ہوئے ہے۔ اس سے تو تم انکار نہیں کر سکتے ہو۔ اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ قیام قیامت کا وقت تو اگرچہ معلوم نہیں ہے لیکن وہاں تمہارے ساتھ یہ کچھ ہونے والا ہے اور یہ منظر نہایت ہی موثر کلمات میں پیش کیا جاتا ہے۔

سورت کا خاتمہ الحمد للہ پر ہوتا ہے کہ اللہ واحد ہے 'وہ رب ہے' تمام جنان والوں کا رب ہے۔ اس کی عظمت اور اس کی کبریائی بہت ہی بڑی ہے اور تمام آسمانوں اور زمینوں میں وہ مفرد ہے۔ کوئی اس کے مقابل کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کوئی اس کی بادشاہت میں دست درازی نہیں کر سکتا اور وہ عزیز و حکیم ہے۔



درس نمبر ۶۳۶ تشریح آیات

۲۲۔۔۔ تا۔۔۔ ۳۷

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُم بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۲۲﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا اتُّخِفْنَا بِهَا إِنَّا كُنَّا صَادِقِينَ ﴿۲۳﴾ قُلِ اللَّهُ يُخَيِّكُم مِّمَّنْ يُؤْمِنُ ثُمَّ يُجَمِّعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَ لَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۴﴾

”یہ لوگ کہتے ہیں کہ ”زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے“ ہمیں ہمارا مرنا اور جینا ہے اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔“ درحقیقت اس معاملہ میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں اور جب ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔ لے بی“ ان سے کہو اللہ ہی ہمیں زندگی بخشا ہے پھر وہی ہمیں موت دیتا ہے پھر وہی تم کو اس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔“

قیامت کے بارے میں ان کا نظریہ اس قدر کوتاہ بینی پر مبنی تھا کہ ان کے نزدیک زندگی بس یہی تھی جسے وہ اس زمین پر گزرتی دیکھ سکتے تھے۔ ایک نسل ہے جو پیدا ہوتی ہے اور گزرتی چلی جاتی ہے۔ بظاہر موت کوئی چیز نہیں ہے سوائے اس کے کہ وقت گزرتا ہے اور ہم مرتے ہیں اور زمانہ لپیٹتا چلا جاتا ہے۔ گویا یہ زمانہ ہے جو تمام فیصلے کرتا ہے اور ان پر موت طاری کرتا ہے اور وہ مرجاتے ہیں۔

یہ ایک سطحی نظریہ تھا۔ صرف ظاہری حالات کو دیکھ کر اسے اختیار کیا گیا تھا ”زندگی کے پیچھے جو اسرار و رموز تھے ان کو تلاش کرنے کی اس میں کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔ سوال یہ تھا کہ زندگی کہاں سے آگئی؟ اور کون ہے جو زندگی واپس لے لیتا ہے۔ موت کچھ متعین دنوں کے بعد تو نہیں آ جاتی کہ انہوں نے زمانے کے ساتھ موت کو وابستہ کر دیا۔ بچے بھی بوڑھوں کی طرح مرتے ہیں اور صحت مند لوگ بھی تو مرتے ہیں۔ جس طرح پیار لوگ مرتے ہیں۔ ضعیف لوگوں کی

طرح بنے کئے بھی مرتے ہیں۔ لہذا اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو زمانے کا تعلق موت و حیات سے نہیں ہے۔ بشرطیکہ کوئی موت کی حقیقت کو جانتا چاہے۔ چنانچہ کہا گیا:

وَمَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (۴۵: ۲۴) ”در حقیقت اس معاملے میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض گمان کی بنا پر باتیں کرتے ہیں۔“ یہ محض ظن و تخمین کے پائے چوبین پر چل رہے ہیں۔ ان کے خیالات بجھے ہوئے ہیں اور ان کے نقوش و خندے ہیں۔ گہرے غور و فکر پر مبنی نہیں ہیں، نہ کسی علم پر مبنی ہیں۔ اس کائنات کے حقائق کا ادراک ان کو نہیں۔ موت و حیات کے جو حالات انسان پر طاری ہوتے ہیں، یہ ان کے صرف سطحی اسباب دیکھتے ہیں۔ حقیقی اسباب نظروں سے لوجھل ہیں۔ انہوں نے صرف اس قدر معلوم کیا ہے کہ زیادہ دن گزرنے کے بعد انسان کمزور ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔

وَإِذَا تَلَّیٰ عَلَیْهِمْ آیتُنَا بَیِّنَاتٍ مَا کَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا ائْتُوا بِآبَائِنَا إِنْ کُنْتُمْ

صَادِقِیْنَ (۴۵: ۲۵) ”اور جب ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔“ ان کی یہ بات بھی نہایت سطحی سوچ پر مبنی ہے اور اس سے پہلے انہوں نے اس کائنات کے قوانین فطرت کا مطالعہ نہیں کیا۔ اس دنیا میں اللہ نے حیات و ممات کے لیے جو نظام تحریر کیا ہے اور ان کے جو اسرار و رموز مقررہ کیے ہیں، ان پر انہوں نے گہرے انداز میں نہیں سوچا۔ اس کے اندر گہری حکمت کار فرما ہے۔ لوگ اس جہاں میں آتے ہیں اور آتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ کے نظام میں ان کو یہاں فرصت عمل مہیا کی جا رہی ہے۔ مرنے کے بعد ان کو ایک مقررہ وقت پر دوبارہ اٹھایا جائے گا اور یہاں انہوں نے جو کچھ کیا، اس پر ان کو حساب و کتاب دینا ہو گا۔ لہذا حشر و نشر سے پہلے اللہ کے نظام کے مطابق اسیں یہاں نہیں اٹھایا جاسکتا۔ قیامت کے مقررہ دن سے پہلے یہاں ان کا اٹھانا حکمت آزمائش کے خلاف ہے۔ بعض لوگ یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہر چہ قبل از وقت آڈٹ کر دیا جائے۔ لیکن اللہ کا اپنا کام اور نظام ہے اور اس کی اپنی حکمت اور اسیم ہے۔ جس کے لوہے یہ پوری کائنات قائم ہے۔ لہذا اس احمقانہ تجویز کے مطابق اللہ کی پوری اسیم کو نہیں بدلا جاسکتا۔ یہ قرآنی استدلال کا کوئی معقول جواب دینے کی بجائے بس یہ کہتے ہیں:

اِئْتُوا بِآبَائِنَا إِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ (۴۵: ۲۵) ”کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔“

سوال یہ ہے کہ اللہ وقت مقررہ سے پہلے ان کے باپ دادا کو کیوں اٹھالائے۔ اس معاد سے قبل جو اس نے اس پوری کائنات کے لیے مقرر کر رکھی ہے؟ محض اس لیے کہ ان کو یہ یقین آجائے کہ اللہ مردوں کو دوبارہ اٹھا سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ اپنی سنت کے مطابق ان کی آنکھوں کے سامنے ہر لمحہ اور ہر لحظہ زندگی کو اٹھا سیں رہا ہے۔

قُلِ اللّٰهُ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یَجْمَعُکُمْ اِلَیَّ یَوْمَ الْقِیَمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ (۴۵: ۲۶)

”ان سے کہو کہ اللہ ہمیں زندگی بخشا ہے۔ پھر وہی ہمیں موت دیتا ہے۔ پھر وہی تم کو اس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے۔“ یہی تو وہ معجزہ ہے جسے وہ اپنے آباؤ اجداد کے لئے آنے میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ ان کی آنکھوں کے سامنے واقع نہیں ہو رہا ہے۔ بینہ وہی معجزہ۔ اللہ ہی تو ہے جو انسان کو پیدا کیے جا رہا ہے۔ وہی تو ہے جو مارتا ہے۔ آخر میں اس میں کیا انہونی بات ہے کہ اللہ قیامت کے دن دوبارہ جمع کرے گا۔ اس میں آخر کیوں وہ شک میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ جس چیز سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے۔ اس کی نظیر خود ان کی زندگی ہے۔

وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۴۵: ۲۶) ”مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔“ اللہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو کنٹرول کرنے والا ہے۔ وہ ہر چیز کو بنانے والا ہے۔ وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے اگر اس نے پہلے پیدا کیا ہے اور تم مانتے ہو کہ کیا ہے لیکن اللہ ان کے سامنے منطقی دلائل کی بجائے ایک منظر پیش فرماتا ہے :

وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُومِنُ
يَخْسِرُ الْمُبْطِلُونَ ﴿۲۷﴾ وَتَرَى كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَى إِلَى كِشْفَتِهَا
الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۸﴾

”زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے“ اور جس روز قیامت کی گھڑی آگھڑی ہوگی اس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے۔ اس وقت تم ہر گردہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے۔ ہر گردہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامہ اعمال دیکھے۔ ان سے کہا جائے گا: ”آج تم لوگوں کو ان اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے رہے تھے۔“ آیت میں پہلے تو ان کے انجام کا فیصلہ جلدی سے بتا دیا گیا کہ اس دن یہ لوگ عظیم خسارے سے دوچار ہوں گے لیکن فیصلہ سننے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عظیم اور وسیع دعریض میدان ہے۔ اس میدان میں اولین اور آخرین تمام امتیں جمع ہیں۔ جو شخص کبھی اس کرۂ ارض پر زندہ رہا ہے۔ تھوڑی عمر لی ہو یا زیادہ، یہ سب موجود ہیں۔ بحرین گھٹنوں کے بل گرے ہیں۔ گردہ در گردہ جمع ہیں۔ اور حساب کی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ منظر بہت ہی خوفناک ہے کہ تمام انسان لگے اور پچھلے ایک ہی میدان میں جمع ہوں گے۔ پھر یہ خوفناک اس لیے بھی ہو گا کہ لوگوں کی ویسٹ کڈائی خوفناک ہوگی کہ سب گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔ پھر یہ خوفناک اس لیے بھی ہو گا کہ سخت حساب و کتاب ہونے والا ہو گا۔ اور پھر یہ اس لیے بھی خوفناک ہو گا کہ اللہ جبار و قہار کا دربار ہو گا۔ جو حقیقی منعم اور فضل و کرم کرنے والا ہے۔ جس کے فضل و کرم کا شکر ادا نہیں کیا گیا اور نہ اس کے فضل و کرم کو لوگوں نے پہچانا ہے۔

اس کے بعد اس بد حال گردہ بحرین سے کہا جائے گا جن کا منہ خشک ہو گا اور سانس ہی ہوگی :

هَذَا كَيْفَ نَطِيقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۹﴾

”یہ ہمارا تیار کر لیا ہوا اعمال نامہ ہے جو تمہارے اوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے جو کچھ بھی تم کرتے تھے اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے۔“

اب ان کو معلوم ہو گا کہ اس اعمال نامے سے کوئی چھوٹی بڑی شے رہ نہیں گئی۔ اس لیے کہ ہر چیز اللہ کے علم کے مطابق لکھی گئی ہے جس سے کوئی چیز غائب نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد ان اقوام و ملل کی تقسیم ہوگی، مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کو صرف دو حصوں میں بانٹ دیا جائے گا۔ تمام اقوام و ملل کے لوگ اب دو طبقے ہوں گے۔ ایک گروہ اور طبقہ اہل ایمان کا ہو گا اور ایک اہل کفر کا ہو گا۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک صرف دو پارٹیاں ہیں اور دو جھنڈے ہیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان۔ اس کے علاوہ تمام ملتیں تمام فرقے اور مذاہب ختم ہوں گے۔ تمام آبادی دو گروہ ہو جائے گی۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي

رَحْمَتِهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿۶۱﴾

”پھر جو لوگ ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہی صریح کامیابی ہے۔“

اب یہ گروہ اس طویل انتظار سے نجات پائے گا۔ قتل اور اضطراب دور ہو گا۔ آیت میں ان کے انجام کو جلدی سے نہایت سادہ انداز میں بیان کر دیا۔ اور یہ لوگ گئے اپنے اصل مقام کی طرف۔

لیکن ہماری نظریں اچانک یہ دیکھتی ہیں کہ ایک دو سرا گروہ ہمارے سامنے ہے اور ان کو طویل الفاظ میں سرزنش کی جاتی ہے۔ ان کو شرمندہ کیا جاتا ہے اور ان کے برے اعمال و اعمال ان کو یاد دلائے جاتے ہیں۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا أَفَلَمْ تَكُنْ آيَتِي تُلَىٰ عَلَيْكُمْ فَانْتَكَبْتُمْ

وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ﴿۶۲﴾ وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَ السَّاعَةُ لَا رَيْبَ

فِيهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ ۚ إِنَّ نَظْنَ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ

بِیَسْتَبِقِينَ ﴿۶۳﴾

”اور جن لوگوں نے کفر کیا (ان سے کہ جائے گا) ”کیا میری آیات تم کو نہیں سنائی جاتی تھیں؟ مگر تم نے تکبر کیا اور محرم بن کر رہے اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے ہم تو بس ایک گمان سار کہتے ہیں، یقین ہم کو نہیں ہے۔“

اب ذرا دیکھو کیا حال ہے؟ اور تمہیں کس قدر یقین آرہا ہے۔ قدرے وقفے کے بعد اب ان کی ذہنی دنیا کے حالات کہ اب ان پر چودہ طبق روشن ہیں:

وَبَدَأَ لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۳۳﴾

”اس وقت ان پر ان کے اعمال کی برائیاں کھل جائیں گی اور وہ اسی چیز کے پھیر میں آجائیں گے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔“

اس کے بعد دوبارہ ان کو شرمندہ کیا جاتا ہے اور یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اب ان کو پوچھنے والا کوئی بھی نہ ہو گا اور ان کا بہت ہی دردناک انجام ہو گا۔

وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنفِثُكُمْ كَمَا نَفِثْنَا لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّنْ تَصَرُّعٍ ﴿۳۴﴾ ذَلِكُمْ بِأَنكُمُ اتَّخَذْتُمُوآيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا وَغَرَّبَكُمْ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا

”اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ ”آج ہم بھی اسی طرح تمہیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے۔ تمہارا ٹھکانا اب دوزخ ہے اور کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق بنالیا تھا اور تمہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا۔“

اب ان کے آخری انجام کے اعلان پر پردہ کرتا ہے، ”جہنم میں ان کو ہمیشہ کے لیے پھونڈ دیا جاتا ہے“ نہ ان سے کوئی عذر طلب کیا جاتا ہے اور نہ معافی کی درخواستیں طلب کی جاتی ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿۳۵﴾

”لہذا آج نہ یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے کہا جائے گا کہ معافی مانگ کر اپنے رب کو راضی کرو۔“ گویا ان الفاظ کے ساتھ ہی ہم کرخت آواز میں سنتے ہیں اور جہنم کے دروازے ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اب یہ مظہریں فتم ہوتا ہے اور اس حالت میں کوئی تغیر اور تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

اس مقام پر اللہ کی حمد و ثنا کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اس تمہید اور منظر کے بعد سورت کے آخری کلمات نہایت ہی موثر ہیں۔

قُلْ لِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۶﴾ وَ لَهُ الْكِبَرِيَاءُ

فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۳۷﴾

”پس تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو زمین اور آسمانوں کا مالک اور سارے جہان دالوں کا پروردگار ہے۔ زمین اور

آسمانوں میں بڑائی اسی کے لیے ہے اور وہی ذبردست اور دانا ہے۔“

اللہ کی بڑائی اور اللہ کی عظمت کا اعلان ہوتا ہے۔ آسمانوں میں بھی وہ بڑا ہے اور زمین میں بھی وہی بڑا ہے۔ انسانوں کا بھی وہ حاکم ہے اور جنوں کا بھی وہ حاکم ہے۔ وحوش و طیور کا بھی وہی خالق ہے، غرض جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ اللہ کا ہے سب کے سب ایک ہی رب کی نگرانی میں ہیں۔ اللہ ہی ہے جو مدبر کائنات ہے اور رب کائنات ہے۔

اللہ کی ثنا اور کبریائی کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس کائنات میں بڑائی صرف اللہ ہی کی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہر بڑا چھوٹا ہو جاتا ہے اور جساریاں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا ہے۔ ہر سرکش یہاں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ رب مطلق اور اکبر مطلق کے سامنے۔

اس کبریائی، اس ربوبیت، اس قدرت اور اس حکمت اور اس تدبیر کے ساتھ غالب قرار پاتا ہے۔

وَ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۳۷ : ۴۵) ”وہ ذبردست اور دانا ہے۔“ الحمد للہ رب العلمین !

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۶

آیات ۱ --- تا --- ۳۵

سورۃ الاحقاف - ۴۶

آیات ۱ --- تا --- ۳۸

سورۃ محمد - ۴۷

آیات ۱ --- تا --- ۲۹

سورۃ الفتح - ۴۸

آیات ۱ --- تا --- ۱۸

سورۃ الحجرات - ۴۹

آیات ۱ --- تا --- ۴۵

سورۃ ق - ۵۰

آیات ۱ --- تا --- ۳۰

سورۃ الذاریات - ۵۱

سورۃ احقاف ایک نظر میں

یہ سورت مکی ہے اور اس کا موضوع اسلامی عقیدہ ہے۔ یعنی اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت پر ایمان لانا کہ وہ واحد ہے اور پردردگار ہے۔ وہ اس پوری کائنات اور اس میں پائے جانے والی مخلوقات کا رب ہے اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور آپؐ سے پہلے بھی کئی رسول گزرے ہیں، آپؐ پر یہ قرآن نازل ہوا ہے اور یہ ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو پہلے نازل ہوئیں۔ اور یہ کہ مرنے کے بعد اٹھایا جائے گا اور پھر حساب و کتاب ہو گا اور یہ حساب و کتاب ان اعمال کی بنیاد پر ہو گا جو لوگوں نے اس دنیا میں کیے، اچھے یا برے۔

یہ وہ بنیادی تصویرت ہیں جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے۔ اس لیے تمام مکی قرآن میں اللہ نے ان پر مفصل بحث کی ہے اور مدینہ میں بھی ان ہی کی بنیاد پر مفصل ہدایات دی گئی ہیں۔ مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تھی، اسلامی سوسائٹی قائم تھی اور مدینہ میں بھی جو ہدایات دی گئیں، جو قوانین بنائے گئے، ان مباحث کے دور ان بھی جا بجا ان امور کی طرف اشارہ کیا جاتا رہا کیونکہ اسلام کے تمام قوانین، اخلاق، آداب، اور ادارے اسلامی نظریہ حیات پر مبنی ہیں۔ چنانچہ خالص قانونی اور دستوری مباحث کے درمیان بھی ایمان، توحید اور رسالت کی بات ہوتی رہتی ہے۔

چنانچہ یہ سورت ہر اسلوب اور ہر انداز سے، یہ عقیدہ، دلوں میں بٹھانا چاہتی ہے۔ ہر زلوہ سے، ہر میدان میں نکلوتی، نفسیاتی اور تاریخی دلائل سے مسح ہو کر یہ اسلامی عقائد کی بات کرتی ہے بلکہ یہ سورت اسلامی عقائد کو اس پوری کائنات کی حقیقت بتاتی ہے۔ یہ عقیدہ صرف انسانوں کا نہیں ہے، یہ جنوں کا بھی ہے۔ ایک طرف اس عقیدے پر کائنات شاہد ہے دوسری طرف لہل کتاب میں سے بعض حق پرست بھی اس پر شہادت دیتے ہیں۔

یہ سورت انسانوں کو آسمان اور زمین کی سیر کراتی ہے۔ قیامت کے مناظر میں لے جاتی ہے اور انسان کو انسانی تاریخ میں قوم عادیہ کے ارد گرد بستیاں اور ان کی ہلاکت اور زمین و آسمان کے دوسرے نشانات بتاتی ہے کہ جس طرح قرآن حق بات کی شہادت دیتا ہے اسی طرح یہ کائنات اور تاریخی واقعات بھی حقیقت کی شہادت دیتے ہیں۔

اس سورت کے چار حصے ہیں۔ پورہ سورت کی عمارت گویا چار ستونوں پر کھڑی ہے اور ایک ہی مربوط عمارت ہے، پہلے سبق حروف حا۔ میم سے شروع ہوتا ہے جس طرح اس سے پہلے کی چھ سورتوں کا آغاز انہی حروف سے ہوا ہے۔ اور ہر جگہ ان حروف کے بعد وحی اور کتاب الہی کے نزول کی بحث ہے۔

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (۶: ۲) ”اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانائی کی طرف سے ہے۔“ اور اس کے بعد مصلح کتاب کائنات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کائنات کو حق پر پیدا کیا گیا ہے۔ اور اللہ کی حمد و ثناء اسے صحیح صحیح اندازوں سے پیدا کیا ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى (۳: ۴۶)
 ”ہم نے زمین و آسمان کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں، برحق پیدا کیا ہے اور ایک مدت خاص کے تعین کے ساتھ پیدا کیا ہے۔“ مگر یہ لوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں کہ یہ قرآن جو پڑھی جانے والی وحی و کتاب ہے اور یہ کائنات جو دیکھی جانے والی کھلی کتاب ہے، دونوں سچائی پر مشتمل ہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَاءُ تَدْرُوا مَعْرِضُونَ (۳: ۴۶) ”مگر یہ کافر لوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس سے انہیں خبردار کیا گیا ہے۔“

اس کے بعد قوم کے عقائد شرکیہ پر سخت تنقید کی جاتی ہے کہ لوگ حق آنے کے بعد دوسرے الہوں کو پکارتے ہیں جن کی الوہیت پر کوئی سند نہ کتاب کائنات میں موجود ہے اور نہ کتب سماوی میں سے کسی حقول روایت میں

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَا ذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَوَاتِ ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِنْ قَبْلِ هَذَا أَوْ أَثَرَةٍ مِنْ عِلْمٍ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

(۴: ۴۶) ”اے نبی! ان سے کہو کہ تم نے انہیں کھول کر دیکھا ہے کہ وہ ہستیاں ہیں کیا جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ ارا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین میں انہوں نے کیا پیدا کیا ہے یا آسمانوں کی تخلیق سمیر میں ان کا کیا حصہ ہے اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ تمہارے پاس؟ تو وہی لے آؤ اگر تم سچے ہو۔“ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ جن کو تم پکارتے ہو، اگر قیامت تک بھی کوئی کھڑا پکارتا رہے تو وہ نہیں سن سکتے اور نہ جواب دے سکتے ہیں بلکہ قیامت میں تو جو بہت ہی اعصاب شکن دن ہو گا یہ معبود صاف منکر ہوں گے۔

اس کے بعد یہ بات آتی ہے کہ یہ لوگ دعوت اسلامی کا استقبال کس انداز سے کرتے ہیں۔

هَذَا سِحْرٌ مُبِينٌ (۷: ۴۶) ”کہ یہ کھلا جادو ہے۔“ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ کہتے ہیں یہ اللہ پر افترا ہے۔ رسول اللہ کو کہا جاتا ہے کہ ان کو ایسے انداز سے جواب دے جو ایک نبی کے شایان شان ہوتا ہے، یعنی خدا کوئی اور خدا پرستی کے ساتھ تمام امور اللہ کے سپرد کر دے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۸: ۴۶) قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (۹: ۴۶) ”کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسول نے اسے خود گھڑ لیا ہے ان سے کہو کہ اگر میں

نے اسے خود گمراہ کیا ہے تو مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے۔ جو باتیں تم جانتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے۔ وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ ان سے کو ”میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں“ میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے اور میرے ساتھ کیا۔ میں تو صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کرنے والے کے سوا کچھ نہیں ہوں۔“

پھر ان کے سامنے بعض ایسے لوگوں کی مثال بطور حجت پیش کی جاتی ہے جنہوں نے دعوت اسلامی کو قبول کیا اور وہ بنی اسرائیل میں سے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں وہی باتیں ہیں جو تورات میں تھیں، وہ تو ایمان لے آئے اور تم نے کفر اختیار کر لیا۔

فَأَمَّنَ وَاسْتَكَرْتُمْ (۴۶: ۱۰) ”وہ تو ایمان لے آیا اور تم ٹھنڈ میں پڑے رہے“ ان پر تنقید کی جاتی ہے کہ تم ٹھنڈ میں پڑے رہے اور اصرار کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہو حالانکہ اہل کتاب میں سے جو لوگ لٹل علم تھے وہ ایمان لائے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (۴۶: ۱۰) ”اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔“ اس اصرار کے لیے وہ جو وجوہات بیان کرتے تھے اور بہانہ تراشیاں کرتے تھے ان کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے تھے۔

لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ (۴۶: ۱۱) ”اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے بہت نہ لے جاتے۔“ جب انہوں نے اس ہدایت کو قبول نہیں کیا اور مخالف صف میں ہیں تو یہ اور کیا کہیں گے۔

وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَذَا أَفْكَ قَدِيمٍ (۴۶: ۱۱) ”چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے یہ ضرور تمہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔“ یہاں حضرت موسیٰ کو دی جانے والی کتاب تورات کا ذکر کر کے کہا جاتا ہے کہ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے اور قرآن کا مشن اور دعوت یہ ہے۔

لِيُنذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَبُشْرَىٰ لِلْمُحْسِنِينَ (۴۶: ۱۲) ”تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روئیں اختیار کرنے والوں کو بشارت دے۔“ اور اس خوشخبری کی تفصیلات پر یہ سبق ختم ہوتا ہے ”ان لوگوں کے لیے جنہوں نے تصدیق کی اور پھر جم گئے۔“

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْلَمُونَ (۴۶: ۱۴) ”یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، پھر اس پر جم گئے، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم، ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اپنے اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے۔“

دوسرے سبق میں عقائد کے زاویہ سے انسانی فطرت کے دو نمونے پیش کیے گئے ہیں، ایک سلیم الفطرت اور مستقیم الفطرت اور دوسرا کجی اختیار کرنے والا ابتدائے آفرینش سے ان دونوں نمونوں کو دکھایا جاتا ہے جو والدین کے زیر سایہ پلتے ہیں اور جب وہ بلوغ اور سن رشد کو پہنچتے ہیں تو پھر وہ خود مختارانہ تصرفات کرتے ہیں۔ پہلا نمونہ تو اللہ کی نعمتوں کا شعور رکھتا ہے، والدین کے ساتھ حسن سلوک اٹھاتا ہے اور اللہ کا ذکر و شکر کرنے کی طرف راغب ہوتا ہے، توبہ کرنے والا، اطاعت شعار، خضوع و خشوع کرنے والا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعَدَ الصَّادِقُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ (۴۶: ۱۶) ”اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں۔ یہ جتنی لوگوں میں شامل ہوں گے۔ اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جا رہا ہے۔“ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو والدین کے نافرمان ہیں جس طرح وہ رب کے نافرمان ہیں اور آخرت کے سکر ہیں۔ یہ ہیں دو اقسام کے لوگ۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (۴۶: ۱۸) وَلِكُلِّ دَرَجَةٍ مِمَّا عَمِلُوا وَلِيُوفيَهُمْ أَعْمَالُهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۴۶: ۱۹) ”یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جو ٹولے ہو گزرے ہیں، انہی میں یہ بھی شامل ہوں گے۔ بے شک یہ گھائے میں رہ جانے والے لوگ ہیں۔“

اس سبق کا خاتمہ قیامت کے مناظر میں سے ایک نہایت ہی تیزی سے گزر جانے والی جھک سے کیا جاتا ہے جس میں ان لوگوں کا انجام دکھایا جاتا ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلْهَبْتُمْ طَيِّبَتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ (۴۶: ۲۰) ”پھر جب یہ کافراگ کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا، تم اپنے حصے کی نعمتیں، اپنی دنیا کی زندگی ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھالیا۔ اب جو تکبر تم زمین

میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔
 میرا سبق قوم عاد کی ہلاکت کے بارے میں ہے 'جب انہوں نے اپنے پیغمبر کو رد کر دیا۔ یہاں ان کے قصے سے وہ
 کڑی لی جاتی ہے جن میں وہ اس ہوائے امید میں باندھے ہوئے ہیں جو بانجھ ہے 'جس سے وہ توقع کرتے ہیں کہ بارش
 لے کر آ رہی ہے اور اس کے نتیجے میں ہر طرف زندگی پھوٹ نکلے گی 'حالانکہ وہ ہلاکت اور بربادی کی حامل تھی۔ اور وہ
 دراصل وہ عذاب تھا جس کے لیے وہ شور مچاتے تھے کہ جلدی آئے۔

فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسَقِّبًا أَوْ دِيْتِهِمْ قَالُوا هَذَا عَارِضٌ مُّمْطَرُنَا بَلْ هُوَ مَا
 اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ رِيحٌ فِيْهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ (۲۴: ۴۶) تَدْمِرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَاصْبِرُوا
 لَا يُرَى الْاَلَمَسُكُنْهُمْ كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۲۵: ۴۶) "پھر جب انہوں نے اس
 عذاب کو اپنی دادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے "یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا۔۔۔۔۔" نہیں بلکہ یہ وہی چیز
 ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے 'یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آ رہا ہے۔ اپنے رب کے حکم
 سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا۔ آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس
 طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔" قوم عاد کے اس برے انجام سے ان کے دلوں کو متاثر کر کے یہ یاد دلایا جاتا ہے
 کہ اس بات کو وہ نوٹ کریں کہ عاد کے لوگ اہل قریش سے زیادہ مالدار اور قوت والے تھے۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّهُمْ فِيمَا اِنْ مَّكَّنْكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَ اَبْصَارًا وَ اَفْئِدَةً فَمَا
 اَغْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَا اَبْصَارُهُمْ وَ لَا اَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِآيٰتِ
 اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوْا بِهِ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶: ۴۶) "ان کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو
 نہیں دیا۔ ان کو ہم نے کان، آنکھیں اور دل سب کچھ دے رکھے تھے مگر نہ وہ کان ان کے کام آئے نہ آنکھیں نہ
 دل کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔ اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آگے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔"
 آخر میں ان کو ان بستیوں کی ہلاکت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو مکہ کے ماحول میں ہیں 'اور ان کے ان معبودوں کی
 کمزوری کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور ان کے قرآنی دلائل کی بنا پر ان خداؤں کی حقیقت کے ظاہر ہو جانے کی طرف متوجہ
 کیا جاتا ہے 'جن کو وہ پوجتے ہیں۔

چوتھے سبق میں قرآن کے بارے میں جنات کے رد عمل کی ایک کہانی ہے۔ اللہ کے رسول نے ان کو قرآن سنایا۔ وہ
 متاثر ہوئے 'اور گواہی دی کہ یہ کلام سچا ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلَى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۰: ۴۶) "تصدیق

کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی۔ رہنمائی کرنے والی ہے حق اور راہ راست کی طرف۔ جب یہ لوگ اپنی قوم کی طرف لوٹتے ہیں تو ان کو ذراستے ہیں اور ایمان کی دعوت دیتے ہیں۔

يَقَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُجْرِكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ (۳۱: ۴۶) وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ

لَهُ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءُ أُولَئِكَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (۳۲: ۴۶) ”اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلائے دے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچا دے گا اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں کوئی بل بوتہ رکھتا ہے کہ اللہ کو رچ کر دے اور نہ اس کے کوئی حاجی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچالیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔“ اور جنوں کی اس تقریر میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس پکڑناٹ کی کتاب مفتوح میں بھی یہ حقیقت پائی جاتی ہے کہ اللہ پیدا کرنے، مارنے اور پھر دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَمْ يَعْزِ بِخَلْقِهِنَّ بِقَدِيرٍ عَلَى أَنْ يُحْيِيَ بَنِي الْمَوْتِ بَلَى إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۳۳: ۴۶) ”اور کیا ان لوگوں کو یہ بھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین و آسمان پیدا کیے اور جن کو ہاتھ ہوئے وہ نہ تھا وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے کیوں نہیں یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

یہاں اب کفار کا وہ منظر پیش کیا جاتا ہے جب ان کو آگ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس وقت وہ ان باتوں کا اقرار کریں گے جن کا یہاں انکار کرتے تھے۔ لیکن وہاں اقرار و یقین کا فائدہ کیا ہو گا۔

اس کے بعد رسول اللہ کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں اور ان کے لیے عذاب طلب کرتے ہیں جدی نہ فرمائیں۔ ایک مختصری مصلحت ہے جو انہیں دی جا رہی ہے۔ یہ عذاب جلدی ان کو آئے گا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعِزِّ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ كَانَتْهُمْ يَوْمَ يَوْمَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ بَلِّغْ فَهَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الْفَاسِقُونَ (۳۵: ۴۶) ”میں نے نبی صبر کر د جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے مقابلہ میں جدی نہ کرو جس روز یہ لوگ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے تو انہیں یوں معلوم ہو گا جیسے دنیا میں ان کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی۔ اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا۔“ یہ ہے یہ سورت مختصراً۔

اب آیات کی تفصیلی تشریح۔

درس نمبر ۲۳ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۱۲



**خَمْرٌ ۝ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا
أُنذِرُوا مُّعْرِضُونَ ۝**

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ح‘م‘ اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانائی کی طرف سے ہے۔ ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں ’برحق‘ اور ایک مدت خاص کے تعین کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مگر یہ کافر لوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس سے ان کو خبردار کیا گیا ہے۔“

یہ اس سورت کا پہلا زمرہ ہے کہ یہی عربی حروف تہجی ہیں جنہیں تم استعمال کرتے ہو اور انہی سے یہ کلام بنا ہے جو عربوں کے مروج اسالیب کلام سے معجز و ممتاز ہے۔ اس لیے یہ کلام الہی ہے اور ایک زبردست حکمت والی ذات کا کلام ہے اور اس کتاب میں جو سچائی ہے ’اس سچائی پر یہ کائنات بھی مبنی ہے‘ جسے تم دیکھتے ہو۔ یہ کلام بھی اس کا پتلا ہوا ہے اور یہ پیچیدہ کائنات بھی اس کی مبنی ہوئی ہے۔ یہ کائنات بھی ایک کتاب ہے جسے کلی آنکھیں اور کھلے دل پڑھ سکتے ہیں۔

دو دنوں کتابوں کا کلام حق پر مبنی ہے۔ یہ کتاب ایک زبردست اور حکیم ہستی الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲: ۴۶) کا کلام ہے۔ اس لیے یہ کتاب منظر قدرت الہیہ ہے اور مشتمل پر حکمت الہیہ ہے۔ اور زمین و آسمان کی تخلیق بھی اسی حق پر ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى (۳: ۴۶)
”ہم نے زمین و آسمان کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں ’برحق‘ اور ایک مدت خاص کے تعین کے ساتھ

پیدا کیا ہے۔“۔ ہر عرصے میں وہ متعدد پورا ہو گا جو اس مخلوق کے پیدا کرنے سے مطلوب ہے۔ اور اللہ نے اس کائنات اور اس کے اندر پائی جانے والی مخلوقات کے بارے میں جو اندازے رکھے تھے وہ ظاہر ہوں گے۔

یہ دونوں کتابیں کھلی ہیں۔ تمہاری نظروں کے سامنے ہیں، اللہ کی قدرتوں کی کمائیاں بتا رہی ہیں۔ اللہ کی حکمتوں پر گواہ ہیں، اور اللہ کی تدبیر اور تقدیر ان سے عیاں ہے اور یہ کائناتی کتاب اس پڑھی جانے والی وحی کی کتاب کی تائید کرتی ہے اور اس میں جو ارادہ اور جو خوشخبری ہے اس کی بھی تائید یہ کائنات کرتی ہے لیکن۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَاءُ أَنْزِلُوا مُعْرِضُونَ (۳: ۷۶) ”مگر یہ کافر لوگ اس حقیقت سے منہ موڑ رہے ہیں جس سے ان کو خبردار رکھا گیا ہے۔“۔ اور ان کا یہ رویہ قابلِ تعجب ہے کیونکہ منزل کتاب اور نظارہ دکھانے والی کتاب دونوں کتابیں پکار پکار کر ان کو دعوت دے رہی ہیں۔

یہ کتاب جو نازل کی گئی ہے یہ بتاتی ہے کہ اللہ ایک ہے، وہ ہر چیز کا رب ہے کیونکہ وہی خالق ہے، ہر چیز کی تدبیر کرنے والا ہے، ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کرنے والا ہے اور یہ کتاب کائنات ان سب چیزوں کی تصدیق کر رہی ہے۔ اس کائنات کے نظام کا پوری طرح ہم آہنگ ہونا اور اس کی حرکات کا سمیت ہی مضبوط ہونا اس بات پر گواہ ہے کہ اس کا ایک ہی بنانے والا، چلانے والا اور تدبیر کرنے والا ہے۔ جس نے ہر چیز کو بنایا اور بڑی مہارت سے ہر چیز کو بنایا۔ چنانچہ ہر پیدا کردہ چیز اور اس کی ماہیت اور وجود اور اس کی رفتار کی ایک ہی ساخت اور طرز ہے۔ لوگ پھر کس بنیاد پر متعدد اہوں کے قائل ہیں؟ یہ بات حیرت انگیز ہے۔ آخر ان لوگوں کے اہوں نے کیا بنایا ہے اور وہ کیا کرتے ہیں؟ یہ کائنات جو اللہ کی بنائی ہوئی ہے یہ تو تمہارے سامنے کھلی کتاب ہے۔ اس میں تمہارے خود ساختہ معبودوں کا کیا حصہ ہے؟ اس مخلوقات میں سے اگر کوئی ایک قسم کی مخلوق بھی انہوں نے بنائی ہے تو دعویٰ کرو اور بتاؤ!

قُلْ أَرَبُّكُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَدُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَوَاتِ إِيَّائِي يَكْتُمُونَ قَبْلِ هَذَا أَوْ آثَرَةٍ مِنْ عَلِيمٍ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۷۷﴾ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَفِلُونَ ﴿۷۸﴾ إِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ ﴿۷۹﴾ وَإِذَا تَشَلَّى عَلَيْهِمْ آيُنَا بَيَّنَّتْ قَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ هَذَا يَسْحَرُونَ ﴿۸۰﴾

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا هُوَ
 أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ هُوَ الْخَفِيُّ
 الرَّحِيمُ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ
 إِنِ اتَّبِعُهُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ
 مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ
 ۱۰ فَأَمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ
 كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ
 فَسَيَقُولُونَ هَذَا أَفْكٌ قَدِيمٌ ۝ وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۝
 وَهَذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّنَذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۝ وَبُشْرَى
 لِلْمُحْسِنِينَ ۝

”اے نبی! ان سے کہو“ ”بھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا بھی کہ وہ ہستیاں ہیں کیا۔ جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر
 پکارتے ہو؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین میں انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں کی تخلیق و تدبیر میں ان کا کوئی حصہ
 ہے؟ اس سے پیسے آئی ہوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ (ان عقائد کے ثبوت میں) تمہارے پاس ہو تو وہی لے آؤ اگر تم
 سچے ہو۔ آخر اس شخص سے زیادہ ہکا بھکا انسان اور کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب
 نہیں دے سکتے بلکہ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ پکارنے والے ان کو پکار رہے ہیں اور جب تمام انسان جمع کیے جائیں گے
 اس وقت وہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن اور ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔“

ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں اور حق ان کے سامنے آ جاتا ہے تو یہ کافر لوگ اس کے
 متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسولؐ نے اسے خود گھڑ لیا ہے۔ ان سے کہو ”اگر میں نے
 اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے جو باتیں تم بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے میرے
 اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔“

ان سے کہو ”میں کوئی نرالا رسولؐ تو نہیں ہوں میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے اور میرے ساتھ
 کیا میں تو صرف اس دجی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے

کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔“۔ لے نبیؐ ان سے کہو ”کبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو تمہارا کیا انجام ہو گا؟) اور اس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جاسکتے تھے۔ چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنا اور رحمت بن کر آچکی ہے اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی رہاں عربی میں آئی تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے۔“

اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین فرماتا ہے کہ آپ اپنی قوم کے سامنے یہ کائناتی شہادت پیش کریں۔ یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں تو بحث و مناظرہ نہیں کیا جاسکتا، وہ سامنے موجود ہے۔ جو انسانی فطرت کو خطاب کرتی ہے۔ اس کی منطق اور اس کا انداز گفتگو بھی فطری ہے۔ اس کتاب کائنات اور فطرت انسانی کے درمیان گہرا ربط بھی موجود ہے۔ اس کو نہ دبایا جاسکتا ہے اور نہ اس میں کوئی کسی کو دعو کہ دے سکتا ہے۔ یہ فطری سوال ہے۔

اَرُونِي مَا ذَا خَلَقُوا مِنَ الْاَرْضِ (۴: ۷۶) ”ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی زمین میں انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟“ یہ ممکن نہ تھا اور نہ ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ ان معبودوں میں سے کسی نے خواہ وہ پتھر ہوں، درخت ہوں، جن ہوں یا فرشتے، زمین میں سے کوئی حصہ یا کوئی چیز پیدا کی ہے۔ فطری سوچ، حقیقت واقعہ، اور ہر چیز بذات خود یہ پکار پکار نہتی ہے کہ کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے تو کچھ بھی پیدا نہیں کیا۔

اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ (۴: ۷۶) ”یا آسمانوں کی تخلیق و تدبیر میں ان کا کوئی حصہ ہے۔“۔ کوئی انسان یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ ان مذکورہ معبودوں کا آسمانوں میں کوئی حصہ یا شرکت ہے۔ آسمانوں کے اندر ایک سطحی نظر بھی بتا دیتی ہے کہ خالق کائنات کس قدر عظیم ہے اور پھر یہ کہ وہ واحد ہے۔ ایک ہی نظر میں ایک معقول انسان تمام گمراہیوں اور انسانوں کو جھٹک کر پیچک دیتا ہے۔ اللہ تو انسان کا خالق ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کائنات پر ایک گہری فطری انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ اس لیے اللہ بار بار انسان کو متوجہ کرتا ہے۔ کائنات کی اس کھلی کتاب پر نگاہ تو ڈالو۔ اس کے نظام پر غور کرو اور تمہارے دل و دماغ پر اس کائنات سے جو تسکین آتے ہیں، ان سے پوچھو کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں۔

اس کے بعد بعض نہایت ہی گمراہ درجے کے انسانوں کی راہ بند کرنے کے لیے اور ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ایک سوال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات زیادہ گمراہی میں آگے بڑھ کر کوئی یہ زعم بھی کر سکتا ہے کہ ہمارے پاس شرک کی نقلی دلیل ہے یا کوئی اور بہانہ کر سکتا ہے حالانکہ دراصل اس کے پاس کوئی حجت و دلیل نہیں ہے۔ اس لیے قرآن مجید ایسے لوگوں کا ناطقہ بند کرنے کے پہلے ہی مطالبہ کر دیتا ہے کہ لاؤ اگر کوئی حجت و دلیل تمہارے پاس ہے اور پھر قرآن مجید ان کو استدلال کا طریقہ بھی بتا دیتا ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے کے لیے صحیح طریق کار یا ہوا کرتا ہے۔

اَيُّوْنِيْ بِكُتُبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثَرَةً مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۶: ۴) ”اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ تمہارے پاس ہو تو وہی لے آؤ اگر تم سچے ہو۔“ یا تو اللہ کی کوئی بھی کتاب پیش کرو۔ یا کتب سماوی میں سے کوئی اثر تمہارے پاس باقی ہو اسے لے آؤ۔ قرآن سے قبل جس قدر کتب سماوی بھی نازل ہوئی ہیں وہ تو قرآن کی تائید میں شہادت دیتی ہیں کہ اللہ وحدہ خالق ہے اور وہی کائنات کا مدبر ہے اور اس میں تمام چیزوں کو ایک قدر اور اندازت پیدا کرنے والا ہے۔ ان کتابوں میں سے کوئی ایک کتب بھی متعدد اللہ کے خرافات کو تسلیم نہیں کرتی۔ یا یہ کہ زمین و آسمان میں سے کوئی چیز ان الہوں نے بنائی ہو یا وہ کسی چیز کے بنانے میں شریک ہوں کوئی علم یا اثر یا نص کتب سماوی میں نہیں ہے۔

قرآن کریم ان کے سامنے اس کائنات کی شہادت بھی پیش کرتا ہے۔ کائنات کی شہادت تو فیصلہ کن شہادت ہوتی ہے۔ یوں قرآن مجید ان کے عقائد کو حجت و دلیل سے محروم کر دیتا ہے۔ اور ان کو یہ بھی سکھا دیتا ہے کہ بحث و دلیل کا صحیح اندازہ کیا ہوتا ہے اور یہ سب باتیں ایک ہی آیت میں سکھا دی جاتی ہیں جس کے الفاظ اگرچہ بہت تھوڑے ہیں لیکن زور دار اور فیصلہ کن ہیں۔

اس کے بعد قرآن کریم ان کے سامنے یہ نکتہ پیش کرتا ہے کہ جن چیزوں کو تم اللہ بناتے ہو اور پھر پکارتے ہو ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے یہ تو تمہاری اس پکار کو سنتے ہی نہیں اس دنیا میں تم اگر ساری زندگی ان کو پکارتے رہو اور قیامت میں تو بھی وہ صاف صاف انکار کر دیں گے۔ لہذا اپنی اس حرکت پر ذرا غور ٹوکرو۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَا يَسْتَجِیْبُ لَهُ اِلٰی یَوْمِ الْقِیْمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غٰفِلُوْنَ (۴۶: ۵) ”وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءٌ وَ كَانُوْا

بَعَادَتِهِمْ كُفْرٰیْنَ (۴۶: ۶) ”آخر اس شخص سے زیادہ بکا ہوا انسان اور کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتے بلکہ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ پکارنے والے ان کو پکار رہے ہیں اور جب تمام انسان جمع کیے جائیں گے اس وقت وہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن اور ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔“

بعض لوگ ایسے تھے جو بتوں کو بذات خود اللہ مانتے تھے۔ اور بعض ان کو فرشتوں یا نیک لوگوں کی شبیہ سمجھتے ہوئے اللہ مانتے تھے۔ بعض درختوں کو اللہ مانتے تھے، بعض فرشتوں اور شیطان کو اللہ مانتے۔ ان میں سے کوئی بھی پکارنے والے کی پکار کا جواب نہ دے سکتا تھا، یا اگر پکار سنتا تھا تو کوئی فائدہ نہ دے سکتا تھا، پھر پھر درخت تو نہ کچھ سن سکتے تھے اور نہ جواب دے سکتے تھے۔ فرشتے بھی مشرکین کی اس حرکت پر کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ شیاطین تو بہر حال ان کو حریف گمراہ کرنے کے لیے وسوسہ اندازیاں کرتے تھے۔ جب قیامت کا دن ہو گا اور لوگ اٹھائے جائیں گے تو یہ تمام اللہ جو پوجے جاتے تھے یہ اپنے گمراہ عبادت گزاروں کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔ یہاں تک کہ شیطان جس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرے وہ یہ کہے گا۔

وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُمُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا

أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۴ : ۲۲) ”اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا ”حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں۔ میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر بیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو، لپٹے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا، میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا ہی ہے۔“

یوں قرآن مجید ان کو خود اپنے دعویٰ اور اپنے خیالات کے سامنے پیش کرتا ہے کہ ان دعویٰ کا انجام دنیا اور آخرت میں کیا ہونے والا ہے۔ جبکہ اس سے قبل ان کو کائنات کی نشانیاں بتائی گئیں کہ یہ شرک کے عقائد کا انکار کرتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا اللہ صرف ایک اللہ العالمین ہے اور خود مشرکین کی دنیا اور آخرت کی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ وہ اپنے ان خیالات پر نظر ثانی کریں۔

قرآن مجید یہاں ان بات پر ستوں پر تنقید کرتا ہے جو ایسے بتوں کو پکارتے تھے جو ان کو کوئی نفع یا نقصان نہ دے سکتے تھے۔ نزول قرآن کے وقت ایسے روایتی زندہ اور مردہ معبود موجود تھے۔ لیکن یہ آیت صرف ان بتوں تک محدود نہیں ہے، جو ایک خاص زمان و مکان میں ایک خاص شکل میں پکارے جاتے تھے اور ان سے امیدیں وابستہ کی جاتی تھیں۔ آیت بہت وسیع ہے اور اس میں وہ سب معبود شامل ہیں جو اللہ کے سوا کسی بھی زمان و مکان میں پائے جائیں گے۔ جن کو عوام پکارتے ہیں اور جن سے امید وابستہ کرتے ہیں اور جو ان کو کوئی نفع و نقصان نہیں دے سکتے۔ کیونکہ نفع و نقصان پہنچانے والا تو اللہ ہی ہے۔ غرض شرک اس سادہ صورت اور شکل تک محدود نہیں ہے جو نزول قرآن کے وقت عربوں میں پائی جاتی تھی۔ کئی ایسے لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ اصحاب اقتدار کو شریک کرتے ہیں۔ افسران کو شریک کرتے ہیں، بڑے بڑے سرمایہ داروں کو شریک کرتے ہیں، ان سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں، ان کو پکارتے ہیں، لیکن یہ سب کے سب بہت ہی عاجز اور کمزور ہیں اور یہ کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔ وہ تو خود اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کو پکارنا شرک ہے، ان سے امیدیں وابستہ کرنا بھی شرک ہے۔ ان سے ڈرنا بھی شرک ہے۔ لیکن یہ شرک ذرا شرک خفی ہے اور اکثر لوگ غیر شعوری طور پر اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

--- ۰۰۰ ---

اس کے بعد اس پر بحث ہوتی ہے کہ رسول اللہ اور آپ کی سچی دعوت کے بارے میں، ان کا موقف کیا ہے۔ شرک کے بارے میں ان کے خیالات کا جائزہ تو خوب لیا گیا۔ اب بتایا جاتا ہے کہ وحی اور دعوت اسلامی کے بارے میں ان کا

موقف کس قدر غلط اور غیر معقول ہے۔

وَ اِذَا تَلَّی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَقُّ لَمَّا جَاءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۷) اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ اِنْ افْتَرِیْتُهُ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِیْ مِنْ اللّٰهِ شَیْئًا هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِیضُوْنَ فِیْهِ کَفٰی بِهٖ شَهِیْدًا یُّبَیِّنِیْ وَ بَیِّنْکُمْ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (۸) قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِّیْ وَلَا بِکُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ وَمَا اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۹) قُلْ اَرَاۤءَ یَتِمُّ اِنْ کَانَ مِنَ عِنْدِ اللّٰهِ وَ کَفَرْتُمْ بِهٖ وَ شَهِدَ شَٰهِدٌ مِّنْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی مِثْلِهٖ فَاَمَنَ وَ اسْتَكْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظَّالِمِیْنَ (۱۰) وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْ کَانَ خَیْرًا مَّا سَبَقُوْنَا اِلَیْهِ وَ اِذْ لَمْ یَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَیَقُوْلُوْنَ هٰذَا اِفْکٌ قَدِیْمٌ (۱۱) وَ مِنْ قَبْلِهٖ کَتَبَ مُوْسٰی اِمَامًا وَ رَحْمَةً وَ هٰذَا کِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّنَذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ بُشْرِیْ لِلْمُحْسِنِیْنَ (۱۲)

(۷: ۱۲ تا ۱۶) ”ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں اور حق ان کے سامنے آ جاتا ہے تو یہ کافر لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسولؐ نے اسے خود گھڑ لیا ہے۔ ان سے کہو ”اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچ سکو گے“ جو باتیں تم بتاتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے ”میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے“ اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔“

ان سے کہو ”میں کوئی ترالا رسوں تو نہیں ہوں“ میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے اور میرے ساتھ کیا“ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔“ اے نبیؐ ان سے کہو ”کبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو تمہارا کیا انجام ہو گا؟) اور اس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے۔ ایسے خالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔“

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لیتا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جاسکتے تھے۔ چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آچکی ہے

اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی زبان عربی میں آئی تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے۔“

بات کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات اور اس کی دعوت ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ بڑی واضح، دل لگتی اور کھلی باتیں ہیں لیکن یہ لوگ اس قدر ذلیل اور ضدی اور کم بخت ہیں کہ یہ اس سچائی کے بارے میں یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ

هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ (۷: ۴۶) ”یہ کھلا جادو ہے۔“ حالانکہ دعوت اسلامی اور جادو کی نوعیت اور موضوع ہی مختلف ہے۔ ایک نبی اور جادوگر کے مقاصد ہی مختلف ہیں۔ یوں ان کے اس غلط موقف پر حملہ کیا جاتا ہے جس کے لیے نہ دلیل ہے اور نہ وجہ جواز ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بہت ہی واضح ہے اور آیات بیانات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ان کے ایک دوسرے اعتراض کو لیا جاتا ہے جو وہ کیا کرتے تھے کہ یہ قرآن اپنی طرف سے گھڑا ہوا ہے اور اللہ کی طرف منسوب ہے اور ایک افترا ہے۔ اس شبیہ کو قرآن استفہام اور سوالیہ انداز میں پیش کرتا ہے کہ یہ بھی کوئی سوال ہے یا کوئی معقول انسان ایسی بات سوچ سکتا ہے؟

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ (۸: ۴۶) ”کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسوں نے اسے خود گھڑ لیا ہے۔“ یعنی کیا وہ اس قدر جبری ہو گئے ہیں کہ ایسی بات بھی کرتے ہیں حالانکہ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آپؐ سے کہا جاتا ہے کہ اس سوال کا جواب اس طرح دیں جس طرح ایک پیغمبر کی شان ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ سوال بہت ہی لادینی ہے۔ اس جواب سے اظہار ہو کہ آپؐ کو اپنے فرائض کا اچھی طرح شعور ہے، آپؐ کو اپنے رب کا بھی اچھی طرح شعور ہے۔ آپؐ کو اس کائنات کی حقیقی قدروں اور حقیقی قوتوں کا پورا احساس ہے۔

قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۸: ۴۶) ”ان سے کہو، اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے جو باتیں تم بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔“ ان سے کہہ دو میں کیوں افترا باندھوں؟ کس کے مفاد کے لیے یہ افترا باندھوں؟ کن مقاصد کے لیے میں ایسا کروں؟ کیا اس لیے کہ تم مجھ پر ایمان لاؤ اور میری اطاعت کرو لیکن تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟

قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا (۸: ۴۶) ”اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے۔“ میرے افترا کی وجہ سے وہ مازنا میرا مواخذہ کرے گا۔ لہذا اگر تم میرے ساتھ ہو اور مجھ پر ایمان لاؤ تو اس میں مجھے کیا فائدہ ہو گا۔ افترا پر جب اللہ مجھ سے مواخذہ کرے گا تو تم اس وقت کیا کر سکتے ہو۔ تم تو بہت ہی عاجز اور کمزور ہو۔ میری کیا مدد کرو گے۔

یہ ایک ایسا جواب ہے جو نبی کے شایانِ شان ہے جو اللہ سے ہدایات لیتا ہے اور جسے اللہ کے سوا اس کائنات میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اسے صرف اللہ ہی کی قوت نظر آتی ہے۔ نیز یہ ایک منطقی اور معقول تردید بھی ہے۔ اگر کوئی ذرا اپنی عقل کو کام میں لائے۔ ان کو جواب دے کر اس پر آپ یہ اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔

هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ (۸: ۴۶) ”جو باتیں تم بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔“ یعنی جو تم کرتے اور کہتے ہو۔ اور جن باتوں کو اللہ جانتا ہے ان پر وہ ضرور تمہیں سزا دے گا۔

كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ (۸: ۴۶) ”میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے۔“ اللہ گواہی بھی دے گا اور فیصلہ بھی کر دے گا اور اللہ کی گواہی اور اس کا فیصلہ کافی ہیں۔

وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (۸: ۴۶) ”وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔“ وہ تم پر مہربان ہوتا ہے اور اپنی مہربانی سے تمہیں ہدایت دے دیتا ہے۔ اور تم نے جو گمراہیاں کیں انہیں بخش دیتا ہے۔ کیونکہ ایمان کے بعد سبقت اعمال معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ ایسی تردید ہے جس میں ان کے لیے دھمکی اور ڈر لیا بھی ہے۔ ان کے لیے حوصلہ افزائی اور ایمان کا لالچ بھی ہے۔ غرض ہر طریقے سے اللہ کی کوشش ہے کہ انسانوں کے دل بدل جائیں۔ انسان کے جسم کی تار تار کو چھیڑا جاتا ہے کہ شاید نغمہ ایمان برآمد ہو جائے۔ سامعین کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ معاملہ بہت اہم ہے اور یہ لوگ جو احقاف باتیں کرتے ہیں یہ محض بھجگانہ باتیں ہیں، محض دعوے کرتے چلے جا رہے ہیں۔ داعیِ اعظم کے دل میں جو بات ہے اور جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں وہ بہت ہی عظیم ہے۔ اس کی اہمیت اور عظمت کا ان کو کوئی شعور نہیں۔

وحی پر ان کے اعتراض کا ایک دوسرے زاویہ سے بھی جواب دیا جاتا ہے۔ یہ کہ وحی ایک ایسا واقعہ ہے جس کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ لاکھوں افراد اسے مانتے ہیں۔ آخر اس میں عجوبے کی کیا چیز ہے کہ یہ اسے جادو یا خیرا کہتے ہیں۔ یہ کوئی عجیب و غریب چیز تو نہیں ہے۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنَّا نَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيْنَا وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (۹: ۴۶) ”ان سے کہو میں تو نرالا رسول تو نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے اور میرے ساتھ کیا۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں۔“

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی پہلے رسول نہ تھے۔ آپ سے پہلے کئی رسول گزرے تھے۔ آپ کا معاملہ بھی انہی کی طرح ہے۔ انہوں نے کوئی ایسا دعویٰ نہ کیا تھا۔ پہلے بھی کئی انسانوں کو رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اللہ کو معلوم ہوتا ہے کہ کون رسالت کے لیے لائق ہے۔ اس کو یہ منصب دے دیا جاتا ہے۔ اور وہ بے کم و کاست پھر تبلیغ شروع کر دیتا ہے۔ یہی ہے رسالت کی حقیقت اور ماہیت۔ رسول کا دس جب سرچشمہ رسالت مل جاتا ہے تو پھر اللہ سے رسالت کی کوئی

دلیل طلب نہیں کرتا اور نہ اپنے لیے کوئی خصوصیت طلب کرتا ہے۔ پیغام ملتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ جو بات اس تک پہنچتی ہے اس کی تبلیغ شروع کر دیتا ہے۔

وَمَا أَدْرِى مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَيْتُمْ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيْ (۹:۴۶) ”مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ کل میرے ساتھ کیا اور تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔“ رسول رسالت کے کام کو اس لیے شروع نہیں کرتا کہ وہ غیب جانتا ہے یا وہ جانتا ہے کہ اس کا اس کی قوم کا اور اس کی دعوت کا انجام کیا ہو گا۔ وہ تو اللہ کے اشاروں اور ہدایات کے مطابق کام کرتا ہے۔ اسے اللہ پر بڑا بھروسہ ہوتا ہے، وہ اللہ کے ارادوں کا تابع ہوتا ہے اور اللہ کی ہدایات پر عمل کرتا ہے۔ ایک ایک قدم اللہ کے حکم سے اٹھاتا ہے لیکن مستقبل اسے معلوم نہیں ہوتا۔ تمام راز اللہ کے ہاں ہوتے ہیں اور رسول مستقبل کے راز معلوم کرنے کے لیے بے چین بھی نہیں ہوتا کیونکہ اس کا دل مطمئن ہوتا ہے اور بارگاہ رب العزت کے آداب میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ اسی علم پر اتکا کرے جو اسے دے دیا گیا ہو اور مستقبل کے پردوں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش نہ کرے۔ رسول تو ہمیشہ اپنے فرائض کی حدود پر کھڑا ہوتا ہے۔

وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (۹:۴۶) ”میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا کچھ نہیں۔“ اللہ کے دربار میں پہنچنے والوں کے یہی آداب ہوتے ہیں اور عارف باللہ لوگوں کا یہی اطمینان ہوتا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل کرتے ہیں اور دعوت دیتے چلے جاتے ہیں اس لیے نہیں کہ وہ دعوت کا انجام دیکھتے ہیں۔ اس لیے بھی نہیں کہ دعوت کا مستقبل روشن ہوتا ہے یا وہ اس کے نتیجے میں چھوٹی یا بڑی کامیابی پاتے ہیں۔ پس وہ اس کام کو اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ان کا فرض ہوتا ہے اور بس۔ وہ اپنے رب سے کوئی دلیل بھی نہیں مانگتے کیونکہ دلیل تو ان کے دل میں ہوتی ہے۔ وہ اللہ سے کچھ مراعات بھی نہیں مانگتے۔ اس سے بڑی رعایت یا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ ان کو اس کام کے لیے چنا گیا۔ وہ اس باریک خط سے سو تر بھر آگے نہیں بڑھتے جو ان کے لیے سمجھ دیا گیا ہے اور وہ انہی نقوش پر قدم رکھتے ہیں جو ان کے لیے سمجھ دیا گیا۔

اس کے بعد ایک قرعی شہادت کی طرف ان کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہ شہادت لکل کتاب کی ہے، جو نزول وحی سے ایسی طرح واقف ہیں۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَهِدٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَأَمْنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ إِنْ اللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (۱۰:۴۶) ”ان سے کہو، کبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو تمہارا کیا انجام ہو گا؟) اور اس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑ رہے۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا“

یہ ممکن ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہو کہ بنی اسرائیل میں سے کسی شخص یا کسی گروہ نے قرآنی تعلیمات کو تورات اور دوسری کتابوں کے مماثل پاتے ہوئے ایمان لے آیا ہو کیونکہ کتب سادہ پر ایمان لانے والے لوگ جانتے تھے کہ یہ کتب وہی بات کرتی ہے جو ان کتابوں میں ہے۔ بعض روایات میں تو آتا ہے کہ یہ آیت عبداللہ ابن سلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کی راہ میں یہ مانع ہے کہ وہ مدینہ میں مسلمان ہوئے تھے اور یہ سورت مکی ہے۔ ایسی روایات بھی ہیں کہ یہ آیت مدنی ہے کیونکہ یہ عبداللہ ابن سلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے جبکہ ایسی روایات بھی ہیں کہ یہ مکی ہے اور اس کا عبداللہ ابن سلام کے واقعہ سے تعلق نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مکہ کے کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو، مکہ میں لٹل کتاب میں سے کوئی شخص ایمان لایا ہو اگرچہ یہاں لٹل کتاب بہت ہی کم تھے اور مکی حالات میں ان کے ایمان لانے کی بہت ہی اہمیت ہو کیونکہ مشرکین امی تھے اور ایسے معاشرے میں لٹل کتاب کے ایمان لانے کی اہمیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لٹل کتاب کی شہادت کی طرف قرآن نے مکی مقامات میں اشارہ کیا ہے اور مشرکین کی تردید کے لیے اسے پیش کیا جو بغیر دلیل اور ثبوت کے اور بغیر علم و ہنر کے اور بغیر کسی کتاب اور سادہ روایات کے قرآن کی تکذیب کرتے تھے۔

لیکن سمجھنے کی بات یہاں یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہاں احتمالی اسلوب استدلال پیش کیا ہے۔ ”تم نے بھی سوچا کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور.....“ اس طرز استدلال کی غرض یہ ہے کہ مشرکین کے اصرار کے اندر تزلزل پیدا کیا جائے۔ ان کے اصرار کی شدت کو کم کیا جائے۔ ان کے عناد کو ٹھنڈا کیا جائے۔ ان کے اندر ذرا خوف اور احتیاط پیدا کیا جائے کہ اس تکذیب میں اتنا آگے نہ بڑھو۔ اور یہ استدلال کیا جائے کہ تم تو نہیں مانتے لیکن اگر سچ نکلے تو پھر..... تو تمہارا انجام بہت ہی برا ہو گا۔ لہذا اس فرض اور احتمال ہی کو مد نظر رکھ کر احتیاط کرو کہ اگر یہ سچ نکلا تو تم پر وہ تمام عذاب آجائیں گے جن سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں ڈراتے ہیں۔ لہذا حضورؐ کی تکذیب کرنے میں ذرا متامل کرو۔ اور اس دعوت پر غور و فکر کرو، قبل اس کے کہ تم اس قدر خطرناک انجام سے دوچار ہو جاؤ یا احتمال پیدا ہو جائے ایسے انجام کا خصوصاً ایسے حالات میں کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص یا گروہ نے یہ شہادت بھی دے دی ہو کہ اس کتاب کی نوعیت کلام الہی جیسی ہے۔ اور اس طرح وہ ایمان لایا۔ اور جب یہ کتاب سب سے پہلے تمہارے لیے آئی، تمہاری زبان میں آئی، تمہارے آدمی کے ذریعہ آئی تو تم تکبر کرتے ہو اور انکار کرتے ہو، یہ واضح ظلم ہے۔ واضح حق کو چھوڑ کر آگے بڑھ جانا ہے اور اس صورت میں تمہارے سب اعمال ضائع ہوں گے اور اللہ کا عذاب آجائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۴۶: ۱۰) ”ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا“۔ غرض قرآن لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہر طریقہ اختیار کرتا ہے۔ مختلف اسالیب کلام اختیار کرتا ہے تاکہ انسانوں کے دلوں کے شکوک دور کرے اور مختلف راستوں سے اپنی دعوت لوگوں کے دلوں تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔ قرآن نے جو مختلف اسالیب اختیار کیے ہیں، ان میں آنے والے داعیوں کے لیے سامان عبرت اور رہنمائی ہے۔ باوجود اس کے کہ خدا و رسولؐ دونوں کے ہاں یقیناً قرآن حق تھا، اللہ کا کلام تھا اور اس میں شک اور احتمال کی کوئی بات نہ تھی۔ لیکن لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ اسلوب بھی اپنایا گیا کہ ممکن ہے اسی طرح شدت مخالفت کم ہو جائے۔

آگے مضمون جاری ہے کہ قرآن کے بارے میں اور دین اسلام اور اسلامی نظام کے بارے میں وہ جو کہتے تھے ان کا جائزہ۔ وہ اپنی کندھ بلب اور کفر کی ایک اور وجہ جو اب بھی پیش کیا کرتے تھے۔ یہ منکر اور زعم خود اپنے درجے کے لوگوں کی بات ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ

فَسَيَقُولُونَ هَذَا أَفْلَك قَدِيمٌ (۱۱: ۴۶) ”جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے حلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے۔ چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔“

آغاز اسلام میں ’اسلام کی طرف فقرا اور غلام لپکے تھے۔ اس لیے کبرا اور مستکبرین اس کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ ان کی نظروں میں یہ بات کھلتی تھی اور وہ یہ کہتے تھے اگر یہ دین کوئی اچھا دین تھا تو یہ لوگ کیا ہم سے زیادہ جاننے والے اور ہشیار تھے اور نہ ہمارے مقابلہ میں یہ پھل کر سکتے تھے۔ کیونکہ ہم ان سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں‘ زیادہ باشعور ہیں اور ان کے مقابلے میں نیک و بد کی زیادہ تمیز رکھتے ہیں۔

لیکن یہ معاملہ ایسا نہیں تھا۔ یہ کبراء جو اسلام کو قبول نہ کرتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اس میں شک کرتے تھے یا جاہل تھے اور ان کو خبر نہ تھی کہ قرآن مجید سچائی ہی سچائی ہے۔ یا یہ کہ اس میں خبر نہیں ہے بلکہ تکبر کی وجہ سے وہ ایسا کرتے تھے اور یہ لوگ قبولیت حق کو اپنے سے فروتر کام سمجھتے تھے۔ پھر وہ یہ سمجھتے تھے کہ موجودہ اجتماعی نظام میں ان کو سوسائٹی میں جو مقام حاصل ہے یہ نہ رہے گا جو مفادات ان کو حاصل ہیں وہ نہ رہیں گے۔ پھر یہ بھی ایک وجہ تھی کہ آباء اجداد کے طریق کار کے بارے میں وہ یہ خیال کرتے تھے کہ یہ ایک قابل فخر رویہ ہے لیکن جو لوگ اسلام کی طرف پہلی ہی آواز پر لپکے ان کی راہ میں یہ موانع نہ تھے جن کی وجہ سے کبراء رک گئے تھے۔

ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ بڑے لوگ حق کو قبول نہیں کرتے۔ کبرا اور غرور کی وجہ سے ان کے لیے حق کے سامنے جھکنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ نظرت کی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔ اور وہ حجت کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ کبر و غرور ان کو ذکیٹ کرنا ہے کہ ہٹ دھرمی کرو اور نہ مانو۔ جھوٹے عذرات تراشو۔ باطل سے باطل جھوٹا دعویٰ کرو‘ یہ بڑے لوگ کبھی بھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لوگ اپنی دلت کو زندگی کا محور بنانے کی فکر میں ہوتے ہیں اور جس طرح وہ اپنے موجودہ معاشرے میں محور ہوتے ہیں اسے جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَيَقُولُونَ هَذَا أَفْلَك قَدِيمٌ (۱۱: ۴۶) ”چونکہ انہوں نے اس سے

ہدایت نہ پائی اس لیے یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔“ ہاں اگر ”ان“ لوگوں نے ہدایت قبول نہیں کی تو پھر لازماً سچائی میں کوئی نقص ہو گا۔ کیونکہ بڑے لوگوں سے تو غلطی کا صدور ممکن نہیں! لیکن یہ لوگ اپنی نظر میں اور جمہور عوام کی نظروں میں اپنے آپ کو وہ جو باور کراتے تھے کہ وہ ایک معصوم اور غلطی سے پاک قسم کی مخلوق ہیں۔

بہر حال وحی کے سلسلے میں یہ پیرا گراف اور مطالعاتی سفر کتاب موسیٰ کی طرف ایک اشارے پر ختم ہوتا ہے کہ قرآن

سابقہ کتب سادی کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔ خصوصاً تورات اور قرآن کے درمیان گہری مماثلت ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مشن تو تورات ہی کا تکملہ تھا۔ اس سے پہلے بنی اسرائیل کے ایک گواہ کی طرف بھی اشارہ ہو چکا ہے۔

وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَى إِمَامًا وَرَحْمَةً وَهَذَا كِتَابٌ مُصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّنَذِرَ

الَّذِينَ ظَلَمُوا وَبُشْرَى لِلْمُحْسِنِينَ (۱۲: ۴۶) ”حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آچکی ہے اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی زبان عربی میں آئی ہے تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے۔“ قرآن کریم نے سابقہ کتب سادی کے ساتھ اپنے تعلق کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے خصوصاً تورات کی طرف اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب تو اس کا تکملہ تھی اور ان کا مشن تورات ہی کا تسلسل تھا۔ اصل دستور و قانون تو تورات ہی میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے امام اور رحمت کا لقب دیا گیا جب کہ ہر رسالت اس زمین اور اہل زمین کے لیے رحمت ہوئی ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

وَهَذَا كِتَابٌ مُصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا (۱۲: ۴۶) ”اور یہ کتاب تصدیق کرنے والی زبان عربی میں

ہے۔“ یہ تصدیق ان اصل کتابوں اور اصل تعلیمات کی کرتی ہے جن کے اوپر تمام ادیان سادی قائم ہیں۔ یہ کتاب اس نظام کی تصدیق کرتی ہے جس کے مطابق تمام اہل دین چلتے رہے۔ اور یہ کتاب اس صراطِ مستقیم کی تصدیق کرتی ہے جو انسانوں کو اللہ تک پہنچاتا ہے۔

اور عربی کتاب جس طرح وہ تھی، یہاں اس لیے کہا گیا کہ اہل عرب پر اس احسان کا اظہار کر دیا جائے کہ ان کی زبان میں یہ کتاب اتری۔ اور ان کو یاد دلایا گیا کہ تم پر تو اللہ کا خصوصی کرم ہوا ہے۔ اور خاص مہربانی اور عنایت ہوئی ہے کہ تم کو اس دعوت کا حامل بنایا اور تمہاری زبان کو یہ اعزاز بخشا کہ اس میں قرآن عظیم نازل ہوا۔ مقصد صرف زبان نہ تھی بلکہ یہ تھا۔

لِّنَذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَبُشْرَى لِلْمُحْسِنِينَ (۱۲: ۴۶) ”تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور

نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے۔“

اس پہلے سبق کے آخر میں محسنین کی جزائی تصویر کھینچی جاتی ہے اور جایا جاتا ہے کہ قرآن کریم تمہارے لیے یہ خوشخبری ماتا ہے۔ بشرطیکہ وہ توحید مطلق اور ربوبیت کا اعلان کر دس اور پھر اس پر جم جائیں اور اس کے تقاضے پورے کریں۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا

هُمُ يَحْزَنُونَ ﴿۱۳﴾ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا

يَعْمَلُونَ ﴿۱۴﴾

”یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، پھر اس پر جم گئے، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اپنے ان اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں۔“

یہ کہ انہوں نے رہنا اللہ کہہ دیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے جو انہوں نے کہہ دی۔ یہ محض ایک عقیدہ بھی نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل نظام زندگی کا اقرار ہے۔ زندگی کی تمام سرگرمیوں کا نام ہے رہنا اللہ۔ اللہ ہی ہمارا رب، ہماری سوچ میں بھی، ہمارے نظریات میں بھی، ہمارے اعمال میں بھی اور اس دنیا میں ہمارے پورے تعلقات میں بھی۔

اللہ ہی ہمارا رب ہے، لہذا ہم اسی کی بندگی کریں گے، اسی سے ڈریں گے، اسی پر بھروسہ کریں گے اور اسی کا رخ کریں گے۔ اللہ ہی ہمارا رب ہے، لہذا تمام وسائل و ذرائع اسی کے ہیں اور اس کے سوا کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ کسی اور سے کوئی طمع و لالچ جائز ہے۔

اللہ ہی ہمارا رب ہے، لہذا ہر سرگرمی، ہر سوچ اور ہر تقدیر اسی کی طرف ہے، اور ہر چیز میں اسی کی رضا مطلوب ہے۔ اللہ ہی ہمارا رب ہے، لہذا فیصلے بھی وہی کرے گا، شریعت اور قانون بھی اسی کا ہو گا اور ہدایت اور رہنمائی بھی اسی کی ہوگی۔ اللہ ہی ہمارا رب ہے، لہذا اس کائنات میں جو لوگ ہیں جو اشیاء ہیں وہ ہمارے ساتھ مربوط ہیں اور ان کے ساتھ ہمارا رابطہ ہے۔ کیونکہ ان کا رب بھی اللہ ہی ہے۔ اللہ ہی ہمارا رب ہے تو نظام زندگی بھی اسی سے اخذ کریں گے۔ یہ محض الفاظ ہی نہ ہوں گے محض عقیدہ ہی نہ ہو گا، بلکہ ایک ربانی نظام ہو گا۔

ثُمَّ اسْتَقَامُوا (۴۶: ۱۳) ”اور پھر اس پر جم گئے۔“ یہ دوسری شرط ہے۔ یہ اس طرح کہ وہ اسلامی نظام کو قبول کرنے کے بعد اس پر جم گئے۔ ان کا دل اور ان کا نفس اس پر مطمئن ہو گیا، ان کے خیالات اور تصورات اس پر جم گئے، ہر قسم کا اضطراب اور شک ختم ہو گیا، تمام دوسری دلچسپیاں اور تمام کششیں ختم ہو گئیں، تمام میلانات اور رجحانات ختم ہو گئے۔ یہ بات یاد رہے کہ دنیا کی دلچسپیاں متنوع اور جاذب ہوتی ہیں اور کسی نظام اور طریق کار پر جم جانا بڑا ہی مشکل کام ہے، جگہ جگہ انسانوں کے لیے پھسلنے کے مقامات ہوتے ہیں اور رکاوٹیں ہوتی ہیں اور ہر طرف سے اپنی طرف کھینچنے کے لیے آوازیں اٹھتی ہیں۔

رَبَّنَا اللَّهُ (۴۶: ۱۳) ”اللہ ہی ہمارا رب ہے“ کہنے کے بعد پورا نظام زندگی اپنانا ہوتا ہے اور اس پر جم جانا ہوتا ہے اور جن لوگوں کو اللہ نے معرفت حق اور استقامت علی الحق عطا کر دی وہ بہت ہی بڑے اور مختار لوگ ہوتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے حق میں یہ فیصلہ صادر ہوا۔

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۴۶: ۱۳) ”ان کے لیے نہ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ وہ کیوں ڈریں اور کیوں پریشان ہوں۔ جس نظام کو انہوں نے اپنایا ہے وہ اللہ تک پہنچانے والا ہے اور اس پر جم جانا اللہ کی طرف سے ضمانت ہے۔

اُولَٰئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۴۶: ۱۴) ”اپنے لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے“۔ اپنے ان اعمال کے بدلے جو دنیا میں وہ کرتے رہے۔ یہاں یہ عمل کا نفع رہنا اللہ کی توفیق کرتا ہے۔ اور نفع منہاج پر استقامت کے معنی متعین کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنت میں ہمیشہ رہنا تمہارے اعمال اور تمہاری استقامت کی وجہ سے ہے۔ یعنی ”اللہ ہی ہمارا رب ہے“ کے منہاج اور اس پر استقامت سے عمل اور مسلسل عمل سامنے آئے اور وہ اس پر جم جائیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دین میں اعتقادات اور تصورات محض الفاظ ہی نہیں ہوتے کہ کوئی صرف کلمہ طیبہ کے الفاظ کہہ دے، بلکہ کلمہ طیبہ ایک طریق زندگی ہے۔ اگر کلمہ محض الفاظ ہی ہوں ایک طرز زندگی نہ بنے تو وہ ارکان اسام والا کلمہ نہ ہو گا۔ آج لاکھوں لوگ کلمہ طیبہ کی شہادت محض زبانی تو دیتے ہیں مگر یہ کلمہ ان کے ہونٹوں سے آگے نہیں بڑھتا اور یہ کلمہ ان کی زندگی کے اوپر کوئی اثر نہیں ڈالتا، نہ اس کے اندر کوئی تغیر پیدا کرتا ہے۔ کلمہ پڑھنے کے بعد وہ اسی طرح جاہلانہ زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح دوسرے بت پرست کرتے ہیں، جبکہ اپنے ہونٹوں سے وہ دن رات یہ کلمہ پڑھتے رہتے ہیں، یہ الفاظ ہی ہوتے ہیں، ان کی زندگیوں میں اس کا مفہوم نہیں ہوتا۔

لا الہ الا اللہ، یا ربنا اللہ، اللہ ہی ہمارا رب ہے، یا اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ یہ تو دراصل زندگی گزارنے کا ایک طریقہ اور منہاج ہے۔ یہ مفہوم ہر مسلمان کو اپنے ذہن میں چھی طرح بشعائیت چاہئے تاکہ وہ پھر اس نظام کو تلاش کرے جس کی طرف ان کلمات میں اشارہ کیا گیا ہے اور وہ اس نظام پر غور کرے اور اسے قائم کرنے کی فکر کرے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۸ ۲۳ ایک نظر میں

یہ سبق انسانی فطرت کے موضوع پر ہے کہ جب انسان صحیح فطرت پر ہوتا ہے تو وہ کس طرح ہوتا ہے اور جب اس کی فطرت بگڑ جائے تو اس کے شب و روز کیا ہوتے ہیں۔ آغاز اس فصاحت سے کیا جاتا ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اسلامی اخلاق و آداب اور خصوصاً والدین کے بارے میں وصیت قرآن کریم میں اسلامی عقیدے کو اپنانے کے ساتھ متصلاً آئی ہے۔ اس لیے کہ ایمان کے تعلق کے بعد اسلام والدین اور اولاد کے لچھے تعلق کو اہمیت دیتا ہے۔ ایمان کے بعد ایک مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ اسلام لانے اور عقیدہ توحید اپنانے کے بعد فوراً والدین کے ساتھ حسن سلوک کو کیوں لایا جاتا ہے؟ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام احترام والدین کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسلام اور قرآن یہ جانا چاہتے ہیں کہ باپ اور بیٹے کے درمیان جو قوی تعلق ہے۔ نہ سب سے مضبوط تعلق ہے لیکن اسلامی تعلق اور اخوت خونی رشتوں سے بھی برتر ہے۔

اس سبق میں دو نمونے دیئے گئے ہیں، ایک نمونہ یہ ہے کہ والدین اور اولاد کے درمیان خونی رشتہ بھی ہے اور اس کے بعد نظریاتی رشتہ بھی ہے تو دونوں کے درمیان یہ تعلق ہدایت یافتہ تعلق ہو گا اور دونوں اللہ تک پہنچ کر جنت کے مستحق ہوں گے۔ دوسرے نمونے میں نسب کا رشتہ ایمان کے رشتے سے جدا ہو جاتا ہے۔ یہ آپس میں نہیں ملتے۔ اس صورت میں خون کے رشتے کے باوجود اور دجہنم کی مستحق ہوتی ہے اور پھر قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر بھی پیش کیا جاتا ہے اور اس میں فسق اور انکبار کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۸ ۲۳ تشریح آیات

۱۵۔۔۔ تا۔۔۔ ۲۰

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ
 كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ
 سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَ عَلَىٰ
 وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ
 إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَقَبَلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا
 وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعَبَادَ الصَّدَقِ الَّذِينَ كَانُوا
 يُوعَدُونَ ﴿٢٠﴾

”ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا ”اے میرے رب“ مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں۔ اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔“

یہ وصیت جنس انسان کے لیے ہے۔ اور یہ انسانیت کی بنیاد پر ہے۔ اس وصیت کے لیے انسان کے علاوہ کسی اور صفت کی ضرورت کو نہیں لایا گیا۔ اور احسان کے ساتھ بھی کوئی قید اور شرط نہیں لگائی۔ والد کا محض والد ہو یا ہی یہ فرض کر دیتا ہے کہ اس کے ساتھ احسان کیا جائے۔ والد ہونے کے ساتھ کوئی اور صفت ضروری نہیں ہے۔ اور یہ وصیت اس اللہ نے فرمائی جو انسان کا خالق ہے اور یہ وصیت شاید صرف انسان ہی کو کی گئی۔ مخلوقات کی دوسری اصناف کو شاید یہ حکم

نہیں دیا گیا۔ آج تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ دوسرے حیوانات پرندوں اور حشرات الارض کو اس قسم کی کوئی ہدایت ہو۔ ہاں یہ بات حیوانات کی فطرت میں بھی دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش کس۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ وصیت صرف انسان کو ہے اور یہ ہے بھی خاصہ انسان۔

قرآن کریم میں بھی اس حکم کا تکرار ہے جو بطور وصیت کیا گیا اور احادیث میں بھی اس کی سخت تاکید آتی ہے۔ البتہ والدین کو اپنی اولاد کے بارے میں بہت ہی کم وصیت کی جاتی ہے۔ اگر کوئی ہدایت ہے تو بعض حالات کے بارے میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی پرورش والدین کی فطرت کے اندر ہی رکھ دی گئی ہے۔ والدین خود بچے کی پرورش کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کو اس کام کے لیے اہمارے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ والدین بچوں کے لیے اس قدر قربانیاں دیتے ہیں کہ بعض اوقات والدین بچوں پر اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔ رنج و الم تو معمولی بات ہے اور اسی سلسلے میں وہ ان سے کوئی عوض طلب نہیں کرتے۔ نہ ان سے طالب شکر ہوتے ہیں۔ لیکن نوجوان نسل پیچھے کو کم ہی دیکھتی ہے۔ کیونکہ ان سے اس قسم کی قربانی کا مطالبہ خود ان کی اولاد کرتی ہے اور یونہی زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔

لیکن اسلام نے اپنی فطری تعلیمات کی رو سے سوسائٹی کی پہلی اکائی خاندان کو مقرر کیا ہے۔ خاندان ہی وہ گوارہ ہے جس میں باپوں بچے پرورش پاتے ہیں اور بڑے ہوتے ہیں۔ اس گوارے سے بچے محبت 'عقاد' باہم کفالت اور خاندان کی تعمیر و تربیت حاصل کرتے ہیں۔ جس بچے کو کسی خاندان کی تربیت نہیں ملتی وہ اپنی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو سے ناقص ہوتا ہے۔ اگرچہ خاندان کے دائرہ سے باہر اس کو ضروریات زندگی وافر مقدار میں میسر ہوں۔ اور اس کی تعلیم و تربیت کا اچھا انتظام کیا گیا ہو۔ ایسے بچے میں سب سے بڑی جو کمی ہوتی ہے وہ محبت کے شعور کی کمی ہوتی ہے۔ یہ بات علمائے نفسیات کے ہاں ثابت ہو چکی ہے کہ ہر بچہ زندگی کے پہلے دو سال صرف اپنی ماں کی گود میں رہنا چاہتا ہے۔ اور وہ اس میں کسی اور کی شرکت نہیں قبول کرتا۔ دنیا میں بچوں کی پرورش کے جو مصنوعی ادارے بنائے گئے ہیں ان میں سب سے پہلے تو ماں مفقود ہوتی ہے۔ کیونکہ وہاں کام کرنے والی عورت یعنی نرس کو تو کوئی بچہ سنبھالنے پڑتے ہیں۔ ان بچوں کا پھر ایک دوسرے کے ساتھ حسد ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مصنوعی مشترکہ ماں پر باہم مشاغل ہوتے ہیں 'یوں بغض و عناد ان کی ابتدائی زندگی سے ان میں پردان چڑھتا ہے اور جس ننھے دل میں نفرت پیدا ہو جائے۔ اسی میں پھر محبت پیدا نہیں ہوتی۔ پھر بچے کے اوپر ایک عرصے تک ہی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کی شخصیت میں ثبات پیدا ہو جائے۔ اور یہ بات صرف ایک خاندان ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔ رہے بچوں کی پرورش کے مصنوعی ادارے تو ان میں بچہ ایک ہی مضبوط نگران سے محروم ہوتا ہے کیونکہ مصنوعی ماؤں کی ذیونیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے ان کی شخصیت کے اندر بھی انتشار ہوتا ہے۔ اور وہ مضبوط شخصیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے اداروں کے جو تجربات سامنے آ رہے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بچوں کی پرورش کے لیے خاندان کی نرسری کو جو ضروری قرار دیا ہے اس کے اندر بڑی گہری حکمت ہے اور بچوں کی تربیت کا فطری طریقہ وہی ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے 'جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہے۔ اور قرآن یہاں اس ماں کے کردار کو قلمبند کرتا ہے۔ ماں کی مستحسین 'ماں کی محبتیں اور ماں کی جدوجہد اور نہایت ہی کریمانہ انداز اور شریفانہ برتاؤ۔ اللہ نے اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ احسان کرنے کی جو وصیت کی ہے 'اس کی تعمیل میں

نولاد اگر رات دن لگی رہے تو بھی وہ ماں کے احسان کو پورا نہیں کر سکتی۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمَلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (۱۵: ۴۶)
 ”اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جتا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔“

اللہ نے ماں کی مشقتوں کے لیے جن الفاظ کا انتخاب کیا ہے ان کا تلفظ ہی مشقت کا اظہار کر دیتا ہے۔ الفاظ کی آواز اور ترجمہ ہی سے جہد و مشقت اور تھکاوٹ ظاہر ہوتی ہے۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا (۱۵: ۴۶) ”ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اسے جتا۔“ جس طرح تھکا ماندہ آدمی لمبی لمبی سانس بھرتا ہے۔ مشکل سے سانس لیتا ہے تھکا ہوا ہوتا ہے۔ یہی ہوتی ہے حمل کی تصویر خصوصاً آخری دنوں میں اور وضع حمل اور اس کی مشکلات اور اس کے آلام تو ہر کسی کو معلوم ہیں۔

آج کل علم جنین بہت آگے بڑھ گیا ہے اور حمل کے تمام مراحل اور اس کے اندر ہونے والی عملیات سے انسان واقف ہو چکا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں ان تمام عملیات میں کس قدر مشقت اٹھاتی ہے اور قربانی دیتی ہے۔ عورت کے انڈے کے ساتھ جب مادہ منویہ کا جراثیم ملتا ہے تو یہ رحم مادر کی دیواروں سے چپکنے کی سعی کرتا ہے اور رحم کی دیوار سے چپکنے ہی اس کی دیوار کو کھانا شروع کر دیتا ہے کیونکہ اس کے اندر کھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ رحم کی دیواروں کو دیکھ کی طرح چاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ جس جگہ کو یہ کھانا شروع کرتا ہے وہاں ماں کا خون جمع ہوتا ہے اور ایک چھوٹا سا حوض بن جاتا ہے اور یہ انڈا جس کے اندر جراثیم ہوتا ہے اور یہ جراثیم دونوں خون کے اس حوض میں ہوتے ہیں اور خون کے اندر ماں کے جسم کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اس خون کو یہ چوستا ہے اور بڑھتا رہتا ہے اور رحم کی دیواروں کو یہ چاٹتا رہتا ہے اور خون پیتا رہتا ہے۔ اور مادہ حیات حاصل کرتا ہے۔ یہ ماں کھانا کھاتی ہے پانی پیتی ہے اور خوراک ہضم کر کے اس انڈے اور اس جراثیم کے لیے تازہ خون تیار کرتی ہے اور اس خونخوار جراثیم کو خوراک مہیا کرتی ہے۔ ایک ایسا وقت آتا ہے کہ بچہ کی ہڈیاں بننا شروع ہوتی ہیں اور اس وقت پھر وہ زیادہ خون چوستا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں بعض اوقات والدہ کو ٹیکسیم کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس دور میں عورت ہڈیوں کا گودا اس بچے کو فراہم کرتی ہے تاکہ اس بچے کا جسمانی ڈھانچہ تیار ہو اس عظیم جہد و جد کا یہ ایک قلیل حصہ ہے۔ پھر وضع حمل کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ نہایت ہی پر مشقت اور کربناک عمل ہے۔ لیکن ماں کے اندر جو بے پناہ محبت ہوتی ہے اپنے بچے کے لیے اس کی وجہ سے یہ سب کچھ وہ برداشت کرتی ہے کیونکہ یہ تقاضائے فطرت ہے۔ یوں ماں اس چھوٹے بچے کو زندگی دیتی ہے اور خود کچھلتی جاتی ہے۔ اس کے بعد دودھ پلانے اور پھر پالنے پوسنے کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے گوشت اور خون کا لچوڑ دودھ کی شکل میں اسے دیتی ہے۔ اور اپنے دل دماغ اور اعصاب کی پوری قوت صرف کر کے اسے پالتی ہے۔ لیکن ان تمام مشقتوں کو وہ خوشی خوشی قبول کرتی ہے۔ نہایت محبت اور رحیمانہ انداز میں۔ کبھی نہیں تھکتی کبھی بچے سے نفرت نہیں کرتی ان تمام مشقتوں کا صلہ یہ ماں صرف یہ چاہتی ہے کہ اس کا بچہ صحیح و سالم ہو اور بڑھتا ہی چلا

جائے۔ پس یہی صلب ہو وہ چاہتی ہے۔

اس طویل جدوجہد اور مشقت اور تریانی کا صلہ کوئی ماں کو دے سکتا ہے۔ کوئی خواہ کتنی ہی جدوجہد کرے، ماں کی خدمت میں اس کا صلہ کوئی نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی کٹہ نہ، جہد بھی کرے وہ بھی قلیل ہوگی۔

ایک شخص طواف کرتے ہوئے اپنی ماں کو اٹھانے ہو۔ تو اور وہ رسول اللہ کے سامنے آیا تو ہر دیا کہ حضور میں نے اس کا حق ادا کر دیا تو آپؐ نے فرمایا ”نہیں صرف ایک بار سانس لیے۔ برابر بھی ہیں۔“ (البزہ)
اب قرآن مجید اس انسان کو والدین کے ساتھ احسان کی وصیت اور ماں کی بے مثال مشقتوں اور تریانیوں کے مرحلے سے گزار کر اسے سن رشد میں لے جاتا ہے۔ اب یہ مضبوط اتوار اور دانشمند ہے۔ اور اس کی نظرت درست ہے اور اس کا دل ہدایت یافتہ ہے اور یہ ہے قرآن کا انسان مطلوب۔

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ اُسْدُهُ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ
اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَاَصْبِحْ لِيْ فِي ذُرِّيَّتِيْ اِنِّىْ

تُبْتُ الْيَتٰى وَاَلِيٍّ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۱۵:۴۶) ”یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا ”اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں۔“

انسان سن رشد کو ۳۰ اور ۴۰ کے درمیان پہنچ جاتا ہے۔ چالیس سال رشد و ہدایت کی انتہا ہوتے ہیں اس میں انسان کی تمام قوتیں مکمل ہو جاتی ہیں اور انسان مدبر اور فکر میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اب یہ تکمیل کے مراحل طے کر جاتا ہے۔ اور اس کے اندر خمیراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سن میں پھر جو مستقیم الفطرت ہو وہ اس زندگی سے درابند ہو کر سوچتا ہے۔ اور پھر وہ پوری انسانیت کے انجام پر بھی غور کرتا ہے۔

قرآن مجید ایک ایسی شخصیت کی رہنمائی و ارادات کو یہاں قلم بند کرتا ہے جو فطرت سلیمہ کی مالک ہو اس مرحلے میں جہاں انسان عمر کا ایک حصہ پیچھے چھوڑ چکا ہے اور اگلی عمر میں پھر وہ متوجہ الی اللہ ہوتا ہے اگر مستقیم الفطرت ہو۔

رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ (۱۵:۴۶)
”اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں۔“ یہ ایک ایسے دل کی دعا ہے جو اپنے رب کی نعمتوں کا شعور رکھتا ہے کہ یہ انعامات جو تو نے مجھ پر کیے اور مجھ سے پہلے میرے والدین پر کیے اور مسلسل اگلے وقتوں سے یہ انعامات ہو رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے قوت شکر بہت کم ہے۔ اے اللہ آپ ہی ہمیں توفیق دے اور ضبط دے کہ ہم یہ شکر بجالائیں۔ یہ نہ ہو کہ میں ادھر ادھر ہو کر انتشار میں اپنی قوتیں ہی ضائع کر دوں اور اصل کام یعنی شکر الہی بجالانے کو ایک طرف چھوڑ دوں۔

وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ (۱۵:۴۶) ”اور میں نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو“۔ یہ دوسری دعا ہے یہ شخص اللہ کی مدد و طلب کرتا ہے کہ وہ عمل صالح کر سکے۔ وہ اپنے کمال اور احسان کو رضائے ربی کے کام میں استعمال کرے کیونکہ رضائے الہی اس کا بڑا مقصد ہے۔ رضائے الہی حصولِ نجات کے لیے توبہ کی پوری جدوجہد ہے۔

وَأَصْلَحَ لِي فِي دِينِي (۱۵:۴۶) ”اور میری دین میں بھی نیک بنا کر مجھے سچے دین“۔ یہ تیسری دعا ہے۔ ہر صالح آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی صالحیت اس کی اولاد میں منتقل ہو۔ اور اس کا دل مطمئن ہو کہ اس کی اولاد میں ایسے لوگ ہیں جو اس کے بعد اللہ کی بندگی اور اس کی رضامندی کے طالب ہوں گے۔ نیک اولاد بندہ صالح کی پسلی تمنا ہوتی ہے اور خزانوں اور دولت کے مقابلے میں وہ نیک اولاد کو ترجیح دیتا ہے۔ زندگی کی ہر آرائش و زیبائش سے زیادہ اسے نیک اولاد پسند ہوتی ہے اور یہ دعا والدین سے اولاد کی طرف جارہی ہے کہ آنے والی نسلوں میں بھی اللہ کی بندگی ہوتی رہے۔ اور یہ جو دعائیں اور درخواستیں وہ کر رہا ہے ان کی منظوری کے لیے اس کے پاس سفارش یہ ہے کہ میں توبہ کرتا ہوں اور سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

أَنِّي تَوَّابٌ إِلَيْكَ وَ إِلَيَّ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۱۵:۴۶) ”میں توبہ کرنے والوں میں سے ہوں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں“۔ یہ ہیں ایک معیاری بندہ صالح کی صفات اپنے رب کے حوالے سے جس کی فطرت میدہی اور سلیم ہو۔ ایسے بندوں کے ساتھ اللہ کا تعلق پھر کیا ہوتا ہے اس کی وضاحت بھی قرآن نے کر دی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

أُولَئِكَ الَّذِينَ نَقَبَلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعَدَ الصَّادِقُ الَّذِي كَانُوا يُوْعَدُونَ (۱۶:۴۶) ”اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔“

اللہ کے ہاں جزاء اعمال حسہ پر ہے اور گنہگاروں کو معاف کر دیا جاتا ہے اور جنت کے اصل مستحقین کے ساتھ ایسے لوگ جا ملیں گے اور یہ اللہ کا وعدہ ہے نہ سچا وعدہ ہے۔ یہ وعدہ دنیا میں کیا گیا تھا اور اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

--- ○ ○ ○ ---

اور اس آیت کے مقابلے میں ’فجور اور گمراہی کا مال بھی ملاحظہ ہو۔‘

وَالَّذِي قَالَ لِبٰوَالِدَيْهِ اِنِّي لَكُمْ اَعِدْنِيْ اَنْ اُخْرِجَ وَقَدْ خَلَيْتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ وَهُمَا يَسْتَعْجِلُنِ اللّٰهَ وَبِكَ اٰمِنُ اِنْ وَعَدَ اللّٰهُ حَقًّا ۖ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَا اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۚ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ

فِي أَمْرِ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ﴿١٧﴾
 وَلِكُلِّ دَرَجَتٍ مِمَّا عَمِلُوا ۖ وَيُؤْفِقُهُمْ أَعْمَالُهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٨﴾ وَيَوْمَ
 يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَتَكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ
 اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۖ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿١٩﴾ فِي
 الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ﴿٢٠﴾

۱۰۸

”اور جس شخص نے اپنے والدین سے کہا: ”اف تنگ کر دیا تم نے کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد قبر سے نکالا جاؤں گا؟ حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں (ان میں سے تو کوئی اٹھ کر نہ آیا) ماں اور باپ اللہ کی دہائی دے کر کہتے ہیں ”ارے بد نصیب! ماں جا، اللہ کا وعدہ سچا ہے“ مگر وہ کہتا ہے ”یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جو ٹوٹے (اسی تلاش کے) ہو گزرے ہیں انہی میں یہ بھی جا شامل ہوں گے۔ بے شک یہ گھانے میں رہ جانے والے لوگ ہیں۔“ دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کئے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔“ پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لا کھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: ”تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھالیا اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔“

والدین مومن ہیں اور لڑکا نافرمان ہے۔ وہ سب سے پہلے ان کی نیک روش کا انکار کرتا ہے۔ وہ نہایت ہی کرخت جارح اور قابل نفرت انداز میں ان سے مخاطب ہوتا ہے۔

أَفْ لَكُمْ أَمْ لَا (۱۷: ۴۶) ”اف تنگ کر دیا تم نے“ اور اس کے بعد پورے دین کی بنیاد ہی کا انکار کر دیتا ہے یعنی آخرت کا۔ اور ان الفاظ میں:

أَتَعِدُنِي أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلْتُ الْقُرُونُ مِنْ قَبْلِي (۱۷: ۴۶) ”کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد قبر سے نکالا جاؤں گا؟ حالانکہ مجھ سے پہلے نسلیں گزر چکی ہیں“۔ یعنی وہ چلے گئے اور ان میں سے کوئی ایک بھی تو دلہن نہیں آیا۔ حالانکہ قیامت کا وقت طے شدہ ہے اور لوگوں کا اٹھایا جانا اس طرح ہو گا کہ سب کو اکٹھا اٹھایا جائے گا، ایک ایک آدمی کو نہیں۔ یہ بات تو اس کو کسی نے بھی نہ کہی تھی کہ ایک ایک آدمی کو یا ایک ایک نسل کو اٹھایا جائے گا۔ یہ کوئی مزاح تو ہے نہیں۔ یہ تو آخری حساب ہو گا اور سب کا ہو گا۔

والدین اس کے منہ سے یہ کفر سنتے ہیں اس کی ان باتوں سے پریشان ہو جاتے ہیں یہ اللہ کا بھی گستاخ ہے اور ان

کے ساتھ بھی مستحکم رویہ رکھتا ہے۔ وہ سخت پریشاں ہو جاتے ہیں۔ مارے خوف کے کانپ اٹھتے ہیں۔

وَهُمَا يَسْتَغِيثَنَّ اللَّهُ وَيَلْتَأَمِنُ أَنْ وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا (۱۷:۴۶) ”ماں اور باپ اللہ کی دہائی دے کر کہتے ہیں ”ارے پر نصیب مان جا، اللہ کا وعدہ سچا ہے۔“ ان والدین کی باتوں سے ان کا خوف اور پریشانی بھتی پڑتی ہے جبکہ یہ نافرمانا بد بخت کفر و انکار پر مصر ہے۔

فَيَقُولُ مَا هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۱۷:۴۶) ”مگر وہ کہتا ہے یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ باتیں ہیں۔“ اور اللہ پھر ایک لوگوں کے انجام کو جلد ہی ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔

---○●○---

أَوَلَيْكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ
سُوءٌ كَانُوا فَخْسِرِينَ (۱۸:۴۶) ”یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے، ان سے پہلے
دن۔ اور انسانوں کے جو ٹولے (اسی تلاش کے) ہو گزرے ہیں، انہی میں یہ بھی شامل ہوں گے۔ بے شک یہ گھائے
میں رہ جانے والے لوگ ہیں۔“

ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ اللہ کی عدالت سے ان کے خلاف فیصلہ صادر ہو جائے کیونکہ یہ منکر اور
تمثالانے والے ہیں اور اس قسم کے بہت سے لوگ موجود بھی ہیں اور گزر بھی گئے ہیں۔ انسانوں میں سے بھی ہیں اور جنوں
میں سے بھی ہیں۔ اور ان کے بارے میں اللہ نے جو فیصلہ کر دیا ہے، وہ نافذ ہو کر رہے گا۔ اللہ کے فیصلے نافذ ہوتے ہیں۔

أَنَّهُمْ كَانُوا فَخْسِرِينَ (۱۸:۴۶) ”بے شک یہ لوگ گھائے میں رہ جانے والے ہیں۔“ اس سے
بڑا خسارہ اور کیا ہو گا کہ انسان دنیا میں ایمان و یقین سے محروم ہو جائے اور آخرت میں اللہ کی رضامندی اور جنت سے
محروم ہو جائے اور پھر دائمی طور پر عذاب جہنم میں گرفتار ہو جائے۔

---○○○---

لو پر حملہ یہ بتا دیا گیا اہل ہدایت کو جزا ملے گی اور اہل ضلالت کو سزا اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ حساب میں کسی کے
ساتھ ناانصافی نہ ہوگی۔

وَلَكِنْ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا وَلِيُوفيَهُمْ أَعْمَالُهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۱۹:۴۶)
”دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں، کہ اللہ ان کے کئے کا پورا پورا بدلہ ان کو
دے۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔“

ہر فرد کا اپنا مقام ہے اور ہر فرد کی اپنی کمائی ہے۔ اور ہر فرد کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ ملے گا۔ جن دو
گروہوں کا اوپر ذکر ہوا، وہ گروہ مسلمانوں میں سے ہیں۔ لیکن یہاں قرآن مجید نے ان کا تعین دو گروہوں اور دو

افراد کی طرح کیا ہے اور یہ انداز بھی طرح ذہن نشین ہوتا ہے۔ یوں گویا ایک متعین مشاں کو بیان کیا جا رہا ہو۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات بعض متعین افراد کے بارے میں وارد ہوئی ہیں لیکن ان میں سے کوئی روایت بھی صحت کے درجے میں نہیں ہے۔ مناسب یہی ہے کہ ان دونوں کو دو کرداروں کا بیان یا دو نمونے سمجھا جائے۔ دونوں نمونوں کے بیان کے بعد قرآن کریم۔ جو تبصرہ دونوں پر الگ الگ کیا ہے وہ عام ہے۔ پہلے نمونے کے بعد وہ یہ تبصرہ آیا ہے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ تَنفَلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَأْمَلُوا وَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ

الْجَنَّةِ وَعَدَّ الصَّدَقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ (۱۶: ۴۶) ”اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں۔ یہ جتنی لوگوں میں شامل ہوں گے۔ اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔“ اور دوسرے کردار پر تبصرہ یہ ہے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ

أَنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (۱۸: ۴۶) ”یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جو ٹولے (اس تلاش کے) ہو گزرے ہیں۔ انہی میں یہ بھی شامل ہوں گے بے شک یہ گھائے میں رہ جانے والے لوگ ہیں۔“ اور پھر دونوں فرقوں پر جو عام تبصرہ ہے۔

وَلِكُلِّ دَرَجَةٍ مِمَّا عَمِلُوا وَلِيُوفيَهُمْ أَعْمَالُهُمْ وَهُمْ لَا يَظْلَمُونَ (۱۹: ۴۶)

”دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔“ ان سب سے معوم ہوتا ہے، ان آیات میں دو متعین افراد کی طرف اشارہ نہیں بلکہ دو عام کرداروں کا تذکرہ ہے جو ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں۔

--- ۵۵۵ ---

اب ان کو قیامت کے ایک منظر کے سامنے کھڑا کر کے اس کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے کہ یہ ہو گا وہ دن جس کا تم انکار کرتے ہو۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَانُوا عَلَى النَّارِ أَدْهَتُمْ طَبِيعَتُكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ

اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ

الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ (۲۰: ۴۶) ”پھر جب یہ کافروں کے سامنے مقرر کیے جائیں گے تو اس سے کہا جائے گا: ”تم اپنے جیسے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے ہو ان کا لطف تم نے اٹھالیا۔“ یہ تکہ تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم۔“ عذاب دیا ہے۔“

یہ اسکرین پرست بڑی تیزی سے گزر جانے والی ایک جھلک ہے۔ گو ایک فیصلہ سنا دیا گیا لیکن دیکھنے والا گھرے غور و فکر میں غوب جاتا ہے۔ یہ منظر اس وقت کا ہے جب آگ میں ڈالے جانے سے قبل وہ جہنم کے اوپر لائے جائیں گے۔ اس وقت ان کو بتادیا جائے گا جس طرح مجرم کو سزا سے قبل سنا دیا جاتا ہے۔

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْنَعْتُمْ بِهَا (۶: ۲۰) ”تم اپنے جس کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا حسب تم نے اٹھا لیا۔“ دنیا میں ان کو اللہ نے بہت سی پاکیزہ چیزیں دی تھیں لیکن انہوں نے دنیا کی عیش و عشرت ہی میں سب کچھ لٹا دیا اور آخرت کے لیے کچھ بھی باقی نہ بچھوڑا۔ انہوں نے آخرت کا کوئی خیال نہ رکھا۔ اس طرح دنیا ہی میں چرچک گئے جس طرح جانور چرچک جاتے ہیں۔ اور کل کا خیال نہیں کرتے۔ نہ اللہ کا شکر داکیا۔ نہ حرام سے بچے اور نہ کوئی نیک کام کیا۔ ان کے اس رویہ کی وجہ سے اللہ نے ان کو دنیا ہی دے دی اور آخرت میں محروم کر دیا۔ ان کی بڑی غلطی یہ تھی کہ دنیا کے ان مختصر لمحات کے عیش کے لیے انہوں نے آخرت کی نہ ختم ہونے والی طویل زندگی کو بھلا دیا جس کی طوالت کا تصور بھی انسان نہیں کر سکتا۔

فَالْيَوْمَ تُحْرَوْنَ عَذَابَ الْهُوَٰلِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ

وَمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ (۶: ۲۰) ”اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔“ اس دنیا میں جو شخص بھی تکبر کرتا ہے وہ ناحق ہی کرتا ہے۔ تکبر اور کبرائی صرف اللہ کی چادر ہے۔ بڑائی کا حق اللہ کے بندوں کو نہیں ہے۔ نہ کم نہ زیادہ اور یہ توہین آمیز سزا اسی تکبر کے بدلے میں ہے اور جو لوگ فسق و فجور اختیار کرتے ہیں وہ بھی تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں اسی لیے ان کو بھی توہین آمیز سزا دی جائے گی کیونکہ عزت تو اللہ اور رسول اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

یہ سبق انہوں نے یہ سیکھنا چاہی کہ جس میں منکرین آخرت بدکاروں اور مسکبرین فی الارض کے لیے توہین آمیز سزا کا اعلان کیا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر فطرت سیدہ رکھنے والے لوگ خدا خوفی پر آمادہ ہو کر سیدھی طور محفوظ راہ لیتے ہیں۔

درس نمبر ۹۲۳ ایک نظر میں

یہ سبق گزشتہ دو اسباق سے بالکل مختلف موضوع پر ہے۔ گزشتہ اسباق میں انسانی قلب و نظر کو جن زاویوں سے لیا گیا تھا اس سبق میں ان سے مختلف بالکل ایک نیا پہلو لیا گیا ہے اس سبق میں مشرکین مکہ کو وادی احقاف کی سیر کر لئی جاتی ہے کہ یہ وادی اور دوسری وادیاں جو تباہ ہوئیں وہ مکہ کے ارد گرد واقع تھیں۔ اور یہ لوگ ان واقعات سے پوری طرح باخبر تھے جو قوم عاد اور ان کے رسول حضرت ہود علیہ السلام کو پیش آئے۔ انہوں نے بھی اپنے رسول سے وہی سلوک کیا تھا جو یہ حضرت نبی کریمؐ سے کر رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہی اعتراضات کیے تھے جو یہ کر رہے ہیں۔ اور حضرت ہود نے بھی آداب نبوت کے حدود و قیود کے اندر ان کو جوابات دیئے تھے، لیکن اہل مکہ کو معلوم ہے کہ ان پر اللہ کا کیسا سخت عذاب آیا۔ ان کی قوت اس عذاب کا مقابلہ نہ کر سکی۔ حالانکہ اہل مکہ سے وہ زیادہ قوی الجشہ تھے۔ ان کی دولت اور ثروت ان کو کوئی فائدہ نہ دے سکی۔ حالانکہ وہ ان سے زیادہ دولت مند تھے۔ وہ انہی کی طرح آنکھیں کان اور دل و دماغ رکھتے تھے مگر انہوں نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا۔ ان کے مقابلے میں وہ ذہنی لحاظ سے بھی اونچے تھے اور انہوں نے جو اللہ بنا رکھے تھے وہ بھی ان کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔

غرض مشرکین مکہ کو خود اپنے اسلاف کے انجام کے سامنے کھڑا کر کے قرآن ان کا نقشہ ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ رسالت کا یہ ایک ہی سلسلہ اور شجرہ ہے، ایک ہی دعوت ہے اور سنت الہیہ بھی ایک ہے۔ انہوں نے انکار کیا۔ ہلاک ہوئے، تم انکار کرتے ہو، ہدایت کے مستحق بنتے ہو۔ عقیدہ توحید کوئی نیا گھڑا ہوا عقیدہ نہیں ہے، یہ دعوت نوح علیہ السلام سے ادھر تاریخ میں چلی آرہی ہے۔ زمان و مکان کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۹۲۳ تشریح آیات

۲۱ --- تا --- ۲۸

وَ اذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتْ
 النُّجُورُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّىْ
 اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿٢١﴾ قَالُوْا اَجِئْتَنَا لِنَاْفِكَنا عَنْ اِهْتِنَا
 قَاتِنَا بِمَا تَعِدُنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٢﴾ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ
 اُبَلِّغُكُمْ مَا ارْسَلْتُ بِهٖ وَ لِكِنِّىْ اَرۡسَلُكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿٢٣﴾ فَلَمَّا رَاُوْهُ عَارِضًا
 مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَّتِهِمْ ؕ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّسۡطَرِّنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمُوْهُ
 رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ؕ يُّتَدَمَّرُ كُلّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاصْبَحُوْا لَا يَرٰى
 اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٢٤﴾ وَ لَقَدْ مَكَّنَّهُمْ فِىۡمَا اِنْ
 مَّكَّنَّكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفۡئِدَةً ؕ فَمَا اَغْنٰ عَنْهُمْ
 سَمْعُهُمْ وَّ لَا اَبۡصَارُهُمْ وَّ لَا اَفۡئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِذْ كَانُوْا يَجْعَدُوْنَ اِبۡلِيۡتَ
 اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهۡزِءُوْنَ ﴿٢٥﴾ وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا هَولَكُم مِّنْ

الْقُرْآنِ وَصَرَفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ فَلَوْلَا نَصْرُهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا
مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ ۖ وَذَلِكَ إِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوا
يَفْتَرُونَ ۝

”ذرا انہیں عار کے بھائی (ہو) کا قصہ سناؤ جب کہ اس نے احقاف میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا اور ایسے خبردار کرنے والے اس سے پیسے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی آتے رہے۔ کہ ”اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو“ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑا ہونٹا دکھانا کہ عذاب کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے کہا ”کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں بھگا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دے؟ اچھا تو لے آ“ اپنا وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر واقعی تو سچا ہے۔ اس نے کہا ”اس کا علم تو اللہ کو ہے“ میں صرف وہ پیغام تمہیں پہنچا رہا ہوں ہے کہ مجھے بھیجا گیا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت پر ت رہے ہو۔ پھر جب انہوں نے اس عذاب کو اپنی دادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے ”یہ بدل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا“ ”نہیں“ بلکہ یہ دینی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا صوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آ رہا ہے ”اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا“۔ آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح ہم بھروسوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ ان کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے۔ ان کو ہم نے کان آکھیں اور دس سب کچھ دے رکھے تھے مگر نہ وہ کان ان کے کسی کام آئے نہ آنکھیں نہ دل۔ یونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ تمہارے گرد و پیش کے علاقوں میں بہت سی بستیوں کو ہم برباد کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات بھیج کر بار بار طرح طرح سے ان کو سمجھایا شاید کہ وہ باز آ جائیں۔ پھر کیوں نہ ان بستیوں نے ان کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا اریہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا؟ بلکہ وہ تو ان سے کھڑے گئے اور یہ تھا ان کے جھوٹ اور ان بناؤنی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے۔“

احقاف، احقاف کی جمع ہے جس کے معنی ریت کے بند ٹیلے کے ہیں، اہل عاد کے مکانات جزیرۃ العرب کے جنوب میں حضرموت کے علاقے میں بلند ٹیلوں پر تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قلم دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی عاد کی کہانی سنیں اور یہ بتائیں کہ ان کے بھائی ہود نے بھی اسی طرح اپنی قوم کو ڈر دیا تھا۔ یہ اس لیے کہ حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں قوم کا رد عمل ایسا ہی تھا جس طرح اہل قریش آپ کی دعوت کی تکذیب کر رہے ہیں جس طرح آپ ان میں سے ہیں اسی طرح حضرت ہود بھی عادیوں میں سے تھے۔ دُک ذرا سنبھلیں کہ دعوت حق کی تکذیب کے ویسے ہی نتائج بھی ہو سکتے ہیں۔ عار کا عار بھی قریش کے قریب تھا اور ان کے واقعات سے وہ باخبر بھی تھے۔

عاد کے بھائی ہود علیہ السلام۔ اپنی قوم کو ہار دیا حضرت ہود بھی رسولوں میں سے کوئی پہلے رسول نہ تھے۔ ان سے پیسے بھی نئی اقوام میں رسول آچکے تھے۔

وَقَدْ خَلَقْتُ النُّذُرَ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ (۴۶: ۲۱) ”اور ایسے خبردار کرنے والے ان سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی آتے رہے۔“ زمان و مکان کے اعتبار سے ان کے قریب بھی تھے اور ان سے دور بھی تھے۔ کیونکہ لوگوں کو انجام بد سے ڈرانے کا سلسلہ اللہ نے اپنی مخلوق کے لیے جاری رکھا، دعوت و رسالت زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ یہ کوئی عجیب و غریب اور غیر معمولی بات تو نہ تھی۔

اور ان کو اس چیز اور اس دعوت اور اسی بات سے ڈراؤ جس سے تمام رسول ڈراتے رہے۔

أَلَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ أَنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۴۶: ۲۱) ”کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔“ اللہ کی بندگی کرو، یعنی عقیدہ بھی توحید کا رکھو اور پوری زندگی میں اطاعت بھی اللہ کے احکام کی کرو، اور اگر تم اس دعوت کی مخالفت کرو گے تو اس کے نتیجے میں دنیا و آخرت کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اشارہ یوم عظیم کے عذاب کی طرف ہے۔ یوم عظیم کا اطلاق قرآن مجید میں قیامت پر ہوتا ہے کہ قیامت کی خوفناکیاں عظیم و شدید ہیں۔
توجہ الی اللہ کی اس دعوت اور عذاب الہی سے ڈرانے کا انجام کیا ہوا۔

---○○○---

قَالُوا أَجِئْنَا لِنَتَفَكَّنَا عَنْ الْهَيْئَةِ فَأَتَيْنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ

(۴۶: ۲۲) ”انہوں نے کہا ”کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دے؟ اچھا تو لے آ“ اپنا وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر واقعی تو سچا ہے۔“
انہوں نے اپنے بھائی پر بدگمانی کی اور انہا ان کو چیلنج دے دیا کہ لاؤ وہ عذاب جس سے ڈراتے ہو اور اس کے ساتھ انہوں نے ان کا مذاق بھی اڑایا۔ اور باطل پر اصرار کیا۔ حضرت ہود ایک نبی کی طرح یہ سب باتیں برداشت کرتے ہیں۔ کوئی بڑا دعویٰ نہیں کرتے اور اپنے حدود میں رہتے ہوئے کہتے ہیں۔

---○○○---

قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَأُبَلِّغُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَكِنِّي أَرَكُمُ قَوْمًا

تَجْهَلُونَ (۴۶: ۲۳) ”اس نے کہا ”اس کا علم تو اللہ کو ہے، میں صرف وہ پیغام تمہیں پہنچا رہا ہوں جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔“

میں تو تمہیں عذاب سے ڈراتا ہوں کیونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہیں ڈراؤں۔ مجھے کیا معلوم کہ عذاب کب آئے گا، اور عذاب کیا ہو گا۔ ان امور کا علم تو اللہ کے پاس ہے۔ میں تو اللہ کی طرف سے صرف پیغام پہنچانے والا ہوں۔ میں اللہ کے ساتھ علم اور قدرت میں شریک نہیں ہوں۔

وَلَكِنِّي أَرَكُمُ قَوْمًا تَجْهَلُونَ (۲۳: ۴۶) ”...“ کچھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ بہت ہی کم عقل نظر آ رہے ہو اس سے بڑی حماقت اور کیا ہوگی کہ ایک بھائی اور ناصح مشفق ڈرا رہا ہے اور جواب میں وہ چیلنج دیتے ہیں۔

حضرت ہود اور ان کی قوم کے درمیان دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں طویل مکالمہ اور مجادلہ ہوا تھا۔ یہاں قرآن کریم اسے مختصر کر دیتا ہے کیونکہ یہاں جلد جلد ان کے سامنے انجامِ بد پیش کرنا ہے تاکہ ان کے چیلنج اور جلد بازی کا جواب دیا جاسکے۔

---○○○---

فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسَقِلًا أَوْدِيَّتِهِمْ قَالَوا هَذَا عَارِضٌ مُّمِطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ رِيحٌ فِيْهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ (۲۴) تَدْمِرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَاصْبِرْوا لَآ يَرِى الْاَلَمَ سَكِنُهُمْ كَذَلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ (۲۵) (۲۴: ۴۶ - ۲۵) ”پھر جب انہوں نے اس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے ”یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا۔“۔۔۔“ نہیں بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آ رہا ہے اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا۔“ آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح ہم مجرموں کو بذلہ دیا کرتے ہیں۔“

ردیلت میں آتا ہے کہ ان کو شدید گرمی نے آیا۔ بارش رک گئی اور خشکی اور سخت گرمی کی وجہ سے علاقہ آگ اور دھواں بن گیا۔ اس کے بعد بادل کا ایک ٹکڑا آیا۔ یہ لوگ بہت خوش ہوئے اور ان لوگوں نے وادیوں میں نکل کر اس بادل کا استقبال کیا۔ سمجھتے تھے کہ بس اب بارش ہوگی۔

قَالُوا هَذَا عَارِضٌ مُّمِطِرُنَا (۲۴: ۴۶) ”یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا۔“۔
اور لسانِ الحلال نے ان کو یہ جواب دیا۔

بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ رِيحٌ فِيْهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ (۲۴: ۴۶) تَدْمِرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا

رَبِّهَا (۲۵: ۴۶) ”نہیں بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آ رہا ہے۔ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا۔“ یہ نصیحت تیز چلنے والی ہوا ہے۔ اور اس قدر سخت اور بے قابو ہے جس طرح کوئی سرکش جاہل ہوتا ہے۔

مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَنْتَ عَلَيْهِ اَلَّا جَعَلْتَهُ كَالرِّمِيمِ (۴۲: ۵۱) ”جس چیز پر بھی وہ گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔“ قرآن کی اس آیت میں ہوا کو ایک زندہ مخلوق کی طرح بتایا گیا ہے گویا وہ سنتی ہے اور

اسے حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو نیست و نابود کر کے رکھ دو۔

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا (۲۵: ۴۶) ”اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کرنے والی“ یہ ہے وہ کائناتی حقیقت جس کا شعور قرآن کریم بار بار انسانوں کو دیتا ہے۔ یوں کہ یہ کائنات بھی اسی طرح زندہ ہے جس طرح ہم زندہ ہیں۔ اس کی تمام قوتیں شعور رکھتی ہیں۔ یہ تمام اشیاء اللہ کے احکام لیتی ہیں اور بجالاتی ہیں۔ انسان بھی ان قوتوں میں سے ایک قوت ہے۔ جب وہ ایمان لے آئے اور اس کا قلب معرفت الہی کے لیے کھل جائے تو پھر وہ بھی اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائناتی قوتوں سے پیغام لے سکتا ہے۔ ان کے ساتھ ہم قدم ہو کر چل سکتا ہے۔ اور یہ قوتیں بھی اس کے ساتھ چل سکتی ہیں۔ یہ چیزیں بھی مومن کے ساتھ اس طرح ہم قدم ہو کر چلتی ہیں، لیکن اس ہم آہنگی کی صورت وہ نہیں ہوتی جو زندہ انسانوں کی ہوتی ہے۔ درحقیقت گو ہر چیز زندہ ہے لیکن اس کی زندگی اس طرح نہیں جس طرح کی زندگی کے ہم مادی ہیں۔ ہم صرف زندگی کی ظاہری صورتیں ہی دیکھ سکتے ہیں اور اس ظاہر بینی کی وجہ سے باطن صورتیں ہم نہیں دیکھ سکتے۔ جن لوگوں کی چشم بصیرت کھل جاتی ہے۔ وہ دیکھ سکتے اگرچہ ہماری یہ آنکھیں ان کو نہیں دیکھ سکتیں۔

بہر حال اس ہوا کو جو حکم دیا گیا اس نے وہ پورا کر دیا۔ اس نے ہر چیز کو نیست و نابود کر دیا۔

فَاصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسْكَنُهُمْ (۲۵: ۴۶) ”آخر کار ان کا حاس یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا“۔ رہے وہ ان کے مویٹی، ان کے مال و اسباب تو ان میں سے کوئی چیز نہ رہی۔ خالی خالی مکانات و محلات رہ گئے۔ کوئی زندہ شخص ان میں نہ تھا۔

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ (۲۵: ۴۶) ”اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔“

یہ سنت جاریہ ہے اور مجرموں پر نافذ ہونے والی تھری اتھی ہے۔

--- ۰۰۰ ---

جانی کے اس نقشے کو دیکھنے والوں کی طرف ایک نکتہ توجہ! کہ دیکھو حضرت ہود کی قوم کی طرح تم بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہو۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّهُمْ فِيمَا اِنْ مَكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً فَمَا اَغْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَّ لَا اَبْصَارُهُمْ وَّ لَا اَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوا يَحْجِدُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَّ حَافِیْہُمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۲۶: ۴۶) ”ان کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے۔ ان کو ہم نے کان، آنکھیں اور دل سب کچھ دے رکھے تھے مگر نہ وہ کان ان کے کسی کام آئے نہ آنکھیں نہ دل۔ یونکہ وہ اللہ کی آیات کا اندازہ کرتے تھے اور اسی چیز کے مجرمین وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔“

یہ لوگ جن کو اللہ کی قوتوں میں سے ایک معمول قوت نہ مل سکی۔ کر دیا ان کو ہم نے وہ قوت دی جو

ابن اعلیٰ قریش 'تم کو نہیں دی گئی۔ قوت' مال، علم اور ساز و سامان میں وہ تم سے زیادہ تھے۔ اسی طرح بننے، دیکھنے اور سوچنے کی قوت بھی ان میں تم سے زیادہ تھی۔ قرآن کریم قوت مدرکہ کو کبھی دل کتا ہے، کبھی دماغ کتا ہے اور کبھی عقل کتا ہے۔ سب سے مراد قوت مدرکہ ہوتی ہے۔ یعنی ان کے یہ حواس بڑے ترقی یافتہ تھے مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ انہوں نے راہ ہدایت دیکھنے میں ان کو معطل کر دیا۔

اِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ (۲۶: ۴۶) ”کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے“۔ اور جب انسان آیات الہیہ کا انکار کر دے تو اس کے حواس معطل ہو جاتے ہیں اور اس کا احساس روشنی اور نور اور اوراک ختم ہو جاتا ہے۔

وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۲۶: ۴۶) ”اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے“ یعنی عذاب الہی اور مصیبت۔

اس واقعہ سے قرآن ہر صاحبِ سمع و بصر اور قلب کو جو سبق دینا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی قوت والا اپنی قوت پر مغرور نہ ہو، کوئی مالدار شخص اپنے مال پر مغرور نہ ہو، کوئی صاحبِ علم اپنے علم پر مغرور نہ ہو۔ اس لیے کہ اللہ کی ان کائناتی قوتوں میں سے یہ ایک ہی قوت تھی جسے اللہ نے ان زبردست قوت والے، مال والے اور علم والے لوگوں پر مسلط کیا اور انہیں ختم کر کے رکھ دیا۔ اور وہ یوں رہ گئے کہ صرف عالیشان مکانات ہی رہ گئے اور بس۔ اور جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو یہی ہوتا ہے۔

ہوا ایک ایسی قوت ہے جو مسلسل کام کرتی ہے اور یہ اللہ کے کائناتی نظام کے مطابق چلتی ہے۔ اللہ جس وقت چاہے اسے بربادی پر مامور کر دے۔ عام طور پر تو وہ تعمیر کا کام کرتی ہے لیکن جب اللہ چاہے تو وہ ہلاک کرنا شروع کر دیتی ہے۔ تمام کائناتی قوتیں جو ایک دگر پر کام کرتی نظر آتی ہیں ان کا سبب اس کے اندر یہی امر رہی ہے اور جب امر رہی دوسرا حکم دے تو یہ دوسرا کام کرتی ہیں جو کوتاہ نظر انسانوں کو خارق عادت نظر آتا ہے۔ نظام اسباب پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ وہ ہر چیز کو، ہر حرکت کو، ہر حادثہ کو، ہر رجحان کو، ہر شخص کو اور ہر کام کو اپنے احکام اور اپنے نقشے کے مطابق چلاتا ہے۔ اور جس جگہ بھی وہ کام ہوتا ہے اس کی قدر کے مطابق ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمیں وہ کام خارق عادت نظر آئے۔

ہوا بھی دوسری کائناتی قوتوں کی طرح اپنا مقررہ وظیفہ سرانجام دیتی ہے۔ اسی طرح انسانی قوت اور دوسری کائناتی قوتیں جو انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں وہ کائناتی نقشے کے مطابق کام کرتی ہیں۔ جو انسانی حرکت میں آتا ہے یہ قوتیں بھی اس کے ہم قدم ہو کر حرکت کرتی ہیں۔ یوں وہ اسے تسلیم اپنا کام کرتی ہے جو اللہ نے اس دنیا کے لیے مقرر کی ہے۔ انسان کو جو ارادے کی آزادی دی گئی ہے تو وہ اس کائناتی نظام کے فریم ورک کے اندر ہے۔ جسے اس کائنات کا ناموس کلی کہا جاتا ہے جسے نظام تضاد و تدرک کہ جاتا ہے۔ اور جسے سنت الہیہ کہا جاتا ہے جس کے اندر کوئی تغیر اور اضطراب نہیں ہوتا۔

---o o o---

اب اس سبق کا خاتمہ ایک عام تبصرے پر ہوتا ہے جس میں عاد کے سوا دوسری بستیوں کا بھی ذکر ہے جو مکہ کے ارد گرد زمانہ قبل میں ہلاک ہوئیں۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرَىٰ وَصَرَّفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۲۷) فَلَوْلَا نَصْرُهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ وَذَلِكَ أَفْكُهُمْ وَمَا كَانُوا يَفْقَهُونَ (۲۸: ۴۶) ”تمہارے گرد و پیش کے علاقوں میں بہت سی بستیوں کا نام نہ کر چکے۔ ہم نے اپنی آیات بھیج کر بار بار طرح طرح سے ان کو سمجھایا شاید کہ وہ باز آجائیں۔ پھر کیوں نہ ان بستیوں نے ان کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا؟ بلکہ وہ تو ان سے کھوئے گئے اور یہ تھا ان کے جھوٹ اور ان بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گمراہ رکھے تھے۔“

جزیرۃ العرب میں کئی بستیوں کو ہلاک کیا گیا تھا جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔ احقاف میں عاد ہلاک ہوئے۔ یہ جنوب میں تھے اور ثمود حجر میں ہلاک ہوئے جو شمال میں تھے اور سبا یمن میں ہلاک ہوئے اور اہل مدین شام کی راہ میں تھے۔ اسی طرح ذرا مزید شمال میں لوط کی بستیاں تھیں اور اہل عرب ان کی کمائیوں سے بھی واقف تھے اور ان بستیوں سے گزرتے رہتے تھے۔

ان آیات میں اللہ نے ان کی طرف ان کے انجام کی طرف اشارہ کیا کہ شاید مکہ کے مکذبین باز آجائیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کو بار بار سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے۔ اور اپنی گمراہی میں بوختے ہی چلے گئے۔ تب ان پر ہمارے عذاب آئے، قسم قسم کے عذاب۔ ان کے بارے میں بعد کے ”نے“ والے ان کی کمائیاں ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ عرب کے موجودہ مشرک بھی ان کو سنتے اور جانتے ہیں اور صبح و شام ان بستیوں میں سے گزرتے رہتے ہیں اور ان کے آثار ابھی تک قائم ہیں لیکن اسے کاش کہ وہ عبرت لیتے۔

یہاں اب قرآن مجید مشرکین مکہ کو ایک حقیقت واقعہ بتاتا ہے۔ اللہ نے ان سے پہلے بھی مشرکین کو ہلاک کیا اور ان کو نیست و نابود کر دیا اور ان میں سے ایک شخص بھی زندہ نہ رہا۔ لیکن وہ جن معبودوں کو پکارتے تھے اور یہ گمان کرتے تھے کہ یہ ان کو اللہ کے قریب تر لاتے ہیں تو ان بستیوں نے کیوں نہ اللہ کے غضب کو کم کر کے ان کو ہلاکت سے بچایا۔

فَلَوْلَا نَصْرُهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً (۲۸: ۴۶) ”پھر کیوں نہ ان بستیوں نے ان کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا۔“

نہ صرف یہ کہ ان بستیوں نے ان کی مدد نہ کی بلکہ بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ (۲۸: ۴۶) ”بلکہ وہ تو ان سے کھوئے گئے۔“ اور انہوں نے ان لوگوں کو اکیلا چھوڑ دیا اور ان کو ان معبودوں تک بھیجنے کا راستہ بھی معوم نہ ہوا تاکہ وہ ان کو پکڑیں اور اللہ کے عذاب سے بچنے میں ان کی مدد لیں۔

وَذَلِكَ أَفْكُهُمْ وَمَا كَانُوا يَفْقَهُونَ (۲۸: ۴۶) ”اور یہ تھا ان کا جھوٹ اور ان بنیادی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گمراہ رکھے تھے۔“ یہ جھوٹ اور افتراء ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا یہ انجام ہے۔ اور یہ ان معبودان باطل کی حقیقت ہے۔ اور اس شرک اور عبادت کا یہ انجام ہے کہ یہ لوگ نیست و نابود کر دیئے گئے۔ لہذا مکہ کے ان مشرکوں کو جو ان معبودوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ انہیں خدا کے قریب کریں گے اپنے اس فعل کے بارے میں سوچ لینا چاہئے کہ اس کا انجام کیا ہو گا اور ایسے عقائد کا انجام تاریخ میں کیا ہوتا رہا ہے۔

درس نمبر ۲۴۰ ایک نظر میں

اس سورت کا یہ آخری سبق ہے اس سورت کے موضوع کی وضاحت کے لیے یہ ایک نئی وادی میں سفر ہے۔ ایک واقعہ کہ جنوں نے قرآن کی دعوت کو سنا۔ تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ خاموشی سے سنو۔ اور سن کر یہ سنے کیا کہ ہم ایمان لاتے ہیں۔ وہ ایمان لائے اور اپنی قوم میں جا کر انہوں نے دعوت دین کے کام کا آغاز کر دیا۔ اپنی قوم کو عذاب جہنم سے ڈرانا اور جنت کی خوشخبری دینا شروع کر دیا۔ اور انہوں نے اپنی قوم کو متنبہ کیا کہ اگر تم نے منہ موڑا اور گمراہی اختیار کی تو نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔

جنوں کی خبر کو یہاں اس انداز سے پیش کرنا اور یہ دکھانا کہ قرآن مجید کا ان کے دلوں پر کس طرح اثر ہوا اور انہوں نے ایک دوسرے سے کہا خاموش ہو کر سنو، پھر جس گہرے تاثر کے ساتھ انہوں نے قرآن مجید کی تعلیمات کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ یہ سب امور انسانی دلوں کو متاثر کرنے والے ہیں کیونکہ اصل میں تو قرآن انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنوں کے تاثرات جس طرح قرآن نے قلم بند کیے ہیں، وہ بہت ہی پر تاثر انداز ہے۔ خصوصاً جبکہ جن بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ٹھیک موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ تعلیمات آرہی ہیں۔ قرآن کا اشارہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو جنوں نے تو پا لیا مگر انہیں اس سے غافل ہیں کہ قرآن جو دعوت دے رہا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد پہلی دعوت ہے۔ چنانچہ یہ بات پوری سورت کے مضمون کے ساتھ گہرا ربط اور مناسبت رکھتی ہے۔ پھر جنوں نے بھی اس کائنات کی کھلی کتاب کی نشانوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تعلیمات قرآنی کی تصدیق خلق سموات و ارض سے ہو سکتی ہے۔ اور یہی تخلیق کائنات دوبارہ تخلیق پر بھی شاہد عادل ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس پر انسانوں نے ہمیشہ بحث اور جدال کیا ہے۔ مسئلہ حشر و نشر کے حوالے ہی سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ہوگی قیامت۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ (۴۶: ۳۴) ”جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے۔“ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وصیت کی جاتی ہے کہ ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کریں اور ان پر عذاب لانے کے لیے جلدی نہ فرمائیں اور ان کو چھوڑ دیں۔ قیامت کی گھڑی قریب ہے۔ اور جس دن برپا ہوگی تو وہ کہیں گے ہم تو دنیا میں ایک گھڑی بھر ہی رہے، بس ہلاکت سے قبل تبلیغ ہی کی گئی۔

درس نمبر ۲۲۰ تشریح آیات

۲۹ --- تا --- ۳۵

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا
 حَضَرُوهُ قَالُوا أَنصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ ﴿۱﴾ قَالُوا يٰقَوْمُنَا
 إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى
 الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۲﴾ يٰقَوْمُنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرَ
 لَكُمْ مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۳﴾ وَمَنْ لَا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ
 فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءُ ۚ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ
 مُّبِينٍ ﴿۴﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْ
 بِخَلْقِهِنَّ يَقْدِرْ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۚ بَلَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۵﴾ وَ
 يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا
 قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۶﴾ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ
 مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ ۚ كَانَتْهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا
 إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ ۚ بَلَّغْ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۷﴾ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ

۴ ”اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے (جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو ہماری طرف سے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔

جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انہوں نے جاکر کہا ”اے ہمارے قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف۔ اے ہمارے قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کرو اور اس پر ایمان لے آؤ۔“ اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچ دے گا۔“ اور جو کوئی اللہ کے دلائل کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بوتہ رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے، اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچ لیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور کیا ان لوگوں کو یہ بھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے اور ان کو بناتے ہوئے وہ نہ تھکا، وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے؟ کیوں نہیں یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے، اس وقت ان سے پوچھا جائے گا ”کیا یہ حق نہیں ہے؟“ یہ کہیں گے ”ہاں ہمارے رب کی قسم (یہ واقعی حق ہے)۔“ اللہ فرمائے گا ”اچھا تو اب عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے رہے تھے۔ پس اے نبی! صبر کرو جس طرح لو لو العزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔ جس روز یہ لوگ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو گا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھرت زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی، اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا؟“

جنوں نے نہایت خشوع اور خضوع کے ساتھ قرآن کو سنا اور اس کے بعد انہوں نے جو تبصرہ کیا اور قرآن نے یہاں اسے نقل کیا، اس میں اسلامی نظریہ حیات کی تمام بنیادی باتیں آگئی ہیں۔ یعنی وحی الہی کی تصدیق، تورات اور قرآن کے تصورات میں وحدت، یہ اعتراف کہ ہم ایمان لاتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں، اور آخرت پر ایمان اور ان ائمال کی تصدیق جو جنت کو لے جانے والے ہیں اور ان اعمال کی تصدیق جو جہنم کو لے جانے والے ہیں۔ یہ اعتراف کہ اللہ پوری کائنات کا خالق ہے، وہی مخلوقات کا دلی ہے۔ اور یہ کہ تخلیق کائنات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہی وہ مضامین ہیں جو اس پوری سورت میں لیے گئے ہیں اور سورت کے تمام اسباق کا موضوع ہیں۔ اور یہی موضوعات جنوں کی ذہنی، جو انسانوں کے متعلق ہے، دوبارہ مانے گئے۔

ان آیات کی تشریح سے پہلے دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے، یہ کہ جن کیا ہیں اور یہ کہ یہ واقعہ کہاں اور کب ہوا۔ قرآن مجید کی طرف سے یہ ذکر کرنا کہ جنوں کے کچھ لوگوں نے قرآن کو سنا اور اس کے بعد یہ کہا اور یہ کیا، جنوں کے وجود کے لیے بس یہی کافی ثبوتی دلیل ہے۔ اور نہ اس واقعہ کے بارے میں کچھ مزید کہنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات ثابت ہونے کے بعد کہ جن اس قائل ہیں کہ رسول خدا کی زبان عربی قرآن کو سنیں اور عربی زبان کو سمجھیں۔ اور یہ کہ وہ ایک مخلوق ہیں جو ایمان اور کفر کے قائل ہیں، ہدایت اور ضلالت کے قائل ہیں، جنوں کی حقیقت اور انہیں ایک مخلوق ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جب اللہ ایک حقیقت کی تصدیق کر دے تو اس کے بعد اس مخلوق کی حقیقت کو مزید ثابت کرنا ایک بے معنی حرکت ہے۔ لیکن یہاں کلام کرنے کا ہمارا مقصد یہ ہے کہ انسانی تصور میں اس کا وضاحت ہو جائے۔

ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات میں، رازوں کے ذخیرے ہوئے ہیں۔ اس کے اندر ایسی مخلوقات موجود ہیں جن

کی حقیقت 'صفات' اور اثرات سے ہم بالکل واقف نہیں۔ اور ہم جن قوتوں اور رازوں کے اندر رہتے ہیں۔ ان میں سے صرف چند رازوں اور بھیدوں سے ابھی تک ہم واقف ہوئے ہیں۔ بہر حال آئے دن ہم ان بھیدوں کے انکشافات کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ کی مخلوقات میں سے بعض مخلوق کے بارے میں دریافت کر لیتے ہیں۔ بعض کی ذات معلوم کر لیتے ہیں۔ بعض کی صفات ہمیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اور بعض چیزوں کے تو صرف ہمارے ارد گرد آثار ہی پائے جاتے ہیں۔

ابھی تک ہم نے اس کائنات کی شاہراہ پر 'جس کے اندر ہم رہتے ہیں' اس کے رازوں کو معلوم کرنے کے سلسلے میں چند قدم ہی لیے ہیں۔ اس کائنات میں ہمارے آباء و اجداد رہ کر چلے گئے اور ہماری اولاد ان کی اولاد آنے والی ہے۔ ان سب لوگوں کو اس کائنات کے ایک چھوٹے سے ذرے کے اوپر رہنا ہے۔ اگر اس پوری کائنات کے حجم اور وزن کا تصور کیا جائے تو اس حجم اور وزن میں اس زمین کی حیثیت ایک ذرے کے برابر بھی نہیں ہے۔

آج تک جو معصوم ہم فراہم کر سکے ہیں 'اگر ان معلومات کو آج سے صرف پانچ سو سال پہلے کی حالت کے مقابلے میں دیکھا جائے تو ہم جنوں سے بھی زیادہ بڑے بڑے عجائبات دریافت کر سکے ہیں۔ آج ہم ایٹم کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں۔ اگر آج سے پانچ سو سال پہلے کوئی ایسی باتیں کرتا تو لوگ کہتے کہ یہ بخون ہے۔ یا کم از کم اسے جنت کے مقابلے میں زیادہ عجیب و غریب بات سمجھا جاتا۔

ہمارا علم و ادراک ہمارے انسانی حدود ادراک کے محدود دائرے کے اندر ہے اور ادراک کی یہ قوت ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس زمین پر وہ مقاصد پورے کرنے کے لیے دی گئی ہے جن کو ہم نے زمین کے اوپر منصب خلافت کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں یہاں حاصل کرنا تھا۔ صرف اس محدود دائرے میں کہ زمین کی قوتیں ہمارے لیے مسخر ہوں 'ہمارے تابع ہوں تاکہ وہ فرائض ہم بحسن و خوبی ادا کر سکیں۔ ہمارے جس قدر انکشافات ہیں وہ اس دائرہ فرائض کے اندر ہیں اور ہم جس قدر بھی آگے بڑھ جائیں ہم اسی دائرے کے اندر ہی رہیں گے۔ یعنی اس دائرے کے اندر ہی رہیں گے جو اللہ نے ہمارے یہاں قیام اور خلافت ارضی کے لیے مقرر اور مقرر کر دیا ہے۔ نہ اس سے ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت ہے۔

مستقبل میں ہم مزید انکشافات کریں گے۔ ہم بہت کچھ جانیں گے 'اس قدر ہمارے علوم میں اضافہ ہو گا کہ ایٹم کے راز ہمارے لیے بچوں کا کھیل بن جائے گا۔ لیکن ان انکشافات کے باوجود ہم اس محدود دائرے کے اندر ہی رہیں گے جو اللہ نے ہمارے لیے مقرر کر دیا ہے۔ انسانی دائرے کے اندر رہیں گے۔ جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا "اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے وہ بہت ہی قلیل ہے"۔ یعنی ان اسرار اور حقیقت کے مقابلے میں جو تمہارے علم سے باہر ہیں۔ صرف خالق کائنات ہی ان غائب باتوں کو جانتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا علم غیر محدود ہے۔ اور انسانوں کا علم اور اس کے ذرائع علم محدود ہیں۔

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمْدُهُ مِنْ بَعْدِهِ سَعَةً أَبْحَرَ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ "اگر زمین میں جس قدر درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر کو سات اور سمندر سیاہی

بن کر مدد کے لیے آئیں تو اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں۔“

اگر بمقابلہ علم الہی ہماری حالت یہ ہے تو ہم صرف اپنی لاعلمی کی بنا پر بالجزم نہ کسی بات کی نفی کر سکتے ہیں اور مثبتات۔ نہ ان کا تصور کر سکتے ہیں اور نہ عدم تصور۔ یہ بہر حال اللہ کی کائنات کے غائب علاقوں کی باتیں ہیں اور کائنات کی ان قوتوں اور ان اسرار میں سے ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہے۔ اسی بنا پر لکی کسی شے کے بارے میں ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں جو ہمارے علم سے باہر ہے۔ جبکہ ابھی تک ہمیں خود اپنی ذات سے متعلق مکمل اسرار و رموز کا پتہ نہیں ہے کہ ہماری روح اور ہماری قوت مدد کے حالات کیا ہیں۔ حقیقت جن تو بڑی بات ہے۔ بعض ایسے راز بھی ہو سکتے ہیں جن کا ہمارے لیے انکشاف مقدر ہی نہ کیا گیا ہو۔ مثلاً وہ تمام حقائق جن کے وجود کی قرآن نے اطلاع دی ہے 'یا آثار ہائے ہیں کیونکہ ان حقائق کا جاننا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے اس لئے کہ اس زمین پر انسان نے جو فریضہ ادا کرنا ہے اس کے لیے اس کی کوئی افادیت نہیں ہے۔

اگر اللہ نے اپنے کلام کے ذریعہ ہمیں کچھ اسرار بتا دیئے ہیں 'اور ان تک ہم اپنے تجربات کے ذریعے نہیں پہنچے تو ہمارا فرض یہ ہے کہ جس قدر علم اللہ نے دے دیا ہے (بذریعہ اطلاع) ہم شکر اور تسلیم و رضا کے ساتھ اسے قبول کر لیں۔ ہم اس کے بارے میں اسی قدر عقیدہ رکھیں جس قدر اللہ نے بتا دیا ہے۔ نہ اس میں کمی کرس اور نہ اس میں اضافہ کرس۔ اور یہ کہیں کہ اس سلسلے میں حقیقت جاننے والے نے ہمیں اسی قدر بتایا ہے 'اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں بتایا۔ دوسرا کوئی ذریعہ علم بھی نہیں ہے اور اس میدان میں ہمارا تجربہ بھی نہیں ہے۔

قرآن کھیم کی ان آیات سے اور سورت جن کی آیات سے (اور رائج بات یہ ہے کہ سورت جن بھی اسی واقعہ کے بارے میں ہے) اور ان نصوص سے جو قرآن کریم میں جگہ جگہ جنوں کے بارے میں وارد ہیں اور ان احادیث سے جو جنوں کے بارے میں وارد ہیں اور صحیح ہیں۔ ہمیں جو حقائق معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مخلوق ہے جنے جن کہا جاتا ہے۔ یہ مخلوق آگ سے پیدا شدہ ہے۔ کیونکہ قرآن نے ابلیس کے بارے میں یہ کہا ہے۔

اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ مَخْلُقَتْنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ”میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔“ اور یہ بھی قرآن بتاتا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا۔

اَلْاِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهِ ”سوائے ابلیس کے یہ جنوں سے تھا۔ تو اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔“ غرض ابلیس کی ماہیت جنوں سے ہے۔

اس مخلوق کی خصوصیات انسانوں سے مختلف ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ آگ سے ہی ہے۔ یہ کہ وہ لوگوں کو دیکھتے ہیں اور لوگ انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّهٗ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ”بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے‘ جبکہ تم ان کو نہیں دیکھ رہے۔“ اور یہ کہ انسانوں کی طرح ان کی بھی سوسائیاں اور قبیلے ہیں۔ جس طرح آیت سابقہ میں قبیلے کا ذکر

ہوا۔ اور یہ کہ یہ جن اسی زمین پر رہتے ہیں اور بس سکتے ہیں۔ لیکن ان کی آیادیاں کہاں ہیں۔ اس کا میں علم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے جب آدم اور ابلیس سے کہا کہ تم جنت سے نکلو اور زمین پر جاؤ تو الفاظ یہ تھے :

اٰتٰیطُوْا بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰی حَیْثُ اٰتٰوْا تَمَّ مِنْ سَیْرِ بَعْضُ دُوَسْرُوْنَ کَے دشمن ہیں اور تمہیں حق ہو گا کہ زمین میں ٹھہرو اور ایک وقت تک متاع حیات کا بھی۔ وہ جن جو سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیئے گئے تھے وہ آپ کے لیے کام بھی کرتے تھے یہاں ان کو زندہ رہنے کی قدرت بھی دی گئی ہوگی تب ہی وہ کام کرتے ہوں گے۔ یہ کہ جن اس کرۃ ارض سے باہر بھی رہ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کی یہ بات نقل کی ہے۔

وَ اَنَا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنَهَا مِلْئًا حَرَسًا شَدِیْدًا وَ شُهَبًا (۸) وَ اَنَا کُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ یُسْمِعُ الْاِنَّ یَجِدْ لَهُ شُهَابًا رَّصَدًا (۹) (۷۲ : ۸ - ۹)

”اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پریداروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے اور یہ کہ پہلے ہم سن گن لینے کے لیے آسمانوں میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے ایک شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے۔“

یہ کہ یہ جن انسانوں کو متاثر کر کے گمراہ کر سکتے ہیں اور مسلمانوں میں سے اللہ کے بندوں پر تو ان کا اثر نہیں ہوتا۔ البتہ گمراہ لوگوں پر وہ اثرات ڈال سکتے ہیں کیونکہ

قَالَ فَبِعَرَّتْکَ لَّا غُوٰیۡتَهُمۡ اَجْمَعِیۡنَ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُحَلِّصِیۡنَ ”اس نے کہا بس تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا، ماسوائے ان میں سے تیرے مخلص بندوں کے۔“ اس قسم کی تمام دوسری آیات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں البتہ یہ معلوم نہیں ہے کہ شیطانوں اور جنوں کی دوسرے اندازی کس طرح ہوتی ہے۔ اور یہ کہ یہ جن انسانوں کی آواز سننے ہیں۔ ان کی زبان کو سمجھتے ہیں کیونکہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآن سنا اس کو سمجھا اور اس سے متاثر ہوئے۔

اور یہ کہ انسانوں کی طرح جن بھی ہدایت اور گمراہی کے قابل ہیں۔ کیونکہ جنوں نے خود یہ اعتراف کیا۔

وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیۡنَ وَ مِنَ الْقٰسِطِیۡنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِکَ نَحْرُوْا وَ اَرۡشَدُوْا (۱۴) وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَکَانُوْا الْجَہَنَّمَ حَطًّا (۱۴) (۷۲ : ۱۴، ۱۵)

”اور یہ کہ ہم میں سے کچھ مسلم ہیں اور کچھ حق سے منحرف تو جنہوں نے اسام اختیار کر لیا۔ انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔“ اور یہ کہ پھر وہ اپنی قوم کی طرف گئے اور ان کو ڈرنے لگے اور ان کو دعوت ایمان دینے لگے۔ جبکہ انہوں نے خود ایمان قبول کر لیا۔ اور ان کو معلوم ہو گیا کہ ان کی قوم دولت ایمان سے محروم ہے۔

یہ باتیں تو جنوں کے بارے میں یقینی ہیں۔ اور یہی ان کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اور اس پر ہم جو اضافہ کریں، گے اس پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی۔ رہا وہ واقعہ جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کا صرف رائج روایات کے مطابق سورت جن بھی اشارہ کر رہی ہے۔ تو اس بارے میں متعدد روایات وارد ہیں۔

امام بخاری نے مسند سے 'مسلم'۔ شیبان ابن فرح سے انہوں نے ابو عوانہ سے اور امام احمد نے اپنی سند میں کہا: عفان سے انہوں نے ابو عوانہ سے 'ابوبکر بیہقی نے اپنی کتب دلائل النبوة میں ابو الحسن علی ابن احمد ابن عید ان سے انہوں نے احمد ابن عبید الصفاری نے اسماعیل قاضی سے انہوں نے مسند سے انہوں نے ابو عوانہ سے انہوں نے ابوبشر سے انہوں نے سعید ابن جبیر سے کہ ابن عباس سے فرماتے ہیں: "رسول اللہ نے جنوں پر کلام الہی نہیں پڑھا۔ اور نہ ان کو دیکھا ہے۔ حضور اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کے ساتھ عکاظ کی طرف جا رہے تھے۔ اس وقت شیاطین اور آسمانوں کی خیروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی اور ان پر شہاب ثاقب کی بارش کر دی گئی۔ تو شیاطین اپنی قوم کی طرف واپس آگئے قوم نے کہا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تو انہوں نے کہا ہمارے اور آسمانوں کی خیروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی ہے۔ اور ہم پر شہاب ثاقب چھوڑے گئے۔ تو انہوں نے کہا کہ تمہارے اور آسمان کی خیروں کے درمیان جو رکاوٹ ڈال دی گئی ہے اس کی کوئی وجہ ہوگی تو چاہئے کہ زمین کے مشرق اور مغرب کے درمیان پھیل جاؤ اور دیکھو کہ وہ کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ رکاوٹ ڈال دی گئی ہے چنانچہ یہ بھی مشرق و مغرب میں پھیل گئے یعنی اطراف عالم میں وہ معصوم کرنے لگے کہ وہ کیا سبب ہے جس کی وجہ سے ہمارے اور آسمان کی خیروں کے درمیان پابندی لگ گئی۔ تو وہ گردہ جو تمامہ کی طرف جا رہا تھا وہ لوگ رسول اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس وقت آپ نخلہ میں تھے اور عکاظ کے بازو کی طرف جا رہے تھے۔ حضور اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز فجر پڑھ رہے تھے۔ جب ان جنوں نے قرآن سنا تو متوجہ ہو کر سننے لگے۔ تو انہوں نے کہا خدا کی قسم یہ ہے وہ حقیقی سبب جس کی وجہ سے تم پر آسمانوں کی خیریں لینے پر پابندی لگ گئی ہے۔ جب یہ لوگ اپنی قوم کی طرف لوٹے تو انہوں نے یہ رپورٹ دی۔ فَقَالُوا اِنَّا سَمِعْنَا

قُرْآنًا عَجَبًا (۱) يُهْدِي اِلَى الرُّشْدِ فَاَمْنًا بِهِ وَلَكِنْ نُّشْرِكُ بِرَبِّنَا اَحَدًا (۲) (۷۲: ۱)

(۲) "اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔" رسول اللہ کو اطلاع دی گئی۔

قُلْ اَوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ (۷۲: ۱) "اے نبی! کو میری طرف وحی بھیجی گئی کہ جنوں کے ایک گردہ نے قرآن کو غور سے سنا۔" حضور کی طرف دراصل جنوں کے اقوال وحی کیے گئے۔

امام مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے عقیدہ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا میں نے حضرت ابن مسعود سے پوچھا کہ جنوں کی رات تم میں سے کوئی حضور کے ساتھ تھا۔ انہوں نے کہا ہر رات ہم میں سے کوئی بھی حضور کے ساتھ نہ تھا۔ ہوا یوں کہ ایک رات ہم حضور کے ساتھ تھے کہ حضور غائب ہو گئے۔ تو ہم نے پہاڑیوں اور وادیوں میں آپ کو تلاش کرنا شروع کیا۔ ہم نے کہا کہ حضور کو کوئی چیز لے اڑی یا آپ کو اچک لیا گیا۔ ہم نے یہ رات بہت ہی بری طرح گزاری۔

جب صبح ہوئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضورؐ حرا کی طرف سے چلے آرہے ہیں۔ ہم نے کہا حضورؐ ہم نے رات کو آپؐ کو تلاش کیا اور آپؐ کو نہ پایا۔ اس وجہ سے ہم نے یہ رات اس قدر تکلیف میں گزاری جس قدر کوئی تکلیف سے کوئی رات گزار سکتا ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا: میرے پاس جنوں کا ایک شخص دعوت لے کر آیا تھا۔ میں اس کے ساتھ چل گیا۔ میں نے ان پر قرآن پڑھا تو یہ سن کر ہم نے کہا حضورؐ ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں اور ہمیں ان کے آثار بتائیں اور ان کی آگ کے آثار بتائیں۔ اور جنوں نے آپؐ سے اپنی خوراک کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: ”ہر وہ ہڈی جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو جو تمہارے ہاتھ آئے اور جس پر زیادہ گوشت ہو وہ تمہاری خوراک ہے۔ اور ہر بیگنی یا لید تمہارے جانوروں کے لیے ہے۔“ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا ”لَٰذَا اِنَّ دُوْنُوْنَ جِزْرُوْنَ كَے ساتھ استیجا نہ کرو کہ یہ تمہارے بھائیوں کی خوراک ہے۔“

ابن اسحاق اور ابن ہشام نے جنوں کے واقعہ کو حضورؐ کے سفر طائف کے بعد نقل کیا ہے۔ حضورؐ نے طائف جا کر بنی ثقیف سے مدد چاہی۔ یہ آپؐ کے چچا ابو طالب کی موت کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس وقت آپؐ پر اور مسلمانوں پر مکہ میں بہت ہی تشدد ہو رہا تھا۔ بنی ثقیف نے آپؐ کی دعوت کو برے انداز میں رد کر دیا اور جب آپؐ واپس ہونے لگے تو بچوں اور نادانوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔ یہاں تک کہ آپؐ کے دونوں پاؤں مبارک پتھروں سے لہلہاں ہو گئے۔ اور آپؐ نے اس موقع پر یہ گہری اور موثر دعا فرمائی۔ ”اے اللہ میں تجھ ہی سے اپنی قوت کی کمزوری کی شکایت کرتا ہوں اپنی قلت مدد ہیر کی شکایت کرتا ہوں اور لوگوں پر اپنی کمزوری کی شکایت کرتا ہوں اے ارحم الراحمین تو کمزوروں کا رب ہے اور میرا رب ہے تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کسی ایسے شخص کے جو مجھ پر حملہ آور ہو؟ تو نے میرا معاملہ کسی دشمن کے حوالے کر دیا ہے؟ لیکن اے اللہ اگر تو ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن تیرا دامن تو میرے لیے بہت وسیع ہے۔ میں تیرے چہرے کی رد تہی میں پناہ لیتا ہوں جس نے تمام تاریکیوں کو روشن کر دیا ہے۔ اور اس نور کی وجہ سے دنیا و آخرت بھی ہو جاتی ہے۔ اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غضب ہو یا مجھ پر تیرا عذاب آجائے۔ تجھے اختیار ہے کہ تو مجھے مشقت میں ڈالے جب تک تو راضی نہ ہو۔ تیرے سوا کوئی قوت لار جائے پناہ نہیں ہے۔“

کہتے ہیں اس کے بعد رسول اللہؐ مکہ کی طرف لوٹنے لگے۔ جب آپؐ بنی ثقیف کی طرف سے کسی بھلائی سے مایوس ہو گئے۔ جب رات آپؐ بچلہ میں آئے تو رات کو آپؐ نماز کے لیے اٹھے تو اس وقت جنوں کا ایک گروہ آپؐ کے پاس سے گزرا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ حضورؐ نے ان کی تعداد سات بتائی جو دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کی بات توجہ سے سنی۔ جب حضورؐ نماز فارغ ہوئے تو یہ جن اپنی قوم کی طرف چلے گئے اور ان کو ڈرانے لگے۔ یہ خود ایمان لائے تھے اور جو کچھ انہوں نے سنا اسے قبول کر چکے تھے۔ اللہ نے یہ کہانی حضورؐ پر نازل فرمائی۔

وَ اِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمْعُوْنَ الْقُرْآنَ (۴۶: ۲۹) ”اور جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔“

وَ يُجْرِكُمْ مِّنْ عَذَابِ اَلِيْمٍ (۴۶: ۳۱) ”اور تمہیں عذاب الیم سے بچائے گا۔“ اور سورۃ جن میں فرمایا فُلُّ اَوْحٰی اَنّٰی اِنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ۔۔۔ الیٰ حمزہ (۷۲: ۱) علامہ ابن کثیر نے روایت ابن

اسحاق پر یوں تبصرہ کیا ہے ”یہ تو صحیح ہے لیکن ان کا کہنا کہ جنوں کے ساتھ خطاب بھی اسی رلت کو ہوا۔ یہ بات قابل بحث ہے کیونکہ جنوں کا قرآن مجید سننا آغاز وحی کے زمانے میں تھا جس طرح حضرت ابن عباس کی روایت میں ہے۔ اور حضورؐ کا سفر طائف تو اس وقت ہوا جب آپ کے چچا محترم حضرت ابو طالب فوت ہو گئے تھے۔ اور یہ وفات ہجرت سے ایک یا دو سال قبل ہوئی تھی۔ واللہ اعلم!

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس کی روایت سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ کیونکہ یہ روایت پوری طرح نصوص قرآن کے ساتھ متفق ہے۔

قُلْ أَوْحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ (۷۲ : ۱) ”اے پیغمبرؐ کہہ دے کہ میری طرف یہ وحی آئی ہے کہ جنوں میں سے کچھ لوگوں نے قرآن کو غور سے سنا۔“ یہ آیت قطعاً ہوتی ہے کہ اس واقعہ کا علم حضور اکرمؐ کو اس طرح ہوا کہ آپؐ پر وحی نازل فرمائی۔ اور یہ کہ آپؐ نے جنوں کو دیکھا نہ تھا۔ ورنہ آپؐ کو یہ احساس ہوا کہ جن جن سن رہے ہیں۔ پھر اسناد کے اعتبار سے بھی یہ روایت سب سے قوی ہے۔ اور ابن اسحاق کی روایت بھی اس کے ساتھ متفق ہے۔ جس طرح قرآن مجید نے ہمیں جنوں کی صفات میں بتایا کہ اِنَّہٗ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِّنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ”یہ اور اس کا قبیلہ تو ہمیں دیکھ رہا ہے جبکہ تم انہیں نہیں دیکھ رہے۔“ میں سمجھتا ہوں اس حادثہ کی تحقیق میں اس قدر بات کافی ہے۔

---○○○---

وَ اِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَصَرُوهُ قَالُوا لَا تَنْصِتُوا

فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ (۴۶ : ۲۹) ”اور وہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو ہماری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔“ یہ اللہ کی ایک خاص تدبیر تھی کہ اس نے جنوں کو قرآن کی طرف موڑ دیا۔ محض کوئی اتفاقی بات نہ تھی۔ ان کی تقدیر میں یہ تھا کہ جن بھی نبی آخر الزمان کی رسالت سے اسی طرح خبردار ہو جائیں جس طرح وہ حضرت موسیٰ کی رسالت سے خبردار تھے اور ان میں سے ایک فریق آگ سے بچ جائے جسے شیطان اور جنوں کے لیے تیار کیا گیا ہے اور انسانی شیاطین کے لیے بھی۔

قرآن کریم نے ان کی تعداد کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سننے والے جنوں کی تعداد تین سے دس تک تھی اور قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ ان کے پردہ احساس پر قرآن کے کیا اثرات بیٹھے یعنی خوشی، اچھا تاثر، خضوع اور خشوع۔

فَلَمَّا حَصَرُوهُ قَالُوا لَا تَنْصِتُوا (۴۶ : ۲۹) ”اب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم پڑھ رہے تھے) تو

انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔“ یوں اس پورے عرصے میں وہ بڑی خاموشی سے سنتے رہے۔

فَلَمَّا قُصِيَ وَلُغُوا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ (۲۹: ۴۶) ”پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پہنچے۔“ یہ اثر بھی ان پر اس لیے ہوا کہ انہوں نے قرآن کو نہایت غور سے سنا تھا۔ خاموش سوکر سنا اور آخر تک سنتے رہے۔ جب تلاوت ختم ہوئی تو وہ فوراً اپنی قوم کے پاس گئے اور ان کے شعور میں وہ بات اپنالی تھی جو اگر کسی کے شعور میں داخل ہو جائے تو وہ خاموش نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کی تبلیغ اور لوگوں کے ذرا لے کے کام میں شغف کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے کہ جب کسی شخص کے احساس میں ایک نئی بات بیٹھ گئی ہو۔ اور اس کے حساسات کو ایک نہایت ہی موثر غالب اور چھا جانے والے نظریہ نے اپنی گرفت میں لے لیا ہو تو وہ فوراً حرکت میں آجاتا ہے، ہر جگہ اسی کی بات کرتا ہے اور بڑے اہتمام کے ساتھ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔

قَالُوا اَيَقُوْمُنَا اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيۤ اِلَى

الْحَقِّ وَاِلَى طَرِيقٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۰: ۴۶) ”اور انہوں نے جا کر کہا: اے ہمارے قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے۔ تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف۔“ وہ بڑی جلدی سے اپنی قوم کی طرف لوٹے اور جاتے ہی انہوں نے ان کے سامنے تقریر شروع کر دی کہ برادران قوم! ہم نے ایک نئی کتاب سنی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اور اپنے اصولوں میں یہ موسیٰ کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتب سماوی سے واقف تھے، کیونکہ قرآن آیات اور بنیادی تعلیمات سنتے ہی ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ دونوں کی تعلیمات ایک ہیں انہوں نے قرآن کا جو حصہ سنا تھا ضروری نہیں ہے کہ اس میں کتاب موسیٰ کی تعلیمات ہوں۔ البتہ انہوں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ دونوں کتابوں کا مزاج اور سرچشمہ ایک ہے۔ یہ جنوں کی شہادت جو انسانی تعضبات اور موثرات سے دور ہیں اور قرآن کا کچھ حصہ سننے پر انہوں نے یہ تبصرہ کر دیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ایک برحق کتاب ہے۔ اور کتب سابقہ کی مصدق ہے۔ یہ ایک اہم شہادت ہے۔

قرآن سننے کے بعد ان کے شعور میں جو بات بیٹھ گئی اور ان کے دل و دماغ نے جس حقیقت کو پایا وہ یہ تھی کہ

يَهْدِيۤ اِلَى الْحَقِّ وَاِلَى طَرِيقٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۰: ۴۶) ”یہ حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔“ یہ نہایت ہی اہم بات ہے جو انہوں نے کہی کیونکہ قرآن سے پہلا تاثر یہی ملتا ہے کہ یہ کتاب برحق ہے اور دوسرا یہی ملتا ہے کہ یہ سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جو شخص بھی بصیرت رکھتا ہو وہ قرآن کو پڑھ کر یہ دونوں باتیں محسوس کرتا ہے۔ اگر اس کی روح بغض و عناد، کبر اور خواہشات نفسانیہ کی رسیوں میں جکڑی ہوئی نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم کا ایک حصہ سننے ہی ان لوگوں نے اس راز کو پایا اور اپنی قوم کے سامنے پہلی تقریر میں یہی حقیقت بیان کر دی جو ان کے احساسات کی سچی تعبیر تھی۔

اس کے بعد انہوں نے جو باتیں اپنی قوم سے کہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس دعوت پر مطمئن ہو گئے ہیں اور اب ان پر فرض ہے کہ وہ ایک ایک فرد تک اس دعوت کو پہنچا دیں۔

يَقَوْمَنَا أَجِثُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُجْرِكَكُمْ مِنْ

عَذَابِ أَلِيمٍ (۴۶: ۳۱) ”اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلائے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ! اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچائے گا۔“ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ کتاب جو نازل کی گئی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ جن و انس دونوں کے لیے دعوت ہے اور اسے پوری زمین کے لوگوں تک پہنچانا چاہئے۔ اور اس کتاب کو سنتے ہی انہوں نے اس بات کو پا لیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم داعی الی اللہ ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا ”اے ہماری قوم! داعی الی اللہ کی دعوت کو قبول کرو اور ان پر بھی ایمان لاؤ“ انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ایمان اور عمل صالح کے نتیجے میں بخشش نصیب ہوتی ہے اور اللہ کے عذاب سے بچا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے جو کچھ سمجھا اس کی تعلیم دے دی۔

ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ اس پر جنوں کی بات ختم ہو گئی ہے لیکن سیاق کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلی دو آیات بھی جنوں کے کلام کا حصہ ہیں۔ خصوصاً یہ آیت

وَمَنْ لَّا يُحِبِّ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِنْ دُونِ أَوْلِيَاءٍ أُولَٰئِكَ فِي

ضَلَالٍ مُبِينٍ (۴۶: ۳۲) ”اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بوتہ رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی اور سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچالیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔“ معلوم ہوتا ہے کہ ان جنوں کے ذرا بولے کا یہ ایک قدرتی حصہ ہے جو انہوں نے اپنی قوم کو دیا کیونکہ انہوں نے ان کو دعوت ایمان اور قبولیت حق دی۔ لہذا ذرا بولے کے بعد قوی احتمال اس کا ہے کہ وہ اپنی قوم کو اس بات سے ذرا نہیں کہ اگر انہوں نے اس بات کو قبول نہ کیا تو انجام کیا ہو گا۔ اور جو قبول نہ کرے گا وہ اللہ کو عاجز نہ کر سکے گا کہ اللہ اس پر سزا و جزاء کا نظام نافذ کرے۔ اور اس عذاب الیم دے۔ اور پھر قیامت میں ایسا شخص کوئی دوست و یار ایسا نہ پائے گا جو اس کی مدد کر سکے۔ اور یہ کہ نہ ماننے والے گمراہی کے راستے میں پھر بہت دور تک چلے جائیں گے۔

اسی طرح کی آیت میں بھی زیادہ احتمال یہ نظر آتا ہے کہ یہ بھی کلام جن ہے۔ یہ ان لوگوں پر تعجب ہے جو اللہ کی اس دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ قیامت سے بچ جائیں گے اور یہ کہ نہ قیامت ہے اور نہ جزا و سزا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْصِ بِخَلْقِهِنَّ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ

أَن يُّحْيِيَ الْمَوْتَىٰ بَلَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۴۶: ۳۳) ”اور کیا ان لوگوں کو یہ بھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے اور ان کو بناتے ہوئے وہ نہ تھکا وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے؟ کیوں نہیں! یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔“ یہ ایک طرح توجہ دہنا ہے اس کائنات کی کھلی کتاب کے مطالعہ کی طرف جس کا تذکرہ سورت کے آغاز میں بھی ہوا تھا۔ بالوقت یوں ہوتا ہے کہ ایک نکتہ قرآن مجید

میں براہ راست بھی ہوتا ہے۔ پھر وہی بات ایک قصے میں بھی آ جاتی ہے، اس طرح بتا دیا جاتا ہے کہ یہ قصہ اس لئے لایا گیا اور سبق کلام میں مناسبت آ جاتی ہے۔

یہ کتاب پہلے تو یہ بتاتی ہے کہ یہ عظیم کائنات جس کے تصور سے سرچکرا جاتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی... یہ آسمان اور زمین اور اس کے اندر رنگ رنگ مخلوقات جو دیکھتے ہی بتا دیتی ہیں کہ اللہ کے لیے تمام مخلوقات کو دوبارہ پیدا کر دینا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کی یہ کائناتی اسکیم یہ بتاتی ہے کہ دوبارہ حشر ہو گا۔ اور یہاں بات کو بطور استغمام لانے سے تاکید مزید ہو جاتی ہے اور استغمام کا جواب ہاں میں ہے۔ اس لیے آخر میں یہ فقرہ آتا ہے۔

اِنَّهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۳۳: ۴۶) ”یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے“۔ لہذا اللہ دوسری ندرتوں کے ساتھ تمام مخلوقات کو دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ اور آخر میں دوبارہ اٹھائے جانے کے اصل مقصد کو نہایت ہی شخص انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ حساب و کتاب یوں ہو گا۔

—○○○—

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلٰی النَّارِ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلٰی وَ رَبَّنَا قَالِ

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۳۴: ۴۶) ”جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لئے جائیں گے اس وقت ان سے پوچھا جائے گا ”کیا یہ حق نہیں ہے؟“ یہ کہیں گے ”ہاں ہمارے رب کی قسم (یہ واقعی حق ہے)“۔ اللہ فرمائے گا ”اچھا تو اب عذاب کا مرہ چکھو اپنے اس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے رہے تھے“۔ اس منظر کو پیش کرنے کے لیے تمہیدی کلمات۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلٰی النَّارِ (۳۴: ۴۶) ”جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لئے جائیں گے“۔ یہ الفاظ آتے ہی قاری سوچتا ہے کہ اگلا غلط کیا ہو گا کیا قصہ ہو گا قصہ نہیں آتا اور اسکرین پر مکالمہ آ جاتا ہے۔

اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ (۳۴: ۴۶) ”کیا یہ حق نہیں؟“ اچانک اس سوال سے گویا ان لوگوں پر برق نغمائی کر جاتی ہے جو قیامت کا مذاق اڑاتے تھے اور قیامت کے جلدی لانے کا مطالبہ ہر پیغمبر سے کرتے تھے۔ آج ان کی گردن حق کے سامنے جھک گئی ہے جس کا وہ انکار کرتے تھے۔ نہایت شرمندگی سے جواب دیتے ہیں۔

قَالُوا بَلٰی وَ رَبَّنَا (۳۴: ۴۶) ”ہاں اور ہمارے رب کی قسم“ اب تو وہ بڑی شرافت سے قسم رہی اٹھاتے ہیں۔ لیکن دنیا میں اللہ کو رب ہی تو نہ مانتے تھے۔ نبیوں کو نہ مانتے تھے۔ آج تو رب کے نام کو قسم کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اس پر جواب نہیں دیا جاتا، کوئی تبصرہ نہیں ہوتا، حقارت آمیز انداز میں فیصلہ ان پر پھینک کر گفتگو ختم کر دی جاتی ہے۔

قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ (۳۴: ۴۶) اللہ فرمائے گا ”اچھا تو عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے تھے“۔ اختصار کے ساتھ۔ جیسا کہ کوئی عدالت مختصری آرڈر ٹیٹ لکھتی ہے۔ ”جرم ظاہر ہے مگر معترف ہے“ جہنم میں جوتے۔“۔ یہاں اس منکر کو تیزی سے گزارنا بھی مقصود ہے، کیونکہ بات فیصلہ کن ہے۔ بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے منکر تھے اب معترف ہیں لہذا سزا چکیں جہنم کا۔

--- () ---

جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے فیصلے، دو ٹوک فیصلے کے اس منظر اور اہل ایمان، جنات کے منظر کے بعد، اور اس سورت کے آخر میں جس میں کافروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ کہا، اور قرآن کریم کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا، اب حضور اکرمؐ کو آخری ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں، جلد بازی نہ کریں۔ آپ نے تو اس سورت کے مناظر میں دیکھ لیا کہ ان کا کیا انجام ہونے والا ہے اور یہ بہت ہی قریب ہے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ كَانَهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ بَلَّغَ فَبَلَّ يَهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ

(۳۵: ۴۶) ”پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولو العزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔ جس روز یہ لوگ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دمایا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو گا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی، اب کیا تاخیر مانو گوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا؟“ اس آیت کا ہر لفظ ہمارے لیے زاوہ راہ ہے۔ ہر کلمے اور ہر غلطی کے پیچھے قصائد، چھوڑیں، معافی، اشارات اور فیصلوں اور قدروں کا ایک ذخیرہ ہے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ (۳۵: ۴۶) ”پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولو العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔“۔ یہ حضور اکرمؐ کو ہدایت ہو رہی ہے اس دور میں آپ پر ظلم اور زیادتیوں کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ پوری قوم آپؐ کے اور مسلمانوں کے خلاف تشدد میں لگی ہوئی تھی۔ آپؐ نے بطور یتیم نشوونما پائی تھی اور ابتدائی دور ہی میں ایک ایک کر کے حامیوں اور اولیاء سے محروم کر دیے گئے تھے۔ باپ گئے، ماں گئیں، دادا گئے اور آخر میں چچ گئے۔ پھر آپؐ کی وقادار بیوی گئیں اور آپؐ اللہ اور اللہ کی دعوت کے لیے فارغ ہو گئے۔ اس طرح اللہ کے سوا ہر سارے سے محروم ہو گئے۔ آپؐ کو بمقابلہ اجنبیوں کے اپنے رشتہ داروں سے زیادہ اذیت ملی۔ آپؐ نے ایک ایک فرد سے ملاقات کی، ایک ایک قبیلے سے ملاقات کی کہ میری مدد کرو، لیکن ہر بار آپؐ منفی جواب کے ساتھ لوٹے۔ بعض لوگوں نے تو مذاق اڑایا۔ بعض نے تو آپؐ کے پیچھے اوباش لگا دیئے یہاں تک کہ آپؐ کے پاؤں لولہاں ہو گئے۔ لیکن آپؐ نے مذکورہ بالا دعا سے زیادہ کچھ نہ کہا۔ اس لیے یہاں آپؐ کو رب ذوالجلال کی طرف سے تسلی کی ضرورت تھی۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعِزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ (۳۵: ۴۶) ”پس اے نبی صبر کرو جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو۔“ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت ہی دشوار گزار راستہ ہے۔ دعوت اسلامی کا راستہ بہت ہی مشکل اور بہت ہی تلخ ہے۔ اس کے لیے تو ذات محمدی کی ضرورت ہے۔ جو ہر طرف سے کٹ جائے، دعوت کے لیے یکسو ہو جائے۔ پختگی اور ثبات میں، باطن کی صفائی اور شفافیت میں رب کی ہدایت پر چلے۔ اللہ کے احکام کے مطابق صبر و ثبات کا مظاہرہ کرے اور دعوت کے مخالفین سے انتقام یا ان کے انجام بد کے لیے شتابی نہ کرے۔

لیکن راستے کی مشقتوں اور زخموں کے لیے مرہم کی بھی ضرورت ہے۔ مشکلات کے لیے صبر ایوبی چاہئے۔ تکلیفوں کے لیے ایک بیٹھا گھونٹ بھی چاہئے اور یہ بیٹھا گھونٹ اللہ کی سرمد رحمت کا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعِزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ (۳۵: ۴۶) ”پس اے نبی صبر کرو جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو۔“ وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے جس طرح ایک دن کا ایک لمحہ یا گھڑی بھر۔ آخرت سے پہلے تمام زمانہ بھی دراصل ایک گھڑی ہی ہے۔ اس پورے مکان و زمان کے نقوش انسانی ذہن کے پردے پر اتنے بھی نہ رہیں گے جس طرح دن کے چند لمحات کے نقوش، پھر یہ اپنے انجام کو پہنچنے والے ہیں یہ ابدی دنیا کے دروازے پر ہیں۔ صرف اس قدر وقت ہے کہ ہلاکت سے قبل ان تک پیغام پہنچ جائے۔

بَلِّغْ فَهَلْ يَهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ (۳۵: ۴۶) ”ہات پہنچا دی گئی! اب بافرمان لوگوں کے سوال اور کوئی ہلاک ہو گا۔“ نہیں کیونکہ اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ لہذا ہر داعی کو صبر کرنا چاہئے اور یہ صبر ایک مختصر وقت کے لیے ہے۔ پھر اللہ کے وعدے کے مطابق ہی فیصلہ ہو گا کہ فاسق ہی ہلاک ہوں گے۔

--- ○ ○ ○ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ---- ۲۶

سورۃ محمد - ۴۷

آیات ۱ --- تا --- ۳۸

سورہ محمد ایک نظر میں

یہ مدنی سورت ہے اور اس کا ایک نام دو سرا بھی ہے وہ ہے ”سورہ قتال“ کیونکہ اس کا موضوع اور محور دراصل قتال ہے۔ قتال کی صورتیں اور اس کے حالات اور اس کے اندازِ تعبیر اور صوتی اثرات سب میں قتال کا رنگ غالب ہے۔ اس کے مضمون کا آغاز ہی ان لوگوں کے تعارف سے ہوتا ہے جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے اور ان لوگوں کے تعارف سے جو ایمان لائے۔ کفار پر تنقید کی گئی ہے۔ اور اہل ایمان کی تعریف کی گئی ہے۔ اور یہ اعلان کہ اللہ اہل کفر کا دشمن ہے اور اہل ایمان کا دوست ہے۔ اور اس بات کی اللہ کے ہاں بڑی اہمیت ہے۔ پس گویا یہ اعلان ہے کہ اللہ اپنے اور اپنے دین کے دشمنوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہے۔ آغاز میں

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ (۱) وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ (۲) ذَلِكَ بِأَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَأَنَّ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَبِّهِمْ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ لِلنَّاسِ أَمْثَالَهُمْ (۳) (۱۴۷ تا

۳) ”جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اللہ نے ان کے اعمال کو رائیگاں کر دیا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور اس چیز کو مان لیا جو محمد پر نازل ہوئی ہے۔ اور ہے وہ سراسر حق ان کے رب کی طرف سے.... اللہ نے ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا۔ یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔ اس طرح اللہ لوگوں کو ان کی ٹھیک ٹھیک حیثیت بتائے دیتا ہے۔“

کافروں کے ساتھ اس اعلانِ جنگ کے مقصد بعد اہل ایمان کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان کے خلاف جنگ شروع کر دیں یہ حکم نہایت ہی زوردار اور سخت الفاظ میں ہے اور اس میں جنگ کے اندر مخالفین کو خوب کچل دینے کے بعد گرفتار کرنے اور گرفتار شدہ گان کے احکام بتائے گئے ہیں۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَتَخْتَمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَتَاقَ

فَمَا مِّنَّا بَعْدُ وَاَمَّا فِدَاءٌ حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷: ۴) ”پس جب کافروں سے تمہاری مذہمیز ہو تو پہلا کام گردنیں اڑانا ہے، یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط بندھو، اس کے بعد احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کر دنا آئندہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔“

اس حکم کے بعد حکمت قتال کا بیان ہے۔ مسلمانوں کو قتل پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ شہید ہوئے وہ نہایت ہی باعزت لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا اکرام کرے گا۔ اور جو لوگ یہ جنگ صرف اللہ کی خاطر لڑتے ہیں ان کے ساتھ اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے۔ اور اللہ کافروں کو ہلاک کر کے ان کے اعمال کو ضائع کر دیتا ہے۔

ذٰلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَالَّذِينَ قَتَلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷: ۴) سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (۴۷: ۵) وَ يَدْخُلُهُمُ الْجَنَّةُ عَرَفَهَا لَهُمْ (۴۷: ۶) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۴۷: ۷) وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷: ۸) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۴۷: ۹) ”یہ ہے تمہارے کرنے کا کام، اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نکت لیتا مگر تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے۔ اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ وہ ان کی راہنمائی فرمائے گا، ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کر دے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے۔ لے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔ رہے وہ لوگ، جنہوں نے کفر کیا ہے، تو ان کے لیے ہلاکت ہے۔ اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے لہذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دئے۔“

یہاں کفار کو شدید دھمکی دی جاتی ہے اور اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ مومنین کا دباؤ و ناصر ہے۔ اور اہل کفر کا کوئی ناصر و مددگار نہیں، وہ یکہ و تنها چھوڑ دئے گئے ہیں۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكَافِرِيْنَ اَمْثَالُهَا (۴۷: ۱۰) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰى الَّذِينَ آمَنُوْا وَاَنَّ الْكَافِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۴۷: ۱۱) ”کیا وہ زمیں میں چلے پھرے نہ تھے کہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر اسٹ دیا اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں۔ یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں۔“

اس کھلے اعلان جنگ اور زبردست دھمکی کے بعد ایمان اور کفر کے متعلق دوسرے اہم امور لیے جاتے ہیں۔ دنیا اور آخرت میں اہل ایمان کے شب و روز اور اہل کفر کے حالات بیان کیے جاتے ہیں۔ مومنین کو دنیا و آخرت میں طیب صاع حیات دیا جاتا ہے اور کافروں کو کما جاتا ہے کہ دنیا میں تو وہ حیوانوں کی طرح کھاتے ہیں۔ کوئی اعلیٰ مقصد ان کے سامنے نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَدْخُلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنَّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَ يَآكُلُوْنَ كَمَا تَآكُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوٰى لَّهُمْ

(۱۲۰۴۷) ”ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو اللہ ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے سوٹ رہے ہیں، جانوروں کی طرح کھاپی رہے ہیں اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔“ جبکہ اہل ایمان کی جنتوں میں پسندیدہ پینے کی چیزیں ہوں گی، پانی تارہ اور صاف تارہ دودھ، لذیذ شراب، صاف شدہ شدہ بڑی مقدار میں اور کثرت سے نروں کی شکل میں۔ پھر مختلف قسم کے پھل اور اللہ کی مغفرت اور رضامندی۔ آخر میں پوچھا جاتا ہے۔

كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَ سَقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَفُتِلِحَ اَمْعَآءُ هُمْ (۱۵۰۴۷) ”کیا یہ شخص ان لوگوں میں طرح ہے جو جہنم میں رہیں گے اور حمیم ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا۔“ جب سورت کے آغاز میں کافروں کے ساتھ یہ باتیں ہوئیں اور مومنوں اور کافروں کا تعلق اور انجام صاف صاف بتا دیا گیا تو پھر منافقین کے ساتھ بھی چند باتیں ضروری تھیں۔ مدینہ میں یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ مل کر نئی اٹھنے والی اسلامی جماعت اور حکومت کے لیے شدید خطرہ بن رہے تھے۔ یہ لوگ ان مشرکین مکہ کے مقابلے میں زیادہ خطرناک تھے جو باہر سے اسلام کے خلاف برسر پیکار تھے۔ خصوصاً غزوہ بدر کے بعد اور غزوہ احزاب سے پہلے کے دور میں جبکہ یہودیوں کی قوت کا زور توڑ دیا گیا تھا اور منافقین کی مرکزی قوت بھی کمزور ہو گئی تھی جیسا کہ ہم نے سورت احزاب میں تفصیلات دے دی ہیں۔

اس سورت میں منافقین کے ساتھ مکالمے کا خاص رنگ ہے۔ آغاز ہی سے سخت حملے اور جنگ کا انداز ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ کی مجلس میں باتوں کو غور سے نہیں سنتے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ درحقیقت یہ گمراہ ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ حَتّٰى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوْا الْعِلْمَ

مَاذَا قَالَ اَنْفَا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ اَتَّبَعُوْا اَهْوَاَئِهِمْ (۱۶۰۴۷)
”اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں اور پھر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں سے جنہیں علم کی نعمت بخشی گئی ہے۔ پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی انہوں نے کیا کہا تھا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے نچہ لگا دیا ہے اور یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں۔“

ایسے لوگوں کو دھمکی دی جاتی ہے کہ کیا یہ قیامت کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں تو ان کے ہوش ٹھکانے نہ ہوں گے۔

فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا فَأَنَّى لَهُمْ

اِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرُهُمْ (۴۷: ۱۸) ”اب کیا یہ لوگ قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ اچانک ان پر آجائے؟ اس کی عداوت تو آچکی ہیں جب وہ خود آجائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقعہ رہ جائے گا۔“

اس کے بعد منافقین کی حالت کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے کہ جب قتال کا حکم آتا ہے تو ان کی پریشانی، بزدلی اور ہلکا بین واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے، کیونکہ یہ تو رکھاوے کے مسلمان ہیں۔ حکم قتل سے اصلی اور نقلی مسلمانوں کے درمیان امتیاز ہوتا ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ مُحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا

الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ

(۴۷: ۲۰) ”جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی مگر جب ایک پختہ سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی، وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔“

ایک بار پھر ان منافقین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اطاعت اختیار کریں، معروف طریقہ اپنائیں اور جب کسی معاملے کا عزم بالجزم ہو جائے تو مناسب تو یہ ہے کہ یہ اپنے وعدوں میں سچے ہوں ورنہ ان کے خلاف بھی اعلان جنگ ہوگی۔

فَأُولَىٰ لَهُمْ (۴۷: ۲۰) طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ

لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ (۴۷: ۲۱) فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَ

تَقَطَّعُوا أَرْحَامَكُمْ (۴۷: ۲۲) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعَمَّى

أَبْصَارَهُمْ (۴۷: ۲۳) ”ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اطاعت کریں اور معروف باتیں کریں اور اب جب قطعی حکم دے دیا گیا ہے تو اس وقت یہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلے تو انہی کے لیے بہتر ہوتا۔ اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جاسکتی ہے کہ تم اٹے منہ پھر گئے تو زمین میں فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا۔“

بتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے شیطان کی رفاقت اختیار کر لی ہے، یہ یہودیوں کی سارثوں میں شریک ہیں اور موت کے وقت ان کے ساتھ فرشتوں کا سلوک بہت سخت ہو گا اور دنیا میں بھی ان کے راز فاش ہوں گے۔ یہ بطور سازش اسلامی معاشرے کے فرد بنے ہوئے ہیں اور مفادات حاصل کر رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰى اَدْبَارِهِمْ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى الشَّيْطٰنُ
 سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ (۲۵۰:۴۷) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ
 سَنُطِيعُكُمْ فِىۡ بَعْضِ الْاَمْرِ وَاَللّٰهُ يَعْلَمُ اَسْرَارَهُمْ (۲۶۰:۴۷) فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّيْتُهُمُ
 الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ (۲۷۰:۴۷) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اتَّبَعُوْا مَا اسَاطَطَ
 اللّٰهُ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۲۸۰:۴۷) اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيۡ قُلُوْبِهِمْ
 مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَصْغَانَهُمْ (۲۹۰:۴۷) وَلَوْ نَشَاءُ لَّارٰيْنَكَهُمْ فَلَعَرَفْتُهُمْ
 بِسِيْمَتِهِمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِىۡ لَحْنِ الْقَوْلِ وَاَللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ (۳۰۰:۴۷) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ
 حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجْتَهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِيْنَ وَنَبْلُوْا اَخْبَارَكُمْ (۳۱۰:۴۷) ”حقیقت یہ ہے
 کہ جو لوگ ایمت واضح ہو جانے کے بعد اس سے پھر گئے، ان کے لیے شیطان نے اس روش کو سل بنا دیا ہے۔ اور
 جھوٹی توقعات کا سلسلہ ان کے لیے دراز کر رکھا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے
 کہہ دیا کہ بعض مقامات میں ہم تمہاری مانیں گے اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔ پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب
 فرشتے ان کی رو میں قبض کر س گے اور ان کے منہ اور جینھوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے؟ یہ اسی لیے تو ہو گا
 کہ انہوں نے اس طریقے کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے اور اس کی رضا کارانہ اختیار کرنا پسند نہ کیا۔ اسی بنا
 پر اس نے ان سب کے اعمال ضائع کر دیئے۔ کیا وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے
 دلوں کی کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا۔ ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور ان کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو
 گے مگر ان کے انداز کلام سے تو تم ان کو جان ہی لو گے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے۔ ہم ضرور تم لوگوں
 کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کر س اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہے۔“
 اس سورت کے تیسرے سبق میں روئے سخن پھر مشرکین مکہ لل قریش اور یہودیوں کی طرف ہے اور ان پر تنقید کی
 گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَاقُّوْا الرُّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ
 الْهُدٰى لَنۡ يُّضْرُوْا اللّٰهُ شَيْئًا وَّسَيَحْبِطُ اَعْمَالُهُمْ (۳۲۰:۴۷) ”جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی
 راہ سے روکا اور رسولؐ سے جھگڑا کیا جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی۔ درحقیقت وہ اللہ کا کوئی نقصان بھی نہیں کر
 سکتے بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کر لیا عارت کر دے گا۔“

اور اہل ایمان کو بھی ذرا لیا جاتا ہے کہ یہ نہ ہو کہ باغی کی وجہ سے ان کے اعمال بھی غارت ہو جائیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ لَا تَبْطُلُوا أَعْمَالَكُمْ
(۳۳: ۴۷) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ اصْدَوْا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ

اللَّهُ لَهُمْ (۳۴: ۴۷) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو کفر کرنے والوں اور خدا سے روکنے والوں اور مرتے دم تک کفر پر جے رنے والوں کو تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا۔“

مسلمانوں کو جنگ کے وقت ثابت قدم رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

فَلَا تَهِنُوا وَ تَدْعُوا إِلَى السَّلَامِ وَ أَنْتُمْ الْآعِلُونَ وَ اللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَتْرِكَكُمْ أَعْمَالَكُمْ

(۳۵: ۴۷) ”پس تم ہود نہ ہو اور صلح کی درخواست نہ کرو تم ہی غالب رہنے والے ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔“

بتایا جاتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کا ساز و سامان کچھ حقیقت بھی نہیں رکھتا اور حسب توفیق خرچ کر دے اللہ نے تم پر مہربانی کر کے یہ فرض نہیں کیا کہ اپنا پورا مال خرچ کر دو کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ وہ انسانوں کی کنجوسی سے واقف ہے۔ اگر اللہ سب کا سب مال طلب فرماتا تو تم دل بھٹی اور کنجوسی اختیار کرتے۔

إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَ لَهُوَ وَ إِنْ تَوَمَّنُوا وَ تَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أَجُورَكُمْ وَ لَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ (۳۶: ۴۷) إِنْ يَسْأَلْكُمْوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخُلُوا وَ يُخْرِجْ

أَصْغَانَكُمْ (۳۷: ۴۷) ”یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل تماشا ہے۔ اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلتے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور وہ تمہارا مال تم سے نہ مانگے گا اور اگر وہ کہیں تمہارے مال تم سے مانگ لے اور سب کا سب تم سے طلب کر لے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ ابھار لائے گا۔“

اور سورت کا خاتمہ مسلمانوں کو سخت تنبیہ پر ہوتا ہے۔ اگر تم نے بخل کیا اور اپنے مال اللہ کی جنگ میں خرچ نہ کیا تو پھر تم معزول!

هَآأَنْتُمْ هَآؤَلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخُلُ وَ مَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَخِلْ عَنْ نَفْسِهِ وَ اللَّهُ الْغَنِيُّ وَ أَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ وَ إِنْ تَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۳۸: ۴۷) ”دیکھو تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو“

اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ سے بخل کر رہا ہے۔
 اللہ غنی ہے، تم ہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم منہ موزوں گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو ملے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ
 ہوں گے۔“

--- ۰۰۰ ---

غرض سورت کے آغاز سے آخر تک مسلسل جنگی ماحول اور حق و باطل کی کشمکش ہے۔ ہر فقرے سے یہ بات پھوٹی
 ہے کہ باطل کا سر پھوڑ کر رکھ دو۔ آیات کے خاتمے پر آواز کی شوکت یہ تاثر دیتی ہے کہ گویا توپ کے گولے برس رہے
 ہیں۔ الفاظ بھی بھاری اور رعب دار ہیں مثلاً۔

أَعْمَالَهُمْ، نَالَهُمْ، امْتَالَهُمْ، أَهْوَاءَهُمْ، أَمْعَاءَهُمْ اور جب الفاظ نرم بھی ہوں تو یوں نظر آتا
 ہے کہ کسی میدان جنگ میں تلواریں چمک رہی ہیں مثلاً أَوْزَارَهَا، امْتَالُهَا اقْتَالُهَا۔ جس طرح اس سورت کے
 الفاظ سخت پر شوکت اور آرمی کمانڈر جیسے ہیں اسی طرح اس کے اندر پیش کردہ مناظر بھی سخت ہیں مثلاً قتل و مٹانے کے
 بارے میں کہا گیا ہے: فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ (۴۷: ۴) ”پس جب کافروں کے ساتھ
 تمہارا آمنا سامنا ہو تو گردنیں اڑا دو“۔ اور خوب قتل کرنے کے بعد گرفتاری کے لیے یہ الفاظ ہیں: حَتَّىٰ إِذَا
 أَتَحْتَمَوْهُمْ فَشَدُّوا الرِّجَالِ (۴۷: ۴) ”اور جب خوب کچل دو تم ان کو تباہ رہے سے قیدیوں کو جکڑ کر
 باندھو“۔ اور کافروں کے لیے بددعا بھی نہایت ہی سخت الفاظ میں ہے: فَتَعَسَّأَلَهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ (۴۷: ۸)
 ”ہلک ہو جائیں اور ان کے اعمال کو اللہ اکارت کر دے“۔ سابقہ اقوام کی ہلاکت بھی اسی طرح دھماکہ خیزی کے ساتھ
 بیان ہوئی۔ دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكَافِرِينَ امْتَالُهَا (۴۷: ۱۰) ”اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر الٹ دیا اور ایسے
 ہی نتائج ان کافروں کے لئے مقدر ہیں“ اور جہنم میں ان کی حالت یہ ہوگی۔ وَ سَقُّوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ
 (۴۷: ۱۵) ”اور انہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا“۔

اور منافقین کی بزدلی اور ان کے خوف و ہراس کو جبکہ انہوں نے قتال کا حکم سنایا بیان کیا گیا۔ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ
 نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (۴۷: ۲۰) ”وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے ان پر حالت
 موت چھا گئی“ اور اگر مسلمان بھی جمادات منہ موزوں تو اللہ ان کو ان سخت الفاظ میں دھمکی دیتا ہے۔ وَإِنْ تَوَلَّوْا
 يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۴۷: ۳۸) ”اگر تم منہ موزوں گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم
 کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔“

یوں اس سورت کے مضامین و موضوعات اس کے الفاظ، فنی انداز، منطوق، سخت قسم کے مناظر اور قتال اور جنگ
 کے دو ٹوک احکام اس سورت کی فضا اور اس کے ماحول کو سخت دو ٹوک اور شدید بنا دیتے ہیں۔ (۱)

(۱) میں جب بھی سورت محمد کو پڑھتا تو اس کا منفرد انداز محسوس کرتا لیکن سید صاحب نے اس کا سبب
 نہایت احسن انداز میں پیش کیا۔ (مترجم)

درس نمبر ۲۲ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۱۵



الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَأَنَّ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ لِلنَّاسِ أَمْثَالَهُمْ ۚ

”جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اللہ نے ان کے اعمال کو رائیگاں کر دیا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور اس چیز کو مان لیا جو محمد پر نازل ہوئی ہے۔ اور ہے وہ سراسر حق ان کے رب کی طرف سے.... اللہ نے ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا۔ یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔ اس طرح اللہ لوگوں کو ان کی ٹھیک ٹھیک حیثیت بتائے دیتا ہے۔“

سورت کا افتتاح یوں ہے جس طرح کوئی فوج حملہ آور ہو جاتی ہے، کوئی مقدمہ نہیں، کوئی تمہید نہیں۔ اعلان ہو جاتا ہے کہ کافر بظاہر جو اچھے کام کر رہے ہیں وہ کالعدم ہیں جنہوں نے کفر کیا ہے، اللہ کی راہ پر چلنے سے رکے ہیں اور دوسروں کو روکا ہے۔ اعلان ہوتا ہے کہ ان کے یہ اعمال کالعدم (void) ہیں۔ لہذا اعلان نہایت ہی موثر، عام فہم اور مشخص انداز میں ہے۔ ان کے اعمال راستہ گم کر گئے ہیں اور اس وجہ سے ہلاک اور ضائع ہو گئے، یوں کہ گویا یہ زندہ

انسان یا حیوان ہیں اور انہوں نے راستہ گم کر دیا ہے، ہمت دور نکل گئے ہیں اور ہلاک ہو گئے ہیں، یہ ملبوم اور یہ نقشہ بتاتا ہے کہ گویا یہ اعمال لوگوں سے یا مہیشیوں کے گلے سے الگ ہو گئے اور لوگ ان اعمال سے الگ ہو گئے اور دونوں کا انجام ہلاکت پر ہوا۔

یہ جن اعمال کے گم ہونے کا اعلان ایک فوجی فرمان کی شکل میں ہوا ہے۔ ان سے مراد وہ اعمال خیر نیہ ہیں جو ایمان، جہاد کے رنگ سے محروم ہیں اور کرنے والوں کی غرض نیکی ہے لہذا اعمال صالحہ کی قدر و قیمت ایمان اور نظریہ جہاد کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ اس قسم کے اعمال جو بظاہر نیکی کے اعمال ہوتے ہیں لیکن ان کی تہ میں دہیہ نیکی کا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات دہیہ بھی نیکی کا ہوتا ہے لیکن ایمان پر مبنی نہیں ہوتا۔ اس طرح بغیر ایمان کے ایک عارضی 'سرسری جذبہ' ہوتا ہے جس کی وجہ سے کچھ اعمال صادر تو ہو جاتے ہیں لیکن ثبات و دوام سے محروم ہوتے ہیں 'وہ کسی مضبوط اور واضح منہاج اور نظریہ پر مبنی نہیں ہوتے۔ اور زندگی کے طویل منصوبے سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کائنات کے اندر پوشیدہ ناموس الہی سے مربوط نہیں ہوتے۔ اس لیے باطل ہوتے ہیں۔ لہذا اعمال کے لیے ایمان ضروری ہے۔ یہ اعمال اس سے بندھے ہوئے ایک صحیح رخ پر جا رہے ہوں اور عمل کرنے والا اس ایمانی دہیہ سے عمل کر رہا ہو اور یہ عمل اس کائناتی نظام سے بھی مربوط ہو، جو انسان کو اس کائنات سے جوڑتا ہے۔ اور اس طرح اس کائنات میں ہر عمل کا ایک مقصد اور ایک اثر ہوتا ہے۔ اور وہ ایک منزل تک جاتا ہے۔

اور دوسری طرف

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ

رَبِّهِمْ (۲: ۴۷) ”اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور اس چیز کو مان لیا جو محمدؐ پر نازل ہوئی ہے۔ اور ہے وہ سراسر حق ان کے رب کی طرف سے۔“

وَالَّذِينَ آمَنُوا (۲: ۴۷) میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان مانا شامل ہے لیکن یہاں اس کا ذکر علیحدہ بطور تاکید کیا گیا ہے تاکہ اس کی صفت میں یہ جملہ لایا جائے۔
وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ (۲: ۴۷) اور سابق ایمان کی تاکید مزید ہو جائے اور عمل صالح کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ایمان زندہ ہے، موجود ہے اور فعال ہے۔

كَفَرُ عَنْهُمْ سُبَاتِهِمْ (۲: ۴۷) ”اللہ نے ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں۔“ یہ خبر ہے الذین کی۔ اور کفار کے اعمال کو ضائع کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ اعمال بظاہر خیر یہ تھے۔ اور ایمان نہ ہونے اور کفر کے وجود نے ان کو ضائع کر دیا جبکہ نین کے سینات کو بھی دور کر دیا گیا اور وہ بخش دیئے گئے۔ یہ مکمل مقابلہ ہے کہ کفر سے نیک اعمال ضائع ہونے اور ایمان سے برے اعمال فنا ہوتے ہیں۔ یہ ہے اہمیت ایمان کی۔

وَأَصْنَحْ بِالْهَمِّ (۲: ۴۷) ”اور ان کا حال درست کر دیا۔“ کسی کا حال درست کر دینا، ایک بڑی نعمت

ہے جو ایمان کے نتیجے اور اثر میں کیا جاتا ہے۔ فرحال اور فارغ البال ہونا اطمینان، آرام، سلامتی اور رضامندی کا مظہر ہوتا ہے۔ جب انسان اندر سے مطمئن ہو تو اس کا شعور، اس کی سوچ اور اس کا قلب اور ضمیر اور اس کے انکار اور اعصاب اور اس کا پورا نفس نہایت اچھی طرح کام کرتے ہیں۔ اور وہ امن و سلامتی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ قلبی اطمینان سے اور کوئی بڑی نعمت نہیں ہے۔ یہ ایک افق ہے، جو نہایت روشن ہے اور صاف و شفاف ہے اور یہاں تک رسائی صرف اللہ ایمان کو حاصل ہوتی ہے۔

یہ کہ کافروں کے اعمال ضائع کر دیئے اور مومنین کی برائیاں معاف کر دیں یہ کسی دوستی یا رشتہ داری کی بناء پر نہیں، محض اتفاق کے طور پر بھی نہیں بلکہ ایک موثر اور متعین اصول کے مطابق ایسا کیا گیا۔ اس ناموس فطرت کے مطابق جس کے اوپر یہ کائنات قائم ہے۔ یہ ناموس حق ہے جو اساس تخلیق ہے اور جس کے مطابق اللہ نے زمین و آسمان بنائے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اتَّبَعُوْا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّبَعُوْا الْحَقَّ مِنْ

رَبِّهِمْ (۴۷: ۳) ”اور یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے اس حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا۔“۔ جہاں تک باطل کا تعلق ہے اس کی جڑیں اس کائنات کے اندر دور تک نہیں ہوتیں، اس لیے وہ تباہ ہو جاتا ہے اور جو شخص بھی باطل کا پیرو ہوتا ہے یا باطل کا نتیجہ ہوتا ہے وہ ضائع ہونے والا ہوتا ہے اور کافر چونکہ باطل کے پیرو کار ہوتے ہیں اس لیے ان کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی مفید چیز باقی نہیں رہتی۔ اور حق چونکہ مستقل ہوتا ہے، آسمان و زمین بھی اس پر قائم ہیں، اس کی جڑیں اس کائنات میں بہت دور تک چلی جاتی ہیں۔ اس لیے وہ باقی ہوتا ہے اور مومن چونکہ اس کے پیرو کار ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو بھی دوام حاصل ہوتا ہے اور اللہ ان کی کوتاہیوں کو معاف کرتا ہے اور ان کی اصلاح حال فرماتا ہے۔

یہ ایک واضح اور طے شدہ معاملہ ہے اور متعین اصولوں پر اور متعین اسباب پر قائم ہے لہذا اس میں کوئی اتفاقی امر نہیں ہے یا محض تک پر مبنی نہیں ہے۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ (۴۷: ۳) ”اسی طرح اللہ لوگوں کو اس کی ٹھیک ٹھیک

حیثیت بتا دیتا ہے۔“۔ یعنی ایسے اصول اللہ بتا دیتا ہے جس کے مطابق وہ اپنے نفس اور اعمال کو تولدے ہیں اور وہ ان معیاروں کو جانچتے ہیں جن کے مطابق وہ اپنے معاملات چلاتے ہیں اور قیاس اور پیمانوں میں خود مختار نہیں ہیں۔

یہ اصول تو پہلی آیت میں طے کر دیا گیا، اس کے بعد لیل ایمان کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ وہ حق کے پیرو کار ہیں اور اس حق کا قیام اور غلبہ اس کرۂ ارض پر ضروری ہے۔ حق کی فطرت میں غلبہ ہے۔ اس نے لوگوں کی زندگی کے پیمانے طے کرنے ہیں، لوگوں کی زندگی کو حق کے اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہے، اور کافر چونکہ باطل پر ہیں، اس لیے باطل اور لیل باطل دونوں کے آثار کا شکار ضروری ہے۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا
 اَتَخَنَتُمُوهُمْ فَشَدُّوا الوُثَاقَ ۖ وَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً ۚ حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ
 أَوْزَارَهَا ۚ ذَلِكَ ۚ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُمْ
 بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِينَ قَتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ ۖ سَيَهْدِيهِمْ
 وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۖ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۖ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن
 تَشَاءُوا اللَّهُ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعَسَا لَهُمْ وَ
 أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أُنْزِلَ اللَّهُ فَاحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ۖ أَفَلَمْ
 يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ دَمَّرَ اللَّهُ
 عَلَيْهِمْ ۖ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا
 مَوْلَى لَهُمْ ۚ

۱۱۷

مَوْلَى لَهُمْ ۚ

■

”پس جب ان کافروں سے تمہاری ٹک بھیز ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب تیدیوں کو مضبوط باندھو، اس کے بعد (جس میں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کر لو، تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔ یہ ہے تمہارے کرنے کا کام۔ اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا، مگر (یہ طریقہ اس نے اس لیے اختیار کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے۔ اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا، ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو وقف کرا چکا ہے۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کر دو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جمادے گا۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے، تو ان کے لیے ہدایت ہے اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسہ اللہ نے ناز کیا ہے، لہذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر الٹ دیا، اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں۔ یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں۔“

اس آیت میں کافروں کے ساتھ ملقات سے مراد جنگ کا آمنا سامنا ہے۔ محض ملاقات نہیں ہے۔ اس سورت کے

نزوں تک جزیرۃ العرب میں بعض لوگ مسلمانوں کے ساتھ برسرِ جنگ تھے اور بعض کے ساتھ صلح کا معاہدہ تھا۔ سورہ برات ابھی نازل نہ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں مشرکین کے ساتھ معاہدے ختم کر دیئے گئے تھے۔ اس طرح کہ جو معاہدے متعین وقت کے لیے تھے ان کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ وہ اپنے وقت تک رہیں گے اور جن کے اندر کوئی دقت متعین نہ تھا ان کے معاہدین کو چار ماہ کا عرصہ دے دیا گیا۔ اور یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ اس کے بعد جزیرۃ العرب میں جہاں بھی کوئی مشرک پایا جائے گالت قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ جزیرۃ العرب اسلام کا مرکز تھا اور اسے صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کرنا ضروری تھا۔ جزیرۃ العرب کے اندر مشرکین کو اسلام قبول کرنا تھا یا ملک بدر ہونا تھا۔ اور یہ اصول دوسرے علاقوں کے لیے نہیں ہے۔ 'دوسرے اسلامی ممالک میں مشرکین بطور اقلیت جزیہ دے کر رہ سکتے ہیں۔ نیز گردنیں مارنے کا حکم بھی اس وقت ہے جب وہ اسلام قبول نہ کریں۔ گردنیں اڑانیں کا حکم قتل کی عملی صورت ہے اور یہ اس سورت کی فضا کے ساتھ مناسب لفظ ہے۔

حَتَّىٰ اِذَا اَخْتَمْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَتَا قَ (۷۴: ۷۵) ”یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح پکڑ دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو“۔ اٹھان کے معنی ہیں شدید قتل یعنی پکڑ دینا۔ یعنی دشمن کی قوت کو ختم کر کے رکھ دینا۔ قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا کہ آئندہ اس میں حملے کی طاقت نہ رہے۔ جب وہ اس پوزیشن میں چلا جائے تب قیدیوں کو گرفتار کرنا شروع کیا جائے۔ لیکن اگر دشمن کا سر پکڑنا نہ گیا ہو تو دشمن کو قید کرنا شروع نہ کیا جائے۔ اس تفسیر کے مطابق اس آیت اور انفال کی اس آیت کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو گا جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو سرزنش کی گئی تھی کہ انہوں نے غزوہ بدر میں بہت سے لوگوں کو قیدی بنا لیا حالانکہ مناسب تھا کہ انہیں قتل کر دیا جاتا جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے۔ سورہ انفال میں کہا گیا۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهُ اَسْرٰى حَتّٰى يَشْرِي فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ (۶۷) لَوْ لَا كَتَبَ مِنْ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسْكُكُمْ فِیْمَا اَنۡحَدْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۶۸) (۸: ۶۷، ۶۸) ”کسی نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح پکڑ نہ دے۔ تم لوگ دنیا کا فائدہ چاہتے ہو حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے لکھا نہ جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے یا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔“

لہذا دشمن کی قوت کو پکڑنا تو سب سے پہلے ہے تاکہ دشمن آئندہ اسلامی مملکت پر حملہ نہ کر سکے اور اس کے بعد قید کا معاملہ ہو گا۔ کیونکہ جنگ کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسلامی ریاست پر حملہ آور ہونے والی قوت کو ختم کر دیا جائے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ مسلمانوں کی قوت انفرادی اعتبار سے کم ہو اور مشرکین تعداد میں زیادہ ہوں۔ اس دور کے جنگی حالات میں دشمن کے سپاہی کو ختم کر دینا جنگ کی حکمت عملی میں بہت ہی اہم تھا۔ اور یہی حکم اب بھی رہے گا اگر یہ مقصد

اس پر موقوف ہو کہ دشمن کی قوت کو کھٹا قتل شدید کے بغیر ممکن نہ ہو اور اس کے بغیر - دو بارہ سے تہہ روکا نہ جاسکتا ہو۔ اس کے بعد لوگوں کو قید کرنے کا حکم پھر یہ ہے اور یہ واحد نص ہے جو قیدیوں کے ضابطے کا تعین کرتی ہے۔

فَإِمَّا مِّنَّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (۴۷: ۴) ”اس کے بعد تمہیں اختیار ہے احسان کرو یا فدیہ کا معاملہ کرو۔“ یعنی بعد میں جنگی قیدیوں کا مصرف یہ ہے کہ یا تو ان قیدیوں کو بطور احسان چھوڑ دو یا فدیہ کا معاملہ کرو یعنی مسلمان قیدیوں کے بدلے میں چھوڑ دو یا کوئی مالی تاوان جنگ لے کر چھوڑ دو یا کوئی اور اجرت عمل لے لو۔ جیسا کہ بدر کے قیدیوں سے کچھ کام لیے گئے۔

اس آیت میں قیدیوں کے مصرف کے لیے کوئی تیسری صورت نہیں۔ یعنی قیدیوں کو قتل کرنا یا غلام بنانا یعنی مشرکین کے قیدیوں کے معاملے میں۔ نیز اس سے بعد مذکور ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء نے بعض قیدیوں کو غلام بنایا اور بعض کو متعین حالات میں قتل کیا۔

میں اس آیت کی تشریح کے بارے میں امام جس جس حنفی کی تشریح نقل کرتا ہوں، درمیان میں جہاں مجھے کچھ کہنا ہے انہوں گا اور اس کے بعد وہ مطلب بیان کروں گا۔ میرے خیال میں درست ہے۔ جصاص کہتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَإِذَا لَقِبْتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ (۴۷: ۴) ”پس جب کافروں سے تمہاری ٹہ بھڑ ہو تو گردنیں مارتا ہے۔“ آیت کا ظاہری مضمون متقاضی ہے کہ کفار کے ساتھ کوئی دو سرا معاملہ تب جائز ہے جب ان کی قوت کو اچھی طرح کچل دیا جائے اور اس کے مماثل حکم دو سری جگہ ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ (۸: ۶۷) ”نبی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں حتیٰ کہ وہ زمین میں دشمن کی قوت کو کچل دے۔“ (اور یہ بات درست ہے کیونکہ دونوں آیات کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے) (تطب)۔

روایت بیان کی محمد ابن جعفر ابن محمد ابن یمان سے انہوں نے ابو عبیدہ سے انہوں نے عبد اللہ ابن صالح سے انہوں نے معاویہ ابن صالح سے انہوں نے علی ابن طلحہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے کہ آیت۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ (۸: ۶۷) یوم بدر کے بارے میں ہے۔ اس وقت مسلمان قلیل تھے۔ جب وہ زیادہ ہو گئے اور ان کی قوت زیادہ ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے دو سری آیت نازل کی۔

فَإِمَّا مِّنَّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (۴۷: ۴) اللہ نے نبی اور مسلمانوں کو اختیار دے دیا کہ اگر چاہیں تو قتل کر دیں، چاہیں تو غلام بنالیں، چاہیں تو فدیہ لے لیں۔ ابو عبیدہ نے ان الفاظ میں شک کیا ہے (اگر چاہیں تو غلام بنالیں) (غلام بنانا چونکہ خود حضرت ابن عباس سے نقل ہونے میں بھی مشکوک ہے۔ اس لیے ہم اسے ترک کرتے ہیں۔ رہا

قتل کرنا تو اس آیت سے جواز قتل معلوم نہیں ہوتا کیونکہ آیت احسان کرنے یا فدیہ لے کر چھوڑ دینے سے ہے۔ منصوص ہے۔

روایت کی ہے جعفر ابن محمد نے ابو سعید سے انہوں نے ابو مہدی اور حجاج سے دونوں نے سفیان سے وہ کہتے ہیں کہ میں نے سدی سے سنا کہ وہ اس آیت کی تفسیر یہ بیان کرتے تھے :

فَأَمَّا بَعْدُ وَأَمَّا فِدَاءٌ (۴۷: ۴) ”اس کے بعد احسان کرو یا فدیہ کا معاملہ کرو“۔ کہ یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے اور اس کو سورہ توبہ کی آیت۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ (۵: ۹) ”مشرکین کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ“ نے منسوخ کر دیا ہے ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ یہ آیت۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ (۴۷: ۴) اور آیت۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُتَخَيَّرَ فِي الْأَرْضِ (۸: ۶۷) اور آیت۔

فَأَمَّا تَثَقُّفْنَهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مِّنْ خَلْفَهُمْ (۵۷: ۸) (۱) یہ سب احکام ثابت اور موجود ہو سکتے ہیں اور منسوخ نہ ہوں گے۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ مشرکین کو خوب قتل کرو اور قیدی نہ بناؤ۔ الا یہ کہ وہ خوب دلیل ہو جائیں اور ان کی قوت ٹوٹ جائے۔ یہ اس وقت تھا جب مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ لہذا مناسب یہ ہے کہ یہ حکم قائم رہے اور ایسے حالات میں اس پر عمل کیا جائے جس طرح آغاز اسلام میں مسلمانوں کی حالت تھی۔ (میرا خیال یہ ہے کہ مشرکین جہاں ملیں ان کو قتل کرو۔ یہ حکم صرف جزیرۃ العرب کے مشرکین کے لیے تھا جبکہ یہ آیت عام ہے یعنی آیت زیر بحث۔ جب دشمن کی قوت کو کچل دیا جائے تو پھر قیدی بنانا جائز ہو گا۔ اس پر خلفاء نے رسول اللہ کے بعد عمل کیا اور سورہ برات کے نزول کے بعد بھی عمل ہوا۔ انہوں نے بعض مخصوص حالات کے سوا کسی قیدی کو قتل نہیں کیا۔ رہی یہ آیت

فَأَمَّا مَنَّا بَعْدُ وَأَمَّا فِدَاءٌ (۴۷: ۴) ”اس کے بعد احسان کرو یا فدیہ لو“۔ بظاہر عبارت کا مفہوم یہی ہے کہ دو میں سے ایک چیز کر سکتے ہو یعنی یا احسان کرو اور قیدیوں کو رہا کر دو اور یا پھر فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ اس سے قیدیوں کے قتل کے جواز کی نفی ہوتی ہے اور سلف صالحین کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ روایت ہے حجاج ابن مبارک ابن فضالہ سے انہوں نے حسن سے روایت کی کہ انہوں نے قیدی کے قتل کو مکروہ سمجھا اور حکم کیا اس پر احسان کرو یا فدیہ کا معاملہ

(۱) ”پس یہ لوگ اگر تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد دوسرے جو لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں ان کے حواس باختہ ہو جائیں۔“

کرو۔ حدیث بیان کی جعفر نے ابو عبیدہ سے انہوں نے بیٹھ سے انہوں نے اٹھتے سے کہ میں نے عطا سے پوچھا قیدی کے قتل کا کیا مسئلہ ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ یا احسان کر کے چھوڑ دیا نذیر کا معاملہ کرو۔ یہی بات میں نے حسن سے پوچھی تو انہوں نے کہا اس کے ساتھ وہی معاملہ ہو گا جو حضورؐ نے بدر کے قیدیوں سے فرمایا کہ یا تو احسان کر کے چھوڑ دیا یا نذیر لیا۔ حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ عطلائے اصغر کا ایک رئیس قیدی ابن کے حوالے کیا گیا کہ اسے قتل کر دیں تو انہوں نے اسے قتل کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ آیت پڑھی۔

فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (۴۷: ۴) اسی طرح مجاہد اور محمد ابن سیرین سے بھی یہی روایت ہے کہ انہوں نے قیدیوں کے قتل کو ناپسند کیا۔ سدی سے یہ روایت آئی ہے کہ یہ آیت۔

فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (۴۷: ۴) منسوخ ہے فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ (۵: ۹) نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اسی قسم کی روایت ابن جریج سے بھی منقول ہے۔ روایت کی جعفر نے ابو عبیدہ سے انہوں نے حجاج سے اور انہوں نے ابن جریج سے انہوں نے کہا کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ حضورؐ نے عقبہ ابن ابو معیط کو بدر کے دن باندھ کر قتل کیا۔ نصر ابن حارث کو بھی بدر کے دن قتل کیا گیا۔ اور احد کے دن ابو عزمہ شاعر۔ قید کیے جانے کے بعد قتل ہوا اور بنو قریظہ کو قتل کیا گیا جب وہ سعد ابن معاذ کے فیصلے پر ہتھیار ڈال کر اسیر ہو گئے تو سعد ابن معاذ نے فیصلہ دیا کہ ابن کو قتل کر دیا جائے اور ان کی اولاد کو غلام بنا لیا جائے۔ ابن میں سے صرف زبیر ابن باطا پر احسان کیا گیا اور خیبر کا بعض علاقہ تو مصالحت سے فتح ہوا اور بعض علاقہ بزور شمشیر فتح ہوا اور ابو الحقیق کے ساتھ یہ شرط طے ہوئی کہ کچھ چھپائے گا نہیں۔ جب اس کی خیانت ظاہر ہو گئی کہ اس نے چھپایا ہے تو اسے قتل کر دیا گیا۔

حضورؐ نے مکہ کو فتح کیا اور حکم دیا کہ بلال ابن فطل، مقیس ابن حبابہ اور عبداللہ ابن ابی السرح اور دوسروں کو قتل کر دیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا: ”یہ اگر کعبہ کے پردوں کے ساتھ بھی لٹک رہے ہوں تو انہیں قتل کرو“۔ اہل مکہ پر احسان کیا۔ ان کے اموال کو مال غنیمت نہ بنایا۔ صالح ابن کیمان سے روایت ہے انہوں نے محمد ابن عبدالرحمن سے انہوں نے اپنے والد عبدالرحمن ابن عوف سے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر الصدیق کو یہ کہتے سنا: ”کاش فداء جب میرے پاس لایا گیا تو میں اسے نہ جھٹایا تو اسے آزادانہ قتل کر دیتا یا اسے کامیابی سے رہا کرتا“ ابو موسیٰ نے اسوس کے ایک زمیندار کو پناہ دینے کے بعد قتل کر دیا۔ ہوا یوں کہ اسے امان دے دی گئی کہ فلاں فلاں لوگوں کو قتل نہ کیا جائے گا لیکن اس معاہدے میں وہ اپنا نام لکھنا بھول گیا۔ یوں وہ قتل ہو گیا۔ یہ احادیث و آثار ہیں جو حضور اکرمؐ سے اور صحابہ سے تواتر کے ساتھ آئے ہیں کہ قیدیوں کو رکھا بھی جاسکتا ہے اور قتل بھی کیا جاسکتا ہے اور اس پر بڑے شہروں کے فتناء کا اتفاق ہے۔ (اس قتل کا جواز آیت سے نہیں لیا جاتا، صرف رسول اللہؐ کے عمل اور بعض صحابہ کے عمل سے لیا جاتا ہے۔ لیکن جن حالات میں قیدیوں کو قتل کیا گیا ہے، ان کا منسل مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ قتل ہوئے، ان کے قتل کی مخصوص وجوہات تھیں۔ یہ وجوہات جنگ اور قیدی بن جانے کے علاوہ تھیں۔ نصر ابن حارث اور عقبہ ابن ابو معیط مکہ میں حضور اکرمؐ کی آہو کرتے تھے۔ اور آپؐ کو اور دعوت اسلامی کے حاملین کو اذیت دیتے تھے۔ یہی مسئلہ ابو عزمہ شاعر کا تھا۔ بنو قریظہ نے تو حضرت سعد ابن معاذ کا فیصلہ پیشگی قبول کر لیا تھا۔ غرض تمام حالات میں متعین اسباب نظر آتے

ہیں۔ اس لیے ان حالات میں اس آیت سے ہٹ کر عمل کیا گیا۔ یعنی آیت من اور فداء سے)۔

اور قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنے میں بھی اختلاف ہوا۔ ہمارے ساتھیوں (احناف) سب کی رائے یہ ہے کہ قیدیوں کو مال کے بدلے نہ چھوڑا جائے گا اور نہ ہی قیدی غلاموں کو دارالحرب میں کسی کے ہاتھ فروخت کیا جائے گا کہ وہ دوبارہ اسلام کے خلاف جنگ کریں۔ امام ابو حنیفہ کی رائے تو یہ ہے کہ ایسے قیدیوں کو مسلمان قیدیوں کے بدلے بھی رہا نہ کیا جائے تاکہ وہ اسلام کے خلاف کبھی جنگ نہ کر سکیں۔ امام یوسف اور محمد فرماتے ہیں کہ مسلمان قیدیوں سے مشرکین قیدیوں کا تبادلہ ہو سکتا ہے۔ امام ثوری، امام اوزاعی کا بھی یہی قول ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے کہ عورتوں اور بچوں کو بھی لٹل دارالحرب کے ہاتھوں فروخت کیا جاسکتا ہے۔ ہاں غلام مردوں کو فروخت نہ کیا جائے گا۔ امام مزی نے امام شافعی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ بطور احسان چھوڑ دے یا فدیہ کے بدلے چھوڑ دے۔ جو لوگ مال یا مسلمان قیدیوں کے بدلے کافر قیدیوں کی رہائی کے جواز کے قائل نہیں ان کی دلیل یہ ہے۔

فَأَمَّا مَنْ بَعْدُ وَأَمَّا فِدَاءٌ (۷: ۴) آیت کے ظاہری الفاظ یہی مفہوم دیتے ہیں کہ مال کے بدلے یا مسلم قیدیوں کے بدلے رہائی جائز ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدریوں کو اس کے بدلے رہا فرمایا۔ اور مال کے بدلے رہائی پر دلیل اس حدیث سے دی جاتی ہے جو ابن مبارک نے معمر سے روایت کی ہے 'انہوں نے ایوب سے 'انہوں نے ابو قتادہ سے 'انہوں نے ابوالمہدیاب سے 'اور انہوں نے حضرت عمران ابن حصین سے کہ قبیلہ ثقیف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ساتھیوں کو قید کر لیا تھا۔ اور مسلمانوں نے بنی عامر ابن منصرہ قبیلے سے ایک شخص کو قید کر لیا تھا۔ اس قیدی کے پاس سے حضورؐ گزرے۔ یہ بندھا ہوا تھا۔ اس نے حضورؐ کو پکارا کہ میرا تصور کیا ہے حضورؐ فرمایا تمہارے ساتھیوں کے جرم کی وجہ سے تم پکڑے گئے ہو۔ قیدی نے کہا کہ میں تو مسلم ہوں یہ سن کر آپؐ نے فرمایا اگر یہ بات تم اس وقت کہتے جب آزاد تھے تو تم پوری طرح کامیاب ہوتے۔ اس کے بعد حضورؐ چلے گئے۔ اس نے دوبارہ پکارا۔ حضورؐ متوجہ ہوئے۔ اس نے کہا میں بھوکا ہوں۔ تو حضورؐ نے فرمایا ہاں یہ تمہاری ضرورت ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے اس کو ان دو مسلمانوں کے بدلے رہا کر دیا۔ جن کو ثقیف نے قید کر لیا تھا۔ (ہمارے خیال میں جو لوگ فدیہ کے طور پر قیدیوں کو رہا کرنے کے قائل ہیں ان کے دلائل مضبوط ہیں، بمقابلہ ان دلائل کے جو امام جصاص نے فدیہ بالمال یا مسلمان قیدیوں کے تبادلہ کے خلاف دیئے ہیں

امام جصاص نے حنیفہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے بات ختم کی ہے۔ یہ کہ آیت زیر بحث میں احسان اور فدیہ کا ذکر ہے تو یہ آیت درج ذیل آیت سے منسوخ ہے۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُواْهُمْ وَاحْصِرُوهُمْ وَأَقْعُدُواْ لَهُمْ

كُلُّ مَرَصِدٍ فَإِنْ تَابُواْ وَأَقَامُواْ الصَّلَاةَ وَآتَوْاْ الزَّكَاةَ فَخَلُّواْ سَبِيلَهُمْ (۹: ۵)

”مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو“۔ اور یہی روایات ہم نے سدی 'ابن جریر سے نقل کی ہیں۔ اور اللہ

کر میں ایسا ہو گیا (اور ہمارے دور میں ہو گیا ہے) کہ تمام بین الاقوامی قوتوں نے قیدیوں کو غلام نہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تو اس وقت اسلام بھی اس مثبت قاعدے کی طرف رجوع کرے گا اور وہ یہ ہے۔

فَأَمَّا مَنْ بَعْدُ وَأَمَّا فِدَاءٌ (۴۷: ۴) کہ یا بھور احسان قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے یا بھور فدیہ تاکہ وہ حالات ختم کر دیے جائیں جن میں قیدیوں کو غلام بنایا جاتا تھا کیونکہ اسلام میں غلامی کا ادارہ ضروری نہیں ہے اور نہ کوئی بنیادی اصول ہے۔

یہ وہ رائے ہے جو نص قرآنی سے قطعی طور پر معلوم ہوتی ہے اور ان تمام حالات اور واقعات سے بھی یہی معلوم ہوتی ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں نمودار ہوئے۔ اور صحیح رائے وہی ہوتی ہے جس کی طرف اللہ کسی کو توفیق دے۔ لیکن یہ بات دہن میں اچھی طرح رکھنا چاہئے کہ نصوص قرآنی سے یہ رائے بادی النظر میں ثابت ہوتی ہے اور قرون اولیٰ میں جو واقعات پیش آئے اور جو حالات تھے ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے 'یہ بات نہیں ہے کہ اسلام پر ادارہ غلامی کو جائز رکھنے کا کسی نے الزام لگایا ہے اور میں اس کی نفی کرتا ہوں اور اسلام کا دفاع کرتا ہوں۔ میں اس قسم کے دفاع کا قائل نہیں ہوں۔ اگر میرا خیال یہ ہوتا کہ اسلام غلامی کو جائز سمجھتا ہے تو میں اعلان کر دیتا کہ یہ درست ہے اور انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے کہ غلامی کے ادارے کو جائز رکھا جائے اور کوئی انسان جو انسان ہو اور اس کے اندر اسلامی آداب کا ذرا سا شعور بھی ہو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے لیکن میری رائے یہ ہے۔ اور میری رائے قرآن سے زیادہ معقول ہے۔

یہ قوانین و ہدایات یعنی قتال اگر نہیں لڑنا سختی سے قیدیوں کو باندھنا اور قیدیوں کے لیے یہ اصول اس وقت تک ہیں۔

حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (۴۷: ۴) "تو آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے"۔ اور اسلام اور اس کے دشمنوں کے درمیان جنگ ختم ہو جائے۔ یہ کلی قاعدہ ہے اور جہاد قیامت تک کے لیے چلنے والا ادارہ ہے۔ جس طرح رسول اللہ نے فرمایا:

حَتَّى تَكُونَ كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا جب تک کہ اللہ کا کلمہ بلند نہیں ہو جاتا۔

--- ○ ○ ○ ---

اللہ نے یہ جہاد اس لیے نہیں فرض کیا کہ وہ لوگوں سے کافروں کے مقابلے میں کوئی مدد لینا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کفار کو تو براہ راست ہی ختم کر سکتا ہے۔ یہ نظام تو اس لیے تجویز ہوا ہے کہ اللہ اپنے بعض بندوں کو دوسروں کے مقابلے میں آزما چاہتا ہے۔ اس آزمائش ہی پر ان کے درجات کا آخرت میں فیصلہ ہو گا۔

ذَلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَكِنْ لِيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بَعْضٍ وَالَّذِينَ قَتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَنْ يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ (۴) سَيَهْدِيهِمْ وَ يُوصلِحُ بِاللَّهِمْ (۵) وَ يُدْخِلُهُمْ

الْجَنَّةَ عَرَفَهَا لَهُمْ (۶: ۷۷)۔ ”یہ ہے تمہارے کرنے کا کام۔ اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے منت لیتا مگر (یہ طریقہ اس نے اس لیے اختیار کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے۔ اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا، ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو وقف کر چکا ہے۔“

یہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکا، اس قسم کے لوگ ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں، خدا کے دین کے باغی، سرکش اور مفیدین جو ظلم اور تکبر کے جامہ میں سامنے آتے ہیں اور اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو بہت قوت والے دکھاتے ہیں۔ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں اور یہ لوگ اس چھوٹے سے ذرے کے اوپر رہتے ہیں جسے عرف عام میں زمین کہا جاتا ہے۔ جو اس کائنات کے عظیم کردوں، دیو پیکل اجسام، ستاروں اور سیاروں کے درمیان فی الواقع ایک ذرہ ہی ہے۔ ان کے عداوہ دوسرے جہاں ہے شمار ککٹوں اور بلیک ہول ہیں جن کی تعداد صرف اللہ ہی جانتا ہے اور جو اس وسیع اور ہولناک کائنات میں تیرتے پھرتے ہیں اور بکھرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ زمین ایک ذرہ ایک چھوٹا سا ریلی کا دانہ ہی تو ہے۔ ان تمام جہانوں کے اندر یہ ہولناک نظم و نسق اور جمع و تفریق صرف اللہ نے قائم کر رکھی ہے۔ اس لیے قوتوں کا مالک تو اللہ ہی ہے۔

دنیا کے یہ ذکیئر اور ان کے متبعین بلکہ یہ پوری زمین اور اس کی پوری آبادی، اس کائنات کی نسبت میں اس طرح ہیں جس طرح اٹل زمین کی نسبت نہایت ہی چھوٹے قسم کی چیونٹیوں کا دس بارہ ارب کا چھٹا بلکہ یہ نسبت اگر تناسب کے حسابی قاعدے سے ظاہر کی جائے تو (زمین : کائنات = زمین : ذرہ) بھی ہیں۔ پوری زمین اور اس کی آبادی کائنات کے مقابلے میں ذرے سے بھی کم ہے۔ اور اللہ کی قوتیں تو کائنات سے بھی وسیع ہیں۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ!

اللہ تعالیٰ مومنین کو حکم دیتا ہے کہ ان دشمنان اسلام کی گردنیں اڑاؤ اور لچھی طرح پھیل کر ان کو خوب باندھو۔ یہ احکام اس لیے دیئے گئے ہیں کہ مومنین دست قدرت کے لیے آہ بن جائیں۔ اگر اللہ چاہتا تو براہ راست اور علانیہ کافروں سے انتقام لے لیتا۔ جس طرح اللہ نے بعض اقوام کو طوفان، کڑک دار آواز اور نیست و نابود کر دینے والی ہولوں وغیرہ کے ذریعہ تباہ کیا، بلکہ اللہ تو کون لیکن کے ذریعہ بغیر ان اسباب کے بھی انتقام لے سکتا ہے۔ لیکن اللہ اپنے مومن بندوں کے لیے بہتری چاہتا ہے۔ ان کو آزماتا ہے۔ ان کو تربیت دیتا ہے۔ ان کی اصلاح کرتا ہے۔ اور ان کے لیے نیکیوں کے اسباب فراہم کرتا ہے۔

اللہ مومنین کو آزماتا ہے اور اس آزمائش میں مومنوں کے قلوب میں بہترین جذبات کو ابھارتا ہے اور اس سے اچھا جذبہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ کسی انسان کے لیے وہ عقیدہ اس کی جان سے عزیز ہو جائے جس پہ وہ ایمان لایا ہے۔ اور انسان اپنے اس عزیز عقیدے کے لیے جہاد کرے، مارے اور مارا جائے۔ اور اس کی حالت یہ ہو کہ وہ دین کے معاملے میں کوئی مسالت اور رواداری نہ کرے۔ دین کے بغیر زندہ نہ رہ سکے اور اس دین کے سوا کسی اور طریقے کے مطابق زندگی نہ گزار سکے۔

اور اللہ تعالیٰ مومنین کی تربیت یوں فرماتا ہے کہ ان کے دلوں سے اس فانی دنیا کی تمام خواہشات اور تمام رغبتیں نکال دیتا ہے، حالانکہ انسان کے لیے ایسی خواہشات کو دسے نکال دینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے دلوں سے کمزوری دور ہو جاتی ہے، نقص کمال میں بدل جاتا ہے۔ ہر قسم کا کھوٹ نکل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان کی تمام

خواہشات ترازو کے ایک پلڑے میں ہوں اور دوسرے پلڑے میں صرف دعوتِ جہاد ہو اور اللہ کی رضامندی کی طلب ہو تو اللہ کی رضامندی اور جہاد کا پلڑا بھاری نکلتا ہے۔ اللہ اس بات کو ظاہر کر دیتا ہے کہ ان نفوس کو اختیار دیا گیا تو انہوں نے دین کو اختیار کیا، ان کو تربیت دی گئی تو انہوں نے حق کو جان لیا، وہ بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم نہیں اٹھاتے بلکہ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔

اور اللہ مومنین کی اصلاح کرنا چاہتا ہے، جہاد فی سبیل اللہ اللہ کی تکالیف اور موت سے بار بار آنکھیں ملانے کی وجہ سے ان کے ذہن سے موت کا خوف ہی دور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ موت کا ڈر لوگ اپنے نفوس سے اور اپنے اخلاق اور اپنی اقدار سے بڑے تکلمات کے بعد نکالتے ہیں اور بڑی مشقتیں اٹھا کر وہ اپنے دل سے موت کا ڈر نکالتے ہیں لیکن جو شخص، مجاہد فی سبیل اللہ ہو وہ ہر وقت موت سے آنکھیں ملاتا رہتا ہے اور وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ موت سے دو چار ہو گیا یا بچ گیا۔ اور اللہ کی راہ میں مرنے کی ہر بار فکر کرنا، ارادہ کرنا، خصوصاً شدید خطرات کے لمحات میں انسانی جسم کے اندر بجلی کی ایک لہر دوڑا دیتا ہے اور جو شخص ایسے مراحل سے بچ کر نکل آئے تو وہ بالکل ایک جدید روح اور پاک و صاف شخصیت لے کر آتا ہے۔ جہاد میں شریک ہونے والے شخص یعنی غازی کی شخصیت ہی زوالی ہوتی ہے۔

پھر یہ جہاد پوری انسانی جماعت کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ جب انسانوں کی قیادت ان مجاہدین کے ہاتھ آ جاتی ہے جن کے نفوس تمام دنیاوی آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک ہوتے ہیں۔ اور جن کی نظروں میں دنیا کی سب چمک دار چیزیں بچ ہوتی ہیں بلکہ خود دنیا کی اس پوری زندگی کو بھی وہ حقیر سمجھتے ہیں جبکہ وہ موت کے کنوؤں میں کود جاتے ہیں۔ اور دنیا کی کوئی چیز بھی، کوئی دس فریبی بھی ان کی نظروں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی اور وہ صرف رضائے الہی کے طالب ہوتے ہیں۔ جب دنیا کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو، تو لوگوں کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے اور دنیا کی بھی۔ اور شر و فساد ختم ہو کر دنیا امن و امان کے دامن میں پناہ لیتی ہے، اس لیے کہ انہوں نے یہ بلند مقاصد اپنے خون کی قیمت پر حاصل کیے ہیں اور یہ ذاتی مفادات کے لیے نہیں بلکہ رضائے الہی کے لیے حاصل کیے ہیں۔

پھر یہ اللہ کی توفیق اور سہولت ہوتی ہے، جسے وہ جس خوش قسمت کو چاہے، مہیا کر دیتا ہے تاکہ وہ اللہ کی رحمتوں کو بغیر حساب کے لپیٹے۔ اور جو ازل بد بخت ہوتے ہیں ان کو بھی اللہ کی طرف سے ایک راہ میسر ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں انہیں اللہ کا غضب اور عذاب ملتا ہے، ہر کسے راہبر کا رہے ساختہ، اور جس نیک بخت کو یہ حصہ مل گیا اور اللہ اسی کو دیتا ہے جس کا اندرون اس کے لیے تیار ہو۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں مرنے والوں کا انجام کیا ہے۔

وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَنْ يُضِلَّ أَعْمَالُهُمْ (۴۷: ۴) ”جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے، اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہ کرے گا۔“

سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (۴۷: ۵) وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَفَهَا لَهُمْ (۴۷: ۶) ”وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا ان کا حال درست کرے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے۔“ ان کے اعمال ضائع نہ کرے گا۔ یہ اس بات کے بالقابل ہے جو کفار نے معامے میں کئی گئی کہ ان کے اعمال ضائع ہوں گے۔ اس لیے کہ مومنین کے اعمال مضبوط اور اصلی درخت سے جڑے ہوئے ہیں اور یہ درخت ہے

سچائی کا درخت۔ یہ اعمال اس حق اور سچائی سے صادر ہوتے ہیں۔ یہ اعمال حق کی حمایت میں ہوتے ہیں۔ حق کی سمت میں ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ جاتی ہوتے ہیں اور دوام کی صفت رکھتے ہیں کیونکہ حق لازوال ہے۔
شہداء کی حقیقت قابل غور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں دوسری جگہ میں فیصلہ دے دیا ہے۔

وَقُولُوا الْمَن يَقْتُلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَّا تَشْعُرُونَ ”اور جو اللہ کے راستے میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں۔“ لیکن یہاں ان کو ایک دوسرے پہلو سے پیش کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جس راستے میں متاع حیات قربان کی اس راستے میں وہ مسلسل آگے ہی بڑھ رہے ہیں۔ وہ ہدایت خلوص ’صفائی اور اطاعت کی راہ ہے۔

سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (۷۴: ۵) ”اللہ ان کی رہنمائی فرمائے گا اور ان کا حال درست کر دے گا۔“ وہ اپنے رب اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ’وہ اب بھی ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ یعنی شہادت کے بعد بھی وہ درجات عالیہ طے کر رہے ہیں اور ان کے حالات درست کیے جا رہے ہیں اور ان کی روح زمین کی آلودگیوں سے پاک ہو رہی ہے۔ ان کو ملاء اعلیٰ میں جو مقام حاصل ہے ’اس مقام کی مناسبت سے ان کو مزید تربیت دی جا رہی ہے۔ اور وہ صاف و شفاف بنائے جا رہے ہیں۔ یہ ایک مسلسل زندگی ہے۔ صرف اہل زمین کی نظروں میں یہ منقطع ہو گئی ہے۔ اہل زمین شہادت کے درجات کو دیکھ نہیں پاتے اس زاویے سے اندھے ہیں جب کہ یہ شہداء حضرت عالم بالا میں بدستور درجات بلند کے مدارج طے کر رہے ہیں۔ ہدایت ’صفائی‘ اشراق اور شغائی میں مزید انوار ربی حاصل کر رہے ہیں.....
اور سب سے آخر میں!

وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَفَهَا لَهُمْ (۷۴: ۶) ”وہ ان کو اس جنت میں داخل کر دے گا جس سے وہ ان کو واقف کر چکا ہے۔“ احادیث میں شہداء کے بارے میں آتا ہے کہ ان کو جنت میں ان کی جائے قیام دکھائی جاتی ہے۔ امام احمد نے روایت فرمائی ہے۔ زید ابن نمر مشفی سے انہوں نے ابو ثوبان سے ’انہوں نے اپنے والد ثوبان سے انہوں نے کھول سے انہوں نے کثیر ابن مرہ سے انہوں نے قیس جذامی سے اور انہوں نے ایک ایسے شخص سے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت حاصل تھی وہ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: شہید کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی اسے چھ درجات حاصل ہو جاتے ہیں ’اس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں‘ وہ دیکھ لیتا ہے کہ جنت میں اس کی جائے قیام کیا ہے ’ خوبصورت آنکھوں والی حوریں اس کے نکاح میں دے دی جاتی ہیں۔ وہ قیامت کے عظیم خوف سے محفوظ ہو گا۔ عذاب قبر سے مامون ہو گا۔ اور اسے ایمان کا جامہ پہنایا جائے گا۔ یہ حدیث صرف امام احمد نے نقل کی ہے۔

ایک دوسری حدیث اسی مفہوم کی بھی مروی ہے۔ اس میں بھی تصریح ہے کہ شہید اپنی جائے قیام کو پہلے ہی دیکھ لے گا (ترمذی)۔ یہ ہے اہل جنت کے لیے ان کی جائے قیام کی معرفت اور یہی ان کے لیے رہنمائی ہے اور یہی ان کا اصلاح حاس ہے۔ اس جہاں کو چھوڑ کر وہ نہایت ہی بلند زندگی گزارتے ہیں۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کے اس اعزاز ان سے اللہ کی رضامندی ان کی اس جگہی اور بلند مقامات کی اس فضا میں نکل ایمان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے لیے یکسو ہو جائیں اور اسلامی نظام کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ ان سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ وہ تمہاری مدد کرے گا اور اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں کے لیے تو ہلاکت ہی مقدر ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَ يَثْبِيتْ أَقْدَامَكُمْ (۷) وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ (۸) ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أُنْزِلَ اللَّهُ فَاحْبَطُوا

أَعْمَالَهُمْ (۹) (۷: ۷ تا ۹) ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جمادے گا۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے تو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے اللہ اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے۔“

مومن اللہ کی مدد کس طرح کرتے ہیں؟ تاکہ وہ اپنی شرط پوری کر دیں اور اللہ جواب میں ان کی نصرت کرے اور ان کو ثابت قدم کر دے۔ اللہ کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے لیے مخلص ہو جائیں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں نہ ظاہری شرک اور نہ خفی شرک۔ اور وہ اللہ کے مقابلے میں کسی شخص پر اور کسی شے پر بھروسہ نہ کریں اور اللہ ان کے لیے ان کی ذات اور تمام محبوب چیزوں سے محبوب ہو جائے اور انسان کی خواہشات، میلانات، مرغوبات، اس کی حرکات و سکنات، اس کے غلبات اور اس کی تمام سرگرمیوں میں اللہ حاکم ہو جائے۔ یہ ہے نفوس انسانی کی طرف سے اللہ کی نصرت۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسانی زندگی کے لیے ایک شریعت اور نظام زندگی تجویز کیا ہے اور یہ نظام اس زندگی اور اس کائنات کے لیے ایک خاص تصور پر تشکیل پایا ہے۔ اللہ کی نصرت یوں ہوتی ہے کہ اس کے نظام کی نصرت کی جائے اور پوری زندگی میں انسان اس نظام کو نافذ کر دے۔ یہ ہے اللہ کی نصرت ہماری حقیقی زندگی میں۔ یہاں دو فقرے بہت ہی اہم ہیں ان پر غور ضروری ہے۔

وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ”جو اللہ کے راستے میں قتل ہوئے“۔ دوسرا یہ کہ ”إِن تَنصُرُوا اللَّهَ“ ”اگر تم اللہ کی مدد کرو“۔ ان دونوں حالات میں یعنی قتل ہونے میں اور نصرت میں یہ ضروری ہے کہ یہ اللہ کی راہ میں ہو۔ یہ ایک نہایت ہی واضح قابل توجہ نکتہ ہے لیکن جب کسی نظریہ پر صدیاں گزر جاتی ہیں تو اس کی اصل صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ لوگ شہادت اور جہاد کے الفاظ تو بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا حقیقی مفہوم اور شرائط ان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔

کوئی جہاد نہیں ہے، کوئی جنت نہیں ہے، کوئی شہادت نہیں ہے۔ مگر صرف اس وقت کہ وہ صرف اللہ کے لیے ہو۔ اللہ کی راہ میں ہو۔ صرف اللہ کے لیے رکا ہو، اللہ کے نظام کی مدد کے لیے مرتا ہو، اور اس نظام کو اپنی ذات اور اپنے منہاج حیات میں نافذ کرنا ہو۔

کوئی جہاد، کوئی شہادت اور کوئی جنت نہیں، لایہ کہ یہ سب کچھ اللہ کا کلمہ بند کرنے سے ہے ہو پھر اس لیے ہو کہ اللہ کا نظام لوگوں کی زندگیوں میں غالب ہو۔ ان کے اخلاق و طرز عمل میں نافذ ہو، ان کے احوال اور قوانین اور دستور

میں نافذ ہو۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نمائش شجاعت کے لیے لڑتا ہے یا صیت جاہلیہ کے لیے لڑتا ہے یا ریاکاری کے لیے لڑتا ہے۔ کیا یہ فی سبیل اللہ ہیں۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے جنگ کی محض اس لیے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو صرف وہ فی سبیل اللہ ہے، (شیخین و ترمذی اور نسائی)۔

اسلامی جہاد کا نہ کوئی اور جھنڈا ہے نہ کوئی اور مقصد ہے۔ اللہ کے لیے جو لڑتا ہے وہ بس اللہ ہی کے لیے لڑتا ہے۔ اس لیے جو شہید ہوتا ہے وہ وہی ہے جو اسی کے پی شہید ہوتا ہے۔ صرف ایٹ شداء کے لیے جنت کا وعدہ ہے۔ صرف یہی جھنڈا اور یہی مقصد مقبول ہے۔ وہ نہیں جو صدمہ گزر جانے کے بعد کوئی نئے جھنڈے بن گئے، کچھ نئے مقاصد سامنے آگئے اور کچھ نئے نام رکھ لیے گئے!

داعیان حق کو اس واضح بات کو سمجھ لینا چاہئے اور ہمارے معاشروں کے اندر جہاد و قتال کے تصور میں جو انحراف واقع ہو گیا ہے اس کا خیال رکھنا اور اسے درست کرنا چاہئے۔ نئے جنوں اور ان کے نئے جھنڈوں کے لیے بھی جہاد کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے عقیدے اور جہاد کے مفہوم کو واضح اور شفاف رکھیں۔

میں دوبارہ کہتا ہوں کہ جہاد صرف وہی ہے جو اللہ کے کلمے کے بلند کرنے کے لیے ہو۔ انسانی نفس میں کلمے کی بلندی، انسانی ضمیر میں اس کلمے کی بلندی اخلاق اور طرز عمل میں اس کلمے کی بلندی، نظم مملکت اور اداروں میں کلمے کی بلندی، تعلقات اور روابط میں اللہ کے کلمے کی بلندی اور زندگی کے ہر موڑ اور ہر رخ میں کلمہ اللہ کی بلندی اور سر بلندی۔ اس کے سوا جو نعرہ ہے وہ اللہ نہیں ہے، وہ شیطان کے لیے ہے۔ اس کے سوا کسی مقصد کے لیے نہ شہادت ہے نہ جنت ہے نہ اللہ کی نصرت ہے نہ ثابت قدمی ہے۔ محض دھوکہ اور فریب ہے۔ بچتے دور جدید کی بت گری سے اور آزاری سے۔

اگر دوسرے لوگوں کے لیے جو داعی الی اللہ نہیں اس قسم کا صاف ستھرا تصور جہاد و قتال مشکل ہے، تو داعیان حق کو تو اپنے خیالات اور اپنا شعور، ان غلط تصورات سے صاف کرنا چاہئے۔ داعیان اسلام کو تو دور جدید کے نعروں سے دور رہنا چاہئے جو بدایتہ فی سبیل اللہ نہیں ہیں۔

تو یہ تو اللہ کی طرف سے ایک شرط ہے اپنے بندوں پر، جسے اللہ کی جانب سے لازم کیا ہے، تو اس کے مقابلے میں اللہ نے اس پر یہ لازم کیا ہے کہ وہ ایسے بندوں کی مدد کرے گا۔ وہ ان کے قدم مضبوط کر دے گا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ اگر کچھ عرصے کے لیے بظہر نصرت خداوندی آتی ہوئی نظر نہ آئے تو اس کے بھی کچھ دوسرے اسباب ہوتے ہیں۔ نصرت اور قدم جمانے سے قبل ان کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ (خرید دیکھئے تفسیر ان اللہ یدفع) (سورہ حج و تشریح) یہ اللہ نے فیصلہ کرنا ہے کہ آیا اس کے بندوں نے شرط پوری کر دی ہے یا نہیں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ ہم جو لب شرط کے کلمات پر بھی غور کر لیں۔ ۱۔ بَنَصْرُكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ”وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا“۔ سب سے پہلے تو انسان کی سوچ ادھر جاتی ہے کہ نصرت سے پہلے ہی قدم جما دیئے جاتے ہیں۔ اور قدم جمانے کے بعد ہی نصرت آتی ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن یہاں نصرت آنے کے بعد قدم جمانے میں ایک دوسری حالت اور ایک دوسرے مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یعنی جب اللہ کی نصرت آجائے اور مومنین غالب ہو جائیں تو اس کے بعد قدم جمانا مطلوب ہے۔ اور یہ بہت ہی مشکل کام ہے۔ کفر و ایمان کا معرکہ اللہ کی

نصرت اور فتح آجانے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا۔ حق و باطل کی کشمکش پھر بھی جاری رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذات اور عملی زندگی میں نصرت کی الگ ذمہ داریاں ہیں۔ کبر و غور سے اجتناب، سستی اور وطن (کنزوری) سے اجتناب بہت سے لوگ مشکلات برداشت کرتے ہیں لیکن نصرت اور فتح کے بعد کم لوگ قدم جما سکتے ہیں۔ اور یہاں شہید اسی کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم!

وَالَّذِينَ كَفَرُوا افْتَعَسَالَهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۷۴: ۸) ”وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے تو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے۔“ یہ نصرت اور ثابت قدمی کے بالکل متضاد حالت ہے۔ اللہ کی طرف سے بدبختی کی دعا دراصل اعلان ہلاکت ہے اور ناکامی اور نامرادی کا اعلان ہے اور اعمال کے ضائع ہونے کا مطلب ہے ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

ذَلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوا مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۷۴: ۹) ”کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے۔ لہذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔“ اس سے اس بات کی بہت اچھی تصویر کشی ہوتی ہے کہ ان کے دلوں میں قرآن کریم کے بارے میں کس قدر کراہت ہے۔ اور اللہ کی شریعت اور نظام کو وہ کس قدر ناپسند کرتے ہیں اور کتنی کراہت ان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کفر کریں، مسلمانوں سے دشمنی رکھیں اور جنگ و جدال اور تنازعات رکھیں۔ درحقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگوں کی اسلام کے بارے میں ذہنی حالت یہی ہوتی ہے۔ وہ اسلام کو نہایت ہی کمزور سمجھتے ہیں اور اس سے متصادم ہوتے ہیں اگرچہ یہ بہترین اور مستحکم نظام ہے، لیکن ان لوگوں کو پسند نہیں ہوتا۔ یہ اس قسم کے لوگ ہیں جو ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں۔ اور آپ ان سے مل سکتے ہیں۔ جب آپ ایسے لوگوں سے ملیں گے تو ان کے منہ اور روپیہ سے اسلام کے خلاف نفرت کا لاوا پھوٹ رہا ہو گا۔ بعض لوگوں کو تو اس قدر ارجحی ہوتی ہے کہ محض اسلام کے ذکر ہی سے ان کو بھوکاٹنے شروع کر دیتے ہیں۔ اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی معاملے میں اور کسی مکالمے میں اسلام کا ذکر ہی نہ آئے۔ آج ہمارے دور میں ایسے بہت سے لوگ ملتے ہیں اور ان کا یہ طرز عمل کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

ایسے لوگوں کی سزا کیا ہے؟ یہ کہ اللہ نے ان کے تمام اعمال کو باطل کر دیا اور اعمال کے لیے ضبط کے لفظ کا استعمال قرآن مجید کا مخصوص انداز ہے جس میں وہ کسی مفہوم کو نہایت ہی حسی انداز دے دیتا ہے۔ ”محبوط“ کا لفظی معنی ہے کسی جانور کا زہریلی گھاس کھا کر پھول جانا، اس پھولنے سے جانور گھنٹوں میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کفار کے اعمال بھی پھول جاتے ہیں، بظاہر وہ بہت ہی بڑے بڑے نظر آتے ہیں لیکن انجام ہلاکت و بربادی ہوتا ہے۔ یہ ایک تصویر ہے ایک حرکت ہے جس میں ان لوگوں کی حالت کو بتایا گیا ہے جو اسلام سے نفرت کرتے ہیں اور اپنے بڑے بڑے کاموں پر مغرور ہوتے ہیں اور یہ اعمال پھولے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح جانور زہریلی گھاس کھا کر پھول جاتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اس کے بعد انہیں اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا پیچھے مڑ کر تاریخ کو پڑھیں اور غور کریں۔ یہ بات دراشدیت سے کہنی جاتی ہے۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللَّهُ

عَلَيْهِمْ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَلُهَا (۴۷: ۱۰) ”کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے

جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر الٹ دیا اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں۔“

یہ ایک خوفناک اور خشکیاں نظر ہے۔ اس میں نہایت ہی ہیجان اور شور و فغاں ہے۔ ان لوگوں کا منظر جن کو چشم

زدن میں نیست و نابود کر کے رکھ دیا گیا۔ ان کے تمام آثار مٹا دیئے گئے۔ بلے کے ڈھیر لگا دیئے گئے ہیں اور وہ بلے کے

ان ڈھیروں کے نیچے کراہ رہے ہیں۔ یہ منظر جس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں اس کا اس طرح پیش کرنا ہی مقصود

ہے۔ انداز بیان سے ان اقوام کی جاہلی بستیوں کا لمبہ بن جانا اور توڑ پھوڑ کا اظہار ہوتا ہے۔

اس قسم کے خوفناک منظر کو پیش کر کے اور الفاظ کے ذریعہ اسکرین پر توڑ پھوڑ دکھا کر حاضرین کو کہا جاتا ہے کہ تمہارا

جو رویہ ہے اس کے نتیجے میں کچھ ایسا ہی منظر تمہارے انتظار میں ہے۔

وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَلُهَا (۴۷: ۱۰) ”ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں۔“ اس قسم کے نتائج

کفار کے انتظار میں کیوں ہیں؟ اور اہل ایمان کی نصرت اس انداز میں کیوں ہے؟ یہ اللہ کا دائمی اصول ہے۔

---○○○---

ذَلِكَ بَأْنُ اللَّهِ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَى لَهُمْ (۴۷: ۱۱) ”یہ اس

لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں۔“

جس کا آقا اللہ ہو اور وہ اس کا مددگار ہو تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔ یہ شخص کسی کا محتاج نہ ہو گا ہر کسی سے بے

نیاز ہو جائے گا۔ ایسے شخص پر اگر مشکل حالات بھی آتے ہیں تو اسے سمجھنا چاہئے کہ اس کی آزمائش ہو رہی ہے۔ اور اس

آزمائش کے بعد خیر ہی خیر ہے۔ یہ آزمائش اور یہ مشکلات اس لیے نہیں کہ اللہ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے بھی

نہیں کہ اللہ نے اپنے بندوں کی مدد کرنے کا جو وعدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ بلکہ یہ ایک بندہ مومن کی

آزمائش ہوتی ہے۔ اور جس کا آقا اللہ نہ ہو تو اس کا کوئی آقا اور ناصر نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ تمام جنوں اور تمام انسانوں کو

آقا بنا لے۔ آخر کار انسانوں پر بھروسہ کرنے والا نامراد ہوتا ہے اگرچہ دنیا کی تمام قوتیں اس کی حمایت پر مرکوز ہوں۔

---○○○---

اب ان لوگوں کے ساز و سامان جنہوں نے ایمان قبول کیا اور ان لوگوں کے ساز و سامان کے درمیان موازنہ کیا جاتا

ہے جنہوں نے کفر کیا۔ یہ دونوں گروہ جو اس وقت باہم برسرِ پیکار ہیں ان کے درمیان فرق کیا ہے؟ اور ان کے

ساز و سامان کے درمیان فرق کیا ہے؟

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

الْأَنْهَارُ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَشْهُوِيَةٌ لَهُمْ ﴿۱۲﴾

كَائِنٌ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجْتِكَ أَهْلُكُم فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝
 أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيْتَةٍ مِّنْ رَبِّهِ كَمَن زُرَّ لَهُ سُوءُ عَمَلٍ ۖ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ۝
 مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّنْ مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّنْ
 لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ ۖ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ
 مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَبِّهِمْ ۖ كَمَن هُوَ خَالِدٌ
 فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ۝

”ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو اللہ ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں جانوروں کی طرح کھا پل رہے ہیں اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔ اے نبیؐ کتنی ہی بستیاں لپی گزر چکی ہیں جو تمہاری اس بستی سے بہت زیادہ زور آور تھیں جس نے تمہیں نکال دیا ہے۔ انہیں ہم نے اس طرح ہلاک کر دیا کہ کوئی ان کا بچانے والا نہ تھا۔ بھلا کیسے ایسا ہو سکتا ہے کہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف و صریح ہدایت پر ہو وہ ان لوگوں کی طرح ہو جائے جن کے لیے ان کا براہِ عمل خوشنما بنا دیا گیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کے پیرو بن گئے ہیں۔ پرہیزگار لوگوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی، نھرے ہوئے پانی کی نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہو گا نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف شفاف شہد کی۔ اس میں ان کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے بخشش۔ (کیا وہ شخص جس کے حصہ میں یہ جنت آنے والی ہے) ان لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا؟“

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے بعض اوقات اس زمین پر بھی بہت اچھا کھاتے پیتے ہیں لیکن اللہ مومنین کے اس حصے کے درمیان جو ان کو جنت کی صورت میں ملنے والا ہے اور کافروں کے اس تمام سروسامان کے درمیان موازنہ کرتا ہے جو ان کو اس دنیا اور آخرت دونوں میں ملنے والا ہے۔

مومنین کا حصہ رسدِ ی ہے کہ ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور ان کو یہ مقام عزت اللہ عطا کرے گا۔ لہذا مومنین کا یہ ساز و سامان اور یہ اکرام بہت ہی بڑا ہے۔ یہ بارگاہ عزت میں ہے۔ یہ اللہ کے ہاں ان کا مقام ہے اور یہ ایمان و تقویٰ اور عمل و صلاح کی بنا پر ہے۔ یہ اونچی جنتوں میں اونچے رب تعالیٰ کی طرف سے بلند ایمان اور اعلیٰ اعمال کے بدلے ہو گا سب کچھ بلند!

اس کے مقابلے میں کافروں کا ساز و سامان یوں ہے جس طرح موٹے جریک رہے ہیں۔

وَيَا كُلُّوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْآنْعَامُ (۱۲: ۴۷) ”جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں۔“ یہ ان کی بہت ہی خستہ اور گری ہوئی حالت ہے، اس کے اندر انسانیت کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں ہے۔ اس میں یوں نظر آ رہا ہے کہ کچھ حیوان ہیں جو منہ مار رہے ہیں اور حیوانی اور سخت قسم کی خوراک کھا رہے ہیں اور اس میں پاک و صاف اور اچھے اور برے کی کوئی تیز نہیں ہے۔ پس یہ ایک چارہ ہے جو یہ کھا رہے ہیں۔ اس کے لیے کوئی ضابطہ حلال و حرام نہیں۔ اس میں خدا کے خوف کی کوئی بات نہیں۔ نہ عدالت ضمیر کی کوئی پابندی عائد ہے۔

حیوانیت کا خاصہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کھائے اور پیئے۔ اگرچہ کھانے پینے میں حیوانوں نے نہایت ہی اعلیٰ ذوق بنا لیا ہو اور مختلف قسم کے استعمال کی اشیاء میں بہت ترقی کر لی ہو۔ جیسا کہ آج کل کے بہت سے نوردلیتے اس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات مقصود نہیں ہے۔ اصل انسانی خصوصیت یہ ہے کہ انسان ایک ارادے کا مالک ہو، اس کی زندگی گزارنے کی کچھ قدیریں ہوں، اللہ کے ہاں جو طیب اور پاک خوراک ہو یعنی رزق حلال وہ اسے اختیار کرے۔ وہ ایسے ارادے کا مالک ہو جس کے اوپر انسانی شہوات کا دباؤ نہ ہو۔ اور نہ ہی وہ مقصد پیش نظر ہو کہ ”باہر عیش و عشرت کی تلاش کہ عالم دوبارہ نیست“۔ اور وہ اس زندگی کو موشیوں کی طرح صرف دسترخوان ہی نہ سمجھتا ہو۔ اور عیش و عشرت ہی اس کے نزدیک زندگی نہ ہو۔ جو جائز و ناجائز کے حدود و قیود سے پاک ہو۔ بلکہ انسان اور حیوان کے درمیان تو فرق ہی یہ ہے کہ انسان ایک صاحب ارادہ مخلوق ہے۔ اس کا اس جہاں میں ایک خاص مقصد ہے اور ایک خاص شعور حیات ہے جو غیر مبہم اصولوں پر قائم ہے اور یہ اصول اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ اگر انسان ان باتوں کو گم کر دے تو گویا اس نے تمام انسانیت کو گم کر دیا ہے۔ اور وہ صرف حیوان رہ گیا ہے۔ کیونکہ انسانی خصوصیات میں سے اعلیٰ خصوصیت اس نے گم کر دی ہے۔

---○○○---

اب ایک موازنہ ان بستیوں کے درمیان جو ہلاک ہوئیں اور اس بستی کے درمیان جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکال دیا۔

وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِنْ قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجَتْكَ أَهْلُكُنْهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ

(۱۳: ۴۷) ”لے بی“ کتنی ہی بستیوں ایسی گزر چکی ہیں جو تمہاری اس بستی سے بہت زیادہ زور آور تھیں جس نے تمہیں نکال دیا ہے۔ انہیں ہم نے اس طرح ہلاک کر دیا کہ کوئی ان کا بچانے والا نہ تھا۔“

یہ وہ آیت ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان اس وقت نازل ہوئی جب آپ ہجرت کا سفر فرما رہے تھے اس میں رسول اللہ کو تسلی دی گئی ہے۔ کیونکہ اپنا ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑنا ایک مشکل کام ہے اور اس میں تسلی دی گئی کہ بظاہر تو یہ لوگ بڑے جبار نظر آتے ہیں، دعوت اسلامی کی راہ رو کے ہوئے ہیں، اہل ایمان پر تشدد کرتے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے ان کو اپنے گھروں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ دولت ایمان لے کر جا رہے ہیں لیکن دراصل یہ جبار بہت ہی کمزور ہیں۔

---○○○---

اب دونوں فریقوں کے درمیان مزید موازنہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ مومنین کو جتنی عطا

کرے گا، جہاں نہریں بہتی ہیں، اس دنیا میں ان کو نصرت اور عزت بخشے گا، اور کفار کا کوئی آقا نہیں ہے، ان کا کوئی ناصر نہیں ہے وہ دنیا میں ہلاک ہوں گے اور آخرت میں خوار ہوں گے، اور ہمیشہ جہنم میں ہوں گے۔ یہ کیوں؟

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ

(۱۴: ۴۷) ”بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف و صریح ہدایت پر ہو، وہ ان لوگوں کی طرح ہو جائے جن کے لیے ان کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کے پیرو بن گئے ہیں۔“

یہ ہے وہ فرق دونوں گروہوں کے درمیان، دونوں میں زندگی اور مقصد زندگی دونوں میں فرق ہے۔ جو اہل

ایمان ہیں وہ

عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ (۱۴: ۴۷) ”اپنے رب کی طرف سے صاف ہدایت پر ہیں۔“ وہ حق کو جانتے ہیں اور انہوں نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ حق کے سرچشمے تک پہنچ گئے ہیں اور ان کے پاس جو حق آرہا ہے وہ اس پر چلے ہوئے ہیں۔ وہ کسی دھوکے میں ہیں اور نہ گمراہی میں۔ اور کفار ایک بڑے دھوکے میں پڑے ہیں۔ شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال خوشنما بنا دیئے ہیں۔ پھر ان کے اعمال کے بارے میں ان کو کوئی یقین بھی نہیں ہے کہ وہ کہاں سے ہدایات لیتے ہیں۔

وَ اتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (۱۴: ۴۷) ”وہ اپنی خواہشات کے پیرو کار ہیں۔“ کوئی ضابطہ نہیں ہے۔ کوئی اصول نہیں ہے جس پر جائز و ناجائز کا تعین ہو، اور کوئی روشنی ان کے پاس نہیں جس کے ذریعہ وہ حق و باطل کی تیز کر سکیں۔

—○○○—

یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ ان کے حالات، طرز زندگی اور سمت مغرب جدا ہیں۔ اس لیے ممکن نہیں کہ وہ ایک پیمانے کے مطابق ناپے اور تولے جا سکیں۔ اور دونوں کا ایک ہی انجام ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کے درمیان فرق و امتیاز ہے۔ دونوں کا انجام بھی مختلف ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ حَمَرٍ لَّذَّةٍ لِلشَّرِيبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ

أَمْعَاءَهُمْ (۱۵: ۴۷) ”پرہیزگار لوگوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی، نھرے ہوئے پانی کی نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے حرے میں ذرا فرق نہ آیا ہو گا، نہریں بہہ رہی ہوں گی لسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی، نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف شفاف

شہد کی۔ اس میں ان کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے بخشش۔ (کیا وہ شخص جس کے حصہ میں یہ جنت آنے والی ہے) ان لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا۔“

جنت کی خوشیوں اور جہنم کے عذاب کی یہ نہایت ہی محسوس تصویر اور منظر قرآن کریم میں بار بار آتا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ کبھی معنوی اور مجرد خالص خوشیوں کا ذکر بھی آتا ہے۔ کئی جگہ اس قسم کی خوشیوں کا ذکر بھی ہے جن کے اندر حیات کا حصہ کم ہے۔“

اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ وہ انسان کو خوب جانتا ہے۔ ”من خوب می شناسم چیران یار سارا“۔ اللہ کو معلوم ہے اور سب سے زیادہ معلوم ہے کہ انسان کے انوں پر زیادہ اثر کس چیز کا ہوتا ہے۔ ان کی تربیت کس طرح ممکن ہے۔ ان کے لیے کون سی نعمتیں بہتر ہیں اور ان کے لیے کون سی مناسب ہیں۔ پھر انسانوں کے بھی کئی مدارج ہیں ’نفوس انسانی کے بھی کئی رنگ ہیں۔ مختلف مدارج ہیں۔ یہ سب انسان ہیں۔ انسانیت میں برابر ہوتے ہوئے بھی رنگ ’مزاج اور خواہشات میں اختلاف ہے۔ اس لیے اللہ نے اپنے فضل و کرم اور انعامات میں بھی تنوع رکھا ہے۔ اور ہر کسی کو اس کی خواہش کے مطابق دیا ہے اور دے گا۔ وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے۔

انسانوں میں سے ایسے بھی ہیں جن کی اصلاح کے لیے تھمرے ہوئے پانی کی نہریں ’دودھ کی نہریں جن کا ذائقہ بدلا ہوا نہ ہو۔ غسل مصفیٰ کی نہریں ’اور لذیذ شراب کی نہریں مناسب ہیں ’یہی ان کی خواہش ہے۔ پھر یہ لوگ اس قسم کے پھل کو پسند کرتے ہیں ’پھر رب کی مغفرت ’لہذا اللہ نے ایسے ہی لوگوں کی تربیت کے لیے ان کی خواہشات کے مطابق یہ انعامات رکھے ہیں۔ اور انہی کے بارے میں ہے۔

لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ یعنی ان کے لیے مناسب ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کی بندگی ان انعامات کے شکر کی وجہ سے کرتے ہیں جو لائقہ ادہیں ’بعض ایسے ہیں جو اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ کی بندگی کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں ’یا پھر وہ اس بات سے شرم محسوس کرتے ہیں کہ اللہ ان کو ایسی حالت میں دیکھے جسے وہ ناپسند کرتا ہے۔ ایسے لوگ اللہ کی بندگی پر جنت کی لالچ نہیں رکھتے۔ اور دوزخ کے ڈر سے نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو انعامات کی پرواہ نہیں ہوتی۔ نہ سزا کا خوف ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی تربیت اور جزاء کے لیے بھی اللہ نے ایک معیار رکھا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ”جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لیے خدائے رحمن محبت پیدا کر دے گا۔“ اور ان کو یہ یقین بھی ہو گا۔

فِي مَقْعَدٍ صَدَقَ عِنْدَ مَلِيْكَ مُّقْتَدِرٍ ”یہ سچائی کے مقام پر صاحب اقتدار بادشاہ کے پاس“ کرسی نشین ہوں گے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں مبارک سوچ جاتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آپ اس قدر عبادت کرتے ہیں حالانکہ آپ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ”مائشہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ ہوں؟“۔ (مسلم)

رابعہ عدد یہ فرماتی ہیں 'اگر - جنت ہوتی اور نہ آگ ہوتی تو کیا کوئی اللہ کی عبادت نہ کرتا اور کوئی اللہ نہ سے ڈرتا؟ انہی سے سفین ثوری نے ان کے ایمان کی حقیقت پر چھی تو انہوں نے جواب دیا "میں نے اللہ کی بندگی اس کی آگ کی ڈر کی وجہ سے نہیں کی اور نہ اس کی جنت کی لالچ کی وجہ سے کی کہ میں ایک برے مزدور کی طرح بن جاؤں کہ محض لالچ میں کام کروں۔"

بہر حال انسانوں میں سے بعض کا یہ رنگ ہے اور بعض کا وہ رنگ۔ اور اللہ نے دونوں کے لیے میناؤں کے مطابق انعامت رکھے ہوئے ہیں۔ جو ان کے مزاج کے مطابق ہیں۔ اور جن سے ان کی تربیت ہوتی ہے۔ یہ بات نظر آتی ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کی جوں جوں تربیت کی 'اس کی ساتھ ساتھ وسائل تربیت بھی زیادہ لطیف ہوتے گئے اور مسلمانوں کے بدلتے ہوئے ذوق کے مطابق تہذیب ہوتے رہے کیونکہ انسان اپنی تاریخ میں انسانیت کے مختلف مدارج پر رہا ہے۔

بہر حال جزاء کی بھی دو قسمیں ہیں۔ یہ نہریں قسامت کے پھلوں کے ساتھ اور اللہ کی مغفرت اور رضامندی کے ساتھ اور دوسری قسم:

كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ (۴۷: ۱۵) "ان لوگوں کی طرح جو جہنم میں رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا۔" - عذاب کی یہ صورت نہایت ہی حسی اور سخت ہے۔ یہ صورت اس صورت کی فضا کے ساتھ بہت ہی مناسب ہے۔ کیونکہ یہ سورہ قبل ہے۔ پھر جس قوم کی تربیت ہو رہی ہے وہ نہایت ہی سخت اور اچھڑ اور ہٹ دھرم ہے۔ یہ اس دنیا میں بھی اس قدر مگن ہے کہ ماسوائے کھانے پینے کے اس کے سامنے کوئی اور اونچا نصب العین نہیں ہے۔ فضا ایسی ہے کہ سامان معیشت بھی حسی ہے۔ اس قوم کا مزاج بھی جانوروں کی طرح حسیات ہی کو دیکھتا ہے۔ اس لیے ان کے لیے سزا بھی ایسی ہی سخت ہے۔ گرم ترین پانی ان کو اس طرح پلایا جائے گا کہ نہ صرف یہ کہ منہ جل جائے گا بلکہ آنتیں تک کٹ جائیں گی اور دنیا میں یہ لوگ تھے بھی جانوروں کی طرح سخت۔

کس طرح یہ لوگ ایمان والوں کی طرح ہو سکتے جو نہایت مذہب ہیں۔ یہاں یہ پہلا مطالعہ ختم ہوتا ہے۔ جو صورت شروع ہوتے ہی ان لوگوں پر ایک تنقیدی حملے کی شکل میں شروع ہوا تھا۔ اور یہ اس طرح جاری رہا جس طرح دو کیپوں کے درمیان جنگ جاری ہوتی ہے۔ آخر تک یہ کشمکش سخت الفاظ میں ہوتی رہی ہے۔

درس نمبر ۲۴۲ ایک نظر میں

یہ سبق منافقین کے بارے میں ہے 'اس میں بتایا گیا ہے کہ ان کا موقف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں کیا تھا؟ قرآن کے بارے میں کیا تھا؟ پھر مسلمانوں پر جہاد فرض ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں وہ کیا سوچتے تھے؟ یاد رہے کہ یہ جہاد صرف اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے تھا؟ پھر یہ کہ مدینہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے مخالف اسلام یہودی قبائل کے ساتھ ان کے خفیہ تعلقات ان مقاصد کے لیے تھے۔ یہ کہ ان خفیہ سازشوں کی وجہ سے یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا چاہتے تھے۔

تحریک نفاق مدینہ کی پیداوار ہے۔ مکہ میں اس کا وجود ہی نہ تھا۔ کیونکہ مکہ میں ایسے حالات ہی نہ تھے جن میں کسی کو منافق بننے کی ضرورت پیش آتی کہ میں مسلمان رہے ہوئے تھے۔ لہذا کسی کو منافق بننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جب اللہ نے مدینہ میں اوس اور خزرج کے ذریعہ اسلام کو عزت بخشی اور مدینہ کے اکثر خاندانوں میں اسلام پھیل گیا۔ اکثر لوگ مسلمان ہو گئے تو بعض ایسے لوگ بھی دیکھا دیکھی مسلمان ہو گئے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ کرتے تھے کہ آپ اور اسلام یہاں قوت پکڑیں۔ یہ لوگ مسلمان تو ہو گئے لیکن ان کے دل اسلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی سے بھرے ہوئے تھے۔ اور وہ اس آرزو میں بیٹھ گئے تھے کہ حالات گردش میں آئیں اور اس نئی قوت پر ضرب لگائی جائے۔ ان کا سربراہ عہد بن ابی بن سؤل تھا۔ یہ مشہور زمانہ منافق تھا۔

مدنی دور کے آغاز میں یہودی مدینہ میں ایک زبردست فوجی 'اقتصادی اور تنظیمی قوت رکھتے تھے۔ یہ لوگ بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبے کو پسند نہ کرتے تھے۔ نہ آپ کے دین اور آپ کے معبین کو پسند کرتے تھے۔ یہودیوں کا یہاں اس پوزیشن میں موجود ہونا بھی منافقین کے لیے ایک سہارا تھا۔ اور اس مشترکہ دشمنی نے ان کو جلد ہی ایک دوسرے کا دوست بنا دیا۔ لہذا یہ دونوں قوتیں ہر موقع پر مسلمانوں کے خلاف سازشیں تیار کرتیں۔ اگر مسلمانوں پر مشکل حالات ہوتے تو یہ اپنی منافقت اور بغض و عداوت کا اظہار کر دیتے۔ اور اگر مسلمان اچھی حالت میں ہوتے تو یہ خفیہ اور اندھیروں میں ان کے خلاف سازشوں کا تانا بانا تیار کرتے۔ مدینہ کے دس سالہ عہد حکومت میں پانچ سالوں تک یہ اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بنے رہے۔

مدینہ میں جس قدر سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں تو اتر کے ساتھ منافقین کی سازشوں 'عداوتوں اور ان کے نفاق کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی مذکور ہے کہ یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اور ان سے ہدایات لیتے ہیں اور بعض سازشوں میں شریک ہیں۔ یہ سبق ان میں سے ایک ہے جس میں یہودیوں اور منافقین کے اشتراک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

درس نمبر ۲۲۲ تشریح آیات

۱۶۔۔۔ تا۔۔۔ ۳۱

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ
عِنْدِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
كَبَّرَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا
زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ۖ فَهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُمْ
بَغْتَةً ۖ فَتَقْدِرَ ۖ إِذَا جَاءَ أَشْرَاطُهَا ۚ فَأَنَّىٰ لَهُمْ إِذَا جَاءَهُمْ ذِكْرُهُمْ ۖ فَاَعْلَمُوا أَنَّهُ
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرُوا لِذَنبِكُمْ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ
مُسْقَلَاتِكُمْ وَمَشَاكُمْ ۖ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۚ فَإِذَا أُنْزِلَتْ
سُورَةٌ مُحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ
إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ
فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۖ فَهُمْ عَسِيئَرُونَ
تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ
اللَّهُ فَأَصْبَحُوا أَبْصَارُهُمْ ۖ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ ۚ الْقُرْآنَ أَمْرًا عَلَىٰ قُلُوبٍ
أَقْفَالُهَا ۚ

”ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں اور پھر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان

لوگوں سے جنہیں علم کی نعمت بخشی گئی ہے۔ پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی انہوں نے کیا کیا تھا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے غپ لگا دیا ہے اور یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ہے اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں ان کے جیسے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے۔ اب کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے ٹھکر ہیں کہ وہ اچانک ان پر آجائے؟ اس کی علامات تو آچکی ہیں۔ جب وہ خود آجائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقع باقی رہ جائے گا؟ پس اے نبیؐ خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی۔ اللہ تمہاری سرگرمیوں کو بھی جانتا ہے اور تمہارے ٹھکانے سے بھی واقف ہے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی جاتی (جس میں جنگ کا حکم دیا جائے) مگر جب ایک پختہ سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔ ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ اطاعت کریں اور صحیح باتیں کہیں۔ مگر جب قطعی حکم دے دیا گیا اس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے تو انہی کے لیے اچھا تھا۔ اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر تم اگلے منہ پھر گئے تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے؟ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا۔ کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟“

منہم (ان میں سے) کا اشارہ کافروں کی طرف بھی ہو سکتا ہے کیونکہ درس سابق میں کافروں سے بحث تھی اور درحقیقت منافقین بھی کافر ہی تھے۔ اگرچہ چھپے ہوئے کافر تھے۔ اللہ نے یہاں ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے ان کو کافروں میں شمار کیا ہے کہ ان کافروں میں سے بعض منافقین ہیں۔ اور یہ اٹھ مسلمانوں کی طرف بھی ہو سکتا ہے یعنی مسلمانوں میں سے بعض منافقین ہیں۔ کیونکہ منافقین باقاعدہ نماز بھی پڑھتے تھے اور اسلام بظاہر ان کو مسلمان سمجھ کر ان کے ساتھ معاملہ کرتا تھا۔ لیکن انہوں نے صورتوں میں یہ منافق ہی تھے۔ آیت میں ان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ ان میں تھیں اور یہ پورا سبق لہا کے بارے میں ہے۔ یہ لوگ مجلس میں یوں بیٹھے ہوئے کہ گویا ہم تن گوش ہیں اور اچھی طرح بات سن رہے ہیں لیکن درحقیقت یہ سن نہیں رہے ہوتے تھے۔ بلکہ ”بر زبان تسبیح و در دل گاؤں“ کا مصداق ہوتے اور اگر سنتے بھی تو ان کے دل کو بات لگتی ہی نہ تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نفل علم سے طرزا پوچھتے ہوں کہ بتائیے جناب ابھی کیا کیا صاحب نے۔ یعنی ہمارے پلے تو کوئی بات پڑی نہیں ہے۔

اس سے ان کی مراد یہ اشارہ بھی تھا کہ ہم تو ان باتوں کی کوئی زیادہ پرواہ نہیں کرتے لیکن نفل علم حضرت کی باتوں کا ایک ایک لفظ یاد کرتے ہیں۔ الفاظ بھی اور معانی بھی۔ صحابہ کرام کا طریقہ بھی یہ تھا کہ وہ حضورؐ کے الفاظ اور معانی دونوں کو یاد کرتے تھے۔ اور یہ لوگ یعنی منافقین ان الفاظ اور معانی کو بطور مزاح دہراتے تھے۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ نہایت بد فطرت اسلام کے معاند اندھے اور اسلام کے ترقی پذیر حالات پر جل بھن گئے تھے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (۱۶:۴۷) ”یہ وہ لوگ

ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپ لگا دیا ہے۔ یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں۔“ یہ تو تھا منافقین کا حال۔ رہا اہل ہدایت کا حال تو وہ اس کے برعکس تھا۔

---○○○---

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ (۱۷:۴۷) ”رہے وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے۔“

اس آیت میں واقعات کی جو ترتیب ہے، وہ قابل توجہ ہے۔ جو ہدایت پر ہیں وہ خود ہدایت کی راہ لیتے ہیں تو اللہ ان کو مزید ہدایت کی توفیق دیتا ہے اور ان کو ہدایت میں مزید گہرائی بخشتا ہے۔

وَاتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ (۱۷:۴۷) ”اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا کرتا ہے۔“ تقویٰ ایک قلبی حالت کا نام ہے جس کے نتیجے میں انسان ہر وقت اللہ سے ڈرتا رہتا ہے۔ اس کو شعور ہوتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ اللہ کے غضب سے انسان ڈرتا ہے۔ اللہ کی رضا کا متلاشی ہوتا ہے۔ اور اس بات سے وہ اپنے آپ کو بچتا ہے کہ اللہ اس کی بری حالت میں دیکھے۔ یہ تیز احساس ہی تقویٰ ہے۔ یہ اللہ اس شخص کو عطا کرتا ہے جس سے اللہ راضی ہو اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان راہ ہدایت لینے میں رغبت رکھتا ہے۔ تو اللہ مزید ہدایت دے کر اسے تقویٰ کا مقام دیتا ہے غرض ہدایت کی خواہش، پھر اللہ کی طرف سے مزید ہدایت اور پھر اللہ کا تقویٰ اور ذرہ در ذرہ مدد اور جو نفاق، غفلت اور خواہشات نفس کی پیروی کے بالتقابل ہیں۔

---○○○---

اب بات ان لوگوں کی طرف آتی ہے جو منافق ہیں، اندھے ہیں، غافل ہیں، جو مجلس رسول سے لڑی حالت میں نکلتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے سنا اس سے کوئی نفع نہیں اٹھایا۔ ہدایت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ان کے دلوں کے اندر خدا کا کوئی خوف پیدا نہ ہوا۔ چنانچہ یہ دہائی کر لئی جاتی ہے کہ حساب و کتاب کا دن بہت ہی جلدی آنے والا ہے۔

فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا فَأَنَّى لَهُمْ إِذَا

جَاءَهُمْ ذِكْرُهَا (۱۸:۴۷) ”اب کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ اچانک ان پر آجائے؟ اس کی علامات تو آچکی ہیں۔ جب وہ خود آجائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقع باقی رہ جائے گا؟“

ان آیات میں منافقین کو ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ جگایا جاتا ہے اور گریبان سے پکڑ کر ان کو اس طرح جھنجھوڑا جاتا ہے جس طرح کسی نشتے میں دھت شخص کو کھینچا جاتا ہے۔ یعنی یہ غافل لوگ جو رسول اللہ کی مجلس میں جاتے ہیں اور وہاں سے کچھ ہدایت لیے بغیر، کچھ یاد کیے بغیر، کچھ نصیحت پکڑے بغیر، کورے کے کورے واپس ہوئے۔ یہ بد بخت اب کس چیز کا انتظار کرتے ہیں۔

فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً (۱۸:۴۷) ”کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے منتظر

ہیں کہ اچانک آجائے۔“ اور ان کے حالات یہ ہوں کہ یہ غفلت اور لاپرواہی میں، اور فسق و فجور میں غرق ہوں۔
اگر یہ لوگ قیامت ہی چاہتے ہیں تو

فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا (۱۸: ۴۷) ”اس کی علامات تو آچکی ہیں۔“ یہ آخری رسالت قیامت کی بڑی نشانی ہے۔ یہ رسالت دراصل اعلان ہے کہ اب قیامت جلد ہی آنے والی ہے۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا: بعثت انا والساعة کہ نین ”میں اور قیامت ان دو کی طرح مبعوث ہوئے ہیں۔“ آپؐ نے اپنی دو انگلیوں سہ پہ اور درمیانی انگلی کو جو ذکر اشارہ فرمایا (متفق علیہ)۔ حضور اکرمؐ سے اوپر اگر زمانہ لوگوں کو زیادہ طویل ہوتا ہوا نظر آتا ہے تو اللہ کے ایام ہمارے ایام کے مقابلے میں بہت ہی طویل ہوتے ہیں۔ اللہ کے حساب میں قیامت کی نشانی آگئی ہے۔ اور بڑی نشانی یہ آخری رسالت ہے۔ اور یہ کسی عقلمند شخص کی روش نہیں ہو سکتی کہ مصیبت آئے اور وہ سویا ہوا ہو۔ اور وہ پھر بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کر سکے۔

فَأَنبِئْ لَهُمْ إِذَا جَاءَهُ تَهُمُ ذِكْرُهُمْ (۱۸: ۴۷) ”جب وہ آجائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقعہ باقی رہ جائے گا۔“ یہ نہایت ہی قوت سے مجنبوڑنے کے مترادف ہے کہ جاگو، خطرہ سر پر ہے اور سختی کے ساتھ گریبان سے پکڑ کر ہلانا، اس سورت کے تحت انداز کے بھی مناسب ہے۔

---○○○---

اب روئے سخن حضور اکرمؐ اور آپؐ کے ہدایت یافتہ، متقی اور متلاشیین ہدایت ساتھیوں کی طرف پھر جاتا ہے کہ وہ ہدایت کے لیے ایک دوسری راہ بھی اپنائیں۔ علم و معرفت، توبہ و استغفار، اللہ کا خوف اور خشیت اختیار کریں اور آخری وقت کا انتظار کریں۔ اللہ تمہاری دنیا و آخرت کے انجام سے ابھی طرح واقف ہے۔

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ

مَّتَقَلِّبُكُمْ وَمَتَّوَكُّمُ (۱۹: ۴۷) ”پس لے نبیؐ خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی۔ اللہ تمہاری سرکرمیوں کو بھی جانتا ہے اور تمہارے ٹھکانے سے بھی واقف ہے۔“

یہاں آپؐ کو اور مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ تمہاری مت جس نظریہ پر قائم ہے اس کو سمجھو وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور اللہ، معبود اور حاکم نہیں ہے۔

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ (۱۹: ۴۷) ”پس لے نبیؐ خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی اور عبادت کے مستحق نہیں۔“ اس حقیقت کو ذہن میں تازہ کرتے ہوئے پھر دوسری ہدایات یہ ہیں۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ (۱۹: ۴۷) ”اپنے قصور کے لیے معافی مانگو۔“ حالانکہ حضورؐ کے تو اگلے پچھلے

گناہ معاف تھے؟ لیکن ایک باشعور متقی اور حساس بندے کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت اپنی مسامی کو کمزور سمجھتا ہے۔ اگرچہ وہ اطاعت الہی میں بہت جدوجہد کرتا ہو۔ حضورؐ جانتے تھے کہ استغفار اور ذکر شکر ہے اور اللہ کی مغفرت کا مزید شکر ہے۔ اور پھر آپ کے منصب و مقام پر بعد میں جو لوگ آنے والے تھے ان کے لیے یہ ہدایت ہے اور امام مسلمانوں کے لیے یہ رہنمائی ہے کہ جب حسیب خدا کو یہ ہدایت ہے کہ مغفرت طلب کر دے، جبکہ وہ بخش دیئے گئے ہیں تو دوسروں کو تو ہر وقت استغفار کرنا چاہئے۔ نیز حضورؐ اپنے لیے اور مومنین و مومنات کے لیے استغفار کرتے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کے دلوں میں محبت رسولؐ کا شعور تازہ رہنا ہے کہ رسول کریمؐ کی وجہ سے ان پر اللہ کی رحمت ہو رہی ہے۔ اور حضور اکرمؐ مومنین اور مومنات کے لیے مغفرت طلب کر رہے ہیں۔ پھر ان ہدایات کے سلسلے کی آخری بات۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلِّبِكُمْ وَاَمَّا مَثْوٰیكُمْ (۱۹:۴۷) ”اللہ تمہاری سرگرمیوں کو بھی جانتا ہے اور تمہارے ٹھکانے سے بھی واقف ہے۔“ اس سے دل مومن کو اطمینان بھی نصیب ہوتا ہے اور اس کے دس میں یہ تصور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ ہماری چلت پھرت سے بھی واقف ہے اور انجام سے بھی واقف۔ اطمینان یہ کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے اور خوف یہ کہ اللہ ہر حالت میں ہم کو جانتا ہے اس سے چھپ کر ہم کوئی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ یہ ہے اسلامی تربیت کہ اللہ کے بارے میں تیز احساس رکھو، ہر وقت اس سے ڈرتے رہو اور ہر وقت انتظار میں رہو کہ وہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔

---○○○---

اب روئے سخن ایک نہایت ہی حساس موقف کی طرف آتا ہے۔ اس وقت تک پالیسی یہ تھی کہ جماد و قتال سے رکھ لیکن اب اللہ نے جماد کا حکم دے دیا۔ یہ منافقین پر ایک ضرب تھی۔ وہ سخت دہشت زدہ ہو گئے کیونکہ اب تو ان کے لیے چھپ کر رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اب اگر وہ نفاق پر رہے اور اخلاص کے ساتھ اسلام قبول نہ کیا تو ان کا اندرون ظاہر ہو جائے گا۔ کیونکہ جب جماد کا فیصلہ ہو گا تو جنگ میں جانا ہو گا یا پیچھے رہنا ہو گا۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ اٰمَنُوا لَوْ لَا نَزَّلَتْ سُورَةٌ فَاِذَا نَزَّلَتْ سُورَةٌ مُحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَاٰتِ الدِّينِ فِي قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّظُنُّوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ (۲۰) طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهُ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (۲۱) فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتَقَطَّعُوْا اَرْحَامَكُمْ (۲۲) اُولٰٓئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاصْمَهُمْ وَاَعْمٰیْ اَبْصَارَهُمْ (۲۳) اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ

الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالٌهَا (۲۴) (۲۴: ۲۰ - ۲۴) ”جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی جاتی (جس میں جنگ کا حکم دیا جائے) مگر جب ایک پختہ سورت نازل کر دی

گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔ ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ اعانت کریں اور صحیح باتیں کہیں۔ مگر جب قطعی حکم دے دیا گیا اس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچ نکلتے تو انہی کے لیے اچھا تھا۔ اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر تم اگلے منہ پھر گئے تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے؟ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا۔ کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا 'یا دلوں پر ان کے قتل چڑھے ہوئے ہیں؟'

نفل ایمان کسی نئی سورت کے نزول کا مطالبہ کرتے تھے 'یا تو اس لیے کہ ان کے دلوں میں ہر وقت یہ شوق رہتا تھا کہ وہ نئی نئی ہدایات لیتے رہیں۔ کیونکہ ان کو قرآن سے بے حد محبت تھی۔ وہ ہر نئی سورت میں علم و انس کا ایک نیا سامان اپنے لیے پاتے تھے۔ اور اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ نئے حالات میں مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کی ہدایات اور اجازت چاہتے تھے کہ اسلام کے لیے لڑ مرنے کی ہدایات ان کو دی جائیں۔

لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُورَةُ (۴۷: ۲۰) "کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی۔"

فَإِذَا أَنْزَلَتْ سُورَةً مُحْكَمَةً (۴۷: ۲۰) "مگر جب پختہ سورت نازل کر دی گئی۔" اور اس قدر مفصل کہ اس میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

وَذُكِرَ فَبِمَا الْقِتَالُ (۴۷: ۲۰) "جس میں جنگ کا ذکر کیا گیا۔" جس میں پھر کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی اور جو لوگ قتل سے پیچھے رہتے ہیں 'یا جہادی کاموں میں پیچھے رہتے ہیں' ان کی مذمت بھی کر دی گئی تو بیمار دلوں والے لوگ یعنی منافقین کی حالت غیر ہونے لگی اور وہ پردے گرنے لگے جن کے پیچھے چھپ کر یہ سازشیں کرتے تھے۔ ان کی جزع و فزع، شور و فغاں اور سسے اور ڈرے ہوئے ہونا یہاں تک کہ مارے خوف کے ان پر غشی کا طاری ہونا قابل دید تھا۔ قرآن کھیم نے یہاں ان لوگوں کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ گویا وہ ہیں سامنے اسکرین پر۔

رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ

(۴۷: ۲۰) "تو تم نے دیکھا کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔" یہ اس قدر خوبصورت انداز تعبیر ہے کہ انسان اس کی نقل نہیں اتار سکتا۔ نہ کسی اور عبارت میں نہ کسی اور زبان میں اس طرز تعبیر کو اپنا سکتا ہے۔ خوف و ہراس کی یہ ایسی تصویر ہے کہ کچلی اور خوف سے بھی آگے بڑھ کر ان لوگوں پر گویا غشی کی حالت طاری ہو رہی ہے۔ اور خیال میں ان لوگوں کی پھر عجیب و غریب حرکات سامنے آتی ہیں۔ اور وہ تمام نفوس و شخصیات کی تصاویر ذہن میں آ جاتی ہیں جن کو پختہ ایمان نصیب نہ ہو جس کی فطرت بھی نہ ہو اور جن کے اندر اس قدر جذبہ جہاد نہ ہو جس کی وجہ سے وہ خطرے کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ لوگ مریض اور منافق ہوتے ہیں۔

یہ لوگ اس قدر ذلت و گراؤ اور شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں کہ دوبارہ ان کو ایمان کی دعوت از سر نو دی

جاتی کہ ایمان ہی حقیقی زادراہ ہے جب اللہ سے جواں ہوتے ہیں اور جس سے پاؤں مضبوط ہوتے ہیں۔

فَاُولٰٓئِیْہُمْ (۴۷: ۲۰) طَاعَۃٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰہَ

لَکَانَ خَیْرًا لَّہُمْ (۴۷: ۲۱) ”ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ اطاعت کرس اور صحیح باتیں کرس۔ مگر جب قطعی حکم دے دیا گیا اس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلے تو انہی کے لیے اچھا تھا۔“ ہاں جس شرمندگی میں وہ مبتلا ہیں اس کے مقابلے میں ان کے لیے یہی اچھا تھا۔ وہ حیران ہیں کہ کیا کرس۔ پریشان ہیں کہ کیا ہو گا۔ اب ان کا نفاق تو چھپ نہ سکے گا۔ ان کے لیے بہتر پالیسی اب یہ ہے۔

طَاعَۃٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ (۴۷: ۲۱) ”وہ اطاعت کرس اور سیدھا رویہ اختیار کر کے بات کرس۔“ اللہ کے احکام کو اب نفاق کے بجائے دس سے قبول کر لیں۔ اور اللہ پر یقین کر کے اس کے احکام کو مان لیں۔ اور اس قسم کی باتیں کرس جو سچی ہوں اور سچے دل سے ہوں۔ اور پختہ ضمیر کے مطابق ہوں اور یہ ان کے لیے اب نئے حالات میں زیادہ مفید ہو گا جبکہ اب احکام قطعی ہو گئے ہیں۔ اب تو انہوں نے یا جہاد میں جانا ہے یا پیچھے رہنا ہے۔ لہذا عزیمت اور شعور کے ساتھ جہاد کرو۔ اس طرح ان کے دل مضبوط ہوں گے، ان کا عزم پختہ ہو جائے گا۔ قدم مضبوط ہوں گے، جہاد ان کو مشقت اور بیگار نہ نظر آئے گا۔ اور جنگ ان کے لیے ایک ایسی بلائے ناگہانی نہ ہوگی جس نے منہ کھولا ہوا ہے۔ جنگ میں گئے نہیں کہ اس بلا کے منہ میں پڑے نہیں۔ اگر سچے دل سے جہاد کرس گے تو دو بھائیوں میں ایک بھائی تو بہر حال ملے گی۔ یا تو خطرے سے نجات اور فتح ملے گی اور یا شہادت اور جنت ملے گی۔ اور یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہو گی۔ یہ ہے وہ زادراہ یعنی حقیقی ایمان جس کے نتیجے میں عزائم جواں اور پاؤں مضبوط اور جزم و فزع مفقود ہو جاتے ہیں اور انسان کو اطمینان اور قرار و ثبات ملتا ہے۔

اب ان کو نہایت سختی سے جہاد سے پیچھے رہنے کا انجام بتایا جاتا ہے کہ اگر انہوں نے اسلام سے منہ موڑ لیا تو انہیں معلوم ہے کہ اسلام سے قبل ان کی حالت کیا تھی۔ تم نے نفاق کے ساتھ اسلام قبول کیا ہے اس میں کتنے فائدے ہیں؟

فَہَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَ تَقَطَّعُوْا اَرْحَامَکُمْ

(۴۷: ۲۲) ”اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا اور کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ تم لٹے منہ پھرو گے تو زمین میں بھڑا فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے۔“ یعنی تم سے تو یہی توقع ہے۔ ذرا سابقہ حالات کی روشنی میں دیکھو کہ اگر اسلام سے منہ موڑو گے تو سابقہ حالات کی طرف لوٹ کر ایک دوسرے کے اور اپنے ہی بھائیوں کے گلے کاٹو گے جس طرح اسلام سے قبل تھے۔ اسلام سے روگردانی سے ڈرنے کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی حقیقی صورت حال کیا ہے اگر یہ اپنی موجودہ پوزیشن پر ہی ڈلے رہے جس طرح کہ نظر آتا ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فَاَصَمَہُمْ وَاَعَمٰی اَبْصَارَہُمْ (۴۷: ۲۳) اَفَلَا

يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۲۴: ۴۷) ”یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لخت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا۔ کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟“ یہ لوگ نفاق کی بیماری میں بدستور مبتلا ہیں۔ درحقیقت وہ اس دعوت سے حقیقتاً منہ موڑ رہے ہیں جس میں وہ بظاہر داخل ہو چکے ہیں اور اس پر ان کا یقین بھی نہیں ہے۔ اس لئے

فَأَصْمَهُمْ وَأَعَمَّى أَبْصَارَهُمْ (۲۳: ۴۷) ”اللہ نے ان کو بہرا اور اندھا بنا دیا ہے۔“ ان کی قوت سماعت تو موجود ہے اور قوت بصرہ بھی موجود ہے لیکن انہوں نے کانوں اور آنکھوں کو معطل کر دیا ہے یا سمع و بصر کے نتیجے میں جو ادراک حاصل ہوتا ہے اس کو معطل کر دیا ہے۔ گویا ان کے یہ حواس اپنا فریضہ منہی ادا نہیں کر رہے۔ قرآن نہایت ہی سرزنش کے انداز میں پوچھتا ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ (۲۴: ۴۷) ”کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے؟“ یوں کہ ان کی آنکھوں کے پردے زائل ہو جائیں کان سننے لگیں اور ان تک قرآن کے نور کی رسائی ہو ان کے پردہ شعور پر ارتعاش ہو ان کے دلوں کے اندر جوش و خروش پیدا ہو اللہ کا ضمیر غفلت ہو جائے اور ان کے اندر ایک ایسی زندگی آجائے جو قرآن کے نور سے منور ہو اور وہ اس تہدایت اخذ کریں۔

أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۲۴: ۴۷) ”یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟“ یہ قفل ان کے دلوں تک قرآن کے نور کو جانے نہیں دیتے۔ ان کے دل اس طرح بند ہیں جس طرح دروازے بند ہونے کی صورت میں انسان ہوا یا کوئی چیز اندر نہیں جاسکتی اور نہ روشنی جاسکتی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

منافقین کے حالات ابھی جاری ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد ان کے منہ موڑنے کے اسباب کیا ہیں؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ یہودی سازش میں شریک ہو گئے ہیں اور انہوں نے ان کے ساتھ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ جو سازش تیار کریں گے یہ ان کی اطاعت کریں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ

الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا

نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأُمْرِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ ۚ فَكَيْفَ إِذَا

تَوَقَّتَهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا

ع ۹. اسَخَطَ اللَّهُ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَاحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ۚ أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي

قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَنْ لَنْ يُخْرِجَ اللَّهُ أَصْغَانَهُمْ ۖ وَلَوْ نَشَاءُ لَارَيْنَاكَهُمْ
فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسَيِّئِهِمْ ۚ وَكَتَعْرِفْتَهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ ۝
وَكُنْزُوكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجْهِدِينَ مِنْكُمْ ۚ وَالصَّابِرِينَ ۚ وَنَبْلُوا أَخْبَارَكُمْ ۝

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اس سے پھر گئے ان کے لیے شیطان نے اس روش کو سل بنا دیا ہے اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ ان کے لیے دراز کر رکھا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے۔ اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔ پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی رودیں قبض کر س گے اور ان کے منہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے؟ یہ اسی لیے تو ہو گا کہ انہوں نے اس طریقے کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے اور اس کی رضا کا راستہ اختیار کرنا پسند نہ کیا۔ اسی بنا پر اس نے ان کے سب اعمال ضائع کر دیئے۔ کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھ دیں اور ان کے چروں سے تم ان کو بچو نہ لو۔ مگر ان کے انداز کلام سے تو تم ان کو جان ہی لو گے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے۔ ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں آلیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کر س اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں۔“

قرآن کریم نے ایمان لانے اور ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد ان کی جانب سے ایمان کو ترک کرنے کے عمل کو نہایت ہی حس انداز میں پیش کیا ہے۔ یعنی واپسی اور اٹے پاؤں پھرنے کا عمل اور اس کے اسباب یہ تھے کہ شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی کی اور ان کے لیے اس برے کام کو خوبصورت بنا دیا یعنی ظاہری حرکت کہ ایک شخص اٹے پاؤں پھر رہا ہے اور معنوی حرکت اس انداز تغیر میں دونوں نظر آتی ہیں جبکہ یہ منافق اپنی جانب سے اپنے ان اعمال کو اچھی طرح چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شیطان ان پر کس طرح مسلط ہو گیا اور کس طرح وہ ان کو مزید بنانے میں کامیاب ہو گیا حالانکہ آغاز میں یہ لوگ ایمان لائے تھے تو وجہ یہ تھی :

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ

الْأَمْرِ (۲۶: ۷۷) ”اسی لیے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے۔“۔ مدینہ میں یہودی تھے اور وہ نزول قرآن کے پہلے مخالف تھے کیونکہ ان کو توقع تھی کہ آخری رسول بھی یہودی ہو گا۔ رسالت کا خاتمہ ان پر ہو گا۔ یہ لوگ کافروں پر مکمل فتح کی توقع اس رسول کے دور میں کرتے تھے اور کافروں کو اس امر سے ڈراتے بھی تھے کہ جب نبی آخر الزمان آئے گا تو وہ پوری دنیا پر غالب ہو گا۔ اور پوری دنیا میں ان کو غلبہ حاصل ہو گا۔ اور پھر یہودیوں کی مملکت قائم ہوگی۔ لیکن اللہ نے آخری رسول ابراہیم علیہ السلام کی اس نسل سے بھیجا جو یہودی نہ تھی اور حضور اکرم جب مدینہ ہجرت کر کے آئے تو انہوں نے اس ہجرت کو بھی پسند نہ کیا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کا رہاسا اثر سوخ بھی ختم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اول روز سے یہ لوگ رسول اللہ

کے خلاف جمع ہو گئے تھے اور آپؐ کے خلاف خفیہ سازشوں کی جنگ شروع کر دی تھی۔ کیونکہ بقا ہر وہ میدان جنگ میں تو حضور اکرمؐ کے خلاف نہ جنگ کر سکتے تھے اور نہ اس کا کوئی جواز تھا۔ اس طرح یہودیوں کے ساتھ ہر وہ شخص شامل ہو گیا جو حضورؐ سے دشمنی رکھتا تھا۔ تمام منافقین ان سازشوں میں شریک ہو گئے اور یہ جنگ ان کے اور رسول اللہؐ کے درمیان چلتی رہی اور آخر کار حضور اکرمؐ نے ان کو جزیرۃ العرب سے جلا وطن کر دیا۔

یہ منافقین جو ہدایت پانے کے بعد منافق ہو گئے تھے انہوں نے یہودیوں کو یہ یقین دہانی کر لی کہ۔

سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ (۲۶: ۴۷) ”بعض معاملات میں ہم تمہاری اطاعت کرس گے“۔ اور رائج بات یہ ہے کہ یہ یقین دہانی خفیہ سازشوں کے سلسلے میں تھی جو وہ اسلام اور رسول اللہ کے خلاف تیار کرتے رہتے تھے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اسْرَارَهُمْ (۲۶: ۴۷) ”اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے“۔ یہ نہایت ہی دھمکی آمیز تبصرہ ہے بلکہ دھمکی ہے کہ کس یہ اپنی سازشیں ہم جانتے ہیں ان کا سب کچھ۔ اللہ کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں اور اللہ کی قوت کے مقابلے کی کوئی قوت نہیں۔

---○○○---

یہ زندگی مختصر ہے اور آخر کار ہمارا شکر جب پہنچے گا اور ان سے امانت حیات وصول کرے گا تو

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّيْتَهُمْ لَمُنْكَسَةً يَصْرِفُونَ وُجُوْهُهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ (۲۷: ۴۷) ”پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی رد میں قبض کریں گے اور ان کے منہ اور ہونٹوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے؟“۔ یہ نہایت ہی خوفزدہ کرنے والا اور توہین آمیز منظر ہے۔ جب ان کی موت کا وقت ہو گا یہ بے بس ہوں گے۔ اس زمین پر سے رخصت ہو رہے ہوں گے اور دوسری حیات کا آغاز ہو رہا ہو گا۔ اور اس نئی زندگی کا آغاز یوں ہو رہا ہے کہ فرشتے ان کے منہ پر بڑی بے دردی سے تھپڑ مار رہے ہیں اور چوڑوں پر ڈنڈے رسید کر رہے ہیں۔ حالانکہ بذات خود موت کا وقت نہایت ہی دردناک ہوتا ہے۔ خوف اور کرب کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن یہ چونکہ اگلے پاؤں پھرے ہیں اس لیے ان کو چوڑوں پر سزا مل رہی ہے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

---○○○---

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اتَّبَعُوْا مَا اسْوٰطَ اللّٰهِ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ

(۲۸: ۴۷) ”یہ اسی لیے تو ہو گا کہ انہوں نے اس طریقے کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے اور اس کی رضا کا راستہ اختیار کرنا پسند نہ کیا۔ اسی بنا پر اس نے ان کے سب اعمال ضائع کر دیئے۔“

یعنی انہوں نے خود اپنے لیے یہ انجام پسند کیا ہے۔ انہوں نے خود اس طریقے کو اپنایا جو اللہ کو ناراض کرنے والا طریقہ ہے۔ یعنی نفاق، معصیت اور اللہ کے دشمنوں اور اللہ کے دین کے دشمنوں اور رسول کے دشمنوں کے ساتھ مل کر سازشیں کرنا۔ انہوں نے خود اللہ کی رضامندی کو ناپسند کیا۔ اور اس کے حصول کی کوشش نہ کی بلکہ انہوں نے

وہ کام کیا جس سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور غضب میں آتا ہے یوں اللہ نے ان کے تمام اعمال کو (حبط) کر دیا۔ جن پر وہ مست تھے اور جن کو وہ ناپسند کرتے تھے اور اپنے ان اعمال کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ ہم ان کے بہت ہی ماہر ہیں۔ یہ مومنین کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور یوں بظہر ان کی یہ سازشیں غبارے کی طرح پھولی ہوئی ہوتیں اور طوفان کی طرح آتیں لیکن چشمِ زدن میں ختم ہو جاتیں۔

---○○○---

آخر میں کہا جاتا ہے کہ اللہ ستار ہے، لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو کہ اپنے اوپر اسلام ہ جھوٹا بارہ اوڑھے ہوئے ہو، اس کو اللہ تار سکتا ہے اس لیے اب بھی باز آ جاؤ۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَنْ لَنْ يُخْرِجَ اللَّهُ أَضْغَانَهُمْ (۲۹) وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيمِهِمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ (۳۰) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجْتَهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوًا أَجْرَكُمْ

(۳۱) (۴۷: ۲۹ تا ۳۱) ”کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے، یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور ان کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو۔ مگر ان کے اندازِ کلام سے تو تم ان کو جان ہی لو گے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے۔ ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حامات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں۔“

منافقین کو اپنی فنی مہارت پر پورا اعتماد تھا۔ اور وہ بالعموم اپنی سازشوں کو مسلمانوں سے چھپانے میں کامیاب رہتے تھے۔ قرآن مجید ان کو بتاتا ہے کہ یہ ان کی بہت ہی احمقانہ سوچ ہے۔ آخر خدا ہر چیز کو جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام بھیدوں کو کھول سکتا ہے۔ اور مسلمانوں کو بتا سکتا ہے کہ تمہارے دلوں میں ان کے خلاف کس قدر بغض بھرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيمِهِمْ (۴۷: ۳۰) ”ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور ان کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو۔“ اگر ہم چاہیں تو ان کی لیک ایک شخصیت تم کو بتا دیں، یہاں تک کہ تم لیک ایک کو ان کی علامات سے پہچان لو۔

یہ آیت اس سے پہلے کی ہے جب اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے نام بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیئے تھے لیکن بہر حال ان کے لیے، چالاک کی، بیچ دہر باتوں اور آپ کے خطاب سے غلط استدلال کرنے کی عادت کی وجہ سے آپ ان کو جانتے تھے۔

وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ (۴۷: ۳۰) ”مگر ان کے اندازِ کلام سے تو تم جان ہی لو گے۔“

بات اب صرف اللہ کے علم پر مگر رکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اعمال کو بھی جانتا ہے اور ان کے محرکات کو بھی جانتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ (۳۰: ۴۷) ”اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے۔“ اس سے کوئی بات مخفی نہیں رہتی۔ اب اللہ اسلامی سوسائٹی کو صاف کرنے کے لیے آزمائش کا اعلان فرماتا ہے۔ یہ آزمائش پوری امت کی ہوگی۔ اس آزمائش کے نتیجے میں صابر اور نجاہد جدا ہو کر ایک طرف آجائیں گے اور ان کی خبریں عام ہو جائیں گی اور اسلامی صف میں کوئی مشکوک آدمی نہ رہے گا اور منافقین اپنی منافقت نہ چھپا سکیں گے۔ وہ تو بہت ہی ضعیف لوگ ہیں۔

وَلَنَسْلُوْا اَنْفُكُمۡ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُحْسِنِیْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ وَ نَبْلُوْا اَخْبَارَكُمْ

(۳۱: ۴۷) ”ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہے۔“ اللہ تو تمام نفوس کے خفیہ خزانوں سے بھی واقف ہے۔ اور زیر زمین معدنیات سے بھی واقف ہے۔ اور انسانوں کی خفیہ اور چھپائی ہوئی باتوں کو بھی جاننے والا ہے۔ اور جو معاملات ہونے والے ہیں ان کو اس طرح جانتا ہے جس طرح وہ عملاً ہو چکے ہوں۔ اب اللہ مزید مجاہدین اور صابرین کو کس طرح جاننا چاہتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسانوں کے ساتھ انتہائی مہربان ہے جس قدر اس کی قوت اس کی طبیعت اور ان کی استعداد کے مطابق کیا جاسکتا ہے۔ انسان اس طرح نہیں جانتے جس طرح اللہ جانتا ہے۔ لہذا یہ علم اور ظہور انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانیں کہ مجاہدین اور صابرین کون ہیں؟ اور پھر ان کو اس علم و ظہور سے نفع ہو۔

آزمائش خواہ مشکلات میں ہو یا خوشحالی میں، نعمتوں میں ہو یا مشقتوں میں ہو، ہاتھ کھلے کرنے میں ہو یا معیشت کی تنگی میں ہو، خوشی میں ہو یا غم میں ہو، اس آزمائش کی وجہ سے نفوس کے اندر کی خفیہ صلاحیتیں کھل کر سامنے آ جاتی ہیں۔ آزمائش کی وجہ سے لوگوں پر صلاحیتوں کا انحصار ہو جاتا ہے۔ یہاں اللہ کے علم سے مراد وہ ظہور ہے جو لوگوں کو ابتلا میں ڈالنے سے ہو جاتا ہے۔ اور لوگوں کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ (اللہ کے لیے یہ کوئی نیا علم نہیں ہوتا، لوگوں کے لیے نیا ہوتا ہے) اور اسے لوگ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اتنا کہ بعد لوگوں کی قابلیت کا معلوم ہو جاتا ہے، جسے لوگ سمجھ سکیں، لوگوں کے شعور اور ان کی شخصیت پر اس کا اثر ہوتا ہے اور یوں اللہ کی حکمت اپنا کام کرتی ہے۔

لیکن اللہ کا حکم یہی ہے کہ انسان آزمائش طلب نہ کرے اور یہ دعا کرے کہ اللہ اپنی آزمائشوں سے بچائے اور عافیت اور رحمت میں رکھے۔ لیکن اگر آزمائش آجائے تو صبر کرے اور اس کو معلوم ہو کہ اس میں اللہ کی حکمت کام کر رہی ہے اور انسان اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی مشیت کے حوالے کر دے اور اللہ پر بھروسہ کرے کہ آزمائش کے بعد اللہ کی رحمت اور عافیت نصیب ہوگی۔

ایک بڑے عابد اور صوفی حضرت فضل رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب ان پر یہ آیت پڑھی جاتی تھی تو وہ روتے تھے اور یہ دعا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ لَا تَبْلُوْنَا فَاَنْتَ اِنْ بَلَوْتَنَا فَضَحْتَنَا وَهَتَكْتَ اسْتَارَنَا وَعَذَبْنَا ”اے اللہ! ہمیں آزمائش میں نہ ڈال، اگر تو نے ہمیں آزمائش میں ڈالا تو ہمیں شرمندہ کر دے گا، ہماری پردہ دہری کر دے گا اور ہمیں عذاب میں مبتلا کر دے گا۔“

درس نمبر ۲۴۳ ایک نظر میں

یہ سبق اس سورت کا آخری سبق ہے۔ اس کا آغاز ہوتا ہے اس آیت سے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَتَشَاقُّوْا الرُّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ

الْهُدٰى (۴۷ : ۳۲) ”جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسوں سے جھگڑا کیا جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی....“ یہ کون موگ ہیں؟ زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے متعلق اس سورت کے آغاز میں بھی اسی انداز سے بات کی گئی تھی یعنی مشرکین مکہ کیونکہ یہی لوگ ہیں جسوں نے دعوت اسلامی کے مقابلے میں متکبرانہ رویہ اختیار کیا رسول اللہؐ سے جھگڑتے ہوئے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے آخر تک روکتے رہے۔ البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد عام کفار ہوں اور اس عتاب میں ہر وہ شخص آتا ہے جو کافر ہے اور یہ رویہ اپنائے ہوئے ہے خواہ وہ مشرک ہے، یہودی ہے یا منافق۔ ظاہر یہ کام کر رہا ہے یا خفیہ کر رہا ہے۔ سب کو یہ دھمکی دی گئی ہے کہ تم کچھ بھی نہ کر سکو گے لیکن پہلا مفہوم زیادہ مناسب ہے۔

بہر حال اس دوسرے اور آخری سبق میں باقی باتوں کے مخاطب مسلمان ہیں۔ ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کو جاری رکھیں۔ اور اس میں کوئی دیر نہ کریں اور یہ تجویز بھی نہ دیں کہ کفار کے ساتھ امن و سالیات کا رویہ مزید اختیار کیا جائے۔ کیونکہ کفر نے ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ اور یہ مصالحت کسی بھی مصلحت کے پیش نظر نہیں ہونی چاہئے۔ کسی کمزوری کی وجہ سے کسی رشتہ داری کی وجہ سے کسی مفاد کی وجہ سے کسی مالی تاوان کے ڈر کی وجہ سے۔ جہاں تک مالی تاوان کا تعلق ہے اللہ اسی قدر مال کا مطالبہ فرماتا ہے جس قدر انسان کی استطاعت میں ہو۔ اللہ نے انسان کے فطری بخل کو اس سلسلے میں مد نظر رکھا ہے۔ کہ جاتا ہے کہ اگر وہ اس دعوت کی ذمہ داریاں نہ ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ اس کی ذمہ داری کسی اور پر ڈال دے گا۔ اور کوئی دوسری جماعت اٹھ اڑے گا۔ جو یہ ذمہ داریاں بحسن و خوبی ادا کریں گے۔ اور جو اس کی ہمت کو سمجھیں گے۔ یہ ایک نہایت ہی خوفناک دھمکی ہے اور اس سورت کے مضامین اور فضا کے ساتھ لگا کھاتی ہے۔ اور اس وقت مومنین کے صفوں میں جو حالات پائے جاتے تھے یہ دھمکی ان کا بہترین علاج بھی تھی۔ کیونکہ اس وقت منافقین کے علاوہ بھی ایسے لوگ تھے جو عافیت پسند تھے جبکہ مسلمانوں کی اکثریت ندائی، مخلص، بہادر اور مشہور تھی اس بارے میں روایات بھری پڑی ہیں۔ اجازت قتل کے وقت چونکہ ہر قسم کے لوگ موجود تھے اور قرآن کریم ان کی تربیت کر کے ان کو اعلیٰ مراتب تک لے جا رہا تھا اس لئے یہاں یہ انداز تعبیر اختیار کیا گیا۔

درس نمبر ۲۴۳ تشریح آیات

۳۲۔۔۔۔۔ تا۔۔۔۔۔ ۳۸

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا
تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ ۚ لَنْ يَصُورُوا اللَّهُ شَيْئًا ۖ وَسَيُحِطُّ أَعْمَالَهُمْ ۖ يَا أَيُّهَا
الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ۚ إِنَّ
الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ
لَهُمْ ۚ فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلَامَةِ ۚ وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ ۚ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَ
لَنْ يَتْرَكَ أَعْمَالَكُمْ ۚ إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ ۖ وَلَهُمْ وَإِنْ تَوَمَّنُوا وَيَتَّقُوا
يُؤْتِكُمْ أَجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلَكُمْ أَمْوَالَكُمْ ۚ إِنَّ يَسْأَلَكُمْ فِيْكُمْ تَبَخَّلُوا وَ
يُخْرِجُ أَصْحَابَكُمْ ۚ هَٰأَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَمِنْكُمْ
مَنْ يَبْخُلُ ۚ وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَبْخُلْ عَنْ نَفْسِهِ ۖ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ ۖ وَأَنْتُمْ
الْفُقَرَاءُ ۚ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۚ

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسولوں سے جھڑا کیا جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی،
در حقیقت وہ اللہ کا کوئی نقصان بھی نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کر لیا غارت کر دے گا۔ اے لوگو! جو ایمان
لائے ہو، تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔ کفر کرنے والوں اور راہ خدا سے
روکنے والوں اور مرتے دم تک کفر پر جے رہنے والوں کو تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا۔ پس تم پورے نہ بنو اور صلح کی
درخواست نہ کرو۔ تم ہی غالب رہنے والے ہو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔

یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشا ہے۔ اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلتے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور وہ تمہارے مال تم سے نہ مانگے گا۔ اگر کہیں وہ تمہارے مال تم سے مانگ لے اور سب کے سب تم سے طلب کر لے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ ابھار لائے گا۔ دیکھو، تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں، حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔ اللہ تو غنی ہے، تم ہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم منہ موزو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔“

یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ نہایت ہی تاکید فیصلہ۔ اللہ کا وعدہ ہے جو واقع ہونے والا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اسلام کی راہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ سچائی کے راستے میں وہ جم کر بیٹھ گئے کہ لوگوں تک یہ سچ بات پہنچنے نہ پائے۔ اپنی قوت، اپنا مال، اور اپنے تمام وسائل اس میں جھونک دیئے کہ اسلام پھیلنے نہ پائے۔ پھر وہ ہر مقام پر رسول اللہ سے جھگڑنے لگے۔ آپ کی زندگی میں آپ کی مخالفت کی۔ آپ کے لئے ہوئے نظام زندگی کی مخالفت کی اور آپ کی صفوں کی مخالف صفوں میں کھڑے ہو گئے یا جنہوں نے حضورؐ کی وفات کے بعد دین اسلام کی مخالفت کی۔ اسلامی نظام زندگی اور نظام شریعت کی مخالفت کی۔ اور سنت نبویؐ اور دعوت اسلامی پر قائم لوگوں کی مخالفت کی۔ اور یہ انہوں نے اس حال میں کی۔

مَنْ بَعْدَ مَا قَبِلْنَاهُمُ الْهُدَىٰ (۴۷: ۳۲) ”جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی“۔ اور ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ حق ہے۔ لیکن یہ لوگ ہوائے نفس اور عناد کی وجہ سے اندھے ہو گئے۔ اور مفادات اور مصلحتوں نے ان کو آخرت کے مفاد کے مقابلے میں دنیا کے مفادات کی طرف مائل کر دیا۔ اللہ کا تاکید فیصلہ ان لوگوں کے بارے میں یہ ہے اور یہ فیصلہ یقیناً نافذ ہونے والا ہے کہ۔

لَنْ يَصْرِفُوا إِلَهُ شَيْئًا (۴۷: ۳۲) ”درحقیقت یہ اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے“۔ یہ لوگ اس قدر کمزور اور حقیر ہیں کہ یہ اللہ کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہی نہیں، لہذا مقصود اس کی نفی کرنا نہیں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے دین، اللہ کے نظام شریعت اور اللہ کے داعیوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ وہ اللہ کے قوانین قدرت اور نظام فطرت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے۔ اگرچہ وہ بہت ہی زور آور ہوں۔ اگرچہ وہ ایک وقت تک بعض کمزور مسلمانوں کو ایذا دیتے رہے ہوں۔ انہم ان کا کیا ہو گا؟

وَسَيَحْبُطُ أَعْمَالَهُمْ (۴۷: ۳۲)، ”بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا“۔ یوں ان کی تمام سازشیں ختم ہو کر رہ جائیں گی اور نیست و نابود ہوں گی، جس طرح ایک ہٹا کٹا نیل زہریلی گھاس چرنے کے بعد پھول جاتا ہے اور پھر ڈھیر ہو جاتا ہے۔

اس فضا میں جس کے اندر ان لوگوں کو دھمکی دی گئی جنہوں نے کفر کیا، اسلام کی راہ روکی اور رسول اللہؐ اور دین کے داعیوں کے ساتھ دشمنی کی، خود مسلمانوں کو بھی متنبہ کیا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت کریں اور اپنے اعمال کافروں کی طرح ضائع نہ کریں۔

---○○○---

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (۴۷: ۳۳) ”اے
 لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔“

اس سخت ہدایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت مسلمہ کے اندر بھی ایسے لوگ تھے جو مکمل اطاعت سے گریزاں تھے
 یا یہ کہ ان پر مکمل اطاعت درابھاری تھی اور بعض قربانیاں ان کو حد سے زیادہ مگ رہی تھیں لیکن اس وقت ایک قوی
 دشمن کے مقابلے میں یہ ضروری تھیں جس نے اسلام کی راہ روک رکھی تھی۔ اور یہ قوتیں اس وقت ہر طرف سے اسلام
 پر حملہ آور تھیں۔ اور ان مسلمانوں کے ان قوتوں کے ساتھ تجارتی، برادری اور رشتہ داری کے تعلقات بھی تھے۔ اور
 اس وقت ان سب تعلقات کو کاٹ دینا ان کو مشکل معلوم ہوتا تھا۔ جس طرح اسلامی دعوت اور نظریہ کا تقاضا تھا کہ اب
 یہ تمام تعلقات کٹ جائیں۔

بچے مسلمانوں پر ان ہدایات کا بڑا شدید اثر ہوا تھا۔ وہ ایک بار تو ان دھمکیوں کے نتیجے میں کانپ لٹھے تھے اور وہ
 بروقت ڈرتے تھے کہ شاید ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس سے ان کے اعمال ہی اکارت جائیں۔

امام احمد ابن نصر ہروزی نے کتاب الصلوٰۃ میں روایت کی ہے۔ ابو قتادہ سے ”انہوں نے وکیع سے ”انہوں نے ابو جعفر
 رازیؒ انہوں نے ربیع ابن انس سے ”اور انہوں نے ابو العالیہ سے ”جو کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء یہ خیال کرتے
 تھے کہ لا الہ الا اللہ پڑھ لینے کے بعد کوئی گناہ مضریں ہے جبکہ شرک کے ساتھ کوئی عمل مفید نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت
 نازل ہوئی۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (۴۷: ۳۳) ”اللہ کی اطاعت
 کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔“ اس کے بعد وہ ڈرنے لگے کہ کوئی گناہ دوسرے اعمال کو
 برباد نہ کر دے۔

حضرت عبداللہ بن المبارک سے منقول ہے کہ ”بکر ابن معروف نے ”مقاتل ابن حیان سے ”انہوں نے نافع سے ”اور
 انہوں نے حضرت ابن عمر سے ”روایت کی ہے ”وہ کہتے ہیں: ”ہم رسول اللہؐ کے ساتھی یہ خیال کرتے تھے نیکیاں سب کی
 سب مقبول ہوں گی ”یہاں تک کہ آیت۔“

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (۴۷: ۳۳) ”اطاعت کرو اللہ
 کی اور اطاعت کرو رسول اللہؐ کی اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔“ نازل ہوئی تو ہم نے سوچا کہ وہ کیا چیز ہے جو ہمارے
 اعمال کو ضائع کر دے گی۔ تو ہم نے کہا کہ کبار اور مہجرت اور فواحش ہوں گے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔“

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ”اللہ اس بات کو معاف نہیں
 کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس کے سوا کسی کے جو گناہ چاہے ”معاف کر دے۔“ جب یہ آیت نازل

ہوئی تو ہم نے ایسا کھنا چھوڑ دیا تاہم کبار گناہوں کے ارتکاب کرنے والوں کے انجام سے ڈرتے تھے۔ نوحی کے مرعبین سے ڈرتے تھے اور جو ان سے بچتا ہو اس کے انجام کے بارے میں پر امید تھے۔

ان نصوص سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سچے مسلمان ان نصوص کو کس طرح لیتے تھے۔ وہ کس طرح مضطرب اور چوکے ہو جاتے تھے۔ وہ کس طرح کانپ اٹھتے تھے اور ڈرتے رہتے تھے 'وہ کس طرح محتاط رہتے کہ وہ کہیں ان کی زد میں نہ آجائیں۔ وہ کس طرح ہر وقت سوچتے رہتے تھے کہ ان کی زندگی نصوص الہی کے مطابق ہو 'اور وہ اس تیز احساس کے ساتھ آیات الہیہ کو لیتے تھے 'اس لیے وہ اس انداز کے مسلمان تھے۔

---○○○---

اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ رسول اللہؐ سے دشمنی کرتے ہیں اور آپ کی اطاعت سے دور ہو جاتے ہیں اور ایسے رویے پر اصرار کرتے ہیں اور اس دنیا سے کافر ہو کر مر جاتے ہیں ان کا انجام کیا ہو گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ

ہُمْ (۳۷: ۴۷) "کفر کرنے والوں اور راہِ خدا سے روکنے والوں اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہنے والوں کو تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا۔"

مغفرت کے لیے اس دنیا میں ہر کسی کو ضلالت دے دی گئی ہے۔ اور توبہ کا دروازہ کافروں اور گناہگاروں پر اس وقت تک کھلا ہے جب تک سکراتِ موت شروع نہیں ہو جائے۔ جب روح حلقوم تک آئے پہنچے تو اس وقت خالص آخری لمحات میں توبہ کا دروازہ بند ہوتا ہے اور اس وقت موقعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔

---○○○---

اس قسم کی آیت جس طرح کافروں اور منافقین کو خطاب کر رہی ہیں۔ اس طرح خود مسلمانوں کو بھی دعوت دے رہی ہیں۔ یہ آیات کافروں کو متنبہ کرتی ہیں کہ کوتاہیوں کا سدھار کر د 'توبہ کرو قبل اس کے کہ سکرات شروع ہو جائیں اور مسلمانوں کو ان آیات کا خطاب یوں ہے۔ کہ تم ان اسباب اور ان راہوں سے دور رہو جو تمہیں اس انجام تک پہنچا سکتی ہیں۔ اس آیت میں مسلمانوں اور کافروں دونوں کو خطاب یوں ہے کہ اگلی آیت میں دعوت اور جہاد میں سستی کو اس آیت پر مرتب کیا گیا ہے کہ اس انجام سے بچو اور سستی نہ کرو۔

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْا اِلَی السَّلٰمِ وَ اَنْتُمْ اَلْعٰلَوْنَ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ یُّبٰرِكُمْ اَعْمَالُكُمْ

(۳۷: ۴۷) "پس تم ہود نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو۔ تم ہی غالب رہنے والے ہو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اہل کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔"

یہ ہے وہ بات جس سے مسلمانوں کو ڈرایا جا رہا ہے۔ ان کے سامنے ان کافروں کا انجام رکھا جاتا ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑتے تھے تاکہ مسلمان اس کے تصور سے بھی ڈریں۔ اس ڈراوے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے

کہ اس وقت مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو جماد کی مسلسل مشقتوں کو ایک بھاری حکم سمجھتے تھے۔ اور ان کے عزم میں کمزوری تھی۔ اور یہ لوگ امن و عافیت چاہتے تھے تاکہ جنگ کی مشقتوں سے آرام میں رہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں میں سے بعض کی مشرکین کے ساتھ رشتہ داریاں بھی ہوں یا ان کے ساتھ مادی معاملات میں شراکت ہو، اس زلویہ سے یہ لوگ امن اور صلح کو پسند کرتے ہوں کیونکہ انسان ہمیشہ انسان رہا ہے اور قرآن کریم ان بشری اور فطری کمزوریوں کا علاج اپنے انداز سے کر رہا ہے۔ اور قرآن مجید نے اس طرح جو تربیت جاری رکھی تو اس کے نتیجے میں دور اول میں ایک معجزانہ گروہ تیار ہو گیا۔ لیکن ان مساعی اور کامیابیوں کے باوجود اس بات کی نفی نہیں کی جاسکتی کہ جماعت مسلمہ کی صفوں میں کمزور لوگ ہوں۔ خصوصاً ایسے ابتدائی مدنی دور میں چنانچہ اس آیت میں بعض ایسی ہی کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ قرآن کریم کس طرح لوگوں کو لیتا تھا۔ ہمیں بھی چاہئے کہ قرآنی انداز کے مطابق دور جدید کے لوگوں کی تربیت کس۔

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلَامِ وَأَنْتُمْ الْآعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَتَرَكَكُمْ أَعْمَالَكُمْ

(۳۵: ۴۷) ”پس تم ہودے نہ بنو“ اور صلح کی درخواست نہ کرو، ”تم ہی غالب رہنے والے ہو“ اللہ تمہارے ساتھ ہے“ اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔“

تم چونکہ غالب ہو اس لیے صلح کی درخواست نہ کرو، تم اعتقاد اور تصور حیات کے اعتبار سے بلند ہو، تم خدا سے تعلق کے زاویہ سے بھی بلند ہو، تمہارا آقا بلند ہے، ”نظام زندگی“ مقاصد زندگی اور مقصود زندگی کے اعتبار سے بھی تم بلند ہو، ”شعور“ اخلاق اور طرز عمل کے اعتبار سے تم بلند ہو۔ قوت، مرتبے اور ذریعہ نصرت کے اعتبار سے بھی تم بلند ہو۔ تمہاری پشت پر بہت بڑی قوت ہے واللہ مسلم۔ تمہارے ساتھ تو اللہ ہے۔ تم اکیلے تو نہیں ہو، تم ایک نہایت ہی بلند اور جبار اللہ تعالیٰ کے زیر تربیت ہو جو قادر مطلق ہے۔ وہ تمہارا مددگار ہے اور ہر وقت حاضر و ناظر ہے اور تمہارے ساتھ ہے۔ وہ تمہاری مدافعت کرتا ہے تمہارے اعداء کی حیثیت کیا ہے، جب کہ تمہارے ساتھ اللہ ہے۔ تم جو کچھ خرچ کرتے ہو، اور جو کچھ کرتے ہو اور تمہیں جو مشقتیں پہنچتی ہیں۔ ان کا حساب رکھا جا رہا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ضائع نہیں ہوتی۔

وَلَنْ يَتَرَكَكُمْ أَعْمَالَكُمْ (۳۵: ۴۷) ”اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔“۔ اللہ تمہارے اعمال میں کوئی کوتاہی نہ کرے گا کہ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو اور اس کا معاوضہ تمہیں نہ ملے۔

غیر کمزوری دکھانے اور صلح چاہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اعلیٰ ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہو گا لہذا تم مکرم، ماجور اور منصور ہو۔

---○○○---

یہ تو ہے پہلا لمحہ اور دوسرا یہ کہ ان کو بتا دیا جاتا ہے کہ امن و عافیت تم جس دنیا کے لیے طلب کرتے ہو، اس کی حیثیت کیا ہے؟ ٹھیک ہے ان میں تمہیں بعض قربانیاں تو دینی ہوں گی، لیکن آخرت میں کامل اجر تمہیں ملیں گے اور تم

سے تمہارے مال بھی طلب نہ کرے گا۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَ نَهْوٌ وَّ اِنْ تُوْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَّ لَا

يَسْئَلُكُمْ اَمْوَالُكُمْ (۳۶: ۴۷) ”یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشہ ہے۔ اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور وہ تمہارے مال تم سے نہ مانگے گا۔“

اگر ہماری اس دنیاوی زندگی کے پیچھے کوئی اعلیٰ اور ارفع مقصد نہ ہو تو وہ یقیناً سود و لعب ہے۔ اگر اس دنیا میں اسلام کے اعلیٰ مقاصد اور اسلامی نظام کے قیام کے ارفع مقاصد نہ ہوں تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔ اسلام کا مقصد زندگی اس دنیا کو آخرت کی کھیتی بنا دیتا ہے۔ اور اس میں اللہ کی خلافت کے حقوق کو بھی طرح اور اگر نائی قیمت میں اچھے نتائج پیدا کرتا ہے۔ آیت کا دوسرا فقرہ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے :-

وَ اِنْ تُوْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ (۳۶: ۴۷) ”اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا۔“ اس دنیا میں ایمان لانا اور تقویٰ اختیار کرنا ہی اس کو سود و لعب کے دائرے سے نکال دیتا ہے۔ اور اسے ایک سنجیدہ مقام عطا کرتا ہے اور اسے حیوانی سامان قیث سے ذرا بلند مقام دیتا ہے۔ دنیا کا نظام پھر نظام خلافت راشدہ بن جاتا ہے اور یہ عالم بالا کے ساتھ پیوستہ ہوتا ہے۔ جب اسلامی نظام اور قانون شریعت نافذ کر دیا جائے تو پھر مومن کی اس دنیا کی زندگی بھی سود و لعب کے دائرے سے نکل کر ایک عبادت بن جاتی ہے اور مومن کو اس کی تمام سرگرمیوں پر آخرت میں اجر ملتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے اللہ لوگوں سے یہ مطالبہ نہیں فرماتا کہ وہ اپنے تمام اموال خرچ کر دیں۔ اسلام دوسرے فرائض اور واجبات میں بھی لوگوں کو مشقت میں نہیں ڈالتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ انسان فطرتاً تمیز دل ہے۔ اس لیے اللہ نے لوگوں پر ان کی طاقت کے مطابق بوجھ ڈالا ہے۔ اس لیے اللہ نے لوگوں پر رحم کرتے ہوئے انہیں یہ حکم نہیں دیا کہ وہ سب مال خرچ کر دیں ورنہ ان کے دل کا کھوٹ ظاہر ہو جاتا۔

---o o o---

اِنْ يَسْئَلْكُمْ مَوَالُهَا فَيُحْفَظْكُمْ تَبَخَّلُوْا وَ يُخْرِجْ اَصْغَانَكُمْ (۳۷: ۴۷) ”اگر کہیں وہ تمہارے مال تم سے مانگ لے اور سب کے سب تم سے طلب کر لے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ ابھار لائے گا۔“

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ کے احکام کس قدر حکیمانہ ہیں جس طرح اس سے اللہ کی رحمت اور مہربانیوں کا اظہار ہوتا ہے کہ دین اسلام میں جو فرائض و واجبات مقرر کیے گئے ہیں وہ فطرت کے عین مطابق ہیں اور اس میں انسانوں کی بشری کمزوریوں اور انسانی استعداد کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ اسلام ایک ربانی نظام زندگی ہے۔ اور یہ انسانوں کے لیے ایک ربانی نظام تجویز کرتا ہے۔ یہ نظام ایک ربانی نظام اس زاویہ سے ہے کہ اس کے قواعد اللہ نے بنائے ہیں اور یہ انسانی اس لحاظ سے ہے کہ اس میں انسان کی استعداد قوت اور ماحول کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور اللہ ہی ہے جو ان کے لیے نظام تجویز کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی مخلوق سے اچھی طرح واقف ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔

---o o o---

آخر میں ان کی واقعی صورت حالات ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے کہ ان حالات میں اتفاق فی سبیل اللہ کی ضرورت ہے۔ قرآن اپنے خوبصورت انداز میں ان کے دلوں کے بجل کا علاج کرتا ہے۔ جس طرح قرآن نے جانی قربانی کے سلسلے میں ان کی تربیت کی۔

هَآنَتُمْ هَؤُلَاءِ تَدْعُونَ لِنُفْسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخُلُ وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَبْخُلُ عَنْ نَفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ وَإِنْ تَتَوَكَّلُوا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۴۷: ۳۸)

”دیکھو! تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔ اللہ تو غنی ہے، تم ہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔“

قرآن کریم اس وقت کے معاشرے کا نقشہ نہایت ہی خوبصورتی سے کھینچتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ ہر معاشرے میں مالی اتفاق کی دعوت کے سلسلے میں بعض لوگوں کا طرز عمل دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ بعض مالی اعتبار سے بخل کرتے ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جو فیاض ہوتے ہیں۔ یہی صورت حالات ابتدائی اسلامی معاشرے کی تھی جس کو روایات میں اچھی طرح قلم بند کیا گیا ہے اور قرآن کریم نے بھی دوسرے مقامات پر تفصیلات دی ہیں۔ اسلام نے اس میدان میں مجزاانہ مثالیں پیش کی ہیں۔ لوگوں نے جو دوستی اور جو انفرادی میں بے پناہ قربانیاں دیں لیکن ان مثالوں کے باوجود مالی لحاظ سے بخل پایا جاتا ہو گا، بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو جان تو دیتے ہوں گے لیکن ان کے لیے مال دینا مشکل ہو گا۔ یہی وہ کج روی ہے جس کا علاج قرآن مجید اس آیت میں کر رہا ہے۔

وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَبْخُلُ عَنْ نَفْسِهِ (۴۷: ۳۸)

”حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔“ کیونکہ اللہ کی راہ میں جو لوگ خرچ کر رہے ہیں وہ دراصل خود انہی کے بینک میں جمع ہو رہا ہے۔ اور یہ بچت دراصل ان کو اس وقت کام آئے گی جہاں پر کچھ بھی آمدن نہ ہوگی۔ جب ان کو زمین سے اٹھایا جائے گا اور ان کے پاس ان کی مملوکات میں سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ لہذا وہاں یہی کمائی اور بچت ان کے کام آئے گی۔ اس لیے اگر وہ اس مد میں خرچ کرنے سے بخل کرتے ہیں تو یہ بخل وہ خود اپنے خلاف کر رہے ہیں۔ وہ اپنی بچتوں میں کمی کر رہے ہیں اور خود اپنا مال کم کر رہے ہیں اور خود اپنے آپ کو محروم کر رہے ہیں۔

اور اللہ جو ان سے اتفاق فی سبیل اللہ کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ بھی خود ان کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔ یہ انہی کے لیے زیادہ بچت ہوتی ہے انہی کا خزانہ اور ذخیرہ بڑھتا ہے۔ اللہ کو اس مال سے کچھ فائدہ نہیں ہے اور نہ اللہ کو ایسے کسی مال کی ضرورت ہے۔

وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَ أَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ (۴۷: ۳۸) ”اللہ غنی ہے اور تم اس کے محتاج ہو۔“ وہی ہے جس نے ہمیں یہ مال دیا ہے۔ اس مال سے جو تم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو اللہ اسے تمہارے ہی لیے جمع کرتا ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ تمہیں دیا ہے اس کا وہ کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ وہ آخرت میں تمہارے جمع کیے ہوئے مال سے بھی غنی ہے۔ تم اس دنیا میں بھی فقراء اور اس کے محتاج ہو اور آخرت میں بھی فقراء اور اس کے محتاج ہو۔ اس دنیا میں جو تمہیں رزق اور نعمتیں درکار ہیں تم ان کے محتاج ہو۔ اور اجر آخرت میں بھی محتاج ہو۔ یہ تو اللہ ہی ہے جو یہاں اور وہاں دونوں جگہ تم پر فضل کرتا ہے اور تم اس کا کوئی صلہ نہیں دے سکتے ہو تم یہاں بھی محتاج ہو اور وہاں بھی۔

اس لیے بخل اور کنجوسی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ تمہارے پاس جو دولت ہے وہ بھی اسی کی دی ہوئی ہے اور آخرت میں وہ جو اجر دے گا وہ بھی اس کا فضل ہو گا۔ ایسا لیے تم جو خرچ کرتے ہو وہ بھی اللہ ہی کا فضل ہے۔ اور آخری اور دو ٹوک بات کہ اللہ نے جو تمہیں اپنی دعوت کے لیے چنا ہے۔ یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے اور تمہارے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو اس کا لال نہ بنایا اور اس کی ذمہ داریاں پوری نہ کیں تو اللہ تمہارے انتخاب کو واپس لے لے گا۔ اور کسی دوسری قوم کو اس کام کے لیے منتخب کر دے گا۔ اور یہ اس قوم پر اللہ کا احسان ہو گا اور وہ اس انتخاب کی قدر کس لے!

وَ اِنْ تَوَلَّوْا يَسْتَبَدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ (۴۷: ۳۸) ”اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔“ جن لوگوں نے ایمان کا مزہ چکھا ہے ان کے لیے تو یہ بہت ہی خوفناک دھمکی ہے کہ تمہیں ہٹا کر کسی دوسری قوم کے لے آیا جائے گا۔ اس شخص کے لیے یہ بہت ہی بڑی دھمکی ہے جس کو احساس ہو کہ دعوت اسلامی اور خیر امت کی ذمہ داری سپرد کر کے اللہ نے ان کو بہت بڑا اعزاز بخشا ہے کیونکہ جو شخص اللہ کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے اسے اللہ نے عظیم امانت سپرد کی ہے۔ وہ اس زمین پر اللہ کی سند اور سہارے سے چلتا ہے۔ اس کے وجود میں اللہ کا نور ہے۔ وہ آتا ہے اور جاتا ہے اور اس پر اپنے آقا کی علامات ہیں۔

اگر کسی نے ایمان کی مٹھاس کو بچھ لیا ہو اور پھر اس سے سب کر لیا جائے تو یہ خسارہ وہی محسوس کر سکتا ہے یہ بے عزتی وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے دریا کبریائی میں بار بار پانی پانی ہو اعزاز پایا ہو اور پھر اسے دھتکار دیا جائے اور اس کے پیچھے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ بلکہ ایسے دامن حق کی زندگی تو جہنم بن جاتی ہے جو حق تعالیٰ تک پہنچ چکے ہوں اور پھر دور ہو جائیں اور ان کے سامنے پردے حائل ہو جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان ایک بہت بڑی عطا ہے۔ اس کی قیمت کی کوئی چیزیں کائنات میں نہیں ہے۔ اور یہ پوری انسانی زندگی اور پوری زمین کی دولت اس کے مقابلے میں ہیچ ہے جب ترازو کے ایک پلڑے میں ایمان ہو اور دوسرے میں یہ پوری کائنات ہو۔

اس لیے یہ دھمکی اتنی بڑی دھمکی ہے جو مومن کو دی جاسکتی ہے اور یہ دھمکی ذرا غور کیجئے اللہ کی طرف سے ہے!



فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۶

سورۃ الفتح - ۲۸

آیات ۱ --- تا --- ۲۹

سورۃ الفتح ایک نظر میں

یہ مدنی سورت ہے اور یہ صبح حدیبیہ کے بعد ۶ ہجری کو نازل ہوئی۔ اس میں اسی اہم واقع اور اس کی تفصیلات پر تبصرہ ہے۔ اس سورت میں اس وقت جماعت مسلمہ کے جو حالات تھے وہ بیان کیے گئے ہیں۔ قرآنی ترتیب کے مطابق اس سے پہلی سورت 'سورت محمد' ہے لیکن سورت محمد اس سے تین سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ اور اس عرصہ میں مدینہ میں اسلامی سوسائٹی میں اور مسلمانوں کے حالات میں کافی تبدیلیاں واقع ہو گئی تھیں۔ جماعت مسلمہ کے موقف اور اس کے مخالفین کے موقف میں بھی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ جماعت کی تربیت اور اس کی نفسیاتی اور ایمانی کیفیت میں بڑے ہی تغیرات ہو گئے تھے۔ جماعت مسلمہ ایمانی اور اخلاقی لحاظ سے نہایت پختہ اور گہرے ادراک کی حامل ہو گئی تھی۔

اس سے قبل کہ ہم اس سورت کے مضمون اور اس کی فضا پر بحث کریں مناسب ہے کہ اس واقعہ کی تفصیلات دے دی جائیں جس کے بارے میں یہ نازل ہوئی ہے تاکہ ہم بھی اس فضا میں زندہ رہیں جس میں مسلمان زندہ رہتے تھے اور ان پر یہ سورت نازل ہو رہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ خانہ کعبہ میں داخل ہو رہے ہیں اور مسلمان بھی آپ کے ساتھ ہیں 'سرمندائے ہوئے یا بادل کنوائے ہوئے'۔ ہجرت کے بعد مشرکین مکہ نے خانہ کعبہ میں مسلمانوں کا پھیلنا ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اور یہ داخلہ حرام مہینوں میں بھی ممنوع تھا حالانکہ ان کا احترام ایام جاہلیت میں بھی سب عرب کرتے تھے۔ ان مہینوں میں لوگ اسلحہ اتار دیتے تھے۔ ان ایام میں جنگ اور قتال کو بہت ہی برا سمجھتے تھے 'خصوصاً مسجد حرام سے کسی کو روکنا تو بہت ہی بوجرم تھا۔ جن لوگوں نے ایک دوسرے سے قصاص لینا ہوتا تھا وہ بھی اس حرمت کے سائے میں اکٹھے پھر آکرتے تھے۔ ایک شخص اپنے باپ اور بھائی کے قاتل کو بھی ملتا اور وہ اس پر تلوار نہ اٹھاتا۔ اور نہ اسے مسجد حرام سے روکتا۔ لیکن مسلمانوں کے معاملے میں انہوں نے اپنی نہایت ہی پختہ روایات کو بھی توڑ دیا۔ اور رسول اللہ اور آپ کے ساتھیوں کو ہجرت کے بعد چھ سال تک بیت اللہ سے روکے رکھا۔ یہ ۶ ہجری تھا کہ رسول اللہ نے یہ خواب دیکھا۔ آپ نے اپنا خواب صحابہ کرام کے سامنے بیان کر دیا۔ اس لیے وہمت خوش ہوئے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔

ہمارے لیے ابن ہشام اعلیٰ ترین ذریعہ ہیں۔ انہوں نے جس طرح اس واقعہ کی تصویر کھینچی ہے وہ بخاری شریف کی روایت اور امام احمدؒ کی روایت سے متفق بھی ہے۔ علامہ ابن حزم نے جو اربع السیرۃ میں جو روایات دی ہیں ان سے بھی متفق ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں 'اس کے بعد (یعنی غزوۃ بنی المصطلق اور اس کے بعد کے واقعہ اُفک کے بعد) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں رمضان اور شوال کا مہینہ رہے۔ اور ذوالقعدہ کے مہینے میں عمرہ کے لیے نکلے۔ آپ کا ارادہ جنگ کا نہ تھا۔ اور مدینہ کے ارد گرد تمام دیہاتی عربوں کو بھی حکم دیا کہ وہ آپ کے ساتھ عمرہ کے لیے چلیں۔ آپ کو قریش

سے اندیشہ تھا کہ وہ رکاوٹ ڈالیں گے۔ جنہوں نے اس مقصد کے لیے تیاریاں بھی کر لی تھیں کہ آپؐ کو بیت اللہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ اکثر دیہاتی اس سفر میں شریک نہ ہوئے اور آپؐ کے ساتھ مجاہدین اور انصاری نکلے۔ اور بعض وہ لوگ بھی تھے جو دوسرے عرب قبائل سے ساتھ ہو لیے تھے۔ آپؐ نے ہدی کا جانور بھی لیا۔ عمرے کا احترام باندھنا کہ لوگ یہ یقین کر لیں کہ حملے کا ارادہ نہیں ہے اور یہ کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپؐ بیت اللہ کا احترام کرتے ہیں اور صرف زیارت کعبہ کے لیے نکلے ہیں۔ ابن اسحاق نے کہا کہ حضرت جابر بن عبد اللہ فرمایا کرتے تھے کہ حدیبیہ میں ہماری تعداد ۱۲۰۰ تھی۔

زہری کہتے ہیں کہ جب یہ قافلہ عثمان کو پہنچا (یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان دو مراحل سفر پر ہے) تو حضورؐ کو بشر بن سفیان الکعبی ملے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ قریش کو آپؐ کے قافلے کا پتہ لگ گیا ہے۔ اور انہوں نے اپنے ساتھ کنواریوں اور بچوں والیوں کو بھی نکال لیا ہے۔ انہوں نے شیروں کی کھالیں پن رکھی ہیں اور دادی ذی طویٰ میں خیمہ زن ہیں اور وہ اللہ کے ساتھ پختہ عہد کیے ہوئے ہیں کہ آپؐ کو مکہ میں داخل ہونے نہ دیں گے۔ اور یہ ہیں خالد بن ولید جسے انہوں نے اپنے سواروں کے ساتھ کرباع النعمیم تک بھیج دیا ہے۔ (یہ عثمان سے آٹھ میل آگے ایک بستی ہے) اس پر حضورؐ نے فرمایا ”ہلاکت ہے قریش کے لیے“ کھاگئی ان کو جنگ ان کا کیا بگڑا اگر وہ مجھے اور دوسرے عربوں کو لڑنے کے لئے چھوڑ دیتے“ اگر مجھے دوسرے عرب مار لیتے تو میں ان کا مقصد تھا اور اگر مجھے اللہ عربوں پر غالب کر دیتا تو یہ لوگ بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہوتے۔ اور اگر وہ اسام میں داخل نہ ہوتے تو اگر وہ لڑتے تو ان کے پاس ”قوت“ تو ہوتی۔ قریش غلط سوچ رہے ہیں۔ خدا کی قسم میں جہاد کرتا رہوں گا اس نظام کے لیے جس کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ مجھے غالب کر دے یا میری یہ گردن کٹ جائے پھر حضورؐ نے فرمایا ”کون ہے جو ہمیں اس راستے سے علیحدہ کسی دوسرے راستے پر لے جائے جس میں یہ لوگ نہ ہوں؟“

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھے عبد اللہ ابن ابوبکر نے بتایا کہ قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے کہا حضورؐ میں لے جاؤں گا۔ کہتے ہیں یہ ان کو سخت اور پتھر لے راستے سے لے گیا اور یہ راستہ پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ جب لوگ اس کے ساتھ چلے تو یہ راستہ لوگوں کے لیے بڑا دشوار ثابت ہوا۔ جب یہ دادی سے گزر کر آخر میں ہموار زمین کی طرف نکلے تو رسول اللہؐ نے لوگوں سے کہا پڑھو۔

نَسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَنَتُوبُ إِلَيْهِ ”ہم اللہ سے معافی چاہتے ہیں اور اس کی طرف لوٹتے ہیں“۔ تو لوگوں نے یہ دعا پڑھی تو حضورؐ نے فرمایا ”ایسا ہی ایک مرحلہ تھا کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ تم لسی دعا پڑھو تو انہوں نے انکار کر دیا تھا“ (یہاں رسول اللہؐ کا اشارہ اس طرف سے جو قرآن کریم میں آیا ہے۔

وَادْخُلُوا الْآبَاءَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةً نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ وَنَمُنُّ بِذِي الْمُنْتَفِعِينَ (۵۸)

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ (۵۹) (۵۸: ۵۹) ”مگر بستی کے دروازے سے سجدہ ریز ہو کر داخل ہونا اور کہتے جانا حطہ ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کس گے۔ اور نیکو کاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے“ مگر جو بات ان سے کہی گئی تھی ”ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔“

ابن شہاب زہری نے کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ اب دائیں جانب سے، صحن کے پیچھے سے منیۃ الرار کی راہ سے مکہ کے ٹھلے علاقے میں حدیبیہ کے مقام پر اترو، چنانچہ یہ لشکر اسی راہ سے چلا۔ جب قریش کے سواروں نے لشکر اسلام کے غبار کو دیکھا کہ یہ تو دوسرے راستے سے نکل گیا ہے تو وہ قریش کی طرف تیزی سے لوٹے۔ رسول اللہؐ جب منیۃ الرار سے گزر رہے تھے تو آپؐ کی اونٹنی بیٹھ گئی۔ تو لوگوں نے کہا کہ ”لوٹنی اڑ گئی“۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ”اڑی نہیں اور نہ اس کی ایسی عادت ہے لیکن دراصل اسے اس ذات نے روک لیا ہے جس نے ہاتھی کو مکہ سے روکا تھا۔ آج قریش اگر مجھے کسی ایسی بات کی دعوت دیں جس میں وہ صلہ رحمی کے طالب ہوں تو میں ان کی بات مان لوں گا“۔ اور بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ”وہ کوئی ایسی بات مجھ سے طلب کرے جس کا مقصد اللہ کی حرمات کو بچانا ہے تو میں ضرور ان کی بات مانوں گا“۔ اس کے بعد لوگوں سے فرمایا کہ یہاں قیام کرو، تو لوگوں نے کہا حضورؐ یہاں تو پانی نہیں ہے۔ جس کے اوپر ہم قیام کریں۔ حضورؐ نے ترکش سے ایک تیر نکالا اور اسے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو دیا۔ وہ شخص وہاں کے حوض میں سے ایک حوض میں گیا اور وہ حیر وہاں گاڑ دیا اور وہاں سے صاف پانی نکل آیا۔

جب حضورؐ اطمینان سے اتر گئے تو ان کے پاس ہدیل ابن ورقہ الخزاعی آیا اور ان کے ساتھ خزاعہ کے دوسرے کچھ لوگ بھی تھے۔ انہوں نے حضورؐ سے باتیں کیں اور آپؐ سے پوچھا کہ آپؐ کے آنے کا مقصد کیا ہے۔ تو آپؐ نے ان کو بتایا کہ میرے آنے کا مقصد لڑنا نہیں ہے۔ میں صرف زیارت کعبہ کے لیے آیا ہوں اور اللہ کی حرمات کا احترام کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے ان سے بھی وہ بات کی جو بشر بن سغیان سے کہی تھی۔ یہ لوگ واپس ہوئے اور قریش سے کہا، اے قوم قریش تم محمدؐ کے معاملے میں جلد بازی سے کام لے رہے ہو، محمدؐ جنگ کے لیے نہیں آئے۔ وہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں، قریش نے ان پر الزام لگایا اور برا بھلا کہا۔ قریش نے کہا کہ درست ہے کہ وہ جنگ کے لیے نہیں آیا لیکن ہم زبردستی مکہ میں داخل ہونے نہ دیں گے اور ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ عرب یہ کہیں کہ محمدؐ آیا اور زبردستی مکہ میں داخل ہو کر چلا گیا۔

خزاعہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت ہی مخلصین میں سے تھے۔ ان لوگوں نے حضورؐ سے معاہدہ امن اور دوستی بھی کر لیا تھا (بعد میں ان کے احوال آئیں گے) ان میں مسلمان تھے یا مشرک تھے، وہ مکہ میں ہونے والی کسی کارروائی کو حضورؐ سے نہ چھپاتے تھے۔ اس کے بعد قریش نے حضورؐ کے پاس مکرز بن حصص ابن الاغیف، ابو عامر ابن لوئی کے بھائی کو بھیجا۔ جب رسول اللہؐ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ”یہ ایک غدار شخص ہے“۔ جب یہ رسول اللہؐ کے پاس آیا تو اس کے ساتھ بھی رسول اللہؐ نے وہی باتیں کی تھیں جو ہدیل اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیں۔ یہ واپس ہوا اور اس نے بھی مشرکین کو رپورٹ دے دی۔ اس کے بعد قریش نے جلسہ ابن صخرہ یا ابن زبان کو بھیجا۔ یہ ان دنوں حبش والوں کے سردار تھے۔ (حبش ایک جگہ ہے جہاں بن الحارث ابن عبدمنافہ ذن کنانہ رہتے ہیں) جب اسے حضورؐ نے دیکھا تو فرمایا: ”یہ ایک ایسی قوم کا فرد ہے جو عبادت گزار ہیں تو قربانی کے جانور ہی اس کے سامنے کر دو کہ یہ اچھی طرح دیکھ لے“ جب اس نے دیکھا کہ قربانی کے جانور وادی میں سیلاب کی طرح آرہے ہیں۔ وہ بہت متاثر ہوا اور رسول اللہؐ سے ملنے سے قبل ہی واپس ہو گیا۔ ان جانوروں کا احترام کرتے ہوئے اور۔۔۔ قریش کو حالات بتائے تو انہوں نے اسے کہا، بیٹھو تم دیہاتی ہو، تمہیں کیا پتہ ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے عبد اللہ ابن ابوبکر نے بتایا کہ حلیس اس بات پر بہت غصہ ہوا اور کہا اے لائل قریش! ہم نے اس پر نہ تمہارے ساتھ حلف اٹھایا ہے اور نہ معاہدہ کیا ہے کہ ہم بیت اللہ سے ایسے لوگوں کو روکیں گے جو بیت اللہ کا احترام کرتے ہوئے آئیں۔ پھر اس نے کہا خدا کی قسم یا تو تم محمدؐ کو اس کام کے لیے چھوڑ دو گے جس کے لیے وہ آیا ہے یا میں جہش کے لوگوں کو اس طرح لے کر چلا جاؤں گا جس طرح ایک آدمی چلا جاتا ہے یعنی پوری طرح۔ تو انہوں نے اسے کہا 'خاموش رہو' ہمیں چھوڑ دو کہ ہم اپنے لیے کوئی راستہ طے کر لیں۔

زہری کہتے ہیں اس کے بعد انہوں نے عروہ ابن مسعود ثقفی کو حضورؐ کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا لائل قریش! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم حضرت محمدؐ کے پاس جس کو بھی بھیجے ہو اور وہ واپس آکر صحیح بات کرتا ہے تو تم اسے برابر بھلا کہتے ہو اور گالیاں دیتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ تم میرے والد کی جگہ پر ہو اور میں تمہارا بیٹا ہوں۔ (اس کی ماں عبد شمس سے تھی) تم پر جو معیبت آئی ہوئی ہے وہ میں نے سن لی ہے۔ اس لیے میں نے اپنی قوم میں سے ان لوگوں کو جمع کیا جو میری بات مان رہے تھے اور تمہاری مدد کے لیے میں آیا ہوں۔ تو انہوں نے کہا 'تو نے سچ کہا اور ہمارا تجھ پر یقین ہے۔ یہ گیا اور رسول اللہؐ کے پاس آپ کے سامنے بیٹھا اور کہا محمدؐ تو مختلف لوگوں کو جمع کر کے لایا ہے کہ ان سے اپنے انڈے پھوڑ دے۔ یہ ہیں قریش جن کے ساتھ کتوریاں اور بچوں والیاں نکلی ہیں اور انہوں نے شیعوں کے چڑے چنے ہوئے ہیں۔ وہ حلف اٹھا رہے ہیں کہ تمہیں زبردستی شہر میں داخل ہونے نہ دیں گے۔ اور خدا کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ لوگ کل تم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ حضرت ابوبکر حضورؐ کے سر پر کھڑے تھے۔ انہوں نے اسے دھمکایا (۱) اور کہا: کیا ہم رسول اللہؐ کو چھوڑ دیں گے؟ اس نے کہا حضورؐ یہ کون ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا یہ ابن ابوقحافہ ہیں۔ تو اس نے کہا خدا کی قسم اگر اس کا بھہ پر ایک احسان نہ ہوتا تو میں اس کو جواب دے دیتا، لیکن یہ بات اس کے بدلے رہ گئی۔

اس کے بعد وہ رسول اللہؐ کی داڑھی مبارک پکڑ کے بات کرنے لگا اور مغیرہ ابن شعبہ رسول اللہؐ کے سر پر کھڑے تھے اور لوہے میں ڈوبے ہوئے تھے یہ شخص جب بھی حضورؐ کی داڑھی مبارک کو پکڑتا حضرت مغیرہ ابن شعبہ اس کے ہاتھ کو جھٹک دیتے اور کہتے 'رسول اللہؐ کے چہرہ مبارک سے ہاتھ روک ورنہ یہ تمہارے جسم کے ساتھ نہ ہو گا۔ وہ کہتا تم پر تباہی ہو، تم کس قدر سخت اور کڑھت ہو۔ اس پر حضورؐ جہنم ہوئے۔ عروہ نے کہا کہ محمدؐ یہ کون ہیں آپ نے جواب دیا یہ تمہارے بھائی مغیرہ ابن شعبہ ہیں۔ اس پر عروہ نے کہا "لے غدار! تمہارے چوتروں کو تو میں نے کل ہی دھویا ہے۔"

ابن ہشام کہتے ہیں کہ اس کا واقعہ یہ ہے کہ مغیرہ ابن شعبہ نے اسلام سے قبل بنی مالک ابن ثقیف کے تیرہ آدمی قتل کیے تھے۔ اس طرح ثقیف کے دونوں قبائل کے درمیان ہجاء پیدا ہو گیا تھا۔ بنی مالک مغنولین کی قوم تھے اور بنی احناف مغیرہ کی قوم تھے۔ عروہ نے مغنولین کو ۱۳ دیتیں دیں اور اسی شر کو فرو کر دیا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں زہری نے یہ کہا ہے کہ حضورؐ نے اس کے ساتھ بھی وہی بات کی جو دوسروں کے ساتھ کی تھی اور کہا کہ میں جنگ کے لیے نہیں آیا۔ یہ شخص حضورؐ کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا لیکن اس نے اندازہ کر لیا کہ صحابہ کرام

(۱) اصل روایت میں ایسا فقرہ ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت ابوبکر صدیق نے یہ کہا ہو گا کیونکہ آپ نہایت ہی مذہب گفتگو کرتے تھے۔

حضورؐ سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو یہ لوگ وضو کے پانی کو اچک لیتے ہیں۔ اور اگر آپؐ تھوکتے ہیں تو یہ اسے بھی اچک لیتے ہیں۔ آپؐ کے بالوں میں سے کوئی بال اگر گرتا ہے تو یہ اس کو بھی محفوظ کر لیتے ہیں۔ یہ شخص قریش کے پاس گیا اور رپورٹ دی۔ ”نفل قریش میں کسریٰ کے دربار میں بھی گیا ہوں“ اور اس کی حکومت دیکھی ہے۔ اور قیصر کے پاس بھی اور اس کی حکومت بھی دیکھی ہے اور نجاشی کو بھی اس کی مملکت میں دیکھا ہے“ خدا کی قسم محمدؐ اپنی قوم میں جس طرح ہیں، اس طرح میں نے کوئی بادشاہ اپنے معین میں نہیں دیکھا۔ میں نے ان کے ساتھ ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ وہ کسی حال میں بھی ان کو کسی دشمن کے سپرد کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔“

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھے بعض اہل علم نے بتایا کہ رسول اللہؐ نے خراش ابن امیہ خزاعی کو بلایا اور انہیں قریش کے پاس بھیجا۔ آپؐ نے ان کو سواری کے لیے لونٹ دیا جسے ثعلب کہا جاتا تھا تاکہ وہ قریش کے شرفاء تک وہ بات پہنچا دیں کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ انہوں نے حضور اکرمؐ کے لونٹ کی ٹانگیں کاٹ دیں اور چاہا کہ اسے قتل کر دیں لیکن حبش کے لوگوں نے ان کو منع کر دیا۔ انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ واپس ہوئے اور رسول اللہؐ کو اطلاع دی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھے بعض ایسے لوگوں نے بتایا جن کو میں متہم نہیں کرتا، بروایت عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ سے، انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے کہ قریش نے چالیس ہزار افراد بھیجے یا پچاس ہزار۔ ان کو کہا کہ تم رسول اللہؐ کے لشکر کے ارد گرد چکر لگاؤ اور ان کے لیے عہد کے ساتھیوں میں سے کسی کو پکڑ لاؤ، یہ سب کے سب پکڑے گئے اور رسول اللہؐ کے پاس لائے گئے اور آپؐ نے سب کو معاف کر دیا اور جانے دیا۔ انہوں نے رسول اللہؐ کے لشکر پر حیر بھی برسائے اور پتھر بھی مارے۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمرؓ ابن الخطابؓ کو بلایا کہ ان کو اشراف قریش کے پاس بطور سفیر بھیجیں۔ انہوں نے فرمایا حضورؐ میں یہ خطرہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھے جان سے مار دیں گے اور مکہ میں اس وقت بنی عدیٰ ابن کعبؓ میں سے کوئی بھی نہیں ہے جو میری حفاظت کرے۔ قریش کو یہ معلوم ہے کہ میں ان کا کس قدر دشمن ہوں اور ان پر میں نے کس قدر سختیاں کی ہیں۔ ہاں، میں ایک ایسے شخص کو تجویز کرتا ہوں جو میرے مقابلے میں زیادہ موزوں ہے۔ یہ ہیں عثمانؓ ابن عفانؓ۔ رسول اللہؐ نے ان کو بلایا اور ان کو بھیجا کہ وہ قریش کو سمجھا دیں کہ میں لڑائی کے لیے نہیں آیا۔ اور میں صرف عمرے کے لیے آیا ہوں اور بیت اللہؐ کا احترام کرتا ہوں۔

ابن اسحاق نے بیان کیا کہ حضرت عثمانؓ رضی اللہ عنہ مکہ گئے۔ ان کو وہاں ابانؓ ابن سعیدؓ ابن العاصؓ ملے۔ مکہ میں داخل ہوتے ہوئے یا پہلے، اس نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کو اس وقت تک پناہ دے دی کہ وہ حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دیں۔ حضرت عثمانؓ گئے اور ابوسفیانؓ اور قریش کے زعماء کو ملے۔ اور رسول اللہؐ کا پیغام چھپے ہوئے مجھے یہ پیغام دے کر بھیجا گیا ہے۔ جب حضرت عثمانؓ پیغام سے فارغ ہوئے تو انہوں نے کہا کہ اگر تم طواف کرنا چاہتے ہو، تو کر لو۔ تو انہوں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا جب تک رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم پیسے طواف نہ کر لیں۔ قریش نے ان کو اپنے ہاں روک لیا۔ رسول اللہؐ اور مسلمانوں تک یہ اطلاع پہنچ گئی کہ حضرت۔۔۔ کو قتل کر دیا گیا ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبداللہؓ ابن ابی بکرؓ نے مجھے بتایا کہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ خبر سنی تو فرمایا ہم اس وقت

تک یہاں سے نہ ملیں گے جب تک ان سے لڑ نہیں لیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا یہ بیعت الرضوان تھی 'ایک درخت کے نیچے۔ لوگ کہتے تھے کہ رسول اللہؐ نے ان سے موت پر بیعت لی اور جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ہم سے موت پر بیعت نہیں لی تھی بلکہ یہ بیعت لی تھی کہ ہم بھاگیں گے نہیں۔ رسول اللہؐ نے لوگوں سے بیعت لی۔ ان میں سے ایک شخص بھی نہ رہا۔ سوائے ایک شخص جابر بن قیس کے جو بنو سلمہ سے تھا۔ حضرت جابر بن عبد اللہ فرماتے تھے کہ میں اسے اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنی اونٹنی کے پیلو کے ساتھ چٹا ہوا ہے۔ یوں کہ لوگوں کو نظر نہ آئے۔ اس کے بعد رسول اللہؐ کے پاس خبر آئی کہ حضرت عثمان کے بارے میں جو اطلاع آئی تھی وہ غلط تھی۔

ابن ہشام کہتے ہیں اور مجھے ایک میرے معتمد ذریعہ نے بتایا ہے اور انہوں نے اس شخص سے جس کے پاس سند تھی یہ بات نقل کی۔ انہوں نے ابن الولیک سے 'اور انہوں نے ابن عمر سے روایت کی کہ رسول اللہؐ نے حضرت عثمان کے لیے بیعت کی اور اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے پر مارا اور کہا یہ عثمان کے لیے ہے۔

ابن اسحاق نے کہا 'زہری کہتے ہیں کہ اس کے بعد قریش نے قبیلہ بنو عامر کے سہیل ابن عمرو کو بھیجا کہ تم جاؤ اور محمد ﷺ سے مصالحت کر لو اور صلح میں یہ شرط ضرور ہو کہ وہ اس سال چلا جائے تاکہ عرب یہ باتیں نہ کہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زبردستی مکہ میں داخل ہو گیا۔ سہیل آئے 'جب رسول اللہؐ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو آپؐ نے کہہ دیا کہ مظلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ صلح چاہتے ہیں کیونکہ انہوں نے سہیل کو بھیجا ہے۔ جب سہیل ابن عمرو رسول اللہؐ کے پاس پہنچے تو اس نے رسول اللہؐ سے گفتگو کی اور بہت طویل بات کی 'ایک دوسرے کے ساتھ مذاکرات ہوئے اور صلح کی بات ہونے لگی۔

جب تمام معاملات طے ہو گئے اور ماسوائے کچھ جانے کے اور کوئی بات باقی نہ رہی تو عمر ابن الخطابؓ کو ذکر لکھے 'حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا "ابوبکر کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول خدا نہیں؟" انہوں نے کہا: ہاں۔ کیا ہم مسلمان نہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آخر ہمارے دین میں ہم پر ذلت کیوں مسلط کی جا رہی ہے؟ تو حضرت ابوبکر نے فرمایا: عمر! تم آپؐ کے طریقے پر قدم رکھو۔ بس حضورؐ کے نقش قدم پر چلو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ رسول خدا ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ رسول اللہؐ ہیں۔ اس کے بعد وہ رسول اللہؐ کے پاس آئے اور کہا: رسول خدا کیا آپ رسول اللہؐ نہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا "ہاں"۔ اور کہا: کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ تو فرمایا: "ہاں"۔ کیا وہ مشرکین نہیں ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا: "ہاں"۔ تو انہوں نے کہا کہ پھر ہمارے دین میں ہمیں اس ذلت سے کیوں دوچار کیا جاتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: "میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں۔ میں اللہ کے احکام کا خلاف ورزی نہیں کر رہا۔ اس لیے اللہ مجھے بھی بھی ضائع اور برباد نہیں کرے گا"۔ حضرت عمر کہا کرتے تھے کہ میں۔۔۔ اس دن جو حرکت کی 'اس کی معافی کے لیے میں آج تک دوزخ میں رکھتا ہوں۔ صدقہ بھی دیتا ہوں 'نماز بھی پڑھتا ہوں 'غلاموں کو بھی آزاد کرتا ہوں 'ان باتوں کی ذر کی وجہ سے جو میں نے کیں 'جبکہ یہ باتیں کرتے وقت میں یہ خیال کرتا تھا کہ میں درست کر رہا ہوں۔

اس کے بعد حضورؐ نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو بلایا۔ اور فرمایا 'لکھو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" تو سہیل نے کہا ہمیں اس کی خبر نہیں اب نہ لکھو بسم اللہ تو حضورؐ نے فرمایا اچھا لکھو بسم اللہ اللہم اس کے بعد فرمایا لکھو "وہ وہ ہے جس پر محمد رسول اللہؐ اور سہیل ابن عمر کے درمیان مصالحت ہوئی"۔ اس پر سہیل نے کہا کہ اگر میں یہ شہادت دیتا کہ آپ رسول اللہؐ ہیں تو میں آپ کے ساتھ لڑا کیوں؟" آپ اپنا نام اور اپنے والد کا نام لکھیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ

لکھو ”یہ وہ صلح ہے جو محمد ابن عبداللہ اور سہیل ابن عمر کے درمیان طے ہوئی کہ لوگوں کے درمیان دس سال تک جنگ نہ ہوگی، لوگ ان سالوں میں امن سے رہیں گے، ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے، یہ کہ قریش میں سے کوئی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد کے پاس آئے گا تو وہ اسے واپس کر دے گا۔ اور جو شخص محمد سے قریش کی طرف آئے گا وہ اسے واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ اور ہمارے درمیان ایک ”مقتل برتن“ ہے یعنی ایک دوسرے پر حملہ نہ ہو گا اور اس میں کوئی غلبہ چوری نہ ہوگی اور نہ خیانت ہوگی، یہ کہ قبائل میں جو عمر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ معاہدہ کرے کر سکے گا، اور جو قریش کے ساتھ معاہدہ کرے کر سکے گا۔ (اس پر خزاعہ کے لوگ لٹھے اور کماہم محمد کے ساتھ ہیں اور بنو بکر لٹھے اور انہوں نے کماہم قریش کے عہد میں ہیں)۔ اور اس سال تم واپس ہو گے اور مکہ میں داخل نہ ہو گے اور جب اگلا سال ہو گا تو ہم مکہ سے نکل آئیں گے اور تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں داخل ہو گے اور تین دنوں تک رہ سکو گے۔ اور تمہارے پاس وہی اسلحہ ہو گا جو ایک عام سوار کے پاس ہوتا ہے۔ تلواریں نیام میں ہوں گی اور اس کے سوا کوئی اور ہتھیار نہ ہو گا۔

رسول اللہ اور سہیل ابن عمر دستاویز تیار کر رہے تھے کہ ابو جندل ابن سہیل ابن عمر زنجیروں میں بندھے ہوئے پہنچ گئے۔ یہ مشرکین کے ہاتھ سے حضور اکرمؐ سے ملنے کے لیے نکل آئے تھے۔ حضورؐ کے ساتھی جب اس ہم پر نکلے تھے تو انہیں فتح کا پورا پورا یقین تھا کیونکہ رسول اللہؐ کی خواب سے انہوں نے یہی سمجھا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ صلح طے ہو گئی اور اب ہم نے عمرے کے بغیر واپس ہونا ہے اور رسول اللہؐ نے صلح کی جو شرائط تسلیم کی ہیں وہ یہ ہیں تو لوگوں پر غم کے پہاڑ ٹوٹ گئے اور قریب تھا کہ لوگ مرجستے۔ جب سہیل نے ابو جندل کو دیکھا تو لٹھے اور اس کے منہ پر مارا اور گریبان سے پکڑ لیا اور پھر کہا: محمد اس کے آنے سے قبل یہ معاہدہ ہمارے درمیان طے نہ ہو گیا تھا؟ حضورؐ نے فرمایا ٹھیک ہے، طے ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اسے گریبان سے پکڑ کر باندھ رہا تھا تاکہ اسے قریش کی طرف واپس بھیج دے اور ابو جندل چیخ رہا تھا اے مسلمانو! کیا مجھے مشرکین کی طرف لوٹا دیا جائے گا کہ وہ مجھے اذیت دیں۔ اس پر مسلمانوں کی صفوں میں جو غم اور غصہ تھا وہ زیادہ ہو گیا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا ”ابو جندل صبر کرو اور برداشت کرو“ ان شاء اللہ تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ جو دوسرے ضعیف مسلمان ہیں ان کے لیے اللہ کوئی نہ کوئی راہ نکال لے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آپس میں صلح کر لی ہے۔ ہم نے بھی منظوری دے دی ہے اور انہوں نے بھی دے دی ہے۔ اور ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ ہم غداری کریں۔“ حضرت عمر بن الخطابؓ لٹھے اور ابو جندل کے پاس کھڑے ہو گئے اور کہا ابو جندل صبر کرو، یہ مشرک ہیں اور مشرکین کا خون کتے کے خون کے برابر ہے۔“ حضرت عمرؓ اپنی تلوار کا دستہ اس کے قریب کر رہے تھے۔ کہتے ہیں حضرت عمرؓ کی خواہش یہ تھی کہ ابو جندل یہ تلوار مجھ سے چھین لیں اور اپنے باپ کا کام ختم کر دیں۔ لیکن انہوں نے اپنے باپ کو ترجیح دی اور معاملہ ٹانڈ ہو گیا۔ اور ابو جندل سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کا کوئی خیال نہیں کیا البتہ حضورؐ کے عہد کا احترام کیا۔

جب یہ دستاویز تیار ہوئی تو اس پر مشرکین اور مومنین میں سے کئی لوگوں نے گواہ کے طور پر دستخط کیے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، عمر بن الخطابؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ، عبداللہ بن سہیلؓ، عمرؓ، سعد ابن ابوقحاصؓ، محمد ابن مسلمہؓ، مکرز بن حفصؓ (یہ اس وقت مشرک تھے) اور علی بن ابی طالبؓ اس دستاویز کے کاتب حضرت علیؓ تھے۔

زہری کہتے ہیں کہ جب معاہدے کا معاملہ ختم ہوا تو حضورؐ نے حکم دیا کہ قربانیاں کر دو اور بال کٹاؤ۔ کہتے ہیں خدا کی قسم کوئی شخص نہ اٹھا۔ یہاں تک کہ حضورؐ نے تین بار یہ احکام صادر کیے۔ جب کوئی نہ اٹھا تو حضورؐ ام سلمہ کے کمرے میں آئے اور ان کے سامنے یہ بات کی کہ لوگوں کی حالت تو یہ ہو گئی ہے۔ حضرت ام سلمہ نے کہا اے اللہ کے نبیؐ آپ اس کو پسند کرتے ہیں؟ آپؐ نکلیں کسی سے بات نہ کہیں یہاں تک اپنے ہدیہ کو قربان کر دیں اور اپنے حجام کو بلائیں کہ وہ بال مونڈ دے۔ رسول اللہؐ نکلے کسی سے کوئی بات نہ کی، آپؐ نے اپنے ہاتھ سے جانور کو دبح کیا اور اپنے حجام کو بلایا اور اس نے آپؐ کے مال کاٹے۔ جب انہوں نے دیکھا تو سب لٹھے اور قربانیاں کرنے لگے اور ایک دوسرے کے سر مونڈنے لگے۔ حالت یہ تھی کہ کہیں وہ ایک دوسرے کے سر کاٹ کر قتل نہ کر دیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن نجیح نے بیان کیا مجاہد سے ابن عباسؓ سے کہ حدیبیہ کے دن بعض لوگوں نے سر منڈوا لیے اور بعض نے بال چھوٹے کر دیئے تو رسول اللہؐ نے فرمایا منڈوانے والوں پر اللہ رحم کرے اس پر لوگوں نے کہا کہ بال چھوٹے کرنے والوں کو یا رسول اللہؐ؟ تو آپؐ نے دوبارہ کہا اللہ منڈوانے والوں پر رحم کرے۔ انہوں نے پھر پوچھا کہ بال چھوٹے کرنے والوں پر تو رسول اللہؐ نے فرمایا اور بال چھوٹے کرنے والوں پر۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا حضورؐ آپؐ نے صرف منڈوانے والوں کے لیے کیوں رحم کی درخواست کی تو حضورؐ نے فرمایا انہوں نے کوئی شک نہیں چھوڑا۔

زہری کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں سے قافلہ کو واپس ہونے کا حکم دیا یہاں تک کہ آپؐ مکہ اور مدینہ کے درمیان تھے کہ سورت الفتح نازل ہوئی۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے روایت کی ہے مجمع ابن حارثہ انصاری سے۔ یہ قرآن کریم کے قاریوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے کہا ہم حدیبیہ کے موقع پر حاضر تھے۔ جب ہم حدیبیہ سے لوٹے تو اچانک دیکھتے ہیں کہ لوگ اونٹ دوڑا رہے ہیں۔ لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہؐ پر وحی آگئی ہے ہم بھی لوگوں کے ساتھ گھوڑے تیز دوڑا کر آگے بڑھے۔ کراع انھیں کے پاس رسول اللہؐ اپنی سواری پر تھے اور لوگ آپؐ کے ارد گرد جمع ہو گئے تو آپؐ نے ان پر یہ سورت پڑھی۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا (۸: ۱) ”اے نبیؐ ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی۔“ رسول اللہؐ کے ساتھیوں میں سے ایک شخص نے کہا رسول خدا کیا یہ فتح ہے؟ آپؐ نے فرمایا ”ہاں اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے یہ البتہ فتح ہے۔“

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ عمر ابن الخطابؓ سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ ایک سفر میں تھے میں نے حضورؐ سے کسی چیز کے بارے میں تین بار پوچھا تو آپؐ نے جواب نہ دیا۔ تو میں نے کہا تجھے تیری ماں روئے لے لین خطابؓ تو نے رسول اللہؐ پر اصرار کیا اور بار بار دہرایا۔ تین بار اور آپؐ نے جواب نہ دیا۔ کہتے ہیں میں اپنی سواری پر چڑھ گیا اور اپنے اونٹ کو حرکت دی۔ تو میں ڈر کی وجہ سے آگے چل گیا۔ اس ڈر کی وجہ سے کہ شاید میرے بارے میں کوئی آیت نہ نازل ہو جائے۔ اچانک ایک شخص پکار رہا تھا اے عمرؓ تو میں دلہن ہوا اور مجھے یقین تھا کہ میرے بارے میں کوئی آیت نازل ہو گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج رات مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی

ہے جو مجھے دنیا اور مافیہا سے زیادہ محبوب ہے۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا (۱: ۴۸) لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ

(۲: ۴۸) ”اے نبیؐ ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمادے۔“
(امام بخاری، ترمذی، نسائی)۔

--- ○ ○ ○ ---

یہ تھی وہ فضا جس میں یہ سورت نازل ہوئی، اس فضا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی ہدایات اور الہامات پر مطمئن تھے۔ اس لیے آپ نے تمام فیصلے اور ارادے ترک فرما کر عالم بالا کی ہدایات پر عمل کیا اور ہر قدم اور ہر مرحلہ پر آپ عالم بالا کی ہدایات کے مطابق فیصلے فرماتے رہے اور یہ الہام آپ کو قدم قدم پر ہوتا رہا اور کوئی جد کرنے والا آپ کو اس سے جدا نہ کر سکا، خواہ وہ مشرکین میں سے ہو یا آپ کے ساتھیوں میں سے ہو جو آغاز میں اس صلح پر راضی نہ تھے۔ کیونکہ اس میں مشرکین کی ضد اور ہٹ دھرمی کو قبول کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں کو اطمینان عطا کر دیا تو وہ ہر خامندی، یقین اور قبولیت اور گہری اور عمیق قبولیت کی طرف لوٹ آئے جبکہ بعض صحابہ کرام تو آغاز ہی میں ایسے ہی مقام پر تھے۔ خلافت ابوبکر صدیقؓ۔ آپ کی روح نے کسی بھی وقت روح رسولؐ سے جدائی اختیار نہیں کی۔ آپ کو ہمیشہ ہر معاملے میں مکمل اطمینان رہا۔ اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ اطمینان آپ سے جدا نہیں ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ سورت کا آغاز رسول اللہ کے لیے بشارت کے ساتھ ہوا اور اس بشارت کی وجہ سے حضورؐ بہت خوش تھے۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا (۱: ۴۸) لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ وَ
يُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا (۲: ۴۸) وَ يَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَظِيمًا

(۳: ۴۸) ”اے نبیؐ ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دے۔ اور تمہیں سیدھا راستہ دکھائے اور تم کو زبردست نصرت بخشنے۔“

اور اس آغاز کے بعد مومنین کے لیے اللہ کے اس احسان کا ذکر کیا، کہ ان پر بھی اطمینان کا نزول ہوا۔ ان کے ایمان کا اعتراف کیا گیا اور ان کو بھی مغفرت اور ثواب کی بشارت دی گئی اور یہ کہ آسمانوں کے لشکر اللہ کے اختیار میں ہیں اور وہ تحریک اسلامی کی پشت پر ہیں۔

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (۴: ۴۸) لِيُدْخِلَ

الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَ يُكَفِّرُ عَنْهُمْ

سَيِّئَاتِهِمْ وَكَانَ ذَلِكَ عِنْدَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا (۵: ۴۸) ”یعنی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکنت نازل کی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھالیں۔ زمین و آسمان کے سب شکر اللہ کے بقدرت میں ہیں اور وہ علیم و حکیم ہے۔ تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے۔“ اور منافقین اور منافقات اور مشرکین اور مشرکات کے لیے اللہ کا عذاب اور غضب تیار ہے۔

وَيُعَذِّبُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّالِمِينَ بِاللَّهِ ظُنُّ السُّوءِ عَلَيْهِمْ ذَاتُ السُّوءِ وَاللَّهُ غَضِبَ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ

مَصِيرًا (۶: ۴۸) ”اور ان منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں۔ برائی کے پھیر میں وہ خود ہی آگئے“ اللہ کا غضب ان پر ہو اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم مہیا کر دی جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔“

اس کے بعد رسول اللہ کی بیعت کی طرف اشارہ ہے کہ جو آپ کی بیعت کریں گے وہ اللہ کی بیعت ہوگی۔ اور ان کے دل اس راہ سے براہ راست اللہ سے مربوط ہو گئے ہیں۔ اور اب وہ اللہ حی و قائموت کے ساتھ متعلق ہیں۔ گویا انہوں نے اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا (۸: ۴۸) لَتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَ تَعَزَّوْهُ وَتُقَرِّوْهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (۹: ۴۸) إِنَّ الَّذِينَ يَبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَى نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَى بِمَا

عَاهَدَ عَلَيْهِ اللَّهُ فَسَيُؤْتِيَهُ أَجْرًا عَظِيمًا (۱۰: ۴۸) ”اے نبی ہم نے تمہیں شہادت دینے والا بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ اے لوگو تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کا ساتھ دو اس کی تعظیم اور توقیر کرو اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔ اے نبی جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا اب جو اس عہد کو توڑے گا تو اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہو گا اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔“

اس بیعت اور اس سے پیچھے رہنے کے بارے میں اور حدیبیہ میں مومنین پر تبرے سے بھی ان دیہاتیوں پہ تبرہ

سخت ہے جو سرے سے اس سفر میں اکل ایمان کے ساتھ ہی نہ نکلے۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزرات کو پیش کرنے سے پہلے ہی رد کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی فرماتا ہے کہ ان کے دلوں میں تو بہت کچھ بدگمانیاں تھیں کہ رسول اللہ اور مومنین تو واپس آنے والے ہی نہیں۔ اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مستقبل میں ان کے ساتھ رویہ کیا ہونا چاہئے نیز یہ کہ عنقریب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوں گی اور بہت کچھ غنائم ملیں گے اور پھر ان کے منہ سے رال ٹپکے گی جو پیچھے رہ گئے تھے۔

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا
يَقُولُونَ بِالسَّيِّئَةِ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ
ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۴۸: ۱۱) بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ
يُنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَى أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزَيْنَ ذَلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنُّ
السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا (۴۸: ۱۲) وَمَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا
لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا (۴۸: ۱۳) وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَ
يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (۴۸: ۱۴) سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا
انْطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَانِمَ لَنَا خُذُوهَا ذُرُونَا نَتَّبِعْكُمْ يَرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلِمَ اللَّهِ قُلْ لَنْ
تَتَّبِعُونَا كَذَلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا
قَلِيلًا (۴۸: ۱۵) قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سُدُّعُونَ إِلَى قَوْمٍ أُولَى بَأْسٍ شَدِيدٍ
تَقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسَلِّمُونَ فَانْطَبِعُوا بِإِذْنِ اللَّهِ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ

مَنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۴۸: ۱۶) ”اے نبی“ بدوی عربوں میں سے جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے اب وہ آکر ضرور تم سے کہیں گے کہ ہمیں اپنے اموال اور ہال بچوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا، آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں، یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ بات کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی، ان سے کنا، اچھا یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملے میں اللہ کے فیصلے کو رد کر دینے کا کچھ اختیار رکھتا ہے۔ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاتا چاہے یا نفع بخشتا چاہے تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے، بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اللہ اور مومنین اپنے گھروالوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آ سکیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم سخت

بد باطن لوگ ہو۔“ اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے، جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے۔ اور وہ غفور و رحیم ہے۔ جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو، یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں، ان سے صاف کہہ دینا کہ ”تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔ اللہ پہلے ہی فرما چکا ہے۔“ یہ کہیں گے کہ ”نہیں بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو۔“ بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔ ان پیچھے چھوڑ جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لئے بدایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا۔ اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا۔“

یہاں ضروری تھا کہ پیچھے رہنے والوں میں معذور لوگوں کی بات بھی سامنے آ جائے۔ اور ان لوگوں کی بات بھی آ جائے جن پر جہاد فرض ہی نہ تھا یعنی وہ عاجز تھے اور یہ بھی عذر تھا۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَنْ يَتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيمًا (۴۸: ۱۷) ”ہاں لگے اندھا، لنگڑا اور مریض جہاد کے لیے نہ آئے تو کوئی حرج نہیں، جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا، اللہ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور جو منہ پھیرے گا اسے وہ دردناک عذاب دے گا۔“

تکلفین اور معذورین پر تبصرے کے بعد اب مومنین، ان کے موقف، ان کے خطبات پر بحث ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی کی گئی ہے۔ ان بشارتیں دی گئی ہیں۔ یہ لوگ جن کا ایمان قوی تھا اور جنہوں نے اپنا سب کچھ اللہ پر فروخت کر دیا تھا۔ اس پیراگراف میں اللہ تعالیٰ ان نفوسِ تدسیہ کی اصل حقیقت روشن فرماتا ہے۔ اعلان فرماتا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہے، ان پر احسان کرنے والا ہے اور ان کو ثبات قدم کرنے والا ہے۔ اور اللہ ان کو متعین طور پر جتنا ہے کہ ان لوگوں سے اللہ راضی ہو گیا ہے۔ وہ سب جو ایک درخت کے نیچے بیعت رضوان میں شریک ہوئے، ان کے دلوں میں جو کچھ تھا، وہ بھی بتا دیا۔ اور ان سے راضی ہو گیا۔ اور یہ فیصلہ کر دیا کہ عنقریب تم پر فتوحات کھلنے والی ہیں اور اموال غنیمت کے دروازے کھلنے والے ہیں۔ اور یہ ایک کائناتی فیصلہ ہے، یہ ایک عظیم حادثہ ہے جس پر یہ پوری کائناتی قوتیں گواہ ہیں۔ اس واقعہ سے دنیا متاثر ہوئی ہے اور انتظار میں ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا (۴۸: ۱۸) ”و مغایم کثیرہ یاخذونها“

وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۱۹:۴۸) وَعَدَّكُمْ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُ وَنَهَا فَعَجَلَ لَكُمْ هَذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا (۲۰:۴۸) وَأُخْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (۲۱:۴۸) وَلَوْ قَتَلْتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالْوَلُوكَ الْأَدْبَارُ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَ لِيَا وَلَا نَصِيرًا (۲۲:۴۸) سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا

(۲۳:۴۸) ”اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے‘ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا۔ اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی‘ ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی اور بہت سے مال غنیمت انہیں بخش دیا‘ جسے وہ عنقریب حاصل کریں گے۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ اللہ تم سے کثرتِ اسواں کا وعدہ کرتا ہے۔ جنہیں تم حاصل کرو گے۔ فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمہیں عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیا تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشنے۔ اس کے علاوہ دوسری اور غیبیوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے۔ جس پر تم بھی قادر نہیں ہوئے ہو‘ اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے‘ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ کافر لوگ اس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے‘ یہ اللہ کی سنت ہے جو پیسے سے چلی آرہی ہے۔ اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔“

مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ جو افراد مسلمانوں کو اذیت دینے آئے تھے‘ اللہ نے ان کو گرفتار کر دیا اور یہ بھی بتایا کہ جن لوگوں نے مسجد حرام سے لوگوں کو روکا ہے‘ ان کا عمل باری النظر میں غلط تھا۔ انہوں نے قربانی کے جانوروں کو اپنی جگہ تک پہنچنے نہ دیا۔ یہ بھی ان کی غلطی تھی‘ پھر اس سال مسلمانوں کو لڑائی سے روک دینے میں حکمت ہے۔ اور یہ مصالحت جو مسلمانوں کی سمجھ میں نہ آرہی تھی۔ اس پر اللہ نے ان کو راضی کر دیا اور ان کے دلوں پر سکینت نازل کر دی۔ اور یہ سب ان حکمتوں کی وجہ سے تھا جن کو اللہ تو دیکھ رہا تھا مگر ان کو نظر نہ آئی تھیں۔ اور یہ حکمتیں فتح مکہ اور غلبہ دین تھا اور یہ عمل اللہ کی تدبیر سے ممکن ہوا۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (۲۴:۴۸) هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيِ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ وَلَوْ لَا رِجَالٌ مُؤْمِنُونَ وَ نِسَاءٌ مُؤْمِنَاتٌ لَمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَّوُّوهُمْ فَتَصِيَّبُكُمْ مِنْهُمْ مَعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِي

رَحْمَتِهِ مَنْ يَسَاءُ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۴۸: ۲۵) اِذْ
 جَعَلْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلْنَا اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى
 رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقُّ بِهَا وَأَهْلُهَا وَكَانَ
 اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (۴۸: ۲۶) لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّءُوفَ بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ
 الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوفًا وَمُسْكِمِينَ وَمَقْصِرِينَ لَا تَخَافُونَ
 فَعْلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا (۴۸: ۲۷) هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ
 رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا

(۴۸: ۲۸) ”وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے“
 حالانکہ وہ ان پر ہمیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر کیا
 اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا۔ اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد
 و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم
 پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی روکی وہ اس لئے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر دے۔ وہ
 مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (لعل مکہ میں سے) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے۔ جب ان کافروں نے اپنے
 دلوں میں جاہلانہ حیثیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند
 رکھا کہ وہی اس کا زیادہ حق دار اور اس کے لٹل تھے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ فی الواقعہ اللہ نے اپنے رسول کو سچا
 خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے
 اور اپنے سرمنڈاؤ گے اور بال ترشاؤ گے اور ہمیں کوئی خوف نہ ہو گا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے اس
 لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے یہ قرعہ تم کو عطا فرمادی۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق
 کے ساتھ بھیجا ہے کہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔“

اور سورت کا خاتمہ ہوتا ہے انسانوں کے اس مجموعے کی تعریف پر جسے اس مقصد کے لیے اٹھایا گیا ہے جس کی
 مخصوص صفات ہیں اور ان صفات کی طرف توجہ اور انجیل میں بھی اشارہ موجود ہے کہ اس جماعت کو کامیابی اور
 مغفرت نصیب ہوگی۔

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكُوعًا

سُجَّدًا يَتَغَوَّنَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَ رِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْئَهُ فَازْرَهُ فَاسْتَعِظَ فَاكْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ

آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَ أَجْرًا عَظِيمًا (۲۹: ۴۸) ”محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب میں پاؤ گے۔ جود کے اثرات ان کے چروں پر موجود ہیں۔ جن سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت ثورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کوئیل نکالی۔ پھر اس کو تقویت دی پھر وہ گد رانی پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تا کہ کفار ان کے بھٹنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔“

یوں اس سورت کے نصوص کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور یہ سورت اس فضا میں زندہ نظر آتی ہے جس میں یہ نازل ہوئی۔ اور اس طرح واقعات کی صحیح تصویر بھی سامنے آتی ہے۔ قرآن کا انداز بیان دراصل تاریخی تسلسل کا نہیں ہے بلکہ وہ تربیتی ہدایات کے انداز میں بات کرتا ہے۔ ایک انفرادی واقع کے حوالے سے اصولی بات کی جاتی ہے اور ایک خاص پالیسی کو عالم گیر اصول میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا منفرد طریقہ ہے۔

اس سورت کی فضا مضامین اور اس سے ماقبل ترتیب مصحف میں پائے جانے والی سورت محمدؐ کی فضا اور مضامین پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سورت محمدؐ کے نزول کے بعد تین سالوں میں جماعت اسلامی کے شب و روز میں کس قدر تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ یاد رہے کہ رائج رائے یہی ہے کہ سورت محمدؐ اور سورت فتح کے نزول میں تین سال کا فاصلہ ہے۔ ان تین سالوں میں قرآن کریم نے اس جماعت کی جو تربیت کی اور جس طرح وہ قرآن کے زیر سایہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے گزری، اس کے نتیجے میں یہ جماعت اس مقام تک پہنچ گئی جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ہے۔

سورت فتح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم ایک نہایت ہی پختہ کار اور پختہ سوچ والی جماعت کو دیکھ رہے ہیں۔ اس نے اسلامی عقیدے کو لچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اس کا ایمانی معیار بہت اونچا ہو گیا ہے۔ اس جماعت کے افراد اب اسلامی دعوت اور اسلامی نظام کے غلبے کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔ اور اب وہ فضا نہیں ہے جو سورت محمدؐ کی تھی کہ اسے جہاد بالمال اور جہاد بالنفس میں حصہ لیتے کے لیے اکسایا جا رہا تھا۔ بلکہ اب یہ جماعت غلبہ اسلام کے لیے یہ سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہے۔ اور اس کی تیزی اور جذبے کو کنٹرول کرنے کے لیے اسے لگام دی جا رہی ہے، ٹھنڈا کیا جا رہا ہے کہ زرار کو ’صلح کرد‘ اس میں مصلحت ہے۔

اب یہاں اسے ایسی آیت کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ سورت محمدؐ میں تھی۔

فَلَا تَهِنُوا وَ تَدْعُوا إِلَى السَّلَامِ وَ أَنْتُمْ الْغَالِبُونَ وَ اللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَتْرُكَكُمْ أَعْمَالُكُمْ

(۳۵: ۴۷) ”پس بوجہ نہ ہو اور صلح کی درخواست نہ کرو! تم ہی غالب رہنے والے ہو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔“ اور پھر لہی ہدایات کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

هَآنَتُمْ هَؤُلَاءِ تَدْعُونَ لِنُفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخُلُ وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَبْخُلُ عَنْ نَفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ وَإِنْ تَتَوَكَّلُوا يَسْتَدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا

يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۳۸: ۴۷) ”دیکھو تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو! پس تم میں سے بعض لوگ بخل کر رہے ہیں حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے۔ اللہ تو غنی ہے۔ تم ہی اس کے محتاج ہو! اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔“

نیز یہاں اب اس جماعت کو جہاد پر ابھارنے کی بھی اس طرح ضرورت نہ تھی جس طرح سورت محمد میں ضرورت تھی وہاں ان کو آمادہ کیا گیا تھا کہ جہاد میں تمہارے لیے بڑا اعزاز ہے اور نہ ہی یہ کہنے کی ضرورت تھی کہ جہاد میں تمہاری آزمائش ہو رہی ہے۔

ذَلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَكِنْ لِيَبْلُوَ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ وَالَّذِينَ قَتَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَنْ يُضِلَّ أَعْمَالُهُمْ (۴۷: ۴) سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (۴۷: ۵) وَ

يَدْخُلُهُمُ الْجَنَّةُ عَرَفَهَا لَهُمْ (۴۷: ۶) ”اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے منٹ لیتا مگر تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا! ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کر دے گا جس سے وہ ان کو وقف کرا چکا ہے۔“

اب یہاں کا نقشہ بالکل مختلف ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دل میں سکوں کی ایک کیفیت نازل فرمائی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر حدیبیہ کے موقع پر کفار سے ٹکرا جانے کا جو جوش تھا اسے فی الحال ٹھنڈا کیا جائے۔ اب ان کے جوش انتقام اور غیرت کو ٹھنڈا کیا جا رہا تھا اور اللہ کے احکام اور رسول اللہ کی حکیمانہ پالیسی پر انہیں مطمئن کیا جا رہا تھا کیونکہ اس وقت صلح اور نرمی ہی میں مصلحت تھی۔ یہاں اب لوگوں نے جوش و خروش سے بیعت رضوان کی اس کی تعریف ہو رہی ہے۔ اور یہاں اب مسلمانوں کی جماعت کی وہ تعریف ہے جو اس سورت کے آخر میں ہے۔

ہاں ایک بات اس اصول کے خلاف نظر آئے گی کہ بیعت رضوان کی تعریف کی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ نَكَتَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَى نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهِ اللَّهُ فَمِنْهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ (۴۸: ۱۰)

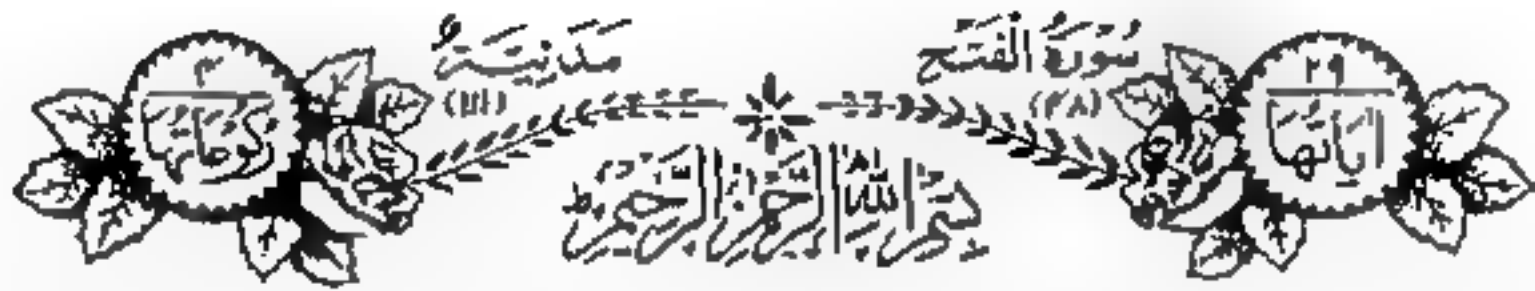
”اے نبیؐ جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال ان کی اپنی ذات پر ہو گا۔ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے اللہ عظیم اس کو اجر عطا کرے گا۔“ اس میں دراصل جہاد پر ابھارنے سے زیادہ مجاہدین کی تکریم اور بلند مرتبے کا اظہار ہے کہ یہ عہد انہوں نے دراصل اللہ سے کیا تھا۔ اور اس عہد کو توڑنے کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو مدینہ کے گرد جہاد سے رہ گئے تھے۔ اسی طرح منافقین اور منافقات کی مذمت بھی ایک عمومی بات ہے جو اس دور کے ہر سورت میں ہے لیکن یہاں سورت محمدؐ کی طرح مستقل نہیں ہے۔ سورت محمدؐ کے دور میں یہ منافقین اور یہودی گٹھ جو ڈرکتے تھے تو جس طرح مسلمانوں کے نفوس کے اندر تبدیلی آگئی تھی اسی طرح خارجی حالات میں بھی کافی تبدیلی آگئی تھی۔

اسی طرح اس سورت کی فضا سے معلوم ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں کی قوت بمقابلہ مشرکین بہت زیادہ ہے۔ یہاں آنے والی فتوحات کی طرف صریح اشارات ہیں۔ پھر یہ مہین گوئیاں ہیں کہ آئندہ جو فتوحات اور اموال غنیمت آنے والے ہیں حدیبیہ کی محم سے پیچھے رہنے والے ان کے اندر بہت دلچسپی لیں گے اور معذرتیں کرس گے لیکن وہ اب محروم ہیں اور یہ کہ یہ دین ہی غالب ہو گا۔ ان سب امور سے معلوم ہوتا ہے کہ سورت محمدؐ کی فضا سے یہاں سورت فتح کی فضا بہت ہی مختلف ہے۔

لوگوں کی نفسیاتی تربیت جماعت مسلمہ کے شب و روز اور مدینہ کے ماحول کی مجموعی حالت میں اب ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ جو لوگ قرآنی آیات و نصوص سے سیرت نبویؐ کا مطالعہ کرتے ہیں ان کو یہ بات بھی طرح سمجھ میں آتی ہے۔ یہ تبدیلی قرآنی منہاج تربیت اور نبوی تربیت کا نتیجہ ہے۔ قرآن و سنت کی تربیت کے نتیجے میں یہ جماعت اب اس پوری دنیا کی منفرد جماعت ہے۔ اس تبدیلی میں ان انسانی جماعتوں کی لیڈر شپ کے لیے بھی اشارات ہیں کہ اس کو تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے کہ اگر کارکنوں میں نقص، ضعف، ماضی کے اثرات، جس دور میں کارکن ہوں اس دور کی کمزوریاں ہوں یا اس دنیا کے مفادات، گوشت و پوست کی ضروریات سے وہ متاثر ہوں تو انہیں برداشت کرنا چاہئے۔ یہ سب باتیں اس منفرد جماعت کے اندر بھی ابتدائی دور میں تھیں لیکن برداشت، حکمت، بہادر تربیت نے لوگوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ یاد رہے کہ مختلف ادوار کے مختلف تجربات بھی تبدیلی اور تربیت میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ مختلف واقعات میں تربیت کے مختلف مواقع ہوتے ہیں۔ یوں اخلاقی، تربیتی اور انضباطی معیار بتدریج نہایت بڑھ جاتا ہے اور مادی خواہشات شفاف ہوتی چلی جاتی ہیں اسی طرح خاندانی اور روایاتی کمزوریاں دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ماضی سے انسان اپنے ساتھ جو کمزوریاں لاتا ہے وہ بھی دور ہو جاتی ہیں۔ اور دلوں کا افق وسیع اور اعلیٰ ہوتا جاتا ہے۔ یوں نصب العین بلند ہوتا ہے اور نیچے دیکھنے والے دور افق میں بلند یوں پر رد فضاں دیکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارے لیے رسول اللہؐ کی سیرت میں بہترین نمونہ ہے۔ اور قرآن کا منہاج تربیت ہمارے لیے ایک صراطِ مستقیم ہے۔

درس نمبر ۲۲۲ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۱۷



إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا ۖ لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ
وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝ وَينصرك الله نصراً
عَظِيماً ۝

”اے نبی! ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دے اور تمہیں مید ہاراستہ دکھائے اور تم کو زبردست نصرت بخشنے۔“

اس سورت کا آغاز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایک فضل و کرم کے ذکر سے ہوتا ہے۔ کہ آپ کو فتح مبین بھی عطا کر دیا گیا ہے اور آپ کے لگے اور پچھلے سب ذنوب معاف کر دیئے گئے۔ آپ پر اپنی نعمتیں تمام ہو گئیں، آپ کو مستقل ہدایت نامہ دے دیا گیا اور ایک زبردست نصرت اور فتح بھی دے دی گئی۔ اور یہ ہے صلہ اس گھرے اطمینان اور مبر کا جن کے ساتھ آپ نے ہدایت الہیہ پر عمل کیا۔ اور اس بات کا کہ آپ نے اللہ کی جانب سے وحی اور الہامات و ہدایات پر پورا پورا عمل کیا۔ اپنی تمام خواہشات اور ارادوں کو ترک کر دیا اور اللہ کی نگرانی پر پورا پورا بھروسہ کیا۔ آپ نے ایک خواب دیکھا اس کے مطابق آپ حرکت میں آ گئے۔ آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی اور لوگ جیخسے کہ ”قصواء“ نے چلنے سے انکار کر دیا۔ اڑ گئی۔ لیکن آپ نے اس سے کوئی اور اشارہ لیا۔ ”قصواء اڑ نہیں گئی اور نہ اس کی یہ عادت ہے لیکن اسے اس ذات نے روک لیا ہے جس نے مکہ سے ہاتھی کو روکا تھا۔ اگر قریش آج کوئی بھی ایسا منصوبہ مجھے دس جس میں صلہ رحمی کی درخواست ہو تو میں منظور کروں گا۔“ حضرت عمر بن الخطاب آپ سے نہایت ہی جوش میں پوچھتے ہیں ”کیا ہمیں اپنے دین میں ذلت نہیں دی جا رہی ہے؟“ آپ جواب دیتے ہیں ”میں اللہ کا بندہ ہوں، رسول ہوں، میں اس کے حکم کی مخالفت نہیں کر سکتا اور ان شاء اللہ وہ مجھے ضائع نہیں کرے گا۔“ یہ تو یہی صلح کی بات لیکن جب اطلاع

آتی ہے کہ حضرت عثمانؓ قتل ہو گئے ہیں تو آپؐ فرماتے ہیں ”ہم اس وقت تک ڈلے رہیں گے جب تک قوم سے انتقام نہ لے لیں۔“ لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا جاتا ہے۔ یہ بیعت بیعت الرضوان قرار پاتی ہے اور اس سے ان لوگوں کو بھلائی نصیب ہوتی ہے اور یہ ان کے لیے رتبہ بلند تھا جنہوں نے اس میں حصہ لیا۔

یہ سورت دراصل فتح عظیم تھی۔ اور صلح حدیبیہ بھی دراصل فتح عظیم تھی، کیونکہ اس کے نتیجے میں بے شمار فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ یہ دعوت اسلامی کے زلویہ سے بھی فتح تھی۔ امام زہری کہتے ہیں اس سے قبل اسلام کو جو فتوحات ملی تھیں یہ ان سے بڑی فتح تھی۔ اس سے قبل یہ تھا کہ لوگ جہاں بھی ملتے جنگ ہوتی۔ جب صلح ہو گئی اور حالت جنگ ختم ہو گئی اور لوگوں کو ایک دوسرے کی جانب سے امن نصیب ہو گیا، ملنا جلتا آزاد ہو گیا تو انہوں نے اسلام کے موضوع پر بحث و مکالمہ شروع کر دیا۔ اسلام کے بارے میں جس شخص نے معقول گفتگو کی وہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ صلح حدیبیہ اور فتح کے درمیان دو سالوں میں اس قدر لوگ مسلمان ہو گئے کہ ان کی تعداد سابقہ تمام عرصے کے مسلمانوں کے برابر تھی یا زیادہ تھی۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ زہری کی بات پر دلیل یہ ہے کہ جابر بن عبد اللہ کے قول کے مطابق حضور اکرمؐ حدیبیہ کی مہم پر چودہ سو افراد لے کر نکلے تھے لیکن ٹھیک دو سال بعد جب مکہ پر حملہ ہوا تو آپ کے ہم رکاب دس ہزار زائد افراد تھے۔ اور اس عرصہ میں خالد ابن ولید اور عمر ابن العاص رضی اللہ عنہما مسلمان ہوئے۔

زمین پر یہ فتح یوں تھی کہ مسلمان قریش کے شہر سے محفوظ ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موقع مل گیا کہ جزیرۃ العرب کو یہودیوں کے باقی خطرات سے پاک فرمادیں۔ بنی قینقاع، بنی النضیر اور بنو قریظہ کو اس سے قبل ختم کر دیا گیا تھا۔ یہ خطرہ اب خیبر کے محفوظ قلعوں میں موجود تھا۔ کیونکہ خیبر کے یہ قلعے شام کے راستے میں واقع تھے۔ چنانچہ حدیبیہ کے بعد اللہ نے خیبر کا علاقہ بھی مسلمانوں کو دے دیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے علاقے اور خنائم کو صرف ان لوگوں میں تقسیم کیا جو حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے ان کے علاوہ کسی کو کچھ نہ دیا۔

یہ مدینہ کے مسلمانوں اور مکہ کے قریش کی طویل جنگ میں مسلمانوں کی فتح تھی۔ استاذ محمد درودہ اپنی کتاب سیرۃ الرسول میں فرماتے ہیں :

”اس میں شک نہیں کہ یہ صلح جسے قرآن کریم نے فتح قرار دیا اسے ہر مفہوم میں مسلمانوں کی فتح سمجھنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے سیرۃ النبی کے فیصلہ کن واقعات میں شمار کرنا چاہئے۔ یہ واقعہ اسلام کی تاریخ میں اسلام کی قوت اور استحکام کا سبب بنا۔ ایک بڑا مفید واقعہ تو وہ بہر حال تھا ہی۔ اس صلح کے ذریعہ قریش نے پہلی مرتبہ اسلامی حکومتِ مدور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو تسلیم کیا اور مسلمانوں کو انہوں نے اپنے برابر کی قوت تسلیم کیا بلکہ قریش نے اسلامی حکومت کا دفاع کیا۔ اس سے پہلے دو سالوں میں قریش نے دو مرتبہ مدینہ پر حملہ کیا اور جنگ احزاب تو حدیبیہ سے ایک سال قبل ہوئی تھی جس میں قریش بے شمار احزاب کو لے کر مدینہ پر چڑھ آئے تھے تاکہ مومنین اور اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اور غزوہ احزاب کے درمیان لیل ایمان کی صفوں میں بے حد اضطراب پیدا ہو گیا تھا اور ایک عام بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ مدینہ پر حملہ کرنے والوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی اور جنگ احزاب کا پورے عالم عرب پر اثر تھا کیونکہ تمام عرب لیل قریش کی پیروی کرتے تھے اور وہ قریش کے سخت موقف سے متاثر ہوتے تھے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ مدینہ کے ارد گرد کے دیہاتی اور منافق یہ پیش گوئیاں کرتے تھے کہ اس جنگ سے مسلمان کسی صورت میں صحیح سالم واپس نہ آسکیں

گئے اور وہ ہر قسم کا سوائے ظن رکھتے تھے۔ تو اس صورت میں اس فتح کی اہمیت اور ظاہر ہو جاتی ہے اور اس کے اثرات دور رس ثابت ہوتے ہیں۔“

”بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو الہام تھا، وہ درست تھا اور یہ کہ قرآن کریم نے بھی اس کی تائید کر دی۔ اور اس صلح کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت ہی عظیم مادی معنوی اور دعوتی فوائد حاصل ہوئے۔ نیز جنگی اور سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی پوزیشن بہت ہی مضبوط ہو گئی۔ قبائل کی نظروں میں مسلمان ایک مضبوط قوت بن گئے اور واپس ہوتے ہی مدینہ کے گرد کے جو قبائل پیچھے رہ گئے تھے وہ آکر عذرات پیش کرنے لگے۔ مدینہ کے اندر منافقین کی آواز دہنے لگی اور وہ کمزور ہو گئے۔ اور ہر طرف سے عرب و فود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنا شروع ہو گئے اور یہودیوں کی قوت کو خیر اور اس کے آس پاس کے علاقوں سے ہٹا دیا گیا۔ یہ لوگ شام کے راستے پر پھیلے ہوئے تھے۔ حضور اکرمؐ کے لیے ممکن ہو گیا کہ آپؐ بعد یمن اور بلقا جیسے دور دراز علاقوں میں فوجی مہمات ارسال کریں۔ اور ٹھیک دو سال بعد حضورؐ نے مکہ کو دس ہزار کے لشکر کے ساتھ فتح کیا۔ یہ فیصلہ کن فتح تھی کہ جب اللہ کی مدد آئی اور فتح مکمل ہوئی اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگے۔“

میں یہ کہتا ہوں کہ ان تمام پہلوؤں کے سوا ایک دوسرا پہلو ہے جس کے زلویہ سے یہ فتح عظیم تھی۔ اس سے اسلام کے لئے لوگوں کے دل و دماغ فتح ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں بیعت الرضوان کا واقعہ پیش آیا جس میں مسلمانوں نے موت اور عدم فرار پر بیعت کی اور اللہ نے اعلان کر دیا کہ درخت کے نیچے جن لوگوں نے بیعت کی ان سے اللہ راضی ہو گیا ہے۔ اور قرآن میں اس اعلان کا اندراج ہو گیا اور پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی لیڈر شپ اور انقلابی جماعت کے خدو خال اور اوصاف کو اس صورت میں اس فتح کے نتیجے میں قلم بند کر دیا گیا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا
سُجَّدًا يُبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ
مِثْلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمِثْلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْئَهُ فَازْرَهُ فَاسْتَغْلَظَ
فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سَوْفِهِ يَعْجِبُ الزُّرَّاعُ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَ

عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (۲۹: ۴۸) ”محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طب میں پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں۔ جن سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونیل نکالی۔ پھر اس کو تقویت دی پھر وہ گد رلی پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور

بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔“

میں کتنا ہوں اسلامی دعوت کی تاریخ میں یہ بہت ہی بڑی فتح ہے جو کسی جماعت کو حاصل ہوئی۔ اس کے آثار کافی دیر تک اسلامی تاریخ میں نکلتے رہے۔

پھر اس کے نتیجے میں سورت فتح نازل ہوئی۔ جس پر حضور اکرم بہت ہی خوش تھے۔ حضور پر اللہ کی رحمتوں کی بارش یوں ہوئی کہ اگلے پچھلے قصور معاف ہوئے اور آپ کے ساتھی مومنین پر یہ فیض ہوا کہ اللہ ان سے راضی ہوا۔ حضور کو مکمل ہدایت دی گئی اور عظیم نصرت دی گئی اور پھر جماعت اہل ایمان کو تورات، انجیل اور قرآن کا سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ حضور اکرم نے فرمایا ”گزشتہ رات مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی جو اس ترم دولت سے زیادہ قیمتی ہے جس پر کبھی سورج طلوع ہوا ہے۔“ اور آپ نے رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ ان نعمتوں پر آپ اور طویل ترین نمازیں پڑھتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ نماز پڑھنے کے لیے اٹھتے تو آپ کے پاؤں سوج جاتے۔ حضرت عائشہؓ نے آپ سے عرض کیا کہ اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے ہیں تو آپ کیوں اس قدر تکلیف کرتے ہیں اس پر حضور نے فرمایا: ”اے عائشہ! کیا میں فلز گزلبندہ نہ ہوں۔“

یہ افتتاح تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ تھا۔ اس کے بعد پایا جاتا ہے کہ اس فتح کے دریغ مسلمانوں پر کس قدر انعامات کیے گئے اور اللہ نے اپنے دست قدرت سے کس طرح ان کے دلوں پر سیکڑا مارا۔ اور آخرت میں ان کے لیے یہ بخشش اور فوز عظیم کے انعامات ہوں گے۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ
إِيمَانِهِمْ ۚ وَ اللَّهُ جُنُودَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَ كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ لِيَدْخُلَ
الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَ يُكَفِّرُ
عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ ۚ وَ كَانَ ذَلِكَ عِنْدَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا ۝ وَ يُعَذِّبُ الْمُنَافِقِينَ وَ
الْمُنَافِقَاتُ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّالِمِينَ ۚ بِاللَّهِ ظَنُّ الشُّوْءِ عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ
السُّوْءِ ۚ وَ غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ أَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۚ وَ سَاءَتْ
مَصِيرًا ۝ وَ لِلَّهِ جُنُودُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَ كَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝

وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھالیں۔ زمین اور آسمانوں کے سب لشکر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ عظیم و حکیم ہے۔ (اس نے یہ کام اس لیے کیا ہے) تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہوس بہہ رہی ہوں گی اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے..... اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور ان منافق مردوں اور عورتوں اور

مشرک مردود اور عورتوں کو سرمایہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں۔ برائی کے پھیر میں وہ خود ہی آگئے، اللہ کا غضب ان پر ہو اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم مہیا کر دی جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ زمین اور آسمان کے لشکر اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔“

سکینہ کا لفظ ایک معنوی تعبیر اور تصویر اور پرتو پر دلالت کرتا ہے۔ جب کسی قلب پر سکینہ نازل ہو تو وہ مطمئن، خوش اور پروتار ہوتا ہے۔ ات یقین، بھروسہ اور ثبات حاصل ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ سرسیم خم کر دیتا ہے۔ اور اللہ کے ہر حکم پر راضی ہوتا ہے۔ اور ایسا شخص پھر نہایت بادقار ہوتا ہے۔

اس واقعہ پر مسلمانوں کے دل کئی وجوہات سے جوش میں آ جاتے تھے اور ان پر مختلف قسم کے تاثرات کا دہاؤ تھا۔ ایک تو لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی تعبیر یہ کر رکھی تھی کہ آپ مسجد حرام میں اسی سال داخل ہوں گے۔ پھر یہ کہ قریش نے یہ شرط رکھ دی کہ آپ اس سال واپس ہو جائیں اور اگلے سال عمرہ کریں اور حضورؐ نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ حالانکہ انہوں نے احرام باندھ لیا تھا اور ہدی کے گلے میں شعار باندھ لیا تھا۔ اور یہ امور ایسے تھے جو بعض جذباتی لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہ اس وقت سخت جوش میں تھے کہ آیا ہمیں یہ نہ بتایا گیا تھا کہ ہم بیت اللہ کو جائیں گے اور طواف کریں گے۔ ابوبکرؓ جن کا دل حضور اکرمؐ کے ساتھ دھڑکتا تھا نے فرمایا کیا آپؐ نے یہ فرمایا تھا کہ اسی سال تم عمرہ کرو گے؟ تو انہوں نے کہا اس سال کا تو نہیں کہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ”پس تم آؤ گے اور طواف کرو گے۔“ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو چھوڑا اور حضور اکرمؐ کے پاس پہنچے اور حضورؐ سے کہا: ”کیا آپؐ نے نہ بتایا تھا کہ ہم بیت اللہ کو جائیں گے اور طواف کریں گے؟“ حضورؐ نے فرمایا ”درست“ لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ تم اسی سال عمرہ کرو گے؟“ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا ”نہیں“۔ حضورؐ نے فرمایا ”بے شک تم آؤ گے اور طواف کرو گے۔“ یہ باتیں تھیں جو دلوں میں لاوے کی طرح لٹل رہی تھیں۔

پھر مومنین قریش کی شرائط پر بھی سخت برہم تھے۔ یہ کہ اگر کوئی مسلمان اپنے دل کی اجازت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ جاتا ہے تو اسے تو واپس کر دیا جائے گا لیکن اگر کوئی مسلمان، مسلمانوں کی اجازت کے بغیر مکہ چلا جاتا ہے تو اسے واپس نہ کیا جائے گا۔ پھر انہوں نے اپنی جاہلیت کی وجہ سے بسم الرحمن الرحیم کا نام کٹوا کر بسمک اللہم کر دیا۔ پھر انہوں نے آپ کے نام سے رسول اللہ کا لفظ کٹوا دیا۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے سہیل کے کہنے کے مطابق (رسول اللہ) کا لفظ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ نے اسے خود محو کر دیا اور کہا ”اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں رسول ہوں۔“

مسلمانوں کی بہادری، دینی حمیت اور جذبہ جہاد اور مشرکین کے ساتھ لڑنے کا جذبہ تو اس اجتماعی بیعت سے ظاہر ہے جو انہوں نے کی۔ لیکن معاملہ چونکہ اچانک صلح، امن اور واپسی پر منتج ہو گیا اس لیے مسلمان اسے ٹھٹھے پیڑوں برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کی طرف سے جذبات کا اظہار ہوا۔ اس طرح رسول اللہؐ کے فرمان کے باوجود انہوں نے قربانیاں نہ کیں، سر نہ منڈوائے، باوجود اس کے کہ حضورؐ نے تین مرتبہ احکام صادر فرمائے۔ حالانکہ وہ حضورؐ کے احکام پر مرثیے والے تھے۔ عروہ ابن مسعود ثقفی نے قریش کو جو رپورٹ دی اس سے مسلمانوں کی حالت ظاہری اور لب حالت یہ ہے کہ جب حضورؐ نے قربانی ذبح کر دی اور سر منڈوا لیا تب جا کر انہوں نے جانور ذبح کیے اور سر منڈوائے۔

غرض ان کو اس واقعہ نے سخت ہمارا تھا۔ اب جب کہ وہ اطاعت کی طرف آگئے تو پھر بھی دہشت زدہ تھے۔ یہ لوگ مدینہ سے عمرہ کی نیت سے نکلے تھے۔ جنگ لڑنے کا تو ارادہ ہی نہ تھا۔ نہ نفسیاتی لحاظ سے اور نہ مادی لحاظ سے وہ جنگ کے لیے تیار تھے۔ لیکن جب قریش نے سخت موقف اختیار کیا 'پھر یہ خبر آئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ پھر قریش نے کچھ موگ بھیجنوں نے مسلمانوں کے لشکر پر تیر اور پتھر پھینکے۔ جب رسول اللہؐ نے جنگ پر بیعت چاہی تو وہ تہہ دل سے تیار ہو گئے۔ لیکن اس بیعت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کے اندر جنگی حالت اچانک نہ آئی تھی۔ یہ جنگی حالت بالکل اچانک تھی یہ لوگ جنگ کے لیے نکلے نہ تھے۔ اس وجہ سے بھی مسلمانوں کے دلوں کے اندر جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ یہ چودہ سو تھے۔ اور قریش اپنے گھروں میں تھے اور ان کے ساتھ اطراف مکہ کے مشرکین بھی معاون و مددگار تھے۔

جب انسان ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر اس آیت پر غور کرتا ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ (۴۸: ۴) ”وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی“ تو انسان لفظ اور مفہوم دونوں کی خوبصورتی اور محاسن کو محسوس کرتا ہے اور اس وقت جو صورت حالات تھی وہ بھی پوری طرح ذہن میں بیٹھ جاتی ہے اور اچھی طرح محسوس ہوتی ہے کہ اس سکینت کی ٹھنڈک نے کس طرح جلنے والے دلوں کو فوراً سکون بخشا ہو گا اور کس طرح ان کو بحال کر دیا ہو گا۔ چونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کے دلوں کی حالت کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ جو جوش ہے وہ جوش ایمان ہے 'جو محبت اور غیرت ہے وہ محبت اسلامی اور قربت ایمانی ہے۔ کسی مفاد یا جاہلیت کے لیے نہیں ہے۔ اس لیے اللہ نے یہ سکینت نازل کی۔

لِيَزِدُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ (۴۸: ۴) ”تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھا لیں“۔ طمانیت وہ درجہ ہے جو ایمان کے جوش و خروش کے بعد آتا ہے۔ اس میں بھرپور اعتماد ہوتا ہے۔ کوئی بے چینی نہیں ہوتی، ایسی رضامندی ہوتی ہے جو اعتماد و یقین پر مبنی ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس بات کو نمایاں کیا جاتا ہے کہ نصرت اور غلبہ نہ تو ناممکن ہے۔ اور نہ ہی مشکل ہے۔ اگر اللہ کی حکمت کا تقاضا ہوتا تو یہ اللہ کے لیے بہت ہی آسان ہے۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے 'ایک اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے۔ اللہ کی افواج لا تعداد ہیں 'ان پر کوئی قوت غالب نہیں آسکتی۔ لیکن اللہ نے غلبے کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔

وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمُوتِ وَ الْأَرْضِ وَ كَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (۴۸: ۴) ”زمین اور آسمانوں کے لشکر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے“۔ یہ اللہ کی حکمت ہے اور اس کا علم ہے جو معاملات کو اپنی مرضی سے چلاتے ہیں۔

اور اس علم اور حکمت ہی کا تقاضا تھا کہ۔

أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ (۴۸: ۴) لِيَزِدُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ (۴۸: ۴) ”جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور پڑھالیں۔“ تاکہ ان کے لیے اللہ نے جو بڑی کامیابی مقدر رکھی ہے، وہ پوری ہو جائے۔

لِيَدْخُلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَ يُكْفَرُ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَ كَانَ ذَلِكَ عِنْدَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا (۴۸: ۵) ”تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے۔“

اگر اس بات کو اللہ فوز عظیم قرار دیتا ہے تو یہ فی الواقع فوز عظیم ہے۔ اپنی حقیقت میں فوز عظیم ہے۔ یہ ایک عظیم کامیابی ہے، ان لوگوں کے خیال میں جن کو وہ ملی ہے، اللہ کی تقدیر کے مطابق اور اللہ کے پیانوں کے مطابق۔ اس وقت مسلمان بہت خوش تھے ان فتوحات پر جو اللہ نے ان کے لیے لکھ دی تھیں۔ جب انہوں نے اس سورت کا یہ آغاز سنا تو وہ ان فتوحات کی امید کرتے تھے۔ ان کے انتظار میں تھے اور ان کو علم ہو گیا تھا کہ اللہ رسول اللہ پر کیا کیا مہربانیاں کرنے والا ہے۔ اور اس میں ان کا جو حصہ ہے اس کے لیے وہ انتظار میں تھے۔ اور آپ سے پوچھتے رہتے تھے اور جب انہوں نے سنا اور جانتا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

---○○○---

اس کے بعد اللہ کی حکمت کا ایک دوسرا پہلو سامنے آتا ہے، جو اللہ نے اس واقعہ میں رکھا ہوا تھا یہ کہ منافقین اور منافقات کو سزا دے اور مشرکین اور مشرکات سے ایسے کاموں کا صدور ہو اور وہ سزاؤں کے مستحق ہو جائیں۔

و يُعَذِّبُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّالِمِينَ بِاللَّهِ ظُنُّ السُّوءِ عَلَيْهِمْ ذَاتُ السُّوءِ وَالْغَضِبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَعْنُهُمْ وَ أَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَ مَاءً تَمَصُّرًا (۶) وَلِلَّهِ جُنُودُ السَّمُوتِ وَ الْأَرْضِ وَ كَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۴۸: ۷) ”اور ان منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں۔ برائی کے پھیر میں وہ خود ہی آ گئے، اللہ کا غضب ان پر ہو اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم میاں کر دی جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ زمین اور آسمان کے لشکر اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔“

اس آیت میں اللہ نے مشرکین اور مشرکات، منافقات اور منافقین کو صفت سوء ظن میں شریک کیا ہے اور اس صفت میں کہ ان کو یقین نہ تھا کہ اللہ مومنین کی لہذا کرے گا۔ اس لیے اللہ نے ان کو اس سزا میں بھی شریک رکھا کہ ان پر برائی کا پھیر آ گیا اور یہ خود ہی گھیرے گئے۔ اور یہ برائی ان پر پڑنے والی ہے۔ اور ان سب پر اللہ کا غضب ہے اور سب پر اللہ کی لعنت ہے اور ان سب کا انجام بھی برا ہے اور یہ اس میں شریک ہیں۔ یہ اس لیے کہ نفاق ایک بہت ہی ذلیل حرکت ہے۔ یہ شرک

کے برابر ہے بلکہ شرک سے بھی بری ہے اور گری ہوئی حرکت ہے۔ اور مسلمانوں کو ادیت دینے میں ان منافقین اور منافقات کا کردار مشرکین اور مشرکات سے کم نہیں ہے۔ اگرچہ دونوں کی اذیتوں کا دائرہ اور نوعیت مختلف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کی اہم صفت یہ قرار دی ہے کہ یہ اللہ کے بارے میں بدگمانیاں کرتے ہیں۔ ایک مومن اپنے رب کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہے اور بیحدہ اللہ سے خیر چاہتا ہے۔ اور خیر کی توقع کرتا ہے خواہ اس کے حالات اچھے ہوں یا وہ مشکلات میں ہو۔ وہ اپنے ایمان کو مضبوط کرتا ہے کہ دونوں حالات میں اللہ سے بھلائی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا دل اللہ کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اور اللہ بھلائی کے چشمہ کو کبھی بند نہیں فرماتا۔ جب انسان کا قلب داصل باندھ ہو تو وہ اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے اور براہ راست اس کا ذائقہ محسوس کرتا ہے۔ رہے منافق اور مشرک تو ان کو تعلق باللہ کی نعمت حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ اس حقیقت کو محسوس نہیں کرتے اور نہ اسے اپنے اندر پاتے ہیں۔ پس وہ اللہ کے ساتھ سوء ظن کرتے ہیں اور صرف ظاہری امور کو دیکھ کر فیصلے کرتے ہیں اور اپنے احکام کو ظاہری امور پر مبنی کرتے ہیں۔ جب کوئی ظاہری علامات ان کو نظر آتی ہیں تو وہ توقع کرتے ہیں کہ ان پر بھی مصیبت آگئی اور مسلمانوں پر بھی۔ ان کو اللہ کی تقدیر اور تدبیر پر کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ اللہ کی تقدیر اور تدبیر بعض اوقات نظروں سے اوجھل ہو کر کام کرتی ہیں۔

اس آیت میں اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کی مختلف انواع و اقسام کو جمع کیا، ان کا حال بیان کیا اور یہ بتایا کہ ان کے لیے کس قدر برا انجام ہے اور آخر میں بتایا کہ ان کا سوء ظن غلط ہے۔ اللہ کی قدرت وسیع اور حکمت دور رس ہے۔

وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِيْمًا (۷: ۴۸) ”زمین و آسمان کے لشکر اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ زیر دست و حکیم ہے۔“۔ لہذا ان دشمنان اسلام کی کوئی بات اللہ کو عاجز نہیں کر سکتی، ان کی کوئی سرگرمی اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ تو زمین و آسمان کی قوتوں کا مالک ہے اور عزیز و حکیم ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رخ کیا جاتا ہے کہ آپ کا فرض مضیٰ کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں اہل ایمان کے فرائض کیا ہیں۔ آپ نے ان تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا۔ وہ ایمان لا چکے، بیعت الرضوان میں براہ راست اللہ سے بیعت بھی کر چکے۔ یہ عہد انہوں نے براہ راست اللہ سے کیا ہے۔ اس لیے یہ نہایت ہی عظیم مقام ہے جس تک وہ پہنچ گئے ہیں۔ یاد رکھیں کہ اس بیعت اور عہد کی ذمہ داریاں بھی عظیم ہیں۔

اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَٰهِدًا وَ مَبَشِّرًا وَ نَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ ۝ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوْقِرُوْهُ ۝ وَ تَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً ۙ وَ اَصِيْلًا ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَٰیْعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَٰیْعُوْنَ اِلٰهَکَ ۝ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اٰوٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهِ اللّٰهُ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ سَیَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلْفُوْنَ

مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا يَقُولُونَ بِآيَاتِنَاهُمْ
 مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ
 ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝ بَلْ ظَنَنْتُمْ
 أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَى أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزَيَّنَ ذَلِكَ فِي
 قُلُوبِكُمْ وَظَنَّتُمْ ظَنَ السَّوءِ ۝ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا ۝ وَمَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ
 وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا ۝ وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
 يُخْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۝ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ سَيَقُولُ
 الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَارِهِمْ لِتَأْخُذُوهُمْ ذُرُوعًا وَنَضَبًا يُرِيدُونَ أَنْ
 يُبَدِّلُوا كَلِمَ اللَّهِ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُولُونَ
 بَلْ تَحْصِدُونَنَا بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ
 الْأَعْرَابِ سُدْعُونَ إِلَى قَوْمِ آدِثٍ بِأَسْ شَدِيدٍ تَقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ ۝
 فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ
 يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝

اے نبی! ہم نے تم کو شدت دینے والا بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ اے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کا (یعنی رسول کا) ساتھ دو اس کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔ اے نبی! بدوی عربوں میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے اب وہ آکر ضرور تم سے کہیں گے کہ ”ہمیں اپنے اموال اور ہاں بچوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا“ آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ ان سے کہنا ”اچھا“ یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے۔ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع پہنچانا چاہے؟ تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے۔ (مگر اصل بات وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو) بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آئیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھد لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم

سخت بد باطن لوگ ہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ مسلمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے۔ لور وہ غفور و رحیم ہے۔ جب تم میں غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔ ان سے صاف کہہ دینا کہ ”تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے“ اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے۔ یہ کہیں گے کہ ”نہیں“ بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو۔“ (حالانکہ بات حسد ہی نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔ ان پیچھے چھوڑے جانے والے بددی عربوں سے کہنا کہ ”عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا جو بڑے زور و شور میں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا“ اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا۔

اے نبیؐ جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہو گا“ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

رسول اللہؐ ان تمام لوگوں پر گواہ ہیں جن کی طرف آپ کو بھیجا گیا ہے۔ آپ شہادت دیں گے کہ جو پیغام آپ کو دے کر بھیجا گیا تھا آپ نے وہ لوگوں تک پہنچا دیا ہے اور یہ کہ لوگوں کا رد عمل یہ رہا ہے۔ اور ان میں سے بعض مومن ہوئے۔ بعض نے کفر اختیار کیا اور بعض نے منافقت کا رد یہ اختیار کیا۔ بعض لوگوں نے اصلاح قبول کی اور بعض بدستور مقصد رہے تو حضورؐ نے جس طرح رسالت کا حق ادا کیا اور پیغام پہنچایا اسی طرح حضورؐ شہادت بھی دیں گے کیونکہ حضورؐ ہمیشہ خوش خبری دینے والے ہیں، اچھے انجام اور اللہ کی مغفرت کی اور اچھے انجام کی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے اطاعت کی اور ڈرانے والے ہیں کافروں، منافقوں اور مقصد نافرمانوں کو کہ ان کا انجام برا ہو گا۔ ان پر اللہ کا غضب ہو گا، لعنت ہوگی اور سخت سزا ہوگی۔

یہ تو ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی۔ اس کے بعد مومنین سے خطاب ہے کہ رسالت کے حوالے سے تمہارے فرائض کیا ہیں؟ یہ کہ اللہ اور رسول اللہؐ پر ایمان لاؤ، اس کے بعد ایمان کے تقاضے پورے کرو، اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں اللہ اور رسولؐ کی مدد کرو، رسول اللہ کا غایت درجہ احترام کرو، اور صبح و شام اللہ کی تسبیح و تہجد کرو، یعنی پورے دن اللہ کی بندگی کرو کیونکہ دن کے دونوں اطراف کا ذکر کر کے اس سے مراد پورا دن لیا گیا ہے۔ یعنی ہر وقت اللہ سے جڑے رہو۔ یہ ہے ایمان کا ثمرہ اور پھل جس کی ہر مومن سے توقع کی جاتی ہے اور رسولؐ کو شاہد، مبشر اور نذیر اسی لیے بنا کر بھیجا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ لوگوں کے اور اللہ کے درمیان رابطہ قائم کر کے ایسی بیعت اور ایسا معاہدہ کرادیں کہ آپ کے چلے جانے کے بعد بھی یہ رابطہ قائم رہے۔ جب لوگ رسول اللہؐ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کریں تو گویا انہوں نے اللہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يَبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (۴۸ : ۱۰) ”اے نبی جو تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔“ یہ بات مسلمانوں اور رسول اللہ کے درمیان ہونے والی بیعت کو بہت ہی نازک اور عمدہ دلرانہ بناتی ہے کہ لوگوں کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے اس عقد میں اللہ کا بھی ہاتھ تھا۔ لہذا یہ بیعت لینے والا تھا اور بیعت کرنے والوں کے ہاتھ کے اوپر اللہ کا ہاتھ تھا اور اللہ کی ذات اقدس قدر عظیم ذات ہے اللہ جو صاحب جلال و اکرام ہے! اس کا ہاتھ!

اس شعور اور تصور سے انسان کے دل سے اس عہد کو توڑنے کا خیال ہی نکل جاتا ہے۔ چاہے رسول اللہ اس دنیا سے اٹھ ہی کیوں نہ جائیں۔ لہذا تو بہرحال حاضر ہے۔ وہی تو اس عہد کا اصلی فریق ہے اور وہی نگران ہے۔

فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ (۴۸ : ۱۰) ”جو شخص اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ذات پر ہو گا۔“ اسی کو خسارہ ہو گا۔ اس کے درمیان اور اللہ کے درمیان جو سودا ہوا ہے۔ اس میں فائدے میں رہنے والی پارٹی تو وہ خود ہے۔ اللہ تو دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے۔ لہذا اگر یہ عہد توڑے گا تو نقصان اسی کو ہو گا۔ یہ اللہ کے غضب اور اللہ کی سزا کا مستحق ہو گا۔ کیونکہ اللہ نقص عہد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اللہ تو وفا۔ عہد کرنے والوں اور وفاداروں کو پسند کرتا ہے۔

وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهِ اللّٰهُ فَسَيُوْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (۴۸ : ۱۰) ”اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔“ علی الاطلاق اجر عظیم ہو گا۔ نصیبات کے سوا ہی۔ کیونکہ اللہ عظیم ہے جو یہ عہد کر رہا ہے۔ لہذا اس کا اجر بھی عظیم ہے۔ یہ اللہ کے حساب سے عظیم ہے۔ انسان تو اس اجر اور اس اجر کے عطا کرنے والے کی عظمت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ انسان نہ اللہ کی عظمت کا تصور کر سکتا ہے نہ اللہ کے عظیم بیانات کا تصور کر سکتا ہے کیونکہ انسان خود بھی چھوٹا ہے اور اس کا تصور بھی چھوٹا ہے۔

جب بات بیعت کی حقیقت پر ہو رہی تھی اور وفاداری اور بے وفائی تک پہنچی تو ان لوگوں کا ذکر شروع ہوا جنہوں نے اس موقع پر بے وفائی کی۔ یعنی مدینہ کے ارد گرد دیسات میں رہنے والے لوگ۔ جنہوں نے رسول اللہ کے ساتھ سفر حدیبیہ میں نکلنے سے اس لیے انکار کیا کہ ان کو اللہ کے ساتھ بدظنی تھی اور اس موقع پر جو مومنین جا رہے تھے ان کے بارے میں ان کو توقع تھی کہ وہ مصیبت میں گرفتار ہوں گے اور نقصان اٹھائیں گے جو قریش کے پاس ان کے گھروں کو جا رہے تھے۔ اس سے قبل یہ قریش مسلسل دو سال مدینہ میں جا کر مسلمانوں کے ساتھ لڑتے رہے تھے۔ ان کے بارے میں اس سورت میں حضور کو یقینی اطلاع کر دی گئی ہے کہ جب آپ اور آپ کے رفقاء صحیح سلامت مدینہ پہنچیں گے تو ان لوگوں کے عذرات کیا ہوں گے۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ مسلمان واپس ہی نہ ہوں گے حالانکہ قریش نے مسلمانوں کے ساتھ دس سالہ صلح کر لی۔ اگرچہ شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ لیکن دراصل قریش نے اپنے موقف سے ہٹ پائی اختیار کی۔ انہوں نے حضور اکرمؐ کو اور مسلمانوں کو اپنے مساوی تسلیم کیا، صلح کر کے دشمنی سے اپنے آپ کو چھڑایا۔ بہرحال یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے عدم خروج کے اصل اسباب بھی بتا دیتا ہے اور ان لوگوں کو حضور اکرمؐ اور مسلمانوں کے سامنے عیاں کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس جنگ میں آپ کے ساتھ جو نکلے ہیں ان کے لیے اچھا

مستقبل ہے۔ وہ یہ کہ مستقبل میں ان کو نہایت ہی دافر مقدار میں اموال غنیمت، فتوحات اور کامیابیاں ملیں گی اور یہ لوگ جو اس دم سے پیچھے رہ گئے تھے یہ ان سے محروم ہوں گے۔ مستقبل کی آسان سمات میں یہ اعراب چاہیں گے کہ آپ کے ساتھ جنگ کے لیے نکلیں تاکہ اموال غنیمت میں اپنا حصہ پائیں۔ آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ آسان سمات میں اب ان کی پیشکش کو قبول نہ فرمائیں۔ اور ان آنے والی سمات میں صرف ان لوگوں کو لے جائیں جو حدیبیہ میں شریک تھے۔ یہاں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اگر تم بچے طور پر جہاد کرنے والے ہو تو تمہیں سخت طاقتور دشمن کے ساتھ لڑنے کے لیے موقعہ دیا جائے گا اگر فی الواقع تم جنگ کرنا چاہتے ہو اس وقت پھر نکلتا۔ وہاں اللہ تمہارا جو حصہ ہو گا دے گا۔ اگر انہوں نے اس وقت اطاعت کی تو اجر عظیم کے مستحق ہوں گے۔

---o o o---

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَ أَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا
يَقُولُونَ بِالسَّيِّئَةِ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ
ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۱۱) بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ
يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَ الْمُؤْمِنُونَ إِلَى أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَ زَيْنَ ذَلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنُّ
السَّوْءِ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا (۱۲) وَ مَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَ رَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ
سَعِيرًا (۱۳) وَ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ
وَ كَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (۱۴) سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَانِمَ
لِنَاخِذُوهَا ذُرُونَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلِمَ اللَّهِ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَلِكُمْ قَالَ اللَّهُ
مَنْ قَبْلُ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا (۱۵) قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ
مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعُونَ إِلَى قَوْمٍ أُولَىٰ بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ فَإِنْ
تَطِيعُوا أَوْيَتَكُمْ إِنَّهُ أَجْرٌ حَسَنٌ وَ إِنْ تَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا

(۱۶) (۴۸: ۱۱ تا ۱۶) ”اے نبی! بدوی عربوں میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے اب وہ اگر ضرور تم سے کہیں گے کہ ”ہمیں اپنے اموال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا“ آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا

فرمائیں۔“ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ ان سے کہنا ”اچھا“ یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلے کو رد کر دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے۔ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے۔ (مگر اصل بات وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو) بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آ سکیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم سخت بد باطن لوگ ہو۔ اللہ اور اس کے رسول پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ میا کر رکھی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے اور وہ غفور و رحیم ہے۔ جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔ ان سے صاف کہہ دینا کہ ”تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے“ اللہ پسند ہی یہ فرما چکا ہے۔“ یہ کہیں گے کہ ”نہیں“ بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو۔“ (حالانکہ بات حسد کی نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔ ان پیچھے چھوڑے جانے والے بد دی عروں سے کہنا کہ ”عقرب تب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا۔“

قرآن کریم نے یہاں صرف ان لوگوں کے اقوال نقل کر کے ان کی تردید پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس بہترین موقع پر ان کی گہری نفسیات کو لیا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر اٹھنے والے وساوس اور خیالات کو لیا ہے۔ اور پھر اس کے لیے علاج تجویز کیا ہے۔ ان کے اندر جو اخلاقی بیماریاں تھیں یہاں ان کی تشخیص کی گئی تاکہ ان کا مناسب علاج کیا جائے۔ جو حقائق ہیں وہ باقی رہیں اور اسلامی تصور حیات کے اصل الاصول واضح کر کے باقی رکھے جائیں۔

مدینہ کے ارد گرد کے جو دیہاتی باوجود دعوت کے حدیبیہ کے موقع پر رہ گئے تھے وہ قبائل غفار، خزیمہ، اضمع اور اسلم وغیرہ تھے۔ قرآن کہتا ہے ان کا عذر یہ ہو گا۔

شَغَلَتْنَا أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا (۱۱: ۴۸) ”ہمیں اپنے اموال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول رکھا۔“

لور یہ تو کوئی عذر نہیں ہے۔ ہمیشہ ہر کسی کا مال اور اولاد اور اہل و عیال تو ہوتے ہی ہیں اگر ایسے عذرات مقبول ہوں تو پھر کوئی شخص بھی نظریاتی کام اور اپنے عقیدے اور دعوت اسلامی کی ذمہ داریوں کے لیے کوئی وقت نہ پائے گا۔ لور دوسری بات وہ یہ کہیں گے۔

فَاسْتَغْفِرْ لَنَا (۱۱: ۴۸) ”آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں۔“ لیکن پھر اس میں بھی سچ نہیں ہے۔ بتایا جاتا ہے۔

يَقُولُونَ بِاللَّيْنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ (۱۱: ۴۸) ”یہ لوگ اپنی زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں

جو دلوں میں نہیں ہوتیں۔“

اس موقع پر ان کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا ایک نظام قضا و قدر ہے اور اسے کوئی بھی روک نہیں سکتا۔ جنگ سے پیچھے رہ جانا تقدیر کو نہیں روک سکتا۔ نہ کسی اقدام کو روکا جاسکتا ہے۔ اللہ کی قدرت کے اندر تم لوگ گھرے ہوئے ہو۔ وہ جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے اور وہ ہر چیز سے خبردار ہے۔ وہ علم کے مطابق تصرف کرتا ہے۔

قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ

اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۸: ۱۱) ”ان سے کہنا“ اچھا! یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے۔ اگر وہ ہمیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے۔“

اس سوال ہی میں بتا دیا کہ ایک سچے مومن کا رویہ کیا ہونا چاہئے اسے چاہئے کہ وہ اللہ کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ اللہ کے احکام کی فوراً تعمیل کرے اور اس میں لیت و لعل نہ کرے۔ کیونکہ توقف کرنے اور لیت و لعل کرنے سے نہ کوئی نقصان رفع ہو سکتا ہے اور نہ نفع موخر ہو سکتا ہے۔ اور عزرائل گھڑا اس سے مخفی نہیں ہے۔ اللہ جزاء و سزا اپنے علم کے مطابق دیتا ہے۔ اس لیے عزرائل گھڑنے سے اس کے ہاں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ نہایت ہی بردباریت ہے۔ مناسب نفا میں ہے اور یہی قرآن کا طریقہ ہے کہ وہ نہایت ہی مناسب وقت پر ٹوک دیتا ہے۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزِينَ ذَلِكَ فِي

قُلُوبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنُّ السُّوءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا (۸: ۱۲) ”بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھروالوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آئیں گے اور یہ خیال تمہارے دل کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم سخت بد باطن لوگ ہو۔“ یوں اللہ ان لوگوں کو عیاں کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ ان کی نیت اور دلوں کا حال ان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ انہوں نے جو اندازے لگا رکھے تھے وہ بھی ان کو چاہیے گئے۔ اللہ کے بارے میں ان کے دلوں میں جو سوئے ظن تھا وہ بھی بجا دیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ رسول اللہ اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں۔ لہذا مدینہ کو واپس آنے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ ان لوگوں کے منہ میں جا رہے ہیں جنہوں نے ان کے گھر میں آکر ان سے جنگ کی ہے اور انہوں نے مدینہ میں آکر رسول اللہ کے ساتھیوں کو قتل کیا ہے۔ ان کا اشارہ احد اور احزاب کی طرف تھا۔ ان لوگوں نے اللہ کی قوتوں اور اللہ کی مہربانیوں کا حساب نہ لگایا تھا کہ اللہ اپنے قتل شدہ بندوں پر کیا کیا کرم کرتا ہے۔ نیز انہوں نے معاملات کو سیکور طریقے سے سوچا تھا اور ان کے دل اسلامی نظریہ حیات سے خالی تھے ان کے نزدیک فرض اور ڈیوٹی تو کوئی چیز ہی نہ تھی۔ حالانکہ اسلامی نظریہ کے کچھ تقاضے تھے اور ان کے لیے ہر قربانی بیچ سبھی جانی چاہئے تھی۔ پھر رسول اللہ کی اطاعت اور آپ کی معیت کو نفع و ضرر، نفع و نقصان کے حساب و کتاب سے برتر ہونا چاہئے تھا۔ یہ تو وہ فریضہ تھا جسے نتائج کی پرواہ کیے بغیر ان کو ادا کرنا چاہیے تھا۔

بہرحال انہوں نے بدگمانیاں کیں اور بدظنی اور بدگمانی ان کے لیے خوشنما بنا دی تھی۔ ان کو اس بدگمانی کے علاوہ کچھ 'نظریہ' نہ آتا تھا۔ انہوں نے اس بدظنی کے سوا کسی دوسرے واقعہ یا کسی دوسرے رخ کے بارے میں سوچا ہی نہیں اور ان کی جانب سے سوء ظن تھا۔ یہ اس لیے پیدا ہوا تھا کہ ان کے دل برے تھے۔ ان کو یہاں "قوم بور" کہ گیا ہے۔ یہ عجیب انداز تعبیر ہے۔ "بور" اس زمین کو کہتے ہیں جو بخر ہو اور اس میں کوئی روئیدگی نہ ہو۔ نہ کوئی درخت اور پھل ہوں نہ کوئی سنہری فص ہو۔ جس دل میں حسن ظن کی سرسبزی نہ ہو، پھر اللہ کے بارے میں پر امید نہ ہو اور اس کے اندر کوئی حسن ظن نہ ہو، تو وہ بخر ہے، وہ مردہ ہے اور آخر کار اس نے برباد اور تباہ ہوتا ہے۔

جماعت مومنہ کے بارے میں آج بھی بعض لوگ اس انداز سے سوچتے ہیں، اس قسم کے لوگ جس طرح مدینہ کے ہرگزرد بستے تھے، جن کے دل خشک تھے اور ان میں زندگی کی روح نہ تھی۔ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ باطل پرستوں کا پلڑا بھاری ہے اور دنیا کی زیادہ قوتیں اہل شر اور اہل باطن کے ساتھ ہیں۔ نیک لوگ تعداد میں بہت کم ہیں، یا وسائل کے لحاظ سے غریب ہیں، یا مرتبہ اور مال و دوست کے اعتبار سے کم ہیں۔ یہ دیمائی 'بدوی' اور اس قسم کے لوگ ہر زمان و مکان میں کی کچھ سوچتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی سوچ کچھ یوں ہوتی ہے کہ اہل ایمان یا اسلام کے چاہنے والوں کا مقابلہ چونکہ بڑی قوتوں سے ہے اور یہ قوتیں بظاہر بہت ہی پھولی ہوئی ہیں لہذا ان مٹھی بھر اسلام والوں کی خیر نہیں ہے۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ ان سے دور رہا جائے۔ ایسے لوگ ہر وقت یہ توقع رکھتے ہیں کہ آج یا کل ان کو جڑ سے اکھڑک پھینک دیا جائے گا۔ اور یہ دعوت ہی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے وہ بطور احتیاط اس راہ سے جدا دوسرے راستے پر چلتے ہیں۔ لیکن اللہ اس قسم کے لوگوں کے سوء ظن کو ہمیشہ ناکام بنا دیتا ہے اور اللہ اپنے فضل و کرم کے حالات کو تبدیل فرماتا ہے اور اپنی تدبیر سے اپنے بندوں کے لیے راہ ہموار کر دیتا ہے۔ اللہ اپنے پیانوں سے ٹاپتا ہے، جو حقیقی پینے ہیں۔ اور جو اللہ کے قوی ہاتھ میں ہیں۔ وہ بعض لوگوں کو مگر لٹا ہے اور بعض کو اٹھاتا ہے، اور کافرین، منافقین اور اللہ کے بارے میں سوئے ظن رکھنے والوں کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ اور اس قسم کے لوگ ہر دور اور ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔

اص ٹرازو ایمان کا ترازو ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بدوی مسلمانوں کو کہتا ہے کہ اس ترازو سے تولو، اور اس ترازو کے مطابق ہی اعمال کی جزاء تجویز فرماتا ہے، اللہ کی رحمت اس ترازو کے ساتھ ہے۔ فرصت کے لمحات قلیل ہیں، اللہ کی رحمت اور مغفرت کو حاصل کرو اور فائدہ اٹھاؤ!

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا (۱۳: ۴۸) وَلِلَّهِ
مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا

رحیمًا (۱۴: ۴۸) "اللہ اور اس کے رسول پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے، جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے، اور وہ غفور و رحیم ہے۔" یہ لوگ اپنے اموال اور اہل و اولاد کا عذر پیش کرتے تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ جنم جو کافروں کے لیے تیار رکھی ہوئی ہے، اس میں مال و اولاد کیا فائدہ دے گے، اگر وہ اللہ اور رسول اللہ پر ایمان نہ

لائے۔ فرض ترازو کے دو پلڑے ہیں۔ ایک ایمان کا دوسرا کفر و نفاق اور سوء ظن کا، ان میں ان کو ایک کو قبول کر لینا چاہئے۔ اللہ جو ہمیں ڈرتا ہے وہ آسمانوں اور زمین کی قوتوں کا مالک ہے۔ وہ عذاب بھی دے سکتا ہے اور معاف بھی کر سکتا ہے۔

اللہ لوگوں کو جزایا سزا ان کے اعمال پر دیتا ہے۔ لیکن اس کی مشیت مطلق و آزاد ہے۔ اس پر کوئی قید نہیں ہے۔ یہ بات یہاں اس لیے بتادی گئی کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اعمال پر جزاء بھی اسی نے طے کی ہے۔ اللہ کی رحمت اور مغفرت سب کے لیے قریب ہے۔ مناسب ہے کہ لوگ اسے طلب کریں۔ قبل اس کے کہ اللہ کے عذاب کا فیصلہ صادر ہو جائے اور یہ فیصلہ ظاہر ہے انہی لوگوں کے لیے ہو گا جو اللہ اور رسول اللہ پر ایمان نہ لائیں گے۔

اس کے بعد اللہ ان اموال غنیمت کی طرف اشارہ فرماتا ہے جو مومنین کے لیے مقدر ہو چکے ہیں۔ اور یہ ان لوگوں کی بدگمانیوں کے بالکل متضاد صورت حالات ہوگی اور انداز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات بہت ہی قریب وقت میں رونما ہونے والے ہیں۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَائِمٍ لَّنَا خُذُوهَا ذُرُونَا نَتَّبِعْكُمْ يَرِيدُونَ
أَنْ يُبَدِّلُوا كَلِمَ اللَّهِ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسَدُونَنَا
بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا (۱۵: ۴۸) ”جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔ ان سے صاف کہہ دینا کہ ”تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے“ اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے۔“ یہ کہیں گے کہ ”نہیں، بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو۔“ (حالانکہ بات حسد کی نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔“ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد فتح خیبر ہے۔ ممکن ہے فتح خیبر ہی ہو۔ اگر مراد خیبر نہ بھی ہو لیکن مراد یہی ہے کہ غنیمت مسلمان کسی مہم پر جائیں گے اور یہ لوگ کہیں گے کہ ہمیں بھی جانے دو۔

مفسرین نے خیبر کا نام اس لیے لیا ہے کہ خیبر کا واقعہ صلح حدیبیہ کے منہل بعد میں ہوا۔ کیونکہ فتح خیبر محرم ۱ ہجری میں ہوا۔ یعنی صلح حدیبیہ کے دو ماہ بعد۔ اور اس میں اموال غنیمت بھی بہت طے تھے اور خیبر کے قلعے جزیرۃ العرب میں یودیوں کی آخری پناہ گاہ تھے۔ بعض بنو نضیر اور بنو فربطہ بھی یہاں آکر پناہ گیر ہو گئے تھے حالانکہ ان کو جزیرۃ العرب سے خارج کر دیا گیا تھا۔

مفسرین نے یہ بات تواتر سے کہی ہے کہ حدیبیہ کی مہم پر جانے والوں کے ساتھ اللہ کا عہد تھا کہ خیبر کے اموال غنیمت میں ان کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو گا۔ لیکن اس بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہے۔ شاید وہ عملی واقعات سے یہ اصول اخذ کر رہے ہیں۔ حضور اکرمؐ نے ان کو اہل حدیبیہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اور اس مہم میں آپؐ نے کسی اور کو ساتھ نہ لیا تھا۔

بہر حال اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ آپ پیچھے رہنے والے اعراب کی اس پیشکش کو رد کر دیں جب وہ آپ کے ساتھ قریب کے آسان اموال غنیمت کے لیے جانا چاہیں۔ اور یہ فیصلہ دے دیا کہ ان کا لکنا اللہ کے حکم کے خلاف ہے اور پیشگی اطلاع دے دی کہ جب آپ ان کی پیشکش کو رد کر دیں گے تو وہ الزام لگائیں گے کہ تم ہمارے ساتھ حسد کرتے ہو۔ بَلْ تُحْسَدُونََنَا ”بلکہ تم حسد کرتے ہو“۔ تم اس مہم میں اس لیے نہیں لے جاتے کہ تم ہمیں اموال غنیمت نہیں دینا چاہتے۔ ساتھ ہی پھر فرمایا کہ دیا کہ یہ لوگ اللہ کی حکمت کو نہیں جانتے یہ کم فہم ہیں۔ اللہ کی حکمت یہ ہے کہ پیچھے رہے والوں کو در آمد میت سے دو چار کیا جائے اور مطیع فرمان بندوں کو زرا انعامات دیئے جائیں تاکہ ان کی اطاعت شعاری کا انعام انہیں ملے۔ کیونکہ انہوں نے ایسے حالات میں اطاعت کی جب سامنے موت ہی نظر آرہی تھی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے کہتا ہے کہ ان پیچھے رہ جانے والوں سے کہہ دیں کہ تمہارے لیے ایک اور امتحان کا مقام ابھی باقی ہے۔ عنقریب ایک مہم ایک زبردست قوم کے خلاف بھیجی جائے گی اور تمہیں اس میں بلایا جائے گا۔ اور یہ لوگ سلام کی وجہ سے تمہارے ساتھ لڑیں گے۔ اگر اس امتحان میں تم کامیاب ہو گئے تو تمہارے لیے بھی اجر ہو گا۔ اگر اس آخری امتحان میں بھی تم معصیت پر جتے رہے تو پھر تم ہمیشہ کے لیے عذاب الیم کے مستحق ہو جاؤ گے۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولَىٰ بِأَنْفُسِكُمْ فَتَقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسَلِّمُونَ فَإِنْ تَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ حَسَنًا وَ إِنْ تَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۱۶: ۴۸) ”ان پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ ”عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا۔“

اس کی تفسیر میں بھی اختلاف ہے کہ یہ لوگ کون ہیں جن کو اُولَىٰ بِأَنْفُسِكُمْ ”بڑے زور آور ہیں“ کہا گیا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ کے زمانے میں تھے یا خلفاء راشدین کے زمانے میں تھے۔ قریب بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ہی کے دور میں تھے اور مقصد یہ تھا کہ مدینہ کے داخل میں جو بدوی عرب تھے ان کے ایمان کو آزمایا جائے۔

اہم بات یہ نہیں ہے کہ یہ کون تھے اہم یہ ہے کہ قرآن کا انداز تربیت کیا ہے؟ قرآن بیمار دلوں کا علاج کس طرح کرتا ہے۔ کس طرح قرآن ہدایت دیتا ہے اس طرح عملاً آزماتا ہے۔ یہ بات اس سے معصوم ہوتی ہے کہ بچے مسلمانوں کے سامنے ان بدوی لوگوں کی فکری حالت کو طے کر لیا جاتا ہے کہ خود ان پر بھی اور مسلمانوں پر ان کی حالت کھل جائے۔ اور پھر ان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ایمان اور عمل میں ٹھوس رویہ اختیار کرو اور اعلیٰ قدروں کو اپناؤ۔

چونکہ معاملہ آزمائش کا تھا اس لیے اللہ نے تمام مسلمانوں کے لیے خروج لازمی کر دیا۔ اور ان لوگوں کو متعین کر کے بتا دیا کہ حقیقی عذر کیا ہے۔ اگر اس کے مطابق کوئی جہاد سے رہ گیا تو اسے کوئی سزا نہ ہوگی نہ گناہ ہو گا۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرْبٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَابِ حَرْبٌ وَ

لَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ ۖ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي
 مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ ع

۱۰ ”ہاں اگر اندھا اور لنگڑا اور مریض جہاد کے لیے نہ آئے تو کوئی حرج نہیں۔ جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا اللہ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور جو منہ پھیرے گا اسے وہ دردناک عذاب دے گا۔“

اندھا اور لنگڑا تو دائمی اعتبار سے معذور ہیں اور وہ جہاد کے لیے نہیں نکل سکتے اور بیمار وقتی طور پر معذور ہوتا ہے۔ جب تک کہ وہ تندرست نہیں ہوتا وہ معذور رہتا ہے۔

اصل بات تو اطاعت اور معصیت کی ہے اور جذبہ اطاعت اور نیت معصیت ایسے امور ہیں جن کا تعلق دل اور نفسیات سے ہے۔ ظاہری اشکال اور ظاہری عذرات سے نہیں ہے۔ جو شخص اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت کرتا ہے اس کی جزاء جنت ہے اور جو منہ پھیرے گا اسے یاد رکھنا چاہئے کہ عذاب الیم اس کے انتظار میں ہے۔ ہر کسی کو چاہئے کہ وہ جہاد اور اس کی مشقوں کو جہاد کے اجر کو پیچھے بیٹھے رہنے کو اور اس کی راحتوں کو تولے، اں کا باہم موازنہ کرے اور اسے ان میں سے جو بات پسند ہو اسے اختیار کرے۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۲۵ ایک نظر میں

یہ پورا سبق مومنین کی باتوں پر مشتمل ہے۔ مومنین کے ساتھ مکالمہ ہے۔ اس مجموعے کے ساتھ مکالمہ جس نے درخت کے نیچے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اللہ حاضر تھا اور اس کا گواہ تھا اور اس بیعت کی تصدیق و توثیق کرنے والا تھا اور بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ صحابہ کرام کا وہ گروہ جنہوں نے اپنے کانوں سے سنا کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو یہ فرما رہا ہے :

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يَبَايَعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ

فَآنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا (۱۸: ۴۸) ”اللہ اس مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا، اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی“۔ یہ ان مومنین کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہے اور ان کے ساتھ مکالمہ ہے۔ اور ان کو خوشخبری ہے کہ اللہ نے ان کے لیے بہت ہی قیمتی خزانہ جمع کر رکھے ہیں۔ بہت سی فتوحات ان کو نصیب ہونے والی ہیں اور اس سفر میں بھی اللہ ان کا حامی و مددگار رہا اور آئندہ بھی رہے گا۔ اور اللہ نے اپنی سنت کے مطابق ان کے لیے مسلسل فتوحات رکھی ہوئی ہیں اور اللہ کی سنت کبھی بدلتی نہیں ہے۔ اس میں کفار پر تنقید بھی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے کیوں اس موقع پر صلح کو ترجیح دی اور یہ کہ رسول نے جو خواب دیکھا تھا وہ سچا تھا کہ مسلمان مسجد حرام میں داخل ہوں گے۔ اور یہ نہایت ہی پر امن انداز میں داخل ہوں گے اور ان کا دین بہر حال غالب ہو کر رہے گا۔

یہ سبق اور یہ سورت اس ممتاز اور منفرد جماعت صحابہ کے خدو خال پر ختم ہوتی ہے۔ جنہوں نے رسول اللہ کے ہر کام انقلابی کام کیا۔ اور تورات اور انجیل کے حوالے سے ان کے اوصاف بیان ہوئے اور آخر میں اعلان ہوا کہ وہ مغفرت اور اجر کریم کے مستحق ہو گئے ہیں۔

درس نمبر ۲۵ تشریح آیات

۱۸ --- تا --- ۲۹

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۝ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝

”اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی، ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی اور بہت سامان غنیمت انہیں عطا کر دیا جسے وہ (مقرب) حاصل کرس گئے۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔“

میں آج چودہ سو ساں بعد اسلامی تاریخ کے افق پر، ان مقدس لمحات کو دیکھ رہا ہوں جن میں یہ پوری کائنات دیکھ رہی ہے کہ عالم بالا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ اطلاع آرہی ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ باتیں بتائی جا رہی ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس کائنات کے ان صفحات کو پڑھ سکوں اور اس کائنات کے ضمیر میں ان لمحات کے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا اسے دیکھ سکوں۔ کیونکہ یہ پوری کائنات اس وقت اللہ کے اس قول کے ساتھ ہم قدم تھی کہ یہ متعین لوگ جو اس وقت زمین کے اس متعین ٹکڑے پر موجود ہیں اور درخت کے نیچے بیعت کر رہے ہیں، یہ زمین کا ٹک ہے۔ میں اپنی چشم بصیرت کے ساتھ ان سعادت مند ان زمین کے حالات کو دیکھنا چاہتا ہوں، جنہوں نے اپنے کانوں کے ساتھ اور ذاتی طور پر اپنی شخصیت کے ساتھ، یہ بات سنی کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتا ہے کہ ”میں ان سے راضی ہو گیا۔“ پھر اس مقام کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے جہاں وہ تھے، درخت کے نیچے اور اس بیعت کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے۔

اذِيبَايَعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (۱۸:۴۸) ”جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔“ یہ آیات انہوں نے اپنے سچے نبی کی زبان سے خود سنیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو مژدہ سنایا گیا۔

یا اللہ! ان مقدس ہستیوں نے ان لمحات کو کس طرح گزارا، اور ان لہزہ شادانہ کی۔ ”یہ سنا، جن میں ذات باری بذات خود ہر شخص کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اے فلاں لے فلاں، تم سے میں راضی ہوں، تم ہو جس بے درخت

کے نیچے بیعت کی۔ تمہارے دل کی بات میں جانتا تھا۔ میں نے تم پر پھر سکینت نازل کی۔
ہم میں سے ایک شخص یہ آیت پڑھتا ہے۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ”اللہ وہی اور دوست ہے، ان لوگوں کا جو ایمان لائے۔“ تو وہ اپنے آپ کو
سعادت مند سمجھتا ہے۔ وہ اپنے دل میں امید کرتا ہے کہ میں بھی ان شاء اللہ اس آیت کے عمومی مفہوم میں شامل ہوں یا
پھر کوئی پڑھتا ہے یا سنتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ”بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ اس لیے وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور
اپنے دس میں کہتا ہے۔ ان شاء اللہ میں بھی ان صبر کرنے والوں میں سے ہوں، لیکن وہ لوگ خود سن رہے ہیں اور خدا کے
پیغمبر اُمّیں سنا رہے ہیں، ایک ایک سن رہا ہے کہ اللہ کی مراد اس سے ہے، اور وہ اس سے بات کر رہا ہے۔ اس تک پیغام
بھیج رہا ہے کہ وہ اس سے راضی ہو گیا ہے۔ اس کے نفس میں جو کچھ تھا، اسے جانتے ہوئے بھی اس سے راضی ہو گیا۔
یا اللہ کس قدر عظیم اعزاز ہے یہ!

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یَبَیْعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ
فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَتٰهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا (۱۸: ۴۸) ”اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا، جب وہ
درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، ان کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم تھا، اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی۔ ان
کو انعام میں قریبی فتح بخشی۔“ اللہ نے جان لیا کہ ان کے دل میں، اس کے دین کے لیے جوش و خروش ہے، اپنی دلت
کے لیے نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سچے دل سے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ جانتا تھا کہ ان کے دلوں کے اندر جنگ کے
سلسلے میں جو خیالات اٹھتے ہیں وہ ان کو پی رہے ہیں اور ضبط کر کے رسول اللہ کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں کہ رسول اللہ
کے پیچھے ایک مطیع فرمان مسلم کی طرح کھڑے ہوں گے۔

فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ (۱۸: ۴۸) ”اللہ نے ان پر سکینت نازل کر دی۔“ یہ ایک عجیب غلط اور
انداز ہے۔ سکینہ نازل ہو رہا ہے۔ سکون، ٹھنڈاؤ، وقار اور ثابت قدمی یہ ان پر نازل ہو رہے تھے۔ اس وقت ایسے
حالات میں دوڑ دھوپ، گرمی، غیرت اور دوسرے تاثرات کی وجہ سے لوگوں کے اندر بے چینی ہوگی، جسے ٹھنڈک،
اطمینان اور مسرت سے بدل دیا گیا۔

وَاَتٰهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا (۱۸: ۴۸) ”اور ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی۔“ یہ صلح بذلت خود فتح تھی، اس سے
کئی دوسری فتوحات کا آغاز ہوا۔ فتح خیرہ تو فوراً ہی ہوئی اور مفسرین کی یہ اظہار رائے ہے کہ اس سے مراد فتح خیبر ہے۔

وَمَغَاسِمَ کَثِیْرَةٍ یَّاخُذُوْنَہَا (۱۹: ۴۸) ”اور بہت سا مال غنیمت انہیں عطا کر دیا جائے، مغرب

حاصل کرس گئے یا فتح کے ساتھ یہ اموال ملے اگر مراد فتح خیر ہو، فتح کے بعد ملنے والے اموال غنیمت۔ اگر ہم خود اس صلح ہی کو فتح قرار دیں کیونکہ اس مصالحت کی وجہ سے مسلمان کئی دوسری فتوحات کے لیے فارغ ہو گئے۔

وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۱۹: ۴۸) ”اللہ زبردست اور حکیم ہے۔“ یہ تمام آیات کا نتیجہ ہے یعنی اللہ کی رضا، فتح اور بے شمار اموال غنیمت کے وعدے میں اللہ کی قوت، قدرت اور حکمت و تدبیر کا فرما ہے۔ اور قوت اور حکمت ہی اللہ اپنے وعدے پورے کرتا ہے۔

اس اعلان کے بعد کہ اللہ کی ذات ان بیعت کرنے والوں سے راضی ہو گئی ہے، اب بات کا رخ خود مومنین کی طرف مڑ جاتا ہے، اب وہ مخاطب ہیں۔ صلح، فتح، ہدایت اور غنیمت ہر بات کی جاتی ہے جو انہیں دی جا رہی ہے:

وَعَدَكُمْ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُوهَا وَكَانَ لَكُمْ هَذِهِ وَيَدَى النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۚ وَآخَرَىٰ لَكُمْ تَقْدِيرًا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۚ وَلَوْ قَتَلْتُمُ الدِّينَ كَفَرُوا لَوْلَا اِلَادَبَارُ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۚ سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ وَلَكِنْ تَجِدُ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۚ

اللہ تم سے بکثرت اموال غنیمت کا وعدہ کرتا ہے جسیں تم حاصل کرو گے۔ فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمہیں عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیئے تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشنے۔ اس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ کافر لوگ اگر اس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پینہ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔ جو پہلے سے چلی آ رہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔“

یہ ایک صریح خوشخبری ہے اللہ کی طرف سے، اس کو مومنین نے سنا، اس پر انہوں نے خوب یقین کیا اور انہوں نے جان لیا کہ ان کے لیے بہت کچھ تیار کر لیا گیا ہے اور اس کے بعد وہ زندہ رہے اور ان آیات کا مصداق چشم سر دیکھتے رہے۔ کیونکہ یہ اللہ کا وعدہ تھا اور اللہ کے وعدے کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ یہاں اللہ فرماتا ہے کہ فوری طور پر تو یہ فتح تمہیں عطا کر دی۔ اس سے مراد صلح حدیبیہ ہو سکتی ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حدیبیہ ہی فتح اور غنیمت تھی اور جیسا کہ پہلے ہم نے بیان کیا صلح حدیبیہ درحقیقت فتح تھی اور جن حالات میں یہ فتح ہوئی، انہوں نے بھی

اس کو مسلمانوں ہی کی فتح بنایا اور اس سے مراد فتح خیبر بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ مجاہد سے مروی ہے کیونکہ حدیبیہ کے بعد یہ قریب ترین ماں غنیمت تھا جو مسلمانوں کو ملا۔ زیادہ رائج بات یہ ہے کہ خود صلح حدیبیہ کو فتح کہا گیا ہے۔

اللہ نے بتایا کہ تم پر اللہ کا یہ بہت ہی بڑا احسان ہے کہ اس نے لوگوں کو رد کر دیا کہ وہ تم پر ہاتھ ڈالیں۔ ان میں مشرکین مکہ بھی تھے اور دوسرے لوگ بھی تھے جو بد وقت اس انتظار میں تھے کہ مسلمان کسی چکر میں پھنس جائیں اور ہم بھی حملہ کر دیں۔ اس وقت ہرحال مسلمان قلیل تعداد میں تھے۔ اور دوسرے لوگ بہت زیادہ تھے لیکن انہوں نے اپنی بیعت کو پورا کر دیا اور اپنی ذمہ داریوں کو ادا کیا۔ اس لیے اللہ نے ان سے لوگوں کے ہاتھ روکے اور انہیں امن میں رکھا۔

وَلَتَكُونَنَّ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ (۴۸: ۲۰) ”اور تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے“۔ یہ واقعہ جسے آغاز میں انہوں نے بہت ہی ناپسند کیا تھا اور ان کے دلوں پر وہ بھاری پتھر کی طرح تھا، اللہ دیتا ہے کہ یہ ان کے لیے ایک معجزہ ہو گا۔ آنے والے دنوں میں وہ اس کے نتائج دیکھیں گے اور ان لوگوں نے جو رسول اللہ کی اطاعت کی اور سر تسلیم خم کیا، ناپسند کرتے ہوئے بھی تو اس کی انہیں جزاء ملے گی وہ جان لیں گے کہ یہ تو بہت ہی عظیم واقعہ تھا۔ اور جو جزاء ملے گی وہ بہت ہی بڑی ہوگی اور ان کے دلوں میں سکون، اطمینان اور یقین انڈیل دیا جائے گا۔

وَيَهْدِيكُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا (۴۸: ۲۰) ”اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشنے گا“۔ تمہاری اطاعت، تمہاری فرمانبرداری اور تمہارے صدق نیت کی وجہ سے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جامع انعام کا اعلان کر دیا۔ انہیں ماں غنیمت بھی ملے گا اور انہیں ہدایت بھی نصیب ہوگی۔ لہذا ہر طرف سے ان کے لیے خیر ہی خیر ہوگی۔ اور یہ بھلائی اور خیر اس معاملے میں ہوگی جسے وہ پسند ہی نہ کرتے تھے۔ اور ایک بھاری پتھر کھینچتے تھے۔ یوں ان کو پیشگی اطلاع دی جاتی ہے کہ اللہ نے ان کے لیے جو پسند کیا ہے وہی اصل پسند ہے۔ اس طرح ان کو تربیت دی جاتی ہے کہ ہر حال میں اطاعت اور حکم کی بجا آوری کرو۔

ان انعامات و مفادات کے علاوہ کچھ دوسرے مفادات کا بھی یہاں اعلان کیا جاتا ہے اور یہ مفادات وہ اپنے قوت بازو سے حاصل نہ کر سکے تھے لیکن اللہ نے اپنی قدرت اور تدبیر سے وہ چیزیں انہیں عطا کر دیں۔

وَأُخْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا

(۴۸: ۲۱) ”اس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم بھی قادر نہیں ہوئے۔ اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے“۔ اس کے ”علاوہ“ کے بارے میں روایات میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہے؟ یا فتح خیبر ہے؟ یا قیصر و کسریٰ کی مملکتوں کی فتوحات ہیں؟ یا اس سے وہ تمام فتوحات مراد ہیں جو صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کو نصیب ہوتی رہیں؟

زیادہ مناسب یہی ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہو کیونکہ یہ صلح حدیبیہ کے بعد ہوا اور اس فتح کے اسباب صلح حدیبیہ ہی نے فراہم کیے۔ یہ صلح صرف دو سال تک جاری رہ سکی۔ اس کے بعد مشرکین مکہ نے اس عہد کو توڑ دیا۔ اس طرح

اللہ نے اس فتح کی راہ ہموار کر دی اور مکہ مکرمہ بغیر جنگ کے فتح ہو گیا۔ یہ مکہ ہی تھا جو مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کیا کرتا تھا اور مسلمانوں کے گھر کے اندر آکر لڑتا تھا اور حدیبیہ کے وقت بھی اسی نے مسلمانوں کو بغیر عمرہ دلہن کر دیا۔ اللہ نے اسے گھیر لیا اور بغیر جنگ کے یہ قبضے میں آ گیا۔

وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (۴۸: ۲۱) ”اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ یہ بھی دراصل ایک درپردہ خوشخبری تھی۔ اس وقت اللہ نے اسے ظاہر نہیں کیا تھا اور ان غیبی امور میں سے تھا جو ابھی ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ یہاں اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا تاکہ لوگ مطمئن اور پر امید ہوں اور خوش ہوں۔

---○●○---

یہاں تک اللہ نے ان کو موجودہ غنیمت کے لیے بھی خوشخبری دے دی اور اس کے بعد کی آنے والی غنیمتوں کی خوشخبری بھی دے دی گئی اور مسلمان ان کا انتظار کرنے لگے ’ان خوشخبریوں کے ساتھ ساتھ ایک بڑی خوشخبری یہ بھی دے دی گئی کہ اب ان شاء اللہ مسلمان فتح مند اور کامران رہیں گے۔ اس سال جو صلح طے کر لی گئی ’وہ اس لئے نہیں کر لی گئی کہ مسلمان کمزور تھے یا یہ کہ مشرکین بہت قوی تھے لیکن بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ صلح طے کر لی گئی اگر اس بار بھی لڑ لیں تو ہار جاتی تو بھی یہ ہزیمت اٹھاتے کیونکہ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ جب مسلم اور کافر کا کسی فیصلہ کن مقام پر مقابلہ ہو جائے تو مسلم فتح یاب ہوں۔

وَلَوْ قَتَلْتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (۲۲)
مُسْنَةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۲۳) (۴۸: ۲۲ تا

۲۳) ”یہ کافر لوگ اگر اس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔ جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔“

یوں مومنین کی فتح اور کفار کی شکست کو اللہ اس سنت کے مربوط فرماتا ہے جو اس کائنات میں جاری ہے جس کے اندر کوئی تغیر نہیں ہو کرتا۔ کس قدر عظیم سکینت ہے یہ؟ کس قدر عظیم بھروسہ ہے یہ؟ کس قدر ثابت قدمی ان مومنین کو دی جا رہی تھی کہ وہ اللہ کے کلام میں اس کے نبی کی زبانی اپنی فتح اور کفار کی شکست کی خوشخبریاں سن رہے ہیں۔

اللہ کی سنت تو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ ہاں اس کی سنت کے مطابق فتح میں دیر ضرور ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فتح کے اسباب کا تعلق مومنین کی تیاری اور تربیت سے ہوتا ہے اور ان کی تیاری اور چھی طرح تربیت کا علم اللہ ہی کو ہوتا ہے۔ یا ان حالات کی آمد پر ہوتا ہے جن میں مومنین کے لیے نصرت اور فتح کے اسباب و حالات فراہم ہو جائیں اور کافروں کی ہزیمت یقینی ہو جائے تاکہ فتح کی اہمیت اور اثر وسیع ہو جائے یا دوسری وجوہات بھی ہو سکتی ہیں جن کو اللہ جانتا ہے۔ بہر حال سنت الہیہ کے مطابق فتح حق کی ہوتی ہے اور اللہ کی سنت کبھی بدلتی نہیں۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (۴۸: ۲۳) ”اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے“ اب اللہ

فرماتا ہے کہ یہی حکمت تھی کہ وادی مکہ میں اللہ نے کافروں کو توفیق نہ دی کہ وہ مسلمانوں پر ہاتھ ڈالیں اور مسلمانوں کو بھی توفیق نہ دی کہ وہ مشرکین مکہ پر اس وقت ہاتھ ڈالیں جب وہ ان کے قابو میں آگئے تھے۔ یہ ان چالیس آدمیوں کی طرف اشارہ ہے۔ چالیس ہوں یا کم و بیش۔ جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے آئے تھے۔ یہ پکڑے گئے اور رسول اللہ نے معاف کر دیا۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَאَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ

بِطَّنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ۝

هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيِ مَعْكُوفًا أَنْ يَنْبَلُ

مَحِلَّهُ ۚ وَلَوْلَا رِجَالُ مُؤْمِنُونَ وَنِسَاءُ مُؤْمِنَاتٌ لَمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَّوَّهُمْ

فَتُصِيبَكُمْ مِنْهُمْ مَعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ لَوْ

تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۚ إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا

فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ ۚ وَ

عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَالزَّمَهُمْ كَلِمَةً ۚ التَّقْوَى ۚ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ

۹ ن اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝

۱۱

”وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے‘ حالانکہ وہ ان پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے لونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا۔ اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے‘ اور یہ خبر نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو) جنگ نہ روکی جاتی۔ روکی وہ اس لیے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر لے۔ وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (لعل مکہ میں) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے۔ (یہی وجہ ہے کہ) جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کے زیادہ حق دار اور اس کے لعل تھے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔“

یہ ایسا واقعہ تھا جو ہو چکا تھا اور سامعین اسے خوب جانتے تھے۔ اللہ اس انداز میں اس کا ذکر فرما رہا ہے کہ بتائیں کہ جو واقعات بھی ہوئے ان میں اللہ کی تدبیر اور تقدیر کام کر رہی تھی اور اس سے قرآن مجید ان کے دلوں میں اس احساس

کو مگر اگر رہا تھ کہ اللہ کا ہاتھ ان کے لیے تدبیر کر رہا ہے 'ان کی قیادت اللہ کے رسول کے ذریعہ اللہ کے ہاتھ میں ہے' اور اللہ ان کے میلانات کو بھی کنٹرول کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کے لیے ہو جائیں۔ اپنے نفوس کو اللہ کے سپرد کر دیں اور انہیں احکام الہی میں کوئی تردد نہ رہے۔ بالکل ادھر ادھر نہ دیکھیں اور پوری طرح اسلام میں داخل ہو جائیں۔ اپنے احساسات، اپنے جذبات، اپنا رخ اور اپنی تمام سرگرمیاں اللہ کے حوالے کر دیں اور یہ یقین کر لیں کہ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور یہ کہ خیر و برکت ہے جسے اللہ اختیار کرے اور یہ کہ وہ اللہ کی قدرت اور مشیت کے مطابق چل رہے ہیں۔ چاہے وہ کوئی بات اختیار کریں یا اسے رد کر دیں اور اللہ ہر حال مسلمانوں کی بھلائی چاہتا ہے 'تو اب اگر وہ اللہ کے احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں تو یہ بھلائی بڑی آسانی کے ساتھ حاصل ہو جائے گی۔ اللہ عظیم و بصیر ہے۔ ظاہر اور پوشیدہ سب کو جانتا ہے وہ علم و بصیرت کے ساتھ ان کے لیے راہ تجویز کرتا ہے۔ وہ ان کو ہرگز برباد ہونے نہیں دیتا۔ نہ اللہ کسی ایسی چیز کو ان سے روکتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔

وَ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا (۴۸: ۲۴) ”اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔“

---○○○---

اب اللہ مسلمانوں کے مخالف کیمپ پر تبصرہ فرماتا ہے کہ اللہ کے چنانے کے مطابق ان کے شب و روز کیا ہیں؟ اور اللہ ان کی کارروائیوں کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے؟ وہ مومنین کو مسجد حرام سے روک رہے ہیں اور یہ کہ اللہ مسلمانوں کو کس نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور ان کے دشمنوں کو کس نگاہ سے!

هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ الْهَدْيِ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ وَلَوْ لَا رِجَالٌ مُؤْمِنُونَ وَ نِسَاءٌ مُؤْمِنَاتٌ لَمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَّوَّهُمْ فِتْصِيكُم مِّنْهُمْ مَّعْرَةٌ بَغَيْرِ عِلْمٍ يُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۲۵) اِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَ الزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَ كَانُوا أَحَقُّ بِهَا وَ أَهْلِهَا وَ كَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (۲۶) (۴۸: ۲۵ تا ۲۶) ”وہی لوگ تو

ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچے دیا۔ اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ ناداننگی میں تم انہیں پال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی۔ روکی وہ اس لیے تھی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے

داخل کر لے۔ وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے۔ (یہی وجہ ہے کہ) جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حسیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کے زیادہ حق دار اور اس کے لائق تھے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔“

اللہ کے پیانوں کے مطابق وہ بلا شک کافر ہیں، اس لیے وہ اس مکروہ لقب کے مستحق ہیں۔

هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا (۲۵: ۴۸) ”وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا“۔ اللہ تعالیٰ یہ لقب ان کو عطا کرتا ہے کہ گویا کافر ہی اہل مکہ ہیں۔ چونکہ یہ صفت کفر میں کانوں تک غرق ہیں اس لیے یہ لوگ اللہ کے ہاں مکروہ ترین مخلوق ہیں اس لیے کہ اللہ کفر کو نہایت ہی مکروہ سمجھتا ہے۔ پھر دو برابر اقل جو یہ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اہل ایمان کو مسجد حرام سے روک رہے ہیں اور قربانی کے جانوروں کو بھی روک رہے ہیں کہ ان کو اپنے محل ذبح تک لے جایا جائے۔

وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيِ مَعْكُوفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلُّهُ (۲۵: ۴۸)

”تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا“۔ یہ کام اسلام میں بھی گناہ کبیرہ ہے اور جاہلیت میں بھی گناہ تھا۔ اور ابراہیم علیہ السلام سے ادھر جزیرۃ العرب میں جس قدر ادیان بھی نازل ہوئے ان سب میں یہ گناہ کبیرہ افعال تھے۔ ان کے عرف ’ان کے عقیدہ اور مسلمانوں کے دین کے مطابق یہ مکروہ کام تھے۔ اس لیے اللہ نے مسلمانوں کو ان پر حملہ کرے سے اس سے روکا کہ ان کے یہ جرائم کہیں چھوٹے تھے، ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کی کوئی اور حکمت تھی۔ اللہ مہربانی فرماتے ہوئے اس حکمت کا انکشاف فرماتا ہے۔

وَلَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَّوُّوْهُمْ فَتَضَيَّبُوْكُمْ

مِنْهُمْ مَّعْرُوفٌ بَغِيْرٌ عِلْمٍ (۲۵: ۴۸) ”اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانسی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی) مکہ میں بعض ضعیف اور کمزور مسلمان رہ گئے تھے جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہ کی تھی۔ اور انہوں نے مشرکین کے درمیان رہتے ہوئے اپنے اسلام کو خوف کے مارے چھپا رکھا تھا۔ اگر جنگ شروع ہو جاتی اور مسلمان مکہ پر حملہ آور ہو جاتے اور وہ نہ جانتے کہ کون مسلم ہے اور کون کافر ہے، ممکن تھا کہ یہ مسلمان ان ضعیف مسلمانوں کو روند کر قتل کر دیتے۔ اور پھر کافریہ کہتے کہ مسلمانوں نے مسلمانوں کو بھی معاف نہ کیا۔ یوں مسلمانوں کو ان مسلمانوں کی دیت دینا پڑتی جن کو انہوں نے خطا کے طور پر قتل کر دیا تھا۔ پھر ایک حکمت یہ بھی تھی کہ آج جو کافر مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے اور ہدی کے جانوروں کو جائے ذبح سے روک رہے ہیں، انہی میں سے بعض لوگ عظیم مسلمان بننے والے ہیں۔ اور اللہ کی رحمتوں میں داخل ہونے والے ہیں اور اللہ ان سب کو جانتا تھا۔ اگر اس وقت یہ لوگ جدا ہوتے تو اللہ ضرور اجازت دے دیتا لیکن ابھی تک اللہ نے ان کو جدا نہ کیا تھا۔ اس لیے اللہ نے اس موقع پر کافروں کو اس مار سے بچا لیا۔

رضامندی اور اطمینان کے ساتھ۔

یہی وجہ ہے کہ مومنین اس بات کے مستحق تھے کہ وہ اہل تقویٰ کی بات کریں۔ اور یہی اس کے مستحق بھی تھے اور یہ مومنین کی ایک نئی تعریف ہے جبکہ اس سے قبل جو کہا گیا کہ ان پر سکینت نازل کی گئی یہ بھی ان — یہ ایک اعزاز تھا۔ کیونکہ سکینت کے اندر وقار اور تقویٰ دونوں شامل ہیں۔ تو یہ اس لیے نازل ہوا کہ وہ اللہ کے پیانوں کے مطابق اس کے وہ اہل تھے۔ اور اس کی شہادت خود اللہ دیتا ہے۔ مسلمانوں پر اللہ کی طرف سے گواہی کہ وہ اس بات کے مستحق ہیں ایک دوسرا اعزاز ہے اور یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے۔

وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (۲۶: ۴۸) ”اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔“

--- ○ ○ ○ ---

یہ بات پہلے گزر گئی ہے کہ بعض مومنین جو مدینہ سے رسول اللہ کا خواب سن کر نکلے تھے ان پر اس امر کا بہت برا اثر ہوا تھا کہ وہ اس سال مسجد حرام میں داخل نہ ہو سکے۔ اور انہیں مسجد حرام سے لوٹا دیا گیا۔ یہاں اس خواب کی صداقت کی تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ خواب اللہ کی طرف سے تھا اور یہ سچا تھا۔ اور یہ واقع ہونے والا ہے بلکہ اس سے بڑا اللہ پیش آنے والا ہے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّمِّيَا بِالْحَقِّ ۚ أَتَدْخُلْنَ
الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ ۚ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ ۚ
لَا تَخَافُونَ ۚ فَهَلِ امْرَأَةٌ لَمَّا تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا ۚ
هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ
وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۖ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى
الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۖ شَرِهُمُ رُكْعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ
وَرِضْوَانًا ۖ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ الشُّجُودِ ۚ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي
التَّوْرَةِ ۖ وَهُمْ فِي الْإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْئَهُ فَازْرَأَهُ
فَأَسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سَوْقِهِ ۖ يُعْجِبُ الرُّزَّاعَ لَبِيعِظَ بِهِمُ
الْكُفَّارُ ۚ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً ۚ

اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۲﴾

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھا دیا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے 'اپنے سرمنڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے' اور ہمیں کوئی خوف نہ ہو گا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قرینی فتح تم کو عطا فرمادی۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمد اللہ کے رسول ہیں 'اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ عہود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت تورلت میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کوئیل نکالی پھر اس کو تقویت دی 'پھر وہ گد رلی' پر اپنے تئیں پرکھری ہو گئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کباب ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان سے منفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔"

وہی یہ بشارت کہ یہ مسجد حرام میں پر امن داخل ہوں گے اور سرمنڈوائیں گے اور بال ترشوائیں گے اور بے خوف و خطر عمرہ ادا کریں گے تو یہ ایک سال بعد ہو گیا تھا۔ اور صلح حدیبیہ کے دو سال بعد تو بطریق کھل ہو گیا تھا جب مکہ ہی فتح ہو گیا اور پورے مکے پر اللہ کا دین اور اسلامی نظام نافذ ہو گیا۔ لیکن اللہ لل ایمان کو اسلامی آداب بھی سکھاتا ہے اور یوں فرماتا ہے کہ

لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ (۲۷: ۴۸) "کہ ان شاء اللہ تم مسجد حرام میں داخل ہو گے۔" مسجد حرام میں داخل ہونا تو حقیقی ہے کیونکہ اللہ نے اطلاع دے دی ہے لیکن مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کی مشیت کو اپنے شعور کا حصہ بنالیں اور اسے بے قید سمجھیں تاکہ یہ بات ان کے دلوں میں بیٹھ جائے کہ ہونا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اور اسے لل ایمان اپنی سوچ کا حصہ بنالیں کہ قرآن بھی بار بار اس کا ذکر کرتا ہے اور تمام فیصلوں کو اللہ کی مشیت کے تابع قرار دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جہاں اللہ کے وعدے مذکور ہیں وہاں بھی وہ مشیت الہیہ کے ساتھ مشروط ہیں۔ حالانکہ اللہ بھی اپنے وعدوں کے خلاف نہیں کرتا لیکن اللہ کی مشیت ہر قسم سے آزاد ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے دل میں اس حقیقت کو بٹھالیں تاکہ ان کی فکر کی اساس ان شاء اللہ پر ہو۔

اب یہ وعدہ کس طرح حقیقت بنا۔ روایات میں آتا ہے کہ جب سن سات ہجری میں ذہ القعدہ کا مہینہ آیا یعنی صلح حدیبیہ کے بعد تو حضور اکرم مکہ کی طرف عمرے کے لیے نکلے۔ آپ کے ساتھ سب لل حدیبیہ تھے۔ ذوالحلیہ سے آپ نے احرام باندھا۔ ہدی کے جانور ساتھ لیے۔ جس طرح پہلے سال یہاں سے ہی آپ نے احرام باندھا تھا اور جانور ساتھ لیے تھے اور آپ اور آپ کے صحابہ کرام تنبیہ کرتے ہوئے چل پڑے۔ جب حضور اکرم مہینہ ان کے قریب ہوئے تو محمد بن مسلمہ کو گھوڑوں اور اسلحہ کے ساتھ آگے بھیج دیا۔ جب مشرکین نے انہیں دیکھا تو وہ بہت ہی مرعوب ہو گئے۔ ان

کا خیال یہ ہوا کہ شاید رسول اللہؐ ان سے لڑنا چاہتے ہیں۔ اور آپؐ نے ان کے درمیان ہونے والے عہد کو توڑ دیا جو یہ تھا کہ دس سال تک جنگ نہ ہوگی۔ یہ لوگ گئے اور لٹل مکہ کو خبردار کر دیا جب رسول اللہؐ تشریف لائے اور مرالطہراں میں اترے۔ تو تمام اسلحہ، تیر، نیزے، بطن، مانج کی طرف بھیج دیئے اور وہاں سے مکہ کی طرف اس حال میں روانہ ہوئے کہ تلواریں نیام میں تھیں۔ جس طرح ان کے ساتھ ملے ہوا تھا۔ جب آپؐ راستے میں تھے تو قریش نے مرکز ابن طلحہ کو بھیجا اس نے آکر حضورؐ سے کہا کہ ہم نے تو آپؐ کے بارے میں یہ نہیں سنا کہ آپؐ نے کبھی عہد توڑا ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا: 'آپؐ کا مطلب کیا ہے۔ تو اس نے کہا کہ آپؐ اسلحہ لے کر آئے ہیں۔ نیزے، تیر وغیرہ تو آپؐ نے فرمایا یہ بات نہیں ہے وہ تو ہم نے مانج کی طرف بھیج دیئے ہیں تو اس نے کہا درست ہے آپؐ کے بارے میں ہماری معلومات یہی ہیں کہ آپؐ نیک اور متقی ہیں نیز وفائے عہد کرنے والے ہیں۔

کفار کے رؤساء مکہ سے نکل گئے تاکہ ان کی نظریں رسول اللہؐ پر نہ پڑیں۔ وہ آپؐ کو دیکھنا بھی گوارا نہ کر سکتے تھے۔ رہے عام لٹل مکہ مرد اور عورتیں اور بچے تو وہ راستوں اور کونٹوں پر بیٹھ گئے اور رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو دیکھتے رہے۔ حضورؐ مکہ میں داخل ہوئے، آپؐ کے رفقاء آپؐ کے آگے آگے تھے، سب تلبیہ پڑھ رہے تھے، جس قدر جانور تھے ان کو ذی طوی بھیج دیا گیا۔ حضورؐ اپنی ناقہ قصواء پر سوار تھے جس پر آپؐ حدیبیہ کے دن بھی سوار تھے۔ عبد اللہ ابن رواحہ انصاری نے زمام تھم رکھی تھی اور ناقہ کو چلا رہے تھے۔

یوں آپؐ کی غلبہ جی ہوئی۔ اللہ کا وعدہ پورا ہوا اور اگلے سال فتح مکہ بھی ہو گیا اور اللہ کا دین مکہ پر بھی غالب ہو گیا۔ اور اس کے بعد پورے جزیرہ العرب میں غالب ہو گیا اور اب آخری خوشخبری یوں پوری ہوئی:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَىٰ

بِاللَّهِ شَهِيدًا (۲۸: ۴۸) ”وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔“ دین اسلام صرف جزیرۃ العرب ہی میں غالب نہ ہوا بلکہ پوری دنیا میں غالب ہوا۔ اور یہ عمل صرف نصف صدی کے اندر اندر پورا ہو گیا۔ یہ دین کسریٰ کی پوری مملکت پر غالب ہو گیا اور قیصر کی مملکت کے بھی بڑے حصے کو فتح کر لیا۔ ہند اور چین میں بھی غالب ہو گیا۔ پھر جنوبی ایشیا اور ملایا میں غالب ہوا اور انڈونیشیا میں غالب ہوا اور یہی دنیا تھی جو اس دور میں آباد تھی۔ یعنی چھٹی صدی اور ساتویں صدی عیسوی میں۔ لیکن اللہ کا دین آج تک تمام ادیان پر غالب ہے۔ اگرچہ دنیا کے ان حصوں میں جہاں مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل تھا، مسلمان ہپا ہو گئے۔ خصوصاً یورپ اور بحرہیض کے جزائر سے۔ اور مسلمان مشرق و مغرب میں اٹھنے والی نئی قوتوں کے مقابلے میں ہپا ہو گئے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ دین حق یعنی دین اسلام بحیثیت دین آج بھی تمام ادیان پر غالب ہے۔ یہ دین اپنی ذات، اپنی ماہیت اور اپنی ذاتی صلاحیتوں اور خوبیوں کی وجہ اپنے ماننے والوں کی مدافعت بغیر تلوار کے کرتا ہے اور بغیر کسی سیاسی قوت کی پشت پناہی کے یہ دین آگے بڑھ رہا ہے۔ کیونکہ اس دین کی فطرت میں نواہیں فطرت کے ساتھ ہم رنگی ہے اور توہین فطرت اس کائنات میں اللہ کے ودیعت کردہ حقیقی اصول ہیں۔ پھر اس دین میں عقل، روح اور جسم سب کی

ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ انسانی تعمیر و ترقی، سوسائٹی کی ضروریات، فرد کی ضروریات سب کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ ایک جھوپڑی کے باشندے اور ایک محل اور کوٹھی کے باشندے سب کی ضروریات کو اس دین میں پورا کیا گیا ہے۔
دوسرے مذاہب کے پیروکار اگر اس دین پر تعصب سے پاک نظروں کے ساتھ غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ بہت بڑی قوت والا دین ہے۔ اور یہ آج بھی انسانیت کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے اور اس ترقی یافتہ دور میں کسی بھی ترقی یافتہ سوسائٹی کی ضروریات کو یہ دین نہایت ہی استقامت کے ساتھ پوری کر سکتا ہے۔

وَكَفَى بِاللّٰهِ شَهِيدًا (۲۸: ۴۸) ”اور اس پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔“ غرض بعثت نبی کی بعد ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اللہ کا یہ وعدہ سیاسی لحاظ سے سچا ثابت ہو گیا اور یہ دین تمام دنیا پر غالب ہو گیا اور اپنی ذات کے اعتبار سے یہ اب بھی تمام ادیان پر غالب ہے۔ بلکہ تمام دوسرے ادیان دنیا سے ختم ہو گئے اور یہی ایک دین ہے جو اپنی ذاتی صلاحیت کی وجہ سے قائم و دائم ہے اور اپنی عملیت کے لحاظ سے یہ ہر وقت قابل عمل ہے۔
آج صرف اس دین کے ماننے والے اس حقیقت کے ادراک سے محروم ہیں کہ یہ دین اسلام اپنی ذات کے اعتبار سے غالب ہے۔ جبکہ اس دین کے دشمن اس بات کو جانتے ہیں اور اس سے بہت ڈرتے ہیں اور اپنی سیاسی پالیسی میں دین اسلام کی اس خطرناکی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

---○○○---

اب ہم اس سورت کے خاتمہ کی طرف آرہے ہیں۔ اس میں قرآن نے صحابہ کرام کی وہ تصویر کشی کی ہے جو اس وقت عملاً موجود تھی اور یہ جماعت محترمہ جس کے بارے میں پہلے آچکا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور اس جماعت کے ایک ایک فرد تک اللہ کی خوشنودی کی اطلاع کر دی گئی، یہ کون لوگ تھے؟ تو سنئے!

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكُوعًا
سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ
مِثْلَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمِثْلَهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْئَهُ فَازَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ
فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيُغَيِّظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَ
عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (۲۹: ۴۸) ”محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو
لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل
اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ ہلک پھانے
جانتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت تو رلت میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ”کھیت ہے جس نے پہلے
کوٹیل نکالی، پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گد رلی، پر اپنے تئیں پرکھڑی ہو گئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تا

کہ کفار ان کے بھلنے پھولنے پر ہیں۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔“

یہ ایک زبردست تصویر ہے۔ قرآن کریم نہایت ہی انوکھے انداز میں یہ تصویر کشی کرتا ہے۔ اس جماعت کی نمایاں جھلکیاں یہاں دی گئی ہیں۔ ان کے ظاہری حالات، ان کے پوشیدہ روحانی حالات، ان کے باہم تعلقات، ان کے کفار کے ساتھ تعلقات۔

أَشَدُّ أَعْلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۲۹:۴۸) ”کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔“ اور اللہ کی بندگی اور پرستش کرتے ہوئے۔

تَرَهُمْ رُكْعًا سُجَّدًا (۲۹:۴۸) ”تم دیکھو گے انہیں رکوع و سجود میں۔“ اور ان کی قہی حالت اور خواہش اور فکر کیسی ہے۔ ان کی دلچسپیاں کیا ہیں۔

يَتَّبِعُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا (۲۹:۴۸) ”اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول ہیں۔“ اور ان کے ظاہری خدو خال اور نشانات کیا ہیں، چہرے مرے کیسے ہیں۔

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (۲۹:۴۸) ”سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں۔“ اور تورات و انجیل میں بھی ان کی یہی صفات ملتی گئی ہیں۔ (۱) كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شِعْلَهُ (۲۹:۴۸) ”ایک بھتی کی طرح جس نے پہلے کوئیل نکالی۔“ (۲) فَأَزْرَهُ (۲۹:۴۸) ”پھرات تقویت دی۔“ (۳) فَاسْتَعْلَظَ (۲۹:۴۸) ”پھر وہ گدردلی۔“ (۴) فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوْقِهِ (۲۹:۴۸) ”پھر لپٹے تنے پر کھڑی ہو گئی۔“ (۵) يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (۲۹:۴۸) ”کاشت کرنے والے کو وہ خوش کرتی ہے۔“ (۶) لِيَغْضَبَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۲۹:۴۸) ”تاکہ کفار ان کے بھلنے پھولنے پر چلیں۔“

یہاں سب سے پہلے اس صفت محمدی کو ثابت اور سوکد کیا جاتا ہے جس کا انکار سبیل ابن عمرو نے کیا تھا کہ آپ کے نام کے ساتھ رسول اللہ کا لفظ نہ لکھیں یعنی محمد رسول اللہ (محمد اللہ کے رسول ہیں) اور اس کے بعد صحابہ کرام کی یہ انوکھی اور عجیب تصویر شروع ہو جاتی ہے نہایت ہی انوکھے انداز میں۔

مومنین کے حالات تو مختلف ہوتے ہیں لیکن ان جھلکیوں میں جو صفات دی گئی ہیں یہ تمام مومنین کی زندگی میں ہوتی ہیں اور یہ ان کی زندگی کے بنیادی نکات ہیں۔ انہی نکات سے اس تصویر کے خطوط ابھرتے ہیں جو نہایت ہی خوبصورت اور چمک دار ہیں۔ یہاں اللہ نے جو جھلکیاں دی ہیں ان میں ان باتوں کو بہت نمایاں کیا گیا ہے جن سے اس جماعت کی عزت افزائی ہو۔ لہذا وہ نکات اور وہ خطوط یہاں نمایاں ہیں جن کے ذریعہ عالم بالا میں انہیں اعزاز ملا ہے۔

ان کے معزز اور مکرم ہونے کی پہلی جھلکی اور رنگ یہ ہے کہ یہ لوگ۔

أَشَدُّ أَعْلَى الْكُفَّارِ رَحْمَاءُ بَيْنَهُمْ (۲۹: ۴۸) ”کافروں پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔“
یہ کافروں پر بہت ہی سخت ہیں حالانکہ اس وقت کافروں میں ان کے آباء ’بھائی‘ قریبی رشتہ دار اور دوست موجود تھے۔
لیکن انہوں نے ایسے تمام رشتوں کو یکدم کاٹ کر رکھ دیا۔ اور وہ آپس میں رحم دل ہیں حالانکہ ان کے درمیان صرف
دینی اخوت ہے۔ لہذا ان کی شدت بھی اللہ کے لیے ہے اور ان کی نرمی بھی اللہ کے لیے ہے۔ یہ ہے نظریاتی حمیت
اسلامی حمیت ’دینی غیرت‘۔ لہذا وہ اپنے نفس کے لیے کچھ نہیں چاہتے۔ اور نہ ان کے نفوس کے لیے اس دین میں کچھ
ہے۔ یوں وہ اپنے جذبات اور اپنی محبتوں کو اپنے تعلقات اور طرز عمل کو اپنے نظریات اور عقائد کی اساس پر استوار اور
تعمیر کر رہے ہیں۔ وہ نظریاتی دشمنوں پر سخت اور نظریاتی دوستوں کے لیے ریشم کی طرح نرم ہیں۔ وہ انانیت اور خواہشات
نفسانیہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے کسی اور تعلق کے لیے وہ مشتعل ہی نہیں ہوتے۔

اب دوسری جھلکی ’ان کے تکریم اور ان کا شرف ان کی رکوع و سجود میں ہے۔ جب وہ عبادت کرتے ہیں تو رکوع و
سجود میں ہوتے ہیں اور تم انہیں ہمیشہ اس حالت میں پاؤ گے گویا یہ صفت ان کی دائمی صفت ہے اور عبادت میں رکوع
و سجود مکمل حالت ہے اور ان کے ذہنوں میں بھی یہی حالت ہے اور ان کے جسم بھی بروقت رکوع و سجود میں ہیں گویا ان
کی پوری زندگی اور پورا وقت اسی کام میں گزرتا ہے۔

ان کی جو تیسری جھلکی دکھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی باطنی ’ان کی روحانی اور ان کی نفسیات کی حالت کیا ہے۔

يَتَتَوَنُّونَ فَضُلًا مِّنَ اللَّهِ وَ رِصْوَانًا (۲۹: ۴۸) ”تم ان کو اللہ کے فضل اور خوشنودی کی طلب
میں مشغول پاؤ گے۔“ یہ ان کے شعور کی دائمی حالت ہے۔ ان کا دل جن باتوں میں ہر وقت مشغول رہتا ہے ’ان کے
اندر ہر وقت جو شوق اٹھتے ہیں وہ یہی ہیں کہ کسی طرح اللہ راضی ہو جائے ’اللہ کی رضا اور اس کے فضل کی طلب کے سوا
ان کا اور کوئی مشغلہ اور دلچسپی ہی نہیں ہے۔

اور چوتھی خوبی یہ کہ ان کی عبادت ان کے فیروز اور ان کے خدوخال میں ظاہری طور پر نظر آتی ہیں۔

سَيَمَاهُمُ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (۲۹: ۴۸) ”ان کے سجود کے اثرات ان کے چہروں میں
موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔“ یعنی ان کے چہرے میں نور ’روشنی اور چمک نظر آئے گی۔ اور ان کا چہرہ
صاف و شفاف ہو گا۔ اور یہ ان کی صاف ’زندہ اور روح پرور عبادت کی وجہ سے۔ اس سیما سے مراد وہ معروف
نشان (محراب) نہیں ہے جو بعض لوگوں کے ماتھے پر پڑ جاتا ہے (جب وہ سجدے میں ماتھا رکھتے ہیں) مِّنْ أَثَرِ
السُّجُودِ (۲۹: ۴۸) کے لفظ سے ذہن میں یہ نشانی آ جاتی ہے۔ اثر اسوہ سے مراد اثر العبادہ ہے۔ کیونکہ سجدہ عبادت
اور بندگی اور اطاعت کا درجہ کمال ہوتا ہے اور اس میں انسان عاجزی اور اطاعت کی کمال حالت میں ہوتا ہے۔ اس حالت کا اثر
انسان کے چہرے پر بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عبادت گزاروں کے چہروں پر سے کبر و غرور اور مستی دور ہو جاتی ہے اور اس
کی جگہ شریفانہ تواضع ’صاف و شفاف طرز عمل‘ پر وقار نور اور تقویٰ کا دھماپن آ جاتا ہے جس سے مومن کا چہرہ نہایت ہی
خوبصورت نظر آتا ہے جبکہ اس کے چہرے پر مایوسی بالکل نہیں ہوتی اور وہ خوش اور مطمئن نظر آتا ہے۔

یہ روشن تصویر جو ان جھلکیوں میں نظر آتی ہے یہ کوئی نئی تصویر نہیں ہے۔ یہ ان کے لیے نظام قضا و قدر میں لکھی

ہوئی ہے۔ لوح محفوظ میں درج ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کا تذکرہ توریت میں بھی آیا ہے اور انسانوں کو ان کے بارے میں غرہ شجرہ دی گئی ہے۔ قبل اس کے وہ اس زمین پر پیدا ہوں۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيلِ (۲۹: ۴۸) ”یہ ہے ان کی صفت توریت میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے“

اللہ نے ان دو سابقہ کتابوں میں حضرت محمدؐ اور آپؐ کے رفقاء کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ

كَزَّرَعٍ اَخْرَجَ شَطِئَهُ (۲۹: ۴۸) ”ایک کھیتی کی طرح ہیں جس نے پہلے کوئیل نکالی“۔ وہ اس طرح بڑھے جس طرح فصل ابتداء میں کوئیل نکالتی ہے، تروتازہ ہوتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑھتی اور قوی ہوتی ہے۔ فَازَرَهُ (۲۹: ۴۸) ”پھر اس کو تقویت دی“۔ یعنی اس کوئیل نے اسے مضبوط کیا۔ یا نال نے اس کو مضبوط کیا۔

فَاسْتَغْلَظَ (۲۹: ۴۸) ”پھر وہ مضبوط سے مضبوط ہو گئی“ یعنی وہ نال اور فصل۔

فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهِ (۲۹: ۴۸) ”پھر وہ تنے پر کھڑی ہو گئی“۔ یعنی وہ فصل اپنی نال، تنے یا ڈنڈی پر کھڑی ہو گئی، اب اس میں نہ کمزوری ہے اور نہ جھکاؤ، مضبوط ہے اور سیدھی ہے۔

یہ تو ہے فصل کی ذاتی صورت حالات۔ لیکن کسان کے نفس پر اس کے کیا اثرات ہیں۔ ماہرین پر اس کے کیا اثرات ہیں جو بڑھنے والے کو بھی جانتے ہیں اور مرجھانے والے کو بھی جانتے ہیں۔ پھلدار کو بھی جانتے اور بے پھل کو بھی۔ تو ایسے لوگوں کے دل میں سرت دوڑ جاتی ہے۔

يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (۲۹: ۴۸) ”کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے“۔ اور بعض قراتوں میں الزراع کی جگہ الزارع (بونے والا) آیا ہے۔ اور مراد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اس بڑھنے والی قوی تروتازہ اور فرحت بخش فصل کے کسان ہیں۔ پھر کفار کے دلوں پر اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟ وہ غصہ اور جھنجھلاہٹ۔

لَيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۲۹: ۴۸) ”تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں“۔ آخر میں کفار کے غصے کا ذکر کر کے قرآن نے اشارہ کر دیا کہ کہیں اس کو لوگوں کی فصل پر ہی چسپاں نہ کرو۔ اس سے مراد اللہ والوں کی فصل ہے۔ اور رسول اللہ کی فصل ہے اور یہ ان لوگوں کی فصل ہے جو دست قدرت کے آلات ہیں اور کفار کے لیے پریشانی کا باعث۔

یہ مثال بھی کوئی نئی مثال نہیں ہے کہ کتاب تقدیر کے صفحات میں درج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ذکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمین پر آنے اور مبعوث کیے جانے سے بھی پہلے اس کا ذکر تورات اور انجیل میں موجود ہے۔ اور انجیل میں تو اس کی تصریح موجود ہے کہ محمدؐ اور اس کے ساتھی آئیں گے۔

یوں اللہ اپنی مازوال کتاب میں اس جماعت کی صفات کو قلم بند فرماتا ہے۔ یعنی جماعت صحابہ کی۔ یوں اس کائنات

کے مرکز میں یہ جماعت قائم ہوتی ہے۔ پوری کائنات اس کے ساتھ چلتی ہے اور یہ جماعت باری تعالیٰ سے اپنی یہ تعریف منتی ہے۔ اور پھر آنے والی نسلوں کے لیے ان کی صفت بطور نمونہ ریکارڈ کر دی جاتی ہے تاکہ آئندہ کی نسلیں بھی اس معیار کو قائم کرنے کی سعی کیں تاکہ ایمان اپنے اعلیٰ درجات میں قائم ہو۔

جماعت صحابہ کی اس صفت اور تکریم کے بعد پھر اعلان ہوتا ہے کہ ان کے لیے اجر عظیم ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا

(۲۹:۴۸) ”اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔“ اس جماعت کی صفات کے بعد اب یہ ایک عمومی اعلان ہے اور اس اعلان کے مستفید ہونے والوں میں ظاہر ہے کہ وہ سب سے پہلے داخل ہیں۔ مغفرت اور اجر عظیم۔ یہی ایک اعلان ہی ان کے لیے بڑا اعزاز ہے اور ان کے لیے تو اللہ کی رضامندی ہی بڑا اجر ہے لیکن اللہ کا فضل و کرم بلا قیود اور بلا حدود ہے اور اللہ کی بخشش بے انتہا و لامحدود ہے۔

میں ایک بار پھر چشم خیال کو کھول کر اس جماعت کرمہ کو دیکھ رہا ہوں جس کے دل سعید ہیں۔ جو اللہ کے یہ فیوض رحمت اور اعزاز و اکرام اور عظیم اجر کے وعدے پا رہے ہیں۔ ان کو سنایا جا رہا ہے۔ یہ اعلان کہ اللہ کی کتابوں میں اللہ کے پیاروں میں اللہ کے ایوانوں میں ان کے لیے یہ ہے یہ ہے۔ حدیبیہ سے یہ دلہن ہو رہے ہیں اونٹوں کی رفتار کے گرد و غبار میں یہ سورت سنتے ہیں اب یہ ان کی روح اور ان کی زندگی ہے۔ ان کے کانوں اور ارواح میں یہ اثر رہی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور مسکراتے ہیں اور ان کا وجود ہی اللہ کا مجسم فضل و کرم ہے..... میں چشم تصور سے ان کو دیکھ کر ذرا ان کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ (راہ مجھے بھی ان کے ساتھ چند قدم چلنے دو) لیکن جو شخص ان کی راہ پر نہیں چلا وہ اس جشن فتح میں کیا شریک ہو سکتا ہے؟ نہیں وہ دور ہی سے دیکھتا رہے گا..... اللہ! تو ہی کسی کو یہ اعزاز بخش سکتا ہے کہ وہ دور سے نجات کو نہ دیکھے بلکہ اس جشن میں کود پڑے۔ لے لے لے لے تو جانتا ہے کہ میں اس جشن میں کودنے کے لیے بے تاب ہوں!

--- ۰۰۰ ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۶

سورۃ الحجرات - ۴۹

آیات ۱ --- تا --- ۱۸

سورۃ الحجرات ایک نظر میں

یہ سورت صرف اٹھارہ آیات پر مشتمل ہے۔ لیکن اپنے مضامین کے اعتبار سے ایک عظیم سورت ہے۔ اس میں نظریات، دستور و قانون اور انسانی وجود کے بارے میں نہایت ہی اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو انسان کے دل و دماغ کے لیے نہایت ہی وسیع آفاق اور وسیع دنیا کے دردازے کھولتے ہیں۔ نہایت گہرے تصورات اور نہایت عظیم معانی اس کا موضوع ہیں۔ اس کے ان موضوعات میں تخلیق و تنظیم، تربیت و تہذیب، دستور و قانون اور ہدایات و رہنمائی کے مسائل لیے گئے ہیں۔ یہ مسائل اس قدر گہرے، وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ ان کے بیان کے لیے موجودہ آیات کے مقابلے میں سیکڑوں آیات درکار ہیں۔ لیکن یہاں دریا کوڑہ میں بند کر دیا گیا ہے یا دریا بحال رہا۔

یہ سورت دو باتوں کو نہایت کھل کر بیان کرتی ہے اور یہ دو باتیں نہایت اہم بہت عظیم اور غور و فکر کے لائق ہیں:

پہلی بات یہ کہ سورت ایک بلند، پاکیزہ اور سلیم الفطرت ماحول اور اونچے معاشرے کے نشانات وضع کرتی ہے۔ یہ وہ اصول اور قوانین بیان کرتی ہے اور وہ طرز زندگی متعین کرتی ہے جس کے لوہے ماحول اور یہ معاشرہ قائم کیا جانا مطلوب ہے۔ وہ اصول و مبادی جس کے لوہے اس سوسائٹی نے قائم ہونا ہے اور پھر جن کے مطابق اس ماحول اور اس سوسائٹی کی حفاظت کی جانی ہے۔ ایک ایسی سوسائٹی جو اللہ کی بنائی ہوئی ہو، جو اللہ کی طرف رخ کیے ہوئے ہو اور جسے صحیح معنوں میں ایک الہی سوسائٹی کہا جاسکتا ہو۔ ایک ایسی سوسائٹی جس کا دل صاف ہو، جس کے تصورات پاکیزہ ہوں، جس کی زبان پاک ہو اور جس کی سیرت اور جس کا اندرون پاک ہو، ایک ایسی دنیا اور سوسائٹی جو اللہ کے ساتھ کچھ آداب کو ملحوظ رکھے، جو رسول اللہ کے ساتھ بھی کچھ آداب قائم رکھی ہو، اپنی ذات کے ساتھ بھی اس کے آداب ہوں اور دوسروں کے ساتھ بھی آداب ہوں جس کے ضمیر میں بھی آداب ہوں، جس کے اعضا بھی مودب ہوں۔ پھر اس سوسائٹی نے اپنے حالات کے لیے منظم قوانین بنا رکھے ہوں، اور اس کا نظم و نسق ایسا ہو جو اسے بچاتا ہو، اور یہ قوانین اور یہ تنظیمی ادارے انہی آداب پر مبنی ہوں، انہی آداب سے پھونٹے ہوں، ان آداب کے ساتھ ہم آہنگ ہوں، وہ اس سوسائٹی کی روحانی دنیا اور ظاہری دنیا کے لیے کافی ہوں۔ اس کا شعور اور اس کے قوانین ہم آہنگ ہوں۔ اسے آگے جانے اور ترقی کرنے اور اس کے دائرہ ممنوعات کے درمیان بھی توازن ہو؟ اس کے احساسات اور اقدامات متوازن ہوں اور یہ پوری کی پوری اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی اعلیٰ ارفع اور پاک و صاف سوسائٹی کا قیام نہ فقط روحانی تطہیر پر چھوڑا گیا ہے اور نہ ہی فقط قانون سازی اور انتظامی اداروں کے حوالے کیا گیا ہے، بلکہ اس کی روحانی تطہیر، اس کا قانون و دستور اور اس کے انتظامی ادارے سب مل کر کام کرتے ہیں۔ یہ سوسائٹی نہ تو ایک فرد کی سوچ کے تابع ہے اور نہ ہی حکومت کے اداروں کی سوچ کے حوالے ہے۔ بلکہ اس میں افراد، حکومت دونوں مل کر اپنے اپنے فرائض باہم تعاون سے ادا کرتے ہیں رہائی ہدایات کی روشنی میں۔

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس کے اندر اللہ اور رسول اللہ کے بارے میں کچھ ماری آداب ہیں۔ بندے کو اللہ کے سامنے اور اللہ کے رسول کے سامنے کچھ آداب بھی ملحوظ رکھنے ہوتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ

عَلِيمٌ (۴۹: ۱) ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔“ کوئی انسان امر و نہی میں اللہ سے آگے نہ بڑھے۔ اللہ پر کوئی فیصلہ اور ڈگری نافذ نہ کرے۔ اور اللہ جو حکم دے اور جس سے روکے اس سے تجاوز نہ کرے وہ اپنے خالق کے مقابلے میں اپنی رائے اور اپنے ارادے پر زور نہ دے۔ اس سے ڈرے اور اس سے حیا کرے اور نہایت ہی ادب سے اس کی بارگاہ میں رہے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بھی وہ کچھ ظاہری آداب بھی ملحوظ رکھے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (۴۹: ۲) إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ فَلتَتَقَوَّىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ (۴۹: ۳) إِنَّ الَّذِينَ ينادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۴۹: ۴) وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَاللَّهُ

غَفُورٌ رَحِيمٌ (۴۹: ۵) ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کر لیا سب عارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ رسوں خدا کے ہاں بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم ہے۔ اے نبی! جو لوگ تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ تمہارے پر آمد ہونے تک مبرا کرتے تو انہی کے لیے بہتر تھا۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔“

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس میں افعال اور اقوال کو گہنی طرح جانچا جاتا ہے، کوئی بات اگر سنی جائے تو اس کی تحقیق کی جاتی ہے، سنتے ہی فیصلہ نہیں کر دیا جاتا اور یہ بات خدا سے ڈرنے پر رکھی گئی ہے۔ اور کسی حکم سے پہلے رسول اللہ سے مشورہ ضروری ہے۔ اور رسول اللہ — مشورہ بھی اس وقت کیا جائے جب آپ مشورے طلب فرمائیں، خواہ خواہ مفت مشورے نہ دیا کریں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنِیَا فْتَبِنُوهُ إِنْ تَصِیْوُا قَوْمًا بِحَهْلَةٍ فَتَصْبِحُوا
عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (۶ : ۴۹) وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ
مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ
الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَئِكَ هُمُ الرَّشِدُونَ (۷ : ۴۹) فَصَلِّ مَنِ اللَّهُ وَبِعَمَّةٍ
وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۸ : ۴۹) ”اب ہوگو‘ جو ایمان لائے ہو‘ اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی ۔۔۔ ر آئے تو
تحقیق کر لیا کرو‘ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کئے پر پشیموں ہو‘ خوب جان رکھو کہ
تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ بہت سے معادلت میں تمہاری بات مان لیا کرے تو تم خود ہی مشکلات میں
جھلا ہو جاؤ۔ مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو متفر
کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل اور احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔“

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جو اپنے وجود کی حفاظت کے لیے ایک انتظامی مشینری رکھتی ہے۔ اس کے ذریعہ اس کے اندر واقع ہونے والے اختلافات کو دور کیا جاتا ہے، 'قتلوں کو فرو کیا جاتا' بے چینیاں دور کی جاتی ہیں اور لوگوں کی خواہشات کو کنٹرول کیا جاتا ہے کہ اگر ان کا علاج نہ کیا جائے تو سوسائٹی تباہ ہو جائے۔ ایسے مواقع پر یہ سوسائٹی اسلامی اخوت کے اصولوں کے مطابق اپنے مسائل حل کرتی ہے اور خالص عدل و اصلاح کے نقطہ نظر سے کام کرتی ہے۔ خدا خونی اور اللہ کی رحمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔

وَأِنْ طَائِفَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيئَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (٤٩ : ٩) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلَحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (٤٩ : ١٠) ”اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔“

یہ ایک لٹی سوسائٹی ہے جس کے افراد ایک دوسرے کے بارے میں نیک جذبات اور خواہشات اور شعور رکھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ ایک بہترین طرز عمل اختیار کرنے کے بھی کچھ آداب ہیں جن کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَر قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِاللِّقَابِ بَشَرِ الْأَلْسِمِ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۴۹: ۱۱) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔“

اس سوسائٹی کا شعور پاک اس کے اندر لوگوں کی عزت محفوظ لوگوں کی خلوتیں محفوظ کسی پر شک کرنا گناہ کسی کے خلاف تجسس کرنا گناہ لوگوں کا امن عزت شرافت مکمل طور پر محفوظ ان معاملات میں کوئی کسی کو چھیڑ نہیں سکتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ أَثْمٌ وَلَا تَحْسَبُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ

إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ (۴۹: ۱۲) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے اور رحیم ہے۔“

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس کی اساس مطلق انسانیت پر ہے۔ جس میں اقوام اور اجناس محض تعارف کے لیے ہیں اور وہ یہ تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں۔ یہ سوسائٹی باقی تمام خواہشات اور رنگ و نسل کے شوائب سے پاک ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّن ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقٰكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۴۹: ۱۳) ”اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنائیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا باخبر ہے۔“

یہ سورت اسلامی سوسائٹی کے نشانات اور اس کے خدو خال کے تعین کے ساتھ مخصوص ہو جاتی اگر اسلام اور ایمان کے حدود کے تعین کو بھی نہ لیا جاتا۔ کیونکہ اس سوسائٹی کے قیام کی دعوت لوگوں کو ایمان کے عنوان سے دی گئی۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا..... ایمان کے حوالے ہی ان کو پکارا گیا تاکہ جواب دیں اور لبیک کہتے ہوئے اس سوسائٹی کو

قائم کرس۔ اس لئے کہ کون بد بخت ایسا ہو گا جو اللہ کی جانب سے یہ مٹھی آواز سنے گا۔ یا ایہا الدین امنوا..... اور لبیک نہ کہے گا۔ اس آواز کو سن کر حیا آ جاتی ہے اور پھر اس پیاری آواز کے بعد اس راہ میں ہر مشقت آسان ہو جاتی ہے۔ ہر دل سننے کے لیے دوڑتا ہے اور عمل کے لیے اٹھتا ہے۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۴۹: ۱۴)

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (۴۹: ۱۵) قُلْ أَتَعْلَمُونَ

اللَّهُ بِدِينِكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

(۴۹: ۱۶) ”یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، ان سے کہو، تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے، ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری اختیار کرو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔ اے نبی! ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے رہو حالانکہ اللہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔“

اور سب سے آخر میں یہ سورت بتاتی ہے کہ دین اسلام لوگوں کے لیے اللہ کا بہت ہی بڑا انعام ہے اور ایمان تو جسے مل جائے اس کے لیے اللہ کی نعمت ہے۔ لیکن یہ نعمت اللہ صرف ان کو دیتا ہے جو اس کے مستحق ہوں۔

يَمْنُونَ عَلَيْهِمْ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمْنُوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمْنُ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَاحِقِينَ (۴۹: ۱۷) إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَوَاتِ

وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ (۴۹: ۱۸) ”یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان سے کہو، اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی طرف ہدایت دی، اگر تم واقعی سچے ہو۔ اللہ زمین و آسمان کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب کچھ اس کی نگاہ میں ہے۔“

دوسری بڑی بات جو اس پوری سورت سے ظاہر ہوتی ہے اور ان حالات سے معلوم ہوتی ہے جن میں یہ سورت

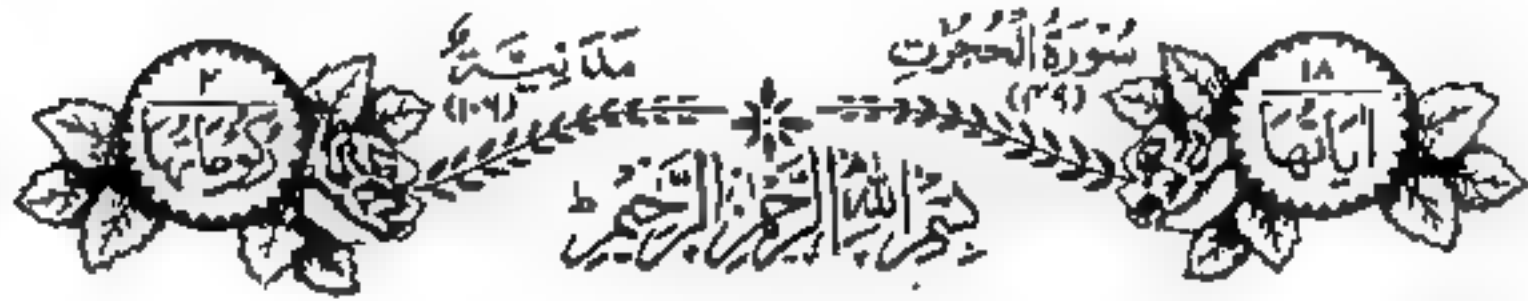
اور اس کی آیات نازل ہوئیں یہ ہے کہ قرآن کریم نے اسلامی جماعت کی تربیت کے لیے کس قدر عظیم جدوجہد کی۔ اور یہ جدوجہد مسلسل کی جاتی رہی اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ہر مرحلے میں اس قدر عظیم حکمت کے ساتھ اس جماعت کے تک تک درست کیے۔ جس کے نتیجے میں اس کرۂ ارض پر اس قدر پاکیزہ سوسائٹی وجود میں آئی جو نہایت ہی باوقار، پاکباز اور صحت مند سوسائٹی تھی۔ اور ایسی سوسائٹی تاریخ میں ایک ہی بار اس کرۂ ارض پر وجود میں آئی۔ اس کے بعد اس قسم کی سوسائٹی کا تصور بھی کسی نے پیش نہیں کیا یا نہ کوئی ایسی سوسائٹی کا ناول بھی لکھ سکا ہے۔

لیکن یہ سوسائٹی پاک صاف، صحت مند، نظریاتی، ایماندار اور خالص انسانی بنیادوں پر، انسانی تاریخ کے ایک دور میں، زمین کے ایک خطے میں وجود میں آئی۔ یہ اچانک وجود میں نہیں آئی تھی۔ نہ یہ بطور اتفاق وجود میں آئی تھی۔ یہ نہ راتوں رات وجود میں آئی تھی، نہ یہ کسی طبعی حالات کی وجہ سے اچانک مشروم (ایک قسم کی خود روگھاس) کی طرح وجود میں آگئی تھی بلکہ یہ نہایت ہی مدبرانہ طور پر اور ایک پودے کی طرح نمودار ہوئی اور بڑھتے بڑھتے سحر ریح کے ساتھ وہ پودا درخت بن گیا جس کی شاخیں بلند اور جنمیں زمین میں گہری تھیں اور اس نے اپنی نشوونما کے لیے ضروری وقت بھی لیا اور اس کے لیے نہایت ہی گہری اور مسلسل جدوجہد بھی کرنا پڑی۔ اور اس سلسلے میں راتوں کی نیند حرام کی گئی، طویل صبر کیا گیا، بھیرت افروز محنت کی گئی۔ لوگوں کے اخلاق کو سنوارا گیا۔ لوگوں کو ہدایات دی گئیں اور وہ آگے بڑھائے گئے۔ ان کو قوت دی گئی اور ملت قدم رہنے کی تلقین کی گئی۔ عملی تجربات کیے گئے۔ کڑے سے کڑے امتحانات سے گزارے گئے۔ اور آزمائشوں اور مشکلات سے انہیں گزارا گیا۔ اور تجربوں اور آزمائشوں سے عبرت لی گئی۔ اور اس پورے عرصے میں یہ سوسائٹی اللہ کی مسلسل نگرانی میں رہی جو عظیم و خیر ہے۔ اور اسے اس عظیم امانت کے اٹھانے کے لیے تیار کیا گیا اور زمین پر اللہ کی مشیت کو رو بعل لانے کے لیے تیار کیا گیا اور پھر یہ کہ ان حضرات کے اندر کچھ مخصوص خصوصیات بھی تھیں جن کی وجہ سے تاریخ انسانیت میں انہوں نے یہ مقام حاصل کیا۔ اور یہ حقیقت وجود میں آئی۔ آج شاہراہ تاریخ انسانی پر ہمیں یہ سوسائٹی دور سے نظر تو آئی ہے، مگر ایک خراب کی طرح!!

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۲۶ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۱۸



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ
 اللَّهَ شَهِيدٌ عَلِيمٌ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ
 النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ
 وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَغْضَوْنَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ
 الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِيَتَّقُوا لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ إِنَّ الَّذِينَ
 يُنَادُونَكَ مِن وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا
 حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
 آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْحَبُوا عَلَىٰ
 مَا فَعَلْتُمْ نَذِيرٌ ۚ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو۔ کیسے ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کر لیا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ رسول خدا کے حضور بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ

ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے، ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم۔ اے نبیؐ جو لوگ تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ تمہارے ہر آمد ہونے تک صبر کرتے تو انہی کے لیے بہتر تھا، اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچاؤ گے اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

سورت کا آغاز ہی نہایت ہی محبوب آواز سے ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (۴۹ : ۱) ”اے ایمان والو“ یہ اللہ کی طرف سے پکار ہے، ان لوگوں کو جو اللہ پر ایمان بالغیب لانے والے ہیں اور یہ پکار کر اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے دلوں کے اندر جوش و خروش پیدا فرماتا ہے، کیونکہ اللہ سے مومنین کا تعلق، تعلق ایمان ہے۔ اہل ایمان کے اندر یہ شعور ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے ہیں۔ انہوں نے اللہ کے جھنڈے اٹھا رکھے ہیں اور اس جھوٹے سے سیارے پر یہ لوگ اللہ کے بندے، اللہ کے کارکن اور اس کی فوج ہیں اور ان کو اللہ نے یہاں کسی مقصد کے لیے بھیجا ہے اور اسی لیے اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان کی محبت پیدا کر دی ہے اور ایمان کو ان کے لیے محبوب بنا دیا ہے اور اس فوج میں اللہ نے ان کو بھرتی کر کے ان پر احسان کیا ہے۔ لہذا ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اس موقف پر کھڑے رہیں جہاں اللہ نے ان کے کھڑے کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ کے سامنے وہ یوں کھڑے ہوں جس طرح عدالت میں ایک شخص فیصلے کے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے یا ایک ماتحت فوجی اپنے افسر سے ہدایات کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ وہی کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے اور اس کام کے لیے تیار ہوتا ہے جس کا اسے حکم دیا جاتا ہے۔ پوری طرح سر تسلیم خم کرتے ہوئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ

عَلِيمٌ (۴۹ : ۱) ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو، اور اللہ سے ڈرو، اور وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔“ اے ایمان والو! اللہ اور رسول اللہ کے سامنے اپنی مرضی کی تجاوز نہ پیش کرو، نہ اپنے نفوس کے بارے میں نہ اپنے ماحول کی زندگی کے بارے میں اور اللہ اور رسولؐ کا فیصلہ کرنے سے قبل کسی معاملہ پر اپنا فیصلہ خود صادر نہ کرو، اور کسی معاملے میں اللہ اور رسولؐ کا فیصلہ ہو تو اس میں اپنے فیصلے صادر نہ کرو۔

قادر فرماتے ہیں کہ بعض لوگ اپنی ان خواہشات اور تجاوزات کا اظہار کرتے تھے کہ کیا ہی اچھا ہو کہ فلاں فلاں معاملے میں احکام آجائیں۔ اگر اس طرح ہو جائے تو بہت بہتر ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی ان تجاوزات کو ناپسند فرمایا۔ عونی کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ اور رسول اللہ کے سامنے باتیں کرنے سے ردک دیا گیا۔ مجاہد کہتے ہیں کہ رسول اللہ سے خواہ مخواہ فتویٰ نہ مانگا کرو، خود اللہ جو چاہے نازل فرمادے۔ ضحاک کہتے ہیں، ”اللہ اور رسول اللہ اور اصول دین اور قوانین شریعت کو چھوڑ کر اپنے فیصلے نہ کرو، اور علی بن ابی طالب نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف نہ کہو۔“

یہ اللہ اور رسول اللہ کے معاملے میں فکری اور نظریاتی آداب ہیں۔ اللہ سے ہدایات اخذ کرنے اور نافرمانی کرنے کے یہ آداب ہیں کہ جو حکم آئے اس کی تعمیل کرو اور باقی کے بارے میں خاموش رہو۔ یہی اصول دین اور شریعت کا بہترین

رہی ہے۔ یہ خدا خونی اور اس کی اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اللہ تو سب کچھ دیکھ رہا ہے اور یہ سب باتیں اس مختصری آیت میں بتادی گئی ہیں۔

یوں مسلمانوں کا اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ تعلق تھا۔ کوئی شخص اللہ اور رسول اللہ کے سامنے اپنی تجویز نہ دیتا تھا۔ کوئی رسول اللہ کے سامنے کسی رائے کا اظہار نہ کرتا تھا۔ جب تک آپؐ رائے طلب نہ فرمائے۔ کوئی بھی کسی معاملے یا حکم میں فیصلہ اس وقت تک نہ کرتا تھا جب تک وہ اللہ اور رسول اللہ کے اقوال کی طرف رجوع نہ کر لیتا۔

امام احمد، ابو داؤد، اور ترمذی نیز ابن ماجہ نے نقل کیا ہے کہ حضورؐ جب حضرت معاذ بن جبل کو بن کا گورنر بنا کر بھیج رہے تھے تو ان سے پوچھا کہ تم فیصلہ کس طرح کرو گے انہوں نے عرض کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ تو فرمایا کہ اگر اللہ کی کتاب میں حکم نہ ہو تو عرض کیا کہ سنت رسول اللہ کے ساتھ آپؐ نے فرمایا اگر سنت میں بھی کوئی ہدایت نہ پاؤ تو انہوں نے کہا میں اپنی رائے کے مطابق اجتہادی فیصلہ کروں گا۔ یہ سن کر حضورؐ نے ان کے سینے پر ضرب لگائی اور فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اللہ نے رسول خدا کے نمائندے کو وہ توفیق دی جو رسول اللہ کی خواہش تھی۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ ان سے پوچھ رہے تھے کہ آج کون سا دن ہے جس میں تم ہو۔ اور وہ جگہ کون سی ہے جہاں تم ہو۔ وہ سب جانتے تھے لیکن وہ سب جواب دیتے ہیں کہ اللہ اور رسول اللہ بہت زیادہ جانتے ہیں اور یہ وہ اس لیے کہتے تھے کہ کہیں ان کا قول اللہ اور رسولؐ سے پیش قدمی نہ ہو جائے۔

ابوبکرہ قعق ابن الحارث رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آتا ہے کہ جبہ الوداع کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کون سا مہینہ ہے؟ ہم نے کہا اللہ اور رسول اللہ زیادہ جانتے ہیں۔ حضورؐ خاموش ہو گئے اور ہم نے یہ خیال کیا شاید مہینے کا نام بدل گیا ہے اور حضورؐ کوئی دوسرا نام لیں گے۔ تو حضورؐ نے فرمایا کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ ہم نے کہا ہاں رسول خداؐ یہ ذوالحجہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا یہ کون سا شہر ہے؟ ہم نے کہا اللہ اور رسول خداؐ زیادہ جانتے ہیں تو حضورؐ خاموش ہو گئے اور ہمارا خیال ہوا کہ شاید حضور بلد حرام کا نام بدل دیں گے۔ آپؐ نے فرمایا کیا یہ بلد حرام نہیں ہے؟ تو ہم نے کہا کہ ہاں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ کون سا دن ہے؟ تو ہم نے کہا اللہ اور رسول اللہ زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ خاموش ہو گئے اور ہم نے کہا کہ شاید حضورؐ اس کا نام بدل دیں گے آپؐ نے فرمایا کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے کہا ہاں...

یہ بھی صورت حال جناب نبویؐ میں صحابہ کرامؓ کے ادب اور احترام کی۔ نہایت احتیاط، تقویٰ، خشیت۔ یہ آیات نازل ہونے کے بعد ان کے اندر یہ ادب اور احترام پیدا ہوا تھا۔ کیونکہ ان آیات میں کہا گیا کہ اللہ سے ڈرو اور اللہ سے سچ و عظیم ہے۔

دوسرا ادب و احترام یہ تھا کہ حضور اکرمؐ کے ساتھ گفتگو میں آداب نبوت کو ملحوظ رکھو۔ نہایت احترام سے اور دلی احترام سے بات کرو۔ تمہاری حرکات اور تمہاری آواز سے احترام ظاہر ہو۔ آپؐ کی شخصیت نور آپؐ کی مجلس اور گفتگو نہایت ہی ممتاز ہو۔ اللہ تعالیٰ نہایت ہی پسندیدہ انداز میں ان کو ڈرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ
كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (۴۹: ۲) ”اے لوگو!

ایمان لائے ہو، اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو، جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں یہ نہ ہو کہ تمہارا کیا کر یا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ ایمان لانے والوں سے خطاب کر کے اس بات کا اظہار کر دیا کہ تمہارا وقار ایمان سے ہے اور ایمان تمہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے۔ نبی کی بارگاہ میں ذرا بھی بے احتیاطی سے اعمال غارت ہو جائیں گے اور تمہارے اعمال اسی طرح بے اثر ہو جائیں جس طرح ہٹاکٹ جانور زہریلی گھاس سے آٹا فنا ختم ہو جاتا ہے۔ تمہیں پتہ بھی نہ ہو گا اور اعمال ضائع ہو چکے ہوں گے۔

صحابہ کرامؓ کے دلوں کے اندر اس محبوب لوبہ یاری آواز نے وہ اثر کر لیا تھا جس کی مثال نہیں ملتی۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں: بشر بن صفوان سے، انہوں نے نافع ابن عمر سے انہوں نے ابن ابی ملیکہ سے وہ کہتے ہیں کہ قریب تھا کہ صحابہ میں سے دو برتر مقام کے لوگ ابوبکر اور عمرؓ ملاک ہو جائیں۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے باہم تکرار کی جب بنو حنیملہ کا وفد آیا تھا۔ یہ نوں ہجری کی بات ہے ایک نے کہا کہ اقرع ابن حابس کو امیر بنائیں یہ اٹھج کے مولیٰ میں سے تھا، دوسرے صاحب نے ایک دوسرے شخص کے بارے میں کہا، مجھے نام یاد نہیں ہے (دوسری روایت میں 'تغلق ابن معبد آیا ہے) حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا، تم تو میرے خلاف ہی کرتے ہو۔ حضرت عمرؓ نے کہا میرا ارادہ آپ کی مخالفت کا نہ تھا۔ اس معاملے میں ان کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ

كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (۲: ۴۹) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو، جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کر یا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔“ ابن الزبیرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت عمرؓ حضورؐ سے اس قدر آہستہ بات کرتے کہ آپ کو پوری طرح نہ سنا تے اور حضورؐ ان سے دوبارہ پوچھتے۔ اور حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے کہا اے رسول خدا میں آپ سے صرف کاناپھوسی میں بات کروں گا۔

امام احمد روایت کرتے ہیں سلیمان ابن مغیرہ سے انہوں نے ثابت سے انہوں نے حضرت انس ابن مالک سے وہ کہتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ

كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (۲: ۴۹) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو، جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کر یا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔“ تو ثابت ابن قیسؓ نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کہنے لگے ”میں ہی تھا جو رسول اللہؐ پر اپنی آواز بلند کرتا تھا۔ میں ہی جنسی ہوں اور

میرے ہی اعمال گئے“ وہ گھر میں نہایت ہی مغموم ہو کر بیٹھ گئے۔ تو رسول اللہؐ نے محسوس کیا کہ یہ شخص نہیں آرہے ہیں۔ بعض لوگ ان کے پاس ہو گئے کہ آپ کی غیر حاضری کو رسول اللہؐ نے محسوس کیا ہے۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ رسول اللہؐ کی آواز سے تو میری آواز بلند ہوتی ہے اور میں ہی اونچی آواز سے باتیں کیا کرتا تھا۔ میرے تو اعمال ہی ضائع ہو گئے۔ لازماً میں جہنمی ہوں۔ یہ لوگ حضورؐ کے پاس آئے۔ آپ کو اطلاع دی کہ وہ تو یہ کہتے ہیں۔ تو حضورؐ نے فرمایا نہیں ”وہ تو اہل جنت میں سے ہیں“۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں وہ ہم میں پھرتے اور ہم یہ سمجھتے کہ یہ جا رہا ہے جنتی!

غرض ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو“ کے محبت آمیز انداز گفتگو کے ساتھ مومنین کو جو کال دی گئی اس سے وہ کانپ اٹھے اور آئندہ کے لیے جناب رسالت میں نہایت خاموشی سے سہم کر بیٹھتے کہ کہیں ان کے اعمال ضائع نہ ہو جائیں۔ اور ان کو اس کا شعور ہی نہ ہو کیونکہ شعوری طور پر تو وہ بہت محتاط تھے لیکن ان کو زیادہ دیر اس بارہ کا تھا کہ غیر شعوری حالت میں ان کا نقصان نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ بہت ڈر گئے تھے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی خدا خونی اور رسول اللہؐ کے ہاں ان کے ان آداب کا اظہار نہایت ہی عجیب پیرائے میں کیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغْضُوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اَمْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ

لِلتَّقْوٰی لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ (۴۹: ۳) ”جو لوگ رسول خداؐ کے ہاں بات کرتے ہوئے اپنی آواز کو پست رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم ہے۔“

تقویٰ اور خدا خونی اللہ کی ایک عظیم بخشش ہے۔ اللہ ہی اس اعزاز اور نعت کے لیے دلوں کا انتخاب کرتا ہے۔ اس امتحان اور اختیار اور خلوص اور طہارت قلبی کے بعد پھر ان دلوں کو تقویٰ دیا جاتا ہے، لہذا یہ نعت انہی دلوں کو دی جاتی ہے جو اس کے لیے تیار ہوں اور یہ ثابت ہو جائے کہ یہ دل تقویٰ کے مستحق ہیں اور جو لوگ اپنی آوازیں رسول اللہؐ کے ہاں نجی رکھتے ہیں ایسے لوگوں کو تقویٰ کے لیے منتخب کیا گیا اور اس انعام کے ساتھ یعنی تقویٰ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو مغفرت بھی دی جاتی ہے۔

انتہائی ڈراوے کے بعد یہ ایک گہری ترغیب ہے۔ اس طرح اللہ اپنے مختار بندوں کے دلوں کو تربیت فرماتا ہے اور ان کو اس عظیم کام کے لیے تیار کرتا ہے اور اسی انداز تربیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے آغاز میں جماعت صحابہ کو تیار فرمایا تھا۔ یہ لوگ ہدایت پر تھے اور روشنی کے حامل تھے۔

امیر المومنین عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ آپ نے مسجد نبویؐ میں دو آدمیوں کی آواز سنی، ان کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ وہ آئے اور انہوں نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کہاں ہو؟ اس کے بعد ان سے کہا تم کہاں سے آئے ہو؟ انہوں نے کہا ہم لعل طائف سے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر تم اہل مدینہ سے ہوتے تو میں تمہاری خوب خبر لیتا۔

علمائے امت نے اس بات کو سمجھا اور فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بلند آواز سے بات کرنا منع ہے جبکہ آپ کی زندگی میں مسجد نبویؐ میں اونچی آواز سے بات کرنا ممنوع تھی۔ ہر حال میں ممنوع تھا بوجہ احترام۔

اس کے بعد ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا جو ۹ ہجری کو پیش آیا۔ فتح مکہ کے بعد ہر طرف سے دُود آرہے تھے۔ بنی حنیملہ کا ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا۔ یہ لوگ خالص خشک دیہاتی تھے۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرات کے سامنے جن میں ازواج مطہرات بھی تھیں کھڑے ہو کر پکارا 'محمد درابا ہر آئیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس طریقے کو ناپسند فرمایا کیونکہ یہ طریقہ نہایت اجڈ اور پریشان کن تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (۴۹: ۴)

”اُنہم صبروا حتی تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۴۹: ۵)
 ”اے نبی جو لوگ تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ تمہارے بارے میں تک صبر کرتے تو انہی کے لیے بہتر تھا۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔“ اللہ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان میں سے اکثر عقلمند نہیں ہیں۔ اور ان کی اس حرکت کو ان کے لیے مکروہ کر دیا کیونکہ وہ اسلامی آداب کے خلاف تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے مقام کے ساتھ جس قدر احترام کا تعلق ہونا چاہئے تھا یہ اس کے خلاف تھا۔ آپ مسلمانوں کے قائد اور مربی تھے اور خدا کے نبی تھے۔ اس لیے ان سے کہا گیا کہ ان کے لیے مناسب تھا کہ صبر کرتے اور انتظار کرتے تاکہ حضور اپنے معمول کے مطابق باہر نکل آتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ و استغفار کرنے اور اللہ کی طرف رجوع کی ترغیب دی۔

مسلمانوں نے ان آداب کو خوب سمجھا۔ انہوں نے رسول اللہ کی شخصیت سے آگے بڑھ کر ہر استاد اور ہر عالم دین کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا۔ ایسی شخصیات کو انہوں نے گھروں کے اندر پریشان نہ کیا۔ اور ان کے نکلنے کا انتظار کیا۔ کبھی اساتذہ کے گھروں کے اندر چھینے کی کوشش نہ کی۔ ایک اور مشہور راوی اور عالم ابو عبیدہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے کسی عالم کا دروازہ کبھی نہیں کھٹکھٹایا۔ ہمیشہ انتظار کیا کہ وہ نکل آئیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهْلَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا

فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (۴۹: ۶) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو جاؤ۔“

اہل ایمان کو پہلی پکار یہ تھی کہ تم نے رہنمائی کہاں سے لینی ہے اور تمہاری قیادت کہاں ہے۔ دوسری پکار۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ عَنْ حُدُودِ اللَّهِ لَا تَحْسِبُوا أَنَّ عَهْدَ اللَّهِ هِيَ حُدُودُ اللَّهِ

اس سورت کی بیشتر ہدایات اور آداب اور قوانین کی بنیاد تھیں۔ کیونکہ مسلمانوں کو یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ ہدایت و ارشاد کا سرچشمہ کہاں ہے۔ اور یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ مرشد اور قائد کا احترام اور مقام کیا ہے تاکہ قائد کا بھی احترام ہو اور جو ہدایت وہ دیتا ہے ان کو بھی سنجیدگی سے لیا جائے۔ یہ تیسری پکار اور ہدایت اس لیے ہے کہ اس جدید سوسائٹی میں خبروں کے سلسلے میں پاپسی کیا ہوگی اور خبر سن کر ایک عام آدمی کا رد عمل کیا ہونا چاہئے؟ تو یہ کہا گیا کہ یہ خبر بھی قائد کے

پاس جانی چاہئے اور ہر خبر کی تفتیش اور تحقیق ہونی چاہئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهْلَةٍ فَتُصْبِحُوا

عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (۶: ۴۹) ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں یہاں نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو ناراض نہ ٹھکانا چاہو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔“۔ یہاں فاسق کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ فاسق پر بدگمانی کی جاسکتی ہے اور یہ تخصیص اس لیے کر دی گئی کہ لوگ اسلامی جماعت میں قابل اعتماد لوگوں کے تصرفات و اقدامات پر بھی شک نہ کریں۔ اور معصومات کے مسئلے میں اعتبار۔ بجائے شک ایک اصول نہ بن جائے کیونکہ ایک اسلامی جماعت میں اصول تو یہی ہو گا کہ اس کے ارکان کی خبروں پر اعتبار کیا جائے گا اور ان پر عمل ہو گا۔ رہا وہ شخص جو فاسق ہے تو اس کی خبروں کی تصدیق ضروری ہوگی کیونکہ اس پر شبہ کیا جاسکتا ہے۔ یوں ایک اسلامی جماعت میں خبروں کے اعتبار اور عدم اعتبار لینے یا نہ لینے کے بارے میں ایک معتدل قاعدہ بن جائے گا۔ کسی فاسق کی خبر پر فوراً عمل نہ ہو گا۔ یہ نہ ہو کہ کسی پر کوئی زیادتی ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جلد بازی کی وجہ سے ہو جائے گی۔ اور بعد میں اسلامی سوسائٹی کو نادم ہونا پڑے۔ ایسا کام کر لیا جائے جس سے اللہ ناراض ہو کیونکہ یہ ایک ایسے فعل کا مصدر ہو جائے گا جو حق اور عدل کے پیمانوں پر پورا نہ اترتا ہو۔

ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ولید ابن عقیلؓ ابومصیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کو رسول اللہ نے بنی المصطلق کے پاس زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجا۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ مجاہد اور قتادہ نے یوں کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے ولید ابن عقبہ کو بنی المصطلق کی طرف بھیجا کہ ان کو صدقہ دیں۔ انہوں نے اسے قبول کیا۔ وہ واپس آئے اور کہا کہ بنی المصطلق جمع ہو رہے ہیں کہ آپؐ سے جنگ کریں اور بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ اسلام سے بھی مرتد ہو گئے ہیں۔ رسول اللہؐ نے خالد ابن ولیدؓ کو بھیج دیا کہ معاملے کی تحقیق کریں اور جلد بازی نہ کریں۔ وہ گئے اور ان کی آبادی کے قریب رات کو پہنچے۔ انہوں نے اپنے جاسوس بھیجے جب وہ واپس آئے تو انہوں نے اطلاع دے دی کہ یہ لوگ تو بخت مسلمان ہیں اور انہوں نے اذان دی اور نماز پڑھی۔ صبح کے وقت ان کے پاس حضرت خالد بن ولیدؓ آئے تو انہوں نے وہ بات دیکھی جس پر انہیں تعجب ہوا۔ حضرت خالد واپس ہوئے اور رسول اللہؐ کو اطلاع دی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قتادہ کہتے ہیں حضور اکرمؐ فرماتے ہیں ”تحقیق اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔“۔ نیز دوسرے سلف صالحین نے بھی یہ لکھا ہے ”مثلاً ابن ابولیلیؓ، یزید ابن روحانؓ، شہاکؓ، مقاتل ابن حیانؓ وغیرہ نے کہ یہ آیت ولید ابن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی، واللہ اعلم! (اختتام اقتباس از ابن کثیر)

لیکن آیت کا مفہوم عام ہے۔ اصول یہ ہے کہ فاسق آدمی کی بات کی تحقیق و تفتیش کی جائے گی۔ رہے صالح لوگ تو ان کی باتوں پر عمل ہو گا کیونکہ ایک مومن جماعت کے اندر یہ اصول ہے کہ ہر شخص کی بات پر اعتبار ہو گا ماسوائے فاسق کے۔ اور صالح آدمی کی بات پر اعتبار ہی تفتیش و تحقیق کا ذریعہ ہے۔ یہی بات کہ ہر معاملے میں شک کیا جائے اور ہر خبر کو چھوٹا تصور کیا جائے لایہ کہ وہ ثابت ہو جائے تو یہ اسلامی سوسائٹی کا اصول نہیں ہے ورنہ کسی بھی سوسائٹی میں کوئی اجتماعی کام چل ہی نہ سکے گا۔ اسلام زندگی کو معمول کے مطابق چلنے دیتا ہے۔ وہ احتیاطی تدابیر بے شک اختیار کرتا ہے مگر

اس لیے کہ زندگی کا معمول چلا رہے۔ اس لیے نہیں کہ زندگی معطل ہو کر رہ جائے۔ یہ ہے نمونہ اسلامی اصول کا کہ خبروں کے اخذ و رد میں اس کا اصول کیا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ ولید ابن عقبہ نے ابتدا میں جو اطاعات فرما لیں، ان کے نتیجے میں بعض لوگوں نے بنی المصطلق کو سخت سزا دینے کی تجویز کی ہوگی۔ یہ اس لیے کہ اس وقت دین اسلام کے لیے بے حد جوش اور جذبہ پایا جاتا تھا اور اس لیے بھی کہ زکوٰۃ کا انکار کر دینا بہت بڑا جرم تھا۔ چنانچہ اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ تمہارے اندر رسول اللہ بھی موجود ہیں اور رسول اللہ کی موجودگی کو درابھنے کی کوشش کرو کیونکہ آپ کا تو خدا سے رابطہ قائم ہے۔

وَاعْلَمُوا أَن فِیْكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ یُطِيعُكُمْ فِی کَثِیْرٍ مِّنَ

الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَکِنَّ اللَّهَ حَبِیْبُ الْإِیْمَانِ وَزَیْنَهُ فِی قُلُوبِکُمْ وَکَرَّهَ

إِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْیَانَ أُولَئِکَ هُمُ الرُّشِدُونَ ۚ فَضَلَّاهُمُ اللَّهُ

وَنِعْمَ ۖ وَاللَّهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ۚ وَإِنْ طَائِفَتِیْنِ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوا

فَاصْلِحُوا بَیْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِی تَبْغِی حَتَّىٰ

تَفِیءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَاصْلِحُوا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ

اللَّهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۚ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَاصْلِحُوا بَیْنَ أَخَوَیْکُمْ وَ

ع ۱۰ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُونَ ۚ

۱۳

خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری ہمت مان لیا کرے تو تم زود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ۔ مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا اور کفر و فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان حقیقت کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

وَاعْلَمُوا أَن فِیْكُمْ رَسُولَ اللَّهِ (۷: ۴۹) ”خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول

موجود ہے۔“ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضور اس وقت موجود تھے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ

ایک عظیم حقیقت ہے۔ کیا کوئی یہ بات تصور کر سکتا ہے کہ آسمان کا زمین کے ساتھ دائمی رابطہ ہو جائے اور یہ رابطہ ہر وقت بحال رہے اور لوگوں کو نظر آئے۔ اور ہم یہ کہیں کہ ارادۃ الہی اہل زمین کے لیے متوجہ ہے۔ لوگوں کو ان کے حالات بتائے جا رہے ہیں۔ ان کی خفیہ باتیں ان کو بتائی جا رہی ہیں۔ ان کی ظاہری باتوں سے ان کو خبردار کیا جا رہا ہے اور ان کی غلطیوں کو فوراً درست کیا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنے دل کی بات چھپاتا ہو لیکن آسمان سے اطلاع آ جاتی ہے کہ یہ سوچا جا رہا ہے۔ اللہ رسول اللہ کو فوراً بتا دیتا ہے اور ہدایت کر دیتا ہے کہ یہ ہدایات میرے بندوں کو دے دو، حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔ یہ ایک بہت بڑی خبر ہے اور یہ ایک عظیم حقیقت ہے۔ بعض اوقات ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ کو اپنے درمیان چلتا پھرتا پاکر بعض لوگ اس طرف متوجہ نہ ہوں۔ اس لیے ان کو متوجہ کیا جا رہا ہے۔

وَاعْلَمُوا أَن فِیْكُمْ رَسُولَ اللَّهِ (۷: ۴۹) ”خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان رسول اللہ موجود ہیں۔“ اس کو جانو، اور اس کی قدر کرو، یہ تو ایک عظیم معاملہ ہے۔

اور رسول اللہ کی موجودگی کو جانو، اس کے تقاضے یہ ہیں کہ رسول اللہ کی جانب سے کوئی فیصلہ آنے سے پہلے ہی فیصلے نہ کرتے پھرو۔ کیونکہ رسول اللہ کے فیصلے وحی و الامام پر مبنی ہیں۔ اور اللہ کی ہدایات پر رسول اللہ جو فیصلے فرماتے ہیں انہی میں خیر و برکت ہے۔ اور اگر رسول اللہ تمہاری ہی باتوں کے پیچھے چلیں تو تم اپنی نادانی سے اپنے آپ کو مشکلات میں مبتلا کر دو گے کیونکہ رسول اللہ کے فیصلے اللہ کے امام پر مبنی ہیں۔ اور اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ بندوں کی بہتری اس میں ہے۔ رسول اللہ کی موجودگی تو بڑی رحمت ہے۔ آپ کی تدبیر اللہ کی تدبیر ہے اور آپ کا کما، اللہ کا کما ہے۔

لَوْ یَطِیْعُكُمْ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَسَتْ (۷: ۴۹) ”اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کریں تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ گے۔“ اس معاملے میں تمہارے لیے مسورہ ہے کہ اپنے امور کو اللہ اور رسول اللہ کے حوالے کر دو اور پورے کے پورے امام میں داخل ہو جاؤ۔ اور اللہ کی تقدیر کے آگے اور اللہ کی تدبیر کے سامنے سر تسلیم خم کر دو، اللہ کے احکام کو مانو اور اللہ کے سامنے اپنی تجاویز مت رکھو۔

اس کے بعد ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم کو ایمان کی جو نعمت دی گئی ہے، اس کی قدر کرو، یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب بنایا، تمہارے دلوں میں ایمان کو خوبصورت بنا دیا، تم نے اسے قیمتی جانا، تمہارے دل اس سے لگ گئے، اور کفر کو تمہارے دلوں کے لیے مکروہ بنا دیا۔ فسق و معصیت کو تم ناپسند کرنے لگے۔ یہ اللہ کی بڑی ہی رحمت اور کرم تھا۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَیْكُمْ الْإِیْمَانَ وَزَیَّنَهُ فِیْ قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَیْكُمْ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْیَانَ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّشِیْدُونَ (۷: ۴۹) فَضَّلْنَا مِنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةُ اللّٰهِ

عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (۸: ۴۹) ”مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔“

اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے دلوں کو ایمان کے لیے کھول دینا، ان کے دلوں کو ایمان کے ساتھ متحرک کر دینا، ان کے دلوں کے لیے ایمان کو حسین بنا دینا کہ وہ اس کی طرف لپکیں، اور ایمان کے کمالات و جمالات دیکھ سکیں، یہ دراصل ان بندوں پر بہت ہی بڑا فضل و کرم ہے اور بہت ہی بڑی نعمت ہے۔ اس کے مقابلے میں ہر نعمت ہیچ ہے۔ یہاں تک کہ انسان کی زندگی اور اس کا وجود بھی ہیچ ہے۔ انسان کا وجود اور اس کی پوری زندگی بھی ایمان کے مقابلے میں کم قیمت ہے اور ادنیٰ ہے۔ غنقریب یہ سیت آنے والی ہے۔

بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ (۹: ۱۷) ”بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ تمہیں اس نے ایمان کی طرف ہدایت کی۔“ منسل بت وہاں آئے گی، ان شاء اللہ!

جو بات یہاں فکر و نظر کے لیے دامن کش ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو یاد دلارہا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے اس بھلائی کا ارادہ کیا۔ اور یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے دلوں سے یہ شر نکالا۔ یعنی کفر، فسق اور معصیت کا شر۔ اور یہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے فضل و کرم سے تمہیں راہ راست پر لگایا ہے۔ اور یہ سب کام اللہ نے اپنے علم و حکمت کی بنا پر کیا اور یہ اطمینان دلایا کہ اس کے نتیجے میں تمہارے لیے خیر اور برکت ہوگی۔ اس لیے تم جلد بازی نہ کرو، اللہ اور رسول اللہ کے سامنے تجاویز نہ رکھو اور حکم سے پہلے جوش و خروش نہ دکھاؤ کیونکہ اللہ ہی تمہارے لیے بہتر فیصلے کرتا ہے۔ اور ابھی تک تو رسول تمہارے اندر موجود ہیں۔ لہذا اپنے معاملات ان کی موجودگی میں اپنے ہاتھ میں نہ لو۔ میں مقصد ہے اس تبرے سے جو اس حکم پر کیا گیا کہ تم اپنے لیے مشکلات پیدا کر لو گے۔

انسان بہت ہی جلد ہزی کرتا ہے۔ اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اقدامات سے آگے کیا ہے۔ انسان اپنے نفس اور دوسروں کی بھلائی کے لیے تجاویز مرتب کرتا رہتا ہے لیکن اس کا علم اس قدر محدود ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔

وَيَذَعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَصُوًّا ”اور انسان شرکی دعا اس طرح کرتا ہے جس طرح کہ خیر کی دعا کی جاتی ہے اور انسان بہت بڑا جلد باز ہے۔“ اگر انسان اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اسلام میں پورا پورا داخل ہو جائے، اللہ کی پسند کو اپنی پسند بنالے اور اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ اس کے لیے اللہ جس چیز کو پسند کرتا ہے وہ اس کی اپنی پسند سے افضل ہے۔ وہ اس کے لیے زیادہ مفید اور خیر و برکت لانے والی ہے، تو انسان راحت اور سکون محسوس کرے۔ اور اس زمین پر اس کی یہ مختصر زندگی نہایت ہی اطمینان اور خوشی سے گزرے لیکن یہ اللہ کا ایک عظیم احسان ہوتا ہے۔ اور وہ جس پر چاہتا ہے یہ احسان کرتا ہے۔

وَ اِنْ طَائِفَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَقْتُلُوْا فَاصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَهُمَا عَلٰى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوْا الَّتٰى تَبَغٰى حَتّٰى تَفِيْءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَاَتَتْ فَاصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسَطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۹) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ

اِخْوَةٌ فَاصْلِحُوا بَيْنَ اٰخَوِيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۱۰) (۴۹: ۹ تا

(۱۰) ”اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑویں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔“

یہ ایک عملی قانون ہے اور یہ خود اسلامی معاشرے کو جھگڑوں، خصومات اور خانہ جنگی سے بچانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ نہ ہو کہ لوگ ذاتی مفادات اور محض جذبات کے تحت لڑائیاں شروع کر دیں۔ اور یہ قانون اس مناسبت سے بنایا گیا ہے کہ اس سے قبل ایک فاسق کی خبر کے نتیجے میں خود مومنین میں سے ایک گروہ کے خلاف جنگ کے مواقع پیدا کیے گئے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ تنازعات سے قبل بھی تفتیش کی جائے کہ غلط خبروں پر تنازعہ نہ شروع ہو اور اگر ہو جائے تو پھر یہ قانون ہے۔

بعض روایات میں اس آیت کے نزول کا سبب بھی متعین حادثہ بتایا جاتا ہے یا یہ کہ بغیر کسی مخصوص واقعہ کے اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات کے لیے قانون بنا دیا ہو۔ بہر حال اسلامی سوسائٹی کو بچانے کے لیے یہ نہایت ہی مضبوط قانون ہے۔ اس کے ذریعہ اسلامی سوسائٹی اور اسلامی حکومت انتشار اور فرقہ بندی اور خانہ جنگی سے محفوظ رہتی ہے اور اجتماعی تصادم کے وقت عدل و انصاف کے قیام کی راہ تجویز کی گئی ہے کہ اصلاح اور انصاف کے ذریعہ اس شتم کے مسائل کو حل کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔ اور اس میں بھی خدا خوفی، اللہ کی رحمت کی طلب کو اصل مقصد بنایا گیا ہے۔

ہر آیت کسی مخصوص واقعہ کے سبب نازل ہوئی ہے۔ یا محض فرضی حالت کے لیے یہ قانون بنایا گیا ہو، بہرحال دونوں فریقوں کے برسر پیکار ہونے کے باوجود دونوں کو مومن کہا گیا ہے اور اس احتمال کے باوجود یہ کہا گیا ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے پر دست درازی کرنے والا ہو۔ بلکہ اس احتمال کے باوجود کہ بعض اوقات دونوں دست درازی کرنے والے ہوں۔

اس صورت میں جو لوگ غیر جانبدار ہوں ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ دونوں کے درمیان اصلاح کرسں۔ اگر اصلاح کے بعد بھی زیادتی کرنے والا گروہ باز نہ آئے اور حق بات یا حق کے فیصلے کے آگے نہ جھکے یا دونوں کی زیادتی کا تعین ہونے کے باوجود دونوں حکم حلیم نہ کرسں یا صلح کو رد کرسں تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ باغی اور نافرمان گروہ کے خلاف یا دونوں کے خلاف لڑیں اور ان کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھیں جب تک کہ دونوں اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر دیتے۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ اہل ایمان کے درمیان کسی صورت میں بھی جھگڑا نہ ہو۔ اور جن باتوں میں ان کا اختلاف ہو اور جن کی وجہ سے جنگ شروع ہوئی ہو ان میں وہ اللہ کے احکام کے سامنے جھکیں۔ اگر باغی اللہ کے حکم کو قبول کرسں، اور مومنین دونوں کے درمیان مصالحت کرا لیں اور یہ عدل اور انصاف پر مبنی ہو اور اللہ کی اطاعت کی طلب، رضا کے حصول کے لیے ہو تو

ان اللہ یحب المُنْقِصِطِینَ (۹ : ۴۹) ”لہذا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“ اور اس قانون کے بعد یہ نصیحت و تبصرہ کہ سب مومن بھائی ہیں کہ اہل ایمان کے درمیان اخوت اور رابطہ قائم ہونا چاہئے۔ یہ اسلامی اخوت ہی ہے جس نے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا کیا ہے اور صدیوں کی لڑائیوں کے بعد ہمیں باہم الفت بخشی ہے۔ اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ اس وجہ سے تم رحمت خداوندی کے سزاوار ہو سکتے ہو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ فَاصْلِحُوا بَيْنَ اَخْوَايَكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ

تُرْحَمُونَ (۹ : ۱۰) ”مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرنا امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔“ اس اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ جماعت مسلمہ کے درمیان محبت، سلامتی، تعاون اور اتحاد اصل الاصول ہو اور خلاف و اختلافات اور جنگ و جدال شاذ و نادر ہی ہوں اور اس اصول کے قیام کے لیے دوسرے مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے والے مومنین کے خلاف لڑیں یہاں تک کہ وہ انصاف کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ یہ اسلامی سوسائٹی کا اصل الاصول ہے۔ یہ ایک نہایت ہی اہم اقدام ہے اور فیصلہ کن انداز میں ہے۔

اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ جب مسلمان باغیوں کے خلاف جنگ کریں گے تو کسی زخمی کو قتل نہ کریں گے، کسی قیدی کو قتل نہ کریں گے۔ اور معرکہ ترک کیے جانے اور اسلحہ پھینک دینے کے بعد کسی کو سزا نہ دی جائے گی۔ اور باغیوں کے اموال غنیمت میں نہ لئے جائیں گے۔ کیونکہ باغی فرقہ کے خلاف جنگ کا مقصد یہ ہے کہ انہیں انصاف کے اصولوں پر کیے جانے والے فیصلوں کا پابند کرنا اور اخوت اسلامی کا قیام بحال کرنا ہے۔

اسلامی دستور کا اصل الاصول تو یہ ہے کہ تمام اسلامی علاقوں میں ایک ہی امامت یا خلافت ہو اور اگر کسی ایک امام کی بیعت ہو جائے تو دوسرے کو قتل کرنا لازمی ہے۔ اور دوسرے امام اور اس کے ساتھیوں کو باغی تصور کیا جانا چاہئے۔ اور تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ پہلے امام کی طرف سے لڑیں گے۔ اس اصول پر حضرت علیؓ نے واقعہ جمل میں اور واقعہ صفین میں باغیوں کے ساتھ جنگ کی اور آپ کے ساتھ صحابہ میں سے جلیل القدر صحابیوں نے حصہ لیا۔ بعض صحابہ کرامؓ نے اس معرکہ میں شرکت نہ کی۔ مثلاً سعد، محمد بن سلمہ، اسامہ بن زید اور ابن عمرؓ یا تو اس لیے کہ ان کے ذہنوں میں حق واضح نہ تھا۔ یعنی اس واقعہ میں خود ان کا اپنا ذہن صاف نہ تھا کہ حق کدھر ہے۔ اس لیے انہوں نے اسے فتنہ سمجھا یا اس لیے جس طرح امام جصاص فرماتے ہیں ”یا اس لیے کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ امام کے ساتھ جو فوج ہے وہ کافی ہے۔ اس کو ان کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے جائز سمجھا کہ وہ بیٹھ جائیں۔“ پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس پر ان کے وہ اقوال بھی دلائل دہانت کرتے ہیں جو ان سے مروی ہیں جیسا کہ بعد میں حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت بتاتی ہے کہ وہ سخت ناامید تھے کہ انہوں نے امام کے ساتھ مل کر جنگ نہ کی۔

اس اصول کے اپنی جگہ ہوتے ہوئے بھی ہر قسم کے حالات میں اس قرآنی قاعدے پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایسے استثنائی حالات جن میں عالم اسلام کے مختلف دور دراز علاقوں میں مختلف امامتیں قائم ہوں۔ ایسے حالات استثنائی ہوتے ہیں اور سرزمین کے قانون ضرورت کے تحت متعدد امامتیں تصور ہوتی ہیں تو مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر ایک امام کے

ساتھ مل کر باغیوں کے خلاف لڑیں اگر یہ باغی امام کے خلاف بغاوت کریں یا اگر کوئی ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ ایک حکومت کے اندر لڑے اور حکومت کو دونوں تسلیم کرتے ہوں۔ اسی طرح مسلمانوں کا یہ بھی فرض ہے کہ اگر باغیوں نے اپنی امامت قائم کر لی ہو جبکہ متعدد امامتیں برائے ضرورت موجود ہوں تو وہ امام کے ساتھ مل کر ان کے خلاف لڑیں۔ اور اس باغی گروہ کے خلاف سب اکٹھے ہو جائیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے جھک جائے۔ اس طرح یہ آیت ہر قسم کے حالات میں اپنا فیصلہ دیتی ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ یہ نظام جو یہاں تجویز کیا گیا ہے تکمیل اور ثالثی کا نظام ہے اور یہ اس لیے ہے کہ فریقین حکم الہی کے سامنے جھک جائیں۔ یہ نظام قرآن نے اس قسم کے تمام انسانی نظاموں سے پہلے تجویز کیا ہے۔ مگر یہ ایک مکمل نظام ہے اور یہ ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک ہے۔ اور اس سلسلے میں انسانوں نے جو نظام بھی بنائے ہیں ان سب میں کئی قسم کے عیب اور غلطیاں ہیں۔ اسلام نے جو نظام تجویز کیا ہے 'وہ پاکیزہ' منصفانہ اور نہایت اصولی ہے کیونکہ اس نظام کے تحت فیصلے اللہ کے قانون کے مطابق کئے جاتے ہیں۔ اس میں کسی کی غرض یا کوئی ذاتی خواہش کے لیے کوئی منجائش نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی نقص اور قصور ہے۔ لیکن بد بخت انسانیت اب بھی ٹھوکر کھاتی مگر تی پڑتی غلط راہوں پر چارہاں ہے حالانکہ اس کے سامنے شاہراہ موجود ہے۔

--- () ---

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُوا قَوْمًا مِّنْ قَوْمٍ
عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءً مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا
مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الْأَسْمُ الْفُسُوقِ
بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ٥ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِشْوٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبِ
بَعْضُكُم بَعْضًا ٦ أَيَحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا
اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ٧ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَ
جَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ٨ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ٩ إِنَّ اللَّهَ
عَلِيمٌ خَبِيرٌ ١٠

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ

عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔“

اے لوگو جو ایمان لائے ہو بہت گمن کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے سرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اللہ بڑا قوی کرنے والا اور رحیم ہے۔ لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔“

قرآن کریم اسلامی نظام حیات کے دریغ جو فضلاء سوسائٹی قائم کرنا چاہتا ہے اس کے اندر بہت ہی بلند معیار کے آداب و اخلاق ہوتے ہیں۔ اس میں ہر فرد کو عزت نفس حاصل ہوتی ہے اور کوئی فرد کسی فرد کی ہنگ عزت نہیں کر سکتا۔ فرد کی یہ عزت سوسائٹی کی عزت کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ ایک فرد کی ہنگ عزت پوری انسانی سوسائٹی کی ہنگ عزت ہے۔ اس لئے کہ انسانی جماعت نفس واحد ہے اور اس کی عزت ایک ہی عزت ہے۔ ایک انسان کی تذلیل پوری انسانیت کی تذلیل ہے۔

اس آیت میں قرآن کریم 'انہی ٹھٹھے بولوں سے' مسلمانوں کو پکارتا ہے۔ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔" پھر ان کو اس بات سے منع کرتا ہے کہ کوئی گروہ دوسرے گروہ سے مزاح کرے۔ نہ مرد دوسرے مردوں سے مزاح کریں۔ نہ ہو سکتا ہے جن سے مزاح کیا جاتا ہے وہ دوسروں سے اچھے ہوں۔ نہ عورتیں دوسری عورتوں سے مزاح کریں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جن سے مزاح کیا جا رہا ہے اللہ کے پیاروں میں وہ مزاح کرنے والیوں سے بہتر ہوں۔

اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا کی ظاہری قدسیں اور بھائیاں اور برتیاں جو بعض مرد یا بعض عورتیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ دراصل حقیقی برتیاں نہیں ہیں جن کے ساتھ اللہ کے ہاں لوگوں کو قولا جاتا ہے۔ اللہ کے ہاں کچھ اور قدسیں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ مزاح کرنے والوں کی نظروں سے وہ اوجھل ہوں، صرف اللہ انہیں جانتا ہو اور ان کے ساتھ اللہ ان بندوں کا وزن مقرر کرتا ہو۔ بعض اوقات امراء فقراء سے مزاح کرتے ہیں 'ایک قوی ضعیف سے' ایک مضبوط نوجوان ایک ضعیف سے 'ایک ذہین ایک غبی سے' ایک صاحب اولاد بے اولاد سے 'ایک مضبوط یتیم سے' ایک خوبصورت عورت بد صورت سے 'ایک جوان عورت بوڑھی سے' ایک معتد عورت مجزئی ہوئی شکل والی سے 'ایک امیر عورت غریب سے' لیکن یہ چیزیں تو اس عارضی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ اللہ کے ترازو میں یہ چیزیں بالکل بے وزن ہیں۔ لیکن قرآن کریم صرف ان ہدایات و اشارات پر ہی اکتفاء نہیں کرتا۔ بلکہ ایمانی اخوت کے جذبہ کو بھی ابھارتا ہے کہ جو لوگ ایمان لے گئے ہیں وہ ایک ہی جسم و جان ہیں 'ان میں سے کوئی دوسرے پر طعن کرتا ہے تو وہ خود اپنے اوپر طعن کرتا ہے۔'

وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ (۶۹: ۱۱) "اور اپنے ہی نفوس پر طعن نہ کرو۔" لہٰذا عیب جوئی کو کہتے ہیں لیکن لہٰذا

لفظ میں ایک ترنم اور ایک رنگ ہے۔ یہ معنوی عیب جوئی نہیں بلکہ ہسانی مار ہے اور آنکھوں سے بھی اشارہ ہے۔
لوگوں کو ایسے ناموں سے پکارنا جن کو وہ پسند نہیں کرتے اور ان ناموں کے ساتھ پکارے جانے کو مزاح سمجھتے ہیں۔ اس سے بھی اسلام منع کرتا ہے۔ مومن کا مومن پر یہ حق ہے کہ وہ اس نام سے نہ پکارے جسے وہ پسند نہ کرے یا اسے تنگ سمجھے۔ مومنین کے آداب میں یہ شامل ہے کہ وہ دوسرے مومنین کو ایسے ناموں سے نہ پکاریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے زمانے کے کئی نام اور لقب بدل دیئے تھے۔ حضورؐ نے اپنے تیز احساس سے اور اپنے مہربان دل سے محسوس کیا کہ یہ لوگ ان ناموں کو پسند نہیں کرتے جن کے معنی خراب تھے یا جن سے مذمت نکلتی تھی۔

اس آیت نے پہلے تو یہ اشارہ کیا کہ اللہ کے ترادوں میں حقیقی وزن کن باتوں کا ہے۔ اس کے بعد اسلامی اخوت کے شعور کو اجاگر کیا بلکہ اسلامی وحدت کے شعور کو جوش دلایا۔ اس کے بعد اب ایمانی شعور کو ابھارا گیا اور مومنین کو ڈر لایا گیا کہ تم سے کہیں ایمانی شعور گرم نہ ہو جائے۔ مزاح، طعن و تشنیع اور برے ناموں سے ایک دوسرے کو پکارنے سے تم فاسق نہ بن جاؤ۔

بَنَسِ الْاِسْمِ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ (۴۹: ۱۱) ”ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔“ ان آداب کو ملحوظ نہ رکھنا ایک قسم کا ارتداد ہے اور یہ ظلم ہے اور ظلم شرک ایک ہی چیز ہوتے ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَتَّبِعْ فَاُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۴۹: ۱۱) ”اور جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔“ یہ ہیں اسلام کے فاضلہ معاشرے کے آداب و اخلاق اور اس کے خد و خال۔

---○○○---

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا احْتَبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ أَثْمٌ وَلَا تَحْسَبُوا وَلَا يَغْتَبُ بَعْضُكُم بَعْضًا أَيُّحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ (۴۹: ۱۲) ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو، تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ لہٰذا سے زرد، لہٰذا بڑا توبہ کرنے والا اور رحیم ہے۔“

یہ آیت اس فاضلہ معاشرہ کی حفاظت کے لیے ایک دوسری باڑ ہے۔ جس میں ایک فرد کی آزادی اور اس کی عزت محفوظ ہوتی ہے، اسی طرح ان کو یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے شعور اور اپنے ضمیر کا اظہار کس طرح کریں گے۔ اور دوسروں کے بارے میں ان کی سوچ آئندہ کیا ہوگی۔ یہ نہایت ہی موثر انداز میں بیان ہوا ہے۔

اس کا آغاز بھی اس چیلاری آواز سے ہوتا ہے ”اے لوگو، جو ایمان لائے ہو۔“ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ دو سروں کے بارے میں بہت زیادہ گمان اور برے گمان کرنے سے باز رہو۔ کسی کے بارے میں اپنے فیصلے شکوک و شبہات پر نہ کرو۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے۔

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اَنَّمْ (۱۲: ۴۹) ”کہ بعض گمان گنہ ہوتے ہیں“۔ زیادہ زور بعض الظن پر ہے۔ یعنی بعض گمان گناہ ہوتے ہیں یعنی بدگمانی گنہ ہے۔ کیونکہ کوئی یہ معلوم تو نہیں کر سکتا کہ میرا کون سا ظن صحیح اور کون سا غلط ہے لہذا کسی پر کوئی بدگمانی نہیں کرنا چاہئے۔

لہذا مسلمانوں کو ایک دوسرے کے بارے میں اچھا گمان ہی رکھنا چاہئے اور ہر قسم کے شکوک و شبہات سے دلوں کو صاف رکھنا چاہئے۔ اور جس سوسائٹی میں ایک دوسرے کے خلاف شکوک و شبہات نہ ہوں اس میں لوگوں کے دل ایک دوسرے سے صاف ہوتے ہیں۔ کوئی کسی پر شک نہیں کرتا۔ ہر شخص دوسرے سے مطمئن ہوتا ہے اور ایسے معاشرے میں زندگی کس قدر خوشی سے گزرتی ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن اسلام کے روشن معاشرے میں یہ اصول صرف انفرادی تعامل ہی میں مروج نہیں ہے بلکہ یہ اجتماعی معاملات میں بھی ایک اہم اصول ہے۔ اور اس سے لوگوں کے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے۔ اسلام کے پاکیزہ معاشرے میں کسی کو محض شک اور شبہ کی بنیاد پر نہیں پکڑا جاتا نہ شبہات کی بنیاد پر مقدمے قائم کیے جاتے ہیں۔ شک کی بنا پر لوگوں کو جیلوں میں سےیں ٹھوسا جاتا۔ بلکہ شک کی بنیاد پر کسی کو وائرہ تفتیش میں لانا بھی جرم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر تم نے بدگمانی شروع کر دی تو پھر کوئی تفتیش نہیں ہے۔“ (طبرانی) یعنی اگر کوئی تفتیش بھی کرتا ہے تو لوگوں کو بے گناہ سمجھ کر تفتیش شروع کرو، ان کی آزادی بحال ہو، ان کے حقوق محفوظ ہوں۔ ان کا اعتبار و وقار بحال ہو۔ کسی کو اس وقت پکڑا جائے جب لچھی طرح معلوم ہو کہ اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ محض تفتیش اور شک کے لیے کسی کو ہراساں نہیں کیا جاسکتا۔

سبحان اللہ کیا مقام بلند ہے جہاں تک یہ آیت انسانی آزادیوں، انسانی حقوق، انسانی اعتماد و اعتبار اور انسانی وقار کو پہنچاتی ہے۔ اس مقام تک آج کے نام نہاد مذہب اور جمہوری معاشرے بھی نہیں پہنچ سکتے جہاں تک اسلام نے عملاً ایک سوسائٹی کے ضمیر کو پہنچایا، پھر یہ معیار عملاً ایک سوسائٹی میں قائم کیا اور آج سے چودہ سو سال قبل۔ اسی اصول کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے شک کے دائرے کو اور محدود کیا جاتا ہے۔

وَلَا تَجَسَّسُوا (۱۲: ۴۹) ”تجسس نہ کرو“۔ بسا اوقات تجسس بدگمانی ہی کے نتیجے میں ہوتا ہے اور بعض اوقات لوگوں کے راز معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور لوگوں کی کمزوریاں معلوم کرنے کے لیے۔ قرآن کریم اس گھنیا حرکت کو اخلاقی نقطہ نظر سے لیتا ہے۔ اور لوگوں کے دلوں کو اس قسم کے برے خیالات سے پاک کرتا ہے کہ کوئی کسی کے خفیہ حالات معلوم کرے اور اس کی کمزوریوں کے ٹوہ میں لگا رہے کیونکہ اخلاقی ظہیر میں اس کے مقاصد یہی ہیں کہ لوگوں کی پوشیدہ کمزوریوں کو نہ اچھالا جائے۔

لیکن یہ اصول محض اخلاقی ضابطے سے بھی آگے جاتا ہے۔ اس کا تعلق اجتماعی پاکیزگی اور قانونی اور انتظامی معاملات سے بھی ہے۔ اسلام میں لوگوں کی بعض آزادیاں، بعض عزتیں اور بعض شرفیں ایسی ہیں کہ ان پر کسی صورت میں دست درازمی جائز نہیں ہے۔

اسلام کے فاضلانہ معاشرے میں لوگوں کی جان، ان کی چار دیواری، ان کے راز، ان کی خفیہ کمزوریاں محفوظ ہوتے

ہیں۔ کسی وجہ سے بھی کوئی کسی کی جان کسی کے گھر کسی کے رازوں اور کسی کی کمزوریوں پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ یہاں تک کہ اسلام میں ادارہ تحقیق و تفتیش جرائم کو بھی یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ تجسس کرے۔ اسام لوگوں کے ساتھ ان کے ظاہری حالات کے مطابق برتاؤ کرتا ہے اور کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کے گھر کے اندر ٹھس کر اندرونی حالت معلوم کرے۔ اسلام ظاہری جرائم اور خلاف ورزیوں ہی پر پکڑتا ہے۔ کسی کو ظن یا توقع پر نہیں پکڑا جاتا کہ ان لوگوں نے جرم کیا ہے یا کرنے والے ہیں۔ اسام میں پکڑ دھکڑ ارتکاب جرم کے بعد ہے۔ اس طرح گرفتاری کے لیے دوسرے تحفظات ہیں جو ہر جرم کے لیے علیحدہ ہیں۔

امام ابو داؤد نے روایت کی ہے 'ابوبکر ابن شیبہ سے انہوں نے ابو معاویہ سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے زید ابن وہب سے 'وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود آئے۔ ان سے کہا گیا یہ فلاں ہے اور اس کی داڑھی سے شراب کے قطرے گر رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو تجسس سے منع کیا گیا ہے۔ ہاں اگر کوئی چیز ہم پر ظاہر ہو گئی کہ اس کا ارتکاب کیا گیا ہے تو ہم پکڑتے ہیں۔ اور مجاہد نے کہا کہ تجسس نہ کرو 'لوگوں کو ان کے ظاہری اعمال پر پکڑو۔ جو بات اللہ نے چھپا دی ہے اسے چھپا رہے دو۔

امام احمد نے دجین کاتب عقبہ سے روایت کی ہے 'وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عقبہ سے کہا کہ ہمارے بعض پڑوسی شراب پیتے ہیں۔ میں ان کے خلاف پولیس کو بلانے والا ہوں کہ ان کو پکڑ لیں تو حضرت عقبہ نے کہا کہ ایسا نہ کرو 'بلکہ ان کو نصیحت کرو اور دھمکی دو۔ کہتے ہیں انہوں نے ایسا کیا 'وہ باز نہ آئے تو دجین پھر ان کے پاس آئے کہ میں نے تو انہیں روکا وہ نہ روکے۔ اب تو میں ان کے لیے پولیس بلانے ہی والا ہوں۔ اس کو عقبہ نے کہا 'تم بدک ہو جاؤ! ایسا نہ کرو' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے "جس نے ایک مومن کی پردہ پوشی کی اس نے گویا ایک زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کو قبر سے نکال لیا"۔ (ابو داؤد سمیعی)

سفیان ثوری نے راشد ابن سعد سے انہوں نے حضرت معاویہ ابن ابوسفیان سے 'روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا "تم اگر لوگوں کی خفیہ باتوں کی ٹوہ میں لگو گے تو ان کو برباد کر دو گے یا قریب ہے کہ ان کو برباد کر دو"۔ اس پر حضرت ابوالدرداء نے کہا یہ ایک بات ہے جو حضرت معاویہؓ نے حضورؐ سے سنی 'اللہ اسے اس کے ذریعہ نفع دے۔ (ابو داؤد)

اس طرح قرآن کریم کی یہ آیت اسلام کے سیاسی نظام کی ایک دستوری دفعہ بن گئی اور محض اخلاقی اور روحانی اصلاح پر مشتمل ایک وعظ ہی نہ رہی بلکہ یہ لوگوں کے بنیادی حقوق اور ان کی شخصی آزادیوں کے لیے ایک تحفظ بن گئی اور اسلامی قانون اور دستور میں ان کے حقوق کا ایسا تحفظ کیا گیا کہ دور دور قریب سے اور کسی بھی بہانے سے ان پر دست درازی ممکن ہی نہ رہی۔

یہ دور رس حقوق کہاں؟ یہ بلند افق کہاں؟ اور وہ حقوق کہاں جن پر آج کی مغربی جمہوری حکومتیں بظلمت بجاتی ہیں۔ وہ کہاں؟ اور وہ بھی چودہ سو سال کے بعد۔ اس کے بعد ایک عجیب انداز گفتگو میں اور نہایت ہی انسانی اور اخلاقی اسلوب میں قرآن کریم غیبت اور بدگوئی کی ممانعت کرتا ہے۔

وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُم مِّنْ بَعْضٍ أَيْحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ

(۴۹: ۱۲) ”اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو، تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔“ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ اس کے بعد ایک ایسا منظر پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے نہایت سنگدل آدمی بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ ایک بھائی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھا رہا ہے۔ یہ منظر دکھا کر کہا جاتا ہے۔ اگر تم نے اس منظر کو ناپسند کیا ہے تو پھر تم نے غیبت کو بھی ناپسند کیا۔

اس آیت میں جو جو چیزیں ممنوع قرار دی گئیں ان پر ایک جامع تبصرہ۔ یعنی بدگمانی، تجسس اور غیبت کہ خدا سے ڈرو اور اشرار اس طرف کہ اگر کسی نے ایسی غلطی کی ہے تو معافی مانگو اور طلب مغفرت کرو۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ (۴۹: ۱۲) ”اللہ سے ڈرو اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔“ یہ آیت جماعت مسلمہ کی زندگی میں خون کی طرح دوڑتی ہے اور اس سوسائٹی میں تمام بنیادی حقوق کی محافظ بن جاتی ہے۔ اور انسانی خیالات و تصورات کے لیے ایک انداز فکر بن جاتی ہے۔ اور اسلامی اخلاق کے لیے طرز عمل بن جاتی ہے اور قرآن ہی کے انداز میں حضور اکرمؐ مد ظلیٰ تجسس اور غیبت کے تصور اور تخیل ہی سے لوگوں کو ڈراتے ہیں۔ امام ابو داؤد نے روایت کی ہے قعنبی سے انہوں نے عبدالعزیز ابن محمد سے انہوں نے عہد سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے ”وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ غیبت کی حقیقت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ”تم اپنے بھائی کا تذکرہ اس طرح کرو کہ وہ اسے ناپسند کرے“ تو کہا گیا کہ اگر میں ایسی بات کروں جو اس میں فی الواقعہ ہو تو آپؐ نے فرمایا اگر اس میں وہ بات ہے جو تم کرتے ہو تو تم نے غیبت کی اور اگر اس میں وہ بات نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان باندھا (ترمذی، احمد)

امام ابو داؤد نے روایت کی ’مسند سے‘ انہوں نے یحییٰ سے ’انہوں نے سفیان سے‘ انہوں نے علی ابن اتر سے ’انہوں نے ابو حذیفہ سے‘ اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ’وہ کہتی ہیں‘ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، آپ کے لیے منیہ کی یہ یہ ہمتیں کافی ہیں (مسند دہلوی نے کہا ان کا مقصد ان کی کوتاہیوں سے تھا) اس پر حضورؐ نے فرمایا: ”تم نے ایسی بات کی ہے اگر تم اسے سمندر میں ملاؤ تو اس کا رنگ بدل جائے۔“ حضرت عائشہؓ نے کہا ”اور میں نے ان کے سامنے ایک انسان کی باتیں کیں تو آپؐ نے فرمایا“ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میں کسی انسان کی حکایت کروں اور مجھے یہ ’یہ ملے۔“

امام ابو داؤد نے حضرت انس ابن مالک سے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ”جب مجھے معراج کا سفر کر لیا گیا تو میں کچھ لوگوں کے پاس سے گزرا، ان کے ناخن تائبے کے ہیں جن سے وہ اپنے منہ اور سینے نوچ رہے ہیں۔ میں نے کہا: ”یہ کون لوگ ہیں جبرائیل! فرمایا“ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی بے عزتی کرتے ہیں۔“

جب معز اور غامد یہ نے زنا کا اعتراف کر لیا اور رسول اللہؐ نے ان دونوں کے رجم کے احکام دے دیے، کیونکہ انہوں نے اقرار کیا، پھر اقرار پر اصرار کیا اور کہا کہ ہمیں پاک کر دیں۔ حضورؐ نے ایک شخص کو سنا جو دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ کیا تو نے ان دونوں کو نہیں دیکھا کہ ان دونوں کے گناہ کو اللہ نے چھپایا لیکن ان کے نفوس نے ان کو تپ چھوڑا کہ

کتوں کی طرح پتھروں سے ہلک کر دیئے گئے۔ اس کے بعد حضورؐ آگے گئے۔ راستے میں ایک گدھے کی ماش پڑی ہوئی تھی آپؐ نے فرمایا کہ ”فلاں فلاں کہاں ہیں؟“ ان دونوں سے کہا اتر دو اور اس مردار گوشت کھاؤ۔“ تو انہوں نے کہا رسول خدا اللہ آپؐ کو معاف کرے کیا مردار گدھے کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے؟ تو رسول اللہؐ نے فرمایا ”یہ تم نے جو اپنے بھائی کا گوشت کھایا ابھی یہ تو اس سے مشکل کام تھا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ شخص تو اس وقت :تہیٰ سرود میں ذبکیاں لے رہا ہے۔“ (ابن کثیر)

اس قسم کی مسلسل تربیت کے ذریعے ہی اسلامی سوسائٹی کی تطہیر کی جاتی رہی اور وہ پاک ہو کر ایک بلند مقام تک پہنچی۔ یہ ایک انسانی خواب تھا جو اسلامی تاریخ ہی میں حقیقت بنا۔

--- ۵۵۵ ---

اہل ایمان کو اس مٹھی آواز سے ہر بار پکارنے کے بعد اے لوگو جو ایمان لائے ہو ان کو انسانیت کے روشن افق پر انسان کے نفسیاتی آداب کے زاویہ سے اجتماعی آداب کے حوالے سے بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے انسانی عزت، آبرو، آزادی کی ضمانتوں اور گارنٹی کے حوالے سے نہایت ہی بند یوں تک پہنچی کر ان کی حساسیت کو نہایت تیز کر کے اور خدا خونی اور خشیت الہی کے ہتھیاروں سے لیس کرنے کے بعد اب روئے سخن پوری انسانیت کی طرف ہے۔ پوری انسانیت مختلف رنگوں، مختلف نسلوں، مختلف زمانوں اور مختلف عدتوں کے لوگوں کی طرف دیکھو تمہاری اصل تو ایک ہے تمہاری اصل تدریس بھی ایک ہیں۔ اور انہی قدروں کی بدولت صحابہ کرامؓ کی یہ جماعت ان بلندیوں تک پہنچی۔

--- ۵۵۵ ---

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاهُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ

أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۱۳: ۴۹) ”لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔“

اے لوگو! مختلف اقوام اور مختلف رنگ کے لوگو! مختلف اقوام و قبائل کے لوگو! تمہاری اصلیت تو ایک ہے۔ لہذا آپس میں اختلافات نہ کرو! آپس میں جھگڑے نہ کرو اور الگ الگ راہوں پر نہ چلو۔ اے لوگو! تمہیں جو پکار رہا ہے وہ تو وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تمہیں اس نے ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔ وہ تمہیں بتاتا ہے کہ اس نے کیوں تم کو اقوام و قبائل میں تقسیم کیا ہے؟ یہ اس لیے نہیں کہ تم ایک دوسرے کے گلے کاٹو اور جنگیں لڑو یہ تو محض تعارف اور جوڑ کے لیے ہے، رہا زبان اور رنگ کا اختلاف، طبیعت اور مزاج کا اختلاف، قابلیت اور استعداد کا اختلاف تو یہ ایسے اختلافات اور ایسی رنگارنگی ہے جنکی وجہ سے نزاع اور جنگ بلا جواز ہے بلکہ ان چیزوں کو باہم دمہ داریاں سرانجام دینے کے لیے موجب تعاون ہونا چاہئے۔ نیز ان اختلافات کے ذریعہ سوسائٹی کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اللہ کے ترازو میں تو رنگ و نسل، زبان اور وطن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اسلام میں تو واحد میزان میں تمام قدروں کو پایا جاتا ہے

اور اسی کے مطابق حسن و قبح کے اصولوں کا تعین کیا جاتا ہے وہ یہ ہے۔

اِنْ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۱۳:۴۹) ”تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔“ اور معزز درحقیقت ہے ہی وہی شخص جو اللہ کے نزدیک معزز ہے۔ اللہ اپنے علم اور خبرداری کی بنا پر تمہارا وزن کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۱۳:۴۹) ”بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔“

یوں تمام امتیازات ختم کر دیئے جاتے ہیں، تمام جھوٹی قدریں ختم کر دی جاتی ہیں۔ ایک ہی پیمانہ ایک ہی قدر کے ساتھ رہ جاتا ہے کہ انسانیت کی میزان اور خدا خونی کی قدر اور ان کے سوا سب کچھ بیچ۔

یوں اس کرہ ررض پر یہ سب نزع اور جھکڑے مٹ جاتے ہیں اور وہ تمام گھٹیا مقاصد اور اہداف ختم کر دیئے جاتے ہیں جن کے اوپر لوگ اس طرح بھینچتے ہیں جس طرح کتے ہڈی پر۔ اس طرح لوگوں کے درمیان الفت و محبت کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اللہ سب کا اللہ قرار پاتا ہے۔ تمام ایک ہی اصل سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہی انسانی جھنڈا رہ جاتا ہے۔ جس کے نیچے تمام لوگ کھڑے رہ جاتے ہیں یعنی اللہ ﷻ عطا یہ میں اور اسلام نے یہ جھنڈا واحد انسانی جھنڈا آج سے چودہ سو سال قبل اس لیے بند کیا ہے تاکہ انسانیت کو رنگ، نسل، قوم اور وطن کے شیطانی جھنڈوں سے نجات دی جا سکے۔ رنگ کی عصبیت، نسل کی عصبیت، زمین کی عصبیت، قبیلے کی عصبیت اور خاندان کی عصبیت سے نجات دی جائے۔ یہ سب عصبیتیں جاہلیت سے لگی ہیں اور جاہلیت کے فروغ کے لیے ہیں۔ یہ مختلف رنگوں اور لباسوں میں آتی ہیں اور یہ مختلف ناموں سے آتی ہیں لیکن یہ سب ننگی جاہلیت کی اقسام ہیں۔ ان پر کوئی اسلامی لباس نہیں ہے۔

اسلام نے عصبیت جاہلیت کی تمام اقسام کے خلاف جہاد کیا، کہ وہ اپنا عالمی انسانی نظام رب العالمین کے جھنڈے کے نیچے، نہ نسل کے جھنڈے کے نیچے قائم کرے۔ یہ سب کھوئے جھنڈے ہیں اسلام ان کو نہیں پہچانتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے، جو لوگ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اس حرکت سے باز آجائیں ورنہ اللہ کے لیے یہ بات بہت آسان ہے کہ تمہیں گہریلے سے ہٹا کر دے۔ (البزار) اور عصبیت جاہلیت کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا ”اسے چھوڑ دو یہ گندہ ہے۔“ (مسلم)

یہ ہے وہ اصول جس پر اسلامی نظام قائم ہے جو ایک عالمی انسانی نظام ہے اور جو عالمی انسانی سوسائٹی بناتا ہے۔ اسلام نے یہ سوسائٹی اور نظام آج سے چودہ سو سال قبل قائم کیا جبکہ انسانیت ابھی تک اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتی ہے کیونکہ انسانیت نے ابھی تک اس معاشرے کی طرف اسلام کے صراطِ مستقیم سے چٹنا نہیں شروع کیا۔ یعنی اللہ رب العالمین کے جھنڈے کے نیچے کھڑی ہو کر۔ یہی وہ واحد جھنڈا ہے عقیدۂ توحید کا جھنڈا جس کے نیچے پوری انسانیت کھڑی ہو سکتی ہے۔

---○○○---

اب اس سورت کے آخر میں ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت بیان کی جاتی ہے اور یہ ان اعراب کی تردید میں بیان کی جاتی ہے جو ایمان کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان جتاتے تھے کہ ہم مسلمان ہوئے ہیں اور اس احسان کے بارے میں نہ سوچتے تھے کہ اللہ نے دعوتِ ایمان بھیج کر لوگوں پر کس قدر احسان کیا۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ امَّا قُلْ لَمَّا تَدْعُوهُمْ قُلْ لَكُمْ قُلُوبُكُمْ وَإِنْ تَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلَيْتُكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۱۳ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝۱۴ قُلْ أَعْلَمُونَ اللَّهُ بِذُنُوبِكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝۱۵ يَسْتُونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُوتُوا عَلَىٰ إِسْلَامِكُمْ يَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝۱۶ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝۱۷

ع ۸

۱۴ ”یہ بدوی کہتے ہیں کہ ”ہم ایمان لائے“۔ ان سے کہو، تم ایمان نہیں لائے۔ یہ یوں کہ ”ہم مطیع ہو گئے“۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری اختیار کر لو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا، یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا۔ اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی سچے لوگ ہیں۔ اے نبی! ان (مدعیان ایمان) سے کہو، کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان سے کہو، اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر تم واقعی اپنے (دعوائے ایمان میں) سچے ہو۔ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کہتے ہو وہ سب اس کی نگاہ میں ہے۔“

یہ آیات بخواسد کے رسائی مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم ”ایمان لائے“ ہیں۔ یہ انہوں نے اس وقت کہا جب وہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ سے یہ بات بھی کہی کہ حضور! ہم نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن آپ کے ساتھ ہم کبھی نہیں لڑے جبکہ دوسرے عربوں نے آپ کے ساتھ لڑائیاں لڑیں تو اللہ نے ان کو بتایا کہ تمہارے ذہنوں کے اندر جو بات ٹپخی ہوئی ہے، وہ غلط ہے کہ تم نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلامی حکومت کے سامنے سہا تسلیم خم کر دیا ہے، لیکن ابھی تمہارے دل مرتبہ ایمان تک نہیں پہنچے۔ اس سے معلوم ہوا کہ

حقیقت ایمان ابھی ان کے دلوں میں نہیں بیٹھی تھی۔ اور ان کی لادرج نے ابھی جام ایمان نوش نہیں کیا تھا۔

قُلْ لَّكُمْ تَوْفِيقُوۡنَ ۚ وَلٰكِنْ قُوۡلُوۡا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدۡحُلۡ الْاِيۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ (۱۴:۴۹)
 ”ان سے کہو تم ایمان نہیں مانے بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔“

لیکن اس کے باوجود اللہ نے فرمایا کہ تمہارے اعمال پر حمیس پوری پوری جزا دی جائے گی اور تمہارے اعمال کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو گا۔ یہ اسلام جو ابھی تک دلوں کے اندر داخل ہو کر قلوب سے اندر نہیں پہنچا کہ وہ پختہ اور قابل اطمینان ایمان بن جائے یہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ ان اچھے اعمال پر انہیں جزائے خیر دی جائے اور وہ کفار کے اعمال کی طرح ضائع نہ ہوں۔ اور اللہ کے ہاں ایسے مسلمانوں کے اجر میں کمی نہ ہوگی جب تک وہ مطیع فرمان اور سر تسلیم خم کرنے والے رہتے ہیں۔

وَ اِنْ تَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلۡتَکُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِکُمۡ شَیۡئًا (۱۴:۴۹) ”اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرمان برداری اختیار کر لو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے۔“ کیونکہ اللہ بہت ہی رحیم و کریم ہے۔ وہ اپنے بندوں سے اسلام اور ایمان کی راہ میں پہلا قدم ہی قبول کرتا ہے۔ اطاعت اور تسلیم ہی سے راضی ہو جاتا ہے اور اس کے بعد دل میں خود بخود ایمان اور اطمینان آ جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۴:۴۹) ”بے شک اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔“ اس کے بعد حقیقی ایمان پیدا دیا۔

اٰمَنَ الْمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یَرَۡتَابُوۡا وَجَہِدُوۡا بِاَمْوَالِہِمۡ وَاَنْفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰلِحُوۡنَ (۱۵:۴۹) ”حقیقت میں مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان مانے۔ پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی سچے لوگ ہیں۔“

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور رسول پر دل سے یقین ہو جائے۔ ایسا یقین جس کے ساتھ دل میں کوئی شک اور شبہاں باقی نہ رہے۔ ایسا یقین جو مستحکم ہو جس کے اندر کوئی تزلزل اور اضطراب نہ ہو جس کے اندر کوئی غش یا شک نہ ہو۔ جس میں قلب و شعور میں کوئی تزلزل نہ ہو اور جس کے نتیجے میں جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کے اعمال پیدا ہوں دل جب ایمان کی شیرینی کو چکھ لے اور اس پر مطمئن اور پختہ ہو جائے تو اس کا اخراج اعمال و جوارح سے ہوتا ہے۔ عملی دنیا میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ مومن کی سعی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایمان جو اس کے احساس و شعور کے اندر اور اس کے باطن میں بیٹھا ہے وہ انسان کے ارد گرد ماحول کے معاملات میں بھی ظاہر ہو۔ ایمان کی جو حسی تصویر انسان کے قلب میں ہوتی ہے اور اس کی عملی صورت جو مومن کے ماحول میں ہوتی ہے ان کے درمیان تو فرق و امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ایسی صورت ہو تو پھر ایک شخص کے مومن کو ہر وقت ادیت ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کے لیے میدان میں آ جاتا ہے اور یہ مومن کے انفرادی ایمان کا صدور اور طوفان ہے جو عملی شکل اختیار کرتا ہے اس لیے کہ مومن اس طرح اپنے دین کی تصویر کو

عمل میں مانا چاہتا ہے تاکہ یہ تصویر واقعی تصویر بن جائے۔ اس لیے مومن کی جنگ اس کے ماحول سے ایک مومن کا خالص ذاتی معاملہ ہے۔ یہ نہ مومن کے دین میں کچھ اور ہو اور اس کے ماحول میں کچھ اور ہو یہ دہری زندگی وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا ہے کہ ایمان کو دل سے نکال دے اور جدھر ہوا چلتی ہے اور چپے لگے اس لیے ایک شخص کے مومن ہوتے ہی اس کی اس کے ماحول کے ساتھ جنگ شروع ہو جاتی ہے جسے جہاد کہا جاتا ہے۔ اور یہ جہاد اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک مومن کے گرد پھیلی ہوئی اس جاہلیت کو ختم نہیں کر دیا جاتا۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّدُقُونَ (۱۵: ۴۹) ”ایسے ہی لوگ سچے ہیں“۔ یہ اپنے عقیدے اور نظریہ میں سچے ہیں اگر وہ کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں لیکن ان کے دل کا ایمان مسخ ہو کر ان کے ماحول کے ساتھ نہیں ٹکراتا جو زندگی کی عملی صورت میں ایمان سے متضاد ہے تو سمجھو کہ ایمان نہیں ہے۔ عقیدے اور نظریات میں ایسا شخص سچا نہیں ہے۔ اس آیت میں لفظ اللہ کے ساتھ صبر قابل ملاحظہ ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا (۱۵: ۴۹) ”حقیقت میں تو مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا۔“۔ غرض ایمان صرف عبادت ہی نہیں ہے۔ ایمان مجرد شعوری حالت کا نام بھی نہیں ہے اور یہ اس حالت کے اندر کوئی رد و بدل بھی نہیں ہے جو نفس کے اندر ہوتی ہے۔ ایمان کے بعد لَمْ يَرْتَابُوا (۱۵: ۴۹) ”پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا۔“۔ اور اس کے ساتھ اس آیت کی حصر بھی درج ذیل آیت کے مشابہ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا ”وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے اور اس کے بعد انہوں نے استقامت اختیار کی۔“۔ یہ کہنے کے بعد کہ اللہ ہمارا رب ہے کوئی شک نہ کرنا اور استقامت اختیار کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات نفس مومن پر مختلف تجربات اور مختلف مشکلات کے نتیجے میں اور بعض شدید آزمائشوں کے نتیجے میں شکوک و اضطرابات پیدا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز میں بعض اوقات انسانوں پر سخت شدائد آتے ہیں لیکن ایک سچے مومن کے دل میں کوئی اضطراب اور کوئی شک پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ثابت قدم رہتا ہے۔ اور اس کے اندر کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا اپنے خدا پر پورا پورا بھروسہ ہوتا ہے اور وہ سیدھی راہ پر پوری استقامت کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور وہ آگے ہی بڑھتا رہتا ہے۔

اس انداز میں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لعل ایمان کو اس بات پر متنبہ کر دیا جائے کہ اس راہ میں بہت سی مشکلات مقامات لغزش اور مقامات خطرہ موجود ہیں تاکہ ایک مومن اپنے عزم کو پختہ کر لے اپنی تیاری خوب کرے اور سیدھا سیدھا چلے۔ اور جب افق پر دھند چھا جائے تو اسے شک نہ ہونے لگے اور وہ طوفانوں اور آندھنیوں کی نذر نہ ہو جائے۔

اس کے بعد یہی بیان جاری رکھتے ہوئے ان کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ تو تمہارے دلوں اور نیوؤں سے بھی واقف ہے۔ یہ تو اللہ ہی ہے جو تمہیں تمہارے دلوں کی باتیں جانتا ہے اور اللہ تم سے علم حاصل نہ کرے۔

قُلْ أَتَعْلَمُونَ اللَّهُ بِدِينِكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۱۶:۴۹) ”بے شک ان سے کہو کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔“ انسان اپنے عم کے بارے میں لمبے چوڑے دعوت کرتا ہے حالانکہ وہ خود اپنے نفس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ اپنے آپ کی شعوری دنیا کے بارے میں بھی پوری معلومات نہیں رکھتا۔ اور نہ اسے اپنے نفس کی پوری حقیقت معلوم ہے اور نہ شعور اور لا شعور کی۔ انسان یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی عقل کس طرح کام کرتی ہے۔ کیونکہ انسان جب کوئی کام کرتا ہے تو اس وقت وہ خود اپنے دماغ کا ملاحظہ (observation) نہیں کر سکتا۔ اور جب وہ اپنے نفس کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کا وہ کام رک جاتا ہے جو وہ کر رہا ہوتا ہے۔ لہذا ملاحظہ کے لیے کوئی چیز ہی نہیں رہتی۔ اور جب انسان کسی کام میں لگا ہوتا ہے اس وقت وہ نگرانی نہیں کر سکتا۔ اس لیے انسان خود اپنی ذات کی حقیقی معرفت سے بھی عاجز ہے۔ اور اس کے معلوم کرنے سے بھی عاجز ہے کہ انسانی دماغ کس طرح کام کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی تو وہ چیز ہے جس پر انسان نازاں ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۱۶:۴۹) ”حالانکہ اللہ زمین اور آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے۔“ حقیقی علم اللہ کے پاس ہے ہم تو صرف ظاہری علم جانتے ہیں جبکہ اللہ ہر چیز کی ماہیت اور حقیقت سے واقف ہے۔ اور اللہ کا علم شامل محیط اور ماحدہ دہے اور ازلی اور ابدی ہے۔

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۱۶:۴۹) ”اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔“ یعنی جس پر چیز کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ علم محیط رکھتا ہے۔ یہ بیان کرنے کے بعد کہ تم ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے ہو اور نہ تم نے اس کی حقیقت کا ادراک کیا ہے رونے غن حضور آرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے کہ یہ لوگ آپ پر اپنے اسلام کا احسان رکھتے ہیں ان کا احسان جتنا ناقص اس بات کی شہادت ہے کہ وہ حقیقت ایمان کا ادراک نہیں کر سکے۔ اور انہوں نے ابھی تک ایمان کی مناس کو چکھا نہیں ہے۔

يٰۤمُنُوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمْنُوْا عَلٰى اِسْلَامِكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمْنُ عَلَيْكُمْ اَنْ

هٰذَاكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۷:۴۹) ”یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے“ ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر واقعی تم سچے ہو۔“

انہوں نے یہ احسان جتنا دیا تھا کہ وہ اسلام لائے ہیں اور ان کا زعم یہ تھا کہ وہ مومن ہیں جواب یہ آیا کہ اپنے اسلام کا احسان نہ جتاؤ۔ اگر تم دعوائے اسلام و ایمان میں سچے ہو تو احسان اللہ کی جانب سے ہے۔

یہ جو اللہ نے ان کی تردید میں آیت نازل کی ہے یہ ایک عظیم حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ جس سے بڑے بڑے لوگ غافل ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ اس پر قدر۔ غور کرس۔ بعض اہل ایمان بھی اس سے غافل ہوتے ہیں۔

اہل زمین پر اللہ۔ اہل آسمان میں سے ایمان سب سے بڑا احسان ہے۔ سب سے بڑا احسان تو خود انسان کا وجود اور اس کی رہن و سمجھا جاسکتا ہے۔ نیز انسان کی زندگی کے لوازمات اور مقدمات اور ضروریات کو سمجھا جا

سکتا ہے مثلاً صحت 'ساز و سامان اور زندگی لیکن ایمان ان میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

یہ وہ احسان ہے جو انسان کی پوری زندگی کو 'بمقصد' یا معنی اور ممتاز بنا دیتا ہے اور ایمان کی وجہ سے انسان کا کردار اس زمین میں بہت ہی حقیقی اور ممتاز ہو جاتا ہے۔

ایمان کی وجہ سے انسان کے اندر پسلی تبدیلی یہ واقع ہوتی ہے 'بشرطیکہ ایمان کی حقیقت انسان کے ذہن میں بیٹھ جائے کہ ایک مومن انسان کا تصور کائنات بہت ہی وسیع ہو جاتا ہے کیونکہ اس تصور کی وجہ سے انسان اس کائنات کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے اور اس کے اندر انسان کا ایک کردار متعین ہو جاتا ہے اور اس کے ماحول میں جو بھی چیزیں ہیں انسان اشخاص واقعات ان سب کی قدریں اس کے ہاں متعین ہو جاتی ہیں اور وہ اس سیارۃ زمین پر اپنے اس مختصر سفر کو نہایت ہی اطمینان سے طے کرتا ہے اور اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات سے مایوس ہوتا ہے اور اپنے خالق کے ساتھ مانوس ہوتا ہے 'جو اس کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی خالق ہے'۔ اپنی اہمیت اور عظمت کا بھی شعور ہوتا ہے اور یہ کہ وہ اپنا کردار اس طرح ادا کر سکتا ہے کہ اللہ اس سے راضی ہو 'اور وہ اس کائنات کی مخلوقات اور انسانوں کے لیے باعث خیر و برکت بن سکتا ہے۔

انسان کے تصور میں ایک دوسرے پہلو سے بھی وسعت آتی ہے کہ وہ زمان و مکان کے حدود سے باہر نکل جاتا ہے۔ اپنی چھوٹی سی رات کے حدود سے بھی باہر آ جاتا ہے اور اس کائنات کی وسعتوں میں چلا جاتا ہے۔ جس کے اندر اللہ نے بے پناہ قوتیں رکھی ہوئی ہیں۔ اور بے حد اسرار چھپے ہوئے ہیں اور انسان اس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ بھی ایک طرح لامحدود ہو جاتا ہے۔

چونکہ انسان اپنی جنس کے اعتبار سے انسانیت کا ایک فرد ہوتا ہے 'وہ ایک ہی اصل کی طرف لوٹتا ہے اس لئے انسان نے ابتداء میں اپنی انسانیت اللہ کی روح سے لی ہے اور یہ اسے خدا نے اپنی روح ایک مٹی کے ڈھانچے میں پھونک کر عطا کی ہے اور اسی نفع روح کی وجہ سے یہ انسان 'لم بالا کے نور کے ساتھ جڑ جاتا ہے اور یہ نور زمین و آسمان کے حدود کے اندر محدود نہیں ہے۔ یہ ان سے بھی ورا ہے جس کی نہ انتہا ہے اور نہ ابتدا ہے اور مکان و زمان کے حدود میں مقید نہیں ہے۔ یہی نور اور روح ہے جس کی وجہ سے انسان 'انسان ہے۔ جب ایک انسان کے نفس کے اندر یہ بات بیٹھ جاتی ہے تو سب سے پہلے کوئی انسان خود اپنی ہی نظر میں بلند ہو جاتا ہے۔ یہ تصور انسان کو خود اس کے اپنے احساسات کے اندر مکرم بناتا ہے اور اسے نہایت ہی روشنی اور آفاقیت کا شعور دیتا ہے۔ اس کے قدم تو زمین پر چلتے ہیں لیکن اس کی روح 'اس کے سرچشمے سے جا ملنے کے لیے پھڑپھڑاتی ہے جس نے اسے ابتدا میں روح اور نور سے نوازا اور جس نے اسے یہ عجیب رنگ حیات دیا۔

اور یہ شخص اپنی امت اور گروہ کے اعتبار سے امت مسلمہ کا ایک فرد ہوتا ہے۔ یہی وہ واحد امت ہے جو تاریخ کے ثقیب و زرد میں، زمانوں سے ایک معزز قافلے کی صورت میں جا رہا ہے۔ اس کی قیادت کبھی نوح، کبھی ابراہیم، کبھی موسیٰ، کبھی عیسیٰ اور کبھی محمد علیہم السلام کے ہاتھ میں رہی۔ انسان کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کے دس میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ اس پاک شجر کی ایک شاخ ہے جس کی جڑیں تاریخ کی گہرائیوں میں۔ ررر تک چلی گئی ہیں اور جس کی شاخیں آسمانوں کے اندر بہت دور تک جا چکی ہیں۔ یہی تصور ہی انسان کو ایک بلند روح حیات عطا کرے کے لیے کافی

ہے جسے یہ مل جائے وہ زندگی کے نئے احساسات لے لیتا ہے اور اس کی اس زندگی کے اندر ایک دوسری زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کو یہ زندگی اس کے اس نظریاتی نسب نامہ سے ملتی ہے۔

نہیں، ابھی انسانی تصور رک نہیں گیا، یہ اپنی ذات، اپنی است، اپنی انسانیت سے بھی آگے بڑھ کر اپنی روح کے اندر اس پوری کائنات کو بھی سمیٹ لیتا ہے کہ یہ تو اس ذات نے تخلیق کی ہے جس نے انسان کو بنایا ہے، جس نے اس روح بخشی ہے۔ اور جس کی وجہ سے وہ کائنات کا دولہا بن گیا ہے۔ پھر اس کا ایمان اسے بتاتا ہے کہ یہ کائنات بھی ایک زندہ وجود رکھتی ہے۔ یہ زندہ ایٹم سے پیدا شدہ ہے۔ اس کی ہر چیز میں ایک روح ہے۔ اس پوری کائنات کی بھی روح ہے۔ اور انسانوں کی ارواح اور اس کائنات کی عظیم روح دراصل دونوں باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں۔ یہ سب کی سب اللہ کو پکارتی ہیں۔ اس کی تسبیح کرتی ہیں، اللہ کی حمد و ثنا اور اس کی اطاعت میں لگی ہوئی ہیں اور پوری طرح اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں، یوں انسان اس عظیم کائنات کے کل کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ یہ نہ اس سے جدا ہے اور نہ اس سے الگ ہے۔ یہ اللہ سے صادر ہے اور اپنی روح سے اس کی طرف متوجہ ہے۔ اور آخرت میں بھی اس نے اسی کی طرف جانا ہے۔ لہذا یہ انسان اپنی محدود ذات سے بڑا ہے۔ وہ اس قدر بڑا ہے جس قدر وہ اس کائنات کی بڑائی کا سور ذہن میں جما سکتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کی تمام ارواح سے مانوس ہے۔ اور پھر وہ اس روح سے مانوس ہے جو اللہ نے اس کے اندر پھونکی ہے اس نکتے پر آکر وہ سوچتا ہے کہ وہ اس پوری کائنات سے متحد ہو سکتا ہے خواہ وہ کائنات کس قدر طویل و عریض کیوں نہ ہو اور اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس میں کاربائے نمایاں سرانجام دے۔ اور بڑے بڑے واقعات کا سبب بنے اور ہر چیز کو متاثر کرے اور اس سے متاثر ہو۔ پھر اس کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اس قوت سے استفادہ کرے جس نے اس کی تخلیق کی، اور اس کے پورے ماحول میں پھیل ہوئی کائنات کی تخلیق کی۔ وہ عظیم قوت جو نہ کمزور ہوتی ہے، نہ کم ہوتی ہے اور نہ غائب ہوتی ہے۔ یعنی اللہ العلیہ المتعال۔

اسی وسیع تصور کے پیمانے میں، پھر یہ انسان تمام اشیاء، تمام واقعات، تمام اشخاص، تمام اقدار، تمام اہتمامات، تمام مقاصد، اور تمام منازل کو ایک بالکل جدید پیمانے کے ساتھ تو لے لے، اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں اس کا حقیقی کردار کیا ہے۔ اس کائنات میں اس کا مقصد وجود کیا ہے؟ اور اس کائنات میں وہ اللہ کی اقدار میں سے ایک قدر ہے۔ اس لیے اللہ جس طرف چاہے اسے موڑ دے جس طرح چاہے اسے استعمال کرے۔ یوں وہ پھر اسی سفر زندگی کو، اس سیارے پر طے کرتا ہے، طہیت قدمی کے ساتھ، واضح بصیرت کے ساتھ اور مانوس ضمیر کے ساتھ۔

جب انسان اس زاویہ میں اپنے ماحول میں پائے جانے والی اس کائنات کی حقیقت کو پا لیتا ہے۔ پھر وہ یہ بات متعین کر لیتا ہے کہ اس دنیا میں اس کا کردار کیا ہے؟ اور اس کا دہر کو ادا کرنے کے لیے اسے یہاں کیا کیا قوتیں دی گئی ہیں تو اس علم و معرفت سے اسے اطمینان، سکون اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کہ اس کے ماحول میں جو کچھ ہو رہا ہے، اور اسے جو کچھ پیش کر رہا ہے، اس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ اس کا محرک کون ہے یا خود وہ کہیں سے آرہا ہے؟ اور کیوں آیا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ یہاں اسے کیا ملنے والا ہے۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا مقصد زندگی کیا ہے، اور اسے جو کچھ پیش آرہا ہے وہ اس کا مقدر ہے۔ اور ہو کر رہنا ہے۔ اور یہ دنیا آخرت کی بھیبتی ہے۔ اور یہ کہ چھوٹے بڑے کاموں پر اسے جزا ملے گی۔ وہ عبت نہیں پیدا کیا گیا۔ نہ وہ شتر بے مہار ہے، نہ وہ اکیلا جائے گا۔

اس تصور اور شعور سے انسانی زندگی تلقی 'بے چینی' حیرت 'استعجاب اور لاعلمی (بابت آغاز و انجام) کی پریشانی سے نجات پالیتی ہے۔ نہ اسے راستے کی بے چینی ہوتی ہے اور نہ وہ اپنے آنے اور جانے سے پریشان ہوتا ہے۔ ذرا عمر خیم کو نئے وہ پریشان ہے :

”مجھے جامہ حیات 'میرے پوچھے بغیر پہنا دیا گیا' اس حیات کے دوران میں مختلف باتیں سوچتا رہا 'عنقریب جامہ حیات مجھ سے تار لیا جائے گا اور مجھے معلوم نہیں ہے کہ میں کیوں آیا اور مجھے جانا کہاں ہے؟“

پس ایک مومن نہایت ہی قلبی اطمینان سے یہ یقین رکھتا ہے اور بڑی خوش دلی سے یہ اطمینان رکھتا ہے اور ایک ہشاش دہشت چہرے کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ اسے عمر کا جامہ دست قدرت نے پہنایا ہے۔ وہ دست قدرت عظیم و قدیر کے طور پر اس کائنات میں متصرف ہے۔ اور وہ ہاتھ جس نے اسے جامہ حیات پہنایا ہے وہ زیادہ محکم اور رحیم و کریم ہے۔ لہذا اس کے ساتھ کسی مشورے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ انسان وہ سوچ پیش نہیں کر سکتا جس قدر عظیم و قدیر سوچ سکتا ہے اور انسان کو عظیم و قدیم نے جامہ حیات اس مقصد کے لیے پہنایا ہے کہ اس نے اس کائنات میں ایک کردار ادا کرنا ہے۔ یہ اس کائنات کے اندر موجود چیزوں سے متاثر ہو گا اور ان کو متاثر کرے گا اور اس نے جو کردار ادا کرنا ہے وہ اس کردار سے ہم آہنگ ہے جو اس دنیا میں تمام اشیاء ادا کر رہی ہیں۔ زندہ ہوں یا غیر زندہ 'ابتداء سے انتہا تک۔

پس ایک مومن جانتا ہے کہ وہ کیوں آیا ہے 'اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے جانا کہاں ہے؟ اور وہ کسی فکری انتشار میں گرفتار نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنا یہ سفر اور اپنا یہ کردار نہایت اطمینان سے ادا کرتا ہے۔ نہایت یقین کے ساتھ 'نہایت وثوق کے ساتھ۔ کبھی تو یہ مومن درجہ ایمان میں اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اپنا یہ کردار اس قدر خوشی اور انبساط کے ساتھ ادا کرتا ہے کہ اس تختہ حیات کی خوبصورتی کا شعور رکھتا ہے 'اور اسے ایک عظیم عطیہ سمجھتا ہے۔ اور اس عمر اور جامہ عمر کو عظمت شائق سمجھتا ہے۔ وہ بادشاہ جو لطیف و خیر اور جو جمیل اور دود و درخیم ہے اور جو کردار یہاں ادا کرنا ہے 'چاہے جس قدر مشقت کا باعث بن جائے وہ اسے ادا کر کے رب ذوالجلال کے ہاں پہنچ سکتا ہے۔

اور اس قسم کا پریشان کن شعور صرف ایمان کی وجہ سے غائب ہو جاتا ہے 'اس قسم کے شعور کے اندر میں بھی ایک عرصے تک گرفتار رہا ہوں۔ نہایت ہی کربناک پریشانیوں میں 'اس زمانے میں جب مجھے قرآن کے سایہ عاطفت میں آنے کی توفیق نہ ملی تھی۔ اور اس زمانے میں کہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر ابھی اپنے سایہ عاطفت کے اندر مجھے داخل نہ کر دیا تھا۔ یہ شعور میری روح میں موجود تھا اور میں نے ”آزردہ دل 'آزردہ کندہ اپنے را“ کے بموجب یہ شعور پوری کائنات کو اڑھا دیا تھا۔

وقف الکون حائرا ابن محضی

ولماذا وكيف لو شاء محضی

عبث ضائع وجهد غبین

ومصير مقنع ليس یوضی

(یہ پوری کائنات انگشت بندہاں ہے کہ یہ کہاں جا رہی ہے 'کیوں جا رہی ہے اور کس طرح جا رہی ہے 'اگر وہ جانا چاہے تو عبث جدوجہد ہے اور فانی دنیا ہے اور جب موت کا نقارہ بجن جائے تو چاہے نہ چاہے 'جانا ہے)۔

آج میں جانتا ہوں 'اور اللہ کے فضل و کرم سے جانتا ہوں کہ کوئی جدوجہد ضائع نہیں ہے' یہ کیے کی جزا و سزا ہے۔ کوئی جدوجہد اکارت نہیں جاتی ہے۔ اور انجام مرضی کے مطابق ہے اور عادل اللہ اور شفیق و رحیم رب کے پاس جانا ہے۔ اور یہ کہ یہ کائنات یہاں رک نہیں رہے گی۔ اس کائنات کی روح رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے اور اس کی حمد و ثناء کر رہی ہے اور یہ اس کی مرضی کے مطابق چل رہی ہے۔ اور اس کے اس قانون کے مطابق چل رہی ہے جو اس کے لیے اس نے تیار کیا ہے اور نہایت ہی حلیم و رضا اور اطاعت امر کے ساتھ جا رہی ہے۔

میں سمجھتا ہوں فکر و شعور کی دنیا میں بھی انسان کے لیے یہ بہت بڑی دولت ہے اور جسمانی اور اعصابی غلطی سے بھی اور حسن کارکردگی 'جدوجہد اور تاثیر اور تاثر اس کے علاوہ ہیں۔

ایمان جس طرح انسانی جسم و روح کے لیے ایک قوت مجتہد ہے 'اسی طرح وہ ایک اقدامی قوت بھی ہے۔ جو نئی کسی دل میں ایمان جاگزیں ہوتا ہے وہ عملی جدوجہد کی شکل میں پھر جسم سے باہر آتا ہے ایمان کی جو صورت دہن میں ہوتی ہے۔ وہ ایمان کی اس صورت کے ساتھ ہمقدم ہوتی ہے جو خارج میں عملی دنیا میں ہوتی ہے اور انسان کی قوائے متحرکہ پر ایمان قابض ہو جاتا ہے اور اسے ایمانی راستے کی طرف بڑھاتا ہے۔

”یہ ہے وہ راز جس کی وجہ سے نفس کے اندر عقیدے کی قوت مضمر ہے اسی طرح ایک مومن ہونے کی وجہ سے نفسیاتی قوتوں میں اضافے کا راز بھی یہی ہے۔ نظریہ کی وجہ سے دنیا میں جو عجائبات و معجزات صادر ہوتے ہیں اور ہوتے رہے ہیں ان کا راز بھی ہے ان معجزات کی وجہ آئے دن زندگی کا چہرہ بدل جاتا ہے۔ یہ ایمان اور نظریہ ہی ہے جس کے لیے لوگ یہ فانی زندگی بھی قربان کر دیتے ہیں اور اس زندگی میں قدم رکھتے ہیں جو کبھی فانی نہیں ہوتی اور ایک نہایت ہی ضعیف اور چھوٹا شخص بھی ایک بادشاہ، ایک ڈکٹیٹر کے سامنے سر اٹھا کر چلتا ہے اور آگ اور لوہے کی قوتوں کی کوئی پرداہ نہیں کرتا اور پھر وہ وقت آتا ہے کہ ایمان کے سامنے بارود ٹکست کھا جاتی ہے۔ یہ صرف ایک انسان نہیں ہوتا جو ان عظیم قوتوں کو ٹکست دے دیتا ہے بلکہ وہ ایک عقیدہ ہوتا ہے جو ان قوتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے بلکہ یہ وہ عظیم ایمانی قوت کا سرچشمہ ہے جس سے انسانی روح قوت حاصل کرتی ہے۔ یہ سرچشمہ بھی خشک نہیں ہوتا، کبھی اس میں کی نہیں آتی 'یہ کبھی کمزور نہیں ہوتا'۔“ (۱)

”یہ معجزانہ تغیرات جو ایک نظریہ، ایک فرد اور ایک سوسائٹی کے اندر رونما کرتا ہے 'کوئی ایسا نظریہ نہیں کر سکتا جو خرافات اور انسانوں پر قائم ہوتا ہے' جو ناقابل فہم ہو یا محض خوف اور حیرانگی اور تخیلاتی ہو بلکہ وہ عقیدہ کر سکتا ہے جو قابل فہم اور مضبوط اصولوں پر مبنی ہو۔ حقیقی دینی عقیدہ وہ ہوتا ہے جو انسان کو اس کائنات کی ظاہری اور باطنی قوتوں کے ساتھ یکجا کر دے اور انسان کی روح کے اندر اعتماد اور اطمینان پیدا کر دے۔ اس کے اندر ایک ایسی قوت پیدا کر دے جس کے ساتھ وہ تمام ناپائیدار اور زائل ہونے والی باطل قوتوں کا مقابلہ کرے۔ اور اسے یقین ہو کہ سخر کار وہ فتح یاب ہو گا۔ یہ اعتماد اللہ کی ذات سے حاصل ہو۔ اور یہ عقیدہ ایسا ہو جو انسان کو یہ بتاتا ہو کہ وہ اپنے ماحول کے واقعات سے 'ماحول کی تمام چیزوں اور تمام لوگوں کے ساتھ متعلق ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو اس کی منزل بھی دکھائے اور اس کا

انجام بھی جائے۔ اس کی پوری قوتوں کو مجتمع کرے اور ایک رخ پر ڈال دے۔ یہ ہے عقیدے کی قوت کا راز۔ کہ وہ تمام قوتوں کو مجتمع کر کے ایک محور کے گرد گھما دیتا ہے۔ ان کو ایک سمت سٹا کرتا ہے۔ انہوں کو ان کا ہدف معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنے اس نصب العین کی طرف نہایت قوت، یقین اور اعتماد سے بڑھتے ہیں۔^(۱)

غرض عقیدہ اور نظریات کی قوت میں یوں بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ یہ اس طرف بہتے ہیں جس طرف یہ پوری کائنات جاتی ہے۔ پوری کائناتی قوتیں جاتی ہیں، ظاہری یا باطنی ہوں۔ یونکہ کائنات کے اندر جتنی بھی قوتیں ہیں وہ ایمان کے راستے پر چل رہی ہیں۔ یوں ایک مومن کے لیے یہ کائناتی قوتیں رفتی سفر ہوتی ہیں اور اس طرح یہ ایمانی قوت اور کائناتی قوتیں مل کر باطل پر حملہ آور ہوتی ہیں، اگرچہ باطل بظاہر بڑی قوت نظر آئے اور آنکھوں کی چکاچوند کر دینے والی ہو لیکن ایمانی قوت سے وہ پاش پاش ہو کر رہے گی۔

اللہ نے ہم سے کہا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمَنُوْا عَلٰى اِسْلَامِكُمْ بِاللّٰهِ يَمُنْ عَلَيْكُمْ

اَنْ هٰذَاكُمْ - اِيْمَانُ اَنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۷: ۴۹) ”یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان سے کہو: ”اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت کی، اگر تم واقعی سچے ہو“۔ یہ ہے وہ عظیم دولت جس کا مالک بھی اللہ ہے اور جس کا بخشنے والا بھی اللہ ہے۔ اور اللہ دولت ایمان اسی کے حوالے کرتا ہے جس کے بارے میں اس علم ہوتا ہے کہ یہ اس فضل عظیم کا مستحق ہے۔

اللہ نے سچ کہا، جو شخص ان حقائق و علوم کے ساتھ دوستی کر لے اور یہ معانی اور یہ شعور اسے حاصل ہو جائے اور ان کے اندر وہ زندہ ہو اور وہ اس کے اندر اس چھوٹے سے سیارے پر معمولی حالات میں مختصر زندگی گزار رہا ہو اس نے گویا کچھ بھی نہیں کھویا اور جو شخص اس دولت سے محروم ہو گیا، وہ اگر نادر و نعم کی زندگی بھی بسر کرے، اس طرح زیادہ کھائے پیے جس طرح مویشی بہت سا کھاتے اور پیتے ہیں، تو وہ جان لے کہ اس سے یہ مویشی اچھے ہیں جو اپنی فطرت کے اعتبار سے خالق کریم کے مطیع فرمان ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۸: ۴۹)

”اللہ زمین و آسمان کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ اس کی نگاہ میں ہے“۔ جو اللہ زمین و آسمانوں کے غیب سے واقف ہے، جو ضمیروں کی بات جانتا ہے، جو انسانی شعور سے بھی واقف ہے، جو دیکھ رہا ہے کہ لوگ کرتے کیا ہیں۔ وہ صرف وہ باتیں ہی نہیں جانتا جو لوگوں کی زبان سے نکلتی ہیں بلکہ ان شعوری جذبات سے بھی واقف ہے جو دلوں میں جوش مارتے ہیں، ان اعمال سے بھی واقف ہے جو ان دلی جذبات کے نتیجے میں عمل میں آتے ہیں۔

یہ ہے گیارہ آیات پر مشتمل یہ عظیم سورت، یہ مومنین کے لیے نہایت ہی اہم نشانات راہ تجویز کرتی ہے اور نہایت ہی اعلیٰ اور پاکیزہ نشانات نیز انسانی شعور و ضمیر کی گہرائیوں میں نہایت ہی عظیم اصول اور حقائق کی نشاندہی کرتی ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

(۱) کتب عالمی سلامتی کا باب عقیدہ اور زندگی

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ---- ۲۶

سورۃ ق - ۵۰

آیات ۱ تا ۴۵

سورۃ ق ایک نظر میں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کو عید اور جمعہ کے خطبات میں پڑھا کرتے تھے اور یہ سورت اکثر خطبہ جمعہ کا موضوع ہوا کرتی تھی۔ جبکہ بہت بڑے عجمی ہوا کرتے تھے اور نہایت ہی شاندار اجتماعات۔

یہ سورت نہایت ہی ڈرانے والی سورت ہے۔ معنوی اعتبار سے بھی نہایت موثر ہے اور انداز تعبیر کے اعتبار سے بھی بہت زور دار ہے۔ اس کے سائے گرے 'تصاویر کے رنگ تیز اور آیات کے فواصل واضح ہیں۔ یہ سورت نفس انسانی کے شیب و فراز میں دور دراز تک اتر جاتی ہے۔ نفس انسانی حالت خطرہ میں مضطرب ہو اور بے ساختہ حرکات کر رہا ہو یا پوشیدگی اور تنہائی کی حالت میں ہو 'یا زینت محفل ہو یا باطن میں متفکر ہو' ہر حال میں یہ سورت اس کی نگرانی کرتی ہے۔ انسان کی ولادت سے اس کی وفات تک 'بعث و حشر تک اور یوم الحساب سے آخری انجام تک یہ اس کا تعاقب کرتی ہے۔ غرض نہایت ہی سخت نگرانی کی کیفیت ہے اور یہ نگرانی بہت ہی تفصیلی اور ڈراؤنی اور ہمہ جہت ہے۔ اور اس ضعیف انسانی مخلوق پر پوری طرح چھٹی ہوئی ہے۔ یہ انسان ہر وقت اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور اس نگرانی کے دائرہ سے اس کا کوئی چھوٹا بڑا معاملہ خارج نہیں ہے۔ اس کی حرکات و سکنات پوری طرح نوٹ ہو رہی ہیں 'نہ کم نہ زیادہ۔ اس کا ہر وسوسہ ریکارڈ ہو رہا ہے اور اس کی ایک ایک سانس کا حساب ہو رہا ہے 'ہر غفہ نیپ ہوتا ہے اور ہر حرکت کا حساب لگایا جاتا ہے۔ پھر یہ نگرانی اس قدر کامل 'شامل اور جامع ہے کہ اس کا دائرہ دلوں کے وسوسوں تک وسیع ہو جاتا ہے۔ تمام اعضاء پر یہ نافذ ہے۔ بغیر حجاب اور بغیر پردے کے۔ کوئی پردہ جس قدر بھی دیز ہو 'اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتا۔ غرض تنہائی اور محفل میں عمل اور حرکت میں نیت اور وسوس میں یہ انسان اللہ کی نگرانی اور رقابت کے تحت ہے۔ ہر وقت اور ہر حال میں۔

یہ پورا قرآن ان حقائق کی تعلیم دیتا ہے اور یہ ہر مسلمان کو معصوم ہیں لیکن اس سورت کو پڑھ کر یوں نظر آتا ہے کہ شاید یہ سب مضامین پہلی بار آ رہے ہیں۔ انسانی احساس اچانک چونک اٹھتا ہے۔ نفس انسانی رزا اٹھتا ہے۔ اور یہ سورت اسے اس قدر جھنجھوڑتی ہے کہ اس پر ریشہ طاری ہو جاتا ہے۔ اور انسان تعجب کے ساتھ ساتھ خائف بھی ہو جاتا ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ انسان سویا ہوا تھا اور جاگ اٹھا اور گہری غفلت سے ہوش میں آ گیا۔

ان امور کے علاوہ اس میں زندگی کی متنوع صورتیں 'موت کی مختلف شکلیں 'کل سڑ جانا' دوبارہ اٹھایا جانا 'حشر کی حشر سامانیاں 'قیام قیامت کو دل میں اٹھانا' احساس کو اس کے لیے ہر وقت تیار کرنا' غرض وہ عظیم حقائق لائے ہیں جو آسمان و زمین میں درخشاں ہیں۔ بارشیں اور زمین کی سرسبزیاں 'کجوریں اور پھل غرض تمام اہم مناظر و حقائق اس سورت میں ہیں جو

تَبْصِرَةٌ وَذِكْرِي لِكُلِّ عَبْدٍ مُنِيبٍ (۵۰: ۸) ”آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اس بندے کے لیے جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔“

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا سورت کی تلخیص اور پھر اس پر تبصرہ بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اس قسم کی زوردار اسلوب بیان رکھنے والی سورت کے حقائق، معانی، تصاویر اور رنگوں کے شیڈز (Shades) کو بیان کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ اور انسان کے لیے ممکن نہیں کہ خود قرآنی انداز اور اسلوب میں اس پر کچھ کہ سکے جبکہ قرآنی عبارت خود ان باتوں کو بطریق احسن جا رہی ہوں اور ایسے حالات میں کسی تبصرے اور تعریف اور ویساچے کے مقابلے میں براہ راست سورت کا اثر انسانی فطرت، ضمیر اور احساس پر زیادہ ہوتا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ ہم براہ راست تفسیر آیات شروع کر دیں۔ اللہ معاون و مددگار ہو۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۴ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا پہلا سبق ہے۔ اس کا موضوع مسئلہ بعث بعد الموت ہے۔ مشرکین مکہ اس کا انکار کرتے تھے بلکہ جو لوگ بعث بعد الموت کے قائل تھے وہ ان کی جانب سے یہ عقیدہ رکھنے پر تعجب کرتے تھے۔ لیکن قرآن صرف ان کے اس غلط خیال ہی کو موضوع بحث نہیں بناتا۔ بلکہ انکار پر بحیثیت مجموعی تنقید کرتا ہے اور ان کی اصلاح کر کے اور ان کی کج فکری کو درست کر کے ان کو سچائی کی راہ کی طرف لوٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن کریم کی سعی یہ ہے کہ ان کے غافل دلوں کو جھنجھوڑے اور خوب جگائے تاکہ وہ اس کائنات کے اندر جو عظیم حقائق ہیں، ان کو سمجھنے کے لیے اپنے دل کے دروازے کھولیں۔ اس لیے قرآن کریم محض منطقی انداز مناظرہ میں ان کے ساتھ موضوع بعث بعد الموت پر کوئی مباحثہ نہیں کرتا۔ وہ صرف ان کے مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ ان کے زنگ آلود دماغ کو صیقل کرتا ہے کہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔ وہ ان کے وجدان کو چھوٹا ہے تاکہ اس کے اندر احساس تیز ہو اور وہ اپنے ماحول کے اندر پائے جانے والے حقائق سے براہ راست متاثر ہو سکے۔ یہ ایک ایسا سبق ہے جس سے وہ لوگ خوب استفادہ کر سکتے ہیں جن کا کام دلوں کی اصلاح کرنا ہو۔

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۲ تشریح آیات

۱۔۔۔ تا۔۔۔ ۱۵



قَالَ الْقُرْآنُ السَّجْدَةُ ۝ بَلْ عَجَبًا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ
 الْكَافِرُونَ هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ ۝ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذَلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ ۝
 قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِیْظٌ ۝ بَلْ كَذَّبُوا
 بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَرِیْجٍ ۝ أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ
 كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ ۝ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا
 فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِیْجٍ ۝ تَبْصِرَةٌ وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ
 عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ۝

”ق“ قسم ہے قرآن مجید کی۔ بلکہ ان لوگوں کو تعجب اس بات پر ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود انہی میں سے ان
 نے پاس آگیا۔ پھر منکرین کہنے لگے: ”یہ تو عجیب بات ہے کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ
 اٹھائے جائیں گے)؟ یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے۔ (حالانکہ) زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے
 علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔ بلکہ ان لوگوں نے تو جس وقت حق ان کے
 پاس آیا اسی وقت اسے صاف بخند دیا۔ اسی وجہ سے اب یہ ابھمن میں پڑے ہوئے ہیں۔ اچھا تو کیا انہوں نے کبھی اپنے
 لوپر آسمان کی طرف سے دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رخسہ نہیں ہے۔ اور
 زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات لگا دیں۔ یہ ساری چیزیں

آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اس بندے کے لیے جو (حق کی طرف) رجوع کرنے والا ہو۔
سورت کا آغاز حرف ق اور قرآن مجید کی قسم سے ہوتا ہے، مطلب یہ کہ یہ قرآن مجید تو ایسے ہی حروف سے مرکب ہے اور لفظ قرآن کا پہلا حرف ہی قاف ہے۔

---○○○---

یہاں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ کس بات پر قسم اٹھانی جا رہی ہے۔ یہ قسم کلام کے آغاز میں ہے۔ اس کا پہلا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے کلام کا آغاز قسم سے کر رہا ہے، لہذا بیدار ہو جاؤ، معاملہ غیر معمولی ہے۔ اللہ اور قسم، لہذا معاملہ خطرناک ہے۔ شاید اس آغاز کا مقصد یہی ہے کیونکہ بجائے اس کے کہ بعد میں وہ بات ذکر کی جائے جس کے لیے قسم اٹھانی جا رہی ہے، حرف اضرب ”بل“ کو لایا گیا ہے۔ کیونکہ قسم نے مخاطب پر خوب اثر ڈال دیا۔ اس لیے اب ان کے تعجب اور بعث بعد موت کو ایک ”انہونی بات سمجھنے“ کے موضوع کو لیا جاتا ہے، اس انداز میں کہ گویا مشرکین کے سامنے جب رسول اللہ نے دوبارہ اٹھائے جانے کی بات کی تو انہوں نے اس کا یوں انکار کر دیا گویا کفار کے نزدیک یہ لیک نئی بات ہے۔

بَلْ عَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ (۲) ء

اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذَلِكَ رَجَعَ بَعِيدٌ (۵۰: ۲ تا ۳) ”بلکہ ان لوگوں کو تعجب اس بات پر ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود انہی میں سے ان کے پاس آگیا۔ پھر منکرین کہنے لگے: ”یہ تو عجیب بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے)؟ یہ وہی تو عقل سے بعید ہے۔“
کیا یہ بات قابل تعجب ہو سکتی ہے کہ ایک ڈرلنے والا ان میں سے آگیا۔ اس میں تو کوئی تعجب نہیں بلکہ یہ تو بالکل ایک قدرتی بات ہے اور فطرت سلیمہ اسے بڑی سادگی اور خوشی خوشی قبول کرتی ہے۔ یہ نہایت ہی معقول بات ہے کہ لوگوں کا مصلح اپنی قوم میں سے ہو، لوگوں کے احساسات میں، ان کے ساتھ شریک ہو، انہی جیسا شعور رکھتا ہو، ان کی زبان بولتا ہو، ان کی زندگی اور ان کی دوڑ دھوپ اور غم درد میں شریک ہو، ان کے میلانات اور جذبات کو جانتا ہو، ان کی طاقت اور حد برداشت سے واقف ہو، کہ وہ انہیں بتلائے کہ جس شرک، ظلم اور بد عملی میں وہ مبتلا ہیں، اس کے نتیجے میں بت ہی برا انجام ان کے انتظار میں ہے اور تاکہ ان کو سکھائے کہ انہوں نے کس طرح سیدھا راستہ اختیار کرنا ہے۔ اور جدید دعوت کو اگر وہ قبول کر لیں تو انہیں اپنے اندر کیا کیا تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ اور ان تبدیلیوں اور فرائض اور ذمہ داریوں میں وہ پہلا شخص ہو گا اور ان کے ساتھ شامل ہو گا۔

ان کو خود رسالت پر تعجب تھا۔ پھر جو رسول آیا اس نے اپنی دعوت میں سے عقیدہ بعث بعد الموت پر زیادہ زور دینا شروع کر دیا۔ کیونکہ اسلامی نظام کا دارومدار ہی آخرت کی جواب دہی کے عقیدے پر ہے۔ آخرت کی جواب دہی کے عقیدے ہی کے تمام مطلوبہ اعمال تقاضے ہیں۔ مسلم کا پہلا فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ حق پر قائم ہو اور باطل کو نیچا دکھائے۔ وہ خیر کو لے کر لٹھے اور شر کا خاتمہ کر دے۔ اس کی پوری سرگرمی اللہ کی بندگی ہو۔ وہ ہر حرکت میں اللہ کی طرف متوجہ ہو، اور تمام اعمال پر اس کے لیے جزاء ضروری ہے۔ کبھی تو یہ جزاء دنیا ہی میں آتی ہے لیکن پوری جزاء صرف آخرت ہی میں مل سکتی ہے۔ ہر انسان کا آخری حساب و کتاب آخرت میں ہو گا۔ لہذا عالم آخرت نہایت منطقی اور ضروری

ہے۔ لوگوں کو اٹھایا جانا ضروری ہے کہ وہ زندگی کا حساب لیں۔ جب کسی کے ذہن سے آخرت کی جو لہدہی کا احساس ہی ختم ہو جائے تو اس شخص کی زندگی سے وہ تمام اعمال و اخلاق ناپید ہو جاتے ہیں جو اس عقیدے پر مبنی ہوں۔ ایسا شخص کم از کم ایک مسئلہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

لیکن ان لوگوں نے اس مسئلے کو اس زاویہ سے نہیں دیکھا۔ انہوں نے بالکل ایک دوسرے زاویہ سے اور بالکل ایک سادہ نقطہ نظر سے دیکھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے موت و حیات کی حقیقت پر بالکل غور نہیں کیا اور نہ انہوں نے اللہ کے نظام قضا و قدر کے کسی پہلو پر غور کیا۔ اس لیے وہ اس کے قائل ہوئے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذَلِكُمْ رَجْعٌ بَعِيدٌ (۳:۵۰) ”کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے! یہ واپسی تو عمل سے بعید ہے۔“ ان کی نظروں میں مسئلہ یہ ہے کہ مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد زندگی کا دوبارہ پیدا ہونا مسجد ہے اور یہ ایک نہایت ہی سادہ نظریہ ہے۔ کیونکہ ایک دفعہ جب مردہ مٹی میں زندگی ڈال دی گئی ہے تو دوبارہ مٹی میں اسی طرح زندگی ڈالنا کیا مشکل کام ہے جبکہ یہ معجزہ ان کے سامنے ہر لحظہ رو بہ عمل ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کائنات کے ہر پہلو میں ہو رہا ہے۔ اس سورت میں قرآن کریم نے ان کو اس نکتے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ زندگی کی اس نمائش گاہ کے بارے میں ہم قرآن مجید کے اشارات اور تکوینی دلائل پر کوئی بات کریں۔ مناسب ہے کہ مرنے اور مٹی ہونے کی طرف انہوں نے جو اشارہ کیا اور جسے قرآن نے نقل کر کے اس پر تبصرہ کیا، اس پر ذرا غور کریں۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا (۳:۵۰) ”کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے۔“ ہاں ہم مرجائیں اور مٹی بھی ہو جائیں گے جو بھی قرآن کے ان الفاظ کو پڑھتا ہے جو قرآن نے کفار کے منہ سے لیے ہیں، وہ اپنی ذات پر نگاہ ڈالتا ہے اپنے ارد گرد دوسرے زندہ اشیاء کو دیکھتا ہے۔ اور وہ موت اور مٹی ہونے کے عمل پر ضرور غور کرتا ہے بلکہ جب وہ زندہ ہوتا ہے اور پھر رہا ہوتا ہے تو بھی وہ محسوس کرتا ہے کہ شاید مٹی ہونے کا عمل اس کے جسم میں جاری ہو چکا ہے۔ غرض موت کے سوا اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا تصور انسان کا دل ہل نہ دیتا ہو اور پھر قبر میں مٹی ہو جانے کے تصور ہی سے انسان کانپنے لگتا ہے۔

---○○○---

اس پر جو تبصرہ قرآن کرتا ہے وہ اس اثر کو مزید گہرا کر دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ زمین اس جسم کو آہستہ آہستہ کھاتی ہے۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِیْظٌ (۴:۵۰) ”(حالانکہ) زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔“

انداز تعبیر ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ زمین کو زندہ اور متحرک کر دیا گیا ہے اور وہ ان اجسام کو کھا رہی ہے جو اس کے منہ میں آہستہ آہستہ غائب ہو رہے ہیں۔ اور یہ زمین ان اجسام کو کھا رہی ہے نہایت آہستگی کے ساتھ۔ اذر پھر ان کے اجسام کو یوں دکھایا گیا ہے کہ وہ تسلسل کے ساتھ کھائے جا رہے ہیں۔ زمین ان کے جسم کے جس حصے کو کھاتی ہے، اسے اللہ جانتا

ہے اور وہ نکلا جا رہا ہے کہ وہ حصہ کہاں ہے۔ اس لیے ان کے جسم کے ذرے، مرنے کے بعد کہیں گم نہیں ہو جاتے۔
 رہی یہ بات کہ اس مٹی میں روح کس طرح ڈال دی جائے گی تو یہ بات تو ایک بار ہو چکی ہے۔ اور ان کے لہر و گرد جو
 لاتعداد زندہ اشیاء پیدا کی جا رہی ہیں اور جن کی کوئی انتہا نہیں ہے ان کو تو وہ دیکھ رہے ہیں۔

یوں دلوں کو اس قدر تیز احساس دلایا جاتا ہے یساں تک کہ یہ دل پھٹ جاتے ہیں اور نرم ہو جاتے ہیں اور ان کے
 اندر احساس کو اس قدر تیز کر دیا جاتا ہے کہ وہ بات کو جلدی مانتے ہیں۔ یہ بطور تمہید اصل مقصود بالذات بات کہنے سے
 پہلے کیا جاتا ہے۔

---○○○---

اس کے بعد ان کی شخصیت کا تجزیہ کر کے بتایا جاتا ہے اور وہ اصل سبب بتایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ وہی
 اعتراضات وہ کرتے ہیں یہ کہ انہوں نے سچائی کا مضبوط پلیٹ فارم چھوڑ دیا ہے، ان کے پاؤں کے نیچے زمین ہی نہیں
 ہے۔ اس لیے یہ کسی موقف پر جم ہی نہیں سکتے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَّرِيجٍ (۵:۵۰) ”بلکہ ان لوگوں نے تو جس وقت حق ان
 کے پاس آیا اسی وقت اسے صاف بھٹا دیا۔ اسی وجہ سے اب یہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔“
 یہ بھی ایک نہایت منفرد انداز تعبیر ہے۔ جو لوگ مستقل سچائی کو ترک کرتے ہیں تو پھر ان کے قدم کسی جگہ نہیں
 جم سکتے۔

سچائی ایک ایسا نقطہ ہے جس پر وہ شخص قائم ہوتا ہے جو سچائی پر ایمان لاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے قدموں میں
 کوئی لغزش نہیں ہوتی۔ اس ریش میں اضطراب نہیں ہوتا کیونکہ اس کے قدموں کے نیچے زمین مضبوط ہوتی ہے۔ اس
 میں کوئی زلزلہ نہیں آتا اور نہ اس کا کوئی حصہ زمین میں دھنسا ہے جبکہ اس کے ماحول کے دوسرے افراد ڈانواں ڈول،
 مضطرب، بے ثبات اور دولت یقین سے محروم ہوتے ہیں۔ نہ ان میں کوئی مضبوط کردار ہوتا ہے اور نہ وہ مشکلات
 برداشت کر سکتے ہیں۔ جس نے بھی حق سے تجاوز کر لیا اور ادھر ادھر ہو گیا، وہ پھسل گیا۔ اور ثبات و قرار سے محروم ہو
 گیا۔ اور اسے کبھی اطمینان نہ ہو گا۔ وہ ہر وقت شک، پریشانی اور بے چینی میں مبتلا رہے گا۔

پھر جو شخص سچائی کو چھوڑ دے تو ہر طرف سے خواہشات نفس کی آندھیاں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ میلانات و
 خواہشات، بدلتی ہوئی خواہشات، اسے کسی ایک جگہ نکلے نہیں دیتیں۔ حیران و پریشان، افاق و خیزاں کبھی ادھر دوڑتا ہے،
 کبھی ادھر بھاگتا ہے۔ جہاں کھڑا ہوتا ہے وہاں مطمئن نہیں ہوتا۔ پاگلوں کی طرح کبھی دائیں، کبھی بائیں، کبھی آگے کبھی پیچھے
 دوڑتا رہتا ہے۔ اس کے لیے کوئی جائے امن و قرار نہیں ہوتی۔

یہ ایک عجیب انداز بیان ہے کہ وہ ”امر مریج“ میں پھنسا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں جس میں الجھن ہو اور وہ فیصلہ نہ
 کر سکا ہو اور دائمی غلبان میں گرفتار ہو۔ انداز بیان ایسا ہے کہ ایسے شخص کی اندرونی کیفیات کو اس کی حرکات ظاہر کر رہی
 ہیں اور لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔

---○○○---

مضمون یہ چل رہا تھا کہ یہ لوگ بعث بعد الموت اور حشر و نشر کے قائل نہ تھے۔ اس کے لیے بتایا گیا تھا کہ اس کے لیے یہی ثبوت کافی ہے کہ اس کائنات کی بنیاد حق پر ہے جو اس کے اندر جما ہوا ہے اور پہاڑ کی طرح بلند نظر آتا ہے۔ لہذا اب یہاں اس کائنات کے اندر پائے جانے والے حق کے بعض مناظر پیش کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ذرا آسمانوں اور زمین پر غور کرو زمین کے اندر جسے ہوئے پہاڑوں کو دیکھو۔ آسمانوں سے برسنے والی بارشوں کو دیکھو، بلندیوں تک بڑھنے والے کھجور کے درختوں کو دیکھو، باغات و نباتات کو دیکھو، یہ سب حق کی علامات ہیں۔ جس طرح یہ چیزیں مستقل ہیں، حق بھی مستقل ہے۔ نہایت ہی خوبصورت انداز تعمیر میں سچائی کی یہ مثالیں۔

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ

فُرُوجٍ (۶:۵۰) ”اچھا تو کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بتایا اور آراستہ کیا، اور اس میں کہیں کوئی رخسہ نہیں ہے۔“

یہ آسمان اس کائنات کی کتاب کا ایک صفحہ ہے۔ یہ کتاب اس سچائی پر گواہ ہے جس کا یہ لوگ انکار کرتے ہیں۔ یہ دیکھتے نہیں کہ اس کائنات میں کس قدر بلندی، ثبات اور قرار ہے۔ اور پھر ان آسمانوں میں زیب و زینت اور کمال و جمال ہے اور ان کے نظام میں کوئی خلل اور کوئی اضطراب نہیں ہے۔ ثبات اور کمال و جمال آسمان کی صفت ہے اور یہ صفات یہاں انداز بیان کے اندر بھی ایک ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں کیونکہ حق میں بھی کمال و جمال اور ثبات و قرار ہوتا ہے۔ چنانچہ آسمانوں کے لیے جمعیت، خوبصورتی، دوام اور سوراخوں اور دراڑوں سے پاک ہونے کی صفات لائی گئی ہیں۔

---○○○---

ایسی ہی صفات زمین کے لیے استعمال ہوئی ہیں کیونکہ زمین بھی اس کائنات کی کتاب کا ایک ورق ہے۔ اور اسے بھی ثبات اور کمال و جمال اور قرار حاصل ہے۔ زمین کو آسمان کے بالقابل لایا گیا ہے۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ

بَهِيجٍ (۷:۵۰) ”اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اگائیں۔“

زمین کا بچھایا ہوا ہونا، پہاڑوں کا جما ہوا ہونا اور نباتات کا خوبصورت ہونا، تمام صفات کمال و جمال دکھانے والی چیزیں ہیں اور ہادی النظر میں یہ صفات نظر آتی ہیں۔ آسمان کی خوبصورت اور طویل و عریض تعمیر اور بھی ہوئی زمین اور بلند و بالا پہاڑوں کے مناظر دکھا کر ان لوگوں کے دل و دماغ کو ایک نکتے کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے۔

تَبْصِرَةً وَذِكْرًا لِكُلِّ عَبْدٍ مُنِيبٍ (۸:۵۰) ”یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور سبق

دینے والی ہیں ہر اس بندے کے لیے جو (حق کی طرف) رجوع کرنے والا ہو۔“

یہ بصیرت عطا کرنے والی باتیں ہیں۔ بصارت دینے والی باتیں ہیں اور دلوں کو قبولیت حق کے لیے کھولنے والی باتیں

ہیں۔ اس مطالعہ سے انسانی دماغ اور انسانی روح اس کائنات کے ساتھ جڑ جاتی ہے اور اس حکمت، ترتیب اور کمال تخلیق کو پالیتی ہے جو اس کے اندر موجود ہے اور پھر جن لوگوں کا دل اپنے معبود کی طرف مائل ہوتا ہے وہ اپنے رب کے کمالات کو دیکھ کر لوٹ جاتا ہے۔

یوں انسانی دماغ اور اس عظیم اور خوبصورت کائنات کے درمیان اتحاد و اتصال پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کتاب کائنات کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کائنات سے متعارف ہوتا ہے اور انسانی دل اور انسانی سوچ پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ اور انسانی زندگی پر یہ تعلق اور رابطہ اثر انداز ہوتا ہے اور یہ وہ رابطہ ہے جو قرآن سائنس اور معرفت الہی کے درمیان پیدا کرتا ہے۔ یعنی اس معرفت کے درمیان جو انسان رکھتا ہے اور اس حقیقت کے درمیان جو سائنس علم رکھتا ہے اور ہمارے دور میں علم کا جو سائنسی منہاج مروج ہے اس میں یہ حقیقت نہیں ہے یہ رابطہ نہیں ہے۔ یوں اللہ نے انسانوں اور اس کائنات کے درمیان جس کے اندر وہ رہتے ہیں ایک تعلق پیدا کیا تھا اور بدیدہ دور کے اہل علم اور سائنس دانوں نے یہ تعلق کاٹ دیا ہے۔ انسان اس کائنات کا حصہ ہے اور جب تک وہ اس کائنات کا ہدم نہیں ہو گا اس وقت تک اس کی زندگی نہ مستحکم ہو سکتی ہے نہ مستقیم۔ اور جب تک اس کے دل کی دھڑکن اور اس کائنات کی حرکت کے اندر ہم آہنگی نہ ہوگی، وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ستاروں اور سیاروں، آسمانوں اور فضاؤں، نباتات اور حیوانات اس کائنات اور اس کی دسعتوں کے اندر انسان جس قدر بھی نئی دریافت کرے۔ وہ دریافت دل سے ہم آہنگ ہو۔ اور انسان اس نئی دریافت کردہ دنیا کا دوست ہو اور اس طرح وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ انسان اور اس کائنات کا آخری خالق اور سبب اللہ تعالیٰ ہے۔ جب تک علم، دریافت اور معرفت کی آخری منزل، خالق کی منزل تک نہ پہنچ سکے اسے سمجھا جائے کہ وہ علم ناقص ہے۔ ایسی ہر تحقیق اور ایسی ہر تحقیق کا ہر نتیجہ بانجھ ہے، بے مقصد ہے اور انسان کے لیے غیر مفید ہے۔

یہ کائنات سچائی کی کھلی کتاب ہے جسے ہر زبان میں پڑھا جاتا ہے اور ہر ذریعہ سے اس کا ادراک کیا جاتا ہے۔ اسے ایک خیمے اور بھونپڑی کا باشندہ بھی پڑھ سکتا ہے اور نہایت ہی تعلیم یافتہ اور مہلات میں رہنے والا بھی پڑھ سکتا ہے۔ ہر شخص اپنے قوت اور اک کے مطابق اسے پڑھتا ہے۔ ”ہر کسے از عن خود شد یار من“ اسے اپنی صلاحیت کے مطابق اس کے اندر حق نظر آتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اس نیت سے پڑھ رہا ہو کہ وہ حق اور سچائی تک پہنچ جائے۔ یہ کتاب ہر حال میں قائم ہے اور ہر کسی کے سامنے کھلی ہے۔

تَبْصِرَةٌ وَذِكْرٌ لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ (۸:۵۰) ”یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور نصیحت دینے والی ہیں ہر اس شخص کے لیے جو سچائی کا متلاشی ہو“۔ لیکن جدید سائنسی علوم کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ اس سے یہ تہمید اور آنکھیں کھول دینے کی صلاحیت کو ختم کر دیا گیا ہے۔ انسان کے دل اور اس کی روح کا تعلق اس کائنات سے کاٹ دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ علم ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کے دل اندھے ہیں۔ اور ان کے سروں پر نام نہاد سائنسی انداز فکر سوار ہے۔ اور یہ سائنسی انداز یہ ہے کہ کائنات کا تعلق انسان کی روح سے کاٹ دیا جائے۔

لیکن کائنات کا ایمانی مطالعہ ان لوگوں کے نام، سائنسی انداز میں بہر حال کوئی کمی نہیں کرتا، بلکہ وہ اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ یہ کائنات حقائق ایک دوسرے سے بھی مربوط ہیں اور پھر یہ حقائق ایک حقیقت کبریٰ سے بھی مربوط ہیں اور ان حقائق کو

اس حقیقت کبریٰ سے مربوط کر کے پھر تمام حقائق کو انسانی ادراک اور انسانی شعور اور انسانی روح کے ساتھ یوں پیوست کرتا ہے کہ یہ انسان کو متاثر کریں۔ انسان کی زندگی کو متاثر کریں۔ یہ محض خشک معلومات ہی نہ ہوں جو ذہنوں میں دفن ہوں اور عملی زندگی میں ان کا کوئی مقصد نہ ہو بلکہ ان کو عملی زندگی پر ایمان کے راستے سے اثر انداز ہونا چاہئے اور ہماری تمام تحقیقات اور انکشافات کو ایمان کے راستے سے حقیقت کبریٰ سے جوڑ کر انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز ہونا چاہئے۔

اس طرح اس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانے کے بعد اب بحث اس کتاب کائنات کے اندر آگے بڑھتی ہے۔ پیش نظر یہی مضمون ہے کہ موت کے بعد حشر و نشر ہو گا اور حساب و کتاب ہو گا۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جِبْتٍ وَحَبِّ

الْحَصِيدِ ﴿١٥﴾ وَالتَّخْلُ بِسُقْتِ لَهَا طَلْعُ نَضِيدٍ ﴿١٦﴾ رِزْقًا لِلْعِبَادِ ﴿١٧﴾ وَأَحْيَيْنَا بِهِ

بَلَدَةً مَيِّتًا ﴿١٨﴾ كَذَلِكَ الْخُرُوجُ ﴿١٩﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ ﴿٢٠﴾ وَأَصْحَابُ الرَّسِّ

وَشَمُودُ ﴿٢١﴾ وَعَادُ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ ﴿٢٢﴾ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ

تُبَعٍ ﴿٢٣﴾ كُلُّ كَذَّابٍ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ ﴿٢٤﴾ أَنْفَعِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ

۱۵ اَعْرِضْ فِي كَيْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿٢٥﴾

۱۵ اور آسمان سے ہم نے برکت والا پانی نازل کیا پھر اس سے باغ اور فصل کے غنے اور بلند و بالا کجور کے درخت پیدا کر دیئے جن پر پھوس سے مدے ہوئے خوشے تھے یہ دیکھتے ہیں۔ یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا۔ اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں۔ (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے) نکلتا بھی اسی طرح ہو گا۔ ان سے پہلے نوح کی قوم اور اصحاب الرس اور شمرد اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائی اور ایکہ والے اور تبع کی قوم کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہو گئی۔ کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔“

آسمانوں سے جو پانی نازل ہوتا ہے وہ مردہ زمین کو زندہ کرنے سے بھی پہلے مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے اور اس کا نزول ہی دلوں پر بہت ہی اچھا اثر ڈالتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ چھوٹے بچے ہی بارش سے خوش ہوتے ہیں اور اس کے لیے ددڑتے ہیں اس میں اچھوتے کودتے ہیں بلکہ معمر لوگ جن کے اندر احساس جمال ہو وہ بھی بارش کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور ان کے دل بھی بارش میں خوش محسوس کرتے ہیں۔ بچے تو ہوتے ہی چھوٹے ہیں۔

یہاں بارش کے پانی کو ماء مبارک کہا گیا ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مختلف قسم کے پھلوں کے باغات اور کھیتیں والی کھیتیاں تیار فرماتا ہے اور اسی کے ذریعہ کجوروں کے لوسچے درخت اور ان کے پخت پھلوں اور خوبصورت درختوں کو اگایا جاتا ہے۔

وَالنَّحْلُ بَسَقَتْ لَهَا طَلْعَ نَضِيدٍ (۵۰: ۱۰) ”بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیئے ہیں جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے بہ بہ لگتے ہیں۔“ خوشوں کے لیے بہ بہ کی صفت مانی گئی۔ اس سے بلند و بالا درخت کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس کے اوپر بہ بہ خوشے لگے ہوئے نظر آئیں۔ مضمون اور معنی کے اعتبار سے بھی یہ الفاظ مناسب ہیں کیونکہ بات حق و سچائی کی ہو رہی ہے۔ حق بلند و بالا بھی ہوتا ہے اور خوبصورت بھی اور اس کا بول بھی بالا ہونا چاہئے۔

۰ اور انسان پر یہ سرانیاں کر کے ’اسانی دل کے اندر ممنونیت پیدا کی جا رہی ہے کہ دیکھو یہ شفاف پانی‘ یہ باغ و ریح ’یہ کھیت اور حیوانات اور یہ آسمانوں سے باتیں کرنے والے پھلوں سے لدے کھجور کے درخت‘ یہ سب کچھ۔

رَزَقًا لِلْعَاد (۵۰: ۱۱) ”یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا۔“ اس رزق کے اسباب اللہ کہاں سے چلا کر لاتا ہے۔ پھر نباتات اگاتا ہے ’پھر ثمرات لگاتا ہے‘ یہ سب کچھ بندوں کے لیے۔ اور اللہ ہی صحیح آقا ہے اور اس کا پورا پورا شکر ادا کرنے کی قدرت ہی یہ بندے نہیں رکھتے۔

اور اب یہ کہ یہ پوری کائنات اس ہدف کی طرف بڑھ رہی ہے۔

وَ أَحْيَيْنَا بِهِ نَفْسًا كَذَلِكَ الْخُرُوجُ (۵۰: ۱۱) ”اور اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے نکلنا بھی اسی طرح ہو گا)۔ یہ عمل تمہارے ماحول میں رات دن دہرایا جا رہا ہے‘ تم اس کے عادی ہو گئے ہو۔ دیکھتے ہو لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے اور پھر بھی تم اعتراض کرتے ہو۔ اگر تم غور کرتے تو تمہیں اپنا اعتراض عجیب لگتا۔ جس طرح موجودہ زمین پر لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ اسی سہولت سے دوبارہ اٹھا لیے جائیں گے۔ قرآن کا انداز کیا ہی شاندار ہے۔ پہلے دلائل دے کر بعد دعویٰ کہ کائنات سے مختلف قسم کے دلائل اور موثرات کی ایک طویل فہرست دے کر آخر میں کہتا ہے کہ ”یوں“۔ اور اس انداز سے انسان بہت متاثر ہوتا ہے۔

--- ○ ○ ○ ---

اب انسانی تاریخ کے طویل ریکارڈ سے کچھ عبرتیں اور نصیحتیں ’اس سے قبل پورے دلائل دیئے گئے تھے وہ اس کائنات کی کھلی کتاب سے تھے۔ اب کتاب تاریخ کے اوراق الٹئے! اور دیکھئے کہ جن لوگوں نے آخرت کی جوابدہی کا انکار کیا ان کا انجام کیا ہوا۔ اپنے رویے پر ذرا غور کرو۔ انہوں نے بھی اسی طرح تکذیب کی جس طرح تم کر رہے ہو اور ان پر جو عذاب آیا کیا تم پر ایسا عذاب نہیں آ سکتا؟

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَ أَصْحَابُ الرُّسِّ وَ ثَمُودُ (۱۲) وَ عَادٌ وَ فِرْعَوْنُ
وَ إِخْوَانُ لُوطٍ (۱۳) وَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَ قَوْمُ ثَبَعٍ كُلُّ كَذَّابٍ الرُّسُلَ فَحَقَّ
وَعِيدُ (۱۴) أَفَعَيَيْنَا بِالْحَلْقِ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ (۵۰: ۱۲ تا ۱۴)

”ان سے پہلے نوح کی قوم، اور اصحاب الرس اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائی اور ایکہ والے اور تبع کی قوم کے لوگ بھی جھنڈ چکے ہیں۔ ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہو گئی۔ کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔“

رس نے معنی میں کنواں وہ کنواں جس کا من پتھروں سے بنا ہوا ہو اور ایکہ کے معنی ہیں درختوں کا جھنڈ۔ اصحاب ایکہ غان قوم شعیب ہے۔ اصحاب الرس کی تفصیلات قرآن میں وارد نہیں ہیں۔ تبع حیري بادشاہوں کا لقب ہے۔ اور باقی اقوام جن کی طرف اشارہ کیا ہے وہ مشہور ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں اس سرسری اشارے سے مقصد ان اقوام کی تفصیلات دینا نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ بیان کرنا ہے کہ ان کو ہر ایک کیا گیا۔ جب انہوں نے رب العالمین کے رسولوں کی تکذیب کی۔ قابل توجہ یہ فقرہ ہے۔

كُلُّ كَذَّابٍ الرَّسُلَ فَحَقَّ وَعَيْدُ (۱۴:۵۰) ”ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہو گئی۔“ اس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ رسول بھی ایک ہیں۔ ان کے منصب کی نوعیت بھی ایک ہے اور ان کا مشن بھی ایک رہا ہے حالانکہ سب کے سب نے رسولوں کو نہ جھٹلایا تھا۔ بلکہ ایک رسول کو جھٹلایا لیکن ایک رسول کو نشانہ بھی دراصل سب کو جھٹلانا ہے۔ رسول سب بھائی ہیں اور رسالت ایک ہی شجرہ نسب ہے جس کی جڑیں دور تک تاریخ میں جلی گئی ہیں۔ اور اس شجرہ کی ہر شاخ دراصل اس کی خصوصیات کی تلخیص ہے۔ اور اس کی ایک صورت ہے اور جس سے ایک شاخ کو چھوٹا دیا اس نے پورے سلسلے کو پکڑ لیا۔ فحق وعید (۱۴:۵۰) ”پس ان پر میری وعید نازل ہو گئی۔“ جس کی تفصیلات سامعین کو معلوم ہیں۔

ان اقوام پر عذاب الہی تکذیب کی وجہ سے آیا اور تکذیب انہوں نے قیامت کی ہی تھی۔ تو اللہ کا سوال۔

فَعَيَّنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ (۱۵:۵۰) ”کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے۔“ یعنی ان کے سامنے کیا یہ شہادت موجود نہ تھی تخلیق چونکہ موجود تھی اس لیے جواب نہ دیا۔

سُئِلَ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ (۱۵:۵۰) ”بلکہ ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے تھے۔“ یہ دیکھتے نہ تھے کہ ان کے سامنے یہ کس موجود ہے۔ شہادت موجود ہے لہذا ان کا علاج ہی یہی تھا جو ہوا۔

درس نمبر ۸۲۲ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا دوسرا سبق ہے۔ اس میں بھی بعث بعد الموت کی بحث ہے جس طرح پہلے حصے کا موضوع بھی یہی تھا۔ تکذیب کرنے والوں کے سامنے کچھ مزید موثر دلائل رکھے گئے ہیں۔ لیکن یہ دلائل ذرا دھمکی آمیز انداز میں ہیں اور خوفناک مناظر پر مشتمل ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے جس طرح سورت کے آغاز میں تھا۔ پھر سکرات موت کا ذکر ہے، پھر حساب و کتاب اور ہر کسی کے اعمال نامے کی پیشی کا ذکر ہے اور پھر جہنم کا منہ کھلا ہو گا اور جب بھی اس میں اس کی انسانی خوراک کی کوئی قسط بھیجی جائے گی تو وہ منہ چاٹ کر اور اسے چکھ کر کھے گی۔

هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ (۵۰ : ۳۰) ”کیا اور بھی ہے“۔ غرض یہ ایک ہی سفر ہے، پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ موت کے سکرات سے گزرتا ہے اور حساب و کتاب پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہ زندگی کا طویل سفر ہے، باہم متصل اور مربوط۔ اور اس منظر میں اسے مسلسل کڑیوں کی شکل میں قلم بند کیا گیا ہے جس کے اندر کوئی کڑی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہے۔ نہ کوئی کسی کڑی یا مرتبے سے بچ کر نکل سکتا ہے۔ اور انسان اس سفر کے آغاز سے انتہا تک اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ کسی جگہ یا مرحلے میں وہ اللہ سے آزاد نہیں ہے۔ ہر وقت اللہ کی نگرانی میں ہے۔ اس سورت میں اس سفر کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ خوفناک بھی ہے اور حیران کن بھی کہ ایک انسان اللہ قہر و جبر کے قبضہ قدرت میں سفر کے مراحل طے کر رہا ہے، وہ اللہ جو دونوں کے تمام بھیدوں کو جاننے والا ہے۔ انسان کیا کر سکتا ہے جب اسے بلانے والا وحدہ لا شریک ہے، نہ بھولتا ہے، نہ سوتا ہے اور نہ کسی چیز سے غافل رہتا ہے۔ انسان تو اس وقت بھی بے حد ہراساں ہو جاتا ہے جب اسے احساس ہو کہ اس کے پیچھے کسی ارضی حکومت کی سی آئی ڈی لگی ہوئی ہے۔ زمین والوں کی حکومت کیا ہوگی اور ان کے جاسوس کیا ہوں گے۔ اگر کوئی خفیہ پولیس نگری کر بھی رہی ہے تو انسان کی ظاہری حرکت کی نگرانی کر رہی ہے۔ وہ اس پولیس سے گھر میں چھپ جاتا ہے جب وہ اپنے گھر کے اندر آکر اپنے پیچھے دروازہ بند کرے یا وہ اپنا منہ بند کر دے اور منہ سے لفظ تک نہ نکالے۔ لیکن اللہ جبار و قہار کی نگرانی بڑی سخت ہے۔ انسان جہاں بھی ہو، جس حال میں بھی ہو اس کے کارندے ہر وقت لکھ رہے ہیں اور وہ دلوں کے بھیدوں تک کو جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی نگرانی کڑی نگرانی ہے۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۸۲۲ تشریح آیات

۱۶۔۔۔ تا۔۔۔ ۳۵

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَ
نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۚ إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّينَ عَنِ الْيَمِينِ
وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۚ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۚ وَ
جَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ ۚ

”ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے دوسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں“ (اور ہمارے اس براہ راست علم کے علاوہ) دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی غلط اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضرہائے نگران موجود نہ ہو۔ پھر دیکھو وہ موت کی جان کنی حق لے کر آپہنچی یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔“

آیت کے آغاز میں ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ (۵۰: ۱۶) ”ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے۔“ یہاں اس عبارت کے ایک ضمنی مفہوم کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ یہ کہ کسی بھی چیز مشینری یا آلے کا بنانے والا اس کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کا خالق نہیں ہوتا کیونکہ آلات اور مشینری کا مادہ تو اس نے نہیں بنایا اور اس کی تشکیل اور ترکیب میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا۔ جبکہ اللہ خالق بھی ہے موجد بھی اور انسان کو جوڑنے والا بھی ہے۔ یہ آغاز سے انتہا تک اللہ کے دست قدرت سے نکلا ہوا ہے۔ اس لیے اللہ اس کی حقیقت اور اس کے اسرار و رموز سے خوب واقف ہے۔ اس کے ماضی، حال اور آئندہ سے وہ آگاہ ہے۔

وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ (۵۰: ۱۶) ”اور اس کے دل میں ابھرنے والے دوسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔“ یوں انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر چیز اللہ کے سامنے ظاہر ہے۔ اس کے اور خالق کے درمیان پردہ نہیں ہے۔ اس کے دل کی خفیہ ترین امنگوں سے بھی خالق واقف ہے۔ اور یوم الحساب کے لیے تو ہر طرح کی تیاری

ہو رہی ہے جس کا وہ منکر ہے۔

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۵۰: ۱۶) ”اور ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔“ اس شے رگ سے جس میں اس کا خون دوڑ رہا ہے۔ یہ اللہ کے قبضہ ملکیت کی ایک تصویر ہے۔ اور اللہ کی براہ راست نگرانی ہے۔ جب انسان اس حقیقت کا تصور کرتا ہے تو اس کا رول رول کانپ اٹھتا ہے۔ اگر انسان صرف اسی آیت کے مفہوم کو مستحضر رکھے تو وہ کبھی ایسی بات نہ کرے جس سے اللہ ناراض ہو بلکہ انسان طویل پسندیدہ خیالات کو اپنے دل ہی میں نہ لائے۔ صرف یہی آیت اس بات کے لیے کافی ہے کہ انسان ہر وقت محتاط رہے، ہر وقت خائف رہے اور ہر وقت حساب و کتاب کے لیے بیدار رہے۔ قرآن کریم مزید اس نگرانی کی تشریح یوں کرتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی، ہر حرکت، سونا، کھانا، پینا، خاموش رہنا، بات کرنا، غرض سفر زندگی پورے کا پورا دو فرشتوں کے درمیان کٹ رہا ہے۔ یہ فرشتے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ اس کے ہر لفظ کو اس کے منہ سے نکلتے ہی ریکارڈ کر لیتے ہیں۔

إِذْ يَتَلَفَّى الْمُتَلَفِّينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ (۵۰: ۱۷) مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ

أَلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (۵۰: ۱۸) ”دو کتاب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں۔ ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔“ یعنی جو نگران ہے وہ حاضر باش ہے۔ یعنی عید رقیب کی صفت ہے۔ یہ مفہوم نہیں ہے جس طرح ذہن میں آتا ہے کہ دو نگرانوں میں سے ایک کا نام رقیب ہے اور دوسرے کا عید ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح ریکارڈ کرتے ہیں؟ اس سلسلے میں انسان کو اپنے تعیلات پیش نہ کرنا چاہئے۔ یہ فیسی امور ہیں اور ان کو اسی طرح قبول کرنا چاہئے جس طرح قرآن میں مذکور ہیں۔ مفہوم پر ہمارا ایمان ہے اور کیفیت کا ہمیں پتہ نہیں ہے۔ اگر کیفیت کا پتہ لگ بھی جائے تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پھر بعض کیفیات ہمارے تجربات کے دائرے ہی میں نہیں ہوتیں اور ہم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

آج دور جدید میں ریکارڈنگ کے وہ طریقے ہم نے دیکھ لیے ہیں جن کا تصور بھی ہمارے آہ و واجہ اد نہ کر سکتے تھے۔ ان طریقوں سے انسان کی ہر حرکت اور ہر غلط ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ آڈیو، وڈیو، ٹیپ، سینما کی ریل، اور ٹیلی ویژن کے ٹیپ (اور اب کمپیوٹر اور اس کا نیٹ ورک) یہ تو وسعت آگئی ہے انسانی دائرہ ریکارڈ میں۔ جہاں اللہ اور اس کے عملے کا تعلق ہے تو ان کے پاس ایسے ذرائع اور ایسے طریقے ہو سکتے ہیں جن کا ہم ابھی تک تصور ہی نہیں کر سکتے۔ بس اللہ نے جو اطلاع کر دی ہے اس پر یقین کرو۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اس حقیقت کے دائرے کے اندر زندہ رہیں جس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ اور اس شعور کو تازہ کریں کہ ہم جو بات بھی کرتے ہیں جس فعل کا لکھنا بھی کرتے ہیں۔ ہمارے دائیں بائیں اللہ کے کارندے بیٹھے ہوئے ہیں اور لکھ رہے ہیں تاکہ یہ ریکارڈ قیامت میں ہمارے خلاف پیش ہو یا ہمارے حق میں پیش ہو۔ اور یہ حساب ایسا ہے کہ اس سے کوئی بات نہیں چھوٹی۔

اور میں چاہئے کہ اس حقیقت کو ذہن میں تازہ رکھتے ہوئے زندگی بسر کریں۔ بس یہی ہمارے لیے کافی ہے اس کی کیفیت ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو۔ جس شکل و صورت میں بھی ہو یہ ریکارڈ تیار ہو رہا ہے۔ اور ہم کسی طرح اس سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ اللہ نے پیشی اطلاع ہمیں دے دی ہے تاکہ ہم اس کا خیال رکھیں۔ رہی یہ بات کہ اس کی کیفیت کیا ہے تو یہ ایک عبث جدوجہد ہوگی۔ جن لوگوں نے اس قرآن اور اس کے حقائق اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات سے فائدہ اٹھایا، ان کا انداز اور طریقہ یہی تھا کہ شعور کو پختہ کر د اور عمل کو فقط۔

امام احمد نے روایت کی 'ابو معاویہ سے' انہوں نے محمد ابن عمر ابن علقمہ لیسے سے انہوں نے اپنے والد سے 'انہوں نے ان کے دادا سے اور انہوں نے حضرت بلال ابن حارث مزی سے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک آدمی ایک لفظ بولتا ہے جو اللہ کی رضامندی کا لفظ ہوتا ہے۔ اسے یہ یقین نہیں ہوتا کہ اس لفظ پر اللہ اس سے اپنی رضامندی لکھ دیتا ہے قیامت۔ اور ایک دوسرا شخص ایک لفظ بولتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب ہوتا ہے اور اس کو یقین نہیں ہوتا کہ یہ لفظ کہیں تک پہنچ گیا۔ اللہ قیامت تک اس شخص سے ناراضگی لکھ دیتا ہے" کہتے ہیں کہ علقمہ کہا کرتے تھے کہ کتنی ایسی باتیں ہیں جن کے کہنے سے میں بلال ابن حارث کی حدیث کی وجہ سے رک گیا۔ (ترمذی 'نسائی' ابن ماجہ)۔

امام احمد سے روایت ہے کہ وہ سکرات الموت میں فریاد کر رہے تھے انہوں نے سنا کہ یہ فریاد بھی لکھی جا رہی ہے تو خاموش ہو گئے اور ان کی روح پرواز کر گئی۔ یوں یہ حضرات قرآنی ہدایات کو لیتے تھے۔ اور یوں تھی ان کی زندگی۔

---○○○---

یہ تو ہیں کتاب زندگی کے صفحات اور آخری صفحہ اس دنیا کی زندگی کا اٹھایا جا رہا ہے۔

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ (۱۹:۵۰) "پھر دیکھو وہ موت کی جان کنی حق لے کر آپہنچی 'یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا'۔ موت وہ حقیقت ہے جس سے اللہ کی تمام مخلوقات زرتی ہے۔ اور ہر شخص موت کا تصور اپنے ذہن سے محو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہے۔ موت ایک ایسا طلبکار ہے جو مطالبے سے ٹھکتا نہیں۔ یہ اپنی رفتار سے انسان کے قریب ہوتی رہتی ہے۔ اور اس کے قدموں کی رفتار بھی سست نہیں پڑتی۔ اور اس کے مقررہ وقت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی۔ موت کے آخری لمحات جنہیں سکرات الموت کہا جاتا ہے۔ اس کے تصور ہی سے انسان کے اعضا کانپ اٹھتے ہیں۔ یہ موت کا منظر اسکرین پر ابھی پیش ہو رہا ہے کہ سوال ہوتا ہے۔

ذَلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ (۱۹:۵۰) "یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا"۔ انسان ابھی تک تو زندہ ہے اس دنیا میں ہے لیکن وہ اس سوال کو سن رہا ہے۔ لیکن جب وہ حقیقتاً جان کنی کے لمحات میں ہو گا اور اس وقت وہ یہ سوال سنے گا تو حالت کیا ہوگی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آپ پر سکرات الموت طاری ہوئے تو آپ اپنے چہرہ مبارک سے ہینہ پرچھ رہے تھے اور فرماتے تھے۔

"سبحان اللہ فی الواقعہ جان کنی کے لمحات ہوتے ہیں"۔ آپ یہ کہہ رہے تھے حالانکہ آپ رفیق الاعلیٰ کی طرف

رواں تھے اور اللہ کے لقاء کے مشتاق تھے وہ سروں کی حالت کیا ہوگی؟
یہاں آیت میں ایک لفظ قابل توجہ ہے۔

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ (۱۹:۵۰) ”لور موت کی جاں کنی حق لے کر آ پئی۔“
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب آخری لمحات میں ہوتا ہے تو اسے عالم آخرت نظر آ جاتا ہے۔ تمام تجربات ہت جاتے ہیں اب یہ جن باتوں سے جاہل تھا وہ اسے معلوم ہو جاتی ہیں۔ وہ بھی اس کے سامنے آ جاتی ہیں جن کا وہ انکار کیا کرتا تھا۔ لیکن اب تو وقت گزر جاتا ہے۔ اب دیکھنا تو مفید نہیں رہتا۔ اب علم و فضل اور حق کا ادراک کس کام کا! کیونکہ اب توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ ایمان لانا اب مفید نہیں ہے۔ یہ وہ سچائی تھی جس کی وہ تکذیب کرتے تھے اور اس کے بارے میں سخت غلبان میں تھے۔ اب جبکہ انہوں نے اسے پالیا ہے اور تصدیق کر رہے ہیں تو یہ ادراک اور تصدیق ان کے کسی کام کی نہیں ہے۔

--- ۰۰۰ ---

اب سکرۃ الموت سے ذرا آگے مہمانِ حشر میں حساب و کتاب کی ہونا کیاں!

وَنُفَعِرُ فِي الصُّورِ ذٰلِكَ يَوْمَ الْوَعِيدِ ۝ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَاقِبٌ ۝ وَ شَهِيدٌ ۝ لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ۝ وَقَالَ قَرِينُهُ هٰذَا مَا لَدَيَّ عِتِيدٌ ۝ اَلْقِيََا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ۝ مَّتَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ ۝ مُّرِيبٍ ۝ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۝ فَالْقِيَٰةُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ ۝ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَّلٰكِنْ كَانَ فِي صُلٰى بَعِيْدٍ ۝ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَاَقْدَمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعْدِ ۝

۱۴ مَا يَبْدُلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا اَنَا بِظَلّٰمٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

۱۶ ”لور پھر صور پھونکا گیا“ یہ ہے وہ دن جس کا تجھے خوف دلایا جاتا تھا۔ ہر شخص اس حال میں آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ اس چیز کی طرف تو غفلت میں تھا، ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا لور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے۔ اس کے ساتھی نے عرض کیا یہ جو میری سپردگی میں تھا، حاضر ہے۔ حکم دیا گیا پھینک دو جہنم میں ہر کئے کافر کو جو حق سے عناد رکھتا تھا، خیر کو روکنے والا لور حد سے تجاوز کرنے والا تھا، شک میں پڑا ہوا تھا اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا بنائے بیٹھا تھا۔ دہل و داسے سخت عذاب میں۔ اس کے ساتھی نے عرض کیا ”خداوند! میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔ جواب میں ارشاد ہوا

”میرے حضور جھکنا نہ کرو! میں تم کو پہلے ہی انجامِ بد سے خبردار کر چکا تھا۔ میرے ہاں بات چلی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں ہوں۔“

یہ ایک ایسا منظر ہے کہ اس کا ذہن میں تازہ کرنا ہی کافی ہے۔ اگر یہ تازہ کر لیا جائے تو اس زمین کی پوری زندگی احتیاط، ڈر اور انتظار میں کٹ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کس طرح پیش کر سکتا ہوں جب کہ سینک والے نے سینک منہ کے ساتھ لگایا ہوا ہے اور اپنے ماتھے کو جھکایا ہوا اور انتظار میں ہے کہ اسے حکم دیا جائے۔ صحابہ کرامؓ نے فرمایا پس ہم کیا کہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ”کو۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل“۔ (ترمذی)

وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَنَهِيْدٌ (۵۰: ۲۱) ”ہر شخص اس حال میں آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر مانے والا ہے اور ایک گوانی دینے والا۔“ وہ آیا وہ جس کا حسب کیا جا رہا ہے، نجات مزا ہونے والی ہے۔ ایک چلا کر لانے والا ہے اور ایک شہرت دینے والا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں لکھنے والے اور دنیا میں اس کی حفاظت کرنے والے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اور فرشتے ہوں۔ لیکن پہلی تفسیر رائج ہے۔ عدالت میں پیشی کا یہ بہترین طریقہ ہے لیکن یہ اللہ جبار کی عدالت ہے۔ ایسے مشکل وقت میں اسے یہ کہہ جائے گا۔

لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ

مَحْدِيْدٌ (۵۰: ۲۲) ”اس چیز کی طرف سے تو غفلت میں تھا۔ ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے۔“ آج تیری نظر بڑی تیز ہے اور پردوں کو پار کر کے بھی دیکھ رہا ہے۔ کام کرنے کی جگہ میں تو نے غفلت برتی۔ تو نے اس وقت کا خیال ہی نہ رکھا۔ یہ ہے وہ انجام جس کی تو توقع ہی نہ رکھتا تھا۔ آج دیکھتا جاتا۔ آج تیری نظر تیز ہے۔

اب اس کا ساتھی آگے بڑھتا ہے۔ رائج یہ ہے کہ یہ وہ گواہ ہے جس کے پاس اس کا احوال نامہ ہے۔

وَقَالَ قَرِينُهُ هَذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ (۵۰: ۲۳) ”اس کے ساتھی نے عرض کیا: یہ جو میری سپردگی میں تھا حاضر ہے تیار۔“ عتید کے معنی ہیں حاضر، تیار۔ یعنی اب کوئی نئی چیز تیار نہیں کرنی ہے پہلے سے تیار ہے۔ یہاں اب اس ریکارڈ کو پڑھا میں جاتا ہے پس عدالت سے جلدی کے ساتھ ڈگری صادر ہوتی ہے اور نائد ہوتی ہے۔ فوراً بارگاہ رب العزت سے اس سابق اور شہید کو حکم دیا جاتا ہے۔

الْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ (۵۰: ۲۴) مِّنَ اللَّخْبِرِ مُعْتَدٍ

مُرِيْبٍ (۵۰: ۲۵) الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَالْقِيَةُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ (۵۰: ۲۶)

”وہ حکم دیا گیا، پھینک دو جہنم میں ہر کئے کافر کو جو حق سے عناد رکھتے تھے۔ خیر کو روکنے والا اور حد سے تجاوز کرنے والا، شک میں پڑا ہوا تھا اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو خدا بنائے بیٹھا تھا“ ڈال دو اسے سخت عذاب میں۔“

ان صفات کے ذکر سے اس مشکل وقت کی مشکلات میں گرفتار لوگوں کے خوف و ہراس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے سے مشکل میں گرفتار مجرموں پر اللہ جبار و قہار کے غضب کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام صفات اس بات کی مستحق ہیں کہ مجرم کو زیادہ سے زیادہ سزا دی جائے۔ سخت کافر، عناد رکھنے والا ہر بھلائی سے روکنے والا، ہر معاملے میں حد سے گزرنے والا اور غایت درجے کا شکی جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے الہ بنارکھے ہیں اور ان صفات کو گنوانے کے بعد پھر تاکید امر فآلِقِیْہِ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ (۵۰: ۲۶) ”ڈال دو اسے سخت عذاب میں“ جہنم کے عذاب میں جو شدید ہی ہو گا۔

اس مقام پر اس شخص کے ساتھی بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور کانپ اٹھتے ہیں اور جلدی بے اپنے بارے میں کسی الزام کے سائے کو رد کرتے ہیں، محض اس بنا پر کہ یہ اس جہنمی کا ساتھی تھا۔

قَالَ قَرِیْنُهُ رَبَّنَا مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَکِنْ کَانَ فِی ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ (۵۰: ۲۷) ”اس کے ساتھی نے عرض کیا خداوند! میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود ہی پرے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔“ ہو سکتا ہے کہ یہ ساتھی وہ نہ ہو جس کا ذکر پہلے ہوا۔ جس نے اس مجرم کے کاغذات پیش کیے۔ بلکہ اس سے مراد وہ شیطان ہو جو اس کے ساتھ اسے گمراہ کرنے کے لیے لگا ہوا تھا۔ اور اب وہ یہاں اپنے آپ کو بری الذمہ کرنے میں لگا ہوا ہے اور پورے قرآن مجید میں ایسے مشابہ اور مکالمے موجود ہیں جن میں گمراہ کرنے والے شیاطین اپنی برات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسا کہ یہاں ہے لہذا یہ بھی بعید از امکان نہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ قرین سے مراد اعمال نامہ تیار کرنے والا فرشتہ ہو اور اس ہولناک احکام الہی سے ڈر گیا ہو اور اپنی برات کا انحصار کر رہا ہو اور یہ بیان کر رہا ہو کہ بے شک میں تو اس بد بخت کا ساتھی تھا، لیکن اس کی گمراہی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے، اس طرح اس بری الذمہ شخص کا اپنی برات ظاہر کرنا، اس بات پر دلالت ہوگی کہ اس خوفناک اور کرہناک منظر کو دیکھ کر فرشتے ساتھی نے یہ کہا۔^(۱)

غرض اب آخری حکم آ جاتا ہے اور بات ختم ہو جاتی ہے :

قَالَ لَمَّا تَخْتَصِمُوْا اِلٰیَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمْ بِالْوَعِیْدِ (۵۰: ۲۸) مَا یُبَدِّلُ الْقَوْلُ

لَدٰی وَمَا اَنَا بِظَلٰمٍ لِّلْعَبِیْدِ (۵۰: ۲۹) ”ارشاد ہو گا، میرے حضور جھڑانہ کرو میں تم کو پہلے ہی انجام بد سے خبردار کر چکا تھا۔“ میرے ہاں بات بٹنی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں ہوں۔“ لہذا یہ جھگڑنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس سے قبل تمہیں بار بار خبردار کر دیا گیا تھا کہ ہر عمل پر جزاء و سزا ملے گی، تمام اعمال لکھ دیئے

(۱) اس دوسری توجیہ سے اگلا فقرہ مانع ہے ”میرے حضور جھڑانہ کرو“ نیز فرشتہ کس طرح یہ سوچ سکتا ہے کہ میں ظلمی میں نہ پکڑا جاؤں۔ (مترجم)

گئے ہیں۔ اب ان کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ ہر کسی کو اس کے اعمال نامے کے مطابق بدلہ ملے گا۔ کسی پر عمنہ ہو گا کیونکہ جزا دینے والا حاکم عادل ہے۔۔۔
اس پر حساب و ترتیب کا یہ منظر اپنی تمام ہولناکیوں اور شدت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن ابھی یہ بحث ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کا ایک خوفناک پہلو بھی باقی ہے۔

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ ﴿۵۰﴾ وَانْزِلَتْ
الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴿۵۱﴾ هَذَا مَا تُوْعَدُونَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴿۵۲﴾ مَنْ خَشِيَ
الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ ﴿۵۳﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ذَلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ﴿۵۴﴾
لَكُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴿۵۵﴾

”وہ دن جبکہ ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ ہے؟ اور جنت متقین کے قریب لے آئی جائے گی کچھ بھی دور نہ ہوگی۔ ارشاد ہو گا ”یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ہر اس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا جو بے دیکھے رخصت سے ذرا تھا اور جو دس گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے۔ داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ۔“ وہ دن حیات ابدی کا دن ہو گا۔ وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ان کے لیے ہے۔“

یہ پورا منظر ہی سوال و جواب کا منظر ہے، یہاں مکالمے کے لیے جہنم کو پیش کیا جاتا، یوں یہ عجیب و غریب اور خوفناک منظر ہے۔ تمام کفار معاند، بھلائی سے روکنے والے، حد سے گزرنے والے اور قیامت میں شک کرنے والے موجود ہیں۔ یہ سب جہنم میں کثرت سے پہنچنے جا رہے ہیں اور جہنم میں ان کے ذخیر لگ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جہنم سے کہا جاتا ہے کہ کیا تم بھر گئی ہو اور کیا یہ لوگ تمہارے لیے کافی ہیں لیکن وہ بڑی سختی سے جوش میں آکر اور جلتے ہوئے کہے گی۔

هَلْ مِنْ مَزِيدٍ (۵۰: ۳۰) (کیا اور کچھ ہے؟) اس طرح جس طرح بھوکا خونخوار منہ کھولے ہوئے کوئی درندہ ہوتا ہے۔ کیا ہی خوفناک منظر ہے یہ!

---۰۰۰---

اور دوسری طرف ایک دوسرا خوبصورت منظر ہے، پر محبت، جس میں ہر کوئی راضی ہے، سب متقی ایک جگہ جمع ہیں، جنت ان کے قریب کر دی گئی ہے اور ہر طرف سے مرحبا مرحبا کی صدائیں ہیں۔

وَانْزِلَتْ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ (۳۱) هَذَا مَا تُوْعَدُونَ لِكُلِّ اَوَّابٍ
حَفِيظٍ (۳۲) مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ (۳۳) ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ

ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ (۳۴) لَهُمْ مَا يَشَاءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (۵۰: ۳۱ تا ۳۵) ”اور جنت متین کے قریب لے آئی جائے گی، کچھ بھی دور نہ ہوگی۔ ارشاد ہو گا ”یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا“ ہر اس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا، جو بے دیکھے رحمن سے ڈرتا تھا اور جو دل گردیدہ لیے ہوئے آیا ہے۔ داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ۔ وہ دن حیات ابدی کا دن ہو گا۔ وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ان کے لیے ہے۔“

اس منظر کے مکالمات میں ہر کلمے میں حکیم اور عزت افزائی ہے۔ جنت کو اہل ایمان کے قریب کر دیا جاتا ہے۔ لہذا اس تک پہنچنے کے لیے ان کو کوئی سفر نہیں کرنا پڑتا بلکہ جنت ان کے چل کر آتی ہے ان کے قدموں میں۔

غِيْرَ بَعِيْدٍ (۵۰: ۳۱) ”کچھ دور نہ ہوگی۔“ اور دوسری نعمتوں کے علاوہ اللہ کی رضامندی ہوگی اور کہ جائے گا۔

هٰذَا مَا تُوعِدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ (۵۰: ۳۲) مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ الْغَيْْبَ

وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ (۵۰: ۳۳) ”یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہر اس شخص کے لیے جو رجوع کرنے والا اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا، جو بے دیکھے رحمن سے ڈرتا تھا اور جو دل گردیدہ لیے ہوئے آیا ہے۔“ تو عالم بالا سے ان کی یہ تعریف کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اللہ کے پیانے کے مطابق یہ اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں اور اپنے نفس کی پوری طرح حفاظت کرتے ہیں یہ رحمان سے ڈرنے والے ہیں اور انہوں نے اسے کبھی دیکھا نہ تھا۔ اللہ کی طرف ان کے دل لگے ہوئے ہیں اور وہ اس کے مطیع فرمان ہیں۔

اس کے بعد اعلان ہوتا ہے کہ سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ اور کبھی بھی اس سے تم نے ٹکنا نہیں ہے۔

اَدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ (۵۰: ۳۴) ”داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ۔“ وہ دن حیات ابدی کا دن ہو گا۔

پھر عالم بالا میں ان کی عزت افزائی کے لیے اعلان ہو گا کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کے لیے ان کے رب کے نزدیک اور بہت کچھ ہے اور وہ غیر محدود ہے۔

لَهُمْ مَا يَشَاءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (۵۰: ۳۵) ”وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ہے ان کے لیے۔“ وہ جس قدر چاہیں اللہ کے انعامات کی انتہا تک نہیں جاسکتے اور اللہ کے ہاں جو مزید ہے وہ لامحدود ہے۔

درس نمبر ۲۴۹ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے۔ گویا یہ آخری زمرہ ہے اور نہایت بن زور دار آواز میں بتایا جاتا ہے کہ سنو انسانی تاریخ میں ام سابقہ کے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے۔ اس میں کائنات کی ایک جھلک بھی ہے اور حشر و نشر کے بارے میں بھی ایک منظر پیش کیا گیا ہے اور قرآن کے بارے میں بھی ہدایت ہے کہ آپ کام جاری رکھیں۔ قلب و نظر کے لیے بھی کئی ہدایات ہیں اس سبق میں۔

یہ تمام جھلکیاں اس پوری سورت میں بھی گزری ہیں لیکن آخر میں یہ ایک نئے نئے کے ساتھ دہرائی گئی ہیں۔ نہایت تیزی کے ساتھ نکتہ دار انہی باتوں کو دہرایا گیا ہے لیکن ایک نئے دوق اور نئے انداز میں اور بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ ایک ہی بات کو جب ایک ہی سورت میں دہراتا ہے تو وہ نئی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے کہا گیا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَ أَصْحَابُ الرُّسِّ وَ ثَمُودُ (۵۰: ۱۲) وَعَادٌ وَ فِرْعَوْنُ
وَ اخْوَانُ لُوطٍ (۵۰: ۱۳) وَ أَصْحَابُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ ثَبَعٍ كُلُّ كَذِّبٍ الرُّسُلِ فَحَقَّ

وَ عِيدُ (۵۰: ۱۴) ”ان سے پہلے نوح کی قوم، اصحاب الرس، اور ثمود، اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائی اور ایکہ والے اور ثبع کی قوم کے لوگ جھٹلا چکے ہیں، ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہو گئی“ اور یہاں کہا گیا

--- ○ ○ ○ ---

درس نمبر ۲۲۹ تشریح آیات

۳۶ --- تا --- ۴۵

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا
فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّجْنُونٍ ﴿۳۶﴾

”ہم ان سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے بہت زیادہ طاقتور تھیں اور دنیا کے ملکوں کو انہوں نے
چھان مارا تھا۔ پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پاسکے؟“

جس حقیقت کی طرف اشارہ مطلوب تھا وہ یہ ہے لیکن یہاں بالکل جدید انداز میں ہے اور پہلی آیت میں جو انداز ہے
اس سے بالکل مختلف۔ یہاں اقوام کی ایک صفت کا اضافہ کر دیا گیا کہ انہوں نے پوری دنیا میں نقب لگا کر اسے چھان مارا تھا۔
وہ ہر طرف دوڑتے پھرتے تھے۔ اسباب حیات تلاش کرتے تھے لیکن جب ان کو پکڑا گیا تو پھر کیا کوئی جائے فرار تھی؟

هَلْ مِنْ مَّجْنُونٍ (۳۶:۵۰) ”پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پاسکے؟“۔ نہیں! پیش ہے ایک اضافہ اور جس سے بات
اور جاندار ہو جاتی ہے:

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرٍ لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ
وَهُوَ شَهِيدٌ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ
وَمَا مِنَّا مِنْ ثَغُوبٍ ﴿۳۸﴾ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ
طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ﴿۳۹﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ النُّجُودِ ﴿۴۰﴾
وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِي الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿۴۱﴾ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ
بِالْحَقِّ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ ﴿۴۲﴾ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ ﴿۴۳﴾ يَوْمَ
تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذَٰلِكَ حَشْرُ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ﴿۴۴﴾ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا

ع۱۶ یَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكَرَ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَتَخَفُ وَعِيدَهُ

”اس تاریخ میں اس بات کا سہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو یا جو توجہ سے بات کو سنے۔ ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی۔ پس اے نبیؐ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو اور اپنے رب کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریز یوں سے تاریخ ہونے کے بعد بھی۔ اور سنو جس دن مٹادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پکارے گا جس دن سب لوگ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سن رہے ہوں گے وہ زمین سے مردوں کے نکلنے کا دن ہو گا۔ ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی اس دن سب کو پلٹنا ہے جب زمین پھنسنے لگی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہوں گے۔ یہ حشر ہمارے لیے بہت آساں ہے۔ اے نبیؐ جو باتیں یہ لوگ بتا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ بس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اس شخص کو نصیحت کرو جو میری تنبیہ سے ڈرے۔ اہم سابقہ کے عروج و زوال میں بہت بڑی نصیحت ہے لیکن یہ صرف اس شخص کے لیے ہے جو دل و دماغ رکھتا ہو تاریخ اہم جس دل کو حرکت نہیں دے سکتی وہ مردہ ہے یا وہ شخص دل و دماغ رکھتا ہی نہیں ہے۔ بلکہ نصیحت حاصل کرنے اور عبرت لینے کے لیے تو یہ بھی کافی ہے کہ انسان خاموشی سے داستان عروج و زوال اہم سن لے۔ یہ داستان خود ہی چا دے گی۔ سچ یہ ہے کہ یہ ایک عظیم حقیقت ہے۔ نفس انسانی پر اہم ماضیہ کے قصص کا بہت ہی بڑا اثر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں معمولی سی بیداری اور معمولی سی قلبی کشادگی ہی یادوں اور تصورات سے اثر لیتی ہے اور انسان پر بہت اثر ہوتا ہے اور اس میں بہت سی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔

اس سے قبل اس کائنات کی کتاب سے یہ صفحہ الٹا گیا تھا۔

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ

فُرُوجٍ (۵۰: ۶) وَالْأَرْضِ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ

بَهْجٍ (۵۰: ۷) ”کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آڑ بستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رختہ نہیں ہے۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کے خوش منظر نباتات اگائے۔“ اور یہاں یوں ہے۔

---○○○---

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ

لُغُوبٍ (۵۰: ۳۸) ”ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا

اور ہمیں کوئی ٹکان لاحق نہ ہوئی۔“

تو پہلی بات پر یہاں ایک مزید حقیقت کا اضافہ کر دیا گیا۔

وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ (۳۸:۵۰) ”اور ہمیں کوئی ٹکان لاحق نہیں ہوئی۔“ جانتا یہ مقصود ہے کہ اللہ نے اس عظیم کائنات کو نہایت آسانی کے ساتھ پیدا کر دیا۔ مردوں کا زندہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ان ہولناک آسمانوں کے مقابلے میں تو یہ ایک بہت چھوٹا کام ہے۔ ایک مزید ہدایت بطور سبق آموزی۔

---○○○---

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ

الْغُرُوبِ (۳۹) وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ (۵۰:۳۹ تا ۴۰) ”پس اے نبی! جو باتیں یہ لوگ بتاتے ہیں ان پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔“

سورج کا طلوع و غروب اور غروب کے بعد رات کا منظر یہ سب آسمان اور زمین کے مناظر اور حرکات کے ساتھ منسلک ہیں۔ تسبیح و ثنا اور رکوع و سجود کو ان کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے اور تلقین یہ کی گئی ہے کہ ان لوگوں کی باتوں پر صبر کرو کیونکہ یہ ناحق حشر و نشر اور دوبارہ زندہ کرنے کو جھڑپتے ہیں۔ یہاں گویا رات اور دن کے تکرار میں ایک نئی بات داخل کی گئی۔ حمد و ثنا اور رکوع اور سجود کو بھی اس کائنات کے مناظر سے منسلک کیا گیا ہے۔ یوں جب بھی رکوع و سجود ہو گا یہ کائناتی مناظر بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔ سورج کے طلوع و غروب اور رات آنے کے مناظر۔

---○○○---

ایک دو سرائے جو اس کائنات کے صفحات کے ساتھ مربوط ہے۔ یعنی صبر کرو اور سجدے کرو اس حال میں کہ آپ ایک عظیم حادثہ اور ایک عظیم واقعہ کے انتظار میں ہوں۔ جو گردش لیل و نہار کے کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ اور اس سے غافل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے دل غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور یہ وہ بات ہے جو اس سورت کا محور اور محور ہے اور اصلی موضوع۔

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ (۴۱) يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ

ذَلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ (۴۲) اِنَّا نَحْنُ نَحْيِ وَنُمِيتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيرُ (۴۳) يَوْمَ تَشَقُّقُ

الْاَرْضُ عَنْهُمْ سَرَاعًا ذَلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرُ (۵۰:۴۱ تا ۴۴) ”اور سنو جس دن منادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پکارے گا جس دن سب لوگ آوازہ حشر کو ٹھیک ٹھیک من رہے ہوں گے وہ زمین سے مردوں کے نکلنے کا دن ہو گا۔ ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی اس دن

سب کو پلٹنا ہے جب زمین پھنکے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جارہے ہوں گے۔ یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے۔“

یہ ایک نیا اور پرتاثر منظر ہے۔ اس دن کا منظر جو بہت ہی مشکل دن ہو گا۔ ایک دوسری جگہ اس منظر کی تعبیر ایک دوسرے انداز میں کی گئی۔

وَنفِخَ فِي الصُّورِ ذَلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ (۲۰:۵۰) وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا

سَاقِقٌ وَشَهِيدٌ (۲۱:۵۰) ”اور پھر صور پھونکا گیا یہ ہے وہ دن جس کا تجھے خوف دلایا جاتا تھا۔ ہر شخص اس حال میں آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانگ کر لانے والا اور ایک گواہ دینے والا ہے۔“

اور یہاں نوح صور کے ساتھ ایک چیخ کا ذکر بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی خروج کا منظر سامنے آتا ہے۔ اور پھر زمین پھٹ رہی ہے اور لوگ اس سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔ یہ تمام مخلوقات جو آغاز حیات سے اس سفر کے انتہائی اس زمین میں دفن ہوئے تھے۔ یہ سب قبروں پھٹ پڑیں گی اور جن میں جو بھی جس قدر لوگ بھی دفن ہوئے تھے، نکلے چلے آئیں گے۔ معری کہتا ہے :

رب قبر صار قبرا مرارا
ضاحك من تراحم الاضداد
دفین علی بقایا دفین
فی طویل الآجال والاماد

(کتنی ہی قبریں ہیں جو بار بار قبریں بنی ہیں ان کے اندر جو متضاد قسم کے لوگ دفن ہوتے چلے آ رہے ہیں ان پر وہ مسکرا رہی ہیں۔ ایک مردے کو دوسرے کے جسم کے بقایا جات پر دفن کیا جاتا ہے، طویل زمانوں سے اور قدیم زمانوں سے۔“

تمام چیزیں زمین کے پھنکنے کے بعد خود بخود نکلتی چلی آئیں گی۔ ٹوٹے ہوئے جسم، ہڈیاں، ذرات جو زمین کی فضاؤں میں ہوں یا زمین کی وادیوں میں بہہ کر جہاں بھی ٹھہرے ہوں جن کی جگہ اللہ ہی جانتا ہے، جمع ہوتے چلے آئیں گے، یہ ایک ایسا منظر ہے کہ ہمارے خیال کی گرفت سے برتر ہے۔

اس پرتاثر منظر کے سایہ ہی میں اس حقیقت کو سامنے لایا جا رہا ہے جس کا وہ انکار کرتے تھے۔

اَنَا نَحْنُ نَحْيُ وَنُمِيتُ وَآلَيْنَا الْمَصِيرُ (۴۳:۵۰) ”ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت

دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی ان سب کو پلٹنا ہے۔“ اور

ذَلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ (۴۴:۵۰) ”اور یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے۔“ اور اس حقیقت

کے اظہار کا یہ بہترین وقت و مقام تھا۔

---○○○---

اسی منظر کے زیر سایہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ ثابت قدمی سے اپنے کام کو جاری رکھیں۔ ان کے جدال اور جھگڑوں، ہٹ دھرمی اور جھٹلانے کی پرواہ نہ کریں۔ جو حقیقت ان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، وہ واضح ہے اور اگر چشم بصیرت ہو تو دیکھی جاسکتی ہے۔

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكَرَ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ

وَعَيْدٍ (۴۵:۵۰) ”اے نبیؐ جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔ پس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اس شخص کو نصیحت کرو جو میری تنبیہ سے ڈرے۔“
جو باتیں یہ بنا رہے ہیں ہم ان کو خوب جانتے ہیں اور تمہاری قسلی کے لیے بس یہی کافی ہے کہ ہم جانتے ہیں اور ہمارے جاننے کے کچھ نتائج بھی ہوں گے۔ یہ بہت ہی خوفناک دھمکی ہے۔

وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (۴۵:۵۰) ”تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔“ کہ آپ ایمان اور تصدیق پر کسی کو مجبور کر دیں۔ اس میں آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے۔“۔ اختیارات ہمارے پاس ہیں۔ ہم نگرانی کر رہے ہیں اور ان کے ذمہ دہر ہیں۔

فَذَكَرَ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعَيْدٍ (۴۵:۵۰) ”پس تم اس قرآن کے ذریعے ہر اس شخص کو نصیحت کرو جو میری تنبیہ سے ڈرے۔“۔ قرآن بذات خود ایک عظیم قوت ہے۔ یہ دلوں کو ہلا مارتا ہے۔ ذہنی دنیا میں زلزلہ برپا کر دیتا ہے۔ اس کے سامنے سنگ دل سے سنگدل شخص نہیں ٹھہر سکتا۔ قرآن کے حقائق کا سامنا کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ قرآن عجیب انداز میں اثر انداز ہوتا ہے۔

جب ایسی سورتیں لوگوں پر پڑھنے کے لیے اور چشمی کرنے کے لیے موجود ہیں تو کسی جبار کی کیا ضرورت ہے جو لوگوں کی گردنیں مرد و کر مسلمان بنائے۔ قرآن کے اندر وہ قوت ہے جو بڑے بڑے جباروں کے اندر نہیں ہے۔ اس کے ذریعہ دلوں پر وہ ضربات لگ سکتی ہیں جو ڈکٹیٹروں اور جباروں کے کوڑوں کے ذریعہ نہیں لگائی جاسکتی (م۔ ن۔ اللہ العظیم)

نوٹ :- پارہ ۲۶ کی نظر ثانی رہ گئی تھی۔ یہ نظر ثانی آج مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۹۶ء بوقت ۵۲ - ۴ شب ختم ہوئی، اس طرح تقریباً بیس سال کے عرصے میں یہ کام ختم ہوا۔ اے اللہ اسے اپنے دین کی سربلندی کے لیے مفید بنادے اور میرے لیے موجب اجر بنادے۔ آمین۔ سید معروف شاہ شیرازی

---○○○---

تفسیر فی ظلال القرآن

سید قطب شہید
ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

جلد اول	پارہ	۴ تا ۴	۲۵۰ روپے
جلد دوم	پارہ	۵ تا ۸	۳۷۵ روپے
جلد سوم	پارہ	۹ تا ۱۲	۳۲۵ روپے
جلد چہارم	پارہ	۱۳ تا ۱۹	۳۲۵ روپے
جلد پنجم	پارہ	۲۰ تا ۲۶	۳۷۵ روپے
جلد ششم	پارہ	۲۷ تا ۳۰	زیر طبع